تفسیر فصل الخطاب

جلد اوّل

مصنف

سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب----------تفسیر فصل الخطاب

جلد----------اوّل

مصنف----------سید العلما علامہ سید علی نقی النقوی ؒ لکھنوی

پروف ریڈنگ----------مولانا عابد عسکری

کمپوزنگ----------(قائم گرافکس۔جامعہ علمیہ۔ڈیفنس۔کراچی)

ترتیبِ نو----------مجاہد حسین حر

نیٹ سیٹنگ----------قلب علی سیال

سال اشاعت----------2011

ناشر----------مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر ۲۴۔الفضل مارکیٹ۔اردو بازار۔لاہور

ابتدائیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَ اٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ.

قارئین کرام! تفسیر فصل الخطاب کی پہلی جلد پیش خدمت ہے لیکن افسوس صد افسوس کہ سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی اب ہم میں نہیں رہے۔ میں نے ۲۹ مارچ ۱۹۸۶ کو تفسیر کے چند خصوصی نسخے لے کر سرکار ممدوح کی خدمت میں حاضری دی تو معلوم ہوا کہ آپ علیل ہیں اور کسی سے نہیں ملتے۔ بہت دکھ ہوا اور تشویش بھی بہر حال میں نے اپنا وہ نام کہلا بھجوایا جس نام سے آپ مجھے یاد فرمایا کرتے تھے۔ آدمی واپس آیا، اس نے بیٹھک کھول دی اور مجھے انتظار کرنے کو کہا، تھوڑی دیر میں مولانا برآمد ہوئے، کافی دیر گفتگو ہوئی اور پھر خورد و نوش کا سلسلہ بھی چلا۔ میں نے تفسیر کے دو نسخے پیش کیے، تیسرے پر تبرک کے طور پر ان سے دستخط کروالئے اور ساتھ لے آیا۔ مولانا نے تفسیر کو تھوڑی دیر دیکھا اور فرمایا: ''دیر آید درست آید''۔ کسے خبر تھی کہ یہ مولانا سے آخری ملاقات ہے اور پھر کبھی شرف نیاز حاصل نہ ہوگا۔

سید العلماء ۲۹،۳۰ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء رحلت فرما گئے اور عین عید الفطر کے دن مدفون ہوئے۔ خداوند عالم ان کو جوار معصومین میں جگہ عطا فرمائے۔

آہ! وہ شمع جو ۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء لکھنؤ میں روشن ہوئی تھی، گل ہوگئی۔

افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں مگر وہ ہم میں روحانی طور پر موجود اور ہمارے دل و دماغ پر محیط ہیں۔ آج بھی ان کے علمی نکات ہم کو یاد آتے ہیں اور دین و دیانت اور اخلاق و شرافت سے ہماری محبت کو مستحکم کرتے ہیں۔ اب ایسی صلح کل ہستیاں کہاں ہیں جو علم و عمل کے میدان میں اسلامی تعلیمات و اقدار کی امین ہوں اور دنیا کی مشکلات میں ہمارے مژدہ فتح مبین ہوں۔

تفسیر فصل الخطاب کی پہلی جلد کی اشاعت کے تھوڑے دنوں بعد ہی ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' لاہور نے جو تفسیر نمونہ کے ناشر ہیں خواہش ظاہر کی کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کی ان کو اجازت دے دی جائے۔ مختلف مواقع پر اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی لیکن نتیجہ خیز نہ ہوسکی۔ ستمبر ۱۹۹۰ء کے آخری دنوں میں میری بیرون ملک سے واپسی پر پھر گفتگو ہوئی اور طے پایا کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت مصباح القرآن ٹرسٹ کی طرف سے اور پیشکش ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کی طرف سے ہو۔ چنانچہ ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے دوسری جلد کا کتابت شدہ مسودہ مصباح القرآن ٹرسٹ کے حوالے کر دیا تا کہ اشاعت کا کام مصباح القرآن ٹرسٹ کے اہتمام و انصرام کے تحت انجام پا سکے اور تفسیر فصل الخطاب کی جلدیں بہ سرعت شائع ہوتی رہیں۔ الحمد للہ کہ مصباح القرآن ٹرسٹ نے اب نئے سرے سے مکمل تفسیر کی کمپوزنگ کروائی ہے اور قارئین کی سہولت کیلئے اشاعتِ ھذا میں تین جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب کو مکمل شائع کر دیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تفسیر کی پہلی جلد حاضر خدمت ہے، امید ہے کہ قارئین اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور تعاون فرمائیں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

سید علی اکبر رضوی

صدر ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

سرکار سید العلماء علامہ علی نقوی النقوی اعلی اللہ مقامہ کے خطیبانہ و مؤلفانہ فیوض و برکات کا سلسلہ لگ بھگ پچاس سال پر محیط ہے۔ آپ کی تقریر و تحریر میں بیان و زبان کی سادگی اور مفاہیم و مطالب کی گہرائی یکساں طور پر موجود رہی ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کو برصغیر پاک و ہند کے جمہور مسلمین میں عموماً اور شیعہ مومنین میں خصوصاً مقبولیت اور ادب و احترام نصیب ہوا کہ باید و شاید!

سید العلماء کے آثار علمی میں ''شہید انسانیت'' سمیت دسیوں باعظمت کتابیں، آپ کے کئی ایک مجموعہ ہائے تقاریر اور مختلف دینی موضوعات پر کم و بیش پانچ سو رسالے موجود ہیں۔ تاہم آج سے ۲۵ برس قبل جب آپ کا مقدمہ تفسیر قرآن منظر عام پر آیا تو آپ کے تبحر علمی تحقیقی صلاحیت اور ذمہ دار قلم کی رعایت سے اپنے بیگانے ہر ایک کی نظریں آپ کی تفسیر قرآن کی طرف لگ گئیں۔

اس سلسلے میں خاص و عام کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ آپ کی تفسیر آئندہ جلد کی تلاش میں پاکستان کے لوگ ہندوستان جاتے اور وہاں کے لوگ پاکستان آتے، نیز دیگر ممالک میں مقیم مسلمان اس کے لئے ہندو پاک کے کتب خانوں سے برابر رابطہ رکھتے تھے۔ آخر کار ان ہزاروں منتظر اور متلاشی نگاہوں کی تسکین کا سامان یوں ہوا کہ سید العلماء کے ایک نہایت ہی مخلص قدر شناس غلام محمد بٹ نے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک کی مدت میں ثمر بگ (مقبوضہ کشمیر) سے آپ کی تفسیر قرآن ''فصل الخطاب'' کی سات جلدیں شائع کر کے اس اہم فرض کی تکمیل کا اعزاز حاصل کر لیا۔

اس اثناء میں مذکورہ تفسیر کی پاکستان میں اشاعت کی ضرورت کا احساس فرماتے ہوئے سید العلماء نے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کراچی کے صدر سید علی اکبر رضوی کو بھی اس کی اشاعت کے حقوق مرحمت فرما دیئے۔ چنانچہ اس ادارے نے تفسیر فصل الخطاب کی جلد اول شائع کر دی لیکن بوجوہ یہ سلسلہ کچھ آگے نہ بڑھ سکا لہٰذا سید علی اکبر رضوی نے مصباح القرآن ٹرسٹ کی شاندار تفسیری و علمی خدمات کو دیکھتے ہوئے ایک معاہدے کے تحت اس تفسیر کی اشاعت کا عظیم کام اس ٹرسٹ کے حوالے کر دیا۔ بنابریں مصباح القرآن ٹرسٹ نے تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کو خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ جلد اول جو کہ کراچی کے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے شائع کی تھی، کے ختم ہونے پر مصباح القرآن ٹرسٹ نے اسے دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کی، اس کی اصلاح و تزئین میں مقدور بھر کوشش کی گئی، اس کے باوجود ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہمیں اپنی تجاویز و آراء سے مستفید فرمائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آخر میں دردمندانہ گزارش بھی کرتے ہیں کہ تفسیر ہذا کی ترویج میں ہمارے ساتھ ہر ممکن تعاون فرما کر قرآن و عترت کی نصرت اور سید العلماء کی قدردانی کا حق ادا کرنے میں کوشاں رہیں۔

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

ضرورت تفسیر

قرآن مجید جب خود نور، ہدایت، بصیرت، آسان، واضح اور اَحسن (و بہترین) تفسیر ہے تو پھر تفسیر کی کیا ضرورت ہے؟ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات قرآن میں ہے:

وَلَا یَاۡتُوۡنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئۡنٰکَ بِالۡحَقِّ وَاَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا.(فرقان--۳۳)

اور یہ لوگ کوئی بھی مثال نہ لائیں گے مگر یہ کہ ہم اس کے جواب میں حق اور بہترین بیان (وتفسیر) لے آئیں گے

فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰہُ بِلِسَانِکَ لَعَلَّھُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ.(دخان--۵۸)

درحقیقت ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان پر بالکل آسان قرار دیا ہے، شاید وہ نصیحت قبول کریں۔

وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَھَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ.(قمر--۱۷)

''اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی جو نصیحت قبول کرے''۔

قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا غَیۡرَ ذِیۡ عِوَجٍ لَّعَلَّھُمۡ یَتَّقُوۡنَ.(زمر--۲۸)

''عربی زبان کا قرآن جس میں کوئی کجی نہیں، شاید کہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں''۔

قرآن مجید نے نہ فقط اس سوال کا جواب دیا ہے بلکہ یہ بھی بتادیا ہے کہ مفسر قرآن کون ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡھِمۡ وَلَعَلَّھُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ.(نحل--۴۴)

''اے رسول! ہم نے قرآن کو آپ پر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے اُن تمام احکام وغیرہ کو بیان کریں (اور ان کی توضیح وتشریح کریں) جو ان کی طرف بھیجے گئے ہیں شاید وہ غور وفکر سے کام لیں''۔

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا.(فاطر--۳۲)

''پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا انہیں جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا''۔

مذکورہ آیات میں واضح طور پر بتادیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے لئے مفسر کی ضرورت ہے اور مفسر قرآن سب سے پہلے خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے ان کے بعد وہ مفسر قرآن ہیں جو وارث قرآن، وارث علم قرآن اور وارث علم پیغمبرؐ ہیں یعنی اہل بیت وعترت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ جیسا کہ خود پیغمبرؐ نے بھی فرمایا:

''اِنِّیۡ تَارِکٌ فِیۡکُمُ الثَّقَلَیۡنِ------ کِتَابَ اللّٰہِ وَ عِتۡرَتِیۡ اَھۡلَ بَیۡتِیۡ------''

میں آپ لوگوں کے پاس دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب خدا (قرآن مجید) اور دوسری اپنی عترت (یعنی اہلبیت)۔

اہل بیت وعترت پیغمبرؐ کے بعد تفسیر قرآن کی ذمہ داری اُن علماء پر ہے جو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے حقیقی وارث اور "اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَآءِ" کے مصداق ہیں۔

انہی علماء میں سے ایک حضرت آیۃ اللہ علامہ السید علی نقی النقوی المعروف ''علامہ نقن'' ہیں۔ جنہوں نے تفسیر فصل الخطاب لکھ کر احسن طریقہ سے فریضۂ الٰہی انجام دیا۔

تفسیر فصل الخطاب سے قرآن مجید کا ترجمہ وحاشیہ مرتب کرتے وقت جس حد تک میں نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا ہے تو تفسیر کی مختلف اقسام (مثلاً تفسیر رُوائی، تفسیر عرفانی اور تفسیر اجتہادی) میں سے فصل الخطاب کو تفسیر اجتہادی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ علامہ موصوف نے اس تفسیر میں ان تمام علوم سے استفادہ کیا ہے جو ایک جامع اور اجتہادی تفسیر کے لئے ضروری ہیں۔

یہ تفسیر اگرچہ سابقہ کتابت کے مطابق چند مرتبہ مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہو چکی ہے لیکن اب خداوند عالم نے خادمین ادارہ مصباح القرآن لاہور مخصوصاً جناب محترم شیخ محمد امین صاحب کو یہ توفیق عنایت فرمائی کہ وہ اسے کمپوز کروا کر خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ کمپوز اور اصلاح کا کام جناب محترم مجاہد حسین حر صاحب کے سپرد کیا گیا انہوں نے اپنی حد تک کوشش کی لیکن اتنے بڑے کام میں نواقص اور غلطیوں کا باقی رہنا فطری امر ہے۔ قارئین محترم سے گزارش ہے کہ نواقص کے سلسلہ میں راہنمائی فرمائیں تا کہ بعد والے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے۔

دعا ہے کہ خداوند عالم بانیٔ ادارہ مصباح القرآن حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین مرحوم علامہ سید صفدر حسین نقوی النجفی قدس سرہ کے درجات بلند فرمائے۔ ان کے قائم کردہ تمام ادارات کو ترقی وکمال عطا کرے مصباح القرآن و دیگر ادارات کی تاسیس میں ان کے معاون خاص محترم جناب سیٹھ نوازش صاحب دام عزہ کو صحت وسلامتی اور طول عمر عطا کرے۔

علامہ مرحوم کے قائم کردہ تمام اداروں کے سرپرست اعلیٰ اور ان کے روحانی جانشین حضرت آیۃ اللہ حافظ ریاض حسین نقوی النجفی دامت برکاتہ کو صحت وسلامتی اور طول عمر بابرکت عطا فرمائے اور ان کا سایہ ہم سب کے سروں پر قائم ودائم رکھے۔ تمام معاونین وخادمین ادارہ مصباح القرآن مخصوصاً جناب محترم محمد امین صاحب کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

سید فیاض حسین نقوی

جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس۔ کراچی

ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مارچ ۲۰۱۱ء

تفسیر فصل الخطاب

چند تاثرات

ڈاکٹر محسن نقوی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ وَعَلٰی اٰلِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاھِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ اَذۡھَبَ اللّٰہُ عَنۡھُمُ الرِّجۡسَ وَطَھَّرَھُمۡ تَطۡھِیۡرًا.

ہماری خوش نصیبی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی عظیم ترین علمی شخصیات میں سے فردِ وحید و عالم جلیل سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی (۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء۔ ۲۹ رمضان ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۹۸۸ء) کی تفسیر فصل الخطاب کی طبع نو کے موقع پر اس کے بارے میں کچھ خیالات کے اظہار کا موقع ہمیں فراہم ہوا۔

ایک پوتے کے لئے اپنے جدّ (سیّد العلماءؒ ہمارے والد کے چچا تھے) کی کسی کتاب پر لکھنا وہ بھی ''سید العلماءؒ'' جیسی علمی شخصیت کی کتاب، اُس پر مستزاد ''تفسیر القرآن'' جیسا وسیع و دقیق موضوع اِس بے بضاعت کے لئے بہت مشکل کام تھا لیکن توفیق اِلٰہی (عزّوجل) اور ولی العصر، صاحب الزمان علیہ الصلاۃ والسلام اور اُن کے اجدادِ کرام، صلوٰۃ اللہ علیہم کی ہدایت کے توسل سے کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں قرآن مجید کے اردو تراجم کی ابتداء سید العلماءؒ کے اجداد میں سید علی نقویؒ (۱۲۰۰ھ/ ۱۲۵۹ھ بمطابق ۱۷۸۵ء--۱۸۴۳ھ) ابن سید دلدار علی غفرانمآبؒ کے حصّے میں آئی۔ آپ کا ترجمۂ قرآن شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین سے پہلے قرار پاتا ہے۔ اس ترجمے کی زبان قدیم لیکن سلیس اور بامحاورہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ پیر ابراہیم ٹرسٹ کراچی کی لائبریری، ناظم آباد میں موجود ہے۔

یوں تو علمائے شیعہ نے قرآنِ مجید کے بہت سے ترجمے اور حواشی قلم بند کئے جن میں مولانا فرمان علی (۱۸۵۳ء--۱۹۱۶ء) اور مولانا مقبول احمد اعلی اللہ مقامہما (۱۸۷۰ء--۱۸۸۶ء) کے تراجم و حواشی کو خاص شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی طرح اردو تفاسیر میں مولانا عمار علی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۲۸ء--۱۹۷۵ء) کی تفسیر ''عمدۃ البیان'' (۳ جلدیں) ایک متوسط حجم کی تفسیر شمار کی جاتی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مولانا امداد حسین کاظمیؒ (۱۹۰۱ء--۱۹۷۵ء) کا ترجمہ و حاشیہ تفسیر متقین ہماری نظر میں فرمان علیؒ اور مقبول احمدؒ کے تراجم و حواشی پر بوجوہ فوقیت رکھتا ہے۔ اردو تفاسیر میں اس کے بعد علامہ حسین بخش جاڑا صاحب کی تفسیر ''انوار النجف'' تفسیر کے شائقین کا مرکز رہی، اسی طرح علامہ ذیشان حیدر جوادیؒ کا ترجمہ و حاشیہ بھی اس بناء پر بنظر استحسان دیکھا جاتا ہے کہ ترجمہ انتہائی رواں اور حواشی عام قاری کے لئے سہل ہیں۔ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی (دام ظلہ الوارف) کی زیر نگرانی تیار ہونے والی ''تفسیر نمونہ'' کا ترجمہ انتہائی دیانت و عرق ریزی سے کیا گیا اور اس نے خاص حد تک ایک ایسی تفسیر کی کمی پوری کر دی جو طلباء، کالج و یونیورسٹی کے پروفیسروں اور علماء کے لئے ''حوالے'' کا کام دے اور وہ اس کے ذریعے اپنی ''قرآن فہمی'' میں

اضافہ کرسکیں۔ فجزاء ہم اللہ أحسن الجزاء. جس دوران تفسیر نمونہ کی جلدیں طبع ہوکر آرہی تھیں اُسی دوران سید العلماءؒ کی تفسیر ''فصل الخطاب'' پہلے سات جلدوں میں کشمیر سے چھپی، پھر ایک جلد ادارۂ ترویج علوم اسلامیہ سے اور بعد ازاں مصباح القرآن ٹرسٹ نے اس کا پورا سیٹ اچھے انداز میں طبع کیا۔

قرآن مجید کے طالب علم کی حیثیت سے عالم اسلام میں مختلف مکاتب فکر وفقہ کی تفاسیر شائع ہونے کے ساتھ زیر مطالعہ رہتی ہیں تو اپنے مکتب فکر کی اردو تفاسیر وحواشی بھی ہمیشہ زیر نظر رہتے ہیں جو اپنی قدر و قیمت میں کچھ کم نہیں جن میں سے بعض کا ذکر ماقبل ہم کر چکے۔

سید العلماءؒ کی تفسیر کی خاص بات جس نے ہمیں متاثر کیا وہ اس کا ''تفسیری ترجمہ'' ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سید العلماءؒ کی ساری محنت وژرف نگاہی آیات کے ترجمے میں مضمر ہے اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

سید العلماءؒ کسی بھی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے صرف عربی زبان، نحو و بلاغت، معانی و بدائع کو مدّنظر نہیں رکھتے بلکہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث اور اُن کو مدّنظر رکھ کر لکھی جانے والی تفاسیر مثلاً شیخ طوسیؒ کی التبیان، محسن فیض الکاشانی کی الصافی، تفسیر قمی علامہ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان وغیرہ میں پیش کئے گئے مطالب کو اردو ترجمے میں سمو دیتے ہیں اور تائیداً متعلقہ تفسیر کی متعلقہ عبارت کو مختصراً نقل کر دیتے ہیں۔ تفسیری مواد اس ترجمے ہی کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسی لئے ترجمے میں لفظ پر لفظ نہیں رکھا ہے بلکہ اُسے اُردو محاورے کے مطابق ادا کیا ہے۔ نمونے کے طور پر بعض مقامات پیشِ خدمت ہیں:

(۱) سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۱۹ کے ایک جزء:

وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ

اس کا ترجمہ سید العلماءؒ نے یہ کیا ہے : اور جب تخلیہ ہوتا ہے تو تمہارے خلاف غیظ وغضب سے اپنی بوٹیاں کاٹتے ہیں۔

اس کے بعد حاشیے میں پہلے مولا نا فرمان علیؑ کا ترجمہ دیا ہے ''تم پر غصے کے مارے انگلیاں کاٹتے ہیں''۔ پھر ان ہی کا حاشیہ نقل کیا ہے: اس ''الانامل'' کے اصلی معنی پوروں کے ہیں مگر چونکہ اردو محاورہ میں پوروں کا کاٹنا نہیں بولتے ہیں اس وجہ سے یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

بعد ازاں سید العلماءؒ وضاحت کرتے ہیں: مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو میں تو انگلیاں کاٹنا بھی محاورہ نہیں ہے، اس لئے ہم نے ترجمہ بوٹیاں کاٹنے کے ساتھ کیا ہے'' (فصل الخطاب، ج ۳، ص ۳۷)

علامہ جوادیؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب اکیلے ہوتے ہیں تو غصّے سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ تفسیر نمونہ کے اردو ترجمے میں ہے: جب وہ تنہائی میں ہوتے ہیں تو شدید غیظ وغضب سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگ جاتے ہیں۔ (ج ۳ ص ۶۴) سید العلماء کا ترجمہ عربی سے قریب اور اردو محاورے کے مطابق ہے۔

(۲) سورۂ آلِ عمران ہی کی آیت ۱۵۴ کے پہلے جزء میں فرمایا:

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ ...

علامہ جوادیؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: ''اس کے بعد خدا نے ایک گروہ پر پُرسکون نیند طاری کر دی اور ایک کو نیند بھی نہ آئی کہ اسے صرف اپنی جان کی فکر تھی''

اس ترجمے میں ایک تو ''غم'' کا ذکر نہیں ہے، دوسرے تاکہ ''اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ'' میں جو عمومیت ہے وہ مفقود ہے۔ تیسرے قرآن مجید کے الفاظ "وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ..." کا ترجمہ مبہم ہے ''اور ایک کو----'' یہاں مفرد کا گمان ہوتا ہے اگر ''گروہ'' کا اضافہ ہوتا اور ''ایک'' کی بجائے ''دوسرے'' ہوتا تو قرآنی الفاظ کی رعایت بھی ہوتی اور مطلب واضح ہوتا۔

سید العلماءؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: پھر اُس نے رنج وغم کے بعد تم پر سکون واطمینان اُتارا نیند کی صورت سے جو تم میں سے ایک گروہ پر طاری ہو رہی تھی اور ایک گروہ ایسا تھا جسے اپنی جانوں کی فکر تھی۔ (ج ۳ ص ۴۷)

اس کی تائید میں انہوں نے علامہ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

(۳) سورۂ نساء کی آیت ۹۱ کا ایک جزء ہے:

كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا.

علامہ جوادیؒ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: یہ جب بھی فتنے کی طرف بلائے جاتے ہیں اُلٹے اس میں اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔

الفاظِ قرآن میں ''بلائے جاتے ہیں'' کسی لفظ کا ترجمہ نہیں ہے۔

شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب کبھی لوٹائے جاتے ہیں وہ فساد کی طرف تو اس کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

"اُرْكِسُوْا فِيْهَا" کے بنیادی معنی: " یعنی وقعوا فیھا" (التبیان للطوسیؒ) یعنی ''پڑ جانا'' واقع ہو جانا اس کو تائیداً نقل کر کے سید العلماءؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: اور جب فتنہ پردازی کا دوبارہ موقع ملے تو وہ اس میں بالکل جُٹ جائیں گے۔ (فصل الخطاب ج ۳ ص ۲۶۹)

''جُٹ جانا'' اُردو محاورہ ہے جس میں تن دہی سے کسی کام میں دلچسپی سے لگے رہنے کا مفہوم ہے اور یہی "اُرْكِسُوا فِيْهَا" کا درست ترجمہ ہے۔

ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

درج بالا سطور سے سید العلماءؒ کی تفسیر فصل الخطاب کی چند خصوصیات مستفاد ہوتی ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ الفاظِ قرآنی کی بالالتزام رعایت

۲۔ لفظی ترجمے کی بجائے محاوراتی ترجمہ اور لکھنوی اردو محاورے کی مطابقت

۳۔ ترجمے میں عقلی و منطقی اظہار اور ربط کا لحاظ

۴۔ طوالت سے گریز

۵۔ مستند تفاسیر کے طویل اقتباسات سے گریز

۶۔ تفاسیر کے مختصر اقتباسات سے استشہاد

۷۔احادیث کے طویل مندرجات کی بجائے محض متعلقہ حصّے کا اقتباس واشارہ

۸۔تاریخی واقعات کی طرف اشارہ اور تفصیل سے اجتناب

۹۔تفسیر میں نہ اتنی طوالت کہ قاری پر بار ہو جائے اور نہ ایسا اطناب کہ وہ حاشئے میں شمار ہو۔

۱۰۔وہ مضامین جن کی ادائیگی عوام میں خلافِ ادب سمجھی جاتی ہے اُس کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال جن سے وہ دائرۂ ادب وستر سے باہر بھی نہ نکلیں اور مطلب بھی ادا ہو جائے۔مثلاً سورۂ نساء کی آیت ۶ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:''بلوغ کا تعلق تو عمر کے ساتھ ہے جو لڑکے میں ۱۵ برس اور لڑکی میں ۹ برس ہے یا خاص کیفیات جو علامت بلوغ کی حیثیت سے معتبر ہیں''۔(ج ۳،ص:۱۴۴)

۱۱۔فقہی آیاتِ احکام کی وضاحت میں فقہی مسائل کو اپنی پوری فقہی مہارت سے بیان فرمایا ہے مگر اس کو بہت قابلِ فہم انداز میں تحریر فرمایا تا کہ مسائل سمجھ میں آسکیں۔مثلاً سورۂ نساء کی آیات اِرث۔

قابل مبارک باد ہیں مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور کے مسئولین ومنتظمین جو قرآنِ مجید کی خدمت کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ علومِ اہل بیت علیہم السلام کو بھی نشر کر رہے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ اِن سے فرمان خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم :''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: قرآن واہل بیتؑ جب تک اِن سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے'' پر عمل بھی کروا رہا ہے اور ثقلین کی خدمت بھی۔

ایں سعادت بہ زور بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے مساعی کو قبول فرمائے اور انہیں ''ثقلین'' کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

خادم الثقلین

ڈاکٹر محسن نقوی

۲۶ مارچ ۲۰۱۱ء کراچی

فہرست کتاب

عنوان	صفحہ نمبر
پہلا تبصرہ	21
لفظ قرآن کے لغوی تشریح	21
قرآن اور حدیث قدسی میں فرق	21
حدیث نبوی اور حدیث قدسی	24
قرآن کے اصطلاحی معنی	25
دوسرا تبصرہ	26
کلام الٰہی کے معنی اور قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا معرکہ	26
(۱) صفات ثبوتیہ	26
(۲) صفات الٰہی کے بارے میں اختلاف	26
کلام الٰہی کیا ہے؟	27
کلام نفسی کا تصور	27
شیعی نقطۂ نظر	28
نزول قرآن کے معنی	30
وحی کی صورتیں	30
خلق قرآن کا معرکہ	31
وکیع بن الجراح	34
یزید بن ہزون	34
مزنی شاگرد شافعی	34
امام بخاری	34
عبدالرحمٰن بن مہدی	34
تیسرا تبصرہ	37
نزول قرآن کی تاریخ	37

عنوان	صفحہ نمبر
چوتھا تبصرہ	38
اعجاز قرآن	38
معجزہ کے معنی	38
معجزہ کی ضرورت	38
معجزہ اور اثبات حقانیت	40
معجزہ کا سحر اور غیر معمولی انسانی کمالات سے تفرقہ	42
قرآن میں معجزات انبیاءؑ کا تذکرہ	43
حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات	47
اعجاز قرآن	52
سلسلہ معجزات میں قرآن کا امتیاز	53
قرآن مجید کی حیثیتِ اعجاز	54
قرآن کے تازہ ترین معجزات	55
قرآن کے امتیازی خصوصیات بحیثیت اسناد و اعتبار	56
پہلی خصوصیت	56
دوسری خصوصیت	56
تیسری خصوصیت	57
چوتھی خصوصیت	57
پانچویں خصوصیت	57
چھٹی خصوصیت	57
ساتویں خصوصیت	57
آٹھویں خصوصیت	57
نویں خصوصیت	57

عنوان	صفحہ نمبر
پانچواں تبصرہ	58
جمع وتدوین قرآن	58
چھٹا تبصرہ	60
نفیٔ تحریف	60
دیگر آئمہ اہلبیت کے ارشادات	64
قرآن وحدیث کی صحت کا معیار	64
قرآن کی مخالفت کفر	65
قرآن نشان ہدایت	65
قرآن جنت کا رہنما اور جہنم سے سدراہ	66
فقہ جعفری کے احکام متعلقہ قرآن	66
تفسیر اور دیگر علوم قرآن کے بارے میں	67
آئمہ اہلبیتؑ اور پھر ہر صدی کے علمائے شیعہ کی خدمات	67
نفی تحریف کے متعلق علماء شیعہ کے تصریحات	71
ساتواں تبصرہ	77
قراء سبعہ اور سبعۃ احرف	77
آٹھواں تبصرہ	79
فہم قرآن کے سلسلہ میں مختلف نظریات اور صحیح نقطہ نظر	79
قرآن مشکل ہے یا آسان	83
قرنِ اوّل کے مسلمانوں کا عمل بالقرآن	85
(۲) بلاغت کا مفہوم	88
(۳) قرآن سے ثبوت	90
(۴) قرآن کا مطالعہ	92
نواں تبصرہ	94
تفسیر واصول تفسیر	94
تفسیر بالرائے کے معنی تنزیل وتاویل میں فرق	94
محکم ومتشابہہ میں امتیاز اور تفسیر قرآن کے شرائط	94

عنوان	صفحہ نمبر
تفسیر بالرائے کی چند مثالیں	101
(۱) قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کا ذکر ہے	101
محکم اور متشابہہ	107
تاویل آیات کی مختلف اقسام	111
افادات بلاغیؒ از مقدمات تفسیر آلاء الرحمٰن فی تفسیر القران	115
تمہید	116
قرآن مجید کی معجزانہ حیثیت کا ایک خاص پہلو	117
پہلا امر	117
دوسرا امر	118
تیسرا امر	118
اعجاز قرآن کے مختلف رخ	119
تاریخی حیثیت	119
استدلالی حیثیت سے	120
تشریعی حیثیت سے	121
اخلاقی حیثیت سے	122
نفیٔ تحریف	123
فرقہ امامیہ کا قول کہ قرآن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی	123
قرآن مجید کی قرأت	128
اصول تفسیر	132
اس سلسلہ میں چند پہلو قابل تبصرہ ہیں	132
پہلی آیت	136
دوسری آیت	136
تیسری آیت	137
افسوس ناک نتیجہ	138
تفسیر فصل الخطاب	143
سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ	144

عنوان	صفحہ نمبر
سورہ کے لفظی اور اصطلاحی معنی	144
سوروں کے نام	145
سورۂ حمد کے نام	145
سورۂ حمد کی جامعیت	145
زمانۂ نزول	146
سورۂ حمد کا اندازِ بیان	146
بسم اللہ کی خصوصیت	147
اسم کے معنی	148
اسم ذات ''اللہ''	149
رحمٰن اور رحیم کا فرق	149
حمد اور مدح کا فرق	150
حمد اور شکر میں تفرقہ	151
''رب'' (پروردگار) اور ''اب'' (باپ)	151
عالمین کی کثرت	151
رحمٰن ورحیم کے وصف کی تکرار	153
الدین جزاؤ سزا	153
عبادت کا مفہوم	154
تعظیم اور عبادت میں فرق	154
استعانت اور توسل	154
سلسلۂ کلام کی بلیغانہ رفعت	155
صراط مستقیم	156
دعائے ہدایت کا مطلب	157
دین حق کی معرفت میں اشخاص کی اہمیت	157
سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ	160
سورۂ بقرہ کے مضامین	160
مقطعات قرآنیہ اور ان کی نوعیت	161

عنوان	صفحہ نمبر
تقویٰ کا مفہوم	164
ایمان بالغیب کی اہمیت	164
گزشتہ انبیاء پر ایمان کی صورت	166
آخرت پر یقین	166
دلوں پر مہر لگنا کفر کا نتیجہ	169
منافقین کا ذکر	170
خدا کو دھوکا دینے کا مطلب	171
مرض اور اس کے بڑھانے کا مطلب	172
فساد فی الارض کے معنی	173
معیار عقل و بے عقل	174
خدا کی طرف سے استہزا کا مطلب	176
منافقین کی مثال	178
عبادت کا ہمہ گیر حکم اور اس کا فلسفہ	181
قرآن کے مثل لانے کا مطالبہ اور دنیا کی عاجزی	183
ایمان اور عمل صالح	186
قرآن میں مثالوں کا مقصد	189
خلقت آسمان وزمین	192
خلافت آدم کا اعلان	193
ملائکہ کا سوال وجواب	195
تعلیم اسماء اور امتحان آدم پر ملائکہ	195
حکم سجدہ اور ابلیس کا انکار	198
جنت میں آدم کا قیام اور ترک اولیٰ	200
توبہ اور اس کی نوعیت	204
بنی اسرائیل اور ان کا کردار	206
صبر وصلوٰۃ	211
اسرائیلی عقیدۂ شفاعت اور اسلامی عقیدۂ شفاعت میں فرق	214

عنوان	صفحہ نمبر
فرعون کے مظالم اور بنی اسرائیل کی نجات	214
بداء اور اس کا مطلب	217
بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی	218
مطالبۂ دیدار اور اس کا انجام	219
من وسلویٰ	220
بابِ خطہ	221
بارہ (۱۲) چشمے	222
یہود کے لیے فیصلہ تقدیر	225
معیارِ نجات	225
سبت کا حکم اور اس کی مخالفت کا انجام	226
بقرہ یعنی گائے کا قصہ	228
منافقین یہود کا رویہ	233
کتب سماویہ میں تحریف	234
عہد نامہ	236
یہود کا انتظار اور بعد میں انکار	240
یہود کا گزشتہ انبیاء کے ساتھ سلوک	242
تمنائے موت کا مطالبہ اور یہود کی نفسیاتی کیفیت	243
جبرائیلؑ سے دشمنی اور اس کا جواب	245
جادو کی ابتداء اور اس کی ترقی	247
جناب سلیمانؑ کی طرف سے صفائی	248
رَاعِنَا اور اُنْظُرْنَا کا فرق	251
منکرین رسالت کی ذہنیت اور ان کا جواب	252
نسخ اور بدا	253
اہل کتاب کی حاسدانہ ذہنیت	255
یہود ونصاریٰ کے مزعومات اور ان کا جواب	257
مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کا ابطال	261

عنوان	صفحہ نمبر
کفار کے غلط مطالبے	263
امتحان حضرت ابراہیمؑ اور اعلانِ امامت	266
دعائے ابراہیم علیہ السلام اور اس کی قبولیت باشرط عصمت	268
خانۂ کعبہ کی مرکزیت	269
حضرت ابراہیمؑ کی دعائیں اور ان کی استجابت	270
بنائے کعبہ اور ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ کی مناجات	271
دعائے ابراہیمؑ میں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف	273
اولاد ابراہیم علیہ السلام کا دین	276
ابراہیمؑ، اسحاقؑ، اور یعقوبؑ کا دین کیا تھا؟ یہود نصاریٰ کے لئے لمحۂ فکریہ	281
تبدیلی قبلہ	283
مکّہ بزمانۂ قیام سمت قبلہ	283
سمت میں ذاتی تقدس نہیں	285
پہلا ٹکڑا اُمّت وسط	286
شہداء علی الخلق اور ان کے مراتب	287
دوسرا ٹکڑا پہلا قبلہ بھی خالق کا مقرر کردہ تھا	287
تیسرا ٹکڑا	290
مسجد حرام	292
اہل کتاب کا جان بوجھ کر انکار	294
قبلہ اور معیار فضیلت	295
صبر اور صلوٰۃ	298
حیاتِ شہداء	300
کتمان حق کرنے والے پر لعنت	305
توحید الٰہی کے معنی	307
قدرت کی نشانیاں	308
پرستارانِ باطل سے تبرا	310

عنوان	صفحہ نمبر
غذا میں جائز اور ناجائز کی تفریق	312
آباؤ اجداد کی غلط تقلید	314
مردار، خون، سؤر کے گوشت اور غیر ذبیحہ کی حرمت	316
نجاست کفار کے مسئلہ پر ضمنی روشنی	317
معیار نجات ایمان وعمل	321
حکم قصاص	324
فلسفۂ قصاص	325
حکم وصیّت	326
روزہ کا وجوب	329
صاحبانِ اعذار کا بیان	330
ماہ رمضان کی خصوصیت	331
دُعا اور اس کی قبولیت	332
بعض سابق احکام صوم کی منسوخی	334
اعتکاف	335
ناحق مال کھانے اور رشوت ستانی کی ممانعت	336
چاند کا حساب نہ کہ سورج کا	337
گھروں میں دروازوں سے داخل ہو	337
جنگ اور اس کے حدود وقیود	338
اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو	341
حج تمتع کا حکم	343
محصور ومسدود	343
محرّمات احرام	345
عرفات اور مشعر الحرام یعنی مزدلفہ	346
دنیاداروں اور دیانتداروں کے نصب العین کا امتیاز	348
منیٰ میں قیام	349
ریاکار اور مطلب پرست آدمی کا کردار	350

عنوان	صفحہ نمبر
شب ہجرت حضرت علی علیہ السلام کا کردار	352
مسلمانوں کو انتباہ اور دعوت اتحاد واتقیاء	352
جمہور کا انحراف کوئی عجیب بات نہیں	354
اختلاف خلق اور انبیاء کی بعثت	356
مستحقینِ خیرات	358
حکم جہاد بصورت قتال	359
خیرات کی مقدار	363
یتیموں کی بہبودی	364
غیر مسلموں سے شادی بیاہ کی ممانعت	366
ایام میں مقاربت کی ممانعت	367
بات بات پر قسم کھانے کی ممانعت	368
ایلا کے احکام	370
عدۂ طلاق	371
طلاق بائن کا حکم اور اس کا معیار	373
احکام رضاعت	379
عدۂ وفات	381
زمانۂ عدّہ کے بعض احکام	382
مہر وغیرہ جو ادا کرنا ہوگا	383
نماز وُسطیٰ	384
عدۂ وفات کا قدیم حکم جو منسوخ ہو گیا	386
وہ جماعت جو مر کر زندہ کی گئی	388
قرض حسنہ	390
قصہ طالوت وجالوت	391
اجازت دفاع کا حکیمانہ پہلو	397
پیغمبروں میں بعض کی بعض پر فضیلت	398
ہمارے پیغمبر کی متعدد وجوہ سے دیگر انبیاء کے مقابلہ میں بلندی	399

عنوان	صفحہ نمبر
توہم جبر کا دفعیہ	399
آیۃ الکرسی	403
حی وقیوم کے معنی	403
غنودگی کے بعد نیند کی نفی کا مطلب	403
ثبوت شفاعت علم غیب بمشیت الٰہی	404
دین میں جبر نہیں	405
مفہوم وحالات	406
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو نمرود سے	407
عزیر یا ارمیا کا واقعہ	409
حضرت ابراہیمؑ کی خالق سے التجا اور اس کا نتیجہ	410
راہ خدا میں خیرات کی نتیجہ خیزی اور اس کی مثال	412
خیرات کے باعث ثواب ہونے کی شرطیں	413
ریاکاری سے خیرات کے باطل ہونے کی مثال	415
قابل قبول خیرات کی مثال	415
خیرات کے دو اہم اصول	417
فضیلتِ حکمت	419
خیرات کا خفیہ دینا بہتر اعلانیہ	420
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام جبری طور پر ہدایت کرنا نہیں	422
فقراء میں ترجیح کا معیار	424
سودخواروں کی مذمت	426
سود کی حرمت	426
سودخوار کی انجام میں بربادی	427
ترتب اجر وثواب باعتبار اعمال	428
معاملات باہمی کے متعلق احکام	432
حاکمانہ اور حکیمانہ دو قسم کے احکام	432
رہن کا حکم	435

عنوان	صفحہ نمبر
شریعت اسلامی کی خصوصیت	438
سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرَانَ	439
آغاز سورۂ آل عمران	439
اس سورۂ کے خاص مضامین	439
فرقان کے معنی	442
آیات قرآن کی دو قسمیں محکمات اور متشابہات	444
الراسخون فی العلم اور علم تاویل قرآن	444
جنگ بدر کی مختصر روداد	449
محبت آل ومال بری چیز نہیں مگر فکر مآل مقدم	452
سحر خیزی کی تعریف	454
اوصاف الٰہی میں وحدت کے ساتھ عدل کی اہمیت	454
توحید کے ساتھ عدل اصول دین کا لازمی جزء	455
اصل دین صرف اسلام	456
حقیقت اسلام	457
نیرنگ زمانہ سے اللہ کی قدرت کا ظہور	462
حکم تقیہ	464
معیار محبتِ الٰہی اتباعِ رسول	466
آل عمران کون ہیں؟	470
جناب مریم سلام اللہ علیہا کی ولادت اور نشوونما	472
جناب زکریا علیہ السلام کی ولادت فرزند کے لئے دعا	473
ولادت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت	474
جناب مریم سلام اللہ علیہا کی فضیلت وعصمت	476
حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی رفعت	477
قرآن کا اعجازی پہلو بحیثیت بیان واقعات	479
ولادت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت	480
معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام	482

عنوان	صفحہ نمبر
حواریین عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ	484
خداوند عالم کی طرف مکر کی نسبت اور اس کا مفہوم	486
غیبت جناب عیسیٰ علیہ السلام اور غیبت امام مہدی علیہ السلام	487
دائمی طور پر قوم یہود کی پستی کا اعلان	487
نصارائے نجران سے بحث کی آخری کڑی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے نہ ہونے کی	489
واقعۂ مُباہلہ	490
"انفسنا" کے معنی	491
حسنین علیہما السلام کا فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونا	492
مخالفین کو روادانہ دعوت اتحاد	493
اسلام میں فقہا اور مجتہدین کو شریعت سازی کا اختیار نہیں	493
قرآنی تہذیب یا رواداری	494
حضرت ابراہیم علیہ السلام کس دین پر تھے	494
علمائے اہل کتاب کے لئے سرمایۂ انتباہات	497
پرستارانِ باطل کا ایک منصوبہ	498
جماعت اہل کتاب کی بدمعاملگی	502
امانت و دیانت کا لحاظ ہر جماعت کے ساتھ لازم	502
توریت میں تحریف کا وقوع	504
عصمت انبیاء	505
تمام پیغمبروں سے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کا عہد	506
اسلام قانونِ فطرت ہے	507
اسلام کے بغیر نجات کا تصوّر غلط	508
خیرات کے متعلق ضروری ہدایت	510
وجوب حج اور اس کی شرط لازم استطاعت، خانہ کعبہ سرزمین مکّہ اور مقام ابراہیم علیہ السلام	511
اہل کتاب کو تنبیہی تازیانے	512

عنوان	صفحہ نمبر
مسلمانوں کے لئے سامان انتباہ	513
اتحاد اور اتفاق باہمی کی تاکید	515
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم	515
مسلمانوں کو تنبیہی تازیانے	517
انکار نص کے نتیجہ میں افتراق اور اس کا انجام	519
بہترین امت کون ہے	520
یہود کے متعلق قرآنی پیش گوئی اور حالات حاضرہ	521
غزوۂ احد کے لئے روانگی کے وقت کا تذکرہ	525
صحابہ کے واقعات پر تبصرہ کو روکنا منشائے قرآنی کے خلاف ہے	526
جنگ بدر کا حال اور مدد الٰہی	527
فرشتوں کا مدد کے لئے آنا	528
فرشتوں کے بھیجنے کی مصلحت	529
سود کھانے کی ممانعت	531
پرہیزگاروں کے اوصاف حمیدہ کا ایک سلسلہ	532
جنگ احد کی عسکری شکست پر تنبیہیں اور تسلیاں	535
آزمائش کا نتیجہ اصل جاں نثار کا تعارف	536
فرار ہونے والوں پر شدید طنز	538
مستقبل کے خطرہ پر توجہ دہانی	539
موت کا وقت مقرر ہے	540
شان نزول اور حضرت علیؑ کا کردار	540
انبیاء کے ساتھیوں کا کردار اور ساتھ ہونے کا معیار	541
حسن کردار کے ساتھ شان عبودیت کا اظہار	541
فتح، اس کے بعد شکست اور اس کے اسباب	544
صحابہ کے ایک طبقہ کی نبض قرآن دنیا طلبی	544
جنگ احد سے فرار کا عبرت ناک منظر	545
بعد کی کیفیت اور چہ میگوئیاں	546

عنوان	صفحہ نمبر
شہادت میں خسارہ نہیں	549
رسولؐ کی رواداری عام مسلمانوں کیلئے دعائے مغفرت کا حکم	550
مسلمانوں کی رسولؐ سے بدگمانی اور اس پر تنبیہ	552
صحابہ کے درمیان اچھے اور برے میں امتیاز کی ضرورت	553
احد کی شکست اپنے ہاتھوں	554
شکوہ اور جواب شکوہ	555
خیر القرون کے مسلمان اور کفر کے نزدیک	556
منافقین کا کردار اور ان کے حلئے حوالے	556
حیات شہدائے	558
غزوہ حمراء الاسد کے مجاہدین کی توصیف	560
کفار منافقین کو مہلت دیے جانے کی وجہ	564
ثبوت علم غیب بعطائے الٰہی	564
ادائے حقوق واجب نہ کرنے اور بخل سے کام لینے کی مذمت اور اس کا عذاب	566
یہودیوں کی نکتہ چینیوں پر اللہ کا غضب	567
اعتراض برائے اعتراض کا جواب نہیں دیا جاتا	568
بلا وجہ دل بخواہ معجزہ کی فرمائش پر قرآن کا جواب	569
پندار خود کی کیفیت اور مذمت	572
غلبہ واقتدار کو دلیل حقانیت سمجھنا غلط	575
مرابطہ کا حکم اور اسکے معنی	577
سُوْرَةُ النِّسَآءِ	579
سورہ نساء کے خاص خاص مضامین	579
عالم گیر اخوت کا اعلان	580
عورت کی مرد سے تخلیق کا مطلب	580
حقوق انسانی کی اہمیت	581
یتیموں کے مال کا تحفظ	582

عنوان	صفحہ نمبر
تعداد ازواج	582
نابالغوں کی جائداد کی کورٹ ہونے کا حکم	584
کورٹ ختم ہونے کی حد	585
لڑکیوں کو استحقاق میراث	586
محجوب الارث عزیزوں کے ساتھ سلوک اور ہمدردی	586
یتیموں کے مال میں خود برد کرنے والوں کی سزا	588
ماں باپ اور اولاد کی میراث اور ان کے حصوں کی تعیین	589
شوہر اور زوجہ کی میراث	593
میراث ازواج میں بحث طلب مسئلہ	593
وصیت وقرض میراث سے مقدم	595
جنسی جرم کے ثبوت کے لئے چار گواہوں کی ضرورت	597
وہ جن کی توبہ قبول نہیں	598
زمانہ جاہلیت کے ایک رسم کی ممانعت	599
سوتیلی ماؤں کی حرمت	601
کن عورتوں سے شادی کرنا حرام ہے	602
حکم متعہ	604
کنیزوں کے ساتھ نکاح کا حکم	605
مال غیر کو ناحق کھانے کی ممانعت	607
گناہوں میں کبیرہ اور صغیرہ کی تفریق	608
حسد کی ممانعت	610
مردوں کی سیادت وفوقیت کے ساتھ ذمہ داری اور عورتوں کی جنسی بے راہ روی کی صورت میں تادیب کا حق	611
نزاع کی صورت میں دو ثالث مقرر کرنے کا حکم	612
خدا کی طرف سے ہر قسم کی ظلم کی نفی	614
غسل جنابت کا حکم اور تیمّم کی ترکیب	617
شرک ناقابل معافی، باقی ہر گناہ کی معافی کا امکان	621

عنوان	صفحہ نمبر
رسولؐ اور آل رسول علیہم السلام کا محسود خلق ہونا	624
آیہ اولی الامر	627
عدالت غیر شرعی میں مقدمہ لے جانے کی ممانعت	628
توسل کی اہمیت	630
قادیانی جماعت کا غلط استدلال اور اس کی وجہ	632
حکم جہاد بصورت قتال	635
تلوار اٹھانا اسلام کا بنیادی نصب العین نہ تھا	638
اطاعت رسولؐ عین اطاعت خدا ہے	643
جواب سلام کے لئے اسلامی تعلیم	646
قتل خطا کی سزائیں	652
قتل عمد کے گناہ کی اہمیت اور سزائے آخری میں شدت	653
اظہار اسلام کا اعتبار	654
صورت وجوب ہجرت	656
سفر میں نماز قصر کا حکم	658
اتباع رسولؐ راہ اہل ایمان ہے نہ کہ اجماع امت	667
دین الٰہی سے انحراف بطور انکار قابل بخشش نہیں	669
معصوم ہستیوں کی موجودگی کا ثبوت	670
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لقب خلیل کے ساتھ سرفرازی	674
اپنے اور پرائے ہر ایک کے معاملہ میں عدل و انصاف قائم رکھنے کا مطالبہ	681
ایمان لانے والوں کو دعوت ایمان	681
منافقین کے کردار کی رنگا رنگی اور ان کے عذاب کی شدت	684
نفاق سے توبہ کی صورت میں انجام بخیر	686
مظلوم کے لئے ظلم کو برا کہنے کا حق	687
انکار رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مثل انکار خدا کے موجب کفر	688
حیات مسیح علیہ السلام	694

عنوان	صفحہ نمبر
رسول کے بھیجنے کا مقصد اتمام حجت	699
بہت سے پیغمبر وہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے	699
''وہ رسول'' اور ''نبی'' آپ کی آمد کا ہمہ گیر اعلان	703
غلو کی ممانعت، عیسیٰؑ کا صحیح تعارف رد تثلیث اور اثبات توحید	704
کلالہ یعنی بھائی بہن کی میراث	707
سُوْرَۃُ الْمَآئِدَۃِ	709
سورۂ مائدہ کے خاص خاص مضامین	709
گوشت خوری کا جواز اور چوپایوں میں اصالت حلیت	711
شعائر الٰہیہ کی حرمت کے ساتھ ان انسانوں کی بھی عزت و حرمت جو رضائے الٰہی کے جادہ کے سالک ہوں	712
حیوانی قسم کی حرام غذاؤں کے بیان میں آیت اکمال دین جو یقیناً اس سے الگ خاص موقع پر اتری ہے	713
شکاری کتے کے شکار کی حلیت	714
اہل کتاب کے ساتھ غلہ کی خرید و فروخت اور ان کی عورتوں کے ساتھ عارضی طور پر تعلق ازدواجی یعنی متعہ کی اجازت ہے	716
وضو کی ترکیب اور بوقت ضرورت تیمم کا حکم	718
عدل و انصاف میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں	721
الوہیت مسیح علیہ السلام کا ابطال	727
یہود و نصاریٰ کے دعاوی باطلہ اور ان کی رد	728
سرزمین مقدس کی فتح پر ماموری، بنی اسرائیل کی عدول حکمی اور اس کا انجام	730
قصہ ہابیل و قابیل	733
ڈاکوؤں اور فسادیوں کیلئے سخت سے سخت سزاؤں کا اعلان	736
ضرورت وسیلہ	738
چوری کی حد یعنی شرعی سزا	739
توریت میں کم قصاص کا تفصیلی بیان	743

عنوان	صفحہ نمبر
آیہ ولایت	750
حکم تاکیدی اعلان ولایت جناب امیر علیہ السلام بروز غدیر	756
نصاریٰ کے مختلف فرقوں کے کافر ہونے کا صریحی حکم	758
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی صحیح حیثیت	760
بت پرستوں اور یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کی تعریف	764
قسم توڑنے کا کفارہ	768
شراب اور جوئے سے بت پرستی کی طرح ممانعت	768
کیرم وغیرہ کی حرمت	768
حالت احرام میں شکار کی ممانعت	772
دریائی جانور یعنی مچھلی کے شکار کی اجازت	773
اخباریین کے نظریہ ''اصالت حرمت'' کی رد	776
معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام	783
مائدہ (کھانے کے خوان) کا واقعہ	787

****
*****
***
*

عنوان	صفحہ نمبر

پہلا تبصرہ

لفظ قرآن کے لغوی تشریح

"قرآن" قراءۃ کی طرح "قُرء" سے ماخوذ ہے جن کے اصلی معنی لغت عرب میں جمع کرنے کے ہیں۔

کتاب کے عام رواج سے پہلے کسی نظم یا نثر کے جمع کرنے کا اس طرح کہ وہ محفوظ ہو جائے۔ بہترین طریقہ یہی تھا کہ اُسے سینہ میں محفوظ یعنی ازبر یاد کر لیا جائے۔

اس بنا پر صدر اسلام میں "قراءۃ" بمعنی حفظ مستعمل ہوتا تھا اور حافظ قرآن کو "قاری" کہتے تھے۔

چوں کہ یہی حفاظ حروف قرآن کے طریقۂ ادا اور ان کے مخارج و کیفیات سے واقف ہوتے تھے اسے لحن کے ساتھ پڑتے بھی تھے، رفتہ رفتہ قرارۃ بہ معنی علم مخارج حروف ہو گیا اور قاری یعنی مخارج کا جاننے والا چاہے حافظ نہ ہو لیکن یہ بعد کے زمانہ کا محاورہ ہے۔ صدر اسلام میں ایسا نہیں تھا جسے تفصیل کے ساتھ ہم نے اپنی کتاب "تذکرۂ حفاظ شیعہ" میں لکھا ہے۔

پھر چوں کہ جمع یعنی کسی تحریر پر حاوی ہونے کا ایک ادنیٰ درجہ یہ بھی ہے کہ انسان پوری تحریر پر نظر ڈال لے یا زبان پر اسے جاری کرے، اس لئے "قراءۃ" کے معنی مطلق پڑھنے کے بھی ہو گئے اور یہ محاورہ بھی نزول قرآن کے پہلے سے موجود تھا چنانچہ پہلی وحی جس کا آغاز اِقْرَأْ سے ہوا ہے اسی مفہوم کی حامل ہے اور بعید نہیں ہے کہ کتاب الٰہی کے لفظ "قرآن" سے موسوم ہونے کا تعلق اس اِقْرَأْ کے ساتھ بھی سمجھا جائے جس سے اس کتاب کے نزول کا آغاز ہوا ہے جس کے ماتحت نمازوں میں "قراءۃ" کے معنی اسی کتاب کے سوروں کا پڑھنا ہوا نہ کی تسبیح وغیرہ دوسری چیزوں کا پڑھنا چاہے ان کا پڑھنا واجب بھی ہو۔

جس طرح کتاب بمعنی "مکتوب" اور بیان بمعنی "مَبَیَّنْ" بلا تکلف استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح "قرآن" مقروٗ اور محفوظ کے مفہوم کا اعتبار کر کے خداوندی محاورہ میں نام بن گیا ہے ان الفاظ و کلمات کا جو بطور وحی جبرائیلِ امین کے توسط سے حضرت خاتم النّبیّنؐ پر بحیثیت معجزہ اتارے گئے ہیں۔

قرآن اور حدیث قدسی میں فرق:

اسی آخری قید "بحیثیت معجزہ" سے فرق ہو گیا "قرآن" اور "حدیث قدسی" میں کیوں کہ حدیث قدسی بھی اللہ کی طرف کے ارشادات ہیں جو فرشتے کے ذریعہ رسالت مآب تک پہنچے ہیں لیکن وہ خاص آپؐ کے دعوائے نبوّت کی دلیل بنا کر معجزہ کی حیثیت سے نازل نہیں کئے گئے بلکہ وہ خاص مواقع اور حالات میں خاص خاص ارشادات ہیں جن میں سے بعض رسول کے ساتھ تخاطب کے طور پر ہیں جیسے:

لو لاك لما خلقت الا فلاك اگر آپ نہ ہوتے تو میں زمین و آسمان کو بھی پیدا نہ کرتا۔

اور بعض عام بندوں سے تخاطب کی حیثیت سے ہیں جیسے:

عبدی اطعنی حتّٰی اجعلك مثلی میرے بندے! میری اطاعت کر تا کہ میں تجھ کو اپنا نمونہ بنادوں۔

اور بعض میں بلا تخاطب کسی بات کا اظہار ہے، جیسے:

لا یزال العبد یتقرّب اِلیَّ بالنّوافل حتّٰی اکون سمعهُ الّذی یسمعُ بهٖ وَ بصرهُ الّذی یبصر به

بندہ نوافل کے ذریعہ میری بارگاہ میں قریب ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس کا سننے والا کان اور دیکھنے والی آنکھ بن جاتا ہوں۔

اسی طرح مشہور حدیث:

لَا اِلٰهَ اِلَّا الله حِصنی فمن دخل حصنی اَمِنَ مِن عذابی.

''لَا اِلٰه اِلَّا الله'' میرا قلعہ ہے تو جو میرے قلعہ میں داخل ہوا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔

ان احادیث کا مجموعہ جناب شیخ حرِ عاملی رحمۃ اللہ علیہ کا جمع کردہ "الجواهر السنية فی الاحاديث القدسية" موجود ہے۔

قرآن اور ان احادیث قدسیہ میں جو فرق ابھی بتایا گیا واضح حیثیت رکھتا ہے لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ''قرآن اور حدیث قدسی'' میں ایک دوسری حیثیت سے بھی فرق ہے جس کی بناء پر دونوں کی نوعیت ہی الگ الگ ہو جاتی ہے اس کی طرف مجمل طور پر ہمارے بزرگوں میں سے جناب تاج العلماء طاب ثراہ کو توجہ ہوئی چنانچہ موصوف نے پہلے تو تحریر فرمایا ہے:

من الحديث مايسمّٰی حديثًا قدسيًّا وهوما يحكی كلامه تعالٰی غير متحد بِشیءٍ مِّنه كالقراٰن المقصود بتنزيله ذالك

حدیث کی ایک قسم وہ ہے جس کا نام حدیث قدسی ہے اور یہ وہ ہے جس میں کلام الٰہی کا بیان ہوتا ہے اور اس کے کسی جزء کو اس طرح بطور معجزہ پیش نہیں کیا جاتا جیسے کہ قرآن کو معجزہ ہی کے طور پر نازل کیا گیا ہے۔ (جذبہ عزیزیہ شرح وجزہ ص ۹)

ابھی تک وہی فرق دکھایا گیا ہے جو ہم ابھی درج کر چکے ہیں اس کے بعد فرماتے ہیں:

ولا يخفی قيد الحكاية مغن عن ذكر التحدی لا خراج القراٰن فانّهٗ ليس فی مرتبة الحكاية اَللّٰهُمَّ الا انّ يراد ان قراءة النّبی ﷺ بنفسها حكاية فلا بُدّ من التقييد به ليجدی خروجه

اور واضح ہونا چاہئے کہ کلام الٰہی کے بیان کی لفظ قرآن مجید سے حدیث قدسی کا فرق ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے اس لئے کہ قرآن خود کلام الٰہی ہے نہ کہ کلام الٰہی کا بیان، وہاں کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قرآن کو پڑھنا خود کلام الٰہی کا بیان ہے لہٰذا حدیث قدسی کی تعریف میں معجزہ کے طور پر نہ ہونے والی قید قرآن سے امتیاز کے لئے ضروری ہے۔ (جذبہ عزیزیہ شرح وجزہ ص ۱۰)

مگر میری نظر میں جس پہلو کی طرف تاج العلماء طاب ثراہ کا ذہن متوجہ ہوا ہے کافی وزن رکھتا ہے۔

قرآن کے سنانے اور حدیث قدسی کے بیان کرنے کی نوعیت میں فرق ہے اس کے سمجھنے کے لئے انسان کو اپنے درمیانی نامہ و پیام کی نوعیّت پر نظر ڈالنا چاہئے۔ اس وقت حقیقت حال کے ذہن نشیں ہونے میں آسانی ہوگی۔

ہم اپنے کسی عزیز دوست خاص یا معتمد ملازم کے ذریعہ سے کوئی پیغام بھیجتے ہیں کہ ہماری طرف سے یہ بات فلاں شخص تک پہنچا دو۔ یہاں سفارش کا تعلق درحقیقت ہمارے ذہنی مطلب و مقصد سے ہے۔ الفاظ اس کے اظہار کا ناگزیر ذریعہ ہیں اس لئے وہ جب یہ کہے کہ فلاں شخص

نے آپ کے پاس یہ پیغام بھیجا ہے تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ الفاظ بالکل وہی ہوں جو ہمارے لب و ذہن سے نکلے تھے بلکہ بعض اوقات اسے الفاظ کی تبدیلی ضروری ہوگی۔ جیسے اس وقت کہ جب ہماری اور ہمارے اصل مخاطب کی زبان مختلف ہو اور ہمارا پیغام رساں دونوں زبانوں سے واقف ہو تو ہم اس سے اپنا مطلب اپنی زبان میں کہیں گے لیکن اسے اصل مخاطب سے ہمارا مقصد اس کی زبان میں کہنا ہوگا۔ یہاں اس کلام کی نسبت ہماری طرف دے دی جائے گی یعنی وہ فارسی میں کہے تو یہی کہے گا کہ ''فلانی بشما گفتہ است'' اور اردو میں پہنچائے تو کہے گا کہ ''فلاں شخص نے آپ سے کہا ہے''۔

اگرچہ ہم نے اردو یا فارسی میں نہیں بلکہ اپنی بات کو مثلاً عربی میں کہا ہے مگر چوں کہ یہاں الفاظ کا سفارت کے مفاد میں دخل نہیں ہے اس لئے اس کا دوسری زبان میں اس بات کے پہنچانے پر بھی ہماری طرف یہ نسبت دینا کہ انہوں نے آپ سے یہ کہا ہے درست ہوگا۔ یہ ہوتا ہے ''پیغام'' جس میں ''نقل بالمعنیٰ'' یعنی اصل مقصود کو جداگانہ لفظوں میں بیان کرنے کی سفیر کو گنجائش حاصل ہے۔

دوسری صورت ہوتی ہے ''نامہ'' کی۔ اس کی نوعیت مختلف ہے۔ یہاں معانی کو الفاظ سمیت نقوش کے طلسم میں محفوظ کیا جاتا ہے اور انہی الفاظ کو مکتوب الیہ تک پہنچانے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

یہاں اگر ہمارا قاصد خط کو پھاڑ ڈالے اور دوسرا خط اسی مضمون کا تحریر کر دے یا اس کے مطلب کو بلا کم و کاست زبانی جا کر بیان کر دے تو وہ کسی طرح اپنے فرض کو انجام دینے والا اور سفارت ادا کرنے والا نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ وہ خیانت مجرمانہ کا مرتکب اور بد دیانتی کا ملزم ہوگا۔

زبانی کام میں بھی یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب کہ غرض کسی نہ کسی طرح الفاظ سے متعلّق ہو جائے مثال کے طور پر یہ ہے کہ ہمارے دوست نے ہم سے ایک دعا دریافت کی تھی ہم نے کسی شخص سے جو وہاں جا رہا تھا، کہا کہ ''تم ان سے کہہ دینا کہ آپ صبح اُٹھ کر یہ دُعا پڑھ لیا کیجئے''۔ یہاں اس جملہ تک کہ آپ صبح اٹھ کر یہ دعا پڑھ لیا کیجئے۔ پہلی قسم کے پیغام کی حیثیت ہے جس میں درمیانی شخص کو الفاظ میں تغیر و تبدیل کا حق ہے لیکن جہاں سے وہ دعا شروع ہوئی ہے۔ پھر درمیانی شخص کو کسی تبدیلی کا اختیار نہیں ہے۔ اگر اس نے اس میں کوئی کمی یا زیادتی کی تو وہ ناقابل اعتبار سمجھا جائے گا۔

دوسری مثال: ہمارے کسی شاگرد نے کوئی شعر سنایا تھا اور اصلاح چاہی تھی یا ہم نے خود اس کا شعر سن کر اسے پسند نہیں کیا، ترمیم ضروری سمجھی، ایک درمیانی شخص سے جو جا رہا تھا اور شعر یاد رکھنے اور سمجھنے سمجھانے کے قابل تھا، ہم نے کہا کہ فلاں شخص سے کہہ دینا کہ آپ اپنے شعر کو اس طرح بنا لیجئے۔

یہاں اتنے الفاظ میں کہ ''آپ اپنے شعر کو اس طرح بنا لیجئے'' درمیانی شخص کو تغیر و تبدیل کا حق ہے۔ مثلاً وہ کہہ دے کہ آپ اپنے شعر میں اس طرح اصلاح کر لیجئے۔ اس طرح ترمیم کر دیجئے وغیرہ وغیرہ لیکن اصل شعر میں وہ کچھ تغیر و تبدیل کر دے، یہ جائز نہ ہوگا۔ اُس کو اُسے اُنہی الفاظ میں پہنچانا چاہئے جو ہم نے اس کے لئے بتلا دیئے ہیں۔

جب یہ دو نوعیتیں معلوم ہو گئیں تو اب ''حدیث قدسی اور قرآن'' کا فرق سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔

''حدیث قدسی'' اللہ کا پیغام ہے جو رسول تک پہنچنا تھا اور پیغمبر اس ارشاد الٰہی کو نقلِ قول کے طور پر دوسروں سے بیان فرماتے تھے اس کی نوعیت پہلی قسم کی ہے اور قرآن کی نوعیت دوسری قسم کی ہے۔ یہاں اصل الفاظ ہیں جو بحیثیت کلام الٰہی رسول پر اترے ہیں یہاں پیغمبر کا کام

ان الفاظ کو بجنسہ، خلق تک پہنچا دینا ہے جیسے کسی نامہ نویس کا خط پڑھ کر سنایا جائے یا بلاتشبیہ کسی شعر کو محفل میں یا کسی شخصِ خاص کے سامنے پڑھا جائے اس کی حیثیت اس کی طرف سے کسی پیام کو پہنچانے کی نہیں بلکہ اس کے کلام کو پیش کر دینے کی ہوتی ہے۔

''حدیث قدسی'' میں پیغمبرؐ راوی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لئے ہم نے ''مسانیدِ معصومین'' میں ''احادیثِ قدسیہ'' کو ''مسند النبیؐ'' کے عنوان کے ماتحت درج کیا ہے اور قرآن مجید میں پیغمبر کی حیثیت راوی کی نہیں ہے بلکہ قارئین کلام کی ہے جو پہلی وحی "اقراء" کا منشاء تھا۔

حدیث نبوی اور حدیث قدسی:

ہاں اب ایک چیز ابھی باقی ہے اور وہ یہ کہ خود حدیثِ رسولؐ اور احادیث قدسیہ میں کیا فرق ہے۔ جبکہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى کی بنا پر آپؐ کے تمام ہی ارشادات بر بنائے وحی ہوتے تھے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اپنے احادیث میں پیغمبر راویٔ کلامِ الٰہی نہیں بلکہ خود متکلم ہیں لیکن بمنشائے قدرت یا حکم ربانی سے۔

اب چوں کہ تین چیزیں سامنے آ گئیں:

(۱) حدیث رسولؐ (۲) حدیث قدسی (۳) قرآن مجید

حسب ذیل مثال سے غالباً ان تینوں کا فرق واضح ہو جائیگا۔

آپ نے کسی عالم سے جا کر اپنے دوست کی پریشانی کا تذکرہ کیا، انہوں نے کہا کہ آپ میری طرف سے اپنے دوست سے کہیے کہ وہ روز یہ دعا پڑھا کریں اور وہ دعا آپ کو لکھوا دی یا زبانی یاد کرا دی۔

اب آپ اپنے دوست کے پاس گئے ان سے کہا: ''آپ کی پریشانی دور کرنے کیلئے میں آپ کے لئے بہت اچھا نسخہ لایا ہوں۔ فلاں صاحب سے میں نے آپ کا تذکرہ کیا تھا، انہوں نے ارشاد کیا کہ تم ان سے کہہ دو کے آپ صبح اٹھ کر یہ دعا پڑھ لیا کریں، اس کے بعد آپ نے وہ دعا سنا دی۔ کلام آیا ہے آپ کی زبان پر مگر اس میں تین قسم کی چیزیں ہیں۔ شروع میں خود آپ کا کلام ہے۔ اس کے بعد ان کا پیغام ہے جن میں آپ اس مضمون کو پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔ ان میں الفاظ کی خصوصیت نہیں ہے اس کے بعد وہ دعا جو بتانے کی ہدایت ہوئی ہے وہ تیسری قسم کی چیز ہے جس میں الفاظ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ پیغمبر خدا مجمع میں کھڑے ہوئے اور فرمایا:

قد جئتکم بخیر الدنیا والاٰخرۃ میں تمہارے پاس دنیا و آخرت کی بہتری لے کر آیا ہوں۔

یہ الفاظ ''حدیثِ نبوی'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب مثلاً آپ نے فرمایا، کہ اللہ نے مجھے بڑا رُتبہ دیا ہے اور مجھ سے ارشاد فرمایا ہے کہ:

لو لاك لما خلقت الافلاك اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو بھی پیدا نہ کرتا۔

ہوئی ''حدیث قدسی'' اور اب آپؐ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھ پر یہ کلام نازل فرمایا ہے اور اس کے بعد مثلاً آپؐ نے سورہ مزمل پڑھنا شروع کر دیا تو یہ ہے قرآن۔

یہ سب کچھ دنیا کے گوش زد آپؐ ہی کی زبان مبارک سے ہوتا ہے مگر نوعیت میں ان تینوں چیزوں کی فرق ہے۔

ان تمام قسموں کے الفاظ جب خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر جاری ہوتے تھے اور آپؐ سے سننے والوں کے گوش زد تو مقام حقانیت میں ان میں کوئی فرق نہیں تھا اور ہر ایک اس مضمون کے لئے جس سے متعلق ہو دلیل قطعی کی حیثیت رکھتا تھا۔

مگر چوں کہ قرآن مجید میں الفاظ کی خصوصیت تھی، نماز میں اس کا پڑھنا جزو لازم کی حیثیت سے ضروری تھا اور یوں مختلف اوقات میں بھی اس کی تلاوت کو عبادت قرار دیا گیا تھا اس لئے اس کی بعینہ حفاظت کا اہتمام زیادہ ہوا۔ اسے بروقت صحابہ سے قلم بند کرایا گیا اسے بکثرت افراد نے کُلاًّ یا جُزءً حفظ کیا اس لئے اسے تواتر کا ایسا درجہ حاصل ہوا کہ وہ بحیثیت سند بھی قطعی قرار پا گیا۔ احادیث کو کسی عقیدہ یا حکم شرعی کی سند میں پیش کیا جاتا ہے تو انہیں کم اشخاص نے سنا اور ان سے بھی کم تر اشخاص نے حفظ کیا اس لئے مقام اثبات میں باعتبار سند ان کو وہ قطعیت حاصل نہ ہوئی اور ان میں راویوں کے جانچ پڑتال کا سوال پیدا ہو گیا جس میں احادیث قدسیہ اور احادیث نبویہ بالکل یکساں حیثیت رکھتے ہیں اور اس لئے سوائے شیخ حر عاملی کی کتاب کے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، یا بعض علمائے اہل سنت کی دو ایک کتابوں کے جنہوں نے احادیث قدسیہ کو جمع کیا ہے۔ ان کے علیٰحدہ مجموعے بھی تیار نہیں ہوئے بلکہ دوسرے احادیث ہی کے ساتھ ان کی بھی متفرق طور پر اندراج ہو گیا۔

قرآن کے اصطلاحی معنی:

قرآن مجید کے یہ اصطلاح معنی کہ ''وہ کلام جو بطور وحی حضرت رسولؐ خدا پر بحیثیت معجزہ اتارا گیا ہے'' ایک ایسے ساری و جاری مفہوم کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے لحاظ سے کُل اور جُزء کم اور زیادہ یہاں تک کہ ایک آیت بلکہ بعض اجزائے آیت بھی ''قرآن'' کا مصداق ہیں بلکہ ایک لفظ پر بھی جبکہ اس کا لکھا جانا جزو قرآن ہونے کے قصد سے معلوم ہو اس لئے فقہ کی رو سے بغیر طہارت اس کا مس کرنا بھی حرام ہو گا لیکن جیسا کہ صاحب معالم کو اس حقیقت کی طرف توجہ ہوئی ہے بظاہر دوسری وضع کے ساتھ یہ لفظ اس پوری کتاب کے نام کے لئے معیّن ہوئی ہے جو اس وحی کے اجزاء کا مجموعہ ہے۔ اس طرح ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت اور ایک ایک سورہ کو پہلے معنی کے لحاظ سے قرآن کہنا درست ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے جزء قرآن۔

ہمارے گذشتہ بیان سے یہاں تک یہ پتہ چلا کہ قرآن کے لغوی و اصطلاحی سب ملا کر تین معنی ہیں۔ ایک بمعنی مصدر یقنی جمع کرنا یا محفوظ کرنا۔ دوسرے وہ ساری و جاری عام مفہوم جس کے لحاظ سے ایک ایک جملہ اور ایک ایک حرف قرآن ہے۔ تیسرے اس پوری کتاب کا نام خود قرآن کریم میں لفظ قرآن کے ان تینوں معنوں کی سند موجود ہے۔

(۱) اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ.

یہاں لفظ قرآن کی اضافت کتاب کی طرف اور جمع پر عطف بتا رہا ہے کہ اس کے معنی مصدری یعنی ضبط و حفظ مراد ہیں۔

(۲) اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ﴿۷۸﴾ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ؕ﴿۷۹﴾ (سورۂ واقعہ)

یہاں قرآن وہی جامع اور عام مفہوم مراد ہے جو جزء و کل سب پر صادق ہے اور اسی لئے بغیر طہارت مس کرنے کی ممانعت کل قرآن سے مخصوص نہیں بلکہ اجزاء قرآن میں ثابت ہے۔

(۳) وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ (سورۂ حجر)

ہم نے آپ کو عطا کیں سات دو رنگ والی آیتیں اور قرآن عظیم

یہاں قرآن کا اطلاق مجموعہ کتاب پر ہے جس سے سورہ حمد کا صرف بنظر اہمیت و خصوصیت الگ کر کے ذکر کیا گیا ہے اور قرآن کے اسی لحاظ سے حضرت علیؑ کا قول وارد ہوا ہے کہ جو کچھ قرآن میں ہے وہ سورہ حمد میں ہے جس کی تشریح انشاء اللہ سورہ حمد کی تفسیر میں سامنے آئے گی۔

دوسرا تبصرہ

کلام الٰہی کے معنی اور قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا معرکہ

چوں کہ یہ دونوں مسئلے مبادی ومقدّمات کے لحاظ سے ایک ہی بنیادی اساس پر مبنی ہیں اس لئے ہم ان کو سمو کر عام فہم طور پر واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے لئے ذیل کے دو مقدموں کا سمجھنا ذہن نشین کرنے کے لئے ضروری ہے۔

(۱) صفات ثبوتیہ:

سنی اور شیعہ دونوں کے علم کلام کی کتابوں بلکہ چھوٹے دینیات کے رسالوں تک میں ''اللہ کے صفات'' کا ذکر ہوتا ہے اور بچوں کو یاد کرایا جاتا ہے کہ اللہ کے اتنے ''صفات ثبوتیہ'' ہیں یعنی وہ باتیں جو خدا میں پائی جاتی ہیں اور اتنے ''صفاتِ سلبیہ'' ہیں یعنی وہ باتیں جو خدا میں نہیں پائی جاتیں۔

صفات ثبوتیہ کی تعداد آٹھ بتائی جاتی ہیں اور ان میں عالم، قادر، حیٔ، مرید مدرک وغیرہ کے ساتھ متکلم بھی آتا ہے

(۲) صفات الٰہی کے بارے میں اختلاف

صفات الٰہی کے بارے میں شیعی نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ عین ذات ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بس ذات الٰہی ہے جس کے کمال کے مختلف پہلوؤں کی تعبیر مختلف صفات سے ہوتی ہے اس طرح بس مقام لفظ میں ذات کے علاوہ کچھ صفات ہیں مگر مقام حقیقت میں ذات کے علاوہ صفات کوئی چیز نہیں ہیں۔ جیسا کہ امام الموحّدین حضرت علی ابن ابیطالبؑ کا ارشاد ہے جو نہج البلاغہ کے پہلے ہی خطبہ میں درج ہے کہ:

من کمال الاخلاص له نفی الصفات عنه لشهادة کل صفة أنّها غیر الموصوف و شهادة کل مو صو ف أنّهٗ غیر الصفت.

اللہ کی خالص توحید کی تکمیل اس سے ہے کہ اس سے صفات کی نفی کرے کیونکہ موصوف اور صفت کے الفاظ باہم مغایرت کا پتہ دیتے ہیں اور اللہ میں ذات سے مغایر کوئی چیز نہیں ہے۔

اہل سنّت قائل ہیں کہ یہ آٹھ صفتیں ذات کے علاوہ وجود رکھتی ہیں۔ اس طرح ایک ذات الٰہی ہے اور آٹھ صفتیں اور یہ سب قدیم ہیں یعنی ان کی ہستی ہمیشہ سے ہے۔ کیونکہ اگر ان کا وجود عدم کے بعد مانا جائے تو وہ مخلوق ہوگی اور اس طرح ان کی خلقت کے پہلے اللہ نہ عالم ہوگا نہ قادر ہوگا، نہ حیٔ ہوگا، نہ مدرک ہوگا وغیرہ وغیرہ

نتیجہ:

ان دونوں مقدموں سے اہل سنت کے نقطہ نظر سے نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ کلام الٰہی قدیم ہے کیونکہ وہ خالق کی صفت ہے اور جتنے صفات الٰہیہ ہیں وہ قدیم ہیں اور قرآن ہے کلام اللہ لہٰذا قرآن کو مخلوق کہنا کفر ہے۔

کلام الٰہی کیا ہے؟

اب دیکھنا ہے کہ کلام جو اللہ کی صفت ہے اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

''ہمارا کلام'' ہمارے لب و دہن سے نکلتی ہوئی آواز ہے جو مختلف مقاطع پر رکتی، ٹھہرتی، بڑھتی گھٹتی ہوئی مختلف حروف کی تشکیل کرتی اور ان سے مختلف الفاظ کی صورت گری کرتی ہے اس کی سیّال ہستی ہے۔ وہ بے ثبات وجود رکھتا ہے اس کا ہر دوسرا جزء بغیر پہلے جزء کے فنا ہوئے آ نہیں سکتا۔ اس کا ہر حاضر بات کہتے کہتے غائب اور ہر حال زبان ہلانے کے ساتھ ماضی ہو جاتا ہے۔

ہمارا وجود غیر مستقل ہے اور ہماری ہستی خود نفس کے آمد و شد کی رہینِ احسان ہے۔ اس لئے ہمارا کلام بھی یہ ہو سکتا ہے۔ ہم اعضاء و جوارح کے پابند ہیں، ہم جسم و جسمانیات سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اس لئے ہماری زبان بھی، تالو بھی، حلق بھی ہے اور حنجرہ بھی، ذہن کی فضا بھی ہے اور اس میں آواز بھی حادث ہیں تو محلِ حوادث بھی، اس لئے ہمارا کلام وہی ہے جو ہمارے دہن سے نکلے ہماری زبان سے صادر ہو اور ہماری آواز کے ساتھ مخاطب کے گوش گزار ہو۔

''خدا کا کلام'' بھی اگر اسی حیثیت سے سمجھا جائے تو اس میں اور ہم میں فرق کیا رہا۔ غیر مستقل وجود کے ساتھ فوراً ہی سپرد عدم ہو جانے والے الفاظ آواز کے اتار چڑھاؤ کی پیداوار، ان کا مرکز ذات احدیت ہو تو وہ خود تغیر سے بری حوادث کے دسترس سے بلند و برتر قدیم و سرمدی کب رہ جائے گا؟

وہ محل حوادث ہو تو عقلی طور پر خود بھی حادث قرار پائے گا۔

اس لئے کسی باہوش انسان کی یہ مجال نہیں کہ وہ خدا کے کلام کے معنی اس کے دہن سے نکلے ہوئے الفاظ و کلمات قرار دے۔ پھر اس کا کلام کیا ہو سکتا ہے؟

فرقۂ اشاعرہ نے جس کے معنی اب جمہور اہلسنت کے ہیں (کیونکہ ان میں کا دوسرا فرقہ یعنی معتزلہ اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس کا دنیا کے کسی خطہ میں غالباً وجود نہیں ہے) اس کا حل ''کلام نفسی'' کی صورت میں تجویز کیا۔

کلام نفسی کا تصور:

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ الفاظ و کلمات کا سلسلہ جو ہماری زبان پر آتا ہے یہ پورا سلسلہ اسی شکل و صورت میں ہمارے ذہن کے اندر موجود ہوتا ہے۔ خدا چوں کہ زبان و دہن نہیں رکھتا، اس لئے یہ صدائیں اس کی ذات میں نہیں پائی جا سکتیں، مگر یہ اندرونی قسم کا سلسلہ کلام کا اس کی ذات میں اس کے علم و قدرت کی طرح ازل سے موجود رہتا ہے۔ یہ اصل میں خالق کی صفت ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قدیم ہے۔

یہ امکانی حد تک ان کے مسلک کی تشریح ہے جو ان کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے۔ علاّمہ نیشاپوری ''غرائب القرآن'' میں لکھتے ہیں:

منکرو الکلام النفسی اتفقوا علی اَنَّ الکلام اسمه لهٰذا الالفاظ و الکلمات و الاشاعرة یثبتون الکلام النفسی و یقولون اَنَّ الکلام لفی الفوأدو انما جعل اللسان علی الفوأد دلیلا.

کلامِ نفسی کا انکار کرنے والے اس پر متفق ہیں کہ کلام ان الفاظ اور کلمات کا نام ہے اور اشاعرہ کلامِ نفسی کو ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں

کہ اصل کلام دل میں ہوتا ہے اور زبان تو بس اس دل والے کلام کو ظاہر کرنے والی قرار دی گئی ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ اصلاً علم کلام کی بحث ہے جو الٰہیات سے متعلق ہے اس لئے یہاں اس کی مکمل جانچ نہیں ہوسکتی مگر جہاں تک ہمارے موضوع کتاب سے تعلق ہے، یہ سوال ضرور اہمیت رکھتا ہے کہ بالفرض یہ کلام نفسی جو ازل سے موجود بتایا جاتا ہے بجائے خود کوئی معقولیت رکھتا ہو مگر جس بناء پر خالق کو متکلم ماننے کی ضرورت ہے یعنی ارشاد قرآنی۔

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾

اللہ نے موسیٰؑ سے پورے طور پر کلام کیا۔ (سورۂ نساء)

تو آخر اس ازلی وجود کو جو ذات کے ساتھ تھا، طور پر جانے کے بعد موسیٰؑ سے کیا تعلق پیدا ہوا جو وہ اس وقت سے کلیم اللہ قرار پائے اور اس کلام ازلی کا آخر میں حضرت پیغمبر خدا ﷺ سے کیا ربط قائم ہوا جس سے قرآن جو حضرت پر باقساط پورے دَورِ رسالت میں تدریجی طور پر نازل ہوا کلام اللہ ہوگیا۔

شیعی نقطۂ نظر

شیعہ بنیادی حیثیت سے شروع سے آخر تک ان نظریات کے خلاف ہیں۔ ہم تو ذات الٰہی کو قدیم ہونے میں یکتا اور ازلی ہونے میں لاشریک جانتے ہیں۔ ہم اس کی ذات کے لئے صفات قرار ہی نہیں دیتے جو اس کی ذات کے علاوہ قدامت کا درجہ رکھتے ہوں تو کلام کو کسی بھی معنی میں اس کی ذات میں قائم کیوں کر مان سکتے ہیں۔

ہم خدا کے متکلم ہونے کے معنی صرف یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خالق کلام ہے اور جس کلام کو وہ اپنی طرف انتساب کے ساتھ خلق فرمائے وہ اس کا کلام قرار پاتا ہے۔

اب یہاں جبر و اختیار کی منزل میں چوں کہ ہمارا اور اہلسنت کا راستہ الگ الگ ہے، لہٰذا ہماری اس تشریح میں کہ خدا خالق کلام ہوتا ہے انہیں کوئی خصوصیت محسوس نہ ہوگی۔ وہ کہیں گے کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ خدا ہر اس گفتگو کا جو کسی انسان کی زبان سے صادر ہوتی ہے، خالق ہے، لہٰذا یہ سب ہی کلام کلام اللہ قرار پاتا ہے لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ ہم انسانوں کے ذاتی افعال و اقوال کا ذمہ دار خود انسانوں کو سمجھتے ہیں اور ان کا وجود میں لانے والا خود انہیں کو جانتے ہیں ان کو اللہ کے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ اعضاء و جوارح اور آلات و ذرائع جن سے اعمال و اقوال صادر ہوتے ہیں، خدا کے مخلوق ہیں لیکن ان افعال و اقوال کا خود صدور ہرگز خداوند عالم کی ایجاد و تخلیق کا نتیجہ نہیں۔

اس طرح یہ دائرہ بہت تنگ ہوجاتا ہے۔ پھر اس کے علاوہ ایک قید ہم اور لگا چکے ہیں۔ خدا کا کلام وہ سمجھا جائے گا جو انسانی ارادہ و اختیار کار گزاری اور صناعی سے خارج ہو اور پھر خداوند عالم کی طرف سے بحیثیت متکلم اس کا استناد نمایاں ہو۔ لہٰذا اگر آواز اس کی قدرت خاص سے کسی شئے میں پیدا ہوئی مگر نسبت اس کی اللہ نے اپنی طرف نہیں دی تو وہ باوجود مخلوق الٰہی ہونے کے منسوب اسی شئے کی طرف ہوگی جس میں وہ آواز پیدا ہوئی ہے۔ جیسے سنگریزوں کا دست رسالت مآبؐ میں تسبیح پڑھنا سوسمار کا آپ کی رسالت کی گواہی دینا وغیرہ۔ (جیسا کہ بعض روایات میں ہے)۔ یا بچہ کا پاک دامنی یوسفؑ کی گواہی دینا۔ (جیسا کہ قرآن مجید میں مذکورہ ہے مشہور تفسیر کی بناء پر) اور حضرت داؤدؑ کے ساتھ دیوار و در، صحرا و فضا کا مشغول حمد و تسبیح ہونا، اس سب کو کلام الٰہی کہنا درست نہ ہوگا۔ بلکہ اسے یوں کہا جائے گا کہ سنگریزوں نے قدرت خدا سے تسبیح کی، بچہ نے قدرت خدا سے گواہی

دی، دیوار و در نے قدرت خدا سے حمد و تسبیح ادا کی۔ ان سب کو کلام الٰہی کہنا درست نہ ہوگا۔ بلکہ اسے ہم یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں براہ راست کلام خلق نہیں کیا جاتا بلکہ اس شئے میں کلام کرنے کی طاقت خلق کی جاتی ہے جس کی بناء پر کلام وہ خود اسی شے کا ہوتا ہے، خدا کا کلام نہیں ہوتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خداوند عالم نے وہ کلام اپنی طرف نسبت کے ساتھ خلق فرمایا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت حق سبحانہ تعالیٰ نے اس شئے کو اپنا ترجمان قرار دیتے ہوئے جو بات اسے کہنا تھی اسے بطور آواز اس شئے میں خلق کر دیا۔ جیسے درخت میں سے آواز موسیٰؑ کے لئے اِنّی اَنا رّبكَ... الی آخرہ بے جان چیز کی آواز ہو بہو، خدا کی قدرت خاص کا نتیجہ۔ پھر طرز کلام، لب ولہجہ، عنوان تخاطب سے ظاہر کہ آواز کا محل درخت ہے مگر کلام کسی اور کی طرف سے ہے۔ نہیں تو درخت خود خدا ٹھہرتا۔ موسیٰؑ کا پروردگار خود درخت بن جاتا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ معرفت رکھتے تھے۔ درخت کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئے۔ سمجھے کہ درخت مجازی پردہ ہے جس میں متکلم حقیقت اپنی خلق کی ہوئی آواز کے ساتھ مصروف کلام ہے۔ یہ خدا کا پہلا کلام تھا اور اس کے بعد بھی جب گفتگو ہوئی تو ایسی ہی کسی شئے کے ذریعہ سے جس طرح طُور پر گفتگوئیں ابر کی صورت سے ہوئی تھیں، جیسا کہ توریت میں تذکرہ ہے۔

یہ صورت وہ تھی جہاں کلام کا مظہر بے شعور و ارادہ نا قابل تکلم شئے ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کلام کسی ذی شعور با ارادہ و اختیار، قابل نطق و تکلم انسان کی زبان پر آئے اور ہمارے گوش زد ہو، مگر کلام ایسا ہو کہ جو اس انسان کے ارادہ و اختیار کا نتیجہ قرار نہ پا سکتا ہو اور وہ کہتا بھی ہو کہ یہ میرا کلام نہیں ہے بلکہ اس کا انتساب خالق کی جانب ہو تو یہ کلام بھی خداوند عالم کا کلام قرار پائے گا جس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس نے اپنے کلام کا حامل و ترجمان اس انسان کو قرار دیا ہے۔

اب عقلاً اس کی کئی صورتیں متصور ہیں۔

ایک یہ کہ براہ راست اس رسول کی زبان پر اس کلام کو خلق فرمائے لیکن اس کے لئے ضرورت ہوگی کہ وہ کچھ عرصہ تک رسول کی زبان اور ان کے دل و دماغ سے ذاتی ارادہ و اختیار کو سلب کر کے اسے مسخر بنانے اور قہری و غیر اختیاری طور پر کچھ الفاظ کو ان کی زبان پر جاری کرے اس لئے کہ اگر ارادہ و اختیار باقی رہا اور اس کی شرکت سے کلام ظہور میں آیا تو وہ اس انسان کا کلام ہوگا نہ کہ اللہ کا کلام۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی غیر ذی روح ہستی مثلاً دیوار و در پتھر وغیرہ میں خلق کیا جائے اور رسول کے گوش گزار ہو۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کلام قدرت کی طرف سے عالم اعلیٰ کے کسی محل میں خلق ہو اور پھر کسی ذریعہ سے رسول تک پہنچایا جائے۔

پہلی صورت ایک کامل انسان اور مصلح خلق کے لائق نہیں ہے کیوں کہ ایک صاحب شعور و اختیار کا ایک وقت میں اپنی زبان پر بالکل بے قابو ہو جانا کمال انسانی کے خلاف ہے۔ پھر یہ کہ حکمت الٰہی کے اقتضا سے رسولؐ کی تبلیغ و تعلیم مصلحت وقت کے لحاظ سے ہونا ضروری تھی۔ اس لئے کلام الٰہی کے اجراء کے لئے ایسی صورت ہونا چاہئے تھی کہ اس کا پہنچنا رسولؐ تک ہر وقت اور ہر موقع پر ہو سکتا ہو اور آپؐ کی زبان سے اس کی تبلیغ اشخاص اور حالات کو دیکھ کر محدود یا غیر محدود طور پر ہوا کرے۔ یہ بات پہلی صورت میں نہیں ہے اسی طرح دوسری صورت میں بھی یہ بات پورے طور پر حاصل نہیں ہو سکتی۔

بنی اسرائیل کے ضروریات محدود تھے حضرت موسیٰؑ کے لئے ایک خاص وقت کا تقرر ہو گیا کہ وہ طور کی چوٹی پر چلے جاتے تھے۔ اَبر آتا اور اُن تک کلام پہنچتا۔ اب وہ واپس آ کر جن جن باتوں کی تبلیغ کی ضرورت ہوتی اپنی امت کو تعلیم دیتے تھے۔

ہمارے رسولؐ کے لئے یہ بات نہیں ہوسکتی تھی۔

ان کو دین و دنیا کی ضروریات پر حاوی ایک نظام کا حامل بنایا گیا تھا اس لئے ان میں اور افراد خلائق میں ہر وقت رابطہ قائم رہتا تھا اور طرح طرح کے اشخاص آپ ﷺ کو گھیرے رہتے تھے اور خلوت، جلوت، سفر و حضر، منزل و طریق ہر موقع و محل پر کلام الٰہی کے آپ ﷺ تک پہنچنے کی ضرورت تھی لہٰذا کسی جسمانی چیز اور دیوار و در، درخت اور پتھر، ہوا اور اَبر میں ---آواز کا پیدا کرنا حکمت ربانی کے خلاف تھا۔ اس لئے آپؐ کے لئے کلام الٰہی پہنچانے کا تیسرا طریقہ اختیار کیا گیا۔

الفاظ کی خلقت اور وہ بھی ضروری نہیں کہ آواز کی صورت میں ہو بلکہ ہوسکتا ہے کہ یہاں مبدا خلقت میں نقوش ہی پیدا کئے گئے جو آواز نہیں ہوتے بلکہ آوازوں کی علامت ہوتے ہیں اور اسی کے اعتبار سے اس کلام کا نام ''کتاب'' ہوا ہو اور اس کتاب کو قرآن میں ''مکنون'' (چھپا ہوا) کہا گیا ہو اور اس کے محل کا نام ''لوح'' بتایا گیا اور تحریر چوں کہ ''قلم'' سے وابستہ ہوتی ہے لہٰذا قرآن میں سب سے پہلے وحی میں اس کا ذکر آیا کہ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ''قلم کے ذریعہ سے اس نے علم کا سرمایہ فراہم کیا۔

اور حدیث میں آیا۔

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللهُ الْقَلَمَ سب سے پہلے جسے اللہ نے پیدا کیا وہ قلم ہے

اور یہ بات ہے کہ اس ملاء اعلیٰ کی چیزوں کو پوری نوعیت و کیفیت کو اس عالم مادی میں محصور ہونے کی حالت میں ہم نہیں سمجھ سکتے۔

کال کوٹھری میں پیدا ہو کر آنکھ کھولنے والا ''صحن'' ''میدان'' صحرا اور فضا'' کو لفظاً سن سکتا ہے اور اجمالی طور پر (بشرطیکہ کہنے والے پر اعتماد رکھتا ہو) اتنا سمجھ بھی لے گا کہ یہ سب چیزیں ضرور کچھ ہیں، کیا ہیں۔ اس کا نہ وہ صحیح تصور کرسکتا ہے نہ اسے ان چیزوں کا تصور کرایا جاسکتا ہے' ایسے ہی بیت معمور' لوح محفوظ، لوحِ محو و اثبات وغیرہ سب غیبی نام کی چیزیں ہیں جن کو اجمالی طور پر کہنے والے (معصوم رہنمایانِ دین) پر اعتبار (ایمان) کی شرط کے ساتھ ماننا ضروری ہے مگر ان کی حقیقت کے سمجھنے کا مطالبہ ایک دوراز کار اور ہیچ کی بات ہے۔

بہر حال یہ یقینی ہے کہ وہ لکڑی، تانبے، لوہے یا سونے، چاندی کی کوئی تختی نہیں ہے بلکہ وہ عالم روحانیات سے متعلق چیز ہے۔ آسمانی فرشتوں کے پڑھنے کے قابل وہ قرآن کا مرکز اول ہے جہاں قرآن کا وجود پہلے ہو چکا۔

نزول قرآن کے معنی

پھر جب رسولؐ مبعوث برسالت ہوئے تو موقع و محل کے اقتضاء سے جیسی ضرورت پیش آئی اور جیسا موقع درپیش ہوا ملک مقرب یعنی جبرائیلِ امین رسولؐ تک اس کے پہنچانے پر مامور ہوئے اور اسے نازل ہونا کہتے ہیں۔

وحی کی صورتیں

اگرچہ روایات بتاتے ہیں کہ اکثر جبرائیل امین وحیۂ کلبی کی شکل میں مجسم صورت سے بھی آئے ہیں مگر تنزیل قرآن کے لئے ان کا اس طرح آنا ضروری نہ تھا۔ نہ یہ لازم تھا کہ وہ آواز کے ساتھ رسولؐ کو آکے قرآن کی آیتیں سنائیں بلکہ فرشتہ اپنی مشاہدہ انسانی کے ماوراشکل میں بھی آتا اور پیغمبرؐ کے دل و دماغ سے براہ راست رابطہ قائم کر کے کلام الٰہی پہنچاتا۔ اس لئے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ.

اسے جبرائیلؑ امین نے آپؐ کے دل پر اتارا ہے (شعراء۔ ۱۹۳)

جب پیغام زبانی پہنچے ملک کے ذریعہ سے یعنی وہ آ کے کوئی سورہ یا آیت رسولؐ تک پہنچائے، تب بھی وہ کلام الٰہی اس اعتبار سے ہے کہ یہ الفاظ جو ملک کی زبان پر آ رہے ہیں وہی ہیں جو دست قدرت سے لوح محفوظ پر تحریر ہوئے ہیں۔

اسی نسبت کے لحاظ سے وہ کلام اللہ ہے اور مرکز اعلیٰ سے وہ بذریعہ ملک آتا ہے۔ رسولؐ تک اس لحاظ سے منزل من اللہ ہے (اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ) اور جبرائیل امین کے ذریعہ سے اترا ہے۔ اس لئے ارشاد ہوا: ''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ'' اور رسولؐ کے گوش گزار ہونے کی صورت میں وہ جبرائیل کی زبان کا ہے۔ اس لئے اس کی نسبت جبرائیل کی طرف بھی دی گئی ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾

لیکن عین اس وقت کہ جب وہ رسولؐ کے گوش گزار ہوتے ہوئے ''قول روح الامین'' ہے۔ چوں کہ وہ قول ترجمان ہے اسی کلام کا جو خالق متعال کی جانب سے اس سے پہلے وجود میں آ چکا ہے۔ وہ کلام جبرائیل نہیں بلکہ کلام رب العالمین ہے۔

خلق قرآن کا معرکہ

ہمارے نزدیک صفات الٰہی میں بحث اور کلام نفسی کے تصور یا عدم تصور کا بھی نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہئے تھا کہ خلق قرآن کا مسئلہ اس طرح نزاعی بن جائے جیسا کہ بنا اور جس کی تفصیل بقدر ضرورت ابھی سامنے آئے گی۔

شیعہ نقطۂ نظر سے تو ظاہر ہے کہ ہم متکلم ہونے کے معنی ہی خالق کلام کے قرار دیتے ہیں لہٰذا کسی بھی معنی سے کلام کے غیر مخلوق ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ صفات ثبوتیہ میں اس کا شمار بھی تحقیقی حیثیت سے شیعی مسلک کے لحاظ سے درست نہیں ہے اس لئے کہ توحید کے عنوان کے ماتحت جو صفات بیان کیئے جاتے ہیں وہ صفات ذات ہیں۔ اللہ کا متکلم ہونا جب کہ بمعنی خالق کلام ہے تو وہ صفات افعال میں سے ہے۔ صفات افعال جتنے ہیں وہ اصول دین میں سے دوسری اصل عدل میں مندرج ہیں۔ لہٰذا متکلم مثل رؤف، رحیم، رازق، خالق وغیرہ کے، ان اسمائے حسنیٰ میں سے ہوسکتا ہے جو افعال الٰہی کو ظاہر کرتے ہیں۔

بعض دینیات کی کتابوں میں صفات ذات میں درج کرنے کی معقولیت کے لئے متکلم کے معنی یہ لکھے ہیں کہ وہ جس چیز میں چاہے کلام پیدا کرے یعنی اسے قدرت کی طرف راجع کیا ہے مگر اس صورت میں متکلم کو کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ خالق بھی اس معنی میں صفات ثبوتیہ میں ہونا چاہئے کہ وہ جو چاہے پیدا کرے اور رازق بھی اس معنی سے کہ وہ جسے چاہے رزق دے اور محی اور ممیت، معطی اور صانع، مبدی اور معید وغیرہ بھی۔

اصل یہ ہے کہ یہ آٹھ صفات ثبوتیہ کی فہرست ہمارے ائمہ معصومینؑ یا اُن کے پیرو علماء کی مرتب کی ہوئی ہے ہی نہیں بلکہ ہمارے علماء کو جب علم کلام میں کتابیں لکھنے کا موقع ملا تو اہل سنت کے علم کلام کی کتابیں موجود تھیں جن میں صفات ثبوتیہ کا عنوان قائم کر کے آٹھ صفتیں درج کی گئی تھیں ہمارے علماء کو ان میں سے ہر چیز کے متعلق اپنے نقطہ نظر کے اظہار کے لئے تصنیفی حیثیت سے اس کی ضرورت ہوئی کہ وہ ان میں سے ہر عنوان کو بجنسہ ایک سرخی بنا کر اس کے تحت میں جو اپنا نقطہ نظر اور مخالف افراد سے رد و قدح ہے اسے پیش کریں۔ اس بناء پر ان آٹھ صفات کی سرخیاں قائم کی گئیں اور پھر اپنے نقطہ نظر کا اظہار کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصل حقیقت میں ذات کے علاوہ کچھ صفات ہیں ہی نہیں اور مقام

مفہوم میں تمام صفات کا مرجع صرف دو صفتیں ہیں۔علم اور قدرت باقی سب انہیں کی شاخیں ہیں اور متکلم ہونا جس معنی سے درست ہے وہ صفت ذات نہیں بلکہ صفت فعل ہے جسے بلا وجہ صفات ثبوتیہ میں داخل کر دیا گیا ہے۔یہ صاف صاف شیعی نقطہ نظر ہے۔اب آیئے! اہلسنت کے نقطہ نظر سے دیکھیں۔

قطع نظر اس بنیادی اختلاف سے جو ہمیں ان سے صفات کے بارے میں خاص متکلم کے صفات الٰہی میں درج ہونے کے سلسلہ میں ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں اسمائے الٰہی کے طور پر بحیثیت وصفت جیسے: الخالق الباری المصور۔ المومن المهيمن العزيز۔ الجبار المتكبر ہے۔

اس طرح کہیں قرآن میں المتکلم کا لفظ نہیں ہے جو کچھ بھی ہے وہ بطور فعل اس کی طرف اسناد ہے جیسے: كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ یا بحیثیت اضافت حتّٰی یسمع کلام اللہ تو اب جو شے افعال الٰہی میں داخل ہوتی ہے وہ کلّم کا مصدر یعنی تکلیم اور یہ کام جس شے سے متعلّق ہوتا ہے وہ کلام ہے۔تو جس طرح خلق فعل الٰہی ہے جو متعلق ہوتا ہے مخلوق مثلاً سماوارض سے تو اس کی وجہ سے سماء وارض نہ صفات الٰہی میں داخل ہوتے ہیں نہ ان کے قدیم ہونے کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

عطائے رزق اللہ کا فعل ہے۔اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ. لیکن اس کی وجہ سے وہ اشیاء جو متعلق فعل رزق ہوتے ہیں صفت الٰہی نہیں بنتے۔نہ قدیم قرار دیئے جا سکتے ہیں تو اسی طرح تکلیم ایک فعل ہے جو کلام سے متعلق ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے اس فعل کا متعلق یعنی کلام صفات میں کیوں قرار پائے اور اس کے قدیم ہونے کا تصور کیوں کیا جائے؟

اب جب کہ کلام کے صفت الٰہی ہونے ہی کی از روئے قرآن کوئی بنیاد نہیں ہے تو کلام نفسی کے اختراع کی کوئی ضرورت پیدا نہیں ہوتی لیکن کلام نفسی ماننے کے بعد پھر بھی یہ بات تو متفقہ حیثیت سے تسلیم شدہ ہونا چاہئے تھی کہ یہ الفاظ وکلمات جو مجتمعہ حیثیت سے بحالت موجودہ ''قرآن'' کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں جو کاغذ پر لکھے جاتے، سینہ میں محفوظ کئے جاتے، زبان سے پڑھے جاتے ہیں، یہ حادث ہیں قدیم نہیں۔ اس لئے کہ اگر یہی قدیم ہوتے تو اکثریت کو خدا کے متکلم ثابت کرنے کی غرض سے کلام نفسی کے ایجاد کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔

یہ الفاظ حادث ہیں اور خدا محل حوادث نہیں۔اسی لئے تو کلام نفسی کے تخیل کی ضرورت ہوئی اور جب یہ الفاظ حادث ہیں تو ہر حادث کے لئے موجد اور خالق کی ضرورت ہے۔لہٰذا مخلوق بھی ضرور ہوں گے۔

یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں تھا جس میں خواہ مخواہ کی الجھنیں پیدا ہوتیں لیکن افسوس ہے کہ بحث ونظر کے سد باب اور قوائے عقلی کے تعطل نے جسے قرآن اور تعلیمات نبویؐ کے بالکل برخلاف بظاہر کچھ سیاسی مصالح سے رسالت مآبؐ کے بعد ضروری سمجھا گیا تھا اکثر مسلمانوں کے فکر ونظر کی قوتوں کو اس درجہ بے کار کر دیا تھا کہ وہ معنی اور مفہوم پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے سے قاصر ہو کر الفاظ اور تعبیرات کے غلام ہو گئے تھے۔لہٰذا وہ قرآن کو مخلوق کہنا اس کی توہین سمجھتے اور بہت بڑا جرم خیال کرتے تھے۔

چنانچہ علامہ نیشاپوری نے اپنی تفسیر ''غرائب القرآن'' کے مقدمات میں دسواں مقدمہ اسی بحث میں لکھا اور اس میں تحریر کیا ہے:

ذكر قومه من ائمة الا مة ان كلامه الله تعالىٰ قديمه بعد ان عنوا بكلامه هذه الحروف المنتظمة المسموعة اما ان كلامه تعالىٰ هو هذه الحروف فلقوله تعالىٰ اوان احدمن المشركين استجارك فاجره حتّٰى يسمع

کلا مه الله و معلومه ان المسموع لیس الّا من هذه الحروف واما انها قدیمة فلان الکلامه صفة الله تعالیٰ و من المحال قیامه الحادث بالقدیمه و ایضا کل حادث متغیر و التغیر علی ذات الله تعالیٰ و صفاته محال

اسلامی جماعت کے بڑے پیشواؤں میں سے بہت سوں نے کہا ہے کہ اللہ کا کلام قدیم ہے اور پھر کلام سے ہی مرتب حروف مراد لئے ہیں جو سنائی دیتے ہیں۔ یہ کہ کلام الٰہی یہی حروف ہیں، اس آیت سے ثابت ہے کہ قرآن میں ہے ''مشرکین میں سے اگر کوئی آپ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دیجئے۔ یہاں تک کہ وہ کلام خدا سنے اور ظاہر ہے کہ جو چیز سنی جاتی ہے وہ یہی حروف ہیں اور یہ کہ وہ قدیم ہیں اس بناء پر ہے کہ کلام اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور حادث کا قیام قدیم میں محال ہے اور نیز ہر حادث متغیر ہے اور تغیر ذات الٰہی اور اس کے صفات میں محال ہے

اب ملاحظہ کیجئے کہ یہ نقطہ نظر جو بیان کیا گیا ہے اس میں اول اور آخر میں کیسا ٹکراؤ ہے۔ کلام الٰہی یہی حروف ہیں جو سنے جاتے ہیں اور پھر وہ قدیم ہیں اس لئے کہ اللہ کی صفت ہیں یعنی وہ صفت اللہ سے الگ ہو کر ہمارے پردہ گوش سے ٹکراتی ہے یا اللہ سبحانہ (معاذ اللہ) اس صفت سمیت آ کر ہمارے آلہ سماعت سے متصل ہوتا ہے۔ پھر یہ حروف اس وقت ہمیں سننے میں آ رہے ہیں تو وجداناً وہ حادث ہیں اور حادث ذات الٰہی میں قائم نہیں ہو سکتا۔

پھر بھی یہ ماننا ضرور ہے کہ یہی آوازیں کلام اللہ ہیں اور وہ قدیم ہیں۔

ان تمام باتوں کو بیک وقت قبول کرنا بغیر عقل کو ''خیر باد'' کہے ہوئے کیوں کر ممکن ہے مگر علماء کا جم غفیر بھیڑ یا دھسان طور پر یہ سب مان رہا تھا اور اسے داخل عقائد مسلّمات کر رکھا تھا۔

یہ سادگی کا طلسم مسلّمہ عقیدہ کی صورت میں خاموش اطمینان کے ساتھ قائم رہتا۔ اگر تیسری صدی ہجری کے ابتدائی دور میں مامون الرشید خلیفہ المسلمین عباسی کا ذوق تحقیقی اس کے خلاف مصروف جہاد نہ ہوتا۔ یہ خلیفہ اپنے پیش رَو دوسرے اموی و عباسی خلفاء کے برخلاف لہو و لعب اور عیش و عشرت میں مصروف ہونے کے بجائے ایک حد تک علمی تحقیقات اور وسعتِ علوم و فنون کا دلدادہ تھا۔ اس نے علم حدیث اور فقہ کی تحصیل بڑی تکمیل کے ساتھ کی اور فلسفہ و حکمت میں کافی وقت صرف کیا تھا۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۳۱۰)

اس کی آنکھوں میں ایسی باتیں کھٹکتی تھیں جن کی بنیاد صرف عقل کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے پر قائم ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن کے زیر بحث مسئلہ پر اس نے سنجیدگی سے غور کیا اور الفاظ قرآن کے قدیم و غیر مخلوق ہونے کو ایک لایعنی خلاف عقل بات قرار دے کر یہ اعلان کر دیا کہ قرآن مخلوق ہے اس کا قدیم کہنا کسی صورت سے صحیح نہیں ہے۔

طبری نے اس کا آغاز ۲۱۲ھ میں بتایا ہے۔

فیها اظهر المامون القول بخلق القرآن

اس سال مامون نے قرآن کے مخلوق ہونے کا قول ظاہر کیا۔

سطحی نظر رکھنے والے ارباب ظاہر اور محدّثین یقیناً اس سے متفق نہیں ہو سکتے تھے اُنہوں نے سخت اختلاف کیا یہاں تک کہ شورش پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا۔ لہٰذا مامون نے چند سال تک کے لئے اس مسئلہ میں سکوت اختیار کیا۔

کاش یہ بحث صرف علمی و تحقیقی دائرہ میں محدود رہتی مگر کیا کیا جائے کہ عام تشدد آمیز ذہنیت کے علماء و محدثین نے اس بحث کو اسلام اور کفر

کا سوال بنا لیا۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب ''علم الکلام'' کے حصہ اول میں اس تشدد آمیز ذہنیت پر کافی افسوس کیا ہے۔ ہم اس اختلاف اور محدثین کے متشددانہ اقوال کے نمونے ان ہی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

مسائل اختلافیہ میں ایک یہ بھی تھا کہ کلام الٰہی قدیم ہے یا مخلوق و حادث؟ معتزلہ کہتے تھے کہ کلام الٰہی جو خدا کی صفات قدیمہ میں سے ہے وہ قدیم ہے اے لیکن جو الفاظ آنحضرت ﷺ پر نازل ہوتے تھے وہ مخلوق اور حادث تھے۔ محدثین کہتے تھے کہ کلام الٰہی ہر حال میں قدیم ہے۔ زیادہ تدقیق سے دونوں کا حاصل ایک ہی ٹھہرتا ہے لیکن دونوں فرقہ نے اس مسئلہ کو کفر و اسلام کی حد فاصل قرار دیا۔

امام بیہقی نے کتاب ''الاسماالصفات'' میں اس بحث پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے ہم اس کی سند سے اس موقع پر چند بڑے بڑے محدثین کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

وکیع بن الجراح:

مَن زعم ان القراٰن محدث فقد کفر۔ جس شخص کا یہ خیال ہے کہ قرآن حادث ہے وہ کافر ہے

یزید بن ہزون:

مَن زعم ان کلام اللہ مخلوق فھو والذی لآ اِلٰہ اِلاَّ ھو عندی زندیق

جو شخص کہتا ہے کہ کلام الٰہی مخلوق ہے وہ خدا کی قسم زندیق ہے

مزنی شاگرد شافعی:

مَن قال اَنَّ القراٰن مخلوق فھو کافر جو شخص کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے وہ کافر ہے

امام بخاری:

نظرت فی کلام الیھود و النصاریٰ والمجوس فھارایت قوما اضل فی کفرھم من الجھمیۃ وانی لا ستجھل من لا یکفرھم میں نے یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں سب کے کلام دیکھے ہیں جہمیہ کے برابر کوئی ان میں سے کافر، جہل نہیں میں اس کو جاہل سمجھتا ہوں جو جہمیہ کو کافر نہ سمجھے۔

عبدالرحمٰن بن مہدی:

لو رایت رجلا علی الجسر و بیدی سیف یقول القراٰن مخلوق ضربت عنقہ

اگر میرے ہاتھ میں تلوار ہو اور کسی کو پل پر یہ کہتے سن لوں کہ قرآن مخلوق ہے تو اس کی گردن مار دوں

بعض محدثوں نے جن میں امام بخاری بھی شامل ہیں اس مسئلہ میں یہ تفریق کی تھی کہ قرآن مجید کا جو تلفظ کیا جاتا ہے۔ یہ مخلوق ہے اور حادث ہے لیکن محدثین نے اس کی بھی سخت مخالفت کی۔ ذہلی، امام بخاری کے استاد تھے اور صحیح بخاری میں بہت سی حدیثیں ان کی روایت سے مذکور ہیں۔ انہوں نے امام بخاری کا جب یہ قول سنا تو عام حکم دے دیا کہ جو شخص یہ لفظ کہے کہ ''لفظی بالقرآن مخلوق'' وہ ہماری مجلس میں نہ آنے پائے۔

چنانچہ اس واقعہ کو حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ ابن شداد نے ایک تحریر میں لکھا تھا کہ ''لفظی بالقرآن مخلوق'' یہ تحریر امام احمد بن حنبل کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے اس فقرہ کو کاٹ دیا اور کہا کہ قرآن جس صورت میں ہو غیر مخلوق ہے۔

ابو طالب نے کہا تھا کہ امام احمد بن حنبل قرآن کے تلفظ کو مخلوق کہتے ہیں۔ امام بن حنبل کو خبر ہوئی تو غصہ سے کانپنے لگے اور ابو طالب کو بلا کر اس بات کی باز پرس کی۔ (علم الکلام حصّہ مطبوعہ انوار المطابع ص ۱۷)

غالباً اسی متشددانہ رویہ کا نتیجہ تھا کہ مامون الرشید کو اس مسئلہ میں کد ہوگئی ایک تو بادشاہوں کا دماغی توازن ہر بات میں اعتدال کے حدود پر قائم نہیں رہتا، وہ جس بات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس میں حد سے بڑھ جاتے ہیں اور انہماک ان کا افراط کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔

دوسرے عموماً افراد انسانی کی ذہنیت کہ جس بات میں ان کی زیادہ مخالفت ہو، اس میں ان کو زیادہ کاوش اور ردعمل کی کوشش پیدا ہوتی ہے۔

اس کا نتیجہ تھا کہ مامون الرشید نے عارضی طور سے چند سال کے لئے سکوت اختیار کر کے ایک مرتبہ اپنے عقیدہ خلق قرآن کی حمایت میں جہاد کی ٹھان لی۔ اور اسحاق بن ابراہیم خزائی کو جو بغداد میں گورنر کی حیثیت سے تھا، ایک مبسوط خط کے ذریعہ سے حکم دیا کہ وہ تمام علمائے وقت کو جمع کر کے خلق قرآن کے مسئلہ میں ان کے خیالات دریافت کرے اور جو اس کے منکر ہوں انہیں سخت سے سخت سزا کا حکم دیا جائے۔

طبری نے ۲۱۸ھ کے واقعات میں اس تاریخی یادگار خط کو نقل کیا جس کے اہم اجزاء کا مضمون جس میں خلق قرآن کے علمی دلائل بھی درج کئے گئے ہیں حسب ذیل ہے۔ ''ایجانب کو معلوم ہوا ہے کہ سواد اعظم اور جمہور افراد عوام اور پست طبقہ کی رعیت میں سے جن کو قوت نظر اور طاقت استدلال نہیں ہے اور نور علم سے بہرہ مند نہیں ہوئے ہیں۔ تمام اطراف ملک میں بالکل خدا کے مرتب سے ناواقف اور دین خدا کی حقیقت اور اس کی توحید اور ایمان سے کور چشمی و گمراہی میں مبتلا اور اس کے روشن نشانوں اور واجبی راستے سے منحرف اور اس بات سے قاصر ہیں کہ وہ اللہ کو اس کی شان کے مطابق اوصاف کے ساتھ خیال کریں اور اس کی حقیقت معرفت کو حاصل کریں اور اس میں اور اس کے مخلوق میں فرق سمجھ سکیں۔ اس لئے کہ ان کے افکار کمزور ان کی عقلیں ناقص اور وہ غور و فکر اور یادداشت میں کمزور ہیں۔

انہوں نے مساوات قرار دے دی اللہ اور اس کے نازل کردہ قرآن میں اور وہ سب کے سب متفق ہو گئے اور اس پر کہ یہ قدیم و ازلی ہے اور اللہ کی مخلوق نہیں ہے حالانکہ خداوند عالم کتاب محکم میں ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا. ہم نے بنایا ہے اس کو عربی قرآن۔ (زخرف۔ ۳)

ظاہر ہے کہ جو چیز خدا نے بنائی ہو وہ اس کی پیدا کی ہوئی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ

حمد ہے اس اللہ کے لئے جس نے خلق کیا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا تاریکیوں و روشنی کو (انعام۔ ۱)

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوا: كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ

اس طرح ہم تم سے واقعات بیان کرتے ہیں اس دور کے جو پہلے گزر گیا۔ (طٰہٰ۔ ۹۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بعد یہ کلام وجود میں آیا ہے

نیز ارشاد کیا: الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝۱

یہ کتاب وہ ہے جس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں اور پھر حکیم خبیر (خدا) کی طرف سے اس کی تفصیل کی گئی ہے۔ (سورۂ ہود۔۱)

جو شے محکم شدہ اور تفصیل کی ہوئی ہو اس کے لئے کوئی محکم بنانے والا اور تفصیل کرنے والا ہوگا۔ وہی اس کا خالق اور موجد قرار پائے گا۔

پھر انہی لوگوں نے غلط بات پر بحث شروع کر دی اور وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہی اہل حق اہل سنت اور اہل جماعت ہیں اور ان کے سوا جتنے ہیں، سب اہل باطل کافر اور تفرقہ پرداز ہیں۔ اس طرح انہوں نے عوام میں ہنگامہ برپا کر دیا۔۔۔ تمہیں چاہیے کہ جتنے قاضی تمہارے یہاں ہوں سب کو جمع کرو اور ان کے سامنے ہمارے خط کو پڑھ کر سناؤ اور خلق وحدوث قرآن کے متعلق ان کے خیالات دریافت کرو اور یہ واضح کر دو کہ خلیفۃ المسلمین اپنی حکومت میں کوئی منصب ایسے شخص کو سپرد کرنا مناسب نہیں سمجھتے جس کے دین اور خالص توحید پر انہیں بھروسہ نہ ہو۔ جب وہ اس کا اقرار کر لیں اور خلیفہ کی رائے سے متفق اور ہدایت ونجات کے راستے کے سالک ہوں تو انہیں حکم دو کہ وہ اس مسئلہ کو ان تمام شواہد ودلائل کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کریں اور ان سے ان کے عقیدہ کے متعلق دریافت کریں جو قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہ کرے، اس کی گواہی قبول نہ کی جائے۔ اس کے بعد ان تمام قاضیوں کی کارگزاری کی رپورٹ تمہیں میرے پاس بھیجنا ہوگی اور اس کے بعد ان کی نگرانی کرتے رہنا کہ وہ اس پر برقرار ہیں یا نہیں اور برابر ان حالات کی تفصیلی اطلاع میرے پاس بھیجتے رہو۔'' آخر میں مراسلہ کی تاریخ۔ ربیع الاوّل ۲۱۸ھ

چوں کہ مامون الرشید بادشاہ ہونے کے ساتھ ایسا تھا کہ حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

کان یعد من کبار العلماء اس کا شمار بڑے علماء میں ہوتا ہے

اس لئے وہ علماء کے متشددانہ فتوائے کفر کے سامنے سپر انداختہ ہونے کے بجائے خود قوت استدلال کے ساتھ اپنے حریفوں کو کافر ثابت کرنے کے درپے ہوا اور ملوکانہ اقتدار کے ساتھ انہیں کافر کی پاداش دینے پر بھی تیار ہو گیا۔ تاریخ کا بیان ہے کہ اس کے بعد سوا امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح عجل کے باقی جتنے فقہاء ومحدثین تھے سب نے خلق قرآن کے عقیدہ کا اعلان کر دیا۔ سیوطی کے الفاظ یہ ہیں کہ:

اِنَّھُمْ تَوَقَّفُوْا اَوَّلاً ثُمَّ اَجَابَوَا ھُ تَقِیَّۃً

ان لوگوں نے پہلے کچھ تامّل سے کام لیا پھر تقیہ کے طور پر موافقت ظاہر کی

ان تقیہ کرنے والوں میں یحییٰ بن معینؒ ایسے حفاظ وائمہ فن حدیث تھے۔ حافظ یحییٰ بن معینؒ فرماتے تھے کہ: اجبنا خوفا من السیف: ہم نے تلوار کے ڈر سے موافقت کی بعض علماء نے جنہیں موقع ملا ترک وطن کیا۔ چناں چہ حافظ احمد بن عبداللہ بن صالح ابوالحسن عجلی کوفی متوفی ۲۶۱ھ کے حال میں ہے:

خرج الی المغرب ایّام فتنۃ القراٰن وسکن طرابلس الغرب

یہ خلق قرآن والے ہنگامہ میں مغرب کی طرف نکل گئے اور طرابلس مغربی میں قیام کیا۔ (ہدایت العارفین جلد نمبر ۱ کالم ۴۹)

کچھ عرصہ کے بعد مامون کی مدت حیات ختم ہو گئی اور اس کے بعد کے سلاطین رائے عامہ کے پیرو ہو گئے اس طرح یہ ہنگامہ ختم ہوا پھر بھی کچھ عرصہ تک مصنفین اس موضوع پر قلم فرسائی کرتے رہے۔ چنانچہ ابن ندیم نے اس سلسلہ کی ایک کتاب کا حوالہ دیا ہے: الفہرست کے صفحہ ۶۳ کتاب خلق القرآن، الا بن الرواندی بعد میں اہلسنت میں قرآن کا قدیم اور غیر مخلوق ہونا بالکل مسلمات میں سے ہو گیا لیکن شیعی نقطہ نظر بالا تفاق اس کے خلاف رہا جس پر عملی حیثیت سے سابق میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

تیسرا تبصرہ

نزول قرآن کی تاریخ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تدریجی حیثیت سے موقع ومحل کے اقتضا سے نازل ہوتا تھا اور اسی اعتبار سے اس میں ماضی، مستقبل اور حال کے واقعات کی تفریق ہوئی ہے یعنی پہلے ہو چکنے والے واقعات ماضی کے الفاظ سے اور بعد میں ہونے والے مستقبل کی حیثیت میں اور موجودہ حالات کا تذکرہ حال کی صورت میں کیا گیا ہے۔ وہ روز وقوع واقعہ آنے والی آیت میں (الیوم) یعنی (آج) کی لفظ اور آئندہ کے تذکرہ میں حرف سین (س) اور لفظ سَوْفَ کے ساتھ قریب اور بعید کے حدود قائم کرتا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کے نزول کی کوئی ایک تاریخ مقررہ کرنا صحیح نہیں، کیوں کہ وہ تئیس برس کے عرصہ میں جستہ جستہ اترا ہے۔

لیکن جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں نزول قرآن کی تاریخ کا ذکر ملتا ہے۔

ایک طرف یہ ارشاد کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا''۔ اس میں قرآن مجید اتارنے جانے کو گیارہ مہینوں سے ہٹا کر ایک مہینہ میں محدود کیا گیا۔ دوسری طرف ارشاد ہوا:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ہم نے اس کو ایک بابرکت رات میں نازل کیا۔ (سورہ دخان۔ ۳)

اس سے پتہ چلا کہ یہ تنزیل کسی خاص رات میں ہوئی ہے اور اب دونوں آیتوں کو ملا کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ماہ رمضان کی کوئی ایک رات ہے اور پھر ایک پورا سورہ ''سورۂ قدر'' اس میں انضباط مکمل طریقہ سے کیا گیا کہ:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ہم نے اس کو شب قدر میں اتارا ہے

اب ان تینوں آیتوں سے یہ تعین ہوا کہ نزول قرآن شب قدر میں ہوا ہے اور وہ ماہ رمضان کی ایک رات ہے۔

اب وہ کہ جو قرآن کو قدیم اور بطور کلامِ نفسی کے ازل سے ذات الٰہی میں ثابت سمجھتے ہیں ان کے لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ الفاظ جو کاشف اور حاکی ہیں کلام حق کے، وہ تو کسی ایک وقت پر نازل نہیں ہوئے بتدریج اترے۔ لہٰذا ان کی یہ تاریخ ہو نہیں سکتی اور قدیم چیز قدیم ہے اس کی کوئی ابتداء نہیں پھر اس کیلئے تاریخ مقرر کرنے کے کیا معنی؟

لیکن ہم کہ جو قرآن کو حضرت احدیّت کا مخلوق جانتے اور اسی حیثیت سے اس کو کلام الٰہی مانتے ہیں ان آیات کی بتائی ہوئی تاریخ کو اسی انشاء وخلق قرآن سے متعلق سمجھتے ہیں جو عالم ملاء اعلیٰ میں صورت پذیر ہوا یا تنزیل کی لفظ کے لحاظ سے مراد ''تنزیل اول'' ہے جو لوح محفوظ سے ''بیت معمور'' کی طرف ہوئی، جس کا حدیث معصوم میں ذکر ہے (۱)۔

اور پہلے بیان ہو چکا کہ وہاں کے اشیاء ہمارے اس عالم سے تعلق نہیں رکھتے جہاں کے واقعات ہمارے ''فن تاریخ'' کا موضوع بحث بن سکتے ہیں۔

---

(۱) سئل الصادق فقال انزل جملة و حدة شهر رمضان الی البیت المعمور ثم نزل من البیت المعمور الی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ فی طول عشرین سنة (تفسیر علی بن ابراهیم قمی)

چوتھا تبصرہ

اعجاز قرآن

معجزہ کے معنی

معجزہ وہ غیر معمولی چیز ہے جو کسی نبی کو دعوائے نبوت یا کسی اور الٰہی منصب والے کو اس کے منصب کے ثبوت میں خداوند عالم کی جانب سے عطا ہو، جس کے مقابل لانے سے اس کے حدود منصب کے تحت والی دنیا کی تمام طاقتیں عاجز ہوں۔

بعض لوگ اسے مادی حیثیت میں محدود سمجھ لیتے ہیں۔ جیسے: ماہتاب کا شق ہونا آفتاب کا پلٹنا سنگریزوں کا تسبیح کرنا اور ایسی ہی باتیں جو ہوں وہی ان کے نزدیک معجزہ کہلاتی ہیں۔

اس لئے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جو لوگ اپنے عقول کے اعتبار سے اتنے ترقی یافتہ ہوں کہ وہ حقائق پر غور کر سکیں، ان کے لئے ان مادی مظاہرات کی کیا ضرورت؟

یہ خیال اول تو اس لئے غلط ہے کہ صاحبان منصب ہدایت صرف ایسے ترقی یافتہ افراد کے لئے نہیں آتے بلکہ ان کے دائرہ عمل میں خواص کے ساتھ عوام بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا معیار ذہن کے لحاظ سے ان کے پاس دلائل حقانیت ہونا چاہئیں۔ دوسرے یہ کہ معجزہ نام صرف ان مادی مظاہرات کا نہیں ہے بلکہ معجزہ ان غیر معمولی آثار کا نام ہے جو ایک مدعی نبوت میں اس کے دعویٰ کی خصوصی دلیل بن سکیں خواہ وہ از قبیل افعال ہوں جیسے کورِ مادرزاد اور برص وجذام کے مبتلا کو صحت دینا، مردوں کو زندہ کرنا اور مٹی سے پرند کی صورت بنا کر اس میں پھونک مار کر سچ مچ کا طائر بنا دینا۔ یہ معجزات جو حضرت عیسیٰؑ کو عطا ہوئے اور عصا کا دریا پر مارنا جس سے دریا میں راستے بن جائیں اور پتھر پر مارنا کہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلیں اور عصا کو اژدہا بنا دینا جو حضرت موسیٰؑ کے معجزے ہیں یا از قبیل کلام جیسے: قرآن مجید جو ہمارے رسولؐ کا معجزہ ہے یا از قبیل صفت، جیسے ہمارے رسولؐ کے بہت سے خصوصیات جسم اقدس کا سایہ مفقود ہونا، غیر معمولی خوشبو، پس پشت کی چیز کا اس طرح دکھائی دینا جیسے سامنے کی چیز اور ایسی بہت سی باتیں یا اس شخص کے تعلق سے غیر معمولی حالات کا پیدا ہونا، جیسے: قوم فرعون پر جوؤں، مینڈکوں اور خون وغیرہ کے عذاب کا آنا جس کا تذکرہ قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ ہے۔ یہ تمام باتیں معجزات میں داخل ہیں اس طرح خواص وعوام کی سطح ذہن کے لحاظ سے معجزات مختلف ہو سکتے ہیں ایک بلند مرتبہ فلاسفر کے لئے وہ رموز واسرار عقلی معجزہ ہوں گے جو اس کے کلام میں ودیعت ہیں لیکن سطحی نظر رکھنے والے انسانوں کے لئے جو حقائق کلام کی رفعتوں کو نہیں سمجھ سکتے وہی مادی مظاہرات معجزہ قرار پائیں گے۔

معجزہ کی ضرورت:۔

انسانی افراد اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے اقتدار پسندی وجاہ طلبی کے پتلے ہوا وہوس کے مجسمے اور ذاتی ونفسانی اغراض کے بندے ہوتے ہیں۔ انہیں کسی ایسی بات کا دعویٰ جس میں اپنی سیادت تسلیم ہوتی، اپنی بات بالا ہوتی اور دوسرے بہت سے سادہ لوح افراد کے دلوں پر ان کی

حکومت کا سکہ قائم ہوتا ہو بہت خوشگوار معلوم ہوتا ہے ان کو اس میں کسی واقعیت کا لحاظ پس وپیش کرنے پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ ایک وقتی شان وشوکت ان کو بڑے سے بڑے غلط دعویٰ پر آمادہ کرسکتی ہے جس کی آخری حد خدائی کے دعوائے باطل تک پہونچتی ہے۔اس کے آگے کوئی زینہ ہی نہیں کہ قدمِ ادّعاء، وہاں تک پہنچے۔

نبوت اور رسالت اور ایسے ہی کسی خدائی منصب کا بلاشبہ روحانی اقتدار سیادت اور حق فرماں روائی کے ساتھ لازم وملزوم کا رشتہ ہے بلکہ ایک پیشوائے دین کا اپنے ماننے والوں پر اقتدار اس سے زیادہ ہوتا ہے جتنا ایک بادشاہ کا اپنی رعایا پر اس لئے کہ بادشاہ کے سامنے سر جھکتے ہیں اور پیشوا کے لئے دل جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔لہٰذا عام انسانی افراد کے اقتدار پسند طبائع اس جامہ کو زیب تن کرنے اور اس منصب کے غلط دعوایدار ہونے پر بڑی جرات کے ساتھ آمادہ ہوجاتے ہیں۔

اس میں آسانی یوں محسوس ہوتی ہے کہ دنیاوی مناصب ظاہری اسباب اور مادی ساز وسامان سے وابستہ ہوتے ہیں تو وہ سامان جس کے پاس نہ ہوں اس کے لئے ان مناصب کے دعوے کے کوئی معنی نہیں ایک بے تاج وتخت، بے مال ودولت، زاویہ نشین فقیر یہ دعوی کرے کہ میں بادشاہ یا وزیر ہوں یا رکن سلطنت ہوں تو لوگ اسے دیوانہ سمجھ کر ذریعہ تفریح بنالیں گے۔کوئی اسے ماننے اور تسلیم کرنے پر آمادہ کہاں ہوگا لیکن نبوت ورسالت وغیرہ، یہ مناصب کسی ظاہری ساز وسامان سے وابستہ نہیں ہوتے بلکہ وہ روحانی پیغام اور وحی والہام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں تو کسی کو ان کے ادعاء میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔پھر یہ کہ انسانی لوازم زندگی کے اعتبار سے انبیاء ومرسلین بھی عام افراد بشری کی طرح ہوتے ہیں بے شک ان کا ذاتی جوہر ایسا بلند ہوتا ہے کہ قدرت کی طرف سے وہ بلند منصب کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔اب ظاہر ہے کہ عامۃ الخلائق خدا تک جانہیں سکتے کہ خود اس سے پوچھ لیں کہ اس نے اس شخص کو اپنے منصب کے لئے مقرر کیا ہے یا نہیں، تو اب اس دعویٰ کر لینے میں دشواری ہے کہ مجھ کو خدا نے اس عہدے کے لئے منتخب کیا ہے اور تمام خلق کی رہنمائی کے لئے قرار دیا ہے چنانچہ ہر قوم کے نزدیک متفقہ طور پر بعض ایسے لوگ ہیں جنھوں نے غلط طریقہ پر نبوت کا دعویٰ کیا اور کسی باطل مذہب کی بنیاد قائم کی۔

ایک قانون کا مرتب کر لینا اور دنیا کی رفتار پر نظر کر کے کچھ اصول قرار دے لینا جن کو ''شریعت الٰہیہ'' کے نام سے پیش کیا جائے، کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

یہ فیصلہ کہ اس کے تمام احکام صحیح اصول پر مبنی ہیں یا نہیں؟ عام افراد کے حدودِ دسترس سے باہر ہے۔اس لئے کہ انسانی فلاح وبہبود کے سلسلہ میں عقلائے زمانہ کے خیالات ایک نقطہ پر متفق نہیں چہ جائے کہ عام افراد۔

اب اگر اس مدعی نبوت وغیرہ کے پاس جو حقیقۃً خدا کا فرستادہ اور اس کی طرف کے منصب کا حامل ہے صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہو کہ میں خدا کی طرف سے مقرر ہوا ہوں اور اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے کوئی ثبوت نہ ہو تو اس میں اور ان لوگوں میں جو غلط طور پر یہی دعویٰ کر رہے ہیں فرق ہی کیا رہا اور عام افراد پر کیوں کر یہ فرض عائد کیا جائے کہ وہ اس سچے نبی کے قول کو تسلیم کریں، اس کے دعویٰ کو سر آنکھوں پر رکھیں اور اس کی اطاعت کریں اور دوسروں کے دعوے سے انکار کریں اور ان کی شریعت کو تسلیم نہ کریں۔

اس کے لئے عقل ضروری سمجھتی ہے کہ یقیناً وہ شخص جو خدائے حکیم وخبیر کا حقیقی نمائندہ ہے، اس کے لئے خدا کی جانب سے خصوصی طور پر ایسی کوئی بات ہونا چاہئے جیسے وہ بحیثیت دلیل دعوئے نبوت پیش کرے اور جس کے مقابلے میں دنیا کی طاقتیں عاجز ہوں ورنہ ان دیکھا خدا جو بغیر

اپنے آثار قدرت کے نہ پہنچانا جاسکا اس کے سفیر کو ہم بغیر آثار کے کیوں کر پہچانیں۔

اب وہ آثار جو کسی ذات کی معرفت پیدا کر سکتے ہیں، کیسے ہونے چاہئیں، اگر وہ آثار اس کے اور اس کے غیر میں مشترک ہیں تو وہ خصوصی طور پر اس کا تعارف کیوں کر سکتے ہیں تو ضرورت ہے کہ آثار ایسے ہوں جو اس ذات سے مخصوص ہیں۔ وہ ذریعہ معرفت بن سکتے ہیں تو جس طرح خدا کے وجود کی دلیل وہی آثار بن سکتے ہیں جن پر خدا کے سوا کوئی قادر نہ ہو تو اس کی طرف کے عطا کردہ منصب کا ثبوت بھی ایسی ہی نشانیوں سے ہوسکتا ہے جو اس کی طرف صاحب منصب سے مخصوص ہوں۔ مخصوص ہونے ہی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی دوسرا اس کے مثل پیش کرنے پر قادر نہ ہو۔ اسی کو کہتے ہیں "معجزہ"

معجزہ اور اثبات حقانیت

یہ امر ایک حد تک محل بحث رہا ہے کہ معجزہ سے کسی نبی کی سچائی پر کیوں کر روشنی پڑتی ہے؟

بہت سے لوگ معجزہ کی حقیقت کو صرف ایک غیر معمولی عجیب اور غریب کرتب میں منحصر سمجھ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ ایسی باتیں تو اکثر جادوگر، شعبدہ باز بھی پیش کر دیتے ہیں یا بعض غیر معمولی طاقت کے انسان اکثر ایسے کام کرتے ہیں جن سے عام افراد قاصر نظر آتے ہیں تو کیا ان میں سے ہر ایک معجزہ سمجھا جائے گا، اور اگر نہیں تو اس میں اور معجزات انبیاء میں کیا فرق ہے؟

یہ سوال حقیقتاً دلیل اعجاز کے متعلق ناسمجھی پر مبنی ہے۔

اعجاز کی بنیاد ایک باریک خصوصیت پر ہے جس کی وجہ سے ایک قسم کا عجیب وغریب مظاہرہ ایک مدعی نبوت کے لئے دلیل اعجاز اور سبب ثبوت نبوت ہوتا ہے اور اسی قسم کا مظاہرہ ایک ساحر اور جادوگر کا یا کسی غیر معمولی انسان کا کوئی مخصوص کمال اس کا معجزہ نہیں ہوتا اور دلیل نبوت قرار نہیں پاتا۔

غور سے ملاحظہ ہو۔ حضرت حق عز اسمہ حکیم علی الاطلاق نقص وعیب سے بری اور ظلم ودروغ باطل کی حمایت سے بلند وبرتر ہے اس کے دامن حکمت پر کسی باطل پروری اور ناحق کوشی کی حمایت کا دھبہ نہیں پڑ سکتا۔

ہمارے ایسے عام افراد میں کوئی ہماری جانب سے ایک غلط بات کی اشاعت کرے، ہمارا نام لے کر کسی غلط امر کا ادعا کرے اور ہماری طرف سے کوئی شناخت ثبوت میں پیش بھی کرے جس سے عام اشخاص کا دھوکا کھا جانا اصول فطرت کے لحاظ سے حق بجانب ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم حقیقت کا اظہار اور واقعیت کا اعلان کر دیں اور اپنی ذمہ داری کو اس سلسلہ میں پورا کریں۔

ایک گندم نما جوفروش، ریاکار وظاہر دار، زہد وتقوای کا بیوپاری اور بناوٹی ورع وتقویٰ کا دوکاندار میری طرف سے اجازہ اجتہاد یا پیش نمازی میرے جعلی دستخط اور مہر سے بنا کر اطراف وجوانب، شہر ودیہات میں جا تا خلق خدا کی گمراہی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اس صورت میں لوگوں کا تو یہ فرض ہے کہ جب وہ میری طرف نسبت دے کر اپنی اشتہاری پیش نمازی یا اجتہاد کی دعوت دے تو وہ اس سے دلیل اور سند کا مطالبہ کریں لیکن جب اس نے اس مطالبہ کے جواب میں دستخطی ومہری سند پیش کر دی تو عوام کا فرض ختم ہو چکا۔ اب اگر مجھے اس کی اطلاع ہو تو میرا لازمی فریضہ یہ ہے کہ میں اس کا اعلان کر دوں کہ یہ میرے دستخط اور مہر نہیں ہیں میری طرف ان کی نسبت غلط ہے اور اگر میں سکوت کرتا ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے میں اس کے دعویٰ کی تصدیق کرتا اور عملی حیثیت سے اس کی تائید کرتا ہوں۔

اب میرا یہاں تو یہ ممکن ہے کہ میں باوجود اس فریضہ کے عاید ہونے کے اپنے فرض کو محسوس نہ کروں یا احساس ہونے کے باوجود کسی روپہلی، سنہری مصلحت کی وجہ سے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے حمایت باطل اور گمراہی خلق کی ذمہ داری اپنے سر لے لوں لیکن خداوند عالم کے یہاں تو یہ ممکن نہیں ہے۔

جب خدا کی طرف سے ایک شخص نے کسی منصب کا دعویٰ کیا جو رہنمائی اور پیشوائی خلق کی نوعیت رکھتا ہے۔ مثلاً اس نے اظہار کیا کہ مجھے خدا نے نبوت و رسالت کے شرف سے ممتاز کیا اور سفارت کے عہدہ جلیلہ سے سرفراز کیا تو عامہ خلائق کا فرض ہے کہ وہ اس سے دلیل کا مطالبہ کریں اور ثبوت نبوت کے لئے ایسی کسی خاص بات کے پیش کرنے کی خواہش کریں جس سے دوسرے قاصر ہیں۔ اب اگر اس نے عام انسانوں کے طاقت و اقتدار کے حدود سے بالاتر اور عام بشری دائرہ قدرت سے باہر کوئی ایسا امر پیش کر دیا جس سے انسانی کمال کا ہاتھ کوتاہ نظر آیا۔ اس نے کہا کہ یہ طاقت مجھے خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور یہ میری سچائی کا ثبوت ہے

اس کے بعد اگر خدا ہمارا ایسا شخص ہوتا جس پر بے خبری اور سہو و نسیان وغیرہ کا امکان ہوتا تو ممکن ہے عرصہ تک اس کی خاموشی بے خبری کے سبب سے حق بجانب قرار پا سکتی، لیکن عالم و حکیم خدا، حاضر و ناظر خدا اور نظام کائنات کا مدبر خدا اگر اس کے بعد خاموش رہا یعنی اس کے دعویٰ کو برقرار رہنے دیا۔ اس طرح کہ نہ اس کے ادعائے بے مثالی کو توڑنے کے لئے خود اس کی طاقت سلب کی اور نہ اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے کو طاقت عطا کی تو سمجھنا پڑے گا کہ اس نے اس کی نمائندگی کا امضا، سفارت کا اقرار اور عہدہ کی تائید اور اس کے دعوائے نبوت و رسالت وغیرہ کی عملی طور پر تصدیق کر دی ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ سچا صاحب منصب ہے اگر ایسا نہیں تو اللہ پر حمایت باطل گمراہی خلق اور پامالی حق کا الزام آتا ہے جو کسی طرح اس کی شان جلال و کمال کے لئے جائز نہیں ہے۔

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ معجزہ میں جو روح اعجاز دوڑتی ہے وہ اس روحانی پیشوائی کے دعویٰ کی بناء پر ہے جو اس قدرت نمائی کا انتساب خدا کی طرف کر دیتا ہے اور جس کے بعد خالق پر ذمہ داری عاید ہو جاتی ہے لیکن اگر کوئی ایسا دعویٰ نہیں ہے تو لاکھ کوئی عجائبات پیش کرے اور حیرت انگیز کام انجام دے ہر موقع پر اللہ کا یہ فرض تھوڑی ہے کہ ہر بات کے مقابلہ میں ایک بات اور ہر چیز کے جواب میں ایک چیز پیش کرتا رہے۔ آخر اس صورت میں یہ سلسلہ کہیں پر ختم بھی تو ہوگا وہ آخری چیز لاجواب ہی ہوگی کیوں کہ اس کی کوئی مثال موجود نہ ہوگی۔

ان عجیب مظاہروں، حیرت انگیز کرتبوں اور تعجب خیز کارگزاریوں سے جب خدا پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی تو ان عجیب کارناموں کا برقرار رہنا کسی خاص حقیقت کی دلیل قرار نہیں پاتا۔

مذکورہ بالا بیان کی بناء پر معجزہ کی بنیاد حسب ذیل ارکان پر ہے جن کے بغیر کوئی چیز معجزہ سمجھی نہیں جا سکتی۔

(۱) منصب روحانی مثلاً نبوت کا ادعا۔

(۲) غیر معمولی امر ہونا جو اس حلقہ میں کہ جو دعوائے منصب کا مخاطب ہے تمام افراد کے دائرہ اقتدار سے باہر ہو اس لئے کہ اگر ایسا امر ہو جس پر دوسرے اشخاص بھی قدرت رکھتے ہیں تو وہ کسی مرتبہ و عہدہ کی دلیل نہیں بن سکتا۔

(۳) اس دعویٰ کے بعد کسی ایسے شخص کا پیدا نہ ہونا جو اس دعویٰ کو توڑ کر اسے باطل کر سکے۔

(۴) حالات اور خصوصیات کی بناء پر کسی ایسے امر کا موجود نہ ہونا جو اس مدعی نبوت کے دعویٰ کا قطعی بطلان کرنے کے لئے کافی ہو۔ اس

لئے کہ اگر ایسا ہوا یعنی کوئی ایسا امر پایا گیا جو اس کے دعویٰ کو باطل ثابت کرنے کے لئے کافی ہے جیسے مستند تسلیم شدہ نبی سابق کا اعلان کہ میرے بعد آنے والا مدعی نبوت غلط گو ہوگا یا یہ اعلان کہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، یا خود اس شخص کا جو مدعی منصب ہے فاسق و فاجر اور اپنی سابقہ زندگی کے لحاظ سے بالکل ناکارہ ہونا جس کے ساتھ اس کا بعہدہ نبوت وغیرہ منتخب ہونا قطعی دلائل عقلیہ اور خداوند عالم کے مواعید یقینیہ کے خلاف ہے تو ایسے شخص کا مدعی ہونے کے ساتھ کسی غیر معمولی امر کا اظہار بھی اس کی نبوت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے اس لئے کہ ثبوت تو خداوند عالم پر ذمہ داری عاید ہونے کی بنیاد پر تھا اور یہاں اس کی ذمہ داری نبی سابق کے اعلان یا ان قطعی دلائل سے جو ایسے شخص کی نبوت کے منافی ہیں پوری ہو چکی ہے، جو خدا کی طرف سے حجت تمام ہونے اور خلق کو گمراہی سے محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ لہٰذا اب خداوند عالم کو اس مدعی نبوت کے دعویٰ کو خصوصی طور پر کسی طریقہ سے باطل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

معجزہ کا سحر اور غیر معمولی انسانی کمالات سے تفرقہ

معجزہ کے ارکان میں سے پہلا اور تیسرا رکن وہ ہے جو معجزہ کو سحر اور جادو سے الگ کر دیتا ہے یقیناً جادو میں بھی ایک حیرت انگیز صورت کا مظاہرہ ہوتا ہے لیکن یا تو اس کے ساتھ دعوائے نبوت وغیرہ ہوتا نہیں اس لئے خداوند عالم پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی یا اگر دعوئے نبوت و رسالت کے ساتھ یا کسی سچے نبی کے دعوئے نبوت اور معجزہ کے مقابلہ میں ہو تو اللہ اس کے ابطال کا سامان کر دیتا ہے جیسا کہ ساحران فرعون کے قصہ میں واقع ہوا۔ بہت سے وہ اشخاص جنہوں نے حقیقت معجزہ اور دلیل اعجاز پر غور نہیں کیا ہے، اعجاز نبوت کے مقابلہ میں بہت سے اشخاص کے ذاتی کمالات کو پیش کر دیتے ہیں۔

مثلاً یہ کہتے ہیں کہ قرآن بحیثیت فصاحت و بلاغت اگر اس لئے معجزہ ہے کہ اس کا مثل کوئی نہیں لا سکا، تو بہت سے علمی و ادبی آثار مختلف ادباء کے مختلف زبانوں میں ایسے ہیں جن کا مثل و نظیر اب تک باوجود کوشش و کاوش کے وجود میں نہیں آ سکا، جیسے شاہنامہ فردوسی اور گلستان سعدیؔ، اردو میں مثنوی میر حسن اور مراثی میر انیسؔ انگریزی میں شکسپیر وغیرہ کے آثار قلمی اور ادبی کارنامے اس کا جواب ہمارے مذکورہ بالا بیانات سے ظاہر ہے۔ اول تو مذکورہ بالا مظاہرات کا موقع ظہور اس وقت ہے کہ جب ختم نبوت کے اعلان اور ائمہ دین کے نام بنام تعیین نے کسی مدعی منصب الٰہی کے لئے دروازہ بند کر دیا ہے۔ اس لئے چوتھے رکن کی بناء پر دلیل اعجاز مکمل نہیں ہے اور ان مظاہرات سے حقیقت اعجاز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

پھر یہ کہ فردوسیؔ، سعدیؔ، میر حسنؔ، میر انیسؔ اور شکسپیر وغیرہ کے کارناموں کے ساتھ کوئی دعویٰ ایسا وابستہ نہیں ہے جس کے ابطال کی اللہ کی ضرورت ہو۔

دنیا میں مختلف طرح کے کلام ہوتے ہیں کچھ معمولی اور کچھ غیر معمولی، اللہ کو کیا لازم ہے کہ وہ ہمیشہ ان کاموں میں ناکامی پیدا کرتا رہے آخر یہ دل دماغ بھی تو اسی کے خلق کردہ ہیں جن سے یہ غیر معمولی کارنامے ہو رہے ہیں پھر وہ اپنی پیدا کی ہوئی صلاحیتوں کے جوہروں کو روبکار آنے سے کس لئے مانع ہو؟

سحر بھی عالم اسباب کے ماتحت ہے۔ دنیا میں جتنے اسباب کارفرما ہیں سب اللہ کے خلق کردہ ہیں یہ اور بات ہے کہ بعض اسباب سے کوئی خاص کام لینے میں عام حالات میں اس نے روکا ہو۔ چناں چہ سحر ایسی ہی چیز ہے جو ممنوع قرار دی گئی ہے لیکن اسے بے اثر بنانا ہر حال میں اللہ کو لازم ہو، اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ غیر معمولی چیز یا خارق عادت تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اس عام دستور کیخلاف ہے جو ہماری آنکھوں نے قانون قدرت کے ماتحت عام طور سے دیکھا ہے لیکن اکثر عام اسباب کے سلسلہ میں نتائج ایسے غیر معمولی ہوجاتے ہیں جن کو دنیا بے مثال کہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ایک طبیب بعض اوقات ایسے مریضوں کو اچھا کر دیتا ہے جن کا اچھا ہونا اس کے قبل دنیا نے نہیں دیکھا تھا، ایک انشاء پرداز بسا اوقات ایسی تحریر لکھ دیتا ہے جس کی نظیر اس کے پہلے آنکھوں کے سامنے نہیں آئی تھی، ایک شاعر بسا اوقات ایسا شعر کہہ جاتا ہے جیسا شعر اس کے قبل نہیں ہوا تھا، ایک کاتب کے ہاتھ سے بسا اوقات ایسے نقوش نکل جاتے ہیں جن کے مثل پہلے آنکھوں نے نہیں دیکھے تھے۔

ہوسکتا ہے کہ اس طبیب، انشاء پرداز، شاعر یا کاتب کو اپنے اس نتیجہ عمل پر پورا بھروسہ بھی ہو اور وہ دنیا کو دعوت بھی دے کہ اگر کوئی میرا مدمقابل ہو تو اس کے مثل بنا کر پیش کرے۔ سعدی اپنی گلستان پر، یاقوت مستعصمی اپنے کتبوں پر اور میر انیس اپنے مرثیوں پر بجا طور سے فخر کر سکتے تھے اور بے نظیر ہونے کا دعویٰ بھی اپنے حدود میں درست تھا۔

اللہ کو کیا ضرورت کہ وہ ان میں سے ہر ایک کے دعویٰ کو غلط ثابت کرے۔ اس لئے کہ بہر حال وہ نتیجہ کمال ہے اسی کے ایک مخلوق کا اور اس کے عطا کردہ طاقتوں کا کرشمہ ہے۔ وہ اگر اس کے دعوائے کمال کو باطل کرنے کے لئے ایک کو پیدا کرے تو پھر ضرورت ہے کہ اس کی بے مثال باطل کرنے کے لئے ایک اور پیدا کیا جائے اور پھر اس کے لئے تیسرا، یہ سلسلہ چلتا رہے تو کہیں پر تو ختم ہوگا تو جو آخر میں ہوگا اس کا دعویٰ پھر لا جواب رہے گا۔ پھر اگر پہلے ہی صاحب کمال کے ادائے بے مثالی کو برقرار رہنے دیا جاتا تو کیا حرج تھا۔ لہٰذا بلاشبہ ہر دور میں ایسی قابلیت کے اشخاص پیدا ہو سکتے ہیں جن کی ایسی قابلیت ان کے غیر میں مفقود ہے اور ایسے نمونے کمال کے سامنے آسکتے ہیں جن کا مثل ونظیر موجود نہ ہو۔

مگر یہ سب اسی وقت تک ٹھیک ہے جب تک اس کے ساتھ کوئی دعویٰ کسی خداوندی منصب کا نہیں ہے لیکن اگر کوئی اپنے نتیجہ کمال کو یہ کہہ کر پیش کرے کہ اللہ نے مجھے اس عہدہ پر مقرر کیا ہے اور یہ میرا کارنامہ اس کا ثبوت ہے تو اللہ کو لازم ہے کہ وہ کسی کو اتنی قوت عطا کر دے کہ وہ اس کے خلاف مظاہرہ کر کے باطل کر دے۔

قرآن معجزہ ہے اس لئے کہ وہ ثبوت نبوت میں پیش کیا گیا اور پھر دنیا کو دعوت دی گئی کہ اگر وہ اس رسول کی رسالت میں شک رکھتی ہے تو اس کی مثال پیش کرے۔ اس کے بعد بھی جب دنیا قاصر رہی تو معلوم ہوا کہ وہ حقیقتاً انسانی طاقت سے خارج خدا کی خاص قوت وقدرت کا کرشمہ مخصوص امتیاز اور روحانی اختصاص ہے اور یہ معجزہ ہے جسے ثبوت نبوت کے لئے خالق نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا کیا ہے۔

قرآن میں معجزات انبیاءؑ کا تذکرہ

بہت سے افراد جنہوں نے اپنے دل خواستہ اور ساختہ و پرداختہ انبیاء کا حلقہ اطاعت زیب گردن کیا ہے اور زمانہ کے موجودہ دور سے قریب ہونے کی وجہ سے ان کے لئے وہ کچھ معجزات اور خوارق عادات کے ظہور کے ادعا کی جرات نہیں رکھتے، وہ اس کی اپنی کمزوری اور سرمایۂ اعجاز سے بے مائیگی و تہی دستی کو معجزات انبیا کے انکار سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ انبیاء عجیب وغریب مظاہرات پیش کر کے اپنی نبوت تسلیم نہیں کراتے تھے بلکہ صرف ان کی روحانیت تھی جو ان کے لئے قلوب کو جذب کرتی اور لوگوں کو ان کا گرویدہ بناتی تھی۔

وہ اس سلسلہ میں قرآن کے اندر معجزات انبیاء کے تذکرہ کے وجود کا بھی انکار کر دیتے ہیں اور یہ کہتے ہی کہ قرآن میں کہیں معجزہ کو دلیل نبوت نہیں بتایا گیا ہے اور نہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے قرآن نے معجزات کا ادعاء کیا ہے۔

یہ خیال بالکل غلط ہے۔ قرآن مجید نے اکثر انبیاء کے معجزات کا تذکرہ صاف اور صریحی الفاظ میں درج کیا ہے۔ بے شک اس کو ''معجزہ'' کے نام سے یاد نہیں کیا ہے بلکہ ''آیت'' اور ''بیّنہ'' کی لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی کو متکلمین اپنی اصطلاح میں ''معجزہ'' کہتے ہیں۔

الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس کر معانی سے کنارہ کشی کرنا صحیح نہیں ہے ہم کو لفظ معجزہ پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے کہ ہم آپ کے اس لفظ کو قرآن میں تلاش کریں اور اس کی تعریف ڈھونڈھیں۔ قرآن کوئی فرہنگ یا مجموعہ مصطلحات نہیں ہے کہ اس میں لفظ معجزہ اور اس کی تعریف مذکور ہو۔ بے شک ہم کو اس قسم کی دلیل نبوت کا جسے متکلمین اپنی اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں اور جس کے وجود کو ثبوت نبوت میں ضروری سمجھتے ہیں۔ قرآن میں پتہ لگانا چاہئے اگر اس کا پتہ لگ جائے تو الفاظ میں اختیار ہے اور نام رکھنا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اس کو ''معجزہ'' کہیں جیسا کہ اس لفظ کے معنی لغوی (عاجز کر دینے والی چیز) کی مناسبت سے متکلمین کی اصطلاح ہے یا جس لفظ سے قرآن مجید نے ان دلائل کی تعبیر کی وہ، اس لفظ سے تعبیر کیجئے یا کوئی نام اپنے دل سے تجویز کر لیجیے کم سے کم مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اب میں دکھلاؤں کہ قرآن مجید میں اس قسم کی دلیل نبوت کا پتہ ہے یا نہیں اور اسی ذیل میں معلوم ہوگا کہ قرآن نے کس طرح صداقت نبی کی دلیل عقلی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قرآن مجید نے حیرت انگیز مظاہرات قدرت اور دلائل نبوت کو جنہیں انبیاء پیش کیا کرتے تھے ''آیات'' اور ''بینات'' کے نام سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

قبیلہ ثمود کی طرف ہم نے بھیجا ان کے بھائی صالح کو انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت کرو اللہ کی اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ''بینہ'' آ گیا ہے۔ یہ خدا کا خاص (پیدا کردہ) ناقہ جو تمہارے لئے ''آیت'' (نشانی) ہے تو اس کو چھوڑے رکھنا کہ یہ خدا کی زمین میں اپنی غذا حاصل کرے اور تم اسے کوئی برائی نہ پہنچانا جس سے تم دردناک عذاب میں مبتلا ہو۔ (سورۂ اعراف آیت ۷۳)

اس میں ناقۂ صالح کو ''بیّنہ'' اور اسی کو ''آیت'' کہا گیا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

پھر ہم نے ان انبیاء کے بعد مبعوث کیا موسیٰؑ کو اپنی ''آیتوں'' کے ساتھ فرعون اور اس کے گروہ کی طرف تو ان لوگوں نے ان آیتوں پر ظلم کیا۔ اب ذرا دیکھو کہ فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہے اور موسیٰؑ نے کہا تھا کہ اے فرعون! یقیناً میں خداوند عالم کی طرف سے فرستادہ ہوں اور میرے اوپر لازم ہے کہ میں سوا سچی بات کے خدا کی طرف کسی بات کی نسبت نہ دوں۔ میں تمہاری طرف ''بینہ'' لے کر تمہارے رب کی طرف سے

آیا ہوں بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کر دے فرعون نے کہا کہ اگر تم کوئی ''آیت'' لائے ہو تو اسے پیش کرو اگر سچے ہو یہ سن کر موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینک دیا جو ایک مرتبہ صاف اژدھے کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ اور انہوں نے اپنا ہاتھ نکالا جو تمام دیکھنے والوں کی نظر میں چمکدار نظر آیا۔ (سورۂ اعراف آیات ۱۰۳ تا ۱۰۸)

یہاں عصائے حضرت موسیٰؑ اور ید بیضاء کو ''بینہ'' اور ''آیت'' قرار دیا گیا ہے اس کے بعد ساحران فرعون کی آواز نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے معجزات کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے فرعون سے کہا:

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ۝۱۲۶

تو ہم سے کس بات پر ناراض ہوتا ہے سوائے اس کے کہ ہم اپنے پروردگار کی آیتوں پر ایمان لائے جبکہ وہ ہمارے پاس آئیں پروردگار! ہم پر صبر کو غالب کر دے اور ہمیں ایمان کی حالت میں دنیا سے اٹھا۔ (سورۂ اعراف آیت ۱۲۶)

اس کے بعد:

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳۲ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝۱۳۳

ان لوگوں نے کہا جو بھی چاہو تم ''آیت'' ہمارے سامنے پیش کرو کہ ہم پر اس کے ذریعہ سے جادو کرو ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں تو اس وقت ہم نے ان پر بھیجا طوفان اور ٹڈیوں کا لشکر اور جوئیں اور مینڈک اور خون کھلی ہوئی 'آیتیں'' مگر انہوں نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور وہ گنہگار لوگ تھے۔ (سورۂ اعراف آیات ۱۳۲، ۱۳۳)

اس میں پہلے جزء سے صاف ظاہر ہے کہ ''آیت'' اس نوعیت کی چیز کو کہا گیا ہے جن میں کفار جادو کی صورت پاتے تھے اور آخر آیت میں طوفان، جراد، قمل، ضفادع اور دم، ان تمام غیر معمولی درجہ پر آنے والی آفتوں کو ''آیات مفصلات'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰي قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۷۴

پھر ہم نے بھیجے ان کے بعد کچھ رسول ان کی قوم کی طرف اور وہ رسول ان کے سامنے لائے ''بینات'' مگر وہ کب ایمان لانے والے تھے اس چیز پر جس کے پہلے تکذیب کر چکے تھے۔ (سورۂ یونس آیت ۷۴)

اس میں نوحؑ کے بعد مبعوث ہونے والے رسولوں کے ساتھ ظاہر ہونے والے امور کو اجمالی طور پر ''بینات'' سے تعبیر کرتے ہوئے پھر ارشاد ہوا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝۷۵ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۶ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ اَسِحْرٌ هٰذَا ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ۝۷۷ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۷۸ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۝۷۹ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝۸۰ فَلَمَّآ

أَلْقُوا قَالَ مُوسَىٰ مَا جِئْتُم بِهِ السِّحْرُ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿٨١﴾ وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿٨٢﴾

پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد موسیٰؑ و ہارون کو فرعون اور اس کے گروہ کی طرف اپنی ''آیتوں'' کے ساتھ تو انہوں نے ہٹ دھرمی کی اور وہ بڑے گنہگار لوگ تھے۔ تو جب ان کے پاس ان کے پروردگار کے پاس سے سچی حقیقت پیش ہوئی تو انہوں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ موسیٰؑ نے کہا کیا تم سچی بات کو جو تمہارے پاس آئی ایسا کہتے ہو؟ کیا جادو ہو سکتا ہے؟ حالانکہ جادوگر کامیاب نہیں ہوا کرتے۔ انہوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم کو اس سے منحرف کر دے جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا اور تم دونوں کیلئے اس سرزمین پر بڑائی ہو جائے اور ہم تم دونوں پر ایمان لانیوالے نہیں اور فرعون نے کہا کہ میرے پاس ہر کامل جادوگر کو لاؤ تو جب سب جادوگر جمع ہوئے موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ دکھاؤ جو کرتب تم دکھا سکتے ہو جب انہوں نے پھینکا اپنی رسیوں کو تو موسیٰؑ نے کہا کہ جو تم نے پیش کیا ہے وہ سحر ہے اللہ یقیناً اسے بھی باطل کر دے گا اللہ مفسدہ پردازوں کے کام کو سرسبز نہیں کرتا ہے اور جو بات حق ہے اسے وہ اپنے حکم سے پورا کرتا ہے اگرچہ گنہگار لوگ اس کو برا سمجھیں۔ (سورۂ یونس آیات ۷۶ تا ۸۲)

ان آیات میں پورے طور پر اس دلیل عقلی کا خلاصہ موجود ہے جو معجزہ و سحر کے تفرقہ میں ہم نے بیان کیا ہے۔ آیات کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ ظاہری صورت سے جو امر بطور دلیل نبوت نبی کو عطا ہوا تھا وہ ویسی ہی نوعیت رکھتا تھا جو سحر کی ہوتی ہے یعنی غیر معمولی اور خارق عادت اور خلاف نظام عام اسی بناء پر ان لوگوں نے کہا کہ إِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ اور یہی خیال کر کے فرعون نے مقابلہ کے لئے ساحروں کو دعوت دی لیکن پیغمبر نے اس مختصر جملہ سے کہ: أَسِحْرٌ هٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ، فلسفہ اعجاز اور آیت الٰہی اور کرشمہ ساحری کے فرق پر مکمل روشنی ڈال دی۔ اس میں اعجاز اور سحر کے مابین فرق کا معیار جو بتلایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ سحر ہوگا تو اس کی کامیابی اور سرسبزی باقی نہیں رہ سکتی اس لئے کہ اللہ پر لازم ہے کہ وہ اس کا ابطال کر دے اور اگر وہ سرسبز و کامیاب ہوا اور اس کا ابطال نہ ہو تو سمجھو کہ حقیقۃً سحر نہیں بلکہ اعجاز ہے اور اس معیار کو اس سے زیادہ واضح الفاظ میں دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰؑ علیہ السلام نے ساحروں کی کارستانی دیکھی تو فرمایا۔ ''یہ جو تم نے کیا سحر ہے یقیناً خدا اس کو باطل کر دے گا۔ خدا کبھی فساد برپا کرنے والوں کے کام کو سرسبز نہیں کرتا۔''

معلوم ہوا معیار سحر یہ ہے کہ اللہ اس کو باطل کر دے وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ o یعنی جو واقعی حق ہے اور سچ مچ خدا کی طرف کی نشانی ہے، اس کو وہ اپنے مظاہرات قدرت کے ساتھ برقرار رکھتا ہے چاہئے گنہگار لوگوں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے۔ یہ معیار اعجاز ہے۔ اب اس سے بڑھ کر دلیل عقلی کی طرف اشارہ کیا ہوگا؟

ان آیات سے یہ امر بھی ظاہر ہے کہ اس مظاہرہ قدرت کو جسے ''آیت'' اور ''بینہ'' کہا گیا ہے دلیلِ نبوت اور معیارِ حقانیت کی صورت میں پیش کیا ہے بلکہ درحقیقت ''بیّنہ'' کہنا ان مظاہرات کو اسی اعتبار سے ہے کہ وہ کھلی ہوئی دلیل سچائی کی ہیں اور ''آیت'' کہنا اس لحاظ سے ہے کہ وہ حقانیت کی نشانی ہیں۔

اس کی علاوہ ملاحظہ ہو:

اُسْلُكْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذَانِكَ بُرْهَانَانِ مِنْ

رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

داخل کرو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں، وہ نکلے گا روشن، بغیر کسی بری صورت کے اور ملا دو اپنی طرف اپنے بازو کو دہشت سے، یہ دونوں دلیلیں ہوں گی تمہارے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اس کے پاس کے بڑے آدمیوں کی جانب۔ (سورۂ قصص۔ ۳۲)

اس آیت میں صاف صاف حضرت موسیٰؑ کے معجزات کو ''برہان'' یعنی دلیل نبوت کہا گیا ہے۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات:

جب کہ یہ امر ثابت ہو گیا کہ قرآن میں معجزات کو ''آیات و بینات'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اب قرآن میں تلاش کیجئے، آپ کو حسب ذیل ستائیس مقامات پر واضح اور صاف الفاظ میں ثبوت ملے گا کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی معجزات عطا ہوئے ہیں:

(۱) وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

یقیناً ہم نے اتارے ہیں آپ پر روشن معجزات اور نہیں انکار کر سکتے ان کا مگر فاسق لوگ۔ (سورۂ بقرہ)

(۲) وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

جو لوگ علم نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کیوں ہم سے خدا بات نہیں کرتا یا کوئی خاص معجزہ ہمارے پاس کیوں نہیں آتا۔ ایسا ہی کہا تھا انہوں نے جو ان کے پہلے تھے انہیں کا سا قول ان سب کے دل ایک سے ہیں۔ یقیناً ہم نے معجزات ظاہر کر دیئے ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین لائیں۔ (سورۂ بقرہ)

(۳) فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

اگر تم نے لغزش کی، بعد اس کے کہ معجزے تمہاری طرف آ چکے تو جان لو کہ اللہ زبردست ہے ہر کام ٹھیک کرنے والا ہے۔ (سورۂ بقرہ)

(۴) كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ

کیوں کر خدا راہ راست پر لائے گا ان لوگوں کو جنہوں نے ایمان لانے کے بعد پھر کفر کیا حالانکہ انہوں نے گواہی دی کہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس معجزے آئے۔ (سورۂ آل عمران)

(۵) وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴﴾

ان لوگوں کے سامنے جو بھی معجزہ ان کے پروردگار کی طرف سے آتا ہے یہ اس سے روگردانی ہی کرتے ہیں۔ (سورۂ انعام)

(۶) قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِىْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾

ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو ان لوگوں کی باتوں سے رنج ہوتا ہے تو یہ آپ ہی کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کے معجزوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔ (سورۂ انعام)

(۷) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾

جنہوں نے جھٹلایا ہمارے معجزوں کو یہ بہرے ہیں اور گونگے ہیں تاریکی میں مبتلا ہیں۔(سورۂ انعام)

(۸) وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ

جب آئیں آپ کے پاس وہ لوگ جو ہمارے معجزوں پر ایمان لاتے ہیں تو کہیے کہ سلامتی تمہارے واسطے ہے تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر فرض کرلیا ہے رحمت سے کام لینا ۔(سورۂ انعام۔ ۵۴)

(۹) وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ

جب ان کے پاس کوئی معجزہ آتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ویسی ہی باتیں نہ آئیں جو اور پیغمبروں کو ملی تھیں۔اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنا پیغام کس طرح بھیجے۔(سورۂ انعام۔ ۱۲۴)

(۱۰) فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا

یقیناً آیا تمہارے پاس معجزہ تمہارے پروردگار کی جانب سے اور ہدایت ورحمت تو پھر کون زیادہ ظالم ہوگا اس سے کہ جو اللہ کی طرف کے معجزات کی تکذیب کرے اور ان سے روگردانی کرے۔(سورۂ انعام۔ ۱۵۷)

(۱۱) وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۱

جب ہم کسی ایک معجزہ کے بجائے بدل کر دوسرا معجزہ بھیج دیتے ہیں اور اللہ زیادہ واقف ہے اس چیز کے متعلق جسے وہ اتارتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم تو اپنے دل سے گھڑتے ہو بلکہ اکثر ان میں سے علم نہیں رکھتے۔(سورۂ نحل۔ ۱۰۱)

(۱۲) اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۰۴

وہ جو ایمان نہیں رکھتے اللہ کے معجزات پر اللہ انہیں جبراً راہ راست تک نہیں پہنچائے گا اور ان کے لئے دردناک سزا مقرر ہے۔(سورۂ نحل۔ ۱۰۴)

(۱۳) وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۝۹۷ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا

اور ہم ان کو روزِ قیامت اندھا، گونگا اور بہرا محشور کریں گے یہ ان کا بدلا ہے اس کا کہ انہوں نے ہمارے معجزات سے انکار کیا۔(سورۂ بنی اسرائیل۔ ۹۸)

(۱۴) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا

اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس کو اس کے پروردگار کی طرف کے معجزات کے ذریعہ سے یاددہانی کی گئی مگر اس نے روگردانی کی۔(سورۂ کہف۔ ۵۷)

(۱۵) اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا

کیا دیکھا آپ نے اس شخص کو جس نے انکار کیا ہمارے معجزات کا۔(سورۂ مریم۔ ۷۷)

(۱۶) وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ۝۱۶

اور اسی طرح اتارا ہے ہم نے اسے روشن معجزوں کی حیثیت سے اور اللہ منزل تک پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے۔ (سورۂ حج۔ ۱۴)

(۱۷) وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۵۸﴾

اور وہ جو اپنے پروردگار کے معجزات پر ایمان لاتے ہیں۔ (سورۂ مومنون۔ ۵۸)

(۱۸) وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ

اور ہم نے اس میں معجزات اتارے ہیں جو روشن ہیں۔ (سورۂ نور۔ ۱)

(۱۹) وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ

یقیناً ہم نے تمہاری طرف اتارے ہیں واضح معجزات اور ویسی ہی باتیں جو پہلے والوں کو ملی تھیں۔ (سورۂ نور۔ ۳۴)

(۲۰) لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾

ہم نے تارے ہیں روشن معجزات اور اللہ جس کو چاہتا ہے راہ راست تک پہنچنے کو توفیق خاص عطا کرتا ہے۔ (سورۂ نور)

(۲۱) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا

اور کہیے! الحمدللہ! عنقریب ہم تمہیں معجزات دکھائیں گے جنہیں تم پہچانتے ہوگے (سورۂ نمل۔ ۹۳)

(۲۲) وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾

جب وہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو۔ (سورۂ صافات۔ ۱۴، ۱۵)

(۲۳) وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۚ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

اور دکھلا رہا ہے تم کو وہ اپنے معجزات تو اللہ کے کن کن معجزات کا تم انکار کروگے۔ (سورۂ مومن۔ ۸۱)

(۲۴) وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـــًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا

جب ہمارے معجزات میں ان کو کسی کا علم ہوتا ہے تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ (سورۂ جاثیہ۔ ۹)

(۲۵) وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷﴾

اور جب ان کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں ہمارے روشن معجزات تو جو لوگ انکار کرتے ہیں وہ حق کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ (سورۂ احقاف۔ ۷)

(۲۶) وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۶﴾

اور جب کہا عیسیٰ بن مریمؑ نے کہ اے بنی اسرائیل! میں اللہ کا رسول ہوں، تمہاری جانب تصدیق کرنے والا اس توریت کی جو میرے پہلے تھی اور بشارت دینے والا ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہوگا۔ اب جب وہ آیا ان کی طرف معجزات کے ساتھ تو انہوں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ (سورۂ صف۔ ۶)

(۲۷) وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴿۴﴾

اور نہیں اختلاف کیا ان لوگوں نے کہ جنہیں کتاب عطا ہوئی مگر بعد اس کے کہ ان کی طرف معجزہ آ گیا۔ (سورۂ بینہ۔ ۴)

ان تمام آیات سے صاف ظاہر ہے کہ رسالت مآب بھی اسی طرح ''آیات'' اور ''بینات'' کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے جس طرح سابقہ کے انبیاء۔ اس کے علاوہ آیات ۲۲، ۲۵، ۲۷، میں بار بار اس تذکرہ سے کہ وہ لوگ سحر کہتے تھے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو غیر معمولی اور تمام انسانی طاقتوں سے بالاتر مظاہرات نظر آ رہے تھے جس کا جواب ان کے پاس سوا الزام جادوگری کے اور کچھ نہ تھا۔

اب اسے تعصب کی بناء پر دھاندلی کے سوا کیا کہا جائے کہ عیسائی مبلغین اس پر زور دیتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معجزہ دکھانے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ انہیں خداوند عالم کی جانب سے معجزات عطا کئے گئے۔ پادری فندر صاحب نے اپنی کتاب ''میزان الحق'' میں اس پر کافی خامہ فرسائی کی ہے۔

ان کی دیکھا دیکھی بعض دوسرے کم نظر افراد بھی ہ صدا بلند کر بیٹھتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں ایسے اشخاص میں سے ایک نے اس بارے میں قرآن کی ۱۴ آیتوں سے استدلال کی کوشش کی ہے۔ مگر جب ہم ان لوگوں کی استدلالی کائنات پر غور کرتے ہیں تو اصلی حقیقت صاف معلوم ہو جاتی ہے۔

بات یہ ہے کہ سنت الٰہیہ یہ رہی ہے کہ تمام انبیاء کے معجزے یکساں نہ تھے بلکہ ہر نبی کو حکمت و مصلحت کے اعتبار سے خاص معجزات عطا ہوئے۔ ہمارے رسول کو بھی اللہ کی طرف سے خاص معجزات دیئے گئے۔

مشرک لوگ عناد اور تعصب سے ان تمام معجزوں سے سرتابی کرتے ہوئے کبھی مضحکہ کے انداز میں اور کبھی بہانے کے طور پر نئے نئے معجزوں کی فرمائش کرتے تھے، حقیقت طلبی کے جذبہ سے نہیں، بلکہ صرف اپنے انکار کی سخن پروری کے لئے اور کبھی یہ تقاضا کرتے تھے کہ بالکل وہی معجزے جو سابق انبیا کو مل چکے ہیں، ان کو بھی دیئے جائیں۔ ان کے جواب میں کبھی یہ کہا گیا ہے کہ یہ معجزات پہلے انبیاء کو عطا ہوئے، پھر بھی تو لوگوں نے تکذیب کی۔ پھر اب انہی معجزات کے دکھانے کا کوئی حاصل نہیں۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ (بنی اسرائیل۔ ۵۹)

اور کبھی خالق کی طرف سے یہ کہا گیا کہ اگر یہ معجزے دیکھیں گے، تب بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَاۗءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۹ (سورۂ انعام۔ ۱۰۹)

اور کبھی یہ کہا گیا کہ معجزے تمہارے سامنے موجود ہیں۔ اگر تم ایمان لانا چاہتے ہو تو وہ کافی ہیں۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝۱۱۸ (سورۂ بقرہ۔ ۱۱۸)

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہر فرد کی فرمائش پر ہی معجزہ ہونے لگے تو معجزہ بازیچہ اطفال بن جائے اس کی غیر معمولی عظمت و اہمیت باقی ہی نہ رہے۔ یقیناً آیات اور معجزات کا پیش کرنا صرف لوگوں کی طلب پر نہیں ہوتا بلکہ خود نبی و رسول کی مرضی پر بھی نہیں ہوتا۔ وہ صرف خداوند عالم کی حکمت و مصلحت کی بناء پر ہوتا ہے اور اسی لئے ارشاد ہوا ہے:

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ

کسی رسول کو اختیار نہیں کہ وہ کسی آیت کو ظاہر کرے مگر خدا کے حکم سے (سورۂ رعد۔ ۳۸)

اور اسی کو خاص انداز میں رسولؐ کو مخاطب کر کے ارشاد کیا جس سے درحقیقت عام لوگوں کو تنبیہ مقصود ہے:

وَاِنۡ كَانَ كَبُرَ عَلَيۡكَ اِعۡرَاضُهُمۡ فَاِنِ اسۡتَطَعۡتَ اَنۡ تَبۡتَغِىَ نَفَقًا فِى الۡاَرۡضِ اَوۡ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاۡتِيَهُمۡ بِاٰيَةٍ‌ؕ (سورۃ انعام۔ ۳۵)

اگر آپ پر ان کی روگردانی بہت سخت ناگوار گزرتی ہے تو اگر آپ میں قدرت ہو زمین میں کوئی سرنگ لے جانے یا آسمان پر سیڑھی لگانے کی تو ایسا کیجئے اور کوئی آیت پیش کر دیجئے (ایسی جسے یہ لوگ ضرور ہی مان لیں)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی پیش کی ہوئی آیتیں ان کے ایمان لانے کے لئے بے کار ثابت ہوئیں تو اب رسولؐ کے امکان میں نہیں ہے۔۔ کہ ایسی آیت پیش کریں جس سے وہ ضرور ہی ایمان لے آئیں اور رسولؐ کی زبانی ان لوگوں کے مختلف مطالبات کے جواب میں یہ کہلایا گیا ہے کہ۔۔۔۔ سُبۡحَانَ رَبِّىۡ هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا ۔ پاک ہے خدا کی ذات کیا میں کچھ اور ہوں سوا ایک انسان کے جو رسالت کے عہدہ پر مقرر ہوا ہے یعنی میں اللہ کے ارادہ کا پابند ہوں اور اس کے خلاف کوئی قدرت نہیں رکھتا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَاِذَا لَمۡ تَاۡتِهِمۡ بِاٰيَةٍ قَالُوۡا لَوۡلَا اجۡتَبَيۡتَهَا‌ؕ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوۡحٰٓى اِلَىَّ مِنۡ رَّبِّىۡ‌ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ وَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ (سورۃ الاعراف۔ ۲۰۳)

جب آپ کوئی خاص آیت پیش نہیں کرتے، تو وہ کہتے ہیں آپ نے اس آیت کو پیش کرنے کے لئے کیوں منتخب نہ کیا؟

(اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے دوسری آیتیں پیش ہو چکی تھیں) کہیے کہ میں تو وحی ربّانی کا پابند ہوں۔ یہ تمہارے پروردگار کی بصیرت افروز نشانیاں اور مومنین کی ہدایت و رحمت کے ذریعہ موجود ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی ضرورت ہرگز نہیں ہے کہ جس آیت کا مطالبہ جس وقت ہو وہ ضرور ہی ان کی خواہش کے مطابق پیش کر دی جائے لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب خداوند عالم کی طرف سے درحقیقت ایسے آیات و معجزات پیش ہو چکے ہوں جو اس نبی کی حقانیت ثابت کرنے کیلئے کافی ہوں۔ لہٰذا کسی شخص کے دعویٰ نبوت کے بعد مطلق معجزہ کا مطالبہ حق بجانب ہوگا۔

لیکن معجزہ کے سامنے آنے کے بعد کسی معجزہ خاصہ کا مطالبہ ضروری نہیں کہ پورا ہو۔ لہٰذا ایک طرف مذکورہ بالا آیات سے عیسائی حضرات کی مطلب برآری کی حضرت رسول اکرمؐ کو مثل انبیاء سابق معجزات ملے ہی نہیں تھے ورنہ آپ معجزہ کی خواہش کو اس طرح مسترد کیوں کرتے ہرگز صحیح نہیں ہے جبکہ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ کے مطالبہ پر نہ صرف انکار کرنا بلکہ معجزہ کی خواہش کرنے والوں کو سخت وسست کہنا اور اپنے پاس سے نکال دینا اور یہ تصریح کرنا کہ اس زمانہ والوں کو کوئی نشانی نہ دکھلائی جائے گی، موجود ہے۔

دوسری طرف بہائی اور قادیانی جماعتوں کا یہ استدلال بھی غلط ہے کہ نبی و رسول کے لئے معجزہ کی ضرورت ہی نہیں اور نہ کسی کو نبی سے معجزہ کے مطالبہ کا حق ہے۔ یہ آیات قرآنی سے ثابت بھی نہیں ہوتا اور عقلاً بھی درست نہیں ہے معجزہ یعنی کوئی حقیقت کی خاص نشانی اگر نہیں ہے تو اس نبی پر ایمان لانے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور سچے جھوٹے میں امتیاز کا کوئی معیار نہیں ہوگا۔

اعجاز قرآن

صدر المتالہین اپنی شرح اصول کافی (مطبوعہ ایران ۴۴۱) میں لکھتے ہیں کہ معجزہ وہی ہے جو رسالت کی دعویٰ کے ثبوت میں اعلان بے مثالی کے ساتھ پیش ہو اور پھر دنیا اس کے مقابلہ میں عاجز رہے قرآن میں یہ تمام باتیں موجود ہیں۔ اسے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حقانیت کی دلیل بنا کر پیش کیا۔ فصحائے عرب کو دعوت مقابلہ دی اور جوش دلانے والے انداز میں ان کے جذبہ غیرت وحمیت کو تازیانے لگائے مگر وہ باوجود فصاحت کلام وطاقت بیان میں نازش وافتخار کے قرآن مجید کے جواب سے عاجز وقاصر رہے اور بجائے جواب دینے کے مرنے مارنے پر تیار ہو گئے جس میں انتہائی جانی اور مالی نقصانات برداشت کرنا پڑے۔

حالانکہ قرآن اول روز سے ان کی ان تمام زحمتوں اور مشقتوں کا معمولی ساحل پیش کر رہا تھا کہ وہ اس کے جواب میں پورا نہ سہی، چھوٹے ہی کسی سورہ کا جواب پیش کر دیں۔

یقیناً اگر انہیں اس پر قدرت ہوتی تو وہ قرآن کے مطالبہ کے مطابق عوض جنگی ہنگامہ آرائی کے ادبی معرکہ آزمائی کرتے اس صورت میں بغیر کسی خونریزی اور نتیجہ تباہی وبربادی کے اسلام کی آواز پست ہو جاتی لیکن جب انہوں نے قرآن کے پے در پے تازیانوں کے باوجود اس میدان سے گریز ہی پسند کیا اور حرب وضرب، جنگ وجدال کو اس کے تمام مہلک نتائج کے باوجود مقابلہ کے لئے اختیار کیا تو اس سے ان کی عاجزی طشت از بام ہو گئی اور قرآن مجید کا معجزہ ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا۔

شیخ صدر الدین شیرازی کے لفظوں میں:

دفع تحذی المتحدی بنظم الکلام اھون من الدفع السیف۔

دعوائے بے مثالی کرنے والے کی رد۔ ایک کلام مرتب کر کے آسان ہونا چاہئے تھی، یہ نسبت تلوار کے ساتھ مقابلہ کے

علامہ نیشاپوری نے کہا ہے:

فاضطتھم التعجیز الی ایثار الاصعب علی الاسھل فتبین ان الاسھل فی النظر الاصعب فینفس الامر و ذالك من اول الدلیل علی حقیقه المنزل و صدق المنزل علیه

یہ معجزانہ حیثیت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے آسان راستے کو چھوڑ کر مشکل راستہ اختیار کیا جس سے ثابت ہوا کہ جو ظاہری نگاہ میں آسان تھا (یعنی قرآن کا جواب پیش کرنا) وہ حقیقت میں زیادہ مشکل تھا اور یہ بہت بڑا ثبوت ہے اس کلام کی حقانیت کا جو اتارا گیا اور اس شخص کی سچائی کا جس پر وہ اتارا گیا ہے۔ (غرائب القرآن۔ ج ا۔ ص ۲)

پھر جب اس دور کے فصحائے عرب باوجود اس اقتدار خاص اور کمال کے قرآن کے مقابلہ میں عاجز رہے تو دوسروں کو مجال دم زدن کہاں ہو سکتی ہے۔ اس عاجزی کا تعلق براہ راست اگرچہ فصحائے عرب سے تھا مگر اس سے حقانیت کا جو ثبوت ہے وہ ہمہ گیر حیثیت رکھتا ہے اس لئے یہ معجزہ خاص عرب کے لئے نہیں تھا بلکہ تمام خلق کے لئے۔

اس پہلو کو قدیم ترین عربی کے ادیب عمرو بن بحر جاحظ نے ان الفاظ میں نمایاں کیا ہے۔

ان عجز العرب عن مثل نظم القرآن حجة علی العجم من جهة اعلام العرب العجم انهم کانوا عن ذالك

عجزۃ.([1])

قوم عرب کا قرآن کے سے کلام کو پیش کرنے سے عاجز رہنا غیر عرب تمام دنیا کے سامنے حقانیت کا ثبوت ہے جب کہ قوم عرب نے اپنی عاجزی کا اس کے مقابلہ سے اظہار کر دیا ہے۔(البیان والتبیین ۔ ج۳۔ الطبعۃ الاولیٰ ۔ص۱۷۱و ط۴ص۲۷۰)

اور پھر اس پر حقیقت یہ ہے کہ نزول قرآن کو چودہ سو برس ہو گئے اور قرآن اسی ایک آواز سے اپنی مقابل دنیا کے ہر طبقہ کو صدا دے رہا ہے اور عالم کی فضا اس کے دعوائے بے مثالی سے گونج رہی ہے اور اس کے مخالف اپنی تحریک کی اشاعت اور قرآن کی مخالفت میں سلطنتوں کی طاقت، مال و دولت کا زور اور گراں قدرت خزانوں کا سرمایہ صرف کرتے رہے ہیں۔

لیکن قرآن کی آواز (لا یاتمن بمثلہ) آج تک سچی ہے۔اور سب طرح کی مخالفتیں اور قرآنی عظمت کے گھٹانے کی سر توڑ کوششیں ہوئیں قرآن پر (بزعم خود) ادبی اعتراضات کئے گئے۔قرآن واقعات کو بخیال خود مشکوک ثابت کیا گیا۔قرآن کے مضامین کو کتب سابقہ سے ماخوذ بتا یا گیا۔قرآن میں مسلمانوں کی کتابوں سے تحریف کے ثبوت پیش کئے مگر یہ نہ ہوا کہ کوئی ایک قرآن کے کل نہ سہی، بعض کا جواب تحریر کر دیتا۔

جیسا کہ صدر شیرازی نے تحریر فرمایا:

لو کان بظهر فان ارذل الشعراء لم تحدّوا بشعرهم و عورضوا ظهرت المعارضات و المناقضات الجاریة بینهم

اگر ایسا کبھی بھی ہوا ہوتا تو نمایاں ہوتا اس لئے کہ معمولی شعراء نے جب اپنے کلام کے لئے چیلنج کیا اور ان کے جواب دیئے گئے تو یہ مقابلے والے جوابات شہرہ آفاق ہو گئے۔(شرح اصول اصول کافی مطبوعہ ایران۔ص۴۴۱)

پھر یہاں صورت حال یہ ہے کہ حقانیت قرآن کی مخالف جماعتیں بکثرت ہیں۔چاہے وہ جواب کسی ایک مذہب یا جماعت کی کسی فرد کا نتیجہ قلم ہوتا ہے مگر یہ تمام جماعتیں اس کی اشاعت میں متفق ہو جاتیں بلکہ اگر وہ بالکل اس کے مثل نہیں، کچھ اس کے لگ بھگ اور ذرا قریب بھی ہوتا تو یہ لوگ اپنے تعصب سے اسے قرآن سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے اور سب مل کر یہ کہتے کہ قرآن کا دعویٰ (معاذ اللہ) غلط ہو گیا۔جب ایسا نہیں ہوا تو صاف ثابت ہوا کہ قرآن کے مقابلہ میں دنیا کی طاقت حقیقۃ قاصر تھی، قاصر ہے اور یقین کرنا چاہیے کہ ہمیشہ قاصر رہے گی۔

سلسلہ معجزات میں قرآن کا امتیاز

تمام انبیاء آیت و بینات یعنی معجزات کے ساتھ مبعوث ہوئے لیکن ان کی نبوتوں کے چراغ خاموش ہو گئے اس لئے کہ ان کی بنیاد ایسے معجزات پر تھی جو وقتی حیثیت رکھتے تھے۔اس وقت وہ منکروں پر اتمام حجت کے لئے کافی تھے مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ان کی صحت و واقعیت روایات اور مختلف المضمون حکایات کی رہین منت ہو گئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر یہود سے موسیٰؑ کی نبوت کا ثبوت کوئی شخص منکر ہو کر طلب کرے یا عیسائیوں سے عیسیٰؑ کی نبوت کا، تو انہیں سوا خاموشی کے چارہ کار نہیں کیوں کہ ان کی کوئی نشانی جیتی جاگتی ہوئی حیثیت نہیں رکھتی اور کسی نبی نے ایسا معجزہ اپنے بعد نہیں چھوڑا جو تمام اہل عالم

([1])۔البیان و التبیین جلد۳۔ الطبقہ الاولیٰ ص۱۷۱ و ط۴ص۲۷۰

کے سامنے رکھ دیا جائے کہ ہر زمانہ کے لوگ اپنے اپنے دور کے ذرائع اور اپنے ترقی یافتہ دماغوں کے معیار سے اس کا جانچ سکیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کر سکیں۔

بس ایک پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جنہوں نے معجزہ ایسا پیش کیا جو آپؐ کی نبوت کے لئے ہر دور میں دلیل حسّی کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر زمانہ میں حضرت کی نبوت کو تقلیدی حیثیت سے نکال کر تحقیقی دائرہ میں لانے کا ضامن ہے یہ قرآن ہے جس کے زیر دامن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا چراغ انقلابات زمانہ کی ہزاروں آندھیوں میں بھی روشن ہے اور اپنے اعجاز کی روح کے لئے ہوئے ہر انسان کو غور وخوض کی دعوت دیتا ہے اور ہر ادیب جو قرآن کی زبان کو بحیثیت عربی کے سمجھ سکتا ہے (چاہے وہ ایمان رکھنے والوں میں سے نہ ہو) پہلی نظر میں یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک زندہ زبان کے ایک اہم کارنامے کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہی دلچسپی اسے کچھ زیادہ غور پر آمادہ کر دے تو وہ آخر میں یقین کرے گا کہ وہ ایک زندہ نبوت کی زندہ دستاویز کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

قرآن مجید کی حیثیتِ اعجاز

وہ لوگ جو قرآن مجید کو معجزہ سمجھتے اور خداوندی کلام تسلیم کرتے ہیں ان میں اس حیثیت سے تھوڑا سا اختلاف ہو گیا ہے کہ قرآن مجید کس حیثیت سے معجزہ ہے؟ جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰؒ اس کے قائل ہو گئے کہ قرآن صرف وسلب قوی کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق کی قوت قاہرہ کا یہ ایک کرشمہ ہے کہ جب کوئی قرآن کا جواب لکھنا بھی چاہئے تو اس کی قوت سلب ہو جائے اور اس کی طاقت جواب دیدے۔

اگر چہ منطقی طور پر نتیجہ اعجاز کے لحاظ سے اس قول سے کوئی نقصان نہیں ہوتا مگر واقعیت کے لحاظ سے وہ درست نہیں ہے باوجود سید کی جلالت قدر کے جمہور علماء نے اس کو رد کر دیا۔ کیونکہ ان کے قول کا مطلب یہ قرار پاتا ہے کہ قرآن میں خود کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کا جواب لانے سے فصحائے عرب قاصر ہوتے لیکن یہ اللہ کی قدرت ہے کہ اس کا جواب دینے پر کسی کو قدرت نہیں ہوتی اور جب کوئی شخص اس کا جواب لکھنا چاہئے تو اس کی قوت کو سلب کر دیتا ہے اور موانع پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن بے لوث وجدان کا فیصلہ ہے کہ جب ہم جواب کی نیت سے خالی الذہن ہو کر بغیر کسی خیال معارضہ ومقابلہ کے بھی آیات قرآن پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ انسانی سطح سے بلند شان رکھتا ہے چنانچہ شریف مرتضیٰ کے چھوٹے بھائی جامع نہج البلاغہ علامہ شریف رضی جو عربی ادب میں بڑے بھائی سے اونچا درجہ واقعاً چاہے نہ رکھتے ہوں لیکن بحیثیت ادیب ان سے زیادہ نمایاں ضرور ہیں اپنی بیش قیمت تصنیف ''حقائق التاویل'' مطبوعہ نجف اشرف (صفحہ ۱۰۲) میں لکھتے ہیں:

انه ليرىٰ فيه عند الانفراد بتلاوته من غرائب الفصاحة و نواقب البلاغته و نوادر الخواطر عن الكلام عليه و الايضاح من عجائب ما فيه.

انسان جب تنہائی میں اس کی تلاوت کرے تو فصاحت کے ایسے عجائب انداز بلاغت کے حیرت ناک اسلوب بے مثال الفاظ اور حکمتوں کے ایسے سرچشمے دیکھے گا جس پر گفتگو کرنے اور ان عجائبات کی تشریح کرنے سے انسانی ذہن عاجز ہو گا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اعجازی صفت خود قرآن میں مستقل طور پر موجود ہے، نہ یہ کہ کسی آدمی کے مقابلہ کی نیت سے قلم اٹھاتے وقت ہر دفعہ اللہ کی طاقت کے لئے حرکت میں آنے کی ضرورت ہو اور ایسے آدمی کے مقابلہ میں خاص طور سے وہ اپنی قدرت سے کام لیا کرے۔

ایک دوسرا خیال جو بالکل غلط ہے، یہ ہے کہ قرآن بحیثیت اپنی فصاحت و بلاغت کے معجزہ نہیں ہے اور نہ باعتبار اپنے الفاظ و معانی کی

جامعیت کے بلکہ اس کے معجزہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک مکمل اور کامل اثر ونفوذ رکھنے والا قانون ہے اور اس میں حسب اقتضائے زمانہ انسان زندگی کے تمام شعبوں کے لئے احکام بوجہ اتم موجود ہیں۔

یہ خیال اس لئے صحیح نہیں ہے کہ اس صورت میں قرآن مجید کے بس مجموعی طور پر مقابلہ کا سوال پیش کیا گیا ہوتا نہ کہ دس سورتوں کے مقابلہ کی دعوت بلکہ آخر میں صرف ایک سورہ کے جواب کی طلب پھر یہ کہ لاجوابی کا اعلان تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ ابتدا ہی سے ہونے لگا، لیکن یہ جہت اعجاز پیدا ہوتی ہے پورے قرآن کی تنزیل کے بعد اگر اس کے معجزہ ہونے کے یہ معنی ہوتے تو مطالبہ جواب کا تمام قرآن کے نازل ہونے کے بعد ہوتا نہ کہ اثنائے تنزیل میں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہت اعجاز کوئی ایسی ہے جو کل وجز میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

بے شک یہ بھی درست نہیں ہے کہ قرآن کی اعجازی حیثیت بس فصاحت و بلاغت میں منحصر ہے، فصحائے عرب کے لئے وہ بحیثیت فصاحت معجزہ تھا مگر چوں کہ وہ ہر زمانہ میں باقی رہنے والی دلیل بیّن بنا کر بھیجا گیا لہٰذا اس میں بلند اور پست ظاہر بین اور دوررس ہر درجہ کے دماغوں کے لئے جہات اعجاز موجود ہیں اور فصاحت و بلاغت والے اعجاز کے علاوہ وہ باعتبار معارف وحقائق، باعتبار نکات ودقائق، باعتبار جامعیت و وسعت علوم، باعتبار متانت و بلندی تہذیب اور پھر باعتبار اپنے تعلیمات وہدایت کے ہر دور زمانہ کے لئے معجزہ ہے۔

قرآن کے تازہ ترین معجزات

طبیعات وفلکیات میں دنیا برابر ترقی کرتی جارہی ہے اور اسی میں کوئی شبہہ نہیں کہ بہت سے دروازے حکمت وفلسفہ کے جو سابق زمانہ میں بند تھے وہ اب کھل گئے ہیں یا کھل رہے ہیں اور سینکڑوں رموز جو اس کے پہلے راز سربستہ کی حیثیت رکھتے تھے اب منکشف ہوتے جاتے ہیں۔

اگرچہ ان انکشافات میں کچھ ظنی یا وہمی بھی ہوتے ہیں اور ان میں انداز، تخمین یا تخیل اور تمثیل وقیاس کی آمیزش ہوتی ہے اس لئے میں اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ مذہبی آیات وروایات کو کھینچ تان کر جدید تحقیقات پر منطبق کیا جائے۔

یہ کوشش اس لئے صحیح نہیں کہ انسانی فلسفہ وعلم تبدیل ہونے والی چیز ہے اور دین ثابت وبرقرار حقیقتوں پر مبنی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ثابت ولازوال چیز کا متغیر اور تبدیل چیز سے دائمی طور پر تطابق نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا اگر دینی تصریحات کسی موجود تحقیقات فلسفی کے خلاف ہوں تو ہمیں یہ ماننا ناگزیر ہے کہ فلسفہ ابھی اس بلندی کے درجہ تک نہیں پہنچا کہ اس حقیقت کا صحیح انکشاف ہوسکے۔ پھر بھی اس میں شبہہ نہیں کہ سائنس کے بعض تازہ معلومات ایسے ہیں جن کا پتہ قرآن اور احادیث سے صاف صاف چلتا ہے۔ اس قسم کے آیت ہم کو قرآن کے تازہ ترین اعجاز کے پہلو سے روشناس کرتے ہیں کہ وہ چیزیں جو ہزاروں سال تک پردہ خفا میں رہیں اور اب ہزاروں قسم کے جدید آلات رصدیہ اور مختلف قسم کے دوربینوں سے ان کا پتہ چلایا گیا ہے نبی امیؐ کے لائے ہوئے قرآن میں وہ تیرہ چودہ سو برس پہلے مذکور تھیں۔

بعض آیتیں قرآن کی ایسی ہیں کہ ان کو جب ہیئت قدیم کے قدیمی مسلمات کی بناء پر جانچا گیا تو کسی طرح ان کے ظاہری طور پر معنی سمجھ میں نہ آئے لہٰذا مفسرین نے جو ان علوم کو بالکل درست مانتے تھے ان آیات میں تاویلات سے کام لیا لیکن اب جس وقت کی ہیت نے پلٹا کھایا ہے اور علم کے دور میں انقلاب آیا ہے تو وہ آیات بغیر تاویل کے اسی حقیقت کو ظاہر کررہے ہیں جن کا انکشاف اب ہوا ہے۔ عراق کے فلسفی عالم علامہ سید بہۃ الدین شہرستانی نے ایک کتاب ''الہیۃ دارالاسلام'' تقریباً آج سے نصب صدی پہلے تحریر فرمائی تھی جو عراق میں شائع ہوئی اور اس کا اردو

ترجمہ مولانا محمد ہارون صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ نے ''البدر التمام'' کے نام سے کیا جو دفتر ''البرہان'' لدھیانہ سے شائع ہوا۔

اس میں اگر چہ بہت سے تاویلات پہلی قسم میں داخل ہیں جن کی نوعیت سے میں اختلاف کا اظہار کر چکا ہوں لیکن بہت سے نمونے دوسری قسم کے بھی موجود ہیں اور بعض مسائل انکشافات جدید کے واقعی قرآن واحادیث کے تصریحات سے پورے طور پر ثابت ہوتے ہیں جن میں کسی تاویل سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

مصر کے مشہور عالم شیخ طنطاوی جوہری کی کتاب ''القران والعلوم العصریہ'' اور شیخ عبدالحلیم علی بدیراز ہری کی کتاب ''القرآن والعلوم العصریہ'' اور ''معجزات القرآن العشرین'' بھی اس سلسلہ میں اچھی کتابیں ہیں لیکن شیخ طنطاوی نے جو اس رنگ میں پوری تفسیر لکھ ڈالی ''جواہرا القرآن'' وہ ویسی ہی دوراز کار تاویلات اور غیر قانونی علوم کی بہتات سے باوجود اپنی وسعت دامن اور مصنف کی انتہائی عرق ریزی کا ثبوت ہونے کے بحیثیت تفسیر غیر مقبول شے بن گئی۔ عم معظم مولانا سید احمد صاحب قبلہ علامہ ہندی کی کتاب ''فلسفہ الاسلام'' میں بھی قرآن اور علوم عصریہ میں تطابق کے سلسلہ میں کافی فکر انگیز مواد موجود ہے جس کے بہت سے اجزاء غیر مطبوعہ رہ گئے اور معلوم نہیں قلمی شکل میں بھی محفوظ ہیں یا نہیں۔

قرآن کے امتیازی خصوصیات بحیثیت اسناد واعتبار

ہم نے اپنی کتاب ''تحریف قرآن کی حقیقت'' میں بہت تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی ہے، کہ جتنی کتابیں اس وقت الہامی سمجھی جاتی ہیں اور وحی آسمانی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں ان کے متعلق اگر خود ان کے ماننے والوں کے تحریرات کی روشنی میں نظر کی جائے تو ان کی تاریخ زندگی ایسے حوادث وانقلابات کا مجموعہ نظر آتی ہے جن کی بناء پر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے کسی جزء کا بھی دنیا میں وجود باقی ہے اور جسے اب اس کے متبعین سر اور آنکھوں پر رکھ رہے ہیں اور خدا کا کلام سمجھتے ہیں اس میں کوئی آدھا یا چوتھائی جزء بھی ایسا ہے جو اس حقیقی وحی سے عینًا مطابق ہو جو پیغمبروں پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے برخلاف جب ہم اسلامی کتاب ''قرآن کریم'' پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ایسی تمام کمزوریوں سے بلند نظر آتی ہے اور اس کی تاریخ ایسے خصوصیات پر مشتمل ملتی ہے جو اس کے استناد واعتبار کے ضامن ہیں۔

پہلی خصوصیت:

امت اسلامیہ کو جو قرآن مجید کی امانت دار اور اس کی حفاظت ونگہداشت کی براہ راست ضامن سمجھی جا سکتی ہے، وہ حقیقی معنی میں باختلاف زمانہ اس کے صحیح تعلیمات سے کتنی ہی دور جا پڑی ہو اور اس کی بناء پر اہل معنی اس پر ارتداد کا حکم لگا دیں لیکن ایسا کوئی وقت نہیں آیا کہ اس نے قرآن کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کا معاذ اللہ اعلان کیا ہو اور برملا کفر وشرک اختیار کیا ہو بلکہ جس وقت سے مسلمانوں نے دنیائے وجود میں قدم رکھا ان کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوتی رہی اور وہ برابر اسلام کو اپنا نشان قومیت اور قرآن کو اپنا طرہ دستار بنائے رہے

دوسری خصوصیت:

قرآن مجید کے متعلق کبھی کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی کہ اس کا نسخہ کسی خاص فرد یا جماعت کے پاس محدود رہے بلکہ عام طور پر مسلمانوں کو یہ حق حاصل رہا کہ وہ اسے لکھیں نقل کریں اور ازبر یاد کریں۔

تیسری خصوصیت:

قرآن اپنی اصلی زبان (عربی) میں موجود ہے اور صرف اتنا نہیں بلکہ ہر مسلمان قرآن بس اسی کو سمجھتا ہے جو خاص الفاظ پر مشتمل ہے ان کے شرعی احکام بھی اسی قرآن سے تعلق رکھتے ہیں، نماز میں اس کا پڑھنا لازم اور دوسرے اوقات میں اس کی تلاوت باعث اجر وثواب یہ احکام تراجم قرآن پر مرتب نہیں ہیں ترجمہ جس زبان کا ہو وہ ترجمہ ہی کہلاتا یہ کوئی مسلمان اسے قرآن نہیں سمجھتا۔

چوتھی خصوصیت:

قرآن مجید کے آیات کو متفرق طور پر خود رسالت مآبؐ بوقت ورود ہی قلمبند کرالیا کرتے تھے اور پھر ان متفرق آیات کو بعد حضرتؐ کی وفات کے تقریباً فوراً ہی کتابی شکل میں جمع کرلیا گیا جن کی تصدیق وقتاً فوقتاً ان ہستیوں نے کی جنہیں حفاظت قرآن کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔

پانچویں خصوصیت:

قرآن میں خود قدم قدم پر اس کے مُنَزَّلٌ مِنَ اللہ ہونے کا اعلان ہے اور کسی دوسرے شخص کا کیا ذکر رسول کا ذاتی کلام ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

چھٹی خصوصیت:

قرآن کی اصلیت وحقانیت کے بارے میں مسلمانوں میں باوجود آپ کے سینکڑوں اختلافات کے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اس اسے متفقہ حیثیت سے کلام الٰہی سمجھتے ہیں۔

ساتویں خصوصیت:

قرآن کے متعلق اس کے ماننے والے اس نقطہ پر متفق ہیں کہ وہ دنیا کے آخری دور تک رہنما بنا کر بھیجا گیا ہے اور اس کے تعلیمات کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہیں۔

آٹھویں خصوصیت:

قرآن جب سے کتاب شکل میں مدون ہو کر مسلمانوں میں منتشر ہوا، اس کی ایک ایک لفظ کی ہر دور میں جانچ پڑتال ہوتی رہی اور تمام مسلمان بلاتفریق فرقہ اس کی کتاب، قرات اور تفسیر وتشریح کی طرف متوجہ رہے جس سے قرآن مجید میں اب کسی دور میں تصرف اور تحریف کا امکان نہیں رہا۔

نویں خصوصیت:

قرآن مجید کا انداز بیان خود ہی اپنا معیار ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی بڑے سے بڑے فصیح کلام میں بھی قرآن کا ایک جملہ آجاتا ہے تو وہ اس طرح نمایاں ہوتا ہے جیسے سنگریزوں میں موتی اور نہیں تو ستاروں میں ماہتاب۔

پانچواں تبصرہ

جمع وتدوین قرآن

قرآن مجید تدریجی حیثیت سے تیئس برس کے عرصہ میں رسالت مآبؐ پر نازل ہوا۔ مختلف حالات اور واقعات کی مناسبت سے آیات اور کبھی پورے پورے سورے آپؐ پر اترتے اور آپؐ ان کی تبلیغ فرما دیتے تھے اور کوئی لکھنے والا جب آجاتا تھا تو اسے کاغذ یا چمڑے یا درخت کی چھال جو کچھ ملتا اس پر لکھوا دیا کرتے تھے۔

لیکن عرب میں کتابت اور قرات کا رواج بہت کم تھا اس لئے ذوق حفظ ان میں ترقی پر تھا۔ لہٰذا قرآن کے لئے بھی شروع میں حفظ ہی کا طریقہ اختیار کیا گیا اور بیرون جات میں جہاں جہاں لوگ مسلمان ہوتے وہاں قرآن کی تعلیم کے لئے معلمین کو روانہ کیا جاتا تھا اور جتنا جس کو ممکن ہوتا تھا اتنا اس کو قرآن حفظ کراتے تھے لیکن یہ حفظ تنہا حفاظت وحی الٰہی کی ضمانت نہیں بن سکتا تھا جب تک وہ کتابی شکل میں مدون اور محفوظ نہ ہو۔

رسولؐ کے حکم سے بروقت جو کتابت ہوتی تھی وہ متفرق اور غیر مرتب صورت رکھتی تھی اس لئے بعد رسولؐ جو سب سے اہم ضرورت تھی وہ یہ کہ ان اجزاء کو مرتب صورت سے کتاب کی شکل میں لے آیا جائے۔

مگر یہ عام صحابہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ کتاب کے اوراق ہوں تو انتہائی زحمت کے ساتھ سہی کوئی ان کی ترک ملا دے مگر آیتیں قرآن کی جو متفرق چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑوں، چمڑے کے حصوں اور درخت خرما کی چھالوں پر ہوں، ایک ڈھیر کی صورت میں کسی انسان کے سامنے رکھ دی جائیں تو کس میں قدرت ہے کہ انہیں اصل سلسلے کے مطابق مرتب کر دے۔

پھر صحابہ تو ہر وقت رسولؐ کی خدمت میں موجود نہیں رہتے تھے ان میں سے بہت سے حضرات بعد ہجرت اسلام لائے تھے اور قرآن اس کے پہلے سے نازل ہو رہا تھا۔ ان میں زیادہ تر تجارت پیشہ اور کاروباری لوگ تھے ان میں سے اکثر بس نماز میں پڑھنے بھر کے لئے جتنے قرآن کی ضرورت تھی وہ یاد کر لیتے تھے پورا قرآن ہر ایک آدمی کہاں یاد کر سکتا تھا چہ جائیکہ اس کے آیات کی پوری ترتیب اور شان نزول اس کے لئے ایسی ہستی کی ضرورت تھی جسے خاص طور پر خدا اور رسولؐ کی طرف علم قرآن عطا ہوا ہو جو آیات کی ترتیب اور شان و کیفیت نزول سے پورے طور پر مطلع ہو یہ ذات حضرت علی بنا ابیطالبؑ کی تھی جو خالق کی جانب سے اس فریضہ کو انجام دینے کے ذمہ دار تھے اور رسولؐ نے انہی کو تمام دینی امانتوں کا محافظ بنایا تھا۔ چنانچہ پیغمبرؐ خدا کی ودیعتیں سب انہیں کے سپرد تھیں اور وہ قرآن کا مکتوبی ذخیرہ بھی تمام و کمال انہی کے پاس تھا اور رسالت مآبؐ نے آپ کے لئے اعلان فرما دیا تھا کہ عَلِیٌ مَعَ الْقُرْاٰنِ وَ الْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِیٍ علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ۔'' اور اس سلسلے کا نام لے کر جس کی پہلی کڑی آپ تھے قرآن کے ساتھ مرکز تمسک قرار دیا تھا اس طرح کہ اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِیْ اَهْلُبَیْتِیْ۔ مگر رسولؐ کی وفات کے بعد جب اقتدار اپنے مرکز سے ہٹا تو ارباب اقتدار کے سیاسی مصالح اس کے متقاضی نہ تھے کہ قرآن کے ساتھ علی ابن ابیطالبؑ کا نام ہر مسلمان کے ذہن پر نقش ہو۔ لہٰذا باوجودیکہ حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام نے سب سے مقدم یہی کام سمجھا اور اسے اس سرگرمی سے انجام دیا کہ قسم کھائی کہ ردا اپنے دوش پر نہ ڈالوں گا اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر سے باہر نکل کر کہیں آؤں جاؤں گا نہیں جب تک

قرآن کو کتابی صورت سے اس کی تنزیلی ترتیب کے مطابق جمع نہ کردوں۔ چنانچہ چند ہی روز میں آپ نے اس کام کو انجام دے دیا، مگر جب اسے آپ نے ارباب اقتدار کے سامنے پیش کیا تو وہاں سے اسے رد کر دیا گیا اور کہا' ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ خاموشی کے ساتھ اپنے اس جمع کردہ مصحف کو واپس لائے اور اپنے ذخیرہ خاص میں محفوظ کر دیا۔

اب کچھ عرصہ تک اہل اقتدار ملک کے مختلف اطراف میں بھڑکتے ہوئے بدامنی کے شعلوں کو بجھانے میں مصروف رہے' جب اس سے فرصت ہوئی اور ان لڑائیوں میں حفاظ قرآن کی کثیر تعداد قتل ہوگئی اور خوف پیدا ہوا کہ حاملانِ قرآن کے قتل ہونے کے سبب کہیں قرآن کا کثیر حصہ تلف نہ ہوجائے تو اس وقت جمع قرآن کی ضرورت محسوس کی اور اس خدمت کو زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا جو رسالت مآبؐ کے آخری زمانہ کے کم عمر صحابہ میں سے ایک فرد تھے اور حفظ قرآن شوق وذوق سے کیا تھا، انہوں نے بڑی جانفشانی وعرق ریزی کے ساتھ کچھ اپنے حافظہ کی مدد سے اور کچھ صحابہ کے پاس سے متفرق طور پر تھوڑے تھوڑے اجزاء جو تھے، ان سب کو سامنے رکھ کر اور دوسرے صحابہ سے پوچھ کر قرآن مجید کو حکومت وقت کے زیر سایہ جمع کیا۔

اب یہ وہی حکومت کے سیاسی تقاضے تھے کہ جمع قرآن کیلئے اتنے پاپڑ بیلنے کے بجائے اس ایک ذات کی انجام دی ہوئی خدمت سے فائدہ اٹھایا جاتا جو مسلم طور پر سے بڑی عالم قرآن ہستی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے ترتیب آیات تنزیل کے مطابق نہ ہوسکی اور اس سے یہ بڑا علمی خسارہ ہوگیا کہ ناسخ ومنسوخ کی شناخت مشکل ہوگئی اور بعض آیات کی تاویل وتفسیر جو خود سیاق وسلسلہ کلام سے معلوم ہوجاتی اب دشوار ہوگئی جس پر اثنائے تفسیر میں ہم جابجا روشنی ڈالیں گے۔

لیکن یہ خود معنوی طور پر قرآن مجید کے اسلوب کا ایک معجزہ تھا کہ غیر مرتب شکل میں یکجا ہونے کے بعد بھی اس کے آیات کی افادیت برقرار رہی اور اس کی معجزانہ شان فصاحت وبلاغت کو صدمہ نہیں پہنچا۔ اس کے ساتھ چوں کہ حضرت علیؑ ابن ابیطالب علیہ السلام نے اس کے بالمقابل اپنے جمع کردہ قرآن کی اشاعت کرنا ضروری نہیں سمجھی۔ اس سے یقینی طور پر یہ ثابت ہوگیا کہ موجودہ صورت سے جو کتاب جمع ہوئی اس میں کوئی فروگذاشت ایسی نہیں ہوئی ہے جس سے اس کی حقانیت کو صدمہ پہنچا ہو۔ اس طرح واقعی وحقیقی اجماع ہوگیا اس قرآن کی حقانیت پر جو بین الدفیتین موجود ہے جس میں کسی اسلامی فرقہ کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

چھٹا تبصرہ

نفیٔ تحریف

اگر حضرت امیر المومنین علیؑ بن ابیطالبؑ اس قرآن کی اشاعت پر جو ارکان حکومت کی جانب سے مرتب کیا گیا تھا صرف سکوت اختیار فرماتے تو بھی وہ اس کی حقانیت کی دلیل ہوتا واقعہ یہ ہے کہ حضرت نے اس پر سکوت ہی نہیں فرمایا بلکہ اپنے کلمات میں گویا اس پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ اس کے اتباع کی دعوت دی اور اسے معاش اور معاد کے تمام معاملات میں حجت خدا بتلایا۔

اسے میں ہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ہر نقطہ نظر کے شیعہ اس پر متفق ہیں چنانچہ ''عقائد و مسلمات'' کے نعرے لگانے والی جماعت کے ایک رکن رکین مولوی سبط الحسن صاحب ہنسوی اپنے مضمون ''تاریخ خط و خطاطی میں علیؑ کا مقام'' (شائع شدہ الارشاد بڈگام کشمیر جمادی الثانی و رجب ۱۳۸۶ھ اکتوبر و نومبر ۱۹۶۶ء میں لکھتے ہیں:

''باوجود مصروفیت حضرتؑ نے متعدد نسخے قرآن کے تحریر فرمائے جو نقل ہیں اسی نسخہ قرآن کی جس پر امت نے اجماع کیا تھا گویا اس عمل سے امیر المومنینؑ نے مروجہ مصحف کے کلام الٰہی ہونے کی تصدیق فرمادی جو آپ نے منصب امامت کا فرض اولین تھا۔ (الارشاد۔ ص ۲۷)

نہج البلاغہ میں جو آپ کے ارشادات کا مجموعہ ہے اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں

ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

اَللّٰهَ اللّٰهَ اَيُّهَا النَّاسُ، فِيمَا اسْتَحْفَظَكُمْ مِنْ كِتَابِهِ، وَاسْتَوْدَعَكُمْ مِنْ حُقُوقِهِ، فَإِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ لَمْ يَخْلُقْكُمْ عَبَثًا، وَلَمْ يَتْرُكْكُمْ سُدًى، وَلَمْ يَدَعْكُمْ فِي جَهَالَةٍ وَلَا عَمًى، قَدْ سَمَّى آثَارَكُمْ، وَعَلِمَ اَعْمَالَكُمْ، وَكَتَبَ آجَالَكُمْ، وَاَنْزَلَ عَلَيْكُمُ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَعَمَّرَ فِيكُمْ نَبِيَّهُ اَزْمَانًا، حَتّٰى اَكْمَلَ لَهُ وَلَكُمْ، فِيمَا اَنْزَلَ مِنْ كِتَابِهِ وَدِينَهُ الَّذِي رَضِيَ لِنَفْسِهِ.

اللہ کا پاس کرو اے لوگو! کتاب خدا کے بارے میں جس کا محفوظ رکھنا اس نے تم سے چاہا ہے اور تمہیں اس کے حقوق کا امانتدار بنایا ہے کیوں کہ اللہ نے تم کو بیکار نہیں پیدا کیا اور نہ یوں ہی چھوڑ رکھا ہے اور نہ تمہیں بے خبری اور اندھے پن میں چھوڑ دیا ہے اس نے تمہارے حالات مقرر کردیئے اور تمہاری کارگزاریوں پر نشان کھینچ دیئے ہیں اور تمہاری عمریں قلمبند کردی ہیں اور تم پر کتاب اتاری ہے جس میں ہر چیز کا بیان ہے اور اس نے تمہارے درمیان اپنے نبیؐ کو ایک زمانہ تک زندہ رکھا یہاں تک کہ اس نے ان کے لئے اور تمہارے لئے اس کتاب میں جو اتاری ہے اپنے اس دین کو مکمل کردیا ہے جسے اس نے اپنا پسندیدہ قرار دیا ہے۔ (خطبہ ۸۴)

دوسرے خطبہ میں ہے:

تَعَلَّمُوا الْقُرْآنَ فَإِنَّهُ اَحْسَنُ الْحَدِيثِ، وَتَفَقَّهُوا فِيهِ فَإِنَّهُ رَبِيعُ الْقُلُوبِ، وَاسْتَشْفُوا بِنُورِهِ فَإِنَّهُ شِفَاءُ الصُّدُورِ، وَاَحْسِنُوا تِلَاوَتَهُ فَإِنَّهُ اَنْفَعُ الْقَصَصِ.

قرآن کی تعلیم حاصل کرو، اس لئے کہ وہ بہترین کلام ہے اور اس کے سمجھنے کی صلاحیت حاصل کرو کہ وہ کشت دل کے لئے بہار ہے اور اس کی روشنی سے اپنی بیماریوں کو دور کرو اس لئے کہ وہ سینوں کے لئے شفاء ہے اور اس کی تلاوت خوب کرو کیوں کہ وہ واقعات کا بہترین تذکرہ ہے۔(خطبہ ۱۰۸)

تیسرے موقع پر تحکیم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّا لَمْ نُحَكِّمِ الرِّجَالَ، وَاِنَّمَا حَكَّمْنَا الْقُرْآنَ. وهذَا الْقُرْآنُ اِنَّمَا هُوَ خَطٌّ مَسْتُورٌ بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ لَا يَنْطِقُ بِلِسَانٍ، وَلَا بُدَّ لَهُ مِنْ تَرْجُمَانٍ، وَاِنَّمَا يَنْطِقُ عَنْهُ الرِّجَالُ. وَلَمَّا دَعَانَا الْقَوْمُ اِلَى اَنْ نُحَكِّمَ بَيْنَنَا الْقُرْآنَ لَمْ نَكُنِ الْفَرِيقَ الْمُتَوَلِّيَ عَنْ كِتَابِ اللهِ.

ہم نے انسانوں کو حکم نہیں بنایا تھا بلکہ قرآن کو حکم بنانے پر راضی ہوئے تھے اور یہ قرآن وہی ہے جو دونوں دفتیوں کے درمیان لکھا ہوا تحریر کی صورت موجود ہے وہ زبان سے تو بولتا نہیں، اس کے لئے ترجمان کی ضرورت ہے۔انسان وہ ہوتے ہیں جو اس کی ترجمانی کرتے ہیں اور جب ان لوگوں نے ہم کو دعوت دی کہ ہم قرآن کو حکم قرار دیں تو ہم ایسی جماعت نہیں بنے کہ جو قرآن سے روگردانی والی ہو۔(خطبہ ۱۲۳)

چوتھے موقع پر ایک کلام کے ضمن میں ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا حُكِّمَ الْحَكَمَانِ لِيُحْيِيَا مَا اَحْيَا الْقُرْآنُ، وَيُمِيتَا مَا اَمَاتَ الْقُرْآنُ، وَاِحْيَاؤُهُ الاجْتِمَاعُ عَلَيْهِ، وَاِمَاتَتُهُ الافْتِرَاقُ عَنْهُ، فَاِنْ جَرَّنَا الْقُرْآنُ اِلَيْهِمُ اتَّبَعْنَاهُم، وَاِنْ جَرَّهُمْ اِلَيْنَا اتَّبَعُونَا.

دونوں حکم اس لئے مقرر ہوئے تھے کہ وہ زندہ کریں اس بات کو جسے قرآن زندہ کرے اور مردہ کریں اس بات کو جسے قرآن مردہ کرے قرآن کی بات کو زندہ کرنے کے معنی اس پر متفق ہونا ہے اور اسے مردہ کرنا اس سے الگ ہونا تو اگر قرآن ہمیں کھینچے ان کی طرف تو ہم ان کے سامنے گردن جھکالیں اور اگر انہیں کھینچے ہماری طرف تو وہ ہمارے سامنے سر جھکا دیں۔(خطبہ ۱۲۵)

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

كِتَابُ اللهِ بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ، نَاطِقٌ لَا يَعْيَا لِسَانُهُ، وَبَيْتٌ لَا تُهْدَمُ اَرْكَانُهُ، وَعِزٌّ لَا تُهْزَمُ اَعْوَانُهُ.

اللہ کی کتاب تمہارے درمیان موجود ہے یہ وہ بات کرنے والا ہے جس کی زبان تھکنے والی نہیں اور وہ عمارت ہے جس کے ستون گرنے والے نہیں اور وہ مرکز عزت ہے جس کے حمایتی شکست کھانے والے نہیں۔(خطبہ ۱۳۱)

ایک اور موقع پر ہے:

اِنَّهُ سَيَاْتِي عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِي زَمَانٌ لَيْسَ فِيهِ شَيْءٌ اَخْفَى مِنَ الْحَقِّ، وَلَا اَظْهَرَ مِنَ الْبَاطِلِ، وَلَا اَكْثَرَ مِنَ الْكَذِبِ عَلَى اللهِ وَرَسُولِهِ، وَلَيْسَ عِنْدَ اَهْلِ ذلِكَ الزَّمَانِ سِلْعَةٌ اَبْوَرَ مِنَ الْكِتَابِ اِذَا تُلِيَ حَقَّ تِلَاوَتِهِ، وَلَا اَنْفَقَ مِنْهُ اِذَا حُرِّفَ عَنْ مَوَاضِعِهِ، وَلَا فِي الْبِلَادِ شَيْءٌ اَنْكَرَ مِنَ الْمَعْرُوفِ، وَلَا اَعْرَفَ مِنَ الْمُنْكَرِ فَقَدْ نَبَذَ الْكِتَابَ حَمَلَتُهُ، وَتَنَاسَاهُ حَفَظَتُهُ; فَالْكِتَابُ يَوْمَئِذٍ وَاَهْلُهُ مَنْفِيَّانِ طَرِيدَانِ، وَصَاحِبَانِ مُصْطَحِبَانِ فِي طَرِيقٍ وَاحِدٍ لَا يُؤْوِيهِمَا مُؤْوٍ; فَالْكِتَابُ وَاَهْلُهُ فِي ذلِكَ الزَّمَانِ فِي النَّاسِ وَلَيْسَا فِيهِمْ، وَمَعَهُمْ وَلَيْسَا مَعَهُمْ! لِاَنَّ الضَّلَالَةَ لَا تُوَافِقُ

الْهُدَى، وَإِنِ اجْتَمَعَا، فَاجْتَمَعَ الْقَوْمُ عَلَى الْفُرْقَةِ، وَافْتَرَقُوا عَنِ الْجَمَاعَةِ، كَأَنَّهُمْ أَئِمَّةُ الْكِتَابِ وَلَيْسَ الْكِتَابُ إِمَامَهُمْ، فَلَمْ يَبْقَ عِنْدَهُمْ مِنْهُ إِلاَّ اسْمُهُ، وَلَا يَعْرِفُونَ إِلاَّ خَطَّهُ وَزَبْرَهُ.

یقیناً میرے بعد ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں کوئی شے حق سے زیادہ مخفی اور باطل سے زیادہ ظاہر نہ ہوگی اور اللہ اور اس کے پیغمبر پر جھوٹ باندھنے سے زیادہ کوئی چیز نہ ہوگی اور اس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی چیز بے قیمت نہ ہوگی جب اسے ٹھیک (صحیح مفہوم کے ساتھ) پڑھا جائے اور اس سے زیادہ کوئی چیز چالو نہ ہوگی جب کہ اس کا بے محل استعمال کیا جائے اور دنیا میں نیکی سے زیادہ کوئی برائی اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی نہ ہوگی تو قرآن کو اس کے حامل افراد نے پس پشت ڈال دیا ہوگا اور اس کے حافظوں نے اسے بھلا دیا ہوگا تو اس دن قرآن سے سچے اہل قرآن شہر بدر ہوں گے، وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں گے ایک ہی راہ میں کہ ان دونوں کو کوئی پناہ دینے والا نہ ہوگا، تو قرآن اور اس کے والے اس دور میں آدمیوں میں ہوں گے اور پھر بھی ان میں نہ ہوں گے اور ان کے ساتھ نہ ہوں گے اس لئے کہ گمراہی ہدایت کے موافق نہیں ہوا کرتی چاہے ایک جگہ پر دونوں ہوں تو لوگ افتراق پر متحد اور نقطہ اجتماع سے منتشر ہوں گے۔

گویا وہ خود قرآن کے پیشوا ہیں اور قرآن اُن کا پیشوا نہیں ہے تو اُن کے پاس قرآن کا صرف نام باقی ہوگا اور وہ بس اس کے خطوطِ تحریری اور نقوشِ مکتوبی کو پہچانتے ہوں گے۔ (خطبہ ۱۴۵)

ایک کلام کے ذیل میں ارشاد فرماتے ہیں:

وَعَلَيْكُمْ بِكِتَابِ اللهِ، فَإِنَّهُ الْحَبْلُ الْمَتِينُ، وَالنُّورُ الْمُبِينُ، وَالشِّفَاءُ النَّافِعُ، وَالرِّيُّ النَّاقِعُ، وَالْعِصْمَةُ لِلْمُتَمَسِّكِ، وَالنَّجَاةُ لِلْمُتَعَلِّقِ، لَا يَعْوَجُّ فَيُقَامَ، وَلَا يَزِيغُ فَيُسْتَعْتَبَ، وَلَا تُخْلِقُهُ كَثْرَةُ الرَّدِّ، وَوُلُوجُ السَّمْعِ، مَنْ قَالَ بِهِ صَدَقَ، وَمَنْ عَمِلَ بِهِ سَبَقَ.

دیکھو کتاب خدا پر عمل کرتے رہو اس لئے کہ یہ ریسمانِ محکم، ضیائے روشن، فائدہ پہنچانے والی دوا اور سیرابی کا سامان اور دامن تھام لینے والے کے لئے ذریعہ حفاظت اور وابستہ ہو جانے والے کے لئے نجات کا وسیلہ ہے وہ کبھی کج ہونے والا نہیں کہ اس کو سیدھا کرنے کی ضرورت ہو اور نہ وہ صحیح راستہ سے مڑنے والا ہے کہ اسے پلٹانا پڑے بار بار پڑھنا اور گوش زد ہوتے رہنا اس کو کہنہ نہیں کرتا جو اس کے موافق بات کہے وہ سچا ہی ہوگا اور جو اس پر عمل کرے وہ بازی مار لے گا۔ (خطبہ ۱۵۴)

ایک خطبہ میں ہے:

وَاسْتَتِمُّوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ بِالصَّبْرِ عَلَى طَاعَةِ اللهِ وَالْمُحَافَظَةِ عَلَى مَا اسْتَحْفَظَكُمْ مِنْ كِتَابِهِ.

اللہ کے فضل و کرم کو اپنے اوپر مکمل کراؤ اطاعت الٰہی کے راستے پر قائم رہنے کے ساتھ اور جس کتاب کی حفاظت کے تم ذمہ دار بنائے گئے ہو اسے پورے طور پر محفوظ رکھنے کے ساتھ۔ (خطبہ ۱۷۱)

ایک مقام پر:

وَاعْلَمُوا أَنَّ هَذَا الْقُرْآنَ هُوَ النَّاصِحُ الَّذِي لَا يَغُشُّ، وَالْهَادِي الَّذِي لَا يُضِلُّ، وَالْمُحَدِّثُ الَّذِي لَا يَكْذِبُ، وَمَا جَالَسَ هَذَا الْقُرْآنَ أَحَدٌ إِلاَّ قَامَ عَنْهُ بِزِيَادَةٍ أَوْ نُقْصَانٍ: زِيَادَةٍ فِي هُدًى، أَوْ نُقْصَانٍ مِنْ عَمًى وَاعْلَمُوا أَنَّهُ لَيْسَ عَلَى

اَحَدٍ بَعْدَ الْقُرْآنِ مِنْ فَاقَةٍ، وَلَا لِاَحَدٍ قَبْلَ الْقُرْآنِ مِنْ غِنًى فَاسْتَشْفُوهُ مِنْ اَدْوَائِكُمْ، فَاِنَّ فِيهِ شِفَاءً مِنْ اَكْبَرِ الدَّاءِ، وَهُوَ الْكُفْرُ وَالنِّفَاقُ، وَالْغَيُّ وَالضَّلَالُ، فَاسْاَلُوا اللهَ بِهِ، وَتَوَجَّهُوا اِلَيْهِ بِحُبِّهِ، وَلَا تَسْاَلُوا بِهِ خَلْقَهُ، اِنَّهُ مَا تَوَجَّهَ الْعِبَادُ اِلَى اللهِ بِمِثْلِهِ، وَاعْلَمُوا اَنَّهُ شَافِعٌ مُشَفَّعٌ، وَقَائِلٌ مُصَدَّقٌ، وَاَنَّهُ مَنْ شَفَعَ لَهُ الْقُرْآنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفع فِيهِ، وَمَنْ مَحَلَ بِهِ الْقُرْآنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صُدِّقَ عَلَيْهِ، فَاِنَّهُ يُنَادِي مُنَادٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: اَلَا اِنَّ كُلَّ حَارِثٍ مُبْتَلىً فِي حَرْثِهِ وَعَاقِبَةِ عَمَلِهِ، غَيْرَ حَرَثَةِ الْقُرآنِ; فَكُونُوا مِنْ حَرَثَتِهِ وَاَتْبَاعِهِ، وَاسْتَدِلُّوهُ عَلى رَبِّكُمْ، وَاسْتَنْصِحُوهُ عَلى اَنْفُسِكُمْ، وَاتَّهِمُوا عَلَيْهِ آرَاءَكُمْ، وَاسْتَغِشُّوا فِيهِ اَهْوَاءَكُمْ.

یقین جانو کہ یہ قرآن وہ خیر خواہ ہدایت کرنے والا ہے جس سے دھوکے کا خطرہ نہیں اور وہ رہنما ہے جس سے گمراہی کا اندیشہ نہیں اور وہ باتیں کرنے والا ہے جس کے یہاں جھوٹ کا گزر نہیں کوئی اس قرآن کا ہمدم نہیں بنا مگر اس میں زیادتی پیدا ہوئی یا کمی زیادتی ہدایت میں یا کمی جہالت کے اندھے پن میں اور یقین جانو کہ قرآن کے ساتھ کسی کو احتیاج باقی نہیں رہتی اور بغیر قرآن کے استغنا نہیں ہوتا تو اسے تم اپنے دردوں کی دوا بناؤ اور اپنی مصیبت کے وقت اس سے مدد لو اس لئے کہ اس میں سب سے بڑے مرض کی دوا ہو اور وہ کفر و نفاق، کور باطنی و گمراہی ہے تو اس قرآن کے ذریعہ سے اللہ سے سوال کرو اور اس کی محبت کے ساتھ اس کی طرف رخ کرو اور اس کے ذریعہ اس کی مخلوق سے سوال نہ کرو اور اس کی ایسی کوئی دوسری چیز نہیں جس کے ساتھ اللہ کی طرف رخ کیا جائے اور یقین جانو کہ وہ شفاعت کرنے والا ہے اور اس کی شفاعت مقبول ہے اور وہ کہنے والا ہے اور اس کی بات باور کی جانے والی ہے اور جس کی سفارش روز قیامت قرآن کر دے اس کے سہارے اس کی سفارش منظور ہوگی اور جس کا شکایت روز قیامت قرآن کر دے تو اس کے خلاف اس کا شکایت سنی جائے گی تو قیامت کے دن آواز دی جائے گی کہ ہر کاشتکار آج اپنی کاشت کے حساب میں مبتلا ہوگا۔ سوا قرآن کی کاشت کرنے والوں کے تو کیوں نہ تم لوگ اس کی کاشت کرنے والے ہو اور اسی کی پیروی کرنے والے بنو اور اسے اپنے پروردگار کی طرف رہنما بناؤ اور اپنے نفوس کے خلاف اس کی نصیحتوں کو قبول کرو اور اس (کے مطالب) میں اپنے ذاتی خیالات پر بے اعتمادی کرو اپنی نفسانی خواہشوں کو اس میں غلط سمجھو۔ (خطبہ ۱۷۴)

سابق کے ایک خطبہ میں آئندہ زمانہ کے متعلق دنیا والوں کی جو تصویر کشی کی گئی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ دیندار افراد اپنے طرز عمل کی خود جانچ کرتے رہیں کہ وہ تو اس راہ پر نہیں جا رہے ہیں جس کی خبر دی گئی تھی اور جس سے ڈرایا گیا تھا۔

اس کے آخر میں یہ جملہ کہ کتاب و اہل کتاب اس وقت لوگوں کے درمیان موجود ہوں گے مگر نہیں اس لئے کہ ہدایت اور گمراہی ایک نقطہ پر اکٹھا نہیں ہوتی، اس سے اسی قرآن کو جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے، حقانیت پر روشنی پڑتی ہے اور پھر آخر میں یہ فقرہ کہ لاَ يَعْرِفُوْنَ اِلاَّ خطّهٗ و زبرہ، وہ بس اس کے خطوط تحریری اور نقوش مکتوبی کو پہچانتے ہوں گے، اس امر کی صریحی دلیل ہے کہ تحریف سے معنوی تراش خراش مراد ہے۔ الفاظ قرآن بالکل محفوظ ہوں گے۔

یہ ہیں حقیقی حافظ قرآن اور سب سے پہلے جامع قرآن حضرت علیؑ بن ابیطالب کے ارشادات جو بین الدفتین موجود و متداول قرآن کی سالمیت پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔

دیگر آئمہ اہلبیتؑ کے ارشادات

امیر المومنینؑ کے بعد دوسرے ائمہ معصومین علیہم السلام بھی برابر اس کی تبلیغ فرماتے رہے جس میں سے چند عناوین کے تحت میں تھوڑے سے ارشادات ذیل میں درج ہیں:

قرآن وحدیث کی صحت کا معیار

یہ احادیث جن میں احادیث کی صحت وعدم صحت کا معیار قرآن مجید کو بتایا گیا ہے۔خود جوامع حدیث میں اس کثرت سے ہیں کہ وہ تنہا اس قرآن کے حجت کے لئے دلیل قطعی ہو گئے ہیں ان میں سے پانچ حدیثیں جو اصول کافی میں موجود ہیں حوالہ قرطاس کی جاتی ہیں:

(۱)عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان علی کل حق حقیقۃً و علی کل صواب نورا فما وافق کتاب اللہ فخذوہ و ما خالف کتاب اللہ فدعوہ.

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نے ارشاد کیا ہر حق کے لئے حقیقت ہے یعنی حق نما علامتیں اور ہر واقعیت کے لئے روشنی ہے تو جو چیز کتاب خدا کے موافق ہو اسے لے لو۔اور جو چیز کتاب خدا کے خلاف ہو اسے ترک کر دو۔

اس میں اصل حدیث جو بیان ہوئی ہے وہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے لیکن امامؑ جس وقت اسے بیان فرما رہے ہیں اسوقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں یہی مرتب شدہ قرآن ہے جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے تو امامؑ کے اس ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش کرنے سے ظاہر ہے کہ اس کا انطباق اس قرآن موجود متداول پر ہے۔

(۲) سائت ابا عبداللہ علیہ السلام عن اختلاف الحدیث یروی بہ من تثق بہ و من لا تثق بہ قال اذا ورد علیکم حدیث فوجدتم لہ شاھدا من کتاب اللہ عز و جل او من قول رسول اللہ و الا فالذی جآء کم اولی بہ.

امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ ہمارے سامنے مختلف احادیث آتی ہیں جن میں سے بعض کے راوی موثق اور بعض کے غیر موثق ہیں اور پھر ان کے مفاد میں اختلاف ہے (ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے) حضرت نے فرمایا جب تمہارے سامنے کوئی حدیث پیش ہو اور اس کا کوئی شاہد کتاب خدا یا کسی مستند ارشاد رسولؐ میں موجود تو اس پر عمل کرو ورنہ جو شخص اس روایت کو نقل کر رہا ہے وہی اس کا زیادہ حقدار ہے یعنی اسے اس کی طرف واپس کر دو۔

(۳) عن ایوب بن الحر قال سمعت اباعبداللہ علیہ السلام یقول کل شیءٍ مردود الی الکتاب و السنۃ و کل حدیث لا یوافق کتاب اللہ فھو زخرف.

ایوب بن الحر کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ (امام جعفر صادق علیہ السلام) سے سنا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہر شے میں کتاب وسنت کی طرف رجوع لازم ہے اور جو حدیث کتاب خدا کے موافق نہ ہو وہ بناوٹی ہے

(۴)عن ایوب بن راشد عن اباعبداللہ علیہ السلام قال مالم یوافق من الحدیث القراٰن فھو زخرف.

ایوب بن راشد کہتے ہیں کہ ابوعبداللہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ہر شے میں کتاب وسنت کی طرف رجوع لازم ہے اور جو

حدیث کتاب خدا کے موافق نہ ہو وہ بناوٹی ہے۔

(۵)عن هشام بن الحكم و غيره عن ابي عبدالله عليه السلام قال خطب النبي صلى الله عليه وآله فقال ايها الناس! ما جاء كم يوافق كتاب الله فانا قلته و ما جاء كم يخالف كتاب الله فلم اقله.

ہشام بن الحکم وغیرہ سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منیٰ میں خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں کہا کہ جو حدیث تمہارے سامنے ایسی پیش ہو کہ وہ کتاب خدا کے موافق ہے تو وہ میرا قول ہے اور جو ایسی حدیث ہو کہ کتاب خدا کے مخالف ہو وہ میرا قول نہیں ہے

کافی کے علاوہ دوسرے کتب احادیث میں ایسی ہی حدیثیں اس سے زیادہ موجود ہیں اور سب کا متفقہ مطلب یہ ہے کہ قرآن احادیث کی جانچ کا معیار ہے۔

قرآن کی مخالفت کفر

عن ابي عمر عن بعض اصحابه قال سمعت اباعبدالله عليه السلام يقول من خالف كتاب الله و سنّة محمد صلى الله عليه وآله فقد كفر.

ابی عمر وغیرہ سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص کتاب الٰہی اور سنت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرے وہ کافر ہے۔

قرآن نشان ہدایت

(۱) عن طلحه بن زيد عن ابي عبدالله عليه السلام قال انّ هذا القرآن فيه منار الهدى و مصابيح الدجى فليجل جال بصره و يفتح للضياء نظره فان التفكر حيوة قلب البصير كما يمشي المستنير في الظلمات بالنور.

طلحہ بن زید سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا بلا شبہ یہ قرآن (یعنی یہی جو تمہارے ہاتھوں میں ہے) اس میں نشان ہیں ہدایت کے اور چراغ ہیں تاریکی شب کے جسے منظور ہو وہ اس سے اپنی بصیرت کو جلا دے اور اس کی روشنی کے لئے اپنی آنکھ کھولے کیوں کہ غور و فکر صاحب بصیرت کے دل کی زندگی ہے جس طرح روشنی سے انسان تاریکی میں رات قطع کرتا ہے۔

(۲) عن ابي جميله قال قال اباعبدالله عليه السلام كان في وصية امير المومنين عليه السلام اصحابه اعلموا انّ القرآن هدى النهار و نور الليل المظلم على ما كان من جهد و فاقه.

ابی جمیلہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ امیر المومنینؑ اپنے اصحاب کو تاکید کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ قرآن دن کا رہنما اور شب تاریک کا نور ہے جو سخت ترین ضرورت کے موقع پر کارآمد ہے۔

قرآن جنت کا رہنما اور جہنم سے سد راہ

عن ابی بصیر قال سمعت اباعبداللہ علیہ السلام یقول، ان القرآن زاجر و آمر یأمر بالجنۃ و یزجر عن النار.

ابی بصیر سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قرآن روکنے والا اور حکم دینے والا ہے۔ حکم دیتا ہے جنت میں جانے کا روکتا ہے جہنم سے۔

اس کے علاوہ: تلاوت قرآن کے فضائل، حامل قرآن کا درجہ، حفظ قرآن کا ثواب، تعلیم قرآن کی اہمیت، تدبر فی القرآن کا حکم۔ یہ وہ ابواب ہیں جن میں احادیث حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں اور اصول کافی کا آخری حصہ ان احادیث سے مملو ہے۔

پھر وہ مقامات ہیں جہاں ائمہ معصومین علیہم السلام نے احکام شرعیہ کے لئے آیات قرآن سے استدلال کر کے علمائے دین کو ظواہر قرآن سے استفادہ احکام کا سبق دیا ہے۔

اس کے علاوہ امام جعفر صادق علیہ السلام اور دیگر ائمہ معصومینؑ نے امام ابوحنیفہ اور دوسرے فقہائے جمہور کو جب ان کے اجتہادی ماخذوں کی کمزوری پر متنبہ کیا تو یہ فرمایا کہ تم حکم و متشابہ، ناسخ و منسوخ، تنزیل و تاویل کا علم نہیں رکھتے لیکن کبھی یہ نہیں کہا گیا یہ قرآن محرّف ہے اس لئے اس سے استفادہ احکام درست نہیں ہے۔

فقہ جعفری کے احکام متعلقہ قرآن

یہ فقہ جس پر شیعوں کا عمل ہے ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہے جو جمہور امت میں فقہ جعفری کے نام سے موسوم ہوگئی ہے۔ اس کے تمام احکام بھی اسی ''بین الدفتین'' کتاب سے متعلق ہیں جو ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں۔

دیکھئے فقہ کی کتابیں: خط مصحف کو بغیر طہارت چھونا حرام اور حواشی و بین السطور کا چھونا بھی مکروہ سجدہ والے سوروں کا جنب وغیرہ کے لئے پڑھنا حرام ہے اور دوسرے سوروں کی سات آیتوں سے زیادہ کا پڑھنا مکروہ۔ کافر کے ہاتھ قرآن کا ہدیہ کرنا حرام اور کافر کی ملکیت قرآن کے لئے ناجائز موجودہ قرآن کے علاوہ کسی بھی جزء کا بحیثیت قرآن نماز میں پڑھنا حرام نجاست کا قرآن تک پہنچانا گناہ عظیم اور احکام شرعیہ کہ ادلہ اربعہ میں قرآن کا پہلا درجہ ان تمام مقامات پر اور اس کے علاوہ جہاں بھی کسی شیعی عالم کے کلام میں قرآن کا نام آتا ہے اس سب سے مراد یہی قرآن ہوتا ہے جو سب کے سامنے موجود ہے۔

تفسیر اور دیگر علوم قرآن کے بارے میں

آئمہ اہلبیتؑ اور پھر ہر صدی کے علمائے شیعہ کی خدمات

سب سے پہلے تو امیر المومنینؑ کا جو جمع کردہ قرآن تھا اس میں صرف متن قرآن نہ تھا بلکہ الفاظ قرآن کے وہ تشریحات بھی تھے جو حضرت پیغمبرؐ خدا پر منزل من اللہ تھے اور جن کو ائمہ اہلبیتؑ کے احادیث میں تنزیل قرآن یعنی قرآن کے معنی تنزیل کیا گیا ہے چناں چہ احتجاج طبرسیؒ میں اس کے لئے خود حضرت امیر علیہ السلام کا ارشاد درج ہے کہ:

ولقد جئتهم بالكتاب كملا مشتملا على التنزيل والتأويل

میں نے ان کے سامنے پورا قرآن پیش کیا جو تنزیل اور تاویل دونوں پر حاوی تھا۔

اسی لئے اس کے متعلق محمد بن سیرین کا قول تھا:

لو اصيب ذالك الكتاب كان فيه العلم۔ (تاریخ الخلفاء۔ص ۱۸۴)

اگر وہ کتاب لوگوں کے ہاتھ آجاتی تو ایک بڑا عملی ذخیرہ اس میں ہوتا۔

اس کے علاوہ آپ نے اقسام علوم قرآن اور ان کے امثلہ کو بسط و تشریح کے ساتھ یکجا محفوظ کیا۔ چناں چہ شیخ جلیل ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم بن جعفر نعمانی کی کتاب جو تفسیر نعمانی کے نام سے مشہور ہے اسی ایک حدیث پر مشتمل ہے جو امیر المومنینؑ سے منقول ہے اور اس میں حضرت نے آیات قرآن کی ساٹھ قسمیں قرار دی ہیں اور ہر قسم کی ایک مثال ذکر فرمائی اور اس کی تفسیر ارشاد فرمائی۔

سید مرتضیٰ علم الہدی نے اس کتاب کا خلاصہ تحریر فرمایا جو شیخ حر عاملی تک پہنچا تھا اور انہوں نے وسائل الشیعہ میں احکام فقہیہ کے متعلق مضامین کو اس سے اخذ کیا ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے بحار کی اس جلد میں جو قرآن مجید سے متعلق ہے ایک باب یہ قائم کیا ہے کہ:

باب ما ورد عن امير المومنين عليه السلام في اصناف ايات القرآن و انواعها و تفسير بعض اياتها برواية نعماني هي رسالة مفردة مدونته كثيرة الفوائد نذكرها من فاتحتها الى خاتمتها.

اس باب میں امرالمومنینؑ کی وہ حدیث ہے جو آیات قرآن کے اقسام اور ان میں سے بعض آیات کی تفسیر میں نعمانی کی روایت سے وارد ہوئی ہے اور یہ ایک مستقل تصنیف شدہ رسالہ ہے جو بہت فوائد پر مشتمل ہے ہم اسے شروع سے آخر تک پورا نقل کرتے ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم کی ابتداء میں جو آیات قرآن کے اقسام درج ہیں انہیں بھی جہاں تک دیکھا جائے اس حدیث امیر المومنینؑ کا خلاصہ ہے۔

بہرحال سب سے پہلے علم تفسیر کی تدوین امیر المومنینؑ کے ہاتھوں ہوئی ہے۔

پھر امام محمد باقرؑ نے تفسیر تحریر فرمائی جس کا پتہ ابن ندیم نے فہرست میں دیا ہے اور علم تفسیر کے مصنفات کے ذکر میں لکھا ہے۔

كتاب الباقر محمد بن علي بن الحسين رواه عنه ابو الجارود زياد بن المنذر رئيس الجارودية

محمد باقر ابن علی بن الحسین علیہم السلام کی کتاب جسے ان سے ابوالجارود زیاد بن المنذر رئیس فرقہ زیدیہ جارودیہ نے نقل کیا

جیسا کہ ابن ندیم نے لکھا ہے بے شک ابوالجارود ایک زیدی فرقہ کے پیشوا ہو گئے تھے مگر یہ ان کے آخر عمر کی بات ہے جب انہوں نے اس تفسیر کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے کی ہے تو اس وقت وہ جماعت امامیہ میں داخل تھے چناں چہ ابوبصیر یحییٰ بن قاسم اسدی اور بعض دیگر معتبر رواۃ شیعہ نے اس تفسیر کی ان سے روایت کی اور کتب شیعہ میں تفسیر قرآن کے متعلق جو بہت روایات مذکور ہیں ان کے متعلق یہ خیال کرنا درست ہے کہ وہ اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

اس کے بعد امام حسن عسکری علیہ السلام گیارہویں امام نے تفسیر قرآن میں جو افادیت فرمائی ان سے حسن بن خالد برقی نے ایک سو بیس حصوں پر مشتمل تفسیر مرتب کی۔

یہ اس کتاب کے علاوہ تھی جو تفسیر امام حسن عسکریؑ کے نام سے مشہور و مطبوع ہے لیکن اس کی نسبت حضرتؑ کی طرف درست نہیں ہے۔

یہ تمام علمی کاوشیں اسی قرآن سے متعلق تھیں جو جمہور اہل اسلام کے ہاتھوں میں موجود ہے۔

اور جب خود ائمہ معصومین علیہم السلام کو اس بارے میں اتنا اہتمام تھا تو اصحاب ائمہؑ جنہیں صدر اول میں علمائے شیعہ کی حیثیت حاصل ہے ان کے بھی توجہات اس محور پر گردش کرتے رہے چنانچہ اصحاب و تلامذہ حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام میں سے جن کا نام بحیثیت مفسر بہت نمایاں ہے وہ جناب عبداللہ بن عباس ہیں اگرچہ ان کے نام سے جو تفسیر ''تنویر المقیاس'' مطبوع و متداول ہے وہ مثل تفسیر امام حسن عسکریؑ کے بے وزن و بے اعتبار ہے۔

ان کے علاوہ امیر المومنینؑ کے تلامذہ با اختصاص میں میثم بن یحییٰ تمار ہیں جنہوں نے جناب ابن عباس سے کہا:

اسئلني ماشئت من تفسير القران فاني قرات تنزيله على امير المومنين علیہ السلام وعلّمني تاويله. (رجال کشی)

مجھ سے تفسیر قرآن کے متعلق جو پوچھنا ہو دریافت کر لیجئے اس لئے کہ میں نے قرآن کو تمام و کمال جناب امیرؑ سے حفظ کیا ہے اور انہوں نے مجھ کو اس کی تاویل کی تعلیم دی ہے۔

اور جناب ابن عباس نے ان مضامین کو جو انہوں نے بتلائے قلمبند کیا۔

اس کے بعد دوسرا طبقہ جناب عبداللہ بن عباس کے شاگردوں کا ہے جو امام زین العابدینؑ کے اصحاب میں سے ہیں جیسے سعید بن جبیر، ابوصالح، میزان البصری اور طاؤس بن کیسان ابوعبداللہ یمانی متوفی ۱۰۶ھ۔

تیسرا طبقہ امام محمد باقر علیہ السلام کے اصحاب کا ہے اس زمانہ میں اہلبیتؑ کے فیوض علمیہ ذرا آشکار طور پر لوگوں کو پہنچ رہے تھے لہٰذا فن تفسیر کو بھی اس زمانہ میں کافی ترقی ہوئی اور حضرت کے متعدد اصحاب بحیثیت مفسر کتب سیر کے صفحات پر نمایاں ہیں مثلاً جابر بن یزید جعفی، عطیہ عوفی، محمد بن حسن بن ابی سارہ رؤسی، سدی کبیر اسمعیل بن عبدالرحمن ابومحمد قرشی کوفی۔ ابان بن تغلب محمد بن سائب کلبی اور ابوحمزہ ثمالی ان میں سے متعداد افراد کے تفاسیر کا تذکرہ ابن ندیم نے اپنی مشہور و معروف فہرست میں کیا ہے۔

اس کے بعد امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں مخلّ بن جمیل اسدی کوفی اور وہیب بن حفص ابوعلی ہیں۔ انہوں نے امام موسیٰ کاظمؑ سے بھی احادیث اخذ کی اسی دور کے معلّی بن محمد بصری جن کے تصانیف میں کتاب الفہرست بھی ہے۔

ہشام بن سالم، حمزہ بن حبیب، علی بن ابی حمزہ بطائی، حصین بن مخارق ابو جنادہ سلولی، عبداللہ بن عبدالرحمن، اُسمعی البصری اور مشہور ماہر کیمیا و ریاضی و فلسفہ جابر بن حیان طرسوسی۔

اس کے بعد امام موسیٰ کاظمؑ کے وہ اصحاب ہیں جنہوں نے حضرت صادقؑ کے زمانہ کو نہیں پایا۔ عیسیٰ بن داؤد النجار کسائی علی بن حمزہ، یونس بن عبدالرحمن، محمد بن خالد برقی، حسن بن محبوب ابوعلی مراد۔

پھر وہ طبقہ ہے جو امام رضاؑ اور آپ کے بعد کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں جیسے حسن بن علی فضال، دارم بن قبیصہ تمیمی دارمی، مشہور نحوی فراء ابوزکریا، یحییٰ بن زیاد، اقطع کوفی، حسن بن سعید بن حماد کوفی اہوازی اور ان کے چھوٹے بھائی حسین بن سعید، علی بن اسباط کوفی، علی بن معزیار اہوازی، عبداللہ بن صلت ابوطالب قمی، ابوالعباس مبرد اور احمد بن محمد بن عیسیٰ قمی۔

اس کے بعد کا طبقہ: وہ ہے جس نے امام محمد تقیؑ اور آپ کے بعد کے ائمہؑ سے روایت کی ہے ان میں احمد بن محمد بن خالد برقی ہیں۔ محمد بن ارومہ ابوجعفر قمی، علی ابن حسن بن علی بن فضال، حسن بن خالد برقی جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

یہاں سے ائمہ علیہم السلام کے ظہور کا دور ختم اور اصحاب ائمہ علیہم السلام کا سلسلہ قطع ہو جاتا ہے۔ اب وہ علماء ہیں جو ائمہ معصومینؑ کی صحبت سے بہرہ اندوز نہیں ہوئے ان میں بھی ہر دور میں برابر تفسیر قرآن کے مصنفین ہوتے رہے۔

تیسری صدی ہجری کے علماء زمانہ غیبت کے پہلے طبقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں تفسیر قرآن کے مصنفین میں محمد بن ابوالقاسم ابو عبداللہ ماجیلویہ، سعد بن عبداللہ بن ابی خلف اشعری قمی، احمد بن صبیح اسدی، ابراہیم بن محمد بن سعید ثقفی سلمۃ بن الخطاب براد ستانی عیاشی محمد بن مسعود بن محمد بن عیاش سلمٰی سرقندی علی بن ابراہیم قمی فرات بن ابراہیم کوفی، محمد بن علی شلغانی وغیرہ ہیں۔

ان کے بعد وہ طبقہ ہے جو چوتھی صدی ہجری تک باقی تھا ان میں علی بن بابویہ قمی، عبدالعزیز بن یحییٰ الجلودی، ابوبکر صولی، محمد بن حسن ابن الولید القمی، احمد بن محمد بن حسین بن حسن بن دول قمی اور علی بن احمد ابوالقاسم کوفی وغیرہ تھے۔

چوتھی صدی ہجری کے مخصوص: علماء میں جو تفسیر کے مصنف ہیں شیخ صدوق محمد ابن علی بن بابویہ قمی، محمد بن علی بن عبدک ابوجعفر جرجانی، ابومنصور حرام نیشاپوری، موسیٰ بن اسمعیل، محمد بن ابراہیم بن جعفر کاتب نعمانی، عبدالرحمن بن حسن قاشانی، حسن بن موسیٰ نوبختی وغیرہ ہیں۔

پانچویں صدی میں شیخ مفید محمد بن محمد بن نعمان بغدادی، حسین ابن علی بن الحسین ابوالقاسم وزیر مغربی اور پھر شیخ مفید کے تلامذہ سید رضی موسوی جامع نہج البلاغہ اور ان کے بڑے بھائی علم الہدیٰ سید مرتضیٰؒ۔ محمد بن احمد وزیر عمیدی، شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی، علامہ کراچکی، اسمعیل بن علی بن حسین بن سمان شیخ محمد بن احمد بن علی قتال نیشاپوری محمد بن ابی الخیر ہمدانی وغیرہ ہیں۔

اب چھٹی صدی: شروع ہو جاتی ہے اس میں شیخ ابوالفتوح رازی سید عزالدین علی بن ضیاالدین فضل اللہ الحسنی الروندی اور امین الاسلام شیخ ابوعلی طبرسی مصنف تفسیر مجمع البیان، قطب الدین روندی ابن ادریس حلی۔ محمد بن حسین قتال فارسی نیشاپوری اور ابن شہر آشوب مصنف متشابہ القرآن وغیرہ ہیں۔

ساتویں صدی: میں سید احمد بن طاؤس اور علامہ حلیؒ

آٹھویں صدی: میں ملا عبدالرزاق کاشی، شیخ قطب الدین رازی، شیخ مقداد بن عبداللہ سیوری حلی، ابن متوج بحرانی۔

نویں صدی: میں سید بہاء الدین علی بن سید غیاث الدین عبدالکریم حسینی، کمال الدین حسن بن محمد استرآبادی۔

دسویں صدی: میں امیر غیاث الدین منصور حسینی شیرازی، شاہ طاہر دکنی، شہید ثانی شیخ زین الدین عاملی، ابوالغنائم عبدالرزاق کاشانی، علی بن حسن زواری، محمد بن احمد خواجگی شیرزی، ملا فتح اللہ کاشانی، ملا احمد بن محمد مقدس اردبیلی، ملا خلیل قزوینی شارح اصول کافی اور فیضی جو ہندوستان میں محتاج تعارف نہیں، سید حسین خلخالی اور قاضی نوراللہ شوستری جو شیعان ہند میں شہید ثالث کے لقب سے مشہور ہیں۔ مرزا محمد استرآبادی، سید محمد بن زین العابدین حسینی استرآبادی ان میں سے بعض گیارہویں صدی تک رہے ہیں۔

خاص گیارہویں صدی میں احمد بن زین علوی معزالدین اردستانی، نعمت خان عالی، رضی الدین محمد قزوینی، شیخ بہاء الدین عاملی، میر محمد ہادی حسینی مرعشی سوستری، تاج الدین حسن بن محمد اصفہانی، ملا نظام ساوجی، ملا بدیع الزمان ہرمذی اصفہانی، ملا صدرا شیرازی، ملا محسن کاشانی صاحب تفسیر صافی، شیخ فخرالدین طریحی، شیخ حسین بن شہاب الدین عاملی، سید شرف الدین علی حسینی استرآبادی، محمد بن محمد محسن الفیض الکاشانی، نورالدین محمد کاشانی، ملا محمد طاہر قمی، سید ہاشم بحرینی، شیخ جواد کاظمی، حسام الدین طریحی، شیخ حسین بن مطر جزائری، عبدعلی بن جمعہ عروسی حویزی، عبدعلی بن رحمہ حویزی، شیخ عبدالقاہر بن حاج عبد بن رجب عبادی حویزی، سید علی خان حویزی، شیخ فرج اللہ حویزی، سید محمد رضا حسینی، احمد بن حسن حرعاملی، محمد حسین بن محمد قمی، محمد مومن سبزواری، امیر محمد طالقانی، شیخ علی بن شیخ حسین کربلائی، مرزا محمد رضا قمی۔

بارہویں صدی: میں سید نعمت اللہ جزائری، محمد صالح خاتون آبادی، محمد اسمٰعیل خاتون آبادی امیر ابراہیم بن محمد معصوم قزوینی، شیخ سلیمان بن عبداللہ بحرینی، محمد بن عبدالفتاح سراب تنکابنی، شیخ عبداللہ بحرینی، ملا عبداللہ مجلسی، میرزا عبداللہ آفندی مصنف ریاض العلماء سید نورالدین ابن سید نعمت اللہ جزائری، سید عبداللہ بن سید نورالدین شوستری، سید بہاء الدین محمد بن محمد باقر حسینی مختاری نائینی فاضل ہندی بہاء الدین محمد تاج الدین اصفہانی، سید محمد حیدر موسوی عاملی، ابوالحسن شریف فنونی عاملی شیخ احمد جزائری، محمد اسمٰعیل مازندرانی، شیخ محمد رضا ہمدانی، سلطان محمد بن حیدر بن محمد جنابذی شیخ علی حزیں سلیمان جرجی۔

اس کے بعد تیرہویں صدی ہے جس کا آغاز سے جناب غفرآن مآب طاب ثراہ کے قیام لکھنؤ نے لکھنؤ کو شیعہ علمی مراکز کی حیثیت دی آپ کے تلامذہ میں سے مولوی یادعلی صاحب نصیرآبادی نے فارسی میں تفسیر لکھی جو دو جلدوں میں ہے اور اسی دور میں میرزا محمد اخباری نے تفسیر لکھی اور جناب غفرآن مآب کے فرزند سید سید علی نے اردو زبان کی سب سے پہلی تفسیر تحریر کی۔

ان کے علاوہ ہندوستان اور ایران اور عراق میں جن لوگوں نے مکمل تفسیریں لکھیں یا کسی ایک شعبہ تفسیر میں کام کیا، وہ حسب ذیل ہیں

سید عبداللہ شیر کاظمی، حاج میرزا لطف علی بن میرزا احمد تبریزی اخوند ملا مہر علی تبریزی خوئی، حاج ملا عبدالوہاب قزوینی جناب غفرآن مآب کے چھوٹے فرزند سید العلماء مولانا سید حسین اور شاگرد مفتی سید محمد قلی کنتوری اور سید العلماء کے فرزند ممتاز العلماء مولانا سید محمد تقی صاحب تفسیر ینابیع الانوار، آقا محمد حسین باشتہ طلائی، سید رجب علی خاں جگرانوی، ملا علی قاریوز آبادی حاج محمد نجف کرمانی، حاج محمد صالح برغنانی، محمد بن سلیمان تنکابنی، ملا حسن علی تولسیر کانی، ملا محمد تقی ہروی حائری، سید مہدی قزوینی، حاج ملا رضا ہمدانی، ملا سلطان گون آبادی ہمارے جد امجد فردوس مکان الحاج سید محمد ابراہیم، شیخ محمود چشتی عراقی، تاج العلماء مولانا سید علی محمد، مولوی عمار علی پانی پتی، شیخ محمد حسین اصفہانی نجفی، حاج میرزا محمد علی قراجہ داغی محقق شہرستانی حاج میرزا محمد حسین حائری، شیخ حسن شہرودی تبریزی، مولانا ابوالقاسم قمی لاہوری صاحب تفسیر لوامع التنزیل اب ہماری چودھویں صدی

آ گئی ہے اس میں ہندوستان میں جنہوں نے ہم سے پہلے تفسیر کے سلسلہ میں کام کیا شمس العلماء مولانا سید علی حائری۔ مولانا سید محمد محسن زنگی پوری، مولانا سید احمد حسین امر دہوی، مولانا اعجاز حسین امروہوی، حافظ فرمان علی صاحب مترجم قرآن، مولانا محمد ہارون زنگی پوری، مولانا مقبول احمد صاحب دہلوی، مولانا سید راحت حسین صاحب گوپال پوری مولانا سید محمد رضی صاحب زنگی پوری۔

ایران میں ملا حسین سجاسی مقیم زنجان، اخوند ملا حسیب اللہ کاشانی، اخوند ملا محمد تقی کاشانی، شیخ محمد حسین شیرازی، سید محمد رضا حسینی کاشانی پشت مشہدی، آقا حسین نجم۔آبادی طہرانی، شیخ علی اصغر بیر جندی، شیخ محمد باقر بیر جندی اور شیخ محمد نہاوندی اور ہمارے دور کے علامہ سید محمد حسین طباطبائی۔

عراق میں شیخ مرتضیٰ نظام الدین حلّی کاظمینی، آقا فتح علی زنجانی، سید علی طباطبائی یزدی حائری، سید عبدالحسین حسینی آل کمولہ نجفی اور ہمارے دور کے مجاہد قلمی اکبر شیخ محمد جواد بلاغی طاب ثراہ صاحب تفسیر آلاء الرحمن آقا میرزا ہادی خراسانی مجتہد کربلائے معلّٰی، شیخ محمد اشکوری نجفی اور اب عصر حاضر کے مرجع خلائق استاد علام الحاج سید ابوالقاسم خوئی دام ظلہ۔

ظاہر ہے کہ یہ طبقات مفسرین شیعہ پر کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ یہ تو سر دست جو نام ہر صدی کے پیش نظر تھے ان کی ایک مجمل فہرست ہے جو ایک منصف مزاج یا غیر جانبدار صاحب عقل کو یہ احساس پیدا کرنے کیلئے قطعی کافی ہے کہ چودہ صدی کے قریب طویل دور زمانہ کے ہر جزء میں اتنے علماء افاضل اور اہل قلم کی دماغی طاقتیں، صلاحیتیں اور وقت پوری جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ ایک ایسی چیز پر صرف نہیں ہو سکتے جسے وہ دینی حیثیت سے کوئی اہمیت (معاذ اللہ) نہ دیتے ہوں۔ ایسا تصور یا بس کوئی انتہائی متعصب کر سکتا ہے یا دیوانہ۔

علماء شیعہ کی یہ مسلسل کاوشیں جو بین الدفتین موجود ہیں اسی کتاب سے متعلق ان کی نظر میں اس کی دینی اہمیت کا قطعی ثبوت ہیں۔

نفی تحریف کے متعلق علماء شیعہ کے تصریحات

گذشتہ دلائل وشواہد کے بعد ضرورت تو باقی نہیں رہتی پھر بھی ذیل میں مختلف ادوار زمانہ کے چند اکابر علماء کے تصریحات بھی اس بارے میں درج کر کے اس تبصرہ کو ختم کیا جاتا ہے۔

(۱) راس المحدثین شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی جن کی کتاب ''من لا یحضرہ الفقیہ'' شیعوں کے کتب اربعہ میں داخل ہے، اپنے ''اعتقادات'' میں تحریر فرماتے ہیں:

اعتقادنا ان القرآن الذی انزل اللہ تعالیٰ علی نبیہ محمد ﷺ ھو ما بین الدفتین ھو ما فی ایدی الناس لیس باکثر من ذالک. و من نسب الینا انا نقول انہ اکثر من ذالک فھو کاذب.

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن جس کو اللہ نے اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا تھا وہ یہی ہے جو دونوں دفتیوں کے درمیان ہے اور لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہے اور وہ اس سے زیادہ نہ تھا اور جو شخص ہماری طرف اس قول کی نسبت دے کہ وہ اس سے زیادہ تھا، وہ جھوٹا ہے۔

(۲) جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے مسائل طرابلسیہ میں تحریف قرآن کا انکار کیا ہے یہ کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے مگر ان کا یہ قول ان کے شاگرد جناب شیخ طوسی نے تبیان میں اور علامہ طبرسیؒ نے تفسیر مجمع البیان میں درج کیا ہے۔

(۳) شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسیؒ اپنی عظیم الشان تفسیر ''تبیان'' میں تحریر فرماتے ہیں:

اما الکلام فی زیادته و نقصانه فمالا یلیق به لان الزیادة فیه مجمع علی بطلانه و النقصان منه فالظاهر ایضًا من مذهب المسلمین خلافه و هو الالیق بالصحیح من مذهبنا کما نصره المرتضٰی و هو الظاهر من الروایات.

قرآن میں زیادتی وکمی کی گفتگو اس کی شان کے خلاف ہے اس لئے کہ زیادتی کے بطلان پر تو اجماع ہے اور کمی کے متعلق عموماً مسلمانوں کے مذہب کو ظاہر کیا ہے کہ اسکا تصور غلط ہے اور ہماری جماعت کا بھی صحیح طور پر مذہب یہی کہا جا سکتا ہے جس کو سید مرتضیٰ نے تقویت دی ہے اور وہ ائمہؑ کے روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

(۴) امین الاسلام شیخ ابوعلی طبرسیؒ "تفسیر" مجمع البیان میں لکھتے ہیں:

اما الزیادة فیه فمجمع علی بطلانه و أما النقصان فیه فقد روٰی جماعة من اصحابنا و قوم من حشویة العامة ان فی القرآن تغیرا و نقصانا و الصحیح من مذهب اصحابنا خلافه و هو الذی نصره المرتضٰی قدس الله روحه۔

قرآن میں زیادتی کا ہونا تو باجماع باطل ہے اور کمی کے متعلق کچھ شیعہ اور سنی ظاہر بین محدثین نے روایات نقل کی ہیں کہ اس قرآن میں کچھ تغیر وتبدیل اور نقصان ہوا ہے لیکن ہمارے علماء میں جو صحیح مذہب ہے وہ اس کے خلاف ہے اور یہی وہ ہے جسے جناب سید مرتضیٰ قدس اللہ روحہ، نے ثابت کیا ہے۔

(۵) فاضل تونی ملا عبداللہ بشرینی خراسانی شرح وافیہ مطبوعہ لکھنؤ ۵۲، ۵۳ میں لکھتے ہیں:

قد وقع الخلاف فی تغیره فقیل ان فی زیادة و نقصانا و به روایات کثیرة رواها الکلینی علی بن ابراهیم فی تفسیره والمشهور أنه محفوظ و مضبوط کما انزل لم یتبدّل و لم یتغیّر حفظه الحکیم الخبیر.

قرآن مجید میں تغیر وتبدیل کے متعلق اختلاف ہوا ہے بعض نے کہا ہے کہ اس میں کچھ کمی اور زیادتی ہوئی ہے اور اس کے متعلق بہت سے روایتیں بھی آئی ہیں جنہیں کلینی اور علی بن ابراہیم نے درج کیا ہے لیکن زیادہ تر علماء کا قول یہ ہے کہ وہ جتنا نازل ہوا تھا اتنا ہی محفوظ وسالم ہے اور اس میں تغیر وتبدیل نہیں ہوا ہے خداوند عالم نے اس کی حفاظت فرمائی ہے۔

(۶) محقق ثانی شیخ علی بن عبدالعالی کرکی مصنف "جامع المقاصد" آپ نے ایک مستقل رسالہ قرآن مجید میں کمی واقع نہ ہونے کے متعلق تحریر فرمایا۔

(۷) علامہ شیخ بہاء الدین عاملی فرماتے ہیں:

اختلفوا فی وقوع الزیادة و النقصان فیه و الصحیح أن القرآن العظیم محفوظ عن ذالك زیادة کان أو نقصانا و یدل علیه قوله تعالٰی: وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ.

کمی اور زیادتی کے بارے میں اختلاف ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ قرآن کریم اس سے زیادتی اور کمی دونوں اعتبار سے محفوظ ہے اور اس پر آیت قرآن دلالت کرتی ہے کہ "ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔

اس قول کو شیخ جواد بلاغی طاب ثراہ نے آلاء الرحمن میں درج فرمایا ہے۔

(۸) شیخ محمد حسن آشتیانیؒ بحر الفوائد فی شرح الفرآئد معروف بحاشیہ آشتیانی بر رسائل مطبوعہ ایران ۹۹ میں لکھتے ہیں:

المشهور بين المجتهدين الاصوليين بل اكثر المحدثين عدم وقوع التغير مطلقا بل ادعى غير واحد الى الاجماع على ذالك سيّما بالنسبة الى الزيادة.

کمی اور زیادتی کے بارے میں اختلاف ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ قرآن کریم اس سے زیادتی اور کمی دونوں اعتبار سے محفوظ ہے اور اس پر آیت قرآن دلالت کرتی ہے کہ ''ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔

اس قول کو شیخ جواد بلاغی طاب ثراہ نے آلاء الرحمن میں درج فرمایا ہے۔

(۸) شیخ محمد حسن آشتیانیؒ بحر الفوائد فی شرح الفرآئد معروف بحاشیہ آشتیانی بر رسائل مطبوعہ ایران ۹۹ میں لکھتے ہیں:

قول مشہور مجتہدین اصولیین بلکہ اکثر اخباری علماء کے درمیان بھی یہ ہے کہ قرآن میں تغیر وتبدیل بالکل نہیں ہوا ہے بلکہ متعدد حضرات نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے خصوصاً زیادتی نہ ہونے کے متعلق۔

(۹) جناب شیخ جعفر نجفی طاب ثراہ اپنی مشہور ومعروف کتاب ''کشف الغطاء'' میں تحریر فرماتے ہیں:

لا ريب انّه محفوظ من النقصان بحفظ الملك الدّيّان كما دلّ عليه صريح القران و اجماع العلماء فى كل زمان.

بلاشبہ وہ کمی سے محفوظ ہے خالق کریم کی حفاظت کے سبب سے جس پر قرآن صریحی طور سے دلالت کرتا ہے اور اسی پر ہر زمانہ میں علماء کا اجماع رہا ہے۔

(۱۰) سید محمد مہدی رضوی نے اعتقادیہ صدوقؒ کی شرح فارسی میں لکھی ہے جس کا سال تصنیف ۱۲۶۱ھ ہے اس کا قلمی نسخہ ہماری نظر سے گزرا ہے اس میں ۶۵ پر ہے:

''فصل بست و نہم در بیان آنکہ قرآن کلام حق تعالیٰ وحی فرستادہ اوست''

اس کے ذیل میں لکھا ہے:

خداوند نگاہ دارندہ است از زیادہ و نقصان و انعدام: آن از میان مردمان ---------- پھر ہے۔

''فصل سیم اعتقاد درباب مبلغ قرآن و منزل مجموع آن شیخ مہرو ر روح اللّٰہ روحہ می فرما یدکہ اعقاد ما آنست کہ قرآن کہ حق تعالیٰ آں را بر پیغمبر خود محمد رسول اللّٰہ ﷺ فرستادہ ہمانست کہ مکتوب و مرقوم شدہ و جمع درمجلہ گشتہ در دست مرد مانست و زیادہ برین نیست وہر کہ نسبت دہد بما طائفہ امامیہ اثناء عشریہ کہ میگوئم قرآن زیادہ بریں است دروغ گفتہ وغیرہ واقعی بما استناد کردہ و آن کہ مردیست از ثواب ختم مجموع آن و جائز نمودن خواندن زیادہ ازیک سورہ دریک رکعت فریضہ مصدق آنست کہ مابیان ان نمودیم کہ قرآن زیادہ ازین نیست کہ در دست خلائق است و ہمچنیں مردیست۔

درباب نہی از خواندن تمام قرآن دریک شب وآں کہ جائز نیست ختم تمام قرآن درمدت کمتر از سہ روز نیز مصدق آنست کہ مابیا نمودیم درباب آن کہ قرآن زیادہ بریں نیست۔''

(۱۱) ہمارے دور کے بہت بڑے محقق مجتہد مجاہد علامہ شیخ محمد جواد بلاغیؒ نے اپنی کتاب آل ءالرحمن فی تفسیر القرآن'' جلد ا مطبوعہ مطبع ''العرفان'' صیدا میں پہلے تو صفحہ نمبر ۱۸ پر جمع قرآن کے تذکرہ کے بعد لکھا ہے۔

فلم یتفق لامر تاریخی من التواتر و بداهة البقاء مثل ما اتفق للقرآن الکریم کما وعدالله جلّت آلاوه بقوله سورة الحجر: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ. و قوله فی سورة القیامة: اِنَّا اِلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ. و لمن سمعت فی الروایات الشاذة شیئا فی تحریف القرآن و ضیاع بعضه فلا تقم لتلك الروایات وزنا.

کسی تاریخی بات کو یہ تواتر نصیب نہیں ہوا اور بدیہی طور پر باقی ہونے کا ثبوت جیسا قرآن مجید کے لئے حاصل ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا۔ سورہ حجر کی آیت میں ہے کہ ''ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کریں گے'' اور سورہ قیامت میں کہ ہمارے ذمہ ہے اس کا یکجا کرنا اور اس کا برابر پڑھتے جاتے رہنا اور اگر شاذ روایت میں کوئی ایسی بات سنو جس سے قرآن میں کچھ تغیر و تبدیل کا ذکر ہو یا یہ کہ اس کا کوئی حصہ تلف ہو گیا تو ان رویات کا کوئی وزن نہ سمجھو۔

اس کے بعد ۲۵ پر مستقل عنوان قائم کیا ہے:

قول الامامیة بعدم النقصیة فی القران

فرقہ امامیہ کا قول کہ قرآن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

پھر اس ذیل میں صدوقؒ اور ان کے بعد والے علماء کے ارشادات نقل کئے ہیں اور جن روایات سے تحریف کا توہم ہوتا ہے ان کی سند و دلالت پر بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ توہم درست نہیں ہے۔ ان ارشادات کو آخر کتاب میں افادات بلاغی کے تحت میں درج کیا جائے گا۔

(۱۲) ماضی قریب کے سب سے بڑے مشہور و معروف مرجع تقلید آقا سید محسن حکیم طباطبائی علیہ الرحمہ کی نگرانی میں ایک نصاب دینیات کا سلسلہ طلاب مدارس کے لئے الاسلام دین وحیاۃ کے نام سے علامہ سید موسیٰؒ صدر کا تحریر کردہ شائع ہوا ہے جو ۱۹۶۶ء میں بیروت میں طبع ہوا ہے اور کے چھٹے حصہ میں صفحہ نمبر ۵۱ پر ہے۔

القرآن الذی بین ایدینا الآن هو نفس القرآن الذی انزله الله علی عبده محمّد ﷺ و نحن نؤمن به و کل ما جاء فیه و لقد حماه الله من اعدائه و من المنافقین فلا تغیر فیه و لا تبدیل و لا زیادة و لا نقصان و لم یزد علیه کلمة و لا حروف و لم ینقص منه کلمة و لا حرف و لا یأتیه الباطل من بین یدیه و لا من خلفه.

قرآن جو ہمارے سامنے موجود ہے یہ وہی قرآن ہے جو اللہ نے اپنے بندہ خاص حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا تھا اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ہر اس چیز پر جو اس میں درج ہے اور اللہ نے محفوظ اس کو رکھا ہے اس کے دشمنوں سے اور منافقوں سے تو نہ اس میں تغیر ہے اور نہ تبدیل اور نہ زیادتی اور نہ کمی اور اس میں ایک لفظ اور ایک حرف کی بھی زیادتی نہیں ہوئی ہے اور نہ ایک لفظ اور ایک حرف کی کمی ہوئی ہے اور باطل کا دسترس اس پر کسی بھی رخ سے نہیں ہے۔

(۱۳) زمانہ حال کے ایک مرجع تقلید آیۃ اللہ آقائے سید محمد کاظم شریعتمداری بانی ادارہ تبلیغات اسلامیہ قم (ایران) اپنے ایک مکتوب میں جو اسلامی شخصیتوں کے نام تحریر فرمایا ہے۔ اور رسالہ ''فعالیتہای درراہِ وحدت اسلام'' مطبوعہ ایران کے ۶ پر درج ہے۔

ان الحجاج الایرانیین القادمین من زیادة بیت الله الحرام قد جاء و نابهذه الرسالة ور اینا فیها ما لا یعتقد به ای فرد شیعی فی ای مکان کالقول بتحریف القران الکریم العیاذ بالله۔

صفحہ ۸ پر فارسی میں ہے:

"حجاج ایرانی که از زیارت بیت اللّٰه الحرام بر گشتند مقداری ازیں رساله رانزد ما آور دندو ملاحظه نمودیم که چیز ہائے در آن نوشته شده است که ہیچ مرد شیعی درج ہچ جا بان معتقد نیست از قبیل (العیاذ بالله) قول تحریف قرآن کریم" (ترجمه نامه حضرت آیة اللّٰه شریعت مداری به شخصیت ہائے اسلامی)

مطلب یہ ہے کہ

"حج کے موقع پر بعض غیر شیعہ افراد نے ایک پمفلٹ تقسیم کیا ہے جس میں شیعوں کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دی گئی ہیں جن کا کوئی شیعہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں اعتقاد نہیں رکھتا۔ جیسے قرآن مجید کا (معاذ اللہ) محرّف ہونا۔"

(۱۵) ادارہ تبلیغات اسلامیہ قم ہی سے ایک رسالہ شائع ہوا ہے ندای فکری برائے مسیحیان مسیحیت شمارہ ۱۳ اس میں ۹ پر لکھا ہے:

قرآن کریم درحال حاضر بہمان شکل که ہزار و چہار صد سال قبل برپیغمبر محمدؐ نازل شده دست نخورده باقی مانده است --- و از نخستن روزہائے که قرآن از زبانِ پیامبر نقل شده است حتی یک کلمه ہم تغیّر و تبدّل درآں رخ نداده و بہمان صورتیکه وحی شده باقی مانده است۔

قرآن مجید اس وقت تک اسی شکل میں کہ جس طرح چودہ سو برس پہلے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اترا تھا بغیر کسی تصرف کے باقی رہا ہے اور شروع دن ہی سے جب قرآن حضرت پیغمبرؐ خدا کی زبانی پہنچا ہے ایک لفظ کا بھی تغیر و تبدیل اس میں نہیں ہوا ہے اور اسی صورت پر کہ جس طرح وحی ہوئی تھی، باقی رہا ہے۔

(۱۶) "معارف الاسلام" لاہور شمارہ دسمبر ۱۹۶۸ء میں صفحہ ۲۸ پر مولانا مرزا احمد علی امرتسری اعلی اللہ مقامہ نے مجلہ آستان رضوی مشہد مقدس" سے اقتباسات درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مسلم اور محقق ہے کہ" قرآن مقدس علوی ہمیں قرآن موجود است" موجود قرآن ہی حضرت علیؑ کا مقدس قرآن ہے" قرآن کریم ہرگز دست خوش صدمت تحریف وزیادت نقصان نہ گردیدہ (خدائے قرآن این مہیمن جاوید آسمانی را برطبق وعدۂ صدق خویش نگہبانی کردہ چنانچہ فرمودہ است اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ۝ (حجر آیت ۹)

ودرایں کتاب حق کہ از مصدر حقیقت یزادانی فرود آمدہ ہرگز باطلے راہ نیافتہ ونخواہد یافتہ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ (حم سجدہ۔ ۴۱، ۴۲)

یعنی: قرآن حکیم میں کوئی تحریف یا زیادتی یا کمی نہیں ہوئی اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے وعدہ کے مطابق اس کی حفاظت کی جیسا کہ اس نے فرمایا ہے کہ ہم ہی نے قرآن کو تارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس کتاب حق میں جو مصدر حقیقت سے اتری ہے کبھی بھی باطل کو راہ نہیں ملی اور نہ ملے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ کتاب عزیز ہے۔ اس کے پاس باطل نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ حکمت والے قابل تعریف خدا کی طرف سے اتری ہوئی کتاب ہے" علمائے کبار شیعہ صریحاً عقیدہ خوردا مبنی پر صحت وسندیت وعدم زیادت ونقصان قرآن بیان کردہ اند" یعنی شیعہ اثناعشریہ اصولیہ کے اکابر علماء کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ قرآن وہی اور اسی صورت میں ہے جس میں حضرت سرور کائنات علیہ التحیات پر نازل ہوا تھا اس میں نہ تحریف ہوئی، نہ زیادتی ہوئی، نہ کمی ہوئی۔

(۱۷) خود میں نے تقریباً تینتالیس سال قبل اس موضوع پر ایک بسیط کتاب تحریر کی جس کا امامیہ مشن لکھنؤ سے جمادی الاول ۱۳۸۶ھ میں تیسرا ایڈیشن نکلا ہے اور اس کے علاوہ کئی ایڈیشن امامیہ مشن پاکستان کی طرف سے لاہور میں نکلے ہیں اس کے کچھ اقتباسات مذکور بالا تیسرے ایڈیشن کے صفحات کے حوالے سے ذیل میں درج ہیں۔

صفحہ ۶ ''اسلام کے لئے کچھ اصول اساسی ہیں کہ انہی کے اعتقاد کا مجموعہ اسلام کہا جاتا ہے اور ان میں تمام فرقہ اسلامیہ باوجود اپنے آپس کے اختلافات کے برابر شریک ہیں''۔

بنیادی اصول الوہیت، رسالت، کتاب منزل، یعنی قرآن مجید اور روز قیامت یعنی معاد ہیں''۔

صفحہ ۷۔''لازم یہ ہے کہ تمام فرق اسلامیہ کے اس متفقہ عقیدہ کو کہ قرآن مجید وحی سماوی اور کتاب ربانی منزل من اللہ رسولؐ کا اعجاز ہے۔اس میں کوئی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں اور نہ اس میں ذرہ برابر باطل کا شائبہ ہے اور اس پر ایمان واعتقاد کامل تمام مسلمانوں کے اسلام کا جزو اعظم ہے''اسی متفقہ ومتحدہ صورت پر باقی رہنے دیا جائے۔

صفحہ ۱۰۔''پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ حضرت کی نبوت دنیا کے آخری دور تک ہر وقت زندہ ہے کیوں کہ حضرتؐ کی نبوت ورسالت کی بنیاد صرف ان وقتی معجزات پر نہ تھی جو اس زمانہ میں موجود ہونے والے اشخاص ہی کے سر تسلیم کو خم کرا سکتے بلکہ حضرت کے دعوے کی بنیاد اس قرآن مجید پر ہے جو چودہ سو برس کے قریب گزرنے کے بعد بھی اس وقت زندہ ہے اور دنیا کو حق کی طرف دعوت دے رہا ہے۔

دنیا تہی دست ہے جب کہ اس کے پاس قرآن کے مثل کوئی کتاب نہیں لیکن مسلمان قرآن کی بدولت اس خزانہ عامرہ کے مالک ہیں جس کی نظیر صفحہ روزگار میں مل ہی نہیں سکتی۔''

صفحہ ۴۸۔''قرآن مجید کی اصلیت وحقیقت کے متعلق مسلمانوں کے اندر باوجود آپس کے ہزارہا گوناگوں اختلافات کے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ وہ متفقہ حیثیت سے اس نقطہ پر مجتمع ہیں کہ قرآن مجید خداوند عالم کا نازل کردہ رسول عربی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل شدہ ہے اور یہ کہ اس میں کسی انسان کی ساخت وپرداخت کو کوئی دخل نہیں ہے''۔

صفحہ ۲۰۴۔(عنوان''تمام بحث کا آخری نتیجہ یا میرا عقیدہ'')

موجودہ قرآن کلام الٰہی، وحیٔ آسمانی، رسولؐ کا اعجاز اور مسلمانوں کے لئے واجب العمل ہے اس کے کسی جزء یا کل کے مفاد کی مخالفت، مخالفت خدا ہے اور اس کا اتباع ہر مسلمان کا رکن مذہب اور اہم ترین فریضہ ہے اس قرآن کے علاوہ کسی سورہ کسی آیت اور کسی حرف کو بھی جزء قرآن سمجھنا درست نہیں ہے اور نہ اس پر احکام قرآن مرتب ہو سکتے ہیں''۔

ساتواں تبصرہ

قراءسبعہ اور سبعۃ احرف

قرآن مجید جب سے یکجا ہو کر مکتوبی صورت سے عالم اسلامی میں منتشر ہوا اس کے حروف و الفاظ اور رسم الخط کی انتہائی حفاظت کی گئی اور اس کے الفاظ کی صورت و ہیئت میں کسی قسم کی تبدیلی روا نہ سمجھی گئی جس کی بناء پر اس کو وہ تواتر کا درجہ حاصل ہوا جو دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

یہاں تک کہ بعض املا کی غلطیاں جو پہلے کاتب سے اتفاقاً ہو گئی تھیں جیسے لا اذبحنہ کا درمیانی الف اور اسی طرح لا اوضعوا کا بیچ کا الف وہ اب تک قائم رکھیں گئیں اور قرآن کی کتاب میں اس الف کو ترک نہیں کیا جاتا۔

یہ معنوی حیثیت سے چاہے بلا ضرورت سمجھا جائے یا مضحکہ خیز بھی ہو، مگر انضباط و اعتبار کی حیثیت کو اس سے کافی تقویت پہونچتی ہے یورپ میں اس وقت بعض قلمی قدیم کتابوں کا بالکل فوٹو اتار کر شائع کر دیا جاتا ہے یا اگر اس کو نقل کراتے ہیں تو یہ ملحوظ رکھتے ہیں کہ جو لفظ جس طرح لکھا ہے اس کو اسی صورت سے نقل کیا جائے اس میں اگر کہیں کتابت اور املاء کی غلطی ہوتی ہے تو اس کو باقی رکھتے ہیں اور حاشیہ پر یافٹ نوٹ میں لکھ دیتے ہیں کہ یہ لفظ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

بظاہر اس میں یہ غلطی ہے اور صحیح یوں ہے اس طرح حفاظت اور اہتمام پر روشنی پڑتی ہے جس سے کتاب کے اعتبار کو قوت حاصل ہو جاتی ہے لیکن جس طرح موجودہ زمانہ میں قاری ہوتے ہیں جن میں سے بعض قرآن مجید کے پڑھنے میں طریقہ تلفظ اور ادائے حروف کے سلسلہ میں ایسی فنکاریاں کرتے ہیں کہ لفظ کی آواز میں کچھ کا کچھ انقلاب آجاتا ہے۔

اسی طرح صدر اسلام میں بھی قاریان قرآن بہت سے تھے اور ہر ایک کا طریقہ قرات ادائے حروف میں مختلف تھا۔ اس سے بہت سی قرأتیں پیدا ہو گئیں اور ہر ایک قاری کے جو شاگرد تھے وہ استاد کی پیروی میں اسی طریقہ خاص کے پابند ہو گئے۔

ان قاریوں کی قرأتیں نہ رسولؐ سے لی گئی تھیں اور نہ ائمہ معصومینؑ میں سے کسی سے اخذ کی گئی تھیں اس لئے انہیں دینی حیثیت سے سند کوئی حاصل نہ تھی پھر ان کی تعداد بھی کوئی محدود نہ تھی بلکہ یہ کثیر التعداد اشخاص ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہتے تھے جو اپنے اپنے ذوق طبعی کے لحاظ سے ادائے الفاظ میں جدّتیں کرتے تھے اور اسے مستقل قرأت کا درجہ دیتے تھے۔

لیکن بالکل اسی طرح جیسے فقہاء کی کثیر التعداد جماعت میں جب بادشاہ کی نظر توجہ اور عام خلقت کے میلان طبع نے چار آدمیوں کو خاص طور سے پسند کر لیا تو اہلسنت میں وہ چاروں بزرگ اس طرح مستند قرار پا گئے کہ ان کے بعد اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔

اسی طرح ان تمام قاریان قرآن میں سے سات آدمیوں کو منتخب کر کے انہیں ''قراءسبعہ'' کے نام سے تمام امت کا مرکز قرار دے دیا گیا کہ انہی سات آدمیوں میں سے کسی ایک شخص کی قرأت کے مطابق پڑھنا جائز ہے۔

ان ساتوں قرأتوں پر اتفاق کر لینے کے بعد دینی ماخذوں میں ان کے لئے سند تلاش کی گئی تو ایک حدیث دستیاب ہو گئی کہ

''نزل لقران'' ''علی سبعة احرف'' قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے''۔ بس اس کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ ساتوں قرأتیں وہ ہیں جو منشائے الٰہی کے مطابق ہیں۔

حالانکہ خود یہ حدیث اپنے لفظ و معنی کے اعتبار سے اس درجہ مضطرب و مبہم ہے کہ حافظ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ اس میں چالیس قول ہیں۔

اس سب کے برخلاف ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی یہ حدیث قرآنی عظمت کے بالکل مطابق ہے کہ:

ان القران واحد نزل من عند واحد

قرآن کی بس ایک شکل ہے اور وہ ایک ذات بے ہمتا کے پاس سے اترا ہے۔

اور ایک حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ سات حرف جو ہیں وہ تفسیری پہلوؤں سے متعلق ہیں۔

عن زرارہ عن ابی جعفر علیہ السلام قال تفسیر القراٰن علی سبعة احرف منه ما کان و منه ما لم یکن بعد ذالك تعرفه الائمّة.

زرارہ کی روایت ہے، امام محمد باقر علیہ السلام سے آپؑ نے فرمایا کہ قرآن کی تفسیر کی سات نوعتیں ہیں ان میں کچھ ماضی سے متعلق ہیں جس کا وقع ہو چکا اور کچھ مستقبل سے متعلق ہیں جس کا وقوع ابھی نہیں ہوا اس سب کا ائمہ معصومینؑ جانتے ہیں۔ (بصائر الدّرجات۔ مطبوعہ ایران۔ ص ۵۲)

''سبعة احرف کی یہی تشریح قرآنی عظمت و جلالت سے تناسب رکھتی ہے''۔

آٹھواں تبصرہ

فہم قرآن کے سلسلہ میں مختلف نظریات اور صحیح نقطہ نظر

قرآن فہمی اور تفسیر کلام پاک کے بارے میں مختلف جماعتوں کے نقطہ نظر میں بڑا فرق ہے۔ایک جماعت عقل انسانی کو اس کے معانی سمجھنے سے بالکل ہی قاصر سمجھتی ہے وہ کہتے ہیں کہ قرآن سمجھنے والے خاص افراد تھے جو اب ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں لہٰذا ہم صرف ان حضرات کے اقوال پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں براہ راست قرآن سے ہم کسی حکم شرعی یا مسئلہ اعتقادی کو نہیں سمجھ سکتے یہ ہمارے یہاں کی اخباری جماعت ہے جس نے ادلہ احکام سے کتاب الٰہی کو بالکل خارج کر دیا ہے اور اپنے عمل کا دارومدار صرف اخبار و احادیث پر رکھا ہے۔

دوسری طرف وہ جماعت ہے جو قرآن مجید کے ہدایات کو اپنے لئے کافی قرار دے کر سنت کو بالکل نظر انداز کرتا ہے۔ یہ فرقہ مسلمان میں ''اہل قرآن'' کے نام سے موجود ہے جو اپنے تمام افعال و عبادات اور دیگر احکام شرعیہ کی بنیاد قرآن مجید پر رکھنے کا دعویدار ہے یہ دونوں ہی مسلک افراط و تفریط کے کرشمے ہیں۔

قرآن کے لئے پہلے ہی پارے کے آغاز میں یہ اعلان موجود ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ. یہ رہنما ہے پرہیزگاروں کے لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے ''هُدًى لِّلنَّاسِ''، تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس کا دائرہ بجائے خود تمام انسانوں کے لئے صدائے عام کی حیثیت رکھتا ہے۔ بیشک اس صدا پر آتے وہی ہیں جو متقین ہیں یعنی اندیشہ انجام اور فکر نجات رکھتے ہیں کہیں اس کو ضیاء (روشنی) کہیں ذکر (یاد آوری کا سامان) کہیں تبصرہ (آنکھیں کھولنے والا) کہیں شفاء المافی الصدور (سینوں کے اندرونی امراض کا شک وشبہہ اور کفر و نفاق وغیرہ کا علاج) کہیں فرقان (حق و باطل میں جدائی ڈالنے والا) اور کہیں بیان (حقیقتوں کا واضح کرنے والا) وغیرہ وغیرہ کہا گیا ہے جس سے مجموعی طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ یقیناً وہ عام خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کے لئے اتارا گیا ہے اور دنیا کو اس کے مندرجہ مضامین پر غور کرنے، اس سے نتیجہ نکالنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت ہے وہ صرف بطور اوراد و ادعیہ کے زبانوں سے تلاوت کر لینے اور بطور تعویذ و نقش کے گلے میں ڈال لینے اور بطور ایک محترم اور مقدس چیز کے سر آنکھوں پر رکھ لینے اور بوسہ دینے کیلئے نازل نہیں ہوا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس کا مطالب و حقائق سے فائدہ اٹھایا جائے، اس میں غور و خوض کیا جائے، نیز اس سے اپنی عملی زندگی کے لئے سبق حاصل کئے جائیں۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن مجید ایک خاموش رہنما ہے وہ تعلیم کی عملی تشریح نہیں کر سکتا اور پھر اس میں اکثر مضامین بطور اجمال بیان ہوئے ہیں۔ لہٰذا قرآن کے ساتھ ناطق رہنما کی ضرورت ہے جو اس کے تعلیمات کو اپنے عمل سے دنیا کے ذہن نشیں کرے، اس کے مجملات کی تفصیل سمجھائے اور اس کے مبہمات کی توضیح و تفصیل کرے۔

یہ معلّم اپنے زمانہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور اس لئے خود قرآن مجید نے حضرت کی پیروی کی دعوت دی۔(قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ)۔ اور لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اور اسی سے کتاب کے ساتھ سنت کا ماخذ احکام ہونا ظاہر ہے۔

پھر رسولؐ نے اپنے بعد کے لئے اپنے خاص اہلبیت کو جو تعلیمات قرآنی کا مکمل نمونہ تھے قرآن کا ساتھی بتایا اور قیامت کے لئے ان

دونوں کے ساتھ کا اعلان فرمایا۔

یہ حضرت کی مابین فریقین متفق علیہ حدیث ہے جس کا مشہور و معروف متن یہ ہے

اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ كِتَابَ اللهِ وَ عِتْرَتِیْ اَهْلَبَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ وَاَنَّهُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ.

میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں اللہ کی کتاب اور میری عترت جو میرے اہلبیتؑ ہیں جب تک تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ اور یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ یہ دونوں وارد ہوں میرے پاس حوض کوثر پر قیامت کے روز۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسولؐ کے بعد قرآن کے ساتھ رہنمائی میں اہلبیتؑ کا مقام ہے۔ اس لئے قرآن مجید کی تعلیم پر صحیح عمل کے لئے جس طرح احادیث رسولؐ کو سامنے رکھنا ضروری ہے، اسی طرح آپؐ کے ان جانشینوں کے ارشادات کو جن کا حضرتؐ نے عترت اور اہل بیتؑ کی لفظوں کے ساتھ تعارف کرایا ہے۔

اس کے بالمقابل یہ نعرہ کہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ ''ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے''۔ پہلے تو ہنگامی طور پر بلند ہوا۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری دور حیات میں جب حضرتؐ کی علالت پوری شدت پر تھی اور آپؐ نے قلم و دوات اور کاغذ طلب فرمایا کہ اپنے بعد کے لئے جو ذریعہ ہدایت ہے اس کی تحریری دستاویز چھوڑ جائیں تو کسی سیاسی پیش بندی کے طور پر یہ جملہ کہہ کے حضرتؐ کو آپ کے منصوبے کی تکمیل سے باز رکھا گیا مگر اس کے بعد بطور مسلک اس پر کوئی عمل نہیں کیا گیا ورنہ حضرت فاطمہؑ زہرا کو میراث سے محروم کرنے کے لئے اپنی ہی روایت کردہ ایک حدیث کو سند قرار نہ دیا جاتا اور اسی طرح برابر پیش آمدہ مسائل شرعیہ میں رسولؐ کے ارشادات اور فیصلوں کی تلاش کی جاتی تھی اور ان کو حجت مانا جاتا تھا بلکہ لاشعوری طور پر سہی برابر اس حَسْبُنَا کے تصور کی رد ہوتی رہی۔ احادیث رسولؐ سے بھی اور اقوال علماء سے بھی چناں چہ عبید اللہ بن رافع کی روایت ہے کہ حضرت پیغمبرؐ خدا نے فرمایا:

لا الفین احدکم متکیا علیٰ اریکة یاتیه الامر من امری بما امرت به او نهیت عنه فیقول لا ادری ما وجدناه فی کتاب الله.

ایسا میں نہ دیکھوں کہ تم میں کوئی (اطمینان سے) گاؤ تکیہ سے لگا بیٹھا ہو اور میرا کوئی حکم اوامر یا نواہی کے قبیل سے اس کے سامنے آئے اور وہ کہے میں اسے نہیں جانتا ہم نے اسے کتاب الٰہی میں تو پایا نہیں ہے۔

اسے محیی السنہ بغوی نے شرح السنۃ میں درج کیا ہے اور کہا ہے هذا حدیث حسن یہ باعتبار سند حسن حدیث ہے۔ (دراسات اللبیب۔ ص ۵۵)

ایک جگہ یہ الفاظ ملتے ہیں کہ:-

لا عرفن رجلا اتاه الامر من امری ما امرت به اذ نهیت عنه فیقول ما هٰذا عندنا کتاب الله لیس هٰذا فیه.

مجھے خوب معلوم ہے ایسا شخص جس کے پاس میرا کوئی حکم اوامر یا نواہی میں سے پہنچے تو وہ کہے یہ کیا ہے؟ ہمارے پاس کتاب خدا موجود ہے اس میں تو یہ نہیں ہے۔

ایک روایت مقدام بن معدی کرب کندی کی ہے۔

اِنَّ رسول اللہ ﷺ قال یو شك الرجل متکیا علی اریکة یحدث بحدیث من حدیثی فیقول بیننا وبینکم کتاب اللہ عز و جل فما وجدنا فیه من حلال استحللناه وما وجدنا فیه من حرام حرمناه اَلا وان ما حرّم رسول اللہ ﷺ مثل ما حرّمه اللہ عزوجل.

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جلد ہی ایسا وقت آئے گا کہ ایک شخص گاؤ تکیہ سے لگا بیٹھا ہوگا اور اس کے سامنے میری حدیث پیش ہوگی وہ کہے گا کہ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کن کتاب الٰہی ہے تو جو اس میں ہمیں حلال نظر آئے گا اسے ہم حلال سمجھیں گے اور جو اس میں حرام ملے گا اسے حرام سمجھیں گے خبردار آگاہ رہو کہ جسے رسولؐ خدا نے حرام کیا وہ ویسا ہی ہے جیسے اللہ نے حرام کیا ہو

ان دونوں حدیثوں کو عبدالکریم بن محمد سمعانی نے ''ادب الا ملاء والا ستملاء'' مطبوعہ مطبع بریل لیدن ۱۹۵۲ء صفحہ ۳ و ۴ میں درج کیا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر حَسْبُنَا کِتَابَ اللہ کی کوئی رد ہوسکتی ہے جو خود حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی ہے اور اس کے بعد برابر صحابہ اور تابعین اور علمائے اسلام بلاتفریق فرقہ شعوری یا لاشعوری طور پر اس تصور کی رد کرتے رہے۔

چنانچہ اسی ''ادب الاملاء والاستمال ء'' صفحہ ۴ میں مشہور صحابی رسولؐ جناب عمران بن حصینؓ کا قول درج ہے کہ احادیث کے ذکر پر ایک شخص نے کہہ دیا کہ ارے حدیث کا ذکر چھوڑو ہم سے کتاب الٰہی کی بات کرو تو اس پر انہوں نے فرمایا:

انك احمق اتجد فی کتاب اللہ الصلٰوة مفسرة اتجد فی کتاب اللہ الصّوم مفسراً اَفی القراٰن حکم ذٰلك والسنة نفسر ذالك.

تم بے وقوف ہو کیا کتاب الٰہی میں تمہیں نماز کی تفصیل ملتی ہے کتاب الٰہی میں روزہ کا تفصیلی بیان ملتا ہے۔ یہ سب احکام قرآن بیان کیئے ہیں اور تفصیلات سنت سے معلوم ہوتے ہیں۔

بلاتفریق فرقہ فقہ اسلامی یعنی علم شریعت کی تدوین اسی اصول پر ہوئی جو حَسْبُنَا کی باجماع امت عملی رد تھی اسے وضاحت کے ساتھ ملا محمد عبدالصمد پشاوری نے اپنی کتاب طلب الادب میں جو قاضی شوکانی کی کتاب ادب الطلب کی تلخیص ہے اور جسے ہندوستان کے مشہور عالم نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے اپنے اہتمام سے بھوپال میں چھپوایا ہے تحریر کیا ہے وہ لکھتے ہیں (صفحہ ۳۹)

اِذا لم یتقن علم السنة ولم یعرف صحیحه من سقیم ولم یعول علیٰ اهل هٰذا الفن فی اصداره وایراده کانت مصنّفا ته مبنیّة علیٰ غیر اساس لان علم الفقه هو ما خوذ سنّة الا ما صرح بحکمة القرآن الکریم وهو قلیل.

جب کوئی شخص سنت کا علم کافی نہ رکھتا ہوگا اور احادیث میں درست و نادرست کا امتیاز نہ کرے گا اور اس فن کے ماہرین پر دلائل قائم کرنے اور نتیجہ نکالنے میں بھروسا نہ کرے گا تو اس کے تصانیف بے بنیاد ہوں گے اس لئے کہ علم فقہ کا ماخذ عموماً سنت ہے سوا ان امور کے جن کے

حکم کی صراحت قرآن مجید میں ہوگئی ہے اور وہ بہت کم ہیں

ہندوستان کے متاخرین اہل قلم بھی بلاتفریق فرقہ اس نعرہ حَسْبُنَا کی چاہئے لاشعوری طور پر ہورد کرتے رہے ہیں جن میں سے یہاں صرف مولانا ابوالکلام کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

''انسانی سعادت کے لئے تعلیم محض بالکل بیکار ہے جب تک کہ اس تعلیم کے زندہ نمونے بھی انسانوں کے ساتھ نہ ہوں جو اثر طبیعت منفعلہ انسانیہ پر ایک انسانی نمونۂ عمل کا پڑتا ہے وہ محض تعلیم کی سماعت سے نہیں پیدا کیا جاسکتا اخلاق کی کتابیں اپنے موثر تعلیمات سے انسانوں کو رلاسکتی ہیں مگر ان کے دلوں کو نہیں پھیر سکتیں۔

عدالت کا قانون مجرم کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال سکتا ہے لیکن اس کے جرم سے باز نہیں رکھ سکتا حکماء کے حکیمانہ نصائح نیکوں کی بڑی بڑی تعریفیں اور بروں کی بڑی بڑی برائیاں بتلا سکتے ہیں لیکن کسی برے انسان کو نیک نہیں بنا سکتے''۔

''بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد''

لیکن برخلاف اس کے اگر ایک پاک انسان اپنی زندگی کے اندر نیکی کا عملی نمونہ رکھتا ہو اور اس کے اعمال حیات راستبازی کے لئے اسوہ کا حکم رکھتے ہوں تو وہ صرف اپنا نمونہ دکھلا کر نہ صرف افراد اشخاص کو بلکہ اقوام واُمم کے عمال کو یکسر پلٹ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت خلق اللہ کے لئے صرف کتابوں اور شریعتوں ہی کو نہیں بھیجا بلکہ اس کے ساتھ انبیاء کرام علیہم السلام کا (کہ ان کے حاصل تھے) عملی نمونہ بھی دکھلا دیا وہ جس دستور العمل کی طرف قوم کو بلاتے تھے اس کا عملی پیکر خود ان کی پاک ومطہر زندگی تھی۔

اگر شریعت بصورت قانون تختیوں اور کاغذوں پر منقوش تھی تو بصورت وجود حیٔ وقائم ان کی زندگی کے اندر بھی پڑھی جاسکتی تھی اگر اس کی آیات بینات حروف واصوات کی شکل میں دنیا کو دعوت دیتی تھیں تو انبیاء کرام کی زندگی عمل وفعل کے اندر سے اس کی تصویر دکھلاتی تھی۔ اگر قانون کہتا تھا کہ انسان کو ایسا کرنا چاہئے تو حیات نبوت ثابت کر کے دکھلا دیتی تھی کہ اس طرح کیا گیا اور اس طرح کیا جاسکتا ہے۔

''داستان کربلا مطبوعہ حیدرآباد دکن صفحہ ۲۴۲ یا حسین علیہ السلام از مولانا ابوالکلام آزاد''

یہی ضرورت تھی جس کے لئے بعد رسول بھی ایسی ہستیوں کی ضرورت تھی جو قرآن کی تعلیم کا مکمل نمونہ اور اپنے قول وعمل سے اس کے شارح ومفسر ہوں۔ اسی ضرورت کی تکمیل پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث ثقلین سے فرمائی۔

قرآن مشکل ہے یا آسان

حَسْبُنَا کِتَابَ اللّٰہِ کا نعرہ جو ہم سے دور لگا تھا اور اس کی صدائے بازگشت بیگانوں کے حلقوں اہل قرآن پرویز اور طلوع اسلام کی شکلوں میں بلند ہوئی جس پر سیر حاصل تبصرہ ہو چکا، نجانے کس طرح ہمارے آس پاس اس کا ایک دھما کہ ہو گیا۔ بعض خود رو قسم کے دعویداران تحقیق کے قلم سے ان الفاظ میں کہ ''قرآن آسان ہے''۔ بایں معنی کہ ہر شخص ترجمہ پڑھ کے قرآن سے مطلب نکال لے، یہ اس کی ہدایت کے لے کافی ہے کوئی ضرورت نہیں کہ وہ تفاسیر کی طرف رجوع کرے اور اہل علم کی تشریح کا پابند ہوں۔ اس کے دلائل حسب ذیل دیئے گئے ہیں:

پہلی دلیل: قرن اول کے مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقیاں حاصل کیں مگر اب مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس کے معنی اور مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھتے ہیں اور اس کی ذمہ داری علمائے مذہب پر ہے جنہوں نے عام لوگوں کو اپنے پھندے میں پھانسے رکھنے کے لئے عجیب وغریب معنی اور تفسیریں لکھنا شروع کیں، عجیب وغریب مسئلے گھڑتے ان مسئلوں کو قرآنی آیات سے مطابق کرنے کی کوشش میں قرآنی آیتوں کو وہ معنی پہنائے گئے جو کہ کسی صورت سے پیدا نہیں ہو سکتے تھے لہٰذا یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن کے معنی اور مطلب کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس طرح سے اس گروہ نے مسلمانوں کو قرآن مجید سے دور رکھا، حالانکہ اگر اس کے معنی عوام نہیں سمجھ سکتے تھے تو لوگ اسلام کیسے لائے تھے۔ یاد رہے کہ رسولؐ کی رحلت کے ڈیڑھ سو سال بعد تک اسلام میں کوئی فرقہ نہ تھا۔ ہر فرقہ اپنے اصولوں کی پیچ میں یا بادشاہت کی لاگ میں قرآن کے آیات کو اپنے مفید مطلب معنی پہنانے لگا اور کچھ دن بعد وہ اس کا ایمان ہو گیا۔

دوسری دلیل: کسی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسی صاف اور آسان زبان میں ہو کہ پڑھنے والا لکھنے والے کے مطلب کو سمجھ سکے اگر نہ سمجھ سکے تو لکھنے والا قصوروار ہے نہ کہ پڑھنے والا لہٰذا کسی کتاب کا مشکل زبان میں ہونا اس کا عیب ہے نہ کہ خوبی قرآن بلیغ ہے اور بلیغ وہی کلام ہے جس سے کہنے والے کا مقصد سننے والے کے ذہن میں صحیح طور سے پہنچے۔

تیسری دلیل: ہم خود قرآن سے پوچھیں کہ وہ اس معاملہ میں کیا کہتا ہے؟

قرآن میں ہے کہ ہم قرآن کو ایسی کھلی اور صاف زبان میں بیان کرتے ہیں جس کو تم سمجھ سکو، اگر اس کو ایسی زبان میں نازل کیا جاتا جس کو تم نہ سمجھ سکتے تو کوئی ایمان نہ لاتا۔ عربی کے معنی خود صاف اور کھلی ہوئی زبان کے ہیں۔

۱۔ الٓرٰ ۟ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ۙ﴿۱﴾ (ھود۔۱)

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِکِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰی عِلْمٍ هُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ (اعراف۔۵۲)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نے کتاب بھیجی ہے وہ حکیم بھی ہے واقف کار بھی اس نے ہر طرح سمجھ بوجھ کر کتاب کو تفصیل وار بیان کر دیا ہے۔

۱۔ حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ﴿۲﴾ کِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳﴾ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَکْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۴﴾ (حٰم السجدہ۔۱ تا ۴)

۲۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِیًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ ؕ (حٰم السجدہ۔۴۴)

ان آیتوں سے دو باتیں بالکل صاف ہو گئیں۔

(۱) قرآن عربی زبان میں اس قوم کے لئے جو عربی جانتی تھی یعنی جس کی مادری زبان عربی تھی، کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور ایسی زبان میں قرآن نہیں ہے جس کو عرب نہ سمجھ سکتے تھے اور

(۲) ایمان نہ لانے کی یہ وجہ نہیں تھی کہ لوگ سمجھتے نہ تھے بلکہ منہ پھیر کر چل دیتے تھے اور سنتے ہی نہ تھے یعنی صحیح طور سے متوجہ نہیں ہوتے تھے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ''ہم نے تو قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے تو ہے کوئی جو نصیحت حاصل کرے۔'' اس ایک آیت کو سورۂ القمر کے اندر چار مرتبہ دہرایا گیا ہے کیا اس سے زیادہ زوردار الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن آسان ہے۔

چوتھی دلیل: ہم خود قرآن کو پڑھیں اور دیکھیں کہ سمجھ میں آتا ہے یا نہیں؟

قرآن کے لفظی معنی لیکچر کے ہیں قرآن میں ۱۱۴ سورے ہیں ہر سورہ بجائے خود ایک لیکچر ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ان لیکچروں کے درمیان میں لوگوں نے سوالات کر دیئے ہیں۔ ان کا جواب دے کر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔

موضوع قرآن حسب ذیل ہیں:

(۱) خدا کی عبادت کرو (توحید)

(۲) ایک ایسے دن پر ایمان لاؤ جس دن اپنے کئے دھرے کا جواب دینا ہوگا (یعنی قیامت)

(۳) ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے اور لڑائی کے وقت کیسا برتاؤ کرنا چاہئے اور لڑائی کیسی لڑنی چاہئے (یعنی معاشرتی و جنگی احکامات وغیرہ)

(۴) ذیل کے اعتراضات اور ان کے جوابات ان میں کے دو اعتراض حضرت محمدؐ پر ہیں اور دو قرآن پر

(الف) رسولؐ خدا پر دو اعتراض:

(۱) چوں کہ حضرت محمدؐ ایسے انسان ہیں جیسے انسان ہوا کرتے ہیں لہٰذا حضرت محمدؐ رسول نہیں ہو سکتے۔

(۲) چوں کہ محمدؐ معجزہ نہیں دکھاتے ہیں لہٰذا رسول نہیں ہو سکتے۔

(ب) قرآن پر دو اعتراض:

(۱) قرآن نازل وازل کچھ نہیں ہوا، حضرت محمدؐ کی من گھڑت ہے۔

(۲) پہلے خدا کی بھیجی ہوئی کتابیں موجود ہیں لہٰذا اب ایک اور کتاب نازل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

(۵) پرانے رسولوں کے قصے:۔

ان لیکچروں کا مضمون بہت چھوٹا سا ہے ان مضمونوں کو ہر لیکچر میں دہرایا گیا ہے۔

کہیں لوگوں نے سوالات بھی کئے ہیں خاص معاملات بھی آ پڑے ہیں سوالات کے جوابات اور معاملوں کے متعلق حکم بھی دے دیئے گئے ہیں۔ اوپر بیان کیے ہوئے موضوع قرآن کو مدنظر رکھ کر قرآن کو پڑھیے اور پھر دیکھئے کہ قرآن سمجھ میں آتا ہے یا نہیں قرآن میں ایک ہی بات کو بار بار دہرایا گیا ہے اس سے مقصد یہ ہے کہ کسی طرح سے تو بات لوگوں کے دماغوں میں سمائے۔ اگر ایک لفظوں میں بات سمجھ میں نہیں آئی تو اسے

دوسرے لفظوں میں بیان کیا گیا، اگر ایک طریقہ سے بات سمجھ میں نہیں آئی تو اسے دوسرے طریقہ سے بیان کیا گیا اگر اصول سمجھ میں نہ آیا تو مثال دی گئی ان اصولوں کو قصوں کی شکل میں بیان کیا گیا۔ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن جاہل سے جاہل اور عالم سے عالم دونوں کیلئے ہے۔

دوسرا اصول قرآن کو بلکہ ہر کتاب کو سمجھنے کا اس کے معنوں پر غور کرنا ہے۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُہَا .(ق۔۳۷)

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُہَا ﴿۲۴﴾ (محمّد۔۲۴)

تیسری بات: مترجم قرآن میں بریکٹ ( ) کے اندر جو لکھا جاتا ہے ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے بڑھاتا ہے قرآن میں ایسے کوئی لفظ نہیں ہوتے۔

چوتھی بات: اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آجائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بیکار ہیں۔

پانچویں بات: آیتوں کے شان نزول کے جھگڑے بھی عام طور سے بیکار ہیں کیوں کہ ہر فرقہ نے شان نزول اپنے مطلب کے موافق گڑھ رکھی ہے آیت میں اصول بیان کیئے جاتے ہیں وہ اصول جب کبھی ایسا واقعہ ہوگا اس پر چسپاں ہوں گے۔ یہ بات بھی کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی کہ بے جوڑ آیتیں نازل ہوا کرتی تھیں۔ عام طور سے سورے نازل ہوتے تھے۔ یہ تھیں وہ اصولی باتیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن بالکل آسان چیز ہے اور اس کے لئے تفسیر کی ضرورت نہیں ہے مگر کیا یہ نتیجہ درست ہے؟ اس کے لئے ایک ایک کر کے مذکورہ پہلوؤں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

قرنِ اوّل کے مسلمانوں کا عمل بالقرآن

کیا یہ سچ ہے کہ قرنِ اوّل کے مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقی حاصل کی؟

شخصیتوں سے مرعوب ہوئے بغیر دل کی لگتی کہیے قرآن کو سامنے رکھ کر بتایئے کہ قرآن میں کیا کہیں اس کا حکم ہے کہ تلوار لے کر آس پاس کے ممالک پر فوج کشی کرو، امن عالم کو غارت کرو اور لوگوں کو زبردستی اسلام لانے پر مجبور کرو۔ اگر یہ سب عمل بالقرآن ہو تو غیر مسلمین کا یہ اعتراض بالکل درست ہوگا کہ اسلام خونریزی کا حامی ہے اور وہ تلوار کے زور سے اپنی اشاعت کراتا ہے کیا اپنے کسی دعوے کی حمایت کے لئے اسلام کے دامن کو داغ دار بنا دینا گوارا کیا جاسکتا ہے؟

کیا قیصر و کسریٰ کے نظام حکومت کا رواج تعلیم قرآن کے مطابق تھا؟

کیا سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی کا رواج جس کے خلاف جناب ابوذر غفاریؓ احتجاج کرنے اٹھے تھے عمل بالقرآن کا نتیجہ تھا؟

کیا دمشق اور بغداد کی جہانداریاں صاف ستھرے اور سادے اسلام اور تعلیم قرآن کے موافق تھیں؟ کیا عیش و عشرت کی گرم بازاریاں اور توبہ شکن حلقوں میں ''مقدس'' درباروں کی آتش آشامیاں قرآن کی رو سے بالکل مناسب تھیں کیا جمل اور صفین کی میدان داریاں، خود مسلمانوں کے گلوں پر مسلمانوں کی شمشیر آزمائیاں اور آپس کی فتنہ سامانیاں تعلیم قرآن پر عمل کا مظاہرہ تھیں؟

حقیقتوں پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ الفاظ میں اتنی طاقت ہرگز نہیں کہ وہ انسانی حافظہ سے واقعات کی یاد فراموش کرسکیں۔

کیا کربلا کا تاریخی واقعہ کسی عبارت آرائی کے زور سے مٹ سکتا ہے؟ اور کیا جنگ حرہ اور مدینہ مکہ کی شرمناک داستانیں فنا ہو جائیں گی؟ ممکن ہے کہ ''خیر القرون'' کو سراہنے والے مسلمان آج ناواقف غیر مسلموں کے سامنے پرانے زمانہ کے مسلمانوں کو قرآن کا جامہ پہنا دیں اور ان کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھالیں مگر تاریخ کی دوربین سے اس زمانہ کے حالات کا مطالعہ کرنے والے ''گھر کے بھیدی'' مسلمان بھی کیا اس فریب خیال کا شکار بن سکیں گے؟

بڑے نیک طینت، بڑے پاک باطن
ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

گنتی کے آدمیوں کو چھوڑ کر جن کی بدولت خواہ اس زمانہ کو ''خیر القرون'' کہہ لیجئے اور خواہ جو مقدس نام چاہئے بنا لیجئے جہاں تک عام حالات کا تعلق ہے، اتنی تاریکی نظر آرہی ہے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کا ''دور جہالت'' اس کے سامنے مات ہے صرف اس لئے کہ عام طور پر نہ مسلمانوں نے قرآن میں تدبر کیا نہ قرآن کے معانی کی تشریح میں حقیقی رہنماؤں کا دامن تھاما نہ ان عملی مثالوں پر نظر ڈالی جنہوں نے اپنی سیرت کو قرآنی تعلیمات کی تصویر بنا رکھا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ قرآن کو اپنی ناقص سمجھ ذاتی خیالات اور نفسانی خواہشوں کا جولان گاہ بنا لیا۔ اسی کا نتیجہ تھی مسلمانوں کی وہ ابتری پراگندگی اور پریشانی جس کا خمیازہ آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔

اب آج بھی مسلمانوں کو اس پردہ میں کہ قرآن مشکل نہیں آسان ہے۔ اسی کی تلقین کی جائے تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی مگر یاد رکھیے کہ اس سے مسلمانوں کی حالت میں کوئی ترقی یا اصلاح نہیں ہوسکتی۔ بے شک اپنی من مانی باتوں کو از روئے قرآن جاہلوں کے ذہن نشین کرنے میں آسانی ہوگی۔ وہ ناواقف بارہے کا سید جو عربی کے سر پیر سے واقف نہیں یہ سن کر خوش ہو جاتا ہے کہ قرآن میں میرے وطن کا نام بڑی مہربانی سے ''برادر'' اس کی لفظ کے ساتھ موجود ہے۔ يَوْمَ مَبِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا''۔ اس بچارے کو کیا خبر کہ یہ ''اَخْ'' برادر کے معنی میں نہیں اور وہ بَارَهَا شہر کا نام نہیں ہے بلکہ ''اخبار'' ایک لفظ ہے جو خبر کی جمع ہے اور وہ ''ھا'' کی طرف مضاف ہے جو مونث کی ضمیر ہے۔ مگر یہ باتیں اس کے سامنے کہی جائیں تو وہ سمجھے گا عالموں کی الٹی سیدھی تاویل ہے اور لہک لہک کر بار بار علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھے گا۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اس کے نزدیک جمع اور مضاف اور مونث کی ضمیر کی بحثیں اتنی دشوار ہیں کہ ''پاژند'' معلوم ہوتی ہیں اسے تو آسانی اسی میں معلوم ہوگی کہ وہ کہے ''اخ بارھا'' یعنی بار ہا جو سادات کی بستی ہے اسے اللہ سبحانہ نے اپنے بھائی کے خطاب سے نوازا ہے۔

یا قرآن میں انگریزی زبان کی لفظ تلاش کرنے والا خوش ہو جائے یہ آیت سن کر:

وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ

وہ اسے یوں سمجھتا ہے کہ ولم یکن لہ کفواً احمد سمجھتا ہے کہ ون انگریزی کی لفظ ہے۔

اب اگر کسی بچارے عالم کی شامت آئی اور اس نے کہا یہ ون انگریزی کی لفظ نہیں ہے یہ تو کفو کی لفظ کی جزء ہے اور تنوین سے نون کا تلفظ پیدا ہوا ہے جو اعرابی حرکت ہے کوئی مستقل لفظ نہیں ہے تو وہ فوراً کہے گا۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اس کے نزدیک یہ عالمانہ تشریح تاویل اور پاژند ہے اور سیدھی سادی بات جو قرآن سے نکلتی ہے وہ وہی کہ ون بمعنی واحد انگریزی ہے اور اس کی تفسیر ہے لفظ ''احد'' اور اس طرح اس کے نزدیک ثابت ہو جاتا ہے کہ قرآن خود اپنا مفسر ہے اور پھر وہ کہتا ہے کہ اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آ جائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بے کار ہیں۔

بتایئے اس ''بوالہوسی'' کا کیا علاج کیا جائے اور اب شیوہ اہل نظر کی آبرو کہاں رہ سکتی ہے۔

یہ بھی دیکھ لیجئے کہ قرآن کے عجیب وغریب معنی اور تفسیریں جو لکھی گئیں عجیب وغریب مسئلے جو گڑھے گئے، قرآنی آیتوں کو وہ معنی پہنائے گئے جو کسی صورت سے پیدا نہیں ہو سکتے تھے یہ سب اسی دور کی پیداوار ہیں جسے ''قرن اول'' کہا جاتا ہے اور جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقیاں حاصل کیں۔ بعد کے مسلمان تو سب زلہ خوار ہیں انہی اگلے زمانہ کے مفسروں کے اور انہی کی تفسیروں میں سے کسی ایک کو لے کر اس پر اپنے استدلال کی عمارت کھڑی کرتے ہیں مگر وہ مفسرین جن کی تفسیروں نے عجیب وغریب معانی کی بنیاد رکھی اور عجیب وغریب مسائل کی داغ بیل ڈالی وہ وہی صدر اسلام کے مفسرین ہیں جیسے مجاہد ضحاک سدی، کلبی، مقاتل وغیرہ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے اقوال سے کتب تفاسیر بھرے پڑے ہیں۔

پھر یقین جانیے کہ عجیب وغریب معانی کی ایجاد اور تاویلوں کی تراش وخراش سب اسی اصول کے ماتحت تھی کہ قرآن آسان ہے اور ہر شخص اپنی سمجھ سے اس کے معنی بتا سکتا ہے یہی وہ خیال تھا جو جمہور اسلام میں عام طور پر پھیلا یا گیا اور اس کے ماتحت قرآن کے آیات باز یچہ اطفال بنا لئے گئے۔ اس کے برخلاف اہلبیتؑ رسولؐ کا یہ اعلان تھا کہ قرآن کے معنی ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔ اس کے لئے بڑے معلومات کی ضرورت ہے ان کا اعلان یہ تھا کہ قرآن فہمی آسان نہیں بہت مشکل ہے اور اس کے لئے خاص رہنمایان دین کے ساتھ جن کو رسولؐ کی تشریحات براہ راست پہنچے ہیں تمسک کی ضرورت ہے۔

جمہور اسلام نے ائمہ اہلبیتؑ کی اس تعلیم کو نہ پہلے کبھی مانا اور نہ بعد میں۔ اب تسلیم کرتے ہیں۔ پھر اس ترقی وتنزیل کو جو جمہور مسلمین کے ساتھ متعلق ہے اس عقیدہ سے کس طرح وابستہ کیا جا سکتا ہے؟ مسلمانوں نے کسی وقت انتہائی ترقی کی اور اب مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل ہو گئے یہ ممکن ہے بجائے خود حقیقت ہو مگر اس کا قرآن فہمی کے کسی نظریے سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے۔

اس کا سبب اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہ کہ مسلمان شروع شروع اس سادہ اور مساویانہ نظام زندگی پر بر بنائے عادت چلتے رہے جس کو پیغمبر اسلام نے رائج کیا تھا اور فطرت کے اس پیغام کو لے کر آگے بڑھے جو دلوں پر قبضہ کرنے کی طاقت رکھتا تھا، اس لئے وہ فتوحات حاصل ہوئے جنہیں آج ان کی بہت بڑی ترقی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن یہی ترقی تنزلی کا پیش خیمہ بن گئی اس لئے کہ ان میں ملوکیت کا دور دورہ ہو گیا اور سلطنت وکامرانی نے عیش وعشرت کا عمل دخل کر دیا۔ کچھ دن تک دلوں پر بیٹھی ہوئی دھاک نے قوموں کا سر اٹھنے نہ دیا لیکن جب ان کی عملی کمزوریاں طشت از بام ہوئیں اور ان کے راز ہائے درون خلوت، افسانہ ہر انجمن بن گئے تو سرگرم عمل قوموں کی جرات بڑھی۔ ان کی آپس کی رقابتوں اور داخلی کمزوریوں نے دشمن کی امداد کی اور آخر وہ ہوا جس کی بناء پر آج کہا جا رہا ہے کہ مسلمان سب سے زیادہ ذلیل ہیں۔ اگر ان کی ترقی

قرآن کے سچے اصول کو سمجھ کر انہی حدود و قواعد کے اندر ہوتی جو قرآن کے تعلیم کردہ ہیں تو وہ کبھی تنزیل سے تبدیل نہ ہوتی۔

وہ جماعت جو اقلیت میں تھی جس کے سرگروہ اہلبیتؑ معصومین تھے، انہوں نے قرآن کے بارے میں مطلق العنانی اور غیر مشروط آزاد روی کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کے لئے حدود و قواعد مقرر کیئے اور ان کے تحت میں تدبر فی القرآن سے کام لیا ان کے مختصر گروہ نے ہزاروں مادی شکنجوں کے اندر گرفتار رہ کر بڑے روحانی فتوحات کئے اور دنیا میں کوئی جماعت ایسی نہیں بتلائی جاسکتی جس نے اتنے مشکلات اور مصائب کے باجود اس طرح اپنی ہستی کو برقرار رکھا ہو اور اپنے دائرہ میں توسیع جاری رکھی ہو، یہاں تک کہ اس وقت دنیا کے ہر گوشہ میں کچھ نہ کچھ افراد اس اصول مسلک اور طریقہ کے پابند موجود ہیں۔

اسے چاہئے کوئی ترقی سمجھے یا تنزیل، بہرحال وہ ایک محدود اور معتدل سطح پر ہمیشہ رہے۔ نہ دوڑ کر زیادہ چلے اور نہ گرے مگر رہے یہ ہمیشہ اسی راستے پر کہ قرآن فہمی کوئی آسان بات نہیں، مشکل ہے اور اس لئے انہوں نے تنہا قرآن کو اپنی رہنمائی کے لئے کافی بھی نہیں سمجھا بلکہ اہلبیتؑ کے دامن سے تمسک ضروری خیال کیا۔ اب اگر ان میں روحانی حیثیت سے کچھ تنزل نظر آرہا ہو تو اس کا سبب یہ سمجھنا چاہئے کہ ان میں بھی اب ایسے لوگ پیدا ہونے لگے ہیں جو ''ہمرنگ جماعت'' بن کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ قرآن کا سمجھنا آسان ہے اور ہر شخص بذات خود اس سے نتیجہ نکال سکتا ہے اور اس کے لئے کسی غیر کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے دوستوں یہ خیال ہماری قومی زندگی کے لئے راس نہیں ہے۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ رسولؐ کی رحلت کے ڈیڑھ سو سال بعد تک اسلام میں کوئی فرقہ نہ تھا۔

غالباً اس ادّعاء کے موقع پر پیش نظر ایران یا پنجاب اور حیدرآباد کے بابی، بہائی قادیانی، چکڑالوی اور مہدوی فرقے یا اپنے ہندوستان کے بریلوی اور دیوبندی فرقے ہیں جو انہی آخری دنوں کی پیداوار ہیں ورنہ جہاں تک اسلام کے ان فرقوں پر نظر ڈالی جاتی ہے جن کے عقائد کتابوں میں مدون ہیں اور جن کے اختلافی مسائل پر بحث سے علم کلام کی تشکیل ہوئی ہے وہ تمام فرقے رسولؐ کی رحلت کے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر صدر اسلام کے واقعات پر نظر ڈالئے تو ان سے بھی معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں بھی قرآن کی مختلف تاویلیں کی جاتی تھی اور اس کے معانی میں اکثر دشواری محسوس کی جاتی تھی پھر بتائے کہ کون سا وہ دور ہوسکتا ہے جب قرآن کے معانی و مطالب بالکل متفقہ حیثیت رکھے تھے اور ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

بے شک قرآن کے مشکل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکل ''چیستان'' ہے یعنی اس سے کوئی کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔

یقیناً اہل زبان اس کے ظاہری معانی سے بہرہ اندوز ہوئے اور اسی کا اثر تھا کہ مشرکین دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور انہوں نے اس کے غیر معمولی اعجاز کا اندازہ کیا مگر غیر عربی داں طبقہ کے لئے یہ بات بھی مفقود ہے ان کے لئے قرآن کو آسان کہہ دینے کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔

(۲) بلاغت کا مفہوم

کسی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسی صاف اور سادہ زبان میں ہو کہ پڑھنے والا لکھنے والے کے مطلب کو سمجھ سکے۔ سوال یہ ہے کہ پڑھنے والا کون؟ ہر پڑھنے والا خواہ وہ زبان داں ہو یا غیر زبان داں سمجھدار یا ناسمجھ؟ حاضر الذّہن ہو یا پریشان دماغ؟ اگر بلاغت کا معیار یہ ہے اور کسی کتاب کی خوبی یہی ہے تو عالم امکان میں کوئی کتاب بلکہ کسی متکلم کا ایک جملہ بھی اس معیار پر ٹھیک نہیں اترتا۔

جب تک دنیا میں زبانیں مختلف ہیں جب تک کہ دل و دماغ کی طاقتیں جداگانہ ہیں جب تک سننے والوں کی کیفیتوں میں اختلاف ہے

اس وقت تک تو یہ ناممکن ہے کہ کسی کلام سے ہر پڑھنے والا پورا فائدہ اٹھا سکے اس لئے کم از کم آپ کو یہ قید تو لگانا ہی پڑے گی کہ جس زبان میں وہ کلام ہے اس زبان کے واقف کار اس کلام کو سمجھ سکیں اور اس قید کے لگانے کی وجہ سے ہی قرآن کی اس آسانی سے اردو داں طبقہ کی محرومی ظاہر ہے۔

خود ایک زبان میں مختلف مقامات کے محاوروں میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ ایک کلام سب کے لئے مساوی نہیں ہوسکتا۔ مختلف شہروں کی زبان جدا، شہر اور دیہات کی زبان بالکل الگ الگ بلند اور سفید پوش طبقہ اور بازاری لوگوں کی زبان علیحدہ اور مردوں، عورتوں کی زبان مختلف ہوتی ہے اس لئے زبان کے اکثر فقرے ایسے ہوں گے جو کسی کے لحاظ سے آسان اور کسی کے لحاظ سے مشکل ہوں نتیجہ صاف ہے کہ سب کے لئے ان کی آسانی قائم نہیں رہ سکتی۔ اب میں نہیں سمجھ سکتا کہ بلاغت کے مذکورہ معیار پر کون سا وہ کلام ہوگا جو بلیغ کہا جا سکے؟

کہا جا سکتا ہے کہ بلیغ کلام وہ ہے جو مخصوص مخاطبین کے لحاظ سے جن کو براہ راست متوجہ کر کے وہ کلام کیا جا رہا ہے دشوار گزار نہ ہو مگر اس صورت میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہر شخص کے لئے آسان ہی ہوگا اور کسی کو اس کے سمجھنے کے لئے شرح اور تفسیر کی ضرورت نہ ہوگی۔

پھر قرآن کی اگر وہ حیثیت ہے جیسا کہ معرض نے کہا ہے کہ وہ لیکچروں کا مجموعہ اور ان لیکچروں کے ضمن میں جو خاص سوالات ہوئے ہیں ان کا جواب بھی ہے تو بالکل ظاہر ہے کہ لیکچر کے ماحول، حاضر الوقت اشخاص کے معیار فہم اور سائلین کی ذہنیت کا لحاظ ضروری ہے یہی بلاغت کا حقیقی تقاضا ہے اس سے عمومی آسانی کا نتیجہ کہیں برآمد ہوسکتا ہے۔

اس پر بھی غور کر لیجئے کہ زبان میں زمانہ کے امتداد سے کتنے انقلابات ہوجاتے ہیں قرآن کی تنزیل کو ساڑھے تیرہ سو برس ہوئے ہیں غیر ممکن ہے کہ اس مدت میں تمام محاورات اپنی اصلی حالت پر باقی رہیں نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے خالص عرب اہل زبان بھی قرآن کے معانی کی صرف اپنی زبان دانی کے بھروسے پر نہیں سمجھ سکتے بلکہ انہیں بھی قدیم محاورات عرب کے تتبع قدیم ذخیرہ ادب پر عبور اور آیات واحادیث کے مختلف استعمالات میں غور وخوض کی ضرورت ہے اور اس لحاظ سے قرآن کے لئے بھی بالکل آسان نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جہاں تک فصاحت اور سلاست کا تعلق ہے وہ الفاظ کے لغوی معنی اور کلام کے عرفی مفاہیم ہو سکتے ہیں لیکن جو کسی خاص شعبہ کے اصلاحات ہوتے ہیں وہ بہر حال اس شعبہ کے ماہرین کی تشریح پر موقوف ہوں گے۔ قرآن ایک خاص شریعت کا ترجمان بن کر آیا تھا، اس لئے اس میں اس قسم کے الفاظ اور معنی کی کمی نہیں ہے۔ صلوۃ، زکوۃ، حج، صیام، خمس، انفال، جہاد، وغیرہ سب اصطلاحی لفظ ہیں ان کی تشریح ہرگز صرف زبان دانی کی بناء پر نہیں ہوسکتی اس کے لئے ماہرین شریعت کی تفسیر کی ضرورت ہوگی۔

اس صورت میں کیوں کر کہا جا سکے گا کہ قرآن بالکل آسان ہے اور ہر شخص اسے سمجھ سکتا ہے۔

پھر اب غور کیجئے کہ کلام کا مشکل ہونا جو بلاغت کے خلاف ہے اور جس کے لحاظ سے کلام آسان ہونا چاہئے وہ کیا ہے؟

اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کلام میں عام اصول محاورہ کے خلاف کوئی ایسا الجھاؤ ہو جس کے وجہ سے محاورہ سے واقف اہل زبان اس کے معنی کو نہ سمجھ سکیں خواہ وہ الجھاؤ ترکیب نحوی کے لحاظ سے ہو۔ اس کو اصطلاحاً تعقیدِ لفظی کہتے ہیں یا بعید از ذہن استعارات وکنایات کے استعمال سے ہو اس کو تعقید معنوی کہتے ہیں یا الفاظ ایسے صرف کئے گئے ہوں جن کے اس مفہوم کے لئے جو متکلم نے مراد لیا ہے عام طور پر فصحائے اہل زبان کچھ دوسرے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان الفاظ سے وہ واقف نہیں ہیں اس کو ''غرابت'' کہتے ہیں۔

لیکن اگر کلام بجائے خود اصول محاورہ کے مطابق ہے اور انہیں الفاظ پر مشتمل ہے جو اس کے دور ورود میں فصحاء کی زبانوں پر چڑھے

ہوئے تھے مگر اب ہمارے لئے مشکل ہے اس وجہ سے کہ ہم اس زبان سے اس دور کی زبان کے خصوصیات سے ناواقف ہو گئے ہیں تو اس طرح مشکل ہونا ہرگز کلام کا عیب نہ ہوگا بلکہ ہمارا نقص ہوگا کہ ہم اس کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں۔

اس کے بعد یہ دیکھئے کہ ایک ہوتے ہیں کلام کے لفظی معنی یہ تو ایک کلام ہے جو کہ سلیس زبان میں ہے ہر زبان داں جوان محاورات سے واقف ہو سمجھ لے گا اور اگر نہ سمجھے تو خیر مان لیجئے کہ کلام کا نقص ہے لیکن ایک ہوتے ہیں وہ مطالب جو لفظی معانی کی تہوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ جتنا غور کیا جائے اتنے نتائج اور حقائق کلام سے زیادہ منکشف ہوتے جائیں۔ یہ وہ چیز ہے جو متکلم کی بلندی اور قابلیت کے لحاظ سے گہری ہوتی چلی جاتی ہیں اور کلام کے اس حیثیت سے سمجھنے کے لحاظ سے انسانی جماعت کا مجمع اتنا ہی چھٹتا جاتا ہے جتنا بلند متکلم کا وہ کلام ہے۔

اب اگر یہ صحیح ہے کہ قرآن ایک غیر معمولی درجہ کا کلام ہے تو ضرور اس میں یہ بلندی موجود ہوگی اور یقیناً انسانی دماغ کی ایک بلند سطح ہی وہ ہوگی جو اس کے معانی و نکات کا اچھی طرح ادراک کر سکے۔

اگر اس میں یہ بات نہیں ہے اور وہ بالکل ہی سطحی باتوں پر مشتمل ہے جن کو ہر معمولی انسان پوری طرح سمجھ لیتا ہے اور اس کے آگے اس میں کچھ تو یہ آسانی ''یقیناً'' اس کا نقص ہے۔

(۳) قرآن سے ثبوت

اب خود قرآن سے پوچھئے کہ وہ کیا کہتا ہے؟

اپنے کو آسان بتاتا ہے یا مشکل؟ اس کے لئے ذیل کے آیات ملاحظہ ہوں:

(۱) متعدد آیات میں رسولؐ کے فرائض میں تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم کتاب کو قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سورۃ بقرۃ۔ ۱۲۹)

يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سورۃ بقرہ۔ ۱۵۱)

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سورۃ آل عمران۔ ۱۶۴ و۔ سورۃ جمعۃ ۲)

اس سے ظاہر ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا آیات کتاب کو پڑھ کر سنانا (یہ کام الفاظ سے متعلق ہے) اور اس کتاب کی تعلیم دینا (یہ معانی سے متعلق ہے)

اگر قرآن آسان ہوتا اس طرح کہ ہر شخص اس سے خود ہی سب کچھ سمجھ لیتا تو تعلیم کی ضرورت نہ تھی۔

(۲) هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (آل عمران۔ ۷)

''اس نے آپؐ پر کتاب اتاری ہے جس میں کچھ تو کھلی ہوئی آیتیں ہیں جو ''ام الکتاب'' ہیں اور کچھ ''متشابہہ'' ہیں۔ فتنہ پردازی اور تاویل سازی کے لئے، حالانکہ نہیں جانتا اس کی تاویل کو مگر خدا اور ''راسخین فی العلم'' کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں سب ہمارے پروردگار کی جانب سے ہے اور نہیں اس سے اثر لیتے مگر وہ لوگ جو سمجھ دار ہوں۔''

اب آپ دیکھیے کہ قرآن خود بتلا رہا ہے کہ اس میں دو قسم کی آیتیں ہیں کچھ آسان اور کچھ مشکل اور یہ کہ مشکل آیتوں کی اصلی تاویل کو سب نہیں جانتے بلکہ اس کے جاننے والے مخصوص ہیں میں نے ترجمہ میں ''ام الکتاب'' اور ''متشابہہ'' کی اصلی لفظوں کو اس لئے لکھ دیا کہ قرآن کو آسان کہنے والے خود ہی ان کے معنی سمجھ لیں تفسیر کی کیا ضرورت؟

اور دوسرے اشخاص کے لئے اس کے واسطے مستقل تبصرہ آئے گا جس میں اس کی مکمل تشریح کی جائے گی۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ.

یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے بابرکت تا کہ یہ لوگ اس کے آیات میں غور کریں اور تا کہ صاحبان عقل اس سے اثر قبول کریں جو شئے بالکل کھلی ہوئی اور آسان ہو اس کے لئے غور کی ضرورت نہیں ہوتی نیز صاحبان عقل وفہم سے مخصوص کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالکل سطحی مطالب پر مشتمل نہیں ہے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا.

تو وہ کیا قرآن میں غور نہیں کرتے؟ کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں

اس آیت میں لوگوں سے شکوہ کیا گیا ہے کہ اگر قرآن بالکل سطحی ہوتا تو غور وخوض کی ضرورت نہ ہوتی

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ.

اس میں یاد دہانی ہے اس کے لئے جو دل ودماغ رکھتا ہو یا کان لگائے اس حالت میں کہ حاضر الذہن ہو

جو چیز بالکل سطحی اور آسان ہوتی ہے اس کے لئے ان شروط کی ضرورت نہیں ہے ہر شخص خود ہی آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔

اب جو آیتیں بتلائیں۔ کہ قرآن آسان ہے ان کے معنی وہی سمجھنا چاہئیں جو ہم نے ''بلاغت'' کی بحث میں اس سے پہلے لکھے ہیں یعنی اس کلام میں عام اصول محاورہ کے خلاف کوئی ایسا الجھاؤ نہیں ہے جس کی وجہ سے اصول محاورہ سے واقف اہل زبان اس کا مطلب نہ سمجھ سکیں اور یہ کہ اس کی زبان آسان ہے نہ یہ کہ اس کے مطالب سطحی ہیں جن کو ہر شخص بغیر کسی غور وتامل یا تعلیم کے سمجھ سکتا ہے۔

اب ان آیات پر نگاہ بھی ڈال لیجئے۔

کچھ وہ آیتیں ہیں جن میں قرآن کے (مفصل) ہونے کا ذکر کیا گیا ہے مگر اس کی تفصیل میں خود قید موجود ہے (لقوم یعلمون)

ملاحظہ ہو آیت ۱ تا ۳ حم السجدہ

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۚ﴿۲﴾ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳﴾

دوسر آیت وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴿۱۱﴾ (سورہ توبہ۔۱۱)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کا مفصل ہونا ہر شخص اور ہر جماعت کے لحاظ سے نہیں ہے پھر ان آیات سے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن ہر شخص کے لئے آسان ہے اور اہل علم کی تشریح وتفسیر کی ضرورت نہیں ہے۔

کچھ وہ آیات ہیں جن میں قرآن کی زبانوں کو ''مبین'' کی لفظ سے یاد کیا ہے مگر ان سے جو نتیجہ نکلتا ہے، وہ خود قرآن کو آسان کہنے والے کی زبان سے سن لیجئے:

قرآن عربی زبان میں اس قوم کے لئے جو عربی جانتی تھی یعنی جس کی مادری زبان عربی تھی کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور ایسی زبان میں قرآن نہیں جس کو عرب نہ سمجھ سکتے تھے۔

اب بتایئے کہ اس آسانی سے غیر عربی داں طبقہ کو بلکہ ان کو جن کی مادری زبان عربی نہیں ہے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے وہ بہر حال زبان کی تشریح و تفصیل کے محتاج ہوں گے اور تفسیر کی ضرورت باقی رہے گی۔

یاد رکھنا چاہئے کہ جو ایک زبان میں زیادہ آسان ہوگا، وہی دوسری زبان میں زیادہ مشکل ثابت ہوگا۔

بات یہ ہے کہ زبان کی آسانی روزمرہ کے محاورات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے اور محاورے ہی وہ ہوتے ہیں جن کا ترجمہ بعض اوقات مشکل اور بسا اوقات غیر ممکن ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر اپنی زبان میں مشکل عبارت ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں استعارے کنائے صرف ہوئے ہیں یا دقیق مطالب ہیں اور یہ دونوں چیزیں وہ ہیں جو دوسری زبان میں منتقل ہو سکتی ہیں۔

پھر اگر قرآن کو عربی زبان والوں کے لئے آسان کہا بھی گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکل سکتا ہے کہ وہ سب کے لئے آسان ہے اور مطلب تو یہی تھا کہ ہمارے اردو دان طبقہ کو آسانی پیدا ہو اور انہیں علماء سے دریافت کرنے اور تفسیر و تشریح کی جستجو کی ضرورت نہ ہو مگر یہ مطلب قرآن کی آیتوں سے کسی طرح نہیں نکلتا۔

(۴) قرآن کا مطالعہ

ہم خود قرآن کو پڑھیں اور دیکھیں کہ سمجھ میں آتا ہے یا نہیں۔ مجھے نہیں معلوم قرآن کو پڑھ کر دیکھنے کا کیا مطلب ہے؟ اصل الفاظ قرآن کو دیکھ کر؟ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں سمجھنا عربی دانی پر موقوف ہے اور غیر عربی دان ہرگز نہیں سمجھیں گے۔

یا یہ مطلب ہے کہ ترجمہ کو پڑھ کر؟ بظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس کے ثبوت میں بہت سا وقت قرآن کی آیتوں کے ترجمے پیش کرنے پر صرف کیا گیا ہے۔ مگر یاد رکھیئے کہ یہ ترجمے سب عربی دان لوگوں کے کئے ہوئے ہیں اگر یہ سمجھ میں آجاتے ہیں تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ یہ ترجمے آسان ہیں لیکن یہ نہیں ثابت ہوگا کہ قرآن بالکل آسان ہے۔

آسان ہونے کے ثبوت میں اپنی سمجھ کا مظاہرہ اس طرح کرنا کہ قرآن کے معنی لیکچر کے ہیں (حالانکہ یہی غلط ہے قرآن کے لفظی معنی ''لیکچر'' کے نہیں بلکہ ''ریڈنگ'' کے ہیں) اور ان لیکچروں کا موضوع یہ ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، قیامت پر ایمان لاؤ وغیرہ یہ سب باتیں بالکل آسان ہیں لہٰذا قرآن آسان ہے۔ میرے خیال میں اگر آسان ہونے کا یہی معیار ہے کہ اس طرح کا ایک خلاصہ آدمی سمجھ لے تو دنیا کی کوئی کتاب مشکل نہیں ہے۔

بڑی سے بڑی فلسفہ کی دقیق کتاب آسان ثابت کی جا سکتی ہے یہ کہہ کر کہ اس کا موضوع یہ ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے اور کن باتوں کے کیا اسباب ہیں اور منطق کی کتاب اس کا موضوع یہ ہے کہ کن طریقوں سے نامعلوم باتیں معلوم کی جائیں۔ وغیرہ وغیرہ مگر کوئی کتاب جو مشکل ہوتی ہے وہ ان جزئیات اور خصوصی مطالب کے لحاظ سے جو اس عام موضوع کے تحت میں بیان کے گئے ہیں۔۔ اس لئے قرآن کو بھی اس مجمل خلاصہ کے اعتبار سے نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ اس کے تفصیلی مضامین کے لحاظ سے تب آسان اور مشکل ہونے کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔

قرآن کی آسانی کے ثبوت میں بہت سی آیتوں کے تراجم پیش کیئے گئے ہیں مگر یاد رکھیے کہ تراجم سب تفسیر کے ماتحت ہیں یعنی جس قسم کی

تفسیر کو مترجم نے قبول کیا ہے اس کے مطابق آیت کا ترجمہ کیا ہے ان تراجم سے مدد لینا حقیقتاً تفاسیر کا پابند بننا ہے پھر تفسیر سے بے نیازی کا دعویٰ کیوں کر قابل قبول ہوسکتا ہے۔

ترجمے صرف تحت اللفظی معنی پر مشتمل نہیں ہوا کرتے ورنہ بعض اوقات شاید ان سے کچھ بھی مطلب سمجھ میں نہ آئے بلکہ بریکٹ میں توضیحی الفاظ محذوفات کی خانہ پری کے لئے ضمیمے درج کیے جاتے ہیں ان کا اقرار خود سابقہ دلائل کے ذیل میں موجود ہے کہ: ''مترجم قرآن میں بریکٹ ( ) کے اندر جو لکھا جاتا ہے وہ ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے بڑھاتا ہے قرآن میں ایسے کوئی لفظ نہیں ہوتے۔''

اس طرح کے ترجموں کو حقیقتاً ایک مختصر تفسیر سمجھنا چاہئے پھر ان ترجموں کی مدد سے اگر قرآن آسان ہو گیا تو اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکلے گا کہ وہ بغیر تفسیر کی مدد کے خود آسان ہے۔

بے شک اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آجائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بیکار ہیں مگر یہ اس وقت ہے جب کوئی شخص تنہا الفاظ قرآن سے معنی سمجھ لے لیکن اگر اس نے مترجمین کی تفسیروں سے مدد لے کر معنی سمجھے تو تفاسیر بیکار کہاں ثابت ہوئے؟

شان نزول کو بیکار سمجھنا یہ کہہ کر کہ ''عام طور سے جو اصول بیان کے جاتے ہیں وہ اصول شان نزول کے پابند نہیں ہوتے بالکل غلط ہے اکثر آیتیں بنیادی حیثیت سے شان نزول ہی سے مخصوص ہیں مثلاً قرآن میں کہا گیا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ ۔۔۔ الخ (المائدہ۔ ۳)

''آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کیا''۔ اب جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو کہ آیت کس دن اتری؟ ''آج سے کیا مطلب سمجھا جائے؟

یا یہ آیت کہ: اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ (المائدہ۔ ۵۵)

اگر خصوصیت واقعہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ عام اصول کہاں ہے کہ جو حالت رکوع میں زکوۃ دے۔ اس کے واسطے ولایت ضرور ثابت ہو یا یہ آیت کہ۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۔ (بقرہ۔ ۱۸۷) آخر کس اصول کی حامل ہے؟

یہ کہنا کہ ''عام طور پر سورے نازل ہوتے تھے، متفرق آیتیں نہیں اترتی تھیں، حقیقت کے بالکل خلاف ہے چھوٹے سورے تو خیر اکثر ایک ساتھ اترے ہونگے مگر جو بڑے سورے ہیں ان میں خود آیت کا مضمون صاف بتلاتا ہے کہ وہ مختلف موقعوں پر اتری ہوئی ہیں اگر سورے ایک ساتھ نازل شدہ ہوتے تو آیتوں میں ناسخ اور منسوخ آیت ایک ہی سورہ میں موجود نہ ملتی خصوصاً اس طرح کہ ناسخ پہلے اور منسوخ بعد کو نیز مکی اور مدنی آیتیں مخلوط نہ ہوتیں حالانکہ موجودہ ترتیب قرآن میں یہ سب کچھ باتیں ہیں۔

اس کا ذکر ہمارے رسالہ ''تحریف قرآن کی حقیقت'' میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

اب مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن مشکل ہے یا آسان۔

نواں تبصرہ

تفسیر واصول تفسیر

تفسیر بالرائے کے معنی تنزیل وتاویل میں فرق

محکم ومتشابہہ میں امتیاز اور تفسیر قرآن کے شرائط

گزشتہ تبصرہ میں فہم قرآن کے بارے میں جو افراط وتفریط کی کارفرمائیاں ہیں، ان کا تذکرہ ہو چکا جن سے ایک طرف ہمارے یہاں اخباری حضرات پیدا ہوئے اور دوسری طرف اہلسنت میں ''اہل قرآن'' یا پرویزی جماعت کا وجود ہوا۔

یہ تو منظم جماعتیں ہیں جنہوں نے ایک طرف مستقل فرقوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ان کے علاوہ غیر ذمہ دارانہ طور پر انفرادی خود رائیوں کے کرشمے ہیں جن میں ایک طرف موجودہ زمانہ کا (بخیال خود) ''روشن خیال'' گروہ ہے جو اپنی آزادروی کے لئے قرآن مجید کے اجمال سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ نعرہ بلند کرتا ہے کہ قرآن سے ثبوت ہونا چاہئے اور جب قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں ہے تو ہم سے اس کی پابندی کا مطالبہ کس لئے؟

کچھ خود رَو قسم کے محققین ہیں جو قرآن فہمی کے مبادی کو طے کیئے بغیر فہم قرآن کے مدعی ہو کر اپنے طبع زاد خیالات کو قرآن کے سر منڈھتے ہیں۔

بعض واعظین نکتہ آفرینی کے ذوق میں یا مجمع سے داد حاصل کرنے کے لئے یا نادانی کے باوجود ہمہ دانی کے مظاہرہ میں آیات قرآن کے لئے ایسے طبعزاد معانی کا اختراع کرتے ہیں جو الفاظ کتاب الٰہی سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔

مذکورۂ بالا بے راہ رویوں کے دیکھنے کے بعد جب ہم ہادیانِ دین کے ارشادات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کا مضمون ہمیں بظاہر مختلف نظر آتا ہے۔

ایک طرف تو قرآن مجید سے استفادہ کی دعوت دی گئی ہے احکام شرعیہ میں بطور استدلال آیات قرآن کو اس پیرائے میں پیش کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آیات اس حکم کے سمجھنے کے لئے کافی ہیں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید کے معانی کا سمجھنا عام اہل علم وفضل کے لئے ناممکن شے نہیں ہے۔

دوسری طرف یہ ارشاد ہوا ہے کہ اِنَّما یعرف القرٰان مَنْ خوطب بہٖ قرآن کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اسکے حقیقی مخاطب ہیں''۔

اس کے ساتھ تفسیر بالرّائے کو گناہ عظیم بتلاتے ہوئے ارشاد کیا:

مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَاْیِہٖ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ.

جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی وہ اپنا ٹھکانا آتش جہنم میں بنالے۔

یہ بھی ارشاد کیا کہ:

مَنْ فَسَّرَ الْقُرْاٰنَ بِرَا یِہٖ فَاِنْ اَصَابَ فَقَدْ اَخْطَاءَ.

جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی اس نے اگر ٹھیک بھی کہا تو بھی غلطی کی۔

مطلب یہ ہے کہ جو معنی اس نے اپنی رائے سے بتائے ہیں، چاہے اتفاق سے وہ صحیح بھی ہوں لیکن یہ کام بہر حال غلط ہے جو اس نے کیا۔اس طرح قرآن مجید میں عقل آرائیوں کا سد باب کر دیا۔ضرورت ہے کہ ایک طرف مذکورہ سابق حد افراط یا تفریط تک نکل جانے والے خیالات کی تعدیل کی جائے یعنی اس نقطہ اعتدال کا پتہ لگایا جائے جہاں تک تفسیر قرآن کے سلسلہ میں جانا درست ہے اور جس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں اور دوسری طرف ان احادیث واخبار میں مطابقت پیدا کر کے ان کو ایک نقطہ پر جمع کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ ان کا مجموعی طور پر مفاد کیا ہے؟

اس کے لئے حسب ذیل تمہید پر غور سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے الفاظ سے استفادہ معانی جو الفاظ و معانی کے مخصوص ارتباط کا نتیجہ ہے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعدد مرتبے اور مختلف درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ لفظ جو کسی معنی کے لئے وضع ہوئی ہے جب گوش گزار ہو تو فوراً ذہن اس معنی کی طرف منتقل ہو جائے اور وہ معنی دماغ میں گردش کرنے لگیں اس کے لئے یہ ضرورت نہیں یہ کہ متکلم نے وہی معنی مراد بھی لئے ہوں، بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس لفظ کا اظہار کرنے والا کوئی بافہم وشعور متکلم ہو، بلکہ دروازہ کے کھولنے بند کرنے میں اس کے چوکھٹ بازو اور چولوں سے اگر آواز نکلتی ہو اور کسی خاص لفظ کی تشکیل کر رہی ہو جو کسی معنی کی حامل ہے تو ذہن میں وہ معنی آئیں گے ضرور، حالانکہ معلوم ہے کہ وہ کسی متکلم کے زبان و ذہن کی لفظ نہیں کہ اس سے یہ معنی مراد بھی ہوں۔یہ دلالت، دلالت تصور یہ ہے کہ اس لئے کہ لفظ کے سننے کے بعد صرف معنی کا خطور ذہن میں ہوتا ہے اس پر کوئی حکم ایجابی یا سلبی نہیں لگایا جاتا لہٰذا تصور ہی تصور ہے تصدیق کا پتہ نہیں ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ لفظ کے استعمال کے ساتھ معنی ذہن میں آئیں اور اس طرح کہ متکلم نے یہی معنی مراد بھی لئے ہیں اور استعمال لفظ کا اسی معنی میں کیا ہے۔اس کو کہا جائے گا دلالت تصدیقیہ اس لئے کہ یہاں تصور ہی تصور نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ حکم بھی ہے کہ متکلم نے یہی معنی مراد لئے ہیں۔

یہ دلالت اسی وقت پیدا ہوگی جب متکلم فہم وشعور رکھتا ہوا اور اس نے ارادہ کے ساتھ کلام کیا ہو لہٰذا دروازہ سے سنائی دینے والی آواز میں یہ دلالت پائی نہیں جا سکتی اس طرح اگر متکلم باشعور ہستی ہو مگر بوقت تکلم معلوم ہے کہ قصد وارادہ موجود نہیں ہے جیسے: سرسامی کا ہذیان اور مست بے ہوش کی بکواس، اس صورت میں بھی دلالت تصدیقیہ کا وجود نہ ہوگا۔

دلالت تصور یہ تو لفظ کے گوش زد ہوتے ہی فوراً پیدا ہوتی ہے اور بدلتی نہیں لیکن دلالت تصدیقیہ برقرار صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کلام ختم ہو جائے اور کوئی قرینہ اس کے خلاف نہ آئے اس لئے کہ اکثر خاتمہ کلام کے موقع تک ایسے قرائن آجاتے ہیں جو لفظ کو پہلے معنی سے ہٹا کر کسی دوسرے معنی کا جامع پہنا دیتے ہیں مثلاً متکلم کی زبان سے نکلا ''رَاَیْتُ اَسَداً'' جس کا ترجمہ ہے ''میں نے شیر دیکھا''۔یہاں مخاطب کے کان میں لفظ ''اَسَداً'' پہونچتے ہی ''شیر'' کے معنی ضرور آجائیں گے اور شیر بھی وہی جو جنگل والا ہے یہ دلالت تصور یہ ہے کہ اور ابھی ذہن میں خیال بھی یہی ہوتا ہے کہ وہی مراد ہے لیکن مختتم طور پر یہ فیصلہ کہ یہی مراد ہے اس وقت ہوگا کہ جب اس کی بعد ''یرمی'' کا لفظ نہ آجائے یعنی وہ

تیر اندازی کرتا ہے۔ اگر یہ یا ایسی ہی کوئی لفظ آ گیا تو دلالت تصدیقیہ منقلب ہو جائے گی اور یہ سمجھا جانے لگے گا کہ اس سے مراد مجازی معنی ہیں یعنی بہادر انسان۔

ان دونوں دلالتوں کے بعد تیسرا درجہ یہ ہے کہ کلام کے مقصود اصلی کا پتہ چلایا جائے کیوں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ کے بجائے خود معنی کچھ ہیں اور وہ بحیثیت استعمال الفاظ مراد بھی ہیں لیکن اصلی مقصود وہ نہیں ہیں بلکہ اس معنی سے ذہن کا منتقل کرنا منظور ہے کسی اور چیز کی طرف جو درحقیقت بتلانا منظور ہے جیسے کنایہ کی صورت میں کہنے والا کہتا ہے میں اب تمہارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا''۔

اس جملہ میں کوئی لفظ اپنے اصلی معنی کے علاوہ دوسرے معنی میں مستعمل نہیں ہے لیکن پھر بھی اصلی مقصود اس جملہ کے کہنے سے یہ نہیں ہوتا کہ ''میں قدم نہ رکھوں گا'' بلکہ یہ کہ ''میں آؤں گا نہیں'' اس بناء پر اگر وہ خود اپنے پیروں پر اس کے گھر میں نہ جائے بلکہ کسی سواری پر داخل ہو تب بھی اس کا عمل اس کے قول کے خلاف قرار پائے گا۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ لفظ معنی اور مقصود کلام اس سب کے تمام ہونے کے بعد سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اس کلام سے اشارہ کس امر کی طرف ہے۔ مثلاً اتفاق سے مخاطب نے کبھی اس متکلم سے کہا تھا کہ میں تمہارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا۔ آج یہ اسی طرح کہہ رہا ہے کہ میں تمہارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا اور اس کا اشارہ اس کے کہنے سے اس طرف ہو کہ یہ بدلا ہے تمہاری اس دن کی بات کا جو تم نے کہی تھی یہ قسم پہلے تینوں درجوں سے بالکل مختلف ہے وہ درجے لفظ اور اس کے معنی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ چیز جسے ہم نے چوتھے درجہ پر قرار دیا ہے لفظ اور اس کے معنی سے بالکل خارج ہے۔

اس بناء پر کسی شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں نقل بالمعنی کی صورت میں یہ حق حاصل ہے کہ انسان ان الفاظ کے تحت اللفظی معنی کو الفاظ کی الٹ پلٹ کے ساتھ جو معنی کی تبدیلی کا باعث نہ ہو یا مرادفات کے استعمال کے ساتھ بیان کرے۔ مثلاً پاؤں اس کے گھر میں نہ رکھوں گا اسے بیان کر دے کہ اس نے کہا میں اس کے یہاں قدم نہ رکھوں گا''۔

کیوں کہ ان الفاظ کے معنی یہ ہیں اس لئے ان الفاظ کا بھی منسوب کرنا اُس کی طرف صحیح ہے اِسی طرح جو اصل مقصود ان الفاظ کا جو سمجھ میں آیا ہے اسے بھی منسوب کر سکتا ہے۔ مثلاً، کہے کہ اس نے کہا میں اُس کے یہاں اب کبھی نہیں جاؤں گا۔

مگر وہ خارجی چیز جو چوتھی قسم میں ذکر کی گئی ہے جو کلام سے بطور اشارہ نکالی جاتی ہے وہ ہرگز مقولہ، متکلم قرار نہیں پا سکتی اور نقل قول کے موقع پر اس کا ذکر صحیح نہیں ہے مثلاً مذکورہ بالا مثال میں یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس نے کہا ''یہ تمہاری اس دن کی بات کا جواب ہے کیوں کہ اس نے یہ بات کہی ہرگز نہیں تھی بلکہ اس کی بات سے جو اس نے کہی تھی ہم نے اپنے ذہن سے یہ اشارہ پیدا کیا تھا لہٰذا سے اس قائل کی طرف بطور مقولہ منسوب کرنا کسی صورت سے صحیح نہیں ہے۔

دوسرا فرق ایک اور ہے وہ یہ کہ الفاظ کے پہلی قسم کے معنی ہمیشہ ایک ہی ہو سکتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ ایک لفظ سے بوقت واحد ایک زیادہ معنی مقصود ہوں لیکن یہ معانی کہ جو بطور اشارہ نکل سکتے ہیں وہ ایک سے بہت زیادہ ہو سکتے ہیں بلکہ کلام اتنا ہی اعلیٰ پایہ کا ہوگا جتنے اس قسم کے معانی اس میں زیادہ پیدا ہو سکیں۔

پہلی قسم کے معانی الفاظ کی واضح لغوی سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر قرائن لفظیہ و معنویہ سے وابستہ ہیں جو بہر حال محدود و منضبط ہیں لیکن

دوسری قسم کے معانی میں سننے والے کی ذہنیت اور اُفتادِ طبع کا بڑا دخل ہے کیوں کہ یہ معنی لفظ کے تحت میں نہیں ہوتے بلکہ لفظ کے معنی ومطلب کو سمجھ کر پھر سامع خود ایک رائے قائم کرتا ہے جس میں اکثر سامع کے حسن ظن یا بدگمانی وغیرہ کا اثر ہوتا ہے اور وہ متکلم کے ذہن میں بھی نہیں ہوتے جیسے محفل میں ایک شخص درزی پیشہ کسی کے ان الفاظ کو کہ ''خدا کے فضل سے مجھے چوری کی عادت کبھی نہیں رہی ہے''۔ سن کر یہ رائے قائم کرلے کہ اس میں مجھ پر تعریض منظور ہے کہ اس شخص کی چوری کی عادت ہے جیسا کہ کہاوت ہے ''چور کی داڑھی میں تنکا''

اسی طرح سابق وحال کے حالات کو پیش نظر رکھ کر کبھی یہ اشارہ پیدا کرلیا جاتا ہے حالانکہ متکلم کو بہ وقت کلام ان حالات کا لحاظ نہیں ہے۔

غرض یہ کہ اس قسم کے اشارے پیدا کرنے میں وسعت بہت بڑی ہے مگر اس میں قدم قدم پر غلطیاں واقع ہونے کا امکان ہے۔

ایک شخص کسی کو اپنا دشمن سمجھتا ہے لہٰذا اس کی ہر بات میں اپنے لئے کچھ نہ کچھ برا پہلو پیدا کرتا ہے حالانکہ بہت ممکن ہے کہ اس نے نیک نیتی کے ساتھ وہ کلام کیا ہو اور کسی برے پہلو کا قصد نہ رکھا ہو اور ایک شخص جو دوسرے کو اپنا دوست سمجھے ہوئے ہے وہ اس کی ہر بات میں محبت ہی کا پہلو محسوس کرتا ہے چاہے اس بات کرنے والے کے ذہن میں نہ ہو۔ یہ چار درجے ہیں جو کسی نہ کسی طرح مقصود کلام کی تعیین کے مرحلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک پانچویں چیز ہے اور وہ تعیین مصداق کلام یعنی لفظ کے جو بھی معنی کسی نہ کسی صورت سے سمجھ میں آئے ہیں اب یہ دیکھا جائے کہ وہ معنی کس فرد میں پائے جاتے ہیں اور کون ان کا مصداق یا مصداق کی فردِ اکمل قرار پاتا ہے۔

اس کا شرح کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بالکل خارجی اور واقعاتی اور کبھی کبھی اعتقادی چیز ہوتی ہے۔

عام کلام میں جسے شرح کہتے ہیں اسی کو قرآن کی نسبت سے تفسیر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا تفسیر کا تعلق تو کسی نہ کسی درجہ میں معنی کلام الٰہی کے ساتھ ہوتا ہے اب کسی لفظ کے اس معنی کو برقرار رکھتے ہوئے اگر مشاہدہ، تجربہ یا عقل یا موجودہ تحقیقات کی رہنمائی سے کام لے کر اس کے کسی ایسے مصداق کا اظہار کیا جاتا ہے جسے سابق میں نہیں لکھا گیا تو یہ ''تفسیر بالرائے کے تحت میں مندرج نہیں ہوسکتا۔

مثلاً

(۱) قرآن مجید میں ہے:

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ. اس کے معنی صاف ظاہر ہیں کہ خداوند عالم مالک ہے دو مشرقوں کا اور دو مغربوں کا مشرق سے مراد بھی جیسا کہ اس کے ظاہری معنی ہیں مشرق آفتاب اور مغرب سے مراد مغرب آفتاب۔

اب اگر کوئی شخص یہ کرے کہ اس کے معنی کو بدل دے اپنی عقل پر زور دے کر مثلاً یہ کہہ دے کے مشرقین سے مراد ''مشرق آفتابِ نبوت اور مشرق خورشید امامت ہے یہ تو یقیناً معنی میں تصرف ہے اس لئے ہماری آئندہ بحث سے تعلق رکھتا ہے لیکن مشرق ومغرب کے ظاہری معنی کو برقرار رکھتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کرنا کہ یہ دو مشرق اور مغرب کون سے ہیں؟ تفسیر نہیں ہے۔

سابق زمانہ کے مفسرین نے مشرقین ومغربین کا مصداق گرمی اور جاڑے کا مشرق ومغرب قرار دیا، اس لئے کہ ان کے ذرائع معلومات محدود تھے۔ ان کو اس زمانہ کے ایسے انکشافات حاصل نہ ہوئے تھے۔ اب اگر کوئی شخص موجودہ زمانہ کے حاصل شدہ معلومات کی بناء پر

یہ کہے کہ مشرقی ومغربین کا حقیقی مصداق امریکہ کے انکشاف سے سامنے آیا ہے اور دو مشرق اور دو مغرب اس قطر زمین پر جدھر ہم ہیں اور اس قطر زمین پر جدھر امریکہ واقع ہے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور یہ آیت قرآن کی امریکہ کے وجود کا پتہ دے رہی تھی جسے اسی وقت کے لوگ نہ سمجھے تھے اور یہ اس کا ایک اعجازی پہلو ہے جواب سامنے آیا ہے تو یہ تفسیر بالرائے نہ ہوگا اس کے لئے ہم کو قول معصوم سے سند کی ضرورت نہیں ہے جب کہ خود قرآن مجید میں بغیر کسی تصرف معنوی کے دو مشرق اور دو مغرب کا ذکر موجود ہے اور اب تک ہم اپنی کوتاہی معلومات سے دو مشرقوں اور دو مغربوں کا اتنا نمایاں طور پر علم نہ رکھتے تھے جو اسے ہمیں حاصل ہے تو ہم کیوں نہ المشرقین اور المغربین کا مصداق انہیں سمجھیں یہ ہرگز گناہ نہیں ہے۔

(۲) رَبُّ الْمَشَارِقِ وَرَبُّ الْمَغَارِبِ.

یہاں دو ہی مشرقوں اور دو ہی مغربوں کا نہیں بلکہ اس سے زیادہ مشرقوں اور مغربوں کا پروردگار اُسے بتایا جارہا ہے اس کے سمجھنے میں سابق زمانہ کے مفسرین کو بڑی دشواری پیش آئی آفتاب تو ایک ہے پھر بہت سے مشرق اور بہت سے مغرب کہاں سے آئے اس لئے بیچاروں نے مشارق ومغارب سے مراد ہر دن کا مشرق اور مغرب قرار دیا کہ آفتاب اپنی ذاتی شرکت کی بناء پر سال میں ہر دن ایک نئے مشرق سے نکلتا ہے اور ایک نئے مغرب میں ڈوبتا ہے اس بناء پر مشارق اور مغارب کہا گیا ہے۔

لیکن اب جب کہ تحقیق سے ثابت ہوگیا کہ آفتاب ایک نہیں ہے جتنے ستارے ثابت کہے جاتے رہے ہیں ان میں سے ہر ایک آفتاب کی حیثیت رکھتا ہے جس کا مستقل نظام ہے اور اس نظام کے تحت میں ہر ایک کے سیارے ہیں۔

ان تمام آفتابوں کے لئے اپنے سیارات کے اعتبار سے طلوع ہے اور غروب اس لئے مشارق اور مغارب کا مصداق بلاتکلف ان آفتابوں کے مشرق اور مغرب ہیں۔

ایسا کہنا اگر صرف ذاتی عقل کے صرف کرنے سے بھی ہو تو بھی تفسیر بالرائے نہ ہوگا، چہ جائیکہ واقعہ یہ ہے کہ آفتابوں کا متعدد ہونا ائمہ معصومینؑ کے احادیث میں بھی وارد ہوا ہے تو احادیث سے بھی مشارق اور مغارب کے اس مفہوم کو سمجھا جاسکتا ہے۔

(۳) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عالم متعدد ہیں اور حضرت احدیت ان تمام عوالم کا پروردگار ہے۔

معنی آیت کے صاف ہیں ان میں کوئی گنجلک نہیں ہے مگر یہ بہت سے عالم کون ہیں؟

ذہن میں تصور تو یہی تھا کہ عالم بس ایک ہے جس میں ہم بسے ہوئے ہیں۔ تو اب یہ بہت عالم کیا ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا بیچارے مفسرین نے سوچ سوچ کر یہ کہا کہ عوالم سے مراد انواع کائنات ہیں یعنی پتھر ایک عالم ہے درخت ایک عالم ہیں جانور ایک عالم ہیں اور آدمی ایک عالم ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں یہ سب تو اسی ایک عالم کے اجزاء ہیں بہت سے عالم کہاں ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ اس کے آگے اس وقت نظر کی رسائی نہ تھی اب جبکہ یہ ثابت ہوگیا کہ دنیا اس نظام شمسی میں محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے نظام بھی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے سیارات ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری اس دنیا کی طرح ایسی کتنی پوری پوری دنیائیں موجود ہیں تو اب عالموں کے بہت تعداد میں ہونے کا مسئلہ ہوگیا۔

اب اگر ہم کہیں کہ قرآن نے پہلے ہی اس جہان کے آگے دوسرے جہانوں کے وجود کا پتہ دیا تھا تو اسے تفسیر بالرائے کے تحت میں لانا صحیح نہیں ہوگا۔ حالانکہ یہ بھی احادیث سے ثابت ہے کہ عالم ایک نہیں بلکہ بہت ہیں۔

اس طرح کی آیتیں قرآن مجید کی اور ہیں جن کے معنی کا انطباق تحقیقات جدیدہ پر بہت نمایاں ہے جنہیں بعض اہل قلم نے مستقل طور پر موضوع تصنیف بنایا ہے مگر یہاں مثال کے لئے اتنا ہی کافی معلوم ہوتا ہے اور اس قسم کے نمونے جتنے آئیں جہاں معنی ومطلب میں کوئی تبدیلی نہ کی جارہی ہو بلکہ مصداق کو نمایاں کیا جارہا ہو اس کے لئے کبھی حدیث وتفسیر کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے اپنی عقل اپنے مشاہدہ اور جدید معلومات سے ثابت کیا جاسکتا ہے اور وہ ہرگز ہرگز تفسیر بالرائے کے تحت میں مندرج نہ ہوگا۔

تفسیر معانی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اسی کے معنی ہیں:

''كَشْفُ الْمُبْهَمْ ''یعنی استفہام مستعمل ہے یعنی کسی امر کو واضح کرنے کی خواہش علامہ سید رضی جامع نہج البلاغہ اپنی کتاب حقائق التاویل صفحہ ۱۳ میں تحریر فرماتے ہیں۔

معنی التفسیر والتاویل انما یکون لما غمض وخفی ولم یعلم بظاھرہ و ھٰذا صفة المتشابه واما المحکم الذی یعلم بظاھرہ فلا حاجة باحد الیٰ تعلیمهٖ لاَنَّ اھل اللسان فیه سوا سیة.

تفسیر وتاویل کا معنی کے لحاظ سے تعلق ایسی چیز کے ساتھ ہے جو گہری ہو باریک ہو اور سطحی نگاہ سے معلوم نہ ہو۔ یہ بات متشابہات میں ہوتی ہے لیکن محکم آیتیں جن کا مفہوم کھلا ہوا ہو ان میں کسی کو تعلیم کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ تمام اہل زبان ان میں یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔

اب ہم نے معانی الفاظ اور ان کے سمجھنے کے سلسلہ میں سابقاً جو درجے لکھے تھے ان پر نظر ڈالئے تو ان میں پہلا ایک قہری حیثیت رکھتا ہے جو لفظ کے کسی معنی کے لئے وضع ہونے اور اس کا علم حاصل ہونے کا نتیجہ ہے یہ لفظ کے سنتے ہی معنی کا ذہن میں آنا طبعی لازمی ہے لہٰذا تفسیر بالرائے کا اس سے تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔

دوسرا درجہ یعنی الفاظ کو سن کر قرائن حالیہ ومقالیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ رائے قائم کرنا کہ اس لفظ کے یہ معنی ہیں یہ بھی ہر زبان دان کا فطری حق ہے جو سلب نہیں ہوسکتا بے شک یہ حق اس وقت سلب ہوجاتا ہے جب متکلم نے اس کی صراحت کردی ہو کہ اس کا کلام عام محاورات پر مبنی نہیں ہے بلکہ تمام تر اس کے ذاتی اصطلاحات پر مبنی ہے یا کلام کچھ اس طرح کا ہو کہ اس سے روزمرہ کے محاورات کے ماتحت کوئی معنی نکلتے ہی نہ ہوں اس طرح تو دوسری کیا پہلی قسم کی دلالت بھی جو وضع الفاظ پر مبنی ہے حاصل نہ ہوگی۔

قرآن میں بس حروف مقطّعات کو چھوڑ کر جو اس آخری قسم میں داخل ہیں باقی پوری کتاب میں یہ بات نہیں ہے اسے کہہ دیا گیا ہے وہ عربی زبان میں ہے اور اس میں غور وتامل کا حق ہی نہیں دیا گیا ہے بلکہ دعوت دی گئی ہے اَفَلاَ یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا۔ (یہ لوگ قرآن میں غور وفکر کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں)۔ اس کی سچائی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا:

وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا.(نساء۔ ۸۲)

اگر یہ غیر خدا کی جانب سے ہوتا تو انھیں اس میں بڑا اختلاف نظر آتا۔

اگر قرآن ایسا ہوتا کہ اس کے معنی ہی کسی کی سمجھ میں نہیں آتے تو اس میں غور وفکر کی دعوت کیوں دی جاتی ہے اور پھر اس میں اختلاف ہونے نہ ہونے کا اندازہ انہیں کیوں کر ہوسکتا تھا؟

اس میں صاف موجود ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا (ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے) بلکہ ارشاد ہوا بِلِسَانٍ

عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ (یہ صاف کھلی ہوئی عربی زبان میں ہے''۔)

غور کیا جائے تو عقلی دلیل بھی ان آیات کے مفاد میں مضمر نظر آتی ہے۔

قرآن مجید رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ ہے اور اعجاز کا دارومدار اس پر ہے کہ جس چیز میں اس دور کے لوگوں کو ادعائے کمال ہو اس میں ان کی طاقتوں کو شکست دی جائے جس کی تشریح بحث اعجاز میں آچکی ہے۔

ہمارے رسولؐ کے زمانہ میں فصاحت و بلاغت کا دور دورہ تھا لہٰذا آپ کو معجزہ اسی نوعیت کا عطا ہوا جو قرآن مجید ہے۔

اب اگر یہ کسی اور زبان میں ہو جو ان کی زبان سے الگ ہے تو اس کے سبب سے اس کا اعجازی پہلو ختم ہو جائے گا اور قوم پر حجت تمام نہ ہوگی اس لئے ایک زبان کے بڑے سے بڑے ماہرین کا دوسری زبان کی چیز کے جواب سے عاجز ہونا کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے جو دلیل حقانیت بن سکے۔

متعدد آیات میں اس امر کا اظہار کہ یہ قرآن عربی زبان میں غالباً اس اعجازی پہلو کے نمایاں کرنے کے لئے کہ دیکھو یہ کوئی نئی زبان ہے بلکہ یہ اسی زبان کے روزمرہ میں ہے جس میں تم کو فصاحب و بلاغت کا انتہائی دعویٰ ہے اس کے باوجود تم اس کے جواب سے عاجز ہو تو سمجھو کہ یہ کسی بالادست طاقت کا اتارا ہوا ہے۔

اب جب یہ بات یقینی طور پر ثابت ہوگئی کہ قرآن مجید کی کوئی الگ زبان نہیں ہے تو اس کے بعد ہر عربی زبان والے کو اس کے معانی و مطالب سمجھنے کا حق حاصل ہے جس میں محاورات عرب سے واقفیت کے سوا کوئی شرط نہیں ہے۔

بے شک یہ صورت حال دردانگیز ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر شخص جو عربی سے کوئی حس و مس نہ رکھتا ہو وہ بھی قرآن فہمی کا مدعی ہے۔

اس کو سواد ماغی ''بوالہوسی'' کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا جس کے بعد ''شیوہ اہل نظر'' کی آبرو کا جانا یقینی ہے۔

اس کے بعد تیسرا درجہ یعنی کلام کے مقصود اصلی کی تعیین بضمیمۂ قرائن ہیں اور اس لئے ہر لفظ کے معنی میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ اس سے کسی بھی دوسرے معنی کو بطور مقصود اصلی قرار دے دیا جائے بلکہ وہ دوسرے معنی ایسے ہی ہو سکتے ہیں جو اس لفظ کے اصل معنی کے ساتھ اتنا قریبی تعلق رکھتے ہوں کہ ایک سے دوسرے کی طرف ذہن منتقل ہو سکے اور اس لئے الفاظ کے محاورات و اصطلاحات سے واقفیت کی صورت میں جس طرح انسان ان کے تحت اللفظی معانی کے سمجھنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح ان معانی کے مطلب اور مقصود اصلی کے استفادہ کا حق بھی ہے۔

اسی لئے کثیر التعداد احادیث میں مختلف مقامات پر ائمہ معصومین علیہم السلام نے احکام شرعیہ کے استفادہ کے لئے آیات قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے رواۃ احادیث کو یہ حق دیا ہے کہ وہ قرآن مجید سے شرعی احکام کو حاصل کریں۔

بے شک یہ امر ملحوظ رہے کہ کنایات اور مجازات کی تعیین میں ان تمام اصول و شرائط کو مدنظر رکھنا ہوگا جو اہل زبان نے مقرر و معیّن کیے ہیں مثلاً یہ کہ اگر معنی حقیقی کا مراد لینا ممکن ہے اور اس کے خلاف کوئی قرینہ نہیں ہے تو خواہ مخواہ معنی مجازی یا کنایہ پر اس کا محمول کرنا درست نہیں ہے اور صرف اپنی ذاتی رائے سے جو کسی عقلی یا نقلی دلیل پر مبنی نہیں ہے ایسا کرنا تفسیر بالرائے ہوگا۔ اس کے علاوہ جب معنی حقیقی کا مراد لینا ممکن نہ ہو تو پھر اسے کنایہ یا مجازی معنی کو مراد لینا درست ہوگا جو محاورہ اور استعمال عرفی کے مطابق ہوں ایک ایسے بعید معنی پیدا کرنا جو اس معیار کے تحت میں داخل نہ ہوتے ہوں اصول تکلم کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے اور اس صورت میں یہ کہنا کہ مراد خدا وندی یہ ہے تفسیر بالرائے ہوگا۔

تفسیر بالرائے کی چند مثالیں

(۱) قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کا ذکر ہے

.....کبھی خالق کی زبانی:

(۱) تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ. (مائدہ۔۱۱۰)

(۲) تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ. (مائدہ۔۱۱۰)

(۳) تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ. (مائدہ۔۱۱۰)

☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور کبھی خود حضرت عیسیٰؑ کی زبانی

(۱) اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۝ (آل عمران ۴۸)

(۲) اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۝ (آل عمران۔۴۸)

مفہوم ان جملوں کا عربی لغت اور روز مرہ کے لحاظ سے بالکل صاف ہے جسے ہر عربی دان بلا تکلف الفاظ کے سنتے ہی سمجھ لیتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی سے ایک مجسمہ بصورت طائر بناتے تھے اور اس میں پھونکتے تھے وہ بحکم خدا سچ مچ کا پرندہ بن جاتا تھا۔

(۲) کور مادرزاد اور کوڑھی کو شفا بخشتے تھے۔

(۳) مردوں کو بحکم خدا زندہ کرتے تھے۔

ہر آدمی جو عربی سے اس حد تک واقف ہو کر ان الفاظ کے معنی سمجھ سکے وہ ان الفاظ کو سن کر فطری طور پر یہی معنی سمجھے گا پھر یہ کسی اصول عقلی کے خلاف بھی نہیں ہے بلکہ ان میں کی ہر بات خالق کی قدرت کے دائرہ میں ہے اور اس لئے اس کی جانب سے اس کے کسی خاص بندہ کے ہاتھ سے ان کاموں کا وقوع میں آنا ممکن ہے۔

مگر اب ایک طبقہ ہے جو طے کیے ہوئے ہے کہ ہم معجزہ کی قسم کی باتوں کو نہیں مانیں گے اس کے ایک خاص نمائندہ نیاز صاحب فتحپوری تھے۔ انہوں نے الفاظ آیت کے عجیب عجیب معانی بتلائے ہیں۔

''مٹی سے'' کی لفظ سے مراد ہے انسان کہ جو مٹی سے بنایا گیا ہے۔

''پرندے کی صورت'' اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں صلاحیت پیدا کی جائے فضائے روحانیت میں اڑنے کی۔

''پھونکنے'' سے مراد ہے۔ ہدایت کی روح کا پہنچانا اور تکون طیرا باذن اللہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ معارف و ہدایت کو حاصل کر کے ہوائے معرفت میں پرواز کرنے لگتا ہے۔

''اندھے اور کوڑھی کو شفا دینے کے معنی'' ان لوگوں کو ہدایت کرنا جو بالکل علوم و معارف سے بے بہرہ تھے اور۔

''مُردوں کو زندہ کرنے کے معنی ہیں کافروں کو مومن بنانا اور گمراہوں کو ہدایت کرنا۔

مولانا مرزا احمد علی امرتسری نے اپنے رسالہ بابیت و مرزائیت کا تقابل صفحہ ۳۱ میں ان لوگون کے طبع زاد تاویلات میں بھی ان آیات کا

یہی مفہوم لکھا ہے کہ ''ہیت طیر وغیرہ انسانی خاکی پیکر اور طیر روحانی پرواز پھونک سے مراد لی گئی ہے۔

(۲) قرآن مجید میں روز قیامت اور اس کے علامات حشر ونشر اور مردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے کا بہت آیتوں میں تذکرہ ہے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کوئی چیز قرآن میں اس کثرت کے ساتھ اور اتنی اہمیت دے کر بیان نہیں کی گئی ہے جس قدر روز قیامت کا تذکرہ لیکن بہاء اللہ مازندرانی کی امت جو ''بہائی'' کے نام سے معروف ومشہور ہے، ان تمام آیتوں کے معانی دوسرے کہتی ہے۔ وہ ''قیامت'' سے مراد ظہور الٰہی یعنی خداوند عالم کے خاص نمائندہ کا ظہور جو ان کے نزدیک بہاء اللہ تھے۔

''نفخ صور'' سے مراد ہدایت کرنے والے کی آواز مردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے سے مراد بے علم وعرفان افراد کا روح علم سے زندہ ہونا قرار دیتے ہیں اور اس طرح دنیائے لفظ ومعنی میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔

(۳) قرآن کی آیت ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

''مہر لگادی خدا نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ان کے لئے سخت عذاب ہے''۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ کفار ومشرکین کی مذمت ہے لیکن صوفیا کے ایک طبقہ نے جنہیں ایران میں اہل عرفان کہا جاتا ہے اس کو اہل معرفت ارباب عشق صادق کی مدح قرار دیا ہے۔

خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی یعنی علامت قرار دے دی کہ یہ خاص میرے لئے ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ہیں یعنی ماسوا اللہ کوئی چیز ان کی نظر میں آتی ہی نہیں اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے یعنی وہ محبت کی سختیوں کو جھیل رہے ہیں اور پھر عذاب عذوبت سے بھی مشق ہے جس کے معنی خوشگوار کے ہیں اور محبت کی سختی میں ایک خاص خوشگواری وشیرینی ہوتی بھی ہے۔

(۴) یہ اور اس کے بعد کے چند تاویلات ''بابیت و مرزائیت کا تقابل'' رسالہ میں مولانا مرزا احمد علی صاحب امرتسری نے درج کیے ہیں جن میں کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔

باب وبہاء کے تاویلات: ''بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا وَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا۔'' پہاڑ چلائے جائیں اور وہ پراگندہ غبار کی طرح نظر آئیں گے''۔ مطلب یہ ہے کہ جب احکام بوسیدہ ہوجائیں گے اور ان سے تاثیر اٹھادی جائے گی اور نئے احکام ان کی جگہ پر قائم ہوجائیں گے تو اس وقت علماء کی باتیں ایسی بے تاثیر ہوجائیں گی کہ وہ لوگوں کی نظروں میں پراگندہ غبار کی طرح ہوجائیں گی مطلب یہ ہے کہ نئی شریعت قائم ہو گی جس کی وجہ سے علماء کی پرانی باتیں تاثیر نہیں رکھتیں (بحر العرفان صفحہ ۲۷)

(۵) وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (زمر۔۶۷) یعنی ''قیامت کے دن زمین اپنے برکات روک لے گی اور سارے آسمان اپنے برکات لپیٹ دیں گے مطلب یہ ہے کہ دلوں کی زمین اور آسمان جس سے مراد پہلی شریعت ہے۔ وہ لپیٹ یعنی منسوخ کردی جائیں گی یعنی اسلامی شریعت ختم ہوجائے گی اور باب وبہاء کی شریعت جاری ہوگی اور یہ زمانہ قائم آل محمدؐ باب کا ہوگا۔

(۶) ''اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ'' ''یعنی نماز کو آفتاب ڈھلنے سے رات کو اندھیرے تک قائم کرو مطلب اس کا یہ ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کا زمانہ جو ۱۲۶۱ء تک ہے اس وقت تک نماز پڑھو۔ اس کے بعد قائم آل محمد (یعنی باب) ظاہر ہوگا اور اسلامی شریعت منسوخ ہوجائے گی تو نماز پڑھنے کا حکم بدل جائے گا حروف تہجی کے اعداد سے غسق اللیل کے عدد ۱۲۶۱ ہوتے ہیں اس آیت کا

مطلب یہ ہے کہ نماز کو شریعت محمدیہ کے قائم ہونے کے وقت ۱۲۶۱ سال تک قائم کرو اس کے بعد یہ حکم ختم ہے اس لئے کہ دوسری شریعت نازل ہوگی اور وہ باب کے زمانہ کا وقت ہے

(۷) مرزا غلام احمد لکھتے ہیں "دَآبَّةَ الْاَرْضِ" سے مراد وہ علماء اور واعظین ہیں جو آسمانی قوت اپنے میں نہیں رکھتے۔ (ازالۂ اوہام۔ص ۵۰)

(۸): وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ. صاف اس میں جنگ بدر کا ذکر ہے مگر مرزا صاحب قادیانی آیت مذکور کے عدد چودہ سو نکال کر فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہمارے ماننے والوں کی مدد ہے۔ (اعجاز مسیح۔ص ۱۸۳)

(۹) "بابیت و مرزائیت کا تقابل" اس کی مندرجہ مثالوں کے بعد ایک اپنے قریب کی مثال بس اور ملاحظہ کر لیجئے۔

ہم سب کے جانے پہچانے اور میرے خاص طور پر کرم فرما بزرگ مصور فطرت خواجہ حسن نظامی کے مضامین کا مجموعہ "سی پارۂ دل" کے نام سے شائع ہوا ہے اور اردو کے بعض امتحانات کے کورس میں داخل ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

"قرآن شریف میں سب سے پہلے الٓمٓ کا لفظ تم نے پڑھا ہوگا اس میں اشارہ ہے کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کتاب 'علم' کو جس میں کچھ شک نہیں عالمگیر کرنے کے لئے کھڑی ہوگی۔ چنانچہ سر سید احمد خاں نے جو محمدی آل سے تھا یہ کام شروع کیا اور اب آغا خان جو زمرہ آل رسالت سے ہے اس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ (صفحہ ۴۵۵)

ان تفسیرات یا تاویلات میں سے بعض کا تعلق چوتھے درجہ سے ہے یعنی الفاظ کے معانی و مطالب پورے ہو چکنے کے بعد یہ پتہ لگانا کہ اس سے اشارہ کاہے کی طرف ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ الفاظ کے معنی و مطلب سے خارج چیز ہے اس لئے نہ افہام و تفہیم کی حدود اسے اپنے اندر لیتے ہیں اور نہ محاورہ کے اصول اس کو معتبر قرار دیتے ہیں اس لئے یہ معنی جو اشارتاً نکالے جاتے ہیں انہیں متکلم کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہے۔

قرآن مجید میں ایسے اشارات و رموز موجود ضرور ہیں اور یہی وہ ہیں جنہیں "باطن قرآن" بتلایا گیا ہے اور ان بطون میں تہہ در تہہ کثرت ہو سکتی ہے اس لئے یہ بھی آیا ہے کہ: اِنَّ الْقُرْاٰنَ سَبْعِیْنَ بَطْناً" (قرآن کے ستّر باطن ہیں کیوں کہ ظاہر قرآن کی بنیاد معانی الفاظ پر ہوتی ہے اور معنی ایک لفظ کے بوقت واحد ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے ہیں باطن کی بنیاد موز و اشارات پر ہوتی ہے اور اشارہ ایک چیز سے متعدد امور کی طرف ممکن ہے۔

ظاہر قرآن وہ ہے جس کے متعلق پہلے ہم نے اس پر زور دیا ہے کہ اس کے سمجھنے اور اس پر بنیاد عقیدہ و عمل رکھنے کا سب کو حق ہے بشرطیکہ انسان عربی زبان سے کما حقہ واقف ہو لیکن باطن قرآن اس کے مخصوص اہل ہوتے ہیں اور ہر شخص کو اس میں طبع آزمائی کا حق نہیں ہے کیوں کہ ان اشارات کی تعیین جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے زیادہ تر سامع کی افتاد طبع اور ذہنیت کی تابع ہوا کرتی ہے اور اس لئے عام اشخاص کے کلام میں جب ہم اس قسم کے اشارات کی تعیین کریں تو وہ اکثر واقع کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ سوءظن یا سابق و حال واقعات کیلئے بنیادی جوڑ توڑ کا نتیجہ رہتی ہے اور متکلم کو وہ اشارہ یا تعریض مدنظر نہیں ہوتی جسے ہم نے اس کے سر منڈھ دیا ہے۔

پھر جب معمولی اشخاص کے کلام میں عقل انسانی مکمل رہنمائی نہیں کرتی تو خداوند عالم کے کلام میں یہ غیر مکمل عقول کہاں صحیح نقطہ تک رہبری کر سکتے ہیں۔ لہٰذا غلطی کا ہونا اس میں ناگزیر ہے۔ قرآن میں ایسے رموز و اشارات کی تعیین اور ظاہر لفظ سے آگے معانی پیدا کرنا یقیناً تفسیر

بالرائے ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے الفاظ کے ظاہر معنی کو سمجھ کر اس کے مضمون کو بیان کرنا ہرگز تفسیر نہیں ہے کیوں کہ تفسیر کے معنی تو غیر ظاہر کو ظاہر بنانے کے ہیں۔ یہ اسی پر منطبق ہے جس میں ایک غامض ومخفی امر کا کشف ہوتا ہے اور وہ یہ چوتھی صورت ہے۔

پھر اس کے علاوہ ممانعت تفسیر بالرائے کی ہوئی ہے پہلے مراتب ومدارج جو ہیں ان کی بنیاد محاورات عرب کے تتبع زبان دانی اور واقفیت الفاظ ومعنی پر ہے وہ اگر چہ عقل پر موقوف ہے بایں معنی کہ ایک مجنون اس مرحلہ کو بھی ممکن ہے طے نہ کر سکے لیکن ان معانی کی تعیین کسی عقل غور وخوض سے تعلق نہیں رکھتی نہ ان میں رائے کا دخل ہے۔ برخلاف چوتھے درجہ کے کہ وہ نہ تو تتبع لغات پر مبنی ہے اور نہ زبان دانی ووسعت نظر سے متعلق بلکہ پورے طور پر اس میں عقل آرائی اور طبع آزمائی کو دخل ہے کہ ہو نہ ہو، متکلم نے اس کلام سے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے یہ چیز وہ ہے جس سے ممانعت ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک چیز ہے تفسیر بالرائے سمجھنا چاہئے وہ یہ ہے کہ آدمی قرآن کے الفاظ پر قرآن فہمی کی خاطر نظر ہی نہ کرے کہ اس سے واقعی سمجھ میں کیا آتا ہے بلکہ خود ایک رائے قائم کر لے اور پھر کوشش کر کے آیات قرآن کو ایسے معانی کا جامہ پہنائے جن سے اس کی رائے کی تائید ہوتی ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قرآن کو اپنی رائے کا تابع بنا رہا ہے اکثر واعظین کی تفسیر بالرائے یہی نوعیت رکھتی ہے۔

ہم نے جو تفسیر بالرائے کا مفہوم لکھا ہے اسے علمائے فریقین کی تائید حاصل ہے۔

ایک طرف صدر المتالہین شیرازی تحریر فرماتے ہیں:

قد غلب علیٰ طبایع اکثر الناس ان لا معنی القرآن الا ما نقل علی ابن عباس و سایر المُفَسِّرِیْن ومنشاء ھجرھم التجاوز عن الظاھر ہ المشھور امور کثیرۃ اظھرھا امران احدھما غلبۃ احکام الظاھر علیھم وقصور افھامھم عن درك بواطن القرآن واسرار الاٰیات والثانی فی الحدیث المشھور حیث لم یفھمو المراد منه وما معنی التفسیر بالرّائے.

وقال امیر المو منین علیہ السلام الا ان یوتی اللہ تعالیٰ عبدًا فھما فی القرآن فان لم یکن سوٰی حفظ التر جمۃ المنقول فمامعنی الفھم.

وقال علیہ السلام لَو شِئتُ لا وفرت سبعین بعیرا من تفسیر فاتحۃ الکتاب و فی روایۃ من تفسیر الفاتحه و تفسیر ظاھرھا فی غایۃ الا ختصار.

واما قوله من فسّر القرآن برأیه والنھی عنه فیحمل علیٰ احد وجھین الا ول ان یکون له فی الشئ رای الیه میل من طبعه وھواہ فتیاول القرآن علیٰ وفق رائیه فیکون قدفسّر برائیه ای رایه حمله علیٰ ھٰذا ولو لا رایه لما تر جّح عندہ ھٰذا والوجه الثانی ان یَّتَسَارَعُ الیٰ تفسیر القرآن بمجرّد العربیۃ من غیر استفسارھا بالسّماع والنقل فیما یتعلق بقرا،ته وما فیه من الا لفاظ المبھمۃ وما فیه من الحذف والاضمار والتقدیم والتا خیر والاختصار وا کثر المفسّرین غیر العرفأ منھم فی ھٰذا الخطر.(مفاتیح الغیب۔۲۳)

بہت سے لوگوں کے ذہن پر یہ بات چھائی ہوئی ہے کہ قرآن کے کوئی اور معنی ہو ہی نہیں سکتے سوائے اس کے کہ جو ابن عباس اور دوسرے مفسرین کی زبانی وارد ہو گئے ہیں اور مشہور سطحی معنی کے دائرہ سے باہر نکلنے کو ممنوع قرار دینے کا سبب بہت سے امور ہیں جن میں زیادہ نمایاں دو باتیں ہیں پہلے خود ان کے ذہن پر سطحیت کا حاوی ہونا اور ان کی سمجھ کا قرآن کی باریکیوں سے کوتاہی اور آیات قرآنی کے اندرونی رازوں سے قاصر ہونا اور دوسرے وہ مشہور حدیث کہ انہوں نے اس کے مقصد کو صحیح طور پر سمجھا نہیں اور ان کے ذہن میں نہیں آیا کہ تفسیر بالرائے کے معنی کیا ہیں۔ حالانکہ جناب امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے کہ سوا اس کے کہ اللہ کسی بندہ کو قرآن کی سمجھ عطا کرے تو اگر بس سنے سنائے ترجمہ کا یاد کر لینا ہی ہے تو قرآن فہمی کے معنی کیا ہیں۔

اور حضرتؑ نے فرمایا اگر میں چاہوں تو ستّر اونٹ فاتحۃ الکتاب اور ایک روایت میں فاتحہ کی تفسیر سے بھر دوں حالانکہ ظاہری مفہوم کی سورۂ حمد کی تفسیر انتہائی مختصر ہے۔

رہ گیا یہ ارشاد کہ جو قرآن کی اپنی رائے سے تفسیر کرے اور اس کی ممانعت تو اسے دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پر محمول ہونا چاہئے ایک یہ کہ کسی معاملہ میں اس کی ایک رائے ہے اور اس کی طبیعت کا رجحان ہو چکا ہے تو وہ قرآن کی تاویل اس طرح کرتا ہے جو اس کی رائے کے موافق ہو اس طرح وہ تفسیر اپنی رائے کے سبب سے کر رہا ہے یعنی اس کی رائے اس تفسیر کی محرّک ہوئی ہے اور اس کی رائے نہ ہوتی تو یہ پہلو اس کی نظر میں مرجح نہ ہوتا دوسرے یہ کہ صرف عرب دانی کے سہارے سے وہ تفسیر قرآن جھٹ پٹ کر دیتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے حل طلب الفاظ کی تشریح اور مبہم کلمات کی توضیح میں نیز جو اس میں حذف یا اضمار یا تقدم و تاخر یا اختصار ہے ان سب میں اور باخبر علمائے سلف کے تشریحات پر بالکل نظر نہ کرے اور سوا صاحبانِ معرفت کے اکثر مفسرین اس خطرہ سے دوچار رہتے ہیں۔

دوسری طرف اہلسنت میں سے علامہ نیشاپوری رقمطراز ہیں:

ذکر العلماء ان النهی عن تفسیر القرآن بالرأے لا یخلو اما ان یکون المراد به الاقتصار علی المنقول والمسموع وترك الاستنباط او المراد به امر، اخر و باطل ان یکون المراد به ان لا یتکلّم احد فی القرآن الا بما سمعه فان الصحابة قد فسّروا القرآن واختلفوا فی تفسیره علیٰ وجوه ولیس کل ما قالوه سمعوه کیف وقددعا النّبی ﷺ لابن عباس اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُمْ فی الدّین وعلمه التاویل فان کان التاویل مسموعا کالتنزیل فما فائدة تخصیصه بذالك وانّما النّهی یحمل علیٰ وجهین احدهما ان یکون له فی الشئ رای والیه میل من طبعه وهواه فَیُاوّل القرآن علیٰ وفق هواه لیحجّ علیٰ تصحیح غرضه ولو لم یکن له ذالك الرای والهویٰ لَا یُفْهَمُ له من القرآن ذالك المعنی وهٰذا قد یکون مع العلم بأن المراد من الایة لیس ذالك ولکن یلبس علیٰ خصمه وقد یکون مع الجهل وذالك اذا کانت الایته محتملة فمیل فهم الی الوجه الذی یوافق غرضه ویرجح ذالك الجانب برأیه وهواه ولولا رایه لما کان یترجّح عنده ذالك الوجه وقد یکون له غرض صحیح فیطلب له دلیلا من القرآن ویستدل علیه بما یعلم انه ما ارید به کمن یدعوا الیٰ مجاهدة القلب القاسی فیقول المراد بفرعون فی قوله تعالیٰ اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی هو النفس الوجه الثانی ان یتسارع الیٰ تفسیر القرآن بظاهر العربیة من غیر

استظهار بالسماع والنقل فيما يتعلق بغريب القرآن و ما فيه من الالفاظ المبهمة والاختصار والحذف والاضمار والتقديم والتّا خير فالنقل والسماع لا بدّ منه فی ظاهر التفسير اولا ليتقی به مواضع الخلط ثم بعد ذالك يتبع التفهيم والا ستنباط وما عدا هٰذين الوجهين فلا يتطرق النهی اليه ما دام علی قوانين العلوم العربيّة والقواعد الاصلية والفرعيّة.

علماء نے کہا ہے کہ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے یا تو یہ مقصود ہے کہ صرف سابق سے سنے جاتے ہوئے تشریحات پر اکتفاء کرے اور اپنی ذہنی صلاحیتوں سے حقیقت کے سمجھنے میں بالکل کام نہ لے یا اس سے مقصود کچھ اور ہے؟ وہ تصور بالکل غلط ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص قرآن کے بارے میں کوئی بات نہ کہے سوا اس کے جو اس کے کانوں تک پہنچ چکا ہے اس لئے کہ صحابہ نے قرآن کی تفسیر بیان کی ہے اور ان میں تفسیر میں اختلاف اقوال بھی نظر آتا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ جو بھی انہوں نے زبان سے کہا ہے وہ ان کے گوش زدہی ہوا ہو اور یہ کیوں کر ہو سکتا ہے جبکہ حضرت پیغمبرؐ خدا نے ابن عباس کے لئے دعا کی کہ خداوندا اسے دین کے بارے میں سمجھ اور اسے تاویل کا علم عطا کر۔ اب اگر تاویل بھی مثل تنزیل کے سننے سے وابستہ ہوتی تو علم تاویل کی دعا کو ان سے مخصوص کرنے کا فائدہ کیا ہوگا لہٰذا ممانعت کو دو میں سے کسی ایک پہلو پر محمول کرنا چاہیے ایک یہ کہ اس کی کسی معاملہ میں کوئی رائے ہو اور اس کی طبیعت کا رجحان ہو تو وہ قرآن کی تاویل اپنی خواہش کے موافق تراشے تا کہ اپنی مطلب برآری کے لئے قرآن سے استدلال کر سکے اور اگر اس کا یہ رجحان طبع نہ ہوتا تو یہ معنی الفاظ قرآن سے اس کے ذہن میں نہ آتے اور یہ کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ اس شخص کو خود معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا یہ مقصد نہیں ہے لیکن وہ اپنے مدمقابل کو دھوکا دینا چاہتا ہے اور کبھی ناواقفیت کی صورت سے ہوتا ہے اور یہ اس وقت کہ جب آیت میں احتمال اس مفہوم کا ہوتا ہے تو اس کے ذہن کا رجحان اسی پہلو کی طرف ہو جاتا ہے جو اس کے مطلب کے موافق ہے اور اس پہلو کو اس کی رائے اور خواہش کی وجہ سے ترجیح ہو جاتی ہے اور اگر اس کی یہ رائے نہ ہوتی تو اس کے ذہن میں اس رائے کو ترجیح نہ ہوتی اور کبھی اس کی غرض کوئی صحیح ہوتی ہے اور اس کے لئے قرآن سے دلیل تلاش کرتا ہے اور اس پر استدلال کرتا ہے ایسی آیت سے جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ یہ اس کا مطلب نہیں ہے جیسے کوئی نفس امارہ کے مقابلہ کی دعوت دینا چاہتا ہو اور کہے کہ اس آیت میں کہ ''فرعون کی طرف جاؤ اس نے بڑی سر کشی اختیار کر رکھی ہے'' فرعون سے مراد نفس امارہ ہے دوسری صورت یہ ہے کہ تفسیر قرآن میں بس عربی زبان کے پہلو کو سامنے رکھ کر جلد بازی سے کام لے۔ اور لغات قرآنی کے حل اور مبہم الفاظ کی تشریح اور جہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے اور کچھ اجزاء محذوف ہیں اور ضمیروں کی تعیین اور مقدم اور موخر کی تمیز میں علمائے سلف کے کلمات پر بالکل نظر نہ کرے یہ درست نہیں ہے کیوں کہ سب سے پہلے اب تک کے مفسرین کے کلمات کو دیکھنے کی ضرورت ہے تا کہ غلطیوں سے بچ سکے پھر اس کے بعد ذہانت اور فکر و استنباط کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ان دونوں صورتوں کے علاوہ عقل و فہم سے تفسیر کرنے کی ممانعت نہیں ہے جب تک کہ وہ عربی ادب کے قاعدوں کے موافق اور اصولی و فروعی طور پر ثابت شدہ ضوابط کے مطابق رہے۔

ہو سکتا ہے کہ جو اصول پیش کیا گیا ہے اس معیار کے مطابق خود علامہ صدر الدین شیرازی کی تفسیر اکثر مقامات پر حدود سے متجاوز ہو اور اس لئے ہم اسے تفسیر بالرائے میں داخل سمجھیں اور علامہ نیشاپوری نے جو اقوال صحابہ کا حوالہ دیا ہے چوں کہ صحابہ معصوم نہیں ہیں اور ہم ان کے اقوال کو حجت شرعیہ نہیں سمجھتے اس لئے ممکن ہے خود ان کے بعض اقوال ہمارے نزدیک تفسیر بالرائے کا مصداق ہوں لیکن اصولی طور پر دونوں مختلف المسلک عالموں نے تقریباً متفق علیہ طور پر جو تفسیر بالرائے کا مفہوم قرار دیا ہے وہ تقریباً ناقابل اختلاف ہے اور اس لئے متاخرین علمائے محققین

میں جناب شیخ مرتضیٰ انصاری نے بھی رسائل میں تفسیر بالرائے کا مطلب یہی قرار دیا ہے۔

محکم اور متشابہ

قرآن مجید نے خود آیات قرآنی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ (آل عمران۔۷)

اس میں کچھ تو محکم آیتیں ہیں جو اس کتاب میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں اور کچھ متشابہ ہیں تو وہ جن کے دلوں میں کجی ہے متشابہ آیتوں کے درپے رہتے ہیں تاکہ فتنہ پردازی کریں اور طرح طرح کی تاویلیں تراشیں حالانکہ اس حصہ کی حقیقی تاویل سے سوا اللہ اور راسخون فی العلم کے کوئی واقف نہیں ہے

یہ تفریق اسی لحاظ سے ہے کہ بعض آیات وہ ہیں جن کے ظاہری معنی لغت عرب اور عام زبان دانی کے اصول اور محاورات کے مطالعہ سے سمجھ میں آجاتے ہیں ان کے سمجھنے اور اتباع کرنے کا ہر شخص کو حق دیا گیا ہے اور ان معانی کا سمجھنا ان سے نتائج کا پیدا کرنا اور ان کے مصداق کا تلاش کرنا تفسیر بالرائے نہیں ہے اور انہی ظاہری معنی کو تنزیل قرآن کہا جاتا ہے اور کچھ مجمل و مبہم الفاظ ہیں جن کے معانی لغت اور محاورات سے متعین نہیں ہوتے جیسے: مقطعات: الٓرٰ، الٓمّٓ، حٰمٓعٓسٓقٓ وغیرہ یا جو لغوی معنی ہیں وہ عقلاً مراد نہیں ہو سکتے اور اس کے علاوہ کوئی ظاہری مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے معانی رموز و اشارات کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اور دَنٰى فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى وغیرہ

ان کے اصلی مفہوم کا حتم و جزم کے ساتھ متعین کرنا راسخون فی العلم کے سوا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

جن آیات کا لغوی حیثیت سے کوئی ظاہری مفہوم ہے اور کوئی قرینہ انکے خلاف نہیں ہے ان میں بھی بطور رمز و اشارہ کوئی باطنی معنی ہو سکتے ہیں بلکہ بعض احادیث میں ہے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے اور باطن میں بھی باطن یہاں تک کہ بات ستر باطنون تک پہونچتی ہے۔

مذاقِ تصوف رکھنے والے طبقہ نے جو ایران میں عرفاء کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں ان احادیث کی بناء پر باطنی معنی نکالنے میں بڑی طبیعت کے جولانیاں دکھائی ہیں جن میں محی الدین ابن عربی سرخیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ملا محسن فیض کاشانی کی تفسیر صافی کسی حد تک اس رجحان کی حامل ہے اور تفسیر نیشاپوری میں تقریباً ہر آیت میں پہلے ظاہری معنی کے مطابق تفسیر لکھی گئی ہے اور پھر باطنی طور پر تفسیر میں اشہب قلم کو رواں کیا ہے اور ایک فرقہ نے تو اہل مذاہب میں سے اس پہلو کو اتنا مرکزی نقطہ نظر بنایا کہ اس کا نام فرقہ باطنیہ ہو گیا۔ بوہرہ اور آغا خانی اسمٰعیلی جماعتیں اسی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں ان میں بھی ایک حلقہ ایسا ہے جو باطن کے ساتھ ظاہر کو نظر انداز نہیں کرتا ان سے کسی حد تک ہمیں بھی اتفاق ہو سکتا ہے لیکن دوسرا گروہ ہے جو باطن کو لے کر ظاہر کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے ان سے کسی بھی منزل میں اتفاق ہونا تقریباً ناممکن ہے۔

ایسے آیات قرآن مجید کہ جن کا ظاہری مفہوم لغت کے اصل موضوع کا معنی کے لحاظ سے مراد ہونا عقلاً غیر ممکن ہے ان میں انتہا پسندانہ نقطہ یہ ہے کہ عقل کو صدائے فریاد بلند کرنے دو تم وہی معنی مانو جو بتقاضائے لغت قرآن و حدیث سے سمجھ میں آتے ہوں اس سے اسلام میں فرقہ مجسمہ کا وجود ہوا جس نے ''اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى'' کی بناء پر اللہ کو جسمانی طور پر عرش پر بیٹھنے والا اور يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ وغیرہ کی

بناء پر اعضاء وجوارح پر مشتمل بیان کیا اور نجدی وہابی جماعت کے پیشوائے اعظم ابن تیمیہ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ دوسرے اہل سنت جو مجسمہ ہونے سے بچنا چاہتے ہیں اکثر ان آیات واحادیث کو ظاہری معنی پر قرار رکھتے ہوئے ''بِلَا كَيْفَ'' کے قائل میں یعنی ان کا تصور یہ ہے کہ استوٰی کے معنی بیٹھنے ہی کے لو مگر بیٹھنے کی کیفیت کیا ہے؟ اسے کہو کہ ہم سمجھ نہیں سکتے یدٌ کے معنی ہاتھ ہی کے کہو مگر ہاتھ اس کے کس طرح ہیں؟ اسے نہ سوچو۔ اس طرح وہ بخیال خود تجسیم سے محفوظ رہتے ہیں چنانچہ روایت کے بھی وہ آنکھوں سے دیکھنے ہی کے معنی میں قائل ہیں پھر بھی کہتے ہیں کہ اس سے جسم ہونا لازم نہیں آتا اور اس لئے باوجود یکہ یہ بات ہمارے نزدیک خلاف عقل ہے اور روایت بلاشبہ مستلزم تجسیم ہے پھر بھی ہم عام طور پر اہلسنت کو مجسمہ نہیں کہہ سکتے اس اصول کی بناء پر کہ لازم مذہب مذہب نہیں یہ۔

اس کے برخلاف دوسرے سرے پر نقطہ نظر فلاسفہ وحکماء کا ہے جو ایسی تمام چیزوں کو جن کی نوعیت کا سمجھنا ہماری عقل کے احاطہ سے خارج ہے صرف تخئیل وتمثیل پر مبنی قرار دیتے ہیں یہاں تک کہ نعیم جنت اور عذاب دوزخ کے تذکروں کو بھی مثالی حیثیت دیدیتے ہیں۔

یہ نقطہ نظر اس لئے ناقابل قبول ہے کہ اس طرح کسی بھی واقعہ کے اظہار کا دروازہ بند ہو جائے گا کیوں کہ ہر متکلم کے الفاظ میں یہ پہلو پیدا کیا جاسکتا ہے کہ یہ صرف محاکات کی حیثیت رکھتے ہیں تو پھر کسی واقعہ کو اگر سچ مچ بیان کرنا ہو تو الفاظ کہاں سے آئیں؟

صحیح نقطہ نظر جو اعتدال کا نقطہ ہے یہ ہے کہ جب الفاظ کے ظاہری معنی ایسے ہوں کہ کوئی قرینہ لفظی وعقلی ان کے خلاف نہیں ہے تو اس لفظ کا مطلب وہی لینا چاہئے جو لغت وعرف کے لحاظ سے ان الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں لیکن اگر اصلی معنی لفظ کے ایسے ہوں جو عقلاً ممکن نہیں ہیں لیکن محاورات عرفی کے لحاظ سے کوئی قریب ترین مجازی معنی الفاظ کے موجود ہیں جو عقلاً بھی درست ہو سکتے ہیں۔ تو اس لفظ کو ایسے معنی پر محمول کرنا بھی بلاتکلف صحیح ہے جیسے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کا مفہوم بجائے تمکن جسمانی کے جو عقلاً غیر ممکن ہے غلبہ واستیلا بحیثیت قدرت کے معنی میں اور يَدَ اهُ مَبْسُوْطَتَانِ کے معنی جسمانی ہاتھوں کے بجائے جو عقلاً خدا کے لئے نہیں ہو سکتے اقتدار واختیار کے معنی میں لینا جو عرف عام کے بالکل مطابق ہیں اس صورت میں بھی الفاظ قرآن کو مجمل نہیں سمجھا جاسکتا اور توقف یا تحیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر ایسے کوئی عرفی معنی اس لفظ کے موجود ہی نہ ہوں اور ان کا مفہوم صرف اشارات وکنایات ہی کے طور پر ذہن سے نکالا جاسکتا ہے جو مختلف ذہنی پیمانوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتا ہے تو یہ وہ متشابہات ہوں گے جن کے اصل معنی کو راسخون فی العلم کے حوالے کرنا چاہئے اور ان میں ذہانت سے کچھ پہلو سمجھ میں آئے تو اسے بطور احتمال امکانی طور پر کہنا درست ہے لیکن حتم وجزم کے ساتھ کچھ کہنے کی جراءت نہ کرنا چاہئے۔

تعجب ہے کہ علامہ صدر الدین شیرازی جو دور آخر میں فلاسفہ واہل معقول کی صف اول میں ہیں اگر چہ نتیجہ وہ بھی متشابہات میں اسی مسلک سے متفق معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ اس ظاہر پرستی سے بہت حد تک راضی نظر آتے ہیں جسے اللہ کی تجسیم ایسے کفر عظیم کا تصور پیدا ہوا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے ممکن ہے اپنی تفسیر میں خود ان کا قلم اس جادہ سے کسی ایک یا بہت جگہ ہٹ گیا ہو مگر اصولاً وہ ہمارے بیان کردہ نقطہ اعتدال کو پیش کرتے ہوئے بھی ظاہری مفاہیم کو باقی رکھنے کے شدت کے ساتھ حامی معلوم ہوتے ہیں۔

جسے اپنی کتاب مفاتیح الغیب صفحہ ۲۴، ۲۵ (مطبوعہ ایران) میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

سابق اور حال تبصرہ کے بیانات کی رُو سے غور وفکر کرنے کے بعد حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید کا ترجمہ ظاہری معنی الفاظ کے تحت اللفظی معنی کہنے کا حق ہر واقف زبان عربی کو ہے جسے عربی الفاظ کے معانی پر اتنا عبور

حاصل ہو کہ وہ لغت کی مدد سے سہی ہر لفظ کے معنی سمجھ سکتا ہو اور قرائن مقام کی مدد سے مشترک الفاظ کے متعدّد معانی میں سے کسی ایک معنی کی تعیین کر سکتا ہو لیکن ایسے اشخاص کا ترجمہ قرآن کے لئے کھڑا ہونا جو عربی کے محاورات سے اس طرح واقف نہیں ہیں خود غلطی میں مبتلا ہونا اور دنیا کو گمراہی میں ڈالنا ہے افسوس ہے کہ عموماً تراجم قرآن جو رائج ہیں ان میں متعدد ایسے ہی اشخاص کے قلم سے ہیں اور اس لئے ان کا ضرر نفع سے زیادہ ہے۔

(۲) قرآن مجید کے معانی و مطالب میں جہاں تک ظواہر قرآن کے دائرہ کے اندر ہیں ہر شخص کو غور و فکر کرنے کا حق اور نتائج نکالنے کی گنجائش ہے اور قرآنی آیات سے ان کے ظواہر معانی کی بناء پر استدلال بھی ہر شخص کے لئے صحیح ہے بشرطیکہ اس میں اصول محاورہ و تکلم کا لحاظ رکھا جائے اس کے علاوہ عام و خاص مطلق و مقید منسوخ و ناسخ اور مجمل و مبین کا لحاظ بھی ضروری ہے بغیر اس کے تفسیر لکھنے کا حق نہیں ہے۔

(۳) قرآن کے مضامین پر غور و فکر کرنے سے جو رموز و اسرار پیدا ہوں علمی نکات برآمد ہوں، فلسفی انکشافات کا پتہ چلے اور ادبی محاسن کا اندازہ ہو، انہیں سمجھنا اور ان کا نمایاں کرنا مستحسن خدمت ہے جس کے مقبول ہونے کے لئے معانی و مطالب کو بیان شدہ معیار پر سمجھنے کے ساتھ ذوق سلیم قوت نظر اور ایک حد تک ذہانت و ذکاوت کی ضرورت ہے ہاں اس قسم کی نکتہ پردازی و موشگافی بارگاہ تفسیر میں اسی وقت مقبول ہو سکے گی جب اس علمی نکتہ رمز یا انکشاف کے ثابت کرنے کے لئے اصل معنی قرآن میں کوئی تغیر کرنے کی ضرورت نہ پڑی ہو اور اس کے انہی معانی سے کہ جن کرنے کا معیار ابھی بیان ہو چکا ہے، وہ نکات و رموز پیدا ہوئے ہوں۔

(۴) قرآن مجید کے اصلی معانی و مطالب کو محفوظ رکھنے کے ساتھ ان کے مصداق صحیح کا پتہ لگانے میں اگر تاریخی جغرافیائی یا سائنس کے معلومات اور جدید انکشافات سے مدد ان رہی ہو تو ان معلومات سے مدد لے کر قرآنی آیت کے صحیح مصداق کا پتہ چلانا کوئی نامناسب امر نہیں ہے۔

(۵) ''مُتَشَابِهَات'' یعنی ایسے آیات میں جن کے ظاہری معنی نمایاں طور پر متعین نہیں ہیں عقل سے کام لے کر اشارات و رموز تجویز کرنے کا بطور حتم و جزم سوا ''راسخون فی العلم'' کے کسی کو حق نہیں ہو سکتا۔

بے شک اگر عقل پر زور دے کر کچھ اشارات بطور امکان و احتمال پیدا کئے جائیں تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا بلکہ اس کا دروازہ اس وقت بھی بند نہیں ہوگا کہ جب کسی حدیث نے کسی رمز و اشارہ کی تشریح کر دی ہو۔ اس لئے کہ ایک خاص اشارہ کی تشریح ہو جانے سے انحصار ثابت نہیں ہوتا جب کہ خود احادیث سے ثابت ہے کہ بواطن قرآن میں کثرت ہوتی ہے لہٰذا یہ امر غیر ممکن نہیں ہے کہ اور پہلو بھی پائے جاتے ہوں جن کا احتمالی طور پر ذاتی غور و فکر سے استخراج کیا جا سکے۔

(۶) وہ آیات جن کے اصلی معنی جو با اعتبار لغت ہیں' قرینہ عقلی یقینی کی بناء پر مراد نہیں لئے جا سکتے جیسے الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ وغیرہ ان میں معنی حقیقی کو ترک کرنے کے بعد اگر اصول محاورہ کے ماتحت کوئی قریبی معنی پائے جاتے ہوں جیسے ''ید'' کے معنی ''ہاتھ'' نہ ہونے کے بعد ''قدرت و طاقت'' تو یہ 'متشابہات'' نہ سمجھے جائیں گے ہاں جب ایسے کوئی معنی موجود نہ ہوں تو آیت متشابہات میں سے قرار پائے گی۔ ان میں اگر کوئی بات سمجھ میں آئے تو اس کا بطور احتمال ظاہر کرنا درست ہے۔ وثوق کے ساتھ بغیر راسخون فی العلم کی سند کے کچھ کہنا صحیح نہیں ہے۔

(۷) وہ الفاظ جن کے ظاہری معانی موجود ہیں ان میں بطور رمز و اشارہ کوئی معنی احتمالی طور پر بتائے جا سکتے ہیں لیکن حتم و جزم کے ساتھ نہیں --اس لئے کہ تاویل آیات کی راسخون کا حصہ ہے۔

(۸) کسی تاویل کے احادیث میں وارد ہونے کے بعد بھی الفاظ قرآنی کے جو اصلی معنی باعتبار لغت ہیں وہ نظر انداز نہیں ہوں گے بلکہ اعتقاد وعمل جس سے بھی ان کا تعلق ہے اس کا ان کے مواقف برقرار رکھنا ضروری ہوگا۔

یہی بہت بڑا فرق ہے معنی مجازی میں کہ جو لفظ کے اصلی معنی کو چھوڑ کر مراد ہوتے ہیں اور معنی رمزی میں کہ جو بطور اشارہ مقصود ہوتے ہیں پہلی صورت میں اصلی معنی کا نظر انداز کرنا ضروری ہوتا ہے جیسے ''استوٰی'' کے معنی تمکین جسمانی کے اور ''یَدٌ'' کے معنی جسمانی ہاتھ کے لیکن دوسری صورت میں اصلی معنی بھی محفوظ رہتے ہیں اور ان کی پابندی لازم ہوتی ہے۔

اسے اپنے روزمرہ کے محاورات پر نظر کر کے سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً: ایک شخص نے کہا کہ ''فلاں محفل میں جو گیا'' دیکھا شیر بیٹھا ہے، محفل کا ذکر کرنا قرینہ ہے اس کا کہ شیر سے کوئی بارعب و ہیبت انسان مراد ہے اصلی شیر نہیں ہے اب اگر اس متکلم نے کسی دن یہ کہا کہ میں نے سب جانور دیکھے شیر آج تک نہیں دیکھا، تو اس پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ تم نے ابھی اس دن کہا تھا کہ میں نے شیر دیکھا۔ اس لئے کہ اس دن شیر سے مراد بقرینہ جب شیر صفت انسان قرار ابھی دیا گیا تو اس کا تعلق اس جانور سے نہیں رہا جس کا نام شیر ہے۔ اس لئے وہ ثبوت اور نفی کے خلاف نہیں ہے جو اس کے کلام میں ہے۔

اس کے برخلاف دوسرا جملہ ملاحظہ: ایک شخص کسی ایسے انسان پر تعرض کرتے ہوئے جس کی آنکھوں میں بصارت کم ہے یہ کہے کہ خدا کے فضل سے میری آنکھوں میں بصارت کم نہیں ہے۔

اس سے کہنا تو مقصود یہی ہے کہ اس دوسرے شخص کی آنکھوں میں بصارت کی کمی ہے لیکن اس کی بناء پر وہ خود اپنے الفاظ سے غیر متعلق نہیں ہو سکتا یعنی اس کا یہ کہنا جب ہی درست ہوگا۔ جب واقعی خود اس کی آنکھوں میں بصارت کی کمی نہ ہو لیکن اگر تھوڑی دیر میں اس نے خود ضعفِ بصارت کی شکایت کی تو اس کا وہ کلام لغو اور مہمل ہو جائے گا اس کی وجہ یہی ہے کہ تعرض و اشارہ کی صورت میں اصل معنی نظر انداز نہیں ہوتے بلکہ ان کے محفوظ رہتے ہوئے اشارہ کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔

قرآن میں ان دونوں کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) احادیث میں بتایا گیا ہے کہ قرآن میں بہت باتیں اِیَّاکَ اَعْنِیْ وَ اسْمَعِیْ یَا جَارَہ کے طور پر کہی گئی ہیں یعنی خطاب کسی سے ہے اور مقصود کسی اور کو سنانا ہے۔

جیسے یہ آیت:

لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ. (زمر ۔ ۶۵)

اگر آپ شرکت اختیار کیجئے تو آپ کے تمام اعمال رائیگاں ہو جائیں گے اور آپ گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوں گے۔

یہ تنبیہہ حقیقۃً رسول سے متعلق نہیں ہے بلکہ دوسرے اشخاص سے متعلق ہے جسے رسول پر رکھ کے وارد کیا گیا ہے اب کوئی شخص استدلال کرنا چاہئے یا اعتراض کرے کہ کلمہ ''ان'' عربی میں محتمل الوقوع بات کے لئے آتا ہے رسول سے کہنا کہ لئن اشرکت پتہ دیتا ہے کہ آپ سے معاذ اللہ شرکت کے وقوع کا احتمال تھا اور یہ آپ کی عصمت کے خلاف ہے تو یہ استدلال یا اعتراض درست نہ ہوگا۔ اس لئے یہ خطاب جب دوسروں کی تنبیہہ کے لئے ہو گیا تو اس کے نتیجہ کا تعلق رسولؐ کے ساتھ باقی ہی نہیں رہا بلکہ دوسروں سے ہو گیا۔

(۲) قرآن میں بہت جگہ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ یا اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وغیرہ ہے جس کے معنی ادائے نماز کے ہیں اگر بعض روایات میں یہ نظر سے گزرے کہ اقامہ صلوٰۃ سے اشارہ ہے ولایت کے عقیدہ کی طرف جو سبب درستی عبادات ہے تو بلاشبہہ یہ اشارہ اپنی جگہ درست ہوگا لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ یہ آیت وجوب نماز کی دلیل ہی نہ رہے اور کہا جائے کہ اس سے تو ''ولایت ائمہ معصومین'' مراد ہوگئی۔ اب اس کو نماز سے کیا تعلق یہ مغالطہ ہوگا جس کا واقعیت سے کوئی علاقہ نہیں۔ اس آیت میں یقیناً نماز کا حکم ہے اور اشارہ وجوب ولایت کی طرف بھی ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ نہیں ہے کہ پہلے معنی نظر انداز ہو گئے اور اب بطور استعمال لفظی دوسرے معنی مراد ہوں۔

تاویل آیات کی مختلف اقسام

آیات قرآن کی تفسیر وتاویل جو احادیث میں مذکور ہوتی ہے اس کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں جن میں اکثر اشخاص کو اشتباہ ہوتا ہے اور اس لئے نتائج کے اخذ کرنے میں دھوکا کھاتے ہیں۔

(۱) بعض احادیث ایسی ہوئی ہیں کہ ان میں کسی آیت کے شان نزول اور مورد ِورود کی تعین کی جاتی ہے کہ یہ آیت کس موقع پر اتری تھی اس قسم کی احادیث سے ان آیت کے عموم پر جب کہ الفاظ عام ہوں کوئی اثر نہیں پڑ سکتا بے شک اگر الفاظ آیت ہی کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر رہے ہوں ان میں خود ہی عموم پایا نہ جاتا ہو تو حدیث اس وقت میں اس تاریخی انکشاف کی حیثیت رکھتی ہوگی کہ یہ شخص خاص کون تھا جس کے بارے میں یہ آیت اتری ہے دونوں قسموں کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اَفَمَنۡ کَانَ مُؤۡمِنًا کَمَنۡ کَانَ فَاسِقًا ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ. (السجدہ۔۱۸)

کیا جو مومن ہو وہ مثل اس کے ہے کہ جو فاسق ہو۔؟ نہیں یہ سب برابر نہیں ہیں۔

احادیث سے ثابت ہے کہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ سے ولید بن عقبہ نے بحث کی اور اپنی بلندی جتائی۔ اس پر یہ آیت اتری جس میں مومن سے مراد حضرت علیؑ اور فاسق سے مراد ولید بن عقبہ ہے۔ لیکن اس خصوصیت کے معلوم ہونے کے بعد بھی الفاظ آیت سے جو کلیہ سمجھ میں آتا ہے کہ مومن اور فاسق عزت واحترام اور حقوق میں مساوی نہیں سمجھے جاسکتے اپنی جگہ قائم ہے۔

اس ولید کے بارے میں دوسری آیت جو قرآن میں ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا.

اے ایمان لانے والو! اگر فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو (حجرات ۶)

یہ بھی محل آیت کے خاص ہونے کے باوجود حکم عام کی حامل ہے کہ فاسق کی خبر کو معتبر نہیں سمجھنا چاہیے۔

اُحِلَّ لَکُمۡ لَیۡلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمۡ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمۡ وَاَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّکُمۡ کُنۡتُمۡ تَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ فَتَابَ عَلَیۡکُمۡ وَعَفَا عَنۡکُمۡ ۚ (بقرۃ۔۱۸۷)

جائز ہے تمہارے لئے شب ماہ صیام مقاربت کرنا اپنی عورتوں کے ساتھ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے خدا کو معلوم ہے کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اب اللہ نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف کر دیا

اس آیت میں پہلا جزء پہلی قسم سے تعلق رکھتا ہے اس میں عموم ہے اگر چہ مورد ِنزول معیّنا شخاص سے متعلق تھا لیکن حکم عمومی حیثیت رکھتا

ہے۔لہٰذا ہمیشہ کے لئے قائم ہے۔دوسرا جزء کہ ''خدا کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے رہے ہو مگر خدا تم کو معاف کرتا ہے''۔یہ بیان واقعہ ماضی کی حیثیت رکھتا ہے جو مخصوص افراد سے متعلق ہے جن کے اسماء روایات میں درج ہیں اس سے کوئی عمومی کلیہ نہیں برآمد ہوتا جسے مجرمین اپنے لئے گزشتہ جرائم کے عفو کا پروانہ قرار دیں۔

اس قسم میں کبھی الفاظ عام ہوتے ہوئے بھی قرینہ مقام اور سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خاص اشخاص سے متعلق ہے اور ان میں کسی حکم عام کا اعلان نہیں ہے۔

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ. (مائدہ۔۵۵)

تمہارا حاکم اللہ ہے اور اس کا پیغمبر اور وہ ایمان والے جو نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اس حالت میں کہ وہ رکوع میں ہیں۔

یہاں ایسا ہی ہے کہ الفاظ کے عام ہوتے ہوئے سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ یہ ایک خاص منصب کا اعلان ہے جس میں نام کے بجائے تعارف شخصیت کے طور پر یہ اوصاف لائے گئے ہیں۔

لیکن بعض مقامات پر احادیث کسی وسیع عنوان کی فرد اکمل کا پتہ دیتے ہیں یہ آیات پہلی ہی قسم میں دخل ہوں گے یعنی وہ اپنے عموم پر باقی رہیں گے اور ان میں فرد کے ساتھ اختصاص پیدا نہ ہوگا جیسے بعض روایات میں ہے کہ جہاں جہاں قرآن مجید میں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ ہیں، اس سے مقصود ائمہ معصومینؑ ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ حضرات اس مفہوم کے مصداق اتم واکمل ہیں لیکن اس سے بعض گمراہ اشخاص کا یہ گمراہ کن نتیجہ نکالنا کہ جو جو احکام اس عنوان سے مخاطب کر کے کہے گئے ہیں وہ تمام احکام ائمہ سے مخصوص تھے اور ان کا تعلق ہم سے نہیں ہے بالکل غلط ہے اس کے لئے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کی لفظ کے استعمال کو اس مقام پر دیکھنا چاہئے جہاں بعد والا حکم ائمہ سے متعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ. (نساء۔۵۹)

اے ایمان والا اللہ کی اطاعت کرو اور پیغمبرؐ کی اطاعت کرو اور صاحبان امر کی جو تم میں سے ہیں

یہاں اگر یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کو ائمہ سے مخصوص کر دیا گیا تو ہو اولی الامر کون ہوں گے جن کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے ایک آیت اس طرح ہے کہ:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ. (نساء۔۱۳۶)

اے ایمان لانے والوں ایمان اختیار کرو اللہ اور اس کے پیغمبرؐ پر۔

یہاں ماننا پڑے گا کہ پہلے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد اقرار ایمان کرنے والے ہیں اور مطالبہ ان سے یہ ہے کہ وہ دل سے واقعی ایمان اختیار کریں اور ایسی ہی متعدد آیتیں قرآن مجید میں ہیں جن سے معصومینؑ کا مراد لیا جانا ان کی شان بلند کے خلاف ہے۔

اور اسی سے بہت سے ان روایات کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے جن کے متعدد آیات میں احکام کا تعلق خاص ذات سے نہیں ہے لیکن ان روایات میں یہ ہے کہ یہ آیات شان امیر المومنینؑ میں ہیں۔

علامہ صدرالدین شیرازی فرماتے ہیں:

ومن هٰذا القبیل ما یروٰی من الائمّۃ علیہم السلام ان الصراط المستقیم ھُوا میر المومنین علیہ السلام والنَّبَاِ الْعَظِیْمِ الَّذِیْ ھُمْ فِیْہِ مُخْتَلِفُوْنَ امیر المومنین وان اِنَّہٗ فِیْٓ اُمِّ الکِتٰبِ لدینا لعلی حکیم ھوعلی بن ابیطالب وان قولہ تعالیٰ وبِئْرٌ معطلۃوقصر مشید ، الاول ھو الامام الصامت والثانی ھو الا مام الناطق وامثال ذٰلک فی اٰیٰت کثیرۃ.(شرح اصول کافی طبع ایران ۔ ص ۴۰۳)

اسی طرح کی وہ روایتیں ہیں جو ائمہ معصومینؑ سے وارد ہوئی ہیں کہ صراط مستقیم جناب امیر المومنینؑ ہیں اور نباءِ عظیم (بڑی خبر) جس میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں حضرت امیر المومنینؑ ہیں اور یہ کہ انہ فی الکتب والی آیت میں علی حکم سے مراد حضرت علی بن ابی طالبؑ ہیں اور یہ آیت جس کے معنی ہیں ''بند کنواں'' اور ''مضبوط محل'' اس میں پہلے سے مراد وہ امام جو زبان کھول سکے اور اس طرح کا مضمون بہت سی آیتوں میں ہے۔

اسی سے ان روایت کا مطلب بھی واضح ہوتا ہے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ ثلث قرآن شان امیر المومنینؑ میں نازل ہوا۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ جہاں جہاں بھی کوئی صفت مدح قرآن مجید میں ہے اس کے مفہوم کی فرد نمایاں امیر المومنینؑ ہیں اسی طرح آیات مذمت کا تعلق اعداء اہلبیتؑ کے ساتھ بحیثیت امتیازی افراد مصداق کے ہے چاہے وردوان کا امم سابقہ کے کفار و فجار کے سلسلہ میں ہوا ہو۔ بے شک بعض احادیث ایسے ہوتے ہیں جن میں کسی عموم آیت میں تخصیص یا اطلاق میں تقیید کی جاتی ہے یہ احادیث اگر بجائے خود شرائط حجیت کے حامل ہوں تو یقیناً عموم یا اطلاق آیت کی تخصیص یا تقیید کا باعث ہوں گے جیسے قرآن میں زوجہ کی میراث بتاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

وَلَھُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکْتُمْ اِنْ لَّمْ یَکُنْ لَّکُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ کَانَ لَکُمْ وَلَدٌ فَلَھُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَکْتُمْ. (نساء ۱۲)

اوران کے لئے چوتھا حصہ ہے تمہارے متروکہ کا۔ اگر تمہارے لئے اولاد موجود نہ ہو اور اگر تمہارے اولاد ہو تو انہیں آٹھواں حصہ ملے گا۔

اس میں ماترکتم یعنی متروکہ کا لفظ مطلق ہے جس میں منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد دونوں قسمیں داخل ہیں لیکن جب احادیث معتبرہ سے ثابت ہوجائے کہ زوجہ کو غیر منقولہ میں بالکل یا عین جائیداد میں حصہ نہ ملے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اطلاق آیت میں ایک قید ثابت ہوگئی۔

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ متعدد آیات قرآن سے ملا کر کوئی مطلب نکالا جائے اس کی دو نوعتیں ہیں ایک یہ کہ ان دو یا اس سے زیادہ آیتوں میں سے کسی میں کوئی معنوی تصرف نہ کیا جائے بلکہ ہر ایک اپنے اپنے ظاہری معنی پر برقرار رکھی جائے اور پھر بھی آیات کے مجتمع ہونے سے کوئی ایسا مطلب نکل آتا ہے جو ان میں سے کسی ایک آیت میں باعتبار الفاظ مذکور نہ تھا۔ یہ صورت درست ہے اور جو مطلب اس طرح سے پیدا ہو یقیناً قابل اعتبار ہے

مثال: قرآن مجید میں ایک جگہ مدت رضاع یعنی بچوں کو دودھ پلانے کی میعاد مقرر کی گئی ہے دو برس

وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَھُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ. (بقرۃ ۔ ۲۳۳)

ماؤں کا حق ہے کہ وہ اپنے بچوں کو دو برس تک دودھ پلائیں۔

دوسری جگہ حمل اور رضاعت کی مجموعی مدت کم از کم ڈھائی برس بتائی گئی ہے۔

وَحَمْلُہٗ وَفِصٰلُہٗ ثَلٰثُوْنَ شَھْرًا ط (احقاف ۔ ۱۵)

اس کے حمل اور دودھ بڑھائی کی سب مدت تیس مہینے ہے

جب دونوں آیتوں کو ملا دیا جائے اور تیس مہینے کی مجموعی مدت حمل و رضاعت میں سے دو برس یعنی چوبیس مہینے رضاعت کے منہا کر دیئے جائیں تو حمل کی مدد کے لئے چھ مہینے بچتے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ اقل مدت حمل چھ ماہ ہے یہ حکم شریعت قرآن مجید سے مستنبط ہے اگر چہ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں مذکورہ نہیں ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ یہ نتیجہ اجتماعی ظواہر الفاظ پر مبنی نہ ہو بلکہ دو یا اس سے زیادہ آیتوں میں سے کسی ایک آیت میں کسی حدیث نے کوئی تاویلی معنی بتائے ہوں انسان اس تاویل کو لے کر دوسری آیتوں میں بھی جہاں اس طرح کا کوئی لفظ مذکور ہوئی وہی معنی قرار دے لے اور اس سے کوئی خاص نتیجہ نکالے یا کسی مشترک لفظ سے ایک جگہ بقرینہ مقام ایک معنی مراد ہوں تو اب جہاں کہیں وہ لفظ بغیر اس قرینہ کے آئے وہاں بھی وہی معنی قرار دیئے جائیں یا ایک جگہ بطور مجاز کسی معنی میں استعمال ہوا اور دوسری جگہ قرینہ مجاز کے مفقود ہوتے ہوئے بھی اسی معنی پر محمول کرے یہ جوڑ توڑ آیتوں کا ہرگز درست نہیں ہے۔

بے شک یہ صحیح ہے کہ'' القرآن یفسّر بعضه بعضًا '' قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے مگر یہ اسی دائرہ میں ہے جس کا قاعدہ محاورہ وتکلم تقاضا رکھتے ہیں جیسے عام کی تخصیص مطلق کو تقیید اور اضمار کی تعیین۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے عموماً کسی دانش مند متکلم کا ایک وقت کا کلام دوسرے وقت کے کلام کا مبین وشارح قرار پاتا ہے، یہی صورت قرآن مجید میں بھی ہوگی۔ نہ یہ کہ ہر جگہ ایک آیت کا دوسری آیت میں پیوند لگا کر معنی پیدا کر لئے جائیں چاہئے وہ اصول محاورہ کے بالکل خلاف ہوں جیسے ایک جگہ صلوۃ درود کے معنی میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا. (احزاب۔۵۶)

یہاں اس فعل کا اسناد اللہ کی طرف اس کا قرینہ ہے کہ نماز مراد نہیں بلکہ رحمت اور اس کی منابست سے بعد میں طلب رحمت مراد ہے۔

اب جہاں یہ قرینہ موجود ہو جیسے: اِنَّ اللّٰهَ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وہاں یہ معنی مراد لئے جائیں گے مگر مخالفین شریعت اب ان آیات کی بناء پر

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اور يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ اور اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا. اور ایسی ہی بکثرت آیات میں جو صلوٰۃ اور اس سے مشتق الفاظ ہیں ان سب کو درود کے معنی میں قرار دے کر نماز سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیں تو سعی نامشکور کسی طرح حق بجانب قرار نہیں دی جاسکتی۔

واعظین ومقررین اس طرح کے بہت جوڑ توڑ کیا کرتے ہیں اس میں قدم قدم پر تفسیر بالرائے ہوتی ہے جو سخت ترین گناہ ہے۔

مختصر یہ ہے کہ تفسیر قرآن کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔ اس میں وسعت بھی اتنی ہے جو ان تنگ خیال افراد کے تصور سے آگے ہے جو بالکل تابع لفظ رہنا چاہتے ہیں اور ذرا غور وفکر کر کے جو کوئی حکمت اور نکتہ حقیقت قرآن سے نکالا جائے جو سابق کی کتابوں میں مذکور نہ ہوا سے تفسیر بالرائے کہہ دیتے ہیں اور پھر اس میں تنگی بھی بہت ہے جو ان لوگوں کے حدود تخیل سے بہت تنگ ہے جو قرآن مجید کے آیات کی آنکھ بند کر کے اپنے دل سے تفسیر شروع کر دیتے ہیں اور زمین وآسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ہمیں اس تبصرہ کو اتنے طولانی بنا دینے کی ضرورت پڑی ہم نے اس میں جو اصول قواعد قرار دیئے ہیں انہیں اگر انسان پیش نظر رکھے تو امید ہے کہ وہ نقطہ اعتدال پر قائم رہ کر تدبر فی القرآن کے برکات سے بہرہ مند بھی ہوگا اور تفسیر بالرائے کے عمیق گڑھوں میں گرنے سے محفوظ بھی رہے گا۔

افادات بلاغیؒ

از

مقدمات تفسیر آلاء الرحمٰن

فی

تفسیر القران

جلد اوّل

مبطع ''العرفان صیدا

سنۃ ۱۳۵۱ھ۔۔۔سنۃ ۱۹۳۳ء

تمہید

حجۃ الاسلام آیت اللہ شیخ محمد جواد بلاغی طاب ثراہ سامرا کے حوزہ علمیہ کے فارغ التحصیل اور آیت اللہ میرزا محمد تقی شیرازی کے حلقہ درس کے فیضیاب فقہ اور اصول میں بھی اس معیار پر فائز تھے جو ایک بلند پایہ مجتہد کا ہوتا ہے مگر آپ نے خاص طور پر دینی ضرورت کا احساس فرما کر ان علوم دینیہ میں مجاہدانہ طور پر زندگی گزاری جن کی جانب عموماً عراق و ایران کے مجتہدین توجہ نہیں فرماتے چنانچہ مادّیّین اور نصاریٰ وغیرہ کی رد میں ''الھدی الی دین المصطفیٰ'' اور ''الرحلۃ المدرسیۃ'' اور ''انوار الھدیٰ'' وغیرہ ان کی عظیم الشان کتابیں ہیں آخری عمر میں انہوں نے تفسیر قرآن لکھنا شروع کی تھی جو افسوس ہے کہ عمر کی بیوفائی سے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی وہ شام کے شہر صیدا میں زیر طبع تھی جب میں عراق سے مراجعت کر کے ہندوستان آ گیا۔

میرے ہندوستان آنے کے بعد ممدوح کی تفسیر کی پہلی جلد طبع ہو کر ہندوستان آئی اور مجھ تک پہونچی جس میں آغاز تفسیر کے قبل ۴۸ صفحات میں کچھ اہم مقدمات تمہیدی حیثیت سے درج کئے گئے ہیں۔ جب میں نے تفسیر لکھنے کا ارداہ کیا تو مستقل جلد مقدمہ تفسیر قرآن کے نام سے لکھی جو ۲۷۲ صفحات پر مشتمل تھی اس میں بنظر افادیت کچھ مضامین سرکار مرحوم کے زیادہ تر ان کے حوالے کے ساتھ درج کر دیئے گئے تھے اسے بعض اہل اغراض نے غلط فہمی پھیلانے کا ذریعہ بنایا۔

اب اس مرتبہ مناسب معلوم ہوا کہ ان مضامین کو اصل کتاب سے خارج کر کے سرکار بلاغی اعلی اللہ مقامہ کے اہم افادات کو آخر میں بطور ضمیمہ شامل کر دیا جائے تا کہ حقیقت مشتبہ بھی نہ ہو اور اس کتاب کے ناظرین موصوف کے گرانقدر افادات سے محروم بھی نہ رہیں۔ والسلام

علی نقی النقوی

(۱)

قرآن مجید کی معجزانہ حیثیت کا ایک خاص پہلو

معجزہ قرآنی کی ایک اہم خصوصیت جو دنیا کے کسی دوسرے معجزہ میں پائی نہیں جاتی یہ ہے کہ اعجاز کے جتنے ارکان ہیں ان سب کو وہ خود اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اور مقدمات وقرائن خارجیہ یا صرف عقل پر منحصر نہیں ہیں۔

دوسرے معجزات کی یہ صورت ہے کہ خارق عادت آنکھوں کے سامنے پیش ہو لیکن اس کے معجزہ ہونے میں جتنی باتوں کی ضرورت ہے وہ خود اس میں مضمر نہیں ہیں۔

وہ ایک خاموش مشاہدہ غیبی ہوتا ہے جو اپنی زبان سے یہ اعلان نہیں کرتا کہ میرا اظہار کرنے والا مدعی نبوت وغیرہ بھی ہے جو ایک خارق عادت کے معجزہ ہونے کا رکن اعظم ہے اس کے لئے ضرورت ہوگی کہ علیحدہ سے اس شخص کے دعاوی کو دیکھا جائے تا کہ معلوم ہو کہ وہ مدعی کسی منصب کا ہے یا نہیں؟

پھر اس مظاہرہ سے اس استدلال کی بنیاد سمجھ میں نہیں آتی کہ خارق عادت امر کے ظاہر کرنے سے اس کے مظہر اور دعویدار نبوت کی سچائی کیوں کر ثابت ہوتی ہے؟ اس کے لئے پھر عقل کو درمیان میں لانے کی ضرورت ہے کہ وہ دلیل کو ترتیب دے اور بتلائے کہ خارقِ عادت کا ظاہر کرنا کس طرح دعویدار منصب کی سچائی کا ثبوت ہوتا ہے؟

پھر وہ خرق عادت کا مظاہرہ یہ بھی نہیں بتاتا کہ میرا اظہار کرنے والا اپنی سیرت وکردار کے لحاظ سے کیسا آدمی ہے اور یہ بھی ثبوت اعجاز کا بڑا رکن ہے کیوں کہ اگر مدعی نبوت ایک ایسا شخص ہے جس کا سابقہ زندگی اور افعال واعمال کی گندگی یہ خود اس کے دعوے کے رد کرنے کے لئے کافی ہے تو اس صورت میں وہ لاکھ غیر معمولی کرتب دکھلائے کسی طرح خدا پر ذمہ داری عائد نہ ہوگی اور اسے ان عجیب وغریب مظاہرات کو باطل کرنے کی ضرورت نہ ہوگی لہٰذا خوارق عادات کے ساتھ یہ الگ سے اس مدعی منصب کی سیرت سابق وحال زندگی میں دیکھنے کی ضرورت ہوگی کہ اس کے افعال کیسے ہیں اور وہ اس کو خدا کی طرف سے کسی منصب کے لائق ثابت بھی کرتے ہیں؟

یقیناً وہ تمام معجزات ان تمام اعتبارات سے بالکل گنگ اور خارجی تحقیقات اور عقلی غور وفکر کے دست نگر اور ممنون احسان ہوتے ہیں۔ لیکن یہ قرآن مجید کی خصوصیت ہے کہ وہ معجزہ اور اعجاز کے جتنے ارکان وخصوصیات ہیں وہ سب اسی میں موجود ہیں اور کہیں اس سے علیحدہ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

پہلا امر:

قرآن مجید میں صاف صاف اپنے حامل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے دعویٰ نبوت ورسالت کا اظہار موجود ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات ذیل:

قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعاً. (اعراف۔۱۵۸)

کہیے کہ اے گروہ مردم میں خدا کا رسول ہوں تم سب کی طرف

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى. (نجم ۲ تا ۴)

تمہاری ہدایت کرنے والا شخص نہ تو گمراہ اور نہ شرگشتہ وہ اپنی خواہش دل سے کلام ہی نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس پر اتاری جاتی ہے

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ. (سورۂ فتح۔۲۹)

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں کے مقابلہ میں بڑے سخت ہیں

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ (سورۂ احزاب۔۴۰)

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہیں تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ لیکن خدا کے رسول اور فہرست انبیاء کے ختم کرنے والے ہیں۔

دوسرا امر:

اس نے اپنے غیر معمولی درجہ اعجاز کو آپ کی نبوت و رسالت کی دلیل بتلایا اور کہا کہ اگر تم کو ان کی سچائی اور حقانیت میں شک ہو تو اس کے مثل پیش کرو اور اگر ایسا نہ کر سکو فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ تو سمجھ لو کہ وہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ (ہود۔ ۱۴)

اس طرح اعجاز کے وجہ استدلال عقلی کو اہل عقل کے متنبہ کرنے کے لئے ذکر کیا۔

تیسرا امر:

اس نے جناب رسالت مآبؐ کے اخلاق کی پاکیزگی اور کمال طہارت کو متعدد آیات میں ظاہر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ آپؐ کی زندگی اخلاق حسنہ سچائی اور پاکیزگی کا نمونہ رہی ہے جس کی بناء پر آپؐ کی سیرت آپؐ کے بلند دعوے کیے شایان شان ہے ارشاد ہوا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝ (سورۂ قلم۔ ۴ اور ۹)

یقیناً آپ بڑے اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں۔ ان لوگوں کی یہ آرزو ہے کہ آپ سے کسی دورنگی کا ظہور ہو تو یہ بھی دورنگی سے کام لیں۔

نیز آپ کے تعلیمات کی پاکیزگی کے متعلق ارشاد کیا:

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ. (سورۂ اعراف۔ ۱۵۷)

وہ انہیں اچھی باتوں کا حکم دیتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں۔

اور خود اپنے مندرجہ تعلیمات پر اہل نظر کو سنجیدگی سے غور کرنے کا موقع دیتے ہوئے ارشاد کیا

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ. (سورۂ بنی اسرائیل۔۹)

یقین جانو کہ یہ قرآن دعوت دیتا ہے ایسی باتوں کی طرف جو بالکل سیدھی سیدھی اور صحیح ہیں۔

اس طرح قرآن مجید نے تمام وہ پہلو جو ایک معجزہ کی صحت کے سلسلہ میں غور کے قابل ہوا کرتے ہیں سب خود ہی پیش کر دیئے اور اہل نظر کی نظر کے سامنے رکھ دیئے جس کے بعد غور کرنا نہ کرنا خود ان اشخاص کے حسن اختیار اور سوء اختیار کا نتیجہ ہوگا اور حجت پوری قوت کے ساتھ تمام ہوگئی۔

(۲)

اعجاز قرآن کے مختلف رخ

تاریخی حیثیت

حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی ویسا فرض کر لے جیسا ان کے دشمن کہتے ہیں کہ انہوں نے توریت اور انجیل کے مندرجہ واقعات افواہی حیثیت سے عام اشخاص سے سنے اور انہیں قرآن میں درج کر دیا۔

اس کا نتیجہ کیا ہونا چاہئے ؟ یہ کہ توریت و انجیل میں جس طرح واقعات کا تذکرہ ہوا ہے اس کے ساتھ قرآن مندرجہ واقعات ایسے اضافے اختلافات اور حواشی ہوتے جن میں واقعت کے متانت اور استحکام کا پتہ نہ ہوتا اور افواہی باتوں کی خرافت آمیز داستانوں کا اثر بہت نمایاں ہوتا یعنی توریت و انجیل کے مندرجہ واقعات میں اگر خلاف عقل وفطرت اور منافی اصول دینیہ باتیں نہ تھیں تو اس میں نظر آتیں اور اگر تھیں تو اس میں بہت بڑھ جاتیں۔

لیکن جب ہم توریت و انجیل کے مندرجہ واقعات اور پھر قرآن مجید میں انہی واقعات کے تذکرہ کو دیکھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ بائبل کے واقعات میں اس درجہ دور از کار اور خرافت آمیز روایات کی بھر مار ہے کہ کسی طرح عقل و مذہب کے رو سے انہیں صحت کی سند کا دیا جانا ممکن نہیں ہے اور قرآن انہی واقعات کو تمام ان خرافتوں اور دور از کار باتوں کو حذف کر کے ایسے صحیح اور موافق فطرت انداز سے پیش کرتا ہے جسے عقل اصلیت کی سند دینے پر مجبور ہے۔

ملاحظہ ہو توریت کتاب پیدائش فصل ۳ میں حضرت آدمؑ کے ممنوعہ درخت سے تناول فرمانے کا قصہ اور اس میں جو کچھ دُور از کار باتیں ہیں جن سے خدا کی طرف غلط بیانی اور فریب کاری کا الزام عائد ہوتا ہے۔

اور فصل ۱۵ میں ابراہیمؑ کا واقعہ کہ ان کو خدا کے وعدہ میں شک ہوا شام میں زمین عطا کئے جانے کے متعلق اور فصل ۱۸۔۱۹ میں ملائکہ کے آنے کا تذکرہ ابراہیمؑ کے پاس ولادت اسحاقؑ کو خوشخبری لے کر اور کتاب خروج فصل ۳ میں خداوند عالم کا خطاب موسیٰؑ سے درخت کے ذریعہ سے اور اس کا وہ ضمیمہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کی تعلیم موسیٰؑ کو شروع ہوتی تھی غلط بیانی کے سبق کے ساتھ اور فصل ۳۲ میں ہارون کا قصہ کہ انہوں نے گوسالہ تیار کرایا تھا جو خدائے بنی اسرائیل کی حیثیت سے قرار دیا جائے اور انہوں نے اس کے لئے قربانی اور عبادت کے طریقے مقرر کئے تھے۔

ان تمام واقعات کا ایک دفعہ توریت میں مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں کیا کیا باتیں ایسی ہیں جو کسی طرح عقل و دین کی روشنی میں صحیح تسلیم کیے جانے کے قابل نہیں ہیں جن سے جلالِ الٰہی اور طہارت انبیاء پر دھبہ آتا اور بہت سے اصول عقلیہ کو دھچکا پہونچتا ہے اور پھر انہی واقعات کو قرآن مجید میں نکال کر ملاحظہ کیجئے معلوم ہوگا کہ قرآن مجید میں تمام وہ زوائد حذف ہیں جو مذکورہ بالا حیثیت سے نا قابل قبول تھے اور اس میں تمام واقعات ایسے انداز سے بیان ہوئے ہیں جو کسی طرح شان حضرت الٰہی اور شان انبیاء و مرسلین کے خلاف نہیں ہیں۔

ملحقات توریت میں جو واقعات مذکور ہیں وہ بھی کچھ کم افسوسناک نہیں ہیں حضرت ایوبؑ کی طرف انتہائی جزع فزع اور خدا سے شکوہ

بلکہ اس پر اعتراض کی نسبت حضرت داؤدؑ کی طرف زنا کاری کی شرمناک نسبت حضرت سلیمانؑ کی طرف کفر وشرک کے رواج دینے کی نسبت وغیرہ وغیرہ ایسے واقعات جو ایک لحظہ کے لئے صحیح تسلیم نہیں کئے جا سکتے۔

بلکہ توریت اور اس کے ملحقات میں مذکورہ بالا امور سے بڑھ کر بعض باتیں ملتی ہیں جیسے حضرت لوطؑ کی طرف شراب خوری اور نشہ شراب میں اپنی دونوں لڑکیوں کے ساتھ زنا کاری، حضرت یعقوبؑ کی خدا کے ساتھ کشتی حضرت یعقوبؑ کے اپنے والد کے ساتھ فریب کاری، خدا کا مشورہ آسمانی فرشتوں کے ساتھ کہ آخاب بادشاہ بنی اسرائیل کو گمراہ کیا جائے اور اس کے علاوہ بہت باتیں جن سے پرانے عہد نامہ کے صفحات پورے طور پر مملو نظر آتے ہیں۔

انجیل مقدس جو حضرت مسیحؑ کی تاریخ زندگی ہے اس میں بھی اختصار و کمی صفحات کے باوجود حضرت مسیحؑ کی طرف ایسے واقعات کی نسبت موجود ہے جو کسی طرح اُن کی شان کے لائق نہیں ہے جیسے شیراب خوری غلط بیانی ماں اور بھائیوں کے ساتھ بداخلاقی اور نامحرموں کے ساتھ اخلاق سوز بے باکی۔

بلاشبہہ قرآن مجید کے زمانہ میں اور اس کے قبل انبیاء ومرسلین کے تاریخی معلومات کے لئے یہود، قسیسین، نصاریٰ کی تعلیمات کے سوا کوئی سرچشمہ نہ تھا اور توریت وانجیل ہی کے مندرجات تھے جو اخبار یہود وقسیسین نصاریٰ کے نوکِ زبان تھے۔

تو رسول اسلامؐ نے اگر ان تعلیمات کو یہود ونصاریٰ کے علماء سے حاصل کیا ہوتا تو وہ تمام خرافات جو ان کی کتابوں میں مذکور تھے اس حد تک تو آپؐ کے یہاں بھی ملتے جو عام عیسائی علماء کے یہاں از قبیل مسلمات تھے اور اگر آپ ان کو صرف افواہی حیثیت سے صرف عوام کی زبانی سن کر نقل کرتے جیسا کہ عام عیسائی مولفین ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو عام نظام عادات کے مطابق اس میں توریت اور انجیل کے اصل مندرجات سے بدرجہ زیادہ خرافات اور دور از کار باتیں آجاتیں لیکن اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے واقعات کے جو بائبل میں واقعیت کی شان کے بالکل خلاف تھے بالکل ذکر ہی نہیں کیا اور جن واقعات کا بائبل کے ذکر کیا ان کو تمام اضافوں سے الگ کر کے جو اس واقعہ کو واقعیت کے حدود سے الگ پھینکنے کے ذمہ دار تھے۔

اس سے ایک غیر جانبدار انسان کی عقل کو صاف اس نتیجہ تک پہنچنا چاہئے کہ درحقیقت واقعات کی مسخ شدہ صورت وہ تھی جو توریت و انجیل میں رائج ہوگئی تھی اور خدائے قدوس نے جس کا کام بندگان خدا کی ہدایت ہے اپنے اس رسول کو جو خاتم المرسلین ہے ان تمام صحیح واقعات کی اصل صورت میں تعلیم دی تا کہ توریت وانجیل میں پڑی ہوئی خرابیوں کی اصلاح ہوجائے اور گمراہ کن خیالات کا جو جلال الٰہی اور شان انبیاء کے منافی واقعات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں قلع قمع اور آئندہ کے لئے سدباب ہوجائے۔

استدلالی حیثیت سے

قرآن کے محل نزول پر غور کیجئے عرب کی جہالت کفر وشرک کا دور دورہ گمراہی کی شدت عقلوں کی تاہ نگاہوں کی ظاہر بینی علوم وفنون سے اجنبیت اور منطق وفلسفہ سے بالکل ناشناسی اس سب کو دیکھے اور پھر قرآن مجید کے معارف وحقائق سے بھرے ہوئے آیات کی تلاوت کیجئے خاص مسائل توحید اور عدل ونبوت کے مضبوط استدلات کا مطالعہ کیجئے ان آیت کے عمق کو دیکھئے باریک بین دقیق فلسفی نگاہوں سے ان کے معانی پر غور کیجئے معلوم ہوگا کہ وہ کس پایہ کا کلام ہے اور ذہن فیصلہ کرے گا عقل وعادت فطرت وطبیعت کی رو سے اس طرف میں پیدا ہونے والے کسی

انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔

اس کے ساتھ بائبل کے ان استدلالوں پر نظر ڈالئے جو حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں تو محسوس ہوگا کہ ان طریقوں سے اثبات مطلب کی ناکام کوشش کسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے شایان شان نہیں ہے۔۔۔ یہاں تک کہ بعض مقامات پر تعداد الٰہ اور شرک تک کا نتیجہ برآمد ہوتا ہے ایسی کمزوریوں سے قرآن منزہ ومبرا ہے۔

تشریعی حیثیت سے

اس کا عام ذہن پورا اندازہ تو نہیں کر سکتے مگر بہت سے صحیح ذوق اور پختہ عقل رکھنے والے افراد جنہوں نے دنیا کے قوانین واصول انتظامی کا انتقادی نظر سے مطالعہ کیا ہے موازنہ کر کے دو قسم کی تعلیموں میں اتنا ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں سے کون روح انتظامی کے ساتھ زیادہ موافق اور مفاد اجتماعی کے مطابق اور کہاں تک عملی ہے اور فطرت کے ساتھ سازگار اس کے علاوہ اس کا سمجھ لینا تو ہر شخص کے لئے آسان ہے کہ کس قانون میں جامعیت پائی جاتی ہے اور شخصی ونوعی، انفرادی واجتماعی ہر قسم کے احکام پر حاوی ہے۔

بلاشبہہ قرآن مجید کے نزول کے زمانہ میں ایک شریعت موجود تھی شریعت موسویہ جو یہود ونصاریٰ دونوں کے نزدیک مسلم تھی اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف نسبت رکھنے والا ایک آئین تھا جو اگرچہ اس اعلان کی بناء پر کہ زمین وآسمان ٹل جائیں مگر موسیٰؑ کی شریعت کا ایک شوشہ نہیں ٹل سکتا شریعت موسوی کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ہونا چاہئے لیکن وہ عمل طور پر شریعت موسویہ کے خلاف ایک مستقل چیز بن گیا تھا۔

اس کے علاوہ ایران میں زردشتی مذہب سے تعلیمات تھے اور زردشت کی ایک مستقل شریعت تھی جو زندہ حیثیت رکھتی تھی اور ہزاروں آدمیوں کو اپنا پابند بنائے ہوئے تھی۔

کوئی بھی دین اگر اساسی حیثیت سے صحیح ہے تو اس کی شریعت کے اجزاء اصلی یقیناً وہی ہو سکتے ہیں جو خدائے قدوس کے نازل کردہ ہیں یہ اور بات ہے کہ بعد کی تراش خراش نے ان میں تبدیلی کر دی ہو اور طرح طرح سے مسخ کر دیا ہو۔

شریعت موسوی اور عیسوی اس کی یقینی مثال ہے۔

زردشت کے متعلق چوں کہ قرآن نے نبوت کی گواہی نہیں دی ہے لہٰذا اسے قطعی حیثیت حاصل نہیں ہے لیکن قرائن اور بعض اخبار وآثار کی بناء پر بہت سے لوگ نبوت کے قائل ہیں جس کی نفی کے لئے بھی قطعی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اس صورت میں اگر ان شریعتوں میں کچھ ایسے احکام موجود ہوں جو قرآنی احکام کے ساتھ متحد ہیں تو اس میں کوئی اعتراض ان کی بات نہیں ہے لیکن دیکھنے کا امر یہ ہے کہ قرآن میں ان مشترک احکام سے بہت زیادہ اور زندگی کے بہت سے ایسے شعبوں کے متعلق کتنے ایسے احکام وقوانین ہیں جن کا مذکورہ بالا شریعتوں میں صراحۃً وجود کیسا اشارہ بھی نہ تھا۔ اس سے بے لوث ضمیر کو اس نتیجہ تک پہونچنا چاہئے کہ اس شریعت کو طویل عمر زمانہ کے ضروریات کے مطابق اسی خدا نے نازل کیا ہے جس نے ان شریعتوں کو ان کے محدود زمانہ کے لحاظ سے محدود احکام پر مشتمل نازل کیا تھا اور اسی لئے آخرِ عمرِ دنیا تک اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اخلاقی حیثیت سے

بلاشبہ علم اور تربیت کا انسان کے اخلاق پر بڑا اثر پڑتا ہے جہالت اور علوم صحیحہ سے ناواقفیت بڑی سے بڑی بداخلاقیوں کا سرچشمہ ہوتی ہے اور اخلاق کی جان جو کچھ بھی ہے وہ ملکات نفسیہ اور قوائے طبعیہ میں اعتدال کے نقطہ کی پابندی اور افراط وتفریط سے کنارہ کشی ہے۔

بڑے بڑے معلم کے تعلیمات اس وقت بے قیمت ہیں جب وہ یا تو تفریط کی وجہ سے اس حد تک کمزور ہوں کہ ان سے امن وانتظام اور تحفظ وتہذیب وشائستگی کا مقصد حاصل ہی نہ ہوتا ہو اور یا افراط کے لحاظ سے اس درجہ زیادہ ہوں کہ وہ نفسانی طرف کے تقاضوں کی بناء پر کبھی ممنون عمل بن ہی نہ سکیں۔

توریت اور انجیل مرّوجہ کے اخلاقی تعلیمات کی نوعیت انہی دونوں راستوں میں تقسیم ہے اول الذکر افراط اور ثانی الذکر تفریط کے لحاظ سے اعتدال سے علیحدہ ہیں۔

لیکن قرآن مجید کی تعلیم ہر شعبہ حیات میں حدوسط کا درجہ رکھتی ہے وہ افراط وتفریط دونوں سے مبرا ہے۔ اور اس لئے ہر شخص کے لئے ممکن العمل اور تہذیب وشائستگی کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔

یہ خصوصیت بھی قرآن مجید کی وہ ہے جو اس کو تمام کتب ادیان میں ممتاز درجہ عطا کرتی ہے اور اس کے ساتھ جب عرب کی جہالت اور رسول عربیؐ کے ماحول کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے گا تو ماننا پڑے گا کہ وہ الہامی وآسمانی حیثیت رکھتی ہے اور یقیناً خداوند عالم کی جانب سے نازل شدہ ہے۔

(۳)

نفیٔ تحریف

فرقہ امامیہ کا قول کہ قرآن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی

واضح ہو کر طبقہ محدثین کے استاد کل جن کی دقت نظر احادیث کے نقل کرنے میں شہرہ آفاق ہے یعنی جناب صدوقؒ کتاب الاعتقادات میں تحریر فرماتے ہیں:

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن جسے خداوند عالم نے اپنے نبیؐ پر نازل فرمایا وہ یہی ہے جو دونوں دفیتوں کے درمیان موجود ہے اور وہ اس سے زیادہ نہیں ہے اور جو شخص ہماری طرف نسبت دے کہ ہم اصل قرآن کو اس سے زیادہ مانتے ہیں وہ بالکل جھوٹا ہے موصوف نے ان تمام روایات کو جو کمی کے بارے میں وارد ہوئی ہیں دوسرے معانی پر محمول کیا ہے۔

''فصل الخطاب'' کے اواخر میں شیخ مفیدؒ کی کتاب مقالات سے یہ عبارت درج کی ہے کہ ''فرقہ امامیہ'' میں بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ایک کلمہ، ایک آیت اور حروف کی بھی کمی نہیں ہے بے شک جناب امیرؑ کے جمع کردہ قرآن میں جو تاویل اور تفسیر اس کے معانی کی اس کے اصل شان نزول کے موافق ہوئی تھی وہ کم کر دی گئی ہے اور جناب سید مرتضی علم الہدیٰؒ کا بھی قول ہے کہ قرآن میں کوئی کمی نہیں ہے اور معدودے چند افراد جو فرقہ امامیہ اور حشویہ میں کے اس کے خلاف قائل ہو گئے ہیں وہ توجہ کے بھی مستحق نہیں ہیں اس کے خلاف قول ہے وہ اخباریوں میں سے افراد کی طرف منسوب ہے جنہوں نے کچھ ضعیف روایتوں کو صحیح سمجھ کر یہ قول اختیار کر لیا ہے۔

شیخ طوسیؒ کی کتاب تفسیر ''تبیان'' کے شروع میں ہے کہ قرآن مجید کے متعلق زیادتی یا کمی کا سوال اٹھایا جانا بھی مناسب نہیں ہے اس لئے کہ زیادتی کے نہ ہونے پر تو اجماع ہے اور کمی اس کے متعلق بھی تمام مسلمانوں کے مذہب کا ظاہر یہ ہے کہ واقع نہیں ہوئی اور خصوصیت سے ہمارے مذہب میں بھی صحیح قول یہی ہے اور اسی کی حمایت جناب سید مرتضیٰؒ نے کی ہے اور احادیث سے بھی وہی ظاہر ہے بے شک شیعہ اور سنی کی طرف سے بہت سی روایتیں ایسی وارد ہوئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سی آیتیں قرآن کی کم ہو گئیں اور بعض اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ پہنچ گئیں لیکن یہ روایتیں بطریق احاد منقول ہیں جن پر نہ علم کی بنیاد ہو سکتی ہے نہ عمل کی اور بہتر یہ ہے کہ ان روایات سے کنارہ کشی ہی اختیار کی جائے۔''

تفسیر مجمع البیان میں بھی بالکل اس سے اتفاق کیا ہے اور کشف الغطاء کتاب قرآن میں ہے کہ ''اٹھواں مبحث نقص قرآن کے بارے میں یقیناً قرآن مجید نقص کے عیب سے محفوظ ہے خدا کی غیبی حفاظت کے ساتھ جس پر صریحی قرآن کی آیت دلالت کر رہی ہے اور ہر زمانہ کے علماء کا اجماع بھی اسی کے موافق ہے اور شاذ و نادر بعض لوگوں کا قول قابل توجہ نہیں ہے اور جو جو روایت ایسے ہیں کہ ان نقص قرآن کا پتہ چلتا ہے ضرورت مذہب ان کے ظاہر پر عمل سے مانع ہے لہٰذا کسی نہ کسی طرح ان کی تاویل کرنا چاہئے۔

شیخ بہائیؒ کا قول ہے کہ زیادتی اور نقصان کے متعلق اختلاف ہے اور صحیح یہی ہے کہ قرآن ہر طرح کی زیادتی و کمی سے محفوظ ہے اور قول

خداوند عالم کہ ''ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں اس کی دلیل ہے'' اور یہ جو مشہور ہے کہ بعض جگہ امیر المومنینؑ کا نام تھا وہ حذف ہو گیا جیسے:

يَآ اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فِيْ عَلِيٍّ۔ وغیرہ یہ بالکل غیر معتبر ہے:

اور سید محسن بغدادی نے ''شرح وافیہ'' میں لکھا ہے کہ ہمارے علماء میں جو قول مشہور ہے اور جس پر اجماع کا دعویٰ ہوا ہے وہ یہی ہے کہ کمی واقع نہیں ہوئی۔

اور محقق ثانی علی بن عبد العالی کرکی نے ایک مستقل رسالہ قرآن مجید میں کمی نہ ہونے کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ پھر انہوں نے صدوقؒ کا کلام ذکر کیا ہے اور بطور اعتراض ان احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے جن سے نقص قرآن کا پتہ چلتا ہے جواب دیا ہے کہ حدیث جب قرآن اور احادیث متواترہ یا اجماع کے خلاف ہو اور اس کی تاویل ممکن نہ ہو تو اسے ساقط کرنا چاہئے۔

ان تمام علماء کے برخلاف ہمارے ہم عصر محدث (فاضل نوری) نے فصل الخطاب میں کوشش کے ساتھ ان روایات کو جمع کیا جن سے وہ قرآن میں کمی واقع ہونے پر استدلال کرتے ہیں اور ان روایت کے اسناد میں کثرت پیدا کی ہے ان روایتوں سے کہ جو مرسل طریقہ (یعنی بغیر ذکر سند کے) تفسیر عیاشی و فرات بن ابراہیم وغیرہ میں مذکور ہیں۔ حالاں کہ جو شخص جستجو کرے اور ذوق تحقیق رکھتا ہو وہ یقین کرے گا کہ یہ مرسل روایتیں انہی چند مسند روایتوں سے ماخوذ ہیں جو کسی طرح صحیح ہو ہی نہیں سکتیں اور بعض آپس میں اتنا اختلاف رکھتی ہیں کہ خود ہی متعارض ہو جاتی ہیں اس مختصر کتاب میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان آخری دونوں قسموں کو توضیح کے ساتھ لکھا جائے اس کے علاوہ اکثر مستند روایتیں جو ہیں ان کی سندیں چند اشخاص تک منتہی ہوتی ہیں جن میں سے کسی کے متعلق علمائے رجال لکھتے ہیں کہ وہ لا مذہب شخص ہے اس کی حدیثیں کمزور اور روایتیں متروک ہیں کسی کے متعلق یہ کہ اس کے احادیث اور مذہب دونوں مشکوک ہیں اس کی حدیث کبھی قابل قبول ہوتی ہے اور کبھی نا قابل قبول، اور وہ کمزور راویوں سے احادیث کو نقل کرتا ہے اور کسی کی نسبت یہ لکھا ہے کہ وہ بہت زیادہ غلط بیان اور نا قابل اعتبار ہے میں جائز نہیں سمجھتا کہ اس کی تفسیر سے ایک روایت بھی نقل کروں اور یہ کہ وہ واقفی ہونے میں مشہور ہے اور امام رضاؑ سے سخت عداوت رکھتا تھا اور کبھی یہ کہ اس کی روایتیں بالکل خراب ہوتی ہیں اس کی غلو کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے راویوں کی تعداد کی کثرت کوئی فائدہ نہیں دے سکتی اور گر ہم چشم پوشی کر کے اتنے بڑے اہم موضوع پر ان لوگوں کی روایات کو قبول بھی کر لیں تو دوسری متعدد روایتوں کی بناء پر ہمیں ان روایات کے معنی میں یہ کہنا چاہئے کہ جو فقرات ان میں حذف شدہ بتلائے گئے ہیں وہ تفسیر کی حیثیت رکھتے تھے یا تاویل تھے یا بیان تھے اس فرد کا جو یقیناً اس عموم کے تحت میں داخل ہے اپنے اظہر افراد اور مستحق ترین شخصیت ہونے کی جہت سے حکم عام کے ساتھ یا اس فرد کا جو عموم کے ضمن میں تنزیل قرآن کے وقت خصوصیت سے ملحوظ تھی۔ یا اصل جس کے بارے میں آیت نازل ہوئی تھی یا جو مبہم الفاظ (مائے موصولہ وغیرہ) سے مراد اصلی تھی۔ انہی آخری تین پہلوؤں پر محمول ہونا چاہئے ان روایت کو جن میں لکھا ہے کہ یہ تنزیل ہے اور اس کو جبرائیل لے کر آئے تھے اور اس معنی کی دلیل خود ان روایت میں جمع کا عمل میں لانا ہے اور تحریف سے مراد تحریف معنوی ہے جس کے شاہد امام محمد باقرؑ کی وہ تحریر ہے جو آپ نے سعد خیر کو لکھی ہے اور جو کافی کی کتاب روضہ میں مذکورہ ہے اور اس میں لکھا ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے کتاب خدا کا پس پشت ڈال دینا یہ تھا کہ انہوں نے اس کے مکتوبی الفاظ کو تو قائم رکھا اور اس کی جو مقررہ حدیں تھیں ان میں تحریف یعنی تبدیلی کر دی اسی طرح وہ روایات جن میں یہ ہے کہ مصحف جناب امیرؑ یا مصحف ابن مسعود میں اس طرح لکھا ہے اس سے مراد یہی ہے

کہ بطور تفسیر و تاویل تحریر تھا اس کی شہادت دینے کے لئے موجود ہے جناب امیرؑ کا قول جو آپ نے زندیق سے فرمایا ''میں ان کے پاس لایا پوری کتاب جو تنزیل اور تاویل دونوں پر مشتمل تھی''۔

ان روایات میں سے جن کی نسبت ہم نے اشارۃً تحریر کیا یہ ہے کہ فاضل معاصر (محدث نوری) نے چار روایتیں درج کی ہیں جن میں یہ ہے ''بولا یة علی'' کا فقرہ مصحف حضرت فاطمہؑ میں تحریر تھا کسی میں ہے کہ وہ مصحف فاطمہؑ میں یونہی تھا اور واضح ہونا چاہئے کہ جناب فاطمہؑ کی مصحف قرآن نہیں تھا بلکہ وہ ایک کتاب تھی جس میں علمی رموز و اسرار کا تذکرہ تھا جیسا کہ اصول کافی کی متعدد روایتوں سے جو صحیفہ اور مصحف اور جامعہ کے باب میں درج ہیں ثابت ہوتا ہے ان میں امام جعفر صادقؑ کا یہ قول ہے کہ اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے کہیں یہ ہے کہ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ اس میں قرآن ہے جیسا کہ صحیح و حسن حدیثوں میں وارد ہوا ہے۔

اس کے علاوہ کافی میں اس باب میں کہ ائمہ معصومینؑ لوگوں پر گواہ ہیں صحیح حدیث برید کی امام محمد باقر سے اور دوسری حدیث امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ ان دونوں حضرات نے آیت کے بارے میں کہ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً فرمایا امت وسطیٰ ہم ہیں۔ امیر المومنینؑ سے اس کی تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ ہم وہ ہیں جن کے بارے میں خدا نے فرمایا کہ ''ہم نے تم کو امت وسطی قرار دیا''۔ اب جو مرسل طور پر تفسیر نعمانی و تفسیر سعد میں وارد ہے کہ آیت میں ائمہ وسطیٰ ہے۔

اس کو تفسیر ہی پر محمول کرنا چاہئے اور یہ کہ معنی امّۃ وسطیٰ کے ائمہ وسطا تھے جس کو لوگوں نے بدل دیا نیز کافی میں اس باب میں ائمہ معصومینؑ ہادی اور رہنما ہیں۔ فضل کی روایت ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے اس آیت کے معنی دریافت کیے کہ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے حضرت نے فرمایا کہ ہر امام رہنما ہے اس طبقہ کا جس میں وہ ہے اور برید کی روایت ہے امام محمد باقر سے اسی آیت کی تفسیر میں کہ رسالت مآبؐ مُنْذِرٌ (عذاب الٰہی سے خوف دلانے والے) ہیں اور ہر زمانہ میں ہم میں سے ایک رہنما ہے جو رسالت مآبؐ کے احکام کی طرف ہدایت کرتا ہے اور رسالت مآبؐ کے بعد جو رہنما ہوئے ہیں وہ جناب امیرؑ ہیں اور ان کے بعد کے اوصیاء یکے بعد دیگرے اسی کے مثل ہیں۔

روایت ابوبصیر کی امام جعفر صادقؑ سے اور روایت عبدالرحیم قصیر کی امام محمد باقر علیہ السلام سے ان سب میں یہی ہے کہ رسالت مآبؐ منذر ہیں اور علی ابن ابی طالبؑ ہادی اور اس مضمون کی روایتیں اہل سنت کے یہاں بھی ہیں ابو ہریرہ اور ابو برزہ اور ابن عباس اور نیز خود امیر المومنینؑ کے اسناد سے اور حاکم نے مستدرک میں اس روایات کو صحیح السند قرار دیا ہے۔

ان تمام روایات کے ہوتے ہوئے بھی کیا کوئی شخص پسندیدگی کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ فصل الخطاب کی اس کاوش کو جو انہوں نے بعض متاخرین کی تفسیروں سے اور میر باقر داماد کے حاشیہ اقتباسات سے بعض روایتوں کے درج کرنے میں اختیار کی ہے اور لکھا ہے کہ روایات شیعہ اور سنی دونوں طریقوں سے کثرت کے ساتھ ہیں کہ اصل آیت یوں تھی کہ۔ إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرُ الْعِبَادِ وَعَلِيٌّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (بس تم میرے بندوں کے ڈرانے والے ہو اور علیؑ ہر قوم کے لئے رہنما ہیں)۔ یہ ایک شعر جس کو قصیدہ خوان پڑھ سکتے ہیں باقی کوئی شخص جو عربی زبان میں ایک درجہ رکھتا ہو وہ اسے گوارا نہ کرے گا کہ اس کی طرف اس شعر کے نظم کرنے کی نسبت دی جائے اور طرق شیعہ و اہلسنت کا جو حوالہ دیا گیا ہے تو بے شک و شبہہ ان طرق میں سوا اس کے جو ہم نے سابقاً درج کیا اور کچھ نہیں اور وہ اس سے جو محدث نوری نقل کر رہے ہیں مختلف ہے۔

''قیاس کن زگلستان من بہار مرا''

نیز کافی کی روایت ہے جو ابوحمزہ سے امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ: کفار کا قول: رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ اس سے مراد ولایت علی بن ابی طالبؑ کا انکار تھا۔ یہ الفاظ صراحتہً بتلا رہے ہیں کہ یہ تفسیر کی حیثیت سے ہے اس صراحت کے سبب سے توضیح ہو جائے گی۔ ابوبصیر کی ان دونوں ضعیف روایتوں کی جن سے بظاہر یہ پتہ چلتا ہے کہ بولایۃ علی کی لفظ قرآن میں داخل تھی اور وہ حذف کر دی گئی ہے۔

عمر بن حنظلہ کی روایت ہے امام جعفر صادقؑ سے سورہ بقرہ کی اس آیت میں کہ متاعًا اِلَی الحول غیر اخراج آپ نے فرمایا مخرجات عبارت کو دیکھتے ہوئے شبہہ بھی نہیں ہوسکتا سوا اس کے کہ یہ مخرجات کا فقرہ بطور تفسیر بیان ہوا ہے یعنی اخراج کی لفظ سے مخرجات مراد ہے نہ یہ لفظ یہاں پر تھی اور وہ قرآن مجید سے کم کر دی گئی ہے لیکن کتاب فصل الخطاب میں اس کو بطور بیان نقصان درج کیا ہے۔

نیز ان روایات میں سے محمد بن مسلم کی صحیح السند روایت ہے امام جعفر صادقؑ سے جو کتاب کافی میں باب ''منع الزّکوٰۃ'' کے شروع میں درج ہے اس میں ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا یہی مراد ہے اس ارشاد حضرت احدیت سے کہ ان لوگوں کو طوق پہنائے جائیں گے اس شے کے جس کے ساتھ انہوں نے بخل کیا ہے یعنی جو انہوں نے بخل کیا ہے مال زکوۃ میں سے یہ روایت بالکل صراحت کے ساتھ اس امر کو بتلاتی ہے کہ من الزکوۃ کی لفظ بطور تفسیر ہے جو امامؑ نے بیان فرمائی ہے۔ نہ یہ کہ وہ جزء قرآن ہے اور اس روایت کی یہ صراحت شرح قرار پائے گی ابن عمیر والی مرسل نے روایت کی جو امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ قول باری تعالیٰ ہے۔ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ مِنَ الزَّكٰوةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۝

اور اس روایت کے معنی بھی وہی ہوں گے کہ مابخلوا بہ سے مراد من الزکوۃ ہے نہ یہ کہ وہ قرآن کا جزء ہے اور کم کر دیا گیا ہے

نیز انہی روایات میں سے صحیحہ ابوبصیر ہے امام جعفر صادقؑ سے جیسا کہ کافی میں باب ''نَصّ عَلَی الْاَئمہ'' میں مذکور ہے اس روایت میں ہے کہ ابوبصیر نے عرض کیا لوگ کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے حضرت علیؑ اور آپ کی اولاد کا نام قرآن میں ذکر کیوں نہ کر دیا حضرت نے فرمایا ان لوگوں سے کہو کہ رسالت مآبؐ پر قرآن میں یہ نازل ہوا کہ نماز واجب ہے لیکن خدا نے یہ بیان نہیں فرمایا کہ مغرب کی تین رکعت ہے اور عشاء کی چار رکعت یہاں تک کہ رسالت مآبؐ وہ تھے جنہوں نے لوگوں کے سامنے اس کی تفسیر عمل کر کے ظاہر فرمائی اور اسی طرح قرآن نے اجمال سے زکوۃ و حج کے بارے میں کام لیا اور رسولؐ خدا نے تفصیل بتلائی۔ اس روایت سے ظاہر ہے کہ امامؑ نے لوگوں کے اس قول کی رد نہیں فرمائی کہ قرآن مجید میں امیر المومنینؑ کا نام صراحۃً مذکور نہیں بلکہ اس کے دوسرے نظائر پیش کر کے ان کے استدلال کی رد فرمائی۔

اس کی گواہ وہ روایت بھی ہے جو کافی میں اس کے تھوڑی دور بعد صحیحہ فضلاء میں وارد ہے امام محمد باقرؑ سے اور ابوالجارود کی روایت حضرتؑ سے اور ابوالدیلم کی روایت حضرت امام جعفر صادقؑ سے کہ ان دونوں بزرگوں نے مقام استدلال میں اپنے اصحاب کے سامنے جب کہ تقیہ کا موقع بھی نہ تھا یَآاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۔ (مائدہ ۔ ٦٧) کی تلاوت فرمائی اور اس میں ''فی علی'' نہیں کہا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض روایتوں میں جو اس مقام پر یا دوسرے مقامات پر ''فی علی'' کی لفظ ہے وہ بطور تفسیر و بیان ہے جیسے جبرائیل بطور وحی خدا کی طرف سے لائے ہیں لیکن جزء قرآن نہیں ہے اور اس طرح کی وحی تو ہر کلام رسالت مآبؐ کے موافق ہوتی تھی اس لئے کہ (قرآن میں موجود ہے) آپ اپنی خواہش نفس سے بات ہی نہیں کرتے جو کچھ آپ کا کلام ہوتا ہے وہ وحی ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔

نیز ان روایات میں سے فضیل کی روایت ہے۔امام رضاؑ سے کافی کے باب ''معنی التنزیل فی الولایۃ'' میں کہ راوی نے عرض کی یہ آیت هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَo حضرت نے فرمایا یعنی امیر المومنین علیہ السلام۔راوی نے عرض کیا یہ تنزیل ہے؟ حضرت نے فرمایا ہاں اس روایت میں حضرت نے امیر المومنینؑ کا نام یعنی کی لفظ کے ساتھ ذکر کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ جزء قرآن نہیں ہے بلکہ بیان مراد اور هٰذا کی لفظ کے اصلی مشار الیہ کے طور پر ہے۔اب سائل کا یہ پوچھنا کہ یہ تنزیل ہے؟ اور حضرت کا فرمانا کہ ہاں اس سے صاف ظاہر ہے کہ تنزیل سے مراد جزء قرآن ہی نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ جو چیز قرآن کی کسی آیت میں خصوصیت کے ساتھ مراد ہو اس کو وہ حضرات تنزیل کے لفظ سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

یہ روایت اور اس کی ایسی دوسری روایتیں تمام ان دلائل کو ختم کر دیتی ہیں جن سے فصل الخطاب کے اوراق پر کئے گئے ہیں۔

اور ان روایات کی حقیقت بھی اس سے پہلے کھولی جا چکی ہے اور انہی مطالب کی طرف جو ہم نے بیان کیے علمائے اعلام کے کلمات میں جو ہم نے نقل کیے تھے اشارہ موجود ہے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ یہ روایت ضعیف السند ہے اور اسی طرح بعض اس کے قبل کے روایات تو ہم جواب میں کہیں گے اکثر روایتیں جنہیں فصل الخطاب نے نقل کیا ہے وہ ایسی ہی یا اس سے زیادہ ضعیف السند ہیں اس کے علاوہ ہم نے جو صحیح السند روایتیں پیش کی ہیں وہ کیا کم ہیں اور وہ اثبات مطلب کے لئے کافی ہیں ان لوگوں کے واسطے جو صاحبان عقل و تمیز ہوں۔

(۴)

قرآن مجید کی قرأت

قرآن مجید کے آیت کی مادی اور صوری حیثیت اور عام طور پر جو اس کے پڑھنے کا طریقہ ہے وہ نسل در نسل چودہ سو برس میں برابر مسلمانوں کے اندر محفوظ و برقرار رہا ہے اور قراء سبع یا ان کے علاوہ دوسرے قاریوں کی قراتیں جو کتابوں کے اندر درج ہیں کبھی عمومی حیثیت سے اس پر اثر انداز نہیں ہوئیں اور نہ صحیح بخاری اور مسند حاکم وغیرہ میں مختلف صحابہ کی زبانی جو بکثرت مختلف قراءتیں ہیں جنہیں کنز العمال میں درج کیا گیا ہے اس عمومی انداز قراءت کو متاثر بنا سکیں۔

پھر یہ کہ یہ سات یا مزید اضافہ کے ساتھ دس قراءتیں جتنی ہیں وہ بعض الفاظ کی صورت سے بس تعلق رکھتی ہیں نہ یہ کہ وہ کسی لفظ کی کمی یا زیادتی کو بتاتی ہوں اور اس کے بعد بھی وہ آحاد کی روایتیں ہیں دوسرے اشخاص آحاد کی زبانی جن سے کوئی گمان بجائے خود بھی بحد وثوق واطمینان پیدا نہیں ہوتا چہ جائیکہ خود وہ آپس کے تعارض واختلاف کی وجہ سے کمزور بھی ہیں اور پھر اس رسم الخط کے خلاف ہیں جو عام مسلمانوں کے درمیان ایک ہزار برس سے زیادہ کی طولانی مدت میں قائم و برقرار رہا ہے اور قراء سبعہ میں سے ہر ایک صرف ایک راوی کی حیثیت رکھتا ہے جس کی عدالت اور وثاقت بھی ثابت نہیں ہے اور وہ ایسے ایسے احاد سے روایت کرتا ہے جن میں زیادہ تر اسی کی ایسی حیثیت رکھتے ہیں اور پھر خود ان کے بعد ان سے روایات کرنے والے بھی اسی قسم کے اشخاص ہیں چناں چہ عاصم کے دو شاگرد ہیں جن کے ذریعہ سے عاصم کی قراءت کا دنیا کو علم ہوا ہے مگر خود ان دونوں میں عاصم کی قراءت کے متعلق اکثر اختلاف ہوتا ہے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔

اس طرح نافع کے دو شاگرد ابن کثیر سے روایت کے سلسلہ میں ایسا ہی ہے۔

اور ابو عمر بن العلا کے صرف ایک شاگرد یزیدی اور ان کے دو شاگرد ابو عمر و اور ابو شعیب۔

☆ ابن عامر سے سلسلہ روایت میں کچھ دوسرے اشخاص کے واسطہ سے ذکوان اور ہشام

☆ حمزہ کے ایک شاگرد سلیم اور ان کے دو ۲ راوی خلفؔ اور خلادؔ

☆ کسائی کے بھی دو ۲ راوی ابو عمر اور ابو الحارث

اب جبکہ ہر طبقہ میں سے ایک اور دو راوی ہوتے رہے اور وہ بھی باہمی اختلاف کے ساتھ تو تواتر کا دعوی بے بنیاد نہیں تو کیا ہے؟

پھر یہ کہ ان آحاد قراءتوں کی سندوں میں سے کوئی اہلسنت کے اصطلاح کے مطابق بھی صحیح کی تعریف میں داخل نہیں ہے چہ جائیکہ مذہب امامیہ کے معیار پر اس کے بعد نہایت حیرت ناک ہے کسی کا یہ کہنا کہ یہ ساتوں قراءتیں تواتر کا درجہ رکھتی ہیں اور یہ قاری عموماً تھوڑے سے فرق سے باوجود زیادہ تر اس رسم الخط کے موافق رہتے ہیں جو عام طور پر رائج ہے سوا شعبہ کی زبانی والی عاصم کی قراءت کے جو کبھی کبھی اس سے الگ ہوتی ہے اس لئے اس رسم الخط سے جو عموماً قرآن کا ہے برطرف کر کے کسی دوسرے انداز سے پڑھنا کسی طرح درست نہیں ہے خصوصاً جبکہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ:

اِقْرَاءُوْا كَمَا يَقْرَأُ النَّاس..... اس طرح پڑھو جس طرح لوگ پڑھتے ہیں

اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ جو عام طریقہ قراءت کا ہے اس سے انحراف نہ کرو۔

ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ سات یا دس قراءتیں جو ہیں، وہ زیادہ تر کسی لفظ کی شکل وصورت میں عربی صرف واشتقاق کے مختلف طریقوں یا لغوی معنی کے لحاظ سے کچھ تبدیلیوں سے متعلق ہیں۔ جیسے: علیهم الیهم اور لدیهم میں هم کی ھ (ہ) کو کسرہ دیا جائے یا ضمہ اور تظاهرون کی لفظ میں ظ تشدید کے ساتھ یا بغیر تشدید کے تو ان میں جس قراءت کے بھی مطابق پڑھیں اسے صحیح ہونا چاہئے مگر حقیقت میں تلاوت قرآن تو یہ ہے کہ جو لفظ بصورت وحی رسولؐ اتری ہو اسے پڑھا جائے نہ یہ کہ اپنے عربی قواعد کے معلومات کی بناء پر جس جس طرح وہ لفظ صحیح ہوتا ہو اس طرح اس کا ادا کرنا لہٰذا ہمیں یقین نہیں تو قوی سے قوی گمان اس لفظ کا حاصل کرنا ہے جو رسولؐ پر نازل ہوئی تھی اور وہ اس طریقہ پابندی سے وابستہ ہے جو عام مسلمانوں میں صدر اول سے اب تک رائج رہا ہے۔

رہ گیا ان قراءتوں کے اعتبار کے لئے سبعۃ احرف والی حدیث سے استناد، وہ انتہائی کمزور ہے۔

اول تو نزل القرآن علی سبعۃ احرف والی حدیث اپنے لفظ ومعنی کے اعتبار سے اس درجہ مبہم مضطرب اور تاریک ہے کہ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں اس کے معنی درج کرتے ہوئے لکھ دیا ہے کہ:

اختلف فی معنی سبعة احرف علی اربعین قولا.

اس سات حرفوں کے معنی میں چالیس مختلف قول وارد ہوئے ہیں

ان میں پینتیس ۳۵ قول ابن حیان کی کتاب سے درج بھی کئے ہیں اس کے بعد پھر خود حافظ سیوطی نے لکھا ہے:

وقد ظن کثیر من عوام انّ المراد بها القراءات السبعة وهو جهل قبیح.

اور بہت سے عوام نے یہ گمان کیا ہے کہ اس سے مراد ساتوں قراءتیں ہیں اور یہ بہت بری جہالت کا مظاہرہ ہے

دوسرے یہ کہ مستدرک حاکم میں ان شرائط صحت کے ساتھ جو صحیحین کی حدیثوں کا معیار ہیں ابن مسعود کی روایت ہے حضرت پیغمبرؐ خدا سے کہ:

نزل القرآن من سبعة ابواب علیٰ سبعة احرف زاجراً و ا مراً وحلا لاً وحراماً و محکماً و متشابهاً وامثالاً.

قرآن مجید سات بابوں کے قبیل سے سات حرفوں پر نازل ہوا ہے ممانعت ہے، حکم ہے، حلال ہے، حرام ہے، محکم ہے، متشابہہ ہے اور امثال ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سات حرفوں سے مراد سات باب ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں آیات موجود ہیں۔

اسی کے مطابق ابن جریر کی روایت میں ابوقلابہ کی زبانی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

انزل القرآن علیٰ سبعة احرف امر و زاجر و ترغیب و ترهیب وجدل و قصص ومثل.

قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے امر نہی، ترغیب، تہدید، بحث، مباحثہ، قصص اور امثال

اور ابن جریر سنجری ابن المنذر اور ابن الانباری نے ابن عباس کی زبانی حضرتؐ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ:

اِنَّ الْقُرْاٰن علیٰ اربعة احرف حلال و حرام. الخ

قرآن چار حرفوں پر ہے حلال، حرام وغیرہ

اور سنجری نے کتاب ابانہ میں حضرت علیؑ سے روایت کی ہے:

انزل القراٰن علیٰ عشرة احرف بشیر و نذیرو ناسخ و منسوخ وعظة و مثل ومحکم و متشابه و حلال وحرام.

قرآن دس حرفوں پر اتارا گیا ہے خوشخبری تخویف وتحدید، ناسخ ومنسوخ، موعظہ وامثال، محکم ومتشابہہ اور حلال وحرام

تیسرے اہلسنت کی کتابوں میں ان کے معیار پر بہت عمدہ سندوں کے ساتھ ایسی حدیثیں اس سلسلہ میں ہیں جو قطعی نا قابل قبول اور عقلی طور پر واہیات اور خرافات میں داخل ہیں جیسے احمد بن حنبل کی روایت ابوبکرہ سے کہ حضرت رسولؐ خدا نے تقاضہ کر کے جبرائیلؑ سے قرآن کی قراءت کے الفاظ میں ردوبدل کی اجازت حاصل کی یہاں تک کہ سات حرفوں تک تعداد پہونچی جبرائیلؑ نے کہا:

کلّها شاف کاف مالم تختم اٰیة عذاب برحمة واٰیة رحمة بعذاب.

یہ سب طریقے کافی اور شافی ہیں جب تک آیت عذاب کو رحمت پر اور آیت رحمت کو عذاب پر ختم نہ کیا جائے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنی چاہے الفاظ میں تبدیلیاں ہو جائیں بس اتنا نہ ہو کہ آیت عذاب آیت رحمت اور آیت رحمت آیت عذاب ہو جائے۔ دوسری حدیث میں ان جائز تغیرات کی مثال بھی دی گئی کہ جسے تعال کی جگہ اقبل هلم اذهب اور اسرع کی جگہ اعجل وغیرہ

☆ اسی طرح کی روایت طبرانی نے ابوبکرہ سے اور احمد وطبرانی دونوں نے ابن مسعود سے نقل کی ہے۔

☆ ابوداؤد کی حدیث میں ہے:

لیس منها الاَّ شاف کاف ان قلت سمیعا علیما. عزیزا حکیما مالم تختم او اٰیة عذاب برحمة بعذاب.

یہ سب طریقے شافی وکافی ہیں اگر تم سمیعا علیما کہو یا عزیزا حکیما کہو جب تک کہ آیت عذاب کو رحمت سے اور آیت رحمت کو عذاب سے بدلا نہ جائے۔

☆ ابن جریر نے ابوہریرہ کی زبانی حضرتؐ سے روایت کی ہے:

اِنَّ هٰذا القراٰن نزل علیٰ سبعة احرف فاقرؤولا حرج ولٰکن لا تجمعوا ذکر رحمة بعذاب ولا ذکر عذاب بمغفرة.

یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے لہٰذا تم شوق سے خاطر خواہ پڑھو کوئی مضائقہ نہیں ہے بے شک رحمت اور عذاب کی آیتوں کے خلط ملط نہ کرو۔

☆ اور احمد بن حنبل نے عمر کی حدیث درج کی ہے کہ:

القراٰن کله صواب مالم تجعل مغفرة عذابا او عذابا مغفرة.

قرآن جس طرح بھی پڑھو ٹھیک ہی ہوگا جب تک کہ مغفرت کو عذاب اور عذاب کے مغفرت نہ بنادو۔

ان روایت کے لحاظ سے قرآن کی شان اعجاز تو بالکل بے حقیقت چیز ہو جاتی ہے اور سوا ایک محدود تبدیلی کے جس کی ممانعت کی گئی ہے باقی ہر طرح کی تحریف کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے جس کے بعد سالمیت قرآن کی لفظ کے معنی کوئی نہیں رہتے۔

چوتھے معتبر کتب اہل سنت میں ایسے تصریحات موجود ہیں جن سے اختلاف قراءت کی کوئی صحیح بنیاد باقی نہیں رہتی جیسا کہ ابن انباری نے یہ صراحت درج کی ہے کہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، زیدؓ بن ثابت اور تمام مہاجرین وانصار کی ایک ہی قرائت تھی اور ابن ابی داؤد نے سند متصل کے ساتھ انس سے روایت کی ہے انہوں کہا کہ میں نے حضرت پیغمبر خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؑ سب کے پیچھے نماز پڑھی ہے وہ سب مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پڑھتے تھے اور یہ بھی روایت لکھی ہے کہ سب سے پہلے جس نے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ پڑھا وہ مروان بن حکم تھا۔

پانچویں جو فیصلہ کن چیز اس بحث میں ہے، وہ امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے جو بطریق شیعہ سند متصل کے ساتھ کافی میں وارد ہے۔

اِنَّ القراٰن واحد نزل من عند واحد ولکن الا ختلاف یجیٔ من قبل الرُّواۃ.

قرآن بس ایک ہے اور ایک ذات کے پاس سے نازل ہوا ہے مگر اختلاف پیدا ہوتا ہے مختلف راویوں کی وجہ سے

اور صدوقؒ نے اپنے اعتقادات میں بطور مرسل امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے اور کافی میں بطور صحیح فضیل بن یسار سے منقول ہے کہ:

قلتُ لا بی عبد اللہ علیہ السلام اِنَّ النَّاس یقولون اَنَّ القراٰن نزل علیٰ سبعۃ احرف فقال علیہ السلام کذبوا ولٰکنہٗ نزل علیٰ حرف واحد من عند الواحد.

میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا لوگ کہتے ہیں کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے حضرت نے فرمایا وہ جھوٹے ہیں بلکہ وہ ایک حرف پر نازل ہوا ہے ایک ذات کی جانب سے اور اس کی موید سیاری کی روایت بھی ہے جو امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام دونوں سے ہے۔

(۵) اصول تفسیر

اس سلسلہ میں چند پہلو قابل تبصرہ ہیں

(۱) مفرد الفاظ اور عربی زبان میں ان کے معانی کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن مجید عربی زبان کی سب سے زیادہ فصیح سب سے زیادہ عام عربوں میں رائج اور مانوس بولی میں اترا تھا لہٰذا عام طور پر اس کے تحت لفظی معانی قوم عرب کے افراد سے پوشیدہ نہ تھا سوا شاذ و نادر بعض الفاظ کے جو کسی سبب سے بعض افراد کو معلوم نہ ہو۔ جیسا کہ سورہ عبس میں ارشاد الٰہی ہے۔ وَفَاكِهَةً وَّ اَبًّا وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا. مگر جب غیر عرب دوسری قومیں مشرف بہ اسلام ہوئیں اور آپ کے میل جول سے امتداد زمانہ کے ساتھ خود عرب زبان میں تبدیلیاں ہوگئیں تو اب بہت ایسے الفاظ ہوگئے جو نزول قرآن کے وقت عام فہم تھے اور اب عربی روزمرہ والی زبان کے بدل جانے سے وہ الفاظ غیر عام فہم ہوگئے یہاں تک یہ واقفیت کی کمی خواص یعنی زمرہ علماء میں شمار ہونے والے اشخاص تک بھی پہونچ گئی تو اب کتب لغت سے مدد لی جانے لگی۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ مفردات الفاظ کو لغت اور محاورہ کے مطابق حل کرنے کی بنیاد زیادہ تر ذاتی حیثیت سے عربی ادب کی مزاولت اور موارد استعمال کے تتبع پر قائم ہونا چاہئے صرف کتب لغت میں دیکھ لینے سے صحیح نقطہ حقیقت کے پہنچنا جوئے شیر لائے سے کم نہیں ہے۔

مثال کے طور پر ہم ایک معمولی لفظ لمس اور اس کے ساتھ لفظ مس کو دیکھتے ہی اس میں لغت کی کتابوں میں وہ گڈ مڈ یا گڑبڑ ہے جس کے بعد لغت سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

نہایۃ اللّغۃ میں ہے لفظ مس کے معنی ہیں:

مست الشئ اذا لمسته بيدك.

کہا جاتا ہے میں نے اس چیز کو مس کیا جبکہ اپنے ہاتھ سے اس کا لمس کیا ہو

اب قاموس میں لمس کے معنی دیکھئے تو ملے گا:

لمسه مسته بيده و مسسه اى لمسه.

اسے لمس کیا یعنی اپنے ہاتھ سے مس کیا اور میں نے اسے مس کیا یعنی لمس کیا

اور مصباح میں ہے:

مسته افضيت اليه يدى من دون حائل هٰكذا قيّدوه.

میں نے اسے مس کیا یعنی اپنا ہاتھ اس تک پہنچایا بغیر کسی کے اس طرح اس میں قید لگائی ہے

اور اس کے قبل لکھ چکے ہیں:

لمسه افضى اليه بأليد هٰكذا فسّروه

اسے لمس کیا یعنی ہاتھ اس تک پہنچا یا اس طرح اس کی تفسیر ہوئی ہے

ابن درید نے کہا ہے:

اصل اللمس باليد للمتصرّف مِنَ الشَّئ.

لمس دراصل ہاتھ سے ہوتا ہے کہ کچھ اس چیز کو پہچانا جائے

اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ:

لمست مسست و كل ماسّ لامس.

''میں نے لمس کیا'' یعنی میں نے مس کیا اور ہر مس کرنے والا لمس کرنے والا ہے۔

اور فارابی نے کہا ہے کہ لمس مس ہے اور تہذیب میں ابن الاعرابی سے منقول ہے کہ لمس کسی شے کا مس کرنا ہے اور مس کو لکھا ہے کہ مس کے معنی ہیں کسی شے کا مس کرنا ہاتھ سے جوہری نے کہا ہے کہ لمس کے معنی ہیں مس پھر مصباح میں حل لغت کے بعد لکھا ہے:

اِذَا كَانَ اللَّمْس هُوَ الْمَس فَكَيْفَ يَفْرَقُ الْفُقَهَاءُ بَيْنَهُمَا.

جب کہ لمس اور مس ایک چیز ہے تو معلوم نہیں فقہاء ان دونوں میں فرق کیوں قرار دیتے ہیں؟

مگر حقیقت یہ ہے کہ فقہاء معانی الفاظ کو صحیح طور سے سمجھنے میں ان لغویین سے زیادہ نظر رکھتے ہیں اس لئے کہ ان کی عمریں گزرتی ہیں کتاب وسنت کی سیر اور کلام عرب کے تتبع میں انہوں نے بہت خوب سمجھا ہے اور ٹھیک کہا ہے کہ لمس اور مس دونوں میں باعتبار معنی کے فرق ہے۔

''لمس'' کسی شے کا خاص طور سے چھونا ہے ایک ایسے حصہ جسم سے اپنے کہ جس میں احساس کی طاقت ہو خاص طور پر چھونے کا مطلب یہ ہے کہ چھونا اسی قصد سے ہو کہ اسے شے کا احساس کیا جائے صرف ہاتھ سے چھونے کی خصوصیت نہیں ہے مگر ہر طرح سے چھونے کی تعمیم بھی نہیں ہے اگر کسی اور حصہ جسم سے اس مقصد سے چھوا جائے کہ احساس حاصل ہو تو وہ بھی لمس ہوگا لیکن اکثر یہ لمس ہاتھ ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے کیوں کہ وہ آسان ذریعہ ہے اور اس کا احساس زیادہ قوی ہے۔ مگر ''مس'' کے معنی ہیں چھو جانا دوسری شے کا اس میں قصد احساس کی خصوصیت نہیں ہے اور ہاتھ کے ذریعہ سے ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ جو شخص موارد استعمال کا تتبع کرے وہ تصدیق کرے گا کہ لمس اور مس کے یہی معنی ہیں جو تحریر ہوئے ہیں اور لغویین کی ایک بات بھی ٹھیک نہ تھی۔

اس کی دوسری مثال لفظ توفی ہے کہ اس میں اہل لغت کے کلمات میں بڑا اضطراب ہے کسی نے اس کے معنی اَمَاتَہ ''موت دینا'' لکھ دیئے اس کے اتباع میں اکثر مفسرین نے سورہ آل عمران کی آیت يَا عِيْسَى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ میں یہ معنی لکھ دیئے کہ ''اے عیسیٰ میں تمہیں موت دینے والا ہوں'' کسی نے کہا اُمِيْتُكَ حتف انفك ''تمہیں ایسا کروں گا کہ اپنی موت مرو''۔ کسی نے اس کے ساتھ اپنے عقیدہ حیات مسیحؑ کو سنبھالتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ

مُمِيْتُكَ فِي وَقْتِكَ بعد النزول من السّماء.

تمہیں موت دی جائے گی تمہارے وقت پر آسمان سے اترنے کے بعد

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے نہ اس لفظ کے فلسفہ لغوی پر نظر ڈالی نہ اس کے ''مبدا'' اشتقاق پر نہ ''انقلاب تعریفی'' پر نہ قرآن مجید

کے محاورات پر نہ عرب کے استعمالات پر ورنہ ہرگز ہرگز وہ توفی کے معنی موت کے نہ قرار دیتے اور واقعہ یہ ہے کہ کسی ایک جگہ بھی قرآن یا غیر قرآن میں ''توفی'' بمعنی موت نہیں ہے بلکہ اس کے معنی ہیں لینا اور پورا کرنا یہ کبھی موت کی صورت سے ہوتا ہے، کبھی نیند کی صورت سے اسی طرح کبھی زندہ زمین سے آسمان پر اٹھا لئے جانے کے ساتھ ہوسکتا ہے اور خود قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال جس جس انداز سے ہوا ہے وہی اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی ہے جیسا کہ سورہ زمر میں ہے:۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى. (زمر۔۴۲)

اللہ توفی کرتا ہے نفوس کی ان کی موت کے وقت اور جنہیں موت نہیں آئی ہے ان کے سونے کے عالم میں تو روک لیتا ہے اس کو جس پر موت کا فیصلہ ہوا ہے اور بھیج دیتا ہے واپس دوسرے نفس کو ایک خاص مدت تک کیلئے۔

یہاں اگر یوں معنی کہے جائیں کہ اللہ نفوس کو ان کی موت کی صورت میں موت دیتا ہے تو کوئی معقول بات نہ ہوگی اور پھر مزید برآں کہ جسے موت نہیں آئی ہے اسے اس کی نیند کے عالم میں موت دیتا ہے یعنی چہ؟

اسی طرح ارشادِ الٰہی سورۂ انعام میں ہے:۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ. (انعام۔۶۰)

اور وہ، وہ ہے جو رات کو تمہاری توفی کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم نے دن کو کیا ہے پھر وہ دن میں تمہیں اٹھاتا ہے تاکہ مقررہ مدت پوری ہو پھر اسی کی طرف تمہارا پلٹنا ہوگا۔

یہاں بھی رات کو توفی کرنے کے معنی ہیں نیند کا طاری کرنا پھر اللہ بیداری کی صورت میں انہیں دن آنے پر اٹھاتا ہے تاکہ جو عمریں ان کی مقررہ ہیں انہیں پورا کرے پھر آخر میں مرنے اور قیامت میں اٹھائے جانے کی صورت سے اللہ کی طرف انہیں پلٹنا ہوتا ہے۔

اور جیسے کہ سورہ نساء میں ارشاد الٰہی ہے۔(آیت۔۱۵)

حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ. یہاں ہم اگر یہ ترجمہ کریں کہ موت انہیں موت دے تو کوئی معنی نہ ہوں گے معنی اس کے وہی ہیں کہ موت ان کی مدتِ عمر کو پورا کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن اور غیر قرآن عرب کے کلام میں جہاں توفیٰ یا اس سے مشتق الفاظ آئے ہیں تو اس کے کسی شے کو پورا پورا لینے ہی کے معنی ہوتے ہیں جیسا کہ سکوں میں ''درہم وافی'' کا محاورہ ہے یعنی وہ سکہ جس میں کچھ کمی نہیں ہے اور یہ معنی توفی کے اہل لغت نے بھی درج کیے ہیں اور کہا ہے کہ توفاہ اور استوفاہ کے ایک ہی معنی ہیں اور اس کا شاہد شاعر کا یہ قول ہے:

ان بنی الا در لیسو الاحد ولا توفّا ھم قریش فی العدد.

بنو ادر کسی کی ملکیت نہیں ہیں اور نہ قریش تعداد میں ان کی توفی کر سکتے ہیں

یعنی ان کو پورا پورا لے نہیں سکتے لیکن میں کہتا ہوں کہ استیفا اور توفیٰ کے معنی میں اشتقاق کے زیر اثر ایک فرق نمایاں ہے۔

استیفاء باب استفعال کا مصدر ہے جیسے استخراج اس میں تدابیر کے ساتھ کسی شے یا مطالبہ کا پورا پورا حاصل کرنا نکلتا ہے اور توفی معنی میں کسی شے کا پورا حاصل کرنا نکلتا ہے قدرت کے ساتھ اس میں تدابیر کا ہونا ظاہر نہیں ہوتا اور اخذ کے معنی بس لینے کے ہیں اس میں پورے کا مفہوم نہیں ہے۔

اس آیت میں کہ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَ نْفُسَ حِيْنَ مَوْ تِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَا مِهَا میں یتوفیٰ فعل ہے جس کا مفعول الا نفس معطوف علیہ ہے اور اسی پر اَلَّتِيْ لَمْ تَمُتْ کا عطف ہے اسی طرح ایک لفظ توفی یتوفی دو ۲ سے متعلق ہے ایک انفس ۱ اور دوسرے اَلَّتِيْ لَمْ تَمُتْ اب اگر یتوفی کے معنی لیں ''موت دیتا ہے'' تو الا نفس تعلق کے ساتھ تو یہ معنی بن جائیں گے کہ نفوس کو موت دیتا ہے۔ مگر جنہیں موت نہیں آئی، اُنہیں موت دیتا ہے اس کے کیا معنی؟

کوئی کہے کہ وہاں توفی کے معنی بطور مجاز زندہ اٹھا لینے کے لئے لیں گے مگر جب یتوفی کا لفظ ایک ہے تو یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ ایک مفعول کے ساتھ تعلق میں اس کے کچھ معنی ہوں اور دوسرے مفعول کے ساتھ اس کے معنی کچھ اور ہوں۔

اور حقیقت امر وہی ہے کہ توفّی کے ایک عام معنی ہیں اور وہ کسی شے کو پورا پورا لے لینا ہے خواہ عالم زندگی سے الگ کر کے یا عالم بیداری سے یا زمین اور اس دنیا کی اجتماعی زندگی سے علیٰحدہ کر کے آسمان کی طرف اٹھا کر جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے لئے ہوا۔

(۲) مفردات الفاظ کے حل کر چکنے کے بعد دوسری منزل ان الفاظ کے باہمی ارتباط پر نظر کرنا ہے۔ اس کا تعلق علم نحو سے ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس میں بھی نحویوں کے بنائے ہوئے قاعدوں سے زیادہ ذاتی محاورات کے مطالعہ اور عربی کلام کے اسلوب سے انس اور واقفیت پر دارومدار ہونا چاہئے۔

علم نحو کی کتابیں اس وقت کے لئے خوب ہیں جب کہ انسان عربی سے ناشناس ہو اور عربی زبان کو حاصل کرنا چاہ رہا ہو۔ اس وقت کے لئے نحو کی بنیادی قواعد بیشک ایسے ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر اسے آگے بڑھانا اور تحصیل علم عربی میں مصروف ہونا چاہئے لیکن جب انسان کو ملکہ عبارت کے سمجھنے اور صحیح پڑھنے کا پیدا ہو گیا اب اس کو نحو کی کتابوں اور نحویوں کی دوراز کار باتوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑتا وہ جتنا آگے بڑھتا ہے سیر و تتبع کلام فصحاء میں اس کے سامنے نئے نئے اسلوب پیش کرتا جاتا ہے جو ان حدود سے بالکل آگے ہے جن تک نحوی لوگ پہنچ سکے ہیں۔

یعنی سمجھنا چاہئے کہ نحویین کی بہت سی باتیں بالکل ڈھکوسلے کی ہوتی ہیں جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

مثلاً ایک شاعر کا مصرع ہے:

جاءو ا بمذق هل رايت الذئب اقط

''لائے وہ دودھ جس میں پانی ملا ہوا تھا، کیا تم نے بھیڑیا کبھی دیکھا ہے''۔

یہ ایک خاص انداز کلام ہے جس سے زبان شناس افراد لطف اٹھا سکتے ہیں۔

اب ہمارے نحوی اصحاب اس کی ترکیب کہنے بیٹھے الفیہ کے شارحین نیز دوسری نحوی کتابوں کے مصنف لکھتے ہیں کہ اس کلام کی تقدیر یوں ہے:

جاءوا بمذق مقول فيه هل رأيت الذئب قط.

وہ لوگ ایسا پانی ملا ہوا دودھ لائے جس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟

اب خدا ہی کو معلوم ہے کہ اس توجیہ سے بیچارے شاعر کی روح پر کیا گذری؟

وہ تو دودھ کی رنگت کی تصویر کھینچنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ رنگ پیش نظر ہو جائے جو پانی کی کثرت سے دودھ میں نظر آ رہا تھا اس نے یہ الفاظ ایک خاص مصوری کے انداز پر کہے تھے ذی علم محقق ارباب نحو نے ترکیب نحوی کی فکر میں اس کو یوں کہا کہ ''دودھ ایسا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟'' ''یہ'' کبھی بھیڑیا دیکھا ہے۔'' اس کلمہ مقدر مقول فیہ'' جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کے ذریعہ سے دودھ کی صفت قرار پا گیا لیکن کیا اس طرح شاعر کا اصلی مقصود حاصل ہوتا ہے کیا شاعر یہی کہنا چاہتا تھا؟ نہیں ہرگز نہیں آخر دودھ کے بارے میں اس کے کہے جانے کے کیا معنی کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ هل رایت الذیب قط تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے بالکل مستقل استفہامی جملہ ہے جس کی سابق کلام کے ساتھ ترکیبی حیثیت سے کوئی آویزش نہیں ہے وہ صرف ظاہر کرنے والا ہے دودھ کی ایک صفت کو جو شاعر کے ذہن میں ہے کلام کا جزء نہیں ہے وہ یہ کہ لونه کلون الذئب دودھ ایسا تھا کہ جس کا رنگ ہو بہو بھیڑیے کا سا تھا اس کو دل میں رکھ کر اس نے سامعین کے ہر فرد سے سوال کیا ہے هل رایت الذئب قط تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے یعنی اگر تم نے دیکھا ہو تو تم تصدیق کرو گے کہ بیشک دودھ اسی رنگ کا ہے۔

اب دیکھیے کہ یہ معنی کہیں بھی نحویین کی ساختہ و پرداختہ ترکیب سے پیدا ہوتے ہیں؟

نحویین کے اس طرح کے ڈھکوسلوں کی آماجگاہ قرآن مجید کی آیتیں بھی بنی ہیں جس کی مثال ایک یہ ہے کہ قرآن میں متعدد جگہ لَآ اُقْسِمُ کا لفظ ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ۔ لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ وغیرہ وغیرہ

ان آیات کی تفسیر میں جار اللہ زمخشری ایسا متبحر عالم نحو و لغت ایسا گھبرایا ہوا نظر آتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

پہلی آیت:

☆فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ ○ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ (سورہ واقعہ) میں نہیں قسم کھاتا ستاروں کے غروب ہونے کے مقامات کی حالانکہ یہ قسم اگر تم جانو بہت عظیم ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ لا اقسم کے معنی ہیں اقسم قسم کھاتا ہوں اور لا زائد ہے جیسے

دوسری آیت:

☆لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ میں زائد ہے۔ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ: میں نہیں قسم کھاتا روز قیامت کی اور نہیں قسم کھاتا انسان کے نفس کی جو معصیتوں پر ملامت کرتا ہے یہاں ارشاد ہوتا ہے کہ لائے نافیہ کا آنا فعل قسم پر کلام عرب میں بہت شائع و ذائع ہے مثلاً امرالقیس نے کہا ہے:

''لا و ابیك ابنة العامری لا یدّعی القوم انی افر''۔ ''نہیں قسم تیرے باپ کی اے عامری لڑکی! قوم والے نہیں دعویٰ کر سکتے کہ میں جنگ سے فرار کرتا ہوں''۔

غویہ بن سلمہ نے کہا ہے:

الا نادت امامة یا حتمال لتحزنی فلا بك لا ابالی

''امامہ (شاعر کی معشوقہ) نے اعلان کیا ہے کہ وہ اب کہیں اور روانہ ہو جائے گی تا کہ مجھے رنج پہنچائے تو نہیں قسم تمہاری میں کوئی پراہ نہیں کروں گا۔

اس کلمہ ''لا'' کا فائدہ قسم میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ زائد ہوتا ہے جیسے: لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ۔ پھر ادھر ادھر کی کچھ باتوں کے بعد جو نا قابل قبول ہیں کہتے ہیں حق یہ ہے کہ لا نفی ہی کے لئے ہوتا ہے اور معنی یہ ہوتے ہیں کہ میں اس شے کی قسم اس کو عظمت عطا کرنے کے لئے نہیں کھاتا ہوں۔ اس کی دلیل ہے یہ آیت:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ، گویا حرف نفی کے داخل کرنے سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ میرا قسم کھانا اس شے کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے قسم نہ کھانے کے برابر ہے کیوں کہ وہ شے خود ہی عظیم ہے۔

یہ جناب زمخشری کا کلام عجیب و غریب ہے کہاں فعل قسم یعنی اُقْسِمُ یعنی قسم پر لائے نفی کا داخل ہونا جیسا کہ قرآن کی محل بحث آیت میں ہے اور کہاں امرالقیس اور غویہ بن سلمہ کے کلام میں حرف نفی یعنی ''لا'' کا حرف قسم یعنی ''و'' اور ''ب'' کے پہلے آجانا اور پھر قسم کے بعد اس لا کا دہرایا جانا جو شاہد میں پیش کیا گیا ہے۔

ان اشعار میں لا کا قسم سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے بلکہ وہ اس منفی جملہ کا جو قسم کے ساتھ کہا جا رہا ہے اور بعد میں بطور جواب قسم آنے والا ایک جزء ہے جسے بطور تاکید دہرانے کے لئے ایک دفعہ قسم سے پہلے لایا گیا ہے اور دوسری دفعہ فعل منفی کے ساتھ بعد قسم اس کی نظیر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے کہ:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ. (نساء۔۶۵)

تو نہیں خدا کی قسم وہ ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے نزاعات میں آپ کے فیصلہ پر راضی نہ ہوں

اس کو کیا نسبت اس کلمہ ''لا'' سے جو خود فعل قسم پر داخل کیا گیا ہو جیسا لَآ اُقْسِمُ والی آیتوں میں ہے۔

تیسری آیت

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ. (حاقہ۔۳۸۔۳۹)

میں نہیں قسم کھاتا ان چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کو جو تم نہیں دیکھ سکتے

اس کی تفسیر میں لکھا ہے ''یہ قسم ہے تمام اشیاء کی'' سورہ بلد میں ہے۔

چوتھی آیت

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ.

''میں نہیں قسم کھاتا اس شہر کی'' اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ''قسم کھاتا ہوں''

اسی طرح سورہ مَعَارِج تَکْوِیر اور اِنْشِقَاق میں لَآ اُقْسِمُ کے معنی اُقْسِمُ کے قرار دیئے ہیں۔

دوسرے مقامات جہاں حرفوں کو زائد کہا گیا ہے: مثلاً: سورۂ حدید میں: لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ۔ اس کے معنی زمخشری نے قرار دیئے ہیں لیعلم اھل الکتب "تا کہ اہل کتاب کو معلوم ہو" دوسرے کچھ علماء نے بھی زمخشری کی ہمنوائی فرمائی ہے۔

افسوس ناک نتیجہ:

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمنان قرآن کو قرآن پر اعتراض کا موقع مل گیا کہ اس میں بھرتی کے زائد الفاظ ہیں مگر کتاب "الہدی الی دین" کے حصہ اول صفحہ ۳۵۴ و ۳۵۵ میں زیادتی الفاظ کے اس تصور کا بطلان ثابت کیا گیا ہے اور تمام آیتوں میں لا کے معنی بتائے گئے ہیں مثلاً سورہ حدید کی آیت:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○ (حدید۔۲۸۔۲۹)(سپارہ۔۲۷)

اے ایمان لانے والو! تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسول کا اقرار کرو تو وہ عطا کرے گا تمہیں دہرا حصہ اپنی رحمت کا اور قرار دے گا تمہارے لئے ایک روشنی جس کی مدد سے راستہ طے کرو گے اور تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے مہربان تا کہ نہ سمجھیں اہل کتاب کہ وہ لوگ، (جو ایمان لائے) کچھ قدرت نہیں رکھتے، اللہ کے فضل و کرم کے کسی جزء پر بھی اور بلاشبہہ فضل و احسان اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے

اس آیت میں یہ لوگ لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ میں لا کو زائد مانتے ہیں اور اس کے معنی یہ قرار دیتے ہیں کہ "تا کہ معلوم ہوا اہل کتاب کو"۔

ان لوگوں کی آخر سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ خدا کو اس کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس کو کہنا ہو کسی بات کے بارے میں کہ وہ اس طرح ہے مگر وہ اس میں نفی کا کلمہ بڑھا کر جملہ ایسا کہہ دے جس کے معنی یہ ہوں کہ ایسا نہیں ہے! یہ صرف معنی میں عدم تدبیر کا نتیجہ ہے اگر غور سے کام لیتے تو معلوم ہوتا کہ لا زائد نہیں ہے وہ نفی کے معنی رکھتا ہے اور وہ نفی مقصود متکلم کا جزء ہے۔

مطلب آیت کا گنجلک بھی نہیں ہے۔ بالکل صاف ہے جو آیت کے پہلو میں درج شدہ ترجمہ سے ظاہر ہے مطلب یہ ہے کہ اگر اہل ایمان تقویٰ اختیار کریں گے تو خدا کی خاص رحمتوں سے سرفراز ہوں گے اور وہ ان کو نور عطا کرے گا اور ان کی مغفرت کرے گا۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلمین، یہود و نصاریٰ جو اس وقت مسلمانوں کو بالکل بے بس اور بے اقتدار دیکھ رہے ہیں انہیں اس کے بعد یہ پتہ نہ چلے گا اور وہ یہ محسوس نہ کریں گے کہ یہ بے بس ہیں اور ان کا کوئی اقتدار نہیں ہے اور نیز اس لئے کہ فضل و احسان تو خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

اب ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ کلمہ نفی لا رکن کلام ہے یا نہیں اور بغیر اس کے معنی ناقص ہو جاتے ہیں یا نہیں کچھ اور مقامات جہاں لا کو زائد سمجھا گیا ہے۔

(۱) سورہ اعراف کی آیت:

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ○ (اعراف۔۱۲)

کہا کون سی چیز تجھے مانع ہوئی کہ تو سجدہ نہ کرے جبکہ میں نے تجھے حکم دیا کہا میں اس سے بہتر ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ یہاں بھی صاحب کشاف نے کہا ہے کہ الاتسجد میں لا زائد ہے اس دلیل سے کہ دوسری جگہ قرآن میں سورہ ص میں ہے:

مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ط (ص۔۷۵)

تجھے کون امر مانع ہوا اس سے کہ تو سجدہ کرے اسے جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا

اور یہ ویسا ہی ہے جیسے لِئَلاَّ يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ کے معنی ہیں لِيَعْلَمَ : میں کہتا ہوں کہ جو شخص سورہ اعراف اور سورہ ص دونوں جگہ کی آیتوں پر غور کرے اس کی سمجھ میں آئے گا کہ لا زائد نہیں ہے بلکہ سورہ اعراف میں لا اشارہ کے لئے آیا ہے اس امر کی طرف جس کی سورہ ص کے آیات میں صراحت ہے۔

بات یہ ہے کہ کوئی کام جو وقوع میں نہ آئے تو اس کے وقوع سے جو امر مانع ہوتا ہے جیسے: ضد، ملامت، غفلت، عاجزی یا کاہلی اور وہ باعث ہوتا ہے اس کے ترک کا اور تعمیل حکم سے روگردانی کا محرک ہوتا ہے سورہ ص میں پہلے مقام سرزنش میں مانع پوچھ گیا ہے ان الفاظ میں کہ ''تجھے کون سا امر اس سے مانع ہوا کہ تو سجدہ کرے'' اور پھر اس مانع کو ظاہر کر دیا گیا۔۔ یہ کہہ کر کہ:

اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ○ (ص۔۷۵)

تو نے کیا گھمنڈ سے کام لیا یا تو اونچے لوگوں میں سے ہے۔

اور سورہ اعراف میں مانع کو دریافت کیا گیا ہے جو باعث ترک سجدہ ہوا۔ معنی کلام کے یہ ہیں کہ سجدہ سے کون سا امر مانع تھا جس کے باعث تو نے سجدہ نہ کیا؟ اور پھر شیطان کی زبانی اس باعث کو ظاہر کیا ہے کہ:

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ.

میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا۔

(۲) سورہ طہٰ آیت

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ○ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ط اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ○ (سورۂ طٰہٰ آیت۔ ۹۲۔۹۳)

(موسیٰ ؑ نے) کہا اے ہارون کیا امر تمہیں مانع ہوا جب تم نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے کہ تم میرے پیچھے نہ آؤ تو کیا تم نے میرے حکم سے عدول کیا؟

یہاں اَفَعَصَيْتَ کی ف (جس کا ترجمہ ''تو'' ہے) یہ بتاتی ہے کہ اس سے پہلے پیچھے آنے کا مانع جو باعث ہوا عدولِ حکمی کا، دریافت کیا گیا ہے۔ مگر صاحب کشاف نے یہاں بھی کہا ہے کہ لا زائد ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کیا امر تمہیں مانع ہوا اس سے کہ تم میرے پیچھے آؤ۔

(۳) ارشاد الٰہی ہے:۔

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ. (انبیاء۔۹۵)

اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کیا اس پر حرام ہے کہ وہ نہ پلٹیں۔

کشاف میں ہے کہ پلٹنے سے مراد کفر کو چھوڑ کر اسلام کی طرف رجوع ہونا ہے اور لا زائد ہے۔ لیکن اس کی ضرورت کیا ہے کہ پلٹنے سے

مراد اسلام کی طرف پلٹنا لیا جائے تا کہ لا زائد قرار پائے۔ کیوں نہ اس سے مراد لیا جائے توبہ وانابت اور اقرار ایمان کی طرف رجوع ہونا آثار عذاب کے دیکھنے کے بعد جیسے فرعون کا اقرارِ ایمان ڈوبنے کے وقت جس کا ذکر سورۂ یونس میں ہے۔ یا جس کا تذکرہ سورۂ نساء میں ہے۔

اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ. (نساء۔۱۸)

جب ان میں سے کسی کے سر پر موت آ کر کھڑی ہو تب وہ کہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں

اور جیسا کہ سورہ مومنون میں مشرکوں اور ظالموں کے تذکرہ میں ہے

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۙ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ. (مؤمنون۔۹۹۔۱۰۰)

جب ان میں سے کسی کو موت آنے لگتی ہے تو وہ کہتا ہے اے پروردگار مجھے واپس کر دے شاید کہ میں اب نیک اعمال کروں تو یہ سب توبہ وانابت کی طرف رجوع کی مثالیں ہیں مگر آثار عذاب کے مشاہدہ کے بعد یہ رجوع قبول نہ ہوگی بس اسی طرح اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ ان بستیوں والے جنہیں اللہ نے ہلاک کیا ان پر حرام ہے یعنی ناممکن ہے فطری طور پر کہ وہ عذاب کے آثار دیکھنے کے بعد اقرار ایمان اور توبہ وانابت کی طرف رجوع نہ ہوں۔

(۴) سورہ آل عمران کی آیتیں:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ﴿۷۹﴾ وَلَا یَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا ؕ (آل عمران۔۷۹۔۸۰)

کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب وحکمت اور نبوت عطا کرے پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کو میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ تو یہی کہیں گے کہ) اللہ والے بنو اس بناء پر کہ تم کتاب الٰہی کی تعلیم دیتے رہو اور اسے پڑھتے پڑھاتے رہو اور نہ یہ کہ وہ حکم دے کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا بنالو۔ اس میں لا یامرکم کا عطف ہے یقول پر جس کا ثُمَّ کے ساتھ عطف تھا ما کے بعد والے جملہ منفی پر یعنی یہ حق نہیں کہ وہ یوں کہے اور نہ یہ کہ وہ حکم دے تو یہ بعد کی نفی اس پہلی نفی میں زور پیدا کرنے کے لئے ہے جسے دوسرے قول کے طور پر کشاف نے بھی درج کیا ہے اور کہا ہے کہ اس صورت میں لا زائد نہیں ہوگا۔

مذکورہ بالا آیات میں لا کو زائد قرار دینے میں زمخشری منفرد نہیں ہیں بلکہ بہت سے مفسرین اور نحویین اس توہم میں مبتلا ہیں۔

حالانکہ اگر کلام عرب میں لا کا زائد ہونا نظم اور نثر مین رائج ہو تب بھی ان آیات قرآن میں جب کہ نفی کی صورت میں معنی بنتے ہیں تو لا کو زائد قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں اور حقیقت کلام عرب میں بھی سوا شاذ و نادر اکا دکا اشعار کے جنہیں انہی زائد کہنے والوں نے تلاش سے نکال کر درج کیا ہے اور اہم ان اشعار کے متعلق وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس دور میں کہے گئے ہیں باقی ہمیں عام طور پر اس کی مثالیں نہیں ملتیں۔

بعض آیات قرآن میں تو زمخشری نے بھی لا کے زائد کہنے والوں سے اتفاق نہیں کیا ہے جیسے سورہ انعام میں:

وَمَا یُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (انعام۔۱۰۹)

اور تمہیں بھلا کیا خبر کہ جب وہ معجزے آئیں گے تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اور اسی سورہ میں:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا .(انعام۔۱۵۱)

کہیے کہ آؤ میں بیان کروں تم سے وہ باتیں جن کی تمہارے پروردگار نے تم پر پابندی عائد کی ہے تم شرک نہ کرو۔

مگر سورہ نساء کی اس آیت میں کہ:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ .(نساء۔۶۵)

تو نہیں قسم تمہارے پروردگار کی وہ ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک آپ کو ثالث نہ مانیں۔

لکھ دیا ہے کہ فَلَا وَرَبِّكَ کے معنی ہیں: فَوَرَبِّكَ جیسے دوسری جگہ ہے: فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ ''تو قسم تمہارے پروردگار کی ہم ان سے ضرور سوال کریں گے''۔ یہاں لا بڑھایا گیا ہے قسم کے مضمون کو پرزور بنانے کے لئے جیسے: لِئَلَّا يَعْلَمَ میں بڑھایا گیا ہے علم کی ضروری ہونے پر زور دینے کے لئے۔

ان چند سطروں میں جو انتشار خیال ہے وہ قابل عبرت ہے اور اتنی تفصیل اس بحث کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔

شریف رضی نے حقائق التاویل میں بعض لوگوں کا قول واؤ کی زیادتی کے بارے میں چند آیات قرآن کی ذیل میں نقل کیا ہے مثلاً سورہ آل عمران میں وَلَوِ افْتَدٰى بِهٖ اور سورہ ابراہیم ہیں: وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ اور سورہ زمر میں: وہ واؤ عطف ہے ایسے معطوف کے ساتھ جس کا معطوف علیہ لفظاً محذوف ہے مگر سیاق کلام سے ظاہر ہے۔ اور بھی مقامات پر یہ علمائے نحو کا اسلوب قرآن سمجھنے سے قاصر ہونا ہے جس کی بناء پر ان کے تردد اور اضطراب کی وجہ سے دشمنان قرآن کو قرآن پر اعتراضات کا موقع ملا ہے اور اس کے بعض نمونے اور ان کی تشریح کتاب الہدی حصہ اول میں اور بالخصوص تیرہویں مقدمہ میں ۳۲۱ سے آخر کتاب تک سیر حاصل طور پر گئی ہے۔

ان صاحبان فن کی فنکاریوں سے قرآن فہمی میں دشواریاں پیدا ہوئی ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت سے قرآنی محاورات و استعارات صدر اسلام میں کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں سمجھے گئے اور بعد میں جبکہ فطری ادب عربی کی بہار خزاں سے بدل گئی تو وہ معرکتہ الآرا مسائل بن گئے۔ جیسے ''اضلال'' کی نسبت خداوند عالم کی جانب جو بہت سے آیات میں ہے وہ حقیقۃً انسانی نفس امّارہ کی دسیسہ کاریوں کے ساتھ توفیق الٰہی کے سہارے کی ضرورت ثابت کرنے والی ایک نہایت حسین مجازی تعبیر تھی جس کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ انسان کی بداعمالی کا ایک درجہ وہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس کے نفس کے سپرد کر دیا جائے جس کا اثر انسان کی گمراہی کی شکل میں ویسا ہی قوت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ جیسا گمراہ کرنے کا اثر ہو سکتا ہے اسی شباہت کے لحاظ سے بطور استعارہ اس کی تعبیر اضلال یعنی گمراہ کرنے کے ساتھ ہوئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو توفیق الٰہی کی نعمت کی قدر ہو۔

ضلال کے اطلاق میں اس مجازی پہلو کا قرینہ قرآن کی وہ صاف آیتیں ہیں جیسے سورہ اعراف میں: آیت ۲۸

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ

بیشک اللہ برے کام کی تحریک نہیں کرتا

اور سورۂ نحل میں

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ

تَذَكَّرُوْنَ ○ (النحل۔۹۰)

بلاشبہہ اللہ عدالت، بھلائی اور صاحبان قرابت کے حقوق کی ادائیگی کے لئے تحریک کرتا ہے اور شرمناک کام برائی اور ظلم وتعدی سے روکتا ہے اس طرح تمہیں نصیحت کرتا ہے شاید تم اثر قبول کرو۔

اللہ کا اپنی ثناوصفت میں اسے بیان کرنا کہ وہ اچھائی کی تحریک کرتا اور برائی سے روکتا ہے اس کا قطعی ثبوت ہے کہ گمراہ کرنے کی نسبت اس کی طرف مجاز ہے۔ اور بھلا گمراہ کرنے کی نسبت اس کی طرف بطور حقیقت کیوں کر ہوسکتی ہے جبکہ وہ گمراہوں کی مذمت کرتا ہے۔ انہیں ان کی گمراہی پر سزا دیتا ہے اور ان کی طرح طرح سے سرزنش کرتا ہے مثلاً:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ / لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ / لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ / فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ / وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا.

کیوں کر تم اللہ کا انکار کرتے ہو کیوں حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو۔ کیوں اللہ کے راستے سے روگردانی کرتے ہو؟ تو کیا ہو گیا ہے تمہیں! تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔ تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔ تو آخر انہیں کیا ہے کہ وہ نصیحت سے روگردانی کرتے ہیں اور آخر ان کا کیا نقصان تھا اگر وہ ایمان لاتے۔

یہ بحث تفصیلی طور پر علم کلام کے کتب میں درج ہے اور کافی حد تک حصہ سوم رحلہ مدرسہ ۲۹ تا ۴۲ ہیں موجود ہے۔

اس کی ایک مثال قرآن مجید کی آیت الرحمن علی العرش استوی ہے جس میں قرآن مجید کے واضح آیات اور عقلی دلائل پر جو قطعی ہیں، اگر نظر رکھی جاتی تو سمجھ میں آتا کہ عرش سے یہاں پر شان قدرت وجلال اور ازل وابد میں عالم ملکوت پر اس کا اقتدار مراد ہے اور ہماری کوتاہ ذہنیتوں کے لئے جو محسوسات کے دائرہ میں گرفتار ہیں، اس کی تشبیہ دی گئی ہے اس تخت سلطنت سے جس پر سلاطین زمانہ متمکن ہوتے ہیں لیکن ظاہر پرستوں کی اس عجوبہ آفرینی کو کیا کیا جائے کہ ابن مردویہ اور خطیب نے اپنی تاریخ میں اور ابن منصور نے اپنے سنن میں حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بروایت عمر بن الخطاب یہ حدیث درج کردی۔ اسی آیت الرحمن علی العرش استوی کے ذیل ہیں کہ وہ عرش پر اس طرح بیٹھتا ہے کہ عرش کے چر چرانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کنیز العمال جلد ۲۲۶ اور منتخب کنز العمال میں بھی یہ احادیث درج ہیں۔ میزان الاعتدال ذہبی میں عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۔ کی تفسیر میں مجاہد کی زبانی نقل کیا ہے کہ خدا حضرت کو عرش پر اپنے پاس بٹھائے گا۔

کنا شو اهد الحق شیخ یوسف نبہانی ۱۳۰ پر ہے کہ ابن تیمیہ کے تصانیف سے ایک کتاب العرش ہے۔ کشف الظنون میں ہے کہ اس میں لکھا ہے کہ اللہ عرش پر بیٹھتا ہے اور اس میں ایک جگہ خالی رکھی ہے جس میں رسول خدا اس کے پاس بیٹھیں گے۔ جیسا کہ ابوحیان نے آیت قرآن وسع کرسیه السموات والارض کی تفسیر میں درج کیا ہے اور اس میں بھی احمد بن تیمیہ کی کتاب العرش کا حوالہ دیا ہے اور اسی آہنگ پر محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ترانہ ہے۔ اپنے مطبوعہ رسالہ میں جو دیگر رسائل کے ساتھ ایک مجموعہ کے اندار مکہ معظّمہ میں طبع ہوا ہے اور صفحہ ۱۵۵ و ۱۵۶ میں یہی باتیں اسی میں درج ہیں۔

یہ ہے بقدر ضرورت سرکار بلاغی کے افادات کا خلاصہ

تفسیر فصل الخطاب

جلداول

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ ----------144

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ ----------160

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرَانَ----------449

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ

سورہ کے لفظی اور اصطلاحی معنی:

سورہ کے لفظی معنی جو اس کے معنی اصطلاحی کے ساتھ قریبی مناسبت رکھتے ہیں۔شہر پناہ[1] کی دیوار یا ''احاطہ'' کے ہیں لہٰذا ایک قرآنی آیات کے مجموعہ کا جو حضرت احدیت کی طرف سے ایک خاص نام کے ساتھ نازل کیا گیا سورہ نام قرار دیا گیا ہے۔گویا وہ ایک ''احاطہ'' ہے جو کچھ آیات کے گرد گھیر دیا گیا ہے۔قرآن مجید کی تقسیم صرف سوروں کی طرف منجانب اللہ ہے اس کے علاوہ پاروں[2] ربعوں[3] اور رکوعوں[4] کی طرف تقسیم بعد میں قاریوں کی کارستانی ہے جس سے پڑھنے میں سہولت پیدا کرنا منظور تھی۔

قدیم زمانہ میں صفحات کی تعداد کے بجائے حروف کے شمار سے کتابوں کے حجم کا تعین ہوتا تھا مثلاً کہا جاتا تھا فلاں کتاب پچاس ہزار بیتوں کی ہے اور بیت کے معنی ہوتے تھے حرفوں کی ایک خاص تعداد مثلاً پچاس حرفوں کو ایک بیت کہتے تھے پاروں کی تقسیم میں بس اسی اعتبار سے برابر کے اجزاء ہیں کہ ان میں حرفوں کی تعداد تقریباً برابر برابر ہو جائے۔اس میں معنی و مفہوم پر بالکل نظر نہیں کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک بات آدھی پہلے پارے میں چلی جاتی ہے آدھی دوسرے پارے میں تو جب الگ الگ پارے ہوں، جیسا کہ اکثر رائج ہے تو بعض اوقات ایک پارہ کی پہلی آیت کا مطلب سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے جب تک اس کے قبل کا پارہ نکال کر دیکھا نہ جائے کہ اس میں کیا ذکر چل رہا تھا؟

بعد رسول خلفاء کی طرف سے جو قرآن جمع کیا گیا اس میں اکثر ایک سورہ کی آیتیں دوسرے سوروں میں چلی گئیں مگر بعض سورے جو شروع سے آخر تک ایک خاص ساخت رکھتے ہیں ان میں یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ شروع سے اسی صورت پر تھے جس طرح اس وقت موجود ہیں۔ سورہ حمد ایسے ہی سوروں میں سے ہے اس کے علاوہ چوں کہ اس سورہ کا نماز میں بالتکرار پڑھنا فرض عین ہے لہٰذا زمانہ رسولؐ ہی سے اس کو ترتیب

---

[1] ۔سورۃ المدینۃ حائطھا (راغب)

[2] ۔قرآن کے ۳۰ حصے مہینے کے تیس دنوں کے اعتبار سے کر کے ہر حصہ کا نام عربی میں ''جزؤ'' قرار دیا گیا ہے جسے فارسی اور اردو میں پارہ کہتے ہیں۔اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر دن ایک پارہ پڑھ کر مہینہ بھر میں پورا قرآن بآسانی ختم کیا جا سکے۔

[3] ۔پارہ کے چار حصے کر کے ہر حصہ کو رُبع کہا جاتا ہے۔پہلے رُبع کے ختم پر تو رُبع ہی لکھا جاتا ہے۔دوسرے پر نصف اور تیسرے پر ثلث یعنی ثلثہ ارباع ''تین چوتھائی حصے''۔

[4] ۔سوروں کی تقسیم رکوعوں پر کی گئی ہے ہر رکوع تقریباً دس آیتوں کا ہے چونکہ جمہور اہل اسلام نماز میں سورہ حمد کے بعد پورا سورہ پڑھنا ضروری نہیں سمجھتے اسلئے عبدالماجد صاحب دریابادی کی لفظوں میں ''یہ اتنی مقدار ہے جو ایک رکعت میں بآسانی پڑھی جا سکتی ہے چھوٹے سوروں میں ہر سورہ کو ایک رکوع قرار دیا گیا ہے چنانچہ سورہ حمد کو بھی ایک رکوع سمجھا جاتا ہے'' علمائے شیعہ کی اکثریت پورا سورہ ضروری سمجھتی ہے اس لئے ہمارے یہاں رکوعوں میں کوئی افادیت نہیں ہے۔

کے لحاظ سے بھی تواتر کا درجہ حاصل ہو گیا جو اس مرتبہ پر بہت کم سوروں کے لئے سمجھا جا سکتا ہے۔

سوروں کے نام:

سوروں کے کچھ نام بھی وقت نزول ہی سے مقرر تھے جو کسی خاص واقعہ، شخص یا لفظ کی مناسبت سے قرار دیئے گئے تھے لیکن انہیں ایسی توقیفی حیثیت حاصل نہیں ہے کہ کسی دوسرے نام کا اطلاق جائز نہ ہو لہٰذا اگر اس واقعہ یا شخص وغیرہ کے علاوہ کوئی اور خصوصی لفظ یا واقعہ بھی اہمیت کے ساتھ کسی سورہ میں مذکور ہو اور اس کی شناخت کا فائدہ دے سکتا ہو یا کوئی خاص نمایاں صفت کسی سورہ کی ہو تو کیا مضائقہ ہے کہ اس سے بھی اس سورہ کو یاد کیا جا سکے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ایک ایک سورہ کے کئی کئی نام کتابوں میں وارد ہیں۔ ان سب ناموں کا من جانب اللہ یا از جانب رسول اللہ ہونا ثابت نہیں ہے۔

سورۂ حمد کے نام:

تمام سوروں میں سب سے زیادہ نام سورہ حمد کے وارد ہوئے ہیں اور یہ اس کی عظمت کا مقتضا ہے۔ سیوطی نے اتقان میں ۲۵ نام تک گنوائے ہیں۔ ان میں سے مشہور و معروف نام فاتحہ الکتاب یا الفاتحہ اور ام الکتاب اور السبع المثانی اور سورہ حمد ہیں۔ ''فاتحۃ الکتاب'' نام احادیث میں زیادہ آیا ہے فاتحہ کے معنی ہیں افتتاح یعنی آغاز کرنے والی چیز یہ نام اگر آغاز تنزیل سے ثابت ہو جائے تو وہ اس کی دلیل ہوگا کہ کم از کم اس سورہ کا محل وقوع یقیناً مطابق منشائے الٰہی ہے۔

ان ناموں کے علاوہ دوسرے نام غیر مشہور ہیں اور صرف کتابوں میں درج ہیں جیسے: الاساس سورۃ تعلیم المسالۃ سورۃ الکنز، الشفاء والشافیۃ سورۃ الصلوۃ الکافیہ الوافیۃ جنہیں علامہ نیشاپوری نے غرائب القرآن میں درج کیا ہے۔

سورۂ حمد کی جامعیت:

جامعیت اس سورہ کی یہ ہے کہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے اسے تمام قرآن کا خلاصہ بتایا ہے۔ یہ بات جمہورات میں شہرت پا گئی چنانچہ ابن ندیم نے اپنی فہرست میں دو جگہ (ص ۶۳ و ص ۲۵) ابوزید بلخی کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے: فی ان سورۃ الحمد نتوب عن جمیع القرآن ہمارے فہم کے مطابق اس کی تشریح یہ ہے کہ تمام قرآن کا مقصد اصلی دو ۲ باتیں، اعتقاد اور عمل۔ اعتقاد کے دو ۲ شعبے ہیں؛ مبدأ اور معاد۔ اور عمل کے دو شعبے ہیں اچھے اوصاف سے اتصاف اور برے اوصاف سے اجتناب۔ سورہ حمد ترتیب وار ان تمام امور پر مشتمل ہے۔ الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم مبداء اول یعنی حضرت احدیت کا اعتقاد۔ مالک یوم الدین معاد یعنی آخرت ایاک نعبد و ایاک نستعین اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم اچھے اعمال سے اتصاف اور غیر المغضوب علیھم ولا الضالین برے اعمال سے اجتناب معلوم ہوتا ہے کہ سورہ حمد ایک متن ہے اور تمام قرآن اس کی شرح۔ وہ اجمال ہے اور مجموعہ کلام مجید اس کی تفصیل۔

زمانۂ نزول:

قرآن مجید کے سوروں کی ایک تقسیم باعتبار زمانۂ نزول ہے یعنی کچھ مکی سورے ہیں وہ ہیں جو قبل ہجرت رسولؐ نازل ہوئے اور کچھ مدنی ہیں جو بعد ہجرت نازل ہوئے چاہے ان کا نزول مدینہ کے اندر نہ ہوا ہو سورہ حمد کے متعلق اختلاف ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوا ہے یا مدینہ میں یا دونوں جگہ صحیح یہ ہے کہ وہ مکی ہے یعنی جب رسول مکہ معظّمہ میں تھے تب ہی نازل ہوا۔ بلکہ تحقیق یہ ہے کہ وہ بالکل شروع شروع اترا ہے اس لئے کہ نماز بعثت کے بعد ہی سے جاری ہوگئی تھی اور سورہ حمد نماز کا لازمی جزو ہے۔

پاکستان کے ایک باخبر اور سنجیدہ صاحب قلم سید حشمت حسین صاحب جعفری نے اپنے مضمون میں جس کا عنوان ہے ''ابتداء نزول وحی کے متعلق احادیث روایت و درایت کے آئینے میں'' اپنے موضوع کے سلسلہ کے اقوال کو درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

قول چہارم یہ ہے کہ سب سے پہلے سورہ فاتحہ کا نزول ہوا۔ امام واحدی نے اپنی کتاب ''اسباب النزول'' میں اس بارے میں ایک روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ قول علی بن ابی طالب کا ہے (اسباب النزول للواحدی ص ۱۵ مطبوعہ مصر)۔

اس سے اس قول کی نفی نہیں ہوتی کہ سب سے پہلے سورہ اقراء کی پانچ آیتیں مالم یعلم تک نازل ہوئیں: (المنتظر لاہور ۲۰ فروری و ۵ مارچ ۱۹۶۸ء ص ۹) علامہ نیشاپوری نے غرائب القرآن (مطبوعی ایران ص ۲۶) میں سورہ الحمد کے ناموں کے ذیل میں لکھا ہے:

تسسمیتها بفاتحته الکتاب قیل لا نها اول سورة نزلت من السّمآء ۔۔۔روی عن علی بن ابی طالب علیہ السلام انه قال نزلت فاتحته الکتاب بمکة من کنز تحت العرش و الهٰذا قال اکثر العلماء انها مکیة وخاطّاؤ امجاهدا فی قو له انها مدنیةو کیف لا وقد صح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی حدیث ابی کعب انها من اول مانزل بالقراٰن وانها السبع المثانی وسورة الحجر مکیة بلا خلاف

اس کا نام فاتحۃ الکتاب ہوا ہے ایک قول کے مطابق اس لئے کہ وہ سب سے پہلا سورہ ہے جو عالم بالا سے اترا حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے روایت ہے فرمایا کہ فاتحۃ الکتاب مکہ میں عرش کے نیچے کے ایک خزانہ سے نکل کر نازل ہوا اسی لئے اکثر علماء نے کہا ہے کہ وہ مکیہ ہے اور مجاہد کے قول کو کہ وہ مدنیہ ہے غلط ٹھہرایا ہے اور کیونکر ایسا نہ ہو جب کہ حدیث صحیح میں ابی بن کعب کی روایت حضرت پیغمبر خداؐ سے ہے کہ یہ قرآن کے ابتدائی نزول شدہ اجزا میں سے ہے پھر یہ کہ اسی سورہ کا ایک نام سبع مثانی ہے جس کا ذکر سورہ حجر میں ہے جو بلا اختلاف مکی سورہ ہے۔

سورۂ حمد کا اندازِ بیان:

غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ سب سے پہلے اقراء کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئیں جن میں رسول کو کچھ پڑھنے کی ہدایت ہوئی ہے۔ اب اس کے بعد پڑھا کیا جائے؟ اس کی تعلیم کیلئے بوحی خاص رسول پر سورہ حمد اتارا گیا کہ اس کی قرات کی جائے۔

اسی سے اس سورہ کے انداز بیان کا راز معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے اجزائے قرآنی سے مختلف کیوں ہے۔ قرآن میں عموماً انداز تخاطب سے نمایاں ہے کہ وہ خداوند عالم کا کلام ہے لیکن سورہ حمد میں انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بندہ کی عرض ہے اپنے خدا کی بارگاہ میں اصل یہ ہے کہ وہ کلام خدا اس معنی سے ہے کہ اللہ کے ارادہ خاص سے مثل بقیہ اجزائے قرآن اس کی انشا ہوئی ہے اور اسی اعتبار سے وہ قرآن مجید کا جزو ہے مگر

ہو بطور کلام الٰہی اتارا نہیں گیا ہے بلکہ بطور تعلیم رسولؐ اور امت رسولؐ کی قرات اور اللہ کی بارگاہ میں عرض داشت پیش کرنے کے لئے اتارا گیا ہے اور جس طرح: قل ربّ زدنی علما: کہیے کہ اے میرے پروردگار میرے علم میں اور اضافہ فرما، اس میں شروع کا لفظ قل جس کا ترجمہ ہوا ''کہیے'' دعائے عبد کو کلام معبود میں منسلک کرتا ہے اسی طرح سورہ حمد کے پہلے اقرا ''پڑھیے'' اس سورہ کو کلام الٰہی میں منسلک کرنے کا ذریعہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانیوالا بڑا مہربان ہے''

یہ قرآن مجید کی پہلی آیت ہے اور چوں کہ مثل دوسرے سوروں کے وہ سورہ اقراء کا بھی جزو ہے اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی آیت جو اتری ہے وہ بسم اللہ ہی ہے جس کی صراحت بعض کتب اہل سنت میں بھی موجود ہے۔[1]

آیۃ کے لغوی معنی نشانی کے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک مستقل پیغام یا خبر کو بھی آیۃ کہا جاتا ہے۔ غالباً اسی دوسرے معنی کی مناسبت سے ہر سورہ کی تقسیم آیتوں پر ہوئی یعنی کلام کا ایسا فقرہ جہاں سلسلہ کلام رکنے کی علامت میں ایک لفظ اس طرح آ گیا ہے جیسے شعر میں قافیہ ہوتا ہے۔ مگر اس میں قافیہ کے قیود و شرائط کی پابندی نہیں ہے۔ اسی لئے اسے سجع کے لفظ سے یاد نہیں کیا جا سکتا ہوں کہ سجع نثر کلام میں وہی ہوتا ہے جو شعر کے قافیہ والی پابندی کے ساتھ ہو۔ یہ اختتامی الفاظ اپنی نوعیت کے ساتھ قرآن سے مخصوص ہیں اور ان کا اصطلاحی نام ''فواصل'' ہے۔

بسم اللہ کی خصوصیت:

اس آیت (بسم اللہ) کی خصوصیت و اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہر سورہ کی ابتدا میں اتاری گئی اس طرح جتنے قرآن میں سورہ ہیں اتنی ہی تعداد میں یہ آیت ہے۔ صرف سورہ برات کا آغاز بسم اللہ سے نہیں کیا گیا اس لئے کہ یہ آیت رحمت ہے اور وہ سورہ عذاب یہ کمی پوری ہوگئی اس طرح کہ سورہ نمل میں حضرت سلیمان کے مکتوب میں جو ملکہ سبا کا نام تھا، یہ آیت یوں آ گئی کہ: انه من سليمان وانه بسم الله الرحمن الرحيم اور اس طرح بسم الله کی تنزیلی تعداد سوروں کی گنتی کے بالکل برابر ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متواتر احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ سورہ کا جزو ہے اور اسی پر آئمہ اہل بیت علیہم السلام کا اجماع رہا ہے جو صحیح السند روایت سے ثابت ہے۔ قاریان مکہ اور قاریان فقہائے کوفہ سب اس سے متفق رہے ہیں اور اہل سنت کے آئمہ اربعہ میں سے شافعی اور ان کے متبعین کا مسلک بھی یہی ہے۔[2]

تواریخ و اخبار سے ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ کو بآواز بلند پڑھنے کا طریقہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے عہد معاویہ تک برابر قائم رہا۔ سب سے پہلے اس میں تغییر امیر شام معاویہ نے کیا اور مدینہ میں آ کر جب پہلی دفع انہوں نے بغیر بسم اللہ کے رکوع و سجود کے لئے جھکتے وقت تکبیر کو ترک کرتے ہوئے نماز پڑھائی تو مہاجرین و انصار میں شور ہوگیا کہ:

يا معوية سرقت من الصّلوٰة اين بسم الله الرّحمٰن الرّحيم والتكبير عند الركوع والسجود.

اے معاویہ تم نے نماز میں سے چوری کی بسم اللہ الرحمن الرحیم کیا ہوگئی اور رکوع و سجود کے وقت تکبیریں کدھر گئیں؟

---

[1] ۔اول آیت نزلت من اللوح بسم الله الرّحمٰن الرّحيم (محاضرۃ الاوائل ص ۱۲)

[2] ۔غرائب القرآن نیشاپوری جلد ۱ ص ۲۸

مجبور ہو کر معاویہ کو بسم اللہ اور تکبیروں کے ساتھ دوبارہ نماز پڑھنا پڑھی۔

علامہ نیشاپوری لکھتے ہیں کہ:

كان معاوية شديد الشكيمة ذا شوكة فلولا ان الجهر با لتسمية كان مقر را عند كل الصّحا بة لم يجسر وا علىٰ ذلك (غرائب القرآن جلد ۱ ص ۲۹)

معاویہ بڑے طمطراق اور شان وشوکت کے آدمی تھے تو اگر بسم اللہ کو بآواز کہنا تمام صحابہ کے نزدیک متفق علیہ نہ ہوتا تو وہ اس کی جرات کبھی نہ کرتے۔

مگر بعد کے مسلمانوں کی اکثریت کا عمل امیر شام ہی والے طریقہ پر ہو گیا جس کے برخلاف ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے نہ صرف یہ کہ بسم اللہ کو جزء قرآن بتایا، بلکہ نماز میں (چاہے وہ اخفاتی ہو) اسے باجزء کہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم والی آیت سب سے زیادہ اس کی مستحق ہے کہ اسے بآواز بلند کہا جائے اور یہی وہ آیت ہے جس کے لئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:-

وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾ (بنی اسرائیل)

جب آپ پڑھنے میں اپنے واحد پروردگار کا نام لیتے ہیں تو وہ لوگ پیٹھ پھیر کر چلے جاتے ہیں

قرآن کریم کی اس آیت کے بارے میں جناب امیر نے اس حدیث میں جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ یہ بتایا ہے کہ جو کچھ سورہ حمد میں ہے وہ سب بسم اللہ میں ہے۔ اس کی تشریح یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان شعبوں پر غور کیجئے جن کا بیان سورہ حمد کے متعلق آ چکا ہے تو ان سب خلاصہ ہے عہد و معبود کا باہمی تعلق کہ خالق بے نیاز اور مرکز فیض ہے اور مخلوق محتاج اور اس کے فیض کی طالب ہے۔ خالق و مخلوق کا یہ تعلق بسم اللہ سے ظاہر ہوتا ہے جس میں بندہ اپنے خالق کے فیض و رحمت کا پتہ دیتا ہوا اس سے امداد کا طالب ہوتا ہے اس طرح یہ آیت خود ایک معنی سے قرآن مجید کا لب لباب قرار پاتی ہے اور اسی لئے باوجود جزو ہونے کے اس کا انداز سوائے سورہ حمد کے تمام دوسرے سوروں کے عنوان بیان سے مختلف ہے وہ ہر سورہ کا جزء ہے اسی طرح جیسے سورہ حمد قرآن کا جزء ہے مگر جیسے سورہ حمد تمام قرآن کا فاتحہ قرار دیا گیا ہے اور کلام کی ساخت کے لحاظ سے اس سے الگ ہے اسی طرح بسم اللہ ہر سورہ کا جزء ہے مگر ساخت کلام کے لحاظ سے اس سے الگ ہے۔ اس سے ہر سورہ کی ابتداء کر کے یہ رسم قائم کی گئی ہے کہ مسلمان کبھی اپنی ہر تقریر، ہر تحریر اور ہر کام کا اس سے آغاز کریں تا کہ ان کو زندگی کے ہر قدم میں اللہ سے سہارا لینے کا احساس قائم رہے اور اس کا برابر مظاہر ہوتا رہے اس سے سر غرور جھکتا بھی ہے اور ہمت دل بلند بھی ہوتی ہے اور یہ بہت بڑا مقصد ہے جو عاجز و قاصر بندہ کے قادر مطلق پر اعتماد ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور جسے زندہ رکھنے سے اسلام نے مسلمانوں میں ''خودی'' اور ''بے خودی'' دونوں کو سمو کر انسانی رفعت کی شاہراہ قائم کی ہے۔

اسم کے معنی:

پہلی لفظ بسم اللہ مرکب ہے دو جزوں سے ایک "ب" جو عربی میں استعانت یعنی مدد حاصل کرنے کے لئے آتی ہے۔ یہی اس نیاز مندی کے اظہار کا ذریعہ ہے جو بندہ کو اپنے مالک سے مرتبط بناتی ہے دوسرے (اسم) اس کے معنی ہیں نام مگر تحقیق یہ ہے کہ بسم اللہ کا مطلب صرف یہ ہے کہ بندہ اللہ سے مدد حاصل کرنا چاہتا ہے اسم کا لفظ مقام تعبیر میں اس محاورہ کے مطابق لایا گیا ہے کہ کسی بلند ذات کے متعلق جب کوئی کلام کیا

جائے تو یہ کچھ ادب کے خلاف محسوس ہوتا ہے کہ بے دھڑک کسی امر کو خود اُس کی طرف منسوب کیا جائے بلکہ اس سے قریبی تعلق رکھنے والی کسی چیز کو واسطہ بنایا جاتا ہے ''جناب'' اور ''حضرت'' اور ''سرکار'' اس قسم کے الفاظ کی اضافت کسی بڑے نام کے ساتھ اسی لئے ہوتی ہے نیز ''خدام والا شان'' اور ''ملازمان بارگاہ'' اور جدید عربی میں فخامة اور جلالة اور عظمة اور معالی اور سمو وغیرہ کے الفاظ اسی لئے آتے ہیں بس اسی طرح قرآن کریم میں اللہ کی طرف تسبیح اور تحمید اور استعانت کی نسبت میں 'اسم' کی لفظ کا واسطہ آیا ہے اور اسی لئے بسم اللہ کے معنی حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے یہی فرمائے ہیں کہ استعین علی اموری کلها بالله میں اپنے تمام معاملات میں خدا سے مدد طلب کرتا ہوں (کتاب التوحید صدوق رحمۃ اللہ علیہ)۔۔۔اللہ خدائے بحق کا اسم ذات ہے جس کا اطلاق کسی دوسری ذات پر نہیں ہوسکتا۔[1]

اسم ذات ''اللہ'':

اسم اللہ کے علاوہ جتنے الفاظ اسی کی نسبت استعمال ہوتے ہیں وہ ''اسمائے صفات'' یعنی تعریفی القاب ہیں جو اس کے کسی نہ کسی کمال کے پہلو کو پیش نظر رکھ کر استعمال کئے جاتے ہیں ان میں اگر اختصاص ذات خالق کے ساتھ ہوگا تو باعتبار مفہوم ہوگا اس لئے کہ اس لفظ کے معنی ہی ذات الٰہی میں منحصر ہیں جیسے رحمٰن جس کی تشریح ابھی بعد میں ہوگی لیکن اگر وہ معنی ناقص درجہ پر سہی دوسرے افراد پائے جاتے ہیں تو اس وصف کا اطلاق دوسرے پر بھی درست ہوگا جیسے رحیم عالم قادر وغیرہ لیکن اللہ کا لفظ اس ذات کے لئے قرار دیا گیا ہے جو ان تمام صفات پر جامع وحاوی ہے۔

نام ہونے کا اعتبار سے اس کے اشتقاق کی جتنی بحثیں ہیں وہ میرے نزدیک دور از کار ہیں اور اس لفظ کا ترجمہ بھی کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے خدا یا گاڈ یا اس طرح کے تمام لفظ جو دوسری زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں وہ اسمائے صفات کی جگہ پر تو لائے جاسکتے ہیں مگر لفظ اللہ کے قائم مقام ہرگز نہیں ہوسکتے۔

رحمٰن اور رحیم کا فرق:

رحمن اور رحیم دونوں صفتیں رحم سے مشتق ہیں اور مبالغہ یعنی وصفت کی شدت وقوت کو بتاتی ہیں[2] مگر ان دونوں میں فرق ہے رحمن کا اطلاق صرف ذات باری پر ہوتا ہے[3] اور رحیم کا اطلاق غیر پر بھی ہوسکتا ہے جس کی نظیریں قرآن کریم میں بھی موجود ہیں جیسے رسول کے لئے بالمومنین رءوف رحیم اور مومنین کے لئے رحماء بینهم۔

زیادہ تر[4] احادیث سے ان دونوں لفظوں کا فرق یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رحمن اس رحمت کو بتاتا ہے جو خالق کی طرف بتقاضائے ربوبیت تمام کائنات سے متعلق ہے اور جس میں مومن اور کافر کی تفریق نہیں ہے۔اس کے جلوے دنیا میں آنکھوں کے سامنے نمایاں ہیں اور رحیم اس رحمت کے

---

[1] ۔اسم لا یطلق الا علیه سبحانه و تعالیٰ (مجمع البیان) جناب امیرؑ فرماتے ہیں۔الله اعظم اسم من اسماء الله عزو جل لا ینبغی ان یتسمّٰی به غیره (صافی)

[2] ۔اسمان وضعا للمبالغة واشتقا من الرحمة (مجمع)

[3] ۔لا یطلق الرحمن الا علی الله تعالی (راغب)

[4] ۔تلاش سے بعض جگہ اس کے خلاف بھی ملتا ہے جیسے ایک دعا میں ہے: یا رحمن الدنیا والاخرة ورحیمها مگر اس کو شاذ یعنی خلاف مشہور سمجھنا چاہئے۔

اظہار کے لئے ہے جو توجہ وعنایت خاص کے طور پر اپنے محبوب اشخاص سے متعلق ہوتی ہے اور یہ مومنین سے مخصوص ہے جس کا نمایاں ظہور آخرت میں ہوگا۔ اس کو امام جعفر صادقؑ نے ان الفاظ میں بتایا ہے کہ الرحمن اسم خاص لصفته عامة والرحيم اسم عام لصفة خاصة (مجمع البیان)[1] رحمٰن کے عموم کو ترجمہ میں ''سب کو فیض'' کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے اور ''ہمہ گیر'' ہونے ہی کی بنا پر وہ صفت اللہ میں منحصر ہوگئی ہے:

اے کریمی کہ از خزانہ غیب
گبر و ترسا را ظیفہ خوردار ی

رہ گئی اپنی موافق طبع اور دل پسند یا متحد الخیال یا اطاعت شعار افراد پر مہربانی یہ اپنے مقدور بھر بندے بھی کر لیتے ہیں۔ چوں کہ مقام توصیف میں قاعدہ یہی ہے کہ موصوف نام کو قرار دیا جاتا ہے جو ذات پر دلالت کرتا ہے اور اس کی توصیف وصف کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسی لئے ان الفاظ کی ترتیب میں پہلے اللہ کا لفظ لایا گیا ہے جو نفس ذات کو بتلاتا ہے پھر الرحمٰن کو لایا گیا جو اس کی صفت خاص ہے مثل نام کے اور اس لئے تقریباً اسے لقب کا درجہ حاصل ہے اور پھر الرحیم کہا گیا جس میں صرف توصیف ہے۔ پھر یہ کہ رحمٰن ہونے کے مظاہر چوں کہ عموم رکھتے ہیں اور مومن و کافر سب کے لئے ہیں اس لئے بھی انہیں مقدم ہونا چاہئے اور رحیم ہونے کے مظاہر خصوصیت رکھتے ہیں اور ان کا ظہور بھی بطور نمایاں بعد کو یعنی آخرت میں ہے لہٰذا اسے بعد کو ذکر کیا گیا۔

مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے خوب لکھا ہے کہ ''یہ بات اتفاقی نہیں بہت پر معنی ہے کہ قرآن مجید میں اسم ذات کے بعد جو سب سے پہلا اسم صفاتی ارشاد ہوا ہے وہ صفت رحمانیت کا مظہر ہے۔ لین پول (Lane Poole) انگریز اسی لئے اپنے ہم قوموں کو سنا کر کہتا ہے۔ لوگ یہ بات برابر بھول جاتے ہیں کہ قرآن کے اندر وصفت رحمت پر کتنا زور دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ قرآنی آغاز کلام کی رفعت اس وقت زیادہ نمایاں ہوتی ہے جب اس کے سامنے مسیحیت کا افتتاحی فقرہ لایا جاتا ہے: شروع باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے یہاں آغاز ہی سے تثلیث کا گورکھ دھندا سامنے آجاتا ہے جس کا سمجھنا اور سمجھانا عقل کو خیر باد کہے بغیر ممکن ہی نہیں ہے''۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣

''ہر ایک تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار، سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان، جزا و سزا کے دن کا مالک ہے۔''

حمد اور مدح کا فرق:

اردو زبان کی کوتاہی سمجھنا چاہئے کہ حمد کے لئے کوئی ہم معنی لفظ جو اسکے تمام خصوصایت کی حامل ہو ابھی تک نہیں مل سکا ہے ''تعریف'' کے ساتھ حمد کا ترجمہ مجبوری کا نتیجہ ہے کیوں کہ تعریف تو مدح کے بھی معنی ہوئے مگر عربی میں مدح اور حمد میں فرق ہے مدح غیر ذی شعور چیزوں کی بھی ہوتی ہے جیسے موتیوں کی چمک، پھولوں کی مہک، سبزہ کی لہک، پانی کی روانی، سورج کی درخشانی، وغیرہ ان کی تعریف مدح کہلائے گی۔ مگر حمد مخصوص ہے ایسے شخص کی تعریف سے جس کے افعال اختیاری حیثیت رکھتے ہوں خواہ ان افعال کا کوئی احسان اس شخص کی گردن پر نہ ہو جو تعریف

---

[1] ۔فالرحمة الرحمانية جميع الموجودات وتشمل كل النعم وامام الرحمة الرحيمية فهي مختصة بالمومنين (الصافی)

کر رہا ہے۔[1] رہ گیا شکر اس کے معنی تعریف کے ہیں ہی نہیں بلکہ وہ اس احسان کا جو اپنے ساتھ ہوا ہو کسی طرح اعتراف اور نعمت کی قدر کرنے کا نام ہے جو کبھی عملی طور پر ہوتا ہے اور کبھی قولی طور پر۔ اس صورت میں کہ جب اس کا اعتراف تعریف کی صورت میں ہو تو کہنا صحیح ہوگا الحمد اللہ شکر! یعنی میں اس کی تعریف کرتا ہوں اس کے احسانات کے اعتراف کے لئے۔[2]

حمد اور شکر میں تفرقہ:

ہر تعریف کا ذات الٰہی کی طرف راجع ہونا اس عقیدہ کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ انسانی افعال سب اللہ کے مخلوق ہیں لہٰذا جس نے جو اچھا کام کیا وہ اللہ کی طرف سے ہوا، تو جو اس شخص کی تعریف ہو وہ درحقیقت خدا کی تعریف ہے کیوں کہ اس عقیدہ کی بنا پر تو حمد ہی نہیں بلکہ معاذ اللہ مذمت بھی خدا ہی کی طرف عائد ہونا چاہئے بلکہ ہر تعریف کا ذات الٰہی کے لئے ہونا اس بنا پر ہے کہ ہر فعل خیر یا تو براہِ راست اسی کا عمل ہوتا ہے یا دوسرے کا عمل ہے تو اس کی تحریک یعنی ترغیب اور پھر توفیق کے ساتھ ہوتا ہے لہٰذا اس کام کی تعریف بھی آخر میں اس کی طرف راجع ہے لیکن فعل قبیح براہ راست اس سے تو ہوتا ہی نہیں اور دوسرے کی جانب سے ہوتا ہے تو وہ اس کی ترغیب سے نہیں بلکہ ممانعت کے ساتھ ہوتا ہے لہٰذا اس کی مذمت خدا کی طرف راجع نہیں ہوسکتی۔[3]

رب اسم صفت ہے تربیت سے جس کے معنی ہیں تدریجی طور پر کسی شے یا شخص کو اس کے مناسب حال کمال کی منزل تک پہنچانا

"رب" (پروردگار) اور "اب" (باپ):

خداوند عالم خالق بھی ہے اور رب بھی مگر ان دونوں کے مفہوم میں یہی فرق ہے کہ خالق کا لفظ فقط سبب وجود ہونے کو بتاتا ہے اور رب کا لفظ سبب بقا ہونے اور پھر مستقل طور پر اس کی نظر توجہ مخلوقات کی جانب مبذول رہنے کو بتاتا ہے۔ مالک اور ولی وغیرہ پر باضافت رب کا اطلاق کلام عرب میں اسی لئے ہوتا ہے کہ وہ اس شے کے حالات پر نگرانی رکھتے ہیں لیکن اس لفظ کا اطلاق مطلق اور بلا اضافت صرف حق سبحانہ وتعالیٰ پر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس کا ترجمہ پروردگار کے لفظ کے ساتھ مربی سے زیادہ مناسب ہے کیوں کہ مربی کی لفظ کا ہمارے محاورہ میں ذات الٰہی کے ساتھ اتنا اختصاص نہیں ہے جتنا پروردگار کے لفظ کا ہے۔ عیسائیوں نے اسے اب (یعنی باپ) کہا ہے۔ وہ مجازی تصرف کے بعد بھی صرف سبب وجود ہونے کا اظہار کرسکتا ہے مگر اسلام نے اس کے لئے رب کی لفظ منتخب کی ہے جو ہر لحہ اس کے فیض اور عنایت کا پتہ دے رہا ہے۔

عالمین کی کثرت:

عالم کے ایک معنی تو ماسوی اللہ کے ہیں اور اس اعتبار سے غیر اللہ تمام وکمال ایک ہی عالم ہے۔ اس کی جمع بنانے کا کوئی حاصل نہیں مگر عرفی طور پر عالم اس ایک دنیا کو کہہ سکتے ہیں جس کے آسمان وزمین سورج اور چاند ہم سے تعلق رکھتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے علم ہیت کی اصطلاح میں ایک نظا

---

[1] ۔ الحمد قول علیٰ انه مختص بفضله اختیار ته معنیة وهی فضلة الا نعام الیك والی غیرك (نیشاپوری)

[2] ۔ شکر امفعول لاجله نحو ستجته تعظیما (بلاغیؒ)

[3] ۔ لا یحمد حامد الّا ربّه ولا یذم ذام الّا نفسه (نہج البلاغہ)

م شمسی سے جتنے سیارات متعلق ہیں انہیں ایک عالم سمجھنا درست ہے اب جب کہ تحقیقات جدیدہ نے اور متعدد آفتابوں اور ان کے نظاموں کا پتہ چلا لیا ہے تو عالمین یعنی بہت سی دنیاؤں کے مفہوم کا سمجھنا زیادہ آسان ہو گیا ہے پیغمبر اسلامؐ اور ان کے اہل بیت طاہرین علیہم السلام کے احادیث تو پہلے ہی سے اس کا پتہ دے رہے ہیں ہمارے طرق سے امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے جسے جناب شیخ صدوق ابن بابویہ قمی نے خصال میں وارد کیا ہے کہ:

ان اللہ قد خلق الف الف عالم و الف الف اٰدم

اللہ نے ہزار عالم پیدا کیے ہیں اور ہزار ہزار آدم

اہل سنت کے طرق سے ہے:

عن رسول اللہ ﷺ ان اللہ خلق قبل اٰدم المعلوم عندنا مأ ۃ الف ادم وروی عن جعفر الصادق مثلہ.....اخرج الامام ابو اللییث فی نفسہ وعن ابن عباس رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ ﷺ ان اللہ ثمانیۃ عشر الف عالم ولك دینا کم منھا عالم واحد.(محاضرۃ الاوائل ص ۲۳۹ مصر)

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ اللہ نے ان آدم کے پہلے جو عام طور پر معلوم ہیں ایک لاکھ آدم پیدا کئے اور اسی مضمون کی روایت امام جعفر صادقؑ سے ہے---امام ابواللیث نے اپنی تفسیر میں جناب ابن عباس کے واسطہ سے حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث درج کی ہے کہ اللہ کے ۱۸ ہزار عالم ہیں اور تمہاری دنیا میں ایک عالم ہے۔اس کے علاوہ پھر صفحہ ۱۸۱ پر ہے:

روی فی الخبر عنہ ﷺ انہ قال للہ ثمانیۃ عشر الف عالم الدنیا منھا عالم واحد.

روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا اللہ کے ۱۸ ہزار عالم ہیں کہ دنیا ان میں سے ایک عالم ہے۔

پہلے اس قسم کے احادیث بھی ''متشابہات'' کی حیثیت رکھتے تھے لیکن اب موجودہ انکشافات نے زرا ان کی حقیقت سے پردہ ہٹا یا ہے۔مصر کے عصری عالم دکتور علی مصطفیٰ شرفہ بک دار لمعارف کے وقت الشیوع رسالہ ''العلم والحیاۃ'' میں دکتور طٰہٰ حسین انطوف الجمیل، عباس محمود العقاد اور فوٗاد صرف ایسے ممتاز عصری علماء کی معاونت سے شائع ہوتا رہا ہے ۱۹۴۵ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں:

ما الشمس الا واحد مّن مائۃ الف ملیون شمس بین کل شمس جابر تھا مسیر بضع سنین بسرعۃ الضوء ویتأ لف من ھٰذا الشموس عالم ھو الذی یظھرلنا لیلا کسحابۃ عظمیٰ من النور تخترف وجہ السماء وتسمیہ نھر لامحترۃ وھٰذا العالم بدور واحد من مائۃ الف ملیون عالم یبلغ قطر کل منھا مات ولا من السّنین الطوالۃ ص ۴۷.

یہ ہمارا سورج کروڑ در کروڑ سورجوں میں ایک ہے جن میں ہر ایک سورج کا دوسرے سورج سے فاصلہ روشنی کی رفتار سے کئی کئی سال کا ہے اور ان سورجوں سے ایک دنیا ہمیں نظر آتی ہے جو رات کو ہمیں روشنی ایک بڑے بادل کی طرح محسوس ہوتی ہے اور وہ سطح فلک کو طے کرتی ہوئی گزرتی ہے اور ہم اسے کہکشاں کہتے ہیں اور یہ علم اپنے پورے احاطہ کے ساتھ کروڑ در کروڑ عالموں میں ایک ہے جن میں سے ہر ایک کا عرض وطول ہزار ہزار سال کی مسافت کے برابر ہے اس ذہنیت کے مقابلہ میں جو ہر دن کا ایک خدا قرار دے رہی تھی اور اس وقت جب ہر قبیلہ کا خدا الگ الگ سمجھا جا رہا تھا، اسلام یہ آواز بلند کر رہا تھا کہ وہ تو ایک عالم کا پروردگار نہیں، ہزاروں جہان ایسے ہوں تو سب کا وہی ایک پروردگار ہے۔

اس سے ایک طرف ہر طرح کے شرک کا سد باب کیا اور دوسری طرف اتحاد عالمی کی ایک مستحکم بنیاد قائم کی جس پر آج تک دنیا باوجود انتہائی تہذیب وتمدن کی ترقی کے کوئی عمارت نہیں بنا سکی۔ اس بنیاد پر عمارت اسی وقت قائم ہوسکتی ہے جب اس دین (اسلام) اور کتاب (قرآن) کو عمومی طور پر تسلیم کرلیا جائے جو اس اخوت کا سنگ بنیاد رکھنے والے ہیں۔ یہ ہوگا مگر اسی وقت جب قرآن کا وعدہ:

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (فتح۔۲۸، توبہ۔۳۳، صف۔۹)

''تا کہ اس دین کو ہر دین پر غلبہ عطا کرے'' پایہ تکمیل تک پہنچے۔

یہ وہی موقع ہوگا جس کے متعلق کہا گیا ہے:

وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ (سورۂ نور ۵۵)

اور ان کے لئے قائم و برقرار کرے گا ان کے اس دین کو جسے اس نے پسند کیا ہے اور ضرور خوف کے بدلے میں انہیں امن وسلامتی عطا کرے گا کہ وہ میری عبادت کریں گے اس طرح کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ دنیا کے مضطربانہ اٹھتے ہوئے قدم آخر کو اس منزل پر پہنچ کر دم لیں گے۔

رحمٰن ورحیم کے وصف کی تکرار:

''تمام جہانوں کا پروردگار کہنے کے بعد پھر وہ دو صفت دہرائے گئے جو بسم اللہ میں آچکے تھے سب کو فیض پہنچانے والا اور بڑا مہربان اور یہ تکرار بے محل اس لئے نہیں کہ بسم اللہ اگرچہ سورہ کا جزء ہے اسی طرح جیسے سورہ حمد قرآن کا جزء لیکن معنی کے اعتبار سے وہ اس کا جز نہیں بلکہ اس پورے کل کا خلاصہ کہا جائے کہ اس بعد والی شرح کا متن ہے جیسا کہ جناب امیرؑ کی حدیث سے ظاہر ہے۔ اور متن کے خاص جز و کا شرح کے ضمن میں آجانا کوئی خلاف توقع امر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان وصفوں کا تذکرہ اگرچہ بسم اللہ میں ہوا تھا مگر وہاں امداد طلب کرنے کے ذیل میں تھا اور یہاں استحقاق حمد کے ثبوت میں محل بدلا ہوا ہے اور مفاد جداگانہ اس لئے تکرار لازم بھی نہیں آتی۔ غور کیا جائے تو الرحمن سے متصل اس کے قبل رب العالمین کی لفظ اس ہمہ گیری کا برہان واضح ہے جو اس وصف کے حق سبحانہ سے مختص ہونے کا اصلی سبب ہے اور الرحیم سے مالک یوم الدین کا بعد میں اتصال الرحیم کے معنی ہیں جو مخصوص رحمت ہے اس کے محل ظہور کا پتہ دینے کا ذریعہ ہے۔

الدین جزا وسزا:

الدّین کے معنی لغت اور اصطلاح میں بہت سے ہیں مگر یہاں اس کے معنی جزا کے ہیں یعنی اعمال کا معاوضہ خواہ اچھا جسے ہمارے محاورہ میں بھی ''جزا'' کہتے ہیں اور خواہ برا جیسے ہمارے محاورہ میں ''سزا'' کہتے ہیں۔

جزا وسزا کی مناسبت اعمال تعیین ہی کا نام ''حساب'' ہے اس لئے حدیث میں یوم الدین کی تفسیر روز حساب کے ساتھ ہوئی ہے۔[1]

جزا وسزا کا پورا نظام ربوبیت اور رحمانیت کا تقاضا ہے کیوں کہ انسان کا کمال لائق شعور واختیار کے ساتھ اطاعت وایمان میں مضمر ہے جس

---

[1] ۔ عن ابی بصیر عن ابی عبداللہ۔ مالك یوم الدین قال: یوم الحساب (علی بن ابراہیم)

کے بالمقابل معصیت وکفر کے اختیار کی قوت ضروری ہے۔اور جب جب دونوں قوتیں کارفرما ہوئی تو خالق کی طرف سے اطاعت کی جانب تحریک اور معصیت سے تخویف کی ضرورت ہوئی اور یہیں سے جزا وسزا کی تفریق قائم ہوئی جو مقتضائے حکمت وعدالت ہے پھر اس کے تحت میں مومنین اور اہل اطاعت تو جہات خصوصی کے مورد بن کر رحیم کی صفت کے جلوہ گاہ بنتے ہیں۔مالک حقیقی دنیا میں بھی وہی ہے مگر یہاں دوسرے بھی محدود پیمانہ پر سہی مالک ہونے کا دعوی رکھتے ہیں روز جزا کی تخصیص اس لئے ہے کہ اس دن کوئی مالک ہونے کا دعویدار بھی نظر نہیں آسکتا۔لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (مومن آیت ۱۶)اوصاف الٰہی کے بیان میں اللہ کے لفظ کے بعد ربوبیت کا تذکرہ آیا جس کے نمایاں آثار اس دنیا میں سامنے ہیں۔اس کے بعد نظر آگے بڑھی اور آخرت کی طرف گئی کہ وہاں قبضہ صرف اسی کا ہے اس لئے بندہ کی حاجتیں وہاں کے لئے تمام تر اسی سے وابستہ ہیں۔ الوہیت انسان کی ہستی سے پہلے ہے۔ربوبیت انسان کی ہستی کے اثناء میں ہے جو اس کی بقاء وتکمیل کا سبب ہے اور یوم الدین کی مملکت آئندہ دور سے متعلق ہے۔ان مختصر الفاظ میں انسان کی نگاہ ماضی حال اور مستقبل سب پر پڑ گئی اور خالق کی عظمت کا ایک نقشہ سامنے کھینچ گیا۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴿٤﴾

''تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے بس مدد مانگتے ہیں''۔

عبادت کا مفہوم:

عبادت کے معنی ہیں اظہار تذلل یا حکم کی تعمیل جو کسی کو خدا یا خدا کا اوتار (محل حلول) مان کر اختیار کی جائے مطلق تعظیم جیسے کسی کو دیکھ کر کھڑا ہو جانا یا سلام کو جھکنا یا ہاتھ چومنا یا آستان بوسی کرنا عبادت نہیں ہے۔نہ مطلق حکم کی تعمیل عبادت سمجھی جاسکتی ہے۔

تعظیم اور عبادت میں فرق:

مشرکین اپنے اصنام کو ''الٰہ'' کہتے تھے۔ہندوستان کی مشرک قومیں بھی جن مجسموں کو پوجتی ہیں ان مجسموں کے اصل اشخاص کو اوتار مانتی ہیں۔اس لئے ''تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں'' کے الفاظ کسی نوع عمل کو اللہ سے مخصوص قرار دینے کا اظہار نہیں ہیں کہ مثلاً ہم کھڑے بس تیرے ہی سامنے ہوتے ہیں۔کیوں کہ کھڑا ہونا اس کے سامنے تو حقیقۃً ممکن ہی نہیں اور اس کے غیر کے سامنے مختلف اغراض سے آدمی کھڑا ہوتا ہے۔یا جھکتے تیرے ہی آگے ہیں۔آدمی کو بہت سے اسباب سے بہت سوں کے سامنے جھکنا پڑتا ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم تیرے سوا کسی کو خدا نہیں مانتے نہ کسی کو تیرا اوتار سمجھتے ہیں۔اس لئے بحیثیت خدا کے ہمارا جھکنا صرف تیرے ہی لئے ہے اب اگر اس کے حکم سے کسی کی تعظیم ہو تو وہ تعظیم اس شخص یا اس شے کی طرف منسوب ہو سکتی ہے مگر عبادت وہ خدا ہی کی قرار پائے گی جس کے حکم کی وہ تعمیل ہے۔وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ ﴿٣٢﴾ (سورۂ حج)

استعانت اور توسل:

''دوسرا فقرہ تجھ ہی سے بس مدد مانگتے ہیں''اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرے مقابل میں اور تجھ سے بے نیاز ہو کر کسی کو ہم مددگار نہیں سمجھتے۔یوں اسباب ظاہری کی بنا پر گرتا ہوا پاس والے آدمی سے مدد لیتا ہے۔فقیر دولت مند سے مدد لے لیتا ہے۔بلکہ ڈوبتا تنکے تک کا سہارا ڈھونڈ

ھتا ہے مگر یہ سب ظاہری اسباب کی حد تک ہے اس کے پس پردہ ایک مسلمان اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک اور طاقت کو محسوس کرتا ہے جس کے سہارا دیئے بغیر کوئی ظاہری سبب کار براری کے لئے کافی نہیں ہوسکتا وہ خالق کی ذات ہے۔

اسی طرح خالق کے حکم سے گناہوں کی مغفرت یا دعاؤں کی قبولیت کے لئے اس کے مقربین کے ساتھ توسل یہ بھی اس استعانت کے خلاف نہیں ہے جو ذات الٰہی میں منحصر ہے کیوں کہ یہ وسائل اسی کے مقرر کردہ ہیں پھر بھی اصل مرکز اعانت ذات حضرت احدیت ہی ہے۔

سلسلۂ کلام کی بلیغانہ رفعت:

الحمد میں شروع سے ذات الٰہی کا باطور غائب اس کا نام لے کر تذکرہ تھا۔ وہ تمہید تھی جہاں سے اصل دعا شروع ہوئی انداز تخاطب کا ہوگیا۔ یہ انداز کی تبدیلی عربی زبان کے معانی و بیان کی اصطلاح میں ''التفات'' کہلاتی ہے اور نظیریں اس کی ہر زبان کے ادب میں ملتی ہیں یہاں اس میں لطافت یہ ہے کہ اس انداز کی تبدیلی سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بندہ نے حمد وثناء کرتے کرتے معبود کی بارگاہ میں رسائی حاصل کرلی اور اس کی نگاہ کو اپنی جانب موڑ لیا ہے اس میں قریب معنوی کی جو بذریعہ حمد حاصل ہونا چاہئے قرب صوری سے تمثیل بھی ہے اور یہی تصور کمال کے درجہ پر ہوجائے تو نماز کے صحیح معنی میں استعارۃ ''معراج المومن'' بن جانے میں شک ہی کیا ہوسکتا ہے۔

نَعْبُدُ اور نَسْتَعِيْنُ میں جمع کے صیغے ''تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے ہم مدد طلب کرتے ہیں'' اس احساس اجتماعیت کے تحفظ کے لئے ہیں جس کے لئے نماز میں انفرادی سے بدرجہ زیادہ ''جماعت'' کو پسند کیا گیا ہے۔ پھر نماز اگر فرادیٰ بھی ہو تو الفاظ زبان پر یہی ہونا ضروری ہیں گویا ہر بندہ سے اللہ یہ چاہتا ہے کہ اول تو بارگاہ میں اکیلا حاضر نہ ہو بلکہ سب کے ساتھ مل کر آئے اور اگر اکیلا آتا بھی ہے تو عرض معروض فقط اپنی ذات کی طرف سے نہ کرے بلکہ تمام بنی نوع کا نمائندہ بن کر جو عرض معروض کرے سب کی طرف سے کرے اور جو مانگے سب کیلئے مانگے۔ دوسرا مقام ہوتا تو ''ہم'' کے لفظ سے تخاطب میں عظمت کی شان پیدا ہوتی تھی مگر بڑے کی بارگاہ میں اپنی خدمت پیش کرنے کے موقع پر ''میں'' کے لفظ انانیت کا اظہار کرتی ہے ''ہم'' کے استعمال میں یہ پہلو بھی ہے کہ یہ خود اپنی ہستی کو افراد اور اس کے خدمات کو قابل تذکرہ ہی نہیں سمجھتا۔ اس سے انانیت اور خودغرضی دونوں باتیں ختم ہوجاتی ہیں۔

عبدالماجد صاحب نے بہت صحیح لکھا ہے کہ ''نَعْبُدُ کے معاً بعد نَسْتَعِيْنُ لانا گویا بندوں کی زبان سے یہ کہلانا ہے کہ ہم عبادت تک میں تیری ہی توفیق تیری ہی اعانت، تیری ہی دست گیری کے محتاج ہیں''۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہماری عبادت اس سے استعانت پر مترتب ہے تو نَسْتَعِيْنُ پہلے ہونا چاہئے اور نَعْبُدُ بعد کو یہاں نعبد پہلے ہے اور نستعین بعد کو، یہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ بغیر اپنی امکانی کار گزاری کو پیش کئے ہوئے بندہ کو اللہ سے طالب امداد ہونے کا حق ہی نہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (عنکبوت۔ ٦٩)

جو ہمارے راستوں میں جدوجہد کرتے ہیں انہیں ہم منزل مقصد تک پہنچا بھی دیتے ہیں۔

علامہ نیشاپوری لکھتے ہیں:

كانه يقول شرعت فى العبادة فا ستعين بك فى ايما نها حتى لايتمعنى مانع ولا يعارضنى صارف.

(غرائب القرآن ج ١)

گویا بندہ کہہ رہا ہے کہ میں نے عبادت کے لئے قدم تو اٹھا دیا ہے اب اس کے حد کمال تک پہنچنے میں تجھ سے مدد کا خواستگار ہوں کہ میرے لئے کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو: بہرصورت اس سے یہ نتیجہ ظاہر ہے کہ انسانی افعال مخلوق الٰہی نہیں ہیں اور نہ بالکل مطلق العنان ہیں ورنہ اس سے اعانت طلب کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ یہ جبر واختیار کے درمیانی نقطہ ہی پر منطبق ہے جو امر بین الامرین کا مصداق ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵

''بتلا تا رہ ہم کو سیدھا راستہ''

ہدایت جس کی خصوصی درخواست ہے وہ نہ ہدایت عمومی ہے جو اللہ کی طرف سے تمام خلق کے لئے لوازم ربوبیت سے ہے اور نہ جبراً منزل مقصد تک پہنچا دیتا ہے کیوں کہ وہ کوئی انسانی کمال نہیں ہے بلکہ وہی اعانت ہے جس کی خواہش کا اجمالی طور پر ایاك نستعين میں ذکر آیا تھا۔ یہ وہ توفیق ہے جو بندہ کے شامل حال ہوتی ہے جس کی بدولت وہ خیر وفلاح سے قریب آجاتا ہے مگر راستے پر چلنا خود اس کا ذاتی عمل ہوتا ہے۔

صراط مستقیم:

''سیدھے راستے'' سے مراد خالق کا وہ پسندیدہ راستہ ہے جس میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط اور وہی دین حق ہے۔ وہی اتباع رسول اور اطاعت ائمہ کا ماحصل ہے۔ اسی سے رضائے الٰہی اور اس کے نتیجہ میں نعیم آخرت کا حصول ہے، احادیث کے مختلف الفاظ مثلاً:

(۱) الطريق المؤدى الىٰ محبتك والمبلغ الىٰ جنتك والمانع من ان نتبع اهواء نا فنعطب وان نأخذ أرائنا فنهلك. (امام جعفر صادق علیہ السلام)

وہ راستہ جو تیری محبت تک لے جانے والا اور تیری جنت تک پہنچانے والا اور اس سے روکنے والا ہے کہ ہم اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کر کے زحمت ومشقت میں گرفتار ہوں اور اپنی اپنی رائے پر چل کر مبتلائے ہلاکت ہوں۔

(۲) ماقصر عن الغلّو وارتفع عن التقصير. (امير المؤمنين علیہ السلام)

جو غلو کی حد سے پیچھے ہو اور کوتاہی کی منزل سے بالا ہو۔

(۳) الطريق الىٰ معرفة الله۔ (امام صادق علیہ السلام)

معرفت خداوندی تک پہنچانے والا راستہ۔

(۴) الامام المفترض الطاعه. (امام صادق علیہ السلام)

وہ امام جس کی اطاعت منجانب اللہ فرض ہے۔

(۵) الطريق الىٰ معرفت الامام. (روايت ابو بصير من امام جعفر صادق علیہ السلام)

امام کی معرفت کا راستہ اور رسولؐ کے بعد بلافصل جو رہ نمائے حق ہے وہ ذات بدرجہ اولیٰ اس کا مصداق ہوگی لہٰذا وارد ہوا ہے۔

(۶) هو امير المؤمنين و معرفة. [1]

---

[1] ۔ علی بن ابراهیم

یہ جناب امیرؑ اور ان کی معرفت ہے

یہ سب اسی ایک راستے کے تعارف کی تعبیریں ہیں اور حقیقت ایک ہے۔[1]

دعائے ہدایت کا مطلب:

یہ ظاہر ہے کہ دعا کا تعلق ہمیشہ مستقبل کے ساتھ ہوتا ہے۔ ماضی اور حال امرِ حال ہے۔ اس کے متعلق دعا کے کوئی معنی نہیں۔ لہٰذا جو شخص راہ راست پر نہیں ہے اس کے راہ راست پر آنے کیلئے اللہ کی ہدایت درکار ہے اور جو راہِ راست پر ہے اس کے بھی آئندہ اسی راستے پر چلنے کے لئے اللہ کی اعانت مطلوب ہے۔ اور اس لئے اھدنا کی تفسیر یہ وارد ہوئی ہے کہ ''ہمیں راہ راست پر ثابت قدم رکھ''[2] اس کے معنی یہ ہیں کہ آئندہ زندگی میں راہ راست پر چلنا دونوں ہی کے یہاں توفیق الٰہی سے وابستہ ہے پھر یہ کہ عارف اور منزل حق کا سالک جس منزل پر پہنچتا ہے اس سے بالاتر بھی ایک منزل اسے نظر آتی ہے یہاں تک کہ حضرت خاتم النبین ﷺ کی زبان تک پر آتا رہا رَبِّ زِدْنِیْ عِلْماً اور ہر بلند تر منزل صراط مستقیم ہی کا ایک درجہ ہے جو اھدنا الصراط المستقیم کے ساتھ مطلوب ہے۔ لہٰذا یہ ترجمہ کہ ''بتلا تا رہ ہم کو سیدھا راستہ'' مقام عبودیت میں زیادہ مناسب اور جامع ہے۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷

''ان کا راستہ جنہیں تو نے اپنی نعمت سے نوازا ہے نہ ان کا جن پر غضب ہے اور نہ انکا جو بھٹکے ہوئے ہیں۔

یہ اس سیدھے راستے کی تشریح ہے جس پر چلانے کی پہلے دعا کی گئی تھی۔ اس میں نعمت سے مراد نعمت دنیا یعنی مال واولاد وغیرہ نہیں ہے کیوں کہ یہ تو کافروں اور گمراہوں کو بھی ملی ہے اور یہاں انعمت علیھم کا مقابلہ ہے مغضوب الیھم اور ضالین کے ساتھ لہٰذا یہ نعمت صرف وہ ہدایت و توفیق ہو سکتی ہے جو اس کے بہترین طاعت گزار بندوں کے شامل حال رہی (معانی الاخبار حدیث امیر المومنینؑ)۔

دین حق کی معرفت میں اشخاص کی اہمیت:

اس سے ظاہر ہے کہ دین حق کی معرفت اس کے نفس قانون (شریعت) اور کتاب سے اتنی نہیں ہو سکتی جتنی اُن اشخاص کے ذریعہ سے جو اس دین کے اُصول پر بہترین عمل کر کے اس کا ایک جیتا جاگتا مجسّمہ ہو گئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سورۂ حمد میں جو براہ راست عبد و معبود کے درمیان ہے ان بندوں کا ذکر نہ ہوتا جنہوں نے اس کے جادہ رضا پر چل کر اس کی راہ رضا کے سنگ میل یا اس کی منزل مقصود کے لئے منارہ بلند کی حیثیت اختیار کر لی ہے چنانچہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی اپنی تفسیر ماجدی میں نقل کرتے ہیں کہ ''مرشد تھانوی مدظلہ نے فرمایا کہ الذین انعمت علیھم سے اشارہ اس طرف ہو گیا کہ صراط مستقیم میسر نہیں ہوتا بغیر اس کے کہ پیروی اہل صراط مستقیم کی کی جائے اور اس کے لئے محض اوراق کتب کافی نہیں''۔۔ یہ مخصوص نعمتوں سے نوازے ہوئے بندے کون ہیں؟ ان کی تفصیل خود قرآن مجید میں دوسری جگہ اس طرح آئی ہے:

---

[1] ۔امال الکل واحد عند العارفین باسرارھم (صافی)

[2] عن علی کرم اللہ وجھہ ثبتنا علی الھدایۃ (غرائب القرآن)

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (سورۂ نساء۔۶۹)

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریں تو یہ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام واحسان کیا ہے انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں:

''سورہ نساء کی اس آیت کریم سے 'انعمت علیھم'' کی مزید تفسیر وتشریح کرنا ایک ایسی مُسلَّم اور متفق علیہ تفسیر ہے جسے عہد صحابہ واہل بیت نبوت (رضوان اللہ علیہم) سے لے کر طبقات متاخرہ تک تقریباً تمام ارباب علم ورسوخ نے اختیار کیا ہے اور مفسرین ''خاصہ'' و ''عامہ'' سب نے اسے قبول کیا ہے چنانچہ جس طرح محدث ابن جریر طبری نے اس کے متعلق مفسرین صحابہ کے آثار جمع کئے ہیں اسی طرح علامہ کلینی اور شیخ طبرسیؒ (صاحب تفسیر مجمع البیان) بھی اس سے انکار نہیں کرتے۔ اس عاجز نے تفسیر ''البیان'' میں تصریحات حضرات آئمہ کرام علیہم السلام و اقوال مفسرین خاصہ بھی نقل کر دیے ہیں فمن یشاء التفصیل فلیر جمع الیہ'' (داستان کربلاء مطبوعہ حیدرآباد دکن ص ۲۲)

مولانا کی متداول تفسیر ''ترجمان القرآن'' ہے۔ اس میں ہم نے تلاش کیا تو یہ تفصیل دست یاب نہیں ہوئی اس کے علاوہ تفسیر ''البیان'' جس کا حوالہ دیا گیا ہے ہمارے علم میں نہیں ہے۔

اس جماعت کے ذکر کے بعد جن کے قریب لانا ہے ان کے بالمقابل دوسری جماعت کر ذکر بھی ضروری سمجھا گیا ہے جس سے دوری اختیار کرانا منظور ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ صراط مستقیم کی معرفت اور عملی پابندی میں صرف ثبوتی پہلو کافی نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ سلبی پہلو یعنی ان اشخاص اور جماعتوں سے بیزاری بھی نہ ہو جو اس صراط مستقیم سے دوری کا باعث ہیں۔

اس ذیل میں دو جماعتوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ جن پر اللہ کا غضب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر عداوۃً حق سے انحراف اختیار کیا ہے۔ دوسرے وہ جو بھٹکے ہوئے ہیں یعنی جو طلب حق میں کوتاہی سے کام لے کر نا دانستہ گمراہی میں پڑ گئے ہیں۔ یہ ''نادانستہ گمراہی'' اگر پوری امکانی جدوجہد کے ساتھ ہوتی تو وہ مستوجب ملامت وعقوبت نہیں ہوسکتی تھی لیکن یہ نادانستگی قصور کا نہیں ارادۃً تقصیر یعنی سہل انگاری اور دماغی کاہلی کا نتیجہ ہے لہٰذا معاف کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔ پھر بھی یہ جماعت ان سے تو بہتر ہی ہے جو حق کو جاننے کے بعد صرف عداوۃً منحرف رہتے ہیں۔

اب یہ جماعتیں ہیں کون؟ ایک تفسیر یہ ہے کہ المغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں جن کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے کہ:

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ (مائدہ۔۶۰)

جن پر اللہ نے لعنت کی اور اُن پر غضبناک ہوا اور ان میں سے کچھ کو بندروں اور سوٴروں کی شکل میں کر دیا۔

اور الضّآلین سے مراد نصاریٰ ہیں جن کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے کہ:

وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ۝ (سورۂ مائدہ)

اس جماعت کے خیالات کی پیروی نہ کرو جو پہلے گمراہ ہوئے اور بہت سوں کو گمراہ کیے اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے

یہ تفسیر ہمارے یہاں بھی امام جعفر صادق علیہ السلام سے وارد ہوئی ہے [1] اور مفسرین اہل سنت نے بھی آیات مذکورہ کی بنا پر اسے اختیار کیا ہے [2]۔

ممکن ہے کہ براہ راست تنزیلی طور پر یہ جماعتیں مقصود کلام ہوں اور تبعاً ہر جماعت کے ساتھ تمام افراد ملحق ہوں جو صفات میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔ اس لئے ایک حدیث میں آیا ہے المغضوب علیهم النصاب و الضّالّین اهل الشكوك الّذی لایعرفون الامام [3] (یعنی) مغضوب علیهم سے مراد اہل بیت علیہم السلام سے عداوت کا اظہار کرنے والے ہیں اور ضالین وہ شکوک واوہام میں مبتلا لوگ ہیں جو معرفت امام نہیں رکھتے''۔

یہ بحث کہ اللہ غضب ناک کیوں کر ہوتا ہے، غضب تو انفعال وتاثر کا نتیجہ ہوتا ہے اور خدا ہر تاثر سے بری ہے، اس لئے کوئی وزن نہیں رکھتی کہ یہ غضب سے مخصوص نہیں یہی سوال تو رحمت میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ پھر جب کہ رحمت تاثر وانفعال کا نام نہیں بلکہ اس فعل کا نام ہے جو دوسرے کے لئے بہتری اور فائدہ کا باعث ہو تو غضب کے لے بھی یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ وہ تاثر وانفعال کے قبیل سے ہے بلکہ وہ کفر نفاق معصیت اور گمراہی کی بناء پر کسی شخص کے مستحق عذاب ہونے کے علم اور اسی علم کے مطابق اس کے ساتھ سلوک کرنے کا نام ہے۔

جیسا کہ عبدالماجد صاحب نے لکھا: غضب الٰہی کا ذکر اگلے آسمانی نوشتوں میں صراحت کے ساتھ ہے، توریت میں بھی اور انجیل میں بھی توریت میں ہے کہ اب تو مجھ کو چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں انہیں بھسم کر دوں (خروج ۳۲: ۱۱) نیز خروج ۳۲: ۱۲ و ۱۳ استثنا ۱۹، ۲۰ و ۲۱ وغیرہ، انجیل کو عام طور پر سرتا سر حلم ورافت وشفقت کا صحیفہ سمجھا گیا ہے مگر وہ بھی اس ذکر سے خالی نہیں (ملاحظہ وہ متی ۳: ۸ و امکاشفہ ۹، ۱۵ وغیرہ)''

---

[1] ۔تفسیر علی بن ابراہیم قمی

[2] ۔غرائب القرآن نیشاپوری

[3] ۔عن ابن اذنیة عن ابی عبدالله علیہ السلام (تفسیر علی بن ابراہیم)

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ

یہ مدنی سورہ یعنی بعد ہجرت کا نازل شدہ قرآن کے تمام سوروں میں سب بڑا سورہ ہے جو ۲۸۶ آیت پر مشتمل ہے [1]۔

سورۂ بقرہ کے مضامین:

بقرہ گائے اور بیل کو کہتے ہیں۔ چوں کہ اس سورہ میں ایک گائے یا بیل کے ذبح کا قصہ درج ہے، جو کسی اور جگہ قرآن میں نہیں ہے، اس لئے اس نام کے ساتھ موسوم ہوا۔ یہ سورہ علاوہ بسیط ہونے کے اسلام کے بہت سے اہم حقائق اور تعلیمات پر مشتمل ہے، جیسے ایمان بالغیب کی اہمیت، متقین کی شان، منافقین کے اوصاف، اعلان خلافت اور امتحان آدم وملائکہ، متعدد واقعات جناب موسیٰؑ وقومِ بنی اسرائیل، یہود ونصاریٰ کے مزعومات اور ان کی سبق آموز رد، واقعہ ہاروت وماروت، اعلان امامت اور ذریت ابراہیمی میں اس کا بقاء اسلام کی قدامت اور ابراہیم اور ان کے بعد اسحٰقؑ ویعقوب اور اسباطؑ یعنی پیشروان یہود ونصاریٰ کا اس ملت میں مندرج ہونا، تحویل قبلہ حیات شہداء اقسام امتحان فضیلت صبر، احکام حج وعمرہ آیات قدرت حکمِ وصیت، فرضیت واحکام صوم، حکمِ دعا، حکمِ جہاد، دنیا وآخرت کا امتزاج، حدودِ اتفاق، حرمتِ شراب، حرمت قمار، احکامِ حالات مخصوصۂ نسواں، احکامِ طلاق ورضاع، عدۂ وفات وطلاق، نماز خوف، واقعۂ طالوت، حرمت ربوا، احکام دین ورہن ودیگر معاملات وغیرہ وغیرہ ان میں بہت سے امور ایسے ہیں جن کا صرف سورہ میں ذکر ہے اور کہیں درج نہیں کئے گئے ہیں۔ اس لئے ابتدائے زمانہ نزول سے اس سورہ کی اہمیت قرار پائی ہے۔ ہماری قدیم تفسیر میں بطور حدیث وارد ہے کہ اس ایک سورہ میں پانچ سو احکامِ شریعت درج ہیں [2]۔

طرق اہل سنت سے وارد شدہ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ان الفاظ میں کرتے تھے کہ:

الذی انزلت علیه سورة البقرة. (صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۱۵)

وہ ہستی جس پر سورہ بقرہ اتارا گیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''۔

اس آیت کی تشریح وتفسیر پہلے ہو چکی ہے۔

---

[1] ۔ "مائتان وثمانون وست آیات مدنیة (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۵۰) مائتان وست وثمانون فی العدد الکوفی وهو العدد المروی عن امیر المؤمنین" (مجمع البیان ج ۱)

[2] ۔ روی ان فی البقرة خمس مائة حکم (علی بن ابراہیم)

الٓمّٓ ①

الف۔لام۔میم

مقطعات قرآنیہ اور ان کی نوعیت:

ان حروف کو اور ایسے ہی جو بہت سے سوروں کی ابتدا میں ہیں جیسے حٰمٓ، الٓمٓر، الٓمٓصٓ وغیرہ ان سب کو ''مقطعات قرآنیہ'' کہتے ہیں ان کے بارے میں صحیح یہی ہے کہ وہ رازہائے سربستہ ہیں جو مابین خدا اور رسول ایک خصوصی پیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فریقین کے یہاں وہ شخصیتیں جن کے اقوال سرآنکھوں پر رکھے جاتے ہیں یہی بتاتی ہیں ایک طرف علامہ رازی لکھتے ہیں:

قال ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ فی کل کتاب سرّو سرّہ فی القراٰن اوائل السوروقال علی علیہ السلام ان لکل کتاب صفوۃ ھذا الکتاب حروف التھجی. (تفسیر کبیر ج ا ص ۱۵۰)

حضرت ابوبکرؓ کا قول ہے کہ ہر کتاب سماوی میں اللہ کا کوئی مخصوص راز ہے اور قرآن میں اس کا راز ان سوروں کے ابتدائی حروف ہیں اور حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ہر کتاب میں ایک خاص منتخب چیز ہے اور اس کتاب کا منتخب ترین جزء یہ حروف ہیں۔

پھر لکھا ہے:

سئل الشعبی عن ھٰذاہ الحروف فقال سرّ اللہ فلا تطلبوہ وروی ابو ظبیان عن ابن عباس قال عجزت العلماء عن ادرکھا وقال الحسین ابن الفضل ھو من المتشابہات.(ص ۱۵۱)

شعبی سے ان حروف کے بارے میں دریافت کیا گیا انہوں نے کہا یہ اللہ کا راز ہے اسے معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو اور ابوظبیان کی روایت ہے ابن عباس نے کہا کہ صاحبانِ علم ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں اور حسین بن فضل نے کہا ہے کہ وہ متشابہات میں سے ہیں۔

دوسری طرف علامہ طبرسی لکھتے ہیں:

انّھا من المتشابہات الّتی امتأثر اللہ بعلمھا ولا یعلم تأویلھا الّا اللہ وھٰذا ھو المروی عن أئمتنا.

یہ ان متشابہات میں سے ہیں جن کا علم اس نے اپنے سے مخصوص رکھا ہے اور سوا اللہ کے کوئی ان کے مطلب سے واقف نہیں ہے یہی روایت ہمارے آئمہ سے وارد ہوئی ہے۔

جناب تاج العلماء نے اپنے ترجمہ کے حاشیہ میں لکھا ہے:

''یہ متشابہ آیتوں میں قرآن مجید کے بین اور آیتوں کی تفسیر ہوا و ہوس اور اپنی خودرائی سے حرام قطعی ہے اور اسی کو تفسیر بالرائے کہتے ہیں''۔

بے شک چوں کہ خود قرآن مجید میں ہماری مانی ہوئی تفسیر کے مطابق متشابہات کے علم میں اللہ کے ساتھ ''راسخون فی العلم'' کا بھی ذکر موجود ہے اس لئے ان مقطعات کے معانی معصومینؑ کے دایرۂ علم میں ہو سکتے ہیں چنانچہ ہماری قدیم تفسیر میں جو زیادہ تر اقوال آئمہ سے ماخوذ ہے الٓمٓ کے بارے میں ہے جس سے مقصود غالباً تمام مقطعات کے بارے میں بتانا ہے کہ:

ھو حرف من حروف اسم اللہ الاعظم المنقطع فی القراٰن الذی یؤلّفہ النبی و الامام فاذا دعابہ اجیب.

(تفسیر علی بن ابراھیم قمی)

وہ اللہ کے اسم اعظم کے کچھ حروف ہیں جو قرآن میں الگ الگ آئے ہیں جنہیں پیغمبر اور امام ترتیب دیتے ہیں تو ان سے جو دعا مانگتے ہیں وہ قبول ہوتی ہے نتیجہ اس کا بھی یہی ہے کہ وہ ہمارے لئے راز سربستہ ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جن لوگوں نے اپنی ذہنی کاوش کا ان مقطعات کو آماجگاہ بنا کر ان کی حقیقت بتانا چاہی ہے ان کے اقوال کی کثرت بھی خود، مذکورہ بالا حقیقت کی مؤید ہے چنانچہ ان میں سے ان اقوال کی جو علامہ طبری کی جامع البیان یا امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر یا علامہ طبرسی کی مجمع البیان میں درج ہیں تعداد تقریباً ۲۳ تک پہنچتی ہے جن میں سے کوئی بھی کسی معصوم سے وارد نہیں ہے ایسی صورت میں ان کا ذکر کرنا ہی بے کار ہے جب کہ ان ہستیوں نے جن کا حق تھا کہ وہ ایسے مشابہات کی تشریح فرمائیں خود یہ کہہ دیا کہ یہ راز قدرت ہے تو پھر اس کے درپے ہونا نبض قرآن انہی کا کام ہو سکتا ہے جو قرآنی الفاظ فی قلوبھم زیغ [1] کا مصداق ہوں۔

قرآن کے بحیثیت مجموعی ہمارے لئے سرمایہ ہدایت ہونے سے یہ ضروری قرار نہیں پاتا کہ اس کا ہر ہر جزء ہمارے سمجھانے کے لئے نازل کیا گیا ہو بلکہ اسی میں اپنے رسول کے لئے خصوصی رموز و اشارات بھی ودیعت کر دیئے جائیں جن کی بقدر ضرورت تبلیغ رسول اور ان کے وارثان علم کی حکیمانہ مصلحت بینی سے وابستہ رکھی گئی ہو تو اس میں اعتراض کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ خود اسی سورہ میں ہے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ۔۲۹) تمام کائنات ارضی تمہارے لئے خلق فرمائی ہے مگر ان میں بے شمار چیزیں وہ ہیں جن کا علم ابھی تک ہم کو نہیں ہے یا علم حاصل ہوا ہے تو مخصوص معلمین کی تعلیم سے اسی طرح قرآن ہمارے لئے نازل ہوا ہے مگر اس کی ہر جزو کا علم ہمیں بالذات حاصل ہونا ضروری نہیں ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

''یہ خاص کتاب ہے اس میں بدگمانی [2] کی کوئی گنجائش نہیں ہدایت ہے فکر نجات رکھنے والوں کے لئے''

قرآن خود اپنا وصف پیش کر رہا ہے ''کتاب'' کی لفظ سے ظاہر ہے کہ اگرچہ تنزیل قرآن کی متفرق آیتوں کی شکل میں بحسب ضرورت وقت ہوتی تھی مگر کوئی ظرف مکان ایسا ضرور تھا جہاں ان تمام آیات کا مجموعہ کتابی شکل میں موجود تھا۔ آیتیں جو بھی نازل ہوتی تھیں وہ اسی کتاب کے اجزاء کی حیثیت سے۔

پھر اس کے علاوہ کچھ ایسی بھی وحی ہوتی تھی جو اس کتاب سے علیٰحدہ تھی وہ جب رسولؐ کی زبان پر آ گئی ہے تو وہی ''حدیث قدسی'' کہلائی۔

یہ خواہ بوقت تنزیل فرشتہ تصریح کر دیتا ہو کہ وحی منجملہ قرآن ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خداداد قوت امتیاز تھی جس سے وحی کے وہ حصے الگ رہتے تھے جو بطور قرآن نازل ہوئے ہوں اور وہ الگ کہ جو اس سے علیحدہ ہوں۔

---

[1] ۔ ان کے دلوں میں کجی ہے (پارہ سوم آل عمران)

[2] ۔ الریب تویب من الشك وفیه زیادة كانه

وحی اترنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کسی صحابی کو بلا کر وہ آیت لکھوا دیتے تھے۔ اسی سے یہ ظاہر ہے کہ از اول قرآن مجید کا مکتوبی صورت سے محفوظ رکھا جانا ہی منظور الٰہی تھا۔ صرف حفظ اور قراءت پر اعتماد کرنا مقصود نہ تھا۔ نہ ایسا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حسب موقع جو تعلیمات زبان پر لاتے رہے انہیں صحابہ نے بطور یادگار جمع کر لیا ہو۔ یہ حیثیت احادیث کے ان ذخیروں کی ہے جو محدثین کے یکجا کیے ہوئے موجود ہیں۔ قرآن کی کتابی صورت اس سے مختلف ہے۔ وہ خدا کی طرف سے مکتوبی شکل میں اگرچہ نازل نہیں کیا گیا مگر حیثیت اسے کتاب کی منجانب اللہ کی طرف سے حاصل ہے کسی انسان کی طرف سے نہیں۔

''اس کتاب میں شک کی کوئی گنجائش نہیں'' ان آیات اعجاز اور دلائل حقانیت کی بناء پر جو اس کے الفاظ [1]، معانی [2]، تنزیلی پس منظر [3] اور مترتب شدہ نتائج [4] سب میں مضمر ہیں۔

نہ یہ کہ شک کرنے والے اس میں نہیں ہیں۔ [5] شک کرنے والے یا تو حقیقۃً ایسے ہیں کہ وہ دل میں شک رکھتے نہیں بلکہ جان بوجھ کر از روئے عناد تصدیق سے گریز کرتے ہیں اور ایسے ہیں کہ جو مبتلائے غفلت ہیں اور ان دلائل پر غور نہیں کرتے اور اسی لئے اس کی ہدایت کی تاثیر سب میں نمودار نہیں ہوتی بلکہ ایک مخصوص جماعت میں نمودار ہوتی ہے جن کے اوصاف متقین اور اس کے بعد کے لفظوں سے بیان کئے گئے ہیں اگر اس میں شک رکھنے یا انکار کرنے والے موجود نہ ہوتے اور سب اس پر یقین کی کیفیت کے ساتھ متوجہ ہوتے تو اس کی ہدایات سے سب فیض یاب کس لئے نہ ہوتے۔

اس سے فیض حاصل کرنے والے وہی ہوں گے جو ان ارشاد و ہدایت کی باتوں پر جنہیں قرآن پیش کرتا ہے غور کریں اور فائدہ اٹھانے کے قصد سے سنیں۔ رہ گئے سرکش مخالف یا بے پروا غافل، وہ اس پر توجہ ہی نہ کرینگے تو ہدایت کا اثر کیا قبول کریں گے بلکہ ہٹ دھرم اور متعصب مخالف تو جتنا ہدایت کی باتیں زیادہ سنتے ہیں اتنا ہی کفر و عناد میں شدت اختیار کرتے جاتے ہیں [6]۔

یہ وہ ہیں جن کے لئے نتیجۃً وہ باعث ہدایت ہونے کے بجائے زیادتی مرض و ضلالت کا سبب ہو جاتا ہے جس میں قصور خود ان کا ہے اس کتاب کا نہیں جو درحقیقت مجسمہ ہدایت ہے

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمہ آفتاب را چہ گناہ

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ﴿۳﴾

---

[1] ۔ فصاحت و بلاغت

[2] ۔ ان حقائق و معانی کا بیان جن سے اس وقت دنیا ناواقف تھی

[3] ۔ اس کا رسول ﷺ اُمّی کے ذریعہ سے پیش ہونا جس نے امیّین ہی کے درمیان پرورش پائی تھی

[4] ۔ اس کے ادعائے اعجاز کے مقابلہ میں مخالف طاقتوں کی سپر اندختگی اور دائمی عاجزی

[5] ۔ ما نفی ان احد الا یرتاب فیہ وانما المنفی کونہ متعلقا للریب و مظنۃ لہ لانّہ من وضوح الدّلالۃ وسطوع البرھان بحیث لا ینبغی لمرتاب ان یقع فیہ (نیشاپوری)

[6] ۔ فالمؤمن بہ ھتدوا الکافر بہ محجوج (جامع البیان للطبری)

''جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خیرات کرتے ہیں''۔

اس جماعت کا جس نے قرآن سے فیض حاصل کیا جامع وصف ''متقین'' کی لفظ سے بیان ہو گیا یہ اس کی تفصیل ہے۔

تقویٰ کا مفہوم:

''تقویٰ'' کے معنی خوفناک انجام سے اپنا بچاؤ کرنے کے ہیں مگر متقی کا لفظ جس ڈر کو بتاتا ہے وہ کسی مادی نقصان یا ظاہری طاقت کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ان دیکھی ذات خدا کی عظمت کا احساس اور اس کی ناراضی سے بچنا ہے۔ انسان جب اس سے ڈرتا ہے تو صحیح انسانی فرائض کے ادا کرنے کا خیال رکھتا ہے پھر وہ دنیا کی طاقتوں سے نڈر ہو کر حقانیت کا پابند رہتا ہے۔

ایمان بالغیب کی اہمیت:

حقیقت یہ ہے کہ مادی چیزوں کی حرص اور ان کا خوف ہی اکثر سیدھے راستے سے ہٹانے کا باعث ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ آنکھوں کے سامنے جو آسکتے ہیں وہ یہی مادی نفع اور نقصان کے ذرائع ہیں۔ جتنا ان مشاہدات سے آدمی متاثر ہوگا اتنا ہی دولت، کثرت اور طاقت کے اصنام کے سامنے جھکنے پر مائل ہوگا اور جتنا ان عالم شہود کے مظاہر سے بے تعلق ہوگا اور ان سب کی طرف سے آنکھیں بند کر کے دل کی آنکھوں کو کھول کر ان دیکھی قوت کی طرف متوجہ ہوگا اتنا ہی اس نقطہ حق کے ساتھ وابستہ ہوگا جو اس سے عدل و احسان کے سوا کبھی برائی اور ناحق کوشی کا روادار نہیں ہوتا۔ اسی لئے قرآن نے متقین کے وصف میں سب سے پہلے ایمان بالغیب کو رکھا ہے کہ یہ سرچشمہ ہے تمام دوسرے اوصاف کا۔ اس میں مرکزی نقطہ تو حق سبحانہ کی ذات ہی ہے جو بہر صورت غیب الغیوب ہے مگر اس کے ساتھ مذہب سے متعلق تمام حقائق جن کا اعتقاد ضروری ہے داخل ہو جاتے ہیں کیوں کہ وہ سب ہی کسی نہ کسی حیثیت سے غیب ہیں[1]۔

مولوی عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے ''دین کا مغز کہیے یا ایمان کی روح یہی عالم غیب کا عقیدہ ہے یعنی یہ اعتقاد کہ اس عالم مادی سے ماوراء اس کائنات حسی سے اوپر کچھ اور ایک عالم ہے ضرور اور جو اس عالم کے وجود کا قائل نہیں وہ سرے سے مذہب ہی کا قائل نہیں''۔

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ امام غائب کے تسلیم کرنے میں بھی مومنین متقین کو کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے جو مسلمانوں کے درمیان سب سے آخری منزل امتحان ایمان کی بن گئی ہے جیسا کہ امین الاسلام طبرسی نے لکھا ہے:

ویدخل فیه ما رواه اصحابنا من زمان غیبة المهدی ووقت خروجه. (مجمع البیان)

اور اس میں داخل ہے وہ جو ہمارے یہاں وارد ہوا ہے امام مہدی کی غیبت اور آپ کے ظہور کے وقت کے بارے میں۔

اس سے علامہ رازی کا یہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے کہ عام کی تخصیص بغیر دلیل درست نہیں ہے اس لئے کہ ہم کب اس کے قائل ہیں کہ غیب سے مراد بالخصوص یہی ہے بلکہ ہم اسے ایک فرد کی حیثیت سے اس حکم عام میں داخل سمجھتے ہیں جیسا کہ ہمارے جد اعلی جناب جنت مآب سید نقی صاحب قبلہ نے فرمایا ہے:

لسنا نقول ان المراد بالغیب المهدی لا غیر حتی یلزم تخصیص المطلق من غیر دلیل بل نقول

---

[1] ۔یدخل فیه العلم بالله تعالیٰ وبصفاته والعلم بالآخرة والعلم بالنبوة والعلم بالاحکام والشرائع (رازی)

المراد به ما غاب عن العباد علمه من امور الدين كما عن الحسن ادما جاء عند الله كما عن ابن عباس وما جاء فی المهدی صلوات الله علیه داخل فیه (ینابیع الافوار ج۱)

ہم یہ نہیں کہتے کہ غیب سے امام مہدی ہی مراد ہیں اور کچھ نہیں تا کہ مطلق کی تخصیص لازم آئے بغیر دلیل بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ دینی باتیں ہیں جو بندگان الٰہی کی نگاہ سے اوجھل ہیں جیسا کہ حسن کا قول ہے یا وہ جو اللہ کی طرف سے آیا ہے جیسا کہ ابن عباس کا قول ہے اور امام مہدی کے بارے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں وہ اس میں داخل ہیں۔

پھر کوئی شیعہ اگر اس تخصیص کا قائل بھی ہو تو وہ بلا دلیل نہ ہوگا جب کہ اس بارے میں ان ہستیوں کے ارشادات موجود ہیں جو دینی حیثیت کے دلیل قرار پانے کے لئے کافی ہیں[1])۔

اعتقادات کا اصل یعنی ایمان بالغیب کو ذکر کرنے کے بعد دو ۲ وصف اعمال سے متعلق ذکر کیے ہیں جو دو ۲ شعبوں کی نمائندگی کرتے ہیں اول انفرادی فرائض یعنی حقوق اللہ ان سب سے اہم ہے جس کیلئے قرآن مجید میں ہے کہ یہ تمام برائیوں سے روکنے والی چیز ہے (اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ (عنکبوت۔ ۴۵) اور حدیث میں ہے: ان قبلت قبل ما سواها و ان ردت ردّ ما سواها "اگر یہ قبول تو سب اعمال قبول اور یہ مسترد تو سب اعمال مسترد"۔

دوسرے اجتماعی فرائض یعنی حقوق الناس ان میں انفاق کی صفت کا ذکر کیا گیا ہے جو خلق خدا کو ہر طرح کے فائدے پہنچانے پر شامل ہے[2] جس طرح اس میں مال و دولت داخل ہے جو رزق جسمانی کا ذریعہ ہے اسی طرح علم و معرفت جو رزق روحانی ہے اسی لئے آئمہ اہلبیتؑ سے اس کے معنی وارد ہوئے ہیں: وما علمنا هم يثبون "اور ہم نے جو تعلیم دی ہے انہیں وہ اس کی اشاعت کرتے ہیں" اسے علی بن ابراہیم قمیؒ نے اپنی تفسیر میں وارد کیا ہے اور علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں بروایت محمد بن مسلم امام جعفر صادق سے نقل کیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

"اور جو ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا تھا، اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں"۔

ان ہی متقین کے متعلق جن کے لئے قرآن فیض رساں ثابت ہوتا ہے اوصاف کا ایک دوسرا سلسلہ ہے وہ پہلے اوصاف وہ تھے جو بذات خود ان کے بیش قیمت ذاتی جوہر ہیں یعنی غیب پر ایمان حقوق اللہ اور حقوق الناس سب کی ادائیگی اب یہ ان کے وہ اوصاف امتیازی ہیں جو دوسری جماعتوں کے تقابل سے ان میں نمایاں ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ ان کے بالمقابل جتنی دوسری جماعتیں ہیں ان کی صفت امتیازی انکار ہے ایک طرف مشرکین ہیں جو خدا ہی کے منکر ہیں یا اس کے انبیاء پر نازل شدہ تمام ہی تعلیمات کے منکر ہیں اور کسی بھی شریعت و کتاب کے پابند نہیں ہیں

---

[1] ۔ جناب شیخ صدوق محمد بن علی بابویہ قمیؒ نے اپنی جلیل القدر کتاب "اکمال الدین" میں اس بارے میں امام جعفر صادقؑ کی کئی حدیثیں درج فرمائی ہیں۔

[2] ۔ الظاهر انّ الاٰية تعم جميع انواع الصّدقة (ینابیع الانوار)

اسی لئے وہ ''اہل کتاب'' نہیں کہلاتے وہ کسی ''ما انزل'' پر نہ ایمان رکھتے ہیں اور نہ اس کے دعویدار ہیں۔

دوسری طرف اہل الکتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہیں یہ فی الجملہ ما انزل پر ایمان کے مدعی ہیں مگر ان میں سے پہلا گروہ یہود، وہ موسیٰؑ پر نازل شدہ توریت تک تو تسلیم کرتا ہے مگر عیسیٰ علیہ السلام اور ان پر نازل شدہ انجیل اور پھر اس کے بعد کا منکر ہے دوسرا گروہ نصاریٰ وہ بخیالِ خود سہی اور ان کی انجیل تک مانتا ہے لیکن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان پر نازل شدہ شریعت و کتاب کا انکار کرتا ہے تو جہاں تک ایمان ''بما انزل'' کی صفت کا تعلق ہے مخالف جماعتوں میں سے کچھ میں تو دوسرے سے مفقود ہے دہریین اور مشرکین اور کچھ میں وہ ایمان اس طرح ہے کہ بعض کا ایمان اور بعض کا کفر مگر اس جماعت کا جو قرآن سے ہدایت قبول کرنے والی ہے خاص وصفت یہ ہے کہ ان کے یہاں ایمان ہی ایمان ہے۔ یہ ایمان کے بھی حامل ہیں جس کے یہود مدعی ہیں اس ایمان کے بھی جس کے نصاریٰ مدعی ہیں اور پھر اس کے آگے یہ اس کتاب و شریعت پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہے۔

قرآن کی ہدایت سے مسلمان اس کا اعتقاد رکھتا ہے کہ ابتدائے دور کائنات سے ہر قوم اور ہر ملک میں اللہ نے ہادیان دین پیدا کیے ہیں اور ان کی حقانیت پر ایمان جزو اسلام ہے۔

گزشتہ انبیاء پر ایمان کی صورت:

بے شک ان میں سے جن جن کے نام قرآن کریم میں آ گئے ہیں ان کی رسالت پر بالتفصیل ایمان ہے لیکن جن کے نام نہیں آئے ہیں اور ہمارے لئے کوئی قابل اطمینان ذریعہ ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا نہیں ہے ان کی رسالت کا ہم نام بنام یقین نہیں کر سکتے۔ پھر بھی اجمالی طور پر اس کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو بھی رہ نمایانِ دین جس ملک میں آئے وہ سچے تھے۔ اور اسی لئے ان مذاہب کے قدیم پیشواؤں کے بارے میں جن کے نام ان اہل مذاہب کی زبانی سنے جاتے ہیں ایک مسلمان کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کوئی کلمہ نازیبا اور توہین آمیز جملہ زبان پر لائے جب کہ احتمال ہے کہ وہ بھی ان سچے رہبران دین میں سے ہو جن پر ایمان از روئے قرآن لازم ہے۔

آخرت پر یقین:

دوسری صفت یہ ہے کہ وہ روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں یقین وہ راسخ اعتقاد ہوتا ہے جو انسان کے عمل پر لازمی طور سے اثر انداز ہوتا ہے۔ دوسری جماعتوں میں مشرکین و ملاحدہ کو اس زندگی کے بعد کسی دوسرے دور کا تصور ہی نہیں ہے اور وہ اس مرکز عدالت ہی کے نہیں قائل ہیں جو جزا و سزا کے دینے کا حقدار ہے۔ یہود کے یہاں جزاؤ سزا کا تصور اس موجود توریت کے رو سے جو ان کے یہاں متداول ہے دنیوی ہے توریت میں کفر و عصیان کی سزا میں جو دھمکیاں دی گئی ہیں وہ کھیتیوں کے جل جانے عمریں کم ہو جانے اور اسی طرح کی دوسری باتوں کے قبیل سے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان مادی تحفظات کرنے کے بعد بہت حد تک مطمئن ہو جاتا ہے۔

عیسائیوں نے جزا و سزا کے عقیدہ کو فدیہ مسیح کا اعتقاد قائم کر کے بالکل ختم کر دیا اب انہیں اصلاح عمل کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔

مسلمان از روئے آیات قرآن اس دور حیات دنیا کو عبوری سمجھتا اور آخرت کی منزل کو جزا و سزا کا مرکز جان کر ہر اس اقدام سے باز رہتا ہے جو ظلم و ستم اور طغیان و عدوان میں داخل ہو خواہ اس سے دنیوی زندگی میں کتنی ہی بڑی کامیابی حاصل ہو اور عدالت و انصاف سچائی اور امانت

داری بلکہ ایثار قربانی تک کے لئے آمادہ رہتا ہے، چاہے اس میں کتنا ہی اسے نقصان بلکہ دنیوی تباہی تک سے دوچار ہونا پڑے۔

یہ زندگی وہ ہے جو آخرت کے سچے یقین کا لازمی نتیجہ ہے اور اگر مسلمان کی زندگی میں یہ توازن واعتدال نظر نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ زبان سے اصول عقائد کا مقر ہے مگر دل میں اس کے یقین آخرت کا شائبہ تک نہیں ہے۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ⑤

"یہ ہوتے ہیں وہ جو اپنے پروردگار کی ہدایت پر قائم ہوں اور یہ ہیں وہ جو ہر حیثیت سے بہتری پانے والے ہیں"

بطور اثر سے موثر پر استدلال کے جسے منطق میں "برہان انّی" کہتے ہیں اس جماعت کو دکھلا کر قرآنی ہدایات کی رفعت کا ثبوت پیش کیا جارہا ہے۔

کاش آج بھی ایسے مسلمان نظر آئیں جنہیں فخر کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر کے انہیں اسلامی تعلیمات کی رفعت پر غور کرنے کی دعوت دی جاسکے۔ اور یہی اصلی اور موثر تبلیغ ہے کونوا دعاۃ بانفسکم قبل السنتکم۔

فلاح کی لفظ کے ترجمہ میں "ہر حیثیت سے بہتری" لکھنا اردو میں اس کے ترجمہ کے لئے کوئی واحد لفظ دستیاب نہ ہونے کا نتیجہ ہے اہل لغت کا قول ہے کہ کلام عرب میں جامعیتِ خیر کے لئے فلاح سے بڑھ کر کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔[1]

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ⑥

"بلاشبہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے حق میں یکساں ہے خواہ آپ انہیں ڈرائیے یا انہیں نہ ڈرائیے۔ بہرحال وہ ایمان لائیں گے نہیں"۔

حقیقتوں کا انکار کبھی نادانستہ یا کوشش طلب کے ساتھ عبوری دور کے طور پر ہوتا ہے۔ یہ چاہے اصطلاحی طور پر کافر سمجھے جائیں مگر فعل ارادی کے طور پر ان الفاظ سے کہ "جن لوگوں نے کفر اختیار کیا" یہ جماعت سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسی جماعت وہ ہوسکتی ہے جس کا کفر تمہید ایمان بن سکے اور عموماً یہی وہ افراد ہوتے ہیں جو آنکھوں سے پردہ ہٹنے کے بعد اور طلب کی راہ کے منزل تک پہنچ جانے کے بعد حق کو اختیار کر لیتے اور ایمان کے درجہ پر فائز ہو جاتے ہیں۔ ان ہی کے بارے میں رسولؐ کی دعوت وتبلیغ اور تبشیر وانداز کے فوائد مترتب ہوتے ہیں اور انہیں کو کارگاہ اصلاح وارشاد کا ماحاصل سمجھنا چاہئے۔

الذین کفروا سے یہ جماعت مراد نہیں ہے بلکہ ایسے لوگ مراد ہیں جو حق سمجھنے کے بعد باطل کو اس پر ترجیح دیتے ہیں جس کے لحاظ سے قرآن مجید نے قوم ثمود کے باب میں کہا ہے:

فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (حٰمٓ سجدہ آیت۔ ۱۷)

انہوں نے اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دی۔

اور کہیں کسی جماعت کے بارے میں: کہا کہ

---

[1] ۔ لیس فی کلام العرب کلہ اجمع من لفظۃ المفلاح لخیر الدّنیا والاخرۃ کما قال ائمۃ اللّسان (تاج العروس للزبیدی)

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ (بقرہ۔۱۷۵)

یہ وہ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے میں گمراہی اور بخشش الٰہی کے عوض میں عذاب کو مول لیا ہے۔

ایسے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے بارے میں رسولؐ کی ہدایتیں بے کار ہوا کرتی ہیں اس لئے کہ آنکھوں پر پردہ ہوتو ہٹے اور راہ طلب میں قدم زنی ہوتو کسی رہبر کی دست گیری سہارا دے۔ ایسے ہی گروہ کے متعلق اس آیت میں اپنے رسولؐ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے کہ ''چاہے آپ ڈرائیے اور چاہے نہ ڈرائیے یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اب اگر یہ آیت یہود یا مشرکین کے ایک خاص طبقہ کے متعلق ہے جیسا کہ ابن عباسؓ کا قول ہے [1] اور اسے حافظ ابن جریر طبری نے اختیار کیا ہے [2] تو اسے خالق کی طرف سے وقوع میں آنے والے غیب کی اطلاع سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اسے ایک عام حکم سمجھا جائے جیسا کہ ظاہر آیت ہے تو یہ کوئی پیشین گوئی نہیں ہے بلکہ ان کے کفر اختیاری کے مقتضائے طبیعت کا بیان ہے اور ان کے راہ ایمان پر نہ آنے سے جو رسولؐ کو ذرا رنج پہنچتا ہے اس کی تسکین ہے کہ اگر یہ راہ حق پر نہیں آتے تو اس میں آپ کا کوئی قصور تھوڑی ہے۔ یہ تو ان کے کفر اختیاری کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے ان کے لئے اور ہدایت عدم ہدایت یکساں ہوگئی ہے۔

جناب عبدالماجد صاحب نے یہاں حقیقت کی ترجمانی اچھے عنوان سے کی ہے وہ کہتے ہیں:

''طبیب حاذق اپنے علم کی رو سے مدتوں پیشتر خبر دے دیتا ہے کہ فلاں بد پرہیز خود رائے مریض اچھا نہ ہوگا۔ کیا اس پیشین گوئی اس اخبار غیب میں اس شفیق طبیب کی خواہش و مرض کو بھی کچھ دخل ہوتا ہے؟

بقول مفسر تھانوی اس کافر کا ناقابل ایمان ہونا اللہ کے اس خبر دینے کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا یہ خبر دینا اس کافر کے ناقابل ایمان ہونے کی وجہ سے ہوا ہے اور ناقابل ہونے کی صفت خود اس کی شرارت وعناد و مخالفت حق کے سبب سے پیدا ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں اس کی پیدائش کے ساتھ استعداد قبول حق کی رکھی ہے جیسا حدیث میں آ گیا ہے، مگر یہ شخص خود اپنی ہوائے نفسانی اور خود غرضی کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتا ہے یہاں تک کہ ایک روز وہ استعداد فنا ہو جاتی ہے''۔

اسی کو بہت امین الاسلام طبرسیؒ نے ان الفاظ میں کہا ہے:

الصحیح ان نقول ان العلم یتناول الشئ علیٰ ما ھو بہ ولا یجعلہ علیٰ ما ھو بہ فلا یمتنع ان یعلم حصول شئ بعینہ وان کان غیرہ مقدورا۔ (مجمع البیان)

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ علم کسی چیز پر حاوی ہوتا ہے جس طرح پر وہ ہوگی اور وہ اس طرح پر اسے کرنہیں دیتا لہٰذا یہ امر غیر ممکن نہیں ہے کہ کسی معیّن چیز کے ہونے کا اسے علم ہو اگر چہ اس شخص کو اس کے خلاف پر قدرت حاصل ہو۔

---

[1] ۔ قال قائلون انھم رؤساء الیھود المعاندون الذین وصفھم اللہ تعالیٰ بانھم یکتمون الحق وھم یعلمون و ھو قول ابن عباس رضی اللہ عنہ (رازی)

[2] ۔ اولیٰ ھٰذہ التأویلات بالآیۃ تاویل ابن عباس (جامع البیان)

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۧ

''مہر کردی ہے اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے سننے کی طاقت پر اور ان کی نگاہوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے''۔

دلوں پر مہر لگنا کفر کا نتیجہ:

قلب سے مراد یہ ''جسمانی عضو'' نہیں ہے جسے فن تشریح میں قلب کہا جاتا ہے بلکہ مرکز تعقل وشعور مراد [1] ہے جو اس لفظ کے عرفی معنی ہیں اور خدا کا مہر کر دینا کنایہ ہے اس بات سے کہ اس نے نیک توفیق سلب کر لی بوجہ ان کی ہٹ دھرمی کے اور یہ مطلب نہیں ہے کہ بندوں کو مجبور کر کے ان سے گناہ کرواتا ہے'' (تاج العلماء) امام رضاؒ نے فرمایا ہے:

الختم هو الطبع علىٰ قلوب الكفار عقوبة علىٰ كفرهم. (صافی)

''ختم'' سے مراد ہے کافروں کے دلوں پر مہر لگا دینا ان کے کفر کی سزا میں ہے۔

اس کی شاہد دوسری آیت قرآن ہے:

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (نساء۔۱۵۵)

اللہ نے ان پر مہر کر دی ہے ان کے کفر کے سبب سے ہمیشہ سے علمائے امامیہ کا یہی مسلک رہا ہے اس کے برخلاف مسلم اکثریت کے علماء زور وشور سے اس کو شیعوں کے عقیدہ عدل کے خلاف ثبوت میں پیش کرتے رہے چنانچہ ابن جریر طبری ایسا قدآور عالم اس آیت کے تحت میں لکھتا ہے کہ:

هٰذه الأية من اوضح الا قلة علىٰ فساد قول المنكرين تكليف ما لا يطاق. (جامع البیان ج ا ص ۸۸)

یہ آیت سب سے زیادہ واضح دلیل ہے ان لوگوں کے قول کے غلط ہونے کی جو کہتے ہیں کہ ایسی باتوں کا حکم نہیں ہوسکتا جو بندہ کی طاقت سے باہر ہیں۔

مگر کبھی ضمیر کا دباؤ اسلاف کی تقلید پر غالب بھی آجاتا ہے چنانچہ دور حاضر میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کی تشریح وہی کی ہے جو ہمیشہ سے علمائے شیعہ کرتے رہے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

''اللہ کی طرف سے مہر لگ جانے کا یہ فعل بندہ کے کفر اختیاری کے بعد ہوتا ہے نہ کہ اس کے قبل اس کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ اس کا سبب فطرت سلیم ہر انسان کو عطا ہوئی ہے اور اس میں دلائل حق پر غور وفکر کی استعداد بھی شامل ہے لیکن انسان جب اپنے ارادہ وعقل کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے اور آسمانی ہدایتوں اور خداوندی نشانیوں سے مسلسل منہ موڑے ہوئے قانون شیطانی پر چلنے کی ٹھان لیتا ہے تو سلسلہ غضبی کے ماتحت آجاتا

---

[1] ۔اللطيفة الرّبانيّة التي بها يكون الانسان انسانا (نیشاپوری) فالقلب المعنوي هو العقل (شرح اصول کافی صدرا)

ہے انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ رحمت سے خارج ہو جاتا ہے اور نصرت الٰہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اب ہر روشنی اسے تاریکی اور ہر تاریکی اسے روشنی نظر آنے لگتی ہے چنانچہ کھلے ہوئے دلائل حق اور روشن سے روشن آیات الٰہی بھی انہیں نظر نہیں آتے۔ یہ سب ثمرہ ہے ان کافروں کے ارادی اغراض عن الحق اور دانستہ کج روی کا"۔

اس طرز بیان کی اور فہم سماعت و بصارت کی قوتوں سے سزا کے طور پر محرومی کی مثالیں قدیم صحیفوں میں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ "تم سنا کرو پر سمجھو نہیں تم دیکھا کرو پر بوجھو نہیں تو ان لوگوں کے دلوں کو چرباوے اور ان کے کانوں کو بھاری کر" (اسعیاء ۹:۱۰)

"وہ نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے کہ آنکھیں لیپی گئیں۔ سو وہ دیکھتے نہیں اور ان کے دل بھی سو وہ سمجھتے نہیں" (اسعیاء ۱۸:۲۴) "تمہاری آنکھیں جو کہ بنی ہیں موندی ہیں اور تمہارے سروں پر جو کہ غیب میں حجاب ڈالا ہے" (اسعیاء ۱۰:۲۹) "میں نے انہیں ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا" (زبور ۱:۱۱ و ۱۲) انجیل میں اس قسم کی مثالوں کے لئے ملاحظہ ہو رومیوں (۱۱:۷، ۱۸ و ۲۰ تھسلنیکیوں ۲:۱۱)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸

"اور لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے حالانکہ وہ مومن ہیں نہیں"۔

منافقین کا ذکر:

اس کے پہلے اس سورہ میں دو قسم کے آدمیوں کا ذکر ہو چکا ہے ایک مومن یعنی وہ جنہوں نے دل سے اسلام قبول کیا ہے دوسرے وہ جو کھلے ہوئے کافر ہیں اب تیسری جماعت کا ذکر شروع ہوتا ہے یہ ہیں زبان سے اظہار اسلام کرنے اور دل میں کفر کو مضمر رکھنے والے ان کو اصطلاحی طور پر منافق کہتے ہیں۔ پہلی جماعتوں کا ذکر چار آیتوں میں ہو گیا۔ دوسری کا دو آیتوں میں مگر تیسری جماعت کا ذکر یہاں سے شروع ہوا ہے تو تیرہ آیتوں تک مسلسل چلا گیا ہے [1]۔ بات یہ ہے کہ ان "مار آستین" طرح کے افراد اور نمائشی دوستوں سے اسلام کو جتنے نقصان پہنچ سکتے تھے اور پہنچنے والے تھے وہ اس کے کھلے ہوئے دشمنوں سے نہیں پہنچ سکتے تھے اور نہ پہنچنے والے تھے لہٰذا ضرورت تھی کہ اس جماعت کے افعال اور اعمال اور ان کے کردار کی نوعیت اور ان کی سریت کے خدوخال کے متعلق مسلمانوں کو سختی کے ساتھ متنبہ کیا جائے۔ اب اگر سیرت اسلاف سے آئندہ مسلمانوں کا کسی قسم کا علاقہ نہ ہوتا تو یہ ضرورت صرف صدر اسلام میں ختم ہو جاتی مگر چوں کہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قیامت تک کے مسلمانوں کی "سیرت سازی" میں "گزشتگان" کے نقوش پا کو بہت بڑا دخل ہے اس لئے اس جماعت کے کردار پر نظر اور قرآنی بیانات کی کسوٹی پر رسولؐ اسلام کے دور کی مسلمان شخصیتوں کے کردار کا جانچنے اور پرکھنے کی مہم قیامت تک مسلمانوں کی ایمانی زندگی کی تشکیل کے لئے لازمی جزء بن گئی اور یہ ایک ایسی اہم ضرورت دینی ہے جس کے مقابل میں اذکروا موتاکم بخیر کا اخلاقی قانون استثناء کے رخنہ سے شکستہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قرآن مجید کے اتنے شدید اہتمام سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ جماعت صرف چند "سر پھرے" عبداللہ بن ابی کے اصحاب ہی میں محدود نہ تھی جن کا نفاق نام بنام طشت از بام ہو چکا تھا بلکہ اس جماعت میں ایسے بھی افراد ہو سکتے تھے جن کے باطن پر سیاست کا بہت گہرا پردہ پڑا ہوا تھا

---

[1] ۔وصف حال الکفار فی ایتین وحال المنافقین فی ثلث عشرۃ ایۃ فعیٰ علیھم فیھا خبثھم ونکرھم وفضحھم وسفھھم وتھکم بفعلھم وستجل طغیانھم وعمھم ودعاھم صما بکما وعمیا وضرب بھم الامثال الشنیعۃ (نیشاپوری)

اور جن کے نام عام طور پر مسلمانوں کو معلوم نہ تھے جن پر متنبہ کرنے کے لئے دوسری جگہ خود رسولؐ سے ارشاد فرمایا ہے کہ ان میں بعض ایسے ہیں جنہیں آپ بھی نہیں جانتے لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ (توبہ۔۱۰۱)

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹

''وہ اللہ اور ایمان والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ حقیقۃً وہ خود اپنے سوا کسی کو دھوکا نہیں دیتے اور انہیں اس کا احساس نہیں ہے''

خدا کو دھوکا دینے کا مطلب:

حقیقت میں جو اللہ کو اس کے صفات جلال وکمال کے ساتھ مانتا ہو وہ اسے دھوکا دینے کا تصور ہی نہیں کرسکتا مگر چوں کہ منافقین کے دل میں اللہ کی معرفت ہے ہی نہیں ان کا اقرار اللہ کے متعلق صرف زبانی ہے اس لئے وہ ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں کہ ان کے کفر باطنی پر پردہ پڑا رہے۔ وہ رسولؐ اور صاحبان ایمان کو اپنی خیر خواہی کا یقین دلاتے رہتے ہیں تا کہ وہ منافع جو ایمان کے ساتھ وابستہ ہیں حاصل ہوسکیں اس طرح براہ راست تو رسولؐ اور اہل ایمان کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر چوں کہ بمقتضائے اسلام رسول کو رسولؐ کہنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پس پشت اللہ کی طاقت ہے اس لئے نتیجۃً یہ ان کا عمل اللہ کو فریب دینے کی کوشش بن جاتا ہے[1]۔

اب اس کوشش کا انجام کیا ہوتا ہے؟ اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ''حقیقتاً'' وہ سوا خود اپنے ہی کسی کو دھوکا نہیں دیتے یعنی مضرت اس دھوکا دینے کی خود انہی تک پہنچتی ہے[2] اس بناء پر کہ اصل ایمان کا نتیجہ جو نجات آخرت ہے اس سے یہ ان تمام کوششوں کے بعد بھی محروم رہتے ہیں بلکہ اس فریب دہی کی وجہ سے ان کا عذاب صریحی کفار کے عذاب سے بھی زیادہ ہوتا ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (نساء ۱۴۵) مگر انہیں اس کا احساس نہیں اس لئے کہ وہ آخرت کے دل سے قائل ہی نہیں وہ تو بس مادی منافع ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور ان منافع کو حاصل کر کے بس اپنے کو فریب دہی میں کامیاب سمجھ لیتے ہیں۔ انہیں کیا خبر کہ اس کے پس پشت کیا برا انجام پوشیدہ ہے۔

چھوٹے پیمانے پر عبادات وفرائض میں ریاکاری کرنے والا اسی حکم میں ہے بڑے خضوع وخشوع کے ساتھ نمازیں ادا کرتا ہے خلق خدا میں مرجعیت حاصل کرنے کے لئے پھر اس پر اللہ سے ثواب کا امیدوار بھی ہے۔ یہ کیا اللہ کو فریب دینے کی کوشش نہیں ہے؟ نتیجہ میں جب یہ سب عبادتیں رد ہوں گی اور ثواب کی دنیا سنسان نظر آئے گی تو محسوس ہوگا کہ اس نے دھوکہ حقیقت میں خود اپنے ہی کو دیا تھا۔ اسی لئے رسولؐ خدا کی حدیث جسے امام جعفر صادقؑ نے روایت کیا ہے:

انما النجاة ان لا تخادعو الله فيخدعكم فان من يخادع الله يخدعه ويخلع منه الايمان ونفسه يخدع لو يشعر.

---

[1] ۔والتجوز باعتبار ان الجرأة على مخادعة الرسول فى مقدمة الّذين اٰمنوا من حيث انه رسول الله بمنزلة الجرأة على مخادعة الله (البلاغ)

[2] ۔فوبال خداعهم راجع الى انفسهم (مجمع البیان)

نجات اس میں مضمر ہے کہ اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش نہ کرو نہیں تو وہ ایسا کرے گا تم خود دھوکے میں پڑ جاؤ گے اس لئے کہ جو اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرے گا نتیجہ میں یہ خود دھوکا کھائے گا اور وہ اس سے ایمان کا لباس اتار لے گا اور یہ خود اپنے کو دھوکہ دے گا اگر اس کو شعور ہو

کسی نے پوچھا: وکیف یخادع اللہ" یہ اللہ کو کیوں کر فریب دینا چاہے گا" حضرتؒ نے جواب دیا:-

یعمل ما امرہ اللہ عزوجل ثم یرید بہ غیرہ. (صافی)

جن باتوں کا حکم اللہ نے دیا ہے انہیں انجام دے گا مگر اس کا مقصد رضائے الٰہی نہ ہوگا، کچھ اور ہوگا۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ⑩

"ان کے دلوں میں ایک خاص طرح کی بیماری ہے [1] تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھا دی اور انہیں ایک دردناک عذاب اس وجہ سے ہوگا وہ جھوٹ بولا کرتے تھے"۔

مرض اور اس کے بڑھانے کا مطلب:

مرض کیا ہوتا ہے؟ اعتدال طبعی سے ہٹ جانا، دل میں اگر ہٹ دھرمی تعصب اور ماحول کے جراثیم وغیرہ کے اثرات نہ ہوں تو طبعاً وہ حق کے قبول کرنے پر مائل ہوگا (کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام) اب اس کے خلاف شک، کفر یا نفاق یہ سب باتیں غیر طبعی اسباب سے پیدا ہوتی ہیں جو قلب کے لئے ایک بیماری کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب اس بیماری کا جو کسی دل میں پیدا ہو چکی ہے نتیجہ یہ ہے کہ جو ہدایت کے پیام جو وعظ و نصیحت کی آیات اس کے سامنے آتی ہیں وہ بجائے اس کو فائدہ پہنچانے کے اس کے عناد و تعصب اور جوش انکار میں اور اضافہ کرتی ہیں جس کی ذمہ داری خود اس کے سوئے مزاج ذاتی پر ہے اس ہدایت وارشاد پر نہیں جس کا اصلی مقصد حقیقتاً ارشاد و ہدایت بھی ہے۔

اب یہ ایک انداز تکلم ہے کہ جو قہری نتیجہ کسی امر پر مرتب ہو اس کو استعارۃً بطور غرض (مقصد ذکر کر دیا جاتا ہے جیسے فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (قصص۔ ۸) "فرعون کے گھر والوں نے موسیٰؑ کو اٹھا لیا تا کہ یہ ان کے دشمن جان اور سرمایہ رنج و ملال ثابت ہوں"۔ ظاہر ہے آلِ فرعون کا مقصد موسیٰؑ کے اٹھانے سے دشمن جان اور سرمایۂ ملال فراہم کرنا نہ تھا مگر چوں کہ خارج میں نتیجہ یہی مترتب ہوا اور اس لئے کہہ دیا گیا کہ آل فرعون نے انہیں اس کے لئے اٹھایا تھا۔ بس اسی طرح خالق کا مقصود اپنے آیات سے یہ نہیں ہے کہ ان کے مرض میں اضافہ کیا جائے مگر چوں کہ ہوتا یہی ہے جو قرآن کی آیت اترتی ہے جو معجزہ ظاہر ہوتا ہے جو رسولؐ کو فتح حاصل ہوتی ہے، جو اللہ کی جانب سے اپنے رسولؐ پر انعام و اکرام ہوتا ہے ہر ایک سے منافقین کی عداوت ان کے اختلاف اور منافقت میں اضافہ ہی ہوتا ہے اس لئے یہ کہہ دیا گیا کہ اللہ نے ان کے مرض میں اضافہ کر دیا" اس کا عقیدہ جبر سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی بناء پر اس فعل الٰہی زادھم کے پہلے آیا ہے فی قلوبھم مرض

---

[1] ۔التنکیر الدّلالۃ علیٰ کونہ نوعا مبھما غیر ما یتعارفہ الناس من الامراض (ابوالسعود)

درمیان میں فائے تفریع لاکر زادھم اللہ مرضا کہا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ پہلا مرض از جانب خدا نہیں ہے اور اس زیادتی مرض کا اصل سبب ہی ذاتی علت ہے لہٰذا اس کا سبب راجع خود ان افراد کے نقوش کی طرف ہے نہ کہ اللہ کے جبر وقہر کی طرف۔

مولانا عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں ''فزادھم میں حرف فؔ بہت اہم ہے یہ گویا اس کا اعلان ہے کہ آگے جس فعل کا ذکر آرہا ہے وہ محض بطور ثمرہ یا نتیجہ کے پیدا ہوا ہے والفاء للدلالۃ علی ترتّب مضمونہا علیہ (ابوسعود) حق تعالیٰ کی جانب اس قسم کے افعال کا انتساب صرف مجازی حیثیت رکھتا ہے یعنی یہ نہیں کہ اللہ نے خواہ مخواہ ان سے یہ افعال کرا چھوڑے اس نے تو صرف وہ حالات واسباب پیدا کر دیے جن سے ان بدنصیبوں نے خود اپنے مرض کے بڑھانے کا کام لیا، ورنہ اگر وہ اپنی عقل وارادہ کا صحیح استعمال کرتے تو انہی اسباب وحالات سے ہدایت بھی پا سکتے تھے'' اس قسم کے افعال کا حق تعالیٰ کی جانب انتساب قدیم صحیفوں کا بھی ایک محاورہ عام ہے ''اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے انہیں ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا'' (زبور ۸۱:۱۰ و ۱۱) ''بس خدا نے منہ موڑ کر انہیں چھوڑ دیا کہ آسمانی فوج کو پوجیں'' (اعمال ۷:۴۲) ''خدا نے ان کے دلوں کی خواہشوں کے مطابق انہیں ناپاکی میں چھوڑ دیا کہ ان کے بدن آپس میں بے حرمت کیے جائیں'' (رومیوں ۱:۲۴)

آخر میں علاوہ اس عذاب کے جو منافقین کے لئے پہلے ولھم عذاب عظیم کے الفاظ میں بتایا جا چکا ہے ان کے لئے ایک مزید عذاب کی خبر دی گئی ہے کہ ''ان کے لئے ایک عذاب دردناک اس لئے ہے کہ یہ غلط بیانی سے کام لیتے تھے'' اور اسی بناء پر مجموعی طور سے ان کا عذاب صریحی کافروں کے عذاب سے شدید تر ہو گیا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ دنیا میں خرابیاں نہ پھیلاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ارے ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں یاد رہے کہ درحقیقت وہی خرابیاں ڈالنے والے ہیں لیکن وہ اس کا احساس ہرگز نہیں رکھتے''۔

فساد فی الارض کے معنی:

''فساد فی الارض'' کے مفہوم میں وہ بداعمالیاں آتی ہیں جو متعدی الی الغیر ہوں یعنی اس کا نقصان دوسروں تک پہنچے [1] گمراہی اگر کسی کی ذات تک محدود ہے تو وہ کفر یا شرک وغیرہ ہے مگر ''فساد فی الارض'' میں داخل نہیں ہوتی لیکن جب وہ دوسروں کو راہ راست سے ہٹانے کی کوشش میں منتقل ہو جائے تو ''فساد فی الارض'' میں داخل ہے۔

گناہ کچھ تو براہ راست اس عنوان کے تحت میں داخل ہیں جیسے چغل خوری یا کسی دوسری صورت سے لڑاونے کی کوشش اور کچھ ایسے ہیں کہ وہ جب تک صرف انفرادی حیثیت رکھیں ''فسق وظلم'' ''اسراف'' اور ''معصیت'' وغیرہ ہیں اور اپنی جگہ فساد بھی ہیں مگر ''فساد فی الارض'' اس

---

[1] ۔ الاظہر ان یراد بہ الفساد الّذی یتعدی دون ما یقف علیہم (رازی)

وقت قرار پائیں گے جب انسان ان معاصی کی طرف دوسروں کو دعوت دینے لگے اور انہیں اپنا مشن قرار دے لے۔

منافقین کے دل میں جو شک یا انکار ہے وہ اگر بس اسی دائرہ میں محدود رہتا تو اسے ایک انفرادی گمراہی کا درجہ حاصل ہوسکتا ہے اجتماعی گناہ قرار نہ پاتا۔ مگر چوں کہ اسے ''منافقت'' کے سایہ میں چھپانا خود ہی کچھ اغراض کی خاطر ہوتا ہے جن سے اس نظام کو نقصان نہ پہنچانا مدنظر ہوتا ہے جو اصلاحِ عالم کی کفیل ہے پھر اس دورنگی کو نباہنے کے لئے انہیں بہت کچھ ایسی باتیں کرنا پڑتی ہیں جن سے امن عامہ کو خلل پہنچنے کا قوی امکان ہوتا ہے جیسے لگائی بجھائی کرنا ادھر آ کر انہیں برا کہنا، اور ادھر جا کر انہیں برا کہنا مومنین کے ساتھ استہزاد تمسخر کرنا اور کافرین کی ان کے منصوبوں میں ہمت افزائی اور در پردہ امداد کرنا۔ یہ سب باتیں وہ ہیں جو انہیں فساد فی الارض کے جرم کا مرتکب بنا دیتی ہیں اب چاہیے وہ کتنی ہی پردہ داری سے کام لیں مگر اصلیت کھل ہی جاتی ہے چنانچہ جب ان کی دسیسہ کاریوں کی اطلاع اہل ایمان میں سے کسی کو ہو جاتی ہے تو وہ انہیں نصیحت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ یہ اپنی مفسدانہ روش ترک کرو تو وہ اپنی طرف اس جرم کی نسبت سے انکار کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم تو بس اصلاع کرنے والے ہیں یعنی فساد کی طرف ہم کبھی جاتے ہی نہیں اس کے جواب میں خالق یہ اعلان فرماتا ہے کہ وہ تو فساد ہی فساد کرنے والے ہیں۔

اصلاح کا نام ونشان تک ان کے کردار میں نہیں ہے الا کلمہ تنبیہ ہے لہٰذا اس کا ترجمہ ''آگاہ ہو'' اور ''خبردار ہو جاؤ'' کیا جاتا رہا ہے[1] ہم نے موجودہ محاورہ کے لحاظ سے یاد رہے ترجمہ کیا ہے عبدالماجد صاحب نے صحیح کہا ہے کہ ''لفظ'' ''اجی'' میں اگر متانت کی کمی نہ ہوتی تو اردو میں اس مفہوم کے لئے یہی بہترین لفظ ہوتا۔

''انہیں احساس نہیں ہے'' اس لئے کہ وہ اپنی منافقت کی رو یا اپنی حصول منفعت کی دھن میں ان نتائج پر غور نہیں کرتے جو ان کے اس طرز عمل پر مترتب ہوتے ہیں جس کے نقصانات کی لپیٹ میں اکثر وہ خود بھی آ جاتے ہیں اور اسی لئے اگر وہ ان نتائج پر غور کرتے تو شاید خود ہی چاہے دین حق کو دل سے اختیار نہ بھی کرتے لیکن اس مفسدانہ روش کو تو ضرور ترک کر دیتے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جیسے سب آدمی ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم بیوقوفوں کی طرح سے ایمان قبول کریں یاد رہے کہ درحقیقت یہ خود بیوقوف ہیں مگر انہیں خبر نہیں ہے''۔

معیار عقل و بے عقلی:

ایمان کا اظہار تو وہ جماعت خود ہی کرتی تھی مگر اس کے ساتھ ان کے افعال واعمال سے اکثر دورنگی نمایاں ہو جاتی تھی تو بعض مسلمان جو ان سے اتفاقاً ذاتی تعلقات رکھتے تھے ان کو نصیحت کرنا چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ایمان لائے ہو تو اس دورنگی سے کیا فائدہ! صدق دل سے

---

[1] ۔آگاہ ہو تاج الاعلماء) خبردار ہو (فرمان علی صاحب)

اس طرح ایمان لاؤ جیسے اور سچے مسلمان ایمان لائے ہیں یعنی وہ جن کے خلوص وصدق ویقین کا علم ان منافقین کو بھی تھا اور انہی کو الناس سے تعبیر کیا گیا ہے [1] جس سے اشارہ اس طرف بھی ہے کہ تمہارا عمل جو منافقت اور فتنہ پردازی کا ہے وہ حقیقتاً انسانیت کے بھی بالکل خلاف ہے وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ اصل عقل مندی کا طرز عمل تو وہی ہے جسے ہم اختیار کیے ہوئے ہیں کہ اگر بعد میں مشرکین کو فتح حاصل ہو تو ہم ان کے بھی اچھے بنے رہیں اور اگر مسلمانوں کو مختتم فتح نصیب ہو تو ان کے ساتھ بھی ہم لگے رہیں اور جو فوائد حاصل ہو سکتے ہوں وہ حاصل کرتے رہیں ''سیاست'' اسی کا نام ہوتا ہے۔ رہ گئے یہ لوگ جنہیں تم پیش کرتے ہو کہ بس جدھر ہو گئے ادھر ہو گئے یہ تو ہیں احمق یعنی ناعاقبت اندیش کیوں کہ اپنے مستقبل کو خطرہ میں ڈال رہے ہیں۔

یہی ہے وہ رائے جو سیاست دنیا کے ماہرین کی طرف سے ہر اس شخص کے متعلق قائم کی جاتی ہے جو سچائی کا پابند ہو۔ اور یہی وہ عقل کا معیار ہے جس کے پیش نظر حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے تھے: ''لو لا الذین لکنت ادھی العرب'' ''اگر دینی پابندیاں پیش نظر نہ ہوتیں تو میں عرب میں سب سے بڑا سیاست داں مدبر نظر آتا''۔

مگر حقیقت امر یہ ہے کہ یہ ملمع کار سیاست جو دنیا کو بنائے اور آخرت کو برباد کرے عقل کا مقتضا نہیں ہے۔

اصل عقل تو وہ ہے جو ابدی زندگی کے مفاد کو پیش نظر رکھے۔

اس وقت انہیں معلوم ہوگا کہ ان کی یہ طرز عمل ہلاکت خیز ہے جب عذاب ابدی کا منظر ان کے سامنے آئے گا اور وہ دیکھیں گے کہ وہ کافروں سے بھی بدتر عقوبت کے سزاوار قرار پائے ہیں۔

اس لئے کہا گیا ہے کہ حقیقت میں بے وقوف یہی ہیں مگر ابھی ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں لہٰذا انہیں اس کی خبر نہیں ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭

''اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں کہ جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے ایمان اختیار کیا اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ تخلیہ میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یقین جانو ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو فقط بنا رہے تھے [2]۔

اس میں منافقین کے کردار کی مکمل تصویر کشی ہے جو ہر دور میں اس جنس کی مخلوق میں ہر باخبر کو محسوس ہو سکتی ہے۔

وہ ایسے صاحبانِ ایمان سے مل کر جو کسی حد تک اثر ورسوخ رکھتے ہیں ان کو اپنی یگانگی کا یقین دلانا چاہتے ہیں اور جب اپنے شیطانوں یعنی اپنی جماعت کفار کے سرگرداں لوگوں کے پاس جاتے ہیں تو وہاں اپنی پوزیشن صاف رکھنے کی کوشش میں یہ کہتے ہیں کہ ہم تو ان مسلمانوں کے ساتھ استہزاء کر رہے تھے۔

---

[1] ۔فان اسم الجنس کما یستعمل فی مسماہ یستعمل فی ما یکون جامعا للمعانی الخاصۃ المقصودۃ عنہ (ابوالسعود)

[2] ۔ہم تو فقط ٹھٹھے بازی کرتے ہیں (تاج العلماء)

استہزاء کے معنی ہیں ایسا مذاق جس میں دوسرے کی تحقیر ہو اور اسی لئے ان کا یہ جملہ کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ تمسخر کرتے ان کا مذاق اڑاتے ہیں خالق کو اتنا ناگوار ہوا کہ فوراً اس کا جواب دیا گیا جو اس کے بعد آیت میں مذکورہ ہے۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾

''اللہ خود انہیں بناتا ہے [1] اور انہیں ان کی سرکشی میں ڈھیل دیتا ہے کہ یہ اندھے پن میں مبتلا رہیں''۔

قرآن کریم میں خالق کی طرف محل وقوع اور سیاق کلام کی مناسبت سے کچھ ایسے الفاظ صرف ہوئے ہیں جنہیں اس نظم وترتیب کلام سے علیٰحدہ کر کے اگر اس کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کی شان کے خلاف ہے۔ استہزاء اسی طرح کا ایک لفظ ہے اگر بلا کسی تمہید کے اللہ کو مستہزئ ''تمسخر کرنیوالا'' کہا جائے تو یہ کوئی مناسب امر نہ ہوگا لیکن جس صورت سے قرآن میں ان الفاظ کو صرف کیا گیا ہے اس صورت سے استعمال کرنے میں مکر اور استہزاء وغیرہ کا مفہوم ہی دوسرا ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے مکر کرنے والوں کے مکر کو توڑنا اور ان کے استہزاء کا جواب دینا جسے دوسری لفظوں میں مجازاۃ استہزاء سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

خدا کی طرف سے استہزا کا مطلب:

چوں کہ انہوں نے مومنین کے متعلق اس لفظ کا استعمال کیا تھا جو حقارت کا پتہ دیتی ہے ظاہر ہے کہ مومنین کی یہ تحقیر صرف دین الٰہی کے اختیار کرنے کی وجہ سے درپیش ہوئی ہے لہٰذا انہوں نے جو لفظ مومنین کے لئے استعمال کیا تھا اسے اللہ نے اپنی طرف سے ان کی جانب پلٹا دیا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل اللہ کے ساتھ جو برا سلوک کیا جائے اس کا جواب دینے کی ان کو ضرورت نہیں ہوتی بلکہ انکی طرف سے اللہ خود جواب دینے کے لئے آگے آجاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ کے سامنے کسی بندہ کی کہاں پیش جا سکتی ہے امام رضاؑ نے فرمایا ہے: ان اللہ لا یستہزی بہم ولکن یجاز بہم جزآء الاستہزآء (روایت صدوقؒ) ''اللہ ان کا از خود مذاق نہیں اڑاتا بلکہ ان کے مذاق اڑانے کی سزا دیتا ہے'' اسی کو جناب تاج العلماء نے ان الفاظ میں کہا ہے کہ خدا کا چہل کرنا یہ ہے کہ مسخرے کو مسخرے پن کی سزا دے (حاشیہ ترجمہ)

پھر یہ ان کے علم کی سزا بظاہر مشابہت بھی رکھتی ہے ان کے اسی عمل سے جسے وہ تمسخر واستہزاء کہتے ہیں یعنی مسلمانوں کے پاس آکر ظاہر کرتے ہیں ہم مسلمان ہیں اور باطن میں کافر کے کافر رہتے ہیں اسی قسم کا سلوک ان کے ساتھ اللہ نے بھی کیا ہے کہ ظاہر میں ان پر احکام اسلام جاری کر دیے مثلاً ذبیحہ انکا حلال جسم ان کا پاک توریث ونکاح وغیرہ مسلمانوں کا سا برتاؤ مگر باطن میں وہ کافر کے کافر ہی رہے اسی لئے آخرت میں وہ کافر کیسے بلکہ کافر سے بدتر قرار دیئے گئے تو اگر اس طرح کا عمل بنانا اور تمسخر کرنا ہے تو نتیجہ میں دیکھیے کہ بنا کون اور تمسخر کس کا ہوا [2] ؟

مولوی عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں کہ ہنسی اور تمسخر کا انتساب ذات باری تعالیٰ کی جانب قدیم صحیفوں میں موجود ہے تو اے خداوندان پر

---

[1] ۔ خدا بھی چہل کرتا ہے اُن سے (تاج العلماء)

[2] ۔ فاستعیر لذلك لفظ الا ستہزاء طشا بہة له فی ابتہا جهم بظاهر الا مهال والتخویل مع انه مقرون بالا ستہا نة بهم واعداد العذاب الالیم (بلاغی)

ہنسے گا تو ساری قوموں کو مسخرہ بنائے گا (زبور ۸۱۷۹) میں تمہاری پریشانی پر ہنسوں گا اور جب تم پر دہشت غالب ہوگی تو میں ٹھٹھے ماروں گا (امثال ۱:۲۶)

یمدّھم کے لفظی معنی ہیں ان کے لئے زیادتی کرنا ہے مگر اللہ اپنی طرف سے کفر یا سرکشی میں اضافہ پسند نہیں کرتا یہ کفر اور سرکشی تو خود ان کی طرف سے ہے مگر اللہ ان کی عمر کی رسی دراز کرتا ہے اسباب عیش میں ان کے لئے اضافہ کرتا ہے اس کے ساتھ ان کی بداعمالیوں کے باعث اپنی توفیق کا دامن ان سے سمیٹے رکھتا ہے نتیجۃً ان کے سوا اختیار کے ہاتھوں اللہ کی نعمتیں جو خود اس کی طاعت وعبادت کی محرک ہونا چاہیں ان کے لئے مزید سرکشی کا باعث ہوتی ہیں اور یہ خدا کی جانب سے ڈھیل بھی اسی سلوک کا ایک جزو ہے جیسے پہلے کہا گیا تھا کہ اللہ خود انہیں بناتا ہے [1]۔

آخری لفظ یعمھون کا ہے۔ عمہ دل کے اندھے پن کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ بے بصیرتی کے ساتھ اپنی زندگی حقیقی اچھائی اور برائی کی تمیز کے بغیر گزارتے ہیں جس طرح اندھا راستوں میں ٹھوکریں کھاتا ہے اسی طرح یہ زندگی کے پر پیچ راستوں میں بغیر کسی امتیاز اور بلا کسی رہنما کے سہارے کے بھٹکتے پھرتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ ۖ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

''یہ ہیں وہ جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی تو نہ ان کے بیوپار نے نفع ہی دیا اور نہ انہیں ہدایت ہی نصیب ہوئی''۔

متقین کے بعد جو أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ تھا اس کا بظاہر یہ جواب ہے جو منافقین کے ذکر کے بعد وارد ہوا ہے یعنی سورہ کی ابتداء میں جو کردار بیان ہوا تھا وہ ہدایت الٰہی پر قائم رہنے والوں کی شان ہے اور یہ کردار جو بعد کی کئی آیتوں میں بیان ہوا جن کی تفسیر سابقاً بیان ہوئی یہ ان کا ہے جنہوں نے بالاختیار متاع گراں مایہ ہدایت کے بدلے ضلالت کو ترجیح دی اور اسی ترجیح دینے کو مجازاً خریداری کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے اس لئے کہ وہ ہدایت اگرچہ ان کے پاس موجود نہ تھی مگر چوں کہ وہ ان کے بالکل امکان میں تھی اور وہ چاہتے تو بلا مانع ومزاحم اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے اس لئے وہ گویا ان کے قبضہ میں تھی اور اب جو انہوں نے ترک کر کے گمراہی پسند کی یہ ایسا ہے کہ جیسے انہوں نے مقبوضہ ملکیت کو ہاتھ سے دے کر اس کی قیمت میں گمراہی حاصل کی [2]

اب گزشتہ فقرہ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ کے ساتھ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ کو رکھ دیجئے تو دونوں سے یہ صاف ظاہر ہو جائے گا کہ سابق میں جو ھدی للمتقین کہا گیا تھا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خالق کی جانب سے اسے پہلے ہی محدود کر دیا

---

[1] ۔ھذا بمنزلة التفسير لما استعير له لفظ استهزآء (بلاغیؒ)

[2] ۔فان قيل كيف اشتروا الضلالة بالهدىٰ وما كانوا علىٰ هدى قلنا جعلو التمكنهم منه كانه فى ايديهم فاذا تركوه ومالوا الى الضلالة فقد استبدلوها به (رازی)

''ایمان کا قبول کر لینا ان منافقین کے بالکل اختیار کے اندر ہے لیکن اس کے بجائے انھوں نے روش کفر اختیار کی'' (دریابادی)

گیا ہے۔ درحقیقت اس کی طرف سے تو وہ ہدایت سب ہی کے لئے ہے یہ کہ اس سے فائدہ صرف متقین کو حاصل ہوتا ہے اور کافرین ومنافقین محروم رہتے ہیں یہ خود ان دونوں کے اختیار کا فرق ہے اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (سورۂ دہر)

اس فقرہ میں جو مومنین کے لئے آیا تھا نتیجہ ان کے حسن اختیار کا دکھلایا تھا ان لفظوں میں کہ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ فلاح کے معنی جیسا کہ وہاں بیان ہوا دنیا وآخرت کی بہتری کے ہیں اس کے بالمقابل منافقین کے لئے نتیجہ ان کے سوء اختیار کا یہ دکھلایا گیا ہے کہ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ یہ فلاح کے بالمقابل دنیا وآخرت دونوں کے خسارے کا اظہار ہے یعنی ان کے اس بیوپار سے نہ تو دنیا ہی میں انہیں کوئی فائدہ حاصل ہوا کیوں کہ فائدہ تو وہی سمجھا جاسکتا ہے جو سرمایہ سے زیادہ قیمت رکھتا ہو۔ یہاں ہدایت الٰہی کے ذریعہ سے جو ان کے لئے انفرادی اور اجتماعی مفادات حاصل ہوسکتے تھے وہ سب ان کے ہاتھ سے گئے جس کے برابر بھی کوئی شے ان کو نہیں مل سکی چہ جائیکہ اس سے بہتر پھر یہ کہ وہ ہدایت بھی محروم ہوئے جو نجات اخروی کی ذمہ داری تھی۔ لہٰذا آخرت کی کامیابی تو کیا ملتی ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب کا استحقاق انہیں حاصل ہوگیا اور اس سے بڑھ کر خسر الدّنیا والاخرۃ کا مصداق اور کیا ہوسکتا ہے!!

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۖ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾

''ان کی مثال [1] اس شخص کی سی ہے جس نے آگ سلگائی مگر جب اس آگ نے اس کے گردوپیش میں اجالا کر دیا، اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا اس حال میں کہ انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا''۔

منافقین کی مثال:

یہ منافقین کے حالات کی تصویر کشی ہے۔

جو کافر ہیں وہ تو ایک مستقل حال میں ہیں جسے روحانی نقطۂ نظر سے اندھیرا ہی اندھیرا سمجھا جاسکتا ہے مگر منافقین انہوں نے پیغمبرؐ کے پاس آکر اظہار اسلام کیا۔ اس کی وجہ سے وہ اس نورِ حقیقت سے قریب آگئے جو دین ودنیا کی ہدایت کا ذریعہ ہے اور اس طرح ایک آگ گویا انہوں نے سلگائی جس سے فائدہ اٹھانا ان کے لئے آسان تھا۔ اس آگ کی روشنی گردوپیش میں پھیل گئی یعنی سینکڑوں طالبانِ حق اس کے نور سے منور ہوئے اور اس کی وجہ سے دنیا وآخرت کی کامیابی پر فائز ہوئے مگر خود یہ منافقین چوں کہ انہوں نے دل میں انکار وعناد چھپا رکھا اور کھلے دل سے آیاتِ حقیقت پر غور نہیں کیا لہٰذا ان کی آنکھوں کے سامنے سے وہ جو ایک جھلکی روشنی کی کبھی نمودار ہوئی تھی وہ بھی بالکل غائب ہوگئی اور توفیقات الٰہیہ کے سلب ہوجانے سے جو ان کے سوء اختیار کا نتیجہ ہے ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے [2]

---

[1] ۔ ان کی ہائی (تاج العلماء)

[2] ۔ولاجل ان ینوہ اللہ بما للتوفیق والتسدید من الاثر الشریف فی تائید العقل علی مکافحتہ لوساوس الشیطان ونزعات النفس الامارۃ واھوائھا عبر عن حالھم فی غیّھم علی سبیل المجاز واستعارۃ التشبیہ بانھم حینئذ ذھب اللہ بنورھم (البلاغی)

دوسری تفسیر اس تمثیل کی یہ ہے کہ ان منافقین نے جب اظہار اسلام کیا تو اس کے نتائج نمودار ہوئے ان احکام کی صورت میں جو ان کے اسلام پر مرتب ہوئے جیسے مالِ غنیمت سے حصہ ملنا جان و مال کا محفوظ ہونا، اسلامی معاشرہ میں برابر کا درجہ دیا جانا وغیرہ یہ ہے وہ روشنی جو گردوپیش میں پھیل گئی مگر اس کے بعد جب آنکھ بند ہو کے کھلی یعنی آخرت کی منزل سامنے آئی تو وہ سب برکات نظر آئے۔ اب عذاب آخرت اور اس کی سختیوں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا[1]۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾

''بہرے گونگے اندھے ہیں وہ پلٹیں گے نہیں''۔

اس آیت کی وضاحت دوسرے مقام پر خود قرآن کی دوسری آیت سے معلوم ہوتی ہے کہ ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (اعراف آیت ۱۷۹) وہ بہرے اس معنی میں نہیں کہ ان کے کانوں میں سننے کی طاقت نہیں کان ہیں اور کانوں میں ذاتاً سننے کی قوت بھی ہے مگر وہ ان کانوں سے صدائے حق سننے کا کام نہیں لیتے لہٰذا نتیجۃً وہ مثل بہرے کے ہو گئے ہیں زبانیں ہیں مگر تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کلمۂ حق کے ساتھ گویا نہیں ہوتیں۔ اس اعتبار سے ''گونگے'' ہیں۔ آنکھیں ہیں مگر ان سے آیاتِ حقیقی پر نظر نہیں ڈالتے اور تعصب کے پردے ایسے پڑے ہیں کہ جلوۂ حق انہیں نظر نہیں آتا اس لحاظ سے وہ اندھے ہیں[2]۔

اب جب ان کی دشمنی اور ضد سے یہ ثابت ہے تو یہ امید کب کی جا سکتی ہے کہ وہ باطل سے حق کی طرف رجوع کریں اور اس مسلک سے جس پر قائم ہیں پلٹ کر کوئی دوسرا مسلک اختیار کریں۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾

''یا جس طرح بارش آسمان کی جس میں تاریکیاں ہوں اور گرج اور چمک وہ گرنے والی بجلیوں سے مرنے کے ڈر سے اپنی انگلیاں کانوں میں دے لیتے ہیں حالانکہ اللہ کافروں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے''۔

دوسری مثال:

یہ اسلام اور اس میں منافقین کے کردار کی کچھ دوسری حیثیتوں سے تمثیل ہے۔

اسلام اور اس کے برکات کیا ہیں؟ ایک موسلا دھار بارش جو عالم بالا سے ہو رہی ہے جس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر مخالفین حق کافرین اور منافقین کے لئے اس میں تاریکیاں ہیں گرج ہے اور چمک ہے کیوں کہ اسلام کے غلبہ و رفعت سے ان کی آنکھوں میں دنیا سیاہ ہے اور اپنے

---

[1] ۔ وھذا ھو المروی عن ابن عباس وقتادۃ والضحاک والسدی (مجمع البیان)

[2] ۔لما لم تصل الیھم منفعۃ ھذہ الاعضاء فکانھم لیس لھم ھذہ الاعضاء (مجمع)

مستقبل کے لئے ان کا دل دہلا جاتا ہے اور آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں غزوات میں اسلامی فتوحات اور ان میں آئندہ کیلئے انکے مستقبل کے متعلق ہلاکت وتباہی کی جو تخویف وتہدید نظر آتی ہے اور اس کے متعلق وحی الٰہی کے جو پرزور اعلانات ان کے سامنے آتے ہیں ان کے سننے کی تاب بھی انہیں نہیں ہے اس سبب سے ان کے دل لرزنے لگتے ہیں اور وہ ان تاثرات سے بچنے کے لئے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں یعنی کسی نہ کسی طرح ان کے سننے سے گریز کرتے ہیں مگر یہ ان کا کانوں میں انگلیاں دینا یعنی سننے سے گریز کرنا اس شترمرغ سے علیحدہ نہیں ہے جو آندھی کے ڈر سے ریگ میں سر چھپالیتا ہے وہ اس طرح اس عظیم انقلاب کے اثر سے محفوظ کہاں رہ سکتے ہیں اسی کو ان الفاظ میں بتایا گیا ہے اللہ ہر طرف سے کافروں کو گھیرے ہوئے ہے وہ اس سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝٢٠

''قریب ہے کہ بجلی ان کی نگاہوں کو خیرہ کردے [1] جب وہ ان کے لئے اجالا کرتی ہے تو وہ اس روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا ہوجاتا ہے تو وہ کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور اگر خدا چاہتا تو ان کے سننے اور دیکھنے کی طاقتوں کو زائل ہی کردیتا۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

منافقین کو نہ کوئی حق طلبی کا جذبہ ہے۔ نہ وہ حق کو حق سمجھ کر اختیار کرنا چاہتے ہیں بلکہ اپنے دیرینہ کیش سے محبت کی وجہ سے انہیں دین حق کی کامیابیوں سے تکلیف ہوتی ہے مگر وہ اپنے دنیاوی مفادات کے تحفظ کے درپے ہیں اس لئے وہ اسلام کی روز افزوں ترقیوں اور کامیابیوں سے غیر متعلق نہیں رہنا چاہتے۔ ان کی قلبی تکلیف کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان فتوحات کو نظر بھر کر دیکھنے کی بھی تاب نہیں رکھتے اور قریب ہے کہ یہ چمک ان کی نگاہوں کو خیرہ کردے۔ اور اس دنیوی مفاد کے تحفظ کی فکر باعث ہوتی ہے کہ جب یہ فتوحات حاصل ہوں تو وہ دو چار قدم بڑھ کر اپنے کو مسلمانوں سے قریب تر بنانے کی کوشش کریں لیکن جب اتفاق سے یہ فتح وظفر کا سلسلہ رک جاتا ہے اور کہیں مسلمانوں کی وقتی شکست زحمت و تکلیف پیش آجاتی ہے تو پھر فوراً یہ بڑھتے ہوئے قدم رک جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ کہ وہ دل سے حقانیت اسلام پر غور نہیں کرتے اسی بناء پر قرآن نے جھنجھلائے ہوئے لفظوں میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے انہیں آنکھوں اور کانوں کی نعمت سے کلیۃً محروم نہیں کردیا ہے ورنہ جب کہ یہ ان آنکھوں اور کانوں سے کام نہیں لیتے، کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں اور آنکھوں سے ان جلوؤں کے دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے تو یہ آنکھ اور کان اس قابل نہیں ہیں کہ ان کے پاس باقی رکھے جائیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

---

[1] ۔ چوندھیادے (تاج العلماء)

تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اے انسانو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی جس نے تمہیں بھی پیدا کیا اور انہیں بھی جو تمہارے پہلے تھے عجیب نہیں کہ تم اپنے بچاؤ کا سامان کر سکو''۔

عبادت کا ہمہ گیر حکم اور اس کا فلسفہ:

مخصوص طریق عبادت جیسے روزہ وغیرہ کا جہاں قرآن میں حکم دیا ہے وہاں یا ایھا الذین امنوا کہہ کر پکارا ہے اس لئے کہ جنہوں نے اصل رسالت وشعریعت کو تسلیم ہی نہیں کیا سے جزئیات احکام اور طریق عبادت کے بتانے کا کوئی محل نہیں مگر مطلق عبادت یعنی خدا کی بارگاہ میں احساس بندگی کی پیش کش کی طرف جو توجہ دلائی جارہی ہے یہاں یاایّھا الناس کہہ کر مخاطب کیا جارہا ہے اس لئے کہ خالق کی عبودیت کا جب احساس پیدا ہوگا اسی وقت تو وہ رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہنے اور کم از کم اس پیام پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے اور اسی لے یہ احساس عبودیت جس کی دعوت دی گئی ہے اس کا نتیجہ بتایا ہے 'لعلکم تتقون''۔

اتقاء کے معنی ہیں کسی خطرہ سے بچنے کا سامان کرنا۔ چوں کہ خالق کی طرف ذہن کی توجہ ہونے کے ساتھ انسان کو یہ فکر ہونا چاہتے کہ اس کے مجھ پر کچھ حقوق ہیں اور ان حقوق کے ادا نہ کرنے سے میں مستحق سزا ہوں گا۔ اسی سے خطرہ کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اسی خطرہ سے تحفظ کے لئے اس کی طرف سے رسالت کا ادعاء رکھنے والے کی باتوں پر کان لگانے اور ان کی سچائی پر غور کرنے کی ضرورت پیدا ہوتی ہے جس پر آئندہ کے تمام ذرائع نجات کا انحصار ہے۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

''جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور اوپر سے پانی برسایا تو اس سے پھلوں کے قبیل سے تمہاری غذا برآمد کی اب اس کے بعد جان بوجھ کر اللہ کے لئے برابر دار نہ بناؤ''۔

قرآن مجید میں زمین آسمان اور دیگر کائنات عالم کو جو ذکر ہے وہ اس مقصد کے لئے نہیں ہے کہ ان کی حقیقتوں اور ماہیتوں کو بیان کیا جائے بلکہ ایک تو ان کے افادی پہلوؤں کو جو بنی آدم سے متعلق ہیں نمایاں کر کے اللہ کی نعمتوں کا احساس کرانا منظور ہے اور دوسرے ان کی عظمت اور حیرت انگیز خلقت کی طرف توجہ دلا کر خالق کی عظمت وقدرت کی طرف توجہ دلانا مطلوب ہے۔ زمین چاہے کروی ہو اور چاہے مسطح بہر حال

جہاں تک ہمارے لئے اس کار آمد اور محسوس پہلو کا تعلق ہے وہ ایک بچھونے ہی کی حیثیت رکھتی ہے [1] اور اس میں خاص توجہ دلانے والا جز یہ ہے کہ یہ بچھونا کس نے قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اس نے جس نے اس زمین کو خلق فرمایا۔ اسی طرح آسمان وہ ٹھوس جسم ہے یا سیال مادہ ہے اسے قرآن کچھ نہیں بتاتا بے شک اس کی مخصوص شکل جو ہر آنکھ کے سامنے ہے وہ یہی کہ وہ ہمارے سروں پر ایک چھت کی طرح بلند ہے بس اسی کو سامنے رکھ کر اس کے خالق کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔

اس کو سائنس اور ریاضی کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے ان کی حقیقتوں کو معلوم کرنے میدان میں فہم بشری کو تگ و دو کی پوری آزادی حاصل ہے [2]۔

السماء کا لفظ جو پہلی دفعہ ہے وہ تو آسمان کے معنی میں ہے اور دوسری جگہ اس کی سمت یعنی اوپر کا رخ مقصود ہے۔ عربی میں بلندی کے رخ کی ہر شے کو سماء کہتے ہیں [3]۔

زمین اور آسمان کا تذکرہ کے بعد ان کے مابین جس نعمت الٰہی کا ظہور ہوتا ہے وہ باران رحمت ہے۔ اس کا اتارنے والا بھی وہی ہے جس نے آسمان اور زمین پیدا کیے۔

جاہلیت والے عرب چاہے پرستش کتنے ہی اصنام کی کرتے ہوں اور اللہ کو بالکل بھول گئے ہوں مگر تحت الشعوری طور پر یہ ان سب کو احساس تھا کہ پیدا کرنے والا آسمان وزمین وغیرہ کا ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے خود قرآن مجید میں ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (لقمان آیت ۲۵، زمر ۳۸)

اور اگر ان سے پوچھو آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ نے۔

دوسری جگہ ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (عنکبوت ۶۱)

اور اگر ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور آفتاب و ماہتاب کس کے قبضہ میں ہیں تو کہیں گے اللہ کے۔

مگر عبادت کے محل پر وہ اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کے سامنے بھی جھکتے تھے اور اس وقت عملی طور پر یہ چیز بھول جاتے تھے کہ اصل جو ہے وہ اللہ ہے یہ چیزیں کچھ بھی نہیں ہیں قرآن نے ان کے اسی تحت الشعوری احساس کو ابھارتے ہوئے ان کو ان کے عمل کی غلطی کا احساس پیدا کر دیا ہے اور اسی لئے کہا گیا: ''یہ جانتے ہوئے اب تو اللہ کے لئے ہمسر نہ تیار کرو''۔

غالباً دوسری قومیں جنہوں نے بے شمار دیوی اور دیوتا قرار دے لئے ہیں وہ بھی تحت الشعوری طبقاتِ نفس میں کسی ایک واحد ذات کو مانتی ہیں جو ان سب سے بالاتر ہے اس کے بعد قرآن کی یہ آیت ان کے لئے بھی ایک لمحۂ فکر پیدا کرنے کے لئے کافی ہے کہ اگر ایک ذات اس تمام

---

[1] ۔ یکفی فی النعمة علینا ان یکون فی الارض بسائط وصوا ضع مفروشة ومسطوقه ولیس یجب ان یکون جمیعها کذلك (مجمع البیان) فسواء کانت کذلك اوعلیٰ شکل الکرة فالا فراش غیر فستنکر ولا مدفوع لعظم جرمها وتباعدا طراف (نیشاپوری)

[2] ۔ ولیس فی ذلك صراحة بموافقة الهیئة القدیمة ولا صراحة بمخالفة الهیئة الحدیدة (بلاغیؒ)

[3] ۔ کل شئ کان فوق شیء اخر فهو لما تحته سماء (طبری)

کائنات کے لئے کافی ہے تو اس کے مقابل میں ان تمام دیویوں، دیوتاؤں کے ماننے کی کیا ضرورت ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

''اور اگر تم اس کی طرف سے جو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا شک میں مبتلا ہو تو اس قبیل کا ایک سورہ لے آؤ اور جو اللہ کو چھوڑ کے حامی تمہارے ہیں انہیں بھی بلا لو اگر تم سچے ہو''۔

قرآن کے مثل لانے کا مطالبہ اور دنیا کی عاجزی:

پہلے جو کہا گیا تھا کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں، اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ اس میں کوئی شک کرنے والا نہیں بلکہ مقصود اس سے یہ تھا کہ اس کتاب میں ادّلہ حقانیت ایسے نمایاں ہیں جو شک کی گنجائش نہیں رکھتے اب اگر شک ہوگا تو ان دلائل سے بے توجہی کی بناء پر شک کا اظہار ہوگا تو بر بنائے عناد ان دلائل سے چشم پوشی کی بناء پر دونوں صورتوں میں بالمقابل ان خصوصیات کی طرف ذہن کا متوجہ کر دینا کافی ہے جس کا نتیجہ پہلی صورت میں ازالہ غفلت ہوگا اور دوسری میں اتمام حجت۔

اس ذہن کے متوجہ کرنے کے لئے قرآنِ کریم نے یہ نفسیاتی طریقہ اختیار کیا کہ گرم سے گرم الفاظ اور تیز سے تیز تر انداز میں بھی انہیں اس کا مثل لانے اور اس کے جواب میں دوسری کتاب تیار کرنے کی دعوت دی جائے۔ وہ غیور، باحمیت اور پر جوش عرب جو بات پر جان دینے تک کے لئے تیار ہو جاتے ہیں ان طعنوں ان سرزنشوں ان مبارز طلبیوں کو سن کر ضرور اپنی پوری غور و فکر کی طاقتوں سے اس کا جواب تیار کرنے کی کوشش کریں گے اور یہ یقینی ہے کہ وہ ناکام اور عاجز رہیں گے۔ اس عاجزی کے بعد اگر وہ بے ہوش ہیں تو ہوش میں آئیں گے اور ضرور ان خصوصیات کی طرف متوجہ ہوں گے جو اس قرآن میں مافوق البشر درجہ تک مضمر ہیں تب انہیں ایمان لانے کے سوا چارہ کار نہ ہوگا اور اگر وہ بر بنائے عناد انکار کرتے ہیں تب بھی کم از کم اس کے بعد ان کی پیشانی پر عرق انفعال محسوس ہوگا اور اب زبان کھولنے کا موقع نہ رہے گا۔

یہ خاص بات ہے کہ اس عظیم اور پر جلال تحدی کو رسولؐ کی زبانی پیش نہیں کیا گیا تا کہ اس میں انانیت کا پہلو پیدا نہ ہو بلکہ اسے براہ راست خالق نے اپنی ذات کو عظمت و جلال کی شان کے ساتھ ''ہم'' کے لفظ سے یاد کر کے یوں پیش کیا ہے کہ اگر تمہیں اس میں جو ہم نے اپنے ''بندہ'' پر نازل کیا ہے کوئی شک ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں خود رسولؐ کے ذاتی اقتدار اور ہنر آفرینی کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ رسولؐ اس کے اظہار کا صرف ایک واسطہ ہیں اور کچھ نہیں اور یہی درحقیقت وہ نقطۂ شک ہے جسکے بالمقابل یہ دعوت دی گئی ہے یعنی مشرکین اسے خود رسولؐ کا ذاتی کلام کہتے تھے۔ قرآن اسی کے بالمقابل میں جہاد کرنا چاہ رہا ہے اور انہیں متنبہ کرتا ہے کہ اگر رسولؐ کا ذاتی کلام ہوتا تو کوئی وجہ نہیں کہ تم باوجود فصاحت و بلاغت میں انتہائی کمال رکھنے کے اس کا مثل نہ لا سکو۔

اب اگر موجودہ زمانے کے بعض تجدد پسند افراد اسے خود رسولؐ کی دماغی پیداوار قرار دیتے ہیں اور ''من اللہ'' ہونے کے مفہوم صرف یہ قرار دیتے ہیں کہ وہ خداداد طاقتوں کا نتیجہ ہے تو یہ حقیقت میں اسی مقابل نقطہ کی صدائے بازگشت ہے جس کے خلاف اس آیت اور اس کی ایسی

متعدد آیتوں میں قرآنِ کریم نے ایک مستقل محاذ قائم کر رکھا ہے۔

مقابل والے کھلم کھلا شک کیسا، انکار کا اظہار کر رہے تھے۔ مگر چوں کہ قرآنی آیات میں حقانیت و اعجاز کے ایسے نمایاں آثار موجود ہیں کہ یہ شک ہونا نہ چاہئے اس لئے قرآن گویا اسے باور نہیں کرانا چاہتا کہ انہیں واقعی شک ہے اس لئے کہا کہ ''اگر واقعی تم کو شک ہے'' یہ چونکانے کا پہلا تازیانہ ہے۔

''تو اس کے ایسے کلام میں سے (پوری کتاب نہ سہی) ایک سورہ ہی لے آؤ''۔ یہ دوسرا تازیانہ ہے اس میں یہ امر کہ وہ پوری کتاب پیش کر دیں، اسے تو روز اوّل ان کے حوصلہ اور ہمت ہی سے بلند قرار دے دیا گیا۔ اس کے بعد تو اگر انہیں ممکن ہوتا تو ضد ہو جاتی کہ اچھا تو سہی جو ہم پوری کتاب ہی لے آئیں۔ مگر قرآن نے تو مطالبہ بہت تخفیف کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تم ایک سورہ ہی پیش کر دو۔ اس میں بھی قید نہیں کہ طویل سورہ یا مختصر یہ دوسرا تازیانہ ہے اور بہت سخت پھر اس کے بعد یہ کہ تم اگر اکیلے ایسا نہ کر سکو تو اللہ کو چھوڑ کر جو تمہارے مددگار ہیں ان کو جمع کر لو یہ تیسرا تازیانہ ہے ''اگر تم سچے ہو'' سچے کس بات میں! اسی میں کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں ہے۔ اس سے انہیں نتیجہ کی جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر تم اجتماعی طاقت سے بھی ایسا نہ کر سکو، تو تمہیں سمجھنا چاہیے کہ تمہارا خیال غلط ہے۔ یہ حقیقتاً کسی انسانی طاقت کا نتیجہ ہے ہی نہیں بلکہ یہ بذاتِ خاص اللہ کا نازل کردہ ہے اور اسی کا کلام ہے۔ کسی آدمی کا کلام نہیں ہے۔

مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی اس ذیل میں رقم طراز ہیں: ''قرآنِ مجید اپنی زبان کی فصاحت اور حسنِ انشاء کے لحاظ سے بھی یقیناً بے نظیر ہے جیسا کہ عرب کے بڑے بڑے ماہرین ادب تسلیم کر چکے ہیں لیکن یہاں جو تحدی کی جا رہی ہے اس کا مخاطب یا ایہا الناس کے ماتحت سارا عالم ہے صرف قریش یا اہل عرب نہیں۔ اس لئے قرآن مجید کو یہاں صرف انشاء و فصاحت تک محدود رکھنا اس کے عام و عالمگیر چیلنج کو محدود کر دینا ہے۔ قرآن نے اپنی حقیقت خود یہ بیان کر دی ہے کہ وہ هدی للمتقین کتاب ہدیٰ ہے یعنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کا جامع نظام، مکمل، ہمہ گیر و ہر جہتی دستور العمل۔ اس کے علاوہ اس کی اور جتنی حیثیتیں ہیں، تبعی و ضمنی ہیں۔ وہ یہاں پیش اپنے سب سے بڑے وصف کو کر رہا ہے، اور پکار کے کہہ رہا ہے کہ جو ہدایتیں اور بصیرتیں میرے ایک سورہ کے اندر موجود ہیں اب اگر تم اپنی متحدہ کوشش اور جدوجہد سے بھی اس کے مقابلہ میں کوئی چیز پیش کر سکتے ہو تو لاؤ دکھاؤ۔ من مثلہ میں مثلیت کی تفسیر پر بہترین روشنی خود قرآن مجید ہی سے پڑتی ہے: قُلْ فَأْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (قصص۔۴۹) هو اهدی کے ایجاز میں سب کچھ آ گیا''۔

یہ امر کہ قرآن مجید بحیثیت فصاحت و بلاغت ہی نہیں بلکہ اور دیگر حیثیتوں سے بھی معجزہ ہے علامہ بلاغیؒ کی عربی تفسیر ''آلاء الرحمٰن'' کے مقدمہ اور پھر اردو میں ہمارے ''مقدمہ تفسیر میں کافی بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن یہ امر کہ اس آیت میں مخاطب یا ایہا الناس کے ماتحت سارا عالم ہے اس صورت میں پائی ثبوت کو پہنچ سکتا ہے کہ جب موجودہ نظم قرآنی ہی کی مطابقت سے یہ مان لیا جائے کہ یہ آیت تنزیل میں بھی گزشتہ آیات سے مرتبط ہے۔

دوسری صورت میں جب کہ اس کا مخاطب براہ راست قومِ عرب اور بالخصوص قریش کو مانا جائے تو پھر دوسرے افراد کے مقابلہ میں عنوان استدلال دوسرا ہو جائے گا۔ یعنی قوم عرب اور قریش کی اس کے اس تحدی اور دعوت مقابلہ کے سامنے سپر انداختگی خود تمام عالم سے اس کی حقانیت تسلیم کرانے کے لئے حجت ہوگی۔ اس لئے چاہے چیلنج کا رخ ایک محدود سمت کے ساتھ مخصوص ہو مگر نتیجہ اس کا تمام عالم کے لئے مشترک

حیثیت رکھا ہے اور وہ کسی جماعت میں محدود نہیں ہے۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٤﴾

''اب اگر تم نے ایسا نہ کیا اور ہرگز نہ کرو گے تو پھر بچنے کا سامان کرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور وہ کافروں کے لئے مہیا ہے''۔

یہ گزشتہ تازیانوں کے بعد ایک نہیں بلکہ ایک ساتھ متعدد تازیانے ہیں جن کی چوٹ سے اگر ذرہ برابر بھی امکان ہوتا تو وہ بلبلا کر بغیر جواب لائے ہوئے قرار نہ لیتے۔

سچائی پر اعتماد تو دیکھئے کہ ایسے مخالف ماحول میں دشمنوں کی اس کثرت کے درمیان داعی حق حتم و جزم، سکون و اطمینان بلکہ یقین کے ساتھ کہہ رہا ہے ''تم ہرگز ہرگز اس کا مثل نہیں لاؤ گے۔''

ذمہ دار انسان کے لئے اتنے حتم و جزم اور یقین کے ساتھ اپنے مستقبل کے کسی فعل کے اعلان میں دشواری ہوتی ہے چہ جائیکہ دوسرے کا عمل اور وہ بھی مخاطب جماعت کا۔

یہ اعلان خود اس کا سب سے بڑا محرک ہوسکتا ہے کہ وہ اب اپنی پوری طاقت صرف کر کے اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کریں اب اگر ایسا نہ ہوا اور قرآن کی سچائی پورے طور پر ثابت ہوئی تو ہر کھلے ہوئے دل سے غور کرنے والے کو یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن کا مثل لانا یقیناً طاقتِ بشری سے باہر تھا۔

بقول عبدالماجد صاحب ''قرآن کے چیلنج کو ساڑھے تیرہ سو سال سے اوپر ہی ہو چکے ہیں اور دنیا کے کتب خانے اس کتاب سازی کے عہد میں، قرآن کے برابر کیا معنی تقریباً برابر کتاب سے بھی یکسر خالی ہیں۔

''(ہرگز نہیں کرو گے یعنی) قیامت تک، اللہ اکبر! کس زور کی تحدی ہے اور وہ بھی ایک اُمی کی زبان سے! اپنی عقل و حکمت اپنے علوم و فنون پر ناز رکھنے والوں کو کیسا جوش اس وقت بھی آیا ہوگا اور آج بھی آ رہا ہے لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔''

''اگر ایسا نہ کیا اور ہرگز نہ کرو گے'' یعنی اگر تم مثل اس کا نہ لائے اور ہرگز نہ لاسکو گے، اس کی جزا یعنی اس ''اگر'' کا نتیجہ درحقیقت یہ ہے کہ ''پھر ایمان لے آؤ، تسلیم کرلو کہ یہ بے شک اللہ کی طرف کا کلام ہے اور محمد مصطفیٰؐ اس کے رسولؐ ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی اگر تم نے نہ مانا اور اپنے عناد پر اصرار قائم رکھا تو پھر اس کا نتیجہ وہ آخرت کا عذاب ہے جسے ''آتش جہنم'' کہتے ہیں، کیوں کہ وہ کافرین ''یعنی جان بوجھ کر انکار کرنے والوں ہی کے لئے مہیا ہے۔ اس دعوتِ ایمان کو جو تمامیت حجت کا لازمی نتیجہ ہونا چاہیے اور پھر اس دعوت کو قبول نہ کر کے کفر پر قائم رہنے کی پاداش، ان دونوں کو انتہائی اختصار کے ساتھ فاتقوا النار التی... الخ کے الفاظ میں کہہ دیا گیا ہے یعنی اب اس حجت کے قائم ہوجانے کے بعد انکار کا نتیجہ اس قسم کی آگ ہے (جس کے بصورت بقائے انکار تم یقینی مستحق قرار پاؤ گے اس سے بچاؤ کا سامان صرف یہ ہے کہ کھلے دل سے حقیقت کا اعتراف کرلو اور کفر سے ہٹ کر ایمان کا راستہ اختیار کرلو۔

آتشِ جہنم کا عذاب تو درحقیقت نافرمان آدمیوں ہی کے لئے ہے مگر ان آدمیوں ہی کے لئے اس سے بڑھ کر توہین یا سزا کیا ہوگی کہ ان کے وہ معبود بھی جن کی وہ پرستش کرتے تھے اسی آگ میں جھونک دیے جائیں۔ یہ ان پتھروں کو سزا دینا نہیں ہے بلکہ ان آدمیوں ہی کے عذاب کی تکمیل ہے۔ اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ اس آگ کا ایندھن یہ آدمی بھی ہیں اور وہ پتھر بھی جو ان کے معبود تھے [1] اور پھر چوں کہ وہ انہیں تصور کرتے تھے کہ یہ اللہ کے یہاں ہماری سفارش کریں گے تو آج انہیں بھی انہی کے ساتھ جھونک کر دکھلا دیا گیا کہ یہ سفارش کیا کریں گے، یہ اللہ کے مقابلہ میں ایسے بے بس ہیں [2]۔

''اعدّت'' یعنی مہیا کی گئی ہے، کے لفظ سے ظاہر ہے کہ دوزخ خلق ہو چکا ہے اور موجود ہے مگر پردۂ غیب میں ہے جس پر ''ایمان بالغیب'' کا شعار رکھنے والوں کو کسی قسم کے شک وتردد کا محل نہیں ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

''اور مژدہ دو ان کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے کہ ان کے لئے بہشت کے گھنے باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں۔ جب بھی انہیں ان میں سے کوئی پھل کھانے کو ملے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو پہلے ہمیں کھانے کو مل چکا ہے، حالانکہ انہیں وہ ملتا جلتا ہوا دیا گیا ہے اور ان کے لئے ان بہشتوں میں پاک بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے''۔

بشر (مژدہ دو) کا مخاطب رسول بھی ہو سکتے ہیں اور مخاطب غیر معیّنکی حیثیت سے یہ مقصود بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اس خوش خبری کے قابل ہیں۔ لہٰذا کوئی بھی ہو اسے حق ہے کہ وہ انہیں یہ مژدہ پہنچا دے۔

قرآن کریم میں اکثر مقامات جہاں اس قسم کی مفرد تخاطب ہے جیسے اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ، اَلَمْ تَرَ كَيْفَ وغیرہ ان میں یہ دونوں احتمال ہیں مگر میرے نزدیک ان میں سے اکثر مقاماتِ ترجیح دوسرے ہی پہلو کو ہے جیسے آج کل کے طرز تحریر میں ''ذرا دیکھو تو'' یا ملاحظہ کیجئے'' کہا جاتا ہے اور اس سے مقصود کوئی خاص شخص نہیں ہوتا۔

ایمان اور عمل صالح:

مژدہ کے مستحق کون ہیں! وہ جو ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں، یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآنِ کریم میں کسی ایک جگہ بھی جنت اور

---

[1] ۔ الظاهر ان كون الناس والحجارة وقود النار اى حطبها يريد به اصنامهم النحوتة من الحجارة كفر له تعالىٰ انكم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم (مجمع البیان)

[2] ۔ لما اعتقد الكفار فى حجارتهم المعبودة من دون الله انها الشفعاء (رازی)

نعیمِ آخرت کی بشارت صرف ایمان پر مرتب نہیں کی گئی ہے بلکہ ہر جگہ ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کا ذکر ضروری سمجھا ہے۔اس کے بعد کاش ان کی آنکھیں کھلیں جو صرف ''جماعت مومنین'' کا لقب اختیار کر کے اپنے کو اعمالِ صالحہ سے بے نیاز سمجھ لیتے ہیں' اور 'مومن'' ہونے کے بعد حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پابندی کے بغیر ہی نعماتِ بہشت کے خوابِ خوشگوار میں مست ہیں۔اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ صرف اعمال کی پابندی کرنا اور اصول عقائد کی خبر نہ رکھنا بھی نجات کے لئے ہرگز کافی نہیں ہے۔

مولوی عبدالماجد صاحب نے بالکل درست لکھا ہے: ''نیک عمل کے سمجھنے میں بہت سوں کو دھوکا ہوا ہے اور یہ مغالطہ آج کل بہت عام ہو گیا ہے سمجھا یہ جانے لگا ہے کہ نیکی اور ایمان ایک دوسرے سے بالکل الگ اور بے تعلق چیزیں ہیں اور پھر اس مفروضہ کی ایک فرع یہ قائم کی گئی ہے کہ کوئی شخص ممکن ہے کہ بہت صالح اعمال کا ہو، لیکن ایمان سے یک لخت محروم ہے۔حالانکہ یہ تخیل ہی سراسر غلط ہے نیکی ایمان سے الگ نہیں۔ ایمان ہی عملی شکل کا نام ہے۔ایمان جب تک قلبی ہے ایمان ہے۔اگر قولی ولسانی ہے تو اسلام ہے اور وہی ایمان جب عمل سے ظاہر ہونے لگتا ہے تو اس کا نام حسن عمل، حسن کردار یا عمل صالح پڑ جاتا ہے اور حسن عمل کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ عمل رضائے الٰہی کے مطابق ہو، کوئی نیکی اگر پیش کی جاتی ہے جس کی تہہ میں جذبہ ایمانی خفیف سا بھی موجود نہیں تو نیکی کی صرف صورت ہے نیکی کی صرف نقل ہے اور جس طرح نماز کی نقل محض نماز نہیں اسی طرح کسی نیکی کی نقل پر اطلاق نیکی کا نہیں ہوسکتا۔عمل نیکی کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہ عمل ضابطۂ شریعت کے مطابق ہو''۔

اس میں صرف یہ جزو قابل ترمیم ہے کہ ''ایمان جب قولی ولسانی ہو تو اسلام ہے۔ایسا ہی نہیں بلکہ عملی بھی بایں معنی کہ اعمال صالحہ کے مطابق شریعتِ اسلام ظاہری طور پر پابندی ہے مگر اصولِ اعتقاد قلبی طور پر مستحکم نہیں ہیں تو وہ بھی اسلام ہی ہوگا۔

اس کے ساتھ بھی قابل لحاظ ہے کہ جب خوش خبری، نوید اور مژدہ جہاں بھی ہے اس میں جس طرح ایمان تنہا نہیں ہے اسی طرح ''عمل صالح'' بھی، تو اب اس بحث کی اہمیت ہی نہیں رہتی کہ بغیر ایمان عملِ صالح ہوسکتا ہے یا نہیں، جب کہ قرآن کریم نے عمل صالح کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا ہے تو بغیر ایمان تنہا اعمالِ صالحہ ہوں بھی تو نجات کا استحقاق سمجھنا قرآنِ کریم کی رو سے غلط ہی قرار پائے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ ایمان اور اعمالِ صالحہ میں ایک فرق بھی قرآن کریم سے ثابت ہے اور وہ یہ کہ استحقاق اور وعدہ جنت میں ہیں تو دونوں ضروری، لیکن اگر ایمان ہے اور اعمال صالحہ میں کمزوری ہے تو بطور عفو وکرم مغفرت کا امکان ہے۔لیکن اگر ایمان ہی نہیں ہے تو پھر مغفرت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ قرآن میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ. (نساء۔۴۸و۱۱۶)

یقیناً اللہ اسے کبھی نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ جو گناہ ہو اسے جس کے لئے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

آخری لفظ لمن یشاء سے ظاہر ہے کہ یہ مغفرت بطور وجوب اور بحیثیت عموم نہیں ہے بلکہ بطور امکان اور بطورِ ایجاب جزائی ہے لہٰذا اس کے بالمقابل جو نفیِ ایمان کی صورت میں لایغفر کے لفظ سے دیا گیا ہے وہ بطور امتناع اور بطورِ سلب کلی ہوگا اور اس کے بعد ان دونوں کی مقابل جماعت یعنی ایمان اور عملِ صالح دونوں درجوں پر فائز افراد کے لئے جو مژدہ نجات اور نعیم جنت کا ہے وہ بطور وجوب اور بطور ایجاب کلی ہے جس میں کسی استثناء کی گنجائش نہیں ہے اور یہی وہ ہے جس کا عقلی طور پر عدل الٰہی بھی متقاضی ہے۔

باغ کا یہ وصف کہ اس کے نیچے سے نہریں جاری ہیں اس لحاظ سے لایا گیا ہے کہ باغ اصل میں زمین نہیں بلکہ درختوں کا نام ہوتا ہے اس

لئے نہریں اگرچہ زمین کے اوپر ہیں مگر باغوں کے لحاظ سے انہیں نیچے ہی کہنا درست ہے [1]۔

''جب بھی انہیں کھانے کو ملے گا وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم دنیا میں کھا چکے ہیں۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخرت کے پھل جنس کے اعتبار سے وہی ہوں گے جو دنیا میں ہوا کرتے ہیں اور ''جب بھی'' کے الفاظ جو بطور کلیہ ہیں ان سے ظاہر ہے کہ آخرت کے میوے محدود ان ہی اقسام میں نہیں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے اس لئے کہ عرب ان سے واقف تھے۔ کیوں کہ اہل جنت کا دائرہ کسی خاص قوم وملک والوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر ملک کے ایمان وعمل صالح اختیار کرنے والے اس ''مژدہ'' کے عموم میں برابر کا حصہ رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ پھل ہر ملک کے مختلف ہوتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ میوے جن کا ذکر قرآن میں نام کے ساتھ ہے، بعض ممالک میں پیدا ہی نہ ہوتے ہوں لیکن قرآن ان میں سے ہر شخص کا ہر ایک میوہ کے ملنے کے وقت یہ قول بیان کر رہا ہے کہ یہ وہی ہے جو دنیا میں ہمیں ملا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک کو وہی پھل ملیں گے جنہیں وہ دنیا میں شوق سے کھاتا رہا ہے۔ جب ہی تو وہ یہ کہے گا ارے یہ تو وہی ہے جو دنیا میں ہم کھا چکے ہیں [2]۔

قرآنِ کریم نے ان کے اس قول کو حق بجانب بھی قرار دیا ہے اور واقعہ کے اعتبار سے کسی حد تک غلط بھی یعنی ان کا یہ کہنا اس لئے حق بجانب ہے کہ شکل وصورت اور شمائل میں وہ اس دنیا ہی کے پھلوں کی طرح ہیں لہٰذا انہیں یہ کہنا ہی چاہیئے کہ یہ وہی ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ان پھلوں سے حقیقت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک ہی ساتھ ایک لفظ ''متشابہا'' سے ظاہر کی گئی ہیں کیوں کہ مشابہت ہمیشہ دو ایسی ہی چیزوں میں ہوتی ہے جو ذاتاً مغایرت رکھتی ہوں لیکن کسی صفت یا صورت میں ملتی جلتی ہوں۔

آخر میں اہل جنت کیلئے **ازواج مطھرۃ** کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں حوریں بھی آسکتی ہیں اور جن نیک شوہروں کی دنیا والی نیک بیویاں اس لائق ہوں کہ وہ بہشت میں اپنے شوہروں کے ساتھ رکھی جائیں وہ بھی داخل ہوسکتی ہیں۔

مطھرۃ کے لفظ میں ان جسمانی حدث وخبث والی کثافتوں سے پاکیزگی بھی داخل ہے جو جنت کے لئے موزوں نہیں ہیں اور اخلاقی برائیوں سے بھی۔

جب کہ ازواج حوروں کے قبیل سے ہوں تو اس وصف سے متصف ہونا ظاہر ہے اور دنیاوی بیویاں بہشت میں داخل ہونے کے بعد ان کے طبائع جسمانی وروحانی میں بھی وہ اعتدال پیدا ہوگا کہ جسمانی وروحانی کثافتیں جو دنیا کی مادی آب وہوا کے لوازم میں سے ہیں وہاں باقی نہ رہیں گی اور اس لئے وہاں وہ **ازواج مطھرۃ** کے لقب کی مستحق قرار پاسکیں گی [3]۔

آخری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ اہل جنت ان نعمات میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو نعیمِ جنت میں دنیا کی ہر لذت و راحت سے ایک ایسا امتیاز پیدا کرتی ہے کہ وہاں کی جنت کوئی ایک چھوٹی سی چھوٹی نعمتِ دنیا کی تمام نعمتوں کے مجموعہ سے زیادہ بیش قیمت قرار پا

---

[1] ۔اراد اخبر عن ماء انهارها بانّها جارية تحت الاشجار لان الماء اذا كانت تحت الارض فلا حظه فيها للعيون (مجمع البيان)

[2] ۔معناه هذا الذى رزقنا من قبل فى الدنيا عن ابن عباس وابن مسعود قال الشيخ ابو جعفر واقوىٰ الاقوال ابن عباس (مجمع البيان)

[3] ۔قيل هنّ الحور العين وقيل هن من نسآء الدنيا قال الحسن هن عجائزكم الغمض الرمض الغمش طهرن من قذرات الدنيا۔

جاتی ہے کیوں کہ دنیا کی ہر نعمت چاہے کتنی ہی لذیذ کیوں نہ ہو بہر حال فانی ہے اور آخرت کی ہر ہر نعمت ہمیشہ کے لئے باقی ہے اور اسی لئے مفادِ آخرت کے مقابلہ دنیا کا بڑے سے بڑا مفاد بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کو مرضیِ خالق کے مقابلہ میں نہ کسی لالچ میں مبتلا ہونا چاہیے اور نہ کبھی کسی خوف سے متاثر۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

''بلاشبہ اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ وہ مچھر یا اس سے بھی بڑھ کر کسی چیز کی کوئی مثال بیان کرے اب وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ یقیناً حق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے اور جو لوگ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آخر اللہ کا اس طرح کی مثال سے کیا مطلب ہے؟ وہ اس سے بہت سوں کو گمراہی میں ڈالتا ہے اور بہت سوں کی ہدایت کرتا ہے۔ اور گمراہی میں نہیں ڈالتا مگر بداعمالوں کو۔''

قرآن میں مثالوں کا مقصد:

ذہنِ انسانی محسوسات سے مانوس ہے اس لئے وہ کسی حقیقت کا اس وقت تک آسانی کے ساتھ تصور نہیں کرتا جب تک کہ اسے کسی حسی شکل کی مثال دے کر اور مشاہدہ میں آئی ہوئی کسی واقعیت کی نظیر سامنے لا کر پیش نہ کیا جائے اسی لئے قرآنِ کریم میں حقیقتوں کے اظہار کے لئے مثالوں سے کام لیا گیا ہے اور اقسامِ قرآن میں ''امثال'' کو ایک مستقل جگہ حاصل ہے۔ اس میں جیسے بڑی چیزوں کی مثالیں ہیں جیسے آفتاب و ماہتاب وغیرہ، ویسے ہی مخلوقاتِ الٰہی میں بعض چھوٹی چیزوں کی مثالیں دی گئی ہیں جیسے ایک جگہ انسان کی عاجزی دکھانے کے لئے آیا ہے:

وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ۔ (حج ۷۳)

اگر مکھی ان سے ذرا سی کوئی چیز چھین لے جاتی ہے تو یہ اسے اس کے ہاتھ سے چھڑا نہیں سکتے طالب و مطلوب دونوں ہی کمزور (یعنی انسان بھی کمزور مخلوق ہے وہ مکھی ویسے ہی کمزور ہے)۔

کون کہہ سکتا ہے کہ مقصد کلام کے لحاظ سے یہاں مکھی کے علاوہ کسی بڑے جانور مثلاً شیر بھیڑیے وغیرہ کا تذکرہ بھی مناسب ہو سکتا تھا مگر معاندین کے لئے تو اعتراض کا کوئی بہانہ چاہیے۔ انہوں نے اس کو سرمایہ اعتراض بنا لیا کہ واہ خالق کائنات کے کلام ہونے کا دعویٰ اور اس میں مچھر مکھی ایسی حقیر مخلوق کا ذکر، اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔

خدا اس سے نہیں شرماتا یعنی اسے اپنی اور اپنے کلام کی شان کے خلاف نہیں جانتا کہ اس میں مچھر یا اسے بھی بڑھ کر یعنی اس سے بھی زیادہ

چھوٹی کسی شے کی مثال دی جائے کیوں کہ مثال کا مقصد تو کسی حقیقت کو ذہن سے قریب لانا ہوتا ہے۔ اب وہ حقیقت اگر بڑے قد وقامت والی چیز کے ذریعہ سے سامنے آتی ہے تو اس کی مثال دی جائے گی اور چھوٹی چیز کے ذریعہ سے یہ مقصد پورا ہوتا ہے تو اس کا ذکر کرنا بلاغت کے لحاظ سے ضروری ہوگا۔ جو صاحبانِ ایمان ہیں وہ مثال کے چھوٹے اور بڑے ہونے کو نہیں دیکھتے بلکہ اس حقیقت پر نظر کرتے ہیں جو اس کے تحت میں ہے اس سے ان کے علم ویقین میں اضافہ ہوتا ہے اور جو جان بوجھ کر کفر اختیار کیے ہوئے ہیں وہ بطور طنز واستہزاء کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کا بھلا ایسی مثال سے کیا مطلب ہوسکتا ہے؟ اب یہ فقرہ کہ ''بہت سوں کو اس سے گمراہی میں ڈالتا اور بہت سوں کی ہدایت کرتا ہے'' ان ہی کافروں کے قول کا تتمہ بھی ہوسکتا ہے۔ گویا وہ اللہ پر تفرقہ اندازی کا الزام عائد کرتے ہیں کہ ایسی مثالوں کا لانا اور زیادہ لوگوں کو شکوک پیدا کرنے کا ذریعہ ہے تو آخر اس سے فائدہ کیا ہے اور جواب اس کا اس کے بعد اللہ کی طرف سے یہ ہے کہ گمراہ تو صرف وہ ہوتے ہیں جو پہلے ہی سے بداعمال ہیں یعنی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں لہٰذا ان کی گمراہی کا سبب حقیقتاً اللہ کا ان مثالوں کو پیش کرنا نہیں ہے بلکہ خود ان کے سوءِ اختیار کا نتیجہ ہے کہ وہ اس سے گمراہ ہوتے ہیں [1]۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کافروں کا کلام اس جملہ پر ختم ہوگیا کہ اللہ آخر اس سے چاہتا کیا ہے! اور اس کے بعد کلام الٰہی یہ ہے کہ اللہ اس سے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت کرتا ہے۔ اس صورت میں یہ اس قبیل سے ہوگا جیسے اس کے پہلے 'فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا۔''

حقیقت میں اللہ کو مقصود کسی کا گمراہ کرنا نہیں ہوتا لیکن چوں کہ نتیجہ یہی مرتب ہوتا ہے کہ اس کی ان مثالوں سے کچھ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کچھ اپنے تعصب وعناد سے مزید گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں اس لئے اس کی نسبت اللہ کی طرف دے دی گئی ہے اور پھر اس کی تشریح بعد میں کی گئی ہے کہ یہ گمراہی ان ہی لوگوں کے لئے ہے جو پہلے سے راہ حق سے ہٹے ہوئے ہیں اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ گمراہی خود انسان کو بداعمالی اور سوءِ اختیار کا نتیجہ ہے نہ کہ اللہ کی طرف سے خواہ مخواہ ان کو گمراہ کرنے کا ارادہ ہے۔

بہرصورت آخری فقرہ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ہے یہ امر بالکل نمایاں ہے کہ گمراہ کرنے کی نسبت اللہ کی طرف عقیدہ جبر سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی [2]۔

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۲۷

جو اللہ سے کیے ہوئے معاہدہ کو اس کے استحکام کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جس رشتہ کے ملائے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اسے وہ کاٹ ڈالتے ہیں اور دنیا میں خرابی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو گھاٹے میں رہنے والے ہیں''۔

یہ اوصاف ہیں ان فاسقین کے جن کے لئے قرآنی امثال سے گمراہی کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور ان کی یہ گمراہی طبیعتِ فسق کا نتیجہ ہے اس

---

[1] ۔وھٰذا وجہ حسن (مجمع البیان)

[2] ۔ان الرجل اذا ضل باختیارہ عند حصول شئی من غیر ان یکون لذلک الشئی اثر فی اضلالہ فیقال لذلک الشئی انہ اضلّہ (رازی)

لئے یہی اوصاف مطلق فاسقین کے ہر دور میں قرار پائیں گے۔

اللہ سے کیا ہوا معاہدہ ان منافقین کے لئے جو اظہار اسلام کر چکے تھے کھلا ہوا ہے کیوں کہ جب انہوں نے آ کر رسولؐ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور آپ کی رسالت کو تسلیم کیا تو اس سے وفاداری اور احکام کی تعمیل کا عہد و پیمان ظاہر ہے۔ اب جب کہ وہ اس کے بعد برابر رسولؐ کے درپے آزار رہتے ہیں اور احکام کی تعمیل پر اعتراضات کے پہلو ڈھونڈھتے رہتے ہیں تو عہد شکنی کے مجرم ہونے میں ان کے شک ہی کیا ہو سکتا ہے رہ گئے وہ کافر جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا ان کے لئے یہ عہد وہ عہدِ فطرت ہو سکتا ہے جو اللہ کی خالقیت اور ربوبیت کے اقتضاء سے مطالبۂ عبودیت کے طور پر ان سے بواسطۂ عقل وضمیر ابتدائے سنِ شعور ہی سے موجود ہے اور جس کے خلاف عمل کرنا اس عہد کے توڑنے کے مترادف ہے [1]۔

پھر اس عہد کی تجدید انبیاء و مرسلین کی زبان سے بھی ہوتی رہی ہے جو یقیناً ہر ملک اور ہر قوم میں ابتدائے تکوینِ بشر سے آتے رہے ہیں۔

اگرچہ زیادہ نمایاں مصداق اس کے یہود و نصاریٰ ہیں جو ''اہل کتاب'' کہلاتے ہیں۔ ان کو پہلے سے نبی آخر الزمانؐ کی بشارتیں دے دی گئی تھیں۔ اب یہ اسے نہیں مانتے تو عہد شکنی نہیں تو کیا ہے؟

لطف یہ ہے کہ بائبل کا نام بھی خود یہود و نصاریٰ کی اصطلاح میں عہد ہی ہو گیا ہے چنانچہ توریت اور اس کے ملحقات "عهد قديم" (پرانا عہد نامہ) اور انجیل اور کے ملحقات (عهد جديد) (دنیا عہد نامہ) کہلاتے ہیں۔

''جس رشتہ کے ملائے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اسے توڑتے ہیں'' اس میں تمام ''حقوق'' داخل ہیں۔ حقوق اللہ بھی اور حقوق الناس بھی رشتہ کے ملائے رکھنے کا مطلب ہے۔ حقوق کو ادا کرتے رہنا اور توڑنے کا مطلب ہے ان حقوق کو ادا نہ کرنا بلکہ ان کی عملی مخالفت کرنا [2]۔

فساد فی الارض کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔ دوسروں کو کفر یا معصیت کی دعوت دینا اور خلقِ خدا کی گمراہی کا سامان کرنا بدترین قسم کا فساد فی الارض ہے اور ظاہر ہے کہ آیاتِ قرآن پر نکتہ چینیاں جو وہ لوگ کرتے رہتے تھے ان کا مقصد یہی تھا کہ لوگوں کے عقائدِ حقہ میں تزلزل پیدا کریں۔

''یہ لوگ گھاٹا اٹھانے والے ہیں'' دنیا میں بھی کیوں کہ کوئی جماعت ان پر اعتماد نہیں کرتی اور خود ان کے دل کو سکون و اطمینان نصیب نہیں ہوتا اور آخرت میں بھی عذابِ ابدی کی شکل میں۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

''کس طرح تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اسی نے تمہیں جان دار بنایا وہی تمہیں موت دے گا

---

[1] ۔نقضهم لذلك تركهم الاقرار بما قد ثبت صحته لهم بالادلة (مجمع البیان)

[2] ۔ قيل معناه الامر بوصل كل من امر الله بصلته من اوليائه وا لقطع والبراءة من اعدائه وهذا اقوى لانه اعمّ ويدخل فيه الجميع (مجمع البیان)

اور وہی تمہیں زندگی دے گا پھر انجام میں اسی کی طرف تمہارا رجوع ہوگا"۔

"کس طرح" کا لفظ اصل میں تو سوال کو بتلاتا ہے مگر کلامِ الٰہی میں جہاں سوال کا کوئی لفظ آئے اس سے مقصود استفہام کے علاوہ کچھ اور ہی ہوتا ہے اس لئے کہ استفہام یعنی دریافتِ حال کا امکان اس کے لئے ہے جو حقیقت سے ناواقف ہو اور ظاہر ہے کہ خالق کی ذات علام الغیوب ہے کوئی بھی حقیقت اس سے مخفی نہیں ہے لہٰذا کیوں کر اور کس طرح سے بھی دریافتِ سبب مقصود نہیں ہوسکتا بلکہ اس سے زجر و توبیخ مقصود ہوتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں انکار نہ کرنا چاہیے [1]۔

کیوں نہ! انکار کرنا چاہیے؟ اس لئے کہ اللہ کی قدرت کے کرشمے خود تمہارے ہی اندر نمایاں ہیں۔ تم بے جان تھے ان مواد سے لے کر جن سے انسان کی خلقت ہوتی ہے شکم مادر میں اس وقت تک کہ جب تک اس میں جان پڑے وہ بے جان تھا۔ پھر جان ڈال کر اسے اس نے ذی حیات بنایا، پھر وہی اسے عمر پوری ہونے پر موت دیتا ہے، پھر وہی دوبارہ زندہ کرے گا۔ یہ حشر والی زندگی ہے جس پر مختتم جزاؤ سزا کا دارمدار ہے۔ اس زندگی کے بعد حساب و کتاب وغیرہ منازلِ آخرت درپیش ہوں گے اور اس کے بعد آخری انجام جو مومنین کا بہشت اور کافرین کا دوزخ کی شکل میں نمودار ہوگا یہ بھی خالق ہی کی جانب سے ہوگا اور اس کا فیصلہ صرف خالق کی مرضی پر موقوف ہے۔ اس معنی سے کہا گیا "ثم الیه ترجعون" یعنی تمہارا معاملہ اس کے بعد اسی کے ہاتھ میں ہوگا [2]۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾

"وہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے سب، پھر آسمان کی طرف رخ کیا تو انہیں سات آسمانوں کی صورت میں درست کیا اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔

خلقت آسمان و زمین:

یہ انسانی رفعت و عزت کا وہ پیغام ہے جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے اور جسے پیش نظر رکھنے سے ہر قسم کے شرک یعنی غیر اللہ کی پرستش کا سدباب ہوتا ہے۔

انسان نے کائناتِ عالم کو دیکھ کر ان میں اپنے کو حقیر سمجھا۔ وہ جسامت میں پہاڑوں سے بہت کم نظر آیا، نشوونما میں درختوں سے بہت پیچھے دکھائی دیا، ضروریاتِ زندگی کے پورا کرنے میں جانوروں کا محتاج محسوس ہوا، تو وہ ان میں سے ہر چیز کے سامنے جھکنے لگا لیکن اگر وہ اسے پیش نظر رکھے کہ دنیا کی ہر چیز اس کے لئے پیدا ہوئی ہے، اس لئے اسے ان میں سے ہر ایک چیز سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے اور کسی کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہیں تو کبھی ان میں سے کسی کو معبود نہ بناتا ہاں احسان اس کا ماننا اور معبود اسی کو بناتا جو ان سب چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے اور جس نے

---

[1] ۔ کیف فی الاصل سئوال عن الحال. ومعناہ فی الایۃ التوبیخ (مجمع البیان)

[2] ۔ کما یقال رجع امر القوم الی الامیر ولا یراد بہ الرجوع من مکان الی مکان وانما یراد بہ ان النظر صار لہ خاصۃ (مجمع البیان)

اس انسان کو وہ قویٰ عطا فرمائے ہیں جن سے کام لے کر وہ ان تمام عالم کی چیزوں کو تسخیر کر سکتا ہے۔

زمین اور اس کے اندر کی چیزوں کے ذکر کے بعد یہ کہنا کہ ''پھر آسمان کی طرف رخ کیا'' اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمین کی خلقت آسمان سے پہلے ہے حالانکہ دوسری جگہ قرآن میں آیا ہے وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ''زمین کو اس کے بعد بچھایا (نازعات۔۳۰)

دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آسمان ایک واحد شکل میں زمین سے پہلے خلق ہوا۔ اس کے بعد زمین کی تخلیق ہوئی اور زمین کی خلقت کے بعد پھر آسمان کو سات طبقوں پر تقسیم کیا گیا۔ اسی لئے استویٰ کی لفظ کے ساتھ السماء بطور مفرد آیا ہے اور اس کے بعد سبع سموت کی صورت میں اس کے درست کیے جانے کا ذکر ہے۔

یہ آسمان جو ہمیں نظر آتا ہے اگر ''حدِ نظر'' کا نام ہو بھی تب بھی اس کے آگے کیا ہے اس کے متعلق کون بتا سکتا ہے؟ پھر جب کہ خالق خود اسے سات کی تعداد میں بتائے تو انکار کا سبب ہی کیا ہو سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ان سات کی شکل و کیفیت کو نہ سمجھ سکیں۔

آخری فقرہ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ جسے ہر دور کی سائنس کے بلند بانگ دعووں کو پیش نظر رکھ کر ہی لایا گیا ہے کہ آسمانوں کے بارے میں تمہارا سرمایہ حقیقت میں جہل کے سوا کچھ نہیں ہے پھر جہل کی بنیاد پر علیم خبیر خالق کے بیان کی نفی کا حق تمہیں کہاں پہنچا سکتا ہے۔

ہاں اس سات کہنے سے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس بارے میں ہیئتِ قدیم والوں کی تفصیلات کو قبول کر لیا جائے کیوں کہ ان کی بنیاد بھی ظن و تخمین کے سوا کچھ نہیں ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰

''اور اس وقت جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین بنانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا: 'کیا تو اس میں ایسے نائب کو بنائے گا جو اس میں خرابی پھیلائے اور خون خرابہ کرے' حالاں کہ ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے اور تیری پاکیزگی کو سراہتے رہتے ہیں اور اس نے کہا ''یقین جانو کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔

خلافتِ آدمؑ کا اعلان:

یہ کائناتِ عالم میں اشرف المخلوقات انسان کی ''آمد آمد'' کا ذکر ہے جب کہ یہ مخلوق ابھی عالم انوار و ارواح میں تو تھا مگر دنیائے اجسام اس سے خالی تھی۔ اس کے اس عالم میں آنے سے پہلے خالقِ کریم نے اپنے فرشتوں کو اس کے آنے کی خبر دی۔

فرشتے نور سے پیدا کیے ہوئے صاحبِ احساس و شعور وہ مخلوق ہیں جن میں ہوا و ہوس اور جذبات کا پتا نہیں اور اس لئے سرشت ہی کے اعتبار سے معصوم ہیں۔ ان کو خالق منتظر و مشتاق بنانا چاہتا ہے ایک نئی قسم کے مخلوق کا جو مادیت اور روحانیت کا مجموعہ ہوگا اور اس کا پہلا فرد آدمؑ ہیں

جن کے آنے کی ملائکہ کو اطلاع دی جارہی ہے ان الفاظ میں کہ زمین میں ایک جانشین قرار دینا چاہتا ہوں۔

''جانشین کے کیا معنی؟ جو دوسرے کی نیابت میں کوئی ایسا کام انجام دے جس کا اصل ذمہ دار وہ دوسرا ہے۔ اب یہ جانشینی خواہ اصل شخص کی غیبت کی وجہ سے ہو یا انتقال کی وجہ سے اور خواہ اس لئے کہ خود اس کے لئے اس کام کے انجام دینے میں کچھ موانع پائے جاتے ہیں، خالق کی طرف سے جانشین کا مقرر کیا جانا اسی تیسرے سبب سے ہے۔

اصل میں خلائق کی ہدایت و تنظیم تقاضائے ''ربوبیت'' ہے، اس لئے ذمہ دار اس کا وہ خود ہے مگر وہ جسم و جسمانیات سے منزّہ و مبرّا ہے اور خلائق جن کی ہدایت کرنا ہے اور وہ مادیت کے شکنجہ میں اسیر ہیں لہٰذا بلا واسطہ اس کی طرف سے فیض حاصل کرنے کی ان میں صلاحیت نہیں۔ اس وجہ سے ضرورت ہوئی کہ وہ ان ہی میں سے کسی نفس کاملہ کو اپنے فیوض کا مرکز بنا کر ہدایت و تنظیم ملت کا کام سپرد کرے اور وہ اس ہدایت کے فریضہ کو جو اصل میں اللہ سے متعلق ہے اس کی طرف سے انجام دے کر خلقِ خدا پر حجت تمام کرے ان ہی خلفاء میں سے ہر ایک کا نام نبی اور رسول اور کسی وقت امام ہونا ہے جن کا تقرر صرف اللہ کے اختیار خاص سے وابستہ ہے، کسی دوسرے کو اس میں دخل نہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے خلیفہ کے لفظ کے معنی بتائے ہیں:

یکون حجة لی فی ارضی علیٰ خلقی (تفسیر صافی)

وہ روئے زمین پر میری مخلوق کے مقابلہ میں میری حجت تمام ہونے کا ذریعہ ہوگا

علمائے جمہور بھی زیادہ تر اس سے متفق ہیں چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کے معنی میں لکھا ہے:

یخلفنی فی الحکم بین خلقی و ذلك الخلیفة هو ادم ومن قام مقامه فی طاعة الله والحکم بالعدل بین خلقه [1] بن جریر عن ابن عباس و ابن مسعود خلیفة الله فی ارضه لا قامة احکامه و تنقیذ قضایاه معالم [2]

نسل انسانی خود اپنی صلاح و فلاح کے لئے اس کی محتاج تھی اور محتاج ہے کہ اپنے کسی ہم جنس کے واسطہ سے شریعت الٰہی سے استفادہ کرے اور سلسلہ نبوت اسی غرض سے قائم ہوا ہے و کذلك کل نبی استخلفهم الله فی عمارة الارض و سیاسة الناس و تکمیل نفوسهم و تنفیذ امره فیهم [3] (بیضاوی)

اس کے علاوہ یہ ہے کہ خالقِ کائنات کے ساتھ اگرچہ تمام عوالم کا تعلق یکساں ہے بایں معنی کہ وہ سب کا خالق اور مالک ہے مگر نسبتی حیثیت سے عرش کو سریر سلطنت ربانی کا درجہ دیا گیا ہے کہ اور اس کے لحاظ سے زمین اس شرف سے محروم ہے لہٰذا خالق کو منظور ہوا کہ زمین بھی ایک دارالسلطنت ہونے کے شرف سے محروم نہ رہے لہٰذا کہا گیا کہ میں زمین میں اپنا نائب قرار دینا چاہتا ہوں یعنی ایک ایسا شخص جو زمین میں بجائے میرے ہو۔

---

[1] ۔ وہ میرا جانشین ہوگا میرے مخلوقات کے درمیان حکومت کرنے میں، اور یہ جانشین آدم تھے اور جو ان کے قائم مقام ہوئے اطاعتِ الٰہی اور خلائق کے درمیان عدالت کے ساتھ فیصلہ کرنے میں۔

[2] ۔ اللہ کا جانشین اس کی زمین میں اس کے احکام کو قائم کرنے اور اس کے فیصلوں کو جاری کرنے میں۔

[3] ۔ اسی طرح ہر پیغمبرؑ ان سب کو اللہ نے خلیفہ بنایا زمین کے آباد کرنے اور لوگوں کا نظم قائم کرنے اور ان کے نفوس کو کمال کی منزل تک پہونچانے اور خدا کے فرمان کو ان کے درمیان جاری کرنے میں۔

ملائکہ کا سوال وجواب:

اب اس نائب کے متعلق چوں کہ ملائکہ کو خالق کی طرف سے علم دیا جا چکا تھا کہ اس کی خلقت مٹی سے ہوگی۔ نیز انہیں مٹی کے خواص معلوم تھے کہ اس سے پیدا شدہ مخلوق میں جذبات نفس کا ہونا جو سرمایہ جنگ وجدال ہوتے ہیں ضروری ہے اس کے ساتھ انہیں انسان کے علمی جوہر کمال اور اس نوع کی معصوم ہستیوں کی عظمتِ کردار کا اس وقت تک علم نہ تھا اور اس لئے ان کے ذہن میں یہ تھا کہ خود ان سے بڑھ کر کوئی مخلوق مقامِ عبودیت میں بلند اور تقربِ الٰہی میں ان سے آگے نہیں ہے۔ اب جو خالق کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ ''میں زمین میں اپنا جانشین مقرر کرنے والا ہوں'' اور یہ خلافت الٰہیہ کا منصب انہیں اپنے خلاف محسوس ہوا لہٰذا فطری طور پر ان میں ایک اضطراب پیدا ہوا جس نے اس سوال کی شکل اختیار کی: ''کیا اسے مقرر کیا جائے گا جو زمین میں خرابی پھیلائے اور خونریزی کرے''؟ یہ سوال نہ اعتراض تھا، نہ اس میں کوئی جذبہ مخالفت کارفرما تھا کیوں کہ یہ باتیں ملائکہ کی عصمت کے خلاف ہیں بلکہ وہ صرف ایک قلبی اضطراب کا مظاہرہ تھا جو ان کے قصورِ علم کا لازمی نتیجہ تھا۔

خالق نے فعلاً ان کے اس سوال کی تفصیلی جواب نہیں دیا بلکہ مجمل طور پر ایسا جواب دیا جس سے پتہ چلتا تھا کہ قدرت کا راز ہے جس کا بتانا اس وقت مناسب نہیں ہے یا ملائکہ میں ابھی اس کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

''اور اس نے آدمؑ کو وہ تمام نام سکھا دیے پھر ان اشخاص کو فرشتوں کے سامنے پیش کر کے فرمایا بتاؤ مجھے ان کے نام اگر تم سچے ہو''۔

یہ اب آدمؑ کی خلقت کے بعد اسی سوال کے جواب کا انتظام کیا گیا ہے اور اس کے لئے ایک مجلس امتحان کی ترتیب کا اہتمام ہوا ہے۔

سب سے پہلے آدمؑ کو تمام ناموں کی تعلیم دی گئی عامہ مفسرین نے اس کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز جمادات نباتات اور حیوانات ہر چیز کے نام مگر کیا یہ ''فرہنگِ لغت'' کا علم کوئی ایسی بلند فضیلت ہے جو ملائکہ کے مقابلہ میں معیار شرف بن سکے، بعض مفسرین نے اس میں یہ عقلی تصرف کیا ہے کہ علم اسماء میں حقیقتوں صفتوں اور تمام چیزوں کی خاصیتوں کا علم بھی داخل ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ اسماء کے عرفی مفہوم سے خارج ہے اور یہ ظاہر ہے کہ الفاظ عرفی مفاہیم پر محمول ہوتے ہیں نہ کہ ان معانی پر جو عقلی توجیہات کی مدد سے کھینچ تان کر قرار دیے جا سکیں۔

تعلیم اسماء اور امتحان آدمؑ و ملائکہ:

پھر یہ کہ اس کے بعد کہا گیا ہے ثم عرضھم علی الملئکۃ ''پھر انہیں ملائکہ کے سامنے پیش کیا'' اس میں ھم ایسی ضمیر ہے جو ذوی العقول کے لئے آتی ہے یہ ضمیر اسماء کی طرف نہیں پھر سکتی چنانچہ اسماء کے لئے جو ضمیر اس کے قبل پھیری جا چکی ہے وہ کلھا میں واحد مونث کی ہے کلھم نہیں کہا گیا ہے نہ کہنا صحیح ہے اسی لئے تمام مفسرین یہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ ھم کی ضمیر اسماء نہیں بلکہ مسمیات کی طرف پھرتی ہے یعنی وہ چیزیں جن کے نام تھے اور اسی لئے اس کے بعد ہے انبئونی باسماء ھٰؤلاء ''مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ'' یہ نہیں کہا گیا کہ انبئونی

بھذہ الاسماء مجھے یہ نام بتاؤ'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ پیش جو کیے گئے ہیں وہ اسماء نہیں اصحاب اسماء ہیں۔اب اگر اسماء سے مراد ہر شے یعنی کیڑوں مکوڑوں تک کے نام ہیں اور وہ بھی قیامت تک کی چیزوں کے تو ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں اس وقت وجود میں نہ آئی تھیں یہ تو قیامت کے ظرف زمان میں پیدا ہوں گی۔ذوی العقول میں چوں کہ ایک جسم ہے اور ایک روح اور ارواح کے بارے میں اہل مذہب کا عقیدہ اور مذہبی نصوص کا بیان ہے کہ وہ اجسام سے قبل پیدا ہوئے تھے اور ان ہی میں سے بلند مرتبہ ارواح کو ان کے کمال وصفائے جوہر کی بناء پر انوار بھی کہا گیا ہے تو ان کا عالم ارواح یا عالم انوار میں وجود درست ہے اور اسی عالم میں ملائکہ کے سامنے ان کا پیش کیا جانا صحیح ومعقول ہے مگر خالص مادی چیزوں میں یہ بات نہیں ہے۔اب ایک طرف ھم اور ھٰؤلاء دونوں کلموں کا لفظی قرینہ اور دوسری طرف یہ عقلی قرینہ کہ تمام اشیاء پیش کیے جانے کے قابل نہیں ہیں۔یہ دونوں قرینے الاسماء کلھا کے دائرہ میں اس تخصیص کے سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ اس سے تمام چیزوں کے نام مراد نہیں ہیں بلکہ کچھ صاحب عقل شخصیتوں کے نام مراد ہیں۔یہ شخصیتیں وہی ہیں جن کا تعارف اور جن کی پاک سیرت کو ظاہر کرنے والے خط وخال ہی ملائکہ کو عظمت بشری محسوس کروا کے خلافت کے لئے اس کے انتخاب کے متعلق ان کے سوال کا پورا پورا جواب بن جائیں۔

یہ امر پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جس چیز کے تعلم کا آدمؑ کے لئے ذکر کیا گیا ہے وہ فقط اسماء میں مسمّیات یعنی وہ اشخاص جن کے وہ نام تھے آدمؑ کے سامنے پیش نہیں کیے گئے تھے اور جس چیز کا ملائکہ سے سوال ہوا ہے وہ فقط اسماء نہیں ہیں بلکہ مسمیات پیش کر کے یہ کہا گیا ہے کہ اگر سچے ہو تو ان کے نام بتاؤ یعنی ان مسمیات کو دیکھ کر اسماء کی تطبیق کرو اور بتاؤ کہ کون کس کا نام ہے؟ یہ حافظہ کا امتحان نہیں بلکہ ذہانت کا امتحان تھا جس میں انسان ملائکہ سے افضل ثابت ہوا ہے[1]۔

اب اس سلسلہ میں جو قابل غور فقرہ رہ گیا ہے وہ قولِ خالق ان کنتم صادقین ہے۔یعنی ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مخاطب جماعت کسی نہ کسی لحاظ سے سچائی کے معیار سے الگ ضرور ہے اور یہ ملائکہ کی عصمت کے خلاف معلوم ہوتا ہے مگر معلوم ہونا چاہیے کہ ''صدق'' کا وہ مفہوم جو اسے ''کذب'' کے مقابل قرار دیتا ہے، علومِ لفظیہ کی ایک اصطلاح ہے اور اس کے لحاظ سے تو ملائکہ کے بارے میں ''صادق'' یا اس کے خلاف کچھ کہنے کی گنجائش نہیں کیوں کہ ان کا کلام اتجعل فیھا الخ جو اس کے پہلے ہوا تھا وہ خبر تھا ہی نہیں بلکہ استفہامی جملہ تھا جس میں صدق اور کذب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ماننا پڑے گا کہ یہ صدق کچھ اور ہے اور اس کا تعلق بھی اس جملہ کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ ہے۔

حقیقتِ امر جہاں تک غور کرنے سے سمجھ میں آتی ہے اور بعض احادیث بھی اس کے مؤید ہیں یہ ہے کہ یہ الفاظ تو اتنے ہی تھے کہ جو زبان پر آئے مگر ان کا ایک پس منظر تھا جو قلب کے اندر مضمر تھا اور وہ یہ خیال کہ ہم سے بڑھ کر کوئی مخلوق نہیں ہے اور ہم سب سے افضل وبرتر ہیں[2]۔

---

[1] ۔الاسماء کلھا ای اسماء ھؤلاء الھداۃ وروي الصدوق بسندین معتبرین عن الصّادقؑ ان اللہ تبارك وتعالیٰ علم اٰدم اسماء حجبه کلھا ثم عرضھم وھم ارواح علی الملئکة فقال انبئونی بأسماء ھٰؤلاءعرضھم وھم ارواح طاھرة وانوار قدسیة تضئ بالھدی والطھارة والعصمة الا ختیاریة علی الملئکة لیعرفوا فضلھم الفائق ویظھر لھم شئی من حجة الحکمة فی خلق اللہ للبشر علمه بالّذین تشرق الارض بنورھم وتقوم بھم الحجة علی الملئکة (البلاغی)

[2] ۔ انھم قالوا فی انفسھم ما کنا نظن ان یخلق اللہ خلقا اکرم الیه منّا نحنا خوان اللہ وجیرانه واقرب الخلق الیه (روایت عیاشی)

یہ خیال کوئی گناہ نہیں ہے جس پر کسی سزا کا استحقاق ہوا اور جو عصمتِ ملک کے خلاف ہو بلکہ وہ ایک نظری قصور ہے جو نقصِ علم کا لازمی نتیجہ ہے اور جس کے دور کرنے کے لئے بعد میں امتحان کے ذریعہ سے ان کو ادراک پیدا کر دیا گیا اس کا کہ وہ اس منصب کے اہل نہیں ہیں اور انسان اس منصب کے ضروری شرائط میں ان سے افضل وہ برتر ہے۔ کلامِ ملک میں کوئی جزء واقعہ کے خلاف نہ تھا مگر اس سوال کے پس پشت جو ذہنیت کام کر رہی تھی وہ حقیقت کے خلاف تھی اور صادق نہ تھی اور اسی کے لحاظ سے موقع امتحان میں کہا گیا کہ ''اگر سچے ہو تو ان اشخاص کے نام بتاؤ اس امتحان سے ملائکہ کو ان کے نقص کا احساس بھی پیدا کر دیا اور ان افرادِ انسانی کا جو اعلانِ خلافت کا حقیقی مرکز تھے ملائکہ سے تعارف کر کے ان کی عظمت وجلالت کا علم بھی عطا کر دیا''۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾

''انہوں نے کہا تو ہر برائی سے دور ہے ہمیں تو سوا اس کے جو تو نے ہمیں بتا دیا اور زیادہ کچھ علم نہیں ہے یقیناً تو بڑا جاننے والا مناسب ہی کام انجام دینے والا ہے''۔

انسان کی خصوصیت تمام انواع کائنات میں کیا ہے؟ اختیاری طور پر علمی وعملی ترقی کی لامحدود صلاحیت انسان کے علاوہ جتنی مخلوق ہے خواہ اس سے پست ہو جیسے جمادات نباتات اور حیوانات اور خواہ باعتبار صفائے جوہر اس سے بلند ہو جیسے ملک ان میں جتنے خالق کے عطا کردہ کمالات ہیں وہ تو فعلی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان عطایائے الٰہی سے پھر خود اپنی قابلیت سے آگے بڑھنے کی طاقت ان میں یا تو نہیں ہے اور یا ہے تو بہت محدود ہے۔

انسان اور ملائکہ کے مقابلہ میں اگر صرف بتائی ہوئی چیز کے بتانے کا سوال ہوتا جو حافظہ کا امتحان ہوتا ہے تو اس میں ملک کے پیچھے ہٹنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا اس لئے کہ وہ سہو ونسیان سے برتر ہے مگر یہاں سوال اس سے زیادہ تھا۔ بتائے گئے تھے اسماء اور سوال تھا ان کو مسمیات سے مطابق کرنے کا۔ یہ امتحان عقل وفراست کا تھا۔ یہ ایسی چیز کا سوال تھا جو بتائے ہوئے حدود سے خارج تھا اور اسی لئے ملائکہ نے اظہار عجز کیا ان الفاظ میں کہ ''بس ہمیں اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہم کو بتا دیا ہے'' یعنی ہمارے بس کی یہ بات نہیں ہے کہ ہم اس سے زیادہ کچھ بتا دیں۔

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

''اس نے ارشاد کیا اے آدم تم انہیں ان لوگوں کے نام بتا دو تو جب انہوں نے ان کے نام انہیں بتا دیے تو اس نے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمان اور زمین کے چھپے ہوئے رازوں کو جانتا ہوں اور میں وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور وہ بھی جو تم دلوں میں چھپائے ہوئے تھے''۔

جب ملائکہ کی طرف سے اظہار عجز ہو گیا تو اب نظر قدرت متوجہ ہوئی آدمؑ کی طرف ہاں انسان! یہ تیرے جوہر کھلنے کا وقت ہے تو بتادے کہ ان ناموں میں سے کون ان شخصیتوں میں سے کس کا نام ہے؟ آدمؑ نے نوعِ انسانی کی خصوصیت امتیازی کو محک اعتبار پر کامل عیار ثابت کرتے ہوئے اپنی اس قوت تمیز سے کام لیا جس کے وہ بدرجہ کمال حامل تھے۔ اسماء کو دیکھا، مسمیات پر نظر کی مناسبتوں کا لحاظ کیا اور ٹھیک ٹھیک بتا دیا کہ یہ ان کا نام ہے اور یہ ان کا۔ اس طرح انسان کا امتیاز ملائکہ کے مقابلہ میں ثابت ہو گیا اور خالق کو بہت عرصہ قبل اپنے اس جواب کی عملی تصدیق نظر ملائکہ میں ہو جانے سے بطور نازش اسے یاد دلانے کا موقع حاصل ہوا کہ دیکھو میں نے نہ کہا تھا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے یعنی اب تم خوب سمجھ گئے کہ تمہیں چھوڑ کر انسان کو خلافت کے لئے کیوں منتخب کیا گیا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

''اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا اس نے انکار اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔''

حکم سجدہ اور ابلیس کا انکار:

یہ سجدہ جس کا حکم دیا گیا تھا اس کی نوعیت کیا تھی؟ قول قوی یہ ہے کہ وہ پیشانی کے جھکانے ہی کے معنی میں ہے اور وہ آدم ہی کو سجدہ تھا تعظیمی طور پر علامہ طبرسیؒ نے اس کو کہا ہے **المروی عن ائمتنا** (**مجمع**) اور قرآن کے الفاظ بھی اسی کے شاہد ہیں کیوں کہ سجدہ کی اضافت ل کے ساتھ ہوئی ہے (**لادم**) جو مسجود کا پتہ دیتی ہے قبلہ کے لئے الیٰ آنا چاہیے ل نہیں۔

ابلیس کا سجدہ سے انکار کرنا اس تکبر کی بناء پر ان سے بہتر ہوں ان کو سجدہ کیوں کروں، یہ بھی اس کا موید ہے اگر وہ فقط سمت قبلہ کی حیثیت رکھتے ہوتے اور ان کی تعظیم اس میں مضمر نہ ہوتی تو ابلیس کی رگ حمیت کو کوئی جنبش نہ ہوتی۔

بے شک اسلام میں اس طریقۂ تعظیم کا استعمال غیر اللہ کے لئے ممنوع ہو گیا ہے لیکن قبل الاسلام اس کی ممانعت نہ تھی [1]۔

ابلیس کے متعلق اسلام کا قطعی عقیدہ یہ ہے کہ وہ ایک مخلوقِ خاص کا نام ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور جس سے قرآن مجید کے مندرجہ واقعات حقیقی طور پر متعلق ہیں۔ اس کے خصوصیات جو قرآن کریم سے ثابت ہیں حسب ذیل ہیں:

وہ ایک مخلوق ہے جو آگ سے پیدا کیا گیا ہے (اعراف آیت ۱۲ وص آیت ۷۶)

وہ ذی شعور وذی حیات ذات ہے جو سوچ، سمجھ، خیال اور گمان کے اوصاف سے متصف ہوتی ہے (سبا۔ ۲۰)

اسے قیامت تک کے لئے زندہ رہنے کا موقع دیا گیا ہے (سورۂ اعراف۔ ۱۴۔ سورۂ حجر۔ ۳۶ تا ۳۸۔ سورۂ ص۔ ۷۹ تا ۸۱)

---

[1] ۔ وکان سجود الملئکة لادم تکرمة لاٰدم وطاعة لله لا عبادة لاٰدم (جامع البیان للطبری) اصح الا قوال ان لسجود کان بمعنی وضع الجبهة ولکن لا عبادة بل تکرمة وتحیة کالسلام (نیشاپوری)

اس کا ایک قبیلہ ہے جو حقیقت نوعیہ میں اس کے ساتھ شریک ہے ان کی صفت یہ ہے کہ وہ ہمیں دیکھتے ہیں ہم انہیں نہیں دیکھتے ان سب کو شیاطین کہتے ہیں (اعراف ۲۷)

اس کا قبیلہ اس کی نسل اولادی ہی کی ایک جماعت ہے جو افرادِ انسانی کو غلط راستوں پر لے جانے کی مہم میں مصروف رہتی ہے (کہف۔ ۵۰)

اطلاقات قرآنیہ پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابلیس ان میں سے اس فرد اول کا نام ہے جس سے حضرت آدمؑ ابوالبشر کے واقعات کا تعلق ہے اور الشیطان سے اکثر وہی مراد ہوتا ہے۔

ابلیس کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ فرشتہ نہ تھا بلکہ جنات میں سے تھا۔ شیخ مفید علیہ الرحمہ نے اس کے متعلق کہا ہے:

وقد جاءت به الاخبار المتواتر عن ائمة الهدٰی وهو مذهب الامامية.

اس کے متعلق رہنمایانِ دین سے متواتر حدیثیں وارد ہوئی ہیں اور یہ تمام علمائے امامیہ کا مذہب ہے۔

خود قرآن مجید میں بھی ایک جگہ آیا ہے:

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ. (کہف ۵۰)

سوا ابلیس کے وہ جنات میں سے تھا تو اس نے اپنے پروردگار کے حکم کی مخالفت کی۔

اس آیت پر نظر ڈالنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن میں یہ تصریح اس ذہنی خلفشار کو دور کرنے کے لئے ہے کہ ملک ہو کر اس سے معصیت کا صدور کیوں کر ہوا اور اسی لئے فائے تفریع کے ساتھ اس پر مرتب کر کے کہا گیا ہے ففسق عن امر ربه وہ جن میں سے تھا لہٰذا اس نے حکم رب سے انحراف کیا بے شک وہ ملائکہ سے حقیقۃً خارج ہونے کے باوجود چوں کہ ظاہراً صفوف ملائکہ میں داخل تھا اس لئے اسجدوا کا حکم جو پوری جماعت سے متعلق قرار دیا گیا تھا اس میں وہ بھی شریک قرار پایا اور اسی لئے ملائکہ کی اطاعت کے ذکر کے بعد اسکی مخالفت کو بصورت استثناء بیان کیا گیا۔ یہ مخالفت کر کے اس نے اپنی اس رگ مخالفت کا اظہار کر دیا جو حقیقت نوعیہ میں نوع ملائکہ سے مغایرت کی وجہ سے اس میں موجود تھی اور اس کے بعد وہ ظاہری طور پر بھی جمعیت ملائکہ سے خارج کر دیا گیا۔

وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ کا فقرہ بھی بظاہر اس مفہوم کا حامل ہے کیوں کہ اس کے قبل ''انکار کیا'' اور تکبر سے کام لیا سب افعال حدوثی ہیں جو ایک امر کے اس وقت وقوع میں آنے کا اظہار کرتے ہیں اور وہ کافروں میں سے تھا یہ جملہ فعل ثبوتی پر مشتمل ہے جو صفت کے پہلے سے مستقل ثبوت کا پتہ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ از اول اس نوع میں داخل نہ تھا جس کی شان سے اطاعت ہی اطاعت ہوتی ہے بلکہ یہ اس نوع کا فرد تھا جو اس کے پہلے کفر و عناد اختیار کر چکی تھی یعنی جنات جن سے زمین کو پاک کیا گیا تھا۔ یہ صرف اپنے اس وقت تک کے شخصی کردار کی بدولت اس سے الگ کر کے ملائکہ کی جماعت میں پہنچا دیا گیا تھا مگر اب اپنے دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ اس اشتراک فطرت کا جو اسے پہلے سے حاصل تھا ثبوت بہم پہنچا دیا۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا

تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

"اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں قیام کرو اور جیسا تمہارا جی چاہے اس میں سے مزے اور بے فکری کے ساتھ غذا حاصل کرو اور اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم حد سے قدم بڑھانے والوں میں سے ہو گے۔"

جنت میں آدم کا قیام اور ترک اولیٰ:

جَنّت لغت میں ہر گھنے باغ کو کہتے ہیں۔ آئمہ اہلؑ بیت کے متعدد احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے باغوں میں سے ایک تھا جس میں سورج اور چاند طالع ہوتے ہیں مگر اس کے بعد بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ اسی زمین کا ہو جب کہ نظامِ شمسی میں دوسرے سیّارات بھی ہیں جن کی فضا اور آب وہوا اس زمین سے زیادہ صالح ومتعدل سمجھی جاسکتی ہے [1]۔

بے شک خود قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے یہ یقینی طور پر ظاہر ہے کہ وہ جنت جہاں آدمؑ تھے اس زمین کے عوارض واسقام سے بری تھی:

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ (سورۃ طہ)

تمہارے لئے یہاں یہ ہے کہ تم بھوکے نہیں ہوتے اور برہنہ نہیں ہوتے اور نہ تمہیں پیاس لگتی ہے نہ بھوک کی تکلیف ہوتی ہے

اور اس آیت میں جس کی تشریح کی جارہی ہے "رغداً" کی لفظ سے بظاہر ان ہی خصوصیات کی طرف اشارہ ہے کہ زمین کی زندگی کے ساتھ محنت ومشقت دست وگریباں ہے۔ یہ بات اس جگہ نہیں تھی کہ جہاں آدمؑ کو رکھا گیا تھا۔

آدم کے ساتھ سکونت میں ان کی رفیقِ زندگی بھی شریک تھیں۔ جنہیں قرآن مجید نے ہر جگہ آدم کی اضافت کے ساتھ زوج کے لفظ سے یاد کیا ہے جیسے اردو میں زوجہ کہا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سلسلۂ اناث کی پہلی فرد جسے آدم کے لئے شریکِ حیات قرار دیا گیا تھا وجود میں آچکی تھی۔

ان کی خلقت کس طرح ہوئی تھی اور ان کا نام کیا تھا اس کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے روایات میں ان کا نام حواء وارد ہوا ہے۔

اس کے علاوہ جو چیز قرآن سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جنت میں ہر چیز سے غذا حاصل کرنے کی آزادی کے ساتھ انہیں کسی مخصوص درخت سے منع کیا گیا تھا کہ اس کے قریب نہ جانا۔

کلامِ عرب میں جس کی نظیریں قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر بھی موجود ہیں "قریب نہ جانا" کے لفظ کا استعمال کسی شے سے متعلق عمل سے ممانعت کے مفہوم میں ہوتا ہے جیسے:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ. (بنی اسرائیل ۳۴)

---

[1] ۔روی الکلینی وابن بابو یہ مسندا و القمی مرفوعا عن ابی عبداللہ ان جنۃ ادم من جنان الدنیا وھل الا یستلزم کونھا فی الارض (البلاغی)

مال یتیم کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہتر سے بہتر ہو۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾. (بنی اسرائیل)

اور زنا کاری کے پاس نہ جاؤ یہ بڑا شرمناک کام ہے اور بہت برا راستہ ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ. (بقرہ ۲۲۳)

ان عورتوں کے پاس نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں۔

لہٰذا یہاں کلا منہا رغدا ''اس سے بآرام کھاؤ'' کے بعد بقرینہ سیاق ولاتقرباء سے مراد اس درخت سے کھانے کی ممانعت ہے۔

یہ درخت کون سا تھا؟ هذه الشجرة ''اس درخت'' کہنے سے ظاہر ہے کہ حضرت آدمؑ کے لئے مخصوص طریقہ پر اس درخت کی تعیین ہوگئی تھی مگر اشارہ کے ساتھ تعیین کا خاصہ یہ ہے کہ مقصود صرف لفظوں سے معیّن نہیں ہوا کرتا۔ اس میں کوئی عمل جو مفید اشارہ ہو ضرور دخیل ہوتا ہے۔ اسے مخاطب اسی عمل کی مدد سے سمجھا کرتا ہے مگر دوسروں کے لئے جب کہ حکایت صرف الفاظ کی کر دی گئی ہو یا تحریر میں صرف الفاظ آ جائیں تو اس کا سمجھنا کلام سے غیر ممکن ہو جایا کرتا ہے اور ایسے ہی وہ مقامات ہیں جہاں نمایاں طور پر کتاب کا غیر کافی ہونا ثابت ہوتا ہے ایسے مقامات پر تفسیر و تشریح کی طرف تشنگی بالکل بدیہی حیثیت رکھتی ہے۔ اب اگر روایات اس بارے میں مختلف ہو گئے تو پھر اس کی تعیین کا کوئی ذریعہ ہے بھی نہیں اور وہ کچھ ضروری بھی نہیں جبکہ ہمارے ایمان و عمل کا اس کے سمجھنے سے کوئی تعلق نہیں [1]۔

جس چیز کا سمجھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یہ نہی کسی قسم کی تھی اس کیلئے تحقیق یہ ہے کہ نہی مولوی نہ تھی بلکہ ارشادی تھی۔ نہی مولوی وہ ہے جو بحیثیت حاکم قانونی طور پر کی گئی ہو۔ اس کی مخالفت میں سزا کا استحقاق ہوتا ہے اور اسی کی مخالفت کا نام گناہ ہے جو عصمت انبیاء کے خلاف ہے اور نہی ارشادی کی حیثیت ایک ''ناصحانہ مشورہ'' کی ہوتی ہے جس کی مخالفت میں کچھ قہری مضرتیں مضمر ہوتی ہیں جنہیں سزا نہیں بلکہ عمل کا صرف نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے جیسے طبیب کا مریض کو کہنا کہ فلاں فلاں چیز نہ کھانا اب اگر اس نے کھایا اور نقصان ہوا تو یہ کہنا درست نہیں ہے کہ طبیب نے مخالفت کی سزا دی جو یہ ان تکالیف میں مبتلا ہوا بلکہ طبیب نے اپنے علم کی بناء پر جن مضرتوں کی خبر دے دی تھی وہ اس امر پر مرتب ہوئیں جو درحقیقت اس عمل کا لازمی نتیجہ تھیں۔

قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بتایا ہے کہ حضرت آدمؑ کو جو ممانعت کی گئی تھی تو پہلے سے اس کی مخالفت کے نتائج بتا دیئے تھے اس طرح کہ ابلیس کی عداوت پر انہیں متنبہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا تھا: لا یخرجنکما من الجنة فتشقی ان لك الا تجوع فیها ولا تعرٰی انك لا تظمأ فیها ولا تضحٰی دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو بہشت سے نکالنے کا باعث ہو جائے جس کی وجہ سے تم مشقت میں گرفتار ہو جاؤ۔ یہاں تو تمہارے لئے ہے کہ تم بھوکے نہیں ہوتے برہنہ نہیں ہوتے پیاس نہیں لگتی اور تمہیں دھوپ کی تکلیف پیش نہیں آتی اسی سے ظاہر ہے کہ یہ نہی مولوی نہیں ہے اب جب کہ ایک جگہ نتائج کی تفصیل موجود ہے تو زیر نظر آیت میں فتکونا من الظالمین کے اجمال کو بھی اسی مفہوم کا

---

[1] ۔الم یضع لعبادہ دلیلا علیٰ ذلك فی القرآن ولا فی السنة الصحیحة (طبری) ولا علم لنا بایّة شجرة کانت علی التعیین فلا حاجة ایضا الیٰ بیانه (رازی)

حامل ماننا پڑے گا۔

ظلم کے معنی لغت میں وضع الشئی فی غیر محلّہ کے ہیں اور قرآن کریم نے اس کی جامع تعریف کر دی ہے کہ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ یعنی ''اللہ کی مقرر کردہ حدوں سے قدم آگے بڑھانے والے ظالمین ہیں'' لیکن حد کو دیکھنا پڑے گا کہ وہ بطور وجوب والزام قرار دی گئی ہے یا بطور ندب واستحباب یا بحیثیت ارشاد اس اعتبار سے ظلم کا حکم مختلف ہو جائے گا وہ ظلم جو حد وجوبی سے تجاوز کی صورت میں ہو گناہ ہوگا اور جو کسی دوسری قسم کی حد سے تجاوز ہو وہ زیادہ سے زیادہ ''ترک اولیٰ'' کا مصداق قرار پا سکتا ہے گناہ نہ ہوگا جو عصمت کے منافی ہو[1]۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝۳۶

''اس کے بعد شیطان نے ان کا قدم پھسلا کر وہاں سے ہٹانے کا سامان کیا تو انہیں جس میں وہ تھے اس سے نکلوا دیا اور ہم نے کہا کہ اتر جاؤ تم میں ایک کا ایک دشمن ہوگا اور تمہیں زمین پر ٹھہرنے اور ایک میعاد تک فائدہ اٹھانے کا موقع ہوگا۔''

شیطان سے مراد وہی ابلیس ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے وہ اس کا نام تھا یہ اس کا وصف ہے جواب اس کی شرارت کے ظہور کے بعد اس کے لئے ہمیشہ کے واسطے ثابت ہو گیا[2]۔

زلّ کے معنی قدم کا پھسلنا اور ازلّ کے معنی ہیں ''پھسلایا'' اس کے مفہوم میں یہ مضمر ہے کہ اس عمل میں مخالفت الٰہی کا قصد وارادہ نہ تھا اب پھسلنے میں چوں کہ ایک جگہ سے ہٹنے کا تصور شریک ہے اس لئے اس کے متعلق عنہا کے لفظ سے ذکر کیا گیا یہ ضمیر جنت کی طرف راجع ہے[3]۔

اس سے بھی ظاہر ہے کہ شیطان کے کہنے سے جو کچھ ضرر مترتب ہوا وہ بس جنت سے ہٹنا تھا۔ یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ وہ نہی جس کی مخالفت ہوئی ''ارشادی'' تھی نہی مولوی نہ تھی ورنہ اس کے نتیجہ میں سب سے بڑی چیز مالک کی ناراضی بیان ہونا چاہیے تھی۔ اور اسی نقصان ومضرّت کی پھر تشریح یہ کی گئی کہ اس عیش وآرام سے جس میں وہ تھے شیطان ان کے نکلنے کا باعث ہو گیا یہی وہ مضرت تھی جس سے بچانے کے لئے وہ ممانعت ہوئی تھی اور اس کی تکمیل اس حکم الٰہی سے ہو گئی کہ اترو بس اب زمین پر تمہیں ایک مدت تک رہنا اور عمر گزارنا ہوگا۔

---

[1] ۔ والنهی فی لا تقر با للتنزیة او للتحریم الاصح الاول. لیر جع حاصل معصیة الیٰ ترك الاولیٰ فیکون اقرب الیٰ عصمة الانبیاء (نیشاپوری) والنهی ههنا للا رشاد لا للتحریم (فتکون امن الظالمین) لا نفسکما با لخروج من النعیم الی التعب ومثل هٰذا الظلم لا یستوجب ذما ولا یعد ذنبا (بلاغی)

[2] ۔الشیطان فیعال من شطن ای بعد سمی به لبعدہٖ عن الخیر وعن الرحمة (بغوی)

[3] ۔ازلهما عن الجنة بمعنی... ابعدهما منها. فان الازلال والازلاق یقتضی زوال الزّال عن موضوع البتة (ابوالسعود)

اس کا ظاہری مفہوم اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ وہ جنت زمین پر نہ تھی۔

اس شیطان کی وسوسہ انگیزی کے پہلے ضمیریں تثنیہ کی تھیں ''دونوں اس جگہ رہو'' دونوں جس طرح چاہیے کھاؤ پیو'' دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا'' نہیں تو تم دونوں ظالموں میں سے ہوگے۔۔۔ان کے مخاطب حضرت آدمؑ وحضرت حوّا تھے۔اب ابلیس کا ذکر آ گیا تو تین ہو گئے اس لئے اھبطو ا اتر واور بعضکم لبعض عدوتم میں ایک کا ایک دشمن ہوگا۔جمع کی ضمیریں صرف ہوئی ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سجدہ نہ کرنے کے بعد شیطان مجمع ملائکہ سے تو خارج کر دیا گیا تھا مگر مکانی طور پر عالمِ اعلیٰ سے نکالا نہیں گیا تھا اور اسی لئے اس جنت میں آدمؑ وحوّا تک پہنچ سکا۔اب اس وسوسہ انگیزی کے بعد اس کو مکانی طور پر بھی وہاں سے نکالا گیا جو اس کے لئے تو بطور سزا ہی تھا کیوں کہ وسوسہ انگیزی اس کا بطور شرارت ارادی فعل تھا اور آدمؑ وحوا کیلئے یہ ان کے فعل کا لازمی نتیجہ تھا جسے مرتب ہونا اب ضروری تھا اتنی وہ باتیں ہیں جو قرآن کریم سے ثابت ہوسکتی ہیں اس کے آگے جو تفاصیل روایات میں درج ہیں ان کی حقیقت مولوی عبدالماجد دریابادی کے قلم سے سنیے وہ لکھتے ہیں:

''بائبل میں ہے کہ یہ بہکانے والا سانپ کی صورت میں گیا،اس نے آ کر پہلے حضرت حوّا کو بہکایا اور پھر انہوں نے حضرت آدمؑ کو بھی ترغیب کی ہمارے مفسرین نے بھی ایک طویل قصہ نقل کیا ہے جس میں شیطان سانپ طاؤس سب کا ذکر آتا ہے۔یہ قصہ بجائے خود کہاں تک صحیح ہے اس سے یہاں بحث نہیں کہنا صرف یہ ہے کہ یہ اسلامی عقائد میں بہرحال داخل نہیں اور اس کا مآخذ قرآن وسنت نہیں بلکہ اسرائیلی روایات ہیں جو اہل تفسیر زیادہ محتاط ومحقق ہوئے ہیں وہ اس سے الگ ہی رہے ہیں بلکہ اس سے احتیاط ہی کی تنبیہ کی گئی ہے:

اعلم ان هذا و امثاله مما يجب ان لا يلتف اليه[1] (كبير) و قدا كثر المفسرون فى نقل قصص كثيره فى قصة ادم و حوا و الحية والله اعلم بذلك[2] (بحر) و قدذ كر المفسدون ههنا اخبار اسرائيلية[3] (ابن كثير)

علامہ بلاغیؒ نے لکھا ہے:

قدرويت فى كيفية وصوله اليها والوسوسة والمخاطبة بالاغواء روايات لم تصح.(آلاء الرحمٰن)

شیطان حضرت آدمؑ اور حضرت حوّاء تک کیوں کر پہنچا اور وسوسہ انگیزی کس طرح کی اور کہاں انہیں ورغلایا اس سب کے بارے میں ایسی روایتیں آئی ہیں جو پایہ صحت تک پہنچی ہوئی نہیں ہیں۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۳۷

''اس کے بعد آدمؑ نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھ لئے تو اس نے ان کی توبہ قبول کر لی۔وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا بہت مہربان ہے۔''

---

[1] ۔معلوم ہونا چاہیے کہ یہ اور ایسی روایتیں وہ ہیں جن کی طرف توجہ نہ کرنا واجب ہے۔

[2] ۔مفسرین نے بکثرت قصے آدم اور حوّا اور سانپ کے بارے میں درج کیے ہیں اور حقیقت حال سے بس اللہ واقف ہے۔

[3] ۔مفسرین نے یہاں بہت سی اسرائیلی روایتیں درج کر دی ہیں۔

توبہ اور اس کی نوعیت:

درخت کے قریب جانے سے ممانعت جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا اگر چہ مولوی نہ تھی، ارشادی تھی مگر اس قسم کی بھی خالق کی ہدایت سے عملی انحراف ایک بلند درجۂ اطاعت کے لحاظ سے پست ضرور تھا اور اس معنی سے اسے ترک اولیٰ کہنا درست ہے اور اسی لئے وہ اگر چہ اصطلاحی گناہ نہیں جو منافی عصمت ہو مگر ایک نبی کو اس بلند تر درجہ سے اپنے پیچھے ثابت ہونے کا احساس اتنا ہی کرب اور بے چینی سے مبتلا کرتا ہے جتنا ایک واقعی گنہ گار کو اس کا گناہ بلکہ یہ گنہ گار چوں کہ اپنے ضمیر میں اتنی بیداری نہیں رکھتا اور اس کی نگاہ میں عظمت معبود کا اتنا احساس نہیں اس لئے یہ اتنی تڑپ محسوس نہیں کرتا جتنا خالق کا ایک معصوم بندہ صرف کسی مستحب کے ترک ہونے بلکہ بسا اوقات اپنے ذوق و حوصلہ اور ولولۂ اطاعت کے درجہ تک عبادت سے قاصر رہنے کی وجہ سے تڑپ محسوس کرتا ہے۔

اب اگر بندہ واقعی گنہ گار ہوتا تو خالق کی ناراضگی نگاہ مرحمت کو اس سے ہٹائے ہوئے ہوئی۔ اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ خود اس کی طرف متوجہ ہو کر اسے توبہ کا کوئی ذریعہ بتائے۔

یوں عمومی طور پر عفو گناہان کے لئے دعاؤں کا وارد ہو جانا اور چیز ہے اور کسی بندہ کی طرف خصوصیت کے ساتھ نگاہ توجہ الٰہی کا مبذول ہونا اور چیز ہے یہ توجہ تو خود بتاتی ہے کہ بندہ حقیقی معنی میں گنہ گار نہیں ہے صرف ذوق عبودیت کی بلندی سے بارگاہ الٰہی میں اپنے مجرم ہونے کا تصور قائم کر کے دل میں کڑھ رہا ہے، پریشان ہے اور ایک اضطراب محسوس کر رہا ہے اس لئے خداوند کریم کا لطف خصوصی اور تفضّل امتیازی اس بندہ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی تسلی کا سامان بہم پہنچاتا ہے اس طرح کہ اسے خود کچھ انداز توبہ سکھاتا ہے کہ اچھا تم سے اگر کچھ کمی ہوئی ہے جس سے تم اپنے کو مجرم محسوس کرتے ہو تو یہ میرا بتایا ہوا انداز اختیار کرو پھر اس کے بعد جو کمی تم سے ہوئی تھی وہ کالعدم ہو جائے گی اسی کو کہتے ہیں توبہ کا قبول ہونا۔

اب اس توجہ باری کو دیکھ کر اور اس ہدایت ربانی پر عمل کر کے اس عبد الٰہی کو گونہ سکون محسوس ہوتا ہے اور یہ خالق کی عنایت اس کے زخم پر پھاہا رکھ کر اب آئندہ زندگی میں ایک بلند تر معیار طاعت و عبادت کی عملی پابندی کے لئے اسے ذوق و شوق اور نیا حوصلہ بخشنے میں مددگار ہوتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ یہاں نہ حقیقت میں گناہ تھا اور نہ گناہ سے توبہ اور اس کی قبولیت بلکہ صرف وہ آدمؑ کی جلالت کے لحاظ سے ایک بلند تر مرتبہ سے پیچھے رہنا تھا اور اسی کے شدت احساس کے ساتھ آئندہ سے اس سے باز رہنے کا عزم توبہ تھا اور خالق کی طرف سے ان کو اپنی پوری مہربانی و عنایت کے استحقاق کی اطمینان دہانی قبولِ توبہ ہے۔

اس سے سیاق کلام ربانی میں ایک طرح کے اختلاف اسلوب کا راز معلوم ہوگا وہ یہ کہ ممانعت جو درخت کے پاس جانے سے ہوئی تھی اس میں آدمؑ اور حوّا دونوں شریک تھے اور وہاں صیغے تثنیہ کے صرف ہوئے تھے مگر اس کے بعد توبہ کے لئے الفاظ سیکھنے سکھانے اور اس کے بعد توبہ کی قبولیت کے محل پر صرف آدمؑ کا نام لیا گیا اور مفرد ہی صیغے صرف ہوئے اس کا کیا سبب ہے؟ سبب یہی ہے کہ اگر وہ قانونی گناہ ہوتا تو قانون چوں کہ عام ہوتا ہے اس لئے جرم مشترک ہوتا اور توبہ اور اس کی قبولیت دونوں کے لئے ضروری ہوتی مگر چوں کہ وہ گناہ تھا ہی نہیں بلکہ ترک اولیٰ تھا صرف آدمؑ کی جلالت قدر کے لحاظ سے اور قبول توبہ اسی احساس کے مقابلہ میں تسلی دہانی تھی، اس لئے ان چیزوں کا تعلق صرف آدمؑ سے رہا۔ ترک اولیٰ جناب آدمؑ کا تھا اس پر اضطراب اور بے چینی اور جیسا کہ روایات میں ہے شدت گریہ سب آدمؑ کے لئے ہوا اور اسی لئے الفاظ توبہ سکھانے کی ضرورت آدمؑ کو ہوئی اور قبولِ توبہ کی تصریح بھی ان کی نسبت ہوئی یہ اور بات ہے کہ جب آدمؑ نے الفاظ سیکھ لئے تو حوّا کو بھی سکھا دئے ہوں اور دونوں

نے زبان پر جاری کر لئے ہوں جیسا کہ دوسری جگہ ہے قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ (اعراف) یا ہم کہیں کہ حوا بھی طبقہ خواتین میں کسی خاص درجہ رہنمائی پر فائز تھیں۔ اس لئے وہ کسی حد تک ان کے لئے بھی ترک اولیٰ تھا اور اس لئے انہیں اتنی بے چینی نہ سہی جو حضرت آدمؑ کو تھی پھر بھی انفعال ہوا اور انہوں نے الفاظ توبہ کے ادا کرنے میں آدمؑ کے ساتھ شرکت کی۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

''ہم نے کہا تم سب اس سے اتر جاؤ۔ اس کے بعد اگر میری طرف سے تمہاری جانب کوئی ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ انہیں رنج پہنچے گا۔''

قبول توبہ کے بعد پھر بھی اترنے کا حکم ہونا اس کی دلیل قوی ہے کہ زمین پر اتارا جانا آدمؑ وحواؑ کے لئے بطور سزائے جرم نہ تھا۔ ورنہ قبول توبہ کا اعلان ہو چکنے کے بعد پھر سزا کے برقرار رہنے کے کوئی معنی نہیں۔

حقیقت امر یہ ہے کہ یہ سزا نہیں تھی بلکہ درخت کے قریب جانے کا لازمی اثر تھا جس کا مرتب ہونا بہر حال ضروری تھا اور واقعہ تو یہ ہے کہ آدمؑ اسی زمین کی خاطر پیدا ہی ہوئے تھے جیسا کہ خلقت کے پہلے ہی ملائکہ کو خبر یہی دی گئی تھی کہ انی جاعل فی الارض خلیفۃ میں زمین میں جانشین قرار دینے والا ہوں''۔ درخت سے تناول کر لینا زمین پر بھیجے جانے کا فوری سبب ہو گیا اور اگر یہ سبب وقوع میں نہ آتا تو کچھ مدت تک اور جنت میں رہنے دیا جاتا مگر آخر میں پھر اس زمین پر بھیجے جاتے جس سے ان کے مقصدِ خلقت کی تکمیل بہر حال وابستہ تھی۔

اب قلنا اھبطوا کے بعد جو خطاب ہے وہ آدمؑ اور حواؑ کو سامنے رکھ کر اس پوری نوع سے ہے جو ان کی ذریت میں سے اس معمورہ ارض کو نسلاً بعد نسلٍ آباد کرے گی۔ اور اب اس حکم سے قوانین تکلیفیہ کا آغاز ہو رہا ہے جس کے ساتھ جزا و سزا کا وعدہ و وعید بھی موجود ہے یعنی نوعِ انسانی کے سامنے انبیاء و مرسلین کی زبانی جو تعلیمات پہنچتے رہیں گے ان کی جو اطاعت کریں گے انہیں نجات حاصل ہوگی۔

نجات کے مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ انہیں خوف اور رنج درپیش نہ ہوگا اس کا خوف و رنجِ دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بالمقابل جو کفر اختیار کریں گے ان کے ذکر میں آئندہ آیت میں آگ میں ہمیشہ رہنے کا ذکر ہے وہ یقیناً آخرت سے متعلق ہے اسی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ خوف اور رنج کی نفی جو اہل ایمان سے کی گئی ہے یہ بھی آخرت سے متعلق ہے ورنہ دنیا میں تو صاحبان ایمان اکثر و بیشتر خوف و رنج میں مبتلا رہتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور جو کفر اختیار کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے یہ دوزخ والے ہوں گے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

نار کے معنی تو مطلق آگ کے ہیں مگر اس پر ال عہد خارجی کا ہے جس سے اشارہ اس خاص آگ کی طرف ہوتا ہے جو آخرت کے

عذاب کے لئے الٰہی مخبروں نے بتائی ہے جسے اصطلاحاً جہنم کہا جاتا ہے اور اس کا ترجمہ دوزخ کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ مولوی عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے اس آگ کا ذکر سابقہ کتب سماویہ میں بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے جیسے فرشتے نکلیں گے اور شریروں کو راست بازوں سے جدا کر دیں گے اور انہیں آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے وہاں رونا اور دانتوں کا پیسنا ہوگا۔ (متی ۱۳:۴۹و۵۰)

اے ملعونو! میرے سامنے سے اس ہمیشہ کی آگ میں چلے جاؤ جو ابلیس اور اس کے تابعین کے لئے تیار کی گئی ہے اور یہ ہمیشہ کی سزا پائیں گے (متی ۲۵:۴۱و۴۶)

''جہنم میں ڈالا جائے جہاں اس کا کیڑا نہیں مارتا اور آگ نہیں بجھتی (مرقس ۹:۴۸)

یہی دونوں باتیں کہ اس آگ میں داخل ہونے والے کے لئے پھر موت نہیں جو اس عذاب کو ختم کر دے اور نہ وہ آگ خود بجھنے والی ہے کہ اس سے کبھی نجات حاصل ہو سکے قرآن کریم میں خالدون کے لفظ سے ادا کی گئی ہیں۔

یہ خلود جنت اور جہنم دونوں کا وصف ہے وہاں کی نعمت ختم ہونے والی نہیں اور یہاں کا عذاب ہاں جہنم سے کچھ اشخاص کو جن کی معصیت حد کفر تک نہیں پہنچتی ہے میعادی سزا بھی دی جائے گی اور بقدر گناہ اس سزا کے ختم ہونے کے بعد وہ بہشت میں جو ان کی اصلی جگہ سے ہمیشہ کے لئے داخل کر دیے جائیں گے یہ لوگ دراصل اصحاب النار کی لفظ کے مستحق ہیں ہی نہیں کیوں کہ یہ عذاب ان کے لئے ان کی دنیا کی بہت سی تکلیفوں کی طرح ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے انجام آخر کے اعتبار سے انہیں اصحاب الجنۃ ہی سمجھنا درست ہے اور اسی لئے کفر اور تکذیب کرنے والوں کے ذکر کے ساتھ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ کے لفظ کہے گئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوں وقتی طور پر عذاب جہنم سے چاہے کچھ اور لوگوں کو بھی سزا یاب بنا دیا جائے مگر اصلی تعلق رکھنے والے دوزخ کے ساتھ یہی لوگ ہیں جنہوں نے جان بوجھ کر کفر اختیار کیا اور آیات الٰہیہ کی تکذیب کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾

''اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جس سے میں نے تمہیں نوازا اور مجھ سے جو معاہدہ ہے اسے پورا کرو تو میں تم سے معاہدہ پورا کروں اور اس کے بعد مجھ سے ڈرتے رہو۔''

بنی اسرائیل اور ان کا کردار:

حضرت ابراہیم خلیل کے فرزند اسحٰق کے بعد ان کے فرزند یعقوبؑ ہوئے جو اسرائیل کہلائے عبرانی میں ایل کی لفظ اللہ کے لئے آتا ہے اور اسی وجہ سے ملائکہ کے ناموں میں یہ لفظ آیا کرتا ہے جیسے جبرائیلؑ، عزرائیلؑ، اسرافیلؑ وغیرہ۔ اس سے اس طرح کی اضافت نکلتی ہے جیسے عبداللہ قدرۃ اللہ وغیرہ اسراء کے معنی قوۃ کے تھے اور اس طرح اسرائیل کے معنی ہوئے ''اللہ کی قوت''۔

اس لقب کے ساتھ انکا تعارف صرف بطور نسبت اظہار شرف کے لئے ہوسکتا ہے جیسے آدمؑ کے لئے صفی اللہ، شیث علیہ السلام کے ھبتہ اللہ نوحؑ کے لئے نجی اللہ وغیرہ کے القاب لیکن اس لقب کے ساتھ ملقب ہونے کی تقریب کے طور پر مروجہ توریت میں ایک خرافی حکایت درج کی گئی ہے جس میں یعقوبؑ کا خدا کے ساتھ کشتی لڑنا مذکور ہے۔ یہ حکایت بالکل بے بنیاد اور یہود کی اختراع کردہ ہے جو جلال الٰہی کے بالکل خلاف ہے۔

بنی اسرائیل صدیوں تک دنیا میں بڑے عروج کی منزل پر رہے انہیں اللہ نے اپنی جس نعمت سے نوازا اس کی ذرا تفصیل دوسری جگہ قرآن میں حضرت موسیٰؑ کی زبان درج ہوئی ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾ (مائدہ)

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم والو یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو جو تم پر ہے جب کہ اس نے تم میں پیغمبر بنائے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تم کو وہ دیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا۔''

ان کے خالق نے اور جو خصوصی فضل و احسان کے مظاہرے فرمائے ہیں اور ان کے ساتھ جو جو رعایتیں ہوئی ہیں ان کا ذکر اسی سورہ بقرہ میں بہت دور تک جستہ جستہ آتا رہے گا مگر ان تمام نعمتوں، ان تمام احسانوں اور رعایتوں کے باوجود اس قوم کی اکثریت برابر خالق کی نافرمانی کرتی رہی اور چند دفعہ ایسا ہوا کہ من حیث القوم سب کے سب مرتد ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ باوجودیکہ صدہا برس تک انبیاء اس قوم میں ہوتے رہے آخر میں نبوت کی نعمت اس سے سلب ہوگئی اور آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو مبعوث ہوئے وہ آل ابراہیم کی دوسری شاخ یعنی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہوئے۔ یہ چیز بنی اسرائیل کے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔

زمانہ نزولِ قرآن میں یہ بنی اسرائیل دو مذہبوں میں تقسیم تھے۔ ایک یہود جو حضرت موسیٰؑ تک مانتے تھے اور عیسیٰؑ کے قائل نہ تھے دوسرے نصاریٰ جو حضرت عیسیٰؑ کو رسالت کی منزل سے گزار کر خدا یا خدا کے بیٹے کی حد تک مانتے تھے۔ اسلام سے ان دونوں قوموں کو علاوہ مذہبی اختلاف کے یہ جذباتی تعصب بھی تھا کہ یہ رسول ہماری قوم سے نہیں آیا ہے بلکہ بنی اسماعیل سے آیا ہے جو روایات قدیمہ کے بالکل خلاف ہے اس آیت میں قرآن مجید نے اسی کا جواب دیا ہے اور کہا ہے کہ ذرا میرے احسانات کو یاد کرو کہ تمہارے ساتھ میں نے کیا کیا حسن سلوک کیا اس کے ساتھ تم نے ہمیشہ کفران نعمت اختیار کیا پھر اب اگر ایک دوسری قوم کی نوازش نعمت و فضلِ نبوت کے ساتھ ہوگئی تو اس پر چراغ پا کیوں ہوتے ہو؟

پھر یہ کہ خود تمہارے انبیاء نے جنہیں تم اپنا رہنما جانتے ہو پہلے ہی میری طرف سے تم کو یہ خبر پہنچادی تھی کہ آخر زمانہ میں اولاد اسمٰعیلؑ سے ایک نبی پیدا کروں گا۔ اب وہ نبی آیا ہے تو مجھ سے اپنے اس عہد کو پورا کرو کہ اس کی اطاعت کرو گے پھر مجھ سے اس کے بعد اپنے لئے بھی نوازش و اکرام کے عہد کو پورا کرنے کے متوقع ہونا۔ اور جب ایسا نہیں ہے تم کفران نعمت کرتے رہے اب عہد شکنی کر رہے ہو تو پھر مجھ سے تم کسی خوشگوار نتیجہ کا مطالبہ کیوں کرتے ہو تمہیں تو اب مجھ سے ڈرتے ہی رہنا چاہیے۔

اس سے ایک عام اصول مستفاد ہوتا ہے کہ اگر انسان خدا کے ساتھ اپنے فریضہ کی تکمیل نہیں کرتا تو اسے حق بھی نہیں کہ وہ اللہ سے اس کے کسی وعدے کی تکمیل کا مطالبہ کرے اسی لئے امام جعفر صادقؑ نے اس آیت کو پیش فرمایا اس شخص کے جواب میں جس نے پوچھا تھا کہ خدا نے

قبولیت دعا کا وعدہ کیا ہے پھر ہم دعائیں کرتے ہیں تو وہ کیوں نہیں قبول ہوتیں آپ نے فرمایا:

انکم لاتفون للہ بعھدہ فانہ تعالیٰ یقول اوفوا بعھدی اوف بعھدکم واللہ لو وفیتم للہ سبحانہ لوفی لکم (صافی)

(یعنی) تم اللہ سے وہ عہد جو اس نے تم سے لیا ہے پورا نہیں کرتے خود اس نے ارشاد کیا ہے کہ تم میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا۔ اگر تم اللہ سے وعدہ وفائی کرتے تو وہ بھی تم سے ایفائے وعدہ کرتا[1]۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ ۪ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

''اور اس پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کیا ہے تصدیق کرتا ہوا اس کی جو تمہارے پاس ہے اور اس کے اول نمبر کے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کو ذرا سی قیمت پر ہاتھ سے نہ دے دو ورنہ پھر مجھ سے بچاؤ کی فکر کرو''۔

''اس پر جو اب نازل کیا ہے''۔ اس سے مراد قرآن ہے اور جو تمہارے پاس موجود ہے اس سے مراد توریت ہے مطلب یہ ہے کہ اس نبی اور اس کی زبان پر کلام الٰہی اتارے جانے کی اطلاع تو خود توریت میں موجود ہے۔ یہ کتاب تو اس کی سچائی کا عملی ثبوت ہے تو تمہیں تو اس پر اول درجہ کا مومن ہونا چاہیے نہ یہ کہ تم ہی اس کے اول درجہ کے کافر نظر آؤ۔

چوں کہ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت اور قریش کی شکستوں کے بعد اب سب سے بڑے منکر قرآنی صداقت کے یہود ہی نظر آرہے تھے اور واقعہ یہ تھا کہ وہ اس وقت اول درجہ کے کافر بنے ہوئے تھے اس لئے یہ کہا گیا کہ بجائے اول درجہ کے مومن ہونے کے تم اتنی شدت سے کافر کیوں ہو یہ کوئی قید احترازی نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے کافر نہ بنو دوسرے کافر ہوں تو کوئی ہرج نہیں[2]۔

اسی طرح یہ کہ ''میری آیتوں کو ذرا سی قیمت پر ہاتھ سے نہ دے دو''۔ اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ بہت قیمت ملے تو دے دو بلکہ واقعہ یہ تھا کہ علمائے اہل کتاب ذرا ذرا سے نفع کی خاطر احکام الٰہیہ میں تحریف کرتے تھے تو ان کے عمل کی جو حقیقی صورت تھی اس کی رکاکت اور پستی دکھانے کے لئے یہ الفاظ صرف کیے گیے ہیں پھر یہ کہ آیات الٰہیہ پر عمل میں جو بلند مفاد وابستہ ہے اس کے لحاظ سے اس کے مقابلہ میں جو بڑی سے

---

[1] ۔ویوخذ منالا یۃ قاعدۃ کلیۃ وھی ان من لم یف بعھد اللہ فیما اخذہ من الدین والشریعۃ فھو بنفسہ قد نقض عھد اللہ معہ وخرج عن کونہ اھلا لما وعدبہ من اللطف والرحمۃ واستجابۃ الدعاء (البلاغی)

[2] ۔(اول کافر) اوّل من یعدّ من الکافرین وذلک لفاحش کفرکم بعد قیام الحجۃ علیکم من وجوہ عدیدۃ یقال لکثیر الکذب وشدید الفسق اول کاذب واول فاسق ای اول من بعد من الکذبین ومن الفاسقین (البلاغی) لیس فی نھیہ عن ان یکونوا اول کافر بہ دلالۃ علیٰ انہ یجوز ان یکونوا آخر کافر بہ. کما قال الشاعر من انس لیس فی اخلاقھم عاجل الفحش ولا سؤ الجزع ولیس یریدان فیھم فحشا آجلا (مجمع البیان)

بڑی قیمت بھی وہ حاصل کریں گے "ثمن قلیل"[1] ہی ہوگی۔

آخر میں و ایای فاتقون کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس طرز عمل پر قائم رہو گے تو پھر تمہارے لئے میرے عذاب کا استحقاق یقینی ہے اب اگر کر سکتے ہو تو اس سے بچاؤ کی فکر کر لو۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾

"اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور نہ حق کو چھپاؤ حالانکہ تم جانتے بھی ہو"۔

امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالبؑ نے نہج البلاغہ میں مندرج ایک کلام کے ذیل میں فرمایا ہے:

فلو ان الباطل خلص من مزاح الحق لم یحف علی المرتادین ولو ان الحق خلص من الباطل انقطعت عنه السنّ المعاندین ولکن یؤخذ من هٰذا ضغث ومن هٰذا ضغث فیمزجان ویخرجان معا فهنالك یستولی الشیطان علیٰ اولیائه.

اگر باطل حق کی آمیزش سے صاف ہو تو طلب گاروں پر پوشیدہ نہ رہے اور اگر حق باطل سے الگ ہو تو معاندین کی زبانیں اس پر نکتہ چینی سے بند ہو جائیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ ایک مٹھا اس کا لیا جاتا ہے اور ایک مٹھا اس کا اور دونوں کو ملا جلا دیا جاتا ہے اور اس طرح ایک ساتھ سامنے لایا جاتا ہے تو اب نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شیطان اپنے حوالی موالی پر قابو پا جاتا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ نرا کھرا جھوٹ ہو تو اتنا خطرناک نہیں ہے جتنا وہ جھوٹ جس میں سچائی کا شائبہ بھی شریک ہو۔ سیاست دان مخالف اکثر اسی طرح کا جھوٹ بولا کرتے ہیں چنانچہ اس وقت بھی رسولؐ کے مقابلہ میں ایسا ہی کرتے تھے مثلاً اہل کتاب کبھی یہ کہہ دیتے تھے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیغمبر بحق ہیں لیکن اولاد اسمٰعیلؑ اور قریش کے لئے ہیں۔ ہم سے کیا مطلب اس کی صدائے بازگشت آج کل بعض تعلیم یافتہ ارباب وطن کے دہن سے بلند ہوتی ہے ان الفاظ میں کہ محمدؐ صاحب ملک عرب کی ہدایت کے لئے معبوث ہوئے تھے اور سچے رسول تھے یا کچھ نام نہاد مسلمان یہ کہتے ہیں کہ روزہ نماز وغیرہ کے احکام عرب کے ماحول اور اس زمانہ کی فضا کے لحاظ سے تھے۔ اب ہم سے ان کا تعلق نہیں ہے ایسی ہی باتوں پر قرآن مجید نے یہ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ حق کو باطل سے نہ ملاؤ[2]۔

لبس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جن الفاظ میں حقیقت پنہاں ہے ان کے معانی بدل کر حقیقت کو مشتبہ بنایا جائے۔ اس میں علمائے اہل کتاب ید طولیٰ رکھتے تھے بشارتین بعثت محمد مصطفیٰؐ کی باوجود ہزاروں لفظی تحریفوں کے بھی آج تک توریت اور انجیل میں موجود ہیں مگر علمائے اہل کتاب نے الفاظ کے معنی بدل کر اپنی جماعت کو باطل کے شکنجہ سے ہمسنے تک نہ دیا یہاں تک کہ وہ لفظ جس کے معنی احمد تھے اسے ترجموں میں تسلی دہندہ سے تبدیل کر کے حقیقت سے دور کر دیا یہی سلوک اس امت کے جمہور علماء نے خلافت علی مرتضیٰ کے نصوص کے ساتھ کیا اور اس طرح رسالت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کے ادعاء کے ساتھ آپ کی مسلسل تبلیغات وتعلیمات کو ٹھکرانے کا موقع پیدا کر لیا۔

---

[1] ۔ کل کثییر الیه قلیل وکل کبیر الیه حقیر (کشاف)

[2] ۔ وکان اعظمهم یقولون محمد نبی مبعوث الا انه مبعوث الیٰ غیر نا فذلك خلطهم الحق بالباطل ولبسهم ایاه به (طبری)

پھر یہ جان بوجھ کر ہوتا ہے کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ ہر مذہب کے عوام تو سادہ لوح ہوتے ہیں اور خواص گرفتار اغراض ہوتے ہیں عوام اکثر باطل کو نادانستہ اختیار کیے ہوئے ہوتے ہیں مگر علماء زیادہ تر حقیقت سے واقف ہوتے ہوئے دھاندلیوں سے کام لے کر حق سے دور رہتے اور دوسروں کو دور رکھتے ہیں۔ اسی کا قرآن نے ان الفاظ میں اظہار کیا ہے کہ ''حق کو چھپاؤ نہیں جب کہ تم جانتے بھی ہو''۔ اسی لئے خالق کے یہاں مواخذہ ان علماء سے عوام کی نسبت بہت زیادہ ہوگا جواز روئے عدالت ان کے جان بوجھ کر اعراض کرنے کا صحیح نتیجہ ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

''اور نماز ادا کرو اور زکوۃ دیتے رہو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتے رہو۔''

چوں کہ ترتیب آیات کے لحاظ سے سیاق اس بات کا بتانا ہے کہ یہ خطاب یہود سے ہے اس لئے اس آیت کے ذیل میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ کیا کافروں کے فروغ کا مخاطب بنانا درست ہے [1]۔

ہمارے نزدیک یہ بحث اس لئے دور از کار ہے کہ ترتیب آیات موافق تنزیل نہیں ہے لہٰذا ہر آیت کو مستقل طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس سے کیا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ سیاق آیت سے نتیجہ برآمد کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔

اس آیت میں شریعت اسلام کے تین احکام کا ذکر ہے پہلے اقامتِ صلوٰۃ جس کی تشریح یقیمون الصلوۃ میں ہو چکی ہے۔ اس کا مطلب ہے ادائے نماز، دوسرے ایتاء زکوۃ۔ یہ شریعتِ اسلام کا وہ حکم ہے جو اموال سے متعلق ہے یعنی کچھ خاص شرائط کے ساتھ ایک مال میں سے سال گزرنے پر کچھ مخصوص حصّہ فقراء و مستحقین اور دیگر امورِ خیر کے لئے الگ کرنا۔ پہلا عمل انفرادی عبادت کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا مفادِ اجتماعی سے متعلق ہے۔

تیسرا حکم ''رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو''۔ یہ نمازِ جماعت سے متعلق ہے۔ اس میں انفرادی عبادت میں اجتماعیت کو سمونے کی صورت ہے جو شریعتِ اسلام کی خاص خصوصیت ہے۔

اس میں رکوع کا ذکر بظاہر اس لئے ہے کہ نمازِ جماعت میں ادراکِ رکعت کا آخری موقع رکوع ہے جیسا کہ فقہ میں ثابت ہوا ہے اور اس صورت میں کہ جب خطاب یہود سے ہو رکوع کا خاص طور سے ذکر اس لئے بھی ہو سکتا ہے کہ یہود کے یہاں کی عبادت میں رکوع نہیں ہے۔ یہ ان کے بالمقابل اسلامی نماز کی خصوصیت امتیازی ہے [2]۔ مگر ہمیں اس میں تامل ہے اس بناء پر کہ سورہِ آلِ عمران میں جیسا کہ اس کے بعد آئے گا جناب مریمؑ سے خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے: وارکعی مع الراکعین اس سے پتہ چلتا ہے کہ شریعتِ موسوی کی نماز میں بھی رکوع جزء اہم تھا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعد میں یہود نے شریعت موسوی کے اس حکم میں تنسیخ و ترمیم کر کے رکوع کو ساقط کر دیا ہو۔

---

[1] ۔فی هذا الخطاب مع الیهود دلالة علیٰ ان الکفار مخاطبون بفروع الشرائع (نیشاپوری)

دوسرے گروہ کی طرف سے معقول جواب یہ ہے کہ آیت کے یہ سارے احکام ایک آیت قبل کے حکم ایمان و امنوا بما انزل کے ماتحت ہیں یعنی پہلے ایمان لاؤ اور پھر ان احکام پر عمل کرو (دریابادی)

[2] ۔عبر عن الصّلوٰة بالرکوع احترازا عن صلوة الیهود (ابوالسعود)

اَ تَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم تو دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب الٰہی پڑھتے رہتے ہو پھر بھی کیا عقل سے کام نہیں لوگے''؟

یہ خطاب اصلاً علمائے یہود سے ہے چوں کہ مشرکین کو ان کی عملی بلندی کا احساس تھا، اس لئے اکثر وہ ان کے پاس آکر پیغمبر اسلامؐ کے متعلق دریافت کرتے تھے اور یہ ان کو اپنے علم کے مطابق یہ جواب دیتے تھے کہ بلاشبہ جو علامتیں ہماری کتابوں میں پائی جاتی ہیں وہ سب اس رسول میں پائی جاتی ہیں اس لئے اس پر ضرور ایمان لانا چاہیے۔ یہ ہدایت وہ دوسروں کو کرتے تھے مگر خود اپنی کتاب کی تعلیم کے مطابق ایمان قبول نہ کرتے۔ اس سے انہیں اپنے جاہ و منصب کے تحفظ کا خیال مانع تھا کیوں کہ موجودہ حالت میں تو اپنے مذہب میں وہ ایک پیشوا کی حیثیت رکھتے تھے لیکن اگر ایمان قبول کر لیتے تو ان کی حیثیت پیرو کی ہو جاتی بس اسی بے عملی پر قرآن کریم نے اس آیت میں متنبہ کیا ہے۔

وانتم تتلون الکتاب کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو تو تمہارے واسطے سے تمہاری کتاب کے مندرجات پہنچتے ہیں اور تم اس کتاب کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے اور زبان سے پڑھنے والے ہو۔ پھر کیا وہ تمہارے خلاف حجت نہ ہوگی اور یہی اتمام حجت کا پہلو وہ ہے جس پر عقل کا حوالہ دیا ہے کہ سوچو تو خود تمہاری عقل بتائے گی کہ اس صورتِ حال میں ایمان نہ لانے پر ان لوگوں سے زیادہ تم موردِ الزام ہو اور مواخذہ کے زیادہ مستحق ہو۔

اب یہ تنبیہ چوں کہ ایک عام اصول عقلی کے ماتحت ہے اس لئے وہ عمومی طور پر تمام عالمان بے عمل اور واعظان غیر متعظ کو شامل و حاوی ہے [1]۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اور سہارا الوصبر اور نماز کا اور یقیناً وہ گراں ہے مگر عظمت الٰہی سے متاثر دل رکھنے والوں کے لئے جنہیں خیال ہے کہ انہیں اپنے پروردگار کا سامنا کرنا ہے اور یہ کہ انہیں اس کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔''

صبر وصلوٰۃ:

''سہارا'' لینے کے حکم میں مشکلات کے پیش آنے کی خبر مضمر ہے اور کوئی شک نہیں کہ ماحول کے تقاضوں کے خلاف حق کے راستے پر آنا

---

[1] ۔نزلت فی الخطبآء والقصاص وھو قول امیر المؤمنین وھو کل منبر منھم خطیب مصقع کذب علی اللہ وعلی رسولہ وعلی کتابہ اقول وھی جاریۃ فی کل من وصف عدلا وخالف الی غیرہ (صافی)

دشواریوں سے خالی نہیں ہیں اور دوشواریاں بھی ایسی جن کے مقابلہ سے خود اپنی مادی قوت قاصر ہے کیوں کہ قوت قاصر نہ ہوتی تو سہارا لینے اور مدد حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی مگر یہ مدد کسی دوسری مادی طاقت کی نہیں ہے بلکہ راہ حق میں جو مشکلات درپیش ہوں ان کے مقابلہ میں مدد بھی لی جائے تو بس اپنی ایک اندورنی قوت سے اس کا نام ''صبر'' ہے اور ایک بیرونی قوت سے جو پردہ غیب میں ہے اور اس سے مدد مطلب کرنے کا طریقہ ''صلوۃ'' ہے۔

صبر کے اصل معنی برداشت کرنے کے ہیں اور انسان جتنی برداشت کی طاقت بڑھائے گا اتنی ہی مشکلیں آسان نظر آئیں گی۔

اسلام میں ایک عبادت یعنی صوم انسان کے لئے قوت برداشت کی مشق کے واسطے ایک بہترین ورزش کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے متعدد روایات میں صبر کی تفسیر صوم کے ساتھ ہوئی ہے [1]۔

صبر یعنی قوتِ برداشت کے ذریعہ سے انسان میں استقلال اور ثباتِ قدم کا ظہور ہوگا اور اب صلوٰۃ کے ذریعہ سے خالق کی جانب رجوع کرے گا تو توفیقِ ربانی اس میں پہلے تو مزید استقلال پیدا کرے گی اور استقلال کے کمال کے ساتھ ساتھ مشکلات کے دور ہونے کی صورتیں پیدا ہوں گی وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت ۶۹) اسی لئے دوسری آیت میں صبر اور صلوۃ دونوں کو مرکز استعانت قرار دینے کے ساتھ پھر آخر میں انحصار صبر پر کر دیا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (البقرہ:۱۵۳) اور اس سے ظاہر ہے کہ صبر و استقلال کے معیار پر پورے اترنے کا ثبوت دیے بغیر مددِ غیبی کا آسرا لگانا بے کار اور بالکل غلط ہے۔

مگر یہ صبر و صلوٰۃ سے سہارا لینا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے مادی ذہنیت والا آدمی تو ہر مشکل میں کسی مادی قوت ہی کا سہارا ڈھونڈھے گا اور جب نہ مانے گا تو یقین شکست کے ساتھ ہمت ہار جائے گا۔ یہ کام انہیں افراد کا ہے جن کے دل عظمت الٰہی سے متاثر ہوں اور اسی لئے ارشاد ہوا کہ وانہا لکبیرۃ الا علی الخاشعین۔ اس احساس وعظمت کا نتیجہ اس خیال کا قائم ہونا ہے کہ انہیں اپنے پروردگار کا سامنا کرنا ہے اور یہ کہ آخر میں ان کے معاملہ کا انحصار خالق کی مرضی پر ہے۔

یہاں لفظ یظنون صرف کیا گیا ہے جو ادنیٰ درجہ اعتقاد کا پتہ دیتی ہے اور وہ اس لئے کہ انسان کے لئے خالق کی طرف رجوع کا ظن بمعنی گمانِ غالب بھی مطلق العنانی ہے روکنے کے لئے کافی ہے لیکن جو صاحبانِ ایمان ہیں وہ اس سے بالاتر یعنی یقین کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ بھی ان الفاظ میں داخل ہے۔

یوں سمجھنا چاہیے کہ لفظِ ظن اپنے سے کم درجوں کے مقابل میں ہے نہ کہ اپنے سے مافوق کے مقابل میں، اس لئے یہ ظن بڑھ کر یقین کے درجہ پر پہنچ جائے تو وہ اس آیت کے خلاف نہ ہوگا بلکہ اس کی فردِ اکمل ہوگا اور اسی لئے روایات میں یظنون کی تفسیر یوقنون کے ساتھ کی گئی ہے [2]۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى

---

[1] ۔فی الکافی والفقیہ والعیاشی عن الصادق علیہ السلام فی ھذہ الایۃ ان الصبر الصیام (صافی)

[2] ۔فی التوحید والاحتجاج والعیاشی عن امیر المؤمنین علیہ السلام یوقنون انہم یبعثون والظن منہم یقین (صافی)

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

''اے نبی اسرائیل میری وہ نعمت یاد کرو جس وقت میں نے تمہیں نوازا اور یہ کہ میں نے تمہیں تمام خلائق سے زیادہ عطا کیا۔''

قرآن کریم میں متعدد جگہ فضل کا لفظ مال و دولت وغیرہ کی زیادتی کے مفہوم میں آیا ہے جیسے:

فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ (سورۂ نحل ۷۱)

تو جنہیں زیادہ دیا گیا ہے وہ ایسا نہیں کرتے کہ جو انہیں ملا ہے اسے پلٹا دیں انکی طرف جو انکی ملکیت میں ہیں (غلام وغیرہ)

دوسری جگہ فضلتکم علی العالمین کی تشریح یوں آئی ہے: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾ (مائدہ)

جس کا ذکر معہ ترجمہ پہلے آچکا ہے۔

اسی لئے فضلتکم علی العالمین کا ترجمہ میں نے کثرتِ عطا سے کیا ہے۔ فضیلت مرتبہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

پھر ''یاد کرو'' کا لفظ جو شروع میں ہے بتاتی ہے کہ یہ ماضی کا ذکر ہے، حال میں تو کفران کے سبب سے وہ نعمت و فضلیت سب سلب ہو چکی ہے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

''اور اس دن سے بچنے کا سامان کرو جب نہ کوئی دوسرے کو کوئی فائدہ پہنچا سکے گا، اور نہ کسی کی سفارش قبول ہوگی اور نہ کسی کا کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی''۔

جیسا کہ عبدالماجد صاحب دریابادی نے لکھا ہے ''اس دن سے مراد ظاہر ہے کہ یومِ قیامت ہے۔ قیامت کی یاد بڑے حکیمانہ موقع پر دلائی گئی حشر و نشر جزاء سزا کا عقیدہ جو انسان کے دل میں مسؤلیت اور ذمہ داری کی روح ہے اسرائیلیوں کے دلوں ہی سے نہیں کہنا چاہیے کہ ان کی مقدس کتابوں اور نوشتوں تک سے مٹ چکا تھا۔ آگے روزِ قیامت کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں سب میں رد ہی ہے کسی نہ کسی اسرائیلی عقیدہ کی لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ، اس سے مقصود اس اسرائیلی عقیدہ کی رد ہے جو آج تک جیوش انسائیکلو پیڈیا میں ان الفاظ میں لکھا چلا آتا ہے ''بہت سے لوگ اپنے اسلاف کے اور بہت سے لوگ اپنے اخلاف کے اعمالِ حسنہ کی بناء پر بخش دیے جائیں گے (جلد ۶ ص ۶۱) وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (جس صورت میں کہ موت حالت کفر پر اور عدم ایمان میں ہوئی ہے) یہاں بھی رد ہے اس اسرائیلی عقیدہ کی کہ عمل اور عقیدے کیسے ہی ہوں بہرحال اپنے اسلافِ کرام شفاعت کر کے بخشوا ہی لیں گے شفاعت اور ایک شفیع مستقل کا یہی وہ مبالغہ آمیز تخیل ہے جس نے مسیحیت میں آکر انتہائی شکل اختیار کر لی اور کفارہ ہی کی طرح شفاعت پر مسیحیت کی بنیاد ہے۔ لا یو خذ منها

عدل اس میں اصلی ضرب یہودی اور مسیحی عقیدہ کفارہ پر ہے۔ مسیحیوں کے یہاں عقیدہ کفارہ کی اہمیت تو ظاہری ہے لیکن خود یہود بھی اس عقیدہ کفارہ سے متاثر ہو کر قائل ہو گئے تھے (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۲ ص ۲۷۸)''

اسرائیلی عقیدۂ شفاعت اور اسلامی عقیدۂ شفاعت میں فرق:

بے شک اسلام میں بھی شفاعت کا عقیدہ ہے اور وہ قرآن سے ثابت ہے مگر اس میں اسرائیلی عقیدہ کی طرح نہ عمومیت ہے نہ اس طرح قطعیت بلکہ وہ خاص اہل ایمان کے لئے خدا تعالیٰ کے اذن و رضا کے ساتھ مشروط ہوتے ہوئے مایوسیوں کی گھنگھور گھٹا میں صرف ایک امید کی چمک دکھلا کر توجہ الی اللہ کو تازہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس طرح نہ اس میں نجات پر اعتماد کلی ہے جس کے بعد اصلاح اعمال کی ضرورت ہی نہ ہو جو اسرائیلی عقیدہ کا لازمہ ہے اور نہ یاسِ کامل ہی ہے جس کے بعد گنہ گار اپنے کو دوزخی سمجھ کر پھر اصلاح نفس کے بے کاری سمجھ لے بلکہ اسلام کی تعلیم ان دونوں نقطوں کو چھوڑ کر بین بین ہے اور یہی اس کا طرہ امتیاز ہے (الایمان نصفان نصف خوف و نصف رجاء) (یعنی) ایمان کے برابر سے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ خوف ہے اور ایک حصہ امید ہے۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۴۹

''اور اس وقت جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے چھٹکارا دیا جو تمہیں بری طرح تکلیفیں پہنچاتے تھے تمہارے لڑکوں کو حلال کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھ لیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔''

فرعون کے مظالم اور بنی اسرائیل کی نجات:

''تمہیں'' یہ نسبت اور اس کے بعد کی تمام نسبتیں جو اس آیت اور اس کے بعد کی آیتوں میں ہیں، موجودہ بنی اسرائیل کی طرف قومی حیثیت سے دی گئی ہیں ورنہ حقیقۃً تو جنہیں نجات دی گئی تھی اور جن پر یہ واقعات گزرے تھے وہ اس تخاطب سے بہت صدی پہلے کے ان کے آباؤ اجداد تھے۔

فرعون کسی خاص آدمی کا نام نہیں ہے بلکہ مصر کا ہر بادشاہ فرعون کہلاتا تھا جیسے ایران کا ہر بادشاہ کسریٰ اور روم کا قیصر اور حبشہ کا نجاشی۔

بنی اسرائیل پر جن مظالم کا حوالہ قرآن مجید نے دیا ہے ان کا ذکر توریت میں بھی موجود ہے۔ مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے۔ مشقت کی تھیں (خروج ۱: ۱۳ و ۱۴) لڑکوں کو قتل کرنے اور لڑکیوں کے زندہ رکھے جانے کا جو فرعون کی طرف سے حکم تھا اس کا بھی ذکر ان الفاظ میں ہے کہ ''فرعون نے اپنے سب لوگوں کو تاکید کر کے کہا کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم اسے دریا میں ڈال دو اور جو بیٹی ہو جیتی رہنے دو (خروج ۱: ۱۵ و ۲۲)۔

لڑکیوں کے زندہ رہنے دینے کی غرض نہ توریت میں صراحتاً مذکور ہے اور نہ قرآن میں مگر اسے مصائب کے ذیل میں درج کرنے ہی سے ظاہر ہے کہ یہ زندہ رکھنا لڑکیوں کا کچھ ایسے مقاصد کے لئے تھا جن کی یہ نسبت نفسیاتی طور سے مار ڈالنا زیادہ گوارہ ہوسکتا ہے۔

ظلم کا مرتکب اگرچہ ظالم ہوتا ہے اور وہی اپنے ارادہ واختیار کی بناء پر اس کا ذمہ دار ہے مگر خداوند عالم کی طرف سے اس کا موقع دیا جانا کہ وہ ظلم کر سکے اور اس کا اپنی طاقت سے مزاحمت نہ کرنا کبھی بطورِ سزا ہوتا ہے جسے مذہبی روایات میں ان الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے کہ اللہ نے ظالمین کو مسلط کر دیا اور کبھی بطورِ امتحان ہوتا ہے جس میں کامیابی کی صورت میں وہ مظلومین کو اپنے انعام واکرام کے ساتھ سرفراز کرتا ہے۔

آلِ فرعون کے ان مظالم کو جو بنی اسرائیل پر تھے قرآن نے دوسری قسم میں داخل کیا ہے۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝۵۰

''اور جب ہم نے تمہارے ذریعہ سے دریا میں شگاف دے دیا' اس طرح تمہیں چھٹکارا دلایا اور فرعون والوں کو ڈبو دیا' اس حالت میں کہ تم دیکھ رہے تھے۔''

فرعونی حکومت کے مظالم سے نجات دلانے کے لئے خالق کے حکم سے موسیٰؑ اسرائیلیوں کو لے کر مصر کی سرزمین سے نکلے کہ اپنے آبائی وطن شام وفلسطین کی طرف روانہ ہوجائیں فرعون نے اپنی فوج کو ساتھ لے کر ان کا تعاقب کیا۔ وہ لوگ اتفاق سے شب کی تاریکی میں راستہ بھول کر دریا کے قریب پہنچ گئے تھے کہ پس پشت سے فرعونی لشکر آ گیا۔ اب یہ لوگ پریشان ہوئے آگے دریا اور پیچھے دشمنوں کی فوج وحی خداوندی سے موسیٰؑ تمام قوم کو حکم دیا کہ وہ بلا تامل دریا کی طرف قدم آگے بڑھا دیں۔ ان کے پڑھنے کے ساتھ ہی دریا کا پانی بیچ سے پھٹ گیا۔ اس کی بڑی بڑی موجیں ادھر ادھر دیواروں کی طرف کھڑی ہوگئیں اور موسیٰؑ تمام بنی اسرائیل کے ساتھ اس طرف کے ساحل تک پہنچ گئے مگر جب فرعون اپنے لشکر سمیت دریا کے حدود میں پہنچ گیا تو دونوں طرف سے پانی کی موجیں پلٹ پڑیں اور انہوں نے اس تمام لشکر کو غرق کر دیا۔

یہ واقعہ توریت میں بھی مذکور ہے ''پھر موسیٰؑ نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا اور خداوند بہ سبب بڑی پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو جلایا اور دریا کو سکھا دیا اور پانی کو دو حصے کیا اور بنی اسرائیل دریا کے بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہو کر گزر گئے اور پانی کی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی'' (خروج ۱۴، ۲۱، ۲۳) بنی اسرائیل خشک زمین پر دریا کے بیچ میں چلے گئے اور پانی کی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی۔ سو خداوند نے اس دن اسرائیلیوں کو مصریوں کے ہاتھ سے یوں بچایا'' (خروج ۱۳: ۳۹، ۳) اور مصریوں نے پیچھا کیا اور ان کا پیچھا کیے ہوئے وہ اور فرعون کے سب گھوڑے اور اس کی گاڑیاں اور اس کے سوار دریا کے بچوں بیچ تک آئے۔ اور موسیٰؑ نے اپنا ہاتھ دریا پر بڑھا دیا اور دریا صبح ہوتے ہی اپنی اصلی قوت پر لوٹا اور مصری اس کے آگے بھاگے اور خداوند نے مصریوں کو دریا میں ہلاک کیا اور پانی پھرا اور گاڑیوں اور سواروں اور فرعون کے سب لشکر کو جو ان کے پیچھے دریا میں آئے تھے چھپا لیا اور ایک بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا (خروج ۱۴: ۲۳، ۲۴) اسی واقعہ کا تذکرہ قرآن مجید کر رہا ہے۔

فرق کا جو مفہوم عربی میں ہے اسے اس سے سمجھنا آسان ہوگا کہ مانگ نکالنے کو فرق کہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ دریا میں راستہ پیدا ہونا جزر ومد کا کوئی کرشمہ نہ تھا جیسا کہ بعض مادی نقطہ نظر والے افراد نے جو کسی معجزہ کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے توہم کہا ہے۔

بِکم کے لفظ سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ تمہارے داخلہ کے ساتھ ہی پانی نے راستہ دیا[1]۔

رہ گئی عقلی حیثیت سے اس پر بحث تو وہ ایک مستقل کلی موضوع کا جزئیہ ہے جو معجزات انبیاء سے متعلق ہے اور جس پر بحث کا یہ مقام نہیں ہے۔ روحِ مطلب یہ ہے کہ دریا کا اس طرح شگافتہ ہو جانا محالِ عقلی تو ہے نہیں صرف محال عادی سمجھا جا سکتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ عام طور پر ایسا ہوا نہیں کرتا لیکن خدا کو ماننے کے بعد پھر اس کی قدرت کو محدود سمجھنا معقول چیز نہیں ہے۔

اگر نظر حقیقت شناس سے دیکھئے تو دریا کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا خود سمندر کے وجود سے زیادہ حیرت خیز چیز نہیں ہے۔ پھر وہ جو اس کے پیدا کرنے پر قادر تھا وہ کسی وقت اسے دو حصوں میں تقسیم کرنے پر کیوں قادر نہیں ہے۔

عبدالماجد صاحب دریابادی نے اس پر طبیعی نقطہ نظر سے بھی بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''یہاں جس فرق البحر کا ذکر ہے تو یہ سمندر کا پھٹ جانا اور درمیان میں خشکی کی راہ بن جانا کچھ ایسا زیادہ خارق عادت ہے بھی نہیں کہ اس کی نظیر کہیں ملتی ہی نہ ہو۔ بحری زلزلہ کے وقت ایسی صورتیں پیش آتی ہی رہتی ہیں چنانچہ جنوری ۱۹۴۴ء رمضان ۱۳۵۴ھ میں جو عظیم الشان زلزلہ بہار اور اطراف بہار میں آیا اس موقع پر صوبہ کے صدر مقام پٹنہ شہر میں دن دہاڑے کوئی ڈھائی بجے کے وقت ایک مجمع کثیر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گنگا جیسے وسیع و عریض دریا کا پانی چشم زدن میں غائب ہو گیا اور اتنے چوڑے پاٹ میں بجائے دریا کے خشک زمین نکل آئی اور یہ حیرت انگیز اور دہشت ناک منظر چند سیکنڈ نہیں چار پانچ منٹ تک قائم رہا یہاں تک کہ دریا اسی برق رفتاری کے ساتھ یک بیک زمین سے ابل کر پھر جاری ہو گیا۔ واقعہ کی مفصل روداد ایک وقائع نگار کے قلم سے انگریزی روزنامہ پانیر لکھنؤ کی ۲۰ جنوری ۱۹۴۴ کی اشاعت میں درج ہے۔''

''بحر سے مراد سے یہاں دریائے نیل نہیں جیسا کہ بعض ثقات کو دھوکا ہو گیا ہے بلکہ بحر قلزم یا بحر احمر مراد ہے دریائے نیل تو بنی اسرائیل کے مسکن سے مغرب کی طرف واقع تھا اور اسرائیلیوں کا راستہ شام کے لئے مشرق کی طرف تھا نیل سے اس راستے کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا مصر سے شام کی راہ کے قریب بحر قلزم تھا۔ اس کے تنگ شمالی راستے کی طرف یہاں اشارہ ہے۔ مصر کے مشرق میں جہاں اب نہر سویز کھدی گئی ہے۔ اس سے متصل مغرب میں سمندر دو مثلثوں کی شکل میں تقسیم نظر آئے گا۔ یہاں ان میں سے مغربی مثلث مراد ہے اسرائیلیوں نے اسی کو عبور کر کے جزیرہ نمائے سینا میں قدم رکھا تھا۔'' علامہ بلاغی نے لکھا ہے:

البحر هو خليج السويس من البحر الاحمر و عرضه بحسب اختلاف مواقعه نحو عشرة اميال الىٰ نحو عشرين ميلا. (آلاء الرحمٰن)

بحر سے مراد نہر سویز ہے جو بحر احمر سے نکلی ہے اور اس کی چوڑان مختلف موقعوں کے اعتبار سے دس میل سے تقریباً بیس میل تک ہے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

''اور جب ہم نے موسیٰؑ کے لئے چالیس راتوں کی میعاد مقرر کی اور پھر تم نے ان کے بعد گوسالہ تیار کر لیا اور یہ تمہارا

---

[1] ۔معنی بکم انهم كانوا يسلكونه وتفرق الماء كما يفترق بين الشيئين بما يوسط بينهما (نیشاپوری)

بہت بے محل اقدام تھا۔''

بداء اور اس کا مطلب:

فرعونی حکومت سے نجات پانے کے بعد جب بنی اسرائیل کو آزادی کی کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع حاصل ہو گیا تو حکمت الٰہی کا اقتضاء ہوا کہ ان کے لئے ایک مکمل نظام شریعت مقرر کیا جائے۔ اس کے لئے حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ وہ کوہ طور پر آ کر تیس دن دعاؤ مناجات اور عبادت میں مصروف رہیں تو ان کو وہ آسمانی کتاب جو ان کے لئے ایک دستور حیات کی حیثیت رکھتی ہو گی عطا کر دی جائے گی۔ اس معیاد میں بعد کو دس دن اور بڑھا دیے گئے۔ اس تبدیلی کا ذکر دوسری جگہ قرآن مجید میں موجود ہے: وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ (اعراف ۱۴۲) یہ اسی قسم کی تبدیلی تھی جس کو اصطلاح مذہب میں بدا کہا جاتا ہے۔

زیر تحریر آیت میں قرآن مجید نے دونوں میعادوں کا مجموعہ بیان کیا ہے جو علم الٰہی میں ابتدا ہی سے مقرر کیا تھا جیسے سورہ اعراف والی آیت میں پہلے وعدہ اور اس میں اضافہ کے بعد اس طرح ذکر کیا ہے:

فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً۔

اس طرح ان کے پروردگار کی طرف کی میعاد چالیس راتوں کی پوری ہو گئی۔

یہی بدا کی عموماً حقیقت ہوتی ہے کہ مصلحت کا مقتضا شروع میں مختتم نتیجہ کا اظہار نہیں ہوتا لہٰذا جس حد تک اس وقت مصلحت ہوتی ہے اتنا اس وقت بتایا جاتا ہے۔ پھر بعد میں اس میں تبدیلی نمایاں ہوتی ہے جو ظاہر میں تبدیلی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں وہی اصل تقدیر الٰہی ہوا کرتی ہے جو علم باری میں مختتم طور پر شروع ہی سے مقرر ہے سورہ اعراف میں تبدیلی کے ذکر کرنے کے ساتھ یہاں اسی اصلِ تقدیر کو بیان کرنے پر اکتفا کی گئی ہے [1]۔

یہی تبدیلی قوم موسیٰؑ کے لئے ذریعہ ابتلاء ہو گئی۔ انہوں نے بے صبری سے کام لیا اور باوجود یہ کہ ہارونؑ جنہیں حضرت موسیٰؑ اپنا جانشین بنا کر چھوڑ گئے تھے منع کرتے رہے قوم کی ایک بہت بڑی تعداد سامری کے کہنے میں آ کر گوسالہ کو جسے اس نے سونے چاندی سے بنایا تھا خدا مان کر اس کی پرستش میں مصروف ہو گئی۔ اس واقعہ کی بہت سی کڑیاں قرآن مجید میں متفق طور پر مذکور ہیں جن کی تشریح ان ہی آیات کے ذیل میں آئے گی۔

ظاہر ہے کہ یہ ان کا عمل صریحی طور پر ''شرک'' تھا اور شرک کو قرآن میں کہا گیا ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾ (لقمان) اس اعتبار سے بھی وانتم ظالمون کا فقرہ ان کے لئے بالکل درست ہے۔ پھر خصوصی طور پر وہ جتنے قدرت ربانی کے مظاہرے دیکھ چکے تھے اور جو ان پر موسیٰؑ کے احسانات تھے ان کے باوجود ان کا خدا اور رسول کے وعدہ پر بھروسہ نہ کرنا اور ان کے نائب ہارون کے حکم سے سرتابی کرنا ایک شدید قسم کی زیادتی تھی جس کی ہرگز کسی حق شناس جماعت سے توقع نہ کی جانا چاہیے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

---

[1] ۔اربعین لیلة باعتبار مجموع العددین الوعد الاول وھو ثلاثون لیلة والثانی وھو اتمامھا بعشر کما فی سورة الاعراف (البلاغی)

''پھر اس کے بعد بھی ہم نے تمہیں معاف کر دیا کہ شاید اب تم شکر گزاری کرو۔''

گوسالہ کی عبادت کے جرم میں سوائے ہارونؑ کے جو منع کر رہے تھے تمام قوم ہی شریک تھی کچھ اصل اس عمل کے مرتکب ہونے کی صورت سے اور کچھ اس پر راضی رہ کر خاموشی اختیار کرنے کی صورت سے اس بناء پر اس جرم کی پاداش میں اگر پوری قوم پر عذاب نازل ہو جاتا تو کچھ بعید نہ تھا مگر اس کے بعد کی ایک آیت میں جیسا کہ ذکر آئے گا خداوند عالم نے ایک خاص صورت سے سزا دینے اور اس کے ذیل میں تھوڑی جماعت کے ہلاک کر دیے جانے کے بعد عذاب کو برطرف کر لیا۔ یہی وہ معافی ہے جس کا یہاں ذکر ہے۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

''اور اس وقت جب ہم نے موسیٰؑ کو نوشتہ اور تفرقہ امتیاز کا سامان عطا کیا شاید کہ تم ہدایت حاصل کرو۔''

یہ نوشتہ اور حق و باطل کے تفرقہ کا سامان دو چیزیں نہیں ہیں بلکہ وہی توریت جو میعاد مقرر کے پورے ہونے پر الواح کی صورت میں موسیٰؑ کو عطا ہوئی کتاب بھی تھی اور وہی معارف کے لحاظ سے حق و باطل اور اعمال کے اعتبار سے صحیح و غلط اور جائز و ناجائز میں تفرقہ امتیاز کا سامان بھی تھی [1]۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

''اور اس وقت جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم بلاشبہ تم نے گوسالہ بنا کر اپنے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے لہٰذا اپنے خالق سے توبہ کرو اس طرح کہ اپنے آدمیوں کو خود قتل کرو۔ اس میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے تو اس صورت سے اس نے تمہاری توبہ قبول کی بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے۔''

بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی:

توریت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتل کیا جانا شریعت موسوی میں شرک کی قانونی سزا تھی چنانچہ مشرک و مشرکہ کے لئے یہ حکم درج ہے کہ ''اس مرد یا عورت پر یہاں تک پتھراؤ کرو کہ وہ مر جائیں'' (استثناء ۱۷:۵) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گوسالہ پرستوں کے لئے یہ حکم خصوصی سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا بلکہ وہ حد شرعی تھی جو ان پر جاری ہونا ہی چاہیے تھی ہاں اس کے جاری کرنے کا حکم ان لوگوں کو جو اس جرم سے عملاً الگ رہے تھے

---

[1] ۔یعنی الجامع بین کونہ کتابا منزلا وفرقانا یفرق بین الحق والباطل یعنی التوراۃ نحو رأیت الغیث واللیث یرید الرجل الجامع بین الجود والجرأۃ (نیشاپوری)

مگر خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہنے کے مرتکب تھے اب ان کی استقامت واطاعت کا ایک امتحان تھا جس کے بعد ان کی اس چشم پوشی کے گناہ کو معاف کر دیا گیا۔ اس امتحان کے نقطہ نظر سے فاقتلوا انفسکم کی یہ تشریح بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ ہر شخص کے لئے اپنے عزیز کو جو اس جرم کا مرتکب ہوا ہو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کا حکم تھا[1]۔

یہ اپنے عزیزوں کو قتل کرنا وقتی طور پر طبیعتوں پر جتنی بار تھا وہ ظاہر ہے اسی لئے اس ناگواری کو یہ کہہ کر دور کیا گیا کہ اس میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بہتری ہے اس لئے بھی کہ اس طرح تم اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤ گے جو ان مشرکین کے عمل سے بے تعلقی کے فرض کے لحاظ سے تم پر عائد تھی اور اس لئے آئندہ کے لئے تمہاری وفاداری پایہ ثبوت کو پہنچ جائے گی اور نیز آخرت میں تمہیں اس کا اجر وثواب بھی عطا ہوگا۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

''اور وہ وقت جب تم نے کہا اے موسیٰؑ ہم ہرگز آپ کی بات نہیں مانیں گے جب تک کہ ہم ظاہر بظاہر دیکھ نہ لیں اس پر تمہیں بجلی نے گرفت میں لے لیا اس حالت میں کہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔''

مطالبۂ دیدار اور اس کا انجام:

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب قوم نے مطالبہ کیا کہ ہم آپ کے پیغمبر الٰہی ہونے اور شرف مکالمہ سے مشرف ہونے کو اس وقت تک تسلیم نہیں کر سکتے جب تک خود اپنے کانوں سے کلام الٰہی نہ سن لیں۔ اس پر موسیٰؑ نے ستر بزرگانِ قوم منتخب کیے جنہیں لے کر وہ کوہ طور پر گئے۔ اس کا ذکر قرآن کی دوسری آیت میں اس طرح ہے۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ''موسیٰؑ نے اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کیا ہماری طرف کی وعدہ گاہ پر لے جانے کے لئے[2]

آپ انہیں دامن کوہ میں چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئے اور خالق سے مناجات ومکالمہ کے شرف سے مشرف ہوئے جس کی آواز ان سب لوگوں نے صاف صاف سنی مگر اب انہوں نے یہ کہا کہ ہم آپ کا یہ کہنا کہ آپ کی اللہ سے گفتگو ہوئی اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک اپنی آنکھوں سے اس کا دیدار بھی نہ کریں[3]۔

---

[1] ۔الظاهر انه ليس المراد ان يتحرّوا او يقتل كلانسان نفسه بل قتل النفوس المضافة اليهم بالقرابة والرحم الماسة (بلاغی)

[2] ۔(اعراف۔۱۵۵)

[3] ۔روی ابن بابویه فی العیون عن الرضا علیہ السلام ما ملخصا ان بنی اسرائیل قالوا لموسیٰ لن نؤمن لك بأن الله ارسلك وكلمك حتى نسمع كلام الله فاختار منهم سبعين رجلا فلما سمعوا كلام الله من الجهات الست قالوا لن نؤمن بانه كلام الله حتى نرى الله جهرة (بلاغی)

اس پر عتاب الٰہی نازل ہوا اور بجلی نے گر کر اُن سب کو ہلاک کر دیا۔

اس جلال وغضب کے مظاہرہ سے نمایاں ہے کہ یہ مطالبہ عظمت وشان الٰہی کے خلاف تھا جب ہی اس پر اتنا سخت عتاب ہوا[1]۔ جب کہ یہ ایک محال امر ہے اور عظمت وقدوسیت خالق کے منافی ہے تو اس میں دنیاؤ آخرت کی تفریق کیسی؟ اس کا جلال وعظمت جس طرح یہاں ہے ویسے ہی وہاں جیسے آج ہے ویسے ہی کل۔

اگر جنت میں دیدار ہونے والا ہوتا تو بجائے اس غضب وعتاب کے یہ تسکین دہانی مناسب قرار پاتی کہ ابھی صبر کرو آخرت میں جب جنت میں داخل ہونا تب دیدار کر لینا مگر چوں کہ آنکھوں سے کسی چیز کا مشاہدہ جسمیت کا متقاضی ہے اور اللہ جسم نہیں رکھتا اس لئے اس کی رویت بلا فرقِ زمان ومکان محال وغیرہ معقول ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

''پھر تمہارے مرنے کے بعد تمہیں ہم نے دوبارہ جلا دیا کہ شاید اب تم شکر گزار ثابت ہو۔''

''تمہیں'' یعنی تمہاری قوم کے ان آدمیوں کو جو بجلی کی نذر ہو گئے تھے''۔

چوں کہ سوال رویت جلال وعظمت الٰہی سے کی معرفت اور نادانی کی بناء پر تھا تو صاعقہ کے عذاب سے اس تصور وعقیدہ کے جرم کی اہمیت ثابت کر دی گئی جس سے بقیہ قوم کی تنبیہ کا مقصد بھی پورا ہو گیا مگر اس کے بعد انہیں دوبارہ زندگی عطا کر دی گئی تا کہ وہ اپنے گزشتہ عمل کی پاداش کا ذاتی تجربہ ہو چکنے کے بعد اب تنزہ وتجرد معبود کی کامل معرفت اور ایمان بالغیب کے ساتھ اپنے دور حیات میں عبادت واطاعت کی زندگی گزار سکیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عذاب استیصال نہیں بلکہ عذاب تنبیہ تھا جو امراض ومصائب اور تسلط جبارین وغیرہ کی شکل میں اکثر آتا رہتا ہے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

''اور ہم نے تم پر ابر کو سایہ افگن کیا اور تم پر من وسلویٰ اتارا کہ کھاؤ ان پاک وحلال چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اور انہوں نے اس سے کچھ ہمارا نقصان نہیں کیا بلکہ وہ برابر خود اپنے ہی اوپر ستم ڈھاتے رہے۔''

من وسلویٰ:

جزیرہ نمائے سینا میں جو غیر معمولی فضل وکرم خالق کا بنی اسرائیل پر ہوتا رہا اور پھر وہ اس پر ناشکرا پن کرتے رہے اس کا تذکرہ ہے۔

توریت میں اس سایہ کا ذکر ''بدلی کے ستون'' کی لفظوں میں کیا گیا ہے۔ من وسلویٰ کی اصل حقیقت تو اللہ جانے مگر اہل لغت کی تشریح

---

[1] ۔لفرط العناد و التعنت وطلب المستحیل (بیضاوی)

کے مطابق من ایک میٹھی چیز تھی جو درختوں پر شبنم کی طرح گرتی تھی [1]۔

سلویٰ ایک طرح کا طائر ہے [2]۔

ان نعمتوں کے باوجود انہوں نے اپنے نبی کے احکام سے سرتابی کی یہی وہ ظلم ہے جسے کہا جارہا ہے کہ درحقیقت اس طرح انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی مطلب یہ ہے کہ اس سے ہمارا کچھ بگاڑ انہیں ضرر اس کا جو بھی تھا وہ اُن کی ذات ہی کی طرف راجع تھا۔اور یہ انتباہ ہے ہر کافر مشرک اور عاصی کے لئے کسی کی نافرمانی اور سرتابی سے اللہ کے عزت وجلال کبریائی اور جبروت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ ایمان واطاعت کی صورت میں نفع بھی انہی کا خود ہوتا ہے اور کفر وعصیان سے نقصان بھی خود ان ہی کو۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

''اور جب ہم نے کہا کہ اس بستی میں داخل ہو اور اس میں سے جہاں سے چاہو خوب مزے سے کھاؤ پیو اور دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے جانا اور کہنا ''گناہوں کی توبہ'' تو ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور حسن عمل سے کام لینے والوں کو ہم کچھ زیادہ ہی عطا کریں گے۔''

بابِ حطہ:

چوں کہ آیاتِ قرآن کی ترتیب شانِ نزول کے مطابق نہیں ہے اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ ہی کے دور کا ہے بلکہ ممکن ہے ان کے وصی یوشعؑ کے وقت میں پیش آیا ہو یا اس کے بھی بعد کا ہو اور اسی لئے اس بستی کو بھی تعین کے ساتھ نہیں بتایا جاسکتا جس میں داخلہ کے موقع پر یہ صورت پیش آئی تھی بہرحال تعلق اس کا بھی اسرائیل ہی کی تاریخ سے ہے۔

الباب سے مراد شہر پناہ کا پھاٹک ہے جس سے شہر کے اندر داخلہ ہونا تھا۔سجدہ خشوع وخضوع کا انتہائی مظاہرہ ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس کے ظاہری معنی کو چھوڑ کر یہاں بس فروتنی اور انکسار ہی کو مراد لیا جائے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

---

[1] ۔وقال بعض المفسرین انه الترنجبین ولیس له مستند یقول علیه (بلاغی)

[2] ۔اسم طائر یشبه السّمانی (طبرانی) ''اردو میں بعض نے اسے ''بٹیر'' کی قسم سے بتایا ہے اور لکھا ہے بٹیر جزیرہ نمائے سینا کا خاص جانور ہے، بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے، گرمی میں شمال کی طرف چلا جاتا ہے، جاڑے میں جنوب کی طرف پھر آجاتا ہے اڑتا اونچا نہیں، بہت نیچا رہتا ہے، تھک بہت جلد جاتا ہے اور شکار بڑی آسانی ہوجاتا ہے۔(دریابادی)

''مگر ان ظالموں نے اس قول کے بجائے جو انہیں بتایا گیا تھا ایک دوسری بات بدل کر کہہ دی تو ہم نے ان ظالموں پر آسمان سے ایک بڑا عذاب نازل کیا اور اس لئے کہ وہ برابر نافرمانی کرتے رہتے تھے۔''

انہوں نے بدل کر کہہ دیا، اس بارے میں قرآن تصریح نہیں کرتا، روایتیں ضرور ہیں مگر سند کے لحاظ سے بے اعتبار تاہم سب سے اتنا پتا چلتا ہے کہ انہوں نے حکم الٰہی کا استخفاف کرتے ہوئے بطور تمسخر لفظ کو بدل دیا مثلاً حِطَّةٌ (توبہ) کے لفظ کو حنطة (گیہوں) کر دیا، جس سے ان کی ذہنیت بھی ظاہر تھی کہ وہ گناہوں کی معافی کو کوئی چیز نہیں سمجھتے۔ اس کے بجائے ''شکم پری'' کو وہ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ ایک لفظ کی بات نہ تھی بلکہ عدول حکمی ہونے کے ساتھ اہانت حکم وحاکم حیثیت اُسے حاصل تھی۔ چنانچہ اس کی پاداش میں ان پر عذاب نازل ہوگیا[1]۔ پھر قرآن نے اس توہم کو دور کرنے کے لئے کہ اتنی سی بات پر آخر وہ عذاب کے مستحق کیوں کر ہو گئے عذاب کی وجہ بیان کی کہ بما کانوا یفسقون۔ یہ ماضی استمراری کا صیغہ ہے جس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ ان کا فعل اگر اتفاقی طور پر ایک شرارت کی حیثیت رکھتا ہوتا تو اسے ایک وقتی شوخی قرار دے کر ٹالا بھی جا سکتا تھا مگر وہ تھے ہی ایسے کہ برابر عدول حکمی کرتے رہتے تھے جس کا ایک مظاہرہ اسکی رکاکت آمیز صورت سے ہوا اس لئے اب ان پر عذاب نازل ہی ہوگیا[2]۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

''اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لئے پانی کی دعا مانگی تو ہم نے کہا کہ اپنا عصا چٹان پر مارو بس اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اس طرح کہ ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ الگ جان لیا۔ کھاؤ اور پیو اللہ کے دئے ہوئے رزق سے اور زمین پر خرابیاں پھیلاتے نہ پھرو۔''

بارہ (۱۲) چشمے:

مصر سے نکل کر فلسطین کے راستے میں ایک جگہ ایسی آئی جہاں دور تک پانی دستیاب نہ ہوا بنی اسرائیل پریشان ہوئے اور خود پریشان ہو کر جناب موسیٰؑ کو سخت پریشان کیا اور توریت کہتی ہے کہ:

''موسیٰؑ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پئیں موسیٰؑ نے خداوند سے فریاد کر کے کہا کہ میں ان لوگوں کا کیا کروں وہ سب تو مجھے ابھی سنگسار کرنے کو تیار ہیں۔'' (خروج ۱۷: ۱، ۴)

---

[1] ۔الرجز فی لحغة العرب العذاب (طبری)

[2] ۔بسبب فسقهم المستمر حسبما يفيده الجمع بين صيغتي الماضي والمستقبل (ابوالسعود)

اس کے بعد ہے کہ:

''خداوند نے موسیٰؑ کو فرمایا کہ لوگوں کے آگے جا اور بنی اسرائیل کے بزرگوں کو اپنے ساتھ لے اور اپنا عصا جو تو نے دریاء پر مارا تھا اپنے ہاتھ میں لے۔ تو اس چٹان کو مار یو۔ اس سے پانی نکلے گا تا کہ لوگ پیویں چنانچہ موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے لوگوں کے ساتھ یہی کیا'' (خروج ۱۷: ۵و۶)

قرآن کے مختصات میں سے یہ ہے کہ اس نے چشموں کی تعداد بتائی ہے کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی تعداد کے مطابق بارہ چشمے ظاہر ہوئے۔ عبدالماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں:-

''بعض نادان مسیحیوں نے اس تعداد پر اعتراض کر دیا کہ یہ تو بائبل میں موجود نہیں۔ قرآن نے کہاں سے گھڑ کر کہہ دیا؟ قدرت نے سوال کا جواب بھی مسیحیوں کی زبان سے دلوایا۔ جارج سیل انگریزی میں قرآنِ کریم کا قدیم مترجم ہے۔ آیت کے حاشیہ پر لکھتا ہے:-

''ایک مسیحی سیاح جو وہاں ہو آیا ہے بتصریح بیان ہے کہ چٹان سے پانی بارہ مقامات سے نکلتا تھا''

اور ایک دوسرے مسیحی سیاح کا مشاہدہ بیان کرتا ہے چٹان میں اس وقت ۲۴ سوراخ موجود ہیں جو بہ آسانی شمار کیے جا سکتے ہیں بارہ ایک طرف میں اور بارہ ان کے مقابل جانب پادری ڈین اسٹینلی Dean Stanley نے جو انیسوی صدی میں مسیحیت کے ایک ممتاز رکن ہوئے ہیں صدی کے وسط میں بائیل کے مقامات مقدسہ کی جغرافی تحقیق کے لئے بہ نفس نفیس فلسطین اور اس کے ملحقات کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات وتحقیقات پر ایک مستقل تصنیف شائع کی۔

اس میں اس چٹان کا ذکر کر کے لکھتے ہیں: یہ چٹان دس اور پندرہ منٹ کے درمیان بلند ہے آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے اور راس سفسفہ کے قریب لے جا کے وسیع وادی میں واقع ہے۔ شگاف اور دراز جا بجا پڑے ہوئے ہیں کچھ مٹے ہوئے ہیں کچھ بڑے ہیں کچھ چھوٹے گنتی میں اگر سب کو لیا جائے تو بیس ہوتے ہیں اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے تو دس سب سے پہلے قرآن ہی نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کیلئے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے یہ اشارہ انہی شگافوں کی طرف ہے۔''

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اور اس وقت جب تم نے کہا: اے موسیٰؑ ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہیں کریں گے لہٰذا اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے لئے وہ چیزیں نکالے جو زمین سے اگتی ہیں جیسے ساگ، ککڑی، گیہوں مسور اور پیاز، موسیٰؑ نے کہا ارے ایسی پست چیزیں تم بدل کر لینا چاہتے ہو اس کے بجائے جو بہتر ہے! اچھا تو پھر کسی شہر میں جا کر اترو وہاں تمہیں جو مانگتے ہو سب مل جائے گا اور ان پر ذلت اور محتاجی عائد کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا برابر انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کر ڈالتے تھے یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ برابر ظلم و تعدی سے کام لیتے تھے۔''

اس کے قبل ایک آیت میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ بنی اسرائیل کو دشت سینا میں کھانے کی دو چیزیں ملتی تھیں۔ ایک من جسے بعض لوگوں نے ترنجبین بتایا ہے اور دوسرے سلویٰ جس کی بیٹر کے نام سے تشریح کی گئی ہے۔ بنی اسرائیل کی بس ہر پھر کے وہاں یہی غذا تھی ایک مدت تک اسے کھانے کے بعد ان کی طبیعت بھر گئی اور اب انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے ان غذاؤں کی فرمایش کی جن کے وہ مصر میں عادی تھے۔ اور توریت میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

''اور بنی اسرائیل بھی پھر رے اور روتے ہوئے بولے کون ہے جو ہمیں گوشت کھانے کو دے گا۔ ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مفت مصر میں کھاتے تھے اور وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنا اور وہ پیاز اور وہ لہسن پر اب تو ہماری جان خشک ہو چلی یہاں ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے مگر یہ من (گنتی ۱۱: ۴ و ۶)

اس طرح کی فرمائش یا التجا عام حالات میں ہوتی تو کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی کیوں کہ وہ فطرت بشری کے ایک عام تقاضا پر مبنی تھی کہ انسان کا ایک غذا کھاتے کھاتے چاہے وہ کتنی ہی نفیس و لذیذ ہو، جی اکتا ہی جاتا ہے مگر یہاں صورت حال تو یہ تھی کہ مصر سے وہ نکالے گئے تھے مظالم فرعون سے نجات دلوانے کے لئے اور منزل مقصد یعنی فلسطین کے داخلہ سے وہ محروم ہو گئے اپنی اس عدول حکمی اور سرکشی کی بدولت جو وہاں کے قوم جبارین سے مقابلہ کی صورت درپیش ہونے کے بعد ان سے ظاہر ہوئی اور جس میں آخر میں انہوں نے انتہائی جسارت آمیز جملہ تک کہہ دیا تھا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ ۲۴) یعنی آپ جائیے اور آپ کا خدا دونوں جنگ کر لیجئے ہم یہیں بیٹھے ہوئے ہیں اسی کے نتیجہ میں حکم ربانی ہوا فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ (مائدہ ۲۶) یہاں کا داخلہ ان پر چالیس برس کے لئے حرام ہو گیا۔ اتنی مدت میں یہ یونہی سرگرداں پھرتے رہیں گے اس سے ظاہر ہے کہ یہ دشت نوردی کی زندگی ان کے لئے بطور سزا تھی۔ اس صورت میں تقاضائے عقل یہ تھا کہ وہ اپنے گریبان میں خود منہ ڈالتے اور جو کچھ مل رہا تھا اسے غنیمت سمجھ کر صبر و شکر کے ساتھ اسی پر اکتفا کرتے نہ یہ کہ وہ اپنے پیغمبر کو طرح طرح کی فرمائشیں کر کے اور ناز نخرے دکھا کر پریشان کریں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ موسیٰؑ نے ان سے جھلا کر کہا کہ ''ایسا ہی ہے تو کسی شہر میں جا کر اتر پڑو یعنی تمہاری بداعمالیوں سے مقدر میں تو یہ جنگل لکھ دیا گیا ہے۔ پھر جنگل میں یہ چیزیں کہاں؟ ان چیزوں کی طلب ہے تو مصر میں یا کسی شہر میں جا کر بود و باش اختیار کرو جو تمہارے بس میں نہیں ہے [1]۔

---

[1] ۔والامر بالهبوط على كلا الوجهين انما هو للتعجيز لان مصر هي بلاد عبوديتهم وذلتهم ومجمع عدوهم الملنكوب مضافا الى انهم كتب عليهم التيه فكيف يستطيعون الهبوط الى مصر (بلاغیؒ)

یہود کے لیے فیصلہ تقدیر:

یہ تو ایک جزئی واقعہ اس قوم کا تھا جو ذکر ہو گیا۔ اس مثال کو دینے کے بعد اب اس پوری قوم کے لئے قرآنِ کریم نے فیصلہ تقدیر سنایا ہے جو ان کی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ اس کا تعلق خاص ان لوگوں کے ساتھ نہیں ہے جنہوں نے ایک غذا کو بدل کر دوسری غذا کی خواہش کی اس لئے کہ ان کے جرائم میں قتل انبیاء کا بھی ذکر ہے یہ جرم قوم کی طرف نسبت رکھتا ہے ان خاص لوگوں کی طرف نہیں جو کہ تیہ میں حیران وسرگردان پھر رہے تھے پھر جب کہ یہ جرائم ان سے متعلق نہیں ہیں تو ان کی پاداش کو بھی ان سے مخصوص نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ پوری قوم کے لئے کہا گیا ہے کہ ان پر ذلت اور فقیری عائد کر دی گئی ہے [1]۔

اس ذیل میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن میں اس کا ذکر کہیں نہیں ہے کہ یہود کو حکومت کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس میں ذلت اور محتاجی کا ذکر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ایک سود خوار قوم کتنی ہی دولت مند یا بپائے مردی ہمسایہ کسی حکومت کی بھی مالک ہو جائے پھر بھی وہ دناءت نفس اور محتاجی کے احساس سے بلند نہیں ہو سکتی۔

اس ذلت ومسکنت اور غضب میں گرفتاری کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ آیات الٰہیہ کا انکار کرتے رہے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے ظاہر ہے کہ انبیاء کا قتل ناحق تو ہوگا مگر یہاں مطلب یہ ہے کہ خود ان کی نظر میں بھی وہ انبیاء قتل کے مستحق نہ تھے [2]۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾

''یقیناً جو مسلمان ہوں اور جو یہودی، عیسائی اور صابی ہوں جو کوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے اور ان کے لئے کوئی خوف نہیں ہے اور نہ ہی وہ رنج میں مبتلا ہوں گے۔''

معیارِ نجات:

زمانہ رسولؐ میں اسلام لانے والے کئی قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو پہلے کسی دوسرے دین کو اختیار کیے ہوئے نہ تھے خواہ شرک کی

---

[1] ۔الظاھر ان الضمیر لا یختص بالذین طلبوا البصل وما ذکر فانھم لم یعھد منھم قتل النبیین بل یعود الضمیر علی نوع بنی اسرائیل (بلاغیؒ)

[2] ۔فائدۃ التقئید مع ان قتل الانبیاء یستحیل ان یکون بحق الا یذان علیٰ ذٰلک عندھم ایضا بغیر الحق (ابوالسعود)

زندگی بسر کرتے ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ لادینی کی زندگی گزار رہے تھے۔انہوں نے جب دین قبول کیا تو وہ اسلام ہی تھا یا وہ پیدائشی مسلم ہوں دوسرے وہ جو پہلے کسی اور دین کو اختیار کیے ہوئے تھے جیسے یہودیت، نصرانیت، صائبیت وغیرہ ان سب کے لئے قرآن بتانا چاہتا ہے کہ معیار نجات ایک ہی ہے۔یعنی ان کی سابقہ زندگی سے بحث نہیں کہ وہ کیا تھی۔حال کے لئے سب کے واسطے نجات کی شرطین یکساں ہیں اور وہ یہ کہ اب اسلامی تعلیمات کے مطابق مبداء و معاد کو مانیں اور صحیح طریقہ پر اعمال حسنہ کے پابند ہوں۔ظاہر ہے کہ تعلیمات اسلامی کے مطابق عقائد و اعمال کو درست کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے محمد مصطفیٰؐ کی رہنمائی کو قبول کرلیا اس لئے ایمان بالرسالتہ کے ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب اس کے بعد آخرت میں ان کو نجات کا بمناسبت درجہ ایمان و عمل یکساں طور پر استحقاق حاصل ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

''اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور ہم نے تمہارے اوپر کوہ طور کو بلند کیا کہ جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے ہاتھ میں لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو شاید اس طرح تم بچ سکو۔''

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب الواحِ توریت نازل ہوئی ہیں۔

کوہ طور کو ان پر کیوں کر بلند کیا گیا تھا اس کی تفصیل قرآن میں تو ہے نہیں اسرائیلیات کچھ بتاتے ہیں مگر وہ معتبر نہیں بہرحال اس آیت کے انداز بیان سے ظاہر ہے کہ یہ کوئی غیر معمولی مظاہرہ قدرت تھا۔اس عملی تہدید کے ساتھ ان سے کہا گیا کہ اس کتاب کے ساتھ جو نازل ہوئی ہے مضبوطی کے ساتھ تمسک کرو اور اس کے مضامین کو ہمیشہ یاد رکھو کہ اسی میں تمہاری نجات ہے۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

''پھر تم اس کے بعد پلٹ گئے اب اگر اللہ کا خاص فضل و کرم تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تو تم سخت گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔''

سبت کا حکم اور اس کی مخالفت کا انجام:

یعنی عہد و پیمان ہوجانے کے بعد بنی اسرائیل نے کچھ عرصہ کے بعد کتاب الٰہی پر عمل بالکل ترک کردیا۔اب ان کے اعمال کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان پر عذاب نازل ہوجاتا اور وہ ہمیشہ کے لئے تباہ کردیے جاتے مگر خالق کے مخصوص فضل و کرم اور اس کی رحمت نے ان کو مہلت دی اور وہ مکمل تباہی سے محفوظ رہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾

''اور تمہیں معلوم ہیں وہ جنہوں نے تم میں سبت کے بارے میں تعدی سے کام لیا تھا تو ہمارا ان کے لئے حکم ہوا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔''

سَبت شریعت یہود میں ایک خاص دن تھا جو عبادت و ذکر الٰہی کے لئے مخصوص تھا۔ توریت میں اس کے احکام اس طرح بیان ہوئے ہیں:

''پس سبت کو مانو اس لئے کہ وہ تمہارے لئے مقدس ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے۔ پس جو کوئی روزِ سبت کام کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے'' (خروج ۳۱: ۱۴ و ۱۵)

قرآنِ مجید جس واقعہ کو یاد دلا رہا ہے اس کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تاریخِ بنی اسرائیل کا کوئی ایسا واقعہ ہے جس کا زمانۂ نزول قرآن میں عام طور سے یہود میں چرچا تھا۔

کسی خاص جگہ کے لوگ جس کا نام قرآن نے نہیں لیا ہے توریت کے اس حکم کی خلاف ورزی کرتے تھے اس کی سزا میں ان پر یہ عذاب نازل ہوا کہ وہ بندروں کی صورت میں مسخ ہو گئے۔ روایت میں اس مقام کا نام ایلہ آیا ہے جو دریا کے کنارے تھا[۱]۔

''ہم نے کہا''۔۔۔یا۔۔۔'ہمارا ان کے لئے حکم ہونا اس کے لفظی قول یا حکم ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ ارادۂ الٰہی کی تعبیر ہے[۲]۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ان کے اخلاق بندروں کے سے کر دیئے گئے مگر یہ ظاہر الفاظ قرآنی کے خلاف ہے۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

''تو ہم نے اسے ذریعہ عبرت بنا دیا اس زمانہ اور اس کے بعد کے لئے اور نصیحت بنا دیا، فکر نجات رکھنے والوں کے لیے۔''

یہ تتمہ صاف بتا دیتا ہے کہ سزا محسوس شکل و صوت میں ایسی تھی جس کے عذاب الٰہی ہونے کا ہر شخص کو احساس ہو سکے۔ اخلاق کا مثل بندروں کے ہو جانا یہ اس قسم کی چیز نہیں ہے جسے ہر ایک شخص سمجھ سکے کہ یہ خالق کی طرف کا عذاب ہے جو نازل ہوا ہے آج بندر کیا بندروں سے بھی بدتر بہت سوں کے افعال ہیں مگر اس کے عذاب ہونے کا تصور بھی پیدا نہیں ہوتا۔

---

[۱] ۔ھم اھل ایلة قریة علیٰ شاطئی البحر وھو المروی عن ابن جعفر (طبریؒ) ''مقام ایلہ اگر وہی ہے جس کا ذکر توریت میں ایلات کے نام سے آتا ہے (استثناء ۲: ۸) تو یہ فلسطین کے جنوب میں عرب کی عین شمالی سرحد پر (قدیم علاقۂ روم میں) بحرِ قلزم کی مشرقی خلیج میں لبِ ساحل واقع ہے۔ موجودہ جغرافیہ اس کو عقبہ کے نام سے پہچانتا ہے اور عقبہ خلیج عقب کی مشہور بندرگاہ ہے (دریابادی)

[۲] ۔الموادمنه سرعة الایجادو اظھار القدرة وان لم یکن ھناك قول انما امرنا اذا اردناہ ان نقول له کن فیکون (نیشاپوری)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾

''اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ انہوں نے کہا: آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں کہا پناہ بخدا کہ میں جاہلوں میں سے ہوں۔''

بقرہ یعنی گائے کا قصہ:

اس واقعہ کی تفصیل اہل بیت طاہرینؑ سے دو معتبر روایتوں میں وارد ہوئی ہے [1]۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک نہایت نیک آدمی کو اس کے ایک ناہنجار عزیز نے قتل کر دیا اور خود آ کر اس کے خون کا دعویٰ کیا۔ اسی کے قاتل کا پتا چلانے کے سلسلے میں یہ گائے کے ذبح کرنے کا حکم ہوا طبرسیؒ یہ گائے بنی اسرائیل کے ایک جوان صالح کی تھی جس کا اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک اللہ کو پسند آیا اور اس کے صلہ میں اس گائے کے ذریعے سے اس کے فقر و فاقہ کو دور کرنا منظور ہوا اس لئے قاتل کا پتا لگانے کے لئے صفات کے ذریعہ سے اس گائے میں انحصار کر دیا تا کہ یہ لوگ اسے منہ مانگی قیمت پر خرید لیں اور وہی اس جوان کی فارغ البالی کا ذریعہ ہو۔ (صافی)

چوں کہ قاتل کی سراغ رسانی کا گائے کے ذبح کرنے سے بظاہر کوئی تعلق نہ تھا اس لئے قوم والے سمجھے کہ یہ مذاق ہے [2]۔

ظاہر ہے کہ قتل کا ایسا مقدمہ پیش ہونے کے ہنگام پر مذاق کا کوئی محل نہیں ہو سکتا اور اس محل پر مذاق کرنا جہالت کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا اس لئے موسیٰؑ نے مذاق کی نفی ان الفاظ میں فرمائی پناہ بخدا کہ میں جاہلوں میں سے ہوں یعنی اس محل پر مذاق کا میری نسبت تمہیں تصور ہی نہیں ہونا چاہیے [3]۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾

''انہوں نے کہا ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے التجا کیجئے کہ وہ ہمارے لئے ظاہر کر دے کہ وہ کیسی ہے؟ کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ایسی ہے جو نہ بوڑھی ہے نہ بن بیاہی، دونوں عمروں کے بیچ میں، ایسی ہے جس کے بچے ہو رہے ہیں۔ بس اب جو حکم ہو رہا ہے اسے انجام دیدو۔''

پہلے حکم کے الفاظ مطلق تھے کہ ایک گائے ذبح کر دو۔ اگر بنی اسرائیل ان الفاظ کے اطلاق پر عمل کر کے کوئی گائے لے آتے اور ذبح کر

---

[1] ۔رواہ القمی بسند معتبر عن الصادق علیہ السلام وابن بابویہ فی العیون فی الصحیح عن الرضا علیہ السلام (بلاغی)

[2] ۔لم یعرفوا بین ھٰذا الجواب وذلك السؤال مناسبة فظنّوا انه یلاعبھم (رازی)

[3] ۔اطلاق لاسم السّبب علی المسبّب فان الاشتغال بالاستھزاء لایکون الا بسبب الجھل ومنصب النبوة یجل عن ذٰلك (نیشاپوری)

ڈالتے تو اصولاً حکم کی تعمیل میں کسی کمی کا الزام نہیں آ سکتا تھا۔ مگر انہیں پہلے تو یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ قاتل کی سراغ رسانی کے لئے واقعی گائے ذبح کی جائے وہ اسے مذاق قرار دے رہے تھے۔ اب جب نبی کی تصریح کے بعد انہیں یہ یقین آیا کہ واقعی یہ حکم ہے تو ان کے ذہن میں آیا کہ بہرحال یہ کوئی عام گائے نہیں ہوسکتی، ضرور کوئی خاص گائے ہوگی۔ جس میں یہ خاصیت ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے کہا کہ وہ گائے کون سی ہے اور کیسی ہے۔ اب ان کی ذہنیت جب اس مشکل پسندی کی طرف مائل ہوگئی جو ان کے رجحانِ طبعی کا تقاضا تھی اور وہ علم الٰہی میں پہلے ہی سے تھی تو خالق نے کشاں کشاں ان کو اس معیّنہ گائے تک پہنچا دینا چاہا جس کے ذریعہ سے اس ایک جوان صالح کی اقتصادی حالت کو درست کرانا مقصود تھا[1]۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاۗءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝۶۹

''انہوں نے کہا ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے عرض کیجئے وہ ہمیں بتادے کہ اس کا رنگ کیا ہے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے چوکھے زرد رنگ کی جو دیکھنے والوں کو فرحناک بناتی ہو۔''

معلوم ہوتا ہے عموماً اس رنگ کی گائیں کم ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے یہ وصف فردِ واحد تعیین سے بہ نسبت پہلے کے قریب تھا۔ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کو فرحناک بنانا زرد رنگ کی طبعی صفت ہے[2]۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَاِنَّآ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝۷۰

''انہوں نے کہا اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے لئے مزید توضیح کرے اس لئے کہ گائیں ہمیں ملتی جلتی نظر آتی ہیں اور اللہ نے چاہا تو ہم صحیح راستہ پا جائیں گے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ صفات باوجود کمیابی کے اب بھی متعدد گایوں میں جمع نظر آ رہے تھے اور ان کی سمجھ میں یہ آتا ہوتا کہ بس کوئی ایک گائے کافی ہے تو وہ پہلے ہی کیوں ''ہندی کی چندی'' کرتے۔ ان کے تو دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہو نہ ہو یہ کوئی خاص گائے ہے۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اوصاف ایسے آئیں جو بس ایک منحصر ہو جائیں۔ ہاں ضرور ہے کہ گذشتہ ہر صفت سے دائرہ تنگ ہوتا جاتا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ رنگ کے وصف کے بعد اب یہ دائرہ کافی تنگ ہو گیا تھا۔ اسی لئے انہیں امید بندھی کہ بس ذرا سی تشریح اور ہو جائے تو ہم ایک فردِ واحد کو معیّن کرنے میں

---

[1] ۔امام رضاؑ کا ارشاد ہے: ولو انهم عمدوا الىٰ بقرة اجزأتهم ولكن شَدد و فشدّدالله عليهم (طبرسیؒ) ولا تنافی بين الروايتين لجواز ان يكون ذٰلك نتيجة علم الله بتشديدهم علىٰ انفسهم (بلاغی)

[2] ۔عن علیؑ من لبس نعلا صفراء قلّ همّهٗ لقوله تسر الناظرين (نیشاپوری) روی عن الصّادقؑ انّه قال من لبس نعلا صفراء لم يزل مسرورا حتى يبليها كما قال الله تعالىٰ صفرآء فاقع لونها تسر االناظرين (طبرسیؒ)

کامیاب ہوجائیں[1]۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

''کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہے جو نہ محنت کرنے والی ہے کہ زمین کو جوتتی ہو اور نہ وہ کھیتی کو پانی دیتی ہے۔ وہ بے عیب ہے ایسی کہ اس میں کوئی داغ دھبہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا اب آپ نے ٹھیک ٹھیک پتا دیا۔ اب جا کر انہوں نے اسے ذبح کیا اور معلوم تو ایسا ہوتا تھا کہ وہ یہ کریں گے نہیں۔''

معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان ممالک میں عام طور پر گایوں سے بھی کاشت کاری میں کام لیا جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ صفت بجائے خود مشترک بھی ہو لیکن دوسری صفتوں کے ساتھ اس صفت کے اجتماع نے گائے کی ایک مخصوص فرد میں انحصار کا فائدہ دے دیا جس کے بعد کوئی ابہام باقی نہ رہا۔ اور اسی لئے انہوں نے خوش ہو کر کہا کہ اب آپ نے ٹھیک ٹھیک پتہ دیا[2]۔

ابتدائی آیت کے الفاظ ان اللہ یامرکم ان تذبحو ابقرۃ پھر درمیان میں ایک دفعہ کی توضیح کے بعد نبی کا کہنا فافعلو اما تو مرون ''جو حکم ہو رہا ہے بس کر ڈالو'' اور آخر میں یہ کہ وما کادو ایفعلون'' معلوم تو ایسا ہوتا تھا کہ وہ اسے کریں گے نہیں،'' اس سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں یہ تمام موشگافیاں کرنا نہ چاہیے تھیں۔ پہلے ہی جو حکم ہوا تھا اسے بجالے آنا چاہیے تھا۔ انہوں نے بلاوجہ اس معاملہ کو طول دیا اور سوالات کیے جس پر قدرت نے بھی وزن بڑھانا شروع کر دیا۔ اس کی موید حدیث کا حوالہ پہلے آچکا ہے[3]۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْىِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

''اور جب کہ تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا، پھر تم اس کے بارے میں جھگڑ رہے تھے اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا اس کا جسے تم چھپا رہے تھے تو ہم نے کہا کہ اسی گائے کا ٹکڑا اس پر مارو۔

اس طرح اللہ مردوں کو جلاتا ہے اور تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے، شاید اب بھی تم میں عقل آجائے۔

اس آیت کے ذریعہ اس گائے کے ذبح کرنے کا سبب اور اس کا نتیجہ سب ظاہر ہو گیا جو ان روایات کے بالکل مطابق ہے جو اس کی تشریح میں وارد ہوئی ہیں۔

توریت میں ایک جگہ قتل کے بعد قاتل کا سراغ نہ ملنے کے موقع پر گائے کے ذبح کرنے کا ذکر ہے اس طرح کہ:

---

[1] ۔ومعنی اھتدائھم فی ھٰذا الموضع معنیٰ تبیّنھم ایّ ذٰلك الذی لزمھم ذبحہ ممّا سواہ من اجناس البقر (طبری)

[2] ۔الاٰن جئت بالحق ای بحقیقۃ وصف البقرۃ بحیث میّزتھا عن جمیع ما عداھا ولم یبق لنا فی شأنھا اشتباہ اصلا (ابوالسعود)

[3] ۔فی التصحیح عن الرضا علیہ السلام لو انھم عمدوا الیٰ بقرۃ اجزأتھم ولکن شدّدوا فشدّداللہ علیھم (بلاغی)

''اگر اس سرزمین پر جس کا خداوند تیرا خدا تجھے ارثاد کرتا ہے، کسی مقتول کی لاش کھیت میں پڑی ہوئی ملے اور معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے تب تیرے بزرگ اور تیرے قاضی باہر نکلیں اور ان بستیوں تک جو مقتول کے اردگرد ہیں، درمیان کو ناپیں اور یوں ہوگا کہ جو شہر مقتول سے نزدیک ہو اس شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے ہنوز کچھ خدمت نہ لی گئی ہو اور جوئے تلے نہ آئی ہو۔ اور وہاں اس وادی میں اس بچھیا کی گردن کاٹیں'' (استثناء ۲۱: ۱، ۹)

مگر توریت میں اس ذبح کا ماحصل کوئی معلوم نہیں ہوتا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اہتمام صرف قسم کھانے کے لئے ہے کہ ہم نے یہ خونریزی نہیں کی۔ اسلامی روایت یہ ہے کہ گائے کا ٹکڑا مقتول پر مارنے کے بعد وہ زندہ ہو گیا اور اس نے خود اپنے قاتل کا پتہ دے دیا[1]۔

آیت قرآنی میں آخری کذلک یحی اللہ الموتی ویریکم ایاۃ اس روایت کے مناسب ہے۔

آیت کا لفظ قرآنِ مجید میں معجزہ اور غیر معمولی مظاہرہ قدرت کے لئے آتا ہے۔ یریکم ایاۃ سے ظاہر ہے کہ گائے کا ٹکڑا لاش پر مارنے کے بعد کوئی غیر معمولی کرشمہ قدرت نمودار ہوا اور مخرج ما کنتم تکتمون سے ظاہر ہے کہ اس کرشمہ کے ذریعہ سے قاتل کی تعیین ہو گئی۔ یہ صورت بالکل اسی روایت پر منطبق ہوتی ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۷۴

''پھر اس کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہی رہے چنانچہ وہ پتھر کے مثل یا اور بھی زیادہ سخت ہیں' اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بعض سے ندیاں پھوٹ نکلتی ہیں اور بعض ان میں ایسے ہوتے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان میں سے پانی نکلتا ہے اور ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو جلال الٰہی کے اثر سے نیچے آ پڑتے ہیں اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔''

''پتھر کے مثل یا اور بھی زیادہ سخت'' اس طرح کی تردید کلام الٰہی میں اور بھی جگہ ہے جیسے قاب قوسین او ادنی ''(دو کمان بھر یا اس سے بھی کم)''۔ ان مقامات پر او جس کے معنی اردو میں یا کے ہوتے ہیں اظہار شک کے لئے نہیں ہوتا بلکہ وہ بل کے معنی میں ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پتھر کے مثل بلکہ زیادہ سخت ان میں اصل واقعہ وہی ہوتا ہے جو بعد میں آتا ہے مگر یہ ایک اندازِ کلام بمقتضائے بلاغت اختیار کیا جاتا ہے، اس لئے کہ وہی بات ایک دم سے کہہ دی جائے تو اتنی سننے والے کہ ذہن کو متوجہ نہیں کرتی جس قدر کہ اس وقت جب اسے تدریجی طور پر اس کے ذہن تک پہنچایا جائے۔

پتھروں کی جن کیفیات کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے وہ ان کے دلوں کے زیادہ سخت ہونے کا ایک ادبی انداز میں ثبوت ہے یعنی پتھروں

---

[1] ۔فی الکلام محذوف والتقدیر فقلن اضربوہ ببعضھا فضربوہ ببعضھا فحیی (رازی)

میں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ اثر پذیری آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے اور وہ ان کے تکوینی تغیرات ہیں جو خالق کے نظامِ تخلیق کے ماتحت ہیں۔ وہ اس نظامِ تخلیق سے باہر کبھی نہیں ہوتے۔ مگر تم ایسے انسان ہو کہ تمہارا دل خالق کے مقاصد سے باغی ہی رہتا ہے۔ پھر پتھروں کے ارادہ وجلال الٰہی سے متاثر ہونے کے مناظر خود بنی اسرائیل اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ چکے تھے، اس لئے یہ مثال ان کو مخاطب کر کے مطلب کے واضح کرنے کے لئے انتہائی مناسب اور برمحل ہوسکتی تھی[1]۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

''کیا تمہیں اس کی توقع ہے کہ یہ تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں ایسے لوگ رہے ہیں جو اللہ کا کلام سنتے ہیں اور پھر اسے سمجھنے کے بعد جان بوجھ کر اس میں تحریف کر دیتے ہیں۔''

یہ سوال اب مسلمانوں سے ہے۔ کیا کا لفظ جو سوالی حیثیت رکھتا ہے بغرض استفہام نہیں ہے بلکہ بطور انکار ہے یعنی ان سے یہ امید نہ کرنا چاہیے۔

''یو منو الکم ''میں لام سبب کا ہے جس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ تمہاری تبلیغ وہدایت سے متاثر ہو کر ایمان قبول کریں[2]۔

تحریف جس کا ذکر ہو رہا ہے یہ لفظی بھی ہوسکتی ہے اور معنوی بھی۔ لفظی کا مطلب ہے الفاظ میں ترمیم کر دینا اور معنوی اس کی غلط تاویل کر کے کہیں سے کہیں لے جانا۔

من بعد ما عقلوہ کی لفظ تحریف معنوی کے لئے کچھ زیادہ مناسب ہے کیوں کہ سمجھنے کا تعلق معنی سے ہوتا ہے یعنی باوجود یہ کہ اس کا جو اصلی مطلب ہے وہ سمجھ جاتے ہیں پھر بھی جان بوجھ کر اسے غلط معنی پہناتے ہیں اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ جب مطلب سمجھ لیتے ہیں کہ یہ الفاظ ہمارے خلاف پڑتے ہیں تو فوراً لفظوں میں ترمیم کر دیتے ہیں۔ بحیثیت واقعہ حقیقت یہ ہے کہ یہود دونوں قسم کی تحریف کے مرتکب تھے۔ اس لئے دونوں مراد ہوسکتی ہیں۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾

---

[1] ۔قد حدث هٰذا كله لبنی اسرائیل وشاهده وه برأی العین فی الحجر الّذی انفجرت منه العیون والجبل الّذی تجلی له الله فجعله دكّا وامّا انتم یابنی اسرائیل فلا تتاثر قلوبكم بالاٰیات ودلائل الحق (بلاغی)

[2] ۔ای یحدثوا الایمان لاجل دعوتكم ویستجیبوا الدعوتكم كقوله فاٰمن له لوط (نیشاپوری)

''اور جب وہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم مومن ہیں اور جب آپس میں تخلیہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ جو تمہیں معلومات اللہ نے دی ہیں وہ تم انہیں کیوں بتا دیتے ہو کہ جس سے وہ خود تمہارے خلاف پیشِ پروردگار حجت قائم کریں۔ آخر تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے ہو؟''

منافقین یہود کا رویہ:

یہ اب یہود میں سے جو منافق تھے ان کا ذکر ہے ان میں سے بہت سے مسلمانوں کے پاس آ کر اظہار ایمان تو کرتے ہی تھے بعض ان میں سے اپنے ایمان کے خلوص کو ظاہر اور مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے اپنی کتابوں سے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کی پیشین گوئیاں ان کے یہاں موجود تھیں وہ بھی بیان کرتے تھے کہ تم ان دلائل کی بناء پر مسلمان ہوئے ہو۔ یہ لوگ جب آپس کی صحبت میں بیٹھتے تھے تو دوسرے ان کو لعنت ملامت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ خیر ان کے پاس جاؤ اور اسلام کا اظہار کرو انہیں دھوکہ دینے کے لئے اس میں کوئی حرج نہیں مگر یہ کیا غضب کرتے ہو کہ انہیں اپنی کتابوں کی معلومات بھی پہنچا دیتے ہو[1]۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود تمہارے مذہب کی رو سے تمہاری پوری قوم کے مقابل میں دلائل پیش کر سکیں جن کا تمہارے پاس سچ مچ کوئی جواب نہیں ہے۔

''پیش پروردگار'' حجت قائم کرنے کا مطلب بظاہر یہی ہے جس کو ہمارے محاورہ میں یوں کہا جائیگا کہ ''بینی وبین اللہ'' تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ نہ یہ کہ روزِ قیامت حجت پیش کریں کیوں کہ قیامت کے دن تو حقیقتیں خود ہی منکشف ہوں گی، حجت و استدلال کا کوئی موقع نہ ہوگا۔

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾

''کیا انہیں یہ نہیں معلوم ہے کہ جو یہ چھپائیں اور جو ظاہر کریں اللہ کو اس سب کا علم ہے۔''؟

یعنی پیغمبر کو ان دلائل کے معلوم ہونے میں جو ان کی کتابوں میں ہیں ان کے بتانے کی ضرورت نہیں ہے انہیں تو اللہ کی طرف سے اطلاع حاصل ہوتی ہے جس کا علم ظاہر اور پوشیدہ سب پر حاوی ہے اس لئے یہ بتائیں یا نہ بتائیں اللہ اپنے رسولؐ کو جب چاہے گا ان تمام باتوں کی اطلاع دیدے گا۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾

''اور ان میں کچھ ایسے ان پڑھ لوگ ہیں جو سوا بلند بالا توقعات کے اپنی کتاب کا کچھ بھی علم نہیں رکھتے اور وہ بس خام خیالیوں میں مبتلا ہیں۔''

یہ ان عوام کا ذکر ہے جو مذہب کی حقیقت بس اتنی جانتے ہیں کہ ہم اس کی وجہ سے آخرت میں بلند سے بلند تر درجہ کے مستحق ہیں مگر خود اس مذہب کی جس سے نجات کے متمنی ہیں الف ب بھی نہیں جانتے ایسے عوام آج مسلمانوں میں بھی ہیں اور وہ بھی اپنی خام خیالیوں پر کوئی قابل

---

[1] ۔بما فتح اللہ علیکم بما بیّن لکم فی التوراۃ من نعتہ وصفتہ (نیشاپوری)

تعریف حیثیت نہیں رکھتے۔

یہود کے ان بلند و بالا توقعات کا ذکر قرآنِ مجید میں کئی جگہ تفصیل کے ساتھ بھی آیا ہے جیسے یہ کہ جنت میں بس ہم ہی ہم ہوں گے وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى (بقرہ۔۱۱۱) وہ کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی داخل نہیں ہوگا سوا اس کے جو یہودی یا عیسائی ہو۔''

یا یہ کہ دوزخ میں ہم گئے بھی تو بس چند دن کے لئے پھر بہشت میں پہنچنا ضروری ہے لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (بقرہ۔۸۰) (یعنی) ہمیں آگ چھو بھی نہیں جائے گی سوا گنتی کے چند دنوں کے یا یہ کہ ہم من حیث الجماعت اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ۔۱۸)

اب جائزہ لے لیجئے کہ سو فیصدی وہی خیالات اسلامی جماعت کے بہت سے افراد میں سرایت کیے ہوئے ہیں یا نہیں؟ ان کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نجات کیلئے فرائض و اعمال اخلاق حسنہ اور تکمیل نفس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے حالانکہ اسلام ایمان محبت اہل بیت اور ولایت علی بن ابی طالبؑ ہر چیز کا لازمی نتیجہ اطاعت و اتباع ہے جو استحقاق نجات کے لئے ضروری ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

''وائے بحال ان لوگوں کے جو اپنے ہاتھوں سے جعلی نوشتہ لکھ کر تیار کرتے ہیں پھر فقط تھوڑا سا معاوضہ حاصل کرنے کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ وائے بحال انکے اس کی وجہ سے جو وہ لکھتے ہیں اور وائے بحال ان کے اس کی وجہ سے جو وہ کمائی کرتے ہیں۔''

کتب سماویہ میں تحریف:

یہ اب علمائے یہود کا ذکر ہے جیسا کہ مولانا عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے:

''توریت کی تحریف اب کوئی اختلافی یا نزاعی مسئلہ نہیں۔ دوست دشمن سب ہی کو اب تسلیم ہو چکا ہے کہ یہ کلام الٰہی نہیں اور اس کے دوست زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا رسیدہ انسانوں کی تصنیف ہے۔ کسی جامد سے جامد یہودی میں بھی اب یہ ہمت باقی نہیں کہ توریت کو قرآن مجید کی طرح تنزیل لفظی قرار دے اب زیادہ سے زیادہ جو کہا جاتا ہے وہ یہ کہ خاصانِ خدا نے الہام خداوندی سے مشرف ہو کر اپنے طور پر اور اپنی عبارت میں ترتیب و تالیف دیا اور خدائے تعالیٰ کی جانب اس کا انتساب صرف مجازاً یا بالواسطہ ہے حقیقی اور براہ راست کے مفہوم میں نہیں پھر وقتاً فوقتاً جو تصحیفات ہوتی رہی ہیں وہ بالفرض کسی مصلحت یا ضرورت ہی سے ہوئی ہوں بہرحال نفس ان کے وقوع کا اعتراف کھلے خزانے سب کو ہے اور بائبل کی تنقید ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ جرمن فرنچ انگریزی وغیرہ میں چھوٹی بڑی صدہا بلکہ ہزارہا کتابیں اس موضوع پر

تیار ہو چکی ہیں اور مقامات ومضامین کا تو شمار ہی نہیں پھر فن بھی مختلف شاخوں میں تقسیم ہو چکا ہے انتقاد متن انتقاد تاریخی وغیرہ اور ہر شاخ کے الگ الگ ماہرین پیدا ہو رہے ہیں۔ عرب کے امی کے لائے ہوئے کلام کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے تیرہ صدی پیشتر ہی اہل کتاب کی کتاب کو (جو لفظی ترجمہ ہے بائبل کا) تمام تر محرف و نا قابل اعتماد قرار دے دیا تھا۔''

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰

''اور ان کا قول ہے کہ ہمیں دوزخ کی آگ تو چھو بھی نہیں سکتی سوا چند گنتی کے دنوں کے۔ کہو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد نامہ کرا لیا ہے کہ اللہ اپنے عہد نامہ کے خلاف کبھی نہ کرے گا یا تم بے جانے خود ہی اللہ پر ایک بات عائد کر رہے ہو''؟

کہا جاتا ہے کہ یہودی اس کے قائل تھے کہ ہمیں اتنے دن کہ جن میں موسیٰؑ کی غیبت کے موقع پر گوسالہ کی پرستش ہوئی تھی اور وہ چالیس دن تھے آتش دوزخ کی سزا دی جائے گی۔ اس کے بعد چاہے کتنا ہی بداعمال یہودی ہو وہ دوزخ میں نہیں رہ سکتا۔ اسی کی رد کی گئی ہے کہ یہ تم نے اللہ کے یہاں کے معاملات میں اپنے دل سے کیوں کر فیصلہ کر لیا ہے اور اللہ اس کا پابند کس بناء پر سمجھا جا سکتا ہے۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـَٔتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۸۱

''کیوں نہیں'' جو بھی برا کام کرے گا اور اس کے قصور اس پر حاوی ہو جائیں گے، تو یہی لوگ دوزخ والے ہوں گے کہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔''

یہ بَلٰی جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ''کیوں نہیں''، اس نفی سے متعلق ہے کہ ہمیں دوزخ کی آگ چند گنتی کے دنوں کے سوا چھو نہیں سکتی۔ اس کی رد کی جا رہی ہے اور اس ذیل میں نجات اور عدم نجات کے استحقاق کا ایک عام اصول بتایا جا رہا ہے کہ یہ کیا کہ ''ہمیں تو'' آگ چھو بھی نہیں سکتی۔ اللہ کے یہاں ''ماوشما'' کا سوال نہیں۔ اس کے یہاں کی نجات اور عدم نجات کا تعلق تو انسان کی زندگی اور اس کے کردار سے ہے، اگر وہ بے گناہ ہے یا گناہگار ہے مگر گناہوں کے ساتھ حسنات بھی موجود ہیں جن میں ایک بہت بڑا حسنہ ''ایمان'' ہے تو نجات کی امید کی جا سکتی ہے اور سزا ہو بھی تو اعمال کے تناسب سے عارضی ہوگی لیکن اگر جان بوجھ کر معصیت میں مبتلا رہا اور سب سے بڑی معصیت اس کے پیغام کو ٹھکرا دینا ہے جس کا نام کفر و شرک ہے اور جو سلطنت الٰہی سے بغاوت کرنا ہے اور اس کی پوری زندگی اس میں غرق رہی، حسنات کا اس کے نامہ اعمال میں نشان ہی نہیں ہے، تو اب وہ کسی قوم اور کسی جماعت سے بھی تعلق رکھتا ہو اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عذاب دوزخ کا استحقاق حاصل ہے اور اسے نجات حاصل ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٨٢﴾

''اور جو ایمان لائیں اور اچھے اعمال کریں تو یہ لوگ بہشت والے ہیں کہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

جس طرح وہ وعید اپنے عقائد و اعمال سے وابستہ ہے اسی طرح یہ وعدہ بھی حسن اعتقاد اور حسن عمل دونوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر دونوں باتیں حاصل نہیں تو پھر حتمی وعدہ نہیں ہے۔ ہاں تفضّل و احسان و کرم خسروانہ سے مغفرت ہو جائے تو اس پر پابندی عائد کرنے کا کسی کو حق نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٨٣﴾

''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور حسن سلوک سے پیش آنا اپنے ماں باپ عزیز و اقارب، یتیموں اور محتاجوں سے اور لوگوں کے ساتھ حسن گفتار سے کام لینا اور نماز ادا کرنا اور زکوۃ دیتے رہنا پھر تم سب پلٹ گئے بجز تم میں سے تھوڑے سے آدمیوں کے اور تم سب نے روگردانی اختیار کی۔''

عہد نامہ:

یہ عہد و پیمان ضروری نہیں کہ کسی خصوصی مظاہرہ کی شکل میں ہو بلکہ انبیاء و مرسلین پر ایمان لانے ہی میں یہ عہد مضمر ہے کہ ہم ان کے تعلیمات پر عمل کریں گے۔ پھر جب ان انبیاء کی تعلیمات میں ان باتوں کا حکم موجود ہے تو اسی کو کہا گیا ہے کہ اللہ نے اس کا عہد لیا ہے۔

اس لفظ کی اہمیت اس سے بڑھ جاتی ہے کہ خود اہل کتاب کی اصطلاح میں آج تک بائبل ''عہد نامہ'' ہی کہا جاتا ہے چنانچہ توریت اور اس کے ملحقات کو ''عہد قدیم'' اور انجیل اور اس کے ملحقات کو ''عہد جدید'' کہا جاتا ہے۔

اکثر یہ باتیں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے توریت میں اب بھی موجود ہیں۔ مثلاً پہلی بات ''اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو''۔ اس کیلئے ملاحظہ ہو توریت کا حکم: ''میرے حضور تیرے لئے دوسرا خدا نہ ہووے تو اپنے لئے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر پانی میں زمین کے نیچے ہے مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر'' (خروج ۲۰: ۲ ۵ و استثناء ۵: ۷ و ۸)

اور بھی مقامات پر اس کی ہدایت کی گئی ہے

والدین کے متعلق: ''تو اپنے ماں باپ کو عزت دے (خروج ۲: ۱۱۲ استثناء ۵: ۱۶)

اعزا کے متعلق: ''اور اپنے مفلس بھائی کی طرف سے اپنے ہاتھ مت بند کیجیو بلکہ تو اس پر اپنا ہاتھ کشادہ رکھیو اور کسی کام میں جو وہ چاہیے بقدر اس کی احتیاج کے ضرور اس کو قرض دیجیو (استثناء ۱۵: ۸ و ۹)

یتیموں اور محتاجوں کے بارے میں اور مسافر اور یتیم اور بیوہ جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہیں آویں اور کھاویں اور سیر ہوویں۔" (استثناء ۲۹:۱۴)

بعض باتیں اگر توریت میں اب نہیں ملتیں تو یہ تحریفات کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔

لوگوں کے ساتھ حسن گفتار کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی دل آزادی نہ ہو توہین یعنی تمسخر واستہزاء نہ ہو۔

بہترین معیار یہ ہے کہ جس طرح تم خود اپنے سے گفتگو پسند کرتے ہو اسی عنوان پر دوسرے سے گفتگو کرو[1]۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴿۸۴﴾

"اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں خونریزی نہ کرنا اور اپنے آدمیوں کو گھر سے بے گھر نہ کرنا پھر تم نے اس کا اقرار کیا جس کے گواہ تم خود ہو۔"

اس اقرار کا ثبوت توریت میں اب بھی موجود ہے:

"وہ بولے کہ سب کچھ خداوند نے فرمایا ہے ہم کریں گے اور تابع رہیں گے" (خروج ۲۴:۷)

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴿۸۵﴾

---

[1] ۔عن الباقر علیہ السلام قولوا للناس ما تحبون ان یقال لکم (نیشاپوری) کی الکافی والعیاشی عن الباقر علیہ السلام فی ھذہ الآیۃ قولوا للناس حسنا احسن ما تحبّون ان یقال لکم فان اللہ یبغض اللعان السباب الطعان علی المؤمنین المتفحش المسائل الطلحف ویحب الحیّ الحلیم العفیف المتغفف (صافی)

''پھر اب تم یہ ہو رہے ہو کہ آپس میں خونریزی بھی کرتے ہو اور اپنوں میں سے کسی کسی گروہ کو گھر سے بے گھر بھی کر دیتے ہو اور ان کے خلاف گناہ وظلم کے ساتھ متفقہ سازش کرتے ہو اور اگر وہ قید ہو جائیں تو فدیہ ان کا تم ہی دیتے ہو حالانکہ ان کا گھروں سے نکالنا ہی تمہارے لئے ناروا ہے تو کیا تم کتاب کے کسی کسی جزء کو مانتے ہو اور کسی جزء سے انکار کرتے ہو؟ پھر کیا سزا ہے اس کی جو تم میں سے ایسا کرے سوا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے اور قیامت کے دن وہ سخت ترین عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اللہ بے خبر نہیں ہے۔''

مدینہ میں یہود کے تین بڑے قبیلے تھے: بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع اور مشرکین کے دو قبیلے تھے، اوس اور خزرج جن میں جنگ رہتی تھی۔ یہودی قبائل میں سے بعض جنگ میں ایک طرف ہو جاتے تھے اور بعض دوسری طرف اس طرح مشرکین کی باہمی لڑائی میں یہ بھی ایک دوسرے کے فریق بن جاتے تھے اور پھر جب لڑائی ہوتی تھی تو ظاہر ہے کہ یہودیوں ہی کے ہاتھ سے یہودیوں کا خون بہتا تھا۔ گھر سے بے گھر ہونا پڑتا تھا اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو جنگ کے نتیجہ میں اس زمانہ میں ہوا کرتا تھا۔ اسی کو قرآن مجید نے لعنت ملامت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

یہ فقرہ کہ ''اگر وہ قید ہو جائیں تو فدیہ ان کا تم ہی دیتے ہو'' ان کے عمل کا تضاد دکھانے کے لئے ہے یعنی یوں تو تمہیں اتحاد قومی کا اتنا احساس ہے کہ اگر کسی غیر قوم کے ہاتھ میں کبھی تمہارے اس دوسرے قبیلہ کا آدمی گرفتار ہو جائے تو تم جس طرح بھی ممکن ہو اس کا معاوضہ دت کرا سے چھڑا لینا چاہتے ہو مگر بلا وجہ جنگ کے ہنگام میں خود ہی ان کو قتل کرتے ہو یا گھروں سے نکال کر بے وطن بناتے ہو[1]۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿٨٦﴾

''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کے عوض مول لیا ہے لہٰذا نہ ان پر عذاب میں کوئی کمی ہوگی اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔''

وہ سمجھتے تھے کہ ہم انبیاء کی اولاد ہیں اس لئے ہمیں آخرت میں کوئی کھٹکا نہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد ہماری مدد کریں گے۔ قرآن نے اسی آسرے کا خاتمہ کیا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ ۖ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿٨٧﴾

---

[1] ۔فکیف تستجیزون قتلهم ولا تستجیزون ترك فدائهم من عدوهم (طبری)

''اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی اور ان کے بعد لگا تار پیغمبروں کا سلسلہ قائم رکھا اور مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ کو ہم نے نمایاں معجزے عطا کیے اور روح القدس سے ان کو تقویت پہنچائی تو کیا جب بھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ان باتوں کو لے کر آئے جنہیں تمہارے نفوس پسند نہیں کرتے تو تم اکڑا ہی کرو گے بعض کو تو جھٹلاؤ گے اور بعض کو قتل ہی کر دو گے؟''

بیّنات کے لغوی معنی تو کھلے ہوئے دلائل یا واضح نشانیوں کے ہیں مگر اصطلاح قرآنی میں خوارقِ عادات' یعنی غیر معمولی مظاہرات قدرت کو جو رسولوں کے دعوائے نبوت کی تصدیق میں نمودار ہوتے ہیں 'ایات اور بیّنات کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل ہم نے مقدمہ تفسیر میں شواہد و دلائل کے ساتھ درج کیا ہے۔

روح القدس قرآنی اصطلاح میں ایک فرشتہ کا نام ہے ممکن ہے وہ جبرائیلؑ ہی ہوں۔

اس مقام پر روح القدس کے ذریعہ سے تائید کو اپنی جانب منسوب کر کے عیسائی عقیدہ تثلیث کی جو روح القدس کو عیسیٰؑ کے ساتھ اللہ کا شریک قرار دیتا ہے رد کی ہے۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸

''اور کہتے ہیں وہ کہ ہمارے دلوں پر قدرتی غلاف چڑھے ہوئے ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے انہیں اللہ نے رحمت سے دور کر دیا ہے۔ تو اب کم ایمان لائیں گے۔''

پیغمبر کی تبلیغ و تلقین کے مقابلہ میں وہ طنزیہ طور پر الفاظ استعمال کرتے تھے کہ آپ یہ کوشش ہماری ہدایت کی بے کار کرتے ہیں۔ ہمارے دلوں پر تو قدرتی غلاف ہیں لہٰذا ہم ایمان آپؐ پر لا ہی نہیں سکتے [1]۔

بل کے لفظ سے قرآن نے ان کی رد کی ہے کہ ان کے دلوں پر قدرتی خلاف نہ تھے مگر انکے کفر و عناد کے نتیجہ میں ان کی صلاحیت ایمان کم ہوگئی ہے۔ اس صلاحیت کے کم ہونے اور توفیقات کے سلب ہونے ہی کو یہاں ''لعنت'' کی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے [2]۔

''اب وہ بہت کم ایمان لائیں گے''۔ یہ کمی ایمان لانے والوں کے اعتبار سے بھی ہوسکتی ہے یعنی زیادہ افراد ان میں کفر پر قائم رہیں گے بہت تھوڑے ایسے ہوں گے جو ایمان لائیں اور یہ باعتبار قلت صلاحیت کے بھی ہوسکتا ہے یعنی ایمان لانے کا ان کے بہت کم امکان ہے۔ بہر حال اس سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ کفر کے بعد بھی جو اثر مرتب ہوا ہے وہ بحد اضطرار نہیں ہے ورنہ اس کے خلاف ہونا کم افراد میں یا کم درجہ تک بھی غیر ممکن ہوتا۔

---

[1] ۔ان قلوبنا مغشاة باغطية مانعة من وصول اثر دعوتك اليها (رازی) ''اغلف'' کہتے ہی غیر مختون کو، اُس کو جس کے ختنہ نہ ہوا ہو۔ نامختون کہنے کا محاورہ یہود کی زبان پر عام طور سے چڑھا ہوا تھا۔ انجیل میں بھی آیا ہے ''اے گردن کشو اور دل اور کان کے نامختونو (اعمال ۷:۵۱) قرآن کا یہ اندازِ بیان بھی ایک اعجازی پہلو رکھتا ہے کہ جب یہود کا قول نقل کیا تو زبان بھی ان ہی کی اختیار کی (دریابادی)

[2] ۔بل لعنهم الله ردّ لقولهم وان تكون قلوبهم مخلوقة كذلك لانها خلقت الفطرة والتمكن من قبول الحق ولكنهم لعنوا اى طردوا عن رحمة الله وابعدوا عن الخيرات بسبب كفرهم الّذى احدثوه بعد نصب الاملة وازاحة الغلة (نیشاپوری)

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾

''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آئی جو ان کے پاس ولی کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے تو باجود یہ کہ اس کے پہلے یہ لوگ خود کافروں کے سامنے اس کتاب کے ذریعہ سے فتح وظفر کا اعلان کرتے تھے اب جسے وہ پہلے سے جانتے تھے جب ان کے پاس آئی تو وہ خود اس کے منکر ہو گئے اللہ کی لعنت ہو کافروں پر۔''

یہود کا انتظار اور بعد میں انکار:

''تصدیق کرنے والی کتاب'' سے مراد یہی قرآن ہے۔ اس کا خاص جوہر یہ ہے کہ اس نے پہلے ولی کسی کتاب کی اصلاً صداقت سے انکار نہیں کیا ہے بلکہ سب کو من جانب اللہ مانا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اس کے ماننے والوں کی تحریفوں کا پردہ فاش کیا ہے۔

اہل کتاب کے مقابلہ میں جو کافروں کا نام ہے اس سے مراد مشرکین ہے یعنی جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی نبوت کے بھی قائل نہ تھے تو اسلام کے آنے سے پہلے ان کے مقابلہ میں اہل کتاب مومن کی حیثیت رکھتے تھے اور وہ کافر کی۔ یہ اہل کتاب ان کافروں کے سامنے جب بات پڑتی تھی تو کہتے تھے کہ ابھی تم جو چاہو ہمارے ساتھ بدسلوکی کر لو۔ دیکھنا جب محمد مصطفیٰ ﷺ مبعوث ہوں گے تو پھر مدینہ میں ہم ہی ہم ہوں گے۔ تمہارا یہاں پتہ بھی نہیں ہوگا۔ مگر جب حضرتؐ کی بعثت ہوئی تو وہ یعنی باشندگان مدینہ اوس وخزرج تو ایمان لائے اور یہ خود آپؐ کی رسالت کے منکر ہو کر کافر بن گئے [1]۔

یہ ظاہر کرنے کے بعد کہ ان کا انکار کسی غلط فہمی یا نادانی کا نتیجہ نہیں بلکہ سراسر تعصب وعناد پر مبنی ہے خاتمہ آیات میں ان کو مورد لعنت قرار دیا گیا ہے۔

قرآنِ مجید میں کافروں، ظالموں اور کاذبوں پر لعنت بہت جگہ وارد ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مستحق لعنت پر لعنت دشنام نہیں ہے جو خلاف وشائستگی ہو بلکہ وہ کسی کے اعمال سے بیزاری کے اظہار کا بالکل سنجیدہ عنوان ہے [2]۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ

---

[1] ۔کانت الیہود تقول لھن امالو قد بعث فیکم محمد النخرجنکم من دیارنا واموا لنا فلما بعث اللہ محمدا اٰمنت بہ الانصار و کفرت بہ الیہود(صافی)روی فی الکافی فی لموثق عن الصّادقؑ وعن تفسیر العیاشی عن الصّادقؑ مثلہ وفی صحیحۃ اسحٰق بن عمار عن الصّادقؑ ما یقرب من ھٰذا فیکون معنی یستفتحون یستنصرون بالتھدید یطلبون فی کلا مھم ما یصلون من الفتح والنصر فی المستقبل (بلاغی)

[2] ۔ان لعن من یستحق اللّعن من القول الحسن (رازی)

فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

''انہوں نے اپنے نفوس کے بچانے کا کیا برا سامان کیا ہے کہ وہ انکار کرتے ہیں اس کا جسے اللہ نے نازل کیا ہے صرف اس بات کی ضد میں کہ کیوں اللہ اپنے فضل و کرم کی اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے بارش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے دہرے غضب کے مستحق ہیں اور کافروں کے لئے ذلت دینے والا عذاب ہے۔''

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اشتراء کے معنی بیع کے بھی ہوتے ہیں اور یہاں اشتروا کے معنی یہی ہیں کہ انہوں نے کسی بری قیمت پر اپنے نفوس کو بیچا ہے مگر کلام عرب میں عموماً بیع کے محل پر شراء ہوتا ہے نہ کہ اشتراء کے معنی خریدنے ہی کے ہوا کرتے ہیں [1]۔

دوسرا قول یہ ہے اور وہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کہ اشتراء کے معنی خریدنے کے ہیں اور خریداری کا مطلب ہے عذاب آخرت سے اسے چھڑانے کا سامان کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو یہ سامان ایمان اور اطاعت سے مہیا کرنا چاہیے مگر علمائے یہود کی عقل مندی دیکھو کہ یہ خدا ترسی کا ادعاء رکھتے ہوئے بطور سامان نجات کے کفر و عناد کا ذخیرہ فراہم کر رہے ہیں [2]۔

یہ کفر عناد کس لئے تھا، نسلی تعصب کی بناء پر کہ نبوت خاندان اسرائیل سے نکل کر اولاد اسمٰعیل میں کیوں چلی گئی ہے۔ گویا وہ اللہ کے فضل و کرم پر پہرے بٹھانا چاہتے تھے کہ وہ ان سے نکل کر کسی اور طرف نہ جا سکے۔ اب اس میں دو جرم ہو گئے ایک بلا وجہ حقیقت کا انکار جس کا نام کفر ہے اور دوسرے حسد جس کے معنی ہیں اللہ کی نعمت کو جس سے اس کسی کو سرفراز کیا ہے دیکھ کر جل جانا اور اس کے مٹانے کی فکر کرنا۔ اور ان میں سے ہر جرم مستحق غضب ہے اس لئے کہا گیا کہ وہ غضب بالائے غضب یا دہرے غضب کے مستوجب ہیں اور چوں کہ ان کا کفر بر بنائے غرور و تکبر تھا اسی لئے ان کی سزا کے لئے بھی دو لفظ صرف کئے ایک تو عذاب جو کفر و معصیت کا نتیجہ ہے ہی اور دوسرے مہین یعنی ذلت دینے والا جو ان کے غرور کے بالمقابل ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس پر جو اللہ نے نازل کیا ہے ایمان لاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ جو ہم پر نازل ہوا ہے اس پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کے علاوہ ہے اس کے یہ منکر ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور ان کے پاس والی کتاب

---

[1] ۔کلام العرب فیما بلغنا ان یقولوا اشریت بمعنی بعت و اشتریت بمعنی ابتعت (طبری)

[2] ۔وھذا الوجہ اقرب الی المعنی، واللفظ من الاول (رازی)

کی تصدیق کرنے والا ہے کہو کہ اچھا اگر تم ایمان رکھتے تھے تو اس کے پہلے انبیاء کو کیوں قتل کر ڈالتے تھے؟''

یہود کا گزشتہ انبیاء کے ساتھ سلوک:

مطالبہ ایمان کا جواب بنی اسرائیل یعنی یہودی یہ دیتے تھے کہ کوئی ہم کافر تھوڑی ہی ہیں ایمان رکھتے ہیں قرآن نے اس کا جواب پہلے یہ دیا ہے کہ خود ان کے اس قول کے معنی یہ ہوئے کہ جو کچھ ان کے خاندان میں نہیں اترا ہے اس کے یہ منکر ہیں اور جب کہ وہ بھی حق ہے اور من جانب اللہ ہے اور پھر یہ کہ وہ خود ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والا ہے کچھ اس کے خلاف نہیں ہے تو اس کا صرف عناد اور تعصب سے منکر ہونا یہی کفر ہے اس کے بعد پھر ان کے خود اپنے خاندان والی کتابوں پر ایمان کا ان کے قومی کردار کی رو سے جائزہ لیا ہے کہ تم نے من حیث القوم ان ہی کتابوں کو کب مانا تھا بلکہ تم تو ان پیغمبروں کو جو تمہارے پاس آتے رہے قتل ہی کرتے رہے۔ پھر تمہارا دعوائے ایمان خود ان ہی کتابوں پر کہاں تک درست اور حق بجانب ہے؟!

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ ۲

''اور موسیٰؑ تمہاری جانب کھلے ہوئے معجزے لے کر آئے پھر تم نے اس کے بعد بھی حد سے قدم آگے بڑھاتے ہوئے گوسالہ پرستی اختیار کی۔''

بنی اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے جتنے معجزے آئے اتنے شاید ہی کسی دوسری قوم کے سامنے آئے ہوں۔ اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اوّل درجہ کے بالیقین ہوتے مگر واقعات سے یہ قوم جتنی ڈھلمل یقین ثابت ہوئی شاید ہی کوئی قوم ثابت ہوئی ہو۔

قرآن میں بنی اسرائیل کے واقعات پر زور اس امت کی تنبیہہ کے لئے دیا گیا ہے چوں کہ خود حضرتؐ نے اس امت والوں کو مخاطب کر کے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ تم بنی اسرائیل کے طریقے اختیار کرنے والے ہو[1]۔ اس لئے اس قوم کے کرتوت پر بار بار روشنی ڈالی گئی کہ اس امت کے فرض شناس افراد ان راستوں پر نہ چلیں اور نہ چلنے والوں کا ساتھ دیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۪ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

---

[1] ۔لتتبعن۔۔۔سنن بنی اسرائیل خذوا القذّۃ بالقذّۃ حتیٰ لو دخلوا جحر ضب لدخلتموہ (حدیث نبوی)

''اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے اوپر کوہ طور کو بلند کیا کہ جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑو اور بات کی سماعت کرو، انہوں نے کہا کہ سن تو ہم نے لیا مگر ماننے پر تیار نہیں ہیں اور ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں میں گوسالہ کی محبت سرایت کر گئی۔ کہو کہ اگر تم ایمان والے ہو تو تمہارا ایمان کیسے برے تقاضے تم سے کرتا ہے۔''

''سن تو لیا مگر ماننے پر تیار نہیں''۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جسارت آمیز تمسخر کے ساتھ انہوں نے زبان ہی سے کہہ دیا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے نہ کہا ہو بلکہ عمل ان کا اسی کا ترجمان ثابت ہو رہا تھا۔

یہاں تک بظاہر تمام جواب ان کے اس قول کا چلا آ رہا ہے کہ جو ہم پر نازل ہوا ہے اس پر تو ہم ایمان لائے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ سب کہا گیا کہ اگر تم ایمان لائے تھے تو انبیاء کو کیوں قتل کرتے رہے۔ کتنے معجزے پیش کیے گئے اور پھر اس کے بعد بھی تم نے گوسالہ پرستی اختیار کی۔ اس عہد و پیمان کے بعد کہ ہماری شریعت اور اس کے احکام کی اطاعت کرو گے پھر بھی تم نے قولاً یا عملاً اطاعت سے انکار کر دیا۔ اگر تم واقعی اپنی کتابوں پر ایمان رکھتے ہوتے تو اس کے تقاضے یہ نہ ہوتے جو تم سے ظاہر ہوئے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾

''کہو کہ اگر عالم آخرت پیش خدا صرف تمہارے لئے ہے تمام دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر تو اگر تم سچے ہو تو تمہیں موت کا مشتاق و آرزومند ہونا چاہیے۔''

تمنائے موت کا مطالبہ اور یہود کی نفسیاتی کیفیت:

یہود نسلی طور پر اپنے کو نجات کا حق دار سمجھتے تھے۔ یہ ان کا عقیدہ مختلف الفاظ میں قرآن مجید میں نقل کیا گیا ہے اور ہر جگہ ایک خاص طرز میں اس کی رد کی گئی ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (بقرہ ۱۱۱)

ان کا قول ہے کہ ہرگز بہشت میں داخل نہیں ہوگا کوئی سوا اسکے جو یہودی یا عیسائی ہو یہ ان کی آرزوئیں ہیں کہو کہ تم اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ (مائدہ ۱۸)

اور یہودی و عیسائی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ کہو کہ پھر بھلا وہ تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دیگا؟ بلکہ تم بھی اس کی مخلوق میں سے کچھ انسان ہو۔

یہاں ان کے جواب میں کہا گیا ہے کہ اگر تم بلا ایمان و عمل صالح صرف اسرائیلی قوم اور یہودی مذہب میں پیدا ہونے کی وجہ سے یقین نجات رکھتے ہو تو پھر موت سے خائف کیوں ہوتے ہو۔ جب جانیں کہ موت کے مشتاق اور آرزومند ہو۔

مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ نجات کسی قوم اور نسل میں پیدا ہونے سے وابستہ نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ایمان اور عمل صالح کی ضرورت ہے۔ اب اگر مسلمانوں میں سے کوئی فرد یا جماعت کسی وقت یہ سمجھنے لگے کہ ہم بلا لحاظ صفات شخصی صرف جماعتی انتساب کی وجہ سے نجات کے حق دار ہو جائیں گے تو یہی تمام جوابات و مطالبات جو قوم یہود کے سامنے پیش کیے گئے ہیں اس کے سامنے بھی پیش کیے جانا درست ہوں گے۔

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۹۵

''اور وہ اس کے آرزومند کبھی نہیں ہو سکتے ان گناہوں کی وجہ سے وہ اپنے ہاتھوں سے کر چکے ہیں اور خدا اپنی حدود سے تجاوز کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔''

اس میں ان کے ضمیروں کی ترجمانی کی گئی ہے یعنی وہ زبان سے لاکھ کہیں کہ لقائے الٰہی کے ہم مشتاق ہیں مگر وہ جانتے ہیں کہ ان کی سیاہ کاریاں اس لائق نہیں ہیں کہ وہ اس حال میں اپنے خدا کو منہ دکھا سکیں۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰي حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۶

''اور ایک خاص طرح کی زندگی کا لالچ ان میں سب سے یہاں تک کہ مشرکین سے بھی زیادہ پاؤ گے۔ ان میں کا ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اسے ہزار برس کی عمر ملتی حالانکہ اس عمر کا ملنا بھی اسے عذاب سے نہیں بچا سکتا اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے اللہ خوب دیکھتا ہے۔''

مشرکین کا ذکر اس محل پر اس لئے کیا گیا کہ وہ تو آخرت کے قائل ہی نہیں اس لئے وہ اگر اس دنیاوی زندگی کو زیادہ سے زیادہ عزیز رکھیں تو کوئی تعجب نہیں مگر یہ یہود تو کتب سماویہ پر ایمان کا ادعا رکھنے والے ہیں۔ انہیں تو دنیا سے اتنا دل نہ لگانا چاہیے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰي قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۹۷

''کہہ دیجئے کہ جو شخص جبرائیل کا دشمن ہے تو انہوں نے تو اس کو آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے تصدیق کرتا ہوا اس کی جو اس کے پہلے سے تھا اور ہدایت اور خوشخبری ایمان لانے والوں کے لیے۔''

انبیاء مرسلین سے سنی سنائی باتوں کے مٹے ہوئے آثار یہود میں اس حد تک تھے کہ وہ فرشتوں کو وجود تسلیم کرتے تھے کچھ بھولے بسرے نام جبرائیلؑ، میکائیلؑ وغیرہ بھی ان کے ذہن میں تھے مگر جبرائیلؑ کے ساتھ ان کے یہاں یہ روایت وابستہ ہو گئی تھی کہ یہ امتوں پر عذاب ہی لاتے ہیں۔ رسولؐ خدا نے اپنی وحی کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ یہ وحی جبرائیل لاتے ہیں تو وہ اس پر بڑے چراغ پا ہوئے اور انہوں نے کہا کہ

یہ جبرائیل تو ہمارے پرانے دشمن ہیں۔اس لئے وہ ہمارے خلاف اس طرح کی آیتیں لاتے ہیں۔اسی کا جواب قرآن نے دیا ہے۔

عقلاً یہ ہے کہ یا تو وہ سرے سے جبرائیل وغیرہ فرشتوں کے وجود کے منکر ہی ہوتے جیسا کہ مادی نقطہ نظر ہے یا اگر وہ تعلیمات مذہبی کی بنا پر ان کو مانتے تو پھر انہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ وہ تو نور سے مخلوق ہوتے ہیں' ان میں ہوا و ہوس کہاں۔وہ تو حکم الٰہی کے طبعاً پابند ہوتے ہیں۔قرآن نے ان کو ان کے خیال کی اس حماقت پر متنبہ کیا ہے۔

الفاظ آیت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلام جس طرح شروع ہوا تھا اس طرح ختم نہیں ہوا۔معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بات شروع کی گئی ان الفاظ سے کہ کہہ دیجئے کہ جو شخص جبرائیل کا دشمن ہے اس کا تقاضا یہ تھا کہ اب مخاطب آخر تک مشرکین ہوتے اور متکلم رسول اللہؐ رہتے مگر اتنا کہہ کے جیسے متکلم نے اس جملہ کو ناتمام چھوڑ دیا اور وہ اس کی نامعقولیت پر الگ سے رسولؐ کو مخاطب کر کے تبصرہ کرنے لگا۔اس کا تتمہ پھر نئے سرے سے کلام شروع کر کے اس کے بعد والی آیت میں لایا گیا ہے۔

ایسے مواقع پر مفسرین ترکیب نحوی بنانے میں دقتیں محسوس کیا کرتے ہیں لیکن یہ انداز دباء کے کلام میں فصاحت و بلاغت کی جان ہوتے ہیں اور وہ ہر زبان میں متعارف ہیں۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

''جو دشمن ہو اللہ کا یا اس کے فرشتوں کا یا اس کے پیغمبروں کا یا جبرائیل یا میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔''

جبرائیلؑ سے دشمنی اور اس کا جواب:

جو بات اس کے قبل کی آیت میں ''قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ'' کہہ کر شروع کی گئی تھی اسے اب زیادہ وسعت اور عمومیت دے کر ختم کیا گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اولیائے الٰہی سے دشمنی خواہ وہ فرشتوں میں ہوں اور خواہ انسانوں میں ان سے دشمنی نہیں ہے وہ حقیقتاً اللہ سے دشمنی ہے اور ایسا شخص ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔خود اپنا ہی بگاڑتا ہے اس لئے کہ ان سے دشمنی کے نتیجہ میں اللہ خود اس کا دشمن بن جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ خالق سے دشمنی مول لے کر کون مخلوق پر کوئی فلاح حاصل کر سکتا ہے[1]۔

جبرائیلؑ و میکائلؑ فرشتوں کے لفظ میں آ گئے تھے مگر انہیں علیحدہ کر کے اظہار عزت و خصوصیت کے لئے بیان کیا[2]۔

---

[1] ۔الذی سمّاھم اللہ فی ھٰذہ الایۃ ھم اولیآءاللہ واھل طاعتہ ومن عادی اللہ فقد عادی اللہ وبارزہ بالمحاربۃ (طبری)

[2] ۔انما اعاد ذکرھما لفضلھما ومنزلتھما کقولہ فیھما فاکھۃ ونخل ورمان (مجمع البیان)

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

''اور حقیقت امر یہ ہے کہ ہم نے آپ پر بہت صاف اور واضح آیتیں اتاری ہیں اور ان کا انکار بداعمال لوگوں کے سوا کوئی کر ہی نہیں سکتا۔''

آیات سے مراد قرآن کی آیتیں بھی ہیں اور حقانیت کی دوسری نشانیاں بھی۔

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''اور کیا یہ جب بھی کوئی عہد کریں گے تو ایک جماعت ان میں سے اسے پس پشت ضرور ڈال دے گی' بلکہ زیادہ ایسے ہی ہوں گے جو ایمان نہ لائیں؟''

یہ استفہام اقراری ہے یعنی واقعی ان کا مستقل کردار یہی بن گیا ہے۔

وَلَمَّا جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۘ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ پیغمبر آیا جو ان کے پاس والی کتاب کی تصدیق کرنے والا ہے تو ان اہلِ کتاب میں سے ایک جماعت نے اللہ کو اپنے پس پشت ڈال دیا جیسے کہ وہ اسے جانتے ہی نہ تھے۔''

یہاں ''اللہ کی کتاب'' سے مراد خود ان کے یہاں کی کتاب توریت ہے یعنی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کر کے انہوں نے درحقیقت خود اپنی کتاب توریت سے روگردانی کر لی کیونکہ اس میں تو صاف صاف ان کے آنے کی بشارت تھی اور اسے وہ جانتے بھی تھے۔ مگر اب وہ انکار ایسا کر رہے ہیں جیسے کہ وہ بالکل اس سے ناواقف تھے [1]۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰي مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَي الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ

---

[1] ۔کانہم لا یعلمون ای ان القوم کانوا یعلمون ولکنّہم افسدو علمہم وجحدوا و کفروا و کتموا (طبری)

بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

''اور ان لوگوں نے پیروی کی اس کی جو شیاطین حضرت سلیمان کی سلطنت میں پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور سلیمانؑ نے کفر اختیار نہیں کیا تھا بلکہ ان ہی شیطانوں نے کفر پھیلایا تھا کہ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور (پیروی کی) اس کو جو بابل میں ہاروت اور ماروت دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا اور وہ دونوں کسی کو اس وقت کچھ نہیں بتاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیں کہ ہم بس ایک ذریعہ آزمایش ہیں تو تم کہیں کافر نہ ہو جانا مگر وہ لوگ ان سے وہ سیکھتے تھے جس سے کہ مرد اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال دیں حالانکہ وہ اس سے کسی کو بغیر مشیت الٰہی کے نقصان ہی پہنچا سکتے تھے اور وہ ایسی باتیں سیکھتے تھے جو ان کے لئے مضر ہیں اور مفید نہیں ہیں اور وہ خوب جانتے ہیں کہ جو ان چیزوں کو اختیار کرے گا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا اور کس بری قیمت پر انہوں نے اپنے نفسوں کا سودا کیا۔ کاش وہ اس سے باخبر ہوں۔''

جادو کی ابتداء اور اس کی ترقی:۔

اس آیت میں یہود کی ایک اور بے راہ روی کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ بجائے آسمانی کتاب اور حقائق مذہب کی واقفیت حاصل کرنے کے وہ جادو ٹونے میں پڑ گئے ہیں اور اسے اپنا کمال سمجھنے لگے۔

عبدالماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں کہ ''فنون سحر کہانت میں یہود کی مہارت تاریخ میں مسلم چلی آرہی ہے ان کے اکابر و مشاہیر اس کا برابر اعتراف کرتے آرہے ہیں بلکہ اکثر فخر کے ساتھ یہود کا یہ شوق ان کی قدیم تاریخ سے قطع نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بھی قائم تھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کا یہودی النسل و یہود خصلت پروفیسر مارگریس آنجہانی، جس کی اسلام دشمنی ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اپنی انگریزی سیرت رسول میں معاصر یہود عرب کے سلسلہ میں لکھتا ہے یہ لوگ فن سحر کے ماہر تھے اور بجائے میدان جنگ میں آنے کے سفلی عملیات کو ترجیح دیتے تھے'' (صفحہ ۱۸۹) نیز بنی اسرائیل کی ساحری و کہانت کا ذکر خود عہد عتیق کے صحیفوں میں بھی موجود ہے۔

''انہوں نے اپنے بیٹے، بیٹی کو آگ کے درمیان گزارا اور فال گیری اور جادوگری کی۔ ان باعثوں سے خداوند بنی اسرائیل پر پنٹ غصہ ہوا اور اپنی نظر سے انہیں گرا کر دور کر دیا (۲ سلاطین ۱۷: ۱۷ و ۱۸)

اس فن سحر کی ابتدا کیا تھی اور مذہبی جماعت کی اس کے ساتھ گرویدگی کہاں تک اس کے شایان شان تھی اس پر قرآن مجید نے روشنی ڈالی ہے اور اس ذیل میں بعض ان غلطیوں کی اصلاح کی ہے جو عوام کے ذہن میں راسخ ہو گئی تھیں۔

سحر کی اشاعت کی ابتداء دو ذریعوں سے بتائی گئی جن میں ایک از اصل غلط تھا اور ایک بنیادی طور پر صحیح تھا مگر عمل اس پر غلط طریقہ سے

کیا گیا۔

جناب سلیمانؑ کی طرف سے صفائی:

پہلا ذریعہ شیاطین جس کے تفصیل جیسا کہ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ چوں کہ جناب سلیمانؑ پیغمبر کو خالق کی جانب سے اصناف مخلوقات پر غیر معمولی اقتدار عطا فرمایا گیا تھا شیاطین نے ان کے بعد گمراہی خلائق کا یہ سامان کیا کہ کچھ جادو کے قواعد اصول لکھ کر ان پر سرخی یہ قائم کردی کہ یہ وہ علمی ذخیرہ ہے جو آصف بن برخیا نے سلیمانؑ بن داؤدؑ کے لئے فراہم کیا تھا۔ اس کتاب کو انہوں نے تخت سلیمانؑ کے نیچے دفن کر دیا۔ وفات سلیمانؑ کے بعد لوگوں کو وہ کتاب ملی اور یہ بہت سے لوگوں کے لئے سبب کفر بن گیا۔ وہ کہنے لگے کہ بس معلوم ہو گیا کہ سلیمانؑ جو غیر معمولی قدرت وسلطنت کے مالک تھے وہ من جانب اللہ نہ تھی بلکہ اسی سحر کا نتیجہ تھی [1]۔

اس نوشتہ کی ذمہ داری جناب سلیمانؑ کی طرف عائد کی جارہی تھی۔ اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے مذکورہ آیت میں یہ دفع دخل ضروری سمجھا گیا کہ سلیمانؑ نے یہ کفر نہیں کیا تھا شیاطین نے اس کفر کا ارتکاب کیا تھا۔

بظاہر یہاں لفظ کفر کا سحر کے استعمال اور اس کے اعتقادی پر اطلاق ہوا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: **الساحر کالکافر والکافر فی النار**۔

سلیمانؑ کے لئے اس صفائی کے پیش کرنے کی ضرورت اس لئے بھی ہوئی کہ یہود و نصاریٰ میں رائج شدہ بائبل میں نے ان کی طرف بلاتکلف کفر اور شرک کی نسبت دے دی ہے مثلاً: ''جب سلیمانؑ بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں [2] نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا (سلاطین ۱۱: ۴، ۹، ۱۰) ''خداوند سلیمانؑ پر غضب ناک ہوا اور اس نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا'' (سلاطین ۱۱: ۹، ۱۰)

قرآنِ کریم جو کہ انبیاء مرسلین کی شانِ مقدس کو غلط الزامات سے بری کرنے اور ان کی اصل عظمت کو قائم کرنے کا کفیل ہے اس نے اہل کتاب کے عائد کردہ الزامات سے مثل دیگر انبیاء کے سلیمانؑ کو بھی بری کیا اور کہا کہ کفر کے مرتکب دوسرے تھے سلیمانؑ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہ تھی۔

جیسا کہ عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے ''اب قدرت حق کا اعجاز دیکھیے کہ جو محققانہ و فاضلانہ کتب جوامع وحادیات بائبل ہی کے پرستاروں کے قلم سے نکل رہی اور شائع ہو رہی ہیں وہ تائید وتصدیق بائبل کی الزام دہی کی نہیں، قرآن کے جواب صفائی کر رہی ہیں! انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، برطانوی کاوش وتحقیق کا لب لباب ہوتا ہے۔ اس کے سب سے آخری ایڈیشن میں مقالہ زیر عنوان سلیمانؑ نکال کر دیکھئے صاف مضمون ملے

---

[1] ۔ القمی والعیاشی عن الباقرؑ قال لما مات سلیمان وضع ابلیس السحر ثم کتبه فی کتاب فطواه و کتب علی ظهره هٰذا ماوضع اٰصف بن برخیا لملك سلیمان بن داؤد من ذخائر کنوز العلم من اراد کذا و کذا فلیفعل کذا و کذا ثم دفنه تحت السریر ثم استبان لهم فقر أوه فقال الکافرون ما کان یغلبنا سلیمان الا بهذ ا (صافی)

[2] ۔ بائبل کے اردو نسخوں کی زبان یہی ہے۔

گا ''سلیمانؑ خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے'' (جلد ۲ ص ۶۵۲ طبع چہاردہم) انسائیکلو پیڈیا ببلیکا، خاص مسیحی فضلا اور پرستاران بائبل کی تحقیق وتدقیق کا ثمرہ ہے۔ اس میں یہاں تک ہے کہ بائبل کو جو آیتیں ابھی اوپر نقل ہوچکی ہیں ان کا حوالہ دے کر یہ لکھ دیا ہے کہ یہ عبادتیں بعد کو بڑھائی گئی ہیں اور الحاقی ہیں اور پھر لکھا ہے ''یہ تو غالباً صحیح ہے کہ سلیمانؑ کی بیویاں متعدد تھیں۔ اسرائیلی بھی اور غیر اسرائیلی بھی لیکن انہوں نے نہ تو سب کے لئے قربان گاہیں تیار کرائیں اور نہ ہی تو خدائے واحد کے پرستش کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش کا تجربہ ہونے دیا (کالم ۴۶۸۹)

دوسرا ذریعہ سحر کی اشاعت کا بتایا گیا ہے دو فرشتے جن کا نام ہاروت اور ماروت تھا اس اشاعت کا مرکز بائبل تھا جسے جغرافیہ میں اب عراق کہا جاتا ہے۔ یہ اپنی ساحری کے لحاظ سے زمانہ قدیم میں مشہور رہا ہے۔

عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں: ''اسی ملک کا ایک دوسرا قدیم نام کالڈیا (کلدانیہ) ہے اور انگریزی میں آج تک لفظ کالڈین (کالدانی) ساحر کا مرادف چلا آرہا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں اس ملک کا ذکر کثرت سے آیا ہے ذکر اس ملک کی عظمت کا بھی اور اس کی بدعملیوں وتباہ کاریوں کا بھی۔ لیکن اس فہرست جرائم کا عنوان اول سحر کاری تھا۔ بائبل کی شہادت ملاحظہ ہو: ''تیرے سوداگر زمین کے امیر تھے تیری جادوگری سے زمین کی ساری قومیں گمراہ ہوئیں۔ اور نبیوں اور مقدسوں اور زمین کے اور سب مقتولوں کا خون اس میں بہایا گیا (مکاشفہ ۱۸: ۲۳ و ۲۴)

پرانے کتبے اور نوشتے آج جو کچھ دریافت ہوئے ہیں ان کی متفقہ شہادت ہے کہ دینِ بابلی کا جزو اعظم سحر و کہانت، جنتر منتر، ٹونے ٹوٹکے تھے۔'' بابلی مذہب کا جزو اعظم سحر و کہانت کے انواع واقسام ہیں۔ بابلی مذہب کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے تو ہر طرف کہانت کے منتر ہی منتر نظر آئیں گے (انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۲ ص ۱۱۶)

ایک اور فاضل کی تحقیق ہے ''مذہب بابل و نینوا کا جزو اعظم بھوت پریت کا اتارنا جھاڑنا تھا (راجرس کی ریلیجن آف بابیلونیا اینڈ ایریا ص ۱۴۵)

یہ سحر پیشہ و کہانت دوست قوم جب ۶۳۸ ق میں تاجدارِ ایران کے ہاتھوں برباد و منتشر ہوئی تو جہاں جہاں گئی اپنے ساتھ اپنے فنونِ سحر و کہانت کو بھی لیتی گئی تاریخ کا بیان ہے ''یہ لوگ جہاں جہاں گئے اپنے ان علوم کو اپنے ساتھ لیتے گے۔ ان کی تعلیم دیتے رہے اور ضعیف العقیدہ خلقت انہیں ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیتی رہی (ریگوزین کی کالڈیا ص ۲۵۵)

یہود ان استادوں کے شاگرد رشید ثابت ہوئے''۔ بابل کے میل جول نے اسرائیلیوں کے عقائد متعلق ملائکہ وشیاطین کو متاثر کرنا شروع کیا (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۳ ص ۱۷۸، طبع یازدہم) خود یہود کے اکابر کا اعتراف ہے کہ ''بابل کا مذہبی احترام ہر خطہ کے یہود میں قائم رہا''۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۶ ص ۴۱۲، ''دریابادی)۔

قرآنِ کریم نے زیرِ نظر آیت میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ یہود میں دونوں جگہ کا سحر رائج ہے فلسطین کا بھی اور بابل کا بھی اس ذیل میں جس فلسطینی سحر کے ذکر میں اپنے ایک معصوم پیغمبر سلیمانؑ کی پاک دامنی کا اظہار کیا اسی طرح بابلی سحر کے تذکرہ میں اپنے دو فرشتوں ہاروت ماروت کی شانِ عصمت کا تحفظ کیا چوں کہ ان کے متعلق ''اسرائیلیات'' میں ایک حکایت مشہور تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ان دونوں فرشتوں کو انسانی

جذبات دے کر بھیجا گیا تھا اور عراق کی ایک فاحشہ زہرہ سے ان کا تعلق ہو گیا اور اب وہ اسی فاحشہ کے ساتھ ساتھ عذاب الٰہی میں گرفتار ہیں۔

قرآن نے ان فرشتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی عصمت اور انکے دامن کے بے داغ ہونیکا اثبات کر کے گویا ذہن انسانی کو ان کی نسبت عائد کردہ اور الزامات سے بھی بری سمجھنے کی طرف مائل کر دیا ہے۔ اسی لئے مفسرین نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے اس حکایت کے بے سروپا ہونے کا بھی اظہار کیا ہے [1]۔

ایک روایت اس بارے میں بعض کتبِ شیعہ میں بھی درج ہوگئی ہے مگر وہ ضعیف السند ہے [2]۔

دوسری روایت جو الفاظِ قرآن سے بالکل مطابقت رکھتی ہے یہ ہے کہ ان دونوں فرشتوں کو اصل میں ساحروں کا زور توڑنے کے لئے بھیجا گیا تھا [3]۔

یہ فرشتے انسانوں کی صورت میں خالق کی طرف سے بھیجے گئے تا کہ ساحروں کے سحر کا مقابلہ کرنے کے لئے انہیں مسلح کرائیں اور اسی لئے جس کو وہ ان تدابیر کی تعلیم دیتے تھے انہیں متنبہ کر دیتے تھے کہ دیکھو ہمارے ذریعہ سے تم ایک معرضِ امتحان میں ہو، وہ امتحان یہ ہے کہ اس کو بس دفعیہ سحر میں صرف کرنا، خود ساحر نہ بن جانا [4]۔ مگر لوگوں نے ان کی اس تنبیہہ سے صحیح اثر نہ لیا اور کیا یہی کہ وہ خود سحر کرنے لگے اور زیادہ تر اس کا استعمال میاں بیوی کے افتراق کے باب میں کیا جاتا تھا۔

بقول عبدالماجد صاحب ''اب دیکھئے کہ بیسویں صدی کے علمائے یہود اور محققینِ اسرائیلی اپنے اسلاف کے مشغلہ سحر و ساحر کی نوعیت سے متعلق کیا شہادت دیتے ہیں ''سحر کی سب سے زیادہ عام متداول صورت میں اس نقش کی تھی جو عشق و محبت کے لئے دیا جاتا تھا، خاص طور پر وہ نقش جو ناجائز آشنائیوں کے لئے لکھا جاتا تھا اس قسم کے سحر کی ماہر عورتیں ہی زیادہ تر ہوتی تھیں۔ چنانچہ ذکر بھی سحر اور حرام کاری کا عموماً ساتھ ہی ساتھ آیا ہے (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۸ ص ۲۵۵)

یہ فقرہ کہ وہ جس کو نقصان پہنچاتے تھے وہ مشیت الٰہی سے اس کا یہ مطلب نہیں کہ خالق ان کے عمل سے راضی تھا۔ نہیں عمل تو وہ اس کے حکم کے خلاف تھا مگر اثر اس پر قانونِ تکوینی کے مطابق اسی طرح مرتب ہوتا تھا جیسے زہر پر اس کا اثر۔ یہ آثار ایک عام نظامِ قدرت کے تحت میں واقع ہوتے ہیں جن کی مخالفت اسی وقت ہوتی ہے کہ جب اظہارِ معجزہ وغیرہ کی ضرورت ہو۔ اس میں فعل کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے جو ان اسباب کو مہیا کرے اور اسی لئے وہ مستحق ملامت و عقوبت بھی ہوتا ہے بے شک خالق اس کی مزاحمت بہ نظرِ حکمت نہیں کرتا جو اگر وہ کر دیتا ہے تو یہ فعل

---

[1] ۔هٰذه القصة عند المحققين غير مقبولة (نیشاپوری) ان القصة التی ذکر و ها باطلة (رازی) مداره روایة الیهود مع مادفیه من المخالفة لادلة العقل والنقل (ابوالسعود)

[2] ۔راویه عن الباقر علیہ السلام محمد بن قیس وهو مشترك بین الضعیف وغیره (بلاغی)

[3] ۔ قال الصادق علیہ السلام وکان بعد نوح قد کثر السحرة والممو هن فبعث الله تعالیٰ ملکین الیٰ نبیّ ذٰلك الزمان بذکر مایسحر به السحرة وذکر مایبطل به سحرهم ویرد به کیدهم فتلقاه النبی عن الملکین واداه الیٰ عباد الله بامر الله عزوجلّ (صافی) روی ابن بابویه فی العیون عن الرضا علیہ السلام ان هاروت وماروت علما الناس السحر لیحترزوا به عن سحر السحرة ویبطلوا کیدهم (بلاغی)

[4] ۔ امرهم ان یقفوا به علیٰ السحر وان یبطلوه ونهم ان یسحروا به الناس (صافی)

غیر ممکن الوقوع ہو جاتا۔ اس اعتبار سے اسے نتیجۂ مشیت کہا جاتا ہے اور یہی معنی باذن اللہ کے اس آیت میں ہیں۔

''یہ خوب جانتے ہیں''۔ یہ یہود کا تذکرہ ہے جنہیں کہا گیا تھا کہ انہوں نے سلیمان کے زمانہ والے سحرِ فلسطین اور ہاروت و ماروت کے بتائے ہوئے سحرِ بابل کا اتباع کیا۔ انہیں خوب معلوم ہے کہ یہ ان کی آخرت کی بربادی کا سبب ہے کیوں کہ توریت میں بھی اس کی ممانعت صاف الفاظ میں موجود ہے ''تو جادوگری کو بسنے مت دے (خروج ۲۲:۱۸)'' اور جادو نہ کرو، اور ساعتوں کا لحاظ مت کرو۔'' (احبار ۱۹:۲۶) اور نہ مال و ساحر ہو کیوں کہ وہ سب جو ایسے کام کرتے ہیں خداوند کی نفرت کے باعث ہیں'' (استثناء ۱۸:۱۲)

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

''اور اگر وہ ایمان لاتے اور اپنے بچاؤ کا سامان کرتے تو اللہ کی طرف سے ذرا سا بھی ثواب جو انہیں ملتا وہ کہیں بہتر تھا کاش وہ اسے جانتے۔''

مادیت اور مذہب کے نقطہ نظر میں یہی فرق ہے۔ مادی انسان دنیا کے منافع کو بہت کچھ سمجھتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہاں کا بڑے سے بڑا نفع جو حاصل ہو وہ فانی ہے اور آخرت کا زرا سا بھی ثواب دنیا کی ہر شے سے بہتر ہے اس لئے کہ وہ باقی ہے۔ مثوبة میں تنوین (ٌ) سے کچھ اور ذرا کے معنی پیدا ہوئے ہیں[1]۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

''اے ایمان والو ''راعنا'' نہ کہا کرو ''انظرنا'' کہا کرو اور بات کو سنا کرو اور کافروں کے لئے تو دردناک عذاب ہے۔''

رَاعِنا اور اُنْظُرْنَا کا فرق:

جب پیغمبر خدا ﷺ قرآن سناتے ہوتے یا کوئی تبلیغ فرماتے ہوتے تو بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کوئی لفظ مجمع میں سے بعض افراد نہ سن سکیں اس موقع پر وہ شخص حضرتؐ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتے ہوئے پکار کر کہتا تھا رَاعنا یعنی ہمارا لحاظ کیجئے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ براہِ کرم اس جملہ کو دوبارہ ارشاد فرما دیجئے۔ عربی زبان کے لحاظ سے اس میں کوئی خرابی نہیں تھی مگر مجمع میں کچھ یہودی بھی منافقین کی صف میں داخل ہو کر موجود ہوتے تھے۔ وہ اس لفظ کو شرارۃً حضرتؐ کی شان میں ایک دشنام کے طور پر استعمال کرتے تھے مسلمان عموماً اس شرارت کو نہیں سمجھتے تھے اور اپنی جگہ خوش و مطمئن تھے کہ ہماری شرارت کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا، مگر خالق کریم نے ان کی اس شرارت کے سدباب کے لئے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ تم لفظ بدل دو راعنا نہ کہا کرو بلکہ انظرنا کہا کرو۔

تفسرین دیکھئے تو پتہ چلے گا کہ اس حکم کے بعد بھی مفسرین اس راز کو نہیں سمجھ سکے ہیں کہ راعنا میں کونسی خرابی تھی جو سختی کے ساتھ اس

---

[1] ۔تنکیر المثوبة للتقلیل ای بشئی مامن المثوبة کائنة من عندہ تعالیٰ خیر (ابوالسعود)

ممانعت کی گئی مگر اہل بیت رسولؐ نے اس راز کا انکشاف کیا کہ یہ لفظ عبرانی زبان میں دشنام کے معنی پیدا کرتا ہے[1]۔

اللہ جزائے خیر دے علامہ شیخ محمد جواد بلاغی نجفی طاب ثراہ کو جنہوں نے عبرانی زبان سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد عبرانی زبان کی بائیل میں اس راعنا کے لفظ کے محل استعمال ڈھونڈھے اور حضرت امام محمد باقرؑ کے ارشاد کی حقانیت معلوم کی کہ راع کی لفظ ''شر'' اور ''قبیح'' کے معنی میں مستعمل ہے جیسا کہ توریت سفر افصل ۲ و ۳ میں آیا ہے اور کبھی شریر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ سفر ۵ فصل اول اور مزامیر فصل ۶۴ و ۶۵ میں ہے[2]۔

جب مسلمانوں نے حکم الٰہی سے لفظ بدل دی اور انظرنا کہنے لگے تو یہود کی اس شرارت کا سدباب ہو گیا۔

آخر کے فقرہ میں بتایا گیا ہے کہ راعنا کہہ کر دشنام طرازی کرتے ہیں وہ حقیقتاً کافر ہیں جن کو ان کے فعل کی سزا تو ملے ہی گی لیکن تم نادانستہ ان کے شریک کار یا معاون کیوں بنو اور انہیں تمہارے طرز گفتگو سے اس کا موقع کیوں ملے وہ رسولؐ کی شان میں گستاخی کر سکیں۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

''جو کافر ہیں اہل کتاب میں ہوں یا مشرکین میں وہ نہیں پسند کرتے کہ تمہارے لئے تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی کی صورت ہو، حالانکہ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل و کرم والا ہے۔''

منکرین رسالت کی ذہنیت اور ان کا جواب:

کافر یعنی رسالت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منکر دو قسم کے تھے ایک اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ اور دوسرے مشرک یعنی بُت پرستی ان دونوں کو اصولاً نبوت و رسالت سے کوئی اختلاف نہ تھا مگر وہ کہتے تھے کہ آخر یہ رسالت ان کے لئے کیوں تسلیم کی جائے۔

اہل کتاب تو اس بناء پر اسے ناپسند کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کی بیاہتا بیوی یعنی جناب سارہؑ کی نسل آلِ اسحٰقؑ سے تھے اور پیغمبر اسلامؐ دوسری بیوی جناب ہاجرہؑ کی نسلِ آل اسماعیلؑ سے۔ وہ کہتے تھے کہ نبوت اولاد اسحاقؑ کو چھوڑ کر اولاد اسماعیلؑ میں کیوں کر جا سکتی ہے اور مشرکین اس بناء پر اسے ناپسند کرتے تھے کہ ان میں بڑے بڑے صاحبانِ دولت و وجاہت موجود تھے وہ کہتے تھے کہ ان کو چھوڑ کر یہ رسالت ''یتیم عبداللہ'' کو کیوں کر مل گئی چنانچہ ایک جگہ ان کی زبانی قرآن میں آیا ہے: لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف۔ ۳۱) یعنی یہ قرآن مکہ اور مدینہ کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اتارا گیا؟

---

[1] ۔قال الباقر علیہ السلام ھذہ الکلمۃ سبّ بالعبرانیۃ الیہ کانوا یذھبون (طبرسی)

[2] ۔فتکون راعنا فی العبرانیۃ بمعنی شریرنا (بلاغی)

مذکورہ آیت میں ان ہی دونوں گروہوں کے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت نہ خاندانی امتیاز کو دیکھتی ہے اور نہ دولت اور نہ ظاہری وجاہت کو۔ وہ کمال صفات کو دیکھتی ہے اور جس میں یہ خصوصیت ہوتی ہے اسے خدا رسالت کے لئے منتخب فرمالیتا ہے[1]۔

اسی کو دوسری جگہ قرآن نے ان لفظوں میں کہا ہے کہ: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام ۱۲۴) ''اللہ خوب جانتا ہے کہ اسے اپنی رسالت کسے دینا چاہیے کسی دوسرے کا اس میں کیا اجارہ ہے!

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾

''جس آیت کو ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا وہ بھلا دی جاتی ہے تو ہم اس سے بہتر یا اس کے مثل دوسری نازل کر دیتے ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے۔''

نسخ اور بدا:

یہود و نصاریٰ کے رسالت خاتم النبیینؐ پر جو ایرادات تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ خالق خود اپنی سابق کتاب اور شریعت کو منسوخ کر دے؟ کیا اس کے احکام میں غلطی کا امکان ہے؟ کیا اس کی رائے میں تبدیلی ہوتی ہے اور کیا وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوتا ہے؟ ان توہمات کی بناء پر وہ نسخ احکام کو شان الٰہی کے خلاف سمجھتے تھے اور تعجب ہے کہ ان ہی دلائل سے مسلمانوں کا ایک گروہ تقدیرات الٰہیہ میں بدا کا انکار کرتا ہے۔ اس آیت میں انہی کے اس اعتراض کا جواب ہے اور بتایا گیا ہے کہ دوسری شریعت اور کتاب ضرورت دو وجہوں سے پڑا کرتی ہے۔ ایک تو یہ کہ حالات اور مصالح کی تبدیلی کی وجہ سے اب پہلے احکام اتنے مناسب نہیں رہے ہیں جتنے کہ یہ دوسرے احکام۔ اس لئے خالقِ حکیم ظرفِ زمان کی مطابقت سے اب زیادہ مناسبت احکام نافذ کرتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے قانون کو دنیا والوں سے تصرف و تحریف کر کے بالکل نسیاً منسیاً کر دیا ہے اس لئے جدید شریعت اور کتاب میں اس کی تجدید کی گئی ہے جو بحیثیت اصلاحِ خلق ویسے ہی مضمون پر مشتمل ہے جو اس نسیان شدہ حکم کا تھا۔

یہ تصرف و تحریف کر کے بھلانا اصل میں تو فعل انسانوں کا ہے مگر چوں کہ کائنات کا ہر واقعہ تحتِ قدرت الٰہی ہے اور شرائط و اسباب کی فراہمی اور موانع کے فقدان کی باگیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں، اس لئے ان نتائج کو جو انسانی افعال پر بھی مرتب ہوتے ہیں کبھی خالق کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ نسیا منسیا کر دینے کی نسبت خالق کی طرف جو ننسہا کے تحت اللفظی ترجمہ سے سمجھ میں آسکتی ہے، اسی اعتبار سے ہے[2]۔

باوجود حالات کی تبدیلی کے پہلے حکم کو خالق جب ہی باقی رکھتا جب کہ وہ زیادہ مناسب قانون کے اجراء پر قادر نہ ہوتا اور دنیا کے کسی حکم

---

[1] ۔ روی عن امیر المؤمنین علیہ السلام وعن ابی جعفر لباقر علیہ السلام ان المراد برحمتہ ھٰھنا النبوۃ (مجمع البیان)

[2] ۔ نسب الانسآء الی اللہ مجازا کما نسبِ الاضلال باعتبار تمود المنتسبین الیٰ کتابہ (بلاغی)

کو بالکل زینت طاق نسیان بنا دینے کے بعد وہ اس کا کچھ تدارک نہ کرسکتا اور پھر وہ اپنے نبیؐ کو معبوث کر کے ویسے ہی حکم کو دوبارہ نازل کرنے پر قادر نہ ہوتا۔ مگر یہ تو سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے پھر وہ اپنی حکمت کے مقتضیٰ پر عمل کو کس لئے ترک کرے؟

حکمت کی تبدیلی سے حکم میں تبدیلی نہ نتیجۂ جہل ہے نہ پشیمانی بلکہ وہ عین مقتضائے علم وقدرت ہے۔

نسخ کی بحث میں علمائے جمہور نے اس کی خوب خوب تشریح وتوضیح کی ہے۔ یہاں عبدالماجد صاحب دریابادی کا اقتباس ملاحظہ ہو وہ لکھتے ہیں:

''احکام کی مثال طبیب کے نسخہ کی ہے طبیب کی تشخیص اپنی جگہ پر بدستور رہتی ہے لیکن مریض کی حالت بدلتی رہتی ہے اور پھر موسم اور آب وہوا میں کسی فرق ہوتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں کوئی حاذق سے حاذق طبیب بھی اپنے نسخہ کے اجزاء میں ان بدلے ہوئے حالات کے مطابق ترمیم کرنے میں تامل نہ کرے گا۔''

آگے لکھتے ہیں:

''یہ بھی خوب واضح رہے کہ یہ نسخ جو کچھ بھی ہوگا علم بشری ناقص ومحدود کے اعتبار سے ہوگا، ورنہ علم الٰہی میں تو ہر حکم ازل سے وقت معیّنکے لئے مقرر وثابت ہی ہے۔''

یاد رکھنا چاہیے کہ بدا کی نوعیت بھی بالکل یہی ہے کہ وہاں بھی یہی ہے کہ تقدیرات کی تبدیلی جو کچھ بھی ہے وہ علم بشری کے لحاظ سے ہے ورنہ علم الٰہی میں تقدیر اول پہلے ہی سے مشروط ہوتی ہے۔ پشیمانی کا سوال نہ اس میں ہے اور نہ اس میں بلکہ نسخ وبداء دونوں ہی علم وقدرت دونوں کے ایک ساتھ کارفرما ہونے کا نتیجہ ہیں۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی یار ومددگار نہیں ہے۔''

اگر یہ آیت تنزیل میں گزشتہ آیت سے متصل ہے تو مخاطب وہی ہوں گے جو نسخ کے منکر تھے۔

اور اگر یہ الگ ہے تو پھر مخاطب ہر سننے والا اس کلام کا ہوسکتا ہے خواہ براہ راست اور خواہ بتوسط رسولؐ اسی لئے کلام میں تخاطب شروع ہوا ہے بصیغۂ مفرد (الم تعلم) اور بعد میں جمع کا انداز ہوگیا ہے (وما لکم) اور استفہام کہ کیا تمہیں نہیں معلوم یہ حقیقتاً استفہام نہیں ہے بلکہ مقصود اس سے اثبات واقرار کرانا ہے [1]۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ

---

[1] ۔ ویؤل فی المعنی الی الایجاب کانه بقول قد علمت حقیقة (مجمع البیان)

الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

''یا کیا تم چاہتے ہو اپنے رسول سے ویسا سوال کرو جیسا اس کے پہلے موسیٰؑ سے کیا گیا تھا؟ اور جو ایمان کے عوض کفر اختیار کرے گا وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔''

الفاظِ قرآن سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں سے تنبیہہ کے طور پر ہے چوں کہ مسلمانوں کی عام ذہنیت بہت حد تک بنی اسرائیل سے ملتی جلتی تھی جس پر حضرت پیغمبر اسلامؐ نے بھی اپنی حدیث میں تنبیہہ کی تھی کہ لتتّبعنّ سنن بنی اسرائیل (الحدیث) (یعنی) تم بنی اسرائیل کے راستوں پر چلو گے۔'' اس لئے خالقِ کریم نے اس انتباہ کی ضرورت محسوس فرمائی۔

اس انتباہ کے بعد بھی مسلمانوں بروزِ قیامت دیدار کا عقیدہ قائم ہونا جو محسوس حقیقت ہے اس انتباہ کی اہمیت کا زبردست ثبوت ہے۔

حالانکہ آخری الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ خالق کے دیدار کی ہوس ایمان کے عوض کفر کی جانب قدم زنی کے مترادف ہے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾

''بہت سے اہل کتاب کی دلی خواہش یہ ہے کہ کسی طرح ایمان کے بعد پھر دوبارہ تم لوگوں کو کافر بنالیں صرف حسد کی وجہ سے جو ان کے نفوس میں ہے، باوجودیکہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے۔ تو تم انہیں معاف کرتے رہو اور درگزر سے کام لو اس وقت تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اہل کتاب کی حاسدانہ ذہنیت:

یہود و نصاریٰ کی کوششیں مسلمانوں کو ایمان سے برگشتہ کرنے کی اس وقت بھی تھیں اور اب بھی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ قرآن اُن کوششوں کا نفسیاتی سبب بتاتا ہے کہ وہ نہ اپنے مذہب کی حقانیت کے احساس یا اس کی محبت سے ہیں اور نہ تمہاری ہمدردی میں بلکہ اصل اس کا سبب رشک و حسد ہے۔

جس میں دو ۲ عنصر کارفرما ہیں ایک دماغ سے متعلق اور ایک دل سے۔ اول یہ احساس کہ تم جس مذہب پر ہو حق ہے اور اس کے ذریعہ سے تم دنیا و آخرت میں بے شمار فوائد حاصل کرو گے۔ دوسری طرف تقلید آبائی، ماحول اور رعادت کی بناء پر اپنے کیش سے ہٹنے کو اپنے لئے گوارا نہ کرنا اب اس کا نتیجہ عقلاً تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ تمہیں تمہاری حقیقت پروری کی بناء پر قابل عزت سمجھیں اور اپنی محرومی پر ظاہر بہ ظاہر نہ سہی تو دل ہی دل میں حسرت کریں بلکہ خود موانع سے مقابلہ کر کے تمہارے درجہ تک پہنچنے کی کوشش کریں مگر بد باطن کور نفس اور کم ظرف اشخاص کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود تو اپنے نقص کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا مگر تمہاری بلندی سے تکلیف محسوس کرتا ہے اس لئے چاہتا ہے کہ تمہیں کسی طرح کھینچ کر اپنے

راستے پر لے آئے۔

یہی حالت ہر زمانہ میں ان اشخاص کی ہے جو خود کسی کمال سے محروم ہیں یا اپنی بے بضاعتی، کوتاہ عملی یا پست ہمتی سے علمی یا عملی کارناموں سے قاصر ہیں مگر کسی دوسرے کو اس کے کمال کی منزل پر یا ان کارناموں کی راہ میں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے، اس لئے انہیں بھی کھینچ کر اپنی سطح پر لانے میں کوشاں ہوتے ہیں۔ یہ حسد کی وہی قسم ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔

ان کے اس حاسدانہ رویہ پر مسلمانوں کو تکلیف محسوس ہونا بلکہ غصہ ہونا فطری امر ہے۔ یہ غصہ بہت سے افراد میں اشتعال کی حد تک تھا۔ اس لئے قرآن کریم نے آخر میں ان کے ہیجان وغضب کو یہ کہہ کر روکا ہے کہ تم ان سے انتقام لینے کی کوئی فکر نہ کرو اس وقت تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے۔

اس حکم سے مراد امر تکوینی بھی ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تم کچھ فکر نہ کرو یہاں تک کہ تقدیر الٰہی اپنا فیصلہ کرے اور تمہیں وغلبہ عطا کرے اور امر تشریعی بھی ہوسکتا ہے کہ جہاد کا حکم آنے سے قبل تمہیں توقف کرنا چاہیے۔

مفسرین نے زیادہ تر دوسرا قول اختیار کیا ہے [1]۔ مگر آیت کا سب سے آخری ٹکڑا ''ان اللہ علی کل شیء قدیر'' پہلے معنی کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

''اور نماز ادا کرتے اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو کچھ تم اپنے لئے نیک کاموں کا ذخیرہ آگے بھیج دو گے اسے اللہ کے یہاں موجود پاؤ گے۔ یقیناً اللہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔''

اگر یہ آیت تنزیل میں گزشتہ آیات سے متصل ہے تو مطلب یہ ہے کہ ان سے انتقام کے لئے تم اگر اس لئے بے چین ہو کہ جہاد کا ثواب حاصل کرو تو یاد رکھو کہ اللہ کے یہاں کا اجر وثواب کچھ جہاد پر موقوف نہیں ہے بلکہ بغیر اس کے زمانہ سکوت یا صلح میں اگر تم عام فرائض جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی حیثیت سے تم پر عائد ہیں ادا کرتو وہی تمہاری آخرت کو کامیاب بنانے کے لئے کافی ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ ہرگز جنت میں داخل ہوگا مگر وہی جو یہودی یا عیسائی ہو یہ اُن ہی کی خود آرزوئیں ہیں۔ کہو کہ تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔''

---

[1] ۔ الاکثرون علی انہ الامر بالقتل (نیشاپوری)

یہود و نصاریٰ کے مزعومات اور ان کا جواب:

یہودی کہتے تھے کہ نجات صرف یہودیت سے وابستہ ہے۔ نصاریٰ کا قول تھا کہ نجات صرف عیسائیت میں منحصر ہے۔ قرآن نے چوں کہ دونوں جماعتوں کے لئے ایک مشترک لقب ''اہل کتاب'' کا صرف کر کے ان کا تذکرہ کیا ہے لہٰذا ان دونوں کے مقولوں کو سمو کر مشترک طور سے ان کا نقل قول کیا کہ جنت میں وہ داخل ہوگا جو یہودی یا عیسائی ہو یہ دونوں قولوں کے اجتماع کا نتیجہ ہے۔ اس سے کسی ایک کا قول مراد نہیں ہے [1]۔

وہ ظاہر تو کرتے تھے اپنے اس ادعاء کو بطور خبر اور وہ بھی حتم و جزم کے ساتھ کہ سوا ہمارے کوئی بہشت میں جا ہی نہیں سکتا، مگر قرآن نے اس کے جواب میں ظاہر کیا ہے کہ واقعہ ان کو اس کے کہنے کا تو کوئی حق ہے نہیں۔ ہاں ان کی دلی تمنائیں یہی ہیں کہ سوا ان کے کوئی دوسرا نہ جائے لیکن ان آرزوؤں کے پورے ہونے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔ اسی لئے امانی کا لفظ صرف کیا گیا جس کے معنی حسرتوں اور تمناؤں کے ہیں۔ اور اگر ایسے توقعات ہوں جن کے پورے ہونے کا قرینہ پایا جاتا ہے تو ان کے لئے امانی کا نہیں امال کا لفظ صرف کیا جائے گا یعنی امیدیں۔ حالانکہ امید کیلئے بھی امکان ہے پورے نہ ہونے کا مگر قرینہ اس کے وقوع کا کچھ نہ کچھ سامنے ہوتا ہے۔ آرزو میں ایسا بالکل نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اپنے ذاتی جذبات کی ایک پیداوار ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ اب اگر وہ صرف اسے بطور ''آرزو'' ہی کے ظاہر بھی کرتے تو ان سے کسی مطالبہ کا محل نہ ہوتا مگر چوں کہ پیش کر رہے ہیں وہ اسے بطور بیان واقعہ لہٰذا ان کی طرف یہ مطالبہ متوجہ ہوگا یہ کہ اگر سچے ہو تو اس کی دلیل پیش کرو کہ آخر تم میں کیا خصوصیت ہے کہ نجات تمہارے لئے ہو اور کسی کے لئے نہ ہو۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اصول ایک ہوتا ہے۔ اگر کوئی اور جماعت بھی اس کی مدعی ہو کہ نجات صرف اس کے واسطے ہے تو اسے بھی اپنے اوصاف ہی کے لحاظ سے سند پیش کرنا ہوگی کہ اسے تنہا نجات کا استحقاق کس بنیاد پر ہے؟

بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''کیوں نہیں جو اپنے کو اللہ کے سامنے جھکا دے اور وہ حسن عمل بھی رکھتا ہو تو ضرور اس کے پروردگار کے پاس اس کا اجر ہے اور نہ انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ کبھی افسوس ہوگا۔''

اس میں اُن کے قول کی رد کرتے ہوئے نجات کا اصول بیان کر دیا گیا ہے۔

بَلٰى کے لفظ کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ نفی کے بعد ثبوت کا فائدہ دیتی ہے چوں کہ ان کے کلام میں نفی تھی کہ سوا یہود و نصاریٰ کے کوئی بہشت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے اس کا جواب بَلٰى کے لفظ سے شروع ہوا یعنی سوا ان کے کیوں نہیں کوئی داخل ہو سکتا، اصل معیار نجات کا یہ ہے کہ بارگاہ الٰہی میں عبودیت کے ساتھ سرخم کرے اور حسن عمل سے کام لے۔ یہ معیار جس پر منطبق ہو وہ نجات کا حق دار ہے۔

اس معیار کے بیان میں لفظ اَسْلَمَ لا کر اُمت مسلمہ کے اصطلاحی نام کی طرف ذہن منتقل کیا ہے کہ یہ جماعت ضرور نجات کی حق دار

---

[1] ۔عنیٰ به وقالت الیهود لن یدخل الجنة ال من کان هوداً او نصریٰ لن یدخل الجنة الا النصریٰ (طبری)
ادرج الخیر عنهما للایجاز من غیر احلال بشیءٍ من المعنیٰ فان شهرة الحال تغنی عن البیان (مجمع البیان)

ہے مگر اَسْلَمَ کے ساتھ اس کے متعلقات ذکر کر کے اس حقیقت کا اظہار کر دیا کہ یہ استحقاق نجات اسی اور رسمی طور پر کسی جماعت میں محسوب ہو جانے سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان اوصاف کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو انسان کو اصلی معنی میں مسلم کے لفظ کا مصداق قرار دے سکیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

''اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائیوں کا مذہب کچھ نہیں' اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کا مذہب کچھ نہیں' حالانکہ یہ سب ایک کتاب کے پڑھنے والے ہیں۔ یوں ہی وہ جو علم رکھتے ہی نہیں کہنے لگے ان ہی کی سی بات اب اللہ اُن کے درمیان قیامت کے دن اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں یہ اختلاف کرتے رہے ہوں گے۔''

مسلمانوں کے مقابلہ میں یہود و نصاریٰ سب ''اہل کتاب'' کے عنوان کے ماتحت ایک ہو گئے اور ان سب نے متفقہ فیصلہ یہ کر دیا کہ ہمارے سوا کوئی یعنی مسلمان تو بہشت میں جا ہی نہیں سکتے جس کا جواب اس کے قبل کے آیات میں قرآن نے دیا ہے۔ اس آیت میں ان کے باہمی اختلاف کا تذکرہ ہے کہ معیار نجات کے باب میں یہ لوگ خود کب متفق ہیں یہودی عیسائیوں کے مذہب کو بے بنیاد کہتے ہیں اور عیسائی یہودیوں کے مذہب کو، حالانکہ جب یہ سب ایک کتاب توریت کے ماننے والے ہیں تو کاش یہ سب تو ایک ہی ملت کے پیرو ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی دیکھا دیکھی مشرکین کو بھی حالانکہ وہ تو کسی کتاب آسمان اور علم الٰہی کے کسی عنوان سے بھی حامل نہیں، جسارت پیدا ہو گئی اور وہ ان دونوں ہی کے مذہب کو بے بنیاد کہنے لگے۔

کاش قرآن کی اس تنبیہ سے مسلمانوں نے سبق حاصل کیا ہوتا اور وہ مختلف فرقوں میں تقسیم نہ ہوئے ہوتے جن میں ہر فرقہ دوسرے کو لیست علیٰ شیء ہی سمجھتا ہے اور کہتا ہے حالانکہ قرآن نے یہ بھی آخر میں بتا ہی دیا ہے کہ یہ فرقوں کے اختلاف کا جھگڑا کبھی دنیا میں طے ہونے والا نہیں ہے تو آخرت میں بس پیش خدا ہی طے پا سکے گا۔ پھر اختلاف فرق کی بناء پر دنیا میں لڑائی جھگڑے سے کیا فائدہ!

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں نام خدا لئے جانے کو روکے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اس کا حق نہیں کہ وہ ان مسجدوں میں داخل ہوں مگر ڈرتے چوری چھپے۔ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔''

نظم وسیاق ترتیبی کو اہمیت دینے والوں نے بڑی کوشش سے اس آیت کو یہود یا نصاریٰ سے متعلق کیا ہے چوں کہ اس کے قبل ان ہی کا ذکر ہے مگر تفسیر اہل بیتؑ جو خود آیت کے مضمون سے مطابقت رکھتی ہے یہ ہے کہ اس آیت کا تعلق مشرکین مکّہ سے ہے جو مکہ معظّمہ اور مسجد الحرام میں داخل ہونے سے مسلمانوں کے سدراہ ہوئے تھے [1]۔

پھر بھی محل نزول کی اس تخصیص کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا حکم بھی کسی جماعت کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ مساجد الٰہی میں ذکر وعبادت سے روکنے والا ہر شخص خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو قیامت تک اس میں داخل ہے [2]۔

آخر میں جو استثناء ہے اِلَّا خَآئِفِيْنَ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خوف زدہ شکل میں آنا مسجدوں کے اندر کفار کے لئے جائز ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ مسلمانوں کو جب اقتدار حاصل ہوگا اور ان کا پتہ چل جائے گا تو ان پر لازم ہوگا کہ وہ ان کا فوراً اخراج کر دیں۔

یہ جو کہا گیا کہ ''ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب'' تو دنیا کی رسوائی تاریخ میں نمایاں ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں رسولؐ کی زندگی ہی میں دشمنانِ اسلام کے پرخچے اڑ گئے اور ان میں سے بہت سوں کو بادل ناخواستہ تقاضائے وقت سے مجبور ہو کر اسلام کا حلقہ بگوش ہونا پڑا جس پر وہ خود بھی اگر نظر کرتے تو اپنے نفوس کے حقیر و ذلیل ہونے کا انہیں احساس پیدا ہوتا اور آخرت کا عذاب وہ وقت آنے پر آنکھوں کے سامنے آئے گا۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

''اور اللہ کے مشرق اور مغرب دونوں ہی ہیں تو جدھر تم رخ کرو ادھر اللہ کی مرضی مل سکتی ہے یقیناً اللہ وسعت والا ہے بڑا علم رکھنے والا''۔

یہود و نصاریٰ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے عبادت کرتے تھے جو مدینہ سے ایک سمت میں واقع تھا۔ مسلمانوں کے لئے قبلہ کعبہ قرار دیا گیا جو دوسری سمت میں تھا تو انہوں نے اس پر نکتہ چینی کرنا شروع کی۔ اس کے جواب میں یہ آیت اور اس سورہ کے متعدد آیتیں جو بعد میں آئیں گی نازل ہوتی تھیں۔

خالقِ کریم نے اس آیت میں اصولی طور پر واضح کیا ہے کہ سمت بحیثیت سمت کسی تقدس کی حامل نہیں ہے۔ یہ تو اس وقت ہو سکتا ہے جب اللہ جسمیت رکھتا ہوتا اور کسی سمت میں محدود ہوتا لیکن جب کہ وہ جسم اور جسمانیات سے منزہ و مبرا ہے لہٰذا اس سے کسی مکان بحیثیت مکان کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ جو بھی تعلق ہے صرف مخلوق و مملوک ہونے کا ہے تو اس تعلق میں مشرق اور مغرب دونوں ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں اب اگر وہ صرف جماعت میں یک رنگی و یک جہتی پیدا کرنے کی خاطر کسی ایک جانب عبادت میں توجہ کا حکم دیتا ہے تو اس میں مشرق یا مغرب دیکھنے کے کوئی معنی نہیں بلکہ اصل نصب العین حکم الٰہی کی تعمیل کو قرار دینا چاہیے اور جدھر کے لئے اس کا حکم ہو جائے خواہ وہ مشرق ہو خواہ مغرب اسی طرف اس کی

---

[1] ۔ فی المجمع عن الصادقؑ والقمی انهم قریش حین منعوا رسول اللهﷺ دخول مکة والمسجد الحرام (صافی)

[2] ۔ الظاهر ان ما ورد بیان امورد النزول الّذی لا یجعل العام خاصا (بلاغی)

رضا حاصل ہوسکتی ہے [1]۔

اسلام کی عالم گیر وسعت کو دیکھتے ہوئے شریعتِ اسلام کا حکم قبلہ خود اس حقیقت کا مظہر ہے اس لئے کہ اس نے اظہار کے لئے کعبہ کو قبلہ قرار دیا ہے اور ہر اقلیم کے لحاظ سے کعبہ کی سمت مختلف ہے۔ کہیں سے وہ مشرق میں ہوگا اور کہیں سے مغرب میں کہیں وہ جنوب میں ہوگا اور کہیں شمال میں لہٰذا سمت پرستی تو خود اسی سے ختم ہوجاتی ہے اور مکان خاص کی طرف توجہ کی پابندی بھی سب عمومی حالات میں نماز فریضہ کے لئے ہے مسلمانوں کے درمیان یک رنگی و یک جہتی پیدا کرنے کے لئے ورنہ حقیقت عبادت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لئے دعاؤ مناجات اور سجدہ قرآن اور بہت سے حالات میں نماز نافلہ اور بعض اوقات نماز فریضہ میں بھی یہ پابندی اٹھ جاتی ہے اور جدھر بھی رخ کرے ادھر ہی عبادت درست ہوجاتی ہے اور وہاں اس آیت کا مضمون پوری شدت وقوت کے ساتھ نمایاں ہوجاتا ہے اور اسی اعتبار سے احادیث اہل بیتؑ میں آیت کے محل انطباق کے بیان میں ان مواقع کو پیش کیا گیا ہے جہاں بغیر پابندی قبلہ کے نماز صحیح ہوجاتی ہے مثلاً نماز نافلہ بحالت سفر [2] وغیرہ [3]۔

علمائے جمہور میں سے ایک طبقہ کے رجحان کے برخلاف جو اللہ کو عرش پر جسمانی طور پر متمکن مانتے ہیں عبدالماجد صاحب دریابادی کا یہ تبصرہ قابل قدر ہے کہ:

"المشرق المغرب دونوں سمتیں اور ان ہی دو پر کیا موقوف ہے ہر سمت اور ہر جہت اللہ تعالیٰ کے لئے یکساں ہے وہ سب کا یکساں خالق ہے حاکم ہے مالک ہے کسی خاص سمت میں کوئی بھی خاص تقدیس، کوئی شائبہ الوہیت کوئی شان حق نمائی موجود نہیں۔ مذاہب جاہلی کی تاریخ انسانی حماقتوں جہالتوں وہم پرستیوں کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ ایک مشترکہ گمراہی مشرک قوموں میں یہ رہی ہے کہ خدا چوں کہ متمکن ہے اور مجسم ہے اس لئے لازمی ہے کہ اس کی ہستی کسی نہ کسی متعین سمت یا جہت میں ہو اور اس تلبّس کی بناء پر خود وہ سمت یا جہت مقدس ہے مصری ہندی رومی تمام مشرک قوموں نے خدا کو کسی نہ کسی جہت میں فرض کر کے خود اس جہت کو مقدس مانا ہے اور چوں کہ سورج دیوتا کا مرتبہ مشرکین میں عموماً اہم ومقدم رہا ہے اس لئے شاہ خاور کے طفیل میں سمت مشرق ہی عموماً مقدس سمجھی گئی اور دنیا کے اکثر علاقوں میں پوجتی رہی مشرکوں ہی کے اثر سے یہ سمت پرستی کا شرک اہل کتاب میں بھی سرایت کر گیا اور مسیحی مذہب چوں کہ عقائد وعبادات دونوں میں اپنے وقت کے رائج وشائع رومی مذہب ہی کا مثنیٰ یا پرتو ہے اس لئے وہ تو کھلم کھلا مشرق پرستی میں مبتلا ہوگیا۔ یہود جنہیں اپنی توحید پر ناز تھا وہ تمام تر محفوظ نہ رہ سکے بلکہ ان کے بعض فرقے تو پوری طرح

---

[1] ۔المراد بالوجه القصد و الیّة مثل وجهت وجهی للّذی فطر السمٰوٰت والارض او المراد فثم مرضاة الله مثل انما نطعمکم لوجه الله (نیشاپوری)

[2] ۔هٰذا هو المروی عن ائمّتنا (طبرسی)

[3] ۔ فی صحیحة الفقیه عن اسحٰق بن عمار عن ابی عبد الله ؑ نزلت هٰذه الا یة فی المتحیر ای فی صلوٰة الفریضة وروی انه احتج الصادق ؑ هٰذه الأیة لصحة سجود التلاوة لغیر القبلة کما فی روایة الصّدوق فی العلل عن الحلبی عنه والعدم القضاء لصلوٰة الفریضة اذا صلیت خطاء لغیر القبلة کما فی روایة التهذیب عن محمد بن الحسین الجعفی عنه وفی روایة الصدوق المنفل مدانّ الصادق ؑ احتج بالا یة لصحة صلوٰة النا فلة علی الدّابّة اینما توجهت. وانّ النظر الی مجموع هٰذا للمروی ودلالة الأیة وحجتها یرشد بان روایة نزولها فی مورد خاص انما هو باعتقار انطباقها علیه وارادته فی عموم تنزیلها (البلاغی)

اس صفت میں آگے بعض قوموں نے مشرق کے جوڑ پر مغرب کے تقدس کا کلمہ پڑھنا شروع کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ مشرق اگر خطۂ حیات ہونے کی بناء پر مقدس ہے تو مغرب بھی خطۂ موت و دیار ہلاکت ہے۔ شاہ خاور اگر طلوع ادھر سے ہوتا ہے تو روزانہ غروب اور فنا تو ادھر ہی ہوتا ہے۔ پھر اس کے تقدس کا کیوں نہ قائل ہوا جائے چنانچہ یہ دونوں سمتیں خوب پجتی رہیں مشرق زیادہ، مغرب اس سے کچھ کم دنیا کی اس سمت پرستی کے شرک مشرق پرستی اور مغرب پرستی کی ضلالت میں مبتلا تھی کہ توحید قرآنی نے ساری دنیا کے عقائد کو چیلنج کر کے اس مشرکانہ عقیدہ پر ضرب لگا کے ایک عالم کو چونکا دیا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

''اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے کوئی بیٹا قرار دیا ہے۔ بَری ہے اس کی ذات بلکہ اس کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب سامنے جھکے ہوئے ہیں۔''

مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کا ابطال:

یہ عیسائیوں کی رد ہے جو مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ اس کے جواب میں دو فقرے کہے گئے ہیں: ایک سُبْحَانَهٗ اور دوسرا بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. اس کا مطلب ''بیٹے'' کی نسبت کے خلاف ایک عقلی استدلال ہے اور وہ یہ کہ تم بیٹا کس لحاظ سے کہتے ہو! اگر اس معنی سے کہ وہ حقیقت اصلیہ میں خالق کے ساتھ متحد ہیں جس طرح بیٹا باپ سے متحد ہوتا ہے تو یہ ذات باری کی قدوسیت اور اس کی شان لاہوتی کے خلاف ہے سبحانہ سے اس کی طرف اشارہ ہو گیا۔

اور اگر اس معنی سے کہ وہ اس کے مخلوق اور اس کے مطیع ہیں جس طرح بیٹا باپ کے لئے ہوتا ہے تو اس میں مسیحؑ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ آسمان و زمین کی ہر شے اس کی مخلوق و مملوک ہے اور اس کے سامنے خواہ اضطراری تکوینی اور خواہ اختیاری طور پر سر جھکائے ہوئے ہے۔

اس استدلال عقلی سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ یہ اسی عقیدہ کی ردّ ہے کہ مسیحؑ واقعی خدا کے بیٹے ہیں لیکن اس کے برخلاف عبدالماجد صاحب لکھتے ہیں کہ:

''اتخذ ولدا کا صحیح ترجمہ ہے'' لے رکھا ہے ایک بیٹا بنا رکھا ہے ایک بیٹا۔ یہاں مسیحیوں کا یہ قول نہیں نقل ہو رہا ہے کہ خدا کا ایک بیٹا ہے بلکہ یہ کہ خدا نے ایک بیٹا بنا لیا ہے اتخذ ولدا کا صاف مفہوم یہ ہے کہ خدا نے گویا کسی کو متبنیٰ کر لیا ہے۔ قرآن مجید کی تلمیحات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے قرآن کے صدہا مقامات کی طرح یہاں بھی اس کی ضرورت ہے کہ نظر اہل باطل عقائد و خیالات پر ذرا گہری ہو۔ مسیحیوں کے ہاں ایک زبردست فرقہ Adoptionists کے نام سے گزرا ہے۔ ان کے مرکزی عقیدہ کیلئے اصطلاحی لفظ تبنیت (Adoptionism) کا ہے۔ عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح خلقتِ خدا نہیں۔ وہ خدا پیدا نہیں ہوئے۔ وہ خدا شروع سے بنے بنائے اور خود بخود نہیں ہیں بلکہ اصلاً و خلقۃً وہ انسان ہی تھے۔ البتہ اقنوم ثالثہ یعنی روح القدس کا فیضان ان پر شروع ہی سے ہونے لگا تھا۔ اس لئے وہ قدوسیت کے ایسے اوج کمال پر پہنچ گئے اور روح الٰہی ان کے

اندر ایسی حلول کر گئی کہ اقنوم اول یعنی خدائے برتر و اعظم نے انہیں اپنا بیٹا قرار دے کر اپنا متبنّٰی بنا کر شریک الوہیت کر لیا اور اب وہ ربوبیت مالکیت وغیرہ جملہ صفات الٰہی میں شریک و سہیم ہیں اس عقیدہ کے وجود کی شہادت تاریخ میں ۱۸۵ء میں ملتی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں پاپائے روم نے اسے الحاد و زندقہ قرار دیا۔ بارہویں صدی عیسوی میں اس نے پھر زور پکڑا اور پھر یہ لوگ زندیق قرار پائے۔ آیت میں صاف اشارہ مسیحیت کی اس شاخ کی جانب ہے۔''

میرے خیال میں اگر اس عقیدہ کی رد ہوتی تو سبحانہ کے پہلے اتخاذ شریك کا ذکر آتا کیوں کہ صرف برائے نام ''ابن'' قرار دے لینا اتنا شان الٰہی کے خلاف نہیں ہے جتنا اس عقیدہ کا یہ جز کہ ''اس نے ان کو شریک ربوبیت کر لیا۔ اب وہ ربوبیت و مالکیت وغیرہ جملہ اوصاف الٰہی میں شریک و سہیم ہیں''۔ لہٰذا تنزیہ و تسبیح کے لئے اس تصور کا ذکر کرنا زیادہ مناسب تھا مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ ولد قرار دیے جانے ہی کو مورد تنزیہ قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے واقعاً ابن خدا ہونے ہی کے تصور کا انکار ہے۔

رہ گیا اتخذ کا لفظ سے جو استدلال ہے وہ بھی ایک قرآنی نظیر دیکھنے کے بعد غلط معلوم ہوتا ہے ارشاد ہوا ہے:

''اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۝ (بنی اسرائیل) ظاہر ہے کہ مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ یہ نہیں کہ وہ انہیں متبنیٰ خدا کا قرار دیتے تھے۔ معلوم ہوا کہ انحاز اصل تخلیق کے ساتھ بھی وابستہ ہو سکتا ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

''اور آسمانوں کا اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی بات کو طے کر دیتا ہے تو بس اس سے کہتا ہے کہ ہو جا وہ ہو جاتی ہے۔''

بدیع اور مبدع کے معنی ہیں کسی شے کو بنانے والا بغیر نمونہ و شکل کے۔ اسی لئے اس کا ترجمہ ''موجد'' کے لفظ سے کیا گیا ہے [1]۔

کسی بات کو طے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے علمِ تام و شامل میں یہ ہوتا ہے کہ وہ حکمت و مصلحت کے مطابق ہے اس لفظ سے خالق کے فاعل مختار اور مرید ہونے کا اظہار ہے یعنی اس کے افعال بتقاضائے ذات قہری طور پر نہیں ہیں۔

''کہتا ہے کہ ہو جا'' اس سے یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہ لفظ اس کی طرف سے وجود میں آتا ہے۔ قول میں لفظ کی ضرورت تو اس وقت ہے جب قائل زبان و دہن رکھتا ہو لیکن خالق کی ذات جسم و جسمانیات سے منزو مبرا ہے۔ کن کا لفظ صرف ارادہ الٰہی کے تعلق کی تعبیر لفظی ہے مطلب یہ ہے کہ اس کے ارادہ کے ساتھ ہی بس یہ شے عالم وجود میں آجاتی ہے تاخیر و توقف کی کوئی گنجائش نہیں ہے [2]۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ

---

[1] ۔معنی المبدع المنشئی والمحدث مالم یسبقه الی انشاء مثله واحدائه احد (طبری) فی الکافی عن الباقر علیہ السلام فی تفسیرہ ابتدع الا شیاء کلها بعلمه علی غیر مثال کان قبله (صافی)

[2] ۔ یقول له لکن فیکون بلا لفظ ولا نطق بلسان ولا همة ولا تکفر (صافی)

مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

''اور جو دانائی سے محروم ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا قدرت کی کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں آتی؟ یونہی وہ جو ان کے پہلے تھے انہی کی سی بات کہتے تھے ان سب کے دل ملتے جلتے ہوئے ہیں ہم نے اپنی نشانیاں تو صاف پیش کر دی ہیں، ان لوگوں کے لئے جو یقین کرنے پر تیار ہوں۔''

کفار کے غلط مطالبے:

یہ جاہل مشرکین کا ذکر ہے جو نظام رسالت پر ہی معترض ہیں یہ کہہ کر کہ اللہ کو واسطہ اور نمائندہ کی ضرورت کیا ہے؟ وہ براہ راست خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا؟ یہ ان کا قول خود ان کی جہالت کا مظاہرہ ہے اس لئے کہ وہ خالق کو سمجھتے ہیں کہ مادی حیثیت سے وہ جسمانی طور پر کلام کرتا ہے لہٰذا ہم ہی سے کلام کرے حالانکہ اس کا کلام تو غیر مادی ہے جو کانوں پر نہیں بلکہ قلب روحانی اور فطرت ربانی ہی پر نازل ہو سکتا ہے اور وہ ہر بشر کے قالب میں نہیں ہوتی۔ اس کے لئے کچھ مخصوص ہی افراد ہو سکتے ہیں جو روح مجسم کی حیثیت رکھتے ہوں۔ وہی اس لائق ہو سکتے ہیں کہ اس فیض کے حامل ہوں۔ اسی کو دوسرے جگہ اس طرح کہا ہے کہ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ ''اللہ ہی اس محل کو جانتا ہے جہاں وہ اپنی رسالت قرار دے۔''

دوسرا جاہلانہ مطالبہ ان کا یہ تھا کہ کوئی نشانی ہمارے پاس آئے۔ یہ اگر واقعی حقیقت طلبی کے لئے ان کا مطالبہ ہوتا تو حق بجانب تھا اس لئے کہ رسولؐ کے پاس اس کی حقانیت کی دلیل بہر حال کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔ اور یہ دلیل اس کی سچائی کی نشانی ہوا کرتی ہے اسی لئے آیۃ یعنی نشانی کا لفظ قرآن میں بہت جگہ ''معجزہ'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے مگر ان کا یہ مطالبہ تو اس حالت میں تھا کہ رسولؐ کی طرف سے آیات یعنی حقانیت کی نشانیاں یا معجزات کثرت سے پیش ہو چکے تھے پھر بھی وہ یہی رٹ لگائے ہوئے تھے کہ کوئی معجزہ آئے، کوئی نشانی ظاہر ہو کوئی دلیل سامنے آئے یہ ان کا صرف عناد تھا اور اسی لئے ان کے جواب میں کہا گیا ہے کہ نشانیاں تو ہم بڑی واضح و ظاہر پیش کر چکے ہیں مگر وہ ان ہی کو منوا سکتی ہیں جو ماننے کے لئے تیار ہوں اور جو یہ طے کر چکے ہیں کہ ہم چاہیے جو کچھ ہو جائے یقین ہرگز نہ کریں گے تو ان کے لئے کوئی بھی معجزہ آ جائے وہ بے کار ہی ہوگا۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

''ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا اور دوزخ میں جانے والوں کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔''

رسولؐ خدا کو اس کی بڑی فکر تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ایمان لائیں حالانکہ جتنی کامیابی اس بارے میں آپ نے اپنی زندگی میں حاصل فرمائی وہ کسی دوسرے نبی یا رسولؐ کی تاریخ زندگی میں نایاب ہے۔ پھر بھی جو ایمان نہیں لائے تھے اور کفر و شرک پر قائم تھے ان کے متعلق آپ کو بہت ملال ہوتا تھا۔ آپ کے اس رنج و ملال کو دور کرنے کے لئے قرآن مجید میں متعدد مرتبہ اس طرح کی آیتیں آئی ہیں کہ اے رسول ﷺ

آپ کا جو فرض ہے وہ آپ پوری طرح ادا کر رہے ہیں۔ اب ایمان لانا نہ لانا ان لوگوں کا کام ہے۔ اس کی ذمہ داری آپ پر کوئی نہیں ہے لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (غاشیہ ۲۲) وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۵۴﴾ (نور ۵۴) اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ (قصص ۵۶) یہ سب آیتیں اسی باعث سے نازل ہوئی ہیں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (رعد ۴۰) آپ کا کام صرف پہنچا دینا ہے اور ان کے افعال کا محاسبہ ہمارے ہاتھ میں ہے ان میں سے ایک جگہ خود خلائق سے مخاطب ہو کر بھی کہا گیا ہے فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ط (نور ۵۴) ''رسولؐ اس کے ذمہ دار ہیں جس پر وہ مامور ہیں اور تم اس کے ذمہ دار ہو جس پر تم مامور ہو۔''

اس کا مطلب بھی وہی ہے کہ تمہارے کفر و عصیان کی ذمہ داری پیغمبر پر نہیں ہے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ط قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ط وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ لا مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

''اور آپ سے یہودی اور عیسائی تو اس وقت تک کبھی خوش نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ ہو جائیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے اور اگر آپ اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آ چکا ہے ان کے من مانے خیالات کی پیروی کیجئے تو اللہ کے غضب سے بچانے کے لئے آپ کا نہ کوئی یاور ہوگا نہ مدد گار۔''

یہ خطاب رسولؐ سے ہے اور متنبہ کرنا مسلمانوں کو مقصود ہے چوں کہ یہود اور نصاریٰ بہ نسبت مشرکین کے اسلام سے قریب نظر آتے تھے اس لئے کہ وہ (مشرکین) توحید کے لفظاً اور معناً ہر طرح کے منکر تھے اور نبوت و شریعت اور جزا و سزا اس پورے نظام ہی سے بے خبر بلکہ منکر تھے اور یہ توحید کے لفظاً مقر، نبوت و شریعت اور جزا و سزا کے معترف اور وحی و الہام سب ہی باتوں کے ماننے والے تھے۔ صرف اتنی بات تھی کہ انہوں نے کچھ رہنمایانِ دین کے بارے میں غلو سے کام لے کر ان کے بارے میں غلط عقیدے قائم کر لئے تھے اور پھر یہ کہ وہ بالخصوص حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ کے پہلے حضرت عیسیٰؑ کی بھی نبوت کے منکر تھے لہٰذا امید کی جا سکتی تھی کہ اگر ان کے ساتھ ذرا رعایت و مدارات سے کام لیا جائے تو یہ اسلام سے قریب ہوتے جائیں اور دین حق کو قبول کر لیں خالقِ حکیم نے ان کے متعلق اس امید کو قطع کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ کسی خاطر مدارات سے آپ کے نہیں ہو سکتے۔ یہ اس وقت تک آپ سے خوش نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ حق کے منکشف ہونے کے بعد یہ آپ کے لئے ممکن ہی نہیں ہے اور اگر آپ ایسا کیجئے تو خدا کے غضب سے آپ کو بچانے والا کوئی نہیں ہو سکتا یہ بطورِ مفروضہ صرف اس حقیقت کے اظہار کے لئے کہا ہے کہ تصورات میں حق سے قریب ہونے کی وجہ سے کوئی باطل مذہب حق نہیں ہو سکتا۔ نہ یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اسے مان لیا جائے تو اس پر باز پرس اتنی تو نہ ہوگی جتنی شرک پر ہو سکتی ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ حق پر مطلع ہونے کے بعد حق سے روگردانی جس شکل سے بھی ہو وہ باطل ہی ہے اور باطل ہونے کے لحاظ سے ہر باطل برابر ہے اس میں کمی اور زیادتی یا قوت اور ضعف کوئی نہیں ہے

اور اگر وہ دین کے اجزاء ہیں تو ان سے انکار پر مواخذہ میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق ہوسکتا ہے تو علم اور لاعلمی یا مراتب عناد کے لحاظ سے ہوسکتا ہے نہ کہ انکار کی مقدار اور تعداد کے لحاظ سے کہ کون دس باتوں کا منکر ہے اور کون ایک بات کا۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

''جنہیں ہم نے کتاب دی ہے اور وہ اسے پڑھنے کا حق ادا کرتے ہوئے پڑھتے ہیں وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور جو اس سے انکار کرتے ہیں تو یہ وہ ہیں جو خسارے میں ہیں۔''

کتاب سے مراد توریت ہے اور ''جنہیں کتاب دی گئی'' اس سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔ پڑھنے کا حق ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف الفاظ کو زبان پر جاری کرتے یا انہیں رٹتے ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے معانی پر غور کرتے اور ان پر عمل کی کوشش کرتے ہیں[1]۔

مقصود آیت یہ ہے کہ وہ یہود اور نصاری جو خود اپنی کتابوں کے صرف لفظی حافظ نہ ہوں بلکہ ان کے معانی و مطالب پر بھی نظر کیے ہوئے ہوں اور ان کا اتباع بھی پیش نظر رکھتے ہوں ان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ پیغمبر اسلامؐ اور ان کے پیغام پر ایمان نہ لائیں اور جو ان میں سے منکر ہیں ان کے متعلق یقین سمجھنا چاہیے کہ وہ پہلے ہی سے خود اپنی کتاب کے فیض سے بھی محروم ہیں اور انہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ پھر ایک سرمایہ ہدایت پاس موجود ہوتے ہوئے جہالت و گمراہی میں پڑے رہنے سے بڑھ کر خسارہ اور کیا ہوسکتا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

''اے بنی اسرائیل میری وہ نعمت یاد کرو جس سے میں نے تمہیں نوازا اور یہ کہ میں نے تمہیں تمام خلائق سے زیادہ عطا کیا۔''

یہ آیت بالکل ان ہی الفاظ میں پہلے آ چکی ہے اور اس کی تفسیر وہاں درج ہو چکی ہے۔

اگر ترتیب تنزیلی یہی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے یہ تو یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک دفعہ واقعات کے بیان سے پہلے بنی اسرئیل کو متنبہ کیا گیا اور ایک دفعہ پھر واقعات کے بعد ان کے نتیجہ پر توجہ دلائی اور اس صورت میں گویا یوں کہا جا رہا ہے: ''پھر تم سے کہتا ہوں کہ اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جس سے میں نے تمہیں نوازا (الخ)'' اس سورت میں یہ تکرار ویسی ہی ہوگی جیسے سورہ رحمٰن میں فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ

---

[1] ۔ يتبعونه حق اتباعه (طبری) سب سے زیادہ جامع تشریح اس کی امام جعفر صادقؑ کی حدیث میں ہے عن الدیلمی عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال یر تلون اياته ويتفقهون به ويعلمون با حكامه ويرجون وعدهٗ ويخافون وعيده ويعتبرون بقصصه ويأ تمرون باوامره وينتهون بنوا هيه (بلاغی)

کی بار بار تکرار کی گئی ہے جسے یوں سمجھنا چاہیے کہ تنبیہ کے لئے مسلسل تازیانے لگائے گئے ہیں[1]۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ یہ آیت تنزیل میں اس سلسلہ کی ہو ہی نہ اور کسی اور ایسے موقع پر ان ہی الفاظ میں جو ایک دفعہ کہے جا چکے تھے انہیں متنبہ کیا گیا ہو جس کا نظم کلام میں کوئی تعلق ہی پہلی دفعہ کی تنبیہ کے ساتھ نہ ہو۔ چوں کہ ترتیب قرآن کلیتہً مطابق تنزیل قطعی طور پر نہیں ہے اس لئے اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''اور اس دن سے بچنے کا سامان کرو جب نہ کوئی دوسرے کو کچھ فائدہ پہنچا سکے گا اور نہ کسی کا کوئی معاوضہ لیا جائے گا اور نہ سفارش کسی کو کچھ فائدہ پہنچا سکے گی اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔''

گذشتہ آیت کے بعد پہلی جگہ بھی تقریباً ان ہی الفاظ میں یاد آخرت دلائی گئی تھی اور اس کے تمام فقروں کی تشریح وہاں ہو چکی ہے۔ الفاظ میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہاں پہلے شفاعت کے متعلق نفی تھی اور پھر معاوضہ کے متعلق اس طرح کہ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ اور یہاں اس کا عکس ہے مگر اس فرق سے مطلب پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے تفسیر میں کوئی امر محتاجِ تحریر نہیں ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

''اور وہ وقت جب ابراہیمؑ کا ان کے پروردگار نے چند باتوں کے ساتھ امتحان لیا اور انہوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا تو ارشاد ہوا کہ میں تمہیں خلق خدا کا امام بناتا ہوں۔ انہوں نے کہا اور میری اولاد میں سے؟ ارشاد ہوا کہ میری طرف کا عہدہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔''

امتحان حضرت ابراہیمؑ اور اعلانِ امامت:

ابراہیمؑ کی شخصیت چوں کہ مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب ہی میں مسلم تھی اس لئے ان کے واقعات زندگی کا تذکرہ قرآن نے بڑی اہمیت سے کیا ہے۔ مشرکین کی وہ جماعت جس سے شروع میں رسولؐ کو سابقہ پڑا تھا حجاز کی باشندہ تھی اور زیادہ تر جناب ابراہیمؑ سے نسلی تعلق رکھتی تھی۔ اس لئے حج خانہ کعبہ کی پابند تھی اور کعبہ کو اپنا قومی گھر سمجھتی تھی اور یہود و نصاریٰ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل میں سے تھے اور یہ یعقوبؑ بن اسحٰقؑ

---

[1] ۔ تخصیصھم بتکریر التذکیر واعادۃ التحذیر بلمبالغۃ فی النصح وللا یذان بان ذٰلک فذٰلکۃ القضیۃ والمقصد من المقصد (ابو السعود)

بن ابراہیمؑ کی نسل کا نام ہے پھر مسلمانوں کے لئے خصوصیت سے ابراہیمؑ کو اس لئے اہمیت حاصل تھی کہ آپ مذہبی طور پر بھی ان کے مورث اعلیٰ ہیں یعنی ملت اسلامیہ کے پہلے مبلغ حضرت ابراہیمؑ تھے جنہوں نے اس کا نام ''اسلام'' رکھا اور آنے والی امت کا نام ''امت مسلمہ'' تجویز کیا جس کا ذکر آیاتِ قرآن کے سلسلہ میں عنقریب آئے گا۔

''پروردگار نے ابراہیمؑ کا چند امور میں امتحان لیا'' ان امور کی تفصیل قرآن مجید میں مذکورہ نہیں بہرحال یہ ظاہر ہے کہ وہ تکالیف عمومی کے علاوہ کچھ خصوصی امورہ ہو سکتے ہیں جو انبیاؤ مرسلین میں بھی سب سے متعلق نہیں ہوئے بلکہ حضرت ابراہیمؑ ہی کے ذمہ عائد ہوئے اور جنہیں انہوں نے پایہ تکمیل کو پہنچایا ان میں سے ایک نمایاں امر اپنے فرزند اسماعیلؑ کی قربانی کو بھی سمجھا جا سکتا ہے جس کا روایت میں ذکر ہے [1]۔

''آزمایا'' اپنی واقفیت کے لئے نہیں کہ وہ تو خود عالم الغیوب ہے' بلکہ اس منصب کے لئے جو انہیں دیا جانے والا ہے ان کا استحقاق ثابت کرنے کے لیے۔

جب ابراہیمؑ ان امتحانوں میں پورے اترے تو خالق کا ارشاد ہوا کہ میں تمہیں لوگوں کا امام قرار دیتا ہوں۔ امام کے لغوی معنی ہیں جس کی پیروی کی جائے اور مذہبی اصطلاع میں وہ ایک منصب ہے جس کے لازمی نتیجہ میں مفترض الطاعۃ ہونا یعنی اس کی پیروی کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جناب ابراہیمؑ کے لئے نبوت و رسالتؑ و خلت کے مراتب پر فائز ہونے کے باوجود امتحان کے معیار پر پورے اترنے کے بعد امامت کا اعلان کیا جانا، منصب کی رفعت کا ناقابل انکار ثبوت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امامت لغوی چاہے ہر نبی و رسول کے لئے ثابت ہو سکتی ہے لیکن بحیثیت منصب من جانب اللہ امام ایک وہ خصوصی عہدہ ہے جو نبوت اور رسالت کے لئے لازمی نہیں ہے [2]۔

نبی رسولؑ اور امام کے لغوی معنی پر بھی غور کیا جائے تو امامت کی منزل زیادہ بلند نظر آئے گی۔ نبی خبر دینے والا، رسول پیغام پہنچانے والا اور امام یعنی پیشوا، پہلی دونوں چیزوں میں وہ ہمہ گیری، مستقل حیثیت اور دوسروں کے لحاظ سے خود مفہوم لفظ میں وہ رفعت نہیں جو امام میں ہے اور اسی لئے جب کہ عقلی طور پر نبی اور رسول بھی معصوم ہوتے ہیں امام کے لئے خود اس لفظ سے اور زیادہ قوت کے ساتھ عصمت کے ضروری ہونے کا پتہ چلتا ہے [3]۔

امتحان میں تمام و کمال کامیابی کے بعد خالق کی طرف سے اعلان امامت ہوا تھا اس لئے ابراہیمؑ کا دل بڑھا ہوا تھا۔ خالق کی نگاہ کرم کی

---

[1] ۔ عن الصادقؑ انہ ما ابتلاہ اللہ بہ فی نومہ من ذبح ولدہ اسمٰعیل (مجمع البیان)

[2] ۔ اسی مضمون کی امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے کہ انّ اللہ تبارك وتعالیٰ اتخذ ابراھیم عبدا قبل ان یتخذ نبیّنا وان اللہ اتخذہ نبیّنا قبل ان یتخذہ رسولا وان اللہ اتخذہ رسولا قبل ان یتخذہ خلیلا وان اللہ اتخذہ خلیلا قبل ان یجعلہ اماما فلما جمع لہ الاشیآء قال انی جاعلك للناس امام (اصول کافی) وفی العیون عن الرضاء فی حدیث طویل ان الامامۃ خص اللہ عزوجل بھا براھیم الخلیل بعد النبوۃ والخلۃ مرتبۃ ثالثۃ وفضیلۃ شرفۃ بھا (صافی)

[3] ۔ فی الایۃ دلیل علیٰ انہ ﷺ کان معصوما عن جمیع الذنوب لانہ لو صدرت عنہ معصیۃ لوجب علینا الاقتدآء بہ وذٰلك یؤدّی الی کون الفعل الواحد ممنوعا منہ مندوبا الیہ وذٰلك محال (نیشاپوری)

توجہ خاص مبذول دیکھ کر اور منصب کی بلندی کو محسوس کر کے سوال کر لیا ومن ذریتی اور میری اولاد میں سے بھی[1] ؟''

جواب ملا: ''میرا عہدہ ظالموں تک نہیں پہنچتا'' غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ از اول سوال ابراہیمؑ تمام ذریت سے متعلق ہی نہ تھا کیوں کہ انہوں نے کہا تھا ''ومن ذریتی'' میری ذریت میں سے بھی۔ اگر کل کے لئے سوال ہوتا تو من یعنی ''میں سے'' نہ کہا ہوتا[2]۔

اس کے بعد خالق کریم کے جواب کو ابراہیمؑ کی رد یا اس میں کوئی کمی سمجھنا غلط ہوگا بلکہ وہ دعائے ابراہیمی کی قبولیت کا اظہار ہے اس کے ابہام کی تشریح کے ساتھ مطلب فقرہ کا یہ ہوتا ہے کہ ہاں ضرور تمہاری اولاد میں یہ منصب رہے گا البتہ ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔

ظالم کسے کہتے ہیں، اس کی تشریح خود قرآن نے دوسری جگہ کر دی ہے: ''وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ'' (بقرہ ۲۳۳) ''جو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں وہ ظالم ہیں۔'' اس کے بعد ظالم کے لفظ کو کافر سے مخصوص کرنا بلا وجہ ہے ''گناہ'' جو بھی ہوگا' وہ حدِ الٰہی سے تجاوز ہی ہوگا لہٰذا مرتکب اس کا ظالم قرار پائے گا خواہ وہ کفر ہو یا فسق بلکہ ایسا گناہ بھی جو فسق کی حد تک نہ پہنچے۔

دعائے ابراہیم علیہ السلام اور اس کی قبولیت با شرط عصمت:

اس کے علاوہ جب ابراہیمؑ کے لئے امامت کا اعلان عصمت کی دلیل ہوا تو امامت کے بقاء کا اعلان ان کی ذریت میں جیسا کہ اس وعدہ سے ظاہر ہے خود ہی صفت عصمت کے کچھ افراد ذریت میں تا قیامت وجود کی یقینی دلیل ہوں گے۔

اس کے ساتھ جب لفظ ظالم کے حدود کی وسعت دیکھنے کے لئے اس آیت پر نظر کی جائے کہ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ حالانکہ فعل آدمؑ صغیرہ گناہ نہ تھا تو معلوم ہوگا کہ امامت کا درجہ وہ ہے جو اس حد تک کے ترک اولیٰ کو بھی برداشت نہیں کر سکتا جو کسی درجہ تک نبوت کے ساتھ ممکن الوقوع ہوتا ہے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

''اور وہ وقت کہ جب ہم نے خانہ کعبہ کو تمام لوگوں کا مرکز اور مقام امن قرار دیا اور تم لوگ مقام ابراہیمؑ کو اپنے نماز کی جگہ بناؤ۔ اور ہم نے ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو حکم دیا کہ میرے گھر کو پاک رکھنا طواف کرنے والوں اعتکاف کرنے

---

[1] ۔ خبر صادقؑ میں ہے فمن عظمها فی عین ابرٰهیم قال ومن ذرّیّتی (اصول کافی) عیون اخبار الرضا کی روایت میں ہے فقال الخلیل سرورا بها ومن ذرّیّتی (صافی)

[2] ۔ ''مِن ذرّیّتی'' میں من تبعیضیہ ہے اور فقرہ کی ترکیب نے اسے صاف کر دیا کہ ابراہیمؑ کی دعا سوال کے رنگ میں اپنی ساری نسل سے متعلق نہیں۔ اس کے جزو سے متعلق تھی (دریابادی)

والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے۔''

خانۂ کعبہ کی مرکزیت:

بیت کے لفظی معنی تو عام گھر کے ہیں لیکن الف لام عہد کے ساتھ اصطلاح قرآنی میں یہ نام کعبہ کا ہو گیا ہے [1]۔

مثابہ اسم ظرف ہے ثَوْب سے جس کے معنی پلٹنے کے ہیں کسی شے سے لو لگانا اور بغرض حصول ثواب اس کی طرف رخ کرنا اس کی جانب رجوع کرنا ہے۔ اسی لئے ہم نے ترجمہ ''مرکز'' کے لفظ سے کیا ہے۔

بعض مفسرین نے اس میں جا کر پلٹنے کے مفہوم کا لحاظ کرتے ہوئے یہ معنی پیدا کیے ہیں کہ لوگ اس کی زیارت سے سیر نہیں ہوتے بلکہ جا کر پھر آتے ہیں اور بار بار حج کرتے ہیں [2]۔

یہ ایک خصوصیت اس گھر کی بیان کی گئی۔ دوسری یہ کہ وہ محل امن قرار دیا گیا ہے اور وہ معیاری امن کا نمونہ جس میں انسان کیا بلکہ بہائم و طیور اور اس سے بڑھ کر نباتات تک امن میں ہیں یعنی حرم کے حدود ہیں کسی جانور کا شکار نا جائز اور وہاں کی گھانس تک کا اکھاڑنا ممنوع قرار دیا گیا ہے اور انسانوں کے لئے تو اس دنیوی امن کے علاوہ وہ آخرت میں بھی امن کا ذریعہ ہے [3]۔

جیسا کہ مولوی عبدالماجد صاحب نے لکھا ہے ''فرنگی'' قاموس علم و دانش ہیں۔ اتنا تو بہر حال ہے کہ حضرت محمدؐ کے دور سے قبل مکہ کی دو حیثیتیں ہم مسلم پاتے ہیں، ایک تجارتی مرکز کی ایک مقدس معبد کی جس کے اردگرد کی زمین بھی حرج ہے'' (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ج ۱۵ ص ۱۵ طبع چہاردہم)

خانہ کعبہ کا مرکز خلائق اور محل امن ہونا تو حادث نہیں بلکہ قدیم امر تھا اس لئے اسے ذکر ماضی کے طور پر یاد دلایا اور اس کے بعد اب حال کے متعلق حکم ہے جو مسلمانوں ہی کا شعار بننے والا تھا اور وہ مقام ابراہیمؑ کو محل نماز قرار دینا یعنی اس جگہ حج کے موقع پر نماز ادا کرنا [4]۔

مقام ابراہیمؑ سے مراد وہ محل ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے نماز ادا کی تھی اور وہیں وہ پتھر بھی نصب ہے جس پر ان کے قدم کا نشان ہے [5]۔

---

[1] ۔البیت اسم غالب للکعبة کالنجم للثریا وھٰذا من الاسماء التی کانت فی الارض للجنس ثم کثر استعماله فی واحد من ذلك الجنس (نیشاپوری)

[2] ۔یأتونه کل عام ویرجعون الیه فلا یقضون منه وطرا (طبرانی)

[3] ۔ عن الصّادق علیہ السلام من دخل الحرم من الناس مستجیرا به فهو امن من سخط الله عزو جل ومن دخل من الوحش والطیر کان اٰمنا من ان یهاج او یؤذی حتی یخرج من الحرم (کافی)

[4] ۔ فی التهذیب عن الصّادق علیہ السلام یعنی بذٰلك رکعتی طواف الفریضة ومثله فی الکافی (سافی)

[5] ۔ فی الکافی فی الحسن کالصحیح عن ابی عبدالله مقام ابراهیم حیث قام علی الحجر فاثرت فیه قدماه. والظاهر ان المراد من مقام ابراهیم فی الایة هو جهة موقفه ومحل قیامه لا خصوص موطئه فی قیامه او نفس الصّخرة (بلاغی)

نماز کا حکم دینے کے بعد اب مسلمانوں کو اس کی طہارت کے متعلق اہتمام کی طرف متوجہ کرتے ہوئے پھر ذکر ماضی کی طرف عود ہوا ہے کہ یہ آج ہی نہیں ہے بلکہ پہلے ہی تمہارے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند اسماعیلؑ کو ہمارا حکم ہو گیا تھا کہ میرے گھر کی تطہیر کو پیش نظر رکھنا۔ تطہیر کے معنی متفقہ طور پر یہاں طاہر رکھنے کے ہیں طاہر کرنے کے نہیں کیوں کہ خانہ کعبہ طہارت ہی کے ساتھ وجود میں آیا تھا نجاست اس میں کبھی نہ تھی [1]۔

''میرے گھر'' میں اضافت اظہار شرف وعظمت کے لئے ہے اور اسی طرح آدمؑ کے لئے من روحی اور عیسیٰؑ کے لئے روح اللہ اور ایسے ہی عرش کی اضافت۔ ان میں کہیں بھی جسمیت کا تصور کرنا باطل ہے [2]۔

آخر میں خانہ کعبہ کے ساتھ جس طرح کی عبادتوں کا تعلق ہے ان کا بیان کیا گیا ہے ایک طواف یعنی خانہ کعبہ کے اردگرد چکر لگانا جو حج کا ایک ضروری جزء ہے۔ دوسرے اعتکاف یعنی نیت کر کے روزہ کی حالت میں ایک معینہ مدت تک مسجد میں مسلسل قیام۔ اس کے احکام فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں تیسرے نماز جس کی نمایاں حالتیں رکوع وسجود ہیں۔ چوں کہ رکوع وسجود دونوں ایک ہی عبات کے جزء ہیں اسی لئے ان کے درمیان واو عاطفہ جو مغایرت کا پتہ دیتا ہے نہیں لایا گیا۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

''اور وہ وقت جب ابراہیمؑ نے کہا اے میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا اور اس میں رہنے والوں کو پھلوں سے روزی عطا کر انہیں کہ جو ان میں سے اللہ اور آخرت پر بھی ایمان لائیں۔ ارشاد ہوا کہ اور جو کفر اختیار کرے گا میں اسے بھی کچھ دن تو مزے اٹھا لینے دوں گا۔ پھر سے بجبر دوزخ کے عذاب کی طرف لے جاؤں گا اور وہ کیا بُرا ٹھکانا ہے۔''

حضرت ابراہیمؑ کی دعائیں اور اُن کی استجابت:

حضرت ابراہیمؑ نے جو دعائیں کی تھیں ان کی قبولیت کا سب سے زیادہ نمایاں رخ یہ ہے کہ وہ دعائیں اس وقت کے حالات کے تقاضے اور اسباب طبیعیہ کی رفتار کے خلاف تھیں۔ ایک آبادیوں سے دور افتادہ مقام جہاں ابھی نئی نئی انسانوں کی بستی بسی ہے اور ہر وقت لیٹروں اور ڈاکوں کا خطرہ، وہاں امن وامان کہاں پھر وہ جگہ جہاں اب تک پانی کا نام ونشان نہ تھا اور پتھریلی زمین وہاں پھل پھلواری کہاں اور وسائل وذرائع کی

---

[1] ۔ المراد اقرّاہ علیٰ طہارتہ مثل ولھم فیھا ازواج مطھرۃ فمعلوم انھن لم یطھّرن بل خلقن طاھرات (نیشاپوری)

[2] ۔ الاضافۃ للتشریف کنافۃ اللہ (روح المعانی)

نایابی کے سبب دوسری جگہوں سے درآمد کا کیا امکان مگر خلیل حق کی پرخلوص دعائیں تھیں۔ قادر مطلق کی بارگاہ میں ان سے ہر دعا قبول ہو کر رہی۔

الحب فی اللہ و البغض فی اللہ کے ماتحت جو ایمان و اخلاص عبودیت کا لازمی نتیجہ ہے حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا کو اہل ایمان کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ مگر خالق نے اس کی قبولیت کا اعلان کرتے ہوئے اپنی ربوبیت و رحمانیت کے ثبوت میں اس کی خبر دے دی کہ رزق دنیا میں تو کافر بھی مومنین کے ساتھ شریک رہیں گے۔ ہاں آخرت میں وہ رحمت جو بتقاضائے رحیمیت ہے مومنین کے ساتھ مخصوص ہوگی اور وہاں کافروں کا ٹھکانا دوزخ میں ہوگا۔

ان دونوں قسم کی رحمتوں کا فرق بسم اللہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

''اور وہ وقت جب ابراہیمؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ اسماعیلؑ۔ اے ہمارے پروردگار ہم سے قبول فرما یقیناً تو بڑا سننے والا ہے جاننے والا۔''

بنائے کعبہ اور ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی مناجات:

بنیادیں اونچی کرنے کے لفظ سے ظاہر ہے کہ وہ ابتدائی تعمیر نہ تھی بلکہ سابقہ عمارت جو امتداد زمانہ سے منہدم ہو گئی تھی اس کو از سر نو ان ہی بنیادوں پر قائم کرنا تھا[1]۔

اسلامی روایات بتاتے ہیں کہ کعبہ کی زمین تخلیق ارض میں مقدم ترین نقطہ اور اس کی عمارت دنیا کی بنا کردہ عمارتوں میں سب سے مقدم عمارت ہے جو ابوالبشر کے ہاتھ سے قائم ہوئی تھی۔

غیر مذاہب کے محققین نے بھی اپنے حدود تحقیق کے اندر خانہ کعبہ کی غیر معمولی قدامت کا اقرار کیا ہے جن کی تصریحات کو مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے نقل کیا ہے چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں انگریز مصنف باسورتھ اسمتھ نے لکھا ہے ''یہ وہ معبد ہے جس کی قدامت عہد تاریخ سے آگے ہے (محمد اینڈ محمڈ ازم ص ۱۶۶) سر ولیم میور نے لکھا ہے ''مکہ کے مذہب کی تاریخ بہت ہی قدیم ماننی پڑتی ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ ایک نامعلوم زمانہ سے ملک عرب کا مرکز چلا آتا ہے۔'' (لائف آف محمد مقدمہ ص ۱۰۲ و ۱۰۳)

یہ اس خانہ مقدس کے من جانب اللہ تقدس و احترام ہی کا نتیجہ تھا کہ خلیل حق کو اس کی معماری کے لئے منتخب کیا گیا اور وہ اپنے فرزند اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر بنفس نفیس اس کی بنیادوں کو اونچا کر رہے تھے۔

اس وقت ان کے قلبی تاثرات کیا تھے انہیں خالق نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ''رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا الخ'' یہ الفاظ اگر لفظی طور پر ان کی زبان پر جاری ہوئے ہوتے تو بیچ میں قول کا ذکر آتا کہ یقولان یا قائلین مگر درمیان میں بغیر ذکر قول کے مقولہ کا بیان کرنا پتہ دے رہا ہے کہ یہ

---

[1] ۔ رفع القواعد صریح فی ما ذھب الیہ الاکثرون من ان القواعد کانت موجودۃ وان ابراھیم عمرھا ورفعھا (نیشاپوری)

ان کے قلبی تاثرات تھے جنہیں عالم الضمائر خالق نے اپنے الفاظ کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔

تَقَبَّلْ مِنَّا ''قبول فرما ہم سے'' بصورت التجا اس تمنا میں خود بخود یہ احساس مضمر ہے کہ ہمارا عمل اپنی جگہ حقیر ہے اور وہ تیری بارگاہ کے لائق نہیں ہے مگر تو اپنے فضل و کرم سے اپنی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ عطا فرما دے عمل کی درستی کے ساتھ یہی وہ باطنی احساس ہوتا ہے جو عمل کو معراج قبول تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

''پروردگار! اور یہ عرض ہے کہ ہم دونوں کو اپنی بارگاہ میں مسلم قرار دے اور ہماری نسل میں سے بھی ایک امت قرار دے جو تیری بارگاہ میں مسلم ہو اور ہمیں ہماری طاعت و عبادت کے طریقے آنکھوں سے دکھا دے اور ہماری طرف اپنی خصوصی توجہ مبذول فرما یقیناً تو بڑا توجہ فرمانے والا مہربان ہے۔''

''مسلم'' کے معنی ہیں ''سر جھکانے والا'' مگر یہ صفت بحیثیت صفت عباد مخلصین اور بالخصوص انبیاؤ مرسلین میں ہمیشہ ہی سے پائی جاتی تھی۔ ابراہیمؑ نے اس صفت رکھنے والے کو لفظ مسلم سے یاد کیا اور اس وقت سے یہ اصطلاح قائم ہوگئی۔ اس لئے ہم نے ترجمہ میں بجائے اس لفظ کے ترجمہ کے اصل لفظ مسلم ہی رکھ دیا ہے۔

''سر جھکانے والا قرار دے'' کے معنی اس صفت کا پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم بھی تَقَبَّلْ مِنَّا کی طرح یہ ہے کہ ہمارا سر جھکانا درحقیقت تیری شان جلال و کمال کے لحاظ سے کوئی لیاقت نہیں رکھتا۔ تو اپنے کرم سے ہمارے سر جھکانے کو قابل لحاظ قرار دے کر ہمیں اپنے یہاں ''مسلم'' کے لقب کے حق داروں میں محسوب فرما۔

دوسری دعا یہ ہے کہ ہماری اولاد میں سے ایک قوم قرار دے جو ''امت مسلمہ'' کے لقب کی حق دار ہو ''ہماری'' کی اضافت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ دونوں کی طرف ہے لہٰذا ''امت مسلمہ'' کے ظہور کی پیش گوئی چاہے اولاد اسماعیلؑ کے ذریعہ سے پوری ہو لیکن اس امت میں شمولیت کا مطالبہ قدرت کی طرف سے تمام اولاد ابراہیمؑ کو شامل ہوگا چاہے وہ نسل اسماعیلؑ سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔

تیسری دعا ''اَرِنَا مَنَاسِكَنَا'' یہ خالق کی طرف سے عبادت کے لئے ایک دستور العمل کے نفاذ کی درخواست ہے اور ارنا ''ہمیں دکھا دے'' اس دستور العمل کے اجزاء کے اپنی زندگی میں دیکھ لینے کی تمنا کا اظہار ہے جس کی تکمیل فریضہ حج کے لئے نداء کے حکم اور اس نداء کی عملی تاثیر کو وقوع میں لانے کی ضمانت کے ساتھ قرآن کی دوسری آیت سے ظاہر ہوتی ہے کہ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (حج۔ ۲۷) مناسك کا لفظ اگرچہ لغۃً تمام طریق عبادت کو شامل ہے مگر اصطلاحی طور پر اس کا استعمال اعمال حج کے ساتھ زیادہ خصوصیت رکھتا ہے اور پھر بحد تمام و کمال اس کی انجام دہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ہوئی جنہوں نے خود مسلمانوں کو اپنے

ساتھ حج کرا کے دکھلایا اور فرمایا ''مجھ سے اپنے حج کے مناسک کو لے کر محفوظ کر لو''[1]۔

آخری دعا التجائے عبودیت کا ایک عام مظاہرہ ہے کہ ہماری طرف اپنی خاص توجہ مبذول فرما۔

توبہ کے لفظ کا عام استعمال ''گناہ'' کے ساتھ ہوتا ہے مگر اس کے اصل معنی رجوع کے ہیں۔ گناہ سے توبہ اس معنی کا ایک مصداق ہے اور اس کا نتیجہ ہے خالق کی طرف سے گناہ کا بخش جانا۔ لیکن بے گناہ جب بارگاہ الٰہی میں توبہ کرتا ہے تو اس کے معنی اخلاص عبودیت کے مزید اظہار کے ہوتے ہیں اور اس کے مقابل میں خالق کی طرف سے جو نتیجہ ہوتا ہے وہ رحمتِ خصوصی اور توجہ امتیازی کی زیادتی۔ یہ اس کی نسبت سے توبہ کا مصداق ہوتا ہے اور وہی جناب ابراہیمؑ کی دعا کا مقصد ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

''پروردگار! اور یہ گزارش ہے کہ ان میں ایک پیغمبر ان ہی میں سے بھیجنا جو انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کے اخلاق کو درست کرے یقیناً تو بڑا زبردست اقتدار کا مالک اور بڑا حکمت والا ہے۔''

دعائے ابراہیمؑ میں پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف:

یہ نسل اسمعیلؑ میں سے ایک نبی کے آنے کی دعا ہے۔ دعا کا وجود اور اس کی قبولیت دونوں توریت سے ثابت ہیں ایک جگہ ابراہیمؑ سے تخاطب کے طور پر آیا ہے: ''میں نے اسماعیلؑ کے بارے میں تیری دعا سن لی'' دوسری جگہ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ''خداوند تیرا خدا تیرے لئے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میرے مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی طرف کان دھرو (استثناء ۱۸:۱۵)

ظاہر ہے کہ من حیث الجماعت بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسمعیلؑ ہی سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ایک نبی اولاد اسرائیل میں نہیں بلکہ اولاد اسمعیلؑ میں ہوگا جو مثل موسیٰؑ صاحب شریعت و کتاب ہوگا۔

قرآن مجید میں اسی لئے پیغمبر خداؐ کے بارے میں خالق کے یہ الفاظ آئے ہیں کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (مزمل۔۱۵) ہم نے تمہاری طرف ایک پیغمبر بھیجا جو تم پر گواہ ہے اسی طرح جیسے فرعون کی طرف ایک پیغمبر بھیجا تھا''

توریت اور قرآن دونوں کی مطابقت سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ موسیٰؑ کے مانند مبعوث ہونے والے نبی حضرت ختمی مرتبتؐ ہی تھے۔

اس کے بعد رسول کے فرائض کا بیان ہے جس کی تشریح مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

''رسول کا پہلا کام اپنی امت کے سامنے تلاوت آیات ہوتا ہے یعنی اللہ کا کلام پہنچانا گویا رسول کی پہلی حیثیت مبلغ اعظم کی ہوتی ہے۔

---

[1] ۔ سمّی اعمال الحج مناسك قال علیه السلام خذوا عنّی مناسککم لعلّی لا القاکم بعد عامی هٰذا (رازی)

یعلمھم الکتب رسول کا کام محض تبلیغ و پیام رسانی پر ختم نہیں ہوجاتا۔اس کا کام کتاب الٰہی کی تبلیغ کے بعد اس کی تعلیم کا بھی ہے۔اس تعلیم کے اندر شرح ترجمانی تعمیم میں تخصیص، تخصیص میں تعمیم سب کچھ آ گئی اور یہیں سے ان کج فہموں کی بھی تردید ہوگی جو رسول کا منصب (معاذ اللہ) صرف ڈاکیہ یا قاصد کا سمجھے ہوئے ہیں۔گویا رسول کی دوسری حیثیت معلم اعظم کی ہوئی۔ **والحکمۃ** پھر رسول تعلیم محض کتاب ہی کی نہ دیں گے بلکہ حکمت و دانائی کی تلقین بھی امت کو کریں گے۔احکام و مسائل دین کے قاعدے اور آداب، عوام و خواص سب کو سکھائیں گے اور خواص کو رہ نمائی اسرار و رموز میں بھی کریں گے۔گویا رسول کی تیسری حیثیت مرشد اعظم کی ہوئی۔ **یُزَکِّیْھِمْ** تزکیہ سے مراد دلوں کی صفائی ہے۔رسول کا کام محض الفاظ اور احکام ظاہری کی تشریح تک محدود نہیں رہے گا بلکہ وہ اخلاق کی پاکیزگی اور نیتوں کے اخلاص کے بھی فرائض انجام دیں گے۔رسول کی چوتھی حیثیت مصلح اعظم کی ہوئی"۔

اس سے ظاہر ہے کہ ہدایت و اصلاح خلائق کے لئے صرف کتاب الٰہی کافی نہیں ہے ورنہ رسولؐ کا فرض تلاوت آیات پر ختم ہوجاتا۔ اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہ ہوتی اور اسی بناء پر رسولؐ کی وفات کے بعد کتاب کے علاوہ ایک جانشین رسولؐ کی ضرورت ہے جو تعلیم و ارشاد و اصلاح کے فرائض کو بہ نیابت رسول اسی عنوان پر انجام دے جس عنوان پر رسول انجام دیتے تھے اور یہ مقصد ماہرین سیاست اور ذمہ داران نظم و نسق ملکی سے پورا نہیں ہوسکتا اس لئے وہ رسولؐ کے جانشین کہے جانے کے مستحق قرار نہیں پاسکتے۔

دعائے ابراہیمی میں جن جن خصوصیات کو پیش نظر رکھا گیا تھا اور جن امتیازات کے حامل رسولؐ کی درخواست پیش کی گئی تھی اس کے حرف بہ حرف پورے ہونے کا بیان بعینہ ان ہی الفاظ میں قرآن کریم نے متعدد جگہ کیا ہے جیسے:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرۃ۔۱۵۱)

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران ۱۶۴)

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (الجمعۃ۔۲)

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۳۰

"اور کون ہوگا جو ابراہیمؑ کے مذہب سے روگردانی کرے سوا اس کے جس نے خود اپنے کو بے وقوف بنا رکھا ہو اور ہم نے انہیں دنیا میں بھی منتخب کیا اور یقیناً وہ آخرت میں بھی نیکوکاروں میں محسوب ہوں گے۔"

چوں کہ دین اسلام ہی کا دوسرا نام "ملت ابراہیم" تھا اس لئے یہود و نصاریٰ اور مشرکین سب کو اس کی جانب اس لفظ سے متوجہ کیا ہے کیوں کہ وہ سب ابراہیمؑ کو مورث اعلیٰ سمجھتے تھے اس کے علاوہ آیت قرآن نے یہ واضح کیا کہ ملت ابراہیمیؑ کے اصول وہ ہیں جو بالکل انسان کی عقل

عمومی اور فطرت کے مطابق ہیں اس لئے ان سے کوئی شخص اپنی آزاد ضمیر و عقل سے کام لیتے ہوئے روگردانی کر ہی نہیں سکتا اور اگر کوئی اس سے منحرف ہوتا ہے تو وہ حقیقتاً دھوکے میں ہے، نہیں بلکہ اپنے کو عمداً دھوکے میں رکھتا ہے۔ اور اس لئے اس کی جہالت قصوری نہیں بلکہ تقصیری ہے جو بارگاہ الٰہی میں اسے مواخذہ سے بری نہیں کر سکتی۔ پھر آخر میں ملت ابراہیمیؑ کی اس خصوصیت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ دوسرے مذاہب وہ ہوں گے جنہوں نے روحانیت کا معیار دنیاوی زندگی کے تج دینے میں مضمر رکھا ہے مگر اسلامی تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آخرت کے ساتھ دنیا کے بھی آباد اور پر رونق بنانے کا کفیل ہے اور اسی کا نمونہ کامل ابراہیمؑ کی ذات ہے جو دنیاوی نعمتوں سے بھی سرفراز رہے اور آخرت میں بھی بڑے درجہ پر فائز رہے۔

جیسا کہ عبدالماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں! ایک مسیحی مورخ ویورنڈ ولیم ڈین ایم اے نے ایک مستقل سیرت ابراہیمؑ انگریزی میں لکھی ہے جس سے آپ کی دنیوی عروج واقبال پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

''جب ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا: ''سر جھکا دو انہوں نے کہا جھکا دیا سر میں نے تمام جہانوں کے پروردگار کے سامنے۔''

یہ کہنا کوئی لفظی کہنا اور جواب لفظی جواب نہیں ہے بلکہ یہ کہنا وہ مطالبہ فطرت وضمیر ہے جو ہر انسان سے ہے مگر کوئی وہ ہوتا ہے جو اس مطالبہ پر لبیک سے انکار کرتا، کوئی توقف کرتا، کوئی قدرے تامّل کے بعد اسے قبول کرتا ہے، اور ابراہیمؑ کی تعریف یہ ہو رہی ہے کہ انہوں نے اس مطالبہ کے پورا کرنے میں ایک لمحہ کا توقف بھی کبھی نہیں کیا۔ بس جس طرح حکم کن سے اشیاء کے وجود کا ذرہ بھر تخلف نہیں اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (سورۂ یٰسین۔ ۸۲) ویسے ہی سمجھنا چاہیے کہ اس مطالبہ اَسْلِمْ سے اسلام ابراہیمؑ کو ذرہ بھر تاخر نہ تھا۔ اور چوں کہ یہ مطالبہ ہر انسان سے ابتدائے تعقل وشعور سے ہے، اس لئے ماننا پڑے گا کہ ابراہیمؑ کے لئے دور تکلیف میں کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جس میں وہ ذرہ بھر بھی قانون الٰہی سے ہٹے ہوئے ہوں، بلکہ حکم کن کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حکم تکلیفی نہ تھا جو کسی خاص عمر کا پابند ہو بلکہ یہ حکم تکوینی تھا جو مبدأ سے تھا یہ اور بات ہے کہ دور تکلیف آنے کے بعد اُسی نے حکم تکلیفی کی حیثیت حاصل کر لی جس کی وجہ سے اب وہ موردِ مدح وثواب بھی ہو گیا۔ بہر صورت یہ وہ عصمت مطلقہ کی تصدیق ہے جو ابراہیمؑ کی جلالت شان کا بے نظیر ثبوت ہے۔

وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور ابراہیمؑ نے اس کے متعلق وصیت کی اپنے بیٹوں کو اور یعقوبؑ نے بھی اے میرے فرزندو! یقیناً اللہ نے تمہارے لئے یہ مخصوص دین منتخب کر لیا ہے لہٰذا تم مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔''

اولاد ابراہیم علیہ السلام کا دین:

جب کہ ابراہیمؑ دین اسلامی کے پیرو تھے جیسا کہ اس کے پہلے گزر چکا تو ان کی اولاد خواہ وہ اسحٰق علیہ السلام کی نسل سے ہوا اور خواہ اسمعیلؑ کی اسی دین کی پیرو تھی بے شک نسل اسرائیل میں جب موسیٰؑ اولوالعزم اور صاحب شریعت رسول مبعوث ہو گئے تو ان کی طرف منسوب ہو کر دین موسوی اور دین یہود کا تصور الگ قائم ہو گیا اور جب عیسیٰؑ آئے تو ان کی طرف منسوب ہو کر مذہبِ عیسوی اور دین مسیحی کا تخیل جدا قائم ہو گیا مگر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے پہلے اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور ان کی اولاد میں بھی جو دین حقیقی موجود تھا وہ دین اسلام ہی تھا۔ اسی لئے قرآن نے یہود نصاریٰ کے سامنے اس تذکرہ کو چھیڑا ہے کہ تم جو دین موسوی یا عیسوی کے پیرو ہونے کی بناء پر دین اسلام سے وحشت کرتے ہو تو یہ غور کرو کہ تمہارا دین موسوی اور عیسوی تو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سے شروع ہوا ہے مگر وہ دین جو ان کے پہلے خود تمہارے آباؤ اجداد اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کا تھا وہ بھی تو دین اسلام ہی تھا اور یہ آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰؐ اسی دین کے علمبردار ہیں تو تم کو ان سے انحراف و تنفر کا سبب کیا ہو سکتا ہے [1]۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

''تم لوگ اُس وقت کہیں موجود تھے جب یعقوبؑ کی موت کا ہنگام آیا اور انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ، اسمعیلؑ اور اسحٰقؑ کے خدا، معبود واحد کی اور ہم اس کی بارگاہ میں مسلم رہیں گے۔''

اسرائیل جناب یعقوبؑ کا لقب تھا اور ان ہی کی طرف نسبت سے یہود و نصاریٰ بنی اسرائیل کہلاتے ہیں اس لئے ان کا عقیدہ و عمل ان کے سامنے پیش کیا جانا نفسیاتی طور پر ان کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں براہ راست یعقوبؑ کی تعلیم کا بیان ہوا اور ضمناً ان کے پہلے ان کے اسلاف سب کا اعقاد و عمل آ گیا۔

اباء کے اصلی معنی تو باپ دادا کے ہوتے ہیں مگر چوں کہ چچا بھی باپ کا ہم رتبہ ہوتا ہے اس لئے آیت میں اسمعیلؑ کو بھی آباء کے ذیل میں ذکر کر دیا گیا ہے کیوں کہ وہ یعقوبؑ کے والد بزرگوار اسحٰقؑ کے بھائی تھے۔

اس مسلم الثبوت نظیر کے بعد اگر کہا جائے کہ آزر جناب ابراہیمؑ کے باپ نہیں بلکہ چچا کا نام تھا تو اسے نص قرآنی کے مخالف نہیں سمجھا جا سکتا۔

---

[1] ۔ وطی لهذه الكلمة اعنی بالكلمة قوله اسلمت لرب العلمين وهی الاسلام الذی امر به نبيّه وهو اخلاص العبادة التوحيد لله وخضوع القلب والجوارح له (طبری)

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْـَٔلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾

''یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ اس کے لئے وہ ہے جو اس نے کیا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم کرو گے اور جو کچھ کر تے تھے اس کی جواب دہی تم سے نہیں ہوگی۔''

یہود اپنے آباؤ اجداد سے رشتے جوڑ جوڑ کر ہی اپنے کو مطمئن بنا لیتے تھے اور اسی وصف اضافی کو اپنے لئے سرمایہ نجات سمجھتے تھے قرآن نے ان کے بزرگوں کی خدا پرستی کو احوالہ دیتے ہوئے انہیں متنبہ کیا کہ اگر تم نظریہ مسلک اور عمل میں ان سے متحد نہ ہوئے اور تمہارا راستہ ان کے راستے سے مختلف رہا تو تمہارا انتساب ان کی طرف کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ ان کے لئے ان کے اعمال تھے اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔

اسی سے ان مسلمانوں کو بھی سبق لینے کی ضرورت ہے جو صرف بزرگان دین کی طرف انتساب کو ذریعہ نجات خیال کر لیتے ہیں اور ان کے اتباع اور عملی پیروی کی اہمیت کا احساس نہیں کرتے کیوں کہ اصول بہر حال اصول ہے۔ وہ ''من وتو'' کی تفریق کی گنجائش نہیں رکھتا۔ وہ اگر یہود کے لئے تھا تو مسلمانوں کے لئے بھی اسے ماننا لازم ہے۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہے کہ انسان اپنے اچھے اور برے دونوں افعال کا ذمہ دار ہے اور دونوں کا فاعل وہی ہوتا ہے، خدا نہیں۔ کسی کام کے عمل میں لانے ہی کو لفظ کسب سے ادا کیا گیا ہے۔ اس کا کسب کی اس اصطلاح سے کوئی تعلق نہیں جس کے بعض فرق اسلامیہ کے متکلمین نے عقیدہ جبر پر پردہ ڈالنے کے لئے وضع کیا ہے اور خالق کو افعال عباد کا فاعل ماننے کے بعد جس سے کوئی معنی ہی نہیں رہ جاتے وہ ان کی بنائی ہوئی اصطلاح ہے جسے قرآنی استعمال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا عیسائی تو راہ راست پر آ جاؤ گے۔ کہہ دو کہ نہیں بلکہ ہم سچا راستہ دین حق کے پرستار ابراہیمؑ کے مذہب کو سمجھتے ہیں اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔''

''وہ'' کی ضمیر تمام اہل کتاب کی طرف پھرتی ہے اور وہ دو قسم پر تھے ایک یہود اور دوسرے نصاریٰ یہودی کہتے تھے کہ جو مذہب یہود اختیار کر لے وہ راہ راست پر آ جائے گا اور عیسائی کہتے تھے کہ جو عیسائی مذہب اختیار کر لے وہ ہدایت یافتہ ہے قرآن نے دونوں کے مقولہ کو ملا کر بطور اختصار نقل کیا ہے کہ یہ کہتے ہیں یہود یا نصرانی ہو جاؤ حقیقت میں ہر ایک طبقہ ان میں سے ایک ہی کو کہتا تھا یقینی طور پر دونوں کا نام لے کر دعوت کوئی نہیں دیتا تھا[1]۔

---

[1] ۔ یعنی تعالیٰ ذکرہ وقالت الیہود لمحمدﷺ واصحابہ من المؤمنین کونو اھودا تھتدوا وقالت النصاریٰ لھم کونو انصاریٰ تھتدوا (طبری)

قرآن نے ان کے جواب میں اسی لئے یہ کہا ہے کہ تم میں تو پھر بھی اختلاف ہے۔ ایک نقطہ پر تم سب مجتمع نہیں ہو۔ آؤ ہمارے ساتھ مل کر سب اس ملت پر اتفاق کر لو جس کی صحت میں تم سے کسی کو شک نہیں اور وہ ابراہیمؑ کا راستہ ہے جو توحید خالص کے علمبردار تھے۔ رہ گئے تم تو تم نے تو اس میں شرک کی آمیزش کر دی ہے۔ اس وجہ سے اب تمہارا دین صحیح نہیں رہا ہے۔ اس شرک کو چھوڑ کر اصلی توحید جس کے ابراہیمؑ علمبردار تھے وہ دین السلام ہے جس کے آج ہم حامل ہیں۔

آخری فقرہ سے ظاہر ہے کہ چاہیے مشرکین کا لفظ بطور اصطلاح اکثر جگہ قرآن نے اہل کتاب کے بالمقابل استعمال کیا ہو لیکن معنوی طور پر اہل کتاب بھی زمانہ نزول قرآن کے پہلے سے مشرکین کے زمرہ سے الگ نہیں رہے ہیں۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

''کہہ دو کہ ہم تو ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف بھیجا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحٰقؑ یعقوبؑ اور اسباط پر اتارا گیا اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا اور جو دوسرے انبیاء کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور ہم اس کی بارگاہ میں مسلم ہیں۔''

اہل کتاب میں یہود موسیٰؑ کو مانتے تھے اور عیسیٰؑ کے منکر تھے نصاریٰ عیسیٰؑ کو مانتے تھے اور ہمارے رسول حضرت محمد مصطفیٰؐ منکر تھے۔ پھر یہ دونوں ہی فریق متحدہ طور پر نسلی تعصب کی وجہ سے اسحٰقؑ کی تو عظمت کو بہت سراہتے رہتے تھے مگر اسماعیلؑ کو ان کے مقابلہ میں نظر انداز کرتے تھے۔ اس طرح یہ سب انبیاء الٰہی میں تفریق کے جرم کے مرتکب تھے۔ اسلام اگر اپنے پیروؤں کے جذبات کی پیداوار ہوتا تو وہ نفسیاتی طور پر رد عمل کے جذبہ کا شکار ہو کر اس کے برعکس تفریق کا قائل ہو جاتا مثلاً وہ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی عظمت کا منکر ہوتا یا اسمٰعیلؑ کو آگے بڑھا کر اسحٰقؑ سے مغایرت برتتا مگر اسلام تو کسی مخلوق کے ذہن کی پیداوار نہیں۔

وہ خالق کا حقیقی پیام تھا۔ اس لئے اس کی خصوصیت یہ ہوئی کہ وہ رہنمایانِ دین میں سب کی عظمت کا محافظ ہے۔ وہ ان سب پر ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اسماعیلؑ و اسحٰقؑ دونوں ہی کو سچا نبی مانتا ہے اور یعقوبؑ اور اسباط یعنی اولاد یعقوبؑ میں جو انبیاء ہوئے [1]، ان سب پر ایمان کی دعوت دیتا ہے وہ نبی اسماعیلؑ کے ایک رسول کی زبان پر آنے کے ساتھ نبی اسرائیل پر نازل شدہ ہدایت ربانی سے منحرف نہیں ہے بلکہ ان سب پر ایمان رکھتا ہے اس طرح اس کے بالمقابل جو جماعتیں ہیں وہ جزئی حیثیت سے ایمان رکھتی ہیں یعنی بعض پر ایمان کے ساتھ بعض کے کفر کی مرتکب ہیں مگر مسلمان وہ ہیں جو ایمان کلی کے حامل ہیں اور وہ خدا کے کسی پیام اور کسی ہدایت کے منکر نہیں ہیں، چاہے وہ کسی خاندان میں نازل ہوئی ہو بلکہ دنیا کے کسی خطہ میں بھی جو الٰہی پیغام آیا ہو ایک مسلمان اجمالی طور سے اس پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دلائل کی نارسائی سے وہ تفصیلی

---

[1] ۔ھم الا نبیآء من ولد یعقوب (طبری)

طور پر بالتعیین اس کی تصدیق سے قاصر ہو جائے۔ بس یہی اسلامی جماعت کی وہ خصوصیت ہے جسے مذکورہ بالا آیات میں فی الجملہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس میں بنیادی طور پر ایک حقیقت اور بھی محفوظ رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ اس نبی آخر الزماںؐ کی پیش گوئی خود سابقہ کتابوں میں موجود تھی لہٰذا ان کتابوں پر ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ اس پر بھی ایمان لایا جاتا لیکن اگر سابق کتاب میں یہ اعلان ہو گیا ہوتا کہ آئندہ کوئی نبی نہیں ہو گا تو پھر آئندہ مدعی نبوت پر ایمان پہلی کتاب پر ایمان کے منافی ہوتا۔ لہٰذا دونوں پر بوقت واحد ایمان کا امکان ہی نہ ہوتا بلکہ تفریق ہوتا یعنی ایمان بالاول اور کفر بالآخر واجب ولازم ہوتا۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾

''اب اگر یہ لوگ اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو وہ بھی راہ راست پر ہو جائیں گے اور اگر انہوں نے روگردانی اختیار کی تو پھوٹ ڈالنے والے وہی ہیں۔ اس صورت میں اللہ ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور وہ سننے والا اور بڑا جاننے والا ہے۔''

جب یہ بیان ہو چکا کہ تم تو ان سب پر ایمان رکھتے ہو جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ کسی کا انکار نہیں کرتے تو ثابت ہو گیا کہ بنائے مخاصمت تمہاری طرف سے کوئی نہیں ہے۔ نیز یہ کہ جو معیار ہدایت ہے یعنی ایمان اس کے ہر جزء میں تم ان کے ساتھ شریک ہو لہٰذا تمہارے ہدایت یافتہ ہونے میں تو کوئی کلام نہیں مگر وہ ہیں کہ جو اس رسولؐ کی رسالت کو نہیں مانتے تو بنائے مخاصمت جو ہے وہ ان کی طرف سے ہے اور وہ اس پیام ہدایت کا انکار کر کے کفر میں بھی مبتلا ہیں لہٰذا انہیں آپ کی رسالتؐ کو قبول کر کے ہدایت کا راستہ حاصل کرنا چاہیے اور وہ گمراہ بھی ہیں اور تفرقہ اندازی کے بانی بھی۔

آخر میں رسولؐ اور ان کے ساتھ والے مسلمانوں کے لئے تسلی اور بشارت ہے کہ یہ تمہاری جتنی ہی مخالفت کریں تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے کیونکہ تمہارا پشت پناہ اللہ ہے اور وہ تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور اس سے ان کی باتیں اور ان کے کام کوئی پوشیدہ رہنے والے نہیں وہ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے لہٰذا اس کے مقابلہ میں ان کی کامیابی بہر حال غیر ممکن ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

''ہم اللہ کے رنگ پر ہیں اور اللہ سے اچھا کس کا رنگ ہو گا اور ہم اسی کے عبادت گزار ہیں۔''

چوں کہ یہود اور نصاریٰ کے یہاں دین کے اختیار کرنے کے ثبوت میں ایک خاص قسم کے رنگ میں پانی کے ساتھ غسل کا رواج تھا جسے اصطباغ یا تعمید اور بپتسمہ کہا جاتا ہے اس لئے ان کے بالمقابل مسلمانوں کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ تمہیں کسی مصنوعی رنگ کی جو تمہارا ساختہ ہے ضرورت ہو گی مگر ہم جو ہیں تو اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں یعنی اس کے دینِ فطرت کے پیرو ہیں۔ ہمیں کسی ایسے مصنوعی رنگ کی ضرورت

نہیں ہے [1]۔

دین فطرت کو رنگ اس اعتبار سے بھی کہا گیا ہے کہ اس کے آثار و مظاہر ایک مسلمان کی زندگی سے ہویدا ہوتے ہیں اگر وہ سچا مسلمان ہے [2]۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝۱۳۹

''کہو کہ کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں بھی تکرار کرو گے؟ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے تمہارا بھی پروردگار ہے ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں بے شک ہم اس کی خاص عبادت کرنے والے ہیں۔''

اہل کتاب نے اللہ کو مخصوص اپنا بنا لیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اس کے بیٹے اور لاڈلے ہیں اور وہ ہمارا باپ ہے۔ اس کے جواب میں مسلمانوں کو یہ تلقین نہیں کی گئی ہے کہ وہ ان کے مقابلہ میں یہ کہیں کہ نہیں۔ اللہ ہمارا ہے اور کسی کا نہیں ہے۔ اس صورت میں اسلام کے پیام کی ہمہ گیری ختم ہو جاتی نیز احساس فرائض اور اصلاح نفس کے شعور کو نقصان پہنچتا مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ وہ غیر مسلموں کے جواب میں جو صحیح بات ہے وہ کہیں کہ وہ نہ تمہارا مخصوص ہے نہ ہمارا بلکہ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں۔

یہی خالق ہمہ گیری وہ ہے جسے ہر مسلمان کے دماغ میں راسخ کرنے کے لئے سورہ حمد جو ہر نماز میں کم از کم دو مرتبہ ہر مسلمان کو پڑھنا لازم ہے اور چوں کہ کم از کم پانچ نمازیں دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں اوقات مقررہ پر ادا کرنا لازم ہیں اس لئے کم از کم دس مرتبہ اس سورہ کا ہر مسلمان کی زبان پر جاری ہونا ضروری ہے اس میں خالق کو رب العالمین کہہ کر یاد کیا گیا ہے کہ وہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور دوسری جگہ اس کی وسعت ربوبیت کو ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (صٰفّٰت ۵) ''وہ آسمان و زمین کا اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا پروردگار ہے اور تمام مشرقوں کا پروردگار ہے'' اس طرح ان کو ان کی برادری کی وسعت کا بھی احساس پیدا کر دیا گیا ہے کہ جہاں جہاں مخلوق الٰہی ہو چاہیے وہ اس کرہ ارض کے علاوہ دوسرے کرات میں بھی ہو وہ اسی ایک برادری میں داخل ہے جس میں یہ ایک مسلمان مندرج ہے۔ یہ مشترکہ امن و تنظیم اور حقوق عمومی کے احساس کا بھی سنگ بنیاد ہے جس کی تمام عالم انسانی کو ضرورت ہے۔

یہ سبق ہمیشہ یاد رکھنے کا تھا اور آج جب کہ دنیا امن و سکون اور عالمی احساس تنظیم کے لئے تڑپ رہی ہے تو اسے یہی سبق یاد کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا جز ''ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال'' یہ ہر مسلمان بلکہ ہر فرد انسان کو اپنی جگہ یاد رکھنے کا ہے کیوں کہ ہر شخص کو دوسرے پر نکتہ چینی میں جو مزہ ملتا ہے وہ اپنے اوپر نظر ڈالنے سے مانع ہوتا ہے اور اسلام غیر کے اعمال پر نظر سے زیادہ محاسبہ نفس کو

---

[1] ۔ فسّرھا الصادق علیہ السلام بالاسلام کما فی الکافی ورواہ الیماشی (صافی)

[2] ۔ سمّیت صبغۃ باعتبار الاثر الکریم الظاھر من التوحید ومکارم الاخلاق وزینۃ الشریعۃ (بلاغی)

اہمیت دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ تم غیر کے پہلے خود اپنے کو دیکھو کہ تم کیا ہو اور تم میں کیا برائیاں موجود ہیں یہ بات ہو جائے تو ہر انسان کے لئے خود اپنی عملی اصلاح کا دروازہ کھل جائے اور باہمی تصادمات کا ممکن درجہ تک سد باب ہو جائے مگر افسوس یہ ہے کہ غیر تو کیا خود مسلمانوں نے بھی اس تعلیم کو بہت کم سمجھا ہے یا سمجھا بھی تھا تو بہت کم یاد رکھا ہے۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

''کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور اسباط یہودی یا عیسائی تھے؟ ان سے کہنا چاہیے کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ! اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا کہ جو کسی گواہی کو جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے ہے پوشیدہ کرے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔''

ابراہیمؑ، اسحاقؑ، اور یعقوبؑ کا دین کیا تھا؟ یہود و نصاریٰ کے لئے لمحۂ فکریہ:

حقیقت امر سابق میں بیان کر دینے کے بعد کہ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ اور یعقوبؑ یہ سب افراد جو یہود و نصاریٰ سب کے مشترکہ حیثیت سے قابل احترام اور لائق تقلید اسلاف ہیں صرف ایک دین کے پیرو تھے۔ اور وہ دین اسلام ہے جسے حضرت محمد مصطفیٰؐ دنیا میں پیش فرما رہے ہیں۔ دینِ یہود اور دینِ نصاریٰ دونوں اس کے بالمقابل حادث حیثیت رکھتے تھے اور دین اسلام کے اصول ان دونوں مذہبوں کے اصلی اصول پر جامع وحاوی ہیں۔ لہٰذا یہود اور نصاریٰ کے کسی گروہ کو بھی اسلام سے منحرف یا اس پر معترض ہونا کسی صورت سے بھی جائز نہیں ہے۔ اس حقیقت کے پیش ہونے کے بعد اب ان جماعتوں سے براہ راست تخاطب کر کے انہیں ان کے رویہ پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ اپنی جگہ خود غور کریں کہ ان کی یہودیت یا نصرانیت کیا ان کے اسلاف کا دین قرار پا سکتی ہے بلکہ اس کی ابتدا ہی ان کے بعد ہوئی ہے۔

اس ذیل میں خود ان کی سابقہ کتب کے آسمانی تصریحات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ تم آج اپنی زبان سے جو چاہو کہو مگر تمہیں خود معلوم ہوگا کہ تمہاری کتابوں سے جنہیں تم اللہ کی طرف نسبت دیتے ہو صاف ظاہر ہے کہ وہ بزرگ سب توحید حقیقی کے پرستار تھے ایسی صورت میں تم خود اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تمہاری یہ بات صحیح سمجھی جائے یا اللہ کی بات جو آسمانی صحیفوں میں مذکور ہے۔ یہ قرآن کریم کا وہ انداز احتجاج وہ استدلال ہے جو ہر منکر کو خود اس کے ضمیر سے شرمندہ بنا دینے کا سبب ہے یہ اور بات ہے کہ وہ عناد سے کام لے اور اس کے تسلیم کرنے سے انحراف کرے۔

آخری فقرہ اہل کتاب کی جماعت میں جو علماء تھے ان کے اس کرتوت کے راز کو فاش کرنے اور ان کے ضمیر پر تازیانہ لگانے کے

لئے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی کتابوں کے ان فقروں کو جن میں اس حقیقت کا اظہار ہے [1] اور پیغمبر آخر الزماںؐ کے آنے کی بشارت ہے [2] اپنے عوام سے مخفی رکھنا چاہتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ انہیں اس کا پتہ نہ لگنے پائے۔

اس ذیل میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ ایک ظلم ہے اور بہت بڑا ظلم، اپنے اوپر بھی ظلم حقیقت وہ انصاف پر بھی ظلم، خود اپنے اسلاف پر بھی ظلم اور اپنی جماعت کے عوام پر بھی ظلم کہ ان کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر انہیں صراط مستقیم کے فیوض سے محروم رکھا جاتا ہے۔

سب کے بعد اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا حوالہ دے کر اندازہ کیا گیا ہے کہ آج جو چاہو کر لو۔ اللہ تمھارے اعمال سے واقف ہے اور اس کے یہاں کی جواب دہی کے لئے تمہیں منتظر اور تیار رہنا چاہیے۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾

''اور یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، اس کے لئے وہ ہے جو اس نے کیا اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم کرو گے اور وہ جو کچھ کرتے تھے اس کی جواب دہی تم سے نہیں ہوگی۔''

یہ آیت بعینہٖ ان ہی الفاظ میں تھوڑی دور پہلے گزر چکی ہے ایک دفعہ پھر اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تمہارا نسبی انتساب ان کی طرف تمہاری نجات کے لئے کافی نہیں ہے جب تک کہ تم عقائد و اعمال میں ان کے سات متحد نہ ہو۔

بعض نے کہا ہے کہ وہ خطاب بنی اسرائیل سے تھا اور یہ خطاب مسلمانوں سے ہے کہ تمہیں بھی صرف ان اسلاف کے مجاہدات اور توحید کی راہ میں ان کے مساعی کو پیش کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ خود بھی ان کی پیروی کرنا لازم ہے [3]۔

(تمام شدہ پارہ اول تفسیر قرآن علی نقی النقوی ۱۳ صفر ۱۳۷۵ھ)

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُل لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٤٢﴾

---

[1] ۔ یقول وایّ امرئ اظلم منهم وقد کتموا شهادة عندهم من الله بأن ابراهیم علیہ السلام واسمٰعیل علیہ السلام واسحٰق علیہ السلام ویعقوب علیہ السلام والاسباط علیہ السلام کانوا مسلمین فکتموا ذٰلك ونحلوهم الیهودیة والنصرانیّة (طبری)

[2] ۔ فی اطلاق الشهادة مع ان للراد بها ما ذکر من الشهادة المعیّنة تعریض بکتمانهم شهادة الله عز وجل للنبی ﷺ فی التورٰة والانجیل (ابوالسعید)

[3] ۔ تکریم للمبالغة فالزّجر عمّا هم علیه من الافتخار بالآباء والاتکال علی اعمالهم وقیل الخطاب السابق لهم وهٰذا لنا تحذیرا عن الاقتداء بهم (ابوالسعید)

''بہت جلد بے وقوف لوگ یہ کہیں گے کہ کس چیز نے ان لوگوں کو پھیر دیا ان کے اس قبلہ سے جس پر وہ تھے۔ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی کا ہے مشرف بھی اور مغرب بھی جسے وہ چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔''

تبدیلی قبلہ:

استقبال کے معنی عربی میں ہیں کسی شے کی طرف رخ کرنا اور قبلہ وہ شے جس کی طرف رخ کیا جائے اصطلاح شرع میں قبلہ اس کو کہتے ہیں جس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے۔

اس آیت سے آغاز ہوتا ہے تحویل قبلہ کے ذکر کا۔ اجمالی طور پر قرآن مجید سے اتنا تو پتہ چلتا ہی ہے کہ قبلہ پہلے کچھ اور تھا اور اس کے بعد کچھ اور ہو گیا حدیث تاریخ اور تفسیر سب سے اس کی تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائے اسلام میں قبلہ بیت المقدس تھا اور اس کے بعد کعبہ ہو گیا۔

اہل سنت کے صحاح ستہ اور شیعوں کے کتب اربعہ میں کثیر التعداد طرق سے اس کا ذکر موجود ہے اور یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ مسجد قباء میں لوگ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے، جب ایک شخص نے آ کر اطلاع دی کہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم آ گیا ہے۔ یہ سن کر حالت نماز ہی میں شام سے مکہ کی طرف منہ پھیر لیا گیا۔

علی بن ابراہیمؒ کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد بنی سالم میں نماز پڑھا رہے تھے دو رکعتیں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ہوئی تھیں کہ تبدیل قبلہ کا حکم نازل ہوا اور حضرت نے باقی دو رکعتیں کعبہ کی طرف متوجہ ہو کر پڑھیں۔

مدینہ میں آنے کے بعد کتنے عرصے تک حضرتؐ نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی اس میں بے شک اختلاف ہے۔ شیخ الطائفہ کی کتاب تہذیب میں امام جعفر صادقؑ کی زبانی ہے کہ جنگ بدر سے واپسی تک حضرتؐ نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ہے۔ ایسا ہی رسالہ فضل بن شاذان میں ہے اور ابن عباس کی روایت بھی اس کے موافق ہے۔ نیز اس میں یہ ہے کہ آپ نے مدینہ میں آنے کے بعد سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی۔ براہ بن عاذب نے سولہ یا سترہ مہینے کہے ہیں۔ قرب الاسناد میں امام محمد باقرؑ کی زبانی ۱۹ مہینے لکھے ہیں یہی صدوق کی من لایحضرہ الفقیہ میں بھی ہے اور علی بن ابراہیم نے جو امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث نقل کی ہے اس میں سات ۷ مہینے کا ذکر ہے شیخ مفیدؒ نے مسار الشیعہ میں معیّنطور پر بتایا ہے کہ تحویل قبلہ ۱۵ رجب سنہ ۲ ہجری میں ہوئی ہے۔ سیوطی نے درمنثور میں اس کی موافقت کی ہے۔

بہر حال اس مدت کے اختلاف سے تبدیلی قبلہ کے اصل واقعہ کی قطعیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مکہ بزمانۂ قیام سمت قبلہ:

رہ گیا یہ سوال کہ جب حضرت مکہ میں تھے تو کس طرف نماز پڑھتے تھے، اس کے متعلق احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت آپ کعبہ کے سامنے اس طرح نماز پڑھتے تھے کہ بیت المقدس کی طرف بھی رخ رہتا تھا۔ یہ صورت مدینہ میں آ کر پیش آئی کہ بیت المقدس اور کعبہ کی سمتیں

الگ الگ ہوگئیں [1]۔

قرآن مجید کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ کا عمل باوجود یہ کہ بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا تھا۔ مگر آپ کا دل یہ چاہتا تھا کہ کعبہ قبلہ ہوتا پھر بھی آپ نے دل کی خواہش کے مطابق اس وقت تک عمل نہیں کیا جب تک وحی الٰہی صراحۃً اس کے مطابق نازل نہ ہوگی یوں بہ حیثیت بشر کسی خواہش کا ہونا شان رسالت کے خلاف نہیں ہے۔ بے شک عصمت کا تقاضا یہ ہے کہ عمل حکم الٰہی کے بغیر خواہش کی بناء پر نہ ہو۔ وہ اس واقعہ میں محفوظ ہے۔

مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ نے یہ بات ٹھیک کہی ہے کہ:

''معلوم ہوتا ہے کہ وحی الٰہی کا سرچشمہ نبی صلعم کا اپنا قلب نہ تھا ورنہ سولہ سترہ ماہ تک آپ کا دل تو یہ چاہے کہ خانہ کعبہ قبلہ ہو مگر وحی نازل نہ ہو یہ بے معنی بات ہے۔''

مگر اس کے ساتھ ان کو یہ بھی کہہ دینا چاہے تھا کہ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ رسولؐ کے عمل کی بھی بنیاد آپ کی قلبی خواہش پر نہیں ہوتی تھی ورنہ آپ سولہ سترہ ماہ اپنی خواہش کے خلاف عمل جاری نہ رکھتے اور وحی کا انتظار نہ فرماتے۔

بے شک قبلہ کی اس طرح تبدیلی دوسروں کے لئے چہ مگوئیوں کا مرکز ضرور بن گئی، اس لئے کہ احکام الٰہیہ میں تغیر و تبدل بہت سے لوگوں کے ذہن میں آج تک نہیں آیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تبدیلی پیشمانی کا نتیجہ ہوتی ہے اور اللہ عالم الغیب ہے اس کے یہاں پشیمانی کا کوئی سوال نہیں۔ پھر اس کے احکام میں تبدیلی کیوں ہو۔ اسی لئے یہود و نصاریٰ نسخ کے آج تک منکر ہیں [2] اور مسلمانوں کا ایک طبقہ بداء کا اسی لئے منکر ہے مگر احکام الٰہی خواہ تشریح سے متعلق ہوں جن کے بدلنے کا نام نسخ ہوتا ہے اور خواہ تقدیر سے جن کے بدلنے کا نام بداء ہوتا ہے پشیمانی کی بناء پر تبدیل نہیں ہوتے بلکہ حکمت و مصلحت کے بدلنے سے بدلتے ہیں [3] اور یہ تبدیلی علم و حکمت کے خلاف نہیں بلکہ عین اس کا مقتضا ہے۔

یہی چیز ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی جنہیں قرآن نے سفھاء کے نام سے یاد کیا ہے وہ کہتے تھے کہ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ آخر کس لئے یہ اس قبلہ سے جس پر تھے دوسری طرف پھر گئے؟

بعض لوگ کانوا علیہا کی ضمیر کو سابق انبیاء کی طرف راجع کرتے ہیں، یعنی جس قبلہ پر اور انبیاء تھے اس سے ہٹ کر یہ دوسری طرف کیوں رخ کرتے ہیں۔ اس صورت میں یہ الفاظ حضرت پیغمبر خداؐ اور مسلمانوں کے عمل میں کسی تبدیلی کا ثبوت نہ ہوں گے مگر خود قرآن مجید کی

---

[1] ۔لما کان رسول اللہ ﷺ بمکۃ امر اللہ عزّ و جل ان یتوجہ نحو بیت المقدس فی صلوتہ و یجعل الکعبۃ بینہ و بینہا اذا امکن و اذا لم یمکن استقبل بیت المقدس (صافی) فی الکافی فی الحسن کالصحیح عن الحلبی عن ابی عبداللہ سالتہ ھل کان رسول اللہ ﷺ یصلّی الی بیت المقدس قال نعم فقلت اکان یجعل الکعبۃ خلف ظھرہ قال امّا اذا کان بمکۃ فلا و امّا اذا ھاجر الی المدینۃ فنعم حتّٰی تحوّل الی الکعبۃ.(البلاغی)

[2] ۔ گو کہ اُن کی توراۃ اور انجیل میں نسخ موجود ہے جیسا کہ صولت علویہ و عماد الدین وغیرہ میں مفصل لکھا گیا ہے (تاج العلماء)

[3] ۔ مثلاً جاڑے میں لحاف اوڑھنے کا حکم دیا گیا، پھر گرمی میں خود وہ حکم منسوخ کر دیا گیا اس لحاظ سے کہ مصلحت بدل گئی اور سردی نہ رہی (تاج العلماء)

اس کے بعد کی آیت میں صاف رسولؐ کو مخاطب بنا کر کہا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ.

''اور ہم نے وہ قبلہ جس پر آپ تھے صرف اس لئے رکھا تھا کہ پتہ چلے کہ کون پیغمبر کی پیروی کرتا ہے اور کون پچھلے پیروں پلٹتا ہے۔''

اس سے یہ حقیقت بالکل نمایاں ہے کہ خود پیغمبر خداؐ اس کے پہلے اور قبلہ کی طرف رخ کرتے تھے اور اب آپ کا عمل اس سے مختلف ہے۔ اس صورت میں وما لھم عن قبلتھم کی ضمیروں میں دورنگی پیدا کرنا کہ ولھم کی ضمیر مسلمانوں کی طرف راجع ہو اور اس کے بعد قبلتھم کی ضمیر سابق کے انبیاء کی طرف راجع کی جائے بالکل بے نتیجہ اور بے سبب ہے۔

سمت میں ذاتی تقدس نہیں:

ان کے مستعجبانہ سوال کا کہ آخر اس قبلہ کو چھوڑ کر دوسری طرف رخ کرنے کا انہیں کیا داعی ہوا' جواب یہ دیا جا رہا ہے کہ ''مشرق اور مغرب دونوں اللہ کے ہیں'' اس میں مشرق اور مغرب کا ذکر تو اس لحاظ سے ہے کہ یہ دونوں سمتیں بہت نمایاں طور پر باہم دگر مقابل ہیں[1]۔

اصل مطلب یہ ہے کہ اگر سمت میں کوئی ذاتی تقدس ہوتا تو بے شک جس طرف اتنی مدت تک رخ کر کے عبادت کرتے رہے اس سے روگردانی ناروا ہوتی مگر درحقیقت سمت میں کوئی ذاتی عظمت نہیں ہے[2]۔ اصل تو اللہ کا حکم ہے اور ایک سمت کا معینّ کر دینا نماز کے لئے صرف افراد میں ہم آہنگی اور یک جہتی کے مظاہرہ کی ایک صورت ہے' اس لئے جب تک اس نے چاہا ایک طرف رخ کرنے کو کہا اور جب چاہا دوسری طرف اور یہ قبلہ کے ایک دم بدل دینے کا ایک بڑا فائدہ اسی سمت پرستی کے تصور کو ختم کرنا ہے اور اسی بناء پر آخر میں کہا جا رہا ہے کہ ''اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست کی ہدایت کرتا ہے۔'' اس کا یہ مطلب نہیں اس قبلہ کی طرف رخ کرنا راہ راست نہ تھا۔ اگر وہ راہ راست نہ ہوتا تو اتنی مدت تک اس کے پہلے رسولؐ اور وہ بھی خداوند عالم کی ہدایت سے اس قبلہ کی طرف رخ کئے کیوں رہتے بلکہ مقصود یہ ہے کہ قبلہ کی طرف رخ کرنے میں سمت پرستی کی ذہنیت اگر شریک ہوگئی تو آدمی صراط مستقیم سے منحرف ہوگیا۔ خالق سمت قبلہ کی اس تبدیلی سے مسلمانوں کو سمت پرستی کے تصور سے الگ اور خدا پرستی کے صحیح راستے پر قائم رہنے کا سامان کر رہا ہے[3]۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى

---

[1] ۔ المشرق والمغرب ای الجهات کلها (جلالین) ای جمیع الجهات فان تحویل القبلة کان من ناحیة الشمال الغربی الیٰ تقطة الجنوب تقریبا (البلاغی)

[2] ۔ لا یختص به مکان دون مکان لخاصیة ذاتیة یمتنع اقامة غیره مقامه وانّما العبرة بار تسام امره لا بخصوص المکان (بیضاوی)

[3] ۔ صراط مستقیم وهو ما یقتضیه الحکمة والمصلحة من التوجه الیٰ بیت المقدس تارة والی الکعبة اخریٰ (صافی)

الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچوں بیچ والا گروہ بنایا ہے تا کہ تم گواہ ہو لوگوں پر اور پیغمبر گواہ ہوں تم پر اور نہیں قرار دیا تھا ہم نے اس قبلہ کو جس پر آپ تھے مگر اس لئے کہ ہم جان لیں کون پیغمبر کی پیروی کرنے والا ہے اور کون الٹے پاؤں واپس جاتا ہے۔ اگر چہ وہ سوا ان لوگوں کے جنہیں اللہ کی خاص ہدایت شامل حال ہے (اور سب پر) بہت گراں تھا اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ تمہارے ایمان کو اکارت کر دے۔ بے شک اللہ لوگوں پر مہربان ہے بڑا رحمت والا۔''

اس آیت کے متعدد ٹکڑے ہیں اور ہر ٹکڑا ایک خاص مضمون کا حامل ہے۔

پہلا ٹکڑا امتِ وسط

اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچوں بیچ والا گروہ بنایا ہے۔ ''بیچوں بیچ کا مطلب ہے معتدل و متوازن گروہ جس کے اعمال میں نہ افراط ہے نہ تفریط''[1] ''او اسی طرح'' یعنی جس طرح ہم نے تمہیں سمت پرستی کے توہمات سے الگ کر کے دوسروں کی مماثلت سے آزاد مستقل قبلہ کی طرف رخ کرنے پر مامور کیا[2] اسی طرح ہم نے تمہیں سیرت میں ایک مثالی حیثیت عطا کی ہے۔ ''تا کہ تم گواہ ہو لوگوں پر'' گواہ یعنی وہ نمونہ کامل جو معیاری ہونے کی بنا پر دوسروں کے نقص و کمال کے درجہ کا اظہار کر دے۔

چوں کہ پہلا قبلہ وہ تھا جس کی طرف یہود رخ کرتے تھے اور اب قبلہ کی تبدیلی سے انہیں ناگواری یہ تھی کہ ہماری پیروی چھوڑ کر انہوں نے اپنا قبلہ الگ کیوں بنالیا تو اس کا جواب میں یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ امت دنیا میں دوسروں کی پیروی کے لئے نہیں آئی ہے۔ اگر پیروی ہی کرانا ہوتی تو نئے رسول مستقل شریعت اور منفرد کتاب کی ضرورت ہی کیا تھی اور پھر رسول بھی وہ جو خاتم الانبیاءؐ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اسی سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس تعلیم کے سانچے میں ڈھلنے والا گروہ دوسروں کی پیروی کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ وہ تو اس لئے ہے کہ تمام خلائق کیلئے انسان رفعت کا مثالیہ قائم کر کے ان سے اپنی پیروی کرائے۔ اس کی پیروی کا مرکز اگر کوئی ہے تو بس یہ رسولؐ ہے جو اس کے لئے نمونہ بنا کر پیش کیا گیا ہے اور اعلان کر دیا گیا ہے کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران۔۳۱) اور اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظی طور پر امت محمد مصطفیٰؐ میں اپنے کو محسوب کر لینا خلق خدا کے لئے مثال بننے کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ خلائق کے لئے مثال وہی افراد بن سکتے ہیں جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ۔ الوسط خیاع لشئی لانّه محمی عن الفساد وفی تفسیر القمی وسطا ای عدلا وهو المروّی فی روایات الجمهور کما فی الدّرّ المنثور (البلاغی) وسطا خیارا عدولا (جلالین)

[2] ۔ کذٰلك اشارة الیٰ مفهوم الا یة المتقدمة ای کما جعلنا کم مهدیین الیٰ صراط المستقیم او جعلنا قبلتکم افضل القبل (بیضاوی)

کے اتباع کامل کا نمونہ ہوں اور ان میں بھی فرد اکمل وہ ہستیاں ہوں گی جن میں صفات محمدیؐ کا انعکاس اس درجۂ اتم پر ہو کہ وہ ''انفسنا'' کا مصداق بن جائیں اور اسی بناء پر تفاسیر اہل بیتؑ میں وارد ہوا ہے کہ امة وسطا کی مکمل تعبیر ائمۃ وسطا ہے یعنی وہ معصوم ہستیاں جو بعد رسولؐ امامت خلائق کا منجانب اللہ استحقاق رکھتی تھیں [1]۔اس سے جس طرح ائمہ کی بلندی عامہ افراد امت کے مقابلہ میں ظاہر ہوتی ہے اسی طرح تمام ائمہ میں پیغمبر خدا کی رفعت بھی نمایاں ہے جو ان افراد کے لئے سُرمہ چشم ہے جو رسولؐ اور ائمہ اہل بیت میں مساوات مطلق کے حامی ہیں۔

شہداء علی الخلق اور ان کے مراتب:

اس کے ساتھ جب ایک دوسری آیت پر نظر ڈالی جاتی ہے کہ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا (نساء۔۴۱) وہ وقت بھی کیا ہوگا کہ جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو سامنے لائینگے اور آپ (اے رسولؐ) ان گواہوں کے لئے گواہ ہوں گے'' اس کی تشریح پر غور کیا جاتا ہے کہ ہر امت کا گواہ اس کا نبی اور رسول ہوگا اور ان گواہوں کے گواہ ہمارے رسولؐ ہوں گے تو ان دونوں آیتوں سے مل کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک سلسلہ شہداء کا موجودہ امت محمدیہ کے پہلے ہے اور وہ انبیا و مرسلین کا ہے اور ایک سلسلہ شہداء کا اس امت میں ہے اور وہ ائمہ معصومینؑ کا ہے اور ذات ختمی مرتبتؐ اس پہلے سلسلہ پر بھی رقیب و شہید کی حیثیت رکھتی ہے اور دوسرے سلسلہ پر بھی اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی ذات اقدس اولین پر حجت خدا ہے اور آخرین پر بھی اور یہ دوسرا سلسلہ موازی اس پہلے سلسلہ کا ہے لہٰذا اس سلسلہ کے افراد پر پہلے سلسلہ کی کڑیوں کو کوئی مزیت و رفعت از روئے قرآن ثابت نہیں ہوتی اور جب کہ معیار کمال اس سلسلہ کے افراد کا وہی ہے جو انبیائے سلف کے لئے قرآن نے بیان کیا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے نمونہ ہیں اور پہلے انبیاء میں باعتبار مراتب ایک دوسرے پر فضیلت نا قابل انکار ہے تو اگر شخصی مراتب کے لحاظ سے اس دوسرے سلسلہ کے افراد پہلے سلسلہ کے اشخاص سے بلندی بھی رکھتے ہوں تو اس میں بر بنائے قرآن گنجائش انکار و استبعاد نہیں ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو خود معیار شہادت ہی سے اس سلسلہ کی رفعت یہ نسبت پہلے سلسلہ کے ثابت ہے کیوں کہ پہلے سلسلہ کا ہر فرد کسی ایک دور کی امت پر گواہ تھی جو من کل امة بشهيد کے الفاظ سے ظاہر ہے اور یہ سلسلہ جو ''امت وسط'' اور ''ائمہ وسط'' کا ہے تمام خلق پر بلا استثناء شہید ہے جو الناس کے اسم جمع و لام استغراق سے ظاہر ہے اس لئے کوئی تعجب نہ کرنا چاہیے کہ شہداء اولین میں کوئی فرد اگر اس ''امتہ وسط'' میں کی کسی شخصیت کے سامنے آجائے تو اس کو بحکم الٰہی ماموم بننا پڑے اور اس امتہ وسط کی نمائندہ ذات امام قرار پائے جس کی طرف صحیح بخاری اور مسلم کی حدیث میں اشارہ پایا جاتا ہے، كيف بكم اذانزل عيسىٰ بن مريم و اما مكم منكم ۔ یہ امامت اسی خصوصی رفعت کا ایک مظاہرہ ہے جسے شهدآء علی الناس کی لفظوں میں آیت نے ثابت کیا ہے۔

دوسرا ٹکڑا پہلا قبلہ بھی خالق کا مقرر کردہ تھا

اتنے عرصے جو بیت المقدس کی طرف نماز ہوتی رہی وہ کیوں؟ ارشاد ہوتا ہے ''ہم نے اس قبلہ کو جس پر آپ تھے صرف اس لئے بنایا تھا

---

[1] ۔ امة القلمى يعنى الائمة. اقول والخطاب للمعصومين خاصة (صافی) ''وسط بمعنی عادل اس لیے کہ عدالت وسط کا درجہ ہے جیسا علم اخلاق میں ثابت ہوا ہے اور باتفاق عقلاً عدالت جامع جمیع سفات کمالیّہ اور حاوی کل مکارم اخلاق ہے تو اس ایک صفت کا ثابت کرنا مستلزم ان سب کے ثبوت ہے اور جب کہ عالم الغیب سے صادر ہے تو ظاہر باطن دونوں کو شامل ہے پس یہ ممدوح معصوم ہوئے جو کبھی بدی کرتے ہی نہیں (تاج العلماء)

کہ پتا چلے کون رسول کی پیروی کرتے ہیں اور کون نہیں۔'' قرآن صاف اس پہلے قبلہ کے لئے ''ہم نے قرار دیا تھا'' کہہ رہا ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ وہ پہلا قبلہ بھی خالق کا مقرر کردہ تھا اور وہ رسولؐ کا عمل بطورِ خود نہیں بلکہ بوحی الٰہی تھا[1]۔

اس صورت میں یہ کہنا:۔

''اللہ نے بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم نہ دیا تھا، نہ ایسی کوئی وحی قرآن ہی میں موجود ہے' نہ کسی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی طرف آپ نے وحی الٰہی کے حکم سے منہ کیا ہو (بیان القرآن محمد علی صاحب لاہوری)

مضحکہ خیز ہے۔دیکھئے مشرکین کا اعتراض یہی تھا کہ اللہ کے احکام میں تبدیلی کے کیا معنی! اگر واقعہ یہ ہوتا کہ اس کے پہلے پیغمبر خداً بطورِ خود (معاذ اللہ) یہود کی دیکھا دیکھی بیت المقدس کی طرف رخ کرنے لگے تھے' اور اب خالق نے آپ کو اس سے ہٹا کر کعبہ کی طرف رخ کرنے کی ہدایت کی تو مشرکین کے اعتراض کا صاف جواب یہ تھا کہ اب تک جو ہو رہا ہے وہ بغیر کسی ہدایت ربانی کے تھا اور اب خالق کی ہدایت مجھے یہ ہوئی ہے اس سے تمام اعتراض ختم ہو جاتا۔مگر خدا تعالیٰ تو یہ جواب دینا اپنے حبیب کی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔وہ رسولؐ کے اس عمل کی پوری ذمہ داری خود لیتا ہے اور اسی لئے اس کی توجیہ کرتا اور اس کے حکیمانہ مصالح کا پتہ دیتا ہے اور رسولؐ کے یہ ''لائق امتی'' ایسے ہیں کہ وہ اسے رسولؐ کا ذاتی عمل کہہ کر اللہ سے اس کی ذمہ داری ہٹانا چاہتے ہیں۔

رہ گیا یہ کہ قرآن میں وہ وحی درج نہیں ہے' تو یہ واقعہ ہے اور خود یہ آیت اور اس کے علاوہ متعدد دسری آیتیں اس کا ثبوت ہیں کہ اکثر وحی ایسی ہے جو قرآن میں موجود نہیں ہے۔اس کا مظہر صرف پیغمبر خداً کا عمل ہوا ہے اور اسی لئے قانونِ الٰہی کے سرچشمہ کے طور پر کتاب کے ساتھ سنت کو ماننا لازم ہے اور حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ غلط ہے۔

اچھا تو پھر اللہ نے وہ قبلہ کیوں قرار دیا تھا؟ صرف اس لئے کہ معلوم ہو جائے کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون رد گردان ہوتا ہے۔

ہوا کے رخ پر اڑنے والے لیڈر تو ماحول کے رخ پر چلا کرتے ہیں مگر مصلح کو ماحول سازی کا فریضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔مکہ معظّمہ میں مشرکین عرب کعبہ کو تقدس کا مرکز مانتے تھے، وہاں قبلہ بیت المقدس رہا[2] اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ ''اگر چہ وہ ان لوگوں کے سوا جنہیں اللہ کی مخصوص ہدایت شامل حال تھی (اور سب پر) بہت گراں تھا''[3] اور اب مدینہ کا با اقتدار گروہ یہود بیت المقدس کے تقدس کا قائل ہے تو یہاں کعبہ قبلہ بنایا جا رہا ہے، صرف اس لئے کہ دیکھنا ہے کون ماحول کے بندے ہیں اور کون اللہ کے بندے۔اگر پیغمبرؐ کی تعلیم بھی وہی ہو جو زمانہ والوں کی

---

[1] ۔وھو الظاھر ایضا من معتبرۃ التھذیب عن ابی بصیر عن احدھما علیھما السّلام قال قلت لہ امرہ ان یّصلی الیٰ بیت المقدس قال نعم الا ترٰی ان اللہ تعالیٰ یقول وما جعلنا القبلۃ وتلا جمیع الاٰیۃ (البلاغی)

[2] ۔ عن النعمانی باسنادہ عن امیر المؤمنین علیہ السلام ان رسول اللہ ﷺ کان یصلی فی اول مبعثہ الیٰ بیت المقدس جمیع ایام قیامہ بمکۃ (الروایۃ) وفی الفقیہ وصلی رسول اللہ الیٰ بیت المقدس بعد النبوّۃ ثلث عشرۃ سنۃ وتسعۃ عشر شھرا بالمدینۃ وفی الدّر المنثور اخرج الطبرانی عن عثمان بن حنیف وفی الحدیث کان رسول اللہ ﷺ قبل ان یقدم من مکۃ والقبلۃ الیٰ بیت المقدس (البلاغی)

[3] ۔ ظاھر السوق یقتضی ان الضمیر فی کانت یرجع الی القبلۃ الّتی کان علیھا وھی بیت المقدس (البلاغی)

خواہشوں کا مقتضا ہے تو اتباعِ رسولؐ کرنے والوں کا جوہر ہی کہاں نمایاں ہو!

اس میں خاص لفظ قابلِ تشریح یہ ہے کہ امتحان کا نتیجہ سامنے آنے کو یوں کہا گیا ہے کہ ''ہمیں معلوم ہو'' اور ایسی ہی تعبیر قرآنِ مجید میں دوسرے متعدد مقامات پر بھی آئی ہے جیسے:

وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ (آل عمران۔۱۶۶.۱۶۷)

اور تا کہ اسے علم ہو ایمان والوں کا اور اسے علم ہو ان کا جنہوں نے نفاق اختیار کیا۔

لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ (مائدہ۔۹۴)

تا کہ اللہ کو علم ہو اس شخص کا جو غائبانہ اس کا خوف محسوس کرتا ہے

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ (توبہ۔۱۶)

کیا تم سمجھتے ہو کہ چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی تک اللہ کو علم نہیں ہوا تم میں سے ان کا جنہوں نے جہاد کیا۔

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا (نور۔۶۳)

اللہ جانتا ہے انہیں جو تم میں سے پناہ لینے کے لئے کھسکتے رہتے ہیں۔

لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (حدید۔۲۵)

تا کہ اللہ کو معلوم ہو کہ کون اس کی مدد کرتا ہے۔

لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى (کہف۔۱۲)

تا کہ ہم جانیں کہ دونوں گروہوں میں سے کون زیادہ حاوی ہے۔

لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ (سباء۔۲۱)

تا کہ ہمیں معلوم ہو کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس بارے میں شک رکھتا ہے۔

لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ (محمد۔۳۱)

اور ضرور ضرور ہم تمہاری آزمایش کریں گے یہاں تک کہ جان لیں تم میں جہاد کرنے والوں اور صبر کا جوہر رکھنے والوں کو۔

حالانکہ اللہ کو علم پہلے سے ہوتا ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کا علم اگرچہ باعتبار وقت واقعہ کے وقوع پر مرتب نہیں ہوتا مگر ذاتاً ہوتا ہے بر بنائے واقعہ ہی کیوں کہ علم کے معنی ہی ہیں کسی واقعہ کو جاننا۔

اب اگر متبع اور غیر متبع کی تفریق کا کوئی سامان نہ ہوا تو یہ افتراق و امتیاز وقوع ہی میں نہ آئے گا لہٰذا اللہ کو اس کا علم بھی کیوں ہوگا۔ پھر یہ کہ یہ تعلق علم کا قبل میں بحیثیت وقوع آیندہ ہے کہ ایسا ہوگا اور اس کا تعلق باعتبار وقوع حالی و استقبالی اس کے وجود حالی و استقبالی سے وابستہ ہوگا ورنہ خلاف واقعہ قرار پائے گا لہٰذا علم نہیں بلکہ معاذ اللہ جہل ہوگا [1]۔

اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ علم الٰہی حوادث کا سبب نہیں ہوتا بلکہ حقیقتاً ایک طرح سے ان کا نتیجہ ہوتا ہے، اور اسی لئے افعال انسانی کے

---

[1]۔ فی الاحتجاج عنه یعنی الا لنعلم ذٰلك منه وجودا بعد ان علمنا انه سیوجد (صافی)

متعلق اس کا علم جبر کا موجب نہیں ہوتا۔

تیسرا ٹکڑا:

''ایسا نہیں ہونے کا کہ اللہ تمہارے ایمان کو اکارت کر دے۔'' ان الفاظ سے خود ظاہر ہے کہ یہ کسی غلط فہمی کا دفعیہ اور کسی تردد تشویش کا ازالہ ہے۔ اس لئے اس کے پس منظر میں یہ روایت درست معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو پریشانی پیدا ہوئی کہ اس کے پہلے جو نمازیں پڑھی ہیں کہیں وہ سب بے کار تو نہیں ہو گئیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس وقت تو نمازوں کا اس طرف منہ کر کے پڑھنا ہی تمہارا تقاضائے ایمان تھا لہٰذا وہ نمازیں بے کار کیوں کر ہو سکتی ہیں! اس طرح ایمان کے اکارت کر دیئے جانے کا مطلب ہے نمازوں کا اکارت کر دیا جانا[1]۔

اب اس سے یہ حقیقت پھر ایک دفعہ ذہن میں آ جانی چاہیے کہ کسی خاص قبلہ کی طرف رخ کیا جانا اس سمت کے ذاتی تقدس کا کوئی خاصہ نہیں ہے بلکہ اصل تو حکم الٰہی کی تعمیل ہے۔ اس لئے جب تک حکم ادھر کے لئے تھا وہ نماز بالکل صحیح و درست تھی اور جب حکم ادھر کے لئے آ گیا تو یہ نمازیں جو اس سمت رخ کر کے ہوں ویسی ہی صحیح و درست ہوں گی۔ ''اللہ لوگوں پر بڑا مہربان بڑی رحمت والا ہے''۔ یہ اسی کا تتمہ ہے یعنی وہ قبلہ بدل کر تمہاری گزشتہ نمازوں کو بے کار کر دے، یہ اس کی رافت و رحمت کے خلاف ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

''بہت[2] دیکھ رہے ہیں ہم آپکے چہرے کی گردش کو آسمان کی طرف تو اب ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف موڑ دیں گے جس سے آپ خوش ہو جائیں گے۔ بس اب مسجد حرام کی طرف اپنا رخ موڑا کیجئے اور تم لوگ جہاں کہیں ہوا پنے منہ اسی طرف کیا کرو، اور وہ جنہیں کتاب دی گئی ہے یقیناً بخوبی جانتے ہیں کہ یہ ان کے پروردگار کی طرف کا حقیقی فیصلہ ہے اور اللہ اس سے جو وہ کرتے ہیں بے خبر نہیں ہے۔''

سلسلہ آیات کو دیکھنے سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے تک تحویل قبلہ وقوع میں نہ آئی تھی[3]، بلکہ یہی آیت ہے

---

[1] ۔ایمانکم یعنی صلوٰتکم (صافی) فی الکافی عن ابن ابی عمر الزبیری عن ابی عبداللہ علیہ السلام فی الآیۃ ان اللہ سمّی الصّلوٰۃ ایمانا (البلاغی)

[2] ۔قدھنا للمکبّر (البلاغی) بعض لوگوں نے قَدْ کو تحقیق کے لیے قرار دے کر نضارع کو ماضی کے معنی میں لیا ہے اور یہ ترجمہ کیا ہے ''تحقیق کہ دیکھتے تھے ہم'' یہ بظاہر درست نہیں ہے۔

[3] ۔ جعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یدیم التنظر الی السمآء رجآء ان یاتیہ جبرئیل بالذی سأل بریۃ فانزل ھذا الآیۃ (مجمع البیان)

جو پہلے پہل اس حکم کو لے کر آئی ہے [1] اور قبل کی دونوں آیتیں تحویل قبلہ ہو چکنے پر اس کے بعد اتری ہیں [2] یہ اور بات ہے کہ موجودہ ترتیب قرآن یہ بعد میں اور وہ پہلے ہیں مگر ترتیب قرآن تنزیل کے مطابق نہ ہونا تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار کیا ہی نہیں جا سکتا' جس کی تفصیل ''مقدمہ تفسیر'' میں ہو چکی ہے۔ اس صورت میں خواہ مخواہ ترتیب کے تقاضے کو سنبھالنے کے لئے اس بے جوڑ بات کے کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ:

''یہاں مراد اس حکم کا انتظار نہیں کہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا جائے کیوں کہ وہ حکم نازل ہو چکا اور اس پر اعتراضات کا جواب بھی ہو چکا بلکہ یہ انتظار اس لئے ہے کہ خانہ کعبہ جو مشرکین کے قبضہ میں ہے اور جسے اب قبلہ بنایا جاتا ہے کہ کب بت پرستی سے پاک ہوگا اور مسلمانوں کا اس پر کب قبضہ ہوگا'' فلنولّ ینّك ولیته کذا'' کے معنی ہوتے ہیں میں نے اسے فلاں چیز کا والی یا متصرف بنا دیا' یہی معنی یہاں مراد ہیں، نہ پھیرنے کے نہیں اس لئے کہ یہ آئندہ کے متعلق ہے اور منہ پھیرنے کا حکم پہلے ہو چکا (بیان القرآن) مگر یہ ''آیندہ'' اور ''پہلے'' سب ترتیب موجود پر مبنی ہے اور جب کہ اس کے مطابق تنزیل ہونا ثابت نہیں تو اس استدلال کی وقعت ہی کیا! لغت میں تولیہ کے معنی حاکم اور منتظم بنانے کے ڈھونڈ کر نکالنے سے فائدہ کیا جب کہ یہاں بیان بہر حال قبلہ کا ہے اور ادھر رخ کرنے کا چنانچہ اس کے بعد بھی بلا فاصلہ اس پر متفرع کر کے جو بات کہی گئی ہے وہ بھی قبلہ ہی کی ہے کہ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ یعنی ''اب سے آپ اپنا منہ اس قبلہ کی طرف کیا کیجئے''۔ یہ رسول ؐ کو مخاطب بنا کر حکم دیا اور پھر روئے خطاب تمام مسلمانوں کی طرف کر کے ان سے بھی کہا کہ ''اب تم سب اپنے رخ اس طرف کیا کرنا [3]۔

اس انداز سے خود ظاہر ہے کہ اصل تحویل قبلہ کے حکم کو لے کر آنے والی یہی آیت ہے نہ یہ کہ حکم پہلے ہو چکا تھا اور اس کے بعد اس سے متعلق کچھ باتوں کے صاف کرنے کے لئے یہ آیت اتری ہے۔ بے شک اس کے قبل کی آیتوں کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ وہ قبل کے واقعہ سے متعلق ہیں اور تحویل قبلہ اس کے پہلے ہو چکی ہے جس کے لئے کہا جا رہا ہے کہ:

''اب احمق لوگ یہ اعتراض کریں گے'' اور اس کا یہ جواب ہے۔

پھر ایک خاص بات یہ ہے کہ اگر اس آیت میں فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا اور اس کے بعد کے اجزاء کو مان لیا جائے کہ وہ تحویل قبلہ ہو چکنے کے بعد اس ماضی کی بات سے متعلق اس خیال کو دور کر رہے ہیں کہ

خانہ کعبہ میں بت ہیں تو فرمایا کہ اس وجہ سے مضائقہ نہ کرو کیوں کہ ہم تم کو متولی بنا دیں گے اور یہ مرکز توحید موحدین کے ہاتھ میں ہی رہے گا۔ اس لئے بغیر کسی خیال کے دل میں لانے کا اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کرو۔'' (بیان القرآن

اور اس کے قبل کی آیتیں یقیناً تحویل کے بعد اعتراضات کا جواب ہیں' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس وحی کا جو خود تحویل قبلہ کے حکم کو لائی ہے قرآن مجید کے اندر وجود نہیں ہے۔ ایسی صورت میں جیسا بیت المقدس کے لئے کہا گیا ہے کہ:

---

[1] ۔ هٰذا الأية ناسخة لفرض التوجه الى بيت المقدس (مجمع)

[2] ۔ القمى ان هٰذه الأية مقدمة على اٰية سيقول السفهآء (صافى)

[3] ۔ خصّ الرّسول بالخطاب تعظيماً له و ايجا با بالرّغبة ثم عمه تصريحا بعموم الحكم لجميع الامة وسائر الامكنة. وتاكيد الامر القبلة وتحضيضاً لامّة على المتابعة (صافى)

''نہ ایسی کوئی وحی قرآن میں موجود ہے نہ۔کسی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی طرف آپ نے وحی الٰہی کے حکم سے منہ کیا ہو۔''(بیان القرآن)

وہی بات کعبہ کے لئے بھی ہوجائے گی حالانکہ کعبہ کے لئے ان کو خود تسلیم ہے کہ ''ہجرت کے سولہ یا سترہ ماہ بعد خانہ کعبہ صریح وحی الٰہی کے ماتحت قبلہ قرار پایا۔'' یہ صریحی وحی ظاہر ہے کہ سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ الخ والی آیت نہیں ہے وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا الخ والی آیت نہیں ہے۔تو وہی یہی آیت ہے جس کا انداز بتا رہا ہے کہ وہ پہلے پہل اس حکم کو لے کر اتری ہے اور اس کے پہلے تک یہ حکم نہیں آیا تھا۔

المسجد الحرام سے عموماً وہ وسیع احاطہ مراد ہوتا ہے جس میں خانہ کعبہ ہے۔یہ احاطہ کوئی دوسو پچاس قدم لمبا اور دوسو قدم چوڑا ہے اور خانہ کعبہ اس کے وسط میں واقع ہے جو اٹھارا قدم لمبا اور چودہ قدم چوڑا ہے۔اس کے شمال مشرقی کونے پر حجر اسود ہے۔ہاں کسی مسجد حرام کا اطلاق کُل حرم پر بھی کر دیا گیا ہے[1]۔جس کے اندر تمام مکہ معظّمہ اور منیٰ اور عرفات وغیرہ واقع ہیں اور جس کے اندر جنگ کرنا ہتھیار اٹھانا، شکار کھیلنا بلکہ گھاس وغیرہ تک کا کاٹنا ممنوع ہے۔

مسجد حرام:

یہاں مسجد الحرام کو جو قبلہ قرار دیا گیا ہے تو یا تو اس سے مراد کعبہ ہی ہے[2] جیسا کہ اکثر فقہا کا قول ہے کہ اصل قبلہ تمام مسلمانوں کا کعبہ ہی ہے اور یا یہ کہ مسجد حرام کو بہ معنی حرم لے کر ان لوگوں کے لحاظ سے قبلہ قرار دیا گیا ہے جو مکہ معظّمہ سے باہر ہیں جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ کعبہ قبلہ ہے ان کے لئے جو مسجد کے اندر ہوں اور مسجد قبلہ ہے ان کے لئے جو حرم میں مسجد سے باہر ہوں اور حرم قبلہ ہے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے[3]۔

آخر میں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب چاہے کتنے ہی اعتراضات کریں وہ بہرحال آپ کی سچائی اور اس پیغام کی سچائی سے جو آپ پر نازل ہوا ہے پوری طرح واقف ہیں ان پیشین گوئیوں کی بناء پر جو ان کے یہاں موجود ہیں یہ فقط ہٹ دھرمی ہے جو انکار کرتے ہیں اور اسی لئے اس پر تہدیدی انداز میں کہا گیا ہے کہ خداوند عالم ان کے ہر عمل سے خوب واقف ہے یعنی اس کے یہاں انہیں اس کی پاداش ملے گی۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ

---

[1] ۔ جیسے لمن لم یکن اھلہ حاضری المسجد الحرام (بقرہ۔۱۹۶) اور لا تقتلوھم عند المسجد الحرام (بقرہ۔۱۹۱)

[2] ۔لا مانع من ان تسمی الکعبۃ مسجدا باعتبار انھا یسجد الیھا (البلاغی)

[3] ۔ھٰذا موافق لما قالہ اصحابنا ان الحرم قبلۃ من نأی عن الحرم من اھل الافاق (مجمع البیان)

وانما ذکر المسجد دون الکعبۃ لانّہ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کان فی المدینۃ والبعید یکفیہ مراعاۃ الجھۃ (بیضاوی)

مِّنۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

''اور اگر آپ ان اہل کتاب کے سامنے سارے معجزے پیش کر دیں پھر بھی وہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے اور نہ آپ ہی ان کے قبلہ کے پیرو ہوں گے اور خود وہ بھی دوسرے کے قبلہ کے پیرو نہیں ہیں اور جو علم آپ کے پاس آ چکا ہے اس کے بعد اگر آپ ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگیں تو بلاشبہ آپ حد سے تجاوز کرنے والوں میں ہوں گے۔''

بظاہر یہ کچھ اتحاد پسند مسلمانوں کے خیالات کی رد ہے۔ کسی بھی اصولی اختلاف کے موقع پر بعض لوگ اتفاق واتحاد اور تنظیم قومی کا درس دینے لگتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو یک جہتی بہتر ہے۔ مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ تھے جو بسا اوقات سوچتے تھے کہ یہود و نصاریٰ سے جہاں تک ممکن ہو ہم آہنگی اور اتفاق واتحاد پیدا کیا جائے اس لئے کہ وہ اپنا اصلی حریف مشرکین یعنی بت پرستوں کو جانتے تھے یہود و نصاریٰ بہ نسبت ان کے اپنے سے قریب تر محسوس ہوتے تھے لہٰذا انہیں سیاسی حیثیت سے مناسب معلوم ہوتا تھا کہ ہم انہیں اپنے ساتھ ملا کر مشرکین کے مقابلہ میں ہم دست ہو جائیں۔

قرآن میں اس قسم کے تخیلات کی رد بعض دوسری آیتوں میں بھی نظر آتی ہے جیسے: ولن ترضى عنك اليهود ولا النصرى حتى تتبع ملتهم یہود و نصاریٰ تو آپ سے اس وقت تک خوش نہ ہوں گے جب تک آپ ان کے مذہب کو قبول نہ کر لیں۔'' ایسے موقعوں پر بظاہر مخاطب رسولؐ کو بنایا ہے کہ اور رد کی گئی ہے دوسرے لوگوں کے خیالات کی چنانچہ یہاں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے [1] اور بتایا گیا ہے کہ اتفاق واتحاد کا تصور ان سے خیال خام ہے۔ مخالفت اگر غلط فہمی سے ہو تو اس کے دور ہونے کی توقع ہے لیکن اگر حق کو حق جانتے ہوئے عناد سے ہو یا باطل کو باطل سمجھ کر فرض شناسی کی بنا پر ہو تو پھر مفاہمت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اہل کتاب کی مخالفت آپ سے پہلی قسم کی ہے اس لئے ان سے امید نہ کرنا چاہیے کہ وہ اس سے باز آئیں گے [2] اور آپ کا اختلاف ان سے دوسری قسم کا ہے اس لئے یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ اپنے طریقہ کو چھوڑ کر ان کے پیرو ہو جائیں۔ اور پھر ان میں آپس میں کب اتحاد ہے! یہود کا قبلہ اور ہے اور نصاریٰ کا قبلہ اور ہے [3] اور ان کے یہ دونوں قبلے کسی حکم الٰہی کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اپنے ذاتی جذبات سے ہیں اور آپ کا قبلہ قطعی طور سے حکم الٰہی پر مبنی ہے۔ پھر آپ کے لئے کہاں جائز ہو سکتا ہے کہ آپ حق کو چھوڑ کر اور فرمان الٰہی کی مخالفت کر کے صرف اتفاق واتحاد کی خاطر ان کے نفسانی جذبات کی پیروی کرنے لگیں! یہ تو بہت بڑا ظلم یعنی حدود سے تجاوز ہو گا جس کا تصور بھی آپ کی نسبت نہیں کیا جانا چاہیے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ

---

[1] ۔ المراد به غيره ﷺ وذلك من قبيل اياك اعني واسمعي ياجارة (صافی)

[2] ۔ لان المعاند لا ينفعه الدلالة (صافی)

[3] ۔ فان النصاری تتوجه الی المشرق واليهود الیٰ بيت المقدس (البلاغی) اليهود تستقبل المغرة والنصاریٰ مطلع الشمس (البيضاوی)

لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

''وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے، اس (رسولؐ) کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بلاشبہ ان میں سے ایک جماعت دانستہ حق کو چھپاتی ہے۔''

اہل کتاب کا جان بوجھ کر انکار:

اہل کتاب اپنی کتابوں میں صاف صاف پیغمبر اسلام ﷺ کے اوصاف یہاں تک کہ حلیہ کو بھی پڑھ چکے تھے [۱]۔ اس وجہ سے بحیرا راہب نے بچپن میں آپ کو دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ یہ صرف اغراض نفسانیہ جن کی وجہ سے اب وہ انکار کرتے تھے۔ ''جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں،'' اس کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح اپنی اولاد کو پہچاننے میں آدمی کو کوئی تکلف نہیں ہوتا اور نہ ہی ذرا سا بھی اشتباہ اسی طرح وہ بلا تکلف اور بغیر کسی اشتباہ کے آپ کو پہچانتے ہیں۔

ایک دوسرے معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ اَبْنَآءَهُمْ سے مراد انبیائے بنی اسرائیل ہیں ''یعنی جن نشانات سے ان کی سچائی کو سمجھتے تھے اور وہ سب نشانات یہاں بھی موجود ہیں۔'' (بیان القرآن) مگر یہ معنی الفاظ کے مفہوم سے ایک حد تک بعید ہیں۔

پہچاننے میں کل جماعت شریک ہے لیکن اس کے بعد کچھ تو وہ ہیں جنہوں نے ایمان قبول کیا اور بہت سے ایسے نکلے جو جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔ انہی کو کہا گیا ہے: وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ [۲] یہ علم جرم میں شدت کا باعث بنتا ہے لاعلمی سے انکار کرنے والا چاہے ''مقصر'' ہونے کی وجہ سے معذور نہ ہو پھر بھی اتنا قابل سرزنش نہیں ہوتا جتنا جان بوجھ کر انکار کرنے والا۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

''حق وہ ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہو لہٰذا ہرگز جھگڑنے والوں سے نہ ہو۔'' یہ تنبیہ ان لوگوں کے لئے بھی ہوسکتی ہے جو تحویل قبلہ کے بارے میں جھگڑا کر رہے تھے اس صورت میں یہ آیت پہلے کی آیت سے مرتبط ہوگی اور ان لوگوں کے لئے جو رسولؐ کی رسالت سے انحراف کر رہے ہیں۔ اس طرح اس کا تعلق اس کے قبل کی آیت سے بلا فاصلہ ہوگا مگر پہلا احتمال زیادہ قوی ہے اس میں واحد کا صیغہ ہے جس سے مخاطب رسولؐ کی ذات کو سمجھنا ضروری نہیں ہے بلکہ عام محاورہ کے مطابق اس کا مخاطب عام بھی ہوسکتا ہے جس کی نظیریں قرآن میں بہت ملتی ہیں [۳]۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ

---

[۱] ۔ الضمير لرسول الله ﷺ وان لم يستبق ذكره لدلالة الكلام عليه (بيضاوی)

[۲] ۔ وهم العالمون دون المؤمنين (صافی)

[۳] ۔ الخطاب فی النهی يراد به غير النبی ﷺ كما فی قوله تعالیٰ. فلا تقل لهما اُفّ ولا تنهرهما وقل واخفض فقل لهما جناح الزل من الرحمة وقل رب رحمهما ربينی صغيرا (البلاغی)

جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۴۸﴾

''اور ہر ایک کی ایک سمت ہے جدھر وہ رُخ کرتا ہے۔ لہٰذا بڑھ چڑھ کر نیکیاں حاصل کرو جہاں بھی ہو گے تم سب کو اللہ لے آئے گا اللہ ہر بات پر قادر ہے۔''

وجھۃ اور قبلہ کے لفظی معنی تقریباً ایک ہی ہیں۔ وجہۃ جدھر توجہ کیجئے اور قبلہ جس کا استقبال ہو توجہ کے معنی رُخ کرنا اور استقبال اپنے سامنے رکھنا۔

ھو مولیھا کی ضمیر کو بعض مفسرین نے اللہ کی طرف راجع کیا ہے [1]۔ اس صورت میں لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ہر ایک کے لئے ایک سمت رہی ہے جدھر وہ (یعنی اللہ) اس کا رخ کراتا ہے مگر ہمیں دوسرا قول زیادہ سلجھا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضمیر کل کی طرف ہی راجع ہے [2] اور ہم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ احادیث اہل الذکر میں اس کی تفسیر کوئی وارد ملتی نہیں [3]۔

مطلب بظاہر یہ ہے کہ یہ تو ہر جماعت کے نظم و تربیت کا ایک علامتی شعار ہوتا ہے جسے وہ اختیار کرتی ہے تو مسلمانوں کے لئے ہم نے بھی بطور شعار ایک قبلہ قرار دے دیا ہے مگر کبھی اپنی فضیلت و بزرگی کا معیار اسی کو سمجھ نہ لینا۔ فضیلت کا اصل معیار صرف اعمال خیر ہیں۔ اسی میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو اور دنیا کی قوموں پر اس بات میں سبقت حاصل کر کے دکھاؤ جو خالق کی نظر میں معیار بزرگی ہے (اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ) یہی وہ حقیقت ہے جس پر دوسری جگہ ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے کہ: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ..... الخ ''نیکی کا معیار یہ نہیں ہے کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف منہ کرتے ہو بلکہ نیکی کا دارومدار کچھ خاص اوصاف پر ہے (جو بعد میں درج ہیں)۔

قبلہ اور معیار فضیلت:

اسی سے معلوم ہوا کہ یہ قبلہ کی طرف رخ کرنا بت پرستی کے دور سے بھی تعلق نہیں رکھتا۔ اس مقام پر مولوی محمد علی نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اچھے الفاظ لکھے ہیں کہ:

''خانہ کعبہ کی جو کچھ عزت مسلمانوں کے دلوں میں ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ یہ توحید کا اصل مرکز ہے اور نسل انسانی کے اتحاد کا بھی اصل مرکز یہی ہے بعض کوتاہ اندیش مخالفین نے اس عزت کو پرستش کے قائم مقام قرار دے کر اعتراض کیا ہے حالانکہ کسی چیز کی عزت کرنا اور امر ہے اور اس کی پرستش امر دیگر ہے۔'' (بیان القرآن جلد ا ص ۱۳۳)

اگر یہ نکتہ پیش نظر رہے تو مسلمانوں کے ایک طبقہ کی طرف سے بہت سے موقعوں پر جو ''شرک، شرک'' کی بے محل آوازیں بلند ہوتی ہیں

---

[1] ۔ اللہ مولّیھا ایّاھم (صافی)

[2] ۔ ھو مولّیھا وجھۃ فی صلوتہ (جلالین) یجوز ان یکون الضمیر الّذی ھو فی قولہ ھو مولّیھا عائدا الی کلّ والتقدیر لکلّ وجھۃ ھو مولّیھا وجھۃ (مجمع البیان)

[3] ۔ لم اجد عن النبی ﷺ واھل لبیتہ شیئا فی ذٰلک (البلاغی)

وہ موقوف ہو جائیں۔

''جہاں بھی ہو گے اللہ تم سب کو لے آئے گا'' یعنی جب اسے جزا دنیا ہو گی تو تمہارا مشرق اور مغرب کا فاصلہ اس کے نزدیک یکساں ہو گا۔ اس کی قدرت ہر زمان و مکان اور ہر سمت و جہت پر حاوی اور سب کا شامل ہے [1]۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٩﴾

''اور جب بھی کہیں نکلئے تو منہ اپنا مسجد الحرام ہی کی طرف موڑیئے۔ یہی بلاشبہ آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں ہے۔''

چوں کہ اس کے پہلے کی آیات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خود مسلمانوں کی جماعت میں بھی تحویل قبلہ کے معاملے میں بے چینی تھی اور اسکے بعد امکان تھا کہ کچھ لوگ جب تک مدینہ میں ہوں اور پیغمبر خداؐ کی اقتدا میں نماز پڑھیں اس وقت تک تو کعبہ کی طرف رخ کریں اور جب کہیں باہر جائیں تو اپنی پرانی پڑی ہوئی عادت کے مطابق بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو جائیں تو اس لئے اس انتباہ کی ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ حکم سفر و حضر میں یکساں ہے [2] اور اصل میں یہ خطرہ خود رسولؐ سے تو تھا نہیں کہ آپ سفر و حضر میں فرق کر دیں۔ یہ صرف ایک بلیغ انداز تھا دوسروں کو متنبہ کرنے کا۔ اس لئے آیت میں کلام کی ابتدا ہوئی رسولؐ کے ساتھ مخاطب کی صورت میں بلفظ واحد (خرجت اور وجهك اور من ربك) اور انتہائی عام مسلمانوں سے تخاطب پر بصیغہ جمع (وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ) یہ صرف اس لئے کہ اصل انتباہ یہ انہی کے لئے ہے جو جماعت میں شامل ہیں مگر یہ تبدیلی ان پر شاق ہے اور مدینہ سے باہر رسولؐ کی نگاہ سے اوجھل ہوتے ہی طرز عمل میں تبدیلی چوں کہ اس تصور کی غماز ہے کہ اب رسولؐ تو یہاں ہیں نہیں اور دیکھ نہیں رہے ہیں لہٰذا اس خطور ذہنی کے مقابل میں یہ انتباہ کیا جا رہا ہے کہ ''اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے'' یعنی رسولؐ دیکھ رہے ہوں یا نہ اگر تم مسلمان ہو تو تمہیں اللہ کو ماننا ہے اور اس کے لئے تمہارا حضر و سفر یکساں ہے۔ وہ جس طرح تمہیں مدینہ میں دیکھ رہا تھا اسی طرح اب اس جگہ جہاں اس وقت تم ہو تمہیں دیکھ رہا ہے اور تمہارے کردار سے باخبر ہے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ لا لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ق إِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ق فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ق وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ

---

[1] ۔ انّ اللہ علیٰ کلّ شیء قدیر ای ھو القادر علیٰ جمعکم وحشرکم وھو علیٰ کلّ شیء (مجمع البیان)

[2] ۔ کرر لبیان تساوی حکم السفر وغیرہ (جلالین)

تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

''اور جب بھی کہیں نکلئے تو منہ اپنا مسجد الحرام ہی کی طرف موڑ یئے اور تم بھی جہاں کہیں ہو اپنا منہ مسجد الحرام ہی کی طرف موڑ وتا کہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ ملے سوا ان کے جو ظلم و تعدی سے کام لیں تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور اس لئے کہ [۱] میری طرف سے نعمت تم پر پوری ہو جائے اور شاید تم سیدھے راستے پر ہو۔''

اس آیت سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسولؐ کے عمل اور تمام مسلمانوں کے عمل میں جہاں بھی ہوں اختلاف نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کس طرف رخ کر کے نماز پڑھیں اور یہ کبھی کبھی کسی اور رخ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لیا کریں کیوں کہ اس صورت میں لوگ تمہارے خلاف ایک دلیل و حجت پیش کر سکتے ہیں کہ اس تبدیلی سے خود ان سب کا ضمیر مطمئن نہیں ہے اس لئے اب بھی ان میں کچھ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ لیتے ہیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے اور مخالفین کو یہ حجت پیش کرنے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم انہیں کسی حجت کا موقع نہ دو۔ اب جو خواہ مخواہ دھاندلی سے کام لے کر کچھ نہ کچھ ٹھجتی سے کام لئے ہی جائیں ان کا کوئی علاج نہیں ہے [۲]۔

''ان سے نہ ڈرو'' یعنی ان کے اعتراضات کی کوئی پروانہ کرو [۳] ''مجھ سے ڈرو'' یعنی میرے حکم کی اہمیت کا لحاظ کرو [۴] جو تمہاری عبودیت کا عقلی تقاضا ہے۔ پھر یہ کہ میں نے تم پر یہ ایک احسان کیا ہے کہ جو کعبہ تمہارا دینی و قومی مرکز ہے اسی کو تمہارے لئے قبلہ بھی بنا دیا جو تمہارے دینی اور قومی رجحانات کے بالکل مطابق ہے اب تم ہی میں سے کچھ لوگ اس کی مخالفت کریں تو یہ کتنا بڑا کفران نعمت ہے۔ اور پھر جب کہ خالق کا فرمان اس کے لئے صادر ہو گیا تو رشد و ہدایت اس کی تعمیل ہی میں ہے اس کی عدول حکمی کر کے تمہیں گمراہی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

''جیسا کہ ہم نے تم میں تم ہی کا ایک پیغمبر بھیجا جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سنا تا تمہیں سدھارتا تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا اور تمہیں وہ باتیں بتاتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔''

یعنی یہ تحویل قبلہ تم پر ایک احسان ہے جیسا کہ اس کے پہلے تم پر یہ احسان ہو چکا ہے کہ یہ رسول تمہاری جانب مبعوث ہوا [۵]۔

اسی سورہ بقرہ میں پہلے پارے میں انہی الفاظ میں حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت اس پیغمبر کے بھیجے جانے کی دعا کی تھی:

---

[۱] ۔عطف علیٰ لئلا یکون (جلالین)

[۲] ۔فان ھؤلآء الظالمین لا یقطعون جدلھم و احتجاجھم بالا باطیل (البلاغی)

[۳] ۔ فان مطاعنھم لا تضرّکم (بیضاوی)

[۴] ۔ فلا تخالفوا ما امرتکم (بیضاوی)

[۵] ۔ ای ولا تمّ نعمتی علیکم کما اتممتھا بأرسال رسول منکم (صافی)

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (بقرہ۔ ۱۶۹)

اس دعا کی قبولیت کا اظہار کرتے ہوئے متعدد جگہ قرآن مجید میں اسی نبی کے اوصاف انہی الفاظ میں پیش کیے گئے ہیں جو دعائے ابراہیمی میں مذکور تھے ان الفاظ کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔ ''جیسا کہ ہم نے تم میں یہ پیغمبر بھیجا''۔ اس میں اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ کعبہ کی مرکزیت بھی ابراہیمی تمناؤں کی تکمیل کا ایک تتمہ ہے اسی طرح جیسے اس رسولؐ کی بعثت بھی۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

''مجھے تم یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرے شکر گزار رہو اور میری ناشکری نہ کرو۔''

بندہ کا اللہ کو یاد رکھنا احساس فرائض کا قائم رکھنا ہے اور خداوند عالم کا اسے یاد رکھنا نعمتوں سے نوازنا ہے [۱] اس نوازش کو ذکر (یاد) سے تعبیر کرنا عمل اور جزا میں مناسبت ذکری کے قائم رکھنے کے لئے ہے [۲]۔ جو بلاغت کا تقاضا ہے جیسے عرب کا مقولہ: کما تدین تدان

اگر یہ آیت بوقت تنزیل گزشتہ آیات کے ساتھ ہی نازل ہوئی ہو تو اس کا ربط ان نعمتوں کے ساتھ ہے جن کا ذکر ولا تم نعمتی علیکم اور پھر کما ارسلنا الخ میں ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مدینہ کے اندر اور مدینہ کے باہر جہاں بھی ہو قانون الٰہی کا خیال رکھنا چاہیے اور کہیں بھی حکم خداوندی کے خلاف نہیں کرنا چاہیے۔ تب ہی خالق کی نظر رحمت بھی تمہاری طرف مبذول رہے گی اور یہ جو تم پر احسان کیا گیا ہے تبدیل قبلہ کر کے اور اس کے پہلے اس پیغمبر کو بھیج کر [۳] اس کی ناشکری نہ کرو [۴] قبلہ والے احسان کی ناشکری کبھی کبھی گذشتہ قبلہ کی طرف رخ کر لینا ہے اور رسولؐ والی نعمت کی ناشکری اس رسولؐ کی مخالفت کرنا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

''اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز سے مدد لیا کرنا بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

صبر اور صلوٰۃ:

مدد کے مفہوم میں داخل ہے خود اپنی مادی قوت کا ناکافی ہونا۔ اس طرح اس پیغام میں مسلمانوں کے لئے یہ انتباہ مضمر ہے کہ انہیں ایسی مشکلات درپیش ہوں گی جن کے دفعیہ سے ان کی مادی طاقت عہدہ براہ نہ ہو سکے گی۔

عموماً ایسے محل پر انسان کسی بیرونی طاقت کا سہارا ڈھونڈھتا ہے لیکن پوری جماعت خود اپنی حقانیت کے اصولوں کی بناء پر مبتلائے

---

[۱] ۔ فاذکرونی بالطاعۃ اذکرکم بالثواب (بیضاوی وصافی)

[۲] ۔ لاجل المقابلہ انفطیھۃ جری العبر عن ذٰلک بقولہ تعالیٰ اذکرکم (البلاغی) قبل معنا اجازیکم (جلالین)

[۳] ۔ یعنی بالنعمۃ قولہ کما ارسلنا فیکم رسولا منکم الآیۃ (مجمع البیان)

[۴] ۔ اراد بالکفر کفر النعم (صافی)

مشکلات ہوتو اسے وہ بیرونی طاقت مل ہی کیوں سکتی ہے جو اسے سہارا دے اور جو کوئی دوسری جماعت مدد کرنا چاہے گی وہ ضرور اس کی ان سے کچھ قیمت وصول کرے گی اور وہ ان کی حقانیت کے اصول میں کمزوری کا باعث ہوگی اس لئے مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ کسی دوسری طرف کبھی مدد کے لئے نہ دیکھیں بلکہ ایک طرف خود اپنے میں صبر کا جوہر پیدا کریں صبر کیا ہے؟ تمام مشکلات کے باوجود پائے استقامت میں جنبش نہ ہونا۔ یہ داخلی قوت ہے اور اس کے ساتھ اللہ سے مدد طلب کریں صلوٰۃ کے ذریعہ سے یہ بیرونی قوت ہوگی۔ ان دونوں باتوں سے ان کے نفس میں ایک جوہر اعتدال بھی پیدا ہوگا جو انسانیت کا کمال خاص ہے پہلی صفت دنیا کی مادی طاقتوں کے مقابلہ میں استحکام کا پتہ دیتی اور دوسری صفت اپنے مالک ومعبود کی بارگاہ میں تذلل کا ثبوت دیتی ہے پہلا امر خودداری کا مقتضی اور دوسرا خودسری سے مانع ہے۔

مگر آخر میں کہہ دیا ہے کہ اللہ مدد انہی کی کرتا ہے جو صبر کا جوہر رکھتے ہوں۔ اس طرح پورا دارومدار صبر پر ہوگیا وہی اہل حق کی کامیابی کا واحد راز ہے۔

اس آیت کے ابتدائی الفاظ (اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ) بنی اسرائیل کے سلسلہ کی آیات میں پہلے پارے میں آچکے ہیں اس طرح کہ

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ (سورۂ بقرہ)

مگر وہاں مخاطب بنی اسرائیل تھے اور انہیں ان کے فرائض کا احساس پیدا کرانا تھا کہ وہ اس پیغام حق کو جوان کے سامنے خاتم الانبیاءؐ کے ذریعہ سے پہنچا ہے قبول کریں۔ اس میں انہیں ایک طرح کی ''حمیت جاہلیت'' سدراہ تھی اور وہ یہ کہ خاندانی طور پر ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم ہی میں سے کوئی رسول مبعوث ہو۔ اولاد اسماعیلؑ کے سامنے سرخم کرنا ہماری شان کے خلاف ہے۔ یہ ایک طرح کی خودسری ہے جسے ختم کرنے کا ذریعہ صلوٰۃ یعنی رجوع الی اللہ ہے لہٰذا ''صبر وصلوٰۃ'' کا ذکر کرنے کے بعد وہاں زیادہ توجہ صلوٰۃ پر مبذول کی گئی، اس طرح کہ خصوصیت کے ساتھ اس کے ذکر کا سلسلہ بعد تک رہا (وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ) یعنی اللہ کی طرف توجہ عام لوگوں کی طبیعت پر بار ہے سوا ان کے جو عظمت الٰہی سے متاثر دل اور اللہ کو ایک دن منہ دکھانے کا تصور رکھتے ہیں۔ اور اس میں اشارہ تھا کہ تم ان دونوں صفتوں سے محروم ہو اس لئے اس پیغام کا قبول کرنا بھی تمہارے لئے دشوار ہے اور یہاں مخاطب مسلمان ہیں۔ انہیں اس طرح کی کوئی بات صراط مستقیم پر برقرار رہنے سے مانع نہ تھی صرف قوت ارادی کی کمی ہوسکتی تھی جو شدائد ومصائب کے مقابلہ میں سپر انداختہ بنادے۔ اس لئے یہاں ''صبر وصلوۃ'' کا ذکر کرنے کے بعد زیادہ اہمیت صبر کو دی اور ختم کلام اس پر ہوا کہ ان اللہ مع الصٰبرین بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

''اور انہیں جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں یہ نہ کہو کہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں شعور نہیں ہے۔''

حیاتِ شہداء:

زندگی طبعاً پسندیدہ شے ہے اور موت ناپسند ہے اور عقلاً بھی بلاشبہ حیات ایک کمال ہے۔ اسی لئے صفات خالق میں بھی حیّ کی صفت ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ موت نقص ہے اسی طبعی مقتضا اور عقل کے فیصلہ کے مطابق انسان خطروں سے قدم پیچھے ہٹاتا ہے جب جان کے جانے کا اندیشہ ہوتا مگر اسلام نے جس کا نصب العین بلند مقاصد کے لئے قربانی کا مطالبہ تھا اس ذہنیت کا خاتمہ کرنا چاہا اسی طرح کہ قرآن میں اعلان کیا گیا کہ جو اللہ کی راہ میں قتل ہوں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں یہ تمہارے شعور کا نقص ہے کہ تم انہیں مردہ خیال کرتے ہو۔

چوں کہ کائنات عالم کا نظام اسی پر قائم ہے کہ ہر پست بلند کے کام آئے اور یہ کام آنا اس کی بلند تر بقا کا ذریعہ ہوتا ہے تو پھر انسان اپنے مافوق کے کام آکر میّت کیوں کہا جائے بلکہ وہ اس صورت میں شہید ہوگا اور ایک بلند تر حیات کا مالک ہوگا۔ بس شرط یہ ہے کہ مقصد قربانی بلند تر ہو۔ انہی بلند مقاصد کو جو جان سے زیادہ عزیز ہونا چاہیں فی سبیل اللہ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

دنیا پرست لوگ ایسے اشخاص کو جو ان مقاصد کیلئے جان دیتے ہیں یہ کہہ کر ملامت کرتے ہیں کہ بے کار جانِ عزیز ضایع نہ کرو اور کبھی ہمدردی کے لباس میں اس پر اظہار افسوس کرتے ہیں جیسا کہ منافقین کی زبانی کچھ شہدائے راہ خدا کے متعلق ایک جگہ قرآن میں آیا ہے لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا (آل عمران ۱۵۶)

''اگر وہ ہمارے ساتھ ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے''۔ قرآن اس ذہنیت کو ختم کرتے ہوئے منع کرتا ہے کہ انہیں یہ نہ کہو کہ مردہ ہیں۔

اس میں اگر صرف پہلے الفاظ ہوتے کہ مردہ نہ کہو تو اس تصور کا امکان تھا کہ وہ مردہ ہیں مگر ''میّت'' کہنا ادب کے خلاف ہے لیکن آخری ٹکڑے سے یہ تصور ختم ہو جانا چاہیے: بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ یعنی یہ کوئی احترامی ممانعت نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ انہیں مردہ سمجھنا تمہاری بے شعوری ہے۔

انہیں الفاظ کے لب ولہجہ وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ سے اس نظریہ کی بھی رد ہو جاتی ہے جسے راغب اصفہانی نے اختیار کیا ہے کہ:

''یہاں نفی موت سے مراد غم اور ناکامی کی موت ہے۔ موت کے اس معنی کی تائید میں انہوں نے یہ آیت پیش کی ہے وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (ابراہیم ۱۷) مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ خدا کی راہ میں کام کرتے ہوئے مارے جائیں ان پر حزن و ناکامی کی موت نہیں ہوگی۔

اس لئے ان کو ناکام نہ کہو بلکہ وہ کامیاب ہوں گے'' (بیان القرآن)

اس کے معنی یہ ہیں کہ ''نفی موت'' یہاں مجازی طور پر ہے مگر اس تصور کی اس وقت گنجائش بھی تھی جب صرف یہ ہوتا کہ انہیں مردہ نہ کہو لیکن یہاں تو اتنا نہیں ہے بلکہ آخر میں ہے کہ ''وہ زندہ ہیں مگر تمہیں اس زندگی کی شعور نہیں ہے۔'' یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ وہ کسی ایسی حقیقت کا اظہار ہے جو شعورِ عام سے مخفی ہے۔ پھر دوسری جگہ تو احیاء کے بعد تفصیل سے مقتضیات حیات کو ثابت کیا گیا ہے کہ

عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ (سورۂ آل عمران)

''انہیں اللہ کے یہاں سے رزق ملتا ہے۔ وہ اپنے پسماندگان کے پر مسرت حالات کے علم سے خوش ہوتے ہیں'' اس سب کے بعد نفی موت کو رنج و ملال یا تباہی و بربادی کا نفی پر محمول کرنا تاویل نہیں ہے بلکہ ایک قرآنی حقیقت کے تسلیم کرنے سے انکار ہے۔

اور یوں تو اسلامی تعلیم کے مطابق عالم برزخ میں ہر فرد مکلّف کے لئے ایک طرح کی زندگی ثابت ہے۔ مگر قرآن کا اندازِ کلام بتا رہا ہے کہ یہ شہداء کی حیات کوئی امتیاز خصوصی رکھتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس کی پوری نوعیت کو نہ سمجھ سکیں اور ہم حیات برزخی کی پوری نوعیت کو کب سمجھتے ہیں جو اس کی عمومی کیفیت اور حیات شہداء کی خصوصی حالت میں امتیاز کر سکیں اور اسے ہمیں سمجھ سکنا بھی نہ چاہیے اس لئے کہ منزل نقص میں کمال کا صحیح تصور غیر ممکن ہوتا ہے کہ بچپن میں یہ سمجھنا کہ شباب کیا ہوتا ہے خواب میں یہ سمجھنا کہ بیداری کسے کہتے ہیں ویسے ہی اس دور حیات مادی میں یہ سمجھنا کہ مابعد الموت کی زندگی اور پھر وہ بھی حیات شہداء کیا ہے۔

بہر حال وہ ہے سنت کائنات میں جو قربانی کا فطری اصول ہے وہ بھی اس کا متقاضی ہے اور قرآن بھی اس کی تصریح کر رہا ہے لہٰذا ایک مسلمان کو اس کا ماننا بہر حال ضروری ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۵

''اور ضرور بالضرور ہم تمہیں آزمائیں گے خوف، دہشت، بھوک اور مال و جان اور پھلوں کی کمی کسی نہ کسی چیز کے ساتھ اور خوش خبری دیجئے ان صبر کرنے والوں کو۔''

آزمائش کا عمومی طور پر [1] اعلان کر دیا گیا ہے مگر یہ امر غور طلب ہے کہ خالق اپنے بندوں کا امتحان کیوں لیتا ہے؟ امتحان وہ لے جو حقیقت پر مطلع نہ ہو اور خالق تو ہمارے ظاہر و باطن پر حاوی ہے مگر حقیقتاً امتحان کا مقصد یہی نہیں ہوا کرتا کہ امتحان لینے والا خود اطلاع حاصل کرے بلکہ اس کے علاوہ کبھی ناقص کو اس کے نقص کا اندازہ کرانا اور کبھی کامل کے کمال سے دنیا کو متعارف کرانا بھی نصب العین ہوتا ہے اور خالق کا مقصود امتحان سے انہی دونوں امروں میں سے ایک ہوتا ہے۔ ناقص نفوس کو احساس نقص پیدا کرانا تاکہ تحصیل کمال کی طرف توجہ ہو اور کامل نفوس کے کمال کا خلائق کے سامنے ظاہر کرنا اس لئے جتنی زیادہ بلند ہستی ہوتی ہے اتنا ہی خالق کی طرف سے اس کا شدید امتحان ہوتا ہے۔

اللہ کے امتحان کی نوعیتیں تو بہت ہوتی ہیں مگر آیت میں ان میں سے کچھ بطور مثال بیان ہوئی ہیں اس میں اور تو کوئی خاص لفظ محتاج تشریح نہیں مگر ثمرات اس کے ظاہری معنی تو یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ باغوں میں پھل خراب ہو جائیں، کھیتیاں برباد ہو جائیں، مگر یہ نقصان اموال کی ایک قسم ہے اس لئے دوسری تفسیر زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کہ نقص ثمرات سے مراد اولاد کے داغ ہیں جو میوہ زندگی ہوتے ہیں [2] اور اسی لئے نقصان مال کے بعد اس سے شدید تر سے یعنی نقصان نفوس اور پھر اس کے بعد مفارقت اولاد کا ذکر کیا گیا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ جانی نقصان سے زیادہ شدید امتحان ہے۔

---

[1] ۔ یاایّھا الذین اٰمنو کما یقتضیہ سیاق الخطاب اویاایّھا النّاس (البلاغی)

[2] ۔ قیل ارادبہ الاولاد لانّ الولد ثمرۃ القلب (مجمع البیان) عن الشافی النقص من الثمرات موت الاولاد (بیضاوی)

اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

''کہ جب کوئی تکلیف دہ بات [1] ان کے سامنے آئے ان کا قول یہ ہو کہ بلاشبہ ہم اللہ کے ہیں اور بلاشبہ ہمیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔''

یہ صبر کی حقیقت کا بیان ہے۔ بعض لوگ صبر کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ احساس مصیبت ہی نہ ہو مگر احساس تو انسان کے شعور کا نتیجہ ہے۔ اس کا فقدان قابل تعریف کہاں ہوسکتا ہے! اس طرح یہ سمجھنا کہ صبر بس یہ ہے کہ آنکھ سے آنسو نہ نکلے یہ بھی غلط ہے کیوں کہ یہ آنسو نکلنا احساس غم کا وہ طبعی نتیجہ ہے جس کا ربط اس احساس کے ساتھ فطرت نے قائم کیا ہے۔

حقیقتاً صبر یہ ہے کہ انسان تقدیر الٰہی پر معترض نہ ہو اور جو کچھ اس کی جانب سے ہوا ہے اسے صحیح سمجھے یہی وہ ہے جسے کلمہ انا للہ وانآ الیہ راجعون ظاہر کرتا ہے۔

یہ قول صرف لفظی نہیں ہے جسے بس زبان پر جاری ہونا چاہیے بلکہ اس کو دل و دماغ میں راسخ ہونا چاہیے کہ ہم اللہ کے ہیں اور اسے ہم پر اختیار کلی ہے جو وہ کرتا ہے وہ ہمارے حق میں مناسب ہی کرے گا اور ہمیں پلٹ کر اسی کی طرف جانا ہے۔ لہٰذا وہ ہم کو ہر نقصان کا معاوضہ بھی بمقتضائے عدل عطا کرے گا۔ اس کے یہاں ذرہ برابر ظلم نہیں ہے [2]۔

اگر مصائب حق کی راہ میں قیام کی وجہ سے اور ظلم ظالمین کے نتیجہ میں ہوں تو انہی دونوں فقروں میں یہ پہلو بھی مضمر ہے کہ ''ہم اس کے ہیں لہٰذا ہمیں اسی کی راہ میں صرف ہونا چاہیے اور اس راہ میں جو شدائد ہوں ان کی پرواہ نہیں کرنا چاہیے اور ہمیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے اس لئے وہ ہم کو ہمارے ثبات قدم کی جزا اور ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا بھی ضرور دے گا لہٰذا ہم کو پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے یہ دونوں باتیں اگر سامنے رہیں تو کبھی کوئی سختی وصعوبت ہمیں جادہ حق سے متزلزل اور کوئی ظالم وجابر جہاد حق میں سپر انداختہ نہ بنا سکے۔

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

''یہ وہ ہیں کہ ان پر خاص عنایتیں ہیں ان کے پروردگار کی طرف سے اور مہربانی ہے اور یہی ہدایت پانے والے ہیں۔''

صلوٰات، صلوٰۃ کے جمع ہے۔ صلوۃ کی معنی توجہ خاص کے ہوتے ہیں اس کی نسبت جب خدا کی طرف ہو تو اس سے عنایت وافضال یا تعریفوں [3] اور قدردانیوں کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور اس کی نسبت مخلوق کی طرف دی جائے تو وہ اللہ سے دعائے رحمت وعنایت کی شکل اختیار کرتی ہے۔

یہ صلوات ورحمت تو صابرین کے صبر کا خصوصی اجر ہے اور آخر میں جو کہا ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے

---

[1] ۔ فی الحدیث کل شیء یوذی المومن فھو لہ مصیبۃ (صافی ونحوہ فی البیضاوی)

[2] ۔ ھذا اقرار بالبعث والنشور اینحن الیٰ حکمتہ نصیر (مجمع البیان)

[3] ۔ صلوات من ربھم ثناء جمیل (البلاغی)

ہیں کہ یہی راہ ہدایت پر ہیں یعنی مصیبت کے وقت یہ احساس قائم رکھنا کہ ہم اللہ کے ہیں اور اللہ کی طرف پلٹ کر جانا ہے یہی صحیح راستہ ہے [1] مگر ہمارا ذوق یہ کہتا ہے کہ اس صورت میں اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ کا فقرہ پہلے ہونا چاہیے تھا اور صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ کا تذکرہ بعد کو، اس لئے کہ یہ ابتداً اُن کے عمل کی نوعیت ہے جو عمل کے ساتھ ساتھ ہے اور صلوٰت و رحمۃ ان کی جزا ہے جو اس پر مترتب ہے۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ کے دوسرے معنی جو زیادہ دل نشین ہیں وہ یہ ہیں کہ ایسے ہی لوگ جو مصیبت کے وقت یہ احساس رکھتے ہوں وہ ہیں جو پیغام حق کو قبول کر کے صراط مستقیم پر آتے ہیں اور شدائد کو جھیلتے ہوئے اس پر برقرار رہتے ہیں۔ کیوں کہ حق کا راستہ خطرناک ہے لہٰذا بے صبرے چاہے حق کو سمجھ بھی گئے ہوں مگر خطرات کو دیکھ کر لرز جاتے ہیں اور حق کے اختیار کرنے کی ہمت نہیں کرتے اور اگر حق کو اختیار کر لیا ہو تب بھی ان کی بے صبری سے ہر وقت یہ اندیشہ ہے کہ کوئی مصیبت ان کے قدم کو راہ ایمان سے منحرف کر دے جس سے وہ ہلاکت ابدی میں گرفتار ہو جائیں۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

''بلاشبہ صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ بجالائے اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا کہ وہ ان دونوں کا چکر لگالے اور جو شوق و رغبت کے ساتھ کچھ نیکی کرے تو اللہ قدر دان ہے جاننے والا۔''

صفا و مروہ مکہ معظّمہ کی مشہور دو پہاڑیاں ہیں اور شعائر شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں علامت و نشانی لہٰذا شعائر اللہ کا مطلب ہے عبادت الٰہی کی یاد دلانے والی نشانیاں [2]۔

حج اور عمرہ دونوں خانہ کعبہ کی زیارت کو کہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ حج کے لئے زمانہ خاص ہے جس میں ذی الحج کی ۹ سے لے کر ۱۲ تک کی تاریخوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان دونوں کے علاوہ حج نہیں ہوسکتا اور رجو دوسرے دونوں میں ہوتا ہے وہ عمرہ کہلاتا ہے۔

آیت کا مقصود یہ ہے کہ حج اور عمرہ میں صفا اور مروہ کے درمیان سعی [3] بھی لازم ہے [4] جس کے ذیل میں بڑے بڑے سلاطین با اقتدار کو بھی حکم الٰہی کی تعمیل میں ذرا اپنے تمکنت کے درجہ سے نیچے اترنا پڑتا ہے اور یہ اس سعی کے مناسک حج میں قرار دینے کا مستقل مقصد ہے [5]۔

اسی سے یہ سمجھنا صحیح ہے کہ موجودہ دور میں سرمایہ داری اور اقتدار کا مظاہرہ جو صفا و مروہ کے درمیان موٹروں کے دوڑانے کی شکل میں شروع ہوا ہے یہ قانون اسلام کی روح سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتا۔

---

[1] ۔المهتدون للحق والصواب حيث استرجعوا واسلموا القضاء الله (بيضاوی)

[2] ۔ من شعائر الله من اعلام مناسكه جمع شعيرة وهي العلامة (بيضاوی وصافی) شعائر الله اعلام دينه (جلالين)

[3] ۔ بان يسعى بينهما سعيا (جلالين)

[4] ۔في الكافي والعياشي عن الصادق عليه السلام انه سئل عن السعي بين الصّفا والمروة فريضة فقال فريضة (صافی)

[5] ۔عنه عليه السلام جعل السعي بين الصفا والمروة مذلة للجبّارين (صافی)

اس وجوب ولزوم کو آیت میں ان لفظوں میں کہا گیا ہے کہ ''اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا'' یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا کہ شعائر اللہ کہہ کر ان کے مرکز عبادت اور محلّ احترام ہونے کا مقتضی تو ثابت ہو ہی گیا۔ اس مقتضی کے مقابل میں آ سکتا ہے تو کوئی محذور عقلی یا شرعی جو ان کی تعظیم وتکریم سے مانع ہو۔ وہ عام اسلامی ذہنیت کے مطابق شرک کا تصور ہوسکتا ہے کہ چوں کہ پہاڑیاں بے جان ہیں اور پتھر میں انہی پتھروں کے اصنام کی مشرکین پرستش کرتے ہیں۔ تو اب ہم ان کا احترام کیوں کریں[1]۔ اس لئے بجائے حکم دینے کے صراحۃً یہ نفی ضروری سمجھی گئی کہ اس میں خرابی کوئی نہیں ہے۔ شرک کا تعلق تو نیت سے ہے اگر تم شعائر اللہ ہونے کی بناء پر سعی کرو گے تو وہ ہرگز شرک نہیں ہوسکتا کاش اس سے ان مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں جنہیں بات بات پر شرک کا ہوا نظر آیا کرتا ہے اور وہ دوسروں کو بھی اس سے ڈرایا کرتے ہیں۔

تفسیر عیاشی کی روایات سے جو حضرت امام جعفر صادقؑ سے وارد ہے اس آیت کا پس منظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمرۃ القضاء میں مشرکین سے یہ شرط ہوئی تھی کہ چند دنوں کے لئے وہ بتوں کو ہٹا دیں چنانچہ اس پر عمل بھی ہوا تھا مگر ایک صحابی کو سعی میں اتنی تاخیر ہوئی کہ وہ بت دوبارہ لاکر رکھ دیے گئے۔ اس وجہ سے صحابہ کو یہ دغدغہ پیدا ہوا کہ اب بتوں کی موجودگی میں سعی ہونا چاہیے یا نہیں لہٰذا یہ کہا گیا کہ بتوں کے رکھ دیے جانے کے بعد بھی سعی میں کوئی حرج نہیں ہے اسی کے قریب قریب تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی ہے۔

بہر حال فقہائے جمہور کو اس تعبیر کا یہ پہلو محفوظ رکھنا چاہیے کہ لا جناح ''کوئی حرج نہیں ہے'' کہہ کر جس بات کو کہا جائے وہ ہمیشہ مباح و جائز ہی نہیں ہوتی بلکہ کبھی وہ کوئی واجب چیز بھی ہوتی ہے[2] اس لئے سفر میں جو قصر نماز کا حکم ہوا ہے یہ کہہ کر کہ

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ (نساء ۱۰۱)

''جب سفر میں ہو تو کوئی حرج نہیں ہے کہ نماز کو قصر کرو'' اسے صرف اجازت پر محمول کرنا لازم نہیں ہے بلکہ جس طرح لا جناح کہہ کر صفاؤ مروہ کے درمیان سعی کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ اکثر علمائے امت کے نزدیک واجب ہے[3] اسی طرح نماز کے قصر کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے مگر وہ واجب ہے۔ فقط جائز نہیں ہے اس کی مزید تشریح اسی آیت کے تحت میں ہوگی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝۱۵۹

''بلاشبہ وہ جو چھپاتے ہیں ہماری اتاری ہوئی واضح دلیلوں اور ہدایت کو جب کہ ہم اسے تمام لوگوں کے لئے کتاب

---

[1] ۔ فی الکافی عن الصدقؑ ا لمسلمین کانوا یظنّون انّ السعی ما بین الصفا والمروۃ شیئ صنعہ المشرکون فانزل اللہ ھٰذہ الأیۃ (صافی)

[2] ۔ نفی الجناح یدلّ علی الجواز الداخل فی معنی الوجوب فلا یدفعہ (بیضاوی)

[3] ۔ علیہ اجماع الامامیّۃ واکثر الجمھور (البلاغی) عن ابی حنیفۃ انّہ واجب وعن مالك الشافعی انّہ رکن (بیضاوی) قال الشافعی وغیرہ رکن وبیّن فرضیتہ بقولہ ان اللہ کتب علیکم السعی رواہ بیہقی وغیرہ (جلالین) اس کے یہ معنی نہیں کہ سعی بین الصفا والمروہ نہ کرے تو بھی حرج نہیں کیوں کہ اس کا ارکان حج میں سے ہونا احادیث صحیحہ اور تعامل اُمت سے ثابت ہے۔ (بیان القرآن)

میں صاف طور پر بیان کر چکے ہیں کہ وہ ہیں کہ ان پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں۔''

کتمان حق کرنے والے پر لعنت:

اس کتمان کے معنی ہیں ایک چیز کو جس کے اظہار کا موقع ہو جان بوجھ کر ظاہر نہ کرنا چنانچہ ایسے چھپانے والے علماء وا کابر یہود تھے [۱] اور کتاب سے مراد یہاں توریت ہے جس میں آنے والے پیغمبر کے اوصاف اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے علامات صاف طور پر مذکور تھے [۲] لیکن حکم آیت کا ہر اس جماعت کو شامل ہے جو آیت الٰہیہ اور دلائل ربانیہ کا اخفاء کرے اور لوگوں کو ان سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرے [۳]۔

لعنت کیا لفظ صلوٰات کے مقابل ہے جس طرح وہ توجہ خاص کا نام ہے خدا کی طرف نسبت کی صورت میں اس کے معنی رحمت کے ہوتے ہیں اور دوسروں کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں دعائے رحمت کے۔ اسی طرح لعنت کے لفظ کے معنی خدا کی طرف نسبت کی صورت میں رحمت سے دور کرنے کے ہوں گے [۴] اور دوسروں کی طرف منسوب ہونے کی شکل میں رحمت الٰہی سے دور کرنے کی دعا کے ہوں گے۔

آخری فقرہ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ''ان پر لعنت کرنے والے لعنت کریں گے'' اس کی دلیل ہے کہ مستحقِ لعنت پر لعنت کرنا تقاضائے ایمان ہے جس میں ملائکہ اور احکام الٰہی کی پیروی کرنے والے انسان سب شریک ہیں [۵]۔

اس آیت قرآن کی زد میں سب سے زیادہ علماء کا طبقہ آتا ہے جب کہ وہ روپہلی سنہری مصلحتوں کی خاطر یا اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے حقیقتوں کو عوام سے چھپانے کا مرتکب ہو۔ اس کیلئے تفسیر صافی میں متعدد حدیثیں درج کی گئی ہیں۔

ایک حدیث میں امیر المومنین حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے پوچھا گیا کہ آئمہ معصومینؑ کے بعد بہترین خلق کون ہے؟ فرمایا:

العلمآء اذا صلحوا

''علماء جب کہ وہ ٹھیک طور پر اپنے فرائض انجام دیں''

پوچھا گیا ''اور شیطان وفرعون ونمرود کے بعد بدترین خلق کون ہے؟ فرمایا:

العلماء اذا فسدوا وهم المظهرون للا باطيل الكاتمون للحقائق و فيهم قال الله عزوجل اولئك يلعنهم الله و يلعنهم اللاعنون

---

[۱] ۔کاحبار الیهود (بیضاوی)

[۲] ۔فی الکتاب فی التورٰة (البیضاوی) الکتاب التورٰة (جلالین)

[۳] ۔قیل انه متناول لکل من کتم ما انزل الله وهو اختیار البلغیٰ وهو اقویٰ لانه اعم فیدخل فیه اولئك و غیرهم (مجمع البیان)

[۴] ۔یلعنهم الله ای یبعدهم من رحمة (جلالین)

[۵] ۔اللاّعنون الملئکة و المؤ منون و کل شئی بالدعاء علیهم للعنة (جلالین) وهو التصحیح لقوله تعالیٰ علیهم لعنة الله و الملئکة و الناس اجمعین (مجمع)

یہ بھی علما ہی ہیں جب وہ خراب ہوں اور یہ وہ ہوں گے جو غلط باتوں کو ظاہر کریں اور حقیقتوں کو مخفی کریں۔ان کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے کہ ان پر اللہ اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے۔''

دوسری حدیث: ارشاد نبویؐ ہے جس سے کسی حقیقت کے متعلق سوال کیا جائے جو اس کے علم میں ہو اور وہ اسے مخفی کرے تو روز قیامت اس کے منہ میں آتشیں لجام دی جائے گی۔''

تیسری حدیث نبویؐ: ''جب میری امت میں بدعتیں رونما ہونے لگیں تو عالم پر لازم ہے کہ وہ اپنا علم ظاہر کرے اور ایسا نہ کرے گا تو وہ لعنت الٰہی کا مستحق ہے۔''

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

''مگر وہ جنہوں نے توبہ کی، اعمال درست کئے اور اظہار کر دیا تو یہ وہ ہیں جن کی میں توبہ قبول کروں گا، اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا ہوں رحم کھانے والا۔''

تَوُب کے اصل معنی رجوع یعنی پلٹنے کے ہیں[1]۔اسی لحاظ سے جب اس کی نسبت بندہ کی طرف ہو تو اس کا مطلب ہوتا ہے گناہوں سے پشیمان ہو کر بارگاہ الٰہی میں پیمان اطاعت کے ساتھ رجوع کرنا اور جب اس کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو مطلب نکلتا ہے اس بندہ کے گناہوں کو معاف کر کے اس کی جانب توجہ کو پلٹانا۔

بندہ کے تائب ہونے کا لازمی نتیجہ ہے کردار میں تبدیلی کا ہونا یہاں کام کیا تھا جس کا قبل کی آیت میں ذکر ہوا ہے؟ دلائل حقیقت اور خدا کی طرف کے حق راستے کو چھپانا، تو اس میں عملی تبدیلی کیا ہے؟ حقائق کا ظاہر کر دینا اور واقعیت سے پردہ ہٹا دینا چنانچہ یہ تینوں الفاظ: تابوا واصلحوا وبینوا اس تبدیلی کا مکمل بیان ہے۔

توبہ کریں یعنی نادم ہوں۔اپنے عمل کی اصلاح کریں جو ماضی پر ندامت کا مستقبل میں لازمی نتیجہ ہے اور اس محل پر وہ اصلاح عمل کیا ہے یہی کہ جن چیزوں کو چھپاتے تھے انہیں اب بیان کر دیں[2] یہ ہو جائے تو بلاشبہ اللہ ان کی توبہ کو قبول فرمائے گا۔

وہ دوسرے ہوں گے جن کا جذبہ انتقام مشتعل ہو گیا تو اب وہ کسی طرح فروہی نہیں ہوتا۔اللہ جذبات سے بری ہے بلکہ وہ تو رحمت کے لئے بہانہ چاہتا ہے۔اسی لئے تواب کے لفظ کے بعد پھر رحیم کہا گیا ہے تا کہ مجرم کو مایوسی نہ ہو اور وہ سمجھے کہ

رحمت حق بہانہ می جوید

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ

---

[1] ۔ تابوا رجعوا عن ذلك (جلالین)

[2] ۔بیّنوا ما بیّنه الله فی کتابه لیتم توبتهم (بیضاوی)

وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

''بلا شبہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور مر گئے اس عالم میں کہ وہ کافر ہی تھے یہ وہ ہیں کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور انسانوں سب کی لعنت ہے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے نہ عذاب ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔''

کفر اگر غلط فہمی اور بے خبری سے ہو تو قابل اصلاح ہے اور اس صورت میں جب بھی دلائل حق سامنے آجائیں گے وہ راہِ راست اختیار کر لے گا لیکن کفر جان بوجھ کر بر بنائے عناد ہے تو ایسے ہی لوگ وہ ہو سکتے ہیں جو آخر دم تک اس کفر پر قائم رہیں اور دنیا سے انہیں کافر ہونے ہی کی حالت میں موت آئے۔ اب ان کے لئے اصلاح کا دروازہ بند ہے اور چوں کہ انہوں نے جب تک دم میں دم تھا برابر کفر کو قائم رکھا اس لئے اس کی سزا یہ ہے کہ عذاب بھی اُن پر قائم و دائم رہے، رحمتِ خدا سے دور اور عذاب کا مستحق ہونا ہی لعنت ہے [۱] اور تمام کائنات اس لعنت میں ہم آواز اور متفق ہے یہاں تک کہ جو شعوری طور پر لعنت نہ کریں وہ بھی لاشعوری اور فطری طور پر ایسے اشخاص کو مورد لعن ہی بنا رہے ہیں [۲]۔ یہی وہ لعنت کی ہمہ گیری ہے جسے اجمعین کی لفظ نے ظاہر کیا ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

''اور تمہارا خدا بس ایک خدا ہے سوا اس ہمہ گیر فیض والے بڑے مہربان کے کوئی خدا نہیں ہے۔''

توحید الٰہی کے معنی:

یہ آیت بظاہر تنزیل میں گزشتہ آیات سے مرتبط نہیں ہے بلکہ کسی موقع پر نازل شدہ مستقل آیت ہے جس کا مضمون تقریباً سورہ قل ہو اللہ سے متحد ہے [۳] اسے بعض لوگوں نے جو بزعمت گزشتہ آیات سے متعلق قرار دیا ہے [۴] وہ خالی از تکلف نہیں ہے اور بلا ضرورت بھی ہے۔

اللہ کو ایک کہنا اس طرح نہیں ہے جیسے ہر شے کو جب اکیلا دیکھا جائے تو وہ ایک چیز ہوتی ہے بلکہ اللہ ایک ہے اس معنی میں کہ اس کی ذات میں کسی قسم کی کثرت کا شائبہ نہیں ہے۔ نہ اجزاء ہیں، نہ اقسام ہیں اور نہ افراد پھر وہ اس معنی میں ایک ہے کہ کوئی اس کا مثل و شریک نہیں ہے جیسے لا الہ الا ھو کا لفظ نمایاں کرتا ہے۔

---

[۱] ۔ من طردہ اللہ من رحمتہ فھو معذّب (البلاغی)

[۲] ۔ حتیٰ انفسھم فان الکافرین یقولون لعن اللہ (صافی)

[۳] ۔ ان عباس قال ان کفار قریش قالوا یا محمد صف لنا وانسب لنا ربك فانزل اللہ ھٰذہ الاٰیۃ وسورہ اخلاص (مجمع البیان)

[۴] ۔ اس رکوع میں چونکہ صبر کی تعلیم تھی اور صبر کے معنی طاعات پر قائم رہنا ہے اور نیز ہدایت کے پھیلانے کی تعلیم تھی، اس لیے بتا دیا کہ ہدایت کا اصل الاصول توحیدِ الٰہی ہے (بیان القرآن)

الرحمن الرحیم کی تفسیر بیان ہوچکی ہے۔ یہاں اس کا تذکرہ اللہ کے مستحق عبادت ہونے کی وجہ بیان کرنے کے لئے کیا گیا ہے یعنی مستحق عبادت ہے اس لئے کہ اس کے فیوض عمومی وخصوصی سب کے شامل حال ہیں [1]۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

''یقیناً آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں، رات اور دن کی ادل بدل میں [2]۔ کشتیوں میں جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے والی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں اس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا تو اس سے زمین کو اس کے بے جان ہونے کے بعد جان دار بنا دیا میں جنہیں آسمانوں وزمین کے درمیان قابو میں رکھا جاتا ہے [3]، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیں۔''

قدرت کی نشانیاں:

یہ مصنوعات سے صانع پر استدلال ہے جو وجود خالق کے ثابت کرنے کا فطری اور آسان ترین طریقہ ہے اور یوں تو ان میں سے کوئی ایک چیز بھی اس کے وجود کو بتانے کے لئے کافی ہے مگر ان کو سلسلہ وار تفصیل کے ساتھ بیان کرنا عوامی ذہنیت پر اثر انداز ہونے کا ایک نفسیاتی طریقہ ہے جس سے ان کے ذہن میں بیداری ہوتی ہے۔

ایک مجمل دلیل مثلاً یہ کہ عالم کا حدوث اپنے موجد کی نشانی ہے ایک فلسفی کو منوا دینے کے لئے کافی ہوسکتی ہے مگر سطحی دماغ اس سے اتنا متاثر نہیں ہوتا ہے جتنا کائنات کی بہت سی چیزوں کے یکے بعد دیگرے تابڑ توڑ تذکرہ اس کی توجہ کو اس حقیقت کی طرف مبذول کرتا ہے۔ پھر ان اشیاء میں جو تنوع پایا جاتا ہے وہ ایک فلسفی کے ذہن کو بھی خالق کے فاعل مختار ہونے کی طرف متوجہ کرتا ہے اور ان میں جو فوائد واغراض سے مناسبت پائی جاتی ہے وہ اس کی حکمت کاملہ کی طرف توجہ دلاتی ہے جس سے نہ صرف وجود باری بلکہ اس کے صفات کاملہ کی بھی بقدر ضرورت معرفت ہوجاتی ہے۔

---

[1] ۔ انما قرن الرحمٰن الرحیم بقوله لا اله الّا هو لانه بین به سبب استحقاق العبادة (مجمع) فانه لما كان مولی النعم كلها اصولها وفروعها وما سواها امانعمة او منعم علیه لم یستحق العباعة احمد غیره (بیضاوی)

[2] ۔ الٹ پھیر میں رات اور دن کے (تاج العلماء)

[3] ۔ ابر کہ جو مارا مارا پھرتا ہے آسمان اور زمین کے بیچ میں (تاج العلماء)

ان چیزوں کے ذیل جو صنعت باری کا مظاہرہ ہیں کشتیوں کا تذکرہ باعتبار ان کی روانی کے ہے جو قدرتی ہواؤں کے بل بوتے پر ہوا کرتی تھی، جن میں انسانی کارگزاری کا کوئی دخل نہ تھا[1]۔ یا ان عجائب کے لحاظ سے ہے جو خود دریا کی خلقت میں ودیعت ہیں جن کا مشاہدہ انسان کو ان کشتیوں اور جہازوں کے ذریعہ سے ہوا جن سے انسان دریاؤں کو طے کرتا ہے[2]۔

ایک خیال یہ ہے کہ اس سے انسان کا اقتدار دکھانا ہے کہ اس نے کس طرح دریاؤں کو مطیع بنا لیا ہے[3]۔ مگر آیت کا محل ورود اس کے مطابق نہیں ہے۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیں۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کتاب کو کہا ہے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ''یہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے'' یعنی نشانیاں تو وہ بجائے خود ہیں اور ہر ایک کے لئے ہیں مگر چوں کہ فائدہ ان سے وہی اٹھائیں گے جو سمجھ سے کام لیں اس لئے ان کو اس جماعت سے مخصوص بتایا گیا ہے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان دلائل پر نظر کرنا اور عقل سے کام لینا ہر بشر کا فطری فریضہ ہے جس کے ترک کی صورت میں وہ کسی طرح بھی معذور اور قابل معافی نہیں ہے[4]۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

''اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا اس کے بہت سے ہمسر قرار دیتے ہیں اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں مگر جو صاحب ایمان ہیں وہ اللہ کی محبت کہیں بڑھ کر رکھتے ہیں اور کاش[5] یہ ظالم اس موقع پر کہ جب عذاب کو دیکھ رہے ہوں گے پیش نظر رکھتے کہ تمام طاقت بس اللہ کے لئے ہے اور یہ کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔''

یہ آیت اگر تنزیل میں اس کے ماقبل سے مرتب ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سابقہ قدرت کی نشانیوں کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایک متنفس

---

[1] ۔ كيف سخرت لها الرياح المسماة بالتجارية (البلاغی)

[2] ۔ القصد به الاستدلال بالبحر واحواله وتخصيص الفلك بالذكر لانه سبب الخوض فيه والاطلاع على عجائبه (بيضاوی)

[3] ۔ بيان القرآن ص ۴۴.

[4] ۔ فی هذه الآية ايضا دليل على وجوب النظر والاستدلال وابطال التقليد (مجمع البيان)

[5] ۔ لَوْ کا استعمال کلامِ عرب میں تمنا کے موقع پر بھی ہوتا ہے۔ اسی کے لحاظ سے ہم نے یہ ترجمہ کیا ہے مگر اکثر مفسرین اس کو یہاں شرطیہ کہتے ہیں۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوا کہ اگر یہ ظالم اُس موقع سے پہلے اسے پیش نظر رکھتے تو اس صورت میں کلام ناتمام رہتا ہے لہٰذا کہا جاتا ہے کہ لَوْ یَرِی کا جواب محذوف ہے''۔ ''مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں وہ شرک اختیار کرنے کی جرأت نہ کرتے'' (بیان القرآن) تفسیر صافی میں ہے: قيل جواب لو محذوف اى لندموا اشد الندم میں پہلی صورت کو زیادہ مناسب خیال کرتا ہوں جیسا کہ اس کے بعد کی آیت وقال الذين اتبعوا لو انّ لنا كرّة میں تقریباً تمام ہی مفسرین نے لَوْ کو تمنی کے لیے مانا ہے۔

بھی اللہ کے سوا دوسرے کو ماننے والا نہ ہوتا۔ مگر ان تمام روشن دلائل کے باوجود ایسے آدمی موجود ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کو صفات الوہیت سے متصف سمجھتے اور ان کی عبادت کرتے یا ان کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ اس لئے اس میں صرف سونے چاندی پیتل اور پتھر وغیرہ کے بت داخل نہیں ہیں بلکہ وہ اقتدار باطل کے گوشت و پوست والے دیوتا بھی جو اللہ کے بجائے اپنے سامنے سر تسلیم خم کراتے ہوں اس کے تحت میں داخل ہیں [1]۔

بہر حال یہ پرستاران باطل اپنے معبودوں کے کتنے گرویدہ ہوں پھر بھی چوں کہ اس کے پس پشت کوئی ضمیر کا احساس نہیں ہے اس لئے وہ اس گرویدگی و شیفتگی کے برابر نہیں ہوسکتی جو صاحبانِ ایمان کو اللہ کے ساتھ ہوتی ہے جس کا ثبوت ہر اس موقع پر ملتا رہا ہے جب سچے اللہ کے بندوں اور باطل پرستوں میں مقابلہ پڑ گیا ہے۔

اب اگر دعویداران اسلام میں قدموں کا تزلزل نظر آئے تو اس سے یہی سمجھنا چاہیے کہ ان میں وہ ایمان کا جوہر مفقود یا انتہائی کمزور ہو گیا ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾

''جب پیشوا لوگ ان سے جنہوں نے پیروی کی تھی اظہار بے تعلقی کرتے ہوں گے [2] اور [3] عذاب ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگا اور تمام رشتے ان سے قطع ہو چکے ہوں گے [4]''۔

پرستارانِ باطل سے تبرا:

دنیا میں لوگ آنکھ بند کر کے کسی کے پیچھے چل کھڑے ہوتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ کوئی وقت پڑیگا تو یہ ہمارے لیڈر ہمارے کام آئیں گے مگر جب وقت پڑتا ہے اور سب سے بڑا وقت وہی ہوگا کہ جب عذاب الٰہی آنکھوں کے سامنے ہوگا تو پھر ان لیڈروں کو خود اپنی پڑی ہوگی یہ ان سے جنہوں سے ان کی پیروی کی تھی تبرا کر رہے ہوں گے کہ یہ ہمارے پیچھے بے کار آئے۔ ہم نے ان سے تھوڑی کہا تھا کہ یہ ہمیں پیشوا مانیں۔

یہاں جو تبرّا کا لفظ ہے یہ برات سے ہے جس کے معنی کسی شے یا شخص سے علیحدگی کے ہیں چنانچہ مرض سے چھٹکارے کو اسی لئے برء کہتے ہیں اور کسی شخص سے علیحدگی یا بیزاری کو بھی جو قرآن مجید میں کئی جگہ وارد ہے جیسے بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (التوبۃ۔۱) اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ (التوبۃ ۳) اِنَّنَا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ (ممتحنہ ۴) اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (الزخرف ۲۶)

---

[1] ۔وعلی ھٰذا المعنی ماروی عن جابر عن ابی جعفر علیہ السلام انہ قال ھم ائمۃ الظلمۃ واشیاعھم (مجمع البیان)

[2] ۔ پیچھا چھڑائیں گے (تاج العلماء)

[3] ۔ الواو للحال وقد مضمرۃ وقیل عطف علی تبرّآ (بیضاوی) ہم نے اسی دوسرے قول کو اختیار کیا ہے۔

[4] ۔ قطع اُمید ہو جائے گی سب علاقوں اور وسیلوں کی طرف سے (تاج العلماء)

چوں کہ دنیا میں کچھ عزیز داری کے رشتے ہیں کچھ دوستی اور محبت کے ہیں اور کچھ قول قرار اور عہد و پیمان کے ہیں کچھ مشترکہ مفادات کے ہیں [1] انہی کی بناء پر بہت سی پارٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ وہاں یہ سب رشتے قطع ہو چکے ہوں گے اور حقیقت آنکھوں کے سامنے ہوگی جس سے اب کوئی مفر نظر نہ آتا ہوگا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

''اور وہ جنہوں نے پیروی کی تھی کہتے ہوں گے کہ کاش ایک دفعہ ہمیں واپسی کا موقع مل جاتا تو ہم ان سے یونہی الگ ہو جاتے جیسے یہ ہم سے الگ ہو گئے اس طرح اللہ ان کے کرتوتوں کو غم و غصہ کی صورت میں ان کے سامنے پیش کرتا ہوگا اور اب وہ آگ سے نکلنے نہ پائیں گے۔''

یعنی وہ دار دنیا کی طرف واپسی کی تمنا کرتے ہوں گے [2] جہاں وہ ان کے پیچھے چل کے آج عذاب کے مستحق ہوئے اور وہ ان کے کچھ کام نہ آئے اب وہ اپنی اس گزشتہ پیروی پر نادم و پشیمان ہوں گے مگر اس پشیمانی سے فائدہ کیا جب کہ اب حد تکلیف ختم اور توبہ کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔

کاش وہ آخرت سے پہلے دنیا ہی میں ان پیشواؤں کے متعلق نقد و بحث سے کام لیتے اور کم از کم ان لوگوں کی باتوں کا برا نہ مانتے جو ان کے افعال و اعمال کی قدح کرتے ہیں بلکہ انہیں غور سے سنتے اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تو ممکن ہے اس دنیا ہی میں ان سے تبرا کر لیتے۔

بہر صورت ان آیات کی روشنی میں کم از کم اصل اصول تبرا کو تو مسلمانوں کے درمیان مسلم ہو ہی جانا چاہیے۔ شخصیتوں کی بحث بعد میں ہوتی رہے گی اور پھر جب کھلے دل سے اس پر نظر کی جائے گی تو کوئی وجہ نہیں کہ حق مشتبہ رہ جائے اور صراط مستقیم سے تعارف نہ ہو جائے۔

اس ارشاد سے کہ ''اس طرح اللہ ان کے کرتوتوں کو غم و غصہ کی صورت میں ان کے سامنے پیش کریگا'' بے شک یہ ظاہر ہے کہ کافر اور بد اعمال اشخاص کو روز قیامت پشیمانی ہوگی جیسا کہ دوسری آیتوں سے بھی ثابت ہے مثلاً لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اور وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (الحاقۃ ۵۰) اور ممکن ہے اس دلوں کی حسرت ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہو:

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ﴿۷﴾ (الھمزۃ) ''یعنی خدا کی جلائی ہوئی آگ جو دلوں پر بھڑکتی ہے۔'' مگر اس سے یہ سمجھنا غلط ہے کہ وہی حسرت ہی اس کے لئے موجب عذاب اور ایک آگ ہو جاتی ہے (بیان القرآن س ۱۴۶) بایں معنی کہ اس کے علاوہ نار جہنم کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ غلط ہے اس لئے کہ بکثرت آیات میں اس آگ کے اوصاف شعلہ وری، آواز، چمک وغیرہ کا صاف صاف مفصل ذکر کیا گیا ہے۔ ایسی تفاصیل جن کے بعد مجاز کا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا۔

اس کے علاوہ ایک جگہ کہا گیا ہے: كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا (نساء ۵۶) اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آگ سے کافروں کے جسم جلتے ہیں صرف دل ہی نہیں جلتے۔

---

[1] ۔ الاسباب الوصل التی کانت بینھم من الاتباع والاتفاق علی الدین والاغراض الذاتیۃ الی ذلک (بیضاوی) الوصل التی کانت بینھم فی الدنیا من الارحام والمودۃ (جلالین)

[2] ۔ لو للتمنّی ولذلک اجیب بالفاء (بیضاوی) یقولون لو کان لنا رجعۃ الی الدنیا (صافی)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۶۸

''اے انسانو! اس زمین کی چیزوں میں سے کچھ حلال اور پاکیزہ ہے اسے کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔''

''کھاؤ'' بظاہر حکم ہے مگر مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ ''کھا سکتے ہو[1]''۔

غذا میں جائز اور ناجائز کی تفریق:

انسان اور حیوان میں ایک بڑا فرق ہی درحقیقت یہ ہے کہ حیوان کے افعال صرف ضرورت وطبیعت کے ماتحت ہوتے ہیں اس لئے جب اسے بھوک لگے گی تو پیٹ بھرنے سے مطلب ہوگا۔ جائز و ناجائز کی تفریق سے سروکار نہ ہوگا۔ اگر انسان بھی ایسا ہی ہو گیا تو اس میں اور حیوان میں فرق ہی کیا ہوا! اس کا امتیاز خالص یہ ہے کہ وہ ضرورت اور خواہش کی بناء پر فرائض کے احساس سے غافل نہ ہو جائے اور نہ صرف شخصی بلکہ اجتماعی مفادات اور خالق کے احکام پر بھی نظر رکھے چوں کہ یہ انسانی کردار کا ایک طرۂ امتیاز ہے اس لئے جب کہ احکام شرعیہ میں یا یہا الذین امنوا کہہ کر تخاطب کیا گیا ہے یہاں شکم پری میں جائز ناجائز کی تفریق کا حکم دینے میں یا ایہا الناس کہہ کر مخاطب بنایا ہے جس سے سمجھ میں آنا چاہیے کہ یہ تو تمہاری انسانیت کا ایک امتیازی تقاضا ہے لہٰذا تم کو صرف پیٹ بھرنے سے غرض نہیں رہنا چاہیے یہ تمہاری انسانیت کا ایک امتیازی تقاضا ہے، لہٰذا تم کو صرف پیٹ بھرنے سے غرض نہیں رہنا چاہیئے اور یہیں سے خط فاصل کھنچتا ہے اسلام اور سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے درمیان کہ ان دونوں میں غرض صرف تجوریاں بھرنے یا شکم پر کرنے سے ہوتی ہے اور اسلام ان دونوں باتوں کو حدود و قیود کا پابند بناتا ہے۔ تجوری بھرو مگر ناجائز اموال سے نہیں اور شکم بھی پر کرو مگر اتیام کا حق مار کر نہیں، غریبوں کا گلا کاٹ کر نہیں چوری کر کے اور ڈاکہ ڈال کر نہیں یہ آیت کا ایک رخ ہے۔

دوسرا رُخ اس کا ایک اور ہے۔ وہ یہ ہے کہ حلال وحرام مقرر کرنے کا حق اسی کو ہے جو تمام اشیاء کا خالق اور ان کے مصالح ومضرات پر حاوی ہے۔ انسان کو دل بخواہ کچھ چیزوں کو حرام قرار دے لینے کا حق نہیں ہے اور اپنے نفس کو بلاوجہ ایذا دینا خالق نفس کو پسند نہیں ہے جس طرح بعض مذاہب میں معیار روحانیت یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی بے مقصد اپنے کو تعب ومشقت میں مبتلا کرے اور جسمانی اذیتیں برداشت کرے۔ اسلام اس کا حامی نہیں ہے۔ مسلمانوں میں اکثر صوفیاء کی عبادتیں بھی اس کے تحت میں داخل ہوتی ہیں۔

قرآن نے ایک طرف حلال کی قید لگا دی ہے اور دوسری طرف وہ مجملات کے استعمال کی اجازت دیتے ہوئے متنبہ کرتا ہے کہ کچھ چیزوں کو بلاوجہ حرام سمجھ لینا بھی ایک طرح سے شیطان کی پیروی ہے[2]۔

---

[1] ۔ الامر ھنا للاباحۃ (البلاغی)

[2] ۔ نزلت فی قوم حرموا علی انفسھم رفیع الاطعمۃ والملابس (بیضاوی)

بے شک اس آیت میں حلال کی قید نے اس اجازت کو مجمل بنا دیا ہے اور اب حلال وحرام کی معرفت سے کہ کونسی چیزیں جائز ہیں اور کونسی ناجائز ہیں دوسرے دلائل پر نظر کی ضرورت ہوگی۔ اس کا بیان کرنا اس آیت میں مقصود نہیں ہے مگر تلاش کے بعد جب کسی چیز کی حرمت ثابت نہ ہو تو یہ آیت ضرور بتلاتی ہے کہ پھر اس سے پرہیز کی ضرورت نہیں ہے [1]۔ اس طرح اخباری حضرات کا مسلک کہ وہ شک کی صورت میں حرمت کے پہلو کو ترجیح دیتے ہیں منشائے قرآن کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

''وہ تمہیں بس برائی اور بدکاری کا حکم دیتے ہیں اور یہ کہ تم اللہ پر ایسی باتیں منڈھو جن کا تمہیں علم نہیں ہے [2]۔''

شیطان اصطلاح قرآن میں نام اس کا ہے جو برائیوں کا متحرک ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی اصل فطرت کے مطابق نیکیوں کے خلاف راستہ اختیار نہیں کرتا۔ وہ اپنے ضمیر کے مقابلہ میں بیرونی محرکات سے مغلوب نہ ہو تو اس کا ضمیر اسے نیکی ہی کی طرف لے جائے مگر اپنے ضمیر کے فیصلہ کے خلاف وہ ایک خارجی محرک کے پیچھے ہو لیتا ہے جس سے اس کی شرافت انسانی برباد ہو جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن میں اسے انسان کا کھلا ہوا دشمن کہا گیا اور اب اس دشمن کی پہچان بتائی جا رہی ہے کہ جسے تم دیکھو کہ ان کاموں پر تمہیں آمادہ کرتا ہے [3] بس سمجھ لو کہ یہ وہی تمہارا دشمن ہے جو تمہیں گمراہ کرنا چاہ رہا ہے خواہ وہ کسی انسان کے روپ میں ہو۔

اس آیت کے اخیر میں وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ''اللہ کی طرف ان باتوں کی نسبت دینے کو کہتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں ہے''۔ یہ فقرہ اصول فقہ کی اس بحث میں دلیل بن سکتا ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ دلائل ظنیہ میں اصل عدم حجیت ہے جب تک کہ حجیت پر دلیل خاص نہ قائم ہو۔ اس بحث کو جناب شیخ مرتضیٰ انصاریؒ نے رسائل میں تفصیل کے ساتھ درج فرمایا ہے۔ بے شک اگر کسی طریق ظنی کی حجیت پر دلیل قائم ہو جائے تو چوں کہ اس کا اعتبار منجانب اللہ معلوم ہو گیا لہٰذا اس پر عمل ما لا تعلمون میں داخل نہ ہوگا۔ اس کے بعد صاحب تفسیر صافی کا مدعا [4] جو اخباریت کی حمایت میں ہے ثابت نہیں ہو سکتا۔

ہو سکتا ہے کہ آیت کے دونوں ٹکڑے دو قسم کے لوگوں کا کردار پیش کرتے ہوں۔ ایک وہ جو خدا کی حرام کی ہوئی غذاؤں سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ ان کے لئے کہا گیا ہے کہ شیطان برائی اور بدکاری کا محرک ہوتا ہے اور اس طرح اس سے اشارہ ہوتا ہے کہ حرام غذاؤں کے استعمال سے سواء اور فحشآء پیدا ہوتے ہیں [5] یہ بھی شیطان کی کارستانیاں ہیں اور دوسرے وہ جو حلال غذا کو بھی حرام کیے دیتے ہیں انہیں کہا

---

[1] ۔ هذه الآية ذالة على اباحة الماكل الا ما دل الدليل على حذره (مجمع البيان)

[2] ۔ دل سے جوڑو تم اللہ پر بے جانے بوجھے بات کو (تاج العلماء)

[3] ۔ معنى امره هو دعاه اليه (مجمع البيان)

[4] ۔ فيه دلالة على المنع من اتباع الظن في مسائل الدينية راسا (صافی)

[5] ۔ جیسے مثلاً مردار اور خون کے کھانے سے صحت جسمانی پر بُرا اثر اور گندے اخلاق خنزیر کھانے سے بے حیائی۔ آج یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک اس قسم کی غذا اُس قسم کے صفات انسان کے اندر پیدا کرتی ہے مگر قرآن کریم نے آج تیرہ سو سال پیشتر اس حقیقت کی طرف توجہ دلا کر ایسی چیزوں سے روکا (بیان القرآن)

گیا ہے کہ یہ اللہ کے سر ایسی باتیں منڈھتے ہیں جن کا انہیں علم نہیں ہے یہ بھی شیطان کی وسیسہ کاری ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے اتارا ہے اسی کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا، کیا چاہے ان کے باپ دادا ایسے ہوں جو کچھ سمجھتے نہ ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں۔''

آباؤ اجداد کی غلط تقلید:

دین حق کے اصول عقلی ہیں اس لئے وہ تفکر و تدبر سے نہیں روکتا بلکہ ارباب عقل کو عقل سے کام لینے کی دعوت دیتا ہے مگر اس کے خلاف غلط راستوں کے پرستار اپنے لئے سب سے بڑی دلیل یہ رکھتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد ایک راستے پر چلے آرہے ہیں لہٰذا یہ بھی اسی راستے پر چلیں گے یہ اس کے خلاف کچھ سوچنے ہی کے روادار نہیں ہیں۔

قرآن مجید اس اندھی تقلید سے روک رہا ہے اور یہ کہتا ہے کہ انہیں آباؤ اجداد کی شخصیتوں سے قطع نظر یہ دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ عقل کے مطابق تھا یا نہیں [1]۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اصول اصول ہے اس میں جماعتوں کی کوئی خصوصیت نہیں ہے اس لئے مسلمانوں کا بھی فریضہ اپنے دینی اصول میں یہی ہے کہ وہ ہر بات کو عقل و نقل کی کسوٹی پر لا کر پرکھیں اور پھر اس کے صحت و سقم کا اظہار کریں کسی بھی آواز پر بلا دلیل یہ شور مچانا کہ وہ دیرینہ مسلمات کے خلاف ہے قرآن تعلیمات کی روح کے مطابق نہیں ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

''اور جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو چیخ پکار مچاتا ہو ایسی جس سے وہ خود بھی سوا چیخ پکار کے اور کچھ سنتا سمجھتا نہ ہو۔ بہرے، گونگے، اندھے ہیں کہ کچھ عقل سے کام ہی نہیں لیتے۔''

مطلب یہ ہے کہ کفار جو بکواس کرتے ہیں اس کے خود بھی ان کے ذہن میں کوئی معنی نہیں ہیں جیسے کوئی بے معنی چیخ پکار کر رہا ہو جس سے

---

[1] ۔ الواجب اتباع الدّلیل دون اتباع ھؤلآء (مجمع البیان)

خود بھی کچھ سمجھتا نہ ہو کہ کیا کہہ رہا ہے۔اس طرح ینعق اور لا یسمع دونوں کی ضمیریں الذی کی طرف پھرتی ہیں[1]۔

دوسرے مفسرین نے لا یسمع کی ضمیر اسم موصول کلمہ ما کی طرف راجع کی ہے۔اس طرح ترجمہ یہ ہوتا ہے ''جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کی دہائی ویسی ہے جیسے کوئی ایسے کو صدا دے جو سوا چیخ پکار کے کچھ محسوس نہ کرتا ہو''۔مگر اس صورت میں دشواری یہ محسوس ہوتی ہے کہ کفار تو بتوں کو صدا دیتے ہیں۔وہ ایسی چیز ہیں کہ چیخ پکار بھی محسوس نہیں کرتے لہٰذا اس دشواری کے دفعیہ کے لئے یہ سوچا جاتا ہے کہ یہ تشبیہ مفرد نہیں ہے۔ تشبیہ مفرد میں ایک شے کی تشبیہ دوسرے شے سے ہوتی ہے لہٰذا اگر تشبیہ مفرد ہو تو کافروں کی تشبیہ قرار پائے گی اس پکارنے والے کے ساتھ۔اس صورت میں دشواری پیدا ہوگی لیکن اگر ہم کہیں کہ تشبیہ مرکب ہے تو تشبیہ مرکب میں منظر کی تشبیہ کسی منظر کے ساتھ ہوتی ہے۔یہاں کافروں کو جو ہدایت کی غرض سے پکارا جا رہا ہے اس کی تشبیہ ہے ان حیوانوں کے صدا دینے والے سے مطلب یہ ہے کہ کفار کو جو وعظ و نصیحت کیا جاتا ہے اور ان کی ہدایت کی کوشش کی جاتی ہے وہ ایسی ہی لاحاصل ثابت ہوتی ہے جیسے کوئی جانوروں کو صدا دے جو بس ایک پکار کی آواز تو محسوس کرتے ہیں مگر الفاظ کے معنی نہیں سمجھتے وہی حالت ان کفار کی ہے۔اس طرح مشبہ اور مشبہ بہ دونوں مرکب قرار پاتے ہیں مگر اختصار کے لحاظ سے قرآن میں مشبہ کی طرف پکارنے کا ذکر نہیں ہے،اس لئے کہ وہ مشبہ بہ کے پکارنے کے ذکر سے خود سمجھ میں آجاتا ہے۔بعض لوگوں نے اس مطلب کو یوں بنایا ہے کہ داعی کے لفظ کو محذوف قرار دیا ہے[2]۔اس طرح کے اختصار کی نظیریں قرآن مجید میں اور بھی ہیں جیسے پہلے پارے میں:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۖ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ۔

جس کی تفسیر پہلے پارے میں ہو چکی ہے۔

بے شک یہ صورت تکلف سے خالی نہیں ہے اور اسی لئے کہ اس کی توجیہ و توضیح میں اقوال کی تعداد پانچ تک پہنچ گئی ہے[3]۔مجھے پہلی صورت زیادہ سلجھی ہوئی معلوم ہوتی ہے اس لئے میں نے اس کو اختیار کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾

''اے ایمان لانے والو! پاک ستھری چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں کھاؤ اور اللہ کا شکر کرو تم اسی کی پرستش کرتے ہو۔''

یہ ''کھاؤ'' مثل صورۃً حکم اور معنیً اجازت ہے یعنی لذائذ دنیا کو جو حلال ہوں ترک کرنا تمہیں لازم نہیں ہے ان کو شوق سے استعمال کرو

---

[1] ۔ مثل الذین کفروا فی اقوالهم هٰذه الّتی لا یتفکرون فی فساد معانیها کمثل الاصم الذی ینعق کنعاق الرّاعی فی غنمه بمالا یسمع ولا یمیز من مدالیل نعاقه معنی معقولا (البلاغی)

[2] ۔ علیٰ حذف المضاف تقدیره مثل داعی الذین کفروا کمثل الذی ینعق (بیضاوی)

[3] ۔ ملاحظہ ہو مجمع البیان علامہ طبرسیؒ۔

اور یہ اللہ کی ایک نعمت ہے جس کا تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے۔

اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ میں بعض نے ان کو اذا کے معنی میں لیا ہے۔اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا اللہ کا شکر کرو جب کہ تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔'' یہی صورت اور دوسرے ایسے ہی مقامات پر بھی اختیار کی گئی ہے جیسے فَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اس کا ترجمہ وہ یوں کرتے ہیں: اللہ سے ڈرو جب کہ تم ان پر ایمان رکھتے ہو''۔حالانکہ ان کی شرطیہ لینے کی صورت میں معنی یہ ہوں گے: ''اللہ سے ڈرو اگر تم اس پر ایمان رکھتے ہو۔''

میرے خیال میں اُن کا اِن کے معنی میں تصرف کرنا اس تصور پر مبنی ہے کہ خطاب تو مسلمانوں سے ہے لہٰذا ایمان وہ لائے ہوئے ہیں اور اسی کی عبادت اختیار کر چکے ہیں تو ''اگر'' کہنے کے کیا معنی؟ مگر یہ تصور درست نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ خطاب تو تمام مسلمانوں کی جماعت سے ہے۔یہ سمجھنا کہاں درست ہے کہ ان میں سب حقیقی طور پر ایمان کے جوہر کے حامل اور واقع اس کی عبادت پر عامل ہو ہی گئے ہیں۔

آخر اسی قرآن میں یہ بھی تو موجود ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ النساء ۱۳۶)اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر۔'' اگر ''ایمان والو'' کہنے سے ان کے ایمان کا ثبوت لازم ہو تو پھر ایمان کے مطالبہ کا مفہوم ہی کیا ہو سکتا ہے؟ اسی طرح وہاں تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہا گیا ہے کہ تم زبان سے تو بہر حال ایمان کا اقرار کر چکے ہو لیکن اگر اس اقرار میں واقعیت ہے تو پھر تقویٰ بھی اختیار کرو اور اسی طرح یہاں کہا جا رہا ہے کہ اگر واقعی اس کی عبادت پر تم عامل ہو تو اس کا شکر بھی ضرور ادا کرو۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

''اس نے تم پر بس مردار، خون، سور کا گوشت اور وہ جسے اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو [1]۔حرام کیا ہے ہاں جو شخص ناچار ہو جائے، درآں حالانکہ نہ بغاوت کرنے والا ہو اور نہ آگے بڑھنے والا [2]۔تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

مردار، خون، سؤر کے گوشت اور غیر ذبیحہ کی حرمت:

اس آیت کے شروع میں جو انما کی لفظ ہے وہ انحصار ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے جس کا ترجمہ ہم نے ''بس'' کے لفظ کے ساتھ کیا ہے مگر یہ حصر حقیقی نہیں ہے یعنی یہ مقصود نہیں ہے کہ جتنی چیزیں شرع میں حرام ہیں ان سب کی جامع فہرست مرتب کر دی جائے بلکہ یہ حصر اضافی ہے۔واقعہ یہ تھا کہ مشرکین نے دل بخواہ کچھ چیزوں کو حرام کر رکھا تھا جیسے بحیرہ، سائبہ وغیرہ جن کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ صراحت کے ساتھ آیا ہے۔یہ حصر ان ہی چیزوں کے مقابلہ میں ہے یعنی یہ جو تم نے خواہ مخواہ چیزیں حرام کر رکھی ہیں یہ خدا کی جانب سے حرام نہیں ہیں خدا نے جن چیزوں کو حرام

---

[1] ۔ الاحلال فی الذبیحۃ رفع الصّوت بالتسمیۃ (مجمع البیان)

[2] ۔خواہانِ گناہ نہ ہو اور زیادتی کرنے والا نہ ہو (تاج العلماء)

کیا ہے وہ تو یہ ہیں جن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

اب یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ انہوں نے جو پابندیاں عائد کر رکھی تھیں ان کا دائرہ حیوانات اور وہ بھی بہائم کے اندر محدود تھا اس لئے یہاں بھی جو محرمات بتائے گئے ہیں وہ اسی دائرہ سے متعلق ہیں [1] لہٰذا اس جنس کے غیر میں کوئی شے حرام ہو جیسے شراب، اس کا اس آیت کے حصرے کوئی تعارض سمجھنا ہرگز درست نہیں ہے۔ اسی طرح مچھلی اس دائرہ سے خارج ہے لہٰذا جو ذبح کا طریقہ دوسرے حیوانات میں ہے وہ بھی اس میں جاری نہیں اور اگر کچھ اس کے اقسام کی حرمت احادیث سے ثابت ہو تو وہ بھی اس آیت کے منافی نہیں ہے۔

یہاں جو چیزیں بیان ہوئی ہیں ان میں پہلے میتہ ہے۔ یہ وہ مردہ حیوان ہے جو بطریق شرعی ذبح یا نحر نہ کیا گیا ہو، خواہ خود سے مر گیا ہو یا کسی اور طریقہ پر اس کی جان لی گئی ہو جس کے چند اقسام کو قرآن مجید میں دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے: وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۭ وَمَا ذُبِحَ عَلَي النُّصُبِ (المائدہ ۳)

اگر بعد میں مَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ صراحت کے ساتھ نہ کہا گیا ہوتا تب بھی المیتۃ کے تحت میں اس کی حرمت ثابت ہو جاتی اس لئے کہ ذبح کے شرعی طریقہ میں نام الٰہی کا لیا جانا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو خواہ اس کے گلے پر چھری ہی پھیری جائے وہ میتۃً قرار پائے گا مگر اس قسم کو پھر آخر میں اس کی اہمیت کے لحاظ سے صراحتہً بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

الخنزیر کے ساتھ لحم کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ عموماً کھایا وہی جاتا ہے ورنہ حرام اس کے تمام اجزاء ہیں گوشت کی خصوصیت نہیں ہے۔

جیسا کہ بیان القرآن میں ہے: ان چار چیزوں میں سے اول الذکر تین چیزوں کی حرمت کا ذکر یہود کی شریعت میں بھی ہے۔ چنانچہ مردار کی حرمت (احبار ۱۷:۱۵) میں، خون کی حرمت (احبار ۷:۲۶) میں سور کی حرمت (احبار ۱۱:۷) میں ہے اور گو عیسائیوں نے سور کو حلال کر کے اسے اپنی محبوب ترین غذا بنا لیا ہے مگر حضرت مسیحؑ کے کلام میں اس کو پلیدی ہی قرار دیا گیا ہے جیسے ''اپنے موتیوں کو سوروں کے آگے مت پھینکو'' (متی ۷:۶) سوروں کے چرانے کا بھی برے پیرایہ میں ذکر ہے (لوقا ۱۵:۱۵)

پلید روحیں انسان سے نکل کر سوروں کے گلے میں داخل کی جاتی ہیں (متی ۱۸:۲۲) خود پطرس بھی سور کے ساتھ ان لوگوں کو مشابہت دیتا ہے جو بار بار نگاہوں میں مبتلا ہوتے ہیں یعنی اس کو ناپاک قرار دیتا ہے (۲ پطرس ۲:۲۲)''

نجاست کفار کے مسئلہ پر ضمنی روشنی:

ان محرمات پر نظر ڈالی جائے تو تین چیزیں ان میں سے کی وہ ہو سکتی ہیں جن میں طبی حیثیت سے مضرتیں یا جراثیم ہوں یعنی غیر ذبیحہ اور خون اور سور کا گوشت چنانچہ اب ڈاکٹر لوگ بھی ان چیزوں کی مضرتوں کا احساس و اعتراف کرنے لگے ہیں مگر چوتھی چیز یعنی ما اهل به لغير الله وہ حیوان جسے بغیر اللہ کا نام لئے ہوئے ذبح کیا گیا ہو اس میں طبعی اور طبی مفاد نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہ ظاہر ہے کہ زبان پر نام الٰہی جاری کرنے اور نہ کرنے سے گوشت کی تاثیر میں مادی طور پر فرق نہیں ہوتا۔ جب کہ رگیں اسی طرح قطع ہوں۔ خون اسی طرح بہا۔ ماننا پڑے گا کہ اسے حرام قرار دینا صرف ذہن انسانی میں توحید کی اہمیت اور شرک سے تنفر قائم کرنے کے لئے ہے کہ وہ حیوان بھی جو اللہ کا نام لئے بغیر ذبح ہو یا غیر اللہ کی نیت

---

[1] ۔الحصر فی الآیۃ اضافی بالنسبۃ الی المأکول من الحیوان (البلاغی)

سے ذبح ہو حرام ہو جاتا ہے۔

اس سے ان لوگوں کی تسکین ہونا چاہیے جو نجاست کفار و مشرکین کے مسئلہ میں جو فرقہ امامیہ میں متفق علیہ ہے یہ کہہ کر اظہار استعجاب کرتے ہیں کہ پاخانہ، پیشاب وغیرہ جو نجس ہیں تو ٹھیک ہے کہا اُن میں جراثیم ہو سکتے ہیں جن میں تحفظ حکم نجاست کے ساتھ کیا گیا ہے مگر ایک غیر مسلم جب کہ سامنے وہ پورے اہتمام کے ساتھ نہا دھو کر آیا ہو کس لئے نجس سمجھا جائے۔ انہیں اب محسوس ہونا چاہیے کہ یہ نجاست ویسی ہی ہے جیسی ما اھل بہ لغیر اللہ کی حرمت و نجاست نہ یہ جراثیم کی بناء پر ہے اور نہ جسمانی گندگی و کثافت کی وجہ سے ہے بلکہ صرف ذہن مسلم کو کفر و شرک سے دور کرنے کے لئے ہے، وہ حیوان جو ذاتاً حلال ہے صرف اصنام کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے حرام ہو گیا حالانکہ اس میں اس حیوان کا ارادی عمل شریک نہیں ہے تو وہ انسان جو ارادۃً حق سے دور رہتا ہے اور کفر و شرک اختیار کرتا ہے اگر محکوم نجاست ہو جائے تو اس میں تعجب یا انکار کو کونسا محل ہے۔

جب کہ ہمیں اس شریعت میں یہ نظیر بھی ایک ملتی ہے کہ مسلمان ہو مگر بدبختی سے زنا کر مرتکب ہو تو اس فعل حرام سے جنابت کی حالت میں اس کا پسینہ بھی نجس ہے یہ کیا ہے؟ فقط اس فعل حرام سے تنفر پیدا کرنا حالانکہ وہ شخص اصل اصول دین سے منحرف نہیں ہے تو اگر ایک گناہ کی وجہ سے جو بحد کفر نہیں ہے شرع نے جسمانی نجاست کا حکم نافذ کر دیا تو کفر و شرک کی بناء پر جو نجاست کا حکم ہے اسے جسمانی کے بجائے صرف روحانی ماننے کی کیا ضرورت ہے۔

حرمت کے حکم کے بعد مضطر کا استثناء کیا گیا ہے۔ یہ مضطر ضرر سے مشتق ہے اور اسی سے ضرورت کا لفظ بھی ہے۔ لفظی معنی یہ ہوئے کہ جسے ضرورت ہو مگر ہماری عرف عام میں ضرورت کا لفظ اتنی وسیع ہو گئی ہے کہ انسان کو بھوک لگی ہونا اور کسی اور غذا کا سر دست موجود نہ ہونا ''ضرورت'' کے احساس کے لئے کافی ہے مگر قرآن مجید کا منشا یہ نہیں ہے۔ اسی لئے ترجمہ میں ہم نے یہ نہیں لکھا ہے کہ جسے ضرورت ہو بلکہ ''ناچار ہو جائے'' لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کا انحصار اسی غذا میں ہو جائے [1] اور پھر ارشاد ہوا غیر باغ ولا عاد۔ اگر احادیث میں کوئی تفسیر اس کی وارد نہ ہو اور صرف یہی الفاظ ہمارے سامنے ہوں تو اس کا مطلب ہم یہ سمجھیں گے کہ کراہت نفس کے ساتھ بہ مجبوری یہ عمل ہو۔ یہ شخص باغی یعنی خواہش منداس کا نہ ہو اور نہ وہ حد سے آگے بڑھے یعنی بس جتنے میں زندگی کی حفاظت ہو سکے اس پر اکتفا کرے مگر بعض احادیث اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان دونوں صفتوں کا تعلق خود اس فعل کے ساتھ نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جو بحالت اضطرار اکل میتہ وغیرہ کر رہا ہے بجائے خود حکومت الٰہیہ کے باغیوں اور تعدی کرنے والوں میں نہ ہونا چاہیے چنانچہ کچھ احادیث میں ہے کہ باغی وہ ہے جو امام پر خروج کرے اور عادیؔ وہ ہے جو رہزنی کرتا ہو اور بعض احادیث میں یہ ہے کہ باغی وہ ہے جو تفریحاً شکار کھیلتا ہو اور عادی وہ ہے جو چور ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ وہ ہیں جو مر جائیں مگر ان کے لئے اکل میتہ وغیرہ جائز نہیں ہوگا [2]۔

اہل سنت کی بعض تفاسیر بھی اس سے متفق ہیں [3]۔

---

[1] ۔ خاف علی نفسه من الجوع ولا یجد ما کولا غیره لیسد به الرمق (مجمع البیان)

[2] ۔ اذن فکل من صدق علیه انه باغ او عاد لم یجز له ان یتناول من المیتته وان اضطر الیها اخذا باطلاق الکتاب المجید (البلاغی)

[3] ۔ غیر باغ خارج علی المسلمین ولا عاد متعدّ علیهم بقطع الطریق (جلالین)

یہ غالباً اس بنا پر ہے کہ یہ استثناء تو ایک لطف و کرم اور خصوصی وعنایت ہے لہٰذا اس کے مستحق وہی لوگ ہیں جو باغی اور طاغی نہ ہوں۔
اس لئے خاتمہ پر کہا گیا اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ''اللہ بڑا بخشنے والا ہے مہربان''۔ یہ بخشش گناہ کی نہیں ہے کیوں کہ وہ تو پہلے ہی کہہ دیا گیا کہ اس صورت میں گناہ نہیں ہے، بلکہ اس ''مفسدہ ذاتی'' کو جو ان اشیاء میں ہے، بحالت ضرورت نظر انداز کر کے اس اجازت کا دینا اس کی بخشش ہے جو اس کے رحمت و افضال یعنی حیات بشری کے مفاد کو ملحوظ رکھنے کا تقاضا ہے۔ اس لئے موقع اضطرار میں اس اجازت خالق سے فائدہ نہ اٹھانا بھی کفران نعمت ہے [1]۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۙ اُولٰٓئِکَ مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْہِمْ ۪ وَلَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۴﴾

''بلاشبہ جو چھپاتے ہیں کتاب الٰہی میں سے اسے جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کے بدلہ میں تھوڑے سے دام وصول کرتے ہیں یہ لوگ اپنے پیٹوں میں کچھ نہیں بھرتے سوا آگ کے اور قیامت کے دن اللہ ان سے بات تک نہیں کرے گا اور نہ انہیں کبھی سراہے گا اور ان کے لئے ہے دردناک عذاب۔''

''تھوڑے سے دام'' کے متعلق پہلے پارے کی تفسیر میں آچکا ہے کہ آیات الٰہی کے چھپانے کی قیمت میں جو بڑے سے بڑا نفع بھی حاصل کیا جا سکتا ہے وہ اس مفاد کے مقابلہ میں جو ہاتھ سے جاتا ہے تھوڑا ہی ہوگا [2]۔ اس لئے یہ قلیلاً کا لفظ ان کے خسارے کو دکھلانے کے لئے ہے نہ یہ کہ اگر بہت سا نفع لے کر وہ ایسا کریں تو مورد الزام نہیں ہوں گے۔

''اللہ ان سے بات نہیں کرے گا'' یہ کنایہ ہے اس سے کہ وہ رحمت الٰہی اور توجہ ربانی سے بالکل محروم ہوں گے [3]۔
اس رحمت خدا سے دوری میں روز قیامت کا حوالہ دینا اس کی دلیل ہے کہ اس حال کے بعد کوئی مستقبل ہے جس میں یہ عذاب ہوگا، اس لئے مَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہِمْ اِلَّا النَّارَ سے نتیجہ نکالنا کہ بس یہ مال حرام کا کھانا ہی خود آگ ہے اس کے آگے اور کوئی جہنم نہیں ہے منشائے قرآن کے مطابق نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ اس مال حرام کو آگ اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ اس کا نتیجہ آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہے [4]۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَۃَ بِالْہُدٰی وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَۃِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَہُمْ

---

[1] ۔ فی الفقیہ عن الصادق علیہ السلام من اضطرّ الی المیتتہ والدّم ولحم الخنزیر فلم یاکل شیئا من ذلک حتّی یموت فھو کافر (صافی)
[2] ۔ مھما بلغ ذلک الثمن کان قلیلا بالنسبۃ لمکتمّا نھم ما انزل اللہ (البلاغی)
[3] ۔ فیل ھو کنایۃ عن غضبہ تعالیٰ علیھم (صافی)
[4] ۔ ما یاکلون فی بطونھم الا النّار لانھا مالہ (جلالین) کانھم لم یاکلون الّا النار لان ذلک یؤدّیھم الی النّار (مجمع البیان)

عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

''یہ وہ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور بخشش کے بدلے عذاب کو مول لیا تو کتنے وہ آگ کے برداشت کی تاب رکھنے والے ہیں۔''

''مول لینے'' کا محاورہ پہلے پارے میں آچکا ہے: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ ۖ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (بقرہ ۱۲) وہاں اس کی تشریح ہوچکی ہے۔

آخر کا فقرہ: فَمَا أَصْبَرَهُمْ علی النار قرآن مجید کے ایک خاص قسم کے بلیغ طنزیہ فقرات میں سے ہے۔ صبر کے معنی ہیں قوت برداشت سے کام لینا اور صبر آدمی کی ممدوح صفت ہے مگر وہ جو ممدوح ہے بلند مقاصد اور رضائے پروردگار کی خاطر شدائد ومشکلات دنیا پر صبر ہے جو اولیائے الٰہی کا شعار ہے۔

یہ مشرکین لذائذ دنیا کے حاصل کرنے کی خاطر گمراہی اختیار کرتے ہیں۔ ان سے حق پرستی کی پابندیاں برداشت نہیں ہوتیں۔ حقیقت میں تو یہ انتہائی بے صبری ہے مگر قرآن ایک لطیف پیرایہ میں اس کے انجام کا اظہار کرتا ہے کہ جو واقعی صابرین ہیں ان کا صبر کیا ہے؟ وہ تو تھوڑے دن مصائب جھیل کر ابدی نعمتیں حاصل کریں گے۔ قابل حیرت تو ان لوگوں کا صبر ہے جو عذاب الٰہی اور ابدی لعنت ورسوائی کے برداشت کی طاقت رکھتے ہیں جو کسی انسان میں ہرگز نہ ہونا چاہیے۔

ما اصبرهم کلمہ تو تعجب کا ہے مگر تعجب وغیرہ ایسے صفات سے خداوند عالم بری ہے۔ یہ تعجب اس حقیقت کے اظہار کی ایک صورت ہے کہ آدمی کی اس چیز کے برداشت پر ہرگز تیار نہیں ہونا چاہیے جو اس کے شرف انسانی اور بلندی منزل فطری کے خلاف ہے۔ دوسری طرح یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ الفاظ خداوند عالم کی طرف سے تعجب نہیں ہیں بلکہ اس صورت حال کی فی نفسہ قابل تعجب ہونے کا اظہار ہیں [1]۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿۱۷۶﴾

''یہ اس بناء پر ہے کہ اللہ نے کتاب حق کے ساتھ اتاری اور جنہوں نے کتاب کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کیں [2] وہ بلاشبہ بڑی سخت تفرقہ اندازی میں ہیں۔''

یعنی کتاب تو آئی تھی ان کی شیرازہ بندی کے لئے مگر وہ خود اس سے برسر مخالفت ہو کر سخت تفرقہ اور انتشار کا باعث بن گئے ہیں۔

تفرقہ اندازی کے وصف میں بعید کی لفظ کے معنی سمجھنے میں مترجمین کو دشواری پیش آئی ہے۔ چنانچہ عیسائی مترجم پادری عماد الدین نے

---

[1] ۔هو تعجب لمؤمنين من ارتكابهم موجباتها من غير مبالاة (جلالين) المراد فيه الانكار والتقريع على اكتساب سبب الهلاك وتعجيب الغير منه (مجمع البيان)

[2] ۔حيث قال بعضهم شعر وبعضهم كهانة (جلالين)

تو یہ ترجمہ کر دیا ہے کہ ''وہ زمانۂ بعید کی ضد میں ہیں۔'' میرے نزدیک ''بعید'' کا لفظ عربی محاورہ میں شدت کے اظہار کے لئے آتا ہے [1]۔ اس کے لئے بعد زمانی یہ مکانی کے لحاظ کی ضرورت نہیں ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۱۷۷

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی کا نمونہ تو وہ ہے جو ایمان لائے اللہ اور روز آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر اور اس کی محبت میں [2] مال صرف کرے رشتہ داروں، یتیموں، محتاج، پردیسی اور مانگنے والوں پر اور گلوخلاصی میں [3] اور نماز بجالائے اور زکوۃ ادا کرے اور جو اپنا عہد پورا کرنے والے ہوں جب کوئی قول قرار کریں اور فقر و فاقہ بیماری اور ہنگامِ جنگ میں [4] ثابت قدم رہیں۔ یہ وہ ہوتے ہیں جو سچے ہوں اور یہ ہوتے ہیں پرہیزگار لوگ۔''

اس آیت کا تعلق پھر اسی تبدیلی قبلہ والے مضمون کے ساتھ ہے جس کا بیان اس پارے کے شروع کی آیتوں میں تھا۔

معیار نجات ایمان و عمل:

مطلب یہ ہے کہ اس سمتِ خاص [5] کی طرف رخ کو کوئی بنیادی اہمیت نہیں ہے جس پر نجات کا انحصار ہو۔ یہ تو ایک جماعتی شعار ہے جو

---

[1] ۔ فی اختلاف شدید (مجمع) بعید امدہ (البلاغی)

[2] ۔ یعنی رضائے الٰہی کی خاطر۔ اس صورت میں ضمیر راجع اللہ کی طرف ہے اور بعض مفسرین نے ضمیر مال کی طرف راجع قرار دی ہے: علی حبة للمال (صافی) اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ''مال صرف کرے باوجود اُس کی محبت کے''۔

[3] ۔ گردنیں چھڑانے میں (عماد الدین)

[4] ۔ الباسآء شدة الفقر و الضرّآء المرض و حین الباس وقت شدّة القتال فی سبیل اللہ (جلالین)

[5] ۔ المشرق و المغرب ای نحوهما علیٰ سبیل المثال (البلاغی)

شارع کی طرف سے علامت کے طور پر مقرر کر دیا گیا ہے، کسی مسلمان کو بس اس پر اکتفا کر کے نازاں نہ ہو جانا چاہیے کہ ہم کعبہ کی طرف رخ کرتے ہیں تو بس ہم میں کوئی بلندی آ گئی اصل بلندی کا تعلق ان باطنی وظاہری اوصاف کے ساتھ ہے جو اسے اللہ کا سچا بندہ ثابت کریں۔

ان میں سب سے پہلی چیزیں ایمان ہے جس سے دل ودماغ کی دنیا معمور ہوتی ہے اور پھر افعال واعمال ہیں جن میں حقوق اللہ بھی ہیں اور حقوق الناس بھی۔ انسے تمدن ومعاشرت اور کردار واخلاق کی آراستگی ہوتی ہے جب یہ سب باتیں ہوں اس وقت انسان واقعی ایک نیکوکار شخص سمجھا جاسکتا ہے اور ایک سچا مسلمان اور پرہیزگار قرار پا سکتا ہے [1]۔

قرآن مجید کا انداز بیان بڑے نفسیاتی نکات پر مشتمل ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ ایک ایسی ہستی کا کلام ہے جو خود مزاج وطبیعت سے بری ہے مگر وہ مزاج بشر اور طبیعت انسانی کا خالق ہے اس لئے اس نے اپنے کلام میں اس مزاج وطبیعت کے مقتضیات کو اعلیٰ پیمانہ پر ملحوظ رکھا ہے۔

بہت سی باتیں جب ایک ہی انداز اور لہجہ میں کہی جائیں تو ظاہر ہے کہ ترتیب کلام میں بہرحال ان میں سے کچھ پہلے بیان ہوں گی اور کچھ بعد میں مگر فطری طور پر اور لازماً سننے والے کی توجہ شروع کی باتوں کو سنتے سنتے سلسلہ کے طویل ہونے کی بناء پر کم ہوتی جائے گی اور اب آخری باتوں کو رواروی میں سنے گا اس لئے قرآن نے ایسے موقعوں پر بہت سے عرب فصحا وبلغاء کے دستور کے مطابق [2] درمیان میں دو ایک منزلوں پر اسلوب کلام بدلا ہے۔ جس سے ذہن سامع کو ایک دھچکا لگتا اور اس کی توجہ تازہ ہو جاتی ہے۔ یہاں بے چارے نحویوں کو اپنے قواعد نحویہ کے چسپاں کرنے میں بڑی سرمغزی سے کالم لینا پڑتا ہے مگر فطری گفتگو کے بلیغ انداز ان کے ساختہ وپرداختہ قواعد سے بہت جگہ بے نیاز ہوتے ہیں۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ وہ اپنے قواعد کے مطابق بھی اس کے لئے کوئی اصول تلاش کر کے منطبق کرنے کی کوشش کریں چنانچہ یہاں یہی ہوا کہ ابتدائے کلام ہوئی ولکن البر من امن باللہ یہ من اسم موصول اور امن فعل ماضی۔ اب حروف عاطفہ کے ساتھ متعلقات ایمان کی فہرست آگے بڑھی۔ والیوم الاخر۔ والملائکۃ۔ والکتاب۔ والنبیین یہاں ایمان کے متعلقات ختم ہوئے اور اب امن کے مقابل کا دوسرا فعل آیا حرف عطف کے ساتھ: واتی المال علی حبہ ذوی القربی۔ اب فہرست چلی ان لوگوں کی جنہیں مال دیا جائے: والیتامی۔ والمساکین۔ وابن السبیل۔ والسآئلین۔ وفی الرقاب لیجئے: یہ دوسری فہرست بھی ختم ہوئی۔ اب پھر امن اور اتی المال دونوں پر معطوف تیسرا فعل آیا: واقام الصلوۃ اور پھر چوتھا واتی الزکوۃ۔ اب اس سیاق کا تقاضا کیا ہے، یہ کہ اس کے بعد بھی جو وصف ذکر ہو وہ بصیغہ ماضی آئے اور پھر واحد کے صیغے چلے آرہے ہیں: من امن اور اتی اور اقام۔ تو اس کے بعد بھی واحد کا صیغہ آئے مگر متعلم قرآنی محسوس کرتا ہے سننے والا اب اس سلسلہ کو سنتے سنتے تھک چکا ہے اس کی توجہ میں فرسودگی آ گئی ہے اس لئے جو صفت اس سلسلہ میں بیان کی جائے گی وہ اس کی واجبی اہمیت محسوس نہیں

---

[1] ۔ الیہ اشار النبی ﷺ بقولہ من عمل بہذہ الأیۃ فقد استکمل الایمان (صافی)

[2] ۔ مذھبھم فی الصّفات والنّعوت اذا طالت ان یعترضوا بینھا بالمدح او الذّم ومن ذٰلک قول الشاعر انشدہ انقرّاہ:

الی الملک القرم وابن الھمام ولیت الکلیۃ فی المردحم
وذا الرّای حین تغمّ الامور بذات الصّلیل وذات اللّجم

(مجمع البیان)

کرے گا۔لہٰذا وہ سب جیسے ایک سانس میں کہہ چکنے کے بعد اب چپ ہوتا ہے اور خود بھی دم لینے لگتا ہے۔اس کے بعد اب شروع کرتا تو ایک نئے انداز سے: **والموفون بعھدھم** اب یہ جیسے کوئی نئی بات کہی جارہی ہو۔فعل اسم سے بدل گیا اور واحد کا صیغہ جمع سے تبدیل ہوگیا۔سننے والے کے ذہن پر ایک تازیانہ پڑتا ہے اور وہ چونک کر متوجہ ہوتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ یہ وفائے عہد کردار انسانی کا ایک خاص پہلو ہے جو ان تمام باتوں پر ایمان اور ان تمام نمازوں زکوٰۃ اور خیر وخیرات کے بعد مستقل طور پر انسانی زندگی کا ایک جوہر ہے اور ابھی وہ اس پر غور ہی کر رہا ہے کہ اسلوب قرآنی پلٹا کھا کر ذہن پر دوسرا تازیانہ لگاتا ہے: **والصابرین فی الباساٰء والضرآء و حین الباس** ابھی تو تھا **والموفون** رفع کے ساتھ جیسے مبتداء یا فاعل ہوتا ہے، کیوں کہ عربی میں واؤ اور نون کے ساتھ جمع ایسے ہی محل پر آتا ہے۔اس کے بعد عام توقع کے مطابق کہا جانا چاہیے تھا والصابرون مگر وہاں تو جیسے **الموفون بعھدھم اذاعاھدوا** کہہ کے متکلم پھر چپ ہوگیا تھا اور پھر کسی خاص بات کہنے کے لئے دوبارہ اس نے کلام شروع کیا اور اب تو والصابرین نصب کے ساتھ جیسے مفعول ہوتا ہے جس کی علامت عربی میں جمع کی صورت میں اور نون ہوتی ہے۔اب سننے والے کو اس انداز کے بدلنے سے محسوس ہونا چاہیے کہ جیسے وفا بعہد ایمان اور نماز وزکوۃ کا تتمہ نہیں بلکہ مستقل طور پر کردار انسانی کا اہم رخ تھا ویسے ہی یہ فقر وفاقہ سختی ومرض اور میدان جنگ میں صبر وبرداشت کا جوہر حسن عمل کا ایک مستقل رخ ہے جسے قرآن کو خاص طور پر نمایاں کرنا ہے۔

نحویین نے اسے اپنے قواعد کے مطابق اس طرح بنایا ہے کہ یہ الصابرین منسوب بمدح ہے [1]۔یعنی کیا کہنا ان صبر کرنے والوں کا! یوں ہی سہی اس میں کوئی حرج نہیں ہے مگر اصل نکتہ اس تبدیل اسلوب کا وہ ہے جس پر اپنی کوتاہ فہمی اور کثرت مژر بیانی کی حد بھر ہم نے روشنی ڈالی ہے اور اپنے کام کے سمجھنے کے لئے ذہن میں روشنی پیدا کرنا بھی اسی کا کام ہے۔**وله الحمد او الشّکر**۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾

''اے ایمان والو تم پر ان کے بارے میں جو مار ڈالے گئے ہوں لکھ دیا گیا ہے جان کے میں جان لینا' آزاد کے بدلے میں آزاد، غلام کے بدلے میں غلام اور عورت کے بدلے میں عورت۔ہاں جس کے لئے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ چھوٹ ہو جائے تو پیچھا کیا جائے اچھے عنوان سے اور ادائی بھی ہو خوش معاملگی کے ساتھ۔یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک سہولت اور مہربانی ہے۔اب اس کے بعد جو زیادتی کرے تو اس کے لئے

---

[1] ۔نُصب علی المدح (جلالین)

تکلیف دہ عذاب ہوگا۔''

حکم قصاص:

اسلامی قانون کی خصوصیت عدل واعتدال ہے۔ نہ یہاں انتقام پسندی ہے ایسی کہ عفو وکرم کی گنجایش نہ ہو، نہ عفو پروری ہے ایسی کہ مجرم کو جرم کی پاداش کا اندیشہ ہی نہ ہو۔

جیسے اس نے خود اپنے براہ راست گناہوں میں اپنے لئے ایسا نظام حکمت قرار دیا ہے جس سے بندگان خدا امید وبیم دونوں کیفیتوں کے درمیان رہیں ویسے ہی اس نے انسانوں کے باہمی جرائم میں قانون قصاص کی شکل میں شرعی اصول یہ نافذ کیا ہے کہ مقتول کے وارث کو قاتل سے انتقام لینے کا حق ہے مگر معاف کر دینے کی بھی گنجائش ہے۔

اس قانون کے نفاذ کو اس نے کُتِبَ کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ چوں کہ لکھنے کے بعد ایک نقش قائم ہو جاتا ہے ویسے ہی حکم جو لزومی طور پر نافذ کر دیا گیا اس نے ثابت وقرار حاصل کر لیا چنانچہ دوسرے متعدد مواقع پر یہ لفظ کبھی ایجاب والزام اور کبھی حکم تاکیدی کے معنی میں آیا ہے [1] اور کہیں تقدیر الٰہی کے معنی میں کہ وہ بھر مقررہ فیصلہ ہے [2]۔

یہاں قصاص کا جو حکم بیان ہو رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کو قتل کر دے تو اس کے عوض میں اس شخص کو قتل کر دیا جائے یعنی جان کے بدلے میں جان لی جائے۔

قانون قصاص نیا نہیں تھا بلکہ اس کے پہلے شریعت موسوی میں بھی موجود تھا اور وہاں تصریح کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ: **والجروح قصاص**، یعنی اگر جان سے نہیں مارا ہے زخم لگایا ہے تو اس کے بدلے میں بس زخم لگایا جائے گا۔ شریعت اسلام میں یہی حکم باقی رہا۔ اس کے بعد مولوی محمد علی کا لکھنا بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں قصاص کا حکم صرف قتل کی صورت میں ہے۔ زخموں میں قصاص کا حکم نہیں۔ صحابہ نے ضرورت زمانہ کے لحاظ سے کر لیا ہو تو جزآء سنة مثلها کے تحت ہے (بیان القرآن جلد ا صفحہ ۱۵۵)

قصاص کے مجمل حکم پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے اس لئے کہ انتقام کے معنی میں قصاص عرب میں بھی رائج تھا مگر ان کی ذہنیت یہ تھی کہ قاتل اور مقتول کی حیثیتوں کا لحاظ کر کے اس حکم کا اجراء کرتے تھے اور اس میں انہوں نے اونچے نیچے کی تفریق قرار دے رکھی تھی۔ اگر اونچی ذات کا آدمی نیچی ذات والے کے ہاتھ سے قتل ہو جائے تو وہ کہتے تھے کہ اس شریف آدمی کے بدلہ میں اس غلام کے قتل کرنے سے معاوضہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے عوض کسی ویسے ہی شریف آدمی کو قتل ہونا چاہیے تاکہ برابری ہو جائے اور اگر کوئی عورت کسی مرد کو قتل کر دے تو سمجھتے تھے کہ اس عورت کے قتل ہونے سے برابری نہیں ہو سکتی بلکہ کسی مرد کو قتل ہونا چاہیے۔

اسلام نے اس ذہنیت کو ختم کرنے کے لئے قصاص کا حکم دینے کے بعد تفصیل ضروری سمجھی کہ حکم قصاص میں یہ عدم مساوات غلط ہے۔

---

[1] ۔ایجاب والزام کی مثال: کتب علیکم الصیام (بقرہ آیت ۔ ۱۵۴) کتب علیکم القتال (بقرہ آیت ۔ ۲۱۷) اور حکمِ تاکیدی کی مثال کتب علیکم. الوصیة (بقرہ ۔ ۱۵۱)

[2] ۔جیسے: وابتغوا ما کتب اللہ لکم (بقرہ ۔ ۱۸۸)

کسی بے گناہ کو گناہ کار کے بجائے قتل کرنا درست نہیں ہے بلکہ جو قاتل ہو چاہے آزاد ہو اور چاہے غلام چاہے مرد ہو اور چاہے عورت اسی کو قتل ہونا چاہیے۔ اس کے بجائے دوسرے کو قتل کرنا درست نہ ہوگا۔ اسی لئے بعد میں اعتدال کے دوسرے رخ کو نمایاں کرنے کے لئے ارشاد ہوا کہ اگر اس کا بھائی یعنی وارث مقتول [1] خود معاف کر دے تو جن شرائط پر وہ معافی دے ان شرائط کی پابندی ضروری ہوگی۔

یہ معافی کی گنجائش کا تذکرہ اس کی دلیل ہے کہ ابتدائے آیت میں جو کُتِبَ کہا گیا تھا کہ یہ فرض ہے وہ فرض ولزوم مقابل میں اس قاتل کو قتل کرنا بہر حال ضروری ہے۔ نہیں ایسا ضروری نہیں ہے بلکہ ایسی صورتیں ہیں کہ اس قاتل کو لازماً قتل نہ کیا جائے اور دِیَت وغیرہ پر اکتفا کیا جائے۔ چنانچہ مسلمان اگر ذمّی کو یا آزاد غلام کو قتل کر دے تو جان کے بجائے معاوضہ مالی معیّنہ ہے۔ ہاں کسی دوسرے شخص کو قتل کرنا کسی طرح درست نہ ہوگا۔ الحر بالحرو العبد بالعبد کے یہی معنی ہیں یہ نہیں کہ آزاد کا قاتل کوئی غلام ہو تو اب ڈھونڈ کر اس کے بدلے کسی آزاد کو ہی مارا جائے چاہے بے گناہ ہو اور غلام کا قاتل کوئی آزاد ہو تو کسی غلام کو، چاہے وہ بے گناہ ہو، قتل کر دیا جائے یہ ہرگز مقصود کلام نہیں ہے۔

وارث مقتول کے معاف کرنے کا ذکر ان الفاظ میں کرنا کہ فمن عفی له من اخیه شی ' اگر اس بھائی کی طرف سے اس کے لئے کچھ چھوٹ ہو جائے'' یہ در پردہ اس وارث کو معاف کرنے کی ترغیب ہے کہ آخر یہ قاتل بھی تو مسلمان ہے تمہارا بھائی ہی ہے۔ اگر معاف کر دو تو یہ تمہاری اسلامی اخوت کا تقاضا ہی ہوگا۔

'' کچھ چھوٹ ہو جائے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جان کے بدلے میں جان سے درگزر کر دینے پر راضی ہو جائے [2]۔ کیوں کہ بالکل معاف کرنا تو یہ ہے کہ دیت سے بھی دست بردار ہو جائے۔ اس صورت میں کہا جا رہا ہے کہ '' پیچھا کیا جائے اچھے عنوان سے'' یعنی وارث دیت کا تقاضا جو کرے تو اس میں زیادہ سخت گیری نہ کرے اور ادائیگی بھی ہو حسن سلوک کے ساتھ یعنی قاتل کو لازم ہے کہ دیت ادا کرنے میں بلا وجہ تعویق نہ کرے [3]۔ آخر میں جو کہا ہے فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ '' جو اس کے بعد قدم آگے بڑھائے'' یہ دونوں سے متعلق ہے یعنی خون بہا پر راضی ہونے اور معاف کرنے کے بعد پھر اگر جذبہ انتقام کی تحریک سے اس وارث نے اسے قتل کر دیا تو اب یہ مستحق عذاب ہوگا [4] اور یہ بھی کہ اس قاتل نے اگر اس شرط کو پورا نہ کیا جس کی بنا پر معافی دی گئی تھی تو اب وہ اس کی پاداش کا مستحق ہوگا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

''اور تمہارے لئے اس جان کے بدلے جان والے قانون میں زندگی ہے اے عقل والو! شاید تم بچتے رہو''۔

فلسفۂ قصاص:

ان الفاظ میں فلسفۂ قصاص پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس میں قاتل کی ایک جان جاتی تو ضرور ہے مگر اس قانون کی وجہ سے بہت سی جانیں

---

[1] ۔الذی ھو ولیّ الدّم (صافی)

[2] ۔ای بعض العفو وشیئ منه بان رضی منه بالدیة (البلاغی)

[3] ۔اتباع بالمعروف ھی وصیة لولّی وادآء الیه باحسان وصیّة للجانی (صافی)

[4] ۔ظلم القاتل بان قتله بعد ذلك ای العفو (جلالین)

جو بغیر اس کے جانیں، محفوظ ہو جاتی ہیں لہٰذا اس ضرر کثیر کے دفعیہ کے لئے یہ قلیل ضرر ضرر نہیں ہے بلکہ نفع ہے۔

عرب میں اس محل پر ایک مقولہ رائج تھا کہ القتل انفی للقتل ''قتل قتل کو نابود کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔'' قرآن نے اس کے بجائے وہ الفاظ صرف کیے ہیں۔ جن کی رفعت کے ثابت کرنے میں اس مقولہ کے مقابلہ میں علمائے بلاغت نے دریا بہا دیئے ہیں [1]۔

مگر نمایاں پہلو یہی کیا کم ہے کہ ان کے مقولہ لفظ القتل اصل مقصد کا اظہار نہیں کرتا بلکہ تصور ہوتا ہے کہ وہ ابتدائی قتل کو بھی شامل ہے قرآن نے قصاص کے لفظ سے بتا دیا کہ یہ ابتدائی قتل کی تعریف نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس قتل کی جو پاداش قتل میں بطور سزا ہوتا ہے۔ اس طرح کسی غلط فہمی کا امکان نہیں ہے۔ پھر عرب جس طرح بدلہ لیتے تھے کہ ایک کے بدلے بہت سوں کی جانیں لیتے تھے وہ بھی ان کے مقولہ میں داخل تھا۔ یہاں جو قانون قصاص نافذ کیا گیا کہ النفس بالنفس یعنی مقتول کے عوض میں فقط اس کے قاتل کی جان لی جائے، اس سے ان تمام بے گناہوں کی زندگی ہو گئی جن کی عرب کے غلط نظام مکافات کی بدولت بلا وجہ جان جاتی تھی۔

''شاید تم بچتے رہو''، یہ ''شاید'' کا لفظ اس لئے ہے [2] کہ بچنا انسان کا فعل اختیاری ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اس کے بعد بھی جوش غضب میں عواقب پر غور کیے بغیر اس جرم کا ارتکاب کریں لیکن عام نتیجہ اس قانون کا یہ ضرور ہے کہ اب اس سے لوگ قتل ہونے سے محفوظ رہیں

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

''تم پر لکھ دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی ایک کے سامنے موت آ کھڑی ہو [3] اگر وہ کچھ بھی مال چھوڑے جا رہا ہو تو وصیت کر جائے ماں باپ اور زیادہ قریبی رشتہ داروں کے لئے مناسب طور پر جو پرہیزگاروں کے ذمہ لازمی حق ہے۔''

حکم وصیّت:

حَضَرَ کے لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ موت بالکل سامنے آ جائے مگر مقصود اس سے ان آثار کا ظاہر ہونا ہے جو قرب موت کی خبر دیتے ہیں [4]۔ اس کے ساتھ یہ شرط ہے کہ اگر وہ کچھ خیر چھوڑے، خیر کے لفظ کے ایک معنی کلام عرب میں مال و دولت کے ہوتے ہیں یہاں وہی مقصود ہے [5]۔

---

[1] ۔مثلاً: ما فی القرآن اکثر فائدۃ و اوجز فی العبارۃ و ابعد من التکلّف یتکرار الجملۃ و احسن تألیفا بالحروف المتلائمۃ (مجمع البیان)

[2] ۔لا جل انّ الاتّقآء و التقویٰ امر اختیاری للانسان لا الجآء فیہ قبل فیہ لعلّکم تتقون (البلاغی)

[3] ۔جب آ کھڑی ہو تم میں سے کسی کے سر پر موت (تاج العلماء)

[4] ۔ای قرب منکم بان ظھرت امارا تہ بالمرض ونحوہ (البلاغی) الموت ای اسبابہ (جلالین)

[5] ۔خیرا ای مالا (مجمع البیان وغیرہ)

بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے مفہوم میں کثرت بھی مضمر ہے یعنی تھوڑا سا مال ہو تو وہ ترك خيرا کا مصداق نہیں ہے [1]۔

اس حکم وصیت کے لئے جو کُتِبَ کا لفظ آیا ہے وہ وہی ہے جو اس کے پہلے قصاص کے بارے میں صرف ہو چکا ہے اور اس کے بعد صیام کے بارے میں صرف ہوگا۔ وہ بلاشبہ ان دونوں جگہ وجود ولزوم کا اظہار کرتا ہے مگر وصیت میں وہی لفظ صرف کیے جانے کے باوجود اسے بلاتفریق فرقہ مسلمان واجب نہیں سمجھتے [2]۔

ہم آج جب تقریباً چودہ سو برس کے بعد سوچنے بیٹھتے ہیں تو بہت سے آزاد منش افراد قرآن کی ہر آیت سے اس طرح معنی نکالنا چاہتے ہیں جیسے وہ آج ہی ہم پر نازل ہوئی ہے مگر ہم اسے غلط طریقہ سمجھتے ہیں ہمیں تو اپنی ''منزل شناسی'' کے لئے اس درمیان کے چودہ سو برس کے پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ڈیڑھ ہزار برس کے قریب کی مدت میں اور بالخصوص ابتدائی دور کے لوگوں میں عمل بالقرآن کے ذوق کی ہماری یہ نسبت کمی نہ تھی اور فہم قرآن کے ذرائع قرب عہد کی وجہ سے ان کے لئے ہم سے زیادہ تھے۔ پھر وہ سب اگر کسی مفہوم کے خلاف متفق ہیں جب کہ لغت کا تقاضا اس مفہوم کا تھا اور وہ لغت سے بھی زیادہ نہیں، تو کم از کم اتنے ہی تو واقف ضرور تھے۔ پھر بھی انہوں نے اس آیت قرآن کا مفہوم اس لغت کے موافق نہیں سمجھا تو اس سے ہمیں ضرور سمجھنا چاہیے کہ انہیں مرکز تخاطب قرآن یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی سے اس لفظ کی تشریح اس مقتضائے لغت کے خلاف معلوم ہو چکی تھی اور اسی بناء پر اب اس آیت کی رو سے وصیت کے وجوب کا تصور غلط ہے۔

ہاں کچھ مفسرین اس کے قائل ہیں کہ یہ آیت ابتدائے اسلام کے لئے تھی اور احکام میراث آنے کے بعد منسوخ ہوگئی لیکن مجھے یہ خیال بھی درست معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ اگر وہ منسوخ ہوگئی ہوتی تو پھر وصیت کا وجود ہی شریعت میں نہ رہتا حالانکہ مشروعیت وصیت کی بلاشبہ ثابت اور اس کا استحباب مسلّم ہے۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ کتب کے اصل معنی صرف قانون کے نفاذ کے ہیں۔ اب یہ قانون لزومی ہے یا استحبابی یہ دونوں باتیں مسلمانوں کو ہر ہر جگہ رسالت مآب ﷺ کی تشریح سے معلوم ہوئی ہیں۔ جہاں حضرتؐ نے وجود کے ساتھ تشریح فرمائی وہاں اجماع امت وجوب پر ہو گیا اور جہاں استحبابی کے ساتھ تشریح فرمائی وہاں اجماع استحباب پر ہو گیا اور یہ خود حسبنا كتاب الله کے مقولہ کے خلاف ایک واقعاتی ثبوت ہے۔ اگر صرف قرآن پر دار و مدار کبھی بھی رہا ہوتا تو قصاص، وصیت اور صیام سب کا حکم متحد ہوتا جب کہ قرآن میں سب کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوا ہے لیکن جب کہ ایسا نہیں ہے اور بالاتفاق نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ وہ وجوب از روئے قرآن ثابت ہوا ہے اور نہ یہ استحبابی۔ دونوں باتیں قرآن کے علاوہ اس ماخذ سے ثابت ہوئی ہیں جو قرآن کے ساتھ ساتھ اسی مقصد کے لئے بھیجا گیا تھا۔

وصیت کے ساتھ جو **بالمعروف** کی قید ہے یعنی مناسب طور پر اس کے لئے علیحدہ سے یہ معلوم ہونے کی ضرورت ہے کہ وہ مناسب حد کیا ہے؟ بعید نہیں ہے اس سے اشارہ اس حکم کی ضرورت کی طرف ہو جو احادیث سے ثابت ہے کہ ثابت مال میں وصیت ہو تو بلا رضائے ورثہ نافذ ہوگی لیکن اس سے زیادہ میں اجازت ورثہ پر انحصار رہے گا [3] اور ہو سکتا ہے اسے ہم عرف عام پر چھوڑیں کہ عقل عمومی اس وصیت کو ظالمانہ قرار نہ

---

[1] ۔خیرا ای مالا کثیرا (صافی)

[2] ۔الاجماع علی انّ الوصیة لیست بفرض (مجمع البیان)

[3] ۔المعروف بالعدل بان لا یزید علی الثلث (جلالین)

دیتی ہو[1]۔

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾

''تو جو شخص اسے سننے کے بعد پھر بھی اس میں ادل بدل کر دے تو اس کا گناہ انہی ادل بدل کرنے والوں پر ہوگا۔ یقیناً اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔''

''اس کو سننے کے بعد'' یعنی اسے وصیت کا علم ہو گیا ہو خواہ ذاتی اطلاع کے ساتھ یا ثبوت شرعی کی بناء پر تو پھر اگر اس نے ان امور خیر میں اس مال کو صرف نہ کیا تو گنہ گار یہ ہوگا یعنی موصی کو اس فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے بعد اس پر بھی عمل ہوگا یا نہیں کیوں کہ یہ تو اپنے عمل کا ذمہ دار ہے اور وہ اس وصیت کے ساتھ اپنے فرض سے سبک دوش ہو جائے گا۔ اب کوئی مخالفت کرے گا تو اس کا گنہ گار وہ ہوگا جو مخالفت کرتا ہے یہ اس کا ذمہ دار نہیں قرار پائے گا[2]۔

''سننے والا اور جاننے والا ہے'' چوں کہ موصی کا وصیت کرنا سننے کی چیز ہے اور وصی یا وارث کا اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا دیکھنے کی چیز ہے، اس لئے یہ دو الفاظ صرف کئے گئے ہیں یعنی جو وصیت ہو وہ اسے سننے والا ہے اور جو اس وصیت کے ساتھ سلوک ہو اس کا دیکھنے والا ہے[3]۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾

''اب جو خطرہ محسوس کر کے کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے کج روی یا گناہ کا اور اس بناء پر ان کی میں سمجھوتہ کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔''

یہ تبدیل وصیت کی ممانعت سے استثناء کی شکل ہے[4]۔ مطلب یہ ہے کہ وصیت کی مخالفت حرام ہے لیکن اگر وصیت خلاف شرع ہو یا ورثہ کے ساتھ اس سے بہت زیادہ ظلم و زیادتی ہوتا ہو خواہ ناسمجھی سے یا ارادہ[5] تو پھر ایسی شکل اختیار کرنا چاہیے کہ موصی کا مقصد بھی کسی حد تک پورا

---

[1] ۔بالمعروف ای بالشئی الذی یعرف اھل میزانہ جور فیہ ولا حیف (مجمع البیان)

[2] ۔فان الموصی اذالم یکن مقصر ابتأ خیر ما اوصٰی بہ خرج بالوصیۃ عن عھدتہ واثمہ دینا کان او عینا وبقی الا ثم کلّہ علی المبدل (البلاغی)

[3] ۔سمیع لمّا قالہ الموصی من العدل او الحیف علیھم بما یفعلہ الموصی من التغیر واتبدل (مجمع البیان)

[4] ۔لمّا تقدم الوعید لمن بدّل الوصیۃ بیّن فی ھٰذہ الاٰیۃ ان ذلک یلزم من غیّر حقّا بباطل فامّا من غیّر باطلا بحقّ فھو محسن (مجمع البیان)

[5] ۔الاثم ان یکون المیل عن الحق علیٰ وجہ العمد والجنف ان یکون علیٰ وجھۃ الخطأ. روی ذلک عن ابی جعفر علیہ السلام (مجمع)

ہو اور جو ظلم و زیادتی ورثہ پر ہو رہی ہو وہ بھی برطرف ہو جائے۔

''بخشنے والا مہربان'' کہنا کسی وقوع میں آچکنے والے گناہ کے مقابلہ میں نہیں ہے بلکہ شرعی احکام میں یہ ہر ایک کے حقوق کا لحاظ خود خالق کی رافت و رحمت کا نتیجہ ہے جو تمام احکام شریعت میں کارفرما ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾

''اے ایمان لانے والو! تم پر لکھ دیا گیا ہے روزہ رکھنا جس طرح لکھا گیا تھا ان پر جو تم سے پہلے تھے شاید تم پرہیزگار ہو جاؤ۔''

روزہ کا وجوب:

صیام کے لغوی معنی تو باز رہنے اور چپ رہنے کے ہیں مگر شریعت میں وہ ایک خاص عبادت کا نام ہو گیا ہے جسے ہم اپنی زبان میں ''روزہ'' کہتے ہیں اور جس کے شروط و قیود فقہ اسلام میں معین و منضبط ہیں اور یہ بھی اس کا ثبوت ہے کہ قرآن کو صرف لغت کی مدد سے حل کیا جا سکتا جب تک کہ صاحب شریعت کے بتائے ہوئے تشریحات کو سامنے نہ رکھا جائے۔

''جس طرح تم سے پہلے لکھا گیا تھا'' یہ اصل روزہ کے حکم کی تمثیل ہے یعنی اس طرح کی عبادت امم سابقہ میں بھی رہی ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ قیود و شرائط وغیرہ پہلے بالکل یہی تھے جواب مقرر کیے گئے ہیں [1]۔

بعض روایات میں ہے کہ ادوار سابقہ میں روزہ صرف انبیاء پر واجب تھا۔ امتوں پر نہیں اور یہ اللہ کا اس امت پر فضل ہے کہ اسے گزشتہ انبیاء کی سطح پر قرار دے کر ذمہ داری عائد کی گئی ہے [2]۔

''شاید تم پرہیزگار ہو جاؤ'' یہ روزہ کا روحانی نفسیاتی فائدہ ہے یعنی اس طرح انسان کو خواہشات نفس کے مقابلہ کی مزاولت ہوتی ہے تو اس کی مجموعی زندگی پر اثر پڑتا ہے [3] اور اس کے افعال و حرکات میں وہ ضبط و نظام پیدا ہو جاتا ہے جو تقویٰ کا نتیجہ ہوتا ہے جسے خوف الٰہی اور فرض شناسی وغیرہ کے الفاظ سے ادا کر سکتے ہیں۔

چوں کہ روزہ اس صفت کے لئے مقتضی کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ساتھ شرائط کے حصول اور موانع کے فقدان کی ضرورت ہے اور اکثر روزہ داروں میں ایسا نہیں ہوتا جس سے نتیجہ مطلوبہ یعنی بطور کلی جو ہر تقویٰ کا حصول نہیں ہوتا اس لئے اس نتیجہ کو ''شاید'' کے لفظ سے بیان کیا ہے پھر

---

[1] ۔قد دلّت الآثار علیٰ انّه مختلف بحسب الشرائع فی الحدود و الوقت (البلاغی)

[2] ۔من قبلکم من الانبیاء دون الامم (صافی)

[3] ۔لانه یکسر الشهوة التی هی مبدؤها (جلالین)

یہ بھی کہ یہ تقویٰ امر غیر ارادی تو ہے نہیں جو لازم الوقوع ہو بلکہ فعل اختیاری ہے لہٰذا وقوع اس کا خود ان افراد کے ارادہ سے وابستہ ہے [1]۔

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

''گنتی کے کچھ دن اب جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے ہی دن کسی اور زمانہ میں [2]، اور جو اسے مشکل سے رکھ سکتے ہوں [3] وہ فدیہ ادا کریں ایک محتاج کو خوراک۔ اب جو اپنی خوشی سے کچھ بھلائی کرتے تو وہ اس کے لئے خوب ہے اور روزہ رکھو تو اور بھی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم واقف ہو۔''

صاحبانِ اعذار کا بیان:

پہلے روزہ کے مطلق حکم کا بیان ہوا تھا۔ اب مجملاً بتایا جا رہا ہے کہ وہ سال کے ایک مخصوص وقت میں کچھ دن ہوا کرتے ہیں وہ وقت کون سا ہے؟ یہ پھر بھی ابھی نہیں بیان ہوا۔

اب اس خاص وقت میں اگر عذر درپیش ہو جائے یہ عذر دو طرح کا ہوتا ہے جس کے دو الگ الگ حکم ہیں:۔

ایک عذر بیماری جس میں روزہ مضر ہو [4] اور سفر۔ اس قسم کے عذر کی صورت میں روزہ کا اس زمانہ میں ترک لازم ہے [5]۔ پھر دوسرے زمانہ میں اس کی قضا کرے یعنی جتنے دن کے روزہ ترک ہوئے ہیں ان روزوں کو پھر رکھے، دوسری قسم یہ ہے کہ نہ بیمار نہ سفر میں ہو مگر کسی وجہ سے با آسانی روزہ نہیں رکھ سکتا یعنی روزہ میں اسے غیر معمولی مشقت و زحمت ہوتی ہے۔ اس کی صورتیں احادیث میں یہ بیان ہوئی ہیں کہ کبیر السن ایسا ہے کہ روزہ بہت شاق بن گیا ہے یا حاملہ یا بچہ کو دودھ پلانے والی عورت یا کوئی ایسا شخص جسے پیاس کا عارضہ ہے تو اس صورتوں میں اختیار ہے کہ وہ اس مشقت کو برداشت کرے اور روزہ رکھے اس صورت میں اجر و ثواب زیادہ ہوگا یا روزہ نہ رکھے اور فدیہ دے دے جسے بتایا گیا ہے کہ وہ کم از کم

---

[1] ۔بمعنی لتتقوا بلام الغاية وابدلت بلعلّ لكون التقوىٰ اختيارية (البلاغی)

[2] ۔اس پر وہی مقدار ہے اور دنوں میں سے (تاج العلماء)

[3] ۔الوسع دون الطاقة. فالذين يطيقون الصوم يعني يكون صوم بقدر طاقتهم ويكون نون معه علىٰ مشقة (صافی) یعنی جو بیمار رکھ سکتے ہوں لیکن مشقتِ شاقہ ہو مثل مستسقی وغیرہ کے تو ان پر فدیہ ہے (تاج العلماء) قال فی النهاية الطّوق اسم لمقدار ما يمكن ان يفعل بمشقة منه (البلاغی)

[4] ۔مرض يضرّ به الصّوم ويعسّر كما يدلّ قوله تعالىٰ ولا يريد بكم العسر (صافی)

[5] ۔هٰذا نص فی وجوب الافطار علی المريض والمسافر كما ورد عن أئمتنا فی اخبار كثيرة (صافی)

ایک مسکین کے کھانے کی مقدار ہے اور اس کی تعیین شیعہ اور سنی دونوں کے یہاں ایک مد گیہوں کے ساتھ ہوئی ہے [1] اور اس سے زیادہ دیدے تو بہت اچھا ہے [2] اس صورت میں پھر قضا نہ ہوگی۔

یہ سیاق قرآنی سے بالکل ظاہر ہے کہ یہ حکم بھی ایک قسم کے صاحبانِ اعذار ہی کا ہے لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ بلا عذر بھی انسان روزہ نہ رکھے اور فدیہ دیدے تو یہ کافی ہوگا۔ یہ تصور منشائے الٰہی کے قطعاً خلاف ہے جسے قرآن بھی نہیں بتاتا اور احادیث رسولؐ آئمہؑ اور اجماع امت بھی اسے بالکل باطل قرار دیتے ہیں۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

''ماہ رمضان جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے، سراسر ہدایت تمام لوگوں کے لئے اور صحیح رہنمائی اور امتیاز حق و باطل کی کھلی ہوئی نشانیوں کا حامل تو جو شخص تم میں سے اس مہینہ کو پائے تو وہ اس میں روزہ رکھے اور جو بیمار یا مسافر ہو تو اتنے ہی دن کسی اور زمانہ میں۔ اللہ تو تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہیں مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا اور یہ بھی کہ تم تعداد پوری کرو اور اس بات پر کہ اس نے تمہیں سیدھا راستہ دکھایا۔ تم اللہ کی عظمت کے تقاضے کو پورا کرو [3] اور شاید تم اس کے شکر گزار ہو۔''

ماہ رمضان کی خصوصیت:

یہ ایاما معدودات والے اجمال کی تفصیل ہے کہ وہ معینہ دن جن میں روزہ واجب ہے کون سے ہیں۔ وہ ماہِ رمضان ہے [4] اب اگر فی شھر رمضان کہا جاتا تو یہ مطلب نکل سکتا تھا کہ پورے ماہِ رمضان کے روزے واجب نہیں ہیں بلکہ ماہِ رمضان میں چند دن کے واجب ہیں جیسا کہ

---

[1] ۔ طعام مسکین ای قدر ما یاکل فی یوم وھو مدّ من غالب قوت البلد (جلالین) وقدّر فی الروایات بمدّ من حنطة (البلاغی)

[2] ۔ قیل معناہ من اطتم اکثر من مسکین واحد. وقیل اطعم المسکین الواحد اکثر من قدر الکفایة ویجمع بین القولین قول ابن عباس زیادة الطعام (مجمع البیان)

[3] ۔ خدا کی بڑائی کرو (عمادالدین)

[4] ۔ ای الایّام المعدودات ھی شھر رمضان (صافی)

بعض خود رائے اشخاص یہ نظریہ ظاہر کرتے ہیں کہ تین دن ماہِ رمضان میں روزہ رکھ لینا کافی ہے۔مگر یہاں شھر رمضان بطور ظرفیت نہیں ہے بلکہ شھر رمضان بطور رفع مبتدائے محذوف کی خبر کے ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ۔۔۔وہ کون ہے؟ وہی زمانہ جسے ایاما معدودات کے لفظوں نے ظاہر کیا تھا، وہ رمضان کا مہینہ ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پورا مہینہ ہے جس کے روزے واجب ہیں۔

اس میں قرآن نازل ہوا، حالانکہ پورا قرآن مجید رسولؐ پر تو تھوڑا تھوڑا کر کے تیس برس میں نازل ہوا ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی عالم بالا کی تنزیل ہے جس کی پوری نوعیت کا بیان نہیں ہوا ہے۔بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پورا لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر نازل ہوا۔یہ وہ تنزیل ہے جو ماہِ رمضان میں ہوئی ہے اور وہ بھی اس کی ایک رات میں جو شب قدر ہے جیسا کہ قرآن مجید کی دوسرے آیات میں پتہ دیا گیا ہے[1]۔

''تو جو شخص تم میں سے اس مہینے کو پائے'' یعنی بحالت بلوغ وعقل بغیر سفر ومرض وغیرہ کسی عذر شرعی کے وہ پورا مہینہ اس پر سے گزرے تو وہ پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو بیمار وغیرہ ہو وہ دوسرے زمانہ میں رکھ لے جس کا پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔

اب اس میں دو جز ہوئے۔ایک اس مہینے میں ترک صوم اور دوسرے پھر کسی اور زمانہ میں اس کی قضا کا حکم۔ان دونوں کا سبب بتایا گیا ہے کہ بات یہ ہے کہ اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے مشکل نہیں'' یہ تو پہلے جزء کا سبب ہوا اور یہ بھی منظور ہے کہ تم تعداد پوری کر لو یہ دوسرے حکم یعنی قضا کا سبب ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ ''مقصود یہ بھی ہے کہ تم اللہ کی عظمت کو محسوس کرو کہ اس نے کیسے اچھے اصول تمہیں بتائے اور تم شکر گزار ہو'' گذشتہ دونوں باتیں شکر گزاری کی متقاضی ہیں۔یہ بھی کہ وہ ہمیں مشکل میں ڈالنے کا روادار نہیں ورنہ حکم دیتا کہ چاہے بیمار ہو اور چاہے مسافر ہو، بہر حال روزے رکھنا ہوں گے مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور پھر یہ بھی کہ اس نے ہمیں اس فیض سے پھر محروم نہیں کیا بلکہ ایک دوسرا موقع روزہ کی برکات سے مستفید ہونے کا دیدیا۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

''اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو بلاشبہ میں نزدیک ہوں پکارنے والے کی صدا پر لبیک کہتا ہوں جب وہ مجھے پکارے تو انہیں لازم ہے کہ وہ میری آواز پر لبیک کہیں اور مجھ پر یقین رکھیں شاید وہ نیک راہ پر آجائیں۔''

دُعا اور اس کی قبولیت:

''نزدیک'' ہونا جسمانی نہیں ہے بلکہ وہ نزدیکی اسی اعتبار سے ہے جس کی شرح کر دی گئی ہے کہ مجھ تک عرض داشت بھیجنے کے لئے کسی

---

[1] ۔من اللّوح المحفوظ الی السّماء الدّنیا فی لیلة القدر منه (جلالین) وھو المروی عن ابن ابی عبد الله (مجمع البیان)

نامہ و پیام اور دور دراز ذریعہ کی ضرورت نہیں جہاں پکارو وہاں سننے کے لئے موجود ہوں [1]۔

یہ وسعت خود ہی لامکان ہونے کا ثبوت ہے فلیستجیبوا لی ''لہٰذا وہ میری آواز پر لبیک کہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی دُعا کے سننے میں بعد مکانی حائل نہیں ہوسکتا مگر خود ان کا کردار ضرور حائل ہوسکتا ہے لہٰذا انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اعمال کا خیال رکھیں اور قبولیت دعا کے حق دار بنیں [2]۔ یہ فلیستجیبوا لی ان تمام سوالات کا جواب ہے جو عدم قبولیت دعا پر وارد کیے جاتے ہیں جن میں کبھی دبی زبانی سے خداوند عالم پر معاذ اللہ وعدہ خلافی کا الزام بھی لگا دیا جاتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ میں نے جو انہیں اپنے قانون کی اطاعت کی دعوت دی ہے اسے وہ بھی تو لبیک کہیں [3]۔ بغیر اس کے انہیں مجھ سے کسی خاص عنایت کی امید کرنا بے سود ہے۔

دوسری چیز قبولیت دعا میں یہ سدراہ ہوسکتی ہے کہ وہ دعا نظام حکمت اور خود اس شخص کے حقیقی مفاد کے خلاف ہو اس لئے قبول نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ارشاد ہوا ہے ولیؤ منوا بی یعنی مجھ پر یقین کریں کہ میں ان کا بہی خواہ اور شفیق ہوں اور دعا کی قبولیت پر قادر بھی ہوں [4] لہٰذا بلا وجہ ان کی بات کو رد نہیں کرونگا''۔ شاید نیک راستے پر آجائیں۔ اس کی طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ باتوں کو نظر انداز کرنے سے اکثر آدمی گمراہی میں پڑ جاتا ہے اور خداوند عالم کی حکمت اور فیاضی وغیرہ پر اعتراضات کرنے لگتا ہے جو ہلاکت ابدی کا باعث ہوتے ہیں۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

---

[1] ۔ قریب منہم بعلمی (جلالین)

[2] ۔ فلیستجیبوا لی دعائی بالطاعۃ (جلالین)

[3] ۔ کأنّ ھٰذہ الجملۃ فی مقام الشرط ای ان ارادو اان اجیب دعوتہم فلیستجیبولی (البلاغی) القمّی عنہ قیل لہ انا ندعوا فلا یستجاب لنا قال لانکم لا توفون بعہدہ وانّ اللہ یقول اوفوا بعہدی اوف بعہدکم (صافی)

[4] ۔ عن ابی عبداللہ علیہ السلام انہ قال فلیؤ منوا بی ای ولیتحققوا انّی قادر علیٰ اعطائہم ما سألوا (مجمع البیان)

''تمہارے لئے جائز کیا گیا، روزہ کی رات میں اپنی عورتوں سے مباشرت کرنا، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنی ذات کے ساتھ غداری کرتے رہے ہو تو اب اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف کر دیا ہے۔ لہٰذا اب تم ان سے مباشرت کرو اور جو کچھ اللہ نے تمہاری تقدیر میں لکھا ہے اس کے طلبگار ہو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح ہو کر سفید ڈورا کالے ڈورے سے الگ ہو کر تمہارے لئے نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ کو پورا کرو اور جس حالت میں کہ تم مسجدوں میں اعتکاف کیے ہوئے ہو ان سے مباشرت نہ کرنا۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں۔ ان کے نزدیک نہ جاؤ۔ اس طرح اللہ صاف صاف اپنے احکام لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے کہ شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں۔''

بعض سابق احکام صوم کی منسوخی:

ابتدائے اسلام میں یہ حکم تھا کہ ماہِ مبارک رمضان میں راتوں کو بھی عورتوں سے مقاربت جائز نہ تھی۔ اکثر مسلمان چوری چھپے اس حکم کی مخالفت کرتے تھے۔ اس آیت میں خالق نے اس حکم کو منسوخ فرمایا، اس طرح کہ ان کے گزشتہ کردار پر سرزنش بھی فرمائی اور پھر آئندہ کے لئے معافی کا اعلان بھی کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا حکم اس آیت میں یہ بتلایا ہے کہ افطار کے بعد صبح صادق تک کھانا پینا جائز ہے۔ اس کی حد بتائی گئی ہے: الی الیل یعنی ''رات تک'' ظاہر ہے کہ صرف آفتاب کا نظر سے اوجھل ہو جانا اطلاق لیل کے لئے کافی نہیں ہے جب تک ذرا سیاہی بھی افق پر نہ آجائے۔ اس سے فقہ جعفری کے اس حکم کی تائید ہوتی ہے کہ غروب سے جو حد افطار ہے آفتاب کا غروب حسی یعنی نظر سے چھپ جانا مراد نہیں ہے بلکہ افق سے غروب کرنا مراد ہے جس کا لازمی نتیجہ مشرق کی طرف والی سرخی کا زائل ہو جانا ہے [1]۔ قرآن مجید کے الفاظ اسی کا پتہ دیتے ہیں۔

تیسرا حکم یہ بتایا گیا ہے کہ حالت اعتکاف میں رات دن کسی وقت عورتوں سے مباشرت جائز نہیں ہے۔ آخر میں بتا دیا گیا ہے کہ یہ حدود الٰہیہ ہیں جن کی پابندی لازم ہے۔

الفاظ قرآن میں پہلے حکم میں صاف صراحت قبل والے حکم کے منسوخ کرنیکی ہے مگر دوسرے اور تیسرے حکم میں الفاظ سے اس کی صراحت نہیں نکلتی۔ روایت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی ابتدائے اسلام میں ایک حکم تھا کہ ماہِ رمضان المبارک میں جب آدمی سو جائے تو پھر کچھ کھانا پینا جائز نہیں ہوتا تھا۔ اس حکم کو بھی اس آیت میں منسوخ کیا گیا اس طرح کہ سفید ڈورا یعنی صبح صادق کی پو جو پھوٹتی ہے وہ کالی دھاری یعنی رات کی تاریکی سے ممتاز ہو کر سامنے آجائے اس وقت تک کھانا پینا جائز ہے [2]۔ مگر اس منسوخی کے ساتھ کوئی سرزنش نہیں ہے اس لئے کہ کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ ایک صحابی رسولؐ نے جن کا نام بعض روایت میں خوات بن جبیر ہے اور بعض میں مطعم بن جبیر جنگ خندق میں اتفاق سے درمیان میں سو جانے کی وجہ سے روزہ پر روزہ رکھ لیا اور پھر خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے یہاں تک کہ غش آ گیا تو آیت نازل ہوئی اور وہ حکم

---

[1] ۔ لا یخفیٰ انه عند وجود الحمرة المشرقیة لم یقبل اللّیل (البلاغی)

[2] ۔ مروی علی ابن ابرٰ هیم بن هاشم عن ابیه رفعه الیٰ ابی عبدالله علیہ السلام قال کان الاکل محرّ ما فی شهر رمضان باللّیل بعد النّوم و کان النکاح حراما (باللّیل والنهار) (مجمع البیان)

برطرف کیا گیا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دونوں حکم پہلے بطور امتحان تھے۔اس لئے نتیجہ امتحان کے بعد دونوں برطرف ہو گئے مگر پہلے کا نتیجہ ناکامیابی کی شکل میں جس کے بعد ترحماً آسانی کر دی گئی۔

مرد اور عورت کو ایک دوسرے کی پوشاک کہا گیا ہے، اس لحاظ سے بھی کہ ایک کو بغیر دوسرے کے فطرۃً چین نہیں آتا[1]۔اور اس لئے بھی کہ لباس جس طرح جسم کو چھپا لیتا ہے اسی طرح ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بہت حد تک جنسی بے راہ روی سے محافظ ہے اور اسی لئے شوہر دار عورت یا صاحب زوجہ مرد زنا کرے تو اسے ''زنائے محصنہ'' کہتے ہیں کہ ایک قلعہ کے موجود ہوتے ہوئے اس نے اپنے کو محفوظ نہ رکھا۔

اجازت دیتے ہوئے ان الفاظ کا صرف کرنا کہ وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک، ایک طرح اس اجازت کی وجہ بیان کرنا ہے کہ اس حکم میں واقعی ایک مشقت تھی جسے زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہنا چاہیے[2]۔

مباشرت کی اجازت دینے میں یہ الفاظ: ''جو کچھ اللہ نے تمہاری تقدیر میں لکھا ہے اس کے طلب گار ہو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس امر سے مقصود صرف لذت نفس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اولاد جو نظام بشری کے قیام کے لئے ضروری چیز ہے اور جس کا قدرت نے اس عمل کو ذریعہ قرار دیا ہے۔

تیسرا حکم جو اعتکاف کا ہے اس مناسبت سے بیان کر دیا گیا ہے کہ روزہ جو رات کے وقت مباشرت کی اجازت ہے یہ عام روزوں میں ہے لیکن ایک روزے وہ ہوتے ہیں جن کے ساتھ اعتکاف ہوتا ہے۔

اعتکاف:

اعتکاف کے معنی ہیں نیت کے ساتھ تین دن کچھ خاص مساجد میں[3] قیام کرنا اس طرح کی شب و روز کسی وقت مسجد سے باہر نہ نکلے۔ اس میں ہر روزہ غروب آفتاب کے ساتھ ختم ہو جائے گا اور تمام مفطرات صبح صادق تک حلال رہیں گے مگر مباشرت رات کے وقت بھی حرام رہے گی[4]۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

---

[1] ۔ای ھن سکن لکم وانتم سکن لھنّ کما قال وجعلنا الّیل لباسا ای سکنا (مجمع البیان)

[2] ۔ استیناف بیّن سبب الاحلال وھو قلّة الصبر عنھنّ وصعوبة اجتنابھن (صافی)

[3] ۔ الاعتکاف لا یصحّ عندنا الا فی احد المساجد الاربعة (مجمع البیان)

[4] ۔فی الأیة دلالة علیٰ تحریم المباشرة فی الاعتکاف لیلا ونھارا (مجمع)

''اور اپنے آپس کے مال غلط طور پر نہ کھاؤ[1] اور نہ انہیں حکام تک پہنچاؤ تا کہ لوگوں کے کچھ اموال کو بطور گناہ خورد برد کر جاؤ درآں حالانکہ تم واقف ہو۔''

ناحق مال کھانے اور رشوت ستانی کی ممانعت:

یہاں فقہ کے باب معاملات سے متعلق دو اصول بیان ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک سے بہ کثرت احکام شرعیہ کا فقہاء استنباط کرتے ہیں۔

پہلے یہ کہ اپنے آپس کے مال غلط طور پر نہ کھاؤ یعنی ایک دوسرے کے اموال میں[2] بلا جواز شرعی تصرف نہ کرو۔ اس اکل مال بالباطل میں ہر قسم کا سرقہ، ظلم، غضب، مکر، قمار اور سود خواری کے تمام اقسام سب داخل ہیں۔

کلیہ یہ ہے کہ دوسرے کے اموال جب تک کسی ایسے اصول کے تحت جسے شریعت نے معتبر قرار دیا ہے نہ لئے جائیں ان کا لینا حرام ہے۔ لاٹری وغیرہ اسی میں داخل ہے۔

دوسرے حکام کو رشوتیں دے کر[3] لوگوں کے اموال خورد برد کرنے کی ممانعت۔ اس سے ظاہر ہے کہ علم باری میں اس امت کے اندر غلط حکومتیں قائم ہونے والی تھیں جن کے یہاں حق باطل ہو جائے اور باطل حق ہو جائے ورنہ حکومت اگر حق ہو تو اس سے یہ اندیشہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے ذریعہ سے ایک کا مال دوسرے کا ناحق پہنچے گا[4]۔

''درآں حالانکہ تم خود واقف ہو'' یعنی تمہارا ضمیر خود تمہارے اس فعل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا اور تم محسوس کرتے ہو کہ یہ برا ہے[5]۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

''آپ سے نئے چاندوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں کے لئے اور حج کے واسطے وقت مقرر کرنے کا ذریعہ ہیں اور یہ اچھی بات نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آؤ بلکہ نیکی کا

---

[1] ۔ اور نہ کھا جاؤ تم آپس میں مل بانٹ کے ناحق (تاج العلماء)

[2] ۔ لا کل بعضکم مال بعض (صافی)

[3] ۔ تدلوا بها ای ترسلوها رشوة (البلاغی)

[4] ۔ فی الکافی والعیاشی عن الصادق علیہ السلام فی ھٰذہ الآیة انّ اللہ عزّوجل قد علم انّ فی الأمة حکّاما یجورون والقمی قال العالم قد علم اللہ انہ یکون حکام یحکمون بغیر الحق (صافی)

[5] ۔ وانتم تعلمون ان ذٰلك الفریق من المال لیس بحق لکم وانتم مبطلون (مجمع البیان)

نمونہ وہ شخص ہے جو غلط کاری سے بچے اور تم گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو اور اللہ کے غضب سے بچو شاید کہ تم ہر طرح کی بہترین حاصل کرلو۔''

جو شخص حقیقت سے واقف نہ ہو اسے حیرت تو ضرور ہونا چاہیے کہ آخر اتنا بڑا چاند جو چودہویں نظر آتا ہے کیا ہو جاتا ہے جو گھٹ کے اتنا باریک نظر آتا ہے جسے ہلال کہتے ہیں اور پھر یہ بڑھتا کیوں کر ہے جو ماہ کامل کی شکل میں دکھائی دیتا ہے چنانچہ لوگ اسے بار بار پوچھنے رسولؐ کی خدمت میں آئے مگر اس کا جو فلسفہ ہے وہ بتانے پر بھی ان کی سمجھ میں نہ آتا لہٰذا وحی الٰہی نے پیغمبرؐ کی زبانی ان کے ذہن کو اس کے فوائد کی طرف متوجہ کیا جو فرائض و اعمال سے متعلق ہیں۔ ارشاد ہوا کہ اس سے لوگوں کے لئے اوقات مقرر ہوتے ہیں۔

چاند کا حساب نہ کہ سورج کا:

''لوگوں کے لیے'' عام ہے اس میں انکی دنیوی ضروریات بھی داخل ہیں جیسے قرضوں کی ادائیگی وغیرہ اور دینی ضرورتیں جیسے بیوہ کی عدت ماہ رمضان کے روزے اور عید الفطر وغیرہ۔ حج بھی اس میں داخل تھا مگر اس کی اہمیت کی بناء پر خصوصیت کے ساتھ ذکر کر دیا۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رجحان کہ روزہ وغیرہ کو شمسی حساب سے مقرر کیا جائے قرآنی نص کے خلاف ہے۔

گھروں میں دروازوں سے داخل ہو:

''گھروں میں پشت کی طرف سے داخل نہ ہو۔ دروازوں سے داخل ہو''۔ یہ حکم یوں تو مکان کے اندر دروازہ سے داخل ہونے کو صاف بتاتا ہی ہے مگر صرف یہ مفہوم ہو تو اس کا جوڑ قبل والی بات سے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بے شک یہ ارتباط اس تفسیر سے دل نشین طور پر سمجھ میں آجاتا ہے کہ تمہیں کوئی دینی سوال کرنا ہو تو جو اس کا مرکز ہے وہاں ضرور آؤ۔ ادھر بھٹکتے نہ پھرو غلط راستے اختیار نہ کرو اور ہر کام کو اس راہ سے انجام دو جس طریقہ سے اللہ نے حکم دیا ہے [1]۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متواتر حدیث: انا مدینة العلم وعلی بابها فمن اراد العلم فلیات الباب (یعنی ''میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے تو جو علم حاصل کرنا چاہیے اسے دروازہ پر آنا چاہیے'' اسی ارشاد خداوندی کی طرف ناظر ہے [2]۔

دوسرے ایمہ معصومین علیہم السلام کے لئے بھی اسی معنی سے ابواب اللہ کا لفظ وارد ہوئی ہے [3]۔

اتقاء کے معنی بچنے کے ہیں جب اس کی نسبت اللہ کی طرف دی جائے جیسے واتقوا اللہ میں ہے تو اس سے مقصود عمل میں اس کی مخالفت سے اور نتیجۃً اس کے غضب سے بچنا ہوتا ہے [4]۔

یہی اس سے بچنے کا احساس مستقل تقویٰ کہلاتا ہے جس کا ''پرہیز گاری'' سے بھی ترجمہ ہوتا ہے اور اسی کے مدارج و مراتب کے ساتھ

---

[1] ۔عن الباقر علیہ السلام فی قولہ عزوجل واتوا البیوت من ابوابہا قال ان یوتی الامر من وجھہ ای الامور کان (البلاغی)

[2] ۔پس شہر علم میں بھی کہ جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں گزر ممکن نہیں بغیر اس کے دروازہ کے جو حضرت امیرؑ ہیں (تاج العلماء)

[3] ۔قال ابو جعفر علیہ السلام آل محمّد ابواب اللہ ووسائلہ والدّعاۃ الی الجنۃ (مجمع البیان)

[4] ۔ معناہ واتقوا ما نہاکم اللہ عنہ وزھدکم فیہ (مجمع)

اسلام میں انسانی فضیلت کے مراتب قائم ہوتے ہیں (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾

''اور اللہ کی رہ میں لڑو ان سے جو خود تم سے لڑتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو یقیناً اللہ تعالیٰ تجاوز کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا [1]''

جنگ اور اس کے حدود و قیود:

اس آیت میں صاف اسلام کا اصول جو تشدد اور عدم تشدد کے بارے میں ہے ظاہر ہوجاتا ہے وہ جارحانہ جنگ کا حامی نہیں ہے۔ اس لئے قید لگادی ہے کہ ''جو خود تم سے جنگ کرتے ہیں''۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابتدائے جنگ دوسروں کی طرف سے ہے مگر اس ابتدا ہوجانے کے بعد وہ مطلق ''عدم تشدد'' کا بھی قائل نہیں ہے۔ اس لئے اس صورت میں قاتلوا کہہ کر اجازت ہی نہیں بلکہ حکم دیتا ہے کہ اُن تم جنگ کرو اور واضح رہے کہ یہاں جہاد کا حکم قاتلوا کے لفظ سے ہے جو صاف اسلحہ جنگ سے مقابلہ کو ظاہر کرتا ہے جاھدوا نہیں ہے جسے جدوجہد سے لے کر بعض لوگ مقاومت مجہول وغیرہ پر بھی منطبق کر لیتے ہیں۔

بے شک جنگ کے بعد بھی وہ اس مادی ذہنیت سے روکتا ہے کہ جب لڑائی ہے تو اب دشمن کے ساتھ ہر سلوک جائز ہے بلکہ وہ پھر بھی کچھ اخلاقی اور انسانی حدود کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جنگ کے بعد بھی تمہیں حدود کا پابند رہنا ضروری ہے اور ان میں سب سے بڑی حد یہ ہے کہ جب اصول کے تحفظ کے ساتھ صلح کا امکان پیدا ہوجائے تو پھر جنگ قائم رکھنے کے کوئی معنی نہیں۔

حضرت امام حسنؑ کی صلح کو اس روشنی میں دیکھا جائے تو اس کی حقانیت صاف صاف نظر آجائے گی۔

قاتلوا کے ساتھ خاص قید فی سبیل اللہ کی ہے جس کی لفظی معنی تو ہوئے ''اللہ کی راہ میں'' مگر راہ کا مطلب کیا؟ اگر منزل مادی ہو تو اس تک پہنچانے والا کوئی مادی راستہ ہوگا مگر خالق تو کسی سمت و جہت میں نہیں ہے تو اس کی راہ کا مطلب ہے وہ دینی تقاضے جو اسے مقصود و مطلوب ہیں [2]۔

ہوا و ہوس میں گرفتار جاہ و حشم کے بھوکے اور اقتدار پسند خطا کار انسانوں سے اس کی شناخت میں یقیناً غلطی کا اندیشہ ہے اور معاملہ انسانی نفوس کا ہے۔ اس لئے اسلام کا حقیقی تعلیم میں جو فقہ جعفری کی صورت میں محفوظ ہے سوا تحفظ اختیاری کی صورت کے جسے دفاع کہتے ہیں جہاد کو اجازت معصومؑ کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے اور اسی بناء پر ہمارے یہاں یہ مقولہ عام ہے کہ غیبت امامؑ میں جہاد حرام ہے۔

---

[1] ۔ اور زیادتی نہ کرو کہ بے شک خدا نہیں دوست رکھتا زیادتی کرنے والوں کو (تاج العلماء)

[2] ۔ فی سبیل اللہ ای فی دین اللہ وھو الطریق الذی بیّنہ للعباد لیسلکوہ علیٰ ما امرھم بہ ودعاھم الیہ (مجمع البیان)

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾

''اور انہیں مار ڈالو! جہاں انہیں پاؤ اور انہیں نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا اور فتنہ پردازی قتل سے بڑھ کر ہے۔ ہاں مسجد الحرام میں ان سے اس وقت تک نہ لڑو جب تک وہ اس میں تم سے نہ لڑیں لیکن اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی انہیں قتل کرو اسی طرح ان کافروں کو سزا ملے گی۔''

اب یہ جنگ چھڑ چکنے کے بعد سے متعلق ہدایتیں ہیں کہ اس کے بعد ان کے جان و مال کا احترام باقی نہیں رہے گا اور اب کسی رعایت کی ضرورت نہیں کیوں کہ آغاز جنگ ادھر سے ہو چکا اور اب اگر تم انہیں قبضہ پا کر مکہ سے نکال بھی دو تو تمہاری زیادتی نہیں ہے اس لے کہ وہ تمہیں اس کے پہلے گھر سے بے گھر کر چکے ہیں [1] مگر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے رسولؐ نے قبضہ پانے کے بعد اس اجازت ربانی سے فائدہ نہیں اٹھایا اور جائز انتقام بھی نہیں لیا بلکہ فتح مکہ میں سب کو عام معافی دیدی۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ''فتنہ پردازی قتل سے زیادہ بری چیز ہے''۔ یہ فقرہ خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہ آیت کسی خاص واقعہ کی طرف ناظر ہے اور یہی ایسے مقامات ہیں جن میں خود قرآن و حدیث اور تاریخ کے مطالعہ کی تشنگی پیدا کرتا ہے چنانچہ شان نزول کے بارے میں یہ روایت ملتی ہے کہ کسی مسلمان نے غلطی سے ان مہینوں میں سے کسی میں جن میں جدال حرام سمجھا جاتا تھا (محرم، رجب، ذیقعد، اور ذی الحجہ، کسی کافر کو قتل کر ڈالا تھا۔ اس پر مشرکین نے پوری اسلامی جماعت کے خلاف ایک طوفان اشتعال انگیزی کا اٹھا دیا تو قرآن مجید نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ بات اس مسلمان کی بری تو ضرور تھی مگر تم نے جو ایک شخص کے انفرادی فعل پر پوری جماعت کے خلاف شورش اٹھا دی ہے یہ اس ایک آدمی کے قتل سے زیادہ بری چیز ہے۔

فتن کا لفظ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر مسلمانوں کو جبر و تشدد کے ساتھ دین حق سے ہٹانے کی کوشش کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، ہوسکتا ہے الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ سے مشرکین کا یہ جبر و تشدد ہی مراد ہو جو وہ مسلمانوں پر کرتے رہے ہیں [2]۔

اس کے بعد پھر مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ حالت جنگ میں بھی تم کو اپنی جانب سے مقدسات کے احترام کو بھی ادھر سے توڑا جائے تو تمہیں جواب دینا درست ہے۔

جس طرح ہم نے کہا کہ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ کے حق سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسی طرح اس

---

[1] ۔ اخرجوهم من مكة كما اخرجو كم منها (صافی)

[2] ۔ الفتنة و صرف المؤمنين عن دينهم و اضلا لهم كما قال جلّ اسمه فی سورت لبروج ان الذين فتنوا المؤمنين والمؤمنات ثم لم يتوبوا فلهم عذاب جهنّم ولهم عذاب الحريق (البلاغی)

اذن خداوندی سے کہ اگر دوسرے بلد الحرام میں خونریزی کرنا ہی چاہیں تو تم پھر تلوار اٹھا سکتے ہو پیغمبر خداؐ کے وارث حضرت حسین علیہ السلام نے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ دوسروں کی طرف سے خونریزی کے اسباب فراہم ہوئے تو خود عین موقع حج پر حرم خدا سے باہر نکل کر حرمت خانہ کعبہ کو محفوظ رکھا۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾

''اب اگر وہ باز آ جائیں تو بلاشبہ اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔''

یعنی اسلام لانے کے بعد [۱] پھر سابق میں جو کچھ وہ کر چکے ہیں اس کا کوئی محاسبہ نہیں ہوگا۔ نہ مسلمانوں کو اب اس دنیا میں ان سے انتقام لینے کا حق ہوگا اور نہ آخرت میں خدا کے یہاں اب انہیں سزا کا استحقاق۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

''اور ان سے اس وقت تک لڑو کہ کوئی شورش نہ رہے اور پوری پوری اطاعت [۲] اللہ کی ہو جائے۔ ہاں اگر وہ باز آ جائیں تو زیادتی نہیں کی جا سکتی مگر انہی پر جو خود زیادتی کرنے والے ہوں [۳]''

واضح ہونا چاہیے کہ جو ظلم و زیادتی کرنے والے ہوں ان کے ساتھ جو سلوک ہو وہ درحقیقت خود زیادتی نہ ہوگا مگر اسے عدوان یعنی زیادتی عرب کے اس محاورہ کے مطابق کہا گیا ہے کہ جو کسی شے کی سزا ہے وہ اسی نام سے موسوم کر دی جاتی ہے جیسے شاعر نے کہا ہے: فدنا ھم کما دانوا اور عرب کا مقولہ ہے کما تدین تدان [۴]۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

''حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے عوض میں ہے اور حرمتوں میں بھی ادلا بدلا ہے [۵] تو جو شخص تم پر زیادتی

---

[۱] ۔ان انتھوا عن القتال والشرك (صافی)

[۲] ۔الذین ھھنا الاذعان بالطاعۃ (مجمع البیان)

[۳] ۔زیادتی کا وبال ظالموں پر ہوگا (عماد الدین)

[۴] ۔سمّی الجزاء باسم الابتداء للمشاکلۃ وازدواج الکلام کما فی قولہ سبحانہ وجزآء سیئۃ سیئۃ مثلھا ومثلہ فاعتدوا علیہ (صافی)

[۵] ۔آبرودار مہینے بدلے میں آبرودار مہینے کے اور سب آبرودار مقام برابر ہیں (تاج العلماء)

کرے تو جیسی اس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے ویسی ہی زیادتی تم اس کے ساتھ کرو اور اللہ کے غضب سے بچو اور جانتے رہو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔''

محترم مہینے یعنی وہ جن میں عرب غالباً سنت ابراہیمی کے اثر سے [1] جدال وقتال حرام جانتے تھے جیسا کہ پہلے بیان ہوا چار تھے۔ انہی میں ذیقعد کا مہینہ تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ کے ارادہ سے مکہ معظّمہ کی طرف روانہ ہوئے مگر مشرکین آمادہ جنگ ہو کر سدراہ ہوئے جس کے نتیجہ میں صلح حدیبیہ ہوئی۔ یہ ان کا آمادہ جنگ ہونا یقیناً شہر حرام کے احترام کے خلاف تھا مگر انہوں نے اس کی پروانہ کی۔ اس کے بعد معاہدہ کے مطابق دوسرے سال رسول اللہؐ پھر اسی مہینے میں عمرہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اب مشرکین تو تین دن کے لئے مکہ سے باہر چلا جانا پڑا جس سے ان کو بڑی ناگواری محسوس ہوئی، اسی ناگواری کا قرآن مجید اس آیت میں جواب دے رہا ہے کہ اگر اس دفعہ اس ماہ محرم کی حرمت کا تم نے لحاظ کیا ہوتا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سکون واطمینان کے ساتھ حج کر لینے دیا ہوتا تو اس دفعہ تمہیں اسی مہینے میں یہ مشقت وزحمت کیوں اٹھانا پڑتی۔

اب انہوں نے جو پیغمبرؐ کے سدراہ ہو کر جنگ کا اقدام کیا تھا اس میں ظرف زمان کے تقدس، ظرف مکان کے تقدس ارادہ مقدس یعنی احرام حج یا عمرہ کے تقدس سب کو نظر انداز کیا گیا تھا اس لئے ارشاد ہوا **والحرمات قصاص** حرمتوں کا سب کا معاوضہ [2] اور یہ ایک کلیہ ہے جس میں ہر ایسی چیز داخل ہے جس کا پاس ولحاظ انسان کے لئے ضروری ہے [3]۔

آخر میں پھر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ تم کبھی اپنی طرف سے پہل نہ کرو۔ ہاں جو زیادتی تمہارے ساتھ جس طرح ہو اس طرح تم اس کے بدلہ لے سکتے ہو۔

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

''اور خدا کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو اور حسن عمل اختیار کرو، بلاشبہ اللہ اچھے اعمال والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو:

یہ آیت قبل کے مضامین سے غیر مرتبط معلوم ہوتی ہے اور چوں کہ ترتیب موجودہ کا تنزیل کے موافق نہ ہونا یقینی ہے اس لئے خواہ مخواہ قبل سے مرتبط بنانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔

---

[1] ۔لعل الاصل فی حرمتها شریعة ابراهیم کحرمت البیت فاستمر العرب علیٰ ذٰلك وامضاه الاسلام (البلاغی)

[2] ۔انما جمع الحرمات لانه اراد حرمة الشعر وحرمة البلد وحرمة الاحرام (مجمع البیان)

[3] ۔ای کلّ حرمة وهی ما یجب ان یحافظ علیها یجری فیه القصاص (صافی)

اس آیت میں پہلا جزء تو ظاہر بظاہر اموال سے متعلق ہے بے شک تاویل کے ساتھ اسے عام بنایا جاسکتا ہے کہ راہ خدا میں خرچ کرو مطلق ہے۔اس میں جان و مال دونوں داخل ہیں اور اس طرح معرکہ جہاد میں جان نثاری بھی اس کے تحت میں داخل ہے مگر الفاظ کا ظاہری مفہوم اتنی وسعت یقیناً نہیں رکھتا۔

اس کے برخلاف دوسرا فقرہ ''اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو'' اپنی جگہ پر دیکھا جائے تو وہ جان سے متعلق معلوم ہوتا ہے اور اسی بناء پر خودکشی کے جرم ہونے پر اس سے استدلال عموماً کیا ہی جاتا ہے لیکن چوں کہ یہ فقرہ پہلے فقرہ کے ساتھ وارد ہوا ہے تو اب ذہن میں یہ مفہوم آتا ہے کہ یہ بھی انفاق سے متعلق حکم ہے۔مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں صرف کرو مگر اس طرح نہ لٹاؤ جس سے خود تباہ ہو جاؤ چنانچہ ایک حدیث میں جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے اس آیت سے اس حکم پر استشہاد کیا گیا ہے [1]۔

ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ پہلے ہی فقرہ کی تاکید ہے یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اس میں بخل سے کام لے کر اپنی ہلاکت کا باعث نہ بنو۔ اس صورت میں ہلاکت سے مراد ہلاکت اخروی ہے۔

علامہ طبرسیؒ کا خیال ہے کہ آیت کے مفہوم کو عام کیوں نہ لیا جائے جس میں یہ سب معنی داخل ہو جائیں [2]۔مگر یہ اسی وقت مناسب ہے کہ جب پہلے فقرہ کو بھی جان و مال دونوں سے عام سمجھا جائے جو خالی از تکلف نہیں ہے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۪ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

''اور اللہ کے لئے حج اور عمرہ کو پورا کرو۔اب اگر مجبور ہو جاؤ تو پھر جو کچھ قربانی میسر ہو اور اپنے سر اُس وقت تک نہ

---

[1] ۔عن ابی عبد اللہ علیہ السلام لو ان رجلا انفق ما فی یدیه فی سبیل اللہ ما کان احسن ولا ارفق لقوله سبحانه ولا تلقوا بایدکم الی التهلکة (مجمع البیان)

[2] ۔الاولیٰ حمل الآیة علیٰ جمیع هٰذه الوجوه ولا تنا فی فیها (مجمع) الی التهلکة الاسراف و تضیع وجه المعاش وبکلّ ما یؤدّی الی الهلاك (صافی)

منڈاؤ اور جب تک کہ یہ قربانی اپنی جگہ تک نہ پہنچ جائے۔ اب شخص تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی دکھ ہو تو اس کا بدلہ ہوگا روزہ یا خیرات یا قربانی سے مگر جب تمہیں اطمینان حاصل ہو جائے تو جو شخص عمرہ کر کے حج کے موقع تک لذائد سے بہرہ مند ہو رہا ہو [1] اسے لازم ہے کہ جو کچھ میسر ہو قربانی کرے اور جسے قربانی نہ مل سکے اس کے ذمہ ہیں تین روزے زمانہ حج میں اور سات اس وقت جب تم لوگ واپس جاؤ۔ یہ ہو جائیں گے پورے دس۔ یہ اس کے لئے جس کے بال بچے مسجد حرام کے باشندہ نہ ہوں اور اللہ کے غضب سے بچو اور جانے رہو کہ اللہ کی سز ابڑی سخت ہوتی ہے۔''

حج تمتع کا حکم:

اس میں حج اور عمرہ [2] کے متعلق چند شرعی قوانین کا ذکر ہے پہلے حج تمتع جو باجماع امت اسلام میں موجود تھا مگر خلیفہ ثانی عمرؓ ابن الخطاب نے اپنے دور میں اس سے ممانعت کی اور اس لئے سواد اعظم میں واجب نہیں سمجھا جاتا مگر شیعہ علماء متفق ہیں کہ ایسے شخص کے لئے جو مکہ معظّمہ کا باشندہ نہ ہو حج قران اور افراد درست نہیں ہے۔ اس کے لئے حج تمتع معیناً لازم ہے۔

اس آیت میں اول تو آیت کا آغاز اس ارشاد سے ہے کہ حج اور عمرہ کو رضائے الٰہی کے لئے مکمل کرو یہاں **الحج اَوِ العمرۃ** نہیں ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حج یا عمرہ جو تم بجالا رہے ہو اسے پورا کرو بلکہ **الحج والعمرۃ** کہا ہے جس کے معنی دونوں کے اجتماع کے ہیں چنانچہ حج تمتع کے لازمی جزء یہ دونوں ہیں کہ پہلے عمرہ کا احرام باندھے اور اس کے اعمال بجالائے۔ دوسرے فرقہ کے بعض فقہاء عمرہ کو واجب نہیں سمجھتے جو حکم قرآنی کے خلاف ہے [3]۔

پھر آگے چل کر **فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ** کہہ دیا گیا ہے ''عمرہ بجالا کر حج کے مواقع تک متمتع ہو رہا ہو''۔ یعنی ان باتوں سے جو حالت احرام میں حرام تھیں اب عمرہ ختم ہونے کے بعد حج کا احرام باندھنے تک بہرہ اندوز ہو رہا ہو اور چوں کہ اس دوران انسان ان چیزوں سے متمتع ہونے لگتا ہے اسی لئے اس کو حج تمتع کہتے ہیں۔ یہ بھی اس آیت میں بتلا دیا گیا ہے کہ یہ قسم حج ان کے لئے ہے جو مکہ معظّمہ کے باشندہ نہ ہوں۔ (**ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ**)

محصور و مصدود:

اس کے بعد از روئے قرآن اس حج کے تعین میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے [4]۔ محصور و مصدود کا حکم بتایا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں

---

[1] ۔ جس نے حج کے ساتھ عُمرہ ملا کے تمتع کی ہے (عماد الدین)

[2] ۔ عُمرہ ایک مشہور عبادت ہے کہ میقات سے شروع ہو جاتی ہے اور مکّہ میں ختم ہو جاتی ہے۔ اور حج ایک مشہور عبادت ہے کہ مکّہ سے شروع ہوتی ہے اور منیٰ کے مقام میں پہنچ کے تمام ہو جاتی ہے اور کچھ تتمّہ اُس کا پھر مکّہ میں ہوتا ہے اور تفصیل اس کی حج کی بحث میں فقہ کی کتابوں میں ہے۔ (تاج العلماء)

[3] ۔ ھو نصّ فی وجوب العمرۃ کوجوب الحج (صافی)

جو احرام باندھنے کے بعد بیماری یا دشمنوں کے سدراہ ہونے کی وجہ سے حج پورا نہ کرسکیں [1]۔

احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے پہلے قسم یعنی بیماری سے معذور کو محصور کہتے ہیں اور دشمن سے دوچار ہونے والے کو مصدود اور ان کے احکام میں تھوڑا سا اختلاف ہے [2]۔

اس آیت میں ان کا حکم یہ بتایا گیا ہے کہ ان کو احرام کے ختم کرنے کیلئے ضرورت ہے ما استیسر یعنی جو بآسانی ممکن ہو من الھدی یعنی جانور کی قربانی کی۔ اس کی تشریح احادیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر ممکن ہو تو اونٹ نہیں تو گائے اور آخر میں بدرجہ مجبوری بکری۔

اس کے بعد کہا گیا ہے کہ جب تک قربانی اپنے محل پر نہ پہنچ جائے اپنے سر کو منڈوا کر احرام ختم نہیں کرسکتے [3]۔

محل یعنی جہاں اسے نحر یا ذبح کرنا چاہئے اس کی تشریح احادیث سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ اگر دشمنوں کے سدراہ ہونے سے مجبوری پیدا ہوئی ہے تو جہاں دشمن سدراہ ہو بس وہی محل ھدی ہے۔ وہیں قربانی کرکے احرام کو ختم کرے جیسا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ میں عمل فرمایا اور اگر بیماری کی وجہ سے مجبوری پیدا ہوئی ہو تو خود وہیں ٹھہر جائے اور قربانی کے جانور کو مکہ معظّمہ بھیج دے۔ اب اگر حج کا احرام ہے تو محل قربانی منیٰ ہے جہاں دس ذی الحج کو اس کی قربانی ہوگی اور اگر عمرہ کا احرام ہے تو معظّمہ میں کسی جگہ بھی قربانی کردی جائے۔ جب قربانی اس محل تک پہنچ جائے تو اس وقت وہ شخص سر منڈوا کر احرام سے باہر نکل سکتا ہے اس کے پہلے نہیں۔

(۳) حلق یعنی سر منڈوانا احرام کے ختم کے لئے ہوتا ہے لیکن اگر بیماری یا سر میں کسی خاص تکلیف کی وجہ سے حالت احرام ہی میں سر منڈوانے پر مجبور ہوگیا ہو تو کیا کرے؟ اس کے لئے بتایا گیا ہے کہ تین باتوں میں سے ایک میں اختیار ہے۔

۱---روزہ رکھے حدیث میں ہے کہ تین روزے رکھنا ضروری ہیں۔

۲---صدقہ دے حدیث بتاتی ہے کہ کم از کم چھ مسکینوں کو۔

۳---قربانی کرے حدیث میں ہے کہ بکری کی قربانی

(۴) فاذا امنتم الخ اب یہاں سے غیر مصدود محصور کا حکم ہے۔ جب حالت امن میں ہو یعنی نہ مرض کی مجبوری ہو، نہ دشمن کے سدراہ ہونے کی تو جو شخص حج تمتع بجالا رہا ہو اسے بھی ھدی یعنی قربانی ضروری ہے۔

(۵) فمن لم یجد الخ اسی حج تمتع کی صورت میں اگر ایسا شخص ہے کہ اس کے پاس قربانی کے لئے جانور نہیں ہے اور نہ اس کی قیمت ہے تو پھر دس روزے رکھے تین زمانہ حج میں ۷، ۸ اور ۹ ذی الحج کو [4] اور سات روزے اپنے شہر واپس ہونے کے بعد۔

یہاں خاص بات یہ ہے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ یہ شخص جب واپس جائے اس لئے کہ یہ ممکن ہے یہ شخص واپس جائے ہی نہیں بلکہ مکہ معظّمہ ہی میں قیام رکھے۔ اس لئے یہ کہا گیا کہ سات اس وقت رکھے جب تم لوگ واپس جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ نہیں جاتا تو یہ دیکھا جائے گا کہ

---

[1] ۔احصرتم منعکم خوف او عدّو امرض عن المضیّ الیہ وانتم محرمون بالحج (صافی)

[2] ۔قد تکرر فی روایاتنا الصحاح وغیرھا ان المحصور غیر المصدود وانھما مختلفان فی بعض الاحکام (البلاغی)

[3] ۔مکان الذی یجب ان ینحر فیہ (صافی)

[4] ۔یوم قبل یوم الترویۃ ویوم عرفۃ (مجمع البیان)

دوسرے حجاج جو واپس جا رہے ہیں کتنے زمانہ کے بعد اپنے گھروں میں جو اس کے وطن کا سا فاصلہ رکھتے ہوں پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے بعد اسے مکہ میں رہ کر ہی ان روزوں کو ادا کر لینا چاہیے [1]۔

(۶) یہ ان کے لئے ہے جن کے اہل وعیال مکہ معظّمہ کے باشندہ نہ ہوں۔'' باشندہ کی تشریح احادیث سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ جو مکہ معظّمہ سے کسی سمت میں بارہ میل کے اندر ہو وہ حاضرین میں داخل ہے اس کیلئے حج قِران یا حج افراد کا حکم ہے اور ان کے علاوہ جو دوسرے ہوں ان کے لئے حج تمتع ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۷

''حج کے چند خاص مقررہ مہینے ہیں [2] تو جو ان میں حج کی پابندی عائد کر لے تو پھر اس حج میں نہ ہمبستری ہو نہ نافرمانی اور نہ جھگڑا اور جو اچھائی تم کرو اسے اللہ جان لے گا اور توشہ مہیا کرو کہ بہترین توشہ پرہیزگاری ہے اور میرے غضب سے بچو اے عقل رکھنے والو۔''

محرّمات احرام:

یہ گزشتہ اجمال کی کچھ تفصیل ہے اور احرام حج کے بعض احکام مقررہ مہینے یہ شوال، ذی قعدہ اور ذی الحج ہیں کہ حج کے لئے بلکہ اس عمرہ کے لئے بھی جو تمتع کے سلسلہ میں ہو احرام انہیں مہینوں میں باندھ سکتا ہے [3] دوسرے زمانہ میں جو ہوتا ہے وہ صرف عمرہ ہوتا ہے حج نہیں۔

حج کی پابندی عائد کر لے یعنی احرام باندھ لے [4] تو پھر بہت سی چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جن میں سے چند کا یہاں ذکر ہوا ہے۔

پہلے عورتوں سے مقاربت یہاں تک کہ اپنی بیوی سے بھی تعلقات ازدواجی کا قائم کرنا بلکہ خواہش نفس کی تحریک کے ساتھ ہاتھ کا مس کرنا تک ناجائز ہے۔

دوسرے فسوق اسی کے لفظی معنی میں تو ہر گناہ داخل ہے مگر اس محل پر خصوصیت کے ساتھ اس کی تفسیر جھوٹ بولنے کے ساتھ ہوئی ہے [5]۔

تیسرے جدال اس کے معنی یہاں قسم کھانے کے ہیں اور جھوٹی قسم تو بہر حال گناہ ہے مگر حالت احرام میں سچی قسم بھی نہیں کھانا

---

[1] ۔من اقام بمكة يقدر له رجوع اصحابه الى بلده كما عليه فتوى الامامية واحاديثهم (البلاغی)

[2] ۔ معلومات اى اشهر موقة معيّنة لا يجوز فيها التغير والتبدل (مجمع البيان)

[3] ۔ فلا يجوز ان يقدّم احرام الحج على الاشهر المذكورة باجماع الامامية وحديث اهل البيت (البلاغی)

[4] ۔فى الكافى والعياشى قال الرضا عليه السلام الفرض التلبية والاشعار والتقليد (صافی)

[5] ۔روى اصحابنا انه الكذب (مجمع البيان)

چاہیے[1]۔

ان چیزوں سے تو خصوصیت کے ساتھ حالت احرام میں پرہیز واجب ہے۔اس کے علاوہ آخر میں ارشاد ہوا کہ توشہ مہیا کرو بہترین توشہ پرہیز گاری ہے یعنی حالت احرام میں جہاں تک ہو سکے زیادہ سے زیادہ اعمال خیر انجام دو کہ یہ موقع ریاضت نفس کے لئے بہت موزوں و مناسب ہے۔

یہاں بعض اہل تفسیر نے یہ کہا ہے کہ توشہ مہیا کرو۔اس حکم کا باعث یہ ہے کہ اس زمانہ میں بہت سے حاجی زاد راہ لے کر نہیں آتے تھے اور دوسروں پر بار بنتے تھے۔یہ ان کو تنبیہ ہے۔اسی لئے پادری عماد الدین نے بھی یہ ترجمہ کیا ہے کہ راہ کا خرچ لے کر آیا کرو اچھا راہ خرچ پرہیز گاری ہے مگر یہ تفسیر و ترجمہ سیاق کلام الٰہی کی بناء پر درست نہیں ہے[2]۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾

''اس میں تمہارے لئے کوئی حرج نہیں ہے[3] کہ تم کچھ اپنے پروردگار کی نعمت کے طلب گار ہو ہاں جب عرفات سے روانہ ہو تو مشعر الحرام کے حدود میں اللہ کو یاد کرو اور اس کے ذکر میں مشغول ہو جس طرح وہ تمہیں راہ پر لایا حالانکہ تم اس کے پہلے بہکے ہوؤں میں تھے۔''

زمانہ جاہلیت میں لوگ ایام حج میں تجارت کو گناہ سمجھتے تھے۔قرآن نے حالت احرام کی کچھ حرام باتوں کا ذکر کرنے کے بعد اس غلط تصور کی جو حلال خدا کو حرام کرتا تھا اصلاح کرنا چاہی ہے اور کہا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کی نعمت کے طلب گار ہو یعنی تجارت کر کے معاشی فائدہ حاصل کرو[4]۔

عرفات اور مشعر الحرام یعنی مزدلفہ:

اس کے بعد عرفات سے واپسی کے بعد مشعر الحرام میں قیام کا حکم بتایا گیا ہے کہ یہاں زیادہ سے زیادہ وقت ذکر الٰہی میں صرف کرو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دسویں شب کو مشعر الحرام میں قیام بھی واجب ہے جیسا کہ فقہائے امامیہ کا مسلک ہے[5] اور بقرینہ سیاق یہ پتہ چلتا ہے کہ

---

[1] ۔الجدال قول الرجل لا واللہ بلی واللہ (صافی)

[2] ۔عرضها علیٰ کتب اللہ فی تفریع الأیة بالفاء یعرّفك وهنها (البلاغی)

[3] ۔کسی طرح کا الزام نہیں (تاج العلماء)

[4] ۔کانوا یتأثمون بالتجارة فی الحج فرفع عنه الجناح فی ذٰلك (صافی)

[5] ۔فی هٰذا دلالة علیٰ ان الوقوف بالمشعر الحرام فریضة کما ذهبنا الیه (مجمع البیان)

یہاں تجارت وغیرہ کا مشغلہ ناجائز نہیں تو خلاف فضیلت ضرور ہے۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

''پھر چل کھڑے ہو جس طرح اور لوگ چل کھڑے ہوئے ہیں اور اللہ سے بخشش کے طلب گار رہو یقیناً اللہ بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔''

یہ آیت اگر ترتیب نزول کے اعتبار سے اسی جگہ کی ہے جہاں وہ اب ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں دس ذی الحج کو طلوع آفتاب کے بعد مشعر الحرام سے منیٰ آنے کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ عرفات افاضہ یعنی واپسی کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے (فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ) لہٰذا اب ثم یعنی پھر کہہ کر جو ذکر ہو رہا ہے تو یہ کسی دوسری جگہ سے واپسی کا ذکر ہوگا۔ اب یہ جو کہا گیا ہے کہ جیسے اور لوگ واپس ہوئے تو اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اس نقل و حرکت میں ہم آہنگی ہونا چاہیے یہ نہیں کہ کچھ عرفات میں رہیں، کچھ مزدلفہ میں اور کچھ منیٰ جائیں۔ مگر بعض مفسرین کا خیال ہے اور ایک حدیث بھی اس کی تائید میں ہے کہ كَمَا اَفَاضَ النَّاسُ کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح پہلے لوگ چلتے رہے ہیں اور پہلے لوگ سے مراد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں اور ان کے بعد سے سنت ابراہیمی پر عمل کرنے والے ہیں [1]۔

لیکن دوسری روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت ترتیب نزول میں اس کے قبل کی آیت سے مقدم ہے اور افضتم سے مراد عرفات ہی سے واپسی ہے اور یہ کہ اس طرح واپس ہو جیسے اور لوگ قبیلہ قریش کو انتباہ ہے کہ وہ دوسرے قبائل عرب کے ساتھ عرفات میں قیام اور وہاں سے مراجعت نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے اور بس وہیں سے منیٰ چلے جاتے تھے۔ انہیں کہا گیا ہے کہ تمہیں اس امتیاز پسندی سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ تم دوسرے قبائل کا ساتھ دینا چاہیے۔ ہماری بعض روایات بھی اس کے موافق ہیں ۲۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾

''اب جب تم اپنے حج کے کام پورے کر لو تو اللہ کو یاد کرو ایسا جیسے تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے رہے ہو بلکہ اسے بھی بڑھ کر۔ اب انسانوں میں کوئی بھی تو ایسا ہے جو کہتا ہے پروردگار ہمیں جو دنیا ہے اس دنیا میں دیدے اور اس کا

---

[1] ۔قبل ان الناس ابرھیم واسمٰعیل واسحٰق ومن بعدھم من الانبیاء عن ابی عبداللہ علیہ السلام (مجمع البیان)

آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور کوئی ان میں ایسا ہے جس کا قول یہ ہے کہ پروردگار ہمیں عطا کر دنیا میں ایک بھلائی اور آخرت میں ایک بھلائی اور ہمیں آگ کی سزا سے بچا۔''

آیت کے ابتدائی مضمون میں بظاہر مقصود یہ ہے کہ جیسے عموماً رسمی عبادت کرنے والے ایک فریضہ کے اجزاء وشرائط ادا کر کے نازاں ہوجاتے ہیں اور پھر اس کے بعد وہ ایسے سرمست ہوتے ہیں کہ اب معاصی الٰہیہ میں بھی انہیں کوئی باک نہیں ہوتا جیسے کہ عید میں جو درحقیقت فریضہ صیام کی تکمیل پر اظہار تشکر کا موقع ہے بہت سے مسلمان رنگ رلیوں میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ یہ غلط چیز ہے۔ فریضہ حج کے تمام مناسک ادا کرنے کے بعد بھی یاد الٰہی سے غافل نہ ہو اور احساس فرائض قائم رکھو۔

یہاں پر یہ جزء کہ جیسے تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے ہو عربوں کے عام طرز عمل کی بناء پر ہے کہ وہ ایسے موقع پر ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر ومباہات کرتے تھے اور اس میں اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے تھے [1]۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ اس کے بجائے اتنا ہی بلکہ اس سے بڑھ کر اللہ کا ذکر کرو تو وہ تمہارے حال و مستقبل دونوں کے لئے زیادہ مفید ہے۔

دنیاداروں اور دیانتداروں کے نصب العین کا امتیاز:

اب چوں کہ خداوند عالم کی یاد اکثر بصورت دعاؤ مناجات ہوتی ہے اور دعا انسان کی تمناؤں کی آئینہ بردار لہٰذا یہاں قرآن مجید نے انسانوں کی تمناؤں کا تجزیہ کیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو صرف دنیا کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہیں اور اس لئے وہ خدا سے دعا بھی مانگتے ہیں تو صرف اپنے دنیاوی مفادات کے لیے۔ یہ پست نظر ہیں اور ان کا صرف دنیا کو سامنے رکھنا اس بناء پر ہے کہ وہ آخرت کا تصور ہی نہیں رکھتے [2] اس لئے آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے یعنی وہ نجات سے محروم ہیں۔

اور کچھ وہ ہیں جنہیں دنیا وآخرت دونوں کا مفاد مدنظر رہتا ہے۔ وہ دونوں کی کامیابی کے لئے اللہ سے دعا مانگتے ہیں یہ بے شک وہ دین دار ہیں جو دنیا کے آگے کسی آخرت کا تصور رکھتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۖ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾

''یہ وہ ہیں کہ جو کچھ انہوں نے حاصل کیا اس سے وہ بہرہ مند ہوں گے اور اللہ تیزی سے حساب لینے والا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ آخرت کی کامیابی صرف اس کہنے سے اور بارگاہ الٰہی میں دعا کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتی [3] بلکہ اس نصب العین کے مطابق جس قدر وہ اعمال بجالائیں گے ان کی جزاء انہیں ملے گی اور اسی تناسب سے آخرت کی کامیابی ہوگی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ثمرات

---

[1] ۔عرب اس مقام پر اپنے باپ دادا کا ذکر فخریہ کیا کرتے تھے کہ وہ ایسے سخی تھے اور وہ ایسے سورما اور علیٰ ھذا القیاس (تاج العلماء)

۲۔ھو المروی عن الباقرؑ (مجمع البیان)

[2] ۔لانہ عبر مؤمن بالبعث والنشور (مجمع البیان)

[3] ۔فانّ ما سألوہ لا ینال بمحض الدعاء (البلاغی)

آخرت کے لئے صرف ایمان قلبی اور اقرار ذہنی ہی کافی نہیں ہے بلکہ جس حد تک اس کی مطابقت میں اعمال ہوں ان کے موافق جزائے اخروی کا استحقاق ہوگا۔

''اللہ تیزی سے حساب لینے والا ہے'' یہ اس بناء پر کہا گیا ہے کہ اگر اللہ کے افعال مادی نوعیت رکھتے ہوتے اور وہ جب ہی ہوتے کہ جب وہ خود مادی قسم کی ہستی ہوتا، تو اس کے حساب و کتاب کی مدت ان اعمال کی کثرت اور طویل مدت کے لحاظ سے طولانی ہوتی۔ مگر اس کا حساب کتاب تو مادی صورتوں پر مبنی نہیں ہے اس لئے صدیوں اور ہزاروں اور پوری پوری قوموں کی عمر بلکہ تمام کائنات کی عمر کی طوالت اس کے لئے حساب میں تاخیر کی باعث نہیں ہوسکتی۔

اس کا حساب یکساں طور پر ایک چشم زدن کی بات ہے بلکہ وقت کا محتاج ہی نہیں ہے [1]۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

''اور اللہ کو یاد کرتے رہو کچھ گنتی کے دنوں میں، تو جو دو دن میں جلد ہی چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو دیر کرے تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں یہ اس کے لئے ہے جو بچتا رہا ہو اور اللہ کے غضب سے بچنے کا خیال رکھو اور یقین رکھو کہ اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ۔''

منیٰ میں قیام:

۹ ذی الحج کو عرفات میں وقوف اور شب دہم مشعر الحرام میں قیام کے بعد دسویں کی صبح کو منیٰ میں پہنچے وہاں قربانی کا فرض انجام دیا اور سر منڈوا کر احرام سے باہر نکلے۔ اس طرح جو بنیادی اعمال حج ہیں ان سے فرصت ہوگی مگر اس کے بعد ایام تشریق یعنی گیارہ اور بارہ اور بعض صورتوں میں تیرہ کی شب کو بھی منیٰ میں قیام ہوتا ہے۔ اس آیت میں گنتی کے دنوں سے مراد یہی ایام تشریق ہیں [2]۔

یوں تو ہر صورت سے ان دنوں میں انسان مصروف عبادت رہے مگر خصوصی طور پر ان دنوں میں جو یاد الٰہی کا طریقہ وارد ہوا ہے وہ حسب ذیل تکبیرات ہیں جن کے نماز پنج گانہ کے بعد پڑھنے کا حکم ہے:

الله اكبر ، الله اكبر ، لا اله الا الله والله اكبر الله اكبر ولله الحمد الله اكبر على ما هدانا و الحمدلله على ما اولانا و رزقنا من بهيمة الانعام۔

---

[1] ۔هٰذا احد ما يدلّ على انّه ليس بجسم (مجمع البيان)

[2] ۔ يعنى ايّام التشريق (صافى) كما فى صحيحتى الصافى عن محمد بن مسلم و منصور بن حازم و صحيحة التهذيب عن حماد بن موسىٰ عن الصّادق عليه السلام (البلاغى)

یہ تکبیریں مستحب ہیں واجب نہیں ہیں [1]۔

ان " اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ " میں بتایا جارہا ہے کہ گیارہویں اور بارہویں دو تاریخوں میں قیام بہرحال واجب ہے لیکن اس کے بعد اختیار ہے کہ بارہویں کو قبل غروب ہی روانہ ہوجائے اسے نفر اول کہتے ہیں جسے کہا گیا ہے: فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ جو دو دن میں جلد ہی چلا جائے تو کوئی گناہ نہیں یا تیرہویں شب کو بھی قیام کرے اور تیرہویں تاریخ رمی جمرات کے بعد روانہ ہو تو اسے نفر ثانی کہتے ہیں جسے ارشاد کیا گیا ہے: وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اور جو دیر کرے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔''

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ یہ اس کے لئے ہے جو بچتا رہا ہو یہ اس حکم فقہی کا بیان ہے کہ یہ اختیار جو دونوں صورتوں میں ہے اس شخص کے لئے جس نے احرام کی پابندیوں کو پورے طور پر بنایا ہو جس میں خاص اہم چیزیں عورت اور شکار ہیں [2] لیکن اگر حالت احرام میں مقاربت کی ہو یا شکار کرلیا ہو تو پھر تیرہویں شب کا قیام واجب ہے [3]۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾

''اور آدمیوں میں کوئی ایسا ہے جس کی گفتگو دنیا کی زندگی میں تمہیں بڑی پسند آئے گی، اور اللہ کو اپنی دلی حالت پر گواہ کرتا جائے گا حالانکہ وہ سخت کینہ ور ہے'' [4]۔

ریاکار اور مطلب پرست آدمی کا کردار:

یہ ریاکار اور ظاہردار مطلب پرست آدمیوں کا کردار ہے [5] اور چاہیے بوقت نزول کسی خاص شخص کی جانب اشارہ مقصود ہو پھر بھی اس کی عمومیت میں فرق نہیں آتا [6] ہر زمانہ میں ایسے اشخاص آنکھوں سے نظر آئیں گے جو مضمون آیت کی سچی تصویر ہیں۔

ان کے کردار کا خاص جزو بار بار اپنے خلوص اور سچائی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش اور قسموں پر قسمیں ہیں جس کی ضرورت وہ کبھی نہیں محسوس کرتا جو حقیقت میں سچا ہو اور جس کے ایمان و محبت میں کسی قسم کا کھوٹ نہ ہو۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا

---

[1] ۔لصحیحة علی بن جعفر عن اخیه الکاظم علیہ السلام (البلاغی)

[2] ۔لمن اتقی النّسآء والصّید کما هو المشهور بین الامامیّة (البلاغی)

[3] ۔من لم تیّقها فلا یجوز له النفر الاوّل (مجمع البیان)

[4] ۔الالدّ صفة مشبهة نحو اعمی العین واعور ها ای شدید الخصومة (البلاغی) شدید العداوة (صافی)

[5] ۔قال ابن عباس نزلت الآیٰت الثلث فی المرائی لانّه یظهر خلاف ما یبطن وهو المروی عن الصادق علیہ السلام (مجمع البیان)

[6] ۔یشمل عامة المنافقین وان نزلت خاصة (البلاغی)

يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

''اور جب وہ برا اقتدار ہوگا تو دنیا بھر میں دوڑتا پھرے گا کہ اس میں فساد برپا کرے اور کھیتی اور نسل کو برباد کردے [۱] اور اللہ فساد کو دوست نہیں رکھتا۔''

تولیٰ کے معنی بعض مفسرین منہ پھرانے کے کہتے ہیں [۲] اور بعض مترجمین نے بھی اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے [۳] مگر ہم دوسری تشریح کو زیادہ درست سمجھتے ہیں کہ یہ تولیٰ ولایت سے مشتق ہے جس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں [۴] اسی لئے ہم نے ترجمہ یہ کیا ہے کہ جب وہ برسر اقتدار ہوگا۔''

جو نتائج اس شخص کے کردار کے بیان ہوئے ہیں کہ وہ فساد فی الارض اور زراعتوں کی بربادی اور نسل کشی کی صورتیں اختیار کرتا ہے یہ کسی بے اسم و رسم گمنام اور بے اثر شخصیت کے افعال نہیں بلکہ ایسوں ہی کے ہو سکتے ہیں جو وسیع ذرائع رکھتے ہوں اور زمانہ اقتدار کے مالک ہوں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

''اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ کے غضب سے بچو [۵] تو غرور اس سے گناہ پر اصرار کراتا ہے [۶] ایسے کے لئے دوزخ ہی بس کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔''

یہ اس ریاکار اور منافق کے کردار کے ہی نقشہ کا ایک جزء ہے کہ وہ برسر اقتدار ہو کر جو فساد اور خونریزی میں مصروف ہے اور اگر کوئی داعی حق فرض شناسی سے کام لے کر اور ہمت کر کے اسے اس کے غلط اعمال اور خبیث افعال پر ٹوکتا اور غضب الٰہی سے ڈرانا چاہتا ہے تو اس سے متاثر ہونے کے بجائے اپنی خود پسندی کے غرور اور جہالت سے زیادہ اپنے غلط کردار میں اضافہ کر دیتا ہے اور بسا اوقات خود اس داعی حق کی جان لینے کے درپے ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسے کے لئے دوزخ ہی بس کافی ہے یعنی دنیا میں اس کی اصلاح ممکن نہیں ہے اس کے لئے بس وہ ابدی عذاب درکار ہے جس کا کبھی اختتام نہیں ہے۔

---

[۱] ۔تہس نہس کر دے کھیتی اور چوپائے (تاج العلماء)

[۲] ۔اعرض عن الحسن (مجمع البیان)

[۳] ۔اور جب چلا جاتا ہے (عماد الدین) اور جہاں (تمھاری محبت سے) منہ پھیرا (فرمان علی صاحب)

[۴] ۔ملك الامر وصار واليا (صافی) بان تصير له ولاية وتسلط (البلاغی)

[۵] ۔الا تقآء طلب السلامة بما يحجز عن المخافة واتقآء الله انما هوا تقآء عذابه (مجمع البیان)

[۶] ۔حملة الانفة وحمية الجاهليّة على الاثم الذی يؤمر باتقائه (صافی)

دوزخ کو کہا گیا ہے لبئس المهاد۔ مهاد کے معنی تو بچھونے کے ہیں[1] مگر چوں کے بچھونا ایک طرح انسان کی قرارگاہ ہوتا ہے اس لئے یہاں اس کا استعمال محل ومستقر کے معنی میں کیا گیا ہے[2] جیسا کہ دوسری آیت میں اس محل پر وبئس القرار کہا گیا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

''اور آدمیوں ہی میں وہ بھی ہے جو اپنی جان بیچ ڈالتا ہے[3] اللہ کی مرضی کی طلب میں اور اللہ بندوں پر بڑا شفیق ہے۔''

شب ہجرت حضرت علی علیہ السلام کا کردار:

کثیر التعداد شیعہ اور سنی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہما السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے شب ہجرت کے بعد جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بستر پر آرام کی نیند سوئے تھے۔

بیچنے میں کیا ہوتا ہے؟ انسان اپنے پاس کی چیز دوسرے کو دیتا ہے اور اس کے بالمقابل قیمت حاصل کرتا ہے۔ یوں ہی راہ خدا میں جان کی قربانی پیش کرنے والا اپنی جان کو مرضی مولا کی خاطر خطرہ میں ڈال دیتا ہے اس لئے اسے بیچنے کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے[4]۔

آخری ٹکڑا کہ اللہ اپنے بندوں پر بڑا شفیق ہے ایک لطیف پیرایہ میں ان کی قربانی کی قبولیت اور اس پر اپنی بہترین خوشنودی کا اعلان ہے کہ جب وہ ہماری راہ میں اس طرح جان دیتا ہے تو ہم بھلا اس کو اپنی رحمتوں اور رضوان سرمدی کی بارشوں سے محروم کریں گے! اب جتنی قربانی زیادہ عظیم ہوگی اس کی شفقت ومہربانی کے تقاضے اس کے بالمقابل زیادہ نمودار ہوں گے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾

''اے ایمان والو سب کے سب امن وصلح کے احاطہ میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔''

مسلمانوں کو انتباہ اور دعوت اتحاد واتقیاء:

آیت کے الفاظ سے خود ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کو باہمی اختلاف ونزاع سے بچانے اور باہم صلح وسلامتی اور یک جہتی قائم رکھنے کی

---

[1] ۔اور کیا برا بستر ہے (عماد الدین)

[2] ۔المهاد ای القرار کالوطاء فی الثبوت علیه (مجمع البیان)

[3] ۔یشری یبیع (صافی) فی التیبان شری باغ (البلاغی)

[4] ۔انّما اطلق علیه اسم البیع لانه انّما فعل ما فعل لطب رضاء الله (مجمع البیان)

دعوت ہے اس لیسلم کی تفسیر اسلام کے ساتھ قرین قیاس نہیں ہے بلکہ سلم سے مراد امن وصلح ہے۔ جو جنگ کے مقابل ہوتی ہے [1] اور ظاہر ہے کہ سب سے اہم نزاع جو اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی تھی وہ مسئلہ خلافت میں تھی۔ لہٰذا بہت قرین قیاس یہی ہے کہ اس بارے میں مسلمانوں کو انتباہ مقصود ہو اور انہیں یک جہتی کے ساتھ خدا اور رسولؐ کے احکام کی پیروی کی دعوت دینا مقصود ہو [2] اور سلم کے معنی اسلام کے بھی لئے جائیں تو چوں کہ اسلام کا عملی تقاضا خدا اور رسولؐ کے فیصلہ کے سامنے سر جھکانا ہے اس لئے خدا اور رسولؐ کی طرف سے اس اعلان کے بعد کہ پیغمبرؐ کے بعد ولی امر کون ہے مسلمانوں کو پھر خود رائی سے روکنا اور اس فیصلہ باری پر یک جہتی کے ساتھ عمل کرنا اس کے بعد بھی مقصود ہو سکتا ہے [3]۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

''اب اگر اس کے بعد کہ کھلے ہوئے احکام تمہارے پاس آ چکے پھر بھی تم ڈگمگا گئے تو جانے رہو کہ اللہ بہت بڑا زبردست سمجھ بوجھ والا ہے''۔

سیاق قرآن سے ظاہر ہے کہ البینات یعنی کھلے ہوئے دلائل وہی ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں کے سامنے ان کے باہمی اختلافات کے بارے میں واضح طور پر آ چکے ہوں اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان مسائل کو خالق نے مسلمانوں کی ذاتی مرضی اجماع یا شوریٰ پر نہیں چھوڑا تھا بلکہ خود اس سلسلہ میں واضح احکام دے دیئے تھے اور یہی وہ نصوص ہیں جو امامت حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے باب میں متفقہ طور پر کتب اسلامیہ میں موجود ہیں جیسے دعوت عشیرہ کا اعلان اور غدیر خم کا خطبہ۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

''انہیں کیا انتظار ہے سوا اس کے کہ خود اللہ ان کے پاس آئے سفید بادلوں کے سائے میں اور فرشتے اور ہر بات کا پورا فیصلہ ہو گیا ہو آخر میں تو سب چیزوں کی رجوع اللہ ہی کی طرف ہونا ہے''۔

اگر یہ آیت ترتیب نزول میں اسی محل کی ہے تو مطلب یہ ہے کہ رسولؐ کی زبان سے تو ہر طرح اس پیغام کی تبلیغ ہو گئی مگر یہ نہیں مانتے تو کیا اب اس کا انتظار ہے کہ خالق خود ملائکہ کی صفوں کے ساتھ آئے اور پھر یہ تسلیم کریں؟ اس صورت میں ان کا ایمان ایک غیر ممکن امر یعنی اللہ کے برنفس نفیس تشریف لانے کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اور چوں کہ اس کا بذات خود آنا ان کے سامنے غیر ممکن ہے اس لئے ان کا ایمان لانا بھی ان کے اس

---

[1] ۔فیما تفحصنا من کتب اللغة السلم بکسر السین وسکون اللام الصّلح والمراد منه الملائمة وعدم الحرب (البلاغی)

[2] ۔عن الباقر علیہ السلام فی تفسیر السّلم فی الآیة قال فی ولایتنا (البلاغی)

[3] ۔حملها علی الطاعة اعمّ ویدخل فیه ماروا ه اصحابنا من انّ المراد الدخول فی الولایة (مجمع البیان)

انتظار کی وجہ سے غیر ممکن ہے۔

دوسرے مفسرین نے سفید بادلوں کے سائے میں اللہ کے آنے کے معنی اس کے عذاب یا اس کی طرف کے بڑے ہولناک اثارِ قدرت کے ان کے سامنے آنے کے قرار دیئے ہیں جس کا ہنگام روز قیامت کہلاتا ہے اس طرح مطلب یہ ہوگا کہ اس دنیا میں ایمان نہ لائیں گے بلکہ وہ قیامت کا انتظار کر رہے ہیں [1] جب ایمان کا محل باقی نہ ہوگا اور درد تکلیف ختم ہو چکا ہوگا۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲۱۱

''بنی اسرائیل سے پوچھو کہ ہم نے ان کے سامنے کتنے کھلے ہوئے معجزے پیش کیے [2] اور جو اللہ کی نعمت کو اس کے آنے کے بعد بدل ڈالے تو یقیناً اللہ سخت سزا والا ہے۔''

جمہور کا انحراف کوئی عجیب بات نہیں:

اس میں امم سابقہ کے انکار اور اس کے نتائج کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کاش مسلمان اس سے متاثر ہوں۔ پھر اس کے بعد والوں کا استعجاب بھی دور کرنا ہے جیسا کہ بعض سادہ لوح یا دوسروں کی سادلوحی سے فائدہ اٹھانے والے آج بھی کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ خدا کی زبانی واضح بیانات نصب خلافت کے متعلق ہو گئے ہوتے تو بھلا اس دور کے جمہور مسلمین اس سے منحرف کیوں کر ہو سکتے تھے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ دیکھو اور ان کی تاریخ کے واقف کاروں سے پوچھو کہ ان کے سامنے کتنے کھلے ہوئے آثار قدرت اور دلائل حقانیت [3] آئے اور پھر انہوں نے اثر نہ لیا تو پھر اگر اس امت میں بھی ایسا ہو تو تعجب کی کون سی بات ہے؟

آخر میں یہ بھی تنبیہ ہے کہ جو اللہ کی نعمت کو پانے کے بعد بدل ڈالے یعنی اسے قبول نہ کرے اور اس کے بالمقابل خود اپنا دل بخواہ انتظام کرے تو اللہ کی سزا بہت سخت ہے۔

اب اسے اس آیت کے ساتھ دیکھئے جہاں غدیر خم کے اعلان ولایت کے بعد کہا گیا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (مائدہ۔ ۲) ''آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی'' تو اس کے بعد بات صاف ہو جائے گی پھر سن لیجئے وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ 'جو اللہ کی نعمت کو اس کے آنے کے بدل ڈالے تو اللہ کی طرف سے اس کی سخت سزا ہے۔''

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ

---

[1] ۔ای ھل ینظرون الّا یوم القیمۃ (مجمع البیان)

[2] ۔معجزۃ ظاھرۃ علی ایدی انبیائھم (صافی)

[3] ۔مثل الید البیضآء وقلب العصا حیۃ وفلق البحر و تظلیل الغمام علیھم و انزال المنّ والسّلوٰی (مجمع البیان)

اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

''جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کے لئے دنیا کی زندگی بڑی آراستہ بنی ہوئی ہے اور وہ ان سے کہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا تمسخر کرتے ہیں حالانکہ جنہوں نے پرہیزگاری سے کام لیا وہ روز قیامت ان سے بڑھے چڑھے ہوں گے اور اللہ جسے چاہتا ہے بے اندازہ روزی عطا کرتا ہے۔''

''دنیا کی زندگی آراستہ بنی ہوئی ہے یہ آراستہ بنا کر نظروں کو لبھانے والے داخلی طور پر خواہشات نفس اور بیرونی طور پر شیطانی ترغیبات ہیں[۱]۔

بعض لوگوں نے اس کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے مگر جب قرآن نے صیغہ مجہول کے ساتھ فاعل کو مبہم قرار دیا ہے تو خواہ مخواہ اس کی نسبت اللہ کی طرف قرار دے کر تاویلات تلاش کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ اور ہوسکتا ہے کہ اس کے مفہوم میں فاعل پر نظر ہی نہ ہو بلکہ معنی یہ ہوں کہ یہ زندگی ان کفار کی نظر میں بڑی آراستہ معلوم ہوتی ہے وہ اس کی محبت میں گرفتار اور اسکی زیب وزینت کے والہ وشیدا ہیں[۲]۔

وہ مومنین کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں ان کے عقائد ایمانیہ کے ساتھ بھی اور ان کے فقر وفاقہ اور دین حق کی راہ میں پیش آمدہ مشکلات و مصائب پر بھی[۳] حالانکہ کفار کی یہ برتری اس دنیا میں ہے جو گزران ہے اور آخرت جہان کی زندگی کو قیام ودوام ہے وہاں یہ دیکھ لیں گے کہ کون بلند درجہ رکھتا ہے! وہاں بلندی مومنین اور متقین ہی سے مخصوص ہوگی۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

''سب آدمی اصل میں ایک ہی دین والے تھے اسی لئے اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا ثواب وعذاب کی خبریں پہنچانے والا بنا کر اور ان کے ساتھ قانون بھیجا سچائی کے ساتھ تا کہ ان میں جو اختلاف پیدا ہوا ہو وہی قانون ان کے

---

[۱] ۔زیّنها الشیطن واهوء النفس الامّارة (البلاغی)

[۲] ۔حسنت فی اعینهم واشربت محبّتها فی قلوبهم حتّی تهالکوا علیها (صافی)

[۳] ۔یمکن حمله علی الجمیع (مجمع البیان)

درمیان فیصلہ کن ہو اور اس قانون کے بارے میں اس کے بعد کی کھلی ہوئی دلیلیں ان کے سامنے آچکی تھیں انہوں نے ہی اختلاف کیا کہ جنہیں وہ دیا گیا تھا تو اللہ نے انہیں جو ایمان لائے تھے اپنے حکم سے ان باتوں میں کہ جن میں وہ اختلاف رکھتے تھے خصوصی رہ نمائی فرمائی اور اللہ جسے چاہتا ہے اس کی سیدھے راستے کی طرف خصوصی رہنمائی فرماتا ہے۔''

اختلاف خلق اور انبیاء کی بعثت:

یہ آیت قرآن مجید کی مشکل آیتوں میں سمجھی گئی ہے جس سے بعض لوگوں نے اس توہم کی گنجائش پیدا کی کہ لوگوں کے درمیان شروع میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ انبیاؤ مرسلین کے آنے سے اختلافات پیدا ہوئے تو ان اختلافات کی ذمہ داری خالق پر ہوئی۔ اسی لئے بعض لوگوں نے ضرورت محسوس کی کہ درمیان میں ایک جزء کو مقدور و محذوف مانیں اس طرح کہ سب ایک ہی دین پر تھے، پھر ان میں اختلافات پیدا ہوئے اس وقت خدا نے انبیاء بھیجے [1] اب اختلافات کا پیدا ہونا انبیاء کے آنے سے قبل کی بات ہوگئی اور ذمہ داری خدا پر نہ رہی۔

ہمارے نزدیک امة واحدة کے فقرہ کا تعلق ان میں باہمی اختلاف ہونے نہ ہونے کے ساتھ ہے ہی نہیں بلکہ اس سے مقصود وہی ہے جسے دوسرے جگہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَام کے لفظوں میں کہا گیا ہے یعنی تمام خلاق کے لئے دین حقیقی اللہ کی طرف سے ایک ہی ہے یہ نہیں کہ وہ مختلف ادیان و مذاہب میں بٹ گئے ہیں تو یہ سب دین خدا کی طرف سے ہوں اور وہ ان کے اختلاف سے راضی ہو بلکہ اس کی طرف سے تو ان سب کا ایک ہی دین ہونا چاہیے۔ اب اگر ان میں اختلاف ہے تو اس میں جو اس دین حقیقی کے مطابق ہے وہ حق ہے اور جو اس سے الگ ہے وہ باطل ہے۔ وہ وہی ایک راستہ ہے جسے سورہ دہر میں تمام نوع انسانی کی طرف نسبت دے کر کہا گیا ہے کہ انا ھدینہ السبیل ہم نے اس کو ایک راستے کی طرف ہدایت کی اسی اتحاد دین کو اس آیت میں امت واحدہ کہہ کر ظاہر کیا گیا ہے [2] وانزل معھم الکتاب 'ان انبیاء کے ساتھ کتاب نازل کی اس میں عام طور سے کتاب کا مفہوم لکھے ہوئے مجموعہ کا لیا جاتا ہے اس لئے یہ دشواری محسوس ہوئی ہے کہ انبیاء میں سے ہر ایک کے ساتھ تو کتاب نازل نہیں ہوئی صاحب کتاب انبیاء تو معدود یعنی چند ہی ہیں۔ زیادہ تر انبیاء سابق کی نازل شدہ کتاب کے پیرو اور اس کے مبلغ ہوتے تھے۔ اس لئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ ھم کی ضمیر جو معھم میں ہے کل مجموعی کے طور پر ہے کہ اس سلسلۂ انبیاء کے ساتھ کتاب اتاری گئی نہ کل افرادی کے طور پر جس کے معنی یہ ہوں کہ ہر ایک کے ساتھ کتاب اتری [3]

ہمارا ذوق یہ کہتا ہے کہ اس صورت میں انزل معھم الکتب جمع کے صیغہ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا کیونکہ سب کے ساتھ ایک ہی کتاب تو نازل نہیں ہوئی تھی بلکہ متعدد کتابیں متعدد انبیاء پر نازل ہوئیں۔

اس مفرد کتاب کے لفظ سے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ لکھا ہوا مجموعہ مراد ہی نہیں ہے جسے ہماری عرف عام میں کتاب کہتے ہیں بلکہ یہ کتاب

---

[1] ۔ای اختلفوا فبعث اللہ (بیضاوی)

[2] ۔ھی ھنا بمعنی الملّة والدّین (مجمع البیان)

[3] ۔لا یرید بہ انّہ انزل مع کلّ واحد کتابا یخصّہ (بیضاوی)

کتب سے ہے جس کے معنی فرض کے ہیں جس کے اعتبار سے کہا گیا ہے: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا (نساء۔ ۱۰۳) اور اس طرح کتاب کے معنی اس آیت میں قانون الٰہی کے ہیں۔ بعض دوسری آیات قرآن میں بھی ایسے شواہد ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب کا استعمال متعدد جگہ قرآن مجید میں قانون کے معنی میں ہوا ہے اور اس آیت میں بھی یہی معنی مراد ہیں جیسا کہ میں نے ترجمہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ قانون بھیجا اور قانون الٰہی درحقیقت سب انبیاء کے ساتھ والا ایک ہی تھا یہ اور بات ہے کہ اس کے بعض اور دفعات میں باختلاف حالات ظرف زمان ومکان کچھ تبدیلیاں ہوتی رہی ہوں۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

''کیا تم سمجھتے ہو[1] کہ تم بہشت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کی سی صورتیں پیش نہیں آئیں کہ انہیں فقر وفاقہ اور سختیاں درپیش ہوئیں اور انہیں ہچکولے دیے گئے یہاں تک پیغمبر اور ان کے ساتھ کے ایمان لانے والے کہنے لگے کہ آخر اللہ کی مدد کب آئے گی خبردار رہو کہ بلاشبہ اللہ کی مدد نزدیک ہی ہے۔''

قرآن مجید میں متعدد آیات کے آغاز ام حسبتم ان تدخلوا الجنة سے ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی ایک جماعت تھی جو بہشت میں جانے کو بالکل آسان سمجھتی تھی اور آج بھی مسلمان عوام نے بہشت کو بس کچھ دعاؤں اور کچھ الٹی سیدھی نمازوں اور رسمی عبادتوں سے وابستہ سمجھ لیا ہے۔ قرآن مجید نے یہ کہہ کہہ کر کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم بہشت میں چلے جاؤ گے انہی خام خیالیوں کی رد کی ہے دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ (آل عمران۔ ۱۴۲) کیا تم سمجھتے ہو کہ بہشت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی یہ ثابت ہی نہیں ہوا کہ تم میں سچے جہاد کرنے والے اور ثابت قدم رہنے والے کون ہیں'' اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ آخر تمہارے پہلے انبیاء کی امتیں بھی تو ان انبیاء پر ایمان لا کے بہشت کی منتظر رہنے کا حق رکھتی تھیں مگر دیکھو تو ان کی کیسی کیسی آزمائشیں ہوئیں پھر تم لوگ بلا کسی آزمائش کے بسہولت جنت میں جانے کے کیوں متوقع ہو؟

گزشتہ امتوں پر ایسی ایسی سختیاں پڑی تھیں کہ ان کے رسول اور ایمان لانے والے رفقائے رسول بھی گھبرا کر کہتے تھے کہ آخر خدا کی مدد کب آئے گی؟ یہ کب بطور اعتراض نہیں ہوتا تھا بلکہ بطور اظہار تمنا ہوا کرتا تھا[2]۔

یہ اس صورت میں ہے کہ جب یہ متیٰ نصر اللہ بھی رسولؐ ہی کا کلام ہوا اور اگر بعض مفسرین کے خیال کے مطابق یہ سمجھا جائے کہ یہ

---

[1] ۔ام منقطعة ومعنى الهمزة فيها الانكار (بیضاوی)

[2] ۔قال له الرسول استبطاء للنّصر على جهة التمنّي (مجمع البیان)

رسولؐ اور مومنین کی باہمی گفتگو کا بیان ہے کہ مومنین گھبرا کر کہتے تھے کہ متیٰ نصر اللہ اور پیغمبرؐ جواب دیتے تھے الا ان نصر اللہ قریب گھبراؤ نہیں خدا کی مدد نزدیک ہے تو مطلب بالکل صاف ہے۔ اس صورت میں آیت کے الفاظ لف ونشر غیر مرتب کے قبیل سے ہوں گے کہ بات چیت کرنے والوں کے ذکر میں تو رسولؐ کا ذکر مقدم اور الذین امنوا کا موخر ہے اور ان کی گفتگو کا جب ذکر ہو تو الذی امنو کا قول پہلے بیان ہو گیا اور رسول کا بعد کو۔ اور بلاغت اس عکس ترتیب کی متقاضی اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ گفتگو کرنے والوں کے ذکر میں رسولؐ کو تقدم بلحاظ شرف تھا اور نیز اس لئے کہ امنوا کے ساتھ معہ یعنی اس رسولؐ کے ساتھ ہونے کا ذکر کرنا تھا ضمیر کے ساتھ جس کے لئے مرجع کا تقدم لازم تھا اور گفتگو کے محل پر مومنین کا قول سوال ہے جس کا درجہ باعتبار رتبہ و بلحاظ وقت مقدم ہوتا ہی ہے اور رسولؐ کا قول اس کا جواب ہے جو طبعاً لازمی طور پر مئوخر ہی ہوا کرتا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں؟ کہہ دیجئے کہ جو مال بھی تم صرف کرنا چاہو ماں، باپ، عزیزوں، یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کا حق اور جو بھی نیک کام کرو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

مستحقینِ خیرات:

الفاظ آیت سے تو پتہ چلتا ہے کہ سوال یہ تھا کہ کیا خیرات کریں اور جواب میں یہ بتایا گیا کہ کس کس پر صرف کریں مگر شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال میں دونوں جزء تھے یہ بھی کیا خیرات کریں اور یہ بھی کہ کس کس کو دیں [1] بے شک جواب میں پہلے جز کو مبہم چھوڑ دیا گیا یہ کہہ کر کہ ما انفقتم من خیر جو مال [2] بھی تم صرف کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بارے میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہاں لحاظ کی ضرورت اس کی ہے کہ جو دیا جائے، وہ کن لوگوں کو دیا جائے [3] کہ مصرف صحیح میں صرف ہو۔ اس کو تفصیل سے بیان کیا جا رہا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال اس مقدار مقرر کے علاوہ انفاق کے لئے تھا جو بطور زکوٰۃ ہر مسلمان پر واجب ہے [4] اس لئے اس میں مقدار خیرات کو دینے والے کی مرضی پر چھوڑا ہے اور مستحقین میں والدین کا ذکر کیا ہے حالانکہ زکوٰۃ واجب کا اپنے والدین کو دینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

---

[1] ۔نزلت فی عمرو بن الجموح وکان شیخا کبیرا ذا مال کثیر فقال یا رسول اللہ ﷺ ماذا اتصدق وعلیٰ من اتصدّق (مجمع البیان)

[2] ۔من خیر من مال (صافی)

[3] ۔سئل عن المنفق واجیب ببیان المصرف لانہ اھم (صافی)

[4] ۔لیس فی الاٰیۃ ما ینافی فرض الزّکوٰۃ (صافی)

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾

''تم پر جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے کہ حالانکہ وہ تمہیں شاق و ناگوار ہے [1] اور بہت ممکن ہے کسی چیز کو تم ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے اچھی ہے اور بہت ممکن ہے کسی چیز کو تم پسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے بری ہے بات یہ ہے کہ اللہ علم رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے۔''

حکم جہاد بصورت قتال:

اس آیت میں صاف صاف شریعت اسلام میں جہاد کے فرض ہونے کا قتال کے لفظ کے ساتھ اعلان ہوا ہے جو قتل سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے جس سے غیر کے ساتھ مقابلہ کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ قتل کے معنی مار ڈالنے کے ہیں تو قتال کے معنی کیا ہوئے؟ دوسروں کے مقابلہ میں مرنا مارنا۔ اس سے ان لوگوں کے تصورات کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو اسلامی تعلیمات کو مطلق عدم تشدد کے ساتھ ساز گار بنانے کے لئے لفظ جہاد کے لغوی معنی سے جو جہد یعنی کوشش سے ماخوذ ہیں فائدہ، اٹھا کر اسے مقاومت مجہول وغیرہ پر منطبق کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ بہت ممکن ہے کسی چیز کو تم ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے اچھی ہے اور بہت ممکن ہے تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے بری ہے اور اس کے بعد آخر میں یہ کہنا کہ واللہ یعلم وانتم لا تعلمون اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اچھائی اور برائی ایک واقعیت ہے جو اشیاء میں بذات خود مضمر ہے اور اسی کی بناء پر احکام الٰہیہ ہوتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ناقص العقل افراد انسان کو اس کی خبر نہ ہو [2] یہی عدلیہ کا مسلک ہے جو قرآن مجید کے بالکل مطابق ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۡ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ

---

[1] ۔شاق علیکم مکروہ طبعاً (صافی)

[2] ۔فیہ دلیل علیٰ انّ الاحکام تتبع المصالح الرّاجحۃ وان لم تعرف عینہا (بیضاوی)

فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢١٧﴾

''آپ سے لوگ حرمت والے مہینے میں جنگ کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہہ دیجئے کہ اس میں جنگ بڑا جرم ہے [1] اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کا انکار اور مسجد حرام کا اور اس کے باشندوں کا وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بڑا گناہ ہے اور فتنہ وفساد قتل سے بھی بری چیز اور وہ لوگ تم لوگوں سے برابر لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پلٹا دیں اور جو تم میں سے اپنے دین سے پھر کر کفر کی حالت میں دنیا سے جائے تو یہ وہ ہوں گے جن کے اعمال دنیا وآخرت میں اکارت ہو گئے اور یہ دوزخ والے ہیں جو اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اس واقعہ کے متعلق ایک آیت میں پہلے والفتنة اشدّ من القتل کے الفاظ میں اشارہ ہو چکا ہے۔ کچھ مسلمانوں نے رجب کی پہلی تاریخ یہ سمجھ کر کہ ابھی چاند نہیں ہوا ہے مشرکین کے کسی گروہ پر جو لوٹ مار کے لئے مدینہ کی اطراف میں آیا تھا حملہ کر کے کسی ایک کو قتل کر دیا۔ اس پر مشرکین نے ایک طوفان برپا کر دیا کہ مسلمان محترم مہینوں کا احترام نہیں کرتے اور بظاہر خود مسلمانوں کے بھی ایک طبقہ میں بے چینی پیدا ہوئی اور وہ آ کر رسولؐ سے اس سے متعلق دریافت کرنے لگے۔ قرآن نے اس کے جواب میں مسلمانوں کو کہا ہے کہ تمہیں اس کا اقرار کر لینا چاہیے کہ ماہ حرام میں جنگ گناہ ہے مگر اس کے ساتھ مشرکین کو ان کے کردار پر بھی تو متنبہ کرو کہ وہ ایسے ایسے جرائم کے مرتکب ہیں جو اس سے بہت زیادہ بڑے گناہ ہیں لہٰذا ان کی زبان سے تو اس پر اعتراض کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا ان کے جرائم کیا کیا ہیں؟

پہلے صد عن سبیل اللہ خدا کی راہ یعنی قبول اسلام سے لوگوں کو روکنا جس کے شروع سے برابر وہ مرتکب رہے ہیں۔

دوسرے کفر بہ اس دین خدا سے انکار وانحراف رکھنا۔''

تیسرے والمسجد الحرام یہ لفظی حیثیت سے کفر بہ کے قریب ہے اس لئے صاف یہ معنی ہوتے ہیں کہ اور مسجد حرام کے ساتھ کفر، یعنی اس کی حرمت کا انکار مگر اس عام نحوی اصول نے کہ ضمیر جار پر بغیر اعادہ حرف پر جر عطف نہیں ہونا چاہیے [2] بعض مفسرین کو مجبور کر دیا ہے کہ عطف سبیل اللہ پر لیا جائے یعنی مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکنا مگر اس عطف میں معطوف علیہ اور معطوف کے درمیان ایک اجنبی کا فصل جو پیدا ہوتا ہے یعنی صدعن سبیل اللہ کے بعد و کفر بہ آ گیا اور اس کے بعد اب جو والمسجد الحرام آیا تو اس کا عطف درمیان کفر بہ کے فقرہ کو چھوڑ کر اس کے قبل والے سبیل اللہ پر ہو جائے یہ خالی از تکلف نہیں ہے جس کی دوسری نظیر یعنی آیہ وضو میں فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق کے بعد وامسحوا آ گیا اور اس کے بعد جو وارجلکم کا لفظ آیا تو اسے رءوسکم پر عطف نہ لیا جائے جس

---

[1] ۔ کبیر ای ذنب کبیر (بیضاوی)

[2] ۔ لا یجوز حملہ علی البآء فی قولہ و کفر بہ لانہ لا یعطف علی الضمیر المجرور الّا باعادۃ الجار الّا فی ضرورۃ شعر (مجمع البیان) ۲ (مائدہ۔٦)

سے پیروں کا مسح ثابت ہو بلکہ اس کے قبل **وجوھکم** پر عطف قرار دیا جائے جس سے پیروں کا وضو میں دھونا ثابت ہو جائے۔ یہ ہمارے لئے بالا جماع قابل قبول نہیں مانا گیا اور بعض مصنف مزاج مفسرین اہل سنت نے بھی اس بارے میں ہم سے اتفاق کیا ہے اور **ارجلکم** کا عطف **رءوسکم** ہی پر لیا جو کہ قریب ہے اور جس کا مسح لازم ہے تو ویسا ہی بالکل یہاں ہے اس کو کیوں قبول کیا جائے بلکہ **کفر بہ** کے تحت میں اس کو لینا چاہے اور اگر ضمیر مجرور پر عطف بغیر اعادہ جار بالکل ہی غیر ممکن معلوم ہو تو اس معطوف میں جار کو مقدر مان لیا جائے [1] جس سے نحوی قاعدہ کی مخالفت دور ہو جائے گی میں اسے بہتر سمجھتا ہوں، اسی لئے میں نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔

چوتھے: مسجد حرام کے جو اہل و مستحق ہیں یعنی رسولؐ اور ان کے ساتھ مومنین ان کو مسجد حرام اور مکہ معظّمہ سے جلاوطن ہونے پر مجبور کرنا یہ سب باتیں بہت بڑا جرم ہیں۔

اور پھر **پانچویں** خاص اس معاملہ یہ شورش کا طوفان اٹھانا جو پوری قوم کے امن کو غارت کرنے کا سبب ہے۔ یہ ان دو ایک آدمیوں کے قتل سے زیادہ بڑا جرم ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو مخاطب بنا کر کہا گیا ہے کہ ان کفار سے جنگ کوئی وقتی چیز تھوڑی ہے۔ یہ تو ایک مستقل جنگ ہے جسے یہ جب تک ان کے دم میں دم ہے جاری رکھیں گئے یا اس وقت چین لیں گے جب تم اس دین سے منحرف ہو کر شرک و کفر میں ان کے ہم نوا بن جاؤ۔

ختم کلام پر مسلمانوں سے یہ تخاطب بتلاتا ہے کہ آ آ کر سوال کرنے والے مسلمان ہی تھے [2] اور اس لئے آخر میں تو شدید انتباہ کیا گیا ہے کہ اگر تم ایسے وساوس میں مبتلا ہو کر دین سے منحرف ہو گئے تو اپنی شدید ترین ہلاکت کا سامان کرو گے اور اب تک کے اپنے سب کئے کرائے اعمال خیر پر پانی پھیر دو گے اور پھر تم میں ان کفار و مشرکین میں انجام کے اعتبار سے کوئی بھی فرق نہیں رہے گا' بلکہ تم انہی کی طرف مخلد فی النار ہو گے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۙ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢١٨﴾

''بلاشبہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

چوں کہ اسم موصول **الذین** دو دفعہ لایا گیا ہے، ایک دفعہ ایمان لانے کی صفت کے ساتھ **الذین امنوا** اور پھر ہجرت و جہاد کے وصفت کے ساتھ: **والذین ھاجروا و جاھدوا** اس لئے ہو سکتا ہے کہ جو ایمان لائے ان سے مراد وہ مکہ معظّمہ میں باقی ماندہ اہل ایمان ہوں جنہوں نے ابھی ہجرت نہیں کی ہے اور بعد کے اوصاف میں مہاجرین مراد ہوں اور ہو سکتا ہے کہ ایک ہی جماعت مراد ہو اور **الذین** کی تکرار ہر

---

[1] ۔وبالمسجد الحرام علیٰ تقدیر الباء (صافی)

[2] ۔فیہ مناسبۃ لان یکونوا ھم السائلین (البلاغی)

وصف کے مستقل طور پر باعث رحمت الٰہی ہونے کے اظہار کے لئے ہو[1]۔

اس ایمان اور ہجرت و جہاد کے بعد بھی یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ انہیں رحمت الٰہی کا یقین ہے بلکہ امید کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو اندیشہ خلاف کا پتہ دیتا ہے اس لئے کہ ایمان وغیرہ کے بعد بھی انہیں اپنے اعمال کی کمزوری کا تصور اور اس لئے سزا کا دھڑکا لگا رہتا ہے جس پر تفضّل الٰہی سے مغفرت کے امیدوار رہتے ہیں[2] یہی امید وبیم ایمان کا خاص جوہر ہیں[3]۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

”آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدہ بھی ہیں مگر ان کا گناہ ان فائدوں سے بڑا ہے اور یہ پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات کریں؟ کہیے کہ جتنا فاضل ہو۔ اس طرح اللہ اپنی ہدایتیں تمہارے لئے بیان کرتا ہے شاید کہ تم دنیا اور آخرت کے بارے میں غور وفکر سے کام لو۔ اور آپ سے پوچھتے ہیں یتیموں کے متعلق کہہ دیجئے کہ ان کے لئے بندوبست کرنا بہتر ہے اور اگر ان سے مل کر رہو تو وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں اور اللہ خرابی کرنے والے اور درستی کرنے والے کے فرق کو خوب جانتا ہے اور اگر وہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈال دیتا یقیناً اللہ بڑا زبردست ہے بڑا سوجھ بوجھ والا۔“

قرآن مجید کے متداول نسخوں میں تتفکرون اور فی الدنیا والاخرۃ کے درمیان آیت کا گول نشان بنا ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ دو آیتیں ہوگئی ہیں جو قاریان کوفہ کے مسلک کے مطابق ہے مگر دوسرے تمام قاری اس سب کو ایک آیت مانتے ہیں[4] اور معنوی طور پر بھی بلاشبہ

---

[1] ۔ کزر لفظ الذین للعنایۃ بھجرتھم وجھادھم (البلاغی)

[2] ۔ یرجون رحمۃ اللہ فی غفران معاصیھم (مجمع البیان)

[3] ۔ من الواجب علی المؤمنین ان لا ییأس من رحمۃ ولا یأمن من عقوبتہ (مجمع)

[4] ۔ ایتان فی الکوفی وایۃ واحدۃ فیما عدا الکوفی (مجمع البیان)

فی الدنیا والاخرۃ کا جزء تتفکرون سے متعلق ہے۔اسی لئے ہم نے اس سب کی یکجا تفسیر لکھنا ضروری سمجھا۔بہرحال یہ ایک آیت ہو یا دو آیتیں اس محل پر چند احکام شریعت کا بیان ہوا ہے۔

(۱)خمر کے متعلق سوال ہوا خمر کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں اسی لئے سر پر ڈالی جانے والی اوڑھنی کو خمار کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے اس پینے کی نشہ والی چیز کو جو عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے خمر کہا جانے لگا[۱]۔

زمانہ جاہلیت میں شراب کا عام رواج تھا۔اسلام کے شرعی احکام چوں کہ تدریجی طور پر آئے اس لئے شروع شروع اس بارے میں پیغمبر خدا خاموش رہے۔صرف وہ جو خدا کی طرف سے بصیرت ایمانی کے حامل بنائے گئے تھے اس سے الگ تھے۔غالباً خالق کریم کو انتظار تھا کہ افراد جمہور میں خود اپنا شعور پیدا ہو کہ ان کا ضمیر اس فعل سے خلش محسوس کرنے لگے چنانچہ وہی ہوا کہ بعض مسلمانوں کو خود اس کے متعلق ایک طرح کی ذہنی بے چینی پیدا ہوئی اور انہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر کہا کہ یہ شراب جو انسان کو بے عقل بنا دیتی ہے کیا جائز ہے؟

(۲)میسر یہ کیا ہے؟ قمار یعنی جوا۔اس کی بھی یہی شکل ہے شراب کے ساتھ ساتھ آ کر قمار کے متعلق بھی دریافت کیا گیا کہ یہ بہت سوں کو مالی حیثیت سے تباہ کر دینے والی چیز ہے۔اس کا قانون الٰہی میں کیا حکم ہے؟ انہی دونوں سوالوں کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی[۲]۔

میسر چاہیے ابتدا میں کسی خاص قسم کے کھیل کا نام ہو لیکن حکم شرعی کے لحاظ سے ہر قسم کا جوا اس کے تحت میں ہے[۳] چنانچہ لاٹری اور گھوڑ دوڑ میں شرکت کرنا بھی اسی میں داخل ہے۔

چوں کہ ابھی کچھ لوگوں کی نظر اس کے مضرات پر گئی تھی اور بہت سے ابھی اس کی خوش آیند لذتوں اور مفت کی دولت کے حصول کی تمناؤں کا تصور رکھتے تھے اس لئے قرآن مجید نے حکیمانہ انداز بیان اختیار کرتے ہوئے اس مجمع کے بھی تصورات کو سامنے رکھا جو اس کے خوش آیند پہلوؤں کا گرویدہ ہے اور دوا کی اس پہلی خوراک میں ہلکی تحریک انہیں پیدا کرنا چاہی کہ وہ ذرا چونک کر اس کے تاریک پہلوؤں پر بھی متوجہ ہو سکیں، تو ارشاد کیا کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔ہاں عام لوگوں کے لحاظ سے کچھ فائدے بھی ہیں مگر گناہ کی اہمیت ان فائدوں سے زیادہ ہے لہٰذا عقلی معیار پر وہ ناقابل ارتکاب عمل ہوگا کیوں کہ چھوٹا فائدہ جب بڑی مضرت کے ساتھ ہو تو وہ فائدہ نظر انداز کر دینے کے قابل ہوا کرتا ہے اور اس لئے سمجھنے والوں کے لئے یہی آیت حرمت شراب ثابت کر دینے کے لئے کافی تھی مگر اس کے بعد پھر اس بارے میں رفتہ رفتہ زیادہ واضح آیتیں نازل ہوئیں جن کا بیان اپنے اپنے محل پر آئے گا۔

خیرات کی مقدار:

(۳)وہی سوال جو پہلے ہو چکا تھا: ماذا ینفقون ''کیا صرف کریں؟'' وہاں ہم نے کہا تھا کہ دو سوال ہوئے تھے۔ایک یہ کہ کیا خیرات کریں؟ دوسرے کن کو دیں؟ چوں کہ پہلے جزء کے متعلق کوئی خاص بات کہنا نہ تھی اس لئے اس کا مبہم طور پر من خیر کی لفظ سے جواب دے دیا

---

[۱] ۔ھی کل شراب مُسکر مخالط للعقل مغط علیہ (مجمع البیان)

[۲] ۔اتوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقالوا افتنا فی الخمر والمیسر فانہا مذہبۃ للعقل مسلبۃ للمال فنزلت الآیۃ. (مجمع)

[۳] ۔ھو القمار کلّہ وھو المرویّ عن ائمّتنا علیہم السلام (مجمع البیان)

تھا کہ جو بھی مال خیرات میں دو یعنی اس میں اختیار ہے مگر وہ دو کسے؟ اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مسائل پہلے جو جزء کے بارے میں اس ابہام کے مفاد کو نہیں سمجھے اور اب اس جزء کو خاص طور پر پھر پوچھا کہ یہ تو بتایئے کہ کیا خیرات کریں؟ تو اب اس کا جواب پھر ایک لفظ سے دیا گیا کہ العفو یعنی اس کا پوچھنا کیا ہے جتنا تمہارے روزمرہ کی ضروریات سے فاضل بچے [1] اور یہی وہ ہے جسے انسان بلا زحمت دے سکتا ہے جو العفو کے دوسرے معنی ہیں [2]۔

اب چوں کہ اس کا خود شارع کی طرف سے بہ طور حکم نہ آتا بلکہ لوگوں کے بار بار سوال پر بیان کیا جانا خود اس کا قرینہ ہے کہ وہ کوئی لازمی قانون نہیں بلکہ خوشنودی باری تعالیٰ کی خاطر بخوشی خیرات سے متعلق ہے جسے صدقہ مستحبی کہتے ہیں اس لئے احکام زکوۃ سے اسے منسوخ سمجھنے کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ بے شک اس بارے میں ایک روایت بھی وارد ہوئی ہے [3] مگر اس کی سند ایسی نہیں ہے کہ اس کا ماننا لازم ہو۔

اب چوں کہ العفو کے مفہوم میں یہ تھا کہ جو روزمرہ کی ضروریات سے فاضل ہو وہ راہ خدا میں دو یہ روزمرہ کی ضروریات کا لحاظ شارع کی طرف سے مفاد دنیا کا تحفظ ہے اور فاضل کو راہ خدا میں دینے کا حکم اخروی مفاد کی خاطر ہے اس لئے اس کے بعد ارشاد ہوا ہے كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ○ یعنی اللہ نے ایسے احکام تمہارے لئے نافذ کیے ہیں جن پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ دنیا اور آخرت دونوں کا مفاد کس طرح محفوظ رکھا گیا ہے اور یہ درحقیقت شریعت اسلام کے حکیمانہ نظام کی وہ خصوصیت ہے جو اس کی ابدیت کی ذمہ دار ہے۔

یتیموں کی بہبودی:

(۴) ایتام کے بارے میں یہ سوال کب کیا گیا اس کا موجودہ ترتیب قرآن سے کہاں پتہ چل سکتا ہے؟ روایت بتاتی ہے کہ جب سورہ نساء کی یہ آیت اتری کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا 'جو یتیموں کے اموال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے شکموں میں آگ بھرتے ہیں اور عنقریب اس کی گرمی کا مزہ چکھیں گے تو جن جن لوگوں نے کچھ ایتام کی سرپرستی اختیار کر رکھی تھی ان میں اس وعید الٰہی سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ انہوں نے سوچا اس خطرہ عذاب سے بچنے کیلئے بہتر تو یہ ہے کہ ایتام سے کوئی رابطہ ہی نہ رکھا جائے ان کو اپنے یہاں رکھنا ہی خطرناک ہے اور اسے آکر پیغمبرؐ سے پوچھنا شروع کیا چنانچہ اس غیر معتدل رجحان کو متوازن بنانے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی مطلب یہ ہے کہ ان کے اموال کو ناحق کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ نہ یہ کہ ان کے حالات کو سدھارنے اور ان کی پرورش کرنے کے لئے جو تم حسن سلوک کرتے ہو [4] اس سے باز آجاؤ۔ یہ ہرگز کوئی اچھی بات نہیں ہوگی اور پھر ایتام کوئی اور انہیں تمہارے بھائی ہی تو ہیں۔ بھائی کے معاملات سے انسان کو وابستگی ہونا چاہے [5] ہاں تمہاری نیت بخیر اور تمہارا عمل ایتام کی بہبودی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہونا چاہیے اور اس کا دیکھنے

---

[1] ۔العفو ما خوذ من الزیادۃ (مجمع البیان)

[2] ۔العفو نقیض الجهد وهو ان ینفق ما تیسّر له بذله ولا یبلغ به الی الجهد (بیضاوی صافی)

[3] ۔العفو ما فضل عن قوت السنة عن ابی جعفر علیہ السلام الباقر علیہ السلام قال ونسخ ذلك بآیة الزکوٰۃ (مجمع)

[4] ۔بتولی امرهم وحفظ اموالهم والانفاق علیهم منها وتربیتهم وتادیبهم وتعلیمهم (البلاغی)

[5] ۔ای انهم اخوانکم فی الدین ومن حقّ الاخ ان یخالط (بیضاوی)

والا خالق عالم خود ہے وہ خود جانتا ہے کہ کون اس لئے ایتام کو اپنے ساتھ رکھتا ہے کہ ان کی کم سنی نادانی اور بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر ان کے اموال کو خورد برد کرے اور کون انہیں اس لئے رکھتا ہے کہ ان کے اموال کی حفاظت اور ان کی پرورش کا سامان کرے۔ اور خالق حکیم جو رؤف و رحیم بھی ہے اس کا تو طریق عمل یہی ہے کہ وہ بغیر زحمت و مشقت میں ڈالے ہوئے چاہتا ہے کہ جو بلند مقاصد ہیں ان کو صدمہ نہ پہنچے۔

ولو شاء اللہ لاعنتکم یعنی خالق اگر صرف اپنی شان حاکمیت سے کام لے کر تمہارے لئے ہی پابند یہ عائد کر دیتا کہ تمہیں ایتام کے اموال میں ہاتھ لگانا اور ان اموال کے ساتھ ان کی آمیزش کرنا حرام ہے [1] مگر ایتام کی کفالت اور ان کے اموال کی حفاظت تم پر واجب ہے۔ اگر وہ یہ کر دیتا تو تمہیں اس کی پابندی لازم ہوتی مگر وہ تو خود تمہارے لئے سہولت پسندی سے کام لیا ہے اور تمہیں زحمت میں ڈالنا نہیں چاہتا اس لئے تمہیں ان کے ساتھ آمیزش سے منع نہیں کرتا ہاں یہ شرط ہے کہ ان کے نقصان کے درپے نہ ہو۔

آخری دو الفاظ عزیز اور حکیم ان دونوں مثبت اور منفی پہلوؤں سے متعلق ہیں اللہ عزیز یعنی غالب و قاہر ہے لہٰذا اگر وہ چاہتا تو مشقت میں ڈال سکتا تھا اور وہ حکیم ہے لہٰذا وہ اپنی مشیت کو حکمت و مصلحت کے خلاف کبھی جاری نہیں کرتا اور مشقت میں ڈالنا اس کی شان حکمت کے خلاف ہے [2]۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

”اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور یقیناً باایمان کنیز مشرک بیوی [3] سے بہتر ہے چاہے وہ تمہیں پسند بھی ہو اور مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں یقیناً مسلمان غلام مشرک شوہر [4] سے بہتر ہے چاہے وہ تمہیں پسند بھی ہو، یہ لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تمہیں بہشت اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے بلاتا ہے اور اپنے احکام لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کرتا ہے شاید کہ وہ اثر لیں۔“

---

[1] ۔لحملکم علی العنت وھی المشقۃ ولم یجوز لکم مدا خلتم (صافی)

[2] ۔عزیز غالب یقدر علی الاعنات حکیم یحکم ما یقتضیہ الحکمۃ ویتسع لہ الطاقتہ (بیضاوی)

[3] ۔حرّۃ (صافی)

[4] ۔حرّ (صافی)

غیر مسلموں سے شادی بیاہ کی ممانعت:

یہ آیت اس حکم شرعی کا قطعی طور پر ثبوت ہے کہ غیر مسلمین کے ساتھ شادی بیاہ کرنا اسلام میں حرام ہے بے شک سورۂ مائدہ میں ایک جگہ اہل کتاب کی عورتوں سے تعلقات ازدواجی کا ذکر ہے اس طرح کہ :وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ مگر اس میں یہ فقرہ موجود ہے کہ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ''جب تم ان کی اجرتیں دے دو''۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نکاح متعہ سے متعلق ہے جو وقت ضرورت عارضی طور پر ہوا کرتا ہے۔اس میں یہ وسعت دی گئی ہے کہ جب مسلمان عورتیں ایسی موجود نہ ہوں تو اس عارضی صورت میں بھی بت پرست عورتوں کی طرف رخ کرنا قطعاً جائز نہیں ہے پھر اگر توجہ کرو تو اہل کتاب عورتوں کی طرف مگر نکاح دائمی ان سے بھی جائز نہیں ہے جیسے ایک اور آیت میں ان الفاظ میں منع کیا گیا ہے وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ [1] اس آیت میں کوافر کا لفظ ہے یعنی کافرہ عورتیں۔اس میں اتنی بھی گنجائش اہل کتاب کے اخراج کی نہیں ہے جتنی کہ مشرکین کے لفظ میں خیال کی جاسکتی ہے۔

آخر میں اس ممانعت کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ لوگ [2] آتش جہنم کی طرف دعوت دیتے ہیں [3] یعنی شوہر اور زوجہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس لئے اگر چہ یہ امکان ہے کہ مسلمان فریق ہی اپنے دوسرے ساتھی کو متاثر بنادے مگر اس نفع مشکوک کے بجائے امکانی خطرہ سے تحفظ زیادہ ضروری ہے کہ کہیں وہ دوسرا فریق اثر انداز نہ ہوجائے جو ہلاکت ابدی کا سبب ہوگا۔

اب چوں کہ مرد نسبتہً زیادہ طاقتور ہے اور اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے فرقہ اسلامی میں عورت کے لئے مرد کے انتخاب میں زیادہ سختی برتی گئی ہے۔عورت کے انتخاب میں اتنی اہمیت نہیں سمجھی گئی اس لئے متعہ کی بحالت ضرورت جو اجازت ہے وہ بھی مسلمان مرد کے لئے ہے وہ کتابی عورت سے متعہ کرسکتا ہے مگر مسلمان عورت کے لئے کسی نوع کے بھی تعلقات ازدواجی قائم کرنے کی کسی بھی طبقہ کے غیر مسلم مرد سے اجازت نہیں دی گئی ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝۲۲۲

''اور آپ سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دیجئے کہ یہ ایک گندگی ہے [4] لہٰذا تم حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ وہ جائیں ان کے نزدیک نہ جاؤ ہاں جب وہ طہارت کرلیں تو ان

---

[1] ۔ممتحنة ۱۰

[2] ۔اشارة الی المشرکین والمشرکات (صافی)

[3] ۔یعنی الی الکفر والمعاصی الّتی ھی سبب دخول النّار (مجمع البیان)

[4] ۔بگو کہ وے نجاست است (شاہ ولی اللہ)

کے پاس جاؤ جس صورت سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ یقیناً اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور طہارت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔

ایام میں مقاربت کی ممانعت:

چوں کہ حیض کے بارے میں شرائع سابقہ میں بھی احکام موجود تھے اس لئے لوگ اس کے متعلق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی دریافت کرتے تھے اس آیت میں اس حالت کے احکام میں اہمیت کے ساتھ اس حکم کا بیان ہوا ہے کہ مردوں کے لئے ہم بستری کرنا اس حالت میں ناجائز ہے۔

"جب تک پاک نہ ہو جائیں [1] یعنی حیض موقوف نہ ہو جائے اگر چہ ابھی غسل نہ کیا ہو یہی یطھرن کے لفظ کا تقاضا ہے [2] ہاں اگر یہاں پر یتطھرن ہوتا تو یہ معنی پیدا ہوتے کہ جب تک طہارت نہ کرلیں۔ اس کا مطلب ہوتا کہ جب تک غسل نہ کرلیں ان سے مقاربت ناجائز ہے [3] مگر یہ قرأت شاذ ہے اور اس کا اعتبار نہیں ہے۔

جب پاک ہو جائیں تو کہا جا رہا ہے کہ اب اُن کے پاس جاؤ جس صورت سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ پابندی حیض والی برطرف ہوگئی۔ اب جو عام قانون شروع ہوا اس کے مطابق تعلقات ازدواجی سے کام لو۔

اب پہلی جگہ ممانعت کی حد تو حیض موقوف ہونے کو قرار دیا گیا مگر اس کے بعد صراحۃً جو اجازت دی گئی اُسے متفقہ قرأت میں طہارت نہیں، بلکہ تطھر سے وابستہ کیا گیا ہے جس کے معنی غسل کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ درمیانی وقت یعنی وہ موقع کہ جب حیض موقوف ہو چکا اور غسل ابھی نہ کیا ہو اس آیت میں مسکوت عنہ ہے یعنی وہ گزشتہ حرمت کے دائرہ سے بھی خارج ہے اور اس اجازت کی صراحت میں بھی داخل نہیں ہے اس سے ذہن میں کچھ آتا ہے کہ اس حالت میں مقاربت مکروہ ہے اسی لئے گزشتہ حرمت کے دائرہ سے تو خارج کر دیا مگر اجازت کی تصریح نہیں کی جیسا کہ بعض احادیث سے بھی استفادہ ہوتا ہے [4]۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

---

[1] تا آں کہ پاک شوند (شاہ ولی اللہ) یہاں تک کہ پاک ہوں (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔تنخفیف الطاء کما ھو المرسوم فی المصاحف المتداولۃ بین المسلمین یدا عن یدو علیہ قراء تھم ولا عبرۃ بما خرج عن ذٰلك من بعض القرأت (البلاغی)

[3] ۔من قرأ یطھّرن فانما ھو من یتطھّرن ای یغتسلن (صافی)

[4] ۔فی روایۃ اخریٰ والغسل احبّ الیّ (صافی)

''تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں لہٰذا اپنی کھیتی میں جس طرف سے چاہو آؤ[1] اور اپنے مستقبل کے لئے سامان کر رکھو اور اللہ کے غضب سے بچو اور جانتے رہو کہ تمہیں اس کے سامنے جانا ہے اور مبارک باد دیجئے[2] انہیں جو ایمان لائے ہیں۔

اس میں پہلا جزء عام حالات میں عورتوں سے مقاربت کے جواز کے لئے ہے کہ شریعت اسلام میں اس کی حامی کبھی نہیں ہوسکتی کہ عورتوں سے تعلقات ازدواجی تم ختم ہی کرو۔ اس لئے کہ یہ اس مقصد اجتماعی کو صدمہ پہنچانا ہے جس کے لئے خالق نے اس صنف کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے مگر ہاں اس دنیوی مفاد کے لئے آخرت کو بھول نہ جاؤ۔

دوسرا جزء کہ اپنے لئے سامان آخرت مہیا کرو اور اللہ کے غضب سے بچو، یہ ان صورتوں میں کہ جو ممنوع ہیں اس عمل سے روکنے کی تاکید ہے یعنی دنیا کا مفاد کیسا ہی سہی مگر تمہیں اپنے آخرت کے بنانے اور فرائض الٰہیہ کی پابندی کرنے کا خیال بہرحال ضروری ہے[3]۔

عمل کی پابندی کا مطالبہ کرتے ہوئے یہ کہہ کر کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہیں اللہ کو منہ دکھانا ہے، آخر میں یہ کہنا کہ **وبشر المومنین** ''یعنی مبارک باد کے قابل ہیں وہ جو ایمان لائے'' اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس جماعت میں بھی جو اپنے کو مسلم و مومن کہتی ہو بہت سے واقعتاً اس کا یقین نہیں رکھتے کہ کوئی روز حشر و نشر ہے اور خدا کو منہ دکھانا ہے ورنہ ان کا کردار یہ ہوتا ہی نہ جو اس وقت ہے۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

''اور اللہ کو اپنی قسموں کا تختۂ مشق نہ بناؤ[4] تاکہ تم نیکوکار اور پرہیزگار بنو اور لوگوں میں صلح کرا سکو[5] اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔''

بات بات پر قسم کھانے کی ممانعت:

بعض لوگ بات بات پر قسمیں کھاتے ہیں اور زیادہ تر وقتی جذبات کی رو میں اور یہ اکثر نیک کاموں کے ترک سے بھی متعلق ہوتی ہیں مثلاً کسی سے بگڑ گئے تو کہہ دیا بخدا اب میں اس کے ساتھ کوئی نیک سلوک نہ کروں گا یا کسی سے رنجش ہوئی اور کہہ دیا خدا کی قسم اب میں اس سے کبھی

---

[1] ۔من ای جهة شئتم (بیضاوی) ہر روش کہ خواہید (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔بشّر یا رسول اللہ ﷺ (البلاغی)

[3] ۔ای واتّقوا عقاب اللہ بترك مكاوزة الحدّ فيما بيّن لكم (مجمع البیان)

[4] ۔ای نصبا لها (جلالین) العرضة ما تكثر ملاقة ومصادفة كما يقال الانسان عرضة للبلاء (البلاغی)
مت کرو اللہ کو نشانہ واسطے قسموں اپنی کے (شاہ رفیع الدین)

[5] ۔ان تبروا موضعة جرّ هجذف اللّام عن الخليل (مجمع البیان)

بات نہ کروں گا۔ اس وقت انسان ایسا جذبات کی رو میں کہتا ہے اور پھر اس کام کو دل چاہتا ہے تو قسم کی پابندی سد راہ محسوس ہوتی ہے۔ خالق اس طرح کی قسموں سے منع کر رہا ہے اور ارشاد ہو رہا ہے کہ اس طرح کی قسمیں نہ کھایا کرو تا کہ نیک کاموں میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور خلق کے درمیان رنجش و نزاع دیرپا نہ ہو بلکہ صلح کی صورتیں پیدا ہو سکیں۔ چوں کہ قسمیں کلام سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے آخر میں کہا ہے کہ اللہ سننے والا ہے۔ یعنی تم جو قسمیں کھاؤ ان سے وہ بے خبر نہیں ہے اور جاننے والا ہے یعنی ان قسموں سے جو تم کو نقصان پہنچتا ہے اس سے بھی خوب واقف ہے اور اسی لئے وہ تم کو اس سے روکنا چاہتا ہے [1]۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

''اللہ تمہاری لایعنی قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا مگر جو تم دل سے کرو گے اس کا مواخذہ کرے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے برداشت کرنے والا ہے۔''

پہلے جو کہا گیا تھا کہ خالق کو تختۂ مشق اپنی قسموں کا نہ بناؤ اس سے ایسی قسموں کی ممانعت تو ہو ہی چکی مگر اب خیال ہوتا تھا کہ غصہ میں یا بطور تکیہ کلام ایسی قسمیں جو کھائی گئیں تو پابندی تو ان قسموں کی لازم ہو ہی گئی۔ اس آیت میں اسی خیال کی رد کی جا رہی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ ایسی لا یعنی [2] قسموں کی پابندی بھی ضروری نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی محاسبہ تم سے ہوگا اور نہ کفارہ لازم ہوگا [3]۔

آخری الفاظ کہ ''اللہ بخشنے والا ہے برداشت کرنے والا'' اس فعل کے مذموم اور لائق سزا ہونے کی طرف اشارہ ہے مطلب یہ ہے کہ یہ فعل تمہارا یقیناً برا ہے مگر یہ اللہ کی بخشش اور اس کا حلم ہے کہ وہ تم سے اس پر درگزر کرتا ہے اور سزا نہیں دیتا۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

''ان کے لئے جو اپنی عورتوں سے الگ رہنے کی قسم کھا لیتے ہیں چار مہینے کی مہلت ہے۔ اور اس کے بعد اگر وہ رجوع کریں [4] تو بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان''

---

[1] ۔سمیع ایمانکم علیم باحوالکم وما یصلحکم (البلاغی)

[2] ۔اللغو مالم یقصد بہ عقد الیمین بل یجری علی اللسان توکّاءً فی الکلام (البلاغی) ھو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام و ابی عبداللہ علیہ السلام (مجمع البیان)

[3] ۔لا یؤاخذکم اللہ بالعقوبۃ والکفّارۃ (صافی)

[4] ۔رجعوا فی الیمین بالحنث (بیضاوی)

ایلا کے احکام:

اس میں ایلاء کا حکم بیان کیا گیا ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں درج ہے۔ ایلاء یہ ہے کہ مرد قسم شرعی کھالے اور وہ بھی جوش غضب میں تکیہ کلام کے طور پر نہیں بلکہ سمجھی بوجھی قسم [1] کہ وہ اپنی زوجہ سے مباشرت نہیں کرے گا [2] اسے بتایا گیا ہے کہ چار مہینے تک تو انہیں اس قسم پر قائم رہنے کا حق ہے کیوں کہ چار مہینے تک تو یوں بھی انسان کو ترک مباشرت کا حق ہے لیکن چار مہینے کے بعد زوجہ کو مطالبہ کا حق ہے اور اس صورت میں انہیں کفارہ دے کر [3] اس قسم کو توڑ دینا چاہیے یا طلاق دیدینا چاہیے جو اس کے بعد کی آیت میں مذکور ہے [4] اب قسم کے توڑنے کا جو گناہ ہے اسے کہا جارہا ہے کہ خدا معاف کردے گا [5] اور یہ اس کی رحمت ورافت کا تقاضا ہے جسے صرف تفضّل کہا جاسکتا ہے۔

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

''اور اگر وہ طلاق دینا طے کرلیں [6] تو بلاشبہ اللہ سننے والا ہے جاننے والا ہے''

مطلب یہ ہے کہ چار مہینے کے بعد اگر عورت کا مطالبہ تعلقات ازدواجی کے متعلق ہے تو پھر (دو صورتوں میں انحصار ہے: یا تو قسم کو توڑ دیں اور اس کا کفارہ ادا کریں [7] اور یا پورے شعور اور ارادہ کے ساتھ طلاق دے دیں۔ بیچوں بیچ معلق چھوڑنا جائز نہیں ہے۔

طلاق کے ساتھ عزم کے لفظ کا استعمال جو شعور اور ارادہ کی قوت کا پتہ دیتا ہے اس کا ثبوت ہے کہ طلاق کے لئے صرف الفاظ جاری کر دینا خواہ بلا ارادہ ہو یا نمائشی طور پر ہو کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ قصد انشاء اور پورے پورے شعور کا ہونا ضروری ہے جو مطابق تعلیم اہل بیت علیہم السلام مسلک امامیہ ہے اور چوں کہ اس میں دو جزء میں ایک دل سے متعلق اور قصد انشاء اور دوسرا زبان سے متعلق اور وہ صیغۂ طلاق اس لئے تتمہ آیت میں دو لفظ صرف ہوئے سمیع اور علیم خدا سننے والا ہے یہ سننے والا الفاظ سے متعلق ہے اور جاننے والا دل کے اندرونی قصد سے متعلق ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ

---

[1] ۔علیٰ وجد یقع موقع اللغو (مجمع البیان)

[2] ۔انه الحلف علیٰ ترك الزوجة (البلاغی)

[3] ۔یجب علی الفائی عندنا الکفّارة ولا عقوبة علیه (مجمع)

[4] ۔لمعنی لیس لهم بعد

[5] ۔لایتبع بعقوبة (صافی) یدل علیٰ عدم العقاب

[6] ۔وان حتموا قصده (بیضاوی) واگر قصد کردند جدائی را (شاہ ولی اللہ) اور اگر قصد کریں طلاق کی (شاہ رفیع الدین) طلاق ہی کی ٹھان لیں (فرمان علی صاحب)

[7] ۔المذکورة فی سورة المائدة فی تسعة وثمانین (البلاغی)

بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

''اور جن عورتوں کو طلاق دی جائے وہ اپنے کو روکیں گی، تین دفعہ ایام سے پاک ہونے تک اور انہیں جائز نہیں ہے کہ وہ چھپائیں اسے جو اللہ نے ان کے شکموں میں پیدا کیا ہے، اگر وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہیں اور ان کے شوہر اُس دوران اُن کے واپس بلا لینے کے زیادہ حق دار ہیں اگر وہ تعلقات درست رکھنا چاہیں اور ان عورتوں کا حق بھی ویسا ہی ہے جیسا اُن پر بھلائی کرنے کا فرض ہے۔ ہاں مردوں کو اُن پر ایک درجہ فوقیت ہے [۱] اور اللہ زبردست ہے بڑا سوجھ بوجھ رکھنے والا''۔

عدۂ طلاق:

اس میں عدۂ طلاق کا بیان ہے جب کسی عورت کو اس کا شوہر طلاق دے تو طلاق کے بعد ہی فوراً اسے کسی دوسرے مرد سے عقد جائز نہیں ہوگا۔ بلکہ عدّۃ کے گزرنے کا انتظار کرنا ہوگا۔ اسی عدّہ کو یہاں بیان کیا جارہا ہے اور ابتداء میں المطلقٰت کی لفظ، اگرچہ عام ہے، مگر دوسرے دلائل سے ثابت ہوگیا ہے کہ یہ حکم انہی مطلّقات سے مخصوص ہے جنہیں بعدِ دخول طلاق دیا گیا ہو اور انہیں ایام ہوتے ہوں، یعنی یائسہ اور غیر مدخول بہا کا یہ حکم نہیں ہے [۲]۔

اس نظیر کو یاد رکھنا چاہیے اور اس کے بعد اگر احکام میراث میں آیت قرآن ولھن الربع مما ترکتم کی تشریح میں کچھ دلائل کی بناء پر کہا جائے کہ یہ حکم زوجہ کا ہے جائداد منقولہ کے متعلق اور غیر منقولہ میں سے بالکل یا کسی حد تک زوجہ محروم ہے تو یہ نہ کہا جائے کہ یہ نص قرآن کے خلاف ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ عموم کی تخصیص یا اطلاق کی تقیید کا نام مخالفت نہیں ہے جس کے ثبوت کے لئے یہی محل کافی ہے کہ آیت لفظ المطلقات کے ساتھ وارد ہوی ہے مگر حکم وہ کچھ خاص طرح کے مطلقات سے مخصوص مانا جاتا ہے سب کے لئے تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اس مدت تک کہا گیا ہے کہ اپنے کو روکیں گی یہ الفاظ ظاہراً خبر ہیں مگر اس سے مقصود یہ کہنا ہے کہ انہیں اتنی مدت تک ضرور بالضرور اپنے کو روکنا چاہیے [۳]۔

اب یہ مدت کیا ہے تین قرو۔ قرو کے دونوں معنی ہیں ایام بھی اور ایام سے پاک ہونا بھی [۴] مگر ہمارے یہاں اس کی تفسیر تین طہر سے

---

[۱] ۔درجۃ زیادۃ فی الحق وفضیلۃ (نیشاپوری)

[۲] ۔المطلقات یرید بھا المدخول بھن من ذوات الاقراء (بیضاوی)

[۳] ۔ خبر فی معنی الامر للتاکید (صافی)

[۴] ۔ھذا الحرف من الاضداد (مجمع البیان) جمع قرع بفتح القاف وھو الطھر قولان (جلالین)

ہی ہوئی ہے جس کا مطلب تین دفعہ ایام سے پاک ہونے کی مدت [1]۔

بعض ائمہ اہل سنت بھی اس متفق ہیں [2]۔

یہ مطلقات اسے چھپائیں نہیں جو اللہ نے اللہ کے شکموں میں پیدا کیا ہے''۔ یعنی اگر انہیں حمل ہے جس کا شوہر کو بوقت طلاق علم نہیں تھا یا ممکن ہے خود اس عورت کو بھی علم نہ ہو اور اب زمانہ عدہ میں معلوم ہو جائے تو انہیں لازم ہے کہ شوہر کو اس کی اطلاع دے دیں، چھپانے کی کوشش نہ کریں اور بعض روایات میں اس کے معنی یہ لئے گئے ہیں کہ جو ان کی کیفیت ہو طہر ہو یا حیض ہو یا حمل اسے صاف صاف بتا دیں مخفی نہ کریں تا کہ ناواقفیت کی وجہ سے شوہر نہ غلط کاری میں مبتلا ہو سکے اور نہ جو خالق کی طرف سے اسے عدۂ میں رجوع کا حق ہے وہ ضائع ہو سکے [3]۔

اس عدہ کے دوران شوہر کو بغیر کسی عقد کے اسی سابق زوجیت کے حق سے دوبارہ تعلقات ازدواجی قائم کر لینا جائز ہیں جس میں زوجہ کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے [4]۔

ان ارادوا اصلاحا۔ اب یہ شوہروں کو ہدایت ہے کہ اس رجوع سے تمہارا مقصد صرف اس بیچاری عورت کو پریشان کرنا نہ ہونا چاہیے بلکہ واقعی اگر اب نباہ کرنا ہو تو ایسا کرو [5]۔

آخر میں عورتوں کو جو ایک بالکل بے جان مخلوق یا حیوان یا مثل اثاث البیت سمجھ کر ایسا تصور تھا اور اب بھی شاید بہت سے جاہل مردوں کو ہوتا ہے کہ حقوق سب شوہر کے ہیں اور بیوی کا کام تو بس اطاعت کرنا ہے اس کو ختم کرنے کے لئے ارشاد ہوا ہے کہ ایسا نہ سمجھنا مرد اور عورت کا رشتہ ایک طرح سے برابر کا رشتہ ہے لہٰذا جس طرح عورتوں پر فرائض ہیں جن کے مطالبہ کا حق مردوں کو ہے اسی طرح ان کے حقوق بھی ہیں جن کا ادا کرنا مردوں کے فرائض میں داخل [6] اس مطلب کو قرآن نے اس مختصر جملہ میں سمو دیا ہے کہ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ [7]

ہاں اسلام کا نقطہ اعتدال چوں کہ مرد اور عورت کی بحیثیت صنف کلی مساوات کے نظریہ کے ساتھ بھی متفق نہیں ہے جو مغربی تصورات کی بناء پر آج کل تعلیم یافتہ دماغوں پر شدت سے مسلط ہے اس لئے قرآن نے تبادلہ حقوق و فرائض کے بیان کے بعد ایک جملہ میں ارشاد کیا کہ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ. ہاں مردوں کو ان پر ایک درجہ فوقیت ہے۔''

چوں کہ مرد فطری خصوصیات میں ان سے بالاتر ہیں اس لئے شارع نے جو خالق فطرت بھی ہے انہیں طبقہ خواتین کی عزت و ناموس کا محافظ اور نان و نفقہ کا کفیل بنایا ہے اس کا لحاظ عورتوں کو رکھنا لازم ہے جس کا اسلام کا حکیمانہ نظام تشریح اور تقسیم حقوق میں بھی لحاظ کیا گیا ہے۔

---

[1] ۔المراد بالقروء الاطهار عندنا (مجمع) عليه اجماع الامامية وحديثهم (البلاغی)

[2] ۔ذهب الشافعی الی انحصا الاطهار (نیشاپوری)

[3] ۔وهذا القول اعم فالاخذ به اولیٰ (مجمع البیان)

[4] ۔لا يحتاج فی ذلك الیٰ رضا المرأة ولا الیٰ عقد جديد واشهاد (مجمع)

[5] ۔اصلاحا لما بينهن ولم يريدوا مضارتهن (صافی)

[6] ۔ای ولهن حقوق علی الرّجال مثل حقوقهم عليهن فی الوجوب واستحقاق المطالبة عليها (بیضاوی)

[7] ۔هذا من الفوائد العجيبة الجامعة للفوائد الجمة (مجمع البیان)

آخر میں واللہ عزیز حکیم کے الفاظ میں حاکمانہ اور حکیمانہ دونوں پہلوؤں کا امتزاج ہے۔

چوں کہ تقسیم حقوق وفرائض میں مرد اور عورت دونوں پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں وہ دونوں کو اکثر ناگوار ہوتی ہیں اور وہ ان کی مخالفت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور تعمیل سے گریز کرتے ہیں، تو عزیز کہہ کے انہیں عذاب الٰہی کا تصور پیدا کیا گیا ہے کہ اس کی مخالفت کر کے تم اس کے عذاب سے بچ نہیں سکتے کہ وہ زبردست ہے اس کے مقابلہ میں کوئی غالب نہیں آ سکتا اور پھر انہیں بطور ناصح سمجھایا ہے کہ اس نے جو پابندیاں عاید کی ہیں وہ تمہاری بھلائی ہی کے لئے ہیں کیوں کہ وہ ''حکیم'' ہے۔

اس کا کوئی حکم حلم اور مصالح سے خالی نہیں ہوتا [1] اور اس میں بھول چوک اور غلطی کا بھی کوئی امکان نہیں ہے [2]۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

''ایسی طلاق [3] بس دو دفعہ ہو سکتی ہے اس کے بعد پھر یا ٹھیک طور پر رکھے یا مناسب طور پر روانہ کر دے اور تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے انہیں دیا ہے اس میں سے کچھ لے لو مگر یہ کہ ان دونوں کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ خدا کی مقرر کردہ حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ تو اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ وہ حدود الٰہیہ کو قائم نہیں رکھیں گے تو جو کچھ وہ عورت معاوضہ دینا چاہے اس میں ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں۔ ان سے قدم آگے نہ بڑھاؤ اور جو اللہ کی حدود سے قدم آگے بڑھائے تو یہی وہ ہوتے ہیں جو ظالم ہیں۔''

طلاق بائن کا حکم اور اس کا معیار:

اس میں پہلے طلاق بائن کا حکم بتایا گیا ہے اور پھر خلع کا حکم بیان کیا گیا ہے۔

طلاق بائن یعنی جس شوہر کو عدۂ میں رجوع کا حق حاصل نہیں ہے یہ کیوں کر ہوتی ہے ایک دفعہ طلاق دی پھر عدۂ کے اندر رجوع کر لیا۔ اس کے بعد پھر طلاق دیا اور پھر عدۂ کے اندر رجوع کر لیا اس کے بعد تیسری دفعہ پھر طلاق دیا تو یہ طلاق بائن ہوگی۔

---

[1] ۔عزیز یقدر علی الانتقام ممن خالف الاحکام حکیم شرعها لحکم و مصالح (بیضاوی)

[2] ۔مصیب فی افعاله واحکامه لا یتطرّق الیها احتمال العبث والشفه والغلط والباطل (نیشاپوری)

[3] ۔یعنی الطلاق الذی یملك الرجعة عقیبه مرّتان (معالم التنزیل بغوی) طلاق رجعی دو بار است (شاہ ولی اللہ) یہ طلاق دو بار ہے (شاہ رفیع الدین)

سیاق اور الفاظ قرآن صاف اسی صورت کا پتہ دے رہے ہیں۔ چوں کہ اس کے پہلے کی آیت میں اس کا بیان ہوا تھا کہ عدۂ کے اندر اگر شوہر رجوع کر لے تو اس کے لئے جائز ہے اس آیت میں اسی کو کہا جا رہا ہے کہ اس طرح کی طلاق بس دو دفعہ ہو سکتی ہے اس کے بعد ایسا نہیں ہو سکتا لہٰذا اب مختتم طور پر طے کر کے طلاق نہیں دینا ہے تو بس یکسوئی اور حسن معاشرت کے ساتھ اب رشتہ ازدواجی پر قائم رہے۔ یہ ھے امساك بمعروف[1]۔

اور یا بس اب مختتم طور پر سلسلہ ہی قطع کر لے یعنی ایسی طلاق دے جس کے بعد رجوع نہیں ہوگی ۳۔ یہ ہوگی طلاق بائن جس کے بعد یہ رشتہ بالکل منقطع ہو گیا اور عدۂ کے اندر رجوع کا حق نہیں رہا۔

اہل سنت عموماً ایک نشست میں تین دفعہ الفاظ طلاق جاری کر دینے کو بھی طلاق بائن سمجھتے ہیں مگر قرآن مجید کی دونوں آیتوں پر ایک ساتھ غور کرنے کے بعد اس تصور کی گنجائش نہیں رہتی۔

ہم نے الطلاق کا جو ترجمہ کیا ہے ''ایسی طلاق بس دو ہی دفعہ ہو سکتی ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ الطلاق میں الف لام عہد کا ہے اور اس سے اشارہ ہے گزشتہ آیت کے مضمون کی طرف کہ طلاق دے کر عدۂ کے اندر رجوع کر لی جائے۔ اگر یہ مفہوم نہ ہو اور الف لام جنس کا لیا جائے جس کے بعد یہ معنی ہوں گے کہ طلاق بس دو ہی دفعہ ہوتی ہے تو یہ مطلب بالکل درست نہیں ہے اس لئے کہ طلاق تو وہ بھی ہے جو تیسری دفعہ ہوتی ہے جس کے بعد رجوع نہیں ہے۔

پھر عقلاً بھی دیکھئے تو طلاق کی حقیقت اس کی متقاضی ہے کہ اس کے پہلے رشتہ زوجیت قائم تھا اور اسے اب قطع کیا جا رہا ہے ایک نشست میں تین دفعہ کیا ہزار دفعہ الفاظ طلاق زبان پر جاری کر دیئے تو سوال یہ ہے کہ پہلی دفعہ کے صیغہ طلاق سے وہ عورت زوجیت سے خارج ہوئی یا نہیں۔ اگر خارج ہو گئی تو اب وہ زوجہ ہی نہیں ہے۔ پھر بعد کے یہ الفاظ طلاق کا مصداق کیوں کر قرار پا سکتے ہیں اور اگر پہلی دفعہ الفاظ سے خارج نہیں ہوئی بعد کے الفاظ سے خارج ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان تمام الفاظ کے مجموعہ سے طلاق حاصل ہوئی لہٰذا وہ تین طلاق کہاں ہوئے ایک ہی طلاق ہوئی۔

اسی لئے مذہب اہل بیت علیہم السلام یہ ہے کہ تین دفعہ الفاظ طلاق جاری کرنے کے بعد وہ ایک ہی طلاق سمجھی جا سکتی ہے تین طلاقوں کا حکم اس میں جاری نہیں ہوتا[2]۔

دوسرا حکم یہ بیان کیا گیا ہے کہ طلاق دینے پر جو کچھ تم نے دیا ہے یعنی مہر[3] اس کے کل یا کسی جزء کی واپسی کا حکم نہیں ہے یہ تمہید ہے حکم خلع کے بیان کی کہ مہر تو سابق زوجیت کی بناء پر ثابت ہو چکا۔ اب اس کے واپس لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہاں اگر زوجہ خود طلاق چاہتی ہو اور وہ

---

[1] ۔بمعروف ای علی وجه جمیل سائغ فی الشریعة لا علی وجه الاضرار (مجمع البیان) ما یعرف فی الشرع من اداء حقوق النکاح وحسن الصحبة (بغوی) ۳۔بأن لا یراجعها حتی تبین منه (صافی)

[2] ۔علیه مذهب اهل بیت واجماع الامامیة ومذهب ابن عباس (البلاغی) هٰذا هو الّا قیس واختاره کثیر من علماء اهل بیت (نیشاپوری)

[3] ۔مّما ایتمونهنّ ای اعطیتموهنّ من المهر (مجمع البیان)

طلاق کے معاوضہ میں اپنے مہر کو معاف کرے یا اگر لے چکی ہے تو واپس تو دینے پر تیار ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اسی طلاق کو جو معاوضہ کے ساتھ ہوتی ہے طلاق خلعی کہا جاتا ہے۔

اسے یوں کہا گیا ہے کہ جب ان دونوں کو اندیشہ ہو کہ حدود الٰہیہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے یعنی تعلقات اتنے ناخوش گوار ہوں کہ شوہر اور زوجہ دونوں ہی اب نباہ ہونے سے مایوس ہو گئے ہوں تو اس صورت میں گزشتہ حکم نہیں رہے گا۔ اب جب کہ ایسا ہو ''ایسا ہو'' کو قرآن میں اب یوں کہا گیا ہے کہ ''لیکن اگر تم لوگوں کو یہ اندیشہ ہو'' یہ تم لوگ کون؟ اس سے صنعت التفات کے طور پر شوہر اور زوجہ کے مراد ہونے کا امکان تو ہے مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے با اثر اور معقول اشخاصِ مومنین مراد ہوں جو صلح کی کوشش کر سکتے ہیں اور اس صورت میں اس تغیر اسلوب کے اندر یہ مفہوم مضمر ہے کہ اگر انہیں اندیشہ بھی پیدا ہوا ہو تو دوسرے لوگوں کو چاہیے کہ وہ بیچ میں پڑ کر اصلاح حال کی کوشش کریں۔ جب یہ بھی کوشش میں ناکام ہو کر مایوس ہو جائیں تو اب خلع کی معاملت ہو جائے تو بہتر ہے ''یہاں کہا گیا کہ کوئی حرج نہیں'' دونوں کے لئے اس کا مطلب یہ ہے کہ اب بھی کوئی پابندی نہیں ہے بلکہ اختیار ہے۔ زوجہ کو تو اختیار ہے کہ وہ کچھ معاوضہ کی پیش کش کر کے طلاق مانگے اور پھر شوہر کو یہ اختیار ہے کہ وہ اس پیش کش کو چاہے تو منظور کرے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

''اب اگر وہ طلاق دے تو اس کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہو گی جب تک وہ اس کے علاوہ کسی شوہر سے شادی نہ کر لے۔ اب جب وہ اسے طلاق دے دے تو اگر ان دونوں کا خیال ہو کہ وہ اب اللہ کی حدود کو برقرار رکھیں گے تو ان کے لئے کوئی گناہ نہیں کہ وہ آپس میں پھر شادی کر لیں۔

''اور یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں جنہیں وہ بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں۔''

یہ گزشتہ آیت کے مضمون کا تتمہ ہے۔ یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ دو دفعہ کے بعد اب شوہر کو مختتم طور پر دو باتوں میں ایک کو طے کر لینا چاہے یا تو وہ ٹھیک طور پر رہے اور رشتہ ازدواجی کو برقرار رکھے یعنی، اب کبھی طلاق نہ دے اور یا اب وہ اس سے بالکل قطع تعلق کر لینا طے کر لے۔

اب اگر اس نے دوسری شق اختیار کر لی تو اسکا حکم اس آیت میں بیان ہو رہا ہے کہ اگر اس نے اب تیسری بار طلاق دی تو پھر اسے عدۂ کے اندر رجوع کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس طلاق کو طلاق بائن کہتے ہیں۔

اب وہ اس کے لئے اُس وقت تک حلال نہیں ہو سکتی جب تک ایک دوسرے شوہر سے اس کا عقد نہ ہو جائے اور وہ اس سے مباشرت نہ

کرلے [1] اور یہ بھی ایک مثال ہے اس کی کہ الفاظ قرآن مطلق ہیں مگر حکم ایک قید کے ساتھ مقید ہے [2]

ہاں! جب یہ شوہر اپنی مرضی سے طلاق دے دے تو اگر وہ دونوں یعنی سابق کے میاں بیوی سمجھیں کہ اب زوجیت کے فرائض ادا کرتے رہیں گے، تو عدۂ گزرنے کے بعد پھر دوبارہ باہم عقد کر کے رشتۂ زوجیت میں منسلک ہو سکتے ہیں [3]۔

یہ تمام پابندیاں اس لئے ہیں کہ وہ رشتۂ زوجیت کو ایک کھیل اور مذاق نہ سمجھیں اور اس کی اہمیت کو محسوس کریں۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۠ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی میعاد پوری کرنے لگیں [4] تو یا تو اب ٹھیک طور پر انہیں رکھو یا اچھے طور پر انہیں رخصت کر دو [5] اور نقصان رسانی کے طور پر انہیں نہ روکو کہ تعدی سے کام لو اور جو ایسا کرے گا اس نے خود اپنے اوپر ستم ڈھایا اور اللہ کے احکام کو مذاق نہ بناؤ [6] اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اس نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے۔ اس کے ذریعہ سے تمہیں نصیحت کرتا ہے اور اللہ کے غضب سے بچو اور سمجھے رہو کہ بلاشبہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

یہ طلاق رجعی کے متعلق کہا جا رہا ہے جس میں عدۂ کے اندر رجوع کا حق ہوتا ہے کہ عدۂ پورا ہونے کے پہلے ایک دفعہ طے کر لو کہ تمہیں واقعۃً نباہ کرنا ہے یا نہیں۔ اگر صحیح طور پر یعنی ادائے حقوق کے ساتھ [7] نباہ کرنا ہے تو عدۂ کے اندر رجوع کر لو ورنہ عدۂ گزر جانے دو اور پھر انہیں

---

[1] ۔حتی تزوج زوجا غیرہ ویجامعھا (مجمع البیان) اے فق الجمھور علیٰ انہ لا بدّ من الاصابۃ (بیضاوی)

[2] ۔فالاٰیۃ مطلقۃ قیّدتھا السنّۃ (بیضاوی) وتطأھا کما فی الحدیث رواہ الشیخان (جلالین)

[3] ۔فذکر النکاح بلفظ الرّاجع (مجمع البیان)

[4] ۔البلوغ ھٰھنا بلوغ مقاربتہ ایقارب انقضاء العدّۃ (مجمع البیان)

[5] ۔یا جانے دو انہیں اچھی طرح (تاج العلماء)

[6] ۔نہ بناؤ تم ہماری آیتوں کو ہنسی ٹھٹھا (تاج العلماء)

[7] ۔المراد بالمعروف ھٰھنا ان یمسکھا علی الوجہ الذی اباحہ اللہ من القیام بما یجب لھا من النفقۃ وحسن العشرۃ (مجمع البیان)

رخصت کردو کہ اب وہ جا کر چاہیں تو عقد ثانی کرلیں۔

بعض شوہر صرف پریشان کرنے کے لئے کہ وہ دوسرا نکاح نہ کر سکے عدۂ میں رجوع کر لیتے ہیں۔ایسا اب بھی ہوتا ہے اور زمانہ جاہلیت میں تو ایسا بہت کیا جاتا تھا[1] اسے پہلے ''بالمعروف'' ٹھیک طریقہ پر کہہ کر اشارۃً روکا تھا۔اور پھر صراحۃً بھی کہہ دیا کہ صرف ضرر رسانی کے لئے ایسا نہ کرو ورنہ یہ تمہارا ایک ظلم ہوگا جس سے تم خدا کے یہاں نتیجۃً اپنا نقصان کرو گے یعنی تم سے اس کا مواخذہ ہوگا[2]۔

یہ طلاق اور رجوع وغیرہ کے احکام نظامِ معاشرتی کی اصلاح کے لئے حکیمانہ مصالح پر مبنی ہے ''انہیں مذاق نہ بناؤ''[3]۔

یہ عملی مذاق احکام الٰہیہ کے ساتھ ان سب ہی افراد کے کردار میں ہے جو ایمان کے دعوے کے ساتھ پھر بھی اطاعت احکام سے گریز کرتے ہیں[4]۔

آخر میں تہدیدی انداز میں کہا گیا ہے: ''اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے یعنی صرف اس کا خیال نہ رہنا چاہیے کہ ہمارے عمل کو لوگ برا نہ کہیں یا عام افراد خلائق کو اس کی برائی کا احساس نہ ہو۔تمہیں تو اپنے عمل کو مابین خود خدا درست رکھنا چاہیے کیوں کہ لوگوں کو خبر ہو نہ ہو اسے تو ہر بات کا علم ہے[5]۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی میعار پوری کرلیں[6] تو انہیں اپنے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب کہ وہ مناسب صورت پر[7] آپس میں طے کرلیں۔اس سے نصیحت لے گا تم میں وہ شخص جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو یہ تمہارے لئے زیادہ ستھرا اور پاک صاف رکھنے والا طریقہ ہے اور اللہ علم رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے۔''

---

[1] ۔ کانوا یفعلون فی الجاھلیۃ اکثر ھذہ الافعال رجاء ان تختلع المرأۃ منہ بمالھا (نیشاپوری)

[2] ۔ظلم نفسہ بتعریضھا للعقاب (بیضاوی)

[3] ۔لا تستخفوا باوامرہ ونواھیہ (صافی)

[4] ۔من خالف امر الشرع فھو متخذ اٰیات اللہ ھزوا (بغوی)

[5] ۔تاکید و تھدید (بیضاوی وصافی)

[6] ۔بلوغ الاجل ھٰھنا علی الحقیقۃ (نیشاپوری)

[7] ۔بما یحسن فی الدّین والمروۃ من الشرائع۔

اس میں یہ حکم شرعی بتایا گیا ہے کہ طلاق رجعی میں جہاں عدۂ کے اندر رجوع کی اجازت ہوتی ہے اگر عدۂ گزر جائے تو پھر رجوع کا حق نہیں رہتا۔ اس کے بعد وہ شادی کرنا چاہیں تو اس میں کسی کی مزاحمت کا حق نہیں ہے۔

''اپنے شوہروں سے'' یعنی اپنے پسند کے شوہروں سے [1] یا اپنے مطلوب مناسب شوہروں سے [2] اس صورت میں یہ مانع ہونے والے پہلے شوہر بھی ہو سکتے ہیں کہ خود تو طلاق دے چکے، اب وہ جہاں نکاح کرنا چاہتی ہیں اس میں وہ مختلف صورتوں سے سدراہ ہوتے ہیں اور یہ عورت کے اہل خاندان سے سماج کے دوسرے افراد بھی ہو سکتے ہیں جو کسی غلط رسم ورواج وغیرہ کی بناء پر اس کو عقد ثانی سے مانع ہوں اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنے پہلے شوہروں سے [3] اگر از سر نو نکاح کرنا چاہیں تو دوسرے لوگوں کو اُس میں مزاحمت درست نہیں ہے۔

آخری الفاظ بھی اس کا پتہ دیتے ہیں کہ یہ دوسرے افراد خاندان اور افراد ملت کے طرز عمل پر انتباہ ہے کہ اکثر وہ کسی مفروضہ معیار شرافت کے تصور سے عورت کو اس کی مرضی کرنے سے روکتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ہو سکتا ہے کہ نفسانی خواہش اس سے کوئی ایسا عمل کرا دے کے حقیقی معنی میں دامن شرافت داغدار ہی نہیں بلکہ تار تار ہو جائے تو کہا جا رہا ہے کہ ان کو ان کی مرضی کے شوہروں سے عقد کرنے میں مانع نہ ہو''

ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ یعنی یہ اخلاقی پاکیزگی اور تمہارے دامان شرافت کے پاس صاف رکھنے کے لئے زیادہ بہتر طریقہ ہے

اس سے عمومی طور پر ان بے زبان ناکتخدا لڑکیوں کے بزرگ بھی انتباہ حاصل کر سکتے ہیں جو ان پر ان کی مرضی کے خلاف اپنی مرضی کو مسلط کرنے میں ان کی رواجی خاموشی یا رسمی اظہار رضامندی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

''اور مائیں اپنے بچوں کو کامل دو برس تک دودھ پلائیں گی اس کے لئے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے اور

---

[1] ۔ای من رضین بھن ازواجا لھنّ (مجمع البیان)

[2] ۔الذین یرغبن فیھم ویصلحون لھنّ (نیشاپوری)

[3] ۔قیل الذین کانوا ازواجا لھنّ من قبل (مجمع)

بچہ کے باپ [1] پر ان کا کھانا، کپڑا مناسب طور پر لازم ہے [2] کسی بھی متنفس کو اس کی طاقت سے زیادہ حکم نہیں دیا جاتا۔ نہ ماں کو در پے آزار ہونا چاہیے اپنے بچہ کے لئے اور باپ کو اپنے بچہ کے لئے [3] اور وارث پر بھی ایسا ہی لازم ہے ہاں اگر وہ دونوں دودھ بڑھائی کرنا چاہیں آپ کی رضامندی اور باہمی رائے مشورہ سے تو ان پر کوئی گناہ نہیں اور اگر چاہتے ہو کہ اپنی اولاد کو خود دودھ پلوالو [4] تو تمہیں کوئی گناہ نہیں ہے جب کہ جو کچھ تمہیں دینا ہے [5] ٹھیک طور پر حوالے کر دو اور اللہ کے غضب سے بچو اور جانے رہو کہ بلاشبہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کا دیکھنے والا ہے۔"

"مائیں اپنے بچوں کو کامل دو برس دودھ پلائیں گی" یعنی "انہیں ضرور پلانا چاہیے [6] مگر یہ ضرور پلانا چاہیے" استحقاق کا اظہار ہے، نہ یہ کہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ ضرور پلائیں [7] ایسا نہیں ہے۔ اسی لیے انہیں شوہروں سے اُجرت کے مطالبہ کا حق ہے [8] اور قرآن مجید کہہ رہا ہے وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗ اُخْرٰى "اگر تم نے اُجرت کے دینے میں تکلّف کیا تو پھر کوئی دوسری عورت دودھ پلائے گی۔"

اس رضاعت کی مدّت دو برس بتائی گئی ہے اور اسی لئے وہ مدت ہے جس میں رضاع ہو تو رضاعت کے شرعی احکام مرتب ہوتے ہیں۔ ورنہ نہیں اور اسی کے بیان کے لئے اس مدت کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ بعد میں کہا ہے لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ. اس کے لئے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس مدت تک رضاعت واجب نہیں ہے۔ اگر کوئی نہیں چاہتا تو پہلے ہی دودھ بڑھایا جاسکتا ہے [9]۔

اب اگر وہ ماں جو دودھ پلا رہی ہے اپنے شوہر یعنی اس بچہ کے باپ کے حبالہ عقد میں ہے تو اس کا نان ونفقہ تو بہ تقاضائے زوجیت شوہر پر ہے ہی لیکن اگر یہ طلاق دے چکا ہے تو عام حالات میں تو عدۂ کے بعد اب اس کے نان ونفقہ کہ ذمہ داری اس پر نہ تھی لیکن اگر یہ اس سے اپنے بچہ کو دودھ پلوا رہا ہے تو اب اس کا فرض ہے کہ وہ اس مدت رضاعت میں اس عورت کے طعام ولباس کا کفیل رہے [10] [1]۔

احکام رضاعت:

---

[1] ۔المولود له ای الاب (جلالین)

[2] ۔اس پر لازم ہے کہ کھانا کپڑا اس کا واجبی (تاج العلماء)

[3] ۔والدہ اپنے بیٹے کا اور والد اپنے بیٹے کا ضرر نہ چاہیں (عمادالدّین)

[4] ۔اگر تم (اے مردو!) یہ چاہو کہ اپنی اولاد کو (غیر عورت کا) دودھ پلواؤ (عمادالدّین)

[5] ۔ما اردتم ایتاءہ ایّاھنّ وشرطتم لھن (صافی)

[6] ۔خیر فی معنی الامر المؤکد (صافی)

[7] ۔امر استیجاب لا امر ایجاب (مجمع البیان)

[8] ۔لو وجب علیھا الرضاع لم تستحق الاجرۃ (نیشاپوری)

[9] ۔ای ھٰذا منتھی الرضاعۃ ولیس مادون ذٰلك حد محدود وانما ھو علی مقدار اصلاح الصبیّ وما یعیش بہ (معالم التنزیل)

[10] [1] ۔ذٰلك فی المطلّقۃ (مجمع البیان)

اب اس میں ماں کا کام یہ ہوا کہ وہ بچہ کو دودھ پلائے اور باپ کا یہ کہ وہ اس کی ضروریات کا کفیل رہے۔ عام بشری کمزوریوں کی بناء پر طلاق کے بعد دونوں طرف جذبات کام کر سکتے ہیں۔ ایک طرف ہوسکتا ہے عورت شوہر کی ضد میں یہ کہے کہ اپنے بچہ کو دودھ پلوالو، مجھے اب ضرورت نہیں ہے کہ میں اس زحمت میں مبتلا ہوں اور دوسری طرف ہوسکتا ہے کہ مرد اس غیظ وغضب سے کہ جو اسے عورت کے خلاف ہے یہ کہے کہ میں اس سے دودھ بھی پلوانا نہیں چاہتا۔ پیسہ دینا ہے تو کسی اور کو دوں گا۔ قرآن ان دونوں ہی معاندانہ جذبات کے خلاف انہیں بچہ کے مفاد کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ تم دونوں آپس میں کیسی ہی ایک دوسرے سے نفرت رکھتے ہو مگر بچہ تو تم دونوں ہی کا ہے۔ اس کا مفاد تم دونوں کے پیش نظر رہنا چاہیے نہ عورت ہی کو زیبا ہے کہ وہ اپنے بچہ کے نقصان کے درپے ہو اور نہ مرد ہی کو کہ وہ اپنے بچہ کو نقصان پہنچانے کا باعث ہو۔ اس سے ضمناً یہ ایک بات نکلتی ہے کہ بچہ کے لئے خود اس ماں کی رضاعت جتنی مناسب واصلح ہے کسی دوسرے کی نہیں [1] اور اس سے ان لوگوں کی آنکھیں کھلنا چاہئیں جو بلا وجہ بھی صرف شان ریاست میں یا راحت طلبی میں اپنے بچوں کو اناؤں سے دودھ پلواتے ہیں۔

اس محل پر قرآن میں ولد کے لفظ کی تکرار (لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ) اسی لئے کی گئی ہے کہ پہلی جگہ اس کی اضافت ماں کی طرف دینا تھی اور دوسری جگہ باپ کی طرف اور اس اضافت ہی میں ان کے جذبہ ترحم کا بچہ کی نسبت پیدا کرنا مضمر ہے۔ اور یہ انداز خود بتاتا ہے کہ یہ ارشاد حاکمانہ نہیں ہے بلکہ فرمائش حکیمانہ ہے اور اس لئے اگر وہ مخالفت کریں تو قانون انہیں کچھ سزا نہ دے گا مگر اس کے خراب نتائج کا انہیں منتظر رہنا چاہیے۔ اب اگر اتفاق سے طلاق دینے کے بعد باپ کا انتقال ہو گیا تو قرآن کہہ رہا ہے کہ اس کے وارث [2] کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔

یہ کہ حکم گذشتہ کہ اس عورت کو دودھ پلانا اور باپ کو اسی ماں سے دودھ پلوانا چاہیے کوئی حکم وجوبی نہیں ہے بلکہ اولاد کی بہتری کے خیال سے ہے اسے پھر بعد میں نمایاں کیا جا رہا ہے اس طرح کہ اگر دونوں باہمی رضامندی اور باہمی مشورے سے مناسب یہی سمجھیں، یعنی بچہ کے لئے اسی کو بہتر محسوس کریں [3] کہ بچہ کا دودھ دو برس سے پہلے ہی بڑھا دیں [4] مثلاً ماں کی صحت اچھی نہیں ہے اور اس کے دودھ سے بچہ کے بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہے تو کوئی حرج نہیں ہے کہ پہلے ہی دودھ چھڑا دیں۔ اب اگر کسی اور عورت سے دودھ پلوانا چاہو [5] تو اُن دوسری عورتوں سے جو مناسب اُجرت طے کرو۔ اُس کے دینے کے بعد ان سے دودھ پلوا سکتے ہو آخر میں کہا گیا ہے کہ ''اللہ کے غضب سے بچو اور جانے رہو کہ اللہ تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہے'' مطلب یہ ہے کہ بالکل سچائی کے ساتھ جو کچھ کرو بچہ کے حق میں اچھا کرو اور اس میں جذبات سے کام لو اور نہ دوسرے کے ساتھ چال بازی کرنے کی کوشش کرو بلکہ معاملہ صاف ستھرا رکھو کہ بچہ کی صحیح پرورش بھی ہو جائے اور کسی کا حق بھی مارا جائے۔

---

[1] ۔فعن النّبیّ ﷺ لیس للصّبی لبن خیر من امّه وفی الکافی والفقیه عن امیر المؤمنین علیہ السلام مامن لبن رضع به الصّبی اعظم برکة علیه من لبن امّه (صافی)

[2] ۔المراد بالوارث الاب (بیضاوی)

[3] ۔انما شرط تراضیهما وتشاورهما مصلحة للولد (مجمع البیان)

[4] ۔فصالا ای فطاما قبل الحولین (جلالین) از شیر باز گرداندن یعنی پیش از دو سال (شاہ ولی اللہ)

[5] ۔ای لاولادکم مراضع غیر امهاتهم لارضاعهم (معالم التنزیل)

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

''اور جو تم میں مرجائیں اور بیویاں چھوڑ گئے ہوں تو یہ چار مہینے دس دن اپنے کو روکیں جب اتنی مدت پوری کرلیں تو وہ جو اپنے حق میں مناسب طور پر کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہ ہوگا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

عدۂ وفات:

اس میں عدّہ وفات کا بیان ہے اور اس عدّہ وفات کے بعد عقد بیوگان کی اجازت ہے توفی کے اصل معنی تو پورا پورا لینے کے ہیں[1] اور اس لئے حضرت عیسیٰؑ کے لئے زندہ ہونے کے باوجود اس دنیا میں قیام کی مدت پوری ہوجانے کے لئے قرآن میں توفی کی لفظ کا استعمال ہوا ہے مگر چوں کہ عموماً یہ مدت کا پورا ہونا بصورت موت ہوتا ہے اس لئے اکثر موت کیلئے بھی توفی کے لفظ کا استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے کہ یہاں عدّہ وفات کا بیان مقصود ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر شوہر کا انتقال ہوجائے اور زوجہ موجود ہو تو وہ چار مہینے دس دن عدۂ رکھے۔

یہاں بھی الفاظ قرآنی اگرچہ مطلق ہیں مگر حکم مقید ہے ان ہی عورتوں کے ساتھ جنہیں حمل نہ ہو۔ حاملہ کے لئے عدۂ کا تعلق متعلق علیہ طور پر وضع حمل کے ساتھ ہے اس مدت کے گزرنے کے ساتھ نہیں[2]۔

جب یہ عدۂ گزر جائے تو قرآن کہہ رہا ہے کہ تمہارا کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ نیکی کے ساتھ یعنی شرعی طریقہ پر اپنے بارے میں جو چاہیں کریں یعنی جن سے چاہیں عقد کریں۔ انداز بیان بتا رہا ہے کہ اس میں مخاطب وہ لوگ ہیں جو عقد بیوگان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اگر عورت ایسا کرنا چاہیے تو اس پر رسم ورواج یا مزعومہ شرافت کا دباؤ ڈالتے ہیں۔ آخری الفاظ کہ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے انہی لوگوں کے لئے انتباہ ہے کہ تم کس کس عورت کو اس بارے میں متاثر کرتے ہو خدا خوب جانتا ہے۔ اس میں وہ برتاؤ بھی داخل ہے جو عقد ثانی کر لینے والی بیواؤں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو پھر دوسری بیواؤں کو ایسے اقدام سے باز رکھنے کا ذریعہ ہے جس سے ان کا مستقبل تاریک ہوجاتا ہے۔ قرآن صاف سمجھا رہا ہے کہ یہ تمہارا طرز عمل خدا کا ناپسند ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ

---

[1] ۔اصل التوفّی اخذ الشیئ کاملا وافیا (غرائب القرآن) معنی التوفّی هٰذا الشیء وافیا (معالم التنزیل)

[2] ۔ هٰذا فی غیر الحوامل فعدتهن ان یضعن حملهنّ (جلالین)

تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾

''اور تم پر کچھ گناہ نہیں اس میں کہ تم اشارۃً کنایۃً ان عورتوں کی خواست گاری کرو یا اپنے دلوں میں چھپا رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تمہیں وہ جلدی یاد آئیں گی مگر ان سے خفیہ طور پر قول وقرار نہ کرو سوا اس کے کہ اچھے عنوان سے کوئی بات اور عقد نکاح اس وقت تک نہ کرو جب تک مقررہ معیاد پوری نہ ہو جائے اور جانے رہو کہ اللہ تمہارے دلوں کے اندر کی بات جانتا ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور سمجھ لو کہ اللہ بڑا بخشنے والا ہے برداشت کرنے والا[1]۔''

زمانۂ عدّہ کے بعض احکام:

یہ ان افراد کو نصیحت ہے جو بیوہ عورتوں سے عدۂ گزرنے کے بعد نکاح کرنا چاہتے ہیں کہ تمہیں عدۂ کے اندر اس بارے میں صراحۃً کوئی قول قرار کرنا نہیں چاہیے مگر اشارۃً کنایۃً اگر اس کا اظہار کر دو کہ تم ان کے طلب گار ہو[2] تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ مثلاً اس عورت کے سامنے اس کا تذکرہ کرے کہ میرا ارادہ عقد کرنے کا ہے اور اگر ایسی عورت مل جائے جس میں یہ اوصاف ہوں تو کیا کہنا اور اوصاف جو ذکر کیے ایسے ہوں جو اس عورت میں پائے جاتے ہیں[3]۔ یا یہ کہ اس سے باتوں باتوں میں کہے کہ تمہاری طبیعت میرے بہت موافق مزاج ہے اور تمہارے عادات وخصائل وغیرہ مجھے بہت پسند ہیں۔ اب تقدیر دیکھئے میرا ساتھ دیتی ہے یا نہیں[4]۔ بس اس کے علاوہ خود اس سے کوئی وعدہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے، ظاہر بظاہر اور نہ خفیہ طور پر جس کی بعد میں صراحۃً ممانعت کی گئی ہے۔ اس صورت میں پادری عماد الدین کا یہ ترجمہ کتنا غلط ہے کہ ''تم پر کچھ گناہ نہیں کہ عورت کو نکاح کا پیغام خفیہ دو یا اپنے دل میں چھپا رکھو''۔ خدا جانتا ہے کہ تم ان سے کہو گے مگر تم خفیہ وعدہ نہ کر بیٹھو، حسب دستور کوئی بات بول دو' جب بعد میں یہ ہے کہ ''خفیہ وعدہ نہ کر بیٹھو تو شروع میں یہ کیسا کہ عورت کو نکاح کا خفیہ پیغام بھیجو' وہاں خفیہ اور ظاہر کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ وہاں تو یہ ہے کہ الفاظ پیغام کے نہ ہوں بلکہ ایسے ہوں جن سے خیال یہ پیدا ہوتا ہو کہ یہ اس کو پیغام دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایسے الفاظ چاہے مجمع میں بھی کہے جائیں تو قرآن نہیں روکتا اور پیغام خفیہ بھی بھیجا جائے تو قرآن اس کی ممانعت کر رہا ہے۔

اور عقد کرنا تو عدۂ کے پہلے حرام ہے ہی جسے کہا گیا ہے کہ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ عقد نکاح اس

---

[1] ۔بخشنے والا تحمل والا ہے (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔بان تعرضوا بالخطبة ولا تصرحوبها (صافی)

[3] ۔عن ابن عباس (مجمع البیان) عن القاسم بن محمد والشعبی (مجمع)

[4] ۔عن القاسم بن محمد والشعبی (مجمع)

وقت تک استوار نہ کرو جب تک مقررہ میعاد پوری نہ ہو جائے یعنی عدۃ کی مدت گزر نہ جائے [1]۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ''اللہ برداشت کرنے والا ہے'' اس برداشت کا مطلب یہ ہے کہ وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ پوری حجت تمام ہو لینے دیتا ہے اور اس کے لئے برابر مہلت پر مہلت دیئے چلا جاتا ہے [2] جو اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

''تم پر کوئی بار نہیں ہے [3] اگر تم عورتوں کو طلاق دو جب تک کہ انہیں ہاتھ نہ لگایا ہو یا ان کے لئے کوئی مہر مقرر نہ کیا ہو [4] ہاں انہیں خرچ کو دو، خوش حال اپنی حیثیت کے مطابق اور غریب اپنی حیثیت کے موافق کچھ مناسب خرچ جو نیک اعمال لوگوں کے ذمہ ایک حق ہے۔''

مہر وغیرہ جو ادا کرنا ہوگا:

یہ اس صورت کے حکم شرعی کا بیان ہے کہ جب بیوی کو کسی وجہ سے مباشرت کے پہلے ہی [5] طلاق دیدے یہاں اگر کوئی مہر مقرر تھا تو نصف مہر دینا ہوگا جس کا اس کے بعد ذکر ہوگا لیکن بوقت عقد کوئی مہر بھی مقرر نہ تھا تو اس صورت میں کہا جا رہا ہے کہ تم پر کوئی بار نہیں ہے یعنی اس صورت میں کسی خاص مقررہ رقم کی پابندی نہیں ہے بلکہ جو کچھ مناسب ہو حسب حیثیت اسے دیدو۔

یہ حسن عمل رکھنے والوں کے لئے ایک لازم الادا حق ہے، یعنی اس حق کا ادا کرنا حسن عمل کا لازمی تقاضا ہے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

---

[1] ۔حتی ینتھی ما کتب من العدۃ (بیضاوی)

[2] ۔حلیم بتاخیر العقوبۃ عن مستحقھا (جلالین)

[3] ۔ لاتبعۃ علیکم من مھر اووزد (صافی)

[4] ۔المراد بالفریضۃ الصداق بلا خلاف (مجمع البیان)

[5] ۔مالم تمسوھن ای تجامعوھن (بیضاوی)

''اور اگر تم ان عورتوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دو جب کہ تم ان کے لئے کچھ مہر مقرر کر چکے ہو، تو تم کو جو تم نے مقرر کیا ہو اس کا آدھا لازم ہوگا، مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں یا جس کے قبضہ میں نکاح کا معاہدہ ہے''[1]۔

وہ درگزر کرے اور اگر تم لوگ درگزر سے کام لو تو پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے اور آپس میں لطف و کرم کو نہ بھولو۔ بلاشبہ اللہ اس کا جو کچھ تم کرتے تو دیکھنے والا ہے۔''

اب اگر طلاق قبل دخول[2] ہو مگر مہر مقرر ہو تو یہاں نصف مہر کا دینا شوہر کو لازم ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ زوجہ اگر وہ بالغ ہے اور اگر نابالغ ہو تو اس کا ولی جو باپ دادا ہوتا ہے[3] معاف کر دے۔

ایک دوسری تفسیر یہ ہے کہ جس کے قبضہ میں نکاح کا معاہدہ ہے اس سے مراد شوہر ہے مطلب یہ ہے کہ زوجہ معاف کر دے کہ وہ کچھ نہ لے یا شوہر درگزر سے کام لے، بایں معنی کہ اسے حق تو تھا آدھے مہر کے رُوک لینے کا مگر وہ پورا ہی دینے کے لئے آمادہ ہو جائے[4] مگر عفو سے زیادہ تر جو معنی سمجھ میں آتے ہیں وہ اپنے حق سے درگزر کرنے ہی کے ہوتے ہیں دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینے کے نہیں اس لئے پہلی تفسیر الفاظ قرآن سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

بہرحال اس معافی یا درگزر کی قرآن نے یہ کہہ کر ترغیب بھی دی ہے کہ جہاں تک ہو سکے آپس میں تفضّل اور احسان سے کام لینا نہ بھولو' یہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے حق سے ذرا درگزار کرنے پر تیار ہو جائے اس کے لئے یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے ذمہ دوسرے کا حق کچھ بھی رہ جائے۔ لیکن اگر کوئی اپنے حق سے ایک پائی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں اس کے لئے بہت ممکن ہے کہ کچھ اپنے حق سے زائد بھی دانستہ یا نادانستہ وصول کر لے۔ اس لئے ایک احساس فرض رکھنے والے کے لئے پہلی ہی صورت اختیار کرنا بہت بہتر ہے۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾

''پابندی کرو[5] نمازوں کی اور بیچ والی نماز کی اور اللہ کے سامنے قنوت پڑھتے ہوئے کھڑے ہو۔''

نمازِ وُسطیٰ:

درمیانی نماز کی تعیین میں روایات و اقوال مختلف ہیں[6] مگر احادیث اہل بیت علیہم السلام کے رُو سے اس خیال کو قوت ہے کہ اس سے ظہر کی

---

[1] ۔ یا وہ شخص کہ جس کے ہاتھ عقد باندھنا ہے (تاج العلماء)

[2] ۔ المراد بالمس المذکور فی الآیۃ الجماع (بغوی)

[3] ۔ الذی بیدہ عقدۃ النکاح قیل ھو الولی، وھو المروی عن ابی جعفر و ابی عبد اللہ (مجمع البیان) عن ابن عباس ھو الولی اذ کانت محجورۃ (جلالین)

[4] ۔ کسیکہ بدست اوعقدِ نکاح است یعنی زوج حق خود گزاشتہ تمام دہد (شاہ ولی اللہ)

[5] ۔ داوموا علیھا فی مواقیتھا باداء ارکانھا (صافی) تقیّد کنید بر ہمہ نمازہا (شاہ ولی اللہ)

[6] ۔ فی الصّلوۃ الوسطی سبعۃ اقوال (نیشاپوری)

نماز مراد [1] ہے بلکہ ہمارے معصومین علیہم السلام کی صحیح و معتبر احادیث کی بناء پر اس کو یقینی سمجھنا چاہے [2]۔

چوں کہ صحابہ رسول اللہ کے ساتھ دوسری نمازوں کی جماعت میں کثرت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں مگر ظہر کی نماز میں وقت گرم ہونے کی وجہ سے کم لوگ شریک ہوتے تھے، اس لئے اس آیت میں نمازوں کی عام پابندی کے ساتھ خصوصیت سے نماز ظہر کی پابندی کا حکم ہوا اور اسے وسطی اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ دن کی نمازیں تین ہیں۔ ان میں پہلے صبح آخر میں عصر اور بیچ میں نماز ظہر واقع ہوتی ہے بعض روایات و اقوال اہل سنت بھی اسے متفق ہیں [3]۔

قانتین کا لفظ قنوت سے ہے جو نماز کا ایک خاص جزء ہے جو واجب نہ سہی مگر اس کا بڑا تاکیدی حکم ہے اسی لئے ہم نے ترجمہ میں اس لفظ کو بعینہٖ رکھ دیا ہے۔ یہ قنوت کیا ہوتا ہے؟ بارگاہ الٰہی میں دعا جس کا خصوصی طور پر نماز کی دوسری رکعت میں سوروں کی تلاوت کے بعد حکم ہے۔ روایات اہل سنت میں بھی اس کی تائید موجود ہے [4] مگر سواد اعظم کے عام فقہاء چوں کہ قنوت کی اہمیت نہیں سمجھتے اس لئے ان میں اس قنوت کے معنی اطاعت کے [5] اور کبھی چپ رہنے کے [6] کہے جاتے ہیں ظاہر ہے کہ ہمارا نقطۂ نظر اس بارے میں زیادہ واضح ہے اور ہمارے درمیان اس کے بارے میں کوئی انتشار و افتراق بھی نہیں ہے۔

ایک حدیث صحیح سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں قنوت کی تشریح اسی آیت سے ہوئی ہے [7]۔

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

''ہاں اگر تم خوف میں ہو تو پھر پیادے اور سواری کے عالم میں جیسا ہو [8] پھر جب تمہیں اطمینان ہو تو ذکر خدا کا کرو جیسا کہ اس نے تمہیں وہ باتیں سکھائی ہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔''

چوں کہ اس کے پہلے کہا گیا تھا کہ نماز میں کھڑے ہو تو اس آیت میں استثنائی صورت کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی خوف و خطر کی وجہ سے

---

[1] ۔هو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام وابی عبداللہ علیہ السلام ویدل علیه سبب نزول هٰذه الآیة (مجمع البیان)

[2] ۔عن الخلاف ان علیه اجماع الفرقه والمروی فی احادیثنا (البلاغی)

[3] ۔یروی عن عمرو وزید بن ابی بکر وابی سعید الخدری واسامة بن زید وهو قول ابی حنیفة واصحابه (نیشاپوری)

[4] ۔عن ابن عباس ان القنوت هو الدّعاء (نیشاپوری) دلیله ما روی عن ابی عباس قال قنت رسول اللہ ﷺ شهرا متتابعا یدعوا علیٰ احیاء من بنی سلیم علی، واذکر ان وعصیة (بغوی)

[5] ۔ بایستد برائے خدا فرمان بردار شدہ (شاہ ولی اللہ)

[6] ۔کھڑے ہو واسطے اللہ کے چپکے (شاہ رفیع الدین)

[7] ۔فی صحیحة زرارة عن الباقر نزلت هذه الایة فی یوم الجمعة ورسول اللہ ﷺ فی سفره فقنت فیها (البلاغی)

[8] ۔فصلّوا راجلین او راکبین (بیضاوی)

باطمینان کھڑے ہو کر عبادت ممکن نہ ہو تو پھر جس طرح ممکن ہو اسی طرح نماز پڑھو [1] یہاں تک کہ بعض صورتوں میں صرف ایماء واشارہ سے نماز ہوگی [2] لیکن ہر حال میں نماز کا بجالانا ضروری ہے۔ جنگ کی حالت میں نماز کی خاص صورت شرع میں وارد ہوئی ہے جسے نماز خوف کہتے ہیں کتب فقہ میں اس کے احکام تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ آخر میں بتادیا گیا ہے کہ یہ اضطراری حکم ہے، لہٰذا جب عذر زائل ہو جائے، یعنی امن وسکون ہو جائے تو پھر جس طرح عام طور پر نماز کی تعلیم دی گئی ہے [3] اس طرح ادا کرنا لازم ہوگا۔ نماز کو ذکر اسی طرح کہا گیا ہے جیسے نماز جمعہ کے حکم میں ارشاد ہوا ہے اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (یعنی) جب روز جمعہ کی منادی ہو جائے تو فوراً ذکر الٰہی کی طرف دوڑ پڑو یعنی نماز کے لئے روانہ ہو جاؤ۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٤٠﴾

''اور جو تم میں سے دنیا سے جا رہے ہوں [4] اور بیویوں کو چھوڑ رہے ہوں تو انہیں اپنی بیویوں کے لئے وصیت کر جانا چاہیے [5] کہ سال بھر تک بغیر گھر سے نکالے ہوئے انہیں خرچ دیا جاتا ہے ہاں اگر وہ نکل جائیں تو جو کچھ اپنے بارے میں وہ مناسب طور پر کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں اور اللہ زبردست ہے بڑی سوجھ بوجھ رکھنے والا۔''

عدۂ وفات کا قدیم حکم جو منسوخ ہو گیا:

اس آیت سے تو بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عدۂ وفات ابتدائے اسلام میں ایک سال تھا اور اس صورت میں بعد میں جو یہ ہے کہ اگر وہ چلی جائیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک سال ہو جائے اور عدۂ پورا ہو جائے تو اب انہیں اختیار ہے کہ وہ اپنا عقد ثانی کر لیں [6] مگر ظاہر جو آیت سے سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ سال بھر تک انہیں شوہر کے گھر میں رہنے کا حق ہے اور ورثہ کو اس مدت کے اندر انہیں نکالنا جائز نہیں ہے اور شوہر کے مال سے اس دوران میں انہیں نان ونفقہ ملے گا جس کے لئے موقع ملے تو شوہر کو وصیت کر دینا چاہیے لیکن وہ اپنے اس حق سے فائدہ

---

[1] ۔عنی به صلوة الخوف (مجمع البیان)

[2] ۔ فی الکافی عن الصّادق علیہ السلام سئل عن هٰذه الایة فقال اذا خاف من سبع او لصّ یکبّر ویومی ایماء (صافی)

[3] ۔من صلاة الامن (نیشاپوری)

[4] ۔ای الذین یقاربون منکم الوفاة لان المتوفی لا یأمر ولا ینهی (مجمع البیان)

[5] ۔فلیوصوا وصیة لها (مجمع)

[6] ۔قبل ان المراد اذا خرجن بعد مضی الحول وقد مضت العدّة وان بمعنی اذا (مجمع البیان)

نہ اٹھانا چاہیں اور اس درمیان میں چلی جائیں [1] تو پھر ان کا نان ونفقہ ساقط ہو جائے گا اور اب وہ عقد ثانی کر لیں تو کسی مزاحمت کا حق نہیں ہے۔ اس سے عدۂ کے بارے میں مسلمہ عدۂ وفات یعنی چار مہینے دس دن کے خلاف کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ کہ اس میں عدۂ کی صراحت نہیں کی گئی کہ وہ نکلنے کے بعد پھر عقد کب کر سکتی ہے اس کی تشریح دوسری آیت سے ثابت ہو جائے گی۔

اب اس آیت میں اگر عدۂ وفات کا بیان ہے کہ اس کی مدت ایک سال ہے تو بھی اس پر مسلمانوں کا عمل نہیں ہے بلکہ گزشتہ آیت پر عمل ہے جس میں کہا گیا تھا: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک سال والی آیت منسوخ ہے اور وہ چار مہینے دس دن والی ناسخ ہے اور ظاہر ہے کہ اصل تنزیل میں حکم منسوخ مقدم ہوتا ہے اور حکم ناسخ موخر مگر موجودہ ترتیب قرآن میں چار مہینے دس دن والی آیت پہلے ہے جس کی تفسیر سابق میں لکھی گئی اور یہ ایک سال والی آیت بعد ہے جس کی تفسیر اب لکھی جا رہی ہے۔ اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہے جو ایک قطعی حقیقت ہے [2]۔

اور اگر اس میں عدۃ کا بیان نہ سمجھا جائے تب بھی یہ حکم کہ سال بھر تک ورثہ کو لازم ہے کہ اسے گھر میں رہنے کا حق دیں اور اس ایک سال تک اس کا نان ونفقہ لازم ہے۔ یہ بھی فقہ اسلامی میں معمول بہ نہیں ہے لہٰذا اس صورت میں بھی اس آیت کو منسوخ ہی تسلیم کرنا پڑے گا [3]۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾

''اور طلاق دی ہوئی عورتوں کو مناسب طور پر خرچ دینا لازم ہے یہ پرہیزگاروں کے ذمہ ایک حق ہے۔''

ترتیب نزول کو مفادات قرآنی سمجھنے میں خاص اہمیت تھی۔ اس سے انکار ممکن ہی نہیں چنانچہ یہ آیت کب کی اتری ہوئی ہے اس کے معلوم نہ ہونے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں خرچ سے جو مطلقات کو دیا جائے کیا مراد ہے؟

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت اس وقت کی ہے جب مہر کا حکم نہیں آیا تھا یا اس صورت کی ہے جب ایک سال کا عدۂ تھا اور سال بھر تک ان کا نان ونفقہ لازم الادا تھا۔ بہر حال اب جو فقہ اسلامی میں مسلم ہے وہ یہ ہے کہ اگر عورت کا مہر بوقت نکاح کچھ مقرر کر دیا گیا تھا اور تعلقات ازدواجی بھی قائم ہوئے اس کے بعد طلاق دی گئی تھی تو اس صورت میں اس کا پورا مہر واجب الادا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کچھ دینے دلانے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر مہر مقرر ہو چکا تھا اور بغیر تصرفات ازدواجی طلاق ہو گئی تو نصف مہر کا اسے استحقاق ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کچھ ضرورت نہیں اور اگر مہر کچھ مقرر نہیں ہوا تھا اور ازدواجی تعلقات بھی قائم نہیں ہوئے کہ طلاق ہو گئی تو اس صورت میں بس حسب حیثیت کچھ روپیہ پیسہ دے کر اسے رخصت کر دے۔ اس روپے کو جو اس صورت میں دیا جائے فقہ میں متاع اور متعہ کی لفظ ہی سے تعبیر کرتے ہیں ہو سکتا ہے کہ متاع

---

[1] ۔خرجن بانفسهنّ قبل الحول من غير ان يخرجهنّ الورثة (مجمع)

[2] ۔ كان ذٰلك فى الاول الا سلام ثم نسخت المدة بقوله اربعة اشهر وعشرا وهو وان كان مقدما فى التلاوة فهو متا خّر فى النزول (بيضاوى) تلك الاية متاخرة عن هٰذه باجماع المفسرين (نيشاپورى) نسخ عدة الحول باربعة اشهر وعشرا. (معالم التنزيل للبغوى)

[3] ۔اتفق العلماء على ان هٰذه الاية منسوخة (مجمع البيان) الوصية المذكورة منسوخة بآيته الميراث وتربّص الحول بآية اربعة اشهر وعشر السابقة المتاخرة فى النزول (جلالين)

بالمعروف کا اجمال اس پوری تفصیل پر حاوی ہو[1]۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ متاع سے مراد علاوہ مہر کے کچھ دینا بھی ہو اور اسے عام بھی قرار دیں کہ جس میں تمام مطلقات داخل ہو جائیں مگر اس حکم کو وجوبی نہ سمجھا جائے بلکہ استحباب پر محمول کیا جائے اور یہ احادیث سے ثابت ہے کہ مال ومتاع دے کر رخصت کرنے کا استحباب طلاق کے بعد بہر صورت ہے[2]۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٤٢﴾

''اس طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام واضح طور پر بیان کرتا ہے شاید کہ تم سمجھو۔''

آیات کا لفظ قرآن مجید میں اکثر معجزات کے معنی میں آیا ہے اور کبھی مصنوعات قدرت کے معنی میں اور کبھی خود قرآن کی آیات کے معنی ہیں اور ان سب کے علاوہ کبھی احکام کے بارے میں اس لے کہ وہ بھی ایسے حکیمانہ ہیں جو مثل معجزات کے نبیؐ کی سچائی اور اس شریعت کی حقانیت کا ثبوت ہیں۔ چنانچہ یہاں اور اس کے قبل کا بھی بعض آیتوں میں جن کی تفسیر گزر چکی ہے۔ یہ لفظ احکام ہی کے لئے صرف ہوا ہے[3]۔

لعلکم تعقلون میں عقل سے کام لینے کے ہیں[4] اس لئے کہ اگر عقل کے مطابق عمل نہیں کرتا تو وہ نتیجۃً بے عقل کے مثل ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٢٤٣﴾

''کیا نہیں دیکھا تم نے ان کو جو مرنے کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے ہزاروں کی تعداد میں تو کہا انہیں اللہ نے مرجاؤ پھر انہیں زندہ کیا بلاشبہ اللہ بڑا لطف وکرم والا ہے انسانوں پر لیکن اکثر آدمی شکر گزار نہیں ہیں۔''

وہ جماعت جو مر کر زندہ کی گئی:

''کیا نہیں دیکھا'' یعنی کیا تمہیں خبر نہیں[5] یا خبر ہے اور تم نے اس واقعہ پر غور نہیں کیا اور یہ تخاطب کوئی خاص رسولؐ سے نہیں ہے بلکہ

---

[1] ۔عندنا لا یجب المتعة الّا المطلقة التی لم یدخل بها ولم یفرض لها مهر (مجمع البیان)

[2] ۔فی الاخبار ایضا ما یدل علی التعمیم ـــــــ وذٰلك محمول علی الاستحباب (صافی)

[3] ۔یبین اللہ لکم اٰیته هٰذِه احکام (مجمع البیان)

[4] ۔المراد به استعمال العقل مع العمل به (مجمع)

[5] ۔الروية هنا بمعنی العلم (مجمع البیان)

مطلق طور پر سننے والے کو متوجہ کیا جارہا ہے [1]۔

بعض لوگوں نے ہر ایسے صیغہ مفرد کا تخاطب رسولؐ ہی کی جانب قرار دینا ضروری سمجھا ہے چنانچہ یہاں بھی یوں ہی ترجمہ کیا ہے [2] مگر میں اس درست نہیں سمجھتا۔

اب قرآن نے بالا جمال یہ تذکرہ کیا ہے کہ ایک قوم موت کے خوف سے نکلی مگر ایک دم اسے موت آ گئی اس ایک دم موت کی تعبیر ان الفاظ سے کی گئی ہے ''اللہ نے کہا مر جاؤ وہ مر گئے'' [3]

یہ مر جاؤ کوئی خاص لفظی ارشاد نہیں ہے۔ یہ وہی کن فیکون ہے جس کی عمومی تعبیر کی گئی تو کہیں کہا گیا اور خصوصیت مقام کے لحاظ سے تعبیر کی گئی تو کہیں زمین اور آسمان کے لئے کہا: وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ [4] کبھی طوفان نوح کے بعد کہا وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ [5] کبھی جناب ابراہیمؑ پر آگ کے گلزار بنانے کے موقع پر ارشاد ہوا: قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ [6] مراد سب سے تعلق ارادہ ہے اس شے کے ساتھ جو بلا توقف وقوع میں آنے والے ہے، یہاں چوں کہ ارادہ ان سب کے ایک دم مر جانے سے متعلق ہوا جو بغیر کچھ ظاہری اسباب کے تھا لہٰذا اس کی تعبیر لفظ موتوا کے ساتھ ہوئی [7]۔

اب یہ جماعت تھی کون اور اس کا واقعہ کیا تھا؟ اسے جب قرآن نے یہ تفصیل بیان نہیں کیا تو ہم اس کے متعلق یقینی طور پر کیا کہہ سکتے ہیں:۔ روایتیں مختلف میں کوئی کہتا ہے یہ بنی اسرائیل کے کچھ لوگ تھے جو طاعون کے خوف سے نکلے تھے کوئی کہتا ہے جہاد کے خوف سے بھاگے تھے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ جناب موسیٰؑ کے تیسرے جانشین خرقیلؑ کے وقت کی بات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں خیر قیل کوذ والکفلؑ بھی کہتے ہیں۔

بہر حال انسانی تدابیر کی ناکامی اور قدرت الٰہی کی کارفرمائی کی حقیقت جسے پیش کرنا قرآن کا نصب العین ہے اس میں ان خصوصیات کا کوئی دخل نہیں ہے اور قرآن کے ان واقعات کو اس اجمالی انداز پر ٹال دینے ہی سے یہ ظاہر ہے کہ مقصد قرآن تاریخ نگاری نہیں ہے بلکہ ان واقعات کے نتیجہ پر دنیا کو توجہ دلانا ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٤﴾

''اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جانے رہو کہ اللہ سننے والا ہے جاننے والا۔''

---

[1] ۔آیا ندیدہ ای اے بینندہ (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ کیا تو نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ لوگ نہیں دیکھے (عماد الدین)

[3] ۔ای اماتھم اللہ (صافی)

[4] ۔سورۂ حٰم السجدہ۔۱۱

[5] ۔سورۂ ھود۔۴۴

[6] ۔سورۂ انبیاء۔۶۹

[7] ۔المعنی انھم ماتوا میتة رجل واحد من غیر علة بامر اللہ ومشیئة (بیضاوی) ولا امر ولا قول کما فی قولہ سبحانہ اذا قضی امرا فانما یقول لہ کن فیکون (نیشاپوری) فعبّر عن ارادتہ التکر ینیّتہ بالامر بالموت (البلاغی)

اگر یہ آیت تنزیل میں گذشتہ آیت کے بعد ہی کی ہے تو یہ سیاق سابقہ آیت کے متعلق اس قول کو تقویت دیتا ہے کہ وہ لوگ موت کے ڈر سے جہاد کے فریضہ سے جان بچا کر نکلے تھے۔ جب ہی ان کا ذکر کیا گیا کہ وہ فرار کے بعد بھی بچ نہ سکے بلکہ ایک دم مار ڈالے گئے اور پھر زندہ کیے گئے تا کہ انہیں تنبیہ ہو کہ جان بچا کر بھاگنا تقدیر الٰہی کو ٹال نہیں سکتا اور اب اس کے نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کو دعوت جہاد دی گئی کہ اس فریضہ کے ادا کرنے میں موت کی پروہ نہ کرو[1]۔

لیکن چوں کہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہے اس لئے اس آیت کا گذشتہ آیت سے متعلق ہونا ضروری نہیں ہے۔

آخری جملہ: اللہ سننے والا ہے جاننے والا بتاتا ہے کہ اس موقع پر کچھ باہمی چرچے تھے اور کچھ دلوں میں اندیشے تھے اس لئے کہا گیا کہ وہ سمیع یعنی سننے والا ہے ان باہمی چرچوں کا اور علیم یعنی جاننے والا ہے ان دلوں کے اندیشوں کا[2]۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

''کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض حسنہ دے[3] تا کہ وہ اسے بہت گنا زیادہ کر کے ادا کرے اور اللہ ہی تنگی کرتا اور کشادگی دیتا ہے[4] اور اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔''

قرض حسنہ:

جہاد میں جان اور مال دونوں کا کام ہوتا ہے۔ موت کے ڈر کو بے بنیاد قرار دے کر تو جان کی قربانی کے لئے قدم آگے بڑھائے اور اب مال کی قربانی کے لئے آمادہ کیا جا رہا ہے یہ کہہ کر کہ جو مال تم صرف کر رہے ہو اسے یہ نہ سمجھو کہ وہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے جا رہا ہے بلکہ وہ تو ایک قرضہ ہے جو تم اللہ کو دے رہے ہو اور وہ اس کے بعد بہت بڑھا کر تمہیں واپس کرے گا۔ اب یہ واپس کرنا دنیا میں بھی ہو سکتا ہے جس کے لئے کہا جا رہا ہے کہ وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ یعنی تمہارے مال و دولت کی کمی یا زیادتی اللہ ہی کے تو ہاتھ میں ہے کسی اور کے اختیار میں تھوڑی ہے[5]۔

لہٰذا وہ چاہیے تو اسی دنیا میں اس کے بعد اس سے بہت زیادہ تمہیں عطا کر دے اور اگر دنیا سے چلے گئے تو آخرت میں بصورت ثواب اس سے بہت زیادہ عطا ہوگا۔ اس لئے کہا گیا والیه ترجعون یعنی مرنے کے بعد بھی تو اسی کی طرف پلٹ کر جاؤ گے تو وہیں تمہیں بدرجہ زیادہ مل جائے گا۔

---

[1] ۔فان الفرار عن الموت غیر مخلص عنه (صافی) وان الموت اذا لم ینفع منه الفرار فاولی ان یکون فی سبیل الله (نیشاپوری)

[2] ۔سمیع بما یقول المنافق علیم بما یجنه (مجمع البیان)

[3] ۔اُدھار دے کر خود خدا کو اچھا اُدھار (تاج العلماء)

[4] ۔خدا ہی تنگ کرتا ہے روزی اور وہی کشادگی دیتا ہے (تاج العلماء)

[5] ۔یقتر علی بعض ویتوسع علی بعض جسما اقتضت حکمة (بیضاوی)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا موسیٰؑ کے بعد اسرائیل کے معززین کو[1] جب انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے کہ ہم راہ خدا میں جنگ کریں۔ انہوں نے کہا کہیں ایسا تو نہ ہو کہ جب تم پر جنگ کا فرض عائد کیا جائے تو پھر تم جنگ نہ کرو۔ انہوں نے کہا بھلا ہمیں کیا ہو جائے گا[2] کہ ہم خدا کی راہ میں جنگ نہ کریں جب کہ ہم اپنے گھروں اور بال بچوں سے چھڑائے جا چکے ہوں گے۔ مگر جب ان پر جنگ کا فریضہ عائد کیا گیا تو سوا ان کے تھوڑے سے آدمیوں کے سب نے پیٹھ پھیر لی اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔''

قصہ طالوت وجالوت:

یہ نبی کون تھے اور یہ جماعت کون سی تھی جس کا یہ واقعہ ہے؟ اس کی تفصیل بعض روایات میں وارد ہوئی ہے لیکن اگر وہ پایہ تکمیل کو نہ بھی پہنچے تو اس واقعہ کے بیان کرنے کا جو مقصد ہے اس پر کچھ اثر نہیں پڑتا[3]۔ وہ مقصد ہے مسلمانوں کے لئے انتباہ کا سرمایہ بہم پہنچانا۔ یہ بصیرت کے بہت سے پہلو ہیں جو اس پورے واقعہ میں جس کا سلسلہ چند آیتوں تک برابر چلتا رہے گا رفتہ رفتہ نظروں کے سامنے آئیں گے چنانچہ اس پہلی آیت میں ایک خاص پہلو قابل توجہ یہ ہے کہ قوم دشمنان دین کے مقابلہ میں جہاد کے لئے بے چین ہے مگر نبی سے عرض داشت پیش کرتی ہے کہ ایک حاکم مقرر کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد شرعی بغیر اس حاکم کی اجازت کے جو منصوب من اللہ ہو نہیں ہو سکتا اس کے بغیر جو جنگ ہوگی وہ دنیوی جنگ ہو سکتی ہے دینی جہاد نہیں ہو سکتا۔

نبی نے بھی یہ نہیں کہا کہ تمہیں لڑنا ہے تو لڑو اور کسی کو اپنا سردار مقرر کر لو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا خیال دینی حیثیت سے بالکل درست تھا جس کا خدا اور رسول کی طرف سے امضا کیا گیا اور اسے جب قرآن میں مثالی طور پر پیش کیا گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام میں بھی وہ اصول قائم

---

[1] ۔الملأ أی الاشراف والاعیان (البلاغی) ایک ذی رتبہ جتھے کو اسرائیل کے لڑکے بالوں میں سے (تاج العلماء)

[2] ۔ای ای غرض لنا فی ترك القتال (بیضاوی)

[3] ۔لم یحصل العلم بذلك النبی وبأولئك الملا من الخبر التواتر وخبر الواحد لا یفید الّا الظن لکن المقصود حاصل (نیشاپوری)

ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امم سابقہ میں بھی ظاہری طور پر ایمان لانے والی جماعت میں جو مسلمان کہلاتی ہے ایک اقلیت ہی ہوا کرتی ہے جو تعلیم رسول پر قائم و برقرار ہے، ورنہ اکثریت زیادہ تر راہ راست سے منحرف ہوجایا کرتی ہے جس کا ایمان بس نمائشی رہا ہے اور آزمائشی موقع پر ہمیشہ وہ ناقص ثابت ہوئی ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

''اور ان سے ان کے پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انہوں نے کہا اس کے لئے ہم پر بادشاہت کا حق کہاں سے ہوسکتا ہے [1] ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے حق دار ہیں۔ اسے مال و دولت میں کچھ وسعت تو ملی ہی نہیں ہے۔ پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے اسے تم پر ترجیح دی ہے اور اسے علم اور جسمانی طاقت میں زیادتی عطا کی ہے اور اللہ اپنی بادشاہت جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑا وسعت رکھنے والا ہے ''علم والا۔''

باوجود یہ کہ خود التجا کی تھی کہ ہمارے لئے ایک بادشاہت مقرر کیا جائے مگر جب اللہ کی طرف سے بادشاہ کا تقرر ہوا تو اس کے انتخاب پر وہ اعتراض کرنے لگے اور اپنی اہلیت کو پیش کرنے لگے۔ اب اگر انتخاب الٰہی کے مقابلہ میں حق جمہور کوئی چیز ہوتا تو اس فیصلہ کو واپس ہوجانا چاہیے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ نبی نے انتخاب الٰہی کو ان کے مقابلہ میں بطور حجت پیش کیا [2] اس سے مسلمانوں کو انتباہ ہونا چاہیے کہ منصب حکومت کے بارے میں ان کا مسلک جمہوریت پر گامزن ہو ان سنت الٰہیہ کی مخالفت ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ انہیں مال و دولت تو ملا ہی نہیں ہے ویسی ہی عوامی ذہنیت کا اظہار تھا جیسا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے مقابلہ میں جمہور مشرکین کی آواز تھی لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ [3] (یعنی) یہ قرآن آخر مکہ اور مدینہ کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اترا؟ اسی طرح پیغمبر خدا ﷺ کے بعد حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کے خلاف یہ آواز اٹھی کہ ان کی عمر زیادہ نہیں ہے مگر خالق کی نظر میں معیار بزرگی نہ مال و دولت ہے اور نہ سن و سال اصل چیز انتخاب ربانی ہے اور اس آیت میں اس کے لئے وجہ استحقاق بتایا گیا ہے علم و جسم میں وسعت کا ہونا معلوم ہوا کہ جو ہر علم اور قوت شجاعت میں جس کی فوقیت ثابت ہوجائے

---

[1] ۔من این یکون له الملك ویستاهل (صافی) کیف ومن این یصح ویصلح له الملك علینا (نیشاپوری)

[2] ۔رد علیهم اوّلا بان العمدة فیه اصطفآ الله وقد اختاره علیکم وهو اعلم بالصالح منکم (بیضاوی) امره علیکم ولا اعتراض لاحد علی حکم الله (نیشاپوری)

[3] ۔زخرف۔۳۱

وہ خداوند عالم کی نظر میں سرداری کا مستحق ہوگا[1] اس انتخاب کے مقابلہ میں پھر کسی کو چون و چرا کا حق نہیں ہے۔

آخر میں خالق کے مقابلہ میں جمہوریت کی پوری عمارت کو یہ کہہ کر مسمار کر دیا گیا ہے کہ واللہ یوتی ملکہ من یشاء یعنی اصل مالک ملک خدا ہے لہٰذا وہ اپنی طرف سے جسے چاہے مقرر کر دے۔ کسی کو اس میں مداخلت کا حق نہیں ہے[2]۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ خدا واسع ہے اور علیم اس میں وسعت سے مراد اقتدار ہے کہ وہ جو چاہے اس فیصلہ کے نافذ کرنے سے عاجز نہیں اور علیم ہے یعنی جانتا ہے کہ کون اس لائق ہے کہ اسے مقرر کیا جائے[3]۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾

''اور ان سے ان کے نبی نے کہا کہ اس کی بادشاہت کی پہچان یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق[4] آجائے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے سکون کا سرمایہ ہے[5]۔ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کے گھرانے کے کچھ باقی ماندہ متروکات ہیں[6]۔ اسے فرشتے اٹھائے ہوئے ہونگے۔ ضرور اس میں تمہارے لئے نشانی ہے اگر تم ایمان لانے کے لئے تیار ہو۔''

غور کیا جائے تو اس سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے جو ہمارے یہاں مسلم ہے کہ معجزہ کا ضروری ہونا صرف نبی اور رسول ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ خداوند عالم کی طرف کا جو منصب بھی ہو اس کے ثبوت کے لئے معجزہ ہوتا ہے۔ چنانچہ طالوت نبی یا رسول نہ تھے۔ صرف جہاد کے لئے سردار مقرر ہوئے تھے مگر چوں کہ ان کی سرداری خدا کی طرف سے تھی لہٰذا اس کے ثبوت میں معجزہ پیش ہوا اور وہ تابوت سکینہ تھا جو عرصہ نبی

---

[1] ۔انہی کان اعلم بنی اسرائیل فی وقتہ (بغوی) فیہ دلالۃ علی ان من شرط الامام ان یکون اعلم من رعیتہ واکمل وافضل فی خصال الفضل والشجاعۃ (مجمع البیان)

[2] ۔انہ تعالیٰ مالک الملک علی الاطلاق فلہ ان یؤتیہ من یشاء (بیضاوی)

[3] ۔علیم بنم ھو اھل لہ (جلالین)

[4] ۔التابوت الصندوق (بیضاوی)

[5] ۔الضمیر لہ بیان ای فی اتیانہ سکون لکم و طمانیۃ او التابوت ای مودع فیہ ما تسکتون الیہ (بیضاوی) اس میں تمہاری ڈھارس ہوگی (تاج العلماء)

[6] ۔اور بچی کھچی کُھرچن ہوگی اس کی جو کچھ چھوڑ گئے تھے موسیٰؑ اور ہارونؑ کے گھر والے (تاج العلماء)

اسرائیل کی نگاہوں سے گم تھا۔ اب اس کا غیر معمولی طریقہ سے آنا [1] جسے نبی نے یوں کہا ہے کہ ملائکہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر لا رہے ہونگے ان کی حقانیت کا نشان تھا۔ اسی بناء پر ہمارے یہاں آئمہ معصومین علیہم السلام میں سے ہر ایک کے حالات میں ایک باب معجزات کا بھی ملتا ہے جن کا انکار وہی کر سکتے ہیں جو انبیاء ومرسلین کے معجزات کو بھی تسلیم نہیں کرتے اور ان معجزات کا انکار بغیر انکار قرآن کے نہیں ہوسکتا یہ اور بات ہے کہ اس انکار کو تاویلات بعیدہ کے پردہ میں جیسا کہ نیاز صاحبؔ فتح پوری کیا کرتے ہیں، پوشیدہ کر کے ظاہری اسلام کو سنبھالنے کی کوشش کی جائے مثلا ایک مسلمان کے اختیار میں سچائی کے ساتھ اگر زیادہ سے زیادہ ہوسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ سکینہ کی تفسیر میں جو روایات میں مثلاً یہ کہ وہ جنت کی ہوا کے جھونکے تھے جو اس تابوت کے ساتھ ساتھ چلتے تھے [2]۔

یا وہ کوئی خاص حیوانی شکل کی مخلوق تھا، زمرد کا بنا ہوا، انہیں ضعف سند وغیرہ کی بناء پر قبول نہ کرے مگر قرآن جو اسے آیۃ یعنی معجزہ کہہ کے یہ بتا رہا ہے کہ اس میں ایک سکون واطمینان [3] کا سرمایہ موجود تھا اسے اجمالی طور پر کیوں کر قبول نہ کرے گا؟

دوسری چیز یہ بتائی گئی ہے کہ اس تابوت میں موسیٰؑ اور ہارونؑ کے خاندانی متروکات تھے۔ روایات میں ہے کہ ان میں عصائے موسیٰؑ اور الواح توریت بھی تھے اور کیا شبہ کہ متروکات آل موسیٰؑ ہارونؑ میں یہ خاص اہمیت کے حامل اشیاء ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن نے کہا ہے کہ اسے فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ جب قرآن پر ایمان لانے والے کو اسے ماننا ضروری ہے تو اگر روایت یہ کہتی ہے کہ بنی اسرائیل نے آنکھوں سے دیکھا کہ زمین وآسمان کے درمیان فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں تو اس کے انکار کی کی معقول وجہ ہوسکتی ہے بلکہ غور کیا جائے تو جب نبی نے پہلے سے جس معجزہ کی خبر دی ہے اس کا جزیہ ہے کہ ملائکہ اٹھائے ہوئے ہوں گے تو اگر یہ چیز ان کے مشاہدہ میں نہ آجائے تو جہت اعجاز مکمل ہی نہیں ہوتی۔

آخر میں کہا گیا ہے کہ اس معجزہ کے بعد اگر تم نیک نیتی کے ساتھ ماننے کے لئے تیار ہو تو اب کوئی وجہ تامل باقی نہیں رہتی [4]۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص طے کیے ہوئے ہو کہ نہ مانے گا تو اس کے لئے تمام معجزات لاحاصل ہیں جیسا کہ انبیاء ومرسلین کے سامنے ایک بڑی اکثریت ہمیشہ ایسی رہی جو معجزات کو دیکھتی تھی پھر بھی ایمان نہ لاتی تھی۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا

---

[1] ۔ان مجیئ التابوت لا بدّ ان یقع علی وجه یکون خارقاللعادة حتی یصح ان یکون معجزة واٰیة من عند الله دالة علیٰ صدق تلك الدعویٰ (نیشاپوری)

[2] ۔ریح هفافة من الجنة لها وجه کوجه الانسان (مجمع البیان)

[3] ۔طمانیة لقلوبکم (جلالین)

[4] ۔امامن تمام کلام النّبی او خطاب من الله (صافی)

مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

''اب جو طالوت افواج کو لے کر روانہ ہوئے [۱] تو کہا کہ اللہ تم لوگوں کی آزمائش کرنے والا ہے ایک نہر کے ساتھ تو جو اس میں سے پانی پی لے گا وہ مجھ سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا [۲]۔ اور جو اسے چکھے گا بھی نہیں [۳] وہ مجھ سے تعلق رکھتا ہوگا مگر وہ جو بس چلو میں پانی لے لے [۴] تو سب نے اس سے پانی پی لیا سوا ان میں سے تھوڑے سے لوگوں کے۔ اب جب وہ اور ان کے ساتھ کے وہ ایمان لانے والے [۵] وہاں سے آگے بڑھے تو وہ لوگ [۶] کہنے لگے کہ ہم میں آج جالوت اور اس کے افواج کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے۔ ان لوگوں نے جنہیں پورا پورا خیال تھا [۷] کہ وہ خدا کو منہ دکھائیں گے کہا کہ کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو بڑی جماعتوں پر غالب آجاتی ہیں اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

گزشتہ اجمال کی کہ جب جہاد ہوا تو سوا ایک اقلیت کے باقی سب نے منہ پھیر لیا اب اس آیت میں تفصیل ہے۔

طالوت روانہ ہوئے اور ان کے ساتھ والی جمعیت جس کی کثرت کو جنود کی لفظ ظاہر کر رہی ہے یعنی ان کی حیثیت فوج نہیں بلکہ افواج کی تھی۔ روایتوں میں ان کی تعداد ستر اسی ہزار بتائی گئی ہے۔ اب ان کی ایک آزمائش ہو رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ پانی سامنے ہو اور لب تر نہ کیے جائیں جب کہ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ پانی کو چکھے بھی نہیں مگر اس کے بعد جو فقرہ ہے: اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ ۚ اس کے معنی سب مترجمین اور مفسرین نے یہ لئے ہیں کہ ایک چلّو پی لے تو کوئی حرج نہیں۔ مگر چوں کہ حدیث معصومؐ اس بارے میں کوئی نہیں ہے اس لئے ہمیں اس کے خلاف سوچنے کا حق ہے اور سمجھ میں یہ آتا ہے کہ اگر ایک آدھ چلّو کی اجازت دینا ہوتی تو یہ لفظ نہ کہا گیا ہوتا کہ جو چکھے بھی نہ وہ مجھ سے تعلق رکھتا ہے کیوں کہ ایک چلّو تو چکھنے سے بہت زیادہ ہوا پھر چکھنے کی نفی سے اس کے استثناء کا کیا مطلب؟

---

[۱] ۔اصله فصل نفسه ولكن لّما كثر حذف مفعوله صار كاللازم (بیضاوی) پس چوں جدا شد یعنی از وطن (شاہ ولی اللہ)

[۲] ۔فليس من تبعي واشياعي (صافی)

[۳] ۔ومن لم يذقه من طعم الشئي اذا ذاقه (نیشاپوری)

[۴] ۔جو بھرے ایک چلو اپنے ہاتھ سے (تاج العلما ۴)

[۵] ۔يعني القليل (بغوی)

[۶] ۔يعني الذين شربوا وخالفوا امر الله وكانوا اهل شك ونفاق (بغوی)

[۷] ۔يظنون يوقنون (جلالین)

ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن میں چلّو ہاتھ میں لینے کا ذکر ہر پینے کا ذکر ہی نہیں۔ کیوں نہ سمجھا جائے کہ چلو ہاتھ میں لے کر پھینک دینا مراد ہے جس کی نظیر آخرین میں نہر فرات اور ابوالفضل العباسؑ بن علیؑ اور لب تر نہ کرنے اور چلو میں پانی پھینک دینے کی واقعیت کی شکل میں موجود ہے۔ چکھنے کی ممانعت کرتے ہوئے ایسے ہی عمل کی اجازت دی جارہی ہے پینے کی بالکل نہیں نتیجہ یہ ہوا کہ سوا ایک اقلیت کے باقی سب نے عدول حکمی سے کام لیا۔ اس سے نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو ادائے فرض اتنی سختی برداشت نہ کرسکیں وہ تلوار کی آنچ کیا برداشت کریں گے! چنانچہ دشمن کے سامنے پہنچ کر بھی انہوں نے جی چھوڑ دیا اور نبی اور نبی نے پہلے ہی جو خطرہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب جہاد کا فرض عائد ہو جائے تو تم جہاد نہ کرو، وہ واقعیت کی شکل میں سامنے آ گیا۔

ان تمام قرآنی الفاظ میں یہ انتباہ مضمر ہے کہ اکثریت سے کبھی مرعوب نہ ہونا اور اس کے رویہ کہ ہمیشہ حق ہی نہ سمجھنا۔ اکثر ایسا ہی ہوا ہے کہ حق اقلیت میں ہوا اور ایسی اقلیت میں جو نسبۃً بہت کم ہوا اور اکثریت غلط راہ پر جارہی ہو [1]۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾

''اور جب جالوت اور اس کے افواج کے سامنے باہر نکلے [2] تو کہا پروردگار! ہم پر صبر کی طاقت انڈیل دے [3] اور ہمارے قدموں کو جمادے اور کافر جماعت کے مقابلہ ہماری مدد فرما۔''

یہ اسی اقلیت کی آواز ہے [4] جو خدا کو منہ دکھانے کا تصور رکھتی تھی اور جس نے دوسرے لوگوں کو مایوسی سے منع کیا تھا۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

''اب انہوں نے ان لوگوں کو اللہ کے حکم سے شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو مار ڈالا اور اللہ نے انہیں سلطنت اور حکمت عطا کی اور جس جس چیز کا چاہا علم دیا اور اگر اللہ بعض کا بعض کے ذریعہ سے دفعیہ نہ کراتا رہے تو

---

[1] ۔وان اهل الحق اعز من العنقآء واعوز من الكميآء (غرائب القرآن، نیشاپوری)

[2] ۔آنگاہ کہ بمیدان آمدند (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔الافراغ اخلاء الاناء بما فيه وانما يخلو بصبّ كل مافيه فيغيد المبالغة (نیشاپوری) لنڈھادے ہم پر صبر (تاج العلماء) ہمیں پورا صبر دے (عمادالدین)

[4] ۔ایں صالحان گفتند (شاہ ولی اللہ)

زمین تباہ و برباد ہو جائے، لیکن اللہ تمام جہان والوں پر بڑا احسان والا ہے۔"

اجازت دفاع کا حکیمانہ پہلو:

آیت کے آخری حصہ میں مطلق عدم تشدد کے خلاف اسلام کے معتدل نقطہ نظر یعنی اجازت دفاع کے حکیمانہ پہلو پر تبصرہ ہے کہ اگر یہ دفاع کی صورت نہ ہوتی تو سرکشوں اور شرارت پسندوں کی ہمتیں بڑھتی جاتیں اور پھر عالم میں تباہی و بربادی پھیل جاتی مگر خدا نے ایسے طاقت وروں کی سرکوبی کے لئے قانونِ دفاع جاری فرمایا ہے جو اس کا خلق پر ایک بڑا احسان ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

"یہ قدرت الٰہی کی نشانیاں ہیں جنہیں ہم آپ سے سچائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں [1] اور بلاشبہ آپ پیغمبروں میں سے ہیں۔"

یعنی ان واقعات کی خبر آپ کو اللہ کی طرف سے اسی لئے دی جارہی ہے کہ آپ اس کے سچے رسول ہیں ضرورت ہے کہ آپ کے ذریعے سے خلق خدا تک یہ پیغام پہنچائے جائیں جو ان کے انتباہ کا ذریعہ ہوں اور ان واقعات کا آپ کی زبان سے بیان ہونا جب کہ آپ نے کبھی ان اطلاعات کو اکتسابی طور پر حاصل نہیں کیا خود آپ کے مرسل من اللہ ہونے کی دلیل ہے [2]۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

"یہ پیغمبر ہے [3] ان میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضلیت دی [4] ان میں سے وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا

---

[1] ۔نقصها (جلالین)

[2] ۔حيث تخبر بها من غير تعرّف واستماع (صافی)

[3] ۔تلك بمعنى اولئك (مجمع البیان)

[4] ۔تلك مبتدا الرّسل صفت والخبر فضلنا بعضهم على بعض (جلالین)

اوران میں کسی کو کئی درجے اونچا کیا اور دیئے ہم نے عیسیٰؑ فرزند مریمؑ کو کئی معجزے [1] اور انہیں روح القدس کے ساتھ [2] تقویت پہنچائی اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ جو ان کے بعد تھے اپنے پاس کھلی ہوئی نشانیاں آ چکنے کے بعد آپس میں نہ لڑتے مگر ان میں آپس میں اختلاف ہو گیا تو ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ نے کفر اختیار کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

چوں کہ خالق کی طرف سے پاروں کی تقسیم نہیں تھی، بس سوروں کی تقسیم تھی۔ اس لئے اکثر ایک ہی مضمون دو پاروں میں بٹ گیا ہے کہ آدھا جز قبل کے پارے میں آیا اور آدھا بعد کے پارے میں جو پاروں کی تقسیم کرنے والے کے سلیقہ کا آئینہ بردار ہے چنانچہ اس پارے میں بھی یہی صورت ہے کہ یہ پیغمبر جن کی طرف اشارہ ہے: تلك الرسل'' یہ پیغمبر اس کے مشارٌ الیہ انبیاء و مرسلین کا ذکر اس کے قبل والے پارے میں ہے ان کے متعلق جو مضمون ہے اس سے یہ پارہ شروع ہو رہا ہے [3]۔

پیغمبروں میں بعض کی بعض پر فضیلت:

پیغمبروں میں سے بعض کی بعض پر فضیلت کا پہلے مجمل طور پر اظہار کیا گیا ہے، یعنی یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سب پیغمبر ہم رتبہ ہیں اور یکساں حیثیت رکھتے ہیں بلکہ باوجود نفس نبوت یا رسالت میں اشتراک کے ان میں مختلف وجوہ سے کچھ کو امتیاز ہوتا ہے۔ اس کے ذیل میں بطور مثال کچھ خاص امتیازات کا مذکرہ کیا گیا ہے جس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امتیاز کے وجوہ انہی امور میں منحصر ہیں۔ چنانچہ ایک وہ امتیاز یہ بتائی گئی کہ ان میں سے بعض کو خالق نے شرف کلام سے سرفراز فرمایا۔

یوں تو اللہ کے کلام کی بہت سی صوتیں ہیں جن کا ذکر قرآن مجید (شوریٰ ۵۱) میں ہے کہ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ کسی آدمی کے لئے یہ بات حاصل نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے سوا اس کے کہ یا تو (بغیر توسط ملک) وحی (یعنی القاء) ہو یا پردہ کے پیچھے سے کلام ہو یا وہ ایک قاصد بھیجے جو اس کے حکم سے جو وہ چاہتا ہے اس وحی کو پہنچائے۔

اس میں پہلی قسم یعنی القاء کو بھی ایک نوع کلام قرار دینے سے اب کوئی پیغمبر ایسا نہیں سمجھا جا سکتا جس سے کسی نہ کسی طرح کلام نہ ہوتا ہو مگر نمایاں طور پر اللہ سے ہم کلامی کا امتیاز جناب موسیٰؑ کو عطا ہوا جس کی بناء پر ان کا لقب کلیم اللہ ہو گیا اور قرآن مجید میں ارشاد کیا گیا: وکلم اللہ موسیٰ تکلیما (یعنی) اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا اس طرح جو حق ہے کلام کرنے کا اس کی نوعیت خاص طور پر یہ تھی کہ منجانب اللہ آواز کر کے انہیں مخاطب بنایا تھا اور ہمارے رسولؐ سے معراج میں کلام کیا گیا، اس طرح کہ پردہ کے پیچھے سے آواز آئی اور آپ کو مخاطب کیا گیا [4]۔

---

[1] ۔معجزہا (شاہ ولی اللہ) ای الدلالات کابرآء الاکمہ والابرض واحیاء الموتیٰ الخ (مجمع)

[2] ۔پاک روح سے (تاج العلماء)

[3] ۔اشارۃ الی الجماعۃ الذکورۃ فی السورۃ (صافی)

[4] ۔ کلّم اللہ من غیر سفیر کموسیٰ لیلۃ الحیرۃ فی الطور ومحمدﷺ فی المعراج (صافی)

ہمارے پیغمبر کی متعدد وجوہ سے دیگر انبیاء کے مقابلہ میں بلندی:

یہاں کلام سے یہی خصوصی صورت مراد ہے اس لئے اس کو کچھ خاص مرسلین کی خصوصی فضیلت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد پھر جو ارشاد کیا کہ ''بعض کو کئی درجے اونچا کیا گیا'' اس سے مراد ہمارے رسولؐ ہیں جن کو متعدد وجوہ سے گزشتہ انبیاء کے مقابلہ میں خصوصیت حاصل ہوئی۔ علامہ طبرسیؒ مجمع البیان میں لکھتے ہیں:

قال مجاهد اراد به محمدا ﷺ فانه تعالى فضله على جميع انبيائه بان بعثه الى جميع المكلفين من الجن والانس وبان اعطاه جميع الايات التى اعطاها من قبله من الانبياء وبان خصّه بالقران الّذى لم يعطه غيره و هو المعجزة القائمة الى يوم القيامة بخلاف سائر المعجزات فانها قد مضت و بان جعله خاتم النبين وحكمة تقتضى تاخير اشرف الرّسل لاعظم الامور (مجمع البیان)

مجاہد نے کہا ہے کہ اس سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مراد ہیں کہا اللہ سبحانہ نے آپ کو تمام انبیا پر فضیلت عطا کی اس حیثیت سے بھی کہ آپ کو انس وجن سب پر مبعوث کیا اور اس اعتبار سے بھی کہ آپ کو تمام وہ معجزے عطا کیے جو آپ کے قبل دوسرے انبیاء کو متفرق طور پر عطا ہوئے تھے اور پھر یہ کہ آپ کو قرآن کے ساتھ مخصوص کیا جس کے مثل کسی کو آپ کے پہلے معجزہ عطا نہیں ہوا تھا اور وہ ایسا معجزہ ہے جو روز قیامت تک قائم و برقرار ہے برخلاف دیگر معجزات کے جو وقت کے ساتھ گزر گئے اور یہ کہ آپ کو خاتم الانبیاؐ قرار دیا اور حکمت متقاضی ہے کہ سب سے بڑی مہم کے لئے آخر میں وہی ذات بھیجی جائے جو شرف میں سب سے بالاتر ہو۔

اسی کو علامہ فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اور پھر اس کی تلخیص کے طور پر نیشاپوری نے بھی غرائب القرآن میں زیادہ پھیلا کر بیان کیا ہے۔

خاص طور پر قابل غور آیت کا آخری جز ہے اس لئے کہ یہ اور اس سے ملتی جلتی چند اور آیتیں قرآن مجید کی ہیں جن کے معنی کے سمجھنے میں عقل اور معصوم رہنماؤں کا دامن چھوڑ دینے کی وجہ سے ایک طبقہ گمراہی میں مبتلا ہوا ہے اور ایسا سمجھا ہے کہ باہمی جنگ اللہ کی مشیت سے ہوئی ہے' اور کچھ کا ایمان لانا اور کچھ کا کفر اختیار کرنا اسی کی مشیت کا نتیجہ ہے۔ خصوصا جب کہ یہاں آخر میں یہ ہے کہ اللہ جو ارادہ اس کا ہوتا ہے وہ کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کے ارادہ کے خلاف کچھ ہو ہی نہیں سکتا تو پھر جب کہ ارادہ ہی یہ تھا کہ کچھ ایمان لائیں اور کچھ کافر ہوں تو اللہ کا ایمان بھی ضروری ولازم الوقوع تھا جس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا اور ان کا کفر بھی ضروری الحصول تھا جس کے خلاف ممکن نہیں [1]۔

توہم جبر کا دفعیہ:

مگر کیا واقعی قرآن مجید کا یہی مطلب ہے؟ کیا اسلام کی تعلیم یہی ہے؟ ہرگز نہیں اگر ایسا ہوتا تو پھر مومن کو اس کے ایمان کی جزاء اور کافر کو اس کے کفر کی سزا کیوں دی جاتی یا حشر ونشر کس لئے ہوتا اور روز حساب کی کیا ضرورت تھی؟

پھر قرآن یہ کیوں کہتا کہ: فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ

---

[1]۔ فی الأیة دلالة علیٰ صحة مسئلة خلق الاعمال ـــــ وان الکل بقضاء الله وقدره ولان الدواعی تستند لا محالة الیٰ داعیة یخلقها الله عزوجل فی العبد (نیشاپوری)

جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے۔ (کہف۔۲۹)

وہ کیوں کہتا کہ: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا

جو نیک کام کرتا ہے وہ اپنے لئے کرتا ہے اور جو برا کام کرتا ہے اس سے نقصان اسی کو ہوتا ہے (جاثیہ۔۱۵)

جب کہ قرآن کی آیات میں اختلاف بیان ہونا بھی ناممکن ہے۔ اختلاف کو تو قرآن نے غیر اللہ کی طرف سے ہونے کی نشانی بتائی ہے۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا

وہ اگر اللہ کے سوا کسی اور کا کلام ہوتا تو یہ لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔ (نساء۔۸۲)

مگر قرآن مجید تو حقیقتاً اللہ کا کلام ہے، پھر اس میں اختلاف کیوں کر ہوسکتا ہے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سطحی نظر والے آیت قرآن کا مفہوم نہیں سمجھتے۔

یہ آیت اور اس کے مثل جو دوسری آیتیں ہیں جیسے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا

اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو روئے زمین پر جتنے ہیں سب کلیۃً ایمان لے آتے (یونس۔۹۹)

اس سب کا مطلب یہ ہے کہ خالق اگر اپنی جبری طاقت کو صرف کرتا تو کافر کا وجود نہ رہتا۔ اگر جبری طاقت صرف کرتا تو سب ایمان لے آتے۔ اگر جبر سے کام لیتا تو ان میں باہم اختلاف نہ ہوتا۔ اگر جبر کو صرف کرتا تو ان میں باہم جدال وقتال نہ ہوتا۔ مگر جبر کرنا تو اس کے نظام عدل کے خلاف ہے [1]۔

اگر نظام جبر کارفرما ہوتا تو ارسال رسل اور انزال کتب بے کار ہوتا اور پھر کارگاہ قیامت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے اس کا تو ارادہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اختیار سے کام لیں اور جب اپنے اختیار سے کام لیتے ہیں تو باختیار خود کوئی مومن ہوتا ہے اور کوئی کافر جو اللہ کے اس ارادہ کے بالکل مطابق ہے کہ ان پر جبر سے کام نہ لیا جائے اور یہ اپنے اختیار سے کام لے کر جدھر چاہیے جائیں تاکہ مستوجب ثواب یا مستحق عذاب ہوں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۵۴

''اے ایمان لانے والو جو کچھ ہم نے تم کو روزی دی ہے اس میں سے خیرات کرو اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ کوئی بکری ہوگی اور نہ دوستی اور نہ سعی سفارش اور کافر لوگ خود ہی ظلم کرنے والے ہیں۔''

اس دن سے مراد قیامت ہوسکتی ہے [2] اس دن ''کوئی بکری نہیں ہوگی'' یعنی دنیا میں خرید اور فروخت کے ذریعے سے انسان کچھ دولت

---

[1] ۔ لو شآء اللہ لم یقتل الذین من بعد الا نبیآء بان یلجئھم الی الایمان ویمنعھم من الکفر الا انہ لم یدجئھم الی ذٰلك لان التکلیف لا یحسن مع الضرورۃ (مجمع البیان)

[2] ۔ای یوم القیامۃ (مجمع البیان)

کما لیتا ہے۔ وہاں کسی ایسی آسانی کی صورت نہیں ہوسکتی اور منفعت حاصل نہیں کی جاسکتی اور نہ یہ ممکن ہوگا کہ کوئی دولت صرف کر کے اپنے کو عذاب سے بچالے، جسے دوسری جگہ قرآن میں یوں کہا گیا ہے کہ وہاں فدیہ کا کوئی امکان نہ ہوگا[1]۔

اور اس میں یہ پہلو بھی مضمر ہوسکتا ہے کہ اس دنیا میں جو کما کجار ہے ہو اسی میں سے خیرات کر کے ذخیرہ آخرت فراہم کرلو اگر موقع کو تم نے ہاتھ سے جانے دیا اور آخرت کی گھڑی سر پر آ گئی تو اس دن کچھ کمانے کجانے کا امکان نہیں ہے۔

''اور نہ دوستی'' یعنی دوستیاں اس دن قطع ہوجائیں گی اور دنیا والے آپس کے دوست سب وہاں آپس میں دشمن ہوں گے جیسا کہ قرآن میں ہے۔

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ

دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے (زخرف۔ ٦٧)

اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ دوستی اس دن کام نہ آئے گی اور اس لئے کہ ہر ایک کو خود اپنی پڑی ہوگی۔ دوسرے کے کام کون آئے گا[2]۔

اور اس دن سے مراد موت کا دن بھی ہوسکتا ہے کہ اسی وقت دنیاوی رشتے سب ختم ہوجاتے ہیں[3]۔

سفارش کی نفی کے متعلق اس کے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا پر کسی کا دباؤ نہیں ہے جو کوئی سفارش کرے گا وہ بھی اس کی اجازت سے کرے گا جیسا کہ آیۃ الکرسی میں جو اس کے بعد ارشاد ہوا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

کون ہے جو اس کے یہاں سفارش کرے مگر اس کی اجازت سے۔

اس آیت کو سامنے رکھنے کے بعد یہاں جو سفارش کی نفی ہو رہی ہے تو اس سے وہی سفارش مراد ہوسکتی ہے جو بغیر اس کی اجازت کے ہو[4]۔

اب اس تہدید کے ساتھ جو خیرات کا حکم ہوا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ جناب تاج العلما تحریر فرماتے ہیں:

''حکم یا خاص زکوٰۃ کا ہے اخیر میں وعید اور تہدید کے ذکر کی دلیل سے یا عام خیرات کا ہے۔'' (حواشی ترجمہ قرآن)

بعید نہیں ہے کہ عام لیا جائے اور جب عمومی خیرات کا کلیۃ ترک ہوگا تو اس ترک کے دائرہ میں وہ حقوق الناس بھی آجائیں گے جن کا ادا کرنا ضروری ہے اور اس طرح وعید اور تہدید کی زد میں آنا ظاہر ہے۔ آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ''کافر لوگ ہی تو ظالم ہیں۔'' اس سے بعض نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس سے مراد وہی ہیں جو اصطلاحی طور پر کافر ہیں یعنی غیر مسلم اور اسی بناء پر ایک صاحب اس آیت کو پڑھ کر بڑے خوش ہو کر فرمانے لگے کہ

---

[1] ۔لا بیع فیه فیحضون ما تنفقونه او تفتدون به من العذاب (صافی)

[2] ۔ وقیل لان شغله بنفسه یمنعه من صداقة غیره (مجمع البیان)

[3] ۔یحتمل ان یکون المراد به یوم الموت ___ وهو اظهر (صافی)

[4] ۔ولا شفاعة بغیر اذنه (جلالین)

شکر خدا کا کہ اس نے یہ کہا کہ کافر لوگ ہی ظالم نہیں یہ نہیں فرمایا کہ الظالمون هم الكافرون جس کے یہ معنی ہوتے کہ ظالم لوگ ہی کافر ہیں [1]۔ اس میں یہ تلخ احساس مضمر تھا کہ اپنی جماعت میں جو مسلمانوں کی ہے ظالم بہت سے ہیں۔ اگر کہیں آیت یوں ہوتی کہ ظالم ہی کافر ہیں تو یہ سب لوگ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائیں گے۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ آیت کے آغاز میں ایمان لانے والوں کو مخاطب کر کے یہ حکم دینا کہ خیرات کرو اس دن سے پہلے جب نہ کوئی تجارت ہو سکے گی اور نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سعی سفارش۔ پھر مسلمانوں کو چھوڑ کر کسی دوسری جماعت کو کہنا کہ کافر لوگ ظالم ہیں مضمون آیت کو دولخت بنا دیا ہے جس میں دنیا کا اول سے کوئی ارتباط باقی نہیں رہتا اس لئے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جیسے حج کا حکم دیتے ہوئے جو ارشاد کیا:۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا .

اللہ کے لئے لوگوں پر خانہ کعبہ کا حج ہے اس پر جو اس کی استطاعت رکھتا ہے۔ (آل عمران۔ ۹۷)

اور پھر کہا:

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ اور جو کفر کرے تو اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ اس سے علماء یہی معنی سمجھتے ہیں کہ خود ترک حج کو خالق نے یہاں کفر سے تعبیر کیا ہے اسی طرح خیرات دینے کے حکم کے بعد یہ کہنا کہ ''کافر لوگ ہی تو ظالم ہیں'' اس مفہوم کا حامل ہے کہ یہ خیرات نہ دینا ہی ایک طرح کا ''کافر'' ہونا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسے ''کفر'' سے مشتق نہ لیا جائے ''کفران'' سے مشتق لیا جائے جس کے معنی ناشکرے پن کے ہیں اور اس میں کیا شبہ کہ واجب خیرات سے گریز کرنا اللہ کی نعمت کا عملی کفران ہے اور اس سے انسان بلاشبہ بمقابلہ ''شاکرین'' کافرین میں داخل ہوتا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝۲۵۵

''اللہ! نہیں کوئی خدا سوا اُس کے جو زندہ ہے، بندوبست کرنے والا، اس پر نہ غنودگی غالب ہوتی ہے اور نہ نیند۔ اس کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے وہ جو بغیر اس کی اجازت کے اس کے یہاں سفارش کرے؟ وہ جانتا ہے اسے جو اُن کے سامنے ہے اور جو اُن کے پیچھے ہے اور وہ اُس کے علم میں سے ذرا بھر بھی حاوی نہیں ہیں مگر وہ جتنا چاہے۔ اسی کی کرسی آسمان اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے ان دونوں کی حفاظت

---

[1] ۔نقل عن عطاء بن یسار (نیشاپوری)

اسے گراں نہیں گزرتی [1] اور وہ اونچا ہے بہت بڑا [2]۔

آیۃ الکرسی:

یہ پوری ایک آیت ہے جو ''آیۃ الکرسی'' کے نام سے مشہور و معروف ہے [3] اور اس کی بڑی فضیلت ہے [4] اور خاص خاص محل پر اس کے پڑھنے کا ثواب وارد ہوا ہے۔

حی و قیوم کے معنی:

خدا کو جو ''زندہ'' کہا گیا ہے اس کے معنی یہ نہیں کہ وہاں جسم و جان ہے بلکہ حیات کا جو تقاضائے ہے علم و ارادہ وہ اس کی ذات کے لئے ثابت ہے اس لئے اسے حی کہا جاتا ہے [5]۔ القیوم کے معنی میں اختلاف ہے۔ ایک احتمال یہ ہے کہ وہ قائم ہی کی لفظ میں مبالغہ ہے تو یہ معنی ہوئے کہ وہ زندہ ہے برقرار رہنے والا [6] اور دوسرے یہ کہ وہ کائنات کے نظام کو برقرار رکھنے والا ہے [7] بعض مفسرین نے دونوں باتوں کو جمع کر دیا ہے [8]۔

اس پر غنودگی اور نیند طاری ہونے کی نفی کسی غلط مزعومہ کی رد ہی کے لئے ہوسکتی ہے چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ یہود کا یہ تصور تھا کہ خالق آسمان و زمین کے پیدا کرنے کے بعد تھکن کی وجہ سے کرسی پر ایک خاص انداز میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آرام کرنے لگا۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ غالباً اسی مزعومہ کو پیش نظر رکھ کر تھکن کی نفی کی گئی ہے۔

وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ۔ اور ہمیں تھکن کچھ بھی نہیں ہوئی (ذاریات۔ ۳۸)

غنودگی کے بعد نیند کی نفی کا مطلب:

غنودگی نیند کا ادنیٰ درجہ ہے اور نوم پورے طور پر سو جانا۔ یہاں غنودگی کے بعد مقام نفی میں جو نیند کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس بناء پر ہے کہ یہ تو

---

[1] ۔لا ثقیلہ (صافی)

[2] ۔ بلند مرتبۂ و بزرگ ہے (تاج العلماء) ۵ ۔ الحی العلیم القدیر (صافی)

[3] ۔ایۃ واحدۃ عندھم غیر عدّ البصری الحیّ القیّوم ایۃ (مجمع البیان)

[4] ۔ فی الخصال عن النّبیّ ﷺ ان اعظم آیۃ فی القراٰن ایۃ الکرسی (صافی) وعن ابی عبداللہ علیہ السلام قال ان لکل شئی ذروۃ وذروۃ القراٰن ایۃ الکرسی (مجمع)

[5] ۔وہ زندہ ہے ہمیشہ رہنے والا (شاہ رفیع الدین)

[6] ۔سدا برقرار رہے گا (تاج العلماء)

[7] ۔زندہ و تدبر کنندۂ عالم (شاہ ولی اللہ) لمبالغ فی القیام بتدبیر خلقہ (جلالین)

[8] ۔الدائم القائم بتدبیر الخلق و حفظۃ من قام بہ اذا حفظہ (صافی) النظر لجمیع ھذہ الوجوہ محتمل (مجمع البیان)

قوت ارادی کی کسی شخص میں بہت کمی ہے کہ وہ جاگنے میں بھی غنودگی میں مبتلا ہو کر کام سے غافل ہو جایا کرے مگر نیند وہ چیز ہے جو تقریباً ہر ایک ہی کو کسی نہ کسی وقت کام سے بے خبر بنا دیتی ہے۔ خالق کے لئے اونگھنا نہیں ہے اور اس سے بالاتر یہ ہے کہ وہ کبھی سوتا بھی نہیں، نیند بھی اس کے لئے نہیں ہے جو انتظام خلق سے غافل بنا دے۔

شفاعت کی نفی میں یہاں صرف ''اِلَّا بِاِذْنِہٖ'' کا استثناء موجود ہے۔ پھر معلوم نہیں مسلمانوں میں سے بعض لوگ مطلق شفاعت کا انکار کس لئے کرتے ہیں؟

ثبوت شفاعت علم غیب بمشیت الٰہی:

اسی طرح خالق کے علم پر بشر کے حاوی نہ ہونے کے بیان میں ''اِلَّا بِمَا شَآءَ'' کا استثناء موجود ہے [1] جس کے بعد انبیاء اور اولیاء سے علم غیب کی مطلق نفی کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہتا۔

جن ہستیوں کو ہم شفیع مانتے ہیں وہ وہی ہوں گے جو اللہ کے اِذن سے شفاعت فرمائیں اور انبیاء اور آئمہؑ نے علم غیب کی جو خبریں دی وہ وہی ہیں جن کا اللہ نے اپنی مشیت سے انہیں علم عطا فرمایا تھا۔

''وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔'' اس سے پیش پس باعتبار مکان بھی مراد ہو سکتا ہے۔ چوں کہ خود انہیں عموماً اپنے پیچھے کی چیز کا علم نہیں ہوا کرتا مگر اللہ کو اس سب کا علم ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پیش و پس سے مراد ماضی اور مستقبل ہو [2]۔

کرسی کے معنی میں اختلاف ہے۔ کئی حدیثوں میں اس کے معنی علم کے قرار دیے گئے ہیں [3] نیز عالم اعلیٰ میں سب سے بلند مرکز عرش سے موسوم ہے اور اس کے نیچے جو ہے اسے کرسی کہا جاتا ہے [4] مگر واقعہ یہ ہے کہ پوری حقیقت سے نہ عرش ہی کی ہم واقف ہو سکتے ہیں اور نہ کرسی ہی کو ہم پورے طور پر سمجھ یا سمجھا سکتے ہیں۔ بہر حال اصل مقصود یہاں اللہ کے احاطہ علمی کا بیان ہے جسے معصومین علیہم السلام نے بتایا ہے [5]۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ

---

[1] ۔ یعنی ماشاء ان یعلمهم ویطلعهم علیه (مجمع البیان)

[2] ۔ما مضی وما هو ات (البلاغی)

[3] ۔علمه کذا فی التوحید عن الصّادق علیہ السلام (صافی) وهو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام وابی عبداللہ علیہ السلام (مجمع)

[4] ۔سریر دون العرش وقد مروی عن ابی عبداللہ علیہ السلام (مجمع البیان)

[5] ۔شآء ان یتبن احاطة علمه واسطة تدبیره بجمیع ماهو له وملکه فناسب التقریب لا را کنا القاصر بالتمثیل بالجسمانیات المألوفة لنا (البلاغی) وقیال لمقصود من کلام تصویر عظمة اللہ و کبریائه ولا کرسی ثم ولا قعود ولا قاعدوا ختاره جمع من المحققین کا تقفال والزمخشری (نیشاپوری)

عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

''دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ ہو کر نمایاں ہو چکی ہے۔ اس کے بعد جو باطل کی طاقت [۱] کے ماننے سے انکار کرتے [۲] اور اللہ پر ایمان لائے اس نے مضبوط رسی [۳] تھام لی جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں [۴] اور اللہ سننے والا ہے خوب جاننے والا''۔

دین میں جبر نہیں:

روایات شان نزول میں اگر چہ مختلف ہیں کوئی کہتا ہے کہ کچھ انصار مسلمان ہو گئے تھے اور ان کی اولاد میں بعض مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ ان پر جبر سے کام لے کر زبردستی مسلمان بنانا چاہتے تھے (جلالین) کوئی یہ کہ کسی انصاری کا حبشی غلام تھا جسے وہ اسلام پر مجبور کرنا چاہتا تھا (مجمع البیان) اور دوسری روایتیں بھی ہیں مگر سب کا مشترک نتیجہ یہ ہے کہ قرآن نے زبردستی مسلمان بنانے سے روکا ہے اس سے ان مخالفین اسلام کی زبان بندی ہو جانا چاہیے جو کہتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلایا گیا۔

حقیقت میں دین کا تعلق انسان کے دل و دماغ سے ہے۔ وہ چیزیں ہی کب ہوگی جو تلوار کے دباؤ سے اختیار کی گئی ہو۔ جب کہ قرآن نے صاف اعلان کر دیا اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ فہمائش کر دی کہ دین کے معاملہ میں جبر سے کام نہ لو تو اس کے بعد اگر کبھی مسلمانوں نے ایسا کیا بھی ہو تو اس کی ذمہ داری اسلام پر عائد نہیں ہو سکتی۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

''اللہ سرپرست ہے [۵] ان کا جو ایمان لائے وہ انہیں اندھیرے سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کی سرپرست باطل کی طاقتیں ہیں [۶] کہ وہ انہیں روشنی سے اندھیروں کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ ہیں آگ میں جانے والے، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

---

[۱] ۔الشیطان کما فی المجمع عن الصّادق علیہ السلام اقول ویتم کلّ عبد من دون اللہ (صافی)

[۲] ۔کفر وانکار کیا سرکش کا (تاج العلماء)

[۳] ۔اس کا ہاتھ ایسے مضبوط بندھن پر پڑا (تاج)

[۴] ۔جس میں ٹوٹ جانے کی کبھی گنجائش ہی نہیں (تاج)

[۵] ۔متولی امورھم (صافی)

[۶] ۔الطواغبت (صافی) واحد اریدیر الجمع (مجمع البیان)

مفہوم وحالات:

وَلِی کا لفظ جس کا ترجمہ ہم نے ''سرپرست'' کر دیا ہے حقیقتاً اتنا جامع لفظ ہے جس کا پورا مفہوم اردو کے کسی لفظ سے ادا ہونا مشکل ہے۔ علامہ طبرسی رحمہ اللہ نے اس لفظ کی تحقیق بڑی بالغ نظری سے کی ہے جس کا آغاز اس طرح ہے:

الولیُّ من الولی وھو القرب من غیر فصل و ھو الذی یکون اولیٰ من غیرہ واحق بتدبیرہ

وَلِیْ کا لفظ وَلاء سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں ایسی نزدیکی جس میں کوئی فاصلہ نہ ہو اور ولی وہ ہے جو اپنے غیر کے ساتھ اولیٰ ہو اور اس کے انتظام کا زیادہ حقدار ہو۔

اس کے بعد انہوں نے ان تمام الفاظ کو جو اُن حروف (و ل ی) سے مشتق ہیں پیش کر کے اس خصوصیت کا ثبوت دیا ہے جن میں سے بعض الفاظ ہماری اردو زبان میں بھی موجود ہیں جن کے خصوصیات پر ہر ایک غور کر سکتا ہے مثلاً ولی بمعنی حاکم۔ ولی جو نابالغ کے معاملات میں صاحب اختیار ہوتا ہے متولی جو اوقاف کے انصرام وانتظام کا ذمہ دار ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اللہ اہل ایمان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور طاغوت کافروں کی روشنی سے اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ نکالنا اور لے جانا دونوں کو مجبور کرنے کے معنی میں نہیں ہے، ورنہ ان مومنین کو جزا اور ان کافروں کو سزا کا استحقاق نہ ہوتا بلکہ محرکات مہیا کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد بھی اچھے یا بُرے راستے پر جانے کی ذمہ داری جانے والے ہی پر رہتی ہے۔ ایک اور بات قابل توجہ یہ ہے کہ مومنین کے لئے جو کہا گیا ہے کہ اللہ انہیں ظلمتوں سے نور کی طرف نکالتا ہے اور کافروں کے لئے یہ کہ ''طاغوت'' انہیں نور سے ظلمتوں کی طرف لے جاتے ہیں، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ مومنین لازماً پہلے ظلمتوں میں تھے اور کفار لازماً پہلے نور کے اندر تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انہیں ظلمتوں میں گرفتار ہونے سے بچایا اور طاغوت نے انہیں نور حاصل نہ کرنے دیا۔ علامہ طبرسیؒ نے اس کی مثال محاورہ عرب سے یہ دی ہے کہ کہا جاتا ہے: اخرجہ والدہ عن میراثہ ''اسے اس کے باپ نے اپنی میراث سے نکال دیا'' یعنی محروم کر دیا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ میراث ملنے نہ دی اور قرآن سے مثال یہ ہے جو حضرت یوسفؑ کی زبانی ہے:

اِنِّی تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ.

میں نے چھوڑ دی ملّت اس قوم کی جو ایمان نہیں رکھتی۔

اس کا مطلب نہیں کہ (معاذ اللہ) وہ اس ملّت پر تھے بس اسی طرح یہاں کہا گیا ہے۔

علامہ نیشاپوری نے اس پر کچھ زیادہ روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:

والاخراج بشمل الکافر اذا امن المومن الاصلی ولا یبعد ان یقال یخرجھم الی النور من الظلمات و ان لم یکونوا فی الظلمة المیتة فان العبد لو خلا من توفیق اللہ تعالی لحظة لو قع فی ظلمات الجھالات و الضلالات فصار توفیقه تعالیٰ سببا لدفع تلك الظلمات عنه و بین الدفع والرفع تشابه و مثله قوله و کتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم عنھا و معلوم انھم ما کانوا فی النار و یروی انه سمع انسانا قال اشھد ان لا اله الا اللہ فقال علی الفطرة فلما قال اشھد ان محمدا رسول اللہ قال خرج من النار ومن المعلوم انه ما کان فیھا (غرائب القرآن)

نکالنے کے لفظ میں داخل ہے کافر بھی جو بعد میں ایمان لے آئے اور اصلی مومن بھی اور یہ کہنا کہ انہیں ظلمتوں سے نور کی طرف نکالتا ہے کوئی بعید نہیں ہے چاہے وہ ظلمت میں اس کے پہلے قطعاً نہ ہوں اس لئے کہ بندہ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی توفیق ربانی سے محروم ہوجائے تو وہ جہالتوں اور گمراہیوں کی تاریکی میں پڑ جائے گا توفیق الٰہی بس وہ ہوتی ہے جو ان ظلمتوں کے دفعیہ کا سبب ہوتی ہے اور دفع (آتی ہوئی چیز کو روک دینا) اور رفع (آئی ہوی چیز کو ہٹا دینا) دونوں ایک طرح ہی کی باتیں ہیں اور اس کی مثال قرآن سے یہ ہے کہ "ارشاد ہوا ہے تم آتش دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اس نے تم کو اس سے چھٹکارا دیدیا"۔ اور ظاہر ہے کہ وہ اس آگ کے اندر تھے نہیں اور روایت میں ہے کہ پیغمبر خداؐ نے ایک آدمی کو سنا کر وہ کہتا ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی خدا نہیں سوا اللہ کے۔ فرمایا یہ فطرت کے تقاضے پر قائم ہے، پھر جب اس نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ اللہ کے پیغمبر ہیں، فرمایا بس یہ آگ سے نکل آیا اور یہ ظاہر ہے کہ وہ آگ کے اندر نہیں تھا۔

اب ان نظیروں سے آیہ تطہیر میں بھی جو کہا گیا ہے: لیذھب عنکم الرجس، اس کی نوعیت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ یعنی اس سے یہ نتیجہ نکلتا کہ ان اہل بیتؑ میں (معاذ اللہ) کوئی نجاست پہلے موجود تھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے نجاست کا گزران تک ہونے ہی نہ دیا اور وہ بدوفطرت سے پاک وہ پاکیزہ رہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

"کیا نہیں دیکھا تم نے اسے جس نے ابراہیم سے ان کے پروردگار کے بارے میں تکرار کی اس بناء پر[1] کہ اللہ نے اسے سلطنت دے رکھی تھی جب کہا ابراہیم نے کہ میرا پروردگار وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے اس نے کہا میں جلاتا اور مارتا ہوں تو کہا ابراہیم نے کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال دے اس پر وہ کافر مبہوت ہوگیا[2] اور اللہ ظالموں کو منزل مقصد تک نہیں پہنچایا کرتا۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو نمرود سے:

یہ نمرود وہ تھا جو اپنے اقتدار ملکی کے گھمنڈ میں اپنی خدائی کا علم بلند کیے ہوئے تھا اور جناب ابراہیمؑ سے بحث کرنے چلا تھا[3] اور در

---

[1] ۔لان اٰتاہُ اللہ الملك (جلالین) ابطرہ ایتاؤہ الملك وحملہ علی المحاجۃ (صافی) اس برتے پر کہ خدا نے اسے دنیا کا راج دیا تھا (تاج العلماء)

[2] ۔بھوچکا ہوگیا وہ جو کافر تھا (شاہ رفیع الدین) وہ کافر ہکا بکا رہ گیا (فرمان علی صاحب) بالکل بھوچک ہوگیا (تاج العلماء)

[3] ۔ ھو نمرود بن کنعان وھو اوّل من تجبر وادعی الربوبیۃ (مجمع البیان)

حقیقت حضرت ابراہیمؑ کا پہلا ہی استدلال لا جواب تھا مگر اس نے حقیقت کو مجاز پر ڈھال کر حیا و موت کو اپنے ہاتھ کا کام اس طرح بتایا کہ ایک سزائے موت سنائے ہوئے مجرم کی جان بخشی کر دی۔ یہ گویا مردے کو جلا دیا اور ایک بے قصور کی جان لے لی۔ اس طرح زندہ کو مار دیا۔ ہوسکتا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی پہلی ہی دلیل پر زور دیتے کہ جلانا اور مارنا یہ نہیں ہے مگر یہ ایک دور کا راستہ ہوتا۔ اس لئے انہوں نے دوسری دلیل پیش کی جس میں اس طرح کی دھاندلی بھی نہ چل سکے [1] جناب شیخ جواد بلاغیؒ فرماتے ہیں کہ اسے علی بن ابراہیمؒ نے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے مگر کسی معصومؑ سے منقول نہیں اور در منثور میں اس کی نسبت جناب ابن عباس کی طرف رہی ہے مگر جہاں تک قرآن مجید کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نمرود اللہ کا قائل ہوتے ہوئے اپنے کو اس کا شریک قرار نہیں دیتا تھا تا کہ وہ کہتا کہ میں بھی اسی صورت سے جلاتا اور مارتا ہوں اور اس طرح وہ اس مجاز سے کام لیتا بلکہ وہ تو منکر خدا ہوتے ہوئے خود اپنے کو خدا کہتا تھا۔ لہٰذا اس کے کہنے کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہی زندگی اور موت جسے تم فعل الٰہی بتاتے ہو اس کا نہیں میرا ہی کام ہے۔ یہ اس کا ایک بلا وجہ کا بے بنیاد دعویٰ تھا مگر ایسا جس کے بطلان کا کوئی ثبوت عالم مشاہدہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جناب ابراہیمؑ نے اس سے اس پر بحث بے کار سمجھتے ہوئے ایک ایسا مطالبہ کر لیا جس پر وہ کچھ دھاندلی سے کام لے ہی نہیں سکتا تھا اور اسی لئے اسے لا جواب ہونا پڑا [2]۔

آخری فقرہ میں جو ظالمین کی ہدایت کی نفی کی گئی ہے یہ وہ ہدایت بامعنی رہ نمائی نہیں ہے جس کے ذریعہ سے اتمام حجت ہونا بلکہ یہ خصوصی رہ نمائی ہے جو منزل تک پہنچانے کی ضامن ہے جس کے لئے خود انسان کا ذوق طلب اور اسکی جدوجہد درکار ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں پر لگا دیتے ہیں (عنکبوت۔ ٦٩)

اس ہدایت خاص سے ظالمین اپنے ظلم و ستم کی بدولت محروم رہتے ہیں اور وہ ظالم و ستم یہی کیا کم ہے کہ داعی حق کی بات کو سنجیدگی کے ساتھ سنیں نہیں، مذاق اڑا دیں یا غلط قسم کی دھاندلیوں سے کام لیتے ہوئے اس کے تسلیم کرنے سے گریز کریں [3]۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ

---

[1] ۔ف نقلا الیٰ حجة او ضح منها (جلالین) دفعا للمشا غبة وهو فی الحقیقة عدول عن مثال خفیّ الیٰ مثال حلی ــــــ لا عن حضة الیٰ اخریٰ (صافی)

[2] ۔قوله انا احی وامیت مصادرة جزافیة یرید بها الأاحیاء والموف الذین قالها ابراهیم فاراد ابراهیم ان سید بآب المصادران یالدّعاوی السحیفة (آلاء الرحمٰن)

[3] ۔لا یهدی ای لا یوفق ولا یوصل بلطفه (البلاغی)

يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

''یا جیسے وہ آدمی [1] جو گزرا ایک گاؤں کی طرف سے جس کے دیوار و در کا ملبہ گری ہوئی چھتوں پر آ چکا تھا [2] کہا کیوں کر زندہ کرے گا [3] اسے اللہ اس موت کے بعد۔ تو سے اللہ نے سو برس تک کے لئے مردہ کر دیا پھر اسے اٹھایا کہا: کتنے عرصے تک تم اس طرح رہے؟ کہا: رہا میں اس طرح ایک دن یا دن کے کچھ حصہ میں۔ کہا بلکہ تم سو برس پڑے رہے ہو تو اب دیکھو اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو کہ وہ خراب نہیں ہوئی ہیں اور پھر اپنے گدھے کو دیکھو [4] اور یہ اس لئے [5] کہ تمہیں ہم نشانی قرار دیں لوگوں کے لئے اور تم دیکھو ہڈیوں کو کہ کس طرح ہم انہیں کھڑا کرتے ہیں [6]) پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ جب اس پر یہ ثابت ہو گیا تو کہا میں یقینی طور پر جانتا ہوں کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے۔''

عزیر یا ارمیا کا واقعہ:

اس آدمی کے نام میں اختلاف ہے کہ یہ عزیز نبی تھے یا ارمیا نبی اور چوں کہ روایتیں دونوں طرح کی وارد ہیں اس لئے ان میں جمع کی یہ صورت پیدا کی گئی ہے کہ شاید اس طرح کہ واقعہ دو مرتبہ ہوا ہو [7]۔

اس آیت کا تعلق سابقہ آیت سے علامہ بلاغی نے اس طرح قرار دیا ہے کہ پہلے ایسے شخص کا تذکرہ تھا جس نے اللہ سے سرکشی کی اور بطور عناد یہ باتیں کیں اور دوسرے اس کا ذکر ہے جس نے غلط فہمی اور غفلت نے ایک بے محل جملہ کہہ دیا۔ امت محمدی کو تنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم نہ ویسے ہونا اور

---

[1] ۔ای ھل رایت کالذی (مجمع البیان)

[2] ۔ڈھا گیا تھا اپنی چھتوں پر (تاج العلماء) ساقطة حیطانها علی سقوفها (صافی) کان حیطانها کانت قائمة وقد تهدّمت سقوفها ثم تقعّرتالحیطان من قواعدها فتساقطت علی السّقوف المتهدّ (نیشاپوری)

[3] ۔کیف یحیٖ او متیٰ یحیٖ (صافی)

[4] ۔کیف تفرقت عظامه ونخرت وتفتتت (صافی)

[5] ۔ای وفعلنا ذالك لنجعلك اٰیة (صافی)

[6] ۔نرفع بعضها علی بعض للترکیب (صافی)

[7] ۔هو ارمیا النبی وقیل عزیر النبی ویمکن التوفیق بالقول بوقوع هٰذه القضیة مرتین (صافی)

نہ ایسے [1]۔

مذکورہ بالا دونوں قولوں کی تائید میں احادیث موجود ہیں لیکن ان کے بالمقابل صاحب کشاف نے بلاوجہ یہ رائے اختیار کر لی ہے کہ یہ شخص جس کا قصہ بیان ہوا ہے کوئی کافر تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ قول خلاف نصوص ہونے کی بناء پر نا قابل قبول ہے [2]۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

''اور جب کہا ابراہیمؑ نے اے پروردگار مجھے دکھلا کہ کیوں کر تو مردوں کو زندہ کرتا ہے؟ اس نے کہا کیا تمہیں ایمان نہیں ہے۔ کہا کیوں نہیں مگر اس لئے کہ میرے دل کو قرار آئے، کہا تو لے لو چار پرندے اور انہیں اکٹھا کر لو اپنے پاس پھر رکھ دو ہر پہاڑ پر اس کا ایک ٹکڑا۔ پھر پکارو انہیں تو وہ آئیں گے تمہاری طرف دوڑتے ہوئے اور جانے رہو کہ اللہ زبردست ہے حکمت والا۔''

حضرت ابراہیمؑ کی خالق سے التجا اور اس کا نتیجہ:

جناب ابراہیمؑ نے بارگاہ الٰہی میں قدرت کی ایک نشانی دیکھنے کی تمنا کی تھی۔ خود الفاظ حضرت ابراہیمؑ بتاتے ہیں اصل حقیقت کے وقوع میں کوئی شک نہیں ہے۔ صرف کیفیت کا مشاہدہ اپنی آنکھ سے مطلوب ہے [3] خالق نے اس حقیقت کو سوال و جواب سے نمایاں کر دیا [4]۔

یہ دل کا قرار پکڑنا سے جناب ابراہیمؑ نے کہ ''لیطمئن قلبی'' اشتیاق کی بے چینی دور ہونا ہے نہ کہ شک وشبہ کا دفع ہونا جو استحکام ایمانی کے منافی ہو۔ اس کے علاوہ ''بلیٰ'' ''کیوں نہیں'' کی لفظ کے ساتھ لیطمئن قلبی ''تا کہ میرے دل میں سکون وطمانیت پیدا ہو صاف ظاہر کرتا ہے کہ اطمینان ویقین کا وہ مرتبہ جو ایمان کے لئے ضروری ہے حاصل تھا۔ مگر یقین واطمینان کے بھی مراتب ہیں اور یقین میں اضافہ کی خواہش شان نبوت ورسالت کے ہرگز منافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب امام رضاؑ سے کسی نے پوچھا:

اکان فی قلبه شك کیا ان کے دل میں کچھ شک تھا

---

[1] ۔فان من الناس من یکون فی عنادہ وضلالہ ومکابرتہ للحق الواضح کھذا او یکون فی غفلۃ عمّا یعتقدہ فی ایمانہ (آلاء الرحمٰن)

[2] ۔لا مساغ لصاحب الکشاف فی اختیارہ ان صاحب القصۃ کافر (البلاغؒ)

[3] ۔انہ احب ان یعلم ذٰلك علم عیان بعد ان کان عالما من جھۃ الاستدلال والبرھان وھٰذا اقوی الوجوہ (مجمع البیان)

[4] ۔سالہ مع علمہ بایمانہ بذالك لیجیبہ بما سالہ فیعلم السامعون غرضہ (جلالین)

تو حضرتؑ نے فرمایا:

لا کان علی یقین ولکنه اراد من الله الزیادة فی یقینه نہیں وہ یقین کے مرتبہ پر فائز تھے لیکن انہوں نے اللہ کی جانب سے اپنے یقین میں زیادتی کی خواہش کی تھی" (صافی)

یہ زیادتی کسی بھی رسولؑ کی شان کے خلاف نہیں ہے یہاں تک کہ خاتم النبین وافضل المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کی زبانی قرآن مجید میں ہے:

رب زدنی علما: پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما

جناب تاج العلماء لکھتے ہیں: "مطمئن ہوجائے میرا دل کہ تو نے مجھے اپنا دوست بنایا یا نہیں۔"

اس کے بعد سوال خلیلؑ کے پورا کرنے کے سلسلہ میں جو ارشاد ہوا چار پرندے لے کر انہیں اپنے پاس اکٹھا کرلو اس میں یہ مفہوم مضمر ہے کہ انہیں ذبح کر کے ان کے گوشت واستخوان اور پر و بال سب کو خلط ملط کر دو تا کہ پھر جب وہ زندہ ہو کر آئیں تو احیائے موتی کی صورت میں خالق کی صنعت آفرینی کا مشاہدہ ہو۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ قرار دیا گیا ہے انہیں قریب سے خود دیکھ بھال کے پہچان رکھو (تاج العلماء) پھر یہ کہ یہ سوال مشاہدہ کس بناء پر تھا؟ اس کے متعلق جناب تاج العلماء لکھتے ہیں:

مطلب استفہام تھا نہ انکار کہ جو خلاف ایمان تھا اور نہ جانچ کا حاصل کرنا کہ جو موجب تشخیص تھا کہ سب خلاف عصمت ہے بلکہ ضرور حضرت ابراہیمؑ مقرر تھے اس کے اور اسے باور بھی کر چکے تھے اجمالی تصور پر مگر انہوں نے چاہا کہ تفصیل وارا سے بہ چشم خود دیکھ کر تفصیلی علم اس کا حاصل کرلیں اور ایسا تفصیلی علم شرعاً از بسکہ کچھ ضرور نہ تھا اور علم اجمالی اذعان کے لئے کافی تھا تو از خود خدا نے انہیں یہ علم نہ دیا تھا یہاں تک کہ ان کی درخواست پر وہ راز فاش کیا گیا" (حواشی قرآن)

بعض لوگوں نے اسے قبل کے واقعہ سے مرتبط کیا ہے کہ چوں کہ انہوں نے نمرود سے بحث میں کہا تھا کہ میرا پروردگار زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اس نے یہ کہا میں ایسا کرتا ہوں تو انہوں نے چاہا کہ قدرت الٰہی سے مردہ زندہ کرنے کا نمونہ اس کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دیں اور اس صورت میں اطمینان کے معنی یہ ہیں کہ دشمن کے مقابلہ میں بحث میں نمایاں کامیابی ہوجانے سے میرے دل کو سکون حاصل ہو[1]۔

مگر جب کہ یہ سوال و جواب نمرود کے دربار میں نہیں ہوا ہے جیسا کہ صورت واقعہ سے ظاہر ہے تو اس مشاہدہ سے نمرود پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اس لئے یہ توجیہ کوئی وزن رکھتی معلوم نہیں ہوتی۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

---

[1] ۔لیکشف ھٰذہ المسئلة عند نمرود واتباعه ویزول الافکار عن قلوبهم (نیشاپوری)

''مثال ان لوگوں کی جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں مثل اس ایک دانے کے ہے جس نے سات بالیاں اگائیں کہ ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کے لئے چاہتا ہے اور بڑھاتا ہے [1] اور اللہ بڑی سمائی والا ہے بڑا جاننے والا۔''

راہ خدا میں خیرات کی نتیجہ خیزی اور اس کی مثال:

''اللہ کی راہ میں'' یعنی کسی بھی کار خیر میں جس سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہو [2]

یہ ارشاد کہ ہر بالی میں سو دانے ہوں اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ عام طور پر گیہوں کی بالیوں میں سو دانے ہوتے بھی ہوں بلکہ اس برکت کے غیر معمولی ہونے کا اظہار اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کی تمثیل اس عام واقعاتی نشوونما جو حدود مشاہدہ کے اندر ہے کسی چیز سے ہو ہی نہیں سکتی بلکہ اس کی تمثیل کے لئے مفروضات سے مدد لینے کی ضروری ہے [3]۔

پھر یہ کہ وہ بالکل فرضی چیز ہے بھی نہیں کیوں کہ قرآن مجید میں گیہوں کی تخصیص نہیں ہے بلکہ دوسری جنس کے غلے بھی داخل ہیں اور مختلف غلوں میں بالیوں اور بالیوں کے اندر کے دانوں کی تعداد مختلف ہوا کرتی ہے بعض اجناس میں سو کے لگ بھگ تعداد دانوں کی مشاہدہ میں آیا کرتی ہے [4]۔

''اللہ جس کے لئے چاہتا ہے اور بڑھاتا ہے۔'' یہ چاہنا بلا وجہ نہیں ہوتا بلکہ کچھ خلوص قلب کی نوعیت کچھ موقع محل کی نزاکت کچھ اس انفاق کے نتائج کا دور رس ہونا۔ اس اعتبار سے اس کی جزاء میں بیش از بیش اضافہ کا استحقاق ہوتا ہے [5]۔

اسی بناء پر آخری میں دو الفاظ کہے گئے واسع اور علیم واسع کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے خزانہ میں کمی نہیں ہے۔ وہ جتنا چاہے بڑھانے پر قادر ہے اور علیم کا مطلب یہ ہے کہ وہ درجہ استحقاق سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ کس کا انفاق کتنے اضافہ کا حق دار ہے [6]۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٦٢﴾

---

[1] ۔ یضاعف اکثر من ذلك (جلالین)

[2] ۔ الجهاد وغیرہ من ابواب البرّ کلها وهو المروی عن ابی عبد اللہ علیہ السلام (مجمع البیان)

[3] ۔ متیٰ قیل هل رأی فی سنبله مائة حبّة حتی یضرب المثل بها فجرابه ان ذلك متصور وان لم یر (مجمع)

[4] ۔ لیس ذٰلك فرضا موهوما کاینات الاغوال بل هو کثیر مشاهد مُرئی وان کان قلیلا (البلاغی) قد یوجد فی الجادرس وللذرة وغیرها مثل ذٰلك (نیشاپوری)

[5] ۔ علیٰ حسب حال المنفق من اخلاصه وتعبه وهال المصرف وغیر ذٰلك. (صافی)

[6] ۔ واسع لا یضیق علیه ما یتفضّل به من الزیادة علیهم بنیة المتفق وقدر انفاقه (صافی) علیهم بما یستحق الزیادة (مجمع البیان)

''وہ جو اپنے مال کو راہ خدا میں صرف کرتے ہیں پھر اس صرف کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ ایذا پہنچاتے ہیں ان کیلئے ان کا اجر ہے ان کے پروردگار کے یہاں اور انہیں کوئی کھٹکا نہیں ہے اور نہ انہیں افسوس ہوگا۔''

خیرات کے باعث ثواب ہونے کی شرطیں:

اس میں انفاق کی ان خرابیوں کی طرف اشارہ ہے جن سے ثواب اس انفاق کا ختم ہوجاتا ہے اور یہ وہ بلائیں ہیں جن سے کم خیر خیرات کرنے والے محفوظ رہتے ہیں۔

پہلی چیز ہے احسان جتانا، یعنی اس وقت تو کسی کا کام نکال دیا اور پھر دوسرے وقت اس کے منہ پر کہہ دیا کہ تمہارے کیسے وقت پر ہم کام آئے [۱] یہ وہ آگ ہوگی جو خرمن احسان کو جلا کر خال کردے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بعد میں اس کے دل دکھانے کا سامان کرنے لگے مثلاً ایسے لوگوں سے اس کا ذکر کررہا ہے جن پر وہ اپنی حالت کا ظاہر ہونا پسند نہیں کرتا یا اپنا تفوق قائم کرتے ہوئے اس سے حقارت آمیز برتاؤ کررہا ہے [۲] اور ایسے ہی دل آزار طرح کی باتیں [۳]۔

یہ چیز بھی اس احسان کو رائیگاں کرنے کا سبب ہوسکتی ہے۔ اس لئے اجر وثواب کے وعدہ میں شرط عاید کی گئی ہے کہ راہ خدا میں صرف کرے اور پھر اس قسم کی باتیں نہ کرے جو اس خیرات کو بے کار بنانے والی ہیں۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

''اچھے عنوان سے بات کہہ دینا اور بخش دینا [۴] بہتر ہے ایسی خیرات سے جس کے بعد ایذا پہنچانا ہو اور اللہ بے نیاز ہے برداشت سے کام لینے والا۔''

مطلب یہ ہے کہ یہ اس کی ضرورت پوری نہ کرتا۔ مناسب الفاظ میں معذرت کردیتا اور سوال کرنے میں وہ سختی و درشتی اور اصرار بے جا سے جو کام لے رہا تھا یہ اسے برداشت کرکے درگزر کردیتا [۵] تو وہ اس حاجت برآری سے بہتر تھا جس کے بعد یہ اس کا دل دکھائے ''بخشش'' کے ایک معنی یہ بھی کہے گئے ہیں کہ یہ اچھے عنوان سے معذرت کرتا جو اللہ کی جانب سے خود اس شخص کی مغفرت کا باعث ہوتا وہ اس احسان سے بہتر تھا جو اس کی ایذا رسانی سے اکارت ہوجائے۔

اس صورت میں قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ. کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''اچھے عنوان سے بات کہنا'' اور بخشا جانا بہتر ہے ایسی خیرات

---

[۱] ۔ المن ان یعتد باحسانه علیٰ من احسن الیه (صافی)

[۲] ۔ ان یتطاول علیه بسبب ما انعم علیه (صافی)

[۳] ۔ ان یقول اراضی الله منك ومن ابتلانی بك (مجمع البیان)

[۴] ۔ بھلی بات اور بخشش (تاج العلماء)

[۵] ۔ کلام حسن ورد علی المسائل جمیل ومغفرة للدفی الخاصة (جلالین) مغفرة لما یصدر منه من الحاف او ازعاج فی المسئلة (البلاغی)

سے [1] مگر یہ معنی بظاہر بعید میں۔ ''اللہ بے نیاز ہے'' یعنی اسے ایسی خیرات کی ضرورت نہیں ہے جس کے بعد سائل کا دل دکھایا جائے لہٰذا وہ ایسی خیرات کو قبول نہیں کرے گا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ حلیم برداشت سے کام لینے والا ہے اس لئے تمہیں فوراً سزا نہیں دیتا [2]۔

اس میں یہ ارشاد بھی مضمر ہے کہ خالق حلم سے کام لے کر تمہاری غلطیوں سے درگزر کرتا ہے تو تمہیں بھی ان سائلوں کی تلخ کلامی وغیرہ سے درگزر کرنا چاہیے [3]۔

بعض لوگوں نے سمجھا ہے کہ یہ بات مستحبی خیرات ہی سے متعلق ہوسکتی ہے کہ اس کا نہ دینا بہتر ہے اس قسم کے دینے سے جس کے ساتھ یہ طرز عمل اختیار کیا جائے کیوں کہ اگر زکوۃ واجب ہے تو اس کا دینا بہر حال لازم ہے مگر اس کے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ واجب زکوۃ میں بھی یہ ہوسکتا ہے کہ اس کو نہ دے، کسی دوسرے کو دیدے [4]۔

میں سمجھتا ہوں کہ از اول خیرات میں ثواب کے اس بڑھاوے کا اعلان اور اتنی ترغیب وتحریص یہ سب مستحبی خیرات ہی سے تعلق کا پتہ دیتی ہے اس لئے کہ جو شے قانون شرع کے لحاظ سے ضروری ولازم ہے اس کے ترک کی صورت میں عذاب اور غضب الٰہی کا اعلان ہی کافی ہوتا ہے۔ اجر وثواب کی زیادتی بیان کر کے اس پر آمادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶۴

''اے ایمان لانے والو! اپنی خیرات کو اکارت نہ کرو [5] احسان جتانے اور ایذا پہنچانے سے اس شخص کی طرح جو اپنے مال کو خیرات کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کے لئے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کی مثال اس چکنے پتھر [6] کی سی ہے جس پر کچھ خاک پڑی ہو اور پھر اس پر بڑی بڑی بوندوں کا مینہہ برس جائے اور اسے صاف چکنا کر ڈالے (ایسے ہی) وہ جو کچھ ان کے اعمال ہیں ان سے کچھ ان کے پلے نہ پڑے گا اور اللہ کافر لوگوں

---

[1] ۔تجاوز عن السائل الحاحه او نیل مغفرة من الله یسبب الرد الجمیل (صافی)

[2] ۔لا یعاجلکم بالعقوبة (مجمع البیان)

[3] ۔فعلکم بالعبادة بالحلم والغفران لما یندر من السائل (بلاغی)

[4] ۔ردبان الواجب قد یعدل به عن السائل الی مسائل وعن فقیر الی فقیر (بلاغی)

[5] ۔نہ مٹاؤ (تاج العلماء)

[6] ۔صفا چٹ چٹان (تاج العلماء)

کوراہ پر نہیں لگاتا۔''

اس میں تاکیدی طور پر اس بات کے دہرانے کے ساتھ کہ احسان جتانے اور ایذا پہنچانے سے خیرات رائیگاں ہوجاتی ہے پھر خیرات کو باطل کرنے والی ایک تیسری چیز کا پتہ دیا گیا ہے اور وہ لوگوں کے دکھانے کی نیت ہے۔

دکھاوے کے قصد کے ساتھ یہ الفاظ کہ ''وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا'' اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ غیر مسلموں کی خیرات کا ذکر ہے بلکہ یہ اضافہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے ہے کہ ریاکاری خود ایمان کے تقاضے کے خلاف ہے [1] اس لئے کہ اگر یہ شخص خدا اور روز آخرت کا صحیح تصور رکھتا تو یہ مقصد اتنا اہم ہے کہ اس کے مقابلہ میں وہ کسی دوسرے مقصد کو سامنے رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

تشبیہ کے محل میں ''پتھر پر کا غبار'' وہ کھاوے کا عمل ہے اور بارش سے اس کا صفا چٹ ہوجانا روز آخرت کی حقیقت پاش ساعت کا سامنے کا آجانا اور ریاکاری کے نمائشی کردار کا ایک دم غائب ہوجانا ہے۔

ریاکاری سے خیرات کے باطل ہونے کی مثال:

اب وہ اعمال کا ذخیرہ جس پر یہ لوگ آسرا لگائے تھے ان کے ہاتھ نہیں آسکتا اور نہ کام آسکتا ہے اسے کہا گیا ہے کہ انہیں اپنے اعمال میں سے کچھ پلے نہیں پڑے گا [2]۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۶۵

''اور مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال خوشنودی خدا کی خاطر اور اپنے کو ثابت قدم رکھتے ہوئے [3] مثل اس گھنے باغ کے ہے جو کسی اونچی جگہ ہو، جس پر بڑی بڑی بوندوں والا مینہ برسا تو وہ اپنے پھل دونا دوں لایا اور اگر بڑی بوندوں والا مینہ نہ بھی ہو تو پھوہار سہی اور جو تم لوگ کرتے ہو اللہ اس کا دیکھنے والا ہے۔''

قابل قبول خیرات کی مثال:

''اپنے کو ثابت قدم رکھتے ہوئے یعنی اپنی قوت ارادی کو مرتکز کرتے ہیں اس بات پر کہ وہ احسان کے ساتھ کوئی ایسی بات نہ کریں گے جس سے وہ رائگاں چلا جائے گا۔ مثلاً احسان جتانا یا اس شخص کے مقابلہ میں تفوق برت کر، یا اور کسی طرح کو آزار پہنچانا یا اسے دوسروں کے دکھانے

---

[1] ۔فیہ تعریض بان الرّیاء والمن والاذی علی الانفاق من صفات الکفار (صافی) وکل مراء کافر او منافق (مجمع البیان)

[2] ۔لا ینفقون بما فعل ولا یجدون ثوابہ (صافی)

[3] ۔لان ثبتوا انفسھم علی طاعۃ اللہ وطلب رضاہ (البلاغی)

کے واسطے عمل میں لانا[1]۔

اور یہ بھی مفہوم ہوسکتا ہے کہ ان کی محرک اس عمل پر ان کی دینی بصیرت اور ضمیر کو قوت ہے[2]۔

اور ایک مفہوم یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ ایسا اس لئے بھی کرتے ہیں کہ اہل ایمان کے سامنے اپنے ایمان کا ثبوت پیش کریں[3]۔

مگر میرے خیال میں پھر اس کی بھی نوعیت ایک طرح کی نمائش کی ہو جائے گی حالانکہ قرآن مجید سابق کی آیت میں جو ریاکاری والی خیرات کا ذکر ہے اس کے مقابلہ میں اس کردار کو پیش کر رہا ہے جو خالصۃً لوجہ اللہ ہے اور اس لئے اس سے بہتر مجھے ایک اور قول معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسا کرتے ہیں اپنے ضمیر کو مطمئن بنانے کے لئے[4]۔

مثال میں باغ کے لئے اونچے پر ہونے کا ذکر اس لئے ہے کہ وہ باغ زیادہ لطیف اور شاداب ہوتا ہے[5]۔

''بڑے بوندوں والا مینہ اور اگر یہ نہ ہو تو ہلکی پھوہار سہی'' اس سے خیرات کی زیادتی اور کمی مراد ہوسکتی ہے یعنی اگر انہوں نے خیرات زیادہ مقدار میں کی ہے تو وہ تو بڑی بوندوں والے مینہ کی طرح ہے جس سے پیداوار بہت ہونا لازم ہے اور اگر کم بھی دیا ہے تو بھی بے کار نہیں۔ صدق دل سے ہے تو نتیجہ اس کا بھی نفع اخروی کی صورت میں سامنے آئے گا[6]۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

''کیا تم میں سے کوئی چاہے گا اس کا گھنا باغ ہو کھجور اور انگور کا جس کے نیچے سے نہریں جاری ہوں اور اس کے لئے اس میں سب طرح کے پھل موجود ہوں اور اسے بڑھاپا گھیر لے اس حال میں کہ اس کے بے تاب و توان اولاد ہو

---

[1] ۔ یعنی یو طنون انفسهم علیٰ حفظ هٰذه الطاعة وترك اتباعها بما يفسدها من المن والاذى والسمعة الرّياء والعجب ونحوها (صافی)

[2] ۔بقوة اليقين والبصيرة فی الدين (مجمع البیان) اپنی ثابت قدمی کی وجہ سے (تاج العلماء)

[3] ۔قيل تثبيتا من انفسهم عند المؤمنين انها صادقة فی الايمان مخلصة فيه (نیشاپوری)

[4] ۔وقيل انه اذا انفق لاجل مودية الحق ____ فهنا اطمأن قلبه (نیشاپوری)

[5] ۔لانها تكون از كى شجرا واحسن ثمرا وانقى هواء (بلاغی)

[6] ۔يجوز ان يكون التمثيل لحالهم عند الله تعالىٰ بالجنة على الربو ونفقاتهم الكثيرة والقليلة بالوابل والطل (صافی)

اور اس (باغ) کو اپنی لپیٹ میں لے لے ایک بگولا [1] جس میں آگ ہو جس سے وہ جل جائے۔ اس طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے۔ شاید کہ تم غور کرو۔"

مطلب یہ ہے کہ اعمال کے پودے زندگی کی سرزمین پر اس لئے لگائے جاتے ہیں کہ ضرورت کے وقت اور وہ ضرورت کا وقت آخرت کا ہنگام ہے انسان کے کام آئیں لیکن اگر وہ ریا کاری کی خیرات ہے یا وہ احسان ہے جس کے بعد اس نے احسان جتایا ہے یا دل آزاری کی ہے تو یہ بذل وسخا خوب اپنی بہار دکھاتا رہا کہ تعریفیں ہوں نام پھیلا شہرت ہوئی مگر جب اصل ضرورت کا ہنگام آیا تو اس وقت یہ پورا باغ جلا ہوا خاکستر نظر آئے گا اور ذرہ بھر بھی اس سے فائدہ حاصل نہ ہوگا [2]۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۡ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۲۶۷

"اے ایمان والو! خیرات کرو اپنی کمائی کی اچھی پاک وحلال چیزوں سے [3] اور اس سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے برآمد کیا ہے اور قصداً [4] خراب چیز خیرات میں نہ دو درانحالیکہ تم خود اسے لینے پر آمادہ نہیں ہو گے سوا اس صورت کے کہ جب اپنی آنکھیں اس کے بارے میں (کسی وجہ سے) بند کرلو [5] اور جانے رہو کہ اللہ بے نیاز ہے قابل تعریف اوصاف والا۔"

خیرات کے دو اہم اصول:

اس میں پہلا اصول یہ بتایا گیا ہے کہ مال حلال سے خیرات کرو حرام کمائی سے نہ ہو کافی کی حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے اس کی شان نزول منقول ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگوں نے ناجائز ذرائع سے اموال حاصل کیے تھے۔ اب اسلام کے بعد انہوں نے ان اموال کو خیرات

---

[1] ۔ریح عاصفة تنعکس من الارض الی السماء مستديرة كعمود (صافی) غبار يلتف بين السماء والارض كالتفات الثوب فی العصر (مجمع البيان)

[2] ۔هٰذا تمثيل لنقة المرائی المآنّ فی ذهابها وعدم نفعها احوج ما يكون اليها فی الاٰخرة (جلالين) عن الصّادقؑ من انفق ماله ابتغآء مرضا ت الله ثم امتن علی من تصدق عليه كان كمن قال الله ايودّ احدكم الاٰية (صافی) اذا كان احدكم لا يود ذلك ___ فلما ذا يسلط نار المن والاذی فی اعمالهؑ صار جهله ويحرق بها انفاقه (بلاغی)

[3] ۔المراد من الطيب هو غير الردی فی ذاته او بحرمته (البلاغی)

[4] ۔التيمّم التعمد (مجمع البيان)

[5] ۔الّا ان تتسامحوا فيه مجاز من اغمض بصره عن بعض حقه اذا غضّه (صافی) التغميض للعين اطباق الجفن (مجمع)

میں دینا چاہا تو اس سے ممانعت آئی اور بتایا گیا کہ خیرات مال حلال سے ہونا چاہیے۔

طیبات کے ساتھ جو مَا كَسَبْتُمْ کا لفظ ہے جس سے کمائی کا مفہوم پیدا ہوا ہے اس سے ضمناً یہ بات مستفاد ہونا بعید نہیں ہے کہ مال حلال بھی اگر اپنی کمائی کا نہیں ہے تو اس سے خیرات کی اتنی فضیلت نہیں ہے جتنی خود اپنے قوت بازو سے حاصل کرو مال سے خیرات کرنے کی فضیلت ہے [1]۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ یہ غلط ہے کہ جو بری چیز ہو اور اپنے کو ناپسند ہو قصداً راہ خدا میں دے جب وہ چیز ایسی ہے کہ خود تمہیں کوئی دیتا تو تم خود اس کے لینے پر عام حالات میں آمادہ نہ ہوتے تو اسے زکوٰۃ خیرات دینا بھی صحیح نہ سمجھو۔

کافی اور تفسیر عیاشی میں متعدد حدیثیں ہیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایسا کیا جاتا تھا کہ زکوۃ میں جو انتہائی خراب کھجوریں ہیں وہ حاضر کر دی جاتی تھیں۔ یہی بات ہے جس سے اس آیت میں ممانعت ہوئی ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾

''شیطان ڈراتا ہے [2] تمہیں رنگ دستی سے اور تمہیں غلط کاری پر آمادہ کرتا ہے اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی طرف سے بخشش اور کرم کا اور اللہ سمائی والا ہے بڑا جاننے والا۔''

تنگ دستی سے ڈرانا خیرات سے مانع ہونا ہے۔ یہ خیال پیدا کر کے کہ ہم اسے کار ہائے خیر میں صرف کر دیں تو خود تنگ دستی کا شکار ہو جائیں گے اور غلط کاری پر آمادہ کرنے سے بھی خود بخل پر آمادہ کرنا مراد ہو سکتا ہے [3] اس صورت میں یہ پہلے ہی فقرہ کی دوسری تعبیر ہوگی اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ مال حرام یا خراب چیزوں کے دینے کی تحریک کرتا ہے [4] یہ سب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور خدا کا اس خیرات پر وعدہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں بھی اس کی وجہ سے مال پر برکت عطا کرے گا اور آخرت میں بھی مغفرت سے نوازے گا [5]۔

گویا انسان کو جو دل میں اس کے تصورات آتے ہیں ان کے بارے میں پہچان بتائی جا رہی ہے کہ کون شیطان کی طرف سے ہوتے

---

[1] ۔فیه دلالة علیٰ ان ثواب الصدقة من الحلال المکتسب اعظم منه من الحلال الغیر المکتسب وانا کان ذلك لانه یکون اشق علیه (مجمع البیان)

[2] ۔یخوفکم به (جلالین وبلاغی) واوعد مستعمل فی الخیر والشر (صافی) الوعد یصلح بالتقیید للخیر والبشر غیر انه اذا طلق اختص بالخیر (مجمع البیان)

[3] ۔والعرب تسمّی النجیل فاحشا (صافی)

[4] ۔بالفحشاء ای بالمعاصی ترك الطاعات (مجمع)

[5] ۔فالمغفرة اشارة الیٰ منافع الاخرة والفضل اشارة الیٰ ما یحصل فی الدنیا (نیشاپوری)

ہیں، لہٰذا ان پر عمل کرنے سے پرہیز کرو اور کون خدا کی طرف سے ان پر عمل پیرا ہو[1]۔

شیطان کو کہا کہ وہ برائی کی دعوت دیتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ برائی کو خود ضمیر انسانی بعض چیزوں میں محسوس کرتا ہے اور جب ان باتوں کو دل چاہے تو خود سمجھ سکتے ہو کہ یہ شیطان کی تحریک ہے اور یہ بھی کہ وہ تمہارا کتنا بڑا دشمن ہے تو پھر خیرات میں جو تصورات وہ پیدا کرے ان میں تم کیوں آؤ اور خیرات سے ہاتھ کیوں روکو[2]۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۲۶۹

''جسے ہو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا ہوئی اسے بہت بڑی دولت[3] مل گئی اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر عقل والے''۔

فضیلتِ حکمت:

حکمت عقل نظری اور عقل علمی دونوں کے کمال پر حاوی ہے۔ اس لئے اس سے نظر اور عمل دونوں کی صحت حاصل ہوگی[4] اور ایک انسان کی رفعت انسانی انہی دونوں سے وابستہ ہے تو اس سے بڑھ کر دولت کیا ہو سکتی ہے؟

احادیث جو حکمت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں وہ ان دونوں شعبوں کا پتہ دیتی ہیں چنانچہ کافی اور عیاشی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے حکمت کی تفسیر وارد ہوئی ہے: طاعة الله و معرفة الامام ''اللہ کی اطاعت اور امام کی معرفت''۔

دوسری حدیث میں ہے:

معرفة الامام و اجتناب الكبائر التي اوجب الله عليها النار

امام کی معرفت اور ان کبیرہ گناہوں سے بچنا جن پر اللہ نے آتش دوزخ کا مستوجب گردانا ہے۔

تیسری حدیث میں ہے:

الحكمة المعرفة والفقه في الدين فمن فقه منكم فهو حكيم:

حکمت معرفت ہے اور دینی سمجھ، تو جو شخص تم میں سے فہم دینی کا حامل ہو جائے وہ حکیم ہے ایسی ہی اور حدیثیں ہیں۔

''عقل والے'' یعنی جو عقل سے کام لیتے ہیں اور عقل کو ''لُب'' اس لئے کہتے ہیں کہ وہ انسان کا اصل مغز ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ

---

[1] ۔جب یہ خیال آئے کہ خیرات سے گناہ بخشے جاویں گے اور اللہ مجھے یہیں چاہے گا اور دے گا تو جان لے کہ اللہ کی طرف سے آیا (موضح القرآن)

[2] ۔لا يخفى عليكم كونها فحشآء فاعرفوا بهذا عداوته لكم وخبثه وخداعه فيما يعدكم ويخوّفكم به (بلاغی)

[3] ۔بڑی بھلائی (تاج العلماء)

[4] ۔الحكمة تحقيق العلم واتقان العمل (صافی)

انسان ہے وہ بس چھلکا ہے [1]۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

''اور جو کچھ تم خیرات کرو یا منت مانو یقیناً اللہ اسے جانتا ہے اور نہیں ہوں گے ظالمین کے لئے کوئی مددگار۔''

''اللہ اسے جانتا ہے'' یعنی اس کی جزا ضرور ملے گی [2] یہ تو عمل کا روشن رُخ ہے جو خیرات کرنے اور نذر کی وفا کرنے سے متعلق ہے۔ اب دوسرا تاریک پہلو یعنی جو زکوۃ واجب کو روکے یا غلط کاموں میں روپیہ صرف کرے یا غلط نذریں کرے یا صحیح نذروں کو پورا نہ کرے ان سب لوگوں کو ظالمین کے لفظ سے یاد کیا ہے [3]۔

یہ اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتے اور سزا سے بچ نہیں سکتے، اس نہ بچ سکنے کو یوں کہا ہے کہ ان کے کوئی مددگار نہیں ہوں گے۔'' یہ ان کی اس جتھے بندی پر چوٹ ہے جو وہ دنیا میں کیے ہوئے ہیں اور اس زعم میں مبتلا ہیں کہ کوئی بات ہوئی اور پارٹی مدد کے لئے دوڑ پڑی۔ وہاں یہ پارٹی والے سب اپنے اپنے حال میں گرفتار ہوں گے اور کسی اپنے رفیق کو بچانے کے لئے نہ آسکیں گے۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

''اگر تم ظاہر کرو خیرات کو تو یہ بھی اچھا ہے اور اگر اسے پوشیدہ رکھو اور محتاجوں کو دیدو تو وہ بہتر ہے تمہارے لئے اور تمہارے کچھ گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے ہی۔''

خیرات کا خفیہ دینا بہتر اعلانیہ:

''ظاہر کرو'' کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مقصد ہی خیرات کا لوگوں کو دکھانا ہو اسے تو پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ یہ خیرات کے ثواب ہی کو ختم کر دیتا ہے بلکہ ''ظاہر کرو'' سے مطلب یہ ہے کہ خیرات ہوئی تو خوشنودی خدا ہی کے لئے مگر خاص طور پر اسے چھپانے کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اس طرح

---

[1] ۔لانه انفس ما فی الانسان کما ان لبّ الثمرة انفس ما فیها (مجمع البیان)

[2] ۔معناه یجازی علیه (مجمع البیان)

[3] ۔ للظالمین بمنع الزکوٰة والنذور (جلالین) الذین ینفقون فی المعاصی وینذرون فیها ویمنعون الصدقات ولا یوفون بالنذور (صافی) تو بری نذر نہ کرو ناجائز چیزوں کی یا ان کے لیے جیسے بت اور کفر و نفاق کے پیشوا اور بھلی نذر کرو جیسے خدا کی اور پیغمبروں اور اماموں اور دوستانِ خدا کی (تاج العلماء)

دیا گیا کہ سب کو معلوم ہے یہ بھی اچھا ہے یعنی خیرات کا ثواب پھر بھی قائم رہے گا [1] لیکن دوسری صورت زیادہ بہتر ہے۔

شاہ عبدالقادر نے اپنے حاشیہ میں لکھا ہے کہ:

''اگر نیت دکھاوے کی نہ ہو تو خیرات کے لئے یہی بہتر ہے کہ اوروں کو شوق بڑھے اور چھپے بھی بہتر ہے کہ لینے والا نہ شرمادے۔''

اول تو بہتر جو زیادہ اچھے ہونے کا پتہ دیتا ہے اس میں عقلاً یہ ذہن میں آنے والی بات نہیں کہ دو باتیں ہوں اور ہر ایک بہتر ہو بلکہ یقیناً جب ایک چیز بہتر ہوگی تو دوسری اس کے مقابلے میں کمتر ہوگی۔ پھر یہ سیاق قرآنی کے بھی خلاف ہے قرآن کے ساق کلام سے ظاہر ہے یہی ہوتا ہے کہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہے [2] چنانچہ سنتی خیرات میں یہ حکم قطعی طور پر ثابت ہے لیکن واجب زکوۃ کے لئے اظہار افضل ہے تاکہ دوسرے لوگ بھی پیروی کریں اور اس شخص پر ترک واجب کی تہمت عائد نہ ہو سکے جیسا کہ نماز میں بھی سنتی اور واجب میں یہ تفریق ثابت ہے۔

احادیث معصومینؑ میں بھی زکوۃ کے بارے میں یہ تفریق موجود ہے [3] بلکہ ایک حدیث میں تو اس آیت کے دونوں جملوں کو ان دونوں زکوتوں کے فرق ہی پر محمول کیا گیا ہے کہ یہ جو ارشاد ہوا کہ: اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ''اگر ظاہر کرو تو بہت اچھا ہے'' یہ صدقہ واجبہ یعنی زکوۃ مفروضۃ سے متعلق ہے اور دوسرا جزء کہ اِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ''اگر چھپاؤ اور فقیروں کو دیدو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے'' یہ زکوۃ سنتی سے متعلق ہے [4]۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بعض صورتوں میں صدقات کا ظاہر کرنا بہتر آتا ہے اور بعض صورتوں میں مخفی کرنا۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

---

[1] ۔ای فان الصدقة نعم شيئا هي في ذاتها ولا يذهب الا بداء لها بفضلها اذالم يعرض عليها بسببه شئ من الرياء اوا ذى المتصدق عليه (بلاغی)

[2] ۔خير لكم من ابدائها (جلالين)

[3] ۔علی بن ابراهيم باسناده عن الصادقؑ قال الزكوة المفروضة تخرج علانية ــــــ و غير الزكوة ان عه سرّا فهو افضل (مجمع البيان)

[4] ۔في الكافي عن الصادقؑ في قوله تعالىٰ وان تخفوها قال هي سوى الزكوة فان الزكوة علانية غير سر وعنه قال كل ما فرض الله عليك فاعلانه افضل من اسراره وما كان تطوّعا اسراره افضل من اعلانه (صافی)

''آپ پر انہیں ٹھیک راستے پر لگا دینے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ تو اللہ جسے چاہتا ہے ٹھیک راستے پر لگاتا ہے [1]
اور جو تم لوگ مال و دولت خیرات میں دو گے وہ اپنے ہی لئے اور نہیں خیرات کرو گے مگر اللہ کی خوشنودی کے لئے [2]
اور جو مال و دولت خیرات میں دو گے وہ پورا پورا تمہیں ادا کر دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا [3]''۔

ایک ہدایت ہوتی ہے راستہ دکھانے کی صورت میں اور ایک ہاتھ پکڑ کے راستے پر لگانے کی صورت میں رسولؐ کے ذمہ بس پہلا کام ہے اور وہ سب کے لئے عام ہے [4]۔ ہاں اس کے بعد خصوصی سہارا دینا توفیق کی شکل میں وہ خدا کرتا ہے۔ وہ بھی ان کے لئے جنہیں ان کے ذاتی شوق و ذوق کی بناء پر وہ اس کا حق دار پاتا ہے [5] جسے کیا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا: جو ہماری راہ میں کدوکاوش کرتے ہیں انہیں ہم اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں (روم۔۶۹)

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام جبری طور پر ہدایت کرنا نہیں:

اس استحقاق کو یہاں من یشآءُ جسے چاہتا ہے کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے یعنی جیسا کہ پہلے آچکا ہے یہ چاہنا بلاوجہ نہیں ہوتا بلکہ خود انسان کے اختیاری کردار کی بناء پر ہوتا ہے۔

رہ گیا اس کے آگے یعنی جبری طاقت سے منزل تک پہنچا دینا اس کا نام تو حقیقۃً ہے ہی نہیں وہ خدا کے نظام حکمت کے خلاف ہے اس لئے مشیت اس سے متعلق نہیں ہو سکتی وہ وہ ہے جس کے لئے کہا گیا ہے:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا
اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو جتنے روئے زمین پر ہیں سب ہی ایمان لے آتے (یونس۔۹۹)
اور: وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً
اگر اللہ چاہتا تو انہیں ایک قوم بنا دیتا۔ (شوریٰ۔۸)
وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ
اگر اللہ چاہتا تو جو ان کے بعد تھے وہ آپس میں جنگ نہ کرتے جس پر بہ قدر ضرورت وہاں بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔

بار بار ان حقیقتوں پر واضح الفاظ میں تنبیہ کرنے کی اس لئے ضرورت ہے کہ لوگ ان مقامات پر ٹھوکریں بہت کھاتے ہیں مثلاً:

---

[1] ۔تیرے ذمہ پر نہیں ان کا منزل تک پہونچانا بلکہ خداوند پہونچاتا ہے منزل تک (تاج العلماء)

[2] ۔مگر خدا کے منہ سے (تاج العلماء) یہ عام محاورہ ہے کہ مراد اس سے خاطر اور مرضی ہوتی ہے نہ یہ کہ سچ مچ کا مُنہ مراد ہو کہ یہ کفر ہے اس لیے کہ خدا جسم نہیں رکھتا (حواسی تاج العلماء)

[3] ۔تمہارا حق نہ مارا جائے گا (فرمان علی صاحب)

[4] ۔ما علیك الا البلاغ (صافی)

[5] ۔بلطف ممن ان اللطف ینفع فیہ ــــــ فینتہی عما نہی عنہ (صافی) ممّن ھو اھل اللتوفیق (البلاغی)

شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کیا ہے:

"لازم نیست برائے تو اے محمدؐ ہدایت ایشان ولیکن خدا ہدایت می کند ہر کہ امی خواہد۔"

اور شاہ رفیع الدین نے اسی کو اس زمانہ کی اردو میں کہہ دیا ہے کہ:

"نہیں اوپر تیرے ہدایت کرنا ان کا اور لیکن اللہ ہدایت کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔"

تو اس سے بھلا انسان کیا سمجھے جب کہ وہ جانتا ہے کہ رسول کا کام ہدایت کرنا ہے اور کام دوسرا ہے ہی کیا جس کے لئے رسول بھیجے گئے ہوں مگر دوسرے مقامات پر تو شاہ ولی اللہ یا ان کے فرزند شاہ عبدالقادر حاشیہ پر مختصر تشریح کرتے بھی ہیں اور اس محل پر باپ بیٹے صاف کترا جاتے ہیں صرف اس لئے کہ جب اپنا ہی ذہن اس معاملہ میں صاف نہیں ہے تو دوسروں کی تشفی کیا کی جائے؟

اس کے بعد خطاب قرآنی کا رخ خود ان کی طرف ہو گیا جنہیں خیرات دینے کی دعوت دی جاتی تھی کہ تم جیسے یہ سمجھتے ہو کہ تمہیں جو اس کی دعوت دی جاتی ہے وہ کچھ اپنے فائدے کے لئے ہے۔ ایسا نہیں ہے تم دو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے اور کہیں جائے گا نہیں بلکہ خدا اسے پورا پورا تمہیں بے باق کر دے گا۔ یعنی اس کا شایان شان ثواب تمہیں مل جائے گا اور یہ نہیں ہوگا کہ تمہارے ساتھ ذرّہ بھر نا انصافی ہو

اب ذہن میں بس یہ ایک جستجو باقی رہتی ہے کہ خیرات کے ذکر میں آخر یہ ہدایت کے بحث کیوں چھڑ گئی؟ س کا جواب شان نزول سے ملتا ہے جو کافی اہمیت رکھتی ہے۔

یہ سوال آج بھی ہے اور ہمیشہ رہا ہے کہ غیر مذہب کا آدمی جو ہم سے سوال کرتا ہے اسے دینا از روئے مذہب کیسا ہے؟ بعض لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر کسی غیر مومن یا غیر مسلم کو ہم نے دیا تو وہ کھاری کنویں میں گیا یہ سوال زمانہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پیدا ہوا اور اسی کے جواب میں یہ آیت اتری [1] اور خالق نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں خیرات دیتے وقت یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ وہ مسلمان ہے یا کافر تمہیں تو بس یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک انسان ہے اور وہ تمہاری امداد کا محتاج ہے لہٰذا تم امداد کرو اور یہ حقیقت میں خود اپنی مدد ہے کہ تمہیں اس کا اجر ملے گا [2] اور وہ کہیں جائے گا نہیں بلکہ خدا اسے پورا پورا تمہیں بے باق کر دے گا اور یہ نہ ہوگا کہ ذرّہ بھر بھی تمہارے ساتھ نا انصافی ہو۔

یہ ہے وہ وسعت نظر جو دین حق اپنے پرستاروں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ دین کی روح سے بے بہرہ ہیں جو اس وسعت نظر کے حامل نہیں ہیں۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

---

[1] ۔کان المسلمون یمتنعون عن الصدقة علیٰ غیر اھل دینھم فانزل اللہ تعالیٰ ھٰذہ الآیة (مجمع البیان)

[2] ۔فلا یضرّکم کفرھم (نیشاپوری)

''ان تنگ دست افراد کا حق ہے [1] جو اللہ کی راہ میں بے چارہ و تدبیر ہو گئے ہیں [2] اس طرح کہ روئے زمین پر سفر نہیں کر سکتے [3] ناواقف انہیں رکھ رکھاؤ کی وجہ سے [4] مال دار سمجھے گا تم انہیں ان کے قیافہ سے پہچان سکتے ہو [5] وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے [6] اور جو کچھ مال و دولت تم خرچ کرو تو بلا شبہ اللہ اس کا جاننے والا ہے۔''

فقراء میں ترجیح کا معیار:

مستحقین زکوٰۃ کی عام طور پر جو فہرست ہے وہ تو دوسری جگہ بیان کر دی گئی ہے۔ یہاں گذشتہ آیات کے نازل ہونے کے موقع پر جن لوگوں کی امداد کی طرف متوجہ کیا جا رہا تھا ان کے خصوصی اوصاف کا تذکرہ ہے [7]۔

بے شک جن اوصاف کو یہاں ان اشخاص کے لئے وجہ استحقاق کے طور پر بیان کیا گیا ہے ایسے اوصاف کسی اور زمانہ میں جن فقراء میں پائے جاتے ہوں ان کو عام فقراء پر ترجیح ہوگی جو ان اوصاف کے حامل نہیں ہیں مثلاً ایک شخص ہے جو سفر کر کے کسب معاش کر سکتا ہے اس پر اسے ترجیح ہوگی جو بے دست و پا ہے کہیں جا بھی نہیں سکتا۔

اسی طرح جو خودداری کی وجہ سے اظہار فقر و فاقہ کرنا عار سمجھتا ہے اسے ترجیح ہوگی اس پر جو ہر ایک سے اپنا حال کہہ کے اظہار استحقاق کر سکتا ہے۔

جہاں تک میں محسوس کرتا ہوں یہ آیت گذشتہ آیت کے مضمون کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتی۔ غالباً جمع قرآن کے وقت یہ دیکھ کر کہ اس میں بھی انفاق یعنی خیرات کا ذکر ہے اور اس میں بھی انفاق ہی کا ذکر ملتا ہے ان دونوں آیتوں کو اس طرح جوڑ دیا گیا ہے لیکن معنوی تسلسل ان دونوں آیتوں میں کوئی نہیں ہے۔

بہت ممکن ہے سلسلہ تنزیل کے اعتبار سے یہ آیت اس آیت کے قبل کی دونوں آیتوں سے متعلق ہو کہ

(۱) وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ (بقرۃ)

(۲) اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاۗءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ (بقرۃ)

---

[1] ۔تقدیرہ النفقۃ للفقراء (مجمع البیان) اعمدوا للفقراء او صدقاتکم للفقراء (صافی) واما تعلیق الجار ولمجرور بکلمۃ وما تنفقوا فی الاول فلا یصح لان الانفاق یعدی یعلی لا بالکرم (بلاغی)

[2] ۔احصرھم الجھاد (صافی) رُکے پڑے ہیں راہ خدا میں (تاج العلماء)

[3] ۔ای الزموا انفسھم الجھاد فی سبیل اللہ فلا یقع منھم للتصرف لغیرہ ولیس معناہ انھم لا یقدرون علیہ (مجمع)

[4] ۔کم سختی کی وجہ سے (تاج العلماء) ای امتناع من السوال والتجمل فی اللباس والسترلما ھم فیہ من الفقر ووسوء الحال (مجمع)

[5] ۔جنہیں تاڑتا ہے تو ان کی پیشانیوں سے (تاج العلماء)

[6] ۔ معناہ انھم لا یسئلون الناس اصلا ولیس معناہ انھم یسئلون من غیر الحاف (مجمع)

[7] ۔قال ابو جعفر علیہ السلام نزلت الآیۃ فی اصحاب الصفّۃ (مجمع البیان)

اور پھر (۳) للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ الخ اور بیچ میں جو غیر مسلم کی خیرات کے متعلق آیت ہے وہ کسی اور موقع کی ہو۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

''وہ جو اپنے اموال رات اور دن میں خفیہ اور اعلانیہ خیرات میں دیتے ہیں ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے پروردگار کے یہاں اور انہیں کوئی کھٹکا نہیں ہوگا اور نہ افسوس ہوگا۔''

جناب ابن عباسؓ اور دیگر محدثین نے بیان کیا ہے اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے ارشادات سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ آیت حضرت علی ابن طالبؑ کی شان میں نازل ہوئی کہ آپ نے ان چاروں طریقوں سے راہ خدا میں خیرات دی۔ اسی کی مدح قرآن مجید میں ان الفاظ سے ہوئی ہے [۱]۔

علامہ بلاغی نے اس سلسلہ میں شیعہ وسنی طرق سے کثیر التعداد روایات کی طرف تفصیلی اشارہ فرمایا ہے ان میں سے بعض روایات کو علامہ نیشاپوری نے بھی غرائب القرآن میں درج کیا ہے مگر اس کے مفہوم کی وسعت بقدر مرتبہ ہر اس شخص کو اپنے دامن میں لے سکتی ہے جو ان طریقوں سے راہ خدا میں خیرات کرے [۲]۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

''وہ کہ جو سود [۳] کھاتے ہیں نہیں اٹھیں گے مگر جس طرح اٹھے وہ کہ جسے شیطان نے اپنے آسیب سے بدحواس بنا دیا ہو [۴] یہ اس لئے کہ وہ اس کے قائل ہیں کہ تجارت سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو

---

[۱] ۔قال ابن عباس رضی اللہ عنہ نزلت الأیة فی علی علیہ السلام وھو المروی عن ابی عبداللہ علیہ السلام وابی جعفر علیہ السلام (مجمع البیان)

[۲] ۔حکمه سائر فی کل من فعل مثل فعله وله فضل السّبق الی ذلك (مجمع البیان) والأیة اذا نزلت فی شقّ فهی منزلة فی کل ما یجری فیه (صافی)

[۳] ۔ بیاز (تاج العلماء)

[۴] ۔ جسے بولا دیا ہو شیطان نے اپنے چھو جانے کی وجہ سے (تاج العلماء)

حرام کیا ہے تو جس کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے فہمائش آئی اور وہ باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو پھر ایسا کرے تو یہ جہنم والے ہیں کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

سود خواروں کی مذمت:

یہ سود خواروں کے عذاب کا ذکر ہے اور سود کے ساتھ کھانے کا لفظ ہماری معلومہ تمام زبانوں میں بطور محاورہ ہوتی ہے جس کا مطلب ہوتا ہے ''سود لینا'' اب خواہ لے کر اسے کھایا جائے یا کوئی اور تصرف کیا جائے یا جمع کر دیا جائے [1]۔

سود کی حرمت:

''وہ نہیں اٹھیں گے مگر اس طرح'' یعنی قبروں سے جو اٹھیں گے وہ اس طرح اٹھیں گے [2] قیامت میں اس طرح کھڑے ہوں گے [3]۔

ان کا قول یہ تھا کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے یعنی نفع اس میں بھی لیا جاتا ہے لہٰذا دونوں کا حکم یکساں ہونا چاہے حالانکہ اصل میں انہیں کہنا یہ ہے کہ سود بھی بیع کی طرح ہے یعنی بے ضرر چیز ہے مگر اس بات میں زور پیدا کرنے کے لئے ادھر سے کہا گیا ہے کہ بیع بھی سود ہی کی طرح کی چیز ہے [4]۔

یہ ان کی عقل ناقص کا فیصلہ تھا مگر خالق نے اس کی رد کی ہے وہ دونوں یکساں کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ ان میں فرق تو اسی سے ظاہر ہے کہ بیع کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے اور ربو کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ عقل کے فیصلہ کے مقابلہ میں شرع کو پیش کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی عقل کے نقصان کا اظہار ہے کہ وہ مزید غور کریں تو انہیں دونوں میں فرق خود سمجھ میں آ جائے۔

''جو کچھ پہلے ہو چکا ہے'' اس کے یہ معنی تو ظاہری ہیں کہ اسلام میں حرمت ربا کا حکم آنے سے پہلے جو اس نے سود لیا ہے وہ اس کا ہے مگر اس کے ساتھ احادیث معصومین علیہم السلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکم شریعت وارد ہونے کے بعد بھی اگر کوئی لاعلمی کی وجہ سے سود لیتا ہے مگر حکم شرع معلوم ہونے کے بعد اس سے تائب ہو جاتا ہے تو وہ بھی اس میں داخل ہے [5]۔

''وہ اس کے لئے ہے'' اس کا مطلب پہلی نظر میں تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نہ اس پر کوئی گناہ ہوگا اور نہ واپس لیا جائے گا [6] مگر بعد کا فقرہ: وامرہ الی اللہ ''اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے'' یہ بتاتا ہے کہ پہلے کا تعلق صرف اس مال سے ہے وہ وصول کر چکا ہے مگر اس سے گزشتہ فعل کا

---

[1] ۔الوعید فی الآیۃ متوجہ الی کل من ارتبی وان لم یاکلہ (مجمع البیان) الّا انہ غیّر عن الشئی بمعظم مقاصدہ (نیشاپوری)

[2] ۔لا یقومون اذا بعثوا من قبورھم (صافی)

[3] ۔لا یقومون یوم القیامۃ (مجمع البیان) وھو ظاھر للصّام (بلاغی)

[4] ۔ھٰذا من عکس التشبیہ مبالغۃ (جلالین) قاسوا احدھما بالآخر (صافی)

[5] ۔فی التھذیب عن الباقر علیہ السلام والعیاشی عنھما قال الموعظۃ التوبۃ وفی الکافی والفقیہ عن الصادق علیہ السلام کلّ ما اکلہ الناس بجھالۃ ثم تابوا فانہ یقبل منھم وفی معناہ اخبار کثیرۃ (صافی)

[6] ۔لا یؤاخذ بما مضی منہ ولا یستردّ منہ (صافی)

مواخذہ ہونا نہ ہونا خالق کے اختیار سے وابستہ ہے چاہے گا وہ سزا دے گا اور چاہے گا معاف کر دے گا۔

اکثر علماء ہمارے اس خیال سے کہ لہ ماسلف کا تعلق اس مال کے ساتھ ہے جو پہلے لیا گیا ہے متفق ہیں مگر علامہ بلاغی کو اس سے شدید اختلاف ہے اوو ہ فرماتے ہیں کہ لہ ماسلف کا تعلق اس عمل سے ہے کہ وہ معاف ہو جائے گا نہ یہ کہ وہ مال جو وہ لے چکا ہے اس کے لئے حلال ہے۔اس پر ممدوح نے کافی بسیط بحث کی ہے جو ہمارے نزدیک الفاظ قرآنی کے خلاف ہے۔اور اگر فلہ ماسلف کے معنی یہ ہو گئے جیسا کہ ممدوح نے تحریر فرمایا ہے: ای ان اللہ یتوب علیہ و یغفر لہ (یعنی اس کی توبہ قبول کرے گا اور اسے معاف کر دے گا'' تو پھر یہ فقرہ بعد کا ہے بے جوڑ معلوم ہوتا ہے کہ و امرہ الی اللہ اور معاملہ اس کا اللہ کے ہاتھ میں ہے جب اعلان معافی کا ہو گیا تو پھر اس کہنے کا کیا مطلب؟

آخر میں جو سود کی سزا کا بیان ہے وہ اس بناء پر ہے کہ اگر سود کو حلال سمجھتا ہے یا وجود یہ کہ حکم الٰہی کا علم اسے ہو گیا تو وہ حقیقۃ دائرہ اسلام سے خارج اور کفار کے زمرہ میں داخل ہے جیسا کہ تمام ضروریات دین کا حکم ہے منکران کا کافر ہے [1]۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝

''ملیا میٹ کر دیتا ہے اللہ سود کو اور بڑھاتا ہے خیر خیرات کو اور جتنے بہت ناشکرے ہیں [2] گنہ گار اللہ انہیں دوست نہیں رکھتا۔''

سود اسی لئے تو انسان لیتا ہے کہ اس کی دولت میں اضافہ ہو خالق کریم انسان کی اس توقع کو غلط قرار دیتے ہوئے اطلاع دیتا ہے کہ سود کے اموال میں برکت نہیں ہے [3]۔

اور راہ خدا میں جو خرچ کرو گے تو ظاہر میں تو اس سے مال میں کمی ہو گی خداوند عالم اس کی وجہ سے مال میں ایسی برکت عطا فرمائے گا کہ اس میں اور فراوانی ہو گی۔

سود خوار کی انجام میں بربادی:

اور اگر دنیا میں ایسا نہ بھی ہو تو اس کا اثر قیامت میں تو یقیناً رونما ہو گا کہ اس سود خوار کو وہاں ایسی بربادی ہو گی کہ اس دنیا کے تمام منافع اس کے لئے وبال جان ہو جائیں گے اور خیرات کا ثواب اتنا زیادہ ملے گا جس کے مقابلہ میں یہ اتنی مالی قربانی کوئی ناگوار چیز نہیں رہ سکتی چنانچہ کافی اور من لا یحضر میں ہے کہ کسی نے امام جعفر صادقؑ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا اور کہا ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ بعض سود خوار دنیا میں بڑے دولت مند ہو جاتے ہیں اور ان کی دولت آخرت تک ضائع نہیں ہوتی۔آپ نے فرمایا کہ کون مٹنا اس سے زیادہ ہو سکتا ہے کہ سود کی ایک

---

[1] ۔ومن عاد الیٰ تحلیل الربوا والاستخفاف بہ بعد ان تبین لہ تحریمۃ فی الفقیہ والعیون عن الرضاؑ ھی کثیرۃ بعد البیان قال والاستخفاف بذلک دخول فی الکفر (صافی) ومن عاد الی تعاطی الربوا متحلّلا لہ. اوالی الاعتراض علی الشریعۃ (البلاغی)

[2] ۔ الاظہران المراد ھنا ھو کفر النعمۃ وعدم الاکتفاء بما انعم اللہ علیہ من الحلال حتی یقتحم ما حرم اللہ علیہ من الربا (البلاغی)

[3] ۔یمحق اللہ الربوا ینذھب برکۃ ویھلک المال الذی یدخل فیہ (صافی)

معمولی رقم ملنے سے اس کا دین برباد ہو جاتا ہے اور آخرت تباہ ہو جاتی ہے [1]۔

پھر دنیا میں بھی دولت کا زوال چاہے نہ ہو مگر سود خوار کے لئے اور برے نتائج ہیں جو ایک حدیث نبوی میں اس طرح بیان ہوئے ہیں:

الربوا و ان كثر الى قل و ذلك لدعاء الناس عليه و بعضهم اياه ولسقوط عدالة و شهرته بالفسق و العدوان ور بما يطمع الظلمة فى ماله علما منهم ان المال فى الحقيقة ليس له (نیشاپوری)

سود چاہے بہت زیادہ ہو مگر نتیجتاً اس سے بڑی کمی پیدا ہوتی ہے وہ اس لئے کہ لوگ اس کے لئے بددعا کرتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں اور عدالت اس کی مجروح ہو جاتی ہے اور وہ بداعمالی کے ساتھ مشہور ہو جاتا ہے اور اکثر دوسرے ظالم افراد اس کے مال کو ہتھیانے کا منصوبہ بناتے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ وہ مال حقیقت میں اس کا نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

''بلاشبہ وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور اچھے اعمال کیے اور نماز ادا کی اور زکوۃ دی ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے پروردگار کے یہاں اور انہیں کوئی کھٹکا نہیں نہ انہیں کوئی افسوس ہوگا۔''

''اچھے اعمال'' میں نماز اور زکوۃ دونوں داخل ہیں۔ مگر اس اجمال کے بعد یہ تفصیل ان دونوں شعبوں کی اہمیت کے لحاظ سے ہے [2] جیسے مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے پیغمبروں کا دشمن ہو'' کہہ دینے کے بعد پھر'' وہ جبرائیل و میکائیل کہنا جو صرف ان دونوں فرشتوں کی اہمیت کے اظہار کے لئے ہے اور نہ ظاہر ہے کہ فرشتوں میں یہ بھی داخل ہیں۔

ترتب اجر وثواب باعتبار اعمال:

اجر کا ذکر جہاں جہاں قرآن مجید میں ہے اکثر جگہ اسی طرح اضافت کے ساتھ ہے کہ لهم اجرهم ''ان کے لئے ان کا اجر ہے'' اس اضافت میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ ثواب آخرت ایک منضبط و متعین شکل میں نہیں ہے کہ ہر صاحب ایمان بس دائرہ ایمان میں داخل ہوتے ہی اس کا مستحق ہو جائے بلکہ یہ ان اعمال خیر کے تناسب سے ہے جو ہر شخص انجام دے گا لہٰذا جس کا جیسا عمل ہو اسی لحاظ سے اسے اجر ملے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان شرط ترتب اجر ہے مگر معیار میزان اجر کے اعمال صالحہ ہی ہیں۔

اس مقام پر ایک اور نکتہ ہے وہ یہ کہ اجر کے ساتھ عند ربهم کہا جاتا ہے کہ ''ان کے پروردگار کے یہاں'' ان کا اجر ہے۔ یہ نہیں کہ علی ربهم اجرهم یعنی ''ان کے پروردگار کے ذمہ ان کا اجر ہے'' کیوں کہ پہلے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اجر وثواب موجود ہے خالق کے پاس یہ بطور امانت جس کے لئے بس تمہارے اس کے پاس پہنچنے کی دیر ہے۔ لیکن یہ الفاظ کہ اس کے ذمہ تمہارا اجر ہے اس مفہوم کا پتہ نہ دیتے

---

[1] ۔قيل للصّادق عليه السلام وقد يربى الرجل فيكثر ماله فقال يمحق الله دينه وان كثر ماله (مجمع البیان)

[2] ۔النصّ عليهما بالذكر تعظيما لشانهما وان كانا من نوع الاعمال الصّالحة (البلاغی)

کیوں کہ ذمہ پر تو اس کے پاس بھی ہوتا ہے جو قرض لے اور ابھی ادائی پر قادر نہ ہو۔ خالق کے یہاں کا ثواب یہ نوعیت نہیں رکھتا [1]۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

''اے ایمان لانے والو! اللہ کے غضب سے بچو اور جو کچھ سود رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو [2] اگر تم ایمان والے ہو۔''

''ایمان لانے والو!'' کہہ کے تخاطب تو ان سب ہی سے ہوتا ہے جنہوں نے ایمان کا اقرار کیا یعنی مسلمان ہوئے۔ اب ان میں سے کون واقعی مومن ہے اور کون نہیں یہ اس کا عمل بتائے گا۔ اس لئے ''ایمان لانے والو'' کہہ کے مخاطب ہونے کے باوجود آخر میں کہا ہے اگر مومن ہو یعنی اگر تمہارا دعویٰ ایمان کا سچا ہے اور تم واقعی مومن ہو [3] تو تمہارا کردار بھی ویسا ہی ہونا چاہیے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو سود تمہارا لوگوں کے ذمہ رہ گیا ہے اس کا مطالبہ ترک کر دو اس لئے کہ وہ جائز مطالبہ نہیں ہے [4]۔

بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت خالد بن الولید کے بارے میں نازل ہوئی تھی جب خالد نے اسلام لانے کے بعد اپنے باپ ولید بن مغیرہ کے سودی قرضوں کا مطالبہ شروع کیا [5] اس کے علاوہ بھی بعض دوسرے لوگوں کے نام لئے گئے ہیں کہ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی جس کے معنی آیت کے سمجھنے میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾

''اب اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہیں خبردار رہنا چاہیے [6] اللہ اور رسولؐ کی جنگ سے اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں اپنے اصل مال کا استحقاق ہوگا۔ اس طرح نہ تم کسی پر ظلم کرو گے اور نہ تم پر کوئی ظلم ہوگا۔''

العظمۃ للہ! یہ اعلان جنگ ان سے ہے جو اسلام قبول کر چکے ہیں [7] اور یہ ہے حقوق الناس کی اہمیت کہ ان کے نظر انداز کرنے سے اللہ بندہ کے مقابلہ میں برسر جنگ ہو جاتا ہے۔

''نہ تم کسی پر ظلم کرو گے اور نہ تم پر کوئی ظلم ہوگا یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ اب تمہارا اصل مال بھی نہ ملے تو یہ تم پر ظلم ہوتا اور اب چڑھے ہوئے

---

[1] ۔الاول یجری مجری ما اذا باع بالنقد (نیشاپوری)

[2] ۔جانے ہی دو اس بیاز کو کہ جو باقی رہ گیا (تاج العلماء)

[3] ۔ان کنتم مؤمنین صادقین فی ایمانکم (جلالین) ان کنتم مومنین بقلوبکم فان دلیلہ امثال ما امرتم بہ (صافی) مومنین علیٰ حقیقۃ الایمان (البلاغی)

[4] ۔اترکوا بقایا ما شرطتم علی الناس من الربوا (صافی) یعنی آگے جو سود لیا وہ لیا اب اگلا چڑھا ہوا نہ مانگو (حواشی تاج العلماء)

[5] ۔روی عن ابی جعفر الباقر علیہ السلام (مجمع البیان)

[6] ۔کان دھر کے سن لو (تاج العلماء) فاعلموا بہا من اذن بالشئی اذا علم بہ (صافی) کانہ ماخوذ من العلم بواسطۃ السمع بالاذن (بلاغی)

[7] ۔لانہ خطاب مع قوم تقدم ذکرھم وماھم الا المخاطبون بقولہ یا ایھا الذین اٰمنوا (نیشاپوری)

سود کا تم مطالبہ کرو تو یہ تمہارا ظلم ہے۔ عادل شریعت نہ اس کی روادار ہے نہ اس کی [1]۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

''اور اگر تنگ دست آدمی ہو [2] تو مہلت دینا ہوگی [3] خوش حالی تک اور اگر خیرات کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔''

یعنی جو تمہارا مقروض ہے وہ اگر تنگ دست ہے سر دست نہیں دے سکتا تو اصل مال کے مطالبہ میں بھی سختی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس مہلت دینا چاہیئے اس وقت تک کہ اسے کشائش ہو وار اگر خیرات کرو یعنی قرضہ معاف ہی کر دو تو بہتر ہے [4] کشائش میں یہ بھی ہے کہ خود اس کے پاس پیشہ ہو اور یہ بھی ہے کہ اس صورت میں کہ جب حکومت شرعیہ قائم ہو اس کی اطلاع حاکم شرع تک پہنچے اور وہ بیت المال سے زکوۃ کی جو مد قرض داروں کے لئے ہے اس سے اس قرضہ کو ادا کر دیں بشرطیکہ وہ قرضہ جائز مصرف کے سلسلہ میں ہو جس کی احادیث اہل بیتؑ میں تصریح ہے [5]۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۫ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

''اور بچاؤ کی فکر کرو اس دن سے جس میں اللہ کی طرف پلٹائے جاؤ گے پھر ہر ایک نے جو کچھ کمایا ہے وہ اسے پورا پورا پہنچا دیا جائے گا اور ان کی حق تلفی نہیں ہوگی۔''

''اس دن سے بچاؤ کی فکر کرو'' یعنی اس دن کے اُن خطرات سے جو بد اعمال لوگوں کو درپیش ہوں گے۔ اور وہ بچاؤ کی فکر یہی ہے کہ انسان حسنِ عمل کا پابند رہے [6]۔

''اس دن ہر ایک نے جو کمایا ہے وہ اسے پورا پورا پہنچا دیا جائے گا'' براہ راست تو انسان جو کماتا ہے یعنی جو ذخیرہ فراہم کرتا ہے وہ اعمال کا ہے اس صورت میں ''وہ پورا پہنچا دیا جائے گا'' کے معنی یہ ہیں کہ اس کی جزا یا سزا اسے پہنچا دی جائے گی اور بالواسطہ اس جزا و سزا کو خود

---

[1] ۔لا تظلمون باخذ الزیادۃ علی راس المال ولا تظلمون بانقصان من راس المال (مجمع البیان)

[2] ۔کان ھی التی تسمیٰ تامّۃ بمعنی وجد الشئی (نیشاپوری) ان وقع فی غرمائکم ذو اعسار (صافی)

[3] ۔ای فالذی تعاملون بہ نظرۃ الی میسرۃ (مجمع) والتقدیر فالحکم او فالامر نظرۃ (نیشاپوری)

[4] ۔تصدقوا علیہ بمالکم علیہ (صافی) اگر خیرات میں وہ فرض اسی کو دے ڈالو تو بہتر ہے (تاج العلماء)

[5] ۔من المیسرۃ ان یصل خیرہ الی الامام فیضی عنہ من سھم الغارمین اذا کان انفق الذین بالمعروف کما اسند فی الکافی عن الرضاؑ وارسلہ فی مجمع البیان عن الباقرؑ (بلاغی)

[6] ۔المراد اتقاء ما یحدث فیہ من الشدائد والاھوال قاتقاء ذلک لا یمکن الا بالاجتناب المعاصی (نیشاپوری)

اپنے اعمال کے ذریعہ سے انسان اپنے لئے کماتا ہے تو وہ روز قیامت اسے پوری پہنچ جائے گی۔ اس میں ذرہ بھر کمی نہیں ہوگی [1]۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْـَٔـــُٔوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۭ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

”اے ایمان لانے والو! جب کسی مقررہ مدت کے لئے آپس میں قرض کا لین دین کرو [2] تو اسے تحریر میں لے آیا کرو اور چاہیئے کہ کوئی لکھنے والا تمہارے درمیان منصفانہ شرائط کی تحریر لکھے اور کسی کاتب کو جیسے کہ اللہ نے علم کی دولت اسے عنایت کی ہے [3] لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے لہٰذا چاہیے کہ وہ لکھ دے اور جس کے اوپر قرضہ ہے حق

---

[1] ۔قیل فیه وجهان احدهما توفی جزاء ما کسبت من الاعمال والثانی توفی ما کسبت من الثواب والعقاب (مجمع البیان) توفیته باعتبار توفیة جزائه من ثواب او عقاب (البلاغی)

[2] ۔ای تعاملتم وداین بعضکم بعضا (مجمع البیان)

[3] ۔مثل ما علمه الله من کتبه الوثائق (صافی) جیسا کہ خدا نے اسے سکھایا ہے (تاج العلماء) ولا یأب ان ینفع الناس بکتابه کما تفعه الله بتعلیمه (صافی)

عائد ہو رہا ہے اسے چاہیے کہ مضمون تحریر لکھوا دے [1] اور اپنے پروردگار کا خوف دل میں رکھے اور اس میں سے [2] کچھ کم نہ کرے۔ اب اگر وہ شخص جس پر حق عائد ہو رہا ہے کم عقل ہو یا کمزور یا یہ کہ وہ خود نہیں لکھوا سکتا تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے اور اپنی جماعت کے مردوں میں سے دو گواہوں کی گواہی کرا لو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے جو تمہاری نظر میں درست ہوں [3] تاکہ ان دونوں میں سے ایک اگر بھولے تو ان میں سے ایک دوسرے کو یاد دلا دے اور گواہوں کو جب بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں اور چھوٹا یا بڑا کوئی بھی معاملہ ہو جس میں کوئی میعاد مقرر ہو اس کے لکھنے سے اکتاؤ نہیں یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی صورت ہے اور گواہی کے لئے زیادہ ٹھیک انتظام ہے اور اس کا زیادہ سامان ہے کہ شک وشبہ میں نہ پڑو [4] سوا اس صورت کے کہ کوئی نقد انقد خرید وفروخت ہو [5] جسے تم اپنے درمیان وقتاً فوقتاً کرتے ہو تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں کہ اسے نہ لکھو اور جب کوئی خرید وفروخت کرو تو گواہ کر لو اور کاتب یا گواہ کو کوئی نقصان پہنچایا جانا نہ چاہیے اور اگر تم نے ایسا کیا تو وہ تمہارا نافرمانی کرنا ہوگا اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔"

معاملات باہمی کے متعلق احکام:

قرآن مجید خالق کا کلام ہے۔ خالق کی حیثیت فقط حاکم کی تو نہیں بلکہ حقیقی مُربی کی حیثیت ہے۔ اس لئے اس کی طرف کے احکام سب قانونی پابندیوں کی حیثیت سے نہیں ہوا کرتے بلکہ حکیمانہ فہمائشوں کے طریقہ پر بھی ہوتے ہیں یہ کبھی انداز کلام سے اور کبھی دوسرے دلائل سے پتہ چلتا ہے کہ ان احکام کی حیثیت کیا ہے۔ چنانچہ یہاں پر جو احکام ہیں وہ زیادہ تر ایسی ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان احکام کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کی مخالفت سے بس نقصان کا اندیشہ ہے لیکن گناہ کوئی بھی نہیں۔

حاکمانہ اور حکیمانہ دو قسم کے احکام:

مثلاً ان احکام میں پہلا ہی یہ حکم ہے کہ اگر کوئی قرضہ کی لین دین کرو تو اسے لکھ لو۔ اگر یہ حاکمانہ حکم ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر تحریری قرض کی معاملت باطل ہوتی اور ترک تحریر پر انسان گناہ گار ہوتا مگر یہاں ایسا نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا قرضہ آدمی آپس کے اعتبار پر دے دے یا لے لے کچھ لکھا پڑھی نہ کرے تو باوجود یکہ اس حکم قرآنی کی مخالفت ہے پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ معاملت باطل یا ناجائز ہے۔ بے

---

[1] ۔ٹھیک ٹھیک مطلب لکھا جائے (تاج العلماء)

[2] ۔من الحق او ممّا اعلی علیه (صافی)

[3] ۔یعنی ممّن ترضون دینه وامانته وصلاحه وعفّة وتیقظه فیما یشهد به (صافی)

[4] ۔اقرب ان لا تشکوّا (صافی)

[5] ۔حالّة یدا بید (مجمع البیان)

شک نقصان کا اندیشہ ضرور ہے [1]۔ اگر بعد میں آپس میں جھگڑا ہو گیا اور محکمہ عدالت میں بات پہنچی تو بہت ممکن ہے وہاں ثبوت بہم نہ پہنچے اس طرح وہ قرضہ سوخت ہو جائے اور انسان کو اس حکم پر عمل نہ کرے سے اتنا بڑا نقصان اٹھانا پڑ جائے۔ یہ اس وقت نہ ہوتا جب تحریر ہوتی اور گواہیاں ہوتیں جس کا قرآن نے حکم دیا تھا۔

ان احکام میں بعض ایسے ہیں کہ موجودہ دور میں ایسا معلوم ہوگا کہ یہ تو کوئی خاص کہنے کی بات نہیں مگر یہ ہم اپنے اس وقت کے معیار تمدن اور سطح ذہنی کے لحاظ سے کہتے ہیں۔ اس وقت کے معاشرہ پر غور کیجئے جب عوام زیادہ تر لکھنے پڑھنے سے بے بہرہ تھے۔ اب بھی دیہاتوں میں دیکھئے یا بے چاری ان پڑھ عورتوں کے یہاں دیکھئے ہوسکتا ہے کہ صاحب معاملہ لکھنے کو کچھ کہے اور کاتب اپنے مفاد سے اس میں کچھ گھٹا بڑھا دے۔ اس کے علاوہ دوسری صورت یہ ہے کہ کاتب صاحب ناز نخرے کریں کہ میں تو نہیں لکھتا تو اس کے لئے کہا جا رہا ہے کہ یہ کتابت کا علم حاصل ہونا بھی تو اللہ کی ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کی قدر یہی ہے کہ دوسروں کے کام میں صرف ہو لہٰذا اسے لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ بے شک یہ بھی ایک نصیحت ہی ہے کوئی حکم لزومی نہیں ہے کہ اس پر لکھنا واجب ہی ہوا اور انکار حرام ہو [2]۔

مگر یہ جو ہدایت ہے کہ وہ اسی طرح لکھے جس طرح اسے بتایا جا رہا ہے یہ بس اخلاقی ہدایت ہی نہیں ہے بلکہ یہ دوسرے ادلّہ کے ماتحت حاکمانہ پابندی ہے کہ اسے ایسا جائز نہیں ہوگا کیوں کہ یہ تو خیانت اور کسی ایک کے ساتھ ظلم ہے لہٰذا اس سے پرہیز حکماً واجب ہے۔

دستاویز کے مضمون کو وہ بولے جس پر حق عائد ہو رہا ہے یعنی جو قرض لے رہا ہے [3] اب یہ پھر حکیمانہ ہدایتیں شروع ہو گئیں۔ وہ بولے اس لئے کہ دستاویز سے پابند تو وہی بنایا جا رہا ہے۔ پھر یہ کہ گواہ زبان سے اس کا اقرار سن لیں گے تو انہیں گواہی دینے میں آسانی ہوگی۔

اب وہ اگر اس سے قاصر ہے۔ یہاں قرآن نے تین الفاظ صرف کی ہیں۔ ۱۔ سفیہ، ۲۔ ضعیف اور ۳۔ وہ کہ جو خود مضمون بول کر نہ لکھوا سکے۔ یہ اس لئے ہے کہ یا تو اس شخص میں فطری یا عارضی بہرحال قدرتی مجبوری کوئی نہیں ہے مگر اپنی حماقت سے وہ ایسا ہے کہ مال کے بارے میں اس کی سوجھ بوجھ کچھ نہیں ہے اور یا وہ قدرۃً مجبور ہے۔ اب یہ مجبوری یا تو یہ ہے کہ اس میں عقل و ہوش نہیں ہے جیسے صغیر یا سٹھیایا ہوا بوڑھا اور یا سمجھ بوجھ کی کمی نہیں، ہوش و حواس کا فقدان نہیں مگر لکھوا سے وہ معذور ہے جسمانی کمزوری سے کہ وہ بول نہیں سکتا یا اس لئے نہیں لکھوا سکتا کہ وہ زبان سے واقف نہیں ہے وغیرہ وغیرہ [4]۔

گواہوں میں پہلے تو ''اپنی جماعت کے مردوں سے'' کہہ کر اسلام کو معتبر قرار دیا ہے اور پھر آخر میں یہ کہا کہ ''ان گواہوں میں سے جو

---

[1] ۔ یہ پہلی شرط ہے، احتیاط کے لیے نہ کہ وجوب شرعی کے طور پر (حواشی تاج العلماء)

[2] ۔ النہی ھنا للکراھۃ (البلاغی)

[3] ۔ یعنی المدیون یقر علیٰ نفسہ بلسانہ لیعلم ما علیہ (مجمع البیان)

[4] ۔ سفیھا مبذّرا ____ او ضعیفا لصغرا و کبرا ولا یستطیع ____ لحباس او جھل باللغۃ ونحو ذلك (جلالین) فی التھذیب عن الصّادق علیہ السلام السفیہ الذی یشتر الدرھم باضعافہ والضعیف الابلہ (صافی) مثلاً ستہرا بہترا اور سٹھیایا ہوا ہو یا گونگا تو تلا یا قیدی ہو کہ لکھنے والے کے پاس نہ آ سکے (تاج العلماء)

تمہاری نظر میں درست ہوں'' اس سے ان کے وصف وثاقت وعدالت کی طرف اشارہ ہے [1]۔

''ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کا حکم دیتے ہوئے اس کی جو حکمت بتائی ہے کہ اگر ان میں کوئی ایک بھولے تو دوسری یاد دلا دے'' یہ کھلا ہوا اشارہ عورتوں کے نقصان عقل کی طرف ہے کہ ان کے دھوکا کھانے اور بھولنے کا زیادہ امکان ہے [2]۔

اب یہ عصر حاضر کے ترقی پسند افراد کو کتنا ہی ناپسند ہو مگر کیا کیا جائے کہ وہ حدیث نہیں ہے جسے ضعیف کہہ کر ٹال دیا جائے بلکہ قرآن کی آیت ہے جس کا انکار بغیر انکار اسلام کے ممکن نہیں ہے۔

ایک صاحب عجیب دور کی کوڑی لائے ہیں کہ انہوں نے فتذکر کے لفظ کو ذکر بمعنی یاد سے نہیں بلکہ ذکر سے لیا ہے جو مرد کے معنی ہیں ہے۔ اس طرح فَتُذَكِّرَ إِحْدٰىهُمَا الْأُخْرٰى کے معنی یہ ہوں گے کہ ان دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ملنا انہیں مذکر یعنی مرد بنا دے مطلب وہی ہوگا کہ دونوں مل کر ایک مرد کی قائم مقام ہو جائیں مگر یہ معنی اس لفظ کے سننے سے اس مقام پر ذہن میں آتے نہیں ہیں [3]۔

لکھنے کی تاکید کے ساتھ تین فقرے ارشاد ہوئے ہیں: یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی صورت ہے۔

''گواہی کے لئے زیادہ ٹھیک انتظام ہے'' اور ''اس کا زیادہ سامان ہے کہ شک وشبہ میں نہ پڑو'' اس میں کتابت کے تین فوائد کا ذکر ہے۔ پہلے دینی فائدہ کہ اس طرح اللہ کے یہاں تمہاری بری الذمہ ہونے کا زیادہ امکان ہے، تو اس کے یہاں کی جواب دہی سے محفوظ رہو گے۔ دوسرے دینوی فائدہ اجتماعی اعتبار سے کہ جب باہمی نزاع ہو تو ثبوت موجود ہوگا اور رفع نزاع ہو جائے گی۔ تیسرے شخصی فائدہ بجائے خود اپنے ذہن کے لئے سکون کی صورت سے کہ بعض وقت بعد میں خود انسان بھول جاتا ہے کہ کتنا قرضہ تھا تو اگر کم دیتا ہے تو اس کے بعد میں فرض شناس ذہن میں یہ بے چینی رہتی ہے کہ ہم ابھی دیندار تو نہیں ہیں وار اگر زیادہ دے دیا تو یہ کوفت رہتی ہے کہ کہیں وہ زیادہ تو نہیں لے گیا۔ یہ بات اس وقت نہ ہوگی جب لکھا ہوا موجود ہو [4]۔

چھوٹی چھوٹی چیزوں کی نقد خرید وفروخت جہاں ایک ہاتھ کا دینا اور ایک ہاتھ کا لینا ہوتا ہے وہاں لکھنے پڑھنے کی ضرورت نہیں مگر یہیں پھر کہا ہے کہ اگر کوئی بیع وشراء کرو تو گواہیاں کرا لو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بڑی چیز جیسے مکان اور زمین وغیرہ کی معاملت ہو تو چاہے نقد ہو اس میں دستاویز ہو جانا مناسب ہے تاکہ بعد میں جھگڑا نہ ہو۔

آخر میں جو دو الفاظ ہیں: وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۗ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ۔ یہ ہمارے خیال میں دونوں قسم کے احکام کے لحاظ سے ہیں۔ ''اللہ سے ڈرو'' یہ ان احکام کے لحاظ سے ہے جو حاکمانہ ہیں جیسے یہ کہ کاتب لکھنے میں خیانت نہ کرے دوسرے لوگ کاتب اور گواہ پر دباؤ نہ ڈالیں اور ضرر رسانی کے لئے تیار نہ ہوں وغیرہ اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے یہ دوسرے احکام کے لحاظ سے ہے جو حکیمانہ ہیں [5]۔

ہمارے مشہور قدیم مفسر علی بن ابراہیم قمیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ سورہ بقر میں پانچ سو احکام ہیں اور پندرہ حکم صرف اس ایک آیت میں

---

[1] ۔ای ممّن یرضاهم النوع فی الشهادة ویرکن الیٰ شهادتهم لاجل اتصافهم بالصلاح والعدالة (البلاغی)

[2] ۔لان نوع النساء ابعد عن ضبط هذه الامور من نوع الرجال (البلاغی)

[3] ۔لا یخفیٰ ما فیه من التعسّف (نیشاپوری)

[4] ۔فما احسن هٰذه الفوائد وما ادخلها فی الضّبط والترتیب (نیشاپوری)

[5] ۔اتقوا الله فی مخالفة امره ونهیه ویعلّمکم الله احکامه المتصتمّنة لمصالحکم (صافی)

ہیں (مجمع البیان)

یہ آیت قرآن مجید کی سب سے طولانی آیت ہے اور مختصر ترین سورہ رحمٰن میں مدھامتان ہے جو صرف ایک لفظ کی ایک آیت ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

''اور اگر تم سفر میں ہو اور تمہیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو رہن با قبضہ رکھو [1] اگر تمہیں ایک دوسرے کا اعتبار ہو تو پھر جس کا اعتبار کیا گیا ہو اسے اپنی امانت داری کا فرض ادا کرنا چاہیے اور اپنے پروردگار کے غضب سے بچنا چاہیے اور گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو اسے چھپائے گا تو بلاشبہ اس کا دل گنہ گار ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کا جاننے والا ہے۔''

رہن کا حکم:

واضح ہونا چاہیے کہ رہن بغیر سفر کے یوں اپنے شہر میں رہ کر بھی درست ہے۔ یہاں جو کہا جا رہا ہے کہ اگر تم سفر میں ہو اس کا مطلب رہن کے اصول کو کہ وہ سفر ہی میں ہوتا ہے بیان کرنا نہیں ہے بلکہ کتابت جو ایک باعث اطمینان شے تھی جس صورت میں دشوار ہے اس کا بیان کرتے ہوئے اب ایک دوسرے اطمینان کے ذریعہ کو بتایا جا رہا ہے لہٰذا یہ اطمینان کا ذریعہ اگر کوئی حالت حضر میں اختیار کرنا چاہیے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں [2]۔

اس کی نظیر قرآن مجید میں دوسری جگہ یہ ہے کہ:-

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ

اور جب سفر کرو تو تمہارا کوئی حرج تو نہیں ہے کہ تم نماز میں قصر کیا کرو اگر تمہیں خوف ہے کہ کافر لوگ تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ (نساء۔۱۰۱)

یہاں قصر کا باعث پہلے سفر کو بتایا ہے۔ پھر خوف کا ذکر کیا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ سفر جس میں خوف نہ ہو باعث قصر نہیں ہے بلکہ ان دونوں چیزوں میں سے ہر ایک ہی قصر کا موجب ہے خواہ سفر ہو اور خواہ خوف [3]۔

---

[1] ۔بیّنت لسنة جواز الرهن فی الحضر ووجود الکاتب والتقید بما ذکر لان التوثق فیه اشد (جلالین)

[2] ۔لیس الغرض تخصیص الارتهان بهال السّفر بل لما کانت مظنّه اعواز الکتب والا شهاد وامر المسافر بان یقیم الارتهان مقام الکاتب والا شهاد علی سبیل الارشاد الی حفظ المال (صافی)

[3] ۔ولیس الخوف من شرط جواز القصر (نیشاپوری)

اس کے بعد رہن میں جو قبضہ کی قید لگائی ہے اس سے بظاہر تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ رہن کی صحت میں قبضہ ضروری چیز ہے۔ ہمارے یہاں حدیث معصومؑ بھی اس کی تائید میں ہے اور علماء کے اجماع کا دعویٰ بھی ہوا ہے [1] مگر بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ یہاں قبضہ کا تذکرہ اس لئے ہے کہ حالت سفر میں جب تحریر ممکن نہیں ہے تو قبضہ ہی اطمینان کا ذریعہ ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ رہن بغیر قبضہ درست نہیں ہے۔ بہرحال یہ مسئلہ کسی حد تک اختلافی ہے جس کا علم فقہ سے تعلق ہے۔

اب اگر اعتبار رکھتا ہے ایک دوسرے پر جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی شے کہ رہن کی ضرورت محسوس نہیں کی اور یوں ہی اعتبار پر قرض دے دیا تو اب اس شخص کا جس پر اعتبار کیا گیا دینی اور اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ اس اعتبار سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے اور بددیانتی سے کام نہ لے۔

یہ ہے جو آخر میں کہا گیا ہے کہ جس کا اعتبار کیا گیا ہے اسے اپنی دیانت داری کا فرض ادا کرنا چاہے۔ ورنہ وہ دنیا میں چاہے اپنے قرضہ کا ثبوت پیش نہ کر سکنے کی وجہ سے شکست کھا جائے اور یہ اسے چکمہ دے کر نکل جائے اور محفوظ رہے مگر اللہ کو تو اپنے علم میں کسی دستاویز کی ضرورت نہیں ہے وہ تو جانتا ہی ہے کہ کس نے کیا کیا لہٰذا اسے عذاب الٰہی سے ڈرتے رہنا لازم ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

''اللہ سے مخصوص ہے [2] جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور چاہے تم ظاہر کرو اسے جو تمہارے دلوں میں ہے اسے چھپاؤ اللہ اس کا تم سے حساب لے لے گا اور پھر جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

دل کی بات پر مواخذہ یہاں قصد وارادہ عمل کے معاف ہونے نہ ہونے کی بحث ہے جس پر جناب شیخ مرتضیٰ انصاریؒ نے رسائل میں بسیط تبصرہ فرمایا ہے اور آخر میں نتیجہ یہ نکالا ہے کہ بعض صورتوں میں نیت پر عذاب ہے اور بعض میں نہیں ہے۔ بعض مفسرین بھی اس آیت کے ذیل ہیں اس پہلو کی طرف متوجہ ہوئے ہیں [3]۔

ممکن ہے یہ ارشاد الٰہی کہ جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا اسی تفریق پر منطبق ہو اس لئے کہ یہ پہلے بھی ہم ایک جگہ واضح کر چکے ہیں کہ اللہ کا کوئی چاہنا بلا وجہ نہیں ہوتا۔ وہ جسے بخشنا چاہتا ہے اس میں کوئی وجہ استحقاق مراعات کی ہوتی ہے اور جسے بخشنا نہیں چاہتا وہ اس کی عدم اہلیت کی وجہ سے ہوتا ہے لہٰذا وہ تمہارے دل کی باتوں کا حساب لے گا یعنی ان کی نوعیت دیکھے گا کہ کون بخشنے کے لائق ہیں اور کون نہیں ہیں اور پھر جسے چاہے گا بخش دے گا۔ یہ وہی اقسام نیت کے ہیں جن کے متعلق دوسرے دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ معفو قرار دیے گئے

---

[1] ۔فی الکافی عن الصادق علیہ السلام لا رھن الا مقبوضا (صافی) فان لم یقبض لم ینعقد الرھن بالاجماع (مجمع البیان)

[2] ۔خلقا وملکا (صافی) اللام لام الملک (مجمع البیان)

[3] ۔فی نہج البلاغہ وبما فی الصدور یجازی العباد اقول لا یدخل فیما یخفیہ الانسان الوساوس وحدیث النفس ــــــ ولکن ما اعتقدوعزم علیہ (صافی)

ہیں اور جسے چاہیے گا سزا دے گا یہ وہ اقسام نیت کے ہیں جن میں مواخذہ اخروی ثابت ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ قف لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

''ایمان لائے ہیں پیغمبر اس پر کہ جو ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا اور مومنین سب، ہر ایک ایمان رکھتا ہے، اللہ اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر [1] ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفرق نہیں کرتے اور ان کا قول ہے کہ سنا ہم نے اور مانا ہم نے تیری بخشش درکار ہے [2] اے ہمارے پروردگار اور تیری ہی طرف رجوع ہونا ہے۔''

یہود حضرت موسیٰؑ تک مانتے ہیں حضرت عیسیٰؑ کو نہیں مانتے اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ تک مانا وار حضرت محمد ﷺ کو نہ مانا مگر مسلمانوں کی شان یہ ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

یہ اس رسول پر جو کچھ نازل ہوا سے بھی مانتے ہیں اور جو کچھ پہلے نازل ہوا اسے بھی مانتے ہیں۔

ان کے یہاں یہ نہیں ہے کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں اسی کو کہا جا رہا ہے کہ ہم مرسلین میں تفریق کے مرتکب نہیں ہوتے [3]۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ قفة وَاغْفِرْ لَنَا ۟ قفة وَارْحَمْنَا ۟ قفة اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

''اللہ کسی پر ذمہ داری عائد نہیں کرتا مگر اس کی وسعت کے اندر [4] اسے نفع ہوگا اس کا جو وہ کرے اور اسے نقصان

---

[1] ۔ای یقولون (مجمع البیان)

[2] ۔ اغفر غفرانك او نطلب غفرانك (صافی) نسألك غفرانك (مجمع البیان)

[3] ۔ فنؤمن ببعض ونكفر ببعض كما فعل الیهود والنصاریٰ (جلالین)

[4] ۔ الوسع مادون الطاقة (مجمع البیان) ما یسعه قدرتها (صافی) اس کے بوتے بھر (تاج العلماء)

پہنچے گا اس کا جو وہ کرے، پروردگارا! ہماری گرفت نہ کرنا اگر بھول جائیں ہم یا چوک جائیں ہم، پروردگارا! اور ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا اُن پر ڈالا تھا جو ہم سے پہلے تھے اور پروردگارا! ہم پر ایسا بار نہ رکھنا جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اور ہمیں معاف کر اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر تو ہمارا مالک ہے تو کافروں کے مقابلہ ہماری مدد فرما۔''

شریعت اسلامی کی خصوصیت:

خالق نے اس امت پر یہ کرم فرمایا ہے کہ اسے شریعت سہلہ کے ساتھ مکلف فرمایا ہے جس میں بہت رعایتیں موجود ہیں۔ اس لئے بصورت دعا جن چیزوں کو پیش فرمایا ہے وہ خالق کے کیے ہوئے فیصلہ کو اپنے دل کی آواز بنانا ہے جو مقتضائے عبودیت ہے [1]۔

نہ کر یہ باتیں حاصل نہیں ہیں اور اب دعا کر کے ان کے حصول کی کوشش کی جارہی ہے [2]۔

ہاں بعض احادیث میں جو معصومین علیہم السلام سے منقول ہیں یہ ہے کہ یہ سب التجائیں ہمارے پیغمبرؐ نے معراج میں بارگاہ الٰہی میں پیش کی تھیں اور یہ ان دعاؤں کی قبولیت ہے جو شریعت سہلہ کی صورت ہمارے سامنے ہے۔

اس آیت میں مولیٰ کے معنی صاف آقا و مالک کے ہیں مگر من کنت مولا کی بحث خلاف امیر المومنینؑ کے نص کو مشکوک بنانے کے لئے مولی کے معنی دوست کے جو قرار دیے گئے تو وہ ذہن میں اتنا رس بس گئے کہ شاہ رفیع الدین صاحب نے یہاں بھی ترجمہ کر دیا تو ہے دوست دار ہمارا حالانکہ خود ان کے والد شاہ ولی اللہ صاحب یہ ترجمہ کر چکے تھے کہ تو ئی خداوند ما اور جلالین میں ہے۔

مولانا سیدنا ومتولّی امورنا: تو ہمارا سردار اور ہمارے امور کا ذمّہ ہے۔

اور یہی معنی بالکل درست و مناسب ہیں۔

---

[1] ۔انہ علیٰ سبیل التعبد و ان کان تعالیٰ لا یکلف ولا یحمّل احدا مالا یطلیقہ (مجمع البیان)

[2] ۔فسئو الہ اعتراف بنعمۃ اللہ (جلالین)

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرَانَ

مدنیہ-----۲۰۰ آیات

آغاز سورۂ آل عمران:

چوں کہ آل عمران کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس سورہ میں ہے جو یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۚ﴿۳۴﴾ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾

پھر یہ سلسلہ کئی آیتوں تک چلا گیا ہے اس لئے اس سورۃ کا نام ''آل عمران'' ہوا۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں جو خاص مضامین ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

اس سورۂ کے خاص مضامین:

۱-------آیات قرآن میں محکمات و متشابہات کی تفریق۔

۲-------راسخین فی العلم کا امتیاز۔

۳-------جنگ بدر کی روئداد۔

۴-------عدالت کا اصول دین میں ہونا۔

۵-------دین حقیقی اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔

۶-------حکم تقیہ۔

۷-------محبت الٰہی اور اتباع رسولؐ۔

۸-------جناب مریمؑ کی ولادت وغیرہ کے حالات۔

۹-------جناب زکریاؑ کی دعا اور اس کی قبولیت۔

۱۰-------حضرت عیسیٰؑ کی ولادت اور ان کے معجزات۔

۱۱--------حواریین عیسیٰ کا تذکرہ۔

۱۲--------جناب عیسیٰؑ کا آسمان پر اٹھایا جانا اور ان کے متبعین کا غلبہ۔

۱۳--------عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے کی رد

۱۴--------مباہلہ

۱۵--------اہل کتاب کو مشترکہ اصول پر متحد ہونے کی دعوت

۱۶--------دین ابراہیمیؑ کی تشریح

۱۷--------یہود و نصاریٰ کا کردار

۱۸--------پیغمبروں سے عہد و میثاق

۱۹--------اسلام میں نجات کا انحصار

۲۰--------قبولیت خیرات کی شرط

۲۱--------خانہ کعبہ کا امتیاز

۲۲--------مقام ابراہیمؑ

۲۳--------فرضیت حج

۲۴--------مخالفت نص کرنے والوں کا انجام

۲۵--------خیرِ اُمت

۲۶--------یہود کے متعلق پیشین گوئی

۲۷--------بعد وفات رسولؐ ارتداد اختیار کرنے پر انتباہ

۲۸--------غزوۂ اُحد کا عبرت ناک مرقع

۲۹--------حیات شہداء اور اس کے تفصیلات

۳۰--------مانعین زکوٰۃ کا عذاب وغیرہ وغیرہ

ایک روایت یہ ہے کہ سورہ آل عمران کا ابتدائی حصہ آیہ مباہلہ تک پورا جو اسی آیتوں سے زیادہ پر مشتمل ہے، نصارئے نجران سے جو تحقیق مذہب اسلام اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بحث کے لئے آئے تھے بحث و مباحثہ کے سلسلہ میں اترا ہے [1]۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

الٓمّٓ ① اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ② نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا

---

[1] ۔ نقل المفسّرون انه قدم علیٰ رسول اللہ ﷺ وفد نجران فانزل اللہ فی ذلك اوّل سورة آل عمران الیٰ بضع وثمانین اٰیة منها اٰیة المباهلة (نیشاپوری)

لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝٣ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝٤

''الف لام۔میم۔اللہ نہیں کوئی خدا سوا اس کے جو زندہ ہے بندوبست کرنے والا[1]۔

اس نے آپ پر یہ کتاب اتاری[2] حق کے ساتھ تصدیق کرتی ہوئی اس کی جو اسکے پہلے سے موجود ہے اور اس نے اتاری توریت اور انجیل اس کے پہلے سراسر ہدایت بنا کر لوگوں کے لئے، اور اُتارا فیصلہ کن کلام[3] بلاشبہ جنہوں نے اللہ کی نشانیوں کے ساتھ کفر اختیار کیا ان کے لئے بڑا سخت عذاب ہے اور اللہ زبردست ہے بڑی سخت مکافات والا ہے[4]۔''

شروع میں جو حروف میں وہی سورہ بقرہ کی ابتداء والے جنہیں مقطعات قرآنیہ کہتے ہیں اور وہاں ان کے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ یہ قدرت کے راز ہیں جنہیں سوا اللہ اور راسخین فی العلم کے کوئی اور نہیں جانتا[5]۔

اس کے بعد کی آیت وہ ہے جس سے اسی پارے کے ابتدائی حصہ میں آیۃ الکرسی کا آغاز ہوا ہے۔اس کی شرح وہاں ہو چکی ہے۔

''یہ کتاب اس کی جو اس کے پہلے تھا تصدیق کرنے والی ہے'' اس معنی سے بھی کہ پہلے کی کتابوں میں اس رسولؐ اور اس شریعت کی خوش خبری دی گئی تھی لہٰذا اب اس رسولؐ اور اس شریعت کا آجانا ان سب کی مسیحائی کا ثبوت ہے اور اس معنی سے بھی کہ اصول دین تمام انبیاء کے تعلیمات میں مشترک ہیں لہٰذا یہ کتاب وہی بتا رہی ہے جو آدمؑ سے لے کر اب تک تمام انبیاء بتاتے رہے اور اس لحاظ سے بھی کہ اس کی تعلیم یہ ہے کہ گزشتہ تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے اور جب ان انبیاء کی تصدیق لازم ہوئی تو ان کتب و شرائع کی بھی تصدیق ہوگئی جو ان انبیاء پر نازل ہوئے تھے۔

مابین یدیہ یعنی جو اس سے پہلے تھا اس میں اصل توریت اور انجیل بھی داخل تھی مگر ان دو کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہو گیا اس لئے کہ مدینہ اور اس کے اطراف میں ان کے ماننے والوں کا دور دورہ تھا۔پھر جیسا کہ پہلے بیان ہوا بعض روایات کے مطابق اس سورہ کے شروع والے بڑے حصہ کی تنزیل ہی جماعت تصدیق سے مذہبی بحث و مباحثہ کے سلسلہ میں ہوئی تھی تو ان کی مسلمہ کتابوں کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ مقتضائے حال کے عین مطابق تھا۔

---

[1] ۔سدا برقرار ہے (تاج العلماء)

[2] ۔ یعنی القرآن (مجمع البیان)

[3] ۔ ما یفرّق بہ بین الحق والباطل (صافی)

[4] ۔انتقام شدید لا یقدر علی مثلہ منتقم (صافی)

[5] ۔اللہ اعلم بمرادہ بذلك (جلالین) علمها عند الله وامتآء وجه (البلاغی)

اس کتاب کے ساتھ نزل کا لفظ تشدید کے ساتھ اور توریت اور انجیل کے لئے انزل کا لفظ آیا ہے اس سے یہ معنی نکالے گے ہیں کہ قرآن تدریجی طور پر اتارا گیا ہے اور توریت اور انجیل ہر ایک یکجائی طور پر اتاری گئی تھیں [1] ۔مگر مجھے ابھی تک تنزیل اور انزال کے مصدروں میں خاصیت کے اعتبار سے اس تفرقہ کے ہونے پر اطمینان نہیں ہے جب تک کہ علمائے صرف کی تصریح نہ ملے یا شواہد سے پورے طور پر یہ امتیاز نمایاں نہ ہو حالانکہ بعض جگہ قرآن مجید میں خود اس کتاب کے لئے انزل کا لفظ بھی موجود ہے۔

فرقان کے معنی:

اس کے بعد کہا ہے کہ اس نے فرقان اتارا۔قرآن مجید میں دوسری جگہ الفرقان کا لفظ خاص قرآن مجید کے لئے آیا ہے جیسے:

نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا

مگر وہ قرآن کا نام نہیں ہے بلکہ وصف ہے کہ وہ حق و باطل میں تفرقہ کا ذریعہ ہے اس لئے دوسرے پارے میں جس کی تفسیر ہو چکی ہے، حکم صوم کے ذیل میں ارشاد ہوا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ۔

اب زیر تشریح آیت میں قرآن مجید کا ذکر اگر پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو ہم یہ سمجھتے کہ الفرقان سے قرآن ہی مراد ہے مگر چوں کہ الکتاب کے لفظ سے قرآن کا ذکر توریت و انجیل کے پہلے ہو چکا ہے، اس لئے اس الفرقان یعنی تفرقہ حق و باطل کی تشریح معجزہ کے ساتھ کی گئی ہے [2] اور توریت و انجیل کے علاوہ پہلے تمام آسمانی کتابوں کے ساتھ بھی یعنی خصوصیت کے ساتھ قرآن اور توریت و انجیل کا ذکر کر کے خالق کا ارشاد ہے کہ کتابیں بھی ہم نے اتاریں جو امتیاز حق و باطل کا ذریعہ تھیں [3] ۔

مگر احادیث اہل بیت علیہم السلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ الفرقان اسی الکتاب یعنی قرآن کا وہ حصہ ہے جو محکمات کی حیثیت رکھتا ہے اور جسے اصول و قواعد دین کا ماخذ قرار دیا گیا ہے [4] ۔

اسی کو دوسری آیت میں جو عنقریب آئے گی ام الکتاب کہا گیا ہے۔اس صورت میں الکتاب کے بعد اس کا ذکر ویسا ہی بلحاظ اہمیت و خصوصیت ہے جیسے مابین یدیہ اس کے پہلے والی چیزوں کے کہنے کے بعد پھر انزل التورۃ والانجیل کے الفاظ میں دو ۲ کتابوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝۵

---

[1] ۔نزل علیك الكتب القرآن نجوما ـــــ وانزل التورته والانجيل جملة (صافی)

[2] ۔ فرود آورد معجزہ را (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ذكر بعد ذكر الثلثه ليعلم ما عداها (جلالین)

[4] ۔فی الكافی عن الصادق علیہ السلام القرآن جملة الكتاب والفرقان المحكم الواجب العمل به وفی الجوامع عنه الفرقان كل اية محكمة فی الكتاب والقمی والعياشی عنه الفرقان هو كلّ امر محكم والكتاب هو جملة القرآن (صافی)

''بلاشبہ اللہ وہ ہے کہ نہیں پوشیدہ ہے اس پر کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں۔''

باعتبار واقعیت زمین اور آسمان کے کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ کائنات کی کوئی شے اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے مگر چوں کہ انسان مشاہدہ میں آسمان اور زمین ہی محیط کل ہیں اس لئے وسعت علم کو دکھانے کے لئے ان کا ذکر کیا گیا[1]۔

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۶

''وہ وہ ہے جو ماں کے پیٹ میں[2] تمہاری صورتیں بناتا ہے جیسی چاہتا ہے، کوئی خدا نہیں سوا اس کے کہ جو زبردست ہے بڑی سوجھ بوجھ والا''۔

یہ صورت گری جو کئی کئی تاریک حجابوں کے اندر ہوتی ہے قدیم اور جدید ارباب تشریح کی تحقیقات کا مرکز رہی ہے اور اب تک اس کے تمام رموز و اسرار منکشف نہیں ہوئے ہیں جس کا ایک بہت ہی سطحی مگر حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ ابتدائے خلقت انسان سے اب تک ہر دور کی مردم شماری دیکھئے اور سب کی میزان لگائیے تو وہ اتنا بڑا عدد ہوگا جس کا اظہار شاید ہم اپنے اعداد کے ناموں سے نہ کر سکیں۔

ان بے شمار انسانوں کے چہرے ہاتھ اور پاؤں سب محدود و متعین اعضاء ہیں مگر ان سب کی شکل وصورت اور پھر ہر ایک کے اندر جو نقوش ہیں ان میں کوئی نقش دوسرے سے بالکل متحد نہیں ہے اور چہرے اور تمام اعضاء کے باہمی امتیاز کا کیا ذکر صرف ایک چھوٹے سے جزء یعنی انگوٹھے کے نقوش ایک کے دوسرے سے نہیں ملتے کیا یہ صورت گری حدود امکان سے باہر کسی قدرت کاملہ کا ثبوت نہیں دیتی؟

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۷

''وہ وہ ہے جس نے آپ پر یہ کتاب اتاری، اس میں سے کچھ محکم آیتیں ہیں جو کتاب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں[3] اور کچھ متشابہ ہیں جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں جو اس میں متشابہ ہے گمراہ

---

[1] ۔عبر عن العالم بهما لان الحسن لا یتجاوزهما (صافی)

[2] ۔گھیلنوں میں (تاج العلماء)

[3] ۔اصله المعتمد علیه فی الاحکام (جلالین) اصله الذی یردّ الیه غیرها (صافی)

کرنے کی خاطر [1] اور اس کے دل بخواہ معنی بنانے کی خاطر [2] حالانکہ اس کے اصل معنی کوئی نہیں جانتا سوا اللہ اور ان کے جو علم میں جمع ہوئے ہیں [3] کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہر ایک ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور نصیحت کا اثر نہیں لیتے مگر عقل والے۔''

آیات قرآن کی دو قسمیں: محکمات اور متشابہات

محکم ومتشابہ اور تفسیر وتاویل پر مبسوط تبصرہ تو ہم نے مقدمہ تفسیر میں کیا ہے۔ اس محل پر اختصار کے ساتھ اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

یہاں صاف یہ بتایا جارہا ہے کہ اس قرآن میں کچھ محکم آیتیں ہیں اور کچھ متشابہ ہیں مگر دوسری جگہ قرآن میں پورے قرآن کے لئے کہا گیا ہے:-

احکمت ایاتہ: اس کی آیتیں محکم ہیں (ھود۔۱)

اور ایک جگہ پوری کتاب کو ''متشابہ'' کہا گیا ہے:-

كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ.

متشابہ کتاب بطور مثانی جس سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں ان کے جسم پر جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ (زمر۔ ۲۳)

یہ الفاظ مختلف حیثیتوں سے صرف کیے گئے ہیں۔ یہاں جو محکمات اور متشابہات کی تفریق کی گئی ہے وہ الفاظ اور ان کے معنی کے لحاظ سے ہے کہ کچھ آیتیں وہ ہیں جن کے بس ایک ہی معنی ہوتے ہیں جنہیں ہر واقف زبان کے ذہن میں آجانا چاہیے اور کچھ آیتیں ہیں جن کے لغت وعرف کے لحاظ سے کئی کئی معنی ہوتے ہیں یا جو معنی اس لفظ کے عام طور پر ہوتے ہیں وہ کسی وجہ سے مراد نہیں لئے جاسکتے اور اس کے علاوہ دوسرے معنی متعدد جگہ ہوسکتے ہیں یا یہ کہ ان الفاظ کے کوئی معنی عام طور پر سمجھ ہی میں نہیں آتے جیسے مقطّعات قرآنیہ۔

اور وہ جو محکم کہا گیا ہے وہ دلائل حقانیت کے اعتبار سے ہے کہ اس میں کوئی کمزوری نہیں ہے جو اس کے الٰہی کلام ہونے کے اعتقاد میں رخنہ پیدا کرے [4] اور وہ جو متشابہ کہا ہے وہ اس لحاظ سے کہ وہ پورا کلام اس مرتبہ پر ہے جو اس کے اعجاز کے شایان شان ہے اور اس اعتبار سے اس کے تمام اجزاء یکساں اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں ان میں فرق نہیں ہے [5]۔

الراسخون فی العلم اور علم تاویل قرآن:

ہمارے یہاں کی زیادہ تر احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ الرسخون فی العلم سے مراد معصومینؑ ہیں اور اس کا عطف الا کے

---

[1] ۔طلب ان یفتنوا النّاس عن دینھم لتشکیك والتلبیس (صافی)

[2] ۔طلب ان یأولوہ علیٰ ما یشتھونہ (صافی) اس خیال سے کہ انہیں اپنے مطلب پر ڈھال لے جائیں (تاج العلماء)

[3] ۔الذین ثبّتوا وتمکنوا فیہ (صافی) ثابت قدمانِ علم (شاہ ولی اللہ) مضبوط لوگ پختہ علم کے (شاہ رفیع الدین) ثابت قدم لوگ ہیں (تاج العلماء)

[4] ۔بمعنی انہ لیس فیہ عیب (جلالین)

[5] ۔یشبہ بعضہ بعضاً فی الحسن والصدق (جلالین)

تحت میں کلمہ اللہ پر ہے جس کے معنی ہوتے ہیں کہ اس کی تاویل بس اللہ جانتا ہے اور وہ جو علم میں جمے ہوئے ہیں۔ اس پر علامہ شیخ جواد بلاغی طاب ثراہ نے عقلی و نقلی حیثیت سے بڑی سیر حاصل بحث فرمائی ہے جس میں طرق اہل سنت سے بھی وہ اخبار آثار درج فرمائے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ تاویل قرآن کا علم اللہ کے خاص بندوں کو حاصل ہوتا ہے اور یہی بندگان خاص وہ ہو سکتے ہیں جو راسخین فی العلم ہیں [1]۔

علامہ نیشاپوری نے لکھا ہے:

هذا قول مجاهد والربيع بن انس واكثر المتكلمين وقد يروى عن ابن عباس ايضا [2]

یہ مجاہد اور ربیع بن انس اور زیادہ تر متکلمین کا قول ہے اور ایک روایت میں ابن عباسؓ کی طرف بھی اس کی نسبت دی گئی ہے۔

یہاں چند احادیث اہل بیت علیہم السلام کے جنہیں صاحب تفسیر صافی نے درج کیا ہے نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) فی الکافی والعیاشی عن الصادق نحن الراسخون فی العلم ونحن نعلم تاویله

کافی اور عیاشی میں امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے فرمایا کہ ہم ہیں راسخین فی العلم اور ہم اس کی تاویل جانتے ہیں۔

دوسری روایت میں اس کے ساتھ ہے:

(۲) فرسول الله افضل الراسخين فی العلم قد علم الله عزوجل جميع ما انزل عليه من التنزيل و التاويل وما كان الله لينزل عليه شيالم يعلم تاويله واوصياؤه من بعده يعلمونه كلّه۔

تو راسخین فی العلم میں سب سے افضل رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جنہیں اللہ نے خود علم عطا فرمایا تمام ان چیزوں کا جو آپ پر نازل کی ہیں تنزیل اور تاویل دونوں قسم میں سے اور اللہ ایسا نہیں کہ کوئی شے آپ پر اتارے اور آپ کو اس کی تاویل نہ بتائے اور آپ کے اوصیاء آپ کے بعد اس تمام علم کے حامل ہیں۔

اس حدیث کو علامہ طبرسیؒ نے بھی مجمع البیان میں درج کیا ہے۔

تیسری روایت:۔

(۳) فی الکافی عن الباقر علیہ السلام والراسخون فی العلم من لا یختلف فی علمه۔

کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ راسخین فی العلم وہ ہیں جن کے درمیان اس کے علم میں اختلاف نہیں ہوتا

(۴) احتجاج طبرسیؒ میں امیر المومنین علیہ السلام کی ایک حدیث میں کلام الٰہی کے تین اقسام قرار دیے ہیں ایک جسے عوام اور خواص سب ہی سمجھ لیتے ہیں اور دوسری قسم جسے بس ذہین افراد ذہانت سے سمجھ لیتے ہیں اور اس کے بعد:۔

قسما لا يعرفه الا الله وانبياؤه والراسخون فی العلم

ایک قسم ہے جسے اللہ جانتا ہے اور اس کے پیغمبر اور وہ جو علم میں راسخ ہیں۔

بے شک نہج البلاغہ میں امیر المومنینؑ کے کلام میں چند فقرات ہیں جن سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لا یعلم تاویله الا الله یہ جملہ ختم

---

[1] ۔آلاء الرحمٰن ص ۲۵۷، ۲۵۸۔

[2] ۔غرائب القرآن ج ۱۔

ہوگیا ہے اور والراسخون فی العلم کا تعلق بعد والے الفاظ سے ہے اور مدح اسی کی ہے کہ وہ متشابہات کے معنی سمجھنے کے درپے نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ ہمارا کام بس ایمان لانا ہے۔ محکم اور متشابہ دونوں ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور خالق نے ان کے اس اعتراف عجز ہی کو رسوخ فی العلم سے تعبیر کیا ہے۔ یہ فقرات حسب ذیل ہیں:

اعلم ان الراسخین فی العلم هم الذین اغناهم عن اقتحام السدد المضروبته دون الغیوب الاقرار بجملة ماجهلوا تفسیره من الغیب المحجوب فمدح الله اعترافهم بالعجز عن تناول ما لم یحیطوا به علما و سمی ترکهم التعمق فیما لم یکفهم البحث عن کنهه رسوخا.

معلوم ہونا چاہیے کہ علم میں راسخ وہی لوگ ہیں جنہیں غیب کے پردوں میں درّانہ گھسنے سے بے نیاز بنا دیا ہے ان کے اجمالی طور پر اقرار نے ان تمام باتوں کے ساتھ جن کے غیب کے پردہ میں چھپے ہوئے تفصیلات وہ نہیں جانتے تو اللہ نے ان کی مدح کی ہے اس بات پر کہ وہ جن چیزوں کے علم پر حاوی نہیں ہیں ان تک رسائی سے اپنی عاجزی کا اقرار کرتے ہیں اور جس چیز کی حقیقت کی کھوج پر انہیں مامور نہیں کیا ہے اس میں گہرائی تک پہنچنے کی کوشش نہ کرنے ہی کا نام اللہ نے علم میں راسخ ہونا قرار دیا ہے۔

تعجب ہے کہ ملا محسن فیض نے تفسیر صافی میں اس کلام کو تفسیر عیاشی کے حوالہ سے نقل کرتے ہوئے اسے گزشتہ احادیث کے سلسلہ ہی میں درج کر دیا ہے جیسے کہ وہ مضمون میں ان احادیث سے بالکل متحد ہے اور اس پر کوئی بحث نہیں کی ہے۔

بہرصورت نہج البلاغہ کی درج شدہ عبارت کی حیثیت فنی حیثیت سے ایک خبر مرسل کی ہے جس کے مقابلہ میں مستند احادیث زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ⑧

''اے ہمارے مالک! اس کے بعد کہ تو ہمیں سیدھی راہ پر لگا چکا اب ہمارے دلوں کو کج نہ ہونے دے اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت کے ساتھ مالا مال فرما! یقیناً تو بڑا عطا کرنے والا ہے۔''

دلوں کو کج نہ ہونے دے یعنی اپنے توفیقات خاصہ ہمارے شامل حال رکھ کہ ہمارے دل راہ راست سے کج نہ ہو جائیں[1]۔

''اس کے بعد کہ تو ہمیں سیدھی راہ پر لگا چکا یعنی توفیق شامل حال رکھی کہ ہم نے راہ راست پر چلنا اختیار کیا اور یہی وہ رحمت ہے جس کی آئندہ کے لئے بھی طلب ہے[2]۔

---

[1] ۔انما اضیف الزیغ الی الله لانه مسبّب عن امتحانه وخذلانه (صافی) وهذا دعاء للتثبت علی الهدایة والامداد بالالطاف والتوفیقات ویجری مجری قولهم اللهم لا تسلط علینا من لا یرحمنا والمعنی لا تخل بنیننا وبین نبینا من لا یرحمنا لیتسلّط علینا (مجمع البیان)

[2] ۔رحمة بالتوفیق والمعونه (صافی) ای من عندك لطفا تتوصل به الی الثبات علی الایمان (مجمع البیان)

دوسری جگہ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ یہ کج ہونے دینا یعنی توفیقات خاصہ کو سلب کرنا خود انسان کی کج روی کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ

جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو کج ہو جانے دیا (الصّف۔۵)

اس کے بعد اس میں جبر کے تصور کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۹

''اے ہمارے پروردگار! بلاشبہ تو ہے سب لوگوں کا اکٹھا کرنے والا [1] اس دن [2] جس میں کہ کوئی شک نہیں ہے بلاشبہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔''

یہ آخری ٹکڑا بلاشبہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا اگر اس دعا کا جزء مانا جائے تو وہ صنعت التفات کے طور پر ہے التفات کے معنی یہ ہیں کہ کسی کے متعلق ایک انداز میں مثلاً بطور غائب کلام ہوتے دوسرے انداز میں بطور تخاطب کلام ہونے لگے جیسے سورہ حمد میں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ کے بعد تخاطب کا انداز ہو جانا کہ: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝

یہاں اس کا عکس ہے کہ بطور تخاطب کلام ہو رہا تھا ربنا ربنا کہہ کر اور اب آ گیا بصورت غائب کہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ ضمیر تو کے بجائے یہ کہنا کہ ان اللہ لا یخلف المیعاد اس میں اس کا اظہار مضمر ہے کہ وعدہ خلافی شان الوہیت کے خلاف ہے۔ بھلا اللہ اور وعدہ خلافی کرے؟ ناممکن [3]۔

اور ہو سکتا ہے کہ یہ دعا ختم کے بعد خالق کی طرف سے اس کا جواب ہو کہ یہ تو اللہ کا وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ اللہ وعدہ خلاف تھوڑی ہے [4]۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝۱۰

''بلاشبہ جنہوں نے کفر اختیار کیا ہرگز انہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے ان کے مال اور اولاد اللہ کے مقابلہ میں اور یہی

---

[1] ۔بٹورنے والا (تاج العلماء)

[2] ۔اللّام فی قولہ لیوم لاریب فیہ معناہ فی یوم (مجمع)

[3] ۔فکانہ احتجاج علی عدم الخلف للمیعاد بمعنی ان الالہ یجلّ عن ذٰلک فلنا الیقین (البلاغی) معناہ ان الا لھیۃ تنافی خلف المیعاد (نیشاپوری)

[4] ۔التفات عن الخطاب ویحتمل ان یکون من کلامہ تعالیٰ (جلالین)

لوگ آتش دوزخ کا ایندھن ہیں''

علامہ طبرسیؒ لکھتے ہیں کہ من اللہ میں جو من کا لفظ ہے اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ایک ممتاز ادیب ابوعبیدہ کا یہ قول ہے کہ وہ عند کے معنی میں ہے۔اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ان کے مال اور اولاد اللہ کے یہاں انہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچائیں گے۔مبرد کا قول ہے کہ اس کے معنی ابتداء کے ہیں یعنی اللہ کی طرف سے ان کا کوئی مددگار نہیں۔تیسرا قول یہ ہے کہ تغنی کے معنی میں بچانے کا مفہوم ہے اور اللہ سے یعنی اس کے عذاب سے ہمارے بعض مترجمین نے اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے [1]۔

ایک چوتھا تصور یہ ہے کہ من بدلے کے معنی میں ہے یعنی اللہ کے بجائے ان کے اموال اور اولاد ان کے کام نہیں آئیں گے [2]۔

علامہ بلاغیؒ نے اس بحث میں بہت تفصیل سے کام لیا ہے کہ جس کا نتیجہ وہی ہے جو ہم نے ترجمہ میں مدنظر رکھا ہے اور بعض اکابر نے بھی ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے [3]۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑪

''جیسا فرعونی گروہ اور ان کے پہلوں کا حال ہوا کیا [4] کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی بدولت ان کو گرفت میں لے لیا اور اللہ سخت سزا والا ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ⑫

''کافروں سے کہدو کہ بہت جلد تم مغلوب ہوگے اور سمیٹ کے لے جائے جاؤ گے دوزخ کی طرف اور وہ کیا بری آرام گاہ ہے''

دوزخ کو آرام گاہ طنزیہ طور پر کہا گیا ہے [5]۔

اب یہ اعلان جو بہ طور اطلاع کافروں سے مخاطب ہو کر کیا گیا ہے اس میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دو باتوں کی اطلاع ہو تم مغلوب ہو گے یعنی رسول سے جو تم مقابلہ کر رہے ہو اس میں شکست بھی تمہاری ہوگی [6] اور دوزخ کی طرف بھیجے جاؤ گے یعنی آخرت میں عذاب الٰہی میں بھی

---

[1] ۔ان کو خدا کے عذاب سے نہ ان کے مال ہی کچھ بچائیں گے، نہ ان کی اولاد (فرمان علی صاحب)

[2] ۔للبدل مثله فی قوله ان الظن لا یغنی من الحق شیئا ای بدله والمضاف محذوف تقدیره لن تغنی عنهم بدل رحمة الله او طاعة شیئا (نیشاپوری)

[3] ۔اُن کے نہ آڑے آئیں گے ان کے مال اور نہ بال بچے (تاج العلماء)

[4] ۔ کشانهم (صافی) الذاب العادة (مجمع البیان)

[5] ۔المهاد ما یمهده الانسان لاستراحة وعبّر عن جهنّم بالمهاد تهکما بهم (البلاغی)

[6] ۔ستغلبون فی الدنیا بالقتل والاسر وضرب الجزیة وقد وقع ذلك (جلالین) وقد فعل الله ذلك وعده بقتل بنی قریظة واجلاء بنی النضر (صافی) وقد فعل الله ذلك فالیهود غلبوا یوضع الجزیة علیهم والمشرکون غلبوا بالسّیف (مجمع البیان)

گرفتار ہو گے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلا ٹکڑا دوسرے ہی کا اجمال ہو یعنی دنیا میں چاہے تم کتنی ہی کامیابیاں حاصل کر لو مگر آخر میں اللہ کے مقابلہ میں تم بے بس ہو جاؤ گے اور وہ تمہیں آتش جہنم میں پہنچا دے گا۔

اس طرح یہ حکم کسی جماعت کفار سے مخصوص نہیں ہے بلکہ عام ہے جس میں سب کافر داخل ہیں۔

تنہا اگر اس آیت کو دیکھا جائے تو یہ دوسرا مفہوم کچھ زیادہ قرآنی الفاظ سے قریب تر معلوم ہوتا ہے کیونکہ پہلے معنی کی صورت میں ستغلبون ثم تحشرون ہوتا یعنی مغلوب ہو گے۔ پھر تمہیں دوزخ کی طرف بھیجا جائے گا واو عاطفہ بتلاتا ہے کہ دونوں باتیں آخرت ہی سے متعلق ہیں لیکن آیات کا سلسلہ اگر ترتیب نزول کے مطابق مانا جائے تو پہلے ہی معنی کو قوت ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد قد کان لکم آیۃ ''تمہارے لئے اس واقعہ میں نشانی ہے'' کہہ کر انہیں ایک جنگ کے انجام کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دیکھو کس طرح رسولؐ کو فتح حاصل ہوئی ھذا ستغلبون کا وہی مطلب ہوگا کہ تم رسولؐ کے مقابلہ میں مغلوب ہو کر رہو گے۔ فتح کے توقعات تمہارے ہرگز پورے نہیں ہو سکتے اور پھر آخرت میں عذاب میں بھی گرفتار ہو گے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

''تم لوگوں کے لئے ایک معجزہ تھا[1] ان دونوں گروہوں میں جن کی مڈبھیڑ ہوئی تھی[2] ایک گروہ اللہ کی راہ میں جنگ کر رہا تھا اور دوسرا کافر تھا وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ ان سے دُونے ہیں اور اللہ اپنی مدد سے جسے چاہتا ہے تقویت دیتا ہے۔ اس میں عبرت ہے نگاہ والوں کے لئے[3]''۔

جنگ بدر کی مختصر روداد:

یہ جنگ بدر کی مختصر روداد ہے کہ دیکھو کس طرح یہاں اہل ایمان اور کافروں کا مقابلہ ہوا اور کفار تعداد میں ان سے زیادہ تھے مگر انہیں شکست ہوئی اور اہل ایمان غالب ہوئے جو صرف نصرت الٰہی کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد کافروں کو کبھی اپنی کثرت تعداد پر نازاں نہ ہونا چاہیے کیوں کہ خدا جب چاہے گا اپنی غیبی تائید سے اقلیت کو ان پر فتح دے دے گا جس کا مشاہدہ سب کو ہو چکا۔

''وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ ان سے دُونے ہیں'' اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ''وہ مشرکین ان سے یعنی مسلمانوں سے دُونے ہیں'' یہ واقعیت کا اظہار ہے کہ مشرکین کی تعداد ایک ہزار تھی اور مسلمانوں کی تین سو تیرہ تو وہ ان سے دُونے کیا تگنے سے بھی زیادہ تھے مگر اللہ

---

[1] ۔دلالۃ معجزۃ علی صدق محمد ﷺ (صافی) ای حجۃ ومعجزۃ (مجمع البیان)

[2] ۔آپس میں جٹ گئے (تاج العلماء)

[3] ۔اُن لوگوں کے لیے جو منہ پر آنکھیں رکھتے ہوں (تاج العلماء)

اپنی مدد سے جسے چاہتا ہے تقویت دیتا ہے۔اس صورت میں اعجاز کا تعلق باوجود قلت تعداد مسلمانوں کے اس فتح وغلبہ سے ہے۔

دوسرے یہ کہ مشرکین کی آنکھوں کو مسلمان ان سے دُونے نظر آرہے تھے حالانکہ وہ ان سے بہت کم تھے۔اس صورت میں اعجاز کا تعلق خود اس تاثر سے ہوگا اور بعد کا فتح وغلبہ مسلمانوں کا اس معجزہ کا نتیجہ قرار پائے گا[1]۔

علامہ بلاغی رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ ہے کہ مراد یہ ہے کہ مسلمان انہیں بس اپنے سے دُونا دیکھ رہے تھے حالاں کہ حقیقت میں وہ ان سے تگنے تھے دُونے نہ تھے مگر یہ حکمت الٰہی تھی کہ یہ انہیں جو ان کی اصل تعداد ہے اس کے مطابق محسوس نہ کریں تاکہ اہمیت ہار نہ جائیں اور پھر بھی اپنے سے کم یا برابر بھی نہ دیکھیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ان کی ہمت محسوس نہ کریں اور جنگ میں تساہل سے کام لیں (آلاء الرحمن)

علامہ نیشاپوری نے ''یَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ'' وہ ''انہیں ان سے دونا دیکھ رہے تھے'' اس میں یہ ''وْ'' ہ اور ''انہیں'' اور ''ان'' کی جو ایک دم تین ضمیریں ہیں ان کے مرجع کے لحاظ سے چار احتمال قرار دیے ہیں۔

پہلے کہ وہ یعنی کافر انہیں یعنی مسلمانوں کو اپنے سے دُونا یعنی دو ہزار محسوس کر رہے تھے۔اس طرح پہلی اور تیسری ضمیر مشرکین کی طرف اور بیچ کی ضمیر مسلمانوں کی طرف راجع ہے۔

دوسرے وہ یعنی مشرکین انہیں ان سے دُونا دیکھ رہے تھے یعنی مسلمان حقیقت میں تو تین سو تیرہ تھے مگر وہ انہیں چھ سو سے زیادہ نظر آرہے تھے تاکہ انہیں اپنی تعداد کی بہ نسبت بہت زیادہ کم محسوس نہ کریں۔اس طرح پہلی ضمیر مشرکین کی طرف اور بعد کی دونوں ضمیریں مسلمانوں کی طرف عائد ہیں۔

تیسرے یہ کہ مسلمان انہیں اپنے سے دُونا دیکھ رہے تھے (حالانکہ وہ تگنے تھے) یہ وہی احتمال ہے جسے علامہ بلاغیؒ نے تقویت دی ہے نیشاپوری نے اس کو مزید تقویت یوں دی ہے کہ دُونے تک کے مقابلہ کے لئے تو وہ اس آیت سے کہ:

فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٦٦﴾

اگر تم میں سو صبر کا جوہر رکھنے والے ہوں تو دوسو پر غالب آئیں اور اگر تم میں ہزار ہوں تو دو ہزار پر غالب ہوں اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، (انفال)

تیار ہو ہی چکے تھے لیکن وہ انہیں اپنے سے تگنا محسوس کر لیتے تو دہشت میں مبتلا ہو جاتے۔

ہمارے خیال میں اس توجیہ کے ساتھ یہ استشہاد اس لئے درست نہیں کہ اصل میں مطالبہ تو مسلمانوں سے دس گنے کے مقابلہ کا ہوا تھا چنانچہ علامہ نیشاپوری نے اگرچہ کہا یہ ہے کے مطالبہ ان سے دونے کا ہوا لیکن نادانستہ طور پر انہوں نے اس کے شاہد میں جو آیت پیش کی ہے وہ یہ کہ:-

اَلْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (انفال۔ ٦٥)

---

[1] ۔یر المشرکون المسلمین مثل عدد المشرکین (جلالین)

اگر تم میں بیس صبر کرنے والے ہوں تو دوسو پر غالب آئیں اور اگر تم سے سوایسے ہوں تو ایک ہزار کافروں پر غالب آئیں اس وجہ سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو دین کی سمجھ نہیں رکھتے۔

یہ تو ہم نے جناب نیشاپوری کی ترجمانی میں معقولیت پیدا کرنے کے لئے اس سے پہلے وہی آیت درج کی جس میں دونے کے مقابلہ کی دعوت ہے۔

پھر یہ کہ وہاں سیاق قرآنی یہ بتاتا ہے کہ دس گنے کے مقابلہ کی دعوت کے بعد کوئی معرکہ پیش آیا جس میں مسلمان ناکام ہوئے تب دو گنے مقابلہ کی دعوت دی گئی یہ کہہ کر کہ:-

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۔

اب اللہ نے تم سے تخفیف کردی اور معلوم ہوگیا کہ تم میں کمزوری ہے (انفال۔٦٦)

اور ظاہر ہے کہ معرکہ پہلا جو پیش آیا ہے وہ بدر ہی کا ہے تو اگر اس سے پہلے یہ دوسری آیت نازل ہوچکی ہوتی تو مسلمانوں کی کمزوری کا ظہور ہی کہاں ہوتا۔ لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ بدر کے پہلے جو مطالبہ تھا وہ تو دس گنے ہی سے مقابلہ کا تھا تو پھر وہ تگنا انہیں دیکھتے بھی تو انہیں ہمت نہیں ہارنا چاہئے تھی۔

چوتھا احتمال جسے خود انہوں نے رد کردیا ہے یہ ہے کہ وہ یعنی مسلمان انہیں یعنی مشرکین کو ان کی یعنی مشرکین ہی کی جو تعداد تھی اس سے بھی دونا دیکھ رہے تھے یعنی تھے تو وہ ایک ہزار مگر یہ انہیں دو ہزار محسوس کر رہے تھے۔

وہ کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہوسکتا اس لئے کہ یہ تو اور زیادہ خالق کی طرف سے مسلمانوں کو خوف زدہ کرنا ہوگا، کیوں کہ ایک ہزار ہوتے ہوئے واقعاً وہ مسلمانوں سے تگنے تھے ہی اب اللہ انہیں چھ گنا دکھلا کر اور دہشت زدہ کرے، آخر اس میں کیا معقولیت ہوسکتی ہے؟

میں کہتا ہوں کہ یہ تو اس وقت ہوگا جب اس دکھلانے کو اللہ کا عمل قرار دیا جائے مگر یہاں خالق نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ ہم ان کی تعداد انہیں دونی دکھا رہے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ مسلمانوں کی نفسیاتی حالت کا اظہار ہو کہ وہ یوں تو تھے ہی ان سے زیادہ مگر یہ انتہائی خوف و دہشت کی وجہ سے جتنے وہ تھے اس سے بھی دونا انہیں محسوس کر رہے تھے۔ اس کے باوجود یہ خالق کی تائید غیبی اور کچھ نفوس مطمئنہ کا عزم و ثبات تھا کہ اس نے انہیں کمی تعداد اور پھر اس نفسیاتی کیفیت کے باوجود فتح و نصرت عطا فرمائی۔

بہرحال ایسی آیتوں میں جو مفسرین کی بے بسی اور پریشانی نظر آتی ہے وہ بڑی شدت کے ساتھ حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰه کے نعرے کا کھوکھلا پن ظاہر کرتی ہے اور شارحین و معلمین کی ضرورت آفتاب نیم روز کے طور پر نمایاں ہوجاتی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ ذرائع کی کوتاہی یا تاریخی علل و اسباب سے حالات کی ناسازگاری کا نتیجہ ہو کہ حقیقی معلمین کی زبان سے اکثر آیات کی واضح تشریح ہم تک بھی نہ پہنچ سکی یا ہمارے راویوں کو ان کے دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا جس کی وجہ سے ہم بھی عملی طور پر اکثریت کے ساتھ صرف اپنی ذہنی کاوشوں ہی میں گرفتار ہیں اور معیّنطور پر ہم بھی نہیں کہہ سکتے کہ اصل مراد الٰہی اس محل پر کیا ہے؟

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ

الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

''لوگوں کے لئے دل آویز بنائی گئی ہے لذائذ نفس کی محبت جیسے عورتیں، بچے، سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے ذخیرے [۱] نشان لگائے ہوئے گھوڑے [۲] مویشی اور کھیتی باڑی یہ ہے اثاثہ اس دنیاوی زندگی کا اور انجام کی بہتری اللہ کے یہاں ہے۔''

محبت آل و مال بری چیز نہیں مگر فکر مآل مقدم:

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیوی ساز و سامان کی محبت بھی بجائے خود کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ وہ انسانی طبیعت کا ایک فطری تقاضا ہے [۳] مگر جب اس دنیوی مفاد اور آخرت کے مفاد میں تصادم ہو تو ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا بندہ آخرت کے مفاد کو دنیا پر ترجیح دے [۴]۔

اس صورت میں اس دل آویز بنانے کا فاعل اللہ کو بھی سمجھا جائے تو کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ فطرتِ انسانی میں ان چیزوں کی خواہش ودیعت کرنا اجتماعی کرنا اجتماعی اور تمدنی مفادات کے حصول کا ذریعہ ہے [۵]۔

ہاں اس دل آویزی سے اتنا مغلوب ہو جائے کہ آخرت کے مفاد کو نظر انداز کر دے یہ شیطانی کام ہوگا۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ۚ

''کہیے کہ کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتاؤں؟ جنہوں نے پرہیزگاری سے کام لیا، ان کے لئے ان کے پروردگار کے یہاں وہ بہشت ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور پاک و پاکیزہ بیویاں اور

---

[۱] ۔ چنے ہوئے توڑے اور سونے چاندی کے گچھے (تاج العلماء) القنطار صلة مسك نو ر ذهبا (صافی) جمع قنطار وهو المال الكثير العظيم (مجمع البیان)

[۲] ۔المعلّمة او المرعبة (صافی) دغيلے فاصون (تاج العلماء)

[۳] ۔هی ضرورية فينا لا علينا دفعها عن نفوسنا (مجمع البیان)

[۴] ۔هو تحريص علىٰ استبدال ما عنده من اللّذات الحقيقة الابدية بالشهوات المخدجة الفانية (صافی)

[۵] ۔لم يذكر فی هٰذه ما هو محرم العنوان ـــــ فلا مانع من ان يكون الله تبارك اسمه هو المزين (البلاغی)

بہت بڑی اللہ کی خوشنودی [1] اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے بندوں کا''

وہ دنیا کی نعمتیں بھی اگر بطور جائز ہوں تو اللہ کی رحمت کا مظہر ہیں مگر نعم الٰہیہ کے مراتب ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے انسانی رجحانات کے مراتب پیدا ہوتے ہیں [2]۔

ادنیٰ درجہ دنیوی نعمتوں کا ہے اور اس سے بالاتر جنت ہے جو نعم اخروی کا مجموعہ ہے اور ان سب سے بالاتر ہے رضائے الٰہی جس کے لئے دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ: ''اللہ کی ذرا سی بھی خوشنودی بڑی سے بڑی چیز ہے۔''

بلند ترین نفوس وہ ہیں جو جنت کو بھی مطمع نظر نہیں بناتے بلکہ اصل مقاصد رضائے خالق کو قرار دیتے ہیں پھر رضائے خالق کے نتیجہ میں جنت تو لازماً حاصل ہوئے گی اور بہت ممکن ہے وہ سب دنیوی نعمتیں بھی حاصل ہو جائیں لیکن چوں کہ اصل نصب العین رضائے خالق ہے لہٰذا جب بھی خدا کی خوشنودی ان دنیوی چیزوں کی قربانی سے وابستہ ہو جائے گی انسان اس کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کے لئے تیار رہے گا اور ذرا بھی قدم اس راہ سے پیچھے نہیں ہٹائے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ﴿۱۶﴾

''جن کا قول یہ ہے کہ ہمارے پروردگار! بلاشبہ ہم ایمان لائے اب تو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور بچا ہمیں آتش دوزخ کے عذاب سے۔''

موجودہ ترتیب آیات کے لحاظ سے یہ وصف ہے ان ''پرہیزگاروں'' کا جن کا ذکر اس کے قبل کی آیت میں آچکا ہے کہ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ [3] اس طرح یہ تصور بے بنیاد ثابت ہوتا ہے کہ اس مقام پر صرف ایمان کو دعا میں پیش کرنا بتاتا ہے کہ فلاح آخرت کے لئے ایمان کافی ہے۔ اگر عمل صالح بھی جزء لازم ہوتا تو اس کا بھی ایمان کے ساتھ اس دعا میں ذکر ہوتا [4]۔

یہ تصور اس لئے غلط ہے کہ ان کے حسن عمل کا ثبوت تو خالق نے خود ''الصّٰبِرِيْنَ'' کے لفظ سے دے ہی دیا ہے مگر چوں کہ اعمال کی صحت وقبولیت کے لئے ایمان شرط لازم ہے اس لئے اعمال خیر کی پابندی کے ہوتے ہوئے وہ قبولیت کی دعا کیلئے اپنے ایمان کو پیش کر رہے ہیں اور اگر ایمان کے ساتھ بر بنائے اعمال استحقاق عذاب ہوتا ہی نہ تو وہ اپنے ایمان کو پیش کرنے کے ساتھ مغفرت ذنوب اور پھر عذاب النار سے بچائے جانے کی دعا ہی کیوں کرتے؟

ظاہر ہے کہ ''ذنوب'' سے عملی کوتاہیاں ہی مراد ہیں جن کی مغفرت کی ایمان کے ساتھ گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ بغیر ایمان نہیں۔

---

[1] ۔ای رضیٌ کبیر (جلالین)

[2] ۔قیل قد نبّہ بھذہ الایۃ علیٰ مراتب نعمہ فادناھا متاع الدنیا واعلاھا رضوان اللہ ـــــ واوسطھا الجنۃ ونعیمھا (صافی)

[3] ۔وصف المتقین الذین سبق ذکرھم (مجمع البیان) بیان الصفات الذین اتقوا (البلاغی)

[4] ۔توسّلوا بمجرد الایمان الیٰ طلب المغفرۃ (نیشاپوری)

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

''جو صبر کرنے والے [۱] ہیں اور راست باز ہیں اور اطاعت گزار [۲] ہیں اور جو خیرات کرنے والے ہیں اور راتوں کو پچھلے پہر مغفرت کی دعائیں کرنے والے ہیں۔''

سحر خیزی کی تعریف:

''سحر خیزی'' بڑا ممدوح وصف ہے اور اس وقت نماز تہجد بڑی خاص عبادت ہے اور اس وقت کے استغفار میں توجہ قلبی بدرجۂ اتم حاصل ہونے کی وجہ سے قبولیت کا اور پھر مظاہرہ عبودیت کے خلوص کی وجہ سے بھی مراحم ربانی کے مورد ہونے کا زیادہ امکان ہے [۳]۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

''گواہی دی ہے اللہ نے کہ سوا اُس کے کوئی خدا نہیں اور فرشتوں نے اور صاحبان علم نے اس صورت سے کہ وہ پوری پوری عدالت کے ساتھ برقرار ہے کوئی خدا نہیں سوا اس کے کہ جو زبردست ہے، ٹھیک ٹھیک کام کرنے والا''

اوصاف الٰہی میں وحدت کے ساتھ عدل کی اہمیت:

''اللہ نے اس کی گواہی دی ہے'' یعنی اپنے تجلیات قدرت سے خود اس نے اس کا ثبوت پیش کیا ہے [۴] اور آیات حکمت سے اس کے دلائل کو خلق کے ذہن نشین کیا [۵]۔

''اور فرشتوں نے گواہی دی'' یہ بھی ان کارگزاریوں کے ساتھ جنہیں یہ حکم الٰہی وہ نظم عالم میں انجام دیتے ہیں جن کا مظہر آثار قدرت ہیں اور ان کلام الٰہی کی آیتوں کے ساتھ بھی جو ان کے ذریعہ سے انبیاء پر نازل ہوئیں [۶]۔

اور اہل علم یہ انبیاء و اولیائے الٰہی اور راسخ الاعتقاد اہل ایمان ہیں جن کی گواہی اپنے اقوال سے بھی ہے اور اپنے اعمال اور

---

[۱] ۔جھیل جانے والے (تاج العلماء)

[۲] ۔قبل المطیعین اللہ قتادۃ وقیل الدائمین علی الطاعۃ والعبادۃ عن الزجاج وقیل القائمین بالوجبات عن القاضی (مجمع البیان)

[۳] ۔قیل تخصیص الاسحار لان الدعاء فیھا اقرب الی الاجابۃ لان العبادۃ اشق والنفس امضیٰ والروع اجمع (صافی) وبعدھا عن مداخلۃ الرّیاء (البلاغی)

[۴] ۔گواہی دادیعنی آشکارا ساخت (شاہ ولی اللہ) بین لخلقہ بالدلائل والآیات (جلالین)

[۵] ۔بین وحدانیۃ لقوم بظھورہ فی کل شئی ــــــ ولقوم بنصب الدلائل ــــــ ولقوم بانزال الایات الناطقۃ بھا (صافی)

[۶] ۔الملٰئکۃ بالاقرار ذاتا لقوم وفعلا لقوم وقولا لقوم (صافی)

ثبات واستقلال کے مظاہرات اور اس کی راہ میں قربانیوں سے بھی [1]۔

لا الہ الا ھو توحید الٰہی کا اعلان ہے اور شھد اللہ کا جملہ اپنے شاہدین اللہ، ملائکہ اور اولوالعلم اور مشہور دبہ یعنی جس کی گواہی دی جارہی ہے اس کے ذکر کے ساتھ کہ لا الہ الا ھو بظاھر اولوالعلم پر ختم ہوگیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ، ملائکہ اور صاحبان علم اس کے گواہ ہیں کہ سوا اس کے کوئی خدا نہیں مگر متکلم قرآنی نے اس جملہ کے ساتھ اضافہ ضروری سمجھا کہ قائما بالقسط اس صورت سے کہ وہ یعنی خدا پوری پوری عدالت کے ساتھ قائم ہے [2]۔

توحید کے ساتھ عدل اصول دین کا لازمی جزء:

اس سے ظاہر ہے کہ توحید کے ساتھ عدل اصول دین کا لازمی جزء ہے اور ان دونوں چیزوں کو پھر تتمۂ آیت میں دہرادیا۔ توحید کو لا الہ الا ھو کے لفظوں کے ساتھ اور قائما بالقسط کو العزیز الحکیم کے لفظوں میں اس لئے کہ حکمت مطلقہ ربانی عدالت کے ساتھ دست وگریبان ہے۔ جو عدل کو اس کے لئے ضروری نہ سمجھے وہ پھر حکمت مطلقہ کا بھی عمومی طور پر قائل نہیں ہوسکتا۔

عام طور سے قسط کا ترجمہ عدالت ہی کے ساتھ کیا جاتا ہے [3] مگر علامۂ بلاغیؒ نے لفظی اور معنوی دلائل وشواہد سے ثابت کیا ہے کہ قسط عدالت کے بالکل ہم معنی نہیں ہے بلکہ اس کا عالم سطح سے بالاتر مرتبہ ہے جیسے ظلم و جور بالکل مترادف نہیں ہیں بلکہ جور کا درجہ ظلم سے کچھ شدید تر ہے۔ حضرت امام مہدی علیہ السلام کے متعلق فریقین کے احادیث میں متواتر یہ جملہ آیا ہے کہ: یملأ الارض قسطا و عدلا کما ملئت ظلما و جورا اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ عدل جور کے مقابل میں ہے اور قسط ظلم کے مقابلہ میں ہے اور سورہ حجرات میں ہے: فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ''صلح کرو عدالت کے ساتھ اور قسط سے کام لو''۔ یہاں عدالت کے بعد پھر قسط کا حکم ہے اسی بناء پر ہم نے اس کا ترجمہ'' پوری پوری عدالت'' کے ساتھ کیا ہے۔

علامہ نیشاپوری نے قائما کی ترکیب نحوی میں کئی احتمال درج کرتے ہوئے اسے اَوجَہ (زیادہ مناسب) قرار دیا ہے کہ وہ لا الہ الا ھو میں جو ضمیر ھُو کی ہے! اس کا حال ہے جو اس کے معنی میں زور پیدا کرنے کے لئے آیا ہے وہ کہتے ہیں:-

لیکون الالھیۃ والتفرد بھا مقتضیا للعدالۃ۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی خدائی اور وحدانیت بذات خود عدالت کی متقاضی ہے۔

پھر اس پر حقیقت پسندانہ بحث کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

اعلم انّ وجوب الوجود یلزمہ الغنی المطلق والعلم التام والفیض العام والحکمۃ الکاملۃ ورحمۃ الشاملۃ وعدم الانقسام بجھۃ من الجھات وعدم الاقتصار بوجہ من الوجوہ الیٰ شئ من الاشیاء وعدم التقض والنقص فی شئ من الافعال والاحکام الیٰ غیر ذلك من الاسماء الحسنیٰ والتصفات العلیا ومرکوز فی العقل؛

---

[1] ۔فی العیاشی عن الباقر علیہ السلام انّ اولی العلم الانبیاء والاوصیاء (صافی)

[2] ۔انصاف کی بنیاد قائم کرنے والا ہے (تاج العلماء)

[3] ۔بالقسط ای بالعدل (جلالین) القسط العدل الذی قامت بہ السّمٰوٰت والارض (مجمع البیان)

لتسليم من هذا شانه لا يصدر منه شئ الاعلىٰ وفق العدالة وقضيّة السّوية ورعاية الاصلح عموما او خصوصا فكل ما يخيل الى المكلّف انه خارج عن قانون العدالة او يشبه الجور والقبيح وجب ان ينسب ذلك الىٰ قصور فهم وعدم احاطته التامة بسلسلة الاسباب والمُسببات والمبادى والغايات.

معلوم ہونا چاہیے کہ واجب الوجود ہونے کا لازمہ ہے مطلق استغناء اور کامل علم اور ہمہ گیر فیض اور پوری پوری سوجھ بوجھ اور عمومی رحمت اور کسی رخ سے بھی اس کی تقسیم کا ممکن نہ ہونا اور کسی حیثیت سے بھی اس کا محتاج نہ ہونا کسی بھی چیز کی طرف اور اس کے افعال اور احکام میں تضاد اور کسی کمی کا نہ ہونا اور اس کے علاوہ جتنے اس کے اسماء حسنیٰ اور بلند صفات ہیں سب (ذات سے الگ نہیں ہیں بلکہ خود اس کے واجب الوجود ہونے کے لازمی تقاضے ہیں) اور عقل سلیم میں یہ بات راسخ ہے کہ جو اس شان کی ذات ہو اس سے کوئی شے ایسی نہیں ہوسکتی جو عدالت اور مساوات اور زیادہ سے زیادہ مصلحت کے لحاظ سے نہ ہو خواہ وہ مصلحت عمومی ہو یا کسی موقع خاص سے تعلق رکھتی ہو تو اگر انسان کو وسوسہ بھی پیدا ہو اور ایسا خیال ہو اس کے کسی کام میں کہ وہ عدالت کے خلاف ہے یا ظلم وستم یا برائی سے ملتا جلتا ہوا ہے تو اسے اپنی سمجھ کا پھیر قرار دے اور یہ کہ وہ اسباب اور ذرائع اور نتائج کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہے۔ اس لئے اس کو ایسا غلط تصور ہو رہا ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ ایسے ہی غلط تصورات کو ختم کرنے کے لئے فرقہ شیعہ نے توحید کے ساتھ ساتھ عدل کو صراحۃً اصول دین میں درج کرنا ضروری سمجھا ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۱۹

”بلاشبہ حقیقی دین [1] اللہ کے نزدیک اسلام ہے اور جنہیں کتاب ملی تھی انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اپنے پاس علم آجانے کے بعد صرف اپنے درمیان پھیلی ہوئی ناحق کوشی سے [2] اور جس نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا تو بلاشبہ اللہ بڑی تیزی سے حساب لینے والا ہے۔“

اصل دین صرف اسلام:

یہ ”ناحق کوشی“ جان بوجھ کر صرف حسد وعداوت کی بناء پر تھی [3] جیسے مشرکین کو یہ تعصب تھا کہ یہ قرآن کسی امیر اور صاحب دولت پر کیوں نہ اترا اور بنی اسرائیل کو یہ کہ یہ منصب اولاد اسماعیلؑ میں کیوں چلا گیا؟

---

[1] ۔الدین المرضی (جلالین) دین معتبر (شاہ ولی اللہ) لا دین مرضی عند اللہ سوی الاسلام (صافی)

[2] ۔بغیا حاصلا بینھم علی الحق وتمردا علیٰ ما یعلمون (البلاغی)

[3] ۔حسدا وطلبا للریاسۃ (صافی) محض آپس کے بیر کی وجہ سے (تاج العلماء)

گزشتہ آیت کے ربط سے علامہ نیشاپوری نے اس آیت کے تحت میں جو مفہوم لکھا ہے وہ بھی مسلمانوں کی کثرت کے لئے سرمہ چشم ہونا چاہیے وہ لکھتے ہیں:۔

فیه ایذان بان الدین هو العدل والتوحید اضار التوحید فان یعلم ان الله تعالٰی لاشریك له ولا نظیر فی الذات ولا فی صفة من الصفات کما شهد هو به واما العدل فهو ان یعلم ان کل ما خلق وامر المکلف به ونهاه عنه فانه عدل وصواب وفیه حکم ومصالح۔

اس سے اس بات پر روشنی پڑی ہے کہ اصل دین عدل اور توحید ہی ہے۔توحید یہ ہے کہ یہ یقین کر کے کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے اور نظیر نہیں نہ ذات میں اور نہ صفات میں جس کی گواہی اس نے خود دی ہے اور عدل یہ ہے کہ وہ یقین کرے کہ جو کچھ اللہ نے پیدا کیا اور جو اس نے اوامر اور نواہی جاری کیے سب عین مقتضائے عدالت اقر درست ہیں اور ان میں حکمتیں اور مصلحتیں پائی جاتی ہیں۔

وہ فرماتے ہیں کہ پہلے جو کہا گیا کہ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ جس میں دو جزء پھیلا کر رکھے گئے تھے کہ اللہ کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور وہ عدالت کے ساتھ قائم ہے اب ان دونوں جزوں کو سمیٹ کر یوں کہہ دیا گیا کہ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی گواہی یہ ہے کہ اصل دین صحیح اسلام ہے یعنی وہی توحید و عدل کا اقرار جو پہلی گواہی میں صراحۃ بیان ہوا تھا[1]۔

اب اس کے بعد ہر شخص یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ عدل بھی مثل توحید کے ''اصول دین'' میں داخل ہوا یا نہیں:

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

''اب اگر وہ لوگ آپ سے کٹھ حجتی کریں تو آپ یہ کہہ دیجئے کہ میں نے تو سر اسر اپنے کو سپرد کر دیا ہے اللہ کے[2] اور انہوں نے بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے اور کہیے ان سے جنہیں کتاب ملی اور جو کسی کتاب کے پڑھنے والے نہیں ہیں[3] کہ کیا تم نے بھی اسلام اختیار کیا تو اگر وہ بھی اسلام کا اقرار کر لیں تو ٹھیک راستہ پا گئے اور اگر انہوں نے منہ پھرا تو آپ کا فرض تو بس پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کا دیکھنے والا ہے۔''

حقیقت اسلام:

---

[1] ۔غرائب القرآن

[2] ۔معنی وجهی نفسی (مجمع البیان) انقدت له انا (جلالین)

[3] ۔ای الذین لا کتاب لهم (مجمع البیان) اَن پڑھ کہتے تھے عرب کے لوگوں کو کہ ان کے پاس اگلے پیغمبروں کا علم نہ تھا (موضح القرآن)

اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ کے لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ اپنے منہ کو حوالے کر دیا ہے اللہ کے مگر یہ محاورہ کے طور پر ہے۔ مراد اس سے ہوتا ہے کہ اپنے کو بالکل حوالے کرنا۔ چوں کہ منہ کو خصوصیت حاصل ہے اس لئے عرب محاورہ میں اس کا نام لیا جاتا ہے [1] اور محاوروں کے ترجمہ میں لفظی ترجمہ کرنا غلط ہوتا ہے۔ اس لئے ہم نے ''سراسر اپنے کو'' حوالے کرنے سے ترجمہ کیا ہے۔

اس میں اسلام کے پیغام کی اصل حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ ''اسلام'' کوئی اعزازی لقب نہیں ہے۔ بلکہ ایک وصف ہے جو اس کے معنی لغوی کی مطابقت سے ہے یعنی اپنے کو بالکل اللہ کے سپرد کر دینا۔

اگر یہ چیز مسلمانوں کے پیش نظر رہے تو اقتدار و اختیار الٰہی کے مقابلہ میں ''جمہوریت'' وغیرہ کا نام لینا بالکل غلط سمجھیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾

''جو لوگ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کا ناحق قتل کرتے اور انہیں کہ جو انصاف کی ہدایت کریں قتل کرتے ہیں انہیں دردناک عذاب کا مژدہ سناؤ۔''

''مژدہ'' کیا لفظ طنزیہ انداز میں ہے چوں کہ دنیا میں وہ اپنے کو بڑا کامیاب سمجھتے تھے تو جو کامیابی انہیں حاصل ہو رہی ہے وہ ان کے سامنے پیش کرو [2]۔

یہ ''مژدہ'' کن کے لئے ہے؟ ان کے لئے ہے جو پیغمبروں کو قتل کریں اور انہیں قتل کریں کہ جو انصاف کی ہدایت یعنی نیک کاموں کی تبلیغ کرتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ انبیاء کے قتل کا جیسا گناہ ہے ویسا ہی نیک راستوں پر چلنے کی تحریک کرنے والوں کے قاتل کا گناہ ہے [3] چاہے یہ قاتل اسلام کا نام اختیار کیے ہوئے اور مسلمانوں کے بھیس میں ہوں اور بالکل ایک ہی طرح کا عذاب ہے جس کی متحدہ الفاظ میں دونوں کو خبر دی گئی ہے۔

قرآن کے اس اعلان کو پیش نظر رکھا جائے تو یزید اور ابن زیادہ وغیرہ کے لئے پر بنائے نام اسلام جو مغفرت کے پہلو تلاش کیے جاتے ہیں کی قرآن کے اس اعلان کے بعد کوئی گنجائش محسوس نہ ہو۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

---

[1] ۔اضاف الاسلام الیٰ لوجہ لان وجہ الشئی اشرف ما فیہ (مجمع البیان)

[2] ۔ انما قال بشر هم علیٰ طریق الاتساع والا ستعارة والبشارة تکون فی الخیر دون الشر لان ذلك لهم مکان البشارة للمؤمنین (مجمع البیان)

[3] ۔عن الحسن ان فی الآیة دلالة علیٰ ان الامر بالمعروف والناهی عن المنکر یعنی منزلة عند الله منزلة الانبیاء فلهٰذا ذکرهم عقبهم وروی ان رجلا قام الیٰ رسول اللہ ﷺ فقال ای الجهاد افضل فقال افضل الجهاد کلمة حق عند سلطان جائر (نیشاپوری)

''یہ وہ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں اکارت ہو گئے اور ان کے مددگار کوئی نہیں ہیں [1]۔

''اکارت'' ہونے کا تعلق ایسے ہی افعال سے ہوسکتا ہے جو اگر صحیح طور پر وقوع میں آئیں تو ان سے دنیا میں مدح و ثناء اور آخرت میں جزاء و ثواب کا استحقاق ہوگا۔ وہ مورد آیت میں نمایاں طور پر یہ ہے کہ یہ لوگ اہل کتاب تھے جو کچھ سچے انبیاء کے ماننے والے تھے اور ظاہر ہے کہ ان انبیا پر ایمان اور ان کی تعلیمات پر عمل اگر صحیح طریقہ سے ہوتا تو وہ دنیا و آخرت میں سعادت کا باعث ہونا ہی چاہیے [2]۔

نیز خیرات ایثار اور رفاہ عام کے جو کام جو غیر مذاہب کے لوگ اکثر انجام دیتے ہیں [3]۔

مگر وہ اول تو ان انبیاء کے اصل تعلیمات سے دور ہو کر ایمان و عمل کے صحیح معیار پر قائم نہ رہے اور دوسرے بعد میں آنے والے سچے نبی حضرت خاتم الانبیاء کی رسالت کے منکر ہو کر کفار میں داخل ہو گئے اور ایمان صحیح کے جو ہر سے جو صحت اعمال کی بھی شرط ہے محروم ہو گئے۔ اس لئے اب ان کا وہ ایمان بھی جو گزشتہ انبیاء اور کتب پر تھا نتیجہ خیز نہ رہا اور عبادات و اعمال کا بھی کوئی حاصل نہ رہا یہی ہے جسے قرآن مجید نے کہا ہے: حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ یعنی ان کے اعمال اکارت ہو گئے [4]۔

دنیا میں اس طرح اکارت گئے کہ وہ کسی تعریف اور نیک نامی کے مستحق نہ ہوئے اور نہ ان دنیوی مفادات ہی برقرار رہے [5] اور آخرت میں اس لئے کہ ان پر کوئی ثواب نہ ملا بلکہ وہ مبتلائے عذاب ابدی ہوئے [6]۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا انہیں جن کو کتاب کا کچھ علم ملا ہے [7] کہ انہیں دعوت دی جاتی ہے اللہ کی کتاب کی طرف کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے۔ اس پر ایک بڑا گروہ ان میں کا بے اعتنائی کرتے ہوئے روگردانی اختیار کر لیتا ہے۔''

یہ یہود کا ذکر ہے اور کتاب سے مراد یہاں توریت ہے اور یہ کہ انہیں کتاب کا کچھ علم ملا ہے اس لئے کہا گیا ہے کہ اب جو کتاب ان کے پاس موجود تھی اس میں بڑی آمیزش تھی لیکن کچھ حصہ پاشاں طریقہ پر اصل کتاب الٰہی کا بھی موجود ہے [8] وہ بھی بہت سے حقائق کا حامل ہے اور

---

[1] ۔نہیں ہیں ان کے لئے حمایتی (تاج العلماء)

[2] ۔یرید باعمالهم ماهم علیه من اذعائهم التمسك بالتورته واقامة شریعة موسیٰ (مجمع البیان)

[3] ۔اعمالهم التی فیها حسن کالاحسان الی الفقه والمعانی ونحو ذلك (البلاغی)

[4] ۔حبوط العمل عبارة عن وقوعه علیٰ خلاف الوجه الذی یستحق علیه الثواب (مجمع)

[5] ۔اذلم ینالوا بها المدح والنساء ولم تحقن وصائهم واموالهم (صافی)

[6] ۔اذلم یستحقوا بها مثوبه فصارت کان لم تکن (مجمع)

[7] ۔دادہ شدہ اند یک پارۂ از علم کتاب (شاہ ولی اللہ) ایک جرگہ (تاج العلماء)

[8] ۔کانوا یعلمون بعض ما فیه (مجمع البیان) ان التورته والانجیل قد حرّفا وبدلا فی اکثرهما (البلاغی)

حجت تمام ہونے کے لئے کافی ہے۔لہٰذا انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی کتاب ہی کی رو سے رسالت مآب ﷺ کی رسالت اور ان کے پیغام پر غور کرلیں مگر وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوتے اور روگردانی اختیار کرتے ہیں۔

بعض روایات میں شان نزول یہ وارد ہوئی ہے کہ دو یہود کا مقدمہ جو زنا کے مرتکب ہوئے تھے رسولؐ کے سامنے پیش ہوا اور آپ نے شریعت موسوی کے مطابق ان کو سزا دینا چاہی تو وہ بگڑ کر چلے گئے۔اسی کا اس آیت میں ذکر ہے [1]۔

بعض دوسری روایات میں ہے کہ حضرتؐ نے ایک جماعت کو یہود میں سے دین حق کی دعوت دی تو انہوں نے پوچھا آپ کس دین پر ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا ''ملت ابراہیمی پر'' انہوں نے کہا ابراہیمؑ تو خود یہودی تھے۔آپ نے فرمایا کہ توریت لے آؤ، اس سے اس کا فیصلہ ہوجائے مگر انہوں نے اس سے انکار کیا [2]۔

ان دونوں روایتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ''انہیں دعوت دی جاتی ہے اللہ کی کتاب کی طرف'' اس میں کتاب سے توریت مراد ہے مگر علامہ بلاغیؒ کو اس سے اختلاف ہے۔وہ ان روایتوں کو نا قابل قبول قرار دیتے ہیں، اس بناء پر کہ توریت جب کہ تحریف شدہ ہے تو پیغمبر خداؐ اس کی طرف کیوں کر دعوت دے سکتے تھے؟ پھر یہ کہ اس توریت میں وہ باتیں ہیں بھی نہیں جن کے لئے ان روایتوں میں بطور استشہاد اس کی طرف دعوت کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے ان کا خیال ہے کہ کتاب اللہ سے مراد اس جملہ میں قرآن ہے جس کی حقانیت خود ان کی کتابوں سے ثابت تھی [3]۔

جناب ابن عباسؓ کی روایت سے علامہ بلاغیؒ کی تائید ہوتی ہے [4]۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

''یہ اس وجہ سے ہے کہ ان کا قول یہ رہا ہے کہ ہمیں تو آتش جہنم چھوئے گی بھی نہیں سوا چند گنتی کے دنوں کے اور جو انہوں نے جھوٹ بنا رکھے تھے انہوں نے ان کو دین کے بارے میں مبتلائے غفلت کر رکھا ہے'' [5]۔

یہود کے اس مزعومہ کا ذکر پہلے پارے میں ہو چکا ہے۔

''جو انہوں نے جھوٹ بنا رکھے ہیں'' ان میں سے ایک تو یہی کہ ہمیں بس اتنے دن سزا ملے گی جتنے دن ہمارے بزرگوں نے گوسالہ پرستی کی۔ اس کے علاوہ یہ کہ ہمارے آباؤ اجداد جو تمام انبیاء مرسلین کی حیثیت رکھتے ہیں وہ ہمارے بچانے کے لئے کافی ہیں یا جیسے نصاریٰ نے یہ تصور کیا کہ مسیحؑ سولی پر چڑھ گئے تو بس ہمارے گناہوں کا کفارہ ہوگئے اور انہوں نے ہمیشہ کے واسطے عذاب سے چھٹکارا دے دیا غرض ایسی ہی

---

[1] ۔جلالین و مجمع البیان بحوالہ ابن عباسؓ

[2] ۔صافی ملا محسن فیض کاشانیؒ

[3] ۔هو القرآن الذی قامت علیهم الحجّة بانه کتاب الله بدلائل اعجازه وبشری کتبهم (البلاغی)

[4] ۔عن ابن عباس رضی اللہ عنہ انه القرآن ولیس ببعید لانهم دعوا الیه بعد قیام الحجج علیٰ انه کتاب من عند الله (نیشاپوری)

[5] ۔مغرور کر دیا تھا (تاج العلماء)

غلط اندیشیاں جو جزاؤ سزا کی اہمیت کو کم کریں [1]۔

اب اگر مسلمان سب یا ان میں سے کوئی طبقہ اس قسم کے تصورات قائم کر لے تو جو بات قرآن نے ان یہود و نصاریٰ کے بارے میں کہی ہے وہی ان کے بارے میں صادق آئے گی۔

اصل اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو فرائض کا احساس اور سزائے اخروی کا اندیشہ قائم رکھنا چاہیے اور کسی ایسے غلط تصور کو ذہن میں جگہ نہیں دینا چاہتے جو انسان کا محاسبہ الٰہی سے غافل بنا دے۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۖ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾

''اس کے بعد کیا ہوگا [2] اس وقت جب ہم انہیں اکٹھا کریں گے اس دن کے لئے جس میں کوئی شبہ نہیں اور ہر ایک کو جو کچھ اس نے کمایا ہے پورا پورا ادا کر دیا جائے گا اور ان پر کچھ بھی ظلم نہیں ہوگا۔''

یعنی یہاں یہ ان مزعومات سے دل بہلا لیں مگر جب قیامت کا دن آ جائے گا اور حساب کا وقت سامنے ہوگا تو اس دن یہ خیالات ان کے کچھ کام نہ آئیں گے۔

''جب ہم اکٹھا کریں گے اس دن کے لئے'' بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں لام کے معنی فی کے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ ''جب ہم اکٹھا کریں گے اس دن'' [3]۔

مگر علامہ طبرسیؒ اس سے متفق نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دن جمع کریں گے اس سے یہ معنی پیدا نہیں ہوتے کہ اس دن کسی خاص ضرورت سے جمع کیا جا رہا ہے مگر ''اکٹھا کریں گے اس دن کے لئے'' اس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ اس دن کوئی خاص اہم مقصد ہے جس کے لئے اکٹھا کرنا ضروری ہے اور وہ اس مقام پر جزاء و سزا جو بمقتضائے عدل لازم ہے [4]۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۚ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٦﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۚ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ

---

[1] ۔عن ان النار لن تمسّهم الّا ایّاما تلائل وان اٰباءهم الانبیاء یشفعون لهم او انه تعالیٰ وعد یعقوب ان لا یعذب اولادہ (صافی) قولهم نحن ابناءہ واحباءہ عن قتادۃ (مجمع البیان)

[2] ۔کیا حال ہوگا (تاج العلماء)

[3] ۔لیوم ای فی یوم (جلالین)

[4] ۔ای الجزاء لیوم ــــــ ولو قال جمعناهم فی یوم لم یدل علی الجزاء واللام یدل علیٰ ذلك (مجمع البیان)

وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

''کہو اے خدا، سلطنت کے مالک! جسے تو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت سلب کر لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تو عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت نصیب کرتا ہے تیرے قبضہ میں بھلائی ہے بلاشبہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو جاندار کو نکالتا ہے بے جان سے اور بے جان کو نکالتا ہے جان دار سے اور جسے چاہتا ہے بے سان وگمان کے روزی عطا کرتا ہے۔''

نیرنگ زمانہ سے اللہ کی قدرت کا ظہور:

دن رات میں داخل کرنا اور رات کا دن میں داخل کرنا محسوس طریقہ پر گرمی اور جاڑے میں رات اور دن کی زیادتی کمی کی شکل میں سامنے آتا ہے [1] مگر اس کا تذکرہ یہاں انقلابات روزگار کی طرف ذہن کو منتقل کرنے کے لئے ہے جیسے ہماری زبان میں بھی ایک محاورہ یہ ہے کہ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں وہی مفہوم یہاں بھی ان الفاظ سے برآمد ہوتا ہے۔

''جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے نکالنا ہے'' اس کا ایک محسوس مشاہدہ ہے انڈے کا برآمد ہونا طائر سے اور طائر کے بچہ کا نکالنا انڈے سے اور جاندار کا پیدا ہونا نطفہ سے اور نطفہ کا باہر آنا جاندار سے اور اس کی تشریح احادیث میں ہوئی ہے کہ کافر کی اولاد میں سے مومن نکل آتا ہے اور کبھی مومن کی اولاد میں کافر پیدا ہو جاتا ہے [2]۔

نظم قرآنی کو مرضی الٰہی کے مطابق سمجھنے والے جو آیات میں ربط قائم کرتے ہیں انہوں نے ان آیات کا تعلق گزشتہ آیات سے قائم کرنے کے لئے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ:

''یہود جانتے ہیں کہ جو اول ہم میں بزرگی تھی وہی ہمیشہ رہے گی اللہ کی قدرت سے غافل ہیں۔ وہ جس کو چاہیے عزیز کرے اور سلطنت دیوے جس کو چاہیے چھین لیوے اور ذلیل کرے اور جاہلوں سے کامل پیدا کرے اور کاملوں سے جاہل اور جس کو دیا ہے رزق بے حساب دیوے'' (موضح القرآن)

ہم ترتیب قرآن کے مطابق تنزیل نہ ہونے کی بناء پر یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیتیں یہود سے تعلق رکھتی ہیں بہرحال ان الفاظ کے عام مفہوم کے تحت میں بھی یہود کے لئے جو نتیجہ برآمد کیا گیا ہے وہ درست ہے۔

اللہ کی جانب سے سلطنت عطا ہونے کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ وہ کسی کو اہل جانتے ہوئے اپنی جانب سے سلطنت کا حق دار قرار دے اس طرح کا عطائے ملک اس کی جانب سے انبیاء ومرسلین اور ائمہ دین کے لئے ہوتا ہے اس معنی سے اس جملہ کا استعمال قرآن مجید میں طالوت کے واقعہ میں ہوا ہے جب قوم نے کہا:

---

[1] ۔ای تنقص من اللیل وتجعل ذٰلك النقصان زیادة فی النهار وتنقص من النهار وتجعل ذٰلك النقصان زیادة فی اللیل (صافی)

[2] ۔روی ذلك عن ابی جعفر علیہ السلام وابی عبداللہ علیہ السلام (مجمع البیان) وفی المعانی عن الصادق علیہ السلام ان المؤمن اذا مات لم یکن میتا وان المیت هو الکافر ثم فسّر الایت بما ذکر (صافی)

اَنّٰی یَکُوْنُ لَہُ الْمُلْکُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْکِ مِنْہُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَۃً مِّنَ الْمَالِ ط

اسے ہم پر سلطنت کا حق کہاں سے ہوسکتا ہے حالانکہ ہم اس سے زیادہ سلطنت کے حق دار ہیں اور اسے مال میں وسعت تو ملی ہی نہیں ہے (بقرہ:۲۴۷)

تو نبیؑ نے جواب دیا:

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ط وَاللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ ط

بلاشبہ اللہ نے اسے تم پر برگزیدہ کیا ہے اور اسے علم اور جسمانی طاقت میں زیادتی دی ہے اور اللہ اپنی طرف کی سلطنت جسے چاہے دیتا ہے۔

اس عطائے ملک کا لازمہ ہے کہ حقانیت مگر اس کے ساتھ یہ ضروری نہیں کہ قوم سر تسلیم خم کردے جیسا کہ قصہ طالوت میں باوجود یہ کہ اللہ نے حاکم بنا دیا تھا پھر بھی قوم نے تو پہلے اس کی تسلیم ہی کرنے میں چون و چرا کی اور پھر بادل ناخواستہ اس فوج میں شامل بھی ہوئے تو اطاعت نہیں کی بلکہ عدول حکمی سے کام لیا۔

دوسرے معنی عطائے سلطنت کے یہ ہیں کہ عالم اسباب کے نظام کے ماتحت اپنی تدابیر یا کچھ لوگوں کی منصوبہ سازی یا قوم کے انتخاب یا قہر وغلبہ سے کوئی بادشاہ بن جائے اور خالق اپنی قوت قاہرہ کو اس کے حصول میں سدراہ نہ کرے۔ اس طرح کے عطائے سلطنت سے حقانیت ثابت نہیں ہوتی چنانچہ اس طرح عطاء کی اضافت قرآن مجید میں فرعون کے لئے بھی آئی ہے جب حضرت موسیٰؑ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا:

رَبَّنَآ اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَہٗ زِیْنَۃً وَّاَمْوَالًا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا

پروردگارا! تو نے فرعون اور اس کے ارکان وعمائد سلطنت کو اپنی طرف سے سامان آرائش اور بڑے اموال اس دنیوی زندگی میں عطا کیے ہیں (یونس۔۸۸)

اور اکثر مفسرین کی تفسیر کے مطابق نمرود کے لئے بھی:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ

کیا تم نے نہیں دیکھا اسے جس نے ابراہیمؑ سے ان کے پروردگار کے بارے میں بحث وتکرار کی اس بناء پر کہ اللہ نے اسے سلطنت دے رکھی تھی (بقرہ:۲۵۸)

یہاں عطاء کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ نے فرعون اور نمرود کو اس منصب پر مقرر کیا تھا بلکہ یہی ہیں کہ اس نے اپنی قدرت وطاقت کے باوجود ان کے حصول اقتدار میں رکاوٹ پیدا نہیں کی۔

یہاں بظاہر اس جملہ سے کہ جسے تو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت سلب کر لیتا ہے اسی معنی کا عطائے سلطنت مراد ہے اور اس صورت میں عزت اور ذلت سے مراد بھی دنیوی اسباب عزت وذلت کا حاصل ہونا ہے۔ کیوں کہ حقیقی عزت حالات دنیا سے وابستہ نہیں بلکہ صفات شخصی سے وابستہ ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ.

عزت بس اللہ کے لئے ہے اور اس کے پیغمبر کے لئے اور صاحبان ایمان وعلم کے لئے (منافقون۔۸)

انقلابات زمانہ کی آئینہ بردار جو عزت وذلت ہے پہلے ہی معنی کے اعتبار سے ہے [۱]۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝۲۸

''مسلمانوں کو نہ چاہیے کہ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائیں اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتا [۲] سوا اس صورت کے کہ جب ان سے کسی طرح تقیہ کرنا [۳] ہو اور اللہ تمہیں اپنے سے ڈرانا چاہتا ہے اور اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔''

حکم تقیہ:

دوست بنائیں کا مطلب یہ ہے کہ کس امر باطل میں ان کے ساتھ عملی یا قولی کسی طرح کا تعاون کریں اور ان کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ اس سے استثناء صورت تقیہ کا ہے جہاں دل انسان کا حقانیت میں مطمئن ہوتا ہے اور زبان یا عمل سے کسی غلط بات کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس کی بنص قرآن اجازت ہے اس لئے کہ خود مسلمان کا جان ومال اور آبرو بھی اللہ کے نزدیک قابل حفاظت ہے لہٰذا جب اور جہاں ان چیزوں کو خطرہ ہو وہاں کا حکم عام حالات سے مختلف ہوگا۔

یہ دل اور زبان کا اختلاف جھوٹ نہیں ہے کہ جس پر اللہ کی لعنت کا استحقاق ہوتا ہے بلکہ وہ ایک فریضہ کا ادا کرنا ہے جو خوف کی بناء پر ہے۔ تفسیر جلالین میں ہے:

تقة مصدر تقی ای تخافوا مخافة فلکم موالاتهم باللسان دون القلب و هذا قبل عزة الاسلام و یجری فی بلد لیس قویا.

تقاۃ یہ تقیہ کا مصدر ہے یعنی تم کسی طرح کا خوف محسوس کرتے ہو تو تمہیں زبان سے ان کے ساتھ اتحاد کا اظہار جائز ہے نہ کہ دل کے ساتھ یہ اسلام کے طاقت ور ہونے سے پہلے کی بات ہے اور اب بھی جس شہر میں اسلام طاقت ور نہ ہو وہاں یہ حکم جاری ہے۔

یہ کہ اس حکم کا تعلق آغاز اسلام سے تھا مجاہد کی طرف نسبت رکھتا ہے اور وہ اس اعتبار سے درست ہے کہ وہ حالات جن سے اس حکم کا

---

[۱] ۔بان تجعل کله من الفریقین بحسب سیر التقدیر الجاری بحکمتك فی نظام العالم یتسبب الاسباب و تصیره فی حالة تعد عزا واخری تعد ذلّا (البلاغی)

[۲] ۔یعنی انه منسلخ عن ولایة الله رأسا (نیشاپوری)

[۳] ۔مگر آن کہ دفع شر ایشان کند بنوعی از حذر کردن (شاہ ولی اللہ)

تعلق ہے آغاز اسلام میں زیادہ تھے۔ نہ یہ کہ اصل حکم جو ان حالات سے تعلق رکھتا ہے وہ کسی خاص زمانہ سے مخصوص ہے چنانچہ خود اس عبادت میں بھی آخر میں موجود ہے کہ اس کے بعد بھی جہاں حالات ایسے ہوں کہ اظہار حق میں خطرہ ہے وہاں یہ حکم ہوگا علامہ نیشاپوری صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

روی عن الحسن انه قال التقية جائزة الى يوم القيامة وهذا ارجح عند الائمة. (غرائب القرآن)

عوف نے حسن بصری سے روایت کی ہے انہوں نے کہا کہ تقیہ روز قیامت تک جائز ہے اور اکابر علماء کے نزدیک زیادہ ترجیح اسی کو ہے۔

آخر کا فقرہ کہ ''اللہ تمہیں اپنے سے ڈرانا چاہتا ہے'' یہ احساس پیدا کرنے کے لئے ہے کہ تقیہ سمجھ بوجھ کر کرو بے محل اس کا استعمال نہ کرو ورنہ غضب الٰہی کے مستوجب ہوگے [1]۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾

''کہہ دیجئے [2] کہ چاہے تم چھپاؤ اسے جو تمہارے سینوں میں ہے یا اسے ظاہر کرو، بہرحال اللہ اسے جان لے گا اور جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے وہ اس سب ہی کو جانتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

''اس دن [3] کہ جب ہر شخص جو کچھ اس نے بھلائی کی ہے اسے بھی اپنے سامنے موجود پائے گا اور جو کچھ برائی کی ہے اس نے اسے بھی وہ خواہش رکھے گا کہ کاش اس کے اور اس موقع کے درمیان [4] بڑا فاصلہ ہوتا اور اللہ تمہیں اپنے سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر بڑا مہربان ہے۔''

جو کچھ کیا ہے اسے موجود پائے گا یعنی اس کے ذکر کو نامہ اعمال میں اپنے سامنے پائے گا [5] یا اس کے نتیجہ کو جزاء وسزا کی صورت میں [6]۔

---

[1] ۔لا تسترسلوا فی ذلك وتجاوزوا به مقدار الضرورة ___ فان امر الدين عظيم فاحذروا اذن من غضب الله وعقابه (البلاغی)

[2] ۔قل يا رسول الله ﷺ محذّرا (البلاغی)

[3] ۔الاظهر ان العامل فيه يوم (نیشاپوری)

[4] ۔بينها وبين ذلك اليوم وهو له (صافی)

[5] ۔معنی كون العمل محضرا هو ان يكون ما كتب فيه العمل من الصحائف حاضرا (نیشاپوری)

[6] ۔ای جزآء ما عملت (بلاغی)

بعد کا جملہ ''خواہش رکھے گا کہ کاش اس کے اور اس موقع کے درمیان بڑا فاصلہ ہوتا'' یعنی ''کاش یہ منزل اس کے سامنے نہ آتی۔'' یہ انہی سے متعلق ہے جن کا نتیجہ عمل حسرت ناک ہو، ایک دوسرا احتمال یہ ہے کہ بینہ کی ضمیر سُوْء یعنی برائی ہی کی طرف راجع ہو [1]۔

آخر میں جو ارشاد ہوا کہ ''اللہ بندوں پر بڑا مہربان ہے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اپنے سے خوف دلانا اس کے لطف و مہربانی کا نتیجہ ہے کہ یہی خوف تمہاری تعمیر حال و استقبال کا ذمہ دار ہے [2]۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱

''کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے مہربان۔''

معیار محبتِ الٰہی اتباعِ رسول:

دنیائے محبت میں اس سے بڑھ کر بلندی کیا ہوگی کہ مرکز اس رشتہ کا وہ ذات ہو جائے جو مرکز ہر خیر و کمال ہے مگر محبت کا زبانی دعویٰ کافی نہیں ہے جب تک عمل اس کا گواہ نہ ہو اور سب سے بڑھ کر عملی تقاضا محبت کا یہ ہے کہ جس سے محبت ہو انسان اس کی پسند کی باتوں کو پسند کرے اور ناپسند باتوں سے پرہیز کرے۔ اب خدا بذات خود ہمارے مشاہدہ میں نہیں آسکتا اور نہ ہم براہ راست اس کی پسند و ناپسند کو معلوم کر سکتے ہیں لہٰذا اس کی پسند و ناپسند کا آئینہ اس ذات کا عمل ہو سکتا ہے جو اسے محبوب ہے اور تمام کائنات میں محبوبیت الٰہی کے اعلیٰ نقطہ پر جو ذات تھی وہ حضرت ختم المرسلین محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی تھی اس لئے محبت الٰہی کے دعویداروں سے اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطالبہ ہوا [3]۔

مولانا فرمان علی صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:-

''خداوند عالم نے اپنی محبت کی کسوٹی حضرت رسولؐ کی پیروی کو قرار دیا ہے پس محض دعویٰ محبت خدا اور رسولؐ کا کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا جب تک اپنی کارگزاریوں سے ثابت نہ کر دے کہ وہ رسولؐ کا سچا پیرو ہے۔ اسی طرح شیعہ علیؑ ہونے کا دعویٰ اس وقت زیبا ہے جب اپنے افعال، اعمال، رفتار و گفتار سے یہ کر دکھائے کہ جو کام جناب امیرؑ جس طرح کرتے تھے اسی طرح وہ بھی کر گزرے۔ فقط نام کا شیعہ مومن ہونا کافی نہیں ہے۔''

ملا محسن فیض کاشانی نے باوجودیکہ تفسیر میں عموماً کافی اختصار سے کام لیا ہے مگر اس آیت کی تفسیر میں محبت اور اتباع کے تعلق باہمی پر اچھا

---

[1] ۔بینہا ای معصیتہا (مجمع البیان) اس کے اور اس بدی کے درمیان میں (تاج العلماء)

[2] ۔اشارۃ الیٰ انہ تعالیٰ انما نہاھم وحذرھم رافۃ بہم ومراعاۃ اصلاحھم (صافی)

[3] ۔ قال الحسن وابن جریج زعم اقوام علیٰ عہد رسول اللہ ﷺ انہم یحبون اللہ فقالوا یا محمد ﷺ انّا یحبّ ربنا فانزل اللہ ھٰذہ الایۃ (نیشاپوری)

خاصہ سیر حاصل تبصرہ فرمادیا ہے وہ لکھتے ہیں:

فی الکافی والعیاشی عن الصادقؑ اھل الذین الّا الحب ثم تلا ھٰذہ الایۃ اقول المحبۃ من العبد میل النفس الیٰ شی الکمال ادرکتہ فیہ بحیث یحملھا علیٰ ما یقربھا الیہ ومن اللہ رجاہ من العبد و کشف الحجاب عن قلبہ والعبد اذا علم ان الکمال الحقیقی لیس الّا اللہ وان کل ما یراہ کمالا من نفسہ او غیرہ فھو من اللہ وباللہ والی اللہ لم یکن حبّہ الا اللہ وفی اللہ وذلک یقتضی ارادۃ طاعتہ والرغبۃ فیما یقرّبہ الیہ فعلا مۃ المحبۃ ارادۃ الطاعۃ والعبادۃ والاجتھاد البلیغ فی الاتباع من کان وسیلہ الیٰ معرفۃ اللہ تعالیٰ و محبۃ من کان عارفا باللہ محبا ایّاہ محبوبالہ فانّ من ھٰذہ صفاتہ انّما قال ھٰذہ الصّفات بالطاعۃ علیٰ الوجہ المخصوص وھو رسول اللہﷺ ومن بحذوخذوہ فمن احبّ اللہ لا بدلہ من اتباع الرسول فی عبادتہ وسیرتہ واخلاقہ قاحوالہ حتی یحبّہ اللہ فان بذلک یحصل التقرب الی اللہ وبالتقرب یحصل محبۃ اللہ تعالیٰ ایاہ کما قال تعالیٰ وان العبد لیتقرّب الیٰ بالنوافل حتّٰی احبّہ وایضا لما کان الرّسول حبیب اللہ فکل من یدعی محبّۃ اللہ لزمہ محبّۃ الرسول لان محبوب المحبوب محبوب ومحبۃ الرسول انما تکون بمتابعتہ وسلوک سبیلہ قولا وعملا وخلقا وحالا وسیرۃ وعقیدۃ ولا یتمشی دعوی محبۃ اللہ الّا بھٰذا فانہ قطب المحبۃ ومظھرھا فمن لم یکن لہ من متابعۃ نصیب لم یکن لہ من المحبۃ نصیب ومن تابعہ حق المتابعۃ ناسب باطنہ وسرّہ وقلبہ ونفسہ باطن الرسو وسرّہ وقلبہ ونفسہ وھو مظھر محبۃاللہ فلزم بھذہ المناسبۃ ان یکون محبۃ اللہ بقدر نصیبہ من المتابعۃ فیلقی اللہ محبۃ علیہ ویسری من باطن روح الرّسولﷺ نور تلک المحبۃ الیہ فیکون محبوبا للہ محبّالہ ومن لم یتا بعہ خالف باطنہ بالاطاعۃ الرسول فبعد عن وصف المحبوبیۃ وزال المحبۃ عن قلبہ اسرع مایکون اذا لو یحبہ اللہ لم یکن محباللہ وفی حکم الرّسول من امر اللہ والرسول بحبّہ واتباعہ وھم الائمۃ والاوصیآء فی الکافی الصّادقؑ فی حدیث من سرّہ ان یعلم ان اللہ یحبہ فلیعمل بطاعۃ اللہ ولہ تبعنا لم تسمع قول اللہ عزّو جل لنبیہ قل ان کنتم تحبو ن اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفرلکم ذنوبکم واللہ لا یطیع اللہ عبدا ابدا الّا ادخل اللہ علیہ فی طاعۃ اتبا عنا ولا ولا واللہ لا یتبعنا عبدا ابدا الّا احبّہ اللہ ولا واللہ لا یدع احد اتباعنا ابدا الّا ابغضنا ولا واللہ لا یبغضنا احد ابدا الّا عصی اللہ ومن مات عاصی اللہ اخزاہ اللہ واکب علیٰ وجھہ فی النار (صافی)

''کافی اور تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ دین کیا محبت کے سوا کچھ اور ہے؟ پھر حضرت نے اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ میں کہتا ہوں کہ محبت بندہ کی طرف سے نفس کا راغب ہونا ہے کسی چیز کی طرف اس کمال کی وجہ سے جسے اس نے شے میں محسوس کیا ہے اس طرح کہ وہ رغبت متقاضی ہوتی ہے اس کی کہ یہ وہ باتیں انجام دے جو اس سے نزدیک ہونے کا باعث ہوں اور اللہ کی طرف سے محبت کے معنی اس کا خوش ہونا ہے بندہ سے اور پردہ کا ہٹا دینا ہے اس کے دل سے اور بندہ نے جب یہ جان لیا کہ حقیقی کمال سوا اللہ کے کسی کے لئے نہیں ہے اور جو چیز از قبیل کمال نظر آتی ہے خواہ اپنے میں یا کسی دوسرے میں وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے اور اللہ کے سبب سے ہے اور اللہ کی

طرف راجع ہے تو اس کی محبت بس اللہ کے لئے ہوگی اور اللہ کے بارے میں ہوگی اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ اس کی اطاعت کو خواہش مند ہو اور ان چیزوں کی طرف راغب ہو جو اس سے قریب ہونے کی باعث ہیں تو محبت کی پہچان خواہش مند ہونا ہے اطاعت اور عبادت کا اور پوری پوری کوشش اس ذات کی پیروی میں جو اس کا وسیلہ ہے اللہ کی معرفت کی طرف اور اس کی محبت ہے جو اللہ کا عارف اور اس کا محب اور محبوب ہے اس لئے کہ جس کی یہ صفتیں ہیں اس نے یہ اوصاف خاص طور پر اطاعت الٰہی سے ہی پائے ہیں اور وہ رسول خداؐ اور ان کے نائب افراد ہیں تو جو اللہ کا دوست ہوگا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ رسولؐ کی پیروی کرے ان کی عبادت، سیرت، اخلاق اور حالات میں تا کہ اللہ بھی اسے دوست رکھے کیونکہ اس طرح اللہ سے تقرب حاصل ہوگا اور تقرب کے ساتھ اللہ کو اس سے محبت ہوگی جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے کہ بندہ نوافل کے ذریعہ سے مجھ سے قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اسے محبوب رکھنے لگتا ہوں اور نیز چوں کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبوب خدا ہیں لہٰذا جو محبت خدا کا دعوی رکھتا ہو اسے رسولؐ کی محبت لازم ہے اس لئے کہ محبوب کا محبوب محبوب ہوتا ہے اور رسولؐ کی محبت کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان کی پیروی کرے اور ان کے راستے پر چلے گفتار، کردار، اخلاق، حالات، سیرت اور عقیدہ میں اور بغیر اس کے اللہ کی محبت کا دعویٰ صحیح نہیں ہوسکتا اس لئے کہ یہی محبت کا اصل محور اور اس کا مظہر ہے۔ تو جسے آپ کی متابعت کا کوئی حصہ نصیب نہیں، اس کا محبت میں کوئی حصہ نہیں ہوسکتا اور جو آپ کی پورے طور پر پیروی کرے گا اس کا باطن، ضمیر، دل اور نفس رسولؐ کے باطن، ضمیر، دل اور نفس سے ہم آہنگ ہو جائے گا اور آپ محبت الٰہی کا مرکز ہیں تو اس سے ہم آہنگی کی وجہ سے لازم ہوگا کہ اس پیرو کے لئے ایک حصہ محبت الٰہی میں ہو جائے اس مقدار کے لحاظ سے جتنی پیروی کی ہے تو اللہ اپنی محبت اس پر مبذول فرماتا ہے اور رسولؐ نے ضمیر کے اندر سے اس محبت کی روشنی اس کی طرف پہنچتی ہے تو یہ اللہ کا محبوب بھی ہو جاتا ہے اور محب بھی اور آپ کی پیروی نہیں کرتا اس کا ضمیر رسولؐ کے ضمیر سے مختلف ہوتا ہے تو وہ محبوب ہونے کے معیار سے ہٹ جاتا ہے اور محبت انتہائی تیزی کے ساتھ اس کے دل سے دور ہو جاتی ہے اس لئے کہ اگر اللہ کو اس سے محبت نہ ہو تو یہ اس کا محبّ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور رسولؐ ہی کے حکم میں وہ ہستیاں ہیں جن کی محبت اور پیروی کا اللہ اور رسولؐ نے حکم دیا ہے اور وہ آئمہ دینؑ اور اوصیائے رسولؐ ہیں۔ کافی میں امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث کے ذیل میں ہے کہ جو اس بات کے جاننے سے خوش ہو کہ اللہ اسے دوست رکھتا ہے تو اسے اللہ کی اطاعت پر عمل کرنا چاہیے اور ہماری پیروی کرنا چاہیے۔ کیا تم نے ارشاد الٰہی نہیں سنا جو اس نے اپنے رسولؐ سے فرمایا کہ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا، بخدا کبھی بندہ اللہ کی اطاعت نہیں کرے گا مگر یہ کہ اللہ اس کے لئے اپنی اطاعت میں ہماری پیروی بھی داخل کرتا ہے اور بہ خدا کوئی بندہ ہماری پیروی نہیں کرے گا مگر یہ کہ اللہ اسے دوست رکھے گا اور بہ خدا ہماری پیروی کوئی کبھی نہیں چھوڑے گا مگر یہ کہ وہ ہمارا دشمن ہوگا اور بخدا کوئی ہمارا کبھی دشمن نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہ اللہ کا نافرمان ہوگا اور جو دنیا سے اٹھے اس عالم میں کہ وہ اللہ کا نافرمان ہو اسے اللہ رسوا کرے گا اور منہ کے بل اسے دوزخ میں ڈال دے گا۔

اس میں تمام اہم اور ضروری پہلو اتنی تفصیل کے ساتھ آ گئے ہیں کہ اس پر نہ کسی تبصرہ کی ضرورت ہے۔ نہ اس کے آگے کچھ کہنے کی مزید حاجت ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

''کہہ دیجئے کہ فرماں برداری کرو اللہ اور پیغمبر کی، اب اگر تم رد گردانی کرتے ہو تو بلاشبہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔''

بعید نہیں ہے کہ اس آیت کا تعلق اس کے پہلے ہی والی آیت سے ہو یعنی محبت خدا کے دعویداروں سے یہ کہلوایا گیا کہ وہ رسولؐ کا اتباع کریں اور انہی سے یہ بھی کہا جارہا ہے کہ اگر اللہ سے محبت رکھتے ہو تو پھر اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو یعنی ان کے احکام کی تعمیل کرو اس لئے کہ محبت کی سچائی اطاعت ہی سے وابستہ ہے [1]۔

چوں کہ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ محبوب بھی اس سے دل بستگی محسوس کرے۔ اس لئے گزشتہ آیت میں حکم اتباع دینے کے بعد یہ کہا تھا کہ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ یعنی ایسا ہوا تو اللہ تم سے محبت رکھے گا جو کہ تمہاری سچی محبت کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں ادھر یہ کہا جارہا ہے کہ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ۔

تولوا کا لفظ ماضی بھی ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اگر وہ روگردانی کریں [2] اور مضارع بھی ہوسکتا ہے۔ اس طرح یہ معنی ہوں گے کہ اگر تم روگردانی کرو [3]۔

پہلی صورت میں رسولؐ کا مقولہ جس کے کہنے کا حکم ہوا ہے: اطیعوا اللہ و الرسول پر ختم ہوجاتا ہے اور فان تولوا یہ خود خالق کا ارشاد ہے اور دوسری صورت میں فان تولوا بھی جز مقولہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے یعنی جو بات رسولؐ کے کہلوائی گئی ہے اس میں یہ ہے کہ اگر تم روگردانی کرو تو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

چوں کہ اس میں تسلسل کے ساتھ روانی زیادہ محسوس ہوتی ہے اس لئے میں اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

اب مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اطاعت سے انحراف عام کیا تو عملاً یہ کفر ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہرگز نہیں ہوسکتا اور اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا لہٰذا اب وہ محبت کا نتیجہ جو یحببکم اللہ کی صورت میں تھا تم سے متعلق نہیں ہوسکتا اور اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارا دعویٰ محبت بے حقیقت اور بے سود ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّیَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۳۴﴾

''بلاشبہ اللہ نے منتخب کیا آدم، نوح، خاندان ابراہیمؑ اور خاندان عمرانؑ کو تمام جہانوں پر ایک مسلسل نسل کی صورت میں جن کے بعض بعض سے ہیں [4] اور اللہ سننے والا ہے بڑا جاننے والا۔''

---

[1] ۔ یعنی بندے کی محبت یہی ہے کہ شوق سے اللہ کے حکم پر دوڑے (موضح القرآن) معناہ ان کنتم تحبو ن اللہ کما تدعون فاظھروا دلالۃ صدقاتکم بطاعۃ اللہ وطاعۃ رسولہ (مجمع البیان)

[2] ۔ پس اگر روگردانیدند (شاہ ولی اللہ) اعرضوا عن الطاعۃ (جلالین) فان اعرضوا عن طاعۃ اللہ ورسولہ (مجمع البیان) اس پر بھی روگردانی کریں (تاج العلماء)

[3] ۔ پس اگر پھر جاؤ (شاہ رفیع الدین) یحتمل المعنی والمضارعۃ بمعنی فان تتولّوا (صافی)

[4] ۔ یعنی انھم ذرّیۃ واحدۃ متسلسلۃ بعضھا متشعب من بعض (صافی)

آل عمران کون ہیں؟:

خاندان عمران میں حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ بھی ہیں کہ جو ابن عمران تھے اور جناب عیسیٰؑ بھی ہیں کہ جو مریمؑ بنت عمران کے فرزند ہیں اور یہ عمران جس کی طرف موسیٰؑ اور ہارونؑ اور پھر جناب عیسیٰؑ کی نسبت ہے ایک ہی شخص کا نام نہیں ہے بلکہ وہ عمران جن کے فرزند موسیٰؑ و ہارونؑ تھے بہت مقدم تھے ان عمران سے جن کی دختر جناب مریمؑ تھیں [۱]۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہاں لفظ عمران بطور علم مستعمل نہیں ہے جس کا مدلول جزئی حقیقی ہو، ورنہ ان میں سے ایک ہی شخص مراد ہوسکتا ہے دونوں ایک ساتھ مراد نہیں ہو سکتے بلکہ عمران کا لفظ بمعنی ''مسمی بہ عمران'' مجازی تصرف کے ساتھ استعمال ہوا ہے لہٰذا اگر عالم انساب میں کوئی تیسری مسمّٰی بعمران ہے تو اس کی نسل بھی اس آل عمران کے عنوان میں داخل ہوسکتی ہے اور اب بعض روایات سے جو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جناب ابو طالب علیہ السلام کا نام عمران ہے اور آل عمران میں حضرت علی ابن ابوطالبؑ کی فضیلت بھی مضمر ہے یہ اس پہلی تفسیر کے لحاظ سے بھی کوئی غلط چیز نہیں ہے اور اس کے بغیر بھی محمد و آل محمد علیہم السلام آل ابراہیم کی فرد اکمل ہونے کے اعتبار سے اس اصطفاء کا مرکز ہیں ہی اور وہ ''آل ابراہیم'' کے نام سے موسوم ہونے کے اس لئے زیادہ حق دار ہوئے کہ وہ ملت ابراہیم ہی کے مبلغ ہو کر دنیا میں تشریف لائے تھے [۲]۔

اسی لئے عیاشی کی روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام سے ہے کہ آپ نے اس آیت کی تلاوت کر کے ارشاد فرمایا کہ:

نحن منهم و نحن بقية تلك العترة۔

ہم ان میں سے ہیں اور ہم اس نسل طاہر کے باقی رہنے والے افراد ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ روز عاشورہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اس آیت کی تلاوت فرمائی اور آل محمد کی فضیلت کے ثبوت میں اسے پیش فرمایا [۳]۔

تیسری حدیث میں ہے کہ امام رضاؑ نے مامون الرشید کے سوال پر عترت نبوی کی فضیلت میں اس آیت کو پیش فرمایا۔

جب کہ ایک لفظ اصطفاء ہے جس کے متعلقات ہی کی آخری کڑی ''آل ابراہیم'' ہیں جن میں افضل کائنات محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے آل طاہرین علیہم السلام بھی ہیں تو اب تمام عالمین میں پورے احاطہ و استغراق کے ساتھ اس برگزیدگی کا اعلان بالکل صحیح ہے اور اس کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ اس اصطفاء کو کسی ایک دور کے عالمین سے مخصوص کیا جائے جس کی بعض لوگوں نے بلاضرورت احتیاط برتی ہے [۴]۔

اس کی ضرورت تو اس وقت ہوتی کہ جب اس کا تعلق صرف آدمؑ اور نوحؑ وغیرہ ہوتے جن سے افضل ہستیاں بعد میں پیدا ہوگئیں لیکن جب اس سلسلہ میں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی داخل ہوگئے تو اب وہ کون سا دور ہے جو اس افضلیت کے دائرہ سے باہر ہو جسے فی زمانہ کہہ کر

---

[۱] ۔بین العمرانین الف وثمان مائة سنة كذا قيل (صافی)

[۲] ۔قد دخل فی آل ابراهيم نبيّنا واهل بيته (صافی)

[۳] ۔فی المجالس عن الصادق علیہ السلام قال قال محمد بن اشعث بن قيس الكندی للحسين علیہ السلام يا حسين بن فاطمة اٰية حرمة لك من رسول الله ليست يغرك قتلا الحسين هذه الاية (صافی)

[۴] ۔ای علیٰ عالمی زمانه (مجمع البیان)

خارج کرنے کی ضرورت محسوس کی جائے؟

اس سلسلہ میں آخری فقرہ کہ ''اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔'' اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ اصطفاء بلاوجہ نہیں ہے بلکہ یہ ان افراد اور ان جماعتوں کے امتیازی گفتار و کردار کی بناء پر ہے جس سے خدا خوب واقف ہے [1]۔

پھر یہ بھی کہ ان بعض کے انتخاب سے کسی معروضہ اور دعا کا بھی تعلق تھا جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز: **ومن ذریتی** اور میری اولاد میں سے بھی امام مقرر کیے جائیں۔'' مگر اس کی قبولیت کا انحصار ان افراد کی ذاتی اہلیت پر ہے جس کا اللہ جاننے والا ہے [2]۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ
اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی ؕ
وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ
اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ
وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِیَّا ؕ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَكَرِیَّا الْمِحْرَابَ ۙ
وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰی لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

''جب کہا عمران کی بیوی نے کہا اے میرے پروردگار! میں منت مانتی ہوں کہ جو میرے پیٹ میں ہے وہ (تیری بارگاہ میں) نذر ہوگا [3] تو مجھ سے قبول کر یقیناً تو بڑا سننے والا ہے، جاننے والا اب جب ان کے یہاں وہ پیدا ہوئی تو انہوں نے کہا اے میرے پروردگار! یہ تو میرے یہاں لڑکی پیدا ہوئی اور اللہ تو خود ہی خوب جانتا ہے کہ کیا ان کے یہاں پیدا ہوا؟ اور لڑکا، لڑکی یکساں نہیں ہوتے اور میں نے اس کا نام مریم رکھا اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں تو اللہ نے اس لڑکی کو بحسن و خوبی قبول کر لیا اور اسے بڑی اچھی نشوونما دی [4] اور

---

[1] ۔واللہ سمیع باقوال الناس علیہم باعمالھم فیصطفی من کان مستقیم القول والعمل (صافی)

[2] ۔سمیع الدعاء الدّاعین علیم بما تقتضیہ المصلحۃ (البلاغی)

[3] ۔معتقدا لخدمۃ بیت المقدس لا اشغلہ بشئی (صافی)

[4] ۔بہت اچھی باڑھ اور پھبھک دی اُسے (تاج العلماء)

اسے زکریاؑ کی کفالت میں دیا[1] جب اس کے پاس زکریا محراب عبادت[2] میں آتے تھے تو اس کے پاس کوئی کھانے کی چیز دیکھتے تھے۔ انہوں نے کہا اے مریمؑ! یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا کہ اس نے کہا وہ اللہ کی یہاں سے ہے۔ یقیناً اللہ جسے چاہتا ہے بے سان وگمان کے روزی عطا کرتا ہے۔''

جناب مریم سلام اللہ علیہا کی ولادت اور نشوونما:

مادر جناب مریمؑ کی دعا کے ذیل میں درمیان کا ایک فقرہ ''اللہ تو خود ہی خوب جانتا ہے کہ ان کے یہاں کیا ہوا'' یہ نقل قول کرتے ہوئے خود ناقل یعنی حضرت احدیت کی طرف سے اس پر ایک تبصرہ ہے جس کے بعد پھر ان خاتون معظّمہ کی مناجات کا تتمہ درج ہوا ہے[3]۔

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے یہاں بلاوجہ اپنے ترجمہ میں جملوں کی ترتیب کو بدل دیا ہے:-

(۱)---قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی

(۲)---وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ

(۳)---وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی

انہوں نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

'' کہنے لگیں اے میرے پروردگار! (اب میں کیا کروں) میں تو یہ لڑکی جنی ہوں'' (یہ جملہ نمبر ا کا ترجمہ ہوا) اور لڑکا لڑکی کے ایسا گیا گزرا نہیں ہوتا'' (یہ جملہ نمبر ۳ کا ترجمہ ہے)

حالانکہ (اس کے کہنے کی ضرورت کیا تھی) جو وہ جنی تھیں خدا اس کے (شان ومرتبہ) سے خوب وقف تھا (یہ جملہ نمبر ۲ کا ترجمہ ہے)

مذکورہ جملوں کے ترجموں میں علاوہ اختلاف ترتیب کے بریکٹ کے الفاظ (گیا گزرا) اور (شان ومرتبہ) مقصود متکلم کے مطابق معلوم نہیں ہوتے۔ مادر جناب مریمؑ کا مطلب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی خدمت مرد جس طرح کر سکتا ہے عورت نہیں کر سکتی۔ اس میں ''شان ومرتبہ'' ''لڑکی کے گئے گزرے ہونے'' کا کوئی تصور مضمر نہیں ہے۔

جناب زکریا علیہ السلام محراب عبادت میں جب مریمؑ کے پاس جاتے تھے تو ان کے پاس کچھ کھانے کی چیز پاتے تھے۔ روایات میں اس کی تفصیل یہ درج ہے کہ ان کے پاس پھل رکھے ہوئے ملتے تھے اور وہ بھی بے فصل کے میوے یعنی جاڑوں میں وہ پھل جو گرمی میں ہوا کرتے ہیں اور گرمی میں وہ کہ جو جاڑے میں ہوتے ہیں[4]۔

اور یہ ہونا بھی چاہیے تھا اس لئے کہ اگر عام پھل ہوتے تو یہ شبہ ہوتا کہ کوئی آدمی دے گیا ہے اور اس طرح پاک دامنی جناب مریمؑ پر

---

[1] ۔اور سونپ دی وہ زکریاؑ کو (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔المحراب المسجد (البلاغی)

[3] ۔جملة اعتراض من کلامه تعالیٰ (جلالین)

[4] ۔فیجد عندها فاکهة الشتاء فی الصیف وفاکهة الصیف فی الشتاء (جلالین) العیاشی عن الباقر علیہ السلام (صافی)

دھبہ آتا لیکن جب کہ وہ غیر فصل کے پھل ہیں تو اس سے مریمؑ کے اس جواب کی تصدیق ہوتی تھی کہ **ھو من عند اللہ** ''وہ اللہ کی طرف کے ہیں''

ہم نے ''**بغیر حساب**'' کا ترجمہ تقریباً ہر جگہ یہی کیا ہے کہ ''بے سان وگمان کے'' اس بنیاد پر کہ یہ حساب کا لفظ حسب یحسب والے حساب سے ماخوذ ہے جس کے معنی فارسی میں کہے جاتے ہیں ''پنداشتین'' اور اردو میں ہوئے سمجھنا اور خیال کرنا۔

اس صورت میں **کل شی عندہ بمقدار** سے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز اس کے یہاں ایک مقدار مقرر کے مطابق ہوتی ہے اس کے ٹکراؤ کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن اکثر مفسرین حساب کو مقدار معیّن اور پیمانے ہی والے حساب کے معنی میں لیتے ہیں اور اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس کی عطا عام اندازوں کی پابند نہیں ہے نہ اسے اپنے خزانہ کی کمی کا اندیشہ ہے کہ وہ ناپ جوک کر دے [1]۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

''اسی موقع پر دعا کی زکریاؑ نے اپنے پروردگار سے کہا میرے پروردگار مجھے عطا کر اپنی طرف سے پاک و پاکیزہ [2] نسل یقیناً تو دعا کا سننے والا ہے۔''

جناب زکریا علیہ السلام کی ولادت فرزند کے لئے دعا:

بہت سی باتیں آدمی کو معلوم ہوتی ہیں لیکن کسی ایک مشاہدہ سے معلوم بات کا تصور اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ گویا وہ بات ابھی معلوم ہوئی یہاں یہ صورت حال ایسی ہی ہے۔

جناب زکریا علیہ السلام بہت کبیر السن ہو چکے تھے اور ان کے اولاد نہ تھی۔ قرآن کہ یہ الفاظ کہ اسی موقع پر اسی پس منظر کے مطابق ہیں جو احادیث میں ہے کہ مریمؑ کے پاس بے فصل کے میوے نظر آتے تھے۔ اس کو دیکھ کر زکریا کے دل میں ایک تمنا نے کروٹ لی اور ذہن میں یہ تصور قوت کے ساتھ پیدا ہوا کہ وہ خالق جو بے فصل کے میوے دے سکتا ہے اولاد کے عطا کرنے میں بھی عمر خاص کا پابند نہیں ہے۔ وہ بے فصل کے پھل دیتا ہے تو پیری میں مجھے اولاد بھی دے دے تو اس کی قدرت سے بعید نہیں [3]۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى

---

[1] ۔بغیر حساب لا فی الجریان علی العادۃ ولا علیٰ مقدار الضرورۃ (البلاغی)

[2] ۔صاف ستھری (تاج العلماء)

[3] ۔فی ذلك المكان او الوقت (صافی) ای عند ذلك الذی رأیٰ من فاكهة الصیف الشتآء وفاكهة الشتآء فی الصیف (مجمع البیان) علم ان القادر علی الاتیان بالشئی فی غیر حینه قادر علی الاتیان بالولد علی الكبر (جلالین) زکریاؑ جو ساری عمر اولاد سے ناامید تھے اب امیدوار ہوئے کہ شاید وہ بے موسم مجھ کو بھی ملے (موضح القرآن)

مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾

''تو انہیں فرشتوں نے آواز دی اس حالت میں کہ وہ کھڑے ہوئے محراب میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اللہ آپ کو یحییٰ علیہ السلام کی خوشخبری دیتا ہے جو تصدیق کرنے والا ہوگا اللہ کے ایک کلمہ کی اور سردار ہوگا اور انتہائی ضبط نفس رکھنے والا اور نبی ہوگا نیکوکار جماعت میں سے۔''

ولادت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت:

''فرشتوں'' یعنی فرشتوں کی جنس، نہ یہ کہ وہ ندا دینے والے بہت سے فرشتے تھے، ایک نہ تھا[۱]۔

بشارت میں بچہ کے نام کا درج ہوجانا، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نام اس بچہ کا خالق نے رکھدیا ہے[۲] یہ شرف اولین میں فقط جناب یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مختص معلوم ہوتا ہے اور آخرین میں خمسۂ نجباء بلکہ ہمارے معصومینؑ اس شرف کے حامل ہیں۔

اللہ کے کلمہ سے مراد جناب عیسیٰؑ ہیں جن کی بشارت دینے کے لئے جناب یحییٰ علیہ السلام بھیجے جارہے تھے اور ان کا وصف جو حصور ہونے کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے عام معنی جو ضبط نفس کرنے والے کے ہیں وہ تو ہر رسول میں پائے جاتے ہیں کیوں کہ ہر رسول معصوم ہوتا ہے۔ لہٰذا بلاشبہ منہیّات سے اپنے نفس کو روکنے والا ہوتا ہے اور دوسرے معنی اس کے وارد ہوئے ہیں عورتوں سے بے تعلق رہنے والا تو اس صورت میں وہ ایک خصوصی کردار کا اظہار ہے جو اس وقت کے حالات کی بناء پر ممدوح تھا لیکن اس میں ہمہ گیری اور عمومیت نہ تھی[۳]۔ ورنہ ان کے علاوہ دوسرے انبیاء جن میں متعدد ایسے ہیں جو بلاشبہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے برتر تھے اس کردار کو اختیار کرنے اور ان کے لئے وہ ممدوح و مستحسن ہوتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ سوا جناب یحییٰ علیہ السلام اور جناب عیسیٰ علیہ السلام کے ان کے قبل اور بعد ان سے بالاتر ہستیوں نے تعلقات ازدواجی کا اختیار کرنا ضروری سمجھا اور حضرت خاتم الانبیاءؐ نے تو صاف اعلان فرمایا کہ لا رهبانية في الاسلام اور اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ کہ:۔

النكاح من سنتي فمن رغب عن سنتي فليس مني: نکاح میرے طریق کا جزء ہے تو جو میرے طریق سے منحرف ہو وہ مجھ سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔

اس کے بعد عفیف ہونا تو ممدوح رہا مگر حصور ہونا اس معنی میں کوئی قابل تعریف صفت نہیں رہا۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ

---

[۱] ۔ای نوعهم كما يقال قتله الجن (البلاغی)

[۲] ۔سماه الله بهذا الاسم قبل مولده (مجمع البیان)

[۳] ۔حصورا مبالغا في حصر النفس عن الشهرات والملاهي. وعن الصادق علیہ السلام هو الذي لا يأتي النساء (صافی) فيه دليل على ان ترك النكاح كان افضل في تلك الشريعة (نیشاپوری) شرعية ورجحانه ومدحه مختص به اذلم تعهد شرعية ورجحانه بنحو نوعي في شريعة الهية (البلاغی)

اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾

''کہا اے پروردگار میرے! میرے یہاں لڑکا کہاں سے [۱] ہوگا درانحالیکہ میری کبرسنی کا دور آ گیا ہے اور میری بیوی بھی بانجھ ہے۔ کہا اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

یہ انسان امید وبیم کا ایک مرقع ہے جو الفاظ سے نمایاں ہو رہا ہے کہ خود ہی تو اللہ کی قدرت کے اس کرشمہ کو دیکھ کر کہ گرمی میں جاڑے اور جاڑے میں گرمی کا میوہ آ رہا ہے اولاد کے امیدوار ہوئے تھے اور اب جو اللہ کی طرف سے قبولیت دعا کی فرشتے کی زبانی بشارت ملی تو نگاہ طبیعی موانع کی طرف جا رہی ہے [۲] کہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے اور یہ ایک مزید حصول اطمینان کی کوشش اور مضطرب دل کو سکون پیدا ہونے کی خواہش ہے کہ ان موانع کے ہوتے ہوئے پھر خداوند عالم کی جانب سے صراحت ہو جائے کہ ہم تمہارے لئے نظام عادت کو شکستہ کریں گے اور ممکن ہے کہ اس سے نوعیت بھی سمجھنا ہو کہ اسی حالت میں اولاد ہوگی یا ہم دونوں میں کوئی تبدیلی ہوگی کہ ہم جوان اور صحیح وتوانا بنا دیے جائیں گے [۳]۔

اس انداز سوال وجواب کو دیکھیں وہ جو معجزات انبیاء کے منکر ہیں اس خیال سے کہ نظام ودستور عادت شکستہ نہیں ہوتا۔ وہ محسوس کریں کہ اگر عادۃً یہ امر ناممکن نہ ہوتا تو جناب زکریا علیہ السلام نوید ملنے کے بعد بھی کیوں اسے اتنا امر بعید جیسے کہ اس کے باور کرنے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں۔ یہ انداز بیان خود اس واقعہ کے خلافِ عادت ہونے کا قطعی ثبوت ہے۔

خالق نے بھی جواب میں یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ نہیں تم ابھی اتنے کبرالسن نہیں ہوئے کہ اولاد نہ ہو سکے اور تمہاری بیوی بانجھ نہیں ہے بلکہ سب باتوں کے ہوتے ہوئے اس کے بارے میں بس اللہ کی قدرت کاملہ کا حوالہ دیا گیا کہ وہ اسی طرح جو چاہتا ہے کرتا ہے یعنی اس کی قدرت کے مقابلہ میں موانع عادی کوئی چیز نہیں ہیں [۴]۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب حکمت الٰہی متقضی ہو تو قدرت ربانی کا ظہور نظام اسباب کو توڑنے ہی کی شکل میں ہوا کرتا ہے۔ اسی کا نام ''معجزہ'' یا ''کرامت'' ہوتا ہے جو قرآن مجید سے بلا کسی گنجائش تاویل کے محقق وثابت ہے۔

اور بھی تو وجہیں جناب زکریا کے اس سوال کی بیان ہوئی ہیں جن میں سب سے زیادہ غلط یہ توہم ہے کہ جناب زکریاؑ کے دل میں معاذ اللہ یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ یہ فرشتے ہیں جو بشارت دے رہے ہیں یا شیطان ہے جو مجھے خواہ مخواہ پریشان کرنا چاہتا ہے۔ یہ تصور ہمارے نزدیک شان نبوت کے خلاف ہے اس لئے یقیناً باطل ہے [۵]۔

---

[۱] ۔من این یکون وقیل کیف یکون (مجمع البیان)

[۲] ۔استبعاد عادیّ واستفهام (صافی)

[۳] ۔قیل انما ذلك علیٰ سبیل التعرف عن کیفیة حصول الولد ا یعطهما الله ایاه وهما علی ما کانا علیه من الشیب ام یصر فهما الیٰ حال الشباب (مجمع البیان)

[۴] ۔یفعل الله ما یشآء من العجائب الخارقة للعادة (صافی)

[۵] ۔ان الا نبیاء لا قدان یعرفوا الفرق بین کلام الملك ووسوسة الشیطان ولا یجوز ان تیلاعب الشیطان بهم تحیلط علیهم طریق الافهام (مجمع البیان)

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾

''کہا اے پروردگار میرے! میرے لے کوئی نشانی قرار دے، کہا تمہاری نشانی یہ ہے کہ تین دن رات [1] سوا اشارہ کے لوگوں سے بات نہ کروگے اور اپنے پروردگار کو بہت یاد کرو اور شام وسحر اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہو۔''

جناب زکریاؑ کو یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ایسا بہرحال ہوگا اور یہ کہ ان کی کبرسنی کی حالت اور ان کی زوجہ کے بانجھ ہونے کی کیفیت بھی اس میں سدراہ نہ ہوگی، پھر بھی انتہائے شوق سے ایک بےقراری ہے اور وہ معروضہ پیش کرتے ہیں کہ تیرا وعدہ حق مگر جب اس وعدہ کی تکمیل ہونے لگے تو کوئی ایسی علامت مجھے بتلادے کہ میں سمجھوں کہ اب مشیت ربانی اس اعجاز کو دکھارہی ہے یعنی حمل قائم ہوگیا ہے تاکہ میرے قلب کو سکون حاصل ہو اور میں تیرے شکر کا فریضہ ادا کروں [2]۔ تو ارشاد ربانی ہوا کہ اس کی علامت یہ ہوگی کہ ایسا ہونے پر تین دن خود بخود خلق خدا سے کلام کی طرف سے تمہاری زبان بند ہوجائے گی اور سوا یاد الٰہی کے تمہارا کوئی مشغلہ نہ رہے گا [3] اور یہ یاد الٰہی زبان سے ہوگی اس لئے کہ یہ اور زیادہ خدا کی قدرت کی نشانی ہے کہ زبان کوئی نقص نہیں کہ وہ تلفظ نہ کرسکے مگر اس زبان سے سوا ذکر الٰہی کے کوئی دوسرا کلام نہ ہوسکے [4]۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

''اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! بلاشبہ اللہ نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہیں پاک و پاکیزہ بنایا ہے اور تمہیں تمام جہانوں کی عورتوں سے منتخب قرار دیا ہے۔ اے مریمؑ! اپنے پروردگار کی اطاعت کرو، سجدہ کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہو۔

جناب مریم سلام اللہ علیہا کی فضیلت وعصمت:

جناب مریم سلام اللہ علیہا کے لئے اصطفاء یعنی انتخاب کا لفظ بتاتا ہے کہ حضرت مریمؑ خواتین کے طبقہ کے لئے کسی خاص منصب رہبری کی حامل قرار دی گئی تھیں اور تطہیر کا لفظ ان کے عصمت کردار کے جوہر کو ظاہر کرتا ہے جو منصب ہدایت کے لئے اصطفاء وانتخاب کی شرط لازم ہے اور

---

[1] ۔ای بلیالیھا ولھذا ذکر فی سورۃ المریم ثلث لیال (نیشاپوری)

[2] ۔علامۃ یعرف بھا وقت حمل امرأتہ لیزید فی العبادۃ شکرا (مجمع البیان)

[3] ۔لا تقدر علی تکلیم الناس ثلثا (صافی) نہ بول سکے گا تو اُن سے (تاج العلماء)

[4] ۔القدرۃ علی التکلم بالتسبیح والذکر مع العجز عن التکلّم بکلام البشر (نیشاپوری)

آخرت میں جو نساء عالمین پر اصطفاء کا ذکر ہے وہ ان کی افضلیت کا آئینہ دار ہے کہ جب تک یہ افضلیت متحقق نہ ہو اس وقت تک منصب الٰہی کا استحقاق حاصل نہیں ہوتا۔

جب کہ طبقہ خواتین کے لئے جو رہ نمائی کے منصب پر فائز ہو اس کے لئے یہ دونوں باتیں لازم ہیں کہ معصوم ہو اور اپنے دور کے آدمیوں میں افضل ہو تو اس معیار کو ہر منصب ربانی کے لئے پیش نظر رکھنا چاہیے اور اس لئے امامت جو منصب ربانی کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے لئے بھی عصمت و افضلیت ضروری چیز قرار پاتی ہے۔

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی رفعت:

اس کے علاوہ جب اولین میں جہاں شریعت کا اختتام نہیں ہوتا تھا طبقہ خواتین کے لئے ایک صاحب منصب معصوم خاتون کا وجود نظر قدرت میں لازم ہوا تو اس امت مرحومہ میں جس کی ہدایت کلی پر دین کے کامل کرنے اور نعمت کے تمام کرنے کی مہر ثبت ہونے والی ہے کیوں کر طبقہ خواتین کی بغیر کسی ایسے رہ نمائے کامل کے جو عملی حیثیت سے اس طبقہ کے لئے مثال ہو خالی رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے خالق نے اپنے رسولؐ کو وہ بیٹی کرامت فرمائی جسے سیدۃ نساء العالمین اور سیدۃ نساء اھل الجنۃ قرار دیا گیا اور جو آیہ تطہیر کا مورد ہوئی۔ اور چوں کہ اس امت کی ہدایت کا معیار اونچا ہے اس لئے جب اس امت کا رسول افضل المرسلین ہے تو یہ خاتون معظّمہ بھی اسی تناسب سے مریم بنت عمران اور دوسری ایسی مثالی خواتین سے افضل و ارفع ہوں گی۔ اس لئے رسولؐ نے جب اپنی بیٹی کو سیدۃ نساء العالمین فرمایا تو اس کی تشریح فرما دی کہ جناب مریمؑ اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار تھیں لیکن فاطمہ زہراؑ اولین و آخرین سب کی سردار ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب مریمؑ کو جو اصطفك علی نساء العالمین کہا گیا ہے اس میں العالمین کا لفظ شمول مکانی کا حامل ہے یعنی اس دور میں [1] تمام عالم کی عورتوں میں کوئی ان کے مثل نہیں تھی۔ شمول زمانی کی حامی نہیں ہے [2] اس لئے اس کے بعد کوئی خاتون ان سے افضل ہو سکتی ہے لیکن حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے لئے جو سیدۃ نساء العالمین کہا گیا اس کا دائرہ وہی ہے جو اس کے پہلے ان کے پدر بزرگوار کے لئے: و ما ارسلنك الا رحمۃ للعالمین کا اور وہ وہی ہے جو وسعت ربوبیت کے مقام میں الحمد اللہ رب العالمین کا ہے جس سے کوئی مخلوق باہر نہیں ہے۔

یہ اس وقت ہے جب اصطفاء کا لفظ ''سرداری'' کو بتاتا بھی ہو مگر علامہ بلاغی رحمۃ اللہ اس سے متفق نہیں ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اصطفاء کے معنی ہیں بس کسی بات میں اختصاص مضمر ہے۔ یہاں خصوصیت مقام کی بناء پر پہلی دفعہ جو اصطفاء کا لفظ ہے وہ اس کے اظہار کے لئے کہ لڑکی ہوتے ہوئے بھی اللہ نے ان کو خدمت بیت المقدس کے لئے قبول کر لیا اور دوسری دفعہ جو تمام دنیا جہاں کی عورتوں کے مقابلہ میں اصطفاء ہے وہ بغیر شوہر کے اولاد ہونے کی حیثیت سے ہے۔ اس سے سیادت ثابت نہیں ہوتی۔ بے شک اپنے اہل زمانہ پر ان کی سیادت حدیث سے ثابت ہوئی

---

[1] ۔نساء العٰلمین ای اھل زمانك (جلالین) وھو قول ابی جعفر علیہ السلام (مجمع البیان)

[2] ۔ترجیح دی اُن پر جو اُن کے زمانہ میں تھیں۔ حضرت فاطمہؑ کو ساری خدائی کی اگلی پچھلی عورتوں پر (حواشی تاج العلماء)

ہے مگر متفق علیہ احادیث ہی نے حضرت فاطمہ زہراؑ کو نہ صرف سیدۃ نساء العالمین بلکہ سیدۃ نساء اہل الجنہ بتایا ہے [1] اور ظاہر ہے کہ اہل الجنہ کے عموم میں جناب مریمؑ بھی داخل ہیں۔ اس لئے حضرت فاطمہ زہراؑ کی سرداری میں وہ بھی داخل ہیں (آلاء الرحمن)۔

علامہ بلاغی کی جلالت قدر مسلم مگر ان کے کسی ارشاد کے ساتھ لب کشائی کا حق تو سلب نہیں ہوسکتا۔ اصل یہ ہے کہ آیت میں اصطفاک کا لفظ دو دفعہ ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ دونوں جگہ ایک ہی مفہوم کا حامل ہو [2] اس لئے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ پہلی جگہ کا اصطفاء تو بجائے خاص انفرادی امتیاز کا مظہر ہے اور وہ وہی ہے جسے علامہ بلاغیؒ نے بیان فرمایا ہے۔ مگر دوسری دفعہ پھر جو اصطفاک کا لفظ ہے نساء عالمین کے مقابلہ میں ''علی'' کے ساتھ یہ فوقیت بحیثیت منصب کی حامل ہے جس کی دوسری ''سیادت'' ہے اور جب کہ ان کی سیادت کے حدیث سے ثابت ہونے کا تذکرہ ممدوح نے خود فرمایا ہے تو قرآن کے اس جملہ کو اس معنی کا حامل ماننے میں حرج کیا ہے جس کے بعد بھی جیسا کہ موصوف نے خود تحریر فرمایا ہے حضرت فاطمہ زہراؑ کی افضلیت بر بنائے حدیث پھر بھی محفوظ رہتی ہے۔

''رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہو۔'' اس ''ساتھ'' کے معنی معیت عمل کے ہیں یعنی جیسے اور اللہ کے مخلص بندے رکوع کرتے ہیں، اسی طرح رکوع و سجود بجالاتی رہو، معیت زمانی و مکانی مراد نہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تم باہر نکل کر نمازیوں کی صف میں شامل ہو کر نماز ادا کرو [3]۔

اس مثال کو سامنے رکھا جائے تو سورہ بقرہ میں جو وارکعوا مع الراکعین ہے، اس سے نماز جماعت کے حکم کا استفادہ مشکل ثابت ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ وہاں حدیث معصوم کے رو سے یہی تفسیر ثابت ہو جائے۔

ہاں ایک اور بات سنئے: کہ جناب مریمؑ کے بارے میں ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبل اسلام دور موسوی میں جو نماز تھی اس میں بھی رکوع و سجود موجود تھا اور یہ صرف دعا والی نماز جو عیسائی پڑھتے ہیں بعد کی ایجاد ہے۔

یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہے کہ آیت میں سجدہ پہلے اور رکوع بعد کو ہے لہٰذا وہ کوئی نئی نماز تھی۔ ایسا نہیں ہے اس لئے کہ واؤ جو حرف عطف ہے اس میں ترتیب کے معنی پائے نہیں جاتے [4]۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ

---

[1] ۔رواہ احمد والبخاری ومسلم والترمذی والنسائی وابن ماجۃ وابن حبان فی صحیح وابن ابی شیبۃ والحاکم وابو یعلی والرویانی والعقیلی والطبرانی وابن عساکر وصاحب الاستیعاب وغیرھم عن حذیفۃ وابی الخدری وابن عباس وعائشہ وفاطمۃ عن رسول اللہ ﷺ (آلاء الرحمٰن)

[2] ۔لا یجوز ان یکون الاصطفاء بمعنی واحد للتکرار الصرف (نیشاپوری)

[3] ۔ای کن لی فی عدادھم امرت بالصلوٰۃ تذکرار کانھا (صافی) لا ان یکون ذلک امرالھا بان تعمل السجود رکوع معھم فی الجماعۃ (مجمع البیان) ای وکن لی فی زمرۃ المصلّین الکثیر الصلوٰۃ ولا ینحصر المعنی بصلوٰۃ الجماعۃ (البلاغی)

[4] ۔لا یوجب الترتیب ــــــ وانما یوجب الجمع والاشتراک (مجمع البیان)

اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۖ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

''یہ غیب کی خبروں سے ایک ہے جس کی آپ کی طرف ہم وحی بھیج رہے ہیں اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ لوگ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریمؑ کی کفالت کا ذمہ دار ہو اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ آپس میں بحث کر رہے تھے۔''

جناب زکریاؑ کی دعا اور یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کا قصہ تو حضرت مریمؑ کے واقعہ کے ذیل میں بمناسبت آ گیا تھا کہ ان پھلوں کو دیکھ کر ہی حضرت زکریاؑ کو یہ احساس پیدا ہوا تھا اور انہوں نے یہ دعا کی تھی جسے اللہ نے یوں قبول کیا تھا ورنہ اصل بات تو حضرت مریمؑ ہی کی ہو رہی تھی اور اسی کو کہا جا رہا ہے کہ یہ غیب سے ہم آپ کو اطلاعیں دے رہے ہیں ورنہ آپ ان واقعات کو آنکھوں سے تھوڑے ہی دیکھ رہے تھے۔

قرآن کا اعجازی پہلو بحیثیت بیان واقعات:

اس طرح امم سابقہ کے ان حالات کے متعلق جو قرآن میں پیش کیے گئے ہیں اعجاز کے ایک پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے کہ رسولؐ کے لئے کوئی ظاہری ذریعہ ان حالات پر براہ راست مطلع ہونے کا نہیں ہے اور یہ اس بناء پر کہ اہل کتاب کے علماء اپنی مذہبی معلومات کو بطور راز اپنے سینوں میں رکھا کرتے تھے اور اپنی کتابوں کی اشاعت بھی انہوں نے چھوڑ رکھی تھی، اس لئے کہ دوسرے لوگ علم حاصل نہ کر لیں اور اس سے ان کی مرجعیت کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ اس کے علاوہ یہ معلومات خود انہیں مسخ شدہ شکل میں حاصل تھیں لہٰذا ان معلومات کو ان کی اصل شکل میں پیش کرنا یہ فیض ربانی اور وحی آسمانی کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے؟

بحیثیت واقعہ یہ جزء جو یہاں بیان ہوا ہے گزشتہ بہت سے واقعات سے مقدم ہے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے کہ جناب مریمؑ پیدا ہوئی ہیں اور اسکے بعد بلا فاصلہ جو ذکر آتا ہے وہ جناب مریمؑ کے پورے طور پر کمال شباب کی منزل کا ہے کہ ملائکہ نے ان کو جناب عیسیٰؑ کی بشارت دی ممکن ہے یہاں ترتیب میں تنزیل کے لحاظ سے کچھ مقدم و موخر ہو گیا ہے اور اصل ترتیب آیات کے نازل ہونے کی کچھ اور ہو جسے پورے طور پر قائم کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

یلقون اقلامھم کے معنی لفظی ہیں ''اپنے قلم پھینک رہے تھے۔'' یہ قرعہ ڈالنے کا اس وقت کا عام طریقہ تھا یا ممکن ہے خاص طور پر اختیار کیا گیا ہو۔ اس لئے ہم نے ترجمہ یہ کیا کہ وہ ''قرعے ڈال رہے تھے۔'' مگر تفصیل اس کی قرآن مجید میں مذکور نہیں اور بعض کتب تفسیر میں جو تفصیلات درج ہیں وہ مستند نہیں ہیں [1]

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾

---

[1] ۔قد روی فی الدر المنثور وغیرہ فی القاء الاقلام و کیفیتہ روایات لا تنہض حجۃ (البلاغی)

''جب کہا فرشتوں نے اے مریم! بلاشبہ اللہ آپ کو خوش خبری دیتا ہے اپنی طرف کے ایک کلمہ کی جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے جو دنیا و آخرت میں آبرودار [1] ہوگا اور بارگاہ الٰہی میں رسوخ رکھنے والوں میں۔''

ولادت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت:

جناب عیسیٰ علیہ السلام کے نام میں ماں کی نسبت کو شریک کر کے اسی وقت اس کا پتہ دے دیا تھا کہ یہ بے باپ کے پیدا ہوگا ورنہ باپ کی نسبت دی جاتی [2]۔

اس کے علاوہ ابن مریم کہنے سے ابن اللہ ہونے کی رد بھی تھی جو بعد میں نصاریٰ کا مزعومہ ہونے والا تھا [3]۔

انہیں کلمۃ اللہ کہا جانا اس اعتبار سے ہے کہ وہ اسباب فطری کے نظام کے صرف اشارہ قدرت سے جس کی تعبیر کلمہ کن سے ہوتی ہے عالم وجود میں آئیں گے [4]۔

جیسا کہ اس کے قبل بھی ایک آیت مجملا بیان ہوا۔ یہ بات کہنے والا ایک فرشتہ تھا [5] مگر ابہام کے موقع پر جب نام لینا منظور نہ ہو تو جیسے فارسی میں ''گفتہ شد'' کے بجائے ''گفتند'' کہہ دیتے ہیں جس کا لفظی مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے کہا'' ویسے عربی محاورہ میں بھی ایک کی بات کی نسبت اس جماعت کی طرف دے دی جاتی ہے جس کا وہ فرد ہے۔ اس لئے قرآن نے کہا فرشتوں نے کہا اگر اس نظیر کو سامنے رکھا جائے تو آیہ ولایت میں بحث کے صیغے سب جمع کے ہیں:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ (مائدہ..۵۵)

تو انہیں فرد واحد (جناب امیرؑ) سے متعلق کیوں سمجھا جاتا ہے؟ دور از کار ثابت ہوگی۔

وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَکَھْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۴۶﴾

''وہ باتیں کرے گا آدمیوں سے گہوارے میں اور پوری عمر تک پہنچ کے [6] اور نیکوکاروں میں سے ہوگا۔''

''پوری عمر تک پہنچ کے'' کلام کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ المہد کے جوڑ سے یہ مفہوم پیدا کیا ہے کہ گہوارہ میں

---

[1] ۔القمی ذو وجہ وجاہ (صافی) با آبرو (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔خاطبہا بنسبۃ الیہا تنبیہا علیٰ انہا تلدہ بلا اب (جلالین)

[3] ۔نسبہ الیٰ امّہ ردا علی النصاری وقولھم انّہ ابن اللہ (مجمع البیان)

[4] ۔یعنی محض خدا کی ایک بات یعنی کُن ۔۔۔ سے بنایا تھا (تاج العلماء)

[5] ۔یعنی جبرئیل (نیشاپوری)

[6] ۔الکھل فی اللغۃ الذی اجتمع قوتہ و کمل شبابہ من قولھم اکھل البنات ای قوی روی ان عمرہ بلغ ثلثا و ثلثین ثم رفع الی السماء (نیشاپوری)

اور پوری عمر پر پہنچ کے دونوں عالم میں یکساں کلام کرے گا۔ اب یہ دونوں باتیں مل کر ایک خاص چیز بن گئی [1]۔

اس کے علاوہ ہوسکتا ہے کہ کلام کی نوعیت کا اتحاد مراد ہو کہ جو بات وہ گہوارہ میں کہے گا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی قرار دیا ہے وہی بات اس کی آخر تک رہے گی۔ اس میں فرق نہ ہوگا [2]۔

اس طرح ذیل میں نصاریٰ کی رد بھی ہوجاتی ہے کہ وہ جو انہیں خدا اور خدا کا بیٹا کہتے ہیں یہ بالکل جناب عیسیٰؑ کی تعلیم کے خلاف ہے۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾

''انہوں نے کہا اے میرے پروردگار! میرے یہاں کہاں سے ہوگا! حالانکہ مجھے کسی آدمی نے ہاتھ نہیں لگایا ہے [3] فرمایا کہ یونہی اللہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہوجا تو بس وہ ہوجاتی ہے۔''

جناب زکریاؑ کے سوال پر کہ میرے یہاں اولاد کہاں سے ہوگی جو جواب ملا تھا اس میں یہ جملہ تھا کہ ''یونہی اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے'' کیوں کہ وہاں جو اولاد عالم وجود میں آنے والی تھی وہ اپنی نوعیت میں کوئی عجوبہ حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ عام نظام طبیعت کے ماتحت ماں اور باپ سے پیدا ہونے والا بچہ تھا۔ صرف وہ حالات جن میں وہ پیدا ہوگا غیر معمولی ہیں۔ لہٰذا کہا کہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یعنی جن حالات میں چاہیے بچہ کو متولد کردے اور یہاں خود وہ بچہ جو پیدا ہونے والا تھا عجیب حیثیت رکھتا تھا کہ وہ کسی مرد کے نطفہ سے پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ چاہے ایسا بچہ خلق کرے جو نطفہ سے تدریجی طور پر جنین اور پھر طفل کی صورت میں آئے اور چاہیے ایسا بچہ جو بغیر کسی نطفہ کے ایک دم جنین کی شکل میں آ گیا ہو [4]۔

یہ الفاظ قرآنی ان تمام تصورات کا قلع قمع کردینے کے لئے کافی ہیں جو نیاز صاحب فتح پوری وغیرہ ایسے اشخاص کسی طرح ان تمام واقعات کو کھینچ تان کر عام نظام طبیعت اور اسباب فطرت پر منطبق کرنے کی کوشش میں قائم کرتے ہیں۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ

---

[1] ۔قال ابو مسلم معناہ انہ یتکلّم حال کونہ فی المھد وحال کونہ کھلا علیٰ حدّ واحد وصفۃ واحدۃ (نیشاپوری)

[2] ۔یکلّم الناس کلام الانبیاء فی المھد حال کونہ طفلا و کھلا من غیر تفاوت (نیشاپوری)

[3] ۔چھوبھی نہیں گیا مجھے کوئی بشر (تاج العلماء)

[4] ۔عبر عن الفعل ھٰھنا لخلق لان القدرۃ ھٰھنا امم وھو تخلیق مولود بغیر اب (نیشاپوری)

كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ﴿۴۹﴾

''اور وہ اسے سکھائے گا کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل اور پیغمبر بنی اسرائیل کی طرف کہ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے خاص معجزہ [1] لے کر آیا ہوں کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرند کی صورت بنا تا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ بحکم خدا پرند بنا تا ہے اور پیدائشی اندھے [2] اور کوڑھی کو شفاء دیتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتا ہوں اور تمہیں بتا تا ہوں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں سینت کر رکھتے ہو بلاشبہ اس میں بہت بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان لانے کے لئے تیار ہو۔''

معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

یہاں ترتیب آیات میں معنوی حیثیت سے تسلسل نہیں ہے۔اس کے پہلے کی آیت میں جناب مریمؑ کا اظہار تعجب اور اس فرشتہ کا جواب کہ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں یہ ایک مستقل چیز ہے جو درمیان میں آ گئی ہے۔اب اس کے پہلے جو بیان تھا کہ فرشتوں نے مریمؑ سے کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (آل عمران..۴۵) اللہ تمہیں مژدہ دیتا ہے اپنے ایک کلمہ کا جس کا نام عیسیٰ الصالحین ''اور وہ لوگوں سے بات کرے گا گہوارہ میں اور کمال عمر کی منزل پر پہنچ کر اور وہ نیکوکاروں میں سے ہوگا'' اب اسی سلسلہ کی یہ کڑی آتی ہے کہ ''اور اللہ اسے کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم دے گا'' اور پھر پہلے جو لفظ آیا تھا و جیھا فی الدنیا والاخرۃ دنیا اور آخرت میں آبرودار اس پر عطف کے ساتھ یہ لفظ کہ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اور پیغمبر بنی اسرائیل کی طرف جس کا پیغام یہ ہوگا جو بعد میں مذکور ہے [3]۔

''اسے کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل سکھائے گا۔''

اس میں توریت اور انجیل کا ذکر چوں کہ بعد کو ہے، اس لئے پہلے جو لفظ کتاب آیا اس سے بظاہر قوانین الٰہیہ کا علم مراد ہے۔اس طرح کتاب کے معنی ہیں قانون ربانی جس کا حامل بن کر ہر نبی آیا ہے اور بعض لوگوں نے اسے عام کتب آسمانی کے معنی میں لیا ہے اور کہا ہے کہ توریت و انجیل کا ذکر بنظر اہمیت بعد میں خاص طور پر دیا گیا ہے [4] اور بعض نے فن کتاب یا توریت وانجیل کے علاوہ کوئی دوسری کتاب ہونے کا شبہ بھی ظاہر

---

[1] ۔المراد بالایۃ الجنس لا الفرد لانہ عدد الواعا من الایات (نیشاپوری)

[2] ۔سُور (تاج العلماء)

[3] ۔عطفا علیٰ وجیھا وما بعدہ (نیشاپوری)

[4] ۔خدا اس کو (تمام) کتب آسمانی اور عقل کی باتیں اور (خاص کر) توریت وانجیل سکھائے گا (فرمان علی صاحب)

کیا ہے [1] اور بعض نے اسی کو ظاہر کلام الٰہی کے مطابق قرار دیا ہے [2]۔

رسولاً کے لفظ کے ساتھ آل و بنی اسرائیل کی قید اس کا ثبوت ہے کہ جناب عیسیٰؑ کی رسالت صرف خاندان اسرائیل سے مخصوص تھی جو بائبل سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور بعض احادیث معصومین علیہم السلام سے بھی اس کی تصریح کرتے ہیں [3] مگر علامہ بلاغی اس سے متفق نہیں ہیں اس لئے انہوں نے رسولاً الی بنی اسرائیل کا مطلب یہ لیا ہے کہ ابتدائی مخاطب ان کے بنی اسرائیل تھے [4]۔

الفاظ قرآنی کے لحاظ سے یہ مفہوم غلط تو نہیں ہے جیسا کہ ہمارے رسولؐ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا: آپ ام القریٰ (مکہ) اور اس کے گرد و پیش والوں کو عذاب سے ڈرائیں (انعام۔ ۹۲)

مگر آپ کا دائرہ رسالت اتنے میں محدود نہیں تھا بلکہ تمام عالمین کے لئے تھا جو قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے ثابت ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ دائرہ رسالت عیسوی کا عام ہونا دوسرے دلائل سے ثابت ہو مگر ہمارے خیال میں ایسا نہیں ہے بلکہ دوسرے دلائل سے بھی ان کی رسالت کا بنی اسرائیل میں محدود ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔

اس کے بعد معجزات جناب عیسیٰؑ کا ذکر ہے اور وہ اتنے صاف الفاظ میں ہے کہ ان میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔

ان خاص امراض کو شفا دینا یا بینائی پیدا کرنا، چاہے اس وقت کے اطباء کے دست رس سے باہر ہو لیکن ہے وہ اسی جنس کی شے جو اطباء کیا کرتے ہیں لہٰذا اس میں باذن اللہ کے لفظ کے لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی مگر پرند کے مجسمے میں روح پھونک کر جاندار بنانا اور مردہ کو زندہ کرنا خدا کی شان کے کام ہیں م اس لئے ان دونوں میں باذن اللہ کی قید لگائی کہ یہ عیسیٰؑ کا بذات خود کام نہ تھا بلکہ اللہ کا کام تھا جو ان کے ہاتھ پر ظاہر کیا گیا تھا [5]۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝۵۰

"اور تصدیق کرتا ہوا اس توریت کی جو میرے آگے ہے [6] اور اس لئے کہ حلال کروں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام تھیں اور آیا ہوں تمہارے پروردگار کی طرف کے اعجاز کے ساتھ تو اللہ کے غضب سے بچو اور میرا کہنا مانو۔"

---

[1] ۔ اراد به الکتابة عن ابن جریج ۔ وقیل اراد به بعض الکتب التی انزلها الله علیٰ انبیاء سوی التورٰة والانجیل (صافی)

[2] ۔ هو الیق بالظاهر (مجمع البیان)

[3] ۔ عن الباقر علیہ السلام انه ارسل الیٰ بنی اسرائیل خاصة وکانت بنوّته بیت المقدس (صافی)

[4] ۔ باعتبار ابتداء خطابهم فی الدعوة (آلاء الرحمٰن)

[5] ۔ کرّر باذن الله دفعا لوهم الالوهیة فان الاحیاء لیس من جنس افعال البشر (صافی)

[6] ۔ جو میرے سامنے موجود ہے یعنی توریت (تاج العلماء)

''جو چیزیں تم پر حرام کی گئی تھیں ان میں سے بعض کو میں حلال کر دوں'' اس سے ظاہر ہے کہ شریعت عیسوی میں کچھ احکام شریعت موسوی کے منسوخ کیے گئے تھے [1] اور یہ پہلے فقرہ سے کہ میں توریت کی تصدیق کرتا ہوں، کوئی منافی چیز نہیں ہے۔ اس لئے کہ تصدیق کے معنی تو یہ ہیں کہ وہ شریعت من جانب اللہ نازل ہوئی تھی لیکن اللہ کی طرف سے خود مصالح کی تبدیلی کی وجہ سے اب کچھ اس کے احکام بدل دیے گئے جسے قرآن تمام سابق کتب کی تصدیق کرنے والا ہے مگر بہت سے احکام اس میں منسوخ کر دیے گئے ہیں [2]۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۵۱﴾

''یقیناً اللہ میرا پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے تو اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔''

اس میں جناب عیسیٰؑ کے جس پیغام کا ذکر ہوا ہے، اس کا مقصود یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا پیغام وہی اسلامی پیغام تھا جو تمام انبیاء الٰہی دیتے رہے تھے اور جواب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے پیش ہو رہا ہے اور جو عقیدہ نصاریٰ نے ان کے متعلق قائم کر رکھا ہے کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہیں یہ خود حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کے خلاف ہے [3]۔

فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

''تو جب عیسیٰؑ نے ان کی طرف سے انکار محسوس کیا [4] تو کہا کہ اللہ کی سمت (جانے میں) کون ہیں جو میرے مدد گار ہوں [5] جواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور گواہ رہیے گا کہ ہم ''مسلم'' ہیں۔

حواریین عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ:

حواری کا لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخصوصین کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ملا محسن فیض فرماتے ہیں کہ حور کے لغوی معنی خالص سفیدی کے ہیں۔ اس مناسبت سے خالص و مخلص افراد کو اس لفظ سے بیان کیا جاتا ہے۔

عیون اخبار ''الرضاؑ'' کی روایت میں ہے کہ عوام کا تصور تو یہ ہے کہ چوں کہ یہ لوگ کپڑے دھوتے اور صاف کرتے تھے اس لئے حواری کہلائے مگر ہمارے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ وہ خود بھی خالص لوگ تھے اور دوسروں کو بھی گناہ کی آلائش سے وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے صاف

---

[1] ۔۲۔ کالشحوم والشمك ولحوم الابل والعمل بالسّبت كذا قيل (صافی)

[2] ۔ذلك لان النسخ فی الحقيقة بيان لانتهاء فالناسخ الحكم وتخصيص فی الازمان (صافی) مُدة فالناسخ والمنسوخ كلاهما حق فی وقته (نیشاپوری)

[3] ۔انما قال ذلك ليكون حجّة على النصارىٰ فی قولهم المسيح ابن الله (مجمع البیان)

[4] ۔لما سمع ورای انهم يكفرون كذا روی القمی عن الصّادق علیہ السلام (صافی) جانچ لیا عیسیٰؑ نے اُن کا کفر (تاج العلماء)

[5] ۔من اعوانی الیٰ سبيله (صافی) ای فی الدعوة اليه (البلاغی)

کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔

کتاب التوحید کی روایت میں ہے کہ ان کی تعداد بارہ تھی (صافی)

ایک نبی کی زبان سے قرآن کے یہ الفاظ کہ کون میرے مددگار ہیں؟ اس تصور کے قلع قمع کرنے کے لئے کافی ہونا چاہیے کہ غیر اللہ سے امداد طلب کرنا یا اسے کسی بھی حیثیت سے مددگار سمجھنا ایک قسم کا شرک ہے۔ یہ تصور عقل وفطرت کے بھی خلاف ہے اور قرآن مجید کے بکثرت تصریحات کے بھی جن میں سے ایک مقام یہ ہے:

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

''اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے اتارا اور ہم نے اس پیغمبر کی پیروی اختیار کی اب تو ہمیں گواہوں کی فہرست میں درج فرما۔''

گواہی دینا کیا ہے؟ ان اصول دین کا اقرار کرنا جن سے انسان ملت حقہ میں مندرج ہوتا ہے[1]۔ اس طرح یہ ارشاد کہ فاکتبنا مع الشاھدین ایسا ہے جیسے کہا جائے کہ فاکتبنا مع المسلمین'' ہمیں اسلام لانے والوں میں محسوب فرمایا'' فاکتبنا مع المومنین ہمارا اہل ایمان میں شمار فرما۔''

اب مَعَ کے معنی یہ ہوں گے کہ اس صف میں ہمیں داخل قرار دینا[2] لیکن ہوسکتا ہے کہ مع کے معنی ''ساتھ'' ہی کے ہوں[3] اور الشاھدین سے کوئی وہ گروہ مراد ہو جس کا کام ہی گواہ ہونا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ

تم لوگ تمام لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔ (بقرہ۔ ۱۴۳)

یہ امت محمدیہ کے وہ بلند مرتبہ نفوس ہوں گے جن کے ساتھ ہونا امم سابقہ کے مومنین مخلصین کے لئے باعث سعادت ہوسکتا ہے[4]۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾

''انہوں نے اپنی ترکیب کی اور اللہ نے اپنی ترکیب کی اور اللہ سب سے بہتر ترکیبیں کرنے والا ہے۔''

مکر کیا لفظ کا اطلاق جواب مکر یہ کس طرح ہوا ہے، اس کی تشریح پہلے پارے میں اللہ یستھزی بھم کی تفسیر میں ہو چکا ہے۔ یوں بے ڈھرک مکر کی لفظ کا انتساب اللہ کی طرف بظاہر ضرور نامناسب معلوم ہوتا ہے مگر جس صورت سے قرآن مجید نے اس کا استعمال کیا ہے یہاں

---

[1] ۔مع الشاھدین لك بالواحدانیة ولرسولك بالصدق (جلالین)

[2] ۔ای فی جملة الشاھدین بجمیع ما انزلت (مجمع البیان)

[3] ۔لکھ لے ہمیں گواہوں کے ساتھ (تاج العلماء)

[4] ۔وھذا یقتضی ان یکون للشاھدین فضل یزید علی فضل الحوارین (نیشاپوری)

سیاق کلام خود مقابلہ مکر کا اظہار کر رہا ہے [1] اور آخر کا فقرہ اس کے مقابلہ میں دنیا والوں کی ترکیبوں کی ناکامی کا اعلان ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں کسی کا مکر چل نہیں سکتا ہے۔

خداوند عالم کی طرف مکر کی نسبت اور اس کا مفہوم:

صورت واقعہ بھی اس مفہوم کو تقویت پہنچاتی ہے۔ دشمنوں نے ترکیب کی تھی جناب عیسیٰؑ کو ہلاک کرنے کی اور اللہ نے اس کے مقابلہ میں ترکیب یہ کی کہ انہیں آسمان پر اٹھا لیا اور اس ترکیب کی لطافت اس قدر بڑھ گئی کہ وہ لوگ اسی گمان باطل میں رہے کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو ہلاک کر دیا ہے۔

اکثر مفسرین کا تصور یہی ہے مگر علامہ بلاغی طاب ثراہ کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ لفظ مکر میں ذم کا پہلو ہمارے غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اس کے اصل معنی فریق مخالف کے مقابلہ میں ایسی باریک صورت سے اقدام کئے ہیں جسے وہ سمجھ نہ سکے۔ اور اس لئے اس کے بے جھجک انتساب میں بھی خداوند عالم کی طرف کوئی خرابی نہیں ہے چنانچہ قرآن مجید میں اس کا استعمال اس طرح ہوا ہے جیسے:

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ

کیا وہ اپنے خلاف اللہ کی کارروائی سے مطمئن ہیں تو اللہ کی اپنی خلاف کارروائی سے مطمئن نہیں ہوتے مگر وہی جو گھاٹا اٹھانے والے ہوں (اعراف ۹۹)

اور دعا میں اللہ سے خطاب کر کے یہ وارد ہوا ہے کہ:

لا تمكر بي حيلتك۔

اپنی تدابیر میں میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کر۔

قرآن مجید اسی سورہ اور پھر سورہ انفال میں آیا ہے۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔

اللہ بہتر مکر کرنے والا ہے (آل عمران ۵۴) (انفال ۳۰)

جس میں اللہ اور دوسرے اشخاص پر یکساں طور سے الماکرین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ایک ہی استعمال ہیں مختلف افراد کے لحاظ سے مکر کے معنی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہو سکتا۔

علامہ موصوف کا خیال ہے کہ قرآن مجید کے ان شواہد کی موجودگی میں وہ روایت قبول نہیں جو امام رضاؑ کی زبانی وارد ہے کہ اللہ مکر نہیں کرتا بلکہ مکر کی سزا دیتا ہے یہ روایت ضعیف السند ہے اور برفرض صحت یہاں اس عوامی معنی والے مکر کے نفی ہے لیکن زیادہ رجحان اسی کو ہے کہ امام علیہ السلام کا ایسا ارشاد ہو ہی نہیں سکتا جو قرآن مجید کی تصریحات کے خلاف ہو۔

---

[1] ۔ لا يسند الى الله تعالىٰ الا علىٰ سبيل المقابلة والازدواج او بمعنى المجازاة وانما اضاف الله المكر الىٰ نفسه علىٰ مزاوجة الكلام كما قال فمن اعتدىٰ عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدىٰ عليكم والثاني ليس باعتداء (مجمع البیان)

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۵۵

''جب اللہ نے کہا اے عیسیٰؑ! میں تمہاری مدت پوری کرتا ہوں [1] اور تمہیں اپنی جانب اٹھاتا ہوں اور تمہیں ان کافروں سے پاک کرتا ہوں اور انہیں جو تمہاری پیروی کریں گے ان سے کہ جنہوں نے تمہارا انکار کیا روز قیامت تک اونچا رکھوں گا۔ پھر تم سب کا پلٹنا میری طرف ہوگا تو میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا اس کے بارے میں جس میں تمہارا اختلاف رہا کیا۔''

غیبت جناب عیسٰی علیہ السلام اور غیبت امام مہدی علیہ السلام:

''ان کافروں سے پاک کرتا ہوں'' کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمہارے ساتھ رہنے کے لائق نہیں ہیں ان کا ساتھ تمہارے لئے آلایش ہے [2] تمہاری شان اس سے بالاتر ہے کہ تم ان میں رہو۔ اس لئے تمہیں زندہ اپنی طرف اٹھائے لیتا ہوں [3]۔

یہ سلسلہ ہادیان سلف کی آخری فرد کی غیبت تھی جس پر جمہور مسلمین متفق ہیں۔ یہاں نہ طول عمر کی بحثیں پیدا ہوتی ہیں نہ وجود کی افادیت پر کوئی تکرار ہوتی ہے۔ اب اگر یہ سنت الٰہیہ اس امت میں بھی جاری ہوا اور حکمت الٰہی اپنی طرف کے ہادی کو گو یا مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا پیغام پہنچائے کہ یہ کافرین امت اب اس لائق نہیں ہیں کہ تم ان کہ اندر رہو۔ اس لئے غیبت کا پردہ ڈال کر اسے ان سے الگ کر دیا جائے تو اس میں قرآن کے ماننے والے عذر و تکرار کیوں کریں جب کہ یہ حدیث بھی صحاح ستہ میں موجود ہے کہ جو کچھ بنی اسرائیل میں ہوا ہے وہ اس امت میں بھی ضرور ہوگا۔

دائمی طور پر قوم یہود کی پستی کا اعلان:

جنہوں نے جناب عیسیٰؑ کا انکار کیا یہود ہیں۔ ان کے مقابلہ میں عیسیٰؑ کے ماننے والے اب مسلمان ہیں اور نصاریٰ، قرآن نے قیامت تک کے لئے یہ خبر دی ہے کہ یہود پست ہوں گے اور نصاریٰ اور مسلمانوں کو ہمیشہ ان کے مقابلہ میں فوقیت رہے گی [4]۔

---

[1] ۔مستوفی اجلك او قابضك من الارض (صافی) من بریگیرندۂ توام (شاہ ولی اللہ) میں لینے والا ہوں تجھ کو (شاہ رفیع الدین) ای اخذك من بین الناس من عالم الارض (البلاغی)

[2] ۔جعل مقامه فیما بینهم کمقام قاة النجاسة (مجمع البیان)

[3] ۔رافعك الی من الدّنیا من غیر موت (جلالین)

[4] ۔جاعل الذین اتبعوك من المسلمین والنصاریٰ فوق الذین کفروا من الیهود (صافی)

اب اگر خود نصاریٰ کے رحم وکرم سے ان کی کوئی حکومت بھی قائم ہوگئی تو ہو اس فوقیت کے منافی نہیں ہے۔

یہ کہ ان کی برائے نام بھی کوئی سلطنت قائم نہیں ہوگی قرآن مجید میں کہیں مذکور نہیں ہے بلکہ اسی لفظ فوق سے استفادہ کیا گیا ہے [1]۔

اور پھر دوسری جگہ قرآن کا یہ اعلان کہ ان پر ذلت لکھدی گئی ہے اس سے مشاہدہ کی بناء پر ذلت کا معیار یہی سمجھ لیا گیا کہ ان کی سلطنت قائم نہیں ہوگی [2]۔

لیکن برائے نام کوئی حکومت قائم ہوجائے اور وہ دوسروں کی زیر سیادت یا ان کی ہر طرح محتاج ہو تب بھی تو دوسروں کا تفوق یہود پر جو قرآن مجید میں ہے وہ تو صادق ہی رہے گا۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۵۶

''تو جنہوں نے انکار کیا! انہیں میں دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا اور ان کے کوئی مددگار نہیں ہوں گے۔''

دنیا میں یہود جن سختیوں میں ہمیشہ مبتلا رہے وہ تو تاریخ میں آنکھوں کے سامنے ہیں [3] اور آخرت کی منزل وہ ابھی پردہ غیب میں ہے۔ وہ بھی کبھی مشاہدہ میں آجائے گی۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۷

''اور جنہوں نے ایمان قبول کیا اور نیک اعمال کرتے رہے انہیں وہ پورے پورے ان کے صلے دے گا [4] اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔''

یہاں آخری فقرہ کہ ''اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا'' خود اللہ کے افعال میں ظلم وستم کی نفی کے لئے آیا ہے یعنی جب وہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا تو خود اس کے افعال میں ظلم کا شائبہ کہاں ہوسکتا ہے۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۝۵۸

''یہ ہے جو ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں آیتوں اور حکیمانہ یادداشت کے قبیل سے۔''

---

[1] ۔قال الجبائی فیہ دلالۃ علیٰ انہ لا یکون للیہود مملکۃ الیٰ یوم القیامۃ (مجمع البیان)

[2] ۔لعمری انہ کذالک فلا بری ملک یہودی فی الدنیا ولا بلد لھم مستقل (نیشاپوری)

[3] ۔اذلالھم بالقتل والاسر والسبی والحنف والجزیۃ فکلّ ما فعل بھم علیٰ وجہ الاستخفاف والاھانۃ (مجمع البیان)

[4] ۔بھرپور دوں گا انہیں ان کی مزدوریاں (تاج العلماء)

حکیم کے لفظ عموماً حکمت سے مشتق ہوتی ہے۔ اسی کے اعتبار سے ہم نے ترجمہ کیا ہے [1] اگر بعض مترجمین اور مفسرین نے اسے محکم یعنی مضبوط و مستحکم کے معنی میں لیا ہے [2]۔

بعض مفسرین نے دونوں احتمال برابر سے ذکر کیے ہیں [3] اور بعض نے دونوں کو سمو دیا ہے [4] بعض نے ایک تیسرا احتمال یہ بیان کیا ہے کہ حکیم کے معنی حاکم کے ہوں یعنی وہ احکام الٰہی پر مشتمل ہے [5]۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾

بلا شبہ عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے، انہیں تو مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے کہا کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتے ہیں'' [6]۔

نصارائے نجران سے بحث کی آخری کڑی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے نہ ہونے کی بحث میں حضرت آدمؑ کی مثال:

یہ آیت اس موقع کی ہے بلکہ جیسا کہ پہلے آچکا ہے بعض کے نزدیک شروع سے یہ سورہ ہی اس موقع پر نازل ہوا ہے کہ جب نصارائے نجران رسولؐ کے پاس بحث کے لئے آئے تھے۔

انہوں نے الوہیت عیسیٰؑ اور ان کے فرزند خدا ہونے پر یہ دلیل کی کہ وہ بغیر کسی باپ کے پیدا ہوئے تھے تو ان کے جواب میں یہ آیت اتری کہ اس کے پہلے آدمؑ تو بغیر ماں باپ کے وجود میں آئے تھے۔ پھر اس سے وہ خدا یا خدا کے بیٹے نہ ہوئے تو عیسیٰؑ کیوں ہو جائیں گے؟

مولانا فرمان علی صاحب نے اپنے حاشیہ میں خوب بات لکھی ہے کہ:

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں یہود نصاریٰ دونوں شبہ میں پڑے ہوئے تھے۔ یہود تو آپ کی نسبت بیہودہ بدگمانی کرتے تھے اور نصاریٰ خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ خداوند عالم نے حضرت آدمؑ کی مثال دے کر دونوں کی تشفی کر دی۔ یہود کی اس طرح کہ جب خدا میں یہ قدرت ہے کہ آدمؑ کو

---

[1] ۔نصیحت حکمت والی (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔الحکیم المحکم (جلالین) کتاب محکم (شاہ ولی اللہ) مضبوط یادداشتوں میں سے (تاج العلماء)

[3] ۔الحکیم المشتمل علی الحکم او المحکم الممنوع من تطرّق الخلل الیہ (صافی)

[4] ۔القرآن المحکم وانما وصفہ بانہ حکیم لانہ بما فیہ من الحکمۃ کانہ ینطق بالحکمۃ (مجمع البیان)

[5] ۔ھو بمعنی الحاکم کالعلیم بمعنی ان الاحکام تستفاد منہ (نیشاپوری)

[6] ۔فیکون ای فکان فی الحال علیٰ ما اراد (مجمع البیان) وانالم یقل فکان اما لانہ حکایۃ حال ماضیۃ واما تصویر لتلک الحالۃ العجیبۃ (نیشاپوری)

بے ماں باپ کے فقط مٹی سے بنا دیا تو عیسیٰؑ کو ماں سے پیدا کرنا کیا تعجب کی بات ہے اور نصاریٰ کی اس طرح کی اگر عیسیٰؑ کا بے باپ کے پیدا ہونا خدا یا خدا کا بیٹا ہونے کی دلیل ہے تو آدمؑ کے ماں باپ دونوں نہ تھے۔ پھر ان کو خدا یا خدا کا بیٹا بدرجہ اولی ہونا چاہے۔''

اس کو علامہ بلاغی رحمہ اللہ نے بھی اپنے انداز میں تحریر کیا ہے اس طرح کہ:

احتج علی الفریقین بما یعرفونه و یعترفون به من خلقة ادم فماذا یقول الیهود فی اٰدم و ما ذا یقول النصاری فیه (آلاء الرحمن)

دونوں فرقوں کے خلاف اس نے استدلال کیا ہے ایسی چیز سے کہ جس کو وہ جانتے تھے اور جس کو وہ اقرار رکھتے تھے یعنی آدمؑ کی تخلیق تو اب آدمؑ کے بارے میں یہود کیا کہیں گے اور ان کے بارے میں عیسائی کیا کہیں گے؟

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٦٠﴾

''یہ حق بات ہے [1] تمہارے پروردگار کی طرف سے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔''

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦١﴾

''اب جو شخص اس بارے میں آپ نے کچھ حجتی کرے اس کے بعد یہ علمی دلائل [2] آپ کے پاس آ گئے تو کہہ دیجئے کہ آؤ! ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے نفسوں کو اور تمہارے نفسوں کو پھر التجا کریں [3] اور اللہ کی لعنت قرار دیں جھوٹوں پر۔''

واقعۂ مباہلہ:

یہ مشہور و معروف آیہ مباہلہ ہے جس میں نصارائے نجران کو دلائل کے پیش ہونے اور ان کے برابر بحث کئے جانے کے بعد روحانی مقابلہ کی دعوت دی گئی اور اس کے لئے حضرتؐ تشریف لے گئے اس طرح کہ آپ کے ساتھ بیٹوں کی جگہ حسنؑ و حسینؑ تھے اور عورتوں میں خاتون جنت جناب فاطمہ زہراؑ اور انفس کی منزل پر حضرت علی بن ابی طالبؑ حضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب میں دعا کروں تو تم سب آمین کہنا نتیجہ یہ ہوا کہ نصاریٰ نے مباہلہ سے پہلوتہی کی اور جزیہ دینے پر تیار ہو گئے۔

---

[1] ۔خبر مبتداء محذوف (نیشاپوری) ای هٰذا هو الحق من ربك (مجمع البیان) ای الاخبار باحوال المسیح هو الحق (البلاغی)

[2] ۔من البرهان الواضح (مجمع البیان) البیّنات الموجبة للعلم (صافی)

[3] ۔ای نتضرع فی الدعآء (مجمع)

"انفسنا" کے معنی:

یہ واقعہ فریقین کے درمیان متفق علیہ ہے [1] شیخ ابن تیمیہ ایسے متعصب نے بھی اپنی مشہور کتاب "منہاج السنہ" میں جو رد شیعہ کیلئے لکھی گئی ہے اس واقعہ کی صحت اور الفاظ قرآن کے مصداق میں کہ وہ یہی ہستیاں ہیں کسی شک وشبہ کا اظہار نہیں کیا ہے مگر انہوں نے حضرت علی بن ابی طالبؑ کی بلندی ورفعت کے اظہار میں انفسنا کا لفظ کی اہمیت کو گھٹانا چاہا ہے کہ اس سے عموماً اپنے ہم قوم افراد مراد ہوتے ہیں جس میں کسی بلندی اوصاف کا لحاظ نہیں ہوتا جیسا کہ قرآن میں ہے:

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: اپنے نفوس کو قتل کرتے ہو اور وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ: تم اپنے نفوس کو اپنے گھروں سے نہ نکالو

مگر اس کا جواب علامہ بلاغیؒ نے آلاء الرحمن میں بالکل صحیح دیا ہے کہ نفس کا لفظ جو دوسرے اعزاؤ اقارب کا تذکرہ کے ساتھ الگ سے بولا جائے تو وہاں ہم قوم افراد تھوڑی مراد ہوں گے بلکہ اس وقت تو خود اپنی ذات مراد ہوں گی جیسے سورہ تحریم ہے۔

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا.

اپنے نفوس کو اور اپنے عزیز واقارب کو آگ سے بچاؤ اور سورہ زمر اور شوریٰ میں ہے:

الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ

جنہوں نے نفوس اور عزیز اقارب کو خسارہ میں مبتلا کیا۔

یہاں ایسا ہی ہے کہ ابناء اور نساء نا کے بعد لگ سے انفسنا آیا ہے تو اب اسے عام ہم قوم کہاں مراد ہو سکتے ہیں؟ یہاں تو جسے انفسنا کہا جائے وہ اس خصوصیت خاص کا حامل ہوگا کہ وہ متکلم کی ذات کا درجہ رکھتا ہو۔

خود ابن تیمیہ کو اپنے بیان کردہ مفہوم میں ایک کمزوری محسوس ہو رہی ہے کہ اگر ہم قوم مراد ہیں تو پھر چچا عباسؓ اور دوسرے نبی ہاشم کیوں اس منزل پر لائے نہیں گئے؟ اس کے جواب میں انہیں مجبوراً یہ کہنا پڑا ہے کہ عباسؓ کو اسلام میں وہ سبقت حاصل نہ تھی جو علیؑ کو تھی اور دوسرے بنی ہاشم ان میں بھی علیؑ کا ایسا کوئی دوسرا نہ تھا۔

دیکھا آپ نے؟ صیاد کس طرح اپنے دام میں آیا ہے؟! آخر میں نتیجہ کیا نکلا؟ یہی تو کہ انفسنا کہنا اوصاف کی کچھ خاص بلندی اور رسولؐ خدا سے خاص قرب کی بنا پر ہے یعنی ایسی منزلت جو دوسروں کو حاصل نہ تھی۔

اس آیت کی یہ دلالت بھی بلاشبہ مسلم ہے کہ اس میں حسنینؑ کو جو نواسے تھے فرزند رسولؐ کہا گیا ہے چنانچہ علامہ نیشاپوری لکھتے ہیں:

---

[1] ۔فی العیون عن الکاظمؑ ان تاویل قولہ عزو جل ابناء نا الحسنؑ والحسینؑ ونساء نا فاطمۃؑ وانفسنا علی بن ابن طالبؑ (صافی) قد نجران لذلك وقد کرج ومعہ الحسنؑ والحسینؑ وفاطمۃؑ وعلیؑ وقال لھم اذا دعوت فامنوا فابوا ان یلا عنوہ وصالحوہ علی التجزیۃ رواہ ابو نعیم فی دلائل النبوۃ (جلالین) حضرت آپؐ حضرت فاطمہؑ اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ اور حضرت علیؑ کو لے کر گئے (موضح القرآن)

وفی الا یة دلالة علی ان الحسن علیہ السلام و الحسین علیہ السلام وھما ابنا بنت یصح ان یقال انھما ابنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لانہ و عدان یدعوا ابناء ثم جاء بھما (غرائب القرآن)

حسنین علیہما السلام کا فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونا:

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ حسنؑ و حسینؑ جو رسولؐ کی بیٹی کے فرزند تھے انہیں فرزند رسول خداؐ کہنا درست ہے اس لئے کہ آپ نے اعلان فرمایا کہ آپ اپنے بیٹوں کو لائیں گے پھر ان دونوں کو لے کر تشریف لائے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾

''بلا شبہ یہی ہے سچا بیان اور کوئی خدا نہیں سوا اللہ کے اور بلا شبہ اللہ زبردست ہے ہر کام ٹھیک کرنے والا اب وہ منہ موڑیں تو بلا شبہ اللہ تباہ کاروں سے خوب واقف ہے۔''

نفی الوہیت غیر اور توحید باری کے اعلان کے ساتھی یہ الفاظ کہ ''اللہ زبردست ہے ہر کام ٹھیک کرنے والا'' اس استدلال پر مشتمل ہیں کہ شریک کی ضرورت یا قوت کی کمی سے ہوتی ہے یا علم کی کمی سے یعنی سہارا دوسرے کی جسمانی طاقت کا لیا جاتا ہے اور اس کے دماغی کی قوت کا اور اللہ کی نہ طاقت میں نقص ہے اور نہ علم میں پھر وہ اپنا شریک کس لئے بنائے گا[1]؟

آخر میں یہ کہ اللہ تباہ کاروں سے خوب واقف ہے اس سے یہ پتہ دیا گیا ہے کہ خود شرک بہت بڑی تباہ کاری ہے جس سے ارتقائے انسانی کو بڑا دھچکا لگتا ہے اور ذہنیت کی پستی کے ساتھ ہر طرح کی عملی پستی پیدا ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ نوع انسانی کی مکمل تباہی کی طرف منجر ہوتا ہے[2]۔

اسی لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ

شرک بہت بڑا ظلم ہے (لقمان۔ ۱۳)

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا

---

[1] ۔لا احد سواہ یساویہ فی القدرۃ التامّۃ والحکمۃ البالغۃ لیشارکہ فی الالوھیّۃ (صافی)

[2] ۔الاعراض عن التوحید افساد للذین ویؤدی الیٰ افساد النفس بل والیٰ افساد العالم (صافی)

فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

"کہیے کہ اے کتاب والو! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے [1] کہ ہم عبادت نہ کریں اللہ کے سوا کسی کی اور اسی کا کسی شے کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں کے کچھ لوگ کچھ کو اللہ کے سوا مالک ومختار نہ سمجھ لیں۔ اب اگر یہ لوگ منہ پھرائیں تو تم لوگ کہو کہ گواہ رہنا کہ ہم مسلم ہیں۔"

مخالفین کو روادانہ دعوت اتحاد:

اس میں یہود ونصاریٰ کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اصول اسلام خود ان کی کتابوں کے رو سے بھی قابل تسلیم ہیں اور مشرکین کے مقابلہ میں تو ان سب کو یک دست ہونا چاہیے مگر وہ صرف تعصب کی بناء پر مسلمانوں کے مقابلہ میں فریق بنتے ہیں اور اس طرح مسلم کا لفظ جو ان سب میں مشترک ہونا چاہیے ان کے تعصب وعناد کی وجہ سے صرف اس جماعت میں محدود ہو گیا جو کہ اپنے مسلم ہونے کا اعلان کر رہی ہے اور مسلم ہی کہے جانے پر فخر رکھتی ہے۔

نفی شرک کے بعد یہ کہ کچھ لوگ کچھ کو اللہ کے سوا اپنا مالک ومختار نہ مانیں۔" اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مالک ومختار سمجھنا بحیثیت عبادت نہیں کسی اور اعتبار سے ہے اور یہ وہ ہے جسے دوسری جگہ کہا گیا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

انہوں نے اپنے پادریوں اور راہبوں کو اللہ کے سوا مالک ومختار سمجھ لیا ہے۔ (توبہ۔۳۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے شریعت میں حلال اور حرام مقرر کرنے کا انہیں ٹھیکہ دار سمجھ لیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم نے جو مسلمان ہو چکے تھے کہا: یارسول اللہ! ہم ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے حضرتؐ نے فرمایا:

الیس کانوا یحلون لکم و یحرمون فتاخذون بقولهم

کیا ایسا نہ تھا کہ وہ تمہارے لئے حلال وحرام مقرر کرتے تھے تو تم ان کے قول پر عمل کرتے تھے؟

انہوں نے کہا ہاں ایسا تو تھا حضرتؐ نے فرمایا:

هو ذاك "بس یہی وہ ہے جسے قرآن میں اس طرح کہا گیا ہے (صافی)

اسلام میں فقہا اور مجتہدین کو شریعت سازی کا اختیار نہیں:

اسلام میں حلال وحرام مقرر کرنے کا حق کسی کے لئے نہیں مانا جاتا۔ اسی لئے فقہائے امت کو مجتہد کہا جاتا ہے یعنی ان کا کام ہے حلال اور حرام معلوم کرنے کی کوشش کرنا اور دلائل سے پتہ لگانا کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام؟ نہ یہ کہ اپنے دل سے ان احکام کی تشکیل کرنا۔

---

[1] ۔ بیائید بسوئے مسلم سختی میان ما وشما (شاہ ولی اللہ) ای عادلة لا میل لها ـــــ وقیل معناه کلمة مستر بة بیننا وبینك (مجمع البیان) برابر برابر ہے ہمارے اور تمہارے درمیان میں (تاج العلماء)

آخر میں یہ الفاظ کہ ''گواہ رہنا کہ ہم مسلم ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہمارا مسلک وہ ہے جس کی حقانیت پر تمہاری بھی کتابیں متفق ہیں اور ہم تمہیں بھی عملاً اس پر قائم رہنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اب اگر تم اس پر عملاً قائم نہیں رہے تو خود تمہارے ضمیر کو اس کا گواہ ہونا چاہیے کہ اس دین اسلام پر جو تمہارے اسلاف ابراہیمؑ اسماعیلؑ اور اسحاقؑ کا راستہ تھا ہم قائم ہیں اس لئے ہم مسلم ہیں اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ تمہیں اعتراف کرنا چاہیے کہ تم کافر ہو جب کہ اس راہ سے جو اسلام کی ہے تم صاف صاف انحراف اختیار کر رہے ہو [1]۔

قرآنی تہذیب یا رواداری:

مگر قرآن نے پہلے جزء پر اکتفا کیا اور اس جزء کو جس کے اظہار میں تلخی زیادہ تھی بیان نہیں کیا جسے ایک قرآنی تہذیب سمجھنا چاہیے جس کے نمونے کلام الٰہی میں اور بھی موجود ہیں اور جسے ''رواداری'' کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾

''اے کتاب والو! ابراہیم کے بارے میں کیوں خواہ مخواہ تکرار کرتے ہو؟ [2] حالانکہ توریت اور انجیل دونوں نہیں اتریں مگر ان کے بعد تو کیا تم عقل سے کام نہیں لو گے [3]؟!

حضرت ابراہیم علیہ السلام کس دین پر تھے:

یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ ہمارے دین پر تھے اور نصاریٰ کہتے تھے کہ وہ ہمارے دین پر تھے بعض روایتوں میں یہ ہے کہ ان دونوں فرقوں کے آدمیوں نے حضرتؑ کا ثالث بنایا [4]۔

قرآن کہتا ہے کہ تم بلاوجہ بحثیں کیوں کرتے ہو؟ تمہارے خصوصیات امتیازی جو توریت اور انجیل سے وابستہ ہیں حضرت ابراہیمؑ میں کیوں کر ہو سکتے ہیں؟! یہ کتابیں تو ان کے بعد نازل ہوئی ہیں لہٰذا جناب ابراہیمؑ میں وہی مشترک جوہر توحید تھا جو اسلام کا طرہ امتیاز ہے لہٰذا انہیں بسم مسلم کہنا صحیح ہے۔ یہودی یا نصرانی کچھ بھی کہنا بے معنی ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے ایک بہت ضروری سوال اٹھا کر اس کا جواب دیا ہے۔ وہ یہ کہ جب توریت اور انجیل کا جناب ابراہیمؑ کے بعد نازل ہونا اس کی دلیل ہے کہ وہ یہودی اور نصرانی نہ تھے تو پھر قرآن تو اس کے بھی بعد نازل ہوا ہے۔ ایسی صورت میں انہیں مسلم کیوں کہا جاتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہودیت توریت اور نصرانیت انجیل سے وابستہ ہے لیکن اسلام کو خود قرآن نے بتایا ہے کہ وہ ازل سے دین الٰہی

---

[1] ۔معناہ اعترفوا بانکم کافرون حیث اعرضتم عن الحق بعد ما تبیّن (نیشاپوری)

[2] ۔کیوں جھائیں جھائیں کرتے ہو (تاج العلماء)

[3] ۔کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں (تاج)

[4] ۔قیل نزلت الیہود والنّصاریٰ فی ابراھیم ـــــ فترافعوا الیٰ رسول اللہ ﷺ فنزلت (صافی)

ہے اور اس کی بنیاد توحید پر ہے لہٰذا وہ نزول قرآن سے وابستہ نہیں ہے۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ کو مسلم کہنا باعتبار اصل اصول دین ہے۔ اس سے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس شریعت پر کلیتہً عامل ہوں جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی [1]۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦٧﴾

''اچھا! اب تک تو تم ان سے ایسی باتوں میں حجت کر رہے تھے جن کا تمہیں کچھ علم ہے [2] اب کیوں تم ان باتوں میں حجت کرتے ہو جن سے تمہیں کوئی بھی واقفیت نہیں ہے اللہ علم رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے۔ ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ تو نرے کھرے مسلم تھے [3] اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔''

اس سے آگے بڑھ کر خود بخود نتیجہ ذہن میں آجانا چاہیے کہ حضرت موسیٰؑ بھی موسائی یعنی یہودی نہ تھے، اور حضرت عیسیٰؑ یعنی نصرانی نہ تھے اس لئے کہ دین حقیقی جس کی تبلیغ کے لئے تمام سچے انبیاء آئے اسلام ہی ہے لہٰذا حضرت موسیٰؑ بھی اسلام ہی کے مبلغ تھے اور عیسیٰؑ بھی اسلام ہی کے معلم تھے جو دین ان کی طرف منسوب کر دیئے گئے ان سے خود ان کا کوئی تعلق نہ تھا [4]۔

آخر کے فقرہ میں کہ ''وہ مشرکین میں سے نہ تھے'' اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دین جو یہودیت اور نصرانیت سے موسوم ہیں ان میں تو شرک داخل ہو گیا ہے [5] اور انبیاء الٰہی سب توحید کے علم بردار رہے ہیں۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٨﴾

---

[1] ۔اذالاسلام عبارۃ عن الدّین دون احکام الشریعۃ (مجمع البیان)

[2] ۔اے لو، تم وہی تو ہو جو جھگڑتے تھے اس میں جس کا یقین تھا (تاج العلماء)

[3] ۔فان الدین عند اللہ الاسلام والیھودیّۃ ملّۃ محرّفۃ عن شرع موسیٰ علیہ السلام والنصرانیۃ ملۃ محرفۃ عن شرع عیسیٰ علیہ السلام (مجمع البیان)

[4] ۔قیل ان ھٰذا یتضمّن کون الیھودیۃ والنصرانیۃ شرکاء وقیل ان معناہ لم یکن مشرکا علیٰ ما یدعیہ مشرکوا العرب (مجمع)

[5] ۔فی الکافی عن الصادق علیہ السلام خالصا مخلصا لیس فیہ شیٔ من عبادۃ الاوثان (صافی) حنیفا ای مائلا عن الادیان کلھا الیٰ دین الاسلام قویل معناہ مستقیما فی دینہ (مجمع البیان) موحّدا بحقیقۃ التوحید (البلاغی)

''بلاشبہ تمام لوگوں میں ابراہیم سے زیادہ تعلق رکھنے والے [1] وہ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی ہے اور یہ پیغمبر اور وہ جو ایمان لائے ہیں اور اللہ اہل ایمان کا سرپرست ہے۔''

''جنہوں نے ان کی پیروی کی'' یعنی جنہوں نے ان کی تعلیم کو اپنایا اور اس پر عمل پیرار ہے۔اس سے عامہ مفسرین نے ان کے زمانہ والوں کر مراد لیا ہے [2] کہ وہ اس وقت کے سچے مسلمان تھے۔مگر ہمارے نزدیک اس تخصیص کی ضرورت نہیں ہے بلکہ جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کے مبعوث ہونے تک جتنے ملت حنفیہ کے پرستار رہے [3] جن میں فرد اکمل ہمارے رسولؐ کے آباواجداد تھے وہ سب اس میں داخل ہیں، اور اب یہ رسولؐ اور اس رسولؐ پر ایمان لانے والے مسلمان، یہ حقیقی معنی میں جناب ابراہیمؑ کی تعلیمات کے ورثہ دار ہیں [4]۔

اور یہ تعلق جو انہیں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ہے وہ حقیقت ان کی ذات کے ساتھ تھوڑی ہے۔اسلام کی تو خصوصیت یہ ہے کہ یہاں بنیادی اہمیت کسی انسان کی نہیں ہے بلکہ یہ تعلق درحقیقت ذات خالق کے ساتھ ہے۔اس لئے آخر میں کہا گیا: وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ''اللہ اصلی مالک وسرپرست مومنین کا ہے'' اور ان سب کا جن میں خود حضرت ابراہیمؑ بھی داخل ہیں تعلق اس کی ذات سے ہے۔

وَدَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾

''اہل کتاب میں کے ایک بڑے گروہ کی خواہش ہے [5] کہ کاش وہ تمہیں بہکالیں حالانکہ وہ نہیں بہکاتے مگر خود اپنے ہی کو اور انہیں شعور نہیں۔''

چوں کہ اس بہکانے کی کوشش سے وہ دنیا میں ناکامی اور آخرت میں عذاب کے مستحق بنتے ہیں اور اس طرح مسلمانوں کا کچھ نہیں بگڑتا کیوں کہ یہ ان کے بہکانے میں آتے نہیں جو نقصان ہوتا ہے وہ خود انہی کا ہوتا ہے کہ اس لئے کہا گیا کہ ''وہ نہیں بہکاتے مگر خود اپنے ہی'' کو یعنی اس سے نقصان خود ہی اٹھاتے ہیں [6]۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾

---

[1] ۔احقهم بابراهيم (جلالین) نزدیک ترین مردم با ابراہیم (شاہ ولی اللہ) اخصتهم واقربهم منه من الولی وهو القرب (صافی) ابراہیمؑ سے زیادہ خصوصیت انہی لوگوں کو ہے (تاج العلماء)

[2] ۔الّذين اتبعوه فی زمانه (جلالین) پیروی او کردند یعنی دوزمان او (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ من الانبياء والموحدّين الصالحين من النّاس (البلاغی)

[4] ۔ای هم الذين ينبغی لهم ان يقولوا انا علیٰ دين ابرٰهيم عليه السلام (مجمع البیان)

[5] ۔بہت چاہا ایک جرگے نے کتاب والوں کے (تاج العلماء)

[6] ۔لان اثم ضلالهم عليهم والمؤمنون لا يطيعونهم (جلالین) ای لا يرجع وبال اضلالهم الاعلیٰ انفسهم (مجمع البیان)

''اے اہل کتاب! کیوں آیات الٰہی کا انکار کرتے ہو؟ حالانکہ تم خود گواہ ہو[1]۔''

علمائے اہل کتاب کے لئے سرمایۂ انتباہات:

اہل کتاب سے علمائے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ یہ لوگ خود جانتے تھے کہ ان کی کتابوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر اور ان کی علامات صاف طریقہ پر موجود ہیں۔ اس لئے انہیں ضمیر کی رہ نمائی سے خود اس کی گواہی دینا چاہے مگر وہ بجائے اس کی شہادت دینے کے اپنے ذاتی اغراض کے بناء پر خود اس کا انکار کر رہے ہیں۔

اس صورت میں آیات الٰہی سے مراد خود ان کی کتابوں کے مندرجہ مضامین ہوں گے۔

اس کے علاوہ مفسرین نے دو معنی اور بھی لکھے ہیں:

ایک یہ کہ آیات اللہ سے آیات قرآن مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ تمہارا دل گواہی دیتا ہے کہ ان کا مضمون کتب سابقہ کے مطابق ہے پھر بھی انکار کرتے ہو[2]۔

دوسرے یہ کہ آیات سے مراد معجزات ہوں یعنی تم معجزات دیکھ رہے ہو اور جانتے ہو کہ یہ معجزے ہیں پھر بھی مانتے نہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾

''اے کتاب والو! کیوں حق کو باطل کے ساتھ غلط ملط کرتے ہو[3] اور (اصلی) حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو۔''

جیسا کہ ایک جگہ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے فرمایا کہ:

فلوان الباطل خلص من مزاج الحق لم يخف على المرتادين ولوان الحق خلص من لبس الباطل انقطعت عنه ألسُنُ المعاندين ولكن يؤخذ من هذا ضغث ومن هذا ضغث فيمزجان فهنالك يستولى الشيطان على اوليائه.

''اگر باطل حق کی آمیزش سے الگ ہو جاتا تو طلب گاروں پر پوشیدہ نہ ہوتا اور اگر حق باطل کی ملاوٹ سے خالی ہو جاتا تو معترضین کی زبانیں بالکل ہی بند ہو جاتیں مگر ہوتا یہ ہے کہ ایک مٹھی اس کی لی جاتی ہے اور ایک مٹھی اس کی اور پھر دونوں کو ملا دیا جاتا ہے اب شیطان کو موقع مل جاتا ہے اور وہ اپنے دوستوں پر غالب آ جاتا ہے۔''

چا بک دست حامیان باطل کا رویہ یہی رہتا ہے کہ باطل کے ساتھ کچھ حق کی آمیزش رکھتے ہیں تا کہ آدمی موٹی نگاہ سے اس کی غلطی پر متنبہ نہ ہو یہی صورت علمائے اہل کتاب کرتے تھے۔

اس طرح کی آیت پہلے آ چکی ہے جس کی تفسیر میں تشریح کے ساتھ ہم نے اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔

---

[1] ۔تشهدون انها آيات الله (صافی) کیوں تم منکر ہوتے ہو حالانکہ تم اُنہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا کرتے ہو (تاج العلماء)

[2] ۔آيات الله يعنى القرآن (مجمع البیان)

[3] ۔کیوں گھپے دیتے ہو تم حق کو باطل سے (تاج العلماء)

وَقَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

''اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کا قول یہ ہے کہ ایمان لے آؤ اس پر جو مسلمانوں پر نازل ہوا ہے دن کے ابتدائی حصہ میں اور اس کے آخر کے حصہ میں انکار کردو [1] ممکن ہے وہ بھی پلٹ آئیں اور مانو نہیں مگر اسی کی کہ جو تمہارے دین کی پیروی کرے۔ کہیے کہ اصل ہدایت اللہ کی ہدایت ہے کہ کسی کو مل جائے ویسی ہی چیز جیسی تمہارے پاس تھی یا وہ دلیل و حجت میں تمہارے پروردگار کے یہاں تم پر فوقیت لے جائیں کہہ دیجئے کہ بلاشبہ نعمت و احسان اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ گنجائش والا ہے بڑا جاننے والا۔ اپنی رحمت سے جسے چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل و کرم والا ہے۔''

پرستارانِ باطل کا ایک منصوبہ:

اس آیت کے فقرات کی ساخت سمجھنے میں مترجمین کو بڑا دھوکا ہوا ہے اور مفسرین نے بھی دشواری محسوس کی ہے یہاں تک کہ ملا حسن فیض نے کہا ہے کہ:

هی من المتشابهات التی لم یصل الینا من اهل البیت علیہ السلام فیها شی (صافی)

یہ آیت متشابہات میں سے ہے جن کے بارے میں ہم تک اہل بیت رسولؐ سے کچھ نہیں پہنچا۔

اور علامہ نیشاپوری نے لکھا ہے:

عدت الایة من المواضع المشکلة (غرائب القرآن)

اس آیت کا مشکل مقامات میں شمار کیا گیا ہے۔ مگر ہم ہر جملہ کی مختصر تشریح جو بفضل الٰہی ہم سمجھے ہیں درج کرتے ہیں جس میں کوئی پیچیدگی معلوم نہیں ہوتی۔

اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے ایک گروہ نے کہا یہ کوئی قول لفظی نہیں ہے بلکہ ان کا طرز عمل زاویہ نظر اور ان کی ذہنیت جو ہے اس کا

---

[1] ۔ مان لو ــــــ سویرے اور مکر جاؤ جھٹپٹے وقت (تاج العلماء)

اظہار ہے اسی لئے ہم نے ''کہا'' یا ''کہتا'' ہے ترجمہ نہیں کیا بلکہ ترجمہ کیا ہے کہ ایک گروہ کا قول ہے۔

اور یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان جو شاطر سیاست داں لیڈر تھے وہ اپنے کچھ خاص افراد کو اس طرح کے طرز عمل اختیار کرنے کی فہمایش بھی کرتے ہوں گے [۱]۔

وہ کیا قول ہے؟ ایک سیاسی منصوبہ کہ اگر بالکل دوٹوک مسلمانوں کی مخالفت کی جائے تب تو وہ تم سے بھڑک ہی جائیں گے۔ پھر تمہاری بات قبول کیا کریں گے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ انہیں مانوس بناؤ اور پھر اپنا مطلب حاصل کرو۔

اس کی شکل یہ ہے کہ پہلے جا کر ان کی جماعت میں شامل ہو ''ایمان لے آؤ یعنی بظاہر اقرار ایمان کر لو جس کی وجہ سے وہ اپنا آدمی سمجھ لیں پھر کچھ دن رہ کر اور ان کے ساتھ مانوس ہو کر حقائق ایمانی کے متعلق شکوک وشبہات ظاہر کرنا شروع کرو جس سے کچھ نہ کچھ وہ بھی اپنے استحکام ایمانی میں متزلزل ہوں اور پھر حجت کر کے انکار کرنے لگو تو بہت سے ان سے تمہارے ساتھ کھینچ کر اس راستے سے منحرف ہو جائیں گے اور تمہارا مطلب حاصل ہو جائے گا [۲]۔

یہ ہوا اس کا مطلب کہ دن کے ابتدائی حصہ میں ایمانی لاؤ اور آخری حصہ میں کافر ہو جاؤ شاید وہ بھی پلٹ آئیں۔

جیسا کہ علامہ طبرسیؒ نے لکھا ہے اس کی شان نزول بھی یہ بتائی گئی ہے کہ کچھ لوگوں نے ایسا ہی منصوبہ بنایا تھا کہ صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو پھر کافر ہو جاؤ یہ کہہ کر کہ ہم نے خوب دیکھ لیا۔ یہ وہ پیغمبر نہیں ہیں جن کی ہماری کتابوں میں پیشین گوئی ہے [۳]۔

اب اس سیاست والوں کو یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ اس جماعت میں جا کر شامل ہونے والے واقعی ایمان لے ہی نہ آئیں۔ اس لئے کہ وہ ان کی حمیت قومی کو بیدار کرتے ہیں کہ تمہارا آبائی ایک دین ہے۔ یہ لوگ اس دین کو چھوڑ کر الگ ہوئے تو ان کے ساتھ واقعی تمہیں متحد نہیں ہونا چاہیے۔ تمہیں تو ان کی بات ماننا چاہیے جو تمہارے دین پر ہیں۔

ایک معنی اس کے جو میرے نزدیک بعید ہیں یہ کہے گئے ہیں کہ دیکھو خبردار! ایمان کا اظہار نہ کرو یعنی اپنی کتابوں سے ایسے اوصاف آخری رسولؐ کے جو اس پیغمبرؐ پر منطبق ہوتے ہیں بیان نہ کرو مگر اپنے ہی مذہب کے کسی قابل اعتماد آدمی سے جو اسے دوسروں سے نہ کہے [۴]۔

یہاں تک ان باطل کیشوں کی سیاسی تلقین تھی [۵]

اس کا جواب خالق دلوار ہا ہے اپنے رسولؐ کی زبانی:

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ

---

[۱] ۔الظاهر انهم من اليهود قالوا البعض قومهم تعليمالهم بمخاوعة المؤمنين (بلاغی)

[۲] ۔لعلهم يرجعون يشكون فی دينهم ظنّا بانكم قد رجعتم لخلل ظهر لكم (صافی)

[۳] ۔فاذا فعلتم ذٰلك شك اصحابه فی دينه وقالوا انهم اهل الكتاب وهم اعلم به منّا فيرجعون عن م الی دينكم (مجمع البيان)

[۴] ۔ای ولا تبدوا ايمانكم ولا تعترفوا بذٰلك الا لمن تبع دينكم وكان منكم فانه يخفيه كما نخفيه (بلاغیؒ)

[۵] ۔فيكون هٰذا كلّه من كلام اليهود (مجمع البيان) اتفق المفسّرون علیٰ انه من بقية كلام اهل الكتٰب (نیشاپوری)

کہہ دیجئے کہ اصل ہدایت اللہ کی ہدایت ہے [1]۔

یعنی جو اہل ایمان خدا کی طرف سے ہدایت یافتہ ہیں تمہاری ان کا رستانیوں سے متزلزل نہیں ہو سکتے اور اسی میں ان کے اس قومی احساس کا جواب ہے کہ دین حق اور ہدایت ربانی کسی قوم وملت کی ملکیت نہیں ہے۔ ہدایت اللہ کی طرف کی چیز ہے لہٰذا اس میں تمہارا کوئی اجارہ نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کو وہی نعمت دیدے جو تمہیں ملی تھی یعنی کتاب آسمانی تمہیں عطا ہوئی تھی۔ اسی پر تمہیں فخر تھا۔ اب اللہ کی کتاب کسی دوسرے خاندان اولاد اسماعیلؑ کو عطا ہو جائے تو تم اسے کہاں روک سکتے ہو۔ یہ ہے کہ اس جملہ کا مفہوم کہ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ [2] اور اب تک خدا کے یہاں نجات کے حق دار اور کامیاب وکامران تم تھے یہ اب جب کہ دوسری کتاب اور شریعت آ گئی تو یہ دوسرے لوگ اب پیش خدا حجت ودلیل میں تم پر غالب آ جائیں یہ ہیں اس فقرہ کے معنی کہ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ اور اسی کا تتمہ ایک اصول اور ایک کلیہ کی صورت میں آخر میں کہلوایا کہ:

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

کہہ دیجئے کہ فضل وکرم اللہ کے ہاتھوں میں ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

اس طرح پوری سطح کلام کی ہموار معلوم ہوتی ہے مگر دوسرے لوگوں نے اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ کو ان اہل کتاب کا قول قرار دے کر بیچ میں صرف "قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ" کے جملہ کو اس کا جواب مانا ہے جو خالق کی طرف سے ہے۔

اس کے بعد پھر اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ کو مشرکین کے کلام کا تتمہ قرار دیا ہے اور پھر قل ان الفضل بیدا اللہ سے آخر تک اس کا جواب قرار دیا ہے اس طرح ترجمہ میں بڑی گڑبڑ ہوئی ہے مثلاً شاہ ولی اللہ نے قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ کے ترجمہ کے بعد

"کہ بگو یا محمدؐ ہر آئینہ ہدایت ہمانست کہ ہدایت خداست کا ہے و گفتند باور مکنید آنکہ دادہ شود بہیچ کس مانند آنچہ دادہ شدہ اید"

اس میں "گفتند" ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ "باور مکنید" بھی ایسا اضافہ ہے جس کے ہم معنی لفظ قرآن میں یہاں پر نہیں ہے۔

انہوں نے تتبع بظاہر تفسیر جلالین کا کیا جس کے الفاظ یہ ہیں:

المعنى لا تقروا بأن احدا يؤتى ذلك الّا من تبع دينكم

معنی یہ ہیں کہ یہ تسلیم نہ کرو کہ کسی کو ایسی چیز مل سکتی ہے سوا اس کے جو تمہارے مذہب کی پیروی کرے۔

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے بھی اس کی پیروی کی ہے۔

تعجب ہے کہ علامہ بلاغیؒ بھی اگرچہ بیچ میں قالوا وغیرہ کا اضافہ نہیں فرماتے مگر وہ بھی بیچ کے جملہ کو معترضہ قرار دیتے ہوئے اس کے بعد

---

[1] ۔اتفقوا علیٰ ان قولہ قل ان الھدیٰ ھدی اللہ و کذا قولہ قل ان الفضل بید اللہ الیٰ اخرھا کلام اللہ (نیشاپوری)

[2] ۔یعنی من العلم والحکمۃ والکتاب والحجّۃ (صافی) فلا تجحدوا ایّھا الیھود ان یؤتیٰ احد مثل ما اوتیتم من النبوّۃ (مجمع)

کے ان یوتی احد الخ کو مشرکین ہی کے قول کا تتمہ قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

ای ولا تومنوا لغیر من اتبع دینکم بان یؤتی احد من غیرکم مثل ما اوتیتم باعتبار انبیائکم و کتبکم من النبوۃ والرسالۃ والکتاب والشریعۃ او تؤمنوا لھم بانّھم یحاجّو کم عند ربکم و ان لھم علیکم الحجۃ عند اللہ بما تعرفونہ من الحق.

یعنی اور سوا اس کے جو تمہارے دین کا پیرو ہو اور کسی کے لئے یہ تسلیم نہ کرو کہ کسی کو ویسی چیز ملے گی جیسی تمہارے انبیاء اور تمہاری کتابوں کے لحاظ سے نبوت اور رسالت اور کتاب اور شریعت کی نعمت تمہیں عطا ہوئی ہے اور نہ دوسروں کے لئے تم یہ مانو کہ وہ تمہارے پروردگار کے یہاں تم پر حجت میں غالب آئیں گے اور یہ کہ انکی تم پر اللہ کے یہاں اس حق کے لحاظ سے جو تم پہچانتے ہو حجت تمام ہوگی۔

اور زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کا ذہن اس مفہوم سے نزدیک پہنچتا ہے جو ہم نے قرار دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

اوان النبی قال ان لاھدی ھدی اللہ بان یوتی احد الی اخرہ تکون جملۃ ان یوتی متعلقہ بما امر اللہ رسولہ ان یقولہ.

یا یہ کہ پیغمبرؐ نے ان سے یہ کہا کہ ہدایت اللہ کی ہدایت ہے کہ کسی کو ویسی ہی چیز جیسی تمہیں ملی تھی مل جائے تو یہ جملہ اسی مقولہ سے متعلق ہوگا جس کے کہنے کا ان سے اللہ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا تھا۔

مگر پھر لکھ دیتے ہیں:۔

والاظھر ھو الوجہ الاول۔

پہلی صورت زیادہ واضح ہے

مجھے علامہ موصوف کے سلامت ذوق سے اگر کہیں پر شدید شکایت پیدا ہوئی ہے تو وہ یہ موقع ہے کہ ایک ہموار اور متوازن مفہوم کے مقابلہ میں جس میں قطعاً کوئی پیچیدگی نہیں وہ اس مفہوم کو اظہر فرماتے ہیں، جو الفاظ قرآنی سے ذہن میں بلا زحمت وتکلف ہرگز نہیں آسکتا۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

''اور اہل کتاب میں کوئی تو ایسا ہے کہ اگر اس کے پاس ڈھیر بھر بھی روپیہ تم امانت رکھواؤ[1] تو وہ اسے تمہیں ادا کر

---

[1] ۔امین کرے تو ایک گجھے پر (تاج العلماء)

دے گا اور ان میں کوئی ایسا ہے کہ ایک سکہ بھی سونے کا [1] امانت رکھو تو وہ اسے بھی ادا نہ کرے گا مگر جب تک کہ تم اس کے سر پر کھڑے نہ رہو [2] یہ اس لئے ہے کہ ان کا قول یہ ہے کہ ہم پر غیر اہل کتاب کے بارے میں کوئی پابندی نہیں ہے اور وہ اللہ پر جھوٹ منڈھتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کیوں نہیں! جو اپنے عہد کو پورا کرے اور پرہیزگاری سے کام لے تو بلاشبہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔''

جماعت اہل کتاب کی بدمعاملگی:

اہل کتاب میں سے کچھ اچھے کردار کے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ انہیں امانت داری کا بالکل خیال نہیں ہے اور غیر مذاہب کے اموال کو تو وہ کافر کا مال سمجھ کر ہضم کر لینا جائز جانتے ہیں [3] اسی کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ہم پر غیر اہل کتاب کے بارے میں کوئی پابندی نہیں ہے۔

خالق نے اس کی ردفرمائی ہے اور اس رد کا ماحصل یہ ہے کہ جو بات اصول شرافت وانسانیت کے لحاظ سے غلط ہے وہ ہر جماعت کے ساتھ غلط ہے۔ اللہ اسے کسی کے ساتھ بھی پسند نہیں کرے گا۔

امانت ودیانت کا لحاظ ہر جماعت کے ساتھ لازم:

چوں کہ اصول اصول ہی ہے لہٰذا اس سے مسلمانوں کو بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ بھی اگر یہ خیال کر لیں کہ کافروں کے مقابلہ میں ہم پر کوئی اخلاقی ذمہ داری نہیں ہے تو یہ خیال غلط ہے۔ امانت ودیانت کا لحاظ ہر جماعت کے ساتھ معاملت میں ضروری ہے خواہ وہ مسلمانوں کی جماعت ہو یا غیر مسلمین کی۔

حدیث میں ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ نے اس آیت کے پڑھنے کے بعد فرمایا:

ما من شئ كان فى الجاهلية الا هو تحت قدمى الا الامانة فانها مؤداة الى البرو الفاجر (صافى و مجمع البيان)

جو بات بھی زمانہ جاہلیت کی تھی وہ میرے قدموں کے نیچے پامال ہے سوا امانت داری کے کہ اس فریضہ کو نیک اور بد ہر آدمی کے مقابلہ میں انجام دینا ضروری ہے۔

اس حدیث کو علامہ نیشاپوری نے بھی درج کیا ہے اور پھر جناب ابن عباسؓ کے متعلق نقل کیا ہے کہ ان سے کسی نے کہا کہ ہمیں دوسرے اہل مذاہب کی بکریاں وغیرہ کبھی مل جاتی ہیں۔ انہوں نے پوچھا پھر تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں ہمارے لئے کوئی حرج نہیں ہے۔ انہوں نے کہا یہ تو ویسا ہی ہوا جیسے کافر کہتے تھے: ليس علينا فى الامين سبيل: ہم پر ان لوگوں کا جو غیر اہل کتاب ہیں مال کھانے

---

[1] ۔ایک اشرفی (تاج العلماء) والمراد تجعله امينا على قليل من المال (مجمع البيان)

[2] ۔الّا مذة دوامك على راسه تطالبه بالعنف (صافى) مگر تاوقتی کہ باش برسر او ایستادہ (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔سبيل اى امر لا ستحلا لظلم من خالف دينهم (جلالين) اى ليس علينا فى شان من ليسوا من اهل الكتاب ولم يكونوا على ديننا عقاب وذم (صافى) اس لئے کہ غیر مذاہب کا مال کھا جانا درست ہے (حواشی تاج العلماء)

میں کوئی الزام نہیں ہے" (غرائب القرآن)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

"بلاشبہ وہ جو اللہ کے عہد و پیمان اور اپنی قسموں کے عوض میں تھوڑے سے دام وصول کرتے ہیں یہ وہ ہیں کہ ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اللہ روز قیامت ان سے بات بھی نہیں کرے گا اور ان پر نظر بھی نہیں ڈالے گا[1] قیامت کے دن اور نہ انہیں بری قرار دے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

"اللہ کے عہد و پیمان" کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے اس رسول پر ایمان اور اس کی نصرت و اطاعت وغیرہ کا جو عہد لیا تھا[2] اور یہ بھی کہ یہ اللہ سے جو عہد کرتے ہیں[3]۔ بعد میں قسموں کا ذکر اس مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اس عہد و پیمان اور قسموں کے عوض تھوڑے سے دام وصول کرنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ تھوڑی سی جاہ دنیا کی خاطر رشوت لے کر ان فرائض کو ترک کر دیتے ہیں۔ لَا يُزَكِّيْهِمْ کے معنی زیادہ تر یہ قرار دیے جاتے ہیں کہ انہیں پاک نہیں کرے گا[4] مگر ہم نے ترجمہ کیا ہے "بری نہیں قرار دے گا" جس معنی میں ایک جگہ اور قرآن مجید میں یہ لفظ ہے اس طرح:-

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ (نساء ۴۹)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے کو بری سمجھتے ہیں بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے بری قرار دیتا ہے۔

تفاسیر میں اس کے مطابق قول موجود ہے[5]۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾

---

[1] ۔انہیں نظر بھر کے نہیں دیکھے گا (تاج العلماء)

[2] ۔یعھد اللہ الیھم بالایمان بالنّبیّ ﷺ واداء الامانۃ (جلالین) ای بامر اللہ وما یلزمھم الوفاء بہ (مجمع البیان)

[3] ۔بما عاھدوا علیہ اللہ (بلاغی) عوض پیمانی کہ بخدا بستند (شاہ ولی اللہ) ای بعھدھم مع اللہ (بلاغیؒ)

[4] ۔لا یطھّرھم (جلالین) پاک نسازد ایشاں را (شاہ ولی اللہ) نہ پاک کرے گا اُن کو (شاہ رفیع الدین)

[5] ۔قیل لا یحکم بانّھم ازکیآء ولا یسمیھم بذٰلک بل یحکم بانّھم کفرۃ فجرۃ (مجمع البیان) قیل ولا شئی علیھم (صافی)

''اور بلاشبہ ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو اپنی زبان کو کتاب کے پڑھنے میں مروڑ دیتا ہے [1] ۔تا کہ تم اسے کتاب کا جزء سمجھو حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہوتا اور کہتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے اور وہ اللہ پر دیدہ و دانستہ جھوٹ باندھتا ہے۔''

توریت میں تحریف کا وقوع:

کتاب سے مراد توریت ہے اور ''زبان کو مروڑنے'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ اصل کتاب کے الفاظ سے اپنی زبان کو ہٹا کر اپنے ان مصنوعی فقرات کو پڑھنے لگتے ہیں [2] ۔بہرصورت یہ آیت توریت اور کتب مقدسہ میں علمائے اہل کتاب کے لفظی طور پر تحریف کرنے کی دلیل ہے جو شک وشبہ سے بالاتر ایک حقیقت ہے۔اس کے بعد قرآن کی ان آیات کو جن میں کتب سابقہ کی تصدیق ہے اسی اصل کتاب سے متعلق ماننا ضروری ہے نہ وہ جو اہل کتاب میں توریت وغیرہ کے نام سے چیز مروج ہوگئی ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

''کسی انسان کے لئے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ اسے کتاب، اپنی طرف کا اقتدار [3] اور نبوت عطا فرمائے اور پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم میرے بندے بن جاؤ، نہ اللہ کے بلکہ وہ یہی کہے گا کہ [4] تم اللہ والے ہوجاؤ۔اس بناء پر کہ تم کتاب کی تعلیم دیا کیے ہو اور اسے پڑھتے رہے ہو اور نہ وہ تمہیں یہ حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو پروردگار سمجھ لو، کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا اس کے بعد کہ تم مسلمان ہو۔''

یہ ان جماعتوں کو تنبیہ ہے جو کسی نبی کی پیروہونے کی مدعی ہیں جیسے یہود حضرت موسیٰؑ کے اور نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کے اور پھر کسی قسم کے شرک میں مبتلا ہیں خواہ خود اسی پیغمبر کو انہوں نے خدا یا خدا کا بیٹا قرار دے لیا ہو جیسے نصاریٰ یا کسی اور نبی کو جیسے یہود عزیرؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں یا فرشتوں کو جیسا

---

[1] ۔لپیٹ سپیٹ سے زیادہ دبا کر لکھا ہوا پڑھتے ہیں (تاج العلماء)

[2] ۔ای یعطفونها بقرءته عن المنزل الیٰ ما حرّفوه (جلالین) یقتلون السنتهم ویحرفونها فی قراءتهم الیٰ ما لیس فیه (بلاغی)

[3] ۔ فی مجمع البیان ای العلم وفی الکشاف الحکمة ولکن کلّ منها بعید عن اللفظ فالظاهر انه سیطرة الرّسالة والدعوة والارشاد (بلاغی)

[4] ۔فیه حذف ای لا ینبغی لهذا النّبیّ ان یقول للناس اعبدونی ولکنّه ینبغی ان یقول لهم کونوا ربّانیّین (مجمع البیان)

کہ صائبین کا قول تھا[1]۔انہیں سمجھا یا جارہا ہے کہ جب ایسی ہستیوں کے پیرو ہونے کے دعوے دار ہو جو اللہ کے سچے رسول ہیں تو خود غور کرو کہ ان رسولوں نے کیا یہی تعلیم دی تھی کہ تم انہیں خود خدا بنالو یا کسی اور نبی یا فرشتے کو خدا سمجھ لو؟ وہ تو اللہ کے بھیجے ہوئے تھے اس لئے انہوں نے خدا ہی کی پرستش کی دعوت دی تھی۔کسی اور کی تھوڑی لہٰذا اگر تم ان کے پیرو ہو تو ان شرک کی باتوں کو چھوڑ دو اور جو ان کی اصل تعلیم تھی اور وہ اسلام ہے اس کو اختیار کرو۔

عصمت انبیاء:

ایک روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے ہمارے پیغمبرؐ کے پاس آکر یہ عرض کیا کہ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو ہم اپنا معبود بنالیں؟ آپؐ نے فرمایا پناہ بخدا کہ ہم اپنی عبادت کے لئے کہیں۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2]۔

علامہ بلاغیؒ نے بشر کے ساتھ ان اوصاف کے انضمام سے جو آیت میں مذکور ہیں خوب نتیجہ نکالا ہے کہ اس آیت میں ایک ساتھ دو باتوں کا اظہار ہے۔ایک یہ کہ بشر اور اس کے ساتھ باعتبار تخلیق جو نقائص وابستہ ہیں وہ الوہیت سے مانع ہیں اس لئے کسی بھی بشر کے لئے الوہیت کا دعویٰ درست نہیں ہے۔دوسرے یہ کہ عام بشر چاہے غلط طور پر اپنے لئے دعویٰ کرے مگر وہ بشر جسے اللہ نے نبوت وغیرہ عطا کی ہے، اس قسم کا دعویٰ ہرگز نہ کرے گا کیوں کہ وہ معصوم ہوتا ہے اور یہ دعویٰ ہوگا جھوٹ اور معصوم جھوٹا دعویٰ نہیں کرسکتا۔اس لئے انجیل وغیرہ میں اگر خود عیسیٰؑ یا کسی نبی کی طرف نسبت دے کر ایسے الفاظ مذکور ہیں جن سے خود اپنے متعلق الوہیت کا دعویٰ نکلتا ہو تو سمجھ لو کہ اس کی نسبت ان انبیاء کی طرف درست نہیں ہے۔

اس مقام پر علامہ نیشاپوری نے بڑی نکتہ رسی کا ثبوت دیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی ممانعت یا عدم بھی جواز کا اظہار نہیں ہے کہ کسی کو جسے اللہ نے نبوت عطا کی تھی ایسا کہنا جائز نہیں یا درست نہیں تھا کیوں کہ یہ کہنا ناجائز اور نادرست تو سب ہی کے لئے بلکہ یہ عدم امکان کا اظہار ہے مطلب یہ ہے کہ جسے اللہ نے وحی اور کتاب کے لائق سمجھا وہ بندہ ایسے صفات کا حامل ہوتا ہے کہ اس سے اس قسم کے ادعاء کا تصور ہی نہیں ہوسکتا (ملاحظہ ہو غرائب القرآن) اسی کو علم کلام کی زبان میں ہم یوں کہتے ہیں کہ انبیاء اور آئمہ معصومؑ ہیں اور عصمت کی بناء پر ان سے صدور گناہ کا امکان ہی نہیں ہے۔یہ عدم امکان عجز کی بناء پر نہیں ہے جو نقص ہو بلکہ یہ ان کے صفات کی برتری کا تقاضا ہے جو کہ کمال ہے۔یہ اسی طرح یہ جیسے اس کے پہلے اللہ کے صفات میں ہم عادل ہونے کے قائل ہیں جس کے معنی ہیں قبائح وشرور اور ظلم وعبث سے بری ہونا۔اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ ان باتوں کے کرنے سے عاجز ہے بلکہ یہ کہ اس کا کمال ذات اور استغنائے مطلق ان باتوں سے صدور سے مانع ہے۔

علامہ نیشاپوری نے اس کی نظیر میں قرآن کی یہ آیت پیش کی ہے: مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ

اللہ کے لئے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اس کے کوئی اولاد ہو بس ویسا ہی یہاں ہے۔(مریم۔۳۵)

ماکان لبشر (یعنی) اس طرح کے بشر کے لئے یہ بات ممکن ہی نہیں کہ وہ خود اپنی خدائی کے منوانے کے درپے ہو۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ

---

[1] ۔ كما اتخذت الصّائبة الملئكة واليهود عزير او النصارٰى عيسىٰ (جلالين)

[2] ۔ قيل ان ابا رافع الفرضى من اليهود ورئيس وفد نجران قالا يا محمّد اتريدان نعبدك ونتّخذك الها فقال معاذالله ان اعبد غيرالله او اٰمر بعبادة غيرالله ما بذلك بعثني ولا بذلك امرني فانزل الله الاية (مجمع البيان)

رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

''اور جب اللہ نے پیغمبروں سے اقرار لیا کہ میں نے جو تمہیں کتاب اور حکمت عطا کی ہے اس کے بعد ایک رسول تمہاری طرف آئے جو تمہاری پاس کی چیزوں کی تصدیق کر رہا ہو تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ اس نے کہا کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور اس پر میرے عہد و پیمان کو تم نے قبول کیا[1] ؟ انہوں نے کہا ''ہاں ہم نے اقرار کیا'' اس نے کہا کہ اچھا تو گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔ اب جو اس کے بعد منہ پھرائے گا تو یہ لوگ وہی ہوں گے جو بداعمال ہیں[2]۔

آیت کے الفاظ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ تمام انبیاء سے یہ عہد و پیمان لیا گیا اور یہ متعدد احادیث سے بھی جو اس کی تفسیر میں وارد ہوئے ہیں ظاہر ہوتا ہے[3]۔

تمام پیغمبروں سے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کا عہد:

اب جب انبیاء سے عہد و پیمان ہو گیا تو ان انبیاء کی بشارتوں کے ذریعہ سے یہ اطلاع ان کی امتوں میں بھی پہنچتی رہی بلکہ خود اس آیت میں اَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ. کا ایک مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ تم نے میرے اس عہد کو دوسروں سے بھی لیا[4]۔ پاس لئے بعد میں جو تنبیہ ہے وہ امتوں کے لئے ہے کہ جو اس کے بعد منہ پھرائے گا تو یہ فاسق لوگ ہونگے۔ بلکہ دو ایک حدیثیں ایسی ہیں جن میں ہے کہ پیغمبروں سے اقرار کا مطلب ہی یہ ہے کہ ان کی امتوں سے اقرار لیا گیا[5]۔ مگر پہلے احادیث چوں کہ الفاظ قرآن سے زیادہ مطابقت رکھتی ہیں اس لئے وہی قابل ترجیح ہیں۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا

---

[1] ۔اصری ای عھدی (صافی) معناہ وقبلتم علیٰ ذٰلك عھدی (مجمع البیان) اٹھالیا تم نے اس بات پر بوجھ میرے عہد کا (تاج العلماء)

[2] ۔ایسے ہی تو نافرمان و بدچلن ہوتے ہیں (تاج العلماء)

[3] ۔روی عن علیؑ انه قال لم یبعث الله نبیاً اٰدم ومن بعدہ الا اخذ علیه العھد لئن بعث الله محمّداﷺ وھو حیّ لیؤ منن به ولینصرنّه (مجمع البیان)

[4] ۔عن امیر المؤمنینؑ قال اقررتم واخذتم العھد بذٰلك علیٰ امکم (صافی)

[5] ۔فی المجمع عن الصّادقؑ ان معناہ واذا خذالله میثاق امم النّبیّن ـــــ والعیاشی عن الباقرؑ صافی معناہ مبسوطا (صافی)

وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

''تو کیا وہ اللہ کے دین کے سوا اور کسی دین کو تلاش کرتے ہیں حالانکہ اس کے لئے خوش، اور ناخوش، اسلام پر عمل پیرا ہیں [۱] جتنے آسمان اور زمین میں ہیں اور اسی کی طرف انہیں رجوع ہونا ہے۔''

اسلام قانونِ فطرت ہے:

اسلام قانون الٰہی کے سامنے سر جھکانا ہے [۲] اسی کو کہا گیا ہے: ان الدّین عند اللہ الاسلام اب اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا تمام کائنات کے دین سے انحراف ہے کیوں کہ تم کائنات اس کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان کے علاوہ دوسری چیزوں کا سر جھکانا تسخیری طور پر ہے۔ تسخیری اسلام کافر ملحد پر بھی حاوی ہے مگر دین اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اختیاری طور پر بھی اسی راستے پر گامزن ہو جائے جس پر ہو اضطراری طور پر بہر حال گامزن ہے تا کہ شرف انسانی نمودار ہو اور یہ اس کی بناء پر اجر کا حق دار ہو۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾

''کہہ دیجئے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر کہ جو اتارا گیا ہم پر اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اسباطؑ پر اتارا گیا تھا اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے عطا ہوا تھا ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور ہم اس کے لئے اسلام اختیار کیے ہوئے ہیں۔''

بالکل اسی مضمون کی آیت پہلے پارے کے اواخر میں آ چکی ہے۔ وہاں ابتداء قولوا سے ہے یعنی تمام مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے کہ تم کہہ دو۔ یہاں قل سے ابتداء ہے یعنی اے رسولؐ! آپ کہہ دیجئے اور یہ کہنا سب کے نمایندہ کی حیثیت سے ہے [۳] وہاں انزل الینا ہے ہماری طرف نازل ہوا اور یہاں انزل علینا ہے کہ ہم پر نازل ہوا۔ اس کے علاوہ بعد میں یہاں ایک لفظ اوتی عطا کیا گیا ساتھ موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور النبیون کو بطور نائب فاعل ذکر کر دیا ہے اور وہاں موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے بعد پھر وما اوتی کی تکرار کے ساتھ النبیون کو نائب فاعل قرار دیا ہے۔ بہر حال دونوں آیتوں کے مطلب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لئے اب اس کی تفسیر کے لئے اسی آیت کا حوالہ دے دینا کافی معلوم ہوتا ہے۔

---

[۱] ۔اس کے سامنے گردنیں ڈال دی ہیں ____ خوش خوش یا زبردستی (تاج العلماء)

[۲] ۔فی التوحید والعیاشی عن الصّادق علیہ السلام ھو توحیدھم اللہ عزوجل (صافی)

[۳] ۔امر الرّسول بأن یخبر عن نفسہ ومتابعیہ بالایمان (صافی) کما یخاطب رئیس القوم بأن یقول عن نفسہ وعن رعیۃ (مجمع البیان)

مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

''اور جو اسلام کے علاوہ کوئی دین تلاش کرے وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا۔

اسلام کے بغیر نجات کا تصوّر غلط:

یہ آیت صاف وصریح طور پر اس کا اظہار کرتی ہے کہ اسلام کے مقابلہ میں کسی دوسرے دین کے اختیار کرنے والے کے لئے نجات نہیں ہے۔ یہ تصور کہ دوسرے مذاہب کے افراد اگر اپنے معیار پر نیکوکار ہوں تو وہ نجات کے حق دار ہوں گے قرآن کی رو سے درست نہیں ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾

''کیونکر اللہ منزل مقصود پر پہنچائے [1] ان لوگوں کو جو ایمان اختیار کرنے کے بعد پھر کافر ہو جائیں حالانکہ [2] وہ گواہی دے چکے کہ پیغمبر سچا ہے اور ان کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں آ چکیں اور اللہ انہیں کہ جو ظلم و تعدی سے کام لیں منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔ ان کی سزا یہ ہے کہ عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔''

''کیوں کر اللہ منزل مقصد پر پہنچائے یہ قدرت کی کمی کی بناء پر مجبوری کا اظہار نہیں ہے بلکہ حکمت کے اقتضاء کی بناء پر ہے کہ اسے جبر کرنا نہیں ہے تو ہدایت کا تمام سامان ہو جانے اور حق کو خود جاننے پہچاننے اور اقرار کر لینے کے بعد بھی جو لوگ منحرف ہو جائیں ان کے ساتھ اللہ کیا کرے؟ بس وہ یہی کر سکتا ہے اسکے بعد کہ انہیں مورد لعنت قرار دے اور ان کے جرم کی سزا جو ان کے استحقاق کے لحاظ سے صحیح و مناسب ہے انہیں دے۔

اور ہدایت کے دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں جس کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی توفیق خاص راہ راست پر آنے کی ان کے شامل

---

[1] ۔راہ پر لائے گا (تاج العلماء)

[2] ۔عطف علیٰ ما فی ایمانہم من معنی الفعل او حال باضمار قد (صافی)

حال کیوں کر کرے جب کہ یہ اپنے غلط کردار سے اس کے مستحق ہی نہیں رہے ہیں [1]۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

''مگر وہ جنہوں نے اس کے بعد توبہ کر لی اور عمل کی اصلاح کر لی تو بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان۔''

یعنی پھر تو ان کا معاف ہو جانا لازمی ہے۔ اس لئے کہ اللہ کی شان ہی یہی ہے کہ وہ ایسے مجرموں کو معاف فرما دے [2]۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الضَّاۗلُّوْنَ ﴿۹۰﴾

''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہوئے پھر کفر میں اور زیادتی کر لی ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی اور یہ بالکل گمراہ ہیں۔

اگر سیاق سے الگ کر کے اس آیت کو دیکھا جائے تو وہ مرتد کے بارے میں بھی ہو سکتی ہے بلکہ پہلے جو ذہن میں معنی آتے ہیں وہ ہیں اس صورت میں وہ اس حکم کی دلیل ہوگی جو مسلم ہے کہ مرتد فطری کی توبہ قبول نہیں ہے مگر سیاق چوں کہ اہل کتاب سے متعلق ہے اس لئے مفسرین [3] اس کا مطلب یہ کہتے ہیں کہ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہوئے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانا اس طرح مومن ہوئے اور پھر جب عیسیٰ علیہ السلام آئے تو ان کا انکار کر دیا اس طرح کافر ہوئے اور اب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے مزید کفر اختیار کر رہے ہیں [4]۔ اس صورت میں ''ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی'' یہ کسی اصول شرعی کا اعلان نہیں ہے بلکہ علم الٰہی کا اظہار ہے کہ یہ لوگ صدق دل سے توبہ کریں گے ہی نہیں کہ ان کی توبہ قبول ہو بلکہ ان کا اصرار و انکار ایسا ہے کہ وہ توبہ کریں گے بھی تو بہ مجبوری ایسے حالات میں کہ جب اس توبہ کو قبول ہونا ہی نہ چاہیے [5]۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾

''بلاشبہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے [6] ان میں سے کسی ایک سے پورے روئے زمین بھر کا سونا اگر وہ معاوضہ میں دینا چاہیے تو ہرگز قبول نہیں ہوگا۔ یہ وہ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے اور ان کے کوئی مددگار نہیں ہوں گے۔''

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ

---

[1] ۔فانّ هؤلاء قد اخرجوا انفسهم بتمرّدهم على الله عن اهليتهم للطفه وايصالهم الى الهدٰى بتوفيقه (البلاغیؒ)

[2] ۔انّ هذه المغفرة ليست ممّا يرجى اتفاقه بل هي لازمة في رحمة الله ولطفه لانّه غفور رحيم (بلاغیؒ)

عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾

''ہرگز تم بھلائی کا درجہ حاصل نہیں کرو گے [۱] جب تک خیرات نہ کرو اس میں سے جو تمہیں پسند ہے اور جو چیز تم خیرات میں دو گے یقیناً اس سے خوب واقف ہے''

یعنی سلف ما اجماع کردہ اند و آں بدون رضائے خدا منعقد نمی شود (فتح الرحمٰن)

خیرات کے متعلق ضروری ہدایت

بہت سے اشخاص ایسے ہیں کہ جو چیز انہیں خود ناپسند ہوئی، وہ انہوں نے خیرات میں دیدی، اسے کہا گیا ہے کہ یہ خیرات فضیلت نہیں رکھتی۔ خیرات تو وہی فضیلت رکھتی ہے کہ تم اپنے پسند کی چیز راہ خدا میں دو چنانچہ جناب امیر علیہ السلام کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ حضرتؑ نے ایک پیراہن خرید فرمایا جو آپ کو اچھا معلوم ہوا تو اسے آپ نے راہ خدا میں دیدیا (مجمع البیان)

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ وقف جبرائیل علیہ السلام

''سب کھانے بنی اسرائیل کے لئے حلال تھے سوا اُن کے جو اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر لئے تھے [۲] توریت اترنے سے پہلے کہیے کہ توریت لا کر اسے پڑھو، اگر تم سچے ہو، تو جو اس کے بعد اللہ پر جھوٹ باندھے تو یہ بڑے ظالم لوگ ہوں گے۔''

اگر شانِ نزول کی کسی روایت سے رہنمائی نہ ہو تو اس آیت کے مضمون سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ توریت نازل ہونے کے پہلے غذاؤں میں حلال اور حرام کی تفریق من جانب اللہ نہ ہوئی تھی۔ ہاں جناب یعقوب علیہ السلام نے جن کا لقب اسرائیل ہے، کچھ چیزوں کے ترک کی اپنی مرضی سے پابندی کر لی تھی۔ بعض احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اونٹ کا گوشت تھا جو طبّی حیثیت سے جناب یعقوب علیہ السلام کو مضر تھا اس لئے انہوں نے ترک کر دیا تھا [۳]۔ اب یہود جو بعض چیزوں کو دل بخواہ حرام کیے ہوئے ہیں، اس کا ماخذ کوئی بھی نہیں ہے، اسی کو کہا گیا ہے کہ اگر سچے ہو تو توریت لا کر پڑھو، دیکھ لو کہ ان کی حرمت کا پتہ کہاں لگتا ہے؟

---

[۱] ۔لن تبلغوا حقیقة ولا تکونوا ابرار (صافی) ای لن تدرکوا ابرّ اللہ تعالیٰ باھل طاعتہ (مجمع البیان)

[۲] ۔حرام کردہ بود یعقوبؑ برخویشتن (شاہ ولی اللہ)

[۳] ۔فی الکافی والعیاشی عن الصادقؑ ان اسرائیل کان اذا کل من لحمہ الابل ھیج علیہ وجع الخاصرۃ فحرّم علیٰ نفسہ لحم الابل (صافی)

مگر علامہ طبریؒ نے جو شان نزول لکھی ہے، وہ یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت پیغمبر خداؐ پر یہ اعتراض کیا کہ انہوں نے اونٹ کے گوشت کو حلال کر دیا ہے تو اس کا جواب دیا گیا ہے کہ شرعاً تو وہ کبھی بھی حرام نہیں تھا۔ اسے تو جناب یعقوب علیہ السلام نے شخصی طور پر اپنے لئے حرام قرار دیا تھا۔ اس پر کسی حکم شرعی کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ [1]

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۟ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾

''کہیے کہ اللہ نے سچ بتا دیا ہے لہٰذا تم بس ابراہیم کے دین کی، جو غلط راستے کو چھوڑ کر سیدھے راستے پر قائم تھے، پیروی کرو اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔''

حنیف کے معنی لغت میں ہٹنے اور مڑنے کے ہیں، اس لئے جناب ابراہیم علیہ السلام کو جو حنیف کہا گیا ہے، اس میں دوسری غلط راہوں سے ہٹنے کا مفہوم پیدا ہوا ہے۔ [2] دوسری جگہ حنیفاً کے ساتھ مسلمًا کی لفظ کہہ کر اثباتی پہلو نمایاں کیا گیا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ۬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

''یقیناً سب سے پہلا گھر جو تمام لوگوں کے لئے مقرر ہوا، وہی ہے جو مکہ میں ہے، بابرکت اور سرمایہ ہدایت تمام جہانوں کے لئے۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، (خصوصیت سے) مقام ابراہیمؑ اور جو اس کے اندر پہنچ جائے وہ امن میں ہے اور اللہ کے لئے تمام لوگوں کے ذمہ خانہ کعبہ کا حج ہے، جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو [3] اور جو کفر اختیار کرے اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔''

وجوب حج اور اس کی شرط لازم استطاعت، خانہ کعبہ سرزمین مکہ اور مقام ابراہیم علیہ السلام

''پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر ہوا'' یعنی جسے عبادت گاہ خلائق قرار دیا گیا ہے [4] اور دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو دنیا کے اندر وجود میں آیا، وہ یہی تھا اور یہیں سے خلقت زمین کا آغاز ہوا۔ [5]

---

[1] ۔انکر الیھود تحلیل النبی لحرم الابل فقال کل ذلك کان حلا لابراھیم (مجمع البیان)

[2] ۔مائلا عن کل دین الاسلام (جلالین) اصل الحنف الاستقامہ... حنیفا ای مستقیما علی الدین (مجمع)

[3] ۔ھر کہ توانائی دار درفتن بسوئی آں از جھت اسباب راہ (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔وضع للناس لیکون متعبّدا لھم (صافی)

[5] ۔ای بنی اللناس ژلم بین قبلہ بیت مبنی وانما دوحیت الارض من تحتھا (مجمع البیان)

بکہ اور مکہ صرف تلفظ کے فرق کے ساتھ ایک ہی جگہ کے نام ہیں [1] اور ایک روایت ہے کہ پورے شہر کا نام مکہ ہے اور بکہ خاص وہ جگہ ہے، جہاں پر کعبہ ہے [2] لیکن زیادہ حدیثیں اس کی تائید میں ہیں کہ مکہ اور بکہ ایک چیز ہے۔

''مقام ابراہیم'' وہ جگہ ہے جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی دیواریں اونچی کی تھیں اور پتھر میں آپ کے قدم کا نشان ہو گیا تھا۔ [3]

مرکز عبادت کے تعارف میں اس کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کرنا اس کی دلیل ہے کہ اولیائے الٰہی کی یاد اور اس کی یاد کے مراسم کا قیام منافی توحید ربانی نہیں ہے۔

فریضہ حج ''استطاعت'' کے ساتھ مخصوص ہے جس کے حدود و قیود کتب فقہیہ سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٨﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٩﴾

''کہیے کہ اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ اللہ تمہارے اعمال کا گواہ ہے۔ کہیے کہ اے اہل کتاب! اللہ کے راستے سے اس کو جو ایمان لانا چاہے کیوں روکتے ہو؟ تم اسے ٹیڑھا بنانے کے درپے ہو [4] حالانکہ تم خود گواہ ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔''

اہل کتاب کو تنبیہی تازیانے

''اسے ٹیڑھا بنانے کے درپے ہو'' یعنی اس کے بارے میں طرح طرح کے غلط اعتراضات اور نکتہ چینیاں کر کے چاہتے ہو کہ راہ راست کو سمجھنے والے دھوکے میں پڑ جائیں، وہ اسے کج سمجھنے لگیں اور اس طرح سے منحرف ہو جائیں۔ [5]

ایک دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ تم اسے کج روی سے حاصل کرنا چاہتے ہو یعنی طلب حق کی کوشش کے جو صحیح راستے ہیں انہیں اختیار نہیں کرتے ہو۔ [6]

---

[1] ۔بکة لغة فی مکة (جلالین)

[2] ۔عنه موضع البیت بکة والقریة مکة (صافی)

[3] ۔مقام ابراهیم حیث قام علی الحجر فاثرت فیه قدماه (صافی)

[4] ۔تطلبون السبیل عوجا (جلالین)

[5] ۔طالبین الها اعوجاجا بان تلبسوا علی الناس وتوهموا ان فیه عوجا عن الحق (صافی)

[6] ۔قیل معناه تطلبون ذلك السبیل لا علی وجه الاستقامة او علی غیر الوجه الذی ینبغی ان یطلب (مجمع البیان)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

''اے ایمان لانے والو! اگر اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانو گے تو یہ تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹا دیں گے۔''

مسلمانوں کے لئے سامان انتباہ

مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے بہت ایسے ہیں کہ اگر ان کا کہنا مانو گے تو یہ تمہیں گمراہ کر دیں گے۔ ورنہ کچھ اہل کتاب جو انصاف پسند تھے، انہوں نے سچے دل سے اسلام قبول ہی کر لیا۔ ممکن ہے کہ جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے ہیں، ان میں بھی کچھ اسلام کی حقیقتوں کو محسوس کر کے گومگو کے عالم میں ہوں اور ان کی قوت ارادی اظہار حق کے لئے ساتھ نہ دے رہی ہو مگر وہ اپنی اس کمزوری پر اپنی جگہ منفعل ہوں لیکن ان کے علاوہ ایک طبقہ ایسا ہے جو دیدہ دانستہ تعصب وعناد سے اسلام کی راہ سے الگ اور ہٹ دھرمی گویا اس پر مفتخر بھی ہے۔ وہ دوسروں کو بھی حق کی طرف آنے سے مانع ہوتا ہے اور وہ مسلمانوں کو بھی ناصح مشفق کے بھیس میں آ کر ورغلانے کی کوشش کرتا ہے، انہیں کہا جا رہا ہے کہ مسلمان اگر ان کے کہنے پر چلیں تو وہ انہیں بھی کفریہ باتیں سکھا کر گمراہ کر دیں گے۔

اس انتباہ کی ضرورت قرآن کو کیوں محسوس ہوئی؟ صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ علمائے یہود کی بخیال خود علمیت سے مرعوب ہوتے ہوئے ان کا گرویدہ ہو رہا تھا ممکن ہے کہ اس طبقہ کے کچھ افراد قبول اسلام کا نقاب ڈال کر خود مسلمانوں میں شامل ہو گئے ہوں جیسے عبداللہ بن سلام اور کعب الاخبار وغیرہ اور افسوس ہے کہ مسلمانوں کے برسر اقتدار جماعت نے صرف اہل بیت رسولؐ کے معارف وعلوم سے بے نیاز ہونے کے لئے جنہیں وہ اپنا ''حزب مخالف'' سمجھتے تھے، ان نومسلم یہودیوں کو اپنا علمی مرکز بنا لیا جس کی وجہ سے ''اسرائیلیات'' کا بڑا ذخیرہ اسلامی لٹریچر میں شامل ہو گیا جس میں بہت سی باتیں اسلامی روح کے بالکل منافی ہیں۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

''اور کیوں کر اب تم کفر اختیار کرو گے درآں حالیکہ تم میں خداوندی آیتوں کی تلاوت ہوتی اور تم میں اس کا پیغمبر موجود ہے اور جو اللہ سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہوا[1] وہ بے شک سیدھے راستے پر لگا دیا گیا ہے۔''

''کیوں کر'' کے معنی نفی قدرت کے نہیں، بلکہ عدم استحسان کے ہیں، یعنی ہدایت کے تمام اسباب ہوتے ہوئے، پھر گمراہی کو اختیار کر لینا

---

[1] ۔چنگ استوار کردبخدا (شاہ ولی اللہ)

ایسی بات ہے جو ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔[1]

اور یوں تو کفر ہر حالت میں غیر مستحسن ہے مگر ہدایت کے اس ماحول میں ہوتے ہوئے کفر اختیار کرنے کی برائی اور بھی زیادہ شدید ہے[2]۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

''اے ایمان والو! اللہ کے غضب سے بچو، جو حق ہے بچنے کا اور دنیا سے نہ اٹھو مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔''

''جو حق ہے بچنے کا.....'' اس کی تشریح امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس طرح فرمائی کہ:

یطاع ولا یعصی ویذکر فلا ینسی ویشکر فلا یکفر (صافی)

اس کی اطاعت کی جائے، نافرمانی نہ کی جائے اور اسے یاد رکھا جائے، فراموش نہ کیا جائے اور اس کا شکریہ کیا جائے، ناشکرا پن نہ کیا جائے۔

دنیا سے اٹھنا، نہ اٹھنا تو ظاہر ہے، انسان کے اختیار میں نہیں ہے لیکن یہ ایک عام محاورہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم دین اسلام سے کسی وقت بھی منحرف نہ ہونا کہ جب بھی دنیا سے اٹھو، دین حق پر قائم و برقرار ہونے ہی کی حالت میں اٹھو۔[3]

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

''اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھامو اور تتر بتر نہ ہو اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے جب کہ تم آپس میں دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی تو اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے کی بالکل لگر پر تھے تو اس نے تمہیں اس سے چھٹکارا دیا۔[4] اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے لئے ظاہر کرتا ہے، شاید کہ تم سیدھے راستے پر لگ جاؤ۔''

---

[1] ۔انکار و تعجب لکفرهم فی حال اجتمع لهم الاسباب الداعیة الی الایمان الصارفة عن الکفر (صافی)

[2] ۔والکفر وانکان قطعیا فی کل حال فهو فی مثل هذا الحالة اقطع (مجمع البیان)

[3] ۔انما النهی فی الحقیقة عن ترک الاسلام (مجمع البیان)

[4] ۔علی طرف حفرة من جهنم لم یکن بینها وبینکم الا الموت (مجمع البیان)

اتحاد اور اتفاق باہمی کی تاکید

''اللہ کی رسی کو تھامنے'' کے معنی ہیں سب کا اس نظام پر قائم رہنا جو اللہ کا قائم کردہ ہے۔ اسی نظام کا نام ''دین'' ہے اسی نظام کا دستور العمل قرآن ہے اور اسی نظام کے رہبر اور عملی نمونہ رسولؐ اور امامؑ ہیں۔ اس طرح احادیث میں جو حبل اللہ کی تفسیر ''دین اسلام'' سے ہوئی ہے اور کتاب الٰہی سے ہوئی ہے اور آل محمد علیہم السلام یا خصوصیت کے ساتھ حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ساتھ ہوئی ہے، ان سب کا ماحصل ایک ہی قرار پاتا ہے۔ [1]

حدیث ثقلین کے بعض طرق میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ:۔

ایها الناس انی قد ترك فیكم حَبْلَیْن ان اخذتم بهما لن تضلوا بعدی. [2]

میں تم میں دو رسیاں چھوڑتا ہوں اگر تم انہیں تھامے رہو گے تو کبھی میرے بعد گمراہ نہیں ہو گے۔

اس حبل اللہ کے اس جامع مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا چاہیے جو بھلائی کی دعوت دیتی ہو، نیک کاموں کی ہدایت کرتی ہو اور بری باتوں سے منع کرتی ہو اور یہی وہ ہیں جو ہر طرح کی بھلائی حاصل کرنے والے ہیں۔''

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم

''تم میں سے ایک جماعت الٰہی ہونا چاہیے'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعوت و ہدایت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض عین نہیں ہے بلکہ واجب کفائی کی حیثیت رکھتا ہے کچھ لوگ جب اس کام کو انجام دیدیں تو باقی لوگوں پر فرض نہ رہے گا۔ پھر یہ کہ جامعہ اسلامی کا ہر فرد اس کا اہل بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ بہت سے وہ ہیں جو ضروری مسائل سے خود ہی ناواقف ہیں۔ وہ دوسروں کی ہدایت کیوں کر کریں گے؟ اس لئے ہمیشہ اس کے انجام دہی کرنے والے مجموع امت کے کچھ ہی افراد ہوں گے۔ سب نہیں [3] چنانچہ کافی میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا تمام امت پر واجب ہے؟

حضرتؑ نے فرمایا: نہیں۔

پوچھا کیوں؟ آپؑ نے فرمایا:

---

[1] ۔مالا لکل واحد (صافی)

[2] ۔رواہ ابو سعید الخدری عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ (مجمع)

[3] ۔من اللتبعیض لان ماذکر فرض کفایۃ لا یلزم کل الامۃ ولا یلیق بکل احد کالجاھل (جلالین)

انما هو علی القوی المطاع العالم بالمعروف من المنکر لاعلی الضعفة الذین لایهدون سبیلا انی ای من ای یقول الی الحق من الباطل.

ارے! یہ فریضہ تو اس پر عائد ہوسکتا ہے جو اتنی قوت رکھتا ہو، جس کی بات کا وزن لوگ مانیں جو اچھائی اور برائی کے امتیاز سے واقف ہو، نہ وہ بے چارے جنہیں خود پتہ نہیں کہ وہ کدھر سے کدھر جارہے ہیں یعنی انہیں احساس نہ ہو کہ وہ خود حق سے باطل کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔

اس کے بعد آپؑ نے اسی آیت قرآن سے استشہاد فرمایا اور پھر دوسری آیت پیش فرمائی کہ:

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ.﴿الأعراف: ۱۵۹﴾

موسیٰؑ کی پوری قوم میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو حق کا راستہ دکھاتی ہے اور اسی کے ساتھ منصفانہ فیصلہ کرتی ہے۔

اس کے بعد ظاہر ہے کہ بدرجہ اتم ان کاموں کو جو دعوت الی الحق اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ہیں، انجام دینے والے وہی ہوسکتے ہیں جن کی نظر کبھی بھلائی اور برائی کے امتیاز میں چوکے نہیں اور معصومینؑ کے ذوات مقدسہ ہوتے ہیں۔ اس لئے بعض روایات میں ہے کہ امہ کی تفسیر تنزیلی ائمہ ہے یعنی تم میں ایسے اماموں کو ہمیشہ ہونا چاہیے اس صورت میں یہ ''چاہیے'' حکم تکلیفی نہ ہوگا بلکہ ضرورت عقلی کا اظہار ہوگا کہ تمہارے لئے مناسب و اصلح ہے کہ ایسے امام موجود ہوں لہٰذا خداوند عالم ان کے وجود کا ذمہ دار ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ﴿۱۰۵﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۫ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴿۱۰۷﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۱۰۸﴾

''اور ان لوگوں کے ایسے نہ ہونا جو تفرقہ میں پڑ گئے اور کھلی ہوئی دلیلوں کے آنے کے بعد اختلافات میں مبتلا ہوگئے اور یہ وہ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے، اس دن کے جب کچھ چہرے نورانی ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ

ہوں گے تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے [1] ارے! تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے؟ اچھا تو اب عذاب کا مزہ چکھو، اس کی سزا میں کہ تم نے کفر اختیار کیا اور جن کے چہرے نورانی ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم آپ کے سامنے سچائی کے ساتھ پیش کر رہے ہیں اور اللہ جہان والوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا ہے۔''

مسلمانوں کو تنبیہی تازیانے

آیت جن الفاظ میں مسلمانوں کو انتباہ کر رہی ہے، وہ صاف پتہ دیتے ہیں کہ یہ خطرہ سامنے آنے والا ہے کہ جیسے یہود و نصاریٰ کھلے ہوئے دلائل کے بعد تفرقہ میں پڑ گئے اور اختلافات میں مبتلا ہو گئے اسی طرح یہ امت بھی اختلافات میں مبتلا ہو جائے۔

نیز یہ بھی اس آیت سے ظاہر ہے کہ جس چیز میں ان کا اختلاف ہوگا وہ ایسی نہیں ہے کہ اس میں خالق کی طرف سے کوئی ہدایت نہ ہوئی ہو بلکہ اس بارے میں ''نص'' موجود ہوتے ہوئے یہ لوگ اختلافات میں مبتلا ہوں گے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ:

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ. ﴿البينة: ۴﴾

کھلی ہوئی دلیلوں کے آنے کے بعد

اب جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہم مسلمانوں کے اختلافات کا نقطہ مرکزی تلاش کرتے ہیں صاف پتہ ہے کہ وہ ''زعامت کبریٰ'' یعنی جانشینی رسولؐ کا مسئلہ ہے جس میں مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ہوا اور آج تک قائم ہے۔

قرآن مجید صاف کہہ رہا ہے کہ یہ اختلاف ''کھلے ہوئے دلائل'' کے آنے کے بعد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو جماعت ان دلائل کا اقرار کرے اور نص کو تنبع سمجھے وہ صراط مستقیم پر ہے اور جو ان نصوص کا انکار کرتے ہوں، وہ اس تفرقہ اور اختلاف کے ذمہ دار ہیں اور ان کے لئے قرآن میں خالق کی طرف سے سخت الفاظ میں وعید ہوا ہے کہ:

وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. ﴿آل عمران: ۱۰۵﴾

ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

پھر عذاب کے تفصیلات بیان ہوئے ہیں اور اس میں انہیں کہ جو مبتلائے عذاب میں ہیں، صاف کہا گیا ہے کہ یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ ایمان لانیکے بعد کافر ہو گئے۔ اس سے صاف ہے کہ یہ نقطہ اختلاف کوئی فروعی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اصول دین کا جز ہے جو معیار ایمان و کفر قرار پاتا ہے۔

قرآن کے ان تصریحات کے باوجود یہ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ کچھ مسلمان مسئلہ خلافت کو ''فروعی'' چیز قرار دیتے ہیں یا اب ''روشن خیالی'' کے زمانہ میں صرف ''تاریخی بحث'' یا ''سیاسی مسئلہ'' قرار دے کر اس کی دینی اہمیت گھٹائی جاتی ہے۔

اب ایک طرف بلاغت قرآنی کی روشنی میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ صرف ایک ''مفروضہ'' خطرہ کے بارے میں جس کا وقوع نہ ہو، اتنا تفصیلی بیان نہیں کیا جا سکتا کہ جو تم میں سے مانیں گے، ان کے لئے یہ ہوگا اور جو نہ مانیں گے ان کے لئے یہ ہوگا اور جو چہرے روشن ہوں گے وہ

---

[1] ۔علی ارادۃ القول ای فیقال لھم اکفر تم والھمزۃ للتوبیخ والعجب مرۃ حالھم (صافی) بدیشاں گفتہ شود آیا کہ کافر شدید بعد از اسلام خویش (شاہ ولی اللہ) جو لوگ کہ کالے ہوئے منہ ان کے، کیا کافر ہوئے تم پیچھے ایمان اپنے کے (شاہ رفیع الدین)

ایسے ہوں گے اور جو چہرہ سیاہ ہونگے وہ ایسے ہوں گے۔اس انداز بیان سے خود ظاہر ہوگا کہ کچھ واقعی ہوں گے، یہ سیاہ چہرہ والے اور وہ کھلے ہوئے کفار ومشرکین نہیں ہیں، وہ یہود ونصاریٰ نہیں ہیں۔وہ اس امت کے افراد ہیں جس سے کہا گیا تھا کہ:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.﴿آل عمران: ۱۰۴﴾

تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے اور امر بالمعروف کرے اور نہی عن المنکر کرے۔

اس کی مخاطب مسلمان کہلانے والی عام امت ہے اور اسی مسلمان میں سے یہ گروہ پیدا ہوا ہے جسے کہا جارہا ہے کہ ''تم نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا، اب عذاب کا مزہ چکھو۔''

پھر آخر میں تو یہ آیت کہ ''یہ اللہ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم آپ کے سامنے صاف بیان کرتے ہیں۔'' اس کا اعلان ہے کہ یہ بالکل مستقبل قریب میں ہونے والے واقعات میں جنہیں بطور اخبار بالغیب خالق ان انتباہات کے انداز میں پیش فرمارہا ہے۔

اس کے بعد بھی مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھلیں اور وہ حق اور باطل کا امتیاز نہ کریں تو اس کا علاج کیا ہے؟ پھر جو کچھ ہو اس پر ''شکوہ'' نہ کریں کہ ''برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر.....'' وہ اپنے افعال واعمال کا نتیجہ ہے جسے خالق کہہ رہا ہے:

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ

''اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کیا کرتا۔''

مفسرین جمہور کی بوکھلاہٹ ان آیات کی تفسیر میں بہت قابل رحم ہے۔تفسیر جلالین میں ہے:۔

لاتكونوا كالذين تفرقوا واختلفوا من بعد ما جآء هم البينت

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو تفرقہ اور اختلاف میں پڑ گئے کھلی ہوئی دلیلوں ہونے کی ممانعت ہوئی ہے؟ لکھا ہے:

وهم اليهود و انصارى

وہ لوگ یہود ونصاریٰ ہیں۔

تو اب یہ کون ہے جن سے کہا جارہا ہے کہ ان کی طرح نہ ہو؟ یہ بلاشبہ مسلمان ہیں مگر جب نورانی چہروں اور سیاہ چہروں کی بات آئی تو وہاں اَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ کو انہوں نے لکھ دیا۔

وهم الكافرون فيلقون فى النار

وہ سیاہ چہروں والے) کافر ہوں گے اور اس لئے آتش جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔

اس طرح انہوں نے مسلم جماعت کو اس وعید کی زد سے بچالیا، اب جو آیا:

اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ

ارے! تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے۔

تو انہیں اس کی تشریح کے لئے لکھنا پڑا: ''یوم اخذ الميثاق'' یعنی یہ ایمان اس دنیا کا نہ تھا۔عالم ذر میں جو الست بربکم کہا گیا تھا اور اس کا جواب سب نے بلیٰ کہہ کر دیا تھا، یہ اس روز الست والے ایمان کا ذکر ہے کہ تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے۔حالانکہ اصطلاح قرآنی

کے جاننے والے واقف ہیں کہ اس دن کے معاملہ کو قرآن اقرار سے تعبیر کرتا ہے، ایمان سے نہیں، ایمان اور کفر تو دار تکلیف کی چیزیں ہیں۔ اس لئے قرآن کفر بعد الایمان کا الزام ایک تو منافقین پر لگاتا ہے کہ وہ زبان سے ایمان ظاہر کرنے کے باوجود دل سے کافر رہے۔ یہاں ''بعد'' کی لفظ بااعتبار زمانہ نہیں بلکہ باعتبار رتبہ ہوتی ہے کہ یہ کفر جو بعنوان نفاق ہے، مرتب ہوتا ہے اس اقرار اسلام پر جو زبان سے کہا گیا ہے اور دوسرے یہ الزام مرتدین پر ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے اسلام اختیار کیا اور پھر اس سے انحراف کیا۔ کفار اصلی سے کبھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تم ایمان کے بعد کافر ہو گئے چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب اس سے متفق نہیں ہیں۔ وہ نورانی اور سیاہ چہروں کے بیان والی آیتوں پر حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ منہ ان کے ہیں جو مسلمانی میں کفر کرتے ہیں، یعنی منہ سے کلمہ اسلام کہتے ہیں اور عقیدہ خلاف اسلام کے رکھتے ہیں، سب فرقے گمراہ یہی حکم رکھتے ہیں (موضح القرآن)

الحمدللہ کہ یہ کلمہ حق موصوف کے قلم سے نکل گیا ہے، بس اتنا اور رہ گیا کہ شاہ صاحب اس جز پر غور فرما لیتے کہ یہ ''مسلمانی میں کفر'' وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ کی تصریح کے مطابق ''نص'' کا انکار کر کے تفرقہ اور اختلاف کی بنیاد قائم کرنے سے ہوا ہے لہٰذا روشن چہروں والے وہ ہوں گے جو ''نص'' کو مانیں، اور اس کے خلاف کسی اجماع وشوریٰ وغیرہ کو تسلیم نہ کریں اور جو انکار نص کا راستہ اختیار کر کے امور دین میں کوئی جمہوریت وغیرہ کا اصول اختیار کریں وہ کفر تم بعد ایمانکم کا مصداق ہوں گے اور ''فرق باطلہ'' میں داخل ہوں گے۔

انکار نص کے نتیجہ میں افتراق اور اس کا انجام

یہ آیتیں تمام فرق اسلامیہ کو صحیح نقطہ حق کی تلاش میں مشعل راہ بننے کے لئے کافی ووافی ہیں۔

علامہ ثعلبی نے اس نکتہ کو کہ یہ اسی امت میں سے مرتد ہو جانے والوں کا تذکرہ ہے سمجھ لیا ہے جو اس آیت کے ذیل میں انہوں نے پیغمبرؐ کی متفق علیہ ''حدیث حوض'' کو جسے ہم ''حدیث ارتداد'' بھی کہہ سکتے ہیں۔[1] پیش کیا ہے۔

اور یہی مجمل پر حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے بھی اس آیت کی تشریح فرمائی ہے کہ:

هم اهل البدع والاهواء والارآء الباطلة من هذه الامة (مجمع البیان)

یہ اسی امت میں کی وہ جماعتیں ہیں جنہوں نے بدعتیں ایجاد کیں، دل بخواہ راستے اور غلط اعتقادات اختیار کیے۔

تفسیر علی بن ابراہیم قمی میں جناب ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہ کی زبانی اس گمراہ اکثریت کی تشریح اور روز قیامت اس کے ورود کا منظر بڑی تفصیل سے وارد ہوا ہے جو جمہور کی حدیث ارتداد کے بالکل مطابق ہے اور اس کی تشریح وتفصیل کی حیثیت رکھتا ہے اور اسے ملا محسن فیض نے تفسیر صافی میں درج کیا ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۱۰۹

اور اللہ کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام باتوں کی رجوع ہے۔''

یہ آیت بھی اگر مقام تنزیل میں اسی سلسلہ کی آیت ہے اور محسوس ایسا ہو رہا ہے کہ ایسا ہی ہے، اس میں بڑا صاف یہ رخ نظر آرہا ہے کہ یہ

---

[1] ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ہمارا رسالہ ''حدیث حوض'' شائع کردہ امامیہ مشن لکھنو۔

سب اختیار الٰہی کے مقابلہ میں خودرائی، خودمختاری اور حق خودارادی کے تصورات اور جمہوریت کے تخیلات کو ختم کرنے ہی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یعنی تمہارا جو کچھ حق خودارادی ہوسکتا ہے وہ اپنے ایسے دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں ہوسکتا ہے، خالق کے مقابلہ میں تھوڑی جس کا آسمان وزمین میں سب کچھ ہے [1] اور تم خود اس کے مملوک ہو اور جتنی باتیں ہیں سب کا فیصلہ تکوینی طور پر اس کے ارادہ واقتدار سے متعلق ہے لہٰذا اختیاری طور پر بھی تم اپنے معاملہ کو اسی کے نص وانتخاب سے وابستہ کرو تو یہی تمہارے ایمان باللہ کا ثبوت ہوگا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

''تم ایک بہترین جماعت ہو [2] جو تمام خلق کے فائدہ کے لئے سامنے لائی گئی ہے۔ [3] نیک باتوں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ ایمان لائے ہیں اور اکثر بداعمال ہیں۔

بہترین امت کون ہے

یہ پوری امت سے خطاب ہو نہیں سکتا، اس لئے کہ پہلے آچکا ہے: ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینهون عن المنکر (یعنی) تم سے کچھ لوگ ایسے ہونا ہیں جو دعوت خیر دیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کریں'' اس سے ظاہر ہے کہ یہ دعوت پوری امت کو انتباہ کیا جاچکا ہے کہ تم اختلاف نہ کرنا اور تفرقہ میں پڑنا اور یہ کہ کچھ منہ نورانی ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے اور انہیں عذاب ہو رہا ہوگا لہٰذا یہ ماننا ناگزیر ہے کہ اب جو خطاب ہوا ہے: کنتم خیر امة اخرجت للناس تو یہ مجموع امت کے اس گروہ سے ہے جس کے وجود کی امت کے اندر گذشتہ آیت میں فلتکن منکم امة یدعون الی الخیر کہہ کے خبر دی گئی تھی اور اسی لئے بعض روایات میں خیر امتہ کو کہا گیا ہے کہ یہ خیر ائمہ کیوں کر ہوسکتی ہے جبکہ اسی امت نے امام برحق امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ اور حسنؑ وحسینؑ فرزندان رسولؐ کو قتل کیا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

هم ال محمد خیر امت آل رسولؐ ہیں

تیسری حدیث میں ہے:

---

[1] ۔ملکا و خلقا (مجمع البیان و صافی)

[2] ۔الکون فیها یعمه الا زمنة غیر متخصص بالماضی کقوله تعالیٰ و کان الله غفورا رحیما (صافی)

[3] ۔اخرجت اظهرت (صافی)

انما نزلت هذا الاية على محمد فيه وفی الاوصياء خاصة۔

یہ آیت مخصوص طور پر حضرت پیغمبر خداؐ اور ان کے اوصیاء کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

چوتھی روایت ہے:

یعنی الامة التی وجبت لها دعوة ابراهيم۔

اس سے مراد وہ گروہ جن کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا (ومن ذریتی) مستجاب ہوئی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جنہیں منجانب اللہ امامت کا منصب عطا ہوا۔

یہ تمام احادیث ملا محسن فیض کاشانی نے تفسیر صافی میں درج کیے ہیں۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

”ہرگز یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے سوا معمولی اذیت کے [1] اور اگر تم سے یہ جنگ کریں گے تو تمہارے سامنے سے بیٹھ پھرا کر بھاگیں گے، پھر انہیں کہیں سے مدد نہیں ملے گی۔ ان کے نصیب میں ذلت لکھ دی گئی ہے، جہاں بھی یہ پائے جائیں، سوا اللہ کی طرف کے کسی معاہدہ کے یا آدمیوں کے کسی سہارے کے [2] اور یہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہیں اور ان پر محتاجی لکھ دی گئی ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ آیت الٰہی کے ساتھ کفر کرتے رہے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے۔ یہ اس کی سزا ہے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور ہمیشہ ظلم و تعدی سے کام لیتے رہے۔“

یہود کے متعلق قرآنی پیش گوئی اور حالات حاضرہ

اس آیت میں یہود پر ذلت لکھے جانے کے اعلان کے ساتھ الا بحبل من اللہ وحبل من الناس کا استثناء تمام ان اعتراضات کا جواب ہے جو آج تقریباً چودہ سو برس کے بعد انگلستان اور امریکیوں کے دستیاری سے اسرائیلی سلطنت کے قیام کی وجہ سے زبانوں پر آنے لگے

---

[1] ۔ضررا یسیرا کطعن و تهدید (صافی)

[2] ۔مگر بدستاویزی از خدا و دستاویزی از مردمان (شاہ ولی اللہ) مگر ساتھ پناہ اللہ کے اور پناہ لوگوں کی (شاہ رفیع الدین)

ہیں کہ قرآن نے کہا تھا کہ ان پر ذلت لکھ دی گئی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں میں مشہور تھا کہ یہودیوں کی کوئی سلطنت دنیا میں نہیں ہوسکتی۔ پھر یہ آج ان کی سلطنت کیوں کر قائم ہوگئی؟ مگر قرآن نے صاف خود استثناء کر دیا ہے کہ وہ خود اپنی طاقت کے بل بوتے پر اس ذلت سے کبھی نہیں نکل سکتے، ہاں اللہ کی طرف سے کوئی معاہدہ ہو یعنی جزیہ دے کر وہ اسلام کی پناہ میں آجائیں یا کچھ اور لوگوں کے سہارے کبھی قوت حاصل کر لیں تو اور بات ہے۔ اب دنیا خود یہ فیصلہ کرے کہ یہ اسرائیل حکومت دوسروں کے سہارے سے قائم ہوئی ہے یا نہیں؟

اب بھی کیا دنیا اعجاز قرآن کا انکار کرے گی؟

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (انعام۔ ۱۱۵)

لَيْسُوْا سَوَاۗءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝۱۱۳ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۱۴ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝۱۱۵

”وہ سب برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں ایک ثابت قدم جماعت بھی ہے [۱] جو رات کے مختلف اوقات میں آیات الٰہی کی تلاوت کرتی ہے اور وہ سجدے بجالاتی ہے۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اچھی باتوں کی ہدایت کرتے اور بری باتوں سے ممانعت کرتے ہیں اور نیک کاموں میں تیزی کرتے ہیں اور یہ لوگ نیکوکاروں میں ہیں اور وہ جو نیک کام کریں گے اس کی ناقدری [۲] ہرگز نہیں ہوگی اور اللہ پرہیزگاروں سے خوب واقف ہے۔“

جن کے اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں، اہل کتاب میں کے وہ افراد ہیں جنہوں نے صدق دل سے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے کردار میں وہ جوہر تھے جن سے جماعت یہود عموماً محروم ہے۔ [۳]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۱۶ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ

---

[۱] ۔قائمته علی الحق (صافی)

[۲] ۔فلن یضیع ولا ینقص ثوابه (صافی) وسمی منع الجزاء کفرا علی الاتساع لانه بمنزلة الجحد والسوا (جمع البیان)

[۳] ۔وصفهم بصفات لیست فی الیهود (صافی)

الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

''بلاشبہ وہ جو کافر ہیں، انہیں ان کے اموال اور اولاد اللہ (کے عذاب) سے کچھ بھی بچا نہیں سکتے اور یہ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، مثال کے اس کے جو وہ اس دنیوی زندگی میں صرف کرتے ہیں، اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا تھا[1] جو چلی ایک ایسی جماعت کی کھیتی پر جو اپنے اوپر ظلم کرتی رہی تھی[2] تو اسے برباد کر دیا اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے تھے۔''

''مال اور اولاد'' وہ ہوتے ہیں جن پر ہر انسان بھروسا کرتا ہے کہ یہ آڑے وقت میں کام آئیں گے، اس لئے ان کو کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتے[3] ورنہ ان کی خصوصیت نہیں، اس سے تو کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔

آخر میں جو مثال دی گئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ کھیتی برباد ہو جاتی ہے، اسی طرح ان کے یہ اللے تللے جو مصارف دنیا میں ہیں، اس وقت تو آنکھوں کو بہت بھلے لگتے ہیں مگر نتیجہ میں سب اکارت ہوں گے اور انہیں ان سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

''اے ایمان لانے والو! اپنے علاوہ دوسرے ایسے لوگوں کو جو تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کریں گے، اپنا جگری دوست[4] نہ بناؤ، وہ تمہیں زحمت ہی پہونچنے کے متمنی ہیں۔ دشمنی ان کے دہنوں سے بھی ظاہر ہو ہی جاتی ہے اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا رہتا ہے، وہ اور سوا بڑھ کر ہے۔ ہم نے تمہارے لئے واضح نشانیاں[5] پیش کر دی ہیں اگر تم عقل سے کام لو۔''

یہ مومنین کو نصیحت ہے کہ وہ مخالفین دین کو اپنا راز دار اور جگری دوست نہ بنائیں، اس لئے کہ وہ تمہارے حقیقی دوست کبھی نہیں ہو سکتے۔

---

[1] ۔البرد الشدید (مجمع البیان)

[2] ۔بالکفر والمعصیة (صافی)

[3] ۔انما خص الاموال والاولاد بالذکر لان هذا من معتمله الخلق (مجمع البیان)

[4] ۔البطانة خاصة الرجل الذی یستنبونه امرو ماخوذ من بطانة الذی یلی البدن لقربه منه (مجمع البیان)

[5] ۔الدلالات علی شانهم (البلاغی)

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾

''اب تمہارا یہ عالم ہے کہ تم تو ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے اور تم ہر کتاب پر ایمان لائے ہوئے ہو اور وہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب تخلیہ ہوتا ہے تو تمہارے خلاف غیظ و غضب سے اپنی بوٹیاں کاٹتے ہیں [1] کہو کہ مرجاؤ تم لوگ اپنے غم وغصہ سے ''یقیناً اللہ سینوں کے اندر والی باتوں کا جاننے والا ہے۔''

یہ ان ہی مسلمانوں سے تخاطب ہے جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی کے پینگ بڑھاتے تھے۔ [2]

ہم نے تو منون بالکتاب کلہ کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ ''تم ہر کتاب پر ایمان لائے ہوئے ہو۔'' یعنی تم تو ان کی توریت کو بھی جو واقعی تھی، مانتے ہو اور ان کی انجیل کو بھی جو حقیقی تھی، مانتے ہو مگر یہ تمہارے قرآن کو نہیں مانتے۔ اس صورت میں الکتاب سے جنس کتاب مراد ہے اور کلہ اس کے اشخاص یعنی توریت وانجیل وغیرہ کے اعتبار سے ہے [3] لیکن اس کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ الکتاب سے مراد قرآن ہی ہے اور مقصود یہ ہے کہ تم پورے قرآن پر ایمان لائے ہو تو اسی قرآن میں تو وہ آیتیں بھی ہیں جو ظالمین کا سہارا لینے اور کافروں کو دوست بنانے کی ممانعت میں ہیں، پھر تم انہیں اپنا دوست کیوں بناتے ہے [4] مگر مجھے پہلے معنی الفاظ آیت کے سیاق وسباق کے لحاظ سے زیادہ درست معلوم ہوتے ہیں۔

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾

''اگر تمہیں کوئی بھلائی چھو بھی جائے تو انہیں باعث رنج ہوگی اور اگر تمہیں کوئی برائی پہنچے تو وہ اس سے خوش ہوں

---

[1] ۔تم پر (غصہ کے مارے) انگلیاں کاٹتے ہیں''۔ (حاشیہ) اس (الانامل) کے اصلی معنی پوروں کے ہیں مگر چونکہ اردو کا محاورہ میں پوروں کا کاٹنا نہیں بولتے اور غصہ میں انگلیاں کاٹنا بولتے ہیں، اس وجہ سے یہ ترجمہ کیا گیا ہے (مولانا فرمان علی صاحب) مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو میں تو انگلیاں کاٹنے کا بھی محاورہ نہیں ہے، اس لئے ہم نے ترجمہ بوٹیاں کاٹنے کے ساتھ کیا ہے۔

[2] ۔ھا انتم اولآ الخاطئون فی موالاۃ الکفار (صافی)

[3] ۔تومئون بما انزل علیٰ ابراھیم و موسیٰ و عیسیٰ و محمد ﷺ وھم لا یصدقون بکتبکم (مجمع البیان) تومنون بجنس الکتاب کلہ کتابکم و کتابھم وغیرھما (صافی)

[4] ۔ھل یسوغ و یحسن منکم ایھا المومنون بالکتاب کلہ لن تحبوا من لا یبہ اللہ لاجل شرہ (البلاغی)

گے اور اگر تم برداشت سے کام لو اور بچتے رہو [1] تو تمہیں ان کی ترکیبیں کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گی۔ بلاشبہ اللہ ان کے تمام اعمال پر حاوی ہے۔''

یہ منافقین کی خباثت نفس کا حال اور اس کی پاداش کا ذکر ہے جس میں بھلائی کے ساتھ تمسسکم کی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں چھو جائے اور یہی ہم نے ترجمہ کیا ہے ''کوئی بھلائی چھو بھی جائے'' اور برائی کے ساتھ تصبکم کا لفظ جو اصابة سے ہے اور اصابة وہی مصدر ہے جس سے ''مصیبت'' کا لفظ ہے اس میں یہ مفہوم مضمر معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے لئے بھلائی کا کم سے کم حصہ بھی جسے چھونے کا مصداق سمجھا جائے۔'' [2] وہ بھی انہیں گوارا نہیں اور برائی میں صرف امکانات یا خطرات سے بھی انہیں اطمینان نہیں ہوتا بلکہ وہ اس وقت تک خوش نہیں ہوتے، جب تک کہ وہ برائی پورے طور سے بطور ایک مصیبت کے تم پر اثر انداز نہ ہو جائے۔ [3]

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

''اور وہ موقع جب آپ سویرے اپنے گھر بار سے نکلے، اس طرح کے مسلمانوں کو جنگ کے لئے مناسب مورچوں پر جگہ دے رہے تھے [4] اور اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔ جب تم میں سے دو گروہوں نے (پہلے سے) ارادہ کر لیا تھا کہ وہ سستی دکھائیں گے، حالانکہ اللہ ان دونوں کا مالک و سرپرست ہے اور اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسا کرنا چاہیے۔''

غزوۂ احد کے لئے روانگی کے وقت کا تذکرہ

اکثر آیات قرآن مجید اذ سے شروع ہوئے ہیں یعنی جب یہ ہوا۔ ان میں کبھی تو اس ''جب'' کا مرکز تعلق مذکور ہوتا ہے جب ایسا ہوتا تو اس وقت یہ ہوا اور بہت جگہ اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ ایسے موقعوں پر اس کا متعلق محذوف ماننا پڑتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ موقع یاد رکھنے کے قابل ہے چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔ [5]

یہ کس مہم پر نکلنے کا ذکر ہے؟ اس کی تصریح آیت میں مذکور نہیں ہے اور ایسے بھی محل وہ ہیں جو اس دعوے کو کہ قرآن فہمی کے لئے حدیث و

---

[1] ۔ تصبروا علیٰ عداوتهم وتتقوا مولاتهم (صافی)

[2] ۔ کنایة عن قلة اعمالکم (البلاغی)

[3] ۔ بمعنی تصیبکم فادحة اصابة لا بمجرد المسیر (البلاغی)

[4] ۔ تهیئی لهم مقاعد للقتال "مواقف واماکن له (صافی)

[5] ۔ العامل فی "اذ" محذوف والتقدیر "واذکر" (مجمع البیان)

تفسیر کی ضرورت نہیں ہے، غلط ثابت کرتے ہیں۔

تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزوہ احد میں روانگی کا تذکرہ ہے۔[1] اور اس کے بعد اس کا مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ آپ مومنین کو مناسب مورچوں پر جگہ دے رہے تھے جب ایک جگہ تو پوری فوج کا مستقر بنائی گئی اور ایک جماعت کو اس ہدایت کے ساتھ کہ ہمیں فتح ہو یا شکست، بہر صورت تم اس جگہ سے حرکت نہ کرنا، درہ کوہ کے اس تنگ راستے پر مقرر کر دیا گیا، جدھر سے آنے پر مسلمانوں کو محاصرہ میں لیا جا سکتا تھا۔

اس کے تذکرہ کی اس موقع پر ضرورت اس لئے تھی کہ بعد میں رسولؐ کی مقرر کردہ جگہ سے ہٹنا ہی مسلمانوں کے لئے اس عظیم تباہی کے خطرہ سے دوچار ہونے کا باعث ہوا جس نے سوا اکا دکا مجاہدین کے باقی تمام جماعت کے قدموں میں تزلزل پیدا کر کے روبہ فرار بنا دیا۔

قرآن مجید کا اس صورت حال کو اتنی اہمیت کے ساتھ بیان کرنا یہ کہہ کر کہ وہ یاد رکھنے کا موقع ہے، بعض علمائے جمہور کے اس رجحان کو غلط قرار دیتا ہے کہ دور رسولؐ کے مسلمان چونکہ صحابہ کے معزز گروہ سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا اس دور کے واقعات پر ایسا تبصرہ نہیں چاہیے جو کردار کے کسی پہلو کو نمایاں کرتا ہو، اگر افراد کا احترام اس حق پوشی کا متقاضی ہوتا اور خالق کا یہ منشا ہوتا تو قرآن مجید میں ان واقعات کی یاد ایسے چونکانے والے الفاظ کے ساتھ محفوظ نہ کی جاتی۔

صحابہ کے واقعات پر تبصرہ کو روکنا منشائے قرآنی کے خلاف ہے

چونکہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس حکم کی مخالفت ہوتی جس سے نقصان اٹھانا پڑا، اس لئے آخر میں تہدیدی انداز میں کہا گیا ہے کہ ''اللہ سننے والا ہے'' یعنی جو کچھ ان سے کہا سنا گیا تھا، اس سے بھی خوب واقف ہے اور ''جاننے والا ہے'' یعنی جو کچھ ان کا کردار پھر وقوع میں آیا، وہ بھی اس کے علم میں ہے۔

''جب تم سے دو گروہوں نے سستی دکھانا چاہی'' پھر روایت کی ضرورت۔ یہ ''دو گروہ'' کون ہیں؟ قرآن سے کیوں کر معلوم ہو؟ ہاں حدیث میں ہے جو طرق اہل سنت سے سبھی ہے اور مسلم و بخاری دونوں نے اسے درج کیا ہے اور علامہ طبرسیؒ نے امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف نسبت کیساتھ بھی اس کا ذکر کیا ہے کہ یہ دونوں گروہ بنو سلمہ اور بنو حارثہ انصار میں سے ہیں[2] اور یہی دونوں فوج کے دونوں بازوؤں کی حیثیت میں تھے۔[3]

دوسری روایت جو تفسیر قمی میں ہے یہ ہے کہ اس سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہیں۔

علامہ بلاغی نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، اس بنا پر قرآن کہہ رہا ہے کہ ان دونوں گروہوں نے سستی دکھانا چاہی یعنی دکھائی نہیں اور پھر یہ ارشاد ہوا کہ ''اللہ ان کا مالک و سرپرست ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے انہیں اس کمزوری سے محفوظ رکھا اور عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی تو کھلے ہوئے منافق تھے اور وہ ہمیشہ ہی کمزوری دکھاتے تھے، پھر وہ کیوں کر مراد ہو سکتے ہیں؟

---

[1] عن ابن عباس وهو المروی عن ابی جعفر یعنی الباقر علیہ السلام (البلاغی)

[2] ۔هما بنو سلمة و بنو الحارثه حیان من الانصار (مجمع البیان)

[3] ۔وکانا جناحی العسکر (صافی)

ہم سمجھتے ہیں کہ جنگ احد کا جو انجام بعد میں سامنے آیا، اس کی بنا پر یہ کہنا کہ انہوں نے کمزوری دکھانا چاہی تھی مگر نہیں دکھائی، محتاج ثبوت ہے۔ اس لئے کہ بہت ممکن ہے کہ جب درہ کوہ سے خالد بن الولید نے حملہ کیا تو سب سے پہلے دونوں بازو ہی فوج کے پسپا ہوئے ہوں، جس کے بعد تمام فوج منتشر ہوگئی۔ اس لئے قرآن نے ان دو کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا اور اس حقیقت کا انکشاف کہ یہ ان دونوں گروہوں کی وقتی طور پر کوئی اضطراری حرکت نہ تھی بلکہ پہلے سے آپس میں طے کی ہوئی بات تھی کہ کوئی صورت گرگوں ہوئی تو سب سے پہلے ہم میدان سے ہٹیں گے۔

رہ گیا یہ کہنا کہ اللہ ان کا مالک و سرپرست ہے تو یہ اس ارادہ کی مذمت کا اظہار ہے کہ انہیں اپنے مالک کے مقصد کے خلاف ایسا منصوبہ بنانا نہیں چاہیے تھا، پھر دوسرے مسلمانوں کو یہ انتباہ ہے کہ یہ دونوں کمزوری دکھاتے کبھی تو دوسرے مسلمانوں کو ان کے سہارے تو نہیں رہنا چاہیے تھا، انہیں تو اللہ پر بھروسا رکھنا چاہیے تھا لہٰذا ان کے میدان سے ہٹنے کے بعد بھی دوسرے مسلمانوں کو ہمت نہیں ہار دینا چاہیے تھی اور خدا پر بھروسا رکھنا چاہیے تھا۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''اور بلاشبہ اللہ نے تمہاری مدد کی بدر میں جب کہ تم کمزور تھے لہٰذا اللہ کی ناراضگی سے بچتے رہو، شاید کہ تم شکر گزار ثابت ہو۔''

جنگ بدر کا حال اور مدد الٰہی

مادی حیثیت سے جب فریق مخالف کو عددی بھی قوت ہو اور اسلحہ کے لحاظ سے بھی اس کی طاقت زیادہ ہو اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی بے سروسامانی اس حد پر کہ ''بے سروسامانی'' کی لفظ سے اتنی ''بے سامانی'' سمجھ میں نہ آسکتی ہو یعنی تین سو تیرہ آدمیوں میں [1] صرف ۱۳ عدد تلواریں اور صرف دو گھوڑے، یہی بے سروسامانی ہے جسے قرآن نے ایک لفظ: وَاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ سے ظاہر کیا ہے جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ ''تم کمزور تھے''۔ [2]

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

''جب آپ مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہ ہوگی کہ تمہارا پروردگار تمہاری مدد کرے تین ہزار فرشتوں سے جو اتارے گئے ہوں؟ کیوں نہیں، اگر صبر و برداشت اور پرہیزگاری سے کام لو اور

---

[1] ۔فی غیر واحد من الاخبار الموسومة ان عدتهم كانت ثلثمائة وثلث عشر (صافی)

[2] ۔لم يخرجوا اباهبة حرب الا عزة محارب (البلاغی)

وہ تم پر اسی دم فوری طور پر [1] حملہ آور ہو جائیں تو تمہارا پروردگار تمہاری امداد پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا جو نشان زدہ ہوں گے۔ [2]

فرشتوں کا مدد کے لئے آنا

یہ اسی جنگ بدر کا تذکرہ اور امداد غیبی کے واقعہ کی تفصیل ہے۔

''کیا تمہارے لئے یہ کافی نہیں ہے؟'' یعنی اس عظیم نصرت و امداد ربانی کے بعد بھی پھر کیا تمہیں پریشان ہونا چاہیے اور دشمنوں کے مقابلہ میں کمزوری دکھانا چاہیے۔ [3]

وعدہ میں پہلے تین ہزار اور پھر پانچ ہزار کا جو تذکرہ ہے، اس میں مفسرین کو الجھن پیدا ہوئی ہے کہ اصل تعداد ملائکہ کی کیا تھی؟ بعض نے کہا ہے کہ تین ہزار کے بعد پانچ ہزار کے ذکر کا یہ مطلب ہے مزید دو ہزار بھیج کر پوری تعداد پانچ ہزار کر دی جائے گی۔ [4]

دوسرا قول یہ ہے کہ ان تین ہزار کے علاوہ پانچ ہزار بھیجے جائیں گے تو مجموعاً آٹھ ہزار ہو جائیں گے۔ [5]

چونکہ الفاظ آیت دونوں صورتوں میں درست ہوتے ہیں، اس لئے اس بحث کا فیصلہ بغیر معصوم سے وارد شدہ تفسیر کے جواب تک نظر سے نہیں گزری مشکل ہے۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۱۲۶ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَاۗىِٕبِيْنَ ۝۱۲۷

''اور نہیں قرار دیا ہے اسے اللہ نے مگر خوش خبری تمہارے لئے [6] اور اس لئے کہ تمہارے دلوں کو اس سے سکون و اطمینان ہو جائے اور نہیں ہے امداد مگر اللہ کی طرف سے جو بڑا زبردست ہے، سوجھ بوجھ والا، تاکہ کافروں کے ایک بڑے حصہ کا قلع قمع کر دے یا انہیں شکست دیدے جس سے وہ ناکام ہو کر واپس جائیں۔''

مطلب یہ ہے کہ اللہ کو فتح و ظفر عطا کرنے کے لئے فرشتوں کے بھیجنے کی بھی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ یہ پہلے پہل کی لڑائی تھی اور مسلمانوں میں بہت سے کمزور دل اور عقیدہ کے

---

[1] ۔من ساعتهم هذه (صافی) ای من وقتهم هذا القریب (البلاغی)

[2] ۔معلمین من السویم بمعنی اظهار سماء الشئی (صافی)

[3] ۔الن یکفیکم فی الثبات والاطمئنان بالنصر (البلاغی)

[4] ۔فمعناه یمدد کم ربکم بخمسة الاف (مجمع البیان)

[5] ۔فمعناه بخمسة الاف اخر (مجمع)

[6] ۔بشارة لکم (صافی) لتستبشروا (مجمع البیان)

بھی لوگ تھے، اس لئے اللہ نے چاہا کہ نفسیاتی طور پر ان کے دل کو اس مشاہدے سے مضبوط بنادے کہ جب ضرورت ہوگی تو خدا فرشتے بھی ہماری مدد کے لئے بھیج دے گا[1] اور یوں اصل فتح دینے والا اللہ ہے، خواہ وہ فرشتوں کے ذریعہ سے فتح دے یا ایسے کسی انسان کے ذریعہ سے جو اس کا پسندیدہ ہے چنانچہ احد میں پھر اسلامی جمعیت کے منتشر ہونے اور شکست کھانے کے بعد جو فتح عطا ہوئی وہ صرف ایک فرد بشر یعنی حضرت علی بن ابی طالبؑ کی تلوار سے جس کے سر خالق نے اس فتح کا سہرا باندھ دیا اور پھر خیبر میں قلعہ کی فتح کو انہی کے پائے نام رکھا جس کا حضرت پیغمبر خداؐ نے اپنی حدیث میں پہلے سے اعلان فرمادیا تھا ان الفاظ میں کہ یفتح اللہ علی یدیہ' اسی کے ہاتھ پر اللہ اس قلعہ کو فتح کرے گا۔''

فرشتوں کے بھیجنے کی مصلحت

آخر میں امداد الٰہی کے نتیجہ میں دو صورتیں جو بتائی ہیں، ایک یہ کہ دشمنوں کا قلع قمع ہوجائے اور ایک یہ کہ وہ شکست کھا کر واپس چلے جائیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نتیجہ مطلق امداد الٰہی سے تعلق رکھتا ہے، نہ یہ کہ خاص جنگ بدر والی امداد سے۔ ورنہ تعیین کے ساتھ پہلی ہی صورت بیان کی جاتی۔ دو شکلیں اسی لئے بیان ہوئی ہیں کہ بعض جگہ قلع قمع ہوا یعنی بہت سے دشمن قتل ہوئے جیسے بدر اور خیبر وغیرہ میں اور بعض جگہ وہ ایک ہی دو مقابلوں کے بعد شکست کھا کر واپس چلے گئے جیسے جنگ خندق میں۔[2]

اب اللہ کی طرف سے اس بشارت عملی اور اس سکون و اطمینان پیدا کرنے کے اہتمام کے بعد بھی اگر مسلمانوں نے کمزوری دکھائی جیسا کہ احد میں ہوا تو وہ اللہ کے غضب کا باعث ہوگی اور وہ ناشکرے ثابت ہوں گے کہ انہوں نے اللہ کے احسان خاص کے بعد خود تعمیل فرائض میں کوتاہی کی۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

''آپ کو کوئی اختیار نہیں ہے، وہ چاہے ان کی توبہ قبول کرے اور چاہے انہیں سزا دے، بہرحال یہ ظالم لوگ ہیں۔''

عموماً ان ضمیروں کا مرجع انہی کفار کو لیا گیا یعنی اللہ چاہے تو ان کی توبہ قبول کرے جب کہ وہ کفر سے توبہ کرلیں اور اسلام لے آئیں اور چاہے تو وہ انہیں سزا دے جب کہ وہ کفر پر قائم رہیں[3] کیونکہ اس صورت میں وہ خود ظالم ہوں گے۔ اللہ ان کے ظلم کی سزا دے گا۔ علامہ طبرسیؒ نے جو متعدد اقوال آیت کے معنی میں تحریر کیے ہیں، ان سب کا مشترکہ نقطہ بھی یہی ہے کہ وہ مشرکین کے بارے میں ہے مگر چونکہ ان میں سے کوئی بھی

---

[1] ۔فیہ تبییہ علی انہ لاحاجۃ الی مدد وانما امدھم ووعدہ لھم بشارۃ لھم ور بطاعلی قلوبھم من حیث ان نظر العامۃ الی الاسباب اکبر (صافی)

[2]

[3] ۔یتوب علیھم ان اسلموا ویعذبھم ان اصروا (صافی)

قول معصومینؑ کی طرف استناد نہیں رکھتا اور اتنے اقوال کا ہونا خود بتا رہا ہے کہ کوئی ایسا بیان آیت کی تشریح کے متعلق ان لوگوں تک نہیں پہنچا ہے جس کے سامنے یہ سب سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں لہٰذا ہمیں حق معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوال سے ہٹ کر خود سیاق آیت، اصول مسلمہ دین اور عقل سلیم کے ماتحت اس پر غور کریں چنانچہ میرا ذہن اس سے کہ وہ مشرکین کے متعلق ہو، بالکل مطمئن نہیں ہے۔

خالق ارشاد فرما رہا ہے کہ ان کا معاملہ آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے، ہمارے اختیار میں ہے۔ اللہ خواہ ان کی توبہ قبول کرے۔ اب چونکہ یہ ثابت ہے کہ مشرک کی بحالت شرک توبہ قبول ہونے کے کوئی معنی نہیں اس لئے ان لوگوں کو قید لگانا پڑی: ان اسلموا ''اگر وہ اسلام لائیں'' اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شق ایک گروہ سے متعلق ہے اور پھر ''خواہ ان کی توبہ قبول نہ کرے۔'' اب چونکہ اسلام قبل کے جرائم کے نظر انداز ہونے کا قطعی ضامن ہے تو انہیں یہاں یہ قید لگانا پڑی کہ ان صرف اگر وہ کفر قائم رہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شق دوسرے گروہ سے متعلق ہے مگر قرآن میں نہ تو دونوں گروہوں کا الگ الگ ذکر ہے اور نہ

ان دونوں قیدوں کا کوئی پتہ ہے اور ظاہر آیت یہ ہے کہ پوری جماعت میں یہ دونوں شقیں ہیں اور یہ دو شقیں ہمیشہ انہی جرائم میں ہوتی ہیں جو بحالت اسلام سرزد ہوں۔

پھر آخر میں یہ فقرہ فانهم ظالمون آخر یہ ضمیر کن کی طرف راجع ہے؟ اگر کہا جائے کہ دوسرے گروہ کی طرف تو اس دوسرے گروہ کا الگ تو کوئی ذکر ہے نہیں اور اگر پوری جماعت کی طرف ہو جس کا قبل میں ذکر ہے تو ان میں کا ایک گروہ جو اسلام لے آیا، ظالم کیوں کر ہے؟

لہٰذا میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کے پہلے مسلمانوں کو مخاطب کر کے جو تنبیہہ تھی کہ بدر میں اللہ نے اس طرح فرشتوں سے تمہاری مدد کی تو کیا یہ بھی تمہیں ہرگز ہرگز کافی نہیں ہوگی۔ اس ''لن یکفیکم'' کے زور کو جسے ہم ''ہرگز ہرگز'' سے ظاہر کر رہے ہیں، ایسے امکانی تصور پر محمول نہیں کیا جا سکتا جس کا وقوع ہونے والا نہ ہو۔ اس کے اندیشہ کو لفظ لن کے ساتھ جو تاکید کے لئے ہے، ظاہر کرنے کی ضرورت نہ تھی معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ماضی میں بطور سوال اسے پوچھا گیا تھا لیکن بعد کے حال میں وہ خطرہ واقعہ کی شکل میں سامنے آ گیا یعنی اللہ کی وہ امداد مسلمانوں میں سکون و اطمینان پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہوئی اور احد کے میدان میں یہ حقیقت سامنے آ گئی تو اب یہ آیت جو بتصریح مفسرین احد میں نازل ہوئی ہے، انہی مسلمانوں کے اس جرم سے متعلق کیوں نہ سمجھی جائے ور اس کا مضمون اس تصور سے بہت مطابقت رکھتا ہے، اس لئے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنہوں نے مشرکین تک کے لئے بددعا نہیں کی بلکہ یہ کہا کہ: رب اهد قومی فانهم لا یعلمون'' پروردگار! میری قوم کو ہدایت فرما کہ یہ جانتے نہیں ہیں تو بھلا مسلمانوں کے لئے وہ کیوں کر نہ چاہتے کہ ان کی سزائیں معاف ہو جائیں، خالق نے آپ کی اس رافت و رحمت کو نمایاں کرنے کے ساتھ ان جہاد میں کمزوری دکھانے والوں کے کردار پر سرزنش کا یہ انداز اختیار فرمایا کہ گویا خود حضرت پیغمبر خداؐ کو ایک طرح تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ آپ سے ان کے معاملہ کا کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کی معافی یا سزا آپ کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ [1]

اس صورت میں آخر میں قرآن کا کلمہ تحقیق کے ساتھ انهم ظالمون کہنا، عدالت مطلق صحابہ کے عقیدہ کو بے بنیاد ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، اس لئے کہ یہ جن کا ذکر ہے دور پیغمبر خداؐ کے مسلمان ہیں جو صحابہ کے زمرہ میں داخل ہیں۔ اگر صحابی ہونا عدالت کی ضمانت ہوتا تو قرآن انہیں ''ظالمون'' کیوں کہتا؟''

---

[1] ۔ فانك بشر مخلوق و انما لارض فی ذالك الله (البلاغی)

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾

''اور اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے، مہربان۔''

''جسے چاہتا ہے بخشتا اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔'' یہ اس کے اقتدار کا اظہار ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا چاہنا بغیر کسی معیار اور اصول کے ہوتا ہے۔

درحقیقت یہ انسان کے مراتب استحقاق باعتبار نوعیت اعمال ہی میں ہیں کہ کوئی تفضلا بخش دیا جائے، کسی کے لئے شفاعت وغیرہ کی ضرورت ہو اور کوئی بدنصیب کسی صورت سے بخشے جانے کا مستحق نہ ہو، بہرحال یہ بخشنا اور نہ بخشنا ہے فعل خالق ہی کا جس میں کسی دوسرے کا دخل نہیں ہے۔

اس سے بندہ میں خوف اور رجاء کی مخلوط کیفیت پیدا ہوتی ہے جو جو ہر ایمان ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اے ایمان لانے والو! یہ دونا، چوگنا سود نہ کھایا کرو اور اللہ کے غضب سے بچو، شاید کہ ہر طرح کی بہتری حاصل کرو اور بچو اس آگ سے جو کافروں کے لئے تیار اور اللہ اور رسولؐ کی فرماں برداری کرو، شاید کہ تم رحمت کے مستحق ہو جاؤ۔''

سود کھانے کی ممانعت

''دونا چوگنا'' قید کی حیثیت سے نہیں ہے جس کا مطلب یہ ہو کہ اگر دونا چوگنا نہ ہو تو سود جائز ہوگا بلکہ واقعہ یہی تھا کہ اس وقت دونا چوگنا سود کھایا جا رہا تھا[1] اس لئے اس فعل کی رکاکت کو ظاہر کرنے کے لئے ممانعت میں اسے نمایاں کیا گیا۔

اس قسم کے قید کی مثالیں جو حقیقت میں کوئی قید نہیں ہیں، قرآن مجید میں بہت ہیں جیسے ''لاتشتروا بایات اللہ ثمنا قلیلا'' آیت الٰہی کو تھوڑی سی قیمت پر فروخت نہ کرو۔'' اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ بہت سی قیمت ملے تو فروخت کرو۔ والذین یقتلون النبین بغیر حق'' وہ جو پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں۔'' اس کا مقصد یہ نہیں ہے حق کے ساتھ قتل کریں تو ٹھیک ہے کیوں کہ انبیاء کا قتل حق کے

---

[1] ۔قیل کان الرجل منهم یربی الی اجل ثم یزید فیه الی اخر جنی یستغرق بقلیله حال المدیون (صافی) ساتھ ہونا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ تو بہرحال ناحق ہوگا۔ یہی صورت یہاں ہے۔

ساتھ ہونا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ تو بہر حال ناحق ہی ہوگا۔ یہی صورت یہاں ہے۔

پھر یہ کہ اضعافا مضاعفہ سے خود سود کے عدم جواز کی اصل حکمت کا بھی اظہار ہے کہ اس طرح ایک شخص نے دوسرے کو جتنا قرضہ دیا ہے اس سے دونا چوگنا وصول کر لیتا ہے [1] جو کسی طرح انصاف کے مطابق نہیں ہے اور اس سے معاشی عدم توازن پیدا ہوتا ہے، اس لئے یہ قانون حرمت ربوا کا قرار دیا گیا ہے لیکن جب کہ یہ قانون نافذ ہو گیا تو اب دونے چوگنے کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اگر کوئی اس سے کم ہی سود لے تب بھی وہ اس قانون کی مخالفت کی بنا پر فعل حرام ہوگا۔

جن مصالح یا مفاسد عامہ کی بنا پر کلی قوانین نافذ ہوتے ہیں، ان میں یہ اصول عام ہے کہ اگر کسی خاص محل میں وہ مصلحت یا مفسد مرتب نہ بھی ہو، تب بھی قانون کے عموم کی بنا پر وہ حکم وجوب یا حرمت کا قائم رہے گا۔

''اس آگ سے بچو'' یعنی ان افعال سے بچو جو اس آگ میں لے جانے والے ہیں۔ [2]

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۱۳۳﴾

''اور تیزی کرو اپنے پروردگار کی طرف سے بخشش اور اس بہشت کی طرف جس کی چوڑان تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے وہ تیار ہے پرہیزگاروں کے لئے۔''

پرہیزگاروں کے اوصاف حمیدہ کا ایک سلسلہ

بخشش اللہ کا کام ہے، بندہ کا اس کی طرف تیزی کرنا ان اعمال کو جلد سے جلد انجام دینا ہے، جو انہیں مغفرت الٰہی کا مستحق بنائیں۔ [3]

جنت کی وسعت کا تذکرہ انسان کو اس امر کی اطمینان دہانی کے لئے ہے کہ وہاں اس کے لئے کسی چیز کی کمی نہیں ہو سکتی۔ [4]

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۚ﴿۱۳۴﴾

''جو خیرات کرتے ہیں خوش حالی اور پریشانی (دونوں حالتوں) میں اور غصہ کو ضبط کرتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ بھلائی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

---

[1] ۔ھذا بیان لنحو من جھات المفسدۃ فیہ و ذالك انہ یحسب طبعہ وجورہ یتھلك اموال المدیون (البلاغی)

[2] ۔ای اتقوا الافعال الموجبۃ لدخول النار (مجمع البیان)

[3] ۔الی اسباب المغفرۃ فی المجمع عن الامیر المومنین الی ادآء الفرائض (صافی)

[4] ۔ذکرت مستعۃ الجنۃ یطمئن الانسان بان لہ فیھا ماتشھیہ نفسہ من المحل الواسع (البلاغی)

یہ پرہیزگاروں کے اوصاف حمیدہ کا ایک سلسلہ ہے، جو فرض شناس افراد ہیں وہ غصہ سے کبھی کام لیتے ہیں مگر صرف غصہ کی زد میں نہیں بلکہ محل کو دیکھ کر یہاں مرضی الٰہی اسی اقدام سے وابستہ ہے، اس لئے وہ اقدام جذباتی طور پر غصہ کا نتیجہ نہیں ہوتا اور جب تک کسی بلند مقصد کی خاطر اور منشائے قدرت کی تکمیل کے لئے سزا دینا ضروری نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ مجرم سے عفو و درگزر ہی سے کام لیتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اس کے ساتھ بھلائی کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

یوں تو آخر کا جملہ کہ ''اللہ بھلائی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے'' اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ سابق الذکر کردار ہی ''بھلائی'' ہے اور ممکن ہے کہ اس غصہ کے ضبط کرنے اور معاف کرنے کے علاوہ مزید بھلائی کی فضیلت کا اظہار ہو رہا ہو۔[1]

اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں کنیز کے غلطی کرنے پر اس فقرہ کے پڑھنے سے کہ: ''والکاظمین الغیظ'' حضرتؑ نے فرمایا: کظمت غیظی ''میں نے اپنے غصہ کو ضبط کیا'' حضرتؑ نے فرمایا: ''عفوت عنك'' ''میں نے تجھے معاف کر دیا'' اور اس جز کے پڑھنے پر کہ ''واللہ یحب المحسنین'' حضرتؑ نے فرمایا ''میں نے تجھے راہ خدا میں آزاد کیا۔''

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۣ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۵

''اور وہ کہ جب وہ کوئی بڑا برا کام کر ڈالتے ہیں یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں پر استغفار کرتے ہیں اور سوا اللہ کے ہے کون جو گناہوں کو معاف کرے اور وہ اپنے کیے ہوئے پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔''

آیات کے سیاق سے پہلا تصور یہ ہوتا ہے کہ یہ بھی متقین کا وصف ہے، حالانکہ جو متقین ہوں گے وہ ایسے بڑے برے کام کا ارتکاب ہی کیوں کریں گے۔[2] اس لئے ممکن ہے کہ اس سیاق کو تسلیم کرتے ہوئے بھی متقین کا وصف بس پہلا ہی مانا جائے اور گزشتہ آیت کے آخر میں جو واللہ یحب المحسنین ہے اس میں ''المحسنین'' کے لفظ پر اس سلسلہ اوصاف کا عطف مانا جائے یعنی اللہ حسن عمل پر قائم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور (نہیں تو پھر) ایسے لوگوں جو پہلے اگر برے اعمال کر چکے ہیں تو بھی اب ان پر تائب ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کسی اور موقع کی نازل شدہ آیت ہو جسے ترتیب دیتے وقت یہاں چسپاں کر دیا گیا ہو۔

فاحشہ یعنی ''بڑے برے کام[3] کے بعد جو کہا گیا ''یا اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں'' اس سے ہمارے خیال میں تو معمولی درجہ کے گناہ مراد

---

[1] ۔ای من فعل ذالك فهو محسن... و یحتمل ان یکون الاحسان شرطا مضموما الی هذا الشرائط (مجمع البیان)

[2] ۔فیه نوع اشکال واللہ العالم (البلاغی)

[3] ۔فی النهایة: الفاحشة کل ما اشتد قبحه من الذنوب والمعاصی (البلاغی) سیئة بالغة فی القبح کانونا (صافی)

ہیں جو فاحشہ کے درجہ پر نہ ہوں۔ علامہ طبرسیؒ نے جو اقوال نقل کیے ہیں، وہ اس کے مطابق ہیں مگر بعض لوگوں نے ایسا سمجھا ہے کہ وہ فاحشہ سے بھی بدتر قسم کے گناہ ہیں۔ [1]

اور اس ذیل میں ایک طویل روایت شان نزول کی حیثیت سے درج کی گئی ہے جس میں ایک جوان کا قصہ ہے کہ وہ قبروں سے مردوں کو نکال کر ان کے کفن اتارتا تھا اور اسی سلسلہ میں اس نے ایک خاتون کی لاش کی بے حرمتی کی اور اس سے زنا کا ارتکاب کیا۔ پھر اس کا ضمیر بیدار ہوا اور اس نے توبہ کی۔ کہا گیا ہے کہ اسی واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی مگر یہ شان نزول مسلم حیثیت نہیں رکھتی اور علامہ طبرسیؒ نے شان نزول میں جو دو روایتیں درج کی ہیں، وہ پہلے ہی تصور کے مطابق ہیں۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

''یہ وہ ہیں جن کی جزا ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے اور وہ بہشت جن کے نیچے سے نہریں رواں ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کتنا اچھا ہوتا ہے باعمل افراد کا صلہ۔''

یہ خالق کا تفضّل ہے کہ گناہ کے بعد توبہ وانابت سے وہ فقط اس سزا ہی کو ختم نہیں کرتا جو اس گناہ پر مترتب ہو۔ بلکہ اس توبہ واستغفار کو خود ایک قابل معاوضہ عمل قرار دے کر اس کا اجر وثواب بھی عطا فرماتا ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

''تمہارے پہلے بہت قسم کے نمونے گزر چکے ہیں [2] تو زمین میں سیر کر کے دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟''

عقل وہوش کا تقاضا یہ ہے کہ انسان سابقہ واقعات سے سبق لے اور عبرت حاصل کرے۔

افعال اور ان کے نتائج پر غور کے دو انداز ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ عقلی طور پر خود ان افعال کے حسن وقبیح پر غور کرے اور پھر ان کے نتائج کا اندازہ کرے۔ دوسرے یہ کہ مختلف افعال کے جو نتائج وقوع میں آ چکے ہیں، انہیں دیکھے اور ان سے ان افعال کے حسن وقبح کے متعلق رائے قائم کرے۔ پہلا طریقہ بالغ نظر افراد کے لئے مناسب ہے اور دوسرا طریقہ عوام کے لئے چنانچہ یہاں عامہ ناس کو اس دوسرے طریقہ کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔

---

[1] ۔بان اذنبوا عظم من الزنا (صافی)

[2] ۔وقایع سنها الله تعالیٰ فی الامم المذبة (صافی) سنن من الله فی الامم السابقه... وقیل سنن امثال (مجمع البیان)

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

''یہ تمام لوگوں کے لیے واضح تذکرہ اور پرہیزگاروں کے لئے ہدایت اور نصیحت کا ذریعہ ہے۔''

چونکہ ترتیب معلوم نہیں ہے اس لئے ''یہ'' کا اشارہ معین طور پر بتایا نہیں جاسکتا کہ کاہے کی طرف ہے؟ ہوسکتا ہے کہ جنگ بدر کے جو حالات بیان ہوئے ہیں، ان کی طرف اشارہ ہو [۱] اور ممکن ہے کہ پورے قرآنی کی طرف اشارہ ہو۔ [۲]

یہ ''بیان ہے لوگوں کے لئے'' یعنی حقیقت حال پر اطلاع اس سے ہر ایک کو ہوسکتی ہے، چاہے کوئی اثر لے یا نہ لے مگر ہدایت وموعظہ پرہیزگاروں کے لئے ہے [۳] کیوں کہ اس سے اثر وہی لوگ لیتے ہیں جنہیں درستی اعمال اور نجات آخر کی فکر ہو۔ [۴]

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

''اور کمزوری نہ دکھاؤ اور رنجیدہ نہ ہو اور تم برتری رکھتے ہو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔''

جنگ احد کی عسکری شکست پر تنبیہیں اور تسلیاں

عام طور پر برتری'' کے معنی ''فتح وکامرانی'' کے سمجھے گئے ہیں یعنی اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اطمینان رکھو کہ اگر ظاہری طور پر دشمنوں کے خیال میں تمہارا بالکل قلع قمع ہوجائے اور تم تباہ و برباد بھی ہوجاؤ، تب بھی نتیجہ میں فتح تمہاری ہوگی [۵] شرط یہ ہے کہ ایمان کے تقاضوں پر قائم و برقرار رہو۔

چونکہ جنگ احد میں مسلمانوں کو بڑا جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی دھچکا بھی پہنچا تھا اس لئے اس طرح تسلی دی جارہی ہے۔ [۶]

اور آخری فقرہ میں ایک طرح کا انتباہ بھی ہے کہ جو شکست اور پسپائی تمہیں نصیب ہوئی وہ تمہارے ہی ایمان کی کمزوری سے تھی۔ اس کے بعد اگر ایمان مضبوط رکھو گے تو تمہاری فتح یقینی ہے۔

اور یہ بھی مفہوم ہوسکتا ہے کہ اگر تم ایمان کا جوہر رکھتے ہو تو بہرحال تمہیں بلندی حاصل ہے، چاہے جنگ میں تم بظاہر شکست بھی کھاؤ کیوں کہ تم حق پر ہو اور تمہارا مخالف باطل پر ہے تو اپنا دل کیوں تھوڑا کرتے ہو۔ [۷]

---

[۱] ۔الظاهر ان لايات من قوله تعالے "واذغدوت" الیٰ هنا سابقة علیٰ هذا الاية فی نسق التنزيل (البلاغی)

[۲] ۔هذا اشارة الی القرآن (مجمع البيان)

[۳] ۔بيان للناس عامة وهدی و موعظة للمتقين خاصة (صافی)

[۴] ۔لان المتقين هم المنصورون به (مجمع)

[۵] ۔ای الظافرون المنصورون والغالبون عليهم فی العاقبة (مجمع البيان)

[۶] ۔تسيلته لهم عما اصابهم (صافی)

[۷] ۔انكم عالیٰ منهم شانا علی الحق وقتلكم لله وقتلاكم فی الجنة (صافی)

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

''اگر تمہیں کچھ صدمہ پہونچ گیا تو ان لوگوں کو بھی تو ویسی ہی تکلیف پیش آئی ہے اور یہ دنیا کا غلبہ ہے جسے باری باری لوگوں میں ہم ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور اس لئے کہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے کچھ کو مثالی حیثیت والا بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا اور اس لئے کہ اللہ ایمان والوں کو نکھار دے اور کافروں کو رفتہ رفتہ [1] نیست و نابود کر دے۔''

یہ آیت بھی اسی احد کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے کہ تمہیں اگر اس جنگ میں نقصانات برداشت کرنا پڑے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر مشرکین کو بھی تو پہلے جان و مال کا نقصان درپیش ہوا ہے اور اس جنگ میں بھی یہ نہیں کہ ان کا کوئی نقصان ہی نہ ہوا ہو، اس لئے ان نقصانات سے مراد جنگ بدر والے نقصانات بھی ہو سکتے ہیں [2] اور خود اس جنگ میں احد میں جو ان کے نقصانات ہوئے وہ بھی ہو سکتے ہیں۔ علامہ بلاغیؒ نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔ [3]

مگر ہمارے خیال میں اس کے بعد کا فقرہ کہ: تلك الايام نداولها بين الناس پہلے خیال سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو دنیا ہے۔ یہاں ہمیشہ ایک ہی صورت ہی نہیں رہتی۔ اس کو ہمارے اردو محاورہ میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ اس دنیا میں کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔

یہ تو عام اصول فطرت کا حوالہ تھا کہ دنیا میں ہوتا یہی ہے کہ کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ فتح ہمیشہ وہی پائیگا۔

اس کے بعد خصوصی طور پر جو یہاں اس صورت حال میں ابتلاؤ آزمائش کی حکمت تھی اسے بیان کیا جا رہا ہے کہ حالات اگر ساز گار ہی رہیں تو سب ہی مدعیان اسلام یکساں طور پر فتح کا سہرا اپنے سر باندھیں اور پتہ کیوں کر چلے کہ اصل جان نثار اور وفادار کون ہے؟

آزمائش کا نتیجہ اصل جاں نثار کا تعارف

اس نص قرآنی سے ظاہر ہے کہ جو آج ثابت قدم نہی رہے، وہ سچے معنی میں ایمان کے جوہر سے معمور نہیں ہیں۔ آج کی وفاداری وہ کسوٹی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سچے مومن کون ہیں اور ان وفاداری کرنے والوں میں جو کمال منزل ثبات میں ہوں، وہی "شهداء على الناس"، یعنی تمام خلق کے لئے مثالی افراد ہو سکتے ہیں، جن کو اس آیت میں جس کی تفسیر دوسرے پارے کے آغاز میں لکھی جا چکی ہے، ''امت

---

[1] ۔ المحق نقص الشئ قليلا قليلا (صافی)

[2] ۔ هو المروی عن الحسن البصری (البلاغی)

[3] ۔ الاظهر والانسب للمقام واسلوبه وتسلية وتشجيعه ان يراد ما اصاب المشركين يوم احد (البلاغی)

وسط'' کہا گیا ہے اوران کے لئے ارشاد ہوا ہے: ''لتکونوا شھدآء علی الناس: اور حقیقت امر یہ ہے کہ جنگ احد کے اختتام کی منزل تک جو مثالی ہستیاں نظر آتی ہیں، وہ بس خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام اور کوئی تیسرا نہیں ہے۔

پھر تیسری بات یہ ہے کہ جو مومنین ابھی خام کار ہیں، وہ اس زحمت وشدت کے بعد اگر اس وقت قدم کو لغزش ہو بھی گئی تو پھر اس غلطی کو محسوس ہونے سے اگر ندامت پیدا ہوئی تو وہ ذرا نکھر جائیں گے اوران کی خامی دور ہوجائے گی اور جو واقعی دل سے کافر اور صرف نمائشی اسلام لائے ہیں، ان کی قلعی بالکل ہی کھل جائے گی اور طلسم باطل ہوجائے گا۔

پھر یہ بھی کہ ندا ولھا بین الناس میں جو دونوں رخ ہیں کہ دنیاوی غلبہ کبھی مسلمانوں کو ہوتا ہے اور کبھی کافروں کو، اس میں پہلے تو درمیان میں واللہ لایحب الظلمین ''اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا'' کہہ کر یہ بتایا گیا کہ کافروں کو جو اقتدار حاصل ہوتا ہے وہ کوئی اللہ کی مہربانی کا ثوت نہیں ہے بلکہ وہ اتمام حجت کے طور پر ہوتا ہے جس سے وہ اور زیادہ مستحق عذاب بنتے ہیں اور اہل ایمان کے لئے باعث امتحان ہوتا ہے۔[1]

پھر آخر میں شکست کے دونوں پہلوؤں کی حکمت الگ الگ بیان کی ہے۔ مسلمانوں کو جب شکست ہوتی ہے تو وہ اس لئے کہ ''لیمحص اللہ الذین امنوا'' اللہ ایمان والوں کو نکھار دے''[2] اور کافروں کو شکست ہوتی ہے تو وہ اس لئے کہ ان کے زور کو توڑ دے اور رفتہ رفتہ ان کا قلع قمع کردے۔[3]

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

''کیا تم سمجھتے ہو کہ تم بہشت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے معلوم نہیں کیا تم میں واقعی مجاہد کون ہیں اور نہ یہ معلوم کیا کہ ثابت قدم کون ہیں''

اس طرح کی آیت کہ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے؟'' پہلے بھی آچکی ہے۔ اس کے ساتھ کا مضمون مختلف آیتوں میں الگ الگ ہے مگر سب کا مشترک نتیجہ یہ ہے کہ صرف مسلمانوں کی فہرست میں داخل ہوجانا جنت میں لے جانے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ کردار سے ایسا ثبوت فراہم ہونا چاہیے جو استحقاق جنت کا ضامن ہو۔

یہاں جہاد کا ذکر ہے، اس لئے کردار کے اس پہلو کو بیان کیا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ میدان جہاد میں نظر آنے والے سب مسلمان حقیقی مجاہد نہیں ہیں یہ تو وقت آنے پر حقیقت نمایاں ہوگی کہ کون واقعی مجاہد ہیں اور یہی وہ ہوں گے جن کے لئے اللہ کو معلوم ہوگا کہ یہ ہیں حقیقی مجاہد۔

---

[1] ۔اعتراض فیہ تنبیہ علی انہ لاینصر ھم فی الحقیقۃ وانما یدیل لھم احیانا استدراجا لھم و ابتلاء للمؤمنین (صافی) انہ لایمکن الظالمین منھم لمحبۃ لھم (مجمع البیان)

[2] ۔لیطھر ھم ویصفیھم من الذنوب ان کانت الدولۃ علیھم (صافی)

[3] ۔یھلکھم ان کانت علیھم (صافی)

علم اللہ کو بر بنائے واقعہ ہوتا ہے۔اس لئے اگر یہ واقعہ ظہور پذیر ہو ہی نہ تو اللہ کو اس کا علم بھی کیوں ہوگا۔

علم الٰہی میں مجاہدین وہی ہوں گے جن سے عمل جہاد وقوع میں بھی آئے [1] لیکن زمانہ کے اعتبار سے وہ اس وقوع سے موخر نہیں بلکہ ازل سے حاصل ہے۔ [2]

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۖ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾

''اور تم تو ان کا سامنا ہونے سے پہلے [3] مرنے کے آرزومند رہا کرتے تھے۔اب تو تم نے اپنی آنکھوں سے اس کا سماں دیکھ لیا۔''

فرار ہونے والوں پر شدید طنز

یہ میدان جہاد سے فرار کرنے والوں پر بڑا شدید طنز ہے کہ مسلمانوں کا تو قول یہ ہے کہ کافروں سے جنگ کر کے مر گئے تو شہید اور بچ گئے تو غازی اس لئے وہ ہمیشہ شہادت کے آرزومند رہتے ہیں مگر جب شہادت کا موقع سامنے آیا تو وہ فرار کے گوشے تلاش کرنے لگے۔

یہی علی بن ابراہیم قمیؒ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں روایت درج کی ہے کہ مسلمانوں کے سامنے جب جنگ بدر کے شہداء کے مراتب بیان ہوئے تو انہوں نے کہا کہ کاش اب کوئی معرکہ پھر پیش آئے تو ہم اس مرتبہ کو حاصل کریں مگر جب احد کا معرکہ پیش ہوا تو سوا اقل قلیل کے کوئی بھی ثابت قدم نہ رہا۔اسی کے متعلق یہ آیات نازل ہوئی ہے (صافی)

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

''اور محمدؐ نہیں ہیں مگر ایک پیغمبر جن کے پہلے سب ہی پیغمبر گزر چکے ہیں تو کیا یہ مر جائیں یا مار ڈالے جائیں تو تم الٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے اور جو الٹے پاؤں پلٹ جائے تو وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچائے گا اور وہ وقت قریب ہے جب کہ اللہ شکر گزاروں کو صلہ عنایت کرے گا۔''

---

[1] ۔ذکر علم اللہ لانہ لازم للوقوع (البلاغی) ای ولما یجاھدا المجاھدون منکم فیعلم جھادھم لانہ لو کان لعلمہ (مجمع البیان)

[2] ۔الھاء فی تلقونہ ورأیتموہ راجعۃ الی الموت ای من قبل ان تلقوا اسباب الموت (مجمع البیان)

[3] ۔المراد من الموت المتمنی ھی الشھادۃ (البلاغی)

مستقبل کے خطرہ پر توجہ دہانی

''نہیں ہیں مگر ایک پیغمبر'' یعنی خدا نہیں ہیں جسے موت نہیں ہے۔ یہ تو عقلی پہلو ہے اور ''جن کے پہلے سب پیغمبر گزر چکے ہیں۔'' یہ واقعاتی پہلو ہے، رسالت اگر دار دنیا میں بقاء کی ضامن ہوتی تو پہلے کے رسول دنیا سے کیوں اٹھتے؟!

ہم نے ''سب پیغمبر جو ترجمہ کیا ہے، یہ الرسل کے الف لام کی وجہ سے ہے جو استغراق کا فائدہ دیتا ہے اور اس طرح ان الفاظ سے ختم نبوت بھی ثابت ہوتا ہے یعنی سب پیغمبران کے پہلے گزر چکے ہیں، یہ آخری رسول ہیں اس لئے تمام انبیاء میں جو سنت الہیہ رہی ہے وہ مکمل طور پر آنکھوں کے سامنے آچکی ہے۔ بعض لوگوں نے جو یہ ترجمہ کیا ہے کہ ''ان کے پہلے بہت رسول گزر چکے ہیں۔'' اس وقت درست ہوتا جب رسل تنوین کے ساتھ ہوتا۔

قرآن مجید نے الرسل کے ساتھ خلت کی لفظ صرف کی ہے کہ ''گزر چکے ہیں'' ماتت کہا ہے کہ ''مر چکے ہیں۔'' لہٰذا حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر زندہ ہونے یا خضرؑ والیاسؑ کی حیات پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس دار دنیا کی اس عام زندگی کے ایک لحاظ سے جو ان کے دور حضور میں تھی ہمارے رسول کی نسبت سے وہ سب گزرے ہوئے انبیاء میں داخل ہیں۔

اس آیت کا جنگ احد کے واقعہ سے تعلق یہ ہے کہ اس آواز ہی سے قتل محمدؐ ''رسول قتل ہو گئے'' مسلمانوں میں اور زیادہ بھگدڑ پڑ گئی تھی اور بالکل قدم اٹھ گئے تھے کہ جب رسولؐ ہی نہ رہے تو ہم جنگ کر کے کیا کریں؟

صاف ظاہر ہے کہ یہ خطرہ اسی جماعت سے ہے جس کے قدم میدان احد سے اٹھے تھے۔ اب اگر رسولؐ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد یہ خطرہ واقعیت کے لباس میں سامنے آجائیں تو بعد کے مسلمانوں کو راہ صواب کی تلاش میں کن افراد پر نظر کرنا چاہیے؟ انہی پر جو احد کی منزل میں ثابت قدم رہے ہوں۔

رسولؐ کی وفات کے بعد پیدا ہو جانے والے تفرقہ میں اگر ایک طالب حق حق کو معلوم کرنا چاہے تو یہ ایک آیت ہی اس کی مکمل رہ نمائی کے لئے کافی ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور کوئی ذی روح دنیا سے جا ہی نہیں سکتا مگر اللہ کے حکم سے نوشتہ کے طور پر مقررہ میعاد کی قید کے ساتھ اور جو دنیا میں صلہ چاہتا ہے، اسے اسی دنیا میں ہم دے دیتے ہیں اور جو آخرت کا صلہ چاہتا ہے اسے وہاں دیتے ہیں اور وہ دور قریب ہے جب ہم شکر گزاروں کو صلہ دیں گے۔''

موت کا وقت مقرر ہے

میدان جہاد سے فرار کیوں کیا جاتا ہے؟ موت کے ڈر سے اس لئے کہا جارہا ہے کہ موت کا تو دن مقررہ ہے [1] اس کے پہلے کوئی نہیں مرسکتا اور اگر وہ دن آ گیا ہے تو بھاگ کر بھی موت سے بچنا ممکن نہیں ہے۔

دنیا میں جو کام آدمی کرتا ہے، اس کا صلہ بہرحال ملتا ہے لیکن دنیا طلبوں کو دنیا ملتی ہے جیسا کہ احد میں مسلمانوں کی اکثریت مال غنیمت پر ٹوٹ پڑی تو انہیں پھر آخرت کی جزا سے سروکار نہیں رکھنا چاہیے [2] اور آخرت کے طلب گاروں کو اخروی ثواب ملتا ہے۔

اس کے بعد دنیا کے تخت وتاج اور قہر وغلبہ کو درگاہ الٰہی میں مقبولیت اور آخرت کی کامیابی کی ضمانت نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ خطرہ محسوس کرنا چاہیے کہ کہیں یہ کچھ اعمال کی دنیا میں بدلا دینا تو نہیں ہے جس کے بعد آخرت میں کوئی حصہ ہی نہ رہ گیا ہو۔

اس کے پہلے والی آیت میں خاتمہ کا فقرہ یہی تھا کہ: وسیجزی اللہ الشاکرین ''بہت جلد اللہ شکر گزاروں کو صلہ عطا فرمائے گا'' اور اس آیت میں پھر اختتام اسی پر ہے کہ: سنجزی الشاکرین ''بہت جلد ہم شکر گزاروں کو صلہ عطا کریں گے۔''

شان نزول اور حضرت علیؑ کا کردار

یہ بار بار اس کا کہنا ضرور ذہن کو متوجہ کرتا ہے کہ اس کا کسی واقعہ سے تعلق ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے اس بارے میں امام محمد باقرؑ کی ایک حدیث نقل کی ہے جس میں ان دونوں آیتوں کی شان نزول کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ حضرت علی علیہ السلام کے جسم پر میدان احد میں ساٹھ زخم لگے تھے۔ اس وقت تو وہ جوش ایمانی اور پھر رسولؐ کے زخموں کو دیکھ کر ان کے تاثر سے، جیسے ان زخموں سے ذرا بھی متاثر معلوم نہیں ہوتے تھے مگر بعد میں جب مہم ختم ہوگئی تو ان زخموں کے اثر سے آپ کی کیفیت ایسی تھی کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام مسلمان گروہ آپؑ کی عیادت کر رہے تھے اور حضرت علی علیہ السلام اس موقع پر بار بار یہ کہتے تھے کہ یہ زخم تو کچھ نہیں ہیں میں تو شکر خدا اس پر جتنا ادا کروں کم ہے کہ میرے قدم میں تزلزل نہیں ہوا اور میں نے میدان نہیں چھوڑا۔ ان کے اس ادائے شکر کی ادا خالق کے نزدیک اتنی پسندیدہ تھی کہ دو دفعہ شاکرین کے لفظ کے ساتھ آپ کے کردار کا تذکرہ کیا گیا۔ [3]

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

''اور بہت سے نبی ہوئے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے [4] جنگ کی تو جو انہیں اللہ کی راہ میں

---

[1] ۔فیہ تحریص و تشجیع علی القتال (صافی)

[2] ۔تعریض بھن شغلة الغنائم یوم احد (صافی)

[3] ۔فشکر اللہ لہ ذلك فی موضعین (مجمع البیان)

[4] ۔فی الکشاف ان الربی کالربانی وھو المنسوب الی الرب (البلاغی)

مصائب پیش آئے، ان پر وہ سست نہ ہوئے اور نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ عاجزی سے کام لیا اور اللہ صبر و تحمل رکھنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

اس آیت کے متعلق ہم نے اپنے ان بیانات میں بسیط روشنی ڈالی ہے جو امامیہ مشن سے رسالہ کی صورت میں شائع ہوئے ہیں، جس کا نام ہے ''شجاعت کے مثالی کارنامے''

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دور میں جن معرکوں کو تفصیل حدیث یا تاریخ ہی نہیں بلکہ قرآن مجید میں بھی آئی ہے، ان میں ہمیں وہ جماعت نظر نہیں آتی جن کا مثالی کردار قرآن مجید کی اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

انبیاء کے ساتھیوں کا کردار اور ساتھ ہونے کا معیار

لیکن اگر کسی دور تاریخ میں یہ مثالی کردار کسی جماعت میں جیتے جاگتے مرقع کی شکل میں سامنے آ گیا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس جماعت کو پیغمبروں کا حقیقی ساتھی نہ سمجھیں! چاہے جسمانی طور کوئی پیغمبران میں نظر نہ آتا ہو، اس لئے کہ معیت جسمانی کا کوئی اعتبار نہیں جب کہ صفات و کردار میں معیت کا جلوہ نہ ہو اور اگر صفت و کردار اتحاد و عمل کا پتہ دے رہا ہے تو وہ معیت کے جوہر کا حقیقی ثبوت ہے۔

اس پہلو کو اس معہ میں بھی سامنے رکھنے کی ضروت ہے اور محمد رسول الله والذين معه اشداء على الكفار رحماء بينهم میں بھی جس پر اس آیت کے ذیل میں جو ابھی بہت دور ہے انشاء اللہ تبصرہ کیا جائے گا۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

''اور نہیں تھا ان کا کوئی قول سوا اس کے کہ وہ کہا کرتے تھے، اے ہمارے پروردگار! ہماری خاطر بخش دے ہمارے گناہوں کو اور خود ہمارے معاملہ میں ہماری فضول کاری کو اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافر گروہ کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما، تو اللہ نے دنیا میں بھی انہیں صلہ عطا کیا اور آخرت کے ثواب کی بہتری بھی اور اللہ نیک اعمال افراد کو دوست رکھتا ہے۔''

حسنِ کردار کے ساتھ شانِ عبودیت کا اظہار

یعنی باوجود راہ خدا میں اس استقامت کے وہ کبھی اپنے اعمال پر نازاں نہیں رہے بلکہ ہمیشہ اپنے کو خطاوار قرار دیتے ہوئے بارگاہ الٰہی میں عفو کے ملتجی رہے۔[1]

---

[1] ۔وما كان قولهم مع ثباتهم في الدين و كونهم ربانيين الا ان قالوا (صافی)

یہ انداز عبودیت حسن عمل میں چار چاند لگا دینے والا ہوتا ہے جس کی معراج ''صحیفہ سجادیہ'' کی ایسی معصومینؑ کی دعاؤں میں نظر آتی ہے جہاں کامل معصوم ہستی بارگاہ الٰہی میں اس طرح تڑپ کے فریادیں کرتی اور اپنے عفو قصور کے لئے التجائیں کرتی ہے جنہیں پڑھ یا سن کر واقعی مجرموں کی روح میں بھی خوف الٰہی سے ارتعاش پیدا ہو جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

''اے ایمان لانے والو! اگر کافروں کا کہنا مانو گے تو وہ تمہیں پچھلے پیروں پلٹا دیں گے تو تم بڑا خسارا اٹھا کے واپس ہو گے بلکہ تمہارا حامی و سرپرست اللہ ہے اور وہ تمام مددگاروں میں سب سے بہتر ہے۔''

آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ اس کا کسی خاص شان نزول سے تعلق ہے۔ یوں تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں کا کہنا ہر بات میں نہیں ماننا چاہیے، ورنہ وہ تو یہی چاہیں گے کہ یہ انہی کی طرح کفر کا راستہ اختیار کر لیں مگر آخر اس کہنے کی ضرورت کیا پیش آئی؟ روایتیں اس بارے میں مختلف ہیں اور وہ بھی مستند طریقہ پر وارد نہیں ہوئی ہیں۔ اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا واقعہ کیا ہے؟ مگر چونکہ اس کے پہلے جنگ احد ہی کا ذکر چلا آ رہا ہے، اس لئے یہ روایت قابل قبول معلوم ہوتی ہے جو معصوم ذات کی طرف نسبت کے ساتھ وارد ہوئی ہے [1] کہ احد کی شکست کے بعد منافقین دوسرے مسلمانوں سے کہنے لگے کہ بس اب اس دین سے کنارہ کشی کرو اور مشرکین کا کیش اختیار کر لو۔ نجات کی یہی صورت ہے۔

نفسیاتی طریقہ پر بزدل اور پھر کمزور عقیدہ والے لوگ ایسی ہنگامی مصیبتوں میں ایسے ہی رخوں پر سوچا کرتے ہیں، اس لئے یہ روایت درایت کے بھی مطابق ہے۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

''عنقریب ہم رعب ڈال دیں گے ان کے دلوں میں کہ جنہوں نے کفر اختیار کیا، اس لئے کہ انہوں نے اللہ کا شریک کیا ہے ایسی چیزوں کو جس کے لئے کوئی دلیل [2] اس نے نہیں اتاری ہے اور ان کا ٹھکانا دوزخ میں ہے اور ظالموں کا کیا برا ٹھکانا ہے۔''

چونکہ اسلام کے مقابلہ میں اس وقت زیادہ منکرین خدا نہ تھے بلکہ مشرکین تھے، مشرک کا خود مطلب یہ ہے کہ ایک خدائے بزرگ کی

---

[1] ۔عن علیؑ (مجمع البیان)

[2] ۔السلطان ھنا مضاۃ الجنۃ والبرھان (مجمع البیان)

ہستی تو مسلم ہے جس کا نام ''خدا'' ہے مگر دوسری شخصیتوں کو معبود مانا جارہا ہے، خواہ اس کا بیٹا قرار دے کر یا اس کا اوتار سمجھ کر [1] اس لئے قرآن مجید اس طرح سے ان کے مقابلہ میں استدلال پیش کررہا ہے اگر یہ اس کے کسی رخ سے بھی شریک ہوتے تو اللہ کی طرف سے ان کے اس منصب کا کوئی ثبوت اتارا جاتا جیسے ہم جنہیں انبیاء مرسلین کی حیثیت سے مانتے ہیں تو اللہ ان کی نبوت کے

ثبوت کے لئے معجزات ظاہر کرتا ہے لیکن جب ایسا نہیں ہے تو یہ اس سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ تمہارا عقیدہ ان کی نسبت غلط ہے اور چونکہ ان مشرکین کو خود بھی اپنے دعاوی کا کوئی ثبوت نظر نہیں آیا، اس لئے ان کے ضمیر میں کمزوری ہے اور یہی ضمیر کی کمزوری ہے جو انہیں اپنی فتح وظفر پر اعتماد نہیں پیدا کرسکتی اور وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مرعوب ہیں، یہ مرعوبیت صرف اس لئے ہے کہ وہ حقانیت کے جوہر سے محروم ہیں۔

جنگ احد میں مسلمان تو اپنے کردار سے شکست کھا چکے تھے، اب جو مشرکین پھر پسپا ہوئے تو یہ اللہ ہی کی طرف سے ان کے دلوں میں ڈالا ہوا رعب تھا، جس نے انہیں واپس جانے پر مجبور کیا۔ [2]

یہ اور بات ہے کہ اس رعب کا ظاہری سبب خالق نے اپنے ایک بندہ کو بنادیا جس کی تلوار آخر تک مشرکین کے قلع قمع میں مصروف رہی اور وہ وہی تلوار ہے جس کا ملک کو کلمہ پڑھنا پڑا (لا سیف الا ذو الفقار)

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۵۲

''اور بلاشبہ اللہ نے اپنا وعدہ سچ تو کر دکھایا اس وقت جب تم اس کے حکم سے ان کا قلع قمع کررہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے بے عملی سے کام لیا اور آپس میں طرز عمل کے بارے میں جھگڑنے لگے اور تم نے عدول حکمی کی، اس کے بعد کہ اس نے جو تم چاہتے تھے، وہ آنکھوں سے دکھا دیا۔ تم میں کوئی دنیا کا طالب تھا اور تم میں کوئی وہ تھا جو آخرت کا طلب گار ہے تو پھر اس نے تمہیں ان کے مقابلہ میں شکست دے دی [3] تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور اب تمہیں معاف کردیا ہے اور اللہ ایمان والوں پر بڑے فضل وکرم والا ہے۔''

---

[1] ۔ بحسب ما صورة لهم ضلالهم من الدلالة من الله او تنزلات الالهية (البلاغی)

[2] ۔ هو ما قذف فی قلوبهم من الخوف یوم احد حتی ترکوا القتال ورجعوا (صافی)

[3] ۔ کفکم عنهم حین غلبوکم (صافی)

فتح، اس کے بعد شکست اور اس کے اسباب

یہ جنگ احد کا تذکرہ ہے۔ اس میں شروع میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور دشمنوں نے فرار کیا مگر مسلمان مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور وہ لوگ جو درہ کوہ پر معین ہوئے تھے اس فرمان کے ساتھ کہ چاہے فتح ہو اور چاہے شکست، وہ اس جگہ سے نہ ہٹیں، انہیں بھی مال غنیمت کا شوق پیدا ہو گیا اور باوجود یہ کہ ان کے سردار بن جبیر نے بہت سمجھایا، انہوں نے کہنا نہ مانا اور وہاں سے ہٹ گئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بنی ہوئی لڑائی بگڑ گئی، اس درہ کوہ سے خالد بن ولید نے حملہ کر دیا اور ادھر مسلمان جھکے ہوئے غنیمت کا مال اٹھا رہے تھے اور ادھر سے ان کے سروں پر تلواریں پڑنے لگیں جس کی وہ تاب نہ لا سکے اور انہوں نے میدان جنگ سے فرار اختیار کیا، بس اسی واقعہ کو موثر ترین الفاظ میں اس موقع پر قرآن مجید نے پیش کیا ہے اور پھر یاد کر لینے کی یہ چیز ہے کہ اگر خالق کو صرف ''صحابہ'' رسولؐ کے نام کی لاج رکھنے کے لئے یہ مدنظر ہوتا کہ ان کے افعال پر کبھی کوئی نقد و تبصرہ نہ ہو تو وہ ابد تک باقی رکھے جانے والے قرآن میں ان کے ان افعال کا ذکر اور ان پر تبصرہ درج فرمانا ضروری نہ سمجھتا۔

شروع کے یہ الفاظ کہ ''اللہ نے اپنا وعدہ تو اس وقت پورا کر دیا جب تم ان کا قلع قمع [1] کر رہے تھے۔'' اس شروع والی فتح کا پتہ دے رہے ہیں جو مال غنیمت پر ٹوٹنے اور درہ کوہ سے ہٹنے کے پہلے ہوئی تھی [2] اور یہ فتح چونکہ مادی اسباب سے پیدا شدہ توقعات کے خلاف تھی، اس لئے کہ کفار کی تعداد اس جنگ میں بھی مسلمانوں کی چوگنی تو تھی ہی، اس لئے اسے حکم الٰہی سے وابستہ کیا ہے کہ ''تم اس کے حکم سے، ان کا قلع قمع کر رہے تھے۔'' یہ فتح تو خدا کے فضل و کرم کا نتیجہ تھی اور اس کے بعد جو شکست ہوئی وہ تمہارے کرتوت کا نتیجہ ہے۔

صحابہ کے ایک طبقہ کی نبض قرآن دنیا طلبی

اب یہی صحابہ کرام کی ''مقدس'' جماعت ہے جس میں قرآن مجید یہ تفریق کر رہا ہے کہ تم میں بعض دنیا طلب تھے، ظاہر ہے کہ یہ وہی ہو سکتے ہیں جو مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور پھر تلواروں کے سر پر آنے کے بعد میدان خالی کر کے چھوڑ گئے اور بعض وہیں جو آخرت کے طلب گار ہیں۔

اب قرآن کے لفظوں نے تو مجملاً دو حصے کر دیے ہیں مگر اسے میدان احد بتائے گا کہ اکثریت کس گروہ کی تھی اور اقلیت میں کون گروہ تھا اور اگر پھر انجام اسی آغاز کے تناسب سے کوئی ایسا کردار پیش کر دے جہاں کسی عارف کو کہنا پڑے ''چوں صحابہ حب دنیا داشتند'' یا ''اہل دنیا کار دنیا سے ساختند'' اور اس حب دنیا کا عملی نتیجہ کیا سامنے آیا؟ یہ کہ ''مصطفیؐ را بے کفن بگزاشتند'' تو پھر حق کو اسی اقلیت سے وابستہ ماننا پڑے گا جو دنیا کو ٹھکرا رہی ہو اور رسولؐ کے تجہیز و تکفین کو حصول اقتدار کی کوشش پر مقدم کرے اور زیادہ غور سے نظر ڈالئے تو یہ وفات کے بعد رسولؐ کی لاش کو نہ چھوڑنے والا وہی ہے جس نے رسولؐ کی زندگی کے نازک لمحہ میں احد کے میدان میں رسولؐ کو نہیں چھوڑا تھا۔

---

[1] ۔ فی التبیان الحس هو القتل علیٰ وجه الاستئصال (البلاغی)

[2] ۔ کان کذلك حتی خالف الرماة (صافی)

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

''جب تم بے تحاشا چلے جارہے تھے [۱] اور کسی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے [۲] اور پیغمبر تمہارے پیچھے سے تمہیں آواز دے رہے تھے [۳] تو اللہ نے تمہیں ثواب کے بدلے میں [۴] رنج پر رنج پہنچایا [۵] تاکہ تمہیں صدمہ نہ ہو اس کا جو تمہارے ہاتھ سے نکل گیا اور نہ اس کا جو در پیش ہوا اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔''

جنگ احد سے فرار کا عبرت ناک منظر

آخری فقرہ کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو کوئی خسارہ بلاوجہ سامنے آئے اور کوئی مصیبت از خود درپیش ہو جائے تو اسے صدمہ ہونا چاہیے کہ ہم آخر کیوں اس مصیبت سے دوچار ہوئے مگر جب خود اپنے ہاتھوں ایسا ہوا ہے اور اپنے کیے کی سزا ہے تو اب اسے بس ندامت اور پشیمانی اپنے کردار پر ہونا چاہیے، اس منفعت کے ہاتھ سے جانے اور مصیبت کے درپیش ہونے کا کوئی صدمہ نہ ہونا چاہیے۔

دوسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ اب اس ابتلاء سے تم میں صبر کی عادت پیدا ہو اور آئندہ جو مصیبت آئے اسے برداشت کر سکو۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ معنی اس کے قبل کے مضمون سے کہ یہ بطور سزا تھا اور بعد کے فقرہ کے مضمون سے کہ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے، مناسبت نہیں رکھتے۔ اس لئے مجھے پہلی ہی تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ

---

[۱] ۔الاصعاد الذھاب فی الارض (صافی) الفرق بین الامعاد و الصعود ان الاصعاد فی مستمر من الارض و الصعود فی الاتفاع (مجمع البیان)

[۲] ۔لا یقف احد لاحد ولا ینظرہ (صافی)

[۳] ۔ای ینادیکم من ورائکم (مجمع)

[۴] ۔جعل مکان ما ترجونہ من الثواب (مجمع)

[۵] ۔غمّا متصلا بغم (مجمع البیان)

لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

''پھر اس نے رنج وغم کے بعد تم پر سکون واطمینان اتارا نیند کی صورت سے جو تم میں سے ایک گروہ پر طاری ہو رہی تھی اور ایک گروہ ایسا تھا جسے اپنی جانوں کی فکر تھی۔ وہ اللہ کے ساتھ ناحق زمانہ جاہلیت کی سی بدگمانی کر رہے تھے، کہہ رہے تھے کہ کیا ہمیں بھی کچھ اختیار حاصل ہے؟ کہہ دیجیے کہ اختیار پورا اللہ کو ہے۔ یہ اپنے دل میں ایسی باتیں چھپائے ہیں جنہیں آپ سے ظاہر نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہمارے ہاتھ میں کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے کہہ دیجیے کہ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں بھی ہوتے، تب بھی جن کے لئے قتل ہونا لکھا جا چکا تھا، وہ اپنے مقتل کی طرف نکل کر جاتے اور اس لئے کہ اللہ آزمائے اسے جو تمہارے سینوں کے اندر ہے اور نکھار کر سامنے لائے اسے جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ سینوں کے اندر کی باتوں کا جاننے والا ہے۔''

بعد کی کیفیت اور چہ میگوئیاں

یہ فراری جماعت کے اندر دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے، کچھ ایسے تھے جو ایک دفعہ میدان چھوڑنے کے بعد دوبارہ واپس آ گئے اور اب وہ اپنے فرار پر احساس ندامت کی وجہ سے ایسے غوطہ میں ہو گئے تھے کہ اب انہیں میدان جنگ کے خطرے محسوس نہیں ہو رہے تھے جیسے کہ وہ نیند کے عالم میں ہوں۔[1]

بعض مفسرین لکھتے ہیں کو جو مومنین ثابت قدم رہے تھے ان پر واقعی اللہ کی جانب سے عین عالم جنگ میں نیند کا غلبہ ہو گیا تھا[2] مگر ہمارے نزدیک یہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ لڑائی کے بگڑنے کے عالم میں ثابت قدم تھے ہی کے آدمی اور جو دو ایک تھے، وہ ہمہ تن جنگ میں مصروف تھے اور زخموں سے چوران کے لئے یہ موقع کب تھا کہ ان پر نیند طاری ہو۔

تیسرا مفہوم جسے بعض مفسرین نے اختیار کیا ہے، یہ ہے کہ یہ عین موقع جنگ کا ذکر ہے ہی نہیں، بلکہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد جب شہر کی طرف واپسی ہوئی تو مشرکین نے چونکہ یہ دھمکی دی تھی کہ ہم ابھی پھر واپس آئیں گے تو مسلمان گویا ان کے دوبارہ حملہ کا دھڑکا لئے ہوئے تھے، اس وقت جو سچے مومن تھے، ان کے دل میں کوئی دغدغہ نہ تھا، اس لئے اللہ کی طرف سے انہیں ایسا اطمینان حاصل تھا کہ وہ چین سے سو رہے

---

[1] ۔عراهم فی جملة غمومهم غم المعصية بالفرار (البلاغی)

[2] ۔هم المومنون حقار وی انهم غشيهم النعاس فی المصاف حتی کان السيف يسقط عن يدا احدهما خذه ثم يسقط فياخذ (صافی)

تھے اور جو کمزور دل اور ایمان والے تھے، انہیں اپنی جان کی فکر تھی، اس لئے انہیں نیند کہاں آسکتی تھی۔ وہ اس طرح چرچے کر رہے تھے۔ [1]

ان کے لئے قرآن یہ انکشاف کر رہا ہے کہ ان کے عقائد بھی متزلزل ہو گئے تھے اور خدا رسولؐ کے بارے میں میں کفریہ خیالات ان کے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے۔

پھر ان کی اس وقت کی جو چہ می گوئیاں تھیں، وہ قرآن نے درج کی ہیں کہ وہ کہہ رہے تھے کہ ہر بات میں بس اللہ اور رسولؐ اپنا حکم چلاتے ہیں، ہمیں تو بس اپنی رائے سے کام لینے کا موقع دیا ہی نہیں جاتا۔ اگر ہمیں اپنی رائے کے مطابق عمل کرنے کا موقع ملتا تو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ [2]

معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور رسولؐ کے مقابلہ میں حق خود ارادی کا مطالبہ ایک جماعت کا شروع سے تھا۔ یہی بعد رسولؐ نص خدا و رسولؐ کے ماقبلہ میں اجماع و شوریٰ وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ ۙ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٥٥﴾

"بلاشبہ تم میں سے وہ جنہوں نے دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ کے دن پیٹھ پھرائی، انہیں غلطی میں مبتلا کیا شیطان نے صرف ان کی کچھ بداعمالیوں کے نتیجہ میں اور بے شک اللہ نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔"

شیطان انسانوں کو جو بہکانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت خود انسان کی قوت ارادی کی کمی اور فرائض میں اختیاری کوتاہی کے نتیجہ میں جس کی وجہ سے انسان کی جرأت بڑھتی جاتی ہے اور وہ بڑے سے بڑا گناہ بھی کر گزرتا ہے۔ اگر یہ پہلے ہی دن تحریک گناہ کے جذبہ کا مضبوطی سے مقابلہ کر لے تو اس کے نفس کی مقاومت خواہش سے زیادہ طاقت حاصل کر لیتی ہے اور وہ اب قوی محرک سے بھی متاثر نہیں ہوتا یہ ہے شیطان کی شکست۔

اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ "انہیں غلطی میں مبتلا کیا شیطان نے صرف ان کی کچھ بداعمالیوں کے نتیجہ میں"۔ [3]

اس لئے گنہ گار کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ شیطان کو ذمہ دار قرار دے کر خود اپنے کو بے قصور ثابت کرے۔ یہاں پہلے یہ بداعمالی ہوئی کہ مجاہدین اسلام نے شروع شروع دشمن کو شکست دینے کے ساتھ ہی مال غنیمت پر ہلہ بول دیا اور دشمن کی نقل و حرکت سے بالکل بے پرواہ ہو گئے۔ پھر اس کے نتیجہ میں درہ کوہ پر متعین افراد کی اکثریت نے حکم رسولؐ کی مخالفت کی اور وہاں سے ہٹ گئے، جس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ دشمن کے پس پشت سے حملہ کر دینے کے بعد جہاد سے فرار کے ایسے بڑے جرم میں مبتلا ہو گئے تو اس جرم عظیم میں ابتلاء اپنی ہی بداعمالی کا نتیجہ نہیں تھا تو

---

[1] ۔ذکر سبحنه ان تلك الامة لم تكن عامة بل كانت لاهل الاخلاص و بقي لاهل النفاق الخوف والسهر (مجمع البيان)

[2] ۔لم يزح من المدينة بل اقمنا فيها كما كان رأى ابن ابي وغيره (صافی)

[3] ۔بما كسبوه من الذنوب التي سهلت له استنزالهم بمثل هذا الذنب الكبير (البلاغی)

کیا تھا۔[1]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۵۶

''اے ایمان لانے والو! تم ان کی طرح نہ ہو جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اپنے بھائی بندوں کے لئے[2] جب انہوں نے سفر کیا یا جنگ پر گئے، یہ کہنے لگے کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، تاکہ اللہ ان کے دل میں اس رنج وحسرت کو رکھ دے اور اللہ زندہ رکھتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، اسے دیکھنے والا ہے۔''

''تاکہ اللہ اس رنج وحسرت کو ان کے دلوں میں رکھ دے'' یہاں اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ یہ ''تاکہ'' مقصد کو نہیں بلکہ نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے جیسے زوجہ فرعون نے جو جناب موسیٰؑ کو تربیت کے لئے رکھ لیا تو قرآن نے کہا ہے: لیکون لھم عدوا او حزنا'' تاکہ یہ ان کے لئے دشمن جان اور سبب رنج وملال ثابت ہوں۔'' حالاں کہ ان کا مقصد یہ نہ تھا مگر ہوا ایسا ہی، اس لئے یوں کہا گیا۔ اسی طرح یہاں ہے کہ ان کی اس گفتگو کے بعد اب صورت پیدا ہوئی کہ مومنین کو فتح حاصل ہوئی تو ان کے دل مبتلائے رنج وحسرت کہ ہم بھی کیوں نہ گئے تاکہ اس کامیابی میں شریک ہوتے اور مال غنیمت میں ہمیں بھی حصہ ملتا۔[3]

اس صورت میں فی قلوبھم کی ضمیر ان کے کہنے والوں کی طرف راجع ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ کیوں نہ اس ضمیر کو اخوانہم کی طرف عائد سمجھا جائے یعنی وہ یہ سب اس لئے کہتے ہیں کہ مومنین کی جماعت کے دلوں میں ایک غم وغصہ پیدا ہو جائے کہ واقعی ہم کیوں جہاد کو گئے۔ اس صورت میں یہ لام مقصد ہی کے اظہار کے لئے ہوگا۔

بہرصورت یہ ان کا خیال غلط ہے۔ مرنا ہوتا تو وہ گھر پر بیٹھے ہوئے مرجاتے اور بچنا ہے تو سفر میں یا جہاد میں جا کر بھی بچ جائیں گے۔[4]

وَلَىِٕنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا

---

[1] ۔استزلھم الشیطان جعلھم علی الذلۃ ببعض ما کسبوا من معصیتم النبی ﷺ بترک المرکز و الحرص علی الغنیمۃ وغیرہ ذلک (صافی)

[2] لاخوانھم ای فی شان اخوانھم (البلاغی)

[3] ۔خرجوا ونالوا العز والغنیمۃ فصار حسرۃ فی قلوبھم (مجمع البیان) اللام للعاقبۃ مثلھا فی لیکون لھم عدوا و احزنا (صافی) انجام ان کی ایسی گفتگو کا یہ ہے (عمدۃ البیان)

[4] ۔ھو المحی والمیت لا الاقامۃ والسفر فانہ تعالیٰ قد یحی المسافر و الغازی ویمیت المقیم والقاعد (صافی)

يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِاَلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

''اور اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاتے یا مرتے [1] تو اللہ کی طرف کی بخشش اور عنایت اس سے جو وہ لوگ جمع کرتے ہیں زیادہ بہتر تھی اور اگر تم مرو یا مارے جاؤ تو بلاشبہ اللہ ہی کی طرف محشور ہو گے۔''

شہادت میں خسارہ نہیں

اس دار دنیا کی زندگی میں انسان کی بڑی کامیابی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ کوئی بڑی دولت جمع کر جائے مگر یہ جمع کردہ اندوختہ تو بہرحال فانی ہے۔ان کے لئے آخرت کی نعمتیں جو اللہ کی راہ میں مارے جانے کی صورت میں ہیں، وہ بلاشبہ اس سے کہ جو یہ دنیا میں جمع کرتے ہیں بہتر ہیں۔

اگرچہ حقیقت میں اس اندوختہ دنیا میں بمقابلہ دنیا و آخرت کوئی خیر ہے ہی نہیں لیکن چونکہ دنیا والے اس میں بڑی بہتری کا تصور کرتے ہیں، اس لئے اس کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتوں کو کہا گیا ہے کہ وہ ان سب سے جس میں تم خیر سمجھتے ہو بہتر ہیں۔ [2]

''اور اگر تم مرتے۔'' یہ ''تم'' کے مخاطب چونکہ مومنین ہیں تو چونکہ وہ واقعی مومن ہیں، اگر وہ فرش خواب پر بھی مریں تو اللہ کی رضامندی کی دولت لئے ہوئے دنیا سے جائیں گے اور اگر قتل ہوں تو یہ قتل بھی راہ خدا میں ہوں گے تو پھر اسی اللہ کی طرف محشور ہونا ہے جس کی راہ میں جان دی ہے تو بلاشبہ وہ اس کا بہتر سے بہتر صلہ عطا کرے گا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

''تو یہ اللہ کی طرف کی بہت بڑی مہربانی ہے [3] جس سے آپ ان کے لئے اتنے نرم ہیں اور اگر آپ سخت طبیعت، درشت مزاج ہوتے تو یہ سب آپ کے گرد پیش سے تتر بتر ہو جاتے تو انہیں معاف کر دیا کیجیے اور ان کے لئے دعائے مغفرت بھی کر دیجیے اور معاملات میں ان سے مشورہ بھی لے لیا کیجئے، مگر جب حتمی ارادہ کر لیجیے تو اللہ پر بھروسا کیجیے۔ یقیناً اللہ بھروسا کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

---

[1] ۔اومتم فی سبیلہ (صافی)

[2] ۔ان الناس یوثرون الدنیا علی الاخرۃ حتی انھم یترکون الجھاد فی سبیل اللہ محبۃ للاستکبار من الدنیا زایثار المقام فیھا معلیٰ ھذا اجاز ذلك (مجمع البیان)

[3] ۔مامعنا ھا تفحتم قدر الرحمتہ التی لان بھالھم (البلاغی) مانریدۃ للتو کید (صافی) جاء ت مأمو کدۃ للکلام ودخولھا باحسن النظم (مجمع البیان)

رسولؐ کی رواداری: عام مسلمانوں کے لئے دعائے مغفرت کا حکم

اصول جمہوریت وشوری کی حقانیت کے لئے بڑے زور وشور سے یہ آیت قرآن پیش کی جاتی ہے کہ خدا کا ارشاد ہے: **وشاورھم فی الامر** جیسے کہ یہ کوئی مستقل ومنفرد آیت ہے جو نظام امت کا اصول بتلانے کے لئے نازل ہوئی ہے۔

یہ استدلال پیش کرنے والے اگر اس سیاق کو بھی دیکھ لیتے ہیں جس کے ماتحت یہ فقرہ آیا ہے جواب مذکورہ آیت اور اس کے ترجمہ میں سب ہی کے سامنے موجود ہے تو اسے پیش کرتے ہوئے یقیناً انہیں شرم آنا چاہیے۔

وہ تو ناقص الایمان اور عمل کے میدان سے پیچھے ہٹنے والے مسلمانوں کے لئے تازیانے ہیں جو گزشتہ آیات میں برابر لگائے گئے ہیں اور وہی سلسلہ اس آیت میں بھی جاری ہے۔

ارشاد ہو رہا ہے کہ ''یہ اللہ ہی کی طرف کی بڑی رحمت ہے جس سے آپ ان کے ساتھ اتنے نرم ہیں۔'' مطلب یہ ہے کہ ان کا جرم تو اتنا سخت تھا کہ عام آدمی، کوئی امیر فوج یا سردار قوم ان کے ساتھ نرمی برت ہی نہیں سکتا تھا مگر یہ غیر معمولی آپ کا عفو وکرم ہے اور یہ اللہ ہی کی طرف کی قوت برداشت ہے کہ آپ نے ان کے ساتھ ان کی اس عدول حکمی اور بے وفائی کے باوجود نرمی اختیار کی۔ [1]

اور اسی ذیل میں ہے کہ یہ آپ کی اتنی خوش اخلاقی اور مروت داری ہی ہے جو یہ پھر بھی آپ کے گرد پیش نظر آتے ہیں اور جو رزم کی سختی نہ اٹھا سکے وہ بزم میں آپ کے پہلو میں بیٹھے رہا کرتے ہیں لیکن اگر کہیں آپ ان سے سختی سے پیش آئیں تو پھر بزم میں بھی سناٹا ہی سناٹا نظر آئے، لیکن چارہ کار کیا ہے، اس لئے کہ انہیں ناقص مسلمانوں کی جم غفیر کی پرورش کر کے ان کے اندر سے اس اقلیت کو پیدا کرنا ہے جو ایمان دار اور مخلص ہو لہٰذا یہ غلطیاں کریں، آپ انہیں معاف کیجئے اگر اس غلطی کا تعلق آپ کی ذات سے ہو اور خدا سے ان کے لئے طلب مغفرت بھی کیجیے اگر اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو [2] اور معاملات میں ان سے مشورہ بھی لے لیا کیجیے [3] مگر اپنے اقدامات کا انحصار ان کے مشورہ پر نہ رکھیے بلکہ جس طرح عمل کو صحیح سمجھ لیجئے، چاہے وہ ان کے مشورہ کے خلاف ہو تو کر گزریے، اللہ پر بھروسا کیجیے۔

یہ کیا کوئی جمہوریت کا اصول ہے؟

شوری بطور تالیف قلب واتمام حجت نہ بلحاظ حقانیت

گزشتہ آیات کے سلسلہ کو سامنے رکھ کر تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے گزشتہ فرار کے موقع پر جوان کے پے در پے دو فقرے نقل ہوئے تھے۔ ایک **یقولون ھل لنا من الامر من شئی** وہ کہتے ہیں آخر معاملات میں کچھ ہمارا بھی اختیار ہے؟'' پھر یہ فقرہ **لو کان لنا من الامر شئی ما قتلنا ھٰھنا** ''اگر ہمارے ہاتھ میں کچھ اختیار ہوتا تو ہم اس طرح قتل نہ ہوتے۔'' اس سے پتہ چلتا ہے کہ احد میں اسی کو اکثریت نے اپنے فرار کے حجت بنایا کہ ہم سے رائے تو لی ہی نہیں جاتی۔ اگر ہم سے رائے لی جاتی اور اس پر عمل ہوتا تو اس طرح شکست نہ ہوتی۔ اس کے

---

[1] ۔ بعد ان کے واپس آنے کے تو نے ان کے ساتھ سختی نہ کی، باوجود ایسے گناہ سخت کرنے کے تجھ کو وہ دشمنوں میں اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ (عمدۃ البیان)

[2] ۔ فاعف عنھم فیما یختص بك واستغفر لھم فیما لله (صافی)

[3] ۔ واستمل قلوبھم بالمشاورۃ لانھم یضیدونه سدادا وعلماء (البلاغی)

جواب میں پہلے تو خالق نے اصول کا اعلان فرما دیا جو اس غلط جمہوریت کے تصور کا خاتمہ کرنے والا ہے کہ: ان الامر کلہ للہ ''اختیار جو کچھ ہے وہ اللہ کو ہے۔ ''تم کیا چیز ہو؟''..... پھر ان کی اس غلط اندیشی کو کہ اگر ہماری رائے پر عمل ہوتا تو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا'' دور کیا یہ کہہ کر: ''لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیہم القتل الی مضا جعھم ''اگر تم گھروں کے اندر بھی ہوتے تو جنہیں قتل ہونا تھا، وہ مقتل میں پہنچ جاتے۔''

اس کے بعد ان کی انہی باتوں کے مقابلہ میں کہ: ھل لنا من الامر من شئی اور لو کان لنا من الامر شئی..... یہ کہا جا رہا ہے کہ وشاورھم فی الامر یعنی یہ باتیں تو خیر، ان کی غلط ہیں اور یہ کہ کرداران کا بہرصورت ایک گناہ جس پر ان تاویلوں اور توجیہوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر اے رسولؐ! آپ آئندہ سے ''دروغ گورا تا در خانہ باید رسانید'' کے اصول پر اتمام حجت کے لئے ان سے رائے بھی لے لیا کیجیے اور جہاں تک کہ اس پر عمل کرنے میں کوئی بڑا نقصان نہ ہوتا ہو، اس پر عمل بھی کر لیا کیجیے تا کہ ان کی یہ حجت بھی ختم ہو جائی۔ پھر بھی یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ عمل کا انحصار ان کی رائے پر ہے بلکہ اصل دار و مدار خدا کے حکم پر رہے گا اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ خواہ جماعت ساتھ دے یا نہ دے۔

اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ یَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور اگر وہ تمہاری مدد نہ کرے تو پھر وہ کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرے اور صرف خدا پر بھروسا کرنا چاہیے ایمان لانے والوں کو۔''

یہ بھی ان کی اسی بات کی رد کا تتمہ ہے کہ اگر ہماری رائے پر عمل ہوتا تو شکست نہ ہوتی، ہماری بات پر عمل ہوتا تو ہمیں یوں قتل ہونا نہ پڑتا۔ اس کی رد میں اب یہ کہا جا رہا ہے کہ فتح و ظفر اصل اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ بغیر اس کی مدد کے کون ہے جو فتح و ظفر حاصل کر سکے۔

اس سے بھی ظاہر ہے کہ درمیان میں جو یہ تھا کہ ان کی رائے پر عمل کر لیا کیجیے۔ یہ صرف ان کی خاطر داری اور ان پر اتمام حجت کے لئے تھا۔ نہ یہ کہ ان کی اس بات کو تسلیم کر لیا گیا کہ انہیں معاملات میں مداخلت کا حق ہے اور یہ کہ ان کی رائے پر عمل کسی صحیح نتیجہ تک پہنچانے کا ضامن ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّغُلَّ ؕ وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾

''اور کسی پیغمبر سے یہ نہیں ہو سکتا [1] کہ وہ مال غنیمت میں بد دیانتی کرے [2] اور جو بد دیانتی کرے گا، اسے وہ چیز جس کے بارے میں بد دیانتی کی ہے، روز قیامت لانا ہوگی، پھر ہر ایک کو جو اس نے کیا ہے، اس کا پورا پورا بدلا دیا

---

[1] ۔ای لا یجتمع النبرۃ والخیانۃ (مجمع البیان)

[2] ۔فان النبوۃ تنافی الخیانۃ (صافی) الغول ھو الخیانۃ فی الغنیمۃ (جلالین)

جائے گا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔"

مسلمانوں کی رسولؐ سے بدگمانی اور اس پر تنبیہ

شان نزول کے بارے میں جو روایتیں سنی اور شیعہ طرق سے آئی ہیں کہ روز بدر کے مال غنیمت میں سے ایک سرخ رنگ کی چادر غائب ہوگئی تو بعض آدمیوں نے کہا کہ وہ خود رسول اللہؐ کے اپنے لئے الگ کر لی ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یا یہ کہ کسی نے اصحاب میں سے خواہش کی کہ مجھے مال غنیمت میں دوسروں سے زیادہ حصہ ملے، اس پر یہ آیت اتری۔

ان روایات کے روای ضعیف اور مجہول سہی مگر یہ خود الفاظ آیت سے ظاہر ہے کہ یہ کسی واقعہ سے متعلق ہے اور وہ واقعہ کچھ اسی قسم کا ہوسکتا ہے۔

الفاظ آیت شان نزول کے پہلے واقعہ سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ پیغمبر خداؐ کے متعلق اس قسم کا خیال ظاہر کرنے والے کفار و مشرکین نہیں ہوسکتے۔ یہ بجائے خود نوعیت الزام سے بھی ظاہر ہے اور قرآن مجید کے جواب سے بھی اس لئے کہ اس الزام کے لگانے والے جماعت کفار میں سے ہوتے ہیں تو اس جواب کا کوئی محل نہ ہوتا کہ بھلا جو نبی ہو، وہ اس طرح کا کام کیا کرے گا! اس جواب سے ظاہر ہے کہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو نبی ہونے کا اقرار کر چکے ہیں یعنی یہ الزام لگانے والے اس وقت کے معزز مسلمانوں ہی میں ہوں گے جو بلا استثناء صحابہ کی لفظ سے یاد کیے جاتے ہیں اور ان کا عالم یہ ہے کہ اس ذات پر جسے کفار و مشرکین تک امین کی لفظ سے یاد کیا کئے، وہ معاذ اللہ خیانت کا الزام لگا رہے ہیں جس کے جواب میں قرآن انہیں ان کے اقرار رسالت کو یاد دلا رہا ہے کہ تم نے جب انہیں نبی مان لیا ہے تو پھر اس طرح کا توہم کیوں کرتے ہو؟ جو نبی ہوگا، وہ تو کبھی اس طرح کی حرکت نہیں کرسکتا۔

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾

"تو کیا جو اللہ کی خوشنودی کا در پے رہے، وہ اس کے مثل ہے کہ جو اللہ کی ناراضگی میں گرفتار ہو اور جس کا ٹھکانا دوزخ ہو وہ کیا بری منزل ہے۔"

ہر آیت میں شان نزول کی تشنگی محسوس ہوتی ہے کہ یہ آخر کہنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی تھی؟ مگر جب کہ زمانہ کی دست برد نے ہمیں اس علم سے محروم کر دیا ہے تو بس جو آیت کے الفاظ اور جو ان سے نتیجہ برآمد ہوتا ہے، اسی کو سمجھنے اور کہنے کا ہمیں حق رہ گیا۔ اس کے آگے کچھ نہیں۔

یہ آیت اور ایسی ہی بہت سی آیتیں ہیں جو اسلاف کے ساتھ حسن ظن کے اس تصور کو کہ ان کے بارے میں نقد و بحث سے بالکل کام نہ لو، بس یہ سمجھ لو کہ وہ بڑے بزرگ لوگ تھے، اس کے آگے ان کے افعال و اعمال پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، غلط قرار دیتی ہیں۔

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

''ان کے اللہ کے یہاں درجے ہیں [1] اور اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اس کا دیکھنے والا ہے۔''

صحابہ کے درمیان اچھے اور برے میں امتیاز کی ضرورت

ان دونوں آیتوں کو ملایئے تو صاف منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اچھے برے کا فرق کرو اور اتنا ہی نہیں بلکہ اچھوں میں بھی بہت سے درجے ہیں، ان میں بھی سمجھنے کی کوشش کرو کہ کون بلند تر درجہ رکھتا اور اچھے کے مقابلہ میں برے اور افضل کے مقابلہ میں غیر افضل کو بھی یکساں درجہ پر نہ رکھو [2] ۔ چہ جائیکہ دوسرے کو مقدم قرار دینا اور اسے اپنا سربراہ بنالینا اور جو افضل ہو، اسے نذر تغافل کر دینا، یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ اسی بنا پر کافی اور تفسیر عیاشی کی ایک روایت میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہے کہ:

انّ الّذین اتبعوا رضوان اللہ هم الائمة علیہم السلام

مکمل طور پر خوشنودی الٰہی کے درپے رہنے والے آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

''اللہ نے احسان کیا ہے ایمان لانے والوں پر جب کہ اس نے ان میں ایک پیغمبر بھیجا انہی میں سے جو ان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت کرتا، ان کی اصلاح کرتا [3] اور انہیں کتاب وحکمت [4] کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ وہ اس کے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔''

جس طرح قرآن مجید کو ھدی للمتقین ''پرہیزگاروں کے لئے ہدایت اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ اس کی ہدایت سے فائدہ اٹھانے والے یہی ہیں۔ ورنہ وہ نازل ہوا ہے سب کی ہدایت کے لئے جیسا کہ دوسری جگہ اسے ''ھدی للناس'' کہا گیا ہے، اسی طرح یہاں اس احسان کے ذکر میں مومنین کا نام لیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اثر اس احسان کا انہی میں ظاہر ہوا ہے [5] ورنہ مقصود تو رسولؐ کی بعثت سے سب ہی کو اس طرح پر لانا تھا مگر جنہوں نے فیض حاصل ہی نہیں کیا، انہیں اس احسان کا احساس ہی نہیں ہوسکتا تو ان کا ذکر ہی کیوں کیا جائے۔

اور بھیجنے کے ذکر میں انہیں مومن کہنا اس لحاظ سے ہے کہ وہ اب پیغمبر کی دعوت پر لبیک کہہ کے مومن ہوں گے جیسے:

---

[1] ۔ای هم ذودرجات (مجمع لبیان)

[2] ۔هم صلوات اللہ علیهم فی هذا الایه اظهر الافرادو اعلاهم درجة (البلاغی)

[3] ۔یظهر هم من سوء العقائدو الاخلاق و الاعمال (صافی)

[4] ۔القران و السنة (صافی)

[5] ۔لاهتدائم به و انتفاعهم ببیانه و نظیر ذلك ماتقدم من قوله هدی للمتقین (مجمع البیان)

من قتل قتیلا فله سلبه: جو کسی مقتول کو قتل کرے اس کا لباس وغیرہ اس کا حق ہے۔

ورنہ ظاہر ہے کہ جب رسولؐ کو بھیجا گیا ہے، اس وقت تک اس معنی میں مومن اور کافر کی تفریق ہی موجود نہ تھی۔

چونکہ دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے کہ مسلمانوں میں کچھ ایسا تصور کرتے تھے کہ ہم نے جو ایمان اختیار کیا، یہ کوئی ہمارا احسان ہے، قرآن نے انہیں متنبہ کیا کہ:

لَا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰىکُمْ لِلْاِیْمَانِ.

''تم اپنے اسلام اختیار کرنے کا مجھ پر احسان نہ رکھو، بلکہ اللہ کو تم پر احسان جتانے کا حق ہے کہ اس نے ایمان کی طرف تمہاری ہدایت کی'' اس لئے بھی یہاں پیغمبرؐ کی بعثت کو اللہ کی طرف کے احسان کی صورت میں مومنین کے مقابلہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بے شک یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم کلام کی کتابوں میں لکھا جاتا ہے کہ انبیاء کا بھیجنا خداوند عالم پر واجب ہے۔ پھر جب یہ واجب ہے اور خداوند عالم انبیاء کو بھیج کر اس امر واجب کی تکمیل فرماتا ہے تو احسان کیا ہوا؟

مگر یہ سوال لفظ واجب کے اصل معنی پر غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے، خدا پر وجوب کے معنی یہ تھوڑی ہی ہیں کہ کسی اور حاکم نے اس پر یہ فرض قرار دیا ہے یا معاذ اللہ کسی کا اس پر دباؤ ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ خالق عالم کے شایان شان ایسا ہی ہے لہٰذا بالکل درست ہے کہ کوئی فعل بندوں پر ایک لطف و کرم اور احسان ہو اور وہ لطف و کرم اور احسان ہی چونکہ اس کی ربوبیت کی شان کے لائق ہے، اس لئے اسے واجب بھی کہا جائے۔ ان دونوں باتوں میں باہم کوئی منافات نہیں ہے۔

مولانا عمار علی صاحب یہاں لکھتے ہیں:

''جیسے کہ آدمی پر زکوۃ واجب ہوتی ہے اور جب کسی دوسرے کو دیتا ہے تو اس پر اس کا احسان ہوتا ہے، ایسے خدائے تعالی پر پیغمبر کا بھیجنا واجب ہے اور جس وقت اس کو بھیجا اور مومنین نے اس سے فائدہ حاصل کیا تو خدائے تعالیٰ کا ان پر احسان ہو۔'' (عمدۃ البیان)

مگر یہ وجوب دوسری نوعیت کا ہے۔ اس لئے یہ مثال اس محل پر محل نظر ہے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَیْھَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰی ھٰذَا ؕ قُلْ ھُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۶۵﴾

''کیا جب بھی تم کو کوئی ایسا گزند پہونچ جائے جس سے دونا تم پہنچا چکے ہو، تو تم کہو گے کہ یہ کہاں سے ہوا؟ کہہ دیجیے کہ وہ خود تمہارے ہاتھوں ہوا۔ یقیناً اللہ ہر بات پر قادر ہے۔''

احد کی شکست اپنے ہاتھوں

مسلمان بدر میں دشمنوں کو شکست دے چکے اور احد میں بھی شروع میں انہوں نے شکست دی پھر جب رسولؐ کی عدول حکمی کی اور لڑائی بگڑی تو انہیں شکست ہوئی اور اب بہت سے مسلمان قتل ہوئے پھر بھی ان کے مقتولین کی تعداد ان مشرکین کی نصف تھی جو بدر و احد میں ان کے

ہاتھوں قتل یا اسیر ہو چکے تھے [1] مگر اپنے مقتولین دیکھ کر بہت سے مسلمان چیخ اٹھے اور گویا حقانیت اسلام میں شک کرنے لگے کہ جب ہم سچے دین پر ہیں تو ہمیں ہر معرکہ میں بس فتح ہی پانا چاہیے۔ [2]

شکوہ اور جواب شکوہ

اس جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ شکست تمہیں تمہارے ہاتھوں نصیب ہوئی ہے۔ نہ تم عدول حکمی کرتے اور نہ شکست اٹھاتے۔

اس کے بعد بھی اگر کوئی مسلمان کبھی ''شکوہ'' کرے کہ یہ کیا کہ ہم دین حق کی خدمت گزارا اور پھر ''برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر''

تو ''جواب شکوہ'' کے لئے قرآن کا یہ مختصر فقرہ کافی ہوگا کہ: هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ''یہ خود تمہارے ہی ہاتھوں ہے'' تم خود اپنے گریبان میں منہ ڈالو اور دیکھو کہ تمہارے کیا کرتوت ہیں۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

''اور جو کچھ اس دن کہ جب دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ ہوئی [3] تمہیں مصیبت آئی، وہ اللہ کی مشیت کے مطابق تھی [4] اور اس لئے کہ وہ مومنین کو جانے اور انہیں بھی جان لے جنہوں نے نفاق سے کام لیا اور جن سے کہا گیا کہ آؤ! اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دفعیہ کرو تو انہوں نے کہا ''ہم جنگ جانتے تو تمہارے پیچھے آتے؟ وہ اس دن

---

[1] ۔العیاشی عن الصادق علیہ السلام کان المسلمون قد اصابوا ببدر ماۃ واربعین رجلا قتلوا سبعین رجلا واسروا سبعین فلما کان یوم احد اصیب من المسلمین سبعون رجلا فاعتمو الذلك فنزلت (صافی)

[2] ۔من ای وجه اصابنا هذا ونحن مسلمون وفینا رسول الله وینزل علیه الوحی (مجمع البیان)

[3] ۔یعنی یوم احد (صافی)

[4] ۔کائن بقضائه یتخلیه الکفار (صافی) یعنی ساتھ علم خدا کے تھا (عمدۃ البیان)

ایمان سے زیادہ کفر کے نزدیک ہیں۔ اپنے منہ سے کہتے ہیں وہ جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ جو کچھ یہ چھپاتے ہیں، اسے خوب جانتا ہے وہ کہ جو خود تو بیٹھے رہے اور اپنے دوسرے بھائیوں کے لئے [1] کہا کہ اگر یہ ہمارا کہنا مانتے تو مارے نہ جاتے۔ کہیے کہ اچھا، اب تم اپنے سے موت کو ہٹانا اگر تم سچے ہو۔''

خیر القرون کے مسلمان اور کفر کے نزدیک

''اس لئے کہ اللہ مومنین کو جان لے اور جنہوں نے نفاق سے کام لیا، انہیں بھی جان لے'' اس طرح کی آیتیں پہلے بھی آ چکی ہیں اور لکھا جا چکا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ امتیاز وقوع میں آ جائے کیوں کہ علم تو نام ہی اس کا ہے کہ جو مطابق واقعہ ہو [2] لہذا اگر کوئی شے وقوع میں آنے والی ہو ہی نہیں تو وہ علم میں کیوں ہوگی؟

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باعتبار زمانہ اللہ کو علم اس وقت ہوگا جب کہ واقعہ عالم خارج میں ظاہر ہو جائے علم تو ازل سے ہے مگر ہے وہ اسی بنا پر کہ یہ شے اپنے وقت پر وقوع میں آئے گی۔

منافقین کا کردار اور ان کے حیلے حوالے

اس کے بعد منافقین کے کردار کی نشان دہی کی گئی ہے جس میں ذرا تفصیل سے کام لیا گیا۔ یہ فرائض کے ادا کرنے میں جھوٹ موٹ کے حیلوں سے کام لیتے ہیں، ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرو'' ''یا دشمنوں کو دفع کرو'' یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کا جذبہ نہیں بھی ہے تو دشمنوں نے جب حملہ کر ہی دیا ہے کہ تو اپنی قوم اپنی املاک اور اپنے وطن سے ان کی مدافعت ہی کی نیت سے آگے بڑھو [3] تو وہ کہتے ہیں کہ ہم جنگ جانتے یعنی واقف ہوتے کہ جنگ ہونے والی ہے تو اس کے لئے تیار ہوتے اور تمہارے ساتھ چلتے مگر اب جب ہم پہلے سے اس سے واقف ہی نہ تھے تو اب ہم کیوں کر چل سکتے ہیں؟

دوسرے معنی اس جملہ کے یہ کہے گئے ہیں کہ:۔

''اگر جانتے ہم لڑنا اور لڑائی کے فن ہم کو معلوم ہوتے'' (عمدۃ البیان)

مگر میرے خیال میں یہ معنی ''لو نعرف قتالا'' کے ہوتے ہیں۔ ''لو نعلم قتالا'' سے پہلا ہی مفہوم ذہن میں زیادہ آتا ہے۔

ایک اور مطلب اس فقرہ کا یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے کہا ''ہم اگر اسے جنگ سمجھیں تو تمہارے پیچھے آئیں'' مطلب یہ ہے کہ جو تم کر رہے ہو، اسے ہم جنگ سمجھتے ہی نہیں، کیوں کہ جنگ کے لئے طاقتوں کے درمیان تناسب کی ضرورت ہے بلکہ اسے ہم جان دینا سمجھتے ہیں لہذا ہم تمہارے ساتھ اس مہلکہ میں پڑنے سے مجبور ہیں۔ [4]

---

[1] ۔لاجلهم و فيهم يريد من قتل منهم يوم احد (صافی)

[2] ۔اجری علی المعلوم لفظ العلم مجاز ای لیظهر المعلوم من المومن والمنافق (مجمع البیان) لیتمیز الفریقان بظهور ایمان هولاء (صافی)

[3] ۔ادفعوا عن قومکم وبلادکم وحفائظکم ان لم تکن لکم رغبة فی الجهاد فی سبیل الله (البلاغی)

[4] ۔قالوه دغلا و اسهنواء لزعمهم ان مایفعلونه لیس بقتال بل القاء بالنفس الی التهلکة (صافی)

بعد کا فقرہ کہ انہوں نے بعد میں اپنے دوسرے بھائیوں کے لئے جو شہید ہوئے کہا کہ اگر ہمارا یہ کہنا مانتے تو مارے نہ جاتے، اس مفہوم کے بعد خالق کا یہ قول کہ:۔

هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ.

وہ اس دن ایمان سے زیادہ کفر کے نزدیک ہیں۔

یہ بھی اس مفہوم کے ساتھ زیادہ مرتبط معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ ان کا یہ کہنا کہ ''ہم پہلے سے واقف نہ تھے کہ جنگ ہوگی'' یا یہ کہ ''ہم فن جنگ سے واقف نہیں ہیں'' اس میں تو سچ اور جھوٹ کا سوال پیدا ہوتا ہے براہ راست کفر اور ایمان کا نہیں لیکن یہ کہ ''ہم اسے جنگ نہیں سمجھتے یہ تو صراحۃً جان دینا ہے ہم اس میں کیوں کر شریک ہوں۔'' اس میں ایک طرف اللہ کو بھولنا ہے کہ اس کی نصرت و تائید کوئی چیز ہی نہیں، جو کچھ ہیں، وہ بس مادی اسباب ہیں، پھر یہ کہ حکم جہاد جو اس کی طرف سے ہو رہا ہے، اسے غلط قرار دینا ہے۔ اس لئے یہ بالکل ایمان اور کفر کا سوال بن جاتا ہے اور وہ اپنے اس قول سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایمان سے دور اور کفر سے قریب ہیں اور اس لئے ارشاد ہوا کہ ''یہ اپنے منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں'' یعنی ایمان ان کا بس زبانی ہے، دل سے ایمان لائے ہوتے تو یہ اس طرح کی بات نہ کہتے۔ یہی وہ مفہوم ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتا ہے جو مصباح الشریعۃ میں ہے کہ حضرت نے اپنے ایک کلام کے ذیل میں فرمایا:

من ضعف يقينه تعلّق بالاسباب ورخّص لنفسه بذٰلك واتّبع العادات واقاويل الناس بغير حقيقة والسّعي في امور الدّنيا و جمعها و امساكها يقرّ باللّسان انّه لامانع ولامعطي الّا الله وان العبد لايصيب الّا ما رزق و قسّم له و الجهد لايزيد في الرزق وينكر ذٰلك بفعله وقبله قال الله تعالٰى: يقولون بافواههم ماليس في قلوبهم.

جس کا یقین کمزور ہے، وہ اسباب ظاہری سے وابستہ ہوتا ہے اور اس کی بنا پر فرائض سے جی چراتا ہے اور عام طور پر جو ذریعہ ہوا کرتے ہیں انہی پر تمام دنیا کے کاموں میں دار و مدار رکھتا ہے حالانکہ زبان سے یہ اقرار کرتا ہے کہ کوئی روکنے والا اور دینے والا سوا اللہ کے نہیں ہے اور یہ کہ بندہ کو بس وہی ملتا ہے جو اس کا رزق مقسوم ہے اور کوشش سے رزق میں اضافہ نہیں ہوتا مگر اپنے عمل اور دل سے اس کا منکر ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے کہ یہ اپنے منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہیں۔

امام علیہ السلام نے جس محل پر اس آیت سے استشہاد فرمایا ہے، وہ زیر بحث آیت کی صورت محال سے مطابق ہے کہ وہ لوگ اسباب دنیا پر پورا دار و مدار قرار دے کر ہی یہ کہہ رہے تھے کہ یہ تو صراحۃً جان دینا ہے۔ اگر وہ اللہ کی قدرت و قوت اور نیز علم و حکمت کے صرف زبانی نہیں بلکہ دل سے قائل ہوتے تو وہ اس کی طرف سے حکم جہاد ہونے کے بعد ایسا نہ کہتے۔

پھر وہ اپنے لئے عذر پیش کرنے کے موقع پر ہی یہ نہیں کہتے کہ اس فرض کے دور کرنے سے کوتاہی پر یہ منافق نازاں بھی رہتے ہیں اور ان لوگوں کو جنہوں نے خلوص کے ساتھ ادائے فرائض میں حصہ لیا، بیوقوف سمجھتے ہیں اور راہ خدا میں جان دینے والوں کو مورد الزام قرار دے کر کہتے ہیں کہ انہوں نے ایسا ہی کیا ہوتا جیسا ہم نے کیا تو ان کی جان کیوں جاتی؟!

قرآن نے اس کے جواب میں یہ کہا ہے کہ تم جنگ سے جان بچا کر گھر میں بیٹھے رہے تو ہم جب جانیں کہ جب تم اب موت سے اپنے کو

محفوظ کرلو۔

مگر ایسا نہیں ہے، جب موت کو آنا ہوگا تو تم سات پردوں میں بھی بیٹھو گے تو موت آ کر رہے گی۔

پھر جب عارِ فرار کے بعد بھی کبھی نہ کبھی مرنا ہی ہے تو اگر یہ موت ایک فرض کی ادائیگی کی راہ میں، ایک بلند مقصد کی خاطر اور اپنے ملک کی رضا کے لئے آئے، جہاں جان جائے تو اس کی خاطر جائے جو حقیقی اس جان کا مالک ہے۔ جہاں جان دینے والا یہ کہہ سکے کہ:۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تو یہ کون سا ایسا خسارہ ہے جس سے بچنے پر تمہیں خوشی ہو اور جس پر ان لوگوں کو جنہوں نے جانیں دی ہیں تم موردِ ملامت قرار دو۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾

''اور انہیں جو اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں ہرگز مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے یہاں رزق پاتے ہیں، خوش خوش اس پر جو اللہ نے اپنے فضل وکرم سے انہیں دیا اور اپنے پسماندگان کے حال سے جو ان کے پاس نہیں پہنچے ہیں، وہ خوش ہوتے ہیں کہ انہیں کوئی خوف نہیں ہے اور نہ کوئی انہیں افسوس ہونے والا ہے۔ اللہ کی بڑی عنایت اور کرم سے خوش ہوتے ہیں اور اس سے کہ اللہ ایمان والوں کے ثواب کو برباد نہیں کرتا۔''

حیاتِ شہدائے

بظاہر یہ گزشتہ آیات کے مضمون ہی کا تتمہ ہے کہ وہ منافقین راہ خدا میں جان دینے والوں کے حال پر گویا تاسف کرتے ہیں کہ افسوس انہوں نے ہمارا کہنا نہیں مانا ورنہ ان کی جان کیوں جاتی مگر یہ منافقین میدان جہاد سے فرار کرنے کے بعد کیا مرنے سے بچ جائیں گے، پھر انہیں جو موت آئے گی، وہ تو حقیقت میں موت ہی ہوگی اور یہ جان دینے والے جو راہ خدا میں دنیا سے گئے ہیں، انہیں حقیقت میں مردہ سمجھنا ہی غلط ہے بلکہ یہ تو زندہ ہیں۔

اب فقط ''زندہ'' کہہ کر قرآن خاموش ہو جاتا تو یہ سمجھا جا سکتا کہ یہ ''زندہ'' کہنا نتائج کے لحاظ سے مجازی طور پر ہے مثلاً اس اعتبار سے کہ ''نام نکو گزاشت'' یا اس لحاظ سے کہ ''دلش زندہ شد بعشق'' اور ''ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما'' مگر قرآن نے بات کو ''زندہ'' کہہ دینے پر ختم نہیں

کیا ہے بلکہ کیفیات زندگی کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جس سے ثابت ہے کہ وہ حقیقت میں ایک خاص طرح کی زندگی ہے جو ''بقائے روح'' یا اس ''حیات برزخی'' کے علاوہ ہے جو قائلین معاد کے نزدیک سب ہی کے لئے ثابت ہے۔

یہ اور بات ہے کہ ہم اس زندگی کی پوری نوعیت سمجھ نہ سکیں جبکہ ہم خود اس زندگی سے محروم ہیں۔

سونے والے نے خواب کے عالم میں بیداری کو کب سمجھا ہے جو ہم اس خواب بیداری میں اس حیات کی نوعیت سمجھ سکیں جو راہ خدا میں آنکھ بند ہو کر حاصل ہوگی۔

اپنے پسماندگان کے حالات سے جو شہدائے راہ خدا کو مسرت ہوتی ہے، اس ذیل میں یہ فقرہ کہ الا خوف علیھم ولاھم یحزنون ''ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ انہیں افسوس ہونے والا ہے''.....اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں ان کے دنیا کے حالات سے کوئی سروکار نہیں ہے کیوں کہ دنیا میں تو اہل ایمان کو خوف بھی ہوتا ہے اور اکثر رنج بھی اٹھانا پڑتے ہیں بلکہ انہیں ان کے حسن انجام کا جو علم ہوتا ہے کہ یہ پسماندگان ایمان اور عمل میں پختہ ہیں، جس کی وجہ سے ان کی آخرت پر امن ہے، اس پر انہیں مسرت حاصل ہوتی ہے۔[1]

ملا محسن فیض نے اس آیت کے ذیل میں ایک عجب توسعہ کیا ہے جس کے بعد اس کا تعلق صرف شہدائے جنگ سے رہتا ہی نہیں بلکہ ہر ''مومن نیکوکار'' کو وہ شامل ہو جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ:

تشتمل کل من قتل فی سبیل من سبیل اللہ عزوجل سواء کان قتلہ بالجھاد الاصغر و بذل النفس طلبالرضا اللہ اوبالجھاد الاکبر و کسر الناس وقع الھدی بالریاضۃ (صافی)

وہ حاوی ہے ہر اس شخص پر جو اللہ کے راستوں میں سے کسی میں بھی قتل ہو، خواہ وہ جہاد اصغر میں اور جان دینے کے ساتھ رضائے الٰہی کی خاطر قتل ہو یا جہاد اکبر اور نفس کشی اور ریاضت کے ساتھ اپنی خواہش نفس کو مارنے کی صورت سے قتل ہو۔

مگر میرے خیال میں ان کا یہ تصور ان کے متصوفانہ رجحان کا نتیجہ ہے جو ہم ''اہل ظاہر'' کے یہاں درخود اعتناء نہیں ہے۔

وہ اس پر خوش ہوتے ہیں کہ ''اللہ ایمان والوں کے ثواب کو برباد نہیں کرتا''..... یہ جانتے تو وہ دنیا ہی میں تھے، اس لئے کہ عدل الٰہی ایمان رکھتے تھے مگر ''شنیدہ کے بود مانند دیدہ'' اب اسے آنکھ سے بھی دیکھ لیا۔[2]

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾

''وہ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی[3] اللہ اور رسولؐ کی آواز پر لبیک کہی، ان میں سے جنہوں نے حسن عمل سے کام لیا اور بچتے رہے، ان کے لئے بڑا ثواب ہے۔''

---

[1] ۔ای یستبشر ان سعادتھم بصلاحھم (البلاغی)

[2] ۔لانھم یعلمونہ بعد الموت ضرورۃ وانما یعلم ذلك فی دار التکلیف استدلالا (مجمع البیان)

[3] ۔ای فالھم الجراح یوم احد (مجمع البیان) یعنی اس سے کہ پہنچے تھے ان کے زخم (عمدۃ البیان)

غزوہ حمراء الاسد کے مجاہدین کی توصیف

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ''حمراء الاسد'' کے مجاہدین کے بارے میں ہے جس کا واقعہ یہ تھا کہ جب جنگ احد کے بعد رسالت مآبؐ واپس ہوئے تو مشرکین کو چونکہ اس شکست کی وجہ سے مسلمانوں کی کمزوری کا احساس اور اپنی قوت کا ذرا غرّہ ہو گیا تو مقام رجاء میں ٹھہر کر انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ وہ پھر پلٹ کر دوبارہ مدینہ پر ہلہ کر دیں۔ خالق کو معلوم تھا کہ یہ ان کا حملہ کا ارادہ تو صرف اس تصور میں ہے کہ مسلمانوں میں نفسیاتی طور پر اخلاقی کمزوری پیدا ہو گئی ہے لہٰذا اگر اس وقت یہ ثابت کر دیا جائے کہ مسلمان ہمت نہیں ہارے ہیں تو بس اتنے ہی سے کفار کے حوصلے پست ہو جائیں گے لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ جن میں سے اکثر زخمی تھے مقام حمراء الاسد میں ٹھہرے ہوئے تھے، انہی مسلمانوں کو جو زخمی حالت تھے حکم دیا کہ چلو، چل کر کفار کا تعاقب کریں۔ [1]

حالانکہ بھاگنے والوں کا تعاقب کرنا یا خود سے حملہ کرنا آپ کے اصول میں داخل نہ تھا مگر یہ صرف ایک نفسیاتی مظاہرہ تھا ان کی ہمت کے پست نہ ہونے کا کہ ہم میں ابھی مدافعت کیا، پہل کرنے کی جرأت بھی موجود ہے اور یہ کہ زخمیوں کو حکم ہوا، جو صحیح وسالم تھے، انہیں نہیں اور جہاں تک میں محسوس کرتا ہوں، یہ صحیح وسالم افراد کے ضمیر پر تازیانہ تھا، اس لئے کہ احد کی نازک صورت حال کے پیش نظر میدان جنگ میں رہ گئے، یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی گزند سے محفوظ رہے لہٰذا یہ جو بال بال محفوظ تھے، یہ وہی ہو سکتے ہیں جنہوں نے میدان چھوڑنے کے بعد پھر مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ رسولؐ پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ تو بعد میں جب رسولؐ مظفر ومنصور واپس جا رہے تھے تو واپس آ کر مراجعت میں اس جمعیت کے ساتھ شریک ہو گئے تاکہ مدینہ جب واپس جائیں تو فاتحین کے ساتھ ہماری صورت بھی نظر آ رہی ہو، تو خالق کی طرف سے ان کے خلاف اس کا مظاہرہ ہوا کہ ان سے رسولؐ کی امید قطع ہو چکی ہے اور اب انہیں اس جہاد میں کوئی زحمت دینا منظور نہیں ہے لہٰذا جو زخمی تھے بس انہیں کو چلنے کا حکم ہوا اور یہ اب اس جماعت کی اطاعت گزاری تھی کہ باوجود زخمی ہونے کے پھر چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اسی کا اس آیت میں ذکر ہو رہا ہے، ان کی مدح ہو رہی ہے اور انہیں بشارت ثواب دی جا رہی ہے مگر اس میں ایک خاص پہلو دیکھنے کا ہے اور وہ یہ کہ جمہور اہل اسلام نے ایک حدیث بطور مسلمات قرار دے لی ہے کہ وہ صحابہ کرام جو بدر میں شریک ہوئے، ان سے کہہ دیا گیا ہے کہ اب تم چاہے جو بھی کرو، یہ بدر کی شرکت تمہارے حسن خاتمہ کی ضامن ہے۔ یہ حدیث ان کے آئندہ کے افعال پر نقد وجرح کی زبان بندی کے لئے دلیل قاطع سمجھ لی گئی ہے مگر قرآن کو دیکھیے، کیا کہہ رہا ہے؟

وہ ان کے مقابلہ میں جنہوں نے احد میں کوتاہی کی، ان مومنین کا تذکرہ کرتے ہوئے جنہوں نے اللہ اور رسولؐ کی آواز پر لبیک کہی، پھر بھی حسن انجام کی ضمانت نہیں کرتا [2] بلکہ کہتا ہے کہ آئندہ زندگی کو بھی دیکھنا ہے کہ حسن عمل اور مناہی سے پرہیز قائم رہا یا نہیں۔ اگر آخر تک زندگی ٹھیک راستے پر ہی ہے، تب بے شک اجر عظیم کا استحقاق ہے۔ اس لئے افعال واعمال پر نقد وتبصرہ سے نہ اہل بدر کو مستثنیٰ سمجھو اور نہ اہل احد کو ہر ایک کی پوری زندگی کو سامنے رکھ کر نتیجہ پر حکم لگاؤ۔ یا پھر ایسی ہستیاں ہوں جن کی عصمت پر دلیل قطعی قائم ہو گئی ہے جس کے بعد خطاؤ گناہ کا سوال ہی پیدا

---

[1] ۔القمی ان النبی ﷺ الما دخل المدینة من وقعة احد نزل علیه جبرئیل فقال یا محمد صلی الله علیه واله وسلم ان الله یامرك ان تخرج فی اثر القوم ولا یخرج معك الا من به جراحة (صافی)

[2] ۔لم یجر شکر الاستجابة والوعد بالاجر لجمیعهم (البلاغی)

نہیں ہوتا۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾

''وہ کہ جن سے لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے مقابلہ کے لئے بڑا لشکر جمع کیا ہے، ان سے ڈرو تو اس سے ان کے ایمان میں اور اضافہ ہوا اور انہوں نے کہا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور بڑا اچھا کارساز۔ تو وہ پھرے اللہ کی عنایت اور فضل (کیساتھ) اس طرح کہ انہیں کوئی برائی چھو بھی نہیں گئی اور وہ اللہ کی خوشنودی کے درپے رہے اور اللہ بڑے فضل و کرم والا ہے۔''

ایک روایت کے مطابق یہ تتمہ ہے اسی سابق یعنی حمراء الاسد جانے والے لوگوں کا کہ جب ابوسفیان کو رسولؐ کے بڑھنے کا اپنی طرف علم ہوا تو اس نے اس جماعت کی اخلاقی قوت کے آزمانے کو ایک شخص [1] بھیجا کہ وہ انہیں دشمنوں کی کثرت سے مرعوب بنا کر دیکھے کہ اثر ہوتا ہے یا نہیں چنانچہ اس نے آکر ان مسلمانوں سے کہا کہ ارے تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔ وہاں تو تمہارے مقابلہ کے لئے تم سے بدر جہاز یادہ جمعیت تیار ہے اور بروایت درمنثور یہ کسی اور گروہ کا ذکر ہے کہ جو حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی سرکردگی میں بہت تھوڑی تعداد میں گیا تھا اور اسے راستے میں کسی نے ڈرایا کہ تم اتنے سے آدمی جا رہے ہو اور وہاں تو بڑی فوج جمع ہے مگر انہوں نے کہا کہ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ اسی کی تعریف میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔

ہمارے ہاں امام محمد باقر علیہ السلام سے یہ روایت وارد ہوئی ہے کہ یہ غزوہ بدر صغرٰی کی بات ہے۔ اسے ملا محسن فیض نے مجمع البیان کے حوالہ سے درج کیا ہے۔ [2] مگر مجھے مجمع البیان میں یہ نہیں ملا۔ ہاں اس نے کہا تمہارے مقابلہ کے لئے لوگوں نے بڑا لشکر جمع کیا ہے، اس کہنے والے کے سلسلہ میں انہوں نے کہا ایک قول درج کیا ہے کہ یہ کہنے والا نعیم بن مسعود شجعی تھا اور اسے امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب کیا ہے۔ [3]

خالق نے اس وحشت ناک خبر کو سن کر جو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کہنے کی مدح فرمائی ہے، اس کے تحت میں آداب اسلامی میں یہ بھی ایک چیز ہے کہ جب کسی کو کوئی عظیم مہم درپیش ہو تو وہ یہ الفاظ زبان پر جاری کرے۔ [4]

---

[1] ۔ وہ نعیم بن مسعود یا عبدالقیس تھا (عمدۃ البیان)

[2] ۔ فی الجمع عن الباقر علیہ السلام نزلت فی غزوۃ بدر الصغریٰ (صافی)

[3] ۔ ھو قول ابی جعفر و ابی عبداللہ علیہ السلام (مجمع البیان)

[4] ۔ صحت الروایۃ عن الصادق علیہ السلام (مجمع)

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

''یہ تو شیطان ہے جو اپنے حوالی موالی کو ڈراتا ہے، تو تم ان سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو، اگر واقعی مومن ہو۔''

ہم نے جو ترجمہ کیا ہے، اس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ کفار سے خوف دلانے کی کوشش والی شیطانی حرکت جو کسی نے کی تھی، اس سے ڈرتے تو وہ ڈرتے جو سچے مومن نہیں ہیں، چاہے وہ مسلمانوں کی جماعت کے اندر ہوں۔ وہ وہ ہیں جو خود شیطانی تصورات رکھتے ہیں، اس لئے شیطان کے حوالی موالی ہیں اور تم اگر واقعی مومن ہو تو تمہیں شیطان کے ڈرانے پر ان کافروں سے نہیں ڈرنا چاہیے۔

عام طور پر اکثر مفسرین و مترجمین نے اسی صورت سے تفسیر لکھی ہے اور ترجمہ کیا ہے [1] مگر ایک معنی اس آیت کے دوسرے قرار دیے گئے ہیں، جس کی بنا پر ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ یہ شیطان جو اپنے حوالی موالی سے ڈرایا کرتا ہے۔ [2]

اس صورت میں حوالی موالی سے مراد وہی کفار ہیں جن سے اس شخص نے آ کر ڈرایا تھا۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے، صرف پہلا فقرہ: ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ، اس سے بلا غور و فکر جلد جو مفہوم ذہن میں آتا ہے، وہ تو پہلا ہی ہے کہ جنہیں شیطان ڈراتا ہے یعنی اس کے ڈرانے کا اثر جن پر ہوتا ہے وہ اس کے حوالی موالی ہیں مگر اس صورت میں بعد میں: فَلَا تَخَافُوْهُمْ ''تم ان سے نہ ڈرو'' کی ضمیر ''ان'' یہ اولیاء کی طرف سے عائد نہیں ہوگی بلکہ اس کا مرجع اس کلام سے خارج ہوگا اور وہ کفار ہیں جن سے کہ شیطان ڈرا رہا تھا۔ یہ ذرا الفاظ کے ظاہری معنی سے بعید معلوم ہوتا ہے، اس ضمیر کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ وہ اولیاء کی طرف سے راجع ہے یعنی تم شیطان کے حوالی موالی سے نہ ڈرو۔ اب جب اس کا یہ مفہوم قرار پا گیا تو پہلے جملہ میں لازماً وہ دوسرے معنی ماننا پڑیں گے کہ شیطان اپنے حوالی موالی سے ڈراتا ہے۔

بہر حال یہ وہ منزل ہے جہاں اب تک میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں۔ چونکہ ترجمہ کچھ نہ کچھ ہی تھا، اس لئے میں نے پہلے معنی کے مطابق ترجمہ کر دیا ہے لیکن دوسرا احتمال بھی بہت قریب ہے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

''اور یہ لوگ جو کفر میں تیزی کرتے ہیں، آپ کے رنج کا باعث نہ ہوں۔ یہ اللہ کو ہرگز کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اللہ نے طے کر لیا ہے کہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ وہ قرار نہیں دے گا اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب

---

[1] ۔ یخوف اولیاءہ القاعدین من الخروج مع الرسول (صافی) ڈراتا ہے دوستوں اپنے کو کہ وہ منافقین ہیں (عمدۃ البیان)

[2] ۔ قال الزجاج و ابو علی الفارسی وغیرھما ان تقدیرہ و یخوفکم اولیاءہ ای من اولیاء (مجمع البیان و قد یخوف المفعول الاول کما تقول خوف عمرو الکلب و کما فی الایۃ نہی کما اذا قیل یخوفکم اولیاءہ (البلاغی ﷺ)

ہے۔"

یہ رسولؐ سے خطاب ہے۔ وہ پیغمبر جنہیں کفار و مشرکین کے ایمان نہ لانے سے اتنا صدمہ ہوتا تھا کہ خالق نے ارشاد کیا۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴿الکھف: ۶﴾

معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آپ ان کے پیچھے جان دے دیں گے اس افسوس میں کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔

انہیں خود مسلمانوں میں سے ان اشخاص کے کفریہ اقوال و افعال کا جو اسلامی تقاضوں کے خلاف ہیں جتنا صدمہ ہوتا کم تھا اور جیسا علامہ طبرسیؒ نے لکھا ہے کبھی کبھی بمقتضائے عبودیت اپنی جگہ یہ فکر پیدا ہوتی تھی کہ کہیں میری جانب سے تو کوئی کمی نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی طرح ایمان ان کے دل میں راسخ نہیں ہوتا[1] اسی کا اس آیت میں اظہار کیا گیا ہے۔

یہ کفر میں تیزی کرنے والے کافر تھوڑی ہیں۔ یہ وہ ہیں جو اپنے کو مومن کہہ رہے تھے[2] مگر تگ و تاز ان کی کفر کے میدان میں تھی جس کا قرآن ابدی گواہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾

یقیناً وہ جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر مول لیا، ہرگز اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

اس طرح کے الفاظ منافقین کے لئے سورہ بقرہ کے شروع میں آ چکے ہیں کہ:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى (بقرہ۔ ۱۶ اور ۱۷۵)

وہ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی۔

وہاں اس مول لینے کی تشریح ہو چکی ہے کہ انکے لئے اسباب ہدایت سب فراہم ہو گئے تھے پیغمبر خداؐ کی خدمت میں پہنچ گئے، حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے تو اس طرح گویا ہدایت ان کے ہاتھ آ گئی مگر پھر بھی انہوں نے دل میں کفر کو چھپا کر اور منافقانہ چالیں اختیار کر کے گمراہی اختیار کر لی۔ بس اسی معنی سے یہاں کہا جا رہا ہے کہ انہوں نے ایمان کے بدلے کفر مول لے لیا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾

---

[1] ۔لا یبعد انه ربما کان یخطر بباله ان مسار عتهم الی الکفر و امتناعهم عن الایمان لتفریط حصل من قبله فامنه الله من ذلك (مجمع البیان)

[2] ۔هم المنافقون من المتخلّفین (صافی)

''اور یہ کافر ایسا نہ سمجھیں کہ ہم جو ان کی رسی دراز رکھتے ہیں [1] یہ ان کے لئے کوئی اچھی بات ہے۔ ہم تو صرف اس لئے ان کی رسی دراز رکھتے ہیں کہ وہ اور زیادہ گناہ کرلیں اور ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔''

کفار منافقین کو مہلت دیے جانے کی وجہ

ترتیب آیات کے لحاظ سے جو سیاق ہے، اگر تنزیل میں بھی یہ آیت اسی محل کی ہے، جیسا کہ مضمون آیات کے تسلسل اور روانی سے ظاہر ہے تو یہ کافر وہ نرے کھرے کافر نہیں ہیں جو مشرکین یا اہل کتاب ہیں بلکہ یہ کافر معزز طبقہ والے اقراری مسلمان ہیں جنہیں ان کے اعتقاد و عمل کے لحاظ سے قرآن کافر کہہ رہا ہے۔

ان کو ڈھیل دینا سب سے بڑا یہ تھا کہ نام بنام ان کے کفر کا اظہار کر کے ان کو اپنی محفل سے نکال نہیں دیا گیا۔ یہ اس پر بڑے خوش ہیں، سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری سیاست کی کامیابی ہے مگر خالق کا ارشاد ہے کہ یہ ان کے لئے کوئی اچھی بات نہیں ہے بلکہ یہ تو صرف اس لئے ہے کہ یہ اپنے منافقانہ جرائم اور زیادہ کرلیں اور اس کے بعد جو عذاب انہیں ہونے والا ہے، وہ تو ہے ہی۔

بہر حال محل درود آیت چاہے منافقین ہوں مگر حکم تمام کافروں کو عام ہے۔ کافروں کو سب ہی کو ڈھیل ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان پر نعمتوں کی فراوانی ہوتی ہے۔ اموال و اولاد میں خوب کثرت ہوتی ہے۔ سامان عیش و عشرت کی ریل پیل ہوتی ہے۔ اسی طرح خوب کھل کھیلنے کا موقع دیا جاتا اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری قسمت زوروں پر ہے اور خدا یہ سب ہمارے لئے جو کر رہا ہے، یہ سب ہمارے بخت کی یاوری ہے مگر حقیقت ہے کہ میدان ان کے لئے کوئی اچھی بات نہیں ہے بلکہ اس سے ان پر زیادہ سے زیادہ خدا کی حجت تمام ہوتی ہے اور ان کے عذاب و وبال میں اضافہ ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں تباہی اور مکمل تباہی ہے۔ خواہ اس دنیا ہی میں تاکہ دوسروں کے لئے سرمایہ عبرت ہو جائے اور خواہ صرف آخرت کی منزل میں جو اصل جزا و سزا کا محل ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

''اللہ مسلمانوں کی جماعت کو یوں جیسے تم ہو چھوڑنے والا نہیں ہے، جب تک کہ ناپاک کا پاک سے امتیاز نہ کرے اور اللہ تمہیں غیب کی خبر دینے کا بھی نہیں ہے لیکن اللہ اپنے پیغمبروں میں جسے چاہتا ہے، منتخب کرتا ہے تو اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان رکھو اور بچتے رہو تو تمہارے لئے بڑا ثواب ہے۔''

ثبوت علم غیب بعطائے الٰہی

---

[1] ۔ الاملاء اطالة المدة (مجمع البیان)

لیجیے! اس آیت سے صاف فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اس دور یعنی قرن اول، خیر القرون کے مسلمانوں میں پاک بھی تھے اور ناپاک بھی۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ایسی صورتیں پیدا ہوں گی کہ ان کے درمیان امتیاز ہو جائے۔ [1]

اگر خالق کو یہ منظور ہوتا اور مقصد ربانی اس کا متقاضی ہوتا کہ اس دور کے معزز گروہ میں سب کو ایک لکڑی سے ہانکا جائے، سب ہی ''حضرت'' سب ہی ''رضی اللہ عنہ'' سب ہی عدول، سب ہی کی اقتدار باعث نجات تو آخر خالق کو اس خبیث وطیب میں امتیاز پیدا کرنے کا درپے ہی کیوں ہونا چاہیے؟!

پھر بھی یہ اعلان ہو گیا کہ اس امتیاز کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صاف صاف ان آدمیوں کے ناموں کا عوام کے لئے اعلان ہو جائے: مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ، یعنی یہ امید نہ رکھو کہ خدا تم کو غیب پر مطلع کر دیگا تو پھر یہ امتیاز کیوں کر ہوگا؟ اسی طرح جیسے جنگ احد میں سختی پیش آئی اور دو قسم کے کردار سامنے آ گئے، بس یوں ہی اس کے بعد بھی دور رسولؐ میں اور پھر رسولؐ کے بعد ایسے امتحانی مواقع پیش آتے رہیں گے جن میں کردار کے فرق سے یہ امتیاز ہوتا رہے گا کہ کون خبیث ہے اور کون طیب ہے؟ تو اب مقصد الٰہی جو اس امتیاز خبیث وطیب سے وابستہ ہے، کیا اس کی تکمیل یوں ہوگی کہ ہم یہ کہہ دیں کہ صدر اسلام کے واقعات پر اب تبصرہ نہ ہونا چاہیے تا کہ کہیں کچھ ''مقدس'' افراد سے سوءظن پیدا نہ ہو جائے یا یوں ہوگی کہ خوب قرآن وسنت اور عقل کی روشنی میں پھٹک پھٹک کر پوری فراخ حوصلگی اور اللہ کی دی ہوئی بصارت وبصیرت کے ساتھ دور اول کے واقعات پر بار بار نظر ڈالی جائے اور کردار کے جو مرقع سامنے آتے جائیں، انہی سے یہ امتیاز محسوس کرنے کی کوشش کی جائے کہ کون اتباع کے مستحق ہیں اور کون بچنے کے لائق اور یہی بچنا یعنی ان لوگوں کے اتباع کے خطرات کو پیش نظر رکھنا اس محل پر وہ ہے جسے کہا جا رہا ہے کہ تم ایمان پر قائم رہو اور بچتے رہو، تب تمہیں اجر عظیم یعنی آخرت کی کامیابی حاصل ہوگی۔ بغیر اس کے نہیں۔

پھر کہا گیا ہے کہ خالق تمہیں براہ راست غیب پر اطلاع دینے والا نہیں ہے۔ ہاں پیغمبروں میں سے جسے وہ چاہتا ہے اس کے لئے منتخب کرتا ہے۔ [2]

یہ انتخاب بحیثیت رسالت نہیں ہے تا کہ کہا جائے کہ پیغمبر سب ہی اس کے منتخب کردہ ہوتے ہیں بلکہ یہ انتخاب درانتخاب ہے جو مراتب رسالت کی رفعتوں کے لحاظ سے ہے، جس کی دوسری جگہ تصریح کی گئی ہے کہ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یعنی پیغمبروں میں بعض، بعض سے افضل ہیں اور اسی لحاظ سے مراتب علم میں بھی اللہ کی طرف سے فرق ہوتا ہے۔ اب جو افضل المرسلین ہوگا، وہ یقیناً اس علم غیب کے بھی بلند سے بلند مرتبہ پر فائز ہونے کا حق دار ہوگا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس خبیث وطیب کے امتیاز میں رسولؐ کے ارشادات پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے جو آپ نے اپنے گرد وپیش کے مختلف افراد کے بارے میں وقتاً فوقتاً ارشاد فرمائے ہیں۔

اور یہ جو کہا جا رہا ہے کہ ''اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھو''..... اس ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ جس کے بارے میں پیغمبرؐ جو ارشاد فرمائیں، اسے اللہ کے دیے ہوئے علم کا نتیجہ سمجھو۔ رشتہ کی محبت یا دلی رضا وغضب کا اسے نتیجہ قرار نہ دو۔

---

[1] ۔حتی یتمیز المنافق من المخلص (صافی)

[2] ۔فیوحی الیہ و یخبرہ ببعض المغیبات (صافی)

مذکورہ بالا ہدایت ربانی کا تقاضا عمل میں اسی وقت آ سکتا ہے جب تاریخ بھی سامنے رہے اور حدیث بھی تب ہمیں اچھوں اور بروں میں امتیاز کرنے والی بصیرت کا سرمایہ فراہم ہوگا اور ہم غلط رہبروں سے بچ سکیں گے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾

''اور وہ کہ جو بخل کرتے ہیں اس کے ساتھ جو اللہ نے انہیں اپنے فضل وکرم سے دیا ہے، یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لئے کوئی اچھی بات ہے بلکہ یہ ان کے لئے بڑی خرابی ہے بہت قریب ہے وہ وقت کہ انہیں اسی کے جس کے ساتھ انہوں نے بخل کیا ہے، روز قیامت طوق پہنائے جائیں گے اور اللہ کے لئے آسمانوں اور زمین کا ترکہ ہے اور اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اس سے خوب واقف ہے۔''

ادائے حقوق واجب نہ کرنے اور بخل سے کام لینے کی مذمت اور اس کا عذاب

بہت دیر کے بعد یہاں آ کر سلسلہ کلام بدلا ہے، وہ ان کے فرار اور اس کے بعد کے واقعات، منافقین کے کیفیات، ان کے اقوال اور ان کے جوابات اور خالق کے تنبیہات کا سلسلہ تھا جواب ختم ہوا اور اب یقیناً دوسری بات شروع ہوئی ہے جس کا وقت نزول بھی یہ ضروری نہیں کہ بلا فاصلہ اس کے بعد ہی کا ہو بلکہ یہ ممکن ہے کہ ان واقعات کے پہلے ہوا اور ممکن ہے کہ اس کے بعد ہو۔

یوں جناب مولوی حمید الدین فراہی ایسے ترتیبی نظم قرآن پر ایمان والے تو کھینچ تان کر اس کا کچھ نہ کچھ ربط سابق آیات سے ملائیں ہی گے مگر جب ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے اور متفق علیہ طور پر نہیں ہے تو نظم قرآن بحیثیت ترتیب کو اہمیت دینے اور اس کو معنوی حیثیتوں میں دلیل قرار دینے کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

یہ بخل کیا ہے جو ان کے حقوق واجبہ مثلاً زکوۃ وغیرہ کا روکنا جسے اللہ نے اموال میں فرض قرار دیا ہے [1] اور اس تعبیر میں کہ ''جو اللہ نے اپنے فضل وکرم سے انہیں دیا ہے'' عقلی طور پر ان کے عمل کی رکاکت کا اظہار ہے [2] کہ یہ اموال ذاتی طور پر خود ان کا حق ہوتے تو خیر، کوئی وجہ بھی ہوتی کہ وہ ان میں بخل سے کام لیں مگر خدا کے دیے ہوئے اموال اور خدا ہی کے عائد کردہ فرائض سے بخل!

یہ فقرہ کہ ''ان اموال کے طوق ان کی گردن میں ڈالے جائیں گے۔'' بلاشبہ کسی خاص نوعیت کے ہولناک عذاب کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] ۔فسّر ذٰلك بمنع الزكوة (ابلاغی) هو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام (مجمع البیان)

[2] ۔فی ذلك احتجاج علی البا خلین بما فرضه الله بان مایبخلون به انما هو من عطاء الله (البلاغی) فما لهولاء القوم یبخلون علیه بماله ولا ینفقونه (صافی)

اب خواہ ان اموال کے طوق بنا کر ڈالے جائیں [1] یا ایک آتشیں [2] اژدہا ان کے گلے کا احاطہ کیے ہوئے ہو جو برابر انہیں ایذا پہنچاتا رہے جیسا کہ بعض احادیث میں ہے۔

ہم اپنی اس دنیا کے مشاہدات میں گھری ہوئی عقل سے وہاں کی کسی چیز کی اصل نوعیت کب سمجھ سکے ہیں جو اس اژدہے کی پوری نوعیت محسوس کر سکیں۔ بس اس کی شدت سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ وہ ابدی عذاب کا ایک طریقہ ہے جو غضب پروردگار کا نتیجہ اور اس کی نافرمانی کی سزا ہے نعوذ باللہ من ذلك۔

''اللہ کے لئے آسمان اور زمین کا ترکہ ہے'' یعنی جس مال کے ساتھ یہ لوگ بخل کرتے ہیں، یہ ان کے پاس رہ بھی تو نہیں جائے گا۔ ایک وقت میں یہ رکھا رہ جائے گا اور یہ اسے چھوڑ کر چلے جائیں گے اور آخر یہ سب مالک جب اٹھ جائیں گے تو آخر میں تمام اموال پر جس کا قبضہ ہوگا وہ وہی ذات ہے جو سب کے بعد باقی رہنے والی ہے اور وہ بس خالق کی ذات ہے جس کو فنا نہیں.....تو آخر میں یہ سب اموال اس کے ہو جائیں گے [3] مگر اس وقت یہ اسے جبری طور پر پہنچیں گے، اس لئے انہیں ان کے کسی معاوضہ کا بھی حق نہ ہوگا لیکن اگر یہ اختیاری طور پر اس کے فرمان کی تعمیل میں ان اموال کا کچھ حصہ دے دیں تو صرف اتنا ہی نہیں کہ یہ عذاب اخروی سے محفوظ رہیں گے بلکہ وہ انہیں ان اموال فانی کا بہترین معاوضہ نعیم باقی کی شکل میں عطا فرمانے کا ذمہ دار ہے۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾

''اللہ نے سن لیا ہے ان کا کہا، جنہوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم مالدار ہیں، جو انہوں نے کہا کہ وہ ہم قلم بند کر لیں گے اور ان پیغمبروں کا ناحق قتل کرنا بھی اور کہیں گے کہ چکھو آتش جہنم کا مزہ۔ یہ اس کی بدولت ہے جو تم اپنے ہاتھوں کر چکے ہو اور بلاشبہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔''

یہودیوں کی نکتہ چینیوں پر اللہ کا غضب

خود آیت کے مضمون سے بھی ظاہر ہے اور تفسیری روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ یہودیوں کا ذکر آ گیا لیکن یہ انہوں نے کب اور کیوں کہا؟ اس کا پتہ قرآن مجید سے نہیں چلتا۔ ہاں روایت میں ہے کہ جب وہ آیت اتری ہے کہ:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا: کون ہے جو اللہ کو قرضہ حسنہ دے

---

[1] ۔ وہ مال کہ جن کی زکوۃ وغیرہ تمام حقوق ادا نہیں کیے ہیں، وہ مال طوق کر کے ان کی گردن میں ڈالے جائیں گے (عمدۃ البیان)

[2] ۔ فی الکافی عن الباقر ء الصادق علیہ السلام (صافی)

[3] ۔ یموت من فی السموت والارض ویبقی ھو جل جلالہ لم یزل ولا یزال فیبطل ملك كل مالك الا ملكه (مجمع البیان)

اس وقت بطور نکتہ چینی یہودیوں نے یہ کہا کہ لیجیے! مسلمانوں کا اللہ (معاذ اللہ) مفلس ہے اور آدمی مالدار ہیں جب ہی تو وہ ان سے قرض کا خواستگار ہے [1] حالانکہ وہ قرض کس مفہوم سے کہا گیا تھا اور اس کا مطلب کیا تھا؟ اس کا بیان اس آیت کے ذیل میں ہو چکا ہے اور علمائے یہود بھی اسے خوب سمجھتے تھے مگر معترض کو کوئی غرض اعتراض سے ہوتی ہے اور اپنے عوام کو بے وقوف بنا کر انہیں کیا جاتا ہے کہ کیا خوب نکتہ پیدا کیا۔ [2]

اعتراض برائے اعتراض کا جواب نہیں دیا جاتا

اس طرح لفظوں کے معنی بدل کر گرفت کی جائے تو کلام الٰہی میں بھی اس کی گنجائش نکل آتی ہے اور ایسے ہی وہ اعتراض ہوتے ہیں جن کا جواب دینا بے کار ہوتا ہے چنانچہ بلاغت قرآنی نے بھی ان کے اعتراض کا جواب نہیں دیا ہے بلکہ اسے ان کی سرکشی اور عناد کا نتیجہ قرار دے کر اس پر اور اس کے پہلے کے ان کے طغیان وعناد پر جو قتل انبیاء کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا ہے، اللہ کے عذاب کا اعلان کر دیا ہے۔

جواب تو اس وقت دیا جائے جب معترض واقعی سمجھے ہوئے نہ ہو اور جب وہ اصل مطلب سمجھے ہونے کے باوجود صرف بغرض اعتراض، اعتراض کر رہا ہے تو اس کا جواب دے کر اسے سمجھانا بے کار ہوتا ہے بلکہ اس کا جواب اپنی جگہ یہ کہہ لینا ہے کہ ''خدا سمجھے''.....اور اس کے بعد خاموشی اختیار کر لینا ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۸۳

''اور وہ جن کا کہنا یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت کی ہے [3] کہ ہم کسی پیغمبر پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک کہ وہ ایک قربانی پیش نہ کرے جسے آگ آ کر کھالے کہیے کہ میرے پہلے بہت سے رسول تمہارے پاس معجزے اور جو تم کہتے ہو، یہی لے کر آئے تو انہیں تم نے کیوں قتل کر دیا، اگر تم سچے ہو۔''

معجزہ کی طلب جو واقعی حقیقت فہمی کے لئے ہو قابل احترام ہے اور ایسے موقعوں پر معجزات پیش کیے گئے ہیں مگر خواہ مخواہ عناد یا تمسخر کے طور پر جو معجزہ کی فرمائش ہو، اس کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے چنانچہ ایسے ہی موقعوں پر قرآن مجید میں انکار کر دیا گیا ہے کہ بس جتنے معجزے پیش ہو چکے ہیں، وہ کافی ہیں۔ یہ کوئی مذاق نہیں ہے جو بے کار ہوا کرے۔

---

[1] ۔قالہ الیہود الما سمعوا من ذالذی یقرض اللہ قرضا حسنا (صافی)

[2] ۔انما قالوہ تلبیا علیٰ اعوامھم (مجمع البیان)

[3] ۔ای امرنا وقیل اوصانا فی کتبہ وعلی السن رسلہ (مجمع البیان)

بلا وجہ دل بخواہ معجزہ کی فرمائش پر قرآن کا جواب

یہ یہودیوں کا قول بھی اس طرح کا تھا اور بالکل غلط تھا۔ یعنی ایسا کبھی کبھی ہوا تو ہے جیسا کہ خود قرآن نے اقرار کیا ہے کہ قبل کے مرسلین نے یہ معجزہ بھی پیش کیا ہے اور قصہ قابل و ہابیل کے بیان میں بھی احادیث میں ہے کہ اس وقت قاعدہ تھا کہ جس کی قربانی قبول ہوتی تھی، ایک آگ آسمان سے آتی تھی جو اس قربانی کو جلا دیتی تھی مگر یہ کوئی عام اصول نہ تھا کہ ہر نبی کو یہ معجزہ ضرور پیش کرنا چاہیے اور یہ ان کا قول بھی غلط تھا کہ اس صورت میں وہ ایمان ضرور قبول کریں گے۔

قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر ایمان اس کے بعد ضروری ہوا کرے تو ان انبیاء کو کیوں نہیں مانا گیا اور کیوں قتل کر دیا گیا جنہوں نے یہ معجزہ پیش کیا تھا۔

درحقیقت یہ نہ ماننے کے بہانے ہیں، اور کچھ بھی نہیں۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

''اب اگر انہوں نے آپ کو جھٹلایا تو آپ کے پہلے والے بہت پیغمبر جھٹلائے گئے جو معجزے، کتابیں اور روشن آئین حیات لے کر آئے تھے۔''

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو مشرکین کے انکار کی وجہ سے دکھ ہوتا تھا، اس کے لئے رسولؐ کو قرآن مجید میں تسلی کے مختلف انداز اختیار کیے گئے ہیں جو اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد ان آیت کے ذیل میں آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے اور آئندہ گزریں گے، یہاں تسلی اس طرح سے دی گئی ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ آپ کو جھٹلایا جا رہا ہے یہی اس کے پہلے ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔

گزشتہ انبیاء جو آتے رہے وہ ''بینات'' لے کر آئے اور جیسا کہ ہم نے ''مقدمہ تفسیر'' میں لکھا ہے یہ اصطلاح قرآن ''آیات'' اور ''بینات'' ''معجزات'' ہی کو کہا جاتا ہے، اسی لئے ہم نے یہاں ''بینات'' کا ترجمہ کیا ہے۔ ''معجزات''[1]

اور ''زبر'' اس کا ترجمہ ہے ''کتابیں''۔[2]

اور ''الکتاب المنیر'' اس سے مراد تحریری نوشتہ نہیں ہے، ورنہ وہ تو کسی نبی کو ملا تھا اور کسی کو نہیں ملا تھا اور جنہیں ملا ان میں سے ہر ایک کو الگ ملا تھا۔ اس لئے ''زبر'' کو بصیغہ جمع لایا گیا یعنی کتابیں مگر یہاں ''الکتاب المنیر'' کا لفظ مفرد لایا گیا۔

کتب کا لفظ قرآن مجید میں لازمی یا تاکیدی ہدایت عمل اور قانون کے لئے آتا ہے جیسے نماز کو کہا گیا: اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا. اور روزہ، قصاص اور وصیت کے لئے کتب کی لفظ استعمال کی گئی ہے۔ اس لئے یہاں ''الکتاب المنیر'' کا ترجمہ ہم

---

[1] ۔ بالبینات ای المعجزات الباھرات (مجمع البیان)

[2] ۔ الکتب التی فیھا الحکم والزواجر (مجمع)

نے ''آئین حیات'' کے ساتھ کیا ہے جو بلا استثنا سب کے لئے مقرر تھا[1] خواہ وہ پہلے نبی کی شریعت ہو اور خواہ وہ شریعت جو خود ان پر نازل ہوئی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

''ہر ذی روح موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور جو کچھ تمہارا بدلا ہے، وہ پورا پورا قیامت ہی کے دن ملے گا جسے دوزخ سے چھٹکارا دیدیا جائے اور بہشت میں بھیج دیا جائے وہ کامیاب ہے اور دنیوی زندگی تو سرمایہ فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

یہ آیت گزشتہ مضمون سے مرتبط بتائی جاسکتی ہے مگر کہا نہیں جاسکتا کہ وہ اسی سلسلہ میں نازل ہوئی ہے یا نہیں۔

دنیا والے اس دنیا کی کامرانی کو کامرانی سمجھے۔ اس کے خلاف یہ ہے کہ یہ عبوری دور ہے۔ اصل زندگی اس کے بعد کی ہے اور جو وہاں کامیاب ہے وہ درحقیقت کامیاب ہے۔ اسی حقیقت کا اس آیت میں تذکرہ ہے۔

دنیاوی زندگی ''سرمایہ فریب'' کے سوا کچھ نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عیش وعشرت کو لوگ دھوکے سے اصل کامیابی سمجھ لیتے ہیں[2] جو حقیقت کے خلاف ہے۔ نہ کہ اس معنی سے جو غالب نے کہا کہ: ''دنیا تمام حلقہ دام خیال ہے''

یہ ''سوفسطائیت'' کا تصور ہے جسے واقعیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

یقیناً ضرور ضرور تمہاری آزمائش ہوگی تمہارے اموال اور نفوس کے بارے میں اور تمہیں سننا پڑیں گی ان سے کہ جنہیں تم سے پہلے کتاب ملی تھی اور ان سے جنہوں نے شرک کیا ہے بڑی دل آزار باتیں[3] اور اگر تم ضبط وتحمل سے کام لوگے اور خود پرہیزگار رہوگے تو یقیناً یہ مضبوطی کا کردار ہوگا۔''

---

[1] ۔ المشتمل علی الشرائع والاحکام (صافی)

[2] ۔ ای متاع زائل یفتربہ المفترون (البلاغی) الغرور مصدر اوجمع غار (صافی) منعۃ متعکموھا الغرور والخداع المصحل لانکم المفترون ثم نھا تعود علیکم بالرزایا (مجمع البیان)

[3] ۔ وہ باتیں کہ جو باعث آزار اور رنج کی ہیں بہ نسبت پیغمبر کے اور بہ نسبت تمہارے (عمدۃ البیان)

''ضرور ضرور تمہاری آزمائش ہوگی'' جہاد اور خیرات میں جان و مال کی قربانی کے احکام کی صورت میں بھی اور راہ خدا میں پیش آمدہ جانی اور مالی مصائب کی شکل میں بھی [1] ''پرہیزگار رہو گے۔'' ان کے طعن و تشنیع اور استہزاؤ تمسخر کی پروا کیے بغیر احکام الٰہیہ کی پابندی کے ساتھ بھی [2] اور یوں بھی کہ مخالفین کی پست کرداری، بداخلاقی اور بدزبانی کے مقابلہ میں تم ویسی ہی باتوں پر اتر نہ آؤ۔ [3]

''یہ مضبوطی کا کردار ہوگا'' یعنی ایسا کردار جو مضبوط عزم و ارادہ کے جوہر کا تقاضا ہے یا یہ کہ جس پر عزم و ہمت کے پورے استحکام کے ساتھ قائم رہنا چاہیے۔ [4]

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

''اور جب کہ اللہ نے اُن سے جنہیں کتاب دی گئی تھی، عہد و پیمان لیا تھا کہ تم ضرور لوگوں کے لئے واضح طور پر پیش کرتے رہو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں تو انہوں نے اسے اپنے پس پشت ڈال دیا اور اس کے عوض میں ذرا سی قیمت وصول کر لی تو کیا بری ہے وہ معاملت جو انہوں نے کی۔''

یہ عہد و پیمان ہر صاحب علم سے اس علم کے لئے ہے جو اسے عطا کیا گیا ہے [5] حق پوشی جرم ہے اور خصوصاً جب اس حق پوشی سے پوری دنیا کا خسارہ جیسے اہل کتاب جو اس رسول کی حقانیت کو جو ابدی صلاح و فلاح کا پیغام لے کر آیا تھا، چھپا رہے تھے اور اس طرح خلق خدا کی ابدی ہلاکت کا سبب بن رہے تھے اور وہ بھی وقتی ہنگامی ذرا سے نفع کی خاطر جو بحیثیت مقدار زیادہ سے زیادہ بھی ہو تو مفاد آخرت کے مقابلہ میں بہت کم ہی ہے۔ اس لئے اسے ''ثمن قلیل'' سے تعبیر کیا گیا ہے جو ان کے عمل کی عدم معقولیت کا اظہار ہے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

---

[1] ۔فی العلل من الرضاؑ فی اموالکم باخراج الزکوۃ و فی انفسکم بالتوطین علی الصبر (صافی)

[2] ۔تتقوا مخالفۃ امر اللہ (صافی)

[3] ۔پرہیز کرو تم ان کے بدلا لینے سے (عمدۃ البیان)

[4] ۔ای مما بان رشدہ وصوابہ ووجب علی العاقل العزم علیہ (مجمع البیان)

[5] ۔عن نجم الجزار قال سمعت علی بن ابی طالب علیہ السلام یقول ما اخذ اللہ علی اھل الجھل ان یتعلموا حتی اخذ علی اھل العلم یعلموا (مجمع البیان) حضرت علی بن ابی طالبؑ سے روایت کرتے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے جاہلوں سے عہد نہ لیا کہ علم دین کو سیکھو، یہاں تک کہ علماء سے عہد لیا کہ جاہلوں کو تم کردار سکھلاؤ (عمدۃ البیان)

''ہرگز نہ سمجھو انہیں جو اترائے جاتے ہیں اس پر جو انہوں نے کیا اور چاہتے ہیں کہ جو کچھ نہیں کیا، اس کے ساتھ بھی ان کی تعریف ہو تو ہاں۔ انہیں ہرگز یہ نہ سمجھو کہ وہ عذاب سے بچے ہوئے ہیں [1] ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

پندار خود کی کیفیت اور مذمت

اگر اس کا سابق کے مضمون سے تعلق پیدا کرنا ضروری نہ سمجھا جائے تو یہ ایک خاص قسم کے آدمیوں کا کردار ہے جس کا نمونہ ہر دور میں دیکھا جا سکتا ہے۔

''پندارِ خودی'' اتنا کہ جو انہوں نے کیا ہو، وہ ان کے نزدیک ایک کارنامہ ہی ہے اور دوسروں سے اس کے طلب گار کہ ان کی تعریفیں کریں، چاہے ایسے کارناموں کے ساتھ جو انہوں نے نہ بھی کیے ہوں۔ یہ ان تعریفوں پر بڑے خوش ہوتے ہیں۔

اب چاہے وہ عذاب جس کا تذکرہ ہے، اس بنا پر ہو کہ وہ جماعت جس کے کردار کو بیان کرنے کے محل پر آیت نازل ہوئی ہے، کفار کی تھی اور مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں کتنی ہی غلط تعریفیں کرالیں اور کتنے اپنے کارناموں پر خوش ہوں لیں مگر آخرت میں یہ اس عذاب میں ہوں گے جو کہ ان کے کفر اور شرک کا نتیجہ ہے مگر یہ کردار خود اپنی جگہ بھی مذموم ضرور ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اگر اس کے ساتھ کوئی عملی گناہ شریک نہیں ہے تو صرف وہ ذہنیت باعث عذاب نہ ہو۔

اگر آیت کا تعلق سابق مضمون سے سمجھا جائے تو پھر یہ اسی جماعت یہود کا ذکر ہے جو پہلے سے چل رہا ہے [2] کہ یہ جو کچھ کیا اس پر خوش ہیں اور جو نہیں کیا، اس کے نہ کرنے کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں کہ اس پر ان کی تعریف ہو۔

کیا کیا؟ وہیں جس کا اس کے قبل کی آیت میں ذکر ہے: فَنَبَذُوْهُ وَرَاءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا: یعنی کتمان حق کر کے منافع دنیوی حاصل کیے۔

اور جو نہیں کیا، وہ کیا؟ وہ جو عہد و میثاق لیا گیا تھا کہ لا تکتمونہ اس حقیقت کو چھپانا نہیں اس عہد و میثاق پر انہوں نے عمل نہیں کیا، اس پر وہ بہت خوش ہیں۔ [3]

مگر یہاں خوش ہو لیں، آخرت میں ان کے لئے اس پر سخت عذاب ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾

''اور اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

---

[1] ۔فسر المفازۃ ...بالنجاۃ وذکر اللغویون فی معانی الفوز النجاۃ (البلاغی)

[2] ۔نزلت فی الیھود (مجمع البیان)

[3] ۔یعجبون بما فعلوا من اللہ لیس و کتمان الحق... یحمدوا بما لم یفعلوا من الوفاء المیثاق و اظھار الحق (صافی) یعنی پوشیدہ کیا ہے انہوں نے وصف تیرے.....نہیں کیا ہے یعنی عہد کو وفا نہیں کیا ہے (عمدۃ البیان)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی
الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ
النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ
اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۟
رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا
مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ○

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات اور دن کی ادل بدل میں نشانیاں ہیں صاحبان عقل کے لئے، جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور کروٹ میں یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔ اے ہمارے پالنے والے! تو نے اس سب کو بے کار نہیں پیدا کیا ہے۔ تیری ذات ہر برائی سے بری، اب تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے پالنے والے یقیناً جسے دوزخ کے اندر ڈالا، اسے تو نے رسوا کر دیا اور ظالموں کے کوئی بھی مددگار [1] نہ ہوں گے۔ اے ہمارے پالنے والے! اب تو ہمارے لئے ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری غلطیوں کی تلافی کرا دے [2] اور نیکوکاروں کی جماعت کے ساتھ ہمارا خاتمہ کر، اے ہمارے پالنے والے! اور ہمیں عطا کر وہ کہ جو تو نے ہم سے اپنے پیغمبروں کی زبانی وعدہ کیا ہے اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کر۔ یقیناً تو وعدہ خلافی کبھی نہیں کرتا۔''

ان آیات کا پہلا جز اور زیادہ تفصیل کے ساتھ پہلے آچکا ہے''۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ
اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ ﴿البقرة﴾

---

[1] ۔نصرت سے مراد یہ ہے کہ اپنے غلبہ سے عذاب کو دفع کریں اور شفاعت عاجزی اور خوشامد سے ہوتی ہے (عمدۃ البیان)

[2] ۔مٹادے ہم سے بدیاں ہماری کہ وہ گناہان صغیرہ ہیں اور یا یہ کہ بخش تو ہمارے گناہوں کو جن کی توبہ ہم نے نہیں کی اور مٹادے تو بدیاں ہماری بعد ہونے کے جن کی ہم نے توبہ کی ہے (عمدہ)

وہاں ان کی پوری تفسیر درج ہو چکی ہے۔

یہاں جو اضافہ ہے وہ ان صاحبان عقل کے حالات اور ان کی واردات قلبی کی ترجمانی کا ہے جو ان آیات قدرت پر غور کرتے رہتے اور ان سے اپنی معرفت الٰہی کی قوت پہنچاتے رہتے ہیں۔

''کھڑے، بیٹھے، کروٹ میں'' یہ بظاہر ہر حال میں یادِ الٰہی کے قائم رکھنے کی تعبیر ہے۔ [1]

مگر اس کی ایک صورت وہ بھی ہے جس کا ذکر بعض احادیث میں اس آیت کی تفسیر وارد ہوا ہے کہ انسان اگر صحیح ہے تو کھڑے ہو کر نماز پڑھے گا، بیمار ہے تو بیٹھ کر، اس سے بھی زیادہ بیمار ہے تو لیٹ کر۔ غرض ہر حال میں نماز واجب ہے۔ [2]

جو کچھ بارگاہ الٰہی میں خطاب کر کے بعد میں بصورت مناجات ان بندوں کے معروضے ذکر ہوئے ہیں، ان کے پہلے کوئی لفظ یقولون کی طرح کی نہیں ہے کہ ''وہ یہ کہتے ہیں'' لہٰذا یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ الفاظ ان کی زبان پر آتے ہوں بلکہ ان کے تصورات و تفکرات اس طرح کے ہوتے ہیں، جن کے خالق نے ان کی طرف سے ترجمانی فرمائی ہے۔

بے شک چونکہ خالق کا ان الفاظ میں انہیں جز قرآن بنا کر پیش کرنا اس کا ثبوت ہے کہ یہ معیاری تصورات ہیں جو ایک بندہ کے اپنے خالق کی بارگاہ میں مناجات کی صورت سے ہونا چاہیے اور یہ الفاظ اکثر ان تصورات کے پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں، اس لئے احادیث میں بعض نمازوں کے قنوت یا اور حالات میں سورہ آل عمران کے ان آیات کے پڑھنے کی ہدایت ہوئی ہے اور اس کے ثواب وارد ہوئے ہیں مگر پڑھنا پورے طور پر کارآمد اسی وقت ہے کہ جب یہ تصورات ذہن میں بھی ہوں۔ [3]

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

''تو قبول کی اُن کی دُعا ان کے پروردگار نے کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو، خواہ مرد ہو یا عورت، برباد نہ کروں گا، تم ایک دوسرے کی جنس ہی سے تو ہو تو جنہوں نے ہجرت کی ہو اور اپنے گھروں سے نکالے گئے ہوں اور میری راہ میں انہیں ایذائیں دی گئی ہوں اور جنگ کریں اور مارے جائیں تو ان کی غلطیوں کی میں تلافی

---

[1] ۔ المراد من ذلك بيان بعض المصاديق (البلاغی) ای فی سائر الاحوال (مجمع البيان)

[2] ۔ العياشی عن الباقر علیہ السلام... قال الصحيح يصلی قائما والمريض يصلی جالسا وعلی جنوبهم الذی يكون اضعف من المريض الذی يصلی جالسا (صافی)

[3] ۔ قد اشتهرت الرواية عن النبی لما نزلت هذه الايات قال: ويل لمن لاكها بين فكيه ولم يتامل ما فيها (مجمع البيان)

کروں گا اور انہیں بہشتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، اللہ کی طرف سے ثواب کے طور پر اور اللہ کے پاس ثواب کا اچھے سے اچھا سامان ہے۔''

ان تمام تصورات، تفکرات اور دعاؤ مناجات کے بعد بھی خالق کی طرف سے قبولیت کا جو اعلان ہے، اس میں اسے صاف کر دیا جاتا ہے کہ آخرت کا بہتر سے بہتر صلہ جو تم چاہو، وہ موجود ہے مگر یہ فقط دعاؤں سے نہ ہوگا بلکہ عمل سے حاصل ہوگا۔

بے شک عمل جتنا ہوگا، اس کا صلہ کبھی برباد نہیں ہوسکتا اور اس میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ مرد ہے یا عورت کیوں کہ مرد اور عورت کوئی الگ الگ جنس تھوڑی ہیں۔ یہ تو ایک دوسرے کا جز ہیں [1]۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلط فہمی مستقل طور پر سامنے ہے کہ عورت نوع انسانی کا کوئی جز نہیں ہے بلکہ یہ کوئی الگ مخلوق ہے جس کے ذمہ بس فرائض ہیں، اس کے حقوق کچھ نہیں ہیں۔ قرآن اس کا دفعیہ ہر ممکن و مناسب موقع پر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾

''کافروں کا مختلف ممالک میں دندناتے پھرنا [2] تمہیں [3] ہرگز دھوکا نہ دے۔ یہ چند دن کی چاندنی ہے۔ [4] پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا بری منزل ہے۔''

غلبہ و اقتدار کو دلیل حقانیت سمجھنا غلط

غلبہ و اقتدار کو حقانیت کی دلیل سمجھنے والے اس آیت کو آنکھ کھول کر دیکھیں۔ یہ چیز تو کافروں کو بھی حاصل ہو جاتی ہے اگر کچھ بداعمال مسلمانوں کو بھی مل جائے تو وہ ان کے نیکوکار اور پسندیدہ پروردگار ہونے کی دلیل تھوڑی ہے۔

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

---

[1] ۔روی ان ام سلمة رضی اللہ عنہا قالت یارسول اللہ ﷺ مابال الرجال یذکرون فی الھجرة دون النساء فانزل اللہ ھذہ الایة (مجمع البیان) ام سلمہؓ نے جاب رسول خداؐ سے عرض کی یا رسول خداؐ! حق تعالیٰ ہجرت اور جہاد کے ثواب میں مردوں کا ذکر کرتا ہے اور عورتوں کا ذکر نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی (عمدۃ البیان)

[2] ۔سالمین غائمین غیر مواخذین باجرا مھم (مجمع البیان) تبسطھم فی مکاسبھم و متاجرھم ومزارعھم وسعتھم فی عیشھم (صافی) متمتعین بالصحة والامھال (البلاغی)

[3] ۔الخطاب لکل واحد اولنبی ﷺ (صافی)

[4] ۔ای یتمتعون بذلك قلیلا ثم یزول (مجمع)

مگر وہ جو اپنے پروردگار کی ناراضگی سے بچتے رہے، ان کے لئے بہشت ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں کہ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ کی طرف سے سامان ضیافت [1] کے طور پر اور جو اللہ کے یہاں ہے، وہ نیکوکاروں کے لئے بہت اچھا ہے۔ [2]

اتقاء کے اصل معنی بچنے ہی کے ہیں اور جب قرآن میں یہ لفظ آتی ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں عذاب سے بچنا یا غضب خدا سے بچنا مگر چونکہ یہ بچاؤ معاصی سے پرہیز کی شکل میں ہوتا ہے، اس لئے متقی کے معنی ''پرہیزگار'' کے قرار دیئے جاتے ہیں جو لازم معنی ہونے کے اعتبار سے درست ہیں مگر جب

اس اتقاء کے ساتھ مفعول آجاتا ہے تو پھر بچنے ہی کے ساتھ ترجمہ کرنے سے مفہوم درست ہوسکتا ہے پرہیزگاری کو اب درمیان میں لاکر ترجمہ کرنے سے اردو عبارت بننا مشکل ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

''اور یقیناً اہل کتاب میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ اور ان باتوں پر جو تمہاری طرف اتاری گئی ہیں اور جو ان پر اتاری گئی تھیں، ایمان رکھتے ہیں، اللہ کے سامنے دل سے جھکے ہوئے ہیں، آیت الٰہیہ کے عوض میں تھوڑے سی قیمت وصول نہیں کرتے، یہ وہ ہیں کہ ان کے لئے ان کے پروردگار کے یہاں ان کا اجر ہے۔ یقیناً اللہ بڑا تیزی سے حساب لینے والا ہے۔''

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو جماعت یہود و نصاریٰ میں سے سچے دل سے مسلمان ہوگئے۔

بعض روایات میں ہے نجاشی بادشاہ حبشہ کے لئے رسولؐ نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی اور اس پر کچھ لوگ معترض ہوئے ان کے جواب میں یہ آیت اتری ہے۔ [3]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ

---

[1] ۔النزل بضمتین ماعد اللضیف واکرامہ من قری ومنزل (البلاغی)

[2] ۔انس سے روایت ہے کہ ایک روز جناب سید المرسلینؐ حرما کے پتوں کے بوریئے پر استراحت فرماتے تھے کہ اصحاب حاضر ہوئے اور جس وقت بیدار ہوئے تو نقش پتوں کا کمر پر اور پشت مبارک پر نمایاں تھا۔ ایک شخص اصحاب میں سے رویا اور کہا کہ یا رسول خداؐ! کسریٰ اور قیصر تو ریشمی بچھونوں پر آرام کریں اور آپ اس بوریئے پر۔ فرمایا کچھ ڈر نہیں، ان کے واسطے دنیا ہے اور ہمارے واسطے آخرت ہے (عمدۃ البیان)

[3] ۔عن جابر بن عبداللہ و ابن عباس و انس و قتادۃ (مجمع البیان)

تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

''اے ایمان والو! ضبط وتحمل سے کام لو اور دوسروں کے مقابلہ میں پامردی کا ثبوت دو[۱] اور سرحدوں پر مورچے مضبوط رکھو اور اللہ کی ناراضگی سے بچنے کا خیال رکھو۔ شاید کہ تم دین ودنیا کی بہتری حاصل کرلو۔''

اصبروا وصابروا کے جو دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ان کی تشریح میں عبارت وروایات مختلف ہیں[۲] اور اس لئے مجبوراً ہمیں خود ان دونوں لفظوں کی ساخت کے لحاظ سے مناسب انتخاب کرنے کا حق ہے۔

ہماری سمجھ میں آتا ہے کہ صبر کا جو مفہوم ہے، اس میں اگرچہ میدان مقابلہ کی پامردی بھی داخل ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر اس معنی میں ارشاد ہوا ہے:

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا.﴿الأنفال: ۶۵﴾

''اگر تم میں بیس صبر رکھنے والے ہوں تو دوسو پر غالب آئیں اور سوصبر کا جوہر رکھنے والے ہوں تو ایک ہزار کافروں پر غالب آئیں۔''

پھر:

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ.(انفال:۶۶)

''اب اللہ نے تم سے بار ہلکا کر دیا اور جان لیا تم میں کمزوری ہے تو اب اگر تم میں سوصبر رکھنے والے ہوں تو دوسو پر غالب آئیں۔''

یہاں صبر سے میدان جہاد کا ثبات ہی مراد ہے مگر چونکہ مفہوم صبر عام ہے، اس سے زیادہ تر انفرادی طور سے اپنے اوپر جو مصائب پڑتے ہیں، انہی کے برداشت کرنے کی طرف ذہن جاتا ہے اس لئے میدان جہاد کے ثبات کو دوسرے لفظ صابروا کے ساتھ زیادہ واضح کر کے نمایاں کر دیا گیا ہے، جس کی ساخت میں دوسرے سے مقابلہ مضمر معلوم ہوتا ہے۔

کتب فقہیہ میں کتاب الجہاد میں مرابط اور رباط کا خاص عنوان قائم کیا گیا ہے اور اس کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہم نے یہ ترجمہ کیا کہ ''سرحدوں پر مورچے مضبوط رکھو'' جو اس کے قبل کے حکم سے کہ ''مقابلہ میں پامردی کا ثبوت دو'' تناسب بھی رکھتا ہے مگر ہوسکتا ہے کہ اس کا لغوی معنی کے اعتبار سے یہ مطلب ہو کہ اپنے فرائض کی ادائیگی پر ہمیشہ تلے رہو۔[۳]

مرابطہ کا حکم اور اسکے معنی

بلکہ جیسا کہ جہاد کے لفظ جہاد اصغر اور جہاد اکبر دونوں کو شامل ہے اور اس لئے باعتبار موقع ومحل جہاد کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں، اسی طرح

---

[۱] ۔من باب المفاعلة مقابلة الصبر بالصبر و يفهم من المقام زيادة الصبر فی مقام المقابلة (بلاغی)

[۲] ۔اختلف فی معناه علیٰ وجوه (مجمع البیان)

[۳] ۔بمعنی اثبتوا واوطنوا ولازموا (البلاغی) تیار ہو تم دشمنان دین سے لڑنے کے واسطے اور یا یہ کہ منتظر رہو نمازوں کے ایک کے بعد دوسری کے اور یا یہ کہ ربط کرو تم ائمہ معصومین علیہم السلام کے ساتھ اور مشہور اس کے معنی میں یہ ہے کہ آمادہ اور طیار رہو تم دشمنان دین سے لڑنے پر اور گھوڑوں اور ہتھیاروں سے موجود رہو اور گھوڑے اپنے سرحدوں پر باندھ دو کہ کوئی کافر ادھر کا قصد نہ کرے (عمدۃ البیان)

یہ سمجھنا بالکل درست ہے کہ رباط کا مفہوم بھی وسعت رکھتا۔ جس وقت فریضہ جہاد بالسیف کا ہو، اس وقت سرحدوں پر مورچہ مادی اور جسمانی حیثیت رکھتا ہے اور وہ کتب فقہ والا ارباط ہے..... اور جہاں فریضہ خاموشی کا ہو تو باوجود انتہائی ناگواریوں کے اپنے کو اس موقف پر برقرار رکھنا بھی مرابطہ ہے۔ اس طرح بعد رسولؐ جو حالات پیدا ہوئے، ان میں بے پناہ اکثریت کے خلاف ائمہ حق کی معرفت اور ان کے اعتقاد پر باقی رہنا بہت بڑا مرابطہ قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد ان متعدد احادیث کا مطلب سمجھ میں آجاتا ہے جو ملا محسن فیض نے اس آیت کی تفسیر میں درج کیے ہیں:۔

القی عنه (الصادق علیہ السلام) اصبروا علی المصائب و صابروا علی الفرائض و رابطوا علی الائمة.

علی بن ابراہیم قمی کی روایت ہے امام جعفر صادق علیہ السلام سے کہ (اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ) صبر کرو مصیبتوں پر اور فرائض کی انجام دہی میں بڑھ چڑھ کر ثابت قدم رہو اور ائمہ کی موالات پر مرابطہ کرو۔

فی المعانی عن الصادق علیہ السلام اصبروا علی المصائب و صابروه علی الفتنة و رابطوا علی من تقتدون.

معانی الاخبار کی روایت ہے امام جعفر صادق سے صبر کرو مصیبتوں پر اور فتنہ کی صورت میں دوسروں سے ثبات قدم میں مقابلہ کرو اور ان ہستیوں پر جن کی پیروی لازم سمجھتے ہو مرابطہ کرو۔

فی روایة: اصبروا علی دینکم وصابروا عدوکم ممن یخالفکم ورابطوا امامکم.

ایک روایت ہے کہ اپنے دین کے تقاضوں پر صبر کے ساتھ قائم رہو اور تمہارے خلاف جو جماعت ہے ان میں سے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں برداشت سے کام لو اور اپنے امام پر مرابطہ کرو۔

فی المجمع عن امیر المومنین رابطوا الصلوة قال انتظروها واحدة بعد واحدة

مجمع البیان میں روایت ہے جناب امیرؑ سے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے لئے مرابطہ کرو یعنی ایک کے بعد دوسری نماز کا انتظار کیا کرو

عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من الرباط انتظار الصلوة بعد الصلوة

پیغمبر خدا سے مروی ہے فرمایا کہ من جملہ رباط نماز کے بعد پھر دوسری نماز کا انتظار کرنا ہے۔

آخر میں ''فلاح'' یعنی دین و دنیا کی بہتری کے ساتھ ''شاید'' کی لفظ کہنا اس بنا پر ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی فلاح اس سے وابستہ ہے کہ آخری سانس تک ایمان و عمل میں صراط مستقیم پر برقرار رہے۔ [1]

---

[1] ۔ قیل لعلکم لان الفلاح غیر لازم بل شرط الاستمرار علیها مع الایمان الصحیح الی الموت (البلاغی رحمۃ اللہ علیہ)

سُوْرَةُ النِّسَآءِ

''عورتوں کا سورہ''

مدنیہ----۱۷۴ آیات

چونکہ اس سورہ مبارکہ میں زیادہ تر طبقہ خواتین سے متعلق احکام بیان ہوئے ہیں، اس لئے اس سورہ کا نام اسی طبقہ کی نسبت سے معین ہوا اور یہ قرآنی حیثیت سے اس طبقہ کی اہمیت کا ثبوت ہے کہ کوئی سورہ بحیثیت صنف مردوں کے نام سے موسوم نہیں ہوا کہ سورۃ الرجال کہا جاتا لیکن یہ ایک سورہ مستقل طور پر عورتوں کی طرف نسبت دے کر اس نام سے موسوم کر دیا گیا۔ اسی لئے کہ اس طبقہ کے حقوق زیادہ تر نذر تغافل رہے اور خود اس کو بھی اور دوسروں کو بھی اس کے صحیح مقام و مرتبہ کا تصور بہت کم رہا۔

سورہ نساء کے خاص خاص مضامین

۱-----تعداد ازواج کا قانون
۲-----ترکہ کی تقسیم
۳-----زنا کار مرد و عورت کی سزا
۴-----حرام عورتوں کا بیان
۵-----متعہ کا حکم
۶-----عورت اور مرد میں تبادلہ حقوق
۷-----مرد کی فضیلت اور ذمہ داری
۸-----غسل کا حکم
۹-----وضو کی ترکیب
۱۰-----اولی الامر کی اطاعت
۱۱-----جواب سلام کا قانون
۱۲-----ہجرت کا حکم
۱۳-----قصر نماز
۱۴-----حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ وغیرہ وغیرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①

''اے انسانو! لحاظ کرو اپنے اس پروردگار کا جس نے تمہیں پیدا کیا ایک متنفس سے اور اسی سے اس کی رفیقہ حیات کو پیدا کیا اور انہی دونوں سے بہت سے مردوں اور بہت سی عورتوں کو پھیلا دیا اور پاس ولحاظ کرو اللہ کا جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو [1] اور رشتوں کا [2] یقیناً اللہ تم پر حاضر و ناظر ہے'' [3]

عالم گیر اخوت کا اعلان

اس آیت میں متعدد مقاصد مضمر ہیں:

1۔ علم گیر اخوت کہ تمام نوع انسانی ایک برادری میں منسلک ہے اس لئے بھی کہ ان سب کا پیدا کرنے والا ایک ہے اور اس لئے بھی کہ وہ ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ باپ جیسے نفس واحدہ سے تعبیر کیا گیا ہے، حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور ماں جناب ''حوّا'' ہیں۔ [4]

2۔ عورتوں کا حقیقت نوعیہ میں مردوں سے متحد ہونا جس پر اس کے پہلے سورہ آل عمران کے آخر میں مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ بعض کی لفظوں میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں بھی اس غلط فہمی کو کہ عورت نوع انسانی سے خارج ہے، یہ کہہ کر دور کیا گیا ہے کہ ''خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا'' اسی نفس واحدہ سے اس کی شریک حیات کو پیدا کیا۔

عورت کی مرد سے تخلیق کا مطلب

اس کی کیا صورت تھی؟ ہمارے احادیث میں یہ ہے کہ جناب حوا اسی مٹی سے پیدا کی گئیں جو جناب آدم علیہ السلام کی خلقت سے بچ

---

[1] ۔ای یسأل بعضکم بعضا فیقول اسألك بالله (صافی) یعنی اس کی قسم کھا کر بعض تم میں سے بعض کو کہتا ہے کہ میں سوال کرتا ہوں تجھ سے بحق خدا (عمدۃ البیان)

[2] ۔واتقوا الارحام ان تقطعوها (صافی)

[3] ۔یکون الرقیب فعیلا بمعنی الفاعل وهو الحافظ الذی لا یغیب عنه شیء (مجمع البیان)

[4] ۔نفس واحدة وهی ادم زوجها هی حوا (صافی)

گئی تھی۔ [1]

3۔ حقوق انسانی کے متعلق انتباہ کہ جب تم ایک برادری کے ہو تو تم سب کے آپس میں ایک دوسرے پر حقوق بھی ہیں جن کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

حقوق انسانی کی اہمیت

اور یہ رشتوں کے حقوق کی اہمیت ہے کہ جس طرح ایک جگہ قرآن میں احسان والدین کو عبادت الٰہی کے ساتھ بالکل ایک انداز میں پیش کیا ہے، اسی طرح یہاں حقوق قرابت کا لحاظ کرنے کے لئے کہا: ''وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ''یعنی اللہ کی مخالفت سے بچو اور رشتوں کے تقاضوں کی مخالفت سے۔ یہ اس شعبہ کی اہمیت کے لئے کافی ہے۔ [2]

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤی اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ۝۲

''اور یتیموں کو ان کے مال سپرد کرو اور پاک کے بدلے میں ناپاک حاصل نہ کرو [3] اور ان کے مال اپنے مال سے ملا کر نہ کھاؤ۔ یہ بلاشبہ بہت بڑا گناہ ہے۔''

''یتیموں کو ان کے مال سپرد کرو، یعنی جو یتیم تمہاری نگرانی میں تھے اور ان کے اموال بھی تمہارے پاس بطور امانت تھے، اب جب کہ وہ یتیم بالغ اور سمجھدار ہو گئے [4] تو اب ان کے اموال ان کے سپرد کر دو۔

انہیں یتیم باعتبار اس حالت کے کہا گیا ہے، جو انکی اب تک تھی [5] ورنہ بلوغ کے بعد پھر انسان یتیم نہیں کہلاتا۔ ''پاک کے بدلے میں ناپاک حاصل نہ کرو۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا خود اپنا مال چاہے جنس کے اعتبار سے برا ہو مگر وہ تمہارے لئے پاک وحلال ہے لیکن اگر تم نے اسے مال یتیم میں شامل کر دیا اور یتیم کے اموال میں سے عمدہ قسم کا مال خود لے لیا تو وہ تمہارے لئے ناپاک وحرام ہے [6] اب کون سی حماقت ہے کہ اپنے پاک کو چھوڑ کر آدمی ناپاک حاصل کرے۔ [7]

---

[1] ۔روی عن ابی جعفر الباقر علیہ السلام ان اللہ تعالیٰ خلق حواء من فضل الطینۃ التی خلق منہا ادم (مجمع البیان) العیاشی عن الباقر علیہ السلام: وفضل فضلہ من طین فخلق منہا حواء و فی العلل عنہ خلق اللہ عزوجل ادم من طین ومن فضلۃ وبقیۃ فلقت حواء (صافی)

[2] ۔واتقوا الارحام ان تقطعوہا... وہو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام (مجمع البیان) فی الکافی والعیاشی عن الصادق علیہ السلام ہی ارحام الناس ان اللہ عزوجل امر بصلتہا وعظہا الاتری انہ جعلہا معہ اقوال یعنی قونہا باسمہ فی الامر بالتقوی (صافی)

[3] ۔نہ بدل کرلو تم ناپاک مال کو ساتھ پاک مال کے (عمدۃ البیان)

[4] ۔یعنی اذا بلغوا وانتم منہم رشدا کما فی الایۃ اخری (صافی)

[5] ۔سماہم یتامی بعد البلوغ مجازا (مجمع البیان)

[6] ۔قیل کانوا یاخذون الرفیع من اموالہم ویجعلون مکانہ الخسیس فہنوا عنہ (صافی)

[7] ۔لاتستبدلوا ہا حرمہ اللہ تعالیٰ علیکم من اموال الیتامی بما احلہ اللہ لکم من اموالکم (مجمع)

یتیموں کے مال کا تحفظ

اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ تم اس وقت جلدی بازی سے کام لے کر یتیموں کے اموال سے اپنی ضرورت پوری کرتے ہو جو حرام ہے حالانکہ اگر تم صبر سے کام لیتے تو اللہ تمہیں بذریعہ حلال اتنا ہی مال عطا کر دیتا۔ پھر تم اسے چھوڑ کر اس حرام مال کو کیوں اختیار کرتے ہو۔ [1]

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَۃً اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؕ﴿۳﴾ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِہِنَّ نِحۡلَۃً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَکُمۡ عَنۡ شَیۡءٍ مِّنۡہُ نَفۡسًا فَکُلُوۡہُ ہَنِیۡٓـًٔا مَّرِیۡٓـًٔا ﴿۴﴾

”اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے بارے میں یوں انصاف نہ کرو گے تو نکاح کر لو، ان عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں، دو تین، چار سے اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کرو گے تو ایک سے یا جو تمہاری ملکیت میں ہوں، اس میں زیادہ امکان ہے اس کا کہ کج روی نہ کرو [2] اور عورتوں کو ان کا مہر فراخ حوصلگی سے ادا کرو [3] اب اگر وہ خوشی سے اس میں سے کچھ تمہیں بخش دیں [4] تو اسے مزے سے نوش جان کرو۔“

تعداد ازواج

اس میں یتیموں کے اموال کے ربط سے ضمناً تعداد ازواج کا ذکر آ گیا ہے۔ اسے بعض مفسرین اس طرح سمجھتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی ایک صورت یہ ہے کہ اگر وہ صنف اناث سے ہیں تو تم ان کے ساتھ شادی کر لو لیکن اس کے بعد بھی اگر سمجھتے ہو کہ ان کے ادائے حق میں کمی ہوگی تو پھر یتیم لڑکیوں سے شادی نہ کرو بلکہ اور عورتوں سے جو پسند آئیں شادی کرو [5] مگر میرے خیال میں اس صورت میں جو کڑی محذوف ماننا پڑتی ہے یعنی یہ کہ ”حسن سلوک کی خاطر یتیم لڑکی سے شادی کرو“ یہ سلسلہ کلام سے کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سے بہتر یہ مطلب ہے کہ تمہیں یتیموں کی خبر گیری یوں ہی کرنا چاہیے لیکن اگر یوں تمہیں اپنے میں کمزوری محسوس ہوتی ہے کہ منصفانہ صورت سے ان کی خبر گیری

---

[1] ۔بان تتعجلوا الحرام من اموالهم قبل ان یاتیکم الرزق الحلال الذی قدر لکم (صافی)

[2] ۔اقرب من ان لا تمیلوا (صافی)

[3] ۔نحلة القمی ای هبة وقیل عطیة من الله و تفضلا منه علیهن (صافی)

[4] ۔وهبن لکم عن طیب نفس (صافی)

[5] ۔یعنی اس صورت میں یتیم عورتوں سے نکاح مت کرو اور سوائے ان کے جس عورت سے چاہو نکاح کرو (عمدۃ البیان) اگر تم کو اندیشہ ہو کہ (نکاح کر کے تم یتیم لڑکیوں کی رکھ رکھاؤ) میں انصاف نہ کر سکو گے اور عورتوں سے اپنی مرضی کے مطابق دو دو اور تین تین اور چار چار نکاح کرو۔ (مولانا فرمان علی صاحب)

نہ کرسکو گے تو عورتوں سے یعنی ان یتیموں کی بیوہ ماؤں سے نکاح بھی کر سکتے ہو۔

اب یہ ذکر آیا تو خالق نے چاہا کہ یہاں تعدد ازواج کا اصول بتایا جائے کہ اس میں کہاں تک گنجائش ہے تو کہا کہ یہ بس چار کی تعداد تک ہوسکتا ہے۔

اب یہ ذکر اگر چہ یتیموں کے حسن سلوک کے ذیل میں آیا ہے لیکن اس کے احکام جو بیان ہو رہے ہیں، وہ یتیموں سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ جب بھی تعدد ازواج کی ضرورت پیدا ہو تو یہ اصول ہے کہ وہ چار تک ہوسکتا ہے۔ چار سے زیادہ نہیں اور وہ بھی جب ان چار میں عدالت کر سکے یعنی سب کے حقوق ازواجی ادا کر سکے اور اگر سب کے حقوق ادا نہ کر سکے تو پھر ایک ہی کرے یا زیادہ کی ضرورت محسوس ہو تو اپنی مملوکہ کنیزوں سے کام لے کر ان میں تعداد کی قید نہیں ہے۔

جب کہ اصل موضوع بیان اس آیت کا اقسام نکاح نہیں ہیں بلکہ ضمناً یہ تذکرہ آیا ہے تو یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ متعہ اگر شریعت اسلام میں جائز ہوتا تو اس کا بھی تذکرہ یہاں کیوں نہیں کیا گیا جب کہ اسی سورہ میں آگے چل کر اس کا حکم موجود ہے۔

مولانا عمار علی صاحب سونی پتی اعلی اللہ مقامہ نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ:

''یہاں ان عورتوں کا ذکر ہے کہ جن سے انتظام خانہ داری کا تعلق ہے اور وہ یا تو زوجہ دائمی ہوتی ہے اور یا لونڈی ہوتی ہے اور زن ممتوعہ ایسی نہیں ہوتی بلکہ وہ فقط رفع حاجت کے لئے ہوتی ہے۔ اس واسطے اس کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا۔'' (عمدۃ البیان)

جب شادی کا ذکر آ گیا تو پھر ضمناً مہر کا بھی بیان کر دیا گیا کہ مہر کا دینا لازم ہے۔ ہاں عورت کل یا جز معاف کر دے تو اور بات ہے۔

یہ اس کا ثبوت ہے جس پر پہلے روشنی ڈالی گئی ہے کہ اس آیت کا ہر مضمون یتیموں سے مخصوص نہیں ہے تو جیسے مہر کا حکم جو بیان ہوا ہے، وہ بلاشبہ ہر نکاح میں ہے، ویسے ہی تعداد ازواج کا جو قانون بیان ہوا ہے، وہ بھی یتیموں سے مخصوص نہیں ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵

''اور بدعقلوں کو اپنے پاس کے مال جنہیں اللہ نے تمہارے حالات کی درستی کا ذریعہ قرار دیا ہے [1] نہ دو انہیں آزوقہ پہنچاؤ اور کپڑے بنوا دو اور ان سے اچھی گفتگو کرو۔''

اموالکم جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ''اپنے پاس کے اموال'' اس کے مطلب میں اختلاف ہے۔ ایک مطلب اس کا یہ کہا گیا ہے کہ ان خفیف العقل اشخاص کے جو مال تمہارے قبضہ میں ہیں [2] مگر وہ خود ان کو صحیح طور پر صرف کرنے کا شعور نہیں رکھتے، انہیں ان کے سپرد نہ کرو۔ اس صورت میں یہ نابالغوں کی جائداد کو جو کورٹ ہوتی ہے، شرعی حکم ہے جو دینی اصول پر حکومت شرعیہ سے متعلق ہے۔

---

[1] ۔سمی مابہ القیام قیاما للمبالغۃ (مافی)

[2] ۔یعنی مال ان کے جو تمہارے تحت تصرف میں ہیں (عمدۃ البیان)

نابالغوں کی جائداد کی کورٹ ہونے کا حکم

دوسرا مطلب اس کا یہ کہا گیا ہے کہ:۔

''اپنے وہ مال جن پر خدا نے تمہاری گزران قرار دی ہے، بے وقوفوں (ناسمجھ یتیم) کو نہ دے بیٹھنا، ہاں اس میں سے انہیں کھلاؤ اور ان کو پہناؤ (تو مضائقہ نہیں) اور ان سے (شوق سے) اچھی طرح بات کرو۔'' (مولانا فرمان علی صاحب مرحوم)

اس کی تشریح جناب ابن عباسؓ نے یہ کی ہے کہ اگر انسان جانتا ہو کہ اس کی بیوی احمق ہے، مال کا انتظام صحیح طریقہ پر نہیں کر سکتی ہے یا اس کا لڑکا لاابالی ہے، مال کو تباہ کر دے گا تو انہیں مال سپرد نہ کرے بلکہ خود ان کی ضروریات کا انتظام کر دے۔

اس کی تائید میں معصومؑ کی حدیث بھی بیان کی گئی ہے [1] لیکن اگر آیات کی ترتیب جو اس وقت ہے مطابق تنزیل ہو جیسا کہ اس مقام پر مفہوم آیات کے لحاظ سے ذہن کے لئے قابل قبول ہے تو سیاق کلام سے پہلے ہی مفہوم کو تقویت پہنچتی ہے کیوں کہ اس کے بعد کی آیت میں مسلماً خود انکے مال ان کے حوالہ کرنے یعنی کورٹ ختم ہونے کا ذکر ہے تو اس آیت میں بھی ان کے اموال سے خود ان ہی کے اموال کا مراد لینا زیادہ مناسب ہوگا۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶

''اور یتیموں کی جانچ کرو یہاں تک کہ جب وہ تعلقات ازدواجی کے قابل ہو جائیں [2] تو اگر ان میں سمجھ داری بھی پاؤ تو انہیں ان کے مال سپرد کر دو اور فضول خرچی سے کام لے کر اور اس جلدی میں کہ کہیں یہ بڑے نہ ہو جائیں، ان کے مال خورد برد نہ کرو اور جو مال دار ہو اسے تو پرہیز ہی کرنا چاہیے اور جو محتاج ہو، وہ مناسب حد تک اپنی خوراک حاصل کر لے تو جب ان کے مال کے سپرد کرو تو ان پر گواہی حاصل کر لو اور یوں تو اللہ ہی حساب کیلئے کافی ہے۔''

یہ اب یتیموں کے اموال کے کورٹ ختم ہونے کی حد ہے کہ جب وہ بالغ و راشد ہو جائیں تو بس اب انہیں ان کے اموال سپرد کر دیے جائیں۔

---

[1] ۔رواہ ابو الجارود عن ابی جعفر علیہ السلام (مجمع البیان)

[2] ۔لغوا حدا تیانی منہم النکاح (صافی)

کورٹ ختم ہونے کی حد

بلوغ کا تعلق تو عمر کے ساتھ ہے جو لڑکے میں 15 برس اور لڑکی میں 9 برس ہے یا خاص کیفیات جو علامت بلوغ کی حیثیت سے معتبر ہیں اور رشد کا تعلق عقل و شعور یعنی اچھے برے کی تمیز سے ہے، غالباً جانچ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کا تعلق اس رشد کی صفت کے ساتھ ہے۔ [1]

مگر بعض مفسرین نے اسے بلوغ ہی سے متعلق کیا ہے یعنی قرآن اور حالات سے ان کے بلوغ کا اندازہ کرو۔ [2]

اب کورٹ کے زمانہ سے متعلق یہ ہدایت ہے کہ اس دوران میں تم ان کے اموال کی حفاظت کے ذمہ دار ہو۔ وہ تمہارے لئے حلال و جائز نہیں ہیں مگر چونکہ شریعت فطری طور پر سب ہی کے ضروریات کی کفیل ہے، اس لئے یہ نگراں اگر خود تنگ دست ہے تو پھر اسے اس نگرانی کا معاوضہ ملنا چاہیے اور وہ اتنا ہے کہ اس میں سے وہ اپنی خوراک حاصل کر لے مگر اس میں قید لگائی ہے۔ بالمعروف یعنی یہ حق نہیں ہے کہ اجازت مل گئی تو وہ اندھا دھند اس میں سے کھانا شروع کر دے۔ نہیں بلکہ بینہ و بین اللہ جتنی کہ واقعی اسے ضرورت ہے اتنا لے لیکن اگر یہ مالدار ہے تو اسے مفت نگرانی کرنا چاہیے۔ اس لئے کہا ہے: **فلیستعفف** یعنی اسے اپنے کو روکنا چاہیے۔ [3]

اب یہ حکیمانہ ہدایت ہے کہ جب ان کے اموال سپرد کرو تو گواہی حاصل کر لو تا کہ بعد میں جھگڑا نہ ہو۔ یہ حاکمانہ حکم نہیں ہے، اس کی طرف آخر کے فقرہ سے اشارہ ہو جاتا ہے کہ ''یوں تو اللہ حساب کے لئے کافی ہے۔'' یعنی اگر تم نے گواہی نہیں بھی حاصل کی اور اس کا مال اس کے سپرد کر دیا تو آخرت میں کوئی جواب دہی نہیں ہوگی اس لئے کہ خدا تو جانتا ہی ہے کہ تم نے امانت داری سے کام لیا ہے مگر دنیا میں ممکن ہے کہ وہ لے کر انکار کر دیں اور تم عام نگاہوں میں بے ایمان سمجھے جاؤ یا اگر وہ عدالت میں دعوی کریں تو چاہے وہ محکمہ عدالت شرعی ہو بلکہ خواہ معصوم حاکم کے یہاں دعویٰ ہو، تب بھی اصول قضاء کے ماتحت تم ہی سے ثبوت طلب کیا جائے گا کہ تم نے ان کے اموال ان کے سپرد کر دیئے اور اگر تم ثبوت نہ دے سکے تو تمہارے خلاف فیصلہ ہوگا اور تمہیں پھر دوبارہ ان اموال کا معاوضہ دینا پڑے گا لہٰذا مناسب یہی ہے کہ گواہی حاصل کر لو تا کہ بوقت ضرورت کام آئے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ۝۷

''مردوں کا بھی حصہ ہے اس میں سے جو ماں باپ اور دوسرے عزیز تر کہ چھوڑ جائیں اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں سے جو ماں باپ اور دوسرے عزیز تر کہ چھوڑ جائیں، چاہے وہ کم ہو یا زیادہ لازمی طور پر مقرر کیا ہوا [4] حصہ''۔

---

[1] ۔امرهم الله بان يختبروا عقول اليتامى (مجمع البيان)

[2] ۔اختبروهم قبل البلوغ يتتبع احوالهم (صافى)

[3] ۔لايأخذ لنفسه منه قليلا ولا كثيرا (مجمع البيان) فليستعفف من اكلهار (صافى) بدن عوض اس کے مال کی نگہبانی کرے (عمدة البيان)

[4] ۔الفرق بين الفرض والوجوب ان الفرض يقتضى فارضافرضه وليس كذلك الوجوب لانه يجب الشئ فى نفسه (مجمع البيان)

لڑکیوں کو استحقاق میراث

اتنی تصریح کے ساتھ اس حکم کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی صرف یہ ہے کہ جاہلیت میں لڑکیوں کو حصہ نہیں دیا جاتا تھا، خواہ یہی کہہ کر لڑکیوں کا حصہ نہیں ہے [1] اور خواہ یہ اصول قرار دے کر کہ تر کہ ان کا ہے جو نیزہ و شمشیر سے دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہیں [2] بہر حال جس لباس میں بھی یہ تصور ہو قرآن مجید نے اسے رد کیا ہے۔

اس کے بعد یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں میں بھی بعض جگہ لڑکیوں کو حصہ نہ دینے کا رواج اب تک قائم ہے۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۸

''اور جب تقسیم کے موقع پر اعزاء اور یتیم اور غریب موجود ہوں تو انہیں بھی اس میں سے کچھ دے دو اور مناسب طریقہ پر ان سے بات کرو۔''

محجوب الارث عزیزوں کے ساتھ سلوک اور ہمدردی

پہلے تو ان حصوں کا ذکر تھا جو بطور فریضہ مقرر ہیں۔ اب ان وارثوں کو ایک استحبابی حکم ہے جو ان کی انسانیت کا تقاضا ہے [3] وہ یہ ہے کہ جائداد جو ورثہ کو ملی ہے، یہ کوئی ان کی محنت و مشقت کو مکسوبہ تو ہے نہیں۔ یہ تو ایک مفت کی دولت ہے جو انہیں مل رہی ہے تو اب اگر کچھ اور عزیز ایسے جو میراث میں حق نہیں رکھتے [4] مگر حاجت مند ہیں۔ یا عزیز نہیں، غیر ہیں اور یتیم یا مسکین کی حیثیت رکھتے ہیں تو یہ ورثہ اس موقع پر ان کے پیٹ بھرنے کا بھی کچھ سامان کر دیں تو بہت اچھا ہے مگر اس طرح نہیں کہ انکی دل آزاری ہو بلکہ مناسب بات چیت کے ساتھ جس سے ان کی دل شکستگی نہ ہو۔ [5]

بعض روایات بتاتے ہیں کہ یہ حکم صدر اسلام میں بطور وجوب تھا جو احکام میراث کے آنے کے بعد منسوخ ہو گیا اس کے بعد یہ معنی نہیں کہ حکم استحبابی بھی برطرف ہو گیا وہ اب بھی باقی ہے اور عمل کرنا اس پر بہتر ہے۔ [6]

---

[1] ۔قیل کانت العرب فی الجاھلیۃ یورثون الذکور دون الاناث فرد اللہ سبحانہ علیھم (صافی)

[2] ۔قیل کانوا لا یورثون الامن طاعن بالرماح وزاد عن الحریم والمال (مجمع البیان)

[3] ۔المخاطب بذلك الورثه بن ابن عباس وابن الزبیر و الحسن و سعید بن جبیر و اکثر المفسرین (مجمع البیان)

[4] ۔اولو لقربی ممن لا یرث (صافی)

[5] ۔تلطفو الھم فی القول و اعتذروا الیھم واستقلوا ما تعطونھم ولا تمنوا بذلك علیھم (صافی) ان کو دیدیں تو احسان اپنا ان پر نہ رکھیں (عمدۃ البیان)

[6] عن الباقر علیہ السلام انہ سئل امنوختہ ھی قال لا اذا حضروك فاعظھم اقول نسخ لاجوب لاینا فی بقا الجواز والاستحباب (صافی)

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝۹

''اور ڈرنا چاہیے انہیں کہ جو اگر اپنے بعد بے ہاتھ پیر کے بچے چھوڑ جائیں تو انہیں ان کی فکر ہوگی لہٰذا وہ اللہ سے ڈریں اور صحیح طریقہ پر گفتگو کریں۔''

سیاق آیات سے جو سمجھ میں آتا ہے، یہ ہے کہ ان ایتام کی خبر گیری کے لئے جن کا میراث میں حصہ نہیں ہے، وارثوں کو متوجہ کرنے کے لئے انکے انسانی ضمیر کو بیدار کیا جارہا ہے کہ آخر تمہیں بھی تو یہ صورت پیش آسکتی ہے کہ تم چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جاؤ اور ان کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس کا خیال کرو اور اب جو دوسرے کے ایتام ہوں ان کی جہاں تک ہو سکے خبر گیری کرو اور کم از کم دل دکھانے والی باتیں نہ کرو۔

اب جب کہ یہ دوسرے غیر یتیموں کے لئے حکم ہے تو اگر اس ہیئت کی صلبی اولاد ہو اور اسی مرنے والے کے پوتے پوتیاں یا نواسے نواسیاں ہوں جو محجوب ہوگئی ہیں یعنی ان کے باپ یا ماں کا انتقال ان کے دادا یا نانا کے پہلے ہوگیا، اس لئے ترکہ میں ان کا حصہ نہیں رہا جیسا کہ شریعت اسلام کا حکم ہے تو ان چچاؤں یا ماموؤں یا پھوپھیوں یا خالاؤں کو جو وارث ہیں، ان پوتے پوتیوں وغیرہ کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو حسن سلوک تو ضروری ہی کرنا چاہیے اور یہ نہیں کہنا چاہیے کہ تمہارے ماں باپ کا تو پہلے ہی انتقال ہوگیا اب تمہارا اس ترکہ میں حق ہی کیا رہا۔

مگر تفسیروں میں مذکورہ بالا تشریح کے علاوہ دو قول ملتے ہیں:۔

ایک یہ کہ صدر اسلام میں جب کسی مومن کا وقت وفات قریب آتا تھا تو صحابہ آکر گھیر لیتے تھے اور اس سے کہتے تھے کہ قیامت میں یہ اولاد تمہارے کام نہیں آئے گی لہٰذا اپنی زندگی میں آخرت کا سامان اپنے لئے کرلو تو وہ اپنی تمام املاک کی دوسرے مسلمانوں کے لئے وصیت کردیتا تھا اور اس طرح وارث بالکل محروم ہوجاتے تھے۔ قرآن نے اس آیت میں اس طرز عمل کی مخالفت کی ہے اور مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کو اپنی اولاد کا بھی خیال کرنا چاہیے اور دوسرے لوگوں کو اس کے خلاف وعظ و نصیحت نہیں کرنا چاہیے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کے لئے انتباہ ہے جن کی نگرانی میں یتیموں کے اموال ہیں کہ وہ ان میں خورد برد نہ کریں اور کہا ہے کہ تم دوسرے کے یتیم کے مال میں بے دردی سے کام لیتے ہو اور یہ تصور نہیں کرتے کہ کہیں تمہاری اولاد تمہارے بعد کسمپرسی کے عالم میں مبتلا نہ ہو۔ اس کے مطابق امام موسیٰؑ کاظمؑ کی حدیث ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ خالق نے ان لوگوں کو اس طرز عمل کی بنا پر قدرت کی جانب سے ایک طرح کے انتقام سے ڈرایا ہے کہ تمہارے اس طرز عمل کے نتیجہ میں ہوسکتا ہے کہ خالق تمہیں سزا دے کہ تمہارے یتیموں کا یہی انجام ہو۔ [1]

اس کے بعد آیت کا مضمون اس تفسیر کو ذہن سے قریب لاتا ہے کیوں کہ اس میں جیسا کہ ابھی آئے گا، یتیموں کے اموال کھانے ہی کی اخروی سزا کا ذکر ہے۔

---

[1] ۔روی عن موسیٰ بن جعفر علیہ السلام قال ان اللہ اوعد فی مال الیتیم عقوبتین اننتین اما احدھما فعقوبۃ الدنیا قولہ: ولیخش الذین لو ترکوا الایۃ یعنی بذلک لیخش فی ذریۃ کما صبغ بھؤلاء الیتامی (مجمع البیان)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۰﴾

''یقیناً وہ جو یتیموں کے مال ناحق کھاتے ہیں، وہ اپنے شکموں میں صرف آگ ہے کہ جو بھرتے ہیں اور بہت جلد ایک بڑی آگ کی گرمی کا مزہ چکھیں گے۔''

یتیموں کے مال میں خود برد کرنے والوں کی سزا

یہ ان افراد کی بدکرداری پر تنبیہ ہے جو اس جرم عظیم کے مرتکب ہیں کہ بجائے اپنے پاس سے ایتام کی اعانت کرنے کے خود یتیموں کے اموال بھی خورد برد کرتے ہیں۔ انہیں آخرت کے عذاب کی خبر دی گئی ہے جو ان کے اس گناہ کا نتیجہ ہے اور یہ لقمہ ہائے تر جو وہ نوش جان کرتے ہیں چونکہ سبب قطعی آگ میں جلنے کا ہیں اس لئے ان کے انجام پر نظر کرتے ہوئے یہ تعبیر کی گئی ہے کہ یہ لقمہ ہائے تر نہیں بلکہ سمجھو آگ ہے جسے وہ اپنے پیٹ میں بھرتے ہیں مگر یہ اس کا احساس ابھی نہیں کرتے۔ جب وہ آگ مستقبل قریب میں ان کے سامنے آئے گی، تب وہ اس کی گرمی کو محسوس کریں گے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾

''ہدایت کرتا ہے تمہیں اللہ [1] تمہاری اولاد کے بارے میں کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا۔ اب اگر لڑکیاں ہی ہوں دو سے اوپر تو ان کے لئے دو تہائی ترکہ ہوگا اور اگر ایک ہو تو اس کے لئے آدھا ہوگا اور اس (میت) کے ماں باپ کے لئے ہر ایک کے لئے ان میں سے چھٹا حصہ ہوگا متروکہ کا اگر اس کے اولاد ہو۔ اب اگر

---

[1] ۔یوصیکم اللہ ای یامرکم و یفرض علیکم (مجمع البیان)

اس کے اولاد نہیں ہے اور ماں باپ اس کے وارث ہیں تو ماں کو تہائی ملے گا لیکن اگر اس کے بھائی ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، بعد اس وصیت کے جو اس نے کی ہو یا قرضہ کے تمہارے باپ ماں اور تمہاری اولاد، تم نہیں سمجھ سکتے کہ ان میں کون تمہارے لئے زیادہ فائدہ رساں ہے۔ یہ اللہ کی طرف کا مقررہ فریضہ ہے یقیناً اللہ بڑا جاننے والا ہے، بڑا سوجھ بوجھ والا۔''

ماں باپ اور اولاد کی میراث اور ان کے حصوں کی تعین

کوئی مرجائے تو شریعت اسلام نے اس کے متروکہ کو اس کے قرابت داروں کے لئے قرار دیا ہے اب قرابت داروں کے تین طبقے ہیں جن میں سب سے پہلے طبقہ میں ماں باپ اور اولاد ہیں۔ اس آیت میں انہی کے حصوں کا بیان ہے جس میں حسب ذیل مسائل الفاظ قرآنی سے مستفاد ہوتے ہیں:۔

(۱) اگر میت نے اولاد چھوڑی ہے جو صنف میں مختلف ہے مثلاً ایک لڑکا ہے اور ایک لڑکی تو لڑکے کو لڑکی کا دونا ملے گا لہٰذا مال کے تین حصہ ہوں گے۔ دو لڑکے کو دیدیے جائیں گے اور ایک لڑکی کو۔ اسی طرح اگر متعدد ہوں تو اصول یہی ہے کہ ہر لڑکے کے دو حصے مانے جائیں ی گے اور ہر لڑکی کا ایک حصہ اور اتنے حصے لگا کر دو دو حصے لڑکیوں کو دیدیے جائیں گے اور ایک ایک حصہ لڑکیوں کو مثلاً دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہوں تو چار حصے لڑکوں کے اور دو لڑکیوں کے۔ سب چھ حصے ہوں گے اور اگر دو لڑکے ہیں اور ایک لڑکی تو پانچ حصے اور اگر ایک لڑکا ہو اور دو لڑکیاں تو چار حصے۔ اسی طرح جتنی بھی تعداد ہو، اسی اصول پر حساب لگایا جاسکتا ہے۔

(۲) اگر میت نے صرف لڑکیاں چھوڑی ہیں، لڑکا کوئی نہیں ہے تو یہاں الفاظ قرآنی یہ ہیں کہ اگر وہ فوق اثنتین یعنی دو سے اوپر ہیں، اس سے سمجھ میں یہ آتا ہے کہ دو سے زیادہ ہوں مثلاً تین چار یا اور زیادہ ہوں تو ان کے لئے ثلثین یعنی متروکہ کے دو تہائی حصے ہوں گے لہٰذا اگر وہ صرف دو ہوں تو یہ حکم نہیں ہونا چاہیے مگر اجماع امت اس پر ہے کہ دو ہوں یا دو سے زیادہ ہوں، بہرصورت، جب ایک سے زائد ہوں تو یہ حکم ثابت ہے کہ ان کو دو تہائی ملے گا۔ [۱]

اب ہم جو احکام کے ماخذ کو قرآن میں منحصر نہیں سمجھتے بلکہ سنت کو بھی قرآن کے ساتھ ماخذ مانتے ہیں [۲] ہمارے لئے تو آسان ہے مگر کوئی پرویز یا پرویزی جو ماخذ احکام کو قرآن میں منحصر سمجھتا ہے، وہ اسے الفاظ قرآن سے کس طرح سمجھے گا؟ یہ وہی بتا سکتا ہے۔

(۳) اگر میت نے صرف ایک لڑکی چھوڑی ہے تو اسے نصف ترکہ ملے گا۔

(۴) کسی نے اگر ماں باپ دونوں چھوڑے اور اولاد بھی موجود ہو تو ماں باپ کو سدسین یعنی ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

(۵) اگر ماں باپ دونوں ہیں، اولاد نہیں ہے، نہ میت کے بھائی موجود ہیں تو اس صورت میں ماں کو ثلث یعنی تہائی ترکہ ملے گا۔ اب

---

[۱] ۔ظاهر هذا الكلام مقتضى ان البنتين لاتستحقان الثلثين لكن الامة اجتمعت على ان حكم البنتين حكم مازاد اعليها من البنات (مجمع البيان)

[۲] ۔بين اهل البيت ذلك كله على احسن وجه... وهذا كما فى سائر الايات القرانية المجملة فانها انما يادلها الراسخون فى العلم منهم ولا يتفرق احد الثقلين عن الاخر (صافى)

باپ کو کیا ملے گا؟ اس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے مگر چونکہ یہ کہہ دیا گیا ہے کہ: ورثہ ابواہ ''اس کے ماں باپ دونوں وارث ہوئے ہیں'' اور پھر ماں کے لئے کہہ دیا گیا کہ اسے ثلث مل جائے گا تو اس سے عقل ایسا سمجھتی ہے کہ ثلث کے بعد جو باقی رہے وہ سب باپ کو مل جائے گا۔ اجماع علمائے بھی اسی کے مطابق ہے۔ [1]

(۶) اگر اولاد نہیں ہے اور ماں باپ ہیں مگر میت کے بھائی موجود ہیں تو اگرچہ ماں باپ کی موجودگی میں بھائیوں کو ترکہ ملنا نہیں ہے مگر ماں کو ثلث یعنی تہائی کے ملنے سے وہ سدراہ ہو جائیں گے۔ اسے اس صورت میں بس چھٹا حصہ ملے گا۔

اب یہاں قرآن مجید میں تو لفظ اخوۃ آئی ہے جو جمع ہے اس لئے دو سے زیادہ پر اسے دلالت کرنا چاہیے مگر اکثر عربی میں بھی ایک سے زیادہ پر جمع کا اطلاق کیا جاتا ہے [2] چنانچہ اس موقع پر بھی حکم یہی ثابت ہے کہ اگر صرف دو بھائی ہوں تو بھی ماں کو ثلث نہیں ملے گا۔

اب یہاں نبض قرآن جو حصے ثابت ہوئے، وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ثلثین یعنی دو تہائی جو متعدد لڑکیوں کا ہے، جب ان کے ساتھ لڑکا نہ ہو۔

(۲) سُدُس یعنی چھٹا حصہ، یہ اولاد کے ساتھ ماں باپ میں سے ہر ایک کا ہے۔ نیز تنہا ماں کا جب اولاد میت کی نہ ہو مگر بھائی موجود ہوں۔

(۳) ثلث یعنی تہائی۔ یہ اولاد اور بھائیوں کے نہ ہونے کی صورت میں ماں کا حصہ ہے۔

ان حصوں کو جو قرآن مجید سے بالنص ثابت ہیں فُرُوض کہا جاتا ہے اور ان اشخاص کو جن کے یہ حصے مقرّر ہیں ''اصحابُ الفروض'' کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ وہ ''بالقرآن'' ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا تعین از روئے قرآن نہیں ہوتا۔ اس کے لئے پھر سنت ہی کا دامن تھامنے کی ضرورت ہے۔

وہ حسب ذیل صورتیں ہیں:۔

(۱) دو یا اس سے زیادہ لڑکیاں ہیں میت کی، بس تو دو تہائی از روئے قرآن ان کو مل گئے۔ اب باقی ایک تہائی کیا ہوگا؟ اس کا قرآن مجید میں کوئی ذکر نہیں ہے لہٰذا یہ انہیں از روئے قرابت مل جائے گا۔ اس لئے کہ دوسرے ورثہ ان کے مقابلہ میں دور کے ہوں گے۔ ان کے ہوتے ہوئے انہیں میراث کے کسی جز کا بھی حق نہیں ہے۔

(۲) لڑکی بس ایک ہے تو نصف یعنی آدھا از روئے قرآن ملے گا اور باقی آدھا از روئے قرابت۔

(۳) جب اولاد نہ ہو اور ماں باپ ہوں اور بھائی موجود نہ ہوں تو ماں کو ایک ثلث بصورت فرض مل گیا۔ باپ کو کیا ملے گا؟ اس کا ذکر قرآن میں نہیں مگر ہے وہ طبقہ اولی میں ماں کے برابر ہی کا وارث لہٰذا ماں کو ثلث دینے کے بعد باقی دو تہائی مال پورا باپ کو دے دیا جائے گا بر بنائے قرابت۔

---

[1] ۔ظاھرہ الھذا ایدل علی ان الباقی لاب وفیہ اجماع (مجمع البیان)

[2] ۔العرب تسمیّ الاثنین بلفظ الجمع فی کثیر من کلامھم (مجمع البیان)

(۴) جب ماں باپ ہیں، اولاد نہیں ہے مگر میت کے بھائی موجود ہیں تو اب ماں کو ایک سدس ملتا ہے سدس سے زیادہ جتنا ہے وہ باپ کو مل جائے گا۔

(۵) ماں باپ ہیں اور ان کے ساتھ اولاد لڑکے اور لڑکیاں ہیں تو ماں باپ کے لئے سدسین ہیں اور باقی لڑکوں اور لڑکیوں پر اس طرح تقسیم ہو جائے گا کہ لڑکے کو دہرا اور لڑکی کو اکہرا دے دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر ماں کے ساتھ فقط لڑکے یا ایک لڑکا ہے تو وہاں بھی باقی سب اس لڑکے یا ان لڑکوں کو مل جاتا ہے۔ یہ بھی بر بنائے قرابت ہے کیوں کہ لڑکے کا کوئی خاص حصہ قرآن نے مقرر نہیں کیا ہے۔

(۶) ماں باپ کے ساتھ دو لڑکیاں ہوں، تب تو بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں، اس لئے کہ ایک ایک سدس ماں باپ کو مل گیا جس کا مجموعہ ایک تہائی ہوا اور ثلثین یعنی دو تہائیاں لڑکیوں کو مل گئیں لیکن اگر ماں باپ کے ساتھ ایک لڑکی ہو تو چھ میں سے دو سدس یعنی ایک ایک تو ماں باپ کو مل گیا اور نصف یعنی تین لڑکی کو مل گئے۔ اب ایک بچے گیا یہ کیا ہو؟ یہ انہی لوگوں پر ان کے حصص کے اعتبار سے تقسیم ہونا چاہیے یعنی پانچ حصے کر کے ایک ایک والدین کو دے دیا جائے اور تین لڑکی کو یہ بر بنائے قرابت ہے۔ فروض جواز روئے قرآن ثابت ہیں، ان میں شیعہ سنی کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے مگر یہ صورتیں جن میں فرض کے بعد کچھ مقدار بچتی ہے اور وہ بر بنائے قرابت دی جاتی ہے، ان میں فقہی حیثیت سے فرقہ جعفریہ اور دوسرے فرق کے درمیان اختلاف ہے مگر چونکہ یہ اختلاف مندرجہ قرآن مضامین سے متعلق نہیں ہے، اس کا طے کرنا تفسیر قرآن کے موضوع سے خارج ہے۔ فقہ کی استدلالی کتابوں میں طے کرنے کا ہے۔ اس لئے اس بحث کو یہاں درج کرنا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

''تم نہیں سمجھ سکتے کہ ان میں کون تمہارے لئے زیادہ فائدہ رساہے'' اس سے میری تو سمجھ میں یہ آتا ہے کہ چونکہ اس کے پہلے اولاد اور پھر ماں باپ، ان دونوں کی میراث کا ذکر ہے۔ اس لئے یہ فقرہ خود ان کے وارث ہونے سے متعلق ہے اور اس سے ایک بات تو یہ ظاہر ہوتی ہے کہ والدین اور اولاد ایک طبقہ میں ہیں اور بہ حیثیت استحقاق مساوی الدرجہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ مقدار حصہ میں جو ان کے فرق قرار دیا گیا ہے کہ اولاد ایک لڑکی ہو تو وہ نصف ضرور پا جاتی ہے اور دو سے زیادہ ہوں تو دو تہائی اور لڑکے لڑکیاں دونوں ہوں تو ماں باپ کو دے کر جتنا ہے، سب انہیں مل جائے گا اور ماں باپ دو چھٹے حصوں ہی کے مستحق ہیں، اس کے فلسفہ کی طرف اشارہ ہے کہ دین اور دنیا کے فوائد اس شخص کے جتنے بعد کی نسل سے وابستہ ہیں، اتنے پیش رووں سے وابستہ نہیں ہیں، اس لئے ان میں خالق نے یہ فرق قرار دیا ہے۔

اللہ ان میں جو فرق ہے، اس سے واقف ہے کیوں کہ وہ علیم ہے اور اسی کے مطابق حکم شرعی میں فرق قرار دیتا ہے کیوں کہ وہ حکیم ہے۔

مولانا عمار علی صاحب مرحوم نے اسے تمام ورثہ سے متعلق قرار دے کر یوں تشریح کی ہے کہ ''تم نہیں جانتے کہ وارثوں میں سے وہ کون سا ہے کہ جس کا نفع دنیا اور آخرت میں تم کو زیادہ پہونچتا ہے اور ہم جانتے ہیں، اس واسطے ہم نے حصوں میں تفریق کی ہے کہ کسی کو زیادہ پہنچایا ہے اور کسی کو کم پہنچایا ہے۔''.....(عمدۃ البیان)

اس میں بھی کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا مگر ملا محسن فیض نے اس کے مضمون کو پھیلا کر عجیب پیچیدہ طریقہ سے وراثت اور وصیت دونوں پر حاوی قرار دیتے ہوئے یوں تشریح کی ہے کہ:

یعنی لا تعلمون من انفع لکم من اصولکم و فروعکم و عاجلکم و اجلکم ممّن یورثکم و یرثکم امّن اوصیٰ منهم فعرّضکم للتواب بامضاء وصیة امن لم یوص فوقر علیکم ماله اومن اوصیتم له فوفر تم علیه

ام من لم توصوا له فحرمتموہ (صافی)

مقصد یہ ہے کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے اصول (ماں باپ وغیرہ) اور فروغ (اولاد) میں سے جن کی میراث تم پاتے ہو اور جو تمہاری پاتے ہیں یا ان میں جو وصیت کر جاتے ہیں اور تمہیں اس وصیت کو پورا کرنے سے ثواب آخرت فراہم کرتے ہیں یا جنہوں نے وصیت نہیں کی اور اس طرح تمہارے لئے مال آزادی سے استعمال کے لئے چھوڑ دیا یا جس کے لئے تم نے وصیت کی تو مال اس کے لئے فراہم کر دیا یا تم نے اس کے لئے وصیت نہیں کی تو وہ محروم ہو گیا۔

یہ طویل الذیل تفصیل الفاظ قرآنی سے میرے ذہن میں نہیں آتی۔ ہاں اگر کوئی حدیث بتا دیتی کہ اس سے یہ مقصود ہے تو سر تسلیم خم ہو جاتا مگر یہاں صاحب تفسیر صافی نے حدیث کوئی پیش نہیں کی ہے۔

علامہ طبرسیؒ کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ یہ جملہ ہمیشہ آماجگاہ نظر بنا رہا ہے چنانچہ قدیم مفسرین کے پانچ قول انہوں نے اس کے متعلق بیان کیے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی کسی معصوم کی طرف نسبت نہیں رکھتا تا کہ اس کا وزن محسوس ہو۔

وَ لَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

''اور تمہارے لئے آدھا ہوگا اس متروکہ کا جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں اگر ان کے اولاد نہ ہو لیکن اگر ان کے اولاد ہو تو تمہارے لئے ان کے متروکہ کا چوتھائی ہوگا، بعد اس وصیت کے جو انہوں نے کی ہو یا قرضہ کے اور ان کے لئے چوتھائی ہوگا تمہارے متروکہ سے اگر تمہارے اولاد نہ ہو اور اگر تمہارے اولاد ہو تو ان کے لئے تمہارے متروکہ کا آٹھواں حصہ ہوگا، اس لئے وصیت کے بعد جو تم نے کی ہو یا قرضہ کے اور اگر کسی مرد یا عورت کے وارث مادری بھائی بہن ہوں تو ان میں جو کوئی ایک ہو، اسے چھٹا حصے ملے گا اور اگر ایک سے زیادہ ہوں تو وہ تہائی متروکہ میں برابر کے حصہ دار ہوں گے، بعد اس وصیت کے جو کی گئی ہو یا قرضہ کے درانحالیکہ نقصان پہنچانے کا در پے نہ

ہو۔ یہ اللہ کی طرف کی لازمی ہدایت ہے اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، برداشت سے کام لینے والا۔''

شوہر اور زوجہ کی میراث

سابقہ فرائض سے ماوراء اس آیت میں بھی فرائض کا بیان ہے جن میں ایک قسم سببی ہے یعنی ازدواجی تعلق سے جو رشتہ پیدا ہوتا ہے اور دوسری قسم نسبی ہے یعنی خون کا رشتہ۔

پہلی قسم میں چار مسئلے ہیں:۔

(۱) زوجہ مرجائے اور اس کے کوئی اولاد لڑکا یا لڑکی نہ ہو تو شوہر کو نصف متروکہ ملے گا۔

(۲) زوجہ کا انتقال ہوا اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو، نہ لڑکا نہ لڑکی، نہ اس شوہر سے، نہ کسی پہلے شوہر سے تو اس صورت میں شوہر کو چوتھائی ملے گا۔

(۳) شوہر مرجائے اور اس کے کوئی اولاد، لڑکا یا لڑکی موجود نہ ہو۔ نہ اس بیوی سے، نہ کسی اور سے تو، بیوی کو چوتھائی ملے گا۔

(۴) شوہر کا انتقال ہوا اور اس کے اولاد ہو، خواہ کسی اور بیوی سے تو اس صورت میں بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا۔

اب یہاں ایک چیز فقہ امامیہ کے منفردات میں سے ہے اور وہ یہ کہ زوجہ کو زمین میں سے بالکل حصہ نہ ملے گا اور زمین کے علاوہ جائداد غیر منقولہ جیسے عملہ مکانات اور اشجار وغیرہ، اس میں بھی اصل جائداد سے حصہ نہیں ملے گا مگر قیمت کا حساب لگا کر اس کا چوتھا یا آٹھواں حصہ دیا جائے گا۔ بے شک نقد یا جنس، اشیائے منقولہ جتنے ہوں، اس میں حصہ پائے گی۔

میراث ازواج میں بحث طلب مسئلہ

یہ تفصیل قرآن سے نہیں، سنت یعنی احادیث سے ثابت ہے۔ دوسرے حلقوں سے کہا جاتا ہے کہ یہ حکم قرآن کے خلاف ہے اور یہ مسلم اصول ہے کہ احادیث قرآن کے خلاف کسی بات کے بارے میں مستند نہیں سمجھے جا سکتے مگر ہم کہتے ہیں کہ بکثرت نظائر کو چھوڑتے ہوئے ذرا صرف گزشتہ آیت میں جو باتیں باجماع امت سنت کے رو سے ثابت ہیں، انہیں ملاحظہ فرمائیے، ان کی کیا نوعیت ہے؟

(۱) قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو ان کے لئے دو تہائی ترکہ ہوگا، اجماع امت یہ ہے کہ اگر دو ہیں تو بھی یہی حکم ہے۔

(۲) قرآن کہہ رہا ہے کہ لڑکیوں کو اگر کئی ہوں تو ثلثین ملیں گے؟ باقی ثلث کیا ہوگا؟ قرآن اُسے نہیں بتاتا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ ثلث بھی انہی لڑکیوں پر بطور قرابت رد ہو جائے گا۔ جمہور کہتے ہیں کہ میت کے عصبہ یعنی باپ کے رشتہ داروں کو جو صنف ذکور سے ہوں، وہ دے دیا جائے گا۔ قرآن میں صراحۃً نہ اس کا ذکر ہے، نہ اس کا۔

(۳) اسی طرح جب ایک لڑکی ہو تو قرآن کہہ رہا ہے کہ نصف ملے گا، نصف کیا ہوگا؟ اسے کچھ نہیں بتاتا ہم کہتے ہیں کہ اسی لڑکی کو بطور مدد ملے گا۔ دوسرے کہتے ہیں کہ عصبہ کو مل جائے گا۔

(۴) اگر ماں باپ ہوں اور اولاد موجود نہ ہو تو قرآن بس اتنا کہہ رہا ہے کہ ماں کو تہائی ملے گا۔ باپ کا کوئی ذکر نہیں، اجماع امت کہتا

ہے کہ باقی جتنا ہے، وہ سب باپ کو ملے گا۔ اسی طرح اگر بھائی موجود ہوں تو قرآن میں ہے کہ ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور باپ کو کیا؟ کوئی ذکر نہیں، اجماع امت یہ ہے کہ باقی سب باپ کو مل جائے گا۔

تو یہ سب احکام کیا خلاف قرآن ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ مخالفت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کوئی حکم قرآن میں مذکور ہو اور حدیث اس کے خلاف بتلائے تو یہ حدیث قابل قبول نہیں ہے، رد کر دی جائے گی لیکن کسی چیز کا قرآن میں ذکر نہیں اور حدیث نے اس کا حکم بتا دیا یا قرآن میں اجمالی ذکر ہے اور حدیث نے اس کے قیود و شرائط تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے، اس کو مخالفت نہیں کہتے اور حدیثوں کو جو ہم قرآن کے ساتھ ماخذ احکام مانتے ہیں، وہ اسی صورت سے مذکورہ بالا تمام احکام کی نوعیت یہی ہے۔

مثلاً قرآن نے اگر یہ کہا ہوتا کہ لڑکیاں دو ہوں، اس سے زیادہ نہ ہوں تو انہیں ثلثین نہیں ملیں گے تب یہ حکم دو کو بھی ثلثین ملیں گے، قرآن کے خلاف ہوتا مگر قرآن نے کہا کہ ایک ہو تو نصف ملے گا اور دو سے اوپر ہوں تو ثلثین ملیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دو کا حکم مسکوت عنہ رہ گیا یعنی اس کے لئے قرآن کی لفظوں نے بظاہر کچھ نہیں کہا۔ حدیث نے اسے بتا دیا کہ دو کا بھی حکم وہی ہے جو دو سے زیادہ کا ہے۔ اسی طرح لڑکیوں کو ثلثین دینے کے بعد باقی ثلث اور ایک لڑکی کو نصف دینے کے بعد باقی نصف اور ماں کے ثلث یا سدس کے بعد باپ کا حصہ، قرآن میں مسکوت عنہ ہے لہٰذا حدیث سے اس کے حکم کا استفادہ ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے۔ اسے قرآن کی مخالفت نہیں سمجھ سکتے۔

اسی طرح یہ ہے کہ اگر قرآن نے کہہ دیا ہوتا کہ زوجہ کو ہر طرح کے مال سے چاہے وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ، یہ حصہ ملے گا تو اب کسی حدیث کے رو سے کسی مسلمان میں دم نہیں تھا کہ وہ اس حکم کے خلاف کوئی فتویٰ دے سکتا مگر قرآن مجید کو یہاں حصے بیان کرنا ہیں۔ اس کا بیان کرنا نہیں ہے کہ کس کس طرح کے مال میں زوجہ کا حصہ ہوگا۔

بے شک جہاں بھی اس کا حصہ ہے، وہ یہی ہوگا جسے قرآن نے بیان کیا ہے مگر یہ کہ کن صورتوں میں اس کا حصہ ہے؟ اس کو قرآن نے مجمل چھوڑ دیا ہے۔ احادیث نے اس کی تشریح کر دی کہ یہ حصہ جائداد منقولہ میں ہوتا ہے۔ غیر منقولہ میں نہیں ہوتا۔ تو اسے اجمال قرآن کی تفصیل سمجھنا چاہیے۔ مخالف قرآن سمجھنا اس کو غلط ہے۔

دوسری قسم کا حکم جو نسبی رشتہ سے متعلق اس آیت میں بیان ہوا ہے، وہ کلالہ کا ہے کلالہ کی لفظ قرآن مجید میں دوسری جگہ حقیقی (جن کے ماں باپ دونوں ایک ہوں) ان دونوں قسم کے بھائیوں کے لئے آئی ہے مگر یہاں جو حکم مذکور ہے، وہ معصومینؑ کی تشریح کی بنا پر اخیافی بھائی بہنوں کا ہے یعنی وہ سوتیلے بھائی بہن جن کی ماں ایک ہو اور باپ الگ الگ ہوں۔ [1]

حقیقت یہ ہے کہ کہلاتے یہ سب کلالہ ہیں، صرف اضافت سے ان کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ ایک کو کہیں گے الکلالۃ للابوین، ایک کو کہتے ہیں للاب اور ایک کو کہتے ہیں للام۔

اب یہاں اضافتوں کی تعین کہ کس جگہ کون سے کلالہ مراد ہیں بیان حاملین قرآن سے ہوتی ہے، ورنہ صرف الفاظ قرآنی پر کوئی دار و مدار

---

[1] ۔فسرت فی الکافی عن الصادقؑ بمن لیس بولد ولا والد ای القریب من جهة العرض لاالطول والمرادبها هنا الاخوة والاخوات من الام خاصة وفیا لایة الاخری من الاب والام او الاب فقط کذا عن المعصومین (صافی)

رکھے تو دونوں جگہ کے بیان شدہ حکموں میں معاذ اللہ اختلاف نظر آئے۔

بہرصورت اس آیت میں حکم جو بیان ہوا ہے، وہ کلالۃ الام کا ہے کہ اگر ایک ہو تو سدس ملے گا اور ایک سے زیادہ ہوں تو ثلث ملے گا، اس طرح کہ مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہ ہوگی بلکہ ایک ثلث سب پر برابر سے تقسیم کر دیا جائے گا۔

وصیت وقرض میراث سے مقدم

گزشتہ آیات میں جو حصے بیان ہوئے اور اس آیات میں جو حصے، ان سب میں یہ قید لگائی ہے کہ یہ حصے وصیت یا قرضے کے بعد ہوں گے۔

اب یہاں بھی قرآن نے لفظ وصیۃ مجمل کہی ہے۔ احادیث سے اس کی تفصیل معلوم ہوئی ہے کہ وصیت ثلث تک اگر ہو تو اس میں ورثہ کو کوئی اختیار نہیں ہے لیکن اگر ثلث سے زیادہ ہو تو وہ رضائے ورثہ پر موقوف ہوگی۔

اس آیت میں وصیت اور قرضہ کے حکم کے ساتھ جو ایک قید ہے کہ ''وہ وصیت نقصان پہنچانے والی نہ ہو'' اس سے مجملاً یہ پتہ چلتا ہے کہ بعض وصیتیں نا قابل قبول ہوتی ہیں۔ اب اس اجمال کو اس تفصیل پر بھی منطبق کر سکتے ہیں کہ ثلث سے زیادہ جو وصیت ہو، وہ چونکہ حقوق ورثہ کو بہت نقصان پہنچاتی ہے لہٰذا نا قابل قبول ہے اور اس کے علاوہ خاص طور پر ورثہ کو ضرر پہنچانے والی کوئی دوسری وصیت ہو۔ وہ بھی مراد ہو سکتی ہے۔[1]

وصیۃ من اللہ اسے نحوی قواعد کے لحاظ سے ان تمام سابق احکام میراث کے بیان سے بھی متعلق کیا جا سکتا ہے اور خاص حکم وصیت سے بھی اور آخر میں اس کے اس جز سے بھی کہ نقصان پہنچانے کا سبب نہ ہو۔

یہ اللہ کی طرف کی وصیت یعنی ہدایت ہے۔[2]

اب یہ ہدایتیں خالق کی چونکہ الزامی حیثیت رکھتی ہیں یعنی ان کی مخالفت جائز نہیں ہے، اس لئے تتمہ آیت میں ایک لفظ رکھ دی جو در صورت مخالفت ان کے غضب الٰہی کے مستوجب ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ سب جانتا ہے مگر وہ حلیم یعنی برداشت سے کام لینے والا ہے۔[3]

حلم یعنی برداشت کی لفظ اسی چیز کے ماقبلہ میں صرف ہوتی ہے جس میں تقاضا ناراضگی اور سزا کا موجود ہو۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

---

[1] ۔غیر مضار للورثۃ بالزیادۃ علی الثلث او ان یقصد الاضرار بہا (صافی)

[2] ۔وصیۃ نصب علی المصدر ای یوصیکم اللہ بذلک وصیۃ (مجمع البیان)

[3] ۔علیم بالمضار وغیرہ حلیم لا یعاجل بعقوبۃ (صافی)

وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۚ﴿۱۴﴾

''یہ اللہ کی طرف کی حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرے تو وہ اسے ان بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کردہ حدوں سے قدم آگے بڑھائے گا، اسے وہ بڑی ہولناک آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔''

ان دو آیتوں میں جو وعدہ وعید ہے، ان میں وعدہ ان مومنین کے لئے ہے جو اطاعت گزار ہیں۔ اب اس کے مقابلہ میں جو وعید ہے وہ کافروں کے لئے اگر ہو تو بالکل صاف ہے کہ کافر و مشرک بیشک مخلد فی النار ہیں لیکن الفاظ آیت یہ ہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی اور اس کے حدود سے تجاوز کرے، جو مطلق گناہ پر صادق ہیں، ایسے گناہوں پر جن کی سزا خلود جہنم نہیں ہے۔

اس بنا پر جیسا کہ دوسرے آیات واحادیث سے ثابت ہے، اس میں یہ قید سمجھانا گزیر ہے کہ ان حدود سے تجاوز کرے جن کی مخالفت کی سزا آتش جہنم اور خلود فی النار ہے تو اس کے لئے یہ سزا ہوگی ورنہ جس درجہ تک حدالٰہی سے تجاوز کرے گا اس درجہ کی سزا پائے گا یا پھر حد سے تجاوز کو عمل کے علاوہ اعتقاد پر حاوی قرار دیا جائے جو انکار مانزل اللہ میں داخل ہو اور کفر قرار پائے۔ [1]

ایک تیسرا پہلو یہ پیدا کیا گیا ہے کہ من یتعد حدودہٗ ''جو اس کے حدود سے تجاوز کرے۔'' اس میں حدود کے لفظ جمع ہے اور اضافت کے ساتھ جمع استغراق کے معنی پیدا ہوتے ہیں یعنی اللہ کی تمام حدوں سے تجاوز کرے اور ایسا شخص کافر ہی ہوسکتا ہے۔ مومن نہیں ہوسکتا۔ [2]

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کریں [3] تو ان پر اپنوں سے چار کی گواہی حاصل کرو، اگر وہ گواہی دے دیں تو انہیں گھروں میں روک رکھو اس وقت تک کہ موت ان کی عمر کو پورا کرے یا ان کے لئے اللہ کوئی صورت پیدا کرے۔''

ہر دعوے کا ثبوت دو گواہوں سے ہوتا ہے مگر یہ ناموس کا معاملہ اور بدچلنی کا الزام اتنا سخت ہے کہ بغیر چار گواہوں کے ثابت نہیں ہوتا۔

---

[1] ۔ اگر حلال کو حرام جانتا ہے اور حرام کو حلال جانتا ہے (عمدۃ البیان)

[2] ۔ المراد بہ من تعدّی جمیع حدود اللہ وھذہ صفۃ الکفار (مجمع البیان)

[3] ۔ اجمعوا علیٰ ان المراد بالفاحشۃ ھنا الزنا (مجمع البیان)

جنسی جرم کے ثبوت کے لئے چار گواہوں کی ضرورت

ظاہر ہے کہ اس عورت کی بدچلنی اور بے باکی کی حد ہی نہیں اور وہ سماج کے لئے کیسی زہر قاتل ہے جو ایسے جرم کا ارتکاب اتنے آدمیوں کے سامنے کرے کہ چار چشم دید گواہ اور وہ بھی عادل، اس کے جرم کے ثبوت میں پیش ہوسکیں۔ پھر ایسی عورت کو بداخلاقی سے روکنے یا کم از کم سماج کو اس کے اثرات سے بچانے کے لئے اگر یہ سختی کی جائے تو کیا وہ بے محل سمجھی جاسکتی ہے؟

احادیث معصومین علیہم السلام سے ثابت ہوتا ہے کہ زانیہ کے لئے یہ قید عمری اور اس کے بعد کی آیت والی سزا ابتدائے اسلام میں رکھی گئی تھی مگر بعد میں جب وہ آیت نازل ہوگئی کہ:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ۔

زنا کار عورت اور زنا کار مرد، ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

تو وہ پہلا حکم جو آیندہ کی آیت میں مذکور ہے، منسوخ قرار پا گیا اور اس کے بعد یہی سو سو کوڑے مارنے کا حکم ہوگیا بشرطیکہ زنائے محصنہ نہ ہو [1] اور زنائے محصنہ کی صورت میں سنگسار کرنے کا قانون جاری ہوگیا جس کا حکم قرآن میں ظاہر موجود نہیں مگر باجماع امت ثابت ہے۔

ایک دوسرا تصور یہ ہے کہ اس دوسرے قانون کے نفاذ کے بعد بھی پہلی آیتوں کو منسوخ سمجھنا ضروری نہیں ہے۔ اس لئے کہ پہلے یہ گھروں میں روکنے کا جو حکم دیا گیا ہے کہ وہ دائمی کب ہے؟ اس میں تو یہ حد بندی ہے کہ ان کی زندگی کا خاتمہ ہوجائے یا اللہ ان کے لئے کوئی دوسری صورت پیدا کرے۔ وہ دوسری صورت یہاں بیان نہیں کی گئی۔ وہ اس کے بعد معلوم ہوئی جب اس جرم کی حد شرعی کو بیان کر دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ اس حد شرعی کے بعد انکے بند رکھے جانے کا سوال ختم ہوجاتا ہے تو ناسخ اور منسوخ تو وہاں ہوتا ہے جہاں دونوں حکم ایک دوسرے کے خلاف ہوں اور یہاں ایسا نہیں ہے بلکہ ایک حکم کے اجمال کی تشریح دوسرے حکم سے ہوجاتی ہے تو اسے نسخ کے تحت میں کیوں داخل کیا جاتا ہے۔ [2]

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝۱۶

''اور وہ دو شخص تم میں سے جو ایسا کریں تو انہیں تکلیف پہنچاؤ۔ اب اگر وہ توبہ کریں اور اپنے عمل کو ٹھیک کرلیں تو انہیں چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

یہ ان مرد اور عورت کا حکم ہے جو غیر شادی شدہ ہوں یعنی کوئی بھی ان میں کا زنائے محصنہ کا مرتکب نہ ہوا ہو جس کی شرعی سزا ہے سنگ سار کیا جانا لیکن اگر مرد ایسا ہے کہ اس کے کوئی بیوی نہیں ہے اور عورت بھی ایسی ہے کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے تو اس کے سنگ سار کیے جانے کا حکم نہیں

---

[1] ۔ هذا الاية والتي بعدها منسوختان بآية الزانية والزاني (صافي)

[2] ۔ قال بعضهم انه غير منسوخ لان الحبس لم يكن مويدا بل كان مستندا الى غاية فلا يكون بيان الغاية نسخا (مجمع البيان)

ہے۔انہیں بس تکلیف پہنچانا چاہیے۔تکلیف کا مطلب لیا گیا ہے لعنت ملامت کرنا کہ انہیں احساس جرم پیدا ہوا۔اس لئے اس آیت کو بھی منسوخ قرار دیا گیا ہے اس معین حد شرعی کی وجہ سے جو اس کے بعد سورہ نور میں وارد ہوئی جس میں زانی عورت اور مرد دونوں کو یکساں حکم یہ ہے کہ:۔

فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ:

ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

مگر یہاں بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن نے یہاں ایذاء کا حکم مجمل دیا ہے اور اس ایذاء کی تفصیل وتعیین سورہ نور میں ہوئی ہے تو یہ بھی نسخ میں داخل نہیں ہے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَأُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّيْ تُبْتُ الْئٰنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ أُولٰٓئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

''توبہ کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ بس ان کے لئے ہے جو برائی کرتے ہیں نادانی سے [1] پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔یہ ہوتے ہیں جن کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے اور اللہ بڑا جاننے والا ہے،صحیح کام کرنے والا اور ان کے لئے توبہ نہیں ہے جو برائیاں کرتے رہتے ہیں۔یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی ایک کے سر پر موت آ کے کھڑی ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اس وقت میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان کے لئے جو مرتے ہیں اس حالت میں کہ وہ کافر ہیں۔یہ وہ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے۔''

وہ جن کی توبہ قبول نہیں

یہ آیتیں بڑی ہمت شکن ہیں۔وہ کہ جو کفر کی حالت میں دنیا سے جائیں،ان کی توبہ قبول نہیں،یہ تو بالکل مطابق توقع ہے،اس لئے کہ ایمان ہر عمل کی قبولیت کی لازمی شرط ہے اور توبہ بھی ایک عمل ہے لہٰذا کافر کفر سے توبہ کرے تو پھر وہ کافر ہی کہاں رہے گا اور قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ وہ حالت کفر میں دنیا سے جا رہے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کفر سے وہ توبہ کرتے نہیں۔کچھ اور غلطیوں اور گناہوں سے توبہ کرتے ہیں تو اس توبہ سے کوئی فائدہ ہونا ہی نہ چاہیے مگر اسے تو قرآن مجید نے صراحۃ الگ سے ذکر

کیا تو اس کے پہلے جنہیں کہا گیا ہے کہ توبہ قبول نہیں،وہ وہ ہیں جو دائرہ اسلام وایمان میں داخل ہیں،اس کے باوجود جب انہوں نے

---

[1] ۔متبلسین بها سفها فان ارتكاب الذنب والمعصية سفه وتجاهل (صافی) هو المروی عن ابی عبدالله فانه قال كل ذنب عمله العبد وان كان عالما فهو جاهل حين خاطر بنفسه فی معصية ربه (مجمع البيان)

بالکل آخر وقت توبہ کی تو قرآن کہہ رہا ہے کہ ان کی توبہ قبول نہیں۔[1] نعوذ باللہ من ذلك

بعض مفسرین نے بس ایک گنجائش نکالی ہے اور وہ جمع بین الادلہ کے لحاظ سے شاید بعید نہ ہو کہ یہاں جس چیز کی نفی کی جارہی ہے وہ قبول توبہ کا وجوب ہے جو علی اللہ کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے یعنی ''توبہ کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ بس ان کے لئے۔''..... ''ذمہ'' کا مطلب ہے لازماً توبہ قبول کرنا۔ اسے کہا گیا ہے کہ یہ بس ان کے لئے ہے جو جلدی توبہ کرلیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسری صورت میں تفضلا بھی توبہ قبول کرنا غیر ممکن ہو بلکہ اللہ کا فضل وکرم شامل حال ہو تو وہ آخر وقت بھی توبہ کرسکتا ہے۔ اس کے رحم وکرم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔[2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝۱۹

اے ایمان لانے والو! تمہارے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بنو اور نہ ان پر سختی کرو تاکہ تم کچھ حصہ اس کا جو تم نے اُنہیں دیا ہے، لے اڑو سوا اس صورت کے جب وہ کھلی ہوئی غلط کاری کریں اور ان کے ساتھ زندگی گزارو بھلائی کے ساتھ۔ اگر تم انہیں ناپسند بھی کرتے ہو تو بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور اللہ اس میں بہت بھلائی قرار دے۔''

زمانہ جاہلیت کے ایک رسم کی ممانعت

آیت کا مضمون صاف بول رہا ہے کہ اس کی کوئی خاص شان نزول ہے۔ اس شان نزول سے یہ پتہ چل سکے گا کہ زبردستی وارث بننے سے مقصود کیا ہے؟ یہ سختی کرنا کیا ہے جس سے غرض یہ ہے کہ کچھ حصہ جو انہیں دیا ہے، اسے لے اڑے اور یہ ناپسندیدگی کون سی ہے جس میں ممکن ہے کہ اللہ نے بھلائی مضمر کی ہو؟

روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ کسی شخص کے انتقال کے بعد اگر اس کی بیوہ ہے اور کوئی دوسرا وارث ہو خواہ وہ بیٹا ہو تو وارث اس عورت کی میراث کی طمع میں شوہر کے بعد خود اس کے سر پر کپڑا ڈال دیتا تھا کہ یہ اب میری زوجہ ہے اور اس طرح اسے اپنی بیوی کہہ کر اسے گھر میں بند کر کے رکھتا تھا اور خود اس کے لئے کوئی مہر بھی معین نہیں کرتا تھا بلکہ جو مہر اس مورث نے دیا تھا، اسی میں اس کے دیگر

---

[1] ۔اس آخر وقت میں توبہ اس واسطے قبول نہیں ہوتی کہ جس وقت روح گلے میں پہونچتی ہے، اس وقت وہ تکلیف شرع سے باہر ہوجاتا ہے اور آخرت میں قدم رکھتا ہے۔ (عمدۃ البیان)

[2] ۔وجوب القبول غیر التفضل به (صافی)

متروکہ کے مثل یہ اس عورت کا وارث بھی قرار پاجاتا تھا۔ اسی کو اس آیت میں روکا ہے۔[1]

ایک روایت میں یہ ہے کہ خود دور اسلام میں ایسا واقعہ پیش آیا۔ ابوقیس بن اسلت ایک صحابی کے انتقال کے بعد اور اس شان نزول کی روایت بھی معصومؑ سے وارد ہوئی ہے۔[2]

اب اس کے بعد جو ہے: ولا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما اتیمتوھن ''اور ان پر سختی کرو، تاکہ کچھ حصہ اس کا جو تم نے انہیں دیا ہے لے اڑو'' اسے بعض لوگوں نے اس حکم کا تتمہ قرار دیا ہے اور اس صورت میں سختی کرنے سے مراد ان کو عقد ثانی سے روکنا ہے مگر ذہن سے زیادہ قریب یہ چیز ہے اور وہ معصوم سے مروی بھی ہے کہ آیت کا پہلا جز تو اسی صورت سے متعلق ہے اور دوسرا جز، وہ شوہروں کو خود ان کی بیویوں کے متعلق ہدایت ہے اور اب لا تعضلوھن کا مطلب یہ ہے کہ ان پر سختی نہ کرو کہ وہ اس مہر کو جو تم نے انہیں دیا ہے، کل یا جز تمہارے سپرد کردیں۔[3]

اس کے بعد الا ان یاتین بفاحشتہ مبینۃ اس صورت کے کہ جب وہ کھلی ہوئی غلط کاری کریں'' جو کہا گیا ہے، اس اک مہر سے تعلق نہیں ہے بلکہ سختی کرنے سے جو ممانعت ہوتی ہے، بظاہر یہ اس سے استثناء ہے کہ واپس لینے کے لئے تو سختی نہ کرو۔ ہاں اگر وہ غلط کاری کی مرتکب ہوں تو سختی کرو جس کا حق اس کے قبل کی ایک آیت میں بھی دیا جاچکا ہے۔

پھر عام شوہروں کے لئے ہدایت ہے کہ جب عورت میں کوئی بدچلنی والی صورت نہیں ہے تو ان سے اچھے عنوان اور حسن سلوک کے ساتھ[4] زندگی گزاروں۔ اگر تمہارا دل ان سے نہیں بھی ملتا ہے، تب بھی اس کا اثر بدسلوکی کی شکل میں نمودار نہیں ہونا چاہیے اور نہ طلاق دے کر چھٹکارا حاصل کرنا کوئی اچھی بات ہے اس لئے کہ ممکن ہے اللہ نے ان میں تمہارے لئے بڑی بھلائی رکھی ہو جس کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اللہ نے انہی سے تمہارے لئے اولاد صالح مقدر فرمائی ہو۔

وَاِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّکَانَ زَوۡجٍ ۙ وَّاٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰىهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَیۡـًٔا ؕ اَتَاۡخُذُوۡنَهٗ بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۲۰﴾ وَ کَیۡفَ تَاۡخُذُوۡنَهٗ وَقَدۡ اَفۡضٰی بَعۡضُکُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ وَّاَخَذۡنَ مِنۡکُمۡ مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا ﴿۲۱﴾

''اور اگر تم ایک بیوی بدل کر اس کی جگہ دوسری بیوی کرنا چاہو[5] اور تم نے ان میں سے ایک کو بڑی رقم بھی دے

---

[1] ۔القمی عن الباقرؑ کان فی الجاھلیۃ اذا مات حمیم الرجل وله امراۃ القی الرجال ثوبه علیھا فورث نکاحھا بصداق حمیمه الذی کان اصدقھا یرث نکاحھا کما یرث ماله (صافی)

[2] ۔عن مقاتل وھو المروی عن ابی جعفرؑ (مجمع البیان)

[3] ۔العیاشی من الصادق قال الرجل تکون له امرأۃ فیضر بھا حتی تفتدی منه فنھی اللہ عن ذلك (صافی)

[4] ۔بالانصاف فی الفعل والاجمال فی القول (صافی)

[5] ۔تطیق امراۃ و تزویج اخری (صافی)

دی ہو [1] تو اُس میں سے کچھ لو نہیں کیا تم اُسے لوگے جھوٹا الزام لگا کر اور کھلے ہوئے گناہ کے طور پر؟ اور کیوں کر تم اسے لوگے جب کہ تم میں سے ایک دوسرے کی مقاربت سے لطف اندوز بھی ہو چکا ہے [2] اور وہ تم سے پورا پورا عہد و پیمان لے چکی ہیں۔''

یہ بھی ایک دور جاہلیت کی حرکت تھی کہ کسی شوہر نے ایک خوبصورت عورت کو دیکھ لیا اور اس کا دل اس پر آ گیا تو اب وہ اپنی زوجہ پر بدکاری کا الزام لگا دیتا تھا اور اسے اتنا ستاتا تھا کہ وہ اپنا مہر چھوڑ دے اور یہ اسے طلاق دے دے۔ اس کو روکتے ہوئے ارشاد ہو رہا ہے کہ ایک عورت کو طلاق دیدینے کا تمہیں حق ہے مگر مہر اس کا چاہے، بہت زیادہ بھی ہو، وہ اسے دینا بہر حال لازم ہے۔ اس کے ہتھیانے کی کوشش غلط ہے اور بہت بڑا گناہ ہے۔ اگر مباشرت نہ ہو اور طلاق دیا جائے تو مہر اس صورت میں آدھا رہ جاتا ہے لیکن جب مباشرت ہو جائے، تب تو ایک ایک پائی مہر ادا ہونا ضروری ہے اور اب اس میں شوہر کی طرف سے کمی کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اسی کو قرآن مجید نے کہا ہے کہ معاہدہ پورا ہو چکا یعنی عقد ہوا اور اس کے بعد مباشرت بھی واقع ہو گئی [3] تو اب تم مہر کا کوئی ایک جز بھی نہیں روک سکتے۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾

''اور عورتوں میں سے ان سے شادی نہ کرو جن میں تمہارے باپ دادا تصرف از دواجی کر چکے ہوں، سوا اس کے جو پہلے ہو چکا۔ یہ بڑا ہی سخت گناہ ہے اور ناراضگی کی بات اور بہت برا طریقہ ہے۔''

سوتیلی ماؤں کی حرمت

یہ سوتیلی ماؤں سے عقد کی ممانعت ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا۔

''سوا اس کے جو پہلے ہو چکا'' کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عقد جو پہلے ہو چکا، اب بھی قائم رہے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ پہلے جو ہوا وہ ہوا۔ وہ تو اب خارج از بحث ہے لیکن اب ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ [4]

اور اس کا بتانا بھی مقصود ہو سکتا ہے کہ جو پہلے یعنی زمانہ جاہلیت میں اسلام لانے کے پہلے ہو چکا ہے، اس کی سزا اب نہیں ہوگی [5] کیوں کہ الاسلام یجبب ما قبلہ اسلام پہلے کے سب گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ از سر نو ایک زندگی ہے جو انسان کو ملتی ہے جس میں اب اپنے فرائض کا خیال رکھنا لازمی ہے۔

---

[1] ۔ای مالا کثیرا (مجمع البیان)

[2] ۔القمی الافضآء المباشرۃ (صافی)

[3] ۔فی الکافی والعیاشی عنہ المیثاق ھی الکلۃ التی عقد بھا النکاح والغلیظ ھو ماء الرجل یفیضہ الیھا (صافی)

[4] ۔الا ما قد سلف استثنائے منقطع ہے، اس واسطے کہ استثناء ماضی کا مستقبل سے جائز نہیں ہے (عمدۃ البیان)

[5] ۔استثنآء من لازم النھی فکانہ قیل تستحقون العقاب بذلک الا ما قد سلف فی الجاھلیۃ فانکم معذورون فیہ (صافی)

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ز فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ز وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ لا وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

''تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خلائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں اور وہ تمہاری مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری خوشدامنیں اور تمہاری پرورش میں آنے والی تمہاری ان بیویوں کی لڑکیاں جن سے تم نے مقاربت کی ہے لیکن اگر ان کے ساتھ تم نے مقاربت نہیں کی ہے تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اور بیویاں تمہاری صلبی اولاد کی اور یہ کہ تم دو بہنوں کو اکٹھا کرو مگر جو ہو چکا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

کن عورتوں سے شادی کرنا حرام ہے

اس میں محرم عورتوں کی فہرست ہے جن سے کبھی شادی نہیں ہوسکتی۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا حکم ''جمع بین الاختین'' کا بھی ضمناً بتادیا گیا ہے یعنی ایک وقت میں دو بہنوں کے ساتھ تعلقات ازدواجی قائم نہیں کیے جاسکتے۔ ہاں جب ایک بہن کا انتقال ہوجائے یا اسے طلاق دیدے، تب عدہ کے بعد دوسری سے نکاح کرسکتا ہے اس لئے یہ سالی محرم نہیں ہے، کیوں کہ محرم تو وہ ہے جس کے ساتھ کبھی شادی نہ ہوسکے۔

جمع بین الاختین کی ممانعت کے ساتھ جو ہے:۔ الا ما قد سلف ''مگر جو ہو چکا'' اس کا مفہوم بھی وہی ہے جو سوتیلی ماؤں کے ساتھ نکاح کی ممانعت کے ذیل میں بیان ہوا یعنی قبل اسلام جو ہوا، اس کی سزا اب نہیں ملے گی۔ نہ یہ کہ وہ عقد اب بھی برقرار رہے گا۔ [1]

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ج كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ج وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ط

---

[1] ۔فانه مغفور (صافی) ولیس المراد به ان ما سلف حال النهی یجوز استدامة بلا خلاف (مجمع البیان)

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○

''اور عورتوں میں جو شوہر دار ہوں، سوا اس کے جو تمہاری ملکیت میں آتی ہوں۔ یہ اللہ کی طرف کی تم پر لازمی پابندی ہے اور اس کے علاوہ تم پر حلال ہیں کہ تم اپنے اموال سے ان کے ساتھ شادی کرلو پاک دامنی قائم رکھتے اور بدکاری سے بچتے ہوئے تو ان میں سے جس کے ساتھ تم متعہ کرو تو ان کی اجرتیں جو مقرر ہوں ادا کردو اور کوئی حرج نہیں کہ اسے مقررہ مقدار کے بعد پھر تم آپس میں کوئی سمجھوتہ کرو، یقیناً اللہ جاننے والا ہے صحیح کام کرنے والا۔''

جن عورتوں کے ساتھ نکاح حرام ہے، ان میں پہلی فہرست جو تھی وہ محرم عورتوں کی تھی، ان کے ساتھ ابدی طور پر شادی کا امکان نہیں۔ اب اس ذیل میں نامحرم عورتوں میں سے جن کے ساتھ اس وقت عقد نہیں ہوسکتا، ان کا ذکر شروع ہوا۔

اس میں ایک ''جمع بین الاختین'' کی صورت تھی اور اب یہ دوسری صورت ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے شخص کے حبالہ زوجیت میں داخل ہے تو اس حالت میں جب تک کہ وہ اس کی زوجیت سے خارج نہ ہوجائے، دوسرا آدمی اس سے عقد نہیں کرسکتا۔

اب اس میں استثناء جو کیا گیا ہے: اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اپنی کنیز کا کسی سے عقد کردے تو شوہر دار ہونے کے باوجود اس کے ساتھ خود بھی تعلقات ازدواجی قائم کرے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ایک یہ ہے کہ بحالت کفر وہ کسی کی زوجیت میں تھیں [1] اور اب وہ شوہر دار کنیزیں مال غنیمت میں آکر کسی مسلمان کی ملکیت میں داخل ہوئیں تو ان کے ساتھ استبراء یعنی اس عدہ کے گزرنے کے ساتھ جو کنیز کے لئے مقرر ہے، تعلق ازدواجی قائم کرنا درست ہوگا۔ اسی لئے ہم نے یہ ترجمہ نہیں کیا کہ ''مگر جو تمہاری ملکیت میں ہوں'' بلکہ یہ ترجمہ کیا کہ ''جو تمہاری ملکیت میں آئی ہوں اور دوسری یہ بھی صورت ہوسکتی ہے کہ اپنی ہی کنیز کا عقد اس نے خود اپنے ہی غلام سے کیا ہو تو اسے یہ حق ہے کہ یہ ان دونوں میں تفریق کردے اور پھر استبراء یعنی مقررہ مدت جو عدہ کی نوعیت رکھتی ہے گزار کر اس میں خود تصرف کرے۔ [2]

اب اس پورے سلسلہ کو سامنے رکھ کر جو چوتھے پارہ کی آخری آیت اور اس پارہ کی پہلی آیت دونوں کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوا، یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ ان کے علاوہ جو ہیں وہ تمہارے لئے حلال ہیں۔ ان کے ساتھ تم اپنے مال میں سے مہر ادا کر کے باقاعدہ عقد کے ساتھ، نہ کہ بے ضابطہ طور پر جو سفاح یعنی زناکاری میں داخل ہو تعلقات ازدواجی قائم کرسکتے ہو۔

باضابطہ ازدواجی تعلقات کی ایک صورت تو عقد دائمی کی ہے۔ وہ سب ہی کو معلوم ہے۔

دوسری صورت متعہ کی ہے یعنی ایک مقررہ مدت تک کے ازدواج کا معاہدہ جس کے مہر کو اصطلاحاً ''اجرت'' کہتے ہیں، اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے کہ:

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً.

---

[1] ۔ ما ملكت ايمانكم من سبي ما كان لها زوج (بيتان) وان كان لهن ازواج في دار الحرب (جلالين)

[2] ۔ يعني امة الرجل اذا كان قد زوجها عبده ثم اراد نكاحها فرق بينها وا استبراء (علي بن ابراهيم)

حکم متعہ

مترجمین اہل سنت جو متعہ کے قائل نہیں ہیں، وہ استمتاع کو لذت حاصل کرنے کے معنی میں لیتے ہیں، اور اسے نکاح دائمی ہی سے متعلق کرتے ہیں مگر یہ ظاہر قرآن نیز سنت کے خلاف ہے جس کی تفصیل سیر حاصل طور پر ہماری کتاب ''متعہ اور اسلام'' (شائع کردہ امامیہ مشن لکھنو امامیہ مشن پاکستان) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

جناب شیخ طوسیؒ نے اس امر پر کہ اس سے مراد متعہ ہی ہے، نہ کہ نکاح دائمی ایک نہایت لطیف استدلال کیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں کہا گیا ہے کہ عقد کے بعد ہی ان کی اجرتیں انہیں دیدو، اس کے معنی یہ ہیں کہ ایجاب وقبول کے ساتھ ہی پورا مہر ادا کرنا واجب ہوجاتا ہے۔ یہ متعہ ہی میں ہوتا ہے۔ نکاح دائمی میں جب تک کہ مباشرت نہ ہوجائے پورا مہر واجب الادا نہیں ہوتا بلکہ اگر قبل مباشرت طلاق دے دیا جائے تو نصف مہر واجب الادا ہوتا ہے جس کی قرآن میں دوسری جگہ صراحت ہے۔ یہ عقد کے بعد پورے مہر کے ادا کرنے کا حکم بتاتا ہے کہ اس سے مراد عقد منقطع ہی ہے جسے ''متعہ'' کہتے ہیں۔[1]

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾

''اور جس کی حیثیت[2] تم میں سے اس قابل نہ ہو کہ وہ مسلمان بیویوں[3] سے نکاح کر سکے تو پھر اپنی مسلمان لونڈیاں سے[4] جو تم لوگوں کی ملکیت میں ہوں اور اللہ ہی تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے تم میں سے ایک دوسرے کا جز ہے لہٰذا ان سے ان کے مالکوں کی اجازت سے شادی کرو اور انہیں بھلائی کے ساتھ ان کے مہر دیدو،

---

[1] ۔ انما یجب الاجر بکمالہ فی عقد المتعۃ (تبیان)

[2] ۔ الطول الغنی (مجمع البیان) وھو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام (تبیان)

[3] ۔ ای الحرائر المومنات (مجمع)

[4] ۔ الفتاۃ الامۃ وان کانت عجوزا (تبیان)

اس صورت سے کہ وہ پاک دامن رہیں، نہ بدکاری کرنے والی اور نہ اپنے لئے آشنا بنانے والی تو جب کہ وہ مسلمان ہوچکی ہیں [1] اب اگر وہ بدکاری کریں تو ان کے لئے آزاد عورتوں کی آدھی سزا ہوگی۔ یہ اس کے لئے ہے جو تم میں سے حرام کاری کا اندیشہ محسوس کرے اور اگر ضبط کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان۔''

کنیزوں کے ساتھ نکاح کا حکم

کنیز کے ساتھ عقد میں ''المومنات'' کی قید لگانا اس کا ثبوت ہے کہ غیر مسلم عورتوں کے ساتھ عقد درست نہیں ہے، چاہے وہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ میں داخل ہوں۔ اس طرح بعض علمائے کے اس تصور کی کہ زن کتابیہ کے ساتھ عقد جائز ہے، رد ہوجاتی ہے۔ [2]

پھر اس سلسلہ میں یہ فقرہ کہ ''اللہ ہی تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے۔'' اس شبہ کا دفعیہ ہے کہ یہ کنیزیں پہلے تو کافر تھیں۔ اب مسلمانوں کی ملکیت میں آکر وہ اظہار اسلام بھی کرتی ہیں تو اس کا کیا اعتبار! بہت ممکن ہے کہ یہ مالکوں کے دباؤ سے یا انہیں خوش کرنے کے لئے ہو تو اس کا جواب دیا جارہا ہے کہ تمہیں تو ظاہر پر عمل کرنا چاہیے۔ باطنی حقیقت سے تمہیں کیا سروکار۔ اس کا علم تو اللہ ہی کو ہوسکتا ہے۔ [3]

دوسرا امر جو اس میں مانع ہوسکتا ہے، وہ اپنی بلندی اور ان کی پستی کا احساس کہ کہاں ہم اور کہاں یہ کنیزیں! اس کی رد کے لئے یہ فقرہ ہے کہ بعضکم من بعض یعنی اصل حقیقت نوعیہ میں تو تمہارے اور ان کنیزوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے لہٰذا تمہیں اس میں کسر شان محسوس نہ کرنا چاہیے۔ [4]

اس کے بعد جو یہ فقرہ ہے کہ ''اُن سے ان کے مالکوں کی اجازت سے عقد کرو۔''..... یہ پتہ دیتا ہے کہ پہلے جو کنیزوں کو کہا گیا ہے: مما ملکت ایمانکم ''جو تمہاری ملکیت میں ہیں'' اس میں ''تم'' سے مراد خود یہ اشخاص نہیں ہیں۔ جو نکاح کرنا چاہتے ہیں بلکہ تمام مسلمان سے مراد ہیں یعنی ان کنیزوں سے نکاح کرو جو تم مسلمانوں کی ملکیت میں داخل ہیں [5] اور اس صورت میں انہیں مہر دینے کا مطلب ہے ان کے مالکوں کو اس مہر کا دینا جو ان سے طے ہوا ہو۔ [6]

یہ جو کہا گیا ہے کہ: محصنت غیر مسٰفحت ولا متخذات اخدان ''اس صورت سے کہ وہ پاک دامن رہیں، نہ بدکاری کرنے والی اور نہ اپنے لئے آشنا بنانے والی''.....اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے تعلقات جو قائم کرو وہ بطور نکاح جائز کے ہوں [7] جس میں نہ وہ زنا کاری کی مرتکب قرار پاتی ہوں اور نہ چوری چھپے ناجائز تعلقات قائم کرنے والی۔ [8]

---

[1] ۔معناہ اسلمن...وھو الاولیٰ لانہ لاخلاف انہ یجب علیھا نصف الحد اذا زنت وان لم تکن ذات زوج (تبیان)

[2] ۔لان الکتابیۃ لاتسمیٰ مومنۃ (تبیان)

[3] ۔فاکفتوا بظاھرہ و کلوا السرائر الیہ (جلالین)

[4] ۔فلاتستنکفوا امن نکاح الاماٰء فانھا من جنسکم کالحرائر (مجمع البیان)

[5] ۔المراد بہ اماٰء الغیر لانہ لایجوز ان یتزوج الرجل بامۃ نفسہ بالاجماع (مجمع)

[6] ۔لان مھر الامۃ لسیدھا (تبیان)

[7] ۔یعنی بالعقد علیھن (تبیان)

[8] ۔مسفحت زانیات جھرا ولا متخذات اخدان اخلاء یزنون بھا سرا (جلالین)

پھر یہ بتایا ہے کہ بیویوں کے نہ مل سکنے کی صورت میں یہ کنیزوں سے عقد اس لئے ہے کہ تم حرام کاری میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور اگر ایسا اندیشہ نہ ہو اور تم صبر و تحمل سے کام لو تو کوئی ضروری نہیں ہے کہ تم کنیزوں سے عقد کر ہی لو۔

پھر جب کہ آیت کے اس فقرہ سے ظاہر ہے کہ یہ حکم مجبوری کی صورت میں ہے یعنی بیوی کے نہ ہونے کی وجہ سے تو فقہ کا یہ مسئلہ کہ بیوی کی موجودگی میں کنیز سے عقد کرنا بغیر بیوی کی اجازت کے جائز نہیں، از روئے قرآن بھی بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ [1]

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾

''اللہ تو چاہتا ہے کہ تمہارے لئے صاف صاف بیان کر دے اور تمہیں تمہارے پہلے والے لوگوں کے طریقہ کار پر لگا دے اور تم پر نظر رحمت مبذول رکھے اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، صحیح کام کرنے والا۔''

اس آیت سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا احکام جوان عورتوں کے بارے میں ہیں جن سے تعلقات ازدواجی حرام ہیں، شریعت اسلام سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ اس کے پہلے بھی انبیاء کی شریعتوں میں یہ احکام آ چکے ہیں [2] مگر وہ دور جاہلیت میں زینت طاق نسیان بن گئے تھے۔ قرآن مجید میں انہی کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا اور ان کی تجدید و توثیق کر دی گئی۔

بے شک وہ احکام جب اس شریعت میں داخل ہو گئے تو اب وہ شریعت اسلام کے احکام ہیں جس کی پیروی ہم پر واجب ہے۔ نہ کہ اس شریعت کے جو اب منسوخ ہو گئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اثر اس منسوخی کا نمایاں وہیں ہوگا جہاں احکام میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ''پہلے والوں کے طریقہ پر'' لگانا صرف حلال و حرام کے امتیاز کے عام پہلو کے لحاظ سے ہو جس میں یہ ضروری نہیں ہے کہ حلال و حرام کی حد بندی بالکل وہی ہو جو شرائع سابقہ میں تھی۔ [3]

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۟ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

''اور اللہ یہ چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے [4] اور جو نفسانی خواہشوں کے پیرو ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ تم بہت زیادہ کجی اختیار کر لو۔ اللہ چاہتا ہے کہ تمہارا بوجھ ہلکا کرے اور پیدا کیا گیا ہے آدمی کمزور۔''

بندہ توبہ کرتا ہے، بایں معنی کہ اس کے ضمیر میں بیداری پیدا ہوتی ہے، تب خدا اس کی توبہ قبول کرتا ہے یعنی سابق کی اس کی غلطیوں کو نظر

---

[1] ۔من شرط صحة العقد على الامة عندا كثر الفقهاء لا يكون عنده حرة وهكذا عندنا الا ان ترضى الحرة (تبيان)

[2] ۔طرائق الذين من قبلكم من الانبياء في التحليل و التحريم (جلالين)

[3] ۔قال الرماني لا يدل ذلك على انفاق الشريعة وان كنا على طريقهم في الحلال و الحرام (بيتان)

[4] ۔يقبل توبتهم عما سلف من اثامهم (تبيان)

انداز کر دیتا ہے لیکن اگر انسان نافرمانی پر نازاں ہو گیا تو گناہ پر اسے شرمندگی پیدا نہ ہوگی اور اس لئے وہ اس سے باز آنے پر آمادہ نہ ہوگا تو اب خداوند عالم کی طرف سے توبہ قبول کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ "میلا عظیما" بہت زیادہ کجی" سے یہی مراد ہے [1] اور نفسانی خواہشوں کے پیرو یعنی باطل پرست افراد یہی چاہتے ہیں کہ ضمیر میں کبھی زندگی پیدا نہ ہو اور انسان غلط راستوں پر بے محابا چلتے رہیں۔

دوسری آیت میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ شریعت اسلام کے احکام میں خود انسانی کمزوریوں کی بڑی مراعات کی گئی ہے۔ اس کے بعد بدنصیبی نہیں تو کیا ہے کہ پھر بھی انسان ان احکام کی پابندی نہ کرے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۲۹ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰

"اے ایمان لانے والو! اپنے آپس کے مال ناحق نہ کھاؤ، وہاں مگر [2] یہ کہ تم لوگوں کی باہمی رضامندی سے کوئی تجارتی معاملت ہو اور اپنی جانوں کو تلف نہ کرو، بلاشبہ اللہ تم پر مہربان ہے اور جو ظلم و تعدی سے ایسا کرے گا تو اسے ہم آتش جہنم کی گرمی کا مزہ چکھائیں گے اور یہ اللہ کے لئے بالکل آسان بات ہے"

مال غیر کو ناحق کھانے کی ممانعت

اس آیت کا پہلا جز پہلے آچکا ہے جس کی تفسیر پہلے لکھی جا چکی ہے مگر یہاں اس میں اضافہ کیا گیا ہے الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم "سوا اس صورت کے جب باہمی رضامندی سے کوئی تجارتی معاملت ہو"۔.....

یہ "الا" جس کا ترجمہ "سوا" ہوتا ہے، یہاں استثنائے متصل کی حیثیت سے نہیں ہوسکتا جس سے قبل والے عام حکم سے کسی ایسے فرد کو خارج کیا جاتا ہے جو بغیر اس استثناء کے اس میں داخل ہو جاتی۔ یہاں یہ صورت نہیں بلکہ "باہمی رضامندی سے تجارت" جو ہو، وہ "اکل مال بالباطل" میں داخل ہی نہیں ہے۔ یہ کلام عرب میں استثناء کی ایک دوسری قسم ہوتی ہے جسے "استثنائے منقطع" کہتے ہیں۔ یہ استثنائے حقیقت میں پہلے ہی حکم کی ایک قسم کی تشریح کی حیثیت رکھتا ہے یعنی "اکل بالباطل" تو کسی صورت میں بھی درست نہیں ہے۔ ہاں جو "اکل بالباطل" نہ ہو اور وہ باہمی رضامندی والا تجارتی معاملہ ہے، یہ جائز ہے۔ "اپنی جانوں کو تلف نہ کرو" اس سے خودکشی بھی مراد ہو سکتی ہے اور دوسروں کا قتل کرنا بھی [3] وارد ہوا ہے کہ غزوات میں بعض مسلمان جوش جہاد میں یا بخیال خود ایک کارنامہ انجام دینے اور اپنے سر سہرا باندھنے کے شوق میں بغیر اجازت رسول

---

[1] ۔ای تعتدلوا عن الاستقامة عدولا بینا بالاستکبار من المعصیة (مجمع البیان)

[2] ۔الا لکن (جلالین)

[3] ۔ومثله قوله: اذا دخلتم بیوتا فسلموا علیٰ انفسکم (تبیان)

جا کر مشرکین سے بھڑ جاتے تھے، اس آیت میں روکا گیا ہے۔[1]

إِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿٣١﴾

''اگر تم ان چیزوں میں سے کہ جن سے تمہیں منع کیا جاتا ہے، کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرو تو تمہارے اور برے کاموں کی ہم تلافی کر دیں گے اور تمہیں معزز مقام میں پہنچا دیں گے۔''

چونکہ ''سیسات'' کی لفظ جس کا ترجمہ ہم نے ''برے کام'' کیا ''الفاظ قرآنی میں ''کبائر'' کے مقابلہ میں صرف ہوئی ہے، اس لئے اس کی تعبیر گناہان صغیرہ کیساتھ درست معلوم ہوتی ہے۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم صاف یہ ہوتا ہے کہ اگر تم کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرو تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے صغیرہ گناہوں کو معاف کر دیں گے۔

نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں امیر المومنینؑ کا کلام جس میں گناہوں کے اقسام میں ارشاد ہوا ہے:

مِنْ كَبِيْرٍ اَوْعَدَ عَلَيْهِ نِيْرَانَهُ، اَوْ صَغِيْرٍ اَرْصَدَلَهُ غُفْرَانَهُ.

کوئی بڑا ہے جس پر اس نے دوزخ کا اعلان کیا ہے اور کوئی چھوٹا ہے جس پر اس نے اپنی بخشش کی امید دلائی ہے۔

بالکل اسی آیت کی طرف ناظر معلوم ہوتا ہے۔

پھر اسی طرح کی آیت سورۂ النجم میں آئے گی: اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ.

گناہوں میں کبیرہ اور صغیرہ کی تفریق

اسی بنا پر اصطلاح اہل شریعت میں بھی گناہان کبیرہ اور صغیرہ کی دو لفظ شائع و ذائع ہو گئے ہیں مگر قرآن مجید نے ''گناہ کبیرہ'' کی کوئی خاص تعریف یا تحدید نہیں بتائی ہے۔ نہ اس کی نوعیت ظاہر کرنے کے لئے کچھ گناہوں کے نام لئے ہیں۔ علما نے بلا تفریق فرقہ اس کا ایک معیار یہ بتایا ہے کہ گناہ کبیرہ وہ ہے جس پر قرآن مجید میں عذاب کی خبر دی گئی ہو[2] ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر جو حدیث پر مبنی ہے، اس کے مطابق ہے۔[3]

باقی جن منہیات پر قرآن میں وعید نہیں ہے، وہ صغیرہ میں داخل ہیں مگر گناہ صغیر بھی اصرار کی صورت میں کبیرہ بن جاتا ہے اس لئے فقہ میں عدالت کی تعریف میں آیا ہے کہ کبائر کا ارتکاب نہ ہو اور صغائر پر اصرار نہ ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گناہ صغیرہ جس کی تلافی کا اعلان ہے، وہی

---

[1] ۔فنهى الله ان يقتل نفسه من غير امر رسول الله (على بن ابراهيم)

[2] ۔هى ما ورد عليها وعيد كالقتل والزنا والسرقة (جلالين)

[3] ۔قال هى سبعة: الكفر وقتل النفس وعقوق الوالدين واكل مال اليتيم واكل الربوا والفرار من الزحف والتعرب بعد الهجرة وكلماء وعد الله فى القرآن عليه النار فهو من الكبائر (على بن ابراهيم)

ہے جو اتفاقی طور پر ہوگیا ہے کچھ احادیث میں خاص خاص گناہوں کا نام لے کر کبائر کی فہرست بتائی گئی ہے مگر ان احادیث میں کافی حد تک اختلاف ہے۔

ایک خیال یہ ہے کہ کبیرہ اور صغیرہ کی کوئی محدود معین فہرست مرتب ہونا ہی نہیں چاہیے بلکہ یہ بالکل اضافی چیز ہے۔ ہر گناہ کسی دوسرے گناہ کے اعتبار سے کبیرہ ہوسکتا ہے اور کسی کے لحاظ سے صغیرہ اور خالق کو بھی یہ منظور نہ تھا کہ کبیرہ گناہوں کا نام معین کرے ورنہ دوسرے گناہوں کو آدمی سبک سمجھ لیتا۔ جناب شیخ الطائفہ کا نظریہ یہی ہے۔ [1]

ہمارے بزرگوں میں جناب ''تاج العلمائے فرماتے ہیں کہ یہ احادیث جن میں کبائر کا بیان ہے آپس میں اتنا شدید اختلاف رکھتے ہیں کہ ان میں جمع انتہائی دشوار ہے اور گویا یہ اس کا قرینہ ہے کہ کبائر کے سلسلہ میں کوئی خاص شرعی اصطلاح نہیں ہے لہٰذا اسے لغوی معنی ''بڑے گناہ'' پر محمول کرنا بہتر ہے اور جو بھی بڑا گناہ معلوم ہو خواہ اس بنا پر کہ قرآن وحدیث میں اس پر وعید اور تخویف وتہدید ہوئی ہے یا عقلاً وعرفاً وہ بہت بڑا گناہ محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ایک درہم کی چوری ایسے شخص کے پاس سے جس کے پاس اس کے علاوہ کوئی پیسہ ہے ہی نہیں جس کے بعد وہ بھوک سے تلف ہوجائے یا شدید زحمت میں مبتلا ہوجائے یا جیسے مردہ لاشوں کے ساتھ بدفعلی کرنا۔ اس کو کبیرہ سمجھنا چاہیے اور باقی گناہوں کو صغیرہ میں داخل سمجھنا چاہیے۔

موصوف کے نزدیک اسی قول کو ترجیح بھی ہے اور فرماتے ہیں کہ کم از کم زیادہ موافق احتیاط تو وہ ضرور ہے۔ [2]

چونکہ اصلاً یہ بحث فقہ کے مبحث عدالت اور کتاب القضاء والشہادات سے تعلق رکھتی ہے، اس لئے یہاں اتنے پر اکتفاء مناسب ہے۔ اس سے زیادہ بسیط وتفصیل اور تنقیح وتحقیق سے کام لینا تفسیری معیار کے خلاف ہے۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

''اور جو اللہ نے تم میں کے ایک کو دوسرے پر زیادتی عطا کی ہے، اس کی آرزو نہ کرو۔ مردوں کو حصہ ملتا ہے اس کا جو وہ حاصل کریں اور عورتوں کو حصہ ملتا ہے اس کا جو وہ حاصل کریں اور اللہ سے سوال کرو اس کے فضل وکرم سے یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

''زیادتی'' عام ہے اس سے کہ مال ومتاع دنیا میں ہو یا فضائل ومراتب میں اور آرزو جس سے روکا گیا ہے وہ ہے جو بصورت حسد ہو

---

[1] ۔لم یعین الکبائر التی اذا اجتنبها کفر ماعداها لانه او فعل ذالك لکان فیه اغراء بماعداها و ذلك لایجوز فی حکمة تعالیٰ (تبیان)

[2] ۔هذا وان لم نقل بکونه اظهر فلا اقل من کرنه احوله (حویرة عزیزة)

یعنی انسان دوسرے سے اس زیادتی کی وجہ سے جلنے لگے اور چاہے کہ وہ اس مرتبہ پر نہ رہے۔ نیز یہ کہ آدمی بس تمنائیں کرتا رہے کہ ہائے میں اس مرتبہ پر نہ ہوا اور جب کہ وہ مرتبہ کسی عملی جدوجہد سے وابستہ ہو تو وہ اسباب فراہم نہ کرے جو اسے بھی اس مرتبہ تک پہنچا دیں۔

حسد کی ممانعت

بعد کا یہ ''فقرہ کہ ''مردوں کو حصہ ملتا ہے اس کا جو وہ حاصل کریں اور عورتوں کو حصہ ملتا ہے اس کا جو وہ حاصل کریں'' اس دوسرے پہلو سے تناسب رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس فضیلت و بزرگی کے آرزومند ہو تو اسے کام کرو اور پھر خدا سے سوال کرو کہ اس کا فضل و کرم شامل حاصل ہو۔

آخر میں جو ہے کہ ''اللہ ہر بات کا جاننے والا ہے۔'' اس میں یہ معنی مضمر ہیں کہ اللہ بلا وجہ کسی کو زیادتی تھوڑی عطا کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون اس کا مستحق ہے اور جو کچھ انسان جدوجہد کرے، اس سے بھی واقف ہے اور جو اس سے سوال کرے، اس پر بھی مطلع ہے۔ [1]

یہ فقرہ اس کا ثبوت ہے کہ افعال الٰہی میں عدالت و حکمت کارفرما ہے۔ صرف قدرت و طاقت نہیں کہ بلا وجہ جسے جتنا چاہا دے دیا۔ بے شک جسے جتنا چاہے، وہ دیتا مگر یہ چاہنا اس کا کسی مصلحت و حکمت کی بنیاد پر ہوتا ہے، بلا وجہ نہیں ہوتا۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝۳۳

''اور ہر ایک کے ہم نے وارث قرار دیے ہیں اس میں جو چھوڑا ہے ماں باپ اور دوسرے قریب ترین اعزا نے اور جنہیں تمہاری قسموں نے وابستہ کیا ہے تو اس میں ان کا حصہ دے دو، یقیناً اللہ ہر بات پر حاضر و ناظر ہے۔''

لکل ''ہر ایک کے'' اس کی تشریح میں اختلاف ہے جس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:۔

''مقرر کردہ ایم وارثان برای ہر چیزے از انچہ گزاشتہ اند پدر و مادر ایشاں''

یعنی ''ہر ایک'' کا مطلب ہے ترکہ میں سے ہر چیز مگر ان کے بیٹے شاہ رفیع الدین صاحب تحریر کرتے ہیں:

''اور واسطے ہر شخص کے مقرر کیے ہیں ہم نے وارث اس چیز سے کہ چھوڑ گئے ماں باپ اور قرابتی''

ہمارے مفسرین اسی دوسرے ترجمہ سے متفق ہیں۔ [2]

''جنہیں تمہاری قسموں نے وابستہ کیا ہے'' یعنی جاہلیت کے زمانہ میں جو یہ رسم جاری ہوئی تھی کہ مختلف قبائل اور افراد آپس میں حلیف ہوتے تھے، اس حلیف ہونے سے میراث کا استحقاق پیدا نہیں ہوتا بلکہ جو تمہارے حلیف ہیں، ان کے بھی وارث مقرر ہیں لہٰذا میراث تمہیں نہیں، انہی وارثوں کو ملے گی۔ [3]

---

[1] ۔ کان بکل شئی علیما و منه محل الفضل وسوالکم (جلالین)

[2] ۔ لعلکم جعلنا ورثه (تبیان) لکل واحد من الرجال والنسآء جعلنا موالی وورثة (مجمع البیان)

[3] ۔ لهم ورثة اولیٰ بمیراثهم (مجمع)

مگر اس کے برخلاف ایک خیال یہ ہے کہ اس آیت میں حلیفوں کو میراث میں حصہ دینے ہی کا حکم ہے جس کا زمانہ جاہلیت سے رواج چلا آرہا ہے مگر بعد میں اس آیت سے کہ:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ

''جس کا مطلب یہ ہے کہ میراث میں استحقاق بس قرابت ہی سے وابستہ ہے یہ حکم منسوخ ہوگیا۔

دوسرے بعض علماء کا یہ تصور ہے کہ: وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ایک مستقل جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو تم نے اپنا حلیف بنالیا، انہیں ان کا حصہ ادا کرو یعنی اس معاہدہ حلفی کا جو تقاضا ہو مثلاً وقت ضرورت کا آنا دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کرنا، اسے پورا کرو لیکن میراث کا استحقاق انہیں نہیں ہے۔ [1]

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

''مرد عورتوں کے انتظامات و اصلاحات کے ذمہ دار ہیں [2] اس بنا پر کہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر اللہ نے فضیلت دی ہے اور اس کی وجہ سے جو یہ اپنے مال سے خرچ کرتے ہیں تو نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں [3] اور پیٹھ پیچھے بھی جس طرح خدا نے اُن کی حفاظت و کفالت کا انتظار کیا ہے [4] وہ حفاظت کرتی ہیں اور جن عورتوں سے سرکشی کے آثار تم کو محسوس ہوں [5] انہیں سمجھاؤ اور چھوڑ دو انہیں اُن کی خواب گاہوں میں اور مارو بھی اس کے بعد اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو پھر اُن کے خلاف کسی اقدام کے راستے نہ ڈھونڈھو [6] یقیناً اللہ برتر ہے، بہت بڑا۔''

مردوں کی سیادت وفوقیت کے ساتھ ذمہ داری اور عورتوں کی جنسی بے راہ روی کی صورت میں تادیب کا حق

---

[1] ۔فعلیٰ هذا الاية غير منسوخته (تبيان)

[2] ۔قوامون على النساء بالتاديب والتدبير (تبيان)

[3] ۔مطيعات لازواجهن (مجمع البيان)

[4] ۔اى بما حفظهن الله فى مهورهن والزام الزوج النفقة عليهن (تبيان)

[5] ۔تخافون نشوزهن بظهور اسبابه واماراته (مجمع)

[6] ۔فلا تطلبوا العلل فى خربهن وسوء معاشرتهن (تبيان)

آخری فقرہ شوہروں کو تنبیہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ خدا نے تمہیں جو یہ اختیارات دیئے ہیں، ان کے صرف میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا، اس لئے کہ تم عورتوں کے مقابلہ میں برتر سہی، مگر اللہ جو تمام کے حقوق کا نگہبان ہے، وہ سب سے برتر اور بزرگ تر ہے لہٰذا اُس سے ہمیشہ ڈرتے رہو اور حد سے قدم آگے نہ بڑھاؤ۔ [1]

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيۡنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا خَبِيۡرًا ﴿۳۵﴾

''اور اگر تم لوگوں کو اُن دونوں میں پھوٹ کے آثار نظر آئیں تو ایک ثالث اُس کے والوں میں سے اور ایک ثالث اس کے والوں میں سے مقرر کرو۔ اگر وہ دونوں میل کرانا چاہیں گے تو اللہ اُن دونوں میں موافقت کی صورت پیدا کر دے گا۔ یقیناً اللہ جاننے والا ہے، بڑا باخبر''۔

یہ خطاب چاہے سماج کے عام لوگوں سے ہو مگر نفاذ اس کا حاکم شرعی کی طرف سے ہوگا۔ [2]

نزاع کی صورت میں دو ثالث مقرر کرنے کا حکم

اختلاف باہمی کی صورت میں ایک ثالث مرد والوں میں سے اور ایک عورت والوں میں سے مقرر ہوگا وہ دونوں معاملات کو سلجھانے کی کوشش کریں۔

اللہ دونوں میں موافقت کی صورت پیدا کرے گا یعنی شوہر اور زوجہ میں۔ [3]

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُن دونوں آدمیوں میں جو ثالث مقرر ہوئے ہیں۔ [4]

وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔا وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡجَارِ ذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡجَارِ الۡجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ۙ وَمَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنۡ كَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرًا ۙ﴿۳۶﴾ الَّذِيۡنَ يَبۡخَلُوۡنَ وَيَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ وَيَكۡتُمُوۡنَ مَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنۡ

---

[1] ۔فاحذروہ ان یعاقبکم ان ظلمتوھن (جلالین)

[2] ۔ھو الظاھر فی الاخبار عن الصادقین و قیل الزوجان او اھل الزوجین (مجمع البیان)

[3] ۔بین الزوجین (جلالین)

[4] ۔الضمیر فی "بینھما" عائد الی الحکمین (تبیان)

فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ﴿۳۷﴾

''اور اللہ کی عبادت کرو، کسی چیز کو اس کا شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو [۱] اور قرابت داروں، یتیموں، وہ پڑوسی جو عزیز ہو اور وہ پڑوسی بھی جو غیر ہو اور پہلو بہ پہلو رہنے والے ساتھی [۲] اور مسافر اور اُن کے ساتھ جو تمہاری ملکیت میں ہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اُسے دوست نہیں رکھتا کہ جو گھمنڈ رکھنے والا، شیخی بگھارنے والا ہو۔ جو کنجوسی سے کام لیتے ہیں اور لوگوں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو اللہ نے انہیں اپنے فضل و کرم سے دیا ہے، اُسے چھپاتے ہیں اور ہم نے ناشکروں کے لئے ذلت دینے والا عذاب مہیا کر رکھا ہے۔''

چونکہ اُن لوگوں کے لئے عذاب آخرت کی خبر دی گئی ہے، اس لئے ماننا پڑے گا کہ کنجوسی سے مراد ''حقوق واجبہ'' کو روکنا ہے، اس لئے کہ واجبات کو ادا کرنے کے ساتھ کوئی کتنا ہی کنجوس ہو، وہ چاہے مورد مذمت قرار پاتا ہو لیکن مستوجب عذاب نہیں ہوسکتا۔ [۳]

یہاں انہیں مستحق عذاب ہی نہیں بتایا گیا ہے بلکہ کافرین کی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جو ''کُفران'' سے بھی ہوسکتا ہے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے ''ناشکروں کے لئے''..... چونکہ مال اور جو نعمت الٰہی ہے، اُس کا شکر یہی ہے کہ اُسے اللہ کی مرضی کے مطابق خرچ کیا جائے اور ''کفر'' سے بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ حج کے حکم کے بعد کہا گیا ہے:۔

ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین۔

اور جو کفر اختیار کرے تو اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ یہاں ترک حج کو کفر سے تعبیر کیا گیا جو گناہ کی اہمیت ثابت کرنے کا ایک انداز ہے تو منع زکوٰۃ کو بھی جو یہاں ''بخل'' کی لفظ کا مطلب ہے اگر کفر سے تعبیر کیا جائے تو کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ [۴]

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾

''اور جو اپنے مال خیرات میں صرف کرتے ہیں لوگوں کے دکھانے کے لئے اور اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ روز آخرت پر اور جس کا ہمدم شیطان ہو، اس کا بہت بُرا ہمدم ہے''۔

پہلے اُن لوگوں کی مذمت ہوئی تھی جو بخل سے کام لیتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ کرتے ہی نہیں اور اب اُن کی مذمت ہو رہی ہے جو خرچ کرتے تو ہیں مگر لوگوں کے دکھانے کی خاطر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ خیرات کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہی ہیں۔ ایسی خیرات کا کوئی حاصل نہیں

---

[۱] ۔نصب علی المصدر وتقدیرہ: واحسنوا الی الوالدین احسانا (تبیان)

[۲] ۔الرفیق فی سفر او صناعۃ وقیل الزوجۃ (جلالین)

[۳] ۔ذلک لا یلیق الا بمنع الواجب (تبیان)

[۴] ۔فسمی البخیل کافرا (علی بن ابراھیم)

ہے۔[1]

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾

''اوران کا کیا نقصان تھا اگر یہ ایمان لاتے اللہ اور روز آخرت پر اور جو اللہ نے انہیں روزی عطا کی، اُس میں سے خیرات کرتے اور اللہ ان سے خوب واقف ہے''۔

''ان کا کیا نقصان تھا؟'' استفہام انکاری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایسا کرتے کوئی ان کا نقصان نہ تھا بلکہ نقصان تو اس کے خلاف صورت اختیار کرنے سے ہے۔[2]

قرآن مجید میں یہاں اور بہت سے مقامات پر جو انسان کے کسی خاص رویہ پر اس طرح کی سرزنش کی گئی ہے، وہ ثبوت قطعی ہے اس امر کہ انسان اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔

اور خالق کی طرف سے اُس کے افعال میں کوئی جبر نہیں ہے ورنہ اس طرح کی سرزنش کے کوئی معنی ہی نہ ہوتے۔[3]

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

''یقیناً اللہ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا اور اگر وہ نیکی ہو[4] تو اسے بدر جہا بڑھا دیتا ہے[5] اور اپنی جانب سے بہت بڑا اجر عطا فرماتا ہے''۔

خدا کی طرف سے ہر قسم کی ظلم کی نفی

انسانی افعال دو قسم کے ہوتے ہیں: حسنات اور سنیات یعنی نیکیاں اور برائیاں۔ ان کے مقابل میں اللہ کی طرف سے دو چیزیں ہیں ثواب اور عذاب۔

اب مقام تصور میں خدا کی طرف سے جو ثواب اور عذاب ملے، اُس کی ہر ایک میں تین صورتیں ہیں:

حسنات کے مقابلہ میں:

---

[1] ۔جمع الله سبحانه فی الذم والوعید بین من ینفق ماله بالرئاء والسمعة ومن لم ینفق اصلاح (مجمع البیان)

[2] ۔لاضرر فیه وانما الضرر فیماهم علیه (جلالین)

[3] ۔لو کانوا غیر قادرین لکان فیه اوضع العذر لهم ولما جاز ان یقال: وماذا علیهم (تبیان)

[4] ۔معناه ان تلك زنة الذرة حسنة اوو ان تلك فعلة حسنة (تبیان)

[5] ۔یجعلها اضعافا کثیرة وقیل یجعلها ضعفین (مجمع البیان)

(۱) ثواب درجۂ استحقاق سے کم یا بالکل نہیں

(۲) درجۂ استحقاق بھر

(۳) درجۂ استحقاق سے زیادہ

سیّئات کے مقابلہ میں:

(۱) عذاب درجۂ استحقاق سے کم یا بالکل نہیں

(۲) درجۂ استحقاق بھر

(۳) درجۂ استحقاق سے زیادہ

عقلی طور پر حسنات میں پہلی قسم اور سیات میں تیسری قسم داخل ظلم ہے اس لئے آیت قرآن کے پہلے فقرہ سے (اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ) ان دونوں کی نفی ہوجاتی ہے لیکن دونوں میں وسطی قسم یعنی ثواب بمقدار درجۂ استحقاق اور عذاب بقدر استحقاق، یہ بمقتضائے عدل صحیح اور حسنات میں تیسری قسم یعنی ثواب درجہ استحقاق سے زیادہ اور سیات میں پہلی قسم یعنی عذاب درجہ استحقاق سے کم یا بالکل نہیں، یہ دونوں متقضائے تفضّل ہیں جو لازم نہیں ہیں مگر مشیت الٰہی کی صورت میں مستحسن ہیں چنانچہ خالق کی طرف سے حسنات میں تو یہ عام اعلان ہوگیا ہے کہ وہ اُن کی جزا اصل عمل سے بہت زیادہ عطا کرتا ہے جس کا اس آیت کے بھی دوسرے فقرہ میں ذکر ہے اور دوسری آیتوں میں تو اور زیادہ اس جزا کے اضافہ کا اعلان ہے اور سیات میں بھی اُس حد تک کہ خلق خدا میں احساس سزا بالکل ختم نہ ہوجائے اور خوف کا عنصر باقی رہے، جابجا خاص شرائط و قیود کے ساتھ تفضّل کی کارفرمائی کا اعلان ہوا ہے جس کا دوسری آیتوں میں جابجا قرآن مجید میں تذکرہ موجود ہے۔

یہ کہنا کہ ''اللہ ظلم نہیں کرتا'' جیسا کہ اس آیت میں ہے اور قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی، اس کا ثبوت ہے کہ کچھ کام ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ سے (معاذ اللہ) صادر ہوں تو وہ ظلم قرار پائیں گے جو عدلیہ کا نقطہ نظر ہے۔

عدل کے جو منکر ہیں، اُن کا تصور یہ ہے کہ اللہ حاکم مطلق ہے۔ وہ جو بھی کرے، ٹھیک ہے۔ یہ قرآنی تصریحات کی بنا پر درست نہیں ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سے نفی ظلم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ظلم پر قادر نہیں ہے کیونکہ قادر نہ ہوتے ہوئے کسی چیز کا ترک کرنا کوئی تعریف نہیں ہے بلکہ ظلم پر قادر ہوتے ہوئے وہ اپنے کمال ذات، علم و حکمت اور استغنا کی بناء پر ظلم سے بری ہے۔ [1]

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾

''تو کیا ہوگا اس وقت جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں اور آپ کو اُن پر گواہ بنا کر لائیں گے۔''

ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے، اس لئے ''تو کیا ہوگا'' کا تعلق ماقبل سے کیا ہے؟ اسے وثوق کے ساتھ بتایا نہیں جاسکتا۔

ہم جو معنی اس کے سمجھتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہر امت کا گواہ اُس کا پیغمبر ہوگا [2] اور ان لوگوں کے گواہ ہمارے رسولؐ۔ اس سے ہمارے پیغمبرؐ

---

[1] ۔فیہ ایضا دلالۃ علی انہ قادر علی الظلم ... غیر انہ کان قادرا علیہ فانہ لا یفعلہ لعلمہ بقبحہ دلانہ غنی عنہ (تبیان)

[2] ۔شھد یشھد علیھا بعملھا وھو نبیھا (جلالین)

کی فضیلت تمام انبیاء کے مقابلہ میں نمایاں ہوتی ہے کہ آپ کے اُن انبیاء سے وہ نسبت ہے۔ جو اُن انبیاء کو اپنی امتوں سے ہے۔ اسی طرح بعد رسولؐ بھی ہر دور کا امام اپنے عہد کے افراد پر گواہ ہے اور ان گواہوں کے گواہ بھی رسولؐ ہیں [1] جیسا کہ اس کے پہلے دوسرے پارہ کے ابتدائی حصہ میں آچکا ہے۔

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

تم لوگ تمام انسانوں پر گواہ ہو اور پیغمبر تم لوگوں پر گواہ ہوں۔

جس سے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت ان ائمہ معصومین علیہم السلام کے مقابلہ میں بھی ظاہر ہے۔

مگر عام طور پر مفسرین اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ہم ہر امت کا ایک گواہ لائیں گے اور آپ کو ان لوگوں (یعنی اس امت کے افراد) پر گواہ بنا کر لائیں گے۔ [2]

اس طرح حضرت کی کوئی خاص خصوصیت اس آیت سے ثابت نہ ہوگی۔

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۴۲

''اُس دن اُن لوگوں کا جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا اور پیغمبر کی بات نہیں مانی تھی، دل چاہے گا کہ کاش وہ زمین کے برابر کر دیئے جاتے اور وہ (اب) اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔''

''تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ'' کا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ وہ اُس دن آرزو کریں گے کہ وہ اپنی نوعیت وجود میں کاش انسان نہ ہوتے بلکہ زمین کے برابر ہوتے جیسا کہ دوسری جگہ کافروں کی تمنا مذکور ہے کہ

یالیتنی کنت ترابا۔

کاش میں خاک ہوتا [3]

دوسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ ''کاش (وہ پیوند خاک ہو جاتے اور) اُن کے اوپر سے زمین برابر کر دی جاتی'' (ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم)

مجھے معتبر تفاسیر میں ابھی تک اس کی موافقت نہیں ملی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ

---

[1] ۔فرسول اللہ یشھد علی الایمۃ وھم شھداء علی الناس (علی بن ابراھیم)

[2] ۔علی ھولاء یعنی علی امۃ (تبیان) علی قومہ (مجمع البیان) بیاوریم تر گواہ بر ایں امت (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔بان یکونوا ترابا مثلھا (جلالین) یودون انھم لم یبعثوا وانھم کانوا والارض سواء (مجمع البیان)

وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَیْدِیْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

''اے ایمان لانے والو! نماز کے پاس نہ جاؤ اس حالت میں کہ تم نشہ میں ہو جب تک تمہیں اتنا ہوش نہ ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور نہ جنابت کی حالت میں جب تک غسل نہ کرلو، سوا اس صورت کے کہ تم سفر میں ہو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا پائخانہ سے ہو کے آئے ہو یا عورتوں سے مقاربت کی ہے اور پانی دست یاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرلو، اس طرح کہ اس سے اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کرو۔ یقیناً اللہ انصاف کرنے والا ہے، بہت بخشنے والا''۔

غسل جنابت کا حکم اور تیمّم کی ترکیب

یہ آیت شراب کی صریحی ممانعت کے قبل نازل ہوئی تھی اور گویا تمہید تھی شراب کی مطلق ممانعت کے لئے۔ اس میں بس اتنا بتایا گیا تھا کہ نشہ کی حالت میں نماز درست نہیں ہوسکتی۔ جب دوا کی اتنی خوراک حلق سے اتر گئی تو پھر رفتہ رفتہ شراب کی مطلق ممانعت وارد ہوئی۔

حالت جنابت میں نماز کے قریب جانے سے یہ استثناء کہ: اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ ''مگر حالت سفر میں'' اس لئے ہے کہ سفر کی حالت کا حکم بیماری کے ساتھ ساتھ بعد میں ہوا ہے کہ اس صورت میں تیمم کیا جائے گا۔

ایک دوسری تفسیر اس کی یہ ہوئی ہے کہ ''نماز کے قریب نہ جاؤ'' اس سے مراد مساجد میں داخل ہونا ہے اور مساجد میں عموماً حالت جنابت میں جو داخلہ ممنوع ہے، وہ ٹھہرنے کی صورت میں لیکن اگر ایک دروازہ سے داخل ہو اور دوسرے دروازے سے نکل جائے تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔ اس حکم کو بیان کیا جارہا ہے۔

جناب شیخ الطائفہ نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

مگر میرے نزدیک پہلے معنی زیادہ درست معلوم ہوتے ہیں، اس بنا پر کہ وہ عام مساجد کا حکم ہے کہ ان میں ٹھہرنا ناجائز ہے اور گزرنا جائز ہے لیکن مسجدین یعنی مسجد مکہ و مدینہ میں تو گزرنا بھی حرام ہے اور ظاہر ہے کہ وقت نزول آیت قریب محل نماز کا جو ذہن میں آسکتا تھا، وہ یہی مسجدین ہیں لہٰذا یہ کیونکر ممکن ہے کہ عام الفاظ صرف کرکے ایسا حکم بیان کیا جائے جو ان دونوں مسجدوں پر منطبق نہ ہو۔

یہاں بھی احکام فقہ پر نظر کی جائے تو ہر ہر جز میں پتہ چلے گا کہ ان احکام میں قرآن کے ساتھ احادیث کے تشریحات ہی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً بیمار ہو، اس کے ساتھ یہ قید ہے کہ ایسی بیماری جس میں نہانا نقصان کرتا ہو۔ مسافر ہو، اس کے ساتھ یہ قید لازمی ہے کہ مسافر ہونے کی وجہ سے پانی دستیاب نہ ہوتا ہو اور اب اصل سفر نہیں رہا بلکہ پانی کا دست یاب نہ ہونا اصل معیار بن گیا۔ اس لئے اگر حضر میں بھی پانی نہ ملے تو تیمم کا حکم ہوگا۔ اور اگر سفر ہے مگر پانی کا استعمال ممکن ہے تو غسل لازم ہے، تیمم درست نہیں ہے۔

پھر پانی نہ ملنے کے حدود کیا ہیں؟ کتنی دور تک تلاش کرنا لازم ہے؟ بغیر اس تلاش کے تیمم درست نہیں ہے اور جب اتنی تلاش کے بعد نہ

ملے تو تیمم صحیح ہوگا۔

پانی مل رہا ہے مگر غصبی ہے تو کیا حکم ہوگا؟

پانی ملتا ہے مگر اتنی قیمت پر جو اس کے لئے تباہی کا باعث ہے، تو کیا ہوگا؟

غرض ایسے ہی کتنے تفصیلات ہیں جو بغیر بیان معصومین کے معلوم نہیں ہوتے اور کبھی دوسرے قواعد شرعیہ پر نظر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کے اجتماع سے نتیجہ نکالا جاتا ہے جو حقیقتاً مجتہد کا کام ہے اور اس سب سے جو نتیجہ برآمد ہو، وہ علم فقہ کا جز بنتا ہے۔

اسی طرح تیمم میں منہ اور ہاتھوں کی کتنی مقدار پر مسح کیا جائے؟ اس کا بھی بیان احادیث ہی کے ذمے ہے۔ صرف قرآن مجید سے ان احکام قرآنی پر عمل ناممکن ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا اُن کو جنہیں کتاب کا کچھ حصہ ملا ہے کہ یہ گمراہی مول لیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی سیدھے راستے سے بہک جاؤ اور اللہ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کوئی سرپرست اور اللہ سے بڑھ کر کوئی مددگار نہیں ہوسکتا۔''[1]

آیت کے مضمون کا ظاہری نگاہ میں کوئی تناسب قبل والے مضمون سے معلوم نہیں ہوتا اور ہمارے نزدیک اس کی ضرورت بھی نہیں ہے جب کہ یہ معلوم ہے کہ ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ جہاں پر مطابق تنزیل ہو، وہاں بھی یہ ضروری نہیں ہے جب کہ آیات قرآن بحیثیت ایک تصنیف کے مسلسل اجزاء کے آئے ہی نہیں ہیں بلکہ مختلف واقعات کی مناسبت سے اترے ہیں تو اگر دو واقعے دونوعیتوں کے ہوئے ہوں مثلاً کسی دن ایک صحابی کو غسل کی ضرورت ہوئی اور پانی موجود نہ تھا لہٰذا ضرورت تھی کہ تیمم کا حکم بتایا جائے اور اُسی دن اُس کے بعد ہی کسی یہودی نے تھوڑی سی رقم لے کر کسی حقیقت کا انکار کیا اور کچھ مسلمانوں کو بہکانے کی کوشش کی اور اس لئے یہ آیت اُتری۔ کوئی کاتب آیا، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں آیتیں یکے بعد دیگرے لکھوادیں۔ اس طرح کتابت میں اُس وقت یہ دونوں آیتیں مسلسل درج ہوگئیں تو اَب بعد کے مفسرین کے لئے کیا معقولیت ہے کہ ان دونوں آیتوں کے مضمون میں تناسب کی تلاش کریں اور اگر آسانی سے تناسب پیدا نہ ہو تو کھینچ تان کر کچھ نہ کچھ ربط ضرور قائم کر دیا جائے جو ہمارے ہندوستان کے قریبی دور کے ایک صاحب قلم جناب حمید الدین فراہی صاحب کا پوری تفسیر کا مرکزی نقطہ نظر ہے جس کی وجہ سے نام ہی انہوں نے اپنی تفسیر کا ''نظام القرآن'' رکھ دیا ہے اور تعجب ہے کہ ہمارے اکابر مفسرین نے بھی بلاوجہ یہ کوشش

---

[1] ۔خدا دوست بس است و خدا یاری دہندہ بس است (شاہ ولی اللہ)

کرڈالی ہے [1] جس کی ہمارے نزدیک کوئی معقول بنیاد نہیں ہے۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

یہودیوں میں ایسے ہیں جو جملوں کو اُن کے محل سے تحریف کر کے ہٹا دیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور مانا نہیں اور سنو، تمہاری بات نہ سنی جائے [2] اور راعنا اپنی زبان میں دوسرے معنی لے کر [3] اور دین پر اعتراض کرتے ہوئے اور اگر وہ یوں کہتے کہ ہم نے سنا اور مانا اور سنیے اور ہماری طرف دیکھیے تو ان کے لئے بہتر اور زیادہ صحیح ہوتا مگر اللہ نے ان کے کفر کی بدولت ان پر لعنت کی ہے تو یہ ایمان لائیں گے نہیں مگر بہت کم''۔

ہر زبان کے محاورہ کے لحاظ سے جس کے شواہد قرآن مجید میں بھی موجود ہیں قول یعنی کہنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ زبان ہی سے ہو بلکہ بسا اوقات دل میں جو کہا جائے، اسے بھی کہنے کی لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

یہودیوں کی جس جماعت کا ذکر ہے، وہ اگر کھلم کھلا معاندانہ رویہ اختیار کرنا چاہتی تو اُسے رسولؐ کے پاس آ کر اس طرح کے الفاظ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟!

بظاہر تو یہ لوگ ایسے ہی تھے جو منافقانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ پھر زبان سے وہ پیغمبرؐ کی بارگاہ میں اس طرح کی بات کیوں کر کر سکتے تھے کہ سمعنا واطعنا کے بجائے سمعنا وعصینا کہیں اور آپ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے ایک طرح کی بددعا دیں کہ: واسمع غیر مسمع (سنیے، خدا کرے آپ کی بات نہ سنی جائے) وغیرہ وغیرہ..... بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں کچھ وہ دل میں کہتے تھے جن کا خالق نے انکشاف کیا ہے اور کچھ باتیں زبان سے کہتے تھے اور ان کا مطلب کچھ دوسرا لیتے تھے چنانچہ جب آپ کوئی حکم دیتے تھے تو ممکن ہے زبان سے کہ دیتے ہوں: سمعنا ''جی ہم نے سن لیا'' مگر اس کے ساتھ دل میں اُن کے یہ ہوتا تھا کہ: وعصینا، یعنی ''ہمیں ماننا اسے تھوڑی ہے'' ''ہم عدول حکمی کر کے رہیں گے'' اسی طرح آپ کو متوجہ کرتے تھے کہ واسمع ''سنیے ہماری بات'' اور دل میں آپ کی شان میں یہ کہتے تھے کہ غیر مسمع

---

[1] ۔وجہ اتصال ھذہ الایۃ باقبلھا التاکید للاحکام التی یجب العمل بھا بالتحذیر عمن یدعوا الی خلافھا (تبیان)

[2] ۔غیر مسمع حال بمعنی الدّعاء ای لاسمعت (جلالین)

[3] ۔راعنا پیچ دے کر اپنی زبان کو (شاہ رفیع الدین)

''خدا کرے آپ کی بات نہ سنی جائے''۔[1]

بے شک اس معنی میں کہ ہمارا خیال کیجئے ''راعنا'' ایک ایسی لفظ کہتے تھے جس کے معنی برے لیتے تھے۔اس بنا پر اس کے پہلے سورۂ بقرہ میں راعنا کہنے سے منع کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین ان تمام الفاظ کو کہتے ہیں کہ وہ زبان سے کہتے تھے اور وہ ذو معنیین ہوتے تھے حالانکہ سمعنا وعصینا اور اسمع غیر مسمع کے برے معنی اتنے نمایاں ہیں کہ اچھے معنی کسی طرح پیدا نہیں ہوتے بلکہ اچھے معنی کے پیدا کرنے کی کوشش مضحکہ خیز طور پر غلط معلوم ہوتی ہے لہٰذا انہیں ذو معنین کسی طرح نہیں سمجھا جا سکتا جس کے بعد ان کا زبان سے ان الفاظ کو کہنا بالکل خلاف عقل قرار پاتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

''اے اہل کتاب! ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے اتارا ہے تصدیق کرتا ہوا اس کی جو تمہارے پاس ہے، اس سے پہلے کہ ہم بگاڑ دیں کچھ چہروں کو اور انہیں پیٹھ کی طرف پھیر دیں، یا ان پر اس طرح لعنت برسائیں جس طرح ہم نے ہفتہ کے دن والوں پر لعنت برسائی تھی اور اللہ کی بات ہو کر رہتی ہے۔''

فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ کا جو مفہوم ظاہری صورت سے سمجھ میں آتا ہے، وہ وہی ہے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ: ''انہیں پیٹھ کی طرف پھیر دیں'' اور بعض مترجمین نے پہلے بھی ایسا ترجمہ کیا ہے[2] اور اس صورت میں قبل کے فقرہ سے اس کا تعلق یوں ہے کہ جب منہ پیٹھ کی طرف ہو جائے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا حسن و جمال محسوس نہیں ہو سکتا جو سامنے کی طرف ہونے میں ہے۔اس لئے وہ اس کا مٹ جانا ہی ہے لیکن مٹانے کا دوسرا مفہوم جو اس لفظ سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے، یہ ہے کہ ان کے چہروں کے خط وخال اور آنکھ ناک کا امتیاز بالکل مٹ جائے۔اس کی مطابقت سے دوسرے فقرہ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے کہ ''ہم انہیں ان کی پیٹھ کی طرح کا بنا دیں'' یعنی چہرہ اور پیٹھ میں کوئی امتیاز نہ رہے[3] بعض تفاسیر بھی اسکے موافق ہیں۔[4]

لیکن یہ مفہوم فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ کے الفاظ کے جو لغوی معنی ہیں، ان سے بہت دور ہے۔ان الفاظ کے تو معنی یہی ہوتے ہیں کہ انہیں ان کی پشت پر پھرا دیں یا پلٹا دیں۔

---

[1] ۔یعنی الیہود یقولون سمعنا قولك یا محمد ویقولون سرا عصینا (تبیان) یقولون بالسنتهم سمعنا وفی قلوبهم عصینا (مجمع البیان)

[2] ۔پس پھیر دیں ان کی اوپر پیٹھ ان کی کے (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔پس بگردانیمش بر شکل پشت رویہا (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔فنجعلها كالا قفاء لوجا واحدا (جلالین)

''اصحاب سبت'' یعنی ہفتہ والے دن کے لوگوں کا تذکرہ دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے کہ وہ بندروں کی صورت میں مسخ ہو گئے تھے۔ یہ مسخ چونکہ رحمت خدا سے دور ہونے کا ایک مشاہدہ میں آنے والا ثبوت تھا، اس لئے اس کو لعنت کی لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ نہ یہ کہ لعنت کے معنی مسخ کے ہیں، جیسا کہ بعض تفاسیر سے شبہ ہوسکتا ہے۔ [1]

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

''یقیناً اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا ہر بات کو بخش دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرے، اس نے بہت بڑے گناہ کے ساتھ بہتان باندھا'' [2]

شرک ناقابل معافی، باقی ہر گناہ کی معافی کا امکان

اس آیت سے اہل ایمان کے لئے چاہے کتنے ہی گنہ گار ہوں، مغفرت کی امید پیدا کی گئی ہے، پھر مشیت کے ساتھ وابستہ کر کے خوف کی آمیزش کر دی گئی ہے تاکہ خوف ورجا کے دونوں پلے جو ایمان کے لئے ضروری ہیں، برابر ہو جائیں۔ یہ بخشش جس کا امکان شرک کے علاوہ ہر گناہ میں بتایا جا رہا ہے صرف عفو وکرم کے نتیجہ میں ہے جب کہ بندہ نے اس گناہ سے آخر وقت تک توبہ بھی نہ کی ہو، کیونکہ توبہ کی صورت میں تو شرک بھی معاف ہو جاتا ہے۔ شرک میں جو قطعی اعلان عدم مغفرت کا ہے، وہ توبہ نہ کرنے کی صورت میں ہے [3] تو اس کے بالمقابل دوسرے گناہوں میں جو مغفرت کا تصور پیدا کیا گیا ہے وہ بھی اسی صورت سے متعلق ہوگا اور نہ اس استثنا کے کوئی معنی نہ ہوں گے۔ [4]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا انہیں جو خود اپنی تعریفیں کرتے ہیں [5] بلکہ اللہ جس کی چاہے تعریف کرے اور ان پر ایک سوت برابر بھی ظلم نہیں ہوگا'' [6]

مطلب یہ ہے کہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کیا حاصل! تعریف تو وہ ہے جو اللہ کسی کی تعریف کرے۔ اب یہ تعریف قرآن اور حدیث

---

[1] ۔ نلعنهم بمسخهم قردة كما لعنا مسخنا (جلالين)

[2] ۔ هر آئينه افترا كرده به گناه بزرگ (شاه ولی الله)

[3] ۔ نفى ان يغفر من غير توبة لان الامة اجتمعت على ان الله يغفره بالتوبه (مجمع البيان)

[4] ۔ هذه الاية من اكد ما دل على ان الله تعالىٰ يعفو عن المذنبين من غير توبة (تبيان)

[5] ۔ اى يمدحونها ويصفونها بالزكوة والطهارة (مجمع البيان)

[6] ۔ ستم كرده نخواهند شد بمقدار رشته (ولی الله) نہ ظلم کیے جائیں گے ایک تاگے برابر (رفیع الدین)

کی زبان سے بھی ہوسکتی ہے اور یوں بھی کہ انسان کے افعال واعمال ایسے ہوں کہ اللہ اس کی تعریف زبان خلق پر جاری کرادے۔ اور یہ تعریف خود اس کے حسن کردار سے ان کے افعال کا نتیجہ ہوتی ہے، اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ ''ان پر ذرا بھی ظلم نہیں ہوگا'' یعنی جو تعریف کا مستحق ہوتا ہے خدا ضرور اس کی تعریف کرتا اور کراتا ہے۔

ہم بامناسب فقرہ اول یہی معنی سمجھتے ہیں لیکن بعض حضرات نے دوسرے فقرہ میں تزکیہ کے معنی پاک کرنے کے قرار دیئے ہیں یعنی کسی نفس کو پاک بنانا اللہ کا کام ہے۔ [1]

اس میں تاویل کی بھی ضرورت ہے، جب کہ قرآن مجید میں خود دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

قد افلح من زکّٰھا: فلاح پائی اس نے جس نے خود اپنے نفس کو پاک کیا۔

اور پھر پہلے جملہ سے مناسبت بھی زحمت طلب ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۰

''دیکھو یہ کس طرح اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور اس سے بڑھ کر کھلا ہوا گناہ کیا ہوگا۔''

اس جھوٹی تہمت سے مراد کتاب اللہ کی تحریف بھی ہوسکتی ہے لیکن اگر یہ آیت مقام تنزیل میں بھی سابق آیت کے بعد ہی ہو تو اس کی مناسبت سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اپنی تعریفوں کا جو ذکر تھا اس میں جماعت یہود و نصاریٰ کے اس قسم کے دعادی پیش نظر تھے کہ:

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ.

ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں

اور:

لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى.

جنت میں نہیں داخل ہوگا کوئی سوا اس کے جو یہودی یا عیسائی ہو۔

ان تمام خودستائیوں میں اللہ کی جانب ایک غلط چیز کی نسبت مضمر ہے وہ ہمارا باپ ہے، وہ ہم سے محبت کرتا ہے یا وہ ہم ہی کو جنت میں بھیجے گا۔ اس لئے کہا جارہا ہے کہ یہ سب خالق پر غلط تہمتیں ہی یہ لوگ لگا رہے ہیں [2] اور کوئی بھی جھوٹ بولنا گناہ ہے اور کسی پر تہمت لگانا معصیت ہے۔ چہ جائیکہ وہ جھوٹ جس میں اللہ پر غلط تہمت لگائی جائے۔ اس سے بڑھ کر کھلا ہوا گناہ کیا ہوگا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝۵۱ اُولٰٓئِكَ

---

[1] ۔ای یطھر من الذنب من یشاء (مجمع البیان)

[2] ۔ المراد بہ تزکیتہ انفسھم بانھا ابناء اللہ واحباوہ وانہ لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا او نصاری (تبیان)

الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا انہیں کہ جن کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا کہ وہ جبت اور طاغوت کے معتقد ہوتے ہیں اور کافروں کو کہتے ہیں کہ یہ اہل ایمان سے زیادہ ٹھیک راستے پر ہیں۔ یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کرے، اس پر ہرگز کوئی مددگار تم نہ پاؤ گے۔''

جبت اور طاغوت کی تشریح میں تعبیرات کا بہت اختلاف پایا جاتا ہے مثلاً شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

''معتقد می شوند بت را دمعبود باطل را'' (فتح الرحمن)

ان کے صاحبزادے لکھتے ہیں:۔

''یقین لاتے ہیں ساتھ سحر کے اور بتوں کے'' (شاہ رفیع الدین)

تیسرا قول یہ ہے کہ یہ دونوں دو بتوں کے نام ہیں:۔

صنمان لقریش (جلالین)

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے ترجمہ تو یہ کیا ہے کہ

''شیطان اور بتوں کا کلمہ پڑھنے لگے''

مگر حاشیہ پر شان نزول جو لکھی ہے، اس سے جلالین کی تائید ہوتی ہے۔ لکھا ہے کہ:۔

''احد کی لڑائی کے بعد کعب بن اشرف ستر سواروں کے ساتھ رسول اللہؐ سے عہد شکنی کر کے کفار قریش کو آپ کے مقابلہ پر آمادہ کرنے کے واسطے مکہ میں آیا۔ ابوسفیان نے اس سے کہا کہ تم اور محمدؐ دونوں اہل کتاب ہو۔ جب تک تم ہمارے بتوں کو سجدہ نہ کرو گے ہم کو تم دونوں میں سے کسی کا اعتبار نہیں۔ آخر کعب نے جبت و طاغوت کو سجدہ کیا۔''

علامہ طبرسی بھی اس کے موید ہیں اس طرح کہ:۔

یعنی بهما الصنمین الذین کانا لقریش وسجدا لهما کعب بن الاشرف (مجمع البیان)

جناب شیخ الطائفہ نے جبت اور طاغوت کی تشریح میں پانچ قول نقل کیے ہیں جن کے تحت میں یہ تمام تشریحات آ جاتے ہیں اور پھر ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ:

هما کل معبود من دون الله (تبیان)

اللہ کے سوا جس کی بھی عبادت کی جائے، وہ جبت و طاغوت ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں لفظوں کو الگ الگ نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ یہ دونوں ایک ساتھ استعمال ہو کر ایک ہی معنی کو بتاتی ہیں جسے کہیں تنہا لفظ طاغوت سے ظاہر کیا جاتا ہے اور کہیں دونوں لفظوں کو ملا کر ان کے مجموعہ سے جس کی نظریں ہر زبان کے محاوروں میں مثل ''جد و جہد'' کے کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

اب مجموعی حیثیت سے آیت کے مضمون پر نظر ڈالئے۔

اصولاً ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مشرکین یعنی وہ جو خدا کی وحدت اور نظام رسالت وشریعت ہی کے قائل ہی نہیں ہیں، جس طرح مسلمانوں کے حریف مقابل ہیں، اسی طرح یہود اور نصاریٰ کے بھی جو کسی نہ کسی حد تک ان باتوں کو مانتے ہیں لہٰذا یہود ونصاریٰ کو مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک محاذ بنالینا چاہئے تھا جو مشرکین سے برسر مقابلہ ہوتا مگر کتنے غضب کی بات ہے کہ اس جماعت نے بجائے مسلمانوں کا ساتھ دینے کے مشرکین کا ساتھ دیا اور مشرکین پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی کو قرآن نے کہا ہے کہ ''کافروں کو کہتے ہیں کہ یہ اہل ایمان سے زیادہ ٹھیک راستے پر ہیں۔''

یوں تو ''اہل ایمان'' کے مقابلہ میں جس سے مراد یہاں مسلمان ہیں، یہود ونصاریٰ بھی کفار کے زمرہ میں داخل ہیں، مگر چونکہ وہ یعنی یہود ونصاریٰ جن باتوں پر اصول حق میں سے ایمان رکھتے ہیں جیسے وحدت خالق اور نبوت وشریعت، انہیں بھی مشرکین تسلیم نہیں کرتے تو اہل کتاب کے مقابلہ میں مشرکین ''کافر'' کے لقب سے نامزد ہیں۔ اس لئے کہ ''کافر'' گالی کے طور پر کوئی انتقامی لفظ نہیں ہے بلکہ وہ ایک واقعیت کا اظہار ہے کہ اس بات کو کون مانتا ہے کہ اور کون نہیں مانتا چنانچہ رسالت حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہود ونصاریٰ نہیں مانتے تو اس حقیقت کے اعتبار سے وہ کافر ہیں اور اصل نظام شریعت کو جسے یہ سب مانتے ہیں، مشرکین نہیں مانتے تو ان سب کے مقابلہ میں وہ کافر ہیں۔ اسی اعتبار سے یہاں اہل کتاب کا نام الگ لیا گیا ہے اور ''الذین کفروا'' یعنی کافروں کا الگ اور پھر: ''الذین امنوا'' کی لفظ کے ساتھ مسلمانوں کا الگ۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾

''کیا اقتدار سلطنت میں ان کا کوئی موروثی حصہ ہے؟ پھر تو یہ لوگوں کو ذرا سا بھی [1] منہ دیں گے۔''

یہ استفہام انکاری حیثیت رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سلطنت واقتدار کسی کا موروثی حصہ نہیں ہے کہ یہ دوسرے تک ذرا سا بھی اس کے پہونچنے کے روادار نہ ہوں۔ [2]

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

''یا وہ لوگوں پر رشک وحسد کرتے ہیں اُس پر جو انہیں اللہ نے اپنے فضل وکرم سے دیا تھا (اچھا، پھر سن لیں کہ) ہم نے نسل ابراہیمی کو کتاب اور حکمت عطا کی ہے۔ [3] اور انہیں بہت بڑا شاہانہ اقتدار عطا کیا ہے''۔

رسولؐ اور آل رسول علیہم السلام کا محسود خلق ہونا

پہلا استفہام انکاری تھا اور یہ استفہام اقراری ہے [4] یعنی ان کی مخالفت کا سبب یا تو یہ ہے کہ اقتدار سلطنت ان کا موروثی حق ہے لہٰذا

---

[1] ۔شیئا فیما قدر البقرۃ فی ظھر النواۃ (جلالین) کھجور کے شگاف کے برابر (شاہ رفیع الدین) بھوسی بھر بھی نہ دیں گے (مولانا فرمان علی صاحب)

[2] ۔ھذا استفھام ومعناہ الانکار (مجمع البیان)

[3] ۔تحقیق دی ہم نے اولاد ابراہیمؑ کو کتاب اور حکمت (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔معناہ بل یحسدون الناس (مجمع البیان)

یہ کسی دوسرے کو اس کے ملنے کے روادار نہیں ہو سکتے تو یہ بات تو غلط ہے۔ حکومت و اقتدار کسی کی ملکیت نہیں ہے اور یا پھر یہ سبب ہے اور جب پہلا غلط ہے تو یقیناً بس یہی سبب ہے کہ یہ رشک و حسد کی وجہ سے کسی دوسرے پر اللہ کے فضل و کرم کی بارش نہیں دیکھ سکتے تو اگر یہ ہے اور واقعی یہی ہے تو پھر یہ جلتے رہیں۔ ان کے جلنے سے اللہ کی نعمت کا دروازہ کسی پر بند نہیں ہو جائے گا اور اب یہ خوب جلیں کہ ہم قطعی اعلان کیے دیتے ہیں کہ ہم نے اولاد ابراہیمؑ کو جس کا اب مصداق نسل اسمعیلؑ میں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آل طاہرینؑ کی شکل میں نمودار ہوا ہے [1] اپنی طرف سے کتاب اور حکمت عطا کی ہے اور انہیں عالم گیر حکومت کے منصب پر بھی فائز کر دیا ہے [2] جو کسی کے جلنے سے سلب نہیں ہو سکتی اور یہ وہ حکومت ہے جو تاج و تخت سے وابستہ نہیں ہے۔ ہاں تاج و تخت بھی اس کا حق ہے لہٰذا اگر کوئی تاج و تخت پر قبضہ کر کے حاکم بن جائے تو وہ غاصب ہوگا مگر یہ حکومت جس کے پائے نام ہے، اس کے لئے برقرار رہے گی۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

''تو ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور ان میں سے کوئی اس سے روگردان ہو گیا اور دوزخ سے بڑھ کر کون آگ ہوگی۔''

''ان میں سے'' یہ ضمیر ان کی طرف ہے جنہیں کہا گیا تھا کہ ''کیا اقتدار سلطنت میں ان کا کوئی موروثی حصہ ہے یا وہ لوگوں پر رشک و حسد کرتے ہیں''.....مطلب یہ ہے کہ خدا جسے اقتدار عطا کرتا ہے اس میں اس کا لحاظ نہیں ہوتا کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا چنانچہ آل ابراہیمؑ کو خدا نے اپنی طرف سے اقتدار عطا کیا ہے۔ اب یہ لوگوں پر ہے کہ کوئی مانتا ہے اور کوئی نہیں مانتا۔ جس نے نہیں مانا، اس کے نہ ماننے سے ان کے اقتدار پر کوئی حرف نہیں آیا۔ اسی کی آخرت میں بربادی ہوئی کہ آتش دوزخ کا مستحق ہو گیا، جسے آخر آیت میں ان لفظوں میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ''دوزخ سے بڑھ کر کون آگ ہو سکتی ہے۔''

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

''بلاشبہ وہ جنہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کر دیا، انہیں ہم جلد ہی آگ کا مزہ چکھائیں گے جب ان کی پہلی کھالیں گل جائیں گی تو ان پر ہم دوسری کھالیں بدل کر چڑھا دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں۔ یقیناً اللہ

---

[1] ۔ انه النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وهو قول ابی جعفر وزاد فیه واله (تبیان)

[2] ۔ قال مجاهد والحسن انه النبوة وقال ابو جعفر انه الخلافة من اطاعهم اطاع الله ومن عصاهم عصی الله (تبیان)

زبردست ہے، ٹھیک ٹھیک کام کرنے والا اور وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے، انہیں ہم بہت جلد ان بہشتوں میں پہنچا دیں گے جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ان کے لئے وہاں پاک و پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور انہیں ہم محفوظ سایہ میں جگہ دیں گے''۔ [1]

بدلنا هم جلودا غيرها کا ظاہری مفہوم یہی ہے جس کے ساتھ ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس میں عقلی حیثیت سے خواہ مخواہ کی میخیں نکالی ہیں کہ گناہ تو پہلی کھال نے کیے تھے۔ اس دوسری کھال کو سزا دینے کا کیا محل ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ گناہ اس آدمی نے کیے تھے۔ اسی کو جلایا گیا اور اسی کو جلایا جا رہا ہے اور اسی کو اذیت پہنچانے کے لئے ایک کھال کے کہنہ ہو کر بے حس ہو جانے پر دوسری تازہ کھال کا لباس پہنایا جا رہا ہے تاکہ اس کی تکلیف قائم رہے۔ کھال کو سزا نہیں مل رہی ہے۔ وہ اس آدمی کو سزا کی تکلیف کا ذریعہ ہے۔ [2]

اسی کو قرآن میں کہا گیا ہے: ليذوقوا العذاب، جس کا ترجمہ میں نے کیا ہے ''تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھتے رہیں'' وہ، کون؟ کھالیں نہیں بلکہ وہ اشخاص جن پر پرانی کھالوں کے بدلے یہ نئی کھالیں چڑھائی گئی ہیں، وہی اصل مجرم ہیں۔ نہ کہ وہ کھالیں جو ان پر چڑھی ہوئی تھیں بلکہ دوسری جگہ قرآن نے بتایا ہے کہ وہ کھالیں، ان کے خلاف اللہ کی طرف سے گواہی دیں گی اور وہ ان کھالوں سے شاکی ہوں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ.

اور وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ وہ کہیں گی کہ ہمیں گویائی دی اس نے کہ جو ہر شے کو گویائی دیتا ہے اور وہ تو خود ہی جانتا ہے اسے جو تم کرتے تھے۔

اس سے بہت ہی نمایاں طور پر ظاہر ہے کہ جرائم کا ارتکاب کرنے والے اور ہیں، نہ کہ یہ کھالیں جو ان کے خلاف اللہ کی طرف کی گواہی ہوئی ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾

''بلاشبہ اللہ کا حکم تمہیں ہے کہ امانتیں ان کے حق کو ادا کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ یقیناً اللہ تمہیں بہت اچھی ہدایتیں کرتا ہے۔ یقیناً اللہ خوب سننے والا ہے، دیکھنے والا''۔

امانتوں میں اموال بھی ہیں جو مالک بنظر حفاظت دوسروں کے پاس رکھتا ہے اور وہ ذمہ داریاں بھی ہیں جو کسی معاہدہ یا ذاتی حق سے کسی دوسرے کے لئے اپنے اوپر عائد ہوں، جن میں سب سے اہم اللہ کی طرف کے احکام یعنی اوامر و نواہی کی تعمیل ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونا امانت

---

[1] ۔ الظليل هو الكنين لانه لاشمس فيه ولا سموم (تبيان)

[2] ۔ انما هو شي يصل به الالم الى المستحق له (تبيان)

داری کا بہت اہم جز ہے۔[1]

اور پھر اسی کے عام دائرہ میں داخل ہے حکمرانوں کی ذمہ داری جو خلق خدا کی بہبودی کے پاس ولحاظ کی ان پر عائد ہوتی ہے۔[2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۵۹

''اے ایمان لانے والو! فرماں برداری کرو اللہ کی اور فرماں برداری کرو رسولؐ کی اور ان کی جو تم میں فرماں روائی کے حق دار ہیں لہٰذا اگر کسی بات میں تم جھگڑا ہو تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پلٹاؤ اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی اچھا ہے اور انجام کے لحاظ سے بہتر ہے''۔[3]

آیہ اُولی الامر

اولی الامر کے معنی ''حکومت کا حق رکھنے والے'' ہی اس لفظ کا مقتضا ہے، اس لئے کہ غاصب صاحب مال نہیں کہلایا جا سکتا۔ اسی طرح حکومت پر ناجائز تصرف رکھنے والے کو اولی الامر میں سمجھنا بھی غلط ہے۔

اس سے جمہور کے اس خیال کا غلط ہونا ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اولی الامر کے تحت میں دنیوی بادشاہوں کی اطاعت کو فرض قرار دے لیا ہے، حالانکہ ان بادشاہوں کے احکام تو اکثر احکام خدا اور رسولؐ سے متصادم بھی ہو جاتے ہیں تو پھر ان کا حکم اطاعت، خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے حکم سے ٹکرا جائے گا اور کلام الٰہی میں تضاد پیدا ہو جائے گا جو کسی صورت سے صحیح نہیں ہے اور اسی سے جمہور کی دوسری تفسیر بھی کہ اولی الامر سے مراد علماء ہیں غلط قرار پائے گی، اگر علماء سے عام علماء مراد ہوں اور اگر علمائے حقیقی یعنی معصومین علیہم السلام مراد ہوں تو ہمارے نزدیک وہ پہلے معنی یعنی حق حکومت کے اعتبار سے بھی اولی الامر ہوں گے۔

لایجوز ان یوجب اللہ طاعته احد علی الاطلاق الامن ثبت عصمته وعلم ان باطنه کظاهره وامن منه الغلط والامر بالقبیح ولیس ذلك بحاصل فی الامرآء ولا العلماء سواهم جل اللہ ان یامر بطاعة من یعصیه اوبالا نقیاد للمخالفین فی القول والفعل لانه محال ان یطاع المختلفون کما انه محال ان یجتمع ما اختلفوا فیه.(مجمع البیان)

ممکن نہیں ہے کہ اللہ کسی کی بھی اطاعت بلا قید واجب کرے سوا اس کے کہ جس کا معصوم ہونا ثابت ہو اور معلوم ہو کہ اس کا باطن اسکے

---

[1] ۔هو المروی عن ابی جعفر وابی عبداللہ (مجمع البیان)

[2] ۔رواه اصحابنا عن ابی جعفر الباقر وابی عبداللہ الصادق (مجمع)

[3] ۔تاویلا مألا (جلالین) ای احمد عاقبة (مجمع البیان)

ظاہر سے بالکل متفق ہے اور جس سے غلطی اور کسی غلط کام کے حکم دینے کا خطرہ نہ ہو اور یہ بات نہ امراء کے لئے ہے اور نہ معصومین کے علاوہ دوسرے علماء کے لئے بالاتر ہے اللہ اس سے کہ وہ ایسے کی اطاعت کا حکم دے جو خود اس کا نافرمان ہو یا ان لوگوں کی پیروی کا حکم دے جن کے قول اور عمل میں اختلاف ہو۔ اس لئے کہ کئی کی اطاعت جو آپس میں اختلاف رکھتے ہوں ممکن نہیں ہے، جیسے کہ یہ ناممکن ہے کہ جن باتوں میں وہ اختلاف رکھتے ہیں، وہ ایک ساتھ سب صحیح ہوں۔

اس کو اس سے پہلے اس سے زیادہ مختصر لفظوں میں شیخ الطائفہ تحریر فرما چکے ہیں، اس طرح:۔

ولا یجوز ایجاب طاعته احد مطلقا الا من کان معصوما مامونا منهالسهو والغلط ولیس ذلك بحاصل فی الامرآء ولا العلماء وانما هو واجب فی الائمة الذین دلت الادلة علی عصمتهم وطهارتهم (تبیان)

جائز نہیں ہے کسی کی بلا قید اطاعت سوا اس کے جو معصوم ہو اور جس سے بھولنے اور غلطی کرنے کا خطرہ نہ ہو اور یہ بات امراء اور عام علماء میں نہیں ہے اور یہ ضروری ہے بس ان ائمہ میں جن کی عصمت وطہارت ثابت ہوگئی ہے۔

اللہ اور رسولؐ کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کے حکم کے بعد جو کہا گیا ہے کہ تم میں اگر اختلاف ہو تو اللہ اور رسولؐ سے الگ نہیں لیا گیا ہے اس بنا پر کہ رسولؐ کی موجودگی میں اولی الامر کا مصداق بھی آپ ہی ہیں لہٰذا آپ ہی کی اطاعت رسولؐ واولی الامر دونوں کی اطاعتوں کا مصداق ہے لیکن جب پیغمبرؐ دنیا سے اٹھ جائیں تو آپ کی نیابت میں جس دور میں جو اولی الامر کا مصداق ہو، وہ مرکز اطاعت ہوگا۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يَزۡعُمُوۡنَ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّتَحَاكَمُوۡۤا اِلَى الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ يَّكۡفُرُوۡا بِهٖ ؕ وَيُرِيۡدُ الشَّيۡطٰنُ اَنۡ يُّضِلَّهُمۡ ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا ﴿۶۰﴾

''کیا آپ نے نہیں دیکھا انہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ایمان لائے اور اس پر بھی جو آپ پر اتارا گیا ہے اور اس پر بھی جو آپ کے پہلے اتارا گیا تھا۔ پھر بھی وہ چاہتے ہیں کہ حکومت باطل [1] کے پاس وہ مقدمے لے جائیں۔ حالانکہ انہیں حکم یہ ہے کہ وہ اس کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں گمراہی میں مبتلا کرے''۔

عدالت غیر شرعی میں مقدمہ لے جانے کی ممانعت

اس آیت سے اس حکم فقہی کا ثبوت ملتا ہے کہ عدالت جور میں مقدمہ لے جانا ممنوع ہے۔

اس کے علاوہ ایک اصولی حکم جس کی اس آیت میں صراحت ہے، وہ یہ ہے کہ ''حکومت باطل'' کا انکار لازم ہے۔ انکار کے معنی ہیں اس کے باطل ہونے کا اعتقاد اور حسب مواقع اظہار۔

اصل اصول تبرا یہی ہے جسے عوام نے اپنے عمل سے بدنام بنا دیا ہے۔

---

[1] ۔روی عن ابی جعفر وابی عبداللہ ان الایة فی کل من یتحاکم الی من یحکم بخلاف الحق (تبیان)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿٦١﴾

''اور جب ان سے کہا جائے کہ آؤ اس کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور پیغمبر کی طرف تو منافقین کو دیکھے گا کہ وہ آپ سے شدت کے ساتھ [1] روگردانی کریں گے''۔

''جو اللہ نے اتارا ہے'' یعنی قرآن، اس کی طرف آؤ یعنی کتاب خدا پر عمل کرو اور رسولؐ کی طرف آؤ یعنی سنت پر عمل کرو تو منافقین کی علامت یہ ہے کہ وہ آپ سے روگردانی کریں گے۔ یعنی کتاب پر عمل کا چاہے اقرار کرلیں مگر ''سنت'' اور اقوال و اعمال پیغمبرؐ کے قبول کرنے میں انہیں عذر ہوگا جس کے ثبوت میں ایک آواز پہلے آئی تھی: حسبنا کتاب اللہ اور اب پرویز صاحب کا مستقل مشن یہ ہے کہ کتاب کو بہ حیثیت ماخذ قبول کیا جائے اور سنت کو نہیں۔ قرآن پہلے سے اس کردار کا مرقع محفوظ کیے ہوئے ہے۔

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿٦٢﴾

''تو کیسا ہوگا [2] اس وقت جب انہیں ان گزشتہ اعمال کی وجہ سے کوئی مصیبت درپیش ہوگی اور پھر وہ آپ کے پاس آئیں گے خدا کی قسمیں کھاتے ہوئے کہ ہمیں تو بھلائی و موافقت [3] کے سوا کچھ مدنظر نہ تھا''

توفیق جس کا ترجمہ ہم نے ''موافقت'' سے کیا ہے، اس کے دوسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ منافقین جو باطل حکام کے پاس مقدمے لے جاتے ہیں تو وہ بعد میں اس کی تاویلیں کریں گے کہ ہم چاہتے تھے کہ فریقین میں صلح کرادیں اور اتفاق باہمی پیدا کریں۔ [4]

لفظ ''توفیق'' کے ساتھ دونوں ہی معنی سازگار ہیں اور دونوں توجیہیں عقلاً بھی درست ہیں، اور قدیم مفسرین نے بھی بس دونوں قولوں کے نقل کردینے ہی پر اکتفا کی ہے۔ [5] اس لئے کسی ایک قول کو ترجیح دینا مشکل ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ﴿٦٣﴾

---

[1] ۔یصدون عنك صدودا عظیما۔ (تبیان)

[2] ۔موضع کیف رفع بانه خبر مبتدا محذوف والتقدیر فکیف صنعیهم (مجمع البیان)

[3] ۔نخواسته بودیم مگر نیکو کاری و موافقت کردن (شاہ ولی اللہ) نہ چاہا ہم نے مگر احسان یعنی بھلائی اور موافقت کرنا (رفیع الدین)

[4] ۔تالیفا بین الخصمین (جلالین) اراد بالتوفیق الجمع والتالیف (مجمع البیان)

[5] ۔قیل فیه قولان احدهما ای ما اردنا ... الا احسانا الینا وما وافق الحق فی امرنا ... الثانی إلّا توفیقا بین الخصوم (تبیان)

''یہ وہ ہیں کہ اللہ خوب جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے لہٰذا آپ ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے اور انہیں نصیحت کرتے رہیے اور ایسی باتیں ان سے کہتے رہیے جو زیادہ سے زیادہ ان کے دلوں میں اثر پیدا کر سکیں''۔ [1]

فاعرض عنهم کے معنی اگر یہ ہوتے کہ اُن سے منہ پھیر لیجئے جیسا کہ بعض نے ترجمہ کیا ہے [2] تو پھر بعد کے جملوں کا کہ ''انہیں نصیحت کرتے رہیے'' اور ''ایسی باتیں کہتے رہیے جو زیادہ سے زیادہ موثر ہو سکیں'' کوئی محل نہ ہوتا۔ اس لئے ہم نے یہ ترجمہ کیا کہ ''ان کی باتوں کا خیال نہ کیجئے''۔ [3]

''یہ وہ ہیں کہ اللہ خوب جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے''..... اللہ تو سب ہی کے دل میں جو ہے، اسے جانتا ہے مگر جو نرے کھرے آدمی ہیں، ان کے دلوں میں سوا اس کے جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اور کچھ ہوتا نہیں لیکن منافقین کے دلوں میں ان کی زبان کے اظہار کے علاوہ اور کچھ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ارشاد ہوا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ان کی منافقت سے خوب واقف ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿٦٤﴾

''اور کوئی پیغمبر ہم نے نہیں بھیجا مگر اس کے لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور اگر جب انہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی تھی تو آپ کے پاس آتے اور پھر اللہ سے بخشش کے طلب گار ہوتے اور پیغمبر ان کے لئے دعائے مغفرت کرتے تو اللہ کو پاتے بڑا توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان''۔

''اپنے اوپر زیادتی'' کے معنی گناہوں کے ارتکاب کے ہیں جس سے وہ اپنے نفوس کو انجام کے لحاظ سے نقصان پہنچاتے ہیں۔ [4]

توسل کی اہمیت

یہ آیت توسل کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔ استغفار ایک دعا ہی ہے، اس کے لئے براہ راست اللہ سے دعا کافی ہونا چاہئے مگر اس کا طریقہ کار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ پیغمبرؐ کے پاس آ کے استغفار کریں اور پیغمبرؐ ان کے لئے خدا کی بارگاہ میں دعائے مغفرت کریں۔

بس یہی ہے ہر اس دعا کا مطلب جو کسی مقرب الٰہی کے روضہ پر جا کر کی جاتی ہے۔

دعا کا قبول کرنے والا اصل میں خدا ہی ہے مگر اس شخص کا جو کوئی دینی اہمیت رکھتا ہے، وسیلہ اختیار کرنا اس دعا کو قبولیت کی منزل سے قریب کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

---

[1] ۔ یبلغ من نفوسهم کل مبلغ (مجمع البیان)

[2] ۔ پس منہ پھیر لئے ان سے (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔ ای لا تعاقبهم (مجمع البیان)

[4] ۔ فجسوها حقها بادخال الضرر علیها بفعل المعصیة من استحقاق العقاب وتقویت الثواب بفعل الطاعة (تبیان)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾

''تو نہیں، قسم آپ کے پروردگار کی، وہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک ان جھگڑوں میں جو ان کے درمیان ہوں، آپ کو حکم نہ مانیں، پھر جو کچھ آپ فیصلہ کریں، اس سے اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح تسلیم کریں۔''

اس میں صاف حکم رسولؐ کے مقابلہ میں مسلمان کو بالکلیہ ''سپردگی'' اختیار کرنے دعوت دی گئی ہے اور صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ یہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے جس کے بغیر یہ مومن سمجھے ہی نہیں جا سکتے۔ [1]

اس کے بعد فیصلہ خدا اور رسولؐ کو چھوڑ کر کسی اجماع یا شوریٰ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

جب آپ فیصلہ کر دیں تو ''اپنے دل میں تنگی محسوس نہ کریں''.....یعنی بے چینی اور اضطراب جو شک وشبہ کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ [2]

اور یہی پوری طرح اس کا تسلیم کرنا ہے کہ اس کی صحت کے بارے میں انسان کسی شک اور اس کی تعمیل کے متعلق کسی تذبذب میں مبتلا نہ ہو۔ [3]

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿٦٦﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٦٧﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٦٨﴾

''اور اگر کہیں ہم ان پر یہ فرض عائد کر دیتے کہ خود اپنوں کو قتل کرو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو سوا کم لوگوں کے یہ سب اسے عمل میں نہ لاتے اور اگر یہ کرتے وہی جو انہیں ہدایت کی جاتی ہے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا اور ثابت قدمی کا زیادہ سبب ہوتا [4] اس وقت میں ہم انہیں اپنے پاس سے بڑا اجر دیتے اور انہیں سیدھے راستے پر چلنے کی

---

[1] ۔ایشان مسلمان نباشند تا آنکہ حاکم کنند ترا در اختلافی کہ واقع شود میان ایشان (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔حرجا ضیقا او شکا (جلالین)

[3] ۔یسلمون من غیر شك یدخلهم فیه (تبیان)

[4] ۔تثبیتا تحقیقا لایمانهم (جلالین) ای بصیرة فی امر الدین لان من کان علی بصیرة من امر دینه کان ذلك ادعی له الی الثبات علیه (مجمع البیان) محکم تر در استواری دین (شاہ ولی اللہ) اور زیادہ نہ ہوتا ثابت رکھنے میں (رفیع الدین)

خصوصی توفیق کرامت فرماتے۔''

مقصد یہ ہے کہ اس شریعت کے احکام تو آسان ہیں اور یہ عمل نہیں کرتے۔ بنی اسرائیل کو اتنے سخت احکام دیئے جاتے تھے۔ اگر کہیں انہیں ویسے سخت احکام دیئے جاتے [1] تو کیا سوا ایک بہت چھوٹی سی اقلیت کے کوئی بھی تعمیل کرتا؟!!

ایسے بیانات قرآنی کے بعد پھر اگر طبقہ صحابہ کو بلا استثناء آسمان پر چڑھا دیا جائے تو کیا ہنسی آنے کی بات نہیں ہے؟!

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿٧٠﴾

''اور جو اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرے گا تو یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جنہیں اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے، انبیاء، صدیقین، شہیدان راہ خدا اور صالحین اور یہ بہت ہی اچھے رفیق ہیں۔ یہ ہے اللہ کی طرف کا فضل و کرم اور اللہ سے بڑھ کر کون باخبر ہوگا۔''

اطاعت کا اس سے بڑھ کر نتیجہ کیا ہوسکتا ہے کہ انسان کو ان بزرگ ترین طبقات کی معیت حاصل ہوجائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اطاعت کرنے کے بعد نبی ہوجائے گا، یا ضرور ہی صدیق ہوجائے گا یا لازماً شہید ہوجائے گا کیوں کہ یہ تو خاص خاص مرتبے ہیں جو خاص خاص افراد کو حاصل ہوتے ہیں مگر اطاعت کرنے والا اسی منزل یعنی بہشت میں ہے جہاں ان سب اصناف کے افراد ہیں۔ یہی اس کے فخر کے لئے کیا کم ہے؟!

اس سے معلوم ہوا کہ قادیانی جماعت کا اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ نبوت کا دروازہ بند نہیں ہے، بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ اگر اطاعت کے ذریعہ سے آدمی خود انبیاء میں داخل ہوسکتا ہے تو بیچ میں مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ صاف صاف یہ کہہ دیا جاتا کہ: اُولٰٓئِكَ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ یا نعمت کا تذکرہ بھی ضروری سمجھا جاتا تو وہاں مع کے بجائے من آتا کہ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ''یہ ان میں سے ہوگا۔ جنہیں اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا ہے یعنی نبیین وغیرہ..... یہاں من کے بجائے مع کہنا اور پھر آخر میں رفیقا کا لفظ کہنا کہ ''یہ لوگ بہتر رفیق ہیں'' صاف اس کا پتہ دیتا ہے کہ یہ شخص خود ان اصناف میں داخل نہیں ہے۔

قادیانی جماعت کا غلط استدلال اور اس کی وجہ

اس صورت میں بس بات جو غور طلب رہ جاتی ہے، وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء کے بعد صالحین کا لفظ ہے، اس لئے کہ اطاعت خدا اور رسولؐ کے بعد آدمی نبی نہ ہو، صدیق نہ ہو، شہید نہ ہو مگر صالح تو ضرور ہوگا۔ پھر یہ کیوں کہا جا رہا ہے کہ وہ صالحین کی رفاقت میں ہوگا اور اگر صالحین کی رفاقت کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود صالحین میں سے ہے تو پھر نبیین اور صدیقین اور شہداء میں بھی یہ مفہوم درست ہونا چاہئے کہ یہ شخص ان طبقات میں

---

[1] ۔ کما اوحینا علی قوم موسیٰ (تبیان)

داخل ہوجاتا ہے۔

اس پہلو کا تحفظ قادیانی جماعت کے وجود میں آنے سے پہلے شاہ عبدالقادر دہلوی نے کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''نبی وہ لوگ جن پر اللہ کی طرف سے وحی آئے اور صدیق وہ کہ جو وحی میں آوے، ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور شہید وہ جن کو پیغمبر کے حکم پر ایسا یقین آیا کہ جس پر وہ جان دیتے ہیں اور نیک بخت وہ جن کی طبیعت نیکی ہی پر پیدا ہوئی تھی تو جو لوگ ایسے نہیں لیکن حکم برداری میں لگے جاتے ہیں، اللہ ان کو بھی ان کے ساتھ گنے گا۔'' (موضح القرآن)

اسے ہم اپنے لفظوں میں کہیں تو یہ مطلب ہے کہ معیاری درجہ کے وہ افراد جنہیں خالق نے ''صالحین'' کے لفظ سے مرکز معیت قرار دیا ہے، وہ ''معصومین'' ہیں اور دوسرے لوگ جو غیر معصوم ہیں مگر ان کی پیروی میں لگے رہتے ہیں، ان کی اطاعت کا صلہ یہ ہے کہ یہ ان کی رفاقت کی نعمت سے بہرہ اندوز ہوں۔ اس کے بعد قادیانی استدلال ہباءً منثورا ہوکر نیست و نابود ہوجاتا ہے مگر شاہ عبدالقادر صاحب کو اس تشریح کی روشنی میں ایک اور حقیقت بھی تسلیم کرنا لازم ہے اور وہ یہ ہے کہ جب یہ تمام عناوین مختلف ہیں۔ اس طرح کہ بعض افراد میں چاہے ان کا اجتماع ہوجائے مگر یہ اوصاف علیحدہ علیحدہ بھی وجود رکھتے ہیں یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ جو صدیق ہو، وہ نبی بھی ہو یا شہید بھی ہو اور یہ ضروری نہیں کہ جو شہید ہو، وہ صدیق یا نبی بھی لازمی طور پر ہو تو آخر میں الصالحین کا لفظ لانے سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کے طبقہ کے علاوہ بھی معصومین کا کوئی گروہ ہے جن کی معیت مثل معیت انبیاء وغیرہ کے سرمایہ سعادت ہے، ورنہ شروع میں انبیاء کا ذکر ہونے کے بعد پھر آخر میں وہ الصالحین جو بقول شاہ صاحب ''نیکی ہی پر پیدا ہوئے تھے'' کون ہوسکتے ہیں؟

شان نزول میں بھی اس آیت کے جو دو روایتیں وارد ہیں، دونوں اس کی گواہ ہیں مع سے مراد ان جماعتوں میں داخل ہوجانا نہیں ہے چنانچہ علامہ طبرسی لکھتے ہیں:۔

قیل نزلت فی ثوبان مولی رسول الله وکان شدید الحب لرسول الله قلیل الصبر عنه واتاه ذات یوم وقد تغیر لونه ونحل جسمه فقال یاثوبان ماغیر لونك فقال یارسول الله مابی من مرض ولا وجع غیر انی اذالم ارك اشتقت الیك حتی القاك ثم ذکرت الاخرة فاخاف لفی لاارالك هناك لانی عرفت انك ترفع من النبیین وانی ان ادخلت الجنة کنت فی منزل ادنی من منزلك ... فنزلت الایة ... وقیل ان اصحاب رسول الله قالوا ما ینبغی ان نفارقك فانالانراك الا فی الدنیا فاما فی الاٰخرة فانك ترفع فوقنا بفضلك فلا نراك فنزلت الاٰیة (مجمع البیان)

ایک قول یہ ہے کہ وہ ثوبان غلام پیغمبر خدا کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہیں پیغمبرؐ خدا سے بڑی محبت تھی اور آپ کی جدائی برداشت نہیں کرسکتے تھے تو ایک دن وہ حضرتؐ کے پاس آئے اس عالم میں کہ رنگت متغیر تھی اور جسم زار و نزار، حضرتؐ نے دریافت فرمایا کہ اس کا کیا سبب ہے؟ انہوں نے کہا یارسول اللہ! مجھے کوئی بیماری یا تکلیف نہیں ہے مگر میں جب آپ کو نہیں دیکھتا تو جب تک آپ سے مل نہ لوں قرار نہیں آتا اس کے بعد مجھے آخرت کا تصور ہوا تو یہ ڈر محسوس ہوتا ہے کہ وہاں میں آپ کی زیارت نہ کرسکوں گا اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کا درجہ دوسرے انبیاء سے بھی بالاتر ہوگا میں اگر بہشت میں داخل بھی کیا گیا تو آپ کی منزل سے یقیناً بہت نیچے کی منزل میں ہوں گا..... اس پر یہ آیت نازل ہوئی..... اور ایک قول یہ ہے کہ اصحاب پیغمبر خداؐ نے کہا کہ ہمیں آپ سے جدا نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ ہم تو بس دنیا میں آپ کا دیدار کررہے ہیں۔ رہ گئی

آخرت وہاں تو آپ اپنی فضیلت کی بنا پر ہم سب سے بہت بلند ہوں گے تو وہاں آپ کو ہم کہاں دیکھیں گے۔ اس پر یہ آیت اتری۔

اس سے ظاہر ہے کہ معیت کے معنی ساتھ ہونے ہی کے ہیں۔ نہ یہ کہ یہ شخص اس مرتبہ پر فائز ہو جائے گا۔

اس کے بعد ایک حدیث کو دیکھا جائے جو ہمارے یہاں وارد ہوئی ہے کہ معصوم نے شیعوں کے لئے فرمایا:

فی درجتنا یوم القیٰمة۔

وہ روز قیامت ہمارے درجہ میں ہوں گے۔

تو وہ بالکل اس آیت قرآنی کے مضمون سے مطابق معلوم ہوگی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾ وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾

''اے ایمان لانے والو! اپنی حفاظت کا سامان مکمل رکھو [1] اور پھر (جب وقت آئے تو) نکل کھڑے ہو خواہ دستہ دستہ ہو کر الگ الگ [2] اور خواہ نکلو اکٹھا۔ اور بلاشبہ تم میں ایسے بھی ہیں جو ضرور بالضرور دیر کرتے ہیں [3] تو اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتے ہیں مجھ پر اللہ کا بڑا احسان تھا کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا اور اگر اللہ کا فضل و کرم تمہارے شامل حال ہو تو وہ ضرور یہ کہیں گے جیسے کہ تم میں اور ان میں کوئی محبت و الفت تھی ہی نہیں کہ کاش میں ان کے ساتھ ہوتا تو بہت بڑی کامیابی حاصل کرتا۔''

بالکل ظاہر ہے کہ یہ کافروں کا ذکر نہیں ہے ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ ''تم میں ایسے ہیں'' بلکہ یہ انہی کا ذکر ہے جو بظاہر مسلمان ہیں مگر ان کے جذبات کافرانہ ہیں۔ اس لئے کہ کوئی مسلمان مسلمانوں کے مبتلائے مصیبت ہونے پر اور وہ بھی راہ حق میں، شکر خدا ادا نہیں کر سکتا کہ الحمدللہ میں ان میں شامل نہ تھا [4] ایسے ہی مسلمان نما کافروں کا نام منافقین ہوتا ہے۔

---

[1] ۔حذوا حذرکم من عدوکم ای احترزوا منه وتیقنطوا له (جلالین) خذوا اسنحتکم وهو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام (جمع البیان) لو بچاؤ اپنا (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔الثبات جمع ثبة وهی جماعات فی تفرقة ای متفرقین (تبیان)

[3] ۔بعضی از شمار آنست که درنگ می کند (شاہ ولی اللہ) دیر کرتے ہیں نکلنے میں (رفیع الدین)

[4] ۔قال ابو جعفر من یتمنی التاخر عن جماعة المسلمین لایکون الا کانوا (تبیان) قال الصادق علیه السلام واللہ لو قال هذه الکلمة اهل الشرق والغرب لکانوا بها خارجین عن الایمان ولکن اللہ قد سماهم مومنین باقرارهم (علی بن ابراهیم)

اس کے بعد یہ فقرہ کہ: كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ ''جیسے کہ تم میں اور ان میں کوئی محبت والفت تھی ہی نہیں۔'' اس کے سمجھنے میں بعض مفسرین کو دشواری پیدا ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق پہلے جملہ سے ہے کہ جب کوئی مصیبت آئے تو وہ اس طرح کہ جیسے تم میں اور ان میں کوئی محبت کا رشتہ تھا ہی نہیں، یہ کہتے ہیں کہ خدا کا مجھ پر بڑا احسان تھا کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا۔ [1]

مگر ترتیب الفاظ کلام الٰہی اس تفسیر کے بالکل خلاف ہے۔ جب دوسرے جملہ کی شرط حرف عطف کے ساتھ آ گئی کہ ''اگر تمہیں اللہ کا فضل شامل حال ہوا'' تو اب یہاں کا کوئی جزو پہلے جملہ سے مرتبط کرنا بالکل عجیب سی چیز ہے۔ ہمارے خیال میں تو یہ یہیں سے متعلق ہے [2] مطلب یہ ہے کہ اگر تم میں اور ان میں الفت ہوتی تو یہ تمہاری کامیابی کو اپنی کامیابی سمجھتے، مگر یہ اپنے کو تم سے بے گانہ سمجھتے ہیں، اس لئے اب جو کامیابی تمہیں حاصل ہوئی، اس پر ہاتھ ملتے ہیں کہ ہم بھی کاش ان کے ساتھ ہوتے۔ [3]

حکم جہاد بصورت قتال

ہاں، یہاں ایک خاص پہلو سوچنے، سمجھنے اور یاد رکھنے کا ہے کہ جیسے پہلے جملہ میں انسان کا یہ قول کہ ''اللہ کا مجھ پر بڑا احسان تھا کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا'' ذاتاً کسی برائی کا حامل نہیں ہے بلکہ محل کے لحاظ سے اس میں برائی پیدا ہوئی ہے کہ راہ خدا میں مصیبت کے درپیش ہونے پر یہ الفاظ کہے گئے..... اس طرح ان الفاظ میں کہ ''میں بھی کاش ان کے ساتھ ہوتا تو بہت کامیابی حاصل کرتا، ذاتاً کوئی برائی کا پہلو نہیں ہے بلکہ اس پس منظر سے برائی پیدا ہوئی کہ راہ خدا میں مصیبت آنے پر تو وہ اپنی عدم موجودگی پر شکر خدا ادا کرتے ہیں اور جب اتفاق سے فتح ہوتی ہے اور مال غنیمت حاصل ہوتا ہے تو وہ مادی منفعت کے تصور سے کف افسوس ملتے ہیں کہ کاش ہم بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ یہ درحقیقت ان کی مادی ذہنیت، دین اور اہل دین سے بیگانگی کی مذمت ہے جو ان دونوں موقعوں پر ان کے قول سے نمایاں ہوتی ہے لہٰذا اگر محل مختلف ہو جائے تو انہی دونوں قولوں یا ان کے عمل مظاہروں میں بڑی بلندی پیدا ہو جائے اور وہ اس کی بالمقابل شکلیں یہ ہیں کہ راہ خدا میں کسی قربانی کا پیغام ملنے پر شکر خدا ادا کیا جائے اور کسی آماجگاہ مصیبت اور مرکز قربانی میں عدم موجودگی پر کف حسرت ملا جائے جیسے ہم کو ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام نے تعلیم دی ہے کہ جب مجاہدین کربلا کو یاد کرو تو کہو: يٰلَيْتَنَا كُنَّا مَعَكُمْ فَنَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا۔ اب یہ الفاظ ایک بلند ذہنیت کے ترجمان ہوں گے اس طرح کہ وہ اگر صدق دل سے کہے جا رہے ہیں تو بلاشبہ بہت بڑے جذبہ ایمانی کا قوی ترین ثبوت ہیں۔

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾

''تو جو لوگ دنیا کی اس پست زندگی کو آخرت کے عوض فروخت کرنے پر تیار ہوں، انہیں اللہ کی راہ میں جنگ کرنا چاہئے اور جو اللہ کی راہ میں جنگ کر کے مارا جائے یا فتح پائے، اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے''

---

[1] ۔ھٰذا راجع الیٰ قولہ: قد انعم اللہ علی اعترض بہ بین القول ومقولہ (جلالین)

[2] ۔قیل ان الکلام فی موضعہ من غیر تقدیم ولا تاخیر (جمع البیان)

[3] ۔اگر لوگوں کو فائدہ پہنچتا تو پہنچتا ہے اور دشمنوں کی طرح حسد کرتا ہے (موضح القرآن)

اجر آخرت کا انحصار راہ خدا میں جنگ کے بعد دو چیزوں پر رکھا گیا ہے: ایک یہ کہ جہاد میں کام آجائے جس کا مطلب ہے شہید ہونا اور دوسرے دشمن کو بھگا کر فتح حاصل کرے جس سے حق بجانب طور پر ''غازی'' کہا جا سکے۔

ان دونوں صورتوں میں اجر ہے لیکن تیسری صورت کہ میدان جہاد میں جائے اور پھر نہ مارا جائے اور نہ دشمن کو شکست دے بلکہ خود سلامتی کے ساتھ راہ فرار اختیار کرے یا چوتھی صورت کہ دشمنوں کے سامنے ہتھیار ڈال دے، ایسا میدان میں جانا، اور حق کو کمزور کرنے کا باعث ہے، اس لئے اس پر کسی اجر و ثواب کا استحقاق نہیں ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾

''اور تم آخر کیوں نہیں جنگ کرتے اللہ کی راہ میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جو کہتے ہیں کہ پروردگار! ہمیں اس بستی سے کہ جس کے باشندے ظالم ہیں، باہر نکال دے اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کوئی سرپرست قرار دے اور اپنی جانب سے کسی کو مددگار بنا دے۔''

یہ کمزور مسلمان وہ ہیں جو کافروں کے شکنجہ ظلم سے نکلنے کے لئے بے چین تھے اور دل ہی دل میں اللہ سے دعائیں کرتے تھے کہ وہ ان کی مخلصی کی کوئی صورت پیدا کرے اور ''مردے از غیب'' کو باہر لائے جو انہیں اس مصیبت سے نجات دلائے۔ خالق کریم نے ان کی ان دلی التجاؤں کی ترجمانی کرتے ہوئے مسلمانوں کو مشرکین سے مقابلہ کی ترغیب دی ہے۔

اگر ترتیب مطابق تنزیل ہوتی تو پورے طور پر پتہ چلتا کہ یہ آیت کب نازل ہوئی؟ کیوں کہ آغاز سلسلہ جہاد کے موقع پر تو متعدد آیتیں ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قتال کی اجازت مشرکین کی طرف سے آغاز حرب کے بعد ملی تھی۔ اس لئے وہاں یہ الفاظ آئے ہیں کہ

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (حج۔۳۹)

جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے، انہیں اب مقابلہ کی اجازت دی جاتی ہے۔

اور خود اسی سورہ میں اس کے بعد آیت آئے گی جس سے معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی طرف سے تقاضا تھا کہ اجازت جنگ دی جائے مگر انہیں روکا گیا تھا۔

علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اشارات سے پتہ چلتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد جب مشرکین کی عہد شکنی کے بعد دوبارہ حکم جہاد ملا ہے جس کے نتیجہ میں ''فتح مکہ'' واقع ہوئی، اس وقت کی آیت میں اول تو یہ کہ انہوں نے اُن 'کمزور مسلمانوں'' کے ذیل میں جو نام لئے ہیں، ان میں ایک ابوجندل ابن سہیل کا نام ہے جس کے متعلق یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وہ حدیبیہ کے موقع پر ہتھکڑیاں، بیڑیاں پہنے ہوئے رسول خداؐ کے پاس آ کر چاہتا تھا کہ آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں مگر اس کے باپ نے معاہدہ کے شرائط کا حوالہ دیتے ہوئے اسے آپ کے ساتھ جانے سے باز رکھا اور

پھر گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا۔ چونکہ اس معاہدہ میں ایک شرط یہ تھی کہ مشرکین میں سے جو مسلمان ہو کر رسولؐ کے پاس آئیں، رسولؐ کو انہیں واپس کرنا ہوگا، آپ نے اس شرط کی بنا پر ابو جندل کی مدد سے معذوری ظاہر فرمائی اور اس طرح جتنے مسلمان کافروں کے ہاتھ میں ظلم و تشدد کا شکار بنے ہوئے تھے، انہیں اب اپنی مخلصی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی لہٰذا وہ تڑپ تڑپ کر اللہ سے فریاد کرتے تھے۔

آخر میں ان کی اس دعا کے ذیل میں کہ ''ہمارے لئے اپنی جانب سے کسی کو سرپرست اور مددگار بنا دے'' علامہ طبرسی نے لکھا ہے:۔

فاستجاب اللہ دعاءھم فلما فتح رسول اللہ مکۃ جعل اللہ نبیّہ لھم ولیّا (مجمع البیان)

تو اللہ نے ان کی دعا کو قبول کیا اور جب پیغمبر خداؐ نے مکہ فتح کیا تو خداوند عالم نے اپنے پیغمبر کو ان کا مددگار بنایا۔

اس تشریح کو اس لئے پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس آیت کو جہاد اسلامی کا پس منظر دکھانے کے لئے کبھی پیش نہ کیا جائے کہ مسلمانوں کو حملہ کے لئے آمادہ کیا گیا ہے، ان مسلمانوں کو نجات دلانے کے واسطے جو بعد ہجرت مکہ معظّمہ میں رہ گئے تھے۔

ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہجرت کے بعد آغاز جہاد سے اس آیت کا قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾

''جنہوں نے ایمان قبول کیا، وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ اقتدار باطل کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو شیطان کے حوالی موالی سے جنگ کرو۔ یقیناً شیطان کا منصوبہ کمزور ہوا ہی کرتا ہے''۔ [1]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٧٧﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رہو اور نماز پڑھتے رہو، زکوٰۃ ادا کرتے

---

[1] ۔ ہر آئینہ حیلہ شیطان سست است (شاہ ولی اللہ) دخلت کان ھٰھنا موکدۃ لتدل علی ان الضعف لکید الشیطان لازم فی جمیع الاوقات فیما مضی والحال والمستقبل ولیس ھو عارضا فی حال دون حال (تبیان)

رہو۔ پھر جب ان پر جنگ کرنے کا فرض عائد کیا گیا تو ایک دم ان کا یہ عالم سامنے آیا کہ ان میں کی ایک جماعت آدمیوں سے ڈرتی ہے ایسا جیسے اللہ کا ڈر ہو یا اس سے بھی زیادہ اور انہوں نے کہا پروردگارا! تو نے ہم پر جنگ کرنے کا فریضہ کیوں عائد کر دیا تو نے ہم کو کچھ تھوڑے زمانہ تک اور مہلت کیوں نہ دی؟ کہیے کہ دنیا کی پونجی بہت تھوڑی ہے، اور جو پرہیزگار ہو، اس کے لئے آخرت بہت بہتر ہے، اور تم پر ذرا بھی ظلم نہیں ہوگا۔''

ظاہر ہے کہ یہ کافروں کا تذکرہ نہیں ہے۔ کافروں سے کیوں یہ ہدایت ہوتی کہ ہاتھ روکے رہو، نماز پڑھتے رہو اور روزے رکھتے رہو۔ یہ مسلمان ہی ہیں اور مسلمانوں کا وہی معزز طبقہ جو پورے کا پورا بلا استثناء صحابیت رسولؐ کے شرف سے سرفراز ہے اور اس لئے امت کی اکثریت نے ان میں سے ہر ایک فرد کے کردار کو واجب الاتباع سمجھا ہے۔ ان کا عالم قرآن پیش کر رہا ہے۔[1]

اور پھر اسے سمجھ لینا چاہئے کہ اگر اس طبقہ کے افعال و اعمال کے متعلق کف لسان یعنی زبان کو روکنا اور غض بصر یعنی نظر اٹھا کر ان کے اعمال کی طرف نہ دیکھنا ضروری ہوتا تو خالق عالم قرآن ایسی ابدی کتاب میں اس پیغام کو کیوں محفوظ کر دیتا اور پھر اس سرنامہ کلام کے ساتھ کہ: الم تر ''کیا تم نے نہیں دیکھا''.....اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق کسی منزل پر ہماری آنکھوں کو بند رکھنا پسند نہیں کرتا وہ تو چاہتا ہے کہ آنکھ کھولو، دیکھو اور پرکھو اور ہر ایک کے اعمال و افعال کی پوری جانچ پرتال کرو۔ خصوصاً ایسے طبقہ میں جن میں سے تمہیں اپنا پیشوا اور رہبر ڈھونڈھنا ہے۔ آنکھ بند کر کے ان میں سے ہر ایک کے پیچھے ہرگز نہ چلو بلکہ دیکھو کہ کس کا کردار مرضی الٰہی کے مطابق رہا ہے؟ کس کو حسن عمل کی سندیں ملتی رہی ہیں اور کن پر تنبیہ و عتاب کے تازیانے پڑتے رہے ہیں۔

تلوار اٹھانا اسلام کا بنیادی نصب العین نہ تھا

یہاں قرآن آغاز جہاد اور اس کے انجام کی ایک بڑی مبسوط تاریخ اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اور ایسی باتیں بتا رہا ہے جو شاید راویوں نے حدیثوں میں اور اہل قلم نے تاریخوں میں محفوظ نہ بھی کی ہوں۔

اس قرآنی بیان تاریخی سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا بنیادی نصب العین تلوار سے اشاعت اسلام نہ تھا۔ وہ تو کچھ مشرکین کے طرز عمل اور کچھ اپنے آدمیوں کی دانستہ یا نادانستہ بے راہ روی تھی جس سے جنگ کا فرض سر پر عائد ہو گیا۔

قرآن مجید کا انداز بیان اپنے بلاغت و ایجاز میں جو حد اعجاز تک ہے، یہ ہے کہ وہ کچھ کڑیاں واقعات کی بیان کرتا ہے اور کچھ کڑیوں کو سیاق کلام کے سمجھنے والے صاحبان عقل پر چھوڑ دیتا ہے۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ اور سیاق سے پورا واقعہ یوں مرتب ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد جب رسولؐ مدینہ میں تشریف لائے تو کچھ مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوئی اور تقاضے ہونے لگے کہ ان مشرکین نے ہم پر اتنے مظالم کیے ہیں، ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم جنگ کی تیاری کریں اور ان سے انتقام لیں، مگر خالق کا حکم یہ ہوا کہ جنگ کی باتیں نہ کرو۔ انہوں نے کچھ بھی کیا ہو مگر تمہیں ان سے لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ **کفوا ایدیکم** ''تم اپنے ہاتھوں کو روکے رہو'' **واقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ** ''اور نمازیں پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو'' یعنی جو تمہارے ذاتی فرائض ہیں، انہیں انجام دیتے رہو چنانچہ رسولؐ کی طرف سے تمام مسلمانوں کو

---

[1] ۔ھم جماعۃ من الصحابۃ (جلالین)

یہی ہدایت ہوگئی اور خود آپ کا یہ عمل رہا کہ مدینہ میں آنے کے بعد ایک سال کی مدت گذرنے کے باوجود آپ نے نہ اسلحہ جمع کیا اور نہ کوئی دوسرا سامان جنگ فراہم کیا۔ اس لئے جب جنگ بدر ہوئی تو کل فوج اسلام میں صرف تیرہ عدد تلواریں تھیں اور کل جمع دو گھوڑے تھے۔ یہ سامان خود اس حقیقت کا بدیہی ثبوت ہے کہ خدا اور رسولؐ کا نصب العین مدینہ میں آنے کے بعد جنگ کرنا نہ تھا۔ جنگ بادل ناخواستہ مجبوراً رسولؐ کے سر پر آ گئی۔ اب یہ جنگ سر پر کس طرح آئی؟ اس کی تفصیل کا تذکرہ قرآن مجید نے نظر انداز کر دیا ہے مگر سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں نے اس نظام عمل کے خلاف کہ:۔ کفوا ایدیکم واقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ 'اپنے ہاتھ روکے رہو، نماز پڑھتے رہو، اور زکوٰۃ دیتے رہو' اصرار و احتجاج کا سلسلہ جاری رکھا، وہ اس نظام عمل پر مطمئن ثابت نہیں ہوئے اور ان کا بے چینی کے ساتھ یہ مطالبہ رہا کہ ہمیں لڑنے کی اجازت دی جائے۔

اب جنگ بدر کے آغاز کے اسباب جن کی ذمہ داری اموی سیاست نے رسولؐ پر عائد کی ہے وہ اگر کسی حد تک درست مانی جائے تو اس کی نوعیت یہ ہوسکتی ہے کہ اسی جماعت نے جو جنگ پر مصر تھی، اپنی طرف سے مشرکین کے ساتھ چھوٹے پیمانہ پر شاید آویزش شروع کر دی۔

مگر جیسا کہ ہم نے تاریخ اسلام میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، وہ حکایت ہی از سر غلط معلوم ہوتی ہے اور اسی لئے قرآن میں دوسری جگہ ہے:۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا.

انہیں جن سے جنگ کی جارہی ہے، اجازت دی جاتی ہے اس بنا پر کہ ان پر ظلم ہوا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ ابتدائے جنگ مخالف اسلام جماعت کی طرف سے تھی اور ان کے آمادۂ جنگ ہوکر آنے کے بعد مسلمانوں کو مدافعت کی اجازت ملی ہے لیکن اگر قافلوں پر حملہ کی روایت کسی حد تک درست بھی ہو تو اس کی ذمہ داری پیغمبر اسلامؐ پر عائد کرنا، یہ زیر تحریر آیت کے مضمون کے بھی خلاف ہے۔

قرآن کہہ رہا ہے کہ خالق کا حکم تھا: کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ ''اپنے ہاتھ روکے رہو''.....اب کیا ہاتھ روکنے کے فرمان کے بعد یہ گنجائش رہ جاتی ہے کہ رسولؐ چھوٹے چھوٹے دستے بھیج کر مشرکین کے قافلوں کا راستہ رکوائیں یا معاذ اللہ ان کے لوٹنے کا حکم دیں؟

صاف ظاہر ہے کہ اگر کچھ مسلمانوں نے اپنی ناعاقبت اندیشی سے ایسا کیا بھی ہو تو وہ خود اپنی مرضی سے خدا اور رسولؐ کے حکم کے خلاف کیا ہوگا۔

بہرصورت جب ان مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشانہ روش سے یا مشرکین کے خود مدینہ پر حملہ کے منصوبہ سے کتب علیھم القتال کی منزل آ گئی یعنی جنگ کرنے کا فریضہ عائد ہو گیا تو اب وہی جماعت جو جنگ کے تقاضے کر رہی تھی، اسی کا عالم یہ ہو گیا کہ:۔

یَخْشَوْنَ النَّاسَ کَخَشْیَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَةً

وہ آدمیوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسے اللہ سے ڈریں یا اس سے بھی زیادہ۔

اب مسلمان یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو اللہ سے زیادہ آدمیوں سے ڈرتے ہوں، کیا واقعی جوہر ایمان کے حامل سمجھے جاسکتے ہیں؟!

اب اس کے بعد ایک تصور جو ایک پیش بندی کے لئے بہت سے مفسرین نے قائم کر رکھا ہے کہ منافقین کا وجود مدینہ میں آنے کے بعد اس وقت سے ہوا کہ جب سے فتوحات شروع ہوئیں، ورنہ اس کے پہلے تو دور ابتلاء تھا۔ اس دور کے جتنے مسلمان تھے، سب خالص و مخلص مومن تھے، ان میں منافقت کا وجود نہ تھا، یہ تصور از روئے قرآن کہاں تک درست ہوتا ہے؟! کیوں کہ یہ موقع جس کا قرآن میں تذکرہ ہو رہا ہے، فتوحات سے بہت قبل، اس وقت کا ہے جب ابھی تازہ بتازہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں آئے ہیں۔ اس وقت مال غنیمت والے مسلمان تو نہیں

ہیں۔خالص مہاجرین اولین اور سابق الی الدین ہیں مگر قرآن ان کے باطن وظاہر کی پوری ترجمانی کر کے ثابت کیے دے رہا ہے کہ ان میں بھی راسخ الاعتقاد مومنین کم تھے اور اس طرح کے لوگ بہت زیادہ تھے جنہوں نے مرضی خدا اور رسولؐ کے خلاف اصرار بیجا یا کوئی اقدام بے محل کر کے پہلے تو مسلمانوں کے سر پر جنگ کے دیو کو مسلط کیا اور جب اس صورت حال سے نپٹنے کا ہنگام آیا تو خود میدان جنگ میں کوتاہی کی اور پھر انہی کو میدان جہاد میں مہموں کو سر کرنا پڑا جن کے ہاتھ اس کے پہلے كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ کے حکم پر مکمل طور سے عمل کرتے ہوئے باوجود انتہائی سختیوں اور باعث اشتعال حالات کے تلوار کے قبضہ سے بالکل نا آشنا رہے تھے، انہوں نے ہی اسلام کو تباہ و برباد ہونے سے بچایا، ورنہ ان مسلمانوں پر اسلام کی قسمت کا انحصار اگر رہتا تو اس نازک صورت حال میں جب کہ جنگ ایسے ہنگام میں چھڑی تھی کہ ادھر جنگ کی کوئی تیاری ہی نہ تھی، مٹھی بھر ثابت قدم مسلمانوں کا تو خاتمہ ہی ہوجاتا اور اکثریت جو رہتی، وہ خیر سے پھر اپنے سابق کردار (کفر وشرک) پر واپس چلی جاتی جسے چھوڑ کر وہ آئی تھی۔

بعض وقت تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ایسے مسلمانوں کا اپنے اسلام لانے میں یہی منصوبہ تو نہ تھا جسے خالق نے ملائکہ کے ذریعہ مدد دے کر اور پھر مٹھی بھر چند مسلمانوں بلکہ اس کے بعد کبھی تو ایک جان سپار فدا کار کی ثابت قدمی نے شکست دے کر اسلام کو مکمل تباہی سے بچایا۔

اب ایسے نازک حالات میں اگر کسی ایک ضرب سے پورے اسلام وایمان کی قیامت تک کے لئے بقا کا سوال وابستہ ہوا ہو تو اس ایک ضرب کو عبادت ثقلین سے بڑھ کر کہہ دیا گیا تو اس میں حیرت واستعجاب کی کیا بات ہے؟!

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝۷۸

''جہاں بھی تم ہو، تم تک موت پہنچے گی، چاہے تم مضبوط قلعوں میں کیوں نہ ہو اور اگر ان کے لئے کچھ بھلائی ہوتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ان کے لئے کچھ برائی پیش آئی تو کہتے ہیں یہ آپ کے ہاتھوں ہوا[1] کہئے کہ سب اللہ کی طرف سے ہے تو آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جیسے ان کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں۔''

یہ ماشاء اللہ اس وقت کے مسلمانان کرام کا رویہ ہے پیغمبر خداؐ کے ساتھ کہ اگر جنگ میں فتح ہوئی تو اب رسولؐ کی کوئی تعریف نہیں۔کہا یہ ہمیں اللہ نے فتح دی، ہماری قسمت زوروں پر تھی اور اگر کہیں شکست ہوئی تو رسولؐ پر نکتہ چینی شروع ہوگئی اور حضرتؐ پر ذمہ داری عائد کر دی گئی کہ آپ نے یوں کیا، اس لئے یوں ہوا اور ہماری رائے پر عمل ہوتا تو یہ نہ ہوتا۔یہ شکست آپ کی وجہ سے ہوئی۔

اس کے تحت میں یہ تصور مضمر ہے جو آج تک علمائے اسلام کے ایک طبقہ میں چل رہا ہے کہ رسولؐ کے افعال بہت سے اپنی رائے سے

---

[1] ۔ گویند یا محمد این از نزد یك تست (شاہ ولی اللہ)

ہوتے تھے اور بحیثیت بشر ان میں غلطی کا امکان ہے مگر خالق اس تصور کو رد کرتا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ رسولؐ کا تو ہر فعل اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لئے اگر تم اس شکست کا ذمہ دار رسولؐ کے عمل کو سمجھتے ہو، تو وہ رسولؐ کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری خدا پر ہے لہٰذا اس فتح کو اگر خدا کی طرف سے سمجھو تو اس شکست کو بھی اسی کی طرف سے سمجھنا چاہئے۔ پیغمبرؐ پر ذاتی ذمہ داری کوئی نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے امکانی حد تک صحابہ کرام کے ایمان کو سنبھالنے کے لئے اس آیت کو لے جا کر یہود سے متعلق کر دیا ہے اس لئے تصبہم کے بعد لکھ دیا ہے: ای الیھود ''یعنی جماعت یہود'' اور حسنۃ کے معنی میں لکھ دیا ہے: خصب وسعۃ ''شادابی اور کشائش'' اور سیئۃ کے تحت لکھ دیا ہے: جدب و بلاء ''خشک سالی اور آفت'' اور من عندک ''آپ کی طرف سے ہے'' اس کے تحت میں لکھ دیا ہے: لشومک ''آپ کی نحوست سے'' (جلالین)

مگر سیاق کلام الٰہی اس تفسیر کے خلاف ہے۔ خود اس آیت کے شروع کے الفاظ انہی مسلمانوں سے متعلق ہیں جو جنگ سے پہلو تہی کرتے ہیں اس خیال سے کہ کہیں مارے نہ جائیں۔ انہی کے اس تصور کے خلاف یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں موت آنا ہی ہے تو گھروں میں کیا، قلعوں کے اندر بھی بند ہو کر آجائے گی۔ اس سے بھاگ کر جہاد سے پہلو تہی کرنا کیا معنی؟ [1]

اس کے بعد بلا فاصلہ یہ ہے ''اور اگر ان کے لئے کچھ بھلائی ہوئی'' تو بالکل ظاہر ہے کہ جن کا پہلے ذکر ہو رہا تھا، انہی سے متعلق یہ بھی بات ہے کہ اس کو لے جا کر ایک دوسری قوم یہود سے متعلق کرنے میں کیا معقولیت ہو سکتی ہے؟

اسی لئے شاہ عبدالقادر صاحب کو لکھنا پڑا ہے:۔

''یہ منافقوں کا ذکر ہے اگر تدبیر جنگ راست آئی اور فتح اور غنیمت ملی تو کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہوئی یعنی اتفاقاً بن گئی۔ حضرتؐ کی تدبیر کے قائل نہ ہوتے تھے اور اگر بگڑ گئی تو الزام رکھتے حضرتؐ کی تدبیر کا۔ اللہ نے فرمایا کہ سب اللہ کی طرف سے ہے یعنی پیغمبرؐ کی تدبیر اللہ کا الہام ہے۔ غلط نہیں''۔ (موضح القرآن)

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۘ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

''جو تمہارے لئے بھلائی ہو، وہ تو اللہ کی طرف سے ہے اور جو تمہیں برائی پیش آئے، وہ خود تمہارے ہاتھوں ہے اور ہم نے آپ کو لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون حاضر و ناظر ہوگا۔''

''تمہارے لئے میں جو ''تم'' کی ضمیر ہے، اس کے مخاطب رسولؐ نہیں ہیں بلکہ ان مسلمانوں میں سے جن کا ذکر پہلے تھا، ہر شخص مخاطب ہے۔

اس کے قبل کی آیت میں جو کہا گیا تھا کہ جو اچھائی ہو، وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی ہو وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے، وہ ان کی اس تفریق کی رد تھی کہ ''اچھائی اللہ کی طرف سے ہے اور برائی رسولؐ کے ہاتھوں''..... اس کے جواب میں یہ کہہ دیا گیا کہ رسولؐ کے فعل اور اللہ

---

[1] ۔ ان الاجال لا تخطیھم ولا تنفعھم الخشیۃ من القتل (تبیان)

کے فعل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر برائی رسولؐ کی طرف سے ہے تو وہ رسولؐ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد ایک دوسری حقیقت کا اظہار ہے کہ تمہیں جب بھی فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ خدا اور رسولؐ کے احکام پر عمل کرنے سے ہوتی ہے اور جو شکست ہوتی ہے تو کچھ نہ کچھ اللہ کے احکام سے سرتابی کرتے ہو جیسے احد میں کہہ دیا گیا تھا کہ اس درّہ کے پاس سے نہ ہٹنا مگر تم ہٹ گئے یا تمہیں حکم ہے کہ میدان جنگ سے فرار کبھی اختیار نہ کرو مگر تم کمزوری دکھاتے ہو اور راہ فرار اختیار کرتے ہو تو اب جو نقصان پہنچے وہ خدا اور رسولؐ کے ہاتھوں نہیں ہے بلکہ خود تمہارے ہاتھوں ہے۔ [1]

اس کے بعد پھر کلام کی توجہ اس تفریق کی طرف ہوگئی جو وہ کہتے تھے کہ یہ برائی رسولؐ کے ہاتھوں ہوئی تو ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے آپ کو خلق خدا کے لئے رسولؐ بنا کر بھیجا ہے تو آپ کے افعال کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ [2]

اس سے یہ نتیجہ صاف نکالا جا سکتا ہے کہ جو لوگ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال میں بشریت کا تصور کر کے خطا کا تصور کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت رسالت پر ایمان مکمل نہیں رکھتے۔

''اور اللہ سے بڑھ کر حاضر و ناظر کون ہے''..... یہ ان کی عدول حکمیوں پر تنبیہ ہے کہ تم جو احکام رسولؐ کی مخالفت کرتے ہو، اسے اللہ خوب دیکھتا ہے اور اسی کے لحاظ سے اس کا قلم تقدیر تمہارے حق میں جاری ہوتا ہے۔

ہم نے بھلائی اور برائی کا جو مفہوم قرار دے کر مطلب بیان کیا ہے، یہ گزشتہ آیات سے بھی مرتبط ہے یعنی اب جب جہاد کا حکم ہو گیا اور چار و نا چار اب یہ جہادوں میں شرکت بھی کر رہے ہیں تو ذہنیت ان کی یہ ہے کہ ذرا بھی کوئی خرابی پیدا ہوئی اور یہ اس کی ذمہ داری رسولؐ پر عائد کرنے لگے۔

ایک دوسرا مطلب ان آیتوں کا یہ کہا گیا ہے کہ یہ بھلائی اور برائی دنیاوی نعمت اور مصیبت ہے اس کا ذکر پہلے بھی اس ذیل میں آچکا ہے کہ اس آیت کو بعض لوگوں نے جماعت یہود سے متعلق کیا ہے اور ہم اسے رد کر چکے ہیں۔ اس صورت میں ان کا یہ مقولہ اس طرح کا ہے جیسے بنی اسرائیل کے لئے دوسری جگہ وارد ہوا ہے:۔

فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ (اعراف ۱۳۱)

جب انہیں کوئی بھلائی ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں یہ تو ہمارا حق ہے اور اگر کوئی برائی ہوتی ہے تو وہ موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ وہ مصیبت کو پیغمبر کی معاذ اللہ نحوست قرار دیتے تھے۔ اس صورت میں قل کل من عند اللہ کا مطلب یہ ہوگا کہ نعمت اور مصیبت دونوں بقضائے الٰہی ہوتی ہیں۔ اس کو رسولؐ کی طرف منسوب کرنا غلط ہے اور پھر نعمت اور مصیبت دونوں کا فرق بیان کیا گیا ہے کہ نعمت تو اللہ کے فیض و عطا کا نتیجہ ہوتی ہے اور مصیبت آتی تو اسی طرف سے ہے مگر وہ تمہارے بداعمالیوں کی سزا میں ہوتی ہے [3] جس کے لئے

---

[1] ۔ قال ابن عباس والحسن الحسنة ما اصابه يوم بدر من الظفر والغنيمة والسيئة ما اصابه يوم احد (تبيان)

[2] ۔ طاعتك طاعته الله ومعصيتك معصية الله (مجمع البيان)

[3] ۔ يعني بها افعال العباد التي يعاقبون عليها (علي بن ابراهيم)

تمہیں توبہ وانابت کی ضرورت ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے رسولؐ کی شان میں مخالفین نے جو جو گستاخیاں کی ہیں، ان کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے اور حدیث وتاریخ سے بھی ثابت ہے لیکن ہمیں کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ کی شان میں یہ کہا گیا ہو اور معاذ اللہ آپ کے قدم منحوس ثابت ہوئے ہیں بلکہ دوست ودشمن سب کو آپ کے مبارک ومیمون ہونے کا احساس تھا۔ ایسی صورت میں اس آیت میں یہ مفہوم قرار دینا جب کہ وہ سیاق کلام کے مطابق بھی نہیں ہے۔ کوئی صحیح بات معلوم نہیں ہوتی۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿٨٠﴾

''جس نے پیغمبر کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے منہ پھیرایا تو ہم نے آپ کو ان پر پہریدار [1] بنا کر نہیں بھیجا ہے۔''

اطاعت رسولؐ عین اطاعت خدا ہے

بات وہی ابھی چل رہی ہے کہ یہ لوگ خدا اور رسولؐ میں جو تفریق کرتے ہیں، یہ غلط ہے، خدا کا حکم رسولؐ کے حکم سے کوئی الگ نہیں ہے اور رسولؐ کی بات کو ماننا خدا کی بات کو ماننا ہے۔ اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اب لوگ رسولؐ کا کہنا نہ مانیں تو اس میں رسولؐ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان کا کام تو بس احکام کا دینا ہے۔ وہ ہر ایک کے لئے پہریدار نہیں مقرر کیے گئے ہیں کہ انہیں جبریہ مخالفت سے روکے رہیں۔

ان آیات کے مضمون کا تسلسل میرے ذہن میں اس خیال کو مزید تقویت دیتا ہے کہ اس بھلائی اور برائی سے مراد وہی جہاد کے خوشگوار اور ناخوشگوار نتائج ہیں اور ''برائی آپ کی طرف سے ہے'' اس کا مطلب وہی ہے کہ وہ اسے رسولؐ کی معاذ اللہ غلطی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور خالق جواب دے رہا ہے کہ نہیں یہ تمہاری عدول حکمی کا نتیجہ ہوتا ہے اور اسی لئے اطاعت رسولؐ پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس کا نحوست کے تصور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِىْ تَقُوْلُ ؕ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿٨١﴾

''اور وہ زبان سے ''فرماں برداری'' کا لفظ کہتے ہیں اور جب آپ کے پاس سے باہر نکلتے ہیں تو ایک گروہ ان میں کا دل میں اپنے کہے کے خلاف باتیں چھپائے ہوتا ہے اور اللہ لکھتا ہے اسے جو وہ چھپاتے ہیں لہٰذا آپ ان کی طرف توجہ نہ کیجئے اور اللہ پر بھروسا کیجئے اور اللہ سے بڑھ کر مددگار کون ہوگا''۔

---

[1] ۔حافظا لاعمالھم بل نذیرا والینا امرھم فنجازیھم (جلالین)

بیات کے معنی شام کے ہیں لیکن چونکہ شام کو تاریکی ہوجاتی ہے، اس لئے خفیہ منصوبہ بنانے کے بطور کنایہ [1] بیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لئے ہم نے اس کا ترجمہ ''دل میں اپنے کہے کے خلاف باتیں چھپائے ہوتا ہے'' کے ساتھ کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو مفہوم اب اس لفظ کا ہے، اس میں رات کے وقت کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ لیکن بعض مفسرین ومترجمین اس کا یہ مفہوم قرار دیتے ہیں کہ وہ راتوں کو آپس میں اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جو ان کے اس اقرار کے خلاف ہیں۔ [2]

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿٨٢﴾

''تو آخر یہ لوگ قرآن پر غور کیوں نہیں کرتے اور اگر وہ اللہ کے علاوہ کسی کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔''

اختلاف تضاد کے معنی میں بھی اور دورنگی کے معنی میں بھی [3] یعنی کسی شخص کا کلام پورا ایک ہی مرتبہ کمال فصاحت پر نہیں ہوسکتا مگر یہ خالق کا کلام ہے جو ہر طرح کے اختلاف سے بری ہے۔ [4]

قرآن پر غور کرنے کی دعوت دینا اس کا ثبوت ہے کہ قرآن کا ظاہری مفہوم ہر عربی دان کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ [5]

یہ اور بات ہے کہ اس کے تفصیلات یا مشابہات کی تاویل بغیر معصومین کے معلوم نہیں ہوسکتی۔

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٨٣﴾

''اور جب ان کے سامنے کوئی بات امن وامان یا خوف واندیشہ کی آتی ہے تو اور اسے مشہور کردیتے ہیں، حالانکہ اگر اس میں رجوع کریں پیغمبر کی طرف اور فرمان روائی کا حق رکھنے والوں کی طرف جو ان میں سے ہوں تو اسے جان لیں وہ لوگ جو ان میں سے اس کی تہہ تک پہونچ سکتے ہیں [6] اور اگر اللہ کا فضل وکرم تم پر نہ ہوتا اور اس کی

---

[1] ۔بیت اضر و اصله احكام الامر ليلا (تبيان)

[2] ۔وقت شب رائے زنند (شاہ ولی اللہ) ای قدر جماعة منهم ليلا (مجمع البيان)

[3] ۔تناقضا فی معانيه وتناينا فی نظمه (جلالين)

[4] ۔كل هذه المعانی منفی عن كلام الله (مجمع البيان)

[5] ۔يدل على فساد مذهب من زعم ان القرآن لا يفهم معناه الا تفسير الرسول (تبيان)

[6] ۔انانکه از ایشاں می تو انند بر آوردن مصلحت آن (شاہ ولی اللہ)

رحمت تو سوا تھوڑے سے آدمیوں کے تم سب شیطان کی پیروی کرتے۔''

دشمن کی نقل وحرکت یا مسلمانوں کے انتظامات جنگ یا مخالف جماعتوں کی تیاریوں کے متعلق بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا عام طور پر مشہور ہونا مناسب نہیں ہوتا لیکن بعض لوگوں کا کردار یہ ہوتا ہے کہ ان کے پیٹ میں کوئی بات پچتی ہی نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو یہ تنبیہ ہے اور ہدایت کی گئی ہے کہ جو خبر ہو، پہلے اسے ذمہ دار افراد کے کانوں تک پہنچانا چاہئے تا کہ وہ جو مناسب سمجھیں اس کے بارے میں طریق کار اختیار کریں۔ ذمہ دار شخصیت اس وقت خود رسولؐ کی ہے اور آپ کے بعد اولوالامر یعنی معصومین ہر دور میں ہوتے رہیں گے۔ [1]

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿٨٤﴾

''تو اللہ کی راہ میں جنگ کیجئے [2] آپ پر ذمہ داری نہیں ہے مگر آپ کی ذات کی اور ایمان لانے والوں کو بھی آمادہ کرتے رہیے، بہت ممکن ہے کہ اللہ کافروں کے زور کو توڑ دے اور اللہ کا زور وطاقت زیادہ اور اس کی طرف کی سزا سخت ہے۔''

آیت کا انداز بیان یہ بتاتا ہے کہ عام مسلمانوں کی بے وفائی سے رسولؐ کو سخت بددلی پیدا ہوئی تھی، اس پر دل جوئی کے لئے یہ آیت اتری ہے کہ آپ پر دوسروں کی ذمہ داری نہیں ہے آپ پر فقط اپنے عمل کی ذمہ داری ہے [3] چنانچہ بطرق اہل سنت یہ روایت ہے کہ اس کے بعد رسولؐ نے اعلان فرمادیا کہ کوئی ایک بھی میرا ساتھ نہ دے، تب بھی میں اکیلا جہاد کے لئے روانہ ہوجاؤں گا۔ [4]

یہ ان مسلمانوں کے لئے سرمہ چشم ہے جو رسولؐ کو نظام جمہوری کے ماتحت دوسرے مسلمانوں سے رائے مشورہ کا پابند بنانا چاہتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رسولؐ کی ذات جب تمام امت کے لئے ایک مرکز کی حیثیت رکھتی ہے تو امت کو آپ کا تابع ہونا چاہئے، نہ کہ آپ کو امت کی رائے عامہ یا اکثریت کے فیصلہ یا اجماع کا۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿٨٥﴾

''جو اچھی سفارش کرے گا، اسے اس میں سے حصہ ملے گا اور جو بری سفارش کرے گا، اس کا اس میں حصہ ہوگا اور

---

[1] ۔قال ابو جعفر هم الائمه المعصومين (تبيان)

[2] ۔پس جنگ کن یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در راہ خدا (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔امره الله ان يقاتل فی سبيل الله وحده بنفسه (مجمع البيان)

[4] ۔فقال صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بيده لاخرجن ولو وحدی (جلالين)

اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔[1]

آیت کی شان نزول معلوم نہیں۔ بہر حال مقصود یہ ہے کہ کسی امر خیر کی سفارش کرنا بہت اچھا ہے کہ اس صورت میں اس امر خیر کے ثواب میں آدمی شریک ہوجاتا ہے اور کسی کو انسان کسی برے کام پر ابھارے تو یہ بہت بری بات ہے، انسان اس صورت میں اس برے کام کی سزا میں شریک ہوگا۔[2]

گزشتہ آیت سے ربط اس کا یہ قائم کیا گیا ہے کہ آپ مومنین کو راہ خدا میں جہاد پر آمادہ کیجئے اور یہ خیال نہ کیجئے کہ یہ عمل نہیں کرتے تو فائدہ کیا ہے؟ کیوں کہ وہ عمل کریں یا نہ کریں، ایک اچھے کام کی ترغیب وتحریص کا اجر تو آپ کا کہیں نہیں گیا ہے۔[3]

مگر چونکہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہے، اس لئے نہیں سمجھا جاسکتا کہ یہ آیت گزشتہ آیت کے مضمون سے کوئی تعلق رکھتی ہے یا نہیں۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ۝۸۶

"اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو اس سے بہتر طریقہ پر تم سلام کرو یا اسی کو پلٹا دو، یقیناً اللہ ہر شے کا محاسبہ کرنے والا ہے"۔

اسلام میں خود سے سلام کرنا مستحب ہے مگر جواب سلام دینا واجب ہے اور سلام اسلامی کے کم الفاظ "سلام علیکم" یا "السلام علیکم" ہیں جن میں ہندوستانی عوام کے درمیان یہ تفریق ہوگئی ہے کہ پہلا طریقہ شیعوں سے مخصوص ہوگیا اور دوسرا سنیوں سے حالانکہ قدیم ماخذوں کے لحاظ سے یہ تفریق بالکل درست نہیں ہے۔

جواب سلام کے لئے اسلامی تعلیم

شیعوں کے یہاں زیارات میں عموماً السلام علیك اور السلام علیکم وغیرہ کے الفاظ ہیں اور یہی الفاظ نماز میں بھی ہیں اور شیعہ سنی سب کے لئے اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ قرآن مجید میں اہل جنت کا جو سلام ہے وہ سلام علیکم ہی کے الفاظ میں ہے۔ نیز قدیم مفسرین وعلماء بھی سلام کے تحت میں سلام علیکم ہی لکھتے ہیں۔[4]

---

[1] ۔مقیتا ای مقتدرا (علی بن ابراھیم)

[2] ۔کوئی محتاج کی سفارش کر کے دولت مند سے کچھ دلوادے، یہ بھی شریک ہوا ثواب خیرات میں اور جو کافر یا مفسد کو سفارش کر کے چھڑوادے کہ پھر وہ فساد کرے، یہ بھی شریک ہوا اس فساد میں (موضح القرآن)

[3] ۔لما قیل لاتکلف الانفسك عقب ذٰلك بان لك مع هذا فی دعآء المومنین الی الحق ماللانسان فی شفاعة صاحبه بخیر یصل الیه (تبیان)

[4] ۔بتحیة کان قیل لکم سلام علیکم (جلالین)

جواب بہتر دینا چاہئے، اس کی صورت یہ ہے کہ اس نے سلام علیکم کہا تو جواب میں کہے: علیکم السلام ورحمۃ اللہ اور وہ سلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے تو جواب دے۔ علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

''کم سے کم انہی الفاظ کو واپس کر دینا چاہئے''۔ اس سے ظاہر ہے کہ جواب سلام جو واجب ہے، وہ اتنے ہی الفاظ سے پورا ہو جائے گا اور اضافہ مستحب رہے گا۔

بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ باختلاف مخاطب اس میں تبدیلی ہوگی۔ ''اس سے بہتر الفاظ میں جواب دو'' اگر سلام کرنے والا مسلمان ہو اور ''وہی الفاظ جواب میں دہرا دو''۔ اگر وہ کافر ہو۔ [1]

مگر زیادہ قوت پہلی تشریح کو ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾

''اللہ، کوئی خدا نہیں سوا اس کے۔ بلا شبہ ضرور وہ تم سب کو اکٹھا کر کے قیامت کے دن تک پہنچائے گا۔ [2] جس میں کوئی شک نہیں ہے اور اللہ سے زیادہ بات میں سچا کون ہوگا۔''

فَمَا لَكُمْ فِى الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾

''تو یہ کیا ہے کہ تم لوگ منافقوں کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے ہو حالانکہ اللہ نے انہیں ان کے کردار کی وجہ سے پلٹا دیا ہے [3] کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے گمراہ چھوڑ دیا ہے، تم اسے راہ راست پر قرار دو [4] اور جسے اللہ گمراہ چھوڑ دے، اس کے لئے تم ہرگز کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔''

اس آیت کا تعلق واضح طور پر کسی خاص شان نزول کے ساتھ ہے، بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ احد سے واپسی کے بعد اتری ہے۔ جب جنگ سے فرار کرنے والوں کے باب میں اختلاف رائے تھا ایک رائے یہ تھی کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے، دوسری رائے یہ تھی کہ نہیں، ایسا نہیں کرنا

---

[1] ۔ قال قتادہ وابن عباس وابن وھب فحیوا باحسن منھا اھل الاسلام اوردوھا اھل الکفر (تبیان)

[2] ۔ ای لیبعثنکم من بعد مماتکم ویحشرنکم جمیعا الی موقف الحساب (مجمع البیان)

[3] ۔ ای ردھم الی حکم الکفار بما اظھروا من الکفر عن ابن عباس (مجمع البیان)

[4] ۔ تحکموا بھدایۃ من اضل اللہ ای حکم اللہ بضلالہ (مجمع)

چاہئے۔اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی [1] یہ قول، مشہور جامع قرآن جناب زید بن ثابت کا ہے۔ [2]

اس صورت میں یہ چیز یاد رکھنے کی ہے کہ اس پوری فراریوں کی جماعت کو قرآن نے ''المنافقین'' کا لقب دے دیا ہے کہ یہ کبھی راہ راست پر نہیں آئیں گے۔اس کے بعد امت مسلمہ کے لئے کتنے شرم کی بات ہوگی کہ وہ انہی میں سے اپنی دینی و دنیوی پیشوائی کے لئے رہبر اور سربراہ منتخب کرے تو ایسے رہبروں کی پیروی منزل نجات تک کیوں کر لے جا سکے گی۔

مگر مجھے یہ قول درست معلوم نہیں ہوتا۔اس لئے کہ مضمون آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ منافقین جن کے بارے میں آیت ہے، کوئی مختصر گروہ ہے جس کے بارے میں مسلمانوں کی اکثریت میں دو گروہ ہو گئے ہیں لیکن جنگ احد کی روئداد جو تاریخ و حدیث ہی نہیں، قرآن مجید سے بھی ثابت ہے، وہ تو یہ ہے کہ میدان سے فرار کے جرم میں سوا معدودے چند کے جو قتل ہو گئے یا ایسے زخمی ہوئے ہوں کہ بالکل از کار افتادہ ہو گئے ہوں اور پھر آخر میں ایک فرد فرید کے جس نے جنگ کو سر کیا، باقی تمام ہی کے تمام اہلِ اسلام ملوّث تھے تو آخر یہ باغیرت مسلمان کون تھے جن میں سے ایک جماعت ان تمام فراریوں کے لئے حکم ''بزن'' کی حامی تھی اور ایک دم سے قتل عام کرا دینا چاہتی تھی۔اس لئے اس آیت کی شان نزول کا اس احد کے واقعہ سے قطعاً تعلق نہیں ہو سکتا۔

دوسرا قول جسے صاحب مجمع البیان نے درج کیا ہے اور غالباً اسی کو مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے حاشیہ میں جو ''منافقوں'' کے لفظ پر ہے، ان الفاظ میں لکھا ہے کہ:۔

'' کچھ لوگ مکہ سے مدینہ اپنے کو مسلمان ظاہر کر کے جا رہے تھے، راستے میں خدا جانے انہیں کیا سوجھی کہ پھر مکہ واپس آئے اپنے شرک و کفر کا اعلان کر کے یمامہ چلے گئے۔اب کچھ مسلمانوں کو ان سے جنگ کرنے میں تامل ہوا تو یہ آیت اتری۔''

مگر یہ قول بھی کچھ ایسا ہی سا معلوم ہوتا ہے۔اس لئے کہ جب انہوں نے اپنے شرک و کفر کا اعلان کر دیا تو وہ منافق کہاں ہوئے، وہ تو مرتد قرار پائے جو صریحی کفار کی قسم ہے۔

اب جب کہ شان نزول میں وارد شدہ دونوں قول رد ہو گئے تو آیت کی شان نزول کے سمجھنے میں اعتراف عجز کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

''ان کی تو خواہش ہے کہ کاش تم بھی کافر ہو جاؤ، اسی طرح جیسے انہوں نے کفر اختیار کیا [3] کہ تم سب برابر ہو جاؤ

---

[1] ۔لما رجع ناس من احد اختلف الناس منهم فقال فريق اقتلهم وقال فريق لا فنزل (جلالین)

[2] ۔ذكر ذلك زيد بن ثابت (تبیان)

[3] ۔دوست رکھتے ہیں کاش کہ کافر ہو جاؤ تم جب کافر ہوئے وہ (شاہ رفیع الدین)

لہٰذا ان سے اپنے حامی وسرپرست نہ بناؤ، جب تک کہ یہ اللہ کی راہ میں اپنے موجودہ مرکز سے جدائی اختیار نہ کریں، اب اگر وہ روگردانی کریں تو انہیں پکڑو اور جہاں انہیں پاؤ، انہیں مار ڈالو اور ان میں سے اپنا کوئی سرپرست نہ بناؤ اور نہ مددگار۔"

یہ نہ گزشتہ سلسلہ سے متصل آیت معلوم ہوتی ہے اور نہ یہ کفار کے متعلق کسی عام اعلان کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ یہ کسی خاص جماعت کفار کے بارے میں ہے جن کا کردار ایسا رہا ہے جس کی سزا یہ سنائی جارہی ہے کہ جہاں انہیں پاجاؤ قتل کرڈالو، اس صورت میں ان الفاظ کا کہ ان کو اپنا حامی وسرپرست نہ بناؤ، ظاہری مفہوم تو یہ نکلتا ہے کہ بحالت موجودہ جب کہ وہ کافر ہیں، انہیں اپنا حامی وسرپرست نہ بناؤ۔ لہٰذا اس کے بعد کا فقرہ کہ "حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" اس کے معنی یہ نہیں ہوسکتے کہ وہ راہ خدا میں ہجرت کریں، یعنی ترک وطن۔ اس لئے کہ ہجرت کا درجہ ایمان کے بعد ہے۔ جب ابھی وہ ایمان نہیں لائے ہیں تو اس کے کہنے کا کیا محل ہے کہ وہ راہ خدا میں ہجرت کریں۔

اس لئے ہم نے یہ ترجمہ کیا کہ "اللہ کی راہ میں وہ اپنے موجودہ مرکز سے جدائی اختیار کریں"..... اس "مرکز سے جدائی" میں ایمان قبول کرنا اور پھر ہجرت کرنا دونوں داخل ہیں لیکن بعض مفسرین نے "لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا" کا یہ مطلب لیا ہے کہ وہ چاہے ایمان بھی اختیار کرلیں، تب بھی تم ان کو اپنا دوست نہ بناؤ، جب تک کہ وہ راہ خدا میں ہجرت نہ کریں [1] مگر اس صورت میں اس کے بعد کا یہ فقرہ کہ: فان تولوا" تو کیا وہ مسلمان جو کسی وجہ سے ہجرت نہ کریں واجب القتل ہیں؟ ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے تو یہ حکم یقیناً ان سے متعلق ہوگا جو ایمان اختیار نہ کریں تو پھر اس کے قبل کے فقرہ کو بھی مسلمانوں سے متعلق لینا درست نہیں ہونا چاہئے۔

اب روگردانی کرنے کے معنی جب یہ ہیں کہ وہ اپنے کفر کو ترک نہ کریں اور اسلام قبول نہ کریں یعنی اپنے موجودہ موقف پر جو کفر ہے، برقرار رہیں [2] تو اس کے پہلے یہاجروا کے معنی یہ لینا پڑیں گے کہ وہ اپنے اس موقف کو ترک نہ کریں جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا ہے ورنہ کلام دولخت ہوجائے گا اور اول وآخر ربط قائم نہ ہوگا۔

بعض مفسرین نے غالباً قبل کی آیتوں کے سلسلہ کو دیکھتے ہوئے اس آیت کو بھی منافقین سے متعلق قرار دیا ہے [3] مگر اس صورت میں یہ حکم کہ جہاں تم کو وہ ملیں، انہیں قتل کردو، منافقین سے متعلق قرار پائے گا حالانکہ منافقین کے لئے اسلامی مسلک یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی زبان سے لاالہ الا اللہ کہنے کا دنیاوی حقوق تک جو مسلمانوں کے لئے ثابت ہیں، احترام لازم ہے جس میں سب سے زیادہ جان و مال کا محفوظ ہونا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو مسلمانوں کی صفوں میں منافق آخر تک موجود کیوں کر رہتے، جن کا وجود آخر تک تاریخ ہی نہیں بلکہ قرآن وحدیث کی بھی مسلم حقیقت ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ

---

[1] ۔فلا تتخذوا منهم اولياء تو الونهم وان اظهروا الايمان حتى يهاجروا فى سبيل الله هجرة صحيحة (جلالين)

[2] ۔فان تولوا واقاموا على ماهم عليه (جلالين)

[3] ۔ودوا اى ودهؤلاء المنافقون (مجمع البيان)

صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾

''سوا اُن کے جو تعلق رکھتے ہیں ایک ایسی قوم سے کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہے یا تمہارے سامنے آتے ہیں اس حالت میں کہ ان کے دل الجھتے ہیں اس سے کہ وہ تم سے جنگ کریں یا اپنی قوم سے جنگ کریں اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں تم پر قابو دے دیتا اور وہ تم سے جنگ کرتے۔ اب جب وہ تم سے کنارہ کشی کر کے جنگ نہیں کرتے اور انہوں نے تمہاری طرف صلح کا ہاتھ بڑھا رکھا ہے [1] تو اللہ نے تمہیں ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا جواز عطا نہیں کیا ہے۔''

ظاہراً یہ سب کفار ہی کی قسمیں ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ان میں کے ایک صلح پسند گروہ کا ذکر ہے جس میں ابھی اتنی بصیرت یا جرأت پیدا تو نہیں ہوئی ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے مگر وہ مسلمانوں سے لڑنا نہیں چاہتے۔ قرآن نے بر بنائے امن پسندی یہ کہا ہے کہ ان لوگوں کے اس ''بین بین'' طرز عمل کا احترام ہونا چاہئے اور مسلمانوں کو ان سے کوئی تعرض نہ کرنا چاہئے۔ معصوم کی تفسیر بھی اس کے موافق ہے۔ [2]

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾

''کچھ اور لوگ ایسے پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی محفوظ رہیں اور اپنی جماعت سے بھی محفوظ رہیں [3] اور جب بھی فتنہ پردازی کا دوبارہ موقع ملے تو وہ اس میں بالکل جٹ جائیں گے [4] یہ لوگ اگر تم سے کنارہ کشی نہیں کرتے اور تمہاری طرف صلح کا ہاتھ نہیں بڑھاتے اور اپنے ہاتھ نہیں روکتے تو انہیں پکڑو اور جہاں بھی انہیں پاؤ قتل کرو۔ یہ

---

[1] ۔بیگفتند بسوی شما پیغام صلح را (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔قال ابو جعفر علیہ السلام ... هو هلال بن عويمه السلمي واثق عن قومه الا تخيف يا مجيد من اتاك ولا تخيف من اتانا (تبیان)

[3] ۔امن من رہیں تم سے اور امن میں رہیں قوم اپنی سے (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔ارکسوا فيها يعني وقعوا فيها (تبیان)

وہ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمہیں کھلی ہوئی دسترس عطا کیا ہے۔''

مذکورہ بالا تین آیتوں میں کھلے ہوئے کافروں ہی کی تین قسموں کا تذکرہ ہے۔

واضح ہونا چاہئے کہ ایک ہی عمل کے محرکات مختلف ہوتے ہیں جن کا پتہ طریق کار سے چلتا ہے۔

کافروں میں ایک گروہ تو وہ ہے جو شمشیر بکف مسلمانوں کے سامنے ہے۔ان سے جنگ کرنا ہے اوران سے کسی رعایت کی ضرورت نہیں۔

پہلے تو صلح جو کافر جو واقعی جنگ کو پسند نہیں کرتے مگر ان کے ضمیر میں اتنی روشنی پیدا نہیں ہوئی ہے کہ وہ ایمان اختیار کرلیں۔وہ قلبی طور پر جنگ سے گھبراتے ہیں۔نہ وہ مسلمانوں سے لڑنا چاہتے ہیں اور نہ اپنی قوم یعنی ان کفار سے جو برسر جنگ ہیں تصادم کرنا چاہتے ہیں۔اس لئے مسلمانوں کے ساتھ صدق دل سے مصالحانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ان کے لئے قرآن کہتا ہے کہ ان کی اس صلح پسندی کی مسلمانوں کو قدر کرنا چاہئے اوران کے خلاف کوئی اقدام کرنے کا انہیں ہرگز حق نہیں ہے۔

دوسرے وہ جو اس وقت جنگ تو نہیں کررہے ہیں مگر یہ جنگ نہ کرنا ان کا واقعی صلح پسندی کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ایک منافقانہ چال ہے۔وہ جنگ کرنا پسند نہیں کرتے، اس لئے کہ وہ اپنے کو خطرہ میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ابھی جب تک کہ انہیں یہ اطمینان نہیں کہ فتح مسلمانوں کو ہوگی یا کافروں کو، وہ الگ تھلگ رہنے کا اظہار کرتے ہیں،صرف اس لئے کہ اگر مسلمانوں کو فتح ہو تو مسلمانوں کے ہاتھ سے وہ خطرہ میں مبتلا نہ ہوں اور اگر کفار کو فتح ہو تو ان کے ہاتھ سے بھی انہیں آزار نہ پہنچے، اسے قرآن مجید نے ان لفظوں میں کہا ہے کہ: يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ''وہ چاہتے ہیں تم سے بھی محفوظ رہیں اور اپنی جماعت سے بھی''.....مگر ذرا انہیں اطمینان ہو کہ مسلمان کمزور ہیں اوران کے خلاف کوئی ہنگامہ خیزی ان کے لئے باعث نقصان نہیں ہے تو وہ ایک دم ہنگامہ کے اندر کود پڑیں گے۔ایسے لوگ جن کا کردار یہ ظاہر ہو جائے، پھر کسی رعایت کے مستحق نہیں ہیں اوران کی جان و مال محفوظ نہیں ہے۔

قرآن مجید کے ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ یہ تصور کہ اسلام میں ہر کافر کی جان و مال حلال ہے اورانسان کی بحیثیت انسان کوئی قدر و قیمت ہی نہیں، درست نہیں ہے اور یہ اقسام جو کافروں کی بیان ہوئی ہیں اوران کے ساتھ رویہ میں جو فرق قرار دیا گیا ہے، وہ بالکل فتوائے عقل و اخلاق کے مطابق ہے۔اس لئے وہ ہر دور میں قائم ہے اور منسوخ قرار دیئے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ بعد کے مطلق احکام جہاد سے یہ آیتیں منسوخ ہوگئیں [1] مگر میرے خیال میں یہ درست نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ

[1] ۔قال قوم الاٰیة منسوخة (تبیان)

شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۙ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

''اور کسی مسلمان کا کام نہیں ہے [1] کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کرے سوا نادانستہ صورت کے اور جو نادانستہ کسی مسلمان کو قتل کرے تو ایک مسلمان بندہ کو آزاد کرنا ہوگا اور ایک خون بہا اس کے وارثوں کے حوالے کرنا ہوگا، سوا اس کے کہ وہ لوگ معاف کر دیں۔ اب اگر وہ کسی ایسی جماعت میں سے ہے جو تمہاری دشمن ہے اور وہ خود مسلمان ہے تو بس ایک مسلمان بندہ کو آزاد کرنا ہے اور اگر ایسی جماعت میں سے ہے کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے تو پھر وہی ایک خون بہا اس کے وارثوں کے سپرد کرنا ہے اور ایک بندہ کا آزاد کرنا۔ اب جس کے پاس یہ نہ ہو تو دو مہینے متواتر روزے رکھنا ہوں گے اللہ کی طرف سے عنایت کے طور پر [2] اور اللہ جاننے والا ہے، ٹھیک ٹھیک کام کرنے والا۔''

قتل خطا کی سزائیں

قتل خطاء کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا قتل کرنے کا اس انسان کا بالکل ارادہ نہ تھا جیسے یہ تیر لگا رہا تھا کسی جانور کے شکار کے لئے اور اتفاقیہ اس کی زد میں آ گیا کوئی آدمی۔ اس میں چونکہ ایک حق اللہ ہے اور ایک حق الناس یعنی اللہ کا حکم ہے کہ کسی آدمی کو قتل نہ کیا جائے۔ یہاں اس کے ہاتھ سے ایک آدمی قتل ہو گیا۔ یہ اور بات ہے کہ جان کر اس کو قتل نہیں کیا مگر عموماً کوئی نہ کوئی کم توجہی اور رواروی ہوتی ہے جس سے ایسی اتفاقی صورت پیش آتی ہے۔ اس رواروی کے لئے کفارہ ہے ایک بندہ مسلم یعنی غلام یا کنیز کو آزاد کرنا اور حق الناس یعنی وارث کو جو صدمہ پہنچا ہے، اس کے لئے دیت یعنی خون بہا ہے۔ اور چونکہ یہ ان کا حق ہے تو جب وہ معاف کر دیں، یہ ساقط ہو جائے گا لیکن وہ کفارہ یعنی بندہ کو آزاد کرنا، پھر بھی قائم رہے گا۔

اب اگر اس کے عزیز و اقارب سب کافر ہیں اور وہ بھی ایسے کہ مسلمانوں سے ان سے کوئی ''ناجنگ'' معاہدہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں یہ حق الناس ساقط ہے لہٰذا دیت نہیں دینا ہوگی مگر کفارہ پھر بھی برقرار ہے۔

اور اگر وہ قوم کافر ہے مگر مسلمانوں کے ساتھ اس کا معاہدہ ہے تو اس کے وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے ہیں لہٰذا پھر دونوں باتیں ہوں گی: کفارہ بھی اور دیت بھی اور کفارہ نہ دے سکے تو دو مہینے کے روزے رکھے۔ اس کفارہ کی وجہ سے اللہ کی طرف سے معافی ہوگی جسے توبۃ من اللہ کے لفظوں سے ظاہر کیا گیا ہے مگر دیت بہرحال دینا ہے یا وارثوں سے معاف کرانا ہے۔ اگر نہیں دے سکتا، تب بھی وہ ایک قرضہ ہے جو اس کے ذمے ہے۔ دیت ان روزوں کی وجہ سے ساقط نہ ہوگی۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

---

[1] ۔لیس من صفة المؤمن ان یقتل مؤمنا الاخطاء (مجمع البیان)

[2] ۔معناہ رجعة من اللہ لکم الی التیسیر علیکم (تبیان)

''اور جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ اس پر غضب ناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور اس کے لئے بہت بڑا عذاب مہیا کرے گا۔''

یہ سزا قتل نفس کی بالکل وہی بیان ہوئی ہے، جو کفر اور شرک کی سزا ہے یعنی عملی گناہوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جس میں مخلّد فی النّار ہونے کا اعلان ہوا ہو سوا قتل نفس کے کہ اس کی سزا یہ بتائی ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔

پھر بھی شرک اور اس میں ایک مابہ الامتیاز ہے اور وہ یہ کہ شرک میں مغفرت کی گنجائش ہی نہیں ہے اعلان ہو گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ

یقیناً اللہ اس جرم کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

قتل عمد کے گناہ کی اہمیت اور سزائے آخری میں شدت

مگر قتل نفس ایک گناہ ہے جس کی سزا اگر ملے تو یہی ہے لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ معاف ہو جانے کی بنا پر سزا ملے ہی نہ، اسی آیت کے تتمہ کی وجہ سے کہ:۔

يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

اس سے کم کو جس کے لئے چاہتا ہے، اللہ بخش دیتا ہے۔

اس میں قتل نفس کا گناہ بھی داخل ہے اور اعلانِ خلود فی النار اس معافی کا سدباب نہیں کرتا[1] اس کے علاوہ آیت کی یہ تشریح بھی وارد ہوئی ہے کہ کسی مومن کو اس کے ایمان کی وجہ سے قتل کرے اور ظاہر ہے کہ ایمان کی بنا پر وہی قتل کرے گا جو خود ایمان سے خالی ہوگا۔[2]

اور ہمارے یہاں یہ صراحت وارد ہوئی ہے کہ نبیؐ کا جو قاتل ہو، اس کی توبہ کبھی قابل قبول نہیں ہے۔[3]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

---

[1] ۔هذا ماول بمن استحله اوبان هذا جزاؤه ان جوزی ولا بدع فی خلف الوعید لقوله تعالیٰ ویغفر مادون ذٰلك لمن یشآء (جلالین) رواه ایضا العیاشی باسناده عن ابی عبدالله علیہ السلام وقد روی ایضا مرفوعا الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه قال هو جزاؤه ان جازاه (مجمع البیان)

[2] ۔قد روی اصحابنا ان الآیة متوجهة الی من یقتل المؤمن لایمانه وذٰلك لایکون الا کافرا (تبیان)

[3] ۔من قتل نبیا اووصی نبی فلا توبة له (علی بن ابراهیم)

''اے ایمان لانے والو! جب اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) نکلو[1] تو جانچ پڑھتال کرلیا کرو[2] اور اس سے جو تمہیں سلام کرے، یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں ہے تم دینوی زندگی کی دولت چاہتے ہو! تو اللہ کے یہاں بڑے فائدے ہیں۔ ایسے ہی تو تم خود پہلے تھے، اس کے بعد اللہ نے تم پر احسان کیا لہٰذا جانچ پرتال کرلیا کرو۔ یقیناً اللہ اس سے جو تم کرتے ہو باخبر ہے۔''

اس آیت کی شان نزول شاہ عبدالقادر دہلوی ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

''حضرتؐ کے وقت میں مسلمانوں کی فوج پہنچی ایک بستی پر وہاں ایک مسلمان تھا، اپنے مویشی کنارے کر کے کھڑا ہوا تھا اور مسلمانوں سے سلام علیک کہا۔ لوگوں نے سمجھا کہ غرض کو مسلمان جتاتا ہے۔ اس پر یہ آیت اتری''۔ (موضح القرآن)

اس دستہ فوج کا سردار کون تھا؟ اس میں اختلاف ہے، بعض روایتیں بتاتی ہیں کہ وہ اسامہ بن زید تھے اور بعض میں دوسرے نام بتائے گئے ہیں۔

اظہار اسلام کا اعتبار

بہرصورت آیت کے آخری الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ یہ قتل کرنا مال غنیمت کی طمع میں تھا۔

آخر میں ارشاد ہوا کہ ایسے ہی تم پہلے تھے۔ اس کا مطلب پہلی ہی نگاہ میں جو سمجھ میں آتا ہے یہ ہے کہ اب اتنی غیرت ایمانی تم دکھاتے ہو۔ پہلے تم بھی اسلام سے خارج تھے اور بعد میں مسلمان ہو گئے۔ پھر کسی دوسرے کو یہ کیوں سمجھتے ہو کہ وہ اظہار اسلام میں سچا نہیں ہے۔ علامہ طبرسی کی تفسیر اس کے مطابق ہے۔[3]

دوسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں بھی تو یہی تھا کہ تم مال و دولت کی خاطر آدمیوں کی جان لیتے تھے[4] پھر اگر اب بھی ایسا ہی ہوا تو تمہاری جاہلیت اور اسلام میں فرق ہی کیا ہوا؟

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى

---

[1] ۔چوں سفر کنید در راہ خدا یعنی برائے جہاد (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ای میزوا بین الکافر والمؤمن (مجمع البیان)

[3] ۔ کما کان فقدا المقتول کافرا فهداه الله کذلك کنتم کفارا فهدا کم الله (مجمع البیان)

[4] ۔تم ایسے ہی تھے پہلے یعنی غرض دنیا پر خون ناحق کرنے والے (موضح القرآن)

الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

''برابر نہیں ہیں مسلمانوں میں سے بغیر معذوری کے گھر میں بیٹھنے والے اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے۔ اللہ نے اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے رہنے والوں پر بہت فوقیت دی ہے، اور یوں تو ہر ایک سے اس نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور جہاد کرنے والوں کو پیچھے رہنے والوں پر بہت بڑے اجر کے ساتھ فضیلت عطا کی ہے۔ بڑے مرتبوں اور بخشش اور رحمت کے اعتبار سے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

اس آیت کے مضمون سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے دور میں جہاد کے لئے فوج اسلامی میں جانا وجوب عینی کی حیثیت نہ رکھتا تھا یعنی بھرتی نہ تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو قاعدین کے لئے وعید عذاب ہونا چاہئے تھا حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ صاف کہا گیا ہے: كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ''اللہ نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے'' یعنی قاعدین بھی جو گھر میں بیٹھ کر عبادت اور اپنے روزمرہ کے فرائض انجام دے رہے ہیں، اُن کا ثواب انہیں ملے گا مگر مجاہدین کا ثواب ان سے بہت زیادہ ہے۔ اب اگر کوئی اس ثواب کو حاصل نہیں کرتا تو یہ اس کی کم نصیبی ہے مگر اس پر وہ کسی عذاب کا مستوجب نہ ہوگا۔[1]

ہاں جہاد میں کفار کے سامنے جا کر پھر میدان سے فرار اختیار کرنا گناہ کبیرہ ہے کہ وہ عزت و وقار اسلامی کے مجروح کرنے کا سبب ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾

''بلاشبہ وہ جنہیں فرشتوں نے دنیا سے اٹھایا اس عالم میں کہ وہ اپنے اوپر ظلم کے مرتکب تھے انہوں نے ان سے کہا:[2] کہ ارے! یہ تم کس عالم میں تھے؟ انہوں نے کہا ہم دنیا میں دبے پسے ہوئے تھے، انہوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے! یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بڑی بری منزل ہے۔''

---

[1] ۔یدل علی ان القاعدین لم یکونوا عاصبین وان کانوا تارکین للفضل (تبیان) فی ھٰذہ دلالۃ علی ان الجھاد فرض علی الکفایۃ لانہ لو کان فرضا علی الاعیان لما استحق القاعدون بغیر عذر اجرا (تبیان)

[2] ۔علی وجہ التقریر لھم او التوبیخ لفعلھم (مجمع البیان)

ہجرت کے بعد کچھ مسلمان ایسے تھے جو مکہ معظّمہ میں رہ گئے اور پھر جب جنگ بدر ہوئی تو وہ اپنی قوت ارادی کی کمی سے کفار کی فوج میں آ کر ادھر سے قتل ہوئے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

باطل ماحول میں رہ کر اگر باطل کی حمایت سے اپنا تحفظ کر سکتا ہے تو وہاں رہے۔ نہیں تو وہاں سے ہجرت واجب ہے، ورنہ وہ انجام کے لحاظ سے اس جماعت کے ساتھ محسوب رہے گا جس کا وہ شریک کار رہا ہے۔

صورت وجوب ہجرت

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت صرف ان حالات میں واجب ہے جب انسان کافروں کے ملک میں اپنے دینی فرائض کے انجام دینے سے قاصر ہو اور کفار و مشرکین کے ساتھ ان کی باطل پرستیوں میں شرکت پر مجبور کیا جاتا ہو۔ نہ یہ کہ ایسے ملک سے جہاں غلبہ غیر مسلم جماعت کا ہو، بہر صورت ہجرت واجب ہو۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَّلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٩٩﴾

''مگر مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے وہ دبے پسے ہوئے جنہیں کوئی تدبیر ہی ممکن نہ ہو اور نہ کوئی راستہ انہیں ملتا ہو، یہ وہ ہوں گے جنہیں بہت ممکن ہے کہ اللہ معاف کر دے اور اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے، بخشنے والا۔''

یعنی تنگ دستی یا ناتوانی یا کافروں میں گھرے ہوئے ہونے، بہر صورت کسی بھی وجہ سے ہجرت کرنا جنہیں ممکن ہی نہ ہو[1] ان کی مجبوری ہے اور معاف کرنے سے مراد یہاں یہ ہے کہ وہ گنہگار نہیں ہیں۔ نہ یہ کہ گناہ تو ان کا ثابت ہے مگر وہ معاف کر دیئے جائیں گے اور ''بہت ممکن ہے'' کے الفاظ اس لحاظ سے ہے کہ بسا اوقات انسان واقعی معذور نہیں ہوتا اور وہ تساہل کی وجہ سے اپنے کو دھوکا دیتا اور معذوری کی سپر لیتا ہے۔ خدا ایسوں کو معاف نہیں کرے گا۔ ورنہ جو واقعی معذور ہوں، یقیناً قابل معافی ہیں۔ ''بہت ممکن ہے'' ان سے بالخصوص متعلق نہیں ہے۔

بعض مفسرین کا خیال یہ ہے کہ خالق کے کلام میں جہاں بھی عسٰی ''بہت ممکن ہے'' آیا ہے، اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ لازماً ایسا ہوگا۔ یہ عسٰی کا لفظ بس ایک محاورہ کے طور پر صرف ہوتا ہے، اس سے شک کا اظہار منظور نہیں ہوتا۔[2]

''مستضعفین'' کا ایک دوسرا مفہوم ذہنی اعتبار سے کمزوری کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اتنا شعور نہیں رکھتے کہ حق و باطل کا امتیاز کر سکیں تو جب کہ مجنون اور بے ہوش سے بالکل ہی ذمہ داریاں ہٹالی گئی ہیں تو کمی شعور میں بھی اس کے درجہ کے تناسب سے ذمہ داری کو ہلکا تو ماننا ہی پڑے گا۔

---

[1] ۔ھم الذین یعجزون عن الھجرۃ لاعسار ھم وقلۃ حیلتھم (تبیان)

[2] ۔عسٰی من اللہ معناہ الوجوب (تبیان)

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾

''اور جو اللہ کی راہ میں ترک وطن کرے، وہ زمین خدا میں بہت گھومنے پھرنے کی جگہ اور بڑی کشائش [1] پائے گا اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسولؐ کی طرف ہجرت کر کے نکلے، پھر اسے موت آجائے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہو گیا اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

جیسا کہ شاہ عبدالقادر نے لکھا ہے:۔

''یعنی روزی کا ڈر نہ چاہئے کہ بہت جگہ روزی مل رہتی ہے کشائش سے اور یہ خطرہ نہ چاہئے کہ شاید راہ ہی میں مارے جاویں کہ اس میں ثواب پورا ہے'' (موضح القرآن)

امام محمد باقر علیہ السلام کی حدیث میں اس کی شان نزول وارد ہوئی ہے کہ ضمرۃ بن عیص یا عیص بن ضمرہ ایک بزرگوار بیمار تھے۔ انہوں نے حکم ہجرت سننے کے بعد اپنے گھر والوں سے کہا کہ وہ انہیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے چلیں۔ چنانچہ وہ لوگ تخت پر انہیں ڈال کر لے چلے مگر منزل تنعیم تک کہ وہاں ان کی وفات ہو گئی۔

بعض دوسری روایتوں میں اس سلسلہ میں کچھ اور نام وارد ہوئے ہیں جن کا جناب شیخ طوسی نے تبیان میں تذکرہ فرمایا ہے۔

بہر حال شخصیت کے تعین کی اس سلسلہ میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے اور یہ اعلان بھی کوئی خلاف توقع اعلان نہیں ہے اس لئے کہ عام اصول یہ ہے کہ اجر و ثواب کا تعلق عزم اور سچے دل سے تمنائے عمل کے ساتھ ہوتا ہے۔

اگر انسان مقدرات کے ناگزیر موانع کی وجہ سے اس کام کو انجام نہ دے سکا تو یہ اس کے اختیار کے دائرہ سے باہر ہے۔ اس کا اجر و ثواب پر اثر نہیں پڑتا جو اللہ کے عام فضل و احسان کا ایک تقاضا ہے۔

بعض احادیث میں خاص طور سے امت محمدیہ پر جو اللہ کا فضل خاص ہے، اس کا تقاضا بتایا گیا ہے کہ گناہ اس وقت نامہ عمل میں لکھا جاتا ہے جب وقوع میں آجائے اور نیک کام سچے ارادہ کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے۔ چاہے بعد میں وہ کسی وجہ سے عمل میں نہ آسکے۔

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۱۰۱﴾

''اور جب تم سفر کرو تو تمہارا اس میں کوئی حرج نہیں کہ نماز میں قصر کر دو، جب کہ تمہیں ڈر ہے کہ کافر لوگ تمہیں کوئی

---

[1] ۔ اقامت گاہ بسیار و فراخی معیشت (شاہ ولی اللہ)

گزند پہنچادیں گے [1] یقیناً کافر لوگ تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔''

قصر کرنا نماز کا یہ ہوتا ہے کہ چور کعتی نمازوں میں سے آخر کی دو رکعتیں نہ پڑھی جائیں، بس نماز صبح کی طرح دو رکعت پر نماز کو ختم کر دیا جائے۔ [2]

سفر میں انسان کو طرح طرح کے تفکرات اور ذہنی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ انہی کی وجہ سے قصر صلوٰۃ کا حکم ہوا ہے۔ اس زمانہ میں جب آیت نازل ہوئی ہے، خاص پریشانی یہ تھی کہ کافروں کے حملہ کا ڈر لگا رہتا تھا، اس لئے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ حکم قصر اس ڈر کے ساتھ مشروط ہو۔ اس سے مفسرین اہل سنت بھی متفق ہیں اور نہ جواز قصر بھی خوف کے ساتھ مشروط ہوتا حالانکہ جواز قصر سب کے نزدیک مطلق سفر میں ثابت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ آیت میں یوں کہنا درست نہ ہوگا کہ:

''جب تم روئے زمین پر سفر کرو اور تم کو اس امر کا خوف ہو کہ کفار (اثنائے نماز میں) تم سے فساد برپا کریں گے۔'' (مولانا فرمان علی)

جواز قصر باجماع امت صرف سفر کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس خوف کے ساتھ نہیں، جو کچھ اختلاف ہے وہ وجوب قصر میں ہے۔

سفر میں نماز قصر کا حکم

چونکہ حکم قصر ان الفاظ میں دیا گیا ہے کہ: لاجناح علیکم ''اس میں تمہارا کوئی حرج نہیں ہے''۔ اس لئے اکثر علمائے اہل سنت اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ یہ رخصت ہے، عزیمت نہیں ہے یعنی اجازت ہے کہ قصر کر سکتے ہیں۔ اس کی پابندی عائد نہیں کی گی ہے لہٰذا اگر پوری نماز پڑھے تو بھی درست ہے لیکن جیسا کہ پہلے آچکا ہے حج میں صفا و مروہ کی سعی کا حکم بھی انہی الفاظ میں آیا ہے کہ: فلا جناح علیه ان یطوف بهما ''کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ان دونوں کا چکر لگالے'' وہاں علمائے اہل سنت بھی سعی کو واجب سمجھتے ہیں تو ان الفاظ کی وجہ سے قصر صلوٰۃ کے وجوب کا انکار کیوں کیا جائے؟

یہ الفاظ تو اس کے اظہار کے لئے صرف ہوئے ہیں کہ اصل حکم قصر کا تخفیف اور سہولت بہم پہنچانے کے لئے نافذ کیا گیا ہے لیکن جب حکم ہو گیا تو اب پابندی اس کی لازم ہے اور اسی لئے ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیم یہی ہے کہ حالت سفر میں قصر واجب ہے اور نماز اگر پوری پڑھی جائے تو درست نہ ہوگی اور باوجود خالق کی طرف سے اس حکم کے پوری نماز پڑھنا خدا کے اس احسان کی ناقدری بھی ہے چنانچہ بعض علمائے اہل سنت بھی اس سے متفق ہیں۔ [3]

شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ یہ آیت حکم قصر کے بیان کے لئے آئی ہی نہیں ہے بلکہ نماز خوف کے بیان کے لئے ہے [4] خود انہوں نے اس مسلک کے اظہار میں ایسے الفاظ صرف کیے ہیں جن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان

---

[1] ۔ در بلا افگنند شمارا کافران (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ بان تردوها من اربع الی اثنتین (جلالین)

[3] ۔ پوری نہ پڑھے کہ اللہ کی بخشش سے بے پروائی ہوتی ہے اور سنت کا تقید سفر میں نہیں رہتا (موضح القرآن)

[4] ۔ مشهور آنست که این آیت در صلوٰۃ مسافر نازل شده است و خوف قید اتفاقی است و آنچه نزدیك این بنده رجحان یافته است آنست که این آیت در صلوٰۃ خوف نازل شده است و سفر قید اتفاقیست (فتح الرحمن)

کے منفرد تحقیقات میں سے ہے مگر تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس کے پہلے ایک جماعت علماء اختیار کر چکی ہے۔[1]

اس صورت میں سفر کا ذکر اس میں ضمناً ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بغیر جنگ سفر میں حکم قصر جو ہے، وہ سنت سے ثابت ہے، قرآن سے نہیں ہے۔ اس کے بعد اس ''لاجناح'' کے لفظ کا اس قصر سے تعلق ہی باقی نہیں رہتا۔ اب اگر سنت سے یہ ثابت ہے کہ سفر میں قصر ہی نماز پڑھنا چاہئے تو وہی معین ہے اور اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾

''اور جب آپ ان میں ہوں اور انہیں نماز پڑھانے لگیں تو ان میں سے ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے ہتھیار لئے رہیں، جب یہ نماز پڑھ چکیں[2] تو یہ آپ لوگوں کی پشت پناہی کے لئے چلے جائیں اور دوسرا گروہ ان کا جس نے نماز نہیں پڑھی ہے، آجائے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھے اور یہ بھی اپنا سامان حفاظت اور ہتھیار لئے رہیں۔ کفار کی تو آرزو یہ ہے کہ تم لوگ اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے غافل ہو جاؤ تو وہ تم پر ایک دم ٹوٹ پڑیں اور اگر بارش سے اذیت ہو یا تم بیمار ہو تو تمہارا کوئی حرج نہیں ہے کہ تم اپنے ہتھیاروں کو رکھ دو۔ ہاں حفاظت کا خیال رکھو۔ یقیناً اللہ نے کافروں کے لئے ذلت آمیز عذاب مہیا کر رکھا ہے۔''

یہاں نماز خوف کی ترکیب بیان کی گئی ہے کہ فوج اسلام کے دو حصے ہو جائیں۔ ایک حصہ دشمن کے مقابلہ میں جنگ کرتا رہے اور ایک حصہ رسولؐ کے ساتھ نماز میں شریک ہو۔ اس طرح کہ ایک رکعت پیغمبر کے ساتھ بجماعت پڑھے۔ پھر رسولؐ بیٹھے رہیں اور یہ لوگ کھڑے ہو کر اپنی دوسری رکعت بطور خود جلدی جلدی پڑھ کر چلے جائیں دشمنوں کے مقابلہ میں۔ اب وہ لوگ آئیں اور رسولؐ اب کھڑے ہو کر ان کے ساتھ دوسری

---

[1] ۔قال قوم عنیٔ بھذہ الایۃ قصر صلوٰۃ الخوف... وفیھا نزلت ذھب الیہ مجاھد وغیرہ (تبیان)

[2] ۔فرغوا عن سجودھم (مجمع البیان)

رکعت پڑھیں لیکن یہ ان لوگوں کی پہلی رکعت ہے لہٰذا رسولؐ دونوں سجدوں کے بعد پھر بیٹھ جائیں اور یہ لوگ سجدوں کے بعد کھڑے ہو کر اپنی دوسری رکعت جلدی سے پڑھ کر جب سجدوں سے فارغ ہوں تو اب رسولؐ ان کے ساتھ تشہد اور سلام پڑھ کر نماز تمام کریں۔

اس سے اسلام میں نماز جماعت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ صرف پوری فوج اسلام کو جماعت کی فضیلت سے بہرہ اندوز کرنے کے لئے امام جماعت کو جو اس وقت پیغمبر تھے کتنے طویل الذیل طریقہ پر نماز پڑھنے کی ہدایت ہوئی ہے۔

نماز خوف کے احکام کے بیان میں آخر کا فقرہ اس انداز میں ہے جیسے یہ سب احکام بیان کرتے کرتے ایک دفعہ یہ خیال آ گیا کہ یہ سب جھگڑے ان کم بخت کافروں کی وجہ سے ہیں تو یہ کہا گیا کہ ارے! جتنا چاہیں، یہ اس وقت تمہیں پریشان کر لیں۔ انجام میں تو ان کے لئے وہ عذاب سخت ہے کہ یہ بھی یاد ہی کریں گے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾

''پھر جب نماز بجا لے آؤ تو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور کروٹ میں یاد کرتے رہو اور جب تمہیں اطمینان نصیب ہو تو نماز کو پورے طور پر ادا کرو۔ بلاشبہ نماز اہل ایمان پر ایک فریضہ ہے جو اوقات کے تعین کے ساتھ عائد کیا گیا ہے۔''

اب یہ نوافل وغیرہ کے حکم کا بیان ہے یعنی فریضہ تو اس طرح ادا ہو گیا۔ اب اس کے بعد نوافل ادا کرنا ہیں یا یوں ذکر الٰہی کرنا ہے تو وہ حالت جنگ میں اور رفتار کی حالت میں بلکہ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اور مطلق ذکر الٰہی اور دعا ہے تو یہ چیزیں لیٹنے کے عالم میں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان سے کوئی وقت مستثنیٰ نہیں۔[1]

اب اس کے بعد ہے: فاذا اطمانتم ''اور جب تمہیں اطمینان نصیب ہو''۔ یہ اس پورے احکام خوف کے سلسلہ سے متعلق ہے جو اس کے پہلے دو آیتوں سے چل رہا تھا۔ یعنی وہ خوف کی حالت میں قصر کا حکم اور نماز خوف کی ترکیب وغیرہ سب ان اضطراری حالات سے متعلق ہے۔ اب جب تم مطمئن ہو تو پھر نماز کو اس کے پورے رکعات اور کیفیات کے ساتھ جن میں طمانیت اور سکون بھی داخل ہے ادا کرنا لازم ہے۔[2]

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾

''اور اس جماعت سے مڈبھیڑ کے لئے نکلنے میں سستی نہ دکھاؤ۔ اگر تمہیں تکلیف پہونچتی ہو تو انہیں بھی ویسی ہی

---

[1] ۔اذا زال خوفکم من عدو کم وامنتم قائمو الصلوٰۃ بحدودھا غیر قاصر بھا عن شئ من حدودھا (تبیان)

[2] ۔ای فی طلب القوم (مجمع البیان)

تکلیفیں پہونچتی ہیں جیسی تمہیں ہوتی ہیں اور تمہیں اللہ کے یہاں امید وہ ہے جو انہیں نہیں ہے اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، ٹھیک ٹھیک کام کرنے والا۔"

کفار سے مقابلہ میں مسلمانوں کو کبھی کبھی زحمتیں ضرور پیش ہوتی ہیں مگر ایسی زحمتیں تو کفار کو بھی بعض دفعہ پیش آتی ہیں اور اس کے ساتھ ان میں اور اس میں یہ فرق ہے کہ یہ جو صدمے اٹھائیں، ان پر انہیں اجر وثواب آخرت کی امید ہے جو ان تکالیف کو قابل برداشت ہی نہیں بلکہ خوشگوار بنانے کی ضامن ہے مگر کفار اس امید سے محروم ہیں تو مسلمانوں کو تو کبھی پست ہمت ہونا ہی نہ چاہئے۔

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿١٠٥﴾ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٦﴾

"بلاشبہ ہم نے آپ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری ہے تاکہ جو اللہ نے آپ پر نمایاں کر دیا ہے، اس کے مطابق آپ لوگوں میں فیصلہ کریں اور آپ بد دیانتوں کی وکالت نہ کیجئے۔ [1]

اور اللہ سے معافی کی سفارش کیجئے۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان"۔

شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں:۔

"یہ اول وآخر کئی آیت میں ذکر ہے ایک قصہ کا حضرت کے وقت۔ ایک انصاری کی زرہ آٹے میں دھری گم ہوئی۔ صبح کو تلاش ہوئی تو آٹے کا خط دیکھا ایک شخص کے گھر تک، اس کا نام طعمہ بن ابیر تھا [2] وہاں جھاڑ لیا تو نہ پائی زرہ۔ خط آگے دیکھا ایک یہودی کے گھر تک، زید نام اور وہاں پائی۔ اس یہودی نے کہا کہ مجھ کو طعمہ نے سپرد کی۔ طعمہ نے کہا کہ میں بری ہوں، چور وہی ہے۔ طعمہ کی قوم نے مشورت کی کہ ہم حضرت کے پاس سب مل کر گواہی دیں گے کہ طعمہ بری ہے تو حضرت ہماری حمایت کریں گے اور یہودی چور ٹھہرے گا۔ صبح کو یہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔ حضرت کو خبردار کر دیا فی الحقیقت چور یہی تھا طعمہ۔" (موضح القرآن)

اب مذکورہ عبارت میں طعمہ کا نام اور اس کی قوم کا ذکر جس طرح ہے، شاید اس سے صحیح نوعیت واقعہ کی محسوس نہ ہو۔

آیت قرآن کے مضمون اور صورت واقعہ سے صاف ہے کہ یہ طعمہ یا ابوطعمہ اور اس کی قوم والے سب مسلم جماعت کے افراد تھے جو ایک یہودی کو پھانسنا چاہتے تھے اور اس "مسلم" کے لفظ سے بھی بات شاید پوری ظاہر نہ ہو تو سمجھ لیجئے کہ یہ دور رسولؐ کے مسلم تھے یعنی جمہوری اصطلاح میں سب صحابہ کرام کی معزز جماعت کے افراد اور کردار یہ کہ واہ ہی واہ۔

چوری بھی اور پھر ایک بے گناہ کو پھنسانے کی کوشش اور اب یہ پہلو خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے کہ وہ بے گناہ غیر مسلم تھا اور یہ صحابہ اپنے

---

[1] ۔مباش خصومت کنندہ برائے حمایت خیانت کنندگان (شاہ ولی اللہ) مت ہو خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑنے والا (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔تبیان شیخ طوسی سے ثابت ہوتا ہے کہ بشر، بشیر اور مشیر تینوں فرزندان اُبیرق تھے اور بشر کی کنیت ابوطعمہ تھی یہی تینوں اس چوری کے مرتکب تھے۔ اس طرح "طعمہ بن ابیر" کے بجائے "ابوطعمہ ابن ابیرق" کہنا صحیح ہوگا۔

خیال میں شاید وقار اسلامی کا تحفظ کر رہے تھے کہ آئی گئی سب ایک نامسلم اور وہ بھی یہودی پر جائے جو بنص قرآن.....

خدا اور رسولؐ کے سب سے بڑے دشمن ہیں مگر یہ خالق کریم اور شارع اسلام کی طرف سے حقوق انسانی اور عدل و مساوات کے ہمہ گیر مفاد کا تحفظ تھا کہ باوجودیکہ ظاہری قرائن یہودی کو مجرم قرار دے رہے تھے اور مسلمان اور معزز صحابی بچ رہا تھا مگر خالق نے اس موقع پر اپنے خاص ذریعہ سے رسولؐ کو صورت حال پر مطلع کیا اور غیر مسلم کو صاف طور پر بری کر دیا۔

یہ جمہوری مسلمانوں کے سوچنے کی بات ہے کہ اگر خالق کو صحابہ کے ناموس کے تحفظ کے لئے کف لسان کرانا منظور ہوتا تو وہ ان کے بارے میں حسن ظن کے پردہ کو چاک کرنے کی ایک ایسے موقع پر کیوں ضرورت محسوس فرماتا۔ پھر اگر ایسے مخفی کردار کو ان کے نمایاں کرنا خالق نے ضروری سمجھا تو جو صفحہ تاریخ پر نمایاں نقوش کردار کے ثبت ہیں، ان کے تذکرہ کو وہ کیوں پسند نہ فرمائے گا اور ان سے چشم پوشی کیوں ضروری قرار دے گا؟

اس ارشاد کے بعد کہ آپ بددیانتوں کی وکالت نہ کیجئے گا، یہ کہا گیا ہے کہ: **واستغفر اللہ** اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان کی طرف سے صفائی نہ پیش کیجئے۔ ہاں چونکہ مسلمان ہیں اور آپ کا کام ہی دعائے خیر کرنا ہے، اس لئے بارگاہ الٰہی میں ان کی معافی کی درخواست آپ کریں، یہ اور بات ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس استغفار کا تعلق خود رسول خداؐ کے اپنے کسی عمل سے نہیں ہے اور میں یہاں ان مفسرین سے متفق نہیں ہوں جو اس استغفار کا تعلق خود رسولؐ کے کسی عمل یا ارادہ سے قرار دیتے ہیں۔ [1]

نہ اس شان نزول سے متفق ہوں جسے مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے اپنے حاشیہ میں درج کر دیا ہے جس سے خود رسولؐ پر یہ الزام آتا ہے کہ آپ بلاوجہ دوسروں کے کہنے میں آکر ایک بے گناہ پر خفا ہوئے۔

ہمارے اکابرین میں جناب شیخ الطائفہ طاب ثراہ نے بھی اس شان نزول کو ناقابل تسلیم اور شان رسولؐ کے منافی قرار دیا ہے۔ [2]

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۚ﴿۱۰۷﴾

''اور ان کی طرف سے جو خود اپنے ساتھ غداری کرتے ہیں، آپ بحث و مباحثہ نہ کیجئے، یقیناً اللہ اسے جو گنہگار، غدار ہے دوست نہیں رکھتا۔''

اصطلاح قرآنی میں ہر گناہ اپنے ساتھ غداری ہے، اس لئے کہ خود اپنے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ اپنے کو نجات کا حق دار بنایا جائے۔ اب اگر یہ اپنے کو عذاب کا مستحق بناتا ہے تو یہ خود اپنی حق تلفی اور اپنے ساتھ ستمرانی نہیں تو اور کیا ہے۔ [3]

پھر یہ مسلمان جن نے سرقہ تو خود کیا اور تہمت لگاتا ہے ایک غیر مسلم پر اپنی جماعت کے ساتھ بھی غدار ہے، اس لحاظ سے کہ وہ دوسروں کی

---

[1] ۔ امرہ بان یستغفر اللہ من مخاصمۃ عن الخائن (مجمع البیان) و استغفر اللہ عما ھمت بہ (جلالین)

[2] ۔ المراد بذلك امة على انا لا نعلم ان ما روى فى هذا الباب وقع من النبى لان طريقة الاحاد (تبیان)

[3] ۔ یخونونہا بالمعاصی (جلالین) لان ضرر خیانتہم راجع الیہم لاحق بہم (مجمع البیان)

نگاہ میں اپنی پوری جماعت کے کردار کو داغدار بنا رہا ہے۔

بلکہ اس نے چونکہ یہ کوشش کی کہ پیغمبرؐ اسلام سے ایک بے گناہ کو جو غیر مسلم ہے، سزا دلوادے اور ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اس غیر مسلم کی نگاہ میں رسولؐ معاذ اللہ ظالم ہی قرار پاتے تو یہ درحقیقت اس مجسم خلق عظیم اور رحمۃ للعالمین پر بھی ایک ظلم ناروا تھا کہ ان کے دامن کو اپنی خودغرضی کی بدولت داغدار بنانے کی کوشش کی گئی۔

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾

''وہ آدمیوں سے تو چھپ لیں گے، اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ وہ تو ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو اس کی ناپسند گفتگو کرتے ہوتے ہیں اور اللہ اس پر کہ جو یہ کرتے رہتے ہیں حاوی ہے''۔

ابوطعمہ اور اس کی قوم والوں نے یہودی پر الزام لگانے کی سازش کے لئے جو رائے مشورہ کیا تھا، اس پر سرزنش ہو رہی ہے اور وہ ہر اس فرد اور جماعت کے یاد رکھنے کی چیز ہے جو کسی جرم کو پوشیدہ طور پر کرنے کی کوشش کرے۔ وہ پوشیدہ کرنے کی جتنی بھی کوشش کرے، لوگوں سے چھپنے کا امکان ہے مگر اصل حاکم جس کا وہ درحقیقت مجرم ہے، بہرحال اسے دیکھ رہا ہے اور حساب لینے والا اور سزا دینے والا وہی ہے۔

یہ خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا اسلامی عقیدہ ہے جو آدمیوں کے پیش نظر رہے تو ہر شعبہ حیات میں جرائم کا سدباب ہو جائے۔

یبیتون کا ترجمہ ہم نے جو کیا ہے کہ ''راتوں کو اس کی ناپسند گفتگوئیں کرتے ہوتے ہیں''۔ یہ اس لفظ کے حقیقی معنی سے کہ اس میں بیات یعنی شب بسر کرنا داخل ہے، مطابقت رکھتا ہے [1] لیکن بعض مفسرین نے اسے مجاز پر محمول کیا ہے اور اس کے معنی ذہن میں پوشیدہ رکھنے کے لئے ہیں [2] مگر شان نزول کے واقعہ کو دیکھتے ہوئے اس مجاز کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾

''اچھا! اس وقت تم لوگ ان کی طرف سے اس دنیاوی زندگی میں بحث و مباحثہ کر بھی لو تو قیامت کے دن اللہ سے ان کی جانب سے بحث کون کرے گا یا کون ان کا نمائندہ ہو سکے گا''۔

قبل کی آیتوں میں خطاب بصیغہ مفرد خاص رسولؐ سے ہونے کے بعد کہ ''ان کی طرف سے بحث مباحثہ نہ کیجئے'' ''ان کی وکالت نہ کیجئے'' فوراً اس کے بعد خطاب کو بصیغہ جمع وارد کرنا کہ ''تم لوگ یہاں ان کی طرف لڑ لو، قیامت میں ان کی طرف سے کون لڑے گا'' صاف اس کا

---

[1] ۔آں گاہ کہ بشب مشورت می کنند (شاہ ولی اللہ) جس وقت کرتے ہیں رات (رفیع الدین) ای یدبرون باللیل قولا لا یرضاہ اللہ (مجمع البیان)

[2] ۔یبیتون یضمرون (جلالین)

قرینہ ہے کہ پہلا

خطاب بھی اگرچہ بظاہر خود رسولؐ سے تھا مگر اس سے مقصود دوسرے لوگوں ہی کی تنبیہ تھی جو ان مجرموں کی طرف سے صفائی پیش کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

خالق کا ارشاد ہے کہ یہ تو دنیا ہے۔ یہاں تو ہوسکتا ہے کہ گنہگار کی بلا بے گناہ کے سر چلی جائے مگر آخرت میں یہ نہیں ہوسکتا۔ وہاں انہیں عذاب سے تم کیوں کر بچا سکتے ہوں؟!

بعض مفسرین نے جو شان نزول کچھ اس طرح درج کی ہے کہ خود حضرت رسولؐ کو بھی ان تنبیہات قرآنی کی لپیٹ میں لے لیا ہے، یہ ہمارے نزدیک شان رسولؐ کے خلاف بھی ہے اور خود قرآنی الفاظ کے مطابق بھی نہیں ہے جب کہ اس کے بعد قرآن مجید میں آیا چاہتا ہے کہ:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾۔ (النساء۔۱۱۳)

اور اگر اللہ کا فضل وکرم آپ کے شامل حال نہ ہوتا تو ان میں کا ایک گروہ یہ چاہتا تھا کہ آپ کو گمراہ کردے حالانکہ (اب صورت یہ ہے کہ) بس وہ خود اپنے کو گمراہ کرتے ہیں اور آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اللہ نے آپ پر اپنا قانون اور حکیمانہ راز، یہ سب اتار دیا ہے اور آپ کو وہ علم دیا ہے جو آپ کو از خود حاصل نہ تھا اور اللہ کا فضل وکرم آپ پر بہت بڑا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ رسولؐ کو اپنی باتوں میں لانا چاہتے تھے مگر نہیں لا سکے اور قرآن کہہ رہا ہے کہ نہیں لا سکتے تھے۔ آپ کی شان اس سے بلند وارفع ہے کہ آپ ان کی باتوں میں آتے۔ پھر یہ کہنا کتنا غلط ہے کہ انہوں نے حضرت سے بھی معاذ اللہ کچھ نہ کچھ اپنے موافق کہلوا ہی لیا۔[1] استغفر اللہ

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾

''اور جو برائی کرے یا خود اپنے اوپر ظلم کرے، پھر اللہ سے بخشش کا طالب ہو تو وہ اللہ کو بڑا بخشنے والا پائے گا، مہربان۔''

یہاں جو دو الفاظ صرف کئے گئے ہیں، ان میں بظاہر پہلے کا تعلق دوسرے افراد کے ساتھ ہے یعنی دوسرے پر برائی کرے اور دوسرا لفظ (اپنے اوپر ظلم کرے) یہ انفرادی گناہ ہے۔

ہمارے نزدیک رجحان اسی کو ہے۔ ورنہ مفسرین کے بیان میں ان دونوں لفظوں کے فرق میں کافی اضطراب ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں:۔

''گناہ فرمایا کبیرہ کو اور اپنا برا فرمایا صغیرہ کو''۔

---

[1] ۔اسید بن عروہ، بنو بیرق کی طرف سے وکیل بن کر قتادہ کے خلاف آپ کے پاس بحث کرنے کو آیا تھا اور آخر اس نے حضرت سے قتادہ پر کچھ خفگی کرا ہی دی (فرمان علی صاحب)

یہ خود الفاظ کے تحت اللفظی معنی سے تو ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں اگر حدیث سے ثابت ہو جائے کہ اس کی تفسیر یہ ہے تو درست سمجھی جا سکتی ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے ان دونوں لفظوں کا فرق ظاہر کرنے کے لئے کئی قول نقل کیے ہیں [1] مگر کسی کا بھی ثبوت حدیث سے نہیں ملتا۔

اس کے بجائے اللغۃ کے تحت میں سوء کے معنی جو لکھے ہیں:۔

القبیح الذی یواجه به صاحبه ... ورجل سوء من شانه ان یواجه الناس بالمکارہ:۔

وہ برائی جو کسی کے منہ در منہ کی جائے ..... اور مرد سوء وہ شخص ہے جس کا شیوہ یہ ہے کہ لوگوں کے منہ پر انہیں تکلیفیں پہنچاتا ہے۔

یہ ہمارے خیال کی تائید کرتے ہیں۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾

''اور جو کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ بس اپنے ہی نقصان کا باعث ہوتا ہے اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، ٹھیک ٹھیک کام کرنے والا اور جو کوئی غلطی یا گناہ کرے، پھر اسے کسی بے قصور کے سر منڈھ دے، اس نے افتراء اور کھلے ہوئے گناہ کا بوجھ اٹھایا'' [2]

یہ سب تہدیدی و تنبیہی تازیانے اسی جماعت کے کردار پر ہیں جس نے ایک مسلمان کی طرف سے صفائی پیش کرنے کے لئے ایک یہودی پر تہمت لگائی تھی جس کا واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

خطیئۃ جس کا ترجمہ ہم نے ''غلطی'' کے ساتھ کیا ہے، یہ غیر ارادی طور پر ہو سکتی ہے اور اثم جس کا ترجمہ کیا گیا ہے ''گناہ'' یہ جان بوجھ کر غلط کام کا ارتکاب ہے۔ [3]

اب وہ غلطی بھی جو غیر ارادی طور پر ہو، جب اسے کسی بے گناہ کے سر منڈھنے کی کوشش کی تو وہ بجائے خود تو صرف غلطی تھی لیکن اب وہ بھی ایک جانا بوجھا غلط کام ہو گیا لہٰذا اب دونوں کا حکم یکساں ہو گیا کہ وہ بہتان بھی ہے اور اثم مبین یعنی کھلا ہوا گناہ بھی ہے۔

یہ دو الفاظ غالباً حق الناس اور حق اللہ کے لحاظ سے ہیں یعنی باعتبار اس بے گناہ آدمی کے وہ بہتان ہے اور خالق کی معصیت ہونے کے لحاظ سے ''کھلا ہوا گناہ'' ہے۔

---

[1] ۔سوء ای معصیۃ وامر اقبیحا اویظلم نفسه بارتکاب جریمۃ وقیل یعمل سوءً ا بان یسرق الدرع اویظلم نفسه بان یرمی بها بریئاً وقیل المراد بالسوء الشرك وبالظلم مادون الشرك (مجمع البیان)

[2] ۔برخود برداشت افتراء و گناہ ظاہر را (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔الخطیئۃ قدیکون عمدا وغیر عمد والاثم لایکون الاعن عمد (تبیان)

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَیْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

''اور اگر اللہ کا فضل وکرم آپ کے شامل حال نہ ہوتا اور اس کی مہربانی تو ان میں کا ایک گروہ یہ چاہتا کہ وہ آپ کو گمراہ کردے۔ حالانکہ (اب صورت یہ ہے کہ) وہ خود اپنے ہی کو گمراہ کرتے ہیں اور آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اللہ نے آپ پر اپنے قانون کے احکام اور حکیمانہ راز اتار دیئے ہیں اور آپ کو وہ علم دیا ہے جو آپ کو خود حاصل نہ ہوتا اور اللہ کا فضل وکرم آپ پر بہت بڑا ہے۔''

اس مسلمان کی صفائی پیش کرنے میں قسمیں کھا کھا کر اور غلط گواہیاں دے دے کر چاہتے تھے کہ رسولؐ اس یہودی کو مجرم سمجھ لیں اور اسی کو مستوجب سزا قرار دیں۔ اس طرح ایک غیر قوم کی نظر میں مسلمانوں کے کردار کے ساتھ خود رسولؐ کے عدل وانصاف کا دامن بھی داغدار ہوجائے۔

اللہ نے غیر معمولی طریقہ پر رسولؐ کو حقیقت حال سے اطلاع دے کر آپ کے دامن کو اس دھبے سے صاف رکھا اور ان دوست نما دشمنوں کا منصوبہ پورا نہ ہوسکا۔

لَا خَيْرَ فِیْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

''زیادہ تر ان کی سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ سوا اس کے جو کسی خیر خیرات یا نیکی یا لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے کی بات چیت کرے اور جو ایسا کرے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اسے ہم بڑا ثواب عطا کریں گے۔''

سازشیں اور منصوبے زیادہ تر خفیہ سرگوشیوں سے ہی بنتے ہیں چنانچہ یہ ایک مسلمان کو بچا کر یہودی کے پھنسانے کی سازش بھی اسی طرح ہوئی تھی، اس لئے سرگوشی کی مذمت کی گئی اور اس سے استثناء کردیا گیا ان صورتوں کا جب کسی نیک کام کے لئے منصوبہ بنایا جائے اور مصلحت اسی میں ہو کہ تکمیل کے پہلے اس کی خبر پھوٹنے نہ پائے۔ اس صورت میں اتنا ہی نہیں کہ کوئی ممانعت نہیں ہے بلکہ یہ اجر وثواب کا باعث ہوگا۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾

''اور جو صحیح راستہ نمایاں ہو جانے کے بعد پیغمبرؐ سے اختلاف کرے [1] اور ایمان والوں کے راستے کے خلاف رستہ چلے، اسے جدھر وہ گیا ہے، اسی طرف ہم جانے دیں گے اور اسے دوزخ کی آگ کا مزہ چکھائیں گے اور وہ بہت بری بازگشت ہے۔''

شروع کے پہلے اور دوسرے دونوں فقروں کا حرف عطف کے ساتھ وصل دیکھئے تو صاف سمجھ میں آئے گا کہ پیغمبرؐ سے اختلاف کرنا خود ایمان والوں کے راستے کے خلاف راستہ چلنا ہے اب اگر کسی دور کے بعض یا کل مسلمان پیغمبرؐ کی راہ سے الگ اپنی راہ بنائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ نمائشی مسلمان حقیقی ایمان کے جوہر سے خالی ہیں اور ایسا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں جو ایمان والوں کا راستہ نہیں ہے۔ نہ یہ کہ ان مسلمانوں کا اس راستے پر چلنا اس کی ضمانت ہے کہ یہی راہ ایمان ہے۔

اتباع رسولؐ راہ اہل ایمان ہے نہ کہ اجماع امت

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ رسولؐ کا اتباع معیار راہ ایمان ہے۔ کچھ مسلمانوں کا کسی راستے پر چلنا معیار نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایمان کا تقاضا خدا و رسولؐ کی پیروی اور دین کی پابندی ہے [2] جب ایسا نہ ہو تو چلنے والے جو ہر دین سے معرا ہو سکتے ہیں۔ دین کا راستہ مشکوک و مشتبہ نہیں ہو سکتا۔

مگر تعجب ہے کہ اہل سنت کے اکثر مفسرین و متکلمین اس آیت پر پہونچ کر پہلے جز کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور دوسرے جز کو سامنے رکھ کر اسے جمہور امت کے اجماع یا شوریٰ کی حقانیت پر مقام استدلال میں پیش کرتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب نے بھی اس طرح استدلال کر ڈالا ہے کہ:۔

''پس جس بات پر امت کا اجماع ہو، وہی اللہ کی مرضی ہے اور منکر ہو، سو وہ دوزخی ہے۔'' (موضح القرآن)

یہ استدلال آیت کے پہلے جز کو سامنے رکھتے ہوئے بالکل بادر ہوا ثابت ہوتا ہے۔ پھر یہ تو اس وقت ہے جب اس آیت کو تنہا دیکھا جائے اور اگر یہ اسی واقعہ کے سلسلے کی ہے جس کے متعلقہ آیات اس کے پہلے برابر آتے رہے ہیں جیسا کہ مفسرین کا خیال ہے اور امام باقر علیہ السلام کی روایت بھی اس کے مطابق ہے [3] تو حقیقت اور زیادہ نمایاں محسوس ہوگی، اس لئے کہ یہاں تو ہوا یہی تھا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت نے خلاف حق اتفاق کر لیا کہ اس مسلمان کو جو واقعی مجرم ہے چھڑوا دیا جائے اور اس یہودی کو جو بے قصور ہے پھنسا دیا جائے۔

اگر مسلمانوں کے ہر اجتماعی فیصلہ پر خالق کی مہر تصدیق ثبت ہوتی تو چاہئے یہ تھا کہ یہی راستہ حق ہوتا مگر خالق نے سخت الفاظ میں اس منصوبہ پر سرزنش کی اور اسی کو کہا جا رہا ہے یہ مومنین کا راستہ نہیں ہے۔ ایسا راستہ اختیار کرنا دوزخ کی طرف لے جانے والا ہے۔ اب تو حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس آیت کو کسی ایسے اجماع یا شوریٰ کے لئے جو نص رسولؐ کے خلاف ہو، بطلان کی دلیل سمجھا جائے۔ نہ یہ کہ اس کی حقانیت پر اس آیت سے استدلال کیا جائے۔

---

[1] ۔یشاقق یخالف (جلالین) مخالف پیغمبر صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کند (شاہ ولی اللہ) جو کوئی برخلاف کرے رسولؐ کے (رفیع الدین)

[2] ۔سبیل المومنین ای طریقھم الذی ھم علیہ من الذین (جلالین) ای طریقھم الذی ھو دینھم (مجمع البیان)

[3] ۔نزلت ھذہ الأیۃ فی الخائنین الذین ذکرھم اللہ وھو قول مجاھد وقتادۃ واکثر المفسرین وھو المروی عن ابی جعفرؑ (تبیان)

نولہ ماتولی کے لفظی معنی ایک یہ ہیں کہ ''ہم اسے موڑ دیں گے جدھر وہ مڑے'' مگر جب ادھر وہ خود مڑ ہی رہا ہے تو پھر موڑنا تحصیل حاصل ہوگا۔ اس لئے یہ معنی جس کے نتیجہ میں جبر کا تصور ذہن میں آتا ہے، درست نہیں ہوسکتے۔ اس لئے ہم نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ''جدھر وہ گیا ہے، اس طرف ہم جانے دیں گے''[1] یعنی ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ ہم اسے روک دیں اور زبردستی ٹھیک راستے پر قائم رکھیں۔

اس سے یداللہ علی الجماعۃ اور لایجمع اللہ امتی علی الضلالۃ کے اس مفہوم کی نفی ہوجاتی ہے کہ اس امت کے لئے یہ اللہ کی خاص ضمانت ہے کہ وہ اس کی اکثریت کو گمراہی پر مجتمع نہیں ہونے دے گا۔

پھر اس کے تحت میں یہ بھی ہے کہ مخالفت رسولؐ کے اس منصوبہ اور اتباع غیر سبیل المومنین کے ذریعہ سے اگر وہ کوئی سازشی اقتدار یا ملک حاصل کررہے ہیں تو اللہ کے ذمہ یہ بھی نہیں ہے کہ وہ اس منصوبہ کو ناکام بنائے۔

نولہ ماتولی یعنی دنیا میں تو وہ جو کرنا چاہیں کرلیں گے ہم اس میں سدراہ نہ ہوں گے بے شک آخرت میں انہیں عذاب کا مزہ چکھائیں گے اور وہ انجام بہت برا ہوگا۔

نولہ ماتولی کے ایک دوسرے معنی یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ ہم اسے اس والی و مددگار پر چھوڑ دیں گے جس سے اس نے تولا کی ہے یعنی جسے اس نے اپنا مددگار سمجھا ہے۔[2]

مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی حمایت و تائید سے ہاتھ اٹھالیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ جسے اس نے اپنا والی قرار دیا ہوگا، وہ خود عاجز و قاصر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کا کوئی والی و مددگار نہیں ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١١٦﴾

''بے شک اللہ اسے نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کم جو بھی ہو، اسے جس کے لئے چاہتا ہے، بخش دیتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ شرک اختیار کرے، وہ راہ راست سے بہت دور جا پڑا۔[3]

اس آیت کی رو سے شرک وہ گناہ قرار پاتا ہے جو ناقابل مغفرت ہے۔ باقی ہر گناہ کے لئے امکان ہے مگر حتمی وعدہ نہیں ہے بلکہ لمن یشاء کی قید کے ساتھ محدود ہے۔ اس طرح ''امید و بیم'' دونوں کی آمیزش ہوجاتی ہے جو ایمان کا خاص جوہر ہے۔

متفق علیہ اسلامی تصور یہ ہے کہ غیر مسلم کے لئے امکان مغفرت نہیں ہے مگر غیر مسلم کا لفظ بظاہر عام ہے۔ قرآن مجید میں ''شرک کا ذکر ہے''۔ یہ خاص ہے۔

---

[1] ۔ نجعلہ والیا لما تولاہ من الضلال بان نخلی بینہ وبینہ (جلالین)

[2] ۔ معناہ نجعل ناصرہ ما استنصرہ واستعان بہ (تبیان)

[3] ۔ زال عن قصد السبیل ذھابا بعیدا (تبیان) ضلالا بعیدا عن الحق (جلالین)

دین الٰہی سے انحراف بطور انکار قابل بخشش نہیں

جناب شیخ الطائفہ نے اس پر کافی میں بحث فرمائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ جو بھی اسلام کے علاوہ کسی مذہب کا پیرو ہے، وہ ضرور کسی نہ کسی قسم کے شرک میں مبتلا ہے لہٰذا یہ حکم ان کے لئے ثابت ہوگا (تبیان)

شاہ عبدالقادر نے لکھا ہے:۔

''اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبرؐ کے حکم پر راضی نہ ہوئے اور جدا راہ چلے۔ پھر یہ آیت فرمائی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوا دین اسلام کے اور دین رکھے اور اس پر چلے پس جو دین ہے سوا اسلام کے شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں'' (موضح القرآن)

اس سے اول تو یہ سمجھ لیجئے کہ شاہ صاحب اس کے قبل والے بہت سی آیات سے لے کر یہاں تک سب آیتوں کو اسی دفعہ سے متعلق سمجھتے ہیں جس کا ذکر ہو چکا تو اب جو ہم نے گزشتہ آیت کے ذیل میں کہا تھا، اسے مزید قوت ہوگئی کہ سبیل المومنین یعنی اہل ایمان کا راستہ جس پر چلنے کی اللہ دعوت دے رہا ہے، مسلمانوں کا اختیار کردہ راستہ نہیں ہے بلکہ رسولؐ کا جو فیصلہ ہو، اسے تسلیم کرنا، یہی اہل ایمان کا راستہ ہے جس کی خداوند عالم نے دعوت دی تھی اور اب اسی سے انحراف کو وہ شرک کے ایسے شدید لفظ سے یاد فرما رہا ہے۔

پھر جب کہ شرک سے مراد رسولؐ کا فیصلہ ہو گیا اور اس لئے کفر کی ہر قسم شرک بن گئی اور مغفرت سے ناامیدی کیلئے کافی ہوگئی تو اب اگر ہم کہتے ہیں کہ مغفرت ''فروعی'' گناہوں میں ہوتی ہے یعنی جہاں کسی حکم خدا و رسول کا انکار نہ ہو، بس صرف عملی کوتاہی ہو لیکن اگر انحراف اعتقادی قسم کا ہے یعنی کسی حکم خدا و رسولؐ سے انکار ہو گیا تو مغفرت و شفاعت وغیرہ کسی چیز کی گنجائش نہیں ہے اور اس لئے اگر کسی طبقہ نے اس نظام حکمرانی کو قبول نہ کیا جسے خدا و رسولؐ نے مقرر کیا تھا اور اس ولی کی ولایت کو تسلیم نہ کیا جسے ادھر سے مولا بنایا گیا تھا تو ایمان اور اس کے ساتھ ساتھ نجات کا امکان ختم ہو گیا تو اسے قرآنی آیت کے مضمون کے خلاف نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ وہ سیاق کلام کے لحاظ سے مضمون آیت کے بالکل مطابق ہے۔

اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾

''وہ اسے چھوڑ کر نہیں پکارتے مگر کچھ زنانے قسم کے نام اور نہیں پکارتے مگر اس سرکش شیطان کو جس پر اللہ نے لعنت کی تھی اور جس نے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں میں اپنا مقررہ حصہ ضرور رکھوں گا اور ضرور انہیں گمراہ کروں گا اور انہیں سبز باغ دکھاؤں گا اور ضرور انہیں مامور کروں گا تو وہ چوپایوں کے کانوں کو شگافتہ کریں گے اور انہیں کہوں گا تو وہ اللہ کی طرف کی پیدائشی صورت کو بدلیں گے اور جو شیطان کو اپنا سرپرست بنائے گا اللہ کو چھوڑ کے، وہ کھلا ہوا گھاٹا اٹھائے گا۔ وہ انہیں طرح طرح کی امیدیں دلاتا ہے اور سبز باغ دکھاتا ہے اور نہیں انہیں امیدیں دلاتا ہے شیطان مگر دھوکے کے فریب کے طور پر۔ یہ وہ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ اس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہ پائیں گے۔''

مشرکین نے اپنے بتوں کے نام لڑکیوں کے سے رکھ چھوڑے تھے جیسے لات اور عزیٰ اور مناۃ وغیرہ اسی کو کہا گیا ہے کہ وہ خدا کو چھوڑ کر کچھ لڑکیوں کو پکارتے ہیں۔[1]

''پکارتے ہیں'' کا مطلب ہے، معبود قرار دے کر ان کی دہائی دینا۔[2]

معصوم ہستیوں کی موجودگی کا ثبوت

اور پھر وہ فرشتوں کو بھی اللہ کی لڑکیاں ہی کہتے تھے[3] اس کے بعد جو کہا گیا ہے کہ ''اور نہیں پکارتے مگر اس سرکش شیطان کو''۔ یہ پکارنا شعوری طور پر نہیں ہے کہ وہ قصداً اس کا کرتے ہیں بلکہ یہ ان کے پہلے عمل کا لازمہ ہے یعنی وہ بتوں کی پوجا جو کرتے ہیں تو اس سے درحقیقت اس شیطان کی پوجا ہوتی ہے[4] جس نے خلق خدا کے گمراہ کرنے کا پہلے ہی بیڑا اٹھالیا تھا اور کہا تھا کہ ''میں تیرے بندوں میں ایک مقررہ حصہ ضرور رکھوں گا''..... اس کا تو نصب العین یہی ہوسکتا تھا، کہ وہ سب کو گمراہ کردے مگر یہ پہلے سے معلوم تھا کہ اللہ کے کچھ ایسے پختہ، راسخ عزم والے بندے ہیں جن پر اس کی کوشش اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ اس لئے پہلے ہی دن اس طبقہ کا استثناء ہوگیا تھا۔ اس نے کہا تھا: اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ اور خالق نے ارشاد کیا تھا:۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ﴿الإسراء: ٦٥﴾

میرے خاص بندوں پر تیرا کچھ دسترس نہیں ہوگا۔

اور چونکہ اصطلاح قرآنی سے جیسا کہ بکثرت آیات سے ثابت ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر قسم کی غلطی، یہاں تک کہ سہو ونسیان بھی کار شیطان ہے، اس لئے اس نفی مطلق سے کہ کچھ بندے ایسے ہونگے جن پر شیطان کا کچھ دسترس نہ ہوگا، یہ ثابت ہوتا ہے کہ کچھ ہستیاں ایسی معصوم ضرور ہیں کہ جن میں سہو ونسیان کا بھی گزر نہیں ہے۔

---

[1] ۔اصناما مؤنثة كاتلات والعزّىٰ ومناة (جلالين) بتان را كه بنام دختران مسمّٰى كرده اند (شاه ولى الله)

[2] ۔يدعون يعبدالمشركون (جلالين)

[3] ۔قالت قريش ان الملئكة هم بنات الله (تفسير على بن ابراهيم)

[4] ۔يعبدون بعبادتها (جلالين)

یہ جماعت چونکہ پہلے سے علم باری میں تو الگ تھی ہی۔ شیطان کو بھی معلوم تھا کہ وہ اس حلقہ سے لازماً الگ رہے گی، اس لئے یہاں شیطان کے منصوبہ کا جو خلاصہ بتایا گیا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ میں اپنا کچھ مقررہ حصہ رکھوں گا۔

یہ مقررہ حصہ کن لوگوں کا ہے؟ جنہیں خالق نے فرمادیا تھا کہ:۔ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ (حجر۔ ۴۲) یعنی جو گمراہ لوگ تیری پیروی کریں گے، وہ بس تیرے قبضہ میں آئیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ شیطان کے قبضہ میں جانا ان کا فعل ارادی ہے، کوئی مجبوری کی بات نہیں ہے تاکہ شیطان پر ذمہ داری ڈال کر یہ اس کی سزا سے الگ ہونے کا تصور کرسکیں۔

اب شیطان نے جس قسم کی گمراہیاں دنیا میں پھیلائیں، ان کا ذکر شیطان ہی کی زبانی کیا گیا ہے۔ ان میں پہلی بات یہ ہے کہ لاضلنھم یعنی میں اعتقادی طور پر گمراہ کروں گا۔ اس کا مظہر تمام فرق باطلہ ہیں جو خیالات و اعتقادات کی گونا گونی سے مختلف راستوں پر لگ گئے ہیں۔

دوسرے: لامنینھم ''انہیں سبز باغ دکھاؤں گا'' یہ طرح طرح کے غلط توقعات ہیں جن کے ماتحت انسان فرائض الٰہیہ سے غافل رہتا ہے اور قسم قسم کی غلط کاریوں میں مبتلا رہتا ہے۔ اسی کے تحت میں وہ طولِ اَمَل ہے جس کی مذمت احادیث میں بکثرت وارد ہے۔

انسان دوسروں کا گلا کاٹتا ہے ایسے ہی غلط توقعات سے۔ حقوق غصب کرتا ہے انہی بے جا آرزؤں سے۔ چوری، ڈاکا، دنیا کے جتنے جرائم ہیں، وہ سب کرتا ہے اسی سے۔ ورنہ اگر یہ تصور قائم رہے کہ یہ چندروزہ زندگی ہے اور پھر خدا کو منہ دکھانا ہے اور آخرت کی دوامی زندگی حاصل کرنا ہے تو انسان کسی غلط کاری کے راستے پر کیوں جائے؟!

تیسرے: ولامرنھم فلیبتکن اذان الانعام ''میں انہیں کہوں گا تو وہ چوپایوں کے کانوں میں سوراخ کریں گے''۔ یہ مثال کے طور پر ذکر ہے ان بدعتوں کا جو دین کے نام سے رائج کی جاتی ہیں۔

عربوں نے حلال حیوانات میں کچھ کو دل بخواہ حرام سمجھ لیا تھا۔ اور ان حیوانات کو مقدس سمجھنے لگے تھے اور علامت کے طور پر ان کے کانوں میں شگاف دے دیئے تھے۔ اب وہ حیوانات ذبح نہیں ہوسکتے تھے۔ [1]

اسی طرح اور جماعتیں ایسی ہیں جو کچھ حیوانات کو مقدس سمجھ کر چھوڑ دیتی ہیں۔ اب وہ ایک ایک کا نقصان کرتے پھریں، کھیتوں کو چرتے پھریں، سبزی اور پھلوں کی دوکانیں لوٹتے پھریں مگر کوئی ان جانوروں سے کچھ نہ بولے۔ اس لئے کہ وہ مقدس و محترم ہیں۔ یہ سب شیطانوں کی کارستانی ہے۔

چوتھے: اللہ کی طرف کی پیدائشی صورت کو بدلنا۔ اس میں دین فطرت کے خلاف ہر قسم کی تحریف داخل ہے۔ [2]

بعض علما نے اس آیت سے ڈاڑھی منڈوانے کی حرمت پر استدلال کیا ہے کہ یہ بھی اللہ کی پیدا کردہ صورت کو بدلنا ہے۔ بہرحال جب کہ دینی نصوص سے اس فعل کی حرمت ثابت ہے تو یہ بھی اس کے تحت میں داخل تو ہے ہی۔ چاہے خصوصی طور پر مقصود نہ ہو۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

---

[1] ۔ یہ کافروں کا دستور تھا، گائے یا بکری کا ایک بچہ بت کے نام کا کردیا، اس کے کان میں نشان ڈالتے (موضح القرآن)

[2] ۔ فلیغیرن دین اللہ وبہ قال ابرٰھیم و مجاھد وروی ذٰلك عن ابی جعفر و ابی عبداللہ علیھما السلام (تبیان)

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾

''اور وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے، انہیں ہم ان بہشتوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون بات میں زیادہ سچا ہوگا''؟

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾

''نہ تمہارے خیالات خام سے کچھ ہوتا ہے [1] اور نہ اہل کتاب کے خیالات خام سے۔ جو کوئی برائی کرے گا، اس کی اسے سزا دی جائے گی اور وہ اپنے لئے اللہ کو چھوڑ کر کوئی سرپرست نہیں پائے گا اور نہ کوئی مددگار۔''

تنہا اس آیت کو دیکھا جائے تو صاف مخاطب مسلمان ہی معلوم ہوتے ہیں اور ایک روایت شان نزول کی اس کے مطابق ہے مگر چونکہ اس کے پہلے شیطان کے منصوبوں کے ذکر میں آچکا ہے کہ لامنینھم ''میں انہیں طرح طرح کے خیالات خام میں مبتلا کروں گا'' اور وہ باتیں مشرکین سے متعلق تھیں، اس لئے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کے مخاطب مشرکین ہیں۔ یعنی ''اے مشرکو! نہ تمہارے غلط تصورات سے کچھ ہوتا ہے اور نہ اہل کتاب کے غلط تصورات سے۔

جناب شیخ الطائفہ نے اسی قول کو تقویت دی ہے اور فرمایا ہے:۔

ویقوی ذلك ان الله تعالیٰ قدوعد المومنین بقوله: والذین امنوا وعملوا الصلحت بادخال الجنة والخلود فیها وتلك غایة امانی المسلمین فكیف ینبغی بعد ذلك امانیهم۔

اس قول کو تقویت ملتی ہے اس لئے بھی کہ ابھی اللہ نے مومنین سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں بہشت میں داخل کرے گا اور وہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی مسلمانوں کی انتہائی آرزو ہے تو اس کے بعد اس کی آرزوؤں کو کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ ان سے کچھ نہیں ہوتا۔

مگر میں سمجھتا ہوں بغیر یاایھا الذین کفروا: یاایھا المشرکون وغیرہ کے مطلق تخاطب سے ذہن میں مشرکین کا تصور پیدا ہونا مشکل ہے جب کہ بلا فاصلہ ذکر اہل ایمان کا ہے۔ مشرکوں کا کوئی تذکرہ بھی نہیں ہے۔

رہ گیا شیطان کے منصوبوں کا جو تذکرہ پہلے ہے، اس کے تمام اجزاء کو بالخصوص مشرکین سے متعلق قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، جب کہ سوا معصومین کے کسی نہ کسی حد تک شیطان کا داؤں سب ہی پر چلتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ شکار اس کے مشرکین ہیں مگر غلط خیالات اور تصورات اگر مسلمانوں میں آجائیں تو وہ شیطان کے لامنینھم کے حدود میں کیوں داخل نہ ہوں؟!

---

[1] ۔لیس الامر منوطا بامانیکم ولا امانی اھل الکتب بل بالعمل الصالح (جلالین)

پھر جب کہ یہاں ہمارے سامنے شیخ الطائفہ اعلیٰ اللہ مقامہ ہیں جن کا نظریہ نجات کے بارے میں معلوم ہے کہ ولایت ائمہ معصومین علیہم السلام اس کے لئے شرط لازم ہے تو اگر مسلمان بھی اس خیال خاص میں مبتلا ہیں کہ بس لا الہ الا اللہ کہہ دینا کافی ہے اور اس کے بعد نجات دم قدم کو لگی ہوئی ہے تو یہ بھی شیطان کے منصوبہ: لامنینھم کا کرشمہ نہ ہوگا تو کیا ہوگا؟!

رہ گیا یہ کہ اللہ نے مومنین سے اس کے پہلے وعدہ کیا ہے تو وہاں تو ایمان کے ساتھ وعملو الصلحت کی قید ہے۔

اور یہاں لیس بامانیھم کے ساتھ کہا جارہا ہے کہ: من عمل سوء ایجزبہ ''جو برائی کرے گا اس کی سزا پائے گا'' تو یہ اس وعدہ کے مقابل میں کب ہے؟ بلکہ اسی کا تتمہ سمجھنا چاہئے اور اگر ''امانی'' ایسے تصورات ہوسکتے ہیں کہ اب ایمان کے ساتھ ہم جیسے بھی اعمال کریں، ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا جیسے کہ مسلمان عوام نے اپنی بداعمالیوں کا جواز پیدا کرنے کے لئے طرح طرح کے ایسے خیالات قائم ہی کر لئے ہیں۔ تو یہ سب وہ ''امانی'' ہی ہیں جنہیں خالق ارشاد فرمارہا ہے:

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتٰبِ

نہ تمہارے خیالات خام سے کچھ ہوتا ہے اور نہ اہل کتاب کے۔ [1]

غور کیا جائے تو خیالات خام کا تعلق ایسی ہی جماعت کے ساتھ ہوسکتا ہے جو آخرت کا کچھ تصور رکھتی ہے مگر کسی طرح ''اندیشہ عذاب آخرت'' سے اس نے اپنے کو بے نیاز کرلیا ہے۔ رہ گئے بدنصیب مشرکین، وہ تو آخرت کے قائل ہی نہیں ہیں تو ان کے کچھ ''امانی'' ہو بھی کہاں سکتے ہیں؟

''امانی'' تو ماشاء اللہ انہی افراد کے ہوسکتے ہیں جو اپنے ''امت مرحومہ'' یا ''فرقہ ناجیہ'' ہونے کے زعم میں ہو یا اہل کتاب جو اپنے کو اولاد انبیاء قرار دے کر یا مسیح کے کفارہ ہوجانے کے تصور میں مگن ہوکر آخرت کے متعلق ''خواب شیریں'' میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿١٢٤﴾

''اور جو کوئی نیک کام انجام دے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، درانحالیکہ وہ باایمان ہو تو یہ لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی [2] ظلم نہ ہوگا۔''

''خواہ مرد ہو یا عورت'' اس تعمیم کے اظہار کی ضرورت اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ کوئی تصور اس کے خلاف موجود نہ ہو۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب اسلام آیا ہے تو عورت ایک غیر ذمہ دارسی شے سمجھی جاتی تھی کہ یہ چاہے جو کچھ کرے، اسے بہشت کے درجوں سے کیا تعلق اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ تصور ان جماعتوں میں کارفرما ہوگا جو بہشت کی قائل ہیں، ورنہ جو بہشت کو مانتے ہی نہیں، ان سے اس خیال کا کیا تعلق ہوسکتا ہے؟

---

[1] ۔یعنی لیس ما تتمنون انتم ولا اھل الکتب الا تعذبوا بافعالکم (تفسیر علی بن ابراھیم)

[2] ۔نقیرا قدو نقرۃ النواۃ (جلالین) ھی النقطۃ التی فی النواۃ (علی بن ابراھیم) ھی النقطۃ التی فی ظھر النواۃ (تبیان)

ظاہر ہے کہ اس تصور کے بعد خود عورت کو بھی اپنے کردار کی بلندی اور اصلاح و ترقی نفس کا کوئی احساس قائم نہیں ہوسکتا۔

اسلام نے اس تصور کی نفی کی اور یہ بتایا کہ ایمان اور عمل صالح کی ذمہ داری بھی مرد اور عورت میں مشترک ہے اور اس کا صلہ جو بہشت کی صورت میں ہے، وہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اس لئے اگر مرد پیش خدا بلند مرتبہ حاصل کرنا چاہے تو اسے اپنے نفس کو اس قابل بنانا ہے اور عورت اگر مرتبہ حاصل کرنا چاہئے تو اپنے نفس کو اس کا مستحق بنانا ہے۔

یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اصل بات کچھ اور کہی جارہی تھی کہ مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں ہے، پھر بھی قرآن نے صرف ایمان یا صرف حسن عمل کا ذکر نہیں کیا بلکہ اعمال صالحہ کو سرنامہ حکم قرار دے کر ایمان کا بطور شرط ذکر کر دیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز بغیر دوسرے کے کافی نہیں ہے بلکہ قرآن کی اس آیت اور بعض دوسری آیتوں کا انداز بتاتا ہے کہ آخرت کی جزاء اصل میں مراتب عمل ہی کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ ایمان اس عمل کی صحت اور اس پر استحقاق جزا کی شرط لازم ہوا کرتی ہے یعنی ایمان نہ ہو تو اعمال پر نظر ہی نہ ڈالی جائیگی کہ وہ کیسے ہیں۔ جب ایمان ہو تو پھر اعمال دیکھے جائیں گے، اور جیسے اعمال ہوں گے، ویسی جزاء ملے گی۔

سابقہ آیت میں برائیوں پر عام سزا کا اعلان اور اس آیت میں ایمان کی شرط کے ساتھ نیک اعمال پر داخلہ جنت کی بشارت، ایک مومن کے لئے ''امید وبیم'' کی سموئی ہوئی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جو جوہر ایمان ہے اور جو تحریک اصلاح عمل اور احساس فرائض کے لئے لازمی شرط ہے۔[1]

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾

''اور اس سے بڑھ کر کس کا دین اچھا ہوگا کہ جو اپنے کو اللہ کے سپرد کر دے[2] درانحالیکہ وہ اعمال اچھے کرتا رہے اور ابراہیم حنیف کی ملت کا پیرو ہو اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تھا۔''

''حنیف'' کے لفظی معنی مڑنے والا اور مطلب اس کا یہ ہے کہ غلط راستوں سے ہٹ کر صراط مستقیم پر قائم رہے۔[3]

لیکن اصطلاحی طور پر ''ملت ابراہیمی'' کا لقب سا ہوگیا ''ملت حنیفیہ'' اسی لئے ترجمہ میں ہم نے اسی لفظ کو دہرا دیا۔ ''اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تھا'' یعنی خاص دوست۔[4]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لقب خلیل کے ساتھ سرفرازی

ظاہر ہے کہ ہر مومن کو اللہ کا دوست ہونا چاہئے، چہ جائیکہ انبیاء و مرسلین، یہ سب اللہ کے دوست خالص تھے مگر ''اللہ نے انہیں خالص

---

[1] ۔لیقف المؤمن بین الخوف والرجاء (مجمع البیان)

[2] ۔انقادو اخلص عمله (جلالین)

[3] ۔حنیفا حال ای مال عن الادیان کلها الی الدین القیم (جلالین)

[4] ۔صفیا خالص المحبة له (جلالین)

دوست بنایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں لقب عطا کر دیا، ''خلیل'' کا جو یقیناً عبودیت کی ایک بہت بڑی رفعت ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾

''اور اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر حاوی ہے۔''

اس کا علم وقدرت، کمال ذات کے دونوں پہلو، اس حاوی ہونے میں مضمر ہیں۔ [1]

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

''اور آپ سے عورتوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ اللہ ان کے بارے میں تمہیں احکام بتلاتا ہے اور جو تم لوگوں کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے قانون الٰہی میں ان یتیم عورتوں کے بارے میں ہے جنہیں تم جو ان کا حق مقرر ہے، وہ تو دیتے نہیں اور یہ چاہتے ہو کہ ان سے نکاح کر لو اور بے بس و بے کس لڑکوں کے بارے میں اور یہ کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف برقرار رکھو اور جو بھلائی تم کرو گے تو اللہ اس سے یقیناً واقف ہوگا۔''

وما یتلیٰ علیکم فی الکتاب فی یتامی النسآء کے نحوی ترکیب کے لحاظ سے کئی پہلو ہو سکتے ہیں:۔

پہلی صورت یہ ہے کہ ''مایتلیٰ علیکم'' مبتدا ہے اور اس کی خبر ''فی الکتاب'' ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ''جو تم کو پڑھ کر سنایا جاتا ہے، یہ قانون الٰہی میں ہے، ان یتیم عورتوں کے بارے میں''۔ [2]

دوسرے یہ کہ مایتلیٰ علیکم فی الکتاب پورا مبتدا ہے اور اس کی خبر ہے ''فی یتامی النسآء'' اس صورت میں وہ مفہوم ہوگا جسے ہم نے کچھ زیادہ مناسب سمجھ کر ترجمہ اس کے مطابق کیا ہے ''جو تمہیں پڑھ کر سنایا جاتا ہے قانون الٰہی میں ان یتیم عورتوں کے بارے میں ہے'' اور بعض پہلے کے مترجمین نے بھی اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ [3]

ان دونوں صورتوں میں واؤ کے بعد مایتلیٰ علیکم جملہ مستانفہ ہے یعنی اس کا عطف ماقبل پر نہیں ہے بلکہ دونوں جز مستقل مبتدا و خبر ہیں۔

---

[1] ۔ محیطا علم و قدرۃ (جلالین)

[2] ۔ آن چہ خواندہ می شود بر شما در کتاب نازل شدہ است (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ جو حکم (مناہی کا) قرآن میں (پہلے) سنایا جا چکا ہے، وہ حقیقتاً ان یتیم لڑکوں کے واسطے تھا (فرمان علی صاحب)

تیسری صورت یہ ہے کہ یہ سابق میں جو اللہ یفتیکم فیھن کا فقرہ آیا ہے، اس میں ''اللہ'' کا لفظ پر عطف ہے یعنی ان کے بارے میں اللہ تمہیں حکم بتاتا ہے اور وہ آیات کتاب حکم بتاتے ہیں، جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں ان یتیم عورتوں کے بارے میں۔ [1]

چوتھے یہ کہ فیھن میں جو ضمیر ہے، اس پر عطف لیا جائے یعنی اللہ تمہیں حکم بتاتا ہے عورتوں کے بارے میں اور اس بارے میں جو کتاب میں سے تمہارے سامنے پیش ہوتا ہے۔ [2]

اس کے بعد یہ جو آیا ہے کہ: ترغبون ان تنکحوھن، اس میں ترغبون کی لفظ کے معنی میں بھی اختلاف ہو گیا ہے۔

چونکہ رغبت عربی میں لغات اضداد میں سے ہے رغب فیہ کے معنی ہیں ''اس کی طرف راغب ہوا'' اور رَغِبَ عَنْهُ کے معنی یہ ہیں کہ ''اس سے متنفر ہوا''..... یہاں ترغبون کے ساتھ نہ فی کا لفظ ہے، نہ عن کا۔ اس لئے ایک صورت میں معنی یہ ہیں کہ ''تم ان سے نکاح کی طرف راغب ہو [3] ہم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

دوسری صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ ''تم ان کا نکاح نہیں کرنا چاہتے'' [4] ایک شان نزول جو بیان کی گئی ہے، وہ اس کے موافق ہے۔ [5]

اس کے بعد جو ہے ''اور بے بس لڑکوں کے بارے میں'' اس کا محل عطف قریب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ''یتامی النسآء'' عطف ہو یعنی کتاب میں جو احکام تمہارے سامنے پیش ہوئے، یہ ان یتیم لڑکیوں کے بارے میں ہیں کہ ان سے یوں نکاح نہ کرو کہ ان کے مہر نہ دو اور کمزور لڑکوں کے بارے میں ہیں، اور وہ یہ کہ ان کے ساتھ انصاف سے کام لو۔

دوسرا مفہوم اس طرح کہا گیا ہے کہ یہ اس کے قبل جو یفتیکم فیھن آیا تھا کہ ''اللہ عورتوں کے بارے میں تمہیں فیصلہ سناتا ہے تو ان عورتوں کی ضمیر ''ہن'' پر عطف ہوئی ہے [6] یعنی ان عورتوں کے بارے میں فیصلہ سناتا ہے اور ان لڑکوں کے بارے میں۔

یہ اور اسی طرح اس کے پہلے: ''وما یتلیٰ علیکم کا عطف اگر فیھن کی ضمیر پر لیا جائے، یہ مثالیں ہونگی اس کی ضمیر مجرور پر جو فیھن میں ہے بغیر اعادۂ حرف جر عطف کیا گیا۔ اس بحث پر سورۃ البقرہ کی آیت ۲۱۷: (و کفر بہ والمسجد الحرام) کے ذیل میں مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔

اس طرح ''صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کے جملہ پر جو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ''علیہ'' کی ضمیر پر جو مجرور ہے بغیر اعادۂ حرف جو عطف نہ ہونا چاہئے لہٰذا اگر آل کا ذکر ہو بھی تو ''صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ'' کہنا درست ہوگا اور یہ بحث بھی ایک ایسی ہے جو بدنصیبی سے بہت سی غیر اہم

---

[1] ۔مایتلیٰ علیکم فی الکتاب القرآن من اٰیۃ المیراث یفتیکم ایضا (جلالین) یعنی ومایتلیٰ علیکم فی الکتاب ایضا یفتیکم فیھن (مجمع البیان)

[2] ۔قال قوم معناہ یفتیکم فیھن ومایتلیٰ علیکم (تبیان)

[3] ۔رغبت دارید کہ نکاح کنید با ایشان (شاہ ولی اللہ) رغبت کرتے ہو کہ نکاح کرو ان کو (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔ترغبون ایھا الاولیاء عن ان تنکحوھن (جلالین)

[5] فکان جابر یرغب عن نکاحھا ولا ینکحھا (تبیان)

[6] ۔قال لفواء یجوز ان یکون موضعہ جرا عطفا علی المضمر المجرور فی فیھن (مجمع البیان)

بحثوں کی طرح شیعہ سنی فرق کا ذریعہ بن گئی ہے، اس اعتراض کا ان قرآنی آیتوں سے جواب ہوتا ہے، پھر اگر اس اختلاف کی بنیاد اس نحوی دشواری پر ہوتی تو صریحی صلوات میں یہ فرق کیوں ہو گیا کہ شیعہ کہتے ہیں:۔ اللّٰھم علی محمد وعلیٰ اٰل محمد، اور سنی کہیں گے: اللّٰھم علی محمد وعلیٰ اٰل محمد..... یہاں تو ضمیر کا معاملہ نہیں تھا۔ رسولؐ کا صریحی نام موجود تھا، پھر لفظ علیٰ کے اعادہ کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ معلوم ہوا کہ وہاں بھی قاعدہ نحوی کا سہارا صرف بہانہ تھا جذبہ اختلاف کے اظہار کا اور اس کے علاوہ کوئی بنیاد نہ تھی۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾

''اور اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی طرف سے حق تلفی یا بے رخی محسوس کرے [1] تو ان دونوں کے لئے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ آپس میں کسی صورت سے صلح کر لیں اور صلح تو بڑی اچھی چیز ہے اور نفوس عموماً تنگ دلی پر آمادہ رہتے ہیں، اور اگر بھلائی کرو اور پرہیزگاری سے کام لو تو یقیناً اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔''

عام طور سے ''ناشزہ'' کا لفظ عورت کے لئے استعمال ہوتا ہے، جب وہ شوہر کی، جن باتوں میں اطاعت ضروری ہے، ان میں اطاعت نہ کرے مگر قرآن مجید نے یہاں یہ لفظ مرد کے لئے استعمال فرمایا ہے یعنی شوہر بھی ان حقوق کو ادا نہ کر کے جو شریعت نے اس پر عائد کیے ہیں مثلاً اگر نان ونفقہ ادا نہ کرے یا ازدواجی تقاضوں کے ماتحت جو عورت کے ساتھ اسے ربط رکھنا چاہئے، وہ ربط قائم نہ رکھے، تو ''ناشزہ'' ہوتا ہے۔ [2]

وہ دونوں صلح کر لیں، اس میں ''کوئی مضائقہ نہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ حتی الامکان انہیں صلح کر لینا چاہیئے اور حکم کے موقع پر یہ الفاظ کہ کوئی مضائقہ نہیں، ویسے ہی ہیں جیسے صفا و مروہ کے درمیان سعی کے لئے ارشاد ہوا: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (البقرۃ۔۱۵۸) اور قصر نماز کے بارے میں لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ (النساء۔۱۰۱) ''شح'' کو عموماً ''بخل'' کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے [3] جس کی بنا پر ہم نے اس کا ترجمہ ''تنگ دلی'' کا لفظ کے ساتھ کیا ہے مگر جناب شیخ طوسی نے ''شح'' کے معنی بیان کیے ہیں ''زیادتی ہوس'' [4] اور پھر تشریح جو کی ہے وہ ایک طرح کی فیاضی کے مقابل ہونے کا پتہ دیتی ہے کہ عورت تعلقات زوجیت قائم رکھنے کی خاطر اپنا کوئی حق مثلاً نان ونفقہ یا شب باشی کا حق چھوڑ دیتی ہے یا مرد ایسی عورت پر جسے وہ پسند نہیں کرتا، نان ونفقہ جاری رکھتا ہے۔ پھر ''شح'' اور ''بخل'' میں فرق یہ بیان کیا ہے کہ ''بخل'' مال کے ساتھ مخصوص ہے اور ''شح'' کسی اعزاز وغیرہ کے باقی رکھنے کی خواہش کو بھی کہتے ہیں۔

یہ تشریح الفاظ قرآنی کے لحاظ سے بعید معلوم نہیں ہوتی اور شاید ''تنگ دلی'' کا لفظ جو میں نے ترجمہ میں صرف کیا ہے، جناب شیخ علیہ

---

[1] ۔ای علمت وقیل ظنت (مجمع البیان)

[2] ۔نشوزا ترفعا علیها بترك مضاجعتها والتقصیر فی نفقتها (جلالین)

[3] ۔حاضر کردہ شدہ اند نفوس نزدیك بخل (شاہ ولی اللہ) اور حاضر کی گئیں جانیں بخیلی پر (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔الشح افراط فی الحرص علی الشئ (تبیان)

الرحمہ کے تصریحات کے لحاظ سے بھی غلط نہیں ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾

''اور تم ہرگز عورتوں کے درمیان پوری برابری قائم نہیں رکھ سکو گے، چاہے اس کے خواہش مند بھی ہو مگر پورا پورا انحراف تو نہ کرو کہ اسے گویا بیچوں بیچ میں لٹکا ہوا چھوڑ دو اور اگر صلح پسندی اور پرہیزگاری سے کام لو تو بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔ اور اگر دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنے خزانہ سے عطا کرے گا اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا ہے، ہر کام بالکل درست کرنے والا۔''

ایک عدل تو وہ ہے جو تعدد ازواج کی صورت میں لازمی شرط ہے جسے اس سورہ کی ابتدا میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ عدل ہے کچھ لازمی حقوق ازدواجی میں مثلاً راتوں کی تقسیم اور نان ونفقہ کی ادائیگی وغیرہ۔ یہ عدل واجب ہے جس کے بغیر کہا گیا ہے کہ تم کئی شادیاں کرو ہی نہیں بلکہ اگر ایسا عدل نہ کرنا ہو تو بس ایک شادی کرو، لیکن یہاں جو عدل ہے، وہ محبت میں یکسانی ہے۔ [1]

بعض مخالفین اسلام نے جو ان دونوں آیتوں میں تضاد ہونے کا اعتراض کیا تھا، اس کے جواب میں امام نے یہی تشریح فرمائی ہے جس کا ذکر ابھی آئے گا۔

بے شک محبت میں یکسانی ناممکن چیز ہے، اس لئے کہ انسان کا دل کسی ایک طرف زیادہ راغب ہوگا اور ایک طرف کم اور اس دل کے تقاضے کا اثر افعال سے ضرور نمودار ہوگا۔ اس لئے اسے کہا گیا ہے کہ تم ایسا ہرگز نہ کرسکو گے اور خالق کا یہ کہہ دینا کہ تم ایسا نہ کرسکو گے، خود اس کی دلیل ہے کہ یہ عدل واجب نہیں ہے۔ [2]

پھر اس کے بعد یہ کہ ''مگر بالکل تو انحراف نہ کرو اور اسے بیچوں بیچ میں لٹکاؤ تو نہیں''.....اس سے ظاہر ہے کہ اس عدل نہ ہو سکنے کے بعد بھی تعدد ازواج سے ممانعت نہیں کی گئی بلکہ یہ ہے کہ کلیۃً مساوات نہیں برت سکتے تو ایسا نہ ہونے پائے کہ ایک کو تکلیفیں پہنچاؤ اور اسے بیچ ادھڑ میں لٹکاؤ کہ وہ نہ تو اپنی نوعیت حیات کے لحاظ سے اپنے کو شوہردار محسوس کرے اور نہ وہ غیر شوہردار ہو کہ دوسرا عقد کر سکے۔ [3]

یہ اس امر کی دلیل واضح ہے کہ یہ وہ عدل نہیں ہے جو تعدد ازواج کی شرط لازمی ہے، اس لئے بعض لوگوں کا وہاں والی آیت کی عدل والی شرط کو اس آیت کے ساتھ ملانا کہ اللہ نے کہہ دیا ہے کہ تم عدل نہ کرسکو گے اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ تعدد ازواج اسلام میں جائز نہیں ہے، بالکل

---

[1] ۔تسووا بين النسآء فى المحبة (جلالين)

[2] ۔فان ذٰلك ليس اليكم ولا تملكونه فلا تكلفونه ولا تواخذون به (مجمع البيان)

[3] ۔كالمعلقة التى لا هى ايم ولا ذات بعل (جلالين) يعنى كالتى هى لا ذات زوج ولا ايم ... وهو المروى عن ابى جعفر وابى عبدالله عليهما السلام (تبيان)

غلط ہے۔

دونوں آیتوں میں خلط ملط سے غلط اندیشی صدر اسلام ہی میں پیدا ہوگئی تھی جسے ہمارے ائمہ علیہم السلام نے صاف کیا جس کا ذکر ہمارے مشہور قدیم ترین مفسر علی بن ابراہیم قمی کی تفسیر میں موجود ہے اور اسی سے علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے کہ ایک دہریہ نے ابوجعفر احوال (مومن الطاق) کے سامنے ان دونوں آیتوں کو پیش کر کے اعتراض کیا اور انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کیا۔ حضرت علیہ السلام نے فرمایا:

اما قوله: فان خفتم الا تعدلوا فانه عنى فى النفقة واما قوله: ولن تستطيعوا ان تعدلوا فانه عنى فى المودة فانه لا يقدر احد ان يعدل بين المرأتين فى المؤدة۔

پہلے جو ارشاد ہوا ہے کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ عدل نہ کرو گے، تو وہاں مراد عدالت برتنا ہے نان ونفقہ میں اور یہ جو ارشاد ہوا ہے کہ تم ہرگز عدالت نہ کر سکو گے، اس سے مراد یکسانی ہے محبت میں کہ کوئی شخص اس پر قدرت نہیں رکھتا کہ دو بیویوں میں محبت کے اعتبار سے مساوات قائم رکھے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿١٣١﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿١٣٢﴾

''اور اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور ہم نے ہدایت کی ہے انہیں کہ جن کو تمہارے پہلے کتاب دی گئی تھی اور تمہیں کہ اللہ کے غضب سے بچو اور اگر تم کفر اختیار کرو گے تو اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ بے نیاز ہے، تعریفوں کا حق دار۔ اور اللہ کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون کارساز ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ خدا تمہارے اسلام وایمان کا محتاج نہیں ہے۔ یہ خود تمہاری شرافت انسانی کا تقاضا ہے کہ تم اس کے سامنے سر تسلیم خم کرو اور اس کے احکام کی تعمیل کرو۔ ورنہ تم اگر کفر اختیار کرو تو اس سے خدا کا کچھ نہ بگڑے گا[1] وہ تو بے نیاز مطلق ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿١٣٣﴾

''اگر وہ چاہے تو تمہیں اے آدمیو! ختم کر دے اور دوسروں کو لے آئے اور اللہ اس پر بالکل قادر ہے۔''

---

[1] لا يضرہ كفرانكم وعصيانكم (مجمع البيان)

مطلب یہ ہے کہ سرتابی کر کے یہ آدمی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے بلکہ یہ اس کی حکیمانہ وحلیمانہ درگزر ہے کہ وہ ان کے ان معاصی کے باوجود انہیں باقی رکھتا ہے۔ ورنہ وہ چاہے تو ان کو ایک دم نیست ونابود کر دے۔ [1]

ایک دوسری خلق کو وجود میں لے آئے جو اس کی اطاعت کریں اور اس کے احکام سے سرتابی نہ کریں۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝۱۳۴

''جو دنیاوی صلہ کا طلب گار ہو تو اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں ہی کا صلہ ہے اور اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا۔''

اس سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ آخر بہت سے کافروں اور اللہ کے نافرمان بندوں کو اس دنیا کی نعمتیں کیوں بہت زیادہ ملی ہوئی ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ آخرت کا تصور ہی نہیں رکھتے لہٰذا ان کو جو کچھ ملنا تھا، اس دنیا میں مل گیا ہے، اب آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے لیکن اہل ایمان کا نصب العین ہی دنیا سے زیادہ آخرت ہے لہٰذا دنیاوی زندگی ان کی اگر تکالیف میں بسر ہو تو انہیں اس کا غم نہیں ہونا چاہئے، جب کہ آخرت کی منزل میں جو ان کا اصل نصب العین ہے، انہیں کامیابی نصیب ہو۔

اس کے لئے جو دنیاوی صلہ کا طلب گار ہو یعنی آخرت کا اعتقاد نہیں رکھتا، یہ جو کہا گیا کہ اللہ کے پاس دنیا وآخرت دونوں کا صلہ ہے۔ اس میں دنیا کا صلہ تو اس کی مراد کے مطابق یہ دولت یا شہرت یا سلطنت ہے جو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور آخرت کے صلہ سے مراد وہاں کا عذاب ہے جسے لفظ ثواب سے طنز کے طور پر تعبیر کیا گیا ہے۔ [2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۱۳۵

''اے ایمان والو! تمہیں انصاف پر استقلال کے ساتھ قائم رہنا چاہئے [3] اللہ کا گواہ ہوتے ہوئے، خواہ خود اپنے خلاف ہو یا ماں باپ اور عزیز اقارب کے۔ وہ چاہے مالدار ہو اور چاہے تنگدست، بہرحال اللہ ان دونوں کا زیادہ

---

[1] ۔یہلککم (مجمع البیان)

[2] ۔اما ثوابہ فی الاٰخرۃ فنار جھنم

[3] ۔ای دائمین علی القیام بالعدل (مجمع البیان) متعھد انصاف باشید (شاہ ولی اللہ) قائم رہنے والے ساتھ انصاف کے (شاہ رفیع الدین)

بہی خواہ ہے [1] لہٰذا انصاف کے موقع پر نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو اور اگر تم نے حقیقت کو بدلا یا چشم پوشی کی [2] تو یقیناً اللہ جو کچھ تم کرو گے، اس سے باخبر ہے۔''

اپنے اور پرائے ہر ایک کے معاملہ میں عدل وانصاف قائم رکھنے کا مطالبہ

''اللہ کا گواہ'' یعنی حقیقت کا ترجمان اور اظہار حق کرنے والا [3] مطلب یہ ہے کہ انصاف اور اظہار حق میں اپنے اور بے گانہ کی تفریق نہ ہونا چاہئے۔

معصوم نے فرمایا کہ یہ ایک مومن کا دوسرے مومن پر ایک واجب الادا حق ہے۔ [4]

اس کے علاوہ امیر اور غریب کا امتیاز بھی نہ ہونا چاہئے اور خود اپنے خلاف گواہی یعنی ایسے حق کا اقرار جو اپنے اوپر عائد ہوتا ہو۔ [5]

''اللہ ان دونوں کا زیادہ بہی خواہ ہے'' یعنی تم اسے بہی خواہ سمجھتے ہو کہ تم غلط طور پر اس کی طرف داری کرو، حالانکہ حقیقت میں یہ بہی خواہی نہیں ہے۔ خدا تم سے زیادہ ان کا بہی خواہ ہے مگر وہ اسے پسند نہیں کرتا کہ تم جھوٹی گواہی دے کر انہیں فائدہ پہنچانے کی کوشش کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۳۶

''اے ایمان لانے والو! ایمان لاؤ اللہ اور اس کے پیغمبر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے پیغمبر پر اتاری ہے اور اس کتاب پر جو پہلے اس نے اتاری تھی اور جو انکار کرے اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کی پیغمبروں اور روز آخرت کا وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہوا۔''

ایمان لانے والوں کو دعوت ایمان

پہلے تخاطب فرمایا ہے ''اے ایمان لانے والو!'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایمان لا چکے ہیں، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ''ایمان لاؤ'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی ایمان نہیں لائے ہیں تو اس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ شروع میں تو ''ایمان اجمالی'' تھا۔ حقانیت اسلام کا احساس

---

[1] ۔انظر لهما من سائر الناس (مجمع) اولیٰ بهما منکم واعلم بمصالحهما (جلالین) خدا مہربان تر است بر ایشاں (ولی اللہ)

[2] ۔قال مجاهد معنی "تلووا" تبدلوا الشهادة وتعرضوا ای تکتموها وهو قول ابی جعفر علیہ السلام (تبیان)

[3] ۔اظہار حق کنندگان برائے خدا (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔قال ابو عبداللہ علیہ السلام ان للمؤمن علی المومن سبع حقوق فاوجبها ان یقول الرجل حقا وان کان علی نفسه او علی والدیه فلا یمیل لهم عن الحق (علی بن ابراهیم)

[5] ۔بان یکون علیه حق لغیره فیقر له ولا یجحده (تبیان)

ہوا، خواہ معجزہ کو دیکھ کر، خواہ رسولؐ کی سیرت کا مطالعہ کر کے، خواہ گزشتہ انبیاء کی بشارتوں کی بنا پر۔ اس لئے رسولؐ کی خدمت میں آ کر کہا: اشهد ان لا اله الا الله و اشهد انّك رسول الله، یہ تو بالا جمال ایمان ہوا جس سے احکام اسلام اس شخص پر مرتب ہو گئے۔ اس کے بعد ان کو ''ایمان'' مفصل کی تعلیم دی جا رہی ہے کہ تمہیں ان باتوں کو ماننا پڑے گا۔ [1]

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اور یہ زیادہ واضح ہے کہ تخاطب سے کہ ''ایمان لانے والو!'' ظاہری مسلمان مراد ہیں اور انہیں دعوت جو دی جا رہی ہے، وہ اس کی ہے کہ وہ دل سے ان باتوں کو مان لیں تا کہ حقیقی معنی میں مومن ہو جائیں۔ [2]

اب بعد میں جو ہے کہ: من یکفر بالله تو اس سے مراد وہ ہوں گے جو باوجود اقرار اسلام کے ان باتوں کو دل سے نہ مانیں۔ انہیں کا نام ''منافق'' ہوتا ہے۔

جس طرح پہلی صورت میں بھی اگر انہوں نے ''ایمان مجمل'' اختیار کیا تھا مگر اس ''ایمان مفصل'' کو قبول نہیں کیا تو وہ منافق ہی رہیں گے۔

شاہ عبدالقادر دہلوی لکھتے ہیں:

''ایمان والے'' فرمایا ہے ان کو جو ظاہر میں مسلمان ہیں، سو ان کو تقید ہے کہ جب تک دل سے یقین نہ لائیں گے ان سب چیزوں کا تو خدا کے یہاں مسلمان نہیں۔''

اور بعد والے فقرہ کی تشریح میں لکھا ہے:

''یعنی ظاہر مسلمان ہے اور دل سے بہکے تو اگر آخر کو بے یقین مرے تو کافر کے برابر ہیں، ان کی بخشش نہیں اور ظاہر کی مسلمانی سے وہاں راہ نہ ملے گی'' (موضح القرآن)

آخری فقرہ کے حاشیہ میں ان کے والد شاہ ولی اللہ نے بھی لکھا ہے:۔

''از ایں جا وعید منافقان بیان می فرماید''۔

کاش علمائے جمہور اس کو سامنے رکھتے تو ''صحابیت رسولؐ'' کو ''رفعت درجات'' کی ضمانت نہ سمجھتے، اور بایهم اقتدایتم اهتدیتم ''ان میں سے جس کی پیروری کر لو، راہ راست حاصل ہو جائے'' کی روایت کو یا تو وضعی و اختراعی سمجھتے یا اسے مخصوص سمجھتے ان افراد کے ساتھ جن کی خوبی انجام پر حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نصوص نے مہر تصدیق ثبت کر دی تھی اور ان کے حسن کردار کی آیہ تطہیر نے ضمانت کر لی تھی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ

---

[1] ۔ مراد آنست که هر که در ملت اسلامیه داخل شد ادرا به تفصیل تصدیق این چیزها باید کرد (شاه ولی الله)

[2] ۔ المعتمد علیه عندنا واللائق بمذهبنا ان المعنی یا ایها الذین اٰمنوا فی الظاهر بالاقرار بالله ورسوله صدقوهما اٰمنوا بالله ورسوله فی الباطن لیطابق باطنکم ظاهرکم (تبیان) یعنی یا ایها الذین اقروا صدقوا (علی بن ابراهیم)

اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾

''بلاشبہ وہ جو ایمان لائے، پھر کفر اختیار کیا، پھر کفر میں اپنے اور اضافہ کر دیا، اللہ ان کو بخشنے کا نہیں ہے اور نہ انہیں منزل تک پہنچانے کا ہے۔''

یہ لوگ جو ہمیشہ ایمان اور کفر کے دو عملے میں رہے، پھر انجام کار کفر میں شدت ہی اختیار کرتے گئے، بظاہر منافقین ہی ہیں جن کا ذکر پہلے ہی شروع ہو چکا ہے اور اس کے بعد بھی پارہ کے آخر تک انہی کا ذکر رہے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان لائے یعنی زبان سے اقرار ایمان کیا۔ پھر کفر اختیار کیا یعنی دل سے کافر رہے۔ پھر درمیان میں کبھی رسولؐ کے اخلاص اور حقانیت کا دل پر اثر پڑا تو ایمان کی طرف جھکے اور پھر کیش دیرینہ سے محبت یا پہلے زمانہ کے دوست احباب نے ورغلایا تو پھر کافر کے کافر ہی رہ گئے بلکہ اور شدت اختیار کر لی۔

یہ حضرات منافقین ہیں جو رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ انہیں کہہ دیا گیا ہے کہ ''اللہ کبھی انہیں بخشنے نہیں۔''

یہ بھی اس بحث کا ایک شاہد ہے جو پہلے اس آیت کے ذیل میں ہو چکی ہے کہ: ان اللہ لا یغفر ان یشرك به یعنی اللہ شرک کو نہیں بخشتا۔ یہ حکم ایمان حقیقی کے مقابلہ میں ہر قسم کے کفر کو شامل ہے جس میں نفاق بھی داخل ہے۔ اس کی بھی مغفرت نہیں ہے۔

لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کو لے جا کر یہود سے متعلق قرار دیا ہے اور اس طرح کہ ''ایمان لائے'' یعنی موسیٰؑ پر ''پھر کفر اختیار کیا'' گوسالہ پرستی کر کے ''پھر ایمان لائے'' یعنی گوسالہ پرستی سے توبہ کی ''پھر کفر کیا'' یعنی عیسیٰؑ پر ایمان نہ لائے ''پھر کفر میں اضافہ کیا'' حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ پر ایمان نہ لا کر، انہیں کہا جا رہا ہے کہ ان کی مغفرت نہیں ہے (جلالین)

مگر یہ تفسیر سیاق و سباق کے خلاف ہونے کے علاوہ الفاظ آیت سے ذہن میں بالکل نہیں آتی، بلکہ یہ اس طرح کی تشریح ہے جیسے کسی پہیلی کو بوجھا جاتا ہے۔

اس کے برخلاف پہلی تفسیر ذہن سے قریب تر ہے لہٰذا اسی کو صحیح سمجھنا زیادہ مناسب ہے۔ [1]

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ ۚ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا ۙ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ

---

[1] ۔ قال مجاهد وابن زيد يعني بذلك اهل النفاق ... واقوىٰ الاقوال عندنا قول مجاهد (تبیان)

كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾

''مژدہ سنایئے منافقوں کو کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے، وہ جو اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا حوالی موالی بناتے ہیں، کیا یہ ان کے پاس عزت کے طلب گار ہیں؟ عزت تو تمام وکمال اللہ کے اختیار میں ہے اور اس نے تم پر قرآن میں یہ اتار دیا ہے کہ جب سنو آیات الٰہی کو کہ ان کا انکار ہو رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو، جب تک کہ وہ کسی اور گفتگو میں مصروف نہ ہو جائیں۔ ورنہ تم انہی کے ایسے قرار پاؤ گے۔ بلاشبہ اللہ تمام منافقوں اور کافروں کو دوزخ میں اکٹھا کر دے گا۔ وہ جو تمہارے ساتھ موقع پر نظر رکھتے ہیں [1] تو اگر تمہیں اللہ کی طرف سے فتح ہوگئی تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کچھ کامیابی ہوگئی تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تم پر قابو نہ رکھتے تھے اور (پھر بھی) ہم نے مسلمانوں سے تمہاری حفاظت نہیں کی۔ اب اللہ ہی تمہارے درمیان روز قیامت فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز کافروں کو مسلمان پر دسترس قرار نہیں دے گا۔''

منافقین کے کردار کی رنگارنگی اور ان کے عذاب کی شدت

''بشارت'' یعنی مژدہ اور خوش خبری خوش آئند اطلاع کو کہتے ہیں۔ خوفناک خبر کو ''انذار'' کہتے ہیں۔ یہ قرآن کی ایک طنزیہ تعبیر ہے کہ اس نے ''عذاب دردناک'' کی اطلاع کو انذار کے بجائے بشارت کے لفظ سے یاد کیا ہے اور یہاں اس ''طنزیہ'' میں نکتہ بلاغت یہ ہے کہ منافقین بظاہر ''مومنین'' کی حمایت میں داخل تھے جنہیں رسولؐ کا کام بشارت ہی دینا ہے لہٰذا انہیں اپنے مظاہرۂ ایمان کے زعم کی بنا پر کسی بشارت ہی کا متوقع ہونا چاہئے تو اب اس کے بجائے انہیں نفاق کی پاداش میں جو بشارت کے بجائے انذار کیا جا رہا ہے تو اسے لطافت اسلوب کلام اور حکیمانہ ظرافت سے بشارت ہی کے نام سے یاد کیا جا رہا ہے۔

نزل علیکم فی الکتاب ''تم پر قرآن میں یہ اتار دیا ہے'' کیا؟ یہ کہ ''جب آیات الٰہی کے ساتھ کفر اور تمسخر ہو رہا ہے تو اس محفل میں نہ بیٹھو''..... یہ تلاش کرنے پر قرآن میں سورۂ انعام میں ملتا ہے [2] جو اس کے بعد ہے۔

یہ منجملہ اور شواہد کے ایک نمایاں شاہد ہے اس کا کہ ترتیب قرآن موافق تنزیل نہیں ہے۔

آخر میں جو بیان کیا گیا ہے، وہ دورخے آدمیوں کا وہ کردار ہے جو ہمیشہ ہی نظر آتا رہتا ہے، ادھر جائیں گے، ادھر کی سی کہیں گے اور

---

[1] ۔ای ینتظرون بھم (تبیان)

[2] ۔فی الکتاب القرآن فی سورۃ انعام (جلالین) التنزل فی کتابہ تعالے: واذا رأیت الذین یخرضون فی اٰیتنا فاعرض حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ (تبیان)

ادھر آئیں گے، ادھر کی سہی۔

''اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ'' کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ ''کیا ہم تم پر قابو نہ رکھتے تھے اور (پھر بھی) ہم نے مسلمانوں سے تمہاری حفاظت کی'' یہ ایک تفسیر کے مطابق ہے [1] جو ہمارے نزدیک ترجیح رکھتی ہے۔

دوسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ ''کیا ہم تم پر غالب نہیں آئے'' یعنی تمہارا ساتھ دے کر تمہاری رائے کو نہیں بدلا اور مسلمانوں کی طرف جانے سے روکا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارا ساتھ نہ دیتے تو تم مسلمانوں کے دباؤ میں آکر مسلمان ہو گئے ہوتے۔ [2]

''اللہ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا'' یہاں ''تمہارے'' سے مراد ہے ''تمہارے اور ان کے درمیان''..... چونکہ وہ بھی مسلمانوں کی جماعت میں بظاہر شامل تھے۔ اس لئے ''تمہارے'' کے لفظ کو دونوں پر حاوی کر دیا گیا۔ ہاں روز قیامت جب فیصلہ ہوگا تو پھر وہ الگ ہوں گے اور یہ الگ۔ [3]

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

''بلاشبہ منافق لوگ اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ خود انہیں دھوکے میں رکھ رہا ہے اور جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو اکساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر تھوڑا سا۔ وہ بیچوں بیچ میں ڈانواڈول ہیں [4] نہ ان کی طرف اور نہ ان کی طرف جسے اللہ بھٹکنے دے، اس کے لئے تم کوئی راستہ نکال نہیں سکتے۔''

خدا کی طرف دھوکا دینے کی نسبت جوابی طور پر ویسی ہی ہے جیسے پہلے پارے میں مذاق اڑانے کی نسبت یا دوسری جگہ ''مکر'' کی نسبت۔ چونکہ اپنے طرز عمل کی بدولت دھوکا یہ خود کھاتے ہیں، اس طرح کی دنیا میں تو ان پر احکام اسلام جاری ہو جاتے ہیں جس سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے خدا و رسولؐ کو (معاذ اللہ) بے وقوف بنا لیا، مگر جب آخرت میں وہ کافروں کے زمرہ میں محشور ہوں گے بلکہ کافروں سے زیادہ عذاب انہیں ہوگا، جیسا کہ اس کے بعد کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے، تب معلوم ہوگا کہ حقیقت میں دھوکا کس نے کھایا اور بے وقوف کون بنا؟!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ

---

[1] ۔الم نستحوذ علیکم ونقدر علیٰ اخذکم وقتلکم فابقینا علیکم (جلالین)

[2] ۔الم نغلبکم رأیکم بالموالاۃ لکم ونمنعکم من الدخول فی زمرۃ المؤمنین (مجمع البیان)

[3] ۔یحکم بینکم وبینہم یوم القیٰمۃ بأن یدخلکم الجنۃ ویدخلہم النار (جلالین)

[4] ۔متردین بین ذٰلک الکفر والایمان (جلالین) واصل التذبذب التحرک والاضطراب (تبیان)

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾

''اے ایمان لانے والو! اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو حوالی موالی نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کی طرف سے تم اپنے خلاف کھلا ہوا الزام عائد کرلو۔''

یعنی تم نے اگر کافروں سے تعلقات قائم رکھے تو یہ تمہارے نفاق کا ثبوت ہوگا جس کے بعد یہ نمایاں ہوجائے گا کہ تم ان سزاؤں کا جو منافقین کی بتائی جارہی ہیں، پورے طور پر استحقاق رکھتے ہو۔ [1]

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾

''بلاشبہ منافق لوگ آتش جہنم کے سب سے نیچے والے طبقہ میں ہوں گے اور ہرگز تم ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ سوا ان کے جنہوں نے توبہ کرلی اور اعمال درست کرلئے اور اللہ سے وابستہ ہوگئے اور اللہ کی اطاعت خلوص کے ساتھ کرنے لگے تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے اور اہل ایمان کو اللہ بہت بڑا اجر وثواب عطا فرمائے گا۔''

نفاق سے توبہ کی صورت میں انجام بخیر

یعنی نفاق کا جو انجام بد بیان ہوا ہے، وہ اس وقت ہے کہ جب آخر تک قائم و برقرار رہے لیکن جس طرح کافر اگر مسلمان ہوجائے تو اس کا پہلے والا کفر نظر انداز ہوجائے گا، اسی طرح منافق اگر سچا مومن ہوجائے اب مومنین کے زمرہ میں داخل ہوجائے گا اور یہ نہ دیکھا جائے گا کہ وہ پہلے کیسا تھا۔ [2]

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

''اللہ تمہیں عذاب کرکے کیا کرے گا! اگر تم شکرگزار رہو اور ایمان اختیار کرو اور اللہ قدردان ہے، بڑا جاننے والا۔''

یعنی تم اپنے عقائد و اعمال کی بدولت عذاب کے مستحق ہوتے ہو، ورنہ خدا کا عذاب کرنے سے کوئی فائدہ تھوڑی ہی ہے۔ وہ بے نیاز

---

[1] ۔سلطانا مبینا برھانا بینا علی نفاقکم (جلالین) ثابت کنید برائے خدا بر خویشتن الزام ظاھر (ولی اللہ) کردو واسطے اللہ کے اوپر اپنے غلبہ ظاہر (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔فاستثنیٰ منھم التائبین عن نفاقھم (تبیان)

مطلق ہے [1] اور جذبات سے بھی بری ہے اسے معاذ اللہ کوئی دل کی بھڑاس نکالنا نہیں ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾

''اللہ برملا بدگوئی کو پسند نہیں کرتا، سوا اس کے جس پر ظلم ہوا ہو۔ اور اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔''

مظلوم کے لئے ظلم کو برا کہنے کا حق

''برملا بدگوئی'' یعنی بددعا یا غیبت جس کے معنی ہیں کسی کے عیوب کو ظاہر کرنا، یہ ناجائز ہے اور اللہ کو ناپسند ہے لیکن اس سے استثناء یہ ہے کہ جس پر ظلم ہوا ہو وہ مظلوم اپنا درد دل سنائے تو اس پر پابندی نہیں ہے، کیوں کہ اس کی زبان بندی اس کی فطرت کے ساتھ ناانصافی ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ بس اس ظلم کا اظہار کرے۔ یہ نہیں ہے کہ اب جذبہ مخالفت میں اس کی دوسری برائیاں بھی طشت از بام کرنے لگے۔

ہاں ظلم میں کوئی قید نہیں کہ کس درجہ کا ہو۔ یہاں تک کہ ایک روایت میں یہ ہے کہ اگر میزبان نے کسی مہمان کی خاطر داری میں، جتنی ہونا چاہئے، کمی کی ہے تو یہ اس مہمان پر ظلم ہے لہٰذا اس کو اس بدسلوکی کا تذکرہ کرنا درست ہے۔ [2]

اور ایک حدیث میں ظلم کی ایک ایسی قسم کا بیان ہے جسے ظلم محسوس کرنا بڑی بلند نظری کی بات ہے اور وہ یہ کہ کوئی تمہاری تعریفیں ایسی کرے جو غلط ہیں تو یہ بھی تم پر ظلم ہے لہٰذا تم کو اس کی رد کرنا چاہئے اور کہنا چاہئے کہ تم غلط بیان کر رہے ہو اور دوسروں کو بتانا چاہیے کہ یہ ان کا بیان بالکل غلط ہے۔ [3]

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

''اگر کسی نیکی کو ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ یا کسی برائی سے درگزر کرو تو بلاشبہ اللہ معاف کرنے والا ہے، بڑا قدرت رکھنے والا۔''

''نیکی کو ظاہر کرو یا نہ کرو'' یعنی جس نے تمہارے ساتھ نیکی کی، اس کا چاہے تم اعلان کرو یا نہ کرو۔ یہ ایک تفسیر ہے [4] اور دوسرے معنی یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ تم جو نیکی کرو۔ [5]

میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ کیوں نہ ہم ان دونوں پہلوؤں کو سمو لیں۔ ''اگر تم نیکی کو ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ یا برائی کو معاف کرو''..... یہ سب ہی کے کردار کے روشن پہلو معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ''ظاہر کرو نیکی کو'' یعنی جو دوسرے نے تمہارے ساتھ کیا ہے یا چھپاؤ یعنی جو تم نے

---

[1] ۔لا یجتلب بعذابکم نفعا ولا یدفع عن نفسه ضررا لانهما مستحیلان علیه (تبیان)

[2] ۔روی عن ابی عبداللہ انه قال هو الضیف ینزل بالتوجل فلا یحسن ضیافة جاز ان یقول ذٰلك فیه (تبیان)

[3] ۔فی حدیث اٰخر فی تفسیر هٰذا قال: ان جآء ك رجل فقال فیك مالیس فیك من الخیر والثناء والعمل الصالح فلا تقبله منه و کذبه فقد ظلمك (علی بن ابراهیم)

[4] ۔لمن احسن الیکم شکر اله علی انعامه (مجمع البیان)

[5] ۔اگر کھلم کھلا نیکی کرتے ہو یا چھپا کر (مولانا فرمان علی صاحب)

دوسرے کے ساتھ نیکی کی ہو، یا دوسرے کی برائی کو معاف کرو، تو یہ سب بہت اچھا ہے، کیوں کہ اللہ قدرت کے باوجود معاف کرتا ہے تو تم بھی دوسرے کی برائی کے اظہار کا حق رکھتے ہوئے جو پہلی آیت میں دیا گیا ہے، اگر برائی کا اظہار نہ کرو اور معاف کر دو تو بہت اچھا ہے۔ [1]

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾

''بلاشبہ وہ جو اللہ اور اس کے پیغمبر کا انکار کرتے ہیں اور ''اللہ اور اس کے پیغمبروں میں تفریق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کچھ پر ایمان لاتے ہیں اور کچھ کا انکار کرتے ہیں اور اس کے بیچ میں ایک راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، یہ ہیں حقیقت میں کافر لوگ، اور ہم نے کافروں کے لئے توہین آمیز سزا مہیا کر رکھی ہے۔''

یہ یہود کا تذکرہ ہے کیوں کہ یہود اپنے کو خدا پرست کہتے تھے مگر انبیاء میں حضرت موسیٰؑ کو مانتے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ قرآن مجید نے ان کے بارے میں ارشاد کیا ہے کہ یہ ان کا اللہ کو ماننا انہیں مومنین کی صف میں کھڑا نہیں کر سکتا جب کہ یہ پیغمبروں کو نہیں مانتے تو ان کا خدا پرستی کا اظہار بھی بے کار ہے اور یہ حقیقی معنی میں خاص الخاص کافرین کے لقب سے ملقب ہونے کے لائق و سزاوار ہیں۔

انکار رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مثل انکار خدا کے موجب کفر

اب نصاریٰ بھی اس حکم میں ہیں، اس لئے کہ وہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں مگر آخری رسول حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے لہٰذا تفریق بین اللہ والرسل کے جرم کے وہ بھی مرتب ہیں۔

اس سے اس دور کے ان اشخاص کے خیال کا قطعی جواب ہو جاتا ہے جو بعض جماعتوں یا بعض اشخاص کے یہاں خدا کے وجود یا اس کی وحدت کے اقرار کو دکھلا کر کہتے ہیں کہ وہ کافر کہاں رہے؟ وہ تو خدا کو مانتے ہیں۔

اس کے جواب میں قرآن کی صاف آواز ہے کہ بغیر رسالت کی تصدیق کے صرف وحدانیت کا اقرار کسی کو بھی کفر کے دائرہ سے نکال کر ایمان کے حلقہ میں داخل نہیں کر سکتا۔

ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول ضروری چیز ہے اور منکر رسولؐ اسی طرح کافر ہے جس طرح منکر خدا کافر ہوتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾

---

[1] ۔فلا تجهروا له بالسوء من القول الذی اذنت لکم ان تجهروا به (مجمع البیان)

''اور وہ جو اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کی، یہ وہ ہوں گے جنہیں وہ ان کے اجر وثواب عطا کرے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے، بہت مہربان۔''

یہ سب پر ایمان لانے والے مسلمان ہیں، جن کی شان یہ ہے کہ: یومنون بما انزل الیك وما انزل من قبلك ''جو آپ پر اترا ہے، اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور جو آپ کے پہلے اترا تھا، اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔''

''انہیں ان کا اجر عطا ہوگا''۔ یعنی اب جیسے جس کے اعمال ہوں، ان کے اعمال کے اعتبار سے آخرت میں جزاء عطا ہوگی۔

اس سے پہلی حقیقت یہ نمایاں ہے کہ نجات کے لئے اسلام لازم ہے۔ یعنی انبیاء الٰہی میں کسی ایک کو بھی جو نہ مانتا ہو، وہ نجات کا مستحق نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ اعمال کا اجر اسلام کے ساتھ مشروط ہے لہٰذا جب تک عقائد درست نہ ہوں، حسن عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ اسلام وایمان کے بعد جزاء جو ملتی ہے، وہ بمناسبت اعمال ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ مسلمان بلا لحاظ اعمال بلند درجات کا حق دار ہو جائے۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿١٥٣﴾

''آپ سے اہل کتاب یہ فرمائش کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے لکھی لکھائی کتاب اتاریں۔ انہوں نے موسیٰؑ سے تو اس سے بھی بڑی چیز کی فرمائش کی تھی اور کہا تھا کہ ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھلا دیجئے تو ان پر ان کی اس زیادتی کی وجہ سے بجلی گری، پھر انہوں نے بعد اس کے کہ کھلی ہوئی نشانیاں ان کے پاس آئیں، گوسالہ تیار کیا تو ہم نے اس سے درگزر کیا اور موسیٰؑ کو ہم نے نمایاں غلبہ عطا کیا۔''

توریت مکتوبی صورت سے نازل ہوئی تھی مگر قرآن لوح محفوظ میں لکھا ہوا موجود ہوتے ہوئے رسولؐ پر رفتہ رفتہ اترا غیر مکتوبی شکل میں۔ کتاب اس کے بعد ہوئی۔ اسے یہود نے ایمان سے انحراف کا ایک بہانہ بنایا کہ اللہ کی کتاب ہے تو وہ لکھی ہوئی شکل میں کیوں نہ اتری۔[1]

قرآن نے ان کے ماضی کی تاریخ یاد دلاتے ہوئے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ توریت تو لکھی ہوئی شکل میں اتری تھی، اس پر یہ سب کب ایمان لائے اور کب عقیدہ حق پر ثابت قدم رہے جواب یقین کیا جائے کہ ان کی فرمائش پوری ہو جائے تو یہ ایمان اختیار کریں گے۔

---

[1] ۔جملة واحدة كما انزل على موسى (جلالين) كتابى از آسمان يعنى ايك دفعه (شاه ولى الله)

رہ گیا فرمائش کرنا تو ان کی فرمائشیں تو اتنی غیر معقول ہوا کرتی ہیں کہ اس کے پہلے اللہ کے دیدار کی فرمائش کر چکے ہیں۔ پھر ان کی اس فرمائش کا کیا وزن سمجھا جائے۔

بعض نے کہا ہے، ان کی فرمائش یہ تھی کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی کتاب خاص ان کے لئے اترے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ وہ چاہتے تھے، ان کے اکابر کے پاس پیغمبر پر ایمان لانے کے لئے خطوب اللہ کی طرف سے آئیں۔ [1]

آخر میں جو ہے کہ ''موسیٰؑ کہ ہم نے نمایاں غلبہ عطا کیا'' اس غلبہ سے قہر وغلبہ والا دنیاوی اقتدار مراد نہیں ہے بلکہ یہ حقانیت اور دلائل کے لحاظ سے غلبہ ہے جو ہمیشہ باطل کے مقابلہ میں حق کے لئے ہوتا ہے۔ [2]

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾

''اور ہم نے کوہ طور کو اونچا کیا ان سے عہد لینے کے لئے اور ہم نے ان سے کہا کہ دروازہ میں سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور ان سے ہم نے کہا کہ ہفتہ کے دن کے بارے میں قانون الٰہی سے تجاوز نہ کرو اور ان سے ہم نے مضبوط عہد لیا۔''

اس میں حسب ذیل امور کا تذکرہ ہے جو پہلے بیان ہو چکے ہیں: ایک طور کا ان پر بلند ہونا۔ اس کے متعلق ہم وہاں لکھ چکے ہیں کہ اس کی پوری نوعیت تو قرآن مجید سے ظاہر نہیں ہوتی کہ طور کس طرح بلند ہوا تھا مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی عظیم مظاہرہ قدرت تھا۔

دوسرے دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونے کا حکم۔ اس کا ذکر پہلے دو جگہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے کہ ان سے اس موقع پر کہا گیا تھا کہ حطۃ کہو اور انہوں نے بدل کر دوسرا لفظ کہہ دیا۔ اس کی تشریح وہاں بقدر امکان کی گئی ہے۔

تیسرے سبت یعنی ہفتہ کے دن کے متعلق پابندی، اس کا بیان بھی پہلے ہو چکا ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾

''تو ان کے اپنے عہد کو توڑنے اور آیات الٰہی کے ساتھ ان کے کفر اختیار کرنے اور پیغمبروں کو ناحق ان کے قتل کرنے اور ان کے اس قول کی وجہ سے کہ ہمارے دلوں پر تو غلاف چڑھے ہوئے ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے

---

[1] ۔ذکر ذالك ابن حزم واختارہ الطبری (تبیان)

[2] ۔ای حجۃ ظاھرۃ تبین عن صدقہ (مجمع البیان)

سبب سے مہر کر دی ہے تو وہ ایمان نہیں رکھتے مگر بہت کم۔''

یہاں سے یہود کے خلاف ''فرد قرار داد جرم'' شروع ہوا ہے۔ اس سبب سے اور اس سبب سے۔ یہ ابھی تشنہ تکمیل جملہ ہے کہ اس سب کے سبب سے کیا ہوا؟ مگر اس کے لئے جلدی نہیں کرنا چاہئے۔ یہ اس کے بعد کی آیت میں بھی نہیں ہے اور پھر اس کے بعد کی آیت میں بھی بلکہ کافی دیر کے بعد آئے گا کہ اس سب کے سبب سے ان کے لئے کیا ہوا؟

اب اس آیت میں ان امور میں سے جو انہوں نے کیے ہیں جن باتوں کا ذکر ہے، وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) عہد شکنی۔ یہ وہ عہد بھی ہے جو بمقتضائے عبودیت الٰہی ہر انسان کے ذمہ واجب الادا ہے اور وہ بھی جو انہوں نے اپنے دور کے پیغمبر پر ایمان لا کر اطاعت کا معاہدہ کیا ہے۔

(۲) آیات الٰہی کے ساتھ کفر۔ ان آیات سے مراد قدرت الٰہی کی نشانیاں اور حقانیت پیغمبر کے دلائل ہیں[۱] کیوں کہ یہ واقعہ ہے کہ بنی اسرائیل کے سامنے بکثرت مظاہر قدرت پیش ہوئے جو معجزات کی حیثیت رکھتے تھے مگر ان میں کے بہت سے پھر بھی راہ راست سے منحرف ہو جاتے تھے اور تسلیم نہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آیات سے کتاب الٰہی یعنی توریت کے مندرجہ جات بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

(۳) پیغمبروں کا ناحق قتل کرنا۔ ظاہر ہے کہ پیغمبروں کو جو قتل کیا جائے گا، وہ ناحق ہی ہوگا لہٰذا یہ قید کسی خصوصیت کے اظہار کے لئے نہیں ہے بلکہ اس قتل کے جرم ہونے کا سبب ظاہر کرنے کے لئے ہے یہ قتل ہمیشہ خون ناحق ہی ہوتا ہے۔

ہاں یہ ظاہر ہے کہ اس گروہ نے جو اس وقت محل تخاطب ہے، انبیاء کو قتل نہیں کیا تھا مگر چونکہ یہ نقطہ خیال میں ان قاتلوں سے متحد ہیں، اس لئے ان کی طرف سے اس جرم کے ارتکاب کی نسبت دی جا رہی ہے۔[۲]

(۴) ان کا یہ کہنا کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں یعنی وہ ایمان سے انحراف کا اس طنزیہ انداز میں اعلان کرتے ہیں کہ پیغمبر کی ہدایتیں ہم پر اثر کر ہی نہیں سکتیں، اس لئے کہ ہمارے دلوں پر تو غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ ہم ایمان قبول کر نہیں سکتے۔ اس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔ یہاں قرآن نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ کہتے تو ٹھیک ہیں۔ ان کے دلوں پر تو غلاف کیسے، مہریں لگ چکی ہیں کہ ان میں صدائے حق کا اثر پہونچ

ہی نہیں سکتا مگر یہ خود ان کے کردار کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے ضمیر کی آواز سے اتنی بے اعتنائی برتی کہ ضمیر مردہ ہو گیا۔ اسی بنا پر وہ اس کی وجہ سے قابل معافی نہیں قرار پاتے۔

آخر میں جو ہے کہ ''وہ ایمان نہیں رکھتے مگر بہت کم'' یہ کمی ایمان سے بھی متعلق ہو سکتی ہے کہ یہ جو بعض چیزوں کی تصدیق کرتے ہیں جیسے یہود کہ موسیٰؑ کی رسالت کو مانتے ہیں، وہ مقدار میں کم ہے اور اس سے زیادہ حقیقتوں کے وہ منکر ہیں تو ان کے ایمان کا پلہ کفر کے مقابلہ میں سبک ہے۔[۳]

---

[۱] ۔ای جحودهم باعلام الله و حجه وادلته التی احتج بها علیهم فی صدق انبیائه ورسله (تبیان)

[۲] ۔هٰولاء یقتلوا الانبیآء وانما قتلهم اجدادهم واجداد اجداهم فرضی هٰؤلاء بذٰلك فالزمهم الله القتل بفعل اجدادهم فكذٰلك من رضی بفعل قوم فقد نومه وان لم یفعله (علی بن ابراهیم)

[۳] ۔صدقوا ببعض الانبیآء وبعض الكتب و كذبوا بالبعض (تبیان)

اور دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ کمی ایمان لانے والوں کی تعداد کے لحاظ سے ہے یعنی بہت کم ان میں وہ افراد ہو سکتے ہیں جو حق کو قبول کر لیں۔ زیادہ تو ایسے ہی ہیں جن سے ان کے دانستہ انکار اور مسلسل عناد کی وجہ سے قبول حق کی صلاحیت سلب ہی ہو گئی ہے۔

وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾

''اور ان کے کفر کی وجہ سے اور مریم پر بڑا اتہام لگانے کی وجہ سے۔''

بسلسلہ سابق یہود کے جرائم میں سے پانچویں بات ہے جس کا دو الفاظ میں ذکر ہوا ہے: پہلے کفر مگر چونکہ آیات الٰہیہ کے ساتھ کفر کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، اس لئے بظاہر یہ کفر کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ یہ مریمؑ پر بہتان لگانا ہی ہے جسے پہلے اجمالی طور پر کفر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور پھر اس کی تشریح یہ کی ہے کہ انہوں نے مریمؑ پر بہت بڑا اتہام لگایا۔

یوں اتہام کسی پر تو صرف ایک گناہ ہوتا ہے لیکن یہ اتہام چونکہ ایک مرسل کی ماں پر ہے ایسا جس سے اس مرسل کی حقانیت اور عظمت پر اثر پڑتا ہے، اس لئے وہ کفر قرار پاتا ہے۔

اور ایک خیال یہ ہے کہ یہ کفر حقانیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہے [1] اور پھر بہتان کا جرم جناب مریمؑ سے متعلق ہے۔

اس صورت میں یہ دونوں الفاظ دو جرائم کا پتہ دیں گی اور ان کے لحاظ سے اب جرائم کی تعداد چھ تک پہنچے گی۔

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿۱۵۷﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾

''اور ان کے اس طرح کہنے سے ہم نے خدا کے پیغمبر مسیح عیسیٰ فرزند مریم کو قتل کر دیا حالانکہ انہوں نے ان کو نہ قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ انہیں شباہت محسوس کرائی گئی [2] اور جنہوں نے اس بارے میں اختلاف کیا، یقیناً وہ اس کے متعلق شک میں ہیں۔ انہیں سوا گمان کی پیروی کے کوئی علم نہیں ہے اور وہ انہیں یقیناً قتل نہیں کر پائے بلکہ انہیں اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ زبردست ہے، بالکل صحیح کام کرنے والا۔''

ان کا اصل قول تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کرنے کے بارے میں ان کے صرف نام کے ساتھ ہوگا، اس لئے کہ وہ ان کے مسیح اور رسول خدا ہونے کے قائل نہ تھے لہٰذا قرآن میں جو ان کا قول درج کیا گیا ہے، وہ نقل بالمعنی کے قبیل سے ہوگا۔ یعنی خالق نے ان کی بات کو بالکل ان

---

[1] ۔یکفر هم ای یجحدد هولاء لعیسیٰ علیہ السلام (مجمع البیان)

[2] ۔مشتبه شدبر ایشاں (شاہ ولی اللہ) شبہ ڈالا گیا واسطے ان کے (رفیع الدین)

کیے لفظوں میں درج نہیں کیا ہے بلکہ اس مضمون کو اپنے لفظو ں میں جناب عیسیٰ علیہ السلام کے نام کے ساتھ شایان شان القاب کے اضافہ کے ساتھ درج کیا ہے۔ [1]

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ الفاظ انہی کی زبان کے ہوں لیکن بطور طنز یعنی وہ جو کہتے تھے اس کا مطلب یہ تھا کہ دیکھو جو مسیح اور اللہ کے پیغمبر کہے جاتے تھے یا اپنے کو کہتے تھے انہیں کس طرح ہم نے قتل کر دیا۔

پہلی صورت میں جناب عیسیٰ علیہ السلام کے نام کے ساتھ ''مسیح'' اور ''رسول اللہ'' کے الفاظ کا خالق کی طرف سے اضافہ ان کے اس فعل کے ''جرم شدید'' ہونے کے سبب کا اظہار ہے کہ ایسی ہستی کے متعلق جو واقعاً مسیح اور رسول خدا ہے، وہ فخریہ اس کا اظہار کرتے ہیں کہ انہوں نے انہیں قتل کر دیا اور سولی پر چڑھا دیا اور اپنے حدود اختیار میں انہوں نے ایسا کرنے میں کوئی کمی بھی نہیں کی۔ یہ اور بات ہے کہ خالق نے ان کے منصوبہ کو شکست دے دی اور وہ اس طرح کہ انہی کی طرف کے اس آدمی کو جسے انہوں نے مکان کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باہر نکال کر لانے کے لئے بھیجا تھا، عیسیٰؑ کی شبیہ بنا دیا اور انہوں نے اسے عیسیٰؑ سمجھتے ہوئے قتل کر دیا۔ [2]

قرآن مجید کے بعد کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود یہودیوں کو بھی اس کا اطمینان نہیں تھا کہ انہوں نے جناب عیسیٰ علیہ السلام ہی کو قتل کیا بلکہ انہیں اس بارے میں ایک تذبذب سا تھا۔ غالباً اس لئے کہ اگر یہ عیسیٰؑ تھے تو وہ آدمی کہاں ہے جسے ہم نے گرفتار کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ شباہت بھی چہرہ کی تھی مگر قد و قامت عیسیٰؑ کا نہ تھا۔ اس لئے شک ہو رہا تھا کہ یہ کوئی دوسرا شخص تو نہیں ہے۔ [3]

اب حقیقت میں کیا واقعہ ہوا تھا؟ اسے قرآن مجید نے ان الفاظ میں کہا ہے کہ: بل رفعہ اللہ ''بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف بلند کر لیا۔''

اگر تنہا یہ الفاظ ہوتے یہ تصور ہوسکتا تھا کہ یہ رفعت صرف روحانی بلندی ہے اور یہ رفعت، رفعت مرتبہ جو ہر مقرب باری کے لئے بعد وفات لازم ہے لیکن چونکہ یہ رفعہ اللہ کا لفظ قتل اور صلب کی نفی کے مقابلہ میں ہے کہ انہوں نے انہیں قتل نہیں کیا اور سولی نہیں دی اور یقیناً نہیں دی۔ اس کے بعد سے ''بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف بلند کر لیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ بحالت حیات جسمانی طور پر بلند کرنا ہے جو قتل اور صلب دونوں کے مقابلہ میں ہے۔ پھر اگر یہ اٹھانا وہ ہوتا جو اموات کے لئے مستعمل ہوتا ہے تو لاش تو اس عالم ارضی ہی میں، اسی مکان میں موجود ملتی جہاں وہ تھے تو وہ لوگ شبہ میں جہاں مبتلا ہوتے؟!

قرآن مجید کے اتنے اہتمام اور اتنی تاکید کے بعد کہ وہ بار بار قتل کی نفی کر رہا ہے اور پہلی دفعہ دہری دہری نفی سے کہ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ اور پھر يَقِيْنًا کے لفظ کے ساتھ تیسری مرتبہ وَمَا قَتَلُوْهُ کہہ رہا ہے، پھر یہ انتہائی حیرت انگیز سانحہ نہیں تو اور کیا ہے کہ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا اقرار کرنے والوں میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوگئی جو حیات مسیح کی منکر ہے اور یہود کے اس دعوے سے کہ انہوں نے مسیح ہی کو سولی پر چڑھایا تھا، متفق ہے۔

بلاشبہ یہ لوگ خالق کے یہاں اسی عتاب و عذاب کے مستحق ہو سکتے ہیں جس کا خالق نے یہود کے لئے ذکر فرمایا ہے ان کے اس قول کی

---

[1] ۔ قیل انہ من قول اللہ سبحانہ لا علی وجہ الحکایۃ عنہم و تقدیرہ الذی ہو رسولی (مجمع البیان)

[2] ۔ القی اللہ علیہ شبہہ فظنوہ ایاہ (جلالین)

[3] ۔ حیث قال بعضہم لما رأوا المقتول: الوجہ وجہ عیسیٰ علیہ السلام والجسد لیس بجسدہ (جلالین)

بنا پر کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھایا اور قتل کیا ہے۔ اس لئے کہ جب
جرم ایک ہے تو حکم اور پاداش میں تفریق کے کوئی معنی نہیں۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۚ﴿۱۵۹﴾

''اور اہل کتاب میں کوئی نہیں ہے مگر یہ کہ وہ ضرور ان پر ان کے مرنے سے پہلے ایمان لے آئیگا۔ [1]
اور روز قیامت وہ ان کے خلاف گواہ ہوں گے۔''

حیات مسیح علیہ السلام

اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت ابھی واقع نہیں ہوئی ہے، کبھی بعد میں واقع ہوگی اور اس کے پہلے جتنے اہل کتاب اس وقت موجود ہوں گے، وہ ان پر ایمان لے آئیں گے۔ [2]

یہ کب ہوگا؟ اسی وقت جب دین حقیقی کا غلبہ ہوگا اور لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کا مصداق پورا ہوگا تو چونکہ اس دین کا لازمی جز ہے یہ کہ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (البقرۃ۔ ۴) ''وہ اس پر بھی ایمان لاتے ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا اور اس پر بھی کہ جو پہلے اتر چکا ہے'' اس لئے جو اس دین کو اختیار کرتے ہیں، انہیں گزشتہ انبیاء کو ماننا ضروری ہے اور ان گزشتہ انبیاء کے نمایاں افراد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں لہٰذا ان کی نبوت پر بھی ایمان لانا سب کو ضروری ہوگا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:۔

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں۔ جب یہود میں دجال پیدا ہوگا، تب اس جہان میں آ کر اس کو ماریں گے اور یہود و نصاریٰ سب ان پر ایمان لاویں گے کہ یہ نہ مرے تھے'' (موضح القرآن)

مسند احادیث سے ثابت ہے کہ یہ موقع ہوگا جب پیغمبر اسلامؐ کے بارہویں جانشین حضرت مہدی دین عجل اللہ فرجہ ظہور فرمائیں گے۔ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے اور نائب خاتم الانبیاء کے معین و مددگار ہوں گے۔

اب لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ کی ضمیر میں دو احتمال ہوئے:

ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع اور دوسرا جو شاہ عبدالقادر کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، یہ ہے کہ ضمیر اس واقعہ یعنی وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ کی طرف عائد ہو کر یہود ابھی انکار کر رہے ہیں یا شک میں ہیں مگر یہ حقیقت ان پر ایک وقت میں آشکار ہو جائے گی اور اس وقت وہ بھی اس کے ماننے کے لئے مجبور ہوں گے۔

---

[1] ۔ایمان آورد بعیسیٰ علیہ السلام از موت عیسیٰ علیہ السلام (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔یعنی روزی کہ حاضر شوند نزول عیسیٰ علیہ السلام را البتہ ایمان آورد (شاہ ولی اللہ)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ''ان کے خلاف گواہ ہوں گے''۔ بایں معنی کہ انہوں نے ان کی نسبت جو غلط تصورات قائم کر رکھے ہیں، ان کی نفی کر دیں گے۔ یہود جو ان کی حقانیت اور زندگی کے منکر ہیں، ان کا قول بھی ان کے زندہ دنیا میں آجانے سے باطل ہو جائے گا اور نصاریٰ جو انہیں خدا کا بیٹا کہہ رہا ہے، ان کا قول بھی غلط ہو جائے گا[1] اس طرح کہ وہ خود اپنے بندۂ خدا بلکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیرو ہونے کا مظاہرہ کر دیں گے نائب رسول حضرت مہدی آخر الزماں عجل اللہ فرجہ کے پیچھے نماز پڑھ کر جو صحاح اہل سنت سے بھی ثابت ہے۔

شروع میں اکثر مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ: اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ کی دوسری ضمیر جو ''موته'' میں ہے خود اس کتابی کی طرف عائد ہوتی ہے جس سے معنی ہوتے تھے کہ کوئی اہل کتاب میں سے ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے۔ اس کی وجہ سے قرآن کی حقانیت کے خلاف یہ شبہ پیدا کیا جاتا تھا کہ ہمارے سامنے یہودی دنیا سے اٹھتا ہے اور وہ قطعاً ایمان اختیار نہیں کرتا تو قرآن نے یہ کیونکر کہہ دیا کہ جو بھی یہودی ہے وہ اپنی موت سے پہلے ایمان ضرور لے آئے گا۔ اس غلط فہمی کا پردہ امام محمد باقر علیہ السلام نے چاک کیا اور فرمایا کہ یہ ضمیر اس کتابی کی طرف نہیں بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے کوئی ایسا نہیں ہے جو ایمان قبول نہ کرے اور یہ اسی وقت ہوگا جب وہ زمین پر اتریں گے اور حضرت مہدی آخر الزمان علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

امام کے اس ارشاد کو سن کر مشہور دشمن اہل بیت ظالم حجاج بن یوسف نے اعتراف کیا کہ اس کی اس جواب سے تشفی ہوگئی اور اس آیت کے مضمون کی بنا پر جو ایک الجھن تھی، وہ دور ہوگئی۔[2]

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾

''تو یہودیوں کے بڑے ظالمانہ رویہ کے سبب سے ہم نے ان پر وہ اچھی اچھی نعمتیں جو ان کے لئے حلال تھیں، حرام کر دیں اور ان کے روکنے کی وجہ سے بہت سوں کو اللہ کے راستے سے اور ان کے سود لینے کی وجہ سے حالانکہ انہیں اس کی ممانعت تھی اور لوگوں کے مال کو ان کے ناحق کھانے کی وجہ سے اور ہم نے ان میں سے جو کفر پر قائم

---

[1] ۔ اقر علی نفسه بالعبودية (تبیان)

[2] ۔ عن شهر بن حوشب قال قال لی الحجاج یا شهر اية فی کتاب الله قد اعیتنی فقلت ایها الامیر ای اية هی؟ فقال قوله: وان من اهل کتاب الا لیومنن به قبل موته والله انی لامر بالیهودی والنصرانی فاضرب عنقه ثم ارمعة یعینی فما اراه بحرك شفتیه حتی یحمد فقلت اصلح الله الامیر لیس علی ماتاولت قال کیف هو؟ قلت ان عیسیٰ علیہ السلام ینزل قبل یوم القیمة الی الدنیا فلا یبقی اهل ملة یهودی ولا غیره الا امن به قبل موته ولیصلی خلف لمهدی قال ویحك انی لك هذا فقلت حدثنی به محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب فقال جئت به من عین صافیة (تفسیر علی بن ابراهیم)

رہیں [1] ان کے لئے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے۔"

گزشتہ جرائم پر اب جا کر حکم سنایا گیا اور چونکہ وہ سلسلہ طویل ہو گیا تھا، اس وجہ سے اور اس وجہ سے، تو پھر انہی باتوں کو گویا سمیٹ کر ایک جامع لفظ جو سب گناہوں پر حاوی ہے یعنی "ظلم" کا لفظ [2] جس پر تنوین یہاں کثرت وعظمت کا اظہار کرتی ہے کہ ان کا ظلم بہت بڑا اور سخت تھا، سزا یہ بتائی گئی کہ آخرت میں جو عذاب ہے، وہ تو ہے ہی، دنیا میں یہ کیا کم وبال ہے کہ کتنی اللہ کی نعمتوں سے وہ محروم ہو گئے ہیں اور پھر اس سزا کے بعد اب ان کے مزید جرائم کا ذکر ہو گیا جو معاملات مالی سے متعلق ہیں اور پھر اس سب کے بعد عذاب آخرت کا اعلان ہو گیا ان کے لئے جو اپنے کفر اور معاصی پر آخر تک برقرار رہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان ہو جائیں اور حسن عمل اختیار کریں، انہیں ان کے گزشتہ اعمال کی سزا نہ دی جائے گی۔

یہ نعمتیں جن سے وہ محروم ہو گئے، ظاہر الفاظ قرآنی سے تو ذہن میں یہی آتا ہے کہ اس سے مراد وہ سخت شرعی احکام وقوانین ہیں جو یہودیوں کی شریعت میں خصوصی طور پر موجود ہیں، جن کا ایک اور جگہ قرآن مجید میں ذکر ہے [3] کہ:

حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ. (انعام-۱۴۶)

ہم نے ان پر ناخن والے سب جانور حرام کر دیئے اور گائے بیل، بھیڑ بکری کی چربی حرام کر دی یا پیٹ کے اندر کی چیزیں یا جس میں ہڈی کی شرکت ہو۔

وہاں بھی ان محرکات کے ذکر کے بعد یہ جملہ ارشاد ہوا ہے کہ:۔

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ

یہ ہم نے سزا دی ان کے ظلم کی [4]

لہٰذا ذہن میں آنے والی قریبی چیز یہی ہے کہ یہاں:۔

حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ

ہم نے حرام کر دیں ان پر وہ نعمتیں جو ان پر حلال تھیں۔

اس اجمال سے وہی تفصیل مراد ہو جو وہاں درج ہے مگر بعض اہل نظر کو اس میں یہ دشواری محسوس ہوئی ہے کہ یہ احکام تو شریعت توریت میں پہلے سے موجود تھے اور جرائم جن کا ذکر ہوا ہے یعنی جناب مریمؑ پر بہتان لگانا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرنا اور ان کے قتل کا دعویٰ کرنا، یہ سب بعد کی باتیں ہیں تو انہیں ان کی سزا کیوں کر سمجھا جا سکتا ہے؟ اس لئے "ہم نے وہ نعمتیں ان پر حرام کر دیں" اس کے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ ان بداعمالیوں کی سزا میں یہ ہوا کہ جو نعمتیں مثلاً نبوت اور سلطنت وغیرہ انہیں عطا کی گئی تھیں، انہیں ان پر حرام کر دیا یعنی ہمیشہ کے لئے سلب کر دیا۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] ۔مهيا كرديم براى كافران ايشاں يعنى مصران بر كفر (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔لما طال الكلام اجمل تعالىٰ ماذكره ههُنا فى قوله "فبظلم" (تبیان)

[3] ۔هى التى فى قوله: حرمنا كل ذى ظفر الأية (جلالين)

[4] ۔فهذا البغى هو الظلم الذى ذكره ههنا (تبیان)

''ایں بمثابۂ ایں است کہ ضربت علیھم الذلة والمسکنة الایة: وایں آیت: وحرام علی قریة اھلکناھا (فتح الرحمن)

مگر یہ معنی ان الفاظ کے ظاہری مفہوم سے بعید ضرور ہیں اور اس لئے ان کے فرزند شاہ عبدالقادر صاحب نے مفہوم وہی پہلا قرار دیا ہے اور یہ کہا کہ مذکورہ بالا جرائم کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ان سخت احکام سے پہلے ہی ہوئے ہوں بلکہ یہ جرائم ان اشخاص کی اس خبیث طبیعت کی نشاندہی کرنے والے ہیں جو پہلے ہی سے تھی، چاہے اس کے نتائج ان جرائم کی شکل میں سامنے بعد میں آئے ہوں، اس لئے خدا نے جو ان کی طبیعتوں کی برائی سے واقف تھا، ان کے لئے پہلے ہی سے اپنے احکام میں سختی برتی۔ [1]

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾

''اور ان میں سے وہ جو علم میں مضبوط ہیں اور مسلمان کہ ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر اتارا گیا اور جو آپ کے پہلے اتارا گیا تھا اور نماز کے پابندی سے ادا کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور روز آخرت پر یقین رکھنے والے، یہ وہ ہیں کہ ان کو ہم عطا کریں گے بہت بڑا اجر و ثواب۔''

وہ اہل کتاب جو علم میں مضبوط ہیں، وہ اسلام قبول ہی کر لیتے ہیں، اس لئے اس کے بعد وہ بھی مومنین کی جماعت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ جو کہا گیا ''اور مسلمان'' اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے عیسائیت کے بعد اسلام قبول نہیں کیا بلکہ شروع شروع مذہب جو انہوں نے اختیار کیا، وہ اسلام ہی ہے [2] اب خود وہ پیدائشی ہی مسلم ہوں یا بت پرستی اور لامذہبیت کے دور سے گذر کر اسلام لائے ہوں۔

اس کی نظیر پہلے دو جگہ آ چکی ہے۔ جہاں ارشاد ہوا تھا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى (حج۔۱۷) اور دوسری جگہ: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى (مائدۃ۔۶۹).

ان تمام آیتوں میں یہود اور نصاریٰ کے ساتھ جو الذین اٰمنوا آیا ہے، اس کا یہی مطلب ہے کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے شروع ہی سے مذہب جو اختیار کیا وہ اسلام ہی ہے، یہودیت یا نصرانیت نہیں اور الذین ھادو وغیرہ سے مراد وہ ہیں جو پہلے ان مذاہب کو اختیار کیے ہوئے تھے اور اب مسلمان ہوئے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ان آیات میں سے کسی سے بھی یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ نجات اور ثواب آخرت کے لئے اسلام کی شرط نہیں ہے

---

[1] ۔یعنی اوپر سے شرارتیں ان کی جو ذکر کیں، بعض پہلے ہوئیں اور بعض پیچھے لیکن مجمل یہ کہ گناہ پر دلیر تھے۔ اس واسطے ان کی شریعت سخت رکھی کہ سرکشی ٹوٹے (موضح القرآن)

[2] ۔یعنی اصحاب النبی من غیر اھل الکتاب (مجمع البیان)

بلکہ ہر جماعت میں جو خوش عقیدہ اور نیکوکار ہوں، وہ نجات اور ثواب کے حق دار ہیں۔

یہ ہرگز درست نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر جماعت میں واقعاً نیک عقیدہ اور نیک عمل وہی ہونگے جو تعصّبات کے پردوں کو چاک کر کے حقیقت کا جلوہ دیکھیں اور صدق دل سے حقیقتوں کو مان کر اسلام قبول کریں اور اس صالح حیات کے پابند ہوں جس کا نام ''شریعت محمدیؐ'' ہے۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ﴿۱۶۳﴾

''بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح وحی بھیجی تھی نوح اور ان کے بعد والے پیغمبروں کی طرف اور وحی بھیجی تھی ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب [1] اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر اور ہم نے داؤدؑ کو زبور عطا کی تھی۔''

اسباط یعنی اولاد یعقوبؑ کی طرف وحی کا ذکر ان انبیاء کے اعتبار سے ہے جو ان کی نسل میں بعد کو ہوئے۔ اس لئے کہ حضرت یعقوبؑ کی خود صلبی اولاد جو برادران یوسفؑ تھے، نبوت کے مرتبہ پر فائز نہ تھے [2] جو خود ان کے کردار سے ظاہر ہے۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ﴿۱۶۴﴾

''اور کچھ پیغمبر وہ جن کے واقعات ہم نے آپ سے اس کے پہلے بیان کر دیئے ہیں اور کچھ وہ پیغمبر جن کے حالات ہم نے آپ سے بیان نہیں کیے ہیں اور اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا جیسا کلام کرنے کا حق تھا۔''

اس کے قبل کی آیت کے الفاظ اس طرح تھے کہ ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی بھیجی جیسے نوحؑ اور ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ وغیرہ کی طرف بھیجی تھی۔ اگر اس پر لفظی حیثیت سے عطف ہوتا تو کہا جاتا کہ: وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ الخ یعنی اور جس طرح ان پیغمبروں کی طرف وحی بھیجی جن کے حالات بیان ہوئے ہیں اور ان پیغمبروں کی طرف جن کے حالات بیان نہیں ہوئے ہیں مگر چونکہ وحی کے مفہوم میں رسول بنا کر بھیجنا مضمر ہے، اس لئے اس آیت میں عطف اس کے معنی کے اعتبار سے ہوا: وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ، اس طرح مطلب یہ ہوا کہ ''اور جس طرح ان پیغمبروں کو ہم نے بھیجا جن کے واقعات بیان ہوئے ہیں اور ان پیغمبروں کو جن کے واقعات

---

[1] ۔یعقوب والاسباط اولادہ (جلالین)

[2] ۔لیس یصح عندنا ان الاسباط الذین ھم اخوۃ یوسف کانوا انبیاء (تبیان)

بیان نہیں ہوئے ہیں [1] اسی طرح ہم نے آپ کو بھیجا ہے۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ رسلا کو نصب اسی فعل کی بنا پر ہوا ہو اس کے بعد ہے یعنی کچھ پیغمبروں کے ہم نے آپ سے واقعات بیان کیے ہیں اور کچھ پیغمبروں کے نہیں بیان کیے [2] اس صورت میں کسی دوسرے فعل کے مقدر ماننے کی ضرورت نہ ہوگی اور اس صورت میں اس آیت کا کوئی ترکیبی تعلق بھی اس آیت کے قبل کی آیت سے نہ ہوگا، اس لئے ممکن ہے کہ یہ تنزیل میں اس آیت کے تسلسل سے آئی ہی نہ ہو بلکہ کسی اور موقع پر مستقل یا کسی اور آیت کے ساتھ اتری ہو۔

بہت سے پیغمبر وہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے

بہرصورت اس اجمال کی تصریح نے کہ بہت سے پیغمبر ایسے ہیں جن کا ذکر پیغمبر خدا سے یعنی آپ پر نازل ہونے والے آیات کی کتاب میں [3] اور آپ کی زبانی دنیا تک پہونچنے والے احادیث میں نہیں ہوا ہے، ان پیشوایان مذاہب کے لئے جن کے متعلق دوسرے اقوام وحی آسمانی کے دعویدار ہیں جیسے ایران میں زردشت اور ہندوستان کے وہ اشخاص جن کے نام سننے میں آتے ہیں یا جن پر کتابوں کا اترنا بیان کیا جاتا ہے، یہ احتمال پیدا کر دیا ہے کہ ممکن ہے وہ واقعی اللہ کی طرف سے نبوت و رسالت کے منصب پر فائز ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی تعلیم کو بعد میں مسخ کر دیا گیا ہو جیسے اہل کتاب نے توریت و انجیل وغیرہ کے ساتھ سلوک کیا یا انہیں اوتار وغیرہ فرض کر کے ان کے اصل منصب کو فراموش کر دیا گیا ہو جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

''اس شان کے پیغمبر [4] جو مژدہ سنانے والے اور ڈرانے والے تھے تاکہ ان پیغمبروں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی دلیل نہ رہے اور اللہ زبردست ہے صحیح صحیح کام کرنے والا۔''

رسول کے بھیجنے کا مقصد اتمام حجت

''بشارت'' اور ''انذار'' کی دو الفاظ قرآنی اصطلاح میں ایک پورا خاکہ ہوتی ہیں انبیاء کی ہدایتوں کا جن میں ایک مثبت پہلو ہوتا ہے اور

---

[1] ۔وارسلنا رسلا قد قصصنٰهم عليك (جلالین) چنانکہ فرستادیم پیغمبرانی کہ قصہ ایشاں گفتہ ایم (شاہ ولی اللہ) اور بھیجے ہم نے پیغمبر کہ تحقیق بیان کیا ہم نے ان کو (رفیع الدین)

[2] ۔الوجه الثانی ان یکون نصبا بفعل یفسره ما بعده... وتقدیره وقصصنا علیك رسلا الخ (تبیان)

[3] ۔ان اللہ سبحانه ارسل رسلا کثیرة لم یذکرهم فی القرآن (مجمع البیان)

[4] ۔رسلا نصب علی الحال (تبیان)

ایک منفی۔ اوامر اور نواہی اور انہی دونوں کے اعتبار سے نتیجہ میں ثواب ہوتا ہے اور عذاب اور انہی سے متعلق انبیاء جو خلق خدا کو انتباہات کا سرمایہ فراہم کرتے ہیں، ان میں وعدہ ہوتا ہے اور وعید۔ وعد یعنی ثواب کا اعلان اور وعید یعنی عذاب سے تخویف۔ اسی وعدہ کا نام ہے ''بشارت'' اور اس کے وعید کا نام ہے ''انذار''۔

ان کے ذریعہ سے خلق خدا پر حجت تمام ہوتی ہے یعنی ان کی ناواقفیت اور غفلت کا عذر ختم ہو جاتا ہے وہ عذر جس کی ترجمانی زبان قدرت نے دوسری جگہ اس طرح کی ہے کہ وہ کہتے:۔

لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ (طٰہٰ۔ ۱۳۴، قصص۔ ۴۷)

تو نے ہماری طرف کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ ہم تیری تعلیمات کی پیروی کرتے۔

اس عذر پیش ہونے کی صورت میں ان سے حساب، کتاب اور جزاء و مکافات درست نہ ہوتی۔ یہ ان کے لئے عذر کی گنجائش ہی ان کی طرف کی حجت ہے جسے ختم کرنا مقصد رسالت قرار دیا جا رہا ہے، ان الفاظ میں کہ:۔

لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ

ان پیغمبروں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی دلیل نہ رہے۔ [1]

اس دلیل اور بندگان خدا کے عذر ہی کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طرف سے ذات الٰہی پر الزام لایا جاتا جیسا کہ اہل سنت کے بعض مستند مترجمین نے ترجمہ کیا ہے۔ [2]

اس سے علم کلام کے مبحث عدل کے دو اہم مسائل ثابت ہوتے ہیں: پہلے حسن و قبح عقلی یعنی قطع نظر اس سے کہ خالق کا عمل یا حکم کیا ہے؟ خود اپنی جگہ کچھ باتیں ہیں جو عقلاً اچھی یا بری ہیں چنانچہ کچھ باتوں کو عقل یعنی انسانی ضمیر ظلم میں داخل سمجھتی ہے لہٰذا خالق کا ان سے بری ہونا از روئے عقل ضروری ہے۔ اس ضروری ہونے کو یوں کہا جاتا ہے کہ اللہ پر یہ واجب ہے۔

اس واجب ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کسی اور بالا دست طاقت نے معاذ اللہ خالق کو اس کا پابند بنا دیا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی شان کمال کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایسا ہی کرے۔ اس کا نہ کرنا ہی وہ ہوگا جو خلق کے لئے اس کے مقابلہ میں حجت بن سکے اور چونکہ بنص قرآن ارسال رسل نہ ہونے کی صورت میں خلق کے پاس خالق کے مقابلہ میں حجت ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرسلین کا بھیجنا اس پر واجب تھا۔

دوسرے: افعال الٰہی کا بر بنائے غرض و غایت ہونا۔ یہ غرض وہ ''خود غرضی'' والی غرض نہیں ہوتی جس سے خدا کا غنی مطلق ہونا سد راہ ہے بلکہ اس کے علم و حکمت کی رو سے کسی چیز کا حسن ذاتی اور عدل کے لحاظ سے ضروری ہونا، اس کے فعل کی غرض و غایت ہونے کے لئے کافی ہے۔ اسی بنا پر ارسال رسل جو فعل باری ہے، اس کی غرض و غایت بتائی جا رہی ہے کہ خلق کے پاس اللہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے حجت نہ رہے۔

یہی غرض و غایت وہ ہوتی ہے جو اس کے افعال کو عبث اور بے مقصد ہونے سے بری قرار دیتی ہے جسے قرآن کریم میں بہت سی جگہ شان خالق کے خلاف قرار دیا ہے اور اس کی ذات کو اس سے برتر بتایا ہے کہ اس کے افعال معاذ اللہ عبث اور بے مقصد ہوں۔ چونکہ جو امر کسی ذات کی

---

[1] ۔یعنی تا نگویند تقصیر ما نیست، ہیچ پیغمبر نزدیک ما نیاند (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔تا نباشد مردمان را بر خدا الزام (شاہ ولی اللہ) نہ ہو واسطے لوگوں کے اوپر اللہ کے الزام (شاہ رفیع الدین)

رفعت کے لئے ضروری اور اس کی شان کے مطابق ہو، اس کا ترک دو صورتوں سے ہوتا ہے۔ ایک مجبوری سے اور دوسرے نادانستگی سے، اس لئے خاتمہ آیت میں دو الفاظ لائے گئے: وکان اللہ عزیزا ''وہ زبردست ہے'' یعنی اس کی قدرت محدود نہیں تاکہ بربنائے مجبوری وہ کسی امر واجب کو ترک کرے۔ حکیما یعنی اس کی سوجھ بوجھ بھی ایسی ہے کہ وہ صحیح ہی کام کرتا ہے، غلط کام بربنائے ناواقفیت بھی اس سے نہیں ہوسکتا۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾

''مگر اللہ گواہی دے رہا ہے کہ اس کی جو اس نے آپ اتارا ہے۔ اس نے اسے اتارا ہے اپنے خاص علم کے ساتھ اور فرشتے گواہی دیتے ہیں اور اللہ سے بڑھ کر کون گواہ ہوگا۔''

چونکہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہے، اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ آیت گزشتہ سیاق آیات ہی کے ذیل میں نازل ہوئی ہے۔ اس لئے اس ''مگر'' کا ربط گزشتہ کلام کے ساتھ ہونا یقینی نہیں ہے۔ موجودہ صورت حال میں ہم جتنا سمجھ سکتے ہیں اس آیت کا مطلب، وہ یہ ہے کہ وحی تو سب انبیاء پر اتری ہے اور اسی طرح آپ پر بھی وحی اتری مگر سابق انبیاء پر نازل شدہ کتابیں اور صحیفے، ان پر بحیثیت معجزہ رسالت نہیں اترے تھے۔ ان کے دلائل نبوت دوسری قسم کے معجزات کی صورت میں ہوتے تھے لہٰذا اس کلام میں جو ان پر اترتا تھا کوئی ایسی خاص بات نہ ہوتی تھی کہ وہ اثبات نبوت میں پیش کیا جائے مگر آپ یعنی حضرت ختمی مرتب ﷺ پر جو وحی بصورت قرآن اتری ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب بحیثیت اعجاز نازل ہوئی ہے یعنی خود اس کلام میں ایسے خصوصیات ہیں جو اس کے کلام الٰہی اور آپ کے رسول الٰہی ہونے کی دلیل ہیں اور ان خصوصیات کلام کا حامل بنا کر اس کتاب کو بھیجنا ہی اللہ کا گواہی دینا ہے [1] اور چونکہ وہ کلام بھیجا گیا جبریل امینؑ وغیرہ فرشتوں کے ذریعہ سے یعنی وہ فرشتے ان خصوصیات کے حامل کلام کو لے کر اترے تو اس لئے وہ گواہ قرار پائے کہ انہوں نے آپ کی رسالت کا ثبوت فراہم کیا مگر وہ کیا؟ وہ تو ذریعہ وحی تھے اس لئے اصل گواہی خالق ہی کی ہے لہٰذا آخر میں پھر اس کا تنہا نام لے کر کہا گیا کہ۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا۔ اللہ سے بڑھ کر کون گواہ ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾

''یقیناً جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کی راہ سے روکا، وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہوئے۔''

چونکہ اہل کتاب نے اپنی مقدس کتاب کو عام نہیں کیا تھا بلکہ وہ ان کے علماء کے پاس محفوظ رہتی تھیں اور عوام ان کے دست نگر تھے، اس لئے یہ علماء کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس رسولؐ پر خود بھی ایمان اختیار کرتے اور اپنے عوام کو بھی بتلاتے کہ ہماری کتابیں اس رسولؐ کے آنے کی پیش گوئی کرتی رہی ہیں مگر انہوں نے خود بھی کفر اختیار کیا اور حق پوشی سے کام لے کر دوسروں کو بھی سدراہ ہوئے کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ [2] اس کے علاوہ ایسی

---

[1] ۔ واللہ سبحانہ تبین ما انزل علی رسولہ بنصب المعجزات (مجمع البیان) یعنی وحی ہر پیغمبر کو آتی رہی، کچھ نیا کام نہیں ہے، پر اس کلام میں اللہ نے اپنا خاص علم اتارا ہے اور اللہ اس حق کو ظاہر کردے گا چنانچہ ظاہر ہوا کہ جس قدر ہدایت اس نبی سے ہوئی اور کسی سے نہ ہوئی (مواضح القرآن)

[2] ۔ صدوا الناس عن سبیل اللہ یکتمھم نعت محمد ﷺ وھم الیھود (جلالین)

ایسی باتیں بھی کیں جن سے ان کی گمراہی مستحکم ہو جائے مثلاً یہ کہ رسالت اولاد ہارونؑ سے مخصوص ہے، باہر جا ہی نہیں سکتی۔ [1]
اس طرح ان کی گمراہی بہ نسبت ان عوام کے زیادہ شدید اور دوررس ہے۔ [2]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾
اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

''یقیناً جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ظلم کیا، اللہ انہیں بخشنے کا نہیں ہے اور نہ انہیں کوئی راستہ دکھانے کا ہے، سوا دوزخ کے راستے کے جس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔''

کفر کے ساتھ ساتھ ظلم حقیقت پر بھی ہے کہ جان بوجھ کر اس کا انکار کرتے ہیں اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر بھی کہ انہیں سچا جانتے ہوئے سچا مانتے نہیں اور ظلم ان لوگوں پر بھی جنہیں گمراہ کرتے ہیں [3] اور ظلم اپنے نفس پر بھی کہ انہوں نے اس کے لئے ہلاکت ابدی کے سامان کیے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ
تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

''اے انسانو! وہ پیغمبر تمہارے پروردگار کی طرف سے پیغام حق کو لئے ہوئے آ گیا ہے تو ایمان لے آؤ، تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر انکار کرو گے تو بلاشبہ اللہ کے قبضہ میں وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ جاننے والا ہے، بالکل صحیح کام کرنے والا۔''

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے اعلان رسالت اور دعوت ایمان میں کسی ایک دفعہ بھی قوم عرب کو مخاطب نہیں بنایا گیا ہے۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ آپ کی ذات شروع ہی سے کسی ایک قوم اور نسل کی اصلاح کو مطمح نظر بنا کر نہیں آئی تھی۔
پھر آپ کے اعلان رسالت کو ''الرسول'' کے لفظ کے ساتھ ''معرفہ'' بنا کر پیش کیا گیا ہے، اس لئے کہ دنیا کی قوموں میں پہلے سے آپ کا انتظار تھا اور آپ کے اوصاف وعلامات مشہور ومعروف تھے۔ اس لئے آپ کی ذات نادیدہ ہونے کے باوجود ''نکرہ'' یعنی غیر معلوم شے نہ تھی اور اسی لئے توریت میں بھی آپ کا اعلان ''وہ نبی'' کے الفاظ سے تھا اور انجیل میں بھی آپ کا تذکرہ ''وہ نبی'' کے لفظوں میں ہے اور یہی ''وہ'' کا اشارہ ہے جو ''النبی'' اور ''الرسول'' کے لفظوں الف لام عہد کے ساتھ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں ہے۔

---

[1] ۔ادعائوهم انه عهد اليهم ان النبوة لا تكون الّا فى ولد هرون ومن ذريته داؤد وما اشبه ذٰلك (تبيان)
[2] ۔جاءوا عن قصد الطريق جوارا شديدا (تبيان)
[3] ۔ظلموا نبية بتكذيبهم اياه ومقامهم على الكفر على علم منهم ظلمهم عباد الله (تبيان)

''وہ رسول'' اور ''نبی'' آپ کی آمد کا ہمہ گیر اعلان

پھر اس واقعیت کا اعلان ہے کہ جس طرح اللہ کو ماننے سے اللہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے جیسا کہ پیغمبر اعلان فرماتے تھے کہ: قولوا لا الٰہ الّا اللہ تفلحوا ''مانو کہ سوا اللہ کے کوئی خدا نہیں تمہارا ہی فائدہ ہوگا'' اسی طرح رسولؐ کی تصدیق سے رسولؐ کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ خلق خدا کا فائدہ ہے۔'' اس کا اللہ نے اعلان کیا کہ: فامنوا خیرا لکم ''ان پر ایمان لے آؤ، اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔

اس کے بعد ظاہر ہے کہ جب خدا کے ماننے سے خلق کا فائدہ ہے اور رسولؐ کی تصدیق سے بھی خلق خدا ہی کا فائدہ ہے تو نہ ماننے اور تصدیق نہ کرنے سے نقصان بھی خدا و رسولؐ کا نہیں بلکہ انہی کا ہے جو انکار کر کے اپنے کو ہلاکت ابدی میں گرفتار کرتے ہیں اور چونکہ رسولؐ کی حیثیت اپنی ذاتی نہیں ہے بلکہ نمائندہ خدا ہونے کے لحاظ سے ان کا انکار، خدا کے پیغام کا انکار ہے، اس لئے انکار کی صورت میں یہ بتانے کے لئے کہ ان کا کوئی نقصان نہیں ہے، جلال و جبروت الٰہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی تمہارے کفر سے ان کا کچھ بگڑ نہیں سکتا، اس لئے کہ اس کے قبضہ میں تو تمام کائنات ہے۔ تم ایک نہ مانو گے تو کیا ہوگا۔[1] اور یہ بھی اس کا نظام حکیمانہ ہے کہ اس نے تم کو اتنا عارضی اختیار دے رکھا ہے کہ تم اس اختیار سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کے احکام کی مخالفت بھی کر لیتے ہو جو اس کے لئے کوئی خلاف توقع امر نہیں ہے جس پر اسے کوئی افسوس یا پشیمانی ہو کیوں کہ وہ تو ''علیم'' ہے۔ پہلے سے نتائج سے واقف ہے[2] اور ''حکیم'' ہے۔ اس نے جان بوجھ کر بربنائے اصلاح عالم یہ نظام مقرر کیا ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾

''اے اہل کتاب! اپنے مذہب میں غلو سے کام نہ لو اور اللہ کی طرف سوا سچ بات کے کچھ منسوب نہ کرو۔ مریم کے بیٹے عیسیٰؑ مسیح تو بس اللہ کے پیغمبر اور اس کا کلمہ ہیں جسے اس نے مریم کی طرف بھیجا اور اس کی طرف کی ایک روح ہیں لہٰذا اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کے قائل نہ ہو۔ باز آ جاؤ، تمہارے لئے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک اکیلا خدا ہے۔ پاک ہے اس کی ذات اس سے کہ اس کے کوئی اولاد ہو۔ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں، سب اسی کا ہے اور اللہ کارسازی کے لئے کافی ہے۔''

---

[1] ۔ فان ضرر ذٰلك يعود عليكم دون الله تعالى الذى له ملك السموٰات (تبيان)

[2] ۔ عليهما بانهم صائرون اليه من طاعة او معصية (تبيان)

غلو کے معنی ہیں کسی کے بارے میں جوش عقیدت کی بنا پر حد سے بڑھ جانا۔[1]

غلو کی ممانعت، عیسیٰ علیہ السلام کا صحیح تعارف رد تثلیث اور اثبات توحید

نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو میں مبتلا ہوئے یعنی انہیں اللہ کا پیغمبر کہنے کے بجائے اللہ کا بیٹا اور تثلیث کے ذیل میں اللہ کے ساتھ ایک خدا کہنے لگے۔ اسی بنا پر انہیں انتباہ کیا جا رہا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو صحیح صحیح مرتبہ ہے، اسے بیان کیا جا رہا ہے کہ عیسیٰؑ کے بارے میں اتنی باتیں ٹھیک ہیں:۔

(۱) وہ حضرت مریمؑ کے بیٹے ہیں۔ اس ماں کی طرف انتساب میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ ان کا کوئی باپ نہیں ہے۔[2]

(۲) وہ مسیح ہیں، یہ لقب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے خاص ہے۔

(۳) وہ اللہ کے رسول ہیں لہٰذا جیسے سب پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی۔

(۴) وہ کلمۃ اللہ ہیں یعنی خالق کے حکم کن سے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔

(۵) وہ روح اللہ ہیں۔ اس میں روح مِنہ] ''اس کی طرف کی ایک روح'' کہہ کے اس کا اظہار کیا گیا ہے کہ یہ ''روح'' کہنا اس تعلق کے اظہار کے لئے نہیں ہے جو روح کا ذی روح کے جسم سے ہوتا ہے بلکہ یہ روح اللہ کہنا اس انتساب کے اعتبار سے ہے جو باعتبار شرف خالق کے ساتھ ہے[3] جس کی بنا پر حضرت آدم علیہ السلام ہی کی خلقت کے موقع پر ارشاد فرمایا گیا تھا کہ:۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ

جب میں پتلا بنا دوں اور اس میں اپنی طرف کی روح پھونک دوں۔ (ص۔ ۷۲)

یہی روح ہے جس کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔ بحیثیت وصف یہ بات تمام نفوس کاملہ میں عام ہے ہاں خصوصی لقب عطا ہونا شرف خاص ہے۔ جیسا کہ تمام انبیاء کے القاب میں صفت عام ہے اور لفظ بحیثیت لقب اعزاز امتیازی کے طور پر ان کے لئے خاص ہے۔

اتنا مانا جائے تو یہ صحیح ایمان ہے جس کے بالمقابل ایک طرف یہود ہیں جو اس کو بھی نہیں مانتے اور اس طرح کفر کے مرتکب ہیں اور دوسری طرف اس کے آگے جو ہے، وہ غلو ہے جس کے نصاریٰ مرتکب ہیں کہ عیسیٰؑ کو تین میں کا ایک مان لیا اور اس طرح اللہ کا ساتھ سمجھ لیا۔ اس کے مقابلہ میں توحید کا اعلان کیا گیا ان الفاظ میں کہ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (یعنی) اس کی وحدت خالص ہے جس میں کثرت کا شائبہ نہیں ہے۔ دوسری اس طرح غلو کہ عیسیٰؑ کو اس کا بیٹا کہہ دیا۔ اس کے مقابلہ میں صحیح تصور کا اعلان کیا گیا کہ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ یعنی یہ اللہ کا تصور بھی اللہ سبحانہ کی شان جلال کے خلاف ہے۔ اب اگر ولد کے لفظ میں تاویل سے کام لیا جائے کہ جس طرح باپ اولاد کا سبب وجود اور مربی ہوتا ہے۔ اسی طرح عیسیٰؑ اس کے دامن تربیت کے پرورش یافتہ ہیں، تو اس کا جواب قرآن نے اس طرح دیا ہے کہ یہ پھر عیسیٰؑ سے مخصوص بات نہیں ہے۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ یعنی کائنات میں جو کچھ ہے، وہ سب ہی اس کا مخلوق اور اس کے زیر تربیت ہے اور وہ سب ہی کا مدبر و کارساز ہے

---

[1] ۔ اصلا لغو فی کل شی تجاوز حدہ (تبیان)

[2] ۔ انہ ابن مریم لا ابن اللہ کما یزعمہ النصاریٰ ولا ابن اب کما زعمہ الیہود (مجمع البیان)

[3] ۔ اضیف الیہ تشریفا لہ (جلالین)

لہٰذا اس کے معنی سے بھی عیسیٰؑ کو خصوصیت سے اللہ کا بیٹا کہنے کے کوئی معنی نہیں۔

آخری فقرہ: وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ''اللہ کارسازی کے لئے کافی ہے'' اس کا یہ مقصد ہوسکتا ہے کہ اگر یہ سمجھو کہ اس نے انتظام عالم کے لئے عیسیٰؑ کو اپنا ساتھی یا بیٹا قرار دے کر اپنا شریک کرلیا ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ یہ اس وقت ہوتا جب اس کی قدرت ناقص ہوتی اور اسے کسی اور شریک کار کی ضرورت ہوتی مگر ایسا نہیں ہے۔ وہ تنہا کارسازی کے لئے کافی ہے۔ پھر اسے کسی کو اپنا ساتھی یا بیٹا بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ [1]

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

''مسیح ہرگز اس کو اپنے لئے عار نہ سمجھیں گے کہ وہ اللہ کے بندے ہوں اور نہ مقرب فرشتے اور جو اس کی بندگی سے ننگ محسوس کرے گا اور غرور کرے گا تو اللہ ان سب کو جلدی ہی اپنی جانب محشور فرمائے گا تو جس نے ایمان اختیار کیا ہوگا اور نیک اعمال کیے ہوں گے، انہیں ان کا پورا پورا صلہ دے گا اور انہیں اپنے فضل و کرم سے اور زیادہ عطا کرے گا اور جنہوں نے ننگ محسوس کیا اور غرور کیا ہوگا، انہیں وہ دردناک عذاب کی سزا دے گا اور وہ اپنے لئے اللہ کو چھوڑ کر کوئی سرپرست نہ پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔''

مسیح کو نصاریٰ خدا کا بیٹا سمجھتے تھے، اصل میں تو انہی کی رد ہو رہی ہے مگر چونکہ مشرکین فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، اس لئے ضمناً ان کی بھی رد کردی گئی [2] کہ تم ان سب کو چاہے جو کہہ دو مگر یہ سب تو اپنا فخر اسی میں محسوس کرتے ہیں کہ انہیں اللہ کی بندگی کا رتبہ حاصل ہو اور یہی آخرت میں ان کی رفعت مراتب کا ذریعہ ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾

''اے انسانو! تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف کا کھلا ہوا ثبوت آ گیا ہے [3] اور ہم نے تمہاری طرف ایک نمایاں روشنی بھیجی ہے۔''

---

[1] ۔اس کو پیش کار کی حاجت نہیں۔ وہ بس ہے کام بنانے والا (موضح القرآن)

[2] ۔ھٰذا من احسن الاستطراد ذکر الرد علی من زعم انھا الھۃ او بنات اللہ (جلالین)

[3] ۔ای اتاکم حجۃ من اللہ تبرھن لکم علی صحۃ ما امرکم بہ وھو محمد ﷺ (تبیان)

یہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کی موثر انداز میں دعوت ہے کہ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو تو کہ تجلیاں حق کی کتنی روشن اور دلائل حقانیت کتنے آشکارا ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾

''تو جنہوں نے ایمان اختیار کیا اللہ کے ساتھ اور مضبوطی سے اس کا دامن تھام لیا تو وہ انہیں اپنی رحمت اور فضل و کرم میں داخل کرے گا اور اپنی طرف پہنچانے والے سیدھے راستے پر لگا دے گا۔''

''اس کا دامن'' یہ ضمیر قرب کی بنا پر خود ''اللہ'' کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے، اگرچہ تمسک کا انتساب اللہ کی طرف صراحۃً کہیں نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اس بنا پر یہ تعبیر غیر مانوس معلوم ہوتی ہے لہٰذا مفسرین اس ضمیر کی سابق کی آیت میں درج شدہ ''نُوْرًا مُّبِيْنًا'' کی طرف راجع کرتے ہیں۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ پر ایمان لایا اور مضبوطی سے اس کا یعنی ''نور مبین'' کا جو قرآن ہے دامن تھام لیا تو وہ رحمت الٰہی کا حقدار ہوگا۔[1] ''راستے پر لگا دے گا'' یعنی توفیقات خاصہ شامل حال کرے گا[2] جو ان کی راہ طلب میں صحیح جدوجہد کا نتیجہ ہوں گے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت۔۶۹)

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

''آپ سے حکم شرعی دریافت کرتے ہیں[3] کہئے کہ اللہ تمہیں ''کلالہ'' کے بارے میں حکم شرع بتاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا مر جائے جس کے اولاد موجود نہ ہو اور اس کے ایک بہن ہو تو اس کا آدھا متروکہ ہوگا اور وہ اس کی پوری وارث ہوگی اگر اس کے اولاد نہ ہو۔ اب اگر دو بہنیں ہوں تو انہیں دو تہائی متروکہ ملے گا اور اگر بھائیوں (کی صنف) میں مرد عورت دونوں ہوں تو مرد کو دو عورتوں کے برابر ملے گا۔ اللہ تمہارے لئے صاف صاف بیان کرتا ہے کہ تم گمراہ نہ ہو اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

---

[1] ۔ تمسك بالنور الذی انزله الی نبیه... قال ابن جریج الهاء فی به کنایة عن القران (تبیان)

[2] ۔ یوفقهم لاصابة فضله الذی تفضل به علی اولیائه (تبیان)

[3] ۔ الاستفتآء السوال عن الحکم (مجمع البیان)

کلالہ یعنی بھائی بہن کی میراث

اس کے پہلے نصاریٰ کی ردتھی اوران کے الوہیت مسیح اور مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کے تصورات کا ابطال ہورہا تھا اوراب یہ ایک دم میراث کا مسئلہ آ گیا جس سے ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ اس سلسلہ کی آیت نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جامعین قرآن کو پورا سورۂ نساء مرتب ہوجانے کے بعد یہ آیت بھی اس سورہ کی دستیاب ہوگئی تو انہوں نے آخر میں درج کردی جس میں کوئی ترتیب یا ربط کا لحاظ نہ تھا۔

بے شک حمید الدین فراہی صاحب ایسے افراد جو نظم قرآنی پر بڑا زور دیتے ہیں یعنی موجودہ ترتیب قرآن میں ہر آیت کا قبل کی آیت سے کچھ نہ کچھ ربط قائم کردیتے ہیں اوراس سے معانی پیدا کرتے ہیں، انہوں نے یہاں بھی کچھ نہ کچھ کہا ہی ہوگا مگر بے لوث ذہن جسے خاص اس پہلو کے صحیح ثابت کرنے کی دھن نہ ہو یا تفسیر میں فن کاری کا کمال نہ دکھلانا ہو، وہ فطری طور پر اس آیت کو الگ ہی سمجھے گا اور حقیقت میں وہ الگ ہے بھی۔ اس کا کوئی تعلق ماقبل سے نہیں ہے۔ اس آیت میں میراث ''کلالہ'' کا بیان ہورہا ہے یعنی بھائی بہن کی میراث [1] اہل سنت کے یہاں اس کی تعبیر بڑے الجھے ہوئے انداز میں ملتی ہے۔ [2] اس ذیل میں چند مسئلے ہیں:۔

(۱) کسی شخص کا انتقال ہوا اوراس کے اولاد نہیں ہے۔ اب یہاں قرآن کے اطلاق میں علیٰحدہ سے قید لگانے کی ضرورت ہے کہ والدین بھی نہیں ہیں اوراس کی وارث بس ایک بہن ہے تو بہن کو نصف ملے گا۔

(۲) بہن کا انتقال ہوا اور وارث بس بھائی ہے تو یہ بھائی اس کے پورے متروکہ کا وارث ہوجائے گا۔

(۳) دو یعنی ایک سے زیادہ بہنیں ہیں تو انہیں ثُلثین ملیں گے یعنی دو تہائی ترکہ۔

(۴) اگر ورثہ میں بھائی بہن دونوں صنفیں ہیں تو میراث اس طرح ملے گی کہ بھائی کو دہرا حصہ اور بہن کو اکہرا حصہ۔

یہ احکام یہاں بیان ہوئے ''کلالہ'' کے لیکن اگر نظر پہلے کی طرف دوڑائیے تو معلوم ہوگا کہ اسی سورہ میں اس کے پہلے (چوتھے پارہ میں) جہاں والدین اور اولاد اور شوہر اور زوجہ کے حصے بیان ہوئے ہیں، وہاں بھی میراث کلالہ کا بیان ہوا تھا کہ:۔ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ، خلاصہ اس کا یہ بیان تھا کہ کلالہ اگر ایک ہے تو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر ایک سے زیادہ ہو تو انہیں تہائی حصہ دیا جائے گا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ وہاں جو حکم چھٹے حصہ اور تہائی والا بیان ہوا تھا، وہ کلالۃ الام کا ہے یعنی میت کے وہ بھائی بہن جن کی ماں ایک ہے اور باپ مختلف ہیں، ان کا یہ حکم ہے کہ اگر ایک ہو تو سدس اور ایک سے زیادہ ہوں تو ثلث۔ اوراب یہاں جو حکم بیان ہورہا ہے، وہ کلالۃ الابوین اور کلالۃ الاب کا ہے یعنی سگے بھائی بہن جو ایک ماں باپ کے ہیں یا علاتی یعنی جن کا باپ ایک ہی ہے مگر مائیں مختلف ہیں کہ سگے بھائی بہن کی موجودگی میں تو ان کی میراث ملتی ہی نہیں لیکن اگر سگے نہ ہوں تو یہ ان کے قائم مقام ہوتے ہیں یعنی جو حق ان کا ہوتا، وہ اب ان کا ہوگا۔ ان کا یہ حکم ہے کہ اگر ایک بہن ہو تو نصف اور اگر ایک سے زیادہ بہنیں ہوں تو ثلثین اور اگر ایک یا کئی بھائی ہی بھائی ہوں تو کل متروکہ اور اگر بھائی بہن مخلوط ہوں تو بھائی کو دہرا اور بہن کو اکہرا۔ یہ ان بھائی بہنوں کا حکم ہے۔ یہ تفصیل فقہ اسلامی میں متفق علیہ ہے مگر سوال یہ ہے کہ یہ تفصیل معلوم کہاں سے

---

[1] ۔ھو اسم للاخوۃ والاخوات عن الحسن وھو المروی عن ائمتنا (مجمع البیان)

[2] ۔لیس لہ ولد ای ولا والد (جلالین) فرزندش نیست یعنی ونہ والد (شاہ ولی اللہ)

ہوئی؟ قرآن مجید میں تو دونوں جگہ کلالۃ کی لفظ ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ ماخذ احکام بننے کے لئے قرآن اکیلا اتارا ہی نہیں گیا تھا۔ بلکہ قرآن کے ساتھ تفصیلات کے بیان کرنے کے لئے ایک دوسرے ترجمان کو مقرر کیا گیا تھا۔ پھر اس ترجمان کو چھوڑ کر تنہا قرآن کو کبھی کافی سمجھ لیا جائے تو صحیح تعلیمات اسلام کہاں حاصل ہو سکتے ہیں؟!

سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ

مدینہ.....۱۲۰ آیات

اس سورہ کا یہ نام حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر مائدہ آسمانی اترنے والے واقعہ کی بنا پر ہوا ہے جو اس سورہ میں مذکور ہے۔ اور کسی دوسرے سورہ میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں حسب ذیل اہم مضامین ہیں۔

سورۂ مائدہ کے خاص خاص مضامین

۱-----معاہدات کی پابندی کا عموماً ضروری ہونا

۲-----احکام شکار

۳-----حالت احرام میں شکار کا شرعی حکم

۴-----نیک باتوں میں تعاون کا حکم اور برے کاموں میں تعاون باہمی سے ممانعت۔

۵-----میتہ، خون، سؤر کے گوشت اور جھٹکے وغیرہ کی حرمت۔

۶-----روز غدیر تبلیغ ولایت کا حکم محکم اور اکمال دین واتمام نعمت کا اعلان۔

۷-----کلب معلم (شکاری کتے) سے شکار کا حکم۔

۸-----نکاح دائمی میں اسلام کی شرط اور زن کتابیہ سے عقد منقطع (متعہ) کی اجازت۔

۹-----ترکیب وضو

۱۰-----تیمم کا حکم اور اس کی ترکیب

۱۱-----دشمن قوموں کے ساتھ بھی انصاف کی تاکید

۱۲-----بارہ سردار

۱۳-----یہود و نصاریٰ کا دعویٰ کہ خدا ہمارا ہے اور اس کی رد

۱۴-----داخلہ فلسطین کی مہم میں قوم کا مامور کیا جانا اور اس کا انجام

۱۵-----واقعہ ہابیل وقابیل۔

۱۶-----قتل ناحق اور اس کا انجام

۱۷-----وسیلہ کا حکم

۱۸-----چور کی سزا

۱۹-----توریت میں قصاص کا حکم

۲۰-----ارتداد امت کا اندیشہ

۲۱-----آیت ولایت

۲۲-----یہود کا تصور کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور اس کی رد۔

۲۳-----رد نصاریٰ اور ابطال تثلیث

۲۴-----یہود اور مشرکین کے بالمقابل عیسائیوں کی تعریف

۲۵-----قسم توڑنے کا کفارہ

۲۶-----شراب اور جوئے کی حرمت

۲۷-----گواہی میں دو عادلوں کی ضرورت

۲۸-----حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نصاریٰ کے غلط عقائد سے برأت وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ

''اے ایمان لانے والو! معاہدوں کو پورا کرو''

باعتبار مضمون یہ مستقل آیت ہے چنانچہ اس پر پان کی شکل کا آیت کا نشان بھی اور ''ط'' وقف مطلق کی علامت بھی ہے اور ہمارے نقطہ نظر سے چونکہ بسم اللہ والی آیت ہر سورہ کا جز ہے لہٰذا حقیقتاً وہ آیت نمبر ا ہے اور پھر یہ آیت نمبر ۲ اور اس کے بعد والی آیت نمبر ۳ مگر چونکہ قرآن مجید کی تحریر میں شروع کے روایتی رواج کی پابندی اصطلاحی طور پر ایک تعبدی شکل اختیار کر گئی ہے اور عام طور سے قرآنوں میں اس پان والی شکل پر نمبر آیت کا نہیں لگاتے چنانچہ یہاں بھی نمبر ایک اس کے بعد والی آیت پر درج ہوتا ہے لہٰذا ہم نے بھی اسی کا تتبع کیا ہے۔ حالانکہ اس کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

''عقد کے معنی تو گرہ لگانے کے ہیں لیکن چونکہ معاہدہ دو آدمیوں کو ایک بات کا پابند بنا دیتا ہے اس لئے اسے عقد کہتے ہیں۔ نکاح وغیرہ کو بھی عقد اسی اعتبار سے کہتے ہیں کہ وہ دو نفوس کے درمیان کا ایک خاص معاہدہ ہے۔

یہاں جو ''عقود'' کا لفظ ہے، وہ سب معاہدوں پر حاوی ہے [1] وہ معاہدہ بھی جو بندوں کا اللہ کے ساتھ بتقاضائے عبودیت ہے کہ وہ اس

---

[1] ۔عن ابی عبداللہ قولہ: اوفوا بالعقود قال: بالعھود (علی بن ابراھیم)

کے احکام کی تعمیل کریں اور وہ بھی کہ جو دوسرے بنی نوع کے ساتھ معاہدہ ہو۔[1]

اس عموم کی بنا پر آیت قرآن، فقہ کے بہت سے احکام کا سرچشمہ ہوگئی اور وہ ایک اصول ہے جس سے بہت سے فروع فقہیہ کا استنباط ہوتا ہے۔

اس سے یہ قاعدہ بن گیا ہے کہ ہر معاہدہ میں جب تک خاص طور پر اس کے قابل ردوبدل ہونے کا ثبوت نہ ہو، اصل لزوم ہے یعنی اختیار فسخ کے لئے خصوصی دلیل کی ضرورت ہوگی جو اس عموم سے استثناء کا سبب ہو سکے ورنہ فطری طور پر یہ معاہدہ کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس کی پابندی ضروری ہے اور انسان کو اس کی مخالفت جائز نہیں ہے۔

أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ ۗ إِنَّ اللَّهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ ①

''تمہارے لئے چوپایہ کی قسم کے مویشی عموماً حلال ہیں سوان کے جن کا بیان تمہارے سامنے آئے گا[2] لیکن حالت احرام میں شکار کو حلال نہ سمجھنا۔ یقیناً اللہ جو چاہتا ہے، وہ احکام جاری کرتا ہے۔''

گوشت خوری کا جواز اور چوپایوں میں اصالت حلیت

اس میں پہلے تو گوشت خوری کا جواز بطور ایک عام قاعدہ کے اصول کی شکل میں بتایا ہے کہ سوا ان خاص چیزوں کے جن کی حرمت کا بیان آئندہ آئے گا، باقی مویشی جانوروں کا گوشت حلال ہے۔ دوسرے یہ حکم بتایا گیا ہے کہ حالت احرام میں شکار ناجائز ہے اور کسی دوسرے نے شکار کیا ہو تو اس کا گوشت کھانا بھی ناجائز ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۚ وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُوا ۘ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ②

''اے ایمان لانے والو! شعائر اللہ کی حرمت کو برباد نہ کرو اور نہ محترم مہینہ کی اور نہ قربانی کے جانور کی اور نہ گلے

---

[1] ۔العهود المؤكدة التي بينكم وبين الله والناس (جلالين)

[2] ۔وهو قوله: حرمت عليكم الميتة والدم الآية (مجمع البيان)

میں پٹے ڈالے ہوئے جانوروں کی اور نہ ان لوگوں کی حرمت کو جو مقدس گھر کی طرف رُخ کیے ہوئے اپنے پروردگار کے فضل وکرم اور خوشنودی کی طلب میں آرہے ہیں اور جب حرم سے باہر نکل جاؤ تو پھر شکار کرو اور کسی قوم سے مخالفت کہ انہوں نے تم کو مسجد حرام سے روکا تھا تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم بھی زیادتی سے کام لو اور ایک دوسرے کی نیکی اور پرہیزگاری میں مدد کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ کے غضب سے بچو۔ یقیناً اللہ سخت سزا والا ہے۔''

''شعائر اللہ'' یعنی اللہ کی نشانیاں [1] اس میں ہر وہ چیز داخل ہے جو اللہ کی طرف نسبت رکھتی ہے، چنانچہ دوسری جگہ صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ:۔

البدن من شعائر الله یعنی قربانی کے جانور شعائر الٰہیہ میں داخل ہیں لہٰذا یہاں جو شعائر اللہ کے لفظ کے بعد الھدی اور القلائد کا ذکر کیا گیا ہے، اسے عام لفظ کے بعد خصوصیت کے ساتھ اس میں کی بعض خاص فردوں کا نام لے کر بیان کرنے کے قبیل سے سمجھنا چاہئے کیوں کہ ھدی اور قلائد دونوں اسی قسم کے جانور ہیں جنہیں قربانی کے لئے لایا گیا ہے۔ جن کی قربانی ہوگئی وہ الھدی ہیں اور جنہیں گردن میں پٹا ڈال کر ساتھ رکھا گیا ہے کہ وقت آنے پر ان کی قربانی کی جائے گی وہ القلائد ہیں۔ [2]

شعائر الٰہیہ کی حرمت کے ساتھ ان انسانوں کی بھی عزت وحرمت جو رضائے الٰہی کے جادہ کے سالک ہوں

ان سب کی حرمت ہے اور ان کی حرمت کو برباد کرنے سے ممانعت کی جارہی ہے اور جب کہ وہ جانور جو بغرض قربانی لے جائے جارہے ہیں، شعائر الٰہیّہ ہیں تو وہ انسان کیوں کر قابل حرمت نہ ہوں گے جو رضائے الٰہی کے جادہ پر سالک ہیں چنانچہ صراحت کے ساتھ ان جانوروں کے تذکرہ کے بعد ان انسانوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اب اگر اُن جانوروں کا احترام مطلوب باری ہے تو ان انسانوں کی تعظیم وتکریم جو اپنی پوری زندگی راہِ خدا میں صرف کردیں اور آخر میں اس کی راہ میں نثار ہوجائیں، داخل شرک کیوں کر ہوسکتی ہے؟

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَآ أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۗ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ۚ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۚ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۚ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ

---

[1] ۔ جمع شعیرۃ ای معالم دینہ (جلالین) نشانیہائے خدا (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ التقلید فی البدن ان یعلّق فی عنقها شئی لیعلم انّها هدی (مجمع البیان) جن کے گلے میں پٹہ ڈال کر لے جاویں کعبہ کو (شاہ رفیع الدین)

دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳

''تم لوگوں پر حرام کیا گیا ہے مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور جسے اللہ کے سوا کسی کا نام لیکر ذبح کیا جائے اور گلا گھوٹا ہوا اور لکڑی وغیرہ سے مارا ہوا[1] اور بلندی پر سے گر کر مرا ہوا اور کسی جانور کے سینگ مارنے سے ہلاک شدہ اور جسے درندہ نے کھایا ہو مگر وہ جسے تم نے ذبح کر لیا ہو اور جو بتوں پر قربانی کی جائے اور یہ کہ تم جوئے والے تیروں سے حصّے نکالو[2] یہ ایک بڑی بدکرداری ہے۔ آج کافر لوگ تمہارے دین کی طرف سے ناامید ہو گئے ہیں تو ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کر لیا[3] تو جو شخص بھوک میں لاچار ہو گیا جب کہ گناہ کا مرتکب نہ ہو تو یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

حیوانی قسم کی حرام غذاؤں کے بیان میں آیت اکمال دین جو یقیناً اس سے الگ خاص موقع پر اتری ہے

آیت کا مضمون پڑھ جایئے، شروع میں محرمات کا بیان ہے اور آخر میں یہ ہے کہ:۔

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ

مگر جو شخص بھوک میں لاچار ہو جائے جبکہ گناہ کا مرتکب نہ ہو۔ یہ ٹکڑا پہلے کے بیان کردہ احکام تحریم سے بالکل چسپاں ہے جیسا کہ اس کے پہلے پارۂ دوم میں آچکا ہے۔ حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿البقرۃ: ۱۷۳﴾

بالکل ویسا ہی یہاں ہے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۘ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ

بس وہاں الْمَيْتَةَ کا ایک لفظ کہا گیا جس میں مُنْخَنِقَةُ وغیرہ سب درج ہیں اور یہاں میتة کے بعد ان اقسام کا صراحتاً ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد جیسے وہاں اس کے بعد تھا: فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ وہاں اس کے بعد تھا: غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ویسے یہاں ہے غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ وہاں آخر میں تھا: فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ یہاں آخری الفاظ ہیں فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ------ بالکل شروع سے آخر تک وہی مضمون ہے یا نہیں اور اوّل سے آخر بالکل چسپاں ہے یا نہیں؟ مگر یہاں نہ معلوم کیوں کر اس اوّل اور اس آخر کے درمیاں الگ کا ایک مضمون اس آیت کا جز بن کر درج ہو گیا ہے کہ:۔

---

[1] ۔ المقول ضربا (جلالین) آنچہ سنگ یا عصا مردہ باشد (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ دس پانسے تھے، کسی پر لکھا آدھا کسی پر پاؤ، کم یا زیادہ کوئی خالی۔ پھر بانٹنے لگتے تھے تو ہر ایک کے نام پر جو پانسا آیا، وہی حصّہ اس کو ملا یا خالی نکل گیا (موضح القرآن)

[3] ۔ اختیار کردم اسلام را دین برائے شما (شاہ ولی اللہ) پسند کیا واسطے تمہارے اسلام دین (شاہ رفیع الدین)

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ

آج کافر تمہارے دین کی طرف سے ناامید ہو گئے ہیں۔آج میں نے تمہارے دین کو کامل کیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کی اور تمہارے لئے بحیثیت دین اسلام کو پسند کر لیا۔

اسکا اوّل و آخر سے کچھ بھی تعلّق محسوس ہوتا ہے؟

اور پھر جس طرح وہ بیچوں بیچ میں کھپی ہوئی ہے،کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مستقل آیت ہے جو کسی اور موقع پر نازل ہوئی تھی مگر اس کو کیا کیا جائے کہ خود اس کا مضمون اُس کے مستقل ہونے اعلان کر رہا ہے،اس لئے اُسے مستقل سب ہی کو ماننا پڑتا ہے چنانچہ شاہ عبدالقادر دہلوی فرماتے ہیں:۔

''فائدہ یہ جو فرمایا کہ آج پورا دین تمہارا ہو چکا،یہ آیت آخر کو اُتری ہے کہ سب احکام اللہ کے نازل ہو چکے تھے،اس کے بعد تین مہینے حضرت زندہ رہے ہیں'' (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں محرّمات والے جز کے بعد ''ذلکم فسق'' پر ختم ہوتا ہے،بعد والے جز سے بیچ میں لکھا ہے:

''ونزل بعدفة حجّة الوداع. اليوم يئس الذين كفروا من دينكم''

''اور عرفہ کے دن حجۃ الوداع میں یہ آیت اُتری کہ'' آج کافر تمہارے دین سے نا اُمید ہو گئے،آج میں نے تمہارا دین کامل کیا'' الخ

لیجیے انہوں نے تو زمانہ نزول بھی بتا دیا کہ وہ حجۃ الوداع میں اتری ہے مگر تاریخ عرفہ یعنی ۹ ذی الحجہ بتا رہے ہیں۔

اس کے بعد جب کچھ مستند احادیث اس آیت کی تاریخ نزول یہ بتلا رہے ہیں کہ وہ ۱۸ ذی الحج کو مقام غدیر خم میں رسولؐ نے حضرت علی بن ابی طالبؑ کو منبر پر بلند کر کے فرمایا تھا کہ: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ ''جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے'' تو ان احادیث کے ماننے میں کسی کو عذر نہ ہونا چاہیے۔چنانچہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے ہمارے طرق سے تو یہ وارد ہے ہی۔[1] بعض علمائے اہل سنت بھی اس سے متفق ہیں۔

شکاری کتے کے شکار کی حلیت

اس کے لحاظ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دین پورے ہونے کا اعلان اس بنا پر نہیں ہے کہ سب احکام اللہ کے نازل ہو چکے تھے۔احکام کا تعلق تو شریعت سے ہے،نہ کہ اصول دین سے بلکہ یہ اعلان اس لئے ہے کہ آج تحفظ دین کے اس نظام کا اعلان ہو گیا ہے جو رسولؐ کے بعد قائم و دائم رہے گا۔

موصوف کا یہ ارشاد کہ ''اس کے بعد تین مہینے حضرت زندہ رہے ہیں'' یہ غالباً اُسی ۹ ذی الحج کی تاریخ کے لحاظ سے ہے۔ورنہ صحیح حساب تو یہ ہے کہ اس کے بعد ڈھائی مہینے حضرت زندہ رہے اور بس۔

---

[1] ۔روی عن ابی جعفر و ابی عبداللہ علیہما السلام (تبیان) عن محمد بن مسلم عن ابی جعفر قال: اٰخر فریضة انزلها الله الولاية ثم لم يزل بعدها فريضة (علی بن ابراهيم)

مگر یہ حیرت ہر ایک متجسس ذہن کو بہر حال ہونا چاہیئے کہ اس صورت میں یہ آیت حرام جانوروں کی حرمت اور عالم اضطرار میں اُن کی حلیت، دونوں کے درمیان حدِ فاصل بن کر آخر کیوں کر وارد ہوگئی؟

اور اس نظیر کے ہوتے ہوئے جب بائیسویں پارے کے شروع حصّہ میں سورۂ احزاب کی آیۂ تطہیر کو ہم کہتے ہیں کہ وہ مستقل آیت ہے جس کے لئے بین الفریقین شان نزول کے روایات اور احادیث موجود ہیں تو سیاق و سباق کو پیش کر کے اس کا قطعی انکار کرنا کہاں درست ہوسکتا ہے؟!

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴

''آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا چیزیں اُن کے لئے حلال قرار دی گئی ہیں؟ کہیے کہ سب اچھی پاک صاف چیزیں تمہارے لئے حلال ہیں اور جو تم نے شکاری کتّے [1] سدھا کے انہیں اُس ہنر سے جو اللہ نے تمہیں دیا ہے سکھایا ہو تو جسے وہ تمہارے لئے پکڑ لیں، اُس میں سے کھا سکتے ہو اور اُس پر (شکار پر چھوڑنے سے پہلے) اللہ کا نام لے لو اور اللہ کے غضب سے بچو، یقیناً اللہ تیزی کے ساتھ حساب لینے والا ہے''۔

محرمات کا بیان نام لے لے کر کرنا اور حلال چیزوں کے سوال پر اجمالی طور پر یہ کہہ دینا کہ:۔ احل لکم الطیبٰت ''جتنی اچھی پاک صاف چیزیں ہیں، سب ہی حلال ہیں'' یہ اشیا میں اصالت حلّیت کی دلیل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حرمت کے لئے ثبوت کی ضرورت ہے، خواہ وہ طبعی طور سے نفرت کی چیز ہو جو خبائث میں سے ہونے کا معیار ہے اور خواہ دلیل خاص سے از روئے شرع اُس کی حُرمت ثابت ہو اور جب تک ان دونوں میں سے کوئی ایک بات نہ ہو، ہر شے کو حلال ہی سمجھنا چاہیے۔

اس ذیل میں جانوروں کے بارے میں ایک طریقۂ حلّیت تو ابھی تک عام طور سے معلوم تھا کہ انہیں ذبح کیا جائے تو ذبیحہ ہو کر اُن کا کھانا جائز ہوگا۔ یہاں ان کے حلال ہونے کا ایک اور طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ کہ شکاری کتوں کے ذریعے سے تم نے اُن کا شکار کیا ہے تو بھی وہ حلال ہوں گے۔ بے شک جیسے وہاں چھری چلاتے وقت اللہ کا نام لیتے ہو، ویسے ہی یہاں ان کتوں کو شکار پر چھوڑتے وقت اللہ کا نام لے لو۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو نہ وہ چھری کا مارا ہوا حلال ہوگا اور نہ جانور کا پکڑا ہوا۔

اسی تنبیہ کے لئے آخر میں اللہ کے غضب سے بچنے کی تاکید اور حساب آخرت کی یاددہانی کی گئی ہے۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ

---

[1] ۔واذکروا اسم اللہ علیہ قبل الارسال ـــ وقیل معناہ اذکروا اسم اللہ علی ذبح ما تذبحونہ ـــ والقول الاول اصح (مجمع البیان)

وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۵

''آج تمہارے لئے سب اچھی پاک صاف چیزیں حلال کی جا چکی ہیں اور اہل کتاب کا اناج[1] تمہارت لئے حلال ہے اور تمہارا اناج اُن کے لئے حلال ہے اور پاک دامن مسلمان عورتیں اور پاک دامن عورتیں اُن میں سے جنہیں تمہارے پہلے کتاب ملی ہے، جب اُن کی اجرتیں دے دو پاک دامنی کا تحفّظ کرتے ہوئے، نہ کہ بے محابا شہوت رانی کرتے ہوئے اور نہ خفیہ طور پر ناجائز تعلقات قائم کرتے ہوئے اور جو ایمان کے بجائے کفر اختیار کرے، اُس کے سب اعمال اکارت گئے اور وہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا''۔

اہل کتاب کے ساتھ غلہ کی خرید وفروخت اور ان کی عورتوں کے ساتھ عارضی طور پر تعلق ازدواجی یعنی متعہ کی اجازت ہے

پہلے جو حلّیت کا بیان تھا، وہ صرف کھانے کی چیزوں سے متعلق تھا، اب اس حکم کی تکرار کے ساتھ کہ آج تمہارے لئے اب اچھی پاک صاف چیزیں حلال ہیں اور ''آج'' کا مطلب ہے ''اس شریعت میں'' کیونکہ شرائع سابقہ میں بعض سخت احکام نافذ تھے۔ اس شریعت میں آسانی عطا کرتے ہوئے وہ سخت احکام برطرف کر دیے گئے۔

اس کے بعد حلّیت کے دائرہ کو وسیع کرتے ہوئے اب اس کے دامن کو ''کھانے پینے سے بڑھا کر دوسری قسم کے افعال تک وسیع کر دیا گیا ہے جس میں پہلی چیز یہ ہے کہ اناج کی تجارت اس وقت یہودیوں کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمانوں کو غلّہ ان سے خریدنا بھی ہوتا تھا اور بعض وقت باہر سے لا کر اُن کے ہاتھ بیچنا بھی ہوتا تھا تو کچھ لوگوں کو اس میں تردّد ہوتا تھا کہ جب کفار سے ترک موالات کا حکم ہے تو یہ خرید وفروخت اُن کے ساتھ کہاں تک جائز ہے؟ اس کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ اُن کا اناج تمہارے لئے اور تمہارا اناج اُن کے لئے، دونوں باتیں حلال ہیں یعنی تم اُن سے خرید بھی سکتے ہو اور اُن کے ہاتھ فروخت بھی کر سکتے ہو۔

اس کا نجاست اہل کتاب کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس فقرہ سے یہ بتانا نہیں ہے کہ ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا تمہارے لئے جائز ہے۔ اگر یہ ہوتا تو پہلا فقرہ تو ٹھیک ہوگا کہ ان کا کھانا تمہارے لئے جائز ہے مگر دوسرا کہ تمہارا کھانا ان کے واسطے جائز ہے، اس کا کوئی محل نہ

---

[1] ۔یختصّ عندا اصحابنا بالحبوب۔ (تبیان)

ہوگا۔

چنانچہ احادیث میں لفظ طعام کی تفسیر اس آیت میں ''حبوب'' یعنی اناج کے ساتھ ہوئی۔[1]

اور کہ حکم اہل کتاب سے مخصوص نہیں ہے مگر چونکہ مدینہ میں سابقہ تجارت میں انہی کے ساتھ تھا، اس لئے ان کا نام لیا گیا۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس آیت کے ایک اور معنی قرار دیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

''یعنی آنچہ براہل کتاب حلال بود شما حلال است مثل گو سفند و گاد وآنچہ بر شما حلال کردہ شد بر کسی کہ از ایشاں مسلمان شود حلال است مثل شتر وذی ظفر و قبیلۂ یہود ونصاریٰ را درین باب اعتبار نیست''۔(فتح الرحمٰن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ''اہل کتاب کا کھانا'' اس کے معنی ہی ''اہل کتاب کے یہاں جو کھانا حلال ہے'' اور ''تمہارا کھانا'' یعنی ''جو کھانا تمہارے لئے حلال ہے'' ------اس مفہوم کو الفاظ آیت سے ہم بعید سمجھتے ہیں لیکن اس صورت میں بھی پاک اور نجس کے مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں قرار پاتا۔

اب جب حلّیت کا ذکر ما کولات سے آگے بڑھ کر معاملات تک پہنچ ہی گیا تو اس کے بعد معاملۂ ازدواج کا بھی تذکرہ کر دیا گیا کہ نکاح مسلمان ہی عورتوں سے کرنا چاہیے یعنی غیر مسلم عورتوں سے نکاح جائز نہیں ہے۔ اس کے بعد مسلمان خواتین کے علاوہ اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ تعلق ازدواجی قائم کرنے کی اجازت دی گئی مگر اس شرط کے ساتھ کہ اُن کی اجرتیں اُنہیں دے دو اور اجرت چونکہ عقد منقطع یعنی متعہ میں ہوتی ہے، اس لئے فقہ اہل بیت علیہم السلام میں یہ حکم ہوا کہ نکاح سوا مسلمان عورت کے کسی کے ساتھ نہیں ہوسکتا ہے کیوں کہ وہ تو محدود ضرورت کی بنا پر ہوا کرتا ہے اور اسی لئے یہ کہا گیا کہ تم اُن کے ساتھ زنا کاری اور ناجائز آشنائی سے بچنے کی خاطر متعہ کرلو، نہ کہ جنسی ہوس کی رو میں۔

یہ زنا کاری وغیرہ سے بچنا اتنا اہم مقصد ہے کہ اس کے لئے عارضی ازدواج میں اہل کتاب کی حد تک اسلام کی شرط ختم ہوگئی لیکن کتنی افسوس ناک بات ہے کہ جمہور اہل اسلام نے مطلق طور پر مسلم خواتین کے ساتھ بھی عارضی ازدواج کا سدباب کر کے جنسی بے راہ روی کے سدباب کا حکیمانہ ذریعہ جو شریعت میں قرار دیا گیا تھا، اسے ہمیشہ کے واسطے بند کر کے سیہ کاریوں کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھول دیا۔ ممانعت متعہ کی خرابی پر یہی تبصرہ تھا حکیم الاسلام حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کا کہ:

لو لا نہیٰ عمر عن المتعة ما زنیٰ الّا شقی

''اگر (خلیفہ دوم) عمر نے متعہ سے ممانعت نہ کی ہوتی تو سوا انتہائی بد بخت شخص کے کوئی زنا نہ کرتا۔

دوسری روایت میں ہے:

ما زنیٰ الّا شقی

یعنی سوا اقل قلیل کے کوئی اس جرم کا مرتکب نہ ہوتا۔

بہت ممکن ہے کہ آخر میں جو تہدید ہے کہ:

---

[1] ۔عنی بطعامهم الحبوب والفاکهة (علی ابن ابراهیم) هو المروی عن ابی عبدالله علیہ السلام (مجمع البیان)

ومن یکفر بالایمان فقد حبط عمله

جو ایمان کے بجائے کفر اختیار کرے، اس کے سب اعمال اکارت گئے۔

یہ اپنے عموم کے ساتھ حکم شرعی کے اس قسم کے انکار کو بھی شامل ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶

”اے ایمان لانے والو! جب تم نماز کے لئے کھڑے ہونے لگو![1] تو اپنے منہ اور کہنیوں تک کے ہاتھوں کو دھوؤ اور اپنے سر میں مسح کرو اور پیروں کا گٹوں تک! اور اگر حالت جنابت میں ہو تو غسل کرو اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی پیشاب پائخانہ کر کے آیا ہے، یا عورتوں سے تم نے مقاربت کی ہے اور پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر لو، اس طرح کہ اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کو مل لو۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر سختی کرے مگر یہ ضرور چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرنے کا سامان کر دے اور اپنی نعمت تم پر پوری کرے، شاید کہ تم شکر گزار رہو“۔

وضو کی ترکیب اور بوقت ضرورت تیمم کا حکم

اس آیت میں وضو کی ترکیب ہے اور تیمم کی، خواہ بدل وضو ہو یا بدل غسل ہو،-------چنانچہ سب سے پہلے وضو کی ترکیب کا بیان ہے جس کے حسب ذیل اجزاء جو واجب ہیں بیان ہوئے ہیں:

پہلے چہرے کا دھونا۔ یہاں احادیث سے جو استفادہ ہوتا ہے وہ چہرے کے حدود کا تعین ہے، نہ کہ چہرہ میں کسی قید کا کہ وہ کہاں تک دھویا جائے۔

دوسرے ہاتھ کا دھونا۔ اس میں جو الی المرافق ”کہنیوں تک“ کا لفظ ہے، اس سے اہل سنّت کی فقہ میں دھونے کا یہ طریقہ سمجھ لیا گیا

---

[1] ۔ مسح کرو سروں اپنوں کو اور پاؤں اپنوں کو گٹوں تک (شاہ رفیع الدین)

کہ انگلیوں سے کہنی کی طرف ہاتھ لے جا کر الٹا دھویا جائے، مگر تفسیر اہل بیتؑ کی بنا پر مذہب شیعہ یہ ہے [1] اور بعض تفاسیر اہل سنت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے [2] کہ یہ "الی المرافق" ہاتھ کے اُس حصّہ کی مقدار کا پتہ دینے کے لئے ہے جسے دھویا جائے مگر دھویا کس طرح جائے؟ اُسے اس لفظ میں نہیں بتایا جا رہا ہے۔

''کہنی تک کے ہاتھ دھوؤ'' مگر دھوؤ کس طرح؟

اس کا فطری طریقہ یہی ہے کہ ہاتھ کہنیوں سے انگلیوں کی طرف لے جاؤ، اُلٹا نہیں۔ [3]

تیسرے سر کا مسح۔ اس میں فقہ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیم یہ ہے کہ سر کے آگے کے حصّے کا بقدر مسمّٰی مسح کیا جائے اور اس کی استحبابی حد تین انگلیوں بھر ہے۔ اس کے لئے زرارہ نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ قرآن کے الفاظ سے کیوں کر نکلتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: لمکان الباء، یعنی بِرُؤُسِکُمْ میں جو ب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر پورے سر کا مسح ہوتا تو اَمْسِحُوْا رُؤُسَکُمْ کہا جاتا۔ ''ب'' کی ضرورت نہ تھی------ ''ب'' کے آنے سے یہ مفہوم پیدا ہو گیا کہ سر کے اندر کسی جز کا مسح کرنا ہے۔ پورے کا نہیں۔

چوتھے پیروں کا مسح۔ مگر یہاں فقہائے امت میں یہ عجیب اختلاف پیدا ہو گیا کہ اکثریت پیرونکے دھونے کی قائل ہو گئی۔ یعنی انہوں نے اَرْجُلَکُمْ کا عطف بِرُؤُسِکُمْ پر لینے کے بجائے جس کے قبل مسح کا حکم ہے، لے جا کر وُجُوْهِکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ پر عطف قرار دے دیا جس سے دھونے کا حکم پیدا ہو جائے گا۔ مگر یہ اس فطری مفہوم کے بالکل خلاف ہے جو ان الفاظ قرآنی سے ہر ذہن میں آ سکتا ہے۔

وضو کی ترکیب ختم ہونے کے بعد اجمالی طور پر غسل کا حکم بیان ہوا کہ اگر جنابت کی حالت ہے تو اُس سے طہارت کا جو طریقہ ہے، وہ اختیار کرو۔

ظاہر ہے کہ یہاں بھی اگر معلّم شریعت کی زبان سے غسل کی ترکیب معلوم نہ ہوتی تو الفاظ قرآن سے کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا کہ جنابت سے پاک ہونے کا کیا طریقہ ہے؟

اس کے بعد تیمم کا حکم بیان ہوا کہ اگر تم میں کا کوئی پائخانہ جا چکا ہے یعنی حدثِ اصغر ہے جس کے دور کرنے کے لئے وضو کی ضرورت ہے۔

یہاں بھی حدث اصغر کی ایک فرد پائخانہ کا نام قرآن نے لیا اور کیا کیا چیزیں موجباتِ وضو ہیں؟ وہ سب سنّت سے ثابت ہوئی ہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ''یا عورت سے مقاربت کی ہے'' یہ حدث اکبر ہے جس کے دور کرنے کے لئے غسل کی ضرورت ہے۔ یہاں بھی بس ایک قسم کے حدث اکبر یعنی جنابت اور اس کی بھی ایک صورت یعنی مقاربت کا ذکر ہوا ہے۔

یہ ہمیں دوسرے ذرائع کی بنا پر معلوم ہوا ہے کہ حدث اکبر کے جنابت کے علاوہ بھی اقسام ہیں اور جنابت بغیر فعلِ مقاربت بھی ہوتی ہے۔

---

[1] ۔یجب عندنا غسل الایدی من المرافق------والی فی الآیته بمعنی مع کقوله: ولاتاکلوا الی اموالهم الی امر الکم (تیبان)

[2] ۔الی المرافق ای معها کما بینته السنّة (جلالین)

[3] ۔یعنی من المرافق (علی بن ابراهیم)

بہر حال ان دونوں صورتوں میں یعنی خواہ حدث اصغر کی حالت ہے جس کے دفعیّہ کے لئے وضو کی ضرورت ہے اور خواہ حدث اکبر ہے کس کے دور کرنے کے لئے غسل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر پانی موجود نہیں ہے یا بیمار ہے یا حالت سفر ہے اور سواری سے اتر کر پانی تک نہیں جا سکتا تو ان سب صورتوں میں تیمم کرے۔

تیمم کیا ہے؟ یعنی پاک مٹی کے پاس جاؤ اور اس سے چہرہ اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔

چہرہ اور ہاتھ کتنے؟ یہ بھی یہاں تو مذکور ہے نہیں۔ ہاں معلوم ہے کہ چہرہ میں پیشانی کا مسح ہونا چاہیے ناک کے اوپر کے حصّہ تک اور ہاتھوں کی پشت پر مسح ہونا چاہیے۔

ایک ہی ضرب سے یا دو ضربوں سے؟ اس کا قرآن مجید میں تو ذکر ہے نہیں اور حدیثیں مختلف ہیں۔ اس لئے علماء میں بھی اختلاف ہو گیا ہے۔ قولِ قوی یہ ہے کہ بدلِ وضو میں ایک ہی دفعہ ہاتھوں کو خاک پر مار کے چہرے اور ہاتھوں کو مسح کرے اور بدل غسل میں دو ضربی تیمم کرے یعنی ایک دفعہ خاک پر ہاتھ مار کے چہرہ کا اور دوسری دفعہ ہاتھ مار کے ہاتھوں کا مسح کرے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷

”اور یاد کرو اللہ کی بڑی نوازش کو [1] جو تمہارے لئے ہے اور اس کے اُس عہد و پیمان کو جو اس نے تم سے لیا ہے، جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور مانا اور اللہ کے غضب سے بچو، یقیناً اللہ سینوں کے اندر کی باتوں کا جاننے والا ہے“۔

یہ عہد و پیمان ایک مسلمان اللہ اور رسولؐ کے ساتھ اسی وقت کر لیتا ہے جب وہ اسلام قبول کرتا ہے کیوں کہ اطاعت و متابعت، اسلام کے معنی کا لازمی جزء ہے اور پیغمبر خداؐ اس مضمر تقاضے کو عالم ظہور میں بھی لے آتے تھے اس بیعت کے ساتھ جو ہر نو مسلم سے لی جاتی تھی اور جو مسلم گھرانے میں پیدا ہوا ہے، وہ پیدائش کے ساتھ ہی اس عہد و پیمان میں گرفتار ہے، چاہے شعوراً سے اسی وقت ہو کہ جب وہ سن شعور کو پہنچے اور پھر وہ شعوری طور پر اسلام کی راہ کو اختیار کر کے اُسی پر قائم و برقرار رہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸

---

[1] ۔ لم یقل نعم اللہ للاشعار بعظم النعمۃ (مجمع البیان)

''اے ایمان لانے والو! تم اللہ کے عائد کردہ فرائض کی تکمیل کے ذمہ دار [1] اور عدل وانصاف کے ساتھ گواہ رہو اور کسی قوم کی مخالفت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے [2] کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرتے رہو، یہی پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے اور اللہ کے غضب سے بچو، یقیناً جو تم کرو، اللہ اس سے باخبر ہے''۔

عدل وانصاف میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں

اس آیت سے ایک بااقتدار مسلم حکومت کی ذمہ داری غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ بھی نمایاں ہوتی ہے کہ اُسے حقوق وحدود کے معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم رعایا میں امتیاز برتنا درست نہ ہوگا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۹

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝۱۰

''اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن سے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے کہ اُن کے لئے بخشش ہے اور بہت بڑا اجر وثواب اور جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، یہ دوزخ والے ہیں''۔

یہاں دو قسم کے اشخاص کا ذکر ہے:۔

ایک وہ جن سے قطعی وعدہ نجات اور اجر وثواب کا ہے۔ یہ وہ جن میں ایمان اور عمل صالح دونوں شرائط موجود ہوں۔

دوسرے وہ کافر ہیں یعنی ایمان ہی کی صفت سے معرّا ہیں۔ ان کے لئے قطعی طور پر دوزخ کا اعلان ہے۔

مگر ایک درمیانی قسم رہ جاتی ہے، وہ وہ ہیں جنہوں نے کفر وتکذیب سے کام تو نہیں لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے ایمان کے دائرہ میں تو رہے مگر جو ایمان کے عملی تقاضے ہیں، انہیں پورا نہ کر کے عمل صالح کے جوہر سے محروم رہے۔ یہ نہ اس پہلے والے قطعی وعدہ میں داخل ہیں، نہ دوسرے قطعی وعید میں بلکہ یہ وہ ہیں کہ ان کی مغفرت کا بھی امکان ہے اور یہ بھی کہ اُن کی بداعمالیوں کی سزا دی جائے جس کے بعد ان کو نجات حاصل ہو۔

ہاں تصوّری طور پر ذہن میں ایک چوتھی قسم بھی آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ عمل صالح ہو بغیر ایمان کے، بادی النّظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ قسم بھی اُس وعد اور وعید دونوں سے خارج ہے مگر چونکہ اعمال کی صحت میں ایمان کی شرط ہے اور بغیر ایمان کوئی عمل قبول ہی نہیں، اس لئے حقیقت کے لحاظ سے بغیر ایمان اعمال صالحہ کا وجود ہی نہیں ہوسکتا اور مشاہدہ جس کا گواہ قرار پاسکتا ہے وہ خود عمل ہے، نہ کہ اس کی وہ صفت جو کہ اُسے ''عمل صالح'' کا مصداق قرار دے۔

پھر یہ کہ ایمان کے ساتھ تو پہلی قسم میں حرف عطف کے ساتھ عملوا الصّالحات کی قید تقریباً ہر جگہ لگی ہے اور وہ یہاں بھی موجود ہے

---

[1] ۔متعھّد حق اللہ باشید (شاہ ولی اللہ)، ہوجاؤ تم قائم رہنے والے واسطے اللہ کے (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔لا یحملنّکم (تبیان)

مگر دوسری قسم میں کفروا و کذّبوا بآیٰتنا کہا گیا ہے، یہاں حرف عطف کے ساتھ جو اضافہ ہوا ہے، وہ تتمہ کفر ہی ہے، کوئی اور چیز نہیں ہے۔اس کے آگے جیسے وہاں عملوا الصّالحات ہے، ویسے یہاں بلکہ غالبا کہیں: وعملوا السیّئٰت نہیں کہا گیا ہے تا کہ وعید میں بھی کفر کے علاوہ بداعمالیوں کی شرط ہو لہٰذا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ عمل صالح ہو بغیر ایمان کے تو وعد اور وعید دونوں سے خارج ہے بلکہ پہلی شق یعنی وعد میں چونکہ ایمان کے ساتھ وعملوا الصّحات ہے تو وہاں یہ قسم کہ ایمان ہو اور عمل صالح نہ ہو، وعد سے خارج ضرور ہے لیکن دوسری جگہ یہ قسم کہ کفر ہو اور اعضاو جوارح کے افعال میں بداعمالی نہ ہو، وعید کے دائرہ سے لفظاً بھی خارج نہیں ہے۔الفاظ سے ظاہر ہے کہ کفر کی صورت میں اعمال پر نظر ہی نہیں ڈالی جاتی کہ ہو وہ کیسے ہیں؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱

''اے ایمان لانے والو! اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے یاد کرو جب کہ ایک جماعت نے ارادہ کیا کہ وہ تمہاری جانب دست درازی کریں تو اللہ نے اُن کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا، اور اللہ کے غضب سے بچو اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے اہل ایمان کو''۔

مفسرین نے اس کو کسی خاص واقعہ سے متعلق قرار دیا ہے جو اُس کے شان نزول کی حیثیت رکھتا ہے مگر اس میں اتنا اختلاف ہے کہ گویا جتنے منہ اتنی باتیں۔کوئی کہتا ہے کہ یہود کا قبیلہ نضیر تھا جس کے قلعہ میں پیغمبر خداؐ کچھ اصحاب کے ساتھ تشریف لے گئے تو اُس نے اس موقع پر آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا مگر خداوند عالم نے اس کی اطلاع رسولؐ کو دے دی اور حضرتؐ واپس تشریف لائے اور اس طرح بال بال بچ گئے۔

کوئی کہتا ہے: قریش نے ایک آدمی کو حضرتؐ کے قتل کرنے کے لئے بھیجا۔وہ جب آیا تو حضرتؐ کے ہاتھ میں ایک کھینچی ہوئی تلوار تھی۔اُس نے کہا ذرا مجھے تو دکھایئے، آپ نے وہ تلوار اُسے دے دی۔جب وہ تلوار اس کے ہاتھ میں آ گئی تو کہنے لگا اب مجھے آپ کے قتل سے کون روک سکتا ہے؟ حضرت نے بے ساختہ فرمایا ''اللہ''۔۔۔۔۔۔۔بس یہ سننا تھا کہ اُس پر اثر ہوا، تلوار پھینک دی اور مسلمان ہو گیا۔

کوئی کہتا ہے کہ مشرکین نے ایک دفعہ مسلمانوں پر حملہ کا ارادہ کیا تھا کہ وہ طرح طرح کے مصائب میں گرفتار ہو گئے اور حملہ نہ کر سکے۔اسے قرآن کہہ رہا ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ حضرتؐ جب ایک قبیلہ سے جنگ کے لئے تشریف لے گئے ہیں اور اُس موقع پر اپنی جماعت سے جُدا ہو کر تنہا جنگل میں ایک جگہ لیٹے ہوئے تھے کہ اُن کا سردار تلوار لے کر آ گیا اور کہا آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا ''اللہ'' جس کے بعد وہ مُسلمان ہو گیا۔

اتنے شدید اختلاف اقوال [1] کے بعد یہ فیصلہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اصل شان نزول آیت کیا ہے؟

ایک اور قدیم تفسیر یہ ہے کہ یہ مشرکین کے عام رویّہ کا ذکر ہے جو ہجرت مدینہ کے بعد رہا کہ وہ مسلمانوں کا قلع قمع کر دینا چاہتے تھے اور پھر صلح حدیبیہ کے ذریعے سے اللہ نے اُن کے ہاتھوں کو مسلمانوں کی ایذا رسانی سے روک دیا۔ [2]

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَىْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ⑫

''اور بلاشبہ اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لیا اور ہم نے اُن میں بارہ سردار مقرّر کیے اور اللہ نے کہا کہ یقیناً میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم رکھو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ گے اور ان کو تقویت پہنچاؤ گے اور اللہ کو قرضۂ حسنہ دو گے تو میں تمہاری غلطیوں کی تلافی کروں گا اور تمہیں داخل کروں گا اُن بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی مگر جو تم میں سے اس کے بعد کفر اختیار کرے گا تو وہ بلاشبہ سیدھے راستے سے بھٹکا ہوا ہوگا''۔

ایک حدیث پیغمبر خداؐ کی جمہور اُمت میں مسلّم ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا جو کچھ بنی اسرائیل میں ہوا ہے، وہ اس امت میں بھی ہوگا۔ اس لئے بنی اسرائیل کے واقعات بڑی کثرت سے قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں چنانچہ بنی اسرائیل میں بارہ نقیب یعنی سردار ہوئے تو رسول خداؐ نے فرمایا کہ میری امت میں بھی میرے بعد بارہ سردار ہوں گے۔ وہی میرے جانشین ہوں گے۔

یہ دوازدہ امام کا اعلان ہے جو تمام مسلمانوں میں متفق علیہ ہے۔ اس صورت میں حیرت ہوتی ہے کہ پوری اُمّت نے ''اثنا عشری'' ہونے سے کیوں گریز کیا؟

اس موقع پر شاہ عبدالقادر برادر شاہ عبدالعزیز دہلوی صاحب تحفہ کا نوٹ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

''یہ بیان فرمایا بنی اسرائیل سے عہد لیا، حضرت موسیٰؑ کی آخر عمر میں یہ اقرار لیتے ہیں، یہ سورت آنحضرتؐ کی آخر عمر میں نازل ہوئی۔ شاید ہم کو سنایا اسی واسطے کہ ہم کو بھی یہی تقیّد ہے۔ ایک عہد اس امت سے تھا کہ رسولؐ جو بعد میں پیدا ہوں اُن کی مدد کرو۔ اس کے بدل ہم

---

[1] ۔اختلفوا فی الباسطین ایدیھم علیٰ خمسۃ اقوال (تبیان)

[2] ۔یعنی اھل مکۃ من قبل ان فتحھا فکفّ ایدیھم بالصلح یوم الحدیبیہ (علی بن ابراھیم)

سے یہ عہد ہے کہ خلفاء کی اطاعت کرو۔ یہ مذکور بارہ سرداروں کا بیان فرمایا اسی اشارہ کو کہ حضرتؐ نے بتایا ہے میری اُمت میں بارہ خلیفہ ہوں گے قوم قریش سے''۔ (موضح القرآن)

بس اس میں اتنا اور اضافہ درکار ہے کہ ان بارہ سرداروں کے لئے خالق کا اعلان ہے کہ انہیں ہم نے مقرر کیا تھا یعنی جمہور اُمّت کے مقرر کردہ نہ تھے لہٰذا یہ بارہ خلفاء بھی جو رسولؐ کے بعد اس اُمت میں ہیں، اُمت کے اجماع یا شوریٰ سے منتخب کردہ خلفاء نہیں ہیں بلکہ یہ وہی بارہ جانشین رسولؐ کے ہیں جو اللہ کے منتخب کردہ ہیں اور ان کی اطاعت اس اُمّت پر اُسی طرح فرض قرار پاتی ہے جس طرح بنی اسرائیل پر اُن رسولوں کی اطاعت فرض تھی جو ان کی طرف من جانب اللہ مبعوث ہوئے تھے۔ اس کے لئے شاہ صاحب کا آخری فقرہ سن لیجئے کہ:۔

''فرمایا ہے کہ جو خرابی ہوئی پہلی اُمّت میں، سو ہوگی تم میں بھی ۔۔۔۔۔ جیسے وہ خراب ہوئے پیغمبروں کی مخالفت سے، یہ اُمّت خراب ہوئی خلیفہ پر خروج کر کے''۔ (موضح القرآن)

اب ''خلیفہ پر خروج کر کے'' کہا جائے یا حقیقی خلفاء کو نہ مان کر اپنے دل بخواہ اشخاص کو خلیفہ قرار دیکر اور جو حقیقی بارہ سردار تھے، اُن کی اطاعت سے انحراف کر کے۔

''اللہ کو قرضۂ حسنہ'' دینے کا جو ذکر کیا گیا ہے، یہ پہلے بھی آ چکا ہے ان الفاظ میں کہ: وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (الحدید۔۱۸) ''اللہ کو قرضۂ حسنہ دو'' اور: مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (البقرۃ۔۲۴۵) ''کون ہے جو اللہ کو قرضۂ حسنہ دے''۔۔۔۔۔۔ ہر جگہ اس سے مراد یہ ہے کہ اُن کاموں میں صرف کرو جو اللہ کو پسند ہیں، جس کا صلہ وہ تمہیں بعد میں عطا کرے گا۔ [1]

اس میں یہی ضرورت نہیں ہے کہ دوسروں کو ''قرضۂ حسنہ'' ہی دیا جائے۔ ہاں یہ قرضۂ حسنہ دینا بھی کبھی اعانت مومن ہونے کے لحاظ سے اُس کے تحت میں داخل ہو جائے گا۔

اس کا صاف طور پر مطلب یہ ہے کہ یہ ''انفاق فی سبیل اللہ کی تعبیر ''اللہ کو قرضۂ حسنہ'' دینے سے بطور استعارہ ہے جس کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے یعنی راہ خدا میں صرف کرنا، وہ کسی صورت سے بھی ہو، مشبّہ ہے اور قرض مشبہ بہ ہے ''وجہ مشبہ'' جس کو استعارہ میں ''وجہ جامع'' کہتے ہیں بعد میں اُس کا لازماً ملنا ہے۔ یعنی جیسے قرضہ بعد میں ایک فرض شناس لازماً ادا کرتا ہے اسی طرح جو کچھ راہ خدا میں صرف کیا جائے، اس کا معاوضہ بصورت ثواب اللہ ضرور عنایت فرمائے گا۔

اب جب کہ قرضہ ''مشبہ بہ'' کی حیثیت رکھتا ہے تو مشبّہ یعنی انفاق کو قرض دینے سے مخصوص کرنا جیسا کہ بعض تراجم سے ظاہر ہوتا ہے [2] ہرگز درست نہیں ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا

---

[1] ۔ای انفقتم فی سبیل اللہ واعمال البرّ نفقة حسنة یجاز بکم بها فکانه قرض من هذا الوجه (مجمع البیان)

[2] ۔ خدا (کی خوشنودی کے واسطے لوگوں) کو قرض حسنہ دیتے رہو (مولوی فرمان علی صاحب)

قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

''تو ان کے اپنے عہد و پیمان کو توڑ دینے کی وجہ سے ہم نے ان کو مورد لعنت قرار دیا اور اُن کے دلوں کو سخت کر دیا۔ وہ خداوندی کلام کو اس کے اصلی مقامات سے ہٹا دیا کرتے ہیں، اور جن چیزوں کی یاد دہانی انہیں بار بار کی گئی تھی، اُن میں کا بڑا حصّہ بھول گئے اور برابر آپ اُن کی ایک نہ ایک بد دیانتی سے واقف ہوتے رہیے گا سوا اُن میں کے کم آدمیوں کے لہٰذا ان کو معاف کیجیے اور درگزر سے کام لیجئے۔ یقیناً اللہ اچھا سلوک کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

یہ ہے انجام اُس عہد کا جو بارہ سردار مقرر کرنے کے ساتھ بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا اور اب کیا کہا جائے انجام اس عہد کا جو اس وقت بارہ اماموں کے مقرر کرنے کے ساتھ ہوا اور اُن کی اطاعت سے منحرف ہونے کے بعد اُمت کا جو کردار قرآن نے بتایا ہے، اُن کی ہر ہر بات اس اُمّت میں بھی نظر آ رہی ہے تو کیا یہ قرآن کی مکمل تصدیق نہیں ہے؟

شاہ عبدالقادر صاحب کو کیا اپنے گزشتہ نوٹ کے تتمہ کے طور پر اس آیت کے مضمون پر کوئی نوٹ لکھنا نہیں چاہیے تھا مگر اب معاملہ بہت ٹیڑھا تھا، اس لئے انہوں نے خاموشی ہی اختیار فرمانا مناسب سمجھی۔

اور اب بہت زیادہ کچھ طبائع میں ناگواری پیدا نہ ہو تو یہ سوال بھی پیدا تو ہوتا ہی ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے اس عہد اطاعت کے توڑنے کی وجہ سے خالق نے کہہ دیا: لعنّاھم ''ہم نے ان کو مورد لعنت قرار دیا تو اب اس امّت میں جو سردار مقرر کیے گئے، ان کی اطاعت کے عہد کو توڑنے والے کیا ہونگے لعنت کے مورد یا رحمت کے؟

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اور اُن سے جو کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں، ہم نے عہد و پیمان لیا تو انہوں نے بھی اُن چیزوں میں سے جن کی انہیں یاد دہانی کی گئی تھی، بڑے حصّہ کو بھلا دیا تو ہم نے اُن کے درمیان قیامت تک کینہ و بغض کا سامان کر دیا اور جلد آئے گا وہ وقت جب اللہ انہیں بتائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے''۔

اب ایک امّت میں فرقوں کے پیدا ہونے کا جن میں باہمی عداوت اور اختلاف ایسا ہے کہ :۔ کل فرقة تکفّر الاخرٰی (جلالین) ہر ایک فرقہ اُس دوسرے فرقہ کو کافر کہتا ہے۔

سب معلوم ہو گیا کہ یہ اللہ کی طرف کے عہد و پیمان کو توڑنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد بھی مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھلیں تو اس سے بڑھ کر افسوس ناک سانحہ کیا ہو سکتا ہے؟

مولانا فرمان علی صاحب موحوم نے اسے مسیحی ممالک کے باہمی تصادمات پر منطبق کرتے ہوئے یوں کہا ہے کہ:۔

''یہ بھی قرآن کی ایک اعلیٰ درجہ کی پیشن گوئی ہے کہ جس کو تیرہ سو برس گزرنے پر بھی ہم اپنے زمانہ میں پاتے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ اہل یورپ کل عیسائی اور دنیا کی تمام اقوام پر غالب ہیں مگر انگلستان، فرانس، اٹلی، امریکا اور آسٹریلیا میں ہر ایک دوسرے کا جانی دشمن اور خون کا پیاسا ہے فاعتبروا یااولی الابصار''۔

مگر یہ بھی عیسائیوں سے مخصوص چیز تو نہیں ہے، مسلم ممالک آپس کے تصادم سے کب بری ہیں اور ان میں ایک دوسرے کے مقابلہ میں خونریزیوں، سفاکیوں اور ہر قسم کے غیر انسانی حرکات کی کیا کمی ہے؟!

حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں جو باتیں کہی ہیں، خواہ وہ یہود کے لئے: وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (البقرۃ۔۶۱) کا اعلان ہو اور خواہ یہ عیسائیوں کے لئے: وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ کا فرمان، وہ سب باتیں مسلمانوں کو ہوشیار رکھنے ہی کے لئے تھیں کہ تم بھی اگر ان خراب کاریوں میں مبتلا ہو گئے اور انہی جرائم کے مرتکب ہوئے جو ان قوموں نے کیے تھے تو یہی انجام سب تمہارے بھی ہونا ہیں اور اب ایک ایک کر کے وہ ہر ایک انجام مسلمانوں کے سامنے ہے۔اس پر حضرت اقبال ''شکوہ'' کرتے ہیں تو کیا کریں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

''اے اہل کتاب تمہارے پاس آ گیا ہے ہمارا پیغمبر جو تمہارے لئے صاف بیان کر رہا ہے بہت سی ان چیزوں کو کہ جو تم اس کتاب میں سے چھپاتے رہے ہو اور بہت سی باتوں کو وہ نظر انداز کر دیتا ہے [1] تمہارے پاس آئی ہے ایک بڑی روشنی اور واضح کتاب جس سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی خوشنودی کے درپے ہوتے ہیں چلاتا ہے نجات کی راہوں پر اور انہیں اپنے حکم سے نکالتا ہے تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور انہیں لگاتا ہے سیدھے راستے پر''۔

کسی تفسیر میں صراحت تو غالباً نہیں دیکھی مگر میرا ذہن ایسا محسوس کرتا ہے کہ ''تمہارے لئے صاف بیان کرتا ہے'' میں ''تم'' کے مخاطب اہل کتاب کے عوام ہیں اور ''تم جو کتاب میں سے چھپاتے ہو'' اس کے مخاطب ان کے علماء ہیں۔اس لئے کہ جو لوگ جانتے ہوں اور ارادۃً چھپاتے ہوں، اُن کے واسطے بیان کرنے کے کوئی معنی نہیں نکلتے۔چونکہ عنوان خطاب یعنی ''اہل کتاب'' میں دونوں طبقے داخل ہیں، اس لئے دونوں جگہ ''تم'' ''تم'' آیا ہے لیکن دونوں جگہ کے ''تم'' کا مقصد الگ الگ ہے۔

---

[1] ۔یعفو اعن کثیر من ذٰلك فلا یبیّنه (جلالین)

''بہت سی باتوں کو نظر انداز کرتا ہے'' یعنی وہ باتیں جن کی کوئی دینی اہمیت نہیں ہے [1] مثلاً قصص وغیرہ میں اگر کچھ خرافات تم نے بھر دی ہے ایسی جس کا اثر دین پر نہیں پڑتا تو اُن سے رسولؐ نے تعرض نہیں کیا مگر اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہئے تھا کہ بعد میں مسلمان اُن اسرائیلیات کو جزء بنا کر تفسیر قرآن اور احادیث اور تاریخ اسلام درج کر دیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑰

''بلا شبہ کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ، مریم کے بیٹے مسیح ہی ہیں۔ کہہ دیجیے کہ اللہ کی طرف سے کون ہے جسے کوئی اختیار حاصل ہو اگر وہ چاہے کہ مریم کے بیٹے مسیح اور اُن کی ماں اور زمین میں جتنے ہیں، سب کو فنا کر دے اور اللہ کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کی۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''

الوہیت مسیح علیہ السلام کا ابطال

مطلب یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام اور ان کی ماں جب اُسی طرح بے بس ہیں جیسے کہ دنیا کے اور سب لوگ تو پھر انہیں اللہ کے ساتھ متّحد سمجھنا کہاں درست ہو سکتا ہے۔ [2]

معلوم ہوا کہ یہ پہلا حصّہ کہ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ نصاریٰ کے عقیدۂ تثلیث کی رد میں ہے جس کی رو سے مسیح علیہ السلام، اللہ کے ساتھ متّحد قرار دیئے جاتے ہیں۔

اس کے بعد کا جزء کہ: وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ یہ عقیدہ ابنیّت مسیح کی رد ہے۔

یعنی یہ سمجھنا کہ وہ بے باپ کے پیدا ہوئے لہٰذا اللہ کے بیٹے ہیں، غلط ہے۔ کیوں کہ یہ تو اللہ کے ملک و قدرت کی وسعت ہے۔ آسمان اور زمین کی ہر چیز اللہ کی ہے۔ اس معنی سے مسیح علیہ السلام بھی اللہ کے ہیں اور وہ جسے جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جیسے آدمؑ کو بغیر باپ کے پیدا کیا

---

[1] ۔یترك كثيرا لا ياخذ كم به ولا يذكره لانّه لم يؤمر به (تبيان) ممّا ليس فيه فائدة (مجمع البيان)

[2] ۔فكيف يجوز اعتقاد الرّبوبيّة فيه مع انّه مسخّر مربوب مقهور (مجمع البيان) وجه الاحتجاج بذلك انه لو كان المسيح انّها لقدر على دفع امر الله اذا اتى باهلاكه واهلاك غيره (تبيان)

،اس نے مسیح کو بغیر باپ کے خلق کر دیا۔اس سے کوئی اللہ کا بیٹا قرار نہیں پا سکتا۔[1]

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۫ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

''اور یہودیوں اور عیسائیوں کا قول ہے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔کہو کہ پھر وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے بلکہ تم بھی اس کی مخلوقات میں سے کچھ انسان ہو۔وہ جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے،سزا دیتا ہے اور اللہ کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے، سب کی اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے''۔

یہود و نصاریٰ کے دعاوی باطلہ اور ان کی رد

کسی جماعت کو بحیثیت جماعت یہ زعم نہ ہونا چاہیے کہ اُسے اللہ کے ساتھ کوئی خاص رشتہ ہے جس کی بنا پر اُس کے اعمال کا محاسبہ نہ ہوگا۔یہود اور نصاریٰ اسی زعم میں مبتلا ہو گئے تھے جس کی رد ہو رہی ہے مگر رد کا انداز دیکھنا چاہیے کتنا ملائم ہے۔

ان کے جواب میں ایک ایک کر کے اُن کی سیاہ کاریوں کی فہرست پیش کی جا سکتی تھی کہ تم ایسے،تم ایسے۔اس کے بعد بھلا تمہارا مُنہ ہے کہ تم کہو کہ ہم اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں؟! پھر اس کے بعد کی منزل تھی ''تم نہیں،ہم'' کی کہ کہاں تم اور کہاں ہم! ہم ایسے ہیں۔اگر کوئی اس کا بیٹا اپنے کردار کی بنا پر ہو سکتا ہے تو وہ ہم ہو سکتے ہیں اور ہم ہی اُس کے محبوب بھی قرار پا سکتے ہیں۔

عام بخشم بخشا اور جس کا عرف عام میں نام مناظرہ ہے،اُس کے لحاظ سے یہ سب ہونا چاہیے مگر اُن کے ایسے غلط دعوے کے جواب میں قرآن مجید نے میدان گفتگو میں کیسی سبک خرامی اختیار کی ہے۔پہلے خود ان کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے ایک سوال کیا ہے جس کے عام طور پر مفسرین نے جو معنی قرار دیے ہیں،ہم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے کہ وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے؟[2] مگر ''اسلام کی حکیمانہ زندگی'' میں ہم نے اُس کا جو مفہوم قرار دیا ہے اور جواب بھی ہمارے ذہن میں زیادہ موزوں ہے،وہ یہ ہے کہ ''پھر بھلا وہ تمہارے گناہوں کی سزا کا ہے کو دے گا!''

اس صورت میں اس جملہ کے اندر اس ادّعاء کے اثر کا اظہار مضمر ہے کہ جس جماعت کو یہ تصوّر پیدا ہوگا،وہ پھر مواخذہ اعمال سے بالکل نڈر ہو جائے گی لہٰذا مسلمانوں کو بھی یہ تصوّر کبھی قائم نہ کرنا چاہیے۔

---

[1] ۔فدل بها علیٰ انّه لیس فی کون المسیح من اُنثیٰ بغیر ذکر دلالة علیٰ کونه انها (مجمع البیان

[2] ۔وهم یقرون بانّهم یعذّبون ـــ والیهود تقرّ بانّهم یعذبون اربعین یوما وهی عدد الایام التی عبدوا فیها العجل (تبیان) وقیل انّ معناه الماضی ـــ ای فلم عذبکم (مجمع البیان)

اس کے بعد اُن اہل کتاب سے مخاطب ہو کر بس یہ کہا گیا ہے جیسے کسی کو سبق سمجھایا جائے کہ کسی فرد یا جماعت کو اپنے منہ سے اللہ سے اپنے لئے کسی خاص رشتہ کا تصوّر نہیں کرنا چاہیے۔ سب آدمی اس کی مخلوق ہیں، تم بھی اُنہی میں سے ہو۔ پھر بجائے اس کے کہ اُن کے قطعی مستحق عذاب ہونے کا اعلان کیا جائے، ایک عام بات کہہ دی گئی کہ ''جسے وہ چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور یہ چاہنا بلا وجہ تھوڑی ہوتا ہے؟! یہ بھی خود انسان کے اعمال کی کیفیت اور گناہوں کو مقدار اور نوعیت سے وابستہ ہے اور پھر آخر میں اس کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ کی کائنات کی وسعت کے مقابلہ میں، یہ انسان ضعیف البیان ہے، ہی کیا جو یہ ''خودی'' کے زعم میں مبتلا ہو کر ''میں'' اور ''ہم'' کی ڈینگیں مارے۔

اور جتنی باتیں اُن سے مخاطب ہو کر کہی گئی ہیں، سب عام ہیں جن میں ان سے مخاطب افراد کی خصوصیت نہیں بلکہ یہ سب باتیں خود مسلمانوں کو بھی ان تصوّرات کے قائم کرنے سے سدّ راہ ہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۠ ﴿۱۹﴾

''اے اہل کتاب! آیا ہے تمہارے پاس ہمارا پیغمبر تمہارے لئے واضح بیانات لے کر اُس وقت کہ جب عرصہ سے پیغمبروں کا سلسلہ بند تھا[1] کہ تم یہ نہ کہو کہ تمہارے پاس کوئی خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا تو لو یہ ایک خوش خبری دینے والا، ڈرانے والا آیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

یعنی پیغمبروں کا بھیجنا ہمیشہ خلق پر اتمام حجت کے لئے ہوا کیا ہے چنانچہ اب یہ پیغمبرؐ اس لئے بھیجا گیا ہے کہ تم پیش خدا حجّت پیش نہ کر سکو کہ ہماری ہدایت کا کوئی انتظام نہیں ہوا۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾

''اور جب کہا موسیٰؑ نے اپنی قوم سے اے میری قوم والو! یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے جب کہ اس نے تم میں پیغمبر بنائے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ چیزیں دیں جو دنیا میں کسی کو نہیں دی تھیں''۔

یہ اختلاف تعبیر قابل لحاظ ہے کہ پیغمبروں میں کہا گیا ''تم میں پیغمبر بنائے'' اور بادشاہوں میں کہا ''تم میں پیغمبر بنائے'' اور بادشاہوں میں کہا ''تم کو بادشاہ بنایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبری کے لائق جوہر کچھ خاص افراد ہی میں ہوتا ہے، سب نہیں ہوتا اور بادشاہت میں کوئی ذاتی جوہر درکار نہیں۔ وہ اسباب وظروف پر مبنی ہے۔ ہاں وہ بادشاہت بھی جو منصب خاص کے طور پر اللہ کی جانب سے ملے جیسے طالوت کو ملی تھی، اس میں پھر

---

[1] ۔یعنی علی انقطاع من الرّسل وفیہ دلالۃ علی انّ زمان الفترۃ لم یکن فیہ نبیّ (تبیان)

صلاحیت فرد کی شرط ہوتی ہے۔جس کا انتخاب خلق خدا کے ہاتھ میں نہیں ہوسکتا۔

پیغمبر یا امام بغیر خدا کے بنائے نہیں بنتا اور پھر اس میں خلق کے ماننے ،نہ ماننے کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن دنیوی بادشاہت امر اعتباری ہے۔وہ دنیا والوں کے مان لینے سے وابستہ ہے اور اسی لئے جب وہ ماننا چھوڑ دیں تو وہ معزول ہوجاتا ہے مگر نبی کا معزول کرنا افراد امّت کے بس سے باہر ہے۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ''تم کو وہ چیزیں دیں جو کسی کو نہ دی تھیں'' یہ ان واقعات سے ظاہر ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے رونما ہوئے جیسے دریا کا شگافتہ ہونا اور من وسلوی کا نازل ہونا۔یہ اور بات ہے کہ ان سب چیزوں کے ملنے پر بھی اس جماعت نے ناقدری ہی سے کام لیا اور کفران نعمت کرتی رہی لہٰذا انہیں سزا بھی پھر بہت سخت ملی یعنی خدا کی وہ غیر معمولی عطائیں ان کے رفعت مراتب کا سبب نہ تھیں کہ وہ افضل الامم قرار پاتے بلکہ نتیجہ میں کفران نعمت کی وجہ سے شاید انہیں شرّ الامم کا درجہ حاصل ہوگیا ہو جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لئے غضب الٰہی میں گرفتار ہوگئے۔

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿٢١﴾

''اے میری قوم والو!ان پاک سرزمین میں داخل ہوجاؤ جو اللہ نے تمہارے نصیب میں لکھ دی ہے اور پیٹھ دکھا کر بھاگنا نہیں کہ انجام میں گھاٹا اٹھاؤ گے''۔

سرزمین مقدس کی فتح پر ماموری، بنی اسرائیل کی عدول حکمی اور اس کا انجام

حضرت ابراہیمؑ جب نمرود اور وہاں کے دوسرے مشرکین کے عناد اور مخالفت سے مایوس ہوکر نکلے تو پھر شام کے ملک میں کنعان کے علاقے میں جا کر قیام کیا۔یہی کنعان کا علاقہ اب فلسطین کہلاتا ہے۔حضرت یعقوبؑ کے زمانہ تک اس خاندان کا یہاں قیام رہا۔پھر جب جناب یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے کنعان سے نکالا اور کنویں میں پھینکا، پھر وہ بحیثیت غلام مصر کے بازار میں فروخت کیے گئے اور پھر حالات کے انقلاب سے مصر کی مسند اقتدار پر پہنچے تو انہوں نے اپنے والد حضرت یعقوبؑ کو مع تمام افراد خاندان کے مصر میں بلوالیا اور اب کنعان یعنی فلسطین پر ایک سرکش قوم کا قبضہ ہوگیا جو عمالقہ کہلاتے ہیں۔ادھر حضرت یوسفؑ کے بعد مصر میں رفتہ رفتہ ملکی اور غیر ملکی کا سوال ابھرا اور آخر وہاں کی مقامی قوم قبط نے اقتدار حاصل کر کے بنی اسرئیل کو اپنی غلامی میں لے لیا اور اس قوم کے ارباب اقتدار نے جو فرعون کہلاتے تھے، بنی اسرائیل کو غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا اور ان پر انتہائی مظالم کے پہاڑ توڑے تو خالق نے حضرت موسیٰؑ کو مبعوث کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں بشارت دی کہ تم اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین یعنی ملک کنعان میں پھر واپس جاؤ گے اور وہاں تمہیں از سر نو اقتدار حاصل ہوگا چنانچہ اس آیت میں ''ارض مقدسہ'' (پاک سرزمین) سے وہی ابراہیمؑ واسحاقؑ کا شہر کنعان مراد ہے۔

یہ بشارت جب تک فقط بشارت کی شکل میں تھی، قوم والے بڑے خوش تھے مگر جب بظاہر اس کی منزل قریب آ گئی یعنی فرعون اور اس کے ساتھ والے غرق ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ان کے مظالم سے نجات دلا کر سرزمین فلسطین کی طرف روانہ ہوئے تو اب ان پر فرض عائد

کیا گیا کہ تم اپنی امکانی قوت عمل کا استعمال تو کرو یعنی ان عمالقہ سے جو اس سرزمین پر قابض ہیں جا کر مقابلہ کرو اور اس میں کمزوری نہ دکھاؤ میدان جنگ سے پیٹھ نہ پھیراؤ ورنہ گھاٹا اٹھاؤ گے یعنی اس بشارت کی تکمیل تم سے بہت دور ہو جائے گی تو اب کیا ہوا؟ اسے قرآن کی زبان سے سنیے اور ان سے درس لیجیے یعنی سمجھیے کہ مسلمانوں کو بھی اس غلبہ واقتدار عالمی کی بشارت دی گئی ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کے ساتھ اپنی عملی ذمہ داری کوئی نہیں ہے۔

اب اگر اس بشارت کی تکمیل ہمیں دور نظر آ رہی ہے تو اس میں نہ جانیں کس حد تک اپنی عملی کمزوری کا دخل ہے جو سنّت الٰہیہ کے بالکل مطابق ہے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِىْ وَاَخِىْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾

''انہوں نے کہا اے موسیٰؑ! اس میں بڑے زبردست لوگ ہیں اور ہم ہرگز وہاں داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ اس میں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل جائیں اس میں سے تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔ دو اشخاص نے ان میں سے جو ڈرتے تھے، جنہیں اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا، کہا کہ ان کا مقابلہ کر کے دروازہ کے اندر داخل ہو۔ جب داخل ہو جاؤ گے تو پھر یقیناً تم غالب آؤ گے اور اللہ ہی پر بھروسا کرو، اگر ایمان رکھتے ہو۔ انہوں نے کہا اے موسیٰؑ! ہم ہرگز وہاں داخل نہیں ہوں گے، کبھی جب تک کہ وہ اس میں ہیں لہٰذا بس آپ جایئے اور آپ کا پروردگار اور دونوں لڑ لیجیے ہم یہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ موسیٰؑ نے کہا پروردگار! میں قابو نہیں رکھتا مگر اپنے اوپر اور اپنے بھائی پر لہٰذا تو ہی فیصلہ کر دے ہمارے درمیان اور اس بداعمال جماعت کے درمیان''۔

یہ ''بداعمالی'' اگر صرف عدول حکمی کی حد تک ہوتی تو فقط ''فسق'' یعنی بداعمالی قرار پاتی لیکن یہاں اس کے ساتھ احکام الٰہی سے تمسخر بھی شریک تھا جو ان کے آخری فقرہ (آپ جایئے اور آپکا پروردگار اور دونوں مل کر جنگ کر لیجئے) سے ظاہر ہے، اس لئے وہ کفر کے دائرہ میں داخل ہے

لیکن کفر پر ''فسق'' کا اطلاق قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی موجود ہے۔ گویا وہ فسق ہی کی ایک شدید صورت ہے۔ [1]

ان کے اس دل شکن انداز سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے سے انکار کر دینے پر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارونؑ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا [2] کہ پروردگارا! مجھے سوا اپنے بھائی کے کسی پر اختیار نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سوا جناب ہارونؑ کے تقریباً پوری جماعت کو آپ نے فاسقین کا لقب دے دیا ہے۔ جو کہ ہم نے کہا ''کافرین'' کی ایک تعبیر ہے۔

اس کے بعد کبھی اس پر حیرت نہ ہونا چاہیے کہ صرف ایک اقل قلیل جماعت حق کے جادہ پر قائم رہے اور باقی سب ہی اغراض دنیا کا شکار ہو کر اس سے منحرف ہو جائیں۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

''ارشاد ہوا کہ پھر اب وہ [3] ان پر چالیس برس کے لئے حرام ہے، وہ جنگل میں سرگردان پھرتے رہیں گے تو تمہیں ان بداعمال لوگوں پر افسوس نہ ہونا چاہیے''۔

یہ ''حرام'' وہ حرام شرعی نہیں ہے جس کی مخالفت انسان کے لئے ممکن ہو بلکہ یہ وہ فیصلہ تقدیر ہے جو ان کی بداعمالی کی سزا کے طور پر ان کے بارے میں نافذ ہوا ہے [4] کہ اب ایک مدّت دراز تک وہ اس ملک میں داخل ہونے سے محروم ہو گئے۔

تیہ کے معنی ہیں حیرانی و سرگردانی کے ہیں [5] چنانچہ اس صحرا کا نام ہی زمین تیہ ہو گیا۔ اس طولانی مدّت کے دوران میں حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ، دونوں کی وفات ہو گئی اور وہ وہیں صحرا میں دفن ہوئے۔

پھر بعد میں جناب یوشع بن نونؑ جانشین حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرکردگی میں بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہو سکے اور انہوں نے جہاد کر کے وہاں اپنا تسلط قائم کیا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ

---

[1] ۔ قال اللہ تعالیٰ الا ابلیس کان من الجن ففسق عن امر ربہ وکان بذالک کافرا بلا خلاف (تبیان)

[2] ۔ فاخذ موسیٰ بید ھرون وقال (علی بن ابراھیم)

[3] ۔ انھا ای الارض المقدسۃ (جلالین)

[4] ۔ قول اکثر المفسرین انہ تحریم منع ـــــ وقال ابو علی یجوز ان یکون المراد بہ تحریم تعبد والاول ھو الاظھر (تبیان)

[5] ۔ اصل التیہ التحیر الذی لا یھتدی لا جلہ للخروج عن الطریق الی الارض المقصودۃ (مجمع البیان)

اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

''اور سنایئے انہیں آدم کے دونوں بیٹوں کا واقعہ صحیح صحیح جب کہ ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی۔ اس نے کہا میں ضرور تمہیں مار ڈالوں گا۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تو بس پرہیز گاروں سے قبول کرتا ہے۔ اگر تم نے میری طرف ہاتھ بڑھایا کہ مجھے قتل کرو تو میں اپنا ہاتھ تمہاری طرف تمہیں قتل کرنے کے لئے نہیں بڑھاؤں گا۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اٹھاؤ میرا بھی گناہ اور اپنا بھی گناہ تو ہو جاؤ گے اہل دوزخ میں سے اور یہ سزا ہے ظلم ڈھانے والوں کی''۔

قصہ ہابیل وقابیل

آدمؑ کے دونوں بیٹے یعنی ہابیلؑ اور قابیل۔

قرآن مجید کے انداز بیان سے ظاہر ہے کہ یہ بہت قدیم واقعہ ہے اور ایسا قدیم جو ''قبل التاریخ'' کے دائرہ میں داخل ہے۔ بے شک اس کا تذکرہ بائبل میں ہے مگر قرآن مجید سے اس کی جتنی کڑیوں کا پتہ لگتا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) آدمؑ کے دونوں فرزندوں نے قربانی پیش کی۔

(۲) ایک کی قربانی قبول ہوئی، دوسرے کی رد۔

(۳) اس پر وہ جس کی قربانی رد ہوئی تھی، اپنے اس بھائی کے قتل پر آمادہ ہو گیا۔

اس کے آگے مزید تشریحات کے لئے عقل سے مدد لینا ہوگی اور اس کے آگے ان سے جنہیں تشریح قرآن کا حق تھا اور وہ اصل تو معصومین علیہم السلام ہو سکتے ہیں، ورنہ مجبوراً دوسرے علماء کا سہارا لینا پڑے گا، جس سے صرف گمان ہو سکتا ہے، یقین نہیں ہو سکتا۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آدمؑ کے دو فرزندوں سے کیا مراد ہے؟ یوں تو بنی آدم کا لفظ قرآن میں سب انسانوں کے لئے آیا ہے مگر بنی آدم ''آدم کے دو فرزندوں'' کے لفظ سے پہلی مرتبہ جو ذہن میں آتا ہے، وہ یہی کہ وہ بلا واسطہ آدمؑ کے بیٹے تھے۔ ہمارے بعض مفسرین نے اسے متفق علیہ کہا ہے [۱] اور ان دونوں کا نام جو ہمارے یہاں شہرت عام رکھتا ہے، ہابیل اور قابیل ہے مگر ایک قول کا اس کے خلاف یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں بنی اسرائیل میں کے دو بھائی تھے جن کا یہاں ذکر ہے اور انہیں آدمؑ کا فرزند اس طرح کہا گیا ہے جیسے سب آدمی بنی آدم کہے جاتے ہیں [۲] مگر بظاہر یہ قول شاذ ہے اور قوت پہلے ہی قول کو حاصل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ قربانی پیش کرنے کا آخر سبب کیا تھا اور اسی سے یہ مسئلہ حل ہوگا کہ آخر قابیل کیوں اتنا مشتعل ہو گیا کہ وہ سگے

---

[۱] ۔اجمعوا علیٰ انہا ابن اٰدم لصلبہ (مجمع البیان)

[۲] ۔قال الحسن وابو مسلم محمد بن بحر والزجاج ھما من بنی اسرائیل (تبیان)

بھائی کے قتل پر آمادہ ہوگیا؟ بظاہر صرف اتنی بات کہ ایک کی قربانی قبول ہوئی اور ایک کی قبول نہیں ہوئی، یہ انسان کے رنجیدہ ہونے کا باعث ہوسکتی ہے یا کچھ غصہ بھی ممکن ہے پیدا کرے مگر نہ اتنا کہ وہ بعض آدمی جان لینے کے لئے آمادہ ہوجائے۔

یہ خلاتفسیر کی اس روایت سے پر ہوجاتا ہے جس کی تائید معصومؑ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ یہ دراصل ''زن'' کا مسئلہ تھا یعنی ایک لڑکی کی شادی کے لئے جناب آدمؑ نے یہ معیار مقرر کیا تھا کہ کس کی قربانی قبول ہوگی، اس کے ساتھ شادی، یہ بنا تھی کہ قربانی کے قبول نہ ہونے سے قابیل ہابیل کے قتل پر آمادہ ہوگیا۔[1]

تیسری بات یہ ہے کہ قربانی کا پیشِ خدا قبول ہونا، نہ ہونا، عموماً غیب سے متعلق چیز ہوتی ہے مگر قرآن نے یہ جو صورت واقعہ پیش کی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی صورت سے اسی وقت ظاہر ہوگیا کہ کس کی قربانی قبول ہوئی اور کس کی رد۔ اب یہ ذریعہ کیا تھا؟ اس تشنگی کو پھر روایات ہی دور کرسکتے ہیں۔ ان میں یہ جز تو متفق علیہ ہے کہ اس وقت ایک آگ اس امر کو ظاہر کیا کرتی تھی مگر اس میں اختلاف ہے کہ وہ اس قربانی کو جلا دیتی تھی جو رد ہونے والی ہے یا اس قربانی کو جلاتی تھی جو قابل قبول ہے؟ زیادہ شہرت اسی قول کو ہے۔[2]

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

''تو اس کے نفس نے اسے اپنے بھائی کی جان لینے پر رغبت دلائی[3] چنانچہ اس نے انہیں قتل کر دیا اور اس طرح گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوا[4]۔ اب اللہ نے ایک کوّے کو بھیجا جو زمین کرید رہا تھا کہ اسے دکھائے کہ وہ کیوں کر اپنے بھائی کی لاش چھپائے۔ اس نے کہا ہائے افسوس! کیا میں اس کوّے کی طرح بھی نہیں ہوسکتا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپاؤں اور اب وہ پشیمان ہونے والوں میں سے تھا''۔

قرآن مجید کے اس بیان سے درس ملتا ہے کہ فطری اور مناسب صورت انسانی میت کے لئے یہی ہے کہ اسے دفن کیا جائے جس پر اس مخلوق کا عمل ہوا جسے فطرت کی درس گاہ سے براہ راست اس وقت انسان کی تعلیم کے لئے ہی یہ علم دیا گیا تھا۔

جلا دینا یا دریا میں بہا دینا------یہ سب انسان کی طبع زاد چیزیں ہیں۔

---

[1] ۔قال اکثر المفسدین ورواہ ابو جعفر علیہ السلام (تبیان)

[2] ۔قال مجاھد کانت النار تاکل المردودۃ وقال غیرہ بل کانت العلامۃ نار اتاتی فتاکل المتقبل ولا تاکل الموودوۃ (تبیان)

[3] ۔نفس اوسھل ساخت در نظر وا کشتن برادر ش را (شاہ ولی اللہ) رغبت دلائی نفس اس کے نے (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔لا یدل علی انہ قتلہ لیلا لانّ معناہ صار من الخاسرین (تبیان)

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝۳۲

''اس وجہ سے بنی اسرائیل پر ہم نے لکھ دیا ہے کہ جو کسی ایک کو قتل کرے بغیر کسی جان کے بدلے یا روئے زمین پر فساد کرے، وہ ایسا ہے جیسے کہ اس نے تمام آدمیوں کو قتل کیا، اور جو اس کی زندگی کا سامان کرے، وہ ایسا ہے کہ جیسے تمام آدمیوں کی زندگی کا سامان کیا، اور ان کے پاس آ چکے ہیں ہمارے پیغمبر کھلے ہوئے ثبوت لے کر، پھر بھی ان میں کے بہت سے اس کے بعد بھی روئے زمین پر ظلم وتعدّی سے کام لینے والے ہیں''۔

یہ عام اصول ہے کہ:۔

من سنّ سنة حسنة كان له اجر من عمل بها الى يوم القيمة ومن سن سنّة سيئة كان عليه وزر من عمل بها الى يوم القيٰمة.

جو کوئی نیک طریقہ قائم کرے، اسے ثواب ہے، ان سب کا جو قیامت تک اس پر عمل کریں اور جو کوئی برا طریقہ قائم کرے، اس پر وبال ہے ان سب کا جو قیامت تک اس پر عمل کریں۔

لہٰذا بے گناہ انسان کی جان لینے کی بنا سب سے پہلے جس نے قائم کی اس پر قیامت تک کے قتل ناحق کی ذمہ داری ہے۔

اب اگر اس شاذ قول کو اختیار کیا جائے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے کہ یہ قتل کا واقعہ تاریخ بن اسرائیل سے متعلق ہے، تب تو اس آیت کا مطلب زیادہ واضح طریقہ پر سمجھ میں آ جائے گا لیکن قول مشہور کی بنا پر کہ یہ آدم ابوالبشر کے دور کا واقعہ ہے تو ہم اس کی توجیہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب کہ یہ عام اصول ہے تو اس کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ بنی اسرائیل کو متنبہ کیا گیا کہ تم میں سے جو ایسی غلط کاری کرے گا، اس پر ہمیشہ کے وقوع میں آنے والے جرائم کی ذمہ داری ہوگی۔

اس طرح ''من اجل ذلك'' کے لفظی معنی تو ہوئے کہ ''اسی وجہ سے'' مگر مطلب یہ ہوا کہ اس اصول پر جو اس قتل کے متعلق تھا، ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نافذ کیا۔ [1]

---

[1] ۔چوں از قابیل رسم قتل پیدا شد، ہر قتلی کہ در جہاں واقع شد اور ابدان مواخذہ می کنند دہم چنیں در ہر زمانہ کسی کہ رسم کشتن نو می کند بحکم من سنّ سنّته سیئته كان له كفل منها در قتل کہ بعد ازوی آید شرکتی پیدا می کند، پس اینجا من اجل ذٰلك بجائے: علی قیاس ذلك واقع شدہ است (شاہ ولی اللہ)

اور بعد میں بھی یہ بنی اسرائیل سے کوئی مخصوص بات نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے لئے ہے جو کسی غلط بات کی بنا رکھے۔[1]

یہ سب اس صورت میں ہے جب مقام تنزیل میں یہ آیت اسی محل پر کی ہو مگر قرآن مجید کی ترتیب کے جو دوسرے نمونے ہمارے سامنے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے ہم سمجھ ہی نہیں سکتے کہ یہ آیت اصل میں ہے کہاں کی اور کس سلسلہ سے اس کا تعلق ہے؟ ممکن ہے کہ جس ذیل میں آیت اتری ہے، وہاں یہ "من ذالك" (یعنی) "اسی وجہ سے" کا فقرہ کسی اور واضح صورت سے مرتبط ہوتا ہے۔

إِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۭ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۳۳ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۴

"بلاشبہ ان لوگوں کی جو اللہ اور اس کے پیغمبر سے جنگ کرتے ہیں اور دنیا میں دوڑتے پھرتے ہیں فساد کرنے کے لئے، بس یہ سزا ہے کہ انہیں مار ڈالا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا الگ الگ طرفوں سے[2] ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے جائیں۔ یہ ان کے لئے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ سوا ان کے کہ جو توبہ کر لیں اس سے پہلے کہ تم لوگ ان پر قابو پاؤ تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان"۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ سخت سزائیں جن کا اعلان ہو رہا ہے، اپنی مخالف قوم کے افراد کے لئے ہیں جن سے جنگ ہو رہی ہے اور اس لئے اسے پیش کر کے اسلام کی رواداری کو مجروح کرے۔

جی نہیں۔ یہ "اللہ اور رسولؐ سے جنگ کرنے والے جو کہے گئے ہیں کوئی غیر قوم نہیں ہیں۔ یہ اپنی قوم کے وہ بدنصیب اشخاص ہیں جنہوں نے ملک کے امن و امان کو غارت کیا ہے اور بے کس و بے بس افراد کو پریشان کیا ہے اور ان کے جان و مال پر چھاپے مارے ہیں۔ یہ افراد وہ ہیں جنہیں "ڈاکو" کہا جاتا ہے[3] یہ ان کی سزا کا اعلان ہے اور اس کے بعد کوئی حیرت نہ ہونا چاہیے کہ اس میں ہاتھ اور پیر کاٹنے تک کی شدید سزا کیوں درج ہے۔

ڈاکوؤں اور فسادیوں کے لئے سخت سے سخت سزاؤں کا اعلان

جب ایک معمولی چور جو ایک آدمی کا کچھ نقد و جنس، سامان چراتا ہے، اس کی سزا یہ ہے کہ اس کا ہاتھ قطع کر دیا جائے تو وہ شخص جو ڈاکو بن

---

[1] ۔فلفظ الأية خاص فی بنی اسرائیل ومعناہ جار فی الناس کلهم (علی بن ابراهیم)

[2] ۔از جانب مخالف (شاہ ولی اللہ) ہاتھ ان کے اور پاؤں ان کے مخالف طرف سے (رفیع الدین)

[3] ۔نزلت فی قطاع الطریق عن اکثر المفسّرین وعلیه جل الفقهآء (مجمع البیان)

چکا ہو، کیا اس سے کم سزا کا مستحق ہوگا؟

ان سزاؤں پر ناک بھوں وہی چڑھاتے ہیں جنہیں مجرموں کے ساتھ ہمدردی ہے مگر یاد رکھا جائے کہ اسلامی سخت سزائیں ایک فرد یا چند افراد کو اس سخت سزا میں گرفتار کر کے پھر ان بے شمار انسانوں کے لئے باعث عافیت بنتی ہیں جو ان جرائم میں گرفتار ہوتے یا ایسے مجرموں کے مظالم کا پھر شکار ہوتے۔ اس کا جیتا جاگتا نمونہ حجاز کی سرزمین پر موجود ہے جہاں شرعی سزاؤں کے نفاذ نے اس قسم کے جرائم کو تقریباً نایاب بنا دیا ہے۔

یہاں قرآن مجید نے جو کئی سزائیں یا، یا کہہ کے بیان کی ہیں تو ان میں درجوں کا فرق نمودار ہے آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے ارشاد سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ یہ کئی سزائیں جن کا بیان ہے ایک ہی سطح پر نہیں ہیں بلکہ یہ مجرم کے کردار کے مختلف درجوں کے لحاظ سے ہیں۔ جناب شیخ الطائفہ فرماتے ہیں:۔

جزاءوھم علی قدر الاستحقاق فان قتل قتل وان اخذ المال وقتل قتل وصلب وان اخذ المال ولم یقتل قطعت یدہ ورجلہ من خلاف وان اخاف السبیل فقط فانما علیہ النفی لاغیر ھٰذا مذھبنا و ھو المرویّ عن ابی جعفر علیہ السلام و ابی عبداللہ علیہ السلام (تبیان)

ان کی سزا ان کے استحقاق کے لحاظ سے ہوگی تو اگر وہ شخص قتل کو مرتکب ہوا ہو تو قتل کیا جائے گا اور اگر مال بھی لیا ہو اور قتل بھی کیا ہو تو قتل کیا جائے اور سولی دی جائے گی اور اگر صرف مال لیا ہو اور کسی کو قتل نہ کیا ہو تو ہاتھ پیر مختلف سمتوں سے کاٹے جائیں گے اور اگر بس راستے کو پر خطر بنایا ہو تو صرف اس علاقہ سے نکال دیا جائے گا یہی ہمارا مسلک ہے اور امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس کی روایت وارد ہوئی ہے۔

''ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے جائیں الگ الگ اطراف سے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی طرف کے مثلاً داہنا ہاتھ اور پاؤں قطع نہ کیے جائیں بلکہ ہاتھ داہنا کاٹا جائے اور پیر بایاں۔[1]

اگر توبہ کر لیں تو ارشاد ہو رہا ہے کہ ''اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان'' اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ توبہ کے بعد حق اللہ معاف ہو جائے گا لہٰذا حد شرعی جاری نہ ہوگی لیکن جو حقوق النّاس ہیں جیسے وہ مال جو لوٹا تھا یا کسی کی جان لی تھی، وہ معاف نہیں ہو جائے گا، جب تک صاحبان حقوق معاف نہ کریں۔

اس پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے صاحب تفسیر جلالین نے اپنی انفرادیت کا اظہار کیا ہے۔[2] اس کی بنا پر اگر وہ شخص مرتکب قتل ہوا ہے تو حد شرعی کے طور پر حاکم شرع کے یہاں سے جو قتل کی سزا دی جاتی وہ توبہ کے بعد ختم ہو جائے گی لیکن ورثہ خون کا دعوے کر کے بطور قصاص اسے قتل کرا سکتے ہیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ

---

[1] ۔ای ایدیھم الیمنی وارجلھم الیسریٰ (جلالین) یعنی دست راست و پای چپ (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ انّ اللہ غفور رحیم عبر بذٰلك دون "فلا تحدّوھم" لیفید انہ لا یسقط عنہ بتوبۃ الاحدود اللہ دون حقوق الآدمیین۔ کذا اظھر لی ولم ار من تعرّض لہ (جلالین)

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۵﴾

''اے ایمان لانے والوں! اللہ کے غضب سے بچو اور اس کے یہاں کے لئے ذریعہ ڈھونڈو اور اس کی راہ میں جہاد کرو شاید تم دین و دنیا کی بہتری حاصل کرلو''۔

ضرورت وسیلہ

خالق تک پہونچنے کا ذریعہ داخلی طور پر قائم رہنا ہے اس ذہنیت اور کردار پر جو اس کی رضا کا باعث ہو لیکن خارجی طور پر ذریعہ وہ ذات ہوسکتی ہے جو اس معیار سے پورے طور پر واقف ہو۔ یہ اپنے عہد میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے بعد ہر دور کی وہ معصوم ہستی ہے جسے امامؑ کہتے ہیں اس لئے ہمارے یہاں وسیلہ کی تفسیر روایت میں امامؑ کے ساتھ ہوئی ہے۔[۱]

وہابی تصور کہ مطلق توسل شرک ہے، از روئے قرآن درخور اعتناء نہیں ہے۔ جب کہ خالق نے دعائے مغفرت کے لئے رسولؐ کے پاس آنے اور پھر رسولؐ کے اس کے واسطے استغفار کرنے کا طریقہ تعلیم کیا: وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ (النساء) تو یہ توسل کا حکم نہیں ہے تو اور کیا ہے اور اس کے بعد اگر اس آیت میں بھی ''وسیلہ'' سے مراد اپنے دور میں رسولؐ اور ان کے بعد ان کے نائب یعنی امام معصومؑ کی ذات ہو جیسا کہ حدیث معصوم میں ہے تو اس میں کیا خرابی ہے؟!

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۳۶﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۷﴾

''بلاشبہ وہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا، اگر ان کے پاس وہ سب ہو جو زمین میں ہے اور اسی کے برابر اس کے ساتھ اور ہوتا کہ اس کے ذریعہ سے وہ روز قیامت کی سزا سے بچنے کا سامان کریں[۲] تو وہ بھی ان سے قبول نہ ہوگا اور ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس آگ سے نکل جائیں حالانکہ وہ اس سے نکلنے والے نہیں ہیں اور ان کے لئے برقرار رہنے والا عذاب ہے''۔[۳]

عرب میں فدیہ یعنی کچھ تاوان دے کر قید وغیرہ سے رہائی حاصل کی جاتی تھی مگر آخرت کا عذاب وہ ہے کہ اگر دنیا میں جو کچھ مال و دولت

---

[۱] ۔تقربوا الیہ بالامام (علی بن ابراھیم)

[۲] ۔عوض خود دھندہ آں را در عذاب (شاہ ولی اللہ)

[۳] ۔مقیم دائم (جلالین)

اور سامان روئے زمین کا ہے، سب کافروں کے قبضہ میں ہو اور اتنا ہی اور ہو اور یہ سب وہ اپنی جان بخشی کے لئے دینا چاہیں تو بھی بچنا ممکن نہیں ہے۔

شاہ رفیع الدین صاحب نے عجیب ترجمہ کیا ہے کہ:۔

''تا کہ بدلا پاویں ساتھ اس کے عذاب دن قیامت کے سے''۔

اس سے کسی طرح وہ مفہوم ادا نہیں ہوتا۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۳۸ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۳۹

''اور چور مرد اور چور عورت ہو تو ان کے ہاتھ کاٹ دو، سزا میں اس کی جو انہوں نے کیا ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے ایک عبرت ناک سزا ہے [1] اور اللہ زبردست ہے بالکل صحیح کام کرنے والا تو جو توبہ کر لے اپنے ظلم کرنے کے بعد اور کردار درست کر لے تو یقیناً اللہ اس کی توبہ قبول کرے گا۔ بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

چوری کی حد یعنی شرعی سزا

یہاں بھی الفاظ قرآن مجمل تھے۔ احادیث نے چوری کی بھی حد مقرر کی ہے اور ہاتھ کی بھی تعیین کی ہے کہ کون سا ہاتھ اور حد بھی بتائی ہے کہ کہاں سے قطع کیا جائے۔

اسی بنا پر فقہائے امت میں اختلاف بھی ہو گیا۔

فقہ اہل بیتؑ کے مطابق یہ ہے کہ ایک چوتھائی دینار یا اس سے زیادہ کی جو چوری ہو، اس میں یہ حد شرعی جاری ہوتی ہے [2] کچھ اہل سنت بھی اس سے اتفاق رکھتے ہیں۔ [3]

پھر یہ کہ دائیں ہاتھ کی بس چار انگلیاں قطع کی جائیں گی اور انگوٹھا اور ہاتھ کی ہتھیلی چھوڑ دی جائیگی [4] اور دوسری مرتبہ کو چوری میں بایاں پیر گٹے سے قطع کیا جائے گا اور ایڑی چھوڑ دی جائے گی۔ یہ اس لئے کہ نماز کے ارکان ادا کرنے سے وہ قاصر نہ ہو۔

علمائے شیعہ کے درمیان اس بارے میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے۔ [5]

---

[1] ۔نکالا عقوبة لها (جلالین) عبرتی از طرف خدا (شاہ ولی اللہ) عبرت خدا کی طرف سے (رفیع الدین)

[2] ۔النصاب الذی متعلق القطع به قیل فیه ستة اقوال اوله مذهبنا وهو ربع دینار (تبیان)

[3] ۔بیّنت الستة ان الذی یقطع فیه ربع دینار فصاعدا (جلالین)

[4] ۔هو المشهور عن علیؑ (تبیان)

[5] ۔اجمعت الطائفة علیه (مجمع البیان)

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾

''کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ کے لئے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی۔ جسے چاہتا ہے وہ سزا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

''کیا تم نہیں جانتے'' اس میں رسولؐ کا مخاطب ہونا اوّل تو ضروری نہیں بلکہ عام محاورہ کے مطابق ہر آدمی جو اس کلام کو سنے مخاطب ہوسکتا ہے اور اگر لفظی طور پر رسولؐ مخاطب ہوں بھی تو مقصود اس سے دوسرے لوگوں کو ہی متنبہ کرنا ہے [۱] جس کی نظیریں قرآن مجید میں بکثرت موجود ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ ۖ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾

''اے پیغمبرؐ! آپ کو رنج نہ ہونا چاہیے ان کا جو تیزی سے کفر کا راستہ اختیار کرتے ہیں، ان میں سے بھی کہ جو اپنے منہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل ایمان نہیں لائے ہیں اور ان میں سے بھی کہ جو یہودی ہیں، جو سننے والے ہیں جھوٹ کے، سننے والے ہیں دوسرے لوگوں کی جو آپ کے پاس آئے نہیں ہیں، جو الفاظ کو ہٹا دیتے ہیں بعد اس کے کہ وہ اپنی جگہوں پر تھے [۲] اور کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہی حکم دیا جائے تو قبول کرو [۳] اور اگر یہ نہ دیا جائے تو بچو اور جسے اللہ نے گمراہی میں چھوڑ دینا چاہا ہو، اس کے لئے پرگز آپ کا کوئی بس نہیں ہے۔ یہ

---

[۱] ۔فی من یتوجہ ھذا الخطاب الیہ قولان احدھما انہ متوجہ الی النبی صلی اللہ علیہ والہ والمراد بہ امتہ ـــــ والثانی انہ متوجہ الیٰ کل مکلف من الناس وتقدیرہ الم تعلم یا انسان (تبیان)

[۲] ۔من بعد استقرارہ فی مواضعہ (تبیان) ای من بعد ان وضعہ اللہ مواضعہ (مجمع البیان)

[۳] ۔اگر دادہ شود ایں حکم محرف قبول کنند (ولی اللہ)

وہ ہیں کہ اللہ نے چاہا نہیں کہ ان کے دلوں کو پاک کرے۔ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے''۔

''سننے والے ہیں دوسرے لوگوں کی جو آپ کے پاس آئے نہیں ہیں'' یعنی احبار یہود جنہیں اپنے اغراض کی وجہ سے یا اپنی شان کے گھمنڈ میں اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ خود رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوں مگر دوسروں کو بہکاتے ہیں اور وہ عام یہودی یا منافقین ان کی سنتے ہیں یعنی ان کا کہنا مانتے ہیں [1] اور وہ ان کو تحریف شدہ احکام بتا کر کہتے ہیں کہ دیکھو رسول بھی اگر ایسا ہی حکم بتائیں تو قبول کرنا اور اگر کچھ اور بتائیں تو قبول نہ کرنا۔

بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہ آپ کے پاس آ کر آپ کے ارشادات سنتے ہیں، دوسروں کی خاطر جو آپ کے پاس نہیں آتے ہیں [2] مگر سماعون للکذب ''سننے والے ہیں جھوٹ کے'' اس کے ساتھ بلا فاصلہ سماعون لقوم آخرین

''سننے والے ہیں دوسری قوم کی خاطر'' اسے رسولؐ کی باتوں کے سننے پر محمول کرنا کچھ ذوق کے مطابق معلوم نہیں ہوتا۔

لیکن بعض لوگوں نے پہلے جملہ کو بھی رسولؐ کی باتوں کے سننے ہی سے متعلق قرار دیا ہے اور معنی یوں کہے ہیں کہ وہ آپ کی باتیں سنتے ہیں جھوٹ کے لئے یعنی اس غرض سے کہ آپ پر جھوٹی تہمتیں لگائیں اور آپ کی باتیں سنتے ہیں دوسرے لوگوں کی خاطر جو آپ کے پاس نہیں آئے ہیں یعنی ان نہ آنے والوں کے جاسوس ہیں یہ آنے والے اشخاص [3] ہمیں یہ معنی بھی تکلف سے خالی معلوم نہیں ہوتے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾

''جھوٹ کے بڑے ہی سننے والے ہیں، بڑے کھانے والے مال حرم کے [4] تو اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو خواہ ان کے درمیان فیصلہ کیجیے اور خواہ ان سے روگردانی کیجیے اور اگر آپ ان سے روگردانی کریں تو وہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکیں گے اور اگر فیصلہ کیجیے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ کیجیے۔ یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

ہوسکتا ہے کہ یہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مخصوص ہدایات ہوں مگر بعض مفسرین انہیں عام قرار دیتے ہیں یعنی یہ اصول بتایا

---

[1] ۔شنوندگان اند برای گروهی دیگر ان که هنوز پیش تو نیامده اند (ولی الله) سننے والے واسطے قوم دوسری کے کہ نہ آئی تیرے پاس (شاہ رفیع الدین) وہ سردار یہود آپ نہ آئے، بیچ والوں کے ہاتھ بھیجتے اور کہہ دیتے کہ ہمارے معمول کے مطابق حکم کریں تو قبول رکھو نہیں تو نہ رکھو (موضح القرآن)

[2] ۔سماعون منك لقوم لاجل قوم اٰخرين من اليهود (جلالين)

[3] ۔سماعون كلامك للكذب عليك سماعون كلامك لقوم اٰخرين لم ياتوك اى هم عيون عليك (تبيان)

[4] ۔روى عن علی علیہ السلام قال السحت الرشوة فى الحكم (تبيان)

جارہا ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ اسلامی عدالت میں اپنا مقدمہ لائیں تو انہیں اختیار ہے کہ یہ خود اس کا فیصلہ اپنی شریعت کے مطابق کریں یا انہیں خود ان کے مذہبی پیشواؤں کے پاس جانے کی ہدایت کریں۔[1]

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اختیار شروع اسلام میں تھا۔ بعد میں وہ منسوخ ہو گیا دوسری آیت سے جو اس کے بعد اسی سورہ میں آئے گی: وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ --- اس کے بعد یہ لازم ہو گیا کہ ان کے مقدمات کا فیصلہ شریعت حقہ ہی کے مطابق ہوا کرے۔[2]

مگر ارشاد اہل بیت، یہ ہے کہ وہ حکم قائم ہے، منسوخ نہیں ہوا ہے۔[3]

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۳

''اور وہ آپ کو ثالث کیوں کر بنا رہے ہیں، حالانکہ ان کے پاس تو توریت بھی موجود ہے جس میں اللہ کا حکم درج ہے اور پھر وہ اس کے بعد بھی روگردانی اختیار کرتے ہیں اور نہیں ہیں یہ لوگ ایمان لانے والے''۔

شان نزول ان آیتوں کی جسے علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں بیان کیا ہے، بطور خلاصہ یہ ہے کہ یہودیوں میں سے دو اشخاص نے زنائے محصنہ کا ارتکاب کیا جس کی سزا توریت میں سنگسار کرنا تھا۔ مگر چونکہ وہ دونوں مالدار تھے، علمائے یہود نے خود توریت کے اس حکم کو ان کے لئے سخت سمجھتے ہوئے اسے دبا دیا اور انہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیج دیا کہ آپ شاید ان کے لئے کچھ ہلکی تجویز فرما دیں، مگر جب آپ کے پاس آئے تو آپ نے انہیں سنگ ساری کا حکم سنایا اور جب انہوں نے چون چرا کی تو آپ نے انہی کے ایک بڑے عالم سے اقرار کرایا کہ توریت میں اس جرم عظیم کی یہی سزا ہے۔

توریت میں درج شدہ حکم کو حکم اللہ کہنا، اس کی دلیل نہیں ہے کہ وہ کتاب بحیثیت مجموعی تحریف شدہ نہیں۔ اس لئے کہ ممکن ہے یہ حکم جو اس میں اب تک تھا، اس تحریف سے بچ گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے حکم الٰہی ان کے خیال کے مطابق کہا ہو کہ انہیں تو اسے حکم الٰہی سمجھنا ہی چاہیے۔[4]

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا

---

[1] ۔یعنی اھل ذمہ اگر قضیہ خویش بامام رفع کنند، اگر خواھد حکم کند، اگر خواھد بزعمائے ایشاں نقوض نماید (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ھٰذا التخئیر منسوخ بقولہ: ان احکم بینھم الایۃ فیجب الحکم بینھم اذا ترافعوا الینا وھو اصحّ قولی الشافعی (جلالین)

[3] ۔الظاھر فی روایات اصحابنا ان ھٰذا التخییر ثابت فی الشرع للائمۃ والحکام (مجمع البیان)

[4] ۔لایمنع ان یکون فیھا ھٰذا ن الحکمان غیر متبدلین وھو رجم المحصن وجوب القود و یحتمل ان یکون المراد بذٰلك فیھا حکم اللہ عندھم (تبیان)

لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

''بلاشبہ ہم نے توریت کو اتارا تھا جس میں صحیح رہ نمائی اور روشنی تھی، اس کے ساتھ یہودیوں کے لئے فیصلے کرتے تھے وہ پیغمبر جو احکام الٰہی کے سامنے سر جھکائے تھے اور خدا والے اور یہودی علماء بھی اللہ کی اس کتاب کے ساتھ جس کی حفاظت کے وہ ذمہ دار بنائے گئے تھے [1] اور جس کے وہ گواہ تھے تو لوگوں سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو اور میری آیتوں کے عوض میں تھوڑی سی قیمت حاصل نہ کرو اور جو اللہ کے اتارے ہوئے کے مطابق فیصلہ نہ کرے، تو یہی لوگ کافر ہیں''۔

یہ خطاب کہ ''لوگوں سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو'' بظاہر علمائے یہود سے ہے جو بہت سی حقیقتوں کو اپنے عوام کے ڈر سے چھپاتے تھے۔ [2]

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

''اور ہم نے ان پر قانون جاری کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان ہوگی اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں بھی برابر کا بدلا ہوگا۔ اب جو اس میں فیاضی سے کام لے تو وہ اس کے لئے کفارہ ہوگا اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہ لوگ وہ ہیں جو ظلم و تعدی کے مرتکب ہیں''۔

توریت میں کم قصاص کا تفصیلی بیان

یہود کے لئے توریت میں حکم قصاص بالکل اسی طرح تھا جیسے اسلام میں ہے۔ [3]

---

[1] ۔معناہ بما استودعوا (تبیان) ای استحفظهم الله ایاہ (جلالین) حکم می کردند بآنچہ حافظ آن گردانیدہ شدہ انداز کتاب خدا (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ای لا تخشوا یا علماء الیهود الناس فی اظهار صفته النبی محمد ﷺ وامر الرّجم (مجمع البیان)

[3] ۔لا خلاف فی ان ذلك ثابت فی هذا الشرع (تبیان)

فیاضی سے کام لینے کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ قصاص کو معاف کردے [1] اس طرح اس فیاضی کا تعلق اس شخص سے ہوتا ہے جسے نقصان پہنچایا گیا ہے یا مقتول کے ورثا سے اور کفارہ کا تعلق اس کی زندگی کے گناہوں کے ساتھ ہے کہ یہ اس فیاضی اس کے گناہوں میں تخفیف یا معافی کا سبب ہوگی۔ [2]

مگر دوسرے معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ فیاضی سے کام لینے کا مطلب یہ ہے کہ قصاص کے لئے تیار ہوجائے اور اپنے کو محکمۂ عدالت میں پیش کردے۔ [3]

اس صورت میں اس کا تعلق قاتل یا جارح سے ہوتا ہے، اور اب کفارہ کا تعلق اس کے اسی جرم سے ہوگا یعنی اگر وہ بہ خوشی قصاص کے لئے آمادہ ہوگیا تو اب آخرت میں اس سے باز پرس نہ ہوگی مگر پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے۔ [4]

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۖ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾

''اور ان کے نقش قدم پر ہم نے بعد میں بھیجا عیسیٰؑ فرزند مریم کو تصدیق کرتا ہوا اس توریت کی جو ان کے پہلے موجود تھی اور ہم نے انہیں انجیل عطا کی جس میں صحیح رہ نمائی تھی، اور روشنی اور تصدیق کرتی ہوئی تھی اس توریت کی جو اس کے پہلے تھی اور صحیح رہ نمائی اور نصیحت پرہیزگاروں کے لئے''۔

''ان کے نقش قدم پر''------یہ ضمیر بظاہر النّبیّون کی طرف راجع ہے جو اس سلسلہ کی پہلی آیت میں تھا: يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا ''اس توریت کے ساتھ فیصلہ کرتے تھے وہ پیغمبر جو بارگاہ الٰہی میں سرنیاز جھکائے تھے [5] اور ''نقش قدم پر ہم نے بعد میں بھیجا'' یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام شریعت توریت کو منسوخ کرنے نہیں آئے تھے بلکہ اس شریعت کے پیرو تھے جس کا ذکر انجیل میں اب بھی ہے۔ انجیل اسی توریت پر عمل کی دعوت اور مواعظ ونصائح پر مشتمل بنا کر بھیجی گئی تھی۔ یہ تو بعد میں پال نے عقائد میں مسیح کے ابن اللہ ہونے اور صلیب پر چڑھ کر تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ہوجانے کا مسئلہ ایجاد کر کے حلال وحرام کی پابندیاں ختم کردیں، اور شریعت کا بالکل خاتمہ کردیا۔

تصدیق کا ذکر جو دو دفعہ ہے، اس میں ایک ہی بات کی تکرار نہیں ہے بلکہ پہلی دفعہ جو مصدّق کا لفظ ہے، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے

---

[1] ۔ فمن تصدق به ای عفا (علی بن ابراهیم) به ای بالقصاص الذی وجب له تصدق به علی صاحبه بالعفو واسقطه (مجمع البیان)

[2] ۔ کفارة له ای للمتصدق الذی هو المجروح او ولی الدم هٰذا قول اکثر المفسرین (مجمع البیان)

[3] ۔ فمن تصدق به ای بالقصاص بان مکن من نفسه (جلالین)

[4] ۔ هو الاقویٰ (تبیان)

[5] ۔ اٰثار النبیین الّذین اسلموا (مجمع البیان)

ہے کہ وہ توریت کی تصدیق کرنے والے بنا کر بھیجے گئے تھے اور پھر دوبارہ جو یہ لفظ ہے، وہ انجیل کے متعلق ہے کہ اس کے اندر خود توریت کی تصدیق موجود ہے۔ [1]

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

''اور انجیل والوں کو لازم ہے کہ وہ اس کے موافق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں اتارا ہے اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا تو وہ بداعمال لوگ ہوں گے''۔

انجیل کے مندرجات کے متعلق بھی ما انزل اللہ ہونے کی تصدیق ان کی اصل کے لحاظ سے ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شان نزول کے اعتبار سے جس حکم کا اس وقت سوال درپیش ہو، وہ اپنی اصلی صورت میں اب تک انجیل میں موجود تھا۔

یہ امر بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بوقت نزول قرآن جن باتوں کا قرآن نے ان کتابوں سے حوالہ دیا ہے یا جن کے درست ہونے کی تصدیق کی ہے، وہ بھی ضروری نہیں کہ اب موجودہ زمانہ میں توریت وانجیل میں اسی صورت سے باقی ہوں کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ ان کتابوں میں شروع ہی میں تبدیلیاں نہیں ہوئیں بلکہ اس کے بعد بھی مختلف ادوار میں ان میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾

''اور ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تصدیق کرتی ہوئی اس کتاب کی جو اس کے پہلے ہے اور اس کا تحفظ کرتی ہوئی [2] لہٰذا آپ ان کے درمیان وہی فیصلہ کیجیے جو اللہ نے اتارا ہے اور جو کچھ آپ کے پاس حق آ گیا ہے، اس سے ہٹ کر ان کے خیالات کی پیروی نہ کیجیے ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ مقرر کی ہے اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک بنا دیتا مگر اس کا تو مقصد یہ ہے کہ جو اس نے تمہیں بتایا ہے، اس میں

---

[1] ۔لیس ذلك بالتكوير (تبیان)

[2] ۔مقرر ساخته ایم شریعتی وراهی (شاہ ولی اللہ) واسطے ہر ایک کے کیا ہم نے تم میں گھاٹ اور راہ (رفیع الدین)

تمہاری آزمائش کرے لہٰذا نیکیوں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرو، تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے تو وہ تمہیں اصلیت بتائے گا اس کی جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے''۔

اس آیت کے الفاظ کا ظاہری مفہوم کافی پیچیدہ ہے جس کے لئے اصول عقلیہ، نیز دوسری آیات پر نظر ڈالنا لازم ہے۔

بہر حال یہاں جو مفہوم بلا دغدغہ درست معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ اس کے پہلے توریت کا ذکر ہوا پھر انجیل کا ہوا اور اس کے بعد رسولؐ سے خطاب ہوا کہ ''آپ پر یہ کتاب اتاری ہے حق کے ساتھ'' تو اس کے بعد خالق نے اہل توریت، اہل انجیل اور اہل اسلام سب کو سمو کر یہ مشترک خطاب فرمایا ہے کہ: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ ''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے، ایک ایک دور میں ایک شریعت اور ایک راستہ مقرر کیا تھا، یعنی وہ توریت والی شریعت بھی ہماری بھیجی ہوئی تھی، وہ انجیل والی تعلیم بھی ہماری ہی تھی اور اب یہ قرآنی شریعت بھی ہم ہی نے بھیجی ہے لہٰذا توریت کے وقت تک اس شریعت پر عمل لازم تھا اور انجیل آئی تو اس پر عمل لازم ہوا اور اب سب کو قرآن پر عمل لازم ہے کیوں کہ یہ کتاب سب سے آخر میں آئی ہے۔[1]

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور یہ کہ فیصلہ کیجیے آپ ان کے درمیان اس کے ساتھ جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کے خود ساختہ خیالات کی پیروی نہ کیجیے اور ان سے ڈریئے کہ کہیں وہ آپ کو کسی اس حکم سے جو اللہ نے آپ پر اتارا ہے، ہٹانے کی کوشش نہ کریں۔ اس کے بعد اگر انہوں نے روگردانی کی تو جان لیجیے کہ اللہ بس یہ چاہتا ہے کہ انہیں ان کے کچھ گناہوں کی سزا دے اور بلاشبہ لوگوں میں زیادہ تر بداعمال ہیں''۔

پیغمبر خداؐ کو ان کے خود ساختہ خیالات کی پیروی سے روکنا اس کی دلیل ہے کہ اب یہودیت یا عیسائیت جو بھی ہو دین باطل ہے۔ اس سے گزشتہ آیت میں جو ہم نے تشریح کی ہے، اس کی تائید ہوتی ہے کہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ ''تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہ مقرر کی'' وہ بلحاظ وقت نفاذ شریعت تھا یعنی موسیٰؑ کے دور میں شریعت موسوی ہی حق تھی اور عیسیٰؑ کے دور میں شریعت عیسوی ہی درست تھی مگر اب سب کے لئے جو حق ہے، وہ شریعت محمدیؐ ہے اور اس کے مخالف جتنے تصورات ہوں، وہ اھواء یعنی باطل خیالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

---

[1] ۔الخطاب للامم الثلثة امّة موسیٰ وامة عیسیٰ علیہ السلام وامة محمد صلی اللہ علیہ اٰلہ وسلم وفی ھٰذا دلالة علی جواز النسخ علی وان نبیّنا کان متعبّدبشریعة فقط (مجمع البیان)

''تو کیا یہ جاہلیت کے فیصلہ کے طلب گار ہیں؟ حالانکہ اللہ سے بڑھ کر اچھا کس کا فیصلہ ہوگا ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہوں''۔ [1]

''جاہلیت''، یعنی کسی قانون الٰہی پر عمل درآمد نہ ہونے والا دور۔ اس وقت تو ظاہر ہے کہ من مانے فیصلے ہی ہو سکتے ہیں مگر اب جب خدا کا رسولؐ موجود ہے اور اس کے ذریعہ سے قانون الٰہی کا عملی طور پر نفاذ ہو رہا ہے تو اب ایسا کیوں کر ممکن ہے؟!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

''اے ایمان لانے والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست نہ بناؤ، یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جس نے تم میں سے ان سے دوستی کی تو وہ ان ہی میں سے ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا'' [2]

دوستی کا مطلب غلط مقاصد اور باطل منصوبوں میں ان کے ساتھ شرکت اور اس طرح ان کی پارٹی کا ممبر ہونا ہے۔ ورنہ اپنے مذہبی قوانین کی پابندی کے ساتھ معاشرتی تعلقات قائم کرنا اور جائز مقاصد میں تعاون کرنا ہر ایک کے ساتھ درست ہے۔ اس میں قوم وملت کا کوئی سوال نہیں ہے۔

قرآن مجید میں مشرکین تک کے اس طبقہ کے ساتھ جس نے مسلمانوں کے خلاف معاندانہ اقدامات نہیں کئے ہیں اور جارحیت کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں، حسن سلوک اور منصفانہ برتاؤ کی اجازت دی ہے اور وقت ضرورت ان کے کام آنے کی تحریک کی ہے اور خود حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل موجود ہے کہ شب ہجرت تک آپ کے پاس مشرکین کی امانتیں تھیں۔ معاشرتی تعلقات کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟!

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

---

[1] ۔ معناہ عند قوم یوقنون باللہ و بحکمہ (تبیان)

[2] ۔ معناہ لا یہدیہم الی طریق الجنۃ لکفرہم واستحقاقہم العذاب الدائم (تبیان)

''تو دیکھو گے انہیں جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ وہ ان کے حلقوں میں تیزی سے دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر کوئی آفت نہ آئے۔ اب بہت ممکن ہے کہ اللہ فتح دکھادے یا اپنی طرف سے کوئی اور صورت سامنے لے آئے[1] تو پھر یہ اس پر جو انہوں نے اپنے دل میں چھپا رکھا تھا، پشیمان ہوں''۔

موالات یعنی یہود و نصاریٰ کے ساتھ گٹھ جوڑ سے ممانعت ہوئی تھی، اس کا پس منظر یہی ہے کہ منافقین جماعت یہود کے یہاں دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں اور ان کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے جب مسلمان ان پر اعتراض کرتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ یہ ہم احتیاطاً کرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں غلبہ حاصل ہو جائے تو ہمارے لئے خرابی نہ پیدا ہو۔

یہی دورُخے آدمیوں کا کردار ہر دور میں رہتا ہے مگر وہ دوسرے پہلو پر غور نہیں کرتے کہ اگر حالات نے پلٹا کھایا اور ادھر والی جماعت کے لئے خیر و بہتری حاصل ہوئی یا ان منافقین کا راز فاش ہو گیا[2] تو پھر کیا ہوگا؟!

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۵۳

''اور وہ جو ایمان لائے ہیں کہیں گے، ارے کیا یہی وہ ہیں جنہوں نے اپنے مقدور بھر انتہائی سخت قسمیں کھائی تھیں کہ وہ بلاشبہ تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کی تمام محنتیں اکارت گئیں اب وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں ہیں''۔

ممکن ہے منافقین کے انجام آخرت کا عبرتناک ذکر ہو کہ وہاں جب وہ کفار کے زمرہ میں محشور ہوں گے تو اہل ایمان آپس میں یوں کہیں گے۔[3]

اور ہوسکتا ہے کہ یہ گزشتہ آیت کے تعلق سے اسی دنیا میں اس وقت کا ذکر ہو جب ان منافقین کا راز فاش ہو جائے جسے اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ سے تعبیر کیا گیا تھا تو اس وقت مسلمان آپس میں حیرت و استعجاب کے طور پر یہ گفتگو کریں گے۔[4]

اب یہ گھاٹا دنیا کا بھی ہے کہ جو ان کا منصوبہ تھا منافقت کا وہ شکستہ ہو گیا اور آخرت کا بھی کہ وہاں صریحی کفار سے بھی بدتر سزا کے مستحق ہوں گے۔[5]

---

[1] ۔امر من عندہ یرید فیہ ھلاکھم (مجمع البیان)

[2] ۔بالفتح بالنصر لنبیہ باظھار دینہ او امر من عندہ بھتك ستر المنافقین وافتضاحھم (جلالین)

[3] ۔بگویند مومنان یعنی روز قیامت (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔یقول الذین اٰمنو اذا ھتك سترھم (جلالین) تعجبا من نفاق المنافقین (تبیان)

[5] ۔خاسرین الدنیا بالفضیحتہ والاخرۃ بالعقاب (جلالین) اما الدنیا فلیسو امن الانصار وامام الاخرۃ فقربھم اللہ مع الکفار (مجمع البیان) انما وصفھم الخسران لانھم فوتو انفوسھم الثواب واستحقو اعرضا منہ العقاب فای خسران اعظم من ذٰلك (تبیان)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

اے ایمان لانے والو! جو تم میں سے اپنے دین سے پلٹ جائے تو (کوئی بات نہیں) بہت جلد اللہ ایک جماعت کو لائے گا جنہیں وہ دوست رکھتا ہوگا اور وہ اسے دوست رکھتے ہوں گے، وہ ایمان والوں کے سامنے نرم ہوں گے اور کافروں کے مقابلہ میں سخت، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرینگے یہ اللہ کا فضل وکرم ہے جسے چاہتا ہے، وہ عطا کرتا ہے اور اللہ بڑی سمائی والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

جمہور اہل سنت کا خیال ہے کہ یہ جماعت جس کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں، ان کے شروع والے خلفاء اور اس دور کے مسلمانوں کی ہے جنہوں نے روم اور فارس کے ممالک فتح کیے مگر کیا کیا جائے کہ جو اوصاف قرآن نے اس جماعت کے ذکر کئے ہیں، وہ اس جماعت کے افراد پر منطبق نظر نہیں آتے۔

اس کے برخلاف جمہور علمائے شیعہ اس کو امیر المومنینؑ اور ان کے ساتھ کے افراد پر منطبق کرتے ہیں جنہوں نے ناکثین وقاسطین و مارقین سے جہاد کیا کہ بلکہ جناب شیخ طوسیؒ نے تبیان میں کافی بسط اور تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ اوصاف جو آیت میں مذکور ہیں خاص امیر المومنینؑ کی ذات پر منطبق ہیں جس کا شاہد یہ ہے کہ پیغمبر خداﷺ نے روز خیبر یہی وصف یحب اللہ و رسولہ ویحبہ اللہ و رسولہ، اپنی حدیث میں حضرت علیؑ کے تعارف میں خصوصی طور اس انداز میں ارشاد فرمایا جس سے یہ ظاہر ہے کہ علم لے کر جو پہلے جا چکے ہیں، وہ اس صفت سے متصف نہ تھے۔ اس کے بعد یہ تصور کہ آیت کے مذکورہ اوصاف کا مصداق افراد میں سے کوئی ہے، کسی طرح صحیح نہیں قرار پا سکتا۔

ایک دوسری شیعی تفسیر یہ ہے کہ وہ حضرت امام مہدی آخر الزماں عجل اللہ فرجہ کے دور سے متعلق ہے۔ [1]

اسے قرآنی الفاظ کی تائیدیوں حاصل ہے کہ الفاظ قرآن ایسا ظاہر کر رہے ہیں کہ وہ جماعت ابھی موجود نہیں ہے۔ بعد کو آئے گی۔ [2]

رہ گیا یہ کہ پھر یہ کیوں کر ارشاد ہوا کہ ''بہت جلد اللہ ایک جماعت کو لائے گا؟'' تو یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کے پیمانہ میں تو قیامت کا بھی آنا بہت جلد ہے پھر اگر ظہور امام کو جو بہر صورت قیامت کے تو پہلے ہے، بہت جلد کہہ دیا جائے تو اس کے انکار کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ

---

[1] ۔نزلت فی القائم واصحابہ (علی بن ابراھیم)

[2] ۔قولہ تعالیٰ فسوف یاتی اللہ بقوم یوجب ان یکون القوم غیر موجودین فی وقت نزولا الخطاب (مجمع البیان)

الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾

''تمہارا حاکم وسرپرست بس اللہ ہے اور اس کا پیغمبر اور وہ ایمان رکھنے والے جو نماز ادا کرتے ہیں اور خیرات دیتے ہیں اس حالت میں کہ وہ رکوع میں ہیں۔''

آیہ ولایت

یہ مشہور معروف آیہ ولایت ہے جو امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی جب کہ آپ نے مسجد میں حالت رکوع میں سائل کو انگوٹھی عطا فرمائی۔ چنانچہ جملہ فعلیہ: يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ کے بعد جو واؤ کے ساتھ جملہ اسمیہ: وَهُمْ رٰكِعُوْنَ آیا ہے، اس میں صاف واو حالیہ جس سے وہی مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ ''وہ خیرات دیتے ہیں اس حالت میں وہ رکوع میں ہیں، اور اسی مفہوم سے یہ آیت شان نزول کے مطابق ہوتی ہے مگر اکثر مفسرین اہل سنت نے اس واقعہ سے آیت کو غیر متعلق بنانے کے لئے واؤ کو عطف کا لے لیا ہے۔ اس طرح یہ معنی ہوں گے کہ نماز ادا کرتے ہیں اور خیرات دیتے ہیں اور وہ رکوع کیا کرتے ہیں، حالانکہ اس صورت میں يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ کے بعد آخر میں وَهُمْ رٰكِعُوْنَ کے جملہ کی کوئی افادیت ہی باقی نہیں رہتی۔ [1]

پھر یہ کہ اس آیت کا شان امیر المومنین علیہ السلام میں ہونا، تفاسیر اہل بیت علیہم السلام اور اجماع فرقہ شیعہ کے لحاظ سے تو یقینی ہے ہی، اہل سنت کے کچھ روایات بھی اس سے متفق ہیں جب کہ اس کے خلاف اقوال جو اہل سنت کے یہاں ہیں شاذ کی حیثیت رکھتے ہیں اور غالباً اس شان نزول کو مشتبہ بنانے کی خاص کوشش کچھ فرقہ وارانہ ذہنیت کے افراد کی طرف سے اس لئے عمل میں آئی ہے کہ اس آیت سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بلا فاصلہ حضرت علی بن ابی طالبؑ کی خلافت پر استدلال قوت کے ساتھ ہوتا ہے [2] جس کے انکار کے لئے دھاندلی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾

''اور جو تولا رکھے اللہ اور اس کے پیغمبر اور ان ایمان رکھنے والوں سے تو بلا شبہ اللہ کا لشکر ہی غالب آنے والا ہے۔''

سابق کی آیت میں جن کی ولادیت کا اعلان ہوا تھا، انہی کے ساتھ تولا کی دعوت دی جا رہی ہے۔

وہاں مولا نہیں قرار دیا گیا تھا؟ اللہ اور رسولؐ اور وہ ایمان والے جنہوں نے حالت رکوع میں زکوۃ دی ہے۔ یہ تولا کی دعوت انہی کے لئے ہے اور ان سے تولا رکھنے والے ہی اللہ کا لشکر ہیں جو بالآخر دنیا پر غالب آ کر رہیں گے کب؟ اسی وقت کہ جب لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ اور لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ کے وعدے پورے ہوں گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ

---

[1] ۔قوله: ''يقيمون الصلوٰة'' يدخل فيه الركوع فلولم يحمل قوله: ''وهم راكعون'' على انه حال من ''يؤتون الزكوٰة'' و حملنا على من صنعتهم الركوع كان ذٰلك كالتكرار غير مفيد (مجمع البيان)

[2] ۔اعلم ان هٰذا الأية من الادلة الواضحة على امامة امير المومنين علیہ السلام بعد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلا فصل (تبیان)

اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اے ایمان لانے والوں! اس جماعت میں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب عطا ہوئی ہے، ان لوگوں کو جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق اور کھیل سمجھ رکھا ہے اور کافروں کو دوست اپنا نہ بناؤ اور اللہ کے غضب سے بچوں اگر تم ایمان رکھتے ہو اور جب تم نماز کے لئے اذان دیتے ہو تو وہ اسے مذاق اور کھیل کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔''

پہلے آچکا ہے کہ بت پرست گروہ کو اہل کتاب کے مقابلہ میں کفار کہا جاتا ہے، اس لئے کہ اہل کتاب موسیٰؑ اور عیسیٰؑ یا صرف جناب موسیٰؑ ہی کو مانتے تھے اور ان میں سے کسی کو بھی نہیں مانتے تھے تو وہ ان کے مقابل میں کافر تھے لیکن اس وقت کے جو مومن تھے، ان میں سے بھی بہت سے بعد میں خاتم الانبیاء کو نہ مان کر کفار کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ [1]

بہر حال خواہ وہ ہوں جو پہلے ہی سے کفار میں تھے اور خواہ یہ ہوں جواب کافر ہو گئے ہیں اور اس کفر کا ثبوت یہ ہے کہ وہ دین حق کو مذاق اور کھیل سمجھتے ہیں یعنی اس کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں، ان میں سے کسی کے ساتھ بھی ایک مومن کو اتحاد عمل نہ کرنا چاہئے ورنہ غضب الٰہی کا اندیشہ ہے جس سے بچنے کی آخر آیت میں تاکید ہوئی ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾

''کہیے کہ اے اہل کتاب! ہماری کس بات سے تم ناراض ہو سوا اس کے کہ ہم ایمان لائے اللہ اور اس پر جو ہماری طرف نازل ہوا اور جو پہلے اترا تھا اور یہ کہ تم میں سے زیادہ تر بداعمال ہیں۔''

حقیقت امر کے لحاظ سے تو وہ سب ہی بداعمال تھے [2] اس لئے کہ کافر تھے اور کون کافر ہے جو فاسق نہیں ہے لیکن کسی جماعت کو من حیث المجموع کہا جائے کہ تم ایسے ہو تو اس میں تلخی زیادہ ہوتی ہے لیکن اگر یوں کہا جائے کہ تم میں بہت ایسے ہیں تو ہر ایک کے لئے ناگواری کم ہو جاتی ہے کیوں کہ امکان ہوتا ہے کہ یہ شخص ان بہت سے خارج ہو اور اگر ذہن میں فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہو تو ہر ایک کے لئے لمحہ فکریہ تو پیدا ہو ہی جاتا ہے کہ کہیں ان بہت میں وہ ایک بھی تو نہیں ہے؟!

---

[1] ۔والکفار وان وقع علی جمیع الاصناف فھو ظن لیس من اھل الکتاب الیق وعلیہ اغلب فذلك افرد بالذکر (تبیان)

[2] ۔فاسقون خارجون عن امر اللہ طلبا للریاسۃ وحسدا منزلۃ النبوۃ (مجمع البیان)

یہ حکیمانہ انداز گفتگو ہے جسے ''رواداری'' ہی کے لفظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ورنہ اصل میں کہنا یہی ہے کہ تم لوگ ہمارے صرف اس لئے دشمن ہو کہ ہم ایمان اختیار کیے ہیں اور تم کافر و بداعمال اور بے ایمان ہو۔ [1]

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٦٠﴾

''کہیے کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اس سے زیادہ انجام میں اللہ کے یہاں بدتر کون ہے؟ وہ جس پر اللہ نے لعنت کی اور جس پر وہ غضب ناک ہوا اور جن میں اس نے کچھ کو بندروں اور سوروں کی شکل میں کر دیا اور جس نے معبود باطل کی پرستش کی ہو۔ یہ لوگ جگہ کے لحاظ سے بدتر اور سیدھے راستے سے زیادہ ہٹے ہوئے ہیں۔''

اگر یہ آیت تنزیل میں گزشتہ آیت کے بعد ہی کی ہے تو حقیقت یہ ہے کہ جن چیزوں سے اہل کتاب ناراض تھے، وہ تو کوئی بری چیزیں تھیں نہیں لیکن اب یہ ایک خاص طنزیہ انداز میں انہیں ان کے کردار اور اس کے نتائج کا جائزہ لینے کی دعوت ہے اگر بالخصوص تمہاری ناراضگی کی بنا پر یہ سمجھ بھی لیا جائے کہ یہ باتیں بری ہیں تو اس سے زیادہ بری [2] تو یہ باتیں ہیں اور یہ باتیں وہ ہیں جو خود اسی جماعت میں پائی جاتی ہیں جس سے بات ہو رہی ہے مگر کھل کر یہ نہیں کہا جاتا کہ تم تو ایسے ایسے ہو یہ رواداری نہیں تو اور کیا ہے؟

یہ وہ بلیغ انداز گفتگو ہے جسے کسی کے اختیار کرنے پر سطحی نگاہ رکھنے والوں کا اسے ''عقائد و مسلمات'' پر ضرب کاری قرار دینا لازمی ہے۔

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿٦١﴾

''اور جب وہ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، حالانکہ وہ کفر ہی لئے ہوئے ہیں اور اسی کو لئے ہوئے باہر نکلے ہیں اور اللہ اسے جو وہ چھپاتے ہیں، خوب جانتا ہے۔''

یہ آیت گزشتہ سلسلہ سے قطعاً غیر مرتبط ہے۔ یہ منافقین کا ذکر ہے یعنی رسولؐ کے پاس آنے اور آپ کی صحبت میں بیٹھنے کا ان پر ذرا بھی تو اثر نہیں ہوتا، وہ جیسے آئے تھے، ویسے ہی یہاں سے نکل کر چلے جاتے ہیں کچھ بھی ان میں فرق پیدا نہیں ہوتا۔ صحابیت کو اکسیر سمجھنے والے اس

---

[1] ۔علی التلطف للاستدعاء و معنی الأیة هل تکرهون الا ایماننا و (مجمع البیان)

[2] ۔بشر من ذلك الذی تنقمونه (جلالین) انما قال بشر من ذٰلك وان لم یکن من المؤمن شر و کذلك قوله: اولٰئك شر مکانا، علی الانصاف فی الخطاب والمظاهرة فی الحجاج لانه الکفار یعتقدون ان هٰؤلاء اشرار وان مافیهم شر فخرج علی مایعتقدونه (تبیان) المعنی ان کان ذلك عندکم شرّا نسانا اخبرکم بشرّ منه (مجمع البیان)

تصریح قرآنی کو غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٢﴾

''اوران میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ وہ گناہ اور ظلم وتعدی [1] اور حرام خوری میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں۔ کتنا برا ہے وہ جو وہ کرتے ہیں۔''

یہ بہت جمہور عوام ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد رؤسا وعلماء ہیں۔ [2]

مگر چوں کے علماء کا ذکر اس کے بعد کی آیت میں ہے کہ وہ انہیں منع کیوں نہیں کرتے، اس لئے یہاں یہ تفسیر درست معلوم نہیں ہوتی۔

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿٦٣﴾

''آخر کیوں نہیں منع کرتے ان کو خدا پرست لوگ اور پادری ان کے جھوٹ بولنے اور حرام کھانے سے؟ یہ یقیناً کتنا برا ہے جو وہ کرتے رہیں ہیں۔''

اس کے قبل کی آیت میں جو کہا تھا ''کتنا برا ہے وہ جو وہ کرتے ہیں۔'' وہ خود ان عوام کے عمل سے متعلق تھا اور یہ جو کہا جا رہا ہے، ان علماء کے کردار سے متعلق ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کوتاہی کرتے ہیں۔ [3]

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ؕ وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٤﴾

---

[1] ۔الاثم الجرم کانیا ما کان وعالعدوان الظلم (تبیان)

[2] ۔قیل المراد بالکثیر رؤساؤھم وعلماؤھم (مجمع البیان)

[3] ۔لبئس ما کانو ایصنعون ترک نھیھم (جلالین)

''اور یہودیوں کا قول ہے کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ ان کے ہاتھ بندھیں اور ان پر لعنت ہو، اس کی وجہ سے جو انہوں نے کہا بلکہ اس کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جو آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ کی جانب اتارا گیا ہے، وہ ان میں سے بہتوں کے لئے سرکشی اور کفر میں اضافہ ہی کرے گا اور ہم نے ان کے درمیان دشمنی اور کینہ قیامت تک کے لئے ڈال دیا ہے۔ جب بھی یہ جنگ کی آگ سلگائیں گے، اللہ اسے بجھادے گا اور یہ زمین میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

یہود کے اس قول کا کہ ''اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، یہ مطلب بتایا گیا ہے کہ جب اسلام کے غلبہ کی وجہ سے اور ہم سمجھتے ہیں شریعت اسلام میں سود کے حرام کیے جانے سے چونکہ یہود کے معاشیات کا انحصار سود پہ تھا، وہ مالی پریشانی میں مبتلا ہوئے تو جھنجھلا کر انہوں نے یہ کہا کہ خدا کے ہاتھ بندھ گئے ہیں۔ یعنی وہ تنگ دست ہوگیا ہے کہ اب ہمیں اس نے دینا کم کردیا ہے [1] اسی محل پر یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ دو رخ ان کے اس قول کے اور بتائے گئے ہیں اور وہ بھی قرین قیاس ہیں۔

ایک یہ کہ جب یہ آیت اتری کہ: اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا (حدید۔۱۸) ''اللہ کو قرضہ حسنہ دو'' تو اس پر تمسخر کا پہلو پیدا کرتے ہوئے انہوں نے یہ کہا کہ لو! مسلمانوں کا خدا تنگ دست ہے، اس کے پاس پیسہ نہیں ہے کہ وہ قرض مانگ رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی پریشان حالی کو دیکھ کر انہوں نے بطور طعن و تشنیع یہ کہا کہ اللہ تو ان پر بہت مہربان ہے، پھر یہ اس حال میں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود مجبور ہے کہ اپنی جماعت والوں کو اس حال میں دیکھتا ہے اور پھر کچھ نہیں کرتا [2] اس پر یہ آیت اتری۔

اہل سنت کے تفاسیر میں جہاں تک میری نظر سے گزرا ہے سوا ان اقوال کے جو مالیات سے متعلق ہیں اور کوئی آیت کا پس منظر نہیں ملا اور ہمارے بھی بہت سے مفسرین نے اسی کا تتبع کیا مگر ہمارے یہاں کی ایک قدیم تفسیر یہ ملتی ہے کہ اس کا تعلق قضاء وقدر سے ہے۔ یعنی یہود کا یہ قول کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے جو کچھ فیصلے کرنا تھے وہ کر چکا، اب اس کے ہاتھ خود بندھ چکے ہیں۔ کچھ بھی تبدیلی وہ نہیں کرسکتا۔ اس کی قرآن نے رد کی ہے اور کہا ہے کہ اس کے فیصلے ایسے نہیں ہیں کہ وہ خود ان کے بدلنے پر قدرت نہ رکھتا ہو [3] اس لئے دعا استغفار اور شفاعت وغیرہ کو بے اثر سمجھنا غلط ہے۔

شیعہ اور سنی کا مشہور اختلافی بدآ کا مسئلہ انہی دونوں تصوروں پر مبنی ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ

---

[1] ۔مغلولة مقبوضة عن ادرار الارزاق علينا كنوا به عن البخل (جلالين) مقبوضة عن العطآء ممسكة عن الرزق فنسبوه الى البخل عن ابن عباس (مجمع البيان)

[2] ۔يجوز ان يكونوا قالوا ذلك على وجه الهزء حيث لم يوسع على النبی ﷺ وعلى اصحابه (تبيان)

[3] ۔قالوا قد فرغ الله من لامر الايحدث الله غير ما قدر ه فی التقدير الاوّل فرد الله عليهم فقال: بل يداه مبسوطتان اى تقدم ويؤخر ويزيد وينقص له البدا والمشيئة (على بن ابراهيم)

جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾

''اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ان کی غلطیوں کو ہم نظر انداز کر دیتے[۱] اور انہیں راحت و آرام والے بہشتوں میں جگہ دیتے''[۲]

''ایمان لاتے'' یعنی پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم کرتے اور اب سے اپنے اعمال ٹھیک رکھتے تو پہلے کی غلطیاں کالعدم ہو جاتیں یعنی ان کا کوئی مواخذہ نہ ہوتا۔ اس لئے کہ یہ عام اصول ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ہی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ قبل والی زندگی کا کوئی حساب نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ الاسلام یجب ما قبلہ کے اصول کے ماتحت اگر پہلے خون بھی کیا ہو تو اب اس کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

''اور اگر وہ توریت اور انجیل اور اس کو جو ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے اترا تھا[۳] ٹھیک طرح قائم رکھتے تو وہ کھاتے پیتے اپنے اوپر سے اور اپنے پیروں کے نیچے سے[۴] ان میں سے بس ایک گروہ تو اعتدال پر ہے اور زیادہ ان میں سے بڑا برا کردار رکھتے ہیں۔''

پہلے تو ان کی یہ شکایت کی گئی تھی کہ وہ اس آخری رسولؐ پر ایمان نہیں لاتے اور اگر ایسا ہوتا تو ان کی سب غلطیاں نظر انداز ہو جاتیں اور وہ نجات اور نعمات آخرت کے حقدار ہو جاتے اور اب ان کی یہ شکایت ہے کہ ارے اس رسولؐ پر ایمان لانا کیسا، انہوں نے خود اپنی کتابوں کے تعلیمات پر بھی عمل نہ کیا جس کی وجہ سے وہ معاشی تباہی میں مبتلا ہیں کم از کم وہ اپنے ہی یہاں کے تعلیمات پر من وعن عمل کرتے[۵] تو معاشیات کی تو ان کے لئے فراخی رہتی اور دنیا تو ان کی آرام سے کٹتی ہے''۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہاں نجات آخرت کا ذکر نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ تو بہر حال آخری پیغمبرؐ پر ایمان اور پھر اس کی تعلیم پر عمل سے وابستہ ہے۔

---

[۱] ۔ای غطّاھا علیھم و ازال عف بھا عنھم (تبیان)

[۲] ۔امنوا بمحمد (جلالین)

[۳] ۔یعنی سائر کتب سابقہ (شاہ ولی اللہ)

[۴] ۔بان یوسع علیھم الرزق و یفیض من کلّ جانب (جلالین)

[۵] ۔ای عملوا بما فیھا علی ما فیھا دون ان یحرّفوا اشیئا منھا او یغیّروا (مجمع البیان)

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾

''اے پیغمبر! جو اللہ کی طرف سے آپ پر اتارا گیا ہے، اسے پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اس کا کچھ پیغام پہنچایا ہی نہیں اور اللہ لوگوں سے آپ کی حفاظت کرے گا، بلاشبہ اللہ کافروں کو منزل تک نہیں پہنچایا کرتا۔''

حکم تاکیدی اعلان ولایت جناب امیر علیہ السلام بروز غدیر

الفاظ آیت سے ظاہر ہے کہ یہ کسی خاص اتارے ہوئے اہم حکم کی تبلیغ کے لئے تاکید ہے اور اس لئے خود آیت کے الفاظ جستجو پیدا کرتے ہیں کہ وہ کون سا اہم حکم تھا اور جب نہ شیعہ مفسرین کے یہاں بلکہ بہت سے سنی تفاسیر اور احادیث میں بھی یہ مل جاتا ہے اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کا ارشاد بھی اس کے مطابق موجود ہے [۱] کہ یہ آیت حجۃ الوداع میں ولایت حضرت علی بن ابی طالبؑ کے حکم کی تبلیغ کے متعلق آئی ہے جس کے بعد حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم میں وہ تاریخی اعلان فرمایا ہے کہ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ 'جس کا میں مولا ہوں، اس کا یہ علی مولا ہے'' تو آسودگی محسوس ہونے لگتی ہے اور جستجو کا سفینہ ساحل مراد تک پہنچ جاتا ہے۔

مگر کچھ مفسرین اہل سنت نے اس ''جستجو کا دروازہ بند کرنے کے لئے آیت کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ جو بھی اللہ کا حکم اترے، اس کی تبلیغ کر دیجیے یعنی ایک بھی حکم ایسا نہ ہو جو جس کی تبلیغ آپ لوگوں کے خوف سے چھوڑ دیں، ورنہ پھر آپ نے رسالت کا فرض ہی انجام نہ دیا ہوگا یعنی کسی ایک کی تبلیغ نہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے بالکل ہی تبلیغ نہیں کی۔ [۲]

مگر عربی سلیقہ بیان رکھنے والے احساس کر سکتے ہیں کہ اس صورت میں بلغ کل ما انزل الیك ہونا چاہیے یا پھر بلغ ما ینزل الیك (بصیغہ تجدید واستمرار خ، نہ کہ ما نزل الیك فقط جو آپ پر اتارا گیا ہے)۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

---

[۱] ۔قال ابو جعفر و ابو عبداللہ علیہما السّلام ان اللہ تعالیٰ لما اوحی الی النبی علیہ السّلام ان یستخلف علیا کان یخاف ان یشق ذلك علی جماعة من اصحابه فانزل اللہ تعالیٰ هٰذه الآیة (تبیان)

[۲] ۔بلغ جمیع ما انزل الیك من ربك ولا تکتم شیئا منه لخوف ان تنال بمکروه وان لم یفعل ای لم تبلغ جمیع ما انزل الیك فما بلغت کما سالته بالافراد والجمع لان کتمان بعضها کتمان کلها (جلالین)

''کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب تمہاری کوئی مذہبی بنیاد ہی نہیں [1] جب تک کہ توریت اور انجیل اور جو کچھ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے، اس کو قائم نہ رکھو اور یقیناً ان میں سے بہتوں کو یہ جو آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے، سرکشی اور کفر میں اضافہ کا باعث ہوجائے گا تو آپ ان کافر لوگوں پر کوئی افسوس نہ کیجیے گا'' [2]

اہل کتاب کا مشرین سے امتیاز بس برائے نام ایک انتساب کی حد تک ہے ورنہ جب انہوں نے آسمانی کتابوں میں تحریف کردی اور عقائد واعمال کسی بھی ان انبیاء کے تعلیمات پر قائم ہی نہیں رہے تو پھر ان کا دین ومذہب ہی کیا رہا؟ اور ان میں اور غیر اہل کتاب میں جو صریحی کافر ہیں، فرق ہی کیا باقی رہا؟

معلوم ہونا چاہیے کہ توریت اور انجیل کو ٹھیک طور پر قائم رکھنے کا لازمی نتیجہ آخر میں یہ ہے کہ وہ اب اس کتاب پر جو اتاری گئی ہے یعنی قرآن ایمان اختیار کریں اور اس طرح مسلمان ہوجائیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود اپنی کتابوں پر بھی ایمان سے محروم ہیں اور اس لئے آخر میں ان پر صاف صاف ''کافرین'' کے لفظ کا اطلاق کردیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٩﴾

''یقیناً جو مسلمان ہیں ہی اور جو یہودی تھے اور صابئ اور عیسائی، جو بھی اور خدا اور روز آخرت پر ایمان اختیار کرے اور نیک اعمال کرے، ان کے لئے کوئی خوف نہیں ہے اور نہ انہیں رنج ہوگا۔''

اس طرح کی ایک آیت پہلے پارہ میں آچکی ہے۔ صرف ذرا سا فرق ہے کہ وہاں نصاریٰ کا ذکر پہلے اور صائبین کا بعد کو تھا اور یہاں صائبین کا نام پہلے ہے اور نصاریٰ کا بعد کو ہے۔ بہرحال مطلب یہ ہے کہ پہلے کوئی کچھ ہو، خواہ شروع سے مسلمان ہو یا یہودی، عیسائی یا ستارہ پرست ہو، اب معیار نجات سب کے لئے ایک ہے کہ جو ان اصول وعقائد کو تسلیم کرے، جن میں اصل اصول مبداء ومعاد ہے اور اس شریعت پر عامل ہو کہ اس کا نام ''عمل صالح'' ہے وہ آخرت کے خوف ورنج سے محفوظ ہے۔ [3]

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿٧٠﴾

''ہم نے بنی اسرائیل سے عہد وپیمان لیا اور ان کی طرف بہت سے پیغمبر بھیجے، جب بھی کوئی پیغمبر ایسی باتیں لے کر

---

[1] ۔لستم علیٰ شیء من الدّین یعتدّبه (جلالین) علی شیء من الدّین الصحیح (مجمع البیان)

[2] ۔قیل معناه لا تحزن علی هلا کهم و عذا بهم فذٰلك جزاؤهم بفعالهم (مجمع البیان)

[3] ۔یعنی دار صل از هر فرقۂ که باشد چوں ایمان ارد از اهل نجات است و خصوصیت فرق را اعتبار نیست (شاہ ولی اللہ)

آیا جو ان کی غلط خواہشوں کے موافق نہ تھیں [1] تو کچھ کو انہوں نے جھٹلایا ہی اور کچھ کو وہ قتل کر دیا کرتے تھے۔"

وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۷۱

"اور انہوں نے سمجھا کہ کوئی سزا نہ ملے گی [2] تو وہ اندھے اور بہرے ہو گئے، پھر اللہ نے انہیں معاف کیا تو اس کے بعد ان میں سے بہت سے پھر اندھے اور بہرے ہو گئے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس کا خوب دیکھنے والا ہے۔"

نہیں سمجھا جا سکتا کہ یہ آیت گزشتہ آیت سے کوئی تعلق رکھتی ہے بلکہ مضمون آیت سے قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت منافقین کے متعلق کسی سلسلہ آیات کا جز ہے۔

"اندھے اور بہرے ہو گئے" یعنی آیات حقیقت سے آنکھیں بند کر لیں اور صدائے حق کے سننے سے گریز کیا۔ پھر اللہ نے انہیں معاف کیا یعنی انہوں نے توبہ تلّا کی اور اللہ نے توبہ قبول کی مگر پھر وہ اپنی پرانی روش پر واپس ہو گئے اور وہی اندھے بہرے پن کا رویہ اختیار کر لیا۔ [3]

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۷۲

"کافر ہو گئے وہ جنہوں نے کہا کہ مریمؑ کے فرزند عیسیٰؑ ہی اللہ ہیں اور خود مسیحؑ نے یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! اللہ کی پرستش کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے بلاشبہ جو اللہ کے ساتھ شرک کرے اللہ نے اس پر بہشت حرام کر دی ہے اور ان کا ٹھکانا آتش دوزخ میں ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔"

نصاریٰ کے مختلف فرقوں کے کافر ہونے کا صریح حکم

عموماً عیسائی لوگ ظاہر بظاہر مسیحؑ کے علاوہ ذات الٰہی کے منکر نہیں ہیں بلکہ انہیں ایک تو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں پھر تثلیث کے قائل ہیں کہ باپ بیٹا اور روح القدس یہ تینوں خدا ہوتے ہوئے ایک ہیں قرآن نے بھی اس قول کو کہ عیسیٰ علیہ السلام ہی بس اللہ ہیں، صاف صاف جماعت نصاریٰ کی

---

[1] ۔ الهدیٰ هو لطف محلّ الشئی من النفس مع المیل الیه بما لا ینبغی فلذلك غلب علی الهوی صفة الذم (تبیان)

[2] ۔ الفتنة ههنا العقوبة (تبیان)

[3] ۔ یریدان فریقا منهم تابو افتاب الله علیهم ثم عموا وصموا ای عادو الما کانو علیه (مجمع البیان)

طرف منسوب نہیں کیا ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ جنہوں نے یہ کہا، وہ کافر ہو گئے۔ اب تو یہ سمجھا جائے یہ نصاریٰ کا کوئی خاص فرقہ ہے جو مسیح سے علیحدہ کسی ذات کا جس کا نام اللہ ہے تصور ہی نہیں رکھتا جیسا کہ بعض مفسرین کا بیان ہے [1] اور اس آیت کے بعد والی آیت کو اگر تنزیل میں اس سے متصل ہی مانا جائے تو اس خیال کو اس سے تقویت ہوتی ہے اس لئے کہ اس کے بعد والی آیت میں صراحۃً تثلیث کے کفر ہونے کو ظاہر کیا گیا ہے تو دونوں آیتوں کو ملا کر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ نصاریٰ کے ایک فرقہ کی رد میں یہ آیت ہے اور دوسرے فرقوں کی رد میں جو تثلیث کے قائل نہیں، اس کے بعد والی ہے۔

مگر ایک امکان یہ ہے کہ وہ اس آیت کے بعد والی آیت کے ساتھ مقام تنزیل میں نہ آئی ہو بلکہ کہیں اور کی ہو جسے جمع قرآن کے وقت یکسانی مضمون کی بنا پر ساتھ ساتھ درج کر دیا گیا اور یہ کہ ''وہ کہتے ہیں کہ اللہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہی ہیں، عقیدہ تثلیث ہی کی ایک دوسری تعبیر ہو اس کے لازمہ کو نمایاں کرنے کے ساتھ جب تثلیث کی رو سے اللہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ متحد ہے تو پھر وہی اللہ ہیں..... ان سے الگ کوئی نہیں جو اللہ ہو۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۷۳

''بلاشبہ کافر ہو گئے وہ جنہوں نے کہا اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ کوئی خدا نہیں مگر ایک اکیلا خدا اور اگر یہ اس سے جو کہہ رہے ہیں باز نہیں آئیں گے تو جو اس کفر پر ان میں سے برقرار رہیں گے [2] انہیں دردناک عذاب پہنچے گا۔''

یہ جو عام نصاریٰ کا عقیدہ تثلیث ہے [3] صاف صاف اسی کی رد ہے یعنی اللہ اور مسیح اور روح القدس یا اقانیم ثلثہ تین ہوتے ہوئے ایک ہیں یہ صریح کفر و شرک ہے۔

بعض مفسرین نے اقانیم ثلثہ کی تشریح کی ہے: اللہ، عیسیٰ علیہ السلام اور مادر عیسیٰ علیہما السلام [4] مگر یہ غالباً عیسائیوں کے عقائد سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:

''نصاریٰ میں دو قول ہیں: بعض کہتے ہیں اللہ یہی تھا جو صورت مسیح میں آیا اور بعض کہتے ہیں تین حصہ ہو گیا۔ ایک اللہ رہا، ایک روح القدس اور ایک مسیح، یہ دونوں صریحی کفر ہیں۔'' (موضح القرآن)

بظاہر مطلب اس کا وہی ہے جسے ہم نے موجودہ ترتیب کو مطابق تنزیل ماننے کی صورت میں اس کے قبل کی آیت میں ترجیح دی ہے کہ وہ آیت پہلی قسم کے نصاریٰ کی رو میں تھی اور یہ آیت دوسری قسم کے نصاریٰ کی رد میں ہے۔

---

[1] ۔ الذین یقولون من النصاریٰ ان اللہ ھو المسیح ابن مریم ھم الیعقوبیہ... و غیرھم یقولون ان المسیح ابن اللہ (تبیان) ھذا مذاھب الیعقوبیہ منھم لانھم قالوا ان اللہ اتحد بالمسیح اتحاد الذات (مجمع البیان)

[2] ۔ الذین یستمرّون علیٰ کفرھم (تبیان)

[3] ۔ القائلون بھذا المقالۃ جمھور النصاریٰ..... لانھم یقولون اب وابن وروح القدس الٰہ واحد (تبیان)

[4] ۔ ثالث الٰھۃ ثلثۃ ھو احدھما او الاٰخران عیسیٰ وامّہ (جلالین)

اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾

''تو کیوں نہیں یہ توبہ کرتے اللہ کی بارگاہ میں اور اس سے معافی مانگتے اور اللہ تو بخشنے والا ہے بڑا مہربان''

کفر یا شرک سے توبہ صحیح عقیدہ کو اختیار کرنا اور ایمان لے آنا ہے اور ایمان اختیار کرنے کے بعد گزشتہ زندگی کے متعلق کوئی سوال باقی نہیں رہتا کہ وہ کس طرح گزری۔ اس طرح جو کچھ پہلے تھا، وہ سب معاف ہو جاتا ہے جو اللہ کے رحم و کرم کا تقاضا ہے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۷۵﴾

''نہیں ہیں مریم کے بیٹے مسیح ؑ مگر ایک پیغمبر جن کے پہلے اور پیغمبر گزر چکے ہیں اور ان کی ماں صدیقہ (بڑی راست باز) تھیں۔ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم ان کے سامنے کس طرح واضح بیانات پیش کرتے ہیں، پھر یہ دیکھو کس طرح منحرف ہوتے ہیں۔''[1]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی صحیح حیثیت

مسیح ابن مریم علیہ السلام کے متعلق جو صحیح تصور ہے، وہ صاف صاف پیش کر دیا گیا ہے کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے نہیں تھے۔ ہاں خدا کے رسول تھے اور ان کی ماں بڑی راست باز خاتون تھیں۔ اس طرح یہود کے جو خیالات جناب مریم سلام اللہ علیہا کی پاک دامنی اور جناب عیسیٰ علیہ السلام کی طیب ولادت کے خلاف ہیں، وہ بھی غلط ہیں اور عیسائیوں کے جو خیالات ان کے بارے میں الوہیت کے ہیں، وہ بھی خلاف واقع ہیں۔''

''کھانا کھاتے تھے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ بشر تھے، خدا نہ تھے، اس لئے کہ دوسرے انبیاء کے بارے میں کفار و مشرکین کا یہی قول قرآن میں درج ہے کہ یہ تو بشر ہے یاکل الطعام کھانا کھاتے ہے۔ بس جیسے اور انبیاؤ مرسلین تھے، وہی صورت جناب عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کی بھی کہ وہ بیشتر کے ماورا کوئی چیز نہ تھے۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾

''کہیے کہ کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی پرستش کرتے ہو جو تمہارے لئے نہ کسی نقصان پہنچانے پر قابو رکھتی ہے اور

---

[1] ۔ انّٰی کیف یؤفکون یصرّفون عن الحق مع قیام البرھان (جلالین)

نہ فائدہ پہنچانے پر اور اللہ وہی سننے والا ہے، خوب جاننے والا ہے۔"

انسان کا علم بھی محدود ہے اور قدرت بھی۔ یہ نقص اس کی نفی الوہیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے چنانچہ پہلے ماسوی اللہ کی عاجزی دکھلا کر ان نفی قدرت کا صراحتاً اظہار کیا گیا اور پھر اللہ کے لئے یہ کہہ کر کہ "وہی سننے والا ہے، خوب جاننے والا" ان کے نفی علم کو ضمناً ظاہر کیا گیا۔

پھر اس کے ساتھ اس میں تہدید۔ بھی مضمر ہے کہ تم ان معبودوں کو شریک خدا جس جس طرح کہتے اور جس جس طرح مشرکانہ افعال کرتے ہو، سب کا اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اس لئے اس کے عذاب سے پرحذر رہو۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾

"کہیے کہ اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو سے کام نہ لو..... اور ان لوگوں کے دل بخواہ خیالات کی پیروی نہ کرو جو پہلے گمراہ ہو چکے اور انہوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔"

غلو کسی کو اس کے مرتبہ سے بڑھا دینا ہے۔ نصاریٰ نے جناب عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا کہہ دیا۔ بظاہر اس محل پر مخاطب وہی ہیں یا یہود بھی اس کے تحت میں ہوں، اس لئے کہ دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے کہ وہ عزیر کو خدا کا بیٹا کہنے لگے تھے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دین غلو یعنی حد سے قدم آگے بڑھانا، اس غلو سے جو کسی شخص کو اس کے مرتبہ سے بڑھانے کے ساتھ ہوتا ہے، مخصوص نہ ہو بلکہ کسی کو اس کے مرتبہ سے گھٹانا بھی اس شخص کے بارے میں غلو نہ ہو مگر دینی حدود سے تجاوز کی بنا پر دین میں غلو تو ہے لہٰذا یہود اور نصاریٰ دونوں اس معنی میں غلو فی الدین کے مرتکب ہیں کہ وہ اللہ کے سچے انبیاء کی تکذیب کر رہے ہیں۔ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں اور نصاریٰ کم از کم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت سے انکار کے مرتکب تو ہیں ہی لہٰذا دین کی حدود سے قدم آگے بڑھانے میں دونوں شریک ہیں۔ [1]

ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے جو اس وقت مخاطب ہیں یہ راستے کسی ذاتی تحقیق سے اختیار نہیں کیے ہیں بلکہ اپنے اسلاف کی پیروی کر رہے ہیں، اس لئے انہیں انتباہ کیا گیا کہ ایسے اسلاف کی پیروی نہ کرو جو خود گمراہ ہو گئے تھے۔ [2]

تمہاری خود ذمہ داری ہے کہ تم اس گمراہی سے بچو جس میں وہ گرفتار ہو گئے تھے۔ یہ نہیں کہ ان کے نقش قدم پر چل کر خود بھی گمراہ ہو۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۷۸﴾

---

[1] ۔قال قوم المراد به اليهود و انصاریٰ لانّ اليهود ايضاً غلوا فی تكذيب عيسیٰ و محمّد ﷺ (تبيان)

[2] ۔قوم قد ضلوا من قبل بغلّوهم وهم اسلافهم (جلالين) خطاب للّذين كانوا فی عصر النبی ﷺ نهوا ان يتبعوا اسلافهم (مجمع البيان)

''بنی اسرائیل میں جنہوں نے کفر اختیار کیا ان پر لعنت ہوئی داؤد اور عیسٰی فرزند مریم کی زبان سے۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی سے کام لیا اور وہ حد سے گزر جایا کرتے تھے۔''

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾

''وہ کسی برائی سے جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے کو روکتے نہ تھے کیا برا تھا وہ طرز عمل جو وہ اختیار کیے ہوئے تھے۔''

چاہے جرم کے مرتکب کچھ خاص لوگ ہوں لیکن دوسرے لوگوں نے اگر سکوت اختیار کیا اور ان اعمال سے چشم پوشی کی تو وہ سب ہی غضب ولعنت کے مستحق بن جاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو زیارت امام حسینؑ ہے:

لَعَنَ اللهُ أُمَّةً سَمِعَتْ بِذٰلِكَ فَرَضِيَتْ بِهٖ.

لعنت ہو ان لوگوں پر بھی جنہوں نے اس کو سنا اور اس پر راضی رہے۔

یہ بالکل قرآن مجید کی اس آیت کے مطابق ہے، یہاں بھی اسباب لعنت میں ظلم وتعدی کے ارتکاب کو الگ بیان کیا گیا ہے اور اسے الگ کہ وہ برائی سے مانع نہ ہوتے تھے [۱] یہ ان لوگوں کے مورد غضب ہونے کا سبب ہے جو خود جرم کے مرتکب نہ بھی ہوئے ہوں۔

دوسرے معنی لایتناھون کے یہ کہے گئے ہیں کہ وہ باز نہ آتے تھے یعنی اس برائی پر قائم وبرقرار رہتے تھے [۲] اور بعض مترجمین نے ترجمہ اس کے مطابق کیا ہے۔ [۳]

مگر بظاہر یہ درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ باز رہنے کے لئے انتہاء کا لفظ آتا ہے جو باب افتعال سے ہے نہ کہ تناہی جو باب تفاعل سے ہے اور جس کے معنی میں غیر کے ساتھ شرکت مضمر ہوتی ہے۔ [۴]

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾

''دیکھو گے تم ان میں سے بہتوں کو کہ وہ کافروں سے موالات رکھتے ہیں، بہت برا ہے وہ سامان جو ان کے نفسانیتوں نے ان کے لئے رکھا ہے [۵] کہ اللہ ان پر غضب ناک ہوگیا ہے اور وہ عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں

---

[۱] ۔لایتناھون ای لاینھی بعضھم بعضا (جلالین) یك دیگر را منع نمی کردند از ان عملی زشت که مرتکب آن می شدند (شاہ ولی اللہ) ایک دوسرے کو منع نہ کرتے تھے اس برے کام سے کہ وہ کرتے تھے اس کو (شاہ رفیع الدین)

[۲] ۔للتناھی ھٰھنا معتیان احدھما انّہ تفاعل من النھی الثانی انّہ بمعنی الانتھا ایقال تناھی عنہ اذا کف عنہ (مجمع البیان)

[۳] ۔کسی برے کام سے جسے ان لوگوں نے کیا باز نہ آتے تھے (مولانا فرمان علی صاحب)

[۴] ۔مثل قولك لایتضاربون ولا یترامون ولا ینتھون معناہ لا یکفّون (تبیان)

[۵] قدمت لھم انفسھم من العمل لمعادھم (جلالین)

گے۔"

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اہل کتاب کے مقابلہ میں جب کافروں کا لفظ آتا ہے تو اس سے مراد مشرکین ہوتے ہیں [1] اس لئے کہ اہل کتاب تو پھر بھی کچھ انبیاء اور آسمانی کتابوں کو مانتے تھے اور مشرکین اس میں سے کچھ بھی نہ مانتے تھے۔ اسلام نے قرآن کی زبانی بار بار ان کو دعوت دی کہ تمہیں ہمارے ساتھ مل کر ان کافروں کا مقابلہ میں ایک محاذ بنانا چاہیے مگر یہ اہل کتاب بجائے مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کرنے کے اسلام کے خلاف کافروں کے ساتھ سازشوں میں شریک ہوتے تھے یہی ان کے کرتوت کا تاریک پہلو ہے جسے قرآن یہاں نمایاں کر رہا ہے۔

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨١﴾

"اور اگر وہ ایمان رکھتے اللہ اور رسول اور اس پر کہ جو اس پر اترا ہے تو ان لوگوں کو اپنا حوالی موالی نہ بناتے مگر ان میں سے زیادہ تر افراد بداعمال ہیں۔"

عموماً لفظ "النبی" یا "الرسول" مطلق طور پر قرآن میں آئے تو اس سے مراد یہ پیغمبر یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہوتے ہیں اور جو ان پر اترا ہے، اس سے مراد قرآن اور شریعت اسلام مگر مفسرین نے اس خیال سے کہ ذکر یہودیوں کا ہے تو ان کے متعلق یہ فرض کرنے کے کیا معنی کہ وہ اس رسول اور قرآن پر ایمان لاتے، یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یا تو یہ عام یہودیوں کا ذکر ہے ہی نہیں بلکہ ان کا ہے جو منافقین میں داخل ہو گئے ہیں اور "النَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ" سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توریت مراد ہیں کہ اگر یہ واقعی ان پر ایمان رکھتے ہوتے تو مشرکین سے گٹھ جوڑ نہ کرتے۔ [2]

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٨٢﴾

"یقیناً تم سخت ترین دشمن مسلمانوں کا پاؤ گے یہودیوں کو اور مشرکین کو اور سب سے زیادہ مسلمانوں سے محبت میں قریب پاؤ گے انہیں جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ان میں پادری ہوتے ہیں اور دنیا سے الگ تھلگ رہ کر عبارت کرنے والے [3] اور یہ کہ وہ غرور و تکبر سے کام نہیں لیتے۔"

---

[1] الذین کفروا یرید کفار مکة (مجمع البیان)

[2] ۔قولان احدھما انه فی المنافقین من الیھود والثانی المراد بالنبی موسیٰ علیہ السلام (تبیان)

[3] ۔قسیسین علماء ورھبانا عبادا (جلالین)

بت پرستوں اور یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کی تعریف

جیسا کہ قدیم تفسیر میں وارد ہے، یہ آیت اس واقعہ کے پس منظر اتری ہے کہ مکہ معظّمہ میں بہت مسلمان مشرکین کی ایذا رسانیوں کی بنا پر جب حکم رسولؐ سے ہجرت کر کے ملک حبش گئے جسے ''ہجرت اولیٰ'' کہتے تو نجاشی بادشاہ حبشہ نے حقیقت پسندی سے کام لے کر انہیں اپنے یہاں پناہ دی اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے کام لیا۔ اسی لئے بمقابلہ مشرکین عیسائیوں کی تعریف کی گئی ہے۔[1]

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قیامت تک ہر ملک اور ہر دور کے عیسائیوں پر یہ صادق آئے کہ وہ دوسروں سے زیادہ مسلمانوں کے خیر خواہ ہوں بلکہ دنیا کی سیاسی کروٹوں میں وہ وقت آ سکتا ہے جب مسلمانوں کے دشمن نمبر ایک یہی عیسائی لوگ ہوں۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾

''اور جب وہ سنتے ہیں اسے جو پیغمبر پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے ان کی آنکھوں کو کہ لبریز ہو جاتی ہیں آنسوؤں سے، اس سے کہ جو انہوں نے حق پہچانا ہے، کہتے ہیں پروردگارا ہم ایمان لائے تو تو ہمیں گواہوں میں درج فرما اور ہمیں کیا ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں اللہ پر اور اس حق بات پر جو ہمارے پاس آئی ہے اور پھر توقع رکھیں کہ ہمارا پروردگار ہم کو نیک لوگوں میں شامل کرے''۔

آیت کے آخری جزء وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا کو جلالین نے اور ان کے تتبع میں شاہ ولی اللہ نے لانؤمن والے لا کے تحت میں لیا ہے۔ اس لئے شاہ صاحب نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ:

''وچیست ما را کہ طمع نکنیم''۔

مگر انہی کے فرزند شاہ رفیع الدین نے اس نطمع کو فعل ثبوتی قرار دیا ہے اور یوں ترجمہ کیا ہے ''اور طمع رکھتے ہیں ہم یہ''۔

مجھے یہی صحیح معلوم ہوتا ہے اور میں نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ

---

[1] ۔ کان سبب نزولها انّه لمّا اشتدّت قریش فی اذی رسول اللہ ﷺ و اصحابه الذین اٰمنوا به بمکة قبل الهجرة امرهم رسول اللہ ﷺ ان یخرجوا الی حبشه (علی بن ابراهیم)

الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾

''تو اللہ نے صلہ دیا انہیں اس کا جو انہوں نے کہا ان بہشتوں کی صورت میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ صلہ ہے ان کا جو اچھے کام کریں۔ اور جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، یہ دوزخ والے لوگ ہیں''۔

''صلہ ہے اس کا جو انہوں نے کہا، چوں کہ یہ کہنا حقیقت واقعہ کے مطابق اور دل و دماغ کی ہم آہنگی کے ساتھ تھا۔ ورنہ صرف قول کچھ قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ اس نکتہ کی تشریح علامہ طبرسیؒ نے فرمائی ہے، اس طرح کہ:

علق الثواب بمجرد القول لانه قدتبين من وصفهم مايدل علىٰ اخلاصهم فيما قالوه وهو المعرفة فى قوله مما عرفوا من الحق والبكاء الموذن بحقيقة الاخلاص واستكانة القلب ومعرفة والقول اذا اقترن به المعرفة والاخلاص فهى الايمان الحقيقى الموعود عليه الثواب (مجمع البيان)

ثواب کو صرف ان الفاظ کے کہنے پر مرتب کیا گیا، اس لئے کہ ان کی صورت حال سے ایسے آثار نمایاں ہوئے جو ان کے خلوص کا ان کے کہنے میں پتہ دیتے ہیں اور یہی معرفت ہے جس کا اظہار اس ارشاد الٰہی سے ہوا ہے کہ ''اس سے جو انہوں نے حق پہچانا ہے'' اور رونا جو حقیقی خلوص اور دلی تاثر اور معرفت کو ظاہر کرتا ہے اور الفاظ کا زبان سے کہنا جب معرفت اور خلوص کے ساتھ ہو گیا تو یہی حقیقی ایمان ہے جس پر ثواب کا وعدہ ہے۔

ایک خاص پہلو قابل لحاظ یہ ہے کہ عموماً چھٹے پارہ کی آخری آیت کو جو اس کے قبل والی تفسیر کی جلد میں ہے، مستقل طور پر دیکھ کے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس میں بمقابلہ مشرکین و یہود و انصاریٰ کی مدح ہے چنانچہ ہم نے بھی اس آیت کے ذیل میں اس خیال کی ترجمانی کی ہے لیکن اگر یہ تمام آیات مقام تنزیل میں ایک سلسلہ کے ہیں، جو کوئی عجیب نہیں ہے، اس لئے کہ پاروں کی تقسیم فقط صفحات یا سطور یا حروف کی تعداد کو دیکھ کر تقریباً برابر برابر حصوں میں کر دی گئی ہے۔ مضمون کا لحاظ ہی نہیں کیا گیا ہے چنانچہ اس کی نظیریں بہت ہیں کہ آدھی بات گزشتہ پارہ کے آخر میں ہے اور آدھی بعد والے پارہ کے شروع میں۔ اس صورت میں یہ بعد والے اوصاف اسی جماعت کے ہیں جس کا ذکر سابق آیت میں ان الفاظ پر ختم ہوا تھا: بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ''ان میں پادری ہوتے ہیں اور تارک الدنیا لوگ اور یہ تکبر سے کام نہیں لیتے''۔ اس کے بعد بلا فاصلہ یہ ہے کہ: وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ ''جب وہ سنتے ہیں آیات الٰہیہ تو ان کا عالم یہ ہوتا ہے: تو ایسے لوگ جن کی یہ تعریف ہے، اب نصاریٰ کہاں ہوئے؟ وہ تو مسلمان ہو گئے جو سابق میں عیسائی تھے، جیسے جناب سلمان فارسی رضوان اللہ علیہؑ جب کہ اس سلسلہ میں بہشت کے ثواب کا بھی اعلان ہے تو یہ پوری تعریف اور اوصاف اس جماعت سے متعلق ہو ہی نہیں سکتے جو آخر تک عیسائیت کا دم بھرتی رہے اور کسی وقت بھی اسلام قبول نہ کرے۔

یہ تصور میں نے کافی قوت کے ساتھ پیش تو کر دیا ہے مگر ابھی پورے طور سے میں مطمئن نہیں ہوں اور یہ بات کلیۃً درست معلوم نہیں ہوتی دو وجہوں سے: ایک یہ کہ اگر گزشتہ آیت والی مدح کو ہم عیسائیوں کی اسی جماعت سے متعلق کریں جو مسلمان ہو گئی تو پھر اس کے بالمقابل مذمت ہے، اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہود اور مشرکین ایسے ہیں کہ مسلمان ہونے کے بعد بھی مسلمانوں کے شدید دشمن رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات اس

عمومیت کے ساتھ درست نہیں ہے۔

پھر یہ مدح اگر ان عیسائیوں سے متعلق ہے جو مسلمان ہو گئے تو اس مدح کا وہ جزء کہ ''ان میں پادری اور تارک الدنیا لوگ ہوتے ہیں'' چسپاں معلوم نہیں ہوتا۔

اس لئے دونوں آیتوں کو مقام تنزیل میں یا تو مرتبط مانا نہ جائے اور یہ سمجھا جائے کہ پہلی آیت تو اس وقت کی عیسائی قوم ہی کی مدح میں ہے بمقابل یہود و مشرکین، اور دوسری آیت کسی اور موقع پر اتری ہے ان عیسائیوں کی مدح میں جو دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور یا ایک ہی ساتھ نازل شدہ مان کر بھی یہ سمجھا جائے کہ گزشتہ مدح کے ذیل میں عیسائیوں کی طبیعت کی نیکی ہی کا ایک نتیجہ قرآن یہ بتا رہا ہے کہ ان میں قبولِ حق اور آیاتِ الٰہیہ سے اثر پذیری کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے اور وہ اکثر ایمان بسہولت اختیار کر لیتے ہیں اور اب ایمان لانے کے بعد ان کے اچھے انجام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اس طرح دونوں باتیں ٹھیک ہیں یعنی پہلی آیت کے ذیل میں جو لکھا گیا تھا کہ وہ بمقابلۂ یہود و نصاریٰ من حیث القوم عیسائیوں کی مدح ہے وہ بھی درست ہے اور یہ کہ موجودہ آیت میں جو حسنِ انجام اور نعیم جنت کا ذکر ہے، وہ ان عیسائیوں سے متعلق ہے جو صدق دل سے مسلمان ہو گئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۸۷ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸

''اے ایمان لانے والو! جو اچھی دل پسند چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں، انہیں حرام قرار نہ دو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ یقیناً اللہ تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو اللہ نے تمہیں اچھی حلال چیزیں عطا کی ہیں، ان میں سے کھاؤ پیو اور اللہ کی ناراضگی سے بچو جس پر تم ایمان رکھتے ہو''۔

پہلے یہ مضمون آ چکا ہے مگر وہ یہود کے متعلق تھا جنہوں نے بہت سی پابندیاں بلاوجہ عائد کر رکھی تھیں یہاں مخاطب مسلمانوں کو بنایا گیا ہے۔[1] معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اسلام لانے والوں میں بھی یہ رجحان پیدا ہو چلا تھا[2] کہ انہوں نے لذائذ دنیا[3] کو اپنے اوپر حرام کرنا چاہا تھا، خواہ قسم کھا کر یا اپنے دل میں ٹھان کر، لیکن چونکہ اس سے رہبانیت کو تقویت پہنچتی ہے جسے اسلام نے ختم کرنا چاہا تھا لہٰذا مسلمانوں کو اس غیر معتدل رجحان سے روکا گیا۔

---

[1] ۔ هذا خطاب للمؤمنين خاصة (تبيان)

[2] ۔ نزل لما هم قوم من الصاحبة ان يلازموا الصوم والقيام ولا يقربوا النساء والطيب ولا يأكلوا اللحم ولا يناموا على الفراش (جلالين)

[3] ۔ الطيبات اللذات التي تشتهيها النفوس وتميل اليها القلوب (مجمع البيان)

صوفیا کی اکثر چلہ کشی وغیرہ کی ریاضتیں اور ترک حیوانات وغیرہ کی پابندیاں اس رجحان کی حامل ہیں جسے اسلام روکتا ہے۔

تعجب ہے کہ علامہ طبرسیؒ ہی نے نہیں بلکہ شیخ طوسیؒ نے بھی مفسرین اہل سنت کے تتبع میں اس منزل پر منجملہ اور حضرات کے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آیت نازل ہوئی، حضرت علی بن ابی طالبؑ کا نام درج کر دی ہے بلکہ اس سلسلہ میں ایک مرسل حدیث بھی وارد ہوگئی ہے [1] اور پھر آپ کے بارے میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ آپ نے مدۃ العمر گیہوں نوش نہیں فرمایا جسے جناب مفتی میر عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ نے خاص لطف کے ساتھ نظم بھی فرما دیا ہے۔

بظاہر حضرت علی علیہ السلام کی نسبت یہ تصور صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ آپ صاحب علم لدنیؑ ہونے اور آغوش وحی میں پرورش پانے کے باوجود اس طرح کی قسم کھائیں۔ پھر یہ تو قطعاً درست نہیں ہوسکتا کہ قرآن مجید کے ایسے سخت الفاظ میں تنبیہہ کے باوجود آپ معاذ اللہ آخر حیات تک اس اپنے رویہ پر قائم رہیں اور پھر اسے آپ کے فضائل ومناقب میں درج کیا جاتا رہے۔

نہج البلاغہ میں درج شدہ آپ کے ارشاد کی روشنی میں جو سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کی زندگی کی غیر معمولی سادگی اور لذائذ سے کنارہ کشی اس وقت نمایاں طور پر اختیار کی گئی ہے جب آپ شہنشاہ عالمِ اسلام مانے گئے اور دنیا کے تمام اسباب اقتدار کے ساتھ معاشی تکلیف میں شرکت کے لئے رضا کارانہ طور پر اپنے اوپر وہ سختی برداشت کی اور یہی دنیا کو ''طلاق'' دینے کا وہ مفہوم ہے جو بحیثیت حقیقی رہنمائے اسلام کے آپ کے شایانِ شان ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۸۹

''اللہ تمہاری لایعنی قسموں پر تم سے باز پرس نہیں کرے گا مگر وہ تم سے باز پرس کرے گا اس کی جو تم قصداً قسمیں کھاؤ [2] تو اس کا کفارہ دس غریبوں کو کھانا کھلانا ہے اوسط حیثیت کا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا ان کا لباس یا ایک بندہ آزاد کرنا۔ اب جس کے پاس اتنا نہ ہو [3] تو تین دن کے روزے رکھنا۔ یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب

---

[1] ۔ ابی عن ابن ابی عمیر عن بعض رجالہ عن ابی عبداللہ (علی بن ابراھیم علیہ السلام)

[2] ۔ باز خواست می کند از شما بسبب محکم کردن سو گند با قصد (شاہ ولی اللہ) بان حلفتم عن قصد (جلالین)

[3] ۔ فمن لم یجد واحدا مما ذکر (جلالین)

تم قسم کھالو اور اپنی قسموں کا خیال رکھو۔ اس طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے، شاید کہ تم شکر گزار ہو"۔

قسم توڑنے کا کفارہ

پہلا جزء یعنی لایعنی قسموں کا اعتبار نہیں، پہلے آچکا ہے۔ ان قسموں کا کوئی گناہ بھی نہیں اور ان کی مخالفت کا کوئی کفارہ بھی نہیں مگر جو قسمیں سمجھ بوجھ کی ہوں، ان کی مخالفت کا[1] کفارہ یہاں بیان ہو رہا ہے۔

دوسرا جزء یعنی ارادی قسموں کے خلاف عمل کرنے کا کفارہ، اس کا مجمل بیان الفاظ قرآن میں صاف موجود ہے۔ تفصیلات کتب فقہیہ میں مذکور ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۹۰

"اے ایمان لانے والو! شراب، جوا، بت[2] اور جوئے میں استعمال ہونے والے تیر[3] ایک گندگی ہیں شیطان کے کاموں میں سے[4] تو اس سے[5] پرہیز کرو، شاید کہ تم ہر طرح کی بہتری حاصل کرو۔"

شراب اور جوئے سے بت پرستی کی طرح ممانعت

جیسا کہ جناب شیخ الطائفہ اور ان کے تتبع میں علامہ طبرسیؒ نے تحریر فرمایا ہے، اس آیت سے شراب وغیرہ کی حرمت چار پہلوؤں سے ثابت ہوتی ہے: ایک یہ کہ اسے نجاست و گندگی کہا گیا اور نجاست سے پرہیز لازم ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے شیطانی کام قرار دیا گیا۔ تیسرے صاف صاف اس سے پرہیز کا حکم دیا۔ چوتھے یہ کہ فلاح و نجاتِ آخرت کو اس سے پرہیز کا نتیجہ بتایا، جس کے معنی یہ ہیں کہ ان چیزوں کا ارتکاب فلاح آخرت میں سدراہ ہے۔

کیرم وغیرہ کی حرمت

میسر جس کا ترجمہ ہم نے "جوئے" کے ساتھ کیا ہے، اس زمانہ میں ظاہر ہے کہ ایک شکل خاص سے ہوتا تھا لیکن اس کی حقیقت صرف

---

[1] ۔فکفارته ای الیمین اذا قستم (جلالین) ان الکفارة لا تجب بنفس الیمین وانما تجب بالیمین والحنث (مجمع البیان)

[2] ۔الانصاب الاصنام (جلالین) نشانہائے معبودان باطل (شاہ ولی اللہ) قیل لها انصاب لا نها کانت تنصب للعبادة واصل الانتصاب القیام (تبیان)

[3] ۔هی سهام کانوا یجیلونها للقمار (مجمع البیان)

[4] ۔از کردار شیطان (شاہ ولی اللہ)

[5] ۔ای الرجس المعتبر به عن هذه الاشیاء (جلالین)

اس شکل سے وابستہ نہیں ہے چنانچہ قدیم تفسیر میں جو عموماً حدیث پر مبنی ہے، اس کے تحت میں نرد اور شطرنج کا نام خصوصیت سے لیا ہے اور پھر عام قانون یہ بتایا ہے کہ ہر قمار میسر میں داخل ہے [1] چنانچہ اسی بنا پر پچیسی اور گنجفے اور تاش وغیرہ کو ہمارے علماء نے حرام سمجھا حالانکہ یہ نام ہندوستانی ہیں اور ممکن ہے ان کی خاص ترکیب بھی ہندوستانی ہی ہو تو اگر تہذیبِ نو میں اس کی کچھ نئی صورتیں سامنے آئیں جن کا ماخذ یورپ کا کوئی ملک ہو جیسے کیرم وغیرہ تو ان کے حرام ہونے میں بھی تامل کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿٩١﴾

''شیطان تو بس یہ چاہتا کہ شراب اور جوئے میں مبتلا کر کے [2] تمہارے درمیان کینہ وعداوت ڈالتا رہے اور تمہیں یادِ خدا اور نماز سے باز رکھے تو کیا اب تم باز آؤ گے''۔ [3]

اس آیت میں شراب اور جوئے کی کچھ عقلی مضرتیں جو عموماً ان پر مرتب ہوتی ہیں، بیان کی گئی ہیں کہ ان چیزوں کی وجہ سے خواہ مخواہ جھگڑے اور عداوتیں پیدا ہوتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ انسان ان چیزوں میں پڑ کر یادِ الٰہی سے جس کا نتیجہ احساس فرائض ہے اور جس کی بدولت نظامِ حیات میں بہتری پیدا ہوتی ہے [4] اور عبادتِ الٰہی سے جس کا اہم مظہر نماز ہے، بے پرواہ ہو جاتا ہے۔

یہ وہ حکمتیں ہیں جو عمومی طور پر اس قانون کے نفاذ کا باعث ہوتی ہیں اور قانون بن جانے کے بعد اب اگر کسی خصوصی صورت میں یا خاص مقدار میں استعمال سے یہ نتائج نہ بھی مرتب ہوں، تب بھی قانون کی مخالفت حرام ہوگی۔

مثلاً شراب حرام جانے اسی وجہ سے ہوئی ہو کہ اسے پی کر لوگ لڑنے جھگڑنے لگتے ہیں لیکن جب کہ اس حکمت کی بنا پر حرمت شراب کا قانون نافذ ہو گیا تو اب اگر کوئی شخص کسی صورت سے اس کا اہتمام کرے کہ شراب پی کر وہ لڑے گا نہیں تو بھی شراب نوشی کے قانون کی خلاف ورزی لازماً ہوگی اور اس پر مواخذہ کا استحقاق ہوگا۔ اس طرح کوئی شخص خاص طور پر اس کا اہتمام کرے کہ وہ ان ناجائز تفریحات کے ساتھ نماز کی پابندی قائم رکھے گا تو بھی وہ حرمت قائم رہے گی جو عمومی طور پر نافذ ہوئی ہے ان چیزوں کے نوعاً یادِ الٰہی اور عبادت سے غافل کرنے کی بنا پر جس کی وجہ سے ایسی چیزوں کا نام لہو ہوا ہے، اب اگر شخصی طور پر ان کے اس تقاضے کو وقوع میں نہ آنے دیا جائے، تب بھی قانون کے خلاف ہونے کی بنا پر جو مواخذہ اس معصیت کا ہے، اس کا استحقاق ثابت رہے گا۔

یہ اصول تمام ان مصالح وحکم میں جاری ہے جن کی بنا پر احکام کلیہ جاری کئے گئے ہیں۔ یعنی حکم ہو جانے کے بعد اب ہمیں اپنی عقل سے

---

[1] ۔فاما المیسر ولنردوالشطرنج وکل قمار میسر (علی بن ابراھیم)

[2] ۔بسبب خمر وقمار (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ای انتھوا (جلالین)

[4] ۔لما فی ذلک من الدعاء الی الصلاح واستقامۃ الحال فی الدین الدنیا (تبیان)

یہ نہیں دیکھنا ہے کہ وہ وجہ یہاں پائی جاتی ہے یا نہیں بلکہ اب تو قانون کو دیکھنا ہے کہ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے لہٰذا ہمیں اس کی تعمیل واجب ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾

''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو پیغمبر کی اور ڈرتے رہو [1] اس کے بعد اگر تم نے روگردانی کی تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے پیغمبر کے ذمہ بس واضح طور پر پہنچا دینا ہے۔''

یعنی تمہاری روگردانی کی وجہ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی جواب طلب نہ ہوگا۔ آخرت میں باز پرس تم ہی سے ہوگی جس باز پرس کے ذمہ دار ہم ہیں [2] جیسا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے دوسری جگہ ارشاد کیا ہے کہ: فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ''آپ پر تو صرف تبلیغ کرنے کی ذمہ داری ہے اور محاسبہ صرف ہمارے ذمے ہے''۔ (رعد: ۴۰)

پھر اس میں اس طرح کی تہدید بھی مضمر ہے جیسے کوئی کہے کہ ہمارا کام بتا دینا تھا ہم نے تم سے کہہ دیا اب تم جانو یعنی انجام سے اس کے تم کو ہوشیار ہونا چاہیے جس کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

''جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں، ان پر کوئی گناہ نہیں اس میں کہ جو وہ کھائیں جب کہ وہ پرہیز کریں اور ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں، پھر پرہیزگار رہیں اور ایمان پر قائم رہیں اور پھر پرہیز جاری رکھیں اور حسنِ عمل پر برقرار رہیں اور اللہ اچھے اعمال والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

مطلب آیت کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ترک لذّات کا طلب گار اور رہبانیت کا حامی نہیں ہے جیسے دوسرے مقامات پر بھی متعدد طریقوں سے طعام اور لباس دونوں میں بے ضرورت پابندیوں کی نفی کی گئی ہے مثلاً: مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ اور یہ جو بار بار کہا گیا ہے مگر جب وہ پرہیز قائم رکھیں یعنی جو منہیات شرع بالنص ثابت ہیں، ان سے علیحدہ رہیں تو پھر کسی بھی لذیذ چیز

---

[1] ۔واحذروا المعاصی (جلالین) وجزاؤ کم علینا)

[2] ۔معناہ الوعید والتھدید کانہ قال فاعملوا انکم قد استحققتم العقاب لتولیکم عما ادی رسولنا من البلاغ المبین (تبیان)

کے کھانے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔[1]

اس سے اشیاء میں اصالت حلیت ثابت ہوتی ہے یعنی حرام ہونے کا علم نہ ہو، اس وقت تک کسی شے کے استعمال پر مواخذہ نہیں ہوگا۔

دوسرا مطلب آیت کا یہ قرار دیا گیا ہے کہ جو مومنین ہیں اور نیکوکار ہیں، وہ پہلے یعنی حکم حرمت آنے کے قبل[2] کچھ کھا پی چکے ہوں تو اس کا اب مواخذہ نہیں ہوگا جبکہ وہ اس کے بعد احکام کی پابندی کریں اور پھر یعنی برابر اس پابندی کو قائم رکھیں۔[3]

تیسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ مسلمان ہونے کے پہلے اگر یہ ممنوع چیزیں کھائی ہوں تو اس کا اب گناہ نہ ہوگا۔[4]

جناب شیخ طوسیؒ نے شان نزول بھی اس طرح درج کی ہے جو اسے اس حکم کے اترنے کے پہلے سے متعلق قرار دیتی ہے مگر اس شان نزول کے لئے مجاہد وغیرہ متعدد ایسے مفسرین کا حوالہ دیا ہے جن کے تفسیری اقوال کو اہل سنت کے یہاں تو اہمیت حاصل ہوسکتی ہے، شیعی نقطۂ نظر سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے جب کہ کوئی تفسیر معصومؑ اس کی تائید میں موجود نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک اگر آیت میں "من قبل" کی طرح کی کوئی لفظ ہوتی تو ان دونوں مفہوموں میں سے ایک[5] قرار دیا جاتا لیکن جب آیت میں اس طرح کا کوئی لفظ نہیں ہے تو یہ مطلب سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

رہ گیا طَعِمُوْا کی لفظ کا بصیغۂ ماضی ہونا، جس کے معنی ہیں "کھایا" تو یہ کوئی بات نہیں، اس لئے کہ یہاں تو جتنے الفاظ آیت میں آخر تک ہیں: امنوا، اور اتقوا، اور احسنوا سب ہی صیغۂ ماضی ہیں لیکن ان سب کا تعلق سب کے نزدیک حال اور مستقبل سے ہے تو طعموا کو ماضی سے وابستہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾

"اے ایمان لانے والو! اللہ کو تمہاری آزمائش کرنا ہے ایک طرح کے شکار کے ساتھ[6] جسے تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پا جائیں تاکہ اللہ پتہ چلائے کہ کون بے دیکھے اس سے ڈرتا ہے تو جس نے اس کے بعد حد سے

---

[1] ۔فی تفسیر اهل البیت علیه السلام فیما طعموا من الحلال (مجمع البیان)

[2] ۔اکلوا من الخمر والمیسر قبل التحریم (جلالین)

[3] ۔یعنی آنچه قبل از تحریم خوردند عفو است چوں در تقوئ رسوخ پیدا کنند وایں سخن بدان ماند که کسی گوید باتو احسان کنم وباز بتو احسان کنم یعنی آکه پیوسته بتو احسن کنم (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔یعنی کفر کی حالت میں اگر حرام چیز کھائی تھی (موضح القرآن)

[5] ۔جو کچھ کھا (پی) چکے، اس میں کچھ گناہ نہیں (مولوی فرمان علی صاحب)

[6] ۔ای بتحریم شئ من الصید وانما بعض لانه عنی صید البر خاصة (مجمع البیان)

تجاوز کیا، اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

"پتہ چلائے" یعنی اس امتیاز کو واقعہ کی صورت میں نمایاں کر دے [1] اس طرح کی تعبیر پہلے آ چکی ہے اور وہاں اس کی تشریح ہو چکی ہے۔

یہ تمہید ہے آئندہ آیت کے مضمون کی۔ یہاں مجمل اعلان کیا جا رہا ہے کہ شکار کے بارے میں تمہاری آزمائش ہوگی۔ یہ آزمائش کیا ہے اور کس موقع پر ہوتی ہے؟؟ وہ حالت احرام میں خشکی کے شکار کا حرام ہونا ہے۔ جو اس کے بعد کی آیت میں مذکور ہے۔

"نیزے" کا لفظ جو کہا گیا ہے، اس میں خصوصیت مضمر نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ خود تم ہاتھ سے پکڑ کر ذبح کر دیا نیزہ وغیرہ کسی چیز سے گرا لو اور پھر ذبح کرو۔ [2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ۭ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۹۵

"اے ایمان لانے والو! شکار کو نہ مارو اس حالت میں کہ تم احرام باندھے ہوئے ہو اور جو تم میں سے اسے جان بوجھ کر مارے گا تو سزا اس کی جو چوپایوں میں سے [3] ہوگی اس کے مثل جسے اس نے مارا ہے، جس کا فیصلہ کریں گے تم میں سے دو عادل شخص جو قربانی کی صورت سے کعبہ پہنچے گی یا کفارہ ہوگا کچھ مسکینوں کا کھانا یا اس کے عوض میں روزے تاکہ وہ اپنے کئے کی پاداش کا مزہ چکھ لے۔ جو ہو چکا اسے اللہ نے معاف کیا اور جو پھر ایسا کرے گا۔ تو اللہ اس سے بدلا لے گا اور اللہ زبردست ہے، سخت بدلا لینے والا۔"

حالت احرام میں شکار کی ممانعت

حج یا عمرہ کے احرام میں جو پابندیاں عائد ہوتی ہیں، ان میں سے اکثر تو سنت سے ثابت ہیں لیکن ان میں سے وہ اہم پابندی جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے، شکار کی پابندی ہے اور اگر عمداً انسان نے اس پابندی کو توڑا تو اس کی سزا کا بیان ہے جو تین چیزیں ہیں:۔

پہلے جس طرح کے جانور کا اس نے شکار کیا ہے، ویسا ہی جانور کعبہ میں لے جا کر ذبح کرے۔

---

[1] تا متمیز کنند خدا (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ نیزہ کا نام لیا، اس میں سب ہتھیار داخل ہوئے (موضح القرآن)

[3] ۔ قولہ من النعیم یکون صفۃ للجزء (تبیان)

اب یہاں ''اسی طرح'' کے جانور میں صرف جنس میں مماثلت بھی مراد ہوسکتی ہے جیسا کہ اکثر فقہائے اسلام قائل ہیں [1] اور قیمت کے لحاظ سے بھی مماثلت مقصود ہوسکتی ہے یعنی وہ جانور اسی قیمت کا ہو جیسا کہ دوسرا قول ہے۔ [2]

ظاہر نظر میں قرآن کا اس کے بعد یہ کہنا کہ اس کا فیصلہ [3] دو عادل شخص کریں گے دوسرے قول کو تقویت دیتا ہے، اس لئے کہ صرف جنس میں یکساں ہونا کوئی ایسی مشتبہ یا قابل اختلاف چیز نہیں ہے، جس کے لئے کسی خاص شخص کے فیصلہ کی ضرورت ہو، بے شک قیمت میں یکساں ہے یا نہیں؟ اس میں غلطی یا دھاندلی ہوسکتی ہے جس کے لئے دو عادلوں کے فیصلہ کو قرآن نے معتبر قرار دیا ہے مگر چونکہ روایت اہل بیت علیہم السلام بھی پہلے قول کے مطابق ہے [4] اس لئے ترجیح اسی کو ہے۔ اس صورت میں عادلوں کا فیصلہ اس کے متعلق ہوگا کہ جس جانور کا شکار کیا ہے، اس سے جنس کے لحاظ سے قریب تر کون جانور ہے؟ [5] اس لئے کہ جسے قتل کیا ہے، وہ ممکن ہے چوپایہ نہ ہو لیکن جس کی قربانی ہوگی، اس میں چوپایہ ہونے کی شرط ہے مگر ایسا جو اس قتل کئے ہوئے جانور سے تناسب رکھتا ہو جیسے شتر مرغ ہے تو اس کی سزا میں اونٹ کی قربانی ہوگی۔ اب یہ ایسی چیز نہیں ہے جسے ہر آدمی سمجھ سکے۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ''جو ہو چکا اسے اللہ نے معاف کیا، یہ قانون میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ یہ ویسا ہے جیسے اس کے پہلے جمع الاختین اور باپ کی منکوحہ عورتوں کی حرمت کے ساتھ آیا تھا: اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ''مگر جو ہو چکا''.....یعنی اس حکم کے آنے سے پہلے یا زمانہ جاہلیت میں جو ہوا وہ ہوا۔ اب سے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ وہی مطلب یہاں بھی ہے۔ [6]

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٩٦﴾

''تمہارے لئے دریا کا شکار اور اس کا کھانا جائز قرار دیا گیا ہے تاکہ تمہارے لئے اور قافلہ والوں کے لئے فائدہ کا ذریعہ ہو اور خشکی کا شکار تم پر حرام کیا گیا ہے جب تک کہ تم احرام میں رہو اور اللہ کے غضب سے بچو جس کی طرف تم سب کو سمٹ کر جانا ہے''۔

دریائی جانور یعنی مچھلی کے شکار کی اجازت

اس کے قبل کی آیت میں جو کہا گیا تھا کہ ایک طرح کے شکار سے تمہاری آزمائش کی جائے گی، اس آیت میں اس کی تفصیل بیان ہوگئی

---

[1] ۔ مماثلت نزدیك شافعی بحقیقت و هیئت است (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ نزدیك ابی حنیفه بقیمت (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ یحکم بہ ای بالمثل (جلالین)

[4] ۔ هذا هو الذی یدل علیه روایات اصحابنا (تبیان)۔

[5] ۔ فظر ان اشبه الاشیآء من النعم فیحکمان به (مجمع البیان)

[6] ۔ تا منفعت باشد برائے شما برائے قافله (شاہ ولی اللہ)

کہ وہ خشکی کا شکار ہے جو حرام ہے لیکن دریائی شکار جیسے مچھلی حرام نہیں ہے اور بحر کے اصل معنی اگرچہ سمندر کے ہیں مگر جب برّ یعنی خشکی کے مقابلہ میں اس کا استعمال ہو تو اس کے معنی تری کے ہوتے ہیں لہٰذا تالاب اور جھیل وغیرہ کی مچھلیاں بھی اس میں داخل ہیں۔ [1]

اس کے علاوہ ایک مزید اضافہ یہاں یہ ہو گیا کہ گزشتہ آیت سے فقط شکار کے مارنے کی حرمت ظاہر ہوتی تھی اور یہاں تری کے شکار کے ساتھ اس لفظ کے کہنے سے کہ ''اور اس کا کھانا بھی حلال ہے۔'' یہ معلوم ہو گیا کہ خشکی کے شکار کا خود کرنا ہی حرام نہیں ہے بلکہ کسی اور نے شکار کیا ہو تو اس کا کھانا بھی حرام ہے بلکہ ایک مفہوم کے لحاظ سے اس کا استفادہ خود سابق آیت سے بھی ہوتا ہے کہ صید کے ایک معنی مصدر قرار دے کر شکار کرنے کے ہیں اور دوسرے صید بمعنی شکار، خود اس شے کو کہتے ہیں جس کا شکار کیا گیا ہے اور اب معنی یہ ہوئے کہ تم پر شکار یعنی وہ جانور جو شکار کیا گیا ہو، حرام ہے تو اس سے کھانے کی حرمت بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ [2]

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٩٧﴾

''اللہ نے کعبہ کو جو محترم گھر ہے، سب لوگوں کی فلاح و بہبودی کا سبب قرار دیا ہے اور محترم مہینہ اور قربانی کے جانوروں اور ان جانوروں کو جن کے گلے میں پٹا ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ تمہیں معلوم ہو کہ اللہ جانتا ہے اسے جو آسمانوں میں ہے اور اسے جو زمین میں ہے اور یہ کہ اللہ ہر بات کا جاننے والا ہے۔''

کعبہ کے پاس کا اجتماع عرب کے تجارتی منافع کا بھی باعث تھا [3] پھر یہ کہ تمام قبائل عرب باوجود اپنے اختلافات اور مسلسل جنگ و جدل کے ان چیزوں کی حرمت کو مانتے تھے۔ اس لئے حدود حرم میں آکر کھینچی ہوئی تلواریں نیام میں چلی جاتی تھیں اور جب اَشہرِ حُرُم یعنی ذیقعد، ذی الحجہ، محرم اور رجب کے مہینے آجاتے تھے تو لڑائیاں رک جاتی تھیں یا جب کسی قافلہ کے ساتھ قربانی کے جانور دیکھ لیتے تھے تو وہ قافلہ خطرہ سے محفوظ ہو جاتا تھا۔ [4] اسی کو ارشاد کیا ہے کہ خالق نے اس محترم گھر اور ان چیزوں کو تمام لوگوں کے لئے حالات کی درستی اور تنظیم کا مرکز بنایا ہے۔ [5]

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩٨﴾ ؕ

---

[1] ۔اذا اطلق دخل فیه الانهار بلا خلاف (تبیان)

[2] ۔الصید یعتبر یه عن الاصطیاه فیکون مصدر اور یعتبریه عن الصید فیکون اسما ویجب ان یحمل الأیة علی تحریم الجمیع (تبیان)

[3] ۔قیاما لمعایش الناس ومصالحهم (تبیان) سبب انتظام امور مهر ومان (شاه ولی الله)

[4] ۔فاستبثت معایشهم بذلك واستقامت احوالهم به ولذا قال سعید بن جبیر من اتٰی هٰذا البیت یرید شیئا للدنیا والاخرة اصابه وهو المروی عن ابی عبدالله (مجمع البیان)

[5] ۔قال ابن عباس معناه جعل الله الکعبة امنا للناس بها یقومون ای یؤمنون ولولا ها لغنوا وهلکوا وما قاموا (مجمع)

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے اور یہ کہ اللہ بڑا بخشنے والا بھی ہے مہربان۔''

آیت کے دونوں ٹکڑے بیم و رجاء دونوں پہلوؤں کی پرورش کا ذریعہ ہیں جو ایمان کے دو حصے ہیں (الایمان نصفان نصف خوف ونصف رجآء)۔

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾

''پیغمبر کے ذمہ نہیں ہے مگر پہنچا دینا اور اللہ جانتا ہے اسے جو تم ظاہر کرتے ہو اور اسے بھی جو تم چھپاتے ہو۔''

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''کہہ دیجئے[1] کہ گندی اور پاک چیز برابر نہیں ہے، چاہے گندی چیز کی زیادتی تمہارے دل کو لبھائے[2] تو اللہ کے غضب سے بچو اے عقل والو! شاید کہ تم ہر طرح کی بہتری حاصل کرلو۔'' اگر یہ آیت تنزیل میں اسی سلسلہ کی ہے تو مطلب یہ ہے کہ شکار کے ممنوع قرار پا جانے پر حالت احرام میں تمہارا دل نہ دکھے کہ افسوس، اتنی اللہ کی نعمتوں سے ہم محروم ہو گئے اور جو حلال غذا ہے یعنی مچھلی، وہ تو ان غذاؤں سے بہت کم ہے۔ نہیں، یہ تو افسوس تمہیں نہیں ہونا چاہیے، اس لئے کہ وہ حرام غذا چاہے بہت زیادہ ہو، کس کام کی جب کہ اللہ کو اس کا کھانا پسند نہیں ہے۔ اس سے وہ کم مقدار میں غذا اچھی جو اس کی طرف سے پاک وحلال قرار دی گئی ہے۔ دوسری تفسیر یہ کہ خبیث اور طیب سے برے اور اچھے، کافر اور مومن لوگ مراد ہیں[3] اس صورت میں مفاد اس کا وہی ہے جو اکثر آیاتِ قرآن سے ثابت ہے کہ کثرت اور جمہور کی طاقت کوئی قیمت نہیں رکھتی جبکہ حق کے خلاف ہو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

''اے ایمان لانے والو! ایسی چیزوں کے متعلق دریافت نہ کرو کہ اگر وہ تمہارے لئے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں صدمہ ہو اور اگر تم پوچھو گے ان کے متعلق (اس دور میں) جبکہ قرآن اتر رہا ہے تو وہ تمہارے لئے ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ نے انہیں نظر انداز کر دیا ہے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا برداشت کرنے والا۔''

---

[1] ۔قل یا محمد (مجمع البیان)

[2] ۔ کثرۃ الخبیث ای کثرۃ ما تراہ من الحرام (مجمع البیان)

[3] ۔قال السدی الکافر والمؤمن (تبیان)

اخباریین کے نظریہ ''اصالت حرمت'' کی رد

میرے خیال میں اخباریین کے اس خیال کی رد میں کہ اصل اشیاء میں حرمت ہے یعنی جس چیز کا حکم شرع میں وارد نہ ہوا ہو، اسے ممنوع سمجھنا چاہیے، یہ آیت بہت بڑی قوی دلیل ہے۔ خالق کا ارشاد ہے کہ خواہ مخواہ خود سے کھوج کر کر کے نہ پوچھ کہ اس چیز کا کیا حکم ہے؟ اس چیز کا کیا حکم ہے؟ اس پوچھنے پر بہت ممکن ہے کہ تم پر کوئی ایسی پابندی عائد ہو جائے جس پر تمہیں صدمہ ہو اور جب تک شریعت میں اس کا حکم بیان نہیں ہوا ہے، اس وقت تک تمہارے لئے آسودگی ہے۔ ''اللہ نے اسے نظر انداز کر دیا'' یعنی اس کے متعلق کوئی پابندی عائد نہیں کی تو تم جو کرو، اس پر سزا نہیں ملے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اصل اشیاء میں حلّت اور برائت ہے اور بغیر ثبوت ممانعت مواخذہ کا تصور صحیح نہیں ہے۔ اس کے قبل اور بعد گندی اور پاک، حرام اور حلال چیزوں کا ذکر ہے، وہ بھی اس تصور کا جو ہم نے قائم کیا ہے، مؤید ہے اور حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے یہی وارد ہوا ہے کہ یہ آیت احکام شرعیہ سے تعلق رکھتی ہے۔ [1]

لیکن بعض لوگوں نے اس کی شان نزول ایسی بیان کی ہے جس سے اس کا تعلق احکام شرعیہ سے باقی نہیں رہا ہے۔ اس شان نزول کو مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے اپنے حاشیہ میں حسب ذیل الفاظ میں تحریر کیا ہے:

عرب کے کندہ ناتراش جاہل لوگ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے طرح طرح کے سوالات کیا کرتے۔ کسی نے پوچھا میری بی بی اس وقت گھر میں کس طرح ہے؟ کسی نے کچھ، کسی نے کچھ۔ یہاں تک کہ کثرت سوال سے آپ گھبرا کر منبر پر تشریف لے گئے اور غصہ سے فرمایا جسے جو پوچھنا ہو، پوچھے، میں جواب دیتا ہوں، اس پر بھی ان گنواروں کی سمجھ میں نہ آیا اور ایک بول اٹھا میرا باپ کون ہے؟ فرمایا فراقہ بن قیس۔ دوسرے نے پوچھا میرا باپ کہاں ہے؟ فرمایا دوزخ میں۔'' اس کے بعد فرمایا خدا کی قسم اس وقت بہشت و دوزخ میرے سامنے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ کون بہشت میں ہے اور کون دوزخ میں ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم میں سے کون بہشتی ہوگا اور کون جہنمی اگر میں بیان کروں تو سوال کرنے سے پچھتاؤ گے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔'' علامہ طبرسیؒ نے اسے درج کرنے کے بعد لکھا: عن الزهری عن قتادہ عن انس (مجمع البیان) اس سے ظاہر ہے کہ کسی معصوم کی طرف منسوب نہیں ہے اور اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ یہ آیت قبل اور بعد کی آیتوں سے کوئی ارتباط نہیں رکھتی۔ یہ امر کوئی عجیب تو نہیں ہے اور اس کی نظیریں قرآن مجید میں بکثرت ہیں مگر خود مضمون آیت کے لحاظ سے پہلا قول مجھے زیادہ دلنشین معلوم ہوتا ہے۔

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

''تمہارے پہلے کچھ لوگوں نے ایسی باتوں کا سوال کیا؟ پھر ان کے ساتھ کفر اختیار کیا۔''

یعنی خواہ مخواہ پوچھ پوچھ کر تو احکام دریافت کئے اور جب پابندیاں عائد ہوئیں تو ان کی مخالفت کی [2] درصورتیکہ اس سوال کو احکام سے

---

[1] ۔خطب رسول اللہ ﷺ فقال ان اللہ کتب علیکم الحج فقام عکاشتدین محصن ویروی سواقة بن مالك فقال افی کل عام یا رسول اللہ الخ آخر میں ہے: عن بن ابی طالب علیہ السلام وابی امامة الباهلی (مجمع البیان)

[2] ۔صاروا بها کافرین بترکهم العمل بها (جلالین)

متعلق نہ سمجھا جائے جیسا کہ دوسری شانِ نزول سے ظاہر ہوتا ہے تو کفر اختیار کرنے کے معنی انکار کرنے کے ہوں گے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَحِيۡرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيۡلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ ؕ وَاَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾

''اللہ نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی کچھ قرار نہیں دیا تھا لیکن جو کافر ہیں، وہ اللہ پر جھوٹ تہمت لگاتے ہیں اور ان میں کے زیادہ اشخاص عقل وشعور نہیں رکھتے۔''

یہ چند قسم کے جانور مشرکین نے حرام سمجھ رکھے تھے، کسی آسمانی شریعت کی طرف سے حرام نہ ہوئے تھے۔ بلکہ انہوں نے رواجی طریقہ پر ان پابندیوں کو عائد کرلیا تھا۔ اسلام نے انہیں حلال قرار دیا اور بتایا کہ یہ پابندیاں کوئی اصلیت نہیں رکھتیں۔

بحیرۃ وہ اونٹنی جس یہاں کے پانچ دفعہ بچے ہو چکے ہوں اور پانچویں مرتبہ نر پیدا ہوا ہو تو اس کے کان کو پھاڑ دیا جاتا تھا اور اس کی بڑی عزت ہونے لگتی تھی۔ [1]

سائبۃ وہ جانور جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیئے جائیں کہ وہ ہر طرف پھرتے رہیں، جیسے گائے، بیل ہمارے ہندوستان میں کافی نظر آتے ہیں۔ ان جانوروں کو بار برداری وغیرہ کے کام میں نہیں لایا جاتا تھا۔ [2]

وصیلۃ یہ بکریوں میں ایسی بکری ہوتی تھی جس کے پہلے بھی بکری پیدا ہوئی تھی، بیچ میں کوئی نر نہیں ہوا۔ اسے بھی بتوں کے نام کا قرار دیا جاتا تھا۔ [3]

دوسرے معنی یہ بیان کئے گئے ہیں کہ وصیلۃ وہ بکری ہے جو بکرے کے ساتھ پیدا ہوئی ہو۔ اس کو ذبح کرنا ممنوع تھا۔ [4]

اور حامی وہ اونٹ ہوتا تھا جس کے صلب سے دس بچے پیدا ہو چکے ہوں تو اس کے بعد اسے بھی سواری وغیرہ کے کام میں نہیں لایا جاتا تھا۔ [5]

یہ تمام پابندیاں چونکہ از خود عائد کی گئی تھیں اور خالق کی طرف سے کسی پیغمبر کے ذریعہ یہ حکم نہیں آیا تھا تو قرآن نے اسے افترا سے تعبیر کیا ہے اس کے بعد یہ امر قابل غور ہو جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں مسلمانوں کے مختلف حلقوں میں بھی نذر و نیاز کے ذیل میں رواج عام کے ماتحت جو بعض ایسی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں جن کی اصلیت شرع میں کوئی نہیں ہے تو یہ اس افتراء کے تحت میں تو داخل نہیں ہوتا جس کی قرآن مجید نے اتنے سخت الفاظ میں مذمت فرمائی ہے؟!

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰى مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوۡلِ قَالُوۡا حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا

---

[1] ۔ای الناقۃ التی تشق اذنہا (بتیان) الناقۃ کانت اذا انتجت خمسۃ ابطن وکان اخرہا ذکر ابحروا اذنہا (مجمع البیان)

[2] ۔السائبۃ کانوا یسیبونہا لالہتہم فلا یحمل علیہا شئ (جلالین) یقال سبت الدابۃ ای ترکتہا تسیب حیث شاءت (مجمع)

[3] ۔وصلت احدٰہما بالاخرٰی لیس بینہما ذکر (جلالین)

[4] ۔الانثیٰ من الغنم اذا ولدت مع الذکر قالوا وصلت اخاہا لم یذبحوہا (بتیان)

[5] ۔اذا نتجت من صلب الفحل عشرۃ ابطن قالوا حمی ظہرہ فلا یحمل علیہ شئ ولا یدفع من ماء ولا مرعیٰ (تبیان)

عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور پیغمبر کی طرف تو وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کافی ہے وہ جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا چاہے ان کے باپ دادا نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں''۔

یہ مشرکین کی وہی دلیل ہے جو ایک ہی مفہوم کے مختلف الفاظ کے ساتھ قرآن مجید میں جا بجا مذکور ہے اور ہر جگہ اس کا جواب بھی قرآن نے تھوڑے سے انداز کے فرق کے ساتھ ایک ہی دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ خود حقیقتوں پر غور کرے، آباؤ اجداد کا قول یا عمل دلیل صحت نہیں ہوسکتا۔ اولاد کا فرض ہے کہ اپنے باپ دادا کے عمل پر خود اپنی عقل کی روشنی میں غور کرے کہ وہ درست تھا یا نہیں۔ یہی جواب یہاں بھی دیا گیا ہے۔

ایسی ہی آیتوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ عقائد اور اصولِ دین میں تقلید حرام ہے۔ ان میں ہر انسان خود اپنے آزاد ضمیر سے کام لینے پر مکلف ہے۔ [1]

صدر آیت میں یہ الفاظ کہ ''ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف آؤ جسے اللہ نے اتارا ہے اور پیغمبر کی طرف'' اس سے ظاہر ہے کہ خود پیغمبر ﷺ کی ذات بجائے خود نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کے ساتھ وہ پیغام بھی ہوتا ہے جو اللہ کی طرف کا اتارا ہوا ہے۔ اس طرح یہ دونوں ماخذ احکام ربانی ہوتے ہیں۔ خدا کا پیغام جو رسول ﷺ کی زبانی ہوتا ہے اور خود پیغمبر ﷺ کی شخصیت جس کا عمل کاشف رضائے خالق ہوتا ہے۔

یہی بنیاد ہے جس کی بنا پر جمہور امت ماخذ احکام، کتاب اور سنت دونوں کو مانتی ہے اور اس کے خلاف اس آواز کو کہ کتاب کافی ہے، سنت کی ضرورت نہیں، خود کتاب الٰہی کے خلاف جانتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

''اے ایمان لانے والو! تم پر ذمہ داری خود اپنے نفوس کی ہے، جب تم صحیح راستے پر ہو تو جو گمراہ ہو، وہ تمہارا کوئی نقصان نہیں کرے گا۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہوگا تو وہ تم کو بتائے گا کہ تم کیا کرتے تھے۔''

یہ تنبیہ بطور تسلی بھی ہوسکتی ہے، جیسے کچھ ایمان والے اس فکر میں گھلے جاتے ہیں کہ یہ اتنے آدمی گمراہ کیوں ہیں تو جواب میں کہا جا رہا ہے کہ تم ان کی فکر نہ کرو، تم تو الحمدللہ راہ راست پر قائم ہو۔ اب یہ نہیں آتے تو یہ خود اپنا نقصان کریں گے۔ یہ ایسا ہے جیسے خود رسول ﷺ کو مخاطب کرکے بہت جگہ کہا گیا ہے کہ آپ ان کی اتنی فکر کیوں کرتے ہیں؟! آپ کا جو فرض ہے، وہ آپ انجام دے رہے ہیں۔ اب یہ اس سے اثر قبول

---

[1] ۔ فی الایۃ دلیل علی فساد التقلید۔ لا یجوز لاحد ان یعمل علی شئ من امر الدین الا بحجۃ (بتیان)

نہیں کرتے تو یہ بھگتیں گے مگر یہاں دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ تنبیہ واقعی سرزنش کا انداز رکھتی ہو کیوں کہ بہت لوگ دوسروں کے افعال پر نکتہ چینی سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں لیکن خود اپنی خبر نہیں لیتے کہ خود ہم میں کیا کیا نقائص ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان ہی لوگوں کے کردار پر اس آیت میں تازیانہ لگایا گیا ہو کہ تم دوسروں پر ہر وقت نکتہ چینی کیا کرتے ہو، وہ جیسے ہوں، ہوا کریں، تمہیں تو اپنے نفوس کی خبر لینا چاہیے کہ تم تو اپنے فرائض سے غفلت برت نہیں رہے ہو۔

چونکہ عموماً یا ایھا الذین امنوا کہہ کے فقط خاص الخاص سچے صاحبانِ ایمان مراد نہیں لئے گئے ہیں بلکہ پوری جماعت جو ادعائے ایمان رکھتی ہے، سب کو مخاطب بنایا گیا ہے اور ان میں اکثریت ایسے ہی کردار والوں کی ہوا کرتی ہے، اس لئے میرے خیال میں یہ دوسرا مفہوم مقصدِ قرآن سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے اور ہماری قدیم تفسیر بھی جو بظاہر کسی حدیث پر مبنی ہے، اس کے مطابق ہے۔ [1]

بعض مفسرین نے سابق آیت سے اس کے لگاؤ کا خیال مدنظر رکھتے ہوئے یہ مطلب قرار دیا ہے کہ کفار تو باپ دادا کی تقلید کا عذر پیش کرتے ہیں۔ تم اے ایمان والو! اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے خود اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے جادہ پر قائم رہو اور اگر آباؤ اجداد تمہارے غلط راستے پر تھے تو ہوا کریں۔ ان کی غلط کاری یا گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ [2]

اب جنہوں نے اس کو اموات نہیں بلکہ احیاء سے متعلق قرار دیا ہے جس پر اس کے پہلے والی تفسیریں جو ہم درج کر چکے مبنی تھیں، ان میں سے بعض کا ذہن یہاں تک آگے بڑھ گیا کہ تم دوسروں سے کوئی سروکار ہی نہ رکھو کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ تم کو بس اعمال درست رکھنا چاہئیں اور اب ذہن نے یہ سوال اٹھا دیا کہ پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی گمراہ ہے تو ہو، ہم سے کیا مطلب اور کوئی معصیت کر رہا ہے تو ہم سے کیا غرض؟! اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہدایت وارشاد کی بھی ضرورت نہیں مگر ظاہر ہے کہ یہ انتہا پسندانہ نقطۂ نظر بھی غلط ہے۔ [3]

اس کے دفعیہ کے لئے کچھ حضرات نے بہت باریک نظری صرف کی ہے۔ آیت کے لفظ انفسکم کی ایسی تاویل کر ڈالی کہ وہ خود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دلیل قوی بن جائے اور وہ یوں کہ انفسکم کے معنی اپنی ذات کے ہیں ہی نہیں بلکہ یہ لفظ اپنے آدمیوں کے معنی میں ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:۔

وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اپنے آدمیوں کو اپنے گھروں سے نہ نکالو۔ (بقرہ۔ ۸۴)

دوسری جگہ ہے:۔ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اپنے آدمیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرو۔

ویسے ہی یہاں کہا جا رہا ہے کہ تم پر بس اپنی جماعت کے آدمیوں کی اصلاح ہے۔ دوسرے لوگ یعنی غیر مذاہب کے افراد کی بداعمالیوں سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا [4]

اس توجیہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی عمارت تو برپا ہوگئی مگر کفار کو دعوت وارشاد کی بنیاد اب بھی منہدم ہے۔ ہمارے نزدیک صاف سیدھا مطلب وہی ہے جو پہلے لکھا جا چکا ہے۔

---

[1] ۔ اصلحوا انفسلم ولا تتبعوا عورات الناس فلا تذکروھم فانه لا یضرکم ضلالتھم اذا کنتم انتم صالحین (علی بن ابراھیم)

[2] ۔ لا یلزمھم من ضلال اباۂھم شئ من الذم والعذاب (بتیان)

[3] ۔ لیس فی الاٰیة ما یدل علی سقوط انکار المنکر (بتیان)

[4] ۔ لا یضرکم من ضل من الکفار ...وھٰذا قول ابن عباس فی روایة عطا عنه (بتیان)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ
اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ
فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ
اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّآ
اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝۱۰۶ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ
مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ
اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۰۷ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ
يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۱۰۸

''اے ایمان لانے والو! تمہارے درمیان کے گواہ [1] جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے دو عادل ہونا چاہئیں تم میں سے۔ ہاں اگر تم سفر میں ہو اور اس حالت میں تمہیں موت آ رہی ہو تو دوسرے دو تمہارے علاوہ اوروں میں سے [2] اور اگر تمہیں شک ہو تو ان دونوں کو نماز کے بعد کھڑا کرو [3] کہ وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اس سے کوئی قیمت حاصل نہیں کر رہے ہیں چاہے وہ عزیز ہی ہو [4] اور اللہ کی طرف کی گواہی کو چھپائیں گے نہیں کہ اس صورت میں یقیناً ہم گناہ گاروں میں ہوں گے۔ اس کے بعد اگر پتہ چلے کہ وہ گناہ کے مستوجب ہوئے تو ان کی جگہ دوسرے دو آدمی میت کے عزیزوں میں سے جن کا حق ان سے چھینا گیا ہے، کھڑے ہوں [5] اور اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ صحیح ہے اور ہم نے کچھ بھی تجاوز نہیں کیا ہے کہ اس صورت میں ہم یقیناً ظالموں

---

[1] ۔المعنی عدد الشهود منکم اثنان کقوله: الحج اشهر معلومات ای وقت الحج (مجمع البیان)
[2] ۔من غیرکم ای من غیر ملتکم (جلالین)
[3] ۔معنی تحبسونهما تقفونهما (مجمع)
[4] ۔اگرچه کسی که برای نفع او گواهی می دهند صاحب قرابت باشد (شاه ولی الله)
[5] ۔دو کس از ورثهٔ مظلومین بایستند بجای ایشاں (شاه ولی الله)

میں سے ہوں گے یہ زیادہ امکانی صورت ہے اس کی کہ وہ گواہی صحیح صحیح دے دیں یا انہیں ڈر ہو کہ ان کی قسموں کے بعد دوسرے گواہوں سے قسمیں لی جائیں گی [1] اور اللہ کے غضب سے بچو اور بات کی سماعت کرو اور اللہ بدکار لوگوں کو منزل تک نہیں پہنچایا کرتا''۔

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے ان آیات کی شانِ نزول حسب ذیل تحریر کی ہے:

''تمیم داری صحابی نے ابن بیدی اور ابی ماریہ نصرانی کے ساتھ بغرض تجارت سفر کیا اور اس کے پاس علاوہ اور اسباب کے سونے چاندی کے منقش ظروف اور ہار بھی تھے۔ اتفاقاً راہ میں بیمار ہوا اور مر گیا اور تمام مال و اسباب ان دونوں کے حوالے کر گیا کہ میرے وارثوں کو دیدیجیو۔ ان دونوں نے مدینہ آ کر سونے چاندی کے ظروف اور ہار نکال کر باقی اسباب ان کے وارثوں کو دے دیا اور چونکہ ان وارثوں کو تمام اسباب کی فہرست معلوم تھی، ان دونوں نصرانیوں سے یوں جرح شروع کی کیا ہمارا مورث بہت دنوں تک بیمار رہا کہ اس کی بیماری میں بہت کچھ خرچ ہو گیا؟ وہ بولے نہیں، تب پوچھا کیا تجارت کی تھی جس میں گھاٹا ہوا؟ کہا نہیں، پوچھا کہ پھر یہ قیمتی چیزیں سونے کے ظروف وغیرہ کیا ہوئے؟ وہ بولے ہم یہ نہیں جانتے، جو ہمیں دیا تھا وہ ہم نے پہنچا دیا آخر یہ مقدمہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجلاس میں پیش ہوا اور چونکہ ان دعویداروں کا کوئی گواہ نہ تھا، اس وجہ سے آپ نے نصرانیوں کو رہائی دے دی۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر وارثوں نے ایک کٹورا مضارب کے پاس پایا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ان ہی دونوں نصرانیوں نے بیچا ہے۔ تب ان نصرانیوں نے کہا کہ یہ چیزیں ہم لوگوں نے اس کی زندگی میں خریدی تھیں مگر چونکہ کوئی گواہ نہ تھا، اس لئے ظاہر نہ کیا۔ وارثوں میں سے دو شخصوں نے جو میت کے زیادہ قریب تھے قسم کھائی کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ ہم لوگوں کو بیچنا معلوم نہیں اور میت کے ہاتھ کی لکھی ہوئی فہرست بھی نکلی۔ تب حضرت نے نصرانیوں سے کل مال واپس لے کر وارثوں کے حوالہ کیا۔''

مگر جناب شیخ الطائفہ نے تبیان میں اور ان کے تتبع میں علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں النزول کے زیر عنوان جو تحریر فرمایا ہے اور اس کی نسبت امام محمد باقر علیہ السلام کی طرف بھی دی ہے، اس میں ہے کہ تمیم بن اوس داری اور اس کا بھائی عدیؔ دونوں نصرانی تھے اور ابن ابی ماریہ غلام عمرو بن العاص مسلمان یہ تینوں تجارت کے لئے شام کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ابن ابی ماریہ بیمار ہوئے اور انہوں نے وصیت نامہ لکھ کر اپنے ساتھ کے اسباب و اموال کے ساتھ ان دونوں نصرانیوں کے سپرد کیا کہ وہ ان کے عزیزوں کے پاس پہنچا دیں۔ اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ دونوں نصرانیوں نے سامان میں سے جو جو چیزیں پسند تھیں، وہ نکال لیں اور باقی مال وارثوں کے سپرد کیا۔ وارثوں نے مال کا جائزہ لیا تو بہت سی چیزیں جو متوفی اپنے ساتھ لے گیا تھا، نہ پائیں۔ اس کے بعد وصیت نامہ دیکھا تو اس میں فہرست تمام سامان کی پوری تھی۔ اس پر دونوں عیسائیوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا ہمیں یہ نہیں معلوم۔ ہمیں تو یہی سامان سپرد کیا تھا جو ہم نے پہنچا دیا۔ یہ مقدمہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش ہوا اور اس پر یہ آیتیں اتریں چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں سے اسی طرح قسم لی کہ ہمارے سپرد اتنا ہی کیا گیا تھا اور جب انہوں نے قسم کھالی تو انہیں چھوڑ دیا۔ پھر ایک گنگا جمنی برتن ان کے پاس نکلا اور ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا، ہم نے خریدا تھا اور ہم تمہیں بتانا بھول گئے۔ پھر معاملہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گیا، تب دوسری آیت اتری جس کے بعد میت کے دو عزیز عمرو بن عاص اور مطلب بن رفاعہ سہمی کھڑے ہوئے اور انہوں نے قسم کھائی کہ ان دونوں عیسائیوں نے خیانت کی ہے چنانچہ وہ برتن میت کے ورثہ کے سپرد کیا گیا۔ بعد میں تمیم داری مسلمان ہو گیا تو وہ

---

[1] ۔ ترد ایمان الی اولیاء السیت بعد ایمانہم فیحلفوا علی خیانتہم و کذبہم فیقتخوا (مجمع البیان)

کہتا تھا کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ برتن میں نے ناجائز طور پر لیا تھا اور جو فیصلہ میرے خلاف ہوا، وہ بالکل درست تھا۔

وہ نماز جس کے بعد گواہوں کو کھڑا کیا جائے، اس سے مراد نماز عصر تھی کیونکہ قسم کا لینا اسی وقت مروج تھا اور لوگوں کا اجتماع بھی اس وقت زیادہ ہوتا تھا۔ [1]

''وہ گواہ قسم کھائیں کہ ہم نے اس سے کوئی قیمت حاصل نہیں کی ہے'' یعنی گواہی میں کسی ذاتی مفاد کی خاطر کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ [2]

''چاہے وہ عزیز ہوں'' یعنی جس کے وہ گواہ ہیں، وہ ان گواہوں میں سے کسی کا عزیز ہو۔ [3]

جب بھی (قسم کھا رہے ہیں کہ) ہم نے گواہی دینے میں قرابت داری کے لحاظ سے کام نہیں لیا ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾

''جس دن اللہ سب پیغمبروں کو یکجا کرے گا تو کہے گا کہ تمہاری آواز پر کیا لبیک کہی گئی [4]؟ وہ کہیں گے کہ ہمیں خبر نہیں۔ یقیناً تو ہے تمام غیب کی باتوں کا جاننے والا''۔

اس سے غالباً صرف یہ اظہار مقصود ہے کہ قوم کے لبیک کہنے یا نہ کہنے کی ذمہ داری پیغمبروں پر کچھ نہیں ہے۔ اگر قوم گمراہ رہی یا بعد میں گمراہ ہوگئی تو یہ اس قوم کی بدنصیبی ہے۔ پیغمبروں کو اس سے کچھ مطلب نہیں اور ان کا اپنے سے علم کی نفی کرنا اس بنا پر ہے کہ انہیں ذاتاً صرف اپنے سامنے کا علم ہوسکتا ہے لیکن آواز پر لبیک کہنے والے بعد میں ہوسکتے ہیں جن کا علم غیب سے تعلق رکھتا ہے بلکہ حال میں بھی حقیقی لبیک یعنی قلبی ایمان جس پر جزائے اخروی کا انحصار ہے، وہ بھی غیبی ہی چیز ہے اور انبیاء کو اللہ کے دیئے ہوئے علم سے چاہے اس کا علم ہو بھی لیکن مقتضائے عبودتی یہی ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں اپنے سے علم کی نفی کی جائے کہ وہ علم جو ہے، وہ بھی بذات خود تو نہیں ہے، اس کا عطا کردہ ہے۔ [5]

ایک قدیم تفسیر آیت کی جو ہمارے یہاں حدیث میں وارد ہوئی ہے، آیت کے مضمون سے زیادہ چسپاں معلوم ہوتی ہے۔

چونکہ اس کے بعد جناب عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر آئے گا کہ ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے ان سے کہا تھا کہ تمہیں خدا بنالیں اور یہ بھی بعد کے واقعہ سے متعلق ہے اور اسی لئے جناب عیسیٰ علیہ السلام کا جواب یہی درج ہے کہ میں اپنے سامنے تک نگراں تھا۔ بعد میں کیا ہوا؟ اس کا علم تجھ ہی کو ہے۔ تو اسی طرح یہاں مرسلین سے بلا کر ان امتوں پر ظاہر کرنے کے لئے تمہارے رویہ سے انبیاء بے تعلق ہیں، ان سے ان انتظامات کے بارے میں پوچھا جائے گا جو انہوں نے اپنے بعد کے واسطے ہدایت خلق کے لئے کئے تھے کہ کچھ خبر بھی ہے تمہیں کہ قوم نے تمہاری ہدایتوں پر کیسا عمل کیا؟

---

[1] ۔ هو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام وقتادة وسعید بن جبیر وغیرهم (مجمع البیان)

[2] ۔ ای لا نشتری بتحریف الشهادة ثمنا (مجمع)

[3] ۔ تقدیره: ولو کان المشهود له ذا قربی (تبیان)

[4] ۔ چه جواب داده شد شما را (شاه ولی الله) کیا جواب دیئے گئے تھے تم (شاہ رفیع الدین)

[5] ۔ قال بعضهم لا علم لنا مع علمك (تبیان)

اس پر وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ خبر نہیں۔غیب کا تو جاننے والا تو ہی ہے۔[1]

اس بارے میں سب سے زیادہ شدید اس امت کا کردار ہے جو اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کی وصیتوں کے خلاف اور ان کے اہل بیت کے ساتھ روا رکھا اور اس لئے کوئی بعید نہیں کہ تنزیل آیت میں مقصود اصلی اس امت کی تنبیہ ہو کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تو ان کی ہدایتوں پر جس حد تک عمل کر رہے ہو، وہ خیر مگر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دیکھنا ہے تم کیا کرتے ہو؟

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْــَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۱۰

''جب کہے گا[2] اللہ اے عیسیٰ فرزند مریم! یاد کرو میری نعمت کو جو تم پر تھی اور تمہاری ماں پر، جب میں نے تمہیں تقویت پہنچائی روح القدس کے ساتھ کہ تم، لوگوں سے باتیں کرتے تھے گہوارہ میں اور ادھیڑ عمر میں اور جب میں نے تمہیں قانونِ شریعت اور حکمت اور توریت اور انجیل کا علم دیا اور جب تم مٹی سے پرندے کی سی شکل بناتے تھے۔اس کے بعد اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی اور تم پیدائشی اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتے تھے میرے حکم سے اور جب تم مردوں کو جلا دیتے تھے میرے حکم سے اور جب میں نے بنی اسرائیل کو روکا تمہاری طرف سے[3] جب تم ان کے پاس معجزے لائے تو ان میں سے جو کافر تھے، انہوں نے کہا کہ یہ نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو۔''

معجزات حضرت عیسیٰ علیہ السلام

''روح القدس'' ایک خاص فرشتہ کا نام ہے جسے بعض نے کہا ہے کہ جبریلؑ امین ہی ہیں[4] اور بعض نے کہا ہے کہ کوئی اور فرشتہ ہے۔

---

[1] ۔عن ابی جعفر علیہ السلام قال: ماذا اجبتم فی اوصیائکم فیقولون لا علم لنا بما فعلوا بعدنا بہم (علی بن ابراھیم)

[2] ۔معناہ اذ یقول اللہ فی الاٰخرۃ (مجمع البیان)

[3] یعنی قتل کرنے نہ دیا (موضح القرآن)

[4] ۔وھو جبرئیل (مجمع البیان)

مگر شاہ ولی اللہ نے اپنے ترجمہ میں روح القدس کے بعد عجیب تشریح کی ہے کہ:۔''یعنی برکات حظیرۃ القدس''..... مجھے نہیں معلوم اس کا ماخذ کیا ہے؟

''تم لوگوں سے باتیں کرتے تھے گہوارہ میں اور ادھیڑ عمر میں'' اس کا مفہوم سمجھنے میں ذرا ذہنی پریشانی محسوس ہوتی ہے۔اس لئے کہ گہوارہ میں بات کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔پھر اس کا ذکر کیوں ہوا؟ یا تو اس فقرہ کو پہلے جز کا تتمہ سمجھا جائے کہ تم نے گہوارہ میں اور ادھیڑ پن میں یکساں گفتگو کی یعنی جو بات ادھیڑ پن میں کہنے والے تھے، وہی گہوارہ میں بھی کہی کہ ''قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۖ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴿۳۰﴾ (سورۂ مریم) میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے اس نے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے''۔

دوسرا مطلب اس کا بعض مفسرین نے یہ قرار دیا ہے کہ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں ادھیڑ پن کی عمر تک پہنچے ہی نہیں۔وہ تو صرف چالیس برس کی عمر کے تھے جب آسمان کی طرف اٹھا لئے گئے،اس لئے خالق کا یہ کہنا کہ تم نے ادھیڑ پن میں بھی لوگوں سے باتیں کیں،اس کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر اس دنیا میں آئیں گے اور خلق خدا کو دعوت حق دیں گے۔

اسلامی روایات کے مطابق یہ اس وقت ہوگا، جب حضرت مہدی آخر الزماں علیہ السلام ظہور فرمائیں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے انصار میں سے ہوں گے۔

چونکہ یہ ادھیڑ پن میں پھر تبلیغ کا موقع فراہم ہونا، غیر معمولی مظاہرۂ قدرت ہے، اس لئے اس کا گہوارہ کی گفتگو کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔[1]

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَى الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''اور جب میں نے پیغام بھیجا حواریین کی طرف کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ، انہوں نے کہا ہم ایمان لائے اور گواہ رہنا کہ ہم اسلام لائے ہیں۔''

وحی کا لفظ قرآن میں اکثر جگہ خالق کے پیغام کے معنی میں آیا ہے، چاہے وہ قلبی القاء کے طور پر ہو جس کا نام الہام ہوتا ہے جیسا کہ مادر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے یا ہدایت فطری کے طور پر ہو جیسا کہ شہد کی مکھی کے لئے اس کا استعمال ہوا ہے۔یہاں بھی اس لفظ کا استعمال اسی طرح کے معنی میں ہوا ہے۔[2]

اور ممکن ہے کہ جہاں وحی کے لفظ کا استعمال بالواسطہ ہوا ہو یعنی پیغمبر کے ذریعہ سے جو حکم ربانی انہیں پہنچایا گیا ہے، وہی مراد ہو جیسا کہ بعض جگہ قرآن مجید میں انزال کتب کی نسبت خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دی گئی ہے جیسے: یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ اور کہیں اس کی نسبت افراد خلق کی طرف دے دی گئی ہے جیسے:۔وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا ''کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور

---

[1] ۔ کھلا یفید نزولہ قبل الساعۃ لانہ رفع قبل الکھولۃ (جلالین)

[2] ۔ای الھتم وقیل القیت الیھم بالایات التی ارتیھم ایاھا (مجمع البیان)

اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا ہے''.....ظاہر ہے کہ احکام ربّانی افراد امت پر نہیں اترا کرتے بلکہ پیغمبر پر اترتے ہیں مگر چونکہ پیغمبر کے ذریعہ سے وہ احکام ان تک پہنچتے ہیں، اس لئے بالواسطہ وہ ان کی طرف نازل ہوتے ہیں۔ ویسے ہی یہاں یہ کہنا کہ حوارین کی طرف وحی بھیجی اس لحاظ سے ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کے ذریعہ سے ان کی طرف یہ پیغام بھیجا گیا ہے۔[1]

اس نظیر کو سامنے رکھا جائے تو ایک جگہ اَوحَینا کے تحت میں انبیاؤ مرسلین کے ذکر کے ساتھ جو اسباط کا نام ہے، اس سے اس امر پر استدلال نہ کیا جائے کہ فرزندانِ یعقوب سب انبیاء کا درجہ رکھتے تھے۔ جب کہ ان کا کردار جو خود قرآن سے ثابت ہے، منزل نبوت کیا، مرتبہ ایمان کے بھی شایانِ شان نہیں ہے۔ اس کا ذکر اجمالی طور پر سابق میں آچکا ہے۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

''جب کہا حواریین نے کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا آپ کا پروردگار یہ قدرت رکھتا ہے کہ وہ ہم پر آسمان سے ایک خوان کھانے کا اتارے؟! انہوں نے کہا اللہ کے غضب سے بچو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ انہوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ اس میں سے ہم کھائیں اور ہمارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو اور ہمیں معلوم ہو کہ آپ نے ہم سے سچ کہا تھا اور ہم اس پر گواہ ہوں۔''

بنی اسرائیل کتنے ہی معجزے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں دیکھ چکے تھے اور ہر مرتبہ ان کا کردار یہی تھا کہ وہ ٹیڑھے ہی رہتے تھے مگر وہ تو عوام بنی اسرائیل تھے۔ اب یہ ان میں کے خواص کا ذکر ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوارین کہلاتے ہیں مگر ذہنیت ان کی بھی وہی نظر آتی ہے جو ان عوام کی تھی۔

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ

---

[1] ۔ اوحیت الی الحواریین امرتہم علی لسانك (جلالین)

اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

''کہا عیسیٰ بن مریم نے کہ ہمارے پروردگار! اتار ہم پر ایک خوان آسمان سے جو عید ہو [1] ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے اور تیری طرف کی قدرتی نشانی ہو اور ہمیں روزی عطا فرما اور تو تو تمام روزی عطا کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔ اللہ نے ارشاد کیا کہ بے شک میں اسے تم پر اتاروں گا۔ اب اس کے بعد جو تم میں سے کفر اختیار کرے گا تو پھر یقیناً میں اسے ایسی سزا دوں گا جیسی دنیا میں کسی کو بھی نہیں دی ہوگی۔''

بالکل اسی طرح جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کے جاہلانہ سوال رویت پر پہلے انہیں سمجھایا اور جب وہ نہ مانے تو ان کی طرف سے بارگاہ الٰہی میں درخواست پیش کر دی جس پر برق تجلّی چمکی اور کوہ طور سرمہ ہو گیا اسی طرح یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو حواریین کو سمجھایا مگر جب انہوں نے نہیں مانا تو بارگاہ الٰہی میں آپ نے ان کی درخواست پیش کر دی مگر یہ سوال اتنا سنگین نہ تھا جتنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے پیش کردہ سوال تھا۔ اس لئے یہاں اتنا سخت مظاہرہ جلال الٰہی کا نہیں ہوا کہ پیغمبر کو غش آجائے اور پہاڑ سرمہ ہو جائے۔ پھر بھی چونکہ معجزوں کے آچکنے کے بعد پھر خاص خاص معجزوں کی فرمائش کرنا ہی ایمان کمزوری کا ثبوت ہے جو خالق کو ناپسند ہے۔ اس کے بعد پھر فرمائش کی تکمیل کے باوجود اگر انحراف کیا جائے تو یہ بڑی ہی سخت غضب الٰہی کی مستوجب بات ہے، اس لئے دعائے مسیحؑ کی قبولیت کے اعلان کے ساتھ یہ سخت تہدیدی انداز اختیار کیا گیا ہے کہ اگر اس کے بعد ان لوگوں نے نہ مانا تو وہ عذاب ہوگا جو تمام کائنات میں کسی کو نہ ہوا ہوگا۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے ایک عملی نتیجہ اور اچھا نکالا ہے کہ: ''اس میں مسلمانوں کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرق عادت کی راہ سے نہ چاہیں، پھر اس کی شکر گزاری بہت مشکل ہے۔ اسباب ظاہری پر قناعت کریں تو بہتر ہے'' (موضح القرآن)۔

ہاں، ایک نتیجہ شاہ صاحب نے الٹا بھی نکالا ہے جس میں ''وہابیانہ'' مسلک کی سخن پروری مضمر ہے۔ وہ یہ ہے کہ: ''اس قصہ میں یہ ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت کی پیش نہیں جاتی''۔

حالانکہ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ پیغمبر کے واسطہ سے جو دعا کی جاتی ہے، وہ مقبول ہوتی ہے۔ رہ گیا اس دعا کی قبولت کے بعد کفر پر قیام، اس سے ظاہر ہے کہ پیغمبر بھی انتہائی ناراض ہوں گے اور اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے کسی حمایت کا ہونا قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ پھر اس واقعہ سے جو نتیجہ نکالا گیا ہے وہ حقیقت کے مطابق کہاں سمجھا جا سکتا ہے؟!

اس کے برخلاف جناب شیخ الطائفہ اور ان کی پیروی میں علامہ طبرسیؒ نے اسی آیت کے ایک لفظ سے ایسا نتیجہ برآمد کیا ہے جو وہابی تصورات کے قلعہ کو مسمار کر دیتا ہے یعنی وہابی تصور یہ ہے کہ اگر کسی نے پیغمبر یا امام یا کسی ولی خدا سے طلب رزق کر لیا تو مشرک ہو جائے گا کیونکہ رازق ہونا اللہ کی مخصوص صفت ہے مگر اس آیت میں خالق کو خیر الرازقین کہا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ رزق کا انتساب اللہ کے سوا بھی دوسرے کی طرف ہو سکتا ہے۔

جناب شیخ الطائفہؒ فرماتے ہیں:۔

فی الآیة دلالة علی ان العباد یرزق بعضهم بعضا بدلالة قوله وانت خیر الرازقین لانه لو لم یصح ذلك

---

[1] ۔ نتخذ الیوم الذی ینزل فیه عیدا نعظمه نحن ومن یاتی بعدنا (تبیان)

لم یجز خیر الرازقین کما انه لما لم یجز ان یکون الٰھة لم یصح ان یقال انت خیر الاٰلھة وصح ارحم الراحمین واحکم الحاکمین واسرع الحاسبین واحسن الخالقین.(تبیان)

یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ بندے بھی ایک دوسرے کے رازق ہوتے ہیں۔اس کی دلیل یہ جملہ ہے کہ تو تمام رزق دینے والوں میں سب سے بہتر ہے۔اس لئے کہ اگر یہ درست نہ ہوتا تو خیر الرازقین کہنا درست نہ ہوتا جیسے چونکہ خدا بہت نہیں ہو سکتے اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ تو ''خیر الالہۃ'' (خداؤں میں سب سے بہتر) ہے ہاں ارحم الراحمین، احکم الحاکمین، اسرع الحاسبین اور احسن الخالقین کہنا درست ہے۔

مائدہ (کھانے کے خوان) کا واقعہ

انہیں جو تنبیہ کی گئی تھی کہ اگر تم نے کفر کیا تو پھر سخت سزا دوں گا، بلاضرورت تو نہیں ہونا چاہیے چنانچہ ہماری قدیم تفسیر بتاتی ہے کہ کچھ دن تو یہ سلسلہ جاری رہا۔دستر خوان پکے ہوئے کھانے کا آتا تھا اور سب مل جل کر ان غذاؤں کو کھاتے تھے اور شکر خدا ادا کرتے تھے مگر کچھ دن کے بعد مال دار افراد نے کہا کہ غریبوں کو ہمارے پاس نہیں بیٹھنا چاہیے۔ان کے لئے انتظام الگ ہونا چاہیے۔اس پر قہر خدا جوش میں آ گیا اور وہ دستر خوان آنا موقوف ہو گیا اور ایسا کہنے والے بندروں کی شکل میں مسخ ہو گئے۔[1]

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۱۸﴾

''اور جب اللہ کہے گا[2] اے عیسیٰؑ پسر مریمؑ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے علاوہ مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لو تو وہ کہیں گے کہ پاک ہے تیری ذات، مجھے یہ حق نہیں ہو سکتا کہ میں وہ بات کہوں جو میرے لئے صحیح نہیں ہے۔

---

[1] ۔فرفع اللہ المآئدۃ ومسخوا قردۃ وخنازیر (علی بن ابراھیم)

[2] ۔المعنی: اذیقول اللہ یوم القیامۃ (مجمع البیان) فاما لفظ من قال فی معنی یقول فمستعمل کثیر وان کان مجازا (تبیان)

اگر میں نے اسے کہا ہو تو تجھے خود معلوم ہوگا۔ تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور میں تیرے علم پر حاوی نہیں ہوں [1] یقیناً تو تمام غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔ میں نے ان سے نہیں کہا تھا مگر وہی جس پر تو نے مجھے مامور کیا تھا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے اور میں ان پر گواہ تھا، جب تک میں ان میں تھا۔ پھر جب تو نے میری مدت پوری کر دی تو تو ہی بس ان پر نگراں تھا اور تو ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ اگر تو انہیں سزا دے تو وہ بے شک تیرے ہی تو بندے ہیں۔ اور اگر انہیں بخش دے تو بلا شبہ تو زبردست ہے، صحیح ہی کام کرنے والا''۔

یہ سوال و جواب مدعیان عیسائیت کو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ سنوا دینے کیلئے ہے کہ جو کچھ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں باتیں بنا رکھی ہیں اور عقیدے قائم کر رکھے ہیں، ان سے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیزار ہیں اور خود ان کی تعلیم ان عقائد کے موافق نہ تھی۔ [2]

اس آیت کے اس جملہ سے کہ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ قادیانی، وفات حضرت مسیح علیہ السلام پر استدلال کرتے ہیں حالانکہ عربی میں توفی کے اصل معنی موت دینے کے نہیں ہیں بلکہ مدت پوری کرنے کے ہیں۔ یہ مدت کا پورا کرنا چونکہ اکثر موت کی صورت سے ہوتا ہے تو اس لئے عرف عام میں موت کو وفات کہا جانے لگا لیکن اگر مدت پوری ہونے کی کوئی دوسری شکل ہو تو وہ بھی اس لفظ کا مصداق ہوگی جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ہوا کہ وہ زمین سے آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ ان کے لئے مدت پوری ہونے کا یہ عنوان ہوا۔ اس لئے متوفیك کا لفظ اس پر بھی منطبق ہوگا [3] اس کے لئے ویسے قبض روح کی ضرورت نہیں ہے جو موت کی صورت میں ہوتا ہے۔

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾

''ارشاد الٰہی ہوگا کہ یہ وہ دن ہے کہ سچوں کے کام آئے گی ان کی سچائی۔ ان کے لئے بہشت ہوں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش اور وہ ان سے خوش ہوں گے، یہی ہے بڑی کامیابی۔''

''یہ وہ دن ہے''.....یعنی دنیا میں جو انہوں نے عمر بھر قول و عمل میں سچائی کو قائم رکھا، اس کا ثمرہ انہیں آج ملے گا۔ [4]

اس سے ظاہر ہے کہ دنیا میں تو اکثر سچوں کو ان کے سچ سے نقصان بھی پہنچتا ہے اور ان کی زندگی اکثر عسرت و ناکامی کا مرکز نظر آتی ہے۔

---

[1] ۔النفس الغیب (مجمع)

[2] ۔ھٰذا وان خرج مخرج الاستفہام فھو تقریع وتھدید لمن ادعیٰ ذٰلك من النصاریٰ (مجمع البیان)

[3] ۔لا یدل علیٰ انہ اماتہ لان التوفی ھوا القبض الیہ (تبیان)

[4] ۔ھو ما صدقوا فیہ فی دار التکلیف لان یوم القیامۃ لا تکلیف فیہ علیٰ احد (تبیان)

وہ اکثر مظالم کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں۔

اس سے ان کی آنکھیں کھلنا چاہئیں جو دنیاوی کامیابی و کامرانی یا وقتی قہر وغلبہ کی ترازو پر حقانیت کو تولنے کے منادی ہیں مگر قرآن سے صاف ظاہر ہے کہ صادقین کی حقانیت کو اس دنیا کی کامرانی کے معیار پر نہیں جانچا جا سکتا۔ اس کے بعد وہ افراد جنہیں کونوا مع الصادقین کہہ کر مرکز اتباع قرار دیا گیا ہے، انہیں دنیا کی بااقتدار صفوں میں ڈھونڈھنا درست نہ ہوگا۔ بلکہ گوشہ نشینوں، کسمپرسی میں زندگی گزارنے والوں اور ظلم وستم کے قید خانوں میں اسیر افراد میں یہ ''الصادقین'' ملیں گے جن کی اصل کامرانی اسی دن سامنے آئے گی، جب خالق کی ندا ہوگی:۔ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ .

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾

''اللہ کے لئے ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے درمیان کی چیزوں کی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

****

*****

***

*

تفسیر فصل الخطاب

جلد دوم

مصنف

سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تفسیر فصل الخطاب

جلد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دوم

مصنف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سید العلما علامہ سید علی نقی النقوی ؒ لکھنوی

پروف ریڈنگ۔۔۔۔۔۔۔۔مولانا عابد عسکری

کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(قائم گرافکس۔جامعہ علمیہ۔ڈیفنس۔کراچی)

ترتیبِ نو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مجاہد حسین حر

نیٹ سیٹنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قلب علی سیال

سال اشاعت۔۔۔۔۔۔۔۔2011

ناشر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مصباح القرآن ٹرسٹ

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر

۲۴۔الفضل مارکیٹ۔اردو بازار۔لاہور

ابتدائیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ.

قارئین کرام! تفسیر فصل الخطاب کی دوسری جلد پیش خدمت ہے لیکن افسوس صد افسوس کہ سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی اب ہم میں نہیں رہے۔ میں نے ۲۹ مارچ ۱۹۸۶ کو تفسیر کے چند خصوصی نسخے لے کر سرکار ممدوح کی خدمت میں حاضری دی تو معلوم ہوا کہ آپ علیل ہیں اور کسی سے نہیں ملتے۔ بہت دکھ ہوا اور تشویش بھی بہر حال میں نے اپنا وہ نام کہلا بھجوایا جس نام سے آپ مجھے یاد فرمایا کرتے تھے۔ آدمی واپس آیا، اس نے بیٹھک کھول دی اور مجھے انتظار کرنے کو کہا، تھوڑی دیر میں مولانا برآمد ہوئے، کافی دیر گفتگو ہوئی اور پھر خورد و نوش کا سلسلہ بھی چلا۔ میں نے تفسیر کے دو نسخے پیش کیے، تیسرے پر تبرک کے طور پر ان سے دستخط کروالئے اور ساتھ لے آیا۔ مولانا نے تفسیر کو تھوڑی دیر دیکھا اور فرمایا: ''دیر آید درست آید''۔ کسے خبر تھی کہ یہ مولانا سے آخری ملاقات ہے اور پھر کبھی شرف نیاز حاصل نہ ہوگا۔

سید العلماء ۳۰، ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء رحلت فرما گئے اور عین عید الفطر کے دن مدفون ہوئے۔ خداوند عالم ان کو جوار معصومین میں جگہ عطا فرمائے۔

آہ! وہ شمع جو ۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء لکھنؤ میں روشن ہوئی تھی، گل ہوگئی۔

افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں مگر وہ ہم میں روحانی طور پر موجود اور ہمارے دل و دماغ پر محیط ہیں۔ آج بھی ان کے علمی نکات ہم کو یاد آتے ہیں اور دین و دیانت اور اخلاق و شرافت سے ہماری محبت کو مستحکم کرتے ہیں۔ اب ایسی صلح کل ہستیاں کہاں ہیں جو علم و عمل کے میدان میں اسلامی تعلیمات و اقدار کی امین ہوں اور دنیا کی مشکلات میں ہمارے مژدہ فتح مبین ہوں۔

تفسیر فصل الخطاب کی پہلی جلد کی اشاعت کے تھوڑے دنوں بعد ہی ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' لاہور نے جو تفسیر نمونہ کے ناشر ہیں خواہش ظاہر کی کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کی ان کو اجازت دے دی جائے۔ مختلف مواقع پر اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی لیکن نتیجہ خیز نہ ہوسکی۔ ستمبر ۱۹۹۰ء کے آخری دنوں میں میری بیرون ملک سے واپسی پر پھر گفتگو ہوئی اور طے پایا کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت مصباح القرآن ٹرسٹ کی طرف سے اور پیشکش ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کی طرف سے ہو۔ چنانچہ ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے دوسری جلد کا کتابت شدہ مسودہ مصباح القرآن ٹرسٹ کے حوالے کر دیا تا کہ اشاعت کا کام مصباح القرآن ٹرسٹ کے اہتمام و انصرام کے تحت انجام پا سکے اور تفسیر فصل الخطاب کی جلدیں بہ سرعت شائع ہوتی رہیں۔ الحمد للہ کہ مصباح القرآن ٹرسٹ نے اب نئے سرے سے مکمل تفسیر کی کمپوزنگ کروائی ہے اور قارئین کی سہولت کیلئے اشاعتِ ھذا میں تین جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب کو مکمل شائع کر دیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تفسیر کی دوسری جلد حاضر خدمت ہے، امید ہے کہ قارئین اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور تعاون فرمائیں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

سید علی اکبر رضوی

صدر ادارہ ترویج علوم اسلامیہ

کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

سرکار سید العلماء علامہ علی نقوی النقوی اعلی اللہ مقامہ کے خطیبانہ و مؤلفانہ فیوض و برکات کا سلسلہ لگ بھگ پچاس سال پر محیط ہے۔ آپ کی تقریر و تحریر میں بیان و زبان کی سادگی اور مفاہیم و مطالب کی گہرائی یکساں طور پر موجود رہی ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کو برصغیر پاک و ہند کے جمہور مسلمین میں عموماً اور شیعہ مومنین میں خصوصاً مقبولیت اور ادب و احترام نصیب ہوا کہ باید و شاید!

سید العلماء کے آثار علمی میں ''شہید انسانیت'' سمیت دسیوں باعظمت کتابیں، آپ کے کئی ایک مجموعہ ہائے تقاریر اور مختلف دینی موضوعات پر کم و بیش پانچ سو رسالے موجود ہیں۔ تاہم آج سے ۲۵ برس قبل جب آپ کا مقدمہ تفسیر قرآن منظر عام پر آیا تو آپ کے تبحر علمی تحقیقی صلاحیت اور ذمہ دار قلم کی رعایت سے اپنے بیگانے ہر ایک کی نظریں آپ کی تفسیر قرآن کی طرف لگ گئیں۔

اس سلسلے میں خاص و عام کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ آپ کی تفسیر آئندہ جلد کی تلاش میں پاکستان کے لوگ ہندوستان جاتے اور وہاں کے لوگ پاکستان آتے، نیز دیگر ممالک میں مقیم مسلمان اس کے لئے ہندو پاک کے کتب خانوں سے برابر رابطہ رکھتے تھے۔ آخر کار ان ہزاروں منتظر اور متلاشی نگاہوں کی تسکین کا سامان یوں ہوا کہ سید العلماء کے ایک نہایت ہی مخلص قدر شناس غلام محمد بٹ نے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک کی مدت میں ثمر بگ (مقبوضہ کشمیر) سے آپ کی تفسیر قرآن ''فصل الخطاب'' کی سات جلدیں شائع کر کے اس اہم فرض کی تکمیل کا اعزاز حاصل کر لیا۔

اس اثناء میں مذکورہ تفسیر کی پاکستان میں اشاعت کی ضرورت کا احساس فرماتے ہوئے سید العلماء نے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کراچی کے صدر سید علی اکبر رضوی کو بھی اس کی اشاعت کے حقوق مرحمت فرما دیئے۔ چنانچہ اس ادارے نے تفسیر فصل الخطاب کی جلد اول شائع کر دی لیکن بوجوہ یہ سلسلہ کچھ آگے نہ بڑھ سکا لہٰذا سید علی اکبر رضوی نے مصباح القرآن ٹرسٹ کی شاندار تفسیری و علمی خدمات کو دیکھتے ہوئے ایک معاہدے کے تحت اس تفسیر کی اشاعت کا عظیم کام اس ٹرسٹ کے حوالے کر دیا۔ بنابریں مصباح القرآن ٹرسٹ نے تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کو خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ جلد اول جو کہ کراچی کے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے شائع کی تھی، کے ختم ہونے پر مصباح القرآن ٹرسٹ نے اسے دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کی، اس کی اصلاح و تزئین میں مقدور بھر کوشش کی گئی، اس کے باوجود ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہمیں اپنی تجاویز و آراء سے مستفید فرمائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آخر میں دردمندانہ گزارش بھی کرتے ہیں کہ تفسیر ہذا کی ترویج میں ہمارے ساتھ ہر ممکن تعاون فرما کر قرآن و عترت کی نصرت اور سید العلماء کی قدردانی کا حق ادا کرنے میں کوشاں رہیں۔

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

ضرورت تفسیر

قرآن مجید جب خود نور، ہدایت، بصیرت، آسان، واضح اور اَحسن (و بہترین) تفسیر ہے تو پھر تفسیر کی کیا ضرورت ہے؟ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات قرآن میں ہے:

وَلَا یَاۡتُوۡنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئۡنٰکَ بِالۡحَقِّ وَاَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا.(فرقان--۳۳)

اور یہ لوگ کوئی بھی مثال نہ لائیں گے مگر یہ کہ ہم اس کے جواب میں حق اور بہترین بیان (وتفسیر) لے آئیں گے

فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰہُ بِلِسَانِکَ لَعَلَّھُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ.(دخان--۵۸)

درحقیقت ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان پر بالکل آسان قرار دیا ہے، شاید وہ نصیحت قبول کریں۔

وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَھَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ.(قمر--۱۷)

''اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی جو نصیحت قبول کرے''۔

قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا غَیۡرَ ذِیۡ عِوَجٍ لَّعَلَّھُمۡ یَتَّقُوۡنَ.(زمر--۲۸)

''عربی زبان کا قرآن جس میں کوئی کجی نہیں، شاید کہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں''۔

قرآن مجید نے نہ فقط اس سوال کا جواب دیا ہے بلکہ یہ بھی بتادیا ہے کہ مفسر قرآن کون ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡھِمۡ وَلَعَلَّھُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ.(نحل--۴۴)

''اے رسول! ہم نے قرآن کو آپ پر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے اُن تمام احکام وغیرہ کو بیان کریں (اور ان کی توضیح وتشریح کریں) جو ان کی طرف بھیجے گئے ہیں شاید وہ غور وفکر سے کام لیں''۔

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا.(فاطر--۳۲)

''پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا انہیں جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا''۔

مذکورہ آیات میں واضح طور پر بتادیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے لئے مفسر کی ضرورت ہے اور مفسر قرآن سب سے پہلے خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے ان کے بعد وہ مفسر قرآن ہیں جو وارث قرآن، وارث علم قرآن اور وارث علم پیغمبرؐ ہیں یعنی اہل بیت وعترت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ جیسا کہ خود پیغمبرؐ نے بھی فرمایا:

''اِنِّیۡ تَارِکٌ فِیۡکُمُ الثَّقَلَیۡنِ------ کِتَابَ اللّٰہِ وَ عِتۡرَتِیۡ اَھۡلَ بَیۡتِیۡ------''

میں آپ لوگوں کے پاس دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب خدا (قرآن مجید) اور دوسری اپنی عترت (یعنی اہلبیت)۔

اہل بیت وعترت پیغمبرؐ کے بعد تفسیر قرآن کی ذمہ داری اُن علماء پر ہے جو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے حقیقی وارث اور "اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَآءِ" کے مصداق ہیں۔

انہی علماء میں سے ایک حضرت آیۃ اللہ علامہ السید علی نقی النقوی المعروف ''علامہ نقن'' ہیں۔ جنہوں نے تفسیر فصل الخطاب لکھ کر احسن طریقہ سے فریضۂ الٰہی انجام دیا۔

تفسیر فصل الخطاب سے قرآن مجید کا ترجمہ وحاشیہ مرتب کرتے وقت جس حد تک میں نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا ہے تو تفسیر کی مختلف اقسام (مثلاً تفسیر رُوائی، تفسیر عرفانی اور تفسیر اجتہادی) میں سے فصل الخطاب کو تفسیر اجتہادی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ علامہ موصوف نے اس تفسیر میں ان تمام علوم سے استفادہ کیا ہے جو ایک جامع اور اجتہادی تفسیر کے لئے ضروری ہیں۔

یہ تفسیر اگرچہ سابقہ کتابت کے مطابق چند مرتبہ مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہو چکی ہے لیکن اب خداوند عالم نے خادمین ادارہ مصباح القرآن لاہور مخصوصاً جناب محترم شیخ محمد امین صاحب کو یہ توفیق عنایت فرمائی کہ وہ اسے کمپوز کروا کر خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ کمپوز اور اصلاح کا کام جناب محترم مجاہد حسین حر صاحب کے سپرد کیا گیا انہوں نے اپنی حد تک کوشش کی لیکن اتنے بڑے کام میں نواقص اور غلطیوں کا باقی رہنا فطری امر ہے۔ قارئین محترم سے گزارش ہے کہ نواقص کے سلسلہ میں راہنمائی فرمائیں تا کہ بعد والے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے۔

دعا ہے کہ خداوند عالم بانیٔ ادارہ مصباح القرآن حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین مرحوم علامہ سید صفدر حسین نقوی النجفی قدس سرہ کے درجات بلند فرمائے۔ ان کے قائم کردہ تمام ادارات کو ترقی وکمال عطا کرے مصباح القرآن و دیگر ادارات کی تاسیس میں ان کے معاون خاص محترم جناب سیٹھ نوازش صاحب دام عزہ کو صحت وسلامتی اور طول عمر عطا کرے۔

علامہ مرحوم کے قائم کردہ تمام اداروں کے سرپرست اعلیٰ اور ان کے روحانی جانشین حضرت آیۃ اللہ حافظ ریاض حسین نقوی النجفی دامت برکاتہ کو صحت وسلامتی اور طول عمر بابرکت عطا فرمائے اور ان کا سایہ ہم سب کے سروں پر قائم ودائم رکھے۔ تمام معاونین وخادمین ادارہ مصباح القرآن مخصوصاً جناب محترم محمد امین صاحب کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

سید فیاض حسین نقوی

جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس۔ کراچی

ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مارچ ۲۰۱۱ء

تفسیر فصل الخطاب

چند تاثرات

ڈاکٹر محسن نقوی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ وَعَلٰی اٰلِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاھِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ اَذۡھَبَ اللّٰہُ عَنۡھُمُ الرِّجۡسَ وَطَھَّرَھُمۡ تَطۡھِیۡرًا.

ہماری خوش نصیبی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی عظیم ترین علمی شخصیات میں سے فردِ وحید و عالم جلیل سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی (۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء۔ ۲۹ رمضان ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۹۸۸ء) کی تفسیر فصل الخطاب کی طبع نو کے موقع پر اس کے بارے میں کچھ خیالات کے اظہار کا موقع ہمیں فراہم ہوا۔

ایک پوتے کے لئے اپنے جدّ (سیّد العلماءؒ ہمارے والد کے چچا تھے) کی کسی کتاب پر لکھنا وہ بھی ''سید العلماءؒ'' جیسی علمی شخصیت کی کتاب، اُس پر مستزاد ''تفسیر القرآن'' جیسا وسیع و دقیق موضوع اِس بے بضاعت کے لئے بہت مشکل کام تھا لیکن توفیق اِلٰہی (عزّوجل) اور ولی العصر، صاحب الزمان علیہ الصلاۃ والسلام اور اُن کے اجدادِ کرام، صلوٰۃ اللہ علیہم کی ہدایت کے توسل سے کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں قرآن مجید کے اردو تراجم کی ابتداء سید العلماءؒ کے اجداد میں سید علی نقویؒ (۱۲۰۰ھ/ ۱۲۵۹ھ بمطابق ۱۷۸۵ء--۱۸۴۳ھ) ابن سید دلدار علی غفرانمآبؒ کے حصّے میں آئی۔ آپ کا ترجمۂ قرآن شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین سے پہلے قرار پاتا ہے۔ اس ترجمے کی زبان قدیم لیکن سلیس اور بامحاورہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ پیر ابراہیم ٹرسٹ کراچی کی لائبریری، ناظم آباد میں موجود ہے۔

یوں تو علمائے شیعہ نے قرآنِ مجید کے بہت سے ترجمے اور حواشی قلم بند کئے جن میں مولانا فرمان علی (۱۸۵۳ء--۱۹۱۶ء) اور مولانا مقبول احمد اعلی اللہ مقامہما (۱۸۷۰ء--۱۸۸۶ء) کے تراجم وحواشی کو خاص شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ۔ اسی طرح اردو تفاسیر میں مولانا عمار علی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۲۸ء--۱۹۷۵ء) کی تفسیر ''عمدۃ البیان'' (۳ جلدیں) ایک متوسط حجم کی تفسیر شمار کی جاتی ہے ۔ تقسیم ہند کے بعد مولانا امداد حسین کاظمیؒ (۱۹۰۱ء--۱۹۷۵ء) کا ترجمہ و حاشیہ تفسیر متقین ہماری نظر میں فرمان علیؒ اور مقبول احمدؒ کے تراجم وحواشی پر بوجوہ فوقیت رکھتا ہے۔ اردو تفاسیر میں اس کے بعد علامہ حسین بخش جاڑا صاحب کی تفسیر ''انوار النجف'' تفسیر کے شائقین کا مرکز رہی، اسی طرح علامہ ذیشان حیدر جوادیؒ کا ترجمہ و حاشیہ بھی اس بناء پر بنظر استحسان دیکھا جاتا ہے کہ ترجمہ انتہائی رواں اور حواشی عام قاری کے لئے سہل ہیں۔ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی (دام ظلہ الوارف) کی زیر نگرانی تیار ہونے والی ''تفسیر نمونہ'' کا ترجمہ انتہائی دیانت وعرق ریزی سے کیا گیا اور اس نے خاص حد تک ایک ایسی تفسیر کی کمی پوری کر دی جو طلباء، کالج و یونیورسٹی کے پروفیسروں اور علماء کے لئے ''حوالے'' کا کام دے اور وہ اس کے ذریعے اپنی ''قرآن فہمی'' میں اضافہ کر سکیں۔ فجزاء ہم اللہ أحسن الجزاء. جس دوران تفسیر نمونہ کی جلدیں طبع ہو کر آ رہی تھیں اُسی دوران سید العلماءؒ کی تفسیر ''فصل الخطاب'' پہلے سات جلدوں میں کشمیر سے چھپی، پھر ایک جلد ادارۂ ترویج علوم اسلامیہ سے اور بعد ازاں مصباح القرآن ٹرسٹ نے اس کا پورا سیٹ اچھے انداز میں طبع کیا۔

قرآن مجید کے طالب علم کی حیثیت سے عالم اسلام میں مختلف مکاتب فکر و فقہ کی تفاسیر شائع ہونے کے ساتھ زیر مطالعہ رہتی ہیں تو اپنے مکتب فکر کی اردو تفاسیر وحواشی بھی ہمیشہ زیر نظر رہتے ہیں جو اپنی قدر و قیمت میں کچھ کم نہیں جن میں سے بعض کا ذکر ماقبل ہم کر چکے۔

سید العلماءؒ کی تفسیر کی خاص بات جس نے ہمیں متاثر کیا وہ اس کا ''تفسیری ترجمہ'' ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سید العلماءؒ کی ساری محنت وژرف نگاہی آیات کے ترجمے میں مضمر ہے اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

سید العلماءؒ کسی بھی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے صرف عربی زبان، نحو و بلاغت، معانی و بدائع کو مدّنظر نہیں رکھتے بلکہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث اور اُن کو مدّنظر رکھ کر لکھی جانے والی تفاسیر مثلاً شیخ طوسیؒ کی التبیان، محسن فیض الکاشانی کی الصافی، تفسیر قمی علامہ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان وغیرہ میں پیش کئے گئے مطالب کو اردو ترجمے میں سمو دیتے ہیں اور تائیداً متعلقہ تفسیر کی متعلقہ عبارت کو مختصراً نقل کر دیتے ہیں۔ تفسیری مواد اس ترجمے ہی کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسی لئے ترجمے میں لفظ پر لفظ نہیں رکھا ہے

بلکہ اُسے اُردو محاورے کے مطابق ادا کیا ہے۔ نمونے کے طور پر بعض مقامات پیشِ خدمت ہیں:

(۱) سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۱۹ کے ایک جزء:

وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ

اس کا ترجمہ سید العلماءؒ نے یہ کیا ہے : اور جب تخلیہ ہوتا ہے تو تمہارے خلاف غیظ وغضب سے اپنی بوٹیاں کاٹتے ہیں۔

اس کے بعد حاشیے میں پہلے مولانا فرمان علیؒ کا ترجمہ دیا ہے ''تم پر غصے کے مارے انگلیاں کاٹتے ہیں''۔ پھر ان ہی کا حاشیہ نقل کیا ہے: اس ''الانامل'' کے اصلی معنی پوروں کے ہیں مگر چونکہ اردو محاورہ میں پوروں کا کاٹنا نہیں بولتے ہیں اس وجہ سے یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

بعد ازاں سید العلماءؒ وضاحت کرتے ہیں: مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو میں تو انگلیاں کاٹنا بھی محاورہ نہیں ہے، اس لئے ہم نے ترجمہ بوٹیاں کاٹنے کے ساتھ کیا ہے'' (فصل الخطاب، ج ۳، ص ۳۷)

علامہ جوادیؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب اکیلے ہوتے ہیں تو غصّے سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ تفسیر نمونہ کے اردو ترجمے میں ہے: جب وہ تنہائی میں ہوتے ہیں تو شدید غیظ وغضب سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگ جاتے ہیں۔ (ج ۳ ص ۶۴) سید العلماء کا ترجمہ عربی سے قریب اور اردو محاورے کے مطابق ہے۔

(۲) سورۂ آلِ عمران ہی کی آیت ۱۵۴ کے پہلے جزء میں فرمایا:

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ ...

علامہ جوادیؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: ''اس کے بعد خدا نے ایک گروہ پر پُرسکون نیند طاری کر دی اور ایک کو نیند بھی نہ آئی کہ اسے صرف اپنی جان کی فکر تھی''

اس ترجمے میں ایک تو ''غم'' کا ذکر نہیں ہے، دوسرے تا کہ ''اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ'' میں جو عمومیت ہے وہ مفقود ہے۔ تیسرے قرآن مجید کے الفاظ ''وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ...'' کا ترجمہ مبہم ہے ''اور ایک کو----'' یہاں مفرد کا گمان ہوتا ہے اگر ''گروہ'' کا اضافہ ہوتا اور ''ایک'' کی بجائے ''دوسرے'' ہوتا تو قرآنی الفاظ کی رعایت بھی ہوتی اور مطلب واضح ہوتا۔

سید العلماءؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: پھر اُس نے رنج وغم کے بعد تم پر سکون واطمینان اُتارا نیند کی صورت سے جو تم

میں سے ایک گروہ پر طاری ہو رہی تھی اور ایک گروہ ایسا تھا جسے اپنی جانوں کی فکر تھی۔ (ج ۳ ص ۷۴)

اس کی تائید میں انہوں نے علامہ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

(۳) سورۂ نساء کی آیت ۹۱ کا ایک جزء ہے:

كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا.

علامہ جوادیؒ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: یہ جب بھی فتنے کی طرف بلائے جاتے ہیں اُلٹے اس میں اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔

الفاظِ قرآن میں ''بلائے جاتے ہیں'' کسی لفظ کا ترجمہ نہیں ہے۔

شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب کبھی لوٹائے جاتے ہیں وہ فساد کی طرف تو اس کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

''اُرْكِسُوْا فِيْهَا'' کے بنیادی معنی: ''یعنی وقعوا فیہا'' (التبیان للطوسیؒ) یعنی ''پڑ جانا'' واقع ہو جانا اس کو تائیداً نقل کر کے سید العلماءؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: اور جب فتنہ پردازی کا دوبارہ موقع ملے تو وہ اس میں بالکل جُٹ جائیں گے۔ (فصل الخطاب ج ۳ ص ۲۶۹) ''جُٹ جانا'' اُردو محاورہ ہے جس میں تن دہی سے کسی کام میں دلچسپی سے لگے رہنے کا مفہوم ہے اور یہی ''اُرْكِسُوا فِيْهَا'' کا درست ترجمہ ہے۔

ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

درج بالا سطور سے سید العلماءؒ کی تفسیر فصل الخطاب کی چند خصوصیات مستفاد ہوتی ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ الفاظِ قرآنی کی بالالتزام رعایت

۲۔ لفظی ترجمے کی بجائے محاوراتی ترجمہ اور لکھنوی اردو محاورے کی مطابقت

۳۔ ترجمے میں عقلی و منطقی اظہار اور ربط کا لحاظ

۴۔ طوالت سے گریز

۵۔ مستند تفاسیر کے طویل اقتباسات سے گریز

۶۔ تفاسیر کے مختصر اقتباسات سے استشہاد

۷۔ احادیث کے طویل مندرجات کی بجائے محض متعلقہ حصّے کا اقتباس و اشارہ

۸۔ تاریخی واقعات کی طرف اشارہ اور تفصیل سے اجتناب

۹۔ تفسیر میں نہ اتنی طوالت کہ قاری پر بار ہو جائے اور نہ ایسا اطناب کہ وہ حاشئے میں شمار ہو۔

۱۰۔ وہ مضامین جن کی ادائیگی عوام میں خلافِ ادب سمجھی جاتی ہے اُس کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال جن سے وہ دائرۂ ادب وستر سے باہر بھی نہ نکلیں اور مطلب بھی ادا ہو جائے۔ مثلاً سورۂ نساء کی آیت ۶ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

''بلوغ کا تعلق تو عمر کے ساتھ ہے جو لڑکے میں ۱۵ برس اور لڑکی میں ۹ برس ہے یا خاص کیفیات جو علامت بلوغ کی حیثیت سے معتبر ہیں''۔ (ج ۳، ص: ۱۴۴)

۱۱۔ فقہی آیاتِ احکام کی وضاحت میں فقہی مسائل کو اپنی پوری فقہی مہارت سے بیان فرمایا ہے مگر اس کو بہت قابلِ فہم انداز میں تحریر فرمایا تا کہ مسائل سمجھ میں آسکیں۔ مثلاً سورۂ نساء کی آیات اِرث۔

قابل مبارک باد ہیں مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور کے مسئولین و منتظمین جو قرآنِ مجید کی خدمت کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ علومِ اہل بیت علیہم السلام کو بھی نشر کر رہے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ اِن سے فرمان خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: قرآن و اہل بیتؑ جب تک اِن سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے'' پر عمل بھی کروا رہا ہے اور ثقلین کی خدمت بھی۔

ایں سعادت بہ زور بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے مساعی کو قبول فرمائے اور انہیں ''ثقلین'' کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

خادم الثقلین

ڈاکٹر محسن نقوی

۲۶ مارچ ۲۰۱۱ء کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے

* * * * * * * * * * * * * * * * * *

فہرست کتاب

عنوان	صفحہ نمبر
سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ	21
سورہ انعام کے خاص موضوعات	22
انبیاء اور تمام معصومین واقعی بشر ہوتے ہیں، نہ کہ فقط بصورت بشر	26
رئیسوں کے ذہنیت کے مقابلہ میں غریبوں کی دل جوئی	43
خالق کے علم کی ہمہ گیری	46
جناب ابراہیم علیہ السلام کے والد کون؟ آذر یا تارخ؟	52
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا توحید پر استدلال اجرام سماویہ کی الوہیت کی نفی اور الٰہ الحق کا اثبات	54
قمری حساب کا اعتبار	61
نفی رویت	63
رواداری کی تعلیم اور معبودان باطل کے سبّ وشتم سے ممانعت	66
عدل الٰہی	69
اکثریت معیار حق نہیں	70
رسالت بر بنائے بلندی اوصاف	73
تکلیف بلا بیان قبیح ہے	76
مشرکین کی تاریک ذہنیت اور افسوس ناک بدعت	81
اولاد کشی کی مذمّت	81
مشرکین کے بدعات اور ان کی مذمت	87
اپنی بداعمالیوں کی ذمہ داری تقدیر پر رکھنا غلط ہے	89
کچھ اہم محرّمات شرع کی فہرست	91
فرقہ بندی کی مذمت	94
کافر وگناہ گار کا وجود انسان کے فاعل مختار ہونے کا ثبوت ہے	95
اپنی بداعمالیوں کی ذمہ داری تقدیر پر رکھنا غلط ہے	95

عنوان	صفحہ نمبر
انسانی زندگی کی رفعت اور اس کی غرض وغایت	96
سُوْرَۃُ الْاَعْرَافِ	97
سورۂ اعراف کے خاص خاص مضامین	97
اعمال کا وزن	101
جناب آدم وحوا علیہما السلام سے ابلیس کی وسوسہ انگیز گفتگو	106
لباس بہشت کا جناب آدم اور حوا علیہما السلام کے جسم سے جدا ہونا	106
اچھے لباس اور اچھی غذا سے پرہیز ضروری نہیں	108
شراب کی حرمت	112
کافروں کا بہشت میں جانا غیر ممکن	116
بہشت میں قلبی کدورتیں دور ہوجائیں گی مگر کون سی؟	116
اہل بہشت اور اہل دوزخ کی دلچسپ اور عبرت انگیز گفتگو	118
اعراف کا ذکر	119
فساد پھیلانے سے ممانعت	124
پاکیزہ اور ناپاک زمینوں کا تذکرہ	125
جناب نوح علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی قوم کا رویہ	126
جناب ہود علیہ السلام کی تعلیم، ان کی قوم کا رویہ اور آخری انجام	127
جناب صالح علیہ السلام کی تعلیم، ان کی قوم کا رویہ اور آخری انجام	130
جناب لوط علیہ السلام کی تعلیم، قوم لوط کی بدکاری اور اس کا انجام	131
جناب شعیب علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی قوم کا رویہ	132
قوم شعیب کا رویہ اور انجام	134
حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تفصیلی تذکرہ، اور فرعون کا انجام	140
بنی اسرائیل کی دل شکن باتیں	146
تیس راتوں کا وعدہ اور مزید دس کا اضافہ۔ بداء کا کھلا ہوا نمونہ	150

عنوان	صفحہ نمبر
دیدارِ خدا کا سوال اور اس کا انجام	152
گوسالہ پرستی	156
جناب موسیٰ علیہ السلام کا جناب ہارون علیہ السلام پر بظاہر عتاب	157
''النبی'' اس کے اوصاف اور توریت وانجیل میں اس کا تذکرہ	162
رسالت محمدی کی ہمہ گیری	163
اسباط بنی اسرائیل کی تعداد	164
اہل سبت کا ذرا تفصیلی تذکرہ	165
اہل سبت کا عذاب الٰہی سے مسخ ہوجانا	167
عہد اَلَست اور عالم ذر	170
ایک عالم بے عمل کا حال	174
قیامت کے وقت کا علم کسی کو نہیں	179
قرآن کی تلاوت کے وقت خاموشی کا حکم	187
سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ	189
سورۂ انفال کے خاص خاص مضامین	189
انفال کے متعلق حکم خداوندی	190
جنگ بدر کا پس منظر	192
فرشتوں کا جنگ بدر میں اترنا ہی نہیں بلکہ جنگ کرنا	195
میدان جنگ سے فرار کا باعث دوزخی ہونا	196
گمراہ اور پست کردار انسان جانوروں سے بدتر	198
سرزمین مکہ میں مہاجروں کا عالم پریشانی	200
حفاظت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خداوند عالم کی تدبیریں	202
وجودِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مانع نزولِ عذاب	204
بموقع حج مشرکین کے لغویات	205
خمس کا صریح حکم	208
جنگ بدر کے کچھ کیفیات	209
میدان جنگ میں برقرار رہنے کی تاکید	212
تنازع باہمی کے خراب نتائج	212
خدا کی نعمتوں میں تبدیلی خود اپنے نفوس کی تبدیلی کا نتیجہ	215

عنوان	صفحہ نمبر
جہاد کی تیاری اور رباط کا حکم	218
مخالفین کے ساتھ صلح کا حکم	219
بندگان الٰہی کے مددگار ہونے کا ثبوت	220
وہابیت شکن قرآنی صراحت	221
ایک اور دس کے مقابلہ کا حکم	221
مسلمانوں میں کمزوری کا ثبوت	222
قیدیوں کے بارے میں الٰہی منشا کا اعلان	223
سُوْرَةُ الْبَرَآءَةِ	228
سورۂ براءت کے خاص خاص مضامین	229
اس سورہ کے آغاز کی خصوصیت	230
مشرکین سے معاہدۂ سابق کی منسوخی اور ان سے قطعی تبرا یعنی ترک موالات کا اعلان	231
پناہ کے طلبگار مشرکوں کو پناہ دینے اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری کا حکم	233
مساجد الٰہی کا احترام اور کافروں کے داخلہ کی ممانعت	236
جنگِ حنین کا تذکرہ اور باوجود کثرت تعداد مسلمانوں میں ابتری اور انتشار	239
آخر میں دین اسلام کے غالب آنے کا اعلان	244
اکتناز کی مذمت اور اس کی سزا	244
مہینوں کی تعداد بارہ اور چار محترم جن میں جنگ وجدل حرام ہے	245
نسیٔ یعنی مہینوں کی تبدیلی کی شدید مذمت	246
شب ہجرت کا مختصر حال	248
جہاد کے موقع پر مسلمانوں کی پست ہمتی اور کمزوری کے نمونے	253
مستحقین زکوٰۃ کا بیان	257
کفار کے ساتھ ساتھ منافقین سے بھی جہاد کا حکم	263
کھلے ہوئے منافقین کی نمازِ جنازہ سے ممانعت	268
صحرائی عربوں کی مذمّت	272
اسلام میں سبقت رکھنے والوں کی تعریف	273
مسجد ضرار کا ذکر	276
مشرکین کے لئے استغفار کی ممانعت	278

عنوان	صفحہ نمبر
جناب ابراہیمؑ کے استغفار کا پس منظر	279
تکلیف بلا بیاں کا صحیح نہ ہونا	280
صادقین کے ساتھ رہنے کا حکم	282
تحصیل علم دین کے لئے سفر کا حکم وجوب کفائی	283
اوصاف پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	287
سُوْرَۃُ یُوْنُسَ	288
سورۂ یونس، خاص مضامین	288
اسلام میں ماہ وسال کے قمری حساب کا اعتبار	291
اہل بہشت کا سلام۔ سلامٌ علیکم	292
قبل بعثت رسول کی خاموشی سے آپ کے پیغام کے الٰہی ہونے کا ثبوت	295
قرآنی رواداری کی نمایاں مثال	295
حجیت ظن کی بحث میں ارشاد الٰہی اور اس کا انعقاد	303
بغیر ثبوت شرعی کسی چیز کو حرام سمجھنا اللہ پر بہتان ہے اور کفران نعمت بھی ہے	310
نظام حکمت الٰہی جبر کا متقاضی نہیں	322
سُوْرَۃُ ھُوْدٍ	324
سورۂ ہود کے خاص خاص موضوعات	324
دس سوروں کا جواب لانے کا مطالبہ	329
ذکر رسالت مآبؐ وولایت مآبؑ	331
طوفان نوح علیہ السلام کی غرقابی اور اس کا پس منظر	338
طوفان نوح کی غرقابی اور اس کا پس منظر	340
کوہ جودی	340
عمل صالح کے بغیر کسی پیغمبر کی فرزندی بھی کارگر نہیں	341
قبیلۂ عاد اور جناب ہود علیہ السلام کا حال	343
قبیلۂ ثمود اور جناب صالح علیہ السلام کا حال	346
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ولادت اسحاق علیہ السلام کی خوش خبری	348
قوم لوط پر نزول عذاب	351
جناب شعیبؑ اور ان کی قوم کا حال	352

عنوان	صفحہ نمبر
اوقات نماز میں صبح، ظہرین اور مغربین، تین وقتوں کا تذکرہ	359
سُوْرَۃُ یُوْسُفَ	363
سورۂ یوسف کے خاص خاص موضوعات	363
جناب یوسف علیہ السلام کا خواب اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے گفتگو	365
برادران یوسفؑ کا منصوبہ اور یوسفؑ کے ساتھ بدسلوکیاں	365
تذکرہ عزیز مصر وزلیخا	369
واقعۂ یوسفؑ وزلیخا	370
چاک دامانی دلیل پاک دامانی	373
جناب یوسفؑ قید خانہ میں	375
بادشاہ مصر کا خواب اور یوسفؑ کی رہائی کا سامان	379
رہائی سے مقدم بے گناہی کا ثبوت	381
حضرت یوسف علیہ السلام کرسی اقتدار پر	383
بھائیوں کی پہلی دفعہ حاضری اور جناب یوسف علیہ السلام کی فرمائش	384
بھائیوں کی دوسری دفعہ حاضری اور یوسفؑ کی اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس رکھ لینے کے لئے ترکیب	388
جناب یعقوب علیہ السلام کو اس کی اطلاع اور ان کا تاثر	391
جناب یعقوبؑ کا گریہ اور روتے روتے زوالِ بصارت	392
بھائیوں کی تیسری دفعہ حاضری، تعارف اور ان کی توبہ وانابت	393
جناب یوسف علیہ السلام کی خوشبو اور پیرہن کا جناب یعقوب علیہ السلام تک پہنچنا اور بینائی کا پلٹنا	395
بچپن کے خواب کی تعبیر ظاہر ہونا اور سب کا یوسفؑ کے سامنے سربسجود ہونا	396
سُوْرَۃُ الرَّعْدِ	401
سورۂ رعد کے خاص خاص مضامین	401
کسی قوم میں تبدیلی نہیں ہوتی بغیر اپنے نفوس کی تبدیلی کے	405
کائنات کی ہر شے بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز	407
بقائے اصلح	408
بُرائی کا مقابلہ بھلائی سے (عدم تشدّد)	410
یاد خدا سبب اطمینانِ دل	411

عنوان	صفحہ نمبر
معجزہ کا حکم الٰہی پر انحصار	414
محو واثبات بداء	415
رسولؑ کی حقانیت کے دو گواہ، کتاب اور عالم کتاب	418
سُوْرَةُ اِبْرَاهِيْمَ	418
سورۂ ابراہیم کے خاص خاص مضامین	419
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت کے لئے واقف زباں ہونے کی ضرورت	420
ایام الٰہی اور اوران کی یاد کی اہمیت	421
کفر کے ساتھ اعمال خیر رائگاں	424
اچھے اور بُرے کلموں کی مثال	426
حضرت ابراہیمؑ کی مناجات	430
حضرت ابراہیمؑ کی اواخر عمر میں اپنے والدین کیلئے دعائے مغفرت	431
قیامت میں آسمان وزمین کی تبدیلی	434
سُوْرَةُ الْحِجْرِ	434
سورۂ حجر کے خاص خاص مضامین	434
قرآن کی حفاظت کا قطعی وعدہ	437
فرشتوں کو سجدۂ آدمؑ کا حکم اور شیطان کی سرتابی	441
قیامت تک سلسلۂ معصومین علیہم السلام کی بقاء کی ضمانت	442
دوزخ کے سات دروازے	443
اہل بہشت کے دلوں سے کینہ وعداوت کا دور ہونا	443
فرشتوں کا حضرت ابراہیمؑ کے یہاں آنا اور ولادت اسحٰقؑ کی بشارت	445
قوم لوطؑ پر عذاب کے لئے اُنہی فرشتوں کا جانا	446
اصحاب ایکہ کا معذّب ہونا	447
اصحاب حجر کا تذکرہ	448
سبعہ مثانی اور قرآن	449
اعلانیہ تبلیغ کلام کا ابتدائی حکم	451
رسولؐ کے ساتھ تمسخر کرنے والوں کا انجام	451
سُوْرَةُ النَّحْلِ	452
سورۂ نحل کے خاص خاص مضامین	452

عنوان	صفحہ نمبر
اپنے گناہوں کے ساتھ ان کے گناہوں کا بوجھ جنہیں گمراہ کیا ہے	458
ملائکہ اور اہل بہشت کے الفاظ سلام	460
ہر قوم میں پیغمبروں کا بھیجا جانا اور سب کے پیغام کا متّحد ہونا	461
اہل ذکر سے سوال کا حکم	463
آسمان اور زمین کی ہر شے اللہ کے لئے سربسجود	465
لڑکیوں کی ولادت پر رنجیدہ ہونا اہل جاہلیّت کا طریقہ	466
شہد کی مکھی کا ذکر	469
خود اختیاری اشتراکیت کی دعوت	470
ہر امّت کا ایک گواہ اور ہمارے رسولؐ ان گواہوں کے گواہ	476
وہ آیت جو تمام اچھائیوں اور برائیوں کے احکام پر حاوی ہے	477
نیک اعمال دنیا اور آخرت کی بہتری کے ذمّہ دار	480
تلاوت قرآن کے موقع پر اعوذ باللہ کہنے کا حکم	481
ضرورت کے وقت تقیّہ کا صریحی حکم	483
حضرت ابراہیمؑ ایک عبادت گزار اُمت، اتباع ملّتِ ابراہیمؑ کا حکم	487
دعوت وتبلیغ کے لئے حکیمانہ انداز کی ہدایت، ضبط وتحمّل اور رواداری سے کام لینے کی خصوصی تاکید	489
سُوْرَةُ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ	491
سورۂ بنی اسرائیل کے خاص خاص مضامین	491
معراج پیغمبر اسلامؐ	492
بنی اسرائیل کی دو مرتبہ خراب کاری اور اس کی پاداش	495
نامۂ اعمال	497
ہلاکت اقوام کا عام نظام	498
حقوق والدین	501
فضول خرچی کی مذمّت	503
خرچ میں میانہ روی کی ضرورت	504
قانون قصاص	506
ناپ تول میں انصاف کا حکم	507
منکرین معاد کی رد	512

عنوان	صفحہ نمبر
مخالفین حق سے روادارانہ گفتگو کی تعلیم	513
شجرۂ ملعونہ	515
ہر دور کے لئے ایک امام کا وجود	520
اوقاتِ نماز	523
تمام انس وجن مل کر بھی قرآن کا جواب نہیں لا سکتے	529
پیغمبروں کی بشریّت	531
جناب موسیٰؑ کے معجزات	534
گریہ کی تعریف	536
جہر واخفاء کے درمیان نماز ادا کرنے کا حکم	537
سُوْرَۃُ الْکَھْفِ	538
سورۂ کہف کے خاص خاص مضامین	538
واقعۂ اصحاب کہف کا آغاز	540
اصحاب کہف کا غار میں داخل ہونا اور اس کا پس منظر	541
غار میں ان کے محلّ قیام کی خاص خصوصیّت	543
سگ اصحاب کہف کا ذکر	544
صدیوں کی نیند کے بعد ان کی بیداری	545
لوگوں کا ان کے محلّ قیام پر مطلع اور باہمی اختلاف کے بعد وہاں مسجد بنانے کا فیصلہ	546
تعداد میں اختلاف اور حقیقت کی طرف اشارہ	546
انشاءاللہ کہنے کا حکم	547
ایک مالدار اور ایک غریب دو ۲ ساتھیوں کی پیہم گفتگو	551
مال اور اولاد زندگی کی رونق لیکن مآل کی اُمید اعمال سے	553
شیطان کا جنّات میں سے ہونا اور اس کے لئے نسل کا وجود	555
حضرت موسیٰؑ کا سفر اور اس کی درمیانی روئداد	560
حضرت موسیٰؑ کا سفر اور اس کی درمیانی روئداد	561
حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کی ابتدائی گفتگو	562
آغاز سفر اور خضرؑ کا کشتی میں سوراخ کرنا اور پھر ایک لڑکے کو قتل کر دینا	563

عنوان	صفحہ نمبر
جنہوں نے کھانا کھلانے سے انکار کیا ان کے یہاں کی دیوار کی بلا معاوضہ تعمیر	564
جناب خضر علیہ السلام کی طرف سے حقیقتوں کا اظہار	565
قصۂ ذوالقرنین کی ابتداء	566
یاجوج وماجوج کا ذکر	570
کلمات الٰہی کی وسعت بے نہایت	573
حضرت محمدؐ کا مقام بشریت	574
سُوْرَۃُ مَرْیَمِ	574
سورۂ مریم کے خاص خاص مضامین	574
جناب زکریا علیہ السلام کی دعا اور میراث انبیاء کا ثبوت	575
ولادت جناب یحییٰ علیہ السلام کی بشارت	577
جناب یحییٰ علیہ السلام کے اوصاف	578
تذکرہ جناب مریمؑ اور ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی حال	580
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابن اللہ ہونے کی رد	582
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ اور اپنے منہ بولے باپ سے گفتگو	584
جناب موسیٰ وہارون علیہما السلام کا ذکر	587
جناب اسماعیل علیہ السلام صادق الوعد کا تذکرہ	587
جناب ادریس علیہ السلام اور ان کی رفعت جسمانی	588
باغہائے بہشت کی اوصاف	589
اثبات معاد	592
دوزخ کی طرف سے عمومی گزر	592
ثبوت شفاعت	595
خالق کے لئے تصور اولاد کے جرم کی اہمیت	596
ایک خاص جماعت کی محبت کے فرض قرار دیئے جانے کا پیشگی اعلان	596
سُوْرَۃُ طٰہٰ	598
سورۂ طٰہٰ کے خاص مضامین	598
جناب موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کا تفصیلی بیان ---آگ لینے کو جانا اور پیغمبری پانا	601

عنوان	صفحہ نمبر
عصا اور ید بیضاء	602
جناب موسیٰ علیہ السلام کی مناجات اور ہارون کو اپنا وزیر اور شریک کار بنانے کی التجا	602
جناب موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعات اور مدین جانا اور مراجعت	604
فرعون سے گفتگو میں نرمی اور رواداری برتنے کا حکم	605
جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی گفتگو	606
ساحروں کے مقابلہ کا اہتمام	607
معجزہ کا عقلی معیار	608
ساحروں کی فرعون سے گفتگو	609
فرعون اور اس کی فوج کا غرق دریا ہونا	611
سامری کی گوسالہ سازی اور اس کا انجام	612
ثبوت شفاعت	615
جناب آدم علیہ السلام کا ترک اولیٰ	617
اوقات نماز کی طرف اشارہ	620
سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآءِ	623
سورۂ انبیاء کے خاص مضامین	623
اہل ذکر سے سوال کا حکم	626
افعال الٰہی عبث نہیں، حق و باطل کے تصادم کا عام انجام	627
فرشتوں کے اوصاف	628
توحید کی مشہور دلیل اور ”برہان تمانع“	628
توحید الٰہی تمام پیغمبروں کا متفقہ پیغام	630
معصومین علیہم السلام کی توصیف	631
ہر ذی حیات کی خلقت یا بقاء پانی سے، آسمانوں کے ٹھوس جسم نہ ہونے کی طرف اشارہ	632
ہر متنفس کے لئے موت کا مزہ چکھنا ضروری ہے	633
قیامت میں میزان اعمال	636
حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی اور اس کے پہلے اور بعد قوم سے گفتگو	637
خلیل خدا کا آگ میں پھینکا جانا اور آگ کا سرد ہو جانا	640

عنوان	صفحہ نمبر
زراعت سے متعلق جناب داؤد و سلیمان علیہما السلام کا فیصلہ	641
جناب داؤد علیہ السلام کی زرہ سازی	642
جناب سلیمان علیہ السلام کا دوش ہوا پر پرواز کرنا	643
جناب ایوب علیہ السلام کا امتحان اور ان کا صبر	643
حضرت یونس علیہ السلام کی شکم ماہی کے اندر تسبیح	645
جناب زکریا علیہ السلام کی دعا اور اس کی قبولیت	645
یاجوج اور ماجوج کا ذکر	647
انجام کار میں نیکوکاروں کا مکمل اقتدار	650
خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رحمۃ اللعالمین ہونا	651
سُوْرَةُ الْحَجِّ	654
سورۂ حج کے خاص مضامین	654
قیامت کا زلزلہ	655
ادوارِ انسانی کی تبدیلیوں سے حیات بعد الموت کے امکان پر روشنی	656
اختلافِ عقائد کا اصل فیصلہ قیامت میں	660
کائنات کی ہر شے اللہ کے لئے سربسجود	661
کعبہ پر سب کا برابر سے حق	663
سب سے پہلے ندائے حج اور اس کی تاثیر کے لئے اللہ کی ضمانت	664
اللہ کی حرمتوں کی عزت	665
شعائرِ الٰہیہ کی تعظیم کا حکم	666
حیوانات قربانی مجملہ شعائر اللہ	667
اصل چیز قربانی کی ظاہری شکل نہیں بلکہ اصل خوشنودیِ خدا کی فکر	668
دفاعی جنگ کی اجازت اور اس کی بین الاقوامی طور پر ضرورت	669
اللہ کے یہاں کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر	671
پیغمبروں کی تمناؤں میں شیطان کی دراندازی	673
مختلف طریقے عبادت کے اللہ کی طرف سے آتے رہے نہ کہ مختلف معبود	679
مکھی کی مثال سے انسان کی عاجزی کا ثبوت	681
انبیاء کا انتخاب نوع انسان سے نہ کسی دوسری نوع سے	682
دین میں عسر و حرج کی نفی اور مسلم“ نام کی ابتداء	683

عنوان	صفحہ نمبر
سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْنَ	684
سورۂ مومن کے خاص خاص موضوعات	684
نجات کے حق دار اور اہل ایمان کے اوصاف	685
خلق انسانی پر خالق کی نوازش	687
کشتیٔ نوح	690
حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور جنابِ مریم سلام اللہ علیہا قدرت خدا کی ایک نشانی	693
حق انسانی آراء اور خواہشات کا تابع نہیں ہوسکتا	697
اثباتِ توحید میں برہانِ تمانع کی زیادہ واضح تقریر	701
برائی کے مقابلہ میں بھلائی کرنے کی تعلیم	703
سُوْرَۃُ النُّوْرِ	706
سورۂ نور کے خاص خاص مضامین	707
جنسی گناہ (زنا) کی حدِ شرعی	708
ثبوتِ زنا کے لئے چار عینی گواہوں کی ضرورت، عدم ثبوت پر الزام لگانے والوں پر حد شرعی کا اجراء	709
لعان کی صورت اور اُس کی ترکیب	710
واقعہ ''افک'' اور اس قسم کی تہمت لگانے والوں کی مذمّت	711
ایسی خبر کو سُن کر اس کا چرچا کرنے والوں کی سرزنش	712
گھروں میں بلا اجازت داخل ہونے کی ممانعت اور اسلام کا حکم	718
اجنبی مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے پر نظر ڈالنے کی ممانعت	719
خواتین کے پردہ کا حکم اور اس کی اہمیت	720
نکاح کی ترغیب	721
غلام و کنیز کے مکاتبہ کا حکم	722
آیۂ نور	724
عبادت الٰہی کے اوقات کا لحاظ رکھنے کے ساتھ تجارت کی تعریف	725
کافروں کے اعمال خیر و خیرات کا بے کار ہونا	726
ہر جاندار کی خلقت پانی سے	728
صاحبِ ایمان صالحین سے مکمل اقتدار کا وعدہ	732
گھر کے خاص افراد یہاں تک کہ بچوں سے بھی ایک حد تک پردہ	734

عنوان	صفحہ نمبر
ضعیف العمر عورتوں کے لئے برقع چھوڑنے کی اجازت کے باوجود پردہ داری کی تاکید	735
صاحبان ایمان کی شان	737
رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے امتیازی طور پر تعظیم و احترام کا حکم	738
سُوْرَۃُ الْفُرْقَانِ	738
سورۂ فرقان کے خاص خاص مضامین	739
تعلیماتِ پیغمبر خدا اور قرآن کے لئے مشرکین کی پریشان خیالیاں	740
آتش دوزخ کی کیفیت کا تفصیلی بیان	742
فرشتوں کا عام لوگوں کے سامنے آنا قیامت سے وابستہ	745
وہ فلاں شخص جو قیامت تک گمراہی کا ذمہ دار ہے	746
پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہِ الٰہی میں شکایت	747
قرآن مجید کے بتدریج اتارے جانے کی حکمت	748
پست کردار انسانوں کا جانوروں سے بدتر ہونا	752
پانی کا ذریعہ طہارت ہونا	753
میٹھے اور کھارے پانی کے سنگم میں قدرتِ الٰہی کا ظہور	755
نسبتی رشتہ کے ساتھ ازدواجی رشتہ بھی تقاضائے فطرت	755
اجرِ رسالت جو طلب ہو اللہ کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہے	756
اللہ کے بندوں کی شان	759

****

تفسیر فصل الخطاب

جلد دوم

سورہ	صفحہ نمبر
سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ	23
سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ	191
سُوْرَةُ يُوْنُسَ	288
سُوْرَةُ يُوْسُفَ	363
سُوْرَةُ اِبْرَاهِيْمَ	418
سُوْرَةُ النَّحْلِ	452
سُوْرَةُ الْكَهْفِ	538
سُوْرَةُ طٰهٰ	598
سُوْرَةُ الْحَجِّ	654
سُوْرَةُ النُّوْرِ	706

سورہ	صفحہ نمبر
سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ	99
سُوْرَةُ الْبَرَآءَةِ	230
سُوْرَةُ هُوْدٍ	324
سُوْرَةُ الرَّعْدِ	401
سُوْرَةُ الْحِجْرِ	434
سُوْرَةُ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ	491
سُوْرَةُ مَرْيَمَ	574
سُوْرَةُ الْاَنْبِيَآءِ	623
سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ	684
سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ	738

سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ

مکیّہ.....۱۶۵.....آیات

''انعام'' کے معنی چوپایہ جانوروں ہی کے ہیں چونکہ اس سورہ میں حلال وحرام جانوروں کا نمایاں طور پر ذکر ہے، اس لئے اس سورہ کا یہ نام ہوا۔

اس سورہ کو عام طور پر مکیّہ یعنی مکۂ معظّمہ کا انزال شدہ قرار دیا گیا ہے، حالانکہ زیادہ تر تصور یہ ہے کہ فروعِ دین یعنی احکام حلال وحرام کی آیتیں مدینہ پہنچنے کے بعد نازل ہوئی ہیں، اس کے لئے ایک قول یہ ہے کہ وہ پورا مکہ کا نازل شدہ ہے مگر چند خاص آیتیں اس کی مدینہ میں اتری ہیں۔[۱]

اس کے خلاف ایک حدیث میں ہے کہ سورۂ انعام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ پورا ایک ہی دفعہ میں اترا ہے۔[۲]

اس صورت میں اس کی آیتوں کو مکی اور مدنی کا مجموعہ اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے، جب یہ مانا جائے جو کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ ترتیب قرآن کے وقت اس میں کچھ آیتیں ایسی مل گئیں جو دراصل اس سورہ کا جزء نہ تھیں مگر یہاں یہ اس لئے قابل قبول نہیں معلوم ہوتا کہ نام ہی اس سورہ کا انعام انہی آیات کی بنا پر ہے جو حلال وحرام جانوروں کے احکام کو بتاتی ہیں لہٰذا یہ تصور زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کہ تمام فروعی احکام میں غذا کی حلّت وحرمت ایسا اہم امر ہے کہ تمام احکام شرعی میں سب سے پہلے یعنی مکہ معظّمہ ہی میں اس کے احکام نازل کر دیئے گئے۔

اور حقیقت میں بحیثیت کلیہ یہ تصور ہی کہ احکام شرعیہ کا اجراء یا شریعت کا نفاذ بس مدینہ کی ہجرت کے بعد ہوا ہے، بے بنیاد امر معلوم ہوتا ہے جب کہ عبادات میں نماز اور معاملات واحکام میں قواعد ازواج وغیرہ ایسے نظام زندگی کے ضروریات سے متعلق احکام یقیناً مکہ معظّمہ میں بھی جاری تھے اور لفظ ''شریعت'' بھی قرآن میں اسی دور میں اتر چکا ہے۔

جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ (سورۃ جاثیۃ)

ہم نے آپ کو دینی حیثیت سے ایک شریعت کا پابند بنایا ہے تو آپ اس کی پیروی کیجئے اور جاہلوں کے دل بخواہ خیالات پر عمل نہ کیجئے۔

یہ مکی سورہ ہے لہٰذا یہ سمجھنا کہ شریعت ہجرت مدینہ کے بعد آئی ہے، درست نہیں ہے۔

سورۂ انعام کے خاص خاص مضامین

۱-----خالق کے علم کی ہمہ گیری

---

[۱] ۔عن ابن عباس غیر ست اٰیات: وما قدروا اللہ حق قدرہ الیٰ اٰخر ثلث اٰیات: قل تعالوا اتل ما حرم ربکم الیٰ اٰخر ثلث اٰیٰت فانھن نزلن بالمدینۃ وفی روایۃ اُخریٰ عنہ غیر ثلث اٰیات: قل تعالوا اتل الی اخر الثلث (مجمع البیان)

[۲] ۔روی عن انس بن مالك انه قال قال رسول الله صلی الله علیه واله ما نزل علیٰ سورہ من القراٰن جملة غیر سورۃ الانعام وروی عن ابن ابی عبداللہ علیہ السلام انه قال ان الانعام نزلت جملة (تبیان)

۲-----حضرت ابراہیم علیہ السلام کا توحید پر استدلال

۳-----اجرامِ سماویہ کی الوہیت کی نفی اور اللہ حق کا اثبات

۴-----نفی رویت

۵-----رواداری کی تعلیم اور معبودانِ باطل کو سب وشتم سے ممانعت

۶-----عدلِ الٰہی

۷-----اولاد کشی کی مذمت

۸-----اموال ایتام کی حرمت

۹-----فرقہ بندی کی مذمت

۱۰-----انسانی زندگی کی رفعت اور اس کی غرض وغایت-----وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہونچانے والا بڑا مہربان ہے''

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۚ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ①

''سب تعریف اللہ کے لئے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور اجالے کو قرار دیا، پھر بھی وہ جو کافر ہیں، اپنے پروردگار کا برابر دار دوسروں کو قرار دیتے ہیں۔''

ظلمت کو بطور جمع ظلمات اور نور کو بصیغۂ مفرد لایا گیا ہے، یہ ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ دنیا میں باطل زیادہ اور حق کم ہے [1] پھر آسمان اور زمین کے لئے خلق اور ظلمات ونور کے لئے جَعَل کا لفظ صرف کیا گیا ہے۔ اس میں اگرچہ صرف تفنن فی التعبیر بھی ہوسکتا ہے جو شانِ فصاحت کے منافی نہیں ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ دونوں میں یہ فرق سمجھا جائے کہ آسمان اور زمین تو بلا شبہ دونوں وجودی چیزیں ہیں لہٰذا خلق بمعنی عطائے وجود دونوں سے یکساں طور پر متعلق ہے لیکن نور اور ظلمت میں نور وجودی چیز ہے اور ظلمت عدمی چیز ہے۔ اس لئے جَعَل کا لفظ صرف کیا گیا ہے یعنی ایسا نظام مقرر کیا ہے جس کے ماتحت کبھی روشنی ہوتی ہے اور کبھی تاریکی۔ اس سے ظلمت کا مستقل طور پر متعلق ایجاد وتخلیق ہونا لازم نہیں آتا۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ②

''وہ وہ ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر ایک مدت طے کی اور ایک اور مقررہ مدت ہے، اس کے یہاں، پھر

---

[1] ۔ جمعها دونه لكثرة اسبابها (جلالین) راہ صحیح ایک ہے اور اس کے سوا سب راہ غلط ہیں وہ بہت ہیں (موضح القرآن)

بھی تم شک کرتے ہو۔'' ''مٹی سے پیدا کیا۔''

یہ آغاز نسل انسانی کا ذکر ہے جب ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے [1] اور اکثر جگہ جو کہا گیا ہے کہ پانی سے پیدا کیا، وہ ہر ہر آدمی کے لحاظ سے ہے جبکہ سلسلہ نسل انسانی کا آگے بڑھ چکا ہے چنانچہ اس آیت میں کہ: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ان دونوں باتوں کو جمع کر دیا گیا ہے یعنی کہا گیا ہے کہ ''ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا..... پھر (یہ نظام مقرر کیا کہ) اسے نطفہ کی صورت میں ایک محل خاص (شکم مادر) میں رکھا''۔ (سورۂ مومنون)

''ایک مدت مقرر کی''..... یہ ہر آدمی کی عمر ہے جس کے بعد دنیا سے اٹھا لیا جائے گا اور ''ایک اور مقررہ مدت'' یہ تمام نوع انسانی کے دورِ بقاء کی مدت ہے جس کے بعد قیامت آئے گی۔ [2]

پہلی عمر اور اس کا انجام ہر شخص کے مشاہدہ میں ہے۔ اس سے دوسری مدت اور اس کے انجام کا بھی یقین کرنا چاہیے مگر انسان اس غیب کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور اس میں شک کرتا ہے اسی پر سرزنش کی گئی ہے کہ:

ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ'' پھر بھی تم شک کرتے ہو۔''

ایک دوسری تفسیر ہمارے یہاں کی یہ ہے جس کے متعلق معصومؑ سے بھی روایت وارد ہوئی ہے کہ پہلی مدت جسے کہا گیا ہے کہ قَضٰٓى اَجَلًا ''اس نے ایک مدت طے کر دی ہے'' یہ فیصلہ شدہ مدت وہ لوح محفوظ والی ہے جس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں اور بعد میں جو کہا گیا ہے: وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ''اور ایک نامزد مدت اس کے یہاں ہے'' یہ ''لوح محو و اثبات'' والی مدت ہے جس میں مختلف اسباب سے تغیر و تبدل ہوتا ہے جسے اصطلاح مذہب میں بداء کہتے ہیں۔ [3] .....

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ؕ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ﴿۳﴾

''اور وہ اللہ ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی۔ وہ تمہارے ظاہر اور پوشیدہ ''ہر امر کو جانتا ہے اور جانتا ہے اسے جو تم کرتے ہو''۔

''آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی'' یعنی لامکان ہے۔ کسی خاص محل میں محدود نہیں ہے۔ [4]

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْا

---

[1] ۔ خلقکم من طین بخلق ابیکم ادم منه (جلالین) فلما کان اصلنا من طین جاز ان یقول: خلقکم من طین (تبیان)

[2] ۔ یعنی بالاجلین اجل الحیوٰۃ الی الموت و اجل الموت الی البعث و قیام الساعۃ (مجمع البیان)

[3] ۔ عن ابی عبداللہ قال: الاجل المقضی هو المحتوم الذی قضاہ اللہ وحتم والمسمی هو الذی فیه البدا یقدم مایشاء ویؤخر مایشآء والمحتوم الذی لیس فیه تقدیم ولا تاخیر (علی بن ابراهیم)

[4] ۔ ان جعلت فی السمٰوٰت خبرا بعد خبر فیکون التقدیر هو اللہ وهی فی السمٰوٰت وفی الارض یعنی انه فی کل مکان (مجمع البیان) وفی الاٰیۃ دلالۃ علی فساد قول من قال انه تعالیٰ فی مکان دون مکان (تبیان)

بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۵

''اوران کے پاس کوئی نشانی ان کے پروردگار کی نشانیوں میں سے نہیں آتی مگر یہ کہ وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس حق کو بھی جھٹلا دیا[1] جب وہ ان کے پاس آیا۔ اب انہیں بہت جلدی ان باتوں کی جن کا مذاق وہ اڑاتے تھے، خبریں سامنے آئیں گی''۔

یعنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد خوب معلوم ہوجائے گا کہ عذاب الٰہی کیسا ہوتا ہے۔[2]

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۪ وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۶

''کیا انہوں نے دیکھا کہ کتنے دوروں کے افراد کو[3] ان کے پہلے ہم نے ہلاک کر دیا جنہیں ہم نے زمین میں اقتدار دیا تھا جو تمہیں نہیں دیا ہے اور جن پر ہم نے آسمان سے موسلا دھار بارش رحمت کی تھی اور ہم نے نہریں بنائی تھیں جو ان کے پیروں کے نیچے سے بہتی تھیں۔ پھر ان کے گناہوں کی بدولت انہیں ہم نے ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ہم نے دوسری نسلیں پیدا کیں۔''

یہ گزشتہ امتوں کے انجام کی طرف نظروں کو موڑ کر خود انہیں اپنے انجام کے متعلق اندیشہ ناک ہونے کی تحریک ہے۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِىْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷

''اور اگر ہم آپ پر لکھی ہوئی تحریر اتارتے اور یہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو۔''

نہ ماننے کے لئے لاکھ بہانے ہوتے ہیں چنانچہ کافروں کا ایک بہانہ رسول ﷺ کی حقانیت کو تسلیم نہ کرنے کا تھا کہ یہ کیسی کتاب ہے کہ اسے رسول ﷺ زبانی سناتے ہیں اور پھر اسے تحریر کیا جاتا ہے۔ اگر خدا کی کتاب ہے تو آسمان ہی سے تحریری صورت میں کیوں نہیں اترتی؟! مگر یہ سب باتیں صرف عناد کے طور پر نہ ماننے کے لئے تھیں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ اگر یہ صورت بھی ہوتی اور لکھی لکھائی شکل میں کتاب اترتی، تب بھی کافر لوگ اسے جادو کہہ کر انکار کرتے اور ایمان پھر بھی اختیار نہ کرتے۔

---

[1] ۔ای بالحق الذی اتی بہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من القرآن وسائر امور الدین (مجمع البیان)

[2] ۔سوف یأتیھم خبر العذاب الذی ینزل بھم عقوبۃ علیٰ کفرھم (تبیان)

[3] ۔قال الزجاج عندی ان القرن اھل کل مدۃ کان فیھا نبی او کان فیہ طبقۃ من اھل العلم قلت السنون او کثرت (تبیان)

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝۸

''اور انہوں نے کہا کہ ان پر فرشتہ کیوں نہیں اترتا؟ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو بس فیصلہ ہی ہوتا، پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی۔''

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فرشتے اترتے ہی تھے مگر کافروں کا مطلب یہ تھا کہ ہم خود اپنی آنکھوں سے فرشتہ کو اترتے دیکھیں کہ وہ اتر کر ہمارے سامنے ان کی سچائی کی گواہی دے [1] اب جیسا کہ گزشتہ آیات میں بیان ہو چکا، سنت الٰہیہ یہ رہی ہے کہ جب فرمائشی معجزے دکھا دیئے جاتے ہیں تو پھر انکار کرنے پر فوراً عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے، اس لئے کہا گیا ہے کہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی فرمائش کے مطابق اگر فرشتے اترتے تو پھر عذاب خدا سے ان کی مہلت نہیں مل سکتی تھی۔ [2]

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝۹

''اور اگر ہم اسے فرشتہ قرار دیتے تو بھی اسے انسان کی شکل میں قرار دیتے اور انہیں پھر بھی ایسے ہی شبہے کرنے کا موقع دیتے جیسے شبہے وہ اب کر رہے ہیں [3]۔''

مشرکین کا ایک بہانہ عدم قبول کا یہ تھا کہ آخر ہم اپنے ایسے آدمیوں کو کیوں مانیں؟! خدا کو پیغمبر بھیجنا تھا تو فرشتوں کو بھیجتا۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ فرشتہ کا بھیجنا سنت الٰہیہ اور حکمت ربانی کے خلاف ہے فرشتہ بھی ہوتا تو ظاہری صورت میں وہ انسان ہی ہوتا کیونکہ بغیر اس کے وہ نمونۂ عمل پیش نہیں ہوسکتا جس کی پیروی مطلوب الٰہی ہے تو اس وقت بھی یہ ایسی ہی گمراہی کی باتیں کہتے جیسی اس وقت کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ اس وقت وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہی نہ کہ یہ انسان کیوں ہے؟ چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا کیوں ہے؟ تو جب وہ ملک ہوتے ہوئے بھی شکل انسانی میں ہوتا تو بھی یہ لوگ ایسی ہی گمراہی کی باتیں کرتے تو ان کی ان باتوں کے سدباب کے لئے ہم ان مفید حکمت کے تقاضوں کو نظر انداز تھوڑی کر دیں گے جو رسول کے ہم جنس ہونے ہی سے وابستہ ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی گمراہی کے ہم سبب ہوں گے بلکہ یہ کہ ان کی گمراہی کا جو اُن کی غلط ذہنیت کا نتیجہ ہے، ہم اپنے طرز عمل کو بدل کر سدباب نہیں کریں گے۔

پھر یہ بھی پہلو بعض علماء نے پیش کیا ہے کہ قرآن نے اس شبہ و گمراہی میں مبتلا کرنے کو ان کے ملک قرار دینے کے ساتھ وابستہ کیا ہے کہ اگر ملک بناتے تو ایسا ہوتا اور جب ملک بنایا ہی نہیں تو اس گمراہ کرنے کا وقوع بھی نہیں ہوا۔ [4]

---

[1] ۔ملك يصدقه (جلالين) نشاهده (مجمع البيان)

[2] ۔معنى لقضى الامر اى اتم هلا كهم (تبيان)

[3] ۔هر آئينه مشتبهه مى كرديم بر ايشاں انچه الحال اشتباه مى كنند (شاه ولى الله) كانوا يلبسون على ضعفتهم فى امر النبى ﷺ فيقولون انما هذا بشر مثلكم (مجمع البيان) البتہ شبہ ڈالتے ہم اوپر ان کے جو شبہ کرتے ہیں یہ (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔لم يخبر انه ليس عليهم وانما قال لو جعلناه ملكا للبست ولم يجعله ملكا فاذا ماليس (تبيان)

مگر جو مفہوم پہلے بیان ہو چکا، وہ حقیقت حال کی مطابقت کے اعتبار سے بھی اور دوسرے مقامات پر جو قرآنی تعبیرات ہیں، ان کی موافقت کے لحاظ سے بھی زیادہ مناسب ہے۔

انبیاء اور تمام معصومینؑ واقعی بشر ہوتے ہیں، نہ کہ فقط بصورت بشر

بے شک اس آیت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ انبیاء اور تمام معصومینؑ حقیقت میں بشر اور انسان ہی ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ وہ حقیقت میں ملک یا کسی دوسری نوع کے افراد ہوں اور صورۃً انسان ہوں کیونکہ اسے قرآن نے ''فرض غیر واقع'' کے طور پر بیان فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا ہے نہیں۔ نہ ایسا ہے کہ وہ ملک ہوں اور بہ شکل بشر بھیجے گئے ہوں اور نہ کوئی دوسری جنس۔ اس لئے کہ جو حکمتِ الٰہیہ ملک کو رسول بنانے سے سدراہ ہے، وہی کسی دوسری جنس سے بھی سدراہ ہے یعنی وہ حکمت اس کی متقاضی ہے کہ رسول کو عامۂ خلائق کا ہم جنس ہونا چاہیے جو صرف صفاتِ شخصی میں ان پر امتیاز رکھتا ہو جو ایک رہنما کے شایانِ شان ہے۔

نوع یا جنس میں الگ ہوتا تو مقصد رسالت و رہنمائی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۰

''اور آپ کے پہلے بہت پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا تو جنہوں نے ان کا مذاق اڑایا تھا، انہیں اسی عذاب نے آ کر گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ [1]

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۱

''کہیے کہ روئے زمین پر چلو پھرو۔ پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا''؟!

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۱۳

''کہیے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ کس کا ہے؟ کہہ دیجئے کہ اللہ کا ہے۔ اس نے اپنے ذمہ رحمت کرنا عائد کر لیا ہے [2] وہ تم سب کو یقیناً روز قیامت تک جس میں کوئی شک نہیں، اکٹھا کرتا رہے گا جنہوں نے خود اپنا نقصان کیا تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور اسی کا ہے جو رات اور دن میں سکونت پذیر ہے اور وہ سننے والا ہے، بڑا

---

[1] ۔ای نزل بهم العذاب (علی بن ابراهیم)

[2] ۔ کتب قضیٰ (جلالین)

جاننے والا۔"

"اکٹھا کرتا رہے گا" یعنی ابھی تم پر عذاب نازل نہیں کرتا بلکہ مہلت اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل کو آنے کا موقع دیتا ہے تا کہ جب بھی آنکھیں کھل جائیں، وہ اپنے اعمال کی اصلاح کر لیں، یہ کتنی بڑی خدا کی مہربانی ہے جو تمام افراد انسانی کے شامل حال ہے [1] پہلی آیت میں مَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ کر اللہ کے اقتدار کی ہمہ گیری اجزائے ظرف مکان کے اعتبار سے بتائی گئی تھی اور دوسری میں لَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ کہہ کر اس ہمہ گیری کو اجزائے ظرف زمان کے اعتبار سے بتایا گیا ہے۔ [2]

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾

"کہیے کہ کیا کسی دوسرے کو میں سرپرست بناؤں اللہ کے سوا جو آسمانوں کا اور زمین کا وجود میں لانے والا ہے اور وہ روزی دیتا ہے، اسے کوئی روزی نہیں پہنچاتا۔ کہیے کہ میں مامور ہوں اس پر کہ اول درجہ کا مسلم رہوں اور (یہ حکم ہے مجھے کہ) [3] تمہیں مشرکوں میں سے نہیں ہونا چاہیے۔"

یہ بھی ایک انداز گفتگو ہوتا ہے کہ جس غلطی پر دوسروں کو متنبہ کرنا ہے، اسے انسان خود اپنے اوپر رکھ کر کہہ دے۔ یہ اور اس کے بعد کی آیت دونوں اسی انداز کی حامل ہیں۔

اول من اسلم کا ترجمہ جو ہم نے کیا "اول درجہ کا مسلم رہوں" اس کی نظیر پہلے ہی پارہ میں آچکی ہے لیکن اکثر دوسرے لوگ اس اوّلیت کو باعتبار زمانہ قرار دیتے ہیں تو انہیں قید لگانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ "سب سے پہلا مسلمان اس امت میں"۔ [4]

اور بعض لوگ اسے خلقت نوری میں اوّلیت پر منطبق کرتے ہیں کہ جب یہ اول مخلوق ہیں تو اول مسلم اور اول مؤمن بھی یہی ہیں۔ آدم اور دیگر بنی آدم سب ان کے بعد ہیں۔

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

"کہیے کہ میں ڈرتا ہوں، اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، ایک بہت بڑے دن کے عذاب سے۔ وہ

---

[1] ای کتب علیٰ نفسه الایستاصلکم ولا یعجل عقوبتکم بل یعذرویندرویجمع اٰخرکم الی اولکم قرناً بعد قرن الی یوم القیامة (تبیان)

[2] ۔ انما ذکر اللیل والنهار هنا وذکر السمٰوٰت والارض فیما قیل لان الاول یجمع المکان والثانی یجمع الزمان وهما ظرفان لکل موجود (مجمع البیان)

[3] ۔ وقیل لی لا تکوننن من المشرکین (جلالین) ای امرت بالایمان ونهیت عن الشرك (مجمع البیان)

[4] ۔ یعنی من هٰذا الامة (تبیان)

(عذاب) اس دن جس سے الگ رہا، اس پر اس (خالق) نے بڑا رحم کیا ہے [1] اور یہ نمایاں کامیابی ہے"

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۭ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۷ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝۱۸

"اور اگر اللہ تمہیں کسی سختی سے دو چار کرے تو اس کا دور کرنے والا سوا اس کے کوئی نہیں اور اگر کوئی بھلائی تم تک پہنچائے تو بھی وہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے، اور وہ اپنے بندوں سے بالا دست قابو رکھنے والا ہے اور وہ صحیح صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا باخبر۔"

یعنی وہ اپنی بالا دستی اور قدرت سے اندھا دھند کام نہیں لیتا [2] بلکہ بمقتضائے حکمت ضبط وتحمل سے کام لیتا ہے اور باخبر ہونے کے بعد نظام عالم کے تمام مفادات کو سامنے رکھ کر جب محل ہوتا ہے، تب سزا دیتا ہے اور ظالمین کو مہلت دیتا ہے بلکہ خوب دنیوی نعمتوں سے نوازتا ہے اور پھ جب وقت آتا ہے، تب اپنے عذاب میں گرفتار کرتا ہے۔

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۣ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ۭ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝۱۹

"کہیے کہ گواہی میں سب سے بڑھ کر کون چیز ہے؟ [3] کہہ دیجئے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف اس قرآن کی وحی بھیجی گئی ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے تمہیں اور جس تک وہ پہنچے، متنبہ کروں۔ کیا تم اس بات کے گواہ ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے خدا ہیں؟ کہیے کہ میں تو اس کی گواہی نہیں دیتا کیونکہ وہ تو بس ایک خدا ہے اور میں اس سے کہ جو تم شرک کرتے ہو، بے تعلق ہوں۔"

"سب سے بڑھ کے کون چیز ہے" کہ جواب میں "اللہ" کہنا اس کی دلیل قرار دیا گیا ہے کہ ذات الٰہی پر شے کا اطلاق درست ہے [4] "تمہیں اور جس تک وہ پہنچے" اس سے آپ کی رسالت کی ہمہ گیری زمان ومکان کے اعتبار سے ثابت ہوتی ہے یعنی اس کا دائرہ نہ کسی جغرافیائی احاطہ میں محدود ہے اور نہ اس کے حدود سے کوئی زمانہ خارج ہے۔ [5]

---

[1] ۔فقد رحمه الله (مجمع البيان)

[2] ۔معناه انه مع قدرته عليهم لا يفعل الا ما تقتضيه (تبيان)

[3] ۔چه چیز معتبر تر است در باب شهادت (شاه ولی الله)

[4] ۔فی الاية دلالة علی من قال لا يوصف تعالیٰ بانه شئ (تبيان)

[5] ۔ای لا خوف به من بلغه القران الی يوم القيمة (مجمع البيان)

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

''جنہیں ہم نے کتاب دی ہے، وہ انہیں اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ وہ جنہوں نے اپنے کو خسارے میں ڈالا ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

اس مضمون کی آیت پہلے دوسرے پارہ میں آچکی ہے وار یہ آیت بھی اس کا ثبوت ہے کہ اس سورہ کو تمام وکمال مکیّہ سمجھنا درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ مکہ میں اہل کتاب سے کوئی سابقہ نہ تھا تا کہ ان کے تذکرہ کا محل ہوتا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا کہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے بلاشبہ جو ظالم ہوں، وہ کسی طرح کی بہتری حاصل نہیں کر سکتے۔''

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں کئی جگہ ہیں اور یہ ایک روادارانہ انداز تبلیغ ہے کہ کھل کر مخاطبین کو نہیں کہا جاتا کہ تم ظالم ہو بلکہ اس طرح گفتگو کر کے خود انہیں غور کرانے یا ان کے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یاد رکھو کہ اگر میں غلط دعوائے رسالت کرتا ہوں اور اللہ کی طرف منسوب کر کے غلط کلام پیش کرتا ہوں تو بلاشبہ مجھ سے زیادہ ظالم کوئی نہیں اور اگر میں ٹھیک کہتا ہوں مگر تم یا کوئی اس کی تکذیب کرتا ہے تو اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں اور بہر حال جو ظالم ہوں، وہ کبھی فلاح یعنی دین ودنیا کی بہتری حاصل نہیں کر سکتے۔ یہی وہ حکیمانہ اندازِ کلام ہے جسے مختلف الخیال جماعتوں کے سامنے اس دور میں اختیار کیا جاتا ہے تو سطحی نظر والے اپنی جماعت کے آدمی چیخ اٹھتے ہیں کہ اس میں عقائد ومسلمات کو مشکوک بنا دیا گیا ہے مگر قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں یہی انداز اختیار کیا گیا ہے اور وہی روح تبلیغ اور حکیمانہ تخاطب کی جان ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ دونوں باتیں مشرکین ہی پر منطبق ہیں کہ وہی اللہ پر افتراء کرنے والے تھے کہ اس کا شریک قرار دیتے تھے یا اس کے لئے اولاد تجویز کرتے تھے [1] اور وہی آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والے تھے مگر ہمارے خیال میں اس صورت میں درمیان میں ''اَوْ'' نہ ہوتا جس کے معنی ''یا'' کے ہیں بلکہ ''وَ'' ہوتا جس کے معنی ''اور'' کے ہوتے۔ اس لئے کہ اگر افترا اُسے یہ مراد ہے تو وہ افترا اُور تکذیب تو ان میں مجتمعاً تھی نہ کہ ان میں سے کوئی ایک بات۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا

---

[1] ۔ معناہ ومن اکفر ممن اختلق علی اللہ کذبا فاشرك بہ الآلھتہ (مجمع البیان)

يَفْتَرُوْنَ﴿۲۴﴾

''اور جس دن ہم ان سب کو میدانِ حشر میں لائیں گے، پھر ان سے جنہوں نے شرک اختیار کیا تھا، کہیں گے کہ کہاں ہیں تمہارے وہ شریک [1] جن کا تم گمان باطل کرتے تھے؟ پھر کوئی ترکیب ان کے پاس نہ ہوگی سوا اس کے کہ وہ کہیں کہ قسم ہمارے پروردگار اللہ کی، ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھو! کس طرح یہ خود اپنے اوپر جھوٹ باندھنے لگے اور جو کچھ یہ جھوٹ باندھا کرتے، وہ ان سے غائب ہو گیا۔''

لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اہم نے جو ترجمہ کیا ہے ''کوئی ترکیب ان کے پاس نہ ہوگی'' یہ اکثر تفسیروں کے مطابق ہے۔ [2] اس کے علاوہ ایک دوسری تفسیر کے مطابق یہ معنی ہیں کہ ''اب ان کے پاس کوئی جھوٹ بولنے کو نہیں رہ جائے گا، سوا اس کے کہ وہ یہ کہیں یعنی بس مکر جائیں کہ ہم کبھی مشرک تھے ہی نہیں۔ [3]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴿۲۵﴾

''اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو آپ کی بات غور سے سنتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں کہ وہ اسے سمجھتے نہیں اور ان کے کانوں میں بھاری پن [4] اور اگر وہ ہر ہر طرح کا معجزہ دیکھ لیں [5] جب بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ جب آپ کے پاس بحث کرتے ہوئے آئیں گے تو یہ کافر کہیں گے کہ یہ نہیں ہیں مگر اگلے لوگوں کی داستانیں''۔ [6]

غور سے سننا کبھی طلب حق کے لئے ہوتا ہے اور کبھی اس لئے کہ اس میں نکتہ چینی کی کوشش کی جائے ایسا آدمی سنتا تو بڑے غور سے ہے مگر اس سے فائدہ کچھ نہیں اٹھاتا، اس لئے کہ اس کی نیت بخیر نہیں۔ یہی ان کی نفسیاتی کیفیت وہ ہے جسے دلوں پر پردہ اور کانوں میں بھاری پن سے تعبیر کیا گیا ہے اور چونکہ یہ ان کی بدنیتی کا ایک لازمی نتیجہ ہے جس سے اللہ کی توفیقات خیر ان سے سلب ہو جاتی ہیں، اس لئے اس کی پوری ذمہ داری خود ان پر ہوتے ہوئے، اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ ہم نے ایسا کیا۔

---

[1] ۔ انما اضاف الشر کاؤ الیھم لانھم اتخذوھا لانفسھم (مجمع البیان)

[2] ۔ فتنتھم ۔ ای معذرتھم (جلالین) بنا شد عذر ایشاں (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ فتنتھم ای کذبھم (علی بن ابراھیم)

[4] ۔ در گوش ایشاں گرانی (شاہ ولی اللہ) وقراصمھا (جلالین)

[5] ۔ کل علامۃ ومعجزۃ تدلھم علیٰ نبوۃ النبی ﷺ (تبیان)

[6] ۔ قصھائے پیشنیان (شاہ ولی اللہ) کہانیاں پہلوں کی (رفیع الدین) اساطیر اکاذیب (جلالین)

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

''اور وہ ان کی طرف سے روکتے ہیں اور خود ان سے دور رہتے ہیں اور وہ نہیں ہلاکت میں ڈالتے مگر خود اپنے کو اور انہیں شعور نہیں ہے۔''

سلسلۂ آیات سے بآسانی جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے، وہ تو یہ ہے کہ یہ انہی کا ذکر ہے جن کے تاریک کردار کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے اور اس طرح ''ان کی طرف سے روکتے ہیں'' کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف آنے اور ان کی بات ماننے سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں مگر اس میں ذرا سی خلش ذہن کو یہ محسوس ہوتی ہے کہ دوسروں کو روکنے کے بعد خود ان کے دور رہنے کا ذکر جیسے افادیت کا حامل نہیں ہے۔

ایک تفسیر جس کے متعلق گمان قوی یہ ہے کہ روایت پر مبنی ہے، یہ ہے کہ یہ کچھ بنی ہاشم کے کردار کا بیان ہے جو حمیت خاندانی یا جناب ابوطالبؑ کے اثر سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان کی دشمنوں سے حفاظت کرتے تھے جس کو کہا گیا ہے کہ ان کی طرف سے روکتے ہیں یعنی ان کی ایذا رسانی سے مخالفین کو باز رکھتے ہیں مگر خود ان پر ایمان نہیں لاتے [1] ایسے افراد کے کردار کا ذکر جناب امیر علیہ السلام کے کلام میں بھی ملتا ہے جو نہج البلاغہ میں موجود ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷﴾ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾

''اور کاش تم دیکھو جب وہ آتش و دوزخ پر کھڑے کئے جائیں گے تو وہ کہیں گے کاش ہم پلٹا دیئے جاتے اور پھر اپنے پروردگار کی نشانیوں کو نہ جھٹلاتے اور ایمان لانے والوں میں ہوتے، بلکہ ظاہر ہو گیا ان کے لئے، وہ جو چھپاتے تھے پہلے [2] اور اگر یہ پلٹائے جائیں گے تو پھر وہی کریں گے۔ جس سے انہیں ممانعت ہوئی ہو اور بلاشبہ وہ جھوٹے ہیں۔''

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔ ''یعنی دوزخ کے کنارے پہنچ کر حکم ہوگا کہ ٹھہراؤ تو کافروں کو توقع پڑے گی کہ شاید ہم کو پھر دنیا میں بھیجیں تو اب کی بار کفر نہ کریں اور ایمان لاویں۔ سو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس واسطے ان کو نہیں ٹھہرایا بلکہ اس تدبیر سے ان کے منہ سے اقرار کرا دیا کہ ہم نے کفر کیا تھا'' (موضح القرآن)

علامہ طبرسیؒ کا خیال ہے کہ ''وقفوا'' کے یہ معنی ہیں ہی نہیں کہ وہ کھڑے کئے جائیں گے بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ داخل جہنم کئے جائیں

---

[1] ۔ قال بنو ھاشم کانوا ینصرون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ویمنعون قریشا عنہ ویناؤن عنہ ای ...لا یؤمنون (علی بن ابراھیم)

[2] ۔ ظھرت فضیحتھم فی الاخرۃ وتھکت استارھم (مجمع البیان)

گے اور اس طرح وہ اپنے مشاہدہ واحساس کے ساتھ اس کی حقیقت سے واقف بنا دیئے جائیں گے۔[1]

تمنا اگرچہ بذات خود سچ اور جھوٹ سے متصف نہیں ہوسکتی مگر اس تمنا میں بطور اظہار واقعہ ایک خبر بھی مضمر ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم دنیا میں دوبارہ جائیں تو پھر آیات الٰہی کو نہ جھٹلائیں گے اور ہم مومنین میں سے ہوں گے، آخر میں انہیں جھوٹا اسی خبر کے اعتبار سے کیا گیا ہے۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے مگر ہماری یہی دنیوی زندگی اور ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔''

اگر اس آیت کو مستقل طور پر دیکھا جائے تو یہ ترجمہ ہوگا جو ہم نے کیا ہے اور یہ عام دہریّوں کا نقطۂ نظر ہے جو ہر دور میں منکرین خدا اور منکرین آخرت کا رہا ہے اور زبان سے اعلان نہ بھی ہو تو ان کا عمل اسی کا ترجمان رہتا ہے۔ اور اگر یہ آیت مقام تنزیل میں گزشتہ آیت سے متصل ہو جو یہاں پر انداز کلام کو دیکھتے ہوئے بعید نہیں ہے تو یہ عطف ہوگا، اس کے قبل کی آیت کے الفاظ: لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ پر اور اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ''اور وہ یہی کہیں گے'' یعنی اگر دنیا میں دوبارہ جائیں گے تو وہ کریں گے جس سے انہیں ممانعت ہوئی تھی اور یہ کہیں گے جواب تک کہتے آئے تھے کہ بس جو کچھ ہے، یہی دنیا ہے، اس سے آگے کچھ نہیں ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾

''اور کاش دیکھو[2] وہ موقع جب وہ ٹھہرائے جائیں گے اپنے پروردگار کے سامنے۔ وہ کہے گا کیا یہ حق نہیں ہے؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں، قسم ہمارے پروردگار کی۔ کہے گا تو چکھو اس عذاب کو اس سبب سے کہ تم کفر کرتے رہے تھے۔''

علامہ طبرسیؒ جنہوں نے گزشتہ آیت میں وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ کے معنی میں اس مفہوم کو ترجیح دی تھی کہ وہ آگ کی حقیقت پر اب اس میں داخل ہو کر واقف ہوں گے، انہوں نے یہاں تو حتم و جزم کے ساتھ یہی معنی قرار دیئے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی عظمت سے واقف ہوں گے اور اب انہیں اس کی معرفت حاصل ہوگی اور کہا ہے کہ یہاں اس کے سوا کچھ بن ہی نہیں سکتا[3]

مگر جب کہ قرآن میں روز قیامت کے بارے میں دوسری جگہ صاف ہے:

يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶﴾

جس دن تمام لوگ کائنات کے پروردگار کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے۔ (سورۂ مطففین)

تو یہاں بھی یہی معنی کیوں مراد نہیں ہو سکتے؟ اس لئے کہ ہم نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ''وہ ٹھہرائے جائیں گے اپنے پروردگار کے سامنے''۔

---

[1] ۔ الاجود ان یکون معناہ ادخلوھا فعرفوا مقدار عذابھا (مجمع البیان)

[2] ۔ کاش کہ دیکھے تو (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔ لیس بصحیح فی ھذہ الآیۃ الّا وجھا واحدا... وھو ان للعنی عرفوا ربھم ضرورۃ (مجمع البیان)

اگرچہ ''بارگاہ'' کہا جائے ''درگاہ'' کہا جائے یا ''سامنے'' کہا جائے۔ یہ سب الفاظ مجازی ہی طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے سامنے کھڑے ہونے کے معنی اس کی طرف کے فیصلہ کے انتظار میں ٹھہرنے کے ہیں۔ نہ یہ کہ جسمانی طور پر اس کے منہ کے سامنے کھڑے ہوں گے [1] جو کہ اس ذات کی بہ نسبت جو جسم و جسمانیات سے بری ہے، غیر ممکن ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾

''گھاٹا اٹھایا ہے انہوں نے کہ جو اللہ کی بارگاہ میں حاضری کو جھوٹ بتاتے رہے یہاں تک کہ جب اچانک ان پر قیامت آ جائے گی تو وہ کہیں گے کہ واحسرتا! ہم نے اس کے بارے میں کوتاہی کو اور وہ اٹھا رہے ہیں اپنے بوجھوں کو اپنی پشت پر۔ کیا برا بوجھ ہے جو وہ اٹھا رہے ہیں۔''

''اس کے بارے میں کوتاہی کی'' یعنی ایمان لانے اور ان اعمال کے انجام دینے میں جو آج کے دن کام آتے۔ [2]

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

''اونہیں ہے دنیوی زندگی مگر کھیل تماشہ اور بے شک آخرت والا گھر بہتر ہے ان کے لئے جو پرہیزگار ہوں، تو کیا عقل سے تم کام نہیں لو گے؟!''

''دنیوی زندگی'' یعنی لذائذ دنیا اور وہ کام جو صرف دنیا کی خاطر کئے جاتے ہیں مثل کھیل تماشے کے ہیں جو وقتی تفریح کا ذریعہ ہوتے ہیں لیکن ان کا کوئی حاصل نہیں ہوتا لیکن آخرت کی خاطر جو کام کئے جائیں، وہ دائمی زندگی میں انسان کے کام آئیں گے۔ [3]

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِىْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾

''ہمیں معلوم ہے کہ جو وہ کہتے ہیں، وہ آپ کو یقیناً رنج پہنچتا ہے تو وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے ہیں بلکہ وہ ظالم اللہ کی

---

[1] ۔ یحتمل ان یکون معنی اذ وقفوا علی ربهم، حبسوا ینتظر بهم ما یامر ...وقد ظن قوم من المشتبهة ...انهم یشاهدونه وهذا فاسد (تبیان)

[2] ۔ تحسر واعلی تفریطهم فی الایمان والتاهب لها بالاعمال الصالحة (تبیان)

[3] ۔ ای ما یمتع به فی الدنیا۔ بمنزلة اللعب واللهو الذین لا عاقبة لهما فی المنفعة ...فاما الاعمال الصالحات فهی من اعمال الاخرة ولیس بلهو ولا بلعب (تبیان)

آیتوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔''

بلند نفوس کے لئے سنگ وخدنگ اتنے تکلیف دہ نہیں ہوتے جتنی جاہل اشخاص کی لفظی بدتمیزیاں۔ یہ مصیبت پیغام حق کے اعلان کے بعد سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے انتہائی سوہان روح کا باعث تھی۔ اس پر خالق نے بطور تسلی ودل جوئی یہ آیات اتاری ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ آپ کو جو صدمہ ان کی باتوں سے پہنچتا ہے، وہ فطری طور پر بالکل صحیح ہے مگر حقیقت میں وہ شخصاً آپ کو جھوٹا تھوڑی بناتے ہیں۔ یہ بات تو خدا تک پہنچتی ہے، وہ تو خدا کی نشانیوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں، اس لئے ان کے معاملہ کو اللہ پر چھوڑ دیجئے اور آپ رنج نہ کیجئے۔

لَا يُكَذِّبُوْنَكَ کے ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ وہ ذاتی حیثیت سے اپنے صمیم قلب سے تو آپ کو سچا سمجھتے ہیں [1] مگر انہیں پیغام الٰہی کا قبول کرنا منظور نہیں ہے، اس لئے وہ انکار کرتے ہیں۔ علامہ طبرسیؒ نے اس جملہ کے پانچ مفاہیم درج کئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ہمارے بیان کردہ دوسرے مفہوم کو درج کیا ہے اور کہا ہے:

هو قول اکثر المفسرین: وہ زیادہ تر مفسرین کا قول ہے۔

اور سب سے آخر میں پہلے معنی کو جو ہم نے درج کئے ہیں مگر ہماری نظر میں اسی کو ترجیح ہے، اس لئے ہم نے اسی کو مقدم کیا ہے۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾

''اور بہت سے پیغمبروں کو اس کے پہلے جھٹلایا گیا تو انہوں نے اس پر جو انہیں جھٹلایا گیا اور ایذائیں پہنچائی گئیں صبر کیا، یہاں تک کہ ہماری مدد ان کے پاس آئی اور اللہ کی باتوں کا کوئی بدلنے والا نہیں اور آپ کو کچھ نہ کچھ پیغمبروں کی خبریں پہنچ ہی چکی ہیں'' [2]

یہ دوسرا رخ ہے تسلی کا یہ نئی بات تھوڑی ہے۔ آپ کے پہلے ہمیشہ یہی ہوتا رہا اور تمام پیغمبروں کو اس طرح کی باتوں کا سامنا کرنا پڑا اور سنت الٰہیہ یہی رہی ہے کہ وہ پہلے ظالموں کو خوب کھل کھیلنے کا موقع دیتا ہے اور اپنے انبیاء سے صبر وتحمل کے ساتھ اس سب کو برداشت کراتا ہے، پھر آخر میں ان کی مدد کرتا ہے یہی اب بھی ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے۔ [3]

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِىَ نَفَقًا فِى الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا

---

[1] ۔لا یکذبونك فی السر لعلمهم بانك صادق (جلالین)

[2] ۔المعنی انه اجره علیه وآله السلام ببعض اخبارهم علی حسب ما علم من المصالح (مجمع البیان)

[3] ۔لا احد یقدر علیٰ تکذیب خبر الله علی الحقیقة ولا علی اخلاف وعده (تبیان)

تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾

''اور اگر آپ پر ان کی روگردانی بڑی شاق ہے تو اگر کوئی سرنگ زمین میں نکال سکیے، یا کوئی سیڑھی لگا سکیے آسمان میں تو کوئی خاص معجزہ ان کے سامنے لائیے اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں سیدھے راستے پر اکٹھا کر دیتا تو ہرگز آپ جاہلوں میں سے نہ ہو جائیے''۔

یہ ایک انداز بلاغت ہے کہ کبھی محبت کی باتیں ترش روئی کے انداز میں اور سخت لب ولہجہ میں ہوتی ہیں لیکن ان میں مضمر ہوتی ہے شفقت ومحبت۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا بڑا غم ہوتا تھا کہ یہ لوگ گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں اور اپنی بداعمالیوں سے مستحق دوزخ بن رہے ہیں۔اس کے لئے آپ بڑے ہی سوچ میں رہتے تھے اور ایک خاص کرب اور اذیت محسوس فرماتے تھے۔اس کے لئے خالق نے کبھی یوں تلخ انداز اختیار کیا ہے جس میں کوٹ کوٹ کر محبت بھری ہوئی ہے کہ:۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾ (سورۃ کھف)

کیا آپ اپنی جان دے دیجئے گا اس رنج میں کہ یہ لوگ اس قرآن پر ایمان کیوں نہیں لاتے۔

اسی طرح کا تلخ لب ولہجہ اختیار کر کے یہاں کہا جا رہا ہے کہ ہمیں جتنے معجزات بھیجنا تھے، وہ ہم نے بھیج دیئے اور یہ پھر بھی ایمان نہیں لائے تو اب کیا کیا جائے۔اس کے بعد بھی آپ کو پریشانی ہے تو اگر آپ سے ہو سکے تو آپ زمین میں سرنگ نکال کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر کوئی معجزہ پیش کیجئے ایسا کہ وہ ضرور ہی ایمان لے آئیں۔

پھر جیسے نرم لہجہ اختیار کر کے فلسفہ سمجھایا جانے لگا کہ خالق کا اصول ہی یہ نہیں ہے کہ وہ جبر سے کام لے۔نہیں تو وہ چاہتا تو کیا ممکن بھی تھا کہ کوئی گمراہ رہ جائے۔[1]

آخر میں پھر جیسے لہجہ سخت ہو گیا کہ آپ خود سمجھدار ہیں۔ان حقیقتوں سے بے خبر نہیں ہیں لہٰذا اس طرح کی باتیں کبھی نہ کیجئے جو بے خبری کا نتیجہ قرار پا سکتی ہیں۔

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۘ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾

''قبول بس وہی کرتے ہیں کہ جو سنتے ہیں اور جو مردے ہیں انہیں تو اللہ جلائے گا، پھر وہ اس کی طرف پلٹ کر جائیں گے''۔

یہ چوتھا انداز ہے تسلی کا[2]

مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام تبلیغ کرنا ہے، ان کا کام اس تبلیغ کو توجہ سے سننا اور اس سے اثر لینا ہے لیکن اگر سننے والے غور سے سنیں ہی

---

[1] ۔انما لم یفعل ما یلجئھم الی الایمان لان دنیا فی التکلیف ویسقط استحقاق الثواب الذی ھو الغرض بالتکلیف (تبیان)

[2] ۔ثم بین سبحانہ الوجہ الذی لاجلہ لا یجتمع ھؤلاء الکفار علی الایمان (مجمع البیان)

نہیں اور ان میں اتنی زندگی ہی نہ ہو کہ وہ سن سکیں تو مردوں کو جلانا آپ کا کام تھوڑی ہے۔ وہ تو اللہ کا کام ہے۔ مردوں کو تو وہ قیامت میں جلائے گا اور وہاں ان کو سزا دے گا۔

اس میں غور سے نہ سننے والوں کو فائدہ اٹھانے کی صلاحیت مفقود ہونے میں مردوں سے تشبیہ دی ہے [1] ورنہ اگر مردہ ہی ہوتے تو ان پر نہ سننے کا جرم ہی کہاں عائد ہوتا!!

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی معجزہ نہیں اترتا؟ کہہ دیجئے کہ یقیناً اللہ تو کسی بھی معجزہ کے اتارنے پر قادر ہے مگر ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔''

معجزات تو برابر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں پر نمایاں ہوتے ہی رہتے تھے مگر کفار ہٹ دھرمی سے طرح طرح کی فرمائشیں کرتے اور دیکھے ہوئے معجزات کو اَن دیکھا بنا کے یہی رٹ لگاتے تھے کہ آخر کوئی معجزہ یہ کیوں نہیں لاتے۔ [2]

اس کا تذکرہ قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے اور حسب موقع اس کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ یہاں یہ جواب دیا گیا ہے کہ خدا کی قدرت تو ہر معجزہ پیش کر سکتی ہے مگر اس کا فعل حکمت و مصلحت کی بنا پر ہوتا ہے۔ تمہاری نادانی اور جہالت کے مطالبوں کا وہ پابند نہیں ہو سکتا۔ آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ''وہ جانتے نہیں'' اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ وہ اپنی جہالت سے ایسی باتیں کہتے ہیں۔ اگر وہ علم کا جوہر رکھتے ہوتے تو اس طرح کی جاہلانہ باتیں نہ کہتے۔ اور ایک تفسیر میں اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ اگر ان کے فرمائشی معجزات آ جائیں تو پھر نہ ماننے پر عذاب الٰہی میں دیر نہیں ہوگی۔ [3]

جیسا کہ قرآن میں دوسرے مقام پر یہ مضمون صاف طور پر موجود ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

''اور کوئی چلنے پھرنے والا زمین میں نہیں اور نہ کوئی پرندہ ہے جو اپنے دونوں پروں سے اڑتا ہے مگر تمہارے ہی ایسے مختلف اقسام [4] ہم نے تحریر میں کوئی چیز اٹھا نہیں رکھی ہے۔ پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف محشور ہوں گے۔''

---

[1] ۔ بمنزلہ الموتیٰ، فکما ان الموتیٰ لا یستجیبون لمن یدعوھم الی الحق والایمان فکذلک ھٰؤلاء الکفار

[2] ۔ ھلا انزل علیہ اٰیۃ یعنی الایۃ التی سألوھا واقترحوا ان یأتیھم بھا من جنس ما شآءوا (تبیان)

[3] ۔ لا یعلمون ان الایۃ اذا جائت ولم یؤمنوا بھا یھلکوا (علی بن ابراھیم)

[4] ۔ اصناف مصنفۃ تعرف باسمائھا (مجمع البیان)

بظاہر یہ مراد ہے کہ خالق کا نظام تقدیر تمام کائنات پر حاوی ہے [1] اور تم کیا اس سے نکلو گے۔ کوئی مخلوق اس سے نہیں نکل سکتی۔ نوشتۂ تقدیر [2] میں کوئی چیز نظر انداز نہیں ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے کتاب کے معنی قرآن لئے ہیں [3] مگر شروع آیت کے مضمون سے اس کا کچھ لگاؤ معلوم نہیں ہوتا۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾

''اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، وہ بہرے اور گونگے ہیں تاریکیوں میں۔ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے [4] اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔''

یہ چاہنا اس کا اور اس کا بلا وجہ نہیں ہوتا بلکہ انسان کے ذاتی کردار کی سزا یا جزا میں ہوتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:۔

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ

اللہ گمراہی میں انہیں چھوڑتا ہے جو ظلم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ (سورۂ ابراہیم۔ ۲۷)

اور دوسری جگہ:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى

اور جو ہدایت حاصل کرتے ہیں، وہ ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ (سورۂ محمد۔ ۱۷)

پھر ایک جگہ:

يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ

جو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے درپے ہیں، انہیں اللہ اس کے ذریعہ سلامتی کی راہوں پر لگا دیتا ہے۔ (مائدہ:۱۶)

اگر یہ نہ ہوتا تو بلا وجہ تفریق عدالت الٰہی کے خلاف ہوتی۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾

''کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے یا قیامت تم پر آ جائے تو کیا اللہ کے سوا کسی کو پکارو گے تو

---

[1] ۔امم امثالکم فی تقدیر خلقها ورزقها واحوالها (جلالین)

[2] ۔ کتاب یعنی لوح محفوظ (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔وهو قول اکثر المفسرین (مجمع البیان)

[4] ۔یخذله بان یمنعه الطافه (مجمع البیان)

اگر سچے ہو، بلکہ اسی کو پکارو گے تو اگر وہ چاہے گا تو جس کے لئے تم نے اسے پکارا ہے، اس آفت کو دور کر دے گا اور تم انہیں جن کو شریک کرتے ہو، بھول جاؤ گے۔''

یوں تو "رأیت" واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے جس میں فاعل مفرد ہے اور ظاہر ایسا ہوتا ہے کہ مفعول اس کا کُمْ کے لفظ کے ساتھ لایا گیا ہے جو جمع مذکر حاضر کی ضمیر ہے، اس لئے یہ ترجمہ ہوسکتا ہے کہ ''کیا تم میں سے ہر ایک نے اپنی جماعت کو دیکھا ہے مگر نحوی قواعد کے لحاظ سے محاورہ میں اس کا ترجمہ وہی ہوتا ہے جو "اَرَئیتم" کے لفظ کا ہوا کرتا ہے یعنی کیا تم نے دیکھا ہے یا غور کیا ہے [1]؟

اس کے لئے جناب شیخ طوسی رحمۃ اللہ علیہ نے تبیان میں اور علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع البیان میں کافی بسیط مگر پیچیدہ قسم کی بحث کی ہے جو اردو داں طبقہ کے لئے بہت غیر عام فہم چیز ہے۔ بہرحال نتیجہ تمام بحثوں کا یہ ہوتا ہے کہ یہ بس ایک محاورہ ہے جو اہل زبان بولتے ہیں۔ اس میں یہ بیچ میں جو ضمیر ہوتی ہے۔ (ك۔ كما۔ كم) اس کے کوئی خاص معنی الگ سے نہیں ہوتے [2]

مطلب یہی ہوتا ہے کہ کیا تم نے دیکھا وہ جس کا بیان اس کے بعد ہے؟!

ہاں! بعض مترجمین ایسے ملتے ہیں جو رأیتکم لفظ میں فاعل اور مفعول دونوں کے معنی کہتے ہیں۔ [3] مگر میرے خیال میں وہ اہل زبان کے محاورات سے غفلت کے ساتھ صرف عام قواعد نحوی کے ماتحت لفظ پر نظر کرنے کا نتیجہ ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور ہم نے آپ سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف رسول بھیجے تو ان کو طرح طرح کی تکلیفوں میں گرفتار کیا، شاید کہ وہ تضرع وزاری کریں تو آخر یوں انہوں نے جب ہماری طرف سے سختی آئی، تضرع وزاری نہ کی بلکہ ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے آراستہ کر کے پیش کیا ان کی نگاہوں میں ان کاموں کو جو وہ کرتے تھے۔''

قرآن مجید میں جو دو لفظ ہیں: الباساء والضراء ان میں مفہوم کے لحاظ سے کیا فرق ہے اس کے تعین میں اقوال مختلف ہیں۔ بعض نے بأساء کے معنی تنگدستی کے اور ضرّاء کے معنی بیماری کے لئے ہیں [4] اور بعض نے کچھ اور [5] اس لئے ہم نے ترجمہ میں ان سب کا ماحصل

---

[1] آیا دیدید (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔الصحیح الذی علیہا النحویون ان الکاف لا موضع لہا والمعنی ارأیت زیدا ما حالہ والکاف زیادۃ فی بیان الخطاب (تبیان)

[3] ۔کیا دیکھا تم نے اپنے تئیں (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔یرید بہ الفقر والبئوس والاسقام والاوجاع (مجمع البیان) تنگی معیشت و بیماری (شاہ ولی اللہ) ساتھ فقر کے اور مرض کے (رفیع الدین

[5] ۔قال قوم البأ سآء والجوع والضّرّ اء النقص فی اموال والانفس والبأساء من الباس والخوف والضرّأ من الضر وقدیکون البأساء من البئوس (تبیان)

''طرح طرح کی تکلیفوں'' کے ساتھ درج کر دیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اکثر انسانی فطرت مصیبت کے وقت پر اللہ کو یاد دلاتی ہے جیسا کہ جناب امید لکھنوی نے فرمایا ہے:

گر پڑھی بھی کبھی ہم نے تو نماز حاجت
اپنے مطلب کے لئے یادِ خدا بھی آئی

اور اس لئے اکثر افراد کے لئے یہ تکالیف دینا اصلاح نفس کا باعث بن جانے کی بنا پر خالق کی طرف سے ایک لطف خاص کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خالق نے ان افراد کے بارے میں اس ذریعہ کو بھی آزما لیا، اپنے علم کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کو دکھانے کے لئے کہ یہ ایسے ''کج فطرت'' ہیں کہ یہ ذریعہ بھی اصلاح کا ان میں ناکام ہوتا ہے۔ اس کج فطرتی کو ''قساوت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ان کے دل ایسے سخت تھے کہ اس یاد الٰہی کے محرک ہونے والے ذریعہ سے بھی متاثر نہ ہوئے بلکہ ان تمام تکالیف میں بھی ان کے لہو ولعب اور ناجائز تفریحات کے مشغلے جو شیطانی کام ہیں، جاری رہے جس کا مشاہدہ اس تہذیب جدید میں بھی اکثر ملکوں میں ہوتا ہے کہ سخت بھونچالوں اور تباہیوں میں بھی سینما گھروں کی رونق میں فرق نہیں آتا۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾

''تو جب انہوں نے بھلا دیا ان باتوں کو جن کے متعلق انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ان پر ہر چیز کے دروازے ہم نے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ خوب خوش ہو لئے اس سے جو انہیں ملا تھا تو ہم نے اچانک انہیں گرفت میں لے لیا تو وہ ایک دم بے آس ہو گئے [1] تو ظالموں کی اصل نسل قطع ہو گئی [2] اور شکر ہے اللہ کا جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔

''ہر چیز کے دروازے کھول دیئے'' یعنی دولت اور دنیوی عیش وآرام کے سامانوں کی بہتات کر دی۔ [3] اس سے معلوم ہوا کہ یہ دنیوی کامرانیاں اکثر انسانوں پر عتاب الٰہی کی علامت ہوتی ہیں۔ اسی لئے حضرت امیر علیہ السلام سے وارد ہوا ہے:۔

یا ابن ادم اذا رأیت ربك یتابع علیك نعمه فاحذره (مجمع البیان)

اے آدم زاد! جب تو اپنے پروردگار کو دیکھ کہ وہ مسلسل نعمتیں دے رہا ہے تو اس سے خوف کر۔

آخر میں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا فقرہ ان کی انتہائی بداعمالی کا اظہار ہے کہ ان کا وجود صفحۂ حیات پر ایک بہت بڑا دھبہ تھا اور خلق

---

[1] ۔ائسون من کل خیر (جلالین) شدند ناامید شونده (شاه ولی الله)

[2] ۔فلم یبق لهم عقب ولا نسل (مجمع البیان)

[3] ۔ای کل نعمة وبرکة من السمآء والارض (مجمع)

خدا کے لئے ایک وبال تھا جو ہٹا دیا گیا تو یہ اللہ کا بہت بڑا احسان ہوا۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

''کہیے کہ کیا تم نے دیکھا ہے کہ اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے تو اللہ کے سوا کون خدا ہے جو یہ سب تمہیں دے دے؟! دیکھئے کس طرح ہم طرح طرح سے حقیقتیں واضح کرتے ہیں ، پھر بھی وہ روگردانی کرتے ہیں۔''

یہاں دلوں پر مہر لگانے سے مراد شعور کی طاقت کا سلب کرنا ہے۔[1]

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

''کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے اچانک یا ظاہر بظاہر تو کیا سوا ظالم جماعت کے کوئی تباہ و برباد ہوگا۔''

''اچانک'' کے معنی میں مضمر ہے بے خبری مثلاً رات کو عذاب آ گیا، جب وہ سو رہے تھے کہ عذاب کے پیشگی آثار کو بھی نہ دیکھ سکے.....اس لئے اس کے مقابل میں کہا گیا ''ظاہر بظاہر'' یعنی اس طرح کہ آنکھوں سے اس عذاب کی آمد کا مشاہدہ کریں۔[2]

قرآن مجید کا انداز رواداری دیکھئے کہ بہت سخت بات بھی کہتا ہے تو اس میں زیادہ سے زیادہ جو ممکن نرمی ہو، وہ پیدا کر دی جاتی ہے۔

یہاں شرط و جزاء دونوں پر غور کیجئے۔ ''اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے اچانک یا ظاہر بظاہر''.....کھلی ہوئی جزاء اس شرط کے بعد کے مضمون کے لحاظ سے یہ ہے کہ ''کیا تمہارے سوا اس سے کوئی تباہ و برباد ہوگا؟'' مگر تباہی و بربادی کے محل پر صاف صاف مخاطب جماعت کو نہ لا کر قرآن نے جیسے بات ان سے علیحدہ کر کے کہہ دی کہ ''کیا سوا ظالم جماعت کے کوئی اور تباہ و برباد ہوگا؟'' مطلب وہی ہے مگر ذرا سے انداز کے بدلنے سے کلام کی تلخی میں کتنی کمی ہو گئی؟ اسے وہ کیا سمجھیں جنہیں رواداری کی قدر و قیمت معلوم نہیں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور ہم پیغمبروں کو نہیں بھیجتے مگر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر تو جو ایمان لایا اور ٹھیک اعمال کرتا رہا تو نہ

---

[1] ۔طبع علیٰ قلوبکم فلا تعرفون شیئا (جلالین) بان سلب ما فیھا من العقول التی بھا یتئھا لکم ان تؤمنوا بربکم (تبیان)

[2] ۔المغاجاۃ وھو ان یاتیھم العذاب وھم غافلون غیر متوقعین لذلك اوجھرۃ ای وھم مشاھدون لہ ومعانیون نزولہ (تبیان)

ان پر کوئی اندیشہ ہے اور نہ انہیں افسوس ہوگا [1] اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، انہیں عذاب ہوگا [2] اس لئے کہ وہ فسق و فجور کرتے رہے"۔

اولیائے الٰہی سے خوف وحزن کی نفی قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی ہوئی ہے جس کے تحت میں باختلاف الفاظ ہر جگہ لکھا گیا ہے کہ دنیا میں خاصانِ خدا کو بلاشبہ خوف اور حزن سے سابقہ پڑا کرتا ہے، اس لئے جس خوف کی نفی ہوئی ہے وہ "اندیشۂ انجام" ہے جو ضمیر کی بے اطمینانی کا نتیجہ ہوتا ہے اور جس حزن کی نفی ہے، وہ اپنے کردار پر افسوس ہے جو پشیمانی کا مرادف ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں باایمان نیک کردار افراد کے یہاں کبھی نہیں ہوتیں اور اسی کے نتیجہ میں ان کے یہاں وہ ثبات قدم اور استقلال نظر آتا ہے کہ آندھیاں اور زلزلے ان میں جنبش پیدا نہیں کرتے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۵۰

"کہہ دیجئے کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں (بذات خود) غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں نہیں پیروی کرتا مگر اس کی جو میری طرف وحی ہو۔ کہیے کہ کیا برابر ہے اندھا اور آنکھوں والا؟! کیوں غور وفکر سے کام نہیں لیتے ہو"۔

رسول کو جو کچھ اقتدار ہوتا ہے، وہ منجانب اللہ ہوتا ہے اور جو جو کچھ علم غیب ہوتا ہے، وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے [3] اور جو غیب کی باتیں ایسی ہوں جنہیں اللہ نے اپنے سے مخصوص قرار دیا ہے تو ان کا علم غیر اللہ کو نہیں ہوسکتا [4]۔

ذاتاً پیغمبر کے قبضہ میں کچھ نہیں اور نہ بذات خود علم غیب ہے۔ اسی کی نفی ہوئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ میں معاذ اللہ، اللہ کا مدمقابل نہیں ہوں کہ بغیر اس کی مرضی کے کوئی معجزہ دکھا سکوں۔ [5]

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۵۱

"اور ڈراؤ اس کے ذریعہ سے [6] ان کو جو اندیشہ رکھتے ہیں اس کا کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف محشور ہوں گے۔ نہ

---

[1] ۔ کما یحزن اھل النار (مجمع البیان)

[2] ۔ یصیبھم العذاب (مجمع البیان)

[3] ۔ انما اعلم قدر ما یعلمنی اللہ تعالیٰ (مجمع البیان)

[4] ۔ لا اعلم الغیب الذی یختص بعلم اللہ تعالیٰ (تبیان)

[5] ۔ انی لا ادعی الربوبیۃ موانا ادعی النبوۃ (مجمع)

[6] ۔ ای بالقرآن ... وقیل باللہ (مجمع البیان)

ہوگا ان کا اس کے سوا کوئی سرپرست اور نہ سفارشی۔ شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں''۔

''جو آخرت کا اندیشہ رکھتے ہیں'' ان کا اندیشہ انجام بخیر ہونے کی وجہ سے نتیجتاً امید ثابت ہوگا، اس لئے ہماری قدیم تفسیر میں یخافون کے معنی آئے ہیں: یرجون یعنی امید رکھتے ہیں[1] ورنہ فعلی حیثیت سے خوف، رجاء کے مقابل کی چیز ہے اور مومن کی شان یہ ہے کہ وہ خوف اور امید دونوں جوہروں کا حامل ہو جیسا کہ حدیث میں ہے:۔ الایمان نصفان نصف خوف و نصف رجاء۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

''اور انہیں پاس سے دھتکار یئے نہیں جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں کہ اس کی رضا کے طلب گار ہیں۔ آپ پر ان کے حساب کتاب کی کچھ ذمہ داری نہیں ہے، نہ آپ کے حساب کتاب کی ذمہ داری کچھ ان پر ہے، جو آپ انہیں دھتکار دیں تو ہو جائیں گے ظالموں میں سے''۔

رئیسوں کے ذہنیت کے مقابلہ میں غریبوں کی دل جوئی

طبقۂ رؤسا کی ایک ذہنیت یہ ہے کہ غریبوں کے پاس بیٹھنا اٹھنا یا ان کے حلقہ میں رہنا اپنے لئے کسر شان اور باعثِ عار سمجھتے ہیں چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام سے خطاب کر کے قرآن مجید میں ان کا کہنا درج ہے کہ:

اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ:

کیا ہم آپ پر ایمان لائیں حالانکہ آپ کے پیرو ہوئے ہیں بہت کم درجہ کے لوگ۔ (شعراء:۱۱۱)

اس طرح پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بعض رؤسائے عرب کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ غریب مسلمانوں کو اپنے پاس بیٹھنے نہ دیا کریں[2] اس کے جواب میں یہ آیت اتری۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود معاذ اللہ ایسا کرنا چاہتے تھے[3] بلکہ اس قسم کے سخت الفاظ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قسم کے کام سے روکنا ان لوگوں کی زبان بند کرنے کے لئے تھا جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قسم کا کردار اختیار کرنے کے متقاضی تھے۔ اس کے لئے کبھی اسے یوں صرف ممانعت کے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور کبھی اس طرح کہ:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ:

اگر آپ دنیا کے بہت سے آدمیوں کی خواہشوں پر چلنے لگے تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے ہٹا دیں گے۔ (انعام:۱۱۶)

---

[1] ۔ یخافون ای یرجون (علی بن ابراھیم)

[2] ۔ سبب نزول ھٰذہ الآیۃ ماروا ہ ابن مسعود وغیرہ ان ملائن قریش و قال الظرامن الکفار منھم عینیۃ بن حصین قالوا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لو نھیت ھؤلاء عنك لافاك اشراف قومك واسلموا (تبیان)

[3] ۔ کما قال تعالیٰ: لئن اشرکت لیحبطن عملك وان کان الشرك مأمونا منہ (تبیان)

اور بعض جگہ تمثیلی انداز میں اس قسم کے کردار کی تصویر کشی کر کے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے جیسے سورۂ عبس میں ہے جس کی تشریح اپنے محل پر آئے گی چنانچہ وہاں بھی یہ تصور غلط ہے کہ معاذ اللہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ کردار ظہور میں آیا تھا۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔

وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے کچھ لوگوں کی آزمائش کی ہے کچھ کے ذریعہ سے تاکہ وہ کہیں کہ کیا یہ وہ ہیں جن کو ہم میں سے اللہ نے اپنے احسان سے نوازا ہے؟ کیا اللہ شکر گزاروں کا بہترین جاننے والا نہیں ہے؟!''

رئیسوں کا یہ مطالبہ کہ غریبوں کو اپنے پاس سے نکال دیجئے، یہ بھی ایک طرح کے حسد کا نتیجہ ہے یعنی وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان غریبوں نے جو رتبہ حاصل کر لیا ہے وہ ہمیں حاصل نہیں ہے۔ اسی کو کہا جا رہا ہے کہ اس جذبۂ حسد ہی کی وجہ سے مختلف اشخاص میں ایک، دوسرے کے لئے ذریعۂ آزمائش بن جاتا ہے [1]۔

وہ بطور رشک یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا یہ انعام ان غریبوں کے شامل حال کیوں ہوا ہے؟ یہ ان کا کہنا اللہ کا کوئی مطلوبہ مقصد نہیں ہے مگر چونکہ اس امتحان کے نتیجہ میں ہوتا یہی ہے، اس لئے کہا گیا کہ ہم اس طرح آزمائش کرتے ہیں تاکہ وہ یوں کہیں۔ [2]

اس کا جواب آخر کے جملہ سے دیا گیا ہے کہ اسے کیا کیا جائے کہ ان غریبوں نے ہی بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعمت کی قدر کی اور شکر گزار ثابت ہوئے اور تم رئیسوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی، ناشکرے ثابت ہوئے تو کیا اللہ شکر گزاروں کو کوئی صلہ نہ دے اور اب تم ناشکروں کی خاطر سے انہیں نظر انداز کر دے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔

دوسری طرح اس کی تشریح یوں ہوئی ہے کہ دولت اور غربت کوئی معیار بلند و پستی نہیں ہے۔ یہ دونوں امتحان کے طریقے ہیں۔ مالداروں کا امتحان غریبوں کے ذریعہ سے ہے کہ وہ ان کے ساتھ کیسی ہمدردی کرتے ہیں اور غریبوں کا امتحان مالداروں کے ذریعہ سے ہے کہ وہ کس طرح ان سے بے نیازی اختیار کرتے ہیں۔ پھر یہ انہی غریبوں میں سے کچھ افراد کا کردار ہے (جو امتحان میں ناکام ہیں) کہ وہ مالداروں پر رشک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی نعمتیں سب انہی سے مخصوص ہو گئی ہیں؟! [3]

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾

---

[1] ۔ ابتلینا ھٰذا الرؤساء من قریش بالموالی (مجمع البیان)

[2] ۔ فلیس المراد باللام لام الغرض ... لکن اللام لام العاقبة (تبیان)

[3] ۔ یقولوا ای الفقراء اھؤلاء الاغنیآء من اللہ علیھم من بیننا (علی بن ابراھیم)

''اور جب آپ کے پاس آئیں وہ جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے ہیں تو کہیے سلامٌ علیکم [1] تمہارے پروردگار نے اپنے ذمہ رحمت کو عائد کرلیا [2] کہ جو تم میں سے کوئی برائی ناواقفیت سے کرے، پھر اس کے بعد توبہ کرلے اور ٹھیک اعمال کرے تو وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

قرآن نے صاف طریقۂ سلام سکھایا ہے: سلامٌ علیکم.....

اس صورت میں کتنی بڑی جہالت ہے کہ مسلمانوں کا ایک طبقہ سلامٌ علیکم کہنے سے گریز کرتا ہے اور وہ السلام علیکم کا پابند ہو گیا ہے۔ حالانکہ ازروئے قرآن، یہ دونوں ہی طریقے صحیح ثابت ہو رہے ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾

''اور اسی طرح ہم اپنی باتوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور تاکہ مجرموں کا راستہ صاف طور پر سمجھ میں آجائے'' [3]

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

''کہہ دیجئے کہ مجھے اس سے ممانعت ہوئی ہے کہ میں عبادت کروں ان کی جنہیں تم اللہ کے سوا خدا کہہ کے پکارتے ہو [4] کہیے کہ میں تمہارے دل بخواہ خیالات کی پیروی نہیں کروں گا۔ اس صورت میں تو میں گمراہ ہو جاؤں گا اور منزل تک پہنچنے والوں میں نہیں ہوں گا''۔

''اھوآء'' یعنی ''دل بخواہ خیالات'' کے لفظ نے ان کی ہم رنگی سے انکار کی وجہ ظاہر کردی کہ تمہاری یہ عبادتیں اپنی صحت کی کوئی سند نہیں رکھتیں [5] ان کا ''اھواء'' یعنی ''ایجاد بندہ'' کی حیثیت رکھنا ہی خود ان کے بطلان کی دلیل ہے۔

قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۸﴾

---

[1] ۔بگو سلام علیکم (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔یعنی اوجب الرحمۃ لمن تاب والدلیل علیٰ ذلك قولہ: انہ من عمل منکم سوء بجھالۃ (علی بن ابراھیم)

[3] ۔ای لیظھر طریق من عاند بعد البیان...لیجانبوھا ویسلکو غیرھا (مجمع البیان)

[4] ۔الاوثان التی تعبدونھا من دون اللہ وتدعونھا الھۃ (تبیان)

[5] ۔ای انما عبدتموھا علیٰ طریق الھویٰ لا علیٰ طریق البینۃ والبرھان (مجمع البیان)

''کہہ دیجئے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف سے کھلی ہوئی دلیل پر قائم ہوں[1] اور تم نے اسے جھٹلایا ہے۔ میرے پاس وہ نہیں ہے جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو۔ فیصلہ کا اختیار نہیں ہے مگر اللہ کو۔ وہ حق باتیں بیان کرتا ہے اور بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دیجئے کہ اگر میرے قبضہ میں ہوتا وہ جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو تو فیصلہ ہو چکتا میرے اور تمہارے درمیان اور اللہ ظالموں کا بہترین جاننے والا ہے۔''

''جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو''۔ یعنی عذاب الٰہی جیسا کہ دوسری جگہ ہے:

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وہ آپ سے عذاب کے لئے جلدی کرتے ہیں۔ (عنکبوت: ۵۴)

یہ ''جلدی کرنا'' ان کا واقعی عذاب کی خبروں کو صحیح سمجھ کر تھوڑی ہوتا تھا بلکہ چونکہ وہ منکر تھے اور اسے بے اصل سمجھتے تھے، اس لئے کہتے تھے کہ اگر ہمارے اعمال جیسا کہ تم کہتے ہو، عذاب ہی کے مستوجب ہیں تو تم ہم پر عذاب نازل کیوں نہیں کر دیتے؟! اس کا جواب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی یہاں اس انداز میں دیا جا رہا ہے۔

اس جواب میں جو الفاظ صرف کئے گئے ہیں، وہ عام انسانی فطرت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ جلد باز اور اپنے مخالف کے خلاف مشتعل ہونے والا اور جذبۂ انتقام سے کام لینے والا ہوتا ہے تو اگر معاملہ اس کے ہاتھ میں ہوتو وہ ایک دم اپنے مخالفین کو تہس نہس کر دے مگر یہ اللہ ہے جو حکیم ہونے کی بنا پر حلیم ہے اور وہ اپنے بندوں کو طویل مہلتیں دیتا رہتا ہے تا کہ اصلاح کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے اور حجت تمام ہو۔

اب جو بندے بھی مرضی الٰہی کے انتہائی پابند ہیں، وہ خالق کے اس حلم کی بنا پر خود بھی تحمل سے کام لیتے ہیں جیسا کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مخالفوں کے لئے بددعا کے بجائے، خود بارگاہ الٰہی میں ان کی طرف سے معذرت فرماتے تھے کہ رَبِّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ یہ اللہ کی ربوبیت کے زیر سایہ اس کی عبودیت کا حق ادا کرنا تھا اور اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ یہ قول کہ ''اگر معاملہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو کب کا فیصلہ ہو جاتا'' یہ آپ کے مخصوص درجۂ عبودیت سے قطع نظر کرتے ہوئے عام فطرت بشری کا اظہار ہی ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾

''اور اس کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی جنہیں سوا اس کے کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے اسے کہ جو خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے اور نہ کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں اور نہ تر اور نہ خشک مگر یہ کہ وہ ایک روشن نوشتہ میں موجود ہے''۔

خالق کے علم کی ہمہ گیری

---

[1] ۔ علیٰ مرتین من معرفة الله وصحة نبوته لا متبع للهویٰ (تبیان)

یہ خداوند عالم کی وسعت علم کا بیان ہے اور اسی سیاق میں: ''وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ'' مبین کا جملہ ہے جس کا نمایاں مفہوم علم الٰہی ہے جو لوح محفوظ میں ثبت مانا جاتا ہے [1]

جناب شیخ طوسیؒ نے ان دونوں کا الگ الگ بطور دو احتمالوں کے ذکر کیا ہے [2]

مگر عام طور سے یہ فقرہ مستقل آیت کے طور پر اس مضمون کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔ ابھی تک اس کا ماخذ میرے علم میں نہیں ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٠﴾

''اور وہ وہ ہے جو رات کے وقت تمہاری روح کو لے لیتا ہے اور جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے [3] اسے جانتا ہے۔ پھر تمہیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ (زندگی کی) مقررہ مدت پوری ہو [4] پھر اسی کی طرف تمہارا پلٹنا ہوگا۔ پھر وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کرتے تھے۔''

پہلے آچکا ہے کہ تَوَفّی کے معنی موت کے نہیں ہیں چنانچہ یہاں یہ لفظ رات کی نیند کے لئے صرف ہوا ہے کہ اس میں بھی ایک طرح سے انسان کی روح کو اس عالم سے اٹھالیا جاتا ہے۔ [5]

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿٦١﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ڮ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿٦٢﴾

''اور وہ اپنے بندوں پر پورا قابو رکھتا ہے اور تم پر نگہبانوں کو بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی ایک کو رات کا ہنگام آتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اس کی روح قبض کرتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر وہ پلٹائے جاتے ہیں اللہ کی طرف جو ان کا حقیقی مالک ہے بلاشبہ اس کے لئے فیصلہ کرتا ہے اور وہ تیز ترین حساب

---

[1] ۔ فی کتب مبین ھو اللوح المحفوظ (جلالین) ای فی اللوح المحفوظ (مجمع البیان)

[2] ۔ یحتمل امرین: احدھما ان یکون معناہ فی علم اللہ ...وثانیھا ... ان یکون اللہ تعالیٰ اثبت ذٰلك فی کتاب قبل ان یخلق (تبیان)

[3] ۔ کسبتم یقال فلان جارحۃ اھلہ ای کاسبھم (تبیان)

[4] ۔ ای لتستوفوا اٰجالکم (مجمع البیان) ھو الموت (علی بن ابراھیم)

[5] ۔ یقبض ارواحکم عند النوم (جلالین) قبض روح شما می کند بشب (شاہ ولی اللہ)

کرنے والا ہے''۔

نگہبانوں سے مراد کاتبانِ اعمال ہیں[1] اور ایک تفسیر کے مطابق یہ لفظ عام ہے۔اس میں وہ فرشتے بھی داخل ہیں جو آفات وبلّیات سے خود انسان کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ بھی جو اس کے اعمال کو قلم بند کر کے محفوظ کرتے ہیں۔[2]

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٣﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٦٤﴾

''کہیے کہ کون تمہیں چھٹکارا دیتا ہے بیابان اور دریا کے اندھیروں سے[3] کہ تم اسے پکارتے ہو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے، اگر اس سے ہمیں وہ چھٹکارا دیدے تو ہم شکر گزاروں میں سے ہوں گے کہئے کہ اللہ تمہیں ان سے اور ہر طرح کی تکلیف سے چھٹکارا دیا ہی کرتا ہے۔پھر بھی تم شرک اختیار کرتے ہو''۔

''اندھیروں'' سے چھٹکارا دینے کے معنی ہیں ''سخت اور ہولناک تکالیف'' سے نجات دینا جو عرب کے عام محاورہ کے مطابق ہے[4]

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾

''کہیے وہ یہ قدرت رکھتا ہے کہ تم پر عذاب بھیجے تمہارے اوپر سے یا تمہارے پیروں کے نیچے سے یا تمہیں مختلف گروہوں کی صورت میں کر کے دست وگریبان کر دے اور تم میں سے بعض کو بعض کی سختی کا مزہ چکھائے۔دیکھئے ہم کس طرح حقیقتوں کو طرح طرح سے پیش کرتے ہیں، شاید کہ وہ سمجھیں''۔

''اوپر سے یا نیچے سے'' اس سے بظاہر تو وہ عذاب مراد ہیں جو آسمان کی طرف سے آتے ہیں[5] یا جو زمین کی طرف سے آتے ہیں[6] اور یہ بلاشبہ وہ حوادث ہیں جو اللہ کی طرف سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔لیکن ایک تفسیر اس کی یہ ہوئی ہے ''اوپر سے عذاب'' سے مراد کسی حاکم جابر

---

[1] ۔یعنی یرسل علیکم ملائکة یحفظون۔اعمالکم ویحصونها علیکم ویکتبونها (تبیان) ملائکة تحصی اعمالکم (جلالین)

[2] ۔یعنی الملائکة الذین یحفظونکم ویحفظون اعمالکم (علی بن ابراهیم)

[3] ۔ظلمات البرّ والبحر اهوالها فی اسفارکم (جلالین)

[4] ۔یقول العرب للیوم الذی یلقی فیه الشدّة یوم مظلم (تبیان)

[5] ۔کالحجارة والصیحة (جلالین)

[6] ۔کالخسف (جلالین)

کے ہاتھوں پہنچنے والے مظالم اور نیچے سے عذاب کے معنی ہیں کمینے افراد کے ہاتھوں پہنچنے والی تکالیف [1]

اس صورت میں یہ اور نیز اس کے بعد جو ہے یعنی مختلف گروہوں کو دست وگریبان کرنا جیسا فرقہ وارانہ فسادات میں ہوتا ہے [2] یہ براہ راست اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ وہ اشخاص بطور خود یہ امور انجام دیتے ہیں اور خداوند عالم اپنی قوت قاہرہ سے ان کے ارادوں میں سدراہ نہیں ہوتا اور نہ اپنی توفیق خاص سے وہ ایسا سامان کرتا ہے کہ وہ اس سے باز آجائیں بلکہ انہیں یہ سب باتیں کرنے دیتا ہے [3] جو کبھی اولیائے الٰہی کے لئے بطور امتحان ہوتا ہے اور کبھی یہ اس قوم کے لئے ایک عذاب کی صورت سے ہوتا ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۫ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

''اور آپ کی قوم نے اس کو جھٹلایا حالانکہ وہ حق ہے۔ کہہ دیجئے کہ میں تمہارا ٹھیکے دار نہیں ہوں [4] ہر چیز کی ایک مقررہ میعاد ہے اور عنقریب تمہیں معلوم ہوگا۔''

''میں تمہارا ٹھیکے دار نہیں ہوں''.....اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا کام تو بس تبلیغ کر دینا ہے۔ اب تم مانتے ہو یا نہیں مانتے ہو، اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔

''ہر چیز کی ایک مقررہ میعاد ہے'' یعنی عذاب کی جو خبر تم کو دی گئی ہے وہ ابھی پوری نہیں ہوئی تو یہ نہ سمجھو کہ بات ٹل گئی۔ نہیں جو کہا گیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی اس کا وقت جو حکمتِ الٰہیہ کے تقاضا سے مقرر ہوا ہے، آیا نہیں۔ [5]

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۸﴾

''اور جب دیکھو ان لوگوں کو جو ہماری آیتوں کے بارے میں نکتہ چینی میں مصروف ہیں تو ان سے بے توجہی اختیار کرو جب تک کہ وہ کسی اور بات چیت میں مصروف نہ ہو جائیں، اور اگر کبھی شیطان بھلاوے میں ڈال دے تو یاد آنے کے بعد پھر ظالم جماعت کے ساتھ نہ بیٹھو۔''

اس آیت میں تخاطب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ماننا ضروری نہیں اکثر جگہ اس قسم کے واحد کے جو صیغے ہیں، ان میں مخاطب غیر معین مراد ہوتا

---

[1] ۔من فوقکم قال السلطان الجابرُ ممن تحت ارجلکم قال السفلة ومن لا خیر فیه (علی بن ابراهیم)

[2] ۔ای یخلطکم فرقا مختلفی الاهْوٰلاء وقیل عُنِی به یضرب بعضکم ببعض وهو المروی عن ابی عبدالله علیہ السلام (مجمع البیان)

[3] ۔بان یکلمهم الی انفسهم ولا یلطف لهم (تبیان)

[4] ۔الو کیل علی الشئ هو القائم بحفظه والذی یدفع الضرر عنه (مجمع البیان)

[5] ۔وقته الذی یعلمون فیه صحة ما وعدهم به وحقیقة اما فی الدنیا واما فی الاٰخرة (تبیان)

ہے یعنی کوئی بھی ہو، اس کو یہی کرنا چاہیے۔

ایسی صحبتوں میں جہاں حقائق دینی کا مذاق اڑایا جارہا ہو حتی الامکان شریک نہیں ہونا چاہیے۔

آخری فقرہ کا مطلب ظاہر الفاظ سے وہی نکلتا ہے جس کے مطابق میں نے ترجمہ کیا ہے کہ ایک دفعہ بھولے سے ایسا ہو جائے [1] تو پھر یاد آنے کے بعد دوبارہ ایسا نہ کرو اور اس مجمع میں شریک نہ ہو لیکن اس کا دوسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ:

''اگر خطرہ ہو کہ باتوں میں مشغول ہو کر سرکنا بھول جائے تو سوائے نصیحت کے وقت ان میں بیٹھنا موقوف کرے۔''.....(موضح القرآن)

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ''اَمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ'' ''اگر شیطان تمہیں بھلا دے'' کا مطلب نہیں۔ اس کے لئے تو یہ لفظ چاہیے تھے کہ:

ان خفت ان ینسیك الشیطان ''اگر تمہیں ڈر ہو کہ شیطان تمہیں بھلا دے گا''۔ مگر قرآن کے الفاظ یہ نہیں ہیں۔

جو لفظ قرآن مجید میں ہیں، ان کا مطلب وہی ہوتا ہے جو ہم نے درج کیا ہے۔

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٦٩﴾

''اور جو پرہیز گاری اختیار کرتے ہیں، ان پر ان کا حساب کتاب کچھ نہیں ہے مگر نصیحت کرنا ہے، شاید کہ وہ بھی پرہیز گاری اختیار کریں''۔

مطلب یہ ہے کہ کفار اپنے اعمال کے خود جوابدہ ہیں۔ مسلمانوں پر ان کی ذمہ داری کچھ نہیں ہے [2] ہاں نصیحت کرنا فرض ہے۔ عمل کریں یا نہ کریں یہ ان کا کام ہے۔

ایک روایت میں وارد ہوا ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے کہ جب سابق آیت نازل ہوئی کہ مشرکین جب اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا مسلمانوں پر نکتہ چینی میں مصروف ہوں تو ان کے پاس نہ بیٹھو اور ان کی باتیں سننے سے پرہیز کرو تو مسلمانوں نے کہا کہ وہ تو ہر وقت ہی ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں تو اب ہم مسجد الحرام جا کر کعبہ کا طواف ہی ترک کر دیں تو اس کے جواب میں یہ کہا جارہا ہے کہ نہیں تم اپنے کام سے اپنی عبادت کے لئے وہاں گئے ہو تو وہ جو باتیں کرتے رہیں، اس کی ذمہ داری تم پر تھوڑی ہوگی مگر خاص طور پر ان باتوں سے دلچسپی نہ لو اور موقع ہو تو سمجھا دو کہ اس قسم کی باتیں اچھی نہیں ہیں۔ [3]

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ

---

[1] ۔ای انساك الشیطان ذٰلك (تبیان)

[2] ۔نیست بر کسانیکه پرهیز گاری کردند از حساب کافران چیزی (شاه ولی الله)

[3] ۔قال ابو جعفر علیہ السلام لما نزلت: فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظالمین، قال المسلمون کیف نصنع۔ فلا ندخل المسجد الحرام لا نطوف بالبیت الحرام فانزل الله: وما علی الذین یتقون (تبیان)

تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۚ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝

''اور چھوڑ وانہیں کہ جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تفریح بنالیا اور دھوکے فریب میں مبتلا کر رکھا انہیں دنیوی زندگی نے [1] اور ان کو اس کے ذریعہ سے [2] نصیحت کرتے رہو تا کہ بے بسی کے ساتھ مبتلائے ہلاکت نہ ہوا [3] کوئی اپنے افعال سے درحالیکہ نہ ہوگا اس کے لئے اللہ کو چھوڑ کر کوئی مالک اور نہ سفارشی اور اگر ہر طرح کا معاوضہ دینا چاہے تو بھی وہ اس سے نہیں لیا جائے گا۔ یہ ہے عالم ان لوگوں کا جو بے بسی کے ساتھ ہلاک ہوئے ان اعمال کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے کہ ان کے لئے کھولتا ہوا گرم پانی پینے کو ہوگا اور دردناک عذاب اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے۔''

''تا کہ بے بسی کے ساتھ مبتلائے ہلاکت نہ ہو''۔ یعنی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے تبلیغ ہوتے رہنے کا مقصد یہ ہے کہ خلق خدا کی طرف سے پیش خدا یہ حجت پیش نہ ہو سکے کہ ہم بے بس تھے [4] ہمیں تعلیمات الٰہیہ کا علم ہی نہ تھا ہم کو کسی نے ہدایت نہیں کی یعنی جاہل قاصر تھے جو معذور ہوا کرتا ہے۔ اس لئے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ضروری ہے کہ وہ ہر ایک کو متنبہ کرتے رہیں تا کہ اب جو مخالفت کرے، وہ جان بوجھ کر یا اگر کوئی تساہل سے کام لے کر ان کی آواز کو سنے ہی نہ تو جاہل مقصر ہو جو معذور نہیں ہے جس کا بعد میں ذکر ہے کہ یہ بے بسی کے ساتھ ہلاک ہونے کے مستحق ہی ہیں اپنی بدکرداری اور کفر پر اصرار اور عناد کی وجہ سے۔

تو پہلی جگہ جو ''بے بسی'' کا ذکر تھا، وہ مخالفت میں بے بسی تھی لاعلمی کی وجہ سے اور دوسری جگہ سزا اٹھانے میں بے بسی ہے، اس معنی سے جس کی تفصیل درج ہوئی ہے کہ نہ مددگار ہے، نہ سفارشی، نہ کوئی رشوت چل سکتی ہے اور نہ مال و دولت کام آ سکتا ہے۔ یہ بے بسی وہ ہے جو اپنے اعمال کا خمیازہ ہے، اس لئے وہ انسان کو قابل رحم نہیں قرار دیتی۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۡ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ۭ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

---

[1] ۔یعنی بہ اغتروا بحیوتہم (مجمع البیان)

[2] ۔ای عظ بالقرآن وقیل بیوم الدین وقیل بالحساب (مجمع)

[3] ۔لکی لا تبسل ... ای تدفع الی الھلکۃ علیٰ وجہ الغفلۃ وتسلم لعملھا غیر قادرۃ علی التخلص (تبیان)

[4] ۔المبسل المستسلم الذی یعلم انہ لا یقدر علی التخلص (مجمع البیان)

''کہیے کہ کیا ہم خدا کہہ کے پکاریں اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو جو نہ ہمیں نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ ہمیں نقصان پہنچا سکتی ہیں اور اپنے پچھلے پیروں پلٹیں [1] بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں صحیح راستے پر لگا دیا، اس آدمی کی طرح جسے بھوت پریت زمین میں حیران و سرگردان پھرائیں درآنحالیکہ اس کے کچھ ساتھی ایسے ہوں جو اسے ٹھیک راستے کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہماری طرف آؤ۔ کہہ دیجئے کہ اصل ہدایت اللہ کی ہدایت ہے اور ہم اس پر مامور ہیں کہ اللہ کے سامنے سر جھکائیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور یہ کہ [2] نماز ادا کرتے رہو اور اس کی نافرمانی سے بچتے رہو اور وہی وہ ہے جس کی طرف تم سمٹ کر جاؤ گے''۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَیَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ ۚ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴿۷۳﴾

''اور وہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا بالکل صحیح [3] اور جس دن وہ کہے گا ''ہوجا'' تو وہ سب (پھر) ہوجائے گا۔ اس کی بات درست ہے اور اس کا اقتدار ہوگا جس دن صور پھونکا جائے گا، وہ ان دیکھی اور دیکھی سب باتوں کا جاننے والا ہے اور وہ صحیح کام کرنے والا ہے بڑا باخبر''۔

اصطلاح قرآنی ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جو باتیں نظام عادت کے مطابق تدریجی طور پر وقوع میں آتی ہیں انہیں ''خلق'' کہا جاتا ہے اور جو باتیں قدرت الٰہی کے مظاہرہ کے طور پر ایک دم ہوتی ہیں، انہیں ''كُنْ فَیَكُوْنُ'' کے تحت میں لایا جاتا ہے یعنی خالق نے کہا ''ہوجا'' وہ ہوگئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیز بس اشارۂ قدرت سے وقوع میں آتی ہے۔ اس میں تدریجی اسباب والا نظام کارفرما نہیں ہے۔

ابتداء میں آفرینش اشیاء کی عموماً نظام اسباب کے ساتھ ہوئی ہے اس لئے یہ کہا گیا کہ آسمانوں اور زمین کو خلق کیا اور قیامت میں سب کو زندہ کرنا دوبارہ، یہ نظام امر کے ماتحت ہوگا۔ یعنی صرف اشارۂ قدرت سے۔ اس لئے اسے یوں کہا جا رہا ہے کہ وہ دن جب وہ کہے گا، ہوجا اور سب کچھ ہوجائے گا۔ [4]

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۷۴﴾

''اور جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آذرؔ سے کہ کیا تم کچھ بتوں کو خدا بناتے ہو؟ میں تمہیں اور تمہاری قوم والوں کو

---

[1] ۔ ان رجع عن ديننا الذی هو خير الاديان (مجمع البيان)

[2] ۔ هٰذه الاٰية موصولة بالتی قبلها ای امرنا لنسلم لرب العٰلمين وقيل لنا اقيمو الصلوٰة (تبيان)

[3] ۔ خلقها حق وصوابا لا باطل وخطاء (مجمع البيان)

[4] ۔ يوم يقول للشئ كن فيكون هو يوم القيمة (جلالين)

کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں''۔

جناب ابراہیم علیہ السلام کے والد کون؟ آذر یا تارخ؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل باپ کا نام تارخ تھا اور وہ موحّد تھے مگر ان کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بچپن میں انتقال ہو گیا، اس لئے ان کے ایک خاندانی عزیز [1] آذر نے ان کی پرورش کی تھی جس کو پرورش کی بنا پر وہ باپ کہہ کر پکارتے تھے۔

قرآن میں جتنی باتیں ''باپ'' کہہ کر درج کی گئی ہیں، وہ سب اسی آذر سے متعلق ہیں، تارخ سے نہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد تھے۔ اہل سنت جو کہ انبیاء و مرسلین کے آباؤ اجداد کے لئے موحّد ہونا ضروری نہیں سمجھتے وہ بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے کہ ابراہیمؑ کے باپ تارخ تھے مگر وہ خواہ مخواہ ان کی شخصیت کو آذر کے ساتھ مدغم کر کے کہتے ہیں کہ انہی تارخ کو آذر بھی کہا جاتا ہے [2]

حالانکہ یہ خیال غلط ہے اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

فرقہ حقہ امامیہ کا اجماع اس پر ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤ اجداد میں سے کوئی ایک فرد بھی کافر و مشرک نہیں تھا [3]

اسی لئے جناب ابراہیم علیہ السلام کے باپ کو جو حقیقتاً ان کے والد ہوں، ہم کافر و مشرک ماننے سے قاصر ہیں، جب کہ قرآن مجید میں باپ کہہ کے جو نام درج ہے، وہ بالاجماع جناب ابراہیم علیہ السلام کے والد بزرگوار کا نام نہیں ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷۶﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿۷۷﴾ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾

''اور اسی طرح ہم دکھا رہے تھے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی قلم و سلطنت [4] اور یہ اس لئے کہ وہ یقین رکھنے

---

[1] ۔ کان جدّہ لامّہ او عمّہ (تبیان)

[2] ۔ ادر ھو لقبہ و اسمہ تارخ (جلالین)

[3] ۔ وقد ثبت ان اجماعھا حجۃ لدخول المعصوم فیھا (تبیان)

[4] ۔ ملك آسمانہا و زمین (شاہ ولی اللہ) عجائبات آسمانوں اور زمین کے (رفیع الدین)

والوں میں سے ہوں تو جب رات کی تاریکی ان پر چھائی، انہوں نے ایک تارا دیکھا کہا ''یہ میرا پروردگار ہے تو جب وہ ڈوب گیا، کہا میں ڈوبنے والوں کو دوست نہیں رکھتا پھر جب چاند کو چمکتے دیکھا کہا یہ میرا پروردگار ہے تو جب وہ ڈوب گیا، کہا اگر میرا پروردگار مجھے سیدھے راستے پر نہ رکھے تو میں گمراہ لوگوں میں ہو جاؤں پھر جب سورج کو چمکتے دیکھا کہا یہ میرا پروردگار ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے تو جب وہ ڈوب گیا، کہا اے میری قوم والو! یقیناً میں بَری ہوں اس سے جو تم شرک کرتے ہو۔ میں یقیناً اپنا رخ موڑے ہوئے ہوں، اس کی طرف جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے، باقی سب طرف سے ہٹ کر اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''

عام مفسرین نے اس سب کو ایک واقعہ کی صورت میں فرض کیا ہے کہ یوں ہوا اور یوں کہا اور یہ ہوا اور یہ کہا اور اس لئے اہل سنت کے یہاں یہ حدیث بھی آ گئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام معاذ اللہ تین جھوٹ بولے، حالانکہ صورت حال پر غور کیجئے جو قرآن سے ظاہر ہے: رات ہوئی، ستارہ دیکھا کہا یہ میرا پروردگار ہے، یہ کن سے کہا جا سکتا ہے؟ ان سے جو ستارہ پرست ہوں۔

جب وہ غروب کر گیا۔ یہ غروب اسی وقت تھوڑی ہوتا ہے۔ کوئی ستارہ نصف شب کو غروب ہوتا ہے۔ کوئی صبح کو غروب ہوتا ہے تو وہ مجمع جس کے سامنے هٰذا ربی کہا تھا، کیا بیٹھا رہا جواب غروب کے وقت ان سے کہا: لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ میں ڈوبنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

پھر جب چاند نکلا، ظاہر ہے کہ اب یہ اس رات کی بات نہیں ہے۔ اب یہ چاند کے طلوع کی بات دوسری رات کی ہوگی۔ اب یہاں ماہتاب پرست سامنے ہیں، ان سے کہہ رہے ہیں کہ یہ میرا پروردگار ہے جب اس نے غروب کیا۔ وہ کیا اسی وقت غروب ہو گیا؟ ظاہر ہے کہ وہ آخر شب تک کسی وقت میں غروب ہوگا تو اب ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ میرا پروردگار میری ہدایت نہ کرے تو میں گمراہوں میں سے ہوں۔

اب جب سورج نکلا۔ یہ صبح کو نکلے گا۔ اب مجمع اس وقت آفتاب پرستوں کا ہے تو کہا یہ میرا رب ہے یہ سب میں بڑا ہے۔ جب یہ ڈوبا تو اب فقط ان سے نہیں کہا کہ میں ایسے ڈوبنے والے کو دوست نہیں رکھتا بلکہ اب ستارہ پرستوں، مہتاب پرستوں اور آفتاب پرستوں، سب ہی کو مخاطب کر کے ان سب کے معبودوں کی نفی کی کہ اے قوم! میں اس پروردگار کی طرف رخ کئے ہوں جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا توحید پر استدلال اجرام سماویہ کی الوہیت کی نفی اور الٰہ حق کا اثبات

تو اگر یہ کوئی ایک واقعہ ہو تو ماننا چاہیے کہ یہ ایک کوئی بڑی کانفرنس ہوئی جس میں ستارہ پرست بھی جمع ہوئے ہوں، ماہتاب پرست بھی جمع ہوئے ہوں اور آفتاب پرست بھی اور یہ کانفرنس اول شب سے شروع ہوئی اور تمام مجمع بندھا ہوا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے بیٹھا رہا، جس کے نتیجہ میں وہ ستارہ کے غروب کے وقت وہ جملہ فرمائیں اور پھر بھی ابھی یہ کانفرنس اکھٹا رہی اس انتظار میں کہ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کیا کہتے ہیں اور ایک دن گزر کر دوسری رات آ گئی اور اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہتاب پرستوں سے کہا هٰذا ربی اور پھر سکوت چھا گیا اور کانفرس اب اس کے انجام کو دیکھنے کے لئے بیٹھی رہی اور پھر اس کے غروب کے وقت انہوں نے اس کی رد کو مکمل کیا اور اب بھی کانفرنس صبح کے انتظار میں بیٹھی رہی یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سورج کو دیکھا اور پکار کر ذرا زور سے اس کی ربوبیت کا اعلان کیا لیکن کانفرنس اب بھی جمی رہی اور اب اس کے غروب کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سب کے مزعومات کی مشترکہ طور پر رد کر کے ان کے تمام مشرکانہ نظریات کے بطلان کا اعلان کرتے ہوئے توحید کامل کے ثبوت پر یہ کانفرنس برخواست کی۔

کیا ایسی کسی کانفرنس کا ہونا عقل میں آنے کی بات ہے؟

پھر آخر اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے عقل سے کام کیوں نہیں لیا جاتا تا کہ سمجھ میں آئے کہ یہ کسی خاص ایک موقع کی بات کا اظہار نہیں ہے بلکہ ایک انداز ہے اس کے بیان کا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کس کس طرح معبودانِ باطل کی مدت العمر نفی کرتے رہے اور کس کس طرح انہوں نے توحید حقیقی کو ثابت کیا اور اس ذیل میں جو اقوال درج ہوئے ہیں ان میں کا کوئی قول، ضروری نہیں ہے کہ انہی الفاظ میں زبان سے نکلا ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ کبھی انہوں نے ستارہ پرستوں کے قول کو سامنے رکھ کر یوں رد کی اور کبھی مہتاب پرستوں کے قول کو ہدف نگاہ بنا کر اس طرح ابطال کیا اور پھر آفتاب پرستوں کا اس طرح جس کے نتیجہ میں توحید حق منزل ثبوت کو پہنچ گئی۔

رہ گیا سچ اور جھوٹ کا سوال تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کلام جو کسی بات کی خبر دینے کی غرض سے یعنی حکایت واقع کے قصد سے کیا گیا ہو، اس میں سچ اور جھوٹ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ نہ کہ جو مخاطب کا قول رد کرنے کے لئے ہی بطور مفروضہ زبان پر جاری کیا گیا ہو، اس کو جھوٹ کہنا ہرگز درست نہیں ہے۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾

''اور ان سے بحث کی ان کی قوم والوں نے۔ انہوں نے کہا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں بحث کرتے ہو حالانکہ اس نے خود مجھے راستہ دکھایا ہے اور میں ان چیزوں سے جنہیں تم اس کا شریک کرتے ہو نہیں ڈرتا، سوا اس کے کہ میرا پروردگار کوئی بات چاہے۔ میرا پروردگار ہر شے پر اپنے علم کے ساتھ حاوی ہے تو کیوں تم نصیحت قبول نہیں کرتے؟!'' معلوم ہوتا ہے بحث میں ان لوگوں نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ تم ہمارے بتوں کو برا کہتے ہو، دیکھنا تمہارے لئے کیا ہوتا ہے [1]؟!

اس کا جواب یہ دیا ہے کہ تمہارے معبودانِ باطل سے میں نہیں ڈرتا کچھ ہونا ہے تو وہ میرے خدا ہی کے حکم سے ہوگا۔ معبودانِ باطل کچھ نہیں کر سکتے۔

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

''اور میں بھلا ان سے جنہیں تم شریک کرتے ہو کس طرح ڈروں گا، جبکہ تم نہیں ڈرتے اس سے کہ تم نے اللہ کے

---

[1] ۔ خوّفوہ من ترک عبادۃ الھتھم (مجمع البیان)

ساتھ ایسی چیزوں کو شریک کیا ہے جن کے متعلق اس نے تمہارے پاس کوئی دلیل [1] نہیں بھیجی ہے تو دونوں فریق میں سے کون مطمئن رہنے کا زیادہ حق دار ہے؟ (اسے سمجھو) اگر تم علم و شعور رکھتے ہو، وہ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کی ملاوٹ نہیں کی۔ یہ وہ ہیں جن کے لئے امن ہے اور یہ صحیح راستے پر قائم ہیں۔''

''ایمان میں ظلم کی ملاوٹ نہیں کی۔'' اس کی تشریح اہل تفسیر نے یہ کی ہے کہ شرک اختیار نہیں کیا اس لئے کہ قرآن میں شرک کو کہا گیا ہے ظلم عظیم''، ''بہت بڑا ظلم'' [2] مگر جہاں تک میری نظر قرآن مجید کی اصطلاح پر ہے ''شرک'' کو داخل ایمان کسی درجہ پر بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے الذین امنوا کے بعد "و" کے ساتھ جو اضافہ کیا گیا ہے اس سے مراد عملی برائیاں لینا چاہئیں جنہیں گناہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اصطلاح بھی قرآن سے ثابت ہے کہ ہر گناہ داخل ظلم ہے۔ اگر وہ غیر ظلم نہیں بھی ہے تو اپنے اوپر تو ظلم ہے ہی لہٰذا استحقاق امن کی منزل پر اٰمنوا کے ساتھ (وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ) کی وہی حیثیت ہے جیسی دوسری جگہ بشارتوں کے موقع پر اٰمنوا کے ساتھ (وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) کا اضافہ جو تقریباً ہر جگہ قرآن میں موجود ہے۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝۸۳

''اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی تھی ہم جسے چاہتے ہیں درجوں میں بلندی عطا کرتے ہیں۔ یقیناً تمہارا پروردگار صحیح صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔''

یہ اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے جو پہلے ستارے اور چاند اور سورج کی الوہیت کی نفی کر کے توحید الٰہی کے ثبوت میں گزر چکا ہے [3] اور اس کے لئے یہ ضرورت نہیں ہے کہ یہ کسی ایک دفعہ کے واقعہ میں بحث ہوئی ہو اور استدلال کیا گیا ہو بلکہ پوری عمر میں مختلف معبودان باطل کے مقابلہ میں ان کا طریقۂ استدلال یہ تھا جسے خالق اپنی تعلیم خاص کا نتیجہ بتا رہا ہے۔ [4]

دوسرا احتمال یہ ہے کہ گزشتہ تمام استدلال کے طریقوں کی طرف مجموعی طور پر اشارہ ہو جن میں سے ایک وہ ستاروں اور چاند وغیرہ کے حالات سے استدلال بھی ہے۔

اب خالق تو فرما رہا ہے کہ یہ ہماری طرف کی دلیل تھی جو ہم نے ابراہیمؑ کو عطا کی اور اسے وہ ان کی خاص بلندی کا ثبوت قرار دے رہا ہے کہ جسے چاہتے ہیں ہم مرتبوں میں بلندیاں دیتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی نام نہاد حدیث کہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام معاذ اللہ تین دفعہ جھوٹ بولے تو یہ حدیث دیوار پر پھینکنے کے قابل ہوئی یا نہیں؟

---

[1] ۔سلطانا ای حجة لان السلطان هو الحجة فی اکثر القراٰن (تبیان)

[2] ۔الظلم المذکور فی الاٰیة هو الشرك عند اکثر المفسرین (تبیان) نیا میختند ایمان خود را بشرك (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔حجّتنا التی احتج بها ابرٰهیم علیٰ وحدانیة اللہ من افول الکوکب وما بعدهٗ (جلالین)

[4] ۔الحجج التی ذکرها ابرهیم لقومه اعطاها ایاه بمعنی انه هداه لرما (تبیان)

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۙ﴿۸۴﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ﴿۸۵﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۸۶﴾ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾

''اور ہم نے عطا کئے انہیں اسحٰقؑ اور یعقوبؑ، ہر ایک کو ہم نے راستہ دکھایا اور نوحؑ کو اس کے پہلے ہم نے راستہ دکھایا اور ان کی اولاد میں سے داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اور اسی طرح ہم صلہ دیتے ہیں حسن عمل رکھنے والوں کو اور زکریا اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ اور الیاس کو، ہر ایک نیک افراد میں سے تھا اور اسمٰعیلؑ اور یسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ کو اور ہر ایک کو ہم نے تمام جہانوں سے زیادہ عطا کیا اور ان کے باپ داداؤں اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے بھی اور انہیں ہم نے منتخب کیا اور سیدھے راستے پر لگایا۔ یہ اللہ کی خاص ہدایت ہے جس کے ذریعہ سے وہ جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے نوازتا ہے اور اگر وہ شرک اختیار کرتے تو اکارت جاتے، وہ سب کارنامے جو انہوں نے انجام دیئے تھے۔''

اس آیت میں ذریت نوح علیہ السلام میں جناب عیسیٰ علیہ السلام کو درج کیا گیا ہے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ نواسے بھی ذرّیت میں داخل ہوتے ہیں اور اس لئے حضرات حسنین علیہما السلام کو اولاد و ذریت حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہنا عام اصول قرآنی کے مطابق بھی درست ہے۔ [1]

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾

''یہ وہ ہیں جنہیں ہم نے کتاب حکمت [2] اور نبوت عطا کی ہے۔ اب اگر یہ لوگ [3] اس کے ساتھ کفر اختیار کرتے

---

[1] ۔یفید۔ان الذریة تتناول اولاد البنت (جلالین) فی الآیة دلالة علیٰ ان الحسن والحسین من ولد رسول اللہ ﷺ (تبیان)

[2] ۔الحکم معناہ الحکم بین الناس وقیل الحکم (مجمع البیان)

[3] ۔کافر شوند بآیات قرآن ایں کافران (شاہ ولی اللہ)

ہیں تو ہم نے اسے حوالہ کیا ہے ایسے لوگوں کے جو اس کے ساتھ کفر نہیں کریں گے [1] یہ وہ ہیں جنہیں اللہ نے راستے پر لگایا ہے تو ان ہی کی ہدایت کی پیروی کیجئے۔ کہہ دیجئے کہ میں اس پر [2] کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ وہ نہیں ہے مگر نصیحت تمام جہانوں کے لئے۔''

''وہ نہیں ہے'' یعنی قرآن.....مگر زیادہ قریب باعتبار لفظ ''اجر'' ہے جب کہ دوسری آیت میں ایک اجر کا سوال ہوا بھی ہے: قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (شوریٰ۔ ۲۳) تو یہ ھُوَ کی ضمیر بھی اجر ہی کی طرف کیوں عائد نہ ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ اجر جو میں نے طلب کیا ہے، وہ کوئی میرے فائدہ کی چیز نہیں ہے۔ وہ تو خلائق کی ہدایت کا ایک سامان ہے اور تمہاری ہی بہتری کے لئے ہے جیسا کہ تیسری آیت میں ہے:۔ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (سبا ء۔ ۴۷) ''میں نے جو تم سے اجر مانگا ہے، وہ تو تمہارے ہی نفع کے لئے ہے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾

''اور انہوں نے اللہ کو اس کی واقعی شان کے ساتھ نہیں سمجھا [3] جب انہوں نے کہا کہ نہیں اتارا اللہ نے کسی انسان پر کچھ بھی۔ کہیے کہ کس نے اتاری تھی وہ کتاب جسے موسیٰ لے کر آئے تھے روشنی اور ہدایت کا ذریعہ بنا کر لوگوں کے لئے جسے تم متفرق کاغذوں کی شکل میں رکھتے ہو [4] جنہیں لوگوں کے سامنے لاتے ہو اور بہت سا حصہ چھپا دیتے ہو اور تمہیں اب وہ علم دیا گیا جو تمہیں نہیں معلوم تھا [5] اور نہ تمہارے باپ داداؤں کو۔ کہیے کہ اللہ نے (وہ کتاب اتاری تھی) پھر چھوڑ دیجئے انہیں کہ وہ اپنی نکتہ چینیوں میں کھیل کود مچائے رہیں۔''

یعنی خود ہی وہ اس کی سزا پائیں گے۔ [6]

---

[1] ۔مقرر ساختیم برای ایمان بآنہا گروھی را کہ ھر گز کافر نشوند (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔علیہ ای علی القرآن (جلالین)

[3] ۔لم یبلغوا من عظمۃ اللہ ان یصفوہ بصفاتہ (علی بن ابراھیم) ای ماعرفوہ حق معرفتہ وما وصفوہ بما ھو اھل ان یوصف بہ (تبیان)

[4] ۔ای یکتبونہ فی دفاتر مقطعۃ (جلالین) ورق ورق ظاہر کرتے ہو اس کو (شاہ رفیع الدین)

[5] ۔علمتم ایہا الیہود فی القرآن (جلالین)

[6] ۔لیس علی اباحۃ ترک الدعآء والانذار بل علی ضرب من الوعید والتہدید (تبیان)

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾

''اور یہ وہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے اتارا ہے تصدیق کرنے والی اس کی جو اس کے پہلے ہے اور اس لئے کہ آپ متنبہ کریں مکہ میں اور اس کے اردگرد جتنے ہیں، سب کو۔ اور جو روز آخرت کو مانتے ہوں، وہ سب اسے مانتے ہیں اور وہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔''

چونکہ مکہ معظّمہ تقریباً وسط معمورہ میں تھا، اس لئے اس کے اردگرد کا احاطہ تمام دنیا کو حاوی ہے جس میں کسی ملک کی قید نہیں ہے۔ [1]

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾

''اور کون ظالم ہوگا زیادہ اس سے کہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا کہے کہ میری طرف وحی اتری ہے حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ اتری ہو اور جو کہے کہ ویسا ہی عنقریب میں اتاردوں گا جیسا اللہ نے اتارا ہے اور کاش دیکھو تم وہ موقع کہ جب ظالم لوگ مرگ کے سکرات میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوں گے کہ نکالو اپنی روحوں کو آج تمہیں ذلت کا عذاب اس سزا میں ہے کہ تم اللہ کی نسبت غلط باتیں کہتے تھے اور تم اس کی آیتوں کے مقابلہ میں تکبر سے کام لیتے تھے۔''

آیت کس کے بارے میں وارد ہوئی ہے؟ اس سے اختلاف ہے۔ وہ قول جسے معصومؑ سے وارد شدہ روایت کی تائید حاصل ہے ایک یہ ہے کہ وہ مسلیمہ کذاب کے بارے میں ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور کچھ تک بندی کر کے اسے بخیال خود قرآن کے جواب کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ [2]

اور دوسرا قول جس کے بارے میں بھی حدیث وارد ہوئی ہے، یہ ہے کہ وہ عثمان خلیفۂ ثالث کے دودھ شریک بھائی عبداللہ ابن سعد بن ابی سرح کے بارے میں اتری ہے جو خوش نویسی کی بنا پر کتابت وحی کے لئے مامور کیا گیا تھا تو وہ تیزی کر کے جو آیت حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بولتے تھے، اس کا آخری جملہ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بولنے سے پہلے اپنے ذوق کے لحاظ سے لکھ دیتا تھا۔ کبھی ایسا ہوا کہ وہ ٹھیک نکلا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے

---

[1] ۔ومن حولها اهل الارض كلهم عن ابن عباس (مجمع البیان)

[2] ۔الاوّل هو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام (تبیان)

نہیں بدلا۔ بس اسے شیطان نے اس کی گمراہی کا ذریعہ بنا دیا اور وہ کہنے لگا کہ قرآن کی آیتوں کو میں اپنے ذوق کی بنا پر تیار کر سکتا ہوں۔ یہ آیت اس کے بارے میں آئی ہے۔[1]

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۭ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝۹۴

''اور تم ہمارے پاس تن تنہا آئے ہو[2] جیسے کہ ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا تھا[3] وہ سب تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم نے خیال کیا تھا کہ وہ تمہارے بارے میں (ہمارے ساتھ) شریک[4] تمہارے باہمی تعلقات قطع ہو گئے[5] اور جو کچھ تمہارا زعم باطل تھا، غائب ہو چکا ہے۔''

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۭ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۹۵

''یقیناً اللہ شگافتہ کرنے والا ہے دانوں اور گٹھلیوں کا۔ وہ نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالنے والا ہے مردہ کا زندہ سے۔ یہ ہے اللہ تو کدھر بھٹکتے پھرتے ہو[6]''۔

دانے اور گٹھلی کے شگافتہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے اندر جو درخت پنہاں ہے، خواہ کھیتی کی قسم سے یا باغ سے، وہ اس میں سے اپنی قدرت سے برآمد کرتا ہے۔[7]

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۭ ذٰلِكَ

---

[1] ۔عن ابی بصیر عن ابی عبداللہ (علی بن ابراھیم)

[2] ۔وحدانا لا مال لکم ولا اثاث ولا رقیق ولا شئ مما کان اللہ خولکم (تبیان)

[3] ۔ماملکنا کم فی الدنیا (مجمع البیان)

[4] ۔معناہ زعمتم انھم شرکاؤنا فیکم (مجمع البیان)

[5] ۔تقطع بینکم یعنی المودۃ (علی بن ابراھیم)

[6] ۔فکیف تطرفون عن الایمان بعد قیام البرھان (جلالین)

[7] ۔فلق الحب یعنی شقہ من کل ما ینبت من النبات فاخرج منہ النور علیٰ اختلافھا والنوٰی من کل ما یغرس مما لہ نواۃ فاخرج منہ الشجر (تبیان)

تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۹۶﴾ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾

''وہ سفیدۂ سحری کا نمایاں کرنے والا ہے اور اس نے رات کو آرام کا وقت اور سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنایا ہے [1] یہ زبردست واقف کار کا مقرر کردہ نظام ہے اور اس نے تمہارے لئے ستاروں کو قرار دیا ہے تاکہ تم ان سے راستہ حاصل کرو خشکی اور تری کی تاریکیوں میں۔ ہم نے کھول کھول کر باتیں بیان کر دی ہیں ان کے لئے جو جاننے والے ہوں۔''

قمری حساب کا اعتبار

سورج کے طلوع وغروب سے دن اور رات کی تشکیل ہوتی ہے جن سے ہفتے بنتے ہیں، ہفتوں سے مہینے اور مہینوں سے سال اور چاند کے بصورت ہلال طالع ہونے اور پھر آخر میں غائب ہو کر دوبارہ نکلنے سے مہینوں کی تشکیل ہوتی ہے جن کے اجتماع سے سال بنتے ہیں لہٰذا دونوں ہی کو حساب میں داخل قرار دیا ہے اور اگر مہینوں اور تاریخوں میں بھی شمسی حساب معتبر ہوتا تو چاند کا حساب کے مقصد میں کوئی دخل ہی نہ ہوتا۔

قرآن کا محل حساب میں قمر کو اہمیت دینا اس کی دلیل ہے کہ اسلام میں قمری تاریخیں معتبر ہیں اور سوا استثنائی صورتوں کے شمسی تاریخوں کا اعتبار نہیں ہے۔

ستاروں کی رہنمائی کے فائدہ کو بیان کرنے میں جاننے والوں کی قید اس لئے ہے کہ ستاروں کی رہنمائی سے عوام فائدہ نہیں اٹھا سکتے بلکہ وہی لوگ جو ستاروں کی علامتوں کا علم رکھتے ہوں۔ [2]

وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾ وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْۤا اِلٰی ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۹۹﴾

---

[1] ۔اشارہ سبحانہ بذلك الی ما فی حسابهما من مصالح العباد فی معاملاتهم وتواریخهم واوقات عباداتهم (مجمع البیان)

[2] ۔انما اضاف الی الذین یعلمون وان کانت آیات لغیرهم لانهم المنتفعون بها (تبیان)

''اور وہ وہ ہے جس نے تم سب کو ایک متنفس سے [1] پیدا کیا ہے پھر ایک ٹھہرنے کی جگہ اور سونپنے کے مقام پر رکھا۔ ہم نے تفصیل کے ساتھ باتیں بیان کی ہیں ان کے لئے جو سمجھنا چاہیں، اور وہ وہ ہے جس نے آسمان کی طرف سے پانی اتارا تو اس سے ہم نے نکالے ہر طرح کے نباتات تو اس سے باہر نکالی ہری ہری کھیتی [2] جس سے ہم نکالتے ہیں تہہ بہ تہہ [3] دانے اور کھجور کے درختوں سے جن کی شاخوں میں سے کچھ گچھے زمین کی طرف جھکے ہوتے ہیں اور باغ انگور اور زیتون اور انار کے جو ملتے جلتے ہوئے بھی ہیں اور نہیں بھی ملتے جلتے۔ دیکھو ان کے پھلوں کو جب وہ میوہ دار ہوں اور ان کی رسیدگی کو۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہیں۔''

''ٹھہرنے کی جگہ اور سونپنے کے مقام'' کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں جنہیں علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں درج کیا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی معصوم کی طرف استناد نہیں رکھتا۔ ان میں سے جو ذہن میں آنے والا قریبی مفہوم ہے وہ ہے کہ مُسْتَقَرٌّ سے مراد صلب پدر اور مُسْتَوْدَعٌ سے شکم مادر مراد ہے یا اس کے برعکس۔ [4]

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

''اور انہوں نے نظروں سے پوشیدہ مخلوق کو اللہ کا شریک بنایا ہے حالانکہ اس نے انہیں پیدا کیا ہے اور انہوں نے اس کے لئے جہالت سے لڑکے اور لڑکیاں تصنیف کی ہیں۔ پاک ہے وہ اور بلند ہے اس سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ موجد ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ اس کے لئے اولاد کہاں سے ہوگی۔ حالانکہ اس کی کوئی بیوی تو ہے ہی نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔''

یہاں بہت سے مذاہب باطلہ کے مزعومات کو سمیٹ کر ایک ساتھ انہیں یاد دلایا ہے کہ ''انہوں نے اس کے لئے لڑکے اور لڑکیاں تصنیف کی ہیں'' جیسے یہود و نصاریٰ نے عزیر اور مسیح کو اس کا بیٹا قرار دیا اور مشرکین نے فرشتوں کو بیٹیاں قرار دیا۔

اب چونکہ جنات جس قوم کا نام ہے، ان کے متعلق کسی ایسی جماعت کا پتہ نہیں چلتا جس نے ان کا اللہ سے رشتہ قرار دیا ہو جیسا کہ دوسری جگہ قرآن میں ہے: وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (صافات۔۱۵۸)، یا انہیں شریک خدا قرار دیا ہو جیسا کہ یہاں کہا جا رہا ہے، اس لئے مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں جن سے لغوی معنی ''آنکھ سے پوشیدہ'' ہونے کی بنا پر فرشتے مراد ہیں [5] اور اس لئے ہم نے اس کا ترجمہ ''نظروں سے

---

[1] ۔ای من آدم (مجمع البیان)

[2] ۔رطبا من الزرع (تبیان)

[3] ۔یکی بر دیگری پیوستہ (شاہ ولی اللہ) ایک پر ایک چڑھا ہوا (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔فمستقر منکم فی الرحم ومستودع منکم فی الصلب (جلالین)

[5] ۔وصفهم بالجن لخفائهم عن الابصار (تبیان)

پوشیدہ مخلوق'' کے ساتھ کیا ہے مگر ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ کا جنات کے بارے میں اسی طرح کا عقیدہ ہو جو غالباً ہمارے یہاں کی حدیث میں موجود ہے۔[1]

اس کے بعد چونکہ ان مذاہب باطلہ میں سے جن کی رد مقصود ہے، کسی نے اللہ کے لئے بیوی کا ہونا تجویز نہیں کیا ہے، اس لئے بیوی کے نہ ہونے کو اولاد نہ ہونے کی دلیل میں پیش کیا گیا ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿١٠٢﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿١٠٣﴾

''یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار، کوئی خدا نہیں سوا اس کے، وہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے تو اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر کارساز ہے۔ اسے نگاہیں پا نہیں سکتیں اور وہ سب نگاہوں پر حاوی ہے اور وہ جسم و جسمانیات سے بری ہے، بڑا خبر رکھنے والا۔''

نفی رویت

یہ آیت صاف نفی رویت کی دلیل ہے۔ خالق کی شانِ جلال و کمال بیان ہو رہی ہے کہ نگاہیں اسے پا نہیں سکتیں۔ اس میں دنیا اور آخرت کی کوئی قید نہیں ہے مگر کیا کیا جائے تقلید آباء کو کہ شاہ ولی اللہ صاحب حاشیہ یا تفسیر میں نہیں بلکہ اصل ترجمہ میں یہ لفظ بڑھا دیتے ہیں کہ:

''درنمی یابند او را چشمہا یعنی در دنیا''

آخر جلال و کمال رب میں دنیا کی خصوصیت کیا ہے؟ کیا قیامت میں وہ خدا خدا نہیں رہے گا جو اس کا کمال ختم ہو جائے گا اور جلال ذات میں فرق آ جائے گا۔

ان کے ایک صاحبزادۂ بلند اقبال جناب شاہ رفیع الدین صاحب نے ترجمہ میں خیر تصرف نہیں کیا۔ یہ لکھ دیا کہ:۔ ''نہیں پاتیں اس کو نظریں'' مگر دوسرے صاحبزادۂ عالی شان شاہ عبدالقادر نے حاشیہ میں تحریر فرما دیا۔

''یعنی آنکھ میں ی قوت نہیں کہ اس کو دیکھ لے مگر جو وہ آپ کو دکھا دے اس واسطے کہ وہ لطیف ہے۔'' (موضح القرآن)

مگر ذرا بیان قرآن کا انداز دیکھئے۔ وہاں انسان کے نقص کا ذکر نہیں ہو رہا ہے کہ ''یہ ہو تم جو اتنے ناقص ہو کر اپنے زیر قدم نہیں دیکھ سکتے اور تمہاری نگاہیں خدا کو نہیں پا سکتیں۔'' اگر یہ انداز ہوتا یعنی موضوع کلام انسان کا نقص ہوتا تو آپ یہ معنی فرماتے کہ آنکھ میں یہ قوت نہیں کہ اس کو دیکھ لے مگر وہاں تو یوں ارشاد ہو رہا ہے کہ ''یہ ہے تمہارا پروردگار جو واحد حقیقی ہے۔ جو ہر شے کا خالق ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں'' تو یہ ہماری نگاہوں کا ذکر نہیں بلکہ خالق کے کمال و رفعت کا تذکرہ ہے۔ اس لئے اس کے کمالِ رفعت میں دنیا اور آخرت کی تریق غلط ہے۔

---

[1] ۔ قال و کانوا یعبدون الجن (علی بن ابراھیم)

اوراب اس استثناء کی بھی گنجائش نہیں کہ ''مگر جو وہ آپ کو دکھا دے''..... یہ ''مگر'' اول تو قرآن میں کہاں ہے جو ''لطیف'' کے لفظ کا تعلق اس سے قرار دیا جائے پھر کیا جو اس کی شان بیان ہوئی ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ''کوئی اس کے سوا خدا نہیں'' اس میں یہ گنجائش ہے کہ ''مگر جو وہ کسی کو اپنے ساتھ خدا بنا دے کیونکہ وہ لطیف ہے۔'' ظاہر ہے کہ اس میں اس استثناء کی گنجائش نہیں تو پھر اس لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ میں شان الٰہی کا ایک پہلو ہے، اس ''مگر'' کی گنجائش اور لطیف کے اس سے تعلق کی معقولیت کیا ہے؟!

ان لوگوں نے اس معنی کے قرار دینے کے لئے ہی ''لطیف'' کے معنی ''مہربان'' کے قرار دیئے ہیں [1] حالانکہ لطیف کے اس معنی کا کلام سابق کے کسی جز سے ربط نہیں قائم ہوتا بلکہ اس لطیف کے معنی ہیں ''مادہ کی کثافتوں سے بری'' اور یہ کہ لا تدرکه الابصار کی ایک طرح سے دلیل ہے یعنی نگاہیں اس کو اس لئے نہیں پاسکتیں کہ وہ جسمانیت سے بری ہیں اور دوسرا جز الخبیر دوسرے فقرہ یدرك الابصار کی دلیل ہے کہ وہ نگاہوں پر حاوی ہے اس لئے کہ وہ باخبر ہے۔ لطف یہ ہے کہ شاہ رفیع الدین صاحب نے ترجمہ میں ''لطیف'' کے معنی مہربان کے نہیں لئے ہیں بلکہ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ کا ترجمہ کیا ہے ''وہ ہے باریک، دیکھنے والا۔''

یہ ''باریک'' کا لفظ انتہائی کوتاہی تعبیر کے ساتھ وہی مادیت وجسمانیت سے بری ہونے کے مفہوم کا حامل ہوسکتا ہے۔ اس کا مہربانی سے یقیناً کوئی تعلق نہیں مگر دوسرے بھائی صاحب بلا وجہ یہ کہنے لگے کہ ''مگر وہ آپ کو دکھا دے اس واسطے کہ لطیف ہے'' یہ ہوتے ہیں سخن پروری یا روایت پرستی کے کرشمے۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۱۰۴﴾ وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

''آئی ہیں تمہارے پاس بصیرتیں [2] تمہارے پروردگار کی جانب سے تو جو نظر کرے گا، وہ اپنا فائدہ کرے گا اور جو اندھا بنا رہے گا، وہ اپنا نقصان کرے گا اور میں تمہارا پہریدار نہیں ہوں۔ اور اسی طرح ہم طرح طرح سے حقیقتیں بیان کرتے ہیں [3] اور اس لئے کہ وہ کہیں کہ آپ نے خوب پڑھا ہے اور تاکہ اسے صاف صاف ہم بیان کردیں ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں۔''

''لِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ'' کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے کہ ''وہ کہیں کہ آپ نے خوب پڑھا ہے'' یعنی ان کا ضمیر اس کی گواہی دے دے یا کبھی زبان سے بھی اس کا اقرار کرلیں، یہی سیاق وسباق دونوں کا تقاضا ہے کیونکہ اتمام حجت ہونے کا ذکر ہو رہا ہے مگر دوسرے مفسرین نے اس بیچ کے ٹکڑے کو سابق اور لاحق سے علیحدہ کرکے اس لام کو ویسا لام قرار دیا ہے جیسے جناب موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

---

[1] ۔ اوست مہربان، آگاہ (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ بینات ودلالات (مجمع البیان)

[3] ۔ لیقولوا ای الکفار فی عاقبة الامر درست ذکرت اهل الکتاب (جلالین)

''فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا'' (قصص۔۸) فرعون والوں نے انہیں دریا سے نکال لیا تا کہ وہ ان کے لئے دشمنِ جان ثابت ہوں'' یعنی نتیجہ اس کا ان کے لئے یہ ہوا، نہ یہ کہ ان کا مقصد یہ تھا۔ اسی طرح یہاں یہ معنی ہیں کہ ہم نے ہی قرآن اتارا اور بصیرتیں ان کے سامنے پیش کیں، تا کہ وہ یہ کہیں کہ آپ نے یہ سبق یہودیوں سے حاصل کئے ہیں اور ان سے یہ علوم آپ کو ملے ہیں یعنی ایمان پھر بھی اس پر نہ لائیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ [1]

میرے نزدیک یہ مفہوم قرآن کے قبل اور بعد کے فقروں کی بنا پر جن میں اسی طرح لام موجود ہے اور وہ لام غایت ومقصد ہی کے لئے ہے، ناقابل قبول ہے۔

بعض مترجمین نے اس لام کو غرض وغایت ہی کا قرار دیتے ہوئے ایک عجیب طرح کے حذف واضمار کا تصور کر کے ترجمہ کیا ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ ایسا نہ ہو وہ یہ کہیں کہ آپ نے اس کو پڑھا ہے۔ [2]

ظاہر ہے کہ یہ ''ایسا نہ ہو'' بالکل ایجاد بندہ ہے جس کا قرآن میں کوئی نشان نہیں ہے۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۰۶ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝۱۰۷

''پیروی کیجئے اس کی جو آپ کی طرف وحی اتری ہے آپ کے پروردگار کی طرف سے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور مشرکین سے بے اعتنائی اختیار کیجئے اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے اور آپ کو ہم نے ان پر پہریدار مقرر نہیں کیا ہے اور نہ آپ ان کے ٹھیکے دار ہیں۔''

یہ وہی تسلی کی قسم کی آیت ہے یعنی مشرکین کے افعال کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ آپ اپنا فرض انجام دیتے رہیے۔ پھر اس سے مطلب نہ رکھئے کہ وہ مانتے ہیں یا نہیں۔ خدا کو جبر سے کام لینا تو ہے نہیں، ورنہ ایک بھی مشرک نہ ہوتا [3]

پھر اگر وہ شرک اختیار کرتے ہیں تو آپ کیا کریں گے؟ آپ ان کے پہریدار نہیں ہیں کہ زبردستی انہیں شرک سے روکنا آپ کے لئے ضروری ہو اور نہ آپ ان کے ٹھیکے دار ہیں کہ ان کے افعال کی ذمہ داری آپ پر عائد ہو۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا

---

[1] ۔ هٰذه اللام تستميها اهل اللغة لام الصيرورة (مجمع البيان)

[2] ۔ برای احتراز آنکه گویند که خواندهٔ (شاه ولی الله)

[3] ۔ لو شآء الله ان يكونوا على غير الشرك فسر اما اشركوا (تبيان)

يَعْمَلُوْنَ﴿۱۰۸﴾

''اور جن کی یہ اللہ کے سوا دہائی دیتے ہیں، انہیں گالیاں نہ دو کہ وہ جہالت کی بنا پر تجاوز کر کے اللہ کو گالیاں دیں۔ یوں ہی ہم نے ہر قوم کے کردار کو سنوارا ہے۔ پھر ان کے پروردگار کی طرف ان کا رجوع ہوگا تو وہ انہیں جو کچھ کرتے تھے، اس کے متعلق بتائے گا۔''

رواداری کی تعلیم اور معبودان باطل کے سبّ وشتم سے ممانعت

خالق کریم نے معبودان باطل کی نسبت جس حکیمانہ رویہ کی دعوت دی ہے یہ بات تمام پیشوایانِ باطل کے لئے ہے۔

وہ لاکھ برا کہنے کے قابل ہوں مگر اعلانیہ انہیں برا کہو گے تو وہ جسارت و گستاخی کر کے تمہارے پیشوایانِ حق کے خلاف بدگوئی سے کام لیں گے اور اس ''ناصبیت'' و ''خارجیت'' کے مظاہرہ کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔

بے شک دلائل کے ذریعہ سے کسی کی کمزوریوں کا سنجیدہ اور مہذب انداز میں ظاہر کرنا اور چیز ہے اور برا کہنا یا گالیاں دینا دوسری چیز ہے۔ اس میں کسی حق کا اثبات نہیں ہوتا، صرف فریق مخالف کا دل دکھ جاتا ہے۔ اس لئے کہ میں وہ بھی ہمارے معبود یا پیشوا کے خلاف سب وشتم پر اتر آتا ہے لیکن پہلی صورت میں یہ خطرہ یوں نہیں ہے کہ ہم تو استدلال کے ذریعہ سے ان کا ابطال کر رہے ہیں لیکن مخالف حق کے پاس اس طرح کے دلائل ہو ہی نہیں سکتے، اس لئے مجبوراً اگر وہ قبول نہ بھی کرے تو اسے خاموشی کے سوا چارۂ کار نہ ہوگا۔

''یونہی ہم نے ہر قوم کے کردار کو سنوارا ہے''..... یعنی ہم ہمیشہ صحیح سیرت و کردار ہی کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ لوگ اس کی پیروی نہ کریں۔ [1]

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ہر قوم جو کچھ وہ کر رہی ہے اس میں مگن ہے اور وہ اسی کو اچھا سمجھ رہے ہیں اور اب ہم نے بھی انہیں ایسا ہی چھوڑ رکھا ہے کہ ان کے اعمال ان کی نظر میں درست نظر آتے ہیں۔

یہ اللہ کا یوں چھوڑ دینا، ان کے سوء اختیار کا نتیجہ ہے۔ نہ کہ ان کی بداعمالی کا سبب ہے، اس لئے ان سے اس کا محاسبہ ہوگا جس کا آخر آیت میں ذکر ہے۔ [2]

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴿۱۰۹﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴿۱۱۰﴾

---

[1] ۔ المراد به فی الآیة تزئین اعمال الطاعة (مجمع البیان)

[2] ۔ زینا لکل امة عملهم یعنی بعد اخیارهم ودخولهم فیه والدلیل علیٰ ان ذٰلك نفعلهم للتقدم قوله: ثم الیٰ ربهم مرجعهم فینبئهم بما کانوا یعملون (علی بن ابراهیم)

''اور انہوں نے تمام ممکن صورتوں کے ساتھ اللہ کی قسم کھائی کہ اگر کوئی معجزہ ان کے پاس آئے گا تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے، کہیے کہ معجزے تو بس اللہ کے قبضہ میں ہیں اور تم لوگوں کو کیا خبر ہے کہ وہ جب آئے گا تو وہ ایمان نہیں لائیں گے اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو تہہ و بالا کر دیں گے جیسا کہ انہوں نے پہلی بار اس پر ایمان اختیار نہیں کیا اور انہیں چھوڑ دیں گے ان کی سرکشی میں کہ وہ اندھے بنے پھرتے رہیں گے۔''

اس فقرہ سے کہ ''جیسا کہ انہوں نے پہلی بار ایمان اختیار نہیں کیا''[1] ظاہر ہے کہ معجزات جو اتمام حجت کے لئے کافی ہوں، آ چکے تھے۔ اس کے بعد ان کا ی کہنا کہ کوئی معجزہ آئے تو ہم ایمان لائیں گے، دھاندلی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لئے کہا گیا کہ ''معجزے بس خدا کے پاس ہیں'' یعنی ایسے معجزے جنہیں تم مان لو، میرے بس میں قطعاً نہیں ہیں۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿١١١﴾

''اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے اتارتے اور ان سے مُردے باتیں کرتے اور ان کے سامنے تمام چیزوں کو گروہ در گروہ روزِ محشر کی صورت سے لا کر کھڑا کر دیتے[2] تب بھی وہ ایمان لانے والے نہ تھے، سوا اس کے کہ اللہ طے کر لیتا لیکن ان میں زیادہ تر جہالت سے کام لیتے ہیں۔''

''اللہ طے کر لیتا'' یعنی جبری طور پر[3] اسے منظور ہوتا کہ وہ اپنی قوت قاہرہ سے انہیں ایمان کے راستے پر لگا دے جو اس کی حکمت کامل اور انسان کے امتیازی جوہر یعنی اس کے فاعل مختار ہونے کے خلاف ہے۔ اس صورت میں تو خدا کی قدرت کے مقابلہ میں انسان کی قوت ختم ہی ہو جاتی اس لئے یہ سب ایمان لے آتے جو ایمانِ اضطراری ہوتا، ورنہ جہاں تک ان کا اختیار ہے، یہ اتنے معجزات ..... جتنے بھی کسی کے تصور میں آسکیں مثلاً فرشتے براہ راست ان کے پاس اترتے۔

مُردے ان سے باتیں کرتے۔ تمام عالم کی اشیاء محشور ہو کر ان کے سامنے اکٹھا ہو جاتیں، یہ سب ہو جاتا، پھر بھی یہ ایمان نہ لاتے۔ اس لئے کہ سوتا ہوا ہو تو کسی آواز پر جاگ جائے گا اور جو جاگ رہا ہو مگر اٹھنا نہ چاہتا ہو اسے کون سی آواز ہوگی جو بیدار کرے؟!

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿١١٢﴾ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ

---

[1] ۔ کما لم یؤمنوا بما انزل من الآیات اول مرۃ عن ابن عباس و مجاھد (مجمع البیان)

[2] ۔ قبلا بضمتین جمع قبیل ای فرجا فوجا (جلالین)

[3] ۔ ای یجبرھم علی الایمان (علی بن ابراھیم)

وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ﴿۱۱۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے قرار دیا ہر نبی کے لئے دشمن آدمی اور جنات میں کے شیطانوں کو جن میں سے ایک دوسرے کی طرف بناوٹی باتوں کا فریب دہی کے لئے القا کرتا رہتا ہے اور اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے لہٰذا چھوڑیئے انہیں اور اسے جو افترا پردازی کرتے رہتے ہیں اور اس لئے کہ مائل ہوں اس کی طرف دل ان کے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اس لئے کہ وہ اسے پسند کریں جس کا یہ ارتکاب کرتے ہیں۔''

''دشمن قرار دیئے'' یعنی نبی نے حکم خدا سے اعلان نبوت کیا اور پیغام حق پہنچایا تو یہ لوگ اپنی ''کفر دوستی'' اور ''باطل پرستی'' کی وجہ سے ان کے دشمن ہو گئے۔

یہ دشمنی ان کے سوء اختیار کا نتیجہ ہے لیکن چونکہ اس کے ظہور میں آنے کے اسباب خدا کی طرف سے پیدا ہوئے۔ نہ وہ نبی بناتا، نہ ان سے اعلان حق کراتا، نہ یہ لوگ ان کے دشمن ہوتے، اس لئے ان کو دشمن بنانے کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی۔

پھر اس کے بعد جو مضمون ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جو ایک دوسرے کو بناوٹی باتوں کا القاء کرتے رہتے ہیں، وہ فریب دہی کے لئے [1] اور اس لئے ہے [2] کہ ایمان سے بے بہرہ افراد ان کی طرف متوجہ ہوں اور پسند کریں اور وہ بھی ایسا ہی کرنے لگیں۔

درمیان میں جو یہ فقرہ ہے کہ ''اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے'' یہ جملۂ معترضہ کی حیثیت سے ہے جس کے وہی معنی ہیں جو اس کے قبل کی آیت میں تھے یعنی اپنی قوت قاہرہ سے وہ انہیں روکنا چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے مگر جبر کو صرف کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ [3]

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴿۱۱۴﴾

''تو کیا اللہ کے علاوہ کسی کو میں فیصلہ کے لئے تلاش کروں اور وہی تو وہ ہے جس نے تمہاری جانب کتاب اتاری ہے تفصیلی بیانات کی حامل اور جنہیں ہم نے کتاب دی تھی، وہ جانتے ہیں کہ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے سچائی کے ساتھ اتری ہوئی ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔''

چونکہ کتب سابقہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علامات تفصیل کے ساتھ مذکور تھے اس لئے جا بجا قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوب پہچانتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کہا جا رہا ہے کہ وہ اس کتاب یعنی قرآن کو بھی جانتے ہیں پورے طور پر کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جانتے سب ہیں، یہ اور بات ہے کہ ان میں سے کچھ مانتے بھی ہیں اور وہ وہ ہیں کہ جو ایمان لے آئے اور کچھ جانتے ہیں مگر مانتے نہیں ہیں۔

---

[1] ۔تأفریب دھندہ (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔العامل فی قولہ ''لتصغیٰ'' قولہ ''یوحی'' (مجمع البیان)

[3] ۔ذٰلك ینافی التکلیف ولو حال بینہم وبینہ لما فعلوہ (تبیان)

اسی کا نام کفر حجودی ہوتا ہے کہ آدمی جان بوجھ کر انکار کرے۔

اب قرآن مجید میں چونکہ یہاں ماننے کا نہیں، بس جاننے کا ذکر ہے لہٰذا کوئی ضرورت نہیں کہ اسے اہل کتاب کے ان خاص افراد سے متعلق قرار دیا جائے جو مسلمان ہو گئے تھے جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے۔[1]

ہاں اس خصوصیت کی قید لگانے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ ان میں کے علماء اور اپنی کتابوں سے واقف افراد کا ذکر ہے۔ نہ کہ عوام الناس[2] کا جنہیں خود اپنے یہاں کی کوئی خبر نہیں ہے۔ صرف نام کے لئے وہ اپنے کو ان فرقوں سے متعلق قرار دیتے ہیں۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾

''اور آپ کے پروردگار کی بات پوری ہے سچائی اور عدالت میں اور اس کی باتوں کا بدلنے والا کوئی نہیں اور وہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔''

عدل الٰہی

قرآن میں مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے ثبوت عدل اور نفی ظلم پر طرح طرح زور دیا گیا ہے۔ اس کے بعد معلوم نہیں کس واسطے مسلمانوں کے ایک طبقہ نے اس کے صفات سے عدل کو خارج کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں علم کلام کی اصطلاح میں عدلیہ مسلمانوں کا صرف ایک فرقہ رہ گیا ہے۔ حالانکہ از روئے قرآن تمام امت اسلامیہ کو عدلیہ ہونا چاہئے۔

عدل چونکہ مقابل ''ظلم'' ہے اور ''ظلم'' ہر قسم کی بے راہ روی اور غیر مستحسن ہر کام پر حاوی ہے۔ اس لئے عدل ہر حیثیت سے اس کے افعال کے خیر اور مستحسن ہونے کا نام ہے۔ اس ترجمہ ''انصاف'' کے ساتھ کرنا[3] اس کے مفہوم کو محدود بنا دیتا ہے مگر ظاہر ہے کہ جو عدل کے قائل نہیں اور حسن و قبح عقلی کا تصور نہیں رکھتے وہ عدل و حکمت کی پوری قدروں کا اندازہ کہاں کر سکتے ہیں؟!

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

''اور اس زمین کے رہنے والوں کی اکثریت کا اگر تم کہنا مانو تو تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے، وہ نہیں پیروی کرتے مگر گمان کی اور نہیں وہ باتیں کرتے مگر اٹکل پچو۔''

اکثریت معیار حق نہیں

---

[1] ۔یعنی بہم مؤمنی اھل الکتاب (مجمع البیان)

[2] ۔لا یجوز ان یکون علیٰ عمومہ لان کثیرا من اھل الکتاب بل اکثرھم جھال لا یعرفون (تبیان)

[3] ۔تمام است سخن پروردگار تو در راستی و انصاف (شاہ ولی اللہ) پوری ہوئی بات رب تیرے کی راستی میں اور انصاف میں (شاہ رفیع الدین)

اس میں صاف اس اصول کا اعلان ہے کہ اکثریت معیار حق نہیں ہے [1] بلکہ اکثریت تو زیادہ تر عوام کی ہوتی ہے جن کے خیالات کسی ٹھوس دلیل پر نہیں بلکہ توہمات اور بے بنیاد گمانوں پر مبنی ہوتے ہیں تو ان کی پیروی معیار حق کیوں کر ہو سکتی ہے؟

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

''یقیناً تمہارا پروردگار خوب جاننے والا ہے ان کا [2] جو اس کے راستے سے بھٹکتے ہیں اور وہ بہترین جاننے والا ہے ان کا جو سیدھے راستے پر برقرار رہتے ہیں۔''

اس لئے کہ دوسرے لوگ ظاہر کو دیکھتے ہیں، باطن کی خبر نہیں، اور حال سے واقف ہیں، مستقبل پر نظر نہیں۔ [3]

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''تو کھاؤ تم اس سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو، اور تمہیں حق نہیں ہے کہ تم نہ کھاؤ اس سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے حالانکہ اس نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے تمہارے لئے ان چیزوں کو جو اس نے تم پر حرام کی ہیں سوا اس کے جس کی تمہیں اضطراری طور پر مجبوری ہو اور یقیناً بہت سے لوگ اپنے بے بنیاد خیالات سے نادانستہ گمراہ کرتے ہیں، بلاشبہ تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے انہیں جو ظلم و تعدی سے کام لیتے ہیں''۔

''جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو'' اس سے مراد ہے ذبیحہ یعنی جسے بسم اللہ واللہ اکبر کہہ کر ذبح کیا گیا ہو۔ [4]

اگر فقط پہلے والی آیت ہوتی کہ ''کھاؤ تم اس میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو'' تو ہم یہ سمجھ سکتے تھے کہ اس سے مقصود میتہ کے کھانے کی ممانعت ہے یعنی جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اسے نہ کھاؤ، جیسا کہ بعض ترجموں سے ظاہر ہوتا ہے [5] مگر اس کے بعد کی آیت نے یہ بات صاف کر دی ہے کہ یہ اجازت اس ممانعت کے مقابلہ میں جو میتہ کے بارے میں ہے، نہیں ہے بلکہ یہ اجازت کا اعلان ان چیزوں کے بالمقابل ہے جنہیں یہود اور مشرکین نے بلا وجہ حرام سمجھ رکھا تھا یا جسے اب کوئی بغیر کسی معیار شرعی کے کسی رسم و رواج کے ماتحت ممنوع الاکل قرار دے دے۔ ان کے بالمقابل یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ پابندیاں غلط ہیں، بس ایک پابندی ہے اور وہ یہ کہ بسم اللہ کہہ کر ذبح کیا گیا ہو اگر ایسا ہے تو بلا توقف اس کا کھانا

---

[1] ۔فی ھٰذا دلالۃ علیٰ انہ لا عبرۃ فی دین اللہ و معرفۃ الحق بالقلۃ و الکثرۃ (مجمع البیان)

[2] ۔اعلم ای عالم (جلالین)

[3] ۔لان غیرہ لا یعلم جمیع الاشیآء و ما یعلم الا بعلمہ من جمیع جوھھا (تبیان)

[4] ۔الذکر ھو قول بسم اللہ (مجمع البیان)

[5] ۔جس ذبیحہ پر (وقت ذبح) خدا کا نام لیا گیا ہو، اسی کو کھاؤ (مولانا فرمان علی صاحب مرحوم)

درست ہے، اس سے پرہیز کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

''اور گناہ کو چاہے علانیہ ہو اور چاہے خفیہ [1] (بہر صورت ترک کرو، بلا شبہ وہ جو گناہ کرتے ہیں) انہیں سزا ملے گی اس کی جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے۔''

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

''اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اسے نہ کھاؤ اور یقیناً وہ بہت بڑا گناہ ہے اور بلا شبہ شیطان ہیں جو اپنے حوالی موالی کو القاء کرتے ہیں کہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم ان کا کہنا مانو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ۔''

پہلے تو اس پر تنبیہ تھی کہ بعض اقسام کے ذبیحہ سے جو غلط توہمات کی بنا پر پرہیز کرتے ہو، یہ غلط ہے بلکہ جس چیز کو اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا، اسے تمہیں حلال سمجھنا چاہیے اور اب اس دوسرے رخ پر تنبیہ ہے کہ مردار سے یعنی جسے بسم اللہ کہہ کر ذبح نہ کیا گیا ہو، اس سے پرہیز ضروری ہے، یہ حرام ہے اور اس کا کھانا بہت بڑا گناہ ہے۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ اگر ان کا کہنا مانو گے تو مشرک ہو جاؤ گے، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر اس گناہ میں ان کی دعوت کو قبول کر لو گے اور ان کے کہنے سے اکل حرام پر آمادہ ہو جاؤ گے تو پھر رفتہ رفتہ ان کے کہنے سے مبتلائے شرک بھی ہو جاؤ گے۔

اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ بلکہ اسی کو زیادہ قوت ہے کہ حکم الٰہی کے خلاف ان شیاطین کی اطاعت کرنا خود ایک قسم کا شرک ہے۔ [2]

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

''اور کیا وہ جو مردہ تھا تو ہم نے اسے زندہ بنایا اور اس کے لئے ایک روشنی قرار دی جس کو لئے ہوئے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے، اس کی طرح ہے جس کی حالت تاریکیوں میں یہ ہے [3] کہ وہ ان سے نکل ہی نہیں سکتا۔ اسی طرح کافروں کی نظر میں آراستہ ہوئے ہیں وہ اعمال جو وہ کرتے ہیں۔

''مردہ تھا اور اسے زندہ بنایا'' اس سے مراد یہ ہے کہ کافر تھا، اسے ہم نے ایمان کی طرف ہدایت کی اور جہالت میں تھا ہم نے علم عطا

---

[1] ۔الاثم قیل الاھل وقیل کل معصیۃ (جلالین) الاصح القول الاھل (کل اثم) لانہ یعم الجحیم (مجمع البیان)

[2] ۔انکم اذا المشرکون (تبیان) یعنی شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اس کا مطیع ہووے (موضح القرآن)

[3] ۔مانند کسی باشد کہ صفتش ایں است کہ در تاریکیہا است (شاہ ولی اللہ)

کیا۔[1] ''روشنی جس کو لئے ہوئے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے'' ایک مسلمان کا وہ طرز حیات ہے جو دین اسلامی کی تعلیمات کی بنا پر اس کی ہر نقل وحرکت سے نمودار ہوتا ہے جس سے دوسرے دیکھنے والوں کو اگر وہ آنکھوں سے کام لیں اپنے کردار کی پستی کا احساس ہوگا اور وہ اس طرز زندگی سے متاثر ہوکر صحیح راستے کی طرف آجائیں گے۔

''اس طرح آراستہ ہوئے'' یعنی جیسے اہل ایمان کو ہدایت کا راستہ بھلا معلوم ہوا، وہ اس پر چل کھڑے ہوئے ویسے ہی کافروں کو اپنی جہالت سے ان کی بداعمالیاں بھلی معلوم ہوئیں[2] اور یہ اپنے اپنے حسن اختیار وسوء اختیار کا کرشمہ ہے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں کچھ بڑے بڑے مجرم قرار دیئے ہیں کہ وہ اس میں طرح طرح کے منصوبے بناتے ہیں اور وہ منصوبے نہیں بناتے مگر خود اپنی ہی تخریب کے لیکن انہیں شعور نہیں ہے''۔

وہ پیدا تو ان منصوبہ سازیوں کے لئے نہیں کئے گئے تھے مگر چونکہ نتیجتاً انہوں نے پیدا ہونے کے بعد یہی وطیرہ اختیار کیا، اس لئے ان کی پیدائش پر مرتب شدہ نتیجہ کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ہم نے یہ مجرم قرار دیئے ہیں کہ جو طرح طرح کے منصوبے بناتے ہیں۔[3]

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

''اور جب ان کے پاس کوئی معجزہ آتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، جب تک ہمیں نہ ملیں ویسی ہی چیزیں جیسی اللہ کے پیغمبروں کو ملتی ہیں، اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کا منصب کہاں رکھے[4] ان مجرموں کو عنقریب ذلت ہوگی اللہ کے یہاں اور سخت سزا ان تخریبی کاروائیوں کی وجہ سے جو وہ کرتے رہتے تھے''۔

مطلب یہ ہے کہ وہ کفار کہتے تھے کہ اللہ ہم ہی کو رسول کیوں نہیں بناتا اور وہ سب چیزیں نہیں عطا کر دیتا جو پیغمبروں کو ملی ہیں۔[5]

اس کا جواب خالق نے یہ دیا ہے کہ پیغمبری ہر ایک کو تھوڑی ملتی ہے۔ وہ کچھ خاص اوصاف سے وابستہ ہے اور خدا ہی ان اوصاف کو جانتا ہے کہ وہ کس میں پائے جاتے ہیں۔

---

[1] ۔کان میتا بالکفر فصار حیا بالاسلام (تبیان) تشبہ سبحانہ الکفر بالامرادۃ والایمان بالحیوۃ (مجمع البیان)

[2] ۔کما زین للمؤمنین الایمان (جلالین)

[3] ۔لام العاقبۃ کما فی قولہ سبحانہ: لیکون لھم عدوا و حزنا (مجمع البیان)

[4] ۔خدا داناتر است بمحل نہادن پیغمبری خود (شاہ ولی اللہ) اللہ خوب جانتا ہے کہ کس جگہ رکھے پیغمبری اپنی کو (شاہ رفیع الدین)

[5] ۔من یعلم انہ یقوم باعباء الرسالۃ (تبیان)

رسالت بر بنائے بلندی اوصاف

اس سے ظاہر ہے کہ پیغمبروں کی رفعت رسالت کے نتیجہ میں نہیں ہے چونکہ رسالت کا منصب خالق نے عطا کر دیا، اس لئے وہ بلند ہو گئے بلکہ رسالت ان کو رفعت اوصاف و کردار کی بنا پر ملتی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ خالق کا علم محیط ہے اور وہ تجربہ اور مشاہدہ کا محتاج نہیں ہے، اس لئے عطائے منصب ان کو بحیثیت زمانہ مقدم ہے اور عالم خارج میں ان اوصاف کا ظہور مؤخر ہے جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے قرآن کی آیت ان کا یہ اعلان گہوارہ میں بتا رہی ہے کہ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ''مجھے اس نے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے۔''

اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے: کُنْتُ نَبِیًّا وَ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ ''میں اس وقت بھی نبی تھا، جب آدمؑ آب و گل کے درمیان تھا'' یعنی ابھی مفرد عناصر کی منزل تھی اور ترکیب جسمانی کے ساتھ پتلا بھی تیار نہ ہوا تھا۔ روح پھونکے جانے کا کیا ذکر ہے۔

فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ یُّرِدْ اَنْ یُّضِلَّهٗ یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ یَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

''تو جسے اللہ سیدھے راستے پر لگانا چاہتا ہے، اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہی میں چھوڑ دینا چاہتا ہے اس کے سینہ کو تنگی کے ساتھ بالکل بند [1] کر دیتا ہے جیسے کہ وہ جو آسمان میں اونچا ہو رہا ہے [2] اس طرح اللہ نجاست کا حکم لگا دیتا ہے ان پر جو ایمان نہیں لاتے۔''

یہ اللہ کا چاہنا انسان کے کسی کردار ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی لئے آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ اس طرح نجاست کو پائے نام کر دیتا ہے ان کے جو ایمان نہیں لاتے۔ معلوم ہوا کہ یہ ایمان نہ لانا اللہ کے عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا یہ عمل جو ہے، وہ ان کے عمداً ایمان سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ [3]

لہٰذا اس کے بالمقابل جو ''شرح صدر'' (سینہ کو کشادہ کرنا) ہے وہ بھی انسان کے ارادۂ توجہ و التفات کا نتیجہ ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: ''وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا'' جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں، انہیں ہم اپنے راستوں پر لگا دیتے ہیں۔''

اسی کو یہاں کہا گیا ہے کہ جسے وہ راستے پر لگانا چاہتا ہے، اس کے سینہ کو کشادہ کرتا ہے۔ ''سینہ کشادہ کرنا'' حقائق کو اس کے ذہن نشین کرنا اور اسے مزید بصیرت عطا کرنا ہے۔ [4]

---

[1] ۔فالحرج الذی لا مدخل فیه والضیق مایکون له الدخل الضیق (علی بن ابراهیم)

[2] ۔ گویا بالا می رود در آسمان (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔عقوبة له علی ترك الایمان من غیر ان یکون سبحانه مافعاله من الایمان وسالبا ایاه القدرة علیه (مجمع البیان)

[4] ۔یعنی بفهماندش حقیقت اسلام و محاسن آں (شاہ ولی اللہ) بان یثبته علیه ویقوی داعیه علی التمسك به وینهل عن قلبه وساوس الشیطان (مجمع)

اور جو اپنے اختیار سے اعراض و انحراف کرتا ہے، اللہ کی طرف سے بھی اس سے بے توجہی اختیار کر لی جاتی ہے اور اس کے ذہن کے دروازوں کو بند کر دیا جاتا ہے جس کے بعد وہ تعصب اور عناد کی بنا پر رہی سہی اپنے عقل و شعور کی طاقت سے بھی کام لینے کے لائق نہیں رہتا۔ [1]

''اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے'' یعنی اس پر حق کا قبول کرنا بہت ہی شاق و ناگوار ہوتا ہے۔ [2]

اس کی تشبیہ دی گئی ہے اس شخص سے جو بہت اونچائی پر چڑھے تو معلوم ہوتا ہے کہ سینہ میں دم گھٹا جا رہا ہے۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

''اور یہ تمہارے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے۔ ہم نے نشانیاں تفصیل سے پیش کر دی ہیں، ان لوگوں کے لئے جو نصیحت قبول کرتے ہیں۔ ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے ان کے پروردگار کے یہاں اور وہ ان کا سرپرست ہے [3] ان اعمال کے صلہ میں جو وہ انجام دیتے تھے۔''

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓـُٔهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

''اور جس دن وہ ان سب کو محشر میں اکٹھا کرے گا، اے گروہ جنات تم نے بہت آدمیوں پر قبضہ کیا [4] اور ان کے حوالی موالی نے جو آدمیوں میں سے تھے کہا اے پروردگار! ہم نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا اور عمر کو بسر کیا جو تو نے ہمارے لئے مقرر کی تھی۔ اس نے کہا کہ اب تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہے جس میں تم سب ہمیشہ رہو گے، سوا اس کے جسے اللہ چاہے۔ یقیناً تمہارا پروردگار صحیح صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔ اور اس طرح ہم ظالموں کو آپس میں ایک دوسرے کے سپرد کر دیتے ہیں [5] ان اعمال کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے۔''

گروہ جنات سے مراد شیاطین ہیں [6] جو انسانوں کو بہکاتے ہیں اور خالق کا کلام ان سے جس کا ذکر ہے یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی آواز

---

[1] ۔یعنی ہر چند کہ میخواہند حقیقت اسلام و محاسن آں بفہمند نمی توانند (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔معناہ انہ ثیقل علیہ ما یدعی الیہ من الایمان (تبیان)

[3] ۔او کارساز ایشاں است (شاہ ولی اللہ) اور وہ دوست ہے ان کا (رفیع الدین)

[4] ۔ای قد استکثر تم من اضللتموہ من الانس (تبیان) تابع خود بسیار گرفتید از مردمان (شاہ والی اللہ)

[5] ۔مسلط می کنیم بعض ستمگاراں را بر بعضی (شاہ ولی اللہ)

[6] ۔یعنی اے شیاطین (شاہ ولی اللہ)

خلق ہو جسے وہ سنیں اور یوں بھی کہ فرشتے ان سے تخاطب کریں اور فرشتوں کے تخاطب کو اللہ نے اپنا کلام کہا ہو۔ [1]

دوزخ میں ہمیشہ قیام کے اعلان کے ساتھ ''سوا اس کے جسے اللہ چاہے'' ان گنہگاروں کے لحاظ سے ہوسکتا ہے جن کا گناہ کفر کے درجہ تک نہ پہنچا ہو۔

یہ کہ ''ظالموں کو ہم آپس ہی میں ایک دوسرے کے سپرد کر دیتے ہیں'' اس کا ایک مطلب تو وہ ہے جو پہلے لکھا گیا ہے اور دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی سرپرستی سے انہیں خارج کر دیتے ہیں ان کے اعمال کی سزا میں۔ [2]

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

''اے گروہ جن و انسان! کیا تمہاری طرف پیغمبر تم ہی میں کے نہیں آئے جو تمہارے سامنے میری آیتیں بیان کرتے تھے اور تمہیں اس دن کے درپیش ہونے سے ڈراتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ ہم بے شک اپنے خلاف گواہ ہیں اور انہیں دنیوی زندگی نے فریب میں مبتلا کر دیا تھا اور اب انہوں نے اپنے خلاف گواہی دی ہے کہ بیشک وہ کافر تھے۔''

انسان اور جنات کو ایک قبیلہ قرار دے کر خطاب کیا گیا اس اعتبار سے کہ دونوں اس جوہر اختیار کے حامل ہیں جو تکالیف الٰہیہ کی ذمہ داری عائد ہونے کے لئے ضروری ہے جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ''میں نے جنات اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

رُسُلٌ مِّنْكُمْ کے خطاب کو اس مخلوط قبیلہ یعنی جن و انس کے مجموعہ سے بھی متعلق کیا جاسکتا ہے [3] اس صورت میں یہ ضروری نہ ہوگا کہ جنات کے رسول از قسم جنات ہی ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کچھ پیغمبر از قسم جنات بھی مانے جائیں۔

یہ اور بات ہے کہ کوئی رسول جو افضل المرسلین ہے، وہ انسانوں میں سے ہو اور ان سب کا حاکم اور اس پورے سلسلہ کا خاتم ہو۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾

''بات یہ ہے کہ تمہارا پروردگار یہ کرنے کا نہیں ہے کہ بستیوں کو ظلم و ستم کی بنا پر [4] ختم کر دے اس عالم میں کہ اس

---

[1] ۔قال تعالیٰ لهم علی لسان الملئكة (جلالين)

[2] ۔الغرض بذٰلك اعلامهم انه ليس لهم يوم القيمة ولی يدفع عنهم شيئا من العذاب (تبيان)

[3] ۔منكم ای من مجموعكم الصادق بالانس والجن (جلالين) لتغليب احدهما علی الاخریٰ كما يغلب المذكر علی المؤنث و كما وصل يخرج منهما اللؤلؤ والمرجان بعد قوله: مرج البحرين يلتقيان وانما يخرج اللؤلؤ من الملح دون العذب۔ وهٰذا قول اكثر المفسرين (تبيان) وهو الاقویٰ (تبيان)

[4] ۔بظلم يكون منهم (مجمع البيان) بظلم منها (جلالين) بجزائے ظلم (شاہ ولی اللہ)

کے رہنے والے بے خبر ہوں۔''

''بے خبر'' ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ان تک احکام الٰہیہ کے پہنچانے کا خالق کی طرف سے انتظام ہی نہ ہوا ہو۔[1]

اس صورت میں یہ نہیں ہوسکتا کہ انہیں ان کی غلطیوں کی سزا دی جائے جو خلاف عدل ہوگا، ظلم قرار پائے گا، اور خدا ہر برائی سے پاک اور بری ہے۔

تکلیف بلا بیان قبیح ہے

یہ جماعت عدلیہ کا وہ اصول ''عدل'' ہے جو قرآن مجید کی بے شمار آیتوں کے ساتھ ساتھ اس آیت سے بھی ثابت ہے۔

اسی کو اصولِ فقہ میں ان الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں کہ ''تکلیف بلا بیان قبیح ہے'' جس پر اصول عملیہ میں سے ''اصل براءۃ'' کی بنیاد ہے۔

اور علم کلام میں اسی سے اس کی ضرورت ثابت ہوتی ہے کہ خالق پیغمبر مقرر کرے جو خلق خدا کو صحیح راستہ بتا کر حجت تمام کرے جس کا ذکر اس کے قبل کی آیت میں ہے۔[2]

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور ہر ایک کے لئے مرتبے ہیں اس اعتبار سے کہ جو انہوں نے اعمال کئے ہیں اور تمہارا پروردگار بے خبر نہیں اس سے کہ جو وہ کرتے تھے۔''

یاد رہے کہ قرآن مجید میں ہر جگہ مراتب اخرویہ کو اعمال سے وابستہ کیا ہے[3] جن کی صحت ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔

ایمان بلا عمل کا تصور قرآن کی روشنی میں ممکن ہی نہیں ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

''اور تمہارا پروردگار بے نیاز ہے، رحمت والا۔ اگر چاہے، تم لوگوں کو لے جائے[4] اور تمہارے بعد تمہاری جگہ جسے چاہے دیدے جیسا کہ تم لوگوں کو اس نے پیدا کیا کچھ اور لوگوں کی نسل سے۔''

یعنی اس کا تمہیں خلق کرنا اور اس دنیا میں برقرار رکھنا صرف اس کی رحمت ہے، ورنہ اسے تمہاری ضرورت نہیں ہے اور نہ تمہاری

---

[1] ۔غافلون لم یرسل الیھم رسول یبین لھم (جلالین)

[2] ۔این ارسال رسل بسبب آنست یعنی قبل از بعثت رسل عقوبت نہ نمی آید (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ای مراتب فی عملہ علیٰ حسب ما یستحقہ فیجازی علیہ.(مجمع البیان) فالاعظم من العقاب للاعظم من المعاصی والاعلم من للثواب الاعظم من الاطاعات (تبیان)

[4] ۔اگر خواہد دور کند شمارا (شاہ ولی اللہ)

نافرمانیوں اور سرتابیوں سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ [1]

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

''یقیناً جو وعدہ وعید تم سے ہوتا ہے، وہ ضرور آنے والا ہے اور تم قدرت کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔''

عربی زبان میں وعدؔ اچھی بات کے وعدہ کے لئے آتا ہے اور وعید کسی برے نتیجہ سے دھمکانے کے لئے آتا ہے۔ تو عدون کا لفظ عربی قاعدہ کے لحاظ سے دونوں سے ہوسکتا ہے، وعد سے بھی اور وعید سے بھی۔

عموماً اس کا ترجمہ ''وعدہ'' کے لفظ سے کیا گیا ہے [2] لیکن بعض مفسرین نے اسے وعید سے ماخوذ لیا ہے [3] اور آخر کا فقرہ ''وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ'' جس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کو بے بس نہیں بنا سکتے جس کو ہم نے ترجمہ میں اس طرح ادا کیا ہے کہ ''تم قدرت کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے''۔ یہ دوسرے معنی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے یعنی جس عذاب آخرت اور پاداش اعمال سے تمہیں ڈرایا جاتا ہے، تم اسے روک نہیں سکتے اس لئے کہ تمہارے امکان میں یہ نہیں ہے کہ تم اللہ کی قدرت کا مقابلہ کر کے اسے عاجز و مجبور بنا سکو۔

ہم نے ایسا ترجمہ کیا ہے جو دونوں پر منطبق ہوسکتا ہے اور دوسرے مفسرین بھی ایسے ہیں جنہوں نے اس لفظ کو ثواب و عذاب دونوں پر حاوی قرار دیا ہے۔ [4]

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

''کہہ دیجئے کہ اے میری قوم والو! تم اپنی حد پر اپنے کام کئے جاؤ [5] میں اپنا کام کرتا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں معلوم ہوگا کہ انجام میں اس عالم کی بہتری کس کے لئے ہے [6] جو ظالم ہیں وہ بلاشبہ دین و دنیا کی بہتری نہیں پائیں گے۔''

''اپنے کام کئے جاؤ''..... یہ کوئی حکم یا واقعی مطالبہ نہیں ہے بلکہ تہدید کا ایک طریقہ ہے کہ جو کرنا ہو کر لو۔ میرا اس سے کوئی نقصان نہیں ہے تمہیں بعد میں پتہ چلے گا کہ انجام کیا ہوتا ہے۔ [7]

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ

---

[1] ۔الغنی عن خلقه وعبادتهم ولكنه تعالىٰ ابقاكم رحمة لكم ۔ (جلالین) لا ينفعه طاعتهم ولا نصيره معصيتهم (مجمع البيان)

[2] ۔آنچه وعده کرده می شود شمارا (شاه ولی الله) جو کچھ وعدہ دیئے جاتے ہو تم (شاہ رفیع الدین) جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (فرمان علی صاحب)

[3] ۔ان ما توعدون من الساعة والعذاب (جلالین) ان الذی اوعد الخلق به من عقابه علىٰ معاصيه والكفر به واقع (تبیان)

[4] ۔من القيامة والحساب والجنة والنار والثواب والعقاب وتفاوت اهل الجنة فی الدرجات وتفاوت اهل النار فی الدرجات (مجمع البيان)

[5] ۔اعملوا علىٰ قدر منزلتكم او تمكنكم من الدنيا (تبیان) وقيل علىٰ طريقتكم وقيل علىٰ حالتكم (مجمع البيان)

[6] ۔ای العاقبة المحمودة فی الدار الأخرة (جلالین)

[7] ۔وان كان ضيعة ضيعة الامر فالمراد به التهديد (تبیان)

وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

''اورانہوں نے ان چیزوں سے کہ جو اس نے پیدا کی ہیں، کھیت اور چوپائے، ایک حصہ اللہ کا رکھا ہے [1] تو اپنے خیال ناقص کے مطابق کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا ہے اور یہ ہمارے شریکوں کا [2] تو جو ان کے والے شریکوں کا ہے، وہ اللہ کی طرف نہیں جا سکتا اور جو اللہ کا ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جائے گا۔ کیا برا ہے وہ حکم جو وہ لگاتے ہیں۔''

شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں: ''کافر اپنی کھیتی میں سے اور مواشی کے بچوں میں سے اللہ کے نیاز کا نکالتے اور بتوں کے بھی نیاز کا۔ پھر اگر جانور اللہ کے نام کا بہتر دیکھا، بتوں کی طرف بدل دیا اور بتوں کی طرف کا اللہ کی طرف نہ کرتے، اس سے زیادہ ڈرتے۔'' (موضح القرآن)

ان کی اس تفریق کی بنیاد یہ تھی کہ وہ کہتے تھے اللہ تو بے نیاز ہے اسے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے یہ بت بیچارے ضرورت مند ہیں [3] لہٰذا بعض صورتوں میں اللہ کا حصہ ان کی طرف چلا جائے تو کوئی حرج نہیں اگرچہ اللہ کی بے نیازی کا تصور بجائے خود ایک صحیح بات ہے مگر چونکہ ان کے اس رویہ سے اہمیت بتوں کی زیادہ نمایاں ہوتی ہے، اس لئے قرآن مجید نے ان کے اس عمل کو ان کی باطل پرستی کے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

''اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کی جان لینے کو نظروں میں سجا دیا ہے کہ انہیں تباہ کریں اور تاکہ ان کے مذہب کو ان پر مشتبہ کریں [4] اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے لہٰذا چھوڑ دیئے انہیں اور اسے کہ جو وہ جھوٹ باندھا کرتے ہیں۔''

''اسی طرح'' یعنی جیسے انہوں نے قربانیوں میں بٹوارا کیا ہے کہ یہ اللہ کا ہے اور یہ ان کے شریکوں یعنی بتوں کا اور اسے ان بتوں نے یعنی ان کی محبت نے ان کی آنکھوں میں آراستہ و پیراستہ بنا کر پیش کیا ہے، ویسے ہی اولاد کی جان لینے کو ان کی نظروں میں سجا دیا ہے۔ [5]

اس جان لینے سے مراد بظاہر وہ دخترکشی کی رسم ہے جو عرب میں رائج تھی۔ [6]

اور ہوسکتا ہے کہ بتوں پر بچوں کو بھینٹ چڑھانے کی رسم بھی ان میں پائی جاتی ہو۔

---

[1] ۔ھٰھنا حذف یدل الکلام علیه وھو: جعلوا للاوثان منه نصیبا (مجمع البیان)

[2] ۔انما جعلوا الاوثان شرکائھم لانھم جعلوا لھا نصیبا من اموالھم (مجمع) برای شرکائی کہ ما مقرر کردہ ایم (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔یقولون ان اللہ غنی والاصنام احوج (مجمع البیان)

[4] ۔تا مختلط کنند بر ایشاں دین را (شاہ ولی اللہ) ملا دیویں اوپر ان کے دین ان کا (شاہ رفیع الدین)

[5] ۔ کذٰلك کما زین لھم ما ذکر (جلالین)

[6] ۔زینوا لھم قتل البنات (مجمع البیان)

اگر "شرکاء" سے بت مراد لئے جائیں جیسا کہ اس کے پہلے لکھا گیا ہے تو ان کی طرف اس فعل کے سجنے کی نسبت اسی معنی سے ہوگی کہ ان بتوں کی محبت انہیں اس پر آمادہ کرتی تھی اور یہ اس دوسرے مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے ان دونوں باتوں کو سمو دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ان میں سے کسی کے یہاں جب لڑکی پیدا ہوتی تو لوگ اس کو ملامت کرتے تھے اور وہ تنگ و عار کے مارے اسے مار ڈالتا تھا یا زندہ درگور کر دیتا یا پجاریوں کے بہکانے سے بتوں کے آگے بھینٹ چڑھا دیتا اور اپنے خیال میں اسے بہت اچھا کام سمجھتا۔''

ایک احتمال یہ ہے کہ ''شرکاء'' سے شیاطین مراد ہوں، اس لئے کہ گمراہ افراد جب خدا کی اطاعت کے بجائے شیطان کا کہنا مانتے ہیں تو گویا وہ بھی ایک صنم ہے جس کی وہ عبادت کر رہے ہیں اور اس نے ایسی ایسی غلط کاریوں کو ان کی نظر میں سجا کر مستحسن قرار دے دیا ہے [1]

ایک تفسیر یہ ہے کہ شرکاء سے مراد ان کے وہ آباؤ اجداد ہیں جن کی وہ اندھا دھند پیروی کر رہے ہیں۔ [2]

''اور اگر وہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے'' اس طرح کے جملے قرآن مجید میں کئی جگہ ہیں اور ہر جگہ مطلب ایک ہی ہے کہ اگر خالق جبری طاقت کو اپنی بروئے کار لاتا [3] تو یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا مگر جبر کرنا اس کی حکمت کے تقاضا کے خلاف ہے۔

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۱۳۸

''اور ان کا کہنا ہے اپنی خام خیالی سے کہ یہ چوپائے اور کھیت اچھوتے ہیں [4] کہ انہیں نہیں کھا سکتا مگر وہ جسے ہم چاہیں اور کچھ چوپائے ہیں جن کی پشت پر سواری کو ممنوع قرار دیا ہے [5] اور کچھ چوپائے ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے اس پر غلط تہمت لگاتے ہوئے، وہ انہیں عنقریب اس کی جو وہ غلط تہمت لگاتے ہیں، سزا دے گا۔''

یہ سب ان بدعتوں کی فہرست ہے جو ان مشرکین نے ایجاد کر رکھی تھیں۔

یہ چوپائے اور کھیت ''یعنی جنہیں انہوں نے اپنے بتوں پر چڑھا دیا ہے [6]

ان کے کھانے کے لئے انہوں نے دل بخواہ پابندیاں عائد کر رکھی تھیں مثلاً وہ کھائیں گے جو بتوں کے خاص خدمت گزار ہیں۔ وہ بھی،

---

[1] ۔یعنی الشیاطین الذین زینوا لھم قتل البنات (مجمع البیان)

[2] ۔قال یعنی اسلافھم (علی بن ابراھیم)

[3] ۔لوشآء ان یضطرھم الیٰ ترکہ (تبیان)

[4] ۔حجر حرام (جلالین) یہ جانور ہیں اور کھیتی ہے اچھوتی (شاہ رفیع الدین)

[5] ۔حرام کردہ شدہ است سواری بر پشت آنہا (شاہ ولی اللہ)

[6] ۔الانعام والزرع الذین جعلوھما لآلھتھم واوثانھم (تبیان)

مرد، عورتیں نہیں۔[1]

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝۱۳۹

''اوران کا کہنا ہے کہ جوان چوپایوں کے اندر ہے وہ ہمارے افراد ذکور سے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے اور اگر مردار ہوتو وہ سب اس میں حصہ دار ہیں بہت جلد وہ انہیں ان کے اس حکم لگانے کی سزا دے گا۔ یقیناً وہ صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔''

اس کی تشریح شاہ صاحب کے لفظوں میں پڑھئے:

''ایک یہ مسئلہ بھی بنایا تھا کہ جانور ذبح کیا۔ اس کے پیٹ میں سے بچہ نکلا۔ اگر زندہ نکلا تو مرد کھائیں اور عورتیں نہ کھائیں اور مردہ نکلے تو سب کھاویں'' (موضح القرآن)

مشرکین کی تاریک ذہنیت اور افسوس ناک بدعت

ان کے اس مزعومہ کی رد کی جارہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو غذا حلال ہے، وہ سب کے لئے اور جو حرام ہے وہ بھی سب کے لئے۔ اس میں مرد اور عورت کا کوئی فرق نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہ تصور ان کا انہی چوپایوں سے متعلق تھا جن کا کھانا وہ حرام سمجھتے تھے جیسے بحیرہ اور سائبہ۔[2]

''چوپایوں اندر'' کے معنی ایک روایت کے مطابق دودھ کے ہیں[3] اور دوسری روایت کے مطابق پیٹ کے بچے مراد ہیں۔ بعد کے جملہ سے کہ ''اگر مردار ہو'' اس دوسرے مفہوم کو تقویت پہنچتی ہے کیونکہ یہاں سب ہی کے نزدیک پیٹ کے بچے مراد ہیں۔[4]

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَاۗءً عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۱۴۰

''بلاشبہ گھاٹے میں ہیں جنہوں نے اپنے بچوں کی جان لی نادانستہ حماقت سے اور حرام سمجھ لیا اسے جو اللہ نے انہیں عطا کیا تھا اللہ پر غلط باتیں منڈھ کر۔ بے شک وہ گمراہ ہوئے اور انہوں نے سیدھا راستہ اختیار نہیں کیا''[5]

---

[1] ۔لا یحلون ذٰلك الا لمن قام بخدمة اصنامهم من الرجال دون النسآء (مجمع البیان)

[2] ۔هٰذه الانعام الحرّما وهی العائب والبحائر (جلالین)

[3] ۔یعنی البان البحائر والسیب (مجمع البیان)

[4] ۔معناوان کان حنین الانعام میتة (تبیان)

[5] ۔قتلوا اولادهم بالوأد (جلالین)

اولاد کشی کی مذمّت

بچوں کی جان لینے سے مراد وہی ''دختر کشی'' کی رسم ہے جسے جاہل عربوں نے قائم کر رکھی تھی [1] اور چونکہ اس کا محرک ان کے خیال میں ایک بڑا مستحسن جذبہ یعنی شرافت اور حفظِ ناموس کا خیال رکھا، اس لئے خالق نے ان کے اس فعل کو ''شعوری'' اور ''ارادی'' گناہ قرار نہیں دیا بلکہ اس کا سبب ''حماقت'' اور ''بے عملی'' کو قرار دیا۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ ''حرام سمجھ لیا اسے جو اللہ نے انہیں عطا کیا تھا''..... یہ گزشتہ بات کا تتمہ بھی ہوسکتا ہے یعنی یہ اولاد اللہ نے عطا کی تھی اور یہ اس کی نعمت تھی مگر وہ اپنی جہالت سے اپنے کو اس سے محروم کر لیتے ہیں۔ [2]

اور بہت ممکن ہے کہ اس سے مراد وہی بحیرہ اور سائبہ ایسی غذائیں ہوں جنہیں انہوں نے حرام قرار دے لیا تھا [3] جس کا تذکرہ اس کے قبل کی آیتوں میں تھا۔

میرے خیال میں اس ذکر کے بعد یہ فقرہ کہ افْتِرَاءً عَلَى اللّٰهِ ''اللہ پر غلط بات منڈھ کر'' یہ اسی دوسرے احتمال کو تقویت دیتا ہے۔ اس لئے لڑکیوں کا زندہ درگور کرنا ان کے ایک ذاتی تصور پر مبنی تھا کہ وہ اسے لڑکیوں کی عصمت وعفت کے تحفظ کا ذریعہ سمجھتے تھے اور اسے مستقبل کی آبرو ریزی سے حفاظت کا سامان کہتے تھے۔ وہ ''سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ'' یعنی بے شعوری اور لاعلمی کا نتیجہ تو ہے مگر افْتِرَاءً عَلَى اللّٰهِ نہیں ہے کیونکہ وہ اسے کسی حکم الٰہی پر مبنی قرار نہیں دیتے تھے مگر ہاں جانوروں کو جو انہوں نے حرام کیا تھا تو اسے ایسا سمجھ رکھا تھا اور کہتے تھے کہ ان کا کھانا اللہ کی طرف سے ممنوع ہے۔ حالانکہ کسی کتاب سماوی میں اللہ کا کوئی حکم ایسا موجود نہ تھا تو یہ ان کا کہنا بلاشبہ افْتِرَاءً عَلَى اللّٰهِ کی حیثیت رکھتا تھا۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

''اور وہ وہی ہے جس نے پیدا کئے گھنے باغ، وہ بھی جو ایسی بیلوں کے ہیں جو (بانسوں وغیرہ کی مدد سے، اونچی کی جاتی ہیں اور وہ بھی جو اونچی نہیں کی جاتیں [4] اور کھجور کے درخت اور طرح طرح کی کھیتی اور زیتون اور انار، جو ملتے جلتے ہوئے بھی ہیں اور نہیں بھی ملتے جلتے ہیں [5] جب یہ چیزیں پھلیں تو ان کے پھلوں میں سے کھاؤ اور اس کے

---

[1] ۔حرّموا مارزقهم الله مما ذكر (جلالين)

[2] ۔حرّموا مارزقهم الله مما ذكر (جلالين)

[3] ۔يعنى الانعام والحرث الذين يزعمون انها حجر (مجمع البيان)

[4] ۔مرفوعات بالدعائم وغيره معروشات ...يعنى ماخرج من قبل نفسه من انواع الاشجار (مجمع البيان) بوستانهای برداشته شده بر پایها و بوستانهائی غیر برداشته شده بر پایها (شاه ولی الله)

[5] ۔متشابها در قهما وغيره متشابه مطعما (جلالين)

کاٹنے کے وقت جو اس میں کا واجب الاداحق ہے وہ ادا کر دو[1] اور حد سے آگے نہ بڑھو، یقیناً وہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا''۔

''واجب الاداحق'' سے مراد حق مساکین ہے جو زکوٰۃ کے وجوب سے پہلے کوئی تعین نہ رکھتا تھا اور اس فریضہ کے بطور قانون نافذ ہونے کے بعد اس کی مقدار مقرر ہو گئی ہے کہ وہ دسواں یا بیسواں حصہ ہے جس کی تفصیل کتب فقیہ میں درج ہے۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ''حد سے آگے نہ بڑھو'' یہ حد سے بڑھنا حق مساکین کے نکالنے میں بھی ہو سکتا ہے کہ انسان سب لٹا دے اور گھر والوں کے لئے کچھ رکھے ہی نہ اور اپنے صرف میں لانے سے بھی متعلق ہو سکتا ہے کہ انسان فضول خرچیوں میں اڑا دے اور حقوق مساکین دے ہی نہیں اور زکوٰۃ وصول کرنے والوں سے بھی متعلق ہو سکتا ہے کہ حقوق مالیہ کے وصول کرنے میں ان کے ساتھ سختی کرنے میں حد سے قدم آگے نہ بڑھاؤ۔[2]

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾

''اور چوپایوں میں سے بار برداری والے اور زمین پر بچھے ہوئے کھاؤ اس سے جو اللہ نے تمہیں روزی عطا کی ہے اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔''

یہ گزشتہ آیات ہی کے سلسلہ سے ہے یعنی اللہ نے ایسے ایسے باغ پیدا کئے تمہاری غذا کے لئے اور یہ جانور بھی پیدا کئے تمہارے فائدہ کے لئے۔

''زمین پر بچے ہوئے'' سے ایک مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ وہ قابل ذبح ہیں کہ انہیں تم زمین پر لٹا کر ذبح کرتے ہو۔[3]

اور یہ بھی سمجھا گیا ہے کہ اس سے نیچے قد والے جانور مراد ہیں جیسے بکری، بھیڑ وغیرہ جو اپنے قد و قامت کی پستی کی وجہ سے زمین سے لگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔[4]

اور یہ بھی مفہوم لیا گیا ہے کہ چوپایوں سے دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی پشت بار برداری کے کام آتی ہے اور ان کے اون اور بالوں سے بچھانے والی چادریں وغیرہ تیار کی جاتی ہیں۔[5]

آخر میں پھر مشرکین کی ان پابندیوں کے خلاف تنبیہ ہے جو انہوں نے ان جانوروں میں عائد کر رکھی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ سب خدا

---

[1] ۔بدھید زکوٰۃ اورا (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔الخطاب للجمیع بان لایسرف رب المال فی الاعطآء والامام فی الاخذ واصرف ذٰلك الیٰ غیر مصارفه وهٰذا اعم قائدہ (مجمع البیان)

[3] ۔بر زمین غلطانند بجهت ذبح (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔زمین کو لگے ہوئے (شاہ رفیع الدین) کالابل الصغار والغنم سمیت فرشا لانها کالفرش للارض لدنوها منها (جلالین)

[5] منها ما یتخذ من ادبارها واصوافها ما یفرش ویبسط عن ابی علی الجبائی (مجمع البیان)

نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے تو جو اللہ نے رزق تمہیں عطا کیا ہے، اس میں سے کھاؤ اور بلا وجہ اپنے اوپر پابندیاں عائد کر کے کفرانِ نعمت کے مرتکب نہ ہو کہ یہ بھی شیطان کی ایک کارستانی ہے جس سے وہ تمہارے لئے دنیا اور آخرت میں محرومی کا سامان کرتا ہے تو ان بلا وجہ کی پابندیوں کو اپنے لئے قبول کرنا شیطان کے قدم بقدم چلنا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو صوفیا کی بعض ریاضتوں میں جو ترکِ حیوانات وغیرہ کی تعلیم ہے، وہ اس قرآنی ارشاد کی رو سے مستحسن سمجھی نہیں جا سکتی۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ نَبِّـــُٔـوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۴۳ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۴۴ۧ

"آٹھ قسمیں: دو بھیڑ کی جنس سے اور دو بکری کی جنس سے۔ کہو کہ کیا اس نے دونوں قسم کے نروں کو حرام کیا یا دونوں قسم کی ماداؤں کو یا جو دونوں ماداؤں کے پیٹ میں ہو؟ مجھے کسی علم کی بنیاد پر بتاؤ اگر تم سچے ہو اور دو اونٹ کی جنس سے اور دو گائے بیل کی جنس سے۔ کہو کہ (ان میں) کیا اس نے دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں ماداؤں کو یا جو دونوں ماداؤں کے پیٹ میں ہو؟ کیا تم موجود تھے جب اللہ نے تمہیں یہ ہدایت کی تو کون ظالم ہوگا اس سے بڑھ کر کہ جو اللہ پر جھوٹی باتیں منڈھے تا کہ لوگوں کو بغیر کسی علم کے گمراہ کرے! بلا شبہ اللہ ظالم جماعت کے لئے منزل مقصود تک پہنچنے کا سامان نہیں کرتا"۔

یہ بھی اَنْشَاَ (پیدا کیا) کے تحت میں ہے جس کا سلسلہ قبل کی آیتوں سے چل رہا ہے [1] اور یہ تمام ردوقدح انہی مشرکین کے مقابلہ میں ہے جنہوں نے ان جانوروں میں خواہ مخواہ کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔

چونکہ جوڑے میں ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے، اس لئے بھیڑ بکری وغیرہ کی تمام اقسام کے جوڑوں کو ثمانیۃ ازواج کے لفظ سے تعبیر کیا جو افراد کے لحاظ سے آٹھ ہیں لیکن ہمارے محاورہ کے اعتبار سے جوڑوں کی تعداد چار ہوگی۔ [2]

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰي طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ

---

[1] ۔تقدیرہ: وانشا حمولۃ وفرشا ثمانیۃ ازواج (تبیان)

[2] ۔معناہ ثمانیۃ افراد...وقیل معناہ ثمانیۃ اصناف (مجمع البیان)

دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

''کہیے کہ میں نہیں پاتا اس میں کہ جس کی میری طرف وحی اتاری گئی ہے کسی کھانے والے پر کوئی شے جس کا کھانا حرام ہو، سوا اس کے کہ مردار ہو یا بہا ہوا خون یا سور کا گوشت کہ وہ بہت گندی چیز ہے یا غلط ذبیحہ جس پر اللہ کے سوا کوئی نام لیا گیا ہو۔ اب جو اضطراری حالت میں مبتلا ہو اور نہ باغی ہو، نہ حد سے تجاوز کرنے والا تو یقیناً تمہارا پروردگار بخشنے والا ہے، بڑا مہربان ہے''۔

چونکہ زیر بحث چرندہ جانوروں کے اقسام تھے، اس لئے اس نوع میں جو حرام چیزیں ہیں، ان کا ذکر ہوا ہے۔ اس لئے طیور یا دریا کے جانوروں میں جو چیزیں حرام ہیں یا چوپایوں میں جو درندہ قسم کے ہیں وہ اس میں داخل نہیں ہیں۔ [۱]

بہر حال اس صورت میں یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ان چیزوں کی حرمت قرآن سے نہیں، سنت سے ثابت ہے [۲] جس کے بغیر تنہا قرآن ماخذ احکام شرعیہ ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔

''خون'' کے ساتھ ''بہا ہوا'' کی قید اس حکم شرعی پر منطبق ہوتی ہے کہ خونِ متعارف بہنے کے بعد ذبیحہ میں جو خون اجزائے گوشت میں پیوست رہ جائے، وہ خون طاہر و حلال ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۡ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

''اور جنہوں نے یہودیت اختیار کی، ان پر ہم نے حرام کر دیا ہر ناخن دار جانور [۳] اور گائے بیل اور بھیڑ میں سے حرام کر دیا ان پر چربی کو سوا اس کے کہ جو ان کی پشت پر ہو یا آنتوں میں ہا جو ہڈی سے ملی ہوئی ہو۔ یہ انہیں سزا دی ہم نے ان کی بغاوت کی اور یقیناً ہم سچے ہیں''۔

جماعت یہود کے لئے یہ سخت قسم کے احکام منجانب اللہ تھے ان کی سابقہ بداعمالیوں کی سزا میں جیسا کہ دوسری جگہ ہے:

---

[۱] ۔انما هذه الآية رد على ما احلت العرب او حرمت (على بن ابراهيم) مراد حصر اضافی است به نسبت بهيتمه الانعام ...سگ و شیر و باز وغیر آن اگرچه حرام است از بهيمة الانعام نيست (شاه ولی الله)

[۲] ۔يلحق بما ذكر بالسنة كل ذي ناب من السباع ومخلب من الطير (جلالين) قيل ان ما عداه حرم فيما بعد بالمدينة والسورة مكية (تبيان)

[۳] ۔هو مالم يفرق بين اصابعه كالابل والنعام (جلالين) يعنى مثل شتر و شتر مرغ (شاه ولى الله) يعنى اونٹ ان پر حرام تھا (موضح القرآن)

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾ (سورۂ نساء)

اس بغیؔ کی تشریح ہماری قدیم تفسیر میں یہ آئی ہے کہ رؤسائے یہود نے ان چیزوں کو ان کے مرغوب ہونے کی وجہ سے غریبوں کے لئے ممنوع قرار دے دیا تھا تو اللہ نے اس کی سزا یہ دی کہ ان پر بھی ان چیزوں کے استعمال کو حرام قرار دے دیا۔ [۱]

اب یہ کہنے ہی سے کہ یہ چیزیں یہود پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے بطور سزا حرام کی گئی تھیں ظاہر ہو جاتا ہے کہ اب شرع محمدی میں یہ چیزیں حلال ہیں کیونکہ ان میں ذاتاً کوئی خرابی نہیں ہے۔ [۲]

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

''اب اگر یہ آپ کو جھٹلائیں گے تو کہہ دیجئے کہ تمہارا پروردگار بڑی وسیع رحمت والا ہے۔ ہاں اس کا عذاب مجرموں کی جماعت سے ہٹایا نہیں جا سکتا''۔

ہمارے جذبات کا تقاضا یہ ہے کہ تکذیب رسول ﷺ کرنے والوں کے لئے بس آخری ہی جملہ آنا چاہیے اور وہ بھی یوں کہ اس کا عذاب ان کم بختوں سے ہٹایا نہیں جا سکتا مگر یہ قرآن کی رواداری نہیں تو کیا ہے کہ اتنے سخت مجرموں کے تذکرہ کے بعد بھی خالق کی وسعت رحمت کو یاد دلایا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان تکذیب کرنے والوں کے لئے بھی رسول ﷺ کا کام رحمت سے مایوس کرنا نہیں ہے۔ جب بھی ان کے ضمیر میں عرفان حق کی تڑپ پیدا ہو جائے اور وہ تکذیب کے راستے سے ہٹ جائیں تو اللہ کی رحمت ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے موجود ہے۔ ہاں (اگر آخر دم تک اپنی مجرمانہ روش پر قائم رہیں تو ان کے لئے آخر والا جملہ ہے جس کو ضمیر عائد کر کے براہ راست ان سے متعلق کرنے کے بجائے ایک عام اصول کے طور پر ارشاد ہوا کہ ''اس کا عذاب مجرموں سے ہٹایا نہیں جا سکتا یعنی جو آخر دم تک مجرمانہ روش پر قائم رہیں، ان کے لئے عذاب کے سوا دوسرا انجام کیا ہو سکتا ہے؟!

ہم ان دونوں فقروں کا باہمی تعلق ایسا ہی محسوس کرتے ہیں لیکن دوسرے مفسرین میں کوئی یہ مطلب کہتا ہے کہ اس کی رحمت کے عام ہونے کے باوجود اس کا عذاب مجرموں سے نہیں ہٹ سکتا [۳] اور کوئی یہ کہتا ہے کہ اب تک تم عذاب سے اس کی وسعت رحمت کی وجہ سے بچے رہے مگر یہ نہ سمجھو کہ تم اس کے عذاب سے تا آخر بچے ہی رہو گے۔ [۴]

---

[۱] ۔کان ملوك بنی اسرائیل یمنعون فقراء هم من اكل لحم الطير والشحوم فحرم الله ذٰلك عليهم ببغيهم علىٰ فقرائهم (علی بن ابراهيم)

[۲] ۔هٰذه الاشیآء وان كان الله تعالىٰ حرمها علی اليهود فی شرع موسىٰ ﷺ فقد نسخ تحريمها علىٰ لسان محمد صلی الله علیه واٰله واباحها (تبیان)

[۳] ۔معناه ان احدا لا يتمكن من رد عقاب الله عن العصاة المستحقين العقاب مع انه تعالىٰ ذو رحمة واسعة (تبیان)

[۴] ۔یعنی رحمت کی سمائی سے اب تک تم بچے ہو لیکن نہ جانو کہ عذاب پھر گیا (موضح القرآن)

ہماری نظر میں الفاظ قرآن میں دونوں فقروں کے ورود کا انداز ان دونوں مفہوموں سے اجنبیت رکھتا ہے۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

''نزدیک ہے وہ وقت کہ مشرک لوگ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم مشرک نہ ہوتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز اپنی طرف سے حرام کرتے۔ ایسا ہی جھٹلایا انہوں نے جو ان کے پہلے تھے، یہاں تک کہ ہمارے عذاب کا مزہ چکھا۔ کہیے کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ تم ہمارے لئے اسے نکالو۔ تم تو نہیں پیروی کرتے مگر گمان کی اور نہیں کرتے مگر اٹکل پچو باتیں۔ کہہ دیجئے کہ یہ تو اللہ کی زبردست دلیل ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ زبردستی، چاہتا تو سب کو سیدھے راستے پر لگا دیتا''۔

یہ انسان کی وہ کمزوری ہے یا دھاندلی جو اکثر سست اعمال یا بد اعمال افراد کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے کہ ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا اگر اللہ نہ چاہتا تو ہم ایسا کیوں کرتے۔ مشرکین اسے مسلمانوں کے سامنے بطور حجت پیش کرتے تھے کہ ہماری یہ سب باتیں اللہ کو ناپسند ہوتیں تو وہ قادر مطلق ہے۔ وہ ہم کو اس سب سے روک نہ دیتا!

مشرکین کے بدعات اور ان کی مذمت

حقیقت امر یہ ہے کہ اس میں مغالطہ ہے۔ ایک چیز رضا اور پسندیدگی ہے اور ایک یہ کہ اپنے نظام حکمت کی بنا پر وہ جبر سے کام لینا نہیں چاہتا، اس لئے جو انسان کرے، اسے کرنے دیتا ہے۔

مشرکین مشیت کے وہ معنی لیتے تھے کہ اللہ اسے پسند کرتا ہے۔ قرآن نے اس کی رد کی اور کہا کہ اگر وہ پسند کرتا تو پھر اس پر سزا کیوں دیتا؟! اور پھر پسند کے ثبوت کے لئے تو اس کی طرف سے کوئی دلیل ہونا چاہیے۔

پہلی بات کو اس آیت میں ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ''تمہارے ہی ایسے افعال قبل والوں نے کئے تھے اور اس پر انہیں ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا'' یہ عذاب کا ہونا اس کی دلیل ہے کہ وہ اسے پسند نہیں ہیں۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے اسے اس طرح لکھا ہے کہ:

''کافروں کا شبہ ہے کہ اگر ہمارے کام اللہ کو پسند نہ ہوتے تو ہم کو کرنے نہ دیتا۔ اس کا جواب فرمایا کہ اگلوں کو گناہ پر کیوں پکڑا؟ معلوم ہوا کہ وہ بھی ایک مدت ناپسند کام کرتے تھے، اللہ نہ پکڑتا تھا، آخر پکڑا''۔ (موضح القرآن)

پھر دوسری بات کہی ان الفاظ میں کہ:

''یا تمہارے پاس کوئی علم ہے کہ ہمارے لئے اسے نکالو'' یعنی خدا کی جو کتابیں اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں، ان میں کہیں بتاؤ کہ تمہارے افعال کی کوئی سند ہے؟!''[1]

جب عذاب آنے سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ ان افعال کو پسند نہیں کرتا تو اسی کو پھر انسانوں کے فاعل مختار ہونے کے ثبوت میں پیش کر دیا گیا کہ اگر نظام جبر کارفرما ہوتا تو خالق کی ناپسند باتوں کا وقوع ہی عالم میں نہ ہوتا۔ یہ کفر و شرک اور معصیت کا وقوع خارج میں جو بالمشاہدہ ہے، یہ خود اس کا ثبوت ہے کہ خالق کی جانب سے بندے اپنے افعال میں مجبور نہیں ہیں بلکہ مختار خلق کئے گئے ہیں اور اسی لئے وہ اپنے اختیار سے کبھی اس کا پسندیدہ راستہ اختیار کرتے ہیں تو جزا پاتے ہیں اور کبھی اس کا ناپسند راستہ تو سزا پاتے ہیں۔

افسوس ہے کہ سواد اعظم کے علماء چاہے زبان سے جبر کا اقرار نہ کریں مگر اختیار کا تصور ان کے دل و دماغ میں جاگزیں نہیں ہے، اس لئے ایسے مقامات پر ان کے بیانات میں عجیب ژولیدگی پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ اس ٹکڑے کی تشریح شاہ عبدالقادر صاحب نے عجیب فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

''یہ تمہاری غلطی ثابت ہو چکی کہ دلیل نہیں رکھتے تو یہی تو علامت ہے کہ تمہاری قسمت میں ہدایت نہیں ہے''۔ (موضح القرآن)

ارے لیجئے! یہی تو مشرکین بھی کہہ رہے تھے کہ ہم مجبور ہیں۔ ہماری قسمت میں یہی تھا کہ ہم شرک کریں اور یہ غلط مسائل ایجاد کریں۔ اب ہر پھر کے آخر میں وہی بات صحیح نکلی تو ان کی دلیل پوری ہوئی یا اللہ سبحانہ کی؟ یہ تو کوئی ان کی رد نہ ہوئی بلکہ تائید ہوگئی نعوذ باللہ من ذٰلك۔

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

''کہہ دیجئے کہ لاؤ[2] اپنے ان گواہوں کو جو گواہی دیتے ہوں کہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہے، اب اگر وہ گواہی دیں تو آپ ان سے پھر بھی متفق نہ ہوں[3] اور پیروی نہ کیجئے ان لوگوں کے خیالات کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے پروردگار کا (دوسروں کو) برابر دار سمجھتے ہیں''۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ

---

[1] ۔یعنی نقلی از کتب الٰہی (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ھلم لفظ یتعدی تارۃ واخری لا یتعدی فاذا کانت بمعنی ھاتوا فانہا تتعدی ...واذا کانت بمعنی تعالی ابنحو ھلم الینا فانہا لا تتعدی (تبیان)

[3] ۔یا محمد اگر بفرض گواہی دھند ایشان تو معترف مشو با ایشان (شاہ ولی اللہ)

اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

''کہیے کہ آؤ! میں سناؤں [1] جو کچھ تمہارے پروردگار نے تم پر پابندیاں عائد کی ہیں۔ یہ کہ تم اس کا کسی چیز کو شریک قرار نہ دو اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اپنے بچوں کی فقر و فاقہ کے مارے [2] جان نہ لو؛ ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی (دیں گے) اور جنسی غلط کاریوں کے پاس نہ جاؤ، چاہے وہ نمایاں ہوں اور چاہے پوشیدہ [3] اور جس جان کی اللہ نے حرمت قرار دی ہے، اسے مارو نہیں مگر حق کے ساتھ۔ یہ وہ ہے جس کی اللہ نے تمہیں ہدایت کی ہے۔ شاید کہ تم عقل و شعور سے کام لو''۔

اپنی بداعمالیوں کی ذمہ داری تقدیر پر رکھنا غلط ہے

''حق'' سے مراد سزائے شرعی ہے جیسے قصاص یا سنگسار کیا جانا۔

محرمات کی فہرست گنوانے میں جو ان کے مقابل حکم ہے، اسے پیش کیا گیا ہے یعنی شرک حرام ہے، اسے یوں کہا گیا کہ اس کا کسی چیز کو شریک قرار نہ دو۔ ماں باپ کے ساتھ بدسلوکی حرام ہے، اسے یوں کہا کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اسی طرح آخر تک۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

''اور یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو مگر ایسی صورت سے جو بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کی منزل تک پہنچے اور ناپ تول پوری کرو انصاف کے ساتھ۔ ہم کسی پر پابندی نہیں لگاتے مگر اس کی طاقت بھر اور جب بات کہو تو انصاف کرو، چاہے وہ عزیز کیوں نہ ہو [4] اور اللہ کے عہد و پیمان کو پورا کرو۔ یہ وہ ہے جس کی اس کی طرف سے تمہیں ہدایت ہے، شاید کہ تم نصیحت قبول کرو''۔

یتیم کے کمال کی منزل تک پہنچنے سے مراد بالغ و راشد ہونا ہے [5]

ناپ تول کے پورا کرنے کے حکم سے متصل یہ جو کہا گیا ہے کہ ''ہم کسی پر پابندی نہیں لگاتے مگر اس کی طاقت بھر'' اس کا مطلب یہ معلوم

---

[1] ۔ بخوانم (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ ڈر افلاس کے سے (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔ ای علانیتها وسرها (جلالین) قال ابو جعفر علیہ السلام ما ظهر هو الزنا وما بطن هو الخالة (تبیان)

[4] ۔ اگرچہ آن محکوم علیہ صاحب قرابت باشد (شاہ ولی اللہ)

[5] ۔ قال قوم انه لا حد له وانما المراد به حتیٰ یکمل عقله ولا یکون سفیها یحجر علیه (تبیان) وهٰذا قوی وجوه (مجمع البیان)

ہوتا ہے کہ نادانستہ اگر کچھ کمی ہو جائے تو اس کی معافی ہے مگر جان کر ایسا نہ کرو۔[1]

جیسا کہ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

''اسی وجہ سے شریعت نے یہ بتا دیا کہ خریدار یہ قصد کرے کہ میں دام زیادہ دوں اور چیز کم لوں، اور بیچنے والا یہ قصد کرے کہ میں دام کم لوں، چیز زیادہ دوں کیونکہ فریقین جب یہ قصد کریں گے تو ہرگز کسی کو کم نہ پڑے گا مگر اب تو وہ زمانہ ہے کہ اس کا الٹا ہوتا ہے''۔(حاشیہ ترجمہ قرآن)

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۵۳

''اور یہ کہ یہ میرا خاص راستہ ہے، اس کے ساتھ وہ سیدھا بھی ہے[2] تو اس کی پیروی کرو اور دوسرے راستوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں اس کے راستے سے تتر بتر کر کے ہٹا دیں[3] یہ ہے جو اللہ نے تم کو ہدایت کی ہے، شاید کہ تم ان خطرات سے بچو۔''

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۵۴

''پھر یہ کہ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی نعمت تمام کرنے کا ذریعہ اس پر جو نیک کردار ہو[4] اور تفصیل ہر چیز کی اور صحیح رہنمائی اور رحمت بنا کر، شاید کہ وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضری پر ایمان لائیں''۔

''پھر'' کا لفظ ہمیشہ ترتیب واقعہ ہی کے لئے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات ترتیب ذکری کے لئے ہوتا ہے یعنی یہ تو سن چکے۔ اب یہ سنو۔

اگر یہ آیت شان نزول میں اسی محل پر اتری ہوئی ہو تو یہاں پر لفظ ''پھر'' کے یہی معنی ہیں۔ اس کی نظیر نہج البلاغہ کے پہلے ہی خطبہ میں ہے جہاں خلقت زمین وغیرہ کے ذکر کے بعد ارشاد ہوا ہے: ثُمَّ اَنْشَاَ ۔ سُبْحَانَهُ ۔ فَتْقَ الْاَجْوَاءِ، وَشَقَّ الْاَرْجَاءِ، وَسَكَاۗءَ كَالْهَوَاءِ۔ حالانکہ یہ چیزیں خلقت میں اس کے قبل والی چیزوں پر مقدم ہیں مگر بیان بعد میں ہو رہی ہیں۔ اس لئے ثم کا لفظ لایا گیا ہے۔

کچھ اہم محرّمات شرع کی فہرست

شاہ ولی اللہ صاحب نے حالانکہ ترجمہ ایسا کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ثم ترتیب ذکری کے لئے ہے[5] مگر حاشیہ میں اسے

---

[1] ۔لما كان التعديل فى الوزن والكيل على التحديد ...يتعذر بين سبحانه انه لا يلزم فى ذٰلك الا الاجتهاد فى التحوز من النقصان (مجمع)

[2] ۔نصب مستقيما على الحال والفائدة ان هٰذا صراطى وهو مستقيم فاجتمع له الله ان ولو رفع مستقيم ان افاده ذٰلك (تبيان)

[3] ۔متفرق کریں گی تم کو راہ اس کی سے (شاہ رفیع الدین) جدا کنندہ شمارا از راہ خدا (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔تماما للغة (جلالین) پورا کرنا نعمت کا اوپر اس شخص کے کہ نیکی کرتا ہو (شاہ رفیع الدین)

[5] ۔بازی می گویم کہ (شاہ ولی اللہ)

''ترتیب واقعہ'' کے معنی میں قرار دینے کی کوشش کی ہے، اس طرح کہ قبل کی آیات میں جو آیا تھا: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ الخ ''آؤ! میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے کیا حرام کیا ہے'' یہ حرام کرنا روز ازل کا واقعہ ہے یعنی اللہ نے ہمیشہ سے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ اور ''پھر'' یعنی اس کے بعد اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو توریت عطا کی۔ [1]

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے اس بارے میں ان کی پیروی کی ہے [2]۔

مگر معلوم نہیں کہ جب جناب مترجم کے نزدیک یہ معنی ظاہر ہیں تو انہوں نے ترجمہ اس طرح کیوں کیا؟ ہمارے نزدیک یا تو یہ آیت سلسلۂ نزول میں اس مقام کی ہے ہی نہیں، پھر اس کا ربط سابق آیتوں سے قائم کرنا ضروری ہی نہیں۔ اگر وہ کسی اور محل پر نازل ہوئی ہے تو ممکن ہے وہاں وہ ترتیب واقعہ ہی کے عنوان سے ہو لیکن اگر یہ آیت یہیں پر نازل ہوئی ہے تو پھر اسے ترتیب ذکری کیلئے قرار دینا زیادہ مناسب ہے۔ [3]

علامہ طبرسیؒ نے اس کے مفہوم میں چار احتمالوں کا ذکر کیا ہے۔ تین ترتیب ذکری پر مبنی ہیں اور ایک میں آیت کو اسی مقام پر نازل شدہ مان کر ترتیب واقعہ قرار دی گئی ہے، اس طرح کہ اس کے پہلے جناب ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں جو آیا تھا: **وهبنا له اسحٰق ويعقوب** ''ہم نے انہیں اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام عطا کئے'' اس پر عطف کر کے کہا گیا ہے کہ ''پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی''۔

''ہر چیز کا بیان'' اس میں عموم و شمولیت تناسب موضوع کے لحاظ سے ہے یعنی جن چیزوں کا دین و شریعت سے تعلق ہے اور جس جس چیز کی ضرورت تھی، اس میں ہر شے کا بیان آ گیا تھا [4] اس کو غیر متعلق اشیاء یعنی دنیا کی ہر چیز سے متعلق سمجھنا ذوق سلیم کا تقاضا نہیں ہے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ؕ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

''اور یہ ایک بڑی بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے اتارا ہے۔ اب اس کی پیروی کرو اور نجات کا سامان کرو کہ رحمت

---

[1] ۔مترجم گوید ظاهر نزدیك این بنده آنست که حرام گردانیدیم اشیاء مذکوره را در ازل و بر قوم نوح دادیم موسیٰ را کتاب والله اعلم (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔اس سے معلوم ہوا کہ پہلے حکم ہمیشہ سے جاری رہے، پیچھے توریت اتری تو مشرح اور مفصل ہوئی (موضح القرآن)

[3] ۔ثم لترتیب الاخبار (جلالین)

[4] ۔بیان لکل شیء یحتاج الیه فی الدین (جلالین)

تمہارے شامل حال ہو[1] لیکن تم ایسا نہ کہو[2] کہ کتاب بس ہمارے پہلے کی دو امتوں پر نازل ہوئی، اگرچہ ہم ان کی تعلیم سے[3] (بھی) انجان ہی رہے) تھے یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب نازل ہوتی تو ہم ان سے زیادہ راہ راست پر ہوتے تو اب آ گئی تمہارے پاس کھلی ہوئی دلیل تمہارے پروردگار کی طرف کی[4] اور ہدایت اور رحمت۔ اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا کہ جو آیات الٰہی کو جھٹلائے اور ان سے روگردانی کرے۔ ہم عنقریب انہیں کہ جو روگردانی کرتے ہیں ہماری آیتوں سے برے عذاب کی سزا دیں گے اس پاداش میں کہ وہ روگردانی کرتے تھے''۔

پہلے کی دو امتیں یعنی یہود و نصاریٰ جو توریت اور انجیل کی طرف نسبت رکھتے ہوئے اہل کتاب کہے جاتے ہیں۔[5]

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

''کیا انہیں سوا اس کے کچھ اور انتظار ہے کہ فرشتے خود ان کے پاس آئیں یا تمہارا پروردگار بذات خود آ جائے یا تمہارے پروردگار کی بعض مخصوص نشانیاں[6] آ جائیں، جس دن وہ مخصوص نشانیاں آ جائیں گی، اس دن کسی کو جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا اس نے اپنے ایمان میں کچھ بھلائی کے کام نہ کئے ہوں[7] ایمان لانا فائدہ نہ دے گا۔ کہیے کہ انتظار کرو، بلاشبہ ہم بھی منتظر ہیں''۔

''کیا انہیں سوا اس کے کچھ اور انتظار ہے'' یہ استفہام انکاری ہے یعنی سوا اس کے کچھ اور انتظار نہیں ہے[8] بس اس کا انتظار ہے۔

مطلب اس کا شاہ عبدالقادر صاحب کے لفظوں میں یہ ہے کہ:

''اللہ کی طرف سے جو حد تھی ہدایت کی، سو آ چکی ہے اور شرع اور کتاب تب بھی نہیں مانتے تو اب منتظر ہیں کہ اللہ آپ آوے یا قیامت کے نشان دیکھیں، تب یقین کریں جب قیامت کا نشان آوے گا یعنی آفتاب مغرب سے نکلے، تب کافر کا ایمان اور عاصی کی توبہ قبول نہ

---

[1] ۔ای لکی ترحموا (مجمع البیان)

[2] ۔ کراھة تقولوا (مجمع)

[3] ۔قراءتہم (جلالین) بودیم ما از تلاوت ایشاں بے خبر (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔ای حجة واضحة ودلالة ظاھرة (مجمع البیان)

[5] ۔الیھود والنصاریٰ (تبیان)

[6] ۔التی قضطوّھم الی المعرفة ویزول التکلیف عندھا (مجمع البیان)

[7] ۔یا نفع ندھد نفس را کہ کسب نہ کردہ بود و ایمان خود عمل خیر (شاہ ولی اللہ)

[8] ۔ما ینتظر المکتابون (جلالین)

ہوگی"۔(موضح القرآن)

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۱۵۹

"یقیناً وہ جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور بہت سے گروہوں میں بٹ گئے [1] آپ کو ان سے کوئی سروکار نہیں ہے، ان کا معاملہ بس اللہ کے سپرد ہے، پھر وہ انہیں بتلائے گا کہ وہ کیا کرتے رہتے تھے"۔

"آپ کو ان سے کوئی سروکار نہیں ہے" اس کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ان کے باہمی اختلافات میں کوئی دخل نہ دیجئے [2] اور یہ بھی کہ اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ آپ سے اس کا کوئی محاسبہ نہ ہوگا [3] اور یہ بھی کہ آپ کا ان میں سے کسی گروہ سے بھی تعلق نہیں ہے [4] ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بھی معنی کے لحاظ سے وہ کوئی ایسا حکم نہیں ہے جو قائم و برقرار سمجھا جا سکے لیکن بعض مفسرین کے ذوق جہاد کی شدت پر یہ حکم بار ہوا ہے تو انہوں نے لکھ دیا کہ یہ حکم آیت "سیف" سے منسوخ ہو گیا [5] ایسے ہی شارحین و مفسرین قرآن وہ ہیں جو مخالفین اسلام کے اس الزام کو تقویت دیتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلایا گیا۔

مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَاۗءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۱۶۰

"جو نیک کام کرے اسے دس گنا اجر ملے گا اور جو برا کام کرے تو اسے بس اتنی ہی سزا ملے گی، اور ان پر ظلم نہیں ہو گا"۔ بھلائی کے بدلے میں زیادہ بھلائی احسان ہے اور تفضّل و کرم۔ یہ خلافِ عدالت نہیں ہے [6] لیکن برائی کے بدلے میں زیادہ پاداش خلاف عدل ہے، جو شان الٰہی کے خلاف ہے۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۶۱

"کہیے کہ بلاشبہ مجھے میرے پروردگار نے ایک بڑے سیدھے راستے کی طرف (خاص طور سے) رہنمائی کی ہے،

---

[1] ۔ گروہ در گروہ شدند (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ فلا تعرض لهم (جلالین)

[3] ۔ یعنی از تو مواخذہ نہ خواہند کرد

[4] ۔ انه على المباعدة التامة من ان يجتمع معهم فى معنى مناطيم الفاسدة (تبیان)

[5] ۔ هٰذا منسوخ بأيه السيف

[6] ۔ زيادة الثواب على الجزاء تفضل و احسان فجاز ان زيد عليه (تبیان)

اس صحیح و درست [1] دین کی طرف جو خالص و مخلص ابراہیم کا مسلک ہے [2] اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے"۔

فرقہ بندی کی مذمت

ان آیات سے ایک مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ خداوند قدوس کا دین فرقہ بندی سے پاک وصاف ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾

"کہیے کہ میری نماز اور میری سب عبادتیں [3] اور میری زندگی اور میری موت خاص اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور اسی پر میں مامور ہوں [4] اور میں سر اطاعت جھکانے والوں میں سب سے پہلا ہوں"۔ [5]

"سب سے پہلا" باعتبار تقدم زمانی لیا جائے تو اول مخلوق ہونے کے ساتھ بالکل سازگار ہے جیسا کہ اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ سے مستفاد ہے۔ پھر معلوم نہیں سواد اعظم کے بعض مفسرین نے اس میں قید لگانے کی کیا ضرورت محسوس کی ہے کہ اس امت میں پہلا سر اطاعت جھکانے والا ہوں۔ [6]

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اول المسلمین کے معنی ہوں، اول درجہ کا سر اطاعت جھکانے والا جس کی نظیر قرآن میں پہلے آ چکی ہے، تب بھی کوئی قید لگانا اس میں بلا وجہ ہے۔

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

"کہیے کہ کیا اللہ کے سوا کوئی پروردگار تلاش کروں حالانکہ وہ ہر چیز کا پروردگار ہے۔ کوئی شخص بھی برائی نہیں کرتا مگر

---

[1] ۔استغنی بجری ذکر الفعل عن ذکرہ فقال دینا قیما کما قال: اھدنا الصراط المستقیم فیما مستقیما (جلالین)

[2] ۔مراد میدارم ازیں درست کیش ابراھیم را (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔عبادتی من حج وغیرہ (جلالین)

[4] ۔بایں توحید فرمودہ شدم را (شاہ ولی اللہ)

[5] ۔من نختین مسلمانم (شاہ ولی اللہ)

[6] ۔اول المسلمین من ھذہ الامۃ (جلالین)

یہ کہ وہ خود اپنا نقصان کرتا ہے اور کوئی دوسرے کے گناہ کا ذمہ دار نہیں ہے۔ پھر تم سب کا رجوع اللہ کی طرف ہوتا ہے تو وہ تمہیں بتائے گا وہ سب جس میں تم آپس میں اختلاف رکھتے تھے۔''

کافر و گناہ گار کا وجود انسان کے فاعل مختار ہونے کا ثبوت ہے

پہلے خدا کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے معبود بنانے کی رکاکت کا اپنی جگہ یوں اظہار کیا گیا کہ یہ فطرت کائنات کے خلاف ہے۔ تمام کائنات تو صرف اس ایک اللہ کی اطاعت کر رہی ہو اور انسان اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کو معبود مانے یہ قانونِ فطرت کے خلاف کتنی بڑی بدعت ہے؟! اب اس کے خلاف شرک کی چونکہ صرف ایک دلیل تھی اور وہ آباؤ اجداد کی پیروی جسے بار بار پیش کیا کرتے تھے کہ: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ (زخرف) تو اس کی رد کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ ہر ایک خود اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔

اپنی بداعمالیوں کی ذمہ داری تقدیر پر رکھنا غلط ہے

اگر آباؤ اجداد غلط راستہ اختیار کئے ہوئے تھے تو وہ اس کا بھگتان بھگتیں گے۔ تم کیوں اس راستے پر چلو۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ پہلے اپنے لئے کہا گیا ہے کہ میں کیا اللہ کے سوا کسی کو معبود بناؤں؟ تو پھر روئے خطاب مقابل جماعت کی طرف کر کے اشارتاً کہا گیا ہے کیا رہ گئے تم، تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو اس کی جواب دہی مجھ پر نہیں ہے۔ [1]

مگر ہمارے نزدیک تو آغازِ آیت میں ''میں'' سے مراد ''تم'' ہے [2] تو اب دوسروں سے مراد جو اپنے عمل کے ذمہ دار ہیں، آباؤ اجداد ہی کا قرار دیا جانا زیادہ درست ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۚ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾

''اور وہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں پہلوں کی جگہ لینے والا بنایا اور تم میں سے بعض کو دوسروں پر درجوں کے اعتبار سے بلندی عطا کی تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں عطا کیا ہے، اس کے بارے میں تمہاری آزمائش کرے۔ یقیناً تمہارا پروردگار تیزی سے حساب لینے والا ہے اور یقیناً وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

انسانی زندگی کی رفعت اور اس کی غرض و غایت

بعض مفسرین نے خواہ مخواہ یہاں ''خلائف'' کو اس خلیفہ کی جمع لے لیا ہے جس کے معنی حکمراں کے ہوتے ہیں [3] حالانکہ اس صورت

---

[1] ۔وجه اتصاله بما قبله انه لا ينفعني في ابتغاء رب غيره ما انتم عليه من ذٰلك لانه ليس يعذرني في اكتساب الاتم اكتساب غيري له (مجمع البيان)

[2] ۔يقول على وجه الانكار لفعلهم (تبيان)

[3] ۔ساخت شما را بادشاهان زمين (شاه ولی الله) کیا تم کو جانشین زمین کا (شاہ رفیع الدین)

میں "منکم" کا لفظ آتا جس سے پتہ چلتا کہ ان کے اندر کچھ لوگوں کو سلطنت عطا ہوئی حالانکہ وہاں تمام نوع یا تمام امت سے کہا جا رہا ہے لیکن اہل سنت میں بعض مفسرین نے وہی معنی کہے ہیں جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کئے ہیں [1] اور وہی یہاں پر درست ہیں اور ہمارے مفسرین نے عموماً یہی معنی درج کئے ہیں۔ [2]

تعجب ہے کہ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے یہاں یہ ترجمہ کر دیا ہے کہ:

"تمہیں زمیں میں (اپنا) نائب بنایا" جو مسلک جمہور کے مطابق ہے۔ حالانکہ اس آیت میں جمہور نے بھی یہ مفہوم قرار نہیں دیا ہے۔

اہل حق کے عقیدہ میں تمام نوع انسانی اللہ کی نائب نہیں ہے بلکہ اس کے نائب خاص افراد ہوتے ہیں جو تمام نوع میں امتیاز خاص یعنی جوہر عصمت کے حامل ہوتے ہیں۔

---

[1] ۔خلائف الارض ...ای یخلف بعضکم بعضا فیہا (جلالین)

[2] ۔معناہ ان اھل کل عصر یخلف اھل العصر الذی قبلہ کلما مضی واحد خلقہ اخر علیٰ انتظام وانساق (تبیان)

سُوْرَۃُ الْاَعْرَافِ

مکیّہ.....۲۰۰.....آیات

چونکہ اعراف کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس سورہ میں ہے، اس لئے اس سورہ کا یہ نام ہوا۔

سورۂ اعراف کے خاص خاص مضامین

۱---اعمال کا تولا جانا

۲---جناب آدمؑ سے ابلیس کی وسوسہ انگیز گفتگو

۳---لباس بہشت کا جناب آدمؑ وحوّا کے جسم سے جدا ہونا

۴---نماز کے وقت زینت کا حکم

۵---کھانے پینے میں اعتدال کا حکم وراسراف سے ممانعت

۶---یہ کہ اچھے لباس اور اچھی غذا سے پرہیز ضروری نہیں

۷---اہل بہشت واہل دوزخ کی دلچسپ اور عبرت انگیز گفتگو

۸---فساد سے ممانعت

۹---پاکیزہ اور ناپاک زمینوں کا تذکرہ

۱۰---جناب نوحؑ، جناب ہودؑ، جناب صالحؑ، جناب لوطؑ اور جناب شعیبؑ کی تعلیم اور ان کی قوموں کا رویہ

۱۱---حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تفصیلی تذکرہ اور فرعون کا انجام

۱۲---بنی اسرائیل کی دل شکن باتیں

۱۳---حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات

۱۴---جناب موسیٰ علیہ السلام کا تیس راتوں کا وعدہ، پھر اس میں بداء چالیس کی میعاد اور قوم کی گمراہی۔

۱۵---دیدارِ خدا کا سوال اور اس کا انجام

۱۶---گوسالہ پرستی

۱۷---موسیٰ علیہ السلام کا ہارونؑ پر عتاب

۱۸---النبی، اس کے اوصاف اور توریت وانجیل میں اس کا تذکرہ

۱۹---رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمہ گیری

۲۰---اسباط بنی اسرائیل کی تعداد اور بارہ چشمے

۲۱---اہل سبت اور ان کا مسخ ہونا

۲۲---عہد الست یا عالم ذر

۲۳---یہ کہ قیامت کیوقت کا علم کسی کو نہیں

۲۴---قرآن کی تلاوت کے وقت خاموشی کا حکم.....وغیرہ وغیرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہونچانے والا بڑا مہربان ہے''

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾

''الف۔لام۔میم۔صاد۔ یہ وہ کتاب ہے [۱] جو آپ پر اتاری گئی ہے تو آپ کو اس کی طرف سے دل تنگی نہ ہونا چاہیے کہ آپ اس کے ذریعہ سے ہدایت کریں [۲] اور یاددہانی ہو ایمان والوں کے لئے [۳]''

الفاظ کے باہمی ربط میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔سلجھا ہوا مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے آپ پر اتاری گئی ہے تو آپ کو تو اس کی تبلیغ کرنا ہے۔اب یہ لوگ کتنا ہی آپ کو اپنے حملوں کا نشانہ بنائیں، آپ کو دل تنگ نہیں ہونا چاہیے اور وہ اتاری گئی ہے اس لئے تھوڑی کہ آپ اسے خاموشی کے ساتھ اپنے پاس رکھے رہیں بلکہ وہ اتاری اسی لئے گئی ہے کہ آپ اس کے ذریعہ سے خلق خدا کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں اور ایمان لانے والوں کو حقیقتوں کی یاددہانی ہوتی رہے۔لہٰذا یہ کام آپ کو بہرصورت انجام دینا ہے [۴]۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾

''پیروی کرو اس کی جو تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے اور اسے چھوڑ کر دوسرے حوالی

---

[۱] ۔این کتابیست (شاہ ولی اللہ) اجمع النحویون علیٰ ان قولہ: کتاب انزل الیك مرفوع بغیر ھٰذہ الحروف فالمعنیٰ ھٰذا کتاب انزل الیك (مجمع البیان)

[۲] ۔لتنذر متعلق بانزل ای للانذار بہ (جلالین)

[۳] ۔وبرای پند مسلمانان را (شاہ ولی اللہ)

[۴] ۔قال الفراء والزجاج واکثر العلماء انہ علی التقدیم والتاخیر وتقدیرہ: کتب انزل الیك لتنذر وقال اٰخرون ھو متصل بقولہ: فلایکن فی صدرك حرج منہ لتنذر بہ ای کن علی انشراح صدر بالانذار (مجمع البیان)

موالی کی پیروی نہ کرو[1] بہت کم ہے تمہارا نصیحت قبول کرنا''۔[2]

وَ كَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝۴

''اور بہت سی ایسی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے تباہ کیا تو آیا ان پر ہمارا عذاب راتی رات یا جب وہ دوپہر کو محوِ آرام تھے۔''

یہی ترجمہ تمام مفسرین کی تفسیر کے مطابق ہے[3] مگر شاہ رفیع الدین نے ایسا ترجمہ کیا ہے جس میں اگر کتابت کی غلطی سے کچھ رہ نہیں گیا ہے تو وہ عجیب ہے:

''پس آیا ان کے پاس عذاب ہمارا اور وہ سوتے تھے''۔

فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۵

''تو نہ تھی ان کی چیخ پکار[4] جبکہ ہمارا عذاب ان پر آیا سوا اس کے کہ وہ کہہ رہے تھے بے شک ہم گنہگار تھے۔''

یہ اعتراف اگر اس وقت ہو جب موقع اصلاح باقی ہے اور پھر اس کے ساتھ عزمِ اصلاح بھی ہو تو وہ توبہ کی حیثیت رکھے گا، اس لئے سزا سے بچا سکتا ہے مگر یہ اعتراف اس وقت جب توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہو یا اس کے پہلے ہی مگر صرف ضمیر کے دباؤ سے ایک اعترافِ حق کی صورت سے جس کے ساتھ آئندہ زندگی میں کسی تبدیلی کی نیت پائی نہ جاتی ہو کچھ بھی نتیجہ بخش نہیں ہے بلکہ اس انسان کے خلاف عذاب کے حق بجانب قرار پانے کے لئے ایک حجت بنتا ہے جیسا کہ یزید کی زبانی حضرت امام حسین علیہ السلام کو شہید کرنے کے بعد جو اعترافات تاریخ میں ملتے ہیں وہ اسی نوعیت کے ہیں۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝۷

''تو ہم بلا شبہ ان سے بھی پوچھیں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور بلا شبہ رسولوں سے بھی پوچھ گچھ کریں گے، اس کے بعد بے شک ان کے سامنے پوری واقفیت کے ساتھ سب واقعات پیش کریں گے[5] اور ہم غیر حاضر تو تھے نہیں''۔

---

[1] ۔اولیاء یطیعونهم فی معصیة تعالیٰ (جلالین)

[2] ۔اند کی پند می پذیرید (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔بیاتا لیلا اوهم قائلون نائمون بالظهیرة (جلالین) یعنی فی وقت القیلولة وهو نصف النهار (تبیان) ایشان شبانگاہ آرامیدہ بودند یا وقتیکہ ایشان در خواب نیمروز بودند (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔ای لم یکن دعآء هؤلآء (مجمع البیان) پس نہ تھا پکارنا ان کا (شاہ رفیع الدین)

[5] ۔بیان خواهیم کرد بحضور ایشاں بدانش (شاہ ولی اللہ)

یعنی روز حشر ان سب سے جواب دہی ہوگی اور ان کے سامنے خالق کی جانب سے جو کچھ رسولوں کی کارکردگی اور امتوں کی نافرمانی سب ہی پر حاضر و ناظر تھا[1] وہ سب واقعات پیش کئے جائیں گے تاکہ ان کی بنا پر جزا و سزا دی جائے۔

آخر کے جملہ سے کہ ''ہم غیر حاضر تو تھے نہیں'' ظاہر ہے کہ خالق کا پوچھ گچھ کرنا خود معلوم کرنے کی خاطر نہیں ہے اور اسی لئے بعض جگہ قرآن میں سوال کی نفی کی گئی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ

گنہگاروں سے ان کے گناہوں کے بارے میں کچھ دریافت نہیں کیا جائے گا۔ (قصص۔۷۸)

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۚ﴿۳۹﴾

تو اس دن کسی آدمی یا جنات میں سے کسی سے بھی اس کے گناہ کے متعلق پوچھا نہیں جائے گا۔ (رحمن ۳۹)

یہ پوچھا جانا جس کی نفی ہوئی ہے وہی تحقیق حال کے لئے دریافت کرنا ہے جس کی خالق کو ضرورت نہیں کیونکہ اس کے علم میں سب کچھ ہے۔[2] لیکن یہ سوال جس کا آیت زیر تحریر میں اعلان ہے کہ ''ہم پوچھیں گے''۔ ایک تو تہدیدی حیثیت رکھتا ہے[3] اور پھر اس لئے ہے کہ جزا کی بنیاد خود ان لوگوں پر ظاہر ہو جائے جن کو جزا و سزا دی جا رہی ہے اور جزا و سزا کا مفاد پورا ہونے کے لئے ضروری چیز ہے اور یہ ایک بڑا نقصان ہے جو آریوں کے نظام جزا و سزا میں جو تناسخ کے تصور پر مبنی ہے پایا جاتا ہے۔ یعنی وہاں جزا ہے اور سزا پانے والے کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کا ہے کی سزا ہے اور اس سے مقصد جزا و سزا کا فوت ہو جاتا ہے۔

تعلیماتِ اسلام میں جزاء و سزا کے ساتھ حساب و کتاب، میزان اور نامۂ اعمال، یہ سب چیزیں اسی نقص کے مقابلہ میں بندوں کو پورے طور پر بنیاد جزاء سزا بتانے کے لئے ہیں۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِۨالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ﴿۹﴾

''اور اس دن تولا جانا بالکل حق ہے تو جس شخص کے اعمال کے پلے بھاری ہوں گے تو یہی لوگ دین اور دنیا کی بہتری حاصل کرنے والے ہیں اور جس کے اعمال کے پلے سبک ہوں گے تو یہ ہیں جنہوں نے اپنے کو گھاٹے میں مبتلا کیا، اس وجہ سے کہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے۔''

اعمال کا وزن:

---

[1] لنخبرنهم عن علم بما فعلوه وما كنا غائبين عن ابلاغ الرسل والامم الخالية بما فعلوا (جلالين)

[2] ۔المراد به لا يسألون سؤال استعلام واستخبار (تبيان)

[3] ۔هو تعالىٰ وان كان عالما بما كان منهم فانما اخرج الكلام مخرج التهديد والزجر (مجمع البيان)

''اس دن'' یعنی اس موقع پر جس کا ذکر پہلے ہوا کہ ''ہم ان سے پوچھ گچھ کریں گے اور سب واقعات پیش کریں گے۔[1]

''تولا جانا'' یعنی اعمال خیر کی زیادتی اور کمی، نیز کمال اور نقص کی جانچ پڑتال[2]

''حق ہے'' اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ یہ ہونا حق ہے اور ایسا ہو کر رہے گا[3] اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ اس دن جو جانچ پڑتال ہو گی، وہ بالکل ٹھیک ٹھیک ہوگی۔[4]

اور اعمال کے پلوں کا گراں ہونا، نیک اعمال کا زیادہ ہونا ہے[5]

مولانا فرمان علی صاحب مرحوم اپنے حاشیہ میں تحریر کرتے ہیں:

''اعمال کے تولے جانے کا بظاہر یہ مطلب ہے کہ جس طرح کوئی شخص کسی چیز کو ترازو میں تول کر بتا دیتا ہے، اسی طرح خداوند عالم عدل و انصاف کے ساتھ حکم دے گا کہ اس میں ذرا سی کمی زیادتی نہ ہوگی۔ اسی وجہ سے جب کسی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا اعمال تولے جائیں گے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اعمال جسم نہیں ہیں کہ تولے جائیں۔ اس کے علاوہ تولنے کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جو اس کی گرانی اور سبکی کو نہ جانتا ہو اور خدا پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ اس نے پوچھا کہ پھر فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے اچھے اعمال غالب ہوں۔''

اسی مفہوم کو ہمارے قدیم علماء نے بھی ترجیح دی ہے چنانچہ جناب شیخ الطائفہؒ نے فرمایا ہے:

قال مجاهد والوزن عبارة عن العدل فی الاخرة وانه لاظلم فيها علىٰ احد وهو قول البلخی وهو احسن الوجوه (تبيان)

مجاہد کا قول ہے کہ وزن، آخرت میں کامل عدل و انصاف کی ایک تعبیر ہے اور یہ کہ کسی پر ظلم نہیں ہوگا اور یہی بلخی کا قول ہے اور یہ تمام توجیہات میں سب سے بہتر ہے۔

اسی کو علامہ طبرسیؒ نے اس آیت کے تحت میں اس طرح لکھا ہے:

ذكر فيه اقوال احدها ان الوزن عبارة عن العدل فی الأخرة وانه لاظلم فيها علىٰ احد.

اس میں چند قول بیان ہوئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ وزن، آخرت میں عدل و انصاف کی ایک تعبیر ہے اور یہ کہ اس میں کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔

پھر دوسرے متعدد قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

واحسن الاقوال القول الاول (مجمع البيان)

---

[1] ۔ای یوم السؤال المذکور وھو یوم القیامة (جلالین)

[2] ۔سنجیدن اعمال بانصاف (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔بودنیست (ولی اللہ)

[4] ۔الحق العدل صفة الوزن (جلالین)

[5] ۔ھر کہ گراں شد پلۂ نیکیہاے او (شاہ ولی اللہ)

تمام قولوں میں سب سے بہتر پہلا قول ہے۔

اعمال کے ساتھ بھاری اور ہلکے ہونے میں جمع کے صیغے ''موازین'' کا استعمال جس کی بنا پر ہم ترجمہ میں '' پلے بھاری ہوں گے'' اور '' ہلکے پلے ہوں گے'' لکھنے پر مجبور ہوئے، اس کا پتہ دیتا ہے کہ ہر قسم کے اعمال میں صحت و بطلان یا کمال و نقص کے تولنے کے معیار الگ ہیں [1] اور چونکہ میزان یعنی ترازو حقیقت میں ہر وہ شے ہے جس سے کسی چیز کی زیادتی اور کمی وغیرہ نمایاں ہو سکے۔ اسی لئے منطق کو علم المیزان کہتے ہیں کہ اس میں نتائج کے صحیح و غلط ہونے کے معیار بتائے جاتے ہیں اور اشعر میں ''وزن'' کا لفظ کا استعمال ہوتا ہے کہ تقطیع کر کے ان کی کمی یا زیادتی کا اندازہ ہوتا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ ترازو ہر شے کا اس کے اعتبار سے ہوتا ہے لہٰذا ہو سکتا ہے کہ مثلاً نماز کے جانچ کا ترازو کسی کامل نمازی کی نماز ہو اور روزہ کا ترازو کسی ایسے ہی روزہ دار کے روزے ہوں اور راہ خدا میں قربانی کا ترازو ایک بلند مرتبہ شہید کی شہادت ہو اور ایسے ہی زندگی کا ہر شعبہ اور اس سے متعلقہ عبادات و فرائض۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰

''اور بلاشبہ ہم نے تمہیں زمین میں اقتدار عطا کیا اور تمہارے لئے اس میں زندگی کے سامان بنائے [2] (پھر بھی) بہت کم ہے تمہارا شکر گزار ہونا۔''

''مکنا کم'' کا جو ترجمہ کیا گیا ہے: ''تمہیں زمین میں اقتدار عطا کیا'' یہ اس لفظ کا ذہن سے زیادہ قریب مفہوم ہے جس کے مطابق شاہ رفیع الدین صاحب نے بھی ترجمہ کیا ہے: ''قدرت دی ہم نے تم کو'' لیکن ان کے والد بزرگوار نے اس کے خلاف ترجمہ کیا ہے: ''استقرار دادم شمارا در زمین'' لیکن قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اس طرح کے الفاظ کا جو تمکین سے ہیں پہلے ہی معنی میں استعمال پایا جاتا ہے لہٰذا وہی یہاں بھی ترجیح رکھتے ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝۱۱

''اور ہم نے تم کو پیدا کیا اور پھر یہ کہ تمہاری صورت گری کی تو اس کے بعد فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، اس پر ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس، وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ تھا۔''

چونکہ بعد والے واقعات کا تعلق نوع بشر میں ہر فرد کے ساتھ نہیں ہے بلکہ صرف ابوالبشر حضرت آدم علیٰ نبینا وآلہ وعلیہ السلام سے ہے، اس لئے بعض مفسرین نے شروع سے اس خلقت کو آغاز تخلیق کے معنی میں لے لیا۔ اس طرح ''تمہیں'' یا ''تم کو'' سے مراد یہ ہے کہ تمہارے مورث

---

[1] ۔انما جمع الموازین لانه یجوز ان یکون لکل نوع من انواع انطاعات یوم القیامة میزان (مجمع البیان)

[2] ۔ای ما تعیشون به من انواع الرزق ووجوه النعم والمنافع (مجمع البیان)

اعلیٰ کو پیدا کیا اور تمہاری صورت بنائی یعنی تمہارے مورث اعلیٰ کی صورت بنائی [1] اور بعض نے پہلے جملہ کو آدمؑ سے متعلق کیا ہے اور دوسرے کو تمام نوع سے [2] مگر تیسرا تو ظاہر بظاہر آدمؑ ہی سے متعلق ہے، اس لئے اسلوب کلام کو اس انتشار پر محمول کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔

ہاں اس میں کوئی حرج نہیں کہ پہلا فعل یعنی ''تم کو پیدا کیا'' پوری نوع سے متعلق ہو اور اس کے بعد کے واقعات ابوالبشر سے متعلق ہوں اور اسی لئے ثم ''پھر'' کے لفظ کو ہم ترتیب واقعہ کے لئے نہیں سمجھتے بلکہ ترتیب ذکر کے لئے سمجھتے ہیں جسے ترجمہ میں ہم نے یوں ظاہر کیا ہے کہ ''پھر یہ کہ'' بلکہ ہمارے نزدیک تو پہلی صورت میں بھی اس ''ثم'' کے یہی معنی سمجھنا چاہئیں کیونکہ ''صورت کا بنانا'' خلقت کے بعد کا کوئی مرحلہ نہیں ہے جب کہ خود خلقت لازماً کسی صورت پر ہوگی، بلا صورت نہیں ہوسکتی۔

ہاں یہ ممکن ہے کہ خلق بلا صورت سے مراد وہ منزل ہو کہ جب وہ صلب پدر میں ہوتے ہیں کیونکہ اس وقت سب کی ایک شکل ہوتی ہے۔ اختلافِ صورت نمایاں نہیں ہوتا اور دوسری منزل شکم مادر کی ہو، جب ہر انسان میں شکل وصورت کا امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ [3]

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾

''ارشاد ہوا کیا امر تجھے مانع ہوا جو تو سجدہ نہ کرے باوجودیکہ میں نے تجھے حکم دیا۔ اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔''

مانع فعل سے روکتا ہے اور ترک کا باعث ہوتا ہے، اس لئے اس کا انتساب قرآن مجید میں ایک جگہ فعل کی طرف ہوا ہے روکنے کے معنی میں اور ارشاد ہوا ہے: مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ، وہاں ترجمہ یہ ہوگا کہ کون امر اس سے مانع ہوا کہ تو سجدہ کرے'' اور یہاں اس کا انتساب ترک عمل کی طرف ہوا ہے اس لئے معنی باعث ہونے کے پیدا ہوئے یعنی تعمیل حکم سے کون مانع پیش آیا جو باعث ہوا کہ تو سجدہ نہ کرے؟ [4]

تعجب ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے اور بعض ہمارے مترجمین نے بھی اس مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ کا ترجمہ وہی کیا ہے جو مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ کا ہونا چاہیے۔ [5]

غالباً یہ اس وجہ سے ہے کہ بعض مفسرین نے یہاں پر لا کو زائدہ لکھ دیا ہے۔ [6]

مگر کچھ مفسرین کی یہ روش جو اکثر آیات قرآنی میں انہوں نے اختیار کی ہے، بالکل غلط ہے جس نے مخالفین اسلام کو قرآن پر زبان طعن

---

[1] ۔ہر آئینہ آفرید شمارا یعنی پدر شمارا و صورت دادیم شمارا یعنی پدر شمارا (شاہ ولی اللہ) انا بدأنا خلق آدم ثم صورناہ (مجمع البیان) کما یذکر المخاطب ویرادبہ اسلافہ (تبیان)

[2] ۔الربیع وقتادۃ والضحاك والسدی ان المعنی خلقنا آدم ثم صورنا کم فی ظھرہ (تبیان)

[3] ۔خلقنا کم فی اصلاب الرجال وصورنا کم فی ارحام النسآء (علی بن ابراھیم)

[4] ۔ای ما دعاك الی ان لا تسجد وما اضطرك الیہ (مجمع البیان) کس چیز نے منع کیا تجھے کہ نہ سجدہ کیا تو نے (شاہ رفیع الدین)

[5] چہ چیز منع کرد ترا از انکہ سجدہ کنی (شاہ ولی اللہ) تجھے سجدہ کرنے سے کس نے روکا (مولانا فرمان علی صاحب)

[6] ۔لازائدۃ (جلالین)

دراز کرنے کا موقع دیا ہے اور اس پر علامہ شیخ جواد بلاغیؒ نے اپنی تفسیر آلاء الرحمن کے مقدمہ میں بڑی مبسوط بحث کی ہے جسے جدید ایڈیشن میں ہم نے اپنے مقدمہ تفسیر کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کیا ہے۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۱۵﴾ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾

''ارشاد ہوا تو پھر تو اس میں سے اتر جا کیونکہ تجھے اس میں رہ کر یہ زیب نہیں دیتا کہ تو غرور سے کام لے [1] تو نکل جا۔ یقیناً تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے، اس نے کہا مجھے مہلت عطا کر اس دن تک کہ جب سب دوبارہ زندہ ہوں گے، کہا اچھا تو ان میں سے ہے جنہیں مہلت دی گئی۔ اس نے کہا تو جیسا تو نے مجھے گمراہ قرار دیا ہے، اب میں ضرور بیٹھوں گا ان کیلئے تیرے سیدھے راستے پر۔ پھر میں آؤں گا ان کی طرف ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے اور تو ان میں سے زیادہ کو شکر گزار نہیں پائے گا، اس نے کہا نکل جا یہاں سے قابل نفرت اور مردود ہو کر یقیناً جو ان میں سے تیری پیروی کرے گا تو میں بھر دوں گا دوزخ کو تم سے سے۔''

''اس میں سے اتر جا'' اس سے اشارہ جنت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور معلق عالم بالا کی طرف بھی۔ [2]

''مہلت'' کے معنی عام طور پر زندہ رکھنے کے سمجھے جاتے ہیں، اس لئے کہا گیا ہے کہ شیطان کی خواہش کو پورا منظور نہیں کیا گیا کیونکہ اس نے تو قیامت کے دن تک کے لئے زندہ رکھنے کو کہا تھا مگر قیامت تو دوبارہ زندہ کرنے کا دن ہے، نہ کہ موت کا! اس لئے مہلت دی گئی مگر قیامت تک کی نہیں بلکہ قیامت کے پہلے ایک خاص وقت تک جبکہ خالق اس پر موت طاری کر دے گا جسے دوسری جگہ کہا گیا ہے۔

اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۸۱﴾ (سورۂ ص) یعنی اس وقت تک کی مہلت دیتا ہوں جو میرے علم میں معین ہے۔

مگر جناب شیخ طوسیؒ کا رجحان اس طرف ہے کہ مہلت سے مراد دنیا میں مورد عذاب نہ بنانا اور اس کے عذاب کو قیامت پر اٹھا رکھنا ہے اور اس کی اس خواہش کو خالق نے منظور فرما لیا اور اس لئے قیامت سے پہلے اس کی تمام نافرمانیوں کی کوئی پاداش نہیں مل رہی ہے۔

---

[1] ۔فانها لیست بموضع المتکبرین (مجمع البیان)

[2] ۔منها ای من الجنة وقیل من السمٰوٰت (جلالین)

شیطان کی زبانی "بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ" کے جو الفاظ ہیں، ان کا ترجمہ ہم نے یہ کیا کہ "جیسا تو نے مجھے گمراہ قرار دیا ہے"..... یہ اس بنا پر کہ گمراہ کرنے کی نسبت ذات الٰہی کی طرف درست نہیں ہے اور شیطان بھی بر بنائے غرور سرکشی کے باوجود شان الٰہی سے اس وقت اتنا جاہل نہیں مانا جا سکتا کہ گمراہ کرنے کے عمل کو جو قبیح ہے ذات الٰہی کی طرف منسوب کرے مگر علمائے اہل سنت جو حسن و قبح کے عقلی ہونے کے قائل نہیں ہیں، بلا تکلف گمراہ کرنے کی نسبت اس کی جانب دید دیتے ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

"بسبب آنکہ مرا گمراہ کردی"۔

ان کے صاحبزادہ بھی اس پہلو سے ان کے پیرو ہیں، اگرچہ اتنا فرق ہے کہ یہ بما اغویتنی کی "ب" کو قسم کا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

"قسم ہے اس کی کہ گمراہ کیا تو نے مجھ کو"۔ (شاہ رفیع الدین)

یہ "ب" کو برائے قسم لینا پہلے کی بعض تفسیروں کے مطابق ہے [1]۔

شیطان کا یہ کہنا کہ "میں بنی آدم کی طرف سامنے سے آؤں گا اور دائیں سے اور بائیں سے" اس میں جناب ابن عباسؓ کی زبانی یہ نکتہ وارد ہوا ہے کہ فوق کی سمت شیطان کے دسترس سے باہر رہی ہے تاکہ خالق کی رحمت کا راستہ پھر بھی کھلا رہے۔ [2]

ایک پر لطف تفسیر ان سمتوں کی جو بظاہر حدیث معصوم سے ماخوذ ہے یہ ہے کہ آگے سے مراد آخرت ہے کہ شیطان لوگوں کو سمجھاتا ہے کہ انجام میں کچھ بھی نہیں ہے، نہ حساب، نہ کتاب، نہ بہشت، نہ دوزخ، اور پیچھے سے مراد وہ مال و متاع دنیا ہے جو انسان کما چکا ہے، شیطان اسے خیر خیرات میں صرف کرنے سے روکتا ہے اور دائیں سے مراد دین و ایمان ہے کہ وہ حقانیت میں شبے پیدا کر کے اسے کمزور کرتا ہے اور بائیں سے مراد انسانی خواہشیں ہیں جن میں بے راہ روی پیدا کر کے وہ آدمی کی ہلاکت کا سامان کرتا ہے۔ (تفسیر علی بن ابراہیم)

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ
الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا
وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ
تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢١﴾
فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ
عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ
وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٢٢﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ

---

[1] ۔ الباء للقسم (جلالین)

[2] ۔ قال ابن عباس ولا یستطیع ان یأتی من فوقهم لئلا یحول بین العبد وبین رحمة الله تعالیٰ (مجمع البیان)

لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

''اور اے آدمؑ! رہو تم اور تمہاری بیوی بہشت میں اور کھاؤ جہاں سے تم دونوں چاہو اور اس درخت کے نیچے نہ جانا، نہیں تو ہو گے تم دونوں ظالموں میں سے تو وسوسہ میں ڈالا ان دونوں کو شیطان نے تا کہ نمایاں کر دے ان کے لئے وہ جو ان کے چھپانے کے قابل جسم کے حصے خود ان سے چھپے ہوئے تھے اور کہا تم دونوں کو تمہارے پروردگار نے نہیں روکا اس درخت سے مگر اس لئے کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ ہو جاؤ یا ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ، اور ان دونوں سے قسم کھائی کہ میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں تو ان دونوں کو اس نے دھوکے میں ڈال دیا تو جب انہوں نے اس درخت میں سے چکھا تو چھپے ہوئے ان کے جسم کے حصے نمودار ہو گئے اور وہ اپنے اپنے اوپر بہشت کے پتوں کو جوڑ کر پردہ کرنے لگے اور آواز دی ان کو ان کے پروردگار نے کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے روکا نہیں تھا اور نہیں کہا تھا کہ بلا شبہ شیطان تم دونوں کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ان دونوں نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور نہ رحم کرے گا تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔''

جناب آدم وحوا علیہما السلام سے ابلیس کی وسوسہ انگیز گفتگو

اس واقعہ کا بیان پہلے پارے میں آچکا ہے اور وہاں اس پر بقدر ضرورت تفصیلی بحث بھی کی جا چکی ہے شیطان نے انہیں وسوسہ میں ڈالا'' تا کہ نمایاں کر دے ان کے لئے وہ جو ان کے چھپائے جانے کے قابل جسم کے حصے خود ان کی نگاہ سے پہلے چھپے ہوئے تھے۔'' اس کا یہ مطلب ہو تو سکتا ہے کہ وہ از اول برہنہ تھے مگر خود انہیں اس کا احساس نہ تھا یعنی یہ حقیقت ان سے چھپی ہوئی تھی جیسا کہ بائبل میں اس واقعہ کے بیان میں درج ہے مگر قرآن مجید میں دوسری جگہ تصریح ہے کہ ان کے جسم پر لباس جنت موجود تھا اور اس درخت سے کھانے کے بعد وہ لباس ان کے جسم سے جدا ہوا تو وہ برہنہ ہو گئے اور اس لئے جلدی جلدی پتوں سے ستر کرنے لگے، اس لئے یہاں بھی مطلب یہی لینا پڑے گا کہ ان کے جسم پر لباس بہشت کے موجود ہونے کی وجہ سے یہ اعضاء پوشیدہ تھے مگر اب وہ لباس ان کے جسم سے جدا ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ وہ برہنہ ہیں۔

لباس بہشت کا جناب آدم اور حوا علیہما السلام کے جسم سے جدا ہونا

اب یہ کہ شیطان نے یہ اس لئے کیا'' تا کہ نمایاں کرے'' یہ ویسا ہی ہو سکتا ہے کہ جیسے اکثر جگہ اس نتیجہ کو جو کسی امر پر مرتب ہو بطور غرض و غایت بیان کیا جاتا ہے جس کی نمایاں مثال ہے:۔ فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا، فرعون کے گھر والوں نے موسیٰؑ کو دریا سے نکال لیا تا کہ یہ ان کے دشمن جان اور باعث غم وغصہ ہوں'' ویسے ہی یہاں بھی چونکہ ان کے وسوسہ پر نتیجہ یہی مرتب ہوا، اس لئے ان الفاظ میں ذکر کیا گیا۔

پھر یہ کہ شیطان کا مقصود بہشت سے نکلوانا اور آدمؑ کو نقصان پہنچانا تو ضروری تھا۔ اب چاہے سب لوازم اس کے وہ نہ بھی جانتا ہو، تب بھی اس کی طرف ان تمام چیزوں کا بطور غرض ومقصد استناد ہو سکتا ہے اس لئے بعض مفسرین نے جو اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شیطان جانتا تھا کہ اس

درخت کے پاس جانے سے یہ برہنہ ہوجائیں گے اور جو برہنہ ہوجائے، وہ بہشت میں نہیں رہ سکتا[1] کوئی مضبوط وجہ نہیں رکھ سکتا۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾

''ارشاد ہوا اترو! تم لوگوں میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہوگا اور تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہوگا ایک وقت تک کے لئے[2] (یہ بھی) کہا کہ اس میں تم جیو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے (دوبارہ) نکالے جاؤ گے''[3]

اخلاقی نتائج اس پورے واقعہ کے مولانا فرمان علی صاحب مرحوم نے بہت اچھے لکھے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) آدمی کا ساری خدائی حتیٰ کہ جنوں اور فرشتوں سے بہتر ہونا۔
(۲) طبعی عصمت کا فعلی وارادی عصمت سے کم ہونا۔
(۳) حسد وتکبر کی برائی۔
(۴) اپنی جماعت سے علیٰحدگی کی برائی۔
(۵) خلقی صفت نسب وغیرہ پر ناز کرنے کی برائی۔
(۶) تعلّی کے خواہشمند کا پست ہونا۔
(۷) برے آغاز کا برا انجام۔
(۸) قصوروار کے بھی واجب حق کا ساقط نہ ہونا۔
(۹) مجرم کے ضد کرنے پر سزا کی زیادتی۔
(۱۰) بدی کے پیرو کا بانی کی طرح انجام خراب ہونا۔
(۱۱) حقیقی دوست کا مشکل سے بہم پہنچنا۔
(۱۲) بے جانچے کسی بات پر بھروسہ کرنے کی برائی۔
(۱۳) دشمن کی بات پر بھروسہ کرنے کی برائی۔
(۱۴) ناصح کے خلاف کرنے میں زک اٹھانا۔
(۱۵) دشمن کی جھوٹی قسموں پر اعتماد نہ کرنا۔
(۱۶) غلطی پر توبہ اور ندامت کا مفید ہونا۔

---

[1] ۔یوجب ان یکون ابلیس علم ان من اکل هٰذه الشجرة بدت عورته وان من بدت عورته لا یترك فی الجنة (مجمع البیان)
[2] ۔تا وقتی معین یعنی تا مرگ (شاہ ولی اللہ)
[3] ۔عند البعث یوم القیامة (مجمع البیان)

(۱۷) ندامت سے پھر اصلی مرتبہ ہاتھ آنا۔

(۱۸) کبھی ذاتی عداوت کا موروثی عداوت ہوجانا۔

(۱۹) دشمن کی لگاوٹ پر نہ اترانا۔

بر تواضع ہائے دشمن تکہ کردن ابلہی است

پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝۲۶

''اے اولاد آدم! ہم نے تم پر پوشاک اتاری ہے جو تمہارے جسم کے چھپانے کے قابل حصوں کو چھپائے اور دیگر ساز وسامان [1] اور پرہیزگاری کا لباس۔ یہ سب سے اچھی چیز ہے۔ یہ سب اللہ کی نشانیوں میں سے ہے، شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں۔''

اچھے لباس اور اچھی غذا سے پرہیز ضروری نہیں

''تم پر پوشاک اتاری'' یعنی وہ چیزیں خلق کیں جن سے پوشاک تیار ہوتی ہے اور تمہیں وہ عقل وشعور عطا کیا جس سے تمہیں ستر پوشی اور آرائش کی ترکیبیں آئیں۔ اس پوشاک کے تذکرہ میں پرہیزگاری کے لباس کا ذکر اس بنا پر ہوسکتا ہے کہ لباس میں بھی تو شریعت کی طرف سے پابندیاں ہیں لہٰذا ایسا نہ ہونا چاہیے کہ تم ستر پوشی اور آرائش کی دھن میں ان پابندیوں کو نظر انداز کردو۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۲۷

''اے نسل آدم کے لوگو! ایسا ہرگز نہ ہو کہ شیطان تمہیں بہکا دے جیسا تمہارے باپ ماں کو اس نے بہشت سے نکلوایا یا اس طرح کہ ان کے جسم سے ان کے کپڑے تک اتروا دیئے تاکہ ان کے جسم کے چھپانے کے قابل حصے ان کی آنکھوں کے سامنے لے آئے یقیناً وہ اور ان کا قبیلہ تمہیں جس طرح دیکھتا ہے، تم انہیں نہیں دیکھتے یقیناً ہم نے شیطان کو ان کا حوالی موالی قرار دیا ہے کہ جو ایمان نہیں رکھتے۔''

''قرار دیا ہے'' یعنی محسوب کیا ہے [2] جو حقیقت کے مطابق ہے۔ نہ یہ کہ اس نے ان افراد کو ان شیطانوں کی پیروی پر یا ان شیطانوں کو

---

[1] ۔الریش والاثاث متاع البیت من فراش اودثار (مجمع البیان)

[2] ۔معناہ انا حکمنا بذلك ومثله قوله: وجعلوا الملئكة الذين هم عباد الرحمن اناثا ای حکموا بذلك (تبیان)

ان کی سرپرستی پر مجبور کیا ہے۔

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

''اور جب وہ کسی بدکاری کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا تھا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ کہیے کہ اللہ بدکاری کا حکم نہیں دیا کرتا، کیا تم اللہ پر ایسی بات کی تہمت لگاتے ہو جو تم جانتے نہیں ہو۔''

یہ فقرہ کہ ''اللہ بدکاری کا حکم نہیں دیا کرتا'' اس کی دلیل ہے کہ حکم الٰہی سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی کچھ افعال میں ذاتاً بھلائی اور برائی موجود ہے۔ یہ وہ مسلک ہے جسے عدلیہ اختیار کئے ہوئے ہیں مگر جمہور اہل اسلام اس کے خلاف ہیں، یہ جمہور کا مسلک عقل اور قرآن دونوں کے خلاف ہے۔

یوں تو مشرکین طرح طرح کی بدکاریوں کے مرتکب تھے اور فاحشہ کا لفظ ان سب پر حاوی ہے [۱] مگر یہاں مفسرین کا بیان ہے کہ اس سے مشرکین کا برہنہ طواف کرنا مراد ہے۔ [۲]

وہ اس کی توجیہ یہ کرتے تھے کہ وہ کپڑے جن میں ہم نے طرح طرح کے گناہ کئے ہیں، اس لائق نہیں ہیں کہ ہم انہیں طواف کی حالت میں جسم پر رکھیں لہٰذا ہم اس حالت میں طواف کرتے ہیں، جس حالت میں معصومیت کے عالم میں ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ [۳]

دیکھا جائے تو اسلام نے حالت احرام کے لئے خاص طرح کے لباس کا حکم دے کر کم از کم مردوں کے لئے تو ان کے اس وہم کو بھی دور کر دیا ہے جو عام لباس پہن کر طواف کرتے ہیں ان کے ذہن میں تھا۔ ہاں عورتوں کے لئے عزت نسوانی کا پہلو اتنا اہم تھا کہ ان کے لئے اس طرح کے لباس کو مناسب نہیں سمجھا گیا اور انہی اپنے عام لباس میں احرام کی اجازت دی گئی۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۫ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾

''کہیے کہ میرے پروردگار نے عدالت کا حکم دیا ہے اور یہ کہ اپنے چہرہ کو سیدھ پر رکھو ہر نماز کے وقت [۴] اور اسے پکار و نری کھری اس کی عبادت کرتے ہوئے جس طرح اس نے پہلی دفعہ تمہیں پیدا کیا، اسی طرح پھر دوبارہ پلٹنا ہو گا۔''

---

[۱] ۔ھو اسم جامع للقبائح والسیئات (مجمع البیان)

[۲] ۔ کنایۃ عن المشرکین الذین کانوا یبدون سؤاتھم فی طوافھم النساء والرجال (تبیان)

[۳] ۔نطوف کما ولدتنا امھاتنا ولا نطوف فی الثیاب التی قارفنا فیھا الذنوب (مجمع البیان)

[۴] ۔راست کنید روئے خود را (شاہ ولی اللہ) سیدھا کرو اپنے منہ کو (شاہ رفیع الدین)

چہرہ کو سیدھ پر رکھنے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قبلہ کی سیدھ پر رکھو جو شرائط نماز میں سے ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خضوع وخشوع کے ساتھ اللہ سے لو لگانا مقصود ہو [1]

علامہ طبرسیؒ نے اس کی تفسیر میں پانچ قول نقل کئے ہیں مگر ہمارا ترجمہ ''چہروں کو سیدھ پر رکھو'' ان سب ہی پر منطبق ہے۔ اسی لئے ہم نے بریکٹ وغیرہ کے اندر کوئی ایسی تشریح نہیں کی جو صرف ایک قول پر مبنی ہو سکے۔

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

''ایک گروہ کی اس نے ہدایت کی اور ایک گروہ پر گمراہی ثبت ہوگئی [2] بلا شبہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو سرپرست بنایا اور پھر سمجھتے ہیں کہ وہ صحیح راستے پر ہیں۔''

گمراہی ثبت ہونے کے ساتھ شیطانوں کو سرپرست بنانے کا ذکر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ کی طرف سے کسی پر بلا وجہ گمراہی ثبت نہیں ہوتی بلکہ یہ اس کے غلط کردار کا ایک نتیجہ ہوتا ہے جو ظہور پذیر ہوتا ہے۔ [3]

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾

''اے آدم کی نسل کے لوگو! ہر نماز کے وقت اپنی آرائش کی صورتیں اختیار کرو اور کھاؤ پیو اور فضول خرچی نہ کرو۔ یقیناً وہ فضول خرچی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

واجب حد آرائش کی جو نماز میں ضروری ہے وہ لباس ہے جس سے ضروری ستر ہوا اور وہ مرد کے لئے صرف اتنا ہے کہ جو ساتر عورتین ہو اور عورت کے لئے چہرہ اور دونوں ہاتھوں کے سوا پورے جسم کا لباس ہے۔ اس لئے بعض مفسرین نے زینت کی تفسیر یہی کی ہے۔ [4] مگر یہ بعید نہیں ہے کہ اس میں لفظ زینت کے اندر اس کے ماسوا چیزیں مثلاً لباس فاخرہ اور بالوں میں کنگا اور عطر وغیرہ بھی داخل ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے متعلق حکم وجوبی نہیں بلکہ استحبابی ہو جیسا کہ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام دونوں بزرگوں کی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے۔ [5]

امام حسن علیہ السلام کا عمل بھی وارد ہوا ہے کہ آپ نماز کے وقت اپنے سب سے بہتر لباس کو زیب جسم فرماتے تھے اور پھر جب کسی نے اس کا

---

[1] ۔ای اخلصوا سجودکم (جلالین)

[2] ۔حق ای وجب (مجمع البیان)

[3] ۔انه فعل بهم ما فعل من الضلال لانهم اتخذوا الشیاطین اولیآء (تبیان)

[4] ۔زینتکم ما یستر عورتکم (جلالین)

[5] ۔ای خذوا ثیابکم التی تتزینون بها للصلوٰة فی الجمعات والاعیاد عن ابی جعفر الباقر علیہ السلام وقیل ان اخذ الزینة هو المشط عند کل صلوٰة روی ذٰلك عن الصادق علیہ السلام (مجمع البیان)

سبب دریافت کیا تو حضرتؑ نے اس آیت کو پیش فرمایا۔[1]

ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس آیت میں "عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ" سے مراد خاص خاص نمازوں کے ہنگام یعنی جمعہ وعیدین مراد ہیں۔[2]

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

"کہیے کہ کس نے حرام کیا ہے اللہ کی طرف کے سامانِ آرائش کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور اچھی غذاؤں کو؟ کہیے کہ وہ مومنین کے لئے دنیوی زندگی میں بھی ہیں اور روز قیامت تو نری کھری انہی کے لئے ہوں گی۔ اسی طرح ہم اپنی آیتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں ان کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔"

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کا تعلق نحوی قواعد کے لحاظ سے بظاہر کائنةً یا ثابتةً کے ساتھ ہے جو مقدر ہے یعنی یہ نعمتیں ثابت ہیں مسلمانوں کے لئے زندگانی دنیا میں مگر یہاں غیر مومن بھی ان کے ساتھ شریک ہیں اور روز قیامت تو وہ ان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ غیر مومنین کا ان میں کوئی حصہ ہی نہیں ہوگا۔[3]

مگر ایک دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ اٰمنوا کے ساتھ متعلق ہو یعنی جو زندگانی دنیا میں ایمان لائے ہیں ان کے لئے یہ چیزیں روز قیامت بالکل مخصوص ہوں گی۔[4]

بعض مترجمین نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے[5] اور پہلے احتمال کی بنا پر بھی مطلب ایک دوسرا ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ لام استحقاق کا ہو یعنی یہ نعمتیں اس زندگانی دنیا میں حق اہل ایمان ہی کا ہیں مگر یہاں دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ غاصبانہ حصہ اپنا لگا لیتے ہیں اور آخرت میں وہ صرف انہی کے قبضہ میں ہوں گی۔ دوسروں کا ان تک دسترس نہ ہوگا۔[6]

پھر خالصة کے لحاظ سے ایک تیسرا مفہوم بھی قرار دیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ نعمتیں اس دنیا میں بھی مومنین کو حاصل ہیں مگر یہاں ان کے ساتھ طرح طرح کے افکار و آلام بھی ملے ہوئے ہیں اور آخرت میں وہ نری کھری ان کے لئے ہوں گی یعنی کسی غم و رنج اور فکر کا شائبہ نہ ہوگا۔[7]

---

[1] ۔روی العیاشی باسنادہ (مجمع البیان)

[2] ۔مروی عن ابی جعفر علیہ السلام انہ قال فی الجمعات والاعیاد (تبیان)

[3] ۔ثابتة للذین اٰمنو فی حال خلوصھا م یوم القیامة لھم (مجمع البیان)

[4] ۔یحتمل ان یکون قولہ فی الحیٰوة الدنیا متصلة بالصلة التی ھی اٰمنوا (مجمع)

[5] ۔واسطے ان لوگوں کے کہ ایمان لائے بیچ زندگانی دنیا کے خالص ہیں دن قیامت کے (شاہ رفیع الدین)

[6] ۔ھی للذین اٰمنوا فی الحیٰوة الدنیا بالاستحقاق وان شارکھم فیھا غیرھم (جلالین)

[7] ۔ھی للذین اٰمنوا فی الحیٰوة الدنیا للذین اٰمنوا غیر خالصة من الھموم والاحزان والمشقة وھی خالصة یوم القیامة عن ذٰلك عن الجبائی (مجمع البیان)

بہر حال اصل کلام کا مقصد وہ ہے جس سے آیات شروع ہوئی ہیں کہ ان لوگوں کا تصور غلط ہے جو بغیر ممانعت شرعی کے کچھ لذائذ دنیا کو ممنوع سمجھ لیں لیکن اگر انسان ممنوع نہیں سمجھتا پھر بھی اس نے ذاتی طور پر کچھ چیزوں کو ترک کرنے کی پابندی کر لی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ اگر خلق خدا کی ہمدردی و غمخواری یا اور کسی مقصد بلند کے لئے ہے تو ممدوح اور باعث رضائے خالق بھی ہوگی۔ [1]

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

''کہیے کہ میرے پروردگار نے تو بس حرام کیا ہے بدکاریوں کو جو کھلی ہوئی ہوں ان میں سے اور جو پوشیدہ ہوں اور شراب کو اور حدود سے ناحق تجاوز کو اور یہ کہ اللہ کا شریک کرو کسی کو جس کے لئے اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے اور یہ کہ اللہ کی نسبت کہو ایسی بات جو تم جانتے نہیں ہو۔''

شراب کی حرمت

یوں تو اثم کے معنی عام گناہ کے ہیں اور اسی کے مطابق ترجمہ یہاں بھی کیا جاتا رہا ہے مگر ایک تو گناہ کے معنی ہی ہیں کسی ممنوع کام کا ارتکاب تو گناہ کو کہنا کہ اسے حرام قرار دیا گیا ہے بظاہر کسی افادیت کا حامل نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ فواحش کا لفظ جس سے متبادر جنسی قسم کے جرائم ہیں، نمبر ایک اور بغی جس سے متبادر دوسروں کے حقوق کے خلاف کسی بھی صورت سے دستِ تعدی دراز کرنا ہے نمبر 3، ان دونوں کے درمیان حرف عطف کے ساتھ ''الاثم'' کو نمبر 3 بنا کر ذکر کرنا جب اثم کا وہ عام مفہوم نمبر 1 اور نمبر 3 پر بھی حاوی ہے، یہ پتہ دیتا ہے کہ یہ نمبر 2 عام مفہوم گناہ نہیں ہے بلکہ کوئی خاص قسم گناہ ہے جو نمبر 1 اور نمبر 3 کے علاوہ ہے۔ جب کہ خود قرآن مجید میں دوسری جگہ اس لفظ کا استعمال شراب کے معنی میں ہوا ہے جس کے شواہد کلام عرب میں بھی موجود ہیں لہٰذا کیوں نہ یہاں بھی ''الاثم'' کے یہی معنی لئے جائیں اس لئے اس آیت میں بھی زیادہ قوت میرے نزدیک اسی قول کو ہے کہ اس کے معنی شراب کے ہیں [2] جیسا کہ میں نے ترجمہ کیا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾

---

[1] ۔ظاهر الاٰية يدل على انه لا يجوز لا حد تجنب الزينة والملاذ الطيبة على وجه التحريم واما من اجتنبها على ان غيرها افضل منها فلا مانع منه (تبيان)

[2] ۔قال قوم الاثم هو الخمر وانشد ابن الانباری به شربت الاثم حتى ضل عقلی كذالك الاثم يصنع بالعقول (تبيان)

''اور جو بھی کسی دور کے لوگ ہوں [1] ان کی ایک عمر ہوتی ہے تو جب ان کی پوری عمر ہونے کا وقت [2] آجاتا ہے تو ذرا دیر نہ وہ پیچھے رہتے ہیں اور نہ آگے بڑھتے ہیں۔''

''اجل'' کے معنی مدت مقررہ کے ہوتے ہیں۔ عمر بھی ایک مقررہ مدت ہے۔ اس اعتبار سے وہ خود ایک اَجَل ہے اور اس مدت کا اختتام موت کے ذریعہ ہوتا ہے، اس لئے موت حقیقتاً اختتام اجل کا نام ہے لیکن یہ اختتام چونکہ موت کی صورت میں ہوتا ہے، اس لئے عرفاً موت کو ''اجل'' کہا جانے لگا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝٣٥ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٣٦

''اے آدم کی نسل کے لوگو! اگر تمہاری [3] طرف آئیں کچھ پیغمبر تم میں سے جو تمہارے سامنے میرے احکام پیش کریں تو جو پرہیزگاری سے کام لے گا اور اعمال درست رکھے گا تو ان پر نہ خوف طاری ہوگا اور نہ انہیں افسوس کی نوبت آئے گی اور جنہوں نے ہمارے احکام کو جھٹلایا اور ان کے مقابلہ میں اکڑ سے کام لیا تو یہ لوگ دوزخ والے ہوں گے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝٣٧

''تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا کہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے؟ انہیں جو ان کے مقدر کا لکھا ہے [4] وہ تو پہنچے گا، یہاں تک کہ جب ان کے پاس آئیں گے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ان کی روحوں کو قبض کرتے ہوئے، تب وہ کہیں گے کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ کے سوا دہائی دیتے تھے [5] وہ کہیں گے کہ

---

[1] ۔قیل ذکر الامة یقتضی تقارب اعمالا هلا العصر (تبیان)

[2] ۔بیاید میعاد ایشاں (شاہ ولی اللہ) جب آتا ہے وقت ان کا (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔اما اصله ان (تبیان) ای ان یأتکم (مجمع البیان)

[4] ۔بهرۂ ایشاں از آنچه نوشته شد در لوح محفوظ (شاہ ولی اللہ)

[5] ۔تدعون تعبدون (جلالین)

وہ تو ہم سے غائب ہو گئے اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ بے شک کافر تھے۔''

''انہیں جو ان کے مقدر کا لکھا ہے ضرور پہنچے گا'' اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں رزق و نعمت الٰہی کا دروازہ ان پر بند نہیں ہوگا [1] اور یہ بھی کہ جو سزا انہیں ملنا ہے، وہ ملے [2] اور چونکہ الفاظ آیت کا دامن وسیع ہے، اس لئے دنیا و آخرت دونوں کی اچھائی برائی، سب ہی پر انہیں حاوی بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ [3]

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۭ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۸

''ارشاد ہوگا کہ انہی گروہوں کے ذیل میں جنات اور آدمیوں میں کے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، تم بھی دوزخ میں داخل ہو، جب بھی کوئی گروہ داخل ہوتا ہے تو وہ اپنے ساتھ والے دوسرے گروہ کو لعنت ملامت کرتا ہے [4] یہاں تک کہ جب وہ سب وہاں باہم مل جائیں گے [5] تو بعد والے پہلے والوں کے لئے کہیں گے کہ پروردگارا! انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا تو انہیں دوزخ میں زیادہ عذاب کر۔ ارشاد ہوگا کہ ہر ایک ہی کے لئے دونا عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں۔''

''قال'' کا لفظ جس کا ترجمہ کیا گیا ہے ''ارشاد ہوا'' یہ ارشادِ لفظی بھی ہو سکتا ہے اور ارادۂ الٰہی کی ایک تعبیر بھی [6] جیسا کہ کن فیکون میں ہوتا ہے۔ ''ہر ایک کے لئے دونا عذاب ہے'' یعنی حیثیتیں مختلف ہیں، کسی اعتبار سے اگلوں کا عذاب زیادہ ہے کہ وہ دوسروں کی گمراہی کا بھی باعث ہوئے اور کسی حیثیت سے پچھلے عذاب کے زیادہ مستحق ہیں کہ انہوں نے سابق امتوں کے انجام سے بھی عبرت حاصل نہ کی۔ [7]

نتیجہ یہ ہے کہ دونوں ہی عذاب کے یکساں طور پر مستحق ہیں۔

---

[1] ۔بما کتب لهم فی اللوح المحفوظ من الرزق والاجل وغیر ذٰلك (جلالین)

[2] ۔ینالهم ما فی الکتاب من عقوبات المعاصی (علی بن ابراهیم)

[3] ۔قال مجاهد: جمیع ما کتب لهم وعلیهم وهو فی قول عطیة (تبیان)

[4] ۔لعنت کند قوم دیگر مانند خود را (شاہ ولی اللہ)

[5] ۔ادّارکوا تلاحقوا (جلالین)

[6] ۔یجوز ان یکون ذٰلك اخبار اعن جعله ایاهم فی جملة اولئك فی النار من غیر ان یکون هناك قول کما قال: کونوا قردة خاسئین والمراد انه جعلهم کذٰلك (تبیان)

[7] ۔یعنی ایک حساب سے پہلی امت کا عذاب بڑھا کہ پچھلوں کو راہ ڈالی اور ایک طرح پچھلوں کا بڑھا کہ پہلوں کا حال دیکھ سن کر عبرت نہ پکڑی (موضح القرآن)

وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور کہا ان میں کے پہلوں نے ان میں کے بعد والوں سے، تو پھر تم کو ہم پر کوئی فوقیت تو نہ ہوئی تو بس چکھو اس عذاب کو اس کی وجہ سے جو تم اعمال کرتے تھے۔''

بعد والے تو یہ چاہتے تھے کہ قبل والوں پر ذمہ داری عائد کر کے کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا خود بری الذمہ ہو جائیں اور بالکل نہ بھی بچیں تو پہلے والوں پر عذاب تو ان سے زیادہ ہو اور یہ ان کی بہ نسبت کم عذاب کے مستحق ہوں اس لئے کہ یہ تو ''بیچارے'' دوسروں کے کہنے میں آ گئے تھے۔ اس صورت میں ان کو پہلوں کے مقابل میں کچھ فوقیت ہوتی، خواہ مطلق نجات کی بنا پر اور خواہ کمی عذاب کی بنا پر مگر یہ اس کے قبل کی آیت میں معلوم ہو گیا کہ نہیں، نہ یہ عذاب سے بچ سکتے ہیں اور نہ پہلوں کی بہ نسبت ان کے عذاب میں کمی ہے۔ اس طرح پہلے لوگوں کو ان پر اس طعنہ زنی کا موقع ہو گیا کہ تم جو چاہتے تھے کہ ہم پر ذمہ داری عائد کر کے خود ہم سے بہتر حالت میں ہو جاؤ، یہ تمہاری امید بر نہیں آئی بلکہ معلوم ہو گیا کہ تم پورے پورے اپنی گمراہی اور اپنی بداعمالیوں کی ذمہ دار ہو تو اب ان بداعمالیوں کا مزہ چکھو اور سزا برداشت کرو۔

سیاق کلام کا ظاہر تو یہی ہے کہ یہ ''فذوقوا العذاب'' اب سزا اپنے اعمال کی چکھو'' انہی قبل والوں کے کلام کا تتمہ ہے مگر بعض مفسرین نے اس کو ان کے کلام سے خارج کر کے ارشاد حضرت احدیت قرار دیدیا ہے یعنی ان کی بات اس پر ختم ہو گئی کہ ''تمہیں ہم پر فوقیت نہیں ہوئی'' اور اب اللہ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ''بس اب اپنے کردار کا مزہ چکھو[1] مگر مجھے پہلے معنی زیادہ درست معلوم ہوتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾

لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

''یقیناً وہ کہ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے مقابلہ میں اکڑ سے کام لیا، ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھلیں گے اور نہ وہ بہشت میں داخل ہوں گے اس وقت تک کہ جب تک اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ چلا جائے اور اسی طرح ہم بالا دیتے ہیں گنہگاروں کو۔ ان کے لئے دوزخ کا بچھونا ہے اور ان کے اوپر سے اوڑھنا بھی ہے اور یوں ہی ہم پاداش دیتے ہیں ظالموں کو۔''

کافروں کا بہشت میں جانا غیر ممکن

''آسمان کے دروازے کھلنے'' سے مراد ہے رحمت خدا کا متوجہ ہونا اور کلام معصومؑ میں اس کی تشریح یہ وارد ہوئی ہے کہ ان کی دعا اور ان

---

[1] ۔ قال تعالیٰ لھم: فذوقوا العذاب بما کنتم تکسبون (جلالین)

کے اعمال بارگاہ الٰہی کی طرف بلند اور قابل قبول نہیں ہوتے۔[1] ''اس وقت تک یہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں نہ جائے ..... یہ تعلیق المحال بالمحال ہے۔اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی بات میں ناممکن شرط لگا کر خود اس بات کو ناممکن ظاہر کیا جائے۔اب یہاں معنی یہ ہیں کہ جیسے اونٹ کا سوئی کے ناکے میں جانا غیر ممکن ہے، ویسے ہی ان کا بہشت میں جانا غیر ممکن ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۚ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۭ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کرتے رہے ہم کسی پر پابندی عائد نہیں کرتے مگر اس کے مقدور بھر، یہ لوگ بہشت والے ہیں کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور ہم دور کر دیں گے جو ان کے سینوں میں کدورت ہو، ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہتے ہوں گے کہ شکر اللہ کا جس نے ہم کو اس راستے پر لگایا اور ہم یہ راستہ نہیں پا سکتے تھے اگر اللہ ہمیں راہ پر نہ لگاتا بلاشبہ آئے ہمارے پروردگار کے پیغمبر سچائی کے ساتھ اور آواز دی جائے گی انہیں کہ یہ بہشت ہے جس کے تم وارث قرار دیئے گئے ہو ان اعمال کے سبب سے جو تم نے انجام دیئے تھے۔''

بہشت میں قلبی کدورتیں دور ہو جائیں گی مگر کون سی؟

اہل بہشت کے متعلق اس ارشاد میں کہ ''ہم نے دور کر دی ہوگی جو ان کے سینہ میں کدورت ہو'' کدورت سے مراد ذاتی اور دنیوی امور سے متعلق منازعات ہی ہو سکتے ہیں جن کا اصول ایمان اور اس صلاح عمل سے کوئی تعلق نہ ہو جو معیار دخول جنت ہے۔اس لئے کہ منازعت اگر ان شعبوں سے متعلق ہوئی تو جو سرنامہ اوصاف اہل جنت کا یعنی اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، وہ دونوں طرف ایک ساتھ موجود ہی نہ ہوگا تو پھر بعد کے تفصیلات اس سے کہاں متعلق ہو سکتے ہیں؟

اس سے ظاہر ہے کہ کچھ مفسرین نے جو اس آیت کے مضمون کو حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام اور ان سے جنگ کرنے والے افراد مثلاً طلحہ و زبیر وغیرہ سے مرتبط کیا ہے جیسا کہ شاہ ولی اللہ اپنے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

''مثل انچہ میان عثمان و علی و طلحہ و زبیر و عائشہ و عثمان واقع شد''

اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر صاحب نے تو اسے حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی زبانی نسبت دے کر وارد کر دیا ہے۔

---

[1] ۔قال ابو جعفر علیہ السلام: اما المؤمنون فیرفع اعمالھم وارواحھم الی السمآء فتفتح لھم ابوابھا (تبیان)

فرماتے ہیں:

''معلوم ہوا کہ نیکوں کے دل میں بھی آپس میں خفگی ہوگی، جنت کے قریب پہنچ کر آپس میں دل صاف ہوں گے، تب جنت میں جاویں گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ نے فرمایا کہ میں اور عثمان اور طلحہ اور زبیر ان لوگوں میں ہیں اور جنت کے وارث فرمایا یعنی آدمؑ کی میراث پائی۔'' (موضح القرآن)

ہم اس قول کی نسبت حضرت علی علیہ السلام کی طرف درست نہیں سمجھتے کیونکہ جیسا کہ پہلے کہا گیا وہ خلاف اصول ہے۔ مزید براں یہ کہ قرآن تو قلبی ''کدورتوں'' کو کہہ رہا ہے، نہ یہ کہ جب یہ قلبی کدورت عملی حیثیت سے خونریزیوں کے درجہ پر پہنچ جائے اور پھر ایسی ذات کے مقابلہ میں جس کے لئے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما گئے ہوں: ''حَرْبُكَ حَرْبِيْ'' تم سے جنگ مجھ سے جنگ ہے'' اور جس کی محبت اور عداوت کو معیار ایمان و کفر قرار دیا گیا ہے: يَا عَلِيُّ حُبُّكَ إِيْمَانٌ وَبُغْضُكَ كُفْرٌ وَنِفَاقٌ '' اے علیؑ تمہاری محبت ایمان اور تمہاری دشمنی کفر و نفاق ہے'' ..... وہاں اس آیت کے مضمون کو لے جا کر منطبق کرنا صرف اپنے دل کی تسلی یا سخن پروری کے سوا، کیا حقیقت پروری کا نتیجہ ہوسکتا ہے؟

ایک دوسرا مفہوم ان الفاظ کا بہت قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے دلوں سے کینہ و عداوت دور ہو گئے ہوں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے دنیا میں ایک آدمی دوسرے کی بلندی کو دیکھ کر جل جاتا ہے اور اس سے کینہ و عداوت پر کمر باندھ لیتا ہے، یہ بات وہاں نہیں ہوگی۔ اہل جنت آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نہ کینہ رکھتے ہوں گے نہ عداوت رشک و حسد کا وہاں نام نہ ہوگا[1] جیسے دوسرے مقام پر بہشت اور اہل بہشت کے اوصاف میں ہے:

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾

وہاں انہیں کوئی لغو بات سننے میں نہ آئے گی اور نہ گناہ کی بات سوا ہر طرف دعائے خیر و سلامتی کی باتوں کے۔ (سورۂ واقعہ)

اس کے بعد تو اس کے مضمون کا کوئی تعلق دنیا کے باہمی تعلقات کی کشیدگیوں اور منازعتوں کے ساتھ رہتا ہی نہیں ہے۔

آخری جملوں میں ایک بڑا لطیف اسلوب ہے کہ بندے بتقاضائے عبودیت اپنے انجام بخیر ہونے کا واحد سبب توفیق الٰہی کو قرار دے رہے ہیں کہ ہم اس منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتے تھے اگر اس کی توفیق نہ ہوتی اور اللہ اپنے کرم سے اس کا سہرا ان کے حسن اختیار کے سر پر باندھ رہا ہے کہ یہ تم پر کوئی مفت کا احسان تھوڑی ہے۔ یہ تو تمہارے حسن خدمات کا صلہ ہے جو تمہیں آج دیا جا رہا ہے۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

---

[1] ۔ نزع الغل فی الجنة تصبعة الطباع ولسقاط الوساوس واعطاء کل نفس مناها ولا تتمنی ما لغیرها (تبیان)

''اور آواز دیں گے [1] بہشت والے دوزخ والوں کو کہ ہم نے تو جو ہم سے ہمارے پروردگار نے وعدہ کیا تھا، اسے سچا پایا تو کیا تم نے بھی اس وعدہ کو جو تم سے تمہارے پروردگار نے کیا تھا، سچا پایا؟ وہ کہیں گے 'ہاں' تو ایک اعلان کرنے والا ان کے درمیان اعلان کرے گا کہ اللہ کی لعنت ہو ظالموں پر، جو اللہ کی راہ سے روکتے رہے ہوں [2] اور اسے کج بنانے کے درپے ہوں اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہوں''۔

اہل بہشت اور اہل دوزخ کی دلچسپ اور عبرت انگیز گفتگو

''کج بنانے کے درپے ہونا'' شکوک اور بیجا اعتراضات کے ذریعہ سے راہ راست کو مشتبہ بنانے کی کوشش کرنا ہے [3]

ان لوگوں سے جو وعدہ تھا، وہ ان کی بداعمالیوں پر عذاب کا تھا جو اصطلاحی طور پر وعید کہلاتا ہے مگر قرآن مجید نے اسے خواہ عام مفہوم کے اعتبار سے اور خواہ بطور طنز تعبیر کیا ہے وعدہ ہی کے لفظ کے ساتھ [4]۔

من جملہ کثیر التعداد آیات کے یہ آیت بھی لعن کے استحسان پر دلالت کرتی ہے اور اس سے ثابت ہے کہ بداعمالی کا ایک درجہ وہ ضرور ہے جو لعنت خدا کا استحقاق پیدا کرتا ہے اور بداعمالی میں خاص چیز جو صراحۃً اس آیت میں درج ہے وہ راہ حق کو مشتبہ بنانے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں: ''حق تعالیٰ نے قرآن شریف میں بے انصاف فرمایا ہے اکثر گناہوں پر لیکن ہر گناہ پر لعنت نہیں مگر ایسوں پر۔ (موضح القرآن)

پھر کم از کم ''ایسوں پر'' لعنت میں تمام امت کو متفق ہو جانا چاہیے اور اس کو دشنام نہیں سمجھنا چاہیے۔

اعلان کرنے والا جس کا ذکر قرآن میں ہے ملک تو ہو ہی سکتا ہے جس کے لئے ایک روایت ہے کہ وہ مالک خازن جہنم ہوں گے مگر ایک روایت جو کئی طرق سے وارد ہوئی ہے، یہ بتاتی ہے کہ یہ اعلان کرنے والے اللہ کی طرف سے حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہوں گے اور یہ آپ کے ان مناصب میں سے ایک ہے جو آپ کو روز جزاء منجانب اللہ حاصل ہوں گے۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۫ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾

''اور ان دونوں کے درمیان ایک حد فاصل ہوگی ''اعراف'' پر کچھ اشخاص ہونگے جو ہر ایک کو اس کی صورت سے

---

[1] ۔ناديٰ اى وينادى (مجمع البيان)

[2] ۔يعرضون وقيل معناه يصرفون غيرهم (مجمع)

[3] ۔يطلبون لها العوج بالشبه التى يلبسون بها ويوهمون انها تقدح فيها (تبيان)۔

[4] ۔ما وعدكم ربكم من العذاب (جلالين)

پہچانتے ہوں گے اور وہ بہشت والوں کو آواز دیں گے کہ سلام ہو تم پر، وہ اس میں داخل نہیں ہوئے حالانکہ وہ اس کی خواہش رکھتے ہوں گے اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف مڑتی ہیں تو وہ کہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم جماعت کے ساتھ قرار نہ دے۔''

اعراف کا ذکر

''ان دونوں'' یعنی بہشت و دوزخ کے درمیان [۱] ایک پردہ ہے یا حد فاصل ہے یعنی ایک تیسری جگہ ہے جو دونوں کے درمیان ہوگی، اسی کا نام اعراف ہے جس کے نام پر اس سورہ کا نام ''اعراف'' ہوگیا۔

اعراف کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ وہ بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک جگہ ہے جہاں ایسے اشخاص کو جگہ دی جائے گی جو دائرۂ تکلیف سے خارج ہیں، جن سے نہ جزاء کا وعدہ ہے اور نہ انہیں سزا کا استحقاق ہے یا ایسے لوگ جن کے نیک اور بد اعمال کا پلہ برابر ہے۔ [۲]

مگر شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں کہ:

''جنت و دوزخ کے درمیان میں ایک دیوار ہوگی، اس کے سرے پر ایک مرد ہیں نجات والے جو حشر اور حساب سے فارغ ہیں، بہشتی اور دوزخی کو نشان سے پہچان کر جنت والوں کو خوشخبری کہیں گے سلامتی کی'' (موضح القرآن)

کچھ دوسرے مفسرین کا کلام بھی اس کے موافق ہے [۳] اور احادیث اہل بیت علیہم السلام میں جن کی تائید بعض روایات اہل سنت سے ہوتی ہے، یہ وارد ہوا ہے کہ یہ ہستیاں آل محمد علیہم السلام کی ہیں جو مومن اور کافر میں تمیز دے رہی ہوں گی۔ اس سلسلہ میں جناب امیر علیہ السلام کا لقب: ''قسیم الجنة والنار'' بہشت اور دوزخ کے تقسیم کرنے والے'' کتب فریقین میں مسلم ہے۔

یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اہل بہشت کا سلام سلام علیکم ہے، السلام علیکم نہیں ہے جس کا ایک فریق پابند ہوگیا ہے اگرچہ درست وہ بھی ہے مگر آخر سلام علیکم کے جملہ سے پرہیز کی کیا بنیاد ہوسکتی ہے؟

جناب شیخ طوسیؒ نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی جو حدیث درج کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اعراف والی بلندی پر جہاں سے جنت اور دوزخ دونوں زیر نظر ہوتے ہیں، معصومین علیہم السلام اہل ایمان کی اس جماعت کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہوں گے جن کی بداعمالیاں ابھی تک دخول جنت سے سدراہ رہی ہیں [۴] یہ جماعت وہ ہے جو اہل جنت کو بہشت میں جاتے دیکھ کر انہیں سلام کرتی ہے اور خود یہ لوگ اس کے امیدوار ہیں کہ یہی معصومینؑ جنہیں وہ گھیرے ہوئے ہیں، ان کی شفاعت کریں تو ان کے لئے بھی بہشت میں داخلہ کا حکم ہوجائے اور یہی وہ ہیں کہ جب ان کی نگاہ اہل دوزخ پر پڑتی ہے تو وہ اپنے پروردگار سے پناہ طلب کرتے ہیں کہ پروردگارا! ہمیں اس جماعت کے ساتھ قرار نہ دینا۔

---

[۱] ۔ درمیان بہشت و دوزخ حجابیست (شاہ ولی اللہ)

[۲] ۔ رجال استوت حسناتهم وسيأتهم كما في الحديث (جلالين)

[۳] ۔ حجاب حاجز قيل هو سورة الاعراف وعلى الاعراف وهو سور الجنة (جلالين)

[۴] ۔ كما يوقف قائد الجيش مع الضعفآء من جنده (تبيان)

ہماری قدیم تفسیر میں معصومؑ کی زبانی جو حدیث ہے، وہ بھی قریب قریب یہی ہے۔ [1]

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ قَالُوْا مَآ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور آواز دیں گے اعراف والے کچھ لوگوں کو جنہیں وہ ان کی صورت سے پہچانتے ہوں گے کہ تمہیں تمہاری جمع آوری اور اس گھمنڈ نے جو تم رکھتے تھے [2] کچھ فائدہ نہ دیا کیا یہی وہ ہیں جن کے لئے تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ اللہ ان تک اپنی رحمت نہیں پہنچائے گا تم داخل ہو بہشت میں، نہ تم پر خوف ہے اور نہ تم کسی رنج وغم سے دوچار ہو گے۔''

معانی، بیان کی اصطلاح میں یہ انداز کہ کسی جماعت کا پہلے بطور غائب ذکر ہو اور پھر اسی کو صیغۂ حاضر کے ساتھ مخاطب بنا لے "التفات من الغيبة الى الخطاب" کہلاتا ہے۔ یہاں اہل اعراف کی آواز میں پہلا تخاطب اہل دوزخ سے ہوا اور اس میں اہل بہشت کا ذکر صیغۂ غائب کے ساتھ اس طرح ہے کہ:

''کیا یہی وہ ہیں جن کے لئے تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ اللہ ان تک اپنی رحمت نہیں پہنچائے گا۔'' اس طرح اہل دوزخ کو شرمندہ اور ان کے سابق مزعومات کو یاد دلا کر پشیمان کرتے ہوئے آخر میں تخاطب اہل بہشت کے ساتھ ہو گیا کہ یہ تو ان کے مزعومات تھے جو غلط ثابت ہو چکے۔ اب تم جاؤ اور شوق سے بہشت میں داخل ہو۔ [3] اگر پہلے تخاطب کے ساتھ اس تخاطب کو دیکھا جائے تو یہ ایک نئی قسم التفات ہو گی یعنی التفات من الخطاب الى الخطاب، جس میں انداز کلام کی تبدیلی مخاطب کے بدلنے سے ہوتی ہے یعنی ایک شخص یا جماعت سے خطاب کرتے کرتے ایک دم تخاطب دوسرے سے ہونے لگے۔ یہ بھی فصحائے کلام میں ہر زبان میں کبھی کبھی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ معانی بیان کی کتابوں میں ''التفات'' کے اقسام میں اس قسم کا ذکر نہیں۔ اور غالباً اسی وجہ سے اکثر مفسرین نے اس جملہ کو کہ "اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ" سلسلہ کے ساتھ اہل اعراف کی آواز کا جزء قرار دینے میں زحمت محسوس کی ہے اور انہوں نے اس میں یہ ٹکڑا مقدر (ذہن میں پوشیدہ) قرار دیا ہے کہ ''ان سے کہا گیا کہ'' تم جنت میں داخل ہو۔ [4]

---

[1] ۔عن ابی عبداللہ قال: الاعراف کثبان بین الجنة والنار والرجال الائمة صلوٰت اللہ علیہم یقفون علی الاعراف مع شیعتہم فیقول الائمة لشیعتہم من اصحاب الذنوب الخ (علی بن ابراہیم)

[2] ۔جمعکم الاموال والعدد فی الدنیا (مجمع البیان) جمعیت شما و آنکہ سرکشی می کردید (ولی اللہ)

[3] ۔ثم یقولون لھؤلآء (مجمع البیان)

[4] ۔قد قیل لھم ادخلوا الجنة (جلالین) گفتہ شد ایشاں را کہ در آئید بہ بہشت (شاہ ولی اللہ) کہا گیا ان کو بہشت میں داخل ہو (شاہ رفیع الدین)

مگر ہمارے نزدیک اس تقدیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہمارے قول کے لئے سند کافی ہے [1]

قرآن مجید کے معجزنہ انداز کے اسلوب بیان سے اس مقام پر اور اس مطلب کو دیکھتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے تو جیسے ایک منظر اس وقت کا مجسم شکل میں یہ آتا ہے کہ کامل الایمان اور نیک اعمال لوگ جنت میں جا رہے ہیں اور یہ ہستیاں جو بیچ میں کھڑی ہوئی ادھر ادھر کا معائنہ کر رہی ہیں ان جنت کی طرف جانے والوں کے بارے میں اہل دوزخ کو مخاطب کر کے ان کے دنیاوی دور حیات کے تشنیعات کو یاد دلا کر تازیانہ لگا رہی ہیں کہ دیکھو! یہ وہ لوگ ہیں جنہیں تم کہتے تھے کہ انجام ان کا خراب ہے دیکھو آج وہ کس طرح بلا توقف بہشت عنبر سرشت کی طف جا رہے ہیں۔ بس اب جیسے ان کے یہ الفاظ ان بہشت کی طرف جانے والوں کے کان میں گئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ یہ ہمارا کچھ ذکر ہے تو وہ ٹھٹھک گئے اور مڑ کر دیکھنے لگے کہ یہ کون ہیں جو ہمارے لئے یہ فرما رہے ہیں۔ ان کا یہ رکنا اور مڑ کر دیکھنا ان الفاظ کی کہنے والی ہستیوں نے دیکھ لیا اور انہیں مخاطب کر کے کہا ''اے تم کیوں رکتے ہو.....؟ یہ تو ہم ادھر والوں سے کہہ رہے ہیں، تم اپنی راہ جاؤ، اس جنت میں داخل ہو جو گویا تمہاری منتظر ہے اور اب اطمینان رکھو کہ اس میں داخل ہونے کے بعد نہ تمہیں کسی خوف کا سامنا ہوگا اور نہ حزن وملال درپیش ہوگا۔ یہ جیسے ان کی ماضی کی زندگی کی طرف اشارہ ہے کہ تم نے تو حق کی راہ میں عمر بھر خوف اور حزن کی زندگی گزاری، اس کے صلہ میں اب یہ جنت تمہیں مبارک جس میں خوف اور حزن کا گزر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ انداز گفتگو بتا رہا ہے کہ یہ افراد اور محشر کے نمائندہ ہیں اور یہیں پر جو کھڑے ہیں، وہ اس کارخانۂ عدل ومجازاۃ کے ایک کارندہ کی حیثیت سے جن کے قصور ان کی آمد کے لئے آغوش کشادہ ہیں مگر انہیں ابھی اپنے کارہائے منصبی سے فرصت نہیں ہے کہ وہ جا کر اپنے قصور میں متمکن ہوں۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ﴿۵۰﴾ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾

''اور آواز دیں گے دوزخ والے بہشت والوں کو، ڈال دو ہماری طرف بھی [2] تھوڑا سا پانی یا اور جو تمہیں اللہ نے عطا کیا ہے وہ کہیں گے کہ اللہ نے ان دونوں چیزوں کو حرام کیا ہے کافروں پر، وہ جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنا لیا اور جنہیں زندگانی دنیا نے فریفتہ رکھا۔ اب آج ہم انہیں بھلاوے میں ڈالیں گے اسی طرح جیسے وہ اپنے اس دور کے سامنے آنے کو بھولے رہے اور جیسے وہ ہماری آیتوں کو برابر جھٹلاتے رہے۔''

دوسری آیت کے آخر میں یہ الفاظ کہ ''ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے'' یہ بتلاتے ہیں کہ اہل بہشت کا جواب اس پر ختم ہو گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ''اللہ نے ان دونوں چیزوں کو حرام کیا ہے کافروں پر۔'' اور اس کے بعد یہاں سے کہ: الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ

---

[1] ۔ اضطربت اقوال المفسرین فی القائل لهذا القول ...والصحیح ما ذکرناه لانه المروی عن الصادق علیہ السلام (مجمع البیان)

[2] ۔ الافاضة اجراء المانع من علو (مجمع البیان) بریزید برما (شاہ ولی اللہ) ڈالو اوپر ہمارے (شاہ رفیع الدین)

لَهْوًا وَّلَعِبًا ''جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشہ بنالیا'' یہ خود خالق کا ارشاد ہے [1] اور اسی لئے "ننساھم" کے معنی ہم نے نہ بھولنے کے نہیں بلکہ بھلاوے میں ڈالنے کے درج کئے ہیں کیونکہ بھولنے کی نسبت خالق کی طرف درست نہیں ہے۔ [2]

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

''اور ہم ان کے پاس لائے ہیں ایک ایسی کتاب جسے پورے علم کے ساتھ ہم نے تفصیلی بیانات کا حامل بنایا ہے، سراسر رہنمائی اور رحمت قرار دیتے ہوئے [3] ان کے لئے جو ایمان لائیں۔''

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

''کیا انتظار ہے انہیں سوا اس کے کہ اس کا انجام [4] ان کے سامنے آئے؟ جس دن اس کا انجام آئے گا تو وہ جنہوں نے اس کو پہلے بھلایا ہوگا کہیں گے کہ بے شک ہمارے پروردگار کے پیغمبر ہمارے پاس سچائی کے ساتھ آئے تھے تو کیا اب ہمارے کچھ سفارشی ہیں جو ہماری سفارش کریں یا ہم واپس کئے جائیں تو اب ایسے اعمال کریں جو پہلے اعمال سے مختلف ہوں، بلاشبہ انہوں نے اپنے کو گھاٹے میں مبتلا کیا ہے اور اب غائب ہو گئے ہیں ان سے وہ سب جو یہ بہتان باندھا کرتے تھے۔''

''اس کا انجام'' یعنی جو عذاب آخر میں ان کے لئے مقدر ہے۔ اس کا شعوری طور پر تو انتظار کافروں کو نہیں ہے کیونکہ وہ اسے مانتے ہی نہیں بلکہ مومنین حقیقت میں اس کا انتظار رکھتے ہیں مگر چونکہ وہ ایمان لانے میں دیر کر رہے ہیں تو ان کی سرزنش کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ ابھی جب موقع ایمان لانے کا ہے وہ ایمان نہیں لاتے تو کیا اس وقت کا انتظار ہے جب عذاب آ ہی جائے اور پھر موقع ایمان لانے کا باقی ہی نہ رہے [5] ایک تصور یہ بھی صحیح ہو سکتا ہے کہ نہیں، انتظار واقعی ان کو تھا چونکہ انہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اطلاع دینے سے دل کے اندر ایک تذبذب کی کیفیت تو کم سے کم

---

[1] ۔یحتمل ان یکون رفعا بالابتداء ویکون اخبارا من اللہ تعالیٰ علیٰ وجہ الذم (تبیان)

[2] ۔ننساھم نترکھم فی النار (جلالین) فراموش کردن خدا ترك ایشان است در دوزخ (فتح الرحمن)

[3] ۔ھدی حال من الھاء (جلالین) یجوز ان یکون حالا ویجوز ان یکون مفعولا لہ (مجمع البیان)

[4] ۔عاقبۃ مافیہ (جلالین) مصداق ایں وعدہ (شاہ ولی اللہ)

[5] ۔انما اضاف الیھم مجاز الانھم کانوا جاحدین لذلك غیر متوقعین وانما کان ینتظر بھم المؤمنون (تبیان)

پیدا ہوتی ہی تھی تو وہ راستہ دیکھتے تھے کہ دیکھیں ان کی دی ہوئی ان خبروں کا انجام کیا ہوتا ہے؟ [1]

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾

''یقیناً تمہارا پروردگار وہ اللہ ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پھر عرش کی جانب توجہ فرمائی وہ رات کا پردہ ڈالتا ہے دن پر کہ اسے تیزی کے ساتھ جا پکڑتی ہے [2] اور سورج اور چاند اور ستاروں کو قرار دیا ہے ایسا کہ وہ اس کے حکم کے پابند ہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس سے مخصوص ہے پیدا کرنا بھی اور حاکم ہونا بھی [3] بابرکت ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

رات کا پردہ دن پر ڈالنے سے بظاہر ہر روز کا یہ مشاہدہ مراد ہے کہ ابھی سب چیزیں آنکھوں سے دکھلائی دے رہی ہیں اور ایک دم رات آ کر سب چیزوں کو نظروں سے چھپا دیتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے رات کالشکر تیزی کے ساتھ آ کر دن کو گرفتار کر لیتا ہے اور بعض مفسرین نے اس سے مراد یہ قرار دیا ہے کہ رات کا پردہ دن پر پڑتا ہے یعنی جاڑوں میں رات بڑھ جاتی ہے اور دن کے کچھ گھنٹے رات میں داخل ہو جاتے ہیں۔ [4] مگر یہ بات تو دونوں طرف ہے یعنی گرمیوں میں دن آ کر رات پر چھاتا ہے اسی لئے جہاں اس کا ذکر ہوا ہے وہاں دونوں چیزوں کا اس طرح کہ: يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ مگر یہاں دوسری بات کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اس ضرورت سے بعض مفسرین نے ان الفاظ سے دونوں پہلو نکالنا چاہے ہیں کہ ایک کو دوسرے پر ڈھانپتا ہے'' [5] لیکن وہاں تو اللیل مفعول اول اور النہار مفعول دوم ہے۔ جس سے مراد رات کا دن پر چھانا ہی نکلے گا، دوسرے کا چھانا اس پر نکل نہیں سکتا، ورنہ استعمال لفظ بوقت واحد دو معنوں میں لازم آئے گا جو قطعاً ممکن نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دوسرے جز کا ذکر بنظر اختصار نہیں ہوا کہ وہ اسی سے سمجھ میں آ جائے گا [6] مگر یہ اختصار یہیں پر کیوں ہوا؟ دوسرے مقامات پر تو ہر جگہ جہاں ایک کا ذکر ہے، دوسرے کا بھی ہے جیسے: يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ ''وہ لپیٹتا ہے دن کو رات پر'' یہاں اس طرح کیوں نہیں کہا گیا؟ اس سے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہاں وہ مفہوم مراد نہیں ہے۔

---

[1] ۔یعنی کافر راہ دیکھتے ہیں کہ اس کتاب میں خبر ہے عذاب کی۔ ہم دیکھ لیں کہ ٹھیک پڑے تب قبول کریں، سو جب ٹھیک پڑے گی تب خلاصی کہاں ملے گی خبر اسی واسطے ہے کہ عذاب سے بچاؤ پکڑیں (موضح القرآن)

[2] ۔یحلل اللیل النہار ای یدخلہ فیہ (تبیان)

[3] ۔اُورا است آفریدن و فرمان روائی (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔یعنی گاھی اجزائے شب را بلباس نہار پوشانیدہ در حساب نہار می گرداند از پے در آمدن شب بعد در مشابہ آنست کہ گویا کسی را دوان وشتابان می طلبد (فتح الرحمن)

[5] ۔ای یغطی کلا منہما بالاخر یطلبہ یطلب کل منہما الاخر طالبا حثیثا مریعا (جلالین)

[6] ۔لم یقل: ویغشی النہار اللیل لان الکلام یدل علیہ (مجمع البیان)

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۵۵

''اپنے پروردگار سے دعا کرو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

آخری فقرہ کا ربط پہلے جملے سے یہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں انسان کو سمجھ بوجھ سے کام لینے کی دعوت دی جا رہی ہے یعنی دعا کرتے وقت یہ دیکھ لو کہ تم کوئی ناروا اور حد سے بڑھی ہوئی بات تو نہیں مانگ رہے ہو۔[۱]

دوسرا مطلب اس کا یہ کہا گیا ہے کہ یہ حد سے تجاوز گڑگڑانے اور چپکے چپکے دعا کرنے کے بالمقابل ہے کہ تم اکڑ کے ساتھ اور بہت اونچی آواز سے دعا مانگو، یہ خدا کو پسند نہیں ہے۔[۲]

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۶

''اور دنیا میں اس کے بالکل درست حالت میں ہونے کے بعد خرابیاں نہ پیدا کرو، اور اس سے دعا کرو خوف سے بھی اور امید سے بھی۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیک اعمال والوں سے نزدیک ہے۔''

فساد پھیلانے سے ممانعت

بظاہر یہ خطاب مسلمانوں سے اور بالخصوص اسی دور والوں سے ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے دنیا کے حالات درست ہو گئے ہیں[۳] اب ایسا نہ کرنا کہ پھر خرابیاں پھیلاؤ اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حفظ نظام شریعت کے لئے جو انتظام کیا ہے اسے قبول نہ کر کے اپنی من مانی کارروائیاں کرو۔[۴]

اور مضرتوں کے خوف اور منافع کی امید میں اللہ سے لو لگانا ضروری ہے مگر یہ یاد رکھو کہ اس کی رحمت تمہارے حسن کردار سے وابستہ ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۵۷

''اور وہ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو مژدہ دیتی ہوئی اس کے بارانِ رحمت کے آگے، یہاں تک کہ جب انہوں نے

---

[۱] ۔ای لا تجاوزوا حد الحق فی الدعاء فتطلبوا منازل الانبیاء ومالا یجوز ان یعمل فی الدنیا (تبیان)

[۲] ۔وقیل هو الصباح فی الدعاء (مجمع البیان) انه لا یحب المعتدین فی الدعاء بالتشدق ورفع الصوت (جلالین)

[۳] ۔عن ابی حمزة فی هٰذه الأیة قال: ان الارض کانت فاسدة فاصلحها الله نبیّهٗ صلی الله علیه وآله وسلم (مجمع البیان)

[۴] ۔فافسدوا حین ترکوا امیر المؤمنین علیہ السلام وذریته (علی بن ابراهیم)

بوجھل بادلوں کو اٹھایا تو ہم نے انہیں روانہ کر دیا ایک مردہ بستی کی طرف [1] تو برسایا وہاں پانی جس سے نکالے ہر طرح کے پھل اسی طرح ہم مردوں کو (جلا کر) باہر نکالیں گے [2] شاید کہ تم ہدایتوں کا اثر قبول کرو۔"

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ۝۵۸

"اور جو اچھی پاکیزہ سرزمین ہوتی ہے، اس کے نباتات [3] خوب نکلتے ہیں اللہ کے حکم سے اور جو خراب ہوتی ہے، اس میں نہیں نکلتی مگر بری گھانس۔ یوں ہم طرح طرح سے حقیقتیں پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو شکر گزار ہوں۔"

پاکیزہ اور ناپاک زمینوں کا تذکرہ

مطلب یہ ہے کہ نصیحتیں اچھے دلوں میں اثر کرتی ہیں اور جو بدنہاد ہیں، ان میں ان کا اثر خراب ہی پڑتا ہے، اچھا نہیں پڑتا۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

"ایں مثل است برای تاثیر پند در قلب سلیم و عدم تاثیر آن در غیر سلیم" (فتح الرحمن)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

"ستھرے استعداد والے کمال کو پہنچے اور جن کی استعداد خراب تھی، ان کو فائدہ پہنچ رہا تھوڑا سا" (موضح القرآن)

اگر اس قرآنی انتباہ کو سامنے رکھا جائے تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت کے سب بیٹھنے والوں کو ایک ہی مرتبۂ بلند پر نہ سمجھا جائے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵۹ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۶۰ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۱ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۲

"بلاشبہ ہم نے نوحؑ کو بھیجا ان کی قوم کی جانب، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے، یقیناً مجھے تمہارے اوپر بڑے سخت دن کی سزا کا اندیشہ ہے، ان کی قوم کے ممتاز لوگوں نے کہا کہ بلاشبہ ہم تم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! مجھ میں کوئی گمراہی تو ہے

---

[1] ۔ البلد المیت ھو الذی اندرست مشاربہ و تعفت مزارعہ (تبیان)

[2] ۔ کذٰلك الاخراج نخرج الموتیٰ من قبورھم بالاحیاء (جلالین)

[3] ۔ ای زروعہ (مجمع البیان)

نہیں بلکہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں، تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''

جناب نوح علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی قوم کا رویہ

ان آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کو تعلیم دینا اور جواباً ان کے رویہ کو ذکر کیا گیا ہے۔

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٦٣﴾

''اور کیا تمہیں تعجب ہے کہ تمہارے پاس وعظ و نصیحت کا پیغام تمہارے پروردگار کی طرف سے تم میں سے ایک آدمی پر آیا ہے تاکہ وہ تمہیں عذاب کا خوف دلائے اور اس لئے کہ تم پرہیز گاری اختیار کرو اور شاید رحمت تمہارے شامل حال ہو۔''

ذکر اور تذکرہ کے الفاظ دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں ایسے ہی انداز سے آئے ہیں کہ اس سے وعظ و نصیحت کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اس لئے یہاں بھی ہم نے ترجمہ یہی کیا ہے جو بعض تفاسیر میں بھی موجود ہے [1]

لیکن بعض مفسرین نے اس کے معنی وضاحت اور بیان کے لئے ہیں۔ [2]

جناب شیخ الطائفہ نے فرمایا ہے کہ ذکر کی دو قسمیں ہیں: ذکر بیان اور ذکر برہان۔ پہلے کے معنی ہیں کسی بات کا ذہن نشین کرنا۔ دوسرے کے معنی ہیں کسی چیز کو حد ثبوت تک پہنچانا۔ یہاں ذکر میں دونوں معنی کا احتمال ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿٦٤﴾

''تو ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا جس کے نتیجہ میں ہم نے انہیں اور ان کو جو کشتی میں ان کے ساتھ تھے، نجات دی اور ان کو جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ہم نے ڈبو دیا، بلاشبہ وہ بے بصیرت لوگ تھے۔'' [3]

طوفان نوح علیہ السلام کا اجمالی تذکرہ قرآن میں سب سے پہلے یہیں پر ہوا ہے۔

قرآن سے پتہ نہیں چلتا کہ اس طوفان کی وسعت کتنی تھی؟ بس یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنہوں نے جناب نوحؑ کی تکذیب کی تھی، وہ سب

---

[1] ۔ذکر وموعظة (جلالین)

[2] ۔بیان (مجمع البیان)

[3] ۔یقال رجم عم اذا کان اعمی القلب ورجل اعمی فی البصر (مجمع البیان)

غرق ہو گئے [1] اور جو ان کے ساتھ کشتی میں بیٹھ گئے تھے، وہ نجات پا گئے۔

کشتی اور اس کے بنائے جانے اور اس سے متعلقہ تفصیلات قرآن مجید کی آیتوں میں متفرق مقامات پر اس کے بعد ہیں جن کا بیان انشاء اللہ آئے گا۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ﴿۶۸﴾

''اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو، انہوں نے کہا کہ اے میری قوم والو! اللہ کی عبادت کرو، تمہارا اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے تو تم آخر پرہیزگاری کیوں اختیار نہیں کرتے؟ ان کی قوم کے ان ممتاز آدمیوں نے جو کافر تھے، کہا کہ یقیناً ہم تمہیں حماقت میں مبتلا دیکھتے ہیں اور بلاشبہ ہم تمہیں جھوٹوں میں خیال کرتے ہیں۔ کہا اے میری قوم والو! مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے بلکہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کا بھیجا ہوا ہوں، تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا ایمان دار خیر خواہ ہوں۔''

جناب ہود علیہ السلام کی تعلیم، ان کی قوم کا رویہ اور آخری انجام:

اس کے پہلے آ چکا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا ''ہم نے نوحؑ کو بھیجا''۔ یہ ہودؑ کا ذکر اسی سلسلہ میں ہے یعنی اور قبیلۂ عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ [2]

جب ایک ہی واقعہ کی تفصیل سے کلام میں طول ہوا ہو تو یہ فاصلہ معطوف علیہ اور معطوف کے باہمی تعلق میں حارج نہیں ہوتا۔ [3]

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

''اور کیا تمہیں تعجب ہے کہ تمہارے پاس نصیحت آئی تمہارے پروردگار کی طرف سے تم ہی میں سے ایک آدمی

---

[1] ۔ اغرقنا الذین کذبوا بایٰتنا بالطوفان (جلالین)

[2] ۔ عطف سبحانہ علیٰ قصة هود (مجمع البیان)

[3] ۔ انتصب قوله "اخاهم هودا" بقوله: ارسلنا" فی اول الکلام وان تطاول بینهما لان تفصیل القصص یقتضی ذٰلك (تبیان)

پرتا کہ وہ تمہیں متنبہ کرے اور یاد کرو جب اس نے تمہیں نوحؑ کی قوم کے بعد ان کی جگہ صاحب اقتدار بنایا[1] اور تمہیں پیدائشی طور پر طاقت اور قدوقامت میں زیادتی عطا کی تو اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھو شاید تم ہر طرح کی بہتری حاصل کرو۔''

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷۰

''انہوں نے کہا کیا تم ہماری طرف آئے ہو اس لئے کہ ہم اکیلے اللہ کی عبادت کریں اور جس جس چیز کو ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے، اسے چھوڑ دیں تو لاؤ ہمارے پاس وہ جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو، اگر تم سچے ہو۔''

تمام انبیاء کے تذکروں سے ظاہر ہے کہ پیغام سب کا بالکل ایک تھا اور ان کے مقابلہ میں جو جو کہا جاتا تھا، وہ سب بھی تقریباً ایک ہی رہا۔ پیغام ایک اکیلے اللہ کی عبادت کا اور اس کے مقابلہ میں دنیا کو اللہ کی عبادت میں اتنا عذر نہ تھا جتنا اسے اکیلا ماننے میں یعنی غیر اللہ کی عبادت کا چھوڑنا ان کیلئے بڑی زحمت کا باعث تھا اور وجہ اس کی تقلید آباء تھی۔

ان ہی منزلوں سے نوح علیہ السلام کو گزرنا پڑا۔ انہی سے ہود علیہ السلام و صالح علیہ السلام کو اور یہی سب کچھ آخر میں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہاں نظر آتا ہے۔

اور اس لئے آپ کی تسلی اور سچے مسلمانوں کے سکون قلب کے لئے گزشتہ انبیاء کے یکے بعد دیگرے واقعات دہرائے جاتے ہیں کہ جو کچھ آج ہو رہا ہے، یہ کوئی نیا امر نہیں ہے، ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ۭ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَاۗءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝۷۱

''انہوں نے کہا کہ تم لوگوں پر تمہارے پروردگار کی طرف سے عذاب[2] اور غضب نازل ہو گیا ہے، کیا تم مجھ سے جھگڑا کرتے ہو ایسے ناموں کے بارے میں جو خود تم نے اور تمہارے باپ دادا نے تجویز کر لئے ہیں[3] جن کے متعلق اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اچھا تو پھر انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔''

---

[1] ۔جعلکم سکان الارض من بعد قوم نوح (مجمع البیان)

[2] ۔الرجس العذاب (تبیان)

[3] ۔یعنی بے اصل است (فتح الرحمن)

''نام تجویز کر لئے ہیں۔'' یعنی انہیں تم دل بخواہ خدا یا دیوتا وغیرہ سے موسوم کرتے ہو یا مختلف طرح کے تدبیرات سماوی وارضی سے انہیں نسبت دے رکھی ہے، مثلاً فلاں بارش کا دیوتا ہے اور فلاں دولت کی دیوی ہے وغیرہ وغیرہ۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٢﴾

''تو بچا دیا ہم نے انہیں اور ان کے ساتھ والوں کو اپنی رحمت سے اور رگ وریشہ اکھاڑ ڈالا[1] ہم نے ان کا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور وہ ایمان لانے والے نہیں تھے۔''

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾

''اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت کرو، اللہ کی، نہیں ہے اس کے سوا تمہارا کوئی خدا، تمہارے پاس آیا ہے ایک خاص معجزہ تمہارے پروردگار کی طرف سے[2] یہ اللہ کی طرف کی اونٹنی ہے جو تمہارے لئے ایک قدرتی نشانی ہے تو اسے چھوڑ دو کہ کھاتی رہے اللہ کی زمین میں اور اسے ذرا بھی تکلیف نہ پہنچانا، نہیں تو تمہیں دردناک عذاب اپنی گرفت میں لے لے گا۔''

جناب صالح علیہ السلام کی تعلیم، ان کی قوم کا رویہ اور آخری انجام

ان آیات میں حضرت صالح علیہ السلام کا اپنی قوم کو تعلیم دینا اور جواباً ان کے رویہ اور انجام کو ذکر کیا گیا ہے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٧٤﴾

''اور یاد کرو وہ وقت کہ جب اس نے تمہیں قوم عاد کے بعد ان کی جگہ صاحب اقتدار بنایا اور تمہیں زمین میں رہنے کا ٹھکانہ دیا کہ تم اس کے نرم وہموار حصوں میں بھی محلات بناتے اور پہاڑوں کو بھی تراش کر گھر بناتے ہو، تو یاد رکھو اللہ کی نعمتوں کو اور زمین میں خرابیاں پھیلاتے نہ پھرو۔''

---

[1] ۔ای استأصلنا هم (جلالین)

[2] ۔بینة معجزة من ربکم (جلالین) ای دلالة معجزة شاهدة علیٰ صدقی (مجمع البیان)

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾

''ان کی قوم کے ممتاز آدمیوں نے جو گھمنڈ رکھتے تھے، ان لوگوں سے جو دبے پسے ہوئے تھے، ان سے کہ جو ان میں سے ایمان لائے تھے [1] کہا کیا تم جانتے ہو کہ صالحؑ واقعی اپنے پروردگار کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں؟ انہوں نے کہا بے شک ہم اس پر جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے ہیں ایمان رکھتے ہیں اس پر انہوں نے جو گھمنڈ رکھتے تھے کہا کہ جس پر تم ایمان لائے ہم اس کے ساتھ کفر رکھتے ہیں۔''

کافر کے معنی منکر کے ہیں۔ اس لئے جو کسی دین کے عقائد کو نہ مانیں گے، وہ فخر سے کہیں گے کہ ہم اس کے کافر ہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کا غیر مسلموں کو کافر کہنا کوئی ''دشنام'' نہیں بلکہ ایک واقعیت کا اظہار ہے جسے وہ خود تسلیم کرنے پر مجبور رہیں۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾

''آخر انہوں نے اس اونٹنی کو پے کر ڈالا [2] اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی اور کہا اے صالحؑ! لاؤ ہمارے پاس وہ جس کی ہمیں تم دھمکی دیتے رہے ہو [3] اگر تم پیغمبروں میں سے ہو۔ نتیجہ میں ان کو زلزلہ نے اپنی گرفت میں لے لیا تو وہ اپنے گھروں میں بے حس و حرکت ہو کر رہ گئے تو انہوں نے ان لوگوں سے روگردانی اختیار کی اور کہا اے میری قوم والو! میں نے تمہیں اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا دیا اور تمہارے لئے خیر خواہی سے کام لیا مگر تم خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے۔''

مضمون کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخری آیت یعنی ''فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ ...'' الخ انہوں نے ان لوگوں سے روگردانی اختیار کی اور یہ کہا اس عذاب کے آنے اور ان کے ہلاک ہونے کے تذکرہ سے قبل کی ہے اور چونکہ ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے، اس لئے ایسا ہونا کوئی عجیب امر نہیں ہے۔

---

[1] ۔بدل مما قبلہ باعادۃ الجار (جلالین) وھو بدل البعض من الکل الا انہ اعید فیہ حرف الجر (تبیان)

[2] ۔ای فنحروا الناقۃ (مجمع البیان)

[3] ۔فائتنا لان بالعذاب الذی خوفتنا عنہ (تبیان)

بعض لوگوں نے اس آیت کو بعد ہی میں مانا ہے اور یہ توجیہہ کی ہے کہ ان کی ہلاکت کے بعد یہ تخاطب ویسا ہے جیسے آدمی غصہ یا رنج میں اپنے تاثرات کو بطور خود ہی اس طرح ظاہر کیا کرتا ہے جس میں دوسروں کے لئے عبرت کا سامان ہوتا ہے۔[1]

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۸۱﴾

''اور لوط ؑ کو جب کہ انہوں نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ کیا تم ایسی شرمناک بدکاری[2] کے مرتکب ہوتے ہو جس کا تمہارے پہلے دنیا جہان میں کوئی مرتکب نہیں ہوا۔ ارے تم لوگ نفسانی جذبہ سے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کی طرف رخ کرتے ہو! تم بڑے حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو۔''

جناب لوط علیہ السلام کی تعلیم، قوم لوط کی بدکاری اور اس کا انجام

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنسی بے راہ روی میں التذاذ بالمثل کا گناہ قوم لوط کے پہلے دنیا میں ناپید تھا۔ اسی لئے شاید عرف عام میں اس عمل کے مرتکب کا نام ہی لوط کے لفظ کی طرف منسوب ہو گیا ہے۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

''اور نہ تھا ان کی قوم والوں کا جواب سوا اس کے کہ انہوں نے کہا نکال دو انہیں اپنی بستی سے۔ یہ ایسے اشخاص ہیں جو اپنے کو آلودہ ہونے سے بچاتے ہیں[3] تو ہم نے نجات دی انہیں اور ان کے گھر والوں کو سوا ان کی بیوی کے کہ وہ تھی رہ جانے والوں میں[4] اور ہم نے ان پر ایک خاص طرح کی بارش کی، تو دیکھو کیسا انجام ہوا ان گنہگاروں کا۔''

''ایک خاص طرح کی بارش'' یعنی پتھروں کا مینہ، جیسا کہ دوسری جگہ قرآن میں صاف ارشاد ہوا ہے: وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ: ہم نے ان پر سخت مٹی کے پتھروں کی بارش کی۔ (حجر: ۷۴)

---

[1] ۔ انما جاز ان یناديهم مع كونهم جاثمين موتى لما فى تذكر ما اصارهم الى تلك الحال ... من الحكمة والموعظة الحسنة (تبيان)

[2] ۔ اى السيئة العظيمة القبح (مجمع البيان)

[3] ۔ يتحرجون عن ادبار الرجال (مجمع البيان)

[4] ۔ اى من الباقين فى قومه المتخلفين عن لوط (مجمع)

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ﴿۸۵﴾

''اور مدین [1] کی طرف ان کے بھائی شعیبؑ کو۔ انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت کرو اللہ کی، تمہارا اس سے سوا کوئی خدا نہیں، تمہارے پاس آتی ہے کھلی ہوئی دلیل تمہارے پروردگار کی طرف سے تو تم ناپ تول پوری کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو [2] اور دنیا میں اس کی درستی کے بعد خرابی نہ پھیلاؤ۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔''

جناب شعیب علیہ السلام کی تعلیم اور ان کی قوم کا رویہ

ان آیات سے جناب شعیب علیہ السلام کا اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دینا اور جواباً ان کی قوم کے رویہ کو بیان کیا جا رہا ہے۔

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور نہ بیٹھو ہر راستے پر اس طرح کہ دھمکاتے ہو اور روکتے ہو اللہ کی راہ سے اس کو جو اس پر ایمان لائے اور اس (راہ) کو کج کرنے کے درپے ہوتے ہو اور یاد کرو اس وقت کہ جب تم کم تھے تو اس نے تمہیں زیادہ کیا اور دیکھو کہ کیسا ہوتا رہا ہے انجام خرابیاں کرنے والوں کا۔''

وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

''اور اگر تم میں کے ایک گروہ نے ایمان اختیار کیا اس پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ نے ایمان قبول نہیں کیا تو پھر صبر کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔''

یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ سب ہی ایمان لے آئیں۔ اب ایسا نہیں ہوا تو نتیجہ میں لازماً ایک گروہ وہ ہوگا جو نجات پائے گا اور ایک گروہ ہلاک

---

[1] ۔ اسم المدینة او القبلة (مجمع البیان)

[2] ۔ النجس النقص عن الحق الذی یوجبه الحق (تبیان)

ہوگا مگر اس کا فیصلہ آنکھوں کے سامنے آج نہیں آئے گا بعد میں ہوگا۔ [1]

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾

''کہا ان کی قوم کے ان بڑے آدمیوں نے جو گھمنڈ کئے ہوئے تھے کہ ہم نکال دیں گے اے شعیبؑ! تم کو اور انہیں جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے یا تم لوگ واپس آؤ ہمارے مذہب میں۔ کہا کیا چاہے ہم اسے ناپسند کرتے ہوں۔ ہم اللہ پر جھوٹ بہتان لگائیں گے اگر واپس آئیں تمہارے مذہب میں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے چھٹکارا دے دیا ہے ہمارے لئے زیبا نہیں کہ ہم اس میں واپس جائیں سوا اس صورت کے کہ ہمارے پروردگار کو یہی منظور ہو۔ ہمارا پروردگار حاوی ہے ہر شے پر علم سے، اللہ ہی پر ہم بھروسہ رکھتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! تو ہی فیصلہ کردے ہمارے درمیان اور ہماری قوم والوں کے درمیان حق کے ساتھ اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔''

قوم شعیبؑ کا رویہ اور انجام

یہ کہنا ان کا کہ ''تم لوگ واپس آؤ'' اور اس کے جواب میں بھی ''واپس آنے'' کا ذکر ان ساتھ والوں کی اکثریت کے لحاظ سے ہے جو پہلے اس گمراہ جماعت سے وابستہ تھے اور پھر ان سے نکل کر شعیبؑ کے ساتھ آئے تھے، یہ فرداً فرداً ہر ایک کے لئے نہیں ہے کیونکہ کوئی نبی خود کبھی اس جماعت کی گمراہی میں شریک نہیں ہوتا جس کی ہدایت کے لئے وہ آتا ہے۔ [2]

ہاں! یہ بھی پہلو ہوسکتا ہے کہ اعلان رسالت کے پہلے قوم کا تصور یہی ہوتا ہے کہ یہ ہم ہی میں سے ہیں۔ وہ تو جب اعلان حق کرتا ہے، تب انہیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہم سے الگ ہے تو ان کا کہنا اور اس کا جواب دونوں میں واپسی کا لفظ ان کے عام تصور کے لحاظ سے ہو جو ظاہر کی بنا پر قائم تھا۔ [3]

---

[1] ۔بانجاء المحق اهلاك المبطل (جلالين)

[2] ۔غلبوا فى الخطاب الجمع على الواحد لان شعيبا لم يكن فى ملتهم قط (جلالين)

[3] ۔لانه كان عندهم فى ظنهم انه كان قبل ذٰلك على دينهم (مجمع البيان)

یہ کہ اللہ کو منظور ہو یعنی اس کی توفیق ہمارا ساتھ چھوڑ دے اور ہم اپنے سوء اختیار سے گمراہی میں مبتلا ہو جائیں [1] جس پر مورد الزام ہم ہی ہوں گے۔ نہ یہ کہ وہ جبراً کسی کو برے راستے پر لگاتا ہے۔

اور یہ "تعلیق المحال بالمحال" کے طور پر بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کا کسی کے لئے بھی شرک کو چاہنا غیر ممکن ہے تو ہمارا داخل ہونا بھی تمہاری ملت میں ناممکن شے ہے۔ [2]

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

"اور ان کی قوم کے ان بڑے آدمیوں نے جو کافر تھے، کہا کہ اگر تم لوگ شعیب کے پیچھے چلو گے تو یقیناً تم لوگ گھاٹے میں رہو گے تو انہیں زلزلہ نے لے لیا جس کے بعد وہ اپنے گھروں میں مردہ ہو کر اپنے گھٹنوں کے بل گرے ہوئے پڑے تھے جنہوں نے شعیب کو جھٹلایا وہ گویا کبھی ان مکانات میں رہتے ہی نہ تھے [3] جنہوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا، وہی گھاٹا اٹھانے والے ثابت ہوئے تو انہوں نے ان لوگوں کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا اے میری قوم والو! میں نے تو تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا لیکن ایک ایسی جماعت پر جو انکار پر قائم رہی افسوس بھی کیوں کر کروں۔"

بڑے آدمیوں کا یہ قول جو یہاں کی پہلی آیت میں بیان ہوا ہے وہ شعیب علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو چھوڑ کر دوسرے عوام سے ہے جن کے لئے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ بھی شعیب علیہ السلام کے دین کو اختیار نہ کر لیں۔

آخر کا جملہ خالق کی طرف سے ان بڑے آدمیوں کی بات کا جواب ہے۔

وہ کہتے تھے کہ تم شعیبؑ کی پیروی کرو گے تو خسارہ میں رہو گے تو کہا جا رہا ہے کہ اب دنیا دیکھے خسارہ میں کون رہا؟ [4]

اور یہاں ضمیر لانے کے بجائے کہ "وہ خسارے میں رہے" پھر اس فقرہ کو کہ "جنہوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا" دہرا دیا گیا، اس پر زور دینے کے لئے کہ شعیبؑ پر ایمان لانا تو خسارہ کا باعث نہیں ہوا، ہاں ان کو جھٹلانا ہی وہ تھا جس کے نتیجہ میں انتہائی خسارہ سب کی آنکھوں کے

---

[1] ۔یشآء اللہ ربنا ذٰلك فیخذلنا (جلالین)

[2] ۔ کما لا یشآء اللہ عبادۃ الاصنام والقبائح لان ذٰلك لا یلیق بحکمۃ فکذٰلك لا اعود فی ملتکم (تبیان)

[3] ۔لم یغنوا لم یقیموا فیھا فی دیارھم (جلالین)

[4] ۔بین سبحانہ انھم الخاسرون دون من اٰمن بہ (مجمع البیان)

سامنے ہے۔[1]

پورے واقعہ کے ذکر کے بعد، روگردانی کرنے اور پھر اس قوم سے تخاطب کا عنوان وہی ہے جو پہلے آچکا ہے اور اس پر تبصرہ وہاں کیا جا چکا ہے یہاں خاص چیز اس تخاطب کے بعد آخر میں یہ جملہ ہے کہ ''میں ایک ایسی جماعت پر جو انکار پر قائم رہی، کیوں کر افسوس کروں'' اس جملہ سے یہ کیفیت سمجھ میں آتی ہے کہ ان کی ہلاکت پر جیسے انسانی ہمدردی کے جذبہ میں یا بشری حیثیت سے اس انس ومحبت کی بنا پر جو اپنی قوم کے ساتھ ہونا چاہیے جناب شعیبؑ کا دل کڑھا مگر خود ہی ذہن نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ لوگ اس کے مستحق نہیں کہ ان پر کوئی صدمہ کیا جائے کیونکہ انہوں نے خود ہی کفر و عناد پر قائم رہ کے اپنی تباہی کا سامان کیا اور اس عذاب کے مستوجب ہوئے۔[2]

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾

''اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس کے باشندوں کو سختی اور تکلیف کی گرفت میں ضرور ڈالا[3] شاید کہ وہ تضرع وزاری کریں پھر ہم نے برائی کی جگہ بھلائی عطا کردی یہاں تک کہ ان کی تعداد خوب بڑھی[4] اور وہ کہنے لگے کہ ہمارے بزرگوں کو تکلیف اور راحت دونوں ہی پہنچتی رہی ہیں تو ایک دم ہم نے ان کو گرفت میں لے لیا اس عالم میں کہ انہیں اس کا تصور بھی نہ تھا۔''

قرآن مجید اکثر بیان واقعات میں ایسے اجزاء کو جنہیں قبل اور بعد کے ربط سے ذہن خود سوچ سکے الفاظ میں نظر انداز کردیتا ہے چنانچہ سنت الٰہیہ کا بیان امم کے بارے میں جو کیا گیا ہے، اس میں پہلا جز یہ ہے کہ انبیاء بھیجے گئے۔ اب اس کے بعد کیا ہوا؟ وہ معلوم ہے کہ قوم کی اکثریت نے ان کی تکذیب کی[5] اور پیغام ربانی کے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تو اس کے بعد کی یہ بات ہے جو قرآن بتا رہا ہے کہ اللہ نے ان کو سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا۔

یہ سختی اور تکلیف ابھی بغرض اصلاح ہے کہ وہ اس طرح شاید اللہ سے لو لگائیں اور اپنی اصلاح کریں[6] مگر اس کے بعد بھی صورت کیا ظاہر ہوئی؟ وہ الفاظ قرآنی میں درج نہیں ہے۔ خود سمجھئے کہ ان میں سے اکثر اس کے بعد بھی متنبہ نہیں ہوئے اور وہ اپنے کفر وعصیان پر قائم رہے تو اب وہ سختی اور تکلیف دور کردی گئی جسے قرآن بتا رہا ہے۔

---

[1] ۔اعید ذکر ''الذین'' صفة ثانیة من غیر کنایة لتغلیظ الامر فی تکذیبهم شعیبا (تبیان)

[2] ۔قال ابن اسحٰق عزّی نفسه عنهم بعد ان کان حزن علیهم (تبیان)

[3] ۔ گرفتار کردیم اهل آن را بسختی ورنج (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔یہاں تک کہ زیادہ ہوئے (شاہ رفیع الدین)

[5] ۔فلم یؤمنوا به بعد قیام الحجة علیهم (مجمع البیان)

[6] ۔لیتنبهوا ویعلموا انه مقدمة العذاب (مجمع البیان)

یہ تکلیف دور کیوں ہوئی؟ اس وجہ سے کہ جو مقصد اس کا تھا وہ جن میں پورا ہونا تھا ان میں پورا ہو چکا اور وہ جماعت زیادہ تر اقلیت میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد اکثریت کے بارے میں اس مقصد کا حصول ہونے والا نہیں ہے تو اب ان کے لئے راحت و آرام کی فروانی ہوگئی جواب ان کے لئے بطور امہال ہے جس کے نتیجہ میں وہ خوب معاصی الٰہی کے میدان میں کھل کھیلیں گے، حالانکہ اگر ان میں شعور ایمانی ہوتا تو اب اس راحت و آرام سے اللہ کے شکر کی طرف مائل ہوتے مگر انہیں تو عظمتِ الٰہی اور اس کی قدرت کی کارفرمائی کا تصور ہی نہیں ہے۔ وہ تو تکلیف اور راحت دونوں کو اتفاقات زمانہ کا نتیجہ قرار دے کر کہتے ہیں کہ یہ کوئی خاص بات تھوڑی ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کے لئے یہی ہوا کیا کہ کبھی تکلیفوں کا دور ہوا اور کبھی عیش و آرام کا۔ [1]

اس سب کے بعد خالق کی طرف سے ان پر حجت پوری طرح تمام ہوگئی اس لئے اس کے بعد ایک دم بے خبری کے عالم میں ان پر عذاب استیصال آ گیا جس نے ان کا قلع قمع کر دیا۔

اگر مسلمان بصیرت سے کام لیں تو شاید ان کو تاریخ اسلام میں قبل کے سب نمونے مل جائیں اور اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جسے وہ اپنا سب سے بڑا سطوت و شوکت کا دور کہتے ہیں، وہ کوئی اللہ کی مہربانی کا نتیجہ ہو بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہ بھی ان کے ایک طرح کے امتحان کا دور ہو اور جو بلاؤ مصیبت کے دور آئے وہ بھی آزمائش کی حیثیت رکھتے ہوں۔

بس ایک بابرکت وجود کا فیض ہے جس سے وہ آخری انجام یعنی عذاب استیصال سے اب تک بچے ہوئے ہیں جس کا صریحی اعلان قرآن میں ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ.

اللہ اس وقت تک ان پر عذاب نازل کرنے والا نہیں جب تک آپ ان کے درمیان موجود ہیں۔'' (انفال: ۳۳)

پھر اس کے بعد یہ کتنی عبرت ناک صورت واقعہ ہے کہ ان میں کا ایک بڑا طبقہ اس وجود مقدس کی حیات بابرکات کا قائل نہیں ہے جس کی بدولت اس کی زندگی قائم ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾

''اور اگر ان بستیوں کے باشندے [2] ایمان لاتے اور نجات کا سامان کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی طرف سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کو گرفت میں لے لیا ان اعمال کی بدولت جو وہ کرتے تھے۔''

''آسمان کی طرف سے برکت'' بارش ہے اور زمین کی طرف سے نباتات کی پیداوار ہے۔ [3]

---

[1] ۔ھٰکذا عادۃ الدھر (تبیان)

[2] ۔اھل ھٰذہ القری التی اھلکناھا (تبیان)

[3] ۔من السمآء بالمطر والارض بالنبات (جلالین)

اس کے علاوہ دوسرا قول یہ بھی ہے کہ آسمان کی برکت سے مراد دعا کا قبول ہونا ہے اور زمین کی برکت ضرورتوں کا پورا ہوتے رہنا ہے [1] اور یہ دونوں باتیں لازم وملزوم ہیں۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۹۷﴾ اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾

''تو کیا (اب) ان بستیوں والے بالکل بے خوف ہو گئے ہیں اس سے کہ آئے ان پر ہمارا عذاب رات کو [2] جب کہ وہ سوتے ہوں اور کیا وہ بے خوف ہو گئے ہیں اس سے بھی آئے ان پر ہمارا عذاب دن چڑھے جب کہ وہ کھیل تفریح میں مصروف ہوں تو کیا وہ اللہ کے منصوبہ کی طرف سے بالکل نڈر ہو گئے ہیں مگر اللہ کے منصوبہ سے نڈر نہیں ہوتے مگر وہ جو گھاٹا اٹھانے والے ہوں۔''

مَكْرَ اللّٰهِ سے جس کا ترجمہ ہم نے ''اللہ کے منصوبہ'' کے لفظ سے کیا ہے، بداعمالوں کے مقابلہ میں اللہ کی طرف کا وہ انتظام مراد ہے جو انہیں پورے طور پر مستحق عقوبت بنا کر آخر سزا میں گرفتار کرنا ہے [3] سابقہ آیتوں میں گزشتہ امتوں کے ساتھ اللہ کا رویہ جو رہا، اسے بیان کیا گیا تھا اور اس کے بعد ان آیتوں میں اس امت کو متنبہ کیا جا رہا ہے [4] کہ یہ اپنے رسول کے ساتھ جو رویہ اختیار کئے ہوئے ہے تو آخر اسے عذاب الٰہی سے اتنی بے خوفی کیوں پیدا ہو گئی ہے؟!

اَوَ لَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''کیا ان لوگوں کے سامنے جو زمین پر اقتدار کے مالک ہیں، اس کے پہلے صاحبانِ اقتدار کے بعد یہ بات نہیں کھلی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی ان کے گناہوں کے سبب سے مبتلائے مصیبت کر دیں اور ہم ان کے دلوں پر مہر کر دیتے ہیں کہ وہ سنتے نہیں۔''

''لَمْ يَهْدِ'' کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے: یہ بات نہیں کھلی ہے''۔ ظاہر الفاظ سے لغت دیکھے بغیر سمجھ میں زیادہ آتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ فعل لازم کے طور پر ہے جس کا فاعل بعد میں: اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ہے اور بعض تفسیر وتراجم، اس میں ہم سے متفق ہیں۔

---

[1] ۔قیل برکات السمآء اجابة الدعآء والارض تیسیر الحوائج (مجمع البیان)

[2] ۔بیاتا لیلا (جلالین)

[3] ۔اخذ العبد بالضر من حیث لا شعر (تبیان)

[4] ۔استدراجه ایاهم بالنعمة واخذهم نعتبة (جلالین) افامن اهل القریٰ المکذبون لك یا محمد ﷺ (مجمع البیان)

[1]

مگر کچھ مفسرین کے سامنے مشکل ہے کہ ''یہدی'' کی لفظ کا لغت کے اعتبار سے بس ہدایت ہی سے ماخوذ ہونا سمجھ میں آتا ہے اور ہدایت لغۃً فعل متعدی ہے اور اس کے معنی رہنمائی کے ہیں، اس لئے کچھ قاریوں نے اسے ''لم یھد'' کے بجائے ''لم نھد'' (نون کے ساتھ) پڑھا ہے یعنی کیا ہم نے ہدایت نہیں کی اور متداول قرأت کے ساتھ بھی بعض مترجمین نے ترجمہ اسی ہدایت کے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر کرنے کی کوشش کی۔ [2]

مگر اس صورت میں فاعل اس کا واضح نہیں ہوتا کہ کون ہے؟ اس کی خانہ پری کچھ تفاسیر میں فاعل کو ضمیر مقدر مان کر کی ہے کہ ''کیا خدا نے ان کی رہنمائی اس حقیقت کی طرف نہیں کی ہے؟'' ''یا'' جو کچھ پہلے بیان ہوا ہے اس نے ان کی رہنمائی اس طرف نہیں کی''۔ [3]

ہمارے نزدیک اس صورت میں زیادہ بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس یَهْدِ کے فعل کا فاعل بعد کے فقرہ: ''اَنْ لَّوْ نَشَآءُ'' الخ کو مان لیا جائے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ کیا ان کی رہنمائی کے لئے کافی نہیں ہے اس بات کا تصور کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی ان کے گناہوں کے سبب سے مبتلائے مصیبت کر دیں؟ مگر یَهْدِ کے اس مفہوم میں جو ہدایت کے معنی پر مبنی ہے بہت بڑی خلش ذہن میں ''لَمْ یَهْدِ'' کے بعد کے لام سے محسوس ہوتی ہے۔ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ اس صورت میں ''لَمْ یَهْدِ لِلَّذِیْنَ'' ہونا چاہیے۔ یہ لام تو اس منزل کے ساتھ آیا کرتا ہے جس کی طرف ہدایت ہو جیسے: ''یَهْدِیْ لِلْحَقِّ'' آخر جن لوگوں کی ہدایت ہونا مدنظر ہے، ان کے ساتھ لام کا ہے کے لئے ہے؟ اس لئے قوت پہلے ہی مفہوم کو ہے جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا تھا۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَاۤ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

''یہ وہ بستیاں ہیں جن کے کچھ واقعات ہم آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں اور بلاشبہ ان کے پاس ان کے پیغمبر معجزے [4] لے کر آئے تو وہ ایسے نہیں تھے کہ ایمان لاتے اس پر جسے وہ پہلے جھٹلاتے رہے۔ اس طرح اللہ مہر کرتا ہے کافروں کے دلوں پر اور نہیں پائی ہم نے ان میں سے اکثر کے عہد و پیمان کی کوئی حقیقت [5] اور ہم نے ان میں

---

[1] ۔لم یهد لم یتبین (جلالین) آیا واضح نشد بر آنانکه وارث زمین شدند بعد از هلاك ساكنان آن زمین (شاه ولی الله)

[2] ۔ کیا نہیں راہ دکھائی واسطے ان لوگوں کے (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔ای اولم یبین الله... وقیل معناه: اولم یهد ما تلونا من انباء القرٰی (مجمع البیان)

[4] ۔المعجزات الظاهرات (جلاین) بامعجزها (شاه ولی الله)

[5] ۔ای وفاء بعهدهم (جلالین) قائم رہنا اوپر عہد کے (شاہ رفیع الدین)

سے زیادہ تر افراد کو بداعمال پایا۔''

پہلے جھٹلاتے رہے۔اب کتنے ہی معجزے آجائیں، سخن پروری اور بے جا ضد ان کے لئے ایمان لانے سے سدراہ ہے۔

''اسی طرح اللہ مہر کرتا ہے'' یعنی یہ قبل کے کفر وتکذیب کا پھر ایک نفسیاتی نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اب اور زیادہ ایمان سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ یہ تقریباً فطری طور پر ان سے صلاحیت ایمان کا سلب ہونا جو خود ان کے سابق اختیار کردہ کفر کا نتیجہ ہے، اسی کی تعبیر اللہ کی طرف کی مہر سے قرآن مجید میں بہت مقامات پر ہوئی ہے۔

''اکثر کے عہد کی کوئی حقیقت نہیں پائی'' یعنی جو ان سے عہد و پیمان تھا، عہد فطرت بزبان عقل وضمیر بھی اور عہد شریعت انبیاء کے ذریعہ سے بھی انہوں نے اس عہد کو اس طرح بے عملی سے نسیاً منسیاً کیا، گویا کہ ان میں کبھی عہد و پیمان ہوا ہی نہ تھا۔[1]

''اور ان میں سے زیادہ تر کو بداعمال پایا'' یعنی وہ کافر تو سب ہی ہیں مگر ان میں کچھ بداعمالی میں کم ہیں لیکن زیادہ افراد وہ ہیں جو کفر کے ساتھ ساتھ شدت سے بداعمال بھی ہیں۔[2]

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

''پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد موسیٰ ؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے یہاں کے عمائد کی طرف[3] تو ان لوگوں نے ان کے ساتھ ظلم سے کام لیا[4] تو دیکھو کیسا انجام ہوا فسادیوں کا۔''

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾

''اور کہا موسیٰ ؑ نے اے فرعون! میں پیغمبر ہوں تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے۔ میری شان یہ ہے[5] کہ اللہ کی نسبت حق کے سوا کوئی بات نہ کہوں میں لایا ہوں تم لوگوں کی طرف معجزہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تو بنی اسرائیل کو آزاد کردے کہ وہ میرے ساتھ چلے جائیں۔''

---

[1] ۔ای اشراف قومه وذوی الامر منهم (مجمع البیان) اذا اخذ علی الانسان العهد فنقضه قیل لیس علیه ای کانه لم یعهد الیه

[2] ۔فیکون تاویل الایة کفروا بها (جلالین) پس ظلم کیا ساتھ اس کے (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔ای اشراف توحدوذوی الامر منهم (مجمع البیان)

[4] ۔ کفروا بها (جلالین) پس ظلم کیا ساتھ اس کے (شاہ رفیع الدین)

[5] ۔حقیق جدیر علی ان بان (جلالین) سزاوار بآنکہ (شاہ ولی اللہ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تفصیلی تذکرہ، اور فرعون کا انجام

فرعون بنی اسرائیل کو غلام بنائے ہوئے تھا۔ موسیٰ علیہ السلام ان کی آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے اور فرعون سے کہہ رہے تھے کہ انہیں ان کے آبائی وطن شام کی طرف واپس چلا جانے دے۔ [1]

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

''اس نے کہا کہ اگر تم کوئی معجزہ لائے ہو [2] تو اسے پیش کرو، اگر تم سچے ہو، انہوں نے اپنے عصا کو پھینک دیا جو ایک دم کھلا ہوا اژدھا بن گیا اور اپنا ہاتھ باہر نکالا تو ایک دفعہ ایسا ہو گیا کہ وہ سفید نورانی تھا دیکھنے والوں کے سامنے۔''

''اپنا ہاتھ باہر نکالا'' اس میں ایک کڑی درمیان کی ضرور محذوف ہے۔ اس لئے دو قول ہو گئے، ایک یہ کہ ہاتھ گریبان کے اندر لے گئے اور دوسرے یہ کہ بغل کے نیچے [3]

بہر صورت باہر نکالا تو اس سے نور تاباں تھا۔ [4]

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۹﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾

''فرعون والوں میں سے ممتاز آدمیوں نے کہا کہ بلاشبہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے جو تمہیں تمہارے ملک سے نکالنا چاہتا ہے تو تم لوگ کیا رائے دیتے ہو؟! ان لوگوں نے کہا کہ انہیں اور ان کے بھائی کو روک رکھئے [5] اور شہروں میں جمع کرنے والے آدمی [6] بھیجے جو ہر بڑے ماہر جادوگر کو بلا کر لائیں۔''

فرعون والوں میں سے ممتاز آدمیوں نے کہا کہ تم کیا رائے دیتے ہو؟ تو یہ کس سے کہا؟ ایک معنی اس کے یہ کئے گئے ہیں کہ انہوں نے

---

[1] ۔ای ما طلق بنی اسرائیل من عقالا لتسخبر و خلهم ان یرجعوا الی الارض المقدسة (مجمع البیان)

[2] ۔اگر آوردۂ معجزہ (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔فادخل یدہ فی جیبہ وقیل تحت ابطہ ثم نزعها منہ واظهرها (مجمع البیان)

[4] ۔قال ابو علی کان فیها من النور والشعاع مالم یشاهد مثلہ فی ید احد (تبیان)

[5] ۔موقوف دار اورا (شاہ ولی اللہ)

[6] ۔جامعین (جلالین) اکٹھا کرنے والے آدمی (شاہ رفیع الدین)

آپس میں ایک دوسرے سے کہا[1]

دوسرا خیال یہ ہے کہ خواص نے جن میں فرعون بھی تھا، کانفرنس کر کے عوام کی رائے دریافت کی جس کا جواب عوام نے فرعون کو مخاطب کر کے دیا۔[2]

قرآن مجید سورۂ شعراء میں اس قول کی خود فرعون کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

اس لئے بہت ممکن ہے کہ یہاں بھی مراد یہی ہو کہ خود فرعون نے دوسرے لوگوں سے یوں رائے لی اور اس کی نسبت الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ کی طرف ویسی ہے کہ جیسے بادشاہوں کی طرف کسی بات کے انتساب میں یوں کہا جاتا ہے کہ ملازمانِ بارگاہ سلطانی نے ایسا کیا اور اس لئے جواب جو ہے، وہ بصیغۂ مفرد خود فرعون ہی سے تخاطب کے ساتھ ہے: اَرْجِهْ وَاَخَاهُ جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ''ان کو اور ان کے بھائی کو روک رکھئے۔''

ایک بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ تو بنی اسرائیل کے ملک سے باہر لے جانے کا تھا۔ پھر فرعون یا اس کے عمائد نے اپنی قوم سے کیوں کہا کہ یہ تمہیں تمہارے ملک سے نکالنا چاہتے ہیں؟!

معلوم ہوتا ہے جیسے سیاستداں اصحاب اقتدار کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار کے دباؤ سے خود مظلوم عوام کی آواز اپنے حق میں اٹھواتے ہیں، اسی طرح یہاں صورت یہ تھی کہ عمائد تو سب قوم قبط سے ہوتے تھے جو فرعون کے خاندان کے لوگ تھے اور بنی اسرائیل بیچارے غریب عوام تھے تو یہ جلسہ ان لوگوں نے انہی بنی اسرائیل کا کر کے ان کے ہمدرد کے لباس میں یہ کہا کہ یہ شخص جو آیا ہے تمہیں تمہارے ملک سے نکال کر بے گھر کرنا چاہتا ہے اور ان عوام نے ان کی مرضی کے مطابق یا خود اپنے فطری ذہن سے یہ جواب دیا کہ یہ دونوں ساحر ہیں تو ان کے مقابلہ کے لئے شہروں شہروں سے ساحر بلوایئے تا کہ اگر یہ غلط قسم کے دعویدار ہوں تو ان کا دعویٰ باطل ہو جائے۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

''اور سب جادوگر فرعون کے پاس آئے، انہوں نے کہا گیا گر ہم غالب آئے تو ہمیں ایک بڑے معاوضہ کا ضرور حق ہوگا، اس نے کہا ''ہاں اور بلاشبہ تم خاص تقرب رکھنے والوں میں سے بھی ہو گے۔'' انہوں نے کہا اے موسیٰ ؑ! یا تو تم پھینکو اور یا ہم ہی پھینکنے والے ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تم ہی پھینکو، جب انہوں نے پھینکا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انہیں خوفزدہ کر دیا اور بہت بڑا جادو پیش کیا۔''

---

[1] ۔ گفتند اشراف از قوم فرعون بایکدیگر (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ قال الملأ ...لمن دونهم فی الرتبة من الحاضرین (مجمع البیان)

بیان واقعہ میں درمیان کی کڑیوں کا اچھا خاصہ سلسلہ محذوف ہے [1] یعنی ان کے مشورہ کے مطابق فرعون نے اطراف و جوانب میں آدمی بھیج کر ساحروں کو بلوایا اور وہ سب آ کر فرعون کے پاس اکٹھا ہوئے ان سے موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا اور ان سے مقابلہ کا انہیں حکم دیا گیا، تب انہوں نے یہ بات کہی۔

جادو کی قسموں میں سے ایک ''شعبدہ بازی'' ہوتی ہے جسے اردو میں ''ڈھٹ بندی'' کہا جاتا ہے۔ اس سے اصل شے کی کیفیت میں تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ دیکھنے والوں کا حاسہ متاثر ہوتا ہے کہ انہیں ایسا ہی نظر آتا ہے۔ اس آیت میں قرآن کے یہ الفاظ کہ ''لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا'' بتلاتے ہیں کہ ساحران فرعون کے جادو کی نوعیت یہی تھی۔ [2]

يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى

''ان کے جادو کی وجہ سے خیال یہی ہوتا تھا کہ یہ دوڑ رہے ہیں۔'' (سورۂ طٰہٰ۔ ٦٦)

بعض لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ مطلق سحر کا اثر واقعاً خارج میں موجود نہیں ہوتا بلکہ خیال متاثر ہوتا ہے۔ [3] مگر ہمارے نزدیک بطور عموم یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے۔ ہاں سحر کی یہ قسم جو وہ ساحر عمل میں لائے تھے، ایسی ہی تھی۔

یہاں پر قرآن مجید کے دونوں جگہ کے الفاظ: سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ اور يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ان کا تقاضا یہی ہے جو دوسرے مفسرین سے اتفاق کرتے ہوئے میں نے لکھا مگر میں ابھی اس سے مطمئن نہیں ہوں اس لئے کہ اگر ایسا ہو تو اس کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز کو بھی ماننا پڑے گا کہ انہوں نے دیکھنے والوں کی نگاہوں پر سے اس اثر کو دور کر کے ایک دوسرا اثر پیدا کر دیا کہ وہ ایسا محسوس کرنے لگے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے ان سانپوں کو نگل لیا مگر الفاظ قرآنی ایسا بتاتے ہیں کہ واقعی وہاں حرکت کرتے ہوئے سانپ موجود تھے جنہیں عصائے موسوی نے اژدھا بن کر نگل لیا۔ بہرصورت ان دونوں واقعوں میں تفریق نہیں ہوسکتی۔ اگر ساحروں کا عمل خیال کو متاثر کرتا تو موسیٰ علیہ السلام کے عمل کو بھی ایسا ہی ماننا پڑے گا اور اگر وہاں واقعیت مانی جائے تو ساحروں کے کرتب کو بھی واقعیت کا حامل تسلیم کرنا ضروری ہے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۚ﴿١١٧﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۚ﴿١١٨﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۚ﴿١١٩﴾ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۚ﴿١٢٠﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿١٢١﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿١٢٢﴾

''اور ہم نے موسیٰ ؑ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنا عصا پھینکو تو ایک دم وہ نگلنے لگا اسے جو انہوں نے جھوٹ موٹ ظاہر کیا

---

[1] ۔فی الکلام حذف کثیر (مجمع البیان)

[2] ۔بجا دو بستند چشمهائے مردمان را (شاہ والی اللہ) جادو کر دیا آنکھوں پر لوگوں کے (شاہ رفیع الدین) صرفون عن حقیقة ادراکها (جلالین)

[3] ۔فی هٰذه دلالة علیٰ ان السحر لا حقیقة له (مجمع البیان)

تھا تو حق نمایاں ہو گیا [1] اور جو کچھ وہ کرتب دکھایا کرتے تھے، وہ بے حقیقت ثابت ہو گیا تو اس طرح وہ لوگ [2] مغلوب ہوئے اور ذلیل ہو کر رہ گئے [3] اور تمام جادوگر سجدہ میں گر پڑے کہا کہ ہم ایمان لائے تمام جہانوں کے پروردگار پر جو موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ کا پروردگار ہے۔''

''تمام جہانوں کے پروردگار'' کہنے کے بعد ''موسیٰ اور ہارون کا پروردگار'' کہنا اس کا اظہار ہے کہ ہمیں اس ''رب العالمین'' کا تصور انہی موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے ذریعہ سے ہوا ہے کہ فرعون خدائی کا غلط دعویدار ہے اور جس کی طرف سے وہ دعوت دیتے ہیں، وہ خدائے برحق ہے۔ [4]

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

''فرعون نے کہا کہ تم لوگ اس پر ایمان لے آئے اس سے پہلے کہ میں تم کو اجازت دوں، یقیناً یہ ایک چال ہے جو تم لوگوں نے اس شہر میں چلی ہے اس غرض سے کہ اس سے اس کے باشندوں کو باہر نکالو۔ اب تمہیں پتہ چلے گا۔ میں یقیناً تمہارے ہاتھوں اور تمہارے پیروں کو مختلف سمتوں سے کاٹ دوں گا۔ پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا، انہوں نے کہا کہ یقیناً ہم اپنے پروردگار کی طرف پلٹیں گے اور تم ناراض نہیں ہماری کسی بات سے سوا اس کے کہ ہم ایمان لائے اپنے پروردگار کی نشانیوں پر جب وہ ہمارے سامنے آئیں۔ اے ہمارے پروردگار! لنڈھا دے ہم پر صبر کی طاقت اور ہمیں دنیا سے اٹھا مسلمان ہونے کی حالت میں۔''

''ہاتھوں اور پیروں کو مختلف سمتوں سے کاٹ دوں گا۔'' یعنی ایک طرف کا ہاتھ اور ایک طرف کا پیر [5]

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ۭ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ

---

[1] ۔ثبت وظهر (جلالین)

[2] ۔فغلبوا ای فرعون وقومه (جلالین)

[3] ۔صاروا ذلیلین (جلالین)

[4] ۔فیه معنی الذی دعا الی الایمان به موسیٰ وهارون (تبیان)

[5] ۔ای من کل شق طرف (مجمع البیان)

قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

''اور فرعون کی قوم کے بڑے آدمیوں نے کہا کہ کیا آپ موسیٰؑ اور ان کی قوم کے آدمیوں کو چھوڑے رکھیں گے کہ وہ زمین میں خرابیاں پیدا کریں اور آپ کو اور آپ والے خداؤں کو چھوڑ دیں؟ اس نے کہا ہم عنقریب ان کے لڑکوں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے اور بلاشبہ ہم ان پر پورا قابو رکھتے ہیں۔''

اب معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے گرد بنی اسرائیل کے لوگ کافی جمع ہو گئے تھے اور انہیں اپنا سردار ماننے لگے تھے، اس لئے قوم فرعون کے عمائدین کو تشویش پیدا ہوئی اور انہوں نے فرعون کو ان کے خلاف کسی سخت اقدام کے کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔

ہاں ایک بات قابل غور ہے کہ دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ فرعون خود خدائی کا مدعی تھا۔ پھر یہاں قوم کے افراد کے اس کہنے کا کیا مطلب ہے کہ ''آپ کو اور آپ کے خداؤں کو چھوڑ دیں''.....اس کے لئے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''فرعون کے بت یہ تھے کہ اپنی صورت بنا دیتا تھا لوگوں کو کہ اس کی پوجا کریں'' (موضح القرآن)

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس نے کچھ چھوٹے چھوٹے بت قوم میں بنوا دیئے تھے یہ کہہ کر کہ میں تمہارا اور ان خداؤں کا بھی خدا ہوں (جلالین) اور اس لئے دوسری جگہ فرعون کی زبانی قرآن مجید میں یہ الفاظ ہیں کہ: ''اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى'' میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں۔''

دونوں صورتوں میں ''اٰلِهَتَكَ'' کے معنی وہی ہوں گے جو ہم نے ترجمہ میں ظاہر کئے ہیں کہ ''آپ کی طرف کے خدا''۔ نہ یہ کہ ''آپ کے خدا'' کیونکہ ان بتوں کو اس نے عوام کے خداؤں کی حیثیت سے بنوایا تھا۔ اپنے خدا کی حیثیت سے نہیں۔

بعض قاریوں نے اس لفظ ہی میں تصرف کر کے اَلٰهَتَكَ [1] اور اِلٰهَتَكَ [2] کر دیا جو ہمارے نزدیک درخود اعتناء نہیں ہے۔ میں تو اس لفظ کی اسی قرائت سے مطلب ہے جس پر مسلمانوں کا عمل درآمد ہے اور ہمیں اسی کے معنی سمجھنے کی ضرورت۔

ہماری قدیم تفسیر سے اس سوال کا حل بہت آسان ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فرعون پہلے خود بت پرست تھا اس کے بعد اس نے دعوائے خدائی کیا ہے۔ اس صورت میں اٰلِهَتَكَ کے معنی صاف ہیں کہ جن خداؤں کی آپ پرستش کرتے رہے ہیں۔ [3]

جن مظالم کا فرعون نے اب ارادہ ظاہر کیا ہے، یہ وہی مظالم ہیں جو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے کرتا رہا تھا۔ اب اس نے پھر انہی کے اعادہ کا اعلان کیا ہے [4]

ہاں! ان دونوں میں ایک فرق بھی ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے بچوں کا قتل کرنا جو تھا، وہ ان بچوں کا تھا جو نئے پیدا ہوں، تاکہ وہ بچہ موجود نہ رہے جو نجومیوں کے قول کے مطابق اس کی تباہی کا باعث ہوگا اور اب یہ قتل اس قوم کے ان بچوں اور نوجوانوں کا ہے جن سے اندیشہ ہے

---

[1] ۔یعنی عبادتك (تبیان)

[2] ۔انما هو تانیث اله (تبیان)

[3] ۔کان فرعون یعبد الاصنام ثم ادعی بعد ذٰلك الربوبیة (علی بن ابراهیم)

[4] ۔درمیان میں چھوڑ دیا تھا۔ اب پھر قصد کیا (موضح القرآن)

کہ وہ منظم ہو کر اس سے مقابلہ کریں۔ [1]

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾

''موسیٰؑ نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ تم اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر و برداشت سے کام لو یقیناً زمین اللہ کی ہے وہ اس پر تسلط عطا کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے [2] اور آخرت کی بہتری پرہیزگاروں ہی کا حصہ ہے۔''

یہاں ''وارث'' کرنے کا مطلب، اسباب تکوینیہ سے تسلط عطا کرنا ہی ہے۔ یہ نہیں کہ جو تسلط حاصل کر لے وہ منجانب اللہ اس تسلط کا حق دار بھی ہے اور اسی لئے بعد میں کہا ہے کہ ''آخرت کی بہتری پرہیزگاروں کے لئے ہے'' یعنی دنیوی تسلط تو دوسروں کو بھی ہو جاتا ہے لیکن اگر تقویٰ کا جوہر نہیں ہے تو یہ دنیوی کامیابی آخرت کی ناکامی کی ذمہ داری ہوگی۔

بے شک جمہور کے مفسرین جو تسلط و اقتدار کو خود حقانیت کا ایک ثبوت سمجھتے ہیں، انہوں نے وارث ہونے سے مطلب استحقاق کا لیا ہے [3] مگر انہیں اس پہلو پر غور کرنا چاہیے کہ یہ تسلط و اقتدار تو کبھی کافروں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے، پھر ان کافروں کو بھی حقدار ہی ماننا پڑے گا اور اس صورت میں خود یہ فرعون بھی جو اب تک اس بے پناہ اقتدار کا حامل تھا تو اس اقتدار کو منجانب اللہ استحقاق کا مرادف کیوں نہ سمجھا جائے؟! پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس انتزاع سلطنت کی مہم پر اٹھے ہی کیوں ہیں اور اگر فرعون کے خلاف اٹھنا اس لئے درست ہے کہ وہ خلق خدا پر احکام الٰہی کے خلاف حکمرانی کرتا ہے اور مظالم کا مرتکب ہے تو پھر کسی نام نہاد مسلمان کے اقتدار کے خلاف بھی اٹھنا درست ہے جو یزید ہو کر احکام الٰہی کے خلاف رویہ اختیار کرے اور خلائق کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنائے۔

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

''ان لوگوں نے کہا کہ ہمیں آپ کے آنے سے پہلے بھی ایذائیں پہنچیں اور اب آپ کے آنے کے بعد بھی۔ انہوں نے کہا قریب ہے وہ منزل [4] کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں اس کے بجائے زمین پر اقتدار عطا کر کے دیکھے کہ تم کیسے اعمال کرتے ہو۔''

---

[1] ۔ الذین یکون فیھم النجدۃ والقوۃ ویصلحون للقتال (مجمع البیان)

[2] ۔ ای الیٰ من یشاء نقل المواریث فیورثکم بعد اھلاک فرعون لما اورثھا فرعون (مجمع البیان)

[3] ۔ زمین کا وارث کرے یعنی ملک کا حکم کرے جو حق ہے حضرت آدم علیہ السلام کا (موضح القرآن)

[4] ۔ امید است کہ (شاہ ولی اللہ) شتاب ہے یہ کہ (شاہ رفیع الدین)

بنی اسرائیل کی دل شکن باتیں

چونکہ جیسا کہ پہلے آچکا ہے، جناب موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے پہلے بھی یہی ہو چکا تھا کہ لڑکے ہلاک کر دیئے جاتے تھے اور لڑکیاں کنیز بنا کر رکھ لی جاتی تھیں اور وہی اب بعثت موسیٰ علیہ السلام کے بعد فرعون نے اپنے ارادہ کا اعلان کیا ہے [1] اس لئے قوم بنی اسرائیل نے گھبرا کر جناب موسیٰ علیہ السلام سے یہ دل شکن جملہ کہا جس میں ان پر معاذ اللہ ایک طرح کی نحوست کا الزام تھا مگر انہوں نے اسے ان کے وقتی اضطراب کا ایک اضطراری نتیجہ قرار دیتے ہوئے اس کا جواب بڑے تسلی آمیز انداز سے دیا ہے جو ان کی اخلاقی رفعت کا آئینہ بردار ہے۔ اس سے ان لوگوں کو اپنے خیال کی اصلاح کرنا چاہیے جنہوں نے عام شہرت اور بعض غیر مستند روایات کی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تمام سلسلۂ انبیاء میں خاص طور پر ''میر غضب'' مان لیا ہے اور ان کی سیرت کا نقشہ جلال ہی کے چوکھٹے میں دیکھا ہے۔ وہ دیکھیں کہ قوم کی کہی ہوئی کتنی سخت بات کا انہوں نے کتنے نرم لہجہ میں جواب دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دوسرے تمام انبیاء ہی کی طرح غیر معتدل اور بے محل غیظ و غضب سے بری ہیں اور وہی حلم و تحمل رکھتے ہیں جو عام طور سے انبیاء کا شعار رہا ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿١٣٠﴾
فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى
وَمَنْ مَّعَهٗ ۭ اَلَآ اِنَّمَا طٰۗىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣١﴾

''اور ہم نے فرعون والوں کو گرفتار کیا قحط اور پھلوں کی کمی میں۔ شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں تو جب ان کے لئے بھلائی ہوتی تھی تو وہ کہتے تھے کہ یہ ہمارا حق ہے [2] اور اگر انہیں کچھ برائی پہنچتی تھی تو موسیٰ ؑ اور ان کے ساتھ والوں کی نحوست قرار دیتے تھے۔ ارے ان کی نحوست [3] تو اللہ کے یہاں ہے مگر ان میں کے زیادہ لوگ علم نہیں رکھتے۔''

اِنَّمَا طٰۗىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ ''ان کی نحوست تو اللہ کے یہاں ہے۔'' اس کا ایک مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ شومئ تقدیر یا شامت اعمال ہے جو ان کے شامل حال ہے، کسی دوسرے آدمی کی نحوست کا اثر تھوڑی ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''اس کا جواب یہ فرمایا کہ شومی ان کے کفر سے تھی، کیونکہ کافر بھی دنیا میں عیش کرتے ہیں، اصل حقیقت تھی، سو فرمایا کہ دنیا کے احوال موقوف بر تقدیر ہیں'' (موضح القرآن)

ہمارے مفسرین میں جناب شیخ الطائفہ نے بھی یہی تحریر کیا ہے۔ [4]

---

[1] ۔ الذی کان بعد مجیئ موسیٰ الوعید لھم تجدید ذٰلك العذاب (تبیان)
[2] ۔ ای انا نستحق ذٰلك (مجمع البیان)
[3] ۔ طائر ھم شو مھم (جلالین)
[4] ۔ معناہ ان اللہ ھو الذی یاتی بطائر البرکۃ وطائر الشوم من الخیر والشر والنفع والضر (تبیان)

لیکن شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس نحوست کے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ:

''یعنی مواخذہ براعمال ایشان است'' (فتح الرحمٰن)

اسی کو ہم نے ''شامتِ اعمال'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ایک مفہوم اس جملہ کا جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ ہے کہ یہ دنیا کی نحوست جو قحط وغیرہ کی صورت میں ہے، یہ تو کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل نحوست ان کی جو ہے وہ اللہ کے یہاں ظاہر ہوگی یعنی روز جزاء جب انہیں ان کے اعمال کی پاداش ملے گی۔ [1]

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾
فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ
مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

''اور انہوں نے کہا کہ جو بھی ''معجزہ'' تم ہمارے سامنے لاؤ [2] کہ ہم پر اس کے ذریعہ سے جادو کرو، پھر بھی ہم تمہاری بات نہیں مانیں گے، تو ہم نے ان پر بھیجا طوفان ٹڈیوں، جوؤں، مینڈکوں اور خون کے کھلے ہوئے معجزوں کی حیثیت سے [3] اس پر بھی انہوں نے گھمنڈ سے کام لیا اور وہ بڑے گنہگار لوگ تھے۔''

حقیقت میں وہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے پیش کردہ امور کو ''معجزہ'' مان لیتے تو پھر کافر ہی کیوں ہوتے مگر چونکہ یہ باتیں تھیں غیر معمولی اور بحیثیت معجزہ پیش ہوئی تھیں تو انہوں نے پہلے تو ''آیت'' کا لفظ صرف کیا جس کے معنی نشانی کے ہیں اور اسی کو ''معجزہ'' کہتے ہیں، پھر اس کی تاثیر کو جادو کہہ کر انہوں نے اپنی کافرانہ ذہنیت کا ثبوت دے دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ ہم بہرحال ان چیزوں پر جنہیں تم معجزہ کہہ کر پیش کرتے ہو، ایمان نہیں لائیں گے۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ
كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا
كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

''اور جب ان پر عذاب وقوع میں آ گیا [4] تو انہوں نے کہا اے موسیٰ! ہمارے لئے اپنے پروردگار سے دعا کرو، اس عہدہ کے سبب سے جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے۔ اگر تم ہم سے اس عذاب کو ہٹا دو گے تو ہم تم پر ایمان لے

---

[1] ۔ معناہ الا انما الشوم الذی یلحقھم ھو الذی وعدوا بہ من العقاب عند اللہ یفعل بھم فی الاخرۃ (مجمع البیان)

[2] ۔ ای شئ تاتینا بہ من المعجزات (تبیان)

[3] ۔ ای معجزات بینات ظاھرات وادلۃ واضحات (مجمع البیان)

[4] ۔ الرجز العذاب (جلالین)

آئیں گے اور تمہارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے تو جب ہم نے ان سے عذاب کو ہٹا دیا اس مدت تک کہ جس تک پہنچنا اُن کے نصیب میں تھا تو وہ ایک دم عہد کو توڑتے ہوئے نظر آئے۔''

بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ، اس کے ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ ان واسطوں اور دعاؤں کے ذریعہ سے جو اس نے تمہیں بتلائی ہیں [1] ہمارے لئے دعا کرو اور دوسرے یہ معنی کہ جیسا اس نے تم سے پہلے کہہ رکھا ہے کہ اگر یہ ایمان لائیں گے تو میں عذاب سے ان کو بچالوں گا [2] تیسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ اس نے قبولیت دعا کا جو تم سے عہد کیا ہے [3] مگر مجھے یہ معنی زیادہ ذہن سے قریب معلوم ہوتے ہیں کہ عہد عندک کے معنی ہیں، وہ عہدہ اور منصب نبوت و رسالت کا جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے [4] اس لئے میں نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٣٦﴾ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿١٣٧﴾

''تو ہم نے ان سے بدلا لیا [5] اور انہیں دریا میں ڈبو دیا، اس لئے کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ اور ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے ہم نے زمین کے مشرق اور مغرب کے تمام اطراف پر جن میں ہم نے برکت عطا کی تھی، اقتدار کا مالک بنایا اور تمہارے پروردگار کا نیک وعدہ بنی اسرائیل پر پورا ہو گیا [6] اس بنا پر کہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا اور مٹا دیا ہم نے اسے جو فرعون اور اس کی قوم والے کرتے تھے اور جو کہ وہ اونچی اونچی عمارتیں بناتے تھے'' [7]

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿١٣٨﴾ اِنَّ

---

[1] ۔بآں اسماء وادعیہ کہ وحی کردہ است نزدیک تو (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔بما عهد عندك من كشف العذاب عنا ان امنا (جلالین)

[3] ۔تم سے جو خدا نے (قبول دعا کا) عہد کیا ہے (مولوی فرمان علی صاحب)

[4] ۔بما عهد عندك من النبوة عن ابی مسلم فعلی هذا یکون الباء باء القسم المعنی بحق ما اتاك الله من النبوة (مجمع البیان)

[5] ۔ای فجازینا هم علی سوء صنیعهم بالعذاب (مجمع البیان)

[6] ۔راست شد وعدۂ نیك پروردگار تو (شاہ ولی اللہ)

[7] ۔یرفعون من البنیان (جلالین)

هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار اتار دیا تو ان کا گزر ایک ایسی جماعت کی طرف سے ہوا جو اپنے کچھ بتوں کی عبادت پر ٹوٹی ہوئی تھی [1] انہوں نے کہا اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی ایک خدا بنا دیجئے جیسے ان کے خدا ہیں۔ انہوں نے کہا تم ایسے لوگ ہو جو جہالت سے کام لیتے ہو، یقیناً یہ لوگ جس عالم میں ہیں وہ مٹنے والا ہے [2] اور غلط ہیں جو وہ کام کرے رہے ہیں (پھر) کہا کیا اللہ کے سوا تمہارے لئے کوئی خدا تلاش کروں؟ [3] حالانکہ اس نے تمہیں تمام جہانوں سے زیادہ عطا کیا ہے۔''

فَضَّلَكُمْ کے معنی اکثر مفسرین ومترجمین نے ''فضیلت عطا کی ہے'' قرار دیئے ہیں [4] اس صورت میں قید لگانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ یہ فضیلت صرف اس دور والوں کے لحاظ سے ہے [5] اس لئے کہ بعد میں غیر بنی اسرائیل میں ایسی ہستیاں ہوئیں جو بنی اسرائیل کی ہر فرد سے افضل تھیں، مگر ہم اسے فضیلت بمعنی بزرگی سے نہیں سمجھتے بلکہ فضل بمعنی کثرتِ عطا سے سمجھتے ہیں جسے ہم نے اپنے ترجمہ میں ملحوظ رکھا ہے اور اس کی نظیر ابتدا کے پاروں میں آچکی ہے مگر بنی اسرائیل نے اس کثرت عطا کا مقابلہ شدت کفران کے ساتھ کیا، اس لئے وہ ''فضل'' ان کے لئے باعثِ فضیلت بننے کے بجائے انتہائی پستی کا مستوجب ہوگیا۔

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾

''اور (یاد رکھنے کا ہے وہ وقت) جب ہم نے تمہیں چھٹکارا دیا فرعون والوں سے کہ وہ تمہیں طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا کرتے تھے، تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھ لیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی۔''

یہ مضمون تمام وکمال شروع کے پاروں میں آچکا ہے، اس لئے اس مقام پر کسی تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ

---

[1] ۔یقیمون علیها ملازمین لها (مجمع البیان)

[2] ۔هلك ما هم فیه (جلالین) باطل کردہ شدہ است مذہبی کہ ایشان در آنند (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔اصله ابغی لکم (جلالین)

[4] ۔فضل دادہ است شمار ابر عالمها (شاہ ولی اللہ) بزرگی تم کو اوپر عالموں کے (شاہ رفیع الدین)

[5] ۔فی زمانکم (جلالین) قال الحسن وابو علی وغیرهما یرید علی عالمی زمانه (تبیان)

وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

''اور ہم نے موسیٰ ؑ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور ان کا تتمہ قرار دیا مزید دس کو جس سے ان کے پروردگار کی میعاد چالیس راتوں کی پوری ہوگئی اور موسیٰ ؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا تھا کہ تم میری قوم میں میری جانشینی کرو اور ٹھیک کام کرنا اور خرابی کرنے والوں کے طریق کار کی پیروی نہ کرنا۔''

تیس راتوں کا وعدہ اور مزید دس کا اضافہ۔ بداء کا کھلا ہوا نمونہ

یہ واقعہ جس کا قرآن میں صاف تذکرہ ہے، ''بدا'' کا کھلا ہوا نمونہ ہے۔ ''بدا'' میں کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ مصلحت الٰہی اس کی متقاضی ہوتی ہے کہ جو مختتم نتیجہ تقدیر کا ہے، اسے ایک دم سامنے نہ لایا جائے بلکہ پہلے وہ لایا جائے جو خالق کے یہاں کچھ شرائط کے ساتھ مشروط ہے، بعد میں جب اس کی کوئی خاص شرط پوری نہ ہو، جس کا پورا نہ ہونا علم الٰہی میں پہلے ہی سے تھا مگر ظاہر نہیں کیا گیا تھا اس وقت دوسرا فیصلہ سنایا جائے۔ مثلاً تقدیرات کے نوشتہ میں یہ لکھ دیا گیا کہ فلاں شخص کی عمر چالیس برس ہے اس کے بعد اس نے راہ خدا میں کچھ صدقہ دے دیا۔ اب اعلان کر دیا گیا کہ اس کی عمر میں اس صدقہ کی وجہ سے دس برس کا اضافہ کیا جاتا ہے جس سے اس کی عمر پچاس برس ہوگئی۔

یہاں تقدیر الٰہی میں جو تبدیلی ہے، وہ معاذ اللہ کسی لاعلمی کی بنا پر نہیں ہے۔ علم الٰہی میں جس کا مظہر ''لوح محفوظ'' کہلاتا ہے، از اول یہی تھا کہ اس کی پچاس برس کی عمر ہو مگر اس نوشتہ میں جو تقدیروں کا ہے اور جسے ''لوح محو و اثبات'' کہا جاتا ہے، وہ نتیجہ ایک دم درج نہیں ہوتا بلکہ پہلے چالیس برس درج ہوتے ہیں اور پھر دس کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ میں بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ تیس دن کا وعدہ کیا گیا کہ اس کے بعد توریت تم کو عطا ہوگی اور پھر دس دن کا اضافہ کر دیا گیا جس کے بعد ارشاد ہوا کہ ''اس طرح ان کے پروردگار کی میعاد چالیس راتوں کی پوری ہوگئی''..... یہ میعاد، وہی ''لوح محفوظ'' یعنی علم الٰہی والی ہے جس کا ظہور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے تدریجی طور پر ہوا ہے۔

اس کا سبب کیا ہوا؟ اس کے لئے کتب اہل سنت میں عجیب طرح کی رویت ہے جسے شاہ عبدالقادر دہلوی کی زبان قلم سے سنیئے۔

حق تعالیٰ نے وعدہ دیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہ پہاڑ پر تیس رات خلوت کرو کہ تمہاری قوم کو توریت دوں۔ اس مدت میں انہوں نے ایک دن مسواک کی فرشتوں کو ان کے منہ کی بو سے خوشی تھی وہ جاتی رہی۔ اس کے بدل دس رات اور بڑھا کر مدت پوری کی۔'' (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں بھی تقریباً ایسا ہی ہے بس اس میں فرشتوں کا نہیں خود اللہ سبحانہ کا ذکر ہے کہ تیس (۳۰) راتیں پوری ہونے پر موسیٰ علیہ السلام کو اپنے منہ کی بو بری معلوم ہوئی تو انہوں نے مسواک کر لیا اور اللہ نے دس راتیں بڑھا دیں تا کہ وہ جب اس سے کلام کریں تو دہن سے بو آتی ہوئی ہو۔[1] یہ وجہ ہمیں قطعاً غلط معلوم ہوتی ہے اور اس سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے کہ صفائی اللہ کو ناپسند ہے، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے، جب کہ مسواک اسلامی شریعت میں ایک ایسی مستحب عبادت ہے جو واجب کی سرحد سے متصل ہے۔

---

[1] ۔فلما تمت انکر خلوف فمہ فاستاك فامرہ اللہ بعشرۃ اخریٰ لیکلمہ بخلوف فمہ (جلالین)

پھر بھی یہ اس کی نوعیت بہر حال وہی ہے جو "بدا" کی ہوتی ہے جسے یہ علمائے جمہور فرقۂ شیعہ کے خلاف الزامات کی فہرست میں بڑی شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

آیت کا جو تتمہ ہے کہ "موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ تم میری قوم میں جانشینی کرو، اس سے علامہ طبرسیؒ نے ایک لطیف استدلال کیا ہے جس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ نبی تو اس وقت ہو چکے تھے جب جناب موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف جانے کا حکم ہوا، انہوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا "وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ" ہارون کو میرے منصب میں شریک قرار دے۔ (سورہ طٰہٰ۔ ۳۲)

اور خالق نے اس کا اعلان کیا کہ :

وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ہم نے ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر قرار دیا۔ (سورۂ فرقان۔ ۳۵)

مگر اس نبوت کے باوجود وہ امام یعنی قوم کے سربراہ نہیں تھے، امامت حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو حاصل تھی۔ طور پر جاتے وقت جب انہوں نے کہا:

اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ "تم قوم میں میری جانشینی کا کام انجام دو"

تو اس کے معنی یہ تھے کہ اپنی عدم موجودگی میں امامت کا منصب ان کے تفویض کیا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبوت کا لازمہ امامت نہیں ہے ورنہ جبکہ وہ نبی تھے ہی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ضرورت کیا تھی کہ وہ انہیں اپنے خلیفہ قرار دیں۔[1]

اب اس کے بعد جب ہم متفق علیہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کہ:

انت منی بمنزلة هٰرون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی۔

تم کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

نظر ڈالتے ہیں تو صاف یہ حقیقت جلوہ آرا نظر آتی ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب ہارونؑ کی منزل جو موسیٰ علیہ السلام سے تھی وہ اپنے سے حضرت علی بن ابی طالبؑ کے لئے ثابت کی مگر آخر کے جملہ سے نبوت کو مستثنیٰ قرار دیا تو اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضرت ہارونؑ کو علاوہ نبوت کے کوئی منزل خاص حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہ نسبت حاصل تھی اور وہ بنص قرآن خلافت بصورت امامت تھی اور حضرت علی علیہ السلام سے نبوت کی نفی کر دی گئی تھی تو اب لازماً آپ کے لئے وہ دوسری ہی نسبت حاصل ہے کہ آپ بلا فصل خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور آپ کے لئے نبی کا نہیں بلکہ امام کا منصب من جانب اللہ حاصل ہے جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حاصل تھا اور جو مسلمانوں میں فرقۂ حقہ امامیہ کے نزدیک حضرت علی علیہ السلام کو حاصل ہے جسے بدنصیبی سے مسلمان اکثریت تسلیم نہیں کرتی۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ

---

[1] ۔ فی هٰذا دلالة علیٰ ان منزلة الامانة منفصلة عن النبوة وغیر داخلة فیها وانما اجتمع الامران لانبیآء مخصوصین (مجمع البیان)

اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

''اور جب موسیٰ ؑ آئے ہمارے وعدہ کی جگہ پر [1] اور ان سے ان کے پروردگار نے کلام کیا تو انہوں نے کہا پروردگارا! مجھے جلوہ دکھلا کہ میں تیری طرف نظر کروں۔ ارشاد ہوا کہ تم ہرگز مجھے نہیں دیکھو گے [2] مگر اس پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ ٹھہرا رہے تو پھر یہ امید کرنا کہ تم مجھے دیکھ لوگے تو جب ان کے پروردگار نے پہاڑ پر جلوہ نمایاں کیا تو اسے ریز ریزہ کر دیا اور موسیٰ ؑ غش کھا کر گر پڑے، جب وہ ہوش میں آئے تو کہا کہ پاک ہے تیری ذات۔ تیری طرف توبہ کرتا ہوں اور میں اول درجہ کا ایمان لانے والا ہوں۔''

دیدارِ خدا کا سوال اور اس کا انجام

پروردگار کا دیدار اگر کسی دور میں ہونے والا ہوتا تو یہ نہ کہا جاتا کہ تم ہرگز مجھے نہیں دیکھو گے۔ اس ہرگز میں مستقبل کا ہر دور داخل ہے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے غش کھا کے گرنے پر بعد میں موسیٰ علیہ السلام کا یہ معروضہ کہ ''پاک ہے تیری ذات'' یہ بتلاتا ہے کہ اس واقعہ سے یہ بات نمایاں ہوگئی کہ رویت شان الٰہی کے خلاف ہے اور اس کے واسطے نقص ہے۔ اسی لئے تسبیح یعنی عیوب ونقائص سے اس کے بری ہونے کی گواہی سے آغاز کلام کیا۔ تیسرے یہ اقرار کہ ''اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ'' میں اول درجہ کا مومن ہوں، اسے ثابت کرتا ہے کہ خالق کے دیدار کو ناممکن سمجھنا جز ایمان ہے [3] اور جناب موسیٰ علیہ السلام اس کا یقین رکھتے تھے۔

رہ گیا موسیٰ علیہ السلام کا معروضہ پیش کرنا کہ ''ارنی'' اپنا جلوہ مجھے دکھلا، وہ جیسا کہ دوسری آیتوں سے قرآن مجید کی پتہ چلتا ہے، کچھ جاہل افراد پر اس حقیقت کے ظاہر کرنے کے لئے تھا، نہ کہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے۔ [4]

اس سب کے بعد شاہ عبدالقادر صاحب نے نہ جانیں، کیوں کر اس آیت ہی سے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ:

''معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو دیکھنا ہوسکتا ہے کیونکہ نمودار ہوا تھا پہاڑ کی طرف لیکن دنیا کے وجود کو برداشت نہ ہوئی، پہاڑ ٹوٹ گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش گرے تو آخرت کے وجود کو برداشت ہوگی، وہاں دیکھنا تحقیق ہے'' (موضح القرآن)

حالانکہ اگر یہ طور پر جو ہوا، جلوۂ ذات تھا تو ''لَنْ تَرَانِيْ'' کا دعویٰ تو اسی وقت غلط ہوجاتا ہے کیونکہ رویت کی نفی تھی۔ اس کا کوئی ذکر نہیں تھا کہ تم اس کے بعد ہوش میں رہو گے یا نہیں۔ پھر خدا نے ثبوت رویت کو مطلق طور پر اس دنیا کے وجود کے برداشت کرنے سے وابستہ قرار دیا تھا جب وہ نہیں ہوا تو رویت کی ابدی نفی ہوگئی۔ [5]

آخرت کے وجود کا برداشت کرنا یا نہ کرنا تو یہاں خارج از بحث ہی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو خالق یہ فرماتا کہ اس دنیا میں تم مجھے نہیں دیکھ

---

[1] ۔الی المکان الذی وقتناہ لہ (مجمع البیان)

[2] ۔ہرگز نہ دیکھ سکے گا تو مجھے (شاہ رفیع الدین)

[3] عن ابی عبداللہ قال معناہ انا اول من اٰمن وصدق بانك لا ترٰی (مجمع البیان)

[4] ۔ما قالہ الجمہور وھو الاقوی انہ لم یسأل الرویۃ لنفسہ وانما سئالھا لقومہ (مجمع)

[5] ۔لانہ لا یعلق المحال الا بالمحال (تبیان)

سکتے۔ آخرت میں اس تمنا کو پورا کر لینا تو موسیٰ علیہ السلام کے دل کو پوری پوری تسلی بھی ہو جاتی اور غش کھانے کی نوبت نہ آتی۔

بعض مفسرین نے ایک دوسرا پہلو امکان رویت کا پیدا کیا ہے کہ خالق نے ارشاد کیا: "لَنْ تَرَانِيْ" تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے، یہ نہیں کہا کہ "میں ہرگز نہیں دکھائی دوں گا" اس سے پتہ چلتا ہے کہ نفس رویت ناممکن نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا احساس شخصی اس سے قاصر تھا کہ اسے دیکھ سکے۔ [1]

مگر یہ بھی غلط ہے۔ یہ "تم" تو اس لئے ہے کہ انہوں نے سوال اپنے ہی لئے کیا تھا۔ اگر وہ کہتے کہ پروردگار امیری خواہش ہے کہ تو کبھی کسی کو دکھائی دے جا تو اس کے جواب میں یہ کہنے کا محل تھا کہ میں ہرگز دکھائی نہ دوں گا۔

پھر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سواد اعظم اس رویت کا "عامۂ مومنین" کے لئے آخرت میں قائل ہے تو کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام ان عام مومنین کے مقابلہ میں گئے گزرے تھے کہ انہیں تو ہمیشہ کے لئے کہہ دیا گیا تھا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے اور عام مسلمان ایسی تاب نظر رکھتے ہیں کہ وہ دیکھ سکیں گے۔ لاحول ولا قوۃ.

حالانکہ یہ سواد اعظم امۂ مسلمین کا کیا ذکر، ان نفوس کو جو خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے اجزائے نور میں داخل تھے، دوسرے عام انبیا و مرسلین سے (چہ جائیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسے اولوالعزم رسول) مساوی ماننے کے لئے تیار نہیں، چہ جائیکہ افضل مگر یہاں سخن پروری یا بخاری و مسلم کے مندرجات کی تصحیح کے لئے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بیچارے کو عام افراد ملت اسلامیہ سے بھی گھٹا دینے پر تلے نظر آتے ہیں نعوذ باللہ من ذٰلك۔

قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٤﴾

"ارشاد ہوا اے موسیٰ ؑ! بلاشبہ میں نے تم کو تمام لوگوں پر مقدم کیا ہے اپنے پیغاموں اور اپنے کلام کے ساتھ تو لو اسے جو میں نے تمہیں دیا ہے [2] اور شکر گزاروں میں سے ہو۔"

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿١٤٥﴾

"اور لکھا ہم نے ان کے لئے تختیوں میں ہر قسم کے وعظ و نصیحت اور ہر بات کی تفصیل کو [3] تو لو اسے طاقت کے ساتھ اور اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ ان میں کی بہترین باتوں کے پابند رہیں میں جلدی دکھلاؤں گا تم لوگوں کو بداعمال لوگوں کا گھر۔"

بظاہر اس آیت میں دوبار وہ صنعت ہے جسے "التفات" کہتے ہیں، اس لئے کہ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ بطور غیبت ہے کہ "لکھا

---

[1] ۔للتعبير به دون "لن أرىٰ) يفيد امكان رؤية تعالىٰ (جلالين)

[2] ۔ما اٰتيتك من الفضل (جلالين)

[3] ۔بدل من الجار والمجرور قبله (جلالين)

ہم نے ان کے لئے'' پھر ان کی طرف خطاب آ گیا کہ ''لو اسے طاقت کے ساتھ اور اپنی قوم کو حکم دو'' پھر اسی سلسلہ میں خطاب پوری قوم کی طرف ہو گیا کہ ''میں دکھلاؤں گا تم لوگوں کو بداعمالوں کا گھر۔''

اس آخری فقرہ سے مقصود یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم دیکھو گے کہ بداعمالوں کا گھر آخرت میں کونسا ہے یعنی دوزخ اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ بداعمال لوگوں یعنی فرعون اور اس کی قوم کے برباد شدہ گھر تمہاری آنکھوں کے سامنے آئیں گے [1]

جناب شیخ الطائفہ نے یہ دونوں قول درج کئے ہیں۔[2]

ہمارے نزدیک پہلے معنی کو ترجیح ہے۔اس لئے کہ ''دار'' واحد لفظ ہے جس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ تمام فاسقین کا ایک ہی گھر ہے۔اگر دوسرے معنی مراد ہوتے تو گھر کے بجائے ''گھروں'' کے ہم معنی جمع کا لفظ لاتا جاتا۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

''میں اپنی آیتوں سے محروم کردوں گا انہیں جو دنیا میں ناحق گھمنڈ سے کام لیتے ہیں اور اگر وہ ہر معجزہ دیکھ لیں تو بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور اگر وہ دیکھیں ہدایت کے راستے کو تو اسے اپنا رستہ نہیں بنائیں گے اور اگر وہ گمراہی کی راہ دیکھیں تو اسے اپنا راستہ قرار دے لیں گے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور وہ ان کی طرف سے غفلت برتتے رہے اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو اور آخرت کی حاضری کو جھٹلایا، ان کے اعمال اکارت گئے، کیا انہیں سزا ملے گی سوا اس کے جو وہ اعمال کرتے تھے۔''

''محروم کرنے'' کا ایک مطلب یہ کہا گیا ہے کہ ایسی توفیق ان کے شامل حال نہ ہوگی کہ وہ ان آیتوں پر غور کریں۔[3]

مگر چونکہ اس کے بعد صاف ''معجزہ'' کا ذکر معلوم ہوتا ہے، اس لئے پہلے جملہ میں بھی آیت کے معنی معجزہ کے ہو سکتے ہیں۔اس صورت میں ''سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ'' کے معنی یہ ہوں گے کہ میں مزید اپنے معجزے ان کے سامنے نہیں لاؤں گا، اس لئے کہ یہ گھمنڈی ہیں اور ان کے لئے جو معجزہ بھی پیش ہو، وہ بے کار ہے جیسا کہ خود اس آیت میں ہے کہ ''اگر وہ ہر معجزہ دیکھ لیں تو بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے[4] اور دوسرے

---

[1] ۔یعنی منازل فرعونیان خراب شدہ خواهید دید (فتح الرحمن)

[2] ۔قال الحسن و مجاهد والجبائی یعنی به جهنم ...وقال قتادة هی منازلهم ای لتعتبروا بها و بما صاروا الیه من التکال فیها (تبیان)

[3] ۔بان اخذلهم فلا تتفکرون فیها (جلالین)

[4] ۔هٰذا اخبار من الله تعالیٰ عن هٰؤلاء بعلمه فیهم ...وبیان انه انما صرفهم عن اٰیاته لذٰلك (مجمع البیان)

مقامات پر ہے کہ چونکہ اس کے قبل معجزات سامنے آئے اور انہوں نے ایمان اختیار نہ کیا تو اب مزید معجزات کا پیش کرنا ان کے سامنے لا حاصل ہے۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

''اور موسیٰ ؑ کی قوم نے ان کے بعد اپنے زیوروں سے ایک بچھڑے کی مورتی بنالی جس میں سے آواز پیدا ہوتی تھی، کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ ان سے بات نہیں کرتا اور نہ انہیں کوئی رہنمائی کرسکتا ہے۔ انہوں نے اسے بنایا اور وہ ظالم لوگ تھے اور جب وہ پشیمان ہوئے اور محسوس کیا کہ وہ گمراہ ہو گئے تھے تو کہنے لگے کہ اگر ہمارا پروردگار ہم پر رحم نہ کرے گا اور ہمیں نہ بخشے گا تو یقیناً ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوں گے''۔

گوسالہ پرستی

''ان کے بعد'' یعنی کوہ طور پر مناجات کے لئے ان کے جانے کے بعد۔ [1]

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۖ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

''اور جب واپس ہوئے موسیٰ ؑ اپنی قوم کی طرف غصہ اور رنج کے عالم میں تو کہا کتنا برا رویہ اختیار کیا تم نے میرے بعد [2] کیا تم نے اپنے پروردگار کے حکم کے مقابلہ میں جلدی سے کام کیا [3] اور تختیاں انہوں نے ہاتھ سے پھینک دیں اور اپنے بھائی کا سر ہاتھ میں لے کر اپنی طرف انہیں کھینچنے لگے، انہوں نے کہا اے میرے ماں جائے! [4]

---

[1] ۔من بعد مفارقة موسیٰ لهم ومضيه الىٰ ميقات ربه (تبيان)

[2] ۔اى بئسما عملتم خلفى (تبيان)

[3] ۔آيا شتابى كرديد از حكم پروردگار خويش (شاه ولى الله)

[4] ۔ارادامى وذكرها اعطف لقلبه (جلالين)

یقین مانو کہ ان لوگوں نے مجھے بے بس کر دیا تھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر ڈالیں اب تم تو میرے ساتھ دشمنوں کو طعن و تشنیع کا موقعہ نہ دو اور مجھے ظالم گروہ میں قرار نہ دو۔''

''جلدی سے کام لیا'' یعنی میرے آنے میں جو دیر ہوئی تو تم اللہ کی مقرر کردہ مدت ختم ہونے کا انتظار ہ کر سکے۔ [1]

شاہ عبدالقادر صاحب برادر صاحب تحفہ نے اس آیت کے مضمون سے کچھ نشیب محسوس کیا، اس لئے اس کی تشریح میں لکھا ہے:

''حضرت ہارونؑ اور ان کی اولاد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امامت میں امام تھی لیکن جب ان کی جگہ خلیفہ ہوئی تو امت حکم میں نہ رہی۔ خلافت اور کی قسمت میں تھی۔ خلیفہ وہ کہ امت کو دین اور دنیا کے بندوبست میں رکھے جس طرح پیغمبر سنوار گیا تھا، نصرت حق ان کے ساتھ رہے اور امام وہ کہ پیغمبر کا یادگار رہو، جو خدمت و ایثار پیغمبر سے منظور ہو، سو امت ان سے کرے تا برکت اور قبولیت پاویں'' (موضح القرآن)

قطع نظر اس سے کہ یہ دین اور دنیا کا تفرقہ خدا اور قیصر والے حقوق کی تقسیم ہے جس کی دین حق میں گنجائش نہیں، اس سلسلہ میں یہ سوال تو غور طلب بہر حال ہے کہ امت جب امام کے حکم میں نہ رہی تو حق امت کے ساتھ تھا یا امام کے ساتھ؟ اگر حق امت کے ساتھ ہوتا تو ان کی سرتابی و مخالفت کی انہیں سزا کیوں ملتی جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور اگر یہ مان لیا جائے اور ماننا بہر حال ناگزیر ہے کہ حق امام کے ساتھ ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ امام کے خلاف اجماع و شوریٰ وغیرہ جو بھی ہو، وہ باطل ہی ہوگا اور اس اجماع وغیرہ کے نتیجہ میں جو اقتدار قائم ہو، وہ برحق ہرگز نہیں ہو سکتا۔ رہ گیا یہ کہ خلیفہ وہی ہے جو امت کو صحیح راستے پر قائم رکھے تو ظاہر ہے کہ یہ قائم رکھنا جبریہ تو نہیں ہو سکتا جب کہ جبر کی طاقت خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا نہیں کی گئی تو خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کیوں کر ہو سکتی ہے۔

خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام بس تبلیغ کرنا ہے، اس سے زیادہ نہیں تو خلیفۂ رسول کا کام اس سے زیادہ کیوں کر سمجھا جا سکتا ہے؟ بلکہ خالق نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تخاطب کر کے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ اعلان کیا ہے کہ خود ہم لوگوں کو راہ راست پر لانے میں اپنی قوت قاہرہ سے کام نہیں لیتے ورنہ دنیا میں کفار کا وجود نہ ہوتا تو جب کافروں کا وجود خدا کی خدائی میں قادح نہیں اور منافقین کا رہنا پیغمبر کی رسالت کی ناکامی کا ثبوت نہیں تو مخالفین کا وجود یا ان کا برسر اقتدار آ جانا خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تقاضائے منصب کے خلاف کیوں کر ہو سکتا ہے؟! خلیفۂ رسول کا کام خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کام سے زیادہ کیوں کر سمجھا جائے؟ اور اس بنا پر یہ تصور بالکل غلط ہے کہ حضرت ہارونؑ کی خلافت ناکام تھی اور انہوں نے اس کام کو بحسن و خوبی انجام نہیں دیا تھا۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾

''انہوں نے کہا پروردگارا! مجھے بخش دے اور میرے بھائی کو اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو تمام رحم کرنے

[1] ۔امر ربکم ای میعاد ربکم فلم تصبروا له (مجمع البیان)

والوں میں سب سے زیادہ رحیم ہے۔ یقیناً جنہوں نے بچھڑا بنایا، انہیں پہنچے گا غضب ان کے پروردگار کی طرف سے اور ذلت اس دنیاوی زندگی میں اور ایسی ہی ہم سزا دیا کرتے ہیں غلط باتیں بتانے والوں کو اور جو غلطیاں کریں، پھر اس کے بعد توبہ کرلیں اور ایمان لائیں تو یقیناً تمہارا پروردگار اس کے بعد بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

جناب موسیٰ علیہ السلام کا جناب ہارون علیہ السلام پر بظاہر عتاب

حضرت ہارون علیہ السلام نے جو اپنی صفائی پیش کی، اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام فوراً مطمئن ہو گئے اور انہیں ساتھ شامل کر کے بارگاہ الٰہی میں فضل و کرم اور رحمت کی دعائیں مانگنے لگے۔ جس میں اپنا شامل کرنا جیسے اس احساس کا ترجمان ہے کہ میں نے دوسروں کی بداعمالی کا غصہ جو بر بنائے یگانگی ان پر اتارا جس میں دوسروں کی تنبیہ کی مصلحت مضمر تھی، یہ حقیقتاً اس کے مستحق نہ تھے۔ [1]

اس سے بھی ظاہر ہے کہ قوم اگر امام کے ساتھ ظلم و تعدی سے کام لے تو وہ قوم ہی مجرم ہوتی ہے۔ امام پر اس سے کوئی الزام عائد نہیں ہوتا، چنانچہ اس کے بعد جو واقعی مجرم تھے یعنی گوسالہ پرستی کرنے والے انہیں ان کے جرم کی جو پاداش دنیا و آخرت میں ملنے والی ہے۔ اس کا تذکرہ ہے اور اسے شاہ عبدالقادر صاحب اور ان کے ہم خیالوں کو آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ امام کی مخالفت کا کیا انجام ہوا کرتا ہے جس میں آخرت کی سزا ہی نہیں ہوتی بلکہ دنیوی ذلت اور رسوائی بھی ہوتی ہے اور اس کے بعد کون سمجھ سکتا ہے کہ گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں کی جو رسوائیاں اور ذلتیں ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور آج بھی جس نکبت کا مشاہدہ ہو رہا ہے، اس پر ''مفکر اسلام'' ڈاکٹر اقبال کتنا ہی ''شکوہ'' کریں مگر حقیقت کے لحاظ سے وہ اللہ کی طرف کے مقرر کردہ امام اور اس کے قائم کردہ نظام ہی کی مخالفت کا نتیجہ تو نہیں ہیں؟ جس کی خبر پہلے ہی قرآن نے دے دی تھی کہ: وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ۔ یعنی سنت الٰہیہ یہی ہے کہ یہی سزا ہوا کرتی ہے افتراء یعنی اللہ کی بات کے مقابلہ میں اپنی طرف سے دل بخواہ باتیں کرنے والوں کی [2] یہ افتراء قولی ہی نہیں ہوا کرتا جو اس سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے جنہیں یہاں سزا دی گئی ہے، لفظاً کوئی غلط بات اللہ کی طرف منسوب نہیں کی ہے بلکہ یہ عملی افتراء تھا کہ بغیر حکم الٰہی کے اپنے دل سے انہوں نے اپنا ایک معبود بنا لیا تھا جس کا تجویز کرنے والا سامری تھا، اسے بھی سزائے سخت ملی اور اس قوم کو بھی جس نے اس معبود کی پرستش کی تو یقیناً اللہ کے مقرر کردہ نظام کے بجائے دوسرے نظام کو ''دینی نظام'' کہہ کر رائج کرنا بھی بہت بڑا عملی افتراء ہے اور اس کے مقرر کردہ پیشوا کے مقابلہ میں ''سامری صفت'' اشخاص جس صاحب اقتدار کو ''گوسالہ'' بنا کر نصب کر دیں، ان کی بھی سزا اصولی طور پر وہی ہونا چاہیے جو مفترین کی ہوا کرتی ہے۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

---

[1] ۔رب اغفرلی ما صنعت باخی ولاخی اشرکہ فی الدعاء ارضاء لہ وفعاللسماتہ (جلالین)

[2] ۔ کذٰلك کما جزینا ھم نجزی المفترین علی اللہ بالاشراك وغیرہ (جلالین)

''اور جب موسیٰ ؑ کا غصہ فرو ہوا تو انہوں نے تختیاں اٹھالیں [1] اور ان کے لکھے ہوئے میں [2] ہدایت اور رحمت تھی ان کے لئے جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہوں۔''

غصہ ساکن ہونے کو سکوت سے تعبیر کرنے میں ادبی حیثیت سے اس کا اظہار مضمر ہے کہ غصہ کے عالم میں وہ جو اپنے بھائی کو خفا ہو رہے تھے، وہ حقیقت میں ان کی آواز نہ تھی، ان کا غصہ تھا جو بول رہا تھا۔ اب جو وہ غصہ کے کم ہونے سے خاموش ہوئے تو یوں سمجھنا چاہیے کہ غصہ خاموش ہو گیا۔ [3] لیکن چونکہ غصہ قوم کی معصیت پر تھا جس کے اظہار کا ایک طریقہ یہ بھائی کے ساتھ تخاطب تھا، اس لئے اس غصہ کو بھی شانِ رسالت کے خلاف نہیں سمجھا جا سکتا۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّاَىَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِىَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِىْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِىْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

''اور موسیٰ ؑ نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو [4] ہمارے وعدہ کی جگہ کے لئے منتخب کیا۔ جب انہیں زلزلہ نے اپنی گرفت میں لیا [5] تو انہوں نے کہا کہ پروردگار اگر تو چاہتا تو ان سب کو ہلاک کر دیتا پہلے ہی اور مجھے بھی۔ کیا تو ہمیں ہلاک کرتا ہے اس کے سبب سے جو ہم میں سے احمق لوگوں نے کیا؟ یہ نہیں ہے مگر تیری طرف کی آزمائش [6] جس سے جنہیں چاہتا ہے، ان کی گمراہی کا سامان کرتا ہے اور جنہیں چاہتا ہے تو ہدایت کرتا ہے۔ تو ہمارا مالک ہے تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو تمام..... بخشنے والوں میں سب سے بہتر ہے اور لکھ ہمارے نصیب میں اس

---

[1] ۔ اخذ الالواح التی القاها (جلالین)

[2] ۔ در مکتوب وے (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ السکوت فی هذا الموضع احسن من السکوت لتضمنه معنی سکوته عن المعاتبة لاخیه مع اسکون غضبه (تیبان)

[4] ۔ اختیار کرد موسیٰ از قوم خود هفتاد کس (شاہ ولی اللہ)

[5] ۔ پکڑا ان کو زلزلہ نے (شاہ رفیع الدین)

[6] ۔ نیست این حادثه مگر امتحان تو (شاہ ولی اللہ)

دنیا میں بھی بھلائی اور آخرت میں بھی، ہم نے تجھ سے لو لگائی ہے [1] ارشاد ہوا کہ میرا عذاب، اسے میں پہنچاتا ہوں جس تک چاہتا ہوں اور میری رحمت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔ میں اسے لکھوں گا ان کے نصیب میں جو پرہیز گاری سے کام لیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔''

یہ ستر آدمیوں کا انتخاب کس لئے تھا؟ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

''تاعذر گویند از عبادت گو ساله، این جماعت اگرچه عبادت نکرده بودند، برعبادت کنند گان انکار ہم نکردند پس خدائے تعالیٰ ہلاک ساخت۔'' (فتح الرحمن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گزشتہ واقعہ ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اب منتخب کرنے کی نوعیت یہ قرار پاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس جماعت میں سے ان افراد کو الگ کر لیا جن کے متعلق انہیں علم تھا کہ وہ گوسالہ پرستی سے الگ رہے تھے اور انہیں اس لئے اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ وہ اس جرم عظیم پر قوم کیلئے بارگاہ الٰہی میں توبہ وانابت کریں مگر چونکہ علم الٰہی میں یہ لوگ بھی ایک حد تک مجرم تھے جیسا کہ حدیث میں ہے:

الراضی بفعل قوم کالداخل فیه معهم

جو کسی جماعت کے عمل سے راضی رہے، وہ مثل اس کے ہے کہ جو ان کے ساتھ اس عمل میں شریک رہے۔

اور اسی لئے زیارت حضرت امام حسین علیہ السلام میں یہ الفاظ ہیں کہ:

لعن الله امة سمعت بذلك فرضيت به

اس گروہ پر اللہ کی لعنت جس نے اس ظلم عظیم کو سنا اور وہ اس پر راضی رہا۔

اس لئے خالق نے اس جماعت کو بھی ہلاک کر دیا۔ چونکہ موسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کو یہ دیکھ کر منتخب کیا تھا کہ یہ گوسالہ پرستی میں شریک نہیں ہیں، اس لئے ان کے ہلاک ہونے کو انہوں نے اپنے توقعات کے خلاف محسوس کیا اور اب ان الفاظ کے معنی سمجھ میں آتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا

کیا تو ہمیں ہلاک کرتا ہے اس کے سبب سے جو ہم میں سے احمق لوگوں نے کیا ہے۔

احمق لوگوں سے مراد وہ ہوں گے جنہوں نے گوسالہ پرستی کے جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ دوسرے مفسرین کے بیان سے بھی شاہ صاحب کی تائید ہوتی ہے۔ [2]

مگر ان کے صاحبزادہ نے اس آیت کا محل نزول دوسرا بتایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھ لے گئے ستر آدمی سردار قوم کے جب حق تعالیٰ نے کلام کیا سن کر کہنے لگے ہم جب تلک نہ دیکھیں ہمیں

---

[1] ۔ھدنا تبنا (جلالین)

[2] ۔سبعین رجلا ممن لم یعبدوا العجل بامرہ تعالیٰ ...لیعتذروا من عبادۃ اصحابہم العجل فلما اخذتہم الرفجۃ الزلزلۃ الشدیدۃ قال ابن عباس رضی اللہ عنہ لانہم لم یرایلوا قومہم حین عبدوا العجل قال وھم غیر الذین سألوا الرؤیۃ واخذتہم الصاعقۃ. (جلالین)

یقین نہیں، اس سے ان پر بجلی گری اور کانپ کر مر گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس طرح دعا کی آپ کو شامل کر کے، تب بخشے گئے، پھر زندہ ہوئے، یہ شاید بچھڑا پوجنے سے پہلے تھا یا شاید پیچھے تھا۔'' (موضح القرآن)

اس صورت میں یہ وہ واقعہ ہے جس کا حوالہ دوسری جگہ قرآن میں اس طرح ہے کہ:۔

فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً.

انہوں نے موسیٰ ؑ سے تو اس سے بڑا سوال کیا تھا کہ ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھا دیجئے۔ (نساء: ۱۵۳)

ہمارے مفسرین نے دونوں قول نقل کئے ہیں [۱] اور بعض نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے [۲] مگر جناب موسیٰ علیہ السلام کے الفاظ بعد والے ،اس صورت میں زیادہ چسپاں نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ اس صورت میں جو لوگ ہلاک ہوئے، وہ خود مجرم تھے۔ پھر یہ کہنا کیسا کہ: ''جو ہم میں کے احمق لوگوں نے کیا، اس کی وجہ سے کیا تو ہمیں ہلاک کر دے گا؟''

آخر میں جو خالق کا ارشاد ہے کہ ''میں اپنی رحمت ان کے نصیب میں لکھوں گا جو پرہیزگار رہوں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے'' اس سے مراد امت محمدیہ کو لیا گیا ہے، غالباً اس بنا پر کہ اس کے بعد بلا فاصلہ یہ آیت ہے کہ

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ. (اعراف۔ ۱۵۷)

جس کی تفسیر ابھی آئے گی۔ اس میں بلاشبہ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ماننے والوں کا ذکر ہے لہٰذا یہ فقرات انہی سے متعلق ہونا چاہیے اور اب اس کا تعلق پہلے کے واقعہ سے کیا ہے؟ اسے شاہ عبدالقادر صاحب یوں لکھتے ہیں کہ:

''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کے حق میں دنیا اور آخرت کی نیکی جو مانگی، مراد یہ تھی کہ سب امتوں پر مقدم رہیں دنیا اور آخرت میں۔ فرمایا کہ میرا عذاب اور رحمت کسی فرقہ پر مخصوص نہیں۔ سو عذاب تو اس پر ہے جس کو اللہ چاہے اور رحمت کاملہ لکھی ہے ان کے نصیب میں جو اللہ کی ساری باتیں یقین کریں گے یعنی آخری امت کہ سب کتابوں پر ایمان لاویں گے سو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں سے جو کوئی آخری کتاب پر یقین لائے، وہ پہنچے اس نعمت کو اور حضرت موسیٰ کی دعا اس کو لگے۔'' (موضح القرآن)

یہ الفاظ قرآنی کے رو سے بھی بعید نہیں ہے۔ اس لئے کہ سورہ بقرہ کے آغاز میں قرآنی ہدایت سے جو فائدہ اٹھاتے ہیں، ان کے لئے یہی اوصاف وارد ہوئے ہیں کہ:

لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (بقرہ)

ان پرہیزگاروں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کی پابندی قائم رکھتے ہیں اور جو ہم نے انہیں رزق عطا کیا ہے، اس میں سے خیرات کرتے ہیں۔ ان اوصاف کا مضمون اس کے بالکل مطابق ہے جو یہاں ذکر ہوا ہے کہ:۔

لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (اعراف)

اس کے معنی یہ ہیں کہ اصطلاح قرآنی میں اس امت کے ایمان و عمل صالح رکھنے والے افراد کا سرنامۂ تعریف یہی اوصاف ہیں کہ

---

[۱] ۔قولان احدھما لانھم سألوا الرؤیۃ فی قول ابن اسحاق الثانی قال ابن عباس لانھیم لا ینھوا عن عبادۃ العجل (تبیان)

[۲] ۔ھو الصحیح ورواہ علی بن ابرھیم فی تفسیرہ (مجمع البیان)

جو وہاں بیان ہوئے ہیں۔ انہی کو کہیں پھیلا کر بہت سے اوصاف پر تقسیم کر دیا گیا ہے جیسے سورۂ مومنون میں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾ سے لے کر بہت دور تک جو ایک اوصاف کا کس سلسلہ مذکور ہے، یہی اوصاف سمٹ جائیں تو المتقین کے ایک لفظ سے ادا ہوں اور یہی پھیل جائیں تو بہت سے جملوں کی شکل اختیار کریں۔

آخر میں جو دو فقرے ہیں:

(۱) ''میری رحمت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔''

(۲) ''میں اسے لکھوں گا ان کے نصیب میں جو پرہیزگاری سے کام لیں گے۔''

یہ اس بنا پر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا میں دنیا کا بھی ذکر تھا اور آخرت کا بھی تو اس کا جواب بطور لف ونشر اس طرح ہے کہ دنیا والی رحمت تو ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ وہی رحمت ہے جو رحمٰن کے لفظ میں مضمر ہے اور آخرت والی رحمت، اس کا خاص معیار ہے اور وہ ایمان و تقویٰ جو ان جو ہروں کے حامل ہوں گے وہ ان کے نصیب میں ہوگی۔ [1]

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

''جو پیروی کریں اس پیغمبر کی جو وہی نبی اُمی ہے جسے وہ اپنے پاس لکھا ہوا پاتے ہیں توریت اور انجیل میں، جو انہیں ہدایت کرتا ہے نیک کام کی اور انہیں روکتا ہے برے کرتوت سے اور ان کے لئے صاف ستھری چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے اور ان پر گندی چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے ان کے بوجھ کو اتارتا ہے اور ان زنجیروں کو جو ان پر تھیں تو جو اس پر ایمان لائیں اور اس کی عظمت کو مدنظر رکھیں اور اس کی مدد کریں اور اس روشنی کی پیروی کریں جو اس کے ہاتھ اتاری گئی ہے، یہی لوگ ہر طرح کی بہتری حاصل کرنے والے ہیں۔''

''النبی'' اس کے اوصاف اور توریت وانجیل میں اس کا تذکرہ

چونکہ اس آیت کو عام طور پر گزشتہ آیات سے مرتبط سمجھا گیا ہے، اس لئے یہ تمام اوصاف اسی سلسلہ کے ہوں گے کہ میں اپنی رحمت لکھوں گا ان کے نصیب میں جو پرہیزگار ہوں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے اور اس صورت میں یہاں بھی تمام

---

[1] ۔ رحمتی وسعت کل شئ فی الدنیا فسا کتبھا فی الاٰخرۃ للذین یتقون الخ (جلالین)

افعال مستقبل سے تعلق رکھتے ہوں گے یعنی جو پیروی کرتے ہوں گے اس پیغمبر کی۔ [1]

مگر وہ آیت خالق کے اس خطاب کی حیثیت رکھتی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھا۔ اس خطاب کے ذیل میں انجیل کے تذکرہ کو ذہن قبول نہیں کرتا اور جب کہ ترتیب قرآن مسلم مطابق تنزیل نہیں ہے تو ضرورت ہی کیا ہے کہ اسے گزشتہ آیات سے مرتبط کیا جائے بلکہ اس آیت کے مضمون پر الگ سے نظر کرنا چاہیے اور "الذین آمنوا" کس موصوف کی صفت ہے؟ اس کے صحیح مقام کو نظم قرآنی میں لامعلوم سمجھنا چاہیے۔

''بوجھ کو اتارتا ہے اور ان زنجیروں کو جو ان پر تھیں'' اس سے مقصود وہ سخت احکام ہیں جو گزشتہ انبیاء کی امتوں کے لئے تھے۔ [2]

ان مومنین کے اوصاف میں "امنوا بہ" کے ساتھ "وعزّروہ" جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ کی عظمت کو مدنظر رکھتے اور آپ کی تعظیم و تکریم کرتے۔ [3]

ان کے لئے سرمۂ چشم ہے جو تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو داخل شرک قرار دیتے ہیں۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

''کہیے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف بھیجا ہوا اس اللہ کا پیغمبر ہوں جس سے مخصوص ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت، کوئی خدا نہیں سوا اس کے جو جلاتا اور مارتا ہے تو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے نبی امّی پیغمبر پر جو اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو، شاید کہ تم صحیح راستے پر آجاؤ۔''

رسالت محمدی کی ہمہ گیری

یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ ہمہ گیر اعلان رسالت ہے جس میں کسی قوم وقبیلہ، کسی ملک بلکہ کسی دور کی بھی تخصیص نہیں ہے جس میں خطاب کی عمومیت ہی ہمہ گیری کے لئے کافی تھی اور پھر "جمیعا" کے لفظ نے اس میں اور قوت پیدا کردی۔ [4]

اس کے برخلاف کسی ایک جگہ بھی قرآن میں یا ایھا العرب، کہہ کے آواز نہیں دی گئی ہے۔ اس لئے اس دور کے بعض سیکولر قسم کے افراد کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو ان الفاظ میں ماننا کہ وہ عرب قوم کی ہدایت کے لئے آئے تھے اور انہوں نے قوم عرب کو بہت اچھی تعلیم دی اور وہ بڑے درجہ کے رسول تھے وغیرہ وغیرہ، یہ رسالت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اس پیغام کے ساتھ جو آپ نے پیش کیا تھا کفر ہی ہے۔ دینی اصطلاح میں جیسا کہ کلمات معصومینؑ سے معلوم ہوا ہے، رسالت کا منصب نبوت سے بالا ہے پھر ان دونوں آیتوں میں ''رسول'' کہہ کر

---

[1] ۔خواهد نوشت رحمت اخرویه برای آنانکه پیروی می کنند (شاه ولی الله)

[2] ۔امرهم یعنی الثقل بامور محرمة فی تکلیفها مشقة کتحریم العروق والغدد و تحریم السبت (تبیان)

[3] ۔تعظیم کردند اورا (شاه ولی الله) عزّروه وقرّوه (جلالین)

[4] ۔امر سبحانه نَبِیّنَا ان یخاطب جمیع الخلق من العرب والعجم (مجمع التبیان)

حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصف ''نبی'' کے ساتھ کیوں لایا گیا ہے؟ اس کا راز بائبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اور اس کا حوالہ گزشتہ آیت میں دیا بھی گیا ہے کہ: يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وہ اسے پا رہے ہیں لکھا ہوا توریت میں بھی اور انجیل میں بھی''.....ان دونوں کتابوں میں اب بھی وہ فقرے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے ماسلف نے اس پیغمبر کے آنے کی اطلاع ''وہ نبی'' کہہ کر دی تھی۔ گویا کہ اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لقب انبیاء کی زبان میں ''النبی'' تھا۔ اسی لئے قرآن میں خالق کی طرف سے آپ کے ساتھ تخاطب اکثر ''یا ایھا النبی'' کے الفاظ میں کیا گیا ہے اور ان دونوں آیتوں میں رسول کہنے کے بعد آپ کو ''النبی'' کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

''اور موسیٰ ؑ کی قوم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو حق کا رستہ دکھاتے ہیں اور اس کے ساتھ منصفانہ فیصلہ کرتے ہیں''[1]

جن کا یہ وصف ہوگا، وہ حق کی آواز پہنچنے پر اسے قبول کر ہی لیں گے لہٰذا وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان اختیار کر لیں گے اور جو ان کی کتابوں میں آپ کی بشارتیں ہیں، وہ دوسرے لوگوں کو بھی سنا کر انہیں ایمان کی دعوت دیں گے۔

لیکن بعض روایات سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ امۃ مسلمہ یعنی مسلمان قوم سے الگ ایک طبقہ کا پتہ دیا جا رہا ہے جو کسی دور دراز مقام پر بسا ہوا ہے اور وہ صحیح معنی میں شریعت موسوی پر عامل ہوتے ہوئے خالق کی توصیف وثناء کا مستحق ہوا ہے[2] اور چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت اس تک پہنچی ہی نہیں لہٰذا اس کے لئے وہی شریعت موسوی پر قائم رہنا نجات کے لئے کافی قرار پایا ہے۔[3]

وَ قَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

''اور ہم نے انہیں بارہ نسلوں کے اعتبار سے[4] گروہوں میں تقسیم کیا اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی جب ان سے ان کی قوم نے پانی پلانے کی درخواست کی کہ تم اپنی لکڑی کو مارو پتھر پر تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ

---

[1] ۔ای بالحق یکون ویعدلون فی حکمھم (مجمع البیان)

[2] ۔قال ابو جعفر علیہ السلام ھم قوم خلف الرمل لم یغیروا ولم یبدلوا (تبیان)

[3] ۔لا یمنع ان یکون قوم لم تبلغھم الدعوۃ من النبی علیہ السلام فلا نحکم بکفرھم (تبیان)

[4] اسباطا ای قبائل (جلالین)

پڑے۔ ہر گروہ نے اپنا پان گھاٹ جان لیا اور ہم نے ان پر ابر کا سایہ کیا اور ان پر من وسلویٰ اتارا کہ کھاؤ اچھی غذاؤں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔''

اسباط بنی اسرائیل کی تعداد

اللہ کے جتنے احکام ہوتے ہیں، وہ دوسروں کی بھلائی کے لئے ہوتے ہیں اور ان کی مخالفت سے اللہ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ خود ان کا نقصان ہوتا ہے، اس اعتبار سے اکثر جگہ کافروں اور بداعمالوں کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ ہم پر ظلم تھوڑی کرتے ہیں خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں یعنی بھگتان اس ظلم کا انہی کو بھگتنا پڑتا ہے اور نقصان انہی کا ہوتا ہے [1] ورنہ جہاں تک ان کے کردار کا تعلق ہے، یہ بے شک اللہ پر ظلم کرتے ہیں کہ اس کے حقوق کو ادا نہیں کرتے جیسا کہ شرک کے لئے قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔ (لقمان۔ ۱۳)

واقعات اس آیت میں جتنے بیان ہوئے ہیں ان کا ذکر قرآن میں آچکا ہے اور وہاں ان کی تشریح ہو چکی ہے۔

وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِىْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

''اور جب ان سے کہا گیا کہ اس بستی میں جا کر قیام کرو اور وہاں جس جگہ سے چاہو کھاؤ اور ''حِطّہ'' کہو اور دروازہ میں داخل ہو سجدہ کرتے ہوئے تو ہم تمہاری غلطیوں کو معاف کر دیں گے جو نیک اعمال والے ہیں، ان کو زیادتی عطا کریں گے تو جو ان میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے، انہوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی بدل کر دوسری بات کہہ دی تو ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا، اس وجہ سے کہ وہ ظلم کرتے رہتے تھے۔''

اس واقعہ کا ذکر پہلے پارہ میں ہو چکا ہے۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

''اور ان سے اس بستی کا حال پوچھو جو دریا کے کنارے تھی جب کہ وہ ہفتے کے دن کے بارے میں حد سے قدم

---

[1] ۔معناہ ما نقصونا شیئا ولکن نقصوا انفسھم (تبیان)

آگے بڑھاتے تھے، جب کہ ان کے پاس ان کی مچھلیاں کھلے بندوں آتی تھیں اس دن جب وہ ہفتہ کے احترام کے پابند ہوتے تھے [1] اور جب ہفتہ کا دن نہیں ہوتا تھا [2] تو وہ نہیں آتی تھیں۔ یوں ہم ان کی آزمائش کرتے تھے، اس بنا پر کہ وہ بداعمالیاں کیا کرتے تھے"۔

اہل سبت کا ذرا تفصیلی تذکرہ

یہ بستی کون سی تھی؟ اس میں کئی قول ہیں جن میں سے کوئی بھی مستند نہیں ہے [3] لہٰذا اس کی تعیین وثوق کے ساتھ بالکل نہیں ہوسکتی۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

"اور جب ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ کیوں نصیحت کرتے ہو ایسے لوگوں کو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں بہت سخت عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے تو انہوں نے کہا کہ صرف اپنے پروردگار کے پاس عذر پیش کرنے کے لئے اور یہ کہ شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں۔"

اسے گزشتہ آیت کے سلسلہ ہی میں لیا جائے تو یہ مطلب ہوتا ہے کہ ان اصحاب سبت کو نصیحت کرنے والے افراد سے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انہیں نصیحت کرنے سے فائدہ کیا ہے؟ [4]

مگر اس کے قبل کی آیات میں چونکہ اس نصیحت اور ان نصیحت کرنے والوں کا کوئی ذکر نہیں ہے اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اسی سلسلہ کی آیت ہے۔ پھر بھی چونکہ اس کے بعد کی آیتیں زیادہ واضح طور پر انہی لوگوں کے بارے میں ہیں جو اصحاب السبت تھے لہٰذا اس آیت کا بھی اسی سلسلہ میں ہونا زیادہ سمجھ میں آتا ہے۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ مضمون اس کا کسی ایسے ہی موقع سے متعلق ہے جس میں کچھ مرتکب گناہ ہوں، کچھ انہیں نصیحت کرتے ہوں اور کچھ لوگ تماشائی کے طور پر خاموش ہوں اور یہ خاموش رہنے والے ہی وہ ہیں جو نصیحت کرنے والوں کو یہ کہہ کر منع کرتے ہیں [5] کہ آخر انہیں نصیحت کرنے سے فائدہ کیا؟ یہ لوگ تو کم بخت عذاب کے مستحق ہو ہی رہے ہیں۔ اس پر وہ لوگ جو نصیحت کر رہے ہیں یہ جواب دیتے ہیں۔

چونکہ وہ امت جو اپنی بداعمالی سے عذاب کی حقدار ہوتی ہے جب اس پر عذاب آیا کیا ہے، تو اس نے ان لوگوں کو بھی گھیر لیا ہے جو ان کے ساتھ اصل عمل میں شریک نہ تھے مگر خاموش رہے تھے جیسا کہ اس کے پہلے گوسالہ پرستی کے سلسلہ میں آچکا ہے، اس لئے ان نصیحت کرنے

---

[1] ۔روزی که ایشاں بتعظیم شنبه مشغول می شدند (شاه ولی الله)

[2] ۔یوم لا یکون السبت (مجمع البیان)

[3] ۔هی ایلة عن ابن عباس وقیل هی مدین عنه ایضا وقیل الطبریة عن الزهری (مجمع البیان)

[4] ۔فکانو اثلث فرق: فرقة قانصة وفرقة ساکنة وفرقة واعظة (مجمع البیان) اهل دیه سه قسم بودند قسمی شکار می کردند و قسمی از ان نهی می کردند و قسمی نه شکار کردند و نه از ان منع کردند (فتح الرحمن)

[5] ۔فقال الساکتون للواعظین والناهین (مجمع)

والوں کا یہ کہنا کہ ''پروردگار کے پاس عذر پیش کرنے کے لئے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نصیحت کرنے کے بعد کم از کم پیش خدا ہم معذور قرار پائیں گے، اس لئے اس عذاب کا استحقاق نہ ہوگا جس کا سکوت کی صورت میں اندیشہ ہے۔ [1]

پھر آخری فقرہ: "لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ" یہ بتلاتا ہے کہ ان کی طرف سے بالکل مایوسی کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان میں سے کسی پر کوئی اثر نصیحت کا نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ کوئی ان میں سے نصیحت کا اثر قبول ہی کر لے [2] تو وہ اس نصیحت کا پورا ماحاصل ہوگا اور اس لئے یہ اس اصول کے خلاف بھی نہیں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب کی شرط ہے کہ سننے والے کے اثر لینے کا کم از کم احتمال ہو، ورنہ یہ فریضہ عائد نہ ہوگا۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿١٦٥﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿١٦٦﴾

''تو جب انہوں نے بھلا دیا اسے جو انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے انہیں نجات دے دی جو برائی سے روکتے رہتے تھے اور انہیں کہ جو ظالم تھے، ان کی بداعمالی کے سبب سے سخت عذاب میں گرفتار کر دیا اور جب انہوں نے سرکشی کی ان چیزوں کے بارے میں جن سے وہ روکے جاتے تھے تو ہم نے انہیں کہا کہ ہو جاؤ ذلیل بندر۔''

اہل سبت کا عذاب الٰہی سے مسخ ہو جانا

پہلی آیت میں چونکہ نجات کو روکنے والوں سے مخصوص قرار دیا گیا ہے، اس لئے ظالموں کے تحت میں وہ بھی داخل سمجھے جا سکتے ہیں جو خاموش رہے اور اس طرح عذاب ان کے لئے بھی ثابت ہوگا مگر دوسری آیت میں جو کہا گیا کہ ''انہوں نے سرکشی سے کام لیا ان چیزوں میں کہ جن سے وہ روکے جاتے تھے'' اس سے مراد وہی ہو سکتے ہیں جو اصل مرتکب تھے کیوں کہ روکے وہی جاتے تھے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ عذاب الٰہی ان کے لئے نہیں تھا جو عملاً ان سے علیٰحدہ رہتے تھے، اگرچہ خاموش رہے ہوں۔

ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ پہلی آیت کی بنا پر ظالمین کے لفظ کو دونوں پر حاوی سمجھا جائے اور اس طرح وہ عذاب جو ظلم کے نتیجہ میں ہے دونوں کے لئے ہو لیکن یہ خاص عذاب یعنی بندروں کی شکل میں مسخ ہونا، انہی لوگوں کے لئے ہو جو اصل میں مرتکب گناہ تھے۔

بہرحال ان خاموش رہنے والوں کے لئے آیت کے الفاظ سے کوئی واضح نتیجہ نہیں نکلتا جسے صدر اول کے مفسرین بھی پیچیدہ مسئلہ سمجھتے رہے تھے [3]۔

---

[1] ۔لئلا ینسبتا الیٰ تقصیر فی ترك النهی (جلالین)

[2] ۔لعلهم یتقون الصید (جلالین)

[3] ۔قال ابن عباس ما ادری ما فعل بالفرقة الساکتة وقال عکرمة لم تهلك لانها کرهت ما فعلوه وقالت لم تعظون الخ وروی الحاکم عن ابن عباس رضی اللہ عنہ انه رجع الیه واعجبه (صافی) روی عن ابن عباس فیهم ثلثة اقوال (مجمع البیان)

اس ذیل میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ جناب ابن عباسؓ اس آیت کو اپنے دور کے حالات پر منطبق کر کے روتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہم اس وقت اسی تیسرے گروہ میں داخل ہیں اور اس لئے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارا مستقبل کیا ہوگا۔ [1]

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖۚ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾

''اور جب کہ تمہارے پروردگار نے یہ اطلاع دے دی ہے [2] کہ وہ ان کے خلاف قیامت کے دن تک ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہے گا جو انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتے رہیں گے یقیناً تمہارا پروردگار بہت جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بلاشبہ بڑا بخشنے والا بھی ہے، بڑا مہربان۔''

یہ آیت یہود کے لئے بظاہر حکم قطعی کی حیثیت رکھتی ہے کہ روز قیامت تک برابر ایسے افراد کے ہاتھ میں مبتلا رہیں گے جو انہیں طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں چنانچہ بارہ تیرہ سو برس کا مشاہدہ اس کی تصدیق کرتا رہا۔ اس لئے یہ حکم ہمیشہ اٹل سمجھا جاتا رہا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ خود اسی آیت میں آخری جملہ کو ''وہ بلاشبہ بڑا بخشنے والا بھی ہے، بڑا مہربان''۔ اس کی گنجائش پیدا کرتا ہے کہ یہ قوم بھی اپنے کردار کی کبھی اگر اصلاح کر لے تو جس حد تک وہ اصلاح کرے، اس حد تک یہ عذاب کم یا برطرف بھی ہو سکتا ہے۔

خیر، یہ تو یہود کا معاملہ ہے مگر یہاں پر شاہ عبدالقادر صاحب کا یہ نوٹ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ:

''یہ احوال اس امت کو سنایا ہے کہ یہ سب کچھ ان پر بھی ہوگا۔'' (موضح القرآن)

اسے یاد رکھیں وہ افراد امت جو اپنی نکبت پر اللہ سے ''شکوہ'' کرنے بیٹھتے ہیں۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾

''اور ہم نے انہیں دنیا میں بہت سی جماعتوں کی شکل میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ان میں نیک لوگ ہیں اور ان میں ان کے علاوہ بھی ہیں اور ہم نے بھلائیوں اور برائیوں کے ساتھ ان کی آزمائش کی، شاید وہ اللہ سے لو لگائیں''۔ [3]

یہ ھُم کی ضمیر بنی اسرائیل کی طرف ہے کہ ان کے بہت سے جتھے ہو گئے۔

''بھلائیوں اور برائیوں کے ساتھ'' یعنی کبھی دنیا کے راحت و آرام اور اقتدار و دولت کے ساتھ ان کی آزمائش کی اور کبھی تکلیف و

---

[1] ۔روی عن عطا ان رجلہ دخل علیٰ ابن عباس وبین یدیہ المصحف وھو یبکی وقد اتیٰ علیٰ ھٰذہ الآیۃ الیٰ اخرھا فقال ابن عباس قد عملت ان اللہ اھلك الذین اخذوا الحیتان وانجا الذین نھو ھم ولا ادری ماصنع بالذین لم ینھو ھم ولم یواقعوا المعصیۃ وھی حالنا (تبیان)

[2] ۔معنی ''تأذن'' اعلم (تبیان)

[3] ۔ای یرجعوا الیٰ طاعہ وینیبوا الیٰ امتثال امرہ (تبیان)

اذیت اور مصیبت ونکبت میں مبتلا کر کے [1] کہ ان میں سے ہر ایک چیز باختلاف مزاج وطبیعت اصلاح کا ذریعہ ہوسکتی ہے۔

فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ وَّرِثُوا الۡكِتٰبَ يَاۡخُذُوۡنَ عَرَضَ هٰذَا الۡاَدۡنٰى وَيَقُوۡلُوۡنَ سَيُغۡفَرُ لَنَا ۚ وَاِنۡ يَّاۡتِهِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُهٗ يَاۡخُذُوۡهُ ؕ اَلَمۡ يُؤۡخَذۡ عَلَيۡهِمۡ مِّيۡثَاقُ الۡكِتٰبِ اَنۡ لَّا يَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ وَدَرَسُوۡا مَا فِيۡهِ ؕ وَالدَّارُ الۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾

''تو ان کے بعد ایسے ناخلف [2] توریت کی ذمہ داری کے حامل ہوئے جو اس دنیا کے عارضی ساز وسامان [3] کو اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو بخش ہی دیئے جائیں گے، اور اگر اتنا ہی اور عارضی ساز وسامان ہاتھ آئے تو اس پر بھی قبضہ کریں۔ کیا ان سے توریت والا یہ عہد و پیمان نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی نسبت نہ کہیں کوئی بات سوا حق کے اور انہوں نے پڑھا ہے اسے جو اس میں ہے اور آخرت والا گھر بہتر ہے ان کے لئے جو پرہیزگار ہوں، پھر کیوں تم عقل سے کام نہیں لیتے ہو؟!''

ان ناخلفوں سے جو توریت کے وارث ہوئے علمائے یہود مراد ہیں [4] جن کا سب سے بڑا برائیوں کا سرچشمہ قرآن نے دنیا طلبی کو قرار دیا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ علماء کے طبقہ میں یہی فساد کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے جس سے ان کے علیٰحدہ رہنے کی ضرورت ہے۔

اور یہ جو ارشاد ہوا کہ ''اتنا ہی عارضی ساز وسامان اور ہاتھ آئے تو اس پر بھی قبضہ کر لیں''، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا طلبی کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں جس پر کبھی ان میں ندامت و پشیمانی بھی پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کو اپنی کامیابی و کامرانی سمجھتے ہیں [5] اور اس کے بعد بھی مغفرت کا تصور رکھتے ہیں حالانکہ مغفرت تو اس کی ہوتی ہے جو گناہ پر اصرار نہ رکھتا ہو [6] اور گناہ پر اصرار کے باوجود مغفرت کا تصور ہی خدا پر ایک طرح کا بہتان ہے، اس لئے کہ اس نے کبھی ایسا وعدہ نہیں کیا۔ [7]

وَالَّذِيۡنَ يُمَسِّكُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِيۡنَ ﴿۱۷۰﴾

---

[1] ۔بلوناھم بالنعم والنقم والرخاء الشدۃ (مجمع البیان)

[2] ۔جانشینان بد (شاہ ولی اللہ) برے جانشین (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔العرض مایعرض ویقلّ لبثہ (مجمع البیان)

[4] ۔یعنی احبار بنی اسرائیل (فتح الرحمن)

[5] ۔دلیل علیٰ اصرارھم (تبیان)

[6] ۔ای یرجون المغفرۃ وھم عائدون الیٰ ما فعلوہ مصرون علیہ (جلالین)

[7] ۔فلم کذبوا علیہ بنسبۃ المغفرۃ الیہ مع الاصرار (جلالین)

''اور جو لوگ کتاب کے ساتھ تمسک رکھتے ہیں [1] اور جو ''صلوٰۃ'' ادا کرتے رہے ہیں تو بلا شبہ ہم درست اعمال رکھنے والوں کے ثواب کو برباد نہیں کرتے۔''

اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ دور فترت میں یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پہلے اہل کتاب میں ایسے لوگ تھے جو انبیاء کے تعلیمات کی پیروی کرتے تھے اور جو اس وقت طریقۂ عبادت تھا اور اس دور میں ''صلوٰۃ'' سے موسوم وہی طریقہ تھا، اس پر قائم تھے۔ یہ پیش خدا ضرور اجر پائیں گے۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اب جنہوں نے توریت وغیرہ کی بشارتوں پر عمل کرتے ہوئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اختیار کیا اور نماز ادا کی یعنی مسلمان ہوئے اور اس طریقہ سے عبادت کرنا اختیار کیا، وہ نجات پائیں گے۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

''اور جب ہم نے پہاڑ جڑ سے اکھاڑ کر بلند کیا ان پر جیسے کہ وہ ایک سائبان ہے اور انہیں گمان ہوا کہ وہ ان پر گرا ہی چاہتا ہے کہ لو اسے جو ہم نے تمہیں دیا ہے مضبوطی کے ساتھ اور یاد رکھنا اسے جو اس میں ہے، شاید تم بچاؤ کا سامان کر لو۔''

پہاڑ کے اونچا کرنے کا ذکر پہلے کئی مقامات پر آچکا ہے، یہاں جو لفظ صرف کیا گیا ہے، اس کے معنی میں ''جڑ سے اکھاڑنے'' کے پہلو کا اضافہ ہے [2] یعنی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ پہاڑ کا کوئی ٹکڑا الگ ہو کر ان کے سر پر بلند ہو گیا ہو بلکہ پہاڑ سر تا سر نہ سہی تو کم از کم اس کا وہ جزء جو ان کے حد نظر کے سامنے ہے، پورا زمین سے اکھڑ کر اونچا ہوا اور ان کے سر پر سایہ افگن ہوا جیسے کہ وہ ان پر گرا چاہتا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

''اور جب کہ تمہارے پروردگار نے اولاد آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو لیا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں! ہم گواہی دیتے ہیں، اس لئے کہ [3] کہیں تم بروز قیامت

---

[1] ۔یمسکون بالکتاب و یمسکون و یتمسکون و ستمسکون بمعنی واحد (تبیان)

[2] ۔النتق قلع الشیء من الاصل (مجمع البیان)

[3] ۔این شاهد گرفتن برای احتراز از ان است که نگویند (شاه ولی الله)

یہ نہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے یا تم کہو کہ اصل شرک تو ہمارے باپ دادا نے پہلے کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی نسل تھے تو کیا تو ہمیں ہلاک کرے گا اس سبب سے جو باطل پرستوں نے کیا اور اس طرح ہم حقیقتوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور شاید وہ رجوع کریں"۔ [1]

عہد آلست اور عالم ذر

اس آیت کی بنا پر "عالم ذر" اور "روزِ الست" کے محاورات مسلمانوں میں رائج ہوئے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قبل تخلیق ظاہری ایک وقت ایسا تھا کہ تمام اولاد آدم علیہ السلام کسی خاص شکل میں بیک وقت جمع کی گئی تھی اور اس سے یہ سوال و جواب ہوا تھا۔

بعض لوگ اسے کسی ایک دن کی بات نہیں قرار دیتے بلکہ اسے رفتہ رفتہ جو نسلیں ظہور پذیر ہوتی ہیں ان سب کے متعلق بیانِ حال کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے الفاظ عجیب ہیں جن سے شروع میں سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اس کے قائل ہیں جو مشہور عقیدہ ہے کہ یہ کوئی خاص دن تھا اور بعد میں کچھ ایسا کہہ دیا ہے جو دوسرے تصور کا پتہ دیتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

یعنی روز میثاق از آدم اولاد اورا پیدا کرد و از ایشان اولاد ایشان را بتربیتی کہ در خارج متحقق شود (فتح الرحمٰن)

یعنی عہد الست کے دن آدمؑ سے ان کی اولاد کو پیدا کیا اور ان سے ان کی اولاد کو اس ترتیب سے جو ان کی وجود خارجی میں واقع ہوگی۔

شاہ عبدالقادر نے اس کو واضح طور پر قبل تخلیق سے متعلق قرار دیا ہے مگر یہ زیادہ صاف نہیں کہ یہ معاملہ بحیثیت مجموعی سب سے ایک ہی دن ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کرایا اپنی خدائی کا اور پھر پشت میں داخل کیا۔ اس سے مدعا یہ کہ خدا کو ماننے میں ہر کو آپ کی بات ہے۔ باپ کی تقلید نہیں۔ اگر باپ شرک کرے تو بیٹا ایمان لاوے، اگر کسی کو شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا۔ پھر کیا حاصل تو یوں سمجھے کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں رہا ہے اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ سب کا خالق ہے۔ سارا جہاں قائل ہے اور جو کوئی منکر ہے اور جو شرک کرتا ہے، سو اپنی عقل ناقص کے دخل سے، پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے" (موضح القرآن)

جو سوال ممدوح نے اٹھایا ہے، اس کا جواب صاحب جلالین نے یوں دیا ہے:

و التذکیر بہ علیٰ لسان صاحب المعجزۃ قائم مقام ذکرہ فی النفوس.

صاحب اعجاز کی زبانی اس کی یاددہانی قائم مقام ہے اس کی کہ خود اپنے ذہن میں اس واقعہ کی یاد موجود ہوتی۔

ہمارے بعض بالغ نظر علماء جنہیں جرأتِ تحقیق عطا ہوئی تھی اور وہ مخالفت جمہور میں سطحی نگاہ والوں کی طرف سے انکارِ مسلمات کے الزام کی پرواہ نہیں رکھتے تھے جیسے علم الہدیٰ جناب سید مرتضیٰؒ "امالی" میں اور شریف رضی موسوی "حقائق للتاویل" میں اور جناب شیخ الطائفہ "تبیان" میں اس شہرت عامہ کو الفاظ قرآنی اور عقل کے خلاف قرار دیتے ہیں اور انہوں نے اس کا مفہوم دوسرا قرار دیا ہے جس کے بعد وہ سوال جو مذکورہ تصور

---

[1] ۔ نبینہا مثل ما بینا المیثاق لیتدبروہا ولعلہم یرجعون عن کفرہم (جلالین)

میں اٹھ رہا تھا ختم ہو جاتا ہے چنانچہ انہی قدیم اکابر علماء کا تتبع کرتے ہوئے اس نقطۂ نظر کو جناب امین الاسلام علامہ طبرسیؒ نے ''مجمع البیان'' میں چونکہ کافی وضاحت کے ساتھ درج کیا ہے لہٰذا اس بحث کی اہمیت کے پیش نظر اس مقام پر اس تفسیر کی پوری بحث کو جو اس آیت کے متعلق ہے عیون الفاظ کے ساتھ مع ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

ذکر سبحانه ما اخذ علی الخلق من المواثیق بعقولهم عقیب ما ذکره من المواثیق التی فی الکتب جمعابین دلائل السمع والعقل وابلاغافی اقامة الحجة فقال: واذا خذربك ای واذکر لهم یا محمد اذا خرج ربك من بنی اٰدم من ظهور هم ای من ظهور بنی اٰدم ذریتهم واشهد هم علیٰ انفسهم الست بربکم قالوا بلیٰ. اختلف العلماء من العام والخاص فی معنی هٰذه الأیة وفی هٰذا الاخراج والاشهاد علی وجوه! احدها ان الله تعالیٰ اخرج ذریة اٰدم من صلبه کهیئة الذر فعرضهم علی اٰدم وقال انی اٰخذ علی ذریتك میثاقهم ان یعبدوفی ولا یشرکوا بی شیئاً ثم قال لهم الست بربکم قالوا بلیٰ شهدنا انك ربنا فقال للملئکة اشهدوا فقالوا شهدنا وقیل ان الله تعالیٰ جعلهم فهمآء عقلآء یسمعون خطابه ویفهونه ثم ردهم الیٰ صلب اٰدم و الناس محبوسون باجمعهم حتی یخرج کل من اخرجه فی ذٰلك الوقت وکل من ثبت علی الاسلام فهو علی الفطرة الاولیٰ ومن کفر وجحد فقد تغیر عن الفطرة اولاولیٰ عن جماعة من المفسرین وردوافی ذلك اٰثارا بعضها مرفوعة وبعضها مرفوعة یجعلونها تاویلا للأیة ورد المحققون هٰذا التاویل وقالوا انه مما یشهد ظاهر القراٰن بخلافه لا نه تعالیٰ قال: واذ اخذ ربك من بنی اٰدم ولم یقل من اٰدم وقال من ظهور هم ولم یقل من ظهره وقال ذریتهم ولم یقل ذریته ثم اخبر تعالیٰ بانه فعل ذٰلك لئلا یقولوا انهم کانوا عن ذٰلك غافلین او یعتذر وابشرك اٰبائهم وانهم نشأوا بینهم وهٰذا یقتضی ان یکون لهم اٰبآء مشرکون فلا یتناول الظاهر ولد اٰدم لصلبه وایضاً فان هٰذه الذریة المستخرجة من صلب اٰدم لا یخلوا ما ان جعلهم الله عقلاء اولم یجعلهم کذٰلك فان لم یجعلهم عقلاء فلا یصح ان یعرفوا التوحیدوان یفهوا خطاب الله تعالیٰ وان جعلهم عقلاءواخذعلیهم المیثاق فیجب ان یتذکر واذٰلك ولا ینسوه لان اخذ المیثاق لا یکون حجة علی الماخذ علیه الا ان یکون ذاکر اله فیجب ان نذکر نحن المیثاق ولا نه لایجوزان ینسی الجمع الکثیر والجمّ الغفیر من العقلاء شیئا کانوا عرفوه ومیزوه حتیٰ لا یذکره احد منهم وان طال العهد الاتریٰ ان اهل الجنة یعرفون کثیرا من احوال الدنیا حتی یقول اهل الجنة ان قد وجدنا ما وعدربنا حقا ولو جاز ان ینسوا ذٰلك مع هذا الکثرة جاز ان یکون الله تعالیٰ قد کلف الخلق فیما مضی ثم اعادهم اما لیثیبهم واما لیعاقبهم ونسوا ذٰلك وذٰلك یؤدی الی التجاهل والی صحة مذهب التناسخیه.

خداوند عالم نے ان عہد و پیمان کے واقعات کے ذکر کے بعد جو کتب سماوی میں خلق خدا سے لئے گئے تھے، اس عہد و پیمان کا ذکر کیا ہے جو ان سے ان کے عقل وضمیر کے ذریعہ سے لئے گئے ہیں تاکہ نقلی اور عقلی دلائل ہم آہنگ ہو جائیں اور استدلال میں کوئی پہلو باقی نہ رہ جائے تو ارشاد کیا: اور وہ موقع جب تمہارے پروردگار نے لیا یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ ہنگام یاد دلائیے جب آپ کے پروردگار نے اولاد آدم سے ان کی

پشتوں سے یعنی اولاد آدم کی پشتوں سے برآمد کیا ان کی نسل کو اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں۔ سنّی اور شیعہ علماء کے درمیان اس آیت کے معنی اور اس برآمد کرنے اور گواہ بنانے کے بارے میں اختلاف ہوا ہے جس میں چند قول ہیں:۔ پہلے یہ کہ خداوند عالم نے آدمؑ کی نسل کو جو ان کے صلب سے پیدا ہونے والی تھی، چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں (ذروں) کی شکل میں برآمد کر کے ان سب کو آدم کے سامنے پیش کیا اور کہا میں تمہاری نسل سے عہد و پیمان لینا چاہتا ہوں کہ وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں پھر ان سب سے کہا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں ہم اس کے گواہ ہیں کہ تو ہمارا پروردگار ہے، تو فرشتوں سے ارشاد ہوا کہ تم گواہ رہنا انہوں نے کہا ہم گواہ ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ اللہ نے ان کو فہم و عقل عطا کی کہ وہ اس کے تخاطب کو سنیں اور سمجھیں۔ پھر انہیں آدم کی پشت کی طرف پلٹا دیا اور آدمیوں کا سلسلہ اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک کہ وہ تمام اشخاص جو اس وقت تک باہر آئے تھے پیدا ہو کر باہر آجائیں اور جو مسلمان رہتا ہے وہ اپنی اصلی فطرت پر برقرار رہے اور جو کافر ہوتا اور جان بوجھ کر انکار کرتا ہے، وہ اپنی پہلی فطرت سے پلٹ گیا ہے۔ یہ قول مفسرین میں ایک جماعت کا ہے، اور اس بارے میں انہوں نے حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن میں سے بعض کا استناد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے اور بعض کی سند بیچ میں رک گئی ہے، ان روایات کو وہ اس آیت کی تفسیر قرار دیتے ہیں اور محققین نے اس تفسیر کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے ظاہری معنی اس تفسیر کے خلاف ہیں۔ اس لئے کہ ارشاد ہوا ہے کہ ''جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے برآمد کیا، یہ نہیں کہا کہ آدم سے اور کہا کہ ان لوگوں کی پشتوں سے یہ نہیں کہا کہ آدمؑ کی پشت سے اور کہا ان لوگوں کی نسل سے اور یہ نہیں کہا کہ آدم کی نسل سے پھر یہ ارشاد ہوا کہ اللہ نے یہ اس لئے کیا کہ وہ یہ نہ کہیں کہ وہ اس سے بے خبر تھے یا یہ عذر نہ کریں کہ ان کے آباؤ اجداد نے شرک کیا تھا اور وہ انہی میں پلے بڑھے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد میں مشرک افراد تھے لہٰذا ان کے ظاہری مفہوم میں آدم کی براہ راست صلبی اولاد داخل نہیں ہے، اس کے علاوہ یہ نسل جو برآمد کی گئی تھی آدم کی صلب سے اس میں دو ہی صورتیں ہیں:۔ یا تو یہ کہ اللہ نے ان کو عقل عطا کی تھی یا صاحب عقل نہیں بنایا تھا۔ اگر انہیں عقل و تمیز عطا نہیں کی تھی تو ان کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ توحید کو جانیں اور اللہ کے تخاطب کو سمجھیں اور اگر انہیں صاحب عقل و شعور بنایا تھا اور پھر ان سے عہد و پیمان لیا تو ضرور انہیں وہ پیمان یاد ہونا چاہیے اور فراموش نہ ہونا چاہیے اس لئے کہ عہد و پیمان کا لینا اس شخص کے خلاف جس سے وہ عہد لیا گیا تھا سند نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اسے یاد نہ ہو لہٰذا ضروری ہے کہ ہمیں وہ عہد و پیمان یاد ہو اور پھر یہ ممکن بھی نہیں کہ اتنا بڑا مجمع اور صاحبانِ عقل کا جم غفیر ایک ایسی چیز کو جسے انہوں نے جانا تھا اور سمجھا تھا ایک دم بھول جائیں اس طرح کہ ایک کو بھی ان میں سے یاد نہ ہو چاہے زمانہ کتنا ہی زیادہ گزر گیا ہو کیا تم نہیں دیکھتے کہ اہل بہشت دنیا کے گزرے ہوئے بہت سے حالات کو محسوس کر رہے ہوں گے، یہاں تک کہ (اہل دوزخ سے) کہیں گے کہ جو ہمارے پروردگار نے ہم سے وعدہ کیا تھا ہم نے اسے سچا پایا اور اگر اتنی کثرت تعداد کے باوجود بھول ممکن ہو تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ قبل کے جنم میں اللہ نے احکام جاری کئے ہوں پھر اب انہیں اس دنیا میں لایا ہوتا کہ اس جنم کے اعمال کا ثواب دے یا عذاب کرے مگر وہ اس جنم کو بھولے ہوئے ہیں، اس کا نتیجہ اصول دین میں شک پیدا ہونا ہے اور پھر آواگون کا تصور درست ہو جائے گا۔

اس طویل عبارت میں جو استعاراتِ عقل مذکور ہیں، ان کا میری نظر میں اتنا وزن نہیں ہے جتنا الفاظ آیت سے اس استدلال کا کہ اس آیت میں ضمیر خود جناب آدمؑ کی طرف نہیں ہے، نہ ان کا خود پہلے ذکر ہے بلکہ قبل میں بنی آدم کا ذکر ہے اور **ظھورھم** اور **ذریتھم** یہ ضمیریں سب انہی کی طرف ہیں لیکن آغاز آیت جس انداز سے ہوا ہے: **واذا اخذ ربك** جس کے معنی عموماً اس طرح کے ہوتے ہیں کہ وہ موقع بھی خاص تھا

یاد وہ موقع بھی یاد رکھنے کا ہے، یہ انداز بتاتا ہے کہ یہ کسی ایک وقت پر وقوع میں آنے والے کسی واقعہ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ حدیثوں میں بھی جیسا کہ مذکورہ بالا عبارت میں اشارہ موجود ہے 'یوم الذر اور یوم اخذ المیثاق' یعنی عہد الست کا ذکر ہے۔ اس لئے ان محققین کی اتنی مستحکم بحث کے بعد بھی میں اس مرحلہ میں کسی قابلِ اطمینان نتیجہ تک نہیں پہنچا ہوں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿١٧٥﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿١٧٦﴾ سَآءَ مَثَلًا ِّالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿١٧٧﴾

''اور ان کے سامنے بیان کیجئے واقعہ اس کا جسے ہم نے اپنی آیتیں عطا کیں تو وہ ان سے عاری ہو گیا جس کے بعد شیطان اس کے پیچھے لگ گیا وہ گمراہوں میں سے قرار پایا اور اگر ہم چاہتے تو ان کی وجہ سے اسے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو خود زمین سے لگ گیا اور اپنی نفسانی خواہش کا پیرو ہو گیا تو اس کی کیفیت اس کتے کی سی ہوئی کہ اگر اس پر بوجھ رکھو تو وہ زبان منہ سے نکالے یا اسے یونہی چھوڑ دو تو بھی زبان باہر نکالے۔ یہ مثال ہے ان کی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور آپ یہ واقعات پیش کرتے رہے شاید وہ غور کریں۔ کیا بری مثال ہے اس جماعت کی جس نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور جو خود اپنے اوپر ستم ڈھاتے رہے''۔

''اپنی آیتیں عطا کیں'' یعنی ان کا علم دیا۔[1]

''وہ ان سے عاری ہو گیا'' یعنی ان آیات کے علم کا جو تقاضا تھا اسے ترک کر دیا۔[2]

ایک عالم بے عمل کا حال

یہ آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ کسی شخص خاص کا واقعہ ہے جو عالم ہونے کے باوجود عمل کے جوہر سے خالی رہا تو اس کی مذمت وارد ہوئی۔

روایات اس شخص کا نام بلعم باعور بتاتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا اور اس نے باوجود کتب سماویہ کا علم رکھنے کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی[3]

---

[1] ۔دادہ بودیم اور اعلم آیات (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔یعنی تابع شہوت نفس شدو تابع شہوت نفس را عالم نتواں گفت (فتح الرحمن)

[3] ۔ھو بلعم بن باعوراء من علماء بنی اسرائیل سئل ان یدعوا علی موسیٰ واھدی الیہ شئ فدعا فانقلب علیہ (جلالین)

اور ایک روایت یہ ہے کہ وہ امیہ بن ابی الصلت ثقفی ہے جو زمانہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود تھا [1]

یہ جو ارشاد ہوا کہ ''اگر ہم چاہتے تو ان کی وجہ سے اسے بلندی عطا کرتے'' تو یہ چونکہ حکیم مطلق چاہتا ہے لہٰذا بلا وجہ نہیں ہوسکتا۔ اس بنا پر چاہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''اگر ہم اسے اس لائق سمجھتے تو ان آیات کے علم کی وجہ سے اسے رفعت و سربلندی حاصل ہوتی [2] مگر کیا کیا جائے کہ ''وہ تو خود زمین سے لگ گیا'' یعنی دنیا طلبی کر کے سیرت و کردار کی پستی میں گر گیا۔ [3]

اس سے بھی ظاہر ہے کہ وہ چاہنا اس کے ذاتی صفات کی بنا پر ہوتا اور یہ نہ چاہنا اس کے سوء اختیار کی بنا پر ہوا۔

یہ کہ ''اس کی کیفیت اس کتے کی سی ہے'' اسے صرف تمثیل پر بھی مبنی سمجھا جا سکتا ہے مگر بعض روایتیں بتاتی ہیں کہ اس پر عذاب یہی نازل ہوا تھا کہ اس کی زبان کتے کی طرح منہ سے باہر نکل پڑی تھی [4]

کتے کے وصف میں یہ ارشاد کہ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ، اسے عموماً حمل سے لیا گیا ہے [5] چنانچہ ہم نے اس کا ترجمہ بوجھ لادنے کے ساتھ کیا ہے مگر یہ ''حملہ'' سے بھی ہوسکتا ہے یعنی اسے ڈانٹو، ڈپٹو اور اس کی طرف مارنے کے لئے بڑھو۔ [6]

مگر یہ معنی اس وقت مناسب ہوتے جب لہث کے یعنی بھونکنے کے ہوتے کہ کتے کی یہ حالت ہے کہ تم اس سے بولو نہ بولو، وہ بھونکتا ہے مگر زبان منہ سے نکالنے اور ہونکنے [7] کی کیفیت کے ساتھ بوجھ کا لادنا زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

''جسے اللہ ہدایت کرے، وہ ہدایت پانے والا ہے اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے تو یہی لوگ وہ ہیں جو گھاٹا اٹھانے والے ہیں۔''

اللہ ہدایت اسی کی کرتا ہے جس میں طلب صادق اور سعی خالص پاتا ہے (وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) اور گمراہی میں اسی کو چھوڑ دیتا ہے جو مسلسل اعراض سے کام لیتا ہے، اس لئے نتیجتاً دونوں باتیں انسان کے اختیار سے وابستہ ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ

---

[1] ۔ بلغنا ایضاً واللہ اعلم انہ امیہ بن ابی الصلت الثقفی الشاعر المشہور (مجمع البیان)

[2] ۔ یعنی منزلت اور السبب ایں آیات (فتح الرحمن)

[3] ۔ سکن الی الدنیا ورکن الیہا (تبیان)

[4] ۔ اس کو عذاب یہ ہوا کہ کتے کی طرح زبان نکل پڑی (موضح القرآن)

[5] ۔ بوجھ رکھے تو اوپر اس کے (شاہ رفیع الدین)

[6] ۔ ان تحمل علیہ بالطرد والزجر (جلالین)

[7] ۔ اللہث التنفس الشدید من شدۃ الاعیاء (تبیان)

كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

''اور بے شک ہم نے دوزخ کے واسطے پیدا کیا ہے جنات اور آدمیوں میں سے بہتوں کو، ان کے دل و دماغ ہیں۔ جن سے وہ سمجھتے نہیں اور ان کے پاس آنکھیں ہیں وہ جن سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ یہ لوگ مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ یہ وہ ہیں جو بالکل مدہوش ہیں۔''

اصل میں اللہ نے پیدا تو اس لئے نہیں کیا تھا بلکہ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ (ذاریات۔۵۶)،

پیدا اس لئے کیا تھا کہ وہ تقاضائے عبودیت پر عمل کر کے بہتر سے بہتر انجام تک پہنچیں مگر چونکہ نتیجتاً اکثریت نے اپنے سوء اختیار سے جو راستہ اپنایا، اس کا مال دوزخ ہی ہے، اس لئے یہاں یہ تعبیر کی گئی کہ ہم نے ان سب کو دوزخ کے لئے پیدا کیا تھا[1] اس کی نمایاں نظیر قرآن کی جو اور دوسرے ایسے مقامات پر بکثرت پیش کی جاتی ہے، یہ ہے کہ:

فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا.

موسیٰ کو فرعون کے گھر والوں نے دریا سے نکال لیا تا کہ وہ ان کے لئے دشمن اور باعث غم وغصہ قرار پائیں۔ (قصص:۸)

ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے تو اس لئے نہیں نکالا تھا مگر چونکہ نتیجہ یہی ہوا اس لئے اس نتیجہ کا بیان اس طرح کیا گیا جیسے کہ انہوں نے نکالا اسی لئے تھا۔

''وہ چوپایوں کے مثل ہیں''۔ یہ تو بے شعوری کے لحاظ سے اور ''ان سے زیادہ گمراہ ہیں''۔ کیونکہ وہ بھی اپنے حس فطری سے اپنے فائدہ کی چیزوں کی طرف متوجہ ہوتے اور مضرتوں اور اذیتوں سے بچتے ہیں مگر یہ خود اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان کرتے ہیں۔[2]

پھر یہ بھی کہ وہ اپنی پستی کردار میں مورد الزام نہیں، اس لئے کہ ان میں عقل وشعور اور تمیز حق و باطل نہیں ہے اور یہ عقل وشعور رکھتے ہوئے اس پستی میں مبتلا ہیں تو یہ مورد الزام اور گنہگار بھی ہیں۔[3]

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

''اور اللہ سے مخصوص ہیں وہ نام جو بہترین ہیں تو اسے پکارو انہی کے ذریعہ سے[4] اور چھوڑو انہیں جو غلط راستہ

---

[1] ۔اللام فی "لجهنم" لام العاقبة والمعنی انه لما کانوا یصیرون الیها بسوء اختیار هم وقبح اعمالهم جاز ان یقال انه ذرأهم لذٰلك (تبیان)

[2] ۔اضل من الانعام لانها تطلب منافعها وتهرب من مضارتها وهؤلآء یقدمون علی النار معاندة (جلالین)

[3] ۔اضل من الانعام لان الانعام لم تعط اٰلة المعرفة والتمیز فلا تلحقها المذمة وهؤ لآ ء اعطوا اٰلة المعرفة والتمییز فضیعوها. (مجمع البیان)

[4] ۔سموه لها (جلالین)

اختیار کرتے ہیں[1] اس کے ناموں میں جلد ہی انہیں سزا ملے گی اس کی جو وہ کیا کئے ہیں۔''

ایسے ناموں سے جو شانِ الٰہی کے لائق نہیں ہیں، اس کو یاد کرنا اس کی ذات کے بارے میں کسی غلط اعتقاد کا ترجمان ہوتا ہے۔ اسی کو غلط راستہ کہا گیا ہے۔[2]

ایک دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اس واسطے ہیں کہ ان سے دعا کرو اور اس کی حمد وثناء میں ان کا استعمال کرو۔ یہ نہیں کہ ان سے سحر وغیرہ کا کام لو۔[3]

اس صورت میں کج روی کا تعلق تعیین اسماء سے نہیں بلکہ طریقۂ استعمال سے ہے۔ ایک تیسری صورت کج روی کی یہ ہے کہ الفاظ جو ذاتِ باری کے لئے ہیں، وہی رہیں مگر انہیں کو بعینہ یا انہیں بگاڑ کر وہ نام غیر اللہ کے لئے استعمال کر دیئے جائیں جیسا کہ مشرکین کرتے تھے۔[4]

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾

''اور ہماری مخلوق میں ایک گروہ ہے ان کا جو حق کا راستہ بتاتے ہیں اور اس کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں''۔[5]

پہلے یہی الفاظ بنی اسرائیل کے لئے آئے تھے کہ ان میں کچھ ایسے ہیں اور اب عامۂ خلائق میں کہا جا رہا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں اور الفاظ بتاتے ہیں کہ ایسے لوگ خلائق کے اندر اقلیت ہی میں ہیں۔ اکثریت اس کے خلاف ہے۔

ایک معنی آیت کے یہ لئے گئے ہیں کہ ہر دور میں کچھ لوگ راہ راست اور حسن کردار پر قائم رہنے والے ضرور موجود رہیں گے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ تمام خلق گمراہی پر کبھی مجتمع نہیں ہوسکتی۔

ہمارے نقطۂ نظر سے یہ اس طرح درست ہے کہ ہم ہر دور میں ایک معصوم کے وجود کو ضروری مانتے ہیں جو خلق پر حجت خدا کی حیثیت رکھتا ہے، اس طرح ضلالت کے عام طوفان میں بھی ایک منارۂ ہدایت قائم رہتا ہے۔[6]

ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر بھی جو غالباً حدیثوں سے ماخوذ ہے، اسی کے مطابق ہے۔[7]

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾

---

[1] ۔الالحاد الغدول عن الاستقامة والانحراف عنها (تبیان)

[2] ۔یعنی ابو المسیح والو الملائکه می گفتند (فتح الرحمن)

[3] ۔ایک کج راہ یہ ہے کہ سحر میں چلاوے (موضح القرآن)

[4] ۔حیث اشتقوا منها اسماء لالهتهم کاللات من الله والعزیٰ من العزیز ومنات من المنان (جلالین)

[5] ۔ای بالحق یحکمون (مجمع البیان)

[6] ۔عندنا انه لا یخلو وقت من الاوقات ممن یجب اتباعه ویثبت عصمته ویکون حجة الله علیٰ خلقه فیمکن ان یکون المراد بانه ماذکرناه (تبیان)

[7] ۔هٰذه الاٰیة لاٰل محمد ﷺ واتباعهم (علی بن ابراهیم)۔

''اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، انہیں ہم آہستہ آہستہ گرفت میں لیں گے [1] اس طرح کہ انہیں خبر بھی نہ ہو گی اور میں انہیں ڈھیل دوں گا۔ [2] یقیناً میرا منصوبہ بڑا مضبوط ہوتا ہے'' [3]

لفظ ''کیں'' قرآن میں زیادہ تر ایسے ہی انتظام کے لئے آتا ہے جس میں دوسرا شخص بے شعوری کے عالم میں رہے اور اس کی تباہی کا سامان ہو جائے، ہم نے ''منصوبہ'' کے لفظ سے اس کا ترجمہ مجبوری ہی سے کیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ''کیں'' کے لفظ کے تمام خصوصیات ''منصوبہ'' کے لفظ سے ادا نہیں ہوتے جیسا کہ کہیں ہم نے اس کا ترجمہ ''ترکیب'' کے لفظ کے ساتھ بھی کیا ہے، اس کی بھی یہی نوعیت ہے مگر یہاں مضبوطی کے لفظ کے ساتھ ترکیب سے ''منصوبہ'' کا لفظ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۗ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾

''کیا وہ سوچتے نہیں کہ ان کے ساتھی میں کسی طرح کی دیوانگی نہیں ہے، وہ تو نہیں ہے مگر کھلا ہوا خطرہ سے ہوشیار کرنے والا۔''

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں کو سن کر، ان کے دل و دماغ پر جو اثر ہوتا تھا، اسے مٹانے کے لئے وہ آپ کی باتوں کو ''دیوانہ'' کہہ کر ٹالنا چاہتے تھے۔ یہ ان کی بالکل رواروی کی ایک ترکیب تھی۔ قرآن نے ''کیا وہ سوچتے نہیں'' کہہ کر ان کی اسی کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تمہاری اس رواروی سے تمہاری بریت نہیں ہو سکتی۔ ذرا سوچ سمجھ کر سنجیدگی سے محسوس کرو کہ کیا تمہارا ساتھی یعنی یہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس سے تمہارا سابقہ ہے اس میں کوئی بھی جنون کی علامت ہے؟ اگر تم غور کرو تو خود تمہاری سمجھ میں یہ آ جائے گا کہ وہ حقیقتاً تمہارا ہمدرد ہے جو تمہیں خطروں سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔

چونکہ ان کے دل میں دل ڈال کر بات کرنا تھی اور وہ رسول نہیں مانتے تھے، اس لئے صاحب یعنی ساتھی کے لفظ کا استعمال ہوا ہے جو قرآن مجید کے بعض دوسرے مقامات پر بھی ہوا ہے۔

پھر اسی میں یہ بھی مضمر ہے کہ یہ کوئی اجنبی شخص نہیں ہیں۔ یہ تو برابر ان کے ساتھی رہے ہیں اور اسی ساتھ رہنے سے جو انہیں ان کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کا اندازہ ہے، وہ ان پر خدا کی طرف سے ایک بڑی حجت ہے۔

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

''کیا وہ غور نہیں کرتے آسمانوں اور زمین کے کارخانۂ قدرت میں اور ان چیزوں میں جو اللہ نے پیدا کی ہیں اور یہ کہ ممکن ہے ان کی موت [4] نزدیک آ چکی ہو تو اب کس کلام پر وہ اس کے بعد ایمان لائیں گے؟!!''

''اس کے بعد'' کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن جس نے اتنے مؤثر انداز میں ان باتوں کو پیش کیا ہے، اس کے بعد بھی وہ نہیں مانتے تو

---

[1] ۔تاخذهم قليلا قليلا (جلالين)

[2] ۔امهلهم ولا اعاجلهم بالعقوبة (مجمع البيان)

[3] ۔هر آئينه تدبير من محكم است (شاه ولی الله)

[4] ۔اجلهم هو هلاكهم (علی بن ابراهيم)

اور کون سا کلام ہوگا جس کا ان پر اثر ہو اور وہ ایمان قبول کریں [1]

اور یہ بھی مفہوم ہوسکتا ہے کہ اب نہ مانیں گے تو کیا ہلاکت واقع ہوجائے گی، اس کے بعد وہ مانیں گے؟ مگر ''بایّ حدیث'' ''کس کلام پر'' کے لفظ سے ذہن میں زیادہ آنے والا مفہوم پہلا ہی ہے۔

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

''جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے، اس کا کوئی رہنما نہیں ہوسکتا اور وہ انہیں چھوڑ دیتا ہے ان کی سرکشی میں کہ وہ دل کے اندھے بنے رہیں'' [2]

''سرکشی'' کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے گمراہی میں چھوڑ دینا، اس بنا پر ہوتا ہے کہ اتمام حجت کی حد بھر ان کی ہدایت ہوئی مگر انہوں نے کسی طرح قبول نہ کیا تو اب اللہ بھی ان سے صرفِ نظر کر لیتا ہے اور جب اللہ ایسا قادر و حکیم اور پھر مہربان ان کی طرف سے مایوس ہو کر رخ پھیر لے تو اب کس کے بس میں ہوگا کہ ان کی ہدایت کرے۔

مترجمین اہل سنت جو عدالت باری تعالیٰ کے قائل نہیں ہیں، بلا تکلف یہ ترجمہ کر دیتے ہیں کہ ''جسے اللہ گمراہ کرے، اسے کون ہدایت کر سکتا ہے'' [3] مگر ہم اصول حق کی بنا پر اس ترجمہ سے کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

''آپ سے پوچھتے ہیں قیامت کی گھڑی کے متعلق کہ اس کا قیام [4] کب ہوگا؟ کہیے کہ اس کا علم تو بس میرے پروردگار کے پاس ہے، نہیں نمایاں کرے گا اسے اس کا ہنگام آنے پر [5] مگر وہی، بھاری ہے وہ آسمانوں اور زمین میں [6] نہیں وہ تمہارے پاس آئے گی مگر بس اچانک آپ سے پوچھتے ہیں ایسا جیسے کہ آپ اس کے متعلق غلطان و

---

[1] ۔بایّ حدیث بعد القرآن یؤمنون (تبیان)

[2] ۔العمہ فی القلب کالعمی فی العین (مجمع البیان)

[3] ۔ہر کہ گمراہ سازد ش خدا (شاہ ولی اللہ) جس کو گمراہ کرے اللہ (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔ای وقت قیامھا وثباتھا (تبیان)

[5] ۔لوقتھا اللام بمعنی فی (جلالین)

[6] ۔گران شدہ است در آسمانھا وزمین (شاہ ولی اللہ)

پیچان رہے ہیں [1] کہیے کہ اس کا علم تو بس اللہ کے پاس ہے مگر زیادہ تر لوگ نہیں جانتے''۔

قیامت کے وقت کا علم کسی کو نہیں

''بھاری ہے وہ آسمانوں اور زمین میں'' اس کا مطلب بمناسبت سیاق یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا علم اہل آسمان وزمین سب ہی کے لئے دشوار ہے [2] اور یہ بھی کہ اس کے شدائد واہوال تمام اہل آسمان وزمین کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں [3]

''آپ سے پوچھتے ہیں ایسا جیسے کہ آپ اس میں غلطان وپیچان رہے ہیں'' یعنی جیسے کہ آپ اس کے درپے رہے ہیں تو اپنے خالق سے بار بار اس کے متعلق دریافت کر کے علم حاصل کر لیا ہوگا۔ [4]

''مگر زیادہ تر لوگ نہیں جانتے'' اس بات کو کہ اس کا علم اللہ کے ساتھ مخصوص ہے کسی دوسرے کو نہیں ہے [5]

اس سے نمایاں طور پر یہ مستفاد ہوتا ہے کہ یہ ایسا علم ہے جو اس نے اپنے انبیا ومرسلین کو بھی عطا نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد کتنی بے بنیاد ہیں وہ پیشین گوئیاں جو وقتاً فوقتاً قیامت کے لئے ہوتی رہتی ہیں اور کتنی بے عقلی ہے ان پیشین گوئیوں سے وحشت زدہ ہونا اور انہیں اہمیت دینا جس کے حالات ماضی قریب میں کئی مرتبہ اخباروں کے صفحے پر بھی آچکے ہیں۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚۛ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۭ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۱۸۸

''کہیے کہ میں نہیں قدرت رکھتا اپنے لئے کسی نفع اور نہ نقصان پر مگر جو اللہ چاہے اور میں خود غیب جانتا ہوتا تو بہت فائدہ اپنے لئے حاصل کر لیتا اور مجھ تک کوئی برائی پہنچتی ہی نہ میں تو نہیں ہوں مگر خطرہ سے متنبہ کرنے والا اور خوشخبری دینے والا ان لوگوں کو جو ایمان لائیں۔''

اس آیت کی بنا پر مطلق طور سے شفاعت وغیرہ کی نفی کا تصور درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ماشاء اللہ ''جو اللہ چاہے'' کے استثناء میں داخل ہے۔ اسی طرح غیب کے جاننے سے جو انکار ہے وہ بھی ذاتی علم کی نفی ہے۔ نہ کہ عطائے الٰہی سے جو علم حاصل ہو جس کا ثبوت قرآن اور اخبار متواترہ دونوں میں موجود ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ

---

[1] ۔ گویا کہ تو بحث کرنے والا ہے اس سے (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔ یعنی مشکل شدہ است دانستن قیامت (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ ثقلت عظمت... لھولھا (جلالین)

[4] ۔ مبالغ فی السؤال عنھا حتیٰ علمتھا (جلالین)

[5] ۔ لا یعلمون ان ذٰلك لا یعلمه الا الله ویظنون انه قد یعلمه الانبیآء وغیرھم من خلقه (تبیان)

فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

''وہ وہ ہے جس نے تم کو ایک متنفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کے شریک حیات کو قرار دیا تا کہ وہ اس کے ساتھ سکون پائے تو جب اس (مرد) نے اس (عورت) سے مباشرت کی تو ایک ہلکا بوجھ اس کا لے لیا اور اس کو لئے ہوئے چلنے پھرنے لگی۔ پھر جب اس پر بار زیادہ ہوتا تو دونوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ اگر تو ہمیں ایک نیک فرزند عطا کرے تو ضرور ہم تیرے شکر گزاروں میں سے ہوں گے مگر جب اس نے ان دونوں کو ایک اچھی اولاد عطا کی تو ان دونوں نے اس کے لئے شریک قرار دیئے اس میں جو انہیں اس نے عطا کیا۔ برتر ہے اللہ اس سے کہ جو وہ شرک کرتے ہیں۔''

آغاز میں ابتدائے خلقت کا ذکر ہے جو آدم اور حوا کی تخلیق کی منزل ہے اور پھر عام مرد اور عورت کے حال کی مصوری ہے [1] جن میں زیادہ تر افراد اللہ سے نعمت اولاد التجاؤں اور تمناؤں کے ساتھ مانگ کر پاتے ہیں اور پھر ناشکرا پن کرتے ہیں چنانچہ شروع میں اگرچہ تثنیہ کے صیغے ہیں جو مرد اور عورت کے لحاظ سے ہیں اور فعل بھی ماضی ہیں جس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ گزرے ہوئے خاص واقعہ کا اظہار ہے مگر آخر میں "فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ" (اعراف۔۱۹۰) جمع اور حال کا صیغہ آ گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ عام انسانوں کی بات ہے جو ان کی حالی کیفیت سے متعلق ہے۔ جناب آدم اور حوا کا کوئی خاص گزرا ہوا واقعہ بیان نہیں ہو رہا ہے۔

سواد اعظم کے یہاں احادیث کے ذخیرہ میں بہت سی چیزیں دشمنان اسلام کے یہاں کی آ گئی ہیں چنانچہ اس آیت کے تحت میں ترمذی وغیرہ نے ایک روایت درج کر دی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ یہ آخر تک خود آدمؑ اور حواؑ کا تذکرہ ہے اور یہ کہ ان کے یہاں شروع میں کوئی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی تو شیطان نے ان سے آ کر کہا کہ اب کی جو لڑکا ہو، اس کا نام عبدالحارثؔ رکھنا اور وہ زندہ رہا۔

ہمارے نقطۂ نظر سے اس روایت کا کیا درجہ ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ اس کا براہ راست پہلا راوی سمرہ بن جندبؔ ہے جس کی سفاکیوں کے تذکرے دور بنی امیہ میں صفحات تاریخ پر آج تک درج ہیں۔

علمائے اہل سنت کا عصمت انبیاء کے بارے میں موقف عجیب رہا ہے، ان سے عصمت انبیاء کا کھل کر انکار کرتے بھی نہیں بنتا اور اس کے اقرار پر بھی پورے طور پر جمنا کچھ ان کے لئے دشوار معلوم ہوتا ہے چنانچہ اس آیت کے ذیل میں ان کی پریشان ذہنی اور پریشان کلامی کا جو منظر ہے اسے ذرا ملاحظہ کیجئے۔ جلالین صاحبان سمرہ کی اس روایت کو درج کرتے ہیں اور اسے صحیح بھی مانتے ہیں مگر ارشاد ہوتا ہے:

ولیس باشراك فی العبودیة لعصمة اٰدم

یہ عبودیت الٰہی میں شرک نہ تھا، اس لئے کہ آدمؑ معصوم تھے۔

---

[1] ۔فالکنایة فی جمیع ذٰلك غیر متعلقة باٰدم وحواء (مجمع البیان)

مگر قرآن کی آیت کے الفاظ جعلا لہ شرکاء ہیں جس کی تشریح میں انہوں نے یہ اضافہ کیا ہے کہ:۔بتسمیہ عبدالحارث یعنی یہ اللہ کے ساتھ شریک قرار دینا اس طرح تھا کہ انہوں نے ''عبدالحارث'' نام رکھا اور اس حدیث میں جسے وہ مان رہے ہیں، آخر میں ہے:

وکان ذٰلك من وحی الشیطان وامرہ

اور یہ شیطان کی وحی اور اس کے حکم سے تھا۔

پھر اس کے صحیح تسلیم کرنے سے آدمؑ کی عصمت کیوں کر قائم رہ سکتی ہے جب کہ آیت کا خاتمہ اس جملہ پر ہے "فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ" برتر ہے اللہ اس سے کہ جو وہ شرک کرتے ہیں۔اب شاہ ولی اللہ صاحب کو جو بڑے محدث اور ولی مانے جاتے ہیں، کا رنامہ ملاحظہ ہو، وہ فرماتے ہیں:۔

مترجم گوید منطبق بر حال حوا چنانکه در حدیث صحیح آمده که چوں حوا حامله شد شیطان بدلش وسواس انداخت چوں فرزند متولد شد نام اورا عبدالحارث مقرر کرد وچوں وجود جمیع قیود در امثال ایں مواضع ضرور نیست آدم از لوث شرک مبرا باشد وایں آیة عصمت او را مصارمت نکند کذا فهمت۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حوا کے حال پر منطبق ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جب حوا حاملہ ہوئیں تو شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا جب لڑکا پیدا ہوا تو نام اس کا عبدالحارث رکھا اور چونکہ تمام قیدوں کی موجودگی ایسے مقامات پر ضروری نہیں ہے لہٰذا آدم شرک کے دھبے سے بری رہیں گے۔

اور یہ آیت ان کی عصمت سے نہیں ٹکرائے گی۔میں ایسا ہی سمجھا ہوں۔

اب یہ ہر بافہم پڑھنے والا غور کرے کہ وہ خود اس سے کچھ سمجھا؟ اس کے بعد بلا فاصلہ موصوف کا پھر ارشاد یہ ہے:

فلما تغشا ہا کلام علیحدہ است یعنی خدائے تعالٰی آدم و حوا پیدا کرد و از ایشاں نسل بسیار پیدا آورد و بعد ازاں تفصیل انتشار نسل می فرماید۔

''جب اس (مرد) نے اس (عورت) سے مقاربت کی'' یہ الگ کلام ہے یعنی خداوند عالم نے آدم اور حوا کو پیدا کیا اور ان سے بہت سی اولاد خلق فرمائی اور اس کے بعد ان کی نسل پھیلنے کی کیفیت بیان فرمائی۔

اس کے بعد آیت کے دوسرے جز:۔ فلما اثقلت الخ ''جب اس پر بار زیادہ ہوا'' پر حاشیہ لکھا ہے:

مترجم گوید ایں تصویر است حال آدمی را که نزدیک ثقل حمل نیت اخلاص درست کند وچوں فرزند بوجود آید آن را فراموش سازد ودر تسمیه اشراک کند واینجا دانسته شد که شرک در تسمیه نوعیست اس شرک چنانکه اہل زمان ما غلام فلاں وعبد فلاں نام می نہند'' (فتح الرحمن)

میں کہتا ہوں کہ یہ مرقع کشی ہے آدمی کی حالت کی کہ جب حمل کا بوجھ بڑھتا ہے تو اس وقت تک اپنی نیت کو خلوص کے ساتھ ٹھیک رکھتا ہے مگر جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے بھول جاتا ہے اور اس کے نام کے رکھنے میں شرک کرتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ نام رکھنے میں شرک بھی ایک قسم ہے شرک کی جیسا کہ ہمارے زمانے والے فلاں کا غلام اور فلاں کا بندہ نام رکھتے ہیں۔''

یہ بعد والی تشریح پہلے سے بالکل مطابق نہیں ہے اور ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ شاہ صاحب نے پہلے وہ حاشیہ لکھا تھا جس کے آخر میں ہے: کذا فهمت یعنی میں ایسا ہی سمجھا ہوں، پھر ان کا ضمیر خود اس سے مطمئن نہیں ہوا تو انہوں نے اسے قلمزد کر دیا اور یہ حاشیہ لکھا جو: "فلما تغشاها کلام علیحدہ است" سے شروع ہوتا ہے۔ یہ اس حدیث کے رد کر دینے پر مبنی ہے اور بالکل ہماری درج کردہ تشریح سے جو پہلے لکھی جا چکی ہے، مطابق ہے۔

مگر پھر آخر میں جو موصوف نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک "وہابی تصور" کے ثابت کرنے کا نتیجہ نکالا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ غلام محمد یا عبدالحسین نام رکھنا ایک طرح کا شرک ہے، یہ فقط آیت قرآن سے تو نتیجہ نہیں نکلے گا جب تک کہ اس حدیث کو بھی قبول نہ کیا جائے جو "عبدالحارث" والے نام کے متعلق قبل میں درج ہوئی ہے۔ اس صورت میں ممدوح کی یہ تشریح کہ "فلما تغشاہا کلا علیحدہ است" درست نہیں ہوگی کیونکہ اس حدیث میں تو پورا قصہ حضرت آدم اور حوا ہی سے متعلق کہا گیا ہے! نسل آدم سے نہیں جیسا اب شاہ صاحب عصمت آدم کے تحفظ کے لئے تشریح فرما رہے ہیں۔ کیا یہ اضطراب بیان خود اضطراب ذہن کا ترجمان نہیں ہے؟!

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے عجائب وغرائب میں مزید اضافہ فرما کر اپنے کمال علمی کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"بعضے کہتے ہیں حضرت آدم اور حوا پر یہ گزرا، اول جو حمل ہوا، ابلیس ایک نیک مرد کی صورت میں آیا اور ڈرایا کہ تیرے پیٹ میں شاید کچھ بلا ہے۔ جب دونوں دعا کرنے لگے، تب یہ کہا کہ میری دعا سے یہ بلا بدل کر بیٹا ہوگا۔ اس کا نام رکھئے عبدالحارث۔ حارث شیطان کا نام تھا۔ وہی کیا، اس قصہ میں پیغمبروں سے شرک ثابت ہوتا ہے، یا یہ قصہ غلط ہے۔ اس آیت میں مرد اور عورت کو فرمایا ہے۔ آدم اور حوا کو نہیں کہ اول ان کا ذکر ہو چکا۔ یا یوں کہیے کہ جو کچھ انسانوں میں ہونا مقدر تھا، وہ حضرت آدم میں اول ظہور پکڑ گیا، اس میں وہ نمونہ تقدیر تھے۔ اولاد کے گناہ ان میں نظر آئے جیسے آئینہ میں صورت، چنانچہ نفس کی خواہش اور اللہ کی بے حکمی اور کہہ کر بھول جانا اور دے کر مکر جانا، یہ سب اولاد کی خوئیں ان میں نظر آ چکیں" (موضح القرآن)

علمائے شیعہ بہرصورت اس روایت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور وہ ان کے نزدیک ضروریات دین کے خلاف ہے۔ [1]

اس کے علاوہ بجائے خود بھی اس کی سند معتبر نہیں ہے۔ [2]

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾

"کیا وہ شریک کرتے ہیں انہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود بنائے جاتے ہیں اور نہ وہ ان کی کچھ مدد پر

---

[1] فان البراهين الساطعة التي لا يصح فيها الاحتمال ولا يتطرق اليها المجاز والاتساع قد دلت على عصمة الانبياء فلا يجوز عليهم الشرك والمعاصي وطاعة الشيطان (مجمع البيان)

[2] مطعون في سنده لانه يرويه قتادة عن الحسن عن سمرة وهو مرسل لان الحسن لم يسمع من سمرة شيئا في قول البغداديين. (تبيان)

قدرت رکھتے ہیں اور نہ خود اپنی مدد کرتے ہیں اور اگر تم انہیں ٹھیک راستے کی طرف دعوت دو تو وہ تمہاری پیروی نہیں کریں گے، تمہارے لئے برابر ہے خواہ تم انہیں دعوت دو یا تم چپکے رہو۔''

''انہیں ٹھیک رستے کی طرف دعوت دو، وہ تمہاری پیروی نہیں کریں گے'' یہ مشرکین یعنی ان اصنام کی عبادت کرنے والوں کے لئے بھی ہوسکتا ہے جیسے دوسری جگہ ہے۔

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝۱۰

ان پر یکساں ہے، آپ انہیں متنبہ کیجئے یا آپ انہیں متنبہ نہ کیجئے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (یٰسین)

ایک قول اس کے موافق ہے [۱] چونکہ اس کے قبل کی ضمیریں معبودان باطل یعنی اصنام کی طرف راجع ہیں، اس لئے دوسرے لوگوں نے بعد والی ضمیروں کا مرجع بھی انہی کو قرار دیا ہے [۲] اور مطلب یہ لیا ہے کہ کسی بھی کام کو ان سے کہو تو وہ چونکہ ایسے بے حس وحرکت ہیں، نہ تمہاری سنیں گے اور نہ اس پر عمل کریں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝۱۹۴

''یقیناً یہ جن کو تم پکارتے ہو اللہ کو چھوڑ کر، وہ تمہارے ایسے اللہ کے بندے ہیں، اچھا تو پکارے جاؤ، تب جانیں کہ وہ تمہاری حاجت براری کریں، اگر تم سچے ہو۔''

پکارنے سے مراد بحیثیت معبودان کی دہائی دینا ہے [۳] اس لئے شاہ ولی اللہ نے ترجمہ بھی کیا ہے کہ ''کسانیکہ عبادت می کنید ایشاں را'' اس بنا پر اگر معبود حقیقی اللہ کو مانتے ہوئے صرف سبب مجازی اور ذریعۂ ظاہری ہونے کی حیثیت سے کسی کو پکارے اور اس سے مدد کا خواستگار ہو تو وہ اس آیت کے تحت میں داخل نہ ہوگا۔

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَاۗءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ۝۱۹۵

''کیا ان کے پیر ہیں جن سے وہ چلتے ہوں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ جھپٹ کر کچھ اٹھائیں [۴] یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں؟ کہئے کہ تم پکارو اپنے تمام شریکوں کو پھر

---

[۱] ۔عن الحسن (مجمع البیان)

[۲] ۔ای الاصنام (جلالین) لانہا جمادات لا تفقہ ولا تعقل (تبیان)

[۳] ۔یریدتدعونہم الٰہۃ (مجمع البیان)

[۴] ۔معنی البطش التناول والاخذ بشدۃ (مجمع البیان)

میرے خلاف کاروائی کرو کہ مجھے مہلت بھی نہ دو۔''

اس آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ سب بتوں کے متعلق کہا گیا ہے [1] اور مخاطب وہی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر ان معبودانِ باطل کی پرستش کرتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ تمہارے ہاتھ، پیر، کان، آنکھیں تو ہیں جن سے اپنے مطلب کے لئے سہی کام لیتے ہو اور جن کی تم عبادت کرتے ہو، ان کے تو یہ سب بھی نہیں ہے، اس لئے وہ تم سے بدتر ہیں، پھر کتنی بڑی بے عقلی ہے کہ تم انہیں اپنا معبود بنائے ہوئے ہو۔ [2]

اِنَّ وَلِيِّ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۭ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

''یقیناً میرا والی [3] اللہ ہے جس نے یہ کتاب [4] اتاری ہے اور وہ سرپرستی کرتا ہے نیک اعمال لوگوں کی اور جنہیں تم پکارتے ہو اسے چھوڑ کر وہ تمہاری مدد پر قدرت نہیں رکھتے اور نہ خود اپنی ہی مدد کرتے ہیں اور اگر انہیں ٹھیک راستے کی طرف دعوت دو تو وہ نہیں سنیں گے اور دیکھو گے انہیں [5] کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں، حالانکہ انہیں دکھائی نہیں دیتا۔''

صورت تو بتوں کی آدمیوں ہی کی طرح کی بنائی جاتی تھی تو دور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں [6] مگر وہ تو پتھر، لوہے وغیرہ کی آنکھ ہے، اس میں بینائی تھوڑی ہے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾

''معاف کرنے کا وتیرہ اختیار کیجئے اور نیکوکاری کا حکم کیجئے اور جاہلوں سے بے اعتنائی کیجئے اور اگر شیطان کی طرف سے آپ کو کچھ بھڑکانے کی کوشش ہو تو اللہ سے پناہ مانگئے، یقیناً وہ بڑا سننے والا ہے، جاننے والا۔''

یہ جاہل کون ہوتے ہیں؟ وہ جو برائیوں پر تنبیہ سن کر بجائے قائل ہونے کے لڑنے لگتے ہیں، ان کی طرف سے جو سخت کلامی یا دشنام طرازی ہو چکی، اس کے لئے معاف کرنے کی ہدایت ہوئی کہ اب اس کے بدلے کا کوئی خیال رکھنا نہ چاہیے۔ یہ ''گزشتہ را صلوات'' ہے اور آئندہ

---

[1] ۔الھم ... ای لھؤلاء الاصنام (مجمع البیان)

[2] ۔فیکف یجوز لکم ان تتخذوھا الھة (تبیان)

[3] ۔یتولی اُموری (جلالین)

[4] ۔القرآن (جلالین)

[5] ۔می بینی بتان را (شاہ ولی اللہ)

[6] ۔تراھم فاتحة اعینھم نحو کم علیٰ ما صورتم علیه من الصور (تبیان)

کے واسطے ''احتیاط'' کا حکم یوں دیا گیا کہ ''ان سے بے اعتنائی کیجئے'' یعنی اب عمومی حیثیت سے نیکوکاری کی ہدایت کرتے رہیے مگر ایسے جاہلوں کو مخاطب کر کے نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے مگر یہ معاف کرنا اور پھر بے اعتنائی کرنا ایک جہاد نفس کی منزل ہے، کچھ آسان تھوڑی ہے۔ بعض وقت طبیعت آمادہ کرتی ہے کہ اپنا اور ان کا خون ایک کر دیا جائے۔ اسی طبیعت کی تحریک کو کہا گیا کہ اگر شیطان کی طرف سے بھڑکانے کی کوشش ہو تو اللہ سے پناہ مانگئے یعنی ضبط نفس سے کام لیجئے اور اللہ کی توفیق کو رفیق راہ بنائیے اور اشتعال سے کام نہ لیجئے۔

''خدا سننے والا ہے اور جاننے والا'' یعنی اس ہدایت حق میں جو زخم زبان آپ کو پہنچتے ہیں، اللہ انہیں سنتا ہے اور جو کچھ آپ کے ساتھ بدسلوکی ہوتی ہے، اسے وہ جانتا ہے [1] اس لئے آپ کے صبر و تحمل کی جزا بھی اس کے یہاں ہے اور ان ظالموں کی سزا بھی اس کے ذمہ ہے۔ ہم نے جو ترجمہ کیا ہے اور جو تشریح لکھی ہے، وہ اس پر مبنی ہے کہ عفو کے معنی معاف کرنے کے ہیں مگر علامہ طبرسیؒ نے اس قول کو سب سے آخر میں درج کیا ہے [2] اور سب سے پہلے جو غالباً ان کے مختار کی حیثیت رکھتا ہے، یہ قول ہے کہ یہ ''عفو'' کا لفظ اس آیت میں ویسا ہے، جیسے دوسری آیت ہے:

''وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ''

اس ''عفو'' کے معنی ہوتے ہیں ''ضرورت سے فاضل مال'' اس صورت میں یہاں مطلب یہ ہوگا کہ لوگوں سے ان کی ضرورتوں سے فاضل جو مال ہو، وہ لیجئے۔ [3]

مگر ہمیں پہلا مفہوم خود آیت کے الفاظ اور سیاق مضمون آیات کے لحاظ سے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿٢٠١﴾ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿٢٠٢﴾

''جو پرہیزگار ہیں، جب انہیں شیطان کی طرف کا کوئی خیال پیدا ہوتا ہے تو فوراً ہوشیار ہو جاتے ہیں [4] اور ایک دم ان کی بصیرت تازہ ہو جاتی ہے اور جو ان کے بھائی بند ہوتے ہیں، وہ انہیں گمراہی میں کھینچتے ہیں، پھر کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔''

''ان کے بھائی بند'' یعنی شیطانوں کے حوالی موالی جو ہیں [5] وہ خوب شیطانوں کے قبضہ میں آجاتے ہیں۔

مطلب بہرحال یہی ہے، خواہ ھم کی ضمیر کافروں کی طرف پھیری جائے حالانکہ ان کا کسی طرح بھی پہلے ذکر نہیں ہے یا شیطانوں کی طرف جن کا جنس شیطان کی شکل میں پہلے ذکر موجود ہے۔

---

[1] ۔ سمیع بالقول علیم بالفعل (جلالین)

[2] ۔ قیل العفو ھو قبول العذر عن المعتذر و ترك المؤاخذہ بالاساءۃ (مجمع البیان)

[3] ۔ ای خذ یا محمد ما عفا من اموال الناس ای ما فضل عن النفقۃ (مجمع البیان)

[4] ۔ تذکروا فعرفوا ما علیھم من العقاب بذلك فیجتنبونہ ویترونہ (تبیان)

[5] ۔ ای اخوان الشیاطین میں الکفار (جلالین)

''کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے'' یعنی مکمل گمراہی کا سامان کر کے انہیں ہلاکت ابدی میں مبتلا کر کے رہتے ہیں۔ [1]

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

''اور جب کوئی خاص معجزہ ان کے سامنے پیش نہ کیجئے تو وہ کہتے ہیں کہ آپ نے اسی کو کیوں منتخب نہ کیا؟ کہہ دیجئے کہ میں تو بس اس کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس پروردگار کی طرف سے پیغام پہنچتا ہے، یہ کھلی ہوئی نشانیاں ہیں تمہارے پروردگار کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ان کے لئے جو ایمان لائیں۔''

اس آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ ان کے سامنے معجزات خالق کی طرف سے پیش ہوتے تھے مگر وہ اپنے فرمائشی کسی معجزہ پر اصرار کرتے تھے [2] اس پر جواب یہ دیا گیا ہے کہ میں تو وحی الٰہی کا پابند ہوں اور تمہارے سامنے اتنے معجزات پیش ہو چکے ہیں جو اتمام حجت کے لئے کافی ہیں، اس کے بعد یہ ضروری نہیں کہ تم جو کہتے ہو، وہی معجزہ تمہیں ضرور دکھلایا جائے، اس پر مقدمہ تفسیر میں ہم نے کافی روشنی ڈالی ہے۔

تعجب ہے کہ بعض مترجمین کو اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں دقت ہوئی ہے اور انہوں نے عجیب عجیب ترجمے کئے ہیں [3] جس میں قبل کے بعض مفسرین کی ژولیدہ بیانیوں کا بھی دخل ہے۔ [4]

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنو [5] اور خاموش رہو، شاید کہ رحمت تمہارے شامل حال ہو۔''

قرآن کی تلاوت کے وقت خاموشی کا حکم

یہ ہدایت ہے مسلمانوں کے لئے اسی لئے جس طرح قرآن کا پڑھنا عبادت ہے اسی طرح اس کا سننا بھی عبادت ہے۔

یہ قرآن مجید کی ایک طرح کی بے احترامی ہے کہ قرآن بآواز پڑھا جا رہا ہو اور لوگ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف رہیں۔

ایک صورت وہ ہے جس میں خاموشی سے سننا واجب ہے اور وہ نماز جماعت میں ماموم کے لئے جب امام حمد و سورہ پڑھ رہا ہو، اس لئے

---

[1] ۔لا یقصرون عن استغوائهم (تبیان)

[2] ۔بایة یقترحونها (تبیان)

[3] ۔چوں نمی آوری نزدیك ایشان آیتی می گویند چرا از طرف خود انشا نمی کنی (شاہ ولی اللہ) اور جب نہ لاتا تو ان کے پاس نشانی کہتے ہیں کیوں نہ کھینچ لایا تو اس کو (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔هلا اجتبیتها معناه اختلقتها وافتعلتها من قبل نفسك فی قول الزجاج والقراء ... وفی روایة اخری عن ابن عباس و قتادة معناه هلا اخذتها من ربك وتقبلتها منه (تبیان)

[5] ۔النصات السکوت مع استماع (مجمع البیان)

بعض مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ اس آیت سے یہی صورت مراد ہے [1]

ہماری قدیم تفسیر بھی اس کے مطابق ہے [2]

مگر آیت کو جس انداز سے ختم کیا گیا ہے ''شاید کہ رحمت تمہارے شامل حال ہو''.....اس سے اس حکم کا وجوبی ہونا ذہن میں نہیں آتا لہٰذا کیوں نہ اسے حکم استحبابی سمجھا جائے جس کے بعد حالت نماز کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے، یہ ایک تہذیب اسلامی کی تعلیم ہے جس کا قرآن مجید کی شان وجلالت کے پیش نظر تاکیدی حکم ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت بھی اس کے مطابق ہے۔ [3]

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

''اور اپنے پروردگار کو یاد کرو اپنے دل میں بھی گڑگڑاہٹ کے ساتھ اور ڈری سہمی حالت میں اور زبان سے بھی ایسی آواز سے جو زیادہ اونچی نہ ہو [4] صبح اور شام اور غفلت کرنے والوں میں سے نہ ہو۔''

حدیث معصوم سے پتہ چلتا ہے.....کہ ذکر الٰہی کی مختلف حالتوں کے اعتبار سے مختلف صورتیں ہیں۔ پہلا جز کہ دل ہی دل میں یاد کرو یعنی زبان سے کچھ پڑھو ہی نہیں، یہ حالت جماعت میں ماموم کے لئے ہے کہ امام کو سورے پڑھنے کا حکم ہے اور ماموم کو خاموش رہنے کا [5] اور بعد والی صورت امام جماعت یا فرادیٰ نماز پڑھنے والے کے لئے ہے کہ اسے نماز آواز سے پڑھنا چاہیے مگر زیادہ چیخ چیخ کر نہیں جو شانِ خضوع وخشوع کے خلاف ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ السجدة

''یقیناً جو تمہارے پروردگار سے نزدیک ہیں، اس کی عبادت سے سرکشی نہیں کرتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔''

''جو پروردگار سے نزدیک ہیں'' یعنی فرشتے [6]

ان کے کردار کو پیش کرتے ہوئے انسانی شرافت کو غیرت دلائی گئی ہے کہ اسے کب زیبا ہے کہ اس کی عبادت میں کوتاہی کرے۔

قرآن مجید میں یہ پہلا مقام ہے جہاں سجدہ وارد ہوا ہے مگر فقہ اہل بیت کرام علیہم السلام میں یہ سجدہ واجب نہیں ہے۔ [7]

---

[1] ۔لانه لا حال یجب فیها الانصات لقراءة القران الا حال قراءة الامام فی الصلوٰة (تبیان)

[2] ۔یعنی فی الصلوٰة اذا سمعت قراءة الامام الذی تأتم به فانصت (علی بن ابراهیم)

[3] ۔عن ابی عبدالله انه فی حال الصلوٰة وغیرها وذٰلك علیٰ وجه الاستحباب (تبیان)

[4] ۔فوق المسر دون الجهر من القول ای قصدا بینهما (جلالین)

[5] ۔روی زرارة عن احدهما: قال معناه اذا کنت خلف الامام مأتم به فانصت وسبح فی نفسك (مجمع البیان)

[6] ۔هم الملائکة (مجمع البیان)

[7] ۔هٰذه اول سجدات القراٰن وهی عندنا مستحبة غیر واجبة (تبیان)

سُوْرَۃُ الْاَنْفَالِ

مکیّہ.....۷۵.....آیات

سورۂ انفال کے خاص خاص مضامین

اس سورہ کی ابتدا ہی چونکہ انفال کے بیان سے ہوئی ہے جس کے معنی ابھی پہلی آیت کے ذیل میں لکھے جائیں گے، اس لئے اس سورہ کا انفال نام ہوا۔ اس کے علاوہ جو خاص امور اس سورہ میں درج ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱-----جنگ بدر کا پس منظر

۲-----فرشتوں کا میدانِ بدر میں اترنا ہی نہیں بلکہ جنگ کرنا۔

۳-----میدانِ جنگ سے فرار کا باعثِ دوزخ ہونا۔

۴-----ہجرت کے موقع پر حفاظتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خداوندی تدابیر کی طرف اشارہ۔

۵-----وجود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مانع نزول عذاب۔

۶-----خمس کا صریحی حکم۔

۷-----تنازع باہمی کے خراب نتائج پر انتباہ۔

۸-----جہاد کی تیاری اور رباط کا حکم۔

۹-----مخالفین کے ساتھ صلح کا حکم

۱۰-----ایک اور دس کے مقابلہ کی دعوت پر مسلمانوں کی کمزوری کا ثبوت اور پھر ایک اور دو کے مقابلہ کا کم سے کم حکم۔

۱۱-----قیدیوں کے بارے میں الٰہی منشا کا اعلان وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہونچانے والا بڑا مہربان ہے''

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

''آپ سے پوچھتے ہیں انفال کے متعلق، کہیے کہ انفال اللہ کے لئے ہیں اور پیغمبر کے لئے لہٰذا غضب خدا سے ڈرو

اور اپنے درمیانی تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو، اگر تم ایمان والے ہو۔''

انفال کے متعلق حکم خداوندی

انفال کے معنی اموال غنیمت کے کہے گئے ہیں [1]

شاہ ولی اللہ نے اس سورہ کی شان نزول لکھی ہے کہ وہ غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوا ہے:

مسلمانان در غنیمت مباحثه می کردند آنا نکه غارت کرده بودند خواستند که تنها بران متصرف شدند دیگراں خواستند علی السویه قسمت شود خدائے تعالٰی نازل ساخت که متصرف و مختار غنائم خدا و رسول اوست و دیگری را دریں باب دخل نیست و انچه اہل جاہلیت می کردند از استیثار غارت کننده بغنیمت باطل است بعد ازان حکم فرمود که غنیمت را پنج قسم باید کرد چہار قسم درمیان غانمان قسمت کنند و یکی در بیت المال نگاه داشته بمصرف آں رسانند و این تصرف حق است و عطا ی اوست بغیر دخل غارت کنندگان پس آیۂ قل للّٰه والرسول محکم است غیر منسوخ. (فتح الرحمٰن)

مسلمان غنیمت کے بارے میں باہم بحث کر رہے تھے، جنہوں نے لوٹا تھا انہوں نے چاہا کہ اس پر وہ اکیلے قابض ہوں، دوسروں نے چاہا کہ برابر سے تقسیم ہو، خداوند عالم نے یہ حکم اتارا کہ اموال غنیمت پر قابض و متصرف اور صاحب اختیار خدا اور رسول ہیں اور کسی دوسرے کو اس بارے میں کوئی دخل نہیں ہے اور جو زمانۂ جاہلیت والے کرتے تھے کہ لوٹنے والے کو مال غنیمت پر قبضہ میں ترجیح دیں، وہ غلط ہے اس کے بعد حکم دیا کہ مال غنیمت کے پانچ حصے کرنا چاہئیں، چار حصے غنیمت حاصل کرنے والوں میں تقسیم کئے جائیں اور ایک بیت المال میں محفوظ رکھا جائے اور پھر مناسب موقع پر صرف ہو اور یہ حق تعالیٰ کا اختیار ہے اور اس کی عطا ہے جس میں لوٹنے والوں کا کوئی دخل نہیں لہٰذا یہ آیت کہ ''انفال اللہ کے لئے ہیں اور پیغمبر کے لئے'' برقرار ہے اور منسوخ نہیں ہوئی ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''جنگ میں بعض آگے بڑھے اور بعض پشت پر رہے جب غنیمت جمع ہوئی، بڑھنے والوں نے کہا یہ حق ہمارا ہے کہ فتح ہم نے کی اور پشتی والوں نے کہا کہ ہماری ہی قوت سے لڑے۔ حق تعالیٰ نے دونوں کو خاموش کیا کہ فتح اللہ کی مدد سے ہے اور کسی کی پیش نہیں جاتی، سو مالک اللہ ہے اور نائب اس کا رسول ہے۔ پھر آگے بہت دور تک یہی بیان فرمایا کہ فتح اللہ کی مدد سے ہے۔ اپنی قوت نہ سمجھو۔'' (موضح القرآن)

بعض مفسرین یہ اختلاف جوانوں اور بوڑھوں کے درمیان کا بتاتے ہیں:

لما اختلف المسلمون فی غنائم بدر فقال الشبان هی لنا لانا باشرنا القتال وقال الشیوخ کنا ردءً لکم تحت الرایات ولو انکشفتم لفئتم الینا فلا نستأثر وا بها نزل (جلالین)

جب مسلمانوں کے درمیان جنگ بدر کے اموال غنیمت میں اختلاف ہوا کہ جوانوں نے کہا کہ یہ سب ہمارا ہے اس لئے کہ ہم نے

---

[1] ۔ می پرسند ترا از غنیمتها (شاہ ولی اللہ) سوال کرتے ہیں تجھ کو لوٹوں سے (شاہ رفیع الدین)

جنگ کی ہے اور بڈھوں نے کہا کہ ہم تمہاری پشت پناہ تھے اور اگر تم میدان سے ہٹتے تو پلٹ کر ہمارے پاس پناہ لیتے تو ان اموال میں تم اپنے کو مقدم نہ کرو تو یہ آیت نازل ہوئی۔

مذکورہ بالا مندرجات سے جمہور کے درمیان کی پریشان خیالی ظاہر ہے مگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے ارشادات نے انفال کے اقسام پر کافی بسط و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے [1] اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انفال حسب ذیل قسم کی چیزیں ہیں:

(۱) جو مال دارالحرب سے بغیر جنگ حاصل ہو۔

(۲) وہ زمین جس کے مالک بغیر لڑے اسے چھوڑ کر چلے جائیں۔

(۳) لاوارث شخص کا ترکہ۔

(۴) جنگل، میدان اور پہاڑوں کی چوٹیاں وغیرہ، غرض جن چیزوں کا کوئی خاص انسان مالک نہیں ہے۔ یہ سب مِلک خدا ہونے کے لحاظ سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے بعد امام کا حق ہے جس میں عام مسلمانوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ آیت کے بعد کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ عام مسلمان اس سلسلہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی نزاع کر رہے تھے جس پر سختی کے ساتھ متنبہ کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴

''خاص ایمان والے تو بس وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر ہو جائے تو ان کے دل سہم جاتے ہیں اور جب اس کی آیتوں کی تلاوت ان کے سامنے ہو جائے تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کا باعث ہوتی ہیں اور اپنے پروردگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں، جو نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے، اس میں سے خیرات کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو خاص ایمان والے ہیں۔ ان کے لئے مرتبے ہیں ان کے پروردگار کے یہاں اور بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے۔''

قرآن مجید نے اہل ایمان کا جو معیار پیش کیا ہے وہ ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے اور جتنا کوئی اس سے قریب ہوگا، اتنا اس کے ایمان کا درجہ سمجھا جائے گا لہٰذا قرآن مجید کی اس آیت سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ جس میں یہ اوصاف بحد کمال موجود نہ ہوں، وہ ایمان کا کوئی حصہ رکھتا ہی نہیں۔ [2]

---

[1] ۔صحت الرایۃ عن ابی جعفر و ابی عبداللہ علیہما السلام (مجمع البیان)

[2] ۔ھذہ صفات خیار المؤمنین و افاضلھم ... فلا تدل علی ان من کان دونھم فی المنزلۃ خارج عن الایمان (مجمع البیان)

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۖ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَمَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶

''جیسا کہ نکالا آپ کو آپ کے پروردگار نے آپ کے گھر سے بالکل صحیح [1] اور ایک جماعت مسلمانوں میں کی اسے ناپسند کر رہی تھی۔ آپ سے صحیح طریقۂ کار کے بارے میں جب کہ وہ ظاہر ہو گیا تھا وہ بحث کر رہے تھے گویا کہ وہ موت کی طرف لے جائے جا رہے ہوں [2] اس حال میں کہ وہ دیکھ رہے ہیں۔''

''جیسا کہ'' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ انفال کے بارے میں اللہ کا فیصلہ اسی طرح ہے جیسا کہ ابتدا میں اس کا اس مہم یعنی بدر کی جنگ کے لئے آپ کو آپ کے گھر یعنی مدینہ سے [3] نکالنا حق تھا اور اس موقع پر بھی جمہور نے اختلاف کیا تھا مگر اللہ نے ان کی رائے پر عمل نہیں کیا اور اس وقت بھی ان میں سے بہت لوگ اس فیصلہ سے متفق نہیں ہیں، مگر اللہ کو اس کی پرواہ نہیں ہے [4] کاش جمہور اس کے بعد محسوس کرے کہ حکم خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں رائے جمہور کوئی چیز نہیں ہے۔

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸

''اور جب اللہ تم لوگوں سے وعدہ کر رہا تھا دونوں گروہوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے لئے ہے اور تم لوگ خواہش رکھتے تھے کہ جو فوجی ساز و سامان والا نہیں ہے، وہ تمہارے حصہ میں آئے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے احکام کے تحت حق کو ثابت کر دے اور کافروں کی اصل نسل کو ختم کر دے تاکہ وہ اپنی باتوں سے حق کو ثابت کر دے اور باطل کو نیست و نابود کر دے چہرے بداعمال لوگ کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں۔''

جنگ بدر کا پس منظر

ایک طرف تو تجارتی قافلہ آ رہا ہے اور دوسری جانب سے ابوسفیان فوج لئے ہوئے آ رہا تھا۔ خالق نے خبر دی تھی کہ تم لوگ مدینہ سے نکلو

---

[1] ۔بتدبیر درست (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ہانکے جاتے ہیں طرف موت کے (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔بیتك یرادبه المدینة اخرجه الله الی بدر. (تبیان)

[4] ۔یعنی کار در قسمت غنائم بر موافق حکم خدا است، نه موافق ازوی نفوس چنان که بیرون آوردن بتدبیر درست بودو از نزدیك خدا بر خلاف ارادۂ قوم (فتح الرحمن) یعنی غنیمت کا جھگڑا بھی ویسا ہی ہے جیسا نکلتے وقت عقل کی تدبیریں کرنے لگے اور آخر صلاح وہی نکلی جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تو ہر کام میں یہی اختیار کرو کہ حکم برداری میں اپنی عقل کو دخل نہ دو۔ (موضح القرآن) ای هٰذه الحالة فی کراهتهم لها مثل اخراجك فی حال کراهتهم وقد کان خیرا لهم فکذالك ایضا (جلالین)

گے تو ان میں کے ایک سے تمہاری مڈبھیڑ ہوگی [1] اس پر خود غرض اور پست ذہنیت والے مسلمان یہ سبز باغ دیکھنے لگے کہ وہ تجارتی قافلہ ہمارے ہاتھ آئے گا اور ہم اس کے سامان تجارت پر قابض ہو جائیں گے۔

قرآن نے اس کی نسبت صیغۂ جمع کے ساتھ عام مسلمانوں کی طرف دی ہے، کہیں اس میں یہ نہیں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قافلہ کو لوٹنے کے لئے مدینہ سے نکلے تھے مگر اسے کیا کیا جائے کہ دشمنانِ اسلام کا ذکر نہیں شاہ ولی اللہ صاحب تک یہ لکھتے ہیں کہ:

"دراین آیات تعریض است بآن قصد کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در غزوۂ بدر برای غارت کردن کاروانِ قریش متوجہ شد" (فتح الرحمن)

کلام الٰہی کا انداز بالکل اس کے خلاف ہے اور ان دنیا طلب مسلمانوں کی تنبیہ ایسے انداز میں ہے جس سے ان کی مذمت نمایاں ہے بلکہ آخری فقرہ بھی "چاہے بداعمال لوگ کتنا ہی ناپسند کرتے ہوں" انہی لوگوں سے متعلق معلوم ہوتا ہے جو قافلہ کے ہاتھ آنے کی خواہش رکھتے تھے اور فوج سے مقابلہ کو ناپسند کرتے تھے، اگرچہ عام تفسیروں نے اسے کفار و مشرکین سے متعلق کر دیا ہے [2] حالانکہ مشرکین کو ناگواری تو اس قافلہ کے مسلمانوں کے ہاتھ آجانے پر زیادہ ہوتی بلکہ ان کا عین مقصد یہی تھا کہ قافلہ مسلمانوں کے ہاتھ نہ آئے بلکہ فوج کا مقابلہ ہو جائے۔ یہ اور بات ہے کہ نتیجہ اس مقابلہ کا ایسا نکلا جو ان کی مرضی کے خلاف تھا مگر یہاں تو نتیجہ کا نہیں اصل اس مقابلہ کا ذکر ہے لہٰذا یہاں مجرمین سے مراد یہی مسلمان ہو سکتے ہیں جو قافلہ کے لوٹنے کے خیال میں تھے۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝۹

"جب کہ تم لوگ اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری التجا قبول کی کہ میں تمہیں مدد دوں گا ہزار فرشتوں کے ساتھ جس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہے گا۔"

یعنی ان ہزار ہی پر مدد ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ یہ پہلی قسط ہوگی جس کے بعد اس میں اور اضافہ ہوگا۔ [3]

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰

"اور اسے نہیں قرار دیا ہے اللہ نے مگر خوشخبری کے طور پر اور اس لئے کہ اس سے تمہارے دلوں کو اطمینان ہو اور فتح وظفر نہیں ہے مگر اللہ کی طرف سے یقیناً اللہ زبردست ہے، بالکل صحیح کام کرنے والا۔"

---

[1] ۔ المجرمون المشرکون (جلالین)

[2] ۔ المجرمون المشرکون (جلالین)

[3] متتابعین یردف بعضهم بعضا وعدهم بها اولا ثم صارت ثلثة الاف ثم خمسة کما فی ال عمران (جلالین) یعنی یک هزار بودند بعد از ان سه هزار گشتند و بعد از ان پنج هزار شدند (فتح الرحمن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی اصول نہیں ہے کہ ہمیشہ فرشتے آ ہی جایا کریں۔ یہ تو اس دفعہ ہو گیا کہ تمہارے دلوں کو تقویت ہو جائے مگر آئندہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ایسا ہو اور اصل فتح وظفر عطا کرنے والا تو خداوند عالم ہے۔ فرشتے بھی صرف ایک ظاہری ذریعہ ہی ہیں اور فرشتوں سے کام لینا بھی ہو تو اتنی تعداد کی ضرورت نہیں۔ ایک فرشتہ حکم الٰہی سے ایک قوم کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ [1]

بعض لوگوں نے اس خوشخبری اور تقویت قلب کے لفظ سے یہ عجیب نتیجہ نکالا کہ فرشتوں کا آنا جانا اصل میں کچھ نہیں ہے۔ یہ بس مسلمانوں کی تقویت قلب کے لئے ایک سامان تھا کہ فرشتوں کے آنے کا اعلان کر دیا گیا۔ حالانکہ اگر اللہ کی خوشخبری معاذ اللہ ایسی ہوا کرے کہ اسے واقعیت سے کوئی لگاؤ نہ ہو، بس دل کے بہلاوے کا ایک سامان ہی ہو تو اس سے وہ تقویت قلب کا مقصد ہی کہاں پورا ہوگا اور پھر وہ خوشخبری کب ہوگی۔ وہ تو دل کی تسلی ہوگی جو شان الٰہی کے بالکل خلاف ہے۔

خدا ہی آج کل کے روشن خیالوں کو ہدایت فرمائے کہ وہ روشن خیالی کی دُھن میں اتنے تو مدہوش نہ ہوں کہ ان کو خود خبر نہ ہو کہ جو وہ کہہ رہے ہیں، اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟

اِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾

''جب کہ وہ تم پر نیند غالب کر رہا تھا، اپنی طرف سے سکونِ دل کے لئے اور اتار رہا تھا تم پر آسمان سے پانی کہ اس سے تمہاری طہارت کا سامان کرے اور تم سے شیطان کی نجاست کو دور کرے اور اس لئے کہ تمہارے دلوں میں قرار پیدا کرے [2] اور اس کے ذریعہ سے قدموں کو جما دے۔''

مفسرین لکھتے ہیں کہ جنگ بدر میں بہت سے مسلمانوں کو غسل کی ضرورت تھی مگر پانی تھا نہیں کہ وہ غسل کریں اور اس لئے ان کے دلوں میں یہ وسواس ہو رہا تھا کہ آج رنگ اچھا نہیں اور ہمیں شکست سے دوچار ہونا پڑے گا اور زمین نرم تھی جس سے پیر چلنے میں دھنسے جا رہے تھے مگر صبح جو ہوئی تو خوب بارش ہو گئی جس کے پانی سے انہوں نے غسل کیا، اس سے ذہن کو یکسوئی ہوئی تو نیند آ گئی اور اس طرح ان کے دلوں کا وسوسہ بالکل دور ہو گیا اور سکونِ قلب حاصل ہو گیا۔ [3]

ثبات قدم خود ہی سکون قلب کا اثر ہوتا ہے، پھر یہ کہ بارش کے اثر سے زمین سخت ہو گئی جس سے پاؤں زمین پر جمنے لگے اور ریت میں جو دھنسے جاتے تھے، وہ بات جاتی رہی [4] بلکہ دشمنوں کی طرف کی زمین جو پہلے ذرا سخت تھی، وہاں کیچڑ ہو گئی۔ [5]

---

[1] ۔ کما فعل جبریل بقوم لوط فاھلکھم (مجمع البیان)

[2] ۔ بہ بندد بر دل شما یعنی ثابت دارد دلھا را (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ فشربوا واغتسلوا اذھب بہ وسوسۃ الشیطان (تبیان)

[4] ۔ یثبت بہ الاقدام ان تسوخ فی الرمل (جلالین)

[5] ۔ تلبدت بہ ارضھم واوحلت ارض عدوھم (مجمع البیان)

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

''جب کہ تمہارا پروردگار خطاب فرما رہا تھا فرشتوں کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم ثبات قدم پیدا کرو ان میں جو ایمان لائے ہیں، بہت جلد ایسا ہوگا کہ میں کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا تو تم ان کی گردنوں پر ضربیں لگاؤ اور ہر ہر پور پر ضرب لگاؤ، یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے مقابلہ کیا اللہ اور اس کے پیغمبر سے اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر سے مقابلہ کرے گا تو بلاشبہ اللہ سخت سزا والا ہے تو اب اس کا مزہ چکھو اور بلاشبہ کافروں کے لئے آتش دوزخ کا عذاب ہے۔''

فرشتوں کا جنگ بدر میں اترنا ہی نہیں بلکہ جنگ کرنا

پہلی آیت کی ابتدا چونکہ اس تذکرہ سے ہے کہ فرشتوں کو یہ پیغام دیا جا رہا تھا تو ظاہر یہی ہے کہ آخر تک خطاب انہی سے ہے اور اس لئے گردنوں اور ہاتھوں پر ضربیں لگانے کی ہدایت انہی کو ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے تسلی کے لئے صرف اترے ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر باقاعدہ جنگ بھی کی۔

اس جگہ بعض علماء کی یہ توجیہ بھی وقیع ہے کہ فرشتوں کو آدمیوں کی شکل میں انہی کی طرح بنی آدم سے جنگ کرنے کا پہلے کبھی موقع نہیں آیا تھا، اس لئے خالق کی طرف سے انہیں طریقۂ جنگ کی تعلیم دی گئی۔[1] دوسرا ضعیف قول یہ ہے کہ اس میں صنعت التفات ہے جس کے معنی ہیں ایک انداز میں کسی سے بات کرتے کرتے انداز پلٹ دینا، یہاں پہلے خطاب فرشتوں سے تھا کہ اہل ایمان میں ثباتِ قدم پیدا کرو، اس کے بعد تخاطب مسلمانوں سے ہو گیا کہ تم ان کی گردنوں پر ضربیں لگاؤ[2] اور اس کے بعد چونکہ کافروں کا تذکرہ آ ہی گیا کہ انہیں تلواریں لگاؤ تو آخر میں تخاطب ان کافروں سے ہو گیا ہے ''تو اب اس کا مزہ چکھو''[3]

یہاں بلاشبہ صنعت التفات ہے کہ پہلے کافروں کا ذکر بصیغۂ غائب تھا اور اب خود ان سے تخاطب کا انداز ہو گیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ

---

[1] ۔قال ابن الانباری ان الملائکۃ حین امرت بالقتال لم تعلم این تقصد بالضرب من الناس فعلمهم الله تعالیٰ (تبیان)

[2] ۔اے مسلمانان (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔خطاب للمشرکین (تبیان) فذوقوہ ایہا الکفار (جلالین)

بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑯

''اے ایمان لانے والو! جب کافروں سے جنگ میں مڈبھیڑ ہوتو ان کے سامنے سے پیٹھ نہ پھراؤ اور جو ان کے سامنے سے پیٹھ پھرائے گا بجز تدبیر جنگ کے لئے کسی سمت ہٹتے ہوئے یا کسی خاص گروہ کی طرف پناہ لیتے ہوئے تو وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہوگا اور اس کی جائے پناہ دوزخ ہوگی اور وہ بہت بری بازگشت ہے۔''

میدان جنگ سے فرار کا باعث دوزخی ہونا

تدبیر جنگ کے لئے ہٹنے کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ دکھاوے کے طور پر پیچھے ہٹیں تا کہ مخالف فریق دھوکا کھا کر آگے بڑھے اور پھر زد پر لا کر انہیں گھر لیا جائے۔ یہ فرار میں داخل نہیں ہے۔ [1]

علمائے اہل سنت شاید کسی حفظ ماتقدم کے لئے اس کے قائل ہیں کہ میدانِ جنگ سے فرار پر یہ غضب الٰہی اور سزائے آخرت کا اعلان جنگ بدر سے مخصوص تھا مگر الفاظ آیت اس تخصیص کے متقاضی نہیں ہیں اور روایت اہل بیتؑ یہی ہے کہ کسی بھی میدان جنگ سے فرار ہو، وہ غضب خداوندی کا مستوجب ہے۔ [2]

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ⑰ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ⑱

''تو تم لوگوں نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کے قتل کا سامان کیا اور آپ نے جب (سنگریزے) پھینکے تو آپ نے نہیں پھینکے بلکہ اللہ نے پھینکے اور اس لئے کہ وہ مسلمانوں کے لئے اپنی طرف سے ایک خاص فضل وکرم کا مظاہرہ کرے [3] یقیناً اللہ سننے والا ہے بڑا جاننے والا۔ یہ حقیقت ہے [4] اور یقیناً اللہ کافروں کی ترکیب کو شکست دینے والا ہے۔''

روایت میں ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدر میں تھوڑی سی کنکریاں ہاتھ میں لے کر فوج دشمن کی جانب پھینکیں جس کے بعد انہیں شکست ہوئی [5] اسی کو قرآن کی آیت میں کہا جا رہا ہے۔

---

[1] ۔بان یریهم الفرة مکیدة وهو یرید الکرة (جلالین)

[2] ۔قال ابن عباس هو عام وهو قول ابی جعفر و ابی عبدالله (تبیان)

[3] ۔تا عطا کند مسلمانان را از نزدیك خویش عطائے نیکو. (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔ذٰلکم الابلآء حق (جلالین)

[5] ۔ذکر جماعة من المفسرین کابن عباس وغیرہ (تبیان)

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ﴿۱۹﴾

''اگر تم فتح چاہتے تھے تو سامنے فتح آ تو گئی اور اگر باز آ جاؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر پھر تم ایسا کرو گے تو ہم بھی ایسا ہی کریں گے اور تمہیں تمہاری جمعیت چاہے کتنی ہی زیادہ ہو کچھ فائدہ نہ دے گی اور بات یہ ہے کہ اللہ ضرور بالضرور ایمان والوں کے ساتھ ہے۔''

یہ تخاطب کفار کے ساتھ ہے۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ روز بدر ابوجہل نے کہا تھا کہ خداوندا جو ہم میں سے زیادتی کر رہا ہے، اسے شکست ہو تو قرآنی ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو خود تمہاری دعا تھی کہ جو حق پر ہو اس کی فتح ہو چنانچہ حق والوں کی فتح ہو گئی۔

دوسرے بہت سے مفسرین بھی اس سے متفق ہیں۔ [1]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۚ﴿۲۰﴾

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ اور اس کے پیغمبر کی اور اس کی طرف سے روگردانی نہ کرو، درحالیکہ تم سن رہے ہو اور ان کی طرح نہ ہو جنہوں نے کہا تو کہ ہم نے سن لیا مگر وہ (جو حقیقت میں سننا ہوتا ہے، اس طرح) سنتے نہیں ہیں۔''

''ان کی طرح نہ ہو جنہوں نے یوں کہا اور نہ کیا'' بعض نے اس کی تفسیر یہود و نصاریٰ کے ساتھ کی ہے [2] اور بعض نے مشرکین اور اس امت کے منافقین کے ساتھ [3] مگر مشرکین پر تو اس کا منطبق ہونا مشکل ہے اس لئے کہ وہ زبان سے بھی دعویٰ نہیں رکھتے کہ ''ہم نے سن لیا'' جس میں قبول کرنے کا مفہوم مضمر ہے اور ظاہر ہے کہ مشرکین اس کے قبول کرنے سے انکاری ہیں، پھر وہ کیوں کہیں گے **سمعنا** 'سنا ہم نے' ہاں! اہل کتاب اس امت کے منافقین، یہ دونوں اس سے مراد ہو سکتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ نے جو سلوک اپنی کتابوں کے ساتھ کیا یعنی زبانی اقرار اور قلباً انکار، وہی منافقین کا عمل اس کتاب یعنی قرآن اور احکام رسول ﷺ کے ساتھ ہے اور مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ تم منافقین میں سے نہ ہو۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

''بلاشبہ زمین پر بدترین چلنے والے، اللہ کے نزدیک یہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔''

---

[1] ۔حیث قال ابو جهل : اللهم اينا كان اقطع للرحم وانا نا بما لانعرف فاحنه الغداة اى اهلكه (جلالين) قال الحسن ومجاهد والزهرى والضحاك والسدى والفراء (تبيان)

[2] ۔یعنی مانند اهل كتاب كه توريت خواندند وبزبان معترف شدند وبران عمل نه كردند (فتح الرحمن)

[3] ۔هم منافقون والمشركون (جلالين)

گمراہ اور پست کردار انسان جانوروں سے بدتر

زمین پر چلنے والے حیوان اور انسان سب ہی ہیں، ان میں سب سے بدتر کہا گیا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ انسان جانوروں سے اور ان میں بھی سب سے بدتر ہیں۔ [1]

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

''اور اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا ہوتا تو انہیں سناتا اور اگر انہیں وہ سناتا تو بھی وہ پیٹھ پھراتے اس صورت سے کہ وہ بے اعتنائی اختیار کئے ہوئے ہیں۔''

ایک سنانا تو ہدایت عام کی صورت سے سب ہی کے لئے ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے اتمام حجت ہوتی ہے، وہ یہاں مراد نہیں ہوسکتا بلکہ یہ سنانا خصوصی ہدایت کا انتظام ہے جو اسی وقت ہوتا ہے جب کسی سے اثر پذیر ہونے کی امید ہو، اس اثر پذیری کی صلاحیت کو یہاں خیراً یعنی ''کوئی بھلائی'' کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ [2]

یہاں کہا گیا ہے کہ ''اگر اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا'' ظاہر ہے کہ جاننا کسی حقیقت واقعیہ سے متعلق ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ذاتی قصور اس کا باعث ہے کہ اللہ ان کی خصوصی ہدایت نہیں فرماتا مگر بعض مفسرین اہل سنت کو کیا کیا جائے کہ وہ بلاوجہ بھی بعض آیات میں جبر کا مفہوم پیدا کرتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحب اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''یعنی اللہ نے ان کے دل میں ہدایت کی لیاقت نہیں رکھی، جن میں لیاقت رکھی، انہی کو ہدایت دیتا ہے'' (موضح القرآن)

ہمیں نہیں معلوم کہ جاننے کے معنی ہدایت کی لیاقت رکھنا کس لغت میں ہیں؟

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

''اے ایمان لانے والو! لبیک کہو اللہ اور رسول کی آواز پر جب وہ تمہیں دعوت دیں اس چیز کی طرف جو تمہیں زندہ کردے گی اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان سدراہ ہوجاتا ہے اور وہ وہ ہے جس کی طرف تم محشور ہوکر جاؤ گے۔''

یہ دعوت اس دین کی دعوت ہے جو حیاتِ ابدی کا پیغام ہے [3] اس پر لبیک کہوتا کہ توفیقاتِ الٰہی تمہارے شامل حال ہوں اور اگر تم نے روگردانی کی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ توفیقات تم سے سلب ہوجائیں۔ اس کو کہا گیا ہے کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان سدراہ ہوجاتا ہے۔

غنیمت ہے کہ یہاں شاہ عبدالقادر نے بھی حقیقت بینی سے کام لیا ہے اور لکھا ہے:

---

[1] ۔ان هٰولاء الكفار شر من دب على الارض من الحيوان (مجمع البيان) یعنی جانوروں سے بدتر ہیں وہ آدمی جو دین حق کو نہ سمجھیں (موضح القرآن)

[2] ۔انهم يصلحون بما يورده عليهم من حجيه وٰ اياته (تبيان) قبولاً للهدٰى واقبالا على طلب الحق (مجمع البيان)

[3] ۔لما يحييكم من امر الدين لا نه سبب الحيوة الا بدية (جلالين)

''یعنی حکم بجالانے میں دیر نہ کرو، شاید اس وقت دل ایسا نہ رہے۔ اور اللہ اول کسی کے دل کو روکتا نہیں اور مہر نہیں کرتا۔ جب بندہ کاہلی کرے تو اس کی جزا میں روک دیتا ہے یا ضد کرے، حق پرستی نہ کرے تو مہر کر دیتا ہے۔'' (موضح القرآن)۔

چونکہ آخر میں یہ جملہ ہے کہ تم اسی کی طرف محشور ہو گے لہٰذا پہلا مفہوم ذہن میں یہی آتا ہے کہ یہ کسی برے انجام سے خوف دلایا جا رہا ہے مگر علامہ طبرسیؒ نے دو روایتیں جو معصومؑ کی طرف نسبت رکھتی ہیں ایسی درج کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ''یحول بین المرء وقلبه'' اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان سدراہ ہو جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے گمراہی سے بچاتا ہے [1] اس طرح یہ اس کی دعوت پر لبیک کہنے کا ایک صلہ ہے جس کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

ان حدیثوں کو دیکھنے کے بعد ذہن بھی اس مفہوم کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور اس صورت میں آخر کے جملہ کو بھی کہ ''اسی کی طرف تمہیں محشور ہونا ہے'' کوئی تہدید نہیں، بلکہ ڈھارس دینا سمجھنا چاہیے۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

''اور بچو اس ابتلاء سے کہ جو بلاشبہ انہی لوگوں سے مخصوص نہیں رہے گا کہ جو تم میں سے ظلم و تعدی کے مرتکب ہیں اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ سخت سزا والا ہے۔''

یعنی بلا جو آتی ہے، وہ چاہے ایک طبقہ کی بداعمالی کے سبب سے ہو مگر وہ اپنی لپیٹ میں سب ہی کو لے لیتی ہے [2] لہٰذا اس سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے اس طرح کہ خود ایسے اعمال کے مرتکب نہ ہوں اور جو مرتکب ہوتے ہیں، ان کو روکنے کی کوشش کریں۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

''اور یاد کرو وہ وقت کہ جب تم ایسے کم تعداد میں تھے، اس سرزمین پر کمزور شمار کئے جانے والے کہ تمہیں اندیشہ رہتا تھا کہ لوگ تم پر جھپٹا نہ ماریں [3] تو اس نے تم کو پناہ دی اور اپنی مدد سے تقویت پہنچائی اور تمہیں پاک و پاکیزہ غذا پہنچائی کہ تم شکرگزار رہو۔''

---

[1] ۔روی یونس بن عمار عن ابی عبداللہ قال: معناہ لا یستیقن القلب ان الحق باطل ابدا ولا یستیقن القلب ان الباطل حق ابدا وروی ھشام بن سالم عنہ قال: معناہ یحول بینہ وبین ان یعلم ان الباطل حق اوردھما العیاشی فی تفسیرہ (مجمع البیان)

[2] ۔معناہ انہا تعم لان الھرج اذا وقع دخل ضررہ علیٰ کل احد (تبیان)

[3] ۔یاخذ کم الکفار بسرعۃ (جلالین) اچک لے جاویں تم کو (شاہ رفیع الدین)

سرزمین مکہ میں مہاجروں کا عالم پریشانی

یہ مسلمان مہاجرین سے خطاب ہے اور ان کو سرزمین مکہ والا ماضی یاد دلایا جارہا ہے [1] پھر مدینہ کا حال ہے جہاں ان کو پناہ، قوت اور خوشحالی سب ہی کچھ حاصل ہوا۔

''شاید کہ تم شکر گزار ہو'' اس میں یہ طنز محسوس ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی تم میں سے بہت سے ناشکرے ہوں گے جو اطاعت خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے سے منحرف ہوجائیں گے۔

علاوہ ان آیتوں کے جن میں بہت صفائی سے ''کردارِ صحابہ'' پر روشنی ڈالی گئی ہے قرآن کے یہ مجمل اشارے بھی جمہور کے ''عدالت صحابہ'' کی عمومیت والے مسلمہ کو بڑی شدید ضربیں لگاتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٧﴾ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٨﴾

''اے ایمان لانے والو! اللہ اور پیغمبر سے خیانت نہ کرو اور خود اپنی امانتوں میں بھی خیانت نہ کرو درحالیکہ تم علم رکھتے ہو اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے مال اور اولاد آزمائش کا ذریعہ ہیں اور یہ کہ اللہ وہ ہے کہ اس کے پاس بڑے سے بڑا صلہ ہے۔''

امانتوں میں اموال بھی ہیں اور وہ ذمہ داریاں جو اقرار دین کی بنا پر عائد ہوتی ہیں [2]

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس آیت کا تعلق ابولبابہ سے ہے جنہیں بنی قریظہ نے مشورہ لینے کے لئے طلب کیا تھا تو انہوں نے اشارہ سے انہیں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارادہ جو ان کے بارے میں ہے بتلا دیا تھا [3]

فتنہ کے معنی بعض لوگوں نے یہ قرار دیئے ہیں کہ یہ راہِ حق سے ہٹانے کا سبب ہیں [4] مگر یہ اس معنی والا سبب نہیں سمجھا جاسکتا کہ اس کے خلاف ممکن نہ ہو بلکہ یہ ناقص نفوس کی کمزوری ہے کہ ان کے لئے ان کی محبت اس کا باعث ہوتی ہے اور یہی ان کے ذریعۂ آزمائش ہونے کی بنیاد ہے لہٰذا فتنہ کے معنی ذریعۂ آزمائش ہی کے درست ہیں [5] کیونکہ یہ چیزیں انسان کے ارتفاع درجات کا باعث بھی ہوتی ہیں جبکہ وہ حق اور فرض کے

---

[1] ۔در زمین یعنی در مکہ (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ما اؤتمنتم علیہ من الدین وغیرہ (جلالین)

[3] ۔قال الزھری نزلت فی ابی لبابۃ فی قصۃ بنی قریظۃ وھو المروی عن ابی جعفر وابی عبداللہ علیھما السلام (تبیان)

[4] ۔فتنۃ لکم صادۃ عن امور الأخرۃ (جلالین)

[5] ۔المراد بالفتنۃ ھھنا المحبۃ التی تطھیر بھا فا فی النفس من اتباع الھدٰی او تجنبہ (تبیان) لیختبر خلقہ بالاموال والاولاد۔ (مجمع البیان)

راستے پر ثابت قدم رہے۔

کیونکہ یہی چیزیں انسان کے ارتفاع درجات کا باعث بھی ہوتی ہیں جبکہ وہ حق اور فرض کے راستے پر ثابت قدم رہے۔ اور اسی لئے اس فتنہ سے بچنے کی کوشش کوئی ممدوح بات نہیں بلکہ وہ منزل جہاد نفس سے فرار کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے جسے علامہ طبرسیؒ نے اس آیت کے ذیل میں درج فرمایا ہے کہ:

لا یقولن احد کم اللھم انی اعوذبك

تم میں سے کوئی ہرگز یہ نہ کہے کہ خدایا میں تجھ سے۔

من الفتنة لانه لیس احد الا و ھو مشتمل علیٰ فتنة ولکن من استعاذ فلیستعذ من مضلات الفتن.(مجمع البیان)

مانگتا ہوں پناہ فتنہ سے، اس لئے کہ فتنہ (آزمائش کا سامان) تو ہر آدمی کے لئے ناگزیر ہے، ہاں جو شخص پناہ مانگے، وہ پناہ مانگے ان فتنوں سے جو آدمی کی گمراہی کا باعث ہوتے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّیُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۹﴾

''اے ایمان لانے والو! اگر اللہ کے غضب سے بچنے کی فکر رکھو تو وہ تمہارے لئے ایک خاص طرح کی حد فاصل بنا دے گا اور تمہاری غلطیوں سے درگزر کرے گا اور تمہیں معاف کرے گا اور اللہ بڑا فضل و احسان والا ہے۔''

''حد فاصل'' کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ تمہیں مرتبہ میں بلندی عطا فرما کر ایک خاص امتیاز کا مالک بنا دے گا[1] اور یہ بھی کہ فتح و غلبہ عطا فرما کے فوقیت کے لحاظ سے امتیاز دیدے گا[2] اور یہ بھی کہ ان اندیشوں سے جو تمہیں راہ حق میں درپیش ہیں، الگ کر دے گا[3] اور یہ بھی کہ تمہیں وہ نگاہ عطا کرے گا جس سے تم حق و باطل میں تمیز کر سکو[4] غالباً معصومؑ سے یہی تفسیر وارد ہے[5] اس سب کے علاوہ خود قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی یہ دعا وارد ہے کہ:

فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۵﴾

جدائی ڈال دے ہم میں اور اس فاسق گروہ میں (سورۂ مائدہ)

یہ آیت فرقان کے لفظ کے ساتھ بھی اس مفہوم کو ذہن میں لاتی ہے کہ اللہ تمہیں گمراہوں اور گنہگاروں سے الگ رکھے گا اور تم ان کے

---

[1] ۔ کرے گا واسطے تمہارے امتیاز (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔ پیدا کند برای شما فتحی را (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ فرقانا بینکم وبین ما تخافون فتنجون (جلالین)

[4] ۔ ای ھدایة ونورا فی قلوبکم تفرقون بھا بین الحق والباطل (مجمع البیان)

[5] ۔ یعنی العلم الذی تفرقون بہ بین الحق والباطل (علی بن ابراھیم)

وبال میں مبتلا نہیں ہوگے۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾

''اور جب کہ آپ کے خلاف کافر لوگ منصوبے بنا رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا جان سے ماریں یا آپ کو نکال باہر کریں اور وہ تو اپنے منصوبے بنا رہے تھے اور اللہ اپنا منصوبہ بنا رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر منصوبہ بنانے والا ہے۔''

حفاظت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خداوند عالم کی تدبیریں

یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ کفار کی منصوبہ سازی قبل ہجرت اس وقت کی ہے جب حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ معظّمہ میں تھے۔[۱]

ہوسکتا ہے کہ یہ اس وقت کا ذکر ہو، جب بالآخر یہ طے پایا کہ آپ کا اور بنی ہاشم کا مقاطعہ کیا جائے جس کے بعد آپ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ اس صورت میں ان کے بالمقابل اللہ کا منصوبہ وہ قرار پائے گا جس کی تکمیل جناب ابوطالبؑ کے ذریعہ سے ہوئی اور جس جس طرح انہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت فرمائی، وہ خالق کے اس منصوبہ کے اجزاء ہوں گے مگر بعض مفسرین تصریح کرتے ہیں کہ اس سے مقصود مشرکین کی وہ منصوبہ سازی ہے جو دارالندوہ میں مشورہ کے لئے اجتماع کے موقع پر ہوئی تھی جس کے بعد ہجرت ہوئی[۲] اس صورت میں خالق کا منصوبہ وہ ہوگا جس کی تکمیل اس نے علی بن ابی طالبؑ کو بستر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلا کر فرمائی جس کے نتیجہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بسلامتی ہجرت فرمائی[۳] اور اس تدبیر الٰہی کی صورت بھی بے شک ایسی ہے جسے خالق ان کے مکر کے مقابلہ میں لفظ مکر سے تعبیر فرمائے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب سے بچانے اور آسمان پر اٹھانے کے موقع پر بھی ارشاد ہوا ہے:

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ (آل عمران)

مگر مجھے اس محل نزول کے ماننے میں بس اتنا تامل ہے کہ ہجرت کا منصوبہ تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بن چکا تھا چنانچہ اصحاب سب تقریباً مدینہ کی طرف بھیجے جا چکے تھے۔ اسی منصوبہ کو ناکام بنانے کے لئے مشرکین کا اجتماع ہوا تھا۔ اس صورت میں مشرکین کے منصوبہ میں لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ کی دو شقیں تو سمجھ میں آتی ہیں کہ آپؐ کو قید کریں یا قتل کر دیں مگر تیسری شق: اَوْ يُخْرِجُوْكَ ''یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نکال دیں'' سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ نکالنا تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقصد کو پورا کرنا تھا، اسے ناکام بنانا نہیں تھا، پھر اگر ان کے منصوبہ کا یہ بھی جز تھا تو خالق کا اس کے بالمقابل یہ منصوبہ کہ ''نکل جایئے'' کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ ان کے منصوبہ کو شکست دینا کہاں ہوا؟

ہاں! اس صورت میں بھی ایک قول قرین قیاس ہے کہ نکالنے سے مراد ایک خاص طرح سے نکالنا تھا یعنی ایک شتر سرکش پر سوار کر کے

---

[۱] ۔تعریض است بآن قصد کہ کفار در مکہ جمع شدہ این رائے می روند (فتح الرحمن)

[۲] ۔وقد اجتمعوا للمشاورۃ فی شانک بدار الندوۃ (جلالین)

[۳] ۔بان اوحیٰ الیک ما دبروہ وامرک بالخروج (جلالین)

اسے ہنکا دینا جو باعث ہلاکت ہوجائے۔[1]

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣١﴾

''اور جب ان کے سامنے ہماری آیتوں کی تلاوت ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا ہی کلام پیش کریں۔ یہ نہیں ہیں مگر اگلے زمانہ کی فرضی کہانیاں۔''

یہ ان کا کہنا کہ ''ہم چاہیں تو ہم ایسا ہی کلام پیش کریں'' دھاندلی کے طور پر اپنے کھسیانے پن کو چھپاتے ہوئے نفسیاتی طور پر ضمیر کے اس چور کا غماز ہے کہ وہ محسوس کرتے تھے کہ ہم ایسے کلام پر قادر نہیں ہیں۔ ورنہ ''ہم چاہیں'' کے کیا معنی؟ قرآن کے مسلسل تازیانوں پر کہ اس کا مثل لا سکتے ہو تو لاؤ، چاہنا تو فطری امر ہے۔

آخر میں وہ مقابلہ میں جانیں دے رہے ہیں تو اسے کیوں نہیں چاہتے کہ ہم قرآن کے اس مطالبہ کو منظور کر کے اس کا مثل پیش ہی کر دیں۔ یہ ''نہ چاہنا'' ان کی زبان میں حقیقتاً مجبوری کا دوسرا نام ہے۔

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣٢﴾

''اور وہ بھی ایک وقت ہے جب انہوں نے کہا کہ خداوندا! اگر یہ تیری طرف کا حق ہو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر لا کوئی اور ایسا ہی دردناک عذاب۔

چونکہ وہ ظاہر ایسا کرتے تھے کہ یہ حق نہیں ہے، اس لئے گویا اپنی سچائی کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے لئے چاہے دل میں اسی وقت ڈر رہے ہوں مگر دیدہ دلیری سے کام لے کر زبان سے اس طرح کی دعا کرتے تھے اور اللہ کی اس مہلت سے جو انہیں دی جا رہی تھی، غلط فائدہ اٹھا کر اس تکذیب کے حق بجانب ہونے کی بخیال خود ایک دلیل پیش کر رہے تھے کہ اگر یہ سچ ہو تو ہم خود اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہم پر پتھروں کا یا اور اسی قسم کا عذاب نازل کر دے مگر دیکھو ہماری اس دعا کے باوجود ہم پر ایسا کوئی عذاب نہیں آتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پیغام میں کوئی حقانیت نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿٣٣﴾

''اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ ان پر عذاب نازل کرے اس حالت میں کہ آپ ان کے درمیان ہیں اور نہ اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا ہے اس حالت میں کہ جب وہ معافی مانگ رہے ہوں۔''

---

[1] ۔ قالا لفراء: او یخرجوك علیٰ بعیر یطرد به حتی تهلك (تبیان)

وجودِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مانع نزولِ عذاب

اس میں اللہ کی طرف کے ایک عام قاعدہ کا اعلان ہے جسے شاہ ولی اللہ صاحب ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

یعنی سنة اللّٰه آنست که تا پیغامبر درمیان قوم باشد عذاب عام نمی کند وہمچنیں تا آن که ایشاں استغفار می کنند عذاب نمی نماید (فتح الرحمن)

یعنی اللہ کا مستقل طریقہ یہ ہے کہ جب تک پیغمبر قوم کے درمیان ہوتا ہے وہ عمومی عذاب نازل نہیں کرتا اور اسی طرح جب تک وہ معافی مانگتے رہتے ہیں عذاب نازل نہیں کرتا۔

اس کا ربط محل کلام سے ظاہر کرتے ہوئے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''یعنی مکہ میں حضرت کے قدم سے عذاب رک رہا تھا، اب ان پر عذاب آیا، اسی طرح جب تک گنہگار نادم رہے اور توبہ کرتا رہے تو پکڑا نہیں جاتا، اگرچہ اس سے بڑا گناہ ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ گنہگاروں کو دو چیز پناہ ہیں، ایک میرا وجود اور دوسری استغفار'' (موضح القرآن)

اس سے دنیا کو محسوس ہونا چاہیے کہ اب جب کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے اور خلق خدا کی بداعمالیوں کا اس وقت سے اب تک ہر شخص مشاہدہ کر رہا ہے تو دنیا پر عذاب کیوں نہیں آتا؟

اس سے لازمی طور پر ماننا پڑتا ہے کہ دنیا اس حقیقتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود سے خالی نہیں ہے اور اس سلسلہ کی کوئی فرد اب بھی آنکھوں کے سامنے نہیں تو پردۂ غیبت میں قائم و برقرار ہے اور اسی کے سبب سے یہ آسمان و زمین قائم ہیں اور خلق خدا عذاب استیصال سے محفوظ ہے۔

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

''اور کیا استحقاق ہے انہیں کہ اللہ ان پر عذاب نہ کرے جب کہ وہ مسجد الحرام سے روکتے رہے حالانکہ وہ اس کے کوئی ورثہ دار نہیں ہیں، اس کے ورثہ دار نہیں ہیں مگر پرہیزگار لوگ لیکن ان میں کے زیادہ تر آدمی علم نہیں رکھتے۔''

یعنی یہ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان میں موجودگی تھی کہ ان پر عذاب نازل ہوا، ورنہ ان کے افعال ایسے ہی تھے کہ یہ مورد عذاب ہو جاتے۔[1] وہ اپنے کعبہ کا والی و وارث سمجھتے تھے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ اس کے اولیاء ہونے کے لائق نہیں ہیں، اس کے اولیاء تو پرہیزگار ہی ہو سکتے ہیں اور وہ مسلمان ہیں۔

اولیاء کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے ''ورثہ دار'' یہ عام ترجموں میں چاہے نہ کیا گیا ہو[2] مگر اس کی جو تشریح کی جاتی ہے وہ اسی ترجمہ کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''قریش آپ کو اولاد ابراہیم سمجھ کر کعبہ کے مختار ٹھہراتے تھے اور مسلمانوں کو آنے نہ دیتے تھے۔ سو فرمایا کہ اولاد ابراہیم میں جو

---

[1] ۔یعنی اصل استحقاق عذاب دارند ولیکن بودن پیغامبر درمیان ایشان مانع بود (فتح الرحمن)

[2] ۔نیستند سزاوار آنجا (شاہ ولی اللہ) نہیں وہ لائق والی ہونے اس کے (شاہ رفیع الدین)

پرہیزگار ہو اسی کا حق ہے۔'' (موضح القرآن)

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۳۵

''اوران کی نماز خانۂ کعبہ کے پاس سیٹی یا تالیاں بجانے [1] کے سوا نہ تھی، تو اب اس سزا کو چکھو اس کفر کی پاداش میں جو تم کرتے تھے۔''

بموقع حج مشرکین کے لغویات

یعنی بجائے نماز وعبادت کے جو اس خانۂ مقدس کے شایان شان ہے، وہ وہاں ایسے ناشائستہ حرکات کرتے تھے۔ [2]

کہا جاتا ہے کہ ''اس سزا'' سے مراد وہ تباہی ہے جو ان پر جنگ بدر میں آئی۔ [3]

اور آخرت کا عذاب بھی مراد ہو سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ بصورت کلام یا بزبانِ حال ان سے یوں کہا جائے گا [4] کہ اب اس سزا کو چکھو اس کفر کی پاداش میں جو تم کرتے تھے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ۝۳۶ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۳۷

''بلاشبہ کافر لوگ اپنے مال صرف کرتے ہیں اس غرض سے کہ اللہ کے راستے سے روکیں، تو بہت جلد ایسا ہوگا [5] کہ یہ ان کو صرف کریں گے اور پھر وہ ان کے لئے رنج وملال کا باعث بنیں گے، پھر وہ مغلوب بھی ہوں گے اور جو کافر ہیں وہ حشر میں دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے تاکہ اللہ امتیاز کر دے ناپاک کا پاک سے اور جو کچھ ناپاک ہو، اسے ایک دوسرے پر رکھ دے اور ان سب کو تہہ بہ تہہ کر کے دوزخ میں ڈال دے، وہ لوگ ہیں جو گھاٹا اٹھانے والے ہیں۔''

---

[1] ۔ التصدية التصفيق وهو ضرب اليد باليد (مجمع البيان)

[2] ۔ اى جعلوا ذلك موضوع صلوتهم التى امروا بها (جلالين)

[3] ۔ فذوقوا العذاب ببدر (جلالين)

[4] ۔ قال ابو على الجبائى: يقال لهم فى الأخرة: ذوقوا العذاب بما كنتم تكفرون (تبيان)

[5] ۔ زود باشد كه (شاه ولى الله)

''اللہ کے راستے سے روکیں'' یعنی دین الٰہی کے قبول کرنے سے۔[1]

''جو کچھ ناپاک ہو، اسے ایک دوسرے پر رکھ دے'' یعنی جس طرح وہ خیرات جو راہِ خدا میں ہو ذخیرۂ آخرت ہوتی ہے، اسی طرح یہ خرچ جو وہ بڑی فیاضی کے ساتھ باطل پروری کے لئے کر رہے ہیں آخرت کے لئے اکٹھا ہو رہے ہیں اور وہاں یہ سب جمع ہو کر ان کے لئے عذاب آخرت میں اضافہ کا سبب ہو جائیں گے۔[2]

اور گھاٹا اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کیونکہ یہ سب اموال خرچ بھی کریں اور پھر آخرت میں اس کی شدید سزا بھی پائیں گے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۳۸

''کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ باز آجائیں تو ان کے لئے بخشش ہو جائے گی اس کی جو کچھ پہلے ہو چکا ہے اور اگر وہ پھر ایسا کریں گے تو یہ اگلے آدمیوں کی روش ہے جو ہوتی چلی آئی ہے۔''

آخری فقرہ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، یہ ایک تشریح کے مطابق ہے[3] دوسرے معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ اگلے لوگوں کے لئے اللہ کا جو طریقہ ہے وہ سب کے سامنے آچکا ہے یعنی یہ کہ جب ان کی بداعمالیاں زیادہ ہو جائیں تو ان پر عذاب نازل ہو[4] مگر یہ معنی ظاہر الفاظ سے ذرا بعید ہیں۔ پھر بھی علامہ طبرسیؒ نے جو اس کی حمایت میں ارشاد فرمایا ہے وہ قابل لحاظ ضرور ہے۔ وہ فرماتے ہیں سنة (جس کا ترجمہ روش یا طریقہ کے ساتھ ہوتا ہے) اس کی اضافت قرآن مجید میں کئی طرح سے آئی ہے۔ پہلے یہی کہ وہ طریقہ جس کے ساتھ اختیار کیا جائے، اس کی طرف اضافت ہو جیسے یہاں کہا گیا: سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ''پہلے والوں کا طریقہ'' یعنی اللہ کا طریقہ جو اس نے پہلوں کے ساتھ اختیار کیا۔[5]

دوسرے وہ طریقہ جس کے ہاتھ سے عمل میں آئے، اس کی طرف اضافت جیسے:۔ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا ''ان کے طریقہ کے مطابق جنہیں ہم نے رسول بنایا'' یہاں طریقہ کی اضافت مرسلین کی طرف کی گئی ہے، اس لئے کہ اس کا ظہور انہی کے ہاتھ سے ہوتا تھا۔ اور تیسرے خود اپنی طرف اضافت جو کہ حقیقتاً اس طریقہ کا جاری کرنے والا ہے جیسے اس کے بعد ارشاد ہوا:

وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا — تم ہمارے طریقہ کو بدلتا ہوا نہیں پاؤ گے۔ (بنی اسرائیل: ۷۷)

یہ علامہ طبرسیؒ کا ارشاد بہت وقیع ہے مگر اس میں کمی بس اتنی ہے اور وہ بہت بڑی کمی ہے کہ پہلی قسم کی اضافت میں زیر بحث آیت کے علاوہ کوئی شاہد موصوف نے درج نہیں کیا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اس مفہوم کو کافی تقویت حاصل ہو جاتی۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

---

[1] ۔سبیل اللہ ھنا ھو دین اللہ (تبیان)

[2] ۔فیعاقبھم بہ کما قال: یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم الاٰیۃ (مجمع البیان)

[3] ۔ گزشتہ است روش پیشینان (شہ ولی اللہ) تحقیق گزری ہے یہی عادت پہلوں کی (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔سنۃ الاولین فی تعجیل العقاب لھم (تبیان) ای سنۃ فیھم (جلالین)

[5] ۔اضاف السنۃ الیھم لانھا کانت تجری علیھم (مجمع البیان)

بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

''اوران سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ کا وجود نہ رہے اور عبادت بالکل اللہ کی ہونے لگے اب اگر وہ باز آجائیں تو یقیناً اللہ دیکھنے والا ہے اس کا جو وہ کرتے ہیں اور اگر وہ منہ موڑیں تو جان لو کہ اللہ تمہارا مالک ہے، کتنا اچھا مالک اور کتنا اچھا سرپرست۔''

''فتنہ'' کے معنی غلبۂ کفر و کفار کے کہے گئے ہیں [۱] اور بعض مفسرین نے خود کفر شرک کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ [۲]

بعد کا فقرہ: ''يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ'' عبادت بالکل اللہ کی ہونے لگے [۳] اس تشریح کے ساتھ بہت چسپاں ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث ہے کہ اس آیت کا مضمون ابھی تک وقوع میں نہیں آیا ہے وہ وقع میں اس وقت آئے گا جب امام منتظر علیہ السلام ظہور فرمائیں گے [۴]۔

مولیٰ کے معنی مددگار کے لئے جاتے ہیں [۵] مگر اس صورت میں آخری فقرہ: ''نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ'' میں معنوی حیثیت سے تکرار ہوجاتی ہے لیکن جب مولیٰ کے معنی مالک کے لیں تو دونوں فقروں میں سے ہر ایک مستقل افادیت کا حامل قرار پاتا ہے اور معافی بیان کا مسلمہ اصول ہے کہ التاسیس اولیٰ من التاکید یعنی کسی نئے معنی کا لفظ میں پیدا ہونا اس سے بہتر ہے کہ اسے گزشتہ معنی ہی پر زور دینے پر محمول کیا جائے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾

''اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو چیز بھی تم بطور غنیمت حاصل کرو تو بلاشبہ اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے ہوگا اور پیغمبر کے لئے اور صاحبان قرابت اور یتیموں اور غریبوں اور اس کے لئے جو سفر کی راہ میں ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور اس پیغام پر جو ہم نے اتارا اپنے بندہ پر فیصلہ کے دن، اس دن جب دونوں جمعیتوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

---

[۱] ۔فتنہ یعنی غلبۂ کفر (شاہ ولی اللہ)

[۲] ۔فتنۃ شرک (جلالین)

[۳] ۔یکون الدین کلہ للّٰہ وحدہٗ ولا یعبد غیرہ (جلالین)

[۴] ۔روی زرارۃ وغیرہ عن ابی عبداللہ (مجمع)

[۵] ۔مولا کم ناصر کم (جلالین)

خمس کا صریحی حکم

لغت میں غنم کے معنی فائدہ کے ہیں اور اس لئے مالی فائدہ جو حاصل ہو وہ ما غنمتم کا مصداق ہوتا ہے لیکن چونکہ عموماً جہاد کے سلسلہ میں کفار کی شکست کے بعد جو اموال مسلمانوں کے ہاتھ آئیں، وہ مال غنیمت کہلاتے ہیں، اس لئے عام مفسرین نے اس ما غنمتم کو انہی اموال غنیمت کے معنی میں لیا ہے۔[1]

فقہائے شیعہ اس کے دائرہ کو اس کے لغوی معنی کی وسعت کے مطابق تعلیمات اہل بیت علیہم السلام کی روشنی میں حاوی کرتے ہیں بہت سی قسم کے اموال پر جیسے دفینے اور معاون اور منافع اموال تجارت اور غیر مسلمین سے جو مال کسی ایسے ذریعہ سے حاصل ہو جو عام انسانی قوانین کے ماتحت جرم نہیں ہے لیکن شریعت اسلام اسے ممنوع قرار دیتی ہے[2] تفصیل اس کی کتب فقیہہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

بہر حال ما غنمتم کے جو بھی حدود ہوں، یہ تو صاف نص قرآن سے ظاہر ہے کہ علاوہ زکوٰۃ کے ایک فریضۂ مال خمس کا ہے اور یہ اتنا معزز حق ہے کہ اس کے حقداروں میں سب سے پہلے اللہ کا نام ہے اور اس کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اور اس کے بعد ذوی القربیٰ کا۔

شکر ہے کہ یہاں بہت سے مفسرین اہل سنت بھی اس سے متفق ہیں کہ ذوی القربیٰ سے خود مسلمانوں کے قرابت دار مراد نہیں ہیں بلکہ قرابت دارانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

"یعنی خویشاوندانِ پیغمبر را کہ بنی ہاشم و بنی مطلب اند" (فتح الرحمن)

تفسیر جلالین میں بھی ایسا ہی ہے۔

قرابة النبی صلی الله علیه وسلم من بنی هاشم والمطلب"

بس اس بارے میں بھی دونوں فرقوں کے نقطۂ نظر میں اتنا فرق ہے کہ یہاں چونکہ ذوی القربیٰ بصورت جمع نہیں بلکہ ذی القربیٰ بصورت واحد ہے جس کا مفہوم نکلتا ہے ایک شخص خاص جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امتیازی رشتہ رکھتا ہے، اس لئے شیعہ تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد امام ہے[3] اور چونکہ وہی بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمائندہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے، اس لئے حق اللہ، حق الرسول اور حق ذی القربیٰ، ان تینوں کا مجموعہ جو خمس کا نصف حصہ ہوتا ہے، وہ "سہم امام" کہلاتا ہے۔

پھر آخر میں جو "وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ" کے الفاظ قرآن مجید میں ہیں اگرچہ بلا قید ہیں مگر ہمارے یہاں احادیث کی بنا پر یہ قید ثابت ہوئی ہے کہ ان میں سادات ہونے کی شرط ہے[4] اور اس لئے ان تینوں کے مجموعہ کو "سہم سادات" کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ کوئی غیر متوقع بات نہ ہوتی کہ حصوں کی تعیین میں یا تقسیم کے طریقہ میں شیعہ اور سنی میں اختلاف ہو جاتا جیسا کہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

---

[1] ۔اخذتم من الکفار قهرا (جلالین) آنچه غنیمت یافتند از کافران (شاه ولی الله)

[2] ۔عند اصحابنا یجب فی کل فائدة تحصل للانسان من المکاسب وارباح التجارات والکنوز والمعاون والفوض وغیر ذٰلك ... لان جمیع ذٰلك یسمیٰ غنیمة (تبیان)

[3] ۔هو الامام (علی بن ابراهیم)

[4] ۔فهم ایتام آل محمد علیہم السلام خاصة ومساکینهم وانباء سبیلهم خاصة (علی بن ابراهیم)

''چہارخمس عانمانرا بایدداد و یک خمس در بیت المال نہادہ برپنج حصہ یا سہ حصہ قسمت باید کرد علی اختلاف المذہب۔'' (فتح الرحمن)

جو فقہ اہل بیت علیہم السلام کے خلاف ہے مگر اندوہناک سانحہ تو یہ ہے کہ قرآن کی اس آیت کے باقی ہوتے ہوئے جمہور اہل سنت کے یہاں خمس کا فریضہ ہی ساقط کر دیا گیا اور ہمیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس حکم کے آخر میں یہ تہدیدی الفاظ کہ ''اگر ایمان رکھتے ہو اللہ پر'' اسی مستقبل کو دیکھتے ہوئے رکھے گئے تھے کہ باوجود دعوائے اسلام و ایمان کے مسلمانوں کی اکثریت اس حکم پر خط نسخ کھینچ دے گی۔

جنگ بدر کے کچھ کیفیات

''فیصلہ کے دن'' اور ''دونوں جمعیتوں کی مڈبھیڑ کے دن سے مراد روز بدر ہے [1] اور اس کا حوالہ اس لئے دیا گیا ہے کہ اس دن کی فتح مسلمانوں کے لئے صرف قدرتِ ربانی اور تائید الٰہی سے ایک معجزہ کے طور پر ہوئی تھی لہٰذا مسلمانوں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ فتح وہ اپنی قوت بازو سے حاصل کرتے ہیں اور مال غنیمت کا پورا پورا استحقاق خود انہی کو ہے۔ اس میں دوسرے حصے کیوں قرار دیئے جاتے ہیں؟ انہیں اس موقع کو یاد دلا کر ایک طرف استحکام ایمان کا سرمایہ فراہم کیا جاتا ہے کہ اگر ابھی تمہارے ایمان میں کمزوری ہے تو ان قدرتی آثار کو دیکھ کر جو جنگ بدر میں نمودار ہوئے تمہارے ایمان کو مستحکم ہو جانا چاہیے اور دوسری طرف یہ کہ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ تمہارے فتوحات تائید حق پر مبنی ہیں تو جو اس کی طرف کا فریضہ ہو اس کے ادا کرنے کے لئے برضا و رغبت تیار ہو۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۴۲﴾

''جب کہ تم ادھر کے کنارے پر تھے اور وہ اُدھر کے کنارے پر [2] اور قافلہ تم سے نیچے اور اگر تم میں آپس میں وقت مقرر ہوا ہوتا تب بھی تم میں باہم وقت کے اعتبار سے اختلاف ہو جاتا مگر اللہ کو تو پورا کرنا تھا اس بات کو جو کہ ہونے والی تھی تاکہ جو ہلاک ہو وہ حجت تمام ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ ہو وہ حجت کی بنا پر زندہ رہے اور یقیناً اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا۔''

یہاں سے جنگ بدر کی روئداد بیان ہونا شروع ہوتی ہے۔ مسلمان مدینہ کی طرف سے چلے اور ابوجہل کی سرکردگی میں مشرکین کا لشکر مکہ سے آرہا تھا اور ابوسفیان کی سرکردگی میں تجارتی قافلہ شام کی جانب سے آرہا تھا ہوسکتا تھا کہ مسلمان مکہ والوں کے آنے سے پہلے آگے بڑھ جاتے اور شام کے قافلہ تک پہنچ جاتے اور کفار مکہ کی جماعتیں ٹھیک ایک دوسرے کے مقابلہ میں ایک ہی وقت پر اس طرح آمنے سامنے پہنچ گئیں کہ مقابلہ

---

[1] ۔یوم الفرقان ای یوم بدر الفاروق بین الحق والباطل (جلالین)

[2] ۔العدوۃ شفیر الراوی (تبیان) شما بکنارۂ نزدیک بو دید و ایشان بکنارۂ دور تر (شاہ ولی اللہ)

ناگزیر ہوگیا۔ اس کو ایک غیر معمولی کرشمۂ قدرت کے طور پر بیان کیا جارہا ہے کہ اس طرح ایک ہی وقت پر اس جگہ دونوں جماعتوں کا پہنچنا ہوا کہ معلوم ہوتا ہے جیسے پہلے سے دونوں میں طے ہوگیا تھا کہ وہاں پر ہم دونوں اس وقت پر ملیں گے بلکہ اگر آپس میں اس طرح کا قول وقرار بھی ہوتا تب بھی کچھ تو اختلاف ہو ہی جاتا کہ ایک کچھ پہلے پہنچتا اور دوسرا کچھ بعد لیکن یہ خداوندی انتظام تھا تاکہ اب ایک دفعہ کفر کو اسلام کے مقابلہ میں طاقت آزمائی کا موقع دے ہی دیا جائے اور پھر ظاہری اسباب کے تقاضا کے بالکل برخلاف اس اقلیت کو اس اکثریت کے مقابلہ میں فتح عطا کر کے دکھلا دیا جائے [1] اور اس کرشمۂ قدرت کے ذریعہ سے حق اور باطل بالکل نمایاں ہوجائے۔

اب جو ہلاک ہو یعنی کفر پر قائم رہے وہ حق کے آثار آنکھوں سے نمایاں دیکھنے کے بعد [2] صرف ہٹ دھرمی سے کفر پر قائم رہے گا اور جو زندہ ہو یعنی ایمان اختیار کرے وہ حجت یعنی پوری بصیرت ایمان کے ساتھ۔

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾

''جب کہ اللہ نے آپ کے خواب میں ان کی تعداد آپ کو کم دکھائی اور اگر وہ آپ کو ان کی تعداد زیادہ دکھاتا تو تم لوگ سست ہوجاتے اور طریقۂ کار میں آپس میں دست وگریبان ہوجاتے [3] لیکن اللہ نے خیریت رکھی یقیناً وہ سینوں کے اندر والی باتوں کا جاننے والا ہے۔''

اس آیت سے ظاہر ہے کہ جنگ بدر کے پہلے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس جنگ کی صورت خواب میں دکھلائی گئی ہے اور اسی کے پیش نظر آپ برآمد ہوئے۔

اس سے بھی وہ حکایت یا خیال غلط ہوجاتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصل میں مشرکین کے قافلہ کو لوٹنے کے لئے نکلے تھے مگر اتفاق سے مقابلہ اس فوج سے ہوگیا جو قافلہ کی حفاظت کے لئے روانہ ہوئی تھی۔

ہاں! قرآن یہ کہتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں تعداد مشرکین کی کم دکھائی گئی ورنہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس خواب کو بیان فرماتے تو عام مسلمانوں پر خوف ودہشت طاری ہوجاتی اور طریق کار کے اختیار کرنے میں اختلاف ہوجاتا یعنی کچھ اشخاص مرعوبیت کے نتیجہ میں ایسی رائیں دیتے کہ جنگ کی نوبت نہ آئے اور گوشۂ عافیت سے نکلنا نہ پڑے۔

خالق کریم نے اس مصلحت سے خواب میں تعداد کم دکھائی اور اس طرح اس باہمی اختلاف اور کشمکش سے بچالیا۔ [4]

یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ خواب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھایا گیا ہے مگر سستی وغیرہ کی نسبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نہیں ہے ورنہ اس کا ذکر اسی واحد حاضر کے صیغہ کے ساتھ ہوتا جو آیت کے شروع میں ہے بلکہ اس کی نسبت عام مسلمانوں کی طرف ہے اس لئے صیغۂ جمع حاضر استعمال کیا جارہا

---

[1] ۔لیقضی اللہ امرا کان مفعولا فی علمہ وھو نصر الاسلام ومحق للکفر (جلالین)

[2] ۔قیام حجۃ علیہ بما رأی من المعجزات الماھرات (تبیان)

[3] ۔بزدلی می کردید و بایکدیگر نزاع می کردید (شاہ ولی اللہ) البتہ سستی کرتے تو تم اور البتہ جھگڑتے تم بیچ کام کے (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔سلمکم من الفشل والتنازع (جلالین)

ہے۔ (لَفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ)

یہ قرآن مجید کے انداز تعبیر کے وہ پہلو ہیں جن پر سطحی نگاہیں اکثر متوجہ نہیں ہوتیں اور اس لئے غلط اندیشوں میں مبتلا ہوتی ہیں۔

شاہ عبدالقادر نے یہاں پر ایک اچھی نکتہ آفرینی کی ہے وہ لکھتے ہیں: ''پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں کافر تھوڑے نظر آئے اور مسلمانوں کو مقابلہ کے وقت تاکہ جرأت سے لڑیں پیغمبر کا خواب غلط نہیں، ان میں کافر رہنے والے کم ہی تھے اکثر وہ تھے جو پیچھے مسلمان ہوئے۔'' (موضح القرآن) مگر یہ حقیقت تو از روئے قرآن ناقابل انکار ہے کہ اس وقت جو حقیقت واقعہ یعنی جتنی تعداد فوج کی تھی اسے خالق نے خواب میں نمایاں نہیں کیا جس کی مصلحت خداوند عالم کی جانب سے بتائی جارہی ہے اس کے بعد اس اصول کا تو قائل ہونا چاہیے کہ بعض اہم مصالح کی بنا پر حقیقت کو نمایاں نہ ہونے دینا درست ہے اور اس سے تقیہ کا جو مطلق طور پر انکار کیا جاتا ہے یا اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے، وہ بلاشبہ غلط قرار پاتا ہے۔

وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۴۴

''اور جب کہ تمہارے ایک دوسرے کے آمنے سامنے پہنچنے کے وقت وہ ان کی تعداد تمہاری آنکھوں میں کم دکھلا رہا تھا تاکہ اللہ پورا کرے اس بات کو جو وہ کرنے والا تھا اور اللہ ہی کی طرف رجوع ہے تمام چیزوں کا۔''

مشرکین کی تعداد مسلمانوں کو زیادہ نظر آتی تو ان میں سستی پیدا ہوتی اور کفار کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ محسوس ہوتی تو وہ مقابلہ سے گریز کرتے لہٰذا وہ جنگ نہ ہوتی جس میں اللہ کو اپنی قوت قاہرہ کا ثبوت دے کر کفار کو شکست دینا تھی لہٰذا اس نے اپنی قدرت کے تصرف سے ان کی تعداد انہیں کم دکھائی اور ان کی تعداد انہیں کم محسوس ہوئی اس طرح دونوں نے جم کر مقابلہ کیا اور نتیجتاً قدرت کو جو منظور تھا وہ وقوع میں آکر رہا مگر معلوم ہونا چاہیے کہ کفار کا یہ احساس کہ مسلمان تعداد میں بہت کم ہیں جو کہ واقعہ تھا، جنگ شروع ہونے کے قبل تک قائم رہا اور جب لڑائی شروع ہوگئی تو اب خالق کا کرنا یہ تھا کہ یہ انہیں تعداد میں اپنے سے دونے نظر آنے لگے جس کا سورۂ آل عمران میں تذکرہ ہے۔[1]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۴۵

''اے ایمان لانے والو! جب کسی جماعت کا سامنا کرو تو ثابت قدم رہا کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو، شاید کہ تم ہر طرح کی بہتری حاصل کرو۔''

میدان جنگ میں برقرار رہنے کی تاکید

اس کے پہلے سلبی پہلو یعنی فرار سے ممانعت ہو چکی ہے اور اب مثبت طور پر ثابت قدمی کا حکم دیا جارہا ہے جس سے التزامی طور پر وہ ممانعت برآمد ہوتی ہے۔

---

[1] ۔ھٰذا قبل التحام الحرب فلما التحم اراھم ایاھم مثلیھم کما فی ال عمران (جلالین)

آخری فقرہ سے ظاہر ہے کہ فرار کرنے والے ''بہتری'' سے محروم رہیں گے اور چونکہ یہ دین و دنیا کی بہتری ہے اور دینی بہتری کے معنی نجات کے ہیں، اس لئے اس سے ظاہر ہے کہ فرار کرنے والے نجات سے محروم رہیں گے اور بعض مترجمین نے فلاح کے معنی ہی نجات کے قرار دے دیئے ہیں۔ [1]

بے شک یہ حکم کہ جب کسی جماعت کا سامنا کرو تو ثابت قدم رہو، اس میں عقلی و نقلی قرائن سے یہ قید ضروری ہے کہ وہ جماعت ایسی ہو جس سے جنگ بحکم شرع درست ہو اس لئے کہ اگر جنگ ناجائز ہوئی تو اس میں ثابت قدمی بھی شرعاً کوئی ممدوح چیز نہیں ہو سکتی۔ [2]

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۴۶

''اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو کہ تم میں سستی پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا بگڑ جائے گی اور صبر و برداشت سے کام لو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

تنازع باہمی کے خراب نتائج

آیت بتا رہی ہے کہ اگر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے کی بجائے آپس کے اختلافات میں پڑ گئے تو اس کے کیا نتائج نکلیں گے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝۴۷

''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو نکلے اپنے گھروں سے اکڑ میں [3] اور آدمیوں کو دکھانے کے لئے اور وہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اللہ اس پر جو وہ کرتے ہیں حاوی ہے۔''

خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں تعریض ابوجہل اور اس کے ہمراہیوں پر ہے [4] مگر دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ خود مسلمانوں کو جو جہاد میں جاتے ہیں تنبیہ ہے کہ اس میں اکڑ اور دکھلاوے کی نیت شامل نہ ہونا چاہیے [5] مگر اس صورت میں راہ راست سے روکنے کا جز کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ

---

[1] ۔بود کہ شمار سنگار شوید (شاہ ولی اللہ) تو کہ تم چھٹکارا پاؤ (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔الفئة المذکورة فی الایة وان کانت فتطلقة فالمراد منها اکمشرکة او الباغیة (تبیان)

[3] ۔از روئے سرکشی (شاہ ولی اللہ) اترا کر (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔ایں حال ابوجهل و تابعان اوست (فتح الرحمن) هم قریش لما جت خدمت لتحصی ایقن (تبیان)

[5] ۔جہاد عبات ہے، عبادت پر اترا وے یا دکھاوے کو کرے تو قبول نہیں (موضح القرآن)

وَاِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَقَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾

''اور جب کہ شیطان نے ان کے سامنے ان کے کرتوتوں کو بناٹھنا کر پیش کیا اور کہا کہ آج آدمیوں میں کوئی تم پر غالب آنے والا ہے ہی نہیں اور میں تمہارا حمایتی ہوں [1] اس کے بعد جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے آئیں تو وہ پچھلے پیروں پلٹ گیا اور کہا میں تم سے بے تعلق ہوں بلاشبہ میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ میں تو یقیناً اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت سزا والا ہے۔''

بعض مفسرین تو لکھتے ہیں کہ واقعی شیطان آدمی کے بھیس میں آیا اور اس نے ابوجہل سے اس طرح گفتگو کی۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''وہ شیطان تھا جب اس نے جبریلؑ و میکائیلؑ دیکھے مسلمانوں کی طرف، تب بھاگا'' (موضح القرآن)

بلکہ صورت بھی بتائی گئی ہے کہ:

كان اتاهم فی صورة سراقة ابن مالك سيد تلك الناحية (جلالين)

وہ ان کے پاس سراقہ بن مالک کی صورت میں آیا تھا جو ان اطراف کا سردار تھا۔

ہمارے یہاں بھی اس کی روایت موجود ہے [2]

اور ایسا نہ بھی ہو تو وہ بداعمال لوگوں کے ذہن میں خیالات اسی طرح پیدا کرتا ہے جیسے کہ وہ ان سے باتیں کر رہا ہو۔

اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ؕ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۴۹﴾

''جب کہتے تھے منافق لوگ اور وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ ان لوگوں کو فریب میں مبتلا کر دیا ہے ان کے دین نے اور جو اللہ پر بھروسہ کرے تو یقیناً اللہ زبردست ہے صحیح و درست کام کرنے والا۔''

کھلا ہوا مطلب تو اس کا یہی سمجھ میں آتا ہے کہ جنگ کے قبل مسلمانوں کی قلت اور دشمنوں کی کثرت کی بنا پر منافق اور مسلمانوں کے بدخواہ گویا خوش ہو رہے تھے اور مسلمانوں پر یہ طعنے کس رہے تھے کہ ان کے دین نے ان کو فریب میں مبتلا کر دیا ہے کہ یہ اس بے سروسامانی کے عالم میں اتنی کثیر جمعیت کے مقابلہ کے لئے جا رہے ہیں۔ اب غرھم کا لفظ غرور بمعنی فریب سے ہوگا۔

شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادہ شاہ رفیع الدین نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے [3] جلالین کی تشریح بھی یہی ہے:

غرّ هٰؤلآء المسلمين دينهم اذ خرجوا مع قلتهم يقاتلون الجمع الكثير توهما انهم ينصرون بسببه.

---

[1] ۔من مدد کنندہ ام شما را (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔هو قول ابی جعفر و ابی عبداللہ علیهما السلام (تبیان)

[3] ۔فریفتہ است این مسلمانان را دین ایشان (شاہ ولی اللہ) فریب دیا ہے ان کو دین ان کے نے (شاہ رفیع الدین)

دھوکا دیا ہے ان مسلمانوں کو ان کے دین نے جب کہ وہ اپنی قلت تعداد کے باوجود نکلے ہیں اس بڑی جماعت سے جنگ کے لئے یہ تصور کر کے کہ اس دین کے سبب سے مدد الٰہی ان کے شامل حال ہوگی۔

ہمارے اکابر مفسرین نے بھی اسی کے مطابق تشریح کی ہے [1] مگر شاہ ولی اللہ کے دوسرے فرزند شاہ عبدالقادر نے اس غرور کو گھمنڈ کے معنی میں لے کر یہ مطلب کہا ہے کہ:

مسلمانوں کی دلیری دیکھ کر منافق اس طرح طعن کرنے لگے تھے سو اللہ نے فرمایا کہ یہ غرور نہیں توکل ہے"۔ (موضح القرآن)

پہلی صورت میں آخری فقرہ منافقوں کی اس طعنہ زنی کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ڈھارس بندھانا ہے کہ ان کی کثرت تعداد جتنی بھی ہو تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ اللہ کی طاقت سے بڑھ کر نہ کسی کی طاقت ہے نہ اس کی طرح صحیح و درست کوئی کام کرنے والا ہے۔ تم کو اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۵۰ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۵۱ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۵۲

"اور کاش تم دیکھو [2] وہ موقع جب فرشتے کافروں کی قبض روح کر رہے ہوں گے، وہ مارتے ہوں گے ان کے منہ اور پشت پر اور (کہتے ہوں گے) چکھو اس آگ میں جلنے کا مزہ [3]۔ یہ پاداش اس کی ہے جو تمہارے ہاتھ کر چکے ہیں اور یہ کہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اسی طرح کہ جیسے ہوا [4] فرعون کے حوالی موالی اور ان کے ساتھ جو ان کے پہلے تھے انہوں نے آیات الٰہی کے ساتھ کفر اختیار کیا تو اللہ نے ان کے گناہوں کے سبب انہیں گرفت میں لے لیا یقیناً اللہ طاقتور ہے سخت سزا دینے والا۔"

بعض تفاسیر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ جنگ بدر ہی کے موقع کا تذکرہ ہے جب ملائکہ مسلمانوں کی مدد کے لئے آئے تھے اور کافروں سے جنگ کر رہے تھے۔ اور یہ منہ اور پشت پر مارنا جنگ کے عالم کا حال ہے کہ وہ انہیں اسلحہ جنگ سے منہ اور پشت پر ضربیں لگا رہے تھے۔ [5]

---

[1] ۔الغرور اظہار النصح مع ابطان الغش (تبیان)

[2] ۔ کاش کہ دیکھے تو (شاہ رفیع الدین) دوسرے لوگوں نے "لو" کو شرطیہ لیا ہے جیسے "تعجب می کردی اگر می دیدی (شاہ ولی اللہ) جواب "لو": لرایت امرا عظیما. (جلالین)

[3] ۔ویقولون لھم ذوقوا (جلالین) می گویند بچشید (ولی اللہ)

[4] ۔مانند عادتِ قوم فرعون (ولی اللہ)

[5] ۔انہ یوم بدر (تبیان)

اس صورت میں ترجمہ یوں ہوگا کہ ''جب فرشتے کافروں کی پوری طرح جانیں لے رہے تھے اس طرح کہ مار رہے تھے ان کے منہ اور پشت پر اور (کہتے تھے).....(یہ تو اس وقت تمہاری سزا ہے اور) چکھنا (اس کے بعد دوزخ کی) آگ کا مزہ'' یعنی ابھی یہ تو تلوار کی آنچ ہے جس میں تم بھسم ہو رہے ہو مگر اسی پر خاتمہ نہیں ہے بلکہ اس کے بعد آتش جہنم کا عذاب بھی ہے جس میں تمہیں مبتلا ہونا ہے مگر آیت کے الفاظ سے مجھے یہ مفہوم زیادہ قریب معلوم نہیں ہوتا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

''یہ اس بنا پر ہے کہ اللہ نہیں ہے بدلنے والا کسی نعمت کا جو اس نے کسی جماعت کو دی ہے جب تک وہ خود اپنے میں تبدیلی پیدا نہ کریں اور یہ کہ اللہ سننے والا ہے، جاننے والا، اسی طرح کہ جیسے ہوا فرعون کے حوالی موالی اور ان کے ساتھ جو ان کے بھی پہلے تھے، انہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں کو جھٹلایا تو ان کے گناہوں کے سبب سے ہم نے ان کو ہلاک کیا اور فرعون کے حوالی موالی کو ڈبو دیا اور وہ سب ظالم لوگ تھے۔''

خدا کی نعمتوں میں تبدیلی خود اپنے نفوس کی تبدیلی کا نتیجہ

یہ وہی اصول قدرت ہے جو دوسری جگہ قرآن میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ.

خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔ (سورۂ رعد۔۱۱)

یہ تبدیلی کیا ہے جو وہ اپنے میں کریں گے؟! یعنی خالق کی نعمتوں کی ناقدری کرنے لگیں، اسے بھول جائیں، تن آسانی اور عیش پرستی میں مبتلا ہو جائیں، معاصی الٰہیہ میں منہمک ہو جائیں، تب اللہ اپنی نعمتوں کو سلب کر لیتا ہے۔

کیا اس کے بعد اقبالؔ کو اپنے ''شکوہ'' کا جواب کچھ نظم کرنے کی ضرورت تھی؟ پورے شکوہ کا جواب یہ ایک قرآن کی آیت ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ الَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

''یقیناً بدترین چلنے پھرنے والی مخلوق اللہ کے نزدیک یہ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا تو اب کسی طرح وہ ایمان

لائیں گے ہی نہیں جن سے آپ معاہدہ کرتے ہیں پھر وہ ہر دفعہ اس عہد و پیمان کو توڑ ڈالتے ہیں اور انہیں اس میں کوئی باک نہیں ہے تو اب اگر جنگ میں وہ آپ کے ہاتھ آجائیں تو ان کا صفایا کر کے ان کے بعد والوں کی جمعیت کو منتشر کر دیجئے [1] شاید وہ اس سبق کو یاد رکھیں۔''

کفر اگر نادانستہ، بے شعوری کے ساتھ ہو تو وہ درحقیقت ایک کیفیت ہے، انسان کا فعل نہیں ہے قرآن مجید میں زیادہ تر ''کافر کی صفت استعمال کرنے کے بجائے اسم موصول کے ساتھ فعل لایا گیا ہے:

''الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' جس کا ترجمہ یہ ہوا کرتا ہے کہ ''جنہوں نے کفر اختیار کیا'' یہ اختیار ایک دانستگی کا اظہار کرتا ہے جس میں دھاندلی، سخن پروری، نفسیانیت اور عناد کے کیفیات مضمر ہیں اور یہ چیزیں قبول حق سے آئندہ بھی سدراہ ہیں، اسی لئے یہاں ماضی کے کفر کے ساتھ کہ ''الذین کفروا'' جنہوں نے کفر اختیار کیا آئندہ کی خبر کو کہ ''وہ ایمان نہیں لائیں گے'' ف صرف تفریع کے ساتھ بطور نتیجہ بیان کیا ہے یعنی قبل میں جب کہ جان بوجھ کر انکار کیا ہے تو آئندہ کے لئے ان سے یہ امید غلط ہے کہ وہ کبھی ایمان لائیں گے۔ [2]

بعد میں جو اوصاف ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ بنی قریظہ کا کردار ہے۔ آخر میں جو ہے کہ ''شاید وہ اس سبق کو یاد رکھیں''، یعنی ان کے انجام کو دیکھ کر بعد والے عبرت حاصل کریں اور متنبہ ہو جائیں۔ [3]

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

''اور اگر آپ کو کسی جماعت سے بد دیانتی کے آثار محسوس ہوں تو ان کے عہد و پیمان کو ان کی طرف پھینک دیجئے [4] کہ معاملہ برابر ہو جائے، بلاشبہ اللہ بد دیانتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

اس کے پہلے جو حکم تھا کہ ''وہ جنگ میں آپ کے ہاتھ آجائیں تو صفایا کر دیجئے'' ان لوگوں کے لئے تھا جن سے غداری ظہور میں آچکی ہو لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ ابھی غداری عمل میں نہیں آئی لیکن آثار و قرائن اس کے پیدا ہو گئے ہیں کہ یہ بھی غداری کریں گے۔ ان کے لئے یہ کہا جا رہا ہے کہ عہد و پیماں کے قائم رکھتے ہوئے تو ان پر کوئی دستِ تعدی دراز نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کے لئے یہ صورت ہے کہ ان کے عہد و پیمان کو ان کی طرف پھینک دیا جائے یعنی انہیں آگاہ کر دیا جائے کہ اب ہم اس معاہدہ کو منسوخ کرتے ہیں۔ [5]

''معاملہ برابر ہو جائے'' یعنی معاہدہ کے قبل جو صورتِ حال تھی کہ کوئی خاص آئینی پابندی ان کے بارے میں عائد نہیں تھی، وہی

---

[1] ۔متفرق ساز بسبب کشتن ایشان آنان را کہ پس پشت ایشاں باشند (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔کانہ قال کفروا مصممین علی الکفر فھم لا یؤمنون (تبیان)

[3] ۔لعلھم ای الذین خلفھم (جلالین)

[4] ۔اطرح عھدھم الیھم (جلالین)

[5] ۔لظھور امارات الخیانۃ التی دلت علی نقض العھد (تبیان)

صورتحال اب پیدا ہو جائے۔[1]

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اور وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا، یہ نہ سمجھیں کہ وہ نکل گئے، بلاشبہ وہ عاجز نہیں کر سکیں گے۔''

یہ آیت باعتبار مضمون گزشتہ سلسلہ سے بھی متعلق ہو سکتی ہے اور ''نکل گئے'' کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کی ترکیب چل گئی اور وہ داؤں اپنا کر گئے۔[2]

لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ جنگ بدر کے شکست خوردہ مشرکین کے بارے میں ہے اور ''نکل گئے'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ بچ کر نکل گئے اور اب وہ محفوظ ہیں، نہیں تقدیر الٰہی سے بچ کر وہ کہیں تھوڑی جا سکتے ہیں۔[3]

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۶۰﴾

''اور مہیا رکھو ان کے لئے جو تم فراہم کر سکو طاقت کی قسم سے اور گھوڑوں کو مورچوں پر تیار رکھنے کی صورت سے جن کے ذریعہ سے تم خوف زدہ بناؤ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن اور دوسروں کو جو ان کے علاوہ ہیں، جنہیں تم نہیں جانتے ہو اللہ انہیں جانتا ہے اور جو چیز بھی تم اللہ کی راہ میں صرف کرو گے، پوری پوری تمہیں ادا کر دی جائے گی اور تمہارے ساتھ زیادتی نہیں کی جائے گی۔''

جہاد کی تیاری اور رباط کا حکم

''اللہ کے اور مسلمانوں کے دشمن''..... یہ کھلے ہوئے دشمن کفار و مشرکین اور ''دوسرے جو تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے'' اس سے مراد منافقین ہیں جو اپنے دلوں میں طرح طرح کی سازشوں کے خیالات کو پرورش دے رہے ہیں، تمہاری اس تیاری سے وہ بھی خوف زدہ ہو جائیں گے۔

تمام مفسرین کو اس جملہ کے یہی معنی سمجھنے اور لکھنے پڑے ہیں، چنانچہ شاہ ولی اللہ تحریر فرماتے ہیں ''یعنی اہل نفاق (فتح الرحمن)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''وہ لوگ جن کو تم نہیں جانتے، وہ منافق ہیں کہ ظاہر مسلمانی کے پردہ میں ہیں (موضح القرآن)

---

[1] ۔ برابر کے برابر یعنی جو سر انجام صلح سے پہلے کر سکتے ہو، سو اب بھی کر سکتے ہو لڑائی کا، اس میں کچھ بدقولی نہیں (موضح القرآن)

[2] ۔ ایشان پیش دستی کردہ اند (شاہ ولی اللہ) کہ آگے نکل گئے (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔ نزل فی من افلت یوم بدر ...سبقوا اللہ ای فاتوہ...انہم لا یعجزون لا یفوتونہ (جلالین)

اس سے کہ ''تم نہیں جانتے'' صاف ظاہر ہے کہ ایک طبقہ منافقوں کا ایسا تھا جن کا عموماً مسلمانوں کو علم اور احساس نہیں تھا۔ اس لئے منافقین کے لفظ کو جہاں جہاں قرآن میں آئے، بس عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھیوں پر ڈھال کر اطمینان کی سانس لینا درست نہیں ہے۔ یہ تو وہ منافقین تھے جن کا نفاق بالکل کھل گیا تھا اور سب جانتے تھے کہ یہ منافقین ہیں اور اسی لئے ان سے تو بعد میں احکام اسلام بھی سلب کر لئے گئے چنانچہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان پر نماز جنازہ پڑھنے سے روک دیا گیا، استغفار کرنے سے منع کیا گیا تو یہ منافقین وہ کب ہو سکتے ہیں جن کے لئے خالق ارشاد فرما رہا ہے کہ ''تم لوگ انہیں نہیں جانتے۔ ہم جانتے ہیں'' اور یہ فقرہ قرآن کا، جلالین کی اس کوشش کو ناکام بنا دیتا ہے جو انہوں نے اس لفظ کو مشکوک بنانے کے لئے کیا ہے اور کہا ہے:

وھم المنافقون او الیھود اس سے مراد منافقین ہیں یا یہودی

یہ تردید و تردد بالکل بے محل ہے، اس لئے کہ یہود کے لئے کون نہیں جانتا تھا کہ وہ دشمن اسلام ہیں، جو خالق فرماتا کہ ''انہیں بس ہم ہی جانتے ہیں''۔

اس فقرہ کو دیکھتے ہوئے یہی ماننا ناگزیر ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں اور منافق بھی وہ نہیں جو عام طور پر منافق سمجھ ہی لئے گئے تھے بلکہ کچھ بڑے گہرے قسم کے منافق جو آخر تک اسلامی جماعت میں گھلے ملے رہے اور اسلام کے پردہ میں اپنے کو مخفی کئے رہے۔

بعد میں مسلمانوں میں قیامت تک کے واسطے جو انتشار و افتراق کا سامان مہیا کیا، وہ سب انہی منافقین کے گروہ نے جن کے خطرات سے خالق نے بہت سے مقامات پر قرآن میں مسلمانوں کو آگاہ کیا تھا۔

رہ گئے عبداللہ بن ابی وغیرہ، وہ تو وقتی سازشیں کرتے رہتے تھے جو اسی وقت پر منکشف ہو جاتی رہیں اور اس لئے وہ جماعت رسوا اور ذلیل ہو کر ختم ہو گئی۔ اس سے اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو کیا صدمہ ایسا پہنچا جس کا اثر کوئی دیرپا ہوتا اور جس پر متنبہ کرنے کی قرآن اتنی قوت و شدت کے ساتھ برابر ضرورت محسوس کرتا۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦١﴾

''اور اگر وہ صلح کی جانب مائل ہوں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہو جایئے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے، یقیناً وہ سننے والا، بڑا جاننے والا۔''

مخالفین کے ساتھ صلح کا حکم

اسلام میں جنگ اضطراری صورت سے ہوتی ہے یعنی جب امن و صلح کے امکانات ختم ہو گئے ہوں اس وقت جنگ شروع ہونا چاہیے اور جب امن و صلح کے امکانات پھر پیدا ہو جائیں تو اس وقت جنگ کو ختم ہو جانا چاہیے۔ یہ اس آیت سے بالکل صاف ظاہر ہے۔

''اللہ پر بھروسہ کیجئے''.....یعنی اس پر غور بھی نہ کیجئے کہ وہ صلح کی جانب جو مائل ہوئے ہیں، اس سے کہیں مہلت پا کر انہیں مزید مضبوطی حاصل کرنا مقصود نہ ہو یا یہ کہ مسلمانوں پر بے خبری کی حالت میں حملہ کرنا مقصود نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ ان دور دراز کے اندیشوں کو صلح کی راہ میں ہرگز حائل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے اور صلح کر لینا چاہیے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے ''آپ بھی صلح کی طرف مائل ہو جایئے'' والے ٹکڑے کے مضمون پر جو ان کے لفظوں میں ہے، حاشیہ دیا ہے کہ:

''این امر برائے اباحت است'' (فتح الرحمٰن)

مطلب یہ ہے کہ ''مائل ہو جایئے'' سے کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے بلکہ اجازت ہے کہ آپ بھی مائل ہو سکتے ہیں مگر اس کے ساتھ جو ''اللہ پر بھروسہ'' کرنے کا حکم ہے، وہ کیا بس جواز کا پتہ دیتا ہے؟!

پھر آخر میں جو کہا ہے کہ ''وہ سننے والا ہے، جاننے والا''.....یعنی جو پیشکش صلح کی ان کی طرف سے ہوئی، اس بات کو اللہ سن رہا ہے اور اس پیشکش کا جواب ویسا ہی دینا چاہیے جیسا خدا کو مطلوب ہے اور ''جاننے والا ہے'' یعنی ان کی نیت اس صلح کی پیشکش سے کیا ہے؟ اسے اللہ جانتا ہے لہٰذا وہ اس کا تدارک کرے گا یا ان کو اس کی سزا دے گا[1] بہر حال تم کو ان کی نیت سے کوئی بحث نہ ہونا چاہیے۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ حکم قرآنی میں حالات کی نوعیت کا دخل ہو۔ بعض حالات میں مخالف کی پیشکش قبول کرنا لازم ہو اور بعض حالات میں جائز ہو جس پر نظر کرنا اس سربراہ کی ذمہ داری ہے جس کی قیادت میں جہاد ہو رہا ہے۔[2]

وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾

''اور اگر وہ چاہیں گے کہ آپ کو دھوکا دیں تو بلا شبہ آپ کے واسطے اللہ کافی ہے، وہ وہ ہے جس نے آپ کو تقویت پہنچائی اپنی امداد سے اور ایمان والوں کی جماعت سے اور ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا کی۔ اگر آپ تمام روئے زمین کی دولت صرف کر دیتے تو بھی ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا نہیں کر سکتے تھے مگر اللہ نے ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا کی، یقیناً وہ زبردست ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔''

بندگان الٰہی کے مددگار ہونے کا ثبوت

اصل مدد کرنے والا تو خداوند عالم ہے مگر ظاہری ذریعہ امداد کا ایمان والوں کی جماعت ہے تو اس کا بھی خالق نے اپنی امداد کے ساتھ ساتھ ذکر فرمایا ہے۔[3]

اس مثال کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ کسی ولی الٰہی کسی مقرب بارگاہ خداوندی اور خصوصیت کے ساتھ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام یا دیگر آل طاہرینؑ کو وقت مصیبت طلب امداد کے لئے پکارنے پر جو ایک جماعت ''شرک'' ''شرک'' کی آواز بلند کرتی ہے، وہ کتنا غلط ہے۔

---

[1] یعنی اگر دل میں دغا کریں گے، اللہ کو معلوم ہے۔ اس کی سزا دے گا۔ (موضح القرآن)

[2] ۔لیس فی الآیۃ ما یدل علی ان الکفار اذا مالوا الی الھدنۃ وجب اجابتھم الیھا علیٰ کل حال لان الاحوال تختلف فی ذٰلک (تبیان)

[3] ۔بیداری دادن خود و مسلمانان (شاہ ولی اللہ) ساتھ مدد اپنے کے اور ساتھ مسلمانوں کے (شاہ رفیع الدین)

خالق نے مومنین سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرائی تو وہ اسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ''سہارے'' کے طور پر ''بالمومنین'' کہہ کے ذکر فرما رہا ہے، اب وہی اگر ان بزرگواروں سے ہماری مدد کرادے تو اس میں شرک کا کیا سوال ہے؟!

پکارنے والے کے ذہن میں یہ ہونا چاہیے کہ اصل مدد کرنے والا خداوند عالم ہے اور یہ حضرات اس کی طرف سے مقرر شدہ ذرائع ہیں اور بس۔ اس میں شرک کا کوئی تصور قائم کرنا بالکل غلط ہے۔

یہ الفت باہمی جسے خالق نے قدرت الٰہی کا کرشمہ کہا ہے، انصار کی جماعت سے تعلق رکھتی ہے جن میں پہلے اوس وخزرج کے دو جتھے ہمیشہ برسر پیکار رہے تھے [1] مگر اسلام نے انہیں گلے ملا دیا اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد تاریخ میں اوس وخزرج کی قبیلہ داری جنگ پھر کبھی وقوع میں نہیں آئی مگر اب اسے کیا کیا جائے کہ اس کے بعد خود مہاجرین میں ''حب دنیا'' پھوٹ ڈلوا دے اور پھر ''مؤلفۃ القلوب'' کی جماعت کا ایک تیسرا عنصر بھی ایسا داخل ہوجائے جس سے بعد میں مسلمانوں کے درمیان وہ خوں ریز لڑائیاں برپا ہوجائیں جن کی لپیٹ میں مہاجرین وانصار سب ہی آجائیں اور جن کی ہنگامہ خیزی کی شدت کے سامنے اوس وخزرج کی پرانی لڑائیاں بھی گردِ کارواں بن کر پیچھے رہ جائیں اور جن کے نتائج آج تک مختلف خطہ ہائے ارض میں مسلمانوں کو بھگتنا پڑ رہے ہوں۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٤﴾

''اے پیغمبر! آپ کے لئے اللہ کافی ہے اور مومنین میں سے وہ جس نے آپ کی پیروی کی ہے''۔

وہابیت شکن قرآنی صراحت

اے لیجئے! یہاں تو ''کافی'' ہونے کی منزل میں اللہ نے الفاظ قرآن میں اپنے ساتھ ان مومنین کو بھی شریک کرلیا چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی ترجمہ میں یہی لکھتے ہیں:

''کفایت کنندہ است ترا خدا و کفایت کنند ترا آنانکہ پیروی تو کردہ انداز مسلمانان''

شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں:

''کفایت ہے تجھ کو اللہ اور جن نے پیروی کی تیری مسلمانوں میں سے''۔

مفسرین نے بھی یہی تشریح کی ہے:۔

حسب الله وحسبك من اتبعك من المؤمنين (جلالين)

کافی ہے آپ کے لئے اللہ اور کافی ہے آپ کے لئے وہ جس نے مومنین میں سے آپ کی پیروی کی۔

اب ہر مسلمان جانتا ہے کہ بالذات اللہ کافی ہے مگر اسی کی دی ہوئی طاقت سے جو کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کر رہا ہے جب اللہ اپنے ساتھ اس پر بھی ''کافی'' کے ہم معنی لفظ کا اطلاق کر رہا ہے تو اب اگر کوئی اسی کو ''مددگار'' ''کارساز'' ''مشکل کشا'' وغیرہ کے الفاظ سے یاد

---

[1] ۔المراد بالمؤمنين الانصار و بتأليف قلوبهم صاكان بين الاوس والخزرج من المعاداة القتال هذا قول ابي جعفر عليه السلام (تبيان)

کرے تو اس پر ''شرک، شرک'' کی آوازیں کیوں بلند ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس سے ظاہر ہے کہ جماعت ''اہل ایمان'' میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو پیغمبر کے پیرو کی حیثیت نہیں رکھتے اب وہ پیروی کرنے والے چاہے دو چار ہی ہوں بلکہ کسی منزل پر ایک ہی رہ جائے تو اسی کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لئے کافی سمجھیں گے جیسا کہ احد میں ہوا کہ مددگاروں کی جماعت متفرق ہوگئی تھی اور آخر میں ایک علی بن ابی طالبؑ کی ذات تھی جس نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کا حق ادا کر کے آخر میں جنگ کو فتح کر کے دکھلا دیا جس پر ملک کو بھی کلمہ پڑھنا پڑا کہ لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار.

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

''اے پیغمبر! ایمان لانے والوں کو جنگ پر آمادہ کیجئے۔ اگر تم میں کے بیس صبر کرنے والے ہوں تو دوسو (۲۰۰) پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں کے سو (۱۰۰) ہوں تو کافروں میں سے ایک ہزار پر غالب آئیں گے اس لئے کہ وہ ایک ایسی جماعت ہے جو سمجھ نہیں رکھتی۔''

ایک اور دس کے مقابلہ کا حکم

کیا معنی ''سمجھ نہیں رکھتی''؟ یعنی بصیرت ایمانی سے محروم ہے۔[1]

شاہ عبدالقادر کے لفظوں میں ''یعنی یقین نہیں رکھتے اللہ پر اور ثواب پر اور جس کو یقین ہو، وہ موت پر دلیر ہے'' (موضح القرآن)

کہا گیا ہے کہ ''یَغْلِبُوْا'' کے معنی خبر کے نہیں کہ ''غالب آئیں گے'' بلکہ مطالبہ کے ہیں کہ غالب آنا چاہیے۔[2]

چنانچہ وقوع اس کا نہیں ہوا جو بعد کی آیت سے ظاہر ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ جب خالق کی طرف کی خبر مشروط تھی ان میں صبر اور بصیرت ایمانی کے ساتھ تو اس نتیجہ کے عدم وقوع کو اس کی دلیل کیوں نہ سمجھا جائے کہ ان میں صبر کی کمی ثابت ہوئی اور آخرت پر یقین کی بھی جو اس معیاری مقابلہ کی شرط تھی۔

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

---

[1] ۔انهم علیٰ جهالة خلاف من قاتل علیٰ بصیرة وهو یرجو به ثواب الأخرة (تبیان)

[2] ۔وان کان بلفظ الخبر فالمراد به الامر (تبیان)

''اب اللہ نے تم پر سے بار ہلکا کر دیا اور معلوم ہو گیا کہ تم میں کمزوری ہے۔ اچھا تو اب تم میں کے سو صبر والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں اور اگر تم میں کے ہزار ہوں تو دو ہزار پر غالب آئیں۔ اللہ کے حکم سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

مسلمانوں میں کمزوری کا ثبوت

ترتیب قرآن میں دونوں آیتیں پاس پاس ہیں لیکن دونوں کے مضمون سے ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بڑا فاصلہ ہے۔ وہ آیت معرکۂ امتحان میں جانے سے پہلے کی ہے اور یہ معرکۂ امتحان کے نتیجہ کے وقوع میں آنے کے بعد کی ہے جن کے درمیان نہ جانے کتنی آیات اور کتنے سورے دوسرے مضمونوں سے متعلق نازل ہوئے تھے لیکن وہ سب اور مقامات پر ہیں اور یہ دونوں آیتیں ایک ساتھ درج ہو گئی ہیں۔

آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا زعم اپنے ثبات قدم اور بصیرت و یقین کے استحکام پر بہت کچھ تھا جس کے لئے پہلا معیار پیش کیا گیا اور اس کے بعد یہ اس پر پورے نہیں اترے۔

اللہ کو علم اس کا ازل سے تھا لیکن وہ امتیاز وقوع میں اب آیا۔ اس لئے کہا جا رہا ہے کہ اسے علم ہو گیا کہ تم میں کمزوری ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب بھی کہہ رہے ہیں کہ:

''دانست کہ درمیان شما ضعفی ہست۔''

ضعف کیا؟ مادی طاقت سے ضعف تو پہلے ہی تھا، اس لئے کہ کفار دس گنے زیادہ تھے۔ ماننا پڑے گا کہ ایمان کا ضعف، یقین کا ضعف اور صبر میں ضعف ہے۔ اور یاد رکھئے کہ ''تم میں ضعف ہے''

یہ نہیں کہ ''تمہاری آئندہ نسلوں میں ضعف ہوگا لہٰذا تخفیف کی جاتی ہے، مگر شاہ عبدالقادر نے اس میں کچھ خطرناک پہلو محسوس کرتے ہوئے لکھ دیا ہے کہ:

''اول کے مسلمان یقین میں کامل تھے ان پر حکم ہوا تھا کہ آپ سے دس برابر کافروں پر جہاد کریں۔ پچھلے مسلمان ایک قدم آگے تھے تب یہی حکم ہوا کہ دونوں پر جہاد کریں۔ یہی حکم اب بھی باقی ہے'' (موضح القرآن)

اب جلالین کو ملاحظہ فرمایئے، قرآن تو تخفیف کا سبب بتا رہا ہے کہ تم میں کمزوری ظاہر ہوئی اور وہ فرماتے ہیں کہ:

ثم نسخ لما كثروا بقوله: اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ.

جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو وہ پہلا حکم اس آیت کے ذریعہ سے منسوخ کر دیا گیا کہ اب اللہ تم سے تخفیف کرتا ہے۔

یعنی جب تعداد کم تھی تو وہ سخت حکم تھا اور جب تعداد زیادہ ہو گئی تو وہ حکم منسوخ ہو گیا اور یہ دوسری آیت اتری، سبحان اللہ یہ اضطراب کیا ضمیر کے کسی چور کا پتہ نہیں دیتا؟!

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٧﴾

''کسی نبی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے ہاتھ میں کچھ قیدی ہوں، جب تک کہ خوب زمین میں ان کے خون نہ بہائے [1] تم لوگ مال دنیا کے طلبگار ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست ہے، صحیح کام کرنے والا۔''

قیدیوں کے بارے میں الٰہی منشا کا اعلان

کہا جاتا ہے کہ جنگ بدر میں کچھ صحابہ کی یہ رائے ہوئی کہ کفار کے قیدیوں سے فدیہ یعنی مالی معاوضہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے اور خالق کا منشا یہ تھا کہ انہیں قتل کیا جائے۔ اس پر یہ آیت آئی۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حکم وقتی تھا جو بعد میں منسوخ ہو گیا اور یہ حکم ہوا کہ فدیہ لے کر چھوڑا جا سکتا ہے۔ [2]

حقیقت یہ ہے کہ ترتیب کے شان نزول کے مطابق نہ ہونے سے ہم سمجھ نہیں سکتے کہ یہ حکم کن حالات میں ہوا تھا حالانکہ خالق کی جانب سے بعد میں بڑے نرم لب ولہجہ میں عفو وکرم اور فدیہ کی اجازت دی گئی ہے جس کا اس آیت کے لب ولہجہ سے کوئی تناسب محسوس نہیں ہوتا تو معلوم ہوتا ہے کہ خالق کا یہ قہر آمیز عتاب اس پر ہوا کہ کچھ مسلمانوں نے صرف مال دنیا کی حرص میں بغیر حکم الٰہی از خود یہ فیصلہ کر لیا کہ ان سے مالی معاوضہ لے لیا جائے بلکہ بعد کی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ وصول بھی کر لیا جس پر ارشاد ہوا کہ یہ ایسی بات تھی کہ اس پر عذاب الٰہی کا نازل ہو جانا بعید نہ تھا۔

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٦٨﴾ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٩﴾

''اگر خالق کی طرف سے پہلے سے نوشتہ موجود نہ ہوتا تو تم نے جو کیا، اس میں تم پر بڑا عذاب آجاتا لہٰذا کھاؤ اس سے جو صاف ستھرا مال غنیمت میں تمہیں ملے اور اللہ سے ڈرو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان''۔

''اگر پہلے سے نوشتہ موجود نہ ہوتا'' اس سے کون نوشتہ مراد ہے؟ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

''یعنی بعفو غیر منصوص۔''

''خالق کا یہ حکم کہ جس بات میں ممانعت وارد نہ ہوئی ہو، وہ معاف ہے۔''

اس صورت میں نوشتہ سے مراد حکم تشریعی ہے۔

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''وہ بات یہ لکھ چکا کہ ان قیدی لوگوں میں بہتوں کی قسمت تھی مسلمان ہونا'' (موضح القرآن)

اس صورت میں یہ نوشتۂ تقدیر ہے۔

جلالین رقم طراز ہیں:

لولا کتاب من اللہ سبق باحلال الغنائم والاسریٰ لکم

---

[1] ۔یبالغ فی قتل الکفار (جلالین)

[2] ۔ھٰذا منسوخ بقولہ: فاَمَّا منا بعد واما فداء (جلالین)

اگر اللہ کا نوشتہ پہلے سے یہ نہ ہو گیا ہوتا کہ مالہائے غنیمت اور قیدی تمہارے لئے حلال کئے گئے ہیں۔

اس صورت میں بھی نوشتہ سے مراد حکم تشریعی ہے لیکن اگر نوشتہ یہ تھا کہ یہ حلال ہیں تو پھر عتاب کا ہے پر ہے؟ عتاب اس پر ہے کہ تم نے بغیر اجازت کے آئے ہوئے از خود یہ اقدام کیوں کر لیا؟[1] وہ تو اتفاق سے تمہارا عمل نوشتۂ الٰہی کے مطابق ہو گیا، اس لئے تم عذاب سے بچ گئے .....ورنہ یہ کام تم نے ایسا کیا تھا کہ عذاب آ جاتا۔

بہت سے قدیم مفسرین نے اس نوشتۂ الٰہی کو عذاب نہ آنے سے متعلق قرار دیا ہے اور اس کی بنا پر ہمارا ذہن یہ کہتا ہے کہ اس نوشتہ سے خود قرآن کا یہ اعلان مراد ہے کہ:

ما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم

آپ کی موجودگی میں ان پر عذاب نہیں آ سکتا

تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ تمہارا کردار تو یہ ایسا تھا جیسے کردار سے امم سابقہ پر عذاب آ جایا کرتا تھا مگر کیا کیا جائے کہ تم رحمۃ للعالمین کے زیر سایہ ہو اور ان کا وجود تم پر عذاب سے سد راہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

''اے پیغمبر! کہہ دیجئے ان قیدیوں سے جو آپ لوگوں کے قبضہ میں ہیں کہ اگر جانے گا اللہ تمہارے دلوں میں کچھ بھلائی تو وہ عطا کرے گا تمہیں بہتر اس سے کہ جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہیں بخشے گا اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان اور اگر انہوں نے آپ سے غداری کرنا چاہی تو وہ اس کے پہلے اللہ سے غداری کر چکے ہیں تو اس نے ان پر قابو دے دیا اور اللہ جاننے والا ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔''

''بھلائی'' سے مراد یہاں خیر خواہی، خلوص اور چال چلن کا آئندہ ٹھیک رہنا ہے[2] اور ''عطا کرے گا بہتر'' یعنی تمہارے حسن خدمات سے خوش ہو کر جتنا تم سے فدیہ ان مسلمانوں نے لے لیا ہے، اس سے زیادہ تمہیں یہاں سے مل جائے گا اور پھر ایمان و عمل صالح کی صورت میں آخرت کی بخشش، اس کے ماوراء ہوگی، جس کے مقابلہ میں یہ اتنا سارا روپیہ جو تم سے لے لیا گیا ہے، کوئی چیز نہیں ہے۔

یہ قرآن کا حکیمانہ انداز بیان دیکھنے کا ہے کہ اُدھر مسلمانوں کو تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے تخاطب کر کے اتنا سخت عتاب کیا گیا اور ادھر ان قیدیوں کی جن سے فدیہ لیا گیا تھا، اس طرح دلجوئی کی جا رہی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

---

[1] ۔عاتبھم علیٰ ذلك لانھم بادروا الیہ قبل ان یؤمروا بہ (تبیان)

[2] ۔ھو ھٰھنا البصیرۃ فی دین اللہ وحسن النیۃ فی امر اللہ (تبیان)

وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾

''بلاشبہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت کی اور اپنے جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کیا اور جنہوں نے پناہ دی اور امداد کی، یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار ہیں اور جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت نہیں کی، تمہیں ان کی حمایت کا کچھ موقع نہیں، جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں اور اگر تم سے کسی دینی مہم میں مدد مانگیں تو تمہارا فرض ہے کہ مدد کرو، سوا اس صورت کے کہ جب کسی ایسی جماعت کے خلاف ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان کوئی عہد و پیمان ہے اور اللہ اس کا جو تم کرتے ہو دیکھنے والا ہے۔''

پہلے مہاجرین کا ذکر ہے کہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا اور پھر انصار کا ذکر ہے: ''اَلَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا'' ''جنہوں نے پناہ دی اور امداد کی'' اور ان سب کو کہا گیا ہے [1] کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار ہیں یعنی ہونا چاہیے اور ان میں ملکی اور غیر ملکی کا کوئی سوال نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

''یعنی مہاجرین و انصار بایکدیگر باید کہ نصرت دہند و مواخات کنند'' (فتح الرحمن)

یہ وہ قومیت ہے جس کی وحدت تصور اور اتحاد عقیدہ پر بنیاد قائم ہوتی ہے۔ اس وحدت قومی کا تقاضا شاہ عبدالقادر کے لفظوں میں یہ ہے کہ: ''جتنے مسلمان حضرت کے ساتھ حاضر ہیں، ان سب کی صلح اور جنگ ایک ہے۔ ایک کا موافق سب کا موافق، ایک کا مخالف سب کا مخالف'' (موضح القرآن)

مگر یہ یکجہتی انہی مسلمانوں کے ساتھ ہوسکتی ہے جو آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں لیکن اگر کچھ مسلمان ابھی مشرکین کے زیر اقتدار ہیں تو ان کے معاملات وہاں کے حالات سے وابستہ ہیں۔ ان کے ساتھ یہاں کے مسلمان یکجہتی اختیار نہیں کر سکتے اور ان کے سیاسی قسم کے معاملات سے آزاد ملک کے مسلمانوں کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں اگر کسی دینی مہم میں وہ خود امداد طلب کریں تو یہ لوگ دینی رشتہ سے امداد کریں، ورنہ خواہ مخواہ ان کے معاملات میں اپنا پاؤں اڑانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ بسا اوقات مفید ہونے کے بجائے مضر ہوگا۔

بعض مفسرین نے اولیاء بعض کے مفہوم میں یہ قرار دیا ہے کہ ایک دوسرے کا وارث بھی قرار دیا گیا تھا [2] اور اس لئے کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہوگئی اور اسی سورہ کی آخری آیت سے جس میں میراث کی بنیاد قرابت رکھ دی گئی ہے۔ [3]

---

[1] ۔اولئك یعنی المهاجرین والانصار (تبیان)

[2] ۔اولیاء بعض فی النصرة والارث (جلالین)

[3] ۔هٰذا منسوخ بالآخر السورة (جلالین)

مگر ہمیں یہاں کی آیتیں آخر سورہ تک ایک ڈال ہونے کی بنا پر ایک ساتھ نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں لہٰذا ان میں ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ ماننے کے کوئی معنی نہیں ہوں گے۔ اس لئے قبل کی ولایت میں میراث کو داخل کرنا ہی غلط معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کا شاہد درمیان کی آیت ہے جو ابھی آئے گی کہ:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾

جو کافر ہیں، وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو دنیا میں بڑا فتنہ برپا ہوگا اور بڑی خرابی ہوگی۔ (سورۂ انفال)

ظاہر ہے کہ کافروں میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ ایک دوسرے کا وارث ہو تو اہل ایمان کو جس ولایت کی دعوت دی جا رہی ہے اسے میراث سے متعلق کیوں سمجھا جائے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾

''اور جو کافر ہیں، وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں، اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو دنیا میں بڑا فتنہ پیدا ہوگا اور بڑی خرابی ہو گی۔''

اس میں مسلمانوں کی غیرت ایمانی پر ایک طرح کا تازیانہ بھی ہے اور ان کی بصیرت ایمانی کے لئے ایک طرح کا سرمہ بھی۔

تازیانہ تو اس طرح جیسے حضرت علی بن ابی طالبؑ نے نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں یوں غیرت دلائی ہے کہ کتنے غضب کی بات ہے کہ اہل شام اپنے امام کی باطل کی راہ میں اطاعت کرتے ہیں اور تم اپنے امام کی حق کی راہ میں نافرمانی کرتے ہو، ویسے ہی یہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ کافر تو ''کافری'' میں ایک دوسرے کے مددگار اور حمایتی ہیں۔ اب کتنے غضب کی بات ہے کہ تم مومن ہو کے آپس میں یکجہتی نہ رکھو۔

اور بصیرت کے لئے سرمہ یہ ہے کہ تمہارے آپس میں یکجہتی نہ رکھنے سے [1] بڑا فتنہ اور بڑی خرابی ہے یہ فتنہ اور خرابی کیا ہے؟ سب سے زیادہ یہ کہ کفر کو قوت ہوگی اور حق میں ضعف پیدا ہوگا۔ [2]

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾

''اور جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ کہ جنہوں نے پناہ دی اور امداد کی، یہ لوگ حقیقتاً ایمان لانے والے ہیں۔ ان کے لئے بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے۔''

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا

---

[1] ۔لا تفعلوا ما امر تم به من التناصر والتعاون والبرائة من الكفار (تبیان)

[2] ۔بقوة الكفر وضعف الاسلام (جلالین)

الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾

''اور جو بعد میں ایمان لائیں اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد کریں تو یہ بھی تمہارا ہی جز ہیں اور جو صاحبانِ قرابت ہوں، وہ اللہ کے قانون میں ایک دوسرے سے زیادہ اتصال رکھتے ہیں، یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔

اگرچہ ترتیب قرآن عموماً مطابق تنزیل نہیں ہے، پھر بھی بعض آیات کا مضمون اتنا باہم دگر چسپاں اور دست وگریبان ہوتا ہے کہ پتہ چلتا ہے کہ یہ سب ایک ہی وقت کی نازل شدہ ہیں چنانچہ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے یہ سلسلہ آیات ایسا ہی مربوط و مسلسل ہے اور وہ ایک ہی موقع کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ قبل کی آیات میں اس تصور کا امکان تھا کہ میراث بھی صرف اخوت دینی کی بنیاد پر تقسیم ہوگی جس کی بنا پر بعض ذہنوں نے پہلی آیت کے معنی یہی قرار دیئے اور پھر اسے منسوخ مانا جس کی ہم نے رد کی، اب اس آخری آیت میں اس تصور کو دور کیا گیا ہے کہ یہ تو اخوت ایمانی تھی جس کا تذکرہ پہلے ہوا ہے، جسے اتحاد و عمل اور تعاون کی بنیاد ہونا چاہیے مگر صاحبان قرابت جو ہیں وہ آپس میں زیادہ اتصال رکھتے ہیں۔[1] لہٰذا وراثت کا تعلق قرابت ہی سے ہوگا جس میں وحدت دینی بس شرط کے طور پر معتبر ہوگی۔

اس آیت کے آخری ہی جز کی بنا پر جس کی ہم مضمون آیت دوسری جگہ بھی قرآن میں موجود ہے، ان عزیزوں کے علاوہ جن کے حصے قرآن میں بیان کئے گئے ہیں اور جنہیں ''ذوی الفروض'' کہتے ہیں، دوسرے اقرباء کی وراثت کا حکم فقہ اسلامی میں قائم ہوا ہے جنہیں میراث میں اسی نام یعنی ''صاحبانِ قرابت'' کے عنوان کے ماتحت ترکہ دلوایا جاتا ہے اور پھر ان میں طبقات ارث کی تفریق اسی وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ کے اصول پر ہے کیونکہ قرابت اضافی چیز ہے۔ ہر قریب اپنے سے قریب تر کی موجودگی میں دور قرار پاجاتا ہے، اس لئے اسے میراث کا استحقاق نہیں ہوتا لہٰذا ماں باپ اور اولاد کی موجودگی میں جن تک خطوط قرابت بلا واسطہ پہنچتے ہیں، اخوہ و اجداد (بھائی بہنوں اور دادا، دادی، نانا، نانی) کا حق نہیں ہے جن تک خط قرابت ایک واسطہ کے ساتھ پہنچتا ہے اور اس لئے یہ دوسرے طبقہ میں ہیں اور ان کی موجودگی میں ''اَعْمَامِكُمْ و اَخْوَالِكُمْ'' (چچا، پھوپھی، اور ماموں، خالہ) کا حق نہیں ہے جن تک خط قرابت دو واسطوں سے منتہی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ محجوب الارث ہونے کا اصول اسی بنیاد پر ہے یعنی بیٹے کی موجودگی میں پوتا میراث نہیں پاسکتا اور بھائی کی موجودگی میں بھتیجے کو میراث نہیں ملے گی۔

غرض بہت سے احکام شرعیہ ہیں جو اس ایک قرآنی فقرہ سے مستنبط ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

---

[1] ۔بعض ایشان نزدیک تر است ببعضی (شاہ ولی اللہ) نزدیک تر ہیں ساتھ بعض کے (شاہ رفیع الدین)

سُوْرَةُ الْبَرَآءَةِ

مدنیّہ.....۱۲۹.....آیات

اس سورہ کا نام حدیثوں میں تو "سورۃ البراءۃ" ہی ہے جو سورہ کے پہلے لفظ "بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" کے مطابق ہے مگر سورہ کی پیشانی پر عموماً "سورۃ التوبۃ" لکھا جاتا ہے یہ توبہ کا ذکر اس سلسلہ کی تیسری آیت میں بالکل ضمنی طور پر ہے:

فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اگر تم توبہ کرلو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

اور اس کے فوراً ہی بعد اس کی مقابل شق بڑے سخت انداز میں ہے۔

وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ

اور اگر روگردانی کرو تو جان لو کہ تم اللہ کو بے بس نہیں بنا سکتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ بنیادی رخ ان آیات میں تہدید اور سرزنش ہی کا ہے ایسی صورت میں اس ''توبہ'' کے ذکر کو اتنا اہم بنانا کہ سورہ کا نام یہی ہو، سمجھ میں نہیں آتا۔ تصور ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ براءۃ کے لفظ کے ساتھ اعلان تبرّا سے جو ایک ناگواری مسلمانوں کے اکثریتی طبقہ کے ذہن میں پیدا ہوتی ہے، اس کے دور کرنے کے لئے ''سورۃ البراءۃ'' کے نام کے بجائے جو غضب الٰہی کا ترجمان ہے اس کا نام سورۃ التوبہ کردیا جس میں مہربانی کی جھلک نمایاں ہے۔ تلاش سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر اسلام ہی میں ایک طبقہ کی طرف سے یہ تبدیلی عمل میں آگئی تھی جس پر اسی وقت اہل حقیقت نے اعتراض کیا اور اسے اس سورہ کی بنیادی روح کے خلاف قرار دیا۔[1]

حالانکہ مسلماً جیسا کہ ابھی آئے گا یہ سورہ سورۂ عذاب ہی سمجھا گیا اور اسی لئے اس کے شروع میں بسم اللہ نہیں ہے۔

سورۂ براءت کے خاص خاص مضامین

۱۔۔۔۔مشرکین کیلئے جو رعایتیں اب تک تھیں انہیں منسوخ کرنا اور ان سے قطعی طور پر تبرّا یعنی ترکِ موالات کا اعلان۔

۲۔۔۔۔مشرک جو پناہ طلب کرے اسے پناہ دینے اور اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہونے کا حکم۔

۳۔۔۔۔مساجد الٰہی کا احترام اور کافروں کے داخلہ کی ممانعت۔

۴۔۔۔۔جنگ حنین کا تذکرہ اور رباوجود کثرت تعداد مسلمانوں میں ابتری اور انتشار پیدا ہونے کی کیفیت۔

۵۔۔۔۔نجاستِ مشرکین۔

---

[1] روی عن حذیفة انه قال کیف یسمونها سورة التوبة وهی سورة العذاب وروی عن سعید بن جبیر قال قلت لابن عباس سورة التوبة قال: تلك الفاضحة (تبیان)

۶-----آخر میں دین اسلام کے تمام ادیان ومذاہب پر غالب ہونے کا اعلان۔

۷-----اکتناز کی ممانعت۔

۸-----بارہ مہینے اوران میں چار خاص طور پر محترم۔

۹-----محترم مہینوں میں جدال وقتال کی ممانعت۔

۱۰-----نسیٔ یعنی لوند کا مہینہ لگا کر مہینوں کو بدلنے کی سخت ممانعت۔

۱۱-----شبِ ہجرت کا تذکرہ۔

۱۲-----جہاد کے موقع پر مسلمانوں کی پست ہمتی اور کمزوری کے مظاہروں کا تذکرہ۔

۱۳-----منافقین کے کردار کے نمونے۔

۱۴-----مستحقین زکوٰۃ کا بیان۔

۱۵-----کفار کے علاوہ منافقین سے بھی جہاد کا حکم۔

۱۶-----کھلے ہوئے منافقین کی نماز جنازہ سے ممانعت۔

۱۷-----اللہ کے ساتھ رسول ﷺ اور کچھ خاص افراد کے نگراں ہونے کا اعلان۔

۱۸-----ایسے منافقین کے وجود پر انتباہ جن کا نفاق طشت از بام نہیں ہوا ہے۔

۱۹-----مسجد ضرار کا ذکر اور اس کے انہدام کا حکم۔

۲۰-----مومنین کے جان ومال کی خریداری۔

۲۱-----مشرکین کے لئے استغفار کی ممانعت۔

۲۲-----''نفقہ فی الدین'' کے لئے سفر کا واجب کفائی ہونا۔

۲۳-----اجتہاد وتقلید وغیرہ وغیرہ۔

اس سورہ کے آغاز کی خصوصیت

اس سورہ کے شروع میں تمام عالم اسلام کے قرآن اس پر متفق ہیں کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں ہوتی۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ جن سوروں میں بسم اللہ اوپر لکھی گئی ہے ان کے ساتھ بسم اللہ من جانب اللہ نازل ہوئی تھی اور اس سورہ میں بسم اللہ نازل نہیں ہوئی۔

اس کا سبب وہی ہے جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بسم اللہ آیۂ رحمت ہے اور یہ سورہ سورۂ عذاب ہے اس لئے بسم اللہ اس کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی تھی۔

شاہ عبدالقادر نے اس کا عجیب سبب لکھا ہے کہ:

''یہ سورۂ برأت حضرت ﷺ نے بیان نہیں فرمایا کہ جدا سورہ ہے یا اور سورۃ کی آیتیں ہیں۔ سورہ کا نشان تھا بسم اللہ نازل ہوئے۔ اس واسطے اس پر بسم اللہ نہیں'' (موضح القرآن)

حالانکہ اگر اس کا مستقل سورہ ہی ہونا محقق نہ ہوتا تو اس کا سورۂ برات یا سورۂ توبہ مستقل نام کیوں ہوتا اور اس کے آیات ورکوعات کو علیٰحدہ شمار کر کے لکھا کیوں گیا ہوتا۔ نیز قرآنی سوروں کی تعداد میں اس پر اختلاف کیوں نہ ہوا ہوتا۔

دوسرے مفسرین اہل سنت ہماری اس توجیہ کے ساتھ متفق ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر جلالین۔

ولم تكتب فيها البسملة لانه ﷺ لم يا مر بذلك كما يؤخذ من حديث رواه الحاكم واخرج فى معناه عن علی رضی اللہ عنہ ان البسملة امان وهى نزلت لرفع الامن بالسيف وعن حذيفة انكم تسمونها سورة التوبة وهى سورة العذاب (جلالین)

اور اس میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا حکم نہیں دیا جیسا کہ اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے جسے حاکم نے نقل کیا ہے اور اس بارے میں حضرت علی سے بھی وارد ہوا ہے کہ بسم اللہ امان ہے اور یہ سورہ اترا ہے امان کے ختم کرنے کے لئے تلوار کے ساتھ اور حذیفہ سے منقول ہے کہ تم لوگ اسے ''سورۂ توبہ'' کہتے ہو، حالانکہ وہ عذاب کا سورہ ہے۔

بخاری کی روایت ہے کہ یہ سب سے آخری سورہ ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا مگر اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے آخر میں نازل ہونے والا سورۂ مائدہ ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝٢

''بیزاری ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین سے کہ جن سے تم لوگوں نے معاہدہ کیا تھا، اب تم (اے مشرکو!) اس سرزمین میں بس چار مہینے تک گھوم پھر لو اور یقین رکھو کہ تم اللہ کو بے بس نہیں بنا سکتے اور یہ کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔''

مشرکین سے معاہدۂ سابق کی منسوخی اور ان سے قطعی تبرا یعنی ترک موالات کا اعلان

جیسا کہ ترجمہ میں بریکٹ کے ذریعہ سے ہم نے واضح کیا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں خطاب سے خطاب کی طرف ''التفات'' ہے یعنی ابتدا میں تخاطب مسلمانوں کے ساتھ ہے کہ جن سے تم لوگوں نے معاہدہ کیا تھا، اور پھر روئے خطاب مشرکین کی طرف ہے کہ چار مہینے تمہیں مہلت دی جاتی ہے۔

یہ دو اور ان کے بعد کی چند آیتیں ہی سورۂ براءت کی وہ ہیں جن کا حامل بنا کر جناب ابوبکر کو بھیج دیا گیا تھا کہ وہ مکہ میں جا کر مشرکین کے مجمع میں سنا دیں۔ پھر حکم الٰہی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا کہ انہیں یا آپ خود پہنچائیے یا ایسا شخص پہنچائے کہ جو آپ کا جز ہو۔ اس پر حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے ان کو واپس بلوایا اور حضرت علی بن ابی طالبؑ کو مامور فرمایا۔ یہ ہجرت کے نویں سال کا واقعہ ہے۔ [1]

شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے:

سال نہم حضرت پیغامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی مرتضیٰ را در موسم حج فرستاد تا عہود مشرکان را براندازد (فتح الرحمٰن)

ہجرت کے نویں سال حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی مرتضیٰ علیہ السلام کو حج کے زمانے میں روانہ کیا تا کہ آپ مشرکین کے عہد و پیمان کو توڑ دیں۔

تفسیر جلالین میں ہے:

قد بعث رضی اللہ عنہ علیا من السنة وهی سنة تسع فاذن بهم النحر بمعنی بهذه الاٰیات وان لا یحج بعد العام مشرك ولا یطوف بالبیت عریان رواه البخاری

حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سال یعنی ۹ ھ میں حضرت علی علیہ السلام کو بھیجا تو انہوں نے روز عید قرباں، منیٰ میں ان آیات کا اعلان کیا اور یہ کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کو نہ آئے اور کوئی بالکل ہی برہنہ خانہ کعبہ کا طواف نہ کرے، اسے بخاری نے درج کیا ہے۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ یَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۙ﴿۳﴾

''اور اعلان ہے [2] اللہ اور اس کے پیغمبر کی طرف سے تمام لوگوں کو سب سے بڑے حج کے دن کہ اللہ اور اس کا پیغمبر بیزار ہیں مشرکوں سے۔ اب اگر تم توبہ کر لو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم روگردانی کرو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم اللہ کو بے بس نہیں بنا سکتے اور کافروں کو خوشخبری دو دردناک عذاب کی۔''

یہاں التفات غیبت سے خطاب کی طرف ہے یعنی ''اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیزار ہیں مشرکوں سے'' یہاں ان کا ذکر بطور غائب ہے اور پھر یہ کہ اگر تم توبہ کر لو، اور ''اگر روگردانی کرو'' یہ انہی کی طرف تخاطب ہے۔ پھر آخر میں ایک دوسرا پلٹا صنعتِ التفات کی قسم کا یہ ہے کہ ''خوشخبری دو کافروں کو''.....اور کافر یعنی وہی مشرک جن کا ذکر پہلے بطور غیبت تھا اور پھر انہی سے تخاطب ہو گیا اور اب مسلمانوں سے یا کسی بھی مخاطب غیر معین کی طرف روئے خطاب کر کے انہی کا ذکر بطور غیبت ہو گیا۔

''خوشخبری دو''.....کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ ''خوشخبری'' دی جانا چاہیے اور کوئی بھی یہ خوشخبری دے سکتا ہے اور بعض مفسرین کے رو یہ کے مطابق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب ہیں کہ آپ یہ خوشخبری دیجئے۔

---

[1] ۔نزلت براءة فی سنة تسع (تبیان)

[2] ۔اعلام (جلالین) خبر رسانیدن است (شاہ ولی اللہ) پکارنا ہے (شاہ رفیع الدین)

اب مسلمان حج کا دن عرفات کے مقام یعنی ۹ رذی الحج کو سمجھتے ہیں اور اس لئے جب اس دن جمعہ ہوتو اسے ''حج اکبر'' کہتے ہیں مگر اس آیت میں یوم الحج الاکبر ''بڑے حج کا دن'' بقول اکثر مفسرین روز عید قربان یعنی ۱۰ رذی الحج کو کہا گیا ہے۔

إِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴

''سوا مشرکین میں سے ان کے جن سے تم نے معاہدہ کیا ہو، پھر انہوں نے تمہارے لئے کچھ کمی نہ کی ہو اور نہ تمہارے خلاف کسی کی امداد کی ہو تو ان کے لئے ان کے معاہدہ کو ان سے مقرر کی ہوئی مدت تک پورا کرو، یقیناً اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے''۔

''تمہارے لئے کوئی کمی نہ کی ہو'' یعنی جو شرائط معاہدہ کی طے تھیں، ان میں سے کسی بات میں انہوں نے کمی نہیں کی۔ [۱]

آخری فقرہ سے کہ ''اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے''..... یہ معنی نکلتے ہیں کہ کفار کے ساتھ بدعہدی کرنا تقویٰ کے خلاف چیز ہے اور اس میں مؤاخذۂ اخروی ہے جس سے بچنا تمہیں ضروری ہے۔ [۲]

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵

''جب محترم مہینے گزر جائیں تو پھر ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انہیں گرفتار کرو اور ان کا گھیراؤ کرو اور ہر کمین گاہ میں ان کی تاک میں بیٹھو، ہاں اگر وہ باز آجائیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انہیں چھوڑ دو، یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

یہ ان پہلی قسم کے مشرکین کا ذکر ہے جن سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا یا جنہوں نے معاہدہ کی پابندی نہیں کی اور ظاہر ہے کہ وہ مشرکین ایسے ہی تھے جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم کرتے رہے تھے۔ اس لئے ان سے ایک صورت جنگ قائم ہی تھی۔ انہی کو چار مہینے کی مہلت دی گئی تھی اور انہی مہینوں کے گزرنے کے بعد [۳] یہ احکام ہیں کہ جب تک مسلمان نہ ہو جائیں ان کے واسطے اب پناہ نہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اسلام میں تبلیغ کے لئے تلوار سے کام لینے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ

---

[۱] ۔لم ینقصر کم شیئا من شروط العھد (جلالین)

[۲] ۔یحب المتقین باتمام العھود (جلالین)

[۳] ۔یعنی آن چہار ماہ کہ ایشاں را فرصت دادہ بودند (فتح الرحمن)

مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶

''اور اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دیجئے تا کہ وہ اللہ کے کلام کو سنے۔ پھر اس کے اطمینان کی جگہ پر پہنچوا دیجئے یہ اس لئے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو واقف نہیں ہیں۔''

پناہ کے طلب گار مشرکوں کو پناہ دینے اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری کا حکم

معلوم ہوا کہ پہلا حکم ان کے واسطے تھا جو اتمام حجت کی تمام منزلیں ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کے لئے برسر آزار رہے لیکن ایسے مشرکین جو خالی الذہن ہیں اور ان میں کچھ افراد حق طلب بھی ہو سکتے ہیں، ان کے لئے یہ روادارانہ حکم ہے کہ اگر وہ اسلامی مرکز میں تحقیق کے لئے آنا چاہتے ہیں تو انہیں پورے تحفظات کے ساتھ آنے دیا جائے اور پھر ان کو اپنی طرف سے پورے انتظام حفاظت کے ساتھ ان کے مستقر تک [1] پہنچا دینا چاہیے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝۱۰

''بھلا مشرکوں کا کوئی عہد و پیمان ہو ہی کیوں کر سکتا ہے اللہ اور اس کے پیغمبر کے یہاں، سوا ان کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا ہے تو جب تک وہ تمہارے لئے ٹھیک طرح سے برقرار ہیں تم بھی ان کے واسطے برقرار رہو [2] یقیناً اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے حالانکہ وہ اگر تم پر غلبہ حاصل کریں تو تمہارے بارے میں کسی رشتہ اور کسی ذمہ داری کا لحاظ نہ کریں گے تمہیں وہ اپنے منہ سے خوش کرتے ہیں اور ان کے دل انکاری ہیں اور ان میں سے اکثر بداعمال ہیں۔ انہوں نے آیات الٰہی کے عوض میں تھوڑی سی قیمت حاصل کی ہے تو اس کے راستے سے منحرف ہو گئے ہوں گے، بہت برا ہے وہ کام جو وہ کرتے رہے ہیں۔ وہ نہیں لحاظ کرتے کسی مسلمان کے بارے میں کسی رشتہ اور نہ ذمہ داری کا اور یہی لوگ ظلم و تعدی کرنے والے ہیں۔''

---

[1] ۔موضع امنه وهو دار قومه (جلالین)

[2] ۔ما استمروا لكم على العهد والاستقامة الاستمرار على وجه الصواب (تبیان)

مسجد حرام کے پاس والے معاہدہ سے مراد حدیبیہ والی صلح اور اس کے شرائط ہیں۔ اسے کہا گیا ہے کہ تمہیں اس وقت تک پابند رہنا چاہیے جب تک وہ پابند ہیں [1]۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عہد و پیمان کے پابند رہے لیکن بعد میں کفار مکہ کی طرف سے بدعہدی ہوئی اور قبیلۂ خزاعہ پر جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیف تھا، بنی بکر نے چھاپہ مارا اور اس کا قلع قمع کیا تو اس وقت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس ذمہ داری سے بری ہو گئے اور فتح مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ [2]

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۱۱ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝۱۲

''اس کے بعد اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں، اور ہم حقیقتوں کو صاف صاف پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں اور اگر اپنی قسموں کو اپنے عہد و پیمان کے بعد توڑ دیں اور تمہارے دین پر طعن و تشنیع کریں تو کفر کے ان سرغناؤں سے [3] جنگ کرو یقیناً ان کی کوئی قسمیں نہیں ہیں، شاید یہ باز آ جائیں''۔

''توبہ کریں، نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام لے آئیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایمان لانے کیلئے اسلامی زندگی کا عملی طور پر اختیار کرنا بھی ضروری ہے جس میں حقوق اللہ بھی ہیں جن کا مثالی عنوان نماز ہے اور حقوق الناس بھی ہیں جن کی جامع سرخی ''زکوٰۃ'' ہے۔ قسموں کے توڑنے کے ذکر کے بعد یہ جملہ کہ ''ان کی کوئی قسمیں نہیں ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قسمیں ہی کیا جو توڑی جائیں یعنی انہوں نے کھائیں تو تمہیں قسمیں مگر جب توڑ دیں تو بے حقیقت ہو گئیں۔ [4]

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۳

''کیوں نہیں تم جنگ کرتے ان لوگوں سے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑا اور پیغمبر کو نکالنے کا ارادہ کیا اور انہوں نے ہی پہلی دفعہ تمہارے مقابلہ میں پہل کی۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ تو اللہ زیادہ حقدار ہے اس کا کہ اس سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔''

جنگ کے لئے ان موجبات کے ذکر کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصلاً و بالذات جنگ محبوب و مطلوب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے

---

[1] ۔ما استمروا لکم علی العهد والاستقامة الاستمرار علیٰ وجه الصواب (تبیان)

[2] ۔قد استقام علیٰ عهدهم حتی تقضوا بأعانة بنی بکر علیٰ خزاعة (جلالین)

[3] ۔باپیشوایان کفر (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔انما المراد به انهم لا ایمان لهم یفون بها ویتمسکون بمرجبها (تبیان)

خاص اسباب نہ ہوں جو جنگ کو حق بجانب قرار دیں۔

یہ جملہ کہ ''انہوں نے ہی پہلی دفعہ تمہارے مقابلہ میں پہل کی''[1] ان تمام روایات کا قلع قمع کر دینے کے لئے کافی ہے جو ہواخواہانِ آل ابوسفیان نے جنگ بدر میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جارحیت کا الزام عائد کرنے کے لئے وضع کئے ہیں جنہیں ناسمجھی سے مسلمانوں کی تاریخ میں باریابی ہوگئی ہے۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۱۴﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾

''جنگ کرو ان سے، اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دلوائے گا اور انہیں رسوا کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور ایک صاحب ایمان جماعت کے سینہ کی حسرتیں پوری کرے گا اور ان کے دلوں کے غم وغصہ کو دور کرے گا اور اللہ جس پر چاہتا ہے، رحمت کے ساتھ توجہ فرماتا ہے اور اللہ برا جاننے والا ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔''

توبہ کے اصل لغوی معنی توجہ کرنے ہی کے ہیں ہم نے اس موقع پر بھی یہی مفہوم مناسب محسوس کیا ہے جس کے موافق دور قدیم میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے[2] مگر بعض اکابر مفسرین نے اس کے معنی توبہ قبول کرنے ہی کے لئے ہیں اور یہ مطلب لیا ہے کہ کافروں میں جو توبہ کر لیں گے، اللہ ان کی توبہ قبول کرے گا اور پھر ان سے جنگ کی ضرورت نہ ہوگی۔[3]

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

''کیا تم سمجھتے ہو کہ تم چھوڑ دیئے جاؤ گے اس حالت میں کہ ابھی اللہ نے معلوم نہیں کیا ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا ہو تم میں سے اور اللہ اور اس کے پیغمبر اور اہل ایمان کو چھوڑ کر کوئی جگری دوست[4] نہ بنایا ہو، اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، باخبر ہے۔''

اس طرح کی آیتیں پہلے آچکی ہیں اور وہاں اللہ کے معلوم کرنے کا مطلب بیان کیا جا چکا ہے۔

---

[1] ۔قال الطبری: یدؤھم بخروجھم الیٰ بدر لقتالھم (تبیان)

[2] ۔برحمت باز گردد خدا بر ھر کہ خواھد.(شاہ ولی اللہ)

[3] ۔یتوب اللہ علیٰ من یشآء بخروجہ عن موجب القتال (تبیان)

[4] ۔بطانۃ واولیاء (جلالین)

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۖۚ وَفِى النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾

''مشرکوں کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں اپنے اوپر کفر کا اقرار کرتے ہوئے۔ یہ وہ ہیں جن کے اعمال اکارت ہیں اور وہ آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی مسجدوں کو تو بس وہ آباد کرے گا جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا کسی سے ڈرے نہیں تو یہ لوگ بہت ممکن ہے کہ ہدایت قبول کرنے والوں میں ہوں۔''

مساجد الٰہی کا احترام اور کافروں کے داخلہ کی ممانعت

قریش کو فخر تھا کہ وہ مسجد حرام کے آباد رکھنے والے ہیں یہ اسی کا جواب ہے۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۲﴾

''کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس کے برابر قرار دیا ہے کہ جو ایمان لائے اللہ اور روز آخرت پر اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔ وہ اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا، جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کیا، اللہ کے نزدیک مرتبہ میں بہت بڑے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ انہیں خوشخبری دیتا ہے اور ان کا پروردگار اپنی طرف کی خاص رحمت اور خوشنودی اور ان بہشتوں کی جن میں ان کے لئے برقرار رہنے والی نعمت ہے جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یقیناً اللہ کے پاس وہ صلہ ہے جو بہت بڑا ہے۔''

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:

''اوپر سے یہاں تک پانچ آیتیں نازل ہوئیں اس پر کہ کچھ گفتگو ہوئی حضرت علی علیہ السلام اور حضرت عباسؓ میں حضرت عباسؓ نے آخر کو ہجرت کی ہے۔ کہا حضرت علی علیہ السلام نے کہ اگر تم اول ہجرت کرتے تو جہاد میں حاضر ہوتے اور مرتبے بلند پاتے جیسے ہم نے پائے۔ حضرت عباس نے کہا کہ ہم بھی خدا کے کام میں تھے، خدمت حاجیوں کی اور آبادی مسجد حرام کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ کام ان کے برابر نہیں۔ کوئی مسلمان خدمت کرے تو قبول ہے'' (موضح القرآن)

پہلی دو باتیں حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجد حرام کا آباد رکھنا ایمان باللہ وغیرہ کے مقابلہ میں درج ہوئی ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ وہ اعمال حالت عدم ایمان کے ہیں جنہیں فخر کے موقع پر پیش کیا جارہا تھا اور قرآن مجید نے اس کی رد فرمائی۔ جناب شیخ الطائفہ تحریر فرماتے ہیں:۔

خاطب الله تعالیٰ لهذه الاية قوما جعلوا القيام بسقي الحجيج وعمارة المسجد الحرام من الكفار مع مقامهم على الكفر مساويا او افضل من ايمان من امن بالله واليوم الاخر وجاهد في سبيل الله (تبیان)

خداوند عالم نے اس آیت میں ان لوگوں کو مخاطب کیا ہے جنہوں نے حاجیوں کے سیراب کرنے اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو باوجود کفر پر برقرار رہنے کے برابر قرار دیا تھا یا بہتر اس شخص کے ایمان سے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔

ممکن ہے کہ یہاں جناب عباسؓ کا نام لینے کے بجائے ''لوگوں'' کی مبہم لفظ کہہ دینا خلافت بنی عباس کے دور کے تقاضوں کے لحاظ سے اختیار کیا گیا ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

''اے ایمان لانے والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو بھی اپنے حوالی موالی میں داخل نہ کرو، اگر وہ کفر کو ایمان کے مقابلہ میں پسند کریں اور جو تم میں سے انہیں حوالی موالی بنائے گا تو یہی ظالم لوگ ہیں، کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہاری اولاد اور تمہارے بھائی اور تمہارے شریک زندگی اور تمہارے عزیز اور وہ مال جو تم نے جمع کئے ہیں اور وہ کاروبار جس کے مدھم ہوجانے کا تمہیں ڈر ہے اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں، اللہ اور اس کے پیغمبر اور اس کی راہ میں جہاد سے تم کو زیادہ محبوب ہیں تو پھر منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کرے اور اللہ بداعمال

لوگوں کو منزلِ مقصود تک پہنچایا نہیں کرتا ہے۔''

یہ تاریخ وسیرت کی مسلمہ حقیقت ہے کہ فتح مکہ کے لئے جب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روانہ ہونے والے تھے تو حاطب بن ابی بلتعہ نے جو صحابۂ بدر میں کے معزز گروہ میں داخل تھے، خفیہ طور پر اس کی اطلاع مکہ کی طرف ایک قاصد کے ہاتھ بھیجی تھی جسے قدرت کی طرف سے افشائے راز کئے جانے پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے راستے میں روکنے کا انتظام فرمایا۔ ہمارے یہاں کی روایت کے مطابق جو بطور حدیث صراحۃً موجود ہے، یہ آیتیں اسی واقعہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ [1]

مگر قدیم تفسیر میں جس کے متعلق گمان غالب ہے کہ حدیث پر مبنی ہوتی ہے، اس کا گزشتہ آیات ہی سے تعلق بتایا گیا ہے کہ جب یہ حکم ہوا کہ مشرکین مکہ میں اب سے داخل نہ ہوں تو بعض مسلمانوں کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ اس سے ہماری تجارت کو نقصان پہنچے گا اور ہمارے اہل وعیال کو بھی جو مکہ میں ہیں ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی [2] مگر ہمیں پہلی تفسیر زیادہ مرجح معلوم ہوتی ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾

''اللہ نے تمہاری مدد کی ہے بہت سے مقامات پر اور حنین کے دن جب کہ تمہاری کثرت تعداد نے تم میں غرور پیدا کر دیا [3] تو اس نے تمہیں کچھ فائدہ نہ دیا اور تم پر زمین اپنی وسعت کے ساتھ ساتھ تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھرا کے پسپا ہوئے، پھر اللہ نے اپنی طرف کا سکون واطمینان [4] اتارا اپنے پیغمبر اور (سچے) ایمان والوں پر اور ایسی فوجیں اتاریں جنہیں تم نے دیکھا نہیں اور سزا دی انہیں جنہوں نے کفر کیا اور یہی سزا ہوتی ہے کافروں کی پھر اللہ اس کے بعد جس کی چاہتا ہے توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔''

جنگِ حنین کا تذکرہ اور باوجود کثرت تعداد مسلمانوں میں ابتری اور انتشار

---

[1] ۔ روی عن ابی جعفر و ابی عبداللہ (تبیان)

[2] ۔ لما اذن امیر المومنین علیہ السلام بمکۃ ان لا یدخل المسجد الحرام مشرک بعد ذلک العام جزعت قریش جزعا شدیدا و قالوا ذهبت تجارتنا وضاعت عیالنا وضربت دورنا فانزل اللہ عزوجل فی ذٰلک (علی بن ابراھیم)

[3] ۔ العجب السرور بالنفس علی الفخر بما یستحب منه (تبیان)

[4] ۔ طمانینه (جلالین)

ان موقعوں سے جہاں اللہ نے مسلمانوں کی مدد فرمائی، وہ مواقف جہاد مراد ہیں جہاں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اور مخالفین اسلام کا مقابلہ ہوا۔ روایت میں وارد ہوا ہے کہ ان مہموں کی تعداد اسی تھی [1]

اس سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ کثیر کی قید کے ساتھ کوئی نذر وغیرہ کی جائے تو اسّی کی تعداد کثیر کا یقینی مصداق ہوگی۔ (یعنی اگر کوئی شخص نذر مان لے کہ کثیر افراد کو کھانا کھلانے کی نذر مان لے تو اس کے لئے اسی افراد کو کھانا کھلا دینا کافی ہوگا اور یہ تعداد کثیر تعداد کہلائے گی)۔

مسلمان اس جنگ میں بارہ ہزار تھے اور کفار صرف چار ہزار تو بعض مسلمانوں کی زبان سے یہ نکلا کہ اب تو ہم اکثریت میں ہیں، اس لئے دشمن پر غالب آنے میں کوئی شک نہیں۔ اسی کو قرآن مجید کہہ رہا ہے کہ تمہاری کثرت نے تم میں غرور پیدا کر دیا۔ [2]

ان الفاظ سے کہ ایسی فوجیں اتاریں جنہیں تم نے دیکھا نہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ بدر کی طرح جنگ حنین میں بھی فرشتوں کا لشکر مدد کے لئے آیا تھا۔ [3]

بعض لوگوں نے بدر اور حنین میں یہ فرق بتایا ہے کہ حنین میں فقط مسلمانوں میں سکونِ قلب پیدا کرنے کے لئے فرشتے اترے تھے جنگ نہیں کی تھی مگر بدر میں جنگ کی تھی۔ [4]

لیکن ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے حنین میں بدر ہی کی طرح جنگ بھی کی تھی۔ [5]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۲۸

''اے ایمان لانے والو! مشرکین سراسر نجاست ہی نجاست ہیں تو وہ اس سال کے بعد آئندہ مسجد حرام کے پاس بھی نہ جائیں اور اگر تمہیں مفلسی کا اندیشہ ہو [6] تو عنقریب اللہ تمہیں اپنے فضل و کرم سے انشاء اللہ غنی کر دے گا۔ یقیناً اللہ بڑا جاننے والا ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔''

خالق نے صاف الفاظ میں مشرکین کو ''سراسر نجاست'' کہا ہے اور انما کلمۂ حصر کے ساتھ جس کی بنا پر ہم نے ترجمہ کیا کہ ''نجاست ہی

---

[1] ۔روی عن ابی عبدا اللہ انہا کانت ثمانین موطنا (تبیان)

[2] ۔فقلتم لن تغلب الیوم من قلۃ (جلالین)

[3] ۔المراد بہا ھھنا الملائکۃ (تبیان)

[4] ۔قال الحبائی انما نزلت الملائکۃ یوم حنین من جھۃ الخاطر الذی یستجمع قلوبھم ویجبن عنھم اعدآءھم ولم تقاتل الا یوم بدر خاصۃ.(تبیان)

[5] ۔قال رجل یقال شجرۃ بن ربیعۃ للمؤمنین وھو اسیر فی ایدیھم ابن الخیل البلق والرجال علیھم الثیاب البیض فانما قتلنا بایدیھم ... قالو اتلک الملائکۃ (علی بن ابراھیم)

[6] ۔یعنی بسبب انقطاع سوداگران (فتح الرحمن)

نجاست ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں طہارت کا کوئی پہلو ہے ہی نہیں اور اسی لئے فقہ اہل بیت علیہم السلام میں انہیں نجس العین مانا جاتا ہے مگر سواد اعظم کے اقتدار دنیا کی بنا پر سیاسی مصالح، ان کی طہارت کے متقاضی ہوئے لہٰذا وہ قرآن کے اس نص قطعی کے خلاف ان کی طہارت کے قائل ہو گئے اور اس لئے شاہ عبدالقادر قرآن کے حکم صریح نجاست کے تحت یوں رقم طراز ہیں کہ:

''پلیدی ان کے دل میں، بدن پر نہیں'' (موضح القرآن)

حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن ان پر نجس ہی نہیں بلکہ نَجَس کا جس کے معنی ہوئے عین نجاست، اطلاق کیوں کرتا؟!

جلالین کا مشرب اگرچہ وہی ہے لیکن مقام تشریح میں ان کے الفاظ پھر بھی ایک حد تک درست ہیں کہ:

نجس قذر لخبث باطنهم

وہ نجس یعنی بالکل نجاست ہیں اپنے باطن کی گندگی کی وجہ سے۔

یہاں باطن کی نجاست کو علت حکم قرار دیا ہے مگر اس علت سے حکم جو مرتب ہوا وہ کیا ہے؟ خود ان کا نجس ہونا جو ان کی اس خباثت باطنی پر ایک پاداش کی حیثیت رکھتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ مشرکین کے نجس ہونے کی آیت ۹ ہجری میں یعنی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے نازل ہوئی ہے۔[1]

لہٰذا اس کے پہلے مسجدِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کچھ کفار کے داخلہ یا نشست و برخواست یا اکل و شرب کے واقعات جو ہوں، وہ طہارت مشرکین کے ثبوت میں پیش نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ احکام تدریجی طور پر نازل ہوئے ہیں اور اسی تدریج کے ساتھ ان پر عمل ہوا ہے۔ قبل ورود شرع اگر عمل اس کے خلاف ہوا ہو تو وہ اس حکم کے مقابلہ میں کوئی سند نہیں ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾

''اہل کتاب میں سے ان سے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ روز آخرت پر اور نہیں حرام سمجھتے اسے جو اللہ اور اس کے پیغمبر نے حرام قرار دیا ہے اور سچے دین کو اختیار نہیں کرتے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ احساس کمتری رکھتے ہوئے سیدھے ہاتھ [2] جزیہ ادا کریں۔''

سلسلۂ ترتیب تنزیلی میں اس کا فیصلہ مشکل ہے کہ یہ آیت کس منزل پر اتری ہے۔

---

[1] ۔ بعد عامهم هذا عام تسع من الهجرة (جلالين) سنة تسع من الهجرة التي نبذ فيها براءة المشركين وكانت بعده حجة الوداع (تبيان)

[2] ۔ عن يد اى منقادين اوبايديهم لا يوكلون بها (جلالين)

سورۂ ''براءۃ'' کا جزء ہونا تو اس کا مقتضی ہے کہ یہ آخری دور حیاتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آیت ہو مگر اس وقت معاملہ مشرکین یعنی بت پرستوں کا تھا۔ اس میں یہ اہل کتاب کا ذکر کہاں سے آ گیا؟ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۳۰

''اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ اپنے منہ سے ان کی باتیں ہیں، ویسی ہی باتیں کہتے ہیں جیسے پہلے کے کافروں کی باتیں تھیں اللہ ان کو غارت کرے [1] کس طرح کج روی کر رہے ہیں۔ [2]''

یہ اپنے منہ سے ان کی باتیں ہیں'' یعنی بلا ثبوت۔ ان کے پاس ان باتوں کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے [3] اور نہ کوئی صحیح مفہوم ان کا ان کے ذہن میں ہے [4] ''پہلے کے کافروں کی ایسی باتیں ہیں'' یعنی مشرکین بھی تو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے [5] یا یہ کہ خود ان کے باپ دادا اور مذہبی پیشوا جیسے پال جنہوں نے یہ باتیں ایجاد کیں اور یہ اندھا دھند ان کی پیروی کر رہے ہیں۔ [6]

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳۱

''انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے علاوہ پروردگار بنا رکھا ہے اور مریم کے فرزند مسیح کو۔ حالانکہ حکم نہیں تھا سوا اس کے کہ وہ ایک خدا کی عبادت کریں جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، وہ بری ہے اس سے کہ جو وہ شرک کرتے ہیں۔''

احبار یہودیوں کے علماء کہے جاتے تھے اور راہب عیسائیوں کے تارک الدنیا عابد۔ [7]

''انہوں نے پروردگار بنا رکھا ہے'' یعنی چاہے زبان سے انہیں خدا نہ کہیں لیکن حلال و حرام میں صرف ان کے اقوال پر انہوں نے

---

[1] ۔لعنهم الله (جلالين) لعنت كرد ايشان را خدا (شاه ولی الله)

[2] ۔ كيف يصرفون عن الحق مع قيام الدليل (جلالين)

[3] ۔يعنى اصلى ندارد (فتح الرحمن)

[4] ۔لا يرجع الىٰ معنى صحيح فهو لا يجاوز افواههم (تبيان)

[5] ۔یعنی اہل کتاب ہو کر مشرکین کی پیروی کرنے لگے (موضح القرآن)

[6] ۔الذين كفروا من قبل من آبائهم تقليدا لهم (جلالين)

[7] ۔احبارهم علماء اليهود ورهبانهم عباد النصارىٰ (جلالين)

اپنا دارومدار قرار دے لیا ہے۔[1]

حالانکہ علماء کا کام تشریح احکام نہیں ہے بلکہ احکام شرعیہ کو ان کے ماخذوں سے معلوم کر کے عوام کو بتلانا ہے۔ مسلمانوں میں علماء کا جو مرتبہ ہے، وہ اسی حد تک ہے، تشریع احکام میں کسی عالم کا قول ہرگز مستند نہیں ہے۔

مفسرین اہل سنت نے بھی اس کی تشریح یہی کی ہے چنانچہ تفسیر جلالین میں ہے:

حیث اتبعوھم فی تحلیل ما حرم و تحریم ما احل

اس طرح کہ انہوں نے ان کی پیروی کی حلال سمجھنے میں اس کے جو خدا نے حرام کیا تھا اور حرام سمجھنے میں اس کے جو اس نے حلال کیا تھا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''ان کے عالم یا درویش جو اپنی عقل سے ٹھہرا دیتے، وہ جانتے خدا کے ہاں ہم کو چھٹکارا ہو گیا، سو عالم کا قول عوام کو سند ہے جب کہ وہ شرع سے سمجھ کر کہے۔'' (موضح القرآن)

مگر یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اصول فقہ میں اہل سنت کے یہاں جو اصول ''تصویب'' ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ احکام شرعی مجتہدین کے اقوال کے پابند ہیں اور مجتہدین بس چار گزرے ہیں۔ ابوحنیفہ وغیرہ اور سب کے لئے انہی کے اقوال پر چلنا باعث نجات ہے تو بتایئے کہ یہود و نصاریٰ کے اس تصور اور اسلام کی طرف منسوب شدہ تصور میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾

''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ انکاری ہے کسی بات سے سوا اس کے کہ وہ اپنے نور کو کمال تک پہنچائے چاہے کافر لوگ ناگواری محسوس کریں۔''

''اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں'' یعنی پھونکوں سے اس چراغ کو خاموش کر دیں۔

شاہ عبدالقادر اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ:

''یعنی جیسے کوئی پھونک سے چراغ بجھا دے، وہ چاہتے ہیں کہ اپنی جھوٹی باتوں سے دین اسلام کو نہ پھیلنے دیں۔'' (موضح القرآن)

ان کے والد شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے:

''یعنی بشبہات تقریر می کنند در ابطال دین''۔ (فتح الرحمٰن)

جلالین کے الفاظ یہ ہیں۔

نور اللہ شرعہ و براھینہ بأفواھھم بأقوالھم فیہ۔

---

[1] ۔معنی اتخاذھم ارباباً انھم قبلوا منھم التحریم والتحلیل بخلاف ما امر اللہ تعالیٰ وھو المروی عن ابی جعفر وابی عبداللہ (تبیان)

''نورِ خدا'' یعنی اس کی شریعت اور اس کے دلائل ''اپنے منہ سے'' یعنی اپنے اقوال سے اس کے بارے میں۔

ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ''جھوٹی باتوں'' ''شبہات'' اور ''اقوال'' کی خصوصیت افواہ یعنی دہنوں کی لفظ کو دیکھتے ہوئے کی ہے حالانکہ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ ''وہ اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں''..... یہ الفاظ تو بطور استعارہ ہیں۔ یعنی ان کی کوششوں کو دین کے مٹانے میں چراغ کو بجھانے والے کی کوشش سے تشبیہ دی گئی ہے۔

بافواھم ''اپنے دہنوں سے'' یہ لفظ مشبہ بہ یعنی چراغ بجھانے کی مناسبت سے ہے کہ یہ بجھانے کی کوشش زیادہ تر منہ سے ہوا کرتی ہے۔ اس کے لئے یہ ضرورت نہیں ہے کہ مشبہ یعنی دین کے مٹانے کی جو کوشش ہے، وہ بھی منہ سے ہی متعلق سمجھی جائے۔ وہ چیزیں یعنی شبہات اور اس طرح کے اقوال، وہ ایک نوع کی کوشش دین کے مٹانے کی ہے لہٰذا وہ بھی اس کے تحت میں داخل ہیں لیکن ان کے علاوہ جتنی طرح کی کوششیں بھی دین کے خلاف ''دامے، درمے، قدمے، سخنے'' ہوں اور اس سے آگے بڑھ کر زیر تلوار، اور لشکروں اور سیاسی کرتبوں سے وہ کوششیں جو رہ نمایان دین کیخلاف ہر دور میں ہوئیں، سب اس کے تحت میں داخل ہیں جن میں سب سے بڑی کوشش جس میں سلطنتیں مصروف رہیں، وہ ان ہستیوں کی زندگی کا خاتمہ تھا جنہیں محافظ دین کی حیثیت سے خالق نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد برقرار رکھا تھا مگر خالق صاف ارشاد فرما رہا ہے کہ ''یَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ'' (یعنی) اللہ طے کئے ہوئے ہے کہ وہ اپنے نور کو کمال کی منزل تک پہنچا کے رہے گا۔ اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ ان تمام قہاری طاقتوں کی کوشش کے باوجود ان رہنمایان دین کا سلسلۂ وجود ختم نہیں ہوا اور ان تمام منصوبوں کے برخلاف ان میں سے ایک محافظ دین قائم و برقرار ہے جو دین الٰہی کے کمال تک پہنچانے کا ضامن اور ''واللہ متم نورہ'' کا ثبوت کامل ہے۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

''وہ وہ ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے ہر دین کے مقابلہ میں غالب کر کے رہے، چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناپسند ہو۔''

آخر میں دین اسلام کے غالب آنے کا اعلان

اصل میں دین تو وہی ہے جو سچا ہو۔ اس کے خلاف جو کچھ ہو، وہ بے دینی ہے مگر اکثر باطل تصورات چونکہ بنام دین جاری ہیں، اس لئے دین ایک نہ رہا، بہت سے دین ہو گئے اور اب دین کی قسمیں ہو گئیں، دین حق اور ادیان باطلہ [1]

عبوری منزلوں میں اس عمر دنیا کی اکثر باطل غالب بھی نظر آتا ہے مگر آخر میں خالق کا یہ اعلان ہے کہ وہ دین حق کو بلا استثناء تمام ادیان باطلہ کے مقابلہ میں غلبہ عطا کر کے رہے گا یہی غلبۂ دین حق وہ ہے جس کے اہل حق منتظر ہیں [2] اور اس محافظ دین کی راہ دیکھ رہے ہیں جس کے ظہور سے یہ غلبۂ حق دنیا کی آنکھوں کے سامنے آئے گا۔ اللھم عجل فرجه وسهل مخرجه.

---

[1] ۔ الدین کله جمیع الادیان المخالفة له (جلالین) دین الحق هو الاسلام ... وکل دین سواه باطل (تبیان)

[2] ۔ قال ابو جعفر علیہ السلام: ان ذٰلك یکون عند خروج القائم (تبیان)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴿۳۵﴾

''اے ایمان لانے والو! یقیناً بہت سے پادری اور راہب، لوگوں کے اموال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے انحراف کرتے ہیں [1] اور وہ جو سونے اور چاندی کے ذخیرے اکٹھا کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سناؤ، جس دن آتش جہنم میں ان (سونے چاندی کے سکوں) کو تپایا جائے گا، اور ان سے ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا کہ یہ وہ ہے جو تم نے اپنے لئے ذخیرہ جمع کیا تھا۔ اب چکھو مزہ ان کا جو تم ذخیرہ جمع کرتے رہتے تھے۔''

اکتناز کی مذمت اور اس کی سزا

''لوگوں کے اموال ناحق کھاتے ہیں'' یعنی رشوت وغیرہ لے کر غلط مسئلے بتاتے ہیں [2] اکٹھا کرنے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے سے مراد زکوٰۃ وغیرہ حقوق مالی کا جو فرض عین ہیں، ادا نہ کرنا ہے۔ [3]

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴿۳۶﴾

''بلاشبہ مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک بارہ مہینوں کی ہے اللہ کے نوشتہ میں اس دن کہ جب آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہ صحیح دین ہے تو ان میں اپنے نفوس پر ستم نہ ڈھاؤ اور مشرکوں سے

---

[1] ۔دوسرا ترجمہ اس کا یہ ہے کہ "باز می دارند از راہ خدا" (شاہ ولی اللہ) یہ تفسیر جلالین کے مطابق ہے:۔ یصدون الناس

[2] ۔اکل المال بالباطل تملکہ من الجہات التی یحرم منہا اخذہ (تبیان)

[3] ۔لانّہم لو اخرجوا زکوٰتہا و کنزوا ما بقی لم یکونوا ملومین بلا خلاف. (تبیان)

سبھوں سے جنگ کرو جیسے وہ سب ہی تم سے جنگ کرتے ہیں اور جانے رہو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔''

مہینوں کی تعداد بارہ اور چار محترم جن میں جنگ وجدل حرام ہے

''اللہ کے نوشتہ'' سے مراد لوح محفوظ بھی ہوسکتی ہے اور سابق کی نازل شدہ آسمانی کتابیں بھی [1]

''جب سے آسمان وزمین پیدا ہوئے'' یعنی ہمیشہ سے ''چار مہینے حرام ہیں'' یعنی ان کی عزت وحرمت ایسی ہے کہ ان میں جدال وقتال حرام ہے۔ یہ چاروں مہینے ذیقعد، ذی الحج، محرم اور رجب ہیں۔ ان چاروں میں سے محرم کا تو تقریباً نام ہی ہوگیا ''محرم الحرام''۔

یہ صحیح دین ہے ''یعنی ان مہینوں کی اس عزت وحرمت کو ماننا دین کا لازمی تقاضا ہے۔ [2]

اور ہوسکتا ہے یہ پورے سے متعلق ہو یعنی پیش خدا بارہ مہینوں کا ہونا اور ان میں سے چار کا محترم ہونا یہ دین حق کا لازمی جز ہے۔

اس کے ساتھ مشرکین کے مقابلہ میں جنگ کا جو حکم آیا ہے اس قید کے ساتھ کہ ''جیسے تم سے سب مل کر لڑتے ہیں''.....اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ان مہینوں کی حرمت کو نہ مانیں اور آغاز جنگ کردیں تو تم بھی مقابلہ کرو پھر تم پر ان مہینوں کی بے حرمتی کا الزام عائد نہ ہوگا۔ [3]

إِنَّمَا النَّسِيٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ ۚ زُيِّنَ لَهُمْ سُوٓءُ أَعْمَالِهِمْ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٧﴾

''مہینوں میں ردوبدل کرنا، کفر میں ایک بڑی زیادتی ہی ہے جس سے گمراہ ہوتے ہیں، وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا، وہ ایک سال اسے حلال قرار دیتے ہیں اور ایک سال اسے حرام بنا دیتے ہیں تاکہ جو اللہ نے حرام قرار دیئے ہیں، ان کی گنتی پوری کردیں اور اس طرح جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، اسے حلال کردیں۔ ان کی بداعمالی ان کے لئے خوش آئند معلوم ہوتی ہے اور اللہ کافروں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔''

نسیٔ یعنی مہینوں کی تبدیلی کی شدید مذمت

نسیٔ یعنی مہینوں میں ردوبدل کس طرح ہوتی تھی؟

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

''گاہے صفر را محرم می ساختند و محرم را صفر و علی ہٰذا القیاس'' (فتح الرحمن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسم کے اعتبار سے تو جو حرام مہینے ہیں، ان ہی کو حرام قرار دیتے تھے مگر مسمیٰ کو ان کے بدلتے تھے یعنی جو واقعاً

---

[1] ۔فیما کتبہ اللہ فی اللوح المحفوظ و فی الکتب المنزلۃ علیٰ انبیائہ (تبیان)

[2] ۔ذٰلک تحریمھا (جلالین)

[3] ۔واقتلوا المشرکین کافۃ ای جمیعا فی کل الشھور (جلالین)

محرم ہوتا، اسے صفر قرار دیتے اور جو صفر ہوتا، اسے محرم مگر یہ کیونکر ہوتا تھا؟ اس کے لئے مزید تشریح درکار ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''کافروں نے ایک گمراہی نکالی تھی کہ آپس میں لڑتے اس میں آجاتا ماہ محرم، اس کو ہٹا دیتے کہتے اب کے برس صفر پہلے آیا، محرم پیچھے آوے گا تو ماہ حرام میں لڑتے اس حیلہ سے'' (موضح القرآن)

یہ تفسیر جلالین سے ماخوذ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ:

كما كانت الجاهلية تفعله من تاخير حرمة المحرم اذا اهل وهم فى القتال الىٰ صفر

جیسا کہ جاہلیت والے کرتے تھے کہ اگر جنگ میں مصروف ہیں اور اس میں محرم کا چاند ہو گیا تو اس کی حرمت کو بعد میں صفر کی طرف منتقل کر دیتے تھے۔

ایک خیال یہ ہے کہ اس کا باعث معاشی پہلو کا لحاظ تھا چونکہ عربوں کی گزر بسر لوٹ مار پر تھی اور تین مہینے مسلسل محترم ہونے کی وجہ سے اتنی طویل مدت تک وہ اپنی روزی سے محروم رہتے تھے، اس لئے وہ محرم کی جگہ صفر کا اعلان کر دیتے تھے تاکہ وہ درمیان میں لوٹ مار کر لیں اور پھر صفر کے مہینہ میں محرم بنالیں [1] اس کو قرآن نے روکا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿٣٨﴾

''اے ایمان لانے والو! تمہیں کیا ہے کہ جب کہا جاتا ہے تم سے کہ اللہ کی راہ میں باہر نکلو تو تم بوجھل ہو کر زمین گیر ہو جاتے ہو! کیا تم آخرت کے بدلے اس دنیاوی زندگی پر راضی ہو تو نہیں ہے اس دنیوی زندگی کا سروسامان آخرت کے مقابلہ میں مگر بہت کم۔''

یہ تبوک کی جنگ کے لئے چلنے کی دعوت پر کچھ مسلمانوں کے رویہ کا بیان ہے۔ [2]

اس جنگ کے لئے روانگی کا حکم بڑی سخت گرمی کے موسم میں تھا اور پھر بظاہر رومی سلطنت کا مقابلہ تھا اس لئے مسلمان بڑی مشکل سے جنگ کے لئے آمادہ ہو رہے تھے۔

مفسرین اہل سنت جنہیں کردار صحابہ کو سنبھالنے کی فکر دامن گیر رہتی ہے، کہتے ہیں کہ یہ صرف تین آدمی تھے [3] مگر وہ تین آدمی تو وہ

---

[1] ۔انما دعاهم الىٰ ذٰلك لوالى ثلثة اشهر حرم لا يغيرون فيها وكان معاشهم من الغارة. (تبيان)

[2] ۔قال الحسن ومجاهد دعوا الى الخروج الى غزوة تبوك بعد فتح مكة وغزو طائف. (تبيان)

[3] ۔آن حضرت ﷺ در وقت عسرت و گرمی هوا م توجه غزوه تبوك شدند و بسیاری از صحابه موافقت کردند و از مسلمین سه کس بے عذر تخلف کردند. (فتح الرحمن)

تھے جو آخر تک نہیں گئے اور پھر نادم ہوئے۔ ان کی توبہ اور اس کی قبولیت کا ذکر تین عدد کی صراحت کے ساتھ دوسری آیت میں موجود ہے مگر صرف تین عدد کا کردار ایسا تھوڑی ہوسکتا ہے کہ اس پر تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے انتباہ کیا جائے اور ایسی ایسی سخت تہدید وتخویف کی صورتیں اختیار کی جائیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ ''محمل'' میں بڑی ''گرانی'' اور ''ذوق اطاعت'' میں بڑی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لئے ''نوا'' کو ''تلخ تر'' اور ''حدی'' کو ''تیز تر'' قرار دیئے جانے کی ضرورت تھی۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَ لَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾

''اگر تم باہر نہ نکلو گے تو وہ تمہیں دردناک عذاب کے ساتھ سزا دے گا اور تمہارے بدلے کسی دوسرے گروہ کو کھڑا کر دے گا اور تم انہیں کچھ نقصان نہ پہنچاؤ گے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

انداز کلام سے ظاہر ہے کہ یہ آیتیں سب جنگ میں روانگی سے پہلے کی ہیں اور اس وقت مسلمانوں میں یعنی صحابہ میں ایک عام بددلی، سستی اور عدول حکمی کے رجحان کی لہر سی پھیلی ہوئی تھی۔

پھر ان سخت تنبیہوں کے نتیجہ میں بادل ناخواستہ تمام لوگ روانہ ہوئے مگر تین آدمی ایسے تھے جو حیلے حوالے کر کے پھر بھی نہ گئے جن کے متعلق بعد میں آیتیں نازل ہوئیں۔

لَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا میں ضمیر کس کی طرف راجع ہے؟ اس میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ اللہ کی طرف ہے اور دوسرے یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف۔ [1]

ہم نے دوسرے قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے، اس لئے کہ اس کے بعد کی آیت میں بلا فاصلہ جو ضمیریں ہیں، وہ واضح طور پر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی طرف راجع ہیں۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾

''اگر تم ان کی مدد نہ کرو گے تو (کیا ہوا؟) اللہ نے ان کی مدد کی ہے اس وقت جب کافروں نے ان کو نکال دیا تھا، جب وہ دو میں کے ایک تھے [2] جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ رنج نہ

---

[1] ۔قیل فی من یرجع الیہ قولان: احدھما انہ یعود علی اسم اللہ والآخر انہا تعود الی النبی ﷺ (تبیان)

[2] ۔ای احد اثنین (جلالین)

کرو، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے تو اللہ نے اپنی طرف کا سکون واطمینان ان پر اتارا اور ان کو تقویت پہنچائی ایسی فوجوں سے جنہیں تم لوگوں نے نہیں دیکھا اور کافروں کی بات کو نیچا کیا اور اللہ کی بات سب سے بالا اور اللہ زبردست ہے، صحیح کام کرنے والا۔''

شب ہجرت کا مختصر حال

غار میں دوسرے شخص جو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے، یہ مشہور ومعروف صحابی ابوبکرؓ تھے۔

یہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بڑا سخت وقت تھا جس کی سختی میں ساتھ والے کی وجہ سے اضافہ ہوگیا تھا ورنہ نصرت الٰہی کے تذکرہ میں اس واقعہ کے بیان کی کہ ساتھ کون تھا اور اس کی کیا حالت تھی؟ کوئی ضرورت نہ تھی۔

اُدھر مشرکین تعاقب میں آرہے تھے اور ادھر عین اس موقع پر جب مشرکین غار کے دہانے پر تھے، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی پر رقت طاری ہوگئی جس کے لئے روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ:

قد قال له لمّا رأى اقدام المشركين لو نظر احدهم تحت قدمه لابصرنا.(جلالين)

جب انہوں نے مشرکین کی پیش قدمی دیکھی تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہنے لگے کہ ان میں سے کوئی بھی نظر جھکائے اپنے پیر کے نیچے تو وہ ضرور ہمیں دیکھ لے گا۔

مشرکین پہنچ تو گئے ہی تھے وہاں تک۔ بس ایک آواز کی کمی تھی جو نظروں کو قدموں کے نیچے متوجہ کردے یہ کمی پوری ہوگئی گریہ کے غلبہ سے تو بس اس وقت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت صرف خدا کی قدرت کا کرشمہ تھی اور اس نے ان پر سکون واطمینان اتارا یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس لئے کہ قبل اور بعد کی تمام ضمیریں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی طرف راجع ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ درمیان کی اس ضمیر کو کسی اور کی طرف پلٹا دیا جائے۔ [1]

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

''چل کھڑے ہو ہلکے پھلکے اور بھاری، بوجھل (جیسے بھی ہو) اور اپنے مال وجان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانو۔''

''ہلکے پھلکے'' اور ''بھاری بوجھل'' کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ خواہ تمہارے پاس مال ودولت موجود ہو اور تم طاقت رکھتے ہو اور خواہ تم محتاج، پریشان حال اور کمزور ہو، اس صورت میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہوگئی ہے اس ارشاد الٰہی سے کہ:

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ ------ حَرَجٌ کمزوروں پر ------ سختی نہیں ہے۔

مگر شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ اس معنی سے طاقت اور ضعف یہاں مراد نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ خواہ تمہارے پاس اسباب، حشم وخدم زیادہ ہو اور خواہ اتنا ہی بس موجود ہو جو پیٹ پالنے کے لئے کافی ہے، اس سے زیادہ لاؤ لشکر پاس نہ ہو، وہ کہتے ہیں:

---

[1] ۔فان جميع الكنايات قيل هٰذا وبعده راجعة الى النبى ﷺ (تبيان)

"بایں توجیہہ آیۃ محکم باشد غیر منسوخ" (فتح الرحمٰن)۔

محققین علماء کے خیال کے مطابق گراں باری اور سبک باری کی بہت سی شکلیں ہیں جن کے لحاظ سے بہت سے اقوال ہو گئے ہیں۔ یہ کہ خواہ تم جوان ہو یا بوڑھے، یہ کہ مالدار ہو یا غریب، یہ کہ تمہاری طبیعت اس کے لئے آمادہ ہو یا طبیعت پر گراں ہو، کہ سوار ہو یا پیادہ، یہ بھی کہ تم کوئی پیشہ کرتے ہو یا بے کار ہو، صاحب اہل وعیال ہو یا اس بار سے سبکدوش ہو لہٰذا اس کی ضرورت کیا ہے کہ ان میں سے کسی ایک میں آیت کے مفہوم کو محدود بنایا جائے بلکہ کیوں اسے ان تمام پہلوؤں پر حاوی قرار نہ دیا جائے۔ [1]

بہرصورت اسے منسوخ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّا تَّبَعُوْكَ وَ لٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

"اگر قریبی کوئی منفعت ہوتی تو [2] اور سفر معمولی ہوتا [3] تو وہ آپ کے پیچھے پیچھے ہو جاتے مگر ان پر بڑی دور دراز مسافت پڑ گئی اور بہت جلد وہ اللہ کی قسم کھائیں گے کہ اگر ہم روانہ ہو سکتے تو آپ کے ساتھ ضرور نکلتے۔ وہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔"

یہ دور ودراز مسافت شام کی سرزمین تھی جہاں جنگ تبوک کے لئے جانے کی دعوت دی گئی تھی۔ [4]

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ تَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

"اللہ آپ کو معاف کرے، کیوں آپ نے انہیں اجازت دی جب تک کہ کھل نہ جائیں آپ پر وہ جو سچے ہیں اور وہ معلوم ہو جائیں کہ جو جھوٹے ہیں۔"

کچھ منافقین نے پیغمبر ﷺ سے خصوصی طور پر اجازت طلب کی کہ ہم گھروں میں بیٹھے رہیں اور ساتھ نہ جائیں۔ حضرت ﷺ نے انہیں اجازت دے دی۔ ارشاد حضرت احدیت ہے کہ اب تو ان کے لئے ایک پردہ ہو گیا عدول حکمی کے الزام سے بچنے کے لئے۔ آپ اجازت نہ دیتے تو پورا انکشاف ہو جاتا کہ کون تعمیل حکم سچائی کے ساتھ کرتے ہیں اور کون جھوٹے ہیں؟

حضرت ﷺ کو اجازت دینے کا حق بنص قرآن حاصل تھا جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

---

[1] ۔ان یحمل علیٰ عمومہ فیدخل فیہ جمیع ذلك وھو الاولیٰ والالیق بالظاھر (تبیان)

[2] ۔اگر بودی انچہ بآن دعوت می کنی نفع قریب الحصول (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔سفراً سھلا باقتصادہ من غیر طول (تبیان)

[4] ۔یعنی الیٰ تبوك (علی بن ابراھیم)

وَرَسُوْلِهٖ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ .

اگر وہ اپنی کسی مجبوری سے جنگ میں نہ جانے کی اجازت مانگیں تو جسے آپ چاہیں اجازت دے دیجئے۔(نور:۶۲)

اس لئے یہ اجازت دینا معاذ اللہ کوئی فعل ناجائز نہ تھا جو منافی عصمت ہو مگر خالق کی نظر میں اس موقع پر اجازت نہ دینا زیادہ مناسب تھا۔[۱]

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

''آپ سے چھٹی نہیں مانگتے وہ جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اس سے[۲] کہ وہ اپنے مال اور جان سے جہاد کریں اور اللہ پرہیزگاروں کا خوب جاننے والا ہے۔آپ سے چھٹی کے طالب تو بس وہ ہوتے ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دلوں کو شک ہے تو وہ اپنے شک میں ڈانواڈول رہتے ہیں''[۳]

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

''اور اگر وہ باہر نکلنے کی نیت رکھتے تو اس کے لئے پہلے سے تیاری کرتے مگر اللہ کو ان کا چل کھڑا ہونا ناپسند تھا تو اس نے ان کی ہمت پست کردی اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھو بیٹھنے والوں کے ساتھ''

توفیق الٰہی ذوق وطلب کے ساتھ شامل حال ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت۔۶۹)

یہ لوگ اس ذوق سے محروم تھے، اس لئے توفیق ان سے سلب ہوگئی جس کا نام خذلان ہوتا ہے، اسی کو یہاں اس انداز میں بیان کیا گیا ہے۔عام مفسرین نے اسے تقدیر الٰہی کے معنی میں قرار دیا ہے جو ازل سے ثابت ہے[۴] مگر اس طرح وہ بے قصور قرار پاجاتے ہیں۔

جناب شیخ الطائفہؒ نے اس کا مطلب اس طرح لکھا ہے کہ یہ منافق لوگ اگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ واقعی نصرت اسلام اور جہاد کی نیت سے جانے کا قصد رکھتے ہوتے تو وہ اس کا سامان کرتے لیکن ان کی نیت یہ نہ تھی وہ تو یہ سوچے ہوئے تھے اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہاں رکنے کی اجازت نہ دی تو ہم جائیں گے اور ان کا کام بگاڑنے کی کوشش کریں گے اور مسلمانوں میں بددلی پھیلائیں گے لہٰذا اس طرح ان کے جانے کو اللہ

---

[۱] ۔ما کان الاولیٰ ان لا یأذن (تبیان)

[۲] ۔فی التخلف ان یجاھدوا (جلالین)

[۳] ۔معناہ فھم فی شکھم یذھبون ویرجعون (تبیان)

[۴] ۔ای قدر تعالیٰ ذٰلک (جلالین)

نے ناپسند کیا، اور ایسے اسباب فراہم کئے کہ ان کی ہمت پست ہو جائے۔

یہ ان کی ہمت کا پست ہونا اس طرح کے جانے سے ہے جو ان کے پیش نظر تھا۔ نہ کہ واقعی نصرت اسلام کے لئے جانے سے جو بلاشبہ اللہ کو پسند ہے اور اسے کہا نہیں جا سکتا کہ اللہ نے اسے ناپسند کیا[1] اس صورت میں قدرت کی طرف سے ان کی راہ میں زبردست رکاوٹیں ڈالنے ہی کی ہمارے خیال میں بہت پُرزور تعبیر یہ ہے کہ ان سے کہہ دیا گیا کہ بیٹھو گھر میں بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ یہ کہا جانا قدرتی اشارہ کے طور پر حکم کُن کی طرح کی چیز ہے مگر تعجب ہے کہ مفسرین نے ''کہہ دیا گیا'' کے معنی میں اختلاف کے ساتھ یہ بحث کر ڈالی ہے کہ یہ کہنے والا کون ہو سکتا ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں اس پہلو کی طرف توجہ نہیں ہے۔ جو ہم نے لکھا ہے۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاْاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۴۷

''اگر وہ تم میں شامل ہو کر نکلتے تو تم میں بس خرابیوں میں اضافہ کرتے[2] اور تمہارے درمیان گھوڑے دوڑاتے[3] اس کوشش میں کہ تم میں فتنہ وفساد برپا ہو[4] اور تم میں ایسے ہیں جو ان کی خوب سنتے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔''

وہ تو منافقین کا ذکر تھا جو جنگ میں ساتھ نہیں گئے اور اب یہ مسلمانوں کی اس جماعت سے خطاب ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گئی تھی اور انہیں بتایا جا رہا ہے کہ یہ تو ان کے کردار کی مذمت ہے جسے خالق نے ظاہر کیا ہے مگر تمہیں ان کے اپنے ساتھ نہ جانے کا کوئی افسوس نہ ہونا چاہیے بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ ان کا تمہارے ساتھ جانا تمہارے لئے زحمت کا باعث ہوتا۔ وہ اپنی بے عملی اور سہل انگاری سے تمہارے نظم وضبط میں کمی کا باعث بھی ہوتے اور ادھر کی ادھر کر کے خود آپس ہی میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش بھی کرتے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے'' تمہارے درمیان گھوڑے دوڑاتے''.....اور ایک معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ وہ میدانِ جنگ سے فرار کی صورت سے بھاگ دوڑ کرتے[5] مگر الفاظ سے پہلے معنی کا تبادر ذہن کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔

آخر میں بتلایا ہے کہ یہ ساتھ جانے والے بھی سب پختہ کار اور صحیح لوگ نہیں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ: یعنی تم میں ایسے لوگ ہیں جو ان کی باتوں میں آتے اور ان کے آلۂ کار بنتے ہیں۔[6]

اس طرح وہ اگر میدان جنگ میں جاتے تو وہ اپنی سیسہ کاری سے پوری جماعت میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش ہی نہ کرتے بلکہ بہت

---

[1] ۔فثبطهم الله عن الخروج الذی عزموا علیه ولم یثبطهم عن الخروج الذی امرهم به لان الاول کفر والثانی طاعته (تبیان)

[2] ۔فسادا تخذیل المومنین (جلالین)

[3] ۔اسرعوا بینکم بالمشی بالنمیمة (جلالین)

[4] ۔یطلبون لکم الفتنة بالقاء العداوة (جلالین)

[5] ۔ای هربوا عنکم (علی بن ابرهیم)

[6] ۔سماعون لهم ما یقولون سماع قبول (جلالین)

ممکن ہے وہ کامیاب ہوجاتے۔

اس آیت سے گزشتہ آیت کے مفہوم کی بالکل تشریح ہوجاتی ہے اور اسے تقویت ہوتی ہے جو آخر میں جناب شیخ الطائفہؒ کے حوالہ سے درج کیا گیا ہے۔[1]

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

''وہ پہلے بھی فتنہ پردازی کے خواہاں رہے ہیں اور آپ کے لئے معاملات کو درہم و برہم کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ حق سامنے آ گیا اور اللہ کی بات غالب آ گئی، درصورتیکہ وہ ناپسند کرتے تھے۔''

یہ بظاہر تو کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے چنانچہ جناب شیخ الطائفہؒ نے اس کے تحت میں جنگ احد کے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی اپنے ساتھ والوں کی جمعیت کے ساتھ عین موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے الگ ہوکر مدینہ واپس گیا اور اس طرح دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی پست ہمتی کا باعث ہوا۔[2]

دوسرے مفسر اس کے لئے اس خاص موقع کا پتہ نہیں دیتے بلکہ اسے عام بات قرار دیتے ہیں کہ منافقین ہجرت کے بعد شروع شروع ہی میں آپ کو نقصانات پہنچانے کی کوشش کرتے رہے مگر انہیں برابر ناکامی ہوئی۔[3]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

''اور ان میں ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ مجھے چھٹی دیجئے اور مجھے گمراہی میں مبتلا نہ کیجئے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ گمراہی میں وہ خود پڑ ہی چکے ہیں اور بلاشبہ دوزخ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو۔''

جہاد کے موقع پر مسلمانوں کی پست ہمتی اور کمزوری کے نمونے

کہا جاتا ہے کہ یہ شخص جس کی طرف اشارہ ہے جدّ بن قیس تھا۔ اس نے جنگ تبوک کے لئے جانے سے یہ عجیب عذر کیا کہ مجھ پر جنسی خواہش کا غلبہ ہے اور وہاں روم کی حسین عورتیں سامنے آئیں گی تو میں ضبط نہ کرسکوں گا اور گمراہی میں پڑ جاؤں گا۔[4]

تفسیر علی بن ابراہیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے قبل و بعد کی آیتوں میں سب میں اسی جدّ بن قیس کی باتوں کی رد ہے۔ اسی نے یہ کہا تھا

---

[1] ۔بین اللہ فی ھٰذہ الایۃ الوجوہ فی کراھیۃ انبعاثھم ووجہ العلۃ فی تبشیطھم عن ذٰلک (تبیان)

[2] ۔طلبوا فساد ذات بینکم وافتراق کلمتکم فی یوم احد (تبیان)

[3] ۔من قبل اول ما قدمت المدینۃ (جلالین)

[4] ۔انی صغرم بالنسآء واخشی ان رأیت نساء بنی الاصفر ان لا اصبر عنھن فافتتن (جلالین) مرا بیلا و روم بریں کہ جمال رومیان دیدہ مفتون خواھم شد (فتح الرحمن) بہانہ لایا کہ روم کی عورتیں خوبصورت ہیں۔ اس ملک جا کر بدی میں گرفتار ہوں گا۔ (موضح القرآن)

کہ مجھے گمراہی میں مبتلا نہ کیجئے اور اسی نے لوگوں سے کہا تھا کہ اس گرمی میں سفر نہیں کرنا چاہیے اور اسی نے یہ کہا تھا کہ اس جنگ سے زندہ واپس نہیں آسکتے جس پر اس کے بعد کی آیت اتری کہ اگر آپ ﷺ کو کوئی بھلائی پہنچے تو انہیں صدمہ ہوگا۔

بعض مفسرین نے فتنہ یعنی گمراہی کا مطلب بس یہ لیا ہے کہ ایسا حکم مجھے نہ دیجئے جس کی میں تعمیل نہ کروں، اس طرح گمراہی سے مراد بس یہی عدم تعمیل حکم ہے۔ [1]

بہرصورت اس کا قرآن نے یہ جواب دیا ہے کہ وہ گمراہی میں پڑیں گے کیا؟ نصرت حق میں پہلوتہی کرنے کی گمراہی خود کیا کم ہے جس میں وہ مبتلا ہیں ہی۔

إِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَإِنْ تُصِبْكَ مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوا وَهُمْ فَرِحُونَ ﴿٥٠﴾ قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلَانَا ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿٥١﴾

''اگر آپ کے لئے کوئی بھلائی ہو تو وہ ان کے لئے رنج کا باعث ہوگی اور اگر آپ پر کوئی مصیبت آجائے تو وہ کہیں گے کہ (خیر) ہم نے اپنا انتظام پہلے سے کرلیا ہے اور وہ پلٹیں گے اس عالم میں کہ وہ خوش نظر آتے ہوں گے۔ کہہ دیجئے کہ ہرگز ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے، وہ ہمارا مالک ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔''

''ہم نے اپنا انتظام پہلے سے کرلیا ہے''.....اس انتظام سے مراد دشمنوں سے کوئی سازش بھی ہوسکتی ہے اور جنگ سے کنارہ کشی بھی۔ [2]

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۖ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَنْ يُصِيبَكُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِنْ عِنْدِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا ۖ فَتَرَبَّصُوا إِنَّا مَعَكُمْ مُتَرَبِّصُونَ ﴿٥٢﴾

''کہہ دیجئے کہ تم ہمارے لئے دو بھلائیوں میں سے ایک کے سوا اور کا ہے کا انتظار کرسکتے ہو؟ اور ہمیں تمہارے لئے اس کا انتظار ہے کہ اللہ تمہیں سزا دے، خواہ اپنی طرف سے یا ہمارے ہاتھوں سے تو تم انتظار رکھو، یقین سمجھو کہ ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار میں شریک ہیں۔''

بڑے بلیغ انداز میں تعلیم دی گئی ہے کہ ایک مومن کی ذہنیت کیا ہونا چاہئے اور پھر اس ذیل میں ایمان اور کفر کا جو لازمی انجام ہے، اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] ۔ای لا تو ثمنی بان تکلفنی المشقة فی ذٰلك فارقم بالعصیان (تبیان)

[2] ۔یعنی پنہاں با اعدا موافقت کردہ ایم یا از سفر تخلف نمودہ ایم (فتح الرحمن)

مثل تو یہ مشہور ہے کہ ''جنگ دوسر دارد'' مگر ایمان اور کفر کی جنگ میں جو بظاہر ''دوسر'' ہیں، وہ نتیجتاً ایک ہی ہیں۔

جنگ میں ''دوسر'' کیا ہوتے ہیں؟ فتح وشکست نا؟ اور کسی ایک انسان کے لحاظ سے زندگی اور موت ہی نا؟ ان کے علاوہ تو تیسری شق کوئی نہیں ہے؟ لیکن یہ اگر مومن ہے اور حق کی خاطر جہاد کر رہا ہے تو فتح پائے تو اور شکست کھائے تو فتح پا کر زندہ واپس جائے تو، اور قتل ہو کر وہیں کام آجائے تو، بہر حال وہ کامیاب ہے یعنی اس کا انجام بخیر ہے لہٰذا بہر صورت دو بھلائیوں میں کی ایک اسے ملنا ضروری ہے۔

اور جو کفر کے راستے پر چل رہے ہیں، وہاں بھی وہ دونوں ''سر'' نتیجہ کے لحاظ سے ایک ہی ہیں۔ اگر انہوں نے جنگ میں فتح پائی یعنی زندہ رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آخر میں ''انہیں کسی حادثۂ ارضی وسماوی کا شکار ہونا پڑے گا جس سے خدا انہیں ان کے کفر ومعصیت کی دنیا میں بھی سزا دے لے گا اور پھر آخرت میں جو سزا ہوگی، وہ تو ہے ہی اور اگر مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہو گئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے مومنین کے ہاتھ سے انہیں دنیا میں سزا دلوائی اور پھر آخرت کی سزا اس سے الگ رہی۔

غرض اہل حق کے لئے نتیجہ میں کسی برائی کا تصور نہیں ہوسکتا اور اہل باطل کے لئے نتیجہ میں کسی بھلائی کا امکان نہیں۔ اگر یہ چیز پیش نظر رہے تو کسی صاحب ایمان پر مایوسی طاری ہونے کا کہیں امکان ہے؟ یعنی اگر انسان کا ضمیر مطمئن ہو تو اسے یہ غور کرنا ہے ہی نہیں کہ نتیجہ کیا ہوگا؟ اسے سوا کامیابی وکامرانی کے کسی دوسرے تصور کی گنجائش ہی نہیں۔ اسی کو حضرت علی بن ابی طالبؑ نے ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے کہ:

فَإِنَّ الْمَرْءَ الْمُسْلِمَ مَا لَمْ يَغْشَ دَنَاءَةً تَظْهَرُ فَيَخْشَعُ لَهَا إِذَا ذُكِرَتْ، وَيُغْرَى بِهَا لِئَامُ النَّاسِ، كَانَ كَالْفَالِجِ الْيَاسِرِ الَّذِي يَنْتَظِرُ أَوَّلَ فَوْزَةٍ مِنْ قِدَاحِهِ تُوجِبُ لَهُ الْمَغْنَمَ، وَيُرْفَعُ عَنْهُ بِهَا الْمَغْرَمُ. وَكَذٰلِكَ الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ الْبَرِيءُ مِنَ الْخِيَانَةِ يَنْتَظِرُ مِنَ اللهِ إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ: إِمَّا دَاعِيَ اللهِ فَمَا عِنْدَ اللهِ خَيْرٌ لَهُ، وَإِمَّا رِزْقَ اللهِ فَإِذَا هُوَ ذُو أَهْلٍ وَمَالٍ، وَمَعَهُ دِينُهُ وَحَسَبُهُ. (نہج البلاغہ مطبوعہ مصر ص ۶۷ و ۶۸)

جب تک کوئی مرد مسلمان کسی ایسی ذلیل حرکت کا مرتکب نہیں ہوتا کہ جو ظاہر ہو جائے تو اس کے تذکرہ سے اس کی آنکھیں نیچی ہو جائیں اور جس سے ذلیل آدمیوں کی جرأت بڑھے وہ اس کامیاب جواری کے مانند ہے جو جوئے کے تیروں کا پانسہ پھینک کر پہلے مرحلہ پر ہی ایسی جیت کا متوقع ہوتا ہے جس سے اسے فائدہ حاصل ہو اور پہلے نقصان ہو بھی چکا ہے تو وہ دور ہو جائے، اسی طرح وہ مسلمان جو بددیانتی سے پاک دامن ہو، دو اچھائیوں میں سے ایک کا منتظر رہتا ہے، یا اللہ کی طرف سے بلاوا آئے تو اس شکل میں اللہ کے یہاں کی نعمتیں ہی اس کے لئے بہترین ہیں اور یا اللہ کی طرف سے دنیا کی نعمتیں حاصل ہوں تو اس صورت میں اس کے مال بھی ہے اور اولاد بھی اور پھر اس کا دین اور عزت نفس بھی برقرار ہے۔ (ترجمہ مفتی جعفر حسین صاحب مطبوعہ لاہور بار اوّل جلد اوّل، ص ۱۳۹)

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

''کہہ دیجئے کہ تم بخوشی یا بناخوشی کتنی ہی خیرات کرو، تم سے ہرگز قبول نہیں ہوگی۔ یقیناً تم بداعمال لوگ ہو۔''

کہا جاتا ہے کہ اسی جد بن قیس نے (جس کا ذکر چار آیتوں کے پہلے آیت ۴۹: ''وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ'' کے تحت میں آچکا ہے) ساتھ چلنے میں اپنی شہوانی کمزوری کی بنا پر معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں مال سے مدد کرنے کے لئے تیار ہوں، یہ

اسی کا جواب ہے۔[1]

وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾

''اور کون سی چیز مانع ہے اس سے کہ ان کی خیرات ان سے قبول ہو سوا اس کے کہ انہوں نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر اختیار کیا ہے اور نماز کی طرف نہیں آتے مگر الکساتے ہوئے اور خیرات نہیں کرتے مگر اس حالت میں کہ دل سے اسے پسند نہیں کرتے۔''

شرط قبول اعمال ایمان ہے۔ان میں ایمان جو شرط صحت عمل ہے مفقود ہے۔اس کا مرکزی اظہار تو اسی جملہ سے ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ کفر اختیار کئے ہوئے ہیں لیکن اگر وہ کھلے ہوئے کافر ہوتے تو اتنا کہہ دینا کافی تھا۔اس کے لئے آثار وقرائن کی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ ہیں وہ منافق یعنی زبان سے ایمان کا ادعاء رکھنے والے لہٰذا صرف انہیں کافر کہہ دینے پر اکتفاء نہیں کی جاتی بلکہ دل سے ان کے ایمان نہ رکھنے کے شواہد بیان کئے جاتے ہیں کہ جو مومن ہیں، وہ تو رسول ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کیلئے بڑے ذوق وشوق سے آتے ہوں گے لیکن یہ لوگ چونکہ دل سے تو ذوق اطاعت رکھتے نہیں، اس لئے لشتم پشتم بڑے الکساتے ہوئے نماز میں آتے ہیں اور خیرات بھی رغبت اور شوق کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ دکھاوے کی خاطر مصالح پر نظر کر کے بادل ناخواستہ خیرات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا مال بیکار جا رہا ہے۔[2]

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾

''تو تمہیں ان کے مال اور اولاد خوش آئند نہ معلوم ہوں[3] اس سے اللہ بس یہ چاہتا ہے کہ انہیں اس دنیاوی زندگی میں سزا دے اور کشاں کشاں ان کی جانیں نکلیں[4] اس عالم میں کہ وہ کافر ہیں۔''

یعنی کافروں کے لئے دنیوی مال و دولت وغیرہ اکثر عذاب کی ایک شکل ہوتی ہے جس سے ان کے معاصی میں اور اضافہ ہوتا ہے اور وہ دنیا سے جاتے وقت پورے پورے عذاب آخرت کے مستحق ہو کر جاتے ہیں۔[5]

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَوْ

---

[1] ۔وہ جو مدد خرچ دینے لگا تھا، سو جواب ملا کہ بے اعتقاد کا مال قبول نہیں (موضح القرآن)

[2] ۔لانّهم يعدونها مغرما.(جلالين)

[3] ۔اى لا تستحسن نعمتا عليهم فهى استدراج (جلالين)

[4] ۔الزهق الخروج بصعوبة (تبيان)

[5] ۔فيعذبهم فى الأخرة اشد العذاب (جلالين)

يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ۝۵۷

''اور وہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ وہ تم ہی میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے ہیں نہیں مگر وہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں۔ اگر وہ کوئی جائے پناہ پا جائیں یا غار یا کوئی داخل ہونے کی جگہ تو وہ بگ ٹٹ اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گئے۔''

جموح کا لفظ سواری کی سرکشی کے لئے آتا ہے چنانچہ شاہ رفیع الدین نے یجمعون کے لفظ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ''پھر جائیں طرف اس کے اور وہ سرکشی کرتے ہوں۔'' اس کے برخلاف ان کے والد شاہ ولی اللہ نے اس طرح ترجمہ کیا ہے کہ ''متوجہ شوند بآن شتاب کنان۔'' یہ جلالین کے اتباع میں ہے جنہوں نے لکھا ہے:

یسرّعون فی دخوله والانصراف عنکم اسراعا لا یردّه شئ کالفرس الجموح.

اس کے اندر جانے اور تم سے منحرف ہونے میں بہت زیادہ تیزی کرتے ہیں جس سے کوئی چیز روک نہیں سکتی جیسے سرکش گھوڑا۔

ہم نے جو ترجمہ ''بگ ٹٹ'' کے لفظ کے ساتھ کیا ہے، وہ غالباً دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ ''وہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں''.....یعنی ان کے دلوں میں کفر وعناد چھپا ہے، اس کے اظہار سے وہ ڈرتے ہیں لہٰذا ظاہر داری سے کام لے کر تمہاری دوستی کی جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ [1]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝۵۸ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝۵۹

''اور ان میں سے کوئی کوئی ایسا بھی ہے جو اموال زکوٰۃ کے بارے میں آپ پر نکتہ چینی کرتا ہے تو اگر انہیں اس میں سے مل جائے تو وہ راضی رہیں گے اور انہیں اس میں نہ دیا گیا تو وہ ایک دم ناراض ہو جاتے ہیں اور کاش وہ راضی رہتے اس پر کہ جو اللہ اور اس کے پیغمبر نے انہیں دیا ہے اور کہتے کہ اللہ ہمارے لئے کافی ہے۔ وہ عنقریب ہمیں اپنے فضل وکرم سے عطا کرے گا اور اس کا پیغمبر بلاشبہ ہم اللہ ہی سے لو لگائے ہوئے ہیں۔''

یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں دو دفعہ عطا کی نسبت اللہ کے ساتھ ساتھ اس کے پیغمبر ﷺ کی طرف دی گئی ہے تو پھر معلوم نہیں کہ اگر کوئی مسلمان اللہ کو مانتے ہوئے بحیثیت وسیلہ یہ کہے کہ اس کا رسول یا اس کا ولی ہماری مدد کرے گا ہمیں مالا مال کر دے گا، ہمیں اولاد عطا کرے گا تو اس پر کچھ مسلمان کیوں ''شرک'' ''شرک'' کی آواز بلند کرتے ہیں؟!

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ

---

[1] ۔یفرقون من اظهار الکفر (تبیان)

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٠﴾

''اموال زکوٰۃ کا استحقاق تو بس فقیروں اور محتاجوں کو ہے اور انہیں کہ جو زکوٰۃ کے کارندے ہوں اور مؤلفۃ القلوب کو اور گلوخلاصی میں غلاموں کنیزوں کی اور قرض داروں کو اور راہ خدا میں اور مسافروں کو۔ یہ لازمی قانون ہے اللہ کی طرف کا اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، صحیح کام کرنے والا۔''

مستحقین زکوٰۃ کا بیان

تمام مستحقین زکوٰۃ جماعت اہل اسلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر..... درمیان میں ایک صنف مؤلفۃ القلوب کی ہے۔ یہ وہ غیر مسلم اور خام کار نومسلم [1] ہیں جنہیں مدد دینا اسلامی ہمدردی اور اخلاق کے اثر کو ان کے دل پر قائم کر کے انہیں محاسن اسلامی پر غور کرنے کی ایک طرح سے دعوت دینا ہے۔ مؤلفۃ القلوب کے علاوہ دوسرے اقسام میں یہ شرط کہ صحیح العقیدہ مسلمان ہوں، قرآن میں مذکور نہیں ہے بلکہ سنت سے ثابت ہے۔ نیز یہ کہ غیر سادات کی زکوٰۃ سادات پر حرام ہے۔ [2]

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦١﴾

''اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو پیغمبر کو ایذا پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو کان ہیں، کہیے کہ تمہارے لئے بہتری کا کان جو اللہ پر ایمان لائے ہوئے ہے اور مسلمانوں کی بات کو باور کر لیتا ہے اور (اللہ کی) مہربانی ان کے لئے جو تم میں سے ایمان رکھتے ہوں اور جو پیغمبر خدا کو ایذا پہنچاتے ہیں، ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حسن خلق یہ تھا کہ آپ ہر ایک کی بات سن لیتے تھے اور اس پر چپ رہتے تھے جیسے کہ وہ اسے باور کر رہے ہیں۔ اس پر منافقین کہنے لگے کہ یہ تو بس کان ہیں یعنی ہر ایک کی سن لینا ہی ان کا کام ہے۔ [3]

اس پر ارشاد قدرت ہوا کہ یہ تو تمہارے لئے بڑی اچھی بات ہے۔ اس پر شکوہ کیسا!

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾

''وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ تمہیں خوش کریں حالانکہ اللہ اور اس کا رسول اس کا زیادہ حقدار ہے

---

[1] ۔یعنی ضعیف اسلام (فتح الرحمن)

[2] ۔بینت السنۃ ان شرط المعطی منہا الاسلام وان لا یکون ہاشمیا و مطلبیا (جلالین)

[3] ۔یعنی ہر چہ کسی بگوید قبول می کند (فتح الرحمن)

کہ وہ اسے خوش کریں اگر وہ ایمان لائے ہوئے ہوں۔''

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾

''کیا انہیں نہیں معلوم کہ جو اللہ اور اس کے پیغمبر سے مخالفت کرے گا تو بلا شبہ اس کے لئے دوزخ کی آگ ہوگی جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔''

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کفار و مشرکین کا ذکر نہیں ہے بلکہ مسلمانوں میں سے ان افراد کا ذکر ہے جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کریں۔[1] اس سے ظاہر ہے کہ مخلد فی النار ہونا کفار و مشرکین سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ظاہری اسلام لانے والوں میں بھی جو نصّ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ مانیں وہ اس زد میں آتے ہیں۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾

''منافق لوگ ڈرتے ہیں کہ ان پر کوئی سورہ ایسا نہ اتر آئے کہ جو انہیں بتلا دے وہ جو ان کے دلوں میں ہے۔ کہیے کہ اڑاؤ مذاق، یقیناً اللہ برآمد کرے گا اسے جس سے تم ڈرتے ہو۔''

منافق ڈرتے ہیں کہ ان پر ''یعنی مسلمانوں پر[2] '' کوئی سورہ ایسا نہ اتر آئے جو انہیں بتلا دے وہ جو ان کے'' یعنی منافقین کے دلوں میں ہے۔[3] یہ ڈرنا اگر حقیقتاً ہوتا تو وہ تو اللہ اور رسالت دونوں پر ایمان کا نتیجہ ہوتا مگر یہ تو منافق ہیں لہٰذا انہیں واقعاً یہ ڈر کیوں کر ہو سکتا ہے بلکہ یہ بطور تمسخر اس ڈر کا اظہار ہے یعنی وہ آپس میں مذاق اڑانے کے طور پر کہتے ہیں کہ ارے بھئی! ایسی باتیں نہ کرو، کہیں کوئی سورہ ان پر اتر نہ آئے جو انہیں ان باتوں کی اطلاع دے دے، اس لئے قرآن نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ اڑاؤ مذاق۔ یہ تمہارا خوف جسے تم بطور تمسخر ظاہر کرتے ہو حقیقت کا لباس پہن کر رہے گا۔ ہماری قدیم تفسیر اس کے مطابق ہے۔[4]

بعض مفسرین نے اس پہلو کو نہ سمجھ کر اس جواب کو مرتبط بنانے کے لئے ایک فقرہ کو محذوف مانا ہے کہ وہ ڈرتے تو ہیں اس بات سے اور

---

[1] ۔علی وجه التهدید والتقریع والتوبیخ لهؤلآء المنافقین (تبیان)

[2] ۔علیهم ای المؤمنین (جلالین)

[3] ۔خبر دهد ایشاں را بآنچه در دل منافقان است (شاه ولی الله)

[4] ۔کان قوم من المنافقین لما خرج رسول الله ﷺ الی تبوك کانوا یتحلقون فیما بینهم ویقولون لو یرئ محمدا ان حرب الروم مثل حرب غیر هم لا یرجع منهم احدا ابدا فقال بعضهم اخاف ان یخبر الله محمدا بما کنا فیه وبما فی قلوبنا وینزل علیه بهذا قرانا یقرأ علی الناس وقالوا هذا علی حدا الاستهزاء (علی بن ابراهیم)

پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا مذاق بھی اڑاتے ہیں [1] اس پر کہا گیا کہ کہہ دیجئے کہ خوب مذاق اڑاؤ، اللہ ان باتوں کو ظاہر کر کے رہے گا۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾

''اور اگر ان سے پوچھئے تو وہ کہیں گے کہ ہم تو بحث کر رہے تھے اور تفریح کر رہے تھے، کہئے کہ کیا اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے پیغمبر کے ساتھ تم تمسخر کر رہے تھے۔''

بعض لوگ کسی غلط بات کی اہمیت کو مذاق کہہ کر گھٹانا چاہتے ہیں حالانکہ جس کی عظمت نظر میں ہو اس کے ساتھ بطور مذاق بھی انسان کوئی گستاخی نہیں کر سکتا۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۶۶﴾

''عذر خواہی نہ کرو، تم مسلمان ہونے [2] کے بعد کافر ہو چکے ہو۔ اگر تم میں سے ایک گروہ سے ہم درگزر بھی کریں تو دوسرے گروہ کو سزا دیں گے اس بنا پر کہ وہ گنہگار تھے۔''

''عذر خواہی نہ کرو'' یعنی ایسی عذر خواہی جو صدق دل سے نہیں، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

''ایک گروہ سے درگزر کریں تو دوسروں کو سزا دیں گے'' یہ تفریق بلا وجہ نہ ہوگی بلکہ وہ چند آدمی پہلے گروہ والے وہ ہوں گے جنہوں نے صدق دل سے توبہ کی [3] اور جنہیں سزا دی جائے گی، وہ ہیں جو آخر تک اپنے نفاق اور مخالفت پر قائم رہے [4] اور اسی لئے آخر میں کہا گیا:۔ ''بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ'' اس بنا پر کہ وہ گنہگار تھے۔ [5] اس سے ظاہر ہے کہ وہ جنہیں معاف کر دیا گیا، وہ ہیں جو توبہ کی وجہ سے گنہگار کی صف سے باہر نکل گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تین آدمیوں کا ذکر جو قرآن میں کیا گیا ہے (وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا). اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ پوری جماعت تین ہی آدمیوں کی تھی بلکہ یہ تین آدمی وہ ہیں جن کی توبہ قبول ہوئی اور ان کے علاوہ کتنے وہ تھے جو اپنے نفاق پر قائم و برقرار رہے۔ ان کی تعداد کہیں قرآن میں مذکور نہیں ہے۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ

---

[1] ۔وهم مع ذٰلك يستهزأون (جلالين)

[2] ۔یعنی ایمان زبانی خود (فتح الرحمن)

[3] ۔باخلاصها وتوبتها بخشی بن حمب بضم الحاء وفتح الميم وسكون الباء (جلالين)

[4] ۔معناه انهم كانوا مجرمين مصرين على النفاق (جلالين)

[5] ۔معناه انه انما يعذب الطائفة التي يعذبها لكونها مجرمة مذنبة مرتكبة لما يستحق به العقاب (تبيان)

الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾

''منافق مرد اور منافق عورتیں۔ سب ایک تھالی کے چٹے بٹے ہیں [1] برائیوں کی تحریک کرتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں، وہ اللہ کو بھول گئے تو اس نے انہیں بھلاوے میں ڈال دیا [2] بلاشبہ منافق لوگ فاسق ہیں۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے منافق مردوں، منافق عورتوں اور تمام کافروں سے آتش دوزخ کا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہ ان کے واسطے کافی ہے، اور اللہ نے ان پر لعنت کی ہے اور ان کے لئے رہنے والا عذاب ہے۔''

''اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں'' یعنی راہ خدا میں خیرات سے ہاتھ روکے رہتے ہیں۔ [3]

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٩﴾

''ان لوگوں کی طرح جو تم سے پہلے، تم سے زیادہ طاقتور اور مال و اولاد میں تم سے زیادہ تھے تو وہ اپنے نصیب سے بہرہ ور ہوئے۔ اس کے بعد تم بھی اپنے نصیب سے ویسے ہی بہرہ اندوز ہوئے جیسے وہ کہ جو تم سے پہلے تھے اپنے نصیب سے بہرہ ور ہوئے اور تم بھی ویسے ہی مہملات میں پڑے جیسے وہ پڑے تھے [4] یہ وہ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت ہوئے اور یہی لوگ گھاٹا اٹھانے والے ہیں۔''

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ

---

[1] ۔المعنی ان بعضهم یضاف الی بعض بالاجتماع علی النفاق کما یقول القائل لغیره انت منی وانا منك والمعنی ان امرنا واحد لا ینفصل (تبیان)

[2] ۔ترکهم من لطفه (جلالین)

[3] ۔ای یمسکون اموالهم عن انفاقها فی طاعة الله ومرضاته (تبیان)

[4] ۔خضتم فی الباطل والکذب علی الله (تبیان)

لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۷۰﴾

''کیا انہیں نہیں پہنچی خبر ان لوگوں کی جو ان کے پہلے تھے، نوحؑ کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیمؑ کی قوم اور مدین والے اور مؤتفکات والے۔ ان کے پاس ان کے پیغمبر معجزے۔[1] لے کر آئے تو اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے مگر وہ خود اپنے اوپر ظلم ڈھاتے تھے۔''

''مؤتفکات'' سے مراد قوم لوط کی بستیاں ہیں، چونکہ وہ تین تھیں، اس لئے یہاں انہیں بصورت جمع لایا گیا ہے اور دوسری جگہ سورۂ نجم میں ان سب کو ایک کر کے اس طرح کیا گیا ہے کہ ''وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى''۔ بہرصورت کہا گیا ہے کہ ان بستیوں کو اس لفظ سے ان کے انجام کے لحاظ سے یاد کیا گیا ہے کہ ان پر عذاب نازل کیا گیا تو انہیں الٹ دیا گیا۔[2]

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾

''اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ وہ نیک باتوں کی تحریک کرتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں، اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن پر اللہ اپنی رحمت اتارے گا، یقیناً اللہ زبردست ہے، صحیح صحیح کام کرنے والا۔ اللہ نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں سے وعدہ کیا ہے ان بہشتوں کا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاک و پاکیزہ مکانات کا ہمیشہ رہنے والے بہشتوں میں اور اللہ کی طرف کی ذرا بھی خوشنودی سب سے بڑی چیز ہے، یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔''

سابق میں جو اوصاف اور ان کے نتائج نفاق رکھنے والے مردوں اور عورتوں کے لئے بیان ہوئے تھے ان کے بالمقابل اوصاف اور نتائج اب صاحب ایمان مردوں اور عورتوں کے لئے بیان ہو رہے ہیں۔ ''مومنین اور مومنات آپس میں ایک دوسرے کے ہم آہنگ ہیں'' یعنی انہیں آپس میں ہمدم و ہم قدم ہونا چاہیے اور اتحاد و عمل سے کام لینا چاہیے۔ یہی ان کی ایمانی وحدت کا تقاضا ہے۔[3]

---

[1] ۔بالبینات بالمعجزات (جلالین)

[2] ۔قریٰ قوم لوط ای اهلها (جلالین) قال الزجاج معناه اتتفكت باهلها انقلبت (تبیان)

[3] ۔ای یلزم کل واحد منهم نصرة صاحبه (تبیان)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾

''اے پیغمبر! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں سے اور ان پر سختی کیجئے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔''

کفار کے ساتھ ساتھ منافقین سے بھی جہاد کا حکم

یہاں صاف رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار اور منافقین سے جہاد کا حکم ہوا ہے اور دونوں ایک ہی لفظ سے ہیں۔ اس لئے اس میں یہ تفریق کہ وہ پہلا جہاد تلوار والا ہے اور دوسرا زبان سے [1] بالکل ''ایجاد بندہ'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن میں ذرا بھی یہ تفریق نہیں ہے۔

مگر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی مدت حیات میں جتنے جہادوں کا موقع ملا وہ سب کفار کے مقابلہ میں تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی نے اتنی وفا نہیں کی کہ وہ دوسرے جزء کی تکمیل فرما سکیں۔ اس لئے لازماً ضرورت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے بعد خود اپنے کسی ایسے جانشین کو چھوڑ جائیں جو آپ کے باقی کام کی تکمیل کرے۔ اس لئے کہ کوئی بعد میں بطور خود جانشین بن جائے یا دوسرے لوگ بنا دیں تو وہ اپنے افعال کا خود ذمہ دار ہے۔ اس کے فعل سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داری پوری نہیں ہوتی۔ ہاں وہ جانشین اگر بحکم خدا خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقرر کیا ہوا ہے تو جو کچھ وہ کرے، اس کے ذمہ دار رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھے جا سکتے ہیں۔ اب جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے جزء کی تکمیل فرمائی اس ظرف زمانہ کے لحاظ سے، اسی طرح اگر ان کے بعد والا جانشین اپنے ظرف زمانہ کے مطابق صرف دوسرے جز کی تکمیل کرتا ہوا نظر آئے جو تتمہ فعل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے تو اس کے دور پر یہ اعتراض وارد نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے پہلے جز پر کیوں عمل نہ کیا یعنی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اپنے دور میں کافروں سے کوئی جہاد کیوں نہ کیا جب کہ تقسیم عمل کے طور پر تقدیر الٰہی نے ایک فریضہ کے دو جز دو زندگیوں میں تقسیم کر دیئے تھے تو اب دونوں کو ملا ہی کر دیکھنا درست ہوگا۔ جس طرح پہلے جز کے وقت دوسرے جز کو ڈھونڈھنا غلط ہے اسی طرح دوسرے جز کے ہنگام میں پہلے جز کو تلاش کرنا اصولاً بالکل غلط ہوگا۔

یہی تقسیم عمل ہے جسے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متفق علیہ حدیث میں حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کو مخاطب کر کے ظاہر فرمایا تھا کہ:

انك تقاتل علىٰ تأويل القرآن كما قاتلت علىٰ تنزيله.

(اے علیؑ) تم تاویل قرآن پر جنگ کرو گے جس طرح میں نے اس کی تنزیل پر جنگ کی۔

ظاہر ہے کہ تنزیل قرآن کے منکر کافر تھے اور تاویل قرآن کے منکر یعنی صحیح مفہوم کے بجائے غلط مفہوم تراشنے والے تنزیل قرآن کو بظاہر ماننے والے ہوں گے لہٰذا وہ منافقین ہوں گے اور ان سے جنگ کرنا حضرت علی علیہ السلام کی ذمہ داری ہے۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا

---

[1] ۔ الكفار بالسيف والمنافقين باللسان والحجة (جلالين)

وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٧٤﴾

''وہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے کہا کفر کا کلمہ اور اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے اور ایسے منصوبے بنائے جن میں کامیاب نہیں ہوئے اور کوئی بات ایسی نہیں جس سے وہ ناراض ہوں سوا اس کے کہ اللہ اور پیغمبر نے انہیں اپنے فضل و کرم سے مالدار بنایا۔ اب اگر وہ توبہ کر لیں تو انہی کے لئے بہتر ہے اور اگر وہ روگردانی کریں تو انہیں اللہ دنیا و آخرت میں دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا اور روئے زمین پر ان کا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا۔''

''کوئی بات ایسی نہیں جس سے وہ ناراض ہوں سوا اس کے'' یہ جملہ معافی و بیان کے لحاظ سے ایک صنعت کے قبیل سے ہے جسے ''تاکید المدح بما یشبه الذم'' کہتے ہیں یعنی تعریف میں زور پیدا کرنا ایسے انداز میں جو مشابہ مذمت کے ہو' اس کی مثال عربی میں شاعر کا یہ شعر ہے:

و لا عیب فیم غیر انّ سیوفهم
بهن فلول من قراع الکتائب

''ان میں کوئی عیب نہیں ہے سوا اس کے کہ ان کی تلواریں جا بجا گر گئی ہیں افواج سے جنگ میں۔''

عرب نقطۂ نظر سے مسلسل جنگ آزمائی و شمشیر زنی کوئی عیب نہیں، بلکہ بڑا ہنر ہے۔ یہ کہنا کہ سوا اس کے کوئی عیب نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ عیب ڈھونڈھا بھی جائے تو ہنر ہی ملے گا۔ نتیجہ یہی ہے کہ ان میں قطعاً کوئی عیب نہیں ہے۔

اسی طرح یہاں قرآن کا جملہ ہے کہ ''وہ ان کی کسی بات سے ناراض نہیں سوا اس کے کہ اللہ اور رسول ﷺ نے ان کو دولت مند بنا دیا'' .....ظاہر ہے کہ یہ ناراضگی کی بات نہیں تو نتیجہ یہ ہے کہ ان کی ناراضگی رسول ﷺ سے قطعاً حق بجانب نہیں ہے اور ہرگز کوئی وجہ ناراضگی کی ان کے لئے رسول ﷺ سے عقلی طور پر نہیں ہے۔ اس آیت پر نظر کر کے پھر یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن مالدار بنانے کی نسبت اللہ کے ساتھ رسول ﷺ کی طرف دے رہا ہے۔ [1] حالانکہ اصل فاعل خداوند عالم ہے لیکن یہی وہ چیز ہے جس کے کسی مسلمان کی زبان پر آنے سے ایک طبقہ ''شرک'' ''شرک'' کی آوازیں بلند کرنے لگتا ہے جواز روئے قرآن مجید صحیح نہیں ہے۔ ''جو منصوبہ ان منافقین نے بنایا تھا، اس میں کامیاب نہیں ہوئے''..... یہ منصوبہ رسول خدا ﷺ کو شہید کرنے کا تھا، اس موقع پر جب آپ تبوک سے واپس ہو رہے تھے۔ [2]

وَ مِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٧٦﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَاۤ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَ

---

[1] ۔تو گر ساخت ایشان را خدا و رسول او (شاہ ولی اللہ) دولت مند کیا ان کو اللہ نے اور رسول اس کے نے (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔هموا مالم ینالوا من الفتك بالنبی ﷺ لیلة العقبة عند عوده من تبوك (جلالین)

عَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾

''اوران میں ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر وہ اپنے فضل وکرم سے ہمیں عطا کرے تو ہم خیرات کریں گے اور نیک اعمال بجالانے والوں میں سے ہوں گے تو جب اللہ نے انہیں اپنے فضل وکرم سے دیا تو انہوں نے اس کے ساتھ بخل کیا اور بے اعتنائی اختیار کرتے ہوئے روگردانی سے کام لیا تو اللہ نے ان کا انجام یہ کیا کہ ان کے دلوں میں نفاق رہ گیا [۱] اس دن تک کے لئے کہ جب تک وہ اسے منہ دکھائیں گے، اس سزا میں کہ انہوں نے خلف وعدکیا اللہ سے اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔''

مفسرین اس ذیل میں ایک ہی آدمی کا نام لیتے ہیں اور اس کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ میرے لئے وسعت رزق کی دعا فرمائیں چنانچہ آپ نے دعا فرمائی اور اس کے مال ودولت میں فراوانی ہوئی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے نماز جماعت میں آنا چھوڑ دیا اور زکوٰۃ بند کردی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں زکوٰۃ لے کر آیا مگر آپ نے اس کے قبول کرنے سے انکار فرمادیا۔ پھر وہ خلیفۂ اول کے دور میں آیا۔ انہوں نے بھی اس کی زکوٰۃ نہیں لی یہاں تک کہ انہی کے دور میں وہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس شخص کا نام تلبعہ بن حاطب تھا۔ حالانکہ الفاظ قرآن مجید میں جمع کے صیغے صرف ہوئے ہیں۔ اس نظیر کو سامنے رکھئے تو آیۂ ولایت میں یہ سوال پیدا نہیں ہوگا کہ الفاظ قرآن مجید میں جمع کے ہیں: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔ پھر کیوں کہا جاتا ہے کہ یہ آیت خاص حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾

''کیا انہیں نہیں معلوم کہ اللہ جانتا ہے ان کی خفیہ باتیں اور ان کی سرگوشیاں اور یہ کہ اللہ غیب کی باتوں کا بہت بڑا جاننے والا ہے۔''

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۙ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾

''وہ لوگ جو نکتہ چینی کرتے ہیں خیرات کے بارے میں ایسے مومنین پر جو اپنی خوشی سے خیرات کرتے ہیں [۲] اور جو اپنی محنت مزدوری کے سوا اور کچھ رکھتے ہی نہیں [۳] تو ان کا وہ مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ خود ان کا مذاق اڑائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔''

ایک غریب اگر اپنی حسب حیثیت تھوڑا سا راہ خدا میں دیتا ہے تو بہت ممکن ہے کہ وقعت اس کی پیش خدا اس بڑی رقم سے زیادہ ہو جو کوئی

---

[۱] ۔صیر عاقبتهم نفاقا ثابتا فی قلوبهم (جلالین)

[۲] ۔معناه المتفلین من طاعة الله بما لیس بواجب. (تبیان)

[۳] ۔یعنی بمزدوری چیزی پیدا می کنند و صدقه می دهند. (فتح الرحمن)

امیر دیتا ہے مگر دنیا والے رقم کی کمی پر نظر کرتے ہوئے اس غریب کی پیش کش کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور بسا اوقات اس پر طعن و تشنیع کرتے اور تمسخر کرتے ہیں جس پر قرآن نے اتنے سخت الفاظ میں تنبیہ کی ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾

''آپ ان کے لئے دعائے مغفرت کیجئے یا ان کے لئے دعائے مغفرت نہ کیجئے۔ اگر آپ ستّر مرتبہ بھی [1] ان کے لئے دعائے مغفرت کیجئے تو اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ کفر اختیار کیا ہے اور اللہ ایسے فاسق لوگوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا۔''

کفر کی بنیاد پر یہ بتانا کہ'' آپ استغفار کیجئے ان کے لئے یا نہ کیجئے، یکساں ہے'' اس کا ثبوت ہے کہ دوسرے گنہگاروں کے لئے پیغمبر ﷺ کا استغفار سود مند ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''یہاں سے فرق نکلتا ہے بے اعتقاد کا اور گنہگار کا۔ گناہ ایسا کون سا ہے کہ پیغمبر کی بخشائی سے نہ بخشا جائے اور بے اعتقاد کو پیغمبر ﷺ کی ستّر مرتبہ استغفار فائدہ نہ کرے۔ اب جو بے اعتقاد لوگ بھروسہ کریں پیغمبر کی سفارش پر کس دلیل سے مثلاً آدمی سے بدی ہو یا نماز و روزہ نہ ہو اور وہ شرمندہ ہے اور نادم ہے تو وہ گنہگار رہے اور جو کوئی بدکام کو عیب نہ جانے اور فرض خدا کو کرنا، نہ کرنا برابری سمجھے اور کرنے والوں کو طعن کرے، وہ بے اعتقاد ہے'' (موضح القرآن)

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِى الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾

''جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے، وہ پیغمبر خدا کے پیچھے گھروں میں بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہوں نے ناپسند کیا اسے کہ وہ اپنے مال اور جان کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کہا کہ گرمی میں سفر نہ کرو، کہہ دیجئے کہ دوزخ کی آگ زیادہ گرم ہے، کاش وہ سمجھ سے کام لیں۔''

''خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ'' کے معنی جو ہم نے کئے'' پیغمبر خدا ﷺ کے پیچھے'' یہ ترجمہ ایک تفسیر کے مطابق ہے [2] لیکن دوسری تفسیر کی بنا پر اس کا ترجمہ یوں ہوگا کہ'' جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے، وہ پیغمبر خدا کی مخالفت میں بیٹھے رہنے پر خوش ہیں''۔ [3]

---

[1] ۔ المراد به المبالغة لا العدد الخصوص (تبیان)

[2] ۔ ای بعد رسول الله (جلالین) پیچھے رسول اللہ کے (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔ قال ابو عبیدة بعد رسول الله ... وقال غیره معناه المصدر من قولك خالف خلافا (تبیان)

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾

''تو انہیں ہنسنا کم چاہیے اور انہیں رونا زیادہ چاہیے، سزا میں اس کی جو وہ کرتے رہے ہیں۔''

یعنی دنیا میں ان کی خوشی بے بنیاد ہے۔ اگر یہ انجام سے واقف ہوں کہ آخرت میں ان کے لئے کیا ہونے والا ہے تو ان کی ہنسی سب ختم ہو جائے گی۔ بعض وقت صحیح باتوں کیلئے دلیل غلط پیش کی جاتی ہے۔ اس کا بہت بڑا نمونہ یہ ہے کہ جو بہت چلا ہوا ہے کہ عزائے امام حسینؑ میں گریہ کے ثبوت میں اس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے حالانکہ یہ آیت منافقین و کفار کے بارے میں ہے اور جو کہا جا رہا ہے وہ بداعمالی کی سزا کے طور پر ہے۔ اس کا اہل ایمان سے نعوذ باللہ ربط ہی کیا ہو سکتا ہے؟ ایک مفہوم آیت کا یہ کہا گیا ہے کہ ان کی ہنسی کا زمانہ بہت کم ہے یعنی اس دنیا کی مختصر عمر اور انہیں رونا بہت پڑے گا سزائے اخروی سے جس کی مدت بے حد طولانی ہے۔ [1]

اس کے بعد اور بھی اس کا تعلق محل استدلال سے ختم ہو جاتا ہے۔

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

''اب اگر اللہ آپ کو واپس لائے ان میں کی ایک جماعت کی طرف اور آپ سے اجازت نکلنے کی مانگیں تو کہہ دیجئے کہ تم اب میرے ساتھ کبھی نہیں نکل سکتے اور میرے ساتھ کسی دشمن کے مقابلہ میں کبھی تم جنگ نہیں کر سکتے۔ تم تو پہلی ہی مرتبہ گھر بیٹھنے پر راضی ہوئے تو اب بیٹھو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ۔''

جنگ تبوک میں تو موسم بھی بڑا سخت تھا اور مقابلہ بھی بظاہر زبردست دشمن یعنی سلطنت روم تھا مگر اب کسی اور دفعہ جب سازگار حالات میں کوئی مہم درپیش ہوگی تو یہی لوگ جو اس وقت حیلے بہانے کر کے ساتھ جانے سے باز رہے، مال غنیمت کی توقع میں [2] آ آ کر اپنی خدمات کو پیش کریں گے تو قرآن کہتا ہے کہ اس کے بعد اب صاف انکار کر دیجئے گا کہ اس دفعہ جب تم نے جہاد سے کنارہ کشی کی تو اب کبھی تمہیں اس سعادت سے بہرہ یاب نہیں کیا جائے گا۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾

''اور کوئی ان میں سے مر جائے تو اس کی نماز جنازہ کبھی نہ پڑھیے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہو جایئے، بلا شبہ ان لوگوں نے کفر کیا اللہ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ اور مر گئے اس عالم میں کہ وہ بداعمال تھے۔''

---

[1] ۔فاضحکوا بقلیل تمتعکم فی الدنیا فانکم ستبکون کثیرا یوم القیامۃ (تبیان)

[2] ۔برای احراز غنائم (شاہ ولی اللہ)

کھلے ہوئے منافقین کی نمازِ جنازہ سے ممانعت

اہل سنت کی روایت یہ ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابی بن کعب کی نماز جنازہ پڑھائی تھی جس پر بعض صحابہ نے اختلاف کیا تھا مگر حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ مانا۔ اس پر یہ آیت اتری [1] حالانکہ جہاں ایسا ہوا ہے کہ مصلحت الٰہی اس کی متقاضی ہوئی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی عمل پر ٹوکا جائے وہاں یہ کہا گیا ہے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا جیسے:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ. اللہ آپ کو معاف کرے، آپ نے کیوں چھٹی دی انہیں؟

مگر یہاں کوئی اس کا اشارہ نہیں بلکہ یہ مستقل طور پر ہدایت ہے کہ ان منافقین کی آپ نماز جنازہ کبھی نہ پڑھیے گا۔ یہ بھی واضح ہونا چاہیے کہ یہ حکم کچھ خاص منافقین کے لئے تھا جن کی عدول حکمی اس درجہ پر پہنچ گئی کہ ان پر احکامِ کفر جاری ہو گئے، ورنہ بہت سے منافقین کے لئے تو قرآن کی تصریح ہے کہ:

لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ. آپ انہیں نہیں جانتے، ہم انہیں جانتے ہیں۔ (توبہ۔۱۰۱)

ظاہر ہے کہ جب اسباب ظاہری سے نفاق ان کا معلوم ہی نہیں ہوا تھا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے مکلف کیوں کر ہو سکتے ہیں کہ وہ ان کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اس لئے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ نفاق کا دائرہ محدود تھا اور وہ بس یہی لوگ تھے جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

ایک ضمنی استدلال اس آیت سے اور ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان منافقین کے لئے کہا جا رہا ہے کہ ان کی قبر پر کبھی کھڑے نہ ہو جایئے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومنین کے واسطے جس طرح نماز جنازہ احکامِ اسلام میں داخل ہے، اسی طرح ان کے قبور پر وقتاً فوقتاً جانا بھی راجح و مستحسن ہے۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

''اور تم کو ان کے مال اور اولاد خوش آئند معلوم نہ ہوں۔ اللہ کا مطلب بس یہ ہے کہ ان کو دنیا میں انہی کے ذریعہ سے سزا دے اور ان کی جانیں نکلیں اس حال میں کہ وہ کافر ہیں۔''

اس مضمون کی آیت پہلے آ چکی ہے۔

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾

---

[1] ۔ لمّا صلی النبی ﷺ علی أُبی نزل (جلالین)

''اور جب بھی کوئی سورہ[1] اترتا ہے کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے پیغمبر کی معیّت میں جہاد کرو تو ان میں کے قوت وطاقت رکھنے والے افراد آپ سے چھٹی مانگنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں گھر بیٹھنے والوں کے ساتھ چھوڑ دیجئے۔ ان کو پسند ہوئی یہ چیز کہ یہ گھر میں بیٹھنے والی عورتوں کے ساتھ رہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگ گئی تو وہ سمجھیں گے نہیں۔''

ان کے کردار کے وہی پہلو ہیں جو پہلے پیش کئے جا چکے ہیں مگر انہی کو اس طرح دہرایا جا رہا ہے جیسے کوئی حاکم یا بزرگ بڑے زور زور سے کسی پر خفا ہوتا اور ڈانٹتا ہے تم ہمیشہ یہی کرتے ہو تمہاری عادت یہی ہے جب بھی میں تمہیں حکم دیتا ہوں تم ہمیشہ ایسے ہی حیلے حوالے کرتے ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان سب جملوں میں بڑے سخت تیور اور کرخت آواز بنایئے تب پورا مطلب واضح ہوگا۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾

''مگر پیغمبر اور وہ مومنین جو ان کی معیت میں ہیں، انہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا اور یہ وہ ہیں جن کے لئے بھلائیاں ہیں اور یہی وہ ہیں جو ہر طرح کی بھلائی حاصل کرنے والے ہیں۔ اللہ نے تیار رکھا ہے ان کے لئے ان بہشتوں کو جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

منافقین بھی باعتبار زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ معیت رکھتے تھے، نیز پاس رہتے بھی تھے، اٹھتے بیٹھتے بھی تھے مگر خالق نے یہاں ان کے مقابلہ میں خالص مومنین کے لئے ''مَعَهٗ'' کا لفظ استعمال کیا ہے کہ وہ مومنین جو ان کی معیت میں ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ معیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عالم مشاہدہ میں ساتھ رہنے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ خالص ایمان اور اطاعت سے تعلق رکھتی ہے۔

اس کے بعد اس آیت کے مفہوم میں کوئی گنجلک نہیں رہتی جہاں کہا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

جس کی تفسیر کی منزل ہماری کتاب میں ابھی بہت دور ہے مگر یہاں کی آیت اس کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

''اور صحرائی عربوں میں سے معذور اشخاص آئے کہ انہیں چھٹی دے دی جائے اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر سے جھوٹ بولے ہیں، وہ بیٹھ رہے، عنقریب پہنچے گا انہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا ان میں سے دردناک عذاب''

---

[1] ۔سورۃ ای طائفۃ من القرآن (جلالین)

"الْمُعَذِّرُوْنَ" کا ترجمہ "معذور" ایک تفسیر کے مطابق ہے۔[1] لیکن دوسری تفسیر یہ ہے کہ تعذیر کے معنی تقصیر کے ہیں یعنی قصوروار اشخاص[2] جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جھوٹ بولے، وہ "بیٹھے رہے" یعنی عذر خواہی کے لئے بھی نہیں آئے۔[3]

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۖ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾

"نہیں ہے کمزوروں پر اور بیماروں پر اور نہ ان پر جن کے پاس خرچہ نہ ہو کوئی سختی[4] جب کہ وہ اللہ اور رسول کے وفادار ہیں۔ نیک اعمال لوگوں پر کوئی الزام نہیں ہے[5] اور اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان اور نہ ان پر کہ جب وہ آپ کے پاس آئیں اس غرض سے کہ آپ ان کے لئے سواری کا انتظام کر دیں، اس پر آپ ان سے کہیں کہ میرے پاس نہیں ہے کوئی چیز جو میں سواری کے لئے تمہیں دوں تو وہ واپس ہوں اس حال میں کہ آنکھیں ان کی آنسو بہا رہی ہیں اس رنج میں کہ ان کے پاس (راہ خدا میں) خرچ کے لئے پیسہ نہیں ہے۔"

کمزوروں کو جو بیماروں سے پہلے ذکر کیا گیا ہے تو اسے مراد وہ ہیں جو پیدائشی طور پر یا بڑھاپے سے ناتواں ہیں[6] اور بیماری ایک عارضی مجبوری ہے جو قوی ہیکل آدمی کو بھی وقتی طور پر معذور بنا سکتی ہے۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

"الزام[7] تو بس ان پر ہے جو آپ سے چھٹی مانگتے ہیں باوجود یکہ وہ دولت مند ہیں، وہ راضی ہوئے اس پر کہ گھر بیٹھنے والیوں کے ساتھ رہیں اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تو وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔"

---

[1] ۔ای المعتذرون بمعنی المعذورین (جلالین) اهل عذر از صحرا نشینان (شاہ ولی اللہ)
[2] ۔المعذر المقصر (تبیان)
[3] ۔من المجیئ للاعتذار (جلالین)
[4] ۔اثم فی التخلف عنه (جلالین)
[5] ۔هیچ راه عتاب (شاہ ولی اللہ)
[6] ۔هو الذی قوته ناقصة (تبیان)
[7] ۔الطریق بالعقاب والحرج (تبیان)

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾

''وہ عذر خواہی کریں گے تم سے جب تم لوگ ان کی طرف واپس آؤ گے، کہیے کہ تم عذر خواہی نہ کرو، ہم کبھی تمہارا یقین نہیں مانیں گے، ہمیں اللہ نے تمہارے حالات کی اطلاع دے دی ہے [1] اور اللہ اور اس کا پیغمبر تمہارے اعمال کو دیکھے گا [2] پھر تم پلٹا کر لے جائے جاؤ گے۔ اس کی طرف جو حاضر وغائب کا جاننے والا ہے، وہ تمہیں بتلائے گا کہ تم کیا کرتے تھے''

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۪ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

''وہ اللہ کی قسمیں تم سے کھائیں گے جب تم ان کی طرف پلٹو گے تاکہ تم ان سے بے اعتنائی اختیار کرو تو اچھا تم بے اعتنائی ان سے اختیار کرلو، وہ سراپا خباثت ہیں اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے سزا میں ان کی جو وہ کرتے تھے وہ تم سے قسمیں کھاتے ہیں کہ تم لوگ ان سے خوش ہو جاؤ تو تم ان سے خوش ہو بھی جاؤ تو بلا شبہ اللہ بداعمال لوگوں سے خوش ہونے والا نہیں ہے''۔

دونوں آیات کو ملا کر مطلب نکالا جائے تو یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے بار بار قسمیں کھانیں کے دو مقصد ہیں ایک تو یہ کہ تم لوگ ان سے آئندہ کوئی شکایت نہ کرو اور بے اعتنائی اختیار کرلو، اور دوسرے یہ کہ تم ان سے خوش بھی ہو جاؤ تو جہاں تک پہلی بات ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، تم ان سے بے شک کوئی تعرض نہ کرو، اس لئے کہ خالق کی مصلحت ہی یہی ہے کہ جو لوگ اسلام کے دامن میں پناہ لیں، ان کے ظاہری اسلام کو قبول کیا جائے اور انہیں اس دنیا میں ان کی منافقت کی سزا نہ دی جائے اور شکوہ شکایت سے کوئی فائدہ نہیں مگر دوسری بات یعنی تم ان سے خوش بھی ہو جاؤ، یہ بالکل غلط تصور ہے۔ [3]

ایک تو مسلمانوں پر جب ان کی منافقت کا حال کھل گیا تو یہ ان سے دل سے خوش نہیں ہو سکتے۔ پھر اگر یہ خوش ہو بھی جائیں تو اس سے کیا

---

[1] ۔ای اخبرنا باحوالکم (جلالین)

[2] ۔یعنی در دنیا (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔یعنی جس شخص کا حال معلوم ہو کہ منافق ہے، اس کی طرف سے تغافل روا ہے لیکن دوستی اور محبت اور یگانگی روا نہیں (موضح القرآن)

ہوتا ہے، خالق جو عالم الضمائر والاسرار ہے وہ تو ان سے کبھی خوش ہونے والا نہیں اور ظاہر ہے کہ نجات کا انحصار اس کی خوشی پر ہے۔ دنیا والے خوش ہو بھی جائیں تو کیا ہے۔ [1]

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾

''صحرائی عرب کفر اور نفاق میں بہت سخت ہوتے ہیں اور زیادہ امکان ہوتا ہے اس کا کہ وہ نہ واقف ہوں اور ان احکام کے حدود و قواعد سے جو اللہ نے اپنے پیغمبر پر اتارے ہیں اور اللہ بڑا جاننے والا ہے صحیح صحیح کام کرنے والا''۔

صحرائی عربوں کی مذمّت

جہاں تک سمجھ میں آتا ہے یہ اس وقت کے زیادہ تر صحرائی عربوں کی عام کیفیت اور مرکز علم سے دوری کی وجہ سے طبعی اقتضاء کا اظہار ہے نہ کہ کسی اصول کا اعلان ہے اس میں نہ عمومیت ہے اور نہ دوام و استمرار ہوسکتا ہے کہ اس وقت بھی ان میں نا قابل لحاظ اقلیت میں کچھ ایسے اشخاص ہوں جو خاص و مخلص مومن اور احکام شرعیہ سے واقف ہوں اور ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد ان میں ایسے افراد پیدا ہو جائیں جو ایمان علم شریعت کے حامل ہوں۔ خود اس آیت کے بعد ہی قرآن اعراب میں دو قسم کے لوگوں کا پتہ دے رہا ہے جو ابھی آپ کے سامنے آئے گا۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾

''اور صحرائی عربوں میں سے کچھ ایسے ہیں کہ خیر و خیرات میں جو صرف کرتے ہیں اسے ایک بڑا گھاٹا سمجھتے ہیں اور تم لوگوں کے لئے زمانہ کی گردشوں کا راستا دیکھتے ہیں انہی کو بُرے دن دیکھنا پڑیں [2] اور اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا، اور ان صحرائی عربوں میں کچھ ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ اور روز آخرت پر اور جو خیرات کرتے ہیں اسے بارگاہ الٰہی میں تقرب اور پیغمبر کی دعائے خیر کا ذریعہ سمجھتے ہیں، بلاشبہ وہ ان کے لئے تقرب کا سبب ہوگا، عنقریب اللہ انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا، بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

---

[1] ۔ لا ينفعهم رضا كم مع سخط الله عليهم (تبيان)

[2] ۔ يدور العذاب الهلاك عليهم لا عليكم (جلالين)

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

''اور شروع شروع ہی میں پہلے اسلام لانے والے مہاجر اور انصار اور جو حسن عمل کے ساتھ ان کی پیروی کریں، اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں اور اس نے مہیا رکھے ہیں ان کے لئے بہشت جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے بہت بڑی کامیابی''۔

اسلام میں سبقت رکھنے والوں کی تعریف

سبقت اسلام کے بہت سے درجے ہیں، سب سے سابق تو کوئی ایک فرد ہی ہوگا، اور وہ تاریخ اسلام میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی ذات گرامی ہے اس کے بعد اضافی حیثیت سے دیکھا جائے تو مثلاً پہلے ہفتہ میں دعوت اسلام کے ایمان لانے والے تمام مسلمانوں میں سب سے زیادہ سابق الاسلام ہیں پھر مثلاً پہلے مہینہ میں ایمان قبول کرنے والے پھر پہلے سال میں۔ اسی طرح ہجرت کے پہلے اسلام لانے والے بہ نسبت ان کے جو بعد میں اسلام لائے ہیں یہاں چونکہ کہ السّابقون الا وّلون میں مہاجرین کے ساتھ انصار کا بھی نام ہے اور ظاہر ہے کہ انصار آغاز دعوت اسلامی میں وجود نہ رکھتے تھے اس لئے یہ سبقت کچھ زیادہ وسیع معنی میں ہے اور یہ سبقت اس حد تک ہوسکتی ہے کہ ہجرت کے قبل اسلام لانے والے السّابقون الا وّلون مانے جائیں اس لئے کہ انصار یعنی باشندگان مدینہ بہت سے وہ تھے جو غائبانہ طور پر یا بیعت عقبہ کے موقع پر رسولؐ کی خدمت میں جا کر مسلمان ہوگئے تھے یعنی علماء اس سبقت کو ہجرت کے بعد بھی جنگ بدر کے اعتبار سے لیتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''جنگ بدر تک جو مسلمان ہوئے ہیں وہ آگے بڑھ جانے والے ہیں اور باقی ان کے تابع ہیں''۔ (موضح القرآن)

بعض اس کو بیت الرضوان سے وابستہ قرار دیتے ہیں جو حدیبیہ میں ہوئی۔ [۱]

اور بعض اس کے دائرہ کو تمام صحابہ پر حاوی قرار دے لیتے ہیں۔ [۲]

بہرصورت اللہ کی یہ خوشنودی ان کی اس صفت سے متعلق ہے جو سبقت الی الاسلام ہے اور اس کا صلہ بجائے خود وہ ہے جو آخر میں بتایا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب ان کی مستقبل کی زندگی کے متعلق بھی کوئی ضمانت ہوگئی ہے کہ وہ اسی معیار پر قائم رہے گی اور یہ ظاہر ہے کہ آخرت کا انجام جو بھی ہو، وہ مجموعی زندگی اور بالخصوص آخری حالت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے نہ کہ ابتدائی یا عبوری دور کے کسی عمل سے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛؔ مَرَدُوْا عَلَى

---

[۱] ۔قال الشعبی نزلت فی من بایع بیعة الرضوان (تبیان)

[۲] ۔او جمیع الصحابة (جلالین)

النِّفَاقِ ؕ لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۚ﴿۱۰۱﴾

''اور تمہارے اردگرد جو صحرائی عرب ہیں ان میں سے کچھ منافق ہیں اور اس شہر (مدینہ) کے باشندوں میں سے بھی، وہ نفاق پر سرکشی کے ساتھ قائم ہیں [1] آپ انہیں نہیں جانتے، ہم انہیں دو دفعہ سزا دیں گے، پھر وہ بڑے عذاب کی طرف پلٹائے جائیں گے''۔

''دو دفعہ سزا دیں گے'' اس کے معنی دو قسم کے سزا کے بھی ہو سکتے ہیں [2] اور یہ بھی کہ بار بار انہیں سزا ملے گی [3] اور دو کا عدد صرف تکرار کے اظہار کے لئے ہے۔ بہر حال یہ سزا جسے دو دفعہ یا بار بار کہا گیا ہے، قیامت کے پہلے کی ہے [4] کیونکہ قیامت کی سزا کا عذاب عظیم کہہ کے، بعد میں ذکر کیا گیا ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

''اور دوسرے کچھ ہیں جنہیں اقرار ہے اپنے گناہوں کا، انہوں نے نیک اور بد اعمال ملے جلے کئے ہیں بہت ممکن ہے کہ اللہ ان پر رحمت کی نظر ڈالے، یقیناً اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان، ان کے اموال کی زکوٰۃ آپ لے لیجئے جس کے ذریعہ سے آپ انہیں پاک کر دیں اور انہیں برکت دیں اور ان کے لئے دعا خیر کیجئے۔ یقیناً آپ کی دعائے خیر ان کے لئے باعث سکون ہوگی اور اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

سابق میں منافقون میں سے بعض کا تذکرہ آچکا ہے کہ وہ زکوٰۃ، اب دیں بھی تو ان سے نہ لی جائے۔ یہ اسی کے بالمقابل حکم ہے کہ جنہوں نے صدق دل سے توبہ کی ہے وہ زکوٰۃ لائیں تو ان سے قبول کیجئے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

''کیا انہیں نہیں معلوم کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور زکوٰۃ لیتا ہے اور یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے

---

[1] ۔ الحوافیہ واستمروا (جلالین)

[2] ۔ یعنی درمیان مسلمانان ذلیل شوند و در اموال و اولاد آفات بینند (فتح الرحمٰن)

[3] ۔ تکلیف پر تکلیف (موضح القرآن)

[4] ۔ فعلم ان الموتین معا قبل ان یردوا الیٰ عذاب یوم القیامۃ (تبیان)

والا ہے، بڑا مہربان''۔

انداز بتاتا ہے کہ یہ اس غلط فہمی کا دفعیہ ہے کہ توبہ قبول کرنا، نہ کرنا اور زکوٰۃ کو لینا، نہ لینا ذاتاً خود رسولؐ کا کام ہے اس طرح لوگ سمجھتے تھے کہ یہ تفریق آپ کی طرف سے بلاوجہ ہے کہ آپ ایک سے زکوٰۃ اب وہ لاتا بھی ہے تو نہیں لیتے اور باقی دوسرے لوگوں سے لیتے ہیں خداوند عالم نے اس تصور کو غلط قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ رسولؐ کا خود فعل نہیں ہے بلکہ یہ خدا کا عمل ہے جو رسولؐ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اس لئے یہ تفریق اسی کی جانب سے ہے جسے لوگ رسولؐ کی طرف سے سمجھتے ہیں۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

''اور کہیے کہ تم عمل کرتے رہو، اللہ دیکھے گا تمہارے عمل کو اور اس کا پیغمبر اور ایمان والے اور بہت جلد تم پلٹائے جاؤ گے غائب وحاضر ہر بات کے جاننے والے کی طرف تو وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا اعمال کرتے تھے''۔

اس آیت کا مضمون پہلے آچکا ہے مگر وہاں صرف اللہ اور پیغمبرؐ کا ذکر تھا اور یہاں ان کے ساتھ اہل ایمان کا بھی تذکرہ ہے اب چونکہ مخاطب بھی کھلے ہوئے کافر تو نہیں ہیں بلکہ آمنّا کہنے والے بہ اقرار خود مومنین ہی ہیں اس لئے ان اہل ایمان سے مراد جنہیں کہا گیا ہے کہ اللہ اور رسولؐ کے ساتھ ساتھ یہ تمہارے اعمال دیکھ رہے ہیں وہ خالص ومخلص افراد ہی ہو سکتے ہیں جن کے یہاں نفاق وعصیان کا شائبہ تک نہیں اور اس کے مصداق اکمل صرف معصومینؑ ہی ہو سکتے ہیں جو ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں وارد ہے۔[1]

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

''اور وہ دوسرے ایسے ہیں جن کا معاملہ اللہ کے حکم پر موقوف ہے یا انہیں سزا دے گا اور یا ان کی توبہ قبول کرلے گا اور اللہ بڑا جاننے والا ہے صحیح کام کرنے والا''۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

---

[1] ۔ المومنون ھھنا الائمۃ الطاھرون صلوٰۃ اللہ علیھم (علی بن ابراھیم)

''اور وہ بھی ہیں [1] جنہوں نے مسجد بنائی ضرر رسانی، کفر، مومنین میں تفرقہ پیدا کرنے اور ان لوگوں کو موقع دینے کے لئے جنہوں نے اس کے پہلے اللہ اور اس کے پیغمبر سے جنگ کی ہے اور ضرور وہ قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے سوائے بھلائی کے اور اللہ اس کا گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں آپ اس میں کبھی کھڑے نہ ہوجیے، بے شک وہ مسجد جس کی شروع دن سے ہی بنیاد پرہیز گاری پر رکھی گئی ہے اس کی زیادہ مستحق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے اشخاص ہیں جن کی خواہش ہے کہ وہ پاک رہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

مسجد ضرار کا ذکر

قرآن مجید جس حد تک بیان کرتا ہے اس میں واقعات بطور اجمال ہی معلوم ہوتے ہیں، یہ تشنگی باقی رہتی ہے کہ اس کا پورا واقعہ کیا ہے اور بیاس بغیر احادیث و روایات کے مطالعہ کے بجھ ہی نہیں سکتی چنانچہ روایات سے متفرق طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ انصار کے قبیلہ بنی عوف کے کچھ لوگ تھے۔

اس مسجد کی تعمیر میں جو اغراض مضمر تھے ان میں قرآن مجید نے تفریق بین المومنین کو بھی درج کیا ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی کار خیر بھی اگر پارٹی بندی کی بنا پر ہوا ہے [2] تو وہ خالق کے غضب کا مستوجب ہوجاتا ہے۔

اس کے بالمقابل جس مسجد کی تعریف کی گئی ہے وہ مسجد قبا ہے یا مسجد مدینہ جسے ''مسجد نبوی'' کہا جاتا ہے۔

اس میں ایسے لوگ ہیں جن کی خواہش ہے کہ وہ پاک رہیں اس پاکی سے مراد پرہیز گاری ہوسکتی ہے مگر ہمارے آئمہ معصومینؑ کی تفسیر جو ظاہر لفظ کے بالکل مطابق ہے یہی ہے کہ اس سے طہارت پسندی مراد ہے [3] جو بحمد اللہ موالیان اہل بیت علیہم السلام کی خاص طور پر امتیازی علامت ہے۔

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَم مَّنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠٩﴾

''کیا وہ جو اپنی عمارت کی بنیاد رکھے خوف الٰہی اور اس کی خوشنودی پر وہ بہتر ہے یا جو اپنی بنیاد رکھے ایک گڑھے کے کنارے جو دھنس جانے والا ہو تو وہ اس کے ساتھ دھنس جائے آتش جہنم میں اور اللہ ظالم لوگوں کو منزل مقصود تک نہیں پہنچایا کرتا''۔

---

[1] ۔ تقدیرہ: ومنهم الذين (تبیان)

[2] ۔ انما یکون تفریقا بین المومنین بان یتخرّبوا فخرب یصلی فیه وخرب یصلی فی غیرہ (تبیان)

[3] ۔ قیل یطهّرون بالماء من الغایط والبول وهو المروی عن ابی جعفر وابی عبداللہ علیہما السلام (تبیان)

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

''یہ ان کی عمارت جوانہوں نے تعمیر کی ہے ہمیشہ ان کے دل میں خلجان پیدا کئے رہے گی الا یہ کہ ان کے دل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں اور اللہ بڑا جاننے والا ہے صحیح کام کرنے والا''۔

''خلجان'' یعنی حقانیت اسلام میں ان کے شکوک وشبہات بڑھتے ہی رہیں گے [1] کیونکہ وہاں جو بھی جمع ہوں گے وہ سب منافق قسم کے لوگ ہوں گے لہٰذا آپس کی باتوں میں عمر بھر اصلاح کے بجائے اور ذہنیت میں خرابی پیدا ہوتی رہے گی اور یہی ''عمر بھر'' کا مفہوم ان الفاظ سے ادا کیا گیا ہے کہ ''الا یہ کہ ان کے دل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں''[2]

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

''بلاشبہ اللہ نے خرید لیے ہیں ایمان لانے والوں سے ان کے جان اور مال اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں تو مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔ یہ وعدہ ہے اس کے ذمہ سچا توریت اور انجیل اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدہ کا پورا کرنے والا کون ہے تو مبارک ہو تمہیں تمہارا یہ بیچنا جس کی معاملت تم نے اس سے کی ہے یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے''۔

یہ مومنین کو کوئی حکم نہیں ہے کہ تمہیں بیچنا چاہیے اور اس کے بعد اللہ تم سے خرید لے گا کہ یہ اس صورت میں ان کے ارادہ واختیار سے وابستہ ہوتا کہ فروخت کریں یا نہ کریں۔ بلکہ یہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ خود ایمان اختیار کرنا یہ اپنے جان و مال کو اللہ کے ہاتھ فروخت کرنے کا معاہدہ ہے اور اس ایمان کے ساتھ ہی اللہ اس جان و مال کا خود ہمارے معاہدہ کی بناء پر مالک ہوجاتا ہے جس کے بعد کسی سچے مسلمان کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ نہ انفرادی طور پر، نہ اجتماعی طور پر، اس طرح نہ شوریٰ کی کوئی وقعت رہتی ہے نہ اجماع کی۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ

---

[1] ۔ ھمیشہ باشد سبب شك ۔۔۔۔ در دل ایشان (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ الیٰ ان تقطع قلوبھم بالموت والبلیٰ (تبیان)

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

''توبہ کرنے والے، عبادت گزار، حمد الٰہی بجالانے والے، روزوں میں عمر بسر کرنے والے رکوع کرنے والے، سجدے کرنے والے، اچھائیوں کی ہدایت کرنے والے اور برائیوں سے روکنے والے، حدود خداوندی کی حفاظت کرنے والے، اور خوش خبری دو ایسے ایمان لانے والوں کو''۔

السّائحون کا جو ہم نے ترجمہ کیا ہے ''روزوں میں عمر بسر کرنے والے'' یہ بڑے معتبر مفسرین کے قول کے مطابق ہے جس کی تائید میں حدیث رسولؐ بھی موجود ہے اور نہ لغت کی مدد سے اس کا ترجمہ کیا جائے تو معنی ہوں گے ''رواں دواں پھرنے والے''[۱] اس کے ساتھ قید لگانے کی ضرورت ہے کہ ''خدمت دین میں'' یا ''راہ خدا میں''[۲] کیونکہ ظاہر ہے کہ بجائے خود رواں دواں پھرنا کوئی صفت مدح نہیں ہے۔

اس کے قبل کی آیت جس میں جہاد میں مرنے مارنے کی دعوت تھی اور یہ آیت مقام تنزیل میں ایک ساتھ ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ قرآنی معیار پر جہاد راہ خدا وہ ہے جس کے ذمہ دار افراد ان اوصاف سے متصف ہوں جن کا کامل مرقع سوا معصومینؑ کے کوئی نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ایک حدیث میں معصومؑ نے اسی آیت سے اس پر استشہاد فرمایا ہے کہ عام مسلمان جسے جہاد سمجھ رہے ہیں وہ سیاسی لڑائیاں ہیں۔ قرآنی معیار کے مطابق جہاد نہیں ہیں[۳]

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾

''پیغمبر کو اور انہیں جو ایمان لائے ہیں، یہ حق نہیں کہ وہ دعائے مغفرت کریں مشرکین کے لئے، چاہے وہ عزیز ہوں بعد اس کے کہ ان پر ثابت ہو گیا وہ دوزخ والے ہیں''۔

مشرکین کے لئے استغفار کی ممانعت

قرآن مجید میں اکثر دوسروں کے انتباء کے لئے اپنے رسولؐ کو مخاطب کر کے ایک بات کہی گئی ہے اور یہاں تو صراحۃً پیغمبرؐ کے ساتھ ایمان لانے والوں کا ذکر ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس آیت کا تعلق کچھ اس وقت کے مسلمانوں ہی کے ساتھ ان کو متنبہ کرنے کے لئے ہے جس میں صرف اصول کی وحدت نمایاں کرنے کے لئے پیغمبرؐ کا نام لے لیا گیا ہے جیسے:

---

[۱] ۔روی عن النبی ﷺ انه قال سیاحة امتی الصوم وهو قول ابن مسعود وابن عباس و سعید بن جبیر والحسن و مجاهد (تبیان) السّائحون الصائمون (جلالین)

[۲] ۔سفر در راہ خدا کنندگان (شاہ ولی اللہ) پھرنے والے ہیں (شاہ رفیع الدین)

[۳] ۔حدّثنی ابن عن بعض رجاله قال لقی الزهری علی بن الحسینؑ فی طریق الحج فقال یا علی بن الحسین ترکت الجهاد و صعوبته واقبلت للحج... والله بقول: انّ الله اشتریٰ من المومنین الخ قال له علی بن الحسین اتم الآیة فقال: التّائبون العابدون السّائحون... اذا رأینا هٰولاء الذین هٰذه صفتهم فی الجهاد معهم افضل من الحج (علی بن ابراهیم)

لئن اشرکت لیحبطنّ عملك

اگر آپ بھی شرک کریں تو آپ کے سب اعمال اکارت ہو جائیں۔

وہی صورت یہاں بھی ہے مگر جمہور اہلسنّت نے جنہیں جناب ابوطالبؑ کے ایمان پر حرف لانے کے ساتھ خاص دلچسپی ہے اس آیت کا تعلق ابوطالبؑ ہی سے قرار دیا ہے کہ ان کے لئے رسولؐ نے استغفار کیا، اس پر آیت نازل ہوئی ہم اس سے متفق نہیں ہیں۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

''اور ابراہیم کا دعائے مغفرت کرنا اپنے باپ کے لئے نہ تھا مگر ایک وعدہ کی رو سے جو انہوں نے کیا تھا اس سے مگر جب ثابت ہو گیا ان پر کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے اظہار برأت کر دیا، بلاشبہ ابراہیمؑ غم خوار انسان تھے تحمل سے کام لینے والے''۔

جناب ابراہیمؑ کے استغفار کا پس منظر

جس وعدہ کا اس آیت میں حوالہ ہے اس کا بیان بھی دوسری جگہ قرآن مجید میں موجود ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس گفتگو میں جو انہوں نے اپنے چچا یا کسی دوسری طرح کے عزیز آذر سے جسے وہ باپ کہہ کر پکارتے تھے کی تھی جس میں ہدایت حق کو سن کر اس کے انکار پر انہوں نے کہا تھا: سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ (یعنی) تمہیں اپنے فعل کا اختیار ہے مانو، یا نہ مانو، بہرحال میں تمہارے لئے اپنے پروردگار سے دعائے مغفرت کروں گا۔

یہاں پر تو الفاظ قرآن سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس استغفار کے وعدے سے قبل اس نے کچھ رجحان ایمان لانے کا ظاہر کیا ہو مگر ممکن ہے اس میں موجود ترتیب قرآن کا قصور ہو۔ زیر نظر آیت کے جو الفاظ ہیں، ان سے جناب شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آذر نے جناب ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر میں ایمان اختیار کرلوں تو تمہیں میرے لئے دعائے مغفرت کرنی لازم ہوگی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کرلیا اور اس نے اظہار ایمان کر دیا چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حسب وعدہ اس کے لئے خالق سے مغفرت طلب کی مگر بعد میں ثابت ہوا کہ اس کا اظہار ایمان صرف نمائشی تھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے برأت کر لی۔

یہ نتیجہ انہوں نے قرآن کے ان الفاظ سے نکالا ہے کہ ''جب ثابت ہو گیا ان پر کہ وہ اللہ کا دشمن ہے'' کیونکہ اگر اس نے درمیان میں اظہار ایمان نہ کیا ہوتا تو ابتدائے عمر سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کا مشرک ہونا معلوم تھا اس صورت میں ''ثابت ہو گیا'' کے معنی ہی کیا ہوں گے؟ اس کے علاوہ انہوں نے دعائے مغفرت میں یہ الفاظ صرف کئے ہیں کہ:

واغفر لابی انه کان من الضآلین

میرے باپ کو بخش دے! وہ گمراہوں میں سے تھا (شعراء ۸۶)

اس سے ظاہر ہے کہ جس وقت دعائے مغفرت کی ہے اس وقت کی صورت ظاہر یہی ہے کہ وہ اب راہ راست پر آ گیا ہے اور گمراہوں

میں سے نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

''اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ کسی جماعت کو گمراہ قرار دے [1] جب کہ انہیں اس نے راہ راست پر لگا دیا جب تک کہ صاف صاف ان پر ظاہر نہ کر دے وہ باتیں جن سے انہیں بچنا ہے۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔

تکلیف بلا بیاں کا صحیح نہ ہونا

یہ اس اصول کا اعلان ہے جو اصول فقہ میں اصل برأت کے ذیل میں عقلی و نقلی طور پر ثابت ہوا ہے کہ تکلیف بلا بیان قبیح ہے اور جب تک کہ کسی شے سے ممانعت وارد نہ ہو، اس پر مواخذہ ہونے والا نہیں ہے۔

''اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اضلال اور ہدایت اللہ کا اندھا دھند کوئی عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک صفت ثابت پر مبنی ہے جس سے علم الٰہی کا تعلق ہوتا ہے اور وہ اسی اپنے علم پر احکام ضلال و ہدایت مرتب فرماتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

''یقیناً اللہ کے لئے ہے بادشاہت آسمانوں اور زمین کی، وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے اور نہیں ہے تمہارے لئے اللہ کو چھوڑ کر کوئی حامی اور نہ مددگار''۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

''اللہ نے رحمت کی نظر ڈالی [2] پیغمبر اور اُن مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے سختی کے وقت پر ان کا ساتھ دیا جب کہ قریب تھا کہ ان میں سے کچھ کے دلوں میں کجی آ جائے۔ پھر اللہ نے ان پر نظر رحمت ڈالی۔ یقیناً وہ ان کے ساتھ شفیق ہے، بڑا مہربان''۔

یاد رکھئے کہ مہاجرین و انصار میں سے انہی کے لئے نظر رحمت کی توجہ کا بیان ہو رہا ہے جنہوں نے سختی و مصیبت میں رسولؐ کا ساتھ دیا

---

[1] ۔یعنی در حساب گمراهان نمی شمارد قومی را (فتح الرحمن) نہیں ہے اللہ کہ گمراہ ٹھہرائے قوم کو (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔بر حمت متوجه شد (شاہ ولی اللہ)

ہو، نہ یہ کہ رسولؐ کو مصیبت میں چھوڑ کر انہوں نے اپنے لئے گوشہ ہائے عافیت تلاش کئے ہوں۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

''اوران تینوں پر کہ جو پیچھے رہ گئے تھے یہاں تک کہ یہ عالم ہوا کہ زمین ان پر باوجود اپنی وسعت کے تنگ ہوگئی اور وہ خود اپنے سے تنگ ہوگئے [1] اور انہوں نے سمجھا کہ اللہ سے بچاؤ کے لئے کوئی جائے پناہ سوا خود اسی کے نہیں ہے پھر اللہ نے ان کی طرف توجہ فرمائی کہ وہ توبہ کریں، یقیناً اللہ ہی وہ ہے جو بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

''اوران تینوں پر'' اس کا تعلق اس کے قبل والی آیت کے ساتھ ہے کہ اللہ نے اپنی نظر توجہ مبذول فرمائی رسولؐ اوران مہاجرین وانصار پر جنہوں نے رسولؐ کی پیروی کی اوران تین آدمیوں پر جنہوں نے جنگ تبوک کے سفر میں رسولؐ کا ساتھ چھوڑنے کے بعد صدق دل سے توبہ کی اور یہ حقیقت میں ان افراد کی انتہائی دل جوئی ہے کہ ان کی توبہ قبول کرنے کا تذکرہ کرنے کے لئے رسولؐ اور آپ کی سچی اطاعت کرنے والے افراد پر اپنی نظر توجہ کا تذکرہ پہلے کرتے ہوئے اسی سلسلہ میں ان کا نام لے کر اس کا عملی طور پر ثبوت دے دیا کہ التّائب عن ذنبه كمن لا ذنب له : گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے وہ جس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔

چونکہ ان کی توبہ کو بطور نتیجہ ذکر کیا ہے تاب اللہ کے مضمون پر مترتب کر کے، اس لئے پہلے تَابَ کے معنی ہم نے قبول توبہ کے نہیں بلکہ توجہ مبذول فرمانے کے قرار دیے ہیں اور اس توبہ کے بعد جو تَوّاب آیا ہے اس کے معنی توبہ قبول کرنے والا قرار دیے ہیں جو بالکل سیاق قرآنی کے مطابق ہیں۔

یہ الفاظ کہ زمین اُن پر تنگ ہوگئی اور وہ خود اپنے سے تنگ ہوگئے اس ضمیر کی شدید بے چینی کے اظہار کے لئے ہیں جو صحیح احساس جرم کی بنا پر ان میں پیدا ہوئی تھی اور پھر روایت بتاتی ہے کہ ان کے لئے حالات بھی ایسے پیدا ہوگئے تھے کہ گھر والوں تک اُن سے بات نہ کرتے تھے اور انہوں نے خود بھی آپس میں ایک دوسرے سے بات کرنا موقوف کر دی تھی اور جنگل میں ایک دوسرے سے بالکل الگ زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ [2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو''۔

---

[1] ۔ان کی جانیں (تک) ان پر تنگ ہوگئیں (مولانا فرمان علی صاحب)

[2] ۔فضاقت عليهم المدينة فخرجوا الى روس الجبال فكان اهاليهم يجيون لهم بالطعام و يتركونه لهم ولا يكلّمونهم فقال بعضهم لبعض قد هجوا الناس ولا يكلّمنا احد فهلاً نتهاجر نحن ايضا فتفرقوا ولم يجتمع منهم اثنان (تبيان)

صادقین کے ساتھ رہنے کا حکم

یہ ایک مستقل آیت ہے اور چونکہ ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے اس لئے یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ ماقبل یا مابعد ہی کے سلسلہ کی کوئی آیت ہے لیکن مفسرین اہل سنت نے بلا وجہ اس کا تعلق سیاق سے قرار دے دیا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اصلی مرکز سے دور ہوگئی ہے۔ [1]

تفسیر اہل بیتؑ یہ ہے کہ صادقین سے مراد معصومینؑ ہیں۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۙ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۱۲۱﴾

''مدینہ کے باشندوں اور ان کے ارگرد کے صحرائی عربوں کو یہ درست نہیں ہے کہ وہ پیغمبر خداؐ کا ساتھ چھوڑ کر گھر بیٹھیں اور اپنی جانوں کو آپ کا ساتھ دینے سے بچائیں، اس لئے کہ انہیں نہ پیاس، نہ زحمت، نہ مشقت اور نہ بھوک کی مصیبت راہ خدا میں پہونچے گی اور نہ کہیں قدم ایسا رکھیں گے [2] جو کافروں کے لئے غم وغصہ کا باعث ہو اور نہ وہ دشمنوں کے مقابلہ میں کوئی کامیابی حاصل کریں گے مگر یہ کہ اس کے سبب سے ایک نیک عمل ان کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا، بلاشبہ اللہ اچھے اعمال والوں کے ثواب کو رائیگاں نہیں کیا کرتا اور نہ وہ کوئی خرچ کریں گے چھوٹا اور نہ بڑا اور نہ کوئی وادی قطع کریں گے مگر یہ کہ ان کے واسطے اسے نامہ عمل میں لکھا جائے گا تا کہ اللہ انہیں صلہ دے ان کے بہتر سے بہتر اعمال کے لحاظ سے جو وہ کرتے تھے''۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۧ﴿۱۲۲﴾

''اور ایمان لانے والوں کے لئے یہ نہیں ہے کہ وہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں تو ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر

---

[1] ۔ کونوا مع الصادقین فی الایمان والعود بان تلزموا الصدق (جلالین) ساتھ مہاجرین وانصار کے تین شخص اور بھی داخل ہوئے پچاس دن میں (موضح القرآن)

[2] ۔ موطأ مصدر بمعنی وطأ (جلالین)

جماعت میں سے کچھ لوگ سفر کریں تا کہ دین کے سمجھنے کی قابلیت حاصل کریں اور پھر جب واپس جائیں تو اپنی قوم کو متنبہ کریں، شاید وہ اثر لیں۔''

تحصیل علم دین کے لئے سفر کا حکم وجوب کفائی

اس آیت کا تعلق گزشتہ سلسلہ کلام سے معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ وہ جہاد میں جانے کا ذکر تھا اور وہاں تو پیچھے رہنے والوں کی سختی کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اگر یہ آیت اس سے متعلق سمجھ لی جائے تو رسولؐ کے ساتھ نہ جانے والوں پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔ اور جیسا کہ بہت دفعہ لکھا گیا، ترتیب مطابق تنزیل نہیں ہے لہٰذا کوئی وجہ بھی نہیں کہ خواہ مخواہ اسے گزشتہ کے ساتھ مرتبط کرنے کی کوشش کی جائے۔[1]

درحقیقت یہ آیت ایک دوسری بات سے متعلق ہے اور وہ تحصیل علم دین کے لئے سفر ہے اور اسی بناء پر علماء نے اسے اجتہاد اور تقلید کے ثبوت میں پیش کیا ہے اس لئے کہ قرآن نے تحصیل علوم دین کا ذریعہ یہی بتایا ہے کہ ایک جماعت جا کر قابلیت فہم احکام دینیہ کی حاصل کرے۔ یہ ہوئے فقہاء اور پھر جب وہ واپس آئیں تو قوم کے دوسرے لوگوں کو وہ احکام دین پر مطلع کریں اور وہ ان احکام پر عمل کریں۔ یہ ہوئے مقلدین۔ یہی عملی طریقہ ہے جو عقل وفطرت کے عین مطابق ہے۔

تفسیر جلالین میں ایک عجیب طرح سے اس آیت کو گزشتہ سے مرتبط بھی کیا ہے اور پھر اسے علم دین کے واجب کفائی ہونے سے بھی متعلق قرار دیا ہے اور اس تضاد کو بھی رفع کرنے کی کوشش کی ہے جسے ہم نے پہلے دکھلایا ہے کہ اگر جہاد میں جانا واجب کفائی ہوتا جیسا کہ سیاق سے متعلق قرار دینے کے بعد اس آیت سے ثابت ہوتا ہے تو اس کے پہلے ساتھ نہ جانے والوں پر اتنی زجر وتوبیخ کیوں ہوتی۔

وہ کہتے ہیں کہ گزشتہ آیات کے نازل ہونے کے بعد ایک مہم اور پیش آئی تو اب کہ جتنے مسلمان تھے، سب کے سب چل کھڑے ہوئے اور مدینہ میں کوئی نہ رہ گیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ: وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً (یعنی) مومنین کے لئے یہ نہیں ہے کہ وہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ اس میں بیچ میں انہوں نے بڑھایا الی الغزو یعنی میدان جنگ کی طرف، مطلب یہ نکلا کہ تمام مومنین کو ایک دم جنگ کے لئے روانہ نہیں ہونا چاہیے فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہر قبیلہ میں سے کچھ لوگ جائیں۔ اب یہاں وہ جملہ بڑھاتے ہیں: ومکث الباقون اور باقی لوگ قیام کریں۔ لِّيَتَفَقَّهُوْا تا کہ وہ لوگ یہاں پر وہ تشریح فرماتے ہیں: ای الماکتون یعنی یہ قیام کرنے والے علم دین حاصل کریں۔ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اور وہ اپنی قوم کو آگاہ کریں جب وہ یعنی وہ قوم جو جہاد میں گئی ہے واپس آئے۔

اب اس تضاد کو یوں رفع کیا ہے کہ:

قال ابن عباس فھذہ مخصوصۃ بالسّرایا والّتی قبلھا بالنھی عن تخلف احد فیما اذا خرج النبیﷺ۔ ابن عباس نے کہا ہے کہ یہ آیت سریوں سے مخصوص ہے (جن میں پیغمبرؐ خود تشریف نہیں لے جاتے تھے اور کسی کو سردار لشکر بنا کر بھیج دیتے تھے) اور جو آیات اس کے پہلے ہیں کہ کوئی پیچھے نہ رہ جائے وہ اس صورت کے لئے ہیں کہ جب خود رسول تشریف لے جائیں۔

---

[1] ۔ مثلا یوں کہا جائے کہ ''اور یہ (بھی) مناسب نہیں کہ مومنین کل کے کل (اپنے گھروں سے) نکل کھڑے ہوں۔'' (مولانا فرمان علی صاحب)

اب بظاہر تو چولیں سب بیٹھ گئیں مگر اس کی بنیاد میں ایک بڑی منطقی کمزوری ہے وہ یہ ہے کہ اصل الفاظ قرآن یہ ہیں۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ کیوں نہیں ایک گروہ ان میں کا سفر کرتا تا کہ وہ علم دین حاصل کریں۔

یہاں ضمیر وہ کے پہلے ذکر سفر کرنے والوں کا ہے تو اس کا مطلب لازماً یہی ہوگا کہ وہ سفر کرنے والے علم دین حاصل کریں۔ قیام کرنے والوں کا کوئی ذکر ابھی آیہ قرآنی میں نہیں ہے۔ یہ تو مفسر صاحب نے بیچ میں ''ومکث باقون'' اور باقی لوگ قیام کریں بڑھایا اور پھر لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ کے معنی قرار دے رہے ہیں کہ وہ قیام کرنے والے علم دین حاصل کریں۔ گویا خداوند عالم ضمیر پھیر رہا ہے ایک ایسے مرجع کی طرف جسے کئی صدی کے بعد جلالین صاحبان میں کا کوئی ایک بیچ میں لکھ کر اس خلا کو پر کرے گا جو قرآن میں معاذ اللہ پایا جاتا تھا۔

اسی بناء پر بعض مفسرین اہل سنت نے بھی اس سفر کو جہاد سے متعلق قرار نہیں دیا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ نے ممکن نیست مومناں را کہ برآیند پر نوٹ دیا ہے یعنی بطلب علم اور آخر میں لکھا ہے یعنی طلب علم فرض کفایہ است (فتح القرآن)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۲۳

''اے ایمان لانے والو! جنگ کرو ان سے کہ جو تمہارے آس پاس ہیں اور وہ تم میں سختی و مضبوطی محسوس کریں اور جانے رہو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے''۔

قرآن مجید کی اکثر آیات سلسلہ نزول کے مطابق مرتب نہ ہونے کی وجہ سے اپنے پس منظر سے جدا ہوگئی ہیں جن میں وہ آیت نازل ہوئی تھی یہ آیت بھی اسی طرح کی ہے اور اس لئے ایک ایسا شخص جو اسلام کو شمشیر زنی اور خونریزی کا حامل قرار دینے کے درپے ہے، بآسانی اس آیت کا استعمال کرسکتا ہے لیکن اگر اس آیت کو اس منظر میں دیکھا جائے جس میں یہ آیت اتری تھی تو معلوم ہوگا کہ اسباب جنگ ان کفار سے پہلے سے موجود تھے اور ان کی بنا پر یہ حکم آیا ہے جسے کوئی عمومی حیثیت نہیں ہے کہ ہر دور میں مسلمانوں کے لئے یہ اصول قائم ہو کہ انہیں اپنے آس پاس کے کافروں سے جنگ کرنا لازم ہو۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝۱۲۴ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۲۵

''اور جب کوئی سورہ اترتا ہے تو ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ تم میں سے کون ہے جس کے ایمان میں اس نے اضافہ کیا ہو تو (اس کا جواب یہ ہے کہ) جو ایمان رکھتے ہیں ان کے ایمان میں اس سے اضافہ ہوا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں پہلے سے بیماری ہے، ان کو تو ان کی موجودہ خباثت کے ساتھ اور خباثت میں

اضافہ ہوتا ہے اور وہ مریں گے بھی اس عالم میں کہ وہ کافر ہیں''۔[1]

نفاق کا مظاہرہ نکتہ چینیوں کی شکل میں ہوتا ہے چنانچہ ایک ایسا ہی سوال وجواب سورہ بقرہ میں آچکا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿البقرة﴾ اللہ نہیں شرماتا اس سے کہ مچھر یا اس سے بھی چھوٹی چیز کی مثال دے تو جو ایمان رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ انکے پروردگار کی طرف سے حق ہے اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ کا مطلب کیا ہے بہت سوں کو وہ اس سے گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کی ہدایت کرتا ہے اور گمراہی میں انہی کو ڈالتا ہے جو بداعمال ہیں۔

ویسا ہی یہاں ہے کہ قرآن مجید کی کچھ آیات اترنے پر منافقین کہتے ہیں کہ اس کا حاصل کیا ہوا؟ اس میں افادیت ہی کیا ہے؟ اس سے آخر کس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے؟ اس کا جواب قرآن نے یہی دیا ہے کہ تم میں ایمان ہو تو تمہارے ایمان میں اضافہ بھی ہو۔ تم میں تو نفاق کی بیماری دلوں میں موجود ہے اس لئے آیات الٰہی سے تمہارے نفوس میں بجائے ایمان کے اور خباثت ہی زیادہ ہوتی ہے، اور یہ آخری لمحہ زندگی تک تمہاری کیفیت برقرار رہے گی مروگے بھی تم اسی کفر کے عالم میں''۔

معلوم ہوا کہ خالق کی جانب سے کوئی جبر کی کارفرمائی نہیں ہے، انسانی نفوس کی بذات خود حالت ہے جس سے آیات الٰہی کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿١٢٦﴾

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک دو بار آزمائشوں میں مبتلا کئے جاتے ہیں، پھر اس کے بعد بھی نہ وہ توبہ کرتے ہیں اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں''۔

یہ آزمائشیں مختلف طرح کے عوارض وامراض کے ساتھ ہوا کرتی ہیں جن سے صاحبان ایمان اصلاح نفس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ ان سے کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ۭ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۭ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿١٢٧﴾

''اور جب کوئی سورہ اترتا ہے تو ان میں سے ایک دوسرے کی صورت دیکھتا ہے کوئی تمہیں دیکھتا تو نہیں ہے؟ پھر وہ پلٹ جاتے ہیں اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے اس سبب سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں''۔

---

[1] ماتوا علی لفظ الماضی لانه عطف علی زادهم... والمعنی انهم یموتون وهم کافرون (تبیان)

کوئی سورہ یعنی ایسی قرآن کی آیات جن میں ان کی منافقانہ روشوں کا تذکرہ اور ایسے اوصاف ہیں جو بالکل انہی پر منطبق ہیں۔[1]

ایک دوسرے کی صورت دیکھتا ہے۔اس کے ایک معنی تو یہ ہوسکتے ہیں کہ وہ کچھ شرمندگی اور انفعال محسوس کرتے ہیں۔[2] یا یہ کہ جب رسولؐ ان آیات کو مجمع میں سناتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے آپس میں اشارے کرتے ہیں کہ اب یہاں ٹھہرنے کا موقع نہیں، چلنا چاہیے۔[3]

پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں کہ کوئی مسلمان انہیں دیکھتا تو نہیں۔ہوسکتا ہے کہ ان کا ایک دوسرے کی طرف دیکھنا اسی مطلب سے ہو کہ کوئی تمہیں دیکھ تو نہیں رہا ہے اور اس لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ الفاظ وہ کہتے بھی ہوں۔بلکہ یہ ان کی صورت حال کی ترجمانی ہے جو قرآن نے کی ہے[4] مگر عام مترجمین یہاں ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں کہ وہ ایسا کہتے ہیں[5]

پھر وہ پلٹ جاتے ہیں یعنی اس بزم سے ہٹ کر ادھر ادھر چلے جاتے ہیں۔[6]

اللہ کا ان کے دلوں کو پھیر دینا از خود نہیں ہے بلکہ ان کے شعور ایمانی سے کام نہ لینے کا نتیجہ ہے جسے آخر میں ظاہر کر دیا ہے۔[7]

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

''تمہارے پاس آیا ہے تم ہی میں سے ایسا پیغمبر جس پر تمہاری زحمت و تکلیف شاق ہے، جسے تمہاری ہر وقت فکر ہے، جو ایمان قبول کرنے والوں پر بہت شفیق ہے بڑا مہربان۔''

یہ آیت گویا اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿۴﴾ ﴿القلم﴾ کے متن کی ایک بڑی متین شرح ہے جس کی تفصیل ہم بیان کرنا چاہیں تو دفتر کے دفتر ناکافی ہیں۔

اوصاف پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پیغمبرؐ کو جا بجا جو مِنْ اَنْفُسِكُمْ کہا ہے، اس کے معنی عموماً قوم قبیلہ کے لئے جاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی یہی معنی لئے گئے ہیں۔ حالانکہ پیغمبر کی رسالت بعض قرآن تمام نوع بشر پر حاوی ہے جس میں قبیلہ اور قومیت کا اختلاف ظاہر ہے۔اس لئے میں ایک دوسری قرآنی نظیر کے سہارے اور وہ یہ ہے کہ متعدد مقامات پر شریک حیات کے لئے یہ مضمون ہے کہ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (روم۔۲۱) اس نے تم ہی

---

[1] ۔سورة فیها ذکرهم (جلالین) یعنی سورتی که در وے بیان نفاق ایشاں باشد (فتح الرحمن)

[2] ۔از جهت شرمندگی (فتح الرحمن)

[3] ۔یریدون الهرب (جلالین)

[4] ۔فکانهم یقول بعضهم بعض هل یریٰ مکم من احد (تبیان)

[5] ۔(یہ کہہ کر کہ) تم کو کوئی مسلمان دیکھتا تو نہیں ہے پھر (اپنے گھر پر) پلٹ جاتے ہیں (مولانا فرمان علی صاحب)

[6] ۔ای تفرقوا (علی بن ابراهیم)

[7] ۔پیغامبری از قبیله ثما (شاه ولی الله)

میں سے تمہارے لئے شریک زندگی پیدا کئے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ زوجہ ہمیشہ اسی قوم کی نہیں ہوتی جس قوم قبیلہ سے اس کا شوہر ہے لہٰذا اس کے معنی یہ معلوم ہوتے ہیں کہ وہ حقیقت نوعیہ میں اس شوہر کے ساتھ شریک ہے چونکہ ایک عرصہ تک دانشوروں میں یہ چیز محل بحث رہی کہ عورت نوع انسانی میں داخل ہے یا نہیں؟ تو اس کا فیصلہ قدرت نے مِنۡ اَنۡفُسِكُمۡ کہہ کر کیا، اسی طرح انبیاء و مرسلین کے لئے ایسا تصور ہر دور میں ہوتا رہا اور آج بھی موجود ہے کہ وہ حقیقت و نوعیت ذات میں افراد انسانی سے الگ ایک مخلوق ہوتے ہیں، اسے پیش نظر رکھ کر خالق نے متعدد جگہ قرآن مجید میں اس پر زور دیا ہے کہ پیغمبر تم ہی میں سے ایک ہوتا ہے یعنی حقیقت و ماہیت نوعیہ میں تمہارا ہم جنس ہی ہوتا ہے۔ فرشتہ یا کسی دوسری نوع کا فرد نہیں ہوتا۔ بے شک اس کے صفات شخصی ہوتے ہیں جو اسے افراد نوع سے ممتاز بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ تم اگر اس کی پیروی کرو گے تو اسی پیروی کے تناسب سے تم بلند سے بلند تر درجے حاصل کر کے نوع انسانی میں ایک شرف و امتیاز کے حامل ہو جاؤ گے۔

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِىَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَهُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۱۲۹﴾

''اس کے بعد وہ اگر روگردانی کریں تو کہیے کہ اللہ میرے لئے کافی ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں، اس پر میرا بھروسہ ہے اور وہ عظیم المرتبت عرش کا مالک ہے۔''

بعض روایات میں اہل سنت میں ہے کہ لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ سے لے کر یہاں تک، یہ دو آیات قرآن کی سب سے آخری آیات ہیں ان کے بعد پھر کوئی آیت نازل نہیں ہوئی ہے۔[1]

[1] ۔روی الحاکم فی المستدرك عن ابی بن کعب قال اٰخر اٰیة نزلت: لقد جاء کم رسول الیٰ اٰخر السورة (جلالین)

سُوْرَةُ يُوْنُسَ

مکیّہ۔۔۔۱۰۹ آیات

سورۂ یونس کے خاص خاص مضامین

مگر دو تین آیات کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے کہ وہ مدینہ کی نازل شدہ ہیں۔[1]

اس سورہ میں جو خاص واقعہ مذکور ہے اور موجودہ ترتیب قرآن میں سب سے پہلے یہیں درج ہوا ہے وہ قوم یونسؑ پر عذاب کا آنا اور پھر توبہ وانابت سے اس کا برطرف ہوجانا ہے اور یہ واقعہ تاریخ امم میں ایک نادر حیثیت رکھتا ہے کہ عذاب نازل ہوا اور پھر سچے دل سے توبہ ہونے کی وجہ سے وہ پلٹ جائے اس لئے اس واقعہ کو یاد دلانے کی خاطر اس سورہ کا نام ''سورۂ یونس'' ہوا۔

یوں جناب یونس علیہ السلام کا نام اور دوسری سوروں میں بھی آیا ہے مگر وہ ضمناً ہے اس واقعہ کا تذکرہ اسی سورہ میں ہے ہاں اس واقعہ کی بعض کڑیوں کی طرف انتیسویں پارہ کے سورہ قلم میں اشارہ ہے مگر وہاں جناب یونس علیہ السلام کا نام نہیں ہے اور واقعہ کی خاص کڑی یعنی قوم سے عذاب دور ہونے کا ذکر وہاں نہیں ہے۔اس کے علاوہ اس سورہ میں جو خاص باتیں ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔۔۔۔قرآن اور تعلیم اسلام کے بوحی الٰہی ہونے پر رسولؐ کی اس خاموش زندگی سے جو قبل بعثت تھی، استدلال کہ یہ سب اگر ان کے ذہن کی پیداوار ہوتا تو کبھی اس چالیس برس کے اندر ان کی زبان سے اس طرح کی باتیں تمہیں سننے میں آتیں۔

۲۔۔۔۔یہ اصول کہ جو خود دوسرے کی رہ نمائی کا محتاج ہو، وہ پیشوائے خلق نہیں ہوسکتا۔

۳۔۔۔۔جس چیز کے لئے اللہ کی طرف سے کوئی حکم نہ آئے، اس میں کوئی حکم اپنے دل سے جاری کرنا اللہ پر افتراء ہے۔

۴۔۔۔۔اولیائے الٰہی خوف وحزن سے بری ہے۔

۵۔۔۔۔حقانیت معجزہ کا معیار، جو غلط بات اللہ کی طرف منسوب کی جائے، اس کا باطل ثابت کرنا اللہ کو لازم ہے۔

۶۔۔۔۔فرعون کا جسم کا غرق ہونے کے بعد پھر دریا سے نکل کر محفوظ ہوجانا۔۔۔وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۱

---

[1] ۔ مكية الا فان كنت فى شك الأيتين او الثلث او و منهم من يؤمن به الأية (جلالين)

''الف۔لام۔را۔یہ [1] آیات ہیں حکمت والی کتاب کی''۔

شروع کے حروف تو مقطعات قرانیہ ہیں جن کے متعلق لکھا جاچکا ہے کتاب کے وسط میں حکیم کی لفظ کو عموماً حکمت سے لیا گیا ہے [2] جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے لیکن بعض مفسرین نے اسے محکم سے لیا ہے جس کے معنی مضبوط کے ہیں۔ [3]

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲

''کیا یہ لوگوں کے لئے عجیب بات تھی کہ ہم نے انہی میں سے ایک شخص پر وحی بھیجی کہ آپ لوگوں کو ڈرایئے اور ایمان لانے والوں کو خوش خبری دیجئے کہ ان کے لئے سچائی کی روایت قائم ہے ان کے پروردگار کے یہاں کافر کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے''۔

انہی میں سے ایک شخص یعنی رسالت مآبؐ جن کا خاص فریضہ بشارت و انداز ہے اور آپ کا لقب ہی بشیر و نذیر تھا۔ [4]

''قَدَمَ صِدْقٍ'' کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے اس میں بھی تقدم یعنی ماقبل کی صورت حال کا تصور محفوظ ہے [5] اور بعض مفسرین نے تقدّم کا مطلب یہ لیا ہے کہ جو سچائی کا ذخیرہ وہ اپنے گفتار و کردار سے اللہ کے یہاں پہلے بھیج چکے ہیں اور وہ اللہ کے یہاں جزا کی صورت میں ان کے لئے محفوظ ہے۔ [6]

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَي الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

''یقیناً تمہارا پروردگار اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش پر برقرار ہوا تدبیر کائنات کرتا ہوا کوئی سفارشی نہیں ہے مگر اس کی اجازت کے بعد یہ ہے کہ اللہ تمہارا پروردگار تو عبادت کرو اس کی۔ تو کیا تم نصیحت قبول نہ کرو گے۔؟''

---

[1] ۔قال ابو عبیدہ ''تلك'' معناہ ھذا (تبیان)

[2] ۔ایں ایتہای کتاب حکمت است (شاہ ولی اللہ) یہ ہیں نشانیاں کتاب حکمت والی کی (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔الحکم المحکم (جلالین)

[4] ۔استواءً یلیق بہ (جلالین)

[5] ۔معناہ استولیٰ علیہ بانشاء التدبیر من جھتہ ك یستولی الملك علیٰ سریر ملکہ بالا ستیلاء علی تدبیرہ (تبیان)

اس آیت کے تمام اجزاء پہلے آ چکے ہیں آسمان اور زمین کو چھ دن میں پیدا کرنا، عرش پر مستوی ہونا یہ استواء جس کا ترجمہ ہم نے برقرار ہونے سے کیا ہے جسمانی نہیں ہے ۱ بلکہ مقام انتساب میں نقطہ اعلیٰ کو عرش یعنی تخت سلطنت قرار دیا گیا ہے ۲ تو اس اعتبار سے کہا گیا ہے کہ وہ عرش پر ہے تدبیر کائنات بذات خود کر رہا ہے یہ شرک کی اس قسم کے مقابلہ میں ہے جو کائنات کے نظام کو مختلف دیوتاؤں پر تقسیم کر کے اللہ کو اس نظام سے بے تعلق بنا دیتی ہے اور اس لئے عبادت بھی انہی دیوتاؤں کی کرتی ہے اللہ سے کوئی رابطہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اسلام میں اس طرح کے وسائط کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جن کے بعد اللہ سے کوئی مطلب نہ رہے۔

اسلام میں جس طرح کے وسیلہ اور شفیع کا تصور ہے وہ وہی ہے جسے اس آیت میں الا من بعد اذنہ کہہ کر مستثنیٰ کیا گیا ہے یعنی جو وسیلہ ہوتا ہے وہ بھی اللہ کی اجازت سے اور جو شفیع ہوتا ہے وہ بھی اس کے اذن سے۔ اس لئے اس وسیلہ اور شفیع کے ساتھ وابستگی کے بعد بھی بندہ کی لو اللہ سے لگی رہتی ہے اور اس کی طرف سے ذہن کی توجہ منقطع نہیں ہوتی۔

یہی وہ نکتہ ہے جسے وہابی جماعت نہیں سمجھتی اور وہ مشرکین کے تصور وسائل اور مسلمین و مومنین کے تصور وسائل میں فرق محسوس نہیں کرتی حالانکہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مشرکین چونکہ وسائل کو مستقل مان لیتے ہیں اور اللہ سے اب بے نیاز ہونے کا احساس رکھتے ہیں اس لئے عبادت انہیں وسائل کی کرنے لگتے ہیں اور مسلمان ان وسائل کے بعد بھی اصل کارساز اللہ کو جانتا ہے اس لئے مقربین سے توسل کے باوجود بھی عبادت ان مقربین کی نہیں کرتا بلکہ عبادت اللہ ہی کی کرتا ہے۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۴

''اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، بلاشبہ وہی پہلے پہل مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر دوبارہ اسے زندہ کرے گا تا کہ جزا دے انہیں کہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے عدالت کے ساتھ اور جنہوں نے کفر اختیار کیا، انہیں کھولتا ہوا پانی پینے کو ہوگا اور دردناک عذاب اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے''۔

جزا و سزا کو عدالت کے ساتھ وابستہ کرنا اس عقلی حقیقت کا اظہار ہے کہ کارگاہِ آخرت کی ترتیب عدل الٰہی کا نتیجہ ہے اس لئے جو مسلمان فرقے عدل کو اللہ کے لئے ضروری نہیں سمجھتے ان کا آخرت پر ایمان بے بنیاد قرار پاتا ہے جسے صرف رسمی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے حقیقی ایمان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۵

''وہ وہ ہے جس نے آفتاب کو چمک دار بنایا اور چاند کو روشن اور اس کی مختلف منازل قرار دیں تا کہ تمہیں برسوں کا شمار اور حساب معلوم ہو۔ اللہ نے یہ سب نہیں پیدا کیا مگر بالکل صحیح و مناسب [1] وہ تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے آیات ان لوگوں کے لئے جو جاننا چاہیں''۔

اسلام میں ماہ وسال کے قمری حساب کا اعتبار

چاند کی منازل قرار دینے کا مقصد برسوں کا شمار قرار دینا، اس کی دلیل ہے کہ اسلام میں سال قمری ہی معتبر ہے نہ کہ سال شمسی جیسا کہ آج کل کے بعض خودرو، آزاد مفکرین کا رجحان ہے

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ ﴿٦﴾

یقیناً رات اور دن کی ادل بدل میں [2] اور اس میں کہ جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کیا ہے، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو نجات کی فکر رکھتے ہوں۔''

رات اور دن کے ادل بدل کے ساتھ خلقت آسمان وزمین کیلئے جن نشانیوں کا اجمالی حوالہ دیا گیا ہے ان کا کافی زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کے پہلے دوسرے پارہ میں تذکرہ آچکا ہے، اس طرح کہ:

یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، رات اور دن کی ادل بدل میں کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں، اس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا تو اس سے زمین کو اس کے بے جان ہونے کے بعد جان دار بنا دیا اور اس میں ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلا دیئے، ہواؤں کے ہیر پھیر میں اور اس بادل میں جسے آسمانوں اور زمین کے درمیان پابند رہنا پڑتا ہے، نشانیاں ہیں ان کے لئے جو عقل سے کام لیں''۔ (بقرہ آیت ۶۴)

وہاں ان نشانیوں کو کہا گیا تھا لقوم یعقلون ان کے لئے جو عقل سے کام لیں، یہاں کہا جا رہا ہے: لقوم یتقون ان لوگوں کے لئے جو نجات عین عذاب آخرت سے بچنے کی فکر رکھتے ہیں، یہ دونوں باتیں لازم وملزم کی حیثیت رکھتی ہیں، عقل کا تقاضا یہی ہے کہ امکانی خطرات سے اپنا بچاؤ کرے اور یہی عقل کا فیصلہ تحقیق حق اور فکر ونظر کی دعوت دیتا ہے اور جب فکر ونظر سے کام لے گا تو پھر یہ دلائل قدرت جو کائنات آسمان وزمین میں جلوہ گر ہیں، رہنمائی کریں گے اور انسان اپنے ضمیر کے فیصلہ سے قبول حق اور ایمان کے لئے مجبور ہوگا۔ [3]

ان لوگوں کے لئے ان نشانیوں کا ہونا اسی طرح کہا گیا ہے جیسے قرآن کو کہا گیا ھدًی للمتّقین وہ ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ فائدہ اس سے یہی لوگ اٹھاتے ہیں اسی طرح یہ نشانیاں نمایاں تو سب کے لئے ہیں، لیکن ان سے صحیح فائدہ اٹھانے

---

[1] ۔ لا عبثا تعالیٰ عن ذٰلك (جلالین)

[2] ۔ بالذّهاب والمجیئ والزیادة والنقصان (جلالین)

[3] ۔ یتقون فیئو منون (جلالین)

والے وہی ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں اور جو نجات کی فکر رکھتے ہیں۔[1]

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ ۝٧ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝٨

''یقیناً وہ جنہیں ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے اور وہ اس دنیوی زندگی سے خوش اور اس پر مطمئن ہیں اور وہ جو ہماری آیات سے بے پرواہ ہیں، یہ وہ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ میں ہیں ان اعمال کی سزا میں جو وہ کرتے تھے''۔

ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے'' یعنی اس دنیا کے بعد کسی اور دور حیات کے جسے آخرت کہتے ہیں، وہ قائل نہیں ہیں۔[2]

چونکہ دنیا میں جو حالات انسان کو پیش آتے ہیں اکثر اسباب طبیعیہ کی طرف یا کسی انسان کی طرف منسوب ہوتے ہیں لیکن آخرت کی تمام منازل وہ ہیں جن میں اللہ کے سوا کوئی دوسرا سبب کارفرما ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے ان منازل کے پیش آنے کو مجازاً قرآن میں لقائے الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔[3]

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ ۖ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ۝٩ دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۚ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝١٠

''یقیناً وہ کہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کئے، انہیں ان کا پروردگار ان کے ایمان کی بدولت منزل مقصود تک پہنچائے گا۔ ان کے زیر قدم نہریں رواں ہوں گی، آرام والے بہشت کے باغوں میں، وہاں ان کی صدا یہی ہوگی کہ پاک ہے تیری ذات اے اللہ اور آپس کی ملاقات کے وقت ان کی دعا سلام کے ساتھ ہوگی اور آخر میں ان کی آواز ہوگی کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

اہل بہشت کا سلام۔ سلامٌ علیکم

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

اوّل عجائب نعمات دیکھ کر کہیں گے پاک ذات یعنی سبحان اللہ، پھر اس کی لذت پا کر کہیں گے الحمدللہ اور جنت میں طور ملاقات یہی ہے، السلام علیک جو دنیا میں مسلمان کرتے ہیں (موضح القرآن)

اب اسے دھاندلی نہ کہیے تو کیا کہیے کہ قرآن کہہ رہا ہے: سلام (بغیر الف لام) اور آپ اس کی شرح میں فرما رہے ہیں السلام علیک

---

[1] ۔خصّ المتّقین بالذکر لما کانوا هم المنتفعین دون غیرهم (تبیان)

[2] ۔لقاءنا بالبعث (جلالین)

[3] ۔لاق ملاقاة مالا یقدر علیه الا الله یحسن ان یجعل لقاء الله تعظیما لشانه (تبیان)

(الف لام بڑھا کر) جس کی عادت آپ کو ہے، یہ آخر کیوں؟

یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ اہل جنت کا آپس کا سلام ''سلام علیکم'' ہی ہے جو دنیا میں مومنین کرتے ہیں۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑪

''اور یہ لوگ بھلائی حاصل کرنے کے لئے جتنی جلدی کرتے ہیں، اتنی جلد اگر اللہ ان کے واسطے خرابی لے آئے تو ان کی عمر کا خاتمہ ہی ہو جائے مگر ہم تو چھوڑے ہوئے ہیں ان لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے کہ وہ اپنی سرکشی کے اندر اندھا دھند مبتلا رہیں۔''

انسان کوئی اچھا کام کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کے خوش گوار نتائج جلد سے جلد اس کے سامنے آجائیں خالق فرماتا ہے کہ اسی طرح اگر ان کے برے کاموں کے جو خراب نتائج ہیں، ان کے سامنے لانے میں اللہ یونہی جلد بازی سے کام لے تو کیا ہو؟ لیکن اللہ ایسا نہیں کرتا، تحمل سے کام لیتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ وہ خوب کھیل کھیل لیں، پھر آخر میں ان کو جس سخت ترین سزا کے وہ مستحق ہیں، وہ دی جائے گی۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑫

''اور آدمی پر جب مصیبت پڑتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے کروٹ کے بل یا بیٹھے یا کھڑے (جس عالم میں بھی ہو) اس کے بعد جب ہم اس کی مصیبت دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسا چلتا ہوتا ہے جیسے کہ کسی مصیبت میں جو اس پر پڑی ہو، اس نے ہمیں پکارا ہی نہ تھا، اسی طرح حد سے تجاوز کرنے والوں کے لئے آراستہ ہوا وہ طرز عمل جو وہ اختیار کئے ہوئے تھے''۔

ظاہر ہے کہ صریحی کافروں اور اللہ کے منکروں کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان کا ہے جو زبان سے خدا کے قائل ہیں لیکن عملی زندگی میں اس کی اطاعت سے بے نیاز ہیں، یہ جب وقت پڑتا ہے تو دیکھئے کیسی منتیں مرادیں مانتے ہیں اور کس طرح خدا سے دعا کرتے ہیں اور جب وقت نکل جاتا ہے تو کس طرح خدا فراموشی میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہی ہیں جن پر اس آیت میں تنبیہی تازیانہ لگایا گیا ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ⑬

''اور ہم نے تمہارے پہلے بہت نسلوں کو ختم کر دیا جب کہ انہوں نے ظلم سے کام لیا اور ان کے پاس ان کے پیغمبر معجزے لے کر آئے اور وہ کسی طرح ایمان لانے والے نہ تھے، یونہی سزا دیتے ہیں ہم مجرم لوگوں کو۔''

''قرن'' یوں تو زمانہ کی ایک خاص مدت کا نام ہے مگر یہاں پر ہر زمانہ کے وہ لوگ مراد ہیں جو اس کے بعد والے زمانہ میں افسانہ ماضی بن جاتے ہیں اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے۔ [1]

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

''پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں روئے زمین پر ان کی جگہ پیدا کیا تا کہ ہم دیکھیں تم کیسے اعمال کرتے ہو''۔

یعنی اگر تم نے بھی ویسا ہی ظلم وستم کیا جیسا کہ وہ کر چکے تھے تو تمہیں بھی اسی انجام کا منتظر رہنا چاہیے جو ان کا ہوا۔ [2]

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

''اور جب ان کے سامنے ہماری آیات جو بہت ہی صاف ہیں پیش ہوتی ہیں تو وہ جنہیں ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے، کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن پیش کیجئے یا اس کو بدل دیجئے، کہیے کہ مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں اسے خود اپنی طرف سے بدل دوں، میں تو نہیں پیروی کرتا مگر اس کی کہ جو میری جانب وحی ہوتی ہے یقیناً میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، تو میں ڈرتا ہوں ایک بڑے دن کے عذاب سے''۔

ان کے مطالبہ میں جو دو لفظ ہیں: ''اس کے علاوہ کوئی اور قرآن پیش کیجئے یا اس کو بدل دیجئے'' اس کا مطلب ہمارے ذہن میں جو پہلی دفعہ آتا ہے وہ یہ ہے کہ ''اس کے علاوہ'' پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسری کتاب پیش کیجئے۔ جو بنیادی طور پر اس کتاب سے الگ ہو اور بدل دیجئے کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اپنے ڈھانچے کے لحاظ سے تو یہی رہے مگر اس کی مندرجہ مضامین میں کچھ ردو بدل ہو جائے جو ان کے حسب دل خواہ ہو مگر ایک فرق ان دونوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اس کے علاوہ دوسرا قرآن پیش کیجئے۔ اس میں تو یہ ہے کہ یہ کتاب بھی چاہے رہے مگر کوئی اور قرآن بھی جو ہمارے لئے قابل قبول ہو، پیش کیجئے اور بدلنے کے یہ معنی ہیں کہ یہ کتاب اٹھا ہی لی جائے اور اس کے بجائے دوسری کتاب آجائے۔ [3]

مگر مجھے اس تفسیر کے دیکھنے کے بعد بھی پہلا ہی مفہوم درست معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ وہ تو اس قرآن سے اس لئے ناراض ہیں کہ اس میں ان کے خداؤں کی مذمت ہے اور ان کے شرک اور دیگر مزعومات کی رد ہے تو اگر یہ قرآن اسی طرح باقی رہا اور کوئی دوسری کتاب بھی اگر تو اس سے ان کی طبیعت کو پھر بھی خوشی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ چیز تو موجود ہی ہے جو ان کے لئے باعث آزار و تکلیف ہے۔

پھر یہ کہ اس کے ساتھ دوسری کتاب آنے اور اسی میں تبدیلی ہونے میں بنیادی طور پر اتنا فرق ہے کہ اس کے جواب میں رسولؐ کی طرف سے پھر دو باتوں کے کہنے کی ضرورت ہے کہ نہ میرے لئے دوسرا قرآن پیش کرنا ممکن ہے اور نہ اس کا بدلنا ممکن ہے لیکن جواب میں جو کہا گیا

---

[1] ۔القرون الامم (جلالین) سمی اھل کل عصر قرنا لمقارنہ بعضھم لبعض (تبیان)

[2] ۔معناہ انکم ان عملتم بالمعاصی مثل ما عمل بھا اولئك اھلکم کما اھلك من تقدم (تبیان)

[3] ۔انما فرق۔۔۔لان الایتان بغیرہ قد یکون معہ۔۔۔وتبدیلہ لا یکون الا برفعہ (تبیان)

ہے اس میں تبدیلی ہی کو کہا گیا ہے کہ میرے اختیار میں نہیں ہے یہ ہمارے مفہوم کی بنا پر درست ہے کیونکہ اس صورت میں دونوں شقیں تبدیلی ہی کی حیثیت رکھتی ہیں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں کل کی تبدیلی کا مطالبہ ہے دوسرے میں جز کی تبدیلی کا۔ اس لئے جواب میں مطلق تبدیل کو اپنے اختیار سے باہر کہنے سے دونوں ہی باتوں سے معذوری کا اظہار ہو جاتا ہے۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾

''کہیے کہ اگر اللہ کو ایسا منظور ہوتا تو میں اس کو تمہارے سامنے نہ پڑھتا اور نہ وہ تمہیں اس پر مطلع کرتا [۱] کیونکہ اس کے پہلے میں ایک عمر تک تمہارے درمیان رہ چکا ہوں تو کیا تم عقل سے کام نہیں لو گے؟''

قبل بعثت رسول کی خاموشی سے آپ کے پیغام کے الٰہی ہونے کا ثبوت

انسانی تصورات فطری طور پر تدریجی حیثیت سے نشوونما پاتے ہیں، اگر رسالت کا وہ تصور صحیح ہوتا جو ذہنی ارتقاء اور ماحول وغیرہ کی مناسبتوں پر بنیاد قائم کر کے آج بھی اکثر تعلیم یافتہ حلقوں کے اندر پیش کیا جاتا ہے کہ اس وقت کے سماجی ماحول کے تقاضے سے رسولؐ کا ذہن جو فطری طور پر غیر معمولی حس رکھتا تھا، متاثر ہو کر ان اصلاحات کی طرف مائل ہوا جو انہوں نے بنام رسالت پیش کیں تو چالیس برس تک آپ کی زبان پر وقتاً فوقتاً اس طرح کی گفتگو میں آنا چاہتیں تھیں جو اس ماحول سے بیزاری اور ان امراض کی نشان دہی پر مشتمل ہوتیں جنہیں آپ سماج میں محسوس فرما رہے تھے [۲] مگر چالیس برس تک آپ کی زبان پر اس قسم کا کوئی جملہ نہ آنا [۳] اور پھر ایک دم اس پیغام کو لے کر کھڑے ہو جانا، یہ خود اس کا ثبوت ہے کہ یہ آپ کے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ خدا کی طرف کا پیغام ہے جس کے آپ حامل بنائے گئے ہیں۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾

''تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے یا اس کی آیات کو جھٹلائے یقیناً جو مجرم ہیں وہ کبھی فلاح و نجات نہیں پا سکتے''۔

قرآنی رواداری کی نمایاں مثال

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں کئی جگہ ہیں اور یہ انتہائی روادرانہ انداز میں فریق مخالف کو اپنے برابر کی سطح پر لا کر دعوت تفکر دینا ہے۔ یعنی۔۔۔سوچو، سمجھو اور غور کرو، جو میں پیش کر رہا ہوں، وہ اگر میری طبع زاد چیز ہو اور میں خدا کی طرف غلط نسبت دے رہا ہوں تو بے

---

[۱] ۔ معنی قولہ ولا ادراکم بہ قال ابن عباس ولا اعلمکم بہ (تبیان) خبردار نکردے خدا شمارا بآن (شاہ ولی اللہ)

[۲] ۔ یعنی اپنی طرف سے بنا تا تو چالیس برس کی عمر میں بنا تا یا اس قسم کا خیال رکھتا (موضح القرآن)

[۳] ۔ مکثت فیکم عمرا سنین اربعین من قبلہ لا احدّثکم شئی (جلالین)

شک مجھ سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں لیکن اگر یہ اللہ کا کلام ہے اور تم اس کا انکار کر رہے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو حقیقۃً اللہ کی آیات ہیں، انہیں تم جھٹلا رہے ہو تو تم سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں، اب خوب سمجھ لو اور غور کر لو کہ ہم میں سے کون ہے جو واقعاً ایسے جرم عظیم کا مرتکب ہے۔ [1]

یہی حکیمانہ انداز بحث وہ ہے جسے آج غیر اقوام کے سامنے دعوت تدبر کے لیے اختیار کیا جاتا ہے تو ایک حلقہ اس میں انکار مسلمات یا عقائد کو مشکوک قرار دینے کے پہلو پیدا کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہی حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ سبیل رب کی طرف دعوت کا اصل انداز ہے جس کی قرآن نے تعلیم بھی دی ہے اور پیغمبر خدا کا بوحی الٰہی اسی کے مطابق عمل بھی قرآن میں موجود ہے۔

بے شک بعض مفسرین ہیں جنہوں نے دونوں جزء کو کفار سے متعلق قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھنے سے مراد اس کے لیے شریک قرار دینا اور آیات قرآن کو جھٹلانا ہے۔ [2]

مگر اس صورت میں افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ (یونس۔۱۷) اللہ پر جھوٹ افترئ کرے اور اس کی آیات کی تکذیب کرے'' ہوتا اس لیے کہ ان میں دونوں باتیں جمع تھیں مگر قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ یا تو اس پر جھوٹ افترا کرے اور یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ اس سے پہلے ہی معنی زیادہ صحیح و مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾

''وہ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ انہیں نفع پہنچا سکتی ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہماری سفارش کرنے والے ہیں، کہئے کہ کیا تم اللہ کو اطلاع دیتے ہو ایک ایسی چیز کی جس کی خود اسے آسمانوں اور زمین میں کوئی خبر نہیں ہے پاک ہے وہ اور بالاتر ہے اس سے کہ جو یہ شریک قرار دیتے ہیں''۔

علم مطابق واقعہ ہوتا ہے، جب کہ ان کا شریک خدا ہونا خلاف واقعہ ہے تو اللہ کو اس کا علم بھی کہاں ہو سکتا ہے، اللہ کو علم نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس شے کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ [3]

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

---

[1] ۔ لا احد اظلم ممّن اختراع کلاما او خبرا ثم اضافه الی الله ویرید به النبی ﷺ نفسه او کان فعل "او کذّب بآیته" (تبیان) یعنی اگر میں بناتا ہوں تو مجھ سا ظالم نہیں اور جو میں سچا ہوں تو جھٹلانے والوں پر یہی بات ہے۔ (موضح القرآن)

[2] ۔ افترئ علی الله کذبا نبیته الشریك الیه (جلالین)

[3] ۔ لما نفی العلم بذلك نفی المعلوم (تبیان) لو کان له شریك لعلمه اذ لا یخفی علیه شئی (جلالین)

''اور نہ تھے لوگ مگر ایک مذہب کے، پھر انہوں نے آپس میں اختلاف کیا اور اگر نہ ہوتی اللہ کی ایک بات جو پہلے سے طے شدہ تھی تو فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان ان باتوں میں کہ جن میں ان کے درمیان اختلاف تھا''۔

اس آیت کا مضمون بھی قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے ''سب ایک مذہب کے تھے'' یعنی سب کا اصلی دین اسلام تھا[1] یہ اختلاف بعد میں پیدا ہوا۔

''اگر نہ ہوتی اللہ کی ایک بات جو پہلے سے طے شدہ تھی۔'' یعنی یہ کہ اصل جزا و سزا اعمال کی آخرت میں ہوگی[2] تو یہی دنیا میں فیصلہ ہو جاتا یعنی کافروں پر عذاب نازل ہو جاتا اور دنیا میں ایک ہی دین رہ جاتا جو دین حق ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿٢٠﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی؟ کہہ دیجئے کہ غیب اللہ سے مخصوص ہے تو انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں''۔

یہ کفار کی دھاندلی تھی کہ آیات و دلائل حقانیت پیش ہونے کے باوجود[3] وہ برابر کہے جاتے تھے کہ کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی؟ اس کے جواب طرح طرح سے قرآن میں آئے ہیں۔

یہاں جو کہا جا رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نشانیاں آ چکیں، تو تم نے مانیں نہیں، اب آگے کونسی نشانی ایسی ہوگی جسے تم بھی مان لو، یہ غیب کی بات ہے، تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کرتا ہوں۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿٢١﴾

''اور جب ہم انسانوں کو رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں کسی تکلیف کے بعد جو ان پر پڑی ہے تو وہ ہماری قدرت کی نشانیوں کے بارے میں اپنی ترکیبیں لڑانے لگتے ہیں، کہہ دیجئے کہ اللہ ترکیب میں زیادہ تیز ہے، بلاشبہ ہمارے نمائندے لکھ رہے ہیں، وہ جو تم ترکیبیں لڑاتے ہو''۔

ترکیبیں لڑانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نعمت الٰہی کے لئے اعتراف کے تیار نہیں ہوتے بلکہ ایک تو اپنی ذہانتیں صرف کر کے اس کے مادی اسباب تجویز کرنے لگتے ہیں اور پھر اس نعمت الٰہی کے استعمال کے ایسے ایسے طریقے نکالتے ہیں جو مرضی الٰہی کے خلاف ہیں، یہ دونوں کفران نعمت

---

[1] ۔ علی دین واحد وھو الاسلام من لدن آدم علیہ السلام الی نوح علیہ السلام (جلالین)

[2] ۔ بتاخیر الجزآء الی یوم القیامۃ (جلالین) من انہ لا یعاجل العصاۃ بالعقوبۃ (تبیان)

[3] ۔ قد کان اتاھم بالمعجزات التی تدل علی صدقہ (تبیان)

کی صورتیں ہیں۔[1]

''اللہ ترکیب میں زیادہ تیز ہے'' یعنی اسباب بھی تو اسی کے قبضہ میں ہیں۔ وہ چاہے تو اسباب راحت کے بجائے پھر فوراً اسباب زحمت پیدا کردے۔[2]

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ لَىِٕنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

''وہ وہ ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوئے اور وہ چلیں ان (مسافروں) کو لے کر موافق ہوا کے ساتھ اور وہ اس سے خوش ہوئے تو آ گئی ان پر تیز جھکڑ کی ہوا اور آ گئیں ان پر لہریں ہر طرف سے اور انہوں نے سمجھا کہ وہ گھر گئے ہیں تو وہ پکارنے لگے اللہ کو خالص اس سے لو لگاتے ہوئے[3] اگر تو ہم کو اس سے چھٹکارا دے دے تو ضرور ہم شکر گزار ہوں گے۔ اس کے بعد جب اس نے انہیں چھٹکارا دے دیا تو ایک دم وہ دنیا میں ناحق بغاوت کرنے لگے اے لوگو! تمہاری بغاوت سے نقصان خود تمہارا ہی ہے۔ اس دینوی زندگی سے فائدہ اٹھالو، پھر ہماری ہی طرف تمہارا پلٹنا ہے تو ہم تمہیں بتائیں گے جو تم اعمال کرتے تھے۔

گزشتہ آیت میں انسان کا رویہ جو مجملاً بیان ہوا تھا، اس کی یہاں تمثیلی طور پر تفصیل ہے''۔[4]

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّیَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَیْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِیْدًا

---

[1] ۔یعنی سختی کے وقت آدمی کی نظر اسباب سے اٹھ کر اللہ پر رہتی ہے جب کام بن گیا، لگا اسباب پر رکھنے (موضح القرآن)

[2] ۔ڈرتا نہیں کہ اللہ پھر ایک سبب کھڑا کردے اسی تکلیف کا (موضح القرآن)

[3] ۔مخلصین لہ الدین الدعاء (جلالین)

[4] ۔خدا تعالیٰ بیان می فرماید کیفیت مکر و کفران نعمت (فتح الرحمن)

كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

''دنیوی زندگی کی مثال تو بس اس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا تو اس کے سبب سے مل جل کر پیدا ہوئیں زمین سے اگنے والی چیزیں جنہیں انسان و مویشی کھاتے ہیں، یہاں تک کہ جب زمین زیب و زینت کو لے چکی اور وہ سنور گئی اور اس کے باشندے سمجھنے لگے کہ انہیں اس پر قابو حاصل ہے تو آ گیا اس پر ہمارا حکم رات یا دن کو تو ہم نے اس کو کٹا پھٹا بنا دیا ایسا جیسے کہ کل اس کا وجود ہی نہ تھا، اس طرح تفصیل کے ساتھ ہم آیات پیش کرتے ہیں ان کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں''۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾

''اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگاتا ہے''۔

''سلامتی'' کے گھر ''یعنی بہشت کی طرف''[1] یہ دعوت اس کی سب ہی کو ہے اور یہ اس کا بلانا وہ ہدایت عام ہے جس کے ذریعہ سے اتمام حجت ہوتی ہے، اس کا سب کے لیے ہونا ضروری ہے۔ اب جن میں طلب خیر کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے اس کی توفیقات خاص شامل حال ہوتے ہیں، انہیں کہا گیا ہے کہ ''جسے چاہتا ہے، سیدھے راستے پر لگاتا ہے۔''

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

''جنہوں نے نیک کام کیے ہوں، ان کو ویسا ہی نیک بدلہ ملے گا اور کچھ بڑھ کر اور نہیں چھائے گی ان کے چہروں پر سیاہی اور نہ ذلت و حقارت یہ جنت والے ہیں کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جنہوں نے برے اعمال کیے تو انہیں برائی کی سزا ملے گی، ان پر ذلت و حقارت چھائی ہوئی ہوگی، اللہ سے ان کو بچانے والا کوئی نہیں ہے، گویا ان کے چہروں کو ڈھانپ دیا گیا ہوگا اندھیری رات کے ٹکڑوں سے، یہ دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

''نیک کاموں'' کے بدلے میں ''ویسا ہی'' کہا گیا پھر کہا گیا ''کچھ بڑھ کر'' کیوں کہ جزا کا بڑھ کر دینا تفضّل ہونے کی بنا پر مستحسن ہے

---

[1] ۔ یعنی الجنة (علی بن ابراھیم)

لیکن برے کاموں میں بس اتنی ہی کا اعلان ہے کیوں کہ سزا کا بڑھ کر دنیا ظلم ہے جو عدل الٰہی کے خلاف ہے۔[1]

علمائے اہل سنت جو دیدار کے قائل ہیں، انہوں نے اس سے اپنا مطلب عجیب طرح نکالا ہے کہ جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے حسنی ہے یعنی جنت اور زیادتی ہے یعنی دیدار الٰہی[2] مگر اس صورت میں اس کے بالمقابل بداعمالوں کے لیے بھی ہونا چاہیے کہ ان کے لیے ویسی ہی سزا ہے اور وہ دوزخ ہے اور اس پر زیادتی اور وہ دیدار سے محرومی مگر ایسا نہیں کہا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر جو تصریحات موجود ہیں، ان کے پیش نظر یہاں جو جزا کے لیے "الحسنی و زیادہ" کہا گیا اور سزا کے لیے جو "جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا" کہا گیا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ وہی چیز ہے جو دوسرے مقامات پر دوسرے الفاظ میں کہے گئے ہیں۔ مثلاً مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا جو نیک کام کرے، اسے دس گنا ملے گا اور جو برا کام کرے، اسے بس اتنی ہی سزا ملے گی۔[3] (انعام ۱۶۰)

اب یہاں جلالین یا ان کے پہلے صحیح مسلم کی راوی صاحب کیا کہیں گے؟ ایک جزا سے مراد لیں جنت اور پھر نو عدد کی جو زیادتی ہے، اسے کیا نو بار دیدار کے معنی میں لیں گے؟ اور پھر ایک جگہ جو راہ خدا میں خیرات کی جزا بتائی گئی ہے:

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ

مثل اس دانہ کے جس سے سات بالیاں اگیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ (بقرہ ۲۶۱)

اور پھر: وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ 'اللہ جسے چاہتا ہے اور بڑھا کر دیتا ہے' اسے کیا کہا جائے گا؟ دیدار کا شوق بھی اتنا کیا کہ قرآن کے ہر لفظ سے بلا وجہ دیدار ہی کا خواب نظر آئے۔

ہاں الحسنی و زیادۃ کا ایک اور مفہوم ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں وارد ہے جس کے قبول کرنے میں کوئی خرابی نہیں۔ وہ یہ ہے کہ الحسنی سے مراد تو ایمان و عمل کی اصل جزا ہے جس کا آخرت سے تعلق ہے اور وہ بہشت ہے اور "زیادہ" سے مراد یہ ہے کہ اس جزا کے علاوہ دنیا میں انہیں جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں، وہ اس پر مزید ہیں یہ نہیں ہے کہ یہ دنیا کی نعمتیں ان کے آخرت کے ثواب میں سے مجرا کر لی جائیں۔[4]

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾

---

[1] ۔ لان الزیادۃ علی قدر المستحق من العقاب ظلم ولیس کذلك الزیادۃ علی قدر المستحق من الثواب لان ذلك تفضل یحسن تعلہ ابتداءً (تبیان)

[2] ۔ الحسنی الجنہ وزیادۃ ھی النظر الیہ تعالیٰ کما حدیث فی مسلم (جلالین)

[3] ۔ معناہ ان لھم زیادۃ الفضل علی قدر المستحق علی طاھا تھم من الثواب وھی المضاعفۃ المذکورۃ فی قولہ: فلہ عشر امثالھا (تبیان)

[4] ۔ فاما الحسنی فالجنۃ و اما الزیادۃ فالدنیا ما اعطاھم اللہ فی الدنیا لم یحاسبھم بہ فی الأخرۃ و یجمع ثواب الدنیا والاخرۃ (علی بن ابراھیم)

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۲۹﴾ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾

''اور جس دن ہم ان سب کو محشور کریں گے، پھر کہیں گے ان سے جنہوں نے شرک کیا تھا، رہو اپنی جگہ [1] تم اور تمہارے بنائے ہوئے شریک، تو ہم تفرقہ ڈال دیں گے ان کے درمیان اور ان کے بنائے ہوئے شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔ اچھا تو اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے کہ ہم تمہاری عبادت سے بے خبر تھے۔ یہ وہ موقع ہوگا کہ جب ہر ایک نتیجہ دیکھ لے گا [2] اس کا جو وہ پہلے کر چکا ہے اور سب پلٹائے گئے ہوں گے اللہ کی طرف جو ان کا حقیقی مالک ہے [3] اور غائب ہو جائے گا ان سے جو وہ جھوٹ تہمت لگاتے تھے''۔

''تفرقہ ڈال دیں گے ان کے درمیان'' سیاق اور سباق کے لحاظ سے یہ ضمیر مشرکین اور ان کے بنائے ہوئے شرکاء کی طرف راجع معلوم ہوتی ہے۔ یعنی آج ان کا باہمی ایکا ختم ہو جائے گا اور ہر ایک شرک کے جرم کو دوسرے پر ڈال کے خود الگ ہونا چاہیے گا [4] لیکن ایک مفہوم کے لحاظ سے جو مجھے الفاظ آیت سے دور معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ضمیر مشرکین اور مومنین کی طرف راجع ہے کہ ان میں امتیاز اس دن نمایاں ہو جائے گا۔ [5]

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۖۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

''کہیے کہ کون تمہیں روزی دیتا ہے آسمان اور زمین سے یا کون ہے جو سننے کی طاقت اور نگاہوں کا مالک ہے؟ اور کون نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے اور نکالتا ہے بے جان کو جاندار سے اور کون کائنات کا انتظام کرتا ہے؟ اس پر وہ کہیں گے کہ اللہ، کہئے کہ پھر تم بچاؤ کا خیال کیوں نہیں کرتے؟ تو یہی تو تمہارا حقیقی پروردگار ہے تو کیا ہے حق کو

---

[1] ۔ مکانکم نصب بالزموا مقدرا (جلالین)

[2] ۔ دریابد ہر شخصی (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ مالک حقیقی ایشان (شاہ ولی اللہ) مالک اپنے حق کے (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔ المعنی فرقنا بین المشرکین باللہ وما اشرکوا بہ (تبیان)

[5] ۔ میزنا بینہم وبین المومنین کما فی اٰیۃ: وامتازوا الیوم ایہا المجرمون (جلالین)

چھوڑنے کے بعد سوا گمراہی کے تو کیسے تم مڑے چلے جارہے ہو''۔[1]

''سننے کی طاقت اور نگاہوں کا مالک ہے'' یعنی کون انسان کو یہ نعمتیں عطا کرسکتا ہے اور پھر ان طاقتوں کا کام کرتے رہنا بھی اسی کے اختیار سے وابستہ ہے۔[2]

جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے نکالنے کی مثال بتائی گئی ہے کہ حیوان کو برآمد کرتا ہے نطفہ سے اور پھر نطفہ کو حیوان سے۔[3]

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٣٣﴾

''اسی طرح تمہارے پروردگار کی بات سچ ہوئی ان لوگوں پر جو بداعمال ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

ان کی بدعملی، اعراض اور عناد کا تقاضا تھا جس کی بنا پر خالق نے اعلان فرمایا تھا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے، وہی نتیجہ آخر میں سامنے آ گیا، نہ یہ کہ خدا کا یہ اعلان کر دینا اس نتیجہ کے وقوع کا باعث ہوا تا کہ اس کی ذمہ داری خالق پر عائد ہو۔

سواد اعظم کے علماء اس منزل جبر و اختیار میں ہمیشہ گومگو میں رہے ہیں، اس لیے ان کی تحریروں میں دورنگی سی نظر آتی ہے چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''یعنی اللہ نے ازل سے ان کی قسمت میں یقین نہیں لکھا اور سبب اس کا بے حکمی'' (موضح القرآن)

آخر الفاظ سے ظاہر ہے کہ خالق کے فیصلہ کا سبب ان کی بے حکمی یعنی مخالفت احکام الٰہی ہے۔ نہ یہ کہ ان کی بے حکمی کا سبب خالق کا فیصلہ ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''پروردگار کی بات'' سے مراد عذاب کرنے کا فیصلہ ہو۔ اس صورت میں ''انہم لا یومنون'' کا ترجمہ ہوگا ''اس لیے کہ وہ ایمان اختیار نہیں کرتے۔[4]

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۭ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٥﴾

''کہیے کہ تمہارے والے شریکوں میں سے کیا کوئی ہے ایسا جو کائنات کو پہلے پہلے پیدا کرتا ہو، پھر اسے دوبارہ زندہ کرتا ہو، کہیے کہ اللہ وہ ہے جو کائنات کو پہلے پہل پیدا بھی کرتا ہے اور اسے دوبارہ زندہ بھی کرے گا، تو تم کس طرح

---

[1] ۔ کیف تصرفون عن الایمان مع قیام الدلیل (جلالین)

[2] ۔ ان شآء اللہ اصحها وان شآء امرضها (تبیان)

[3] ۔ حیوان را از نطفه را از حیوان (فتح الرحمن)

[4] ۔ التقدیر بانهم اولا نهم لا یؤمنون (تبیان)

منحرف ہوتے ہو؟[1] کہیے کہ کیا تمہارے والے شریکوں میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف رہ نمائی کرتا ہو؟ کہیے کہ اللہ حق کی طرف رہ نمائی کرتا ہے؟ کہیے کہ اللہ حق کی طرف رہ نمائی کرتا ہے تو کیا جو حق کی طرف رہ نمائی کرے، وہ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود اس وقت تک راستا نہ پائے جب تک کہ اسے راستہ دکھایا نہ جائے، تو تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسے فیصلے کرتے ہو''؟

ابتدائے آفرینش سے جتنے انبیاء آئے سب خدائے واحد کی طرف دعوت دیتے رہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ رہ نمائی خلائق کا نظام اسی ایک ذات کا قائم کیا ہوا ہے جسے ''اللہ'' کہتے ہیں، کوئی دوسرا واقعی خدا ہوتا تو اس کا بھی کوئی ولی کبھی آتا مگر جب ہدایت خلق ایک ہی کی طرف سے ہو رہی ہے تو ماننا پڑے گا کہ وہ خدائے واحد ایک اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

یہی وہ استدلال ہے جسے حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے اس وصیت نامہ میں جو امام حسن علیہ السلام کے نام ہے ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے:

لَوْ كَانَ لِرَبِّكَ شَرِيْكٌ لَاَتَتْكَ رُسُلُهٗ، وَلَرَاَيْتَ اٰثَارَ مُلْكِهٖ وَسُلْطَانِهٖ،

اگر تمہارے پروردگار کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے بھی رسول آتے اور اس کی سلطنت و حکمت کے بھی آثار تمہیں دکھائی دیتے۔ (نہج البلاغہ شائع کردہ احباب پبلشرز لکھنؤ ص ۷۷۵)

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

''اور ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو نہیں پیروی کرتے مگر ایک طرح کے گمان کی، بلا شبہ گمان حق تک پہنچنے میں کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ یقیناً اللہ جانتا ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو''۔

حجیت ظن کی بحث میں ارشاد الٰہی اور اس کا انعقاد

''حجیت ظن'' کی بحث میں یہ آیت اس کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے کہ ظن یعنی گمان غالب شرعاً معتبر نہیں ہے مگر یہ قابل لحاظ بات ہے کہ یہ آیت مشرکین کے بارے میں آتی ہے جو اپنا معبود اصنام کو صرف توہمات باطل کی بنا پر بنائے ہوئے ہیں انہیں کہا گیا ہے کہ ان کے پاس کوئی علمی سند نہیں ہے صرف خیال اور گمان ہے جس کی یہ پیروی کر رہے ہیں۔ یہ اصول دین کا باب ہے اور اصول دین میں کوئی بھی ظن کو معتبر قرار نہیں دیتا۔ حجیت ظن کی بحث جو ہے وہ مسائل شرعیہ کے باب میں ہے اس بناء پر اس آیت سے اس بحث میں استدلال قابل نظر ہے۔

لیکن کہا جا سکتا ہے کہ آغاز آیت یعنی وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا اس کا تعلق اگرچہ خاص مشرکین کے ساتھ ہے مگر بعد کا فقرہ:

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا

یقیناً گمان حق تک پہونچنے میں کوئی فائدہ نہیں دیتا۔

---

[1] ۔ تصرفون عن عبادته مع قيام الدليل (جلالين)

یہ ایک عام اصول کے طور پر دین وشریعت کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اس لئے محل ورود اصولِ دین سے متعلق سہی مگر اس کلیہ کے دائرہ میں احکام ومسائل شرع بھی داخل ہوجاتے ہیں اور اس سے استدلال ہر مقام پر درست قرار پاتا ہے، اس لئے بعض مفسرین اہل سنت کو جو اس آیت کے ہوتے ہوئے بھی ظن پر عمل کی گنجائش باقی رکھنا چاہتے ہیں اس کی تفسیر میں قید لگانا پڑی ہے:

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا فِیْمَا الْمَطْلُوْبُ مِنْهُ الْعِلْمُ (جلالین)

بلاشبہ گمان حق تک پہونچنے میں کچھ فائدہ نہیں دیتا'' ان چیزوں میں کہ جن میں یقین مطلوب ہے۔

حالانکہ حکمت آیت تو عام ہے یہ قید اس میں کچھ بلاوجہ سی معلوم ہوتی ہے۔

بے شک کسی خاص طریق ظنی کو جب شارع مقدس نے مستند قرار دے دیا ہے، اپنے نظام حکیمانہ کی بناء پر جو مصالح عمومی یا خصوصی پر مبنی ہوتا ہے تو پھر اس ظن پر عمل حقیقۃً ظن پر عمل ہے ہی نہیں بلکہ اس دلیل علمی پر عمل ہے جو اس ظن کے معتبر ہونے کی متقاضی ہے لہٰذا ایسے ظن کے مطابق عمل اس آیت کی رو سے ممنوع نہیں ہوسکتا۔ [1]

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾

''یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے غلط بنا دیا گیا ہو بلکہ وہ تو تصدیق ہے اس کی جو اس کے پہلے ہے اور قانون الٰہی کی تفصیل ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے''۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾

''کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ کہیے کہ پھر لے آؤ ایک سورہ اس کے مثل اور بلا لو جس جس کو بلا سکو اللہ کے علاوہ، اگر تم سچے ہو، بلکہ انہوں نے جھٹلایا اسے جس کے علم پر وہ حاوی نہیں ہیں اور جس کی حقیقت ابھی ان کے سامنے نہیں آئی، اسی طرح جھٹلاتے رہے وہ جو ان کے پہلے تھے تو دیکھو کیا ہوا انجام ان ظالموں کا''۔

یہ انسان کی کوتاہ اندیشی ہے کہ جسے پورے طور پر سمجھتا نہیں، اس کا انکار کرتا ہے اور پھر اس میں جلد بازی کا دخل ہوتا ہے کہ حقیقت ابھی سامنے نہیں آئی تو انکار کر دیا۔

---

[1] ۔انما تعبد اللہ فی الشرع فی مواضع بالرجوع الی الظن۔۔۔ لما فی ذلك من المصلحة (تبیان)

شاہ ولی اللہ نے لما یاتھم تاویلہ کا ترجمہ کیا ہے:

وہنوز نیامدہ است مصداق وعدۂ وے

اور ابھی وہ جس پر اس کا وعدہ منطبق ہوتا ہے آیا نہیں ہے۔

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے بطور شرح لکھا ہے:

''اس کی حقیقت نہیں آئی یعنی جو وعدہ ہے اس قرآن میں، وہ ابھی ظاہر نہیں ہوا ہے'' (موضح القرآن)

اس کے بعد کیا قابل افسوس بات نہیں ہے یہ کہ اس امت کا ایک طبقہ بھی یہی کر رہا ہے کہ مہدی منتظرؑ کے وعدہ کا مصداق چونکہ ابھی تک سامنے نہیں آیا، اس لئے وہ بجائے انتظار کے انکار پر آمادہ ہو گیا ہے۔ ہماری تفسیر بتاتی ہے کہ یہ آیت رجعت ہی کے بارے میں ہے۔ [1]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾
وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا
بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

''اور ان میں ایسے بھی ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو ان پر ایمان نہیں لاتے اور تمہارا پروردگار خوب جاننے والا ہے فسادیوں کا اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو کہیے کہ میرے لئے میرے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال، تم بے تعلق ہو اس سے جو میں کرتا ہوں اور میں بے سروکار ہوں اس سے جو تم کرتے ہو''۔

یہ روادارانہ انداز تبلیغ ہے جو دوسرے کو اگر وہ عناد و انکار پر بالکل تلا ہوا نہ ہو، اپنے موقف پر غور کرنے کے لئے مجبور کر سکتا ہے۔ [2]

''بے سروکار'' ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے افعال کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوگی جیسے دوسرے مقام پر یوں کہا گیا ہے کہ

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى

کوئی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

اس میں کوئی حکم شرعی ایسا نہیں ہے جس میں اختلاف اوقات سے تبدیلی پیش آنے کا امکان ہو۔ مگر بعض مفسرین بلاوجہ لکھ رہے ہیں کہ یہ آیت احکام جہاد آنے کے بعد منسوخ ہو گئی۔ [3]

دراصل یہ بعض قدیم مفسرین اہل سنت کا قول ہے مگر نظر تحقیق سے اس آیت کا جو مطلب نکلتا ہے اور جو درج ہوا، اس میں جیسا کہ ہم نے

---

[1] ۔ نزلت فی الرجعة (علی بن ابراھیم)

[2] ۔ لم یقل النبی ﷺ ھذا القول شکا فیما یجازی اللہ الکفار و المؤمنین بہ من الثواب و العقاب وانما قال علی وجہ التلطف لخصمہ و حسن العشرۃ وان یستقبلھم لما یکرھونہ من الخطاب فربما کان داعیا لھم ذٰلک الی الانقیاد والنظر الی قولہ (تبیان)

[3] ۔ ھذا منسوخ بآیۃ السیف (جلالین)

لکھا، نسخ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ [1]

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اوران میں کچھ تو وہ ہیں جو آپ کی باتیں توجہ سے سنتے ہیں مگر کیا آپ بہروں کو بھی سنا دیں گے؟ چاہے وہ عقل سے کام نہ لیتے ہوں اوران میں کچھ وہ ہیں جو آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں مگر کیا آپ اندھوں کو بھی راستا دکھا دیجئے گا؟ چاہے وہ دیکھیں نہ''۔

پیغمبرؐ کو تسلّی مختلف اندازوں سے دی گئی ہے ان میں سے ایک انداز یہاں ہے مطلب یہ ہے کہ جو توجہ سے سنتے ہیں، آنکھ اٹھا کر دیکھتے ہیں وہ متاثر بھی ہوتے ہیں اور ایمان قبول کرتے ہیں مگر جو آنکھیں ہوتے ہوئے اندھے بنے رہیں اور کان رکھتے ہوئے بہرے رہیں، ان کے لئے آپ کیوں اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کی ہدایت ضرور ہوجائے، جب وہ اندھے بہرے ہیں تو آپ کے لئے ممکن ہی کب ہے کہ آپ انہیں صدائے حق سنا دیں اور راہ حق دکھا دیں۔

اس تشریح کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جو توجہ سے سنتے ہیں وہ اور ہیں اور جنہیں بہرا کہا گیا ہے وہ دوسرے ہیں جو توجہ سے نہیں سنتے، اسی طرح جو نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں وہ اور ہیں اور جنہیں اندھا کہا گیا، وہ دوسرے ہیں جو نظر اٹھا کر دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔

یہ تشریح بالکل اس کے قبل کی آیت کے بھی مطابق ہے کہ:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ

ان میں سے کچھ ایمان لاتے ہیں اور کچھ ایمان نہیں لاتے۔

وہ جو ایمان لاتے ہیں وہ وہی ہیں جنہیں کہا گیا ہے کہ وہ توجہ سے سنتے ہیں آپ کی باتیں اور نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں آپ کی طرف اور اسی بنا پر وہ ایمان لے آتے ہیں اور وہ جو ایمان نہیں لاتے وہ، وہ ہیں جنہیں بہرا اور اندھا کہا گیا ہے اور جو عقل سے کام نہیں لیتے اور دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے، ان کے ایمان لانے کا بظاہر کوئی امکان بھی نہیں۔

اس میں بظاہر تو کوئی پیچیدگی نہیں ہے مگر شاہ عبدالقادر صاحب نے خواہ مخواہ اس کی تشریح میں جبر کا پہلو پیدا فرما دیا ہے وہ توجہ سے سننے والوں ہی کو بہرا اور نظر اٹھا کر دیکھنے والوں ہی کو اندھا قرار دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''یعنی کان رکھتے ہیں یا نگاہ کرتے ہیں اس توقع میں کہ ہمارے دل پر تصرف کردیں جیسا بعضوں پر ہوگیا، سو یہ بات اللہ کے ہاتھ میں ہے'' (موضح القرآن)

اب یہ جماعت بے چاری کتنی مستحق ہمدردی ہوگئی اور اب روز قیامت خالق کا اسے کفر وعدیم ایمان کی سزا دینا معاذ اللہ کتنا بڑا ظلم ہوجاتا ہے؟ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿الإسراء: ۴۳﴾

---

[1] ۔قال ابن زید ھذہ الایۃ منسوخۃ بایۃ الجھاد و علیٰ ما قلناہ لا یحتاج الیٰ ذلک (تبیان)

حالانکہ اس کے بعد بلا فاصلہ وہ آیت آتی ہے جس میں خالق اپنے سے ظلم کی نفی کر رہا ہے۔

ایک دوسری طرح سے بھی دونوں فقروں کو ایک ہی جماعت سے متعلق کیا گیا ہے ایسے انداز میں کہ جبر لازم نہیں آتا۔ اور وہ یہ ہے کہ کافروں میں کچھ ایسے ہیں جو بڑے غور سے آپ کی باتیں سنتے ہیں مگر یہ فیض حاصل کرنے کی خاطر نہیں ہوتا بلکہ نکتہ چینی کے پہلو تلاش کرنے کے لئے لہٰذا ایسا ان کا سننا نیت کے خراب ہونے کی وجہ سے مثل نہ سننے کے ہے اور اس بنا پر کہا گیا ہے کہ یہ بہروں کی طرح ہیں اور ان میں سے کچھ آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں مگر فائدہ حاصل کرنے کے لئے نہیں لہٰذا ان کا دیکھنا نہ دیکھنے کے برابر ہے اور اس دیکھنے کے باوجود اندھے ہیں جنہیں ہدایت نصیب نہیں ہوسکتی۔ [1]

اس میں ویسا ہی مخدور تو کوئی نہیں ہے جیسا پہلی تشریح میں ہے مگر اس تشریح کی یہ کڑی کہ یہ سننا نکتہ چینی کی خاطر ہے اور دیکھنا بغیر استفادہ کی نیت کے ہے الفاظ قرآن سے سمجھ میں نہیں آتے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

''یقیناً اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا مگر لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں''۔

اب یہاں عبدالقادر صاحب بھی ایک دم پلٹا کھا گئے، فرماتے ہیں:

''یعنی بعضوں کے دل میں اثر نہیں دیتا، سو ان کی تقصیر ہے کہ دل صاف کر کے نہیں سنتے''۔ (موضح القرآن)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾

''اور جس دن ہم انہیں قیامت میں اٹھائیں گے، ایسا معلوم ہوگا کہ وہ نہیں رہے اس عالم میں مگر دن کے تھوڑے حصہ میں، آپس میں ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے اس وقت گھاٹے میں ہیں وہ جو اللہ سے ملنے کو غلط کہتے تھے اور وہ صحیح راستے پر نہ تھے''۔

دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ اس دن ایک دوسرے کو پہچانتا نہ ہوگا مگر یہ دونوں باتیں درست ہیں، قبروں سے اٹھائے جانے کے بعد فطری طور پر تو ایک دوسرے کو پہچان رہے ہوں گے مگر پھر ہول محشر وہ ہوگا کہ جس سے بدحواسی اور نفسانفسی کا عالم ہوجائے گا اور اب جیسے کہ کوئی دوسرے کو پہچانتا ہی نہ ہوگا۔ [2]

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ

---

[1] ۔کانو ا یطلبون السمع الرد لا للفهم... فهم اذا سمعوه علیٰ هٰذا الوجه کانهم ختم لم یسمعوه... ثم قال : افانت تهدی العمی... ای نظر هم الیك لا علیٰ وجه الاستفادة بمنزلة نظر الاعمی الذی لا یبصر (تبیان)

[2] ۔یعرف بعضهم بعضا اذا بعثوا ثم ینقطع التعارف لشدّة الاهوال (جلالین)

شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اور خواہ ہم آپ کو آنکھوں سے دکھا دیں کچھ وہ باتیں جن کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں یا آپ کو پہلے ہی دنیا سے اٹھالیں، بہرصورت ان کی رجوع ہماری ہی طرف ہوتی ہے پھر اللہ گواہ ہے اس پر جو یہ کرتے تھے''۔

یعنی آخر میں اسلام غالب آ کر رہے گا اور دوسری تمام جماعتیں مضمحل ہو کر رہیں گی اب اگر ابھی تک یہ بات پورے طور پر نظر نہ آتی ہو اور یقیناً نظر نہیں آتی تو ایمان بالقرآن کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے لئے آیندہ وقت کا انتظار کیا جائے کیونکہ یہ مختتم غلبہ کا اعلان ہے ایسا وقتی غلبہ نہیں جو ہوا کے جھونکوں کی طرح سامنے آئے اور پھر ختم ہو جائے۔ اس لئے شاہ عبدالقادر صاحب نے یہاں بلا وجہ اپنے منظور نظر صحابہ کی مدح کا جو پہلو پیدا کیا ہے کہ:

''غلبہ اسلام کچھ حضرتؐ کے روبرو ہوا اور باقی ان کے خلفاء سے (موضح القرآن) یہ درست نہیں ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾

''اور ہر قوم کے لئے ایک پیغمبر ہوتا ہے تو جب ان کا پیغمبر آ جاتا ہے تو ان کے درمیان عدالت کے ساتھ فیصلہ ہو جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں ہوتا''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق کی طرف سے رہ نما کے آئے بغیر اتمام حجت نہیں ہوتا اس لئے سزا کا استحقاق پیدا نہیں ہو سکتا مگر جب خالق کی طرف کا رہ نما آ جاتا ہے تو اب جو مخالفت کرتے ہیں انہیں سزا کا استحقاق ہوتا ہے اور ظلم لازم نہیں آتا۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے کچھ عجیب سا لکھا ہے کہ:

عمل آگے سے ہوتے ہیں لیکن رسول کے پہونچنے سے سزا ملتی ہے (موضح القرآن)

اس کا مطلب واضح طور پر سمجھ میں نہیں آتا۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو؟ کہہ دیجئے کہ میں خود اپنے لئے نہ کسی نقصان پر قبضہ رکھتا ہوں اور نہ کسی نفع پر مگر جو اللہ چاہے، ہر قوم کی ایک عمر ہوتی ہے جب ان کی عمر پوری ہو جاتی ہے تو ذرا دیر نہ پیچھے ہٹتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں''۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ

الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾
ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ
تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕ وَمَآ اَنْتُمْ
بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾

''کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر تم پہ اس کا عذاب رات کے وقت یا دن کو آجائے تو وہ کیا چیز ہوگی جس کی گنہگار لوگ جلدی کر رہے ہیں؟ کیا اس کے بعد جب وہ آجائے گا تو تم ایمان لاؤ گے؟ کیا اب! حالانکہ اس کی تم جلدی کر رہے تھے۔ پھر کہا جائے گا ان سے جو ظالم تھے کہ چکھو ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب، کیا تمہیں سزا مل رہی ہے سوا اس کے کہ جو تم اعمال کرتے تھے؟ اور وہ آپ سے دریافت کر رہے ہیں کہ کیا یہ سچ ہے؟ کہیے کہ ہاں خدا کی قسم وہ ضرور سچ ہے اور تم بے بس نہیں بنا سکتے''۔

یعنی اللہ جب تمہیں سزا دینے کے لئے اپنی گرفت میں لائے تو تم بھاگ کر اس کے قبضہ سے نکل نہیں سکتے کہ وہ بے بس ہو جائے۔ [۱]

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا
رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾

''اور اگر ہر اس شخص کی ملک میں جو ظالم ہے، وہ سب ہو جو روئے زمین پر ہے تو وہ معاوضہ میں دے دے اور وہ دل میں چھپائے ہوئے ہوں گے پشیمانی جب کہ عذاب کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے اور ان کے درمیان فیصلہ ہوا ہوگا، عدالت کے ساتھ [۲] اور ان پر ظلم نہیں ہو رہا ہوگا''۔

پشیمانی کا دل میں چھپانا، اس انسان کی نفسیاتی کیفیت کا اظہار ہے کہ وہ پشیمان ہوتا بھی ہے تو کوشش یہی کرتا ہے کہ لوگوں پر اس کا اظہار نہ ہوتا کہ کسی دوسرے کو طعن و تشنیع کا موقع نہ ملے اس کے لئے حدیث نبوی بھی نقل ہوئی ہے اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی روایت آئی ہے۔ [۳]

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا

---

[۱] ۔ای لستم تقدرون علیٰ اعجاز اللہ عما یرید من انزال العذاب بکم (تبیان)

[۲] ۔بالقسط بالعدل (جلالین)

[۳] ۔روی انه قیل لرسول اللہ ما یعنیهم اسرار الندامة وهم فی النار قال یکرهون شماتة الاعداء وروی مثله عن ابی عبداللہ علیہ السلام (تبیان) عن جابر ابن عیسیٰ رواہ عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال قیل له ما ینفعهم اسرار الندامة وهم فی العذاب قال کرهوا شماتة الاعداء (علی بن ابراهیم)

يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

''معلوم ہونا چاہیے کہ بلاشبہ اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، آگاہ ہو کہ بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر ان میں کے زیادہ نادانی میں مبتلا ہیں۔ وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف تم کو پلٹنا ہے''۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اے انسانو! تمہارے پاس آیا ہے وعظ و نصیحت کا مجموعہ تمہارے پروردگار کی طرف سے اور سینوں کے اندر کی بیماریوں کا علاج اور رہنمائی اور رحمت ایمان لانے والوں کے لئے کہیے کہ یہ اللہ ہی کی طرف کے فضل و کرم سے ہے تو اس پر تو انہیں خوش ہونا چاہیے، وہ بہتر ہے اس دولت سے جو وہ جمع کرتے ہیں''۔

موعظہ، وشفاء وہدایت ورحمت، یہ سب اوصاف جن کا پہلی آیت میں ذکر ہے، قرآن مجید اور شریعت محمدؐیہ سے متعلق ہیں۔ [1]

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾

''کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ جو اللہ نے تمہارے لئے روزی کا سامان پیدا کیا ہے تو تم نے اس میں حرام اور حلال خود قرار دے لئے ہیں، کہیے کہ کیا اللہ نے تمہیں حکم دیا تھا یا تم اللہ پر غلط تہمت لگاتے ہو''۔؟

بغیر ثبوت شرعی کسی چیز کو حرام سمجھنا اللہ پر بہتان ہے اور کفران نعمت بھی ہے

چاہے یہ آیت نازل ہوئی ہو اہل کتاب کے بارے میں کہ انہوں نے دل بخواہ کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ کو حرام قرار دے لیا تھا۔ [2]

مگر اس سے یہ عام اصول بھی مستفاد ہوتا ہے کہ حرام اور حلال کے احکام کو خالق کی جانب سے ہونا چاہیے کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے دل سے کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ چیزوں کو حرام قرار دے لے، اگر ایسا کرے گا تو وہ خالق پر ایک افتراء و بہتان کی حیثیت رکھے گا، اسی لئے جناب شیخ مرتضیٰ انصاری رحمہ اللہ نے اس آیت کو اس کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ جب تک خالق کی طرف سے کوئی حکم اس کے مقرر کردہ ذرائع سے ثابت نہ ہو صرف گمان پر حکم لگانا حرام و ناجائز ہے۔

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ

---

[1] ۔یرید بذلك القرآن ما اتی به النبی من الشریعة (تبیان)

[2] ۔هو ما احله وحرمه اهل الکتاب (علی بن ابراهیم)

عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾

''اور کیا ہے گمان ان کا جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں قیامت کے دن اور بلا شبہ اللہ لوگوں پر بڑے فضل وکرم والا ہے مگر زیادہ تر لوگ شکر گزاری نہیں کرتے''۔

کیا ہے گمان؟ یعنی قیامت کے دن جو جزا وسزا کا دن ہے ان کا گمان چیز ہی کیا ہے؟ اس کی وقعت ہی کیا ہے؟ وہاں ان کے گمان پر تو فیصلہ نہیں ہوگا۔

دوسرے معنی یہ قرار دیے گئے ہیں کہ ان کا روز قیامت کے متعلق کیا گمان ہے یعنی خدا ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا، اس بارے میں ان کا کیا تصور ہے؟ [1]

آخری الفاظ بتاتے ہیں کہ اللہ نے انسانی رزق کے لئے جو چیزیں پیدا کی ہیں، ان میں سے کچھ کو بلا وجہ حرام قرار دے لینا کفرانِ نعمت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس سے ہمارے اخباری اصحاب کو بھی ہوشیار ہونے کی ضرورت ہے، جنہوں نے حالت شک میں احتیاط اسی میں سمجھی ہے کہ اس شے کو حرام سمجھ لیا جائے، حالانکہ قرآن مجید پتہ دے رہا ہے کہ اس سے کفران نعمت کی زد میں آنے کا خطرہ ہے۔

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَاۤ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦١﴾

''اور نہیں ہوتے آپ کسی حالت میں اور نہ اس کی طرف کی کوئی چیز آپ پڑھتے ہیں اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو مگر تمہارے اوپر حاضر و ناظر ہوتے ہیں جب تم اس میں بڑے انہماک کے ساتھ مصروف ہوتے ہو [2] اور تمہارے پروردگار سے کوئی ذرہ بھر چیز پوشیدہ نہیں رہتی زمین میں نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور بڑی مگر یہ کہ وہ ایک واضح نوشتہ میں موجود ہے''۔

یعنی لوح محفوظ میں جو علم الٰہی کی خزانہ دار ہے [3] یہ اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور ہی سب سے بڑا خوف الٰہی کا معیار ہے جو اصلاح نفوس کے واسطے اور بے راہ روی سے روکنے کے لئے کافی ہے مگر جو گناہگار ہیں ان پر ان کا اثر مرتب نہیں ہوتا اور اثر پذیر اس سے سب سے زیادہ

---

[1] ۔لمعنی ای شئ یظن الذی یکلفربون علی اللہ انه یصیبهم یوم القیامة علیٰ افترائهم علیٰ اللہ ای لا ینبغی ان یظنوا ان یصیبهم علی ذلك العذاب والعقاب (تبیان)

[2] ۔فالا فاضة الدخول فی العمل علیٰ جهة الانصاب علیه وهو الانبساط الیه فالعمل ماخوذ من فیض الانآء اذا انصب من جوانیه (تبیان)

[3] ۔مبین بین هو اللوح المحفوظ (جلالین)

وہی ہوتے تھے جن کا دامن گناہ سے کبھی آلودہ ہی نہ ہوا تھا۔ [1]

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٤﴾

''آگاہ ہو کہ اللہ کے جو دوست ہیں، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ انہیں رنج ہوتا ہے جو ایمان لائیں اور پرہیزگار رہیں، ان کے لئے خوش خبری ہے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ کی باتوں میں تبدیلی نہیں ہوتی، وہ بہت بڑی کامیابی ہے''۔

دنیوی خوف اور رنج پیش آتے ہیں مگر یہ سب عارضی ہوتے ہیں نتیجہ میں ان کے واسطے کامیابی و کامرانی کے سوا کچھ اور نہیں ہے [2] جس کی خوشخبری ان کو دنیوی زندگی میں مل جاتی ہے جو پیش آمدہ مشکلات و مصائب کے خوف اور رنج کو خوش گوار بنا دیتی ہے اور یہ خوش خبری قرآن و حدیث کے ان عام اعلانات سے بھی ملتی ہے جو ایمان اور تقویٰ پر گراں قدر اجر و ثواب کے متعلق ہیں اور کبھی خصوصی طور پر خواب وغیرہ کے ذریعہ سے جس کے متعلق اہل سنت کے یہاں بھی حدیث ہے [3] اور ہمارے یہاں بھی [4] اور آخرت میں اس کے مظاہر و آثار آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٥﴾

''اور ان کی گفتگو آپ کو رنجیدہ نہ کرے، یقیناً عزت تمام کی تمام اللہ کے لئے ہے، وہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

مشرکین رسولؐ کی شان میں جو توہین آمیز جملے کہتے تھے، ان کے مقابلہ میں رسولؐ کو تسلی دی جا رہی ہے [5] کہ ان کی ان باتوں سے آپ کی شان گھٹ تھوڑی سکتی ہے اصل عزت کا مالک اللہ ہے اور جب اس کی طرف سے آپ کو عزت دی گئی ہے تو دنیا میں وہ کون ہے جو آپ کو سبک اور حقیر کر سکے؟

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿٦٦﴾

---

[1] ۔ كان رسول الله صلى الله عليه وآله اذا قرا هذه الاية بكى بكاءً شديدا (على بن ابراهيم)

[2] ۔ فى الأخرة (جلالين)

[3] ۔ فسرّت فى حديث صحّحه الحاكم بالرّؤيا الصالحه يراها الرجل او ترىٰ له (جلالين)

[4] ۔ فى الحياة الدّنيا الرّؤيا الحسنة يراها المؤمن و فى الأخرة عند الموت (على بن ابراهيم) قال ابو جعفر عليه السلام اللبشرىٰ فى الدنيا الرويا الصالحة يراها المومن لا ترىٰ له (تبيان)

[5] ۔ المراد به تسلية النبى عن قولهم الذى يؤذونه به (تبيان)

''آگاہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر شرکاء کی جو دہائی دیتے ہیں وہ کاہے کی پیروی کرتے ہیں؟ وہ نہیں پیروی کرتے کسی چیز کی سوائے گمان کے اور نہیں ہیں وہ سوا اس کے کہ اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں؟''

مایتبع میں جو "ما" کا لفظ ہے یہ قافیہ بھی ہوسکتا ہے جس کے بعد معنی یہ ہوں گے کہ جو اللہ کو چھوڑ کر دہائی دیتے ہیں وہ نہیں پیروی کرتے کچھ اور شرکاء کی [1] وہ نہیں پیروی کرتے کسی چیز کی سوا گمان کے مگر ہمیں یہ قول زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کہ ماسوا الیہ ہے جس کی بنا پر وہ ترجمہ ہوا کہ وہ کاہے کی پیروی کرتے ہیں۔ [2]

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

''وہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے رات کو قرار دیا، اس لئے کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو دیکھنے والا، بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں''۔

دن خود دیکھنے والا نہیں ہوتا مگر چونکہ دن کو چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں، اس لئے محاورۂ عرب میں دن کی صفت ''دیکھنے والا'' قرار پاتی ہے جس کی مثال ایک بہت زیادہ شائع وذائع محاورہ ہے جو اردو کا بھی تقریباً جز سمجھا جاسکتا ہے ''قائم اللیل و صائم النھار'' جس کے معنی یہ ہوئے کہ ''نماز گزار راتوں والا اور روزہ دار دنوں والا'' ظاہر ہے کہ راتیں نماز گزار اور دن روزہ دار نہیں ہوتے۔ مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص راتوں میں نماز پڑھتا رہتا ہے اور دنوں میں روزہ سے رہا کرتا ہے۔

بس اسی طرح دن کو دیکھنے والا کہا گیا ہے، اس اعتبار سے کہ دن میں چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ [3]

مبصرا کے لفظی ترجمہ میں ''دکھلانے والا'' کہنا درست [4] نہیں ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا

---

[1] ۔پیروی نمی کنند (شاہ ولی اللہ) نہیں پیروی کرتے وہ (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔یحتمل "ما" فی قولہ "وما یتبع" وجھین: احدھما ان تکون بمعنی ای کانہ قال: وای شئ یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکاء (تبیان)

[3] ۔جعل النھار مبصرا وانما یبصر فیہ (تبیان) اسناد الابصار الیہ مجاز لانہ مبصر فیہ (جلالین)

[4] ۔دن کو دکھلانے والا (شاہ رفیع الدین)

مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

''انہوں نے کہا کہ اللہ نے ایک بیٹا بنایا ہے [1] پاک ہے اس کی ذات، وہ بے نیاز ہے، اس کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، تمہارے پاس کوئی دلیل اس پر نہیں ہے، کیا تم اللہ پر منڈھتے ہو ایسی بات جو تم جانتے نہیں ہو۔ کہہ دیجئے کہ بلاشبہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھتے ہیں وہ بہتری حاصل نہیں کریں گے، دنیا میں تھوڑا فائدہ اٹھالیں، پھر ہماری طرف ان کی رجوع ہوگی، پھر ہم ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے بدلے میں اس کے جو وہ کفر اختیار کرتے تھے''۔

پہلے پارہ کی ایک آیت کے ذیل میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک بیان آچکا ہے کہ نصاریٰ کا ایک فرقہ اس کا قائل ہے کہ مسیح، اللہ کے بیٹے نہیں ہیں مگر اللہ نے ان کو متبنیٰ بنالیا ہے اور انہیں اپنے کاموں میں شریک کرلیا ہے انہوں نے اِتّخذ کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ قرآن نے اسی فرقہ کی رد کی ہے مگر اس آیت کے ذیل میں ہم نے اس خیال سے اختلاف کیا تھا اور بتایا تھا کہ وہاں رد میں جو الفاظ کہے گئے ہیں وہ حقیقی ابن ہونے کی رد بتلاتے ہیں۔ اس طرح کے متبنیٰ بنائے جانے کی نہیں مگر یہاں آیت میں بعد میں جو الفاظ ہیں ان سے یہ سمجھ میں ضرور آتا ہے کہ یہ اسی متبنیٰ بنانے کی رد ہے۔

پہلے یہ کہنا کہ هو الغنی یعنی وہ بے نیاز ہے، اس کو دوسرے کی ضرورت نہیں [2] دوسرے یہ کہنا کہ ایسی بات کہتے ہو جس کا کوئی ثبوت نہیں، تم جھوٹ کہتے ہو، ان سب سے ایسا پتہ چلتا ہے کہ یہ وہ ابن حقیقی ہونے کا عقیدہ نہیں ہے جو بالکل محال عقل ہے اور خدا کی ذات کا بے مثال ہونا اس سے مانع ہے بلکہ یہ وہی ابن قرار دینے کا تصوّر ہے جس کا ایک جز کہ اس نے اپنا شریک قرار دیا ہے، اس کی یہ کہہ کر رد کی گئی ہے کہ اللہ تنہا کیا خدائی کے کام انجام نہیں دے سکتا۔ جو وہ شریک قرار دے اور پھر بیٹا بنانے کی ردیوں کی جارہی ہے کہ اپنا بیٹا قرار دینا، یہ تو اللہ کا عمل ہے کیا اس کی طرف سے تمہارے پاس کوئی پیغام آیا ہے کہ میں نے مسیح کو اپنا بیٹا قرار دیا۔ پھر بلاوجہ اللہ پر تہمت کیوں لگاتے ہو؟!

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰۗىِٕفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

---

[1] ۔فرزند گرفته است خدا (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔انما یطلب الولد من یحتاج الیه (جلالین)

''اوران کے سامنے نوحؑ کا واقعہ بیان کیجئے کہ جب کہ انہوں نے اپنی قوم والوں سے کہا: اے میری قوم والو! اگر تم پر شاق ہے میرا قیام اور میری نصیحت کرنا آیاتِ الٰہی کے ساتھ تو میرا تو بھروسا صرف اللہ پر ہے تو تم اپنے تمام مددگاروں کو ساتھ میں ملا کر اپنی مہم کی تیاری کرو [1] پھر تمہیں اس میں کوئی تذبذب وتردد بھی نہیں ہونا چاہیے پھر کر گزرو میرے ساتھ جو کرنا ہو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو، اب اگر تم روگردانی کرتے ہو تو میں نے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگا ہے میرا معاوضہ نہیں ہے مگر اللہ پر اور میں مامور اس پر ہوں کہ اس کے سامنے سر جھکائے رہوں، اس پر ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا تو ہم نے انہیں چھٹکارا دیا اور انہیں کہ جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے اور انہیں دوسری جگہ متمکن کیا، اور غرق کر دیا انہیں کہ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا تو دیکھو کیسا برا انجام ہوا ڈرائے جانے والوں کا''۔

جناب نوح علیہ السلام اور ان کی کشتی اور طوفانِ عذاب کا تذکرہ متفرق طور پر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ہوا ہے یہاں وہ پورا واقعہ بیان نہیں ہوا۔ صرف کشتی اور غرق کا لفظ ہے جو اس پورے واقعہ کی تفصیل کی طرف اجمالی اشارہ کرتا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۷۴

''پھر ان کے بعد بہت سے پیغمبر ان کی قوموں کی طرف ہم نے بھیجے تو وہ ان کے پاس معجزے لے کر آئے [2] مگر وہ ایمان نہیں لانے والے تھے اسی پر کہ جسے پہلے جھٹلا چکے تھے اس طرح ہم مہر لگا دیتے ہیں ظلم وتعدی کرنے والوں کے دلوں پر''۔

''ان کے بعد'' یعنی نوح کے بعد [3] بہت سے پیغمبر آئے جیسے حضرت ابراہیم، ہود اور صالح علیہم السلام وغیرہ''۔

''مہر لگا دیتے ہیں ظلم وتعدی کرنے والوں کے دلوں پر'' اس سے ظاہر ہے کہ مہر لگنا یعنی سلب توفیقات الٰہیہ نتیجہ ہوتا ہے خود اختیاری ظلم و تعدی کا، نہ کہ اس پر مجبور کرنے والا سبب۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝۷۵ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۶ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا

---

[1] ۔ یعنی سمجھانے سے برا مانتے ہو تو جو کر سکو میرا کر ڈالو (موضح القرآن)

[2] ۔ فاتوهم بالحجج والمعجزات الدالة على صدقهم (تبیان)

[3] ۔ من بعده اى نوح (جلالین)

يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ۝۷۷

''پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد موسیٰ ؑ اور ہارون ؑ کو فرعون اور اس کے یہاں کے بڑے بڑے آدمیوں کی طرف [1] اپنی نشانیوں کے ساتھ تو انہوں نے تکبر سے کام لیا اور وہ بڑے گنہگار لوگ تھے تو جب ان کے پاس حق آیا ہمارے پاس سے تو انہوں نے کہا یقیناً یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا کیا تم حق کو ایسا کہتے ہو جب کہ وہ تمہارے پاس آیا، کیا یہ جادو ہے؟ اور جادوگر لوگ کبھی بہتری حاصل نہیں کرتے''۔

اس میں دلیل اعجاز کی طرف بھی اشارہ ہے جس کی تشریح ہم نے ''مقدمہ تفسیر میں کی ہے یعنی اگر یہ جادو ہوتا تو خدا اسے باطل کر دیتا اور جب اس کے باطل کرنے کی کوشش کرنے والے ساحر خود ہی شکست کھائیں گے جیسا کہ بعد میں آئے گا تو اس سے سمجھ لینا چاہیے کہ یہ پروردگار کی طرف کا حق ہے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ۝۷۸ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ۝۷۹ فَلَمَّا جَاۗءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ۝۸۰ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ۝۸۱ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ۝۸۲

''انہوں نے کہا کہ کیا تم آئے ہو اس لئے کہ ہمیں پھیرو اس سے کہ جس پر ہم نے باپ داداؤں کو پایا ہے اور تمہارے لئے بڑائی ہو اس سرزمین پر [2] اور ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور فرعون نے کہا کہ لاؤ میرے پاس ہر بڑے واقف کار جادوگر کو تو وہ جادوگر آئے تو ان سے موسیٰ نے کہا کہ پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو تو جب انہوں نے پھینکا، موسیٰ ؑ نے کہا کہ جو تم لائے ہو، وہ جادو ہے یقیناً اللہ اسے باطل کر دے گا، بلاشبہ اللہ ٹھیک نہیں رہنے دیتا کام فسادیوں کا اور اللہ حق کو اپنی باتوں سے ثابت کر دے گا، چاہے گنہگار لوگ ناپسند کریں''۔

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ کا ترجمہ ہم نے اسے ایک جملہ قرار دے کر یوں کیا ہے کہ ''جو تم لائے ہو، وہ جادو ہے'' دوسرے مترجمین بھی اس سے متفق ہیں [3] مگر ایک تشریح کی بنا پر اس جملہ کا ترجمہ یوں ہوتا ہے کہ کیا ہے وہ جو تم لائے ہو؟ وہ تو جادو ہے'' [4]

---

[1] ۔ الملاء الجماعة الذين هم وجوه القبيلة مأخوذ من انهم تملأ الصدور هبتهم عند منظرهم (تبيان)

[2] ۔ ارض مصر (جلالين)

[3] ۔ آنچه آورده ايد سحر است (شاه ولی الله) جو کچھ لائے ہو تم ساتھ اس کے جادو ہے (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔ ما استفهامية مبتداء خبره جئتم به (جلالين)

مذکورہ بالا آیات میں معجزہ کی حقانیت کا عقلی فلسفہ درج ہے جیسا کہ اس کے پہلے ابھی آیت ۷۷ کے ذیل میں ہم نے مجملاً اشارہ کیا ہے وہ اب ان آیات میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے جس پر مقدمہ تفسیر میں ہم نے ان آیات کو پیش کرتے ہوئے تبصرہ کیا ہے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

''تو نہیں ایمان لائے موسیٰ علیہ السلام پر مگر ان کی قوم کے کچھ بچے فرعون اور ان کے بڑے آدمیوں سے سہمے ہوئے کہ کہیں وہ انہیں سزا نہ دیں اور بلاشبہ فرعون سرکشی کرنے والا تھا روئے زمین پر اور حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے تھا''۔

''ان کی قوم'' سے بقرینۂ اتصال وتقدم ذکر سمجھ میں یہی آتا ہے کہ ''موسیٰ کی قوم'' یعنی بنی اسرائیل [1] لیکن بعض لوگوں نے اس ضمیر کو فرعون کی طرف عائد کیا ہے کہ اس کی بھی قوم کے کچھ بچے ایمان لائے۔ [2]

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور موسیٰ ؑ نے کہا اے میری قوم والو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو پھر اسی پر بھروسہ رکھو اگر تم مسلم ہو، اس پر انہوں نے کہا کہ اللہ ہی پر ہم بھروسا کرتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہمیں ظالم جماعت کا تختۂ مشق نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہمیں نجات دے اس کافر جماعت سے''۔

اللہ پر ایمان اس مرکز کا صحیح تصور ہے جو انسان کا ملجا وماوی ہوسکتا ہے اور ''اسلام'' عملی منزل میں اس کے تقاضے کو پورا کرتا ہے کہ اپنے تمام امور کو اس پر چھوڑ دے پھر کسی بات کی پرواہ نہ رکھے، اسی لئے شروع میں کہا گیا ہے اگر تم ایمان لائے ہو اور آخر میں کہا گیا اگر تم مسلم ہو۔ [3]

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

''اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف کہ جگہ لو اپنی قوم کے لئے مصر کے گھروں میں اور بناؤ اپنے

---

[1] ۔جماعتی از قوم وے (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔طائفة من اولاد قومه ای فرعون (جلالین)

[3] ۔قوله ''ان کنتم مسلمین'' بعد قوله ''ان کنتم اٰمنتم باللّٰه'' لتبین المعنی بالصفتین من الاسلام والایمان علی ان الثقة باللّٰه توجب الاستعلام لامره (تبیان)

گھروں کو قبلہ اور نماز کی پابندی کرو اور خوش خبری دو ایمان والوں کو"۔

"گھروں کو قبلہ بناؤ" اس کے ایک معنی یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ گھروں کو قبلہ رخ بناؤ۔[1]

حالانکہ یہ ان الفاظ کے معنی نہیں ہوتے ہیں اس کا مطلب ہماری قدیم تفسیر میں یہ درج ہے کہ نماز اپنے گھروں کے اندر ادا کرو[2] یعنی راز فاش نہ ہو اور فرعون والوں کے شر سے محفوظ رہو۔

پہلے معنی قرار دینے والے بھی شاید یہی مطلب قرار دیتے ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

"مساجد البیت بناکنند" (فتح الرحمن)

اپنے گھروں کے (اندر) مساجد بناؤ۔

تفسیر جلالین میں ہے:

مصلّی یصلّون فیه لیأمنوا من الخوف وکان فرعون منعهم من الصلوٰة

قبلہ یعنی نماز کی جگہ کہ وہیں نماز پڑھیں تا کہ ضرور دشمن سے محفوظ رہیں کیونکہ فرعون انہیں نماز سے روکتا تھا۔

اب دیکھنے کی چیز ہے کہ یہ تقیہ کی تعلیم نہیں تو کیا ہے؟

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

"موسیٰ نے کہا اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے ساتھ کے بڑے آدمیوں کو اس دنیوی زندگی میں زیب و زینت اور بہت اموال دے رکھے ہیں، اے پروردگار! نتیجہ اس کا یہ ہے کہ[3] وہ تیرے راستے سے بہکاتے ہیں، اے ہمارے مالک! نیست و نابود کر دے ان کے اموال اور سختی کر ان کے دلوں پر کہ جب تک درد ناک عذاب وہ دیکھ نہ لیں گے ایمان نہیں لائیں گے۔ اس نے کہا کہ تم دونوں کی دعا قبول ہوتی ہے اب تم ذرا ٹھیک رہنا اور ان کے راستوں کی پیروی نہ کرنا جو علم نہیں رکھتے"۔

دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی بیان ہوئی ہے ممکن ہے جناب ہارون علیہ السلام نے آمین کہی ہو کیونکہ جواب موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں کو مخاطب

---

[1] ۔بسازید آن خانہای خودرا قبلہ رو (شاہ ولی اللہ) کرو گھروں اپنوں کو رو بقبلہ (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔امروا ان یصلوا فی بیوتهم (علی بن ابراهیم)

[3] ۔لیضلوا فی عاقبة (جلالین)

کر کے دیا گیا ہے [1] اور تنبیہ پوری قوم بنی اسرائیل کو ہے کہ اب تمہاری خواہش کے مطابق تمہارا دشمن تباہ تو کیا جاتا ہے مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی کفران نعمت کرو اور پھر تم بھی تباہی کے مستحق قرار پاؤ۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓى
اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ
وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۹۰ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۹۱
فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ
عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝۹۲

”اور ہم نے گزار دیا، بنی اسرائیل کو دریا سے تو پیچھا کیا ان کا [2] فرعون اور اس کے لشکر والوں نے بغاوت اور ظلم و تعدی سے یہاں تک کہ جب اس کو ڈوبنے کی صورت سامنے آئی تو اس نے کہا میں ایمان لاتا ہوں کہ کوئی خدا نہیں سوا اس ذات کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں، اب؟ حالانکہ اس کے پہلے تو نے نافرمانی کی اور تو فسادیوں میں سے تھا۔ اب آج ہم تجھے تیرے جسم کے ساتھ چھٹکارا دے دیں گے تا کہ تو اپنے بعد والوں کے لئے قدرت کی نشانی رہے اور لوگوں میں زیادہ ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں“۔

پوری قوم کے ڈوبنے کے ساتھ صرف ایک آدمی کی لاش کا محفوظ طریقہ پر نکل کے خشکی پر آجانا [3] خود ہی ایک غیر فطری بات ہے اور پھر ”بعد والوں کے لئے نشانی“ ہونے کا ذکر بتاتا ہے کہ وہ جسم بعد والی نسلوں کی عبرت کے لئے محفوظ رہے گا۔

اس آیت الٰہی کا تذکرہ قرآن سے پہلے کی کتب آسمانی کے مجموعہ بائبل میں نہیں ہے اب اسے معجزہ قرآنی نہ سمجھا جائے تو کیا ہے کہ اہرام مصر کی کھدائی میں جو لاشیں برآمد ہوئی ہیں ان میں اس فرعون کی لاش بھی موجود ہے جو جناب موسیٰؑ کا ہم عصر تھا اور جو بائبل اور قرآن دونوں کی متفقہ شہادت کے مطابق غرق ہو گیا تھا۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا

---

[1] ۔ انما قال ”اجیبت دعوتکما“ والداعی موسیٰ لان دعأ موسیٰ کان مع تامین ھٰرون (تبیان)

[2] ۔ اتبعه اتباعا و تبعه بمعنی (تبیان)

[3] ۔ اما فرعون فنبذه الله وحده فالقاه بالساحل لینظر والیه ولیعرفوه (علی بن ابراهیم) نلقیك علیٰ نحوة من الارض ببدنك عریانا دون روحك (تبیان) نخرجك من البحر ببدنك جدك الذی لا روح فیه (جلالین) بر مکان بلند افگینم یعنی بروئے آب آریم ترا بهمان جسد تو یعنی بغیر تغیر (شاہ ولی اللہ)

حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

''اور ہم نے جگہ دی بنی اسرائیل کو شایانِ شان مقام پر اور اچھی اچھی نعمات سے انہیں غذا دی تو انہوں نے آپس میں اختلاف نہیں کیا، یہاں تک کہ ان کے پاس آیا علم یقیناً تمہارا پروردگار ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن ان باتوں میں جن میں وہ اختلاف کرتے تھے''۔

علم آنے کے پہلے اختلاف پیدا ہوتا تو قابل معافی ہوسکتا تھا لیکن علم آنے اور حجت تمام ہونے کے بعد انہوں نے اختلاف کیا اس لئے روز آخرت کی باز پرس سے بچ نہیں سکتے اور یہ باز پرس ہی غلط کاروں سے وہ فیصلہ قدرت ہے جو قیامت میں ان کے درمیان ہوگا۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾

''تو اگر کوئی شک ہو آپ کو اس میں جو ہم نے آپ پر اتارا ہے تو پوچھ لیجئے ان سے جو کتاب پڑھا کرتے ہیں آپ کے پہلے سے آپ کے پروردگار کی طرف سے حق آ گیا ہے تو نہ ہو جیے شک کرنے والوں میں سے اور نہ ہو جیے ان میں سے جنہوں نے آیات الٰہی کو جھٹلایا اور آپ ہونگے گھاٹا اٹھانے والوں میں سے، یقیناً وہ کہ جن پر آپ کے پروردگار کی بات پوری ہو کر رہی، وہ ایمان نہیں لائیں گے، چاہے ان کے پاس ہر طرح کا معجزہ آ جائے، جب تک کہ دردناک عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں''۔

قرآن مجید کا یہ حکیمانہ انداز بیان ہے کہ بہت سی باتیں پیغمبر خداؐ کو مخاطب بنا کر کہتا ہے اور اس سے تنبیہ دوسروں کی مقصود ہوتی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔

نہ آپ کو کوئی شک تھا نہ آپ کو اہل کتاب سے پوچھنے کی ضرورت تھی[1] نہ آپ کے لئے یہ اندیشہ تھا کہ آپ معاذ اللہ جھٹلانے والوں میں ہوں گے یہ سب باتیں دوسروں سے متعلق ہیں اور یہ راز فاش ہوتا ہے آخر کی آیات سے جب ارشاد ہوا ہے کہ: ''جن پر اللہ کی بات پوری ہو چکی ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے چاہے کتنے ہی معجزے دیکھ لیں، جب تک کہ عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ معلوم ہوا کہ شروع سے سب

---

[1] ۔روی عنه ﷺ انه قال: ما شككت ولا ان شاك وقال ابو عبدالله ؑ لم يسئال النبی ﷺ ويقول ان الخطاب متوجه الى النبی ﷺ والمواد به غيره يشهد به قوله بعد هذا: يا ايها الناس ان كنتم فی شك (تبيان)

باتیں انہی لوگوں کی تنبیہ کے لئے کہی جارہی تھیں'' جب تک عذاب آنکھوں سے نہ دیکھ لیں'' یعنی بعد از وقت [1] اس لئے کہ عذاب سامنے آنے کے بعد توبہ کرنے کی کوئی قیمت نہیں ہے جس کا مشاہدہ اس کے پہلے قصہ فرعون میں ہو چکا۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾

''تو کیوں نہ کوئی بستی اس وقت ایمان لائی جب کہ اسے اس کا ایمان فائدہ پہنچائے سوائے یونس کی قوم کے جب وہ ایمان لائے تو ہم نے ہٹا دیا ان سے رسوائی والا عذاب اس دنیوی زندگی میں اور فائدہ اٹھانے کا موقع دیا انہیں ایک مدت تک''۔

پہلے کے جملہ میں جو ضمناً ایک نفی نکلتی تھی کہ عذاب کو دیکھنے کے بعد ایمان لانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے یا یہ کہ عذاب کے آثار پیدا ہونے کے بعد بھی کوئی بستی ایسی نہ تھی جو صدق دل سے پوری کی پوری ایمان لے آئی ہو [2] اس سے استثناء ہوا ہے کہ قوم یونس کا عموماً تو ایسا ہی ہوتا رہا ہے مگر بس ایک مثال اس کی ہے کہ عذاب آنے کے بعد پوری قوم نے صدق دل سے توبہ کر لی اور وہ توبہ قبول ہوگئی۔

جناب یونسؑ کے قصہ کے اجزاء متعدد مقامات پر قرآن میں بکھرے ہوئے ہیں یہاں اتنے جز کا حوالہ دیا گیا ہے جو موضوع کلام سے متعلق ہے۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾

''اور اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو دنیا میں جتنے ہیں، سب ہی ایمان لے آتے تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کیجئے گا کہ وہ مومن ہو جائیں''؟

نظام حکمت الٰہی جبر کا متقاضی نہیں

مطلب یہ ہے کہ خالق کا نظام حکمت جبر کا متقاضی نہیں ہے ورنہ اگر خدا جبر کی طاقت سے کام لینا چاہتا تو کافر کا وجود ہی کہاں رہتا۔ [3]

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

---

[1] ۔فلا ینفعھم حینئذ (جلالین)

[2] ۔قال الحسن: معنی الایۃ انہ لم یکن فیما خلا ان یؤمن اھل قریۃ باجمعھا حتی لا یشذ منھم احد الا قوم یونس فھلا کانت القریٰ کلھا ھٰکذا (تبیان)

[3] ۔یعنی لو شاء اللہ ان یجبر الناس کلھم علی الایمان لفعل (علی بن ابراھیم)

''اور کسی متنفس کے لئے یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لائے مگر اللہ کی مشیت کے مطابق اور اللہ نجاست کا حکم لگا دیتا ہے ان پر جو عقل سے کام نہیں لیتے''۔

یعنی جبری ایمان اللہ کے اصول کے خلاف ہے تو اس طرح سے تو کوئی آدمی مومن قرار بھی نہیں پا سکتا۔ ان کا کام تو یہ ہے کہ عقل سے کام لیں اور آزاد ضمیر کے فیصلہ کے مطابق ایمان لائیں اور جو ایسا نہیں کرتے [1] انہیں اللہ کفار کے زمرہ میں شمار کر کے نجاست کا حکم لگا دیتا ہے اور مورد عذاب بناتا ہے۔ [2]

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

''کہیے کہ غور کرو، کیا کیا ہے آسمانوں اور زمین میں؟ اور نشانیاں قدرت کی اور تنبیہات فائدہ نہیں دیتیں ان کو جو ایمان نہیں لاتے۔ تو کیا انتظار کر رہے ہیں وہ سوا ایسے دنوں کے جیسے ان لوگوں پر آئے جو ان کے پہلے تھے کہیے کہ اچھا پھر انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں، پھر ہم چھٹکارا دیتے ہیں اپنے پیغمبروں کو اور ان کو جو ایمان لائے ہیں، اس طرح ہمارے ذمہ حق ہے [3] کہ ہم اہل ایمان کو چھٹکارا دیں''۔

ماتغنی الایات والنذر میں اگر ما کو استفہامیہ مانا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ بھلا نشانیاں قدرت کی اور تنبیہات کیا فائدہ دے سکتی ہیں انہیں جو ایمان نہیں لاتے۔ [4]

مطلب اس کا بھی یہی ہے کہ قدرت کی نشانیاں اور تنبیہات فائدہ نہیں دیتیں جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۖ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾

---

[1] ۔لا یعقلون یتدبرون اٰیات اللہ (جلالین)

[2] ۔قیل فی معناہ: قولان احدھما قال الفراء الرجس العذاب۔ الثانی قالا لحسن الرجس الکفر (تبیان)

[3] ۔واجبا علینا (تبیان)

[4] ۔قولان: احدھما ان تکون "ما" نفیا والاٰخر ان تکون للاستفھام (تبیان)

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

''کہیے کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کی طرف سے کچھ شک وشبہ میں گرفتار ہو تو (صاف سن لو) میں عبادت نہیں کرتا ان کی کہ جن کی اللہ کو چھوڑ کر تم عبادت کرتے ہو بلکہ میں عبادت کرتا ہوں اللہ کی جو تمہاری روح قبض کرتا ہے اور میں مامور ہوں اس پر کہ ایمان لانے والوں میں سے ہوں اور یہ (مجھ سے کہا گیا ہے) کہ تم اپنے چہرہ کو ادھر ادھر سے ہٹا کر اس دین کی طرف سیدھا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو اور اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی دہائی نہ دو جو نہ تمہیں نفع پہنچاتی ہیں اور نہ نقصان کہ اگر تم ایسا کرو گے تو یقیناً اس وقت تم ظالموں میں سے ہو گے''۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

''اور اگر اللہ تمہیں کوئی نقصان پہنچائے تو سوا اس کے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تمہارے ساتھ بھلائی چاہے تو کوئی اس کے فضل وکرم کا پلٹانے والا نہیں، اللہ اسے پہنچاتا ہے اپنے بندوں میں سے جس تک چاہتا ہے اور وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان، کہہ دیجئے کہ اے لوگو! تمہارے پاس آیا ہے حق تمہارے پروردگار کی طرف سے تو جو ہدایت حاصل کرے گا وہ صرف اپنے لئے ہدایت حاصل کرے گا اور جو گمراہ ہوگا وہ گمراہ ہو کر اپنا ہی نقصان کرے گا اور میں تمہارا کوئی ٹھیکہ دار نہیں ہوں اور پیروی کیجئے اس کی جو آپ پر وحی اتاری کی گئی ہے اور صبر وتحمل سے کام لیجئے جب تک کہ اللہ کی طرف سے فیصلہ ہو اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے''

سُوْرَۃُ هُوْدٍ

مکیّہ ۔۔۔۔۔ ۱۲۳ آیات

جناب ہود علیہ السلام کا تذکرہ تو اس سورہ کے علاوہ اور سوروں میں بھی ہے اور اس سورہ میں جس طرح جناب ہود علیہ السلام کا ذکر ہے اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہ کا بھی ذکر ہے پھر بھی نام اس کا سورہ ہود قرار پایا ہے جس کی خصوصیات کا کوئی سبب ابھی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ اس کے علاوہ جو خاص امور اس سورہ میں ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

سورۂ ہود کے خاص خاص موضوعات:

۱.....عطائے منصب بحسب قرنیہ فضیلت

۲.....قرآن کے کلام الٰہی ہونے سے منکر، قوم عرب کے فصحاء و بلغاء سے اس کے مثل دس سوروں کا مطالبہ

۳.....طوفان نوح کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ

۴.....فرزند نوح کی غرقابی، نوح علیہ السلام کی بارگاہ الٰہی میں سفارش اور خالق کا جواب

۵.....بغیر عمل صالح، پیغمبرؑ کی فرزندی بھی کارگر نہیں۔

۶.....کوہ جودی پر کشتی نوح کا ٹھہرنا

۷.....قوم لوط پر عذاب لانے والے فرشتوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرزند کی بشارت دینا، جناب سارہؑ کا تعجب اور فرشتوں کا جواب

۸.....اوقات نماز میں صبح، ظہرین اور مغربین، تین وقتوں کا تذکرہ وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴿۱﴾ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا
اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۙ﴿۲﴾ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ
يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ
تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ﴿۳﴾ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ④

''الف۔لام۔را۔وہ کتاب ہے جس کی آیات مضبوط اتاری گئی ہیں پھر یہ کہ انہیں واضح بنایا گیا ہے اس ٹھیک ٹھیک کام کرنے والے کی طرف سے جو بڑا باخبر ہے یہ کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی۔ میں تمہیں اس کی طرف سے متنبہ کرنے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں اور یہ کہ بخشش کے طلبگار رہو اپنے پروردگار سے، پھر اس کی بارگاہ میں لو لگاؤ، وہ تمہیں بہرہ مند کرے گا اچھے فائدوں سے ایک مقررہ مدت تک اور ہر مرتبہ والے کو اس کے درجہ کے مطابق عطا کرے گا اور اگر تم نے روگردانی کی تو مجھے اندیشہ ہے تمہارے لئے ایک بہت بڑے دن کے عذاب کا۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

مقطعات قرآنیہ میں ہمارے ایک ہم عصر صاحب نظر نے یہ ریسرچ کی ہے کہ ہر جگہ اس کے بعد پیغمبرؐ سے تخاطب ضرور ہے اور اس سے وہ اس نتیجہ تک پہونچے ہیں کہ یہ مختلف القاب کے ساتھ حضرت کو پکارا گیا ہے ہم نے جستجو کے بعد اکثر مقامات پر ہم عصر کی اس تلاش کو صحیح پایا ہے مگر اس سورہ میں ایسا نہیں ہے یہاں ''الٓرٰ'' کے بعد کوئی لفظ پیغمبرؐ سے تخاطب کے لئے نہیں ہے بلکہ خود آپ کی جانب سے بطور تکلم بیان ہے۔

کتاب کے معنی میں ایک پیغام کا ہونا مضمر ہے اس لئے یہ کہنے کے بعد کہ یہ کتاب ایسی ہے جو محکم ہے، مفصل ہے، خالق کی طرف سے ہے، اس پیغام کا خلاصہ شروع کر دیا گیا ہے کہ وہ پیغام یہ ہے۔[1]

اس میں یہ اعلان کہ ہر مرتبہ والے کو اس کے درجہ کے مطابق وہ عطا کرے گا[2] بہت دوررس ہے اس سے اس اصول عقلی کی تصدیق ہوتی ہے کہ ترجیح، بلا مرجح اور ترجیح مرجوح دونوں قبیح ہیں اور ان اشخاص کا تصور بالکل غلط ہے جن میں ایک حمد وثنائے کے باری تعالیٰ میں یہ کہنے کی جرأت کر ڈالتا ہے کہ ''قدیم المفضول علی الفاضل'' اسی نے غیر افضل پر مقدم کر دیا ہے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ⑤

''آگاہ ہو کہ وہ اپنے سینوں کو دہرا کیے دیتے ہیں کہ اس سے چھپنے کی کوشش کریں۔ آگاہ ہو کہ جب وہ اوڑھتے لپیٹتے ہیں اپنے کپڑوں کو تو وہ جانتا ہے اسے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ یقیناً وہ سینہ کے اندر والی باتوں کا جاننے والا ہے''۔

''سینوں کے دہرا کرنے'' کا ذکر دل کے رازوں کو چھپانے کی کوشش کے مجسم صورت میں اظہار کا ایک پیرایہ ہے یہ کوشش ایسی ہے جیسے کہ جھکے جاتے ہیں اپنے سینوں کو دبائے لیتے ہیں، سینوں کو توڑے مروڑے ڈال رہے ہیں کہ اندر کے راز کہیں باہر نکل کر طشت از بام نہ ہو جائیں۔

---

[1] ۔ بآں مضمون کہ پیغامبر گوید عبادت کنید الخ (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ دے گاہر بڑائی والے کو بڑائی اس کی (شاہ رفیع الدین)

شاہ عبدالقادر صاحب نے اس تمثیل کو بطور واقعہ شانِ نزول کی صورت سے بیان کیا ہے کہ:

''کافر لوگ کچھ مخالفت کی بات گھر میں کہتے، اس کا جواب قرآن میں اترتا، سمجھتے کہ کوئی کھڑا سنتا ہے، جا کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہہ دیتا ہے تب سے ایسی بات کہتے تو کپڑا اوڑھ کر، جھک کر، دہرے ہو کر اللہ تعالیٰ نے یہ نازل کیا''۔ (موضح القرآن)

شاہ ولی اللہ نے اس سے ایک دوسرے معنی پیدا کئے ہیں جو بظاہر بعید ہیں، وہ کہتے ہیں کہ:

می تواں گفت پیچیدن سینہ عبارت از ایں است کہ فکر ہای نا صواب کند و بشبہات واہیہ دل خودرا اطمینان و ہدو عقائد حقہ را فراموش سازد زیرآلہ صدور اینجا بمعنی علوم صدرآمدہ (فتح الرحمٰن)

کہا جا سکتا ہے کہ سینہ کے دہرا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نادرست فکریں کرتے ہیں اور کمزور شبہات کے ساتھ اپنے دل کو اطمینان دلاتے ہیں اور صحیح عقائد کو بھول جاتے ہیں کیونکہ سینوں کا لفظ یہاں سینہ کے علوم کے معنی میں آتا ہے۔

شروع میں کہا جا سکتا ہے ''کہہ کر تو موصوف نے پھر بھی احتیاط سے کام لیا تھا مگر آخر میں کیوں کہ سینوں کا لفظ یہاں سینہ کے علوم کے معنی میں آیا ہے کہہ کے جواد عا فرمایا ہے اس کے لیے کسی مستحکم ثبوت کی ضرورت ہے ورنہ الفاظ قرآنی اس کے قبول سے انکاری معلوم ہوتے ہیں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝٦

''اور کوئی چلنے پھرنے والا زمین میں نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ پر اس کی روزی ہے اور وہ جانتا ہے اس کے قیام کی جگہ اور اس کے ٹھہرائے جانے کے مقام کو۔ ہر بات ایک صاف کھلے ہوئے نوشتہ میں ہے''۔

صاف کھلے ہوئے نوشتہ سے مراد اس کے پہلے بھی اور یہاں بھی اور شاید اس کے بعد بھی لوح محفوظ ہوا کرتی ہے [1] اور ان نظیروں سے ایک اور آیت:

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿الأنعام: ۵۹﴾

کوئی خشک و تر ایسا نہیں جو ایک صاف کھلے ہوئے نوشتہ میں نہ ہو۔

اس کا یہ مطلب جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ قرآن میں ہر چیز موجود ہے، مشکوک ہو جاتا ہے مستقر ''قیام کی جگہ'' اور مستودع ''ٹھہرائے جانے کا مقام'' ان دونوں میں فرق یہ محسوس ہوتا ہے کہ مستقر تو مستقل قیام کی جگہ ہے اور ''ٹھہرائے جانے کا مقام'' عارضی قیام کا محل ہے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''جہاں ٹھہرنا ہے بہشت، دوزخ، جہاں سونپا جاتا ہے اس کی قبر''۔ (موضح القرآن)

شاہ ولی اللہ نے یہ فرق بتایا ہے کہ:

''مستودع'' جائی است کہ بغیر اختیار او آنجا نگاہ داشتہ باشند مانند صلب و رحم و ''مستقر'' جائی است

---

[1] ۔یعنی اللوح المحفوظ (تبیان) ہو اللوح المحفوظ (جلالین) یعنی در لوح نوشتہ شدہ (فتح الرحمٰن)

که باختیار خود می ماند مثل خانه" (فتح الرحمن)

"مستودع" وہ جگہ جہاں بلا اس کے اختیار کے اس کو رکھا گیا ہو، جیسے پشت پدر اور شکم مادر اور مستقر وہ جگہ ہے جہاں اپنے اختیار سے رہتا ہے جیسے گھر۔

مگر اس فرق کا دونوں الفاظ کے لغوی معنی میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔

تیسرا فرق یہ بتایا گیا ہے کہ:

مستقرها مسکنها فی الدنیا او الصلب و مستودها بعد الموت او الرحم (جلالین)

مستقر اس کے رہنے کی جگہ ہے دنیا میں یا صلب پدر میں اور ودیعت رہنے کی جگہ سے مراد موت کے بعد کی جگہ ہے یا شکم مادر میں۔

اس ایک فرق میں بطور احتمال ایک دوسرا فرق بھی ہے مگر ان میں سے کسی کی بھی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

ہمارے یہاں تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے:

مستقرها حیث یأدی باللیل و مستودعها حیث یموت

مستقر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں وہ رات کو قیام کرتا ہے اور مستودع وہ ہے جہاں اس کی موت ہوگی۔

اس کی نسبت اگر معصومؑ کی طرف ہوتی تو اس کا دینی وزن ہوتا یوں اس کی بھی حیثیت وہی ہے جو دوسرے اقوال کی ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَىِٕنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝۷

"اور وہی وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا چھ دنوں اور اس کا عرش پانی پر تھا تا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اعمال میں بہتر ہے اور اگر آپ کہیے کہ تم لوگ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے تو ضرور وہ جو کافر ہیں، کہیں گے کہ یہ تو نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو"۔

پہلا جز تو متعدد مرتبہ آچکا ہے اس کے بعد خاص جز یہ ہے کہ اس کا عرش پانی پر تھا۔ یعنی آسمان اور زمین کی خلقت کے پہلے، اس سے ظاہر ہے کہ کچھ اسلامی علمائے ریاضی کا یہ تصور کہ عرش قرآن نے آسمان ہفتم یعنی فلک افلاک ہی کو کہا ہے درست نہیں ہے بلکہ قرآن بتا رہا ہے کہ جب آسمان نہ تھے تب بھی عرش تھا۔

وہ "پانی پر تھا" اس سے ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ عرش اس طرح کی جسمانی قسم کی چیز نہیں ہے جسے ہم کسی مادی نوعیت میں محدود کریں بلکہ جلال و جبروت الٰہی کا بلند ترین مرکز جو کائنات پر حاوی ہے وہی عرش ہے اور اسی سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے پہلے کائنات میں پانی تھا یہ نہج البلاغہ میں جو تخلیق عالم کی کیفیت بیان ہوئی ہے اس کے بالکل مطابق ہے [1] تا کہ تمہیں آزمائے اس کا تعلق کا ہے سے ہے؟ ایک

---

[1] ۔علی الماء وھو علیٰ متن الریح (جلالین)

خیال یہ ہے کہ اس کا متعلق محذوف ہے یعنی آسمان وزمین کی تخلیق کے بعد پھر تمہیں پیدا کیا تا کہ تمہیں آزمائے [۱] مگر یہ محذوف جزء چونکہ سلسلہ کلام سے سمجھ میں نہیں آتا اس لئے وہ اصول تکلم کے خلاف معلوم ہوتا ہے دوسری تشریح یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اس لئے پیدا کی ہیں کہ تمہاری آزمائش کی جائے کہ تم اس سب سے کس طرح صحیح فائدہ اٹھاتے ہو [۲] یہ معنی ظاہر الفاظ سے زیادہ قریب الفہم معلوم ہوتے ہیں۔

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۸

''اور اگر ہم ان پر عذاب میں دیر کریں ایک مقررہ مدت تک [۳] تو وہ ضرور یہ کہیں گے کہ کونسی چیز اسے روکے ہوئے ہے؟ آگاہ ہونا چاہیے کہ جس دن وہ ان پر آئے گا تو اسے ان سے ہٹایا نہیں جا سکے گا اور گھیر لے گا انہیں وہی (عذاب) جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے''۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝۹ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّىْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝۱۰ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۱

''اور اگر ہم انسان کو اپنی طرف سے کچھ رحمت کا مزہ چکھائیں پھر اس سے اسے سلب کر لیں تو وہ بلاشبہ بڑا مایوس اور ناشکرا ثابت ہوتا ہے اور اگر اسے کسی نعمت کا مزہ چکھائیں بعد کسی سختی کے جو اسے لاحق تھی تو وہ کہے گا کہ بس مصیبتیں مجھ سے دور ہوئیں بلاشبہ وہ خوش ہونے والا ہوگا۔ بڑا ہی فخر کرنے والا، سوا اُن کے جو صبر وتحمل سے کام لیتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں ان کے لئے بخشش ہے اور بہت بڑا ثواب ہے''۔

صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ صبر وتحمل سے کام لیتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں یہ دونوں ٹکڑے زندگی کے دو مختلف ادوار سے متعلق ہیں، سختی ومصیبت سے متعلق صبر ہے اور جب کشائش، راحت اور آرام ہو تو عیش وعشرت میں مبتلا ہو کر فرائض سے غفلت نہ برتیں، اسے یہاں عملوا الصالحات کی لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔ [۴]

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ

---

[۱] ۔آفریدن شما آنکہ تا بیازماید شما را (شاہ ولی اللہ)

[۲] ۔لیبلوکم متعلق بخلق ای خلقها وفیها من منافع لکم ومصالح لتخبرکم (جلالین)

[۳] ۔تامّد تے شمردہ شدہ (شاہ ولی اللہ) کما قال: واذّکر بعد امّة ای حین (تبیان)

[۴] ۔صبروا فی الشدة وعملوا الصالحات فی الرخآء (علی بن ابراهیم)

عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾

''تو جیسے آپ چھوڑ دیں گے کچھ ان باتوں کو جن کی آپ کی طرف وحی ہوتی ہے اور اس سے آپ کا دم الجھتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان پر ایک خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ ارے آپ تو بس متنبہ کرنے والے ہیں اور اللہ ہر چیز کا ذمہ دار ہے''۔

''جیسے آپ چھوڑ دیں گے'' یعنی آپ کو ان کے کفر عصیان اور بے ہودہ مطالبات سے تکلیف اتنی پہنچتی ہے کہ کوئی اور ہو تو اس کام کو چھوڑ ہی دے جس پر اسے یہ سب سننا پڑتا ہے۔

اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ یہ مشرکین ایسا تصور کرتے ہیں کہ ان کا یہ تشدد، یہ زخم زبان اور یہ آزار رسانیاں آپ کو اس راہ سے ہٹا دیں گی [1] مگر یہ ہونے والی بات نہیں ہے اور یہ حسرت ان کی کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾

''کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ کہیے کہ پھر لے آؤ اس کے مثل دس ہی سورہ گھڑے ہوئے ہیں اور بلا لو جنہیں بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو''۔

دس سوروں کا جواب لانے کا مطالبہ

اس کے پہلے سورہ بقرہ کے تقریباً شروع ہی میں پہلے پارے میں ایک سورہ کے مقابلہ کی دعوت بڑی شدت وقوت کے ساتھ آچکی ہے اور اس اعلان کے ساتھ اگر تم ایسا نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکو گے تو پھر تم کو تیار ہونا چاہیے اس آگ کے لئے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی جماعت جس کے سامنے ایک سورہ کے پیش کرنے کا مطالبہ پیش ہو چکا ہو اور وہ ناکام ہو چکی ہو، پھر اس کے سامنے دس سوروں کے مثل پیش کرنے کا مطالبہ پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لئے یہ مقام ان بدیہی قرائن میں سے ہے جو اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ ترتیب قرآن مطالبہ تنزیل نہیں ہے اور اس لئے شاہ ولی اللہ صاحب کو بھی حاشیہ میں لکھنا پڑا ہے کہ:

مترجم گوید نخست بدہ سورہ مخدّی واقع شد و چوں ازاں عاجز شد ند بیک سورہ تحدی فرمود (فتح القرآن)

میں کہتا ہوں کہ پہلے دس سوروں کے مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے اور جب اس سے عاجز ثابت ہوئے تو ایک سورہ کے مقابلہ کی دعوت دی گئی۔

تفسیر جلالین میں ہے:

---

[1] ۔یوھمون علیك انھم یزیلونك عن بعض ما انت علیه من امر ربك (تبیان)

تحدی بہا اولاً ثم بسورۃ۔

پہلے یہ (دس سوروں کے لانے کا) مطالبہ کیا گیا پھر ایک سورہ کا۔

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

''تو وہ اگر تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہیں تو جان لو کہ وہ بس اللہ کے علم سے اُتارا گیا ہے، اور یہ کہ سوا اس کے کوئی معبود نہیں ہے، تو اب کیا تم اسلام لاؤ گے؟!''

''بس اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے'' یعنی اگر انسانی ہنر کا نتیجہ ہوتا تو اس مرتبۂ فصاحت وبلاغت پر ہوتے ہوئے فصحائے عرب اس کے مقابلہ سے عاجز نہ ہوتے ''اور یہ کہ سوا اس کے کوئی معبود نہیں ہے'' یعنی اگر کوئی اور معبود ہوتا جسے مشرکین مانتے ہیں تو وہ اپنے پیروؤں کی اس مہم میں امداد کیوں نہ کرتا؟

اس طرح یہ دلیل اثباتِ رسالت کے ساتھ اثبات وحدانیت کی بھی کفیل ہوگی۔

''اگر وہ تمہاری دعوت پر لبّیک نہ کہیں'' یعنی تم جنہیں اپنے مدد کے لیے بلاتے ہو، وہ تمہاری مدد کے لیے نہ آئیں یہ خطاب اُنہی مشرکین سے ہے جنہیں کہا گیا کہ ''بلا لو جنہیں بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو'' اسی لیے ہم نے کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ ''تو اب کیا تم اسلام لاؤ گے'' بعض تفاسیر اسی کے مطابق ہیں [1]۔

ایک دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں سے ہو یعنی تم نے جو اُن مشرکین کو مقابلہ کی دعوت دی ہے، اگر وہ اس سے عاجز رہیں اور دس سوروں کے مثل پیش نہ کر سکیں تو تم جان لو یہ یعنی اس ثبوت کے بعد اس حقیقت کا مزید یقین حاصل کر لو۔ اس صورت میں کے معنی ہوں گے کہ اب تمہیں اسلام پر قائم رہنا چاہیے [2]۔

میرے نزدیک چونکہ قبل کی آیت میں دعوت دینے کی لفظ مشرکین سے مخاطب ہو کر ان کے لیے تھی، جنہیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں، اس لیے اس لبّیک کا اُسی دعوت سے تعلّق زیادہ قریب الفہم ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

---

[1] ۔فالم یستجیبوا لکم ای من دعوتموھم للمعاونۃ فاعلموا خطاب للمشرکین فھل انتم مسلمون بعد ھٰذہ الحجۃ القاطعۃ ای اسلموا (جلالین)

[2] ۔اگر قبول نکند آں کافراں سخن شما را پس آیا شما مسلماں ہستید (شاہ ولی اللہ) یعنی بر اسلام ثابت باشید (فتح الرحمٰن)

''جو دنیوی زندگی اور اس کی زیب وزینت کا طلب گار ہو تو ہم اس میں اُن کے کاموں کا پورا پورا نتیجہ ظاہر کر دیں گے اور اُن کے لیے اس میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ یہ وہ ہوں گے جن کے لیے آخرت میں سوا آتش دوزخ کے کچھ اور نہیں ہے اور جو کچھ انھوں نے اس میں کیا ہوگا اور جو کچھ ان کے کام تھے، وہ بے حقیقت ثابت ہوں گے''۔

اس میں ''غازیانِ راہ خدا'' کی صفول میں شامل ہونے والے وہ ''مجاہدین'' بھی داخل ہیں جن کا مقصد فقط مال غنیمت کا حصول ہو[1]۔

جب تمام اعمال خیر میں نیت صرف دنیا کے حصول کی ہوگئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام بقصد قربت نہیں ہوا اور ظاہر ہے کہ عبادتوں کی صحت میں قصد قربت کے نہ ہونے سے باطل ہوئیں۔ اس کے بعد آخرت میں دوزخ کے سوا رہ ہی کیا جاتا ہے[2]۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

''تو کیا جو اپنے پروردگار کی طرف سے کھلی ہوئی حقانیّت کی دلیل کے ساتھ آیا ہے اور جس کے پیچھے آیا ہے اُس کا گواہ جو اُسی کا جزء ہے اور اُس سے پہلے موسیٰ کی کتاب ایک پیشوا اور رحمت کی حیثیت سے یہ اس پر ایمان لائیں گے؟ اور جو ان گروہوں میں سے اُس کے ساتھ کفر اختیار کرے گا تو اس سے قول وقرار بس آتش دوزخ کا ہے تو تمہیں اس میں کوئی شک نہ ہو، وہ یقیناً حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے مگر اکثر لوگ ایمان نہیں رکھتے''۔

ذکر رسالت مآبؐ وولایت مآبؑ

جو اپنے پروردگار کی طرف سے کھلی ہوئی حقانیت کی دلیل لے کر آیا ہے؟ وہ کون ہے؟ باجماع مفسرین اس سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔[3]

اب وہ گواہ جو اس کے پیچھے آیا ہو اور اس کا جز ہو، وہ کون ہے؟ اسے خود پیغمبرؐ کے اقوال میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ علی منی وانا منه اور پھر قصہ برات میں وحی الٰہی: لا یبلغها الا انت اورجل منك ''اس کی تبلیغ کوئی نہیں کرسکتا سوا آپ کے یا ایسے شخص کے جو آپ کا جز ہو'' اور باجماع مفسرین ومحدثین اس کے بعد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہی کے سپرد یہ خدمت کی گئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ یہ گواہ تھا جو اس گواہی کے لئے پیدا ہوا تھا اس لئے اس کے قول وعمل سے کوئی بات اس گواہی کے خلاف کبھی ظاہر

---

[1] ۔ھٰذا صفة المنافقین ذکرہ الجبائی (تبیان)

[2] ۔من عمل الخیر علی ان یعطیه الله ثوابه فی الدنیا اعطاه ثوابه فی الدنیا وکان له فی الاٰخرة النار (علی بن ابراهیم)

[3] ۔هو النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (جلالین)

ہی نہیں ہوئی۔ یہ تفسیر اقوال اہل بیت علیہم السلام میں تو وارد ہوئی ہے، اس کے علاوہ بعض صحابہ سے بھی نقل ہوئی ہے۔ [۱]

بعض مفسرین اہل سنت نے معنی میں تبدیلی کی خاطر يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ کی دونوں ضمیروں کے مرجع میں تفریق کر دی ہے یعنی یتلوہ کی ضمیر تو رسولؐ کی طرف راجع کی ہے اور شَاهِدٌ مِّنْهُ کی ضمیر خدا کی طرف۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ اس کے پیچھے آیا ہے ایک گواہ اس کی طرف سے یعنی خدا کی جانب سے [۲] مگر ظاہر ہے کہ یہ ضمیروں کا اختلاف ظاہر کلام کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ پروردگار کی طرف سے کھلی ہوئی دلیل حقانیت کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اب یہ گواہ اس کی طرف سے کیا ہے؟ اسے سمجھانے کی یوں کوشش کی گئی ہے کہ وہ کھلی ہوئی حقانیت کی دلیل جس کے ساتھ رسول آئے ہیں وہ تو دلیل عقل ہے اور یہ بعد میں جو گواہ آیا، وہ قرآن ہے [۳] مگر عقل تو اس گواہ یعنی معجزات کی بنا پر جن میں سب سے اہم قرآن ہے، نبوت پر دلالت کر سکتی ہے گواہ یعنی قرآن سے پہلے نبوت خاصہ یعنی رسالت مآب حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دلیل عقلی کیا ہو سکتی ہے؟ اسی لئے مفسرین اہل سنت بھی سب اس سے مطمئن نہیں ہیں چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ کھلی ہوئی حقانیت کی دلیل قرآن ہے تو اب اس کے پیچھے جو گواہ آیا ہے؟ وہ کون ہے؟ اس پر گھبرا کر کہہ دیتے ہیں ''جبریلؑ''۔ [۴]

اب اسے منطقی طور پر جانچئے۔ اول تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کی شخصیت ایسی نہیں ہے کہ جو لوگوں کے سامنے آ کر گواہی دے۔ ان کے وجود پر ایمان تو خود قرآن اور رسالت کے تسلیم کرنے پر موقوف ہے۔ پھر یہ کہ قرآن لے کر جبریل امین علیہ السلام ہی تو آئے تو وہ قرآن کے ساتھ یا اس کے پہلے ہوئے، اس کے بعد کہاں سے ہوئے؟

دیکھئے حقیقت کو چھوڑ کر انسان کو کس کس طرح ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں؟

آخر ضمیروں کو الگ الگ مان کر جس سے یہ معنی ہوں گے کہ ان کے بعد آیا ہے ایک گواہ اس کی طرف سے۔ یعنی خدا کی طرف سے، پھر بھی اگر گواہ سے مراد حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کو لے لیا جائے تو ان حضرات کا کیا نقصان ہو جائے گا؟ جب کہ الفاظ قرآنی اس صورت میں بغیر کسی زحمت کے صادق آئیں گے۔ جو دلائل لے کر آئے وہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور جو گواہ بنا کر اللہ کی طرف سے بھیجے گئے وہ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام ہیں اور پھر جب کہ دلائل اور گواہ کے مفہوم میں یہ فرق بھی بالکل ذوق سلیم کے مطابق ہے کہ دلائل و بے زبان سچائی کی نشانیاں ہیں جن سے عقل رسالت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلیم کرتی ہے اور گواہ وہ ناطق انسان ہے جو اپنے گفتار و کردار سے ان کی سچائی کو عمر بھر ثابت کرتا رہا۔

ایک شک اس آیت میں جمہور مفسرین کو محسوس ہوا جس نے انہیں غلطاں و پیچاں بنایا صرف اس سبب سے کہ جو حقیقت ہے اسے وہ قبول کرنا نہیں چاہتے اور ایک دوسری پیچیدگی آیت کی ترکیب نحوی میں محسوس ہوئی ہے جو ہمارے ترجمہ میں بالکل نہیں ہے ہم نے مَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ مبتداء اقرار دیا ہے اور اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ پورے جملہ کو اس کی خبر اور ہمزۂ استفہام کے سوا الیہ مضمون کو ہم اس جملہ سے متعلق قرار دیتے ہیں یعنی جو اس طرح دلیل لے کر آیا ہو اور اس کے بعد اس کا گواہ ہو اور اس کے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب اس کی گواہی دے رہی ہو تو کیا

---

[۱] ۔ روی عن ابی جعفر محمد بن علی بن الحسین علیہ السلام انه علی بن ابی طالب ورواه الرّمانی و ذکره الطبری باسناده عن جابر بن عبدالله عن علی علیہ السلام (تبیان)

[۲] ۔ متصل وے می آید گواہی از جانب پروردگار او (شاہ ولی اللہ) پیچھے پیچھے آتا ہے اس کے ایک شاہد اس کی طرف سے (شاہ رفیع الدین)

[۳] ۔ حجتی از جانب پروردگار خود یعنی دلیل عقل--- وگواہی از جانب پروردگار! و یعنی قرآن (فتح الرحمن)

[۴] ۔ بیّنة بیان من ربه--- وهی القرآن ویتلوه یتعبه شاهد یصدّقه منه الی من الله وهو جبرئیل (جلالین)

یہ لوگ اس پر ایمان لائیں گے؟ ہمیں تو اس میں کوئی دشواری نظر نہیں آتی مگر عام مترجمین ومفسرین کی سمجھ میں یہ نہیں آیا ہے۔ وہ اولئك یومنون به کو مستقل ایک جملہ خبر یہ قرار دینا چاہتے ہیں تو اب اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (تا آخر فقرہ) کی خبر کا آیت میں وجود نہیں رہتا تو اس کے لئے انہیں کوئی فقرہ بڑھانا پڑتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

آیا کسی کو باشد برحجتی مثل دیگران باشد؟

کیا وہ جو روشن دلیل کے ساتھ ہو۔۔۔ مثل دوسروں کے ہوگا؟

یہ تفسیر جلالین سے ماخوذ ہے انہوں نے اس کو عربی میں اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ کے پورے فقرہ کی تشریح کے ساتھ اس طرح لکھا ہے کہ:

كمن ليس كذالك مثل اس کے ہوگا جو اس طرح نہ ہو

مگر ہم اس حذف واضمار کی مضمون آیت میں کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۸﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ﴿۱۹﴾ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ؔ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ﴿۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ﴿۲۲﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہوگا اس سے کہ جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے؟ یہ لوگ پیش ہوں گے اپنے پروردگار کے سامنے اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر غلط تہمت لگائی، آگاہ ہو کہ اللہ کی لعنت ہے ان ظالموں پر جو اللہ کی راہ سے روکیں اور اسے ٹیڑھا کرنے کی کوشش کریں اور وہ آخرت کے منکر تھے۔ یہ لوگ دنیا میں اللہ کے قبضہ سے نکل نہ سکتے تھے اور نہ ان کے اللہ کو چھوڑ کر کوئی مددگار تھے۔ ان کو دونا دوں عذاب ہو گا، نہ وہ سن ہی سکتے تھے اور نہ آنکھوں سے دیکھتے ہی تھے یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے کو خسارے میں مبتلا کیا اور غائب ہو گئے ان سے وہ جنہیں وہ غلط طور پر گھڑتے تھے بلاشبہ آخرت میں وہی گھاٹا اٹھانے والے ہیں''۔

''گواہی دینے والے کہیں گے'' یہاں گواہ دینے والوں سے کاتبان اعمال مراد لئے گئے ہیں جو روز آخرت انسانوں کے اعمال کی گواہی

دیں گے [1] اور جن جن کو اس حقیقت کا علم ہو وہ سب بھی اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ [2]

''نہ وہ سنتے ہی تھے اور نہ آنکھوں سے دیکھتے ہی تھے'' یعنی باوجود گوش و ہوش رکھنے کے عقل سے کام نہ لیتے تھے۔ [3]

یہی اللہ کی حجت ہے ان کے خلاف جو انہیں موردِ عقوبت قرار دیتی ہے۔

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

می تواں گفت ہمزۂ استفہام انکاری محذوف است یعنی آیا نمی تو انستند شنید و آیا نہ می دیدند (فتح الرحمٰن)

کہا جا سکتا ہے کہ سوالیہ معنی پیدا کرنے کے لئے (عربی میں) جو ہمزہ (الف مفتوح) ہوتا ہے جس کا مقصد انکار و اعتراض ہے، وہ محذوف ہے کیا وہ نہیں سن سکتے تھے اور کیا وہ نہیں دیکھتے تھے؟

مگر یہ خلاف ظاہر کلام ہے۔

یہ اللہ کی لعنتیں اور عذاب وغیرہ کس پر ہیں؟ پھر سن لیجئے۔

''اللہ پر جھوٹ باندھنے والوں پر، ان پر جنہوں نے اللہ کی راہ سے روکا اور اسے کج کرنے کی کوشش کی''۔

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں:

''خدا پر جھوٹ بولنا کس طرح ہے؟ علم میں غلط نقل کرنا یا خواب بنا لینا یا عقل سے حکم کرنا، دین کی بات میں یا دعویٰ کرنا کہ کشف رکھتا ہوں، یا اللہ کا مقرب ہوں''۔ (موضح القرآن)

اب اسی فہرست میں بڑھا لیجئے: کسی ایسے منصب کا جو اللہ سے تعلق رکھتا ہو، مدعی ہو جانا یا کسی ایسے عہدہ پر جس کا مقرر کرنا اللہ کے ذمہ ہو، بطور خود یا کسی اجماع یا شوریٰ کا ڈھونگ رچا کر کسی کو متمکن بنانا اور کسی کا بن جانا۔ ان سب کے لئے اللہ قرآن حکیم میں لعنت کا اعلان فرما رہا ہے کسی ایسے مذہب کے پیرو نہیں ہے جسے کہہ دیجئے:

دشنام بمذہبی کہ طاعت باشد
مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٣﴾

''یقیناً جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے اور لگاتار اپنے پروردگار سے لو لگائے رہے [4] یہ اہل بہشت

---

[1] ۔هم الملائكة يشهدون على الرسل بالبلاغ و على الكفار بالتكذيب (جلالين) يعنى كراماً كاتبين (فتح الرحمن)

[2] ۔يعنى الملائكة والانبيآء والعلماء (تبيان) گواہی والے آخرت میں فرشتے ہوں گے جو عمل لکھتے ہیں اور نیک بخت آدمی جن کو خبر تھی (موضح القرآن)

[3] ۔يعنى لفرط كراهتهم له كانهم لم يسمعوا ذلك (جلالين)

[4] ۔اى تواضعوا الله واعبدوه (على بن ابراهيم) الاخبات الخشوع المستمر على استواء فيه (تبيان)

ہیں جو اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے"

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۴

"ان دونوں فریقوں کی مثال مثل اندھے، بہرے اور آنکھ کان والے کی ہے کیا ان دونوں کی بات یکساں ہے؟ کیوں نصیحت قبول نہیں کرتے ہو"؟

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ ۫ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲۵ۙ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝۲۶ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝۲۷ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝۲۸ وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝۲۹ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳۰

"اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا کہ میں تمہارے لئے کھلا ہوا عذاب سے ڈرانے والا ہوں کہ عبادت نہ کرو کسی کی سوا اللہ کے، یقیناً مجھے ڈر ہے تمہارے لئے ایک دردناک دن کے عذاب سے۔ تو کہا ان کی قوم کے بڑے آدمیوں نے کہ جو کافر تھے، ہم نہیں دیکھتے ہیں تمہیں مگر اپنا ایسا ایک آدمی اور نہیں دیکھتے ہم کہ تمہاری پیروی کی ہے مگر ایسوں نے جو ہم میں پست طبقہ کے لوگ ہیں رواروی میں [1] اور نہیں دیکھتے ہم تم لوگوں کے لئے اپنے مقابلہ میں کوئی فضیلت بلکہ ہم تم لوگوں کو جھوٹا خیال کرتے ہیں کہا اے میری قوم والو! کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے حقانیت کی دلیل رکھتا ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت دی ہے مگر وہ تمہاری سمجھ میں نہ آتی ہو تو کیا ہم تمہیں زبردستی اس کا پابند بنا سکتے ہیں جب کہ تم اسے ناپسند کرتے ہو؟ اے میری

---

[1] ۔ای ابتداءً من غیر تفکر فیہ (جلالین) بتامل سرسری (شاہ ولی اللہ)

قوم والو! میں تم سے اس پر کوئی مالی معاوضہ نہیں مانگتا میرا معاوضہ نہیں ہے مگر اللہ پر اور میں نکالنے والا نہیں ہوں انہیں جو ایمان لائے وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں مگر میں دیکھتا ہوں تمہیں کہ تم جہالت سے کام لیتے ہو اور اے میری قوم والو! کون اللہ کے عذاب کے مقابلہ میں میری مدد کرے گا اگر میں انہیں نکال دوں؟ کیوں تم نصیحت قبول نہیں کرتے''؟

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۖ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

''اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں، ہاں میں ان لوگوں کے لئے جنہیں تمہاری نگاہیں حقیر محسوس کر رہی ہیں، یہ بھی نہیں کہتا کہ انہیں اللہ ہرگز کوئی بھلائی عطا نہیں کرے گا اللہ خوب جانتا ہے اسے جو ان کے دلوں میں ہے اس وقت بلاشبہ میں ظالموں میں سے ہوں گا''۔

یہ غالباً اس جزء کا جواب ہے جو انہوں نے کہا تھا کہ ہم تو تمہیں بس ایک آدمی جانتے ہیں ہم تم میں اپنے اوپر کوئی فضیلت نہیں پاتے۔ اس کا جواب یہ دیا جا رہا ہے کہ میں خود کب اس کا مدعی ہوں کہ میں آدمی کے سوا کچھ اور ہوں اور یہ کہ مجھ میں ذاتاً کوئی ایسی بات ہے کہ میں عجوبہ چیز ہوں۔ [1]

اصل تو یہ ہے کہ خالق نے مجھے نوازا ہے اور مجھے نبوت کے خلعت سے سرفراز کیا ہے، اس کی میں تبلیغ کرتا ہوں تو پھر تم جو وہ سب کچھ میرے مقابلہ میں کہہ رہے ہو، یہ جہالت نہیں تو کیا ہے؟

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾

''ان لوگوں نے کہا کہ اے نوح! تم نے تو ہم سے تکرار کی ہے اور بہت زیادہ تکرار کی ہے تو بس اب لے آؤ اسے جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو اگر تم سچے ہو، کہا کہ اسے اللہ ہی لائے گا اگر چاہے گا اور تم اسے (بھاگ کر) بے بس نہیں کر سکتے'' [2]

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾ ؕ

---

[1] ۔ انی لا ارفع نفسی فوق قدرها (تبیان)

[2] ۔ لستم تفرتونه هربا (تبیان)

''اور تمہیں میری نصیحت فائدہ نہیں پہنچا سکتی، کتنا ہی میں تمہیں کرنا چاہوں، اگر اللہ تمہیں گمراہی میں چھوڑ دینا چاہتا ہو، وہ تمہارا پروردگار ہے اور اسی کی طرف تم کو پلٹ کر جانا ہے''۔

اللہ گمراہی میں چھوڑتا ہے انسان کے سوء اختیار سے تو نتیجتاً مطلب یہ ہوا کہ جب تم خود گمراہی میں پڑے رہنا چاہتے ہو[1] تو میری نصیحت تمہیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے؟ اب تو عذاب تم پر آ ہی جائے گا جو تمہاری بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ کو منظور ہے کہ تم پر نازل کرے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ ﴿٣٥﴾

''کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کو گھڑ لیا ہے؟ کہیے کہ اگر میں نے اسے گھڑا ہے تو میرے جرم کی ذمہ داری مجھ ہی پر ہے اور میں بری ہوں اس جرم سے جو تم کرتے ہو''۔

یہ ایک خاص روادارانہ گفتگو کا انداز ہے جسے مسلمات کے حامی اصول وعقائد کے خلاف قرار دے سکتے ہیں مگر حقیقت میں یہ انداز آزاد ضمیر کو معاملہ پر غور کرنے کی دعوت دیا کرتے ہیں۔

اس کے پہلے جناب نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کی گفتگو کا ذکر تھا اور اس کے بعد بھی اسی کا سلسلہ ہے لیکن درمیان میں یہ خود ہمارے پیغمبرؐ سے تخاطب آ گیا ہے اور آپ کی قوم جو قرآن کا انکار کر رہی ہے اس کا ذکر ہے۔[2]

اس سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ مقام تنزیل میں اس سلسلہ کے ساتھ یہ آیت تعلق ہی نہیں رکھتی اور ترتیب میں بے جوڑ طور پر درمیان میں درج ہو گئی ہے اور اس نظیر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ آیہ تطہیر کی نوعیت وقوع کے سمجھنے میں دشواری نہیں رہتی مگر مفسرین اہل سنت نے کہا ہے کہ درمیان میں یہ آیت اس لئے آئی ہے کہ مشرکین قریش بھی تقریباً ویسی ہی باتیں کہتے تھے جیسی قوم نوح علیہ السلام کے افراد نے کہی تھیں۔ اس مطابقت کو دکھانے کے لئے درمیان میں ذکر مشرکین عرب کا آ گیا۔[3]

وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴿٣٧﴾

''اور نوح کی طرف وحی بھیجی گئی کہ اب ان لوگوں کے سوا جو ایمان لے آئے ہیں تمہاری قوم میں سے کوئی کبھی ایمان نہیں لائے گا تو رنجیدہ نہ ہو تم اس سے جو وہ کرتے ہیں اور بناؤ کشتی ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہماری وحی سے

---

[1] ۔مع ایتانکم بما یوجب خیبتکم والعذاب الذی جرہ علیکم قبیح افعالکم و یرید اللہ اھلا کم و عقوبتکم علیٰ ذلك (تبیان)

[2] ۔یقولون ای کفار مکۃ افتراہ اختلق محمد القرآن (جلالین) یا محمد آیا می گویند بربستہ است قرآن را (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔این جملہ زیادہ کردہ شدہ است درو سط قصہ قوم نوح تامتنبہ باشد بر تطبیق حال مشرکین مکہ باحال حضرت نوح علیہ السلام (فتح الرحمن) یہاں تک جتنے سوال اس قوم کے تھے وہی تھے حضرت کی قوم کے۔ گویا یہ سب جواب ان کو ملے، ایک کا نیا دعویٰ تھا سو آگے فرمایا (موضح القرآن)

اور مجھ سے بات نہ کرنا ان کے بارے میں جو ظالم ہیں، وہ سب یقیناً غرق کر دیئے جائیں گے"۔

طوفان نوح علیہ السلام کی غرقابی اور اس کا پس منظر

آیت کا سیاق اس مشہور تصور کی نفی کرتا ہے کہ خواہ مخواہ حضرت نوح علیہ السلام اللہ سے عذاب کی دعا کرتے تھے اور ہر مرتبہ خالق اسے ایک مدت کے لئے ٹال دیتا تھا اور آخر میں جب دعا کی تو یہ ارشاد ہوا کہ ایک کشتی بناؤ۔

قرآن کا انداز بتاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام تو جیسے اب بھی پُرامید تھے اور خیال کرتے تھے کہ شاید قوم ہدایت پا جائے مگر خالق نے خود اطلاع دی کہ اب جو باقی رہ گئے ہیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اب حضرت نوح علیہ السلام نے وہ دعا مانگی جس کا سورہ نوح میں تذکرہ ہے کہ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا. ﴿نوح: ۲۶﴾ اس وقت حکم ہوا کہ کشتی بناؤ۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ق وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ط قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾

"اور وہ کشتی بنا رہے تھے اور جب بھی ان کی طرف سے ان کی قوم کے کچھ بڑے لوگ گزرتے تھے تو ان سے وہ تمسخر کرتے تھے انہوں نے کہا اگر تم ہم سے تمسخر کرتے ہو تو ہم بھی (ایک دن) تم سے تمسخر کریں گے جس طرح تم تمسخر کر رہے ہو۔ اب بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر آتا ہے وہ عذاب جو اسے رسوا کر دے اور اترتا ہے اس پر قائم رہنے والا عذاب"۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

"وہ ہنستے تھے اس پر کہ خشک زمین پر غرق کا بچاؤ کرتا ہے۔ یہ ہنستے اس پر کہ موت سر پر کھڑی ہے اور یہ ہنستے ہیں"۔ (موضح القرآن)

دوسرا عنوان تمسخر کا یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ اچھا! آپ پیغمبری کرتے کرتے، اب بڑھئی گیری کرنے لگے ہیں۔ [1]

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ط وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۴۰﴾ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ط اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾

"یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آیا اور تندور اُبلا، ہم نے کہا کہ سوار کر لو اس (کشتی) میں ہر چیز کے دو جوڑے اور اپنے گھر والوں کو سوا ان کے جن پر بات پہلے ہو چکی ہے اور جو ایمان لائے ہوں اور نہیں ایمان لائے تھے ان پر مگر

---

[1] ۔قیل انّھم کانوا یقولون یانوح صرت نجّارا بعد النبوّۃ (تبیان)

بہت کم اور کہا کہ سوار ہو اس میں اللہ کے نام کے سہارے پر اور اس کا چلنا اور اس کا رکنا۔ یقیناً میرا پروردگار بخشنے والا ہے بڑا مہربان''۔

''سوا ان کے جن پر بات پہلے ہو چکی ہے'' یعنی پہلے کہا جا چکا ہے کہ

لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾

مجھ سے ظالموں کے بارے میں بات نہ کرنا، وہ تو غرق ہو کر رہیں گے (ہود۔ ۳۷)

اس کے بعد بعض لوگوں کا یہ لکھنا کہ اس قول سے مراد قضائے الٰہی ہے [1] تو ہم جبر پیدا کرنے کے شوق کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے؟

پھر خود شاہ صاحب نے تصریح کی ہے کہ یہ جن کے لئے بات پہلے ہو چکی تھی، دو تھے ''یعنی زن نوح و کنعان پسر نوح'' (فتح الرحمن)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''گھر والوں میں سے جس پر بات پڑ چکی ایک بیٹا کنعان اور اس کی ماں، سو وہ ڈوبے'' (موضح القرآن)

روایات بتاتے ہیں کہ پانی ایک تندور میں سے ابلا تھا جس میں روٹیاں پکتی تھیں۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''تنور تھا حضرت نوح علیہ السلام کے گھر میں'' (موضح القرآن)

مگر تفسیر جلالین میں ہے:

فارا التنور للنجار بالماء۔

ایک نان بائی کا تندور پانی سے اُبلنے لگا۔

معلوم نہیں کس وجہ سے تھا شاہ ولی اللہ نے اس کو استعارہ پر محمول کر کے حاشیہ لکھنے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ:

''یعنی تنور غضب الٰہی'' (فتح الرحمن)

حالانکہ بطور استعارہ دریائے غضب الٰہی تو محاورہ میں ہے ''تنور الٰہی'' نہیں اور تنور غضب الٰہی کے ساتھ بطور استعارہ کہا جائے تو وہ مشتعل ہوگا، طوفان نہیں لائے گا۔

اس طرح کا بعید استعارہ بخیال خود ''خلاف فطرت'' تصورات سے بچنے کے لئے نیاز صاحب فتح پوری ایسے افراد کو تو زیب دے سکتا ہے، کسی ذمہ دار ''مسلمان عالم'' کو نہیں''۔

طوفان نوح کی غرقابی اور اس کا پس منظر

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَنَادٰى نُوْحُ ِۨ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ

[1] ۔ سبقت کردہ است بروے قضا (شاہ ولی اللہ)

الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾

''اور وہ چل رہی تھی ان کو لئے ہوئے ایسی لہروں میں جو پہاڑوں جیسی تھیں اور آواز دی نوح نے اپنے بیٹے کو اور وہ الگ ایک طرف تھا کہ اے میرے بیٹے! سوار ہو لے ہمارے ساتھ اور کافروں کے ساتھ نہ ہو۔ اس نے کہا میں بہت جلد پناہ لے لوں گا ایک ایسے پہاڑ کی طرف جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔ انہوں نے کہا آج اللہ کا حکم سے بچانے والا کوئی نہیں ہے سوا اس کے جس پر وہ رحم کرے اور ان دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی تو وہ ڈبوئے جانے والوں میں سے تھا''۔

وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

''اور کہا گیا کہ اے زمین نگل لے اپنے پانی کو اور اے آسمان تھم جا[1] اور پانی تہہ نشین ہوگیا اور جو ہونا تھا وہ ہو چکا اور وہ جودی (پہاڑ) پر ٹھہری اور کہا گیا کہ لعنت ہو ظالم لوگوں پر''۔

یہ اُن آیات میں سے ایک ہے جن کی فصاحت و بلاغت نے ارادہ مقابلہ کرنے والے منکرین قرآن کے ہاتھ سے قلم گرا دیا، یہ اور بات ہے کہ ہمارا اردو یا کسی اور زبان کا ترجمہ ان تمام کیفیات کا حامل نہیں ہوسکتا جو اس آیت کے اصل الفاظ میں موجود ہیں اور جن کا احساس اہل زبان ہی خوب کر سکتے ہیں۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۫ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّيْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۴۷﴾

''اور پکارا نوحؑ نے اپنے پروردگار کو تو کہا اے میرے پروردگار! میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہا اے نوح! وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے وہ تو برے اعمال کا مجسمہ ہے، تو مجھ سے سوال نہ کرو ایسا جس کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ

---

[1] ۔ امسکی عن المطر (جلالین) باز مان (شاہ ولی اللہ) بس کر (رفیع الدین)

ہو۔ کہا اے میرے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں خود تجھ سے اس بات سے کہ تجھ سے سوال کروں ایسا جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور نہ رحم کرے تو میں خسارا اٹھانے والوں میں سے ہوگا''۔

عمل صالح کے بغیر کسی پیغمبر کی فرزندی بھی کارگر نہیں

سوال کے معنی طلب کے ہیں اس لئے مجھ سے سوال نہ کرو ایسا جس کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بے سمجھے مجھ سے کسی بات کی خواہش نہ کرو۔ شاہ عبدالقادر نے خواہ مخواہ سوال کو پوچھنے کے معنی میں لے لیا اس لئے ایک پیچیدگی میں پڑ گئے اور پھر اس سے نکلنے کی کوشش کرنے لگے ہیں وہ کہتے ہیں:

آدمی پوچھتا وہی ہے جو معلوم نہ ہو لیکن مرضی معلوم ہونی چاہیے، یہ کام ہے جاہل کا کہ اگلے کی مرضی نہ دیکھے پوچھنے کی، پھر پوچھے۔ (موضح القرآن)

واقعہ یہ ہے کہ یہاں حضرت نوح علیہ السلام پوچھ گچھ بھی نہیں رہے تھے۔ وہ تو خواہش کر رہے تھے کہ میرے بیٹے کو نجات دے دے، پھر سوال کے معنی پوچھنے کے قرار دینے کی ضرورت ہی کیا ہے؟!

ہماری قدیم تفسیر میں معصوم کی حدیث ہے کہ یہ جناب نوح علیہ السلام کا صلبی بیٹا نہ تھا بلکہ مادر جلوتھا یعنی اس کی ماں جناب نوح علیہ السلام کے حبالۂ عقد میں آئی تو وہ اس کے ساتھ تھا، اس لیے بیٹا کہلایا[1]۔ جو عام محاورہ کے مطابق ہے۔ اس لیے خالق نے بھی ''بیٹے'' ہونے کی نسبت کی نفی نہیں فرمائی لیکن اہل میں سے ہونے کی نفی کر دی۔

اس نظیر کو سامنے رکھا جائے تو کچھ علمائے شیعہ کا یہ تصوّر کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے سوا جو پیغمبرؐ کی بیٹیاں تاریخ سے معلوم ہوئی ہیں، وہ حضرتؐ کی صلبی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ وہ جناب خدیجہؑ کے ساتھ آئی تھیں، اس نظیر کے مطابق محسوس ہوگا۔ اس لئے ممکن ہے قرآن مجید کے الفاظ میں جو پردہ کے بارے میں ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ

اے پیغمبر! اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہیے۔ (احزاب۔ ۵۹)

وہ بیٹیاں داخل سمجھ لی جائیں مگر جب پیغمبرؐ کچھ خاص افراد کو جمع کر کے یہ فرمائیں کہ هٰؤلاء اهلی'' یہ میرے اہل ہیں'' تو وہاں بالا تفاق ایک ہی بیٹی نظر آئے اور وہ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ہوں۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾

''کہا گیا ہے کہ اے نوحؑ! اتر ہماری طرف کی سلامتی اور برکتوں کے ساتھ جو تم پر اور تمہارے ساتھ والوں سے

---

[1] ۔ عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال لیس بابنہ انّما ھو ابنہ عن زوجتہ علی لغۃ طی یقولون لابن المرأۃ ابنہ (علی بن ابراھیم)

پیدا ہونے والی نسلوں پر ہیں [1] اور کچھ جماعتیں ایسی ہوں گی جنہیں ہم فائدہ اٹھانے کا موقع دیں گے، پھر اُن پر ہماری طرف سے دردناک عذاب آجائے گا''۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''حق تعالیٰ نے تسلی فرمادی کہ پھر ساری قوم نوع انسان ہلاک نہ آوے گا قیامت سے پہلے مگر بعض فرقے ہلاک ہوں گے''۔(موضح القرآن)

مگر اس میں آخر کا ٹکڑا خلاف واقعہ ہے اکثر فرقے بھی جو گمراہ ہیں ان کی ہلاکت قیامت ہی سے وابستہ ہے ورنہ دنیا میں تو اکثر پھلتے پھولتے بلکہ غلبہ وتسلط بھی حاصل کرتے اور اقتدار سلطنتی کے مالک ہوجاتے ہیں۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾

''یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جنہیں ہم آپ پر وحی کے ذریعے سے بھیجتے ہیں آپ اس سے پہلے ان سے واقف نہ تھے اور نہ آپ کی قوم والے، تو برداشت سے کام لیجئے، بلاشبہ انجام پرہیزگاروں کے حق میں ہے''۔

یعنی جیسی نوح علیہ السلام کو تکلیفیں پہنچائی گئیں اور انہوں نے صبر سے کام لیا اور انجام میں انہیں کامیابی ہوئی، ویسے ہی آپ بھی صبر سے کام لیجئے آخر میں کامیابی آپ کو ہوکر رہے گی۔ [2]

اس سے بھی ظاہر ہے کہ جناب نوح علیہ السلام کا صبر وضبط خالق کی نگاہ میں مثالی حیثیت رکھتا ہے اور یہ تصور کرنا کہ انہوں نے معاذ اللہ منشائے الٰہی کے خلاف بار بار قوم کے لئے بددعا کی، حقیقت کے خلاف ہے۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

''اور قبیلہ عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! اللہ کی عبادت کرو تمہارا سوا اس کے کوئی خدا نہیں ہے نہیں ہو تم مگر دل سے باتیں بنانے والے، اے میری قوم والو! میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں

---

[1] ۔ ممن معك فی السفينة اى من اولادهم وذرّيّاتهم وهم المؤمنون (جلالين)

[2] ۔ فاصبر على التبليغ واذىٰ قومك كما صبر نوح (جلالين) امر للنبى ﷺ بان يصبر علىٰ اذىٰ قومه وجهلهم بموضعه كما صبر نوح قبل ذٰلك علىٰ اذىٰ قومه (تبيان)

مانگتا۔ میرا معاوضہ نہیں ہے مگر اس پر کہ جس نے مجھے پیدا کیا ہے تو کیوں تم عقل سے کام نہیں لیتے اور میری قوم والو! اپنے پروردگار سے بخشش کے طلبگار رہو، پھر اس سے لو لگاؤ کہ وہ تمہاری طرف گھٹا بھیجے خوب برستی ہوئی اور تمہاری قوت میں مزید قوت عطا کرے اور تم مجرمانہ طور پر روگردانی اختیار نہ کرو''۔

قبیلۂ عاد اور جناب ہود علیہ السلام کا حال

اس کے پہلے نوح علیہ السلام کے ساتھ ارسلنا کا لفظ آچکا ہے کہ ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف، یہ ہود علیہ السلام کا ذکر بطور عطف اسی سلسلہ سے متعلق ہے مطلب یہ ہے کہ اور قبیلہ عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود علیہ السلام کو بھیجا[1]۔

ہود کو بھائی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسی قبیلہ کا ایک فرد تھے۔[2]

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّىْ تَوَكَّلْتُ عَلَي اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾

''ان لوگوں نے کہا اے ہود! تم ہمارے پاس کھلی ہوئی دلیل نہیں لائے اور ہم تمہارے کہنے سے اپنے خداؤں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں اور نہ ہم تم پر ایمان لانے والے ہیں۔ ہم سوا اس کے کچھ کہہ نہیں سکتے کہ ہمارے خداؤں میں کسی نے تمہیں کچھ نقصان پہنچا دیا ہے، انہوں نے کہا کہ میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں بے تعلق ہوں ان سے جنہیں تم اسے چھوڑ کر شریک مانتے ہو تو تم سب مل کر میرے خلاف تدابیر کرو، پھر مجھے مہلت نہ دو، بلاشبہ میرا بھروسا ہے اللہ پر جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر یہ کہ وہ پکڑے ہوئے ہیں اس کی پیشانی کے اوپر کے بالوں کو یقیناً میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے۔ اب اگر تم روگردانی کرو تو میں تمہیں تبلیغ کر چکا اس کی جس کے ساتھ مجھے تمہاری جانب بھیجا گیا تھا اور میرا پروردگار تمہاری جگہ

---

[1] ۔نصب بتقدیر ارسلنا (تبیان)

[2] ۔اخاھم من القبیلۃ (جلالین)

تمہارے علاوہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکو گے یقیناً میرا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ہے''۔

''ہم سوا اس کے کچھ کہہ نہیں سکتے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ہمارے بتوں کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟ بس یہ ایک بات ہوسکتی ہے کہ انہوں نے تمہیں کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہو اور انتقام کے جذبہ میں تم ان کی مخالفت کر رہے ہو۔[1]

اس کے بعد جناب ہود علیہ السلام نے جو جواب دیا ہے اس میں یہ پہلو ہے کہ یہ اصنام بیچارے بھلا مجھے کیا تکلیف پہنچا ئیں گے؟ ہر چیز تو اللہ کے قبضہ میں ہے یہ اصنام بالکل بے بس ہیں، کچھ کر ہی نہیں سکتے۔

پیشانی کے اوپر جو سر کے بال ہیں، وہ اگر پکڑ میں آجائیں تو انسان بالکل بے قابو ہو جاتا ہے اس لئے پیشانی کے اوپر کے بال پکڑنے کا مطلب ہے پورے طور پر قدرت رکھنا یعنی اللہ ہر چلنے پھرنے والے پر کامل اقتدار رکھتا ہے''[2]۔

''یقیناً میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے'' یعنی وہ جو کرتا ہے، ٹھیک ہی ہوتا ہے۔

تفسیر جلالین میں ہے:

علیٰ صراط مستقیم ای طریق الحق والعدل

سیدھے راستے پر ہے'' یعنی حق اور عدالت کے راستے پر۔

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

''یعنی حکیم است'' (فتح الرحمن)

ہمارے یہاں کی تفسیر بھی اس کے موافق ہے۔[3]

مگر شاہ صاحب موصوف کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر اس کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ:

''جو سیدھی راہ پر چلے، وہ اس سے ملے''۔ (موضح القرآن)

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾ وَتِلْكَ عَادٌ ۗ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

''اور جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے ہود کو اور انہیں کہ جنہوں نے ان کا ساتھ دیتے ہوئے ایمان اختیار کیا تھا اپنی

---

[1] ۔ما نقول فی سبب الخلاف الّا ان اعتراك (تبیان)

[2] ۔خص الناصیة بالذکر لان من اخذ بناصیة یکون فی غایة الذل (تبیان)

[3] ۔معناہ ان امر ربی فی تدبیر خلقه۔۔۔ لا عرج فیه والا اضطراب (تبیان)

طرف کی رحمت کے ساتھ چھٹکارا دے دیا اور انہیں بڑے سخت عذاب سے بچا دیا اور یہ ہے وہ قبیلہ عاد جس نے جان بوجھ کر اپنے پروردگار کی آیات کا انکار کیا اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی اور ہر ہٹ دھرم، سرکش کے احکام کی پیروی کی اور ان کے پیچھے لگا دی گئی اس دنیا میں بھی لعنت اور قیامت کے دن بھی معلوم ہونا چاہیے کہ قبیلہ عاد نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی۔ آگاہ ہو کہ لعنت ہے عاد پر جو ہود کی قوم والے تھے''۔

''ہمارا حکم آ گیا'' یعنی عذاب۔ [1]

''یہ ہے وہ قبیلہ عاد'' یعنی اس قبیلہ کی سرگزشت ہے جو آپ کے سامنے پیش کی گئی [2] اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ دنیا میں آنکھ کھول کر ذرا ان کا عالم دیکھو کہ کیا ہو گیا۔ [3]

قبیلہ عاد کے لئے ارشاد ہوا ہے کہ ''انہوں نے اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی، حالانکہ قرآن نے ان کی جانب صرف ایک نبی کی بعثت کا ذکر کیا ہے اور وہ جناب ہود علیہ السلام ہیں مگر چونکہ پیغام تمام رسولوں کا مشترک ہوتا ہے، اس لئے ایک پیغمبر کی جو نافرمانی کی گئی، وہ تمام پیغمبروں کی نافرمانی ہے۔ [4]

''ان کے پیچھے دنیا میں بھی لعنت لگا دی گئی اور آخرت میں بھی' اسے ان افراد کو دیکھنا چاہیے جو فخریہ کہتے ہیں کہ ہم تو شیطان پر بھی لعنت نہیں کرتے وہ محسوس کریں کہ منشائے ربانی کیا ہے؟

یہ تفسیر جلالین سے ظاہر ہے:

اتبعوا فی هٰذه الدنیا لعنة من الناس ویوم القیامة لعنة علیٰ رؤس الخلائق

ان کے پیچھے لگا دی گئی ہے اس دنیا میں بھی لعنت لوگوں کی طرف سے (کہ وہ برابر لعنت کرتے رہیں گے) اور قیامت کے دن تمام خلق کے مجمع عام میں (منادی قدرت کی طرف سے لعنت ہوگی)

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿٦١﴾

''اور قبیلہ ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو، انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت کرو اللہ کی، اس کے سوا کوئی تمہارا خدا نہیں ہے، اس نے تم کو شروع شروع میں زمین سے پیدا کیا اور تمہیں اس میں آباد کیا تو اس سے

---

[1] ۔ امرنا عذابنا (جلالین)

[2] ۔ اینست سرگزشت عاد (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ تلك عاد اشارة الیٰ اٰثارهم ای فسبحوا فی الارض فانظروا الیها (جلالین)

[4] ۔ جمع لان من عصیٰ رسولا فقد عصیٰ جمیع الرسل لاشتراکهم فی اصل ما جاؤا به وهو التوحید (جلالین)

مغفرت طلب کرو، پھر اُس سے لو لگاؤ، یقیناً میرا پروردگار نزدیک ہے، دعاؤں کا قبول کرنے والا''۔

قبیلۂ ثمود اور جناب صالح علیہ السلام کا حال

وہی سلسلہ ہے کلام کا کہ نوح علیہ السلام کو ہم نے بھیجا اور عاد کی طرف ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ اب کہا جا رہا ہے کہ ثمود کی طرف صالح علیہ السلام کو بھیجا۔ زمین سے پیدا کیا'' یعنی ابتدائے خلقت میں ابوالبشر کی تخلیق خاک سے کی۔ [1]

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿٦٢﴾

''ان لوگوں نے کہا کہ اے صالحؑ! ہمارے اندر تم سے اس کے پہلے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، کیا تم ہمیں روکتے ہو، اس سے کہ ہم عبادت نہ کریں اس کی جس کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے رہے اور ہم اس سے جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو بڑے شک وشبہ میں ہیں جو پریشان کن ہے''۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿٦٣﴾ وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿٦٤﴾

''انہوں نے کہا اے میری قوم والو! کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے حقانیت کی نمایاں دلیل کے ساتھ بھیجا گیا ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے خاص رحمت عطا کی ہے تو کون میری مدد کرے گا اللہ کے مقابلہ میں اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ اس صورت میں تو ہمارے لئے سوا خسارہ پہنچانے کے کچھ اور نہیں کر سکتے اے میری قوم والو! یہ اللہ کی طرف کی اونٹنی ہے تمہارے لئے ایک معجزہ کے طور پر تو اسے زمین خدا سے غذا حاصل کرنے دو اور کوئی برائی اسے چھلانا بھی نہیں کہ تمہیں بہت جلد عذاب گرفت میں لے لے گا'' [2]

''ناقہ صالح''، مشہور ہے خدا نے اس کو بطور اعزاز یہاں اور سورہ والشمس میں بھی ناقة الله کہا ہے صرف اس لئے کہ خالق نے بطور اپنے مظاہرہ قدرت کے نمودار کیا۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کو جو روح اللہ کہا گیا ہے، اس کی حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے جسے خواہ مخواہ مسیحی حضرات جناب عیسیٰؑ کے بارے

---

[1] ۔قیل فی معناہ قولان: احدھما انہ خلقکم من اٰدم و اٰدم من تراب۔ الثانی انہ خلقکم من الارض والاول اختیار الجبائی وھو الاقویٰ (تبیان)

[2] ۔اخذ کم عذاب عاجل (تبیان)

میں اپنے مزعومہ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

ناقہ صالح اپنے اس انتساب کی وجہ سے محترم بھی ہو گیا چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:

''حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کی تعظیم کرنا ہوگی'' (موضح القرآن)

بے شمار شواہد و دلائل میں سے کیا یہ نظیر بھی یہ ثابت نہیں کرتی کہ غیر اللہ کی تعظیم مطلقاً شرک نہیں ہے بلکہ اگر اللہ کی طرف انتساب کی وجہ سے ہو تو مطلوب الٰہی ہے۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَالْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾

''تو ان لوگوں نے اسے پے کر دیا تو انہوں نے کہا کہ اپنے گھروں میں بس اب تین دن تک مزے اڑا لو، یہ وعدہ ہے جو جھوٹا نہیں ہے، چنانچہ جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے صالح کو اور انہیں جنہوں نے ان کا ساتھ دے کر ایمان اختیار کیا تھا اپنی طرف کی رحمت کے ساتھ نجات دے دی اور اس دن کی رسوائی سے بچا دیا، یقیناً تمہارا پروردگار طاقت ور ہے بڑا زبردست اور جو ظالم تھے ان کو کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا تو وہ اپنے مکانوں میں منہ کے بل گر گئے جیسے کبھی وہ یہاں بسے ہی ہوئے نہ تھے آگاہ ہو کہ ثمود نے اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کیا، آگاہ ہو کہ لعنت ہے ثمود پر''۔

نزول عذاب کے بعد اس قوم کے بے جان ہونے کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے کئی جگہ قرآن مجید میں جاثمین کا لفظ آیا ہے جس کے معنی عموماً گھٹنوں کے بل بیٹھنے کے ہوتے ہیں اور یہی اکثر مفسرین نے اس کے معنی کہے ہیں[1] مگر بے جان ہونے سے گھٹنوں یا زانوؤں کے بل بیٹھنے کا کوئی تعلق سمجھ میں نہیں آتا، لیکن چونکہ عموماً اس لفظ کے یہی معنی ہوتے تھے، لہٰذا فاصبحوا فی دیارھم جاثمین کا ترجمہ بعض جگہ ہم نے اس طرح کیا ہے کہ وہ بیٹھے بیٹھے بے جان ہو گئے لیکن جناب شیخ الطائفہ نے اس کے معنی لکھ دیے ہیں ''منہ کے بل گرنا''[2] جو بے جان ہونے کے ساتھ زیادہ مناسب رکھتے ہیں، اس لئے ہم نے اب اس کا ترجمہ اسی تفسیر کے لحاظ سے کیا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ

---

[1] ۔بارکین علی الرّکب میبین (جلالین) فجر اٹھے، گھروں اپنے کے زانو پر گرے ہوئے (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔الجثوم السقوط علی الوجوہ (تبیان)

جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿٧٠﴾

''اور جب ابراہیم کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے خوش خبری لے کر آئے، کہا سلام پھر ذرا دیر نہ گزری کہ وہ لے آئے بھنا ہوا بچھڑا تو جب دیکھا ان کے ہاتھوں کو کہ نہیں پہنچتے اس تک تو انہیں ان پر شک ہوا، اور دل ہی دل میں ان سے ذرا ڈر محسوس کیا[1] انہوں نے کہا ڈریے نہیں۔ ہم تو لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ولادت اسحاق علیہ السلام کی خوش خبری

''بھیجے ہوئے'' فرشتے تھے اور خوش خبری ولادت فرزند کی تھی جس کا ذکر اس کے بعد ہے، انہوں نے سلام کیا، ابراہیم علیہ السلام نے جواب سلام دیا۔ یہاں دیکھ لیجئے سلام ہی ہے السلام نہیں ہے۔ جلالین میں ہے قَالَ سَلَامٌ، عَلَيْكُم انہوں نے کہا سَلَامٌ عَلَيْكُم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صرف السَّلَام کہا ہو اور عَلَيْكُم مقدر ہو۔[2]

قوم لوطؑ کی طرف بھیجے گئے ہیں ''یعنی ان پر عذاب نازل کرنے کے لئے'' اصل منزل مقصود وہ تھی، اور برسر راہ ابراہیم علیہ السلام کے پاس ٹھہر گئے بشارت دینے کے لئے۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿٧١﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿٧٣﴾

''اور ان کی بیوی کھڑی ہوئی تھیں تو وہ ہنسنے لگیں، اس پر ہم نے ان کو اسحاق کی خوشخبری دی اور اسحاق کے پیچھے یعقوبؑ کی۔ وہ کہنے لگیں: ارے غضب! کیا میرے یہاں اولاد ہوگی اس حال میں کہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر ہیں اسی عالم میں کہ بوڑھے ہیں؟ بلاشبہ یہ ایک عجیب چیز ہے انہوں نے کہا آپ تعجب کرتی ہیں اللہ کی بات سے۔ اللہ کی رحمت اور اس کی برکات ہیں۔ آپ لوگوں پر اے اس گھر والو! یقیناً وہ قابل تعریف ہے، بزرگی والا''۔

یہ بیوی جناب سارہ تھیں وہ خواہ اس صورت حال پر کہ ان کے شوہر نے مہمان نوازی کے ذوق میں فرشتوں کے سامنے کھانا رکھ دیا اور

---

[1] ۔ اوجس اضمر فی نفسه (جلالین)

[2] ۔ تقدیره: ''سلم علیکم'' فحذف الخبر کما حذف من قوله: فصبر جمیل (تبیان)

بعد میں پتہ چلا کہ وہ فرشتے ہیں اور خواہ خوف و دہشت کے دور ہونے سے جس کا شروع میں غلبہ ہوا تھا[1] اور خواہ قوم لوط پر عذاب آنے کی خبر سننے سے خوش ہو کر[2] ہنسنے لگیں، اس پر فرشتوں نے انہیں ولادت فرزند کی بشارت دی۔ یہ فرزند اسحاق علیہ السلام تھے اور پھر یعقوب علیہ السلام کی بشارت دی یعنی یہ بھی خوش خبری سنائی کہ فرزند جو پیدا ہوگا وہ زندہ رہے گا اور اس کی نسل چلے گی۔

اہل بیت کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے اس گھر والو یہ ہم ہی نے نہیں کیا ہے بلکہ مفسرین اہل سنت نے بھی یہی کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

"بخشا یش خدا و برکات او بر شما است اے اہل ایں خانہ"

شاہ رفیع الدین کے الفاظ یہ ہیں:

رحمت ہے اللہ کی اور برکات اس کی اوپر تمہارے ہیں اے گھر والو"۔

اسے یاد رکھئے۔ اب آیہ تطہیر میں جو کہا گیا ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ. تو وہاں اہل البیت کا ترجمہ یہی کرنا پڑے گا کہ "اس گھر والو" اور اس کے بعد لغت میں بیت دیکھ کر اس کا مطلب سمجھ میں نہ آئے گا جب تک کہ "اس" کے اشارہ کو نہ دیکھا جائے کہ وہ کس گھر کی طرف ہے اب اس گھر میں جو ہیں وہی آیت میں اہل البیت سے مراد ہوں، چاہے لغوی طور پر اہل خانہ کی مصداق کچھ فرما دیں اور ہوں۔

ہاں یہ ملحوظ خاطر رہے کہ جناب سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فقط زوجیت کا رشتہ نہ رکھتی تھیں بلکہ وہ نسبی رشتہ دار بھی جناب ابراہیم علیہ السلام سے رکھتی تھیں یعنی خاندان رسالت کی ایک فرد بھی تھیں اور اس لئے اہل البیت کے خطاب میں وہ بلا تکلف داخل ہوئیں۔ اتنا تو ہمارے پہلے کے مفسرین نے بھی کہا ہے[3] اور اس میں ہم مزید یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ جناب ابراہیم علیہ السلام سے سببی و نسبی رشتہ کے علاوہ سنخ وجوہر شخصی میں بھی ایسا اتحاد رکھتی تھیں کہ ملائکہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ساتھ ان سے بلا واسطہ کلام کیا۔ یہ بات ہر ایک کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝۷۴ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝۷۵ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۝۷۶

"تو جب ابراہیمؑ سے خوف و دہشت کی کیفیت دور ہوئی اور خوش خبری انہیں مل گئی تو وہ ہم سے لوطؑ کی قوم کے بارے میں لڑنے لگے۔ یقیناً ابراہیم بڑی قوت برداشت رکھنے والے، ہمدردی رکھنے والے، خدا سے لو لگانے والے تھے۔" اے ابراہیمؑ درگزر و اُس سے بلاشبہ آچکا ہے حکم تمہارے پروردگار کا اور یقیناً آ کے رہے گا ان پر وہ

---

[1] ۔اس ڈر کے رفع ہونے سے خوش ہو کر ہنس پڑیں (موضح القرآن)

[2] ۔فضحکت استبشارا بهلاکهم (جلالین) یعنی بسبب خوشوقتی از هلاك قوم لوط (فتح الرحمن)

[3] ۔انما جعل سارة من اهل البیت لما کانت بنت عمه (تبیان)

عذاب جو پلٹایا نہیں جا سکتا''۔

ایک بندہ بارگاہ الٰہی میں جو کچھ کہہ سکتا ہے وہ عرض معروض ہی کہلایا جا سکتا ہے بھلا بندہ کی کیا مجال اور وہ بھی ایک پیغمبر کی کہ وہ خالق سے بحث کرے، تکرار کرے اور لڑے؟ مگر یاد رکھئے کہ یہ وہ بندہ ہے جسے خالق نے اپنے خلیل یعنی دوست کا درجہ دیا ہے جو کچھ ابراہیم علیہ السلام کا عمل تھا اسے خود ابراہیم علیہ السلام بیان کرتے تو یقیناً اسے عرض و مناجات ہی کے نام سے یاد کرتے کہ میں نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں عرض معروض کیا مگر خالق اس ''دوست'' ہونے کے رشتہ کو سامنے رکھ کر ان الفاظ میں اس کا ذکر کر رہا ہے کہ وہ ہم سے قوم لوط کے بارے میں لڑنے لگے یعنی یہ کوشش کرنے لگے کہ کسی طرح عذاب ان سے ٹل جائے مگر یہ لڑنا ایسا تھا جو خالق کی نظر میں قابل تعریف ٹھہرا کہ اس پر ابراہیم علیہ السلام کے لئے ثنایہ الفاظ صرف کئے جانے لگے کہ ''اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ'' ابراہیم بڑے متحمل، دردمند دل رکھنے والے، خدا ترس تھے۔

یہ اور بات ہے کہ حکمت الٰہی اب اس قوم کو زیادہ مہلت دینے کی متقاضی نہ تھی اس لئے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عرض معروض کے عذاب آ کر رہا اور اس قوم کو چھٹکارا حاصل نہ ہو سکا۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿٧٧﴾ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿٧٨﴾ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿٧٩﴾ قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿٨٠﴾

''اور جب وہ ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس آئے تو وہ رنجیدہ ہو گئے ان کی وجہ سے اور وہ ان کے سبب سے شش و پنج میں پڑ گئے اور کہا یہ بڑا شر انگیز دن ہے اور ان کی قوم والے دوڑتے ہوئے ان کی طرف آ گئے اور اس کے پہلے برابر وہ سیاہ کاریوں کے مرتکب رہا ہی کرتے تھے انہوں نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! یہ میری لڑکیاں موجود ہیں یہ تمہارے لئے زیادہ مناسب ہیں تو اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمان کے معاملہ میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں ایک بھی شائستہ شخص موجود نہیں ہے؟ ان لوگوں نے کہا تم جانتے ہو کہ ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی مطلب نہیں ہے بلکہ تم بلاشبہ جانتے ہو کہ ہمارا مقصد کیا ہوا کرتا ہے؟ انہوں نے کہا کاش مجھے تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا میں سہارا لے سکتا کسی مضبوط ستون کا''۔

قوم لوط صنف مماثل کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے میں مشہور ہے فرشتے جناب لوطؑ کے پاس نوعمر لڑکوں کی صورت میں آئے تو انہیں دیکھ کر اس قوم کے اوباشوں نے لوطؑ کو گھیر لیا اور سمجھے کہ ان کو ہوس رانی کا اچھا ذریعہ ہاتھ آیا۔ اس سے جناب لوط علیہ السلام کو بڑا صدمہ پہنچا اور ان سے ان کی قوم سے یہ گفتگو ہوئی۔

''بیٹیوں'' کے لفظ سے عام طور پر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ انہوں نے ان کے سامنے خود اپنی بیٹیوں کو پیش کیا مگر ہماری قدیم تفسیر میں یہ ہے کہ بیٹیوں کے لفظ سے خود اس قوم کی عورتیں مراد ہیں کیونکہ ایک نبی کے لئے اس قوم کی سب عورتیں ایک طرح بیٹی کی حیثیت رکھتی ہیں۔[1]

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾

''انہوں نے کہا اے لوط! ہم آپ کے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں، یہ لوگ ہرگز آپ تک نہیں پہونچ سکیں گے، اب آپ اپنے اہل کو لے کر رات کے کسی حصہ میں چلے جایئے گا اور کوئی آپ لوگوں میں سے مڑ کر نہ دیکھے سوا آپ کی بیوی یقیناً اس تک پہونچنے والی ہے وہی مصیبت جو ان لوگوں پر آئے گی۔ بلاشبہ ان کا مقرر شدہ وقت صبح کا ہے کیا صبح نزدیک نہیں ہے؟ چنانچہ جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس سرزمین کو تہ و بالا کر دیا اور ان پر مسلسل کنکر پتھر برسائے جو تمہارے پروردگار کے یہاں نشان زدہ تھے اور وہ ان ظالموں سے کچھ دور نہیں ہیں؟

قوم لوط پر نزولِ عذاب

فرشتوں نے جب جناب لوط علیہ السلام کو بہت پریشان دیکھا تو انہیں مطمئن کیا اور حقیقت حال سے اطلاع دی ''سوا آپ کی بیوی کے'' یعنی اسے اپنے ساتھ نہ لے جایئے گا''۔[2]

آخر کا فقرہ وہ ان ظالموں سے کچھ دور نہیں ہیں'' اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ قوم لوط کے وہ شہر جن پر عذاب نازل ہوا تھا مسافت کے اعتبار سے مکہ والوں سے کچھ زیادہ دور نہیں ہیں، یہ اُن کے حالات خود معلوم کر سکتے ہیں کہ ان کا کیا انجام ہوا؟ اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ یہ ظالم بھی اپنی بداعمالی کے اعتبار سے ایسے ہی عذاب کے مستحق ہیں اور وہ پتھر ان سے کچھ دور نہیں ہیں۔[3]

ہمیں یہ مفہوم بھی بعید معلوم نہیں ہوتا کہ ''الظالمین'' سے جنس مراد ہو یعنی جو بھی اس درجہ کے ظالم ہوں، وہ اسی طرح کے عذاب کے مستحق ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ کی جانب کے کسی خاص عفو و کرم کی بنا پر یا رحمۃ للعالمین کے وجود ذی جود کی برکت سے یا کسی اور مصلحت سے وہ عذاب نازل نہ ہو۔

---

[1] ۔ عنی به ازواجهم وذلك ان النبی ابو امة (علی بن ابراهیم)

[2] ۔ استثناء من الاهل ای فلا تسر بها (جلالین)

[3] ۔ هی الحجارة او بلادها (جلالین)

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾

''اور سرزمین مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو انہوں نے کہا اے میری قوم والو! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ میں تمہیں اچھی حالت میں دیکھتا ہوں اور مجھے اندیشہ ہے تمہارے لئے گھیرنے والے دن کے عذاب کا اور اے میری قوم والو! پورا کیا کرو ناپ تول کو عدالت کے ساتھ اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو، اللہ کی نعمت جو باقی رہ جائے بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم باایمان ہو اور میں کوئی تمہارا نگہبان نہیں ہوں''۔

جناب شعیبؑ اور ان کی قوم کا حال

وہی سلسلہ یعنی نوح علیہ السلام کو بھیجا۔۔۔ ہود علیہ السلام کو۔۔۔ صالح علیہ السلام کو اور اب کہا جا رہا ہے کہ مدین کی طرف شعیبؑ کو بھیجا۔

''اللہ کی نعمت جو باقی رہ جائے'' اس سے بعض لوگوں نے یہ مراد لیا ہے کہ پورے ناپ تول کے بعد جتنا نفع تمہارے لئے رہ جائے وہ بہت اچھا ہے، اس لئے کہ وہ مال حلال ہوگا جس میں مواخذہ تم سے نہیں ہوگا [1] اور اس سے زیادہ واضح مجھے یہ مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے یہاں کی باقی رہنے والی نعمات جو اس کے حکم کی اطاعت سے وابستہ ہیں بہتر ہیں اس دولت فانی سے جو یوں ناجائز طریقہ پر تم حاصل کرتے ہو۔ [2]

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾

''ان لوگوں نے کہا اے شعیبؑ! کیا تمہاری نماز تم پر یہ حکم نافذ کرتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں اسے جس کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے آئے ہیں یا اسے کہ ہم اپنے اموال میں اپنی خواہش کے مطابق تصرف کریں۔ تم تو یقیناً بڑے ضبط و تحمل والے ٹھیک آدمی ہو''۔

یعنی ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ تم نمازیں پڑھا کرتے ہو تو پڑھے جاؤ ہمارا کیا نقصان ہے؟ مگر اب نمازیں پڑھتے پڑھتے تم ہمیں یہ نصیحتیں

---

[1] ۔ رزقه الباقي لكم بعد ايفآء الكيل والوزن (جلالين)

[2] ۔ بقية الله من نعمة وقيل بقية الله طاعة الله۔۔۔ لانه يبقىٰ ثوابها ابدا (تبيان)

کرنے لگے تو کیا تمہاری نماز نے اب تمہیں اس فریضہ پر مامور کیا ہے؟ تم تو بڑے ضبط وتحمل والے ٹھیک آدمی ہو یعنی ہمیں تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم ہم سے یہ بات کہو گے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کی عبادت چھوڑ دیں یا اپنے اموال میں حسب دل خواہ جو تصرف کرتے ہیں، وہ تمہارے کہنے سے ترک کر دیں۔

بعض لوگوں نے اس تعریف میں کہ ''تم بڑے ضبط وتحمل والے آدمی ہو''، تمسخر کا پہلو محسوس کیا ہے [1] مگر مجھے اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی بلکہ ان کے اس کہنے میں کہ بڑے ضبط وتحمل والے ٹھیک آدمی ہو مجھے یہ پہلو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے افعال واعمال سے تمہیں اتفاق تو کبھی نہیں تھا اور تم ناگواری محسوس کرتے تھے مگر تم نے کبھی اس کا اظہار نکتہ چینی یا اعتراض کی شکل میں نہیں کیا، نہ ہمیں اس کے خلاف کوئی تبلیغ وتلقین کی۔

اس میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ پیغمبران خدا بعثت سے پہلے بھی قوم کی گمراہیوں اور بداعمالیوں سے بیزار اور بے تعلق ہوتے ہیں مگر وہ لب کشائی اس وقت تک نہیں کرتے جب تک کہ بعثت ہو یعنی وہ خالق کی طرف سے اس تبلیغ وتلقین پر مامور ہوں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾

''انہوں نے کہا اے میری قوم والو! کیا تم نے غور کیا؟ اگر میں نمایاں دلیل پر ہوں اپنے پروردگار کی طرف سے اور اس نے مجھ کو دی ہے اپنی طرف سے اچھی روزی؟ اور میرا یہ مقصود نہیں ہے کہ میں تمہاری مخالفت کروں خود ان چیزوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے جن سے تم کو منع کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا مگر اصلاح جہاں تک کر سکوں۔ نہیں مجھے توفیق مگر اللہ کی طرف سے اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی میں لو لگاتا ہوں اور اے میری قوم والو! میری مخالفت تم سے ایسے کام کہیں نہ کروا دے کہ تمہیں پہنچ جائے ایسی آفت جیسی پہنچی نوح کی یا ہود کی قوم کو یا صالح ؑ کی قوم کو اور لوطؑ کی قوم تو تم سے دور نہیں ہے اور اپنے پروردگار سے مغفرت کے طالب ہو، پھر اس سے لگو لگاؤ، یقیناً میرا پروردگار مہربان ہے، بڑی محبت والا''۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا

---

[1] ۔ قالوا ذٰلك استهزاء (جلالین)

رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٩٢﴾ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿٩٣﴾

''ان لوگوں نے کہا: اے شعیب! جو کچھ تم کہتے ہو، اس کا زیادہ حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور ہم تم کو اپنے میں کمزور دیکھتے ہیں اور اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے اور تم ہمارے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، انہوں نے کہا: اے میری قوم والو! کیا میرا قبیلہ تمہاری نظر میں اللہ سے زیادہ زبردست ہے؟ اور تم نے اسے اپنے پس پشت ڈال دیا ہے یقیناً میرا پروردگار اس پر جو تم کرتے ہو، حاوی ہے اور اے میری قوم والو! تم اپنی جگہ جو کچھ کرتے ہو، کیے جاؤ اور جو میں کرتا ہوں، میں کئے جاؤں گا بہت جلد تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس پر آتا ہے وہ عذاب جو اسے رسوا کر دے اور کون جھوٹا ہے؟ اور انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں''۔

وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٩٤﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿٩٥﴾

''اور جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے بچا دیا شعیب کو اور انہیں کہ جنہوں نے ان کا ساتھ دے کر ایمان اختیار کیا تھا اپنی رحمت سے، اور گرفت میں لے لیا ان کو جو ظالم تھے کڑک نے، تو وہ اپنے گھروں میں گر گئے، منہ کے بل، گویا کہ وہ وہاں بسے ہی ہوئے نہ تھے، آگاہ ہو کہ لعنت ہے مدین کے لئے جیسی لعنت میں مبتلا ہوئے ثمود''۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٦﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿٩٧﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿٩٨﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿٩٩﴾

''اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی طرف کے معجزہ اور کھلے ہوئے اقتدار کے ساتھ فرعون اور اس کے ساتھ والے بڑے آدمیوں کے پاس تو ان لوگوں نے فرعون کے حکم کی پیروی کی اور فرعون کا حکم بالکل صحیح نہ تھا وہ اپنی قوم کی قیادت

کرے گا قیامت کے دن اور اس طرح انہیں دوزخ کی آگ میں پہنچا دے گا کیا بری ہوگی یہ منزل جہاں وارد ہوا جائے گا اور ان کے پیچھے لگا دی گئی اس دنیا میں لعنت اور قیامت کے دن کیا بُرا عطیہ ہے جو انہیں عطا کیا گیا[1]''

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

''یہ ان بستیوں کی خبریں ہیں جو آپ کے سامنے ہم بیان کرتے ہیں ان میں کچھ کچھ رہ گئی ہیں اور کچھ کا قلع قمع ہو چکا ہے اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا مگر انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا تو نہیں فائدہ پہنچایا انہیں ان کے خداؤں نے جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر دہائی دیتے تھے جب آ گیا آپ کے پروردگار کا حکم اور انہوں نے سوا تباہی و بربادی کے انہیں کچھ اور نتیجہ نہ بخشا''۔

''ان میں کچھ رہ گئی ہیں اور کچھ کا قلع قمع ہو چکا ہے'' اس کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض اقوام کی نسلیں باقی ہیں اور بعض بالکل ختم ہوگئیں کہ نسل بھی باقی نہیں رہی اور دوسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ کچھ ایسی بستیاں ہیں کہ وہاں کے باشندے ختم ہو گئے مگر وہ کھنڈر اب تک باقی ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کے آثار بھی مسمار ہو کر نیست و نابود ہو گئے۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾

''اور اسی طرح ہوتا ہے گرفت میں لینا تمہارے پروردگار کا جب وہ گرفت میں لیتا ہے بستیوں کو اس عالم میں کہ وہ ظلم و ستم کی مرتکب ہیں یقیناً اس کی گرفت دردناک ہوتی ہے، سخت''۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾

''یقیناً اس میں نشانی ہے اس کے لئے جو ڈرے آخرت کے عذاب سے۔ وہ ایسا دن ہے جس کے لئے تمام خلق اکٹھی کی جائے گی اور وہ ایسا دن ہے جس میں سب حاضر ہوں گے اور ہم اس کے لانے میں دیر نہیں کر رہے ہیں مگر ایک مقررہ مدت کے پورا ہونے کے لئے، جس دن وہ آئے گا تو کوئی متنفس بات نہ کرے گا مگر اس کی اجازت سے تو ان میں کچھ بدنصیب ہوں گے اور کچھ خوش نصیب''۔

قرآن مجید کی ایک آیت سے دوسری آیت کی تشریح ہوا کرتی ہے یہاں بات نہ کرنے میں استثناء اجازت کا کر دیا گیا ہے تو دوسری جگہ

---

[1] ۔انما قیل ھٰھنا وفدلان اللعنة جعلت بدلا من الرفد بالعطية (تبیان)

مطلق طور پر جو کہہ دیا گیا ہے:

هٰذَا يَوْمٌ لَا يَنْطِقُوْنَ.

وہ دن ایسا ہوگا کہ وہ بات تک نہیں کرسکیں گے۔ (مرسلات: ۳۵)

اس سے یہی سمجھنا چاہیے کہ بغیر اللہ کی اجازت کے ایسا نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ وہ ارشاد ہے کہ بات تک نہیں کرسکیں گے، مجرموں کی حالت کا اظہار ہے اور بات سے مراد حجت و دلیل اور کوئی قابل قبول صفائی ہے جسے وہ پیش کرسکیں۔ [۱]

اور یہاں اذن کے استثناء کے ساتھ جو ارشاد ہے اس میں تمام خلق کا تذکرہ ہے جن میں وہ بھی داخل ہیں جو مقرب بارگاہ الٰہی ہیں اور جنہیں اس نے خود اس دن کلام کے لئے مامور فرمایا ہے وہ دوسروں کے خلاف گواہی پر بھی مامور ہو سکتے ہیں جو ہماری قدیم تفسیر میں وارد ہے۔ [۲]

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

''تو جو بدنصیب ہیں، وہ آتش دوزخ میں ہوں گے، ان کے لئے اس میں چیخ پکار ہوگی، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں سوا اس کے جو تمہارا پروردگار چاہے یقیناً تمہارا پروردگار جو ارادہ کرتا ہے، اسے کر کے رہنے والا ہے، اور جو خوش نصیب ہیں، وہ بہشت میں ہوں گے ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک آسمان و زمین ہیں سوا اس کے کہ تمہارا پروردگار چاہے، یہ عطائے الٰہی ایسی ہوگی جو قطع ہونے والی نہیں ہیں''۔

مذکورہ آیات میں دو فقرے ذرا ذہن کو پریشان کرتے ہیں:

پہلے دوزخ اور جنت دونوں میں یہ کہہ کر ہمیشہ وہاں رہیں گے یہ فقرہ کہ مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں حالانکہ یہ آسمان و زمین قائم ہیں حالانکہ یہ آسمان اور زمین تو پہلے ہی ختم ہو چکے ہوں گے اور وہاں والے آسمان و زمین، وہ تو اس بہشت و دوزخ کے ساتھ وابستہ ہیں اور وہ بہشت و دوزخ ہمیشہ رہنے والے ہیں تو وہ آسمان و زمین بھی ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

دوسرے دونوں میں اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ کا استثناء ہے، سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے سے متعلق ہے یعنی اہل دوزخ، دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے سوا اس کے جسے اللہ چاہے، اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جسے وہ چاہے، وہ ہمیشہ نہ رہے گا اور اہل بہشت، بہشت میں ہمیشہ رہیں گے سوا اُس کے جسے اللہ چاہے یعنی جسے اللہ نہ چاہے، ایسا شخص ہمیشہ نہ رہے گا اب یہ کون لوگ ہیں جو دوزخ میں ہمیشہ کے لئے ڈالے جائیں اور

---

[۱] ۔ای لا ینطقون بحجته (تبیان)

[۲] ۔یشهد علیهم الانبیاء و الرّسل (علی بن ابراهیم)

پھر مشیت الٰہی متقاضی ہو تو وہ نکال لئے جائیں گے اور جو جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل کئے جائیں اور پھر مشیت الٰہی متقاضی ہو اور وہ وہاں سے خارج کر دیئے جائیں۔

شاہ ولی اللہ نے اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ کا تعلق دوزخ اور جنت میں ہمیشہ کے لئے قیام سے قرار ہی نہیں دیا ہے بلکہ اسے مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ جسے متعلق کیا ہے مگر ایسی ژولیدہ بیانی سے جس کا مطلب سمجھنا دشوار ہے وہ لکھتے ہیں:

یعنی مدت ماندن در بہشت و دوزخ مانند مدت دوام آسمانہا و زمین است درد دنیا اگر زیادتی را کہ در مشیت خدا است و در فہم کسی نمی گنجد، اعتبار نکنند حاصل بیان دوام است بابلغ وجوہ (فتح الرحمٰن)

یعنی جنت اور جہنم میں ان کے رہنے کی مدت آسمانوں اور زمین کے دنیا میں قیام کی مدت کے مثل ہے اگر اس زیادتی کا جو مشیت الٰہی میں ہے اور کسی کے ذہن میں اس کے سمجھنے کی وسعت نہیں ہے لحاظ نہ کیا جائے اور خلاصہ مطلب انتہائی مکمل طریقہ پر ہمیشہ ہمیشہ رہنے کا اظہار ہے۔ ان کے فرزند شاہ عبدالقادر میرے خیال میں زیادہ حقیقت کے قریب پہنچے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ:

''دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ رہیں گے کہ آگ میں جتنی دیر رہ چکے ہیں آسمان و زمین دنیا میں مگر جتنا اور چاہے تیرا رب وہ اسی کو معلوم ہے۔ دوسرے یہ کہ رہیں گے آگ میں جب تک ہے آسمان و زمین اس جہان کا یعنی ہمیشہ مگر جو چاہے رب تو موقوف کر دے لیکن چاہ چکا کہ موقوف نہ ہو۔ اس کہنے میں فرق نکلا اللہ کے ہمیشہ رہنے میں اور بندے کے کہ بندہ کو ہمیشہ رہنے کے ساتھ یہ بات ممکن ہے کہ اللہ چاہے تو فنا کر دے'' (موضح القرآن)

ان میں سے جو پہلے معنی ہیں یعنی مَا شَآءَ رَبُّكَ کا یہ مفہوم کہ اللہ چاہے تو اس مدت کو اور بڑھا دے، یہ جلالین سے ماخوذ ہیں:

تفسیر جلالین میں ہے:

مادامت السمٰوٰت والارض ای مدۃ دوامہا فی الدنیا الا غیر ماشآء ربك من الزیادۃ علیٰ مدتہما مما لامنتہیٰ لہ والمعنی خالدین فیہا ابدا.

جب تک کہ رہے آسمان اور زمین یعنی جتنے عرصہ تک وہ دنیا میں قائم رہے ''سوا اسکے جو تمہارا پروردگار چاہے'' یعنی اور زیادتی ان کی مدت میں جس کی کوئی انتہا نہیں اور مطلب یہ ہے کہ وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

پھر آخر میں لکھا ہے:

وما تقدم من التاویل ہو الذی ظہر لی وہو قال عن التکلف واللہ اعلم بمرادہ

جو معنی بیان ہوئے ہیں وہ میرے ذہن میں آئے ہیں اور ان میں کوئی زحمت نہیں ہے اور اللہ اپنے مطلب سے خود زیادہ واقف ہے۔

ہماری ایک قدیم تفسیر میں یہ ہے کہ یہ قیامت میں ثواب و عذاب کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ اس کے پہلے برزخ والے ثواب اور عذاب کا تذکرہ ہے [1]۔

---

[1] ۔ففی النار... فی نار الدنیا قبل یوم القیامۃ... ففی الجنۃ یعنی فی جناب الدنیا التی تنتقل الیہا ارواح المؤمنین (علی بن ابراہیم)

اس کے بعد مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اور اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہ دونوں فقروں میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ۝۱۰۹

''تو جن چیزوں کی یہ عبادت کرتے ہیں ان سے تمہیں کوئی تردد نہ ہونا چاہیے، یہ نہیں عبادت کرتے مگر اسی طرح کہ جیسے اس کے پہلے ان کے باپ دادا عبادت کرتے تھے اور ہم پورا پورا ان کا حصہ انہیں دیں گے، جس میں کوئی کمی نہ ہوگی''۔

اس تمہیں کا مخاطب رسولؐ کو نہیں ماننا چاہیے یا تو لفظی طور پر ہی جیسا کہ بہت سے مقامات پر ہم نے اسے ترجیح دی ہے کہ مخاطب شخصیت خاص نہیں بلکہ ہر سننے والا اور سمجھنے والا ناظر کتاب یا سامع قرآن ہے اور یا لفظی طور پر رسولؐ کے مخاطب ہوتے ہوئے مقصود اس سے آپ کی امت کو متنبہ کرنا ہے۔[1]

جس کی نظیریں بھی قرآن مجید میں بہت ہیں۔

''پورا پورا حصہ'' دینے سے ایک لطیف پیرایہ ہیں پوری پوری سزا دینا مراد ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝۱۱۰ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱۱

''اور ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی تو اس میں اختلاف پیدا ہوا اور اگر نہ ہوتی اللہ کی طرف کی بات جو پہلے طے ہو چکی تھی تو ان کے درمیان فیصلہ ہو جاتا اور وہ یقیناً اس میں پریشان کرنے والے شک میں مبتلا ہیں اور بلا شبہ ہر ایک کو ایک وقت پورا پورا دے گا تمہارا پروردگار ان کے اعمال کا معاوضہ۔ یقیناً وہ اس سے جو وہ کرتے ہیں، باخبر ہے''۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو اپنی قوم کے انکار سے دل تنگی پیدا ہوتی تھی اس کی بناء پر بہت سی آیات میں گزشتہ انبیاء کی نظیریں پیش کر کے آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ یہاں حضرت موسیٰؑ کی مثال اسی مقصد سے دی گئی ہے۔[2]

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱۲ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ

---

[1] ۔ نهی الله تعالیٰ نبیّه والمراد به امته (تبیان)

[2] ۔ اراد بذلك تسلية النبی ﷺ علیٰ تكذیب قومه (تبیان)

اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴿۱۱۳﴾

''تو مضبوطی سے برقرار رہیے جیسا کہ آپ مامور ہیں اور وہ بھی جو آپ کے ساتھ لو لگاتے ہیں اور تم لوگ سرکشی نہ کرو۔ یقیناً جو جو کچھ تم کرتے ہو اس کا دیکھنے والا ہے اور ان کی طرف جو ظالم ہیں نہ جھکو کہ پہنچے تم کو آتش دوزخ اور اللہ کو چھوڑ کر تمہارے کوئی حوالی موالی نہ ہوں گے پھر تمہاری مدد نہ ہوگی''۔

''یہ برقرار رہنا'' انتہائی مشکل کے باوجود حق کے جادہ پر ثابت قدم رہنا ہے جس کی جاہل لوگ ضد سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی کی خالق کی طرف سے رسولؐ کو ہدایت ہے [1] اور ان کے ان پیروؤں کو جو اللہ سے لو لگائے ہوں یعنی اس کی مرضی کے مقابلہ میں دنیا کی پرواہ نہ کریں اور اس کے مقابل کردار کو سرکشی سے تعبیر فرمایا ہے جس پر ان الفاظ میں ڈرایا گیا ہے کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس کو دیکھنے والا ہے''۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴿۱۱۴﴾

''اور نماز ادا کرو دن کے دونوں طرف کے حصوں میں اور رات کے کچھ حصوں میں یقیناً نیکیاں ختم کر دیتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاد آوری ہے ان کے لئے جو یاد تازہ رکھنا چاہیں۔

اوقات نماز میں صبح، ظہرین اور مغربین، تین وقتوں کا تذکرہ

اس پر سب متفق ہیں کہ دن کے دونوں طرف کے حصوں میں نماز سے مراد صبح اور ظہر وعصر ہے اور رات کے حصوں میں نماز سے مراد مغرب وعشاء ہے جیسا کہ تفسیر جلالین میں ہے:

طرفی النّهارِ الغداة والعشی ای الصّبح و الظّهرو العصر و زلفا جمع زلفة ای طائفة من الیل المغرب والعشاء.

دن کے دونوں طرف کے حصے صبح اور دوپہر سے شام تک یعنی صبح اور ظہر وعصر اور زلف کا لفظ کا زلفة کی جمع ہے یعنی رات کا ایک حصہ اس میں مغرب اور عشاء ہے۔

اسے جس طرح قرآن نے کہا ہے اس سے اوقات نماز کے بارے میں جو فقہ جعفری کی تعلیم ہے، وہی ثابت ہوتی ہے۔

جمہور کا تصور کیا ہے؟ یہ کہ پانچ نمازوں کے پانچ الگ الگ وقت ہیں جن کے درمیان ایسے وقفے گزرتے ہیں جو کسی بھی نماز سے تعلق نہیں رکھتے۔

طلوع صبح صادق سے طلوع آفتاب تک صبح کا وقت ہے اور طلوع آفتاب کے بعد سے زوال تک کسی نماز کا وقت نہیں ہے ویسے زوال آفتاب کے بعد تھوڑی دیر تک ظہر کا وقت ہے اس کے بعد ظہر کا وقت نکل جاتا ہے اور ابھی عصر کا وقت آتا نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ درمیان

---

[1] ۔امر اللہ النّبی ﷺ و امته ان یستقمیوا کما امرهم الله (تبیان)

میں ایک جز ایسا آ گیا جس میں کسی نماز کا وقت نہیں ہے ایسے ہی عصر کے بعد مغرب تک ایک وقفہ ہوتا ہے جو نماز سے خالی ہے اور مغرب کے بعد پھر ایک وقفہ ایسا ہے جس میں عشاء کا وقت داخل نہیں ہوتا اور اس کے بعد عشاء کی نماز ہے جس کے بعد صبح تک پھر نماز واجب کا وقت نہیں ہے اگر یہ صورت ہو تو قرآن کو نماز کے پانچ وقت الگ الگ بیان کرنا چاہئیں۔ وہ کہے کہ دن کے ابتدائی حصہ میں نماز قائم کرو۔ پھر بیچ میں نماز ادا کرو، یہ ظہر ہے۔ پھر آخر کے کچھ حصہ میں نماز ادا کر دو جو نماز عصر ہے۔ پھر رات کے اول حصہ میں ادا کرو۔ یہ مغرب ہوگی۔ پھر رات کے درمیانی حصہ میں ادا کرو یہ عشاء ہوگی۔ مگر قرآن تمام اوقات کو تین پر تقسیم کر رہا ہے۔ دو طرفی النھار ''دن کا اول اور آخری حصہ''.....اول حصہ میں صبح ہے اور آخر حصہ میں ظہر و عصر ہے۔ معلوم ہوا کہ صبح اور ظہر کے بیچ میں ایسا وقفہ ہے جس میں کسی نماز کا وقت نہ ہو مگر دن کا آخر حصہ پورا نماز کے وقت کا ہے جس میں صرف ترتیب ظہر کے پہلے اور عصر کے بعد میں ہونے کی وجہ سے عقلاً کوئی ایک جزء ایک سے مختص ہو جائے وہ اور بات ہے ورنہ اس پورے وقت میں یہ دونوں نمازیں ادا ہو سکتی ہیں اور پھر رات کا کچھ حصہ ہے جس میں مغرب اور عشاء دونوں کا وقت مشترک ہے یہ اور بات ہے کہ ترتیب کی وجہ سے شروع کا کچھ جزء مغرب سے اور آخر کا کچھ جز عشاء سے مختص ہو جائے۔ ورنہ ہے یہ پورا وقت ان ہی نمازوں کا جنہیں ہم ''مغربین'' کہتے ہیں یہی فقہ امامیہ کی تعلیم ہے اور یہی صاف قرآن سے ثابت ہے۔

اس کے علاوہ یہ دیکھئے کہ مغرب اور عشاء دونوں کے وقت کو زلفاً من الیل کہا جاتا ہے رات کا کچھ حصہ ظاہر ہے کہ تاریکی چھائے ہوئے بغیر رات کو اطلاق کسی حیثیت سے نہیں ہو سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ فقط سورج کی ٹکیا کی نظر سے اوجھل ہونے کے ساتھ جب تک کچھ تاریکی آ نہ جائے، نماز مغرب کا وقت نہیں آتا۔ جس طرح روزہ کے اختتام کے لئے کہا ہے:

اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ۔

روزہ کو رات تک مکمل کرو۔

معلوم ہوا کہ اس جزء میں بھی فقہ جعفری ہی قرآن کے موافق ہے کہ غروب حسّی یعنی آفتاب کے نگاہ سے غائب ہونے پر فوراً نہ نماز مغرب پڑھنا درست ہے اور نہ روزہ کھولنا۔ صحیح ہے بلکہ انتظار کرنا چاہیے کہ ذرا تاریکی پیدا ہو جائے اور وہ اسی وقت ہوگی کہ جب حمرۂ مشرقیہ زائل ہو جائے اور سیاہی سر کے قریب آ جائے بغیر اس کے لیل کا اطلاق کسی طرح بھی درست نہیں ہے اور بغیر لیل کے آئے ہوئے از روئے قرآن نہ مغرب کی نماز پڑھنا درست ہے اور نہ روزہ کھولنا۔

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

''اور صبر و برداشت سے کام لیجئے، اس لئے کہ اللہ اچھے اعمال کرنے والوں کے ثواب کو برباد نہیں کرتا''۔

یہاں پر ترتیب اگر مطابق تنزیل ہے تو صبر و برداشت کا حکم گزشتہ دونوں آیات کے مضمون سے مجموعاً متعلق ہو سکتا ہے یعنی راہ حق میں جو مشکلات درپیش ہوں، ان پر صبر سے کام لے استقامت یعنی ثبات قدم برقرار رکھئے اور پابندی فرائض میں محافظت اوقات رکھتے ہوئے، عام طور پر ایسی پابندی میں انسان کو جو کلفت یعنی زحمت محسوس ہوتی ہے اسے برداشت کیجئے۔ [1]

اور یہ پہلے ہی آ چکا ہے کہ یہ حکم خاص رسولؐ کو نہیں ہے بلکہ آپ کے ساتھ آپ کے وفادار افراد امت کو بھی ہے۔

---

[1] ۔ امر اللہ تعالیٰ نبیہ ﷺ بالصبر علیٰ اذیٰ قومہ۔۔ وعلی القیام بما افترض علیہ من ادآء الواجب (تبیان)

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

''تو کیوں نہ ہوئے ان اقوام میں جو تمہارے پہلے تھیں ایسے بچے کچھے سمجھ دار لوگ جو زمین میں خرابیاں پھیلانے سے منع کرتے سوا تھوڑے سے ایسے افراد کے جن کو ہم نے نجات دی ان میں سے ظالم تھے وہ پیچھے لگے رہے ان عیش وعشرت کی لذات کے جو انہیں دی گئی تھیں اور وہ گناہگار تھے''۔

یعنی ہر قوم میں تھوڑے ایسے ضرور تھے جو ان کی بداعمالیوں سے الگ تھے اور انہیں منع بھی کرتے تھے چنانچہ ہمیشہ عذاب نازل ہونے کے موقع پر معدودے چند بچ جاتے تھے لیکن اگر بہت سے ایسے افراد ہوتے جو برائیوں سے روکیں تو قوم پر عذاب نازل ہی نہ ہوتا۔[۱]

اولو بقیّۃ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے بچے کچھے سمجھدار لوگ یہ مختلف تفسیروں سے مستفاد ہوتا ہے۔[۲]

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

''اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو تباہ کرے ظلم کے ساتھ حالانکہ ان کے باشندے درست اعمال ہوں''۔

یعنی عذاب الٰہی بلاوجہ نہیں آیا کرتا جب تک کے وہاں کے باشندوں کے اعمال ایسے خراب نہ ہوں کہ انہیں سزا دینا ضروری ہو۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

''اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو سب کو ایک مذہب پر بنا دیتا[۳] اور وہ برابر اختلاف کرتے رہیں گے سوا اس کے جس کو تمہارے پروردگار کا رحم وکرم شامل حال ہو حالانکہ اس نے پیدا انہیں اسی لئے کیا تھا اور تمہارے پروردگار کی بات پوری ہوئی کہ میں ضرور بھر دونگا دوزخ کو جنات اور انسانوں سے۔ اور پیغمبروں کے واقعات میں سے ہر وہ

---

[۱] ۔یعنی نیک لوگ غالب ہوتے تو قوم ہلاک نہ ہوتی تھوڑے تھے سو اب بچ گئے (موضح القرآن)

[۲] ۔ای کان یجب ان یکون منہم قوم باقون فی الارض ینہون۔۔ و معنی اولو بقیۃ اصحاب جماعتہ تبقیٰ من نسلہم والبقیۃ ممدوحۃ یقال فی فلان بقیۃ ای فیہ فضل و خیر (تبیان) اہل خرد (شاہ ولی اللہ) صاحب شعور کے (شاہ رفیع الدین)

[۳] ۔امۃ واحدۃ ای علیٰ دین واحد کما قال: انا وجدنا ابائنا علیٰ امۃ (تبیان)

چیز ہم آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں جس سے ہم آپ کے دل کو مضبوط کرتے ہیں اور آئی ہے آپ کے پاس اس میں حقیقت اور موعظت اور نصیحت اہل ایمان کے لئے''۔

یہ آیت مشکلاتِ قرآن میں سے ہوگئی ہے اور جبر کے ماننے والوں نے بلا تکلف اسے کہ اللہ نے انہیں اسی لئے پیدا کیا ہے اس معنی میں لے لیا ہے کہ خدا نے اسی اختلاف کے لئے ان کو پیدا کیا ہے [1] اور اس نے پہلے سے طے کر دیا ہے کہ دوزخ کو ان سے بھرا جائے گا مگر عقلی طور پر یہ دونوں باتیں متضاد ہیں اگر اُس نے اسی اختلاف کے لئے انہیں پیدا کیا ہے تو اختلاف کر کے وہ اس کے مقصد کی تکمیل کرتے ہیں پھر دوزخ کو ان سے کیوں بھرا جائے اور اگر وہ اس اختلاف میں مبتلا ہو کر دوزخ میں بھیجے جانے کے مستحق ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اختلاف کے لئے انہیں پیدا نہیں کیا ہے اور وہ اختلاف کر کے اس کی مرضی کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ اسی لئے دوزخ کے مستحق بنتے ہیں مگر جب کہ اس سے پہلے قریب ہی من رحم ربك موجود ہے تو کیوں نہ ''ذالك'' کا مشارٌ الیہ اسی رحمت کو قرار دیا جائے جس کی تائید میں ہمارے قدیم مفسرین کے اقوال موجود ہیں اور اس لئے ہم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔ [2]

یعنی قرآن میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں یا یہ کہ اس سورہ میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں [3] وہ کوئی تاریخ نگاری یا قصہ گوئی کے مقصد سے نہیں ہیں بلکہ ان میں کچھ عملی پہلو ہوتے ہیں جن کی طرف توجہ دہانی منظور ہوتی ہے۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۙ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

''اور کہیے ان سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنے طور پر عمل کرتے رہو، ہم بھی عمل کر رہے ہیں اور انتظار کرو، ہم بھی انتظار رکھتے ہیں''۔

یعنی تمہارے اور ہمارے اعمال کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے دیکھنے کے تم بھی منتظر رہو، ہم بھی منتظر ہیں۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''اور اللہ سے مخصوص ہے آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم اور اسی کی طرف تمام تر معاملہ کی رجوع ہے تو اسی کی عبادت اور اسی پر بھروسا کرو اور تمہارا پروردگار اس سے جو تم لوگ کرتے ہو بے خبر نہیں ہے''۔

---

[1] ۔برای این اختلاف آفریدہ است ایشان را (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔خلقهم یعنی اهل امة لا یختلفون فی الدین (علی بن ابراهیم) قال ابن عباس و مجاهد و قتادة والضحاك ان المواد: وللرحمة خلقهم (تبیان)

[3] ۔درایں سورہ (شاہ ولی اللہ) فی هٰذه الأیات والانبیآء (جلالین) الاوّل اصحّ والتقدیر جآءك فی هٰذه السّورة الحقّ مع ماجآءك فی سائر السّور (تبیان)

سُوْرَۃُ یُوْسُفَ

مکیّہ-----۱۱۱ آیات

جناب یوسف علیہ السلام کا نام تو بسلسلہ انبیاء اور انفرادی طور پر قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر موجود ہے لیکن اس واقعہ کا ذکر جسے قصہ یوسفؑ کہا جاتا ہے اور قرآن نے اسے تمام قصوں میں بہترین کہا ہے، اس سورہ میں درج ہے پھر خود اسی واقعہ کے ذیل میں بہت سی عبرتیں، نصیحتیں اور تعلیمات موجود ہیں۔ مثلاً

سورۂ یوسف کے خاص خاص موضوعات:

۱-----خوفِ فتنہ، خوف خدا یا کسی اہم مصلحت کی وجہ سے حقیقتوں اور واقعیتوں کے اخفاء کا مستحسن ہونا۔

۲-----باوجود دوسرے پر حقیقۃً اطمینان نہ ہونے کے پھر بھی ظاہری قول وقرار پر اتمام حجت کے لئے اعتماد کر کے عمل کرنا۔

۳-----وقتی تکالیف اور مصائب میں حکمت ربانی کے جلوے اور انجام میں کامیابی وکامرانی اور بہتر سے بہتر نتیجہ کا ظہور۔

۴-----امانت داری اور پاک دامانی کی اہمیت اور سخت ترین ماحول میں خطرات کی پرواہ کیے بغیر اس پر ثبات وقرار۔

۵-----تبلیغ حق کے لئے مناسب موقع سے فائدہ اٹھانا اور قید وبند یا کسی بھی عالم میں اپنے نصب العین کو نظر انداز نہ کرنا۔

۶-----قید ومصیبت سے رہائی کہ بہ نسبت زیادہ اہم جرم سے اپنے بری ہونے کی تصدیق۔

۷-----رہنمائے دین کی معاشی نظام کی حکمتوں سے بہترین واقفیت۔

۸-----دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی مجبوری کے مشاہدہ سے رحم دلانہ تاثر۔

۹-----نظر بد کے خطرہ کی مذہبی اصلیت۔

۱۰-----گریہ کا جواز۔

۱۱-----گریہ باوجود علم بحیات

۱۲-----ظالموں کو گریہ سے ناگواری اور ان کی طرف سے اس پر اعتراض

۱۳-----قابو پا کر اپنے ظالموں کے ساتھ عفو وکرم کا مظاہرہ۔

۱۴-----سجدہ تعظیمی کا سابق میں جواز اور اس کے شرک نہ ہونے کا ثبوت۔

۱۵-----اکثریت کا راہ ایمان سے انحراف وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

الٓرٰ ۟ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۟ۙ﴿۱﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾

''الف۔لام۔را۔ یہ واضح کتاب کی آیات ہیں ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنا کر اتارا ہے، شاید تم لوگ عقل سے کام لو''۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَاۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۳﴾

''ہم آپ کے سامنے بہترین قصے سناتے ہیں اس سے جو ہم نے آپ کی طرف قرآن کی وحی بھیجی ہے اگرچہ آپ اس سے پہلے بے خبر تھے''۔

یعنی ہماری تعلیم سے قطع نظر کر کے ذاتاً آپ کسی بھی علم واطلاع کے مالک نہ تھے کیونکہ آپ تو مخلوق ہیں مخلوق کا کوئی کمال بھی اس کا ذاتی نہیں ہوسکتا۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ﴿۴﴾ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۵﴾ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶﴾

''جب کہا یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہ اے بابا! میں نے خواب میں دیکھا گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے۔ انہوں نے کہا اے بیٹا اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کرنا کہ کہیں تمہیں نقصان پہنچانے کے لئے کوئی سازش نہ کریں۔ یقیناً شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے اور اسی طرح تمہیں تمہارا پروردگار امتیاز عطا کرے گا اور تمہیں تعبیر خواب کا علم عطا کرے گا اور اپنی نعمت تم پر پوری کرے گا اور یعقوب کے خاندان پر جس طرح اس نے اسے پورا کیا اس کے پہلے تمہارے آباؤ اجداد میں سے دو ابراہیم اور اسحاق پر، یقیناً تمہارا پروردگار جاننے والا ہے، بڑا ٹھیک کام کرنے والا''۔

جناب یوسف علیہ السلام کا خواب اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے گفتگو

اس طرح تمہیں تمہارا پروردگار عطا کرے گا یعنی جیسے تمہیں اس نے اپنے فضل وکرم سے یہ خواب دکھایا، اسی طرح عالم مشاہدہ میں بھی تمہیں امتیاز عطا کرے گا۔[1]

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝۷

''بلاشبہ یوسفؑ اوران کے بھائیوں (کے حالات) میں نشانیاں ہیں سوال کرنے والوں کے لئے''۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

برادران یوسفؑ کا منصوبہ اور یوسفؑ کے ساتھ بدسلوکیاں

''نقل ہے کہ قریش نے یہود سے کہا کچھ بتاؤ کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھیں سچ آزمانے کو کہا۔ پوچھو کہ ابراہیم علیہ السلام کا وطن شام ہے اس کی اولاد بنی اسرائیل مصر میں کیوں کر آئی۔ فرمایا کہ پوچھنے والے کو نشانیاں ہیں قریش کی کہ یہ ایک بھائی کا حسد تھا کہ اطاعت قبول نہ کی۔ آخر اللہ نے اس کی طرف محتاج کیا اور اس طرح یہود حسد کر کے خراب ہوئے اور قریش نے بھائی کو وطن سے نکالا، وہیں اس کو عروج ہوا''۔ (موضح القرآن)

پھر یہ نشانی اس مثال عمل کے ساتھ بھی مطابق ہے کہ بھائیوں نے تو کس طرح ایذائیں پہنچائیں اور جناب یوسف علیہ السلام نے انہیں معاف کیا اور درگزر سے کام لیا جو بلاشبہ ایک غیر معمولی کردار تھا[2] اسی طرح پیغمبر خداؐ نے قریش کی ایذاؤں کے باوجود جب ان پر فتح مکہ میں قابو پایا تو عام معافی کا اعلان فرمادیا۔

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ۭ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِۨ ۝۸ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝۹

''جب انہوں نے کہا کہ یوسفؑ اوران کا بھائی، یہ ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں''۔ حالانکہ ہم اتنے ہیں طاقت ور یقیناً ہمارے باپ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ قتل کردو یوسف کو یا کسی اور سرزمین پر لے جا کر ڈال دو کہ تمہارے باپ کی توجہ تمہاری طرف ہوجائے اور تم اس کے بعد پھر نیک لوگ ہوجانا''۔

برادران یوسف کی گفتگو سے ظاہر ہے کہ وہ بغض وحسد وغیرہ صفات ذمیمہ رکھنے کے علاوہ ایک نبیؑ خدا یعنی اپنے باپ کی نبوت پر ایمان بھی نہ رکھتے تھے ورنہ وہ انہیں گمراہ قرار نہ دیتے اور اس لئے علمائے شیعہ کو جمہور کے اس تصور سے کہ وہ برادران یوسف کی نبوت کے قائل ہیں

---

[1] ۔ کما اکرمك بان اراك فی منامك هٰذه الرّؤیا (تبیان)

[2] ۔ وکان ذٰلك خروجا عن العادات (تبیان)

شدید اختلاف ہے۔[1]

یہ سب کرلو پھر نیک لوگ ہوجانا یعنی بعد میں توبہ کرلینا۔[2]

یہ توبہ کا وہ عام تصور ہے جو بہت سے لوگوں کے ذہن میں ہے اور جس سے وہ بے باکانہ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں حالانکہ توبہ کوئی ایسا عمل نہیں ہے کہ جب چاہے آدمی اسے کرلے بلکہ وہ صحیح احساس گناہ اور پشیمانی کا نام ہے اگر یہ صحیح احساس گناہ شروع سے ہے اس لئے آدمی توبہ کا واقعہ تصور رکھتا ہے، تو وہ ارتکاب گناہ ہی کیوں کرے گا۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ لَا تَقۡتُلُوۡا يُوۡسُفَ وَاَلۡقُوۡهُ فِىۡ غَيٰبَتِ الۡجُبِّ يَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ السَّيَّارَةِ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ⑩

''ان میں سے ایک نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو اور اندھیرے کنویں میں انہیں ڈال دو تو مسافروں کے قافلوں میں سے کوئی انہیں اٹھالے جائے گا اگر ایسا کرنا چاہتے ہو''۔

یعنی یہ تمہارا مقصد ہے کہ یوسفؑ کو باپ کی نظر سے اوجھل کردو تو یہ صورت اس کے لئے زیادہ مناسب ہے۔[3]

قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاۡمَنَّا عَلٰى يُوۡسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوۡنَ ⑪ اَرۡسِلۡهُ مَعَنَا غَدًا يَّرۡتَعۡ وَيَلۡعَبۡ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ⑫ قَالَ اِنِّىۡ لَيَحۡزُنُنِىۡۤ اَنۡ تَذۡهَبُوۡا بِهٖ وَاَخَافُ اَنۡ يَّاۡكُلَهُ الذِّئۡبُ وَاَنۡتُمۡ عَنۡهُ غٰفِلُوۡنَ ⑬ قَالُوۡا لَئِنۡ اَكَلَهُ الذِّئۡبُ وَنَحۡنُ عُصۡبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوۡنَ ⑭

''ان لوگوں نے کہا اے ہمارے والد صاحب! کیا بات ہے کہ آپ یوسفؑ کے بارے میں ہم پر اطمینان نہیں کرتے حالانکہ ہم ان کے خیر خواہ ہیں، کل ہمارے ساتھ انہیں بھیج دیجئے کہ باغوں سے بہرہ اندوز ہوں[4] اور کھیل کود میں مصروف رہیں اور ہم سب ان کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، کہا مجھے اس سے صدمہ ہوگا کہ تم اسے لے جاؤ اور ڈرتا ہوں کہ اسے بھیڑیا نہ کھالے دراں حالیکہ تم اس کی طرف سے غفلت میں رہو۔ انہوں نے کہا اگر بھیڑیا انہیں کھالے اس صورت میں کہ ہم ایک مضبوط جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں تو ہم یقیناً بڑے خسارے میں ہیں''۔

یعنی اتنی تعداد اور اتنی قوت میں ہونے کے باوجود یہ ہو ہی کیوں کر سکتا ہے کہ ہمارے ہوتے ہوئے بھیڑیا ہمارے بھائی کو کھا جائے۔

---

[1] ۔هو مذهبنا لان الانبیآء لا یجوز ان یقع منهم القبائح (تبیان)

[2] ۔بان تتربوا (جلالین)

[3] ۔ان کنتم فاعلین ما اردتم من التفریق فاکتفوا بذلك (جلالین)

[4] ۔ینال الملاذ ویتفرج (تبیان)

جناب یعقوبؑ نے یہ کیوں کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں بھیڑیا نہ کھا جائے؟ بعض کا خیال ہے کہ یہ وہ چیز ہے کہ جسے دل کو خبر ہونا کہتے ہیں۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''ان کو بھیڑیئے کا بہانہ کرنا تھا وہی ان کے دل میں خوف آیا''۔(موضح القرآن)

دوسرا خیال یہ ہے کہ اس سرزمین پر بھیڑیوں کی کثرت تھی اور یہ خطرہ عموماً رہتا تھا جیسا کہ تفسیر جلالین میں ہے

وکانت ارضا کثیرۃ الذئاب.

اس سرزمین پر بھیڑیوں کی کثرت تھی۔

یا جیسا شیخ الطائفہ نے تحریر فرمایا ہے:

لان الذئاب کانت ضاربۃ فی ذٰلك الوقت (تبیان)

ان دنوں میں عموماً بھیڑیے بچوں کو پھاڑ دیا کرتے تھے۔

یہ کہ ایسا کہنا کسی علم ربانی کا نتیجہ تھا اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ حقیقت میں بھیڑیا یوسفؑ کو کھانے والا تھا ہی نہیں۔ وہ تو بھائیوں نے بعد میں جھوٹا بہانہ کیا تھا اور کوئی شخص تو ایسا کہہ سکتا ہے کہ ان کے لئے جناب یعقوبؑ کا یہ اندیشہ ظاہر کرنا ''سرور بستان یاد دادن'' کا مصداق بن گیا کہ انہیں بہانہ بنانے کے لئے پھر کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

مگر ہمارے ذہن میں تو اس کے خلاف یہ پہلو پیدا ہوتا ہے کہ جناب یعقوبؑ کا بطور پیش بندی یہ کہہ دینا کہ ایسا اتمام حجت کا انداز ہے کہ ان کے لئے اس طرح کے بہانہ کا سدباب ہوجانا چاہیے جب کہ وہ یہ کہہ چکے تھے کہ ہماری اتنی تعداد ہے کہ اس خطرہ کا تصور ہی نہیں کرنا چاہیے کہ ہمارے ساتھ کے ایک فرد کو بھیڑیا کھا جائے اس کے بعد ان کی یہ سراسر مہملیت تھی کہ انہوں نے ایسی ہی بات تراشی جسے وہ خود ناممکن کہہ چکے تھے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

''تو وہ جب انہیں لے گئے اور اس پر متفق ہوئے کہ انہیں اندھیرے کنویں میں ڈال دیں اور ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ تم انہیں بتلاؤ گے ان کی اس کارگزاری کو جب کہ انہیں اس کا شعور نہیں ہوگا''۔

جب وہ اس پر متفق ہوئے تو کیا ہوا؟ یہ واضح ہونے کی بنا پر محذوف ہے یعنی انہوں نے ایسا کر دیا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

آگے نہ فرمایا کہ کیا ہوا؟ اس واسطے کہ لائق بیان نہیں جو کچھ بھائیوں نے سلوک کیا''(موضح القرآن)

اس کے بعد جو فرمایا ہے کہ ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی، یعنی یوسفؑ کو ہم نے یہ اطلاع دیدی بطور تسلی اور دل میں ڈال دیا کہ گھبرانا

نہیں۔اس کا انجام تمہارے حق میں اچھا ہوگا اور انہیں آخر میں ناکامی ہوگی جس کا انہیں اس وقت احساس نہیں ہے۔[1]

بعد کو جن واقعات کی تفصیل سامنے آئے گی کہ بار بار یوسفؑ کے دربار میں حاضر ہونے کے بعد ان بھائیوں نے یوسفؑ کو نہ پہچانا اور آخر میں جب موقع ہوا تو خود جناب یوسف علیہ السلام نے انہیں متنبہ کیا کہ تم نے یوسفؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا اور بتلایا کہ میں یوسفؑ ہوں، یہ سب اس وقت کی وحی کے اجمال میں کہ تم انہیں بتلاؤ گے ان کی اس کارگزاری کو اور انہیں اس کا شعور نہ ہوگا، مضمر ہے۔[2]

وَجَآءُوْۤا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

''اور وہ اپنے باپ کے پاس شام کو روتے ہوئے آئے، کہنے لگے ''اے ہمارے باپ! ہم گئے دوڑ میں مقابلہ کرنے آپس میں اور یوسفؑ کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے اور بھیڑیا آیا اور انہیں کھا گیا اور آپ ہماری بات کا یقین نہیں کریں گے، چاہے ہم سچے ہو''۔اور لائے ان کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر، انہوں نے کہا بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لئے ایک بات بنائی ہے خیر میں صبر کرتا ہوں جو اچھا ہے اور اللہ ہی سے مدد حاصل کی جاسکتی ہے اس کے مقابلہ میں جو تم بیان کرتے ہو''۔

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

''اور ایک قافلہ آیا تو ان لوگوں نے اپنے پانی لانے والے کو[3] بھیجا تو اس نے اپنا ڈول ڈالا، کہا ارے خوش خبری ہو یہ ایک لڑکا ہے اور ان لوگوں نے پوشیدہ رکھا اسے ایک سرمایہ قرار دے کر اور اللہ جاننے والا ہے اس کا جو وہ کرتے ہیں اور ان لوگوں نے انہیں بیچا بہت کم چند گنتی کے چاندی والے سکوں کی قیمت پر اور وہ ان کی ناقدری کرنے والے تھے''۔

---

[1] ۔اوحینا الیہ فی الجب وحی حقیقۃ۔۔۔تطمینا لقلبہ (جلالین)

[2] ۔فی روایۃ ابی جارود عن ابی جعفر علیہ السلام ۔۔۔یقول لا یشعرون انّک انت یوسف۔(علی بن ابراھیم)

[3] ۔الذی یرد الماء لیستقی منہ (جلالین)

یہ بیچنا جس کا ذکر ہے اس میں بیچنے والے وہی بھائی تھے۔[1]

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

بھائی وہاں گئے، کنویں میں نہ پایا، قافلہ پر دعویٰ کیا جب ثابت ہوا اٹھارہ درہم کو بیچ ڈالا۔ پھر آگے قافلہ والوں نے مصر میں جا کر بیچا۔ حق تعالیٰ نے صریحاً ایک بیچنا فرمایا''۔ (موضح القرآن)

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے پہلے جو ہے ان لوگوں نے پوشیدہ رکھا اسے ایک سرمایہ قرار دے کر یہ بھی برادران یوسف کا ذکر ہے

تفسیر جلالین میں ہے:

معلم به اخوته فاتو هم و اسرّوه ای اخضوا امره جا علیه بضاعة بأن قالوا هو عبدنا ابق وسکت یوسف خوفاً ان یقتلوه.

ان کے بھائیوں کو یہ (قافلہ کا حال) معلوم ہوگیا تو وہ ان کے پاس آئے اور اسے چھپایا۔ یعنی ان کے اصل واقعہ کو چھپایا اسے اپنے لئے سرمایہ یعنی حصول مال کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے اس طرح کہ انہوں نے کہا کہ یہ ہمارا غلام ہے جو بھاگ کر آیا ہے یہاں یوسف خاموش رہے اس ڈر سے کہ وہ انہیں قتل نہ کر ڈالیں۔

اس صورت میں انہی (برادران) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ان کی ناقدری کرنے والے تھے۔[2]

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ۭ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۭ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓي اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اور جس نے مصر سے انہیں خریدا، اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اسے عزت کے ساتھ رکھنا ممکن ہے یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنالیں اور اس طرح دنیا میں ہم نے یوسف کو اقتدار ملنے کا سامان کیا اور اس لئے کہ ہم انہیں خوابوں کی تعبیر کا علم عطا کریں اور اللہ اپنے منشاء کے پورا کرنے پر قدرت رکھتا ہے لیکن زیادہ لوگ جانتے نہیں''۔

تذکرہ عزیز مصر و زلیخا

یہ قرآن مجید کا خاص انداز بیان ہے کہ یوسفؑ کی جو دو دفعہ بیع ہوئی ہے اور دو دفعہ ان کی خریداری ہوئی۔ پہلی دفعہ برادران یوسف نے بیچا اور اہل قافلہ نے خریدا اور دوسری دفعہ مصر میں جا کر اہل قافلہ نے بیچا اور عزیز مصر نے خریدا، ان میں پہلی جگہ قرآن نے بیچنے کا ذکر کیا خریداری کا نام نہیں لیا کہ اسے انسان اپنی عقل سے سمجھ لے اور دوسری جگہ خریداری کا ذکر کیا کسی کے فروخت کرنے کا نہیں اسے عقل پر چھوڑ دیا۔

---

[1] ۔ حکی اللہ تعالیٰ عن اخوۃ یوسف انہم باعوا یوسف (تبیان)

[2] ۔ کانوا ای اخوتہ (جلالین)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''مصر میں عزیز نے مول لیا، عزیز کہتے تھے بادشاہ کے مختار کو۔ اس نے ہوشیار دیکھ کر غلاموں کی طرح نہ رکھا، فرزند کی طرح رکھا کہ کاروبار میں نائب ہوگا۔ اس طرح حق تعالیٰ نے اس ملک میں اس کا قدم جمایا'' (موضح القرآن)

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

''اور جب وہ پورے طور پر جوان ہوئے ہم نے انہیں حکمت اور علم عطا کیا اور یونہی ہم صلہ دیتے ہیں نیک اعمال اشخاص کو۔

بَلَغَ اَشُدَّهٗ عرب کا محاورہ ہے جو کس عمر سے شروع ہوتا ہے؟ اس میں اختلاف ہے مگر نتیجہ سب کا وہی ہے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے ''پورے طور پر جوان ہوئے''۔ [1]

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

''اور ان پر ڈول ڈالنے لگی [2] وہ جس کے گھر میں وہ تھے اور اس نے دروازوں کو بند کر دیا اور کہا بس آؤ [3] کہا اللہ کی پناہ۔ یہ میرے مالک ہیں جنہوں نے اچھی طرح مجھے اپنے مکان میں رکھا۔ یقیناً جو ظالم ہیں وہ بہتری نہیں پاسکتے''۔

واقعۂ یوسفؑ وزلیخا

یہ میرے مالک ہیں۔۔۔ زیادہ مفسرین کے اقوال یہی ہیں کہ اس سے اشارہ زلیخا کے شوہر کی طرف ہے جس نے انہیں خریدا تھا اور اس طرح ظاہری حیثیت سے وہ ان کا مالک قرار پایا تھا۔ [4]

یہ شاہد ہے اس کا کہ اصل حقیقت سے قطعہ نظر، عامۂ افراد کی زبان پر جو لقب یا وصف چڑھا ہوا ہے، اُس کا اطلاق اصل حقیقت پر کوئی ضرب نہیں ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ

---

[1] ۔شدہ وھو کما لا لقوہ وقال قوم ھو من ثمانی عشرہ سنۃ الی سنین سنۃ وقال ابن عباس من عشرین وقال مجاھد من ثلاث و ثلاثین سنۃ والا شدّ جمع لا واحد لہ من لفظہ مستعمل (تبیان)

[2] ۔المراودۃ المطالبۃ بأمر للعمل بہ (تبیان)

[3] ۔ای ھلم (جلالین)

[4] ۔انہ ای الذی اشترانی ربی سیدی (جلالین)

السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

''اور اس نے قصد کیا ان کی طرف اور وہ بھی قصد کرتے اس طرف اگر نہ دیکھتے اپنے پروردگار کی طرف کی دلیل [1] اس لئے کہ ہم ان سے برائی اور ہوسنا کی دور رکھیں۔ یقیناً وہ ہمارے خالص چنے ہوئے بندوں میں سے تھے''۔

ہم نے جو ترجمہ کیا ہے اس میں یوسفؑ کی طرف سے قصد ثابت نہیں ہوتا مگر علمائے اہل سنت جو عدل باری کی طرح عصمت انبیاء کو بھی صدمہ پہنچانے کے خوگر ہیں، وہ اگر نہ دیکھتے اپنے پروردگار کی دلیل کے فقرہ کو الگ کر کے پہلے جملہ کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ:

ہر آئینہ قصد کرد آن زن بسوئے یوسف علیہ السلام و قصد کرد بسوی وے یوسف علیہ السلام (شاہ ولی اللہ)

اور دوسرے فقرہ کو الگ کر دیتے ہیں کہ:

''اگر نہ آں بودے کہ دیدے یوسف دلیل پروردگار خود را می شد آنچہ می شد'' اگر ایسا نہ ہوتا کہ دیکھتے یوسفؑ اپنے پروردگار کی دلیل تو جو ہونا تھا ہو جاتا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ''اگر'' والی شرط کی جزاء محذوف ہے یعنی جس بات کا قصد کیا تھا وہ وقوع میں آجاتی۔

دلیل پروردگار کیا تھی؟ اس کے لئے فرماتے ہیں:

''صورت یعقوب حاضر شد انگشت بدندان گرفتہ''

یعقوبؑ کی صورت نظر آئی۔ اس طرح کہ انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے ہیں۔

شاہ رفیع الدین ترجمہ کرتے ہیں:

''قصد کیا اس عورت نے ساتھ یوسفؑ کے اور قصد کیا یوسفؑ نے ساتھ اس کے''۔

جلالین صاحبان بھی پہلے فقرہ کو الگ کر دیتے ہیں اور لولا ان رابرھان ربہ کے بعد کہتے ہیں:

جواب ''لولا'' لجامعھا: لولا ''اگر ایسا ہوتا'' کا جواب یہ ہے کہ وہ اس سے مقاربت کر لیتے''

شاہ ولی اللہ نے فقط جناب یعقوبؑ کی صورت یوسفؑ کو دکھائی تھی اور انہوں نے اس حکایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ:

فضرب صدرہ فخرجت شھوتہ من اناملہ:۔ یعقوبؑ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا تو ان کی خواہش ان کے ہاتھ کی انگلیوں کے راستے سے باہر نکل گئی۔

یہ ہے ''مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ'' کا مصداق۔

یہ سب باتیں علمائے حق کے نزدیک غلط ہیں [2] بلکہ اللہ کی طرف کی دلیل دیکھنے سے مقصود وہ بصیرت ہے [3] جو اس فعل شنیع کے ارتکاب سے انہیں سدراہ ہو۔

---

[1] ۔ اما تقدم جواب لولا فجائز مستعمل (تبیان)

[2] ۔ ھذا الذی ذکروہ کلّمہ غیر صحیح (تبیان)

[3] ۔ یجوز ان یکون الروية بمعنى العلم (تبیان)

اس بصیرت کا مظاہرہ عین اس وقت جو ہوا وہ ہمارے یہاں اس طرح وارد ہوا ہے کہ زلیخا نے اس وقت جب وہ اپنے منصوبہ کو پورا کرنے پر تل گئی تھی، اس بت پر جس کی وہ پرستش کرتی تھی پردہ ڈال دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا یہ تم نے کیا کیا؟ کہا مجھے شرم آتی ہے کہ میں اپنے معبود کے سامنے اس فعل کا ارتکاب کروں۔ جناب یوسف علیہ السلام نے کہا تم اپنے اس معبود سے شرم کرتی ہو جو نہ آنکھوں سے دیکھتا ہے نہ کانوں سے سنتا ہے اور میں اپنے اس معبود سے شرم نہ کروں جو حاضر و ناظر ہے۔ بس یہ کہہ کر وہ دروازہ کی طرف دوڑے کہ گھر سے باہر نکل جائیں [1] جس کے بعد کا حال قرآن مجید میں درج ہے۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۫ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ﴿۲۹﴾

''اور وہ دونوں ایک دوسرے سے پہلے دروازہ کی طرف پہنچنے کے لئے دوڑے اور اس نے ان کے کرتے کو پیچھے سے لمبان میں پھاڑ دیا [2] اور ان دونوں نے اس کے شوہر کو دروازہ پر پایا۔ وہ کہنے لگی نہیں ہے سزا اس کی جو آپ کے ناموس کے ساتھ بدی کرنا چاہے سوا اس کے کہ اسے قید کیا جائے یا اور کوئی دردناک سزا۔ انہوں نے کہا کہ اس نے مجھ پر ڈول ڈالے اور اس کے گھرانے والوں میں سے [3] ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر ان کا کرتا آگے سے پھٹا ہو تو یہ سچی ہے اور وہ جھوٹوں میں سے ہیں اور اگر ان کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہو تو یہ جھوٹ بول رہی ہے اور وہ سچوں میں سے ہیں تو جب اس نے دیکھا ان کے کرتے کو پیچھے سے پھٹا ہوا تو کہنے لگا کہ یقیناً یہ تم عورتوں کی چال ہے یقیناً تمہاری چال بہت سخت ہوتی ہے اے یوسف! اس سے درگزر کرو اور تو اپنے جرم سے توبہ کر، یقیناً تو خطا کاروں میں سے ہے''۔

---

[1] ۔ حدثنی ابی عن بعض رجالہ دفعہ قال قال ابو عبداللہ علیہ السلام (علی بن ابراھیم)

[2] ۔ القدّ شیق الشئی طولا (تبیان)

[3] ۔ گواھی از قبیلہ زن (شاہ ولی اللہ)

چاک دامانی دلیل پاک دامانی

گواہ جس نے گواہی دی کیسا تھا؟ اس کا بیان قرآن مجید میں نہیں ہے روایات میں ہے کہ وہ دودھ پیتا ہوا ایک بچہ تھا جو گہوارہ میں لیٹا ہوا تھا یہ فریقین کی کتب میں موجود ہے [1] مگر دوسرا قول اس کے خلاف یہ ہے کہ وہ اس کے گھرانے کا کوئی غیر معمولی دانش مند قسم کا آدمی تھا اور اس کا شاہد یہ ہے کہ اگر وہ گہوارہ کا بچہ ہوتا تو اس کا بول دینا خارق عادت ہونے کی بنا پر خود حقیقت کے اظہار کے لئے کافی تھا اس کے لئے براہ راست یہ کہہ دینا کافی تھا کہ زلیخا غلط کہہ رہی ہے اور یوسفؑ بے گناہ ہیں مگر یہاں ایسا نہیں ہے بلکہ عقلی قرینہ پیش کیا جاتا ہے جو دونوں میں سے ایک کے قول کو درست ثابت کرتا ہے اس کی ضرورت دودھ پیتے ہوئے بچہ کے لئے کوئی نہ تھی۔ [2]

''اے یوسف! اس سے درگزر کرو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اس کا کوئی چرچا نہ کرنا تاکہ بات گھر کی گھر ہی میں رہے اور عام رسوائی نہ ہو۔ [3]

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَن نَّفْسِهِ ۖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۖ إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٣٠﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا ۚ إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ﴿٣١﴾

''اور کہا اس شہر کی کچھ عورتوں نے کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے نوجوان پر ڈول ڈال رہی ہے، اس کی محبت نے اس کے دل کی گہرائیوں میں اثر کیا ہے [4] ہم اس کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں تو جب اس نے سنا ان کی ترکیب کو تو انہیں بلوا بھیجا اور ان سب کے لئے ایک ایک مسند بچھوادی اور ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چھری دے دی اور کہا نکلو ان کے سامنے تو جب ان سب نے انہیں دیکھا تو بہت بڑھا ہوا پایا انہیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور کہنے لگیں سبحان اللہ یہ آدمی نہیں ہے یہ تو نہیں ہے مگر کوئی بزرگ فرشتہ''۔

عورتوں نے آپس میں جو چرچا کیا تھا، اس کے لئے قرآن کے یہ لفظ کہ **فلما سمعت بمکرھن** جب اس نے ان کی ترکیب سنی بتلاتا ہے کہ ان کی زلیخا پر نکتہ چینیاں واقعی اس کے فعل کو ناپسند کرنے کی بنا پر نہ تھیں بلکہ اس طرح ان کا مقصد یہی تھا کہ زلیخا انہیں بھی حسن و جمال یوسفؑ

---

[1] ۔ قال لهم الله يوسف ان قال للملك سل هذا الصبي في المهد فانطق الله الصبي في المهد ليوسف (علي بن ابراهيم)

[2] ۔ ابن عمها روي انه كان في المهد (جلالين) اس عورت کا رشتہ دار ایک لڑکا دودھ پیتا ہوا بول اٹھا (موضح القرآن)

[3] ۔ لا تذكره لئلا يشيع (جلالين)

[4] ۔ بلغ الحب شغاف قلبها وهو داخله (تبيان)

کا نظارہ کرادے [1] جیسا کہ بعد میں ہوا جس کے بعد وہ گویا قائل ہوئیں کہ زلیخا ان پر وارفتگی میں مجبور و معذور ہے۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝۳۲

''اس نے کہا تو یہی ہے وہ جس کے بارے میں تم لوگ مجھے ملامت کرتے تھے اور بے شک میں نے اس پر ڈول ڈالے تو اس نے اپنے کو بچائے رکھا اور اگر نہ کیا اس نے وہ جس کا میں اسے حکم دیتی ہوں تو وہ ضرور قید کر دیا جائے گا اور ضرور وہ ذلیل ہوگا''۔

شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں:

ان کے روبرو یہ بات کہی تا کہ وہ بھی سمجھا دیں اور حضرت یوسف علیہ السلام ڈر کر قبول کریں (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے: فقلن له اطع مولاتك مطلب یہ ہے کہ اب ان سب کو زلیخا سے ہمدردی پیدا ہوگئی اور جناب یوسف علیہ السلام سے کہا اپنی مالکہ کا کہنا مانو۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝۳۳ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۴

''وہ کہنے لگے اے میرے پروردگار! قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے اس سے جس کی طرف یہ سب مجھے تحریک کرتی ہیں اور اگر تو دور نہ کرے مجھ سے ان کی چال کو تو میں بھی جھک جاؤں ان کی طرف اور جاہلوں میں سے ہوں، تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کی تو ان سے ان کی چال کو ناکام بنا کر ہٹا دیا، یقیناً اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

ان کی چال کو دور کرنے کا مطلب ہے اس سے ان کا اثر پذیر نہ ہونے دینا اور جو ان عورتوں کا اپنی چال سے مقصد تھا اس میں ناکام رہنا۔ [2]

یہاں یدعوننی کا لفظ جمع مونث حاضر کا صیغہ ہے اور اس لئے ہم نے ترجمہ کیا ہے ''یہ سب مجھے تحریک کر رہی ہیں'' یہ یا تو اس وجہ سے ہے جیسا کہ قبل کی آیت کے آخر میں لکھا گیا ہے کہ ان سب کو زلیخا سے ہمدردی پیدا ہوگئی اور کہنے لگیں کہ اس کا کہنا مان لو جیسا کہ بعض تفاسیر میں ہے اور یا جیسا کہ ہماری قدیم تفسیر میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد اب جناب یوسف پر ان تمام عورتوں کے مطالبات کی یورش ہوگئی اور ہر ایک کا پیغام

---

[1] ۔المکر االفتل بالحیلة الی مایراہ من الطلبة (تبیان)

[2] ۔معناہ ضرر کیدھنّ لانّ کیدھنّ قد وقع. (تبیان)

جناب یوسف علیہ السلام کے پاس آیا کہ وہ ان سے تعلقات کی خواہش مند ہیں اس سے کبیدہ خاطر ہو کر جناب یوسف علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔[1]

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ۝۳۵

پھر قدرت کی نشانیاں[2] دیکھنے کے باوجود بعد میں ان کی رائے یہ ہوگئی کہ وہ انہیں ایک مدت تک لازمی طور پر قید رکھیں گے۔

جناب یوسفؑ قید خانہ میں

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

اگرچہ نشان سب دیکھ چکے کہ گناہ عورت کا ہے تو بھی ان کو قید کیا تا کہ بدنامی خلق میں عورت سے اترے یا اس واسطے کہ اس کی نظر سے دور رہیں"۔(موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے:

ينقطع فيه كلام للناس

یعنی اس لئے قید کیا تا کہ لوگوں میں جو چرچے رہتے ہیں، وہ کسی طرح ختم ہوں۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۶

"اور ان کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں انگور کا رس نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا میں نے دیکھا کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں کھا رہی ہیں۔ ہمیں اس کی تعبیر بتایئے۔ ہم آپ کو نیک اعمال آدمیوں میں سے دیکھتے ہیں"۔

قرآن مجید میں اکثر درمیانی کڑیاں سننے والے کی عقل کے حوالے کر کے بنظر اختصار ترک کر دی جاتی ہیں چنانچہ اس ذکر کے بعد "ان کی رائے یہ ہوگئی کہ وہ انہیں ایک مدت تک قید رکھیں گے"۔ درمیان کی لازمی کڑی یہ ہے کہ چنانچہ انہوں نے ان کو قید کر دیا[3] اب اس کے بعد کا ذکر یہ ہے کہ ان کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان داخل ہوئے۔

ہم نے المحسنین کے لفظ کا "حسن عمل" سے لے کر "نیک اعمال" تک کا ترجمہ کر دیا ہے مگر ایک معنی اس کے یہ کئے گئے ہیں کہ ہم

---

[1] ۔فما امسى يوسف فى ذلك اليوم حتى بعث اليه كلّ امأة راته تدعوه الى نفسها فضجر يوسف فقال(على بن ابراهيم)

[2] ۔فالأيات شهامة الصبى و القميص المنخرق من دبر استباقهما الباب حتى سمع مجاذبتها اياه على الباب.(على بن ابراهيم)

[3] ۔فى الأية تقدير فسجن يوسف(تبيان)

سمجھتے ہیں کہ آپ تعبیر خواب کے فن کے ماہر ہیں۔ [1]

مگر میں سمجھتا ہوں کہ انہیں اس مہارت کا اندازہ بغیر تجربہ سابق کے ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے ہاں نیکوکاری مشاہدہ سے متعلق ہے اور خواب نیک آدمیوں سے عموماً بیان ہی کیا جاتا ہے اس لئے میں اسی ترجمہ کو درست سمجھتا ہوں۔

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

انہوں نے کہا تم دونوں تک کوئی کھانا نہیں آئے گا جو تمہیں عطا کیا جائے مگر یہ کہ میں تم کو اس کا انجام بتا سکتا ہوں اس سے پہلے کہ وہ تمہارے پاس آئے۔ یہ اس کا ایک جزء ہے جو اللہ نے مجھے علم عطا کیا ہے میں نے چھوڑا ہے ایسے لوگوں کا مذہب کہ جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور جو آخرت کے منکر ہیں اور میں نے پیروی کی ہے اپنے باپ دادا، ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے مذہب کی۔ ہمیں یہ زیب نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک کریں۔ یہ اللہ کے فضل وکرم سے ہے ہم پر اور تمام لوگوں پر مگر زیادہ تر لوگ شکر ادا نہیں کرتے''۔

شروع میں جو ہے کہ کوئی کھانا نہیں آئے گا تمہارے سامنے جو تمہیں عطا کیا گیا ہو، اس کا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ تم خواب ایسا یکھو تو میں اس کی تعبیر بتا سکتا ہوں۔ [2]

یہ غالباً اس خیال سے ہے کہ سابق کے مضمون سے مناسبت پیدا ہو مگر یہ اس تصور پر مبنی ہے کہ انہوں نے جو کہا تھا کہ آپ کو ہم محسنین میں دیکھتے ہیں اس کا مطلب یہ تھا کہ تعبیر خواب کا ماہر جانتے ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے اس خیال کی تصدیق بلکہ مزید تقویت کی کہ ہاں یہ علم مجھے اللہ کی طرف سے خاص طور پر عطا کیا گیا ہے مگر جب کہ ہم نے کہا کہ محسنین کا لفظ بظاہر حسن عمل سے ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے جو کچھ ارشاد کیا وہ ان کے خیال میں مزید اضافہ ہے کہ تم نے صرف حسن عمل محسوس کیا ہے اس کے علاوہ یہ چیز ہے کہ اس نے مجھے خاص علوم عطا کئے ہیں، اس صورت میں اسے خواب سے متعلق سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ہاں اس کے بعد جو الفاظ ہیں کہ میں اس کی تاویل تمہیں بتاؤں گا قبل اس کے کہ وہ سامنے آئے، اس سے یہ تصور ہوتا ہے کہ وہ پہلے جو رزق سامنے آنے کا ذکر تھا، اس سے مراد خواب ہے مگر یہ تصور اس وقت صحیح ہوتا جب پہلے ماضی کا صیغہ ہوتا کہ ما اتکما جو تمہارے پاس آیا رزق، جو تمہیں دیا گیا ہو، پھر یہ جملہ کہ اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں اسکا انجام بتادوں گا،

---

[1] ۔ ممّن یعرف تاویل الرؤیا من ذلك قول علی علیہ السلام کل امرئ ما یحسنه ای ما یعرفه (تبیان)

[2] ۔ فی منامکما (جلالین) یعنی در خواب (شاہ ولی اللہ)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے جو رزق دیا گیا تھا، وہ خواب میں تھا اور اس کے انجام بتانے کا مطلب اس کی تعبیر کا بتانا ہے مگر یہاں یا تیکما مضارع ہے تو یہ معنی کیوں نہ لئے جائیں کہ کہ اللہ نے مجھے مایکون یعنی آیندہ ہونے والی باتوں کا علم بھی عطا کیا ہے جو تمہیں رزق ملنے والا ہے اس کے ملنے سے پہلے اس کے انجام کی تمہیں خبر دے سکتا ہوں۔

اس سے مقصود معاذ اللہ خودستائی نہیں ہے بلکہ آئندہ جو موعظہ و نصیحت فرمائیں گے اس کے اثر کو بڑھانا ہے اور چونکہ ان کے حسن عمل کا ان کے دل پر اثر ہو چکا تھا، اس لئے ان کا آپ کی بات کو سچ سمجھنا لازمی تھا۔

اب جب کہ پہلے ہی ان کی زبان سے ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ آپ کے حسن کردار سے متاثر تھے اور اب آپ نے جو اپنے علم وہبی کا تذکرہ فرمایا، اس سے یقیناً وہ مزید متاثر ہو چکے ہیں اور ان کی ایک غرض بھی آپ سے وابستہ ہے کہ وہ اپنے خواب کی تعبیر آپ سے حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس پس منظر سے فائدہ اٹھا کر آپ نے چاہا کہ تعبیر خواب سے پہلے تبلیغ حق کے فریضہ کو جو بحیثیت ایک داعی حق کے آپ کے ذمہ تھا ادا کریں اور انہیں شرک کی رکاکت سمجھاتے ہوئے توحید کی دعوت دیں۔ کیونکہ وہ یوں اس طرح کی تبلیغ کرنے لگتے تو وہ شاید سننے کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتے مگر اب تعبیر خواب کے اشتیاق میں انہیں وہ سبب سننا پڑے گا۔ جو حضرت یوسف علیہ السلام تعبیر بتانے سے پہلے ان کو سنائیں گے اور اس لئے اس تبلیغ کی بات شروع کرنے سے پہلے ابتدائی الفاظ میں انہیں یہ اطمینان دلا دیا کہ میں تمہارے خوابوں کی صحیح تعبیر اللہ کے دیئے ہوئے علم سے بتا سکتا ہوں۔ یہ کہہ دینے کے بعد ان کی بعد کی گفتگو چاہے کتنی ہی طولانی ہو مگر انہیں یہ تصور ہرگز نہیں ہو سکتا کہ یہ ان باتوں میں الجھا کر ہمارے اصل سوال کو ٹال رہے ہیں اور جو ہمارا اصل مقصد ہے یعنی ہمارے خواب کی تعبیر، وہ ہمیں نہیں بتائیں گے۔

مذکورہ بالا صورت حال میں یہ تصور نہایت کمزور معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں جناب یوسف علیہ السلام خواب کی تعبیر بتانا نہیں چاہتے تھے اور بعد میں وہ آپ کے پیچھے ہی پڑ گئے تو مجبوراً بتا دی۔ [1]

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

''اے دونوں قید خانہ والو! کیا متفرق خدا اچھے ہیں یا ایک اکیلا اللہ جو سب پر غالب ہے، تم لوگ نہیں پوجا کرتے اسے چھوڑ کر مگر ایسے ناموں کی جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے تجویز کئے ہیں اللہ نے اس کے ساتھ کوئی دلیل نہیں اتاری ہے، نہیں ہے حکومت کا مالک مگر اللہ اس کا حکم ہے کہ نہ عبادت کرو سوا اس کے کسی کی۔ یہی سیدھا دین ہے مگر زیادہ تر لوگ علم نہیں رکھتے''۔

پہلے تو اپنے تعارف کے ذیل میں سچے دین کی ترجمانی کی تھی، اب صاف صاف ان کی ضمیر کو دعوت فکر و تامل دے رہے ہیں تا کہ وہ حق و

[1] ۔قال ابن جریج انه کرہ ان یخبرھما بالتاویل۔۔ فلم یترکاہ حتیٰ اخبرھما (تبیان)

باطل میں موازنہ کر کے اپنے غلط راستے کی غلطی محسوس کریں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾

''اے دونوں قید خانہ والو، تم دونوں میں سے ایک جو ہے تو وہ اپنے مالک کو شراب پلانے والا ہوگا اور دوسرا جو ہے اسے سولی دی جائے گی تو چڑیاں اس کے سر میں سے کھائیں گی، طے پا چکی ہے یہ بات جس کے بارے میں تم دونوں دریافت کرتے ہو''۔

آخر کا جو فقرہ ہے'' طے پا چکی ہے یہ بات'' اس کے لئے الفاظ میں بظاہر کوئی تشنگی معلوم نہیں ہوتی ہے کہ اس کے کہنے کا کوئی خاص سبب ہونا چاہیے بلکہ یہ اسی تعبیر کا تتمہ ہوسکتا ہے کہ جو میں نے تعبیر بتائی ہے یہ خالق کی مشیت میں گزری ہوئی ہے اور وہ ہو کر رہے گی مگر بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے تعبیر بتانے کے بعد ان دونوں نے کہا کہ حقیقۃً ہم نے خواب دیکھے ہی نہ تھے فقط تمہارا امتحان منظور تھا[1] یا یہ کہ اس نے کہا جو تعبیر ناخوش گوار دی گئی تھی[2] اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا اب چاہے خواب دیکھے ہوں یا نہ دیکھے ہوں بہر حال جو تعبیر میں نے دی ہے وہ ظہور میں آ کر رہے گی مگر مجھے یہ خیال کچھ زیادہ دل کو لگتا ہوا محسوس نہیں ہوتا اس لئے کہ اگر انہوں نے شرارتاً یہ خواب بیان کئے ہوتے اور ان کے دل پر جناب یوسف علیہ السلام کے حسن سیرت و کردار کا واقعہ کوئی اثر نہ ہوتا تو وہ اس صبر و سکون کے ساتھ آپ کے اس طولانی تبلیغ موعظہ کو اتنی دیر تک سن نہیں سکتے تھے بلکہ پہلے ہی مذاق اڑاتے ہوئے چلے جاتے۔

میں تو جناب یوسف علیہ السلام کی شان کے خلاف سمجھتا ہوں یہ تصور کہ آپ ان کے مسخرے پن کو نہ سمجھے اور ان سے سنجیدگی کے ساتھ اتنی طویل تقریر کر ڈالی۔

ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ خواب تو واقعی دونوں نے دیکھے تھے اور دونوں سنجیدگی کے ساتھ اس کی تعبیر کے طالب ہوئے تھے مگر جب ایک کو تعبیر بہت ہی ناخوش گوار ملی تو اپنی ناقص بشریت سے اب اس کو غصہ آیا اور ایک طرف اس غصہ کی بنا پر جناب یوسف علیہ السلام کے تپانے کو اور دوسری طرف اپنے ساتھی سے اپنی خفت کے مٹانے کے لئے اس نے یہ کہہ دیا کہ میں خواب واب کچھ دیکھا ہی نہ تھا بہر حال دونوں کے یہ کہنے کی ہم نے خواب نہیں دیکھا تھا یونہی کہہ دیا تھا کوئی وجہ وجیہ نہیں ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پہلو سے جو بھی میں لکھ دیا ہے کہ ایک نے غصہ وغیرہ سے یہ کہہ دیا ہوگا میں مطمئن نہیں ہوں اس لئے کہ یہ جملہ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿یوسف: ۴۱﴾ پہلے کلام کا بلا فاصلہ جزء ہے کوئی الگ آیت نہیں ہے جس سے ہمیں یہ سمجھنے کی گنجائش ہو کہ بیچ میں ان میں سے ایک نے یہ کہا میں نے خواب دیکھا ہی نہیں تھا اور اس پر جناب یوسف علیہ السلام نے یہ جملہ کہا لہٰذا میں تو اسے پہلے بیان کا تتمہ ہی سمجھتا ہوں۔ کسی بات کا الگ سے جواب نہیں سمجھتا۔

---

[1] ۔قالا امار اینا شیئاً فقال قضی الامر الذی فیه تستفتیان صدقتما ام کذبتما (جلالین)

[2] ۔روی ان صاحب الصلب قال مار ایت شیئا (تبیان)

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾

اور کہا انہوں نے اس سے جس کے متعلق وہ سمجھے تھے کہ وہ نجات پانے والا ہے کہ میرا تذکرہ کر دینا اپنے مالک سے یہاں تو شیطان نے اسے اپنے مالک والا تذکرہ بھلا دیا تو وہ قید خانہ میں رہے کئی سال۔

ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اس کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ نجات پانے والا ہے، اس میں ظن کا لفظ جو ہے اس کے عام معنی تو گمان کے ہوتے ہیں اور اس لئے شاہ عبدالقادر نے لکھ دیا ہے۔

اس کو اٹکلا کہ بچے گا۔ معلوم ہوا کہ تعبیر خواب یقین نہیں، اٹکل ہے مگر پیغمبر اٹکل کرے، سو بے شک ہے (موضح القرآن)

مگر حقیقت یہ ہے کہ ظن کبھی یقین کے معنی میں آتا ہے یہاں ایسا ہی ہے کیوں کہ اس سے پہلے آچکا ہے کہ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿یوسف: ۴۱﴾ طے شدہ ہے یہ بات جس کے بارے میں تمہارا سوال ہے، تو اگر جناب یوسف علیہ السلام نے جو کچھ کہا تھا وہ گمان یا اٹکل کی حد میں ہوتا تو اس حتم و جزم کے ساتھ اس کا اظہار کیوں کرتے کہ یہ تو اب ہو کے رہے گا، ٹل نہیں سکتا۔ یہ انداز بتاتا ہے کہ یہ فقط گمان نہیں بلکہ علم ہے چنانچہ تفسیر جلالین میں بھی ہے۔ ظن ایقن (یعنی) ''ظن کیا کے معنی ہیں یقین کیا''۔

اسے اپنے رب کا ذکر شیطان نے بلا دیا تو وہ قید خانہ میں رہے کئی سال۔ یہاں قبل کا سیاق ذہن میں اسی تصور کو لاتا ہے کہ یہ ضمیر اس قیدی کی طرف ہے جس نے نجات پائی۔ اس صورت میں بعض لوگوں نے اس دوسرے لفظ رب سے مراد لیا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کو، شاید اس بنا پر کہ اُن کا احسان اس پر یہ تھا کہ انہوں نے اس کو نجات کا مژدہ دیا تو ایک طرح اس کے ولی نعمت ہوئے، اس لحاظ سے انہیں اس کا رب یعنی سرپست کہا گیا ہے۔ [1]

مگر یہ ظاہر کے خلاف ہے دوسری تفسیر یہ ہے جس کی بنا پر ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ ذِكْرَ رَبِّهٖ کے معنی یہ ہیں کہ اپنے مالک کے یہاں ذکر کرنا یوسف علیہ السلام کا جس کی خواہش حضرت یوسف علیہ السلام نے کی تھی وہ بھول گیا۔ [2]

بادشاہ مصر کا خواب اور یوسفؑ کی رہائی کا سامان

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

''اور بادشاہ نے کہا میں نے خواب میں دیکھی ہیں سات گائیں موٹی جنہیں کھا رہی ہیں سات دبلی گائیں اور سات

---

[1] ۔ قال ابن اسحاق والحسن والجبائی یعود علی الساقی وتقدیرہ فانسی الساقی الشیطان ذکر یوسف علیہ السلام (تبیان)

[2] ۔ ذکر یوسف عند ربّہ (جلالین) یاد کند پیش مولای خود (شاہ ولی اللہ) یاد کرنا خداوند اپنے کے پاس (رفیع الدین)

بالیاں ہری اور دوسری خشک، اے معزز لوگو! مجھے میرے خواب کے بارے میں بتاؤ، اگر تم خواب کی تعبیر دیا کرتے ہو، ان لوگوں نے کہا کہ یہ خوابہائے پریشان ہیں اور ہم خوابہائے پریشان کی تعبیر نہیں جانتے''۔

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾ یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَفِیْهِ یَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور اس نے کہا کہ جو ان دونوں میں نجات پا گیا تھا اور ایک مدت کے بعد اب اسے یاد آیا تھا، کہا کہ میں تم لوگوں کو اس کی تعبیر بتاؤں گا تو مجھے روانہ کرو۔ یوسف! اے بڑے سچے ہمیں تعبیر بتایئے سات موٹی گائیوں کی جنہیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات ہری بالیوں اور دوسرے خشک کی۔ شاید میں ان لوگوں کے پاس جاؤں تو شاید انہیں علم ہو انہوں نے کہا کہ تم لوگ کھیتی کرو سات برس متواتر [1] تو جو کھیتی کاٹو اسے رہنے دو اس کی بالیوں میں سوا تھوڑی سی مقدار کے جسے کھاؤ۔ پھر اس کے بعد سات برس آئیں گے سخت جو کھا جائیں گے اس سب کو جو تم نے ان کے ذخیرہ کیا تھا۔ سوا بہت کم کے اس میں سے جسے تم محفوظ رکھتے ہو، پھر اس کے بعد ایک سال ایسا آئے گا جس میں لوگوں کے لئے بارش ہوگی اور اس میں وہ پھلوں کا عرق نچوڑیں گے۔

بیچ کا جملہ کہ ''ان لوگوں کے پاس واپس جاؤں تو شاید انہیں علم ہو'' کا ہے کا علم؟ خواب کی تعبیر کا یا آپ کے مرتبہ کا؟ یہ دونوں ہی احتمال ہیں [2] ان میں سے بعض نے پہلے کو [3] اور بعض نے دوسرے کو [4] اختیار کیا۔ ہمارے نزدیک تیسرا احتمال بھی ہے اور غور کیا جائے ''تو شاید وہ جانیں'' میں شاید کا لفظ پہلے احتمال کے ساتھ سازگار نہیں ہے اس لئے کہ جب یہ تعبیر بتا دیں گے اور وہ جا کر انہیں اس تعبیر سے مطلع کرے گا تو تعبیر تو انہیں معلوم ہو ہی جائے گی۔ شاید کہنے کا کیا موقع ہے۔

---

[1] ۔الداب استمرار الشیء علی عادۃ (تبیان) دأبا متتابعۃ (جلالین)

[2] ۔یحتمل امرین احدھما لعلّھم یعلمون بمکانك و منزلك الثانی لعلّھم یعلمون تاویل الرؤیا (تبیان)

[3] ۔لعلّھم یعلمون تعبیرھا (جلالین)

[4] ۔یعنی تیری قدر معلوم ہو (موضح القرآن)

ہاں! ایک اور احتمال یہ ہے کہ یہ مطلب ہو کہ شاید ان کی سمجھ میں آئے کہ یہی تعبیر حق ہے اور یہی صورتحال پیش آنے والی ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴿٥٠﴾

اور بادشاہ نے کہا کہ لاؤ انہیں میرے پاس تو جب ان کے پاس قاصد آیا تو انہوں نے کہا واپس جاؤ اپنے مالک کے پاس اور ان سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا واقعہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے یقیناً میرا پروردگار ان کی چال کو خوب جاننے والا ہے۔

بادشاہ سے پوچھو۔ بادشاہ کو کیا معلوم؟ مطلب یہ ہے کہ تم انہیں اس واقعہ کی طرف توجہ دلاؤ تو وہ خود پھر اس کے متعلق تحقیق کریں گے جس سے میری بے گناہی نمایاں ہوگی۔ [1]

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُنَّ يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ ۚ قَالَتِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاوَدْتُّهُ عَن نَّفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٥١﴾

اس نے کہا کہ کیا واقعہ تھا تمہارا جب تم نے یوسف پر ڈول ڈالے تھے؟ ان عورتوں نے کہا کہ پاک ہے اللہ۔ ہمیں ان کی کوئی برائی ثابت نہیں ہوئی۔ عزیز مصر کی بیوی نے کہا کہ اب حق تو نمایاں ہو ہی گیا۔ میں نے ان پر ڈول ڈالے تھے اور وہ بلاشبہ سچے لوگوں میں سے ہیں۔

اس آدمی نے جا کر بادشاہ سے کہا کہ وہ یہ کہتی ہیں تو بادشاہ نے تحقیق کرنا شروع کیا اور ان عورتوں کو طلب کر کے ان سے واقعہ پوچھا۔ [2]

ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ ﴿٥٢﴾

''یہ اس لئے کہ انہیں معلوم ہو کہ میں نے پیٹھ پیچھے ان کے ساتھ غداری نہیں کی اور یقیناً اللہ غداری کرنے والوں کی چال کو کامیاب نہیں کرتا۔

اگر کوئی ثبوت قوی اس کے خلاف نہ ہو تو سیاق تو یہی بتلاتا ہے کہ یہ زلیخا کے کلام کا تتمہ ہے اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میں نے اس وقت یہ اقرار جو کیا ہے، وہ اس لئے ہے کہ یوسفؑ کو معلوم ہو کہ پیٹھ پیچھے ان کے بارے میں میں نے حق گوئی سے کام لیا ہے، پھر اس کے بعد کی آیت جو آئندہ پارہ کی پہلی آیت ہوگی وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي وہ بھی زلیخا کا کلام ہوگا۔ ہماری قدیم تفسیر جو زیادہ تر اقوال معصومینؑ پر مبنی ہے، اس کے

---

[1] ۔فسئلہ ان یسأل (جلالین)

[2] ۔حین رجع الرّسول الی الملك برسالة یوسف جمع النساء و قال لهنّ ما خطبكنّ اذ راودتنّ یوسف عن نفسه (تبیان)

مطابق ہے۔[1]

مگر چونکہ زلیخا کا خدا پرست اور موّحد ہونا ثابت نہیں ہوتا، اس لئے ان آیات کے مضمون سے مفسرین نے ایسا محسوس کیا ہے اور یہی تشریح کی ہے کہ یہ جناب یوسف علیہ السلام کا کلام ہے۔[2]

اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ جو میں نے اس واقعہ کی تحقیق کرائی ہے اس لئے ہے کہ عزیز مصر کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے ناموس کے ساتھ اس کے پیٹھ پیچھے کوئی خیانت نہیں کی۔

ہمارے علماء میں سے بھی جناب شیخ الطائفہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔[3]

مگر مجھے اس میں کافی تردد کی گنجائش معلوم ہوتی ہے اول تو یہ ہے کہ یہاں تحقیق بادشاہ سے کرائی گئی اور خیانت جس کا تصور ہو سکتا تھا اس کا تعلق بادشاہ کے ساتھ نہیں بلکہ عزیز مصر کے ساتھ تھا دوسرے یہ کہ عزیز کو تو اسی وقت پتہ چل گیا تھا کہ یوسفؑ بے گناہ ہیں اور خطا زلیخا ہی کی ہے مگر یہ جانتے ہوئے اس نے سیاسی مصلحت کی بنا پر یوسفؑ کو قید کر دیا تھا پھر اس تحقیق و تفتیش سے عزیز مصر کو معلوم کرانا تحصیل حاصل ہی ہوگا۔

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْۗءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵۳

''اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں۔ بلا شبہ نفس برائی پر آمادہ کیا ہی کرتا ہے مگر یہ کہ میرے پروردگار کا رحم و کرم شامل حال ہو۔ یقیناً میرا پروردگار بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

اگر گزشتہ آیات جناب یوسف علیہ السلام کی زبان کی ہے جیسا کہ اکثر مفسرین کا خیال ہے تو یہ بھی اسی کا تتمہ ہے یعنی یہ کہنے کے بعد کہ یہ تحقیقات میں نے اس لئے کرائی ہیں کہ میں بے گناہ ہوں جیسے فوراً یہ خیال ہوا کہ کہیں اس میں غرور کا پہلو تو پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہا[4] کہ گناہ سے بچنا کوئی میرے نفس کا کارنامہ نہیں، نفس تو برائی پر آمادہ کرتا ہے مگر یہ میرے خالق کا رحم و کرم ہے جو گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ۝۵۴ قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَاۗىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝۵۵

''اور بادشاہ نے کہا کہ انہیں میرے پاس لاؤ کہ میں انہیں اپنا خاص مقرب بناؤں تو جب اس نے ان سے بات

---

[1] ۔ای لا اکذب علیه الآن کما کذبت علیه من قبل ثمّ قالت: و ما ابرئ نفسی الخ (علی بن ابراهیم)

[2] ۔ فاخبر یوسف بذٰلك فقال ذٰلك ای طلب البراءة لیعلم العزیز (جلالین) گفت یوسف این همه برای آنست تا بداند عزیز (شاه ولی الله) یہ تحقیقات اس واسطے ہے کہ جانے عزیز یعنی خاونداس کا (رفیع الدین)

[3] ۔ اختلفوا فی من هٰذا الکلام حکایة عنه فقال اکثر المفسّرین انّه حسن یوسف ـــ و قال الجبائی و البلخی انّه من قول المرأة و کلا الامرین جائز ان و الاوّل اشبه (تبیان)

[4] ۔ اخبار عما قال یوسف علی وجه التواضع لله (تبیان)

چیت کی تو کہا کہ تم یقیناً اب ہمارے یہاں صاحب اقتدار، بھروسے کے آدمی ہو[1] انہوں نے کہا کہ مجھے اس سرزمین کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے، یقیناً میں حفاظت کرنے والا ہوں خوب جاننے والا''۔

حفاظت کرنے والا بے محل صرف ہونے سے اور خوب جاننے والا صحیح استعمال کا مواقع کا۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور اس طرح ہم نے یوسفؑ کو اس سرزمین پر اقتدار کا مالک بنایا کہ وہ اس میں جہاں چاہیں قیام کریں[2] ہم اپنی رحمت کو پہونچاتے ہیں جس تک چاہتے ہیں یقیناً ہم نہیں برباد کرتے صلہ نیک اعمال والوں کا اور بلاشبہ آخرت کا ثواب بہتر ہے ان کے لئے جو ایمان رکھتے ہوں اور پرہیزگاری سے کام لیتے ہوں''۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿۵۹﴾ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اور یوسفؑ کے بھائی ان کے پاس داخل ہوئے تو وہ ان لوگوں کو پہچان گئے اور وہ سب ان کو نہیں پہچان رہے تھے اور جب ان کا سامان سفر ان کی روانگی کے لئے تیار کیا تو کہا تم لوگ اب کی بار اپنے اس ایک علاتی بھائی کو بھی لیتے آنا، کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں پورا پورا ناپ کر دیتا ہوں اور بہترین طریقے پر میزبانی بھی کرتا ہوں، اب اگر تم اسے نہ لائے تو تمہارے لئے میرے پاس تولنے کے لئے غلہ نہ ہوگا اور تم میرے نزدیک نہ آنا۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم اس کے باپ پر اس کے بھیجنے کے لئے ڈول ڈالیں گے اور یقیناً ہم ایسا کریں گے''۔

بھائیوں کی پہلی دفعہ حاضری اور جناب یوسف علیہ السلام کی فرمائش

ان کا نہ پہچاننا عام نظام اسباب کے ماتحت بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت جب ان سے جدا ہوئے تھے تو حضرت یوسف علیہ السلام بچہ تھے اور اب آپ کمال عمر کی منزل میں تھے اور پھر شاہانہ لباس میں تھے اور انہیں یہ سان گمان بالکل نہ تھا کہ جسے انہوں نے کنویں میں ڈالا تھا وہ مصر کی کرسی

---

[1] ۔یقال لفلان مکانته عند الملك وهو مکین عنده واصله التمکن من الامر (تبیان)

[2] ۔ینزل منها حیث یشاء بعد الضیق و الحبس (جلالین)

اقتدار پر ہوگا اس لئے وہ اس نظر سے دیکھ بھی نہیں رہے تھے جو اقتدار زمانہ کے بعد کسی ایسے گم گشتہ کے پہچاننے کا باعث ہوسکتی ہے اور لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ قدرت کی طرف کا کوئی خاص انتظام ہو چنانچہ اس بارے میں دو قول ہو گئے ہیں [1] بعد کو جناب یوسف علیہ السلام کی گفتگو واقعات کی ایک کڑی پر مبنی ہے جسے قرآن مجید نے بنظر اختصار ترک کر دیا ہے اور وہ عقل سے سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب یوسف علیہ السلام ان سے اس کے پہلے کہ وہ انہیں رخصت کریں، گفتگو کے ذیل میں ان کے حالات مثلاً یہ کہ ان کے والد بوڑھے ہیں اور وہ سب اس پریشان حالی کے دور کرنے کے لئے ان سے رخصت ہو کر چلے آئے ہیں مگر اپنے ایک بھائی کو ان کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔ یہ بھی باتوں باتوں میں صراحت ہوگئی کہ یہ سب ایک ماں سے ہے اور وہ چھوٹا بھائی ایک دوسری ماں سے ہے تو جناب یوسف علیہ السلام نے انہی کی بتلائی ہوئی معلومات کی بنا پر یہ کہا کہ اب کی بار آنا تو اپنے اس سوتیلے بھائی کو بھی لیتے آنا۔ [2]

ہماری ایسی قدیم تفسیر میں جو احادیث پر مبنی ہے اس کو بطور واقعہ درج کیا ہے [3] یہ بھی قرین قیاس ہے کہ انہوں نے اس بھائی کے کچھ اوصاف بھی بیان کئے ہوں کہ وہ بڑا سمجھدار ہے اور باپ کا پیارا ہے، اس لیے باپ کو اسکی جدائی گوارا نہیں ہے۔ اور بظاہر ہر اسباب یہ جناب یوسفؑ کے اشتیاق کا باعث ہوسکتا ہے کہ وہ ان کے اس بھائی کو دیکھیں کہ اس کے کیا اوصاف ہیں۔ [4]

اگر انہوں نے اپنی گفتگوؤں میں یہ نجی حالات اپنے بتائے نہ ہوتے تو وہ ضرور جناب یوسفؑ کے از خود کہنے پر کہ اپنے سوتیلے بھائی کو بھی لیتے آنا بھڑک اٹھتے کہ آخر اس میں کیا راز ہے؟

بے شک انہوں نے فطری طور پر یہ چیز بیان نہیں کی ہوگی، وہ اپنے اس ظلم کی روئداد جو خود یوسفؑ پر ڈھایا تھا، اسے جناب یوسف علیہ السلام نے بھی اس وقت اپنے دل میں رکھا اور اس کے بعد جب انہیں مقصد ہوا کہ وہ اپنی شخصیت کو نمایاں کریں جس کا ذکر بعد میں آئے گا تو اس وقت انہوں نے اسی کو چھیڑا کہ سب معلومات تو تم نے میرے لئے فراہم کیں، یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم نے یوسفؑ کے ساتھ سلوک کیا کیا تھا؟ چنانچہ اسی وقت وہ بھڑکے اور کہنے لگے، اچھا تو آپ یوسفؑ ہی ہیں؟

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٦٢﴾

اور انہوں نے اپنے جوانوں سے کہا کہ ان کی پونجی ان کے سامان میں رکھ دو، ممکن ہے یہ اُسے پہچانیں اس وقت

---

[1] ۔ قال الجبائی انّهم فارقوه وهو صبیّ امرد فجاء وه قد التحی و کبر و تغیّرت حاله فلم یعرفوه وقال البلخی ان ذٰلك ممّا خرق الله فیه العادة لنبیّة (تبیان)

[2] ۔ الذی اقتطی طلبه الاخ من ابیهم انّه فاوضهم و سألهم عن اخبارهم و احوالهم و اخبار اهلهم کما یتساءل الناس من مثل ذٰلك و دلّ الکلام علی ذٰلك (تبیان)

[3] ۔ قال فما ابو کم قال اشبح ضعیف قال ذٰلکم اخ غیر کم قالوا لنا اخ من ابینا لا من امتنا قال فاذا رجعتم الیٰ فاتونی به. (علی بن ابراهیم)

[4] ۔ ذکروا انّ اباهم اثره علیهم بالمحبّة مع حکمة و فضله فاحبّ ان یّراه. (تبیان)

جب وہ اپنے گھر بار میں جائیں، شاید پھر واپس آئیں۔

یہ لوگ تو قیمت دے کر غلہ خریدنے آئے تھے انہوں نے غلہ دیا تو چلتے وقت پھر وہ قیمت بھی جو انہوں نے دی تھی، ان کے سامان میں رکھ دی۔

اسے ''پونجی'' اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ وہ اس سے خریداری غلہ کے کاروبار کو چلا رہے تھے۔ [1]

''شاید پھر وہ واپس آئیں'' یعنی شاید اس احسان کی وجہ سے وہ دوبارہ آئیں اور اب جو آئیں گے تو حسب وعدہ ان کے سگے بھائی کو بھی ضرور اپنے ساتھ لائیں گے۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿٦٣﴾

''تو جب وہ لوگ واپس گئے اپنے باپ کے پاس تو کہا اے ہمارے والد صاحب! روک دیا گیا ہم سے غلہ کا ناپ کر دیا جانا، اس لئے ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیجئے تو نپوا کر اناج لے آئیں گے اور یقیناً ہم اس کی حفاظت کریں گے''۔

غلہ روک دیا گیا یعنی آئندہ کے لئے کہہ دیا گیا ہے کہ اگر اپنے اس بھائی کو ساتھ نہ لائے تو غلہ نپوا کر نہیں دیا جائے گا''۔ [2]

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٦٤﴾

''کہا کیا تم پر اس کے بارے میں اطمینان کروں ویسے ہی جیسے اطمینان کیا تھا تم پر اس کے بھائی کے بارے میں پہلے، بہر حال اللہ سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور وہ بہترین رحم کرنے والا ہے''۔

چونکہ انہوں نے حفاظت کی نسبت بڑے زور کے ساتھ اپنی طرف دی تھی وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ تو حضرت یعقوبؑ نے جواب میں کہا کہ تم کیا حفاظت کرو گے، تم نے اس سے پہلے یوسفؑ کی حفاظت کا بھی تو ذمہ لیا تھا، اس ذمہ داری کو کب تم نے پورا کیا اور اصل حفاظت کرنے والا تو اللہ ہے، اس کی حفاظت کے مقابلہ میں تمہاری حفاظت کیا چیز ہے۔ [3]

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ

---

[1] ۔ البضاعة قطعة من المال الّتی للتجارة (تبیان)

[2] ۔ منع منا الکیل ان لم نات باخینا ... وھو قول الحسن والزجاج والجبائی وھو الصحیح (تبیان)

[3] ۔ المعنی فاللہ خیر حفظا من حفظکم الذی نسبتموہ الیٰ انفسکم (تبیان)

ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿٦٥﴾

''اور جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو اپنی پونجی کو پایا کہ وہ انہیں واپس کر دی گئی ہے کہنے لگے اور ہمیں کیا چاہیے، یہ ہماری پونجی بھی تو ہمیں واپس کر دی گئی ہے اور اب ہم اپنے گھر والوں کے لئے پھر غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ پھر اور زیادہ غلہ لائیں گے یہ تو تھوڑا غلہ ہے جو ہمیں ناپ کر ملا ہے''۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿٦٦﴾

انہوں نے کہا کہ میں کبھی نہیں بھیجوں گا اسے تمہارے ساتھ جب تک تم مجھ سے اللہ کی قسم کھا کر یہ عہد و پیمان نہ کرو کہ تم اسے اپنے ساتھ ضرور لے آؤ گے سوا اس کے کہ تم سب گھیر لئے جاؤ تو جب ان سب نے ان سے عہد و پیمان کیا تو انہوں نے کہا کہ اللہ ہماری گفتگو پر گواہ ہے۔ [1]

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٦٧﴾

اور انہوں نے کہا اے میرے بیٹو! ایک دروازے سے شہر کے اندر نہ جانا اور مختلف دروازوں سے جانا اور میں تم کو اللہ سے بچا تو نہیں سکتا، کچھ بھی فیصلہ نہیں ہے مگر اللہ کے قبضہ میں۔ اُسی پر میرا بھروسا ہے اور اسی پر بھروسا کرنا چاہیے بھروسا کرنے والوں کو۔

ایک دروازے سے نہ جانا، یہ اس لئے کہہ دیکھنے والوں کی نظر نہ لگے [2] بعض علمائے اہل سنت نے نظر کو عوامی چیز بنا کر اس کی اصلیت سے انکار کیا ہے لہٰذا ایک دوازے سے جانے کی ممانعت کا سبب یہ قرار دیا ہے کہ کہیں مصر کے اقتدار سلطنت کو ان کے قد و قامت سے ان کی طاقت وری کا صحیح اندازہ ہو تو وہ اپنے لئے سیاسی طور پر ان سے خطرہ محسوس نہ کریں اور ان کی ضرر رسانی کے درپے نہ ہو مگر چونکہ نظر بد کی اصلیت شرعاً معتبر طریقہ پر ثابت ہے اس لئے پہلا ہی خیال جو مفسرین کی اکثرت کا ہے درست معلوم ہوتا ہے۔ [3]

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ۭ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ

---

[1] ۔ وکیل شہید (جلالین)

[2] ۔ تا چشم زخم نرسد (فتح الرحمن)

[3] ۔ الذی قال لہ غیر صحیح فی امر العین بل غیر منکر ان یکون ما قالا المفسرّون صحیحا (تبیان)

اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور جب وہ لوگ داخل ہوئے جس طرح ان کے باپ نے انہیں حکم دیا تھا تو انہیں تقدیر الٰہی [1] سے کوئی چیز بچا تو سکتی نہ تھی مگر یعقوب کے دل کی ایک حسرت تھی جسے انہوں نے نکال لیا [2] اور یقیناً وہ علم رکھنے والے تھے اس کا کہ جس کا ہم نے انہیں علم عطا کیا تھا مگر اکثر لوگ جانتے نہیں''۔

یعنی یعقوبؑ بھی جانتے تھے کہ یہ بس ایک ظاہری بچاؤ کی تدبیر ہے ورنہ ہوگا وہی جو منظور خدا ہوگا۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾

اور جب وہ لوگ یوسفؑ کے پاس داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے پاس رکھا اپنے بھائی کو کہا میں تمہارا سگا بھائی ہوں تو تم پریشان نہ ہونا اس سے جو یہ لوگ کریں، اس کے بعد جب ان کا سامان تیار کرایا تو پانی پینے کا کٹورا اپنے بھائی کے سامان میں رکھوا دیا۔ پھر ایک منادی نے ندا دی کہ اے قافلہ والو! یقیناً تم لوگ چور ہو''۔

شاہی کٹورا یقیناً کوئی معمولی کٹورا نہیں ہوسکتا، ضرور جواہرات اس میں جڑے ہوئے ہوں گے۔ [3]

بھائیوں کی دوسری دفعہ حاضری اور یوسفؑ کی اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس رکھ لینے کے لئے ترکیب

قابل لحاظ یہ امر ہے کہ جناب یوسف علیہ السلام کی ندا میں یہ نہیں ہے کہ یہ چور ہے یعنی ان کا بھائی بلکہ کہا گیا ہے تم چور ہو اس کے لئے ہمارے یہاں امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی یہ نہایت لطیف پہلو وارد ہوا ہے

کہ انہوں نے اس وقت نہ چوری کی ہو مگر ان کے چور ہونے میں شبہ ہی کیا ہے کہ انہوں نے خود یوسفؑ کو ان کے باپ سے چرایا۔ جو یقیناً بڑا جرم عظیم تھا۔ اس طرح یہ جملہ معاذ اللہ جھوٹ نہ تھا۔ جو شان انبیاء کے خلاف ہے بلکہ توریہ تھا جو معانی بیان کی ایک مستقل صنعت ہے اور فصیح کلام کا ایک جوہر ہے۔

قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ

---

[1] ۔من اللہ ای من قضائہ (جلالین)

[2] ۔سر انجام یعقوب علیہ السلام خطرہ راء کہ در ضمیر و بود (شاہ ولی اللہ) مگر ایک خطرہ تھا پیچ دل یعقوبؑ کے کہ کر ڈالا اس کو (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔ھی صاع بالذّھب مرصّع بالجواھر (جلالین) ایک پیالہ مرصّع پانی پینے کا (شاہ رفیع الدین)

بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

انہوں نے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا کہ کیا چیز تمہاری کھوگئی؟ انہوں نے کہا کہ بادشاہ کے پینے کا پیالہ ہمیں نہیں مل رہا ہے اور جو اسے لائے اسے اونٹ کے برابر بھر غلہ انعام میں ملے گا اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ ہم نہیں آئے ہیں اس لئے کہ اس سرزمین میں خرابی پھیلائیں اور ہم چور نہیں ہیں انہوں نے کہا تو کیا سزا ہے اس کی اگر تم جھوٹے ہو، انہوں نے کہا کہ سزا اس کی یہ ہے کہ جس کے سامان میں وہ مل جائے تو یہی آدمی اس کا معاوضہ ہے اس طرح سزا دیتے ہیں ہم مجرموں کو''۔

وہی آدمی معاوضہ ہے یعنی اس کو غلام بنا کر اپنے پاس روک لیا جائے گا۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾

''تو اُنھوں نے اپنے بھائی کے برتن سے پہلے انکے برتنوں سے ابتداء کی، پھر اسے نکال لیا اپنے بھائی کے برتن سے۔ اس طرح ہم نے ترکیب کی یوسف کے لیے۔ وہ نہیں لے سکتے تھے اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانون کے مطابق سوا اس کے کہ اللہ چاہے۔ ہم جسے چاہتے ہیں مرتبوں میں بلندی عطا کرتے ہیں اور ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہوتا ہے''

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں۔

''یعنی بھائیوں کی زبان سے آپ ہی نکلا کہ چور کو غلام کرلو، اُس پر پکڑے گئے، نہیں تو اس بادشاہ کا یہ حکم نہ تھا۔'' (موضح القرآن)

فی دین الملك حكم ملك مصر لانّ جزاءه عنده الضّرب وتقويم مثل المسروق لاالا مسترقان الّاان يشاء الله اخذه بحكم ابيه اى لم يتمكن من اخذه الّا بمشية الله اى بالهامه سؤال اخوته وجوابه.

بادشاہ کے حکم میں یعنی بادشاہ مصر کے قانون میں کیونکہ ان کے یہاں اس کی سزا جسمانی تعزیر تھی اور جو چیز چرائی گئی ہو، ویسی چیز کی قیمت وصول کرنا، نہ یہ کہ چور کو غلام بنانا، سوا اس کے کہ اللہ چاہے۔ یعنی اسے چاہا کہ یہاں یوسفؑ کے باپ کے قانون کے مطابق عمل ہو اور وہ القائے ربانی سے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھ سکیں کہ وہ خود بھائیوں سے پوچھیں اور وہ یہ جواب دیں۔

الّا ما شآء الله سوا اس کے کہ اللہ چاہے، اس کے بعد یہ ارشاد کہ ہم جسے چاہتے ہیں مرتبوں میں بلندی عطا کرتے ہیں، اس حقیقت

کا اظہار ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، یہ اللہ کی ہدایت خاص کا نتیجہ تھا[1] اس کے بعد کتنا غلط ہے یہ تصور کہ اسے جناب یوسف علیہ السلام کا ایک ترک اولیٰ سمجھا جائے کہ انہوں نے معاذ اللہ واقعہ کے خلاف ایک بات کہی۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ۝

''انہوں نے کہا کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے ایک بھائی نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی تو اسے یوسف نے اپنے دل میں چھپائے رکھا اور نہیں ظاہر کیا ان کے لئے۔ کہا تم منزل کے لحاظ سے بدتر ہو اور اللہ خوب جانتا ہے اس کیفیت کو جو تم بیان کرتے ہو''۔

انہوں نے کس بنا پر کہا کہ اس کے ایک بھائی (یعنی یوسف علیہ السلام) نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی اس کے لئے مفسرین کا بیان مختلف ہے ایک یہ ہے کہ

حضرت یوسف ننی از طلا از ان جدۂ مادری خود بدزدید تا از عبادت صنم باز ماند۔ مشابہ این قصہ چیزی کہ سبب تہمت او باشد بدزدی بوقوع آمدہ بود (فتح الرحمن)

جناب یوسف علیہ السلام نے سونے کی ایک مورتی اپنی نانی کے پاس سے چرالی تھی تا کہ وہ بت پرستی سے باز آجائے اسی طرح کا کوئی واقعہ ایسا تھا کہ چوری کا الزام ان پر عائد ہو گیا۔

تفسیر جلالین میں ہے:

کان سرق لابی امه صنما من ذهب فکسره لئلا یعبده

انہوں نے اپنے نانا کی سونے کی ایک مورتی چرائی تھی جسے انہوں نے توڑ دیا تا کہ وہ اس کی عبادت نہ کرے۔

دوسرے یہ کہ:

ان پر چوری کا طعن دیا، وہ قصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو پھوپھی نے پالا، جب بڑے ہوئے تو باپ نے چاہا اپنے پاس رکھیں پھوپھی کو محبت تھی چھپا کر ایک پٹکا ان کی کمر سے باندھ دیا پھر اس کو ڈھونڈھنے لگی لوگوں میں چرچا ہوا آخر ان کی کمر سے نکلا موافق اس دین کے ایک برس پھوپھی کے پاس اور رہے (موضح القرآن)

جناب شیخ طوسیؒ نے ان دونوں اقوال کے علاوہ ایک تیسری بات یہ درج کی ہے کہ وہ دسترخوان پر سے مخفی طور پر کچھ کھانا بچا کر فقراء و مساکین کے لئے رکھ دیتے تھے[2] اس لئے گھر والوں نے یہ الزام ان پر عائد کیا۔

بہر حال وہ چیز کوئی ایسی ہے جو بجائے خود عنداللہ کوئی جرم نہ تھی لیکن برادارانِ یوسفؑ اسے چوری کے لفظ سے تعبیر کر رہے تھے اسے

---

[1] ۔ انما قال ذٰلك لانه تعالیٰ کان امره بذٰلك (تبیان)

[2] ۔ قال قوم انه کان یسرق من طعام المائدة للمساکین (تبیان)

یوسفؑ نے اپنے دل میں چھپائے رکھا اور ان کے سامنے ظاہر نہیں کیا۔ یہ وہی بات ہے جسے بعد میں قرآن نے کہا ہے کہ انہوں نے کہا: اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا تم منزل کے لحاظ سے بدتر ہو تو یہ انہوں نے زبان سے تھوڑی کہا، دل میں کہا۔ [1]

''بدتر'' کا لفظ ان کی اس برائی کے تصور کے لحاظ سے ہے جو وہ جناب یوسف علیہ السلام کے لئے ذہن میں لئے ہوئے تھے اور بطور ابہام اس وقت کہہ رہے تھے ورنہ حقیقت میں تو کوئی برائی جناب یوسف علیہ السلام میں تھی ہی نہیں، برے یہی لوگ تھے جو ان کی نسبت برائی کا تصور کر رہے تھے اور اشارۃً ظاہر کر رہے تھے۔

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۷۸ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ۝۷۹

''ان لوگوں نے کہا اے عزیز مصر! یقین مانیے کہ اس کا ایک بہت بوڑھا باپ ہے تو ہم میں سے ایک کو اس کی جگہ پر رکھ لیجئے ہم تو آپ کو بڑے حسن کردار کا حامل دیکھتے ہیں انہوں نے کہا اللہ کی پناہ اس سے کہ ہم لیں کسی کو سوا اس کے کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس صورت میں تو ہم ظالم قرار پائیں گے۔

یہ کہا کہ ''جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہیں۔ یہ نہیں کہ جس نے چوری کی ہے'' اس لیے کہ وہ جھوٹ ہوتا۔ [2]

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸۰ اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ۝۸۱ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۸۲

تو جب وہ لوگ ان کی طرف سے ناامید ہوئے تو تخلیہ میں جا کر آپس میں چپکے چپکے مشورہ کرنے لگے۔ اُن میں جو سب سے بڑا تھا، اس نے کہا، کیا تمہیں نہیں معلوم ہی کہ تمہارے باپ نے تم سے اللہ کی قسم دے کر عہد لیا تھا اور اس کے پہلے تم نے یوسف کے بارے میں تقصیر کی تھی، لہٰذا میں تو اس سرزمین سے ہٹوں گا نہیں جب تک کہ میرے

---

[1] ۔قال فی نفسه (جلالین) گفت در دل خود (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔لم یقل من سرق تحرزا من الکذب (جلالین)

والد مجھے اجازت نہ دیں یا اللہ میرے لئے اپنا کوئی فیصلہ صادر کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے واپس جاؤ اپنے والد کے پاس اور جا کر ان سے کہو کہ اے ہمارے والد صاحب آپ کے بیٹے نے چوری کی اور ہم نہیں گواہی دیتے مگر وہی کہ جو ہمیں معلوم ہے اور غیب کی بات کی ہمیں خبر نہیں ہے اور اس بستی سے پوچھ لیجئے جس میں ہم تھے اور اس قافلہ سے کہ جس میں ہم آئے ہیں اور ہم بلاشبہ سچے ہیں''۔

اس سلسلہ کے پہلے ٹکڑے فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا میں کچھ ایسی کیفیت ہے کہ اسے محسوس کر کے بعض قرآن کے مقابلہ کا ارادہ کرنے والے سپر انداختہ ہو کر بیٹھ گئے [1] مگر ترجمہ سے اس کیفیت کا اندازہ کرنا ہمیں مشکل بلکہ دشوار معلوم ہوتا ہے۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾

''انہوں نے کہا بلکہ تمہارے نفسوں نے تمہارے لئے ایک بات بنائی ہے تو بہر حال میں صبر کرتا ہوں جو بہتر ہے ممکن ہے کہ اللہ اُن سب کو میرے پاس لائے، یقیناً وہ بڑا جاننے والا ہے صحیح کام کرنے والا''۔

جناب یعقوب علیہ السلام کو اس کی اطلاع اور ان کا تاثّر

ان سب کو یعنی تین بیٹے جو مصر میں رہ گئے ہیں، یوسفؑ اور ان کے حقیقی بھائی اور ان بھائیوں میں سب سے بڑا جس نے مصر سے ہٹنا اس صورت حال میں پسند نہیں کیا۔

اب یہاں ایک پہلو حل طلب یہ ہے کہ یوسف کے بارے میں بھائیوں کے جا کر کہنے سے کہ بھیڑیئے نے کھالیا، یہی الفاظ حضرت یعقوبؑ نے کہے تھے کہ تمہارے نفوس نے تمہارے لئے ایک بات بنائی ہے بہر حال میں صبر کرتا ہوں۔ وہ تو بلا تکلف درست ہے، لیکن وہی الفاظ اب اس دفعہ بھی ان بھائیوں کی اطلاع رسانی پر کہے۔ حالانکہ اس دفعہ ان بھائیوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کے لئے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

پہلی بار کی بے اعتباری سے اب کی بار بھی حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کا اعتبار نہ کیا لیکن نبی کا کلام جھوٹ نہیں بیٹوں کی بنائی بات تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام بھی بیٹھے تھے (موضح القرآن)

اس میں سے صرف پہلا جزء تفسیر جلالین میں ہے:

انهم لما سبق منهم فی امر یوسف۔

انہوں نے ان پر اعتماد نہ کیا ان کے اس عمل کی وجہ سے جو یوسف علیہ السلام کے بارے میں ہو چکا تھا۔

ہماری نظر میں شاہ صاحب نے جو اضافہ کیا ہے وہ بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے یعنی ان کا ضمیر اسلامی اسے گوارا نہیں کرتا کہ ایک نبی کی زبان سے سابق پر قیاس کی بنا پر کوئی خلاف واقعہ بات نکلے مگر اس صورت میں انہیں کسی ایسی حدیث کو بھی رد کر دینا چاہیے جو جناب یعقوبؑ سے بالاتر ذات یعنی ان کے جدامجد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے معاذ اللہ جھوٹوں کی فہرست مرتب کر کے پیش کر رہی ہو۔ چاہے وہ کسی بھی صحیح نام کی

---

[1] ۔ھٰذا من عجیب فصاحة القرآن الخارقة للعادة.(تبیان)

کتاب میں درج شدہ ہو، بہر حال اس حدیث کو غیر صحیح ہی ماننا چاہیے۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٨٤﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿٨٥﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٨٦﴾

''اور اُن کی طرف سے انہوں نے منہ پھیر لیا اور پھر کہا ہائے افسوس یوسف پر اور ان کی دونوں آنکھیں رنج وغم سے سفید ہو گئیں تو ایک خاموش مرقع غم [1] بن گئے۔ ان لوگوں نے کہا خدا کی قسم آپ برابر یوسف کو یاد کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ سخت بیمار پڑ جائیں [2] یا ہلاک ہی ہو جائیں۔ انہوں نے کہا میں تو اپنے رنج وغم کی شکایت بس اللہ سے کرتا ہوں۔ اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے وہ جو تم نہیں جانتے ہو''۔

جناب یعقوبؑ کا گریہ اور روتے روتے زوالِ بصارت

ان آیات سے جناب یعقوبؑ کا گریہ اور روتے روتے زوالِ بصارت کے واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

یعنی تم کیا مجھ کو صبر سکھاؤ گے لیکن بے صبر وہ ہے جو خلق کے آگے شکایت کرے میں تو اس سے کہتا ہوں جس نے درد دیا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھ پر آزمائش ہے دیکھوں وہ کس حد پر جا کر بس ہو (موضح القرآن)

مگر تفسیر جلالین میں ہے:

واعلم من الله مالا تعلمون من ان رؤیا یوسف صدق وهو حیّ

جانتا ہوں اللہ کی طرف سے وہ جو تم نہیں جانتے ہو یعنی یہ کہ یوسف علیہ السلام کا خواب سچا تھا اور وہ زندہ ہیں۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٧﴾

''اے میرے بیٹو! جاؤ، یوسف اور اس کے بھائی کی خبر لو [3] اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یقیناً اللہ کی رحمت

---

[1] ۔مکروب مغموم لا یظهر کربه (جلالین)

[2] ۔مشر فاعلی الهلاك لطول مرضك (جلالین)

[3] ۔التجسس طلب الشئی بالحا (تبیان)

سے نا امید نہیں ہوتے مگر کافر لوگ"۔

بھائیوں کی تیسری دفعہ حاضری، تعارف اور ان کی توبہ وانابت

ان آیات سے بھائیوں کی تیسری دفعہ حاضری، تعارف اور ان کی توبہ وانابت کے واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾ قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِىْ ۫ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾

"جب وہ لوگ ان کے پاس داخل ہوئے تو کہنے لگے اے عزیز مصر! ہمیں اور ہمارے تمام گھر والوں کو بڑی سختی درپیش ہوگئی ہے اور ہم تھوڑی سی پونجی لائے ہیں تو ہمیں پورا پیمانہ ناپ کر دلوا دیجئے اور ہم پر خیرات کیجئے یقیناً اللہ خیرات کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے انہوں نے کہا کچھ تمہیں خبر ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا جب کہ تم جہالت میں مبتلا تھے انہوں نے کہا سچ مچ تم یوسف ہو؟ کہا میں یوسف اور یہ میرا بھائی ہے ہم پر اللہ نے احسان کیا ہے یقیناً جو پرہیزگاری سے کام لیتا ہے اور صبر کرتا ہے تو بلاشبہ اللہ نیک اعمال والوں کے اجر وثواب کو برباد نہیں کرتا۔

درمیانی کڑی سننے والے کی سمجھ پر چھوڑی گئی ہے یعنی اس کے بعد پھر قحط سالی کی پریشانی سے مجبور ہو کر برادرانِ یوسف نے مصر کا رخ کیا اور وہاں پہونچے۔[1]

معاوضہ چونکہ ناکافی تھا، اس لئے اس عاجزی کے ساتھ غلہ کی خریداری کی درخواست کی اور کہا خیرات سے کام لیجئے، یعنی معاوضہ تو اتنا نہیں ہے مگر آپ اس کی کمی کو نظر انداز کیجئے اور ہمیں غلہ پورا دلوا دیجئے[2] اور یہی عاجزی تھی جس پر جناب یوسف علیہ السلام کو رحم آ گیا ہے[3] اور انہوں نے بتلا دیا کہ میں کوئی غیر نہیں ہوں وہی تمہارا بھائی ہوں۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

قحط میں سب اسباب گھر کا بک گیا اب کی بار اون اور پنسیر اور ایسی چیزیں لائے تھے اناج خریدنے کو یہ حال سن کر یوسفؑ کو رحم آیا اور

---

[1] ۔فانطلقوا نحو مصر ليوسف (جلالين)

[2] ۔تصدّق علينا بالمسامحة عن رداءة بضاعتنا (جلالين)

[3] ۔سألوه التصدق عليهم بإيفاء كيلهم فرق لهم (تبيان)

اپنے تئیں ظاہر کیا اور سارے گھر کو بلوالیا۔ (موضح القرآن)

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾

''ان لوگوں نے کہا کہ خدا کی قسم اللہ نے تم کو ہم پر مقدم کیا ہے اور ہم بے شک خطاوار تھے انہوں نے کہا اب آج تم کو کوئی لعنت ملامت کرنا نہیں ہے، اللہ تم کو بخش دے اور وہ تمام رحمت والوں میں سب سے زیادہ رحمت والا ہے۔ لے جاؤ میرے اس کرتے کو اور لے جا کر میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو۔ ان کی آنکھیں روشن ہوجائیں گی اور میرے پاس اپنے تمام گھر والوں کو سب کو لے کر آؤ''۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَاۤ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

''اور جب قافلہ روانہ ہوا تو اُن کے باپ نے کہا میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، اگر تم لوگ مجھے بے وقوف نہ بناؤ، ان لوگوں نے کہا خدا کی قسم آپ اپنی پرانی گمراہی میں ہیں تو جب خوش خبری دینے والا آیا، اس نے اُسے اُن کے چہرہ پر ڈال دیا تو ان کی آنکھیں دوبارہ روشن ہوگئیں انہوں نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو''۔

جناب یوسف علیہ السلام کی خوشبو اور پیرہن کا جناب یعقوب علیہ السلام تک پہنچنا اور بینائی کا پلٹنا

یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیٹے ہی نہیں جو برادران یوسف تھے بلکہ گھر کے دوسرے لوگ بھی جناب یعقوبؑ کی شان میں گستاخیاں کرتے تھے اور جناب یوسف علیہ السلام کو اتنا زیادہ یاد کرتے اور ان کے رونے پر طعن و تشنیع کرتے تھے کیونکہ وہ بھائی تو اس وقت مصر میں تھے تو یہ دوسرے ہی لوگ ہو سکتے ہیں جن سے یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ [1]

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾

---

[1] ۔ انّما قال یعقوب هٰذا القول لمن حضره من اهله و قرابة دون ولده لانّهم کانوا غیبا عنه لم یصلوا الیه۔ (تبیان)

''انہوں نے کہا اے ہمارے والد! ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لئے سفارش کیجئے، یقیناً ہم خطاوار تھے انہوں نے کہا میں تمہارے لئے پروردگار سے بخشش کی التجا کروں گا۔ یقیناً وہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان''۔

یہ کس نے کہا؟ سیاق تو بتلاتا ہے کہ قمیص کے پہنچنے کے وقت ہی جب جناب یعقوبؑ نے کہا کہ میں نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اسی وقت یہ کہا گیا مگر اس وقت جناب یعقوبؑ کے وہ بیٹے ان کے پاس کہاں تھے جو وہ کہتے، معلوم ہوتا ہے کہ درمیان کی کڑیاں یہاں مذکور نہیں ہیں اس قمیص کے پہنچنے اور جناب یعقوبؑ کی بصارت واپس ہونے کے بعد برادران یوسفؑ بھی پھر یوسفؑ کی ہدایت کے مطابق کہ اپنے تمام گھر والوں کو میرے پاس لے کر آؤ۔ کنعان میں اپنے والد کی خدمت میں گئے اور اس وقت انہوں نے یہ کہا۔ [1]

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

''تو جب وہ سب یوسفؑ کے پاس داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں داخل ہو جایئے جہاں انشاء اللہ امن واطمینان سے رہیے گا اور اپنے ماں باپ کو تخت پر اونچا بٹھایا اور وہ سب ان کے سامنے سجدہ میں گر گئے اور انہوں نے کہا اے بابا! یہ میرے خواب کی جو پہلے دیکھا تھا تعبیر ہے جسے میرے پروردگار نے سچ کر دکھایا ہے اور اس نے مجھ پر احسان کیا جب کہ اس نے مجھے قید خانہ سے نکالا اور آپ لوگوں کو بیابان سے یہاں لایا جب کہ اس کے پہلے شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان پھوٹ ڈالی تھی یقیناً اللہ مہربانی کرنے والا ہے جس پر وہ چاہے یقیناً وہ جاننے والا ہے ٹھیک کام کرنے والا۔ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے ایک طرح کی سلطنت دی اور مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم دیا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو میرا پروردگار ہے دنیا اور آخرت میں۔ مجھے دنیا سے مسلمان اٹھا اور مجھے نیک اعمال لوگوں میں محسوب فرما''۔

---

[1] ۔فی الکلام حذف لان تقدیرہ ان اخوۃ یوسف وصلوا الی ابیھم فلما راوہ قالوا لہ یا ابانا استغفر لنا ذنوبنا (تبیان)

بچپن کے خواب کی تعبیر ظاہر ہونا اور سب کا یوسفؑ کے سامنے سر بسجود ہونا

یہ تذکرہ جہاں سے شروع ہوا ہے اس میں درمیان کی کڑیاں پھر محذوف ہیں یعنی یوسفؑ کی خواہش کے مطابق برادران یوسف کنعان گئے اور اب تمام گھر کے لوگوں سمیت دوبارہ مصر آئے۔[1]

یوسفؑ کے پاس داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی۔ حالانکہ ابھی مصر میں داخل نہیں ہوئے ہیں اس لئے کہ اس کے بعد ان کا یہ کہنا ہے کہ مصر میں داخل ہو جایئے۔

اس کی تشریح شاہ ولی اللہ اپنے ترجمہ میں یوں کرتے ہیں:

چوں در آمد از نزد یوسف یعن در خیمه اش و او برائ استقبال برآمده بود جائے داد بسوی خود پدر و مادر خود را و گفت در آئید بمصر"۔

یعنی یوسفؑ ماں باپ وغیرہ کے استقبال کو شہر سے باہر آئے تو وہاں ان کے لئے ایک خیمہ لگایا گیا تھا جس میں فروکش تھے پہلے یہ لوگ ان کے پاس اس خیمہ میں داخل ہوئے۔ وہاں یہ باتیں ہوئیں جن کا ذکر اس آیت میں ہے:

شاہ عبدالقادر نے مختصر طور پر یوں کہا ہے کہ:

باہر شہر سے استقبال کو نکلے وہاں یہ کہا (موضح القرآن)

وہ تفصیل اور یہ اجمال دونوں جلالین سے ماخوذ ہیں جنہوں نے لکھا ہے:

فلما دخلوا علی یوسف فی مضربه.

جب وہ یوسفؑ کے پاس داخل ہوئے ان کے خیمہ میں۔

"وہ سب ان کے سجدہ میں گر گئے"۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

پہلے وقت میں سجدہ تعظیم تھی آپس کی۔ فرشتوں نے حضرت آدمؑ کو کیا ہے اس وقت اللہ نے وہ رواج موقوف کیا: وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ (سورۂ جن۔ ۱۸) یہ اس وقت پہلے رواج پر چلنا ویسا ہے کہ کوئی بہن سے نکاح کرے کہ حضرت آدمؑ کے وقت ہوا ہے" (موضح القرآن)

یہ مثال جو دی ہے اس سے تو ہمیں اتفاق نہیں ہے ہمارے احادیث بتاتے ہیں کہ آدم کے وقت میں بھی بہن سے نکاح نہ تھا مگر اصولاً یہ بات درست ہے کہ سابق شریعت میں اگر کوئی حکم ہو تو اسلام میں منسوخ ہو جانے کے بعد اب اس پر عمل درست نہیں ہے مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ سجدہ غیر خدا کے لئے ذاتاً شرک نہیں ہے اس لئے کہ اگر شرک ہوتا تو کسی دور میں بھی خالق کی طرف سے اس کا حکم نہ ہوتا حالانکہ باعتراف شاہ صاحب ملائکہ نے آدم کو سجدہ کیا۔ اسے رواج کہہ کر ہلکا نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ وہ بنص قرآن حکم الٰہی سے تھا اور یہ ظاہر ہے کہ خالق کی طرف سے کسی دور میں بھی اپنے ساتھ شرک کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اب سجدہ ممنوع بے شک ہے لیکن وہ ایک شرعی حکم ہے جس کی مخالفت سے انسان گنہگار ہوگا لیکن شرک کا حکم عائد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ سجدہ بطور عبادت نہ ہو یعنی اس شے کو خدا سمجھ کے خود اس شے کی پرستش کے طور پر سجدہ

---

[1] ۔فی الکلام حذف لانّ تقدیرہ ان یعقوب و بنیه و اهلهم خلوا الیٰ یوسف فلمّا وصلوا الیه (تبیان)

کرے اس صورت میں سجدہ نہیں بلکہ جو طریقہ اس سے کمتر درجہ کا بھی اختیار کرے گا تو وہ شرک ہوگا اور اگر اس شخص کی عبادت مقصود نہیں ہے تو سجدہ اس کے لئے معصیت ہی سمجھا جا سکتا ہے اس پر شرک کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

ہاں بس تفسیر جلالین کے اس محل پر جو صاحب قلم کار ہیں۔ انہوں نے قرآن کی اس تصریح: خروا له سجدا کے معنی میں تبدیلی فرمادی ہے: وہ کہتے ہیں:

سجود انحناء لا وضع جبهة وكان تحيتهم فى ذلك الزمان

سجدہ بس خم ہو جانے کی حد تک نہ کہ پیشانی زمین پر رکھنا اور وہ یعنی خم ہونا اس زمانہ کے سلام و آداب کا طریقہ تھا۔

حالانکہ سجدہ کے جو اصل معنی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں ان میں اس تبدیلی کی کوئی سند ہونا چاہیے اور یہاں اس کی کوئی سند موجود نہیں ہے بلکہ خرّوا کے ساتھ جو سجّدا ''گر گئے'' کا لفظ ہے وہ قطعی طور پر اس تشریح کی نفی کرتا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

''یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی ہم آپ کی طرف وحی بھیجتے ہیں اور آپ خود ان کے پاس موجود نہ تھے جب انہوں نے طے کیا اپنے منصوبہ کو اور وہ سازش کر رہے تھے''۔

مطلب یہ ہے کہ اگر الٰہی تعلیم نہ ہوتی تو آپ کو ذاتاً ان تفصیلات کے علم کا کوئی ذریعہ نہ تھا شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''یہ مذکورہ توریت میں اور پہلے کی کتابوں میں بھی نہیں''۔ (موضح القرآن)

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

''اور چاہے آپ کتنے ہی خواہش مند ہوں، زیادہ تر لوگ ایمان نہیں لائیں گے''۔

قرآن مجید میں یہ مضمون بہت جگہ ہے اس کے بعد اگر فتح مکہ وغیرہ کے بعد یہ نظر آوے کہ اب زیادہ تر لوگ مسلمان ہو گئے اور مشرکین کی تعداد کم ہو گئی یا اس کا وجود ہی نہ رہا تو قرآن کی ان تصریحات پر ایمان رکھتے ہوئے یقین کرنا پڑے گا کہ ان میں سے زیادہ افراد کا ایمان نمائشی ہے اور انہوں نے حقیقت میں ایمان اختیار نہیں کیا ہے۔

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

''اور آپ ان سے اس پر کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے وہ نہیں ہے مگر یاد دہانی تمام جہانوں کے لئے، اور کتنی ہی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں کہ وہ گزرتے ہیں ان کی طرف سے اس طرح کہ وہ ان سے بے اعتنائی اختیار

کئے ہوتے ہیں اوران میں سے زیادہ ترنہیں ایمان لاتے اللہ پر مگر یہ کہ شرک اختیار کئے ہوئے ہیں''۔

آخری فقرہ صریحی مشرکین سے متعلق تو ہوسکتا ہے بایں معنی کہ وہ اللہ کو مانتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ

اگران سے پوچھو کہ آسمان اورزمین کوکس نے پیدا کیا تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے۔(لقمان۔۲۵)

مگراللہ کو ماننے کے ساتھ وہ دوسرے معبودوں کو مانتے ہیں اس طرح شرک کے مرتکب ہیں۔

عام مفسرین یہی معنی قرار دیتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

یعنی منہ سے سب کہتے ہیں کہ خالق مالک سب کا وہی ہے پھراوروں کو پکڑتے ہیں''۔(موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے:

وما یؤمن اکثرھم باللہ حیث یقرؤن بانہ الخالق الرزاق الا وھم مشرکون بہ بعبادۃ الاوثان

''اکثران میں سے جواللہ پراس طرح ایمان لاتے ہیں کہ اقرار کرتے ہیں اس کا خالق کرنے والا اوررزق دینے والا وہی ہے تو یہ ایمان نہیں ہے مگراس طرح کہ وہ اس کے ساتھ بت پرستی کرکے شرک کرتے ہیں''۔

مگرہمیں اس معنی میں تامل یوں ہے کہ اس طرح کے اقرار کوقرآن نے ایمان نہیں مانا ہے ورنہ دعوت کیوں دی جاتی کہ اللہ پرایمان لاؤ؟اس لئے بعیدنہیں ہے کہ یہ آیت اسی پہلوکونمایاں کرتی ہو جسے اس سے قبل کی آیت میں ہم درج کرچکے ہیں یعنی ان میں سے زیادہ ترجب اللہ پرایمان لائیں گے یعنی مسلمان ہونے کا اقرار کریں گے تب بھی دل میں وہ مشرک ہی ہوں گے اس لئے وہ منافق ہوں گے، حقیقی مومن نہ ہوں گے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اعتقادی طور پر اللہ کے مقر ہیں مگرعملاً ان تقاضوں کو پورا نہیں کرتے ،اس طرح کہ اس کے احکام کے خلاف دوسروں کے سامنے سر جھکاتے اوران کی اطاعت کرتے ہیں اور گویا انہیں خداوندنعمت سمجھتے ہوئے خدا بنائے ہوئے ہیں جوایک طرح کا شرک ہے چاہے قانون شرع میں احکام شرک کے ان پر مرتب نہ ہوں۔ہماری قدیم تفسیراس تشریح کی موید ہے۔[1]

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

''کیاوہ مطمئن ہیں اس خطرہ سے کہ ان پرکوئی چھاجانے والا عذاب اللہ کا اچانک یاان کے سامنے قیامت آجائے درحالیکہ انہیں خبرنہ ہو''۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ

---

[1] ۔شرك طاعة وليس شرك عبادة (علی بن ابراھیم)

اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

''کہیے کہ یہ ہے میرا راستا میں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں پوری طرح سمجھ کر میں بھی اور وہ بھی جو میرا پیرو ہے اور اللہ کی ذات ہر برائی سے پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں''۔

پوری طرح سمجھ کر یعنی تحقیقی طور پر جو ہمارے یہاں ایمان کی شرط لازمی ہے تقلیدی طور پر نہیں، تمہاری طرح نہیں کہ بس ہم نے باپ دادا کو ایک راستے پر چلتے دیکھا ہے لہٰذا ہم بھی اسی راستے پر چلے جائیں گے''۔

جس طرح دوسرے مقامات پر جہاں من اتبعك آیا ہے اس کی تفسیر فرد اکمل ہونے کے لحاظ سے حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ساتھ ہوئی ہے اسی طرح یہاں بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی جو ارشاد ہوا ہے ومن اتبعنی اس کے بھی معیاری مصداق جناب امیرؑ اور ان کے بعد اپنے اپنے دور کے معصومینؑ ہیں۔[1]

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

''اور ہم نے آپ کے پہلے نہیں بھیجا مگر انہی بستیوں میں سے ایسے آدمیوں کو جن کی طرف ہم نے اپنی وحی بھیجی تو کیا وہ روئے زمین پر چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان کے پہلے تھے اور ضرور آخرت کا گھر بہتر ہے ان کے لئے جو پرہیزگاری سے کام لیں تو کیوں تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ یہاں تک کہ جب بھی پیغمبر نا امید ہونے لگے اور سمجھنے لگے کہ ان سے جھوٹی باتیں کہی گئیں تھیں تو ان کے پاس ہماری مدد آ گئی تو جسے ہم نے چاہا، وہ نجات پا گیا، اور ہمارا عذاب ہٹایا نہیں جا سکتا ان لوگوں سے جو گنہگار ہیں''۔

وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا افقرہ مفسرین کے لئے دشوار ثابت ہوا ہے چونکہ اس کے پہلے پیغمبروں کا ذکر ہے کہ وہ ناامید ہو گئے اب یہ جو کہا جا رہا ہے کہ وہ سمجھنے لگے کہ ان سے جھوٹی باتیں کہی گئیں تھیں تو اس سے سطحی نگاہ والے جو مفہوم سمجھ سکتے ہیں وہ مرسلین کی شان کے بالکل خلاف ہے اس لئے مفسرین کے درمیان اس کا مفہوم بتانے میں اختلاف ہو گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں:

''گماں کردند قوم ایشاں کہ بدروغ وعدہ کردہ شد با یشاں''

اس کے برخلاف ان کے بیٹے شاہ محمد رفیع الدین نے پہلی ضمیر رسل ہی کی طرف پھیری ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''گمان کیا اُنہوں نے یہ کہ

---

[1] ۔ یعنی علی بن ابی طالب و آل محمد (علی بن ابراھیم)

اُن سے لوگوں نے تحقیق جھوٹ بولا''۔

اس میں بھی مرسلین کی شان کو محفوظ کیا گیا ہے کُذِبُوْا جو فعل مجہول ہے، اس کا فاعل مضمر، لوگوں کو قرار دیا ہے۔ معاذ اللہ خدا کے وعدوں کو نہیں۔ دوسرے بیٹے شاہ عبدالقادر تقریباً اپنے والد شاہ ولی اللہ سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''یعنی وعدۂ عذاب کو دیر لگی یہاں تک رسولؑ ناامید ہو گئے کہ شاید ہماری زندگی میں نہ آیا پیچھے آوے اور ان کے یار خیال کرنے لگے کہ شاید وعدہ خلاف تھا'' (موضح القرآن)

یہاں چونکہ بات یار یعنی ''اصحاب'' کی آ گئی تھی تو شاہ صاحب کو اس کے بعد دفع دخل کی ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ:۔

''اتنے خیال سے آدمی کافر نہیں ہوتا، اگر جانتا ہے کہ یہ خیال بد ہے''

جلالین صاحبان نے پہلے تو کُذِبُوا کو کُذِّبُوا تشدید کے ساتھ قرار دے کر معنی لکھے ہیں:۔

ظنّوا ایقین الرّسل انّھم قد کُذبوا بالتشدید تکذیبا لا ایمان بعدہ۔

اُنہوں نے گمان کیا یعنی پیغمبروں کو یقین ہو گیا کہ اُن کی تکذیب ہو گئی اب ایسی کہ جس کے بعد کسی کے ایمان لانے کا سوال نہیں۔

پھر کُذِبُوْا بغیر تشدید قرار دے کر اس کے معنی کہے ہیں:۔

ظنّ الامم انّ الرّسل اخلفوا ما وعدوا بہ من النّصر:

امّتوں نے گمان کیا کہ پیغمبروں سے جو فتح وظفر کے وعدے ہوئے تھے غلط نکلے۔ ہماری تفاسیر بھی اس کے موافق ہیں اے

یعنی انّ قومھم ظنّوا انّ الرّسل کذبت فیھا اخبرت بہ (تبیان)

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

بلاشبہ ان کے واقعات میں سبق ہے صاحبان عقل کے لیے۔ وہ کوئی افسانہ نہیں ہے جسے گھڑ لیا گیا ہو بلکہ وہ تصدیق ہے اس کی جو پہلے موجود تھا اور ہر بات کی تشریح ہے اور ہدایت ہے اور رحمت ان کے لیے جو ایمان لائیں۔

سُوْرَۃُ الرَّعْدِ

مکیّہ-----۴۱ آیات

عموماً اس کے سرنامہ پر مکیّہ ہی لکھا ہوتا ہے مگر جیسا کہ جناب شیخ الطائفہؒ نے تبیان میں تحریر فرمایا ہے، یہ متفق علیہ نہیں ہے، دوسرا ایک قول یہ ہے کہ اس میں سے بس ایک آیت مکی ہے: وَلَا یَزَالُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا تُصِیْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ --الخ باقی پورا سورہ مدنی ہے۔

اس سورہ کا نام یہ نام ''رعد'' کے تذکرہ کی وجہ سے ہوا ہے جس کا نام یعنی لفظ ''رعد'' اگرچہ ضمناً پہلے پارہ میں منافقین کی ایک تشبیہہ کے ذیل میں آیا ہے مگر اس سورہ میں رعد کا خاص طور پر اس کی ایک کیفیت کے اظہار کے لیے مستقل ذکر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں حسب ذیل امور کا بیان ہے:-

سورۂ رعد کے خاص خاص مضامین:

۱---خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے میں تبدیلی کا پیدا نہ کرے:-

۲---کائنات کی ہر شے بارگاہ الٰہی میں سربسجود ہے۔

۳---بقائے اصلح

۴---برائی کا مقابلہ بھلائی سے (عدم تشدد)

۵---یاد خدا سبب اطمینان دل

۶---لوح محفوظ اور لوح محو و اثبات

۷---رسول کے گواہ دو: کتاب اور عالم کتاب وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے۔

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ①

الف۔لام۔میم۔را۔ یہ آیات ہیں کتاب کی اور جو اتارا گیا ہے آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے مگر زیادہ تر لوگ ایمان نہیں رکھتے۔

''کتاب سے مراد بظاہر قرآن ہی ہے اور اسی لیے تلك کا ترجمہ ہم نے ''یہ'' کے ساتھ کیا ہے جیسے سورہ بقرہ کے شروع میں ذلك الکتاب کا ترجمہ ''یہ کتاب'' اکثر کیا جاتا ہے مگر بعض لوگوں نے غالباً تلك کے اشارہ بعید کے لیے ہونے کی وجہ سے الکتاب سے انجیل مراد لی ہے، حالانکہ انجیل کا اس کے پہلے کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لیے ترجیح پہلے ہی قول کو ہے۔''[1]

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۲

''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر کسی اڑانوں کے جنہیں تم دیکھو، پھر وہ پورے اقتدار کے ساتھ عرش پر متمکن ہوا[2] اور سورج اور چاند کو پورے طور پر قابو میں رکھا کہ ہر ایک ایک مقررہ مدت تک رواں رہے۔ وہ انتظام کرتا ہے پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ قدرت کی نشانیاں تشریح کے ساتھ پیش کرتا ہے، شاید تم اپنے پروردگار سے ملنے کا یقین کرو۔''

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۳ وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۴

''اور وہ وہ ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں اور ہر طرح کے پھلوں سے اس میں دو دو قسمیں قرار دیں وہ ڈھانپتا ہے رات کو دن پر یقیناً نشانیاں ہیں ان کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں اور زمین میں مختلف طرح کے ٹکڑے پہلو بہ پہلو ہیں اور باغ ہیں انگوروں کے اور کھیتیاں ہیں اور کھجور کے درخت ہیں ایسے کہ ایک ہی جڑ سے کئی درخت نکلے ہیں اور کچھ ایسے نہیں ہیں[3] اور ایک ہی پانی سے سینچے جاتے ہیں اور ان میں بعض کو بعض پر ذائقہ میں ہم فوقیت دیتے ہیں۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو عقل سے کام لیں۔

---

[1] ۔الاول اصح (تبیان)

[2] ۔استولی بالاقتدار علیه و نفوذ السلطان (تبیان)

[3] ۔الصّنوان۔۔۔ان یکون الاصل واحدا ثمّ ینشعب من الرؤس (تبیان)

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۵

''اور اگر تعجب کرو تو قابل تعجب ان کا یہ کہنا ہے کہ کیا جب ہم خاک ہو جائیں گے تو ہم از سر نو پیدا ہوں گے؟ یہ وہ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا اپنے پروردگار کے ساتھ اور یہ وہ ہیں کہ طوق ہوں گے ان کی گردنوں میں اور یہ لوگ دوزخ والے ہوں گے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۶

''اور وہ آپ سے بھلائی کے پہلے برائی کے لیے جلدی کرتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے خداوندی سزاؤں کے نمونے[1] گزر چکے ہیں اور بلاشبہ اللہ بڑا بخشنے والا ہے لوگوں کو ان کے ظلم و تعدی کے باوجود اور بلاشبہ تمہارا پروردگار سخت سزا بھی دینے والا ہے۔''

''جلدی کرتے ہیں'' اس طرح کہ رسولؐ کی خبروں کا جو عذاب کے متعلق ہوتی ہیں، انکار کرتے یا مذاق اڑاتے ہوئے اکثر یوں کہتے ہیں کہ پھر آخر یہ عذاب ہم پر آ ہی کیوں نہیں جاتا یا از خود کچھ صورتیں عذاب کی پیش کر کے کہتے ہیں کہ اگر ہماری بداعمالیاں اتنی ہی جتنی آپ کہتے ہیں تو پھر ہم پر آسمان سے پتھر بھجوایئے اور کوئی دردناک عذاب ہم پر نازل کرایئے۔[2]

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝۷

''اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی نشانی ان کے پروردگار کی طرف سے کیوں نہیں اترتی! آپ تو بس عذاب سے ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کا ایک رہنما ہوتا ہے۔''

آخری فقرہ ''وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ'' اس کی تشریح میں اختلاف ہے۔ ایک تصور یہ ہے کہ یہ الگ جملہ ہے جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے:۔

''اور ہر قوم کا ایک رہ نما ہوتا ہے''۔۔۔۔ شاہ ولی اللہ نے بھی اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ ''و ہر قومی را رہ نمائی می باشد'' تفسیر جلالین میں ہے:

---

[1] ۔ای عقوبات امثالهم من المكذّبين (جلالين)

[2] ۔ كما قالوا: وامطر علينا من حجارة من السماء او أئتنا بعذاب اليم (تبيان)

ولكل قومه هادي يدعوهم الى ربهم بما يعطعه من الأيات لا بما يفترحون:۔

ہر قوم کا ایک رہ نما ہوتا ہے پیغمبر جو انہیں ان کے پروردگار کی طرف دعوت دیتا ہے ان نشانیوں کے ساتھ جو اسے عطا ہوتی ہیں، نہ کہ وہ جس کی وہ فرمائش کریں۔

دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ قبل سے متعلق ہے یعنی آپ تو بس عذاب سے ڈرانے والے اور ہر قوم کے رہنما ہیں۔ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ اس کے مطابق ہے:

''تو ڈرانے والا ہے اور واسطے ہر قوم کے ہدایت کرنے والا۔''

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی تفسیر پہلے قوم کے مطابق ہے اور اس کے لحاظ سے آیت میں یہ کہنے کے بعد کہ ''آپ عذاب سے ڈرانے والے ہیں۔'' یہ کہا گیا ہے کہ ''ہر قوم کا ایک رہ نما ہوتا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے بعد بھی ہر دور کے انسانوں کی رہنمائی کا خالق نے انتظام کیا ہے اور یہ رہنمائی کرنے والا آئمہ معصومینؑ ہیں۔ [1]

اس کی تائید اہل سنت کی بعض روایات سے بھی ہوتی ہے۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝۸ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝۹

''اللہ جانتا ہے جو پیٹ میں لیے ہے کوئی عورت اور جو کمی ہوتی ہے پیٹ کے اندر اور جو زیادتی ہوتی ہے اور ہر چیز اس کے یہاں ایک مقررہ مقدار میں ہے۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر تمام چیزوں کا جاننے والا بزرگ و بالا ہے۔''

پیٹ کے اندر کمی اور زیادتی کا ایک مفہوم یہ ہے کہ خود بچہ کوئی تمام الخلقت پیدا ہوتا ہے اور کسی کے کوئی نقص ہوتا ہے [2] یہ سب علم الٰہی میں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس سے مدت حمل کی کمی و زیادتی مراد ہو [3] یعنی یہ بات کہ کون بچہ کتنے دن شکم مادر میں رہے گا، بس اللہ ہی کے علم میں ہوتی ہے اور کمی سے مراد قبل از وقت یعنی حمل ساقط ہونا بھی ہو سکتا ہے اور زیادتی یہ ہے کہ

نو مہینہ سے بھی زیادہ گزر جائے اور پھر بچہ پیدا ہو۔ [4]

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝۱۰

---

[1] ۔عن ابی بصیر عن ابی عبد اللہ قال المنذر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ والھادی امیر المؤمنین وبعدہ الائمۃ (علی بن ابراھیم)
روی عن ابی جعفر و ابی عبداللہ علیہما السلام ان الھادی ھو امام کل عصر معصوم یؤمن علیہ الغلط و تعمد الباطل (تبیان)

[2] ۔آنچہ ناقص می کنند رحمہا و آنچہ زیادہ می گردانند (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ما تغیض تنقص الارحام من مدۃ الحمل وما تزداد منہ (جلالین)

[4] ۔ما تغیض ای ما تسقط من قبل التمام و ما تزداد یعنی علی تسعۃ اشھر (علی بن ابراھیم)

یکساں ہے تم میں سے وہ جو چپکے چپکے باتیں کرے اور جو اونچی آواز سے بات کرے اور جو رات کے پردہ میں چھپا ہو اور جو دن کو روانہ ہو۔

یعنی اللہ کو یکساں طور پر سب کا علم ہے۔ [1]

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ⑪

''اس کے لیے پہرے دار ہیں اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے جو حکم خدا سے باری [2] باری اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ یقیناً اللہ نہیں بدلتا اس حالت کو جو کسی قوم کی ہے جب تک وہ خود اپنے میں تبدیلی پیدا نہ کرے اور جب اللہ چاہے کسی قوم کے لیے برائی تو اس کا پلٹنا ممکن نہیں ہے اور نہیں ہے ان کے لیے اسے چھوڑ کر کوئی حامی و مددگار۔''

کسی قوم میں تبدیلی نہیں ہوتی بغیر اپنے نفوس کی تبدیلی کے

لہ کی ضمیر میں کافی اختلاف ہے کہ یہ خدا کی طرف راجع ہے یا رسولؐ کی طرف مگر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ آیت کی آیت میں جو تھا مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ ''جو چپکے چپکے بات کرے اور جو اونچی آواز سے اور جو رات کے پردہ میں چھپا ہو اور جو دن کی روانہ ہو'' اسی کی طرف ضمیر ہے یعنی اللہ کا علم بھی اس پر حاوی ہے اور اس کی طرف کے فرشتے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ [3]

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ⑫ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ⑬

وہ، وہ ہے جو تمہیں بجلی چمکتی دکھلاتا ہے ڈرانے اور توقع پیدا کرنے کے لیے اور بوجھل گھٹائیں پیدا کرتا ہے اور بادل کی گرج تسبیح پڑھتی ہے اس کی تعریف کے ساتھ اور فرشتے بھی اس کے ڈر سے اور وہ گرتی ہوئی بجلیاں روانہ کرتا ہے تو انہیں پہنچاتا ہے جس تک چاہتا ہے اور وہ لوگ تکرار کرتے ہیں اللہ کے بارے میں اور وہ سخت عذاب والا ہے۔''

---

[1] ۔ انه یعلم اعلی تصرف احواله (تبیان)

[2] ۔ المعقّبات والمناویات التی یخلف علی واحد منها صاحبه (تبیان)

[3] ۔ فکانه قال للانسان معقبات وهو الاقوی (تبیان)

''ڈرانے اور توقع پیدا کرنے کے لیے''۔۔۔ یہ دونوں کیفیات اس طرح بھی ڈر لگتا ہے کڑک اور چمک سے اور توقع ہوتی ہے اور باران رحمت کی، یوں بھی جنہیں مثلاً سفر درپیش ہے، انہیں بارش کا ڈر ہوتا ہے اور جو اطمینان سے کسی منزل پر ہیں یا زراعت کیے ہوئے ہیں، انہیں بارش بڑی نعمت معلوم ہوتی ہے اور اس کا آسرا لگائے رہتے ہیں۔ [1]

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

''اس کے لیے سچائی والی پکار اور اسے چھوڑ کر جنہیں وہ لوگ پکارتے ہیں، وہ ان کی صدا پر ذرا بھی لبیک نہیں کہتے مگر اس طرح جیسے کوئی دونوں ہاتھ پھیلائے ہو پانی کی طرف کہ وہ پہنچ جائے اس کے منہ تک حالانکہ وہ اس تک پہنچنے والا نہیں ہے اور نہیں ہے کافروں کا پکارنا مگر لاحاصل۔'' [2]

''اسی کے لیے ہے سچی پکار'' بعد کے جملہ کو دیکھتے ہوئے زیادہ قرین قیاس مفہوم اس کا یہ ہے کہ پکارے جانے کا حق اسی کو ہے [3] مگر ایک دوسرے معنی اس کے یہ بھی سمجھ میں آتے ہیں کہ ''اس کی طرف سے ہے سچائی کی طرف دعوت یعنی توحید کا پیغام بعض مفسرین نے اس کے لحاظ سے تفسیر کی ہے۔ [4]

اس کے غیر یعنی اصنام کی پرستش اور ان سے التجاء جو کرتے ہیں، اس کی مثال جو دی گئی ہے وہ لاحاصل ہونے میں ہے کہ کوئی کنویں پر جا کے اور فصیل پر کھڑے ہو کے بس ہاتھ پھیلا دے کہ آ اے پانی میری پیاس بجھا دے تو ظاہر ہے کہ وہ پانی کہاں اس تک آ سکتا ہے۔ وہ تو خود اس کا محتاج ہے کہ کوئی اس کھینچے، تب وہ کہیں پہنچے بس یہی صورت ان لوگوں کے بتوں سے دہائی دینے کی ہے کہ وہ بت کہاں ان کی حاجت روائی کر سکتے ہیں؟ [5] ہوسکتا ہے کہ یہ مثال ''نقش بر آب'' کی طرح عرب میں ''سعی لاحاصل'' کے لیے عام طور پر استعمال ہوتی ہے۔ [6]

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ السجدة

---

[1] ۔قیل فی معنی قوله: خوفًا وطمعا قولان۔۔۔ خوفا من الصواعق التی تکون مع البرق و طمعا فی الغیث الذی یزیل الجدب۔۔۔ وخوفا للمسافرین من اذاه و طمعا للمقیم فی الرزق به (تبیان)

[2] ۔مگر در بے فاعدگی (شاه ولی الله)

[3] ۔یعنی اورا سجده کنند بجناب او نیاز کنند و مدعا طلبند و او اجابت فرماید (فتح الرحمن)

[4] ۔دعوة الحق ای کلمة وهی لا اله الا الله (جلالین)

[5] ۔کباسط کفیه الی الماء علی سفیر البعیر یدعوه البیلغ فاه فار تفاعه من البیر الیه (جلالین)

[6] ۔العرب تضربه مثلا لمن سعی فیما لا یدرکه کالقابض علی الماء (تبیان)

''اور اللہ کے لیے سجدہ میں ہیں وہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، خوشی یا ناخوشی اور ان کے سائے [1] صبح اور شام۔''

کائنات کی ہر شے بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز

ان آیات میں کائنات کی ہر شے بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہونے کا ذکر ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

''کہئے کہ کون مالک ہے آسمانوں اور زمین کا؟ کہہ دیجئے کہ اللہ کہئے کہ کیا پھر تم نے اسے چھوڑ کر اور ایسے حوالی موالی بنا لیے ہیں جو خود اپنے لیے نہ نفع پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ نقصان پر؟ کہئے کہ کیا یکساں ہے اندھا اور آنکھوں والا؟ یا یہ کہ کیا یکساں ہیں اندھیرے اور روشنی یا یہ کہ انہوں نے اللہ کے لیے ایسے شریک بنائے جنہوں نے اس کے خلق کرنے کی طرح خلق کیا تو یہ خلقت ان پر مشتبہ ہوگئی؟ کہئے کہ اللہ ہر چیز کا خلق کرنے والا ہے اور وہ ایک اکیلا غالب ہونے والا ہے۔''

''کیا یکساں ہے اندھا اور آنکھوں والا'' یعنی جو بصیرت کی روشنی رکھتا ہے اور وہ مومن ہے اور جو نور بصیرت سے عاری ہے وہ کافر ہے اسی طرح ''اندھیرا'' گمراہی اور ''روشنی ہدایت۔ [2]

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ؕ ﴿۱۷﴾

''اس نے آسمان سے پانی اتارا تو ندی نالے بہے اپنی مناسب مقدار کے مطابق تو بہتے ہوئے پانی نے اٹھا لیا پھین جو اس کے اوپر آجاتا ہے اور اس سے کہ جسے آگ میں رکھ کر دہکاتے ہیں زیور یا اور کوئی چیز بنانے کے لیے

---

[1] ۔وسجدہ می کنند سایہ ہائے ایشاں (شاہ ولی اللہ) اور پرچھائیاں ان کی (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔الاعمیٰ والبصیر یعنی المؤمن والکافر ... اما الظلمات فالکفر واما النور فھو الایمان (علی بن ابراھیم)

ایسا ہی پھین بلند ہوتا ہے اس طرح اللہ مثال دیتا ہے حق اور باطل کی تو جو پھین ہوتا ہے، وہ نیست و نابود ہو جاتا ہے اور وہ جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے تو زمین میں برقرار رہتا ہے۔ اس طرح اللہ مثالیں پیش کرتا ہے۔''

اس مثال کی تشریح شاہ ولی اللہ یوں کرتے ہیں:۔

بقائے اصلح

یعنی لا بداست کہ در ہر جنس خیر و شر باشد ہمچنیں لا بداست کہ در آدمیاں نیکوکاران و بدکاران باشند لیکن نیکوکاران را مستقر می سازد و کار ایشاں را پیش می برد و بدکاراں ہلاک می کند (فتح الرحمن)

یعنی لازم ہے کہ ہر جنس میں اچھی اور بری دو قسمیں ہوں اسی طرح خود انسانوں میں اچھے اعمال والے اور برے اعمال والے ہوں مگر اللہ نیکوکار افراد کو باقی رکھتا ہے اور اُن کے کارنامہ کو ترقی دیتا ہے اور برے اعمال والوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔

مگران کے فرزند شاہ عبدالقادر اس طرح لکھتے ہیں کہ:

''یعنی آسمان سے دین حق اترتا ہے تو ہر ایک اپنی استعداد کے موافق لیتا ہے، پھر حق اور باطل ٹھہرتا ہے تو میل ابھرتا ہے جیسے مینہ کا پانی زمین سے مل کر یا روپے تانبے کو دہکا کر میل ابھرتا ہے تو آخر جھاگ کو بنیاد نہیں اور کام کی چیز کی بنیاد ہے۔ یہ حق اور باطل ٹھہرنا دنیا کی لڑائی مراد ہے۔ آخر حق غالب ہے یا ہر ایک کے دل میں حق و باطل ٹھہرتا ہے۔ پھر حق اس باطل کو مٹا کر صاف حق رہتا ہے۔'' (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے:

كذٰلك الباطل يضمحل وينمحق وان على الحق بعض الاوقات و الحق ثابت باق

یونہی باطل کمزور ہو جاتا ہے اور بالآخر مٹ جاتا ہے چاہے بعض اوقات حق پر غالب بھی آجائے اور حق برقرار رہنے والی چیز ہے۔

ہماری تفاسیر بھی اس سے متفق ہیں چنانچہ جناب شیخ الطائفہ لکھتے ہیں:۔

فالحق ثابت۔۔۔ والباطل۔۔۔ يذهب لا منفعة فيه بعد ان يرى له حركة و اضطراب

تو حق امر برقرار ہے اور باطل ختم ہونے والا ہے اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے جب کہ قبل میں وہ بہت متحرک نظر آتا ہے۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۭ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ سُوْۗءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۸

''ان کے لیے جو اپنے پروردگار کی دعوت پر لبیک کہیں اچھا نتیجہ ہے اور جنہوں نے اس کی دعوت پر لبیک نہیں کہی، اگر ان کے لیے جو کچھ روئے زمین پر ہے، وہ سب ہو یا اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تو اسے وہ اپنے معاوضہ میں دے دیں ان کے لیے حساب کی سختی ہے اور ان کا ٹھکانا دوزخ میں ہے اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے۔''

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۙ﴿۱۹﴾ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۙ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ؕ﴿۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۙ﴿۲۲﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۚ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ؕ﴿۲۴﴾

تو کیا وہ جو جانتا ہو کہ جو آپ کے پاس آپ کے پروردگار کے پاس سے آیا ہے حق ہے وہ مثل اس کے ہے کہ جو اندھا ہو؟ نصیحت کا اثر تو بس وہ لیتے ہیں جو صاحبان عقل ہوں۔ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور پیمان شکنی نہیں کرتے اور جو ملاتے ہیں ان رشتوں کو جن کے ملانے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور حساب کی سختی کا خوف رکھتے ہیں اور جنہوں نے صبر و تحمل سے کام لیا اپنے پروردگار کی خوشنودی کی طلب میں اور نماز کی پابندی کی اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے، اس سے مخفی اور ظاہر بظاہر خیرات کی اور جو بھلائی کے ذریعے سے برائی کو دور کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے لیے اس عالم کا اچھا انجام ہے، جاودانی زندگی والی جنتیں جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان کے باپ دادا اور بیویوں اور بچوں میں سے جو اس لائق ہوں اور فرشتے ان کے پاس ہر دروازہ سے داخل ہو رہے ہوں گے۔ سلام ہو تم پر اس بنا پر کہ تم نے صبر کیا تو کیا کہنا انجام کا اس دور آخرت کے۔''

دیکھ لیجیے یہاں بھی فرشتے سلام علیکم کہتے ہیں، السلام علیکم نہیں۔

ان آیات میں بُرائی کا مقابلہ بھلائی سے کرنے کا حکم دیا گیا ہے

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾

''اور وہ جو توڑتے ہیں اللہ کا عہد اس کی مضبوطی کے بعد اور کاٹتے ہیں ان رشتوں کو جن کے ملائے جانے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور روئے زمین پر خرابیاں کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور اس گھر کی برائی ہے۔''

عہد الٰہی جس کا دونوں طرح کا ذکر ہے، قبل کی آیت میں تعریف کے سلسلہ میں ینقضون المیثاق اور اس آیت بصورت مذمت ینقضون عھد اللہ اس میں وہ عہد بھی داخل ہے جو بتقاضائے فطرت اور بحکم ضمیر ہر انسان کے ذمہ واجب الادا ہے اور وہ بھی پیمان جو انبیاو مرسلین کے ذریعہ سے لیا گیا ہے اور اس میں وہ عہد و پیمان بھی داخل ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے کیے جاتے ہیں۔ [1]

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

''اللہ وسعت دیتا ہے زرق میں جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگی بھی کرتا ہے اور وہ دینوی زندگی سے خوش ہیں اور نہیں ہے دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں مگر ذرا سی ناپائدار چیز۔'' [2]

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اتری ان پر کوئی نشانی ان کے پروردگار کی طرف سے کہئے؟ کہ اللہ گمراہی میں چھوڑتا ہے جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف ہدایت کرتا ہے اس کی جو دل سے متوجہ ہو۔ [3] جو ایمان لائیں [4] اور ان کے دل یاد الٰہی سے سکون پائیں۔ آگاہ ہونا چاہیے کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔''

یاد خدا سببِ اطمینانِ دل

ان آیات میں یاد خدا سببِ اطمینانِ دل کا ذکر ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کئے ان کے لیے خوشحالی ہے اور اچھا انجام۔''

''طوبیٰ'' کے معنی میں یوں تو بہت سے قول ہیں [5] مگر زیادہ تعداد میں وہ ایسے ہیں جیسے ایک ہی چیز کی متعدد تعبیریں ہوں اور ان سب

---

[1] ۔العھد الذی جعله فی عقوله العباد ـــــ و قد یکون ایضا علی العھد الّذی علیه النّبی ﷺ و فی الاٰیة دلالة علی وجوب الوفاء بالعھد الّتی تنعقد بین الخلق.(تبیان)

[2] ۔قلیل ذاھب (تبیان)

[3] ۔الرجع الیه (جلالین) موضع الذین نصب لانه من صفة من اناب (تبیان)

[4] ۔قیل فی معناہ عشرۃ اقوال (تبیان)

[5] ۔انما قال ''بالرحمٰن'' دون ''الله'' لانّ اھل الجاھلیة من قریش قالوا الله نعرفه و الرّحمٰن لا نعرفه (تبیان)

کا نتیجہ وہ ہے جس کے ساتھ ہم نے ترجمہ کیا ہے یعنی ''خوشحالی''

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

''اسی طرح آپ کو ہم نے بھیجا ایک ایسی قوم میں جس کے پہلے بہت قومیں گزر چکی ہیں تا کہ آپ ان کے سامنے تلاوت کریں اس کی جو ہم نے بطور وحی آپ پر اتارا ہے اور وہ خدائے رحمن کا انکار کرتے ہیں کہئے کہ وہ میرا پروردگار ہے کوئی خدا نہیں سوا اس کے اس پر میرا بھروسا ہے اور اسی کی طرف میری رجوع ہے۔''

رحمٰن کے انکار کا مطلب بظاہر وہی ہے جو دوسری جگہ قرآن مجید میں زیادہ صاف طور پر مذکور ہے کہ:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا

اور جب ان سے کہا جائے کہ رحمن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمن کیا چیز ہے؟ کیا جس چیز کو بھی آپ کہیے ہم سجدہ کرنے لگیں؟ اور اس سے ان کی وحشت اور بڑھتی ہے۔ (فرقان۔ ۶۰)

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی خدائی کا اقرار کرتے تھے مگر رحمن کے نام سے اسے یاد کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ [1]

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾

''اور کاش ہوتا کوئی ایسا قرآن جس سے پہاڑ حرکت میں لے آئے جاتے یا زمین اس سے ٹکڑے ٹکڑے کی جاتی یا اس کے ساتھ مردوں سے باتیں کی جاتیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے تمام کام تو کیا ایمان لانے والے اس بنا پر ناامید تو نہیں ہوتے کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت کر دیتا اور برابر کافروں پر ان کے اعمال کی سزا میں کوئی نہ کوئی آفت آتی رہے گی یا ان کے گھروں کے آس پاس آئے گی یہاں تک کہ آئے اللہ کا وعدہ یقیناً اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔''

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

---

[1] ۔ انما قال ''بالرحمٰن'' دون ''اللہ'' لانّ اھل الجاھلیۃ من قریش قالوا اللہ نعرفہ والرّحمٰن لا نعرفہ (تبیان)

''مسلمان چاہتے ہوں گے کہ ایک نشانی بڑی سی آوے تا کہ کافر مسلمان ہو جائیں۔ سو فرمایا کہ اگر کسی قرآن سے کام ہوتے ہوئے تو البتہ اس سے پہلے ہوتے۔'' (موضح القرآن)

اس پس منظر میں میرے نزدیک زیادہ مناسب یہی ہے کہ شروع میں جو ''لو'' ہے وہ ''لیت'' کے معنی میں ہو، اس کے لیے میں نے ترجمہ ''کاش'' کے لفظ کے ساتھ کیا ہے جس کی نظیریں قرآن مجید میں بہت جگہ موجود ہیں۔ جیسا کہ شاہ صاحب کی مذکورہ بالا تشریح سے بھی ظاہر ہے، یہ لوگ اسے ''اگر'' کے معنی میں لیتے ہیں تو اس ''اگر'' والی شرط کے جواب میں جو محذوف مانا جائے گا[1] تعبیریں مختلف ہو جاتی ہیں جیسے شاہ صاحب مذکور نے ''اگر'' کے جواب میں لکھا ہے ''تو البتہ اس سے پہلے ہوتے یا یوں کہ کوئی کتاب ہوتی جس کی خاصیت یہ ہوتی کہ اس سے یہ باتیں ہوں تو اس قرآن سے بھی یہ سب باتیں ظہور پذیر ہوتیں یا یہ کہ اگر کوئی کتاب دنیا میں اس طرح کی ہوتی تو بس یہی قرآن ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی کتاب ایسی نہیں ہو سکتی تھی۔[2]

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾

''اور آپ سے پہلے بہت سے پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا تو میں نے ڈھیل دی کافروں کو پھر اُنہیں گرفت میں لے لیا تو کیسا تھا میرا عذاب۔

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ۭ قُلْ سَمُّوْهُمْ ۭ اَمْ تُنَبِّـــُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۭ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

''تو کیا وہ ذات جو ہر متنفس پر حاضر و ناظر ہے اس کے اعمال کے بارے میں (ان کو یونہی چھوڑ دے گا؟ ہرگز نہیں) اور انہوں نے اللہ کے لیے بہت سے شریک بنا لیے۔ کہئے کہ نام لو ان کا یا تم اسے بتلاتے ہو ایسی چیز جس کا روئے زمین پر اسے علم نہیں ہے یا بے سمجھے رواروی میں بات کرتے ہو؟ بلکہ کافروں کی نظر میں ان کی چالیں بڑی خوب صورت معلوم ہوتی ہیں اور وہ سیدھے راستے سے ہٹ گئے ہیں اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے تو کوئی اس کا ہدایت کرنے والا نہیں ہے۔ ان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی کبھی عذاب ہے اور آخرت کا عذاب اور زیادہ پر

---

[1] ۔لم یجئ جواب لو لدلالة الکلام علیه (تبیان)

[2] ۔لو کان شئی من القرآن کذٰلك لکان هذا (علی بن ابراهیم)

مشقت ہے اور اللہ سے بچانے والا ان کا کوئی نہیں ہے۔''

شروع کے فقرہ ''کیا وہ ذات'' کے بعد کے خبر الفاظ میں بلکہ سننے والے کی سمجھ میں انداز کلام سے آتا ہے کہ کیا وہ کسی دوسرے کے برابر ہے؟[1]

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۪ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

''اس بہشت کی جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ ہوا ہے، یہ صفت ہے کہ اس کے نیچے سے نہریں رواں ہیں، وہاں کی غذائیں ہمیشہ رہنے والی ہیں اور چھاؤں بھی۔ یہ انجام ہے ان کا جو پرہیزگار ہوں اور جو کافر ہیں، ان کا انجام آتش دوزخ ہے۔

چھاؤں اس لیے ہمیشہ ہے کہ وہاں آفتاب ہے نہیں جس کی دھوپ سایہ کو ختم کرے۔[2]

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾

''اور جنہیں ہم نے کتاب عطا کی ہے، وہ خوش ہوتے ہیں اس سے جو آپ پر اتارا گیا ہے اور ان جماعتوں میں بعض ایسے ہیں جو اس میں سے کچھ پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہئے کہ میں تو اس پر مامور ہوں کہ اللہ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ شرک نہ کروں، اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میری رجوع ہے۔''

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾

''اور اس طرح اتارا ہے ہم نے اس کو عربی زبان کا حکم نامہ[3] اور اگر آپ ان کی خواہشات کی پیروی کریں گے بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آ گیا تو آپ کا اللہ کے مقابلہ میں نہ کوئی مددگار ہو سکتا ہے اور نہ بچانے والا۔''

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ

---

[1] ۔ کمن لیس بہذا الصفۃ و حذف الخبر دلالۃ الکلام علیہ (تبیان) کمن لیس کذلک من الاصنام (جلالین)

[2] ۔ ظلہا دائم لا تنسخہ شمس لعدمہا فیہ (جلالین)

[3] ۔ بلغۃ العرب تحکم بہ بین الناس (جلالین)

لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

''اور ہم نے بھیجے ہیں بہت سے پیغمبر آپ کے پہلے اور قرار دیئے ہم نے ان کے لیے بیوی بچے، اور کسی پیغمبر کے لیے یہ نہیں ممکن کہ وہ کوئی معجزہ پیش کرے مگر اللہ کے حکم سے ہر مدت کے لیے ایک نوشتہ ہے۔''

معجزہ کا حکم الٰہی پر انحصار

چونکہ عیسائیوں میں رہبانیت معیار کمال روحانیت قرار پا گئی تھی، اس لیے وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاہلی زندگی کو خلاف شان رسالت سمجھنے لگے لہٰذا یہاں گزشتہ انبیاء کا حوالہ دیا گیا ہے کہ سابق میں بس مستثنیات ہیں جیسے عیسیٰ علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام جن کے بیوی بچے نہ تھے ورنہ دوسرے انبیاء برابر ایسے ہوتے رہے ہیں جن کے بیوی بچے سب تھے تو اسے تم خلاف شان نبوت کیوں کر قرار دے سکتے ہو۔[1]

اس کے ساتھ شاید یہ کہا گیا ہو کہ آپ وہی معجزے کیوں نہیں دکھاتے جو حضرت عیسیٰؑ دکھلاتے تھے یعنی کور مادرزاد کو بینا بنانا، اکمہ و ابرص کو شفا دینا اور مردوں کو زندہ کرنا تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ ہر نبی کو معجزے خالق کی طرف سے بنظر حکمت اس دور کے تقاضوں کے لحاظ سے دیے گئے یہی عیسیٰؑ کے زمانہ میں طب کا زور تھا، اس لیے ویسے معجزے عطا ہوئے اور اس وقت فصاحت و بلاغت کا دور دورہ تھا اس لیے بطور معجزہ عمومی قرآن عطا ہوا۔

یوں آپ اور آپ کے اوصیاء علیہم السلام کے ہاتھوں کبھی بوقت ضرورت وہ معجزے بھی ظاہر ہو گئے جیسے بیمار کا صحت یاب ہونا، کور کا بینا ہونا اور مردہ کا زندہ ہونا جس کے واقعات کتب سیر و احادیث موجود ہیں مگر یہ چیزیں ان کے یہاں اہمیت کے ساتھ بطور معجزہ عمومی پیش نہیں ہوتیں کہ ان پر تحذی کی جاتی اور انہیں ثبوت رسالت کی دلیل قرار دیا جاتا۔ ویسا معجزہ بس قرآن تھا جس پر طرح طرح سے مفکرین کو دعوت مقابلہ دی گئی اور ان کی لاجوابی نے اس کی حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

''اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور برقرار رکھتا ہے اور اس کے پاس اصل نوشتہ ہے۔''

محو و اثبات بداء

یہ آیت بداسے متعلق ہے۔ بدا کے معنی یہ ہیں کہ بعض تقدیرات الٰہیہ مشروط طور پر ہیں لہٰذا اگر وہ شرائط پورے ہوئے تو تقدیر اس طرح رہتی ہے اور اگر شرائط پورے نہ ہوئے تو تقدیر بدل جاتی ہے لیکن علم الٰہی میں مختتم نتیجہ پہلے سے ہوتا ہے کہ بالآخر ہونے والا کیا ہے؟ تقدیروں کی یہ تبدیلی محو و اثبات کہلاتی ہے اور یہ مختتم نتیجہ کا علم وہ ہے جسے کہا ہے کہ ''اس کے پاس اصل نوشتہ ہے۔'' اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ تقدیروں کی تبدیلی بالکل ویسی ہے جیسے مصالح کے لحاظ سے احکام شریعت کی تبدیلی جس کا نام نسخ ہے مگر اہل سنت چونکہ نسخ کے قائل نہیں لہٰذا اس آیت کی تفسیر میں جس جس طرح الجھے ہیں وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

---

[1] ۔لانهم كانوا انكروا تزويج النبي بالنساء فبين الله تعالى ان لانبياء وقد كان لهم ازواجا وذرية (تبيان)

شاہ ولی اللہ باوجود یہ کہ اس کے قبل کی آیت میں لکل اجل کتاب کا یہ ترجمہ کر چکے ہیں کہ ''ہر قضاء موت را نامہ است'' اور حاشیہ پر اس کی تشریح یوں کر چکے ہیں کہ:۔

چوں قضائے الٰہی بوجہی متحقق شود آن را در عالم ملکوت ثبت کنند

جب خدائی فیصلہ کسی صورت پر ہو جاتا ہے تو اس کو عالم ملکوت میں تحریر کر دیا جاتا ہے۔ (فتح الرحمن)

جس سے ظاہر ہے کہ بعض وقت قضائے موقت ہوتی ہے تو وقت کی تبدیلی کے ساتھ اس میں تبدیلی ہونا چاہیے اسی کا نام بدا ہوگا۔

اب اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:۔

نابود می سازد خدا ہر چہ می خواہد و ثابت کند ہر چہ خواہد و نزدیک اوست ام الکتاب یعنی لوح محفوظ

نیست و نابود کر دیتا ہے خدا جو چاہتا ہے اور برقرار کرتا ہے جو چاہتا ہے اور اس کے پاس ام الکتاب یعنی لوح محفوظ ہے۔

حاشیہ پر اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

مترجم گوید صورت حادثہ در عالم ملکوت خلق می فرماید بعد ازاں اگر خواہد محو کند و اگر خواہد ثابت وارد و شاید کہ معنی چنیں باشد ہر زمانی را شریعتی است نسخ می کند خدا تعالی آنچہ می خواہد و ثابت می گزارد آنچہ خواہد نزدیک اوست لوح محفوظ. (فتح الرحمٰن)

میں کہتا ہوں کہ واقعہ کی صورت خداوند عالم ملکوت میں خلق فرما دیتا ہے اور اس کے بعد اگر چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور اگر چاہتا ہے تو قائم رہنے دیتا ہے اور شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ ہر زمانہ کے لیے ایک شریعت ہے۔ تو منسوخ کر دیتا ہے جو چاہتا ہے۔

دیکھ رہے ہیں آپ شاہ صاحب کس طرح کترا رہے ہیں پہلے جو تشریح کی، اس میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ وقوع میں آئے ہوئے حادثہ کی صورت میں خلق فرمائی جاتی ہے تو آخر اس کے خلق کرنے کا کیا مقصد ہوتا ہے، کیا بعد میں جو واقعہ ہوگا، اس واقعہ کی صورت میں پہلے سے خلق ہوتی ہے جیسا افلاطون کا ''مثل افلاطونیہ'' والا تصور ہے کہ تمام موجودات و واقعات کی صورتیں مادہ سے الگ ازل سے موجود ہیں مگر پھر یہ مٹتی کیوں ہیں؟ جب کہ وہ واقعہ بعد میں ہونے والا ہے تو ان کا مٹنا خلاف واقعہ ہوگا اور اگر ان کے مٹنے کے بعد وہ واقعہ رونما نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تقدیر میں تبدیلی ہوتی ہے مگر اس کے بعد انہوں نے ''شاید'' کہہ کر اسے نسخ احکام سے متعلق قرار دینا چاہا ہے جو متفق علیہ حیثیت رکھتا ہے۔ پھر اس صورت میں وہ صورتیں حوادث کی خلق ہونے والی بات کی ہوئی اور نسخ احکام سے پھر اس جز کا کیا لگاؤ ہے کہ لوح محفوظ اللہ کے پاس موجود ہے۔ پھر جب کہ اس کے پہلے لکل اجل کتاب کا تعلق ''قضائے موقت'' سے تھا تو اس کے بعد والے جملہ کو آپ قضائے تکوینی سے ہٹا کر حکم تشریعی سے متعلق کیوں کر رہے ہیں؟

شاہ عبدالقادر بہت حد تک حقیقت کے قریب آ گئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے۔ بعضے اسباب ظاہر ہیں، بعض چھپے ہیں، اسباب کی تاثیر کا ایک اندازہ ہے۔ جب اللہ چاہے اس کی تاثیر انداز سے کم زیادہ کر دے، جب چاہے ویسی ہی رکھے۔ آدمی کبھی کنکر سے مرتا ہے اور گولی سے بچتا ہے اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ کے علم میں ہے، وہ ہرگز نہیں بدلتا، اندازے کو تقدیر کہتے ہیں۔ یہ دو تقدیریں ہیں، ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی۔'' (موضح القرآن)

اس پہلے قسم کی تقدیر کے بدلنے ہی کا نام بدا ہے اور شاہ صاحب کے بیان سے ظاہر ہو گیا ہے کہ اس کی تبدیلی علم الٰہی میں نقص کی مستلزم نہیں ہے لہٰذا بدا پر یہ اعتراض غلط ہے کہ وہ اللہ کی طرف نسبت جہل کا مقتضی ہے۔

جلالین کو بھی مجمل اور مبہم الفاظ میں سہی، اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔ لکل اجل کتاب کی اس طرح تشریح کرنے کے بعد کہ

لکل اجل مدة کتاب مکتوب فیه تحدیده

ہر اجل یعنی مدت کے لیے ایک نوشتہ ہے تحریر جس میں اس کی حد بندی ہے

اب یوں تشریح کرتے ہیں کہ:۔

یمحوا الله مایشآء ویثبت فیه مایشاء من الاحکام وغیرها وعنده ام الکتاب اصله الذی لا یغیر منه شی و هو ما کتبه فی الازل

اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے اس میں احکام وغیرہ اور اس کے پاس ام الکتاب ہے یعنی اصل نوشتہ جس میں کوئی چیز بدلتی نہیں اور وہ وہ ہے جسے اس نے ازل میں لکھا ہے۔

غرض یہ آیت بداء کے بارے میں اتنی صاف ہے کہ انکار بداء کرنے والوں کو یہاں کچھ بن نہیں پڑتا۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾

''اور اگر ہم آپ کو آنکھوں سے دکھلا دیں کچھ وہ باتیں جن کا ہم ان سے وعدہ وعید کر رہے ہیں یا آپ کو ہم دنیا سے اٹھالیں، بہر حال آپ پر تو بس پہنچا دینا ہے اور حساب کتاب بس ہمارے اوپر ہے۔''

''وعدہ وعید'' سے مراد یہاں وہ عذاب کی خبریں ہیں جو ان کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں دی جا رہی ہیں۔ [1]

چونکہ گزشتہ انبیاء اللہ سے اکثر یہ خواہش کرتے رہے تھے کہ ان کی نافرمان قوم پر ان کی آنکھوں سامنے عذاب آجائے، اس لیے حضرت پیغمبرؐ سے کہا گیا ہے کہ عذاب ہم کب نازل کریں گے؟ یہ ہم سے متعلق چیز ہے۔ آپ کو اس سے بحث نہیں ہونا چاہیے [2] آپ تو بس اپنا کام کرتے رہیے جو تبلیغ کرنا اور دعوت حق دیتے رہنا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ۭ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾

---

[1] ۔بعض الذی نعدالکفار من العقوبة علی کفرهم (تبیان)

[2] ۔فلا تنظر کو نه علی ذلك بان یکون فی ایامك (تبیان)

''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں گھٹاتے ہوئے زمین کو اس کے اطراف و جوانب سے اور اللہ فیصلہ کرتا ہے اس کے حکم کو ٹالنے والا کوئی نہیں اور وہ تیزی سے حساب لینے والا ہے۔''

شاہ ولی اللہ صاحب نے ترجمہ میں ''الارض'' کے معنی ''زمین'' کے بجائے قرار دیے ہیں کہ ''اس سرزمین کی طرف رخ کرتے ہیں [1] اور اب اطراف و جوانب سے کم کرنے کی تشریح یوں کرتے ہیں:۔

''یعنی روز بروز شوکت اسلام بزمین عرب منتشر می شود و دار الحراب ناقص می گردد از اطراف آں عامہ مفسرین ایں آیت را مدنیہ دانند و نزدیک مترجم لازم نیست کو مدنی باشد و مراد از نقصان دار الحرب اسلام اسلم و غفار و جہینہ و قبائل یمن است پیش از ہجرت (فتح الرحمن)

مطلب یہ ہے کہ روز بروز اسلام کی شان و شوکت عرب کی زمین میں پھیلتی جارہی ہے اور دار الحراب گھٹتا جارہا ہے اپنے اطراف و جوانب سے۔ عام مفسرین اس آیت کو مدینہ نازل شدہ مانتے ہیں مگر میرے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ مدینہ کی نازل شدہ ہو اور دار الحرب اسلام کی کمی سے (مراد قبائل اسلم و غفار و جہنیہ اور ہجرت سے قبل قبائل یمن مراد ہیں۔

اس کے قریب قریب شاہ عبد القادر لکھتے ہیں کہ:۔

''ہم چلے آتے ہیں زمین پر گھٹانے کفر کو یعنی اسلام پھیلتا جاتا ہے عرب کے ملک میں اور کفر گھٹتا ہے۔'' (موضح القرآن)

جلالین کا مطلب بھی یہی ہے:

اولم یروا اھل مکہ انا نأتی الارض نقصدار ضھم نقصھا اطرافھا بالفتح علی النبی صلی اللہ علیہ وٰلہ وسلم

کیا نہیں دیکھا انہوں نے یعنی اہل مکہ نے کہ ہم آتے ہیں زمین کی طرف یعنی ان کی سرزمین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اسے گھٹاتے جاتے ہیں اس کے اطراف و جوانب سے رسولؐ کو کامیاب بنا کر۔

مگر خود الفاظ آیت اس تشریح کو بلا تکلف ذہن میں نہیں لائے۔ الارض کے معنی ''دار الحرب'' کس طرح ہیں؟ پھر کفر کا گھٹانا زمین کا گھٹانا کیوں کر ہے؟ وہ تو اس سرزمین کو ناپاک کرنا ہے، زندگی بخشتا ہے۔

ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر ہے جو غالباً معصوم سے مروی ہے کہ زمین کے اطراف کے گھٹانے سے مراد صاحبان علم کی دنیا سے رحلت ہے [2] یہ تاویلی مفہوم تو ہوسکتا ہے مگر نفس الفاظ سے سمجھ میں آنے والے معنی یہ بھی نہیں ہیں۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ؕ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾

---

[1] ۔ قصد می کنیم بایں سرزمین (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ بموت علمائھا (علی بن ابراھیم)

''اور ترکیبیں کر چکے ہیں وہ لوگ جو ان کے پہلے تھے تو سب ترکیبیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جانتا ہے اسے جو کرتا ہے ہر متنفس اور بہت جلد کافروں کو معلوم ہو جائے گا کہ اس عالم کا انجام کس کے حق میں ہے۔''

سب ترکیبیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں'' یعنی وہ ان کی ترکیبوں کے توڑ پر بھی قادر ہے اور ان ترکیبوں کی سزا بھی دینا اسی کے ہاتھ میں ہے [1] اور وہ ترکیبیں کتنی ہی خفیہ ہوں، اس کے علم کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہ سکتیں جسے بعد کا فقرہ بتاتا ہے کہ ''وہ جانتا ہے اسے جو کرتا ہے ہر متنفس۔''

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۭ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۙ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝۴۳

''اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ تم رسول نہیں ہو، کہئے کہ اللہ گواہ ہونے کے لیے کافی ہے میرے اور تمہارے درمیان اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔''

رسولؐ کی حقانیت کے دو گواہ، کتاب اور عالم کتاب

مفسرین اہل سنت ''علم کتاب'' رکھنے والے سے مراد علمائے یہود و نصاریٰ یا ان میں سے نومسلموں کو لیتے ہیں [2] مگر ہمارے یہاں کی تفسیر یہ ہے کہ اس سے راسخین فی العلم یعنی معصومین علیہم السلام مراد ہیں جو کتاب الٰہی کے حقیقی عالم ہیں [3] اور ظاہر ہے کہ رسولؐ کے بعد ان کی فرد اوّل و اکمل حضرت علی بن ابی طالبؑ کی ذات تھی۔ [4]

---

[1] ۔معناہ اللہ جزآء مکرھم (تبیان)

[2] ۔ومن عندہ علم الکتاب من ھو یعنی الیھود و النصاری (جلالین)

[3] ۔قال ابو جعفر و ابو عبداللہ ھم ال محمد لانہم الذین عندھم علم الکتاب بجملۃ لا شیدشئی من ذلك (تبیان)

[4] ۔عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال: الذی عندہ علم الکتاب ھو امیر المومنین (علی بن ابراھیم)

سُوْرَةُ اِبْرَاهِيْمَ

مکیّہ۔۔۔۔۔۵۲ آیات

سورہ کا یہ نام ویسا ہی ہے جیسا سورہ ہود کا نام ہے، جس کی وجہ تسمیہ میں کوئی اختصاص کا پہلو نمایاں نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات تو پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ہیں، اس سورہ میں بھی آپ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ خاص خاص مضامین اس سورہ کے حسب ذیل ہیں:-

سورۂ ابراہیم کے خاص خاص مضامین:

۱۔۔۔۔۔ہر قوم میں رسول اس کی زبان بولنے والا آیا ہے۔

۲۔۔۔۔۔اللہ کے دنوں کی یاد قائم رکھنے کا حکم

۳۔۔۔۔۔اچھے اور برے کلمات کی مثال

۴۔۔۔۔۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مناجات اور اپنی اولاد کے لیے بت پرستی سے الگ رہنے کی عرض داشت

۵۔۔۔۔۔ذریت ابراہیمی کے اندر ہر دور میں سچے مسلمانوں کے وجود کی ضمانت۔

۶۔۔۔۔۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والدین کے لیے دعائے مغفرت جس سے ظاہر ہے کہ آذر جس سے بنص قرآن انہوں نے برأت کر لی تھی، ان کا والد نہ تھا۔

۷۔۔۔۔۔قیامت میں آسمان اور زمین کی تبدیلی۔۔۔وغیرہ وغیرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے

الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۱﴾ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ

الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝٣

''الف۔لام۔را۔یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے آپ پر اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے اجالے کی طرف نکالیں ان کے پروردگار کے حکم سے، اس عزت والے قابل تعریف اللہ کے راستے کی طرف۔ جس کا وہ سب ہے جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے اور وائے ہو کافروں کے لیے سخت عذاب ہے۔ جو ترجیح دیتے ہیں دنیوی زندگی کو آخرت پر اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اسے ٹیڑھا بنانے کے خواہاں ہیں یہ لوگ سخت گمراہی میں ہیں''۔

آخری آیت میں جو یصدون کا لفظ ہے، یہ کلام عرب اور نیز قرآن مجید میں وہ معنی میں مستعمل ہے۔ ایک لازم ''روگردانی کرتے ہیں'' اور دوسرے متعدی ''روکتے ہیں''

بعض جگہ مفعول مذکور ہے تو دوسرے معنی تعین کے ساتھ قطعی ہو گئے ہیں مگر یہاں مفعول مذکور نہیں ہے لہٰذا یہاں دونوں احتمال ہیں اے ہمارے ذہن میں اس کے بعد کے فقرہ کی مناسبت سے متعدی معنی رجحان رکھتے ہیں، اس لیے ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٤

''اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی پیغمبر مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ وہ ان کے لیے صاف صاف بیان کرے تو اللہ جسے چاہے گمراہ قرار دے اور جسے چاہے منزل تک پہنچائے اور وہ عزت والا ہے، بالکل ٹھیک کام کرنے والا''۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت کے لئے واقف زباں ہونے کی ضرورت

''صاف صاف بیان کرے'' یعنی کسی دوسرے مترجم کی ضرورت نہ ہو [1] اس سے ظاہر ہے کہ مترجم کی صورت میں افادیت کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے بعد میں دوسری قوموں کے افراد جب اس پیغام کو قبول کریں تو پورا پورا فائدہ وہ اس کی تعلیمات سے اسی وقت اٹھا سکیں گے۔ جب وہ اس زبان کو بھی حاصل کریں جس میں اس پیغمبر نے براہ راست مخاطب کیا تھا۔ یہ وہ ضرورت ہے جو مسلمانوں کے لیے عربی زبان کی تعلیم حاصل کرنے کی اہمیت کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے گی۔

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے ''اللہ جسے چاہے گمراہ قرار دے اور جسے چاہے منزل مقصود تک پہنچائے'' وہ اس تفسیر کے مطابق ہے [2] اور وہی ہمارے نزدیک قبل کے جملہ سے یہاں مرتبط ہے یعنی انہی کی زبان میں ہدایت ہونے سے حجت الٰہی تمام ہو جائے گی۔ اب اس کے بعد جو اس راستے پر نہ آئے گا، وہ گمراہ قرار پائے گا اور جو آ جائے گا، وہ منزل مقصود تک جو نجات ہے پہنچ

---

[1] ۔لایحتاجون الی من یترجمہ عنہ (تبیان)

[2] ۔یحکم یضلال من یشآء فاضلوا ھم عن الطریق (تبیان)

گا اور اگر حجت ہی تمام نہ ہوتی تو اس کی تفریق کا محل نہ ہوتا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ کہ نکالو اپنی قوم کو اندھیروں سے اجالے کی طرف اور انہیں اللہ کے تاریخی دن یاد دلا و یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر بڑے صبر و تحمل والے، شکر گزار کے لیے۔

ایام الٰہی اور اوران کی یاد کی اہمیت

''اللہ کے تاریخی دن'' سے کیا مراد ہے؟ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں:۔

''وقائعی کہ از جانب او بودند'' (فتح الرحمن)

شاہ رفیع الدین کہتے ہیں:۔ ''ساتھ دنوں یعنی کاموں خدا کے''

جلالین فرماتے:۔ ایام اللہ بنعمہ ''اللہ کے دن یعنی اس کی نعمتیں''

حالانکہ یوم کے معنی نہ واقعہ کے ہیں، نہ کام کے، نہ نعمت کے یوم کے معنی تو دن ہی کے ہیں اور اس کی اضافت اللہ کی طرف ہے، اس سے وہ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے جو ان سب پر حاوی ہے کہ اللہ کے دن وہ ہیں جن میں اللہ کے دین کو تقویت پہنچانے والا کوئی اہم کارنامہ ہوا ہو۔ خواہ براست اللہ کی طرف سے جیسے وہ عذاب جو اس کی جانب سے امتوں پر نازل ہوئے ہیں یا اس کے حکم سے اس کے انبیاء و الیاء اور مقرب بندوں نے اس کی راہ میں جو قربانیاں پیش کی ہیں، وہ سب ایام اللہ میں داخل ہیں اور ان کی یاد آوری کا حکم خالق دے رہا ہے۔ ہماری قدیم تفسیر کا مضمون اس کے مطابق ہے۔ [1]

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۶ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝۷

''اور جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہ یاد کرو اللہ کی اس نعمت کو جو تم پر ہے، جب اس نے تمہیں چھڑایا فرعون والوں سے جو تم کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے اور تمہارے لڑکوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھ لیتے تھے اور اس میں آزمائش تھی تمہارے پروردگار کی طرف سے بہت بڑی اور جب تمہارے پروردگار نے

---

[1] ۔ ایام اللہ ثلاثة یوم القائم و یوم الموت و یوم القیامة (علی بن ابراھیم)

اطلاع دی[1] کہ اگر شکر ادا کرو گے تو میں اور زیادہ دوں گا اور اگر ناشکرا پن کرو گے تو میرا عذاب یقیناً سخت ہے۔''

جو واقعات قوم موسیٰ علیہ السلام کو یاد دلائے جا رہے ہیں، ان کا ذکر سورہ بقرہ میں ہو چکا ہے لہٰذا مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝

''اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر کفر اختیار کرو تم اور وہ سب جو روئے زمین پر ہیں تو یقیناً اللہ بے نیاز ہے قابل تعریف۔ کیا تمہیں نہیں پہنچی خبر ان کی جو تمہارے پہلے تھے، نوح کی قوم والے اور عاد اور ثمود اور وہ جو ان کے پہلے تھے جنہیں سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا؟ ان کے پاس آئے ان کے پیغمبر معجزوں کے ساتھ تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں دبائے اور کہا ہم انکار کرتے ہیں اس کا جس کے ساتھ تمہیں بھیجا گیا ہے اور ہم شک میں ہیں اس سے جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو جو پریشان کرنے والا ہے۔''

فردوا ایدیھم فی افواھھم کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے کہ ''انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں دبائے'' یہ ایک تفسیر کے موافق ہے کہ ضمیریں سب اسی جماعت کی طرف راجع ہیں اور اس صورت میں ہاتھ منہ میں دبانے کے بھی دو مختلف مطلب کہے گئے ہیں، ایک یہ کہ اس سے حیرت کا اظہار مقصود ہے جس کے لیے ہمارے یہاں محاورہ ہے ''انگشت بدنداں ہونا''[2] اور دوسرے یہ کہ اس سے غیظ و غضب کا اظہار مقصود ہے جس کے لیے ہم کہتے ہیں ''اپنی آپ بوٹیاں نوچتے ہیں یا کاٹتے ہیں''[3] اور اس کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں[4] جن میں سے ایک قول کی بنا پر جو قرین قیاس ہے، یہ ترجمہ ہوگا کہ ''اپنے ہاتھ ان کے منہ میں دیے'' یعنی تکذیب اور تمسخر کے ساتھ ان کی زبان بندی کی کوشش کی۔ اس صورت میں آخری ضمیر فی افواھھم والی انبیاء کی طرف راجع ہوگی۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ

---

[1] ۔اعلم جلالین و قد تستعمل تفعل بمعنی افعل کقولھم اوعدتہ و توعدتہ (تبیان)

[2] ۔یعنی از نہایت تعجب و انکار انگشت بدنداں گزیدند (فتح الرحمن)

[3] ۔لیعضوا علیھا من شدۃ الغیظ (جلالین)

[4] ۔فی معناہ خمسۃ اقوال (تبیان)

لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ⑩

''ان کے پیغمبروں نے کہا کہ کیا اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے تمہیں دعوت دیتا ہے کہ تمہارے لیے تمہارے گناہوں سے درگزر کرے اور تمہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دے، انہوں نے کہا تم نہیں ہو مگر ہمارے ہی ایسے آدمی، چاہتے ہو کہ ہمیں روکو اس سے کہ جس کی عبادت کرتے آئے ہیں ہمارے باپ دادا تو لاؤ ہمارے پاس کوئی کھلی ہوئی دلیل۔''

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑪ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ⑫

''کہا ان سے ان کے پیغمبروں نے کہ ہم نہیں ہیں مگر تمہاری ہی طرح ایک آدمی مگر اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اپنے کرم سے نوازتا ہے اور ہمارے لیے یہ نہیں ممکن کہ ہم کوئی دلیل پیش کریں مگر اللہ کے حکم سے اور اللہ ہی پر بھروسا رکھنا چاہیے ایمان والوں کو۔ اور ہمیں کیا ہے کہ ہم اللہ پر بھروسا نہ کریں حالانکہ کہ اس نے ہمیں ہمارے راستوں پر لگایا ہے اور ہم صبر و تحمل سے کام لیں گے، اس پر جو تم ہمیں ایذا پہنچاؤ گے اور اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے بھروسا کرنے والوں کو۔''

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ⑬ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ⑭

''اور کافروں نے اپنے پیغمبروں سے کہا کہ ہم تم کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے اور نہیں تو ضرور تم ہمارے مذہب میں واپس آؤ گے تو اللہ نے وحی بھیجی ان پر کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے۔ اور تمہیں ساکن کر دیں گے اس سرزمین پر ان کے بعد یہ صلہ ہے اس کے لیے جو میرے سامنے کھڑے ہونے کا [1] تصور رکھے اور وہ میری تہدید سے ڈرے۔''

---

[1] ۔مقامی ای مقامہ بین یدی (جلالین)

کافروں کا اپنے پیغمبروں سے کہنا کہ ''تم ہمارے مذہب میں واپس آؤ گے۔'' ان کے خیال ناقص کے مطابق ہے کہ جب تک وہ پیغمبر ان کے افعال پر نکتہ چینی شروع نہیں کرتا، انہیں محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کچھ الگ تصورات رکھتے ہیں اور جس دن سے وہ کار ہدایت شروع کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ آج یہ اپنے سابق دین سے منحرف ہو گئے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک نبیؑ خدا کبھی بھی گمراہوں میں داخل نہیں ہوتا [1] یہ اور بات ہے کہ وہ ابھی گمراہی کے خلاف جہاد پر مامور نہ ہو۔

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿١٥﴾ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿١٦﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿١٧﴾

''اور انہوں نے فتح وظفر کی دعا کی [2] اور ناکام ہوا ہر سرکش عناد رکھنے والا۔ اس کے سامنے دوزخ ہے اور اسے پلایا جائے گا پیپ کی قسم کا پانی۔ جسے وہ ایک ایک گھونٹ کر کے پیئے گا اور بہت مشکل ہے کہ وہ اسے حلق سے اتار سکے [3] اور موت اس کی ہر طرف سے آ رہی ہوگی [4] اور پھر بھی وہ مرے گا نہیں اور اس کے سامنے سخت طرح کا عذاب ہے۔''

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿١٨﴾

''وہ جو اپنے پروردگار کے ساتھ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں، ان کی حالت یہ ہے کہ ان کے اعمال مثل اس خاکستر کے ہیں جس پر ایک جھکڑوں والے دن میں تیز ہوا چلے، وہ جو کچھ کر چکے ہیں اس میں سے کسی چیز پر قبضہ نہیں رکھتے، یہ ہے بڑی سخت گمراہی۔''

یعنی انہوں نے دنیا میں کچھ خیر خیرات وغیرہ کی طرح کام کیے تھے جو بجائے خود نیک کام ہیں اور انہیں ان کے نامہ اعمال میں درج ہونا چاہیے تھا مگر چونکہ ایمان شرط قبول اعمال ہے اور وہ اس سے محروم ہیں، اس لیے ان اعمال میں سے کچھ بھی ان کے پاس نہیں ہے اور وہ آخرت میں خالی ہاتھ ہی ہوں گے۔ [5]

---

[1] ۔تو هموا ذلك علىٰ غير حقيقة انهم كانوا علىٰ ملتهم (تبيان) اى دعوا (علی بن ابراهيم)

[2] ۔طلب فتح كردند پيغامبران (شاه ولی الله)

[3] ۔فلا يقارب ان يشوبه تكرها و هو يشوبه (تبيان)

[4] ۔اسبابه المفيضته له من انواع العذاب (جلالين)

[5] ۔اعمالهم الصالحة كصلة و صدقة فی عدم الانتفاع بها لعدم شرطه (جلالين) يعنی اعمال ايشاں همه حبط شدند بدان منتفع نگردند (فتح الرحمن)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو حکمت و مصلحت کے ساتھ اگر وہ چاہے تو تم سب کو ختم کر دے اور ایک نئی مخلوق کو لے آئے۔ اور یہ اللہ پر کوئی دشوار بات نہیں ہے۔''

یہاں دیکھنے سے مراد معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ جو باتیں بعد میں درج ہیں، وہ از قبیل مشاہدات نہیں ہیں جن سے آنکھ کے دیکھنے کا تعلق ہو۔ [1]

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۲۱﴾

''اور وہ ایک ساتھ سب اللہ کے سامنے حاضر ہوئے تو اب کمزور لوگ کہہ رہے ہیں ان سے کہ جو بڑے بنے ہوئے تھے کہ ہم تمہارے پیرو تھے تو کیا تم ہمیں اللہ کے عذاب سے بچا سکتے ہو۔ انہوں نے کہا اگر اللہ ہمیں منزل تک پہنچاتا تو ہم بھی تمہیں منزل تک پہنچاتے۔ ہمارے لیے یکساں ہے، چاہے ہم بے تاب ہوں، چاہے صبر و تحمل سے کام لیں۔ ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔''

''حاضر ہوئے'' کا لفظ ہے تو ماضی کے لیے مگر یہ منظر کشی کا ایک انداز ہے جو قرآن میں کئی جگہ ملتا ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مستقبل کا یہ واقعہ ایسا یقینی ہے کہ سمجھو جیسے تم دیکھ رہے ہو اور وہ وقوع میں آچکا ہے۔ [2]

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

''اور کہے گا شیطان اس وقت کہ جب جو ہوتا ہے وہ ہو جائے گا کہ بے شبہ اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے

---

[1] ۔الم تعلم لان الروية تكون بمعنى العلم كماتكون بمعنى الادراك بالبصر و ههنا لايمكن ان تكون بمعنى الرّوية بالبصر (تبيان)

[2] ۔والتعبير فيه وفيما بعده بالماضى لتحقق وقوعه (جلالين) معناه مستقبل (على بن ابراهيم)

تمہیں سبز باغ دکھائے تھے تو وہ سب غلط ثابت ہو گئے اور مجھ کو تم پر کوئی جبری تسلط تو تھا نہیں سوا اس کے کہ میں نے تمہیں دعوت دی تو تم نے میری آواز پر لبیک کہی تو مجھے لعنت ملامت نہ کرو اور خود اپنے کو لعنت ملامت کرو میں تمہاری فریاد رسی نہیں کر سکتا اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو میں انکار کرتا ہوں اس سے جو تم نے مجھے اس کے پہلے (خدا کا) شریک قرار دیا تھا[1] بلاشبہ جو ظالم ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

''اور داخل کیے جائیں گے وہ جنہوں نے ایمان قبول کیا اور نیک اعمال کیے بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اپنے پروردگار کے حکم سے، ان کی صاحب سلامت[2] آپس میں سلامٌ کا لفظ ہوگا۔''

یہاں بھی سلامٌ ہی ہے، السّلام نہیں ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''دنیا میں سلام دعا ہے سلامتی مانگنے پر وہاں سلام مبارک بادی سلامتی پر'' (موضع القرآن)

اس طرح ان کے والد کا ترجمہ ''دعائے خیر ایشان'' اور ان کے بھائی کا ترجمہ ''دعا ملاقات ان کی، دونوں غلط ہو جاتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کیسی مثال قرار دی ہے اللہ نے اچھے کلمہ کی؟ مثل اچھے درخت کے جس کی جڑ قائم ہو اور شاخ آسمان سے باتیں کر رہی ہو۔ جو اپنا میوہ ہر زمانہ میں دیتا ہو اپنے پروردگار کے حکم سے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں پیش کرتا ہے، شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں اور مثال خراب کلمہ کی مثل خراب درخت کے ہے جو اکھاڑ لیا جائے زمین کے اوپر ہی سے۔ اس کے لیے پائیداری نہ ہو۔''

---

[1] ۔بشرککم باللہ ومتابعتکم لی قبل لھذا الیوم (تبیان)

[2] ۔تحیتھم فیھا من اللہ ومن الملئکۃ وفیھا بینھم (جلالین)

اچھے اور بُرے کلموں کی مثال

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

یعنی شریعت حق در ملکوت ثابت ودر دنیا ہر روز رواجی تازہ می یابدو مردمان منتفع می شوند و ملت جاہلیت در ملکوت استقرار ندارد یکچند درمیان مردم شائع شود باز برہم کردہ آید (فتح الرحمن)

مطلب یہ ہے کہ سچی شریعت عالم ملکوت میں قائم ہے اور دنیا میں روز بروز نئی مقبولیت حاصل کرتی ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جاہلیت والا دھرم عالم بالا میں قیام نہیں رکھتا اور تھوڑے دن آدمیوں میں پھیلتا ہے، پھر ختم ہو جاتا ہے۔

ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر کچھ دوسری طرح مطلب رکھتے ہیں:۔

''مسلمانوں کا دعویٰ درست ہے جس کی دلیل صحیح ہے اور دل میں اثر رکھتا ہے اور روز بروز چڑھتا ہے اور کافروں کا دعویٰ جڑ نہیں رکھتا، تھوڑا دھیان کرنے سے غلط معلوم ہونے لگے دل میں اس سے کچھ نور نہیں۔'' (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں جو ہے، وہ ان دونوں سے الگ ہے:۔

كذلك كلمة الايمان ثابتة فى قلب المؤمن و عمله يصعد الى السماء وينالہ بركتہ وثوابہ كل وقت و مثل كلمة خبيثة كشجرة خبيثة كذلك كلمة الكفر لاثبات لها ولافرح ولابركة

اسی طرح ایمان کا کلمہ مومن کے دل میں قرار پائے ہوئے ہوتا ہے اور اس کا عمل آسمان کی طرف بلند ہوتا ہے اور اسے اس کے برکت و ثواب سے ہر وقت فائدہ پہنچتا ہے اور خبیث کلمہ کی مثال کفر کا کلمہ ہے جو مثل خبیث درخت کے ہے، اسی طرح کفر کا کلمہ، اس کو نا پائداری ہے، نہ اس سے خوشی ہوتی ہے اور نہ برکت۔

بہر حال الفاظ آیت میں ان سب پہلوؤں کی گنجائش ہے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی ہم غلط نہیں کہہ سکتے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿٢٧﴾

''قائم رکھتا ہے اللہ ایمان لانے والوں کو اس بات پر جو پائدار ہے دینوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور گمراہ قرار دیتا ہے [1] اللہ ظالموں کو اور اللہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔''

''ایمان لانے والوں کو قائم رکھتا ہے۔'' اس کی تشریح میں شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

یعنی وقت مرگ توفیق شہادت می دہد و وقت سوال منکر ونکیر بقول حق گویا سازد (فتح الرحمن)

مطلب یہ ہے کہ مرنے کے وقت حق کی گواہی دینے کی توفیق دیتا ہے اور منکر ونکیر کے سوال کے وقت اس کی زبان پر حق کو لاتا ہے۔

ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں جناب امیرؑ کی حدیث بھی یہی بتاتی ہے کہ یہ ''قول ثابت'' یعنی پائدار پر قیام قبر میں نمایاں ہوگا منکر و

---

[1] ۔یحکم بضلال الظالمین (تبیان)

نکیر کے سوال کے وقت جب بندہ مومن ان کے سوال کا صحیح صحیح جواب دے گا اور وہ خوش ہو کر اسے دعا دیں گے کہ:۔

ثبتك الله بما تحب وترضىٰ

اللہ تجھے برقرار رکھے اس طرح جو تجھے محبوب و دل پسند ہو

حضرتؒ نے فرمایا کہ اس آیت سے مراد یہی موقع ہے۔[1]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿٣٠﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہوں نے نعمت الٰہی کے بدلے میں ناشکری سے کام لیا اور اپنی جماعت کو داخل کیا ہلاکت کے گھر میں، جو دوزخ ہے۔ جس کی تپش میں وہ مبتلا ہوں گے اور کتنا برا ٹھکانا ہے وہ۔ اور انہوں نے اللہ کے لیے برابر دار بنائے تا کہ اس کے راستے سے بہکائیں، کہئے کہ ابھی فائدہ اٹھالو، یقیناً آخرت میں تو تمہیں آتش دوزخ کی طرف جانا ہے۔''

''نعمت الٰہی کے بدلے میں ناشکری'' کا مطلب یہ ہے کہ نعمت الٰہی کا جو تقاضا ہے اور وہ شکر نعمت ہے، اس کے بجائے کفران نعمت سے کام لیا۔[2]

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿٣١﴾

''کہئے میرے ان بندوں سے جو ایمان رکھتے ہیں کہ نماز کی پابندی کریں اور خیرات کریں اس سے کہ جو ہم نے انہیں دیا ہے پوشیدہ طور پر اور ظاہر بظاہر، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جب نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ آپس میں دوستانہ ہوگا۔''

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''یعنی نیک عمل بکتے نہیں اور کوئی دوستی سے رعایت نہیں کرتا۔'' (موضح القرآن)

''دوستانہ'' سے کوئی آدمی بلا معاوضہ بھی کچھ مدد صرف حق دوستی کی بنا پر دیتا ہے یا ''کار خیر'' سمجھ کر، اس لیے ہماری قدیم تفسیر میں اس کی

---

[1] ۔ھو قول الله: يثبّت الله الذين اٰمنوا بالقول الثابت الاية (علی بن ابراهيم)

[2] ۔لما جعلوا الكفر بالنعمة مكان شكرها كانوا قد بدلوا اقبح تبديل (تبيان)

تشریح صدقہ کے لفظ سے ہوئی ہے [1] مگر ہوسکتا ہے کہ صدقہ کے لفظ میں کتابت کی غلطی سے الف رہ گیا ہو اور وہ اصل میں صداقۃ ہو تو وہ لفظ خلال کی جو قرآن میں ہے بالکل لفظی تفسیر ہوگی یعنی دوستی یا دوستانہ جو ترجمہ میں پہلے ہی موجود ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی اتارا تو نکالا اس کے ذریعہ پھلوں سے تمہارا رزق اور تمہارے قابو میں دیں کشتیاں کہ وہ چلیں دریا میں اس کے حکم سے اور تمہارے قبضہ میں دیں نہریں۔ اور تمہارے قابو میں دیے سورج اور چاند جو ہمیشہ چلتے رہتے ہیں [2] اور قبضے میں کیے تمہارے رات اور دن۔ اور تمہیں دیا ہر چیز میں سے جو تم نے مانگا، اور اگر اللہ کی نعمت کا شمار کرو تو اس کا احاطہ تم نہیں کرو گے یقیناً انسان بڑا ظالم ہے، بڑا ناشکرا۔''

مانگ کے پورا کرنے میں من کا لفظ جو صرف کیا گیا جس کے مفہوم سے ''بعض'' کا پتہ لگتا ہے، اس لیے ہے کہ انسان تو اپنی غرض کا بندہ ہے، وہ کبھی ایسی چیز بھی مانگ لیتا ہے جو حکمت نظامِ عالمی کے خلاف ہے اس لیے ایسا سوال پورا نہیں کیا جاتا، ہاں وہ سوال جو کسی بڑے مقصد سے نہ ٹکراتا ہو، اسے بتقاضائے رحمت ورافت پورا کر دیا جاتا ہے اور اس کے لیے من کے بعد کل کا لفظ لایا گیا ہے جو اقسام طلب کے لحاظ سے ہے یعنی یہ اس کی حاجت روائی کسی ایک قسم سے مخصوص نہیں بلکہ ہر ایک طرح کی چیز جو تم مانگتے ہو، وہ دیتا ہے [3] اس لیے ''میں سے'' کے ساتھ ہم نے ترجمہ میں ''ہر وہ چیز'' کہا ہے جس سے بعض اور کل دونوں کے مفہوم محفوظ ہو گئے۔

بہت قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ کشتیوں اور نہروں ہی کی طرح سورج اور چاند اور رات دن کے متعلق سخر لکم کا لفظ صرف کیا ہے جس کا ترجمہ سب جگہ ایک ہونا چاہیے اس بنا پر ہم نے یہاں بھی یہی ترجمہ کیا ہے کہ ''تمہارے قبضے'' یا ''تمہارے قابو'' میں دیئے مگر مشاہدہ اور وجدان ہر ایک کا یہ ہے کہ یہ چیزیں ہمارے قابو میں نہیں ہیں، اس صورت میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ مستقبل کے کسی ایسے دور ارتقاء کی طرف انسانی ذہن کو تحریک ہے جب یہ سب چیزیں بھی اس کے قابو میں آجائیں اور اس وقت کے حال میں (جب قرآن اترا ہے) نوع انسانی ہی میں کچھ بلند ہستیاں

---

[1] ۔لاخلال ای صدقة (علی بن ابراھیم)

[2] ۔الدؤوب مرور الشئی فی العمل علی عادة جاریة فیه (تبیان)

[3] ۔معناه ان الانسان قدیسأ له العافیة فیعطی ویسأله النجاق فیعطی یساله الغنی فیعطی ویساله الملك فیعطیٰ ویسأ له الولد فیعطیٰ ویسأله الغرو تیسرا الامور و شرح الصدر فیعطیٰ... مالم یکن فیه مفسدة فی الدین علیه و علی غیرہ (تبیان)

ایسی موجود تھیں جن کے قبضے میں دیے گئے تھے سورج اور چاند اور دن رات کیوں کہ خطاب مجموع ظرف زمان کی پوری نوع سے ہے ہر زمانہ کی ہر فرد سے نہیں ورنہ ایک دور میں تو جب تک انسانی ذہن نے اتنی بھی ترقی نہیں کی تھی کشیوں پر بھی قبضہ نہ تھا اور نہریں بھی قابو میں نہ تھیں اور اب اتنے ارتقاء کے بعد بھی انسانوں کی اکثریت جو ان فنون سے واقف نہیں، وہ نہ کشتیوں پر قابو رکھتی ہے اور نہ نہروں پر۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۶﴾

''اور جب کہا ابرہیم نے اے میرے پروردگار! اس شہر کو محل امن قرار دے اور بچا مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ ہم بتوں کی پرستش کریں۔ اے میرے پروردگار انہوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے تو جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میرا کہا نہ مانے تو یقیناً تو بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔''

حضرت ابراہیمؑ کی مناجات

''میری اولاد کی تشریح شاہ ولی اللہ کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ''یعنی پسران بلاواسطہ او'' (فتح الرحمن)

غالباً یہ اس مشاہدہ کی بنا پر ہے کہ اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام میں بہت سے کافر و مشرک بھی نظر آتے ہیں مگر نہیں ہیں یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ اولاد ابراہیم علیہ السلام ہر دور میں ایسے افراد رہے ہیں جن کی پیشانی کبھی کسی معبود باطل کے سامنے خم نہیں ہوئی اور بنی کے لفظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو دعا تھی، اس کی قبولیت کا ظہور انہی افراد میں ہوا جسے منطقی ذوق رکھنے والے اپنی زبان میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ''مہملہ'' کا صدق مستقبل کے ہر دور میں بصورت جزئیہ رہا ہے جو اس قضیہ کا قدر متیقّن کے طور پر تقاضا ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾

''اے میرے پروردگار میں نے بسایا ہے اپنے بال بچوں میں سے کچھ کو [1] بغیر کھیتی والے ایک چٹیل میدان میں تیرے محترم گھر کے پاس، اے ہمارے مالک! اس غرض سے کہ وہ نماز کی بنیاد'' قائم کریں، اب تو کچھ انسانوں کے دلوں کو ایسا کر دے کہ وہ ان کی طرف جھکتے ہوں اور انہیں ہر طرح کے پھلوں سے رزق عطا فرما، شاید کہ وہ شکر گزار ثابت ہوں۔''

---

[1] ۔المراد بالذریۃ ھھنا اسماعیل وامۃ (تبیان)

جناب ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں یہ لفظیں کہ ''تیرے محترم گھر کے پاس'' اس بنا پر ہیں کہ اگرچہ اس کے بعد خود جناب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیلؑ اس بیت کی تعمیر کریں گے مگر یہ تعمیر کسی نئے مکان کی نہیں بلکہ اسی قدیم مکان کی ہوگی جو پہلے یہیں پر موجود تھا اور پھر حوادث ارضی وسماوی [1] سے بے انشان ہوگیا تھا، اللہ کے دیے ہوئے علم سے جناب ابراہیم علیہ السلام اس گھر سے واقف تھے، اس لیے انہوں نے یہ الفاظ استعمال کیے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝۳۸

''اے ہمارے پروردگار! یقیناً تو جانتا ہے اسے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور نہیں چھپتی اللہ پر کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں۔''

آخر کا فقرہ کلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جز بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے کلام کا یہ فقرہ کہ ''تو جانتا آخر کا فقرہ کہ ''تو جانتا ہے اسے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں۔'' ختم ہونے کے بعد خود خالق متعال نے بطور تائید یہ کلام ارشاد فرمایا ہو۔ [2]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَي الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۝۳۹ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۣ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاۗءِ ۝۴۰ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝۴۱

''شکر ہے اللہ کا جس نے مجھے باوجود کبرسنی کے اسماعیل اور اسحاق (ایسے بیٹے) عنایت فرمائے یقیناً میرا پروردگار دعا کا سننے والا ہے۔ پروردگار مجھے نماز کا قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی اے ہمارے پروردگار! اور میری دعا کو قبول کر۔ ہمارے پروردگار مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور تمام ایمان والوں کو اس دن کہ جب حساب قائم ہوگا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اواخرِ عمر میں اپنے والدین کے لئے دعائے مغفرت

ظاہر ہے کہ دعا جناب ابراہیم علیہ السلام کی بالکل اواخر عمر کی ہے جب کہ اسماعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں کی ولادت ہوچکی تھی اور پھر وہ استغفار میں اپنی مغفرت کے ساتھ اپنے والدین یعنی والد اور والدہ دونوں کی مغفرت کی التجا کررہے ہیں، حالانکہ دوسرے مقامات پر قال لابیہ اپنے باپ سے کہا اور ایسے ہی الفاظ سے جس کو ابراہیم علیہ السلام کا باپ کہا گیا ہے اور اس سے تخاطب میں یہ مذکور ہے کہ سوف استغفر لك ربّی میں اپنے پروردگار سے تمہارے لیے طلب مغفرت کروں گا، اور اس کے لیے پھر استغفار کیا بھی، اس میں کہیں والد کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ لفظ ہیں کہ: ''واغفر لابی'' میرے باپ کو بخش دے، اور اس کے متعلق قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ:

---

[1] ۔خربة طسم واندرس وقيل انّه رفيع عند الطوفان الى السماء (تبيان)

[2] ۔فال قوم ان قوله ''وما يخفى على الله من شئى فى الارض ولا فى السّماء'' اخبار منه تعالىٰ بذٰلك دون الحكاية (تبيان)

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ.(توبہ۔114)

نہیں تھا ابراہیمؑ کا طالب مغفرت ہوتا اپنے باپ کے لیے مگر ایک وعدہ کی بنا پر جو انہوں نے اس سے کیا تھا مگر جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے برأت کر لی۔

ظاہر ہے کہ یہ اوائل عمر جناب ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا: ربنا اغفر لی ولوالدیّ کہنا آپ کے اواخر عمر کے الفاظ ہیں۔ اس صورت میں جلالین کے یہ الفاظ کتنے بعید از حقیقت ہیں کہ:

هذا قبل ان يتبين عدوا تهما لله:

یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس وقت کی ہے جب انہیں پتہ نہ تھا کہ ان کے والدین اللہ کے دشمن ہیں:۔

اللہ اکبر: انبیاء و مرسلین کے آباؤ اجداد کو مشرک ثابت کرنے کا شوق ان لوگوں کی آنکھوں پر کس طرح پردے ڈال دیتا ہے۔

پوری عمر گزر گئی، خود جلالین صاحبان اس آیت کے شروع میں علی الکبر کے تحت میں لکھ چکے ہیں کہ جب جناب اسماعیلؑ پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر 99 برس کی تھی اور جناب اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو ایک سو بارہ برس کی اور ابھی تک ان کو اپنے والدین کے متعلق یہ علم نہ ہوا کہ وہ معاذ اللہ دشمن خدا تھے مگر جلالین کو اس کا علم ہو گیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت اس کی دلیل قوی ہے کہ آذر جسے ان آیت میں ''اَب'' باپ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، والدین کے لفظ سے نہیں، وہ درحقیقت جناب ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہ تھا۔ [1]

یاد رکھنا چاہیے کہ آب کا لفظ مجازی طور پر کسی مربی کے لیے استعمال ہو جاتا ہے مگر والد وہی ہوتا ہے جس کے نطفہ سے انسان پیدا ہو، وہ آذر نہیں تھا بلکہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے بتایا ہے، والد جناب ابراہیم علیہ السلام کے تارخ تھے اور یہاں والدین سے مراد اصلی ماں باپ ہیں جو دونوں ہی مثل تمام مرسلین کے آباؤ اجداد کے اہل ایمان تھے۔

یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ یہاں جلالین باپ کے ساتھ ماں کو بھی دشمن خدا ظاہر کر رہے ہیں کہتے ہیں کہ: قبل ان يتبيّن له عداو تهما لِلّٰه یعنی اُس وقت تک ان دونوں کی عداوت اللہ سے ظاہر نہ ہوئی تھی، تو پھر قرآن میں دوسری جگہ جو جناب ابراہیم علیہ السلام کے استغفار پر ان کا عذر بیان کیا گیا ہے، اس میں فقط باپ کے لیے استغفار کا ذکر نہ ہونا چاہیے بلکہ ماں باپ دونوں کے لیے استغفار اور ماں سے بھی وعدہ استغفار کا تذکرہ ہونا چاہیے حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس سے ظاہر ہے کہ نظر الٰہی میں یہ استغفار جناب ابراہیم علیہ السلام جو ربّنا اغفر لی ولوالدیّ کے الفاظ میں ہے، کسی معذرت کا محتاج نہیں ہے، ہاں وہ استغفار جو اغفر لابی کے الفاظ میں تھا اور وہاں ماں کا کوئی ذکر نہیں، اس کے لیے قرآن میں ضرورت محسوس کی گئی ہے یہ بتانے کی کہ اس کا کیا سبب تھا؟

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ

---

[1] ۔قد تنبّا ان ابری ابراهیم لم یکونا کافرین و فی الآیة ولایة علی ذٰلك لانّه سألالمغفرة لهما یوم القیمة... قدل ذٰلك علی انّ باه الّذی کان کافر اجدّه لامه او عمّه علی الخلاف (تبیان)

فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿۴۲﴾ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿۴۳﴾

''اور اللہ کو ہرگز بے خبر نہ سمجھنا اس سے کہ جو ظالم یا ظلم کرتے ہیں، وہ تو بس انہیں ڈھیل دیتا ہے اس دن کے لیے جس میں آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی [1]۔ تیزی سے دوڑتے ہوئے منہ اپنے اٹھائے ہوئے اس عالم میں کہ نگاہ ان کی ان کی طرف پلٹتی نہیں اور دل ان کے پریشان ہوں گے [2]۔''

''یہ دن وہی جس کی ہولناکیوں کے مختلف رخ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر درج ہیں اور وہ وہی ہے جس کا زیادہ نمایاں اصطلاحی نام ''قیامت'' ہے۔ [3]

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾ وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾

''اور ڈرایئے لوگوں کو اس دن سے کہ جب ان پر عذاب آئے گا تو ظالم لوگ کہیں گے، اے ہمارے مالک! ہمیں مہلت دے ایک قریبی مدت تک تو ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور پیغمبروں کی پیروی کریں گے اور کیا تم نے پہلے سے قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ ہمیں کوئی زوال نہیں ہوگا۔ اور تم بسے تھے بستیوں میں ان کی جو پہلے اپنے نفس پر ظلم کر چکے تھے اور تمہیں معلوم ہوا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا تھا اور ان کے کیفیات ہم نے تم سے بیان کیے۔ اور انہوں نے اپنی ترکیبیں کیں اور اللہ کے پاس ان کی سب ترکیب ہے اور ان کی ترکیب ایسی تو نہ تھی کہ پہاڑ اس سے ہٹ جائیں۔ تو ہرگز نہ سمجھو اللہ کو کہ وہ ان وعدوں کے خلاف کرے گا جو اس نے اپنے پیغمبروں سے کیے ہیں یقیناً اللہ عزت والا ہے، بڑا سخت بدلہ لینے والا۔''

---

[1] ۔یقال شخص دجرہ فلاں ای فتحہ فلمہ یغمضہ (جلالین)

[2] ۔قلوبھم تتصدّع من الخفقان (علی بن ابراھیم)

[3] ۔ھو یوم القیٰمۃ (تبیان)

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾

وہ دن جب یہ زمین بدل کر دوسری زمین ہو جائے گی اور آسمان بھی اور وہ لوگ حاضر ہوں گے اللہ کے سامنے جو ایک اکیلا ہے، سب پر غالب۔

قیامت میں آسمان وزمین کی تبدیلی

ان آیات میں قیامت میں آسمان وزمین کی تبدیلی کا ذکر آیا ہے۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾

اور دیکھو گے مجرموں کو اس دن جکڑا ہوا زنجیروں میں۔ ان کے کرتے تارکول کے ہوں گے اور ان کے چہروں کو آگ ڈھانپے ہوئے ہوگی۔ تاکہ اللہ سزا دے ہر ایک کو اس کی جو اس نے کیا ہے، یقیناً اللہ تیزی سے حساب لینے والا ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۵۲﴾

یہ تبلیغ ہے تمام لوگوں کے لیے اور اس سے یہ مقصد ہے کہ انہیں تنبیہ ہو اس کے ذریعہ سے اور یہ کہ انہیں معلوم ہو کہ وہ بس ایک خدا ہے اور اس لیے کہ صاحبان عقل اثر لیں۔

سُوْرَةُ الْحِجْرِ

مکیّہ ۔۔۔۔۔۹۹ آیات [1]

اس سورہ کا نام ''اصحاب حجر'' کے تذکرہ کی وجہ سے ہوا ہے جو خصوصیت کے ساتھ اس سورہ میں ہوا ہے۔

سورۂ حجر کے خاص خاص مضامین:

۱.....قرآن کی حفاظت کا قطعی وعدہ

۲.....فرشتوں کو سجدہ آدمؑ کا حکم اور ابلیس کی سرتابی کا تفصیلی تذکرہ

۳.....دوزخ کے ساتھ دروازے

۴.....اہل بہشت سے دلوں سے کینہ وعداوت کا دور ہونا

۵.....فرشتوں کا جناب ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنا اور ولادت اسحاقؑ کی بشارت دینا

۶.....قوم لوط علیہ السلام پر عذاب نازل کرنے کے لیے انہی فرشتوں کا جانا

۷.....اصحاب ایکہ کا معذب ہونا

۸.....سبع مثانی اور قرآن

۹.....علانیہ تبلیغ اسلام کا ابتدائی حکم

۱۰.....رسول کے ساتھ تمسخر کرنے والوں کا انجام وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ①

الف۔لام۔را۔ یہ دستور خداوندی اور ایک بڑے روشن قرآن کی آیات ہیں۔

عام طور پر الکتاب سے مراد قرآن ہی لیا گیا ہے [2] اور پھر قرآن تو قرآن ہے ہی.....اس صورت میں یہ ایک چیز کا دوسری چیز کا عطف

---

[1] ۔مکیة فی قول قتادة و مجاهد وهی تسع و تسعون اٰیة بلا خلاف (تبیان)

[2] ۔الکتاب القران (جلالین)

نہیں ہے بلکہ ایک چیز کے دو وصف ہیں جن کو بطور عطف ظاہر کیا گیا ہے [1] مگر حقیقت یہ ہے کہ لفظ ''کتاب'' کتابت یعنی تحریر سے جس طرح آتی ہے، اسی طرح کتب بمعنی فرض سے بھی، اس لیے قانون الٰہی جو اس کی طرف کے فرائض پر حاوی ہے ''کتاب'' کہلاتی ہے جو قرآن مجید کی بکثرت آیات میں آیا ہے اور اس لیے ہم نے ترجمہ اس کا ''دستور خداوندی'' کے ساتھ کیا ہے۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝۲

''بسا اوقات کافر لوگ اس کے آرزومند ہوں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔''

یہ تمنا دنیا میں بھی ہوسکتی ہے، جب مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہوئی ہیں اور اسلام کے برکات وفوائد محسوس ہوئے ہیں تو ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے اور آخرت میں بھی ہوسکتی ہے جب وہاں کے شدائد اور کفر وعصیان کے نتائج ان کی آنکھوں کے سامنے آئیں گے۔

بہرحال آخرت میں یہ خواہش تو بعد از وقت ہوگی کیوں کہ وہ جزا وسزا کا دن ہے، اس دن عمل کا دروازہ بند ہو چکا ہوگا مگر دنیا میں یہ خواہش اگر صدق دل سے ہو تو وہ سودمند ہوسکتی ہے کیوں کہ اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا موقع ابھی باقی ہے لیکن جو کافر ہیں، ان کے دل میں یہ خواہش چونکہ حقانیت کی تڑپ سے نہیں بلکہ وقتی منافع سے ایک وقتی تاثر کے طور پر ہے لہٰذا اکثر وہ چنگاری ''اندیشہ ہائے سود وزیاں'' کی خاکستر کے نیچے دب کر بجھ جایا کرتی ہے۔

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝۳

''چھوڑ دو انہیں کہ کھائیں اور لذائذ حیات سے بہرہ مند ہوں اور ہوس دنیا انہیں بے خبر بنائے رکھے تو کچھ ہی عرصہ میں انہیں معلوم ہو جائے گا۔''

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۴

''اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم نے تباہ وبرباد کیا مگر یہ کہ اس کے لیے ایک جانا پہچانا نوشتہ موجود تھا۔''

یعنی دنیا اسے ناگہانی آفت سمجھتی ہے مگر حقیقت میں خالق کی جانب سے امت کی بقا وفنا ایک منضبط ومعلوم ضابطہ کے مطابق تھی جو خالق کی طرف سے مقرر ہے۔ [2]

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝۵

''کوئی قوم اپنی مقررہ عمر کی مدت سے نہ آگے بڑھتی ہے اور نہ وہ پیچھے رہتی ہے۔''

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا

---

[1] ۔ انما وصفوا بالکتاب و القرآن لاختلاف اللفظین وما فیهما من الفائدین وان کانا لموصوف وانه (تبیان)

[2] ۔ کتاب معلوم ای اجل مکتوب (علی بن ابراہیم)

مُّنْظَرِيْنَ ⑧

''اورانہوں نے کہا کہ اے وہ جس پر قرآن اتارا گیا ہے، یقینی تم تو دیوانے ہو۔ کیوں نہیں تم لے آتے خود ہمارے پاس فرشتوں کو اگر تم سچے ہو۔'' ہم نہیں اتارتے فرشتوں کو مگر صحیح موقع پر اور انہیں اس وقت میں پھر کوئی مہلت نہ ہو گی۔''

بعد کے گستاخانہ جملہ سے ان کے کہ ''تم تو دیوانے ہو'' یہ ظاہر ہے کہ پہلے ان کا کہنا کہ ''اے وہ جس پر قرآن اتارا گیا ہے۔'' بطور تمسخر تھا۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو ایسا ادعاء رکھتے ہو کہ تم پر قرآن اتارا گیا ہے [1] مگر ہمارے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ تم دیوانے ہو، پھر ہٹ دھرمی والا انہوں نے یہ مطالبہ پیش کر دیا کہ اگر تم سچے ہو تو خود ہمارے پاس فرشتوں کو بلا کر کیوں نہیں دکھا دیتے؟ خالق نے جواب دیا فرشتوں کا اتارا جانا کوئی ہنسی دل لگی کی بات نہیں ہے، وہ امتوں کی طرف بھیجے جاتے ہیں تو عذاب لے کر بھیجے جاتے ہیں، اس وقت جب مہلت کا دور ختم ہو جاتا ہے اور اس امت کا قلع قمع کرنا منظور ہوتا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ⑨

''بلاشبہ ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے اور یقیناً ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

قرآن کی حفاظت کا قطعی وعدہ

یہ آیت اس معرکہ آرا بحث خلق قرآن میں پیش ہوتی رہی ہے جو امت اسلامیہ میں ایک مدت تک ہیجان واضطراب کی باعث رہی۔ اہل سنت کی اکثریت یعنی اشعری لوگ اس کے قائل ہیں کہ قرآن قدیم ہے اور اسے ''حادث'' کہنا کفر ہے حالانکہ قدیم کی لازمی صفت ہے ''لازوال'' اور جو شے ذاتاً لازوال ہو، اس کے لیے حفاظت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، پھر خالق نے یہ کیوں کہا کہ ''ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ [2]

اس کے علاوہ اس آیت کو برابر قرآن مجید کی سالمیت یعنی تحریف وتغیر سے بری، ذمے ہونے کے ثبوت میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔ [3]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ⑩ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑪ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ⑫ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ⑬

''اور ہم نے آپ کے پہلے بھی پیغمبر بھیجے سابق زمانہ کی مختلف جماعتوں میں''۔ اور کوئی پیغمبر ان کے پاس نہیں آتا

---

[1] ۔ نزل عليك على قولك (تبیان)

[2] ۔ في الأية دلالة على حدوث القرآن (تبیان)

[3] ۔ من التبديل و التحريف و الزيادة و النقص (جلالين)

تھا مگر یہ کہ وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔اس طرح ہم اسے داخل کرتے ہیں ان گناہ گاروں کے دل میں۔وہ ان پر ایمان نہیں لائیں گے اور رہا ہے یہی طریقہ اگلے زمانہ والوں کا''۔

''اسے داخل کرتے ہیں ان گناہگاروں کے دلوں میں۔'' یہ ''اسے'' کی ضمیر کی طرف راجع ہے؟ مفسرین اہل سنت جنہیں کسی برائی کے انتساب میں اللہ کی طرف کوئی وحشت محسوس نہیں ہوتی، وہ بلا تکلف اسے مذاق اڑانے یا کفر اختیار کرنے کی طرف راجع کر دیتے ہیں [1] اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان باتوں کا سبب اللہ ہے مگر ہمارے مفسرین اس کے خلاف ہیں۔جناب شیخ الطائفہ نے اس کے لیے قدیم علمائے جمہور کا قول بھی نقل کیا ہے۔بلخی اور جبائی کہتے ہیں کہ ''اسے'' کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے اور اس لیے بعد میں ہے ''وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے''

اگر پہلی جگہ ''اسے'' کی ضمیر کو کفر یا استہزا کی طرف راجع کیا جائے تو ''اس پر ایمان نہیں لائیں گے'' کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اس کفر اور استہزا پر ایمان نہیں لائیں گے، یہ نمایاں طور پر غلط ہے۔ [2]

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۙ﴿۱۴﴾ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

''اور اگر ہم ان پر کھول دیں ایک دروازہ آسمان کا جس سے وہ اس میں چڑھنے لگیں تو وہ کہیں گے کہ یہ ہماری آنکھوں پر نشہ غالب کر دیا گیا ہے بلکہ ہم ایسے لوگ ہیں جن پر جادو ہو گیا ہے۔''

''آنکھوں پر نشہ غالب ہو گیا ہے۔'' اس کے معنی یہ ہیں کہ نظریں صحیح کام نہیں کر رہی ہیں اور ان کی کیفیت غیر فطری ہو گئی ہے۔ [3]

پورا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ نہ ماننے والے کے لیے کوئی معجزہ کارگر نہیں ہے، وہ تو اتنا ہی کہہ رہے ہیں کہ فرشتے خود ہم سے آکر باتیں کیوں نہیں کرتے؟ اگر اس سے بڑھ کر بھی ہو یعنی یہ خود آسمانوں کی طرف بلند ہوں، تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس کی واقعیت کو تسلیم کریں گے بلکہ اسے کسی جادو یا کرتب کا نتیجہ قرار دیں گے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۙ﴿۱۶﴾ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۙ﴿۱۷﴾ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

اور ہم نے آسمان میں بہت سے برج بنائے ہیں اور انہیں سجا یا دیکھنے والوں کے لیے۔انہیں محفوظ رکھا ہے ہر مردود شیطان سے۔سوا اس کے کہ جو چوری چھپے سنے تو اس کا پیچھا کرے گا ایک ٹوٹنے والا تارا جو نمایاں ہوگا۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ

---

[1] ۔ای مثل ادخالنا التکذیب فی قلوب اولئك۔(جلالین)

[2] ۔لو کان المراد انه یسلك الشرك فی قلوبهم یقول انهم لا یؤمنون بالشرك (تبیان)

[3] ۔سکّرت الابصار فلا ینفذنوها ولا تدرك الاشیاء علی حقیقتها (تبیان)

مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ قائم کیے اور اس میں نپی تلی ہوئی ہر قسم کی چیزیں لگائیں۔ اور تمہارے لیے اس میں ذرائع معاش قرار دیے اور ایسے اشخاص جنہیں تم روزی پہنچانے والے نہیں ہو۔

یعنی نوکر، چاکر، عزیز و اقارب، بال بچے سب سے فائدہ اٹھاتے ہو اور رزق پہنچانے والے انہیں حقیقۃً تم نہیں ہو، اللہ ہے۔ [۱]

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

اور کوئی چیز نہیں ہے مگر یہ کہ ہمارے پاس اس کے ذخائر ہیں اور ہم نہیں اتارتے مگر ایک معینہ مقدار پر۔

یعنی جتنی مصلحت متقاضی ہوتی ہے۔ [۲]

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

''اور ہم نے ہواؤں کو بھیجا جو بادلوں کو پانی سے بوجھل بناتی ہیں [۳] اس کے بعد ہم نے اتارا آسمان سے پانی تو اس سے ہم نے تمہیں سیراب کیا اور تم اس کے ذخائر پر قابو نہ رکھتے تھے۔''

آخر کے جملہ کے ایک معنی یہ ہیں کہ ہم بار بار پانی نہ برساتے تو تمہارے بس کی بات نہ تھی کہ ایک دفعہ کے برسے ہوئے پانی کو تم مستقل ذخیرہ کی صورت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھتے [۴] اور یہ بھی کہ تم اس ذخیرہ کہ مالک نہ تھے۔ یہ خدا کا فضل و کرم ہے کہ اسے تمہارے لیے برساتا ہے۔ [۵]

یہاں جناب شیخ الطائفہؒ نے عجیب بات کی ہے جسے سوا ''مسامحہ'' کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اصل آیت کے آخر میں ہے: وما انتم له بخازنين جس کا ترجمہ اور مطلب ابھی ہم نے لکھا مگر موصوف کے ذہن میں اس مقام پر آ گیا: وما انتم له برازقين اور انہوں نے شرح اس کی فرما دی۔ [۶]

لطف یہ ہے کہ تبیان کا جدید ایڈیشن مطبوعہ دار الاندلس تحقیق و تصحیح احمد حبیب قصیر العالی کے ساتھ شائع ہوا مگر اس میں بھی حاشیہ پر اس مسامحہ کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔

---

[۱] ۔من العبید و الدواب و الانعام و انّما یرزقهم الله (جلالین)

[۲] ۔علی حسب المصالح (جلالین)

[۳] ۔تلقح السحاب فیمتلی ماء (جلالین)

[۴] ۔ذای لا تقدرون ان تحزنوه (علی بن ابراهیم)

[۵] ۔ای لیست خزائه بایدیکم (جلالین)

[۶] ۔''وما انتم اله برازقین'' ای لستم تقدرون ان ترزقوا احد ذلك الماء (تبیان)

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾

بلاشبہ ہم زندہ کرتے ہیں اور ہم مارتے ہیں اور ہم ورثہ پانے والے ہیں۔

یعنی سب کی فنا کے بعد ذات الٰہی باقی رہنے والی ہے یہی باختلاف الفاظ تمام مفسرین کے تشریحات کا مطلب ہے۔[1]

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

''اور ہم جانتے ہیں تم میں سے آگے والوں کو اور جانتے ہیں پیچھے والوں کو۔ اور یقیناً تمہارا پروردگار وہی انہیں حشر میں اٹھائے گا بلاشبہ وہ بالکل ٹھیک کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا۔''

''آگے والوں کو'' اور ''پیچھے والوں کو''.....اس کے مفہوم میں جناب شیخ الطائفہؒ نے چار قول بیان کیے ہیں:۔

ایک آگے والے جو گزر گئے اور پیچھے والے جو باقی ہیں۔

دوسرے خلقت کا اول حصہ اور آخری حصہ

یہ دونوں باتیں قریب ہی قریب ہیں اور اہل سنت کی تفسیر جلالین اس کے موافق ہے کہ:

المستقدمين منكم اى من تقدم من الخلق من لدن ادم و لقد علمنا المستاخرين المتأخرين الى يوم القيامة

''تم میں آگے والوں کو'' یعنی جو مخلوق آدم کے بعد سے اب تک تھی اور ''ہم جانتے ہیں پیچھے والوں کو یعنی اب سے لے کر قیامت تک کی مخلوق''

تیسرا قول ان دونوں سے الگ ہے کہ ''آگے والو'' کے معنی نیک کاموں میں آگے رہنے والے اور پیچھے والے'' نیک کاموں میں پیچھے رہنے والے، اور چوتھا جسے شان نزول کے طور پر بیان کیا گیا ہے، یہ ہے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز جماعت میں پہلی صف میں رہنے کی جو تاکید فرمائی تو بعض مسلمانوں نے جو کسی دور دراز مقام پر رہتے تھے یہ ارادہ کیا کہ وہ اپنا گھر فروخت کر کے کہیں قریب کی جگہ پر آ کر بس جائیں تاکہ پہلی صف میں شریک ہو سکیں تو یہ آیت نازل ہوئی مطلب یہ ہے کہ اللہ آگے والوں اور پیچھے والوں کی نیتوں کے لحاظ سے انہیں جزا عطا کرے گا بعد میں جو حشر میں اٹھانے کا ذکر ہے، وہ ان میں سے ہر قول کے ساتھ مرتبط ہو سکتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ وَالْجَاۗنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

---

[1] ۔الوارثون الباقون نرث جميع الخلق (جلالين) اذا افنى الخلق ولم يبين احد كانت الاشياء كلها راجعة اليه ينفرد بالتصرف فيها و كان هو الوارث الجميع الاملاك (تبيان) یعنی ہر کوئی مرتا جاتا ہے اور اس کی کمائی اللہ کے ہاتھ میں رہتی ہے (موضح القرآن)

اور ہم نے پیدا کیا ہے انسان کو گندھی ہوئی مٹی سے جو سوکھ کر کھنکھڑ ہو گئی۔ اور قوم جن کو اس سے پہلے پیدا کیا ہم نے انتہائی تپتی ہوئی جان لیوا آگ سے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿٢٨﴾ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ ﴿٢٩﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ﴿٣٠﴾ إِلَّآ إِبْلِيسَ ط أَبٰٓى أَن يَكُونَ مَعَ السّٰجِدِينَ ﴿٣١﴾

''اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں پیدا کرنے والا ہوں ایک انسان کو گندھی ہوئی کھنکھڑ مٹی سے۔ تو جب میں اسے ٹھیک کرلوں اور اس میں اپنی خاص روح پھونک دوں تو گر جانا اس کے لیے سجدہ میں۔ تو فرشتوں میں سے سب نے سجدہ کیا۔ سوا ابلیس کے اس نے اس بات سے کہ وہ سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دے، انکار کیا۔''

فرشتوں کو سجدۂ آدمؑ کا حکم اور شیطان کی سرتابی

روح کی نسبت اللہ کی طرف کہ ''اس میں اپنی روح خاص پھونک دوں'' اس روح کے امتیاز خاص کا اظہار ہے کہ یہ روح صفات الٰہی کی حد امکان میں جلوہ ہے [1] اور اسی کی بنا پر اسے امتیازی عظمت بھی حاصل ہے [2]۔

باقی امور کہ یہ سجدہ کیسا تھا اور ملائکہ سے ابلیس کا استثناء کیا نوعیت رکھتا ہے؟ پہلے پارے میں اس واقعہ کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے۔ اب دوبارہ یہاں ان کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

قَالَ يٰٓإِبْلِيسُ مَا لَكَ أَلَّا تَكُونَ مَعَ السّٰجِدِينَ ﴿٣٢﴾ قَالَ لَمْ أَكُن لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿٣٣﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ﴿٣٤﴾ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلٰى يَوْمِ الدِّينِ ﴿٣٥﴾ قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿٣٦﴾ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿٣٧﴾ إِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ﴿٣٨﴾

''ارشاد ہوا اے ابلیس! تجھے کیا ہے کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہ ہوا؟۔ اس نے کہا میں سجدہ کرنے کا نہیں ایک آدمی کو جسے تو نے کھنکھڑ مٹی سے پیدا کیا ہے۔ ارشاد ہوا تو پھر تو اس میں سے نکل، تو اب راندہ دیا گیا ہے۔ اور یقیناً تجھ پر لعنت ہے روز قیامت تک۔ اس نے کہا اے میرے مالک! تو پھر مجھے تو ڈھیل دیدے اس دن تک کہ جب

---

[1] ۔ اپنی جان یعنی خاص جس میں نمونہ ہے اللہ کے صفات کا حکم اور تدبیر اور یاد حق کی اور لگاؤ اللہ سے (موضح القرآن)

[2] ۔ اضاف روح ادم الی نفسه تكرمة له (تبیان)

لوگ قبروں سے اٹھیں گے۔ کہا تو ان میں سے ہے جنہیں ڈھیل دی گئی ہے۔ مقررہ وقت والے دن تک''۔

اس کے اس سوال پر کہ اسے قیامت تک کی مہلت دی جائے جو قدرت کا جواب ہے اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ جو اس نے التجا کی تھی، وہ قبول کی گئی اور یوم الوقت المعلوم سے قیامت ہی مراد ہے۔ اس صورت میں جواب قدرت گویا یہ ہے کہ اچھا جا تجھے اس دن تک مہلت دی گئی۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ اس کی التجاء بجنسہ قبول نہیں ہوئی۔ اس نے قیامت تک باقی رہنے کے لیے کہا تھا مگر خالق نے وقت معلوم والے دن ہی تک باقی رکھنے کا اقرار کیا تھا اس سے وہ دن مراد ہے جس کے بعد عام بندوں پر تکالیف شرعیہ کا دور ختم ہو جاتا ہے یعنی جب پہلا دور حیات آخری نسل انسانی کا ختم ہو جائے گا اور اب ہدایت پانے اور گمراہ ہونے کا سوال نہیں رہے گا تو اس کے بعد ابلیس کو بھی موت آ جائے گی، پھر جس طرح سب پاداش عمل کے لیے دوبارہ زندہ ہوں گے، اسی طرح ابلیس بھی، اس طرح خالق کا جواب گویا اس کے معروضہ پر یہ ہے کہ نہیں۔ تجھے بس یوم وقت معلوم تک کی مہلت دی جاتی ہے [1]۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ ۳۹ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ ۴۰ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ۝ ۴۱ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ ۴۲ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ ۴۳ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ۭ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۝ ۴۴

''اس نے کہا اے میرے مالک! اب جب تو نے مجھے گمراہ قرار دے دیا تو میں بھی ضرور ان لوگوں کے لیے روئے زمین میں گناہوں کو آراستہ بنا کر پیش کروں گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا۔ سوا ان میں سے تیرے خالص قرار دیے ہوئے بندوں کے۔ ارشاد ہوا کہ یہ سیدھا راستہ ہے مجھ پر لازم وضروری۔ یقیناً میرے خاص بندے تجھے ان پر کوئی قابو نہ ہوگا سوا گمراہوں کے جو تیری پیروی کریں اور یقیناً دوزخ وہ جگہ ہے جس کا ان سب سے وعدہ ہے۔ اس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازہ کے لیے ان میں سے ایک حصہ مقرر ہے۔''

قیامت تک سلسلۂ معصومین علیہ السلام کی بقاء کی ضمانت

بما اغویتنی کے ترجمہ میں باختلاف عقائد فرق ہے ہم جو عدل کے قائل ہیں اور غلط کاموں کا انتساب خالق کی طرف اس کی شان جلال وکمال کے منافی سمجھتے ہیں، اس طرح کے ترجمہ پر مجبور ہیں جو میں نے کیا ہے کہ ''جب تو نے مجھے گمراہ قرار دے دیا'' یا اسی طرح کا مفہوم جس

---

[1] ۔ الذی ھو اٰخر ایام التکلیف (تبیان)

سے خالق کا سبب گمراہی ہونا ظاہر نہ ہو [1] مگر دوسرے جو عدل کے قائل نہیں ہیں اور قبائح وشرور کی نسبت خدا کی طرف درست سمجھتی ہیں، وہ بے جھجک اس کا ترجمہ یوں کر دیتے ہیں کہ ''تو نے مجھے گمراہ کیا۔'' [2]

بے شک ایک پہلو اس ترجمہ کی صحت کا یہ ہوسکتا ہے کہ یہ تو ابلیس کا قول ہے ہوسکتا ہے کہ اس غلط عقیدہ کا بھی خالق سے شر کا صدور ہوسکتا ہے، آغاز ابلیس سے ہوا ہو اور اس کا مطلب یہ ہو کہ تو نے مجھے گمراہ کیا تو اب میں تیری مخلوق کو گمراہ کروں گا جیسا کہ موجودہ زمانہ کے ایک شاعر صاحب نے جو اپنے اشعار میں دہریت والحاد کے علمبردار رہے ہیں، اپنے ایک شعر میں یہ سوال اٹھایا ہے اور کہا ہے کہ:۔

''شیطان کو گمراہ کیا ہے کس نے؟''

تو شاعر سے پہلے اس تصور کے ایجاد کا سہرا بھی خود ابلیس کے سر ہو، تو کیا تعجب ہے؟!

اس پہلو کو بھی جناب شیخ طوسیؒ نے تحریر فرمایا ہے۔ [3]

اس صورت میں بما اغویتنی میں جو ''ب'' ہے، جسے کسی نے قسم کا اور کسی نے سببیت کا قرار دیا ہے، اس کا ایک تیسرا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ وہ عوضیہ ہو یعنی اس عوض میں کہ تو نے مجھے گمراہ کیا، اب میں تیرے بندوں کو گمراہ کروں گا، ممکن ہے کسی وقت اس پہلو کو میری نظر میں اتنی قوت پہنچ جائے کہ میں ترجمہ آیت کا اس کے مطابق کروں۔

دوزخ کے سات دروازے

دوزخ کے لیے کہا جارہا ہے کہ ''اس کے سات دروازے ہیں'' شاہ عبدالقادر کہتے ہیں کہ:۔

''جیسے بہشت کے آٹھ دروازے ہیں نیک عمل والوں پر بانٹے ہوئے، ویسے ہی دوزخ کے سات دروازے ہیں بدعمل والوں پر بانٹے ہوئے، شاید بہشت کا ایک دروازہ زیادہ ہے کہ بعض لوگ اس کے تفضّل سے جائیں گے بغیر عمل، باقی عمل میں دروازے برابر ہیں'' (موضح القرآن)

''شاید'' کے ساتھ بلا ثبوت اگر توجیہہ کا دروازہ کھولا جائے تو شاید زیادہ قرین عقل اور مطابق حقائق دینیہ یہ ہے کہ سات دروازے بہشت کے عام نیکوکاروں کے لیے ہیں جو حساب وکتاب کے بعد مستحق بہشت قرار پائیں اور ایک دروازہ ان بلند مرتبہ نفوس کے لیے ہے جن کے یہاں حساب کتاب کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ خود دوسروں کے لیے ''موازین اعمال'' کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کی محبت واطاعت معیار استحقاق جنت ہے۔''

دوزخ کے ساتھ دروازوں کے متعلق ایک تصور یہ ہے کہ ان کا تعلق سات طبقوں سے ہوسکتا ہے جو کہ شدت عذاب میں ایک دوسرے

---

[1] ۔بما اغویتنی ای فیما خیّبتنی من رّحمتك لانّ الغیّ الخیبة وقال قوم معناہ بما نسبتنی الی الغیّ و حکمت علّی بالغیّ وقال البلخی معناہ فیما کلفتنی السجود لآدم الذی غویت عندہ کما قال فزادتهم رجسا الیٰ رجسهم المازدادو اعندها (تبیان)

[2] ۔ای باغرائك لی والباء للقسم (جلالین) بسبب آن کہ گمراہ کردی مرا (شاہ ولی اللہ) بسبب اس کے گمراہ کیا تو نے (شاہ رفیع الدین)

[3] ۔علی ان هذا اقول ابلیس ویجوز ان یکون اعتقد ان اللہ خلق فیه الغوایة فکفر بذٰلك کما کفرب الامتناع عن السجود (تبیان)

سے بڑھے ہوئے ہیں۔اس روایت کی نسبت امیر المومنین کی طرف بھی ہے۔[1]

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝۴۵ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝۴۶ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝۴۷ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝۴۸

بلاشبہ پرہیز گار لوگ بہشتوں اور چشموں کے اندر ہیں، داخل ہوں گے ان میں سلامتی کے ساتھ امن واطمینان رکھتے ہوئے۔اور ہم نے دور کر دیا اسے جو ان کے سینوں میں کینہ تھا۔اب وہ آپس کے بھائی بھائی ہیں،تختوں پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے۔نہ ان کو چھو جائے گی ان میں کوئی زحمت اور نہ وہ ان سے نکالے جانے والے ہیں۔

اہل بہشت کے دلوں سے کینہ وعداوت کا دور ہونا

اس سے کہ ''ہم نے دور کر دیا اسے جو ان کے سینہ میں کینہ تھا،اب وہ آپس کے بھائی ہیں''اہل سنت نے اپنے اس تصور میں سہارا لیا ہے کہ بعد رسول صحابہ میں جو آپس میں اختلافات ہوئے،ان میں دونوں فریق آخرت میں رستگار ہوں گے چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''یعنی دنیا میں جو کچھ آپس میں خفگی تھی، جی صاف ہو گئے،اس لیے معلوم ہوا کہ کبھی دو آدمیوں میں خفگی ہوئی ہے اور دونوں بہشتی ہیں جیسے حضرت کے اصحاب''(موضح القرآن)

''لیکن غور کیجئے تو یہ خفگی اور باہمی ناراضگی جس کا ذکر یہاں ہے، وہ باہمی خفگی ہوسکتی ہے جس کا دینی نظریات سے کوئی تعلق نہ ہو لیکن جہاں اختلاف حق و باطل کا ہو، یا ایسے افراد سے اس خفگی کا تعلق ہو جن کے رضا وغضب کو معیار نجات و ہلاکت قرار دیا گیا ہو،کسی کے لیے رسول کا ارشاد ہو:

حُبُّكَ اِيْمَانٌ وَبُغْضُكَ كُفْرٌ وَّنِفَاقٌ

(یعنی) تمہاری محبت ایمان ہے اور تم سے عداوت کفر ونفاق ہے۔

اور

حَرْبُكَ حَرْبِيْ وَسِلْمُكَ سِلْمِيْ

تم سے برسر جنگ ہونا مجھ سے برسر جنگ ہونا اور تم سے مصالحت رکھنا مجھ سے میل رکھنا ہے۔

اور کسی کے لیے پیغمبرؐ کا ارشاد ہو:

مَنْ اٰذَاهَا فَقَدْ اٰذَانِيْ وَمَنْ اَغْضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِيْ

---

[1] ۔قال علی علیہ السلام والحسن وقتادۃ وابن جریج: اطباق بعضھا فوق بعض (تبیان)

''جس نے اسے اذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت پہنچائی اور جس نے اسے غضبناک کیا، اس نے مجھے غضبناک کیا۔''
تو ایسے افراد سے مخالفت وکینہ پروری بلکہ جنگ اور ظلم وتعدی اس حکم قرآنی میں کیوں کر داخل ہوسکتی ہے؟!

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿٤٩﴾ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿٥٠﴾

''میرے بندوں کو اطلاع دے دو کہ میں بڑا بخشنے والا، مہربان ہوں۔ اور یہ بھی کہ میرا عذاب بڑا تکلیف دہ عذاب ہے۔''

''امید وبیم'' کا اجتماع ہی ایمان کا جوہر ہے اور اس اعلان کے دونوں جز اس کی تکمیل ہیں [1]۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿٥١﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿٥٢﴾ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿٥٣﴾ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓي اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿٥٤﴾ قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿٥٥﴾ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ ﴿٥٦﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٥٧﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿٥٨﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥٩﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۙ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٦٠﴾

''اور ان لوگوں سے بیان کیجئے واقعہ ابراہیم کے مہمانوں کا۔ جب کہ وہ ان کے پاس داخل ہوئے اور سلام کیا، انہوں نے کہا، ہمیں تو تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈریئے نہیں۔ ہم آپ کو ایک بڑے صاحب علم بچہ کی خوش خبری دیتے ہیں۔ کہا کیا تم مجھے اس کی خوش خبری دیتے ہو اس عالم میں کہ کبر سنی مجھ پر چھا چکی ہے تو یہ کیا خوش خبری ہے جو تم مجھے دیتے ہو؟۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے آپ کو سچائی کے ساتھ خوش خبری دی ہے تو نہ ہو جایئے نا امید ہونے والوں میں۔ انہوں نے کہا اور اپنے پروردگار کی رحمت سے نا امید کون ہوگا سوا گمراہ لوگوں کے۔ کہا اچھا تمہاری اصل مہم کیا ہے؟ اے بھیجے جانے والو۔ انہوں نے کہا ہم بھیجے گئے ہیں ایک گنہگار جماعت کی طرف۔ سوا لوط کے گھر والوں کے، بلاشبہ ہم ان سب کو چھٹکارا دیں گے۔ سوا ان کی بیوی کے، ہم نے طے کرلیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ سے چھوٹ جانے والوں میں سے ہوگی [2]۔''

فرشتوں کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں آنا اور ولادت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت

---

[1] ۔فلا تعوّلوا علی محض غفرانی و خافوا عقابی و کونوا علی حذر باجتناب و معاصی و العمل بطاعتی (تبیان)
[2] ۔الباقین فی العذاب لکفرها (جلالین)

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ڈر کیوں محسوس ہوا؟ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''ظاہراً'' کچھ سبب نہ تھا ڈر کا، پر ان کے ساتھ جو حکم تھا عذاب، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل پر اس کا اثر پڑا، دل کی صفائی سے یہ ہوتا ہے'' (موضح القرآن)

جلالین نے ایک دوسرے مقام پر جو قرآن میں تذکرہ ہے، اس سے اسے مرتبط کیا ہے جو بعید نہیں ہے کہ صاحب سلامت کے بعد جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غذا پیش کی اور انہوں نے ہاتھ نہیں بڑھایا، تب انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں تو تم سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ [1]

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ضعف پیری کی بنا پر تعجب، اس پر شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

''معلوم ہوا کہ کامل بھی ظاہر اسباب پر بولتے ہیں۔'' (موضح القرآن)

یہ جملہ حقیقت کے لحاظ سے صحیح بلکہ نا قابل انکار ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِالْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾

''تو جب وہ بھیجے ہوئے (فرشتے) لوط علیہ السلام کے پاس آئے۔ تو انہوں نے کہا کہ تم لوگ تو اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ بلکہ ہم آئے ہیں اس (عذاب) کو لے کر جس میں یہ لوگ شک کرتے تھے۔ اور آپ کے پاس ہم حق کے ساتھ آئے ہیں اور بلاشبہ ہم سچے ہیں۔ تو نکل جایئے گا آپ اپنے گھر والوں کو لے کر رات کے ایک حصہ میں اور آپ ان کے پیچھے پیچھے چلئے گا اور آپ میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور چلے جایئے گا جہاں آپ کو حکم ہوگا۔ اور ہم نے انہیں اس فیصلہ کی اطلاع دے دی کہ صبح ہوتے ہوتے ان لوگوں کی اصل نسل ختم ہو جائے گی''۔

قوم لوط علیہ السلام پر عذاب کے لئے اُنہی فرشتوں کا جانا

''کوئی مڑ کر پیچھے نہ دیکھے''..... قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے کہ زوجہ لوط علیہ السلام نے اس حکم کی خلاف ورزی کی جس کے بعد وہ بھی عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئی۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔ ''عورت دل سے منافق تھی لیکن حق تعالیٰ بغیر تقصیر ظاہر کے عذاب نہیں کرتا، ایک حکم ایسا بھیجا کہ اس سے نہ ہو سکا، وہ یہ کہ پیٹھ پھیر کر نہ دیکھو، پھر اس گناہ پر عذاب میں پکڑا۔'' (موضح القرآن) ''مڑ کر پیچھے دیکھنے کا'' ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ کوئی دل چسپی اور لگاؤ اس قوم سے ثابت نہ ہو۔ اگر انسان کو ان سے تعلق خاطر ہو تو ان کے انجام کے متعلق فکر لگی رہے گی کہ ان پر کیا گزری یا ان کے مفارقت شاق ہوگی تو فطری طور سے مڑ کر دیکھے گا حسرت سے کہ اب ان سے جدائی ہو رہی ہے لیکن نہ ان کی کوئی فکر ہے، نہ ان سے کوئی وابستگی تو

---

[1] ۔ قال ابراھیم لما عرض علیھم الاکل فلم یاکل (جلالین)

مڑ کر دیکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ ''پیچھے مڑ کر نہ دیکھے'' کوئی مستقل حکم نہیں ہے بلکہ یہ حکم الٰہی پر بلا تامل روانہ ہونے اور سفر کے جاری رکھنے کی تاکیدی تعبیر ہے جیسے محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ ادھر ادھر نہ دیکھو، بس آگے بڑھتے رہو۔ [1]

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿٦٨﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿٦٩﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٧١﴾ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٢﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿٧٣﴾ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿٧٤﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿٧٥﴾ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿٧٦﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾

''اور آئے اس شہر والے خوش ہوتے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں تو مجھے رسوا نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرو اور مجھے ذلیل نہ کرو۔ ان لوگوں نے کہا کیا ہم نے تم کو تمام دنیا (کے لوگوں کو مہمان کرنے) سے منع نہیں کیا تھا؟۔ کہا یہ میری لڑکیاں موجود ہیں اگر تم کچھ کرنے والے ہو۔ قسم آپ کی جان کی وہ اپنے نشہ میں اندھا دھند مبتلا ہیں۔ تو انہیں سورج نکلتے نکلتے ایک دھماکے نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ تو ہم نے اس کو تہہ و بالا کر دیا اور برسائے ان پر کنکروں کی قسم کے پتھر۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں غور سے دیکھنے والوں کے لیے۔ اور وہ ایک راستے پر ہے جو اب تک برقرار ہے۔ بلاشبہ اس میں نشانی ہے ایمان والوں کے لیے''۔

درمیان میں جو یہ فقرہ ہے کہ قسم آپ کی جان کی، وہ اپنے نشہ میں اندھا دھند مبتلا ہیں۔'' یہ اسی قوم لوط سے متعلق ہے اور ہمارے رسولؐ سے خطاب کر کے [2] انہی کے حال پر تبصرہ کیا گیا ہے جیسا کہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ حضرتؐ کو فرماتا ہے قسم تیری جان کی، وہ قوم لوط اپنی مستی میں ان کی بات نہیں سنتے'' (موضح القرآن) یا یہ درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر خود خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے مشرکین کی حالت کا بیان ہے جیسا کہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: ''ایں کلمہ در وسط قصۂ حضرت لوطؑ یاد کردہ شد تا تنبیہ باشد بر تطبیق حال مشرکین مکہ بر حال قوم لوط و امثال ایشاں'' (فتح الرحمن) بہرصورت پیغمبرؐ سے خطاب کر کے یہ لفظ لعمرك قسم آپ کی جان کی، وہ مخصوص انداز تخاطب ہے جو ہمارے رسولؐ کے سوا کسی پیغمبر کو حاصل نہیں، اور وہ آپ کی شان حبیب اللہ ہی کا ترجمان ہے۔ [3]

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿٧٨﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ

---

[1] ۔ کما یقول القائل امض لشانك ولا تعرج علی شئی (تبیان)

[2] ۔ خطاب للنبی ﷺ ای وحیاتك (جلالین)

[3] ۔ فھذہ فضیلة لرسول اللہ ﷺ علی الانبیآء (علی بن ابراھیم)

مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾

''اور بے شک ایکہ والے ظالم لوگ تھے۔تو ہم نے ان سے بدلہ لیا اور یہ دونوں شاہراہ عام پر ہیں جو نمایاں ہے''۔

اصحاب ایکہ کا معذّب ہونا

''دونوں''یعنی قوم لوط اور اصحاب ایکہ کے شہر گزرگاہ عام پر ہیں جس طرف سے برابر مشرکین، مکہ سے شام جانے میں گزرتے رہتے ہیں تو یہ ان سے عبرت کیوں حاصل نہیں کرتے۔[۱] اصحاب ایکہ کون تھے؟اس کے متعلق شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔''ایکہ کے رہنے والے یعنی قوم شعیب مدین میں رہتے تھے اور پاس اس شہر کے درختوں کا بن تھا، وہاں بھی رہتے تھے''(موضح القرآن)

یہ جلالین سے ماخوذ ہے:الایکة هی غیضة شجرت بقرب مدین وهم قوم شعیب۔

ہماری قدیم تفسیر بھی اس سے متفق ہے۔[۲] ایک خیال یہ ہے کہ جناب شعیبؑ دو گروہوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ایک اہل مدین وہ صیحہ آسمانی سے ہلاک ہوئے اور دوسرے اہل ایکہ، یہ آتشیں بگولے میں گرفتار ہوئے۔[۳]

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾

''اور حجر والوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔اور ہم نے انہیں اپنی نشانیاں عطا کیں تو وہ ان سے روگردانی کرنے والے ثابت ہوئے۔اور وہ پہاڑوں کو تراش کر اطمینان کے ساتھ گھر بناتے تھے۔تو ان کو صبح ہوتے ہوتے ایک دھماکے نے گرفت میں لے لیا۔تو نہیں فائدہ دیا ان کو اس نے جو وہ حاصل کرتے تھے''۔

اصحابِ حجر کا تذکرہ

''حجر''والوں سے قوم ثمود مراد ہے حجر اس جگہ کا نام ہے جہاں وہ آباد تھے۔[۴] دوسرے مقامات پر قوم ثمود کی جانب صرف جناب صالح علیہ السلام کے مبعوث ہونے کا ذکر ہے مگر یہاں کہا جارہا ہے کہ''پیغمبروں کو جھٹلایا''ممکن ہے کہ ان کے پاس برابر پیغمبر آتے رہے ہوں جن کی وہ تکذیب کرتے رہے اور آخری پیغمبر جن کی تکذیب کے بعد عذاب نازل ہوا، جناب صالح علیہ السلام ہوں اور ممکن ہے جناب صالح علیہ السلام ہی کی جو

---

[۱] ۔انهما ای قوم لوط والایکة لبامام طریق مبین واضح افلا یعبتربهم اهل مکة (جلالین)

[۲] ۔اصحاب الغیطة وهم قوم شعیب (علی بن ابراهیم)

[۳] ۔ارسل الی اهل مدین فاهلکو ابالصّیحة و اصحاب الایکة فاهلکوا بالظلة التی احترقو ابنارها (تبیان)

[۴] ۔الحجر وادیین المدینة والشام وهم ثمود (جلالین)

تکذیب انہوں نے کی اسے ''پیغمبروں کی تکذیب کہا گیا اس اعتبار سے کہ پیغام سب پیغمبروں کا ایک ہی ہے۔[1] ''جو وہ حاصل کرتے تھے'' اس سے مراد مال و دولت بھی ہوسکتا ہے[2] اور سیاہ کاریاں اور ہوس رانیاں بھی جو وہ اختیار کیے ہوئے تھے۔[3]

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾

''اور ہم نے نہیں پیدا کیا آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کو مگر بالکل درست اور یقیناً قیامت آنے والی ہے تو آپ اچھے عنوان سے درگزر کرتے رہیے۔ یقیناً آپ کا پروردگار پیدا کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾

''اور بلاشبہ ہم نے آپ کو عطا کی ہیں سات دہرائی جانے والی آیات اور عظیم قرآن''۔

سبعہ مثانی اور قرآن

''سبع مثانی'' کی تفسیر میں اختلاف ہے مگر جس قول کی تائید میں حدیث رسولؐ بھی وارد ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ ''سات دہرائی جانے والی آیات'' سے مراد سورۂ حمد ہے۔[4] جس کی آیات کی تعداد سات ہے اور اس کا پڑھنا ہر ایک پر لازم ہے[5]۔ اس کا بلحاظ خصوصیت و اہمیت تمام قرآن سے پہلے امتیازی طور پر ذکر کیا گیا ہے بلکہ بعض علماء کا خیال ہے کہ اسی سورہ حمد کو ''قرآن عظیم'' بھی کہا گیا ہے، اس لیے کہ لفظ قرآن جس طرح کل کتاب کا نام ہے، اسی طرح ہر جز پر بھی صادق ہے۔[6] مگر زیادہ رجحان اسی کو ہے کہ قرآن عظیم سے سورہ حمد کے علاوہ پورا قرآن مراد ہے۔[7]

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَقُلْ اِنِّيْۤ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾

''نہ بڑھایئے اپنی آنکھوں کو ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے بہرہ مند کیا ہے ان میں سے مختلف طرح کے

---

[1] ۔ بتکذیبهم صالحا لانّه تکذیب لباقی الرّسل لاشتراکهم فی المجیئ بالتوحید (جلالین)

[2] ۔ ما کانوا یکسبون من نبآء الحصون و جمع الاموال (جلالین)

[3] ۔ ما کانوا یکسبون من الملاذ القبیحة (تبیان)

[4] ۔ فاتحة الکتاب (علی بن ابراهیم) روی عن النبی ﷺ قال: السمیع المثانی ام القرآن (تبیان)

[5] ۔ هی سبع اٰیات بلا خلاف فی جملتها و انما سمیت مثانی لانها شئی فی صلوة و قراة (تبیان)

[6] ۔ سات آیات مکرر کہا سورہ فاتحہ کو اور بڑا قرآن بھی اسی کو کہا۔ ہر سورہ قرآن ہے، یہ سب سے بڑا ہے، درجہ میں (موضح القرآن)

[7] ۔ تقدیره و اٰتیناك القراٰن العظیم سوی الحمد (تبیان)

لوگوں کو [1] اور نہ ان پر رنج کیجئے اور جھک کر ملئے ایمان والوں سے۔ اور کہئے کہ میں تو کھلا ہوا عذاب سے ڈرانے والا ہوں''۔

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿٩٠﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿٩١﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٩٢﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾

''جس طرح ہم نے نازل کیا تقسیم کرنے والوں پر۔ جنہوں نے کتاب الٰہی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تو قسم تمہارے پروردگار کی، ہم ان سے جواب طلب کریں گے۔ اس کے متعلق جو وہ کرتے تھے'' ''ہم نے نازل کیا'' یعنی عذاب۔

''تقسیم'' سے کیا مراد ہے؟ وہی جسے دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے کہ ''نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ'' کسی جز پر ایمان لاتے ہیں یا اس پر عمل کرتے ہیں اور کسی جز کا انکار کرتے ہیں یا اس پر عمل کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ [2] اب چونکہ یہ اہل کتاب کا ذکر ہے، اس لیے کہا گیا ہے کہ یہاں قرآن سے مراد خود ان کی کتاب یعنی توریت ہے [3] مگر توریت کی تعبیر کے لیے لفظ ''قرآن'' سے مجھے کوئی نظیر قرآن مجید میں معلوم نہیں ہے۔ دوسرے معنی تقسیم کے یہ کہے گئے ہیں کہ مشرکین نے مکہ معظّمہ کے راستوں کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا کہ وہ وہاں گردش کر کے لوگوں کو اسلام سے روکتے تھے، اب ''مقتسمین'' کا لفظ تو اس طرح کچھ بن جاتا ہے مگر یہ لوگ قرآن کے ٹکڑے ٹکڑے کس طرح کرتے تھے؟ یہ سمجھ میں نہیں آیا۔

تیسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ قرآن کے بارے میں وہ تقسیم ہو گئے ہیں، کوئی سحر کہتا ہے اور کوئی کہانت اور کوئی شعر۔

یہ دونوں قول بھی جلالین نے درج کیے ہیں۔ جناب شیخ الطائفہؒ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ اس قوم ثمود کے لوگ مراد ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں دوسری جگہ یہ ہے کہ انہوں نے آپس میں قسمیں کھا کر جناب صالح علیہ السلام کی مخالفت اور ان کی جان لینے کا منصوبہ بنایا۔ [4] اس میں بھی المقتسمین کے ساتھ دوسرا ٹکڑا چسپاں نہیں ہوتا مشکل یہ ہے کہ ان اقوال میں سے کوئی بھی قول کسی معصومؑ سے مروی نہیں ہے، اس لیے الفاظ آیت بجائے خود محکم ہوں بھی تو ہمارے لیے از قسم متشابہات ہو گئے ہیں جن کے معنی کو وثوق کے ساتھ معین کرنے سے ہم قاصر ہیں۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٤﴾

''تو ظاہر کیجئے آپ اسے جس پر آپ مامور ہیں اور مشرکین کا کوئی خیال نہ کیجئے''۔

یعنی اس کی پرواہ نہ کیجئے کہ اس اعلان کے بعد مشرکین کیا کیا کہیں گے اور کیا کریں گے۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿٩٥﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ

---

[1] ۔اضافا منهم (جلالين)

[2] ۔یعنی بر اهل کتاب که بر بعض آیات عمل می کردند و بر بعض نه (فتح الرحمن)

[3] ۔المقتسمين اليهود و النصارىٰ الذين جعلوا القرآن اى كتبهم المنزلة عضين اجزاء حيث اٰمنوا ببعض و كفروا ببعض (جلالين)

[4] ۔قال ابن زيد هم قوم صالح تقاسموا انبيتنه واهله (تبيان)

يَعْلَمُوْنَ﴿۹۶﴾

''ہم نے آپ کی طرف سے نپٹ لیا ہے ان تمسخر کرنے والوں سے۔ جو اللہ کے ساتھ دوسرا خدا قرار دیتے ہیں تو ان کو بہت جلد انجام کا حال معلوم ہوگا''۔

''تفاسیر بتلاتی ہیں کہ یہ کچھ خاص مشرکین تھے [1] جو طرح طرح کی بلاؤں میں گرفتار ہو کر ختم ہو گئے اور عذاب آخرت کے پہلے عقوبت میں گرفتار ہوئے۔ [2] ''معلوم ہوگا'' یہ ان کے عمل کی اخروی پاداش پر تنبیہ ہے بلکہ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کی سزا ان آفتوں سے جو اس دنیا میں ان پر پڑیں مل گئی۔ انہیں بلکہ آخرت کی سزا اس کے علاوہ ہے جس کا حال انہیں بعد میں معلوم ہوگا۔ [3]

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴿۹۹﴾

''اور ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو دل تنگی ہوتی ہے اس سے جو وہ باتیں کرتے ہیں۔ تو آپ اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے۔ اور سجدہ کرنے والوں میں سے رہیے۔ اور عبادت کیجئے اپنے پروردگار کی جب تک کہ موت والی یقینی ساعت سامنے آئے''۔

مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے فرائض عبودیت کو آخر نفس تک انجام دیتے رہیے، پھر خلق خدا کی پرواہ نہ کیجیے کہ وہ آپ کے لیے کیا کیا کہتی ہے۔ اسی کو سورہ کوثر میں یوں کہا گیا ہے کہ:۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ. اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ: آپ نمازیں پڑھتے رہیے اور قربانی کا فرض ادا کیجیے، جو آپ کا دشمن ہے، اسی کی نسل قطع ہوگی

موت کو یقین اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ بالکل یقینی چیز ہے جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

جمہور علمائے امت اس کی یہی معنی سمجھتے اور کہتے ہیں۔ [4]

---

[1] ۔المستهزء ون برسول الله خمسة (علی بن ابراهیم) خمسة نفرمن قریش: الولدین المغیرة والعاص بن وائل و ابوزمعةوالا سودبن عبدالغوث والحرث بن عطیلة.(تبیان)

[2] ۔اهلكنا كلّامنهم بأفة (جلالین)

[3] ۔یعلمون وبال ذٰلك یوم القیٰمة (تبیان)

[4] ۔معناه حتّٰی یاتیه الموت (تبیان) الیقین الموت (جلالین)

سُوْرَةُ النَّحْلِ

مکیّہ ۔۔۔۔۔ ۱۲۸ آیات [1]

چونکہ اس سورہ میں شہد کی مکھی کا خاص طور پر ذکر ہے، اس لیے اس کا یہ نام ہوا، اس کے علاوہ اس سورہ میں حسب ذیل مضامین ہیں:۔

سورۂ نحل کے خاص خاص مضامین:

۱.....مخلوقات الٰہی مختلف قسم کے حیوانات اور اجرام سماویہ وغیرہ کے ذکر کے ساتھ یہ اعلان کی نعمات الٰہیہ کے شمار سے تمام انسان مل کر بھی قاصر ہیں۔

۲..... یہ کہ انسان اپنے گناہوں کے ساتھ ان کے عذاب میں بھی شریک ہوگا جنہیں اس نے گمراہ کیا ہے۔

۳.....ملائکہ اور اہل بہشت کے الفاظ سلام۔

۴..... ہر قوم میں پیغمبروں کا بھیجا جانا اور سب کے پیغام کا متحد ہونا۔

۵.....آسمان وزمین کی ہر شے اللہ کے لیے سربسجود۔

۶.....لڑکیوں کی ولادت پر لوگوں کا رنجیدہ ہونا اہل جاہلیت کا طریقہ

۷.....خود اختیاری اشتراکیت کی دعوت۔

۸..... ہر امت کا ایک گواہ اور رسولؐ ان گواہوں کے گواہ۔

۹.....وہ آیت جو اچھائیوں اور برائیوں کے تمام اقسام پر ہمہ گیر حیثیت سے حاوی ہے۔

۱۰.....نیک اعمال دنیا اور آخرت کی بہتری کے ذمہ دار

۱۱.....تلاوت قرآن کے موقع پر اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم کہنے کا حکم۔

۱۲.....ضرورت کے موقع پر تقیہ کا صریح حکم۔

۱۳.....حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک عبادت گزار امت

۱۴.....اتباع ملت ابراہیم کا حکم

۱۵.....دعوت وتبلیغ کے لیے حکیمانہ انداز کی ہدایت

۱۶.....ضبط وتحمل اور رواداری سے کام لینے کی خصوصی تاکید وغیرہ وغیرہ

---

[1] ۔مائة و ثمان و عشرون آیة لیس فیها خلاف (تبیان)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ①

''اللہ کا حکم آ گیا ہے تو تم اس کے متعلق جلدی نہ کرو، پاک ہے وہ اور برتر ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں''۔

''اللہ کا حکم'' یعنی اسلام کے غلبہ اور اشاعت دین کے متعلق قدرت کا جو فیصلہ ہے، وہ اب ظہور پذیر ہوا ہی چاہتا ہے۔[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مشرکین عذاب الٰہی کا جو تقاضا کرتے تھے، انہیں یہ جواب دیا گیا ہے۔[2]

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ② خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ③

وہ فرشتوں کو اتارتا ہے اپنے حکم خاص کی روح کے ساتھ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کہ متنبہ کرو کہ کوئی خدا نہیں سوا میرے تو تم میری ناراضگی سے اپنے بچاؤ کا سامان کرو۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا حق کے ساتھ۔ وہ بالاتر ہے اس سے کہ جو وہ لوگ شرک کرتے ہیں۔

بعد میں انبیاء کے جس پیغام کا ذکر ہے کہ ''کوئی خدا نہیں سوا میرے'' یہی وہ ہے جسے اپنے حکم خاص کی روح کہا گیا ہے۔[3]

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ④

''اس نے انسان کو ایک قطرہ گندیدہ سے پیدا کیا، اب ایک دم وہ ہے کہ کھلا ہوا جھگڑالو نظر آ رہا ہے''۔

یعنی یہ انسان اگر اپنی اصلیت پر غور کرے تو تفاخر بے محل سے کام نہ لے مگر وہ اپنی اصلیت کو بھول جاتا ہے اور خواہ مخواہ سینہ تانے ہوئے فخر و مباہات پر نظر آتا ہے۔

یا یہ کہ اپنی ابتدائے خلقت پر نظر رکھتا تو دوسری دفعہ کی زندگی پر جو جزا و سزا کے لیے ہوگی بحث و انکار کے لیے آمادہ نہ ہوتا مگر اس قادر مطلق نے جس طرح اسے پہلی دفعہ پیدا کیا، اسے یہ بھول جاتا ہے اور اس لیے آخرت میں دوبارہ زندہ کیے جانے کو سن کر بحث کرنے اور لڑنے پر تیار ہو جاتا ہے۔[4]

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِيْهَا

---

[1] ۔اتی بصیغۃ الماضی التحقیق وقوعہ ای قرب (جلالین)

[2] ۔امر اللہ یرادبہ العذاب فی قول الحسن و ابن جریج وغیرھما (تبیان)

[3] ۔فسر ذٰلك یقولہ: "ان انذروا" وھو یدل من الروح (تبیان)

[4] ۔خصیم شدید الخصومۃ... قائلا من یحیی العظام وھی رمیم (جلالین)

جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝٦ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝٧ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ؕ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٨

''اور چوپائے اس نے پیدا کیے کہ تمہارے لیے ان میں جڑاول ہے اور دوسرے فائدے اور انہی سے تم غذا حاصل کرتے ہو۔اور تمہارے لیے ان میں تزک و احتشام کا سامان ہے جبکہ شام کو واپس لاتے ہو اور جب چراگاہوں کی طرف روانہ کرتے ہو۔اور وہ تمہارے بوجھوں کو اٹھاتے ہیں شہر کی طرف جہاں تک تم پہنچ نہیں سکتے تھے مگر جانکاہ زحمت ومشقت کے ساتھ، بے شک تمہارا پروردگار بڑا شفیق ہے، بہت مہربان۔اور گھوڑے، خچر اور گدھے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور آرائش کے لیے اور پیدا کرے گا وہ وہ چیزیں جنہیں تم ابھی جانتے بھی نہیں ہو''۔

غور کیا جائے تو اس وقت اور اس کے بعد بھی آئندہ جو جو تیز رفتار ذرائع نقل وحرکت ظہور میں آرہے ہیں، سب قرآن کے اس مجمل اعلان يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ''پیدا کرے گا وہ وہ چیزیں جو تم ابھی جانتے نہیں۔'' کی تفصیل ہیں جو سامنے آتی رہتی ہیں۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝٩

''اور اللہ پر ہے سیدھے راستے کا دکھانا اور بعض ان میں سے کج ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو سیدھے راستے پر لگا دیتا''۔

''اللہ پر ہے سیدھے راستے کا دکھانا'' یعنی اس حد تک رہ نمائی جو جبر کی حد تک نہ پہنچے اس کے ذمہ ہے۔

اس طرح یہ علیٰ کا لفظ ذمہ داری کے اظہار کے لیے ہے اور اس سے مذہب امامیہ کا یہ مسئلہ علم کلام کا ظاہر ہوتا ہے کہ لطف اللہ پر واجب ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر قسم کا لطف ہر حال میں واجب ہے بلکہ لطف وہی جو اتمام حجت کے لیے ضروری ہے۔

جیسا کہ تفسیر جلالین میں ہے:۔

وعلى الله قصد السبيل اى بيان الطريق المستقيم

اللہ پر ہے سیدھا راستہ یعنی سیدھے راستے کا بیان کرنا۔

جناب ابن عباس کی تشریح اس کے مطابق ہے [1] مگر شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان نے اس کے معنی یہ قرار دیے ہیں کہ ''اللہ تک پہنچتا ہے اور سیدھا راستہ۔[2]

میرے خیال میں آیت کے بعد والے مضمون سے پہلے مفہوم کا تعلق زیادہ ہے۔بعد میں جو ہے کہ ''اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو سیدھے

---

[1] ۔قال ابن عباس علی الله قصد السبیل (تبیان)

[2] ۔بر خدا می رسد راہ میانہ (شاہ ولی اللہ) اور اوپر اللہ کے پہنچتی ہے سیدھی راہ (شاہ رفیع الدین) یعنی اس کی قدرتیں دیکھ کر صاف معلوم ہوتی ہیں اس کی خوبیاں اور جس کی عقل سیدھی نہیں وہ بہکتا ہے۔(موضح القرآن)

راستے پر لگا دیتا یعنی جبری طور پر [1] مگر اس کی حکمت کاملہ جبر کی متقاضی نہیں ہے اس لیے کچھ لوگ اپنے سوء اختیار سے غلط راستے پر لگ جاتے ہیں۔

اب پوری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بحد اتمام حجت سب کو سیدھا راستہ دکھائے، وہ اپنی ذمہ داری کو بہر حال پورا کرتا ہے مگر کچھ لوگ اس کی رہ نمائی کا اثر قبول نہیں کرتے، وہ غلط راستے اختیار کر لیتے ہیں اور اگر اللہ جبر سے کام لیتا تو سب ہی منزل مقصد تک پہنچ جاتے پھر جائز کوئی نہ ہوتا مگر جبر سے کام لینا اس کے عدل وحکمت کے تقاضوں کے خلاف ہے۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ۝۱۰ یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۱

''وہ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا تمہارے لیے اس میں سے پینے کا بھی ہوتا ہے اور اسی سے وہ پودے بھی ہوتے ہیں جن سے تم چراگاہ بناتے ہو۔ تمہارے لیے اگاتا ہے اس سے کھیتی اور زیتون اور کھجور کے درخت اور انگور اور طرح طرح کے پھلوں میں سے، یقیناً اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو غور وفکر سے کام لیں''۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝۱۲ۙ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ۝۱۳

''اور تمہارے قبضے میں دیئے رات اور دن اور سورج اور چاند اور ستارے سب قبضے میں ہیں اس کے حکم سے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔ اور جو کچھ رنگ برنگ کی چیزیں پیدا کیں تمہارے لیے زمین میں یقیناً اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو سبق لیں''۔

اب دنیا اس پر غور کرے کہ رات اور دن، اور سورج وغیرہ اس کے قبضے میں کہا ہیں؟ اور اگر نہیں ہیں واقعاً نہیں ہی تو سمجھنا چاہیے کہ ہم ابھی اس انسانی ترقی کے نقطہ پر نہیں ہیں جن کی نشان دہی قرآن کر رہا ہے اور اب اگر کچھ بلند ہستیاں ایسی سننے میں آئیں کہ رات اور دن اور سورج وغیرہ پر ان کا قبضہ تھا تو اس کے انکار پر تل نہ جائے بلکہ سمجھے کہ قرآنی آیت کی روشنی میں ایسی ہستیوں کا وجود ہر دور میں ممکن ہے بلکہ ہونا چاہیے جن کے قبضہ میں یہ سب چیزیں ہوں۔

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً

---

[1] ۔قال الحسن و البلخی لو شاء لهدٰکم بالالجاء لانّه قادر علٰی ذٰلك (تبیان)

تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اور وہ وہی ہے جس نے قابو میں کیا ہے دریا کو کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور نکالو اس میں سے زیور جنہیں تم پہنو اور دیکھو گے تم کشتیوں کو اس میں چلتے ہوئے اور اس لیے کہ تم لوگ اس کے فضل و کرم سے نفع کماؤ اور شاید تم شکر گزار ثابت ہو''۔

''تازہ گوشت'' یعنی مچھلی [۱] اور زیور یعنی موتی مونگا [۲] جو دریا سے برآمد ہوتے ہیں اور نفع کماؤ یعنی تجارت کرو جو منافع حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ [۳]

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾

وَعَلٰمٰتٍ ۭ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

''اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈال دیئے کہ وہ تمہیں لیے ہوئے ڈنواڈول نہ ہو [۴] اور نہریں اور سڑکیں شاید کہ تم راستا پاؤ۔ اور طرح طرح کے نشان اور ستاروں [۵] سے وہ لوگ راستا پاتے ہیں''۔

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾

''کیا جو خالق ہو، وہ اس کے مثل ہے کہ جو خالق نہ ہو؟ کیوں تم نصیحت قبول نہیں کرتے''۔

اس میں بت پرستوں کے لیے انتباہ ہے کہ آخر ان بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو جو کسی چیز کے خلق کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ [۶]

اس کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں کہ بندے اپنے افعال کے خالق ہوتے ہیں یا نہیں جو جبر و اختیار کے موضوع میں شیعہ سنی کا ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾

''اور اگر شمار کرنا چاہو اللہ کی نعمتوں کو تو تم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے، یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

یعنی باوجود گناہوں کے بھی اس کی نعمت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس سے بڑھ کر بخشش و ترحم اور کیا ہوگا؟!

---

[۱] ۔فتصطادون منه انواع السمك فتاكلون لحماً طريّا (تبيان)

[۲] ۔ما يخرج من البحر من انواع الجواهر (علی بن ابراهيم)

[۳] ۔تطلبوا من فضله تعالىٰ بالتجارة (جلالين)

[۴] ۔اى لئلا تميد بكم الارض (تبيان)

[۵] ۔بالنجم بمعنى النجوم (جلالين) فاخبر بالواحد عن الجميع كما قال: اذا الطفل الذين لم يظهروا على عورات النسآء (تبيان)

[۶] ۔فى هٰذه الاٰية وعلى عبادا الاصنام والاوثان (تبيان)

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اور اللہ جانتا ہے اسے جو تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو۔ اور جنہیں وہ پکارتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر وہ کچھ بھی پیدا نہیں کرتے۔ وہ خود پیدا کیے جاتے ہیں۔ وہ مردہ ہیں، زندہ نہیں ہیں اور انہیں خبر نہیں کہ وہ کب دوبارہ زندہ کیے جائیں گے''۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''شاید یہ ان کو فرمایا جو مرے بزرگوں کو پوجتے ہیں'' (موضح القرآن)

اس کے خلاف جلالین نے اسے صاف اصنام سے متعلق کیا ہے [1] ہماری بھی قدیم تفسیر اسی سے متعلق ہے۔ [2]

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

تمہارا خدا ایک خدا ہے تو وہ لوگ جو آخرت پر ایمان لائے ہوئے نہیں ہیں، ان کے دل انکار کرتے ہیں اور وہ تکبر سے کام لیتے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ اللہ جانتا ہے اسے کہ جو وہ چھپاتے ہیں اور (اسے بھی کہ) جو وہ ظاہر کرتے ہیں، یقیناً وہ دوست نہیں رکھتا تکبر کرنے والوں کو۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ کیا اتارا ہے تمہارے پروردگار نے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ اگلے لوگوں کی بے بنیاد

---

[1] ۔مایشعرون ای الاصنام ایان یوم یبعثون ای اخلق فیکف یعبدون اذلا یکون الھا الاالخالق الحی العالم بالبعث (جلالین)

[2] ۔رد علی عبدۃ الاصنام (علی بن ابراھیم)

داستانیں ہیں [1]۔جس کا انجام یہ ہے [2] کہ وہ اپنے بھی بوجھ پورے اٹھائیں گے قیامت کے دن اور کچھ ان کے بھی بوجھ جنہیں یہ ناواقفیت میں گمراہ کرتے ہیں، آگاہ رہو کہ کتنا برا ہے وہ بوجھ جو وہ اٹھا رہے ہیں۔

اپنے گناہوں کے ساتھ ان کے گناہوں کا بوجھ جنہیں گمراہ کیا ہے

دوسروں کے بوجھ بھی ان کے سر پر ہیں، اس لیے کہ یہ ان کے لیے معاصی کے ارتکاب کا باعث رہے ہیں، اگرچہ وہ خود بھی اپنے ارادہ واختیار سے ان کے کہنے میں آنے کی وجہ سے بحیثیت مرتکب گناہ کے ان بوجھوں سے آسودہ نہیں ہیں جیسا کہ حدیث رسولؐ میں ہے:

ایما داع دعا الی الھدٰی فاتّبع فله مثل اجورھم. من غیر ان ینقص من اجورھم شئی و ایما داع دعا الی الضّلالة فانّ علیه مثل اوزار من اتبعه من غیر ان ینقص من اوزارھم شئی (تبیان)

جو رہ نما راہ راست کی طرف دعوت دے اور اس کی پیروی ہو تو اسے ان تمام لوگوں کے ثواب کے برابر ملے گا، بغیر اس کے کہ خود ان پیروؤں کے ثواب میں کچھ کمی ہو اور جو راستہ بتانے والا گمراہی کی دعوت دے، اس پر ان تمام لوگوں کے بوجھوں کے برابر بوجھ ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی بغیر اس کے کہ ان پیروؤں کے بوجھ میں کچھ کمی ہو۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

''جو ان کے پہلے تھے، اُنہوں نے بھی ایسی ہی ترکیبیں کی تھیں تو اللہ آیا اُن کی عمارت پر بنیادوں کی طرف سے تو اُن پر گر پڑی چھت اُن کے اوپر سے اور آ گیا اُن پر عذاب اس صورت سے کہ انہیں خبر بھی نہ ہوئی''۔

بعض لوگوں نے بنیاد اور چھت وغیرہ کا نام دیکھ کر کہا ہے کہ یہ نمرود کا ذکر ہے جس نے بڑی عالیشان ایک عمارت بنوائی تھی کہ اس کی چھت پر چڑھ کر خدائے آسمانی سے جنگ کرے اور یہ اس عمارت کے گرنے کا ذکر ہے۔[3] مگر دوسرا خیال یہ ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمثیلی طور پر ان کے منصوبوں کے شکست کھانے کا ذکر ہے جو اس پیرایہ میں کہا گیا ہے۔[4]

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۷﴾

---

[1] ۔اکاذیب الاوّلین (علی بن ابراھیم و جلالین)

[2] ۔اللّام لام العاقبة لانّھم لم یقصدوا بما فعلوہ لیتحملوا اوزارھم (تبیان)

[3] ۔ھو نمرود بنی صرحا طویلا لیصور منه الی السّماء فیقاتل اھلھا (جلالین)

[4] ۔قال الزجاج و ابوبکر الانباری... وھٰذا الّذی ذکرہ یلیق بکلام العرب ویشبھه (تبیان) این تمثیل است فساد مکر ایشاں را با بلغ وجوہ (فتح الرحمٰن)

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

''پھر قیامت کے دن وہ انہیں رسوا کرے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے بارے میں تم لڑا کرتے تھے؟ کہا ان لوگوں نے کہ جنہیں علم عطا ہوا تھا کہ بلاشبہ رسوائی آج کے دن اور برائی ان کافروں پر ہے۔جن کی قبض روح کریں گے فرشتے اس عالم میں کہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے، ہم کوئی برائی نہیں کرتے تھے کیوں نہیں، یقیناً اللہ جانتا ہے اسے جو تم اعمال کرتے تھے۔تو اب داخل ہو دوزخ کے دروازوں میں۔اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہتے ہوئے تو کیا برا ٹھکانا ہے وہ سرکشی کرنے والوں کا''۔

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۰﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۱﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

''اور کہا گیا ان سے جو بچے رہے تھے [1] کہ کیا تھا وہ جو تمہارے پروردگار نے اتارا؟ انہوں نے کہا اچھا ہی اچھا، ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اس دنیا میں اچھائی کی، اچھائی ہی ہے اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے اور کیا کہنا پرہیزگاروں کے گھر کا۔ ہمیشہ رہنے والے بہشت جن میں وہ داخل ہوں گے جن کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی، ان کے لیے ان میں وہ سب ہوگا جو وہ چاہتے ہوں۔یقیناً اس طرح صلہ دیتے ہیں ہم پرہیزگاروں کو۔جن کی قبض روح کرتے ہیں فرشتے اس عالم میں کہ وہ پاک و پاکیزہ ہیں، کہتے ہیں سلام تم پر، داخل ہو بہشت میں ان اعمال کی بدولت جو تم کرتے تھے''۔

یعنی اہل ایمان کو جو جزا ملے گی، وہ صرف ایمان کی بنا پر نہیں، بلکہ ایمان کے ساتھ ان اعمال خیر کی وجہ سے جو وہ انجام دیتے تھے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ

---

[1] ۔اتقوا الشرك (جلالین)

مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾

''کیا وہ انتظار کرتے ہیں سوا اس کے کہ فرشتے ان کے پاس آئیں یا تمہارے پروردگار کا حکم آئے، ایسا ہی کیا تھا ان لوگوں نے کہ جو ان کے پہلے تھے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا مگر خود انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ تو پہنچیں ان کو برائیاں اُنہی اعمال کی جو انہوں نے کیے تھے اور نازل ہوا ان پر وہی (عذاب) جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے''۔

''جب تک حکم پروردگار آئے'' اس حکم میں عذاب کا نازل ہونا بھی ہے اور موت کا ہنگام بھی اور امام آخر الزمان کا ظہور بھی۔ [1]

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾

''اور کہا ان لوگوں نے جو مشرک ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کو معبود نہ بناتے، ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے، ایسا ہی کیا ان لوگوں نے جو ان کے پہلے تھے تو پیغمبروں کا فرض کیا واضح طور پر تبلیغ کے سوا کچھ اور ہے''۔

مشرکین کا استدلال بظاہر تصور جبر پر مبنی ہے یعنی جب بغیر ارادہ باری تعالیٰ پتی نہیں ہلتی تو ہمارے شرک کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے اور جو آپ ہم پر معترض ہیں کہ ہم نے احکام ایجاد کیے ہیں تو وہ بھی اللہ ہی کے ارادہ سے ہیں [2] پھر ہمیں اس کی سزا کیوں کر مل سکتی ہے؟ مگر شاہ ولی اللہ نے کچھ عجیب طرح اسے مسئلہ اجماع سے مرتبط کیا ہے وہ فرماتے ہیں:۔

یعنی سلف ما اجماع کردہ اند و آں بدون رضائے خدا منعقد نمی شود (فتح الرحمن)

یعنی ہمارے اسلاف نے اس پر اجماع کیا ہے اور وہ بغیر رضائے الٰہی نہیں ہوا کرتا۔

حالانکہ اگر آیت کا یہ مطلب ہو اور یہ آیت کے انداز سے بالکل ظاہر ہے کہ مشرکین کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے غلط ہے تو اس سے اجماع کا بطلان ثابت ہوگا جس طرح مشرکین کا یہ استدلال باطل تھا، اور نہ ان کی بت پرستی اور بدعت آفرینی حق ہوتی، اسی طرح کبھی بھی کوئی جماعت صرف اجماع سلف کو اپنی دلیل قرار دے لے تو وہ استدلال باطل ہی ہوگا مگر واقعہ یہ ہے کہ اس آیت قرآن کے الفاظ سے یہ اجماع والا استدلال ظاہر نہیں ہوتا بلکہ وہی جبر والا تصور سمجھ میں آتا ہے اور چونکہ جبر کا تصور باطل ہے، اس لیے ان کا استدلال بھی غلط ہے۔ شاہ عبدالقادر نے جو تشریح کی ہے، اس سے ظاہر مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ وہ اسے جبر سے متعلق سمجھتے ہیں مگر چونکہ مسئلہ جبر میں خود ان کا ذہن صاف نہیں ہے، اس لیے انہوں نے

---

[1] ۔امر ربك من العذاب والموت وخروج القائم (علی بن ابراھیم)

[2] ۔اراد اللہ ذٰلك منّا فلذٰلك فعلنا كما يقول المجبرة الضلال (تبیان)

مشرکین کی رد میں قرآن کے جواب کی جو تشریح کی ہے، اس سے تقریباً ان مشرکین کی تائید ہی ہوگئی، رد نہیں ہوئی وہ فرماتے ہیں:۔

''یہ نادانوں کے کلام ہیں کہ اللہ کو یہ کام برا لگتا تو کیوں کرنے دیتا مگر ہر فرقے کے نزدیک بعض کام برے ہیں۔ پھر وہ کیوں کرتے ہیں؟ یہاں جواب مجمل فرمایا کہ ہمیشہ رسول منع کرتے آئے ہیں اس سے، جس کی قسمت تھی ہدایت پائی، جو خراب ہونے والا تھا، خراب ہوا۔ اللہ کو یہی منظور ہے۔'' (موضح القرآن)

صحیح یہ ہے کہ انسان فاعل مختار ہے اور جبر سے کام لینا اس کی وجہ تخلیق اور اللہ کی حکمت کا مسئلہ کے خلاف ہے لہٰذا گمراہی اپنے ہاتھوں ہے اور اسے قسمت سے وابستہ کرنا غلط ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۭ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۳۶

اور ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا کہ عبادت کرو اللہ کی اور داعیان باطل سے بچتے رہو تو ان میں سے کوئی وہ تھا جسے اللہ نے منزل تک پہنچا دیا اور کوئی وہ تھا جس کے گمراہی شامل حال رہی تو زمین پر چل پھر کر ذرا دیکھو کہ کیا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا۔

ہر قوم میں پیغمبروں کا بھیجا جانا اور سب کے پیغام کا متحد ہونا

طاغوت کی تشریح جو شاہ عبدالقادر نے کی ہے، وہ یہ ہے:۔

''ہر ڈنگا میں جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے، کچھ سند نہ رکھے، اسی کو طاغوت کہتے ہیں، بت اور شیطان اور زبردست ظالم سب یہی ہیں۔'' (موضح القرآن)

ہمارے مفسرین میں جناب شیخ الطائفہ نے یہ معنی لکھے ہیں:

اجتنبوا اغواء الشیطان بکل داع یدعوا الی الفساد (تبیان)

بچنے کی کوشش کرو شیطان کی کوشش سے ہر ایسے دعوت دینے والے کے ذریعے سے جو خرابی کی دعوت دیتا ہے۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰي هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۳۷

''اگر آپ ان کے صحیح راستے پر آنے کی بڑی آرزو رکھتے ہیں تو (کیا ہوتا ہے) یقیناً اللہ منزل تک نہیں پہنچاتا اسے جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہیں''۔

یہ گمراہی میں اس کا چھوڑ دینا یعنی توفیقات کا سلب کر لینا نتیجہ ہوتا ہے ان کے سوء اختیار کا کہ وہ راہ راست پر آنا نہیں چاہتے تو اللہ نے بھی ان سے ہاتھ اٹھا لیا، پھر آپ کی آرزو سے کیا نتیجہ نکلے گا۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾

''اورانہوں نے قسم کھائی اللہ کی انتہائی سخت قسمیں کہ اللہ دوبارہ زندہ نہیں کرے گا اسے کہ جو مر جائے، کیوں نہیں؟ یہ اس کے ذمہ وعدہ ہے سچا لیکن زیادہ تر لوگ جانتے نہیں۔ تا کہ ظاہر کرے ان پر وہ کہ جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے اور تا کہ جانیں وہ جو کافر ہیں کہ وہ جھوٹے تھے''۔

یعنی دنیا میں تو کوئی باز پرس نہیں، اکثر باطل پرست عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہیں، اس سے وہ دوسروں کو اس فریب میں مبتلا کرتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں۔ اگر حق پر نہ ہوتے تو ہمیں اللہ طاقت و اقتدار کیوں عطا کرتا؟ ہمیں اپنی نعمتوں سے نوازتا کیوں؟ ضرورت ہے کہ ایک دوسرا دور حیات ہو جس میں جو جس قابل ہے، اس کا ویسا ہی انجام سامنے آئے، اس طرح حق کے حق ہونے اور باطل کے باطل ہونے میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ رہے اور کافروں کو بھی جو اپنے سچے ہونے کا زعم باطل ہے، وہ ختم ہو جائے، وہ جان لیں یعنی ماننے پر مجبور ہوں کہ وہ جھوٹے تھے۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾

''ہمارا کہنا ہوتا ہے بس کسی چیز کے لیے جب ہم اس کا ارادہ کریں یہ کہ ہم کہیں اسے ہو جا اور بس بلا توقف وہ ہو جاتی ہے''۔

یہ مضمون تو متعدد مقامات پر قرآن مجید میں آیا ہے مگر اس جگہ اس کا مطلب بشرطیکہ وہ محل تنزیل میں اسی جگہ کی آیت ہو، یہ ہوگا کہ یہ دوبارہ زندہ کیا جانا ہماری قدرت قاہرہ کے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

''اور وہ جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی، اس کے بعد کہ ان پر ظلم ہوئے، انہیں ہم دنیا میں بھی اچھی جگہ دیں گے اور آخرت کا ثواب اس سے بھی بڑا ہوگا، کاش کہ وہ جانیں۔ انہیں جنہوں نے صبر کیا اور اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے تھے''۔

چونکہ یعلمون پر وقف نہیں ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا اتصال بعد والے الفاظ کے ساتھ ہے لہٰذا محسوس ہوتا ہے کہ ''کاش کہ وہ جانیں'' کا تعلق ان کے ساتھ ہے جن کا ذکر بعد کو ہے کہ ''جنہوں نے صبر کیا اور اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے تھے۔'' انہیں جاننے کا مطلب یہ ہے

کہ ان کی منزل سمجھیں کہ انہیں آخرت میں کتنا بڑا اجر ملتا ہے تو پھر اس کردار کو اختیار کریں جو بہترین کردار ہے اور بہترین اجر کا ذمہ دار ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کے پہلے مگر آدمیوں ہی کو جن کی جانب ہم وحی بھیجتے تو پوچھ لو یاد داشت رکھنے والوں سے اگر تم نہیں جانتے۔ کھلی ہوئی دلیلوں اور کتابوں کے ساتھ اور آپ کی طرف ہم نے یہ یاد داشت اتاری ہے تا کہ آپ بیان کریں لوگوں کے سامنے وہ جو ان کی جانب احکام اتارے گئے ہیں اور شاید وہ غور وفکر سے کام لیں''۔

اہل ذکر سے سوال کا حکم

اھل الذّکر کا ترجمہ ''یاد داشت رکھنے والے'' لغوی مفہوم کے لحاظ سے ہے لیکن مراد اس سے کون ہیں؟

جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد علمائے اہل کتاب ہیں چونکہ قرآن مجید میں ایک جگہ الذکر کے لفظ سے توریت مراد لی گئی ہے:- وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (انبیاء ۱۰۵)

مگر اہل بیت معصومینؑ کی تفسیر یہ ہے کہ الذکر سے مراد قرآن ہے جیسا کہ ذکر ہوا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر ...۹)

بلاشبہ ہم نے یہ ذکر اتارا ہے اور یقیناً ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اور ذکر رسولا سے مراد قرآن کے حقیقی عالم یعنی اہل بیت طاہرین علیہم السلام ہیں [1] جب کہ خود ہمارے رسول کو اھل الذکر کہہ کر ذکر کا مصداق قرار دیا گیا ہے تو اس لحاظ سے بھی اھل الذکر آل رسولؐ ہوئے۔

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۶﴾ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۷﴾

''تو کیا مطمئن ہیں وہ جنہوں نے بری بری ترکیبیں کیں اس سے کہ اللہ زمین کو ان کے ساتھ دھنسا دے یا ان پر عذاب آئے ایسی صورت میں جس کی انہیں خبر بھی نہ ہو۔ یا وہ انہیں گرفت میں لے لے ان کی نقل وحرکت کے عالم

---

[1] ۔روی جابر عن ابی جعفر علیہ السلام انہ قال: نحن اھل الذکر (علی بن ابراھیم)

میں تو وہ اسے روک نہیں سکتے۔ یا ان کو گرفت میں لے لے خوف و دہشت کے عالم میں مگر حقیقت یہ ہے کہ تمہارا پروردگار بخشنے والا ہے بڑا مہربان''۔

''نقل وحرکت کے عالم میں''، یعنی جب وہ خرید وفروخت کے سلسلہ میں یا دوسرے کاموں کے لیے ادھر ادھر جاتے ہیں۔ [1]

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

''کیا نہیں دیکھا انہوں نے کسی چیز کو جو اللہ نے پیدا کی ہے کہ اس کی پرچھائیاں پلٹتی ہیں دائیں اور بائیں سمتوں سے اللہ کو سجدہ کرتی ہوئی اور وہ تذلل کے عالم میں ہیں''۔

''ہر چیز ٹھیک دوپہر میں کھڑی ہے، اس کا سایہ بھی کھڑا ہے، جب دن ڈھلا سایہ جھکا، پھر جھکتے جھکتے شام تک زمین پر پڑ گیا جیسے نماز میں کھڑے سے رکوع، رکوع سے سجدہ، اسی طرح ہر چیز آپ کھڑی ہے، اپنے سایہ سے نماز کرتی ہے، کسی ملک میں کسی موسم میں داہنی طرف جھکتا ہے کبھی بائیں طرف۔'' (موضح القرآن)

اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے سایہ کی ظاہری شکل سے جو اس میں رکوع وسجود کی شکل پیدا ہوتی ہے، عوامی ذہن کو رکوع وسجود کی کیفیت کی طرف منتقل کیا ہے کہ پرچھائیوں میں تو یہ بات، اسباب طبیعی کے تغیرات سے قہری طور پر ہوتی ہے، تم اسے ارادی طور پر اختیار کرو۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ السجدة ع

''اور اللہ کے لیے سربسجود ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے چلنے پھرنے والی مخلوق اور فرشتے اور وہ سرکشی نہیں کرتے۔ وہ اپنے پروردگار سے جو ان کے اوپر ہے، ڈرتے ہیں اور وہ کرتے ہیں وہی کہ جس پر مامور ہوتے ہیں''۔

آسمان اور زمین کی ہر شے اللہ کے لئے سربسجود

ان آیات بیان کیا گیا ہے کہ آسمان اور زمین کی ہر شے اللہ کے لئے سربسجود ہے۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾

''اور اللہ نے کہا کہ دو خدا نہ مانو، وہ بس ایک خدا ہے تو مجھ سے بس ڈرتے رہو۔ اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور

---

[1] ۔اذا جاء واوذهبوا فى التجارات و فى اعمالهم ناخذهم فى تلك الحالة (على بن ابراهيم)

زمین میں ہے اور اس کی عبادت بہر حال لازم ہے [1] تو کیا اللہ کے سوا دوسرے سے ڈرو گے"۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

"اور جو تمہارے پاس نعمت ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہے، پھر جب تم پر مصیبت آتی ہے تو اسی کی طرف تم چیختے چلاتے ہو۔ پھر جب تم سے مصیبت کو وہ دور کر دیتا ہے تو ایک دم تم میں ایک گروہ اپنے پروردگار کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے۔ تاکہ وہ کفران نعمت کریں، اس پر جو ہم نے انہیں عطا کیا تو فائدہ اٹھالو، اس کے بعد بہت جلد تمہیں قدر و عافیت معلوم ہوگی"۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾

"اور ایسی چیزوں کا جنہیں وہ جانتے نہیں، حصہ قرار دیتے ہیں اس میں جو ہم نے انہیں رزق عطا کیا ہے۔ خدا کی قسم ضرور تم سے جواب دہی ہوگی اس کی جو تم من گھڑت باتیں بناتے ہو"۔

شاہ ولی اللہ نے تو اپنے ترجمہ میں اس کی تشریح "یعنی بتان" کے لفظ کے ساتھ کر دی ہے یعنی یہ مشرکین کا ذکر ہے جلالین نے بھی لمالایعلمون کی تشریح یہی کی ہے کہ:۔

لمالایعلمون انّها لاتضرّ ولاتنفع وهی الاصنام.

جن کے متعلق انہیں یہ خبر نہیں کہ وہ نہ نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ فائدہ اور وہ بت ہیں۔

ہماری قدیم تفسیر بھی اس کے موافق ہے۔ [2]

مگر شاہ عبدالقادر صاحب نے اسے مطلق نذر و نیاز پر حاوی کر کے "وہابیت نوازی" کا ثبوت دیا ہے وہ فرماتے ہیں:۔

"یہ ان کو فرمایا ہے جو اپنے کھیت میں، مویشی میں، تجارت میں اللہ کے سوا کسی کی نیاز ٹھہراتے ہیں، سب مال اللہ کا ہے اور کسی کا حق نہیں مگر اللہ کی راہ میں دے اپنے ثواب پھر اپنے بدلے ثواب کسی کو دیوے" (موضح القرآن)

نذر و نیاز کا طریقہ "مذہب حق" کے پرستاروں میں یہی ہے کہ اہدائے ثواب کیا جاتا ہے اسے جس کی نیاز لازم دلانا ہے پھر معلوم نہیں اسے شاہ صاحب اس کو آیت قرآن کے تحت میں کیوں لاتے ہیں؟"

---

[1] ۔واصبا ای واجبا (علی بن ابراهیم) قال، ابن عباس دائما ای طاعته واجبه علی الدوام (تبیان)

[2] ۔یجعلون للاصنام نصیبا فی زرعهم وابلهم وغنمهم فرد الله علیهم (علی بن ابراهیم)

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اور وہ اللہ کے لیے پاک ہے اس کی ذات، لڑکیاں قرار دیتے ہیں اور خود ان کے لیے وہ ہے جس کے وہ خواہشمند ہیں۔ اور جب ان میں کسی ایک کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ رنج سے بھر جاتا ہے۔ وہ لوگوں کی نظروں سے چھپ جاتا ہے اس خوش خبری کی برائی سے جو اسے دی گئی ہے۔ اب کیا وہ اسے حقارت کے ساتھ رکھے گا یا اسے مٹی میں توپ ہی دے گا، آگاہ ہو کہ کتنا برا ہے وہ جو یہ حکم لگاتے ہیں''۔

لڑکیوں کی ولادت پر رنجیدہ ہونا اہل جاہلیّت کا طریقہ

ان کے مزعومہ کے ساتھ جو کہا گیا ''پاک ہے اس کی ذات'' وہ اس لیے نہیں کہ خاص لڑکی واقعاً کوئی بری چیز ہے بلکہ اس لیے کہ اولاد کی نسبت ہی اس کی شان کے خلاف ہے۔ اب یہ ان کے مزعومہ کی مزید کمزوری اور رکاکت ہے کہ وہ ایک تو اولاد کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں جو واقعاً اس کی شان الوہیت کے خلاف ہے اور پھر یہ خود اپنے لیے لڑکی کو بہت برا جانتے ہیں۔ مگر جسے وہ اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں، اسے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اس طرح کہ یہ فرض کر لیا ہے کہ ملائکہ صنف اناث میں ہیں اور یہ اس کی بیٹیاں ہیں، جس کے دونوں جز غلط ہیں۔

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۰﴾

''ان کی جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، بری حالت ہے [1] اور اللہ کے لیے بلند ترین اوصاف ہیں اور وہ زبردست ہے، ہر کام ٹھیک انجام دینے والا''۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اور اگر اللہ تمام لوگوں کو ان کی زیادتیوں کی بنا پر گرفت میں لیتا رہے تو روئے زمین پر کسی چلنے پھرنے والے کو چھوڑے ہی نہیں مگر وہ تو انہیں ڈھیل دیتا ہے ایک مقررہ مدت تک تو جب ان کی مدت آ جائے گی تو پھر ایک گھڑی نہ پیچھے ہوں گے اور نہ آگے بڑھیں گے''۔

---

[1] ۔ای لھم بذلك وصف سوء ولله الوصف الاعلیٰ من اخلاص التوحید (تبیان)

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

''اور اللہ کے لیے قرار دیتے ہیں وہ جسے وہ ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں غلط بات بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے بھلائی ہے کوئی شک نہیں کہ ان کے لیے آگ ہے اور وہ آگے بھیجے جانے والے ہیں''[1]۔

پہلے جز کے متعلق ایک خیال ہے کہ اس سے قبل کی آیات میں جو مضمون تھا، اس سے متعلق ہے یعنی وہ خود تو لڑکیاں ناپسند کرتے ہیں اور اللہ کے لیے لڑکیاں قرار دیتے ہیں چنانچہ شیخ الطائفہ فرماتے ہیں:۔

یعنی یضیفون الی اللہ البنات مع کراھیۃ ذٰلك لنفوسھم (تبیان)

یعنی وہ لڑکیوں کی نسبت اللہ کی طرف دیتے ہیں باوجود یہ کہ خود اپنے لیے اسے ناپسند کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے اس ترجمہ پر کہ ''آنچہ ناپسندی دارند'' حاشیہ دیا ہے ''یعنی دختران'' ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے اسے ایک دوسری بات سے متعلق قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں:۔

''یہ ان کو فرمایا جو ناکارہ چیزیں اللہ کے نام دیں اور اس پر یقین کریں کہ ہم کو بہشت ملے اور روز بروز دوزخ میں بڑھتے ہیں۔'' (موضح القرآن)

اسی آیت کے بعد والے الفاظ سے مجھے یہ مفہوم زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

''اللہ کی قسم ہم نے پیغمبر بھیجے بہت سی قوموں کی طرف آپ سے پہلے تو شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال سنوار کر پیش کیے جس کے بعد وہی آج ان کا سرپرست ہوسکتا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

''اور ہم نے نازل نہیں کی آپ پر یہ کتاب مگر اس لیے کہ آپ ان کے لیے واضح طور پر بیان کر دیں اسے جس میں وہ باہم اختلاف رکھتے تھے اور ہدایت اور رحمت بنا کر ان کے لیے جو ایمان لائے ہیں''۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً

---

[1] ۔متروکون فیھا او مقدمون علیھا (جلالین) ای معذبون (علی بن ابراھیم)

لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾

''اور اللہ نے اتارا آسمان سے پانی تو اس سے زمین کو اس کی موت کی حالت کے بعد زندگی بخشی، یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے ان کے لیے جو سننے کے لیے تیار ہوں''۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

''اور بلاشبہ تمہارے لیے چوپایوں میں غور وفکر کا سرمایہ ہے۔ ہم تمہیں سیراب کرتے ہیں اس سے کہ جو ان کے شکم میں فضلہ اور خون کے بیچ میں سے نرا کھرا دودھ ہوتا ہے جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے۔ اور کھجوروں کے درخت اور انگور کے پھلوں سے کہ جن سے تم شراب اور اچھا رزق تیار کرتے ہو۔ یقیناً اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو عقل سے کام لیں''۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''شراب'' کا ذکر اس آیت میں اس لیے ہے کہ اس وقت تک اس کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی [1] مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہاں خطاب مسلمانوں سے ہے ہی نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کو خدا کی قدرت کی نمود کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے، اس لیے انہیں ان انتفاعات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جو صنائع الٰہی سے حاصل کرتے ہیں اس میں شریعت کے حلال اور حرام سے بحث نہیں ہے، پھر یہ کہ انگور وغیرہ سے بنائی جانے والی چیزوں میں شراب کے ذکر کے بعد ''اور اچھا رزق'' کہنے سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ شراب اچھا رزق ''نہیں ہے ورنہ اسے'' ''رزق حسن'' سے الگ کر کے ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی، اس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ اللہ نے یہ سب چیزیں تمہارے فائدہ کے لیے پیدا کی ہیں، اب یہ تمہارا سوء اختیار ہے کہ تم اس سے شراب تیار کرتے ہو جو تمہارے لیے اچھی چیز نہیں ہے۔ [2]

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾

''اور تمہارے پروردگار نے حکم پہنچایا شہد کی مکھی کی طرف کہ تو پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں میں اور ان میں

---

[1] ۔ھذا اقبل تحریمھا (جلالین)

[2] ۔فاتخذتم انتم منہا ما ھو محرّم علیکم و ترکتم ما ھو رزق حسن (تبیان)

جنہیں لوگ اونچا کرتے ہیں۔ پھر تو ہر طرح کے پھلوں سے کھا اور اپنے پروردگار کے مقرر کردہ راستوں پر جو آسان ہیں، چلتی رہ تو اس کے پیٹ سے مختلف رنگوں کا وہ شربت نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے، یقیناً اس میں نشانی ہے ان کے لیے جو غور وفکر سے کام لیں''۔

شہد کی مکھی کا ذکر

جنہیں لوگ اونچا کرتے ہیں'' اس کے ایک معنی لیے گئے ہیں عمارتیں جو بناتے ہیں اور دوسرے انگور وغیرہ کی بیلیں جنہیں کسی بلند چیز پر چڑھایا جاتا ہے۔

شہد کی مکھی کی طرف حکم پہنچانے سے مراد اس کی فطرت میں اسے مضمر قرار دینا ہے جسے حکم تکوینی سمجھنا چاہیے، نہ کہ تشریعی۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝۷۰

''اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں دنیا سے اٹھالے گا اور تم میں سے بعض انتہائی لمبی عمر تک پہنچائے جاتے ہیں یہاں تک کہ دانائی کے بعد ایسے ہوجاتے ہیں کہ کچھ جانتے سمجھتے نہیں، یقیناً اللہ بڑا جاننے والا ہے، قدرت والا''۔

خالق نے خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ اتنی عمر تک جس میں یہ کیفیت ہو، بعض ہی لوگ پہنچتے ہیں اور وہ عمر کتنی ہے جس میں یہ بات پیدا ہوجائے، یہ بتایا نہیں ہے تو اب کسی بھی عمر کے بعد لازماً نہیں سمجھنا چاہیے۔ کہ یہ کیفیت پیدا ہوگئی، پھر یہ ایک عام طبعی تقاضا ہے۔ زیادتی عمر کا جس میں مستثنیات ہوسکتے ہیں، خصوصاً جب کہ امتداد عمر بقدرت الٰہی بصورت اعجاز ہو تو قوائے عقل وشعور کا بحد کمال باقی رکھنا بھی بصورت اعجاز ہوسکتا ہے بلکہ ہونا چاہیے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَاۗدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰي مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝۷۱

''اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض سے زیادہ رزق دیا ہے تو وہ جنہیں زیادہ ملا ہے، اپنے رزق کو پلٹا نہیں دیتے ان پر کہ جو ان کے دست نگر ہیں کہ وہ سب اس میں برابر ہوجائیں، کیا وہ اللہ کی نعمت کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں''۔

خود اختیاری اشتراکیت کی دعوت

عام طور پر مفسرین نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ تم کبھی اپنے غلاموں کو اپنے برابر نہیں لاتے تو پھر اللہ کیوں کر اسے گوارا کرے گا

کہ اس کی مخلوق چیزوں کو اس کے برابر قرار دیا جائے۔[1]

مگر ہماری قدیم تفسیر سے پتہ چلتا ہے کہ ''اپنے رزق کو پلٹا نہیں دیتے'' بطور مذمت ہے اور آمادہ کرنا ہے اس پر کہ تمہیں اپنے گھر والوں کے ساتھ مساوات برتنا چاہیے اور اپنا حصہ ان سے زیادہ نہیں رکھنا چاہیے۔[2]

آخر کا فقرہ آیت کا اس مفہوم کو تقویت دیتا ہے۔ اس طرح قرآن مجید نے اس معاشی یکسائی کا تصور پیش کیا ہے جسے اشتراکیت جبری طور پر نافذ کرنے کی حامی ہے۔ اسلام ضمیر کی تحریک سے اسے اختیاری طور پر جاری کرنے کا علمبردار ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾

''اور اللہ نے تمہارے لیے تمہارے نفوس سے بیویاں قرار دیں اور تمہارے لیے تمہاری بیویوں سے بیٹے، پوتے عنایت کیے اور تمہیں پاک صاف غذاؤں سے رزق عطا کیا تو کیا وہ باطل کو مانتے رہیں گے اور اللہ کی نعمتوں سے ناشکرا پن کریں گے؟ اور وہ اللہ کو چھوڑ کر ایسے کی عبادت کرتے رہیں گے جو آسمان اور زمین سے ان کو رزق دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا اور نہ وہ قدرت ہی رکھتے ہیں''۔

یعنی ملکیت میں بھی ان کے کچھ نہیں ہے، وہ تہی دست ہیں اور توانائی بھی نہیں کہ وہ اپنے دست و بازو سے کچھ کر سکیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو روزی موجود ہے، وہ ان کی ملکیت میں نہیں اور جو روزی نہیں ہے، اس کا پیدا کرنا ان کی قدرت میں نہیں۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾

''تو اللہ کے لیے مثالیں تجویز نہ کرو، یقیناً اللہ جانتا ہے اور تم جانتے نہیں ہو''۔

''ضرب مثل'' کے جو معنی ہیں، اس کے لحاظ سے معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ خداوند عالم کے بارے میں مثالوں کے طور پر کچھ رائے زنی کرتے تھے۔[3]

اب وہ کیا تھا جو وہ کہتے تھے؟ اس کا پتہ نہیں، اس لیے بعض مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ دوسری اشیاء کو اس کے مثل قرار نہ دو یعنی شرک نہ کرو۔[4]

---

[1] ۔یعنی ہیچ کس نمی خواهد که مملوکان خودرا برابر خود سازد (فتح الرحمن) فکیف یجعلون بعض مما لیك الله شرکاء (جلالین)

[2] ۔لا یجوز للرجل ان یخص نفسه بشئی من الماکول دون عیاله (علی بن ابراهیم)

[3] ۔مت بیان کرو واسطے اللہ کے مثالیں (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔معناه لا تجعلوا لله الاشیاء والامثال فانه لا شبه له ولا مثل (تبیان)

شاہ عبدالقادر نے شرک کی ''ضرب مثل'' کے معنی کے تحت میں تشریح کی ہے:۔

''مشرک کہتے ہیں مالک اللہ ہی ہے، بزرگ اس کی سرکار ہیں مختار ہیں اس واسطے ان کو پوجیں، سو یہ غلط مثال ہے، اللہ ہر چیز آپ کرتا ہے کسی پر سپرد نہیں رکھا اور اگر صحیح مثال چاہو تو آگے دو (۲) مثالیں فرمائیں'' (موضح القرآن)

صراحت تو نہیں ہے مگر مجھے موصوف کی تشریح کے بین السطور میں وہابیت جھلکتی نظر آتی ہے اور دیکھا جائے تو ان کا یہ کہنا کہ ''اللہ ہر چیز آپ کرتا ہے، کسی پر سپرد نہیں رکھتا'' کلیۃً درست نہیں ہے ورنہ ملک الموت اور انزال وحی کے لیے جبرائیل کا تقرر اور کاتبان اعمال ان سب کا انکار کرنا پڑے گا۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

''اللہ مثال پیش کرتا ہے ایک حلقہ بگوش غلام کی جو کسی بات پر قدرت نہیں رکھتا اور اس کی جسے ہم نے اچھی روزی عطا کی ہے تو وہ اس سے خفیہ اور اعلانیہ خیرات کرتا ہے، کیا وہ سب برابر ہیں؟ شکر اللہ کا (کہ تم نے اسے مان تو لیا) بلکہ ان میں زیادہ تر لوگ واقف نہیں ہیں''۔

مطلق توسل کا انکار کرنے والے اس مثال کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ''حلقہ بگوش غلام'' جو کسی بات پر قدرت نہیں رکھتا، مثال اصنام کی ہے اور جسے ہم نے اچھی روزی عطا کی ہے تو وہ اس سے خفیہ اور علانیہ خیرات کرتا ہے، مثال خود اللہ کی ہے [1] یعنی جس طرح وہ غلام اور آزاد صاحب ثروت برابر نہیں، اسی طرح یہ اصنام اور اللہ برابر نہیں، مگر ہمارے نزدیک قرآن کی مثال کو اس مفہوم پر منطبق کرنا بالکل درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ حلقہ بگوش غلام کے مقابلے میں جو دوسرا ہے، وہ ذاتی قدرت کا مالک نہیں ہے بلکہ وہاں خالق نے اپنی بالادستی کو نمایاں کیا ہے، یہ کہہ کر کہ ہم نے اسے اچھی روزی عطا کی ہے تو اسے خود خالق پر منطبق کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

ہم اس آیت کو مشرکین کی رد اس لحاظ سے سمجھتے ہیں کہ انہوں نے انتخاب ''وسیلہ'' میں غلطی کی ہے یعنی اپنے دل سے ایسوں کو وسیلہ بنا لیا ہے جنہیں خالق نے کسی قسم کا اختیار عطا نہیں کیا ہے۔ لازم تھا کہ وہ توسل کے لیے خود منشاء قدرت کو دیکھتے کہ اس نے کنھیں خلق کے لیے وسیلہ قرار دیا ہے؟ جسے اس کی طرف سے یہ اختیار عطا ہو، اس کے ساتھ توسل صحیح ہے یہ کہ ''وہ جو بالکل بے بس ہیں'' ان کے مثل نہیں ہیں جنہیں اللہ نے قدرت و اختیار عطا کیا ہے، خود اس کی دلیل ہے کہ کچھ ایسے ہیں جنہیں اللہ نے اپنی عطا سے ایسے اختیارات عنایت کیے ہیں کہ وہ اس کی دی ہوئی قدرت سے خلق خدا کی مدد کرتے ہیں۔

یہ مفہوم دور اول کے مفسرین کی تفسیر کے موافق ہے۔ [2]

---

[1] ۔الاول مثل الاصنام والثانی مثل تعالیٰ (جلالین)

[2] ۔انہ مثل ضرب الکافر الذی لا خیر عندہ والمؤمن الذی یکسب الخیر... ھو قول ابن عباس وقتادۃ (تبیان)

اس کے بعد جب یہ پیش نظر ہے کہ ان کو قدرت ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ کی دی ہوئی ہے تو شرک یعنی اللہ کے مدمقابل قرار دینے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اس مثال کے بعد جو الحمدللہ ہے اور ایسا ہی بعض دوسرے مقامات پر کسی سوال و جواب کے بعد جو "الحمدللہ" ہے جیسے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ (القمان ۲۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سوال کے جواب میں یا اس مثال کے پیش کیے جانے پر مخاطبین عاجزی سے خاموش رہے یا اعتراف جو حق پر مجبور ہوئے تو قدرت نے فاتحانہ انداز میں کہا: الحمدللہ یعنی شکر خدا کہ تم نے اسے تسلیم تو کیا اور پھر گویا خالق نے ان کی طرف سے ایک عذر پیش کیا ہے کہ اگر سمجھ میں آجائے تو بہت سے حقیقت کا اعتراف کرلیں مگر اصل یہ ہے کہ وہ جاہل ہیں، جانتے نہیں ہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾

"اور اللہ ایک مثال پیش کرتا ہے دو آدمیوں کی جن میں سے ایک گونگا ہے کہ کسی بات پر قدرت نہیں رکھتا اور وہ اپنے مالک پر بوجھ بنا ہوا ہے، جدھر وہ اسے بھیجتا ہے کوئی اچھا نتیجہ اس کے ہاتھ سے برآمد نہیں ہوتا تو کیا برابر ہے وہ اور وہ جو عدالت کا حکم دیتا ہے اور سیدھے راستے پر قائم ہو"۔

بعض مفسرین نے اسے بھی بتوں اور خدا کی مثال قرار دیا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

حاصل ایں دو مثل آنست کہ آنچہ در عالم تصرف ندارد یا خدا برابر نیست چنانکہ مملوک ناتواں با مالک توانا برابر نیست و چنانچہ گنگ بے تمیز با صاحب ہدایت دہندہ برابر نیست (فتح الرحمن)

ان دونوں مثالوں کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی چیز دنیا میں تصرف نہیں رکھتی، خدا کے برابر نہیں ہے، جس طرح کمزور غلام صاحب اقتدار مالک کے برابر نہیں ہے اور جس طرح بے عقل و تمیز گونگا ہدایت کنندہ و ہدایت یافتہ شخص کے برابر ہے۔

مگر ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر کے ضمیر نے یہاں اس تشریح کو گوارا نہیں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"یعنی خدا کے دو بندے: ایک بہت نکما نہ ہل سکے، نہ چل سکے جیسے گونگا یا غلام، دوسرا رسول جو اللہ کی راہ بتادے ہزاروں کو اور آپ بندگی پر قائم ہے، اس کے تابع بہتر یا اس کے" (موضح القرآن)

جلالین نے اور تیسری بات کہی: گونگا ہے، کوئی خیر نہیں ظاہر کرتا، وہ کہتے ہیں:

هذا مثل الكافر "یہ کافر کی مثال ہے" اور جو عدالت کا حکم دیتا ہے اور وہ سیدھے راستے پر قائم ہے، کہتے ہیں: وهو مثل المومن "یہ مومن کی مثال ہے" اس کے بعد انہوں نے کہا ہے:۔

"وقيل هذا مثل الله تعالىٰ والا بكم الاصنام والذى قبله فى المؤمن والكافر۔

اور ایک قول یہ ہے کہ یہ مثال اللہ کی ہے اور گونگا مثال ہے بتوں کی اور جو اس کے قبل والی آیت میں مثال تھی، وہ مومن اور کافر کی ہے۔ ہمارے نزدیک نہ وہ پہلی مثال اللہ اور اصنام کی تھی اور نہ یہ دوسری اللہ اور اصنام کی ہے بلکہ پہلی مثل انتخاب وسیلہ کے متعلق تھی اور یہ دوسری مثل انتخاب رہنما سے متعلق ہے۔

ایسے وسیلہ بنانے کے قابل نہیں، جنہیں اللہ نے ذرہ بھر بھی اختیار نہیں دیا ہے بلکہ وسیلہ بنانے کے قابل وہ ہیں جنہیں خالق نے وسیلہ بننے ہی کے لیے پیدا کیا ہے اور اس لیے اپنی جانب سے انہیں بہت سے خاص اختیارات کا مالک بنایا ہے۔ اسی طرح رہ نمائی کے قابل وہ نہیں جو علم و بصیرت سے محروم ہیں، اور مثل گونگے کے نہ صحیح راستا دوسروں کو بتا سکتے ہیں اور نہ خود ہی جس کام پر مامور کیے جائیں، اسے صحیح طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں بلکہ وہ رہ نمائی کے قابل ہیں جو اللہ کی جانب سے علم و بصیرت کے حامل قرار دیے گئے اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر قائم ہیں۔

کلیۃً عملی حیثیت سے ''صراط مستقیم'' پر قیام ہی وہ ''عصمت'' ہے جو منجانب اللہ رہ نمائی کے لیے شرط لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۷۷﴾

''اور اللہ کے لیے آسمانوں اور زمین کا غیب ہے اور قیامت کا معاملہ نہیں ہے مگر مثل چشم زدن کے یا اس سے بھی جلد، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

''اللہ کے لیے غیب ہے'' اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اس غیب کا علم صرف اسے ہے [1] اور یہ بھی کہ یہ غیب کی چیزیں تمام اس کی ملکیت میں ہیں [2] اور ''مثل چشم زدن یا اس سے کم'' کہنا حقیقت امر کے لحاظ سے کسی شک کا اظہار نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اس کے انتہائی نزدیک ہونے کے لیے جو تعبیر کرو وہ درست ہوگی، خواہ مثل چشم زدن کہو، خواہ اس سے کم تر کہو، بہر حال اسے بالکل دور نہ سمجھو۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

''اور اللہ نے نکالا تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے ایسے عالم میں کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور اس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل قرار دیئے تا کہ تم شکر گزار ہو''۔

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِىْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾

''کیا انہوں نے نہیں دیکھا پرندوں کو جو فضائے آسمان میں قانون قدرت کے پابند رکھے گئے ہیں، نہیں انہیں

---

[1] ۔علم پنہاں آسمانہا و زمین (شاہ ولی اللہ) علم غیب آسمانوں کا اور زمین کا (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔قال الجبائی: یحتمل ان یکون المعنی: وللہ ملک ما غاب (تبیان)

تھامے رکھتا مگر اللہ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں"۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور اللہ نے کیا تمہارے لیے تمہارے گھروں میں سکونت کا سامان اور بنائے تمہارے لیے چوپایوں کی کھالوں سے ایسے گھر جو تمہیں ہلکے معلوم ہوتے ہیں تمہارے سفر کے دن اور تمہارے قیام کے دن اور ان کے اُونوں اور رونگٹوں اور بالوں سے تمہارے لیے سامان خانہ داری اور اسباب مہیا کیے ایک مقررہ مدت تک کے لیے۔ اور اللہ نے بنائے تمہارے لیے اپنی ان چیزوں سے جو اس نے پیدا کیں سائے اور قرار دیئے تمہارے لیے پہاڑوں میں چھپنے کے مقامات اور قرار دیئے تمہارے لیے لباس جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور ایسے لباس جو تمہیں تمہارے حملہ سے بچاتے ہیں، اس طرح وہ اپنی نعمت تم پر مکمل کرتا ہے، شاید کہ تم سر اطاعت خم کر دو۔ اب اگر وہ روگردانی کریں تو آپ پر تو بس صاف صاف تبلیغ کی ذمہ داری ہے۔ وہ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں، پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر کافر ہیں۔

چوپایوں کی کھالوں سے جو گھر کہے گئے ہیں، اس سے خیمے اور چھولداریاں مراد ہیں[1] اور ایسے لباس جو تمہیں تمہارے حملہ سے بچاتے رہیں، اس سے زرہیں[2] مراد ہیں جو عموماً تو لوہے کی ہوتی تھیں،

مگر معلوم ہوتا ہے کہ جنہیں اتنی استطاعت نہ ہو یا اتنا بوجھ برداشت نہ کر سکیں ان کے لیے چمڑے وغیرہ کے بھی خول تیار ہوتے تھے جو تلوار وغیرہ سے ایک حد تک بچاؤ کا ذریعہ ہوتے تھے اور شاید وہ افراد کم ہی ہوتے تھے جو لوہے کی زرہیں خریدیں اور پہنیں، زیادہ تر فوجی لوگ ایسے ہی لباس استعمال کرتے تھے اس لیے یہاں خالق نے اسے بطور اپنے انعام و احسان کے پیش فرمایا ہے۔

---

[1] ۔یعنی الخیم والمضارب (علی بن ابراھیم)

[2] ۔لڑائی کا بچاؤ زرہیں (موضح القرآن)

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ﴿۸۴﴾

''اور اس دن کہ جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ اٹھائیں گے پھر کافروں کو اجازت نہ دی جائے گی اور نہ اب خوشنودی حاصل کرنے کا انہیں موقع ہوگا''۔

یہ ہر امت کا گواہ اس کا پیغمبر ہوتا ہے جو قیامت کے دن اس امت کے اچھے اور برے اعمال پر گواہ کی حیثیت سے پیش ہوگا [۱]

''اجازت نہ دی جائے گی'' یعنی اصلاح عمل اور توبہ وانابت کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ [۲]

''نہ اب خوش نودی حاصل کرنے کا انہیں موقع ہوگا، یعنی اب رضائے الٰہی کے حاصل کرنے کی ان کے لیے کوئی صورت نہیں ہوگی [۳]۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ﴿۸۵﴾

''اور جب ظالم لوگ عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو پھر نہ اس میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی''۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴿۸۶﴾ وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴿۸۷﴾

''اور جب مشرک لوگ اپنے شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے اے ہمارے پروردگار! یہ ہمارے وہ شریک ہیں جن کی ہم تجھے چھوڑ کر دہائی دیتے تھے تو وہ انہیں جواب دیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔ اور وہ اللہ کے سامنے سر اطاعت خم کر دیں گے اور جو وہ غلط باتیں منڈھتے تھے، وہ سب ان سے غائب ہوگئی ہوں گی''۔

جنہیں وہ شریک خدا قرار دیتے تھے، انہوں نے کسی معنی سے کہا کہ تم جھوٹے ہو؟ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''جو لوگ پوجتے ہیں بزرگوں کو، وہ بزرگ بے گناہ ہیں، ایک شیطان اپنا وہی نام رکھ کر پجواتا ہے۔ اس سے ان کو کہیں گے کہ تم جھوٹے ہو'' جلالین نے لکھا ہے:۔

انکم لکاذبون فی قولکم انکم عبدتمونا کما فی ایة اخری ما کانوا ایانا یعبدون سیکفرون بعبادتهم

تم جھوٹے ہو اس کہنے میں کہ تم نے ہماری عبادت کی تھی جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: وہ لوگ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے اور یہ کہ

---

[۱] ۔شهید کل امة رسوله (تبیان)

[۲] ۔تاعذر خود کنند (فتح الرحمٰن)

[۳] ۔لا تطلب منهم العتبی ای الرجوع الی ما یرضی الله (جلالین)

عنقریب وہ ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

''وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کی راہ سے روکا ان کو عام عذاب سے بالاتر ہم نے عذاب میں اضافہ کیا اس بناء پر کہ وہ فساد پیدا کرتے تھے''۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

''اور وہ دن جب اٹھائیں گے ہم ہر امت سے ایک گواہ ان پر خود ان میں سے اور آپ کو لائیں گے گواہ بنا کر ان سب کے اوپر اور ہم نے آپ پر یہ کتاب اتاری ہر چیز کا واضح بیان اور ہدایت اور رحمت اور بشارت بنا کر سر اطاعت خم کرنے والوں کے لیے''۔

ہر امّت کا ایک گواہ اور ہمارے رسولؐ ان گواہوں کے گواہ

یہ مضمون دوسری جگہ بھی آچکا ہے کہ ہر امت کا ایک گواہ ہوگا اور وہ اس کا رسول یا اس دور کا امام ہوگا[1] اور ان تمام گواہوں کے گواہ ہمارے رسولؐ ہوں گے[2] اور اس سے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت تمام مرسلین اور ائمہ معصومین علیہم السلام پر اس درجہ ثابت ہوتی ہے کہ جو نسبت امتوں کو انبیاء کے ساتھ ہے، وہ نسبت انبیاء وائمہ کو ہمارے رسول خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہے۔

مگر بعض مفسرین نے جو تشریح کی ہے، وہ اس فضیلت کو ختم کر دیتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ھؤلآء سے مراد یہ امت ہے یعنی ہم ہر امت کا ایک گواہ لائیں گے اور اس امت کا گواہ بنا کر آپ کو لائیں گے۔

جلالین لکھتے ہیں:

وجئنا بك يا محمّد شهيدا على هٰؤلآء اى قومك:-

آپ کو اے محمدؐ! ہم گواہ بنا کر ان لوگوں پر لائیں گے یعنی آپ کے قوم والوں پر

شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کیا ہے:-

وبیاریم ترا گواہ بر ایں کافران.

---

[1] ۔لكلّ زمان و امّة امام يبعث كل امّة مع امامها ۔(على بن ابراهيم)

[2] ۔شهيدًا على هؤلآء يعنى على الأئمه فرسول الله شهيدًا على الائمه وهم شهداء على الناس.(على بن ابراهيم)

آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان کافروں پر۔

مگر اس صورت میں اس کہنے کو قرآن کے حاصل ہی کیا ہوا؟ وہ تو ظاہر ہے کہ جب ہر نبی اپنی امت کا گواہ ہے تو یہ رسول اس امت کا گواہ ہوگا یہ "دندان تو جملہ دردہان اند چشمان تو زیر ابروان اند" کا ایسا جملہ کیا بلاغت قرآنی کے شایان شان ہے؟

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٩٠﴾

"بلاشبہ اللہ عدالت، حسن سلوک اور صاحبان قرابت کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے شرمی، برائی اور ظلم و تعدی سے منع کرتا ہے، تمہیں نصیحت کرتا ہے، شاید تم اثر قبول کرو"۔

وہ آیت جو تمام اچھائیوں اور برائیوں کے احکام پر حاوی ہے

اہل نظر کا فیصلہ ہے کہ کردار کے روشن اور تاریک پہلوؤں پر حاوی اور انتہائی جامع یہ آیت ہے جس میں مختصر الفاظ میں نیکی اور بدی کے تمام شعبوں کو بیان کر دیا گیا ہے۔[1]

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٩١﴾

"اور اللہ کے عہد کو پورا کرو جب تم معاہدہ کرو اور قسموں کو توڑو نہیں ان کی مضبوطی کے بعد درحالیکہ تم نے خدا کو اپنے اوپر ضامن بنایا ہے، یقیناً اللہ جانتا ہے اسے جو تم کرتے ہو"۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِىَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٩٢﴾

"اور مثل اس عورت کے نہ ہو جس نے اپنے کاتے ہوئے سوت کو اس کی مضبوطی کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، تم اپنی قسموں کو اپنے درمیان مکر و فریب کا ذریعہ بناتے ہو کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھ جائے، اس کے ذریعہ سے تو اللہ صرف تمہاری آزمائش کرتا ہے اور وہ تمہارے لیے روز قیامت ظاہر کر دے گا اسے جس میں تم اختلاف کرتے تھے"۔

"اس لیے کہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ جائے یعنی یہ جھوٹی قسمیں صرف اس لیے کھاتے ہو کر کچھ مال و دولت زیادہ مل جائے اور دنیا

---

[1] ۔عن ابن مسعود ھذہ اجمع اٰیۃ فی القرآن للخیر والشر (جلالین)

کی کامیابی دوسروں سے زیادہ نصیب ہوجائے [1] یا یہ کہ یہ مکروفریب اس لیے ہوتا ہے کہ تم اکثریت میں ہو یا وہ اکثریت میں ہیں تو چاہتے ہوں ان میں کمی ہوجائے [2] کاتے ہوئے سوت کا توڑ دینا خود اپنی قسموں کی مخالفت بھی ہوسکتی ہے مگر دوسرا مفہوم اس کا یہ لیا گیا ہے کہ ان قسموں کی مخالفت سے تمہارے کیے کرائے نیک اعمال سب رائیگاں چلے جائیں گے [3] تیسرا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ ان قسموں کے توڑنے سے نقصان خود اپنا ہی ہوگا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''اپنے ہی کام کو خراب کرتا ہے جیسے ایک عورت دیوانی تھی سارے برس سوت کتواتی کہ جڑ اول دوں گی اقربا کو جب جاڑا شروع ہوتا سوت کتر کے بوٹے بوٹے سب کو بانٹتی'' (موضح القرآن)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

''اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک دین پر کر دیتا لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور بے شک تم سے سوال ہوگا اس کا جو تم اعمال کرتے تھے''۔

اس مضمون کی آیات دوسرے مقامات پر بھی آچکی ہیں اور اس کا مطلب ہر جگہ یہ ہے کہ اللہ جبری طاقت سے کام نہیں لیتا ورنہ تمام دنیا راہ ہدایت پر اور ایک دین مناسب پر جو مذہب حق ہے، ہوتی اور کافر کا وجود ہی نہ ہوتا۔ [4]

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾

''اور تم اپنی قسموں کو اپنے درمیان مکروفریب کا ذریعہ نہ بناؤ کہ پیر جمے ہونے کے بعد اکھڑ جائیں اور تم برائی کا مزہ چکھو اس سزا میں کہ تم نے اللہ کے راستے سے روکا اور تمہارے لیے بڑا عذاب ہے''۔

پیر جمے ہونے کے بعد اکھڑ جائیں'' اس کا ایک مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اس سے تمہیں شکست ہوگی اور تمہارا قدم میدان جنگ سے اکھڑ جائے گا اور راہ حق سے ہٹ جائے گا [5] اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ تمہاری قسموں سے دوسرے لوگ جواب تک شکوک وشبہات میں مبتلا نہیں

---

[1] ۔یعنی برای منفعت دنیا تامال و منال زیادہ تر بدست آرو (فتح الرحمن)

[2] ۔لانکم اکثر عددا منھم اولان غیرکم اکثر عددا منکم (تبیان)

[3] ۔حاصل مثل آنست کہ اعمال خود را حبط مکنید چنانکہ ایں زن عمل خود را تباہ کرد (فتح الرحمن)

[4] ۔لوشآء لاکرھھم علی ان یکونو امۃ واحدۃ (تبیان)

[5] ۔یضل بعد ان کان علی الھدٰی (تبیان)

ہے، وہ بھی شوک وشبہات میں مبتلا ہو جائیں گے [1]۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے کچھ عجیب مطلب لکھا ہے، وہ کہتے ہیں:۔

یعنی درجہاد عہد کردہ و قسم خوردہ دغا کردن بسبب آنست کافران من بعد قول ایشاں رامعتبرند انندو باایشاں راصحبت ندارند بلکہ مسلمانان درشبہہ افتند. (فتح الرحمن)

یعنی جہاد میں عہد کر کے اور قسم کھا کے دغا کرنا اس سبب سے ہے کہ کافر اس کے بعد ان کے قول کو معتبر نہ جانیں اور ان کے ساتھ رفاقت نہ کریں بلکہ مسلمان شبہ میں پڑ جائیں۔

میری سمجھ میں اس عبادت کا مطلب کچھ نہیں آیا، بہرحال یہ اس معزز جماعت (صحابہ کرام) کے کردار کا کوئی ایسا ہی پہلو ہے جس پر قرآن مجید تنبیہ کر رہا ہے۔

بما صددتم عن سبیل اللہ صد کے معنی روگردان ہونے کے بھی ہوتے ہیں اور دوسروں کو روکنے کے بھی پہلی صورت میں معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''اس سزا میں کہ تم اللہ کے راستے سے روگردان ہوئے'' اور دوسری صورت میں یہ کہ ''تم نے اللہ کے راستے سے روکا'' جو ہم نے ترجمہ کیا ہے اور دونوں صورتوں میں ''اللہ کے راستے'' سے مراد مطلق دین حق بھی ہوسکتا ہے اور بتقاضائے محل خود یہ قسم کا پورا کرنا بھی ہوسکتا ہے اور اس صورت میں دوسروں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ایک غلط مثال قائم کر کے دوسروں کے لیے بھی یہ دروازہ کھول دیا کہ وہ جھوٹی قسمیں کھائیں اور عہد شکنی سے کام لیں۔ [2]

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

''اور اللہ کے عہد کے مقابلہ میں تھوڑی سی قیمت حاصل نہ کرو، جو اللہ کے یہاں ہے وہی بس تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ جو کچھ تمہارے یہاں ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے یہاں ہو، وہ باقی رہنے والا ہے اور بے شک ہم انہیں کہ جنہوں نے صبر و برداشت سے کام لیا، ان کا صلہ عطا کریں گے ان کے بہترین اعمال کے لحاظ سے جو وہ کرتے تھے''۔

پرہیزگار لوگ جو بھی کام کرتے ہیں، وہ جائز تو ضروری ہوں گے لہٰذا ایک حد تک حسن تو ان کے ہر کام میں ہوگا لیکن جو خاص رضائے الٰہی کے لیے کام ہوں گے اور بہ قصد اطاعت وہ یقیناً ان کے اعمال کی بہترین قسم ہے جن کے لحاظ سے آخرت میں انہیں صلہ عنایت ہوگا۔ [3]

---

[1] ۔ یعنی مسلمانوں کو بدنام نہ کرو کہ یقین لانے والے شک میں پڑیں اور تم پر گناہ چڑھے (موضح القرآن)

[2] ۔ ای بصد کم عن الوفاء بالعھد او بصد کم غیر کم عنہ لانہ مسیر بکم (جلالین)

[3] ۔ انما قال باحسن ما کانوا یعملون لان احسن اعمالھم ھو الطاعۃ اللہ تعالیٰ وما عداہ من الحسن مباح لیس بطاعۃ (تبیان)

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

''جو نیک اعمال کرے خواہ مرد ہو یا عورت درآنحالیکہ وہ باایمان ہو تو ہم اسے ایک پاک و پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور بلاشبہ ہم ان کا صلہ دیں گے ان کے بہترین اعمال کے مطابق''۔

نیک اعمال دنیا اور آخرت کی بہتری کے ذمّہ دار

''پاکیزہ زندگی دیں گے'' اس کے متعلق شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

''یعنی در دنیا نعمت دہیم'' (فتح الرحمٰن) مگر ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر کا جو کہنا ہے، اس کی عبارت عجیب ہے:۔

''یعنی زندگی حیات کی جلا دیں گے یا دنیا میں اللہ کی محبت میں اور لذت میں'' (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے:۔

قیل ھی حیٰوۃ الجنۃ وقیل فی الدنیا بالقناعۃ او الرزق الحلال

کہا گیا ہے کہ یہ بہشت کی زندگی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ دنیا میں قناعت یا حلال روزی۔

ہماری قدیم تفسیر نے اسی کو بتایا ہے کہ پاکیزہ زندگی سے مراد اللہ کے عطا کردہ رزق پر قناعت ہے۔[1]

یہی گزشتہ سیاق کلام کے بھی مطابق ہے، اس لیے کہ اس کے پہلے مال دنیا میں ہوس کی مذمت تھی اور حیات طیبہ کی ضمانت ہر نیک اعمال مومن کے لیے ہوئی ہے لیکن رزق میں فراوانی سب کے لیے یکساں نہیں ہے، جو چیز سب میں مشترک ہوسکتی ہے، وہ رزق الٰہی پر چاہے جتنا ملے قناعت ہی ہے[2] اور آخرت کی جزا کا ذکر صراحۃً بعد کو ہے۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾

''تو جب تم قرآن پڑھو تو اللہ سے پناہ مانگو اس شیطان کے شر سے جو راندہ ہوا ہے''۔

قرآن مجید کے آداب تلاوت میں سے یہ ہے کہ پہلے "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" کہے۔ یہ اسی آیت کے حکم کی ظاہری تعمیل ہے۔

تلاوت قرآن کے موقع پر اعوذ باللہ کہنے کا حکم

اور یہ جو ارشاد ہوا کہ ''جب تم قرآن پڑھو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تم قرآن پڑھنے کے لیے بیٹھو یعنی قرآن پڑھنے لگو، نہ یہ کہ

---

[1] ۔التضوع بما رزقه الله (علی بن ابراهیم)

[2] ۔قال قوم الاولیٰ ان یکون المراد به القناعة فی الدنیا لانّه عقیب ماتوعد غیر هم به من العقوبة فیها مع ان اکثر المؤمنین لیسوا یمنعی الرزق فیها (تبیان)

پڑھنے کے بعد اعوذ باللہ کہو۔[1]

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''بلاشبہ اس کا کوئی قابو نہیں ہے ان پر جو ایمان لائے ہوں اور اپنے پروردگار پر بھروسا کریں۔ اس کا قابو تو بس انہیں پر چلتا ہے جو اسے دوست رکھتے ہیں اور جو اس کے ساتھ شرک اختیار کیے ہوئے ہیں''۔

''اسے دوست رکھتے ہیں'' یعنی شیطان کو اور ''اس کے ساتھ شرک اختیار کیے ہوئے ہیں۔'' یعنی خدا کے ساتھ۔[2] اس آیت میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انسان جو اپنی بداعمالیوں کا ذمہ دار شیطان اور بس شیطان کو بنا دیتا ہے، یہ بالکل غلط ہے، شیطان کا سہارا دینے والا تو خود انسان ہوتا ہے۔ اس کی ذہنیت خود جب تک شیطانی نہ ہو، شیطان اس پر قابو نہیں پا سکتا، اس کا اظہار دوسری جگہ آخرت کے موقع پر خود شیطان کی زبان سے قرآن میں ہے کہ وہ کہے گا:

فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

مجھے ملامت نہ کرو، خود اپنے ہی کو ملامت کرو۔ (ابراہیم۔ ۲۲)

اس لیے شیطان کا آلہ کار بننے پر خود انسان باز پرس سے بچ نہیں سکتا۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

''اور جب بدل کر لے آتے ہیں ہم ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ اور اللہ ہی خوب جانتا ہے اسے جو وہ اتارتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم تو بس اپنے دل سے گھڑتے ہو بلکہ ان میں سے اکثر علم نہیں رکھتے۔ کہئے کہ اسے روح القدس نے اتارا ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ تاکہ وہ انہیں جو ایمان لائے ہیں، ثابت قدمی عطا فرمائے اور ہدایت اور خوش خبری دینے کو سر اطاعت جھکانے والوں کے لیے''۔

کتب الٰہیہ میں نسخ کے ہونے پر عیسائی آج تک معترض ہیں، بس اسی طرح ناسمجھی سے اس وقت والے بھی آیات کی منسوخی پر نکتہ چینی کرتے تھے، اللہ خوب جانتا ہے یعنی وہ مصالح سے واقف ہے کہ اسے کون سا حکم دائمی طور پر نازل کرنا چاہیے اور کون سا وقتی طور پر جس کا مصلحت کے بدلنے سے بدلنا لازمی ہے۔

---

[1] ۔ کما قال اذا قتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا والمعنی اذا اردتم القیام بھا (تبیان)

[2] ۔ بہ ای اللہ تعالیٰ (جلالین)

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۰۳﴾

''اور بے شک وقتاً فوقتاً ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ بس ایک آدمی ہے جو سکھاتا ہے جس کی طرف یہ نسبت دیتے ہیں، اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف سلیس عربی زبان ہے''۔

یہ کون شخص تھا جس کی طرف وہ نسبت دیتے تھے کہ وہ حضرت کو سکھاتا ہے؟

ایک قول یہ ہے کہ:

''ایک شخص غلام رومی نصرانی مکہ میں تھا، حضرتؐ کے پاس بیٹھتا محبت سے اللہ کا کلام اور پیغمبروں کا احوال سننے کو، کافر کہتے وہی سکھا جاتا ہے'' (موضح القرآن)

دوسرا قول:

هو قین نصرانی کان النبی ﷺ یدخل علیه (جلالین)

وہ ایک عیسائی تلواریں بنانے والا تھا جس کے پاس حضرت پیغمبرؐ خدا جایا کرتے تھے۔

ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں اس نام ابوفکیہ ہے۔ یہ ابن حضرمی کا غلام تھا جو یہودی یا عیسائی تھا، پھر مسلمان ہو گیا تو قریش نے اپنے عناد کے جذبہ میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہی ہے جو رسولؐ کو یہ سب باتیں بتاتا ہے (تفسیر علی بن ابراہیم قمیؒ)

شیخ الطائفہؒ نے کہا ہے:۔

قال الضحاك اراد وابه سلمان الفارسی (تبیان)

ضحاک کا قول ہے کہ ان کا خیال سلمان فارسیؓ کے متعلق تھا۔

اگر قرآن کی اہمیت صرف بحیثیت مضامین ہوتی تو ان کے اس تصور کا جواب اس طرح نہ ہو سکتا، جس طرح قرآن نے دیا ہے کیوں کہ بہت ممکن ہے کہ مضامین کسی غیر زبان کے آدمی سے معلوم کر کے انہیں اپنی زبان میں منتقل کر لیا جائے مگر چونکہ قرآن کی اہمیت بحیثیت فصاحت و بلاغت بھی ہے جس میں مضامین کے ساتھ اسلوب بیان اور خصوصی عبادات کا دخل ہے۔ اس لیے غیر زبان کے کسی آدمی کی طرف منسوب کرنا بالکل خلاف عقل ہے۔

اس سے اعجاز قرآن کے متعلق اس تصور کا غلط ہونا ثابت ہوتا ہے جو جناب سید المرتضیٰ علم الہدیٰؒ کی طرف نسبت رکھتا کہ قرآن کا اعجاز اس اعتبار سے ہے کہ مقابلہ کرنے والوں کی طاقت کو اللہ سلب کر لیتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انہیں یوں اس کلام کو سن کر حیرت نہ ہوتی اور وہ اسے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مقدور سے خارج قرار دے کر اس کے لیے کسی دوسرے مصنف کی تلاش نہ کرتے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا یَهْدِیْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾ اِنَّمَا یَفْتَرِی الْكَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

''بلاشبہ وہ جو آیات الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے، انہیں اللہ منزل مقصود تک نہیں پہنچائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ جھوٹ بس وہی گھڑتے ہیں جو آیات الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے اور یہی لوگ جھوٹے ہیں''۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

''جس نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرلیا، سوا اس کے کہ جو مجبور کیا جائے اور دل اس کا ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، بے شک جو کشادہ دلی سے کفر اختیار کرے تو ان پر اللہ کی طرف کا غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے''۔

ضرورت کے وقت تقیّہ کا صریحی حکم

اس آیت میں کافروں کے عذاب سے جو استثناء کیا گیا ہے: الامن اکرہ وقلبہ مطمن بالایمان یہ حکم تقیہ کا بیان ہے جو فطری طور پر تو تمام فرق اسلامیہ نے کیا، عالم انسان کے عقلاء میں متفق علیہ مگر ''سخن'' گسترانہ بحث اور مناظرانہ نوک جھوک'' کے طور پر اسے فرقہ شیعہ کے مقابلہ میں بطور ایک جرم کے پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں ایک دفعہ تیسرے پارہ میں: اِلّآ ان تتّقوا منھم تقٰۃ کہہ کر صراحۃ بطور راستثناء اس کا ذکر کیا گیا ہے اور یہاں الّامن اکرہ و قبلہ مطمئن بالایمان کہہ کر اس کا استثناء کیا گیا ہے۔ روایتیں بتاتی ہیں کہ یہ آیت جناب عمار بن یاسرؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ انہیں مکہ والوں نے جب پکڑا تو انہوں نے ان کے جبر و تشدد سے کچھ الفاظ ان کی مرضی کے مطابق زبان سے کہہ دیئے مگر اس سے ان کے ضمیر میں ایک ہلچل تھی جو ان کے ایمان قلبی کا نتیجہ تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [1]

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''ظالم زبردستی سے اگر منہ سے کفر کا لفظ نکلوا دے، دل میں ایمان ہو تو اس کو گناہ نہیں'' (موضح القرآن)

یہاں تک تو آیت قرآن کی تشریح ہے مگر اس کے بعد وہ اضافہ فرماتے ہیں:۔

''لیکن اگر مرنا قبول کرے اور لفظ بھی منہ سے نہ کہے تو شہید اکبر ہے۔''

یہ اضافہ قرآن مجید کی آیت میں تو ہے نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ کلیۃً درست بھی نہیں ہے اس کا باعتبار موارد حکم مختلف ہوتا ہے، جہاں تقیہ بس جائز ہو، وہاں یہ بات ٹھیک ہے لیکن بعض صورتوں میں تقیہ واجب ہوتا ہے۔ اس وقت مخالفت کرنے والا گناہگار اور ''شہید اکبر'' ہونا کیسا، ہلاکت ابدی میں گرفتار ہوگا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ

---

[1] ۔عمار بن یاسر اخذتہ قریش بمکۃ یقذبوہ بالنار حتٰی اعطاھم بلسانہ ما ارادوہ و قلبہ مطمئن بالایمان (علی بن ابراھیم)

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

''یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے دینوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور یہ کہ اللہ کافر جماعت کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا۔ یہ وہ ہیں کہ اللہ نے مہر لگا دی ان کے دلوں پر اور ان کے سننے کی طاقت اور ان کی نگاہوں پر اور یہی وہ ہیں جو مدہوش ہیں۔ وہ بلاشبہ آخرت میں گھاٹا اٹھانے والے ہیں''۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

''پھر یقیناً تمہارا پروردگار ان کے لیے جنہوں نے تکلیفیں پہنچائے جانے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا، یقیناً تمہارا پروردگار اس سب کے بعد بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

بعض لوگوں نے اس آیت کو تقیہ والی آیت سے مرتبط کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تقیہ کے ساتھ اظہار کفر کرنا تھا تو گناہ مگر اللہ اسے بخش دے گا اور اس کا ہمارے بعد مفسرین نے یہ جواب دیا ہے مغفرت کے اصل معنی پردہ پوشی کے ہیں چونکہ ان کے الفاظ سے ظاہراً ان کے متعلقہ گمراہی اور جرم کا خیال قائم ہوتا تھا لیکن اللہ نے ان کی نیت کی صفائی اور ضمیر کے استحکام کو نمایاں کر کے ان سے برائی کے تصور کو دور کر دیا تو اسی کو مغفرت سے تعبیر کیا گیا ہے [1] مگر ہمیں اس پورے سوال و جواب کی بنیاد ہی سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ یہ آیت حکم تقیہ کے بعد بلا فاصلہ تو ہے نہیں بلکہ تقیہ کے استثناء کے بعد ان کا ذکر شروع ہو گیا جنہوں نے خود اپنے سوء اختیار سے یعنی بلا جبر و اکراہ کفر اختیار کیا ان کے عذاب کا ذکر ہوا، اب اس کے بعد کہا جا رہا ہے کہ دباؤ میں آ کر واقعی جو کافر ہو گئے یہ بھی اس کے بعد اگر اعتقاد اپنے درست کر کے اس ماحول سے نکل آئیں اور مستقبل کی زندگی سے اس کی تصدیق ہو کہ اب وہ حق کے راستے پر ہیں اس لئے راہ حق میں جہاد کرتے ہیں اور پھر ثابت قدم بھی رہتے ہیں تو وہ جو درمیان میں ان کا کفر تھا اس پر اللہ پر مواخذہ نہ کرے گا کہ وہ غفور و رحیم ہے اس کا حکم تقیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''جس دن ہر ایک متنفس آئے گا خود اپنی طرف سے لڑتا ہوا اور ہر متنفس کو جو اس نے کیا ہوگا، اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی زیادتی نہ ہوگی''۔

یعنی اس دن نفسا نفسی کا عالم ہوگا ہر ایک کو بس اپنی فکر ہوگی کسی دوسرے کی فکر نہ ہوگی [2] اس سے مستثنیٰ وہی افراد ہوں گے جنہیں خالق کی طرف سے شفاعت کا منصب عطا کیا گیا ہے۔

---

[1] ۔فلما کشف اللہ عن باطن امر رھم و اخبر انھم کانو ا مطمئنین بالایمان کان فی ذلك مستر علیھم (تبیان)

[2] ۔لا یھمھا غیر ھا (جلالین)

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''اور اللہ نے ایک مثال پیش کی ہے اس بستی کی جو امن و اطمینان کے عالم میں تھی تو اس کے پاس اس کی روزی فراغت کے ساتھ آ رہی تھی ہر طرف سے مگر اس نے اللہ کی نعمتوں کے مقابلہ میں ناشکرے پن سے کام لیا تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف و دہشت کے غلبہ کا مزہ چکھایا اس کی سزا میں جو وہ کرتے تھے''۔

بعض اہل تفسیر لکھتے ہیں کہ اس بستی سے مراد خود مکہ معظّمہ ہے۔[1]

اور شاہ ولی اللہ اسے ایک عام مثال قرار دیتے ہیں اور حقیقۃً یہ دونوں ہی قول قدیم مفسرین کے یہاں پائے جاتے ہیں جن میں سے بعد کسی نے ایک لے لیا اور کسی نے دوسرا۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

''اور ان کے پاس آیا ہے ایک پیغمبر انہی میں سے تو انہوں نے اسے جھٹلایا تو انہیں گرفت میں لے لیا عذاب نے درحالیکہ وہ ظالم تھے''۔

یہ آیت تنزیل میں اگر گذشتہ آیت سے متعلق ہو تو وہ اسی بستی کا ذکر ہوگا مگر یہ اس تفسیر کی بناء پر دشوار ہے جس میں اس بستی سے مراد مکہ معظّمہ لیا گیا ہے اس لئے پھر رسول سے مراد یہ حضرت ختمی مرتبتؐ ہونگے اور یہ آپ کی خصوصیت ہے کہ اپنی قوم کے لئے کبھی بر بنائے تکذیب بددعا نہیں کی اس لئے آپ کی قوم پر اس دنیا میں عذاب استیصال نہیں آیا۔

چونکہ ترتیب موجود مطابق تنزیل نہیں ہے اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیت گزشتہ آیت کے ساتھ اتصال رکھتی ہے اور اس بناء پر میں نے اس آیت کو الگ خارج کر کے اس کا ترجمہ کیا اور اس صورت میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس آیت میں کس قوم کا ذکر ہے بہرحال وہ کوئی ایسی قوم ہے جس پر تکذیب رسول کی وجہ سے من حیث القوم عذاب نازل ہوا۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

''کھاؤ پیو اس سے جو اللہ نے تمہیں پاک، حلال رزق دیا ہے اور اللہ کی نعمت کے شکر گزار رہو۔ اگر تم صرف اس کی

---

[1] ۔مکۃ والمراد اھلھا (جلالین) یہ احوال فرمایا مکہ یا مکی کا (موضح القرآن)

عبادت کرتے ہو، اس نے بس تم پر حرام کیا ہے مردار اور خون اور سؤر کے گوشت کو اور اسے جسے اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو، ہاں جس شخص کو اضطراری صورت پیش آئے اور نہ وہ باغی ہو، نہ تعدی کرنے والا تو یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان"۔

اس مضمون کی آیت پہلے آ چکی ہے اور وہاں اس پر تبصرہ ہو چکا ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۖ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

"اور جن چیزوں پر تمہاری زبانیں غلط طور پر حکم لگاتی ہیں، ان کے لیے یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اس طرح تم اللہ پر تہمت لگاتے ہو، یقیناً وہ جو اللہ پر جھوٹ منڈھتے ہیں وہ دین و دنیا کی بہتری نہیں پائیں گے۔ بہت تھوڑا فائدہ اور ان کے لیے عذاب دردناک ہے"۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

"اور ان پر جو یہودی ہیں، ہم نے وہ چیزیں جو آپ کے سامنے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، حرام کر دیں اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا مگر وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے تھے"۔

جماعت یہود کے لئے خصوصی طور پر جو چیزیں ممنوع قرار دی گئی تھیں ان کا سورہ انعام میں ذکر ہوا ہے کہ:

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ (انعام۔146)

اس آیت میں بھی آخر میں کہا گیا ہے کہ یہ پابندیاں ان پر بطور سزا عائد کی گئی تھیں اور یہاں بھی آخر میں کہا جا رہا ہے کہ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے تھے اس کا مطلب یہی ہے کہ ہماری طرف سے جو ہوا وہ ان کے ظلم و تعدی کی بناء پر سزا کی حیثیت رکھتا تھا۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾

"پھر بلاشبہ تمہارا پروردگار ان کے لیے جو نادانی میں برائی کا ارتکاب کر لیں، پھر اس کے بعد توبہ کر لیں اور عمل درست کر لیں تو یقیناً تمہارا پروردگار اس کے بعد ضرور بالضرور بخشنے والا ہے، بڑا مہربان"۔

گذشتہ کے ربط سے اس کا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ:

یعنی حلال اور حرام میں جھوٹ بنانے والے جب مسلمان ہوئے تو بخش دیئے گئے (موضح القرآن)

لیکن اگر آیت کا حکم عام لیا جائے جیسا کہ بااعتبار معنی واقعی وہ عام ہے تو گزشتہ سے ربط قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

إِنَّ إِبْرٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيفًا ۖ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٢٠﴾ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ۖ اجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٢١﴾ وَآتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿١٢٢﴾ ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٢٣﴾

''بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام ایک امت تھے جو خالص اللہ سے لو لگانے والے، غلط راستے سے ہٹے ہوئے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار ہوتے ہوئے۔ اس نے انہیں منتخب کیا اور انہیں سیدھے راستے پر لگایا۔ اور ہم نے انہیں دنیا میں بھی بھلائی دی اور بلاشبہ وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں سے ہیں۔ پھر ہم نے آپ کو بھی پیغام دیا کہ آپ ابراہیم کی ملت کی پیروی کیجئے باطل سے علیحدہ رہتے ہوئے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک عبادت گزار اُمت، اتباع ملّتِ ابراہیمؑ کا حکم

ابراہیم علیہ السلام ایک امت تھے اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اوصاف حمیدہ کا ایسا مجموعہ تھے کہ ایک پوری قوم میں جتنے الگ الگ اوصاف کثیر التعداد افراد میں پھیلے ہوئے تھے وہ سب ان میں اکٹھا تھے اور یہ بھی مطلب لیا گیا ہے کہ وہ امام یعنی مرکز اقتدار تھے یا ایک پوری امت کے لئے مثالی نمونہ تھے۔ [1]

بعض مفسرین نے ان تمام باتوں کو سمو کر مطلب لیا ہے [2] اور بعض نے امت کو مجموعی قوم کے معنی میں لے کر درمیان میں حذف و تقدیر مان کر یہ مطلب لیا ہے کہ ایک بڑی تعداد نوع انسانی کی ان کی امت تھی۔ [3]

اس کے بعد یہ قابل بحث بات ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آپ مقتدائے کل ہیں مقتدی نہیں ہیں یہاں پر ہماری قدیم تفسیر بتاتی ہے کہ ملّۃ ابراہیم علیہ السلام سے مراد وہ دس (۱۰) سنن ابراہیمی میں ختنہ وغیرہ

---

[1] ۔ تھا پیشوا (شاہ رفیع الدین)

[2] ۔ اما ما قدوۃ جامعا لخیال الخیر (جلالین)

[3] ۔ قال بعضھم کان ذا امۃ (تبیان)

جنہیں شریعت اسلام کا جز بنالیا گیا ہے۔[1]

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٢٤﴾

'ہفتے والے حکم کی پابندیاں تو ان لوگوں پر عائد کی گئی تھیں جنہوں نے اس بارے میں اختلاف کیا تھا، اور بلاشبہ تمہارا پروردگار ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن اس بارے میں جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے''۔

چونکہ قوم یہود میں سبت کا حکم تھا مگر اسلام میں یہ حکم نہیں ہے اور پھر گذشتہ آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقوں پر چلنے کی ہدایت کی گئی تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم تو قوم یہود کے بھی مورث اعلیٰ ہیں۔

جب دونوں ہی حضرت ابراہیمؑ کے ورثہ دار ہیں تو یہ اختلاف کیوں ہے کہ سبت کے احکام وہاں ہیں اور یہاں نہیں اس کا جواب یہ دیا جارہا ہے کہ یہ احکام ملت ابراہیمی میں تو موجود نہ تھے بلکہ یہ تو یہود کے لئے ان کے باہمی اختلاف کی سزا میں عائد کئے گئے لہٰذا اب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو براہ راست ملت ابراہیمی کی پیروی کے ذمہ دار ہیں اس حکم کی پابندی کیوں کریں؟[2]

یہ اس صورت میں ہے کہ جب کہ اس آیت کو گذشتہ آیات کے ساتھ نازل شدہ مانا جائے اور اگر یہ آیت علیٰحدہ نازل ہوئی تو پھر اس سے بس یہ نتیجہ سمجھ میں آتا ہے کہ باہمی اختلاف اللہ کو ہمیشہ سے ان پسند رہا ہے۔[3]

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١٢٥﴾ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ﴿١٢٦﴾ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ﴿١٢٧﴾

''اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیجئے حکمت اور اچھے عنوان سے وعظ ونصیحت کے ساتھ اور ان سے بحث کیجئے بہتر سے بہتر ذریعہ سے۔ آپ کا پروردگار خوب واقف ہے کہ کون اس کی راہ سے ہٹا ہوا ہے اور وہ خوب جانتا ہے ان کو جو سیدھی راہ پر قائم ہیں۔ اور اگر تم لوگ سزا دو تو ویسی ہی جیسی تمہیں سزا دی گئی تھی اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔ اور آپ تو صبر ہی کیجئے اور نہیں آپ کا صبر وتحمل مگر اللہ کی مدد سے اور ان پر رنج

---

[1] ۔ھی الحنیفیة العشر التی جاء بھا ابراھیم (علی بن ابراھیم)

[2] ۔یعنی اصل ملت ابراہیم میں ہفتہ کا کچھ حکم نہ تھا اس امت میں بھی نہیں (موضح القرآن)

[3] ۔حذر عن الاختلاف (تبیان)

نہ کیجئے اور دل تنگ نہ ہو جایئے اس سے جو وہ ترکیبیں کرتے رہتے ہیں۔''

دعوت وتبلیغ کے لئے حکیمانہ انداز کی ہدایت، ضبط وتحمّل اور رواداری سے کام لینے کی خصوصی تاکید

اگر ایک ہی سلسلہ کی یہ آیات ہیں اور یہاں کچھ اور نہیں ہے کہ ایسا ہی ہو تو ان میں مجموعی طور پر ایک عجیب شان پیدا ہو گئی ہے۔

شروع میں ''واحد مذکر حاضر'' کے صیغوں کے ساتھ تخاطب تو خود حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے [1] اور ان میں آپ کو یہ ہدایت ہے کہ آپ نے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیجئے علم وحکمت اور اچھے موعظہ ونصیحت کے ساتھ اور بحث کیجئے تو ایسے انداز میں جو بہتر سے بہتر ہو اس میں نہ کسی جارحانہ عمل کا ذکر ہے نہ ان کی ایذا رسانی پر بطور سزا کسی سختی کا تذکرہ ہے پھر صیغے جمع مذکر حاضر کے ہیں ان میں مسلمانوں سے گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تو یہ شان ہی نہیں ہے کہ آپ بدلہ لینے یا سزا دینے کا ارادہ بھی کریں لیکن تم اگر گذشتہ تکالیف کا بدلہ لینا چاہتے ہو تو اس کا خیال رکھنا کہ یہ بدلہ اس عمل سے بڑھنے نہ پائے جو انہوں نے تمہارے ساتھ کیا ہے بس اسی حد تک تشدد کا تمہیں حق ہے جتنا تمہارے ساتھ تشدد ہو چکا ہے اور اتنا بھی کرنا تمہارے لئے کوئی اچھی بات نہیں ہے اگر صبر وبرداشت سے کام لو تو وہ بہتر ہے۔

یاد رہے کہ یہ مکافاۃ بالمثل کی اجازت بتا رہی ہے کہ یہ حکم ان لوگوں کے بارے میں نہیں ہے جو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں کیوں کہ وہاں تو اصول یہ ہے کہ السلام یجب ماقبلہ (یعنی) جو کچھ بھی وہ شخص پہلے کر چکا ہو اسلام لانے کے بعد وہ کالعدم ہو جاتا ہے اور اب اس کی مکافات کا کبھی بھی سوال پیدا نہیں ہوتا لہٰذا یہ صبر وبرداشت اور عفو ودرگزر کی تعلیم اس غیر قوم کے ان افراد سے متعلق ہے جو اب تک اپنوں کے دائرہ میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔

پھر یہ کہ صبر وبرداشت کی دعوت بے بسی کے عالم میں نہیں ہے اس لئے اس دور میں جب مسلمان بے بسی کے عالم میں ہوں یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں کہ اگر بدلہ لینا ہوگا تو بس اتنا ہی کرنا جتنا تمہارے ساتھ ہوا ہے جب بدلہ لینے پر قدرت ہی نہیں تو بدلہ لینے کا تصور ہی کہاں پیدا ہوگا یہ کہنے سے کہ ''اگر بدلہ لینا چاہو تو بس اتنا ہی کرو'' صاف ظاہر ہے کہ اب طاقتور اتنے ہیں کہ جتنا پہلے ہوا تھا اس سے زیادہ بھی کر سکتے ہیں پھر کہا جا رہا ہے کہ صبر وبرداشت سے کام لو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ عاجزی کی تعلیم نہیں ہے بلکہ جزبہ انتقام سے کام نہ لے کر اپنے جی کو مارنے کی تعلیم ہے۔

اس کے پہلے عنوان خطاب کے بدلنے ہی سے پتہ چل گیا تھا کہ بدلہ لینے کا تصور خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو کریں گے ہی نہیں مگر اب صراحتاً متکلم قرآنی نے پھر پیغمبر خدا کو بصیغۂ واحد مذکر حاضر مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ تو بہر حال صبر ہی سے کام لیجئے اور یہ صبر ایک ایسا کارنامہ ہوگا جو عام انسانی قوت برداشت کی حد اور ان کے مظالم کو دیکھتے ہوئے عام انسانی حدود وامکان سے باہر ہے یہ صبر آپ کا بس خداوند عالم کی طرف کی تائید اور اس خصوصی ضبط نفس کے درجہ سے ہے جو آپ کو مبداء فیاض سے عطا ہوا ہے۔

پھر فقط یہی نہیں کہ عملی طور پر ان کے مظالم کا بدلہ نہ لیجئے بلکہ ان کی بدسلوکیوں پر جو وہ کرتے رہے اور پھر اب آپ ان کا کچھ بدلہ بھی

---

[1] ۔ادع الناس یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (جلالین)

نہیں لیتے اپنے دل میں کڑھیئے بھی نہیں اور اس کی فکر نہ کیجئے کہ اب وہ آپ کے خلاف کیا کیا منصوبے بناتے ہیں اس طرح حزن جس سے منع کیا جاتا ہے وہ ماضی کی یاد سے متعلق ہے اور یہ دل تنگی جس سے روکا جارہا ہے حال اور مستقبل میں ان کی ترکیبوں سے تعلق رکھتی ہے۔

یہ اسلام کی فراخ حوصلگی کی کتنی اہم دستاویز ہے جو قران میں موجود ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بعض جمہوری تصور کے مفسرین جو ذہنی طور پر حقیقۃً اس کے قائل معلوم ہوتے ہیں کہ اسلام تلوار کا مذہب ہے اس حکم کے لئے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیجئے حکمت اور اچھے وعظ ونصیحت کے ساتھ اور ان سے بحث کیجئے ایسے انداز سے جو بہتر سے بہتر ہو۔ یہ لکھ دیتے ہیں کہ:

ھٰذا قبل الامر بالقتال (جلالین) یہ جنگ کا حکم انے سے پہلے کی بات تھی۔

یعنی ان کے نزدیک جنگ کا حکم آنے کے بعد نہ دعوت وتبلیغ کوئی چیز رہی اور نہ بطریق احسن بحث مباحثہ کی بات رہی اب تو تلوار رہ گئی اور بس تلوار! لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

پہلی آیت کو اس کی بلند سطح سے اپنے ذہن کی پست سطح پر لانے کے بعد وہ دوسری آیت کو باوجود پہلی آیت سے متصل ہونے سے نظم قرآنی کے ان پرجوش حامیوں نے پہلی آیت سے بالکل غیر متعلق قرار دیا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک وہ آیت تو حکم جہاد سے آنے سے قبل کی ہے اور اس دوسری آیت جو جب کہ اُس میں جمع مذکر حاضر کے صیغے ہیں جو عام مسلمانوں سے تخاطب کی صاف دلیل ہیں خود رسول ﷺ سے متعلق کر کے ایک غلط حدیث کا سہارا لیتے ہیں کہ جناب حمزہؓ کی لاش کی جو بے حرمتی ہوئی تھی اس پر رسول ﷺ نے قسم کھالی تھی کہ اب میں ان کافروں کو جب قتل کروں گا تو ان کے ساتھ یہی سلوک کرونگا اس پر یہ آیت اتری ہے۔

ہمارے نزدیک نہ یہ حدیث درست ہے اور نہ الفاظ قرآنی یہاں براہ راست رسول ﷺ سے متعلق ہیں ہمارے نزدیک یہ تینوں آیات یہاں کی ایک ڈال ہیں اور ان سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس پر اللہ کی دی ہوئی بصیرت قرآنی سے ہم تبصرہ کر چکے ہیں۔ (واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم)

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

'یقیناً اللہ ان کے ساتھ ہے جو (غلط کاری سے) بچتے رہیں اور جو اچھا کردار قائم رکھیں'۔

یہ آیت بھی مقام تنزیل میں گذشتہ آیات سے متصل ہو تو بعید نہیں ہے تو جس سابقہ کردار کا حکم دیا گیا تھا اس پر ایک عام اصول اور کلیہ کے طور پر اس آیت کا مضمون بالکل چسپاں ہے۔

سُوْرَةُ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ

مکیّہ [1] ------۱۱۱-آیات

ہر شب جمعہ اس سورہ کو پڑھنے کی تاکید ہوئی ہے۔

چونکہ اس سورہ کی پہلی آیت میں ''اسراء'' یعنی معراج کا ذکر ہے اس لئے حق بجانب طور پر اس سورہ کو سورۃ الاسراء کہنا درست ہے مگر اس کے بعد بنی اسرائیل کا ذکر اور ان کے ساتھ تخاطب ہے اس لئے عموماً پیشانی پر جو نام لکھا ہوا ملتا ہے وہ بنی اسرائیل ہے حالانکہ بنی اسرائیل کا ذکر دوسرے بعض سوروں میں سے اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے مگر سوروں کے ناموں میں اس کی مثالیں اکثر موجود ہیں جس پر پہلے تبصرہ ہو چکا ہے اس حدیث میں بھی جو اس کے پڑھنے کی فضیلت میں وارد ہوئی ہے اس سورہ کا یہی نام ہے۔ [2]

ان دو چیزوں کے علاوہ اس سورہ میں حسب ذیل مضامین آئے ہیں:-

سورۂ بنی اسرائیل کے خاص خاص مضامین:

۱-----بنی اسرائیل کی دو مرتبہ خراب کاری اور اس کی پاداش

۲-----نامہ اعمال

۳-----ہلاکت اقوام کا نظام عام

۴-----حقوق والدین

۵-----فضول خرچی کی مذمت

۶-----خرچ میں میانہ روی کی ضرورت

۷-----قانون قصاص

۸-----ناپ تول میں انصاف کا حکم

۹-----منکرین معاد کی رد

۱۰-----مخالفین حق سے روادارانہ گفتگو کی تعلیم

۱۱-----شجرہ ملعونہ

---

[1] ۔ بعض مفسرین نے پانچ آیتوں کو مستثنیٰ کہا ہے کہ وہ مدینہ کی نازل شدہ ہیں (مجمع البیان)

[2] ۔ عن الصادق ق قال: من قرء اسورۂ بنی اسرائیل فی کل لیلۃ جمعۃ لم یمت حتی یدرک القائم ویکون من اصحابہ (مجمع البیان)

۱۲-----اوقات نماز کا بیان

۱۳-----پیغمبروں کی بشریت

۱۴-----جناب موسیٰؑ کے معجزات

۱۵-----گریہ کی تعریف

۱۶-----جہر و اخفات کے درمیان نماز ادا کرنے کا حکم وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①

''پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندہ کو ایک رات مسجد حرام سے انتہائی اونچے سجدہ کے مقام تک جس کے گرد و پیش ہم نے برکت ہی برکت قرار دی ہے تا کہ ہم انہیں دکھائیں اپنی کچھ نشانیاں یقیناً وہ سننے والا ہے، بڑا دیکھنے والا''۔

معراج پیغمبر اسلامؐ

یہ مشہور و معروف آیت واقعۂ معراج پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق ہے چونکہ کہ زمانہ بنی امیہ میں ''المسجد الاقصیٰ'' نام رکھ لیا گیا فلسطین کی مسجد بیت المقدس کا اس لئے اہل سنت نے اس آیت میں جو المسجد اقصیٰ کا لفظ ہے اسے بیت المقدس ہی پر محمول کیا ہے۔[1]

زیادہ سے زیادہ یہ کہا ہے کہ یہ سفر معراج کی پہلی قسط تھی جس کا یہاں قرآن مجید نے ذکر کیا ہے یعنی پہلے آپ کے لئے مکہ سے شام تک کی مسافت طے ہوئی اور پھر آپ آسمان پر تشریف لے گئے جس کا سورہ النجم کی آیات میں ذکر ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ تحریر کرتے ہیں۔

یعنی خدا تعالیٰ در شب معراج پیش از صعود بر آسمانہا آں حضرت را بمسجد بیت المقدس رسانید (فتح الرحمٰن)

یعنی معراج کی رات خداوند عالم نے آسمان پر بلند ہونے سے پہلے آنحضرت کی بیت المقدس کی طرف پہنچایا۔

''حق تعالیٰ اپنے رسول کو معراج کی رات لے گیا مکہ سے بیت المقدس براق پر اور آگے لے گیا آسمانوں پر یہاں اتنا ذکر ہے باقی سورہ نجم میں ہے'' (موضح القران)

ہمارے بھی مفسرین نے جمہور کی اس تفسیر کی جو مسجد اقصیٰ کے لفظ کے متعلق ہے رد نہیں کی ہے مگر اس کی تائید میں معصومینؑ کی روایت بیان نہیں کی ہے بلکہ اسکی نسبت انہی راویوں کی طرف دی ہے جو اہل سنت کے یہاں مقبول ہیں لیکن اعتبار سند کے لئے ہمارے نقطہ نظر سے وہ

---

[1] ۔ المسجد الاقصیٰ ھو بیت المقدس وھو مسجد سلیمان بن داؤد فی قول الحسن وغیرہ من المفسرین (تبیان)

معیار نہیں بن سکتے اور اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ بن امیہ کے زمانہ کی اس اصطلاح کا وجود عہد تنزیل قرآن میں ثابت نہیں ہے لہٰذا ہم نے ترجمہ میں مسجد اقصیٰ کا لفظ بطور نام کے نہیں لکھا بلکہ توصیفی حیثیت سے اس کا جو مفہوم ہے اور جو عالم بالا کے بلند ترین نقطہ پر منطبق ہے تحریر کیا ہے۔

جناب شیخ طوسیؒ نے متفقہ شیعی نقطہ نظر تو یہ پیش کر دیا ہے کہ معراج آسمان کی طرف ہوئی مگر مسجد اقصیٰ کے اس مفہوم کو پیش نظر رکھ کر یہ کہہ دیا ہے کہ بیت المقدس تک سفر قرآن سے ظاہر ہے اور اس کے آگے احادیث سے ثابت ہے [1] مگر ہمیں یہاں جناب شیخ سے شدید اختلاف ہی نہیں بلکہ شکایت ہے کہ انہوں نے اس سے آگے کے لئے صرف احادیث کا حوالہ دیا جب کہ مفسرین اہل سنت بھی جو اس آیت سے صرف بیت المقدس تک جانے کا استفادہ کرتے ہیں آگے کے سفر کے ثبت کو صرف احادیث پر محمول نہیں کرتے بلکہ قرآن مجید ہی کے دوسرے محل یعنی سورۂ والنجم کا حوالہ دیتے ہیں۔

علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ اکثر جگہ صرف جناب شیخ طوسی کی تفسیر تبیان کا تتبع کیا ہے مگر یہاں انہوں نے اپنی جانب سے کافی بسط و تفصیل کے ساتھ محققانہ انداز میں بحث کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے علاوہ معراج کے بارے میں جو احادیث وارد ہیں ان کے مضامین میں بہت اختلافات پایا جاتا ہے لہٰذا معراج کے متعلق جو نقطہ نظر ہے اور ہونا چاہئے اسے ہم چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

اوّل جس حد تک قطعی ہے اور ہر مسلمان کو بتقاضائے اسلام اسے ماننا ضروری ہے وہ مجملاً یہ ہے کہ خالق اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غیر معمولی طور پر لے گیا اور معجزانہ طور پر آپ کو مشاہدات کرائے اس سے قطع نظر کہ کہاں تک لے گیا اور آپ نے کیا کیا دیکھا؟ ''غیر معمولی'' اور ''معجزانہ'' سے یہ نتیجہ طور پر نکلتا ہے کہ جہاں تک بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ لے گیا یقیناً عالم بیداری میں تھا خواب نہ تھا۔ [2]

دوسرے وہ ہے جو اخبار میں آحاد میں ہے اور کسی اصول عقلی یا ضرورت دین کے خلاف نہیں ہے اسے بس ہر ممکن الوقوع سمجھتے ہیں اور ان کے درجہ اعتبار کے لحاظ سے ان کے متعلق گمان غالب یا غیر غالب ہو سکتا ہے۔

تیسرے وہ جن کا ظاہری مفہوم قابل قبول نہیں ہے مگر ان کی معقول تاویل ہو سکتی ہے ان میں درصورت اعتبار روایت کوئی تاویل ضروری ہے جو منطقی دلیل اور ضرورت دین کے موافق ہو اس میں وہ روایات داخل ہیں جن میں یہ ہے کہ حضرت نے کچھ خاص اچھے کام کرنے والوں کو بہشت میں دیکھا کہ وہ نعم الٰہی سے بہرہ ور ہو رہے ہیں اور کچھ خاص گناہوں کے مرتکب افراد کا انجام دیکھا کہ دوزخ میں ان پر طرح طرح کا عذاب ہو رہا ہے چونکہ ثواب بہشت اور عذاب دوزخ کا اصل ہنگامہ بعد قیامت ہے اس لئے ہم اسکی تاویل یہ کر سکتے ہیں کہ آپ کو تمثیلی طور پر یہ مناظر دکھلائے گئے جو بعد میں حقیقی طور پر رونما ہونگے۔

چوتھی قسم وہ ہے جس کا ظاہری مفہوم خلاف مسلمات عقلیہ وضروریات دین ہے اور ان کی زبردستی کے بغیر کوئی صحیح توجیہ و تاویل نہیں ہو سکتی ان باتوں کا رد ضروری ہے جیسے حضرت کا خالق کو عرش پر دیکھنا اور اس کے پہلو میں بیٹھنا اور منہ در منہ ہم کلام ہونا تو یہ باتیں شان الوہیت کے خلاف ہیں۔

اس طرح یہ خود حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ کو چاک کیا گیا اور آپؐ کے دل کو معاذ اللہ آلائشوں سے پاک کیا گیا یہ شان رسالت کے خلاف

---

[1] ۔الّذی یشهد به القرآن الاسرآء من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ و الباقی یعلم بالخبر۔ (تبیان)

[2] ۔ما قال بعضهم ان ذٰلك كان فی النوم فی فظاهر البطلان اذلا معجز یكون فیه ولا برهان (مجمع البیان)

ہے ایسی تمام روایتوں کا رد کرنا ضروری ہے۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝٢ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝٣

''اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت قرار دیا کہ نہ قرار دے مجھے چھوڑ کر کسی کو کارساز۔[1] اے اس نسل کے لوگو جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا! بلاشبہ وہ شکر گزار بندہ تھا''۔

اسلامی روایت کے لحاظ سے نسل نوح سے خطاب مثل یا ایہا الناس اور یا بنی آدم ہے کہ تمام نوع انسانی کو عام ہے کہ کیونکہ نوح ہمارے نزدیک آدم ثانی ہیں اب موجودہ نسل انسانی سب نوح کی اولاد سے ہے[2]

بلاشبہ وہ شکر گزار بندہ تھا کون؟ اس ضمیر کو غالبا قرب لفظی کی وجہ سے نوح علیہ السلام کی طرف راجع کیا گیا ہے یعنی نوح علیہ السلام شکر گزار انسان تھا۔[3] اور یہ اس لحاظ سے درست سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ مستقل آیت ہے لہٰذا اس کا اتصال مقام تنزیل میں اس کے قبل کی آیت سے یقینی سمجھا جاسکتا ہے۔ ورنہ اسے موسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہونا زیادہ نمایاں ہے جن کا ذکر پہلے کی آیت کے سلسلہ کو دیکھتے ہوئے مرکزی طور پر ہے اور اگر یہ آیت اسی سے متصل مانی جائے تو جناب نوح علیہ السلام کا ذکر ضمناً بضمن خطاب ہے۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝٤ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝٥ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝٦ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۡ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝٧ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝٨

---

[1] ۔ یا ذرّیة من حملنا مع نوح (جلالین) اے فرزندان قومی کہ برداشتیم آں را نوح علیہ السلام یعنی بر کشتی (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔ ھو خطاب لجمیع الخلق لانّ الخلق کلّھ من نسل نوح من بنیہ الثلثة (تبیان)

[3] ۔ معناہ انّ نوحا کان عبداللہ کثیر الشّکر (مجمع البیان)

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو اطلاع دی [1] اس کتاب میں [2] کہ تم ضرور ضرور دنیا میں دو مرتبہ خرابی کرو گے اور ضرور تم تکبر سے کام لو گے۔ تو جب ان میں سے پہلی بات کا وقت آئے گا تو ہم تم پر بھیجیں گے اپنے ایسے بندے جو بڑی سخت لڑائی لڑنے والے ہوں گے تو وہ گھروں کے اندر داخل ہو جائیں گے اور یہ وعدہ ہے جو ہو کر رہے گا۔ پھر ہم تمہیں ان کے مقابلہ میں غلبہ دیں گے اور تمہیں مال و اولاد کے ساتھ تقویت پہنچائیں گے اور تمہیں تعداد میں بڑی اکثریت دیں گے۔ اگر تم بھلائی کرو گے تو خود اپنے ہی نفس کے لیے بھلائی کرو گے اور اگر برائی کرو گے تو وہ بھی اسی کے لیے ہو گی۔ تو جب دوسری بات کا وقت آئے گا تو یہ نتیجہ ہو گا کہ پھر ویسے ہی لوگ آئیں گے کہ تمہارا حلیہ بگاڑ دیں گے [3] اور اس مسجد میں اسی طرح داخل ہو جائیں گے جیسے پہلی دفعہ داخل ہوئے تھے۔ اور جس جس چیز پر کہ ان کا قابو ہو گا وہ اسے ملیا میٹ کر دیں گے۔ ممکن ہے کہ اللہ تم پر رحم کرے اور اگر تم نے پھر ایسا کیا تو ہم بھی پھر ایسا ہی کریں گے اور دوزخ کو ہم نے کافروں کے گھیرنے کے لیے قرار دے ہی رکھا ہے''۔

بنی اسرائیل کی دو مرتبہ خراب کاری اور اس کی پاداش

یہ تمام تذکرہ ہے ان انقلابات کا جو بنی اسرائیل کو پیش آئے جس کی خبر پہلے سے کتب سابقہ میں دی جا چکی تھی۔

دو دفعہ بنی اسرائیل نے سرکشی اور نافرمانی سے کام لیا اور اس کے نتیجہ میں ان پر دوسرے طاقتور لوگ غالب آ گئے۔

پہلی دفعہ جالوت کا تسلط ہوا اور عرصہ دراز تک بنی اسرائیل اس کے قہر و غلبہ میں مبتلا رہے جس کے بعد طالوت کی سرکردگی میں اس سے مقابلہ ہوا تو جناب داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا اور اب جناب داؤدؑ اور جناب سلیمانؑ کو اقتدار حاصل ہوا یہ وہ درمیانی دور ہے جس کا قرآن نے حوالہ دیا ہے کہ ہم نے تم کو پھر ان پر غلبہ دیا اور تمہیں اموال و اولاد میں فراوانی عطا کی اس کے بعد دوسری مرتبہ جب ان کی بداعمالیاں زیادہ ہوئیں تو بخت نصر نے ان پر تسلط قائم کیا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا یہ وہ دوسری بار ہے جس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

یہ ایک تشریح ان دو دفعہ کی ہے مگر اس کے علاوہ بعض دوسرے اقوال بھی ہیں جن کا ذکر علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں کیا ہے اور بعض مفسرین نے کہہ دیا ہے تاریخ بنی اسرائیل کے گونا گوں انقلابات میں سے کون دو انقلاب ہیں جنہیں خاص طور پر قرآن مجید نے یاد دلایا ہے؟ اس کا بیان خود قرآن مجید میں ہے نہیں، نہ مستند احادیث موجود ہیں تو ہم یقینی طور پر ان کی تعیین نہیں کر سکتے نہ اس کے جاننے کی کوئی خاص ضرورت ہے۔ [4]

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ

---

[1] ۔ اعلمناھم (علی بن ابراھیم)

[2] ۔ در توریت (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ بعثناھم لیسوءوا (جلالین)

[4] ۔ فلا نقطع علی شیء مما ذکر عن ابی علی الجبائی (مجمع البیان)

الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۝۹ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۰

''بلاشبہ یہ قرآن ہدایت کرتا ہے ایسے راستے کی جو انتہائی درست ہے اور خوش خبری دیتا ہے ان اہل ایمان کو جو اچھے اعمال کرتے ہیں کہ ان کے لئے بہت بڑا صلہ ہے اور یہ کہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے لئے دردناک عذاب بھی مومنین کے لئے جزء بشارت قرار دیا گیا ہے۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ فضائل پر مدح کی تکمیل مخالف پہلو کی مذمت کے ساتھ ہوتی ہے۔

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝۱۱

''اور انسان تو برائی کی بھی دعا کرتا ہے۔ اسی طرح جیسے وہ بھلائی کی دعا کرتا ہے اور انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے''۔

چونکہ انسانی علم محدود ہے اس لئے بسا اوقات وہ بھلائی اور برائی میں امتیاز نہیں کرتا لہٰذا قبولیت دعا بالکل انسان کی خواہش سے وابستہ نہیں رکھی گئی بلکہ خالق اپنی حکمت کے معیار پر جب مناسب سمجھتا ہے اس وقت اس کی دعا قبول کرتا ہے۔

یہی ایک دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ:-

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـــًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۱۶ (البقرہ)

بہت ممکن ہے کہ کسی چیز کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور بہت ممکن ہے کہ کسی چیز کو تم دوست رکھتے ہو اور وہ تمہارے لئے بری ہو بات یہ ہے کہ اللہ علم رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے۔

آخری فقرہ کہ انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بہت سی بھلائیاں اور برائیاں ایسی برائیاں ہوتی ہیں کہ اگر انسان خود ہی کچھ دن حالات کا مطالعہ کرتا تو ان کا خود اسے علم ہو جاتا مگر وہ جلد بازی کی وجہ سے اکثر اتنا انتظار نہیں کرتا اور بس جذبات کی رو میں بہہ کر جو جس وقت جی چاہا اسے خالق سے مانگ بیٹھتا ہے اب بھلا خالق حکیم اس کی ہر دعا کو کیوں کر قبول کرے؟

پھر ایک اور صورت بھی ہے کہ انسان جیسے جذبات سے مغلوب اور حالات سے تنگ ہو کر خودکشی کے لئے تیار ہو جاتا ہے ویسے ہی وہ کسی وقتی ناگواری کی بناء پر صریحاً جن چیزوں کو خود برا سمجھتا ہے انہیں اللہ سے مانگنے لگتا ہے جیسے اپنی موت یا بچوں پر غصہ آیا اور انہیں کوسنے لگا تو یہ کوسنا بھی اللہ سے دعا ہی ہے خود اس سے صبر و سکون کے لمحات میں پوچھئے کہ وہ چاہتا کیا ہے کہ اللہ اس کی ایسی دعاؤں کو فوراً قبول کر لیا کرے وہ کہے گا کہ

---

[1] ۔یبشرھم ایضا بانّ الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ الخ (تبیان و مجمع البیان)

ہرگز نہیں۔[1]

پھر جلد بازی اس اعتبار سے بھی ہے کہ دعا کی قبولیت ممکن ہے مناسب موقع کے انتظار میں رکی ہوئی ہو مگر یہ ادھر کچھ دیر ہوئی اور بس شکوہ کرنے لگا کہ میری دعا قبول نہیں ہوئی یہ اس کی جلد بازی نہیں تو اور کیا ہے؟[2]

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ⑫

''اور ہم نے رات اور دن کو بنایا دو نشانیاں تو مٹا ہوا بنایا رات والی نشانی کو اور دن والی نشانی کو روشن قرار دیا۔ تاکہ تم اپنے پروردگار کے فضل و کرم کو (کمائی کر کے) حاصل کرنے کی کوشش کرو اور تاکہ تمہیں برسوں کی تعداد اور حساب معلوم ہو اور ہر چیز کو ہم نے پوری طرح کھول کھول کر بیان کر دیا ہے''۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ⑬ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ⑭

''اور ہر آدمی ہم نے اس کے نامہ اعمال[3] کو اس کی گردن سے وابستہ کر دیا ہے اور اس کے لئے قیامت کے دن نکالیں گے نوشتہ جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔ پڑھ لے تو اپنے نوشتہ کو، تو خود کافی ہے اپنے خلاف آج جانچ پڑتال کرنے کے لئے''۔

نامۂ اعمال

اعمال نامہ کے گردن سے وابستہ کرنے کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ نامہ عمل جو ایک نوشتہ کی صورت رکھتا ہے ہر انسان کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور بطور محاورہ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ذمہ داری اس کی گردن پر ہے جس سے اسے عہدہ برآ ہونا ہے[4] اور قیامت میں وہ اسے نامہ اعمال کی صورت میں سامنے نظر آئے گا بلکہ بنص قرآن اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

''اعمال نامہ'' کو ''طائر'' کہنا عرب کے اس تصور کے لحاظ سے ہے کہ وہ پرندہ کے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں جانے کو شگون

---

[1] ۔ویدع الانسان بالشرّ علی نفسه و اهله اذا ضجر (جلالین) در حالت تنگدلی بر خود و اولاد خود دعای بدی کند (فتح الرحمٰن) فلو اجاب الله دعاءه لاهلك لكنّه لا يجيب بفضله و رحمته (مجمع البیان)

[2] ۔ گھبراتا ہے کہ میری دعا شتاب کیوں قبول نہیں ہوتی (موضح القرآن)

[3] ۔طائره عمله و الزم الله طائره فی عنقه الحكم عليه بما يستحقه من ثواب او عقاب (تبیان)

[4] ۔فی عرف النّاس و يقولون هٰذا فی رقبتك (تبیان)

نیک و بد کے طور پر سعادت اور نحوست کی نشان قرار دیتے تھے چونکہ اس کا تعلق مستقبل کے ساتھ ہوتا تھا لہٰذا قرآن نے حسن وانجام و بدانجامی کی جو آخرت سے وابستہ ہے اور وہ ''اعمال نامہ کی بناء پر ہے، طائر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ [1]

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝۱۵

''جو ہدایت حاصل کرے وہ ہدایت حاصل کرے گا خود اپنے ہی فائدہ کے لئے اور جو گمراہ ہو وہ گمراہ ہو کے خود اپنا ہی نقصان کرے گا اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور ہم عذاب کرنے والے نہیں ہیں جب تک کوئی پیغام پہنچانے والا بھیج نہ دیں''۔

یعنی بغیر اپنی ارادی کوتاہی کے لاعلمی کی وجہ سے اگر انسان غلطیوں میں مبتلا ہو تو سزا دینا عدل الٰہی کے خلاف ہے اس لئے جب تک وہ پیغمبر بھیج نہیں دیتا جو اس کے احکام پہنچائے اس وقت تک موردِ سزا قرار نہیں دیتا، چونکہ زیادہ تر اُس کا منشا پیغمبروں ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے لیکن جس حد تک ضمیر انسان کا قطعی طور پر بتادے کہ یہ باتیں بری ہیں ان میں خود انسان کا ضمیر ہی اللہ کی ترجمانی کے لئے کافی ہے اس لئے انسان ان احکام میں خلاف ورزی کر کے باز پرس سے کبھی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ [2]

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝۱۶

''اور جب ہم چاہتے ہیں کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو وہاں دولت مندوں کی تعداد بڑھا دیتے ہیں۔ تو وہ اس میں فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں، تو اس پر فیصلہ قدرت نافذ ہو جاتا ہے تو ہم اسے جیسا چاہتے ہیں تہس نہس کر دیتے ہیں''۔

ہلاکت اقوام کا عام نظام

یہ آیت مشکلات قرآن میں سمجھی گئی ہے ہمارے اصول کی بناء پر خالق کے تمام کام بر بنائے عدل ہوتے ہیں۔

''جب ہم چاہتے ہیں کسی بستی کو ہلاک کرنا'' یہ ارادہ ہلاک کرنے کا بلا جواز نہیں ہوسکتا ضرور پہلے ان سے ایسی بداعمالیاں سرزد ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ ہلاکت کے مستحق ہوتے ہیں اب اس کے بعد جو کچھ ہے وہ انہیں بداعمالیوں کا خمیازہ ہے اور اب جو ان کے لئے دولت اور سامان

---

[1] ۔قیل للعمل وطائر علی عادة العرب فی قولهم: جری طائره بکذا و مثله قوله بسبحانه قالوا طائر کم معکم وقوله: انّما طائره عندالله (مجمع البیان)

[2] ۔فتکون الآیة خاصّة فیما یتعلّق بالسّمع من الشرغیات فاقاما کانت الحجّة فیه من جهة العقل فانّه یحقّ العقاب بترکه (مجمع البیان)

عیش کی فراہمی وفروانی ہورہی ہے وہ بھی ان پر بربنائے مہربانی نہیں بلکہ تمام حجت کے طور پر ان کی مکمل ہلاکت کے استحقاق کی تکمیل ہے۔

پھر یہ فقرہ کہ امرنا مترفیھا اس میں امرنا کا جو لفظ ہے اسے اس امر سے لیا جائے جس کے معنی حکم ہوتے ہیں تو اس کے لئے متعلق کی ضرورت ہے کہ کا ہے کا حکم؟ اب ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے دولتمندوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس میں فسق وفجور کا ارتکاب کرتے ہیں جیسا کہ شاہ رفیع الدین کے ترجمہ میں ہے:

''بس حکم کرتے ہیں کہ ہم دولت مندوں کو پس نافرمانی کرتے ہیں بیچ اس کے''

تو کیا خالق کی طرف سے معاذ اللہ اسی فسق وفجور کرنے کا انہیں حکم ہوتا ہے اسے کسی منکر عدل کا بھی ضمیر گوارا نہیں کرتا چنانچہ شاہ ولی اللہ ترجمہ میں لکھتے ہیں۔

می فرمائیم سرکشاں آنجا یعنی آنچہ می خواہیم پس نافرمانی کردند آنجا

ہم وہاں کے سرکشوں کو حکم دیتے ہیں یعنی ان باتوں کا جو ہمیں مطلوب ہیں تو وہ وہاں نافرمانی سے کام لیتے ہیں

امرنا مترفیھا منعیھا بمعنی رؤسائھا بالطاعۃ علیٰ لسان رسلنا ففسقو اخرجو اعن امرنا

ہم وہاں کے مترفین منعموں یعنی ان کے سرغنہ افراد کو اطاعت کا حکم دیتے ہیں اپنے پیغمبروں کی زبانی تو وہ فسق سے کام لیتے ہیں یعنی ہماری عدل وحکمی کرتے ہیں

مگر احکام تو عمومی ہوا کرتے ہیں یہ خاص طور پر دولت مندوں یا سرغنہ اشخاص کو حکم دینے کے کیا معنی؟ لیکن جب امرنا کو امر بمعنی کثرت سے لے لیا جائے جس کے نظائر کلام عرب میں موجود ہیں جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے تو کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہتی۔

ہماری قدیم تفسیر بھی اس معنی کو بتاتی ہے [1] اور علامہ طبرسی نے الحجۃ کے زیر عنوان صدر اول کے بعض ائمہ عربیت کا قول اس کی تائید میں پیش کیا ہے [2] جس کے بعد اس کے ماننے میں کسی عذر نہ ہونا چاہئے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۷﴾

''اور کتنی ہی [3] قومیں [4] ہم نے ہلاک کر دیں نوح کے بعد سے اور تمہارے پروردگار سے بڑھ کر اپنے بندوں کے گناہوں کا دیکھنے والا واقف کار کون ہوگا''۔

یہ آیت مضمون کے لحاظ سے قبل والی آیت سے دست وگریباں ہے اس لئے بعید نہیں کہ مقام تنزیل میں بھی اس سے متصل ہو اور اب اس آیت کے آخری فقرہ کو ملا کر دیکھئے قبل والی آیت کے ابتدائی مضمون سے تو صاف سمجھ میں آئے گا کہ اقوام کی ہلاکت کا ارادہ ان کے گناہوں کی

---

[1] ۔ای کثرنا جبارہا (علی بن ابراھیم)

[2] ۔قال ابو عبیدۃ امرنا اکثر من قولھم امر بنو فلاں ای کثروا (مجمع البیان)

[3] ۔کم یفید التکثیر صد ''رُبَّ'' الذی یفید التقلیل (تبیان)

[4] ۔من القرون ای من الاھم الکثیرۃ المکذبۃ (مجمع البیان)

کثرت کی بناء پر ہوا کرتا ہے نہ کہ بلا وجہ جو کہ عدل وحکمت باری تعالیٰ کے خلاف ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾

''جو اس دنیا کا طالب ہوا سے ہم اسی دنیا میں دے دیتے ہیں جتنا جسے ہمیں دینا ہوتا ہے پھر اس کے لیے دوزخ قرار دیتے ہیں جس کی گرمی اور وہ مذمت اور لعنت میں گرفتار ہونے کے عالم میں برداشت کرے گا اور جو آخرت کا طلب گار ہوتا ہے اور اس کے لیے اُس کی سی کوشش کرتا ہے اس صورت میں کہ وہ باایمان ہے تو یہ وہ ہیں جن کی کوشش کی قدر سمجھی جائے گی اور ہر ایک کو ہم مدد پہنچاتے ہیں انہیں اور انہیں تمہارے پروردگار کے عطا وکرم سے اور تمہارے پروردگار کی عطا پر پابندی نہیں ہے''۔

دنیاوی عطا خالق کی بمقتضائے ربوبیت ہے اور آخرت کی عطا بمقتضائے عدالت ہے ربوبیت اس کی عام ہے اس لئے دنیا کی عطا بھی عام ہے اور عدالت خود مقتضی امتیاز ہے لہٰذا آخرت کی عطا ایمان واطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔

بے شک دنیاوی عطا بھی ہر شخص کے لئے بلا قید اس کی خواہش کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ بلند تر نظام عالمی کے تقاضوں کے اعتبار سے جو ارادہ الٰہی ہوتا ہے اس کے مطابق ملتی ہے۔[1]

دنیا والوں کو عطائے دنیا سے سرفراز کرنے میں بس یرید عاجلة کہا کہ وہ دنیا کا طلب گار ہے تو بس دنیا اسے مل جاتی ہے لیکن آخرت کی عطا کے لئے بس یہ نہیں کہا کہ وہ طالب آخرت کی کامیابی کے لئے ضروری ساتھ قیود عائد کئے کہ ویسی کوشش بھی کرے یعنی ان اعمال کو بجا لائے جو آخرت کی کامیابی کیلئے ضروری ہیں اور اس کے ساتھ مومن بھی ہو پھر نتیجہ کو بھی اس سعی سے وابستہ کیا گیا ہے اس کی کوشش کی قدر کی جائے گی یعنی بقدر کوشش نتیجہ عطا کیا جائے گا۔

اس سے آنکھیں کھلنی چاہئیں ان کی جو آخرت کو بھی بس تصورات یا تمناؤں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

''دیکھو، ہم نے کس طرح ایک کو دوسرے سے بڑھا ہوا قرار دیا ہے اور بلاشبہ آخرت درجوں کے اعتبار سے کہیں

---

[1] ۔یعنی فی الدنیا القدر الذی نریدہ لمن نرید الاعلی قدر ما یریدون (تبیان) العبد ما لا یشاء اللہ فلا یعطیہ لکونہ مفسدۃ (مجمع البیان)

زیادہ اور بڑھاوے کے اعتبار سے کہیں زیادہ ہے''۔

دنیا میں روزی اور تمام نعمتیں سب کو یکساں نہیں ملی ہیں بلکہ ایک دوسرے سے زیادہ عطا ہوئی ہیں جس کے بلحاظ حکمت بہت سے وجوہ ہوتی ہیں۔[1] یہاں تک قرآن وحدیث بتلاتی ہیں کہ کبھی نعمت دنیا کی عطا اور زیادتی بطور سزا بھی ہوتی ہے نعوذ باللہ من ذلک اسی طرح آخرت بھی درجات مختلف ہیں مگر ان کا سبب بربنائے عدالت ایمان واطاعت کے مراتب کا فرق ہوتا ہے۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾

''اس کے سوا کوئی خدا قرار نہ دو نہیں تو مذمت میں گرفتار، بے بس اور بے کس ہو کر بیٹھو گے''۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ؕ ﴿۲۴﴾

''اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم نافذ کیا ہے کہ عبادت نہ کرو سوا اس کے کسی کی اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ اگر تمہارے پاس کبرسنی کی منزل تک پہنچ گیا ان میں سے ایک یا وہ دونوں تو ان سے اف بھی نہ کرو اور نہ ان کو جھڑکی دو اور ان سے اعزاز کے انداز میں بات کرو۔ اور ان دونوں کے لیے تذلیل کے ساتھ اپنے بازو کو جھکائے رہو مہربانی سے اور کہو کہ پروردگار! اپنی رحمت ان دونوں کے شامل حال فرما جس طرح انہوں نے چھٹ پن میں میری پرورش کی''۔

حقوق والدین

اُف کہنے سے ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی قسم کی اذیت نہ پہنچاؤ، اس کے لئے سب سے ادنیٰ درجہ جو ہوسکتا ہے وہ اُف ہے کہ اس میں کوئی ایذا پہنچانا نہیں ہے بلکہ اپنے احساس اذیت کا اظہار ہے تو جب اتنے تک سے منع کیا جارہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے آگے جو ایذا رسانی کے درجے ہیں وہ باختلاف مراتب کس قدر اللہ کی ناراضگی کا باعث ہونگے؟

چونکہ ایذا رسانی کی ممانعت میں ایک کم سے کم چیز کو عنوان حکم بنایا گیا ہے اس لئے معصومؑ نے ارشاد فرمایا کہ اُف کہنے سے کم درجہ کی کوئی چیز ہوتی جو ایذا رسانی کے معنی پیدا کرے تو اللہ اسی کو ارشاد فرماتا، اُف کہنے سے ممانعت اس کا ثبوت ہے کہ اس سے کم تر کوئی چیز دائرہ تصوّر میں

---

[1] ۔بان جعلنا بعضهم اغنياء و بعضهم فقراء بعضهم موالی و بعضهم عبيداو بعضهم اصحّآء و بعضهم مرضٰی بحسب ما علمنا ممن مصالحهم (تبيان) علی حسب ما علمناه من المصالح (مجمع البيان)

نہیں ہے۔[1]

اس حکم میں کبرسنی کا ذکر بطور قید نہیں ہے کہ اگر والدین اکبرالسن نہ ہوں تو ان کا احترام واجب نہ ہو بلکہ یہ اس لئے ہے کہ اس عمر میں زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر بگڑیں بلاوجہ خفا ہونے لگیں یا تکلیف دہ باتیں کہیں یا کریں مگر ان کے حقوق کی بناء پر ان کی کسی بات پر اف کرنا بھی ممنوع قرار دیا گیا پھر یہ کہ اس عمر میں انہیں اولاد سے خدمت لینے کی ضرورت ہوتی ہے اس پر امکان ہے کہ اولاد جز بز ہوکر اف یا ہماری زبان میں افوہ کہے جیسا کہ اکثر ایسا دیکھا اور سنا جاتا ہے لہٰذا خالق نے خاص طور پر اسے مورد ممانعت قرار دیا ہے۔[2]

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

''تمہارا پروردگار تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے، اس سے خوب واقف ہے۔ اگر تم نیک ہو تو وہ لوگانے والوں کو بخشنے والا ہے''۔

بجائے خود اس آیات کا مفہوم واضح ہے[3] لیکن سیاق کلام کے ساتھ مرتبط کرتے ہوئے درصورتیکہ گذشتہ آیت کے ساتھ مقام تنزیل میں متصل ہو مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ماں باپ کبرسنی کے تقاضے سے یا کسی اور وجہ سے مثلاء سوتیلی ماں بلاوجہ لگائی بجھائی کرتی ہے اور غلط طور پر باپ کے کان بھرا کرتی ہو جیسا کہ کبھی کبھی مشاہدہ میں آتا ہے اولاد سے کلیۃً ایسے خفا ہو جائیں ناحق کہ یہ لاکھ ان کی رضا مندی کی کوشش کرے مگر کامیاب نہ ہو تو قرآن اس کے متعلق کہہ رہا ہے کہ تمہارے ضمیر کو مطمئن ہونا چاہئے کہ تمہارا کردار ٹھیک ہے اب اگر اس کے بعد بلاوجہ تم سے وہ ناراض ہیں تو خدا کے یہاں تم مواخذہ وار نہ ہوگے۔

شاہ عبدالقادر کا ذہن بظاہر ایک دوسرے پہلو کی طرف گیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

یعنی دل میں آوے کہ بوڑھے ماں باپ سے معاملت نباہنی مشکل ہے تو فرمایا کہ جس کی نیت نیکی پر ہے اگر خفا کرے اور پھر رجوع لاوے تو اللہ بخشنے والا ہے۔ (موضح القرآن)

مگر ہم نے جو مطلب لکھا ہے، وہ ہمارے نزدیک الفاظ قرآنی سے زیادہ سمجھ میں آتا ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾

---

[1] ۔قال لوعلم انّ شیأ اقلّ من انّ لقاله(علی بن ابراهیم) عن جعفربن محمّدؑ انّه قال: لوعلم الله لفظا ارجزفی ترك عقوق الوالدین من اُفّ لقاله(تبیان) وفی روایة اخریٰ عنهؑ قال: ادنی العقوف افّ ولو علم الله شیئاً ایسو منه واهرن لنهی عنه و فی خبر اٰخر: فلیعمل العآقّ ماشآء ان یعمل فلن یدخل الجنّة(مجمع البیان)

[2] ۔انما خصّ الکبر لان وقت کبر الوالدین ممّا یفطرّ فیه الوالدان الی الخدمة(تبیان)

[3] ۔معناه انّ معلوماته اکثر من معلوماتکم وقیل معناه انّه اعلم بجمیع ما فی ضمائرکم وهٰذا اوجه(مجمع البیان)

''اور قرابت دار کو اس کا حق عطا کرو اور مسکین اور مسافر کو اور بہت زیادہ بے جا خرچ نہ کرو۔ بلاشبہ بیجا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی بند ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا ناشکرا ہی تو تھا''۔

فضول خرچی کی مذمّت

آیہ مودّت اور حکم خمس کی طرح اس آیت میں بھی ''ذوالقربیٰ'' کی تفسیر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحباب قرابت سے ہوئی ہے [1] اور فریقین کے طرف سے وارد ہوا ہے کہ اسی آیت کے نازل ہونے پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فدک اپنی بیٹی حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو ہبہ فرمایا۔

اس کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ اٰت ذاالقربیٰ کا مخاطب رسول ہی کو قرار دیا جائے بلکہ خطاب عمومی ہو تب بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی تعمیل میں پیش پیش ہونا چاہئے بلکہ اس خطاب کی عمومیت اور لفظ ذاالقربیٰ کی قربتداروں رسولؐ سے خصوصیّت کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ خمس میں ذاالقربیٰ کا جو حق ہے اور جو قیامت تک تمام مسلمانوں پر از روئے قرآن واجب الادا ہے، وہ بھی اس اٰت ذاالقربیٰ کے تحت میں خالق کے منظور نظر ہو سکتا ہے۔

صرف بے جا کرنے کی ممانعت اس آیت میں ''تبذیر'' کے لفظ سے ہوئی ہے بعض مترجمین و مفسرین نے تبذیر کو ''اسراف'' کا ہم معنی قرار دیا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کیا ہے۔

''واسراف مکن اسراف کردنی بر آئینہ اسراف کنندگان ہستند برادران شیاطین''

لیکن بعض اہل نظر اسراف اور تبذیر میں فرق قرار دیتے ہیں کہ اسراف کہتے ہیں ''حد سے زیادہ خرچ'' کو اور تبذیر ''بے محل صرف'' کو یعنی صحیح مصرف میں صرف کیا مگر اندھا دھند افراط کے ساتھ تو وہ اسراف ہے اور زیادہ نہ سہی کم ہی صرف کیا ہو مگر غلط مصرف میں تو وہ تبذیر ہے۔ [2]

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

''اور اگر تم ان کی طرف سے بے توجہی اختیار کرنا چاہو اپنے پروردگار کی رحمت کی طلب میں جس کے تم امیدوار ہو تو ان سے ملائم انداز میں گفتگو کرو''۔

اس سے قبل بلا فاصلہ تو مبذرین یعنی بے جا صرف کرنے والوں کا ذکر تھا مگر اس سے مرتبط کر کے اس آیت کا مطلب کچھ نکلتا نہیں لہٰذا اس کا ربط اُس کے پہلے کی آیت سے قائم کیا جاتا ہے جس میں ذی القربیٰ اور یتامیٰ اور مساکین کو دینے کا حکم تھا اور اس صورت میں یہ ضمیر ''اگر ان سے بے توجہی اختیار کرو'' انہی کی طرف پھرتی ہے [3] اور مطلب یہ ہے کہ اگر کسی وقت تمہارے پاس نہیں ہے اور تم ان کی حاجت

---

[1] ۔ھو الذی رواہ اصحابنا رضی اللہ عنہم عن الصادقین علیہما السلام (مجمع البیان)

[2] ۔فلا تبذّر تبذیرا بالاتفاق فی غیر طاعۃ اللہ تعالیٰ (جلالین) قال مجاھد: لو انفق صدّا فی باطل کان مبذّرا ولو انفق جمیع مالہ فی الحقّ لم یکن مبذرا (مجمع البیان)

[3] ۔عنہم ای الذکورین من ذی القربیٰ و ما بعدہ. (جلالین)

براری نہ کرسکو، تب بھی سخت کلامی سے پیش نہ آؤ، نرم وملائم الفاظ میں معذرت کرو۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں۔

یعنی جو کوئی ہمیشہ سخاوت کرتا ہے اور ایک وقت اس کے پاس نہیں ہے تو اللہ کے ہاں امید کا محروم ہوجانا خوش نہیں آتا اس محتاج کی قسمت سے اللہ نعمتوں کو بھیج دیتا ہے سو اس واسطے اگر ایک دفعہ نہ دے تو میٹھے جواب کہے۔ (موضح القرآن)

ہمارے مفسرین بھی اس کے موافق تشریح کرتے ہیں۔ [1]

مگر شاہ صاحب کی اردو تشریح کے الفاظ میں الجھاؤ محسوس ہوتا ہے سلجھی ہوئی تشریح کے لئے شاید الفاظ موزوں ہوں کہ ''بے توجہی اختیار کرو اللہ کی رحمت کی طلب میں جس کی تمہیں امید ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تمہارے پاس نہیں ہے اس لئے اس کی حاجت براری سے مجبور ہو مگر اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ عنقریب تمہیں کشائش عطا کرے گا تم اس وقت اس کا سوال پورا کرسکو گے اس بناء پر اس سوال پر بے توجہی اختیار کرتے ہو یعنی بے توجہی ظاہر کرتے ہو اس طرح کہ سکوت کرتے ہو اور سنی کو اَن سنی بناتے ہو تو یہ طرز عمل بھی وجہ بے اعتنائی کا پتہ دے، اُس لئے تکلیف دہ ہوگا لہٰذا ایسا نہ کرنا چاہیے اس امید کے ہوتے ہوئے اللہ کشائش دے گا [2] خاموش کیوں رہو اور بے اعتنائی کا انداز کیوں اختیار کرو بلکہ اسی امید اور سہارے کی بناء پر اُس سے آئندہ امکانی کوشش کا وعدہ کرلو [3] کہ اُس کے دل کو ڈھارس ہوجائے اور تمہارے طرز عمل سے اُس کی دل شکنی نہ ہو۔

ہم نے ''بے توجہی اختیار کرتے ہو'' کے معنی جو یہ لئے کہ بے توجہی اختیار کرنا چاہتے ہو، وہ اس بناء پر نہیں کہ اگر بے توجہی کر ہی لی اور وہ دل شکستہ مایوس ہوکر چلا گیا تو اس کا محل ہی کیا ہے کہ ان سے ملائم انداز میں گفتگو کرو اس کی نظیریں قرآن مجید میں تلاش سے مل جائیں گی کہ مثلاً ''ایمان لاتے ہو'' کا مطلب ''ایمان لانا چاہتے ہو''۔

یہ سب اس صورت میں ہے جب اس آیت کو مقام تنزیل میں گذشتہ آیت سے متصل سمجھا جائے لیکن اگر یہ آیت سی اور محل پر نازل ہوئی تھی اور کسی دوسرے موقع سے تعلق رکھتی ہے تو شاید اس کے معلوم ہوجانے کے بعد ہم بلا تکلف اس آیت کا مفہوم سمجھ لیں اور اس کا مطلب بیان کرنے میں ہمیں کچھ پاپڑ بیلنے نہ پڑیں۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ﴿٢٩﴾

''اور نہ رکھو اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن سے اور نہ اسے بالکل پھیلا ہی دو، کہ اس صورت میں بیٹھو گے لعنت ملامت میں گرفتار، رنج وغم، پریشانی میں مبتلا''۔

خرچ میں میانہ روی کی ضرورت

---

[1] ۔مثل ما صرفت وجهك عنهم يعني عن الذين امروا باعطائهم حقوقهم ممّن تقدّم ذكره.(تبيان)

[2] ۔اى لتبغى الفضل من الله والسعة التى تمكنك من البذل(مجمع البيان)

[3] ۔فقل لهم قولا حسنا اى عدهم عن جميلة(تبيان)

''ہاتھ کو گردن سے بندھا ہوا نہ رکھو'' یعنی بخل سے کام نہ لو اور ''بالکل پھیلا نہ دو'' یعنی اسراف نہ کرو۔

آخر کے فقرہ کے دو جز بالترتیب ان دونوں احکام سے متعلق ہو سکتے ہیں یعنی بخل سے کام لو گے تو لعنت و ملامت میں گرفتار ہو گے اور اسراف سے کام لو گے نتیجتاً رنج و حسرت میں مبتلا ہو گے [1] اور ممکن ہے دونوں ٹکڑے دوسرے جزء یعنی اسراف ہی سے متعلق ہیں کہ اسراف کی صورت میں بھی جب بعد میں پریشان حالی میں مبتلا ہوتا ہے تو لوگوں کے تیر ہائے ملامت کا نشانہ بنتا ہے اور ''نقصان مایہ وشماتت ہمسایہ'' میں گرفتار ہوتا ہے۔ [2]

اس غلط ذہنیت کے ماتحت کہ جہاں واحد مذکر حاضر کے صیغے کے ساتھ خطاب ہو وہاں مخاطب رسول اللہؐ ہی ہیں یہاں بھی ایسی روایات آ گئیں کہ حضرتؐ ہی نے ایسا کیا تھا کہ کپڑے اتار کر سائل کو دیدیئے یہاں تک کہ اب اتنا لباس نہ رہ گیا کہ گھر سے باہر نکلیں اور اس لئے کئی وقت مسجد میں نماز کو نہ جا سکے جس پر کافروں نے کہنا شروع کر دیا کہ رسول اللہ معاذ اللہ اب سوتے رہتے تھے اور تفریحات میں مشغول رہتے ہیں اتنے کہ نماز کے لئے نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ اس پر یہ آیت اتری۔

ہمارے نزدیک وہ ذہنیت بھی کہ ایسے موقعوں پر ہر جگہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کو مخاطب قرار دیا جائے تو غلط ہے اور یہ روایت بھی درست نہیں ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾

''یقیناً تمہارا پروردگار کشائش دیتا ہے روزی میں جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگی میں مبتلا کرتا ہے، یقیناً وہ اپنے بندوں سے خوب واقف ہے، نظر رکھنے والا''۔

آخر کا فقرہ کہ ''وہ خوب واقف ہے اپنی بندوں سے نظر رکھنے والا'' اس کا پتہ دیتا ہے کہ یہ رزق کی کشائش اور تنگی بلا وجہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں خود انسان کی کیفیت مثلاً وہ محنتی ہے یا سہل انگار، باعمل ہے یا بے عمل اور شکر گزار ہے یا ناشکرا؟ اس سب کو دخل ہے پھر اس کو مال و دولت عطا ہونے کے جو نتائج اُس کی ذہنی کیفیتوں اور ارادی استعدادات کے لحاظ سے ہو سکتے ہیں، ان سب کا علم بھی اللہ کے عمل میں دخیل ہوتا ہے۔ [3]

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾

''اور اپنے بچوں کی فقر و فاقہ کے خوف سے جان نہ لو۔ ہم انہیں اور تمہیں روزی عطا کرتے ہیں، یقیناً ان کی جان لینا بہت بڑی غلطی ہی ہے''۔

یہی فقر و فاقہ کا ڈر تو وہ ہے جو آج بھی خاندانی منصوبہ بندی وغیرہ کے نام سے آنیوالے بچوں کا راستہ روک رہا ہے خالق مذکورہ بالا علان

---

[1] ۔ان امسکت قعدت ملوما عند العقلاء مذموما وان اسرفت بقت محسورا ای مغموما فتحسرا (تبیان) ان امسکت قعدت ملوما مذموما وان اسرفت بقیت فتحسر امغموما عن الجبائی (مجمع البیان)

[2] ۔یعنی سب الزام دیں کہ اتنا کیوں دیا کہ اب محتاج ہو گئے (موضح القرآن)

[3] ۔خبیرا بصیرا ای عالما باحوالهم بصیرا بمصالحهم (مجمع البیان)

جس طرح اس جاہلیت قدیم کے خلاف تھا اس طرح اس جاہلیت جدید کے مقابلہ میں بھی ہے۔

پہلے جو ہوتا تھا یعنی زمانہ قبل اسلام میں بہت بڑی غلطی تھی تو اب بھی جب ایسا ہو تو وہ بہت بڑی غلطی ہوگی۔ [1]

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾

''اور حرام کاری کے پاس بھی نہ جانا، یقیناً وہ شرمناک گناہ ہے اور بہت برا طریقہ ہے''۔

''کان فاحشة'' کے لفظی معنی ہیں ''شرمناک گناہ تھا'' یہاں اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے جیسا کہ سابقہ آیت میں ہم نے کہا کہ اب تک جو ہو رہا تھا وہ برا تھا لہٰذا اب بھی وہ برا ہے، اب تم اس کے قریب بھی نہ جانا لیکن ''کان'' کا لفظ ''ہے'' کے معنی بھی قرآن میں بھی بکثرت موجود ہے لہٰذا بہت ممکن ہے ان تمام آیات میں ایسا ہی ہو۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّى الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾

''اور نہ لو وہ جان جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے مگر کسی حق کی بنا پر اور جو مظلومیت کے ساتھ قتل ہو، ہم نے اس کے وارث کو قابو [2] عطا کیا ہے تو وہ جان لینے میں حد سے آگے نہ بڑھے یقیناً ان کی مدد ہوگی''۔

قانون قصاص

''نہ لو وہ جان ---مگر کسی حق کی بناء پر'' یعنی سوا اس صورت کے جو بطور قصاص وغیرہ قانون الٰہی نے اس کو مستحق نقل قرار دیا ہو۔ [3]

حد سے آگے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے جاہلیت میں ہوتا تھا کہ بڑے آدمی کے عوض میں اس دوسرے قبیلہ کے کسی بڑے آدمی کو قتل کرتے تھے حالانکہ وہ بے گناہ ہوتا تھا، قاتل کوئی اور ہوتا تھا یہ کہ کسی بڑے آدمی کے عوض میں ایک آدمی کا قتل کرنا کافی سمجھا جاتا تھا بلکہ بہت سے آدمیوں کی جان لی جاتی تھی تب سمجھا جاتا تھا کہ بدلا ہوا، ان باتوں کی اب اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس کی مدد ہوگی کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس صورت میں اللہ اس کی مدد کرے گا اور یہ بھی کہ اس کی مدد ہونا چاہئے یعنی دوسرے لوگوں کو لازم ہے کہ اس کی مدد کریں۔ [4]

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾

---

[1] ۔یعنی ان قتلهم فی الجاهلية كان اثما عظيما عند الله وهو اليوم كذلك (مجمع البيان)

[2] ۔ای سلطانا علی القتل (علی بن ابراهیم)

[3] ۔بالحق وهو ان يجب عليه القتل امّا لكفره او ردته او لانّه قتل نفسا بغير حق او زنى وهو محصن (مجمع البيان)

[4] ۔یعنی ہر کسی کو لازم ہے کہ ان کا بدلہ دلانے میں مدد کرے نہ الٹا قاتل کی حمایت کرے (موضح القرآن)

''اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سن تمیز کو پہنچے اور عہد کو پورا کرو۔ عہد کے متعلق یقیناً جواب دہی ہوگی''۔ [1]

یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بالغ کے مال میں بلاحق تصرف درست ہے بلکہ چونکہ عموماً یتیموں ہی کے اموال میں لاوارث سمجھ کر اس قسم کی دست درازیاں ہوتی تھیں اس لئے انہیں مورد کلام قرار دیا گیا۔ [2]

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾

''اور جب ناپو تو لو ناپ پوری کرو اور ٹھیک ترازو سے تولو، یہ بہتر اور نتیجہ کے اعتبار سے زیادہ اچھی بات ہے''

ان آیات میں ناپ تول میں انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿۳۶﴾

''اور ایسی بات کے پیچھے نہ جاؤ جس کے متعلق تمہیں علم نہیں، یقیناً کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر چیز کے متعلق جواب دہی ہوگی''۔

چونکہ اس آیت میں نہی بصیغۂ مفرد کی گئی ہے اس لئے اس سے مخاطب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھا گیا ہے لیکن بہرصورت حکم اس کا عام ہے۔ [3] اور ہم سمجھتے ہیں کہ گذشتہ آیات ہی کی طرح مخاطب بھی سب ہی لوگ ہیں صرف انداز میں تنوع کی خاطر جمع کے صیغہ کو واحد سے بدل دیا گیا ہے جس سے مراد ایک ایک کو مخاطب کر کے بات کہنا مفاد اس جمع اور اس واحد کے صیغہ کا ایک ہی ہے۔

''اس بات کے پیچھے نہ جاؤ جس کے متعلق تمہیں علم نہیں'' اسم کے تحت میں یہ بھی ہے کہ بغیر علم کے کوئی بات نہ کہو اور یہ بھی کہ بلا علم کوئی چیز مانو نہیں اور یہ بھی کہ لاعلمی کے ساتھ کوئی اقدام نہ کرو، غرض کہ قول عمل اور اعتقاد، سب کی بنیاد ضمیر کے اطمینان پر ہونا چاہئے۔ [4]

وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾

---

[1] ۔ کان مسئولا عنه للجزاء علیه فحذف عنه لانّه مفهوم (مجمع البیان)

[2] ۔ انما خصّ الیتیم بذٰلك وان کان التصرّف فی مال البالغ لا یجوز ایضًا لانّ الیتیم الیٰ ذلك اخوج والطمع فی ماله اکثر (تبیان)

[3] ۔ هو متوجه الیٰ جمیع المکلّفین (تبیان)

[4] ۔ الاصل انّه عام فی کلّ قول و فعل و عزم یکون علیٰ غیر علم فکانّه سبحانه قال: لا تقل الّا یعلم انّه یجوز ان یقال و لا تفعل الّا یعلم انّه یجوز ان یفعل و لا تعتقه الّا ما تعلم انّه یجوز ان یعتقد (مجمع البیان)

''اور نہ چلو زمین میں اٹھلاتے ہوئے، بلاشبہ تم ہرگز زمین کو پھاڑ نہیں سکتے اور ہرگز لمبائی میں پہاڑوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ سب باتیں وہ ہیں جن کی برائی اللہ کو ناپسند ہے''۔

اٹھلانا غرور و تکبر سے بھی ہوسکتا ہے اور اپنے کسی کارنامہ پر خوش ہوکر بے جا فخر سے بھی جسے ''اترانا'' کہہ سکتے ہیں۔ مفسرین نے دونوں پہلو اختیار کئے ہیں۔ [1]

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾

''یہ سب اس میں سے ہے جو ہم نے آپ کی طرف حکمت کا ذخیرہ اتارا ہے اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا قرار نہ دو، ورنہ دوزخ میں ڈال دیئے جاؤ گے ملامت میں گرفتار، راندے ہوئے''۔

یہ سب یعنی سابق میں جو جو احکام نافذ کئے گئے ہیں اور جو جو ہدایات ہوئی ہیں [2] اسے حکمت کا ذخیرہ کہنے میں ایک بڑی بحث کا فیصلہ مضمر ہے۔ اگر ذاتاً اشیاء میں بھلائی اور برائی نہ مانی جائے بلکہ یہ سمجھا جائے کہ بھلائی اور برائی صرف شریعت کے امر و نہی سے پیدا ہوئی ہے یعنی جس بات کا حکم دے دیا وہ اچھی ہوگی اور جس سے منع کر دیا وہ بری تو اتنا کہنا کافی تھا کہ ذلك مما اوحىٰ اليك ربّك یہ وہ ہے جو آپ کے پروردگار نے آپ پر وحی بھیجی ہے۔ من الحكمة کہنا اس کا ثبوت ہے کہ یہ احکام بلا وجہ نہیں ہیں بلکہ حکیمانہ طور پر مصالح و مفاسد کی بناء پر ہیں جنہیں انسان اپنی نادانی سے سمجھتا نہیں تھا خالق نے اپنے احکام کے ذریعہ سے اُن سے پردہ ہٹایا ہے۔ [3]

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

''کیا تمہیں تمہارے پروردگار نے بیٹوں کے ساتھ امتیاز عطا کیا ہے [4] اور خود اس نے فرشتوں کی جنس سے لڑکیاں اختیار کی ہیں؟ تم بڑی بات زبان سے نکالتے ہو''۔

یہ مشرکین کا تصور تھا کہ ملائکہ خالق کریم کی بیٹیاں ہیں ان کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر وہ اپنے لئے بیٹیوں کو بہت برا سمجھتے تھے، رد کی جارہی ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ بیٹیاں واقعی بری چیز ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے لئے بیٹے اور بیٹیاں دونوں بری ہیں یعنی اس کی شان الوہیت کے خلاف ہیں۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِىْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾

---

[1] ۔معناہ لا تمش علیٰ وجہ الاشر و البطر و الخیلاء و الکبر ـــــ و قیل المرح شدۃ الفرح بالباطل (مجمع البیان)

[2] ۔الّذی تقدّم ذکرہ من الاوامر و النّواھی (مجمع البیان)

[3] ۔من الحکمۃ المؤدّیۃ الی المعرفۃ بالحسن و القبیح و الفرق بینھما (مجمع)

[4] ۔اخلص لکم البنین و اختار لکم صفوۃ الشئی دونہ (تبیان)

''اور ہم نے اس قرآن میں پلٹا پلٹا کر طرح طرح کی باتیں کہی ہیں تا کہ وہ نصیحت قبول کریں، حالانکہ وہ نہیں بڑھاتا ان کو مگر وحشت کے ساتھ بھڑکنا''۔

پلٹا پلٹا کر یعنی بار بار ایک ایک بات کو دہرایا ہے [1] تا کہ ایک دفعہ نظر تغافل ہو جائے تو شاید دوسری مرتبہ مورد توجہ بن جائے اتمام حجت کے لئے [2] مگر نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ جو آخر میں ہے کہ بجائے مانوس ہونے کے ان کی وحشت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾

''کہئے کہ اگر اُس کے ساتھ اور خدا ہوتے جیسا کہ وہ کہتے ہیں تو وہ ضرور عرش والے تک پہنچنے کا راستا تلاش کرتے۔ پاک ہے وہ اور بالا ہے اس سے جو وہ کہتے ہیں بڑی برتری کے ساتھ''۔

''عرش والے'' یعنی اللہ تک جو خدائے حقیقی ہے، پہنچنے کا راستہ تلاش کرتے'' یعنی اس کے مقابلہ میں فوج کشی کر کے اسے تخت حکومت سے اتارنے کی کوشش کرتے۔ اس طرح یہ آیت بھی ایک طرح ''برہان تمانع'' ہی کے مفاد پر مشتمل ہے جیسے: لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا [3] وغیرہ (انبیاء ۲۲)

اس کے بالمقابل ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ اگر ان کے خیال کے مطابق اور خدا ہوتے تو وہ بھی عرش والے خدا کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ [4]

اسے علامہ طبرسیؒ نے بعض قدیم مفسرین کی زبانی نقل کیا ہے مگر پہلے معنی کو کہا ہے کہ اس کے قائل زیادہ مفسرین ہیں۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَىْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

''اس کی تسبیح کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ ان میں ہیں اور کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں، بلاشبہ وہ بڑا برداشت کرنے والا ہے، بخشنے والا''۔

کائنات تمام و کمال اس کی کمال ذات کو گواہ ہے اور کمال ذات ہی نقائص سے اس کے بری ہونے کا ضامن ہے، اس لیے یہ گواہی اس

---

[1] ۔ای کررنا الدلائل وفضلنا المعانی والامثال (مجمع البیان)

[2] ۔الحکمۃ فیہ الزام الحجۃ وقطع المعذرۃ (مجمع البیان)

[3] ۔قال الحسن والجبائی: لابتغو اسبیلا الی مغالبتہ ومضادۃ کما قال: لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدت (تبیان)

[4] ۔ای لطلبوا طریقا تقربھم الی مالک العرش والتمسوا لزلفۃ عندہ لعلمھم بعلوہ علیھم و عظمۃ عن مجاھد وقتادۃ (مجمع البیان)

کی تسبیح ہے جس میں تمام کائنات یک زبان ہے [1] مگر انسان کو ان دلائل حقانیت پر توجہ نہیں ہوتی یہی توجہ نہ ہونا کائنات کی تسبیح کا نہ سمجھنا ہے [2] اور یہ نہ سمجھنا اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس غافل انسان کو ایک دم اس کے فیض کرم سے محروم ہوجانا چاہیے جس کے بعد اس کا نیست و نابود ہوجانا لازم ہے مگر یہ اس کا علم و مغفرت ہے کہ وہ اپنے منکروں کو بھی دنیا میں جینے کا موقع دیتا ہے اور انہیں اپنی نعمتوں سے مالا مال کرتا ہے اور جب بھی ان کی آنکھ کھلے اور وہ اپنے رویہ کو تبدیل کریں تو وہ ان کی خطا سے درگزر بھی کر دیتا ہے۔ [3]

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۙ﴿۴۵﴾ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾

''اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے درمیان اور ان کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے چھپا ہوا پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اور ہم ان کے دلوں پر پوششیں چڑھا دیتے ہیں کہ وہ نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرا پن کہ نہ سنیں اور جب آپ قرآن میں اپنے پروردگار کا اکیلے ذکر کرتے ہیں تو وہ بھڑک کر اپنے پیچھے پلٹ جاتے ہیں''۔

مستورا کے لفظ کو بعض مفسرین نے ساترا کے معنی میں قرار دیا ہے اب ترجمہ یہ ہوگا کہ ''چھپانے والا پردہ'' مگر پردہ کا تو کام ہی چھپانا ہوتا ہے، اس لیے یہ قید تاکید سے زیادہ کوئی فائدہ نہ دے گی۔ اس کے برخلاف دوسری صورت میں مستور کے لفظ میں اس کے اصل مفہوم کے لحاظ سے کوئی تصرف نہیں ہوگا بلکہ مستور کے معنی وہی ہوں گے جو اس کی اصل شکل تصریفی کا عام تقاضا ہیں اور پھر مزید افادیت بھی ہوجائے گی۔ یعنی معنی یہ سمجھے جائیں کہ یہ ایسا پردہ ہے جو آنکھوں کو نظر نہیں آتا۔ اس کے آثار غور کرنے ہی سے سمجھ میں آتے ہیں، میں نے اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور بعض مترجمین و مفسرین اس کے موافق ہیں۔ [4]

اس آیت سے بہت آسانی کے ساتھ مدعیان جبر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ خالق ہی کی طرف سے انہیں فہم قرآن اور اس کے ذریعہ سے ہدایت قبول کرنے سے روک دیا گیا ہے مگر غنیمت ہے کہ یہاں شاہ ولی اللہ صاحب نے حقیقت پسندی سے کام لیا ہے اور کہا ہے کہ:

''ایں ہر دو آیت کنایت است از عدم انتفاع ایشان بقرآن و مواعظ'' (فتح الرحمٰن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا حقیقۃً نہیں ہے کہ اللہ پردے ڈال دیتا ہو یا انہیں بہرا بنا دیتا ہو بلکہ ان کا باختیار خود جو اعراض ہے، اس سے جو دیر یا محرومی ان میں پیدا ہوگئی ہے، اس کے لاعلاج ہونے کا بطور کنایہ یہ اظہار ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سب ان میں قدرتی مجبوریاں

---

[1] ۔تنزیہ السّمٰوٰت والارض ھوما فیھا من الدّلالۃ علی توحیدہ وعدلہ (تبیان)

[2] ۔لستم تفقھون تسبیح ھٰذا الاشیاء حیث لم تنظروا فیھا فتعلموا کیفیۃ دلالتھا (تبیان)

[3] ۔حلیما یھلکم لایعاجلکم بالعقوبۃ علی کفرکم
غفور الکم اذا تبتم وانبتم الیہ (مجمع البیان)

[4] ۔پردہ پوشیدہ (شاہ ولی اللہ) پردہ چھپا ہوا (رفیع الدین) قیل حجابا مستورا عن الاعین لایبصر انّما ھو من قدرۃ اللہ تعالٰی (مجمع البیان)

پیدا ہوگئی ہیں جن کی وجہ سے اب یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ ہدایت کا اثر قبول کریں۔

''شاہ عبدالقادر کے الفاظ یہ ہیں:

''یعنی اس قرآن میں ایسی تاثیر ہے اور کافروں پر اثر نہیں آتا یہی واسطے کی اوٹ میں ہیں، آفتاب سے جہاں روشن ہے اور جس کی اس طرف پیٹھ ہے، اس کے حساب میں کہیں نہیں۔'' (موضح القرآن)

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ یَسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ یَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾ اُنْظُرْ كَیْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا ﴿۴۸﴾

''ہم خوب جانتے ہیں جس لیے وہ غور سے سنتے ہیں، جب وہ کان لگاتے ہیں آپ کی طرف اور جب وہ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں۔ جب وہ ظالم کہتے ہیں کہ تم نہیں پیروی کرتے مگر ایسے آدمی کی جو جادو کا شکار ہے۔ دیکھیے وہ کس طرح آپ کے لیے طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں تو وہ گمراہ ہوگئے ہیں ایسے کہ راستہ پا ہی نہیں سکتے''۔

''جس لیے وہ غور سے سنتے ہیں'' یعنی استفادہ کی غرض سے نہیں بلکہ نکتہ چینی کے مطلب سے اور تمسخر کے پہلوؤں کی تلاش میں [1] جس کے بعد کتنے ہی فوائد و فیوض کا سرمایہ ہو مگر غور سے سننے کے باوجود وہ سننے والا اپنی نیت کی خباثت سے ان فیوض سے بہرہ مند نہیں ہوتا بلکہ عناد کی وجہ سے اس میں اعتراض کے پہلو تلاش کرتا رہتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر کے ان پر استفادہ کی راہیں بند کرتا ہے۔

''طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں'' کبھی دیوانہ کہتے ہیں، کبھی شاعر، کبھی جادوگر اور اب یہ کہ یہ خود جادو کا شکار ہے۔ [2]

اس سے خود ظاہر ہے کہ ایک بات کہہ کر وہ خود مطمئن نہیں ہوتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ بات بنی نہیں، اس لیے بدل کر دوسری بات کہتے ہیں اور پھر تیسری۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِیْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا یَكْبُرُ فِیْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَیَقُوْلُوْنَ مَنْ یُّعِیْدُنَا ؕ قُلِ الَّذِیْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَیُنْغِضُوْنَ اِلَیْكَ رُءُوْسَهُمْ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ؕ قُلْ عَسٰٓى اَنْ یَّكُوْنَ قَرِیْبًا ﴿۵۱﴾

''اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم ہڈیوں اور بوسیدہ اعضاء کی شکل میں ہوں گے تو کیا ایک نئی تخلیق کے ساتھ اٹھائے جائیں گے۔ کہہ دیجئے کہ تم پتھر ہو جاؤ یا لوہا۔ یا کوئی اور مخلوق جو تمہارے ذہن میں بہت بڑی ہو تو اس پر وہ یہی

---

[1] ۔یعنی بقصد استہزا و عیب جوئی (فتح الرحمٰن)

[2] ۔شبّهوا لك الاشیآء فقالوا مجنون وساحر وشاعر (مجمع البیان)

کہیں گے کہ کون ہمیں دوبارہ لائے گا؟ کہیے کہ وہی جس نے تمہیں پہلی دفعہ پیدا کیا تھا۔ اب وہ آپ کی بات پر اپنے سر ہلانے لگیں گے اور کہیں گے کہ یہ کب ہوگا؟ کہیے بہت ممکن ہے کہ وہ نزدیک ہی ہو''۔

منکرین معاد کی رد

''پتھر ہو جاؤ یا لوہا یا کوئی اور مخلوق'' مطلب یہ ہے کہ تم تو ہڈیوں اور بوسیدہ اعضاء ہی کے زندہ ہونے پر حیرت کرتے ہو۔ ارے یہ چیزیں تو وہ ہیں جن سے ایک وقت میں تعلق حیات تھا نہیں، بالکل بے جان چیزوں سے جن سے زندگی کا کوئی لگاؤ ہی نہیں، جیسے پتھر اور لوہا وغیرہ، یہ بھی تم ہو جاؤ تو خدا جب چاہے گا تم میں روح پھونک دے گا اور تم زندہ ہو جاؤ گے۔''

وہ یہ سن کر ''سر ہلانے لگیں گے'' سر ہلانے کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، قائل ہو کر اقراری طور پر بھی سر ہلایا جا سکتا ہے، بطور تعجب بھی اور بطور تمسخر بھی اس لیے اس کی تشریح میں اقوال مختلف ہو گئے ہیں۔ [1]

يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾

''جس دن وہ تمہیں بلائے گا تو تم اس کی حمد و ثنا کے ساتھ لبیک کہو گے اور ایسا خیال کرو گے کہ تم نہیں رہے مگر بہت کم''۔

فتستجیبون بحمدہ جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ''اس کے حمد و ثنا کے ساتھ لبیک کہو گے'' اس کی ایک تشریح یہ ہے کہ حمد و ثنا کرتے ہوئے لبیک کہو گے [2] لیکن دوسری تشریح یہ ہے کہ جیسے کسی ایسے شخص کو جو بڑا سرکش ہو، حالات نے سر جھکانے پر مجبور کر دیا ہو تو اس سے طنزیہ طور پر کہیں کہ اب تو بحمد اللہ تم بڑے ہی اطاعت گزار ہو، ویسے ہی کہا گیا ہے کہ اس وقت بحمدہ تم صدائے حق پر لبیک کہو گے۔ [3]

''ایسا خیال کرو گے کہ نہیں رہے مگر بہت کم'' یعنی مرنے کے بعد سے قیامت تک کے وقفہ کا کوئی احساس ہی نہیں ہوگا، سمجھو گے تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ ہم دنیا میں تھے اور جلد ہی دوبارہ اٹھائے گئے ہو۔

شاہ عبدالقادر نے ایک دوسرے معنی کہے ہیں:

''یعنی اب شتابی کرتے ہو، تعجب جانو گے کہ دنیا میں کچھ دیر نہ رہے تھے پچاس برس ان ہزاروں برس کے سامنے کیا معلوم ہوں۔'' (موضح القرآن)

مگر قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر جو تشریحات ہیں، وہ پہلے مفہوم سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔

---

[1] ۔یعنی ملزم خواهند شد (فتح الرحمٰن) ینقضون الیك رءوسهم تعجبا (جلالین) حرّکوا رءوسهم مستبعدین لذٰلك وقال ابن عباس یحرّکون رءوسهم مستهزءین (تبیان)

[2] ۔قال سعیدبن جبیر: یخرجون من قبورهم یقولون سبحانك و بحمدك ولا تنفعهم فی ذٰلك الیوم لانّهم حمدوا حین لا ینفعهم الحمد (مجمع البیان)

[3] ۔قیل وله الحمد (جلالین)

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۵۳﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْكُمْ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ﴿۵۴﴾

''اور میرے بندوں سے کہیے کہ وہ ایسی بات کہیں جو بہت اچھی ہے یقیناً شیطان ان کے درمیان جھگڑے ڈال دیتا ہے بلاشبہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ تمہارا پروردگار تم سے خوب واقف ہے چاہے تو اپنی رحمت تمہارے شامل حال کرے اور اگر چاہے تمہیں سزا دے اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو ان پر داروغہ بنا کر''۔

مخالفین حق سے روادارانہ گفتگو کی تعلیم

دونوں آیات کا ایک سلسلہ قرار دے کر مفسرین نے یہی مطلب نکالا ہے کہ مسلمان کافروں سے اس طرح روادارانہ بات کہیں جو بہت اچھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تم سے خوب واقف ہے۔ اگر چاہے تو اپنی رحمت تمہارے شامل حال کرے اور اگر چاہے تو تمہیں سزا دے۔[1] یہ اللہ سے متعلق چیز ہے، پیغمبر کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

''اور تمہارا پروردگار بہت خوب جانتا ہے۔ ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور ہم نے کچھ نبیوں کو کچھ پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی''۔

اس آیت کا ارتباط گزشتہ آیت کے ساتھ ضروری نہیں ہے، مستقل طور پر اس کے تمام اجزاء پر نظر ڈالنے سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے انبیاء میں جو آپس میں فرق مراتب ہے جیسا کہ تیسرے بارہ کی ابتداء میں ہے! تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وہ بلاوجہ نہیں ہے بلکہ خالق جو ظاہر و باطن پر حاوی ہے، وہ تمام نفوس کا جائزہ لے کر ان میں دانا جو صفات کا فرق پاتا ہے، اسی لحاظ سے ان کے مراتب مقرر فرماتا ہے۔[2]

شاہ عبدالقادر نے اسے بھی گزشتہ آیت سے مرتبط کیا ہے وہاں آخر میں تھا ''ہم نے آپ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا'' اس کی تشریح میں موصوف نے لکھا تھا:۔

---

[1] ۔یقولو الکفار... الکلمة الّتی هی احسن هی: ربّکم اعلم بکم (جلالین) بگویند کلمۂ کہ آن بہتر است یعنی با کفّار... و مراد از ایں کلمہ ایں است کہ پروردگار شما دانا تر است بحال شما الخ (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔انّما قال ذلك لیدل علی ان تفضیل الانبیآء بعضهم علی بعض وقع موقع الحکمة لانّه من عالم بباطن الامور (تبیان) بیّن سبحانه بهذا انّه لم یختر الملئکة والانبیآء للمیل الیهم او انّما اختارهم لعلمه بباطنهم (مجمع البیان)

''ندا کرنے میں حق والا جھونجھلا تا ہے کہ دوسرا صریح حق کو نہیں مانتا، سو فرما دیا کہ تم پر ان کا ذمہ نہیں ہے، اللہ بہتر جانے، جس کو چاہے راہ سجھا دے''

اس کے بعد اس آیت کے تحت میں لکھتے ہیں:۔

''یعنی بعض نبی تھے جھونجھلا گئے، تیرا حوصلہ اُس سے زیادہ رکھا ہے'' (موضح القرآن)

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿٥٦﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿٥٧﴾

''کہیے کہ بلاؤ اُنہیں جن کو اللہ کے سوا تم سمجھتے ہو تو (دیکھنا کہ) وہ نہیں قدرت رکھتے سختی کے دور کرنے پر تم سے اور نہ کسی تبدیلی پر، جنہیں وہ پکارتے ہیں خود ہی اپنے پروردگار کی طرف ذریعہ ڈھونڈھتے ہیں کہ کون زیادہ تقرّب رکھنے والا ہے اور وہ اُس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اُس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، یقیناً تمہارے پروردگار کا عذاب ڈرنے کی چیز ہی ہے''۔

اس آیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن اصل وسیلہ اور توسّل کی نفی نہیں کرتا۔ ہاں غلط وسائل جنہیں مشرکین اختیار کرتے ہیں، اُن پر اعتراض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ وسائل تو خود دوسرے وسیلوں کی تلاش میں ہیں تو تم کو تو انہی وسائل کا دامن تھامنا چاہیے جن کے سبب ہی محتاج ہیں اور سب کو ان سے توسّل کرنا ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''یعنی جن کو کافر پوجتے ہیں، وہ آپ ہی اللہ کی جناب میں وسیلہ ڈھونڈھتے ہیں کہ جو بندہ بہت نزدیک ہو اسی کا وسیلہ پکڑیں اور وسیلہ سب کا پیغمبر ہے، آخرت میں انہی کی شفاعت ہوگی'' (موضح القرآن)

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿٥٨﴾

''اور کوئی بستی نہیں مگر یہ کہ ہم اسے ہلاک کر دیں گے قیامت کے دن سے پہلے یا اسے سخت عذاب میں مبتلا کریں گے یہ کتاب میں لکھی ہوئی بات ہے''..... کتاب سے یہاں مراد بقرینہ مقام لوح محفوظ ہے''[1]

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿٥٩﴾

''اور ہمیں ان معجزات کے بھیجنے سے مانع نہیں ہے مگر یہ چیز کہ پہلے لوگ انہیں جھٹلاتے رہے اور ہم نے قبیلہ ثمود کو

اوٹنی عطا کی جو بصیرت عطا کرنے والی تھی تو ان لوگوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم نہیں بھیجتے معجزوں کو مگر خوف دلانے کے لئے''۔

پیغمبر خداؐ کو معجزات خالق کی طرف سے عطا کئے گئے تھے، اس کا ثبوت قرآن مجید میں موجود ہے مگر کفار طرح طرح کی فرمائشیں کرتے تھے جن میں ایک بات یہ تھی کہ آپ وہی معجزے کیوں نہیں دکھاتے جو گزشتہ انبیاء نے دکھائے تھے؟ اس پر ارشاد ہو رہا ہے کہ اس لئے وہ معجزے اب نہیں دکھلائے جاتے [1] کہ پہلے جب وہ معجزے دکھائے گئے تو وہ امتیں کب ایمان لائیں جو تم ایمان لاتے اور جب ایسے معجزے دکھائے جاتے تھے تو پھر انکار کی صورت میں عذاب بھی ضرور آجاتا تھا جیسے قبیلہ ثمود کے لئے ہوا، اسی طرح تمہاری فرمائش کے مطابق اگر معجزے آئیں تو پھر انکار پر عذاب الٰہی آنا لازم ہے اور اس رسولؐ کی قوم کے لئے جو رحمۃ اللعالمین ہے، اللہ کو یہ منظور نہیں ہے۔ [2]

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۠ ﴿٦٠﴾

''اور جب ہم نے آپ سے کہا کہ آپ کا پروردگار تمام انسانوں کو گھیرے ہوئے ہے اور ہم نے نہیں قرار دیا اس منظر کو جو ہم نے آپ کو دکھایا تھا مگر آزمائش کا ذریعہ اور اسی طرح اس درخت کو جو قرآن میں مورد لعنت ہے اور ہم انہیں خوف دلاتے ہیں مگر وہ ان میں اضافہ نہیں کرتا۔ سوا بڑی سرکشی کے''۔

شجرۂ ملعونہ

عامۂ مفسرین نے اس کو معراج سے متعلق قرار دیا ہے اور درخت سے مراد شجرۃ الزقوم لیا ہے جس کا دوسری جگہ قرآن مجید میں ذکر ہے اور وہ دوزخ میں اہل دوزخ کے لئے ہے چنانچہ جلالین لکھتے ہیں:

الرؤیاالتی اریناك عیانا لیلة الاسراء والشجرة الملعونة فی القراٰن وهی الزقوم التی تبت فی اصل الجحیم

وہ منظر جو ہم نے آپ کو ظاہر بظاہر دکھایا شب معراج اور وہ درخت جو قرآن میں مورد لعنت ہے، زقوم کا درخت ہے جو دوزخ کی تہ میں اُگتا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے:

یعنی چوں کافران قصه معراج شنید ندو آیت انّ شجرة الزّقّوم طعام الاثیم بایشان رسید متبعاد کردند و

---

[1] ۔یعنی الایات للّتی اقترحتها قریش (تبیان)

[2] ۔ کنا اذا ارسلنا الی قریة ایة فلم یومنوا بها اهلکناهم ولذٰلك اخرناعن قومك الأیات (علی بن ابراهیم)

محل طعن ساختند (فتح الرحمٰن)

یعنی جب کافروں نے معراج کا واقعہ سنا اور یہ آیت جس کا مضمون یہ ہے کہ یقیناً زقوم کا درخت گناہ گار آدمی کی غذا ہے ان تک پہنچی تو انہوں نے اسے دور از قیاس سمجھا اور مرکز اعتراض بنایا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

وہ دکھاوا معراج ہے اور درخت پھٹکارا۔ یعنی درخت زقوم قرآن میں فرمایا کہ دوزخ والے کھاویں گے"۔ (موضح القرآن)

غالباً اسی بنا پر شاہ ولی اللہ نے الرّؤیا کا ترجمہ خواب سے نہیں کیا ہے بلکہ لکھا ہے: "نمائشی کہ نمودیم بتو" اور ہم نے بھی ترجمہ میں اس کی رعایت کی ہے اب شاہ رفیع الدین جو ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ: "نہیں کیا ہم نے وہ نمود یعنی خواب" جو دکھلائی تجھ کو تو یا وہ معراج کو خواب ہی کی بات سمجھتے ہیں وہ اس شان نزول ہی کے قائل نہیں ہیں چنانچہ دوسری روایت جو جناب ابن عباسؓ سے منقول ہے یہ ہے کہ اس خواب سے مراد وہ خواب ہے جو حضرتؐ نے داخلہ مکہ کے متعلق دیکھا تھا جس کے بعد آپ زیارت مکہ معظّمہ کے لئے روانہ ہوئے تھے پھر مشرکین سدراہ ہوئے اور حضرت بغیر عمرہ ادا کئے ہوئے واپس تشریف لے گئے۔ اس صورت میں آزمائش سے مراد یہی ہے کہ اس خواب دیکھنے کے باوجود بغیر نیت پوری کئے ہوئے واپس ہوئے تو بہت سے مسلمانوں پر حقانیت پیغمبر میں شک غالب آ گیا۔ کہ اگر یہ سچے رسول ہیں تو ان کی بات پوری کیوں نہ ہوئی اور آپ نے یہ جواب دیا کہ میں نے یہ کب کہا تھا کہ داخلہ اسی سال ہوگا۔ اگر غیب پر ایمان ہے تو وعدہ کی تکمیل کے لئے آئندہ کے منتظر رہو۔ اس شان نزول کے بعد رویا کے معنی خواب قرار پائیں گے۔ مگر اس شانِ نزول سے اس شجرۃ الزقوم کا کوئی ربط سمجھ میں نہیں آتا۔ اب تو اس شجرہ سے کوئی اور شجرہ مراد ہونا چاہیے جو مورد لعنت پروردگار ہے۔

تیسری شان نزول جو تفسیر اہل سنت میں وارد ہے اس سے خواب کا بھی پتہ چلتا ہے اور اس شجرہ ملعونہ کی بھی نشان دہی ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ کے منبر پر بندر جست وخیز کر رہے ہیں حضرتؐ کو اس سے بہت صدمہ ہوا یہ اشارہ تھا بنی امیہ کے ان صاحبان اقتدار کی طرف جو بنام خلافت رسول حکمرانی کرنے اور آپ کے منبر پر چڑھ کر خطبہ پڑھنے والے تھے۔ [1]

علامہ طبرسیؒ نے اپنی تفسیر میں ہماری ہی طرح ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے مذکورہ بالا تمام اقوال نقل کر دیئے ہیں اور پھر آخری قول کی تائید میں کلمات آئمہ معصومینؑ درج کئے ہیں اور واقعات سے اسکے شواہد بھی وارد کئے ہیں۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾

---

[1] ۔بنو امیہ (علی بن ابراھیم) روی عن ابی جعفر و ابی عبداللہ علیہما السلام و روی مثل ذٰلك عن سھل بن سعد السّاعدی من ابیہ ـــ ومثلہ عن سعد بن بشار۔ (تبیان)

''اور جب ہم نے کہا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدمؑ کو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، اس نے کہا کیا میں سجدہ کروں اسے جسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے [1] کیا تو دیکھتا ہے اسے [2] کہ جس کو مجھ پر تو نے فضیلت دی ہے، اگر تو نے مجھے روز قیامت تک رکھا تو میں جڑ سے اکھاڑ دوں گا اس کی اولاد کو مگر کم، اس نے کہا کہ اچھا جا! تو جو تیری پیروی کرے گا ان میں سے تو یقیناً دوزخ تم سب کی سزا ہوگی پوری پوری سزا''۔

لا حتکن کے لفظ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے میں جڑ سے اکھاڑ دوں گا یہ اس کے ایک لغوی معنی کے مطابق ہے جسے اکثر مترجمین نے اختیار کیا ہے [3] مگر ایک معنی اس لفظ کے سواری کے منہ میں لگا دینے کے ہیں [4] بعض نے اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ [5]

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾

''اور ورغلا اُن میں سے جس پر تیرا قابو چلے اپنی آواز سے اور بزن بول ان پر اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ اور حصہ دار ہو جا اُن کے ساتھ ان کے مال اور اولاد میں اور اُنہیں سبز باغ دکھا اور انہیں شیطان سبز باغ نہیں دکھاتا مگر دھوکے اور فریب کے طور پر، بلا شبہ میرے جو خاص بندے ہیں، تجھے ان پر کوئی دسترس نہیں ہوگا اور تیرے پروردگار سے بڑھ کر کون کارساز ہوگا''۔

''ورغلا'' اور ''بزن بول'' اور حصہ دار ہو جا یہ صیغے امر کے ہیں جس کے معنی حکم کے ہوتے ہیں، مگر نوعیت اس کی اس محل پر زجر و توبیخ کی ہے جس کا نتیجہ بعد کو بتایا گیا ہے یعنی لاکھ تو یہ سب کچھ کرے مگر میرے جو خاص بندے ہیں وہ تیرے کہنے میں کبھی نہیں آئیں گے۔ شیطان کے جواب میں خالق کا حتمی اعلان جو قرآن میں متعدد جگہ ہے، نوع انسانی میں ہر دور میں کچھ معصوم ہستیوں کے وجود کا قطعی ثبوت ہے۔

''بزن بول'' جو ہم نے ترجمہ کیا ہے، یہ اجلب علیہم کے ایک لغوی معنی کے اعتبار سے ہے [6] اور ایک دوسرے معنی اس لفظ کے ہیں، اس کے لحاظ سے بامحاورہ ترجمہ یہ ہوگا کہ ہلا بول دے ان پر [7]۔

---

[1] ۔نصب ینزع الخافض ای من طین (جلالین)

[2] ۔الکاف فی قولہ: ارایتك لا موضع لها من الاعراب لانّها ذکرت فی الخاطبة توکیدا و هٰذا نصب بارایتك (تبیان)

[3] ۔از بیخ بر کنم (شاہ ولی اللہ) ہلاک کروں گا (رفیع الدین)

[4] ۔قیل انّه من قولهم حنك الدابّة بحنكها اذا جعل فی حنكها الاسفل حبلا یقودها به (مجمع البیان)

[5] ۔یعنی اپنا مسخر کروں جیسے گھوڑے کا لگام دیا (موضح القرآن)

[6] ۔اصل الجلبة شدّة الصوت (تبیان) آواز بکن بر هلاك ایشان (شاہ ولی اللہ)

[7] ۔ای اجمع علیهم ما قدرت علیه (مجمع البیان) کھینچ لا اوپر ان کے (شاہ رفیع الدین)

رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا ﴿۶۶﴾ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾

''تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لئے کشتیوں کو سمندر میں رواں کرتا ہے تا کہ تم اس کے فضل و کرم سے کسب معاش کرو، یقیناً وہ تم پر بڑا مہربان ہے اور جب تمہیں سمندر میں سختی پڑتی ہے تو اس کے سوا جس جس کو پکارتے ہو، سب غائب ہو جاتے ہیں مگر جب وہ تمہیں چھٹکارا دے کر خشکی میں پہنچا تا ہے تو تم روگردانی کرتے وہ اور انسان بڑا ناشکرا ہے''۔

چونکہ قدیم زمانہ میں سمندر کا سفر عموماً بسلسلہ تجارت ہوتا تھا اور اسی لئے بادِ موافق کو تجارتی ہوا سے تعبیر کیا جاتا تھا اسی لئے قرآن مجید میں بھی اکثر جگہ کشتیوں کے ذکر کے ساتھ معاشی منفعت کو نمایاں کیا گیا ہے۔

کشتیوں کو وہ رواں کرتا ہے یعنی اگر ہوا موافق ہی نہ ہو تو تم کشتی کیوں کر چلاؤ اور ہوا اس کے قبضہ میں ہے اس لئے روانی کشتی کی اس کی کارفرمائی سے وابستہ ہے۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِیْلًا ﴿۶۸﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَكُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰی فَیُرْسِلَ عَلَیْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا ﴿۶۹﴾

''تو کیا تم بے کھٹکے ہو اس سے کہ کہیں وہ خشکی ہی میں تمہیں دھنسا نہ دے یا تم پر کوئی آندھی بھیج دے، پھر تم کوئی محافظ اپنے لئے نہ پاؤ، کیا تم اس سے بے کھٹکے ہو کہ وہ دوبارہ تم کو اسی (دریا) میں پلٹائے اور اس کے بعد ایک تیز جھکڑ کی ہوا تم پر بھیج دے اور اس ناشکرے پن کے عوض میں تمہیں ڈبو دے، پھر تم اپنے لئے ہم سے اس سبب سے کوئی باز پرس کرنے والا[1] نہیں پاؤ گے''۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ﴿۷۰﴾

''اور ضرور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے اور انہیں خشکی اور تری کے لئے سواریاں دیں اور انہیں اچھی اچھی

---

[1] ۔ای من یتبع اھلاککم للمطالبۃ بدھائکم او یاخذ ثبارکم (تبیان)

غذاؤں سے روزی دی اور اپنی بہت سی مخلوقات سے زیادہ انہیں عطا کیا''۔

آیت کے آخری جملہ سے انسان کا اشرف المخلوقات ہونا برقرار رہتا ہے یا نہیں؟ مترجمین نے عموماً جو ترجمہ کیا ہے ''بہت سوں پر فضیلت دی ہے'' اس سے عمومی افضلیت قائم نہیں رہتی بلکہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ ایسے ہیں جن پر فضیلت نہیں ہے، جلالین نے لکھا ہے:

کثیر ممن خلقنا کالبھم والوحوش۔

بہت سے اپنے مخلوقات پر جیسے چوپائے اور وحشی جانور۔

مگر اس کے بعد لکھ دیا ہے: و تشمل الملائکۃ اس میں ملائکہ بھی داخل ہیں یہ سمجھ میں نہیں آیا وہاں جب عموم ہے ہی نہیں تو شمول کیسا؟

جناب شیخ الطائفہ کے نکتہ رس ذہن نے اس مشکل کو حل کیا ہے اور اسی کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے وہ حل یہ ہے کہ اس آیت میں فضیلت بحیثیت درجہ و مرتبہ کا ذکر ہے ہی نہیں بلکہ اللہ کی نعمتوں کا ذکر ہے اور وہ انسان کو اتنی ملی ہیں جتنی زیادہ تر مخلوقات کو نہیں ملی ہیں اور اس کی نظیر پہلے پارہ میں آچکی ہے جب بنی اسرائیل کے لئے فضلنا کا لفظ صرف کیا گیا ہے اور اس میں صرف نعمتوں کا زیادہ عطا ہونا مراد ہے جو بغرض امتحان بھی ہوسکتا ہے نہ کہ مرتبہ میں بلند ہونا تو یہی فضلنا کے معنی یہاں بھی ہیں۔

رہ گیا انسان کا اشرف المخلوقات ہونا تو وہ خود اس آیت کے پہلے جملہ سے ثابت ہے کہ لقد کرمنا بنی آدم ہم نے بنی آدم کو عزت عطا کی جس میں اسکے مقابل کی کسی نوع کا استثناء نہیں ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ کرامت و بزرگی میں کوئی اس کا مدمقابل نہیں ہے۔[1]

اس کے علاوہ: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ہم نے انسان کو بہترین درستی کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کی تخلیق کے ذکر کے بعد اپنے کو احسن الخالقین کہنا یہ تمام چیزیں قطعی طور پر اس کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہیں۔

یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۷۱﴾ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِیْلًا ﴿۷۲﴾

''جس دن ہم ہر دور کے لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے تو جسے نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو یہ لوگ (اطمینان کے ساتھ) اپنے نامہ عمل کو پڑھیں گے اور ذرہ بھر بھی ان پر زیادتی نہ ہوگی اور جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں اندھا اور زیادہ کھویا ہوا ہوگا''۔

ہر دور کے لئے ایک امام کا وجود

---

[1] ۔ کرمنا بنی اٰدم ای فضلنا ھم عن ابن عباس و اجویت الصنقہ علیٰ جمیعھم من اجل من کان فیھم علی ھٰذا الصفۃ کقولہ: کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (مجمع البیان)

مفسرین اہل سنت نے امام کے لفظ کو حق اور ناحق دونوں طرح کے اماموں کے معنی میں لیا ہے، اس لئے یہ ترجمہ کیا ہے کہ:

بخوانیم ہر فرقہ را با پیشوائے ایشاں (شاہ ولی اللّٰہ)

بلاویں گے ہم سب لوگوں کو ساتھی پیشواؤں ان کے کے (شاہ رفیع الدین)

ہمارے نزدیک جس طرح نبی کا لفظ جب بلا قرینہ بولا جائے تو اس میں جھوٹے مدعیان نبوت داخل نہیں ہوتے، اسی طرح امام کا لفظ بھی بلا قرینہ امام حق پر ہی صادق آسکتا ہے اور اس لئے یہ آیت ہر دور میں ایک امام کے موجود ہونے کی دلیل ہے جس پر اصلی اور نقلی دلائل دوسرے بھی ہیں اور ان دلائل میں سے ایک یہ آیت بھی ہوگی جس کی تائید میں امام رضاؑ کی مستند حدیث بھی ہے۔[1]

جلالین نے ندعوا لفظ کے معنی ہی بدل دیے ہیں اور جو تفسیر کی ہے، اس کی بنا پر یہ ترجمہ ہوتا ہے کہ ہم ہر جماعت کو اس کے امام کی طرف منسوب کر کے پکاریں گے اور امام کی تفسیر نبی کے ساتھ کی ہے لکھا ہے:

باما مھم نبیھم فیقال یا امۃ فلان: ان کے امام کے ساتھ یعنی ان کے نبی کے ساتھ تو کہا جائے گا اے فلاں کی امت۔

اور پھر دوسرے معنی امام کے لکھے ہیں:

اوبکتاب اعمالھم فیقال یا صاحب الخیر یا صاحب الشر: یا ان کے اعمال کے نوشتہ کے ساتھ تو کہا جائے گا اے نیک اعمال والے یا اے برے اعمال والے۔

حالانکہ امام کے معنی جو یا متبادل ہیں وہ تو پیشوا ہی کے ہیں۔ یہ نامہ اعمال کو امام قرار دینا تو بالکل ہی خلاف تبادر ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـــًٔا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

''اور بلاشبہ وہ اس منزل سے قریب معلوم ہوتے تھے کہ آپ کو بہلا پھسلا کر الگ کر دیں اس سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے کہ آپ اس کے خلاف باتیں ہمارے سر منڈھ دیں اور اس وقت وہ آپ کو دوست جانی بنالیں اور اگر ہم آپ کو ثبات قدم عطا نہ کرتے تو نزدیک ہوتا کہ آپ ان کی طرف تھوڑا سا جھک جائیں اس وقت ہم آپ کو دونا دوں سختیوں میں مبتلا کرتے زندگی کی بھی اور دونا دوں سختیوں میں موت کی بھی، پھر آپ اپنے لئے ہمارے سامنے کوئی مددگار نہ پاتے''۔

پہلی جگہ نزدیک ہونے کی نسبت مشرکین کی طرف ہے، رسولؐ کی طرف نہیں یعنی کوششیں انہوں نے ہر ہر دفعہ ایسی کی تھیں کہ وہ اس

---

[1] ۔عن الرضا علی بن موسیٰ بالا سانید الصحیۃ انہ روی عن اٰباءہ عن النبی ﷺ انہ قال فیہ یدعیٰ کل الناس بامام زمانھم و کتاب و بھم والسنۃ نبیھم (مجمع البیان)

منزل سے قریب معلوم ہوتے تھے اس کے بعد پیغمبرؐ کے ان کوششوں سے جہاں تک متاثر ہونے کا تعلق ہے اسے فرض محال کے طور پر کہا ہے کہ اگر توفیق ربانی آپ کے شامل حال نہ ہوتی تو نزدیک ہوتا کہ آپ بھی ان کی طرف جھک جائیں یعنی وہ کوششیں اتنی زبردست تھیں کہ ایک عام بشر کا ان سے کچھ متاثر ہونا لایعنی تھا مگر آپ تو عام بشر کے درجہ سے بالاتر ہیں اور لطف وخاص ربانی آپ کے شامل حال ہے، اس لئے آپ ان کوششوں سے متاثر نہیں ہوسکتے۔ یہاں جلالین نے بھی حقیقت پسندی سے کام لیا ہے چنانچہ لکھا ہے:

لولا ان ثبتناك على الحق بالعصمة لقد كدت قاربت تركن تحليل اليهم شيئا ركونا قليلا لشدة احتيالهم الحاحهم وهو صريح فى انّه لم يركن ولا قارب (جلالين)

اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے حق پر عصمت کے ذریعے سے تو قریب ہوتا۔ کہ آپ مائل ہوجائیں ان کی طرف ذرا سا کیونکہ ان کی حیلہ گری اور ضد اتنی سخت تھی، اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نہ جھکے اور نہ قریب تھا کہ آپ جھکیں۔

قرآن مجید کی اس طرح کی آیات ان علماء کے قول کی تائید کرتی ہیں جو عصمت کو خداوند عالم کا لطف خاص قرار دیتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کردار میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارادہ واختیار کا دخل نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عصمت کے مقابلہ میں جو تاریک پہلو ہیں ان میں ایک گناہ ہے۔ یہ ارادۃ عدول حکمی اور مخالفت قانون ربانی کا نام ہے۔ اور دوسرے سہو ونسیان اور خطا ہیں جو بصورت وقوع غیر ارادی چیز ہوتے ہیں عصمت ان سب باتوں سے بری ہوتی ہے اب جہاں فعل ارادی ہوتا ہے وہاں ترک بھی ارادی ہوگا۔ اور وہ رسولؐ کا اختیاری کارنامہ ہوگا اور جہاں فعل بصورت وقوع غیر اختیار ہوگا وہاں ترک ارادہ نہیں ہوسکتا۔ وہ لطف خاص ربانی کا نتیجہ ہوگا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید نے جہاں جہاں پیغمبرؐ کے حسن کردار کو لطف ربانی کا نتیجہ قرار دیا ہے وہ سب اس قسم کی غلطیوں سے بچنا ہے اور اس لئے یہاں بھی دیکھئے کہ لطف ربانی نہ ہونے کی صورت میں یہ کہا گیا کہ آپ ان کی طرف تھوڑا سا مائل ہوجاتے۔ یہ ''تھوڑا سا'' آخر کیوں؟ پورے طور پر کیوں نہیں، ہم تو اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ لطف خاص بھی نہ ہوتا، تب بھی جہاں تک ارادی حیثیت کا تعلق ہے آپ ان کے ہم نوا پھر بھی نہیں ہوسکتے تھے مگر انکے فریبوں سے متاثر ہوکر دھوکا کھا کر غیر ارادی طور پر کچھ ان سے متاثر ہوجاتے اور یہی وہ چیز ہے جس سے بچانا لطف خاص کا کام ہے اور اس کے ضعف الحیوٰۃ و ضعف المماٰۃ سے عذاب کے معنی کا پیدا کرنا غلط ہے۔ اگر عذاب ہوتا تو زیادہ موزوں ہوتا کہ حیات اور ممات کے بجائے دنیا اور آخرت ہوتا۔ آخرت موت تھوڑی ہے، وہ تو موت کے بعد کی منزل ہے اس لئے ضعف الحیوٰۃ و ضعف المماٰۃ سے مراد ہم غلط روی کے وہ نتائج سمجھتے ہیں جو قہراً ایک غلط کام پر مرتب ہوتے ہیں اور وہ ارادہ واختیار سے وابستہ نہیں ہوتے۔

یہاں آکر جلالین ٹھوکر کھا گئے جو انہوں نے لکھ دیا:

ضعف عذاب الحيوٰة و ضعف عذاب الممات اى مثل ما يعذّب غيرك فى الدّنيا والاٰخرة.

زندگی کے عذاب کا دونا اور موت کے عذاب کا دونا یعنی جتنا آپ کے سوا دوسرے کو عذاب ہو اس کا دونا دنیا اور آخرت دونوں میں۔

ہم بتا چکے ہیں کہ یہاں نہ عذاب کا ذکر ہے اور نہ دنیا وآخرت کا نام ہے اس لئے یہ تشریح حقیقت سے دور ہے۔

افسوس یہ ہے کہ چونکہ ان آیات کے بارے میں حدیث معصومؑ کو دستیاب نہیں ہوئی، اس لئے ہمارے مفسرین نے بھی جیسے علامہ طبری، وغیرہ بس جمہوری مفسرین کے اقوال نقل کرنے پر اکتفا کی جو ایسے مقامات پر عموماً حقیقت سے دور ہوتے ہیں اور خود ان پر کوئی نقد و تبصرہ نہیں فرمایا سوا حَبر الامۃ جناب ابن عباسؓ کے ایک قول کو نقل کرنے کی جو کافی قیمت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ:

رسول اللہ معصوم و مھکن ھذا تخویف الامۃ لئلا یر کن احد من المومنین الیٰ احد من المشر کین فی شی ء من احکام اللہ و شر ائعہ (مجمع البیان)

پیغمبرؐ خدا تو معصوم ہیں مگر یہ خوف دلانا ہے آپ کی امت کو کہ اہل ایمان میں سے کوئی شخص مشرکین میں سے کسی کی طرف نہ جھکے خالق کے احکام و قوانین کسی جزء میں بھی۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ﴿۷۷﴾

''اور بلاشبہ وہ نزدیک تھے اس سے آپ کو متزلزل کر دیں اس سرزمین سے کہ نکال دیں آپ کو اس میں سے، اس صورت میں وہ نہ رہتے آپ کی بعد مگر بہت کم اس طریقہ کے مطابق جو رہا آپ کے پہلے والے رسولوں کے بارے میں اور آپ نہ پائیے گا ہمارے طریقہ کار میں تبدیلی''۔

الارض سے کون سرزمین مراد ہے؟ اس میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے بعض نے مکہ مراد لیا ہے یعنی ان کا منصوبہ یہ تھا کہ آپ کو یہاں سے جلاوطن کر دیں اور کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت کی نازل شدہ ہے جب ابھی ان کا بس ارادہ ہی تھا انہوں نے جلاوطن کرنے کا سامان نہیں کیا تھا اور پھر جو کہا گیا ہے کہ وہ آپ کے بعد رہیں گے یعنی وہ سب مبتلائے عذاب ہوں گے اور ختم کر دیئے جائیں گے چنانچہ یہ بات جنگ بدر میں وقوع میں آئی کہ وہ سب قتل ہوئے اور بعض مفسرین آیت کو بعد ہجرت کا نازل شدہ قرار دیتے ہیں اور اس صورت میں الارض سے مراد مدینہ ہے [1] اور منصوبہ بنانے والے اس وقت کے یہودی ہیں جنہوں نے مدینہ میں ہر طرح حضرتؐ کے خلاف منصوبہ سازی کی کہ آپ یہاں نہ رہ سکیں۔

ایک تیسرا قول یہ ہے کہ اس سرزمین سے مراد مکہ ہے اور ان کا پہلا منصوبہ تھا کہ وہ آپ کو مکہ سے باہر نکال دیں جو عمل میں نہیں آیا بعد میں انہوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر کے آپ کو وہیں قتل کرنا چاہا جس پر آپ کو ہجرت کا حکم ہوا [2] مگر حقیقت امر یہ ہے کہ ہجرت کا منصوبہ مدینہ منورہ کے لوگوں کی دعوت پر طے پا گیا تھا اور اس غرض سے کہ آپ مدینہ پہنچنے نہ پائیں تا کہ آپ کی جان لینے کا منصوبہ بنا کر گھر کا محاصرہ کر لیا

---

[1] ۔ الارض ارض المدینۃ (جلالین)

[2] ۔ الصحیح ان المعنین فی الآیۃ مشر کوا مکۃ و انھم لم یخرجوھن مکۃ ولکنھم ھموا باخراجہ ثم خرج لما امر بالھجرۃ اخرجوا لا ستو صلوا بالعذاب (مجمع البیان)

جائے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾

''نماز برپا کرو زوال آفتاب سے [۱] رات ڈھلنے تک [۲] اور صبح کو پڑھئے [۳] یقیناً صبح کا پڑھنا وہ موقع ہے کہ جب مشاہدہ کرنے والوں کی حضوری ہوتی ہے''۔ [۴]

اوقاتِ نماز

اس آیت میں نماز فریضہ کے اوقات بیان کئے گئے ہیں جس میں الگ الگ صرف دو وقت نظر آتے ہیں، ایک زوال آفتاب سے رات ڈھلنے یعنی نصف شب تک اور دوسرا اس سے الگ نماز صبح کا وقت حالانکہ نماز کے اوقات پانچ ہیں۔

ہمارے نزدیک قرآن مجید کی یہ آیت صاف صاف فقہ امامیہ کے مسئلہ پر منطبق ہے فقہ امامیہ کی رو سے صرف نماز صبح کا وہ وقت ہے جس کے پہلے اور بعد کسی نماز فریضہ کا وقت نہیں ہے اس لئے اس نماز کو الگ کر کے ذکر کرنا ضروری تھا اس کے علاوہ جتنی نمازیں ہیں وہ زوال آفتاب کے بعد سے نصف شب تک ہیں [۵] اس طرح کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں کسی نہ کسی نماز کا وقت نہ ہو۔ بے شک وہ چار نمازوں پر تقسیم ہے یوں کہ زوال سے غروب آفتاب تک ظہر اور عصر دونوں نمازوں کا وقت ہے ترتیب کے ساتھ کہ پہلے ظہر پڑھنا لازم ہے اور اس کے بعد عصر اور اس بنا پر عقلی طور سے زوال کے بعد شروع کی چار رکعت کا وقت ظہر سے مخصوص ہو گیا ہے اور آخر کی چار رکعتوں کا وقت عصر سے مخصوص ہو گیا ہے باقی درمیان کا پورا وقت۔ دونوں نمازوں میں مشترک ہے اور پھر غروب سے نصف شب تک مغرب وعشاء کا وقت ہے جس میں اسی طرح ترتیب چونکہ لازم ہے اس لئے عقلی طور پر شروع کا وقت مغرب سے مخصوص ہوا اور آخر کا عشاء سے مخصوص ہو گیا بیچ کا وقت مشترک ہے جس میں مغرب بھی ہو سکتی ہے اور عشاء بھی۔ اس طرح زوال سے لے کر نصف شب تک پورا چار نمازوں کا وقت ہے جس کا قرآن مجید نے ایک ساتھ ذکر کیا ہے اور یہ کہ کس نماز کا کون سا وقت ہے اسے مجمل چھوڑ دیا ہے جس کی تشریح سنت نبوی واحادیث معصومین علیہم السلام سے ہو گئی اور صبح کی نماز کا جو اس سلسلہ سے جدا تھی الگ ذکر کیا ہے۔ [۶]

---

[۱] ۔وقت زوال آفتاب (شاہ ولی اللہ) وھو المروی عن ابی جعفر وابی عبداللہ رضی اللہ عنہما (تبیان)

[۲] ۔غسق اللیل انتصافہ (علی بن ابراھیم)

[۳] ۔صلوٰۃ الصبح (جلالین)

[۴] ۔تشھدہ ملائکۃ اللیل وملائکۃ النھار (علی بن ابراھیم) حاضر می شوند فرشتگان (شاہ ولی اللہ)

[۵] ۔ای الظھر والعصر والمغرب والعشاء (جلالین)

[۶] ۔لزوالھا صلوٰۃ الظھر وصلوٰۃ العصر والیٰ غسق اللیل صلوٰۃ المغرب والعشاء الاخرۃ ثم صلوٰۃ الفجر فی فردت بالذکر (تبیان)

یہ فقہ امامیہ کا مسلک ہے جو قرآن کی اس آیت سے صاف نمودار ہے [1] لیکن سواد اعظم کے نقطہ نظر سے ہر نماز کے بعد ایک وقفہ ہے جس میں دوسری نماز کا وقت داخل نہیں ہوتا یعنی ظہر اور عصر کے بیچ میں ایک وقفہ ہے مغرب اور عشاء کے بیچ میں ایک وقفہ ہے اس لحاظ سے قرآن کے لئے ضروری تھا کہ جیسے صبح کی نماز الگ کر کے ذکر کیا گیا ہے ویسے ہی تمام نمازوں کا وقت الگ الگ بیان کرے مثلاً یہ کہ نماز قائم کرو زوال آفتاب کے وقت، پھر آفتاب کی کرنیں زرد ہونے کے وقت، پھر سورج غروب ہونے کے وقت، پھر مغرب کی طرف کی سرخی دور ہونے کے بعد۔ اس طرح پانچ وقت بیان ہوتے یا پھر مجملاً کہ دیا جاتا کہ شب و روز میں پانچ نمازیں ہیں لیکن صبح کی نماز کو الگ نام لے کر کہنا اور پھر زوال سے لے کر نصف شب تک الگ کہنا فقہ اہل سنت کے لحاظ سے کسی طرح نہیں بنتا اور صرف فقہ امامیہ ہے جس کے لحاظ سے صحیح و مناسب قرار پاتا ہے جو درحقیقت فقہ اسلامی کی حقیقی تعلیم ہے اور اہل بیت معصومین علیہم السلام نے اس کی ترجمانی فرمائی ہے۔

آخر آیت میں نماز صبح کے لئے خاص طور پر یہ ارشاد کہ:

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا

یقیناً صبح کا پڑھنا وہ موقعہ ہے کہ جب مشاہدہ کرنے والوں کی حاضری ہوتی ہے صرف تمام نماز ہائے پنج گانہ نماز صبح کے بروقت ادا کرنے کی تاکید و اہتمام کا مظہر ہے کہ اس میں عبودت اور ذوق عبادت کی آزمائش زیادہ ہے اور اسی لے بہت سے پابند نماز بھی نماز صبح کے وقت سوتے اور بعد میں قضا پڑھتے نظر آتے ہیں جو بر بنائے کرم خالق کی جانب سے معاف سہی مگر ذوق عبودیت کے نقص کا ثبوت ضرور ہے۔

مفسرین نے کان مشہودا کی تشریح یہ کی ہے کہ اس وقت پر رات والے فرشتے اور دن والے فرشتے دونوں یکجا ہوتے اور بندہ الٰہی کے ادائے فرض اور مظاہرہ عبودت کے گواہ بنتے ہیں۔ اس کے لئے صحیح بخاری کی حدیث میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہوا ہے کہ:

یجتمع ملائکة والنهار فی صلوٰة الفجر۔

صبح کی نماز کے وقت شب و روز کے فرشتے اکٹھا ہوتے ہیں۔

اسے ہمارے بعض علماء نے بھی نقل کیا ہے۔ [2]

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿٧٩﴾
وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ
لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿٨٠﴾ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ

---

[1] ۔یزید ذلك ما رواه العیاشی بالا سناد عن عبید بن زرارة عن ابی عبدالله فی هٰذه الآیة قال: ان الله افترض اربع صلوات اول وقتها من زوال الشمس الیٰ انتصاب اللیل منها صلوٰة تان اول وقتها من عند زوال الشمس الیٰ غروبها الا ان هٰذه قبل هٰذه و منها صلوتان اول وقتها من عند زوال الشمس الیٰ غروبها الّا انّ هٰذه قبل هٰذه و منها صلوتان اول وقتها من غروب الشمس الیٰ انتصاف اللیل الا ان هٰذه قبل هٰذه (مجمع البیان)

[2] ۔اورده البخاری فی الصحیح (مجمع البیان)

زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

''اور رات کے کچھ حصہ میں آپ نماز تہجد پڑھئے۔ جو آپ کے لئے ایک اضافہ ہے نزدیک ہے کہ آپ کو آپ کا پروردگار ایک قابل تعریف موقف پر کھڑا کرے اور کہیے کہ اے میرے پروردگار! میرا داخلہ کر سچائی کا داخلہ اور نکال بھی مجھے سچائی کے ساتھ اور میرے لئے قرار دے اپنی جانب سے ایسی قوت جو سہارا دینے والی ہے اور کہیے کہ حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ یقیناً باطل تو مٹنے والا ہی ہے''۔

بہت سے دوسرے مفسرین کی طرح ہمارا تصور یہ نہیں ہے کہ جہاں بھی واحد مذکر حاضر کا تخاطب ہو وہاں ہم مخاطب خاص رسولؐ کو قرار دیں بلکہ اکثر جگہ ہم اس خطاب کا مخاطب عام سمجھتے ہیں یعنی کوئی بھی جو سنے وہ اس کا مخاطب ہوسکتا ہے مثلاً: الم تر کیف فعل ربك باصحاب الفیل کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا؟ ارءیت الذی یکذب بالدین کیا تم نے دیکھا اسے جو روز قیامت کو جھٹلاتا ہے قل ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین تمہارا قول یہ ہو کہ میری نماز اور میری تمام عبادتیں اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے سبح اسم ربك الاعلیٰ تسبیح کرو اپنے پروردگار کے نام کی جو بلند و برتر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مقامات پر ہم یہ درست نہیں سمجھتے کہ ترجمہ میں بریکٹ کے اندر اے رسول! کا اضافہ کیا جائے اور ہم ایسے مقامات پر ترجمہ ''تم'' ''تم'' کے تخاطب کے ساتھ کرتے ہیں اور یہ اس کی علامت ہے کہ ہم وہاں مخاطب عام سمجھتے ہیں خاص رسولؐ کو مخاطب نہیں سمجھتے مگر بعض مقامات قرآن مجید میں اس واحد حاضر کے لفظ کے ساتھ تخاطب کے ایسے ہوتے ہیں جن کا مضمون پتہ دیتا ہے کہ یہاں ذاتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب ہیں جیسے: الم نشرح لك صدرك ووضعنا عنك وزرك الذی انقض ظهرك و رفعنا لك ذكرك کیا ہم نے آپ کے سینہ کو کشادہ نہیں کیا اور آپ سے اس بوجھ کو نہیں اتارا جو آپ کی پشت کو توڑے جا رہا تھا۔ اور کیا ہم نے آپ کے ذکر کو اونچا نہیں کیا؟ ما ودعك ربك وما قلیٰ نہ آپ کو آپ کے پروردگار نے چھوڑا ہے اور نہ وہ آپ سے ناراض ہے انك لمن المرسلین بلاشبہ آپ ضرور پیغمبروں میں سے ہیں قد نریٰ تقلب وجهك فی السمآء ہم آپ کے چہرے کی گردش کو آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ایسے مقامات پر ضمیر مخاطب کے ترجمہ میں اپنے دور کے معیار تہذیب کے مطابق آپ کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔

اس کے پہلے کی آیت اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ کا ترجمہ میں نے کیا نماز برپا کرو زوال آفتاب سے نصف شب تک اس لئے کہ وہ احکام رسولؐ سے مخصوص نہیں ہیں یہاں اس آیت میں بھی اگر فقط ومن الیل فتهجد به ہوتا تو ہم اسکو عام حکم سمجھتے کہ رات کے کچھ حصہ میں نماز تہجد ادا کرو مگر یہاں آخر میں عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا امید ہے کہ آپ کو آپ کا پروردگار ایک قابل تعریف موقف پر کھڑا کرے گا۔ اور مقام محمود کی تفسیر مقامات شفاعت سے ہوئی ہے [1] یہ جز ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم اس کا مخاطب رسول اللہؐ کو مانیں اور اس لئے اس آیت کے ترجمہ میں میں نے آپ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اگر یہ آخر کا رجملہ نہ ہوتا تو نماز تہجد کے ساتھ اس فقرہ کا کہ ''نافلة لك'' یہ مطلب ہوسکتا تھا کہ وہ نمازیں جن کا پہلے حکم تھا کہ زوال آفتاب سے نصف شب تک اور پھر صبح کر برپا کرو، وہ تو نماز ہائے فریضہ ہیں اور یہ نماز تہجد فرض نہیں ہے بلکہ نفل ہے کہ اس کا ترک کرنا باعث

---

[1] ۔شفاعت (فتح الرحمن) اجمع المفسرون علی انّ المقام المحمود هو مقام الشّفاعة (مجمع البیان)

عذاب اُخروی نہیں ہے لیکن جب مخاطب رسولؐ کی ذات ہوگئی تو اب نافلة لك کے یہ معنی ہوگئے کہ اور سب نمازیں تو آپ کے علاوہ اور تمام مسلمانوں پر بھی فرض ہیں لیکن یہ نماز تہجد اور مسلمانوں کے لئے مستحب ہے اور آپ کے لئے خصوصی طور پر یہ مزید اضافہ ہے کہ آپ کو اس سے بھی ضرور انجام دینا ہے اور ترک نہیں کرنا ہے [1] اور یہ رہ نمایان دنیا سے خالق کی طرف کے باعظمت رہنما کا امتیاز ہے کہ دوسرے بڑے افراد اپنے لئے مراعات زیادہ قرار دیتے ہیں اور رسولؐ اسلام وہ ہیں جن کا حصہ فرائض میں اور ذمہ داریوں میں دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے چنانچہ نماز شب دوسروں کے لئے سنت ہے اور پیغمبرؐ کے لئے یہ بھی ایک فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے جسے آپ ترک نہیں فرماتے تھے۔

اس انتباہ کے ساتھ کہ یہ آپ پر ایک مزید فریضہ ہے پھر یہ کہ نزدیک ہے کہ آپ کو آپ کا پروردگار ایک قابل تعریف موقف پر کھڑا کرے یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ''جن کے رتبے ہیں سوا، ان کو سوا مشکل ہے''۔ یعنی چونکہ آپ کو اللہ کی طرف سے شفاعت کا بلند مرتبہ ملنے والا ہے، اس لئے آپ کے عمل کا معیار دوسروں سے بلند ہونا چاہیے۔

اس کے بعد کی آیات چونکہ انداز کلام یعنی عنوان تخاطب میں ان دونوں آیات سے متحد ہیں، اس لئے وہ ایک ڈال معلوم ہوتی ہیں اور ہم نے بھی ان کا ترجمہ ایک ساتھ کیا ہے اور اگر تفاسیر کو سامنے نہ رکھا جائے تو ہم کہیں کہ وہ سب ایک ہی موقع یعنی فتح مکہ کے قبل کی نازل شدہ ہیں اور داخلہ سے مراد مکہ میں داخلہ ہے اور نکلنے سے مراد فتح کے بعد وہیں سے مدینہ کی طرف واپسی کے لئے نکلنا ہے اور حق کے آنے اور باطل کے مٹنے کا اعلان بھی اسی فتح کا نتیجہ ہے مگر کیا کیا جائے کہ وہ جو ترتیب قرآن کے مطابق منشاء قدرت ہونے کے بڑے منادی ہیں ان آیات کو شان نزول کے اعتبار سے اتنا پشیمان و پریشان کر رہے ہیں کہ ان میں آپس میں بڑا فاصلہ ہوتا ہے چنانچہ رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ کو جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے میرا داخلہ کر سچائی کا داخلہ اور نکال بھی سچائی کے ساتھ اسے کہتے ہیں کہ یہ ہجرت کے موقع پر مکہ سے نکلنا اور مدینہ میں داخل ہونا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ آیت مکی ہے اور ہجرت سے قبل کی ہے [2] حالانکہ ذوق سلیم کا فیصلہ ہے کہ اس صورت میں اخرجنی پہلے ہوتا اور ادخلنی بعد کو ہوتا پھر اس کے بعد کی آیت: وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کو کہتے ہیں کہ وہ فتح مکہ سے متعلق ہے۔ [3]

علامہ طبرسیؒ نے بس چار قول بلا تبصرہ نقل کر دیئے ہیں جو کسی نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتے۔

بیچ کا فقرہ:

وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا

اس کا ترجمہ شاہ ولی اللہ یہ کرتے ہیں کہ:

ساز برای من از نزدیک خود قوتی یاری دہندہ

بنا میرے لئے اپنی طرف سے ایک طاقت مدد کرنے والی

اب اگر یہ طاقت کسی ایسی شخصیت کے لباس میں نمایاں ہو جو رسولؐ کی نصرت میں ہر جگہ اس طرح کا کارنمایاں انجام دے کہ فرشتہ سے

---

[1] ۔روی انّها فرضت علیه ولم تفرض علی غیره و کانت فضیلة له (تبیان)

[2] ۔ادخلنی المدینة (جلالین)

[3] ۔و قل عند دخول مکّة (جلالین)

لافتی الاعلی کا کلمہ پڑھوالے تو اس روایت کو بالکل درست ماننا چاہیے جو بتاتی ہے کہ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا سے مراد یہی شخصیت ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دعائے رسولؐ کی قبولیت اس شخص میں نمایاں ہوئی۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

''اور ہم اتارتے ہیں اس قرآن کو جو شفا[1] اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لئے اور ظالموں کے لئے اضافہ نہیں کرتا مگر خسارے میں''۔

وہ شفا اور رحمت سب کے لئے ہوسکتا ہے مگر اس وقت جب وہ اس سے نیک نیتی کے ساتھ یہ فوائد حاصل کرنا چاہیں لیکن جو اسے فائدہ اٹھانے کے لئے پڑھتے اور سنتے ہی نہیں بلکہ صرف نکتہ چینی کرنا ان کا مقصد ہے اور اسی لئے انہیں ظالم کہا گیا ہے کہ وہ اپنے سوء اختیار سے اس کے فوائد سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے کفر وعناد میں اور اضافہ ہی ہوتا ہے جو دین و دنیا میں ان کی تباہی کا سبب ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ ان کے لئے تو اور وہ خسارے ہی کا باعث ہوتا ہے[2] اور اسی لئے سورہ بقرہ کے شروع میں اسے کہا گیا ہے کہ ھدی للمتقین وہ فکر نجات رکھنے والوں کے لئے باعث ہدایت ہے اور وہاں اس کی تشریح کی جا چکی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے فائدہ یہی لوگ اٹھاتے ہیں''۔ دوسرے اس سے باختیار خود محروم رہتے ہیں جس میں اس کا کوئی قصور نہیں خود ان کی تقصیر ہے۔ دوسرا رخ اس کا اور ہے کہ قرآن کی آیات ان کے غلط منصوبوں کی پردہ دری کر کے انہیں رسوا کرتی ہیں۔ اس طرح انہیں خسارہ ہوتا ہے۔[3]

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾

''اور جب ہم انسان کو نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ روگردانی اختیار کرتا اور پہلو تہی کرتا ہے اور جب اس کے لئے کوئی خرابی ہوتی ہے تو بے آس ہو جاتا ہے کہ دیجئے کہ ہر ایک اپنے طریقہ پر کام کرتا ہے تو تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ کون زیادہ درست راستے پر چلنے والا ہے''۔

پہلا کردار ان انسانوں کا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے اس کے بعد خود سے ذہن میں صاحب ان ایمان کا کردار آجاتا ہے کہ جب وہ نعمت ملتی ہے تو شکر الٰہی ادا کرتے ہیں اور جب مصیبت آتی ہے تو بھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ اللہ کی طرف سے کشائش کے امیدوار رہتے ہیں اس

---

[1] ۔من البیان (جلالین)

[2] ۔لا یزوا دون من عندہ الا خسارا یخسر ثوابھم ویستحقون العقاب لکفرھم بہ وحرمان انفسھم تلك المنافع التی فیہ (تبیان)

[3] ۔یحتمل ان یرید ان القرآن یظھر خبث سرائرھم ومأیاتمرون بہ من الکید والمکر بالنبی فیفتضھون بذٰلك (مجمع البیان)

کے بعد یہ فقرہ آیت کا چسپاں ہوتا ہے کہ ہر ایک اپنے طریقہ پر کام کرتا ہے یعنی کافر کا رویہ وہ ہے اور مومن کا رویّہ یہ ہے۔[1]

یہ اس وقت ہے جب یہ آیت نمبر ۸۴ مقام تنزیل میں ۸۳ سے متصل ہی ہو۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾

''اور وہ لوگ آپ سے روح کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ہے اور تمہیں علم نہیں دیا گیا ہے مگر بہت کم''۔

یعنی روح کی حقیقت کو معلوم کرنا نہ تمہارے ظرف ذہن کو وسعت کے مطابق ہے اور نہ تمہارے لئے کارآمد۔ مگر اتنا سمجھنا تمہارے لئے ضروری ہے کہ یہ روح از خود نہیں بلکہ پروردگار کے ارادہ کا نتیجہ ہے اس لئے اس کی راہ میں صرف ہونا اور اس کے کام آنا چاہیے۔

ایک تفسیر یہ ہے کہ روح سے مراد قرآن ہے جس کے متعلق آئندہ کی آیت میں اشارہ آئے گا۔

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿۸۷﴾

''اور اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے، اسے بھی سلب کر لیں۔ پھر آپ ہمارے مقابلہ میں اپنے لئے کوئی کام بنانے والا نہ پائیں گے، سوا اپنے پروردگار کی طرف سے ایک فضل و کرم کے، یقیناً اس کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے''۔

یعنی علم آپ کا ذاتی نہیں ہے، اللہ کے فیض و عطا سے ہے پھر اس کا علم کا تحفظ سہو و نسیاں سے امر اختیاری نہیں ہے بلکہ اللہ کے لطف خاص کا نتیجہ ہے جس پر اس کے پہلے ایک جگہ تفصیل سے تبصرہ ہو چکا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عصمت کے دو پہلو ہیں: ایک ہے ارادہ اور وہ ہے گناہوں سے بچنا اور ایک ہے بہ لطف ربانی اور وہ سہو و نسیان و خطا سے بری ہوتا ہے اور چونکہ عصمت میں یہ دونوں جزء دخیل ہیں اس لئے بحیثیت مجموعی جیسا بعض علماء کا قول ہے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ عصمت لطف خاص کا نام ہے لیکن اس سے پیغمبر کے ارادہ کا رنامہ کی عظمت کو نظر انداز کرنا بھی درست نہیں ہے پھر یہ لطف خاص بھی ہر کس و ناکس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس کے لئے علم الٰہی میں صلاحیت نہیں ہے پھر یہ لطف خاص بھی ہر کس و ناکس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اس کے لئے علم الٰہی میں صلاحیت ظرف کی ضرورت ہے جو اس آیت سے ثابت ہے کہ:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام: ۱۲۴)

اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کا منصب کہاں رکھے۔

اس آیت کو مقام تنزیل میں اگر گزشتہ آیت سے متصل مانا جائے تو یہ ایک قرینہ اس کا ہو سکتا ہے کہ سابق آیت میں روح سے مراد قرآن

---

[1] ۔ای کل واحد من المؤمن والکافر یعمل علیٰ طبیعته وخلیقته التی تخلق بها عن ابن عباس (مجمع البیان)

ہی ہے۔[1]

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿٨٨﴾

''کہہ دیجئے کہ اگر انسان اور جنات سب مل کر کوشش کریں کہ اس قرآن کا جواب لے آئیں تو وہ اس کا جواب نہیں لائیں گے، چاہے وہ کیسے ہی ایک دوسرے کے پشت پناہ بن جائیں''۔

تمام انس وجن مل کر بھی قرآن کا جواب نہیں لا سکتے

یہ قرآن مجید کے تمام مطالبات ''ایسا قرآن لے آؤ'' دس سورے ایسے لے آؤ۔ (ارے) ایک سورہ ہی لے آؤ اور اس سب کے جواب میں دنیا کی عاجزانہ خاموشی کے بعد کا نتیجہ ہے جسے یہاں اس عظیم پر جوش انداز کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے اور جس کی تصدیق اس کے بعد بھی دنیا کی خاموشی اور بے بسی آج تک کرتی رہی ہے اور ہمیشہ کرتی رہے گی۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۚ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿٨٩﴾

''اور بے شک ہم نے رخ بدل بدل کر لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں پیش کر دی ہیں تو زیادہ تر لوگوں نے انکار کیا سوا ناشکرے پن کے''۔

یعنی ناشکرے پن کے سوا کسی اور راہ کے اختیار کرنے پر عملی طور سے تیار نہ ہونا تھے نہ ہوئے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿٩٠﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿٩٢﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٣﴾

''اور ان لوگوں نے کہا کہ ہم ہرگز آپ کی بات نہ مانیں گے یہاں تک کہ آپ ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ پھوٹ نکالیں یا آپ کے لئے ایک باغ ہو کھجور اور انگور کا تو اس کے بیچ بیچ ایسا کیجئے کہ نہریں پھوٹ پھوٹ کر بہنے

---

[1] ۔قیل معناہ: ولو شئنا لمحونا ھذا القرآن من صدرك و صدر امتك و فی ھذا دلالة علی ان السوال دفع عن القرآن (مجمع البیان)

لگیں یا جیسا کہ آپ کو زعم ہے آسمان کو ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دیجئے یا اللہ اور ملائکہ کی ایک فوج بنا کر لے آیئے یا آپ کا ایک گھر ہو طلائے خالص کا یا آسمان پر چڑھ جائے اور ہم آپ کے چڑھ جانے کا بھی یقین نہیں کریں گے جب تک کہ ہم پر لکھی لکھائی ایک کتاب نہ اتارے جسے ہم خود پڑھیں، کہہ دیجئے کہ پاک ہے میرا پروردگار میں کیا ایک بشر کے علاوہ جو بھیجا گیا ہے اور کچھ ہوں''؟

یعنی میرا ذاتی اختیار ان باتوں میں کچھ بھی نہیں ہے میں تو خالق کی حکمت و مصلحت کا پابند ہوں، اور کوئی بھی پیغمبر اپنی طرف سے کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا بلکہ جتنے اللہ تصدیق و رسالت کے لئے بر بنائے اتمام حجت از روئے حکمت ضروری سمجھتا ہے، اسے معجزات عطا فرماتا ہے۔[1] اس سے اور ایسی ہی دوسری آیات سے معجزات کی نفی کس طرح ثابت نہیں ہوتی جس پر ہم نے مقدمہ تفسیر میں کافی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

''اور نہیں مانع ہوا لوگوں کو ایمان سے جب کہ ان کے پاس ہدایت آئی مگر یہ کہ انہوں نے کہا کیا اللہ نے ایک بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟ کہہ دیجئے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو سکون و وقار کے ساتھ چلتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے''

پیغمبروں کی بشریّت

یعنی قدرت کا اصول بر بنائے حکمت یہ ہے کہ وہ پیغمبر انہی کے ہم جنس کو بنایا کرتا ہے۔

بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ انبیاء و مرسلین اور ہمارے آئمہ معصوم علیہم السلام صورۃً بشر تھے لیکن حقیقت ان کی اس سے مختلف تھی۔ وہ غور کریں کہ قرآن کہہ رہا ہے کہ عامہ خلائق کے لئے بہت بڑی رکاوٹ بن گیا، ایمان سے یہ امر کہ پیغمبر بشر کیوں ہیں؟ اگر واقعہ یہ ہوتا کہ وہ درحقیقت بشر کے سوا کچھ اور ہوں تو اس رکاوٹ کو دور کرنا کتنا آسان تھا یہ کہہ کر کہ تمہارا یہ سمجھنا کہ وہ بشر ہیں غلط ہے، یہ تو بس صورۃً بشر ہیں حقیقۃً بشر تھوڑی ہیں مگر قرآن ان تمام دشواریوں کو جو انہیں ایمان کی راہ میں اس تصور کی بناء پر ہیں کہ انگیز کرتا ہے اور ان کو قائل معقول کرنے کے لئے دوسرے طریقے اختیار کرتا ہے مگر یہ کسی طرح نہیں کہتا کہ یہ بشر نہیں ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح مشرکین کا وہ تصور غلط تھا کہ رسول کو بشر نہیں ہونا چاہیے اسی طرح ان مسلمانوں کو یہ تصور بھی غلط ہے کہ یہ حضرات بشر نہیں تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے اس تصور میں ذہنیت وہی کارفرما ہے جو مشرکین کے اس تصور میں تھی کہ رسالت یا امامت بشریت کے ساتھ یکجا نہیں ہو سکتی۔ فرق اتنا ہے کہ انہوں نے بشریت کو تسلیم کیا اور رسالت کا انکار کیا اور یہ

---

[1] ۔ المعنی انکم تفرحون علی الأیات ولیس امرها الی وانا امرها الی الذی ارسلنی (تبیان)

لوگ رسالت یا امامت کو تسلیم کر کے بشریت کا انکار کر رہے ہیں، مگر قرآن نے اصل اس ذہنیت کے خلاف جو دونوں میں مشترک ہے حقیقت پروری کی بنا پر مسلسل جہاد اپنا ایک اہم فریضہ قرار دیا ہے لہٰذا ہر ایمان بالقرآن رکھنے والے کو اس کی مخالفت ہی کو اپنا نسب العین بنانا درست ہے موافقت اس کی کسی طرح بھی درست نہ ہوگی۔

ہاں ایک سوال یہاں پر جناب شیخ الطائفہؒ نے اٹھایا اور وہ یہ ہے کہ اگر عامہ خلائق کی طرف ملک بھیجنا حکمت الٰہی کے تقاضے کے خلاف ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول کو ان کا ہم جنس ہونا چاہیے جس کی طرف وہ بھیجا جا رہا ہے تو پیغمبروں کی طرف اللہ فرشتوں کو رسول بنا کر کیوں بھیجتا ہے جیسا کہ تاریخ انبیاء سے بدیہی طور پر ثابت ہے اور قرآن مجید میں ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ط۔ (حج ۔ ۷۵)

اللہ فرشتوں میں سے بھی رسولوں کو منتخب کرتا ہے، اور آدمیوں میں سے بھی۔

اس کا جواب جناب شیخ الطائفہؒ نے یہ دیا ہے کہ پیغمبر چونکہ عامہ خلائق سے اپنی صفات کے لحاظ سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے اور معجزات کا حامل ہونے سے ایک خاص شخصیت رکھتا ہے اس لئے اس کو ایک طرح کی ہم جنسی ملائکہ سے بھی حاصل ہوتی ہے جو طبیعت نوعیہ کے لحاظ سے تو نہیں ہے مگر صفات شخصیہ کے لحاظ سے ہے۔[1]

اس سوال و جواب کو بعینہٖ طور پر ملخص کے جناب طبرسی علیہ الرحمہ نے مجمع البیان مین درج فرمایا ہے جس میں الفاظ بھی جناب شیخ طوسیؒ کے لئے ہیں اور اس پر کسی قسم کا اضافہ نہیں کیا گیا ہے مگر ہم سمجھتے ہیں ملک کی نوعیت رسالت اس رسالت سے مختلف ہے جو پیغمبروں کو حاصل ہوتی ہے ملک کی رسالت نوعیت قاصد ہی کی طرح کی ہے اور پیغمبروں کی حیثیت مرشد اور رہ نمائی کی ہوتی ہے اس لئے ہم ملائکہ کو مرسلین سے افضل نہیں جانتے مگر مرسلین کا افراد امت سے افضل ہونا لازم سمجھتے ہیں یہ مرشد اور رہ نما ہونے کا مقصد وجوب اطاعت و اتباع سے پورا ہوتا ہے اور وہ بغیر ہم جنسی کے غیر معقول ہے۔

ایک بڑا اہم سوال یہاں میرے برادر بجان برادر رئیس العلماء سید کاظم صاحب نقوی نے آپس کی گفتگو میں اٹھایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر یہ اصول ہے کہ رسول کو مرسل الیھم کا ہم جنس ہونا چاہیے تو ہمارے رسولؐ کی رسالت انسانوں کے علاوہ جنات کے لئے بھی کس طرح ہے؟

اس سوال کے بعد مجھے پورے مسئلہ پر از سر نو غائر نظر ڈالنا پڑی کیوں کہ نہ وہ اصول ہمارا طبع زاد ہے کہ اس سے دست برداری ممکن ہو بلکہ وہ صاف قرآن مجید سے مستفاد ہے اور نہ یہ حقیقت کہ رسولؐ کے عموم بعثت میں جنات بھی داخل ہیں۔ قابل انکار ہے کیونکہ اس کا پتہ قرآن مجید کی متعدد آیات سے چلتا ہے۔

اب اس نظر کا جو نتیجہ ہے اس کی تفصیل کے لئے تو کتاب درکار ہے، مجمل یہ ہے کہ فرائض رسالت کے دو جز ہیں ایک قولی ہدایت اور دوسرے عملی مثالیں قائم کرنا۔

یہ دوسرا پہلو وہ ہے جس کے ہم جنسی ہی نہیں بلکہ ہم صنفی بھی درکار ہے اور اسی لئے طبقہ خواتین میں وقتاً فوقتاً ایسی معصوم ہستیوں کی ضرورت عقلاً ثابت ہوتی ہے جو اس طبقہ کے لئے نمونہ عمل بن سکیں اور عموم رسالت جو ہے وہ پہلے پہلو کے لحاظ سے ہے یعنی وہ دین جسے رسولؐ نے پیش کیا وہ

---

[1] ۔ لانّه صاحب معجزة و قد اختير للهداية فصارت حاله بذلك مقاربة لحال الملك (تبيان)

بلا تفرق صنف تمام نوع انسانی ہی نہیں بلکہ بلا امتیاز جنس وانس سب کے لئے ہے لیکن نمونہ عمل آپ انہی کے لئے ہو سکتے ہیں جو جنس میں ہی نہیں بلکہ صنف میں بھی آپ کے ساتھ متحد ہوں۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾

''کہہ دیجئے کہ اللہ کافی ہے گواہ ہونے کے لئے میرے اور تمہارے بیچ میں۔ وہ اپنے بندوں سے واقف ہے خوب دیکھنے والا''۔

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿۹۷﴾

''اور جس کی اللہ ہدایت کرے تو وہ ہے ہدایت پانے والا اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے تو ہرگز ہرگز اسے چھوڑ کر تم اس شخص کے حوالی موالی کوئی نہیں پاؤ گے اور ہم انہیں اٹھائیں گے قیامت کے دن اس طرح کہ منہ اٹھائے ہوئے جاتے ہوں گے اندھے، گونگے اور بہرے، ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، جب وہ بجھنے لگتا ہے تو ہم اُن کے لئے اس کی تپش میں اضافہ کر دیتے ہیں''۔

علی وجوھھم کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ ''منہ اٹھائے ہوئے جاتے ہوں گے'' بعض مفسرین ومترجمین کے قول کے مطابق [1] مگر ایک دوسری تفسیر کے مطابق ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ وہ منہ کے بھل کھینچے جا رہے ہوں گے اس کی تائید میں ایک حدیث بھی منقول ہے جو ہمارے طرق سے نہیں ہے اور اس کا ظاہر کھینچا جانا نہیں ہے بلکہ یہ کہ قدرت کی طرف سے کچھ ایسا ہوگا کہ وہ خود منہ کے بھل چل رہے ہوں گے۔ [2]

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾

''یہ ان کی سزا ہے اس وجہ سے کہ انہوں نے ہماری آیات کے ساتھ کفر اختیار کیا اور کہا کہ کیا جب ہم کچھ ہڈیوں اور

---

[1] ۔ما شین علی وجوھھم (جلالین) روان شدہ بر روی خویش (شاہ ولی اللہ)

[2] ۔روی انس بن مالك انّ برجلا قال یا نبیّ الله کیف یحشر الکافر علی وجهه یوم القیامة؟ قال: انّ الذی امشاه علی رجلیه فی الدنیا قادر علی ان یمشیه علی وجهه یوم القیامة اورده البخاری و مسلم و الصحیح (مجمع البیان)

بکھرے ہوئے اجزاء کی شکل میں ہوں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ قادر ہے اس پر کہ ان کو ایسا پھر پیدا کر دے اور اسی نے ان کے لئے ایک مدت مقرر کی ہے جس میں کچھ شک نہیں تو ظالم لوگ نہیں مانتے سوا انکار کے"۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۧ﴿۱۰۰﴾

"کہیے کہ اگر تم لوگ میرے پروردگار کی رحمت کے خزانوں کو اپنے قبضہ میں رکھتے ہوتے تو خرچ ہونے کے ڈر سے روک لیتے اور انسان بڑا کنجوس ہے"۔

اس مقدس آیت کے مضمون کی تصدیق آج سے بڑھ کے شاید کبھی ہوئی ہو۔ جب ضروریات حیات قدرت کی طرف سے اکثر فراواں ہوتی ہیں مگر بیوپاری اور سرمایہ دار انہیں اپنے پاس بند کر دیتے ہیں اس طرح لوگوں کو نہیں مل سکتیں اور دانہ دانہ کو ترستے ہیں۔

ہم نے آیت کا جو مفہوم لکھا ہے وہ حدیث معصومؑ کے مطابق ہے۔ [1]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿۱۰۳﴾ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴿۱۰۴﴾

"اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو (۹) کھلی ہوئی نشانیاں عطا کیں تو بنی اسرائیل سے پوچھو جب وہ ان کے پاس آئے تو فرعون نے ان سے کہا کہ میں تو اے موسیٰ! ایسا سمجھتا ہوں کہ تم کسی آسیب میں مبتلا ہو گئے ہو، انہوں نے کہا، تجھے معلوم ہے کہ یہ سب نہیں اتارا ہے، مگر آسمانوں اور زمین کے پروردگار نے روشن نشانیوں کی صورت میں اور میں تجھے اے فرعون، سمجھتا ہوں کہ تو ہلاک ہونے والا ہے تو اس نے چاہا کہ ان لوگوں کو اس سرزمین سے ہٹائے تو ہم نے اسے اور ان سب کو جو اس کے ساتھ تھے ڈبو دیا اور کہا ہم نے اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہ قیام کرو اس سر زمین پر تو جب آخرت کا وعدہ آئے گا تو ہم تم سب کو اکٹھا کریں گے"۔

جناب موسیٰؑ کے معجزات

---

[1] ۔ قال: لو کانت الاموال بید الناس لما اعطوا الناس شیئا یخافته النفاد (علی بنی ابراهیم)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''شاید نو نشانیاں نو معجزے ہوں، وہ جو فرعون کے مقابلے میں اللہ نے بھیجے اور شاید نو ۹ حکم ہوں کہ توریت کے سرے پر لکھے جاتے تھے وہ بھی کبیرہ گناہوں سے منع تھا۔ (موضح القرآن)

نو ۹ معجزات کی فہرست جلالین نے حسب ذیل لکھی ہے:

۱۔ الید ۲۔ والعصا ۳۔ والطوفان ۴۔ والجراد ۵۔ والقمل ۶۔ والضفادع ۷۔ والدّم ۸۔ والطمس ۹۔ والسنین و النقص الثمرات

ہمارے قدیم مفسر علی بن ابراہیم نے لکھا ہے:

۱۔ الطوفان۔ ۲۔ والجراد ۳۔ والقمل۔ ۴۔ والضفادع ۵۔ والدم۔ ۶۔ والحجر۔ ۷۔ والعصا۔ ۸۔ ویدہ۔ ۹۔ والبحر

ان میں سات چیزیں تو مشترک ہیں اور دو چیزیں پہلی فہرست میں خاص ہیں طمس جس کا مفہوم واضح نہیں ہے اور قحط سالی جسے دو الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ السنین و نقص من الثمرات اور دو چیزیں دوسری فہرست میں خاص ہیں حجر اور بحر۔ یہ دونوں معجزے نصوص قرآنی میں متعدد جگہ درج ہیں:

جناب شیخ طوسیؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان نو معجزوں کی فہرست میں اختلاف صدر اول ہی کے مفسرین میں پیدا ہو گیا تھا[1] چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں کئی قول نقل کئے ہیں لیکن کسی معصومؑ کی طرف ایک بھی ان میں سے منسوب نہیں ہے۔

علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان اقوال کو نقل کیا ہے، اور پھر اس قول کی تائید میں کہ اس سے نو ۹ حکم مراد ہیں، ایک روایت درج کی ہے جو غالباً طرق اہل سنت سے وارد ہوئی ہے کہ ایک یہودی نے اپنے ساتھ والے سے کہا کہ آؤ چلیں اس پیغمبر کے پاس اس سے ان نو ۹ چیزوں کے بارے میں دریافت کریں دیکھیں کیا جواب ملتا ہے چنانچہ وہ دونوں آئے اور حضرتؑ سے سوال کیا۔ حضرتؑ نے فرمایا، وہ یہ باتیں ہیں:

۱۔ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرو۔ ۲۔ چوری نہ کرو۔ ۳۔ زنا نہ کرو (ناحق خون نہ کرو)۔ ۴۔ کسی بے گناہ کو حکومت وقت سے شکایت کر کے قتل نہ کراؤ۔ ۶۔ سود نہ کھاؤ۔ ۷۔ کسی عورت پر بلا وجہ بدکاری کی تہمت عائد نہ کرو۔ ۸۔ میدان جنگ سے فرار نہ کرو۔ ۹۔ ان کے علاقہ خاص تم یہودیوں کے لئے یہ ہے کہ سبت کے بارے میں قانون الٰہی کی مخالفت نہ کرو۔ یہ سن کر سوال کرنے والے نے حضرتؑ کے ہاتھوں کا بوسہ لیا اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچے نبی ہیں (مجمع البیان)

فرعون کا کہنا کہ ''میں تمہیں ایسا سمجھتا ہوں کہ تم کسی آسیب میں مبتلا ہو گئے'' ہو اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی آسیب کی وجہ سے تمہارا دل الٹ گیا اور دماغ پلٹ گیا ہے[2] جیسا کہ دوسری جگہوں میں کافروں کا رسولؐ کو مجنوں یعنی دیوانہ کہنا مذکور ہے یہاں اس دیوانگی کے سبب کا اظہار ہے کہ وہ کسی جادو یا آسیب کا نتیجہ ہے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۱۰۵﴾ وَقُرْاٰنًا

---

[1] ۔ اختلفوا فی ھذہ التسع (تبیان)

[2] ۔ مغلوبا علی عقلك (جلالین)

فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾

''اور حق کے ساتھ ہم نے اسے اتارا ہے اور حق ہی کے ساتھ وہ اترا ہے اور نہیں بھیجا ہے کہ ہم نے آپ کو مگر خوش خبری دینے والا اور عذاب سے متنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا اور اس قرآن کو ہم نے الگ الگ حصوں میں اتارا ہے تا کہ آپ اسے لوگوں کے سامنے وقفہ وقفہ سے پڑھیں اور ہم نے اسے تدریجی طور پر نازل کیا ہے''۔

فرقنا کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے ہم نے الگ الگ حصوں میں اتارا ہے یہ ایک تفسیر کے مطابق ہے [۱] لیکن اس لفظ کی اس کے علاوہ اور تفاسیر بھی آئی ہیں [۲] جن کی بنا پر ترجمہ مختلف ہوگا۔ اور ایک تفسیر کے لحاظ سے اس کا ترجمہ بالکل وہ ہوگا جو ہم نے آخری جملہ کا کیا کہ ہم نے اس کو تدریجی طور پر اتارا ہے۔ [۳]

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ السجدة

''کہیے کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، یقیناً جنہیں اس کا علم پہلے عطا ہو چکا ہے، ان کے سامنے جب یہ پڑھا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، بے شک ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے اور منہ کے بل گرتے ہیں روتے ہوئے اور وہ ان کے قلبی تاثرات میں اضافہ کرتا ہے''۔

گریہ کی تعریف

یخرون للاذقان جو دو جگہ ہے اس کے لفظی معنی تو ہوئے ٹھوڑیوں کے بل گرتے ہیں مگر یہ محاورہ سے متعلق چیز ہے اس مفہوم کو ہماری اردو میں منہ کے بھل گرنے سے ادا کیا جاتا ہے اس لئے ہم نے یہ ترجمہ کیا۔ شاہ ولی اللہ نے فارسی میں اس کے مطابق ترجمہ کیا ہے می افتند بر روئے خود۔

ہماری قدیم تفسیر بھی جو کلام معصومین علیہم السلام سے ماخوذ ہے اسی کے موافق ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

یخرون علی الاذقان سجدا قال علی الوجه (علی بن ابراهیم)

---

[۱] ۔ نزلنا و شیئا بعد شئ اٰیة بعد ایة و قصة بعد قصة (تبیان) جدا جدا کیا ہم نے اس کو (شاہ رفیع الدین)

[۲] ۔ قیل معناه فرقنا به الحق عن الباطل عن الحسن و قیل معناه بعضه خبرا و بعضه امرا و بعضه نهیا و بعضه وعدا و بعضه وعیدا (مجمع البیان)

[۳] ۔ نزلناه متفرقا فی عشرین سنة او ثلث (جلالین)

وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر جاتے ہیں (کیا مطلب؟) انہوں نے فرمایا منہ کے بل۔

جناب ابن عباسؓ سے بھی یہی معنی نقل ہوئے ہیں۔ [1]

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''نماز میں سجدہ دو بار ہوتا ہے اس واسطے دو بار فرمایا، پہلی بار اس کلام کی تاثیر سے تعجب آتا ہے اور دوسری بار عاجزی (موضح القرآن)

یہ کوئی الفاظ قرآنی کی تشریح نہیں ہے بلکہ ایک نکتہ ہے جو اپنے ذہن سے پیدا کیا گیا ہے حالانکہ جو سجدے ہماری نماز میں ہیں وہ تو حکم الٰہی سے ترکیب نماز کا جزء ہیں، نہ وہ تعجب سے ہوتے ہیں نہ عاجزی سے، پھر الفاظ قرآنی سے جو سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سجدوں کی تعداد بیان ہی نہیں ہو رہی ہے کہ وہ آیات الٰہی کو سن کر دو دفعہ سجدہ کرتے ہیں بلکہ آیات الٰہی سے ان کا تاثر کا اظہار ہے کہ کبھی انہیں سن کر، وہ سجدے میں گرتے ہیں اور یہ الفاظ زبان پر جاری کرتے ہیں اور ان میں بھی الفاظ کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ کسی بھی الفاظ میں اس مضمون کا اظہار کہ بے شک جو اللہ نے وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا اور کبھی وہ سجدہ میں گرتے ہیں اس طرح کہ گریہ کا ان پر غلبہ ہوتا ہے۔

یہاں پر ایک بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ آخرت کی ہنسی سے یہ مطلب نہیں جو نعمات الٰہیہ کو دیکھ کر یا کفار و منافقین کے انجام پر ہوگی، قرآن میں کسی وقت بھی اس دار دنیا میں ہنسی کی تعریف نہیں ہوئی ہے لیکن گریہ کا مورد مدح الٰہی ہونا ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

وہ منہ کے بل سجدے میں گر کر کہتے ہیں کہ سبحان اللہ ہمارے پروردگار کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے یعنی کتب سماویہ میں جیسے نبی کے بھیجنے کا اس نے اعلان کیا تھا، یہ ویسا ہی نبی ہے۔ [2]

یہ سب تعریفیں و توصیف بظاہر تو اہل کتاب کے ایک طبقہ کی ہے مگر یہ طبقہ جس کے یہ اعترافات و تاثرات ہوں، ناممکن ہے کہ مسلمان ہو گیا ہو، اس لئے حقیقۃً یہ ان نومسلموں کی تعریف ہے جو سچے دل سے ایمان لے آئے۔ [3]

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾

''کہیے کہ اللہ کہہ کے پکارو یا رحمٰن کہہ کے پکارو، جسے بھی پکارو تو اسی کے ہیں سب اچھے اچھے نام اور نہ اپنی نماز زور زور سے ہی پڑھو اور نہ اسے چپکے چپکے ہی پڑھو، اور اختیار کرو اس کے درمیان ایک راستا''۔

جہر و اخفاء کے درمیان نماز ادا کرنے کا حکم

عرب عموماً لفظ اللہ سے واقف تھے مگر الرحمٰن کے لفظ سے واقف نہ تھے اس لئے اس پر وحشت محسوس کرتے تھے چنانچہ دوسری جگہ ہے:

---

[1] ۔ای یسقطون علی الوجوہ مساجدین عن ابن عباس وقتادۃ (مجمع البیان)

[2] ۔وعد ربنا بنزولہ وبعث النبی ﷺ (جلالین)

[3] ۔ھم قوم من اھل الکتاب اٰمنوا (علی بن ابراھیم)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿الفرقان:۶۰﴾

''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں یہ رحمان کیا چیز ہے؟ کیا جو آپ ہم سے کہیں ہم اس کو سجدہ کرلیں اور وہ اس سے زیادہ بھڑکتے ہیں''۔

اس وحشت کو دور کرنے کے لئے قرآن میں بسم اللہ کی آیت میں اللہ اور رحمن و رحیم سب الفاظ جمع کر دیئے گئے اور اسی کو یہاں سمجھایا جارہا ہے کہ اللہ اور رحمن کوئی الگ الگ شخصیتوں کے نام نہیں ہیں یہ دونوں ایک ہی ذات کے نام ہیں اور یہ کیا بلکہ اور نام جو صفات کمال کا پتہ دیتے ہیں جیسے علیم، قدیر، سمیع، بصیر وہ سب بھی کہے جائیں تو اس سے مقصود ایک ہی ذات ہوگی اور وہ خدائے واحد ہے۔

آخر میں جو کہا جارہا ہے کہ نہ زور زور ہی سے نماز پڑھو اور نہ چپکے ہی، اسے ہر ہر نماز سے متعلق لیا جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ نہ بہت بلند آواز سے چیخ کر ہی نماز پڑھو اور نہ بالکل آہستہ درمیان کی کیفیت ہونا چاہیے [۱] مگر ہمارے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ یہی ہے کہ ہمیشہ نماز کو زور ہی سے پڑھنے کا حکم ہوا اور نہ یہ کہ آہستہ ہی پڑھنے کا حکم ہو بلکہ اس کے درمیان راستا اختیار کرو کہ بعض نمازیں جہر سے پڑھو اور بعض اخفات سے جس کی تفصیل از روئے سنت ثابت ہوگئی ہے کہ صبح اور مغربین میں قرأت جہر سے ہونا چاہیے اور ظہر وعصر میں قرأت اخفات کے ساتھ ہونا چاہیے [۲] یہ تفریق ہی دونوں کے درمیان کا راستا ہے جس کے اختیار کرنے کا حکم ہے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

''اور کہیے کہ سب تعریف اللہ کیلئے جس نے نہ اپنی اولاد قرار دی ہے اور نہ اس کا سلطنت میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کا عاجزی کی بنا پر کوئی یار و مددگار ہے، اور اس کی بڑائی کا اعتراف کیجئے جیسا بڑائی کا اعتراف کرنا چاہیے''۔

حمد اس تعریف کو کہتے ہیں جو اختیاری کارناموں پر ہو، اس لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس آیت حمد کے ساتھ جن اوصاف کا تذکرہ ہے وہ ذات الٰہی کے کمال وجلال کے تعارف کیلئے ہیں نہ یہ کہ حمد اس کی ان باتوں پر ہے بلکہ حمد اس کے اعطاف والطاف اور نظام عالم میں اس کے افعال حکیمانہ پر ہے جو سراسر خیر ہیں اور ان میں شر کا گزر نہیں ہے۔ [۳]

---

[۱] ۔نماز میں بہت چلانا بھی نہیں اور بہت دبی آواز بھی نہیں بیچ کی چال پسند ہے (موضح القرآن)

[۲] ۔ قال الطبری: یحتمل ان یکون للمراد لا تجهر بصلاتك صلوٰة النّهار و لا تخافت بها یعنی صلوٰة اللیل الّتی یجهر فیها بالقرأة قال و هٰذا یحتمل غیر انّه لم یقل به احد من اهل التاویل (تبیان) بان تجهر بصلاة اللّیل و تخافت بصلوٰة النّهار عن ابی مسلم (مجمع البیان)

[۳] ۔انّ الحمد فی الأیة لیس هو علی ان لّم یفعل ذٰلك و انّما هو علی افعاله المحمودة و وجّه الی من هٰذه صفته لا من اجل انّ ذٰلك صفته (تبیان) کما یقال ان اشکر فلانا الجمیل و لا یشکره علی جماله بل علی افعاله. (مجمع البیان)

سُوْرَۃُ الْکَھْفِ

مکیّہ۔۔۔۱۱۰ آیات

چونکہ کہ اس سورہ میں الکہف یعنی پہاڑ کے ایک خاص غار اور اصحاب کہف یعنی اس غار میں پناہ لینے والے کچھ دیندار افراد کا تذکرہ ہے۔اور وہ کسی دوسری جگہ قرآن مجید میں مذکور نہیں ہے اس لئے اس سورہ کا نام یہ ہوا۔

اس کے علاوہ اس سورہ میں جو مضامین ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:۔

سورۂ کہف کے خاص خاص مضامین:

۱۔۔۔۔آئندہ کے کسی کام کا وعدہ کرتے وقت انشاءاللہ کہنے کا حکم

۲۔۔۔۔دو آدمیوں کی گفتگو جن میں ایک مالدار تھا خدا فراموش اور دوسرا غریب مگر اللہ پر توکل رکھنے والا جس کے ذیل میں یہ سبق ہے کہ خدا کو بھول کر اسباب ظاہری پر تکیہ کرنا غلط ہے۔

۳۔۔۔۔مال اور اولاد سے زندگانی دنیا کی رونق ہے لیکن مال کا دارومدار حسن عمل پر ہے۔

۴۔۔۔۔شیطان کا جنات میں سے ہونا اور اس کے لئے نسل کا وجود۔

۵۔۔۔۔حضرت موسیٰؑ اور جناب خضرؑ کی ملاقات اور اس سے متعلق واقعات۔

۶۔۔۔۔ذوالقرنین

۷۔۔۔۔یاجوج وماجوج

۸۔۔۔۔کلمات الٰہی کی وسعت بلانہایت

۹۔۔۔۔حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام بشریت۔وغیرہ وغیرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۜ﴿۱﴾ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ
بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ
اَجْرًا حَسَنًا ۙ﴿۲﴾ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۙ﴿۳﴾ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۚ﴿۴﴾ مَا

لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝۵

''سب تعریف اللہ کے لئے جس نے اتارا اپنے بندہ پر اس کتاب کو اور نہیں رکھی اس میں کجی، بالکل ٹھیک تا کہ وہ متنبہ کریں اس کی طرف سخت عذاب سے [1] اور خوش خبری دیں ان ایمان والوں کو جو نیک اعمال کرتے ہیں ان کے لئے اچھا صلہ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور عذاب سے متنبہ کریں انہیں جن کا قول یہ ہے کہ اللہ نے اپنے لئے اولاد قرار دی ہے انہیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں ہے اور نہ ان کے باپ داداؤں کو، بہت بڑا ہے یہ جملہ جو ان کے منہ سے نکلتا ہے نہیں کہتے وہ بجز جھوٹ کے''۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝۶

''تو شاید آپ جان دے دیجئے گا [2] رنج وافسوس سے ان کے پیچھے اگر وہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں''۔

یہ اپنے پیغمبرؐ سے جو اس کے ساتھ حبیب ہونے کا بھی رشتہ رکھتا ہے ایسا بظاہر غصہ میں بھرا ہوا تخاطب ہے جس میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام تبلیغ کرنا ہے وہ آپ کر رہے ہیں اب وہ نہیں مانتے اور راہ راست پر نہیں آتے تو آپ ان کے غم میں گھل گھل کر اپنی جان کیوں دیتے ہیں۔ [3]

اس غم اور فکر کو جو خلق خدا کی ہمدردی کی بناء پر تھا۔ دوسری جگہ قرآن میں رسول کے اوصاف میں بطور مدح پیش کیا ہے ان الفاظ میں کہ:

عزیز علیه ما عنتم حریص علیکم (توبه: ۱۲۸)

''ان پر شاق ہے تمہارا مبتلائے زحمت ہونا اور انہیں انتہائی طلب تمہاری ہے (کہ کسی طرح تم راہ راست پر آجاؤ)

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝۷ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا ۝۸

''بے شک یہ سب جو زمین پر ہے، اسے ہم نے اس کی سجاوٹ کا ذریعہ بنایا ہے تا کہ انہیں آزمائیں کہ ان میں اعمال کے لحاظ سے بہتر کون ہے؟ اور بلاشبہ ہم بنانے والے ہیں اسے جو اس پر ہے ایک وقت میں چٹیل میدان۔ [4]

---

[1] ۔تقدیره: لینذرکم باسا کما قال یخوّف اولیاء(تبیان) معناه: لیخوّف العبد الذی انزل علیه الکتاب الناس عذابا شدیدا.(مجمع البیان)

[2] ۔فی روایة ابی الجاود عن ابی جعفر ... یقول قاتل نفسك علی اثارهم (علی بن ابراهیم)

[3] ۔هذا معاتبة من الله سبحانه لرسوله علی شدة وجه و کثرة عرصه علی ایمان قومه (مجمع البیان)

[4] ۔الجرز الذی لا نبات علیه ولا زرع ولا غرس (تبیان)

یعنی زمین کا تمام ساز وسامان انسان کی عملی آزمائش کے لئے ہے کہ وہ ان نعمتوں کا کس حد تک شکر ادا کرتا ہے یا جیسا شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کہ:

اس کی طرف دوڑتا ہے یا اس کو چھوڑ کر آخرت کو پکڑتا ہے (موضح القرآن)

بہرصورت یہ آزمائش اس وقت درست ہے جب انسان کے افعال واعمال کو خود انسان کے ارادہ واختیار کا نتیجہ سمجھا جائے نہ کہ خالق کے جبر یا اس کی تخلیق کا نتیجہ۔[1]

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝۹

''کیا تم سمجھتے ہو کہ اصحاب کہف ورقیم ہماری نشانیوں میں سے کوئی بڑی انوکھی چیز تھے''؟

واقعۂ اصحاب کہف کا آغاز

یعنی قدرت کی کارگزاریاں تو اس سے بہت بڑی انوکھی مثالوں سے بھری ہوئی ہیں، ان کے لحاظ سے اصحاف کہف کا واقعہ کوئی خاص ندرت نہیں رکھتا ہے اس کے بعد اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔

کہف کے معنی ہیں پہاڑ کا غار اور رقیم کے معنی ہیں لوح یعنی تختی۔ ان لوگوں نے جیسا کہ بعد میں بیان ہوگا، ایک غار میں جا کر پناہ لی تھی جہاں خالق نے ان پر ایک طویل نیند طاری کر دی جس کا سلسلہ کئی سو برس تک جاری رہا اور تختی کے لئے ایسا سمجھا تا ہے کہ اس پر ان لوگوں کے نام لکھ کر بعد میں اسے غار کے دہانے پر آویزاں کر دیا گیا دیوار پر نام لکھ دیئے گئے، اس لئے ان کا پتہ دینے میں قرآن مجید نے کہف کے ساتھ رقیم کو یاد دلایا ہے[2] اور کئی قول اس کے ہیں کہ رقیم اس جگہ کا نام ہے جہاں وہ غار واقع تھا۔[3]

اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝۱۰ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝۱۱ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝۱۲

''جب کہ ان جوانوں نے غار کی طرف پناہ لے کر کہا اے ہمارے پروردگار! ہمیں عطا کر اپنی طرف سے خاص لطف وکرم اور سامان کر ہمارے لئے ہمارے معاملہ میں صحیح راستے پر قائم رہنے کا، تو ہم نے ان کے کانوں پر پردے ڈال دیئے اس غار میں گنتی کے کچھ برسوں کے لئے، پھر ہم نے انہیں اٹھایا، تاکہ ہم جانیں کہ دو گروہوں

---

[1] ۔ فی قوله: "ایّهم احسن عملا" دلالة علی ان اللہ سبحانه اراد من الخلق العمل الصالح و علیٰ ان افعالهم الصادرة منهم حادثة من جهتهم (مجمع البیان)

[2] ۔ الرقیم اللوح المکتوب فیه اسماءهم وانسابهم (جلالین) نوشتۂ کہ بردیوار آر غار بود (فتح الرحمن)

[3] ۔ قال قوم هو اسم قریة ذهب الیه ابن عباس وفی روایة اخریٰ عنه انه واد بین غضبان وایلة وقال عطیة: الرقیم واد قال وقتادة: اسم الوادی الذی فیه اصحاب الکهف (تبیان)

میں کون زیادہ صحیح طور پر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت تک یوں رہے"۔

اصحاب کہف کا غار میں داخل ہونا اور اس کا پس منظر

ان کے کانوں پر پردے ڈال دیئے۔یعنی نیند غالب کردی چونکہ خواب سے بیدار ہونے کی سب سے بڑی علامت کان میں آواز پہنچنا ہے اس لئے نیند کے استعارۃ قرآن مجید میں کانوں پر پردہ ڈالنے کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے ضمناً یہ پتہ بھی چل جاتا ہے کہ یہ نیند ہی تھی، موت نہیں تھی اس محل پر قرآن مجید کی یہ تعبیر وہ ہے جس میں عربی کے ماہر علماء نے خاص امتیازی طور پر فصاحت کا جوہر محسوس کیا ہے۔

دو گروہوں میں کون زیادہ صحیح طور پر جانتا ہے اس کے تحت شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

دو فرقے یا تاریخ لکھنے والوں میں ہیں کہ کوئی کتنے برس لکھتے ہیں اور کوئی کتنے یا وے اصحاب کہف جاگ کر بعضے تجویز کرنے لگے کہ ہم ایک دن سوئے، بعض کہنے لگے اس سے کم (موضح القرآن)

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاْ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗۤا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾

"ہم آپ کے سامنے ان کے واقعہ کو حقیقت کے مطابق بیان کرتے ہیں، بلاشبہ وہ کچھ جوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے اور ہم نے ان کی مزید ہدایت کی اور ان کے دلوں کو مضبوط کیا جب وہ کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ ہمارا مالک وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے ہم نہیں پکاریں گے اس کے سوا کسی خدا کو کہ ہم اس وقت بیہودہ بکواس کرتے ہوں گے یہ ہماری قوم والے، انہوں نے اس کے سوا دوسرے خدا بنا لئے ہیں کیوں نہیں ان کی خدائی پر وہ کوئی کھلا ثبوت پیش کرتے؟ تو کون زیادہ ظالم ہوگا اس سے جو اللہ پر جھوٹ تہمت عائد کرے اور جب کہ تم نے علیحدگی اختیار کی ہے ان سے اور ان چیزوں سے جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں تو پناہ لو اس غار کی طرف۔ پھیلائے گا تمہارے لئے تمہارا پروردگار اپنی رحمت سے اور سامان کرے گا تمہارے لئے تمہارے معاملہ میں نفع پہنچانے کا"۔

اصحاب کہف کے وصف کے آغاز میں جوان کہنا نوعمری کا اظہار تو کرتا ہی ہے مگر اس کے ساتھ اس میں ان کی عزت نفس، ثابت قدمی اور

جرأت وہمت مردانہ کے اوصاف بھی مضمر ہیں جن پر مفسرین کی توجہ مبذول ہوئی ہے۔[1]

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾

''اور تم دیکھو گے سورج کو کہ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو مڑ جاتا ہے ان کے غار سے داہنی طرف اور جب وہ ڈوبتا ہے تو کترا جاتا ہے ان سے بائیں طرف اور وہ ایک کھلی جگہ پر ہیں اس غار میں سے۔ یہ اللہ نشانیوں میں سے ہے جس کی ہدایت اللہ کردے، وہ ہدایت پائے ہوئے ہوگا اور جسے وہ گمراہی میں چھوڑ دے تو ہرگز نہیں پاؤ گے اس کے لئے کوئی یار و مددگار جو صحیح راستا بتانے والا ہو''۔

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

بخاطر فاتر می رسد کہ دیوار جنوبی کہف آن قدر بلند است کہ سایہ اصلی او در تمام سال محل خفتن ایشاں رامی پوشاند و دیوار شرقی و غربی آں متصل و دیوار جنوبی بلند تر است و پایہ بپا یہ منحط شدہ و ایں جماعہ سر بجانب شمال و پا بجانب جنوب کردہ خفتہ اند پس وقتیکہ آفتاب طلوع کند ضوء آفتاب بر دیوار غربی و بعضی صحن غار افتدہ ہر چند ارتفاع زیادہ گیرد و بلندی دیوار شرقی از وصول ضوء باالیشان مانع آید و ضوء از جانب راست ایشاں منتقل شود بجانب سر کہ جہت شمال است در وقت استواء بجز سایہ اصلی دیوار جنوبی نمی ماند و چوں آفتاب مائل بغروب شود ضوء آفتاب بر دیوار شرقی افتد و آہستہ و آہستہ بر سر دیوار مرتفع گرد وآں جانب چپ ایشانست (فتح الرحمن)

غار میں ان کے محلّ قیام کی خاص خصوصیّت

ذہن قاصر میں ایسا آتا ہے کہ اس غار کی جنوب کی طرف کی دیوار اتنی اونچی ہے کہ اس کا اصل سایہ پورے سال ان کے سونے کی جگہ کو چھپائے رکھتا ہے اور مشرق اور مغرب کی طرف کی دیوار اُس کی جنوب والی دیوار سے ملی ہوئی ہے اس سے بھی زیادہ اونچی ہے اور پھر رفتہ رفتہ نیچی ہوئی ہے اور یہ لوگ اس طرح سوئے ہوئے ہیں کہ سر ان کا شمال کی طرف ہے اور پیر جنوب کی طرف ہیں تو جب سورج نکلتا ہے تو سورج کی دھوپ مغربی دیوار پر اور غار کے صحن کے کچھ حصہ پر پڑتی ہے اور جتنا جتنا آفتاب بلند ہوتا ہے مشرقی دیوار کی بلندی ان تک دھوپ کے پہنچنے سے مانع ہوتی ہے اور دھوپ ان کے دائیں جانب سے ہٹ جاتی ہے سر کی طرف جو شمال کی طرف ہے جب آفتاب وسط آسمان میں ہوتا ہے تو سوا جنوب کی دیوار کے اصلی سایہ کے کچھ چھاؤں نہیں رہ جاتی اور جب سورج غروب کی طرف جھکتا ہے تو دھوپ مشرقی دیوار پر پڑتی ہے اور آہستہ آہستہ دیوار کے اوپر

[1] ۔حکم لهم سبحانه بانقوة لانّ راس الفتوة الايمان و قيل الفتوة بذل النّدٰى و ترك الاذٰى و ترك الشكرٰى عن مجاهد و قيل هى اجتناب المحارم و استعمال المكارم. (مجمع البيان)

بلند ہوتی ہے اور وہ ان کی داہنی سمت ہوتی ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

حق تعالیٰ کی قدرت سے نہ اس مکان میں ان پر دھوپ آوے، نہ مینہ نہ برف اور کھلی جگہ ہے تنگ حصہ نہیں ہے (موضح القرآن)

دیکھا جائے تو باپ بیٹے کے تصور میں بہت بڑا فرق ہے والد یعنی جناب شاہ ولی اللہ قرآن مجید کے بیان کردہ واقعہ کو طبیعی اسباب پر مبنی قرار دینا چاہتے ہیں اور وہ انجینئری کے اصول سے اس پہاڑی کی ساخت ایسی بتا رہے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دھوپ ان پر نہ پڑے اور ان کے صاحبزادے اسے اسباب طبعیہ سے الگ کر کے صرف قدرت الٰہی کا کرشمہ قرار دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک قرآن کا انداز و بیان دوسرے تصور سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے یعنی بظاہر تو دھوپ ان پر پڑنے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے مگر یہ اللہ کی قدرت ہے کہ ان پر بہت سایہ رہتا ہے اور کبھی دھوپ ان پر نہیں پڑتی۔

ہمارے مفسرین میں علامہ طبرسیؒ کا رجحان بھی پہلے ہی رخ کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوپ کا نہ پڑنا ان کی آرام گاہ کے محل وقوع کا خاصہ ہے وہ فرماتے ہیں:

اخبر سبحانه عن لطفه بهم و حفظه ایاهم فی مضجعهم باختیاره لهم اصلح المواضع لو قاء هم فبوا هم مکانا من الکهف مستقبلا نبات النعش تمیل الشمس عنهم طالعة و غاربة کی لا یؤذ بهم حرها او تغیر الوانهم اویبلی ثیابهم وهم فی متسع ینا لهم فیه روح الریح وکان باب الغار مقابلا لقطب الشمالی (مجمع البیان)

خداوند عالم نے اپنی خاص مہربانی اور ان کی حفاظت کی صورت ان کی خوابگاہ میں بنائی ہے اور ان کے لئے انتخاب سونے کے لئے بہترین جگہ کا اس طرح کہ غار میں نہیں ایسے مقام پر رکھا جو بنات النعش کے رخ پر ہے اس لئے ان سے طلوع اور غروب دونوں میں سورج مڑا رہتا ہے تا کہ انہیں اس کی گرمی اذیت نہ دے یا ایسا نہ ہو کہ ان کی رنگت میں تغیر ہو یا ان کے لباس بوسیدہ ہوں اور وہ کھلی ہوئی جگہ پر رہیں تا کہ ان تک ہوا کا آرام وسکون پہنچتا ہے اور اس غار کا دروازہ قطب شمالی کے مقابل میں تھا۔

مگر کیا کیا جائے کہ الفاظ قرآنی کو دیکھتے ہوئے میرا دل کسی طرح اس تشریح کو قبول نہیں کرتا۔ میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ اس صورت میں اس تذکرہ کے عبد ذٰلك من فضل الله ہوتا ذلك من نعمة الله ہوتا ذٰلك من رحمة الله ہوتا وغیرہ وغیرہ لیکن ذٰلك من اٰیات الله یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہنا بتلاتا ہے کہ یہ کسی جغرافیائی محل وقوع کا لازمی تقاضا نہیں ہے جہاں ریاضی کے اصول سے دھوپ کو پہنچنا ہی نہیں چاہیے بلکہ وہ اللہ کی خاص قدرت کا کرشمہ ہے۔

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۚ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۚ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۭ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝۱۸

''اور تم انہیں جاگتا ہوا سمجھو گے حالانکہ وہ سوتے ہوئے ہیں اور ہم انہیں دائیں اور بائیں کروٹ بدلوا لیتے ہیں اور ان کا کتا غار کے دہانے پر اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے بیٹھا ہے، اگر تم جھانک کر انہیں دیکھو تو پیٹھ پھرا کر ان سے بھاگو گے اور ان کا رعب تم میں بھر جائے گا''۔

ان آیات میں سگ اصحاب کہف کا ذکر آیا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾

''اور یوں ہی ہم نے انہیں اٹھایا کہ وہ آپس میں سوال و جواب کریں ایک کہنے والے نے ان میں سے کہا کہ کتنا تم لوگ رہے؟ انہوں نے کہا ہم رہے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ انہوں نے کہا کہ تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ تم کتنا رہے؟ اچھا تو اپنے میں سے ایک کو بھیجو اپنے اس چاندی کے سکے کے ساتھ اس شہر کی جانب تو وہ دیکھے کہ کون یہاں کا کھانا زیادہ اچھا ہے تو لے آئے تمہارے پاس اس میں سے کچھ غذا اور لازم ہے کہ مناسب رویہ اختیار کرے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔ یقیناً اگر وہ لوگ تم پر قابو پا گئے تو تمہیں سنسار کریں گے یا تمہیں اپنے مذہب میں واپس لے جائیں گے اور اس صورت میں تم کبھی بھی دونوں جہاں کی بہتری حاصل نہیں کر سکتے''۔

صدیوں کی نیند کے بعد ان کی بیداری

یونہی ہم نے انہیں اٹھایا یعنی جس طرح ان کی یہ طولانی نیند صرف قدرت الٰہی کا کرشمہ تھی، ویسے ہی اس کے بعد ان کی بیداری بھی بس اللہ کی قدرت کا نمونہ تھی [1]

کہ وہ آپس میں سوال و جواب کریں یعنی ان کے اٹھنے پر یہ صورت پیدا ہوئی [2] نہ یہ کہ ان کے اٹھانے کا مقصد یہی تھا مگر دوسرا رجحان یہی ہے کہ وہ اس حیرت ناک صورتحال پر مطلع ہو کر اور زیادہ معرفت الٰہی کے درجہ میں ارتقاء حاصل کریں۔ [3]

---

[1] ۔ای کما حفظنا احوالهم تلك المدّة بعثناهم من تلك الرّقدة لانّ احدالامرين كالاٰخر فی انّه لا يقدر عليه الّا الله تعالیٰ (تبیان)

[2] ۔عاقبت بایکدیگر سوال کنند (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔ای ليكون بينهم تساؤل و تنازع اختلاف فی مدة لبثهم فينتبهوا ذٰلك علیٰ معرفة صانعهم ويزدادوا يقيناً الیٰ يقينهم (مجمع البیان)

جہاں تک دیکھا جاتا ہے قرآن میں جہاں جہاں موت کے بعد اٹھانے کا ذکر ہے وہاں یہی ہے کہ بعد میں ان کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کتنے عرصہ تک اس عالم میں رہے۔ یہاں جو طویل خواب ہے، اس کے بعد بھی یہی کیفیت ہے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

سینکڑوں برس رہنا ان کو ایک دن معلوم ہوا مردہ اور سوتا برابر ہے (موضح القرآن)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روح کا جسم کے ساتھ تعلق جو حیات عنصری میں ہوتا ہے شرط ادراک ہے اور اس سے بھی آخرت میں معاد جسمانی کی ضرورت ثابت ہوتی ہے ورنہ جزء وسزا کا مقصد پورا نہ ہوگا۔

وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

''اور اسی طرح ہم نے مطلع کیا ان پر تا کہ انہیں معلوم ہو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں ہے وہ موقع جب لوگ آپس میں ان کے معاملے میں بحث کر رہے تھے تو انہوں نے کہا کہ ان پر ایک عمارت تعمیر کرو، اللہ ہی ان سے خوب واقف ہے کہا انہوں نے جو ان پر غالب آئے تھے تو ہم تو بالضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے''۔

لوگوں کا ان کے محلّ قیام پر مطلع اور باہمی اختلاف کے بعد وہاں مسجد بنانے کا فیصلہ

''تا کہ انہیں معلوم ہو'' یعنی دوسرے جواب تک حیات بعد الموت کے قائل نہیں تھے، وہ ان کی اس کیفیت کا مشاہدہ کر کے سمجھیں کہ جس طرح اتنی طویل موت کے طاری ہونے پر وہ قادر ہے، اسی طرح وہ موت کے بعد زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ [1]

آخر میں اس فیصلہ کے بعد کہ عمارت ان پر بنائی جائے جو لوگ غالب آئے اور انہوں نے مسجد قائم کرنا طے کیا، وہ بلاشبہ کچھ دیندار لوگ تھے [2] اور قرآن مجید کا انداز بیان بتاتا ہے کہ وہ ان کے اس منصوبہ کو قابل تعریف سمجھتا ہے اور اس پر معترض نہیں ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صالحین کے مستقر پر جو قبر کی نوعیت سے ہو، بطور یادگار عمارت قائم کرنا کوئی قابل اعتراض امر نہیں ہے اور یہ عمارت مسجد کی قسم سے بھی ہو سکتی ہے جس میں نمازیں پڑھیں جائیں۔ [3]

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا

---

[1] ۔ لیعلم الّذین یکذّبون بالبعث (تبیان)

[2] ۔ هم المؤمنون (جلالین)

[3] ۔ مسجداً یصلی فیه (جلالین) یتعبّد النّاس فیه ببرکاتهم ودلّ ذٰلك علی انّ لغلبة کانت للمؤمنین. (مجمع البیان)

يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

''جلد ہی لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے جن کا چوتھا کتا تھا اور کہیں گے کہ پانچ تھے جن کا چھٹا کتا تھا اٹکل پچو، غیب کی باتیں بتانے کے طور پر اور کہیں گے کہ سات تھے اور ان کا آٹھواں کتا تھا کہیے کہ میرا پروردگار ہی ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے ان کی تعداد کا علم کوئی نہیں رکھتا سوا کم لوگوں کے تو ان کے بارے میں بحث نہ کیجئے سوا اس بحث کے جو بالکل صاف ہو اور ان کے بارے میں ان میں سے کسی سے دریافت نہ کیجئے''۔

تعداد میں اختلاف اور حقیقت کی طرف اشارہ

چونکہ پہلی دو باتوں کے ساتھ رجما بالغیب ''اٹکل پچو'' کا لفظ کہا گیا ہے اور تیسری بات کے بعد کوئی اس طرح کا تعریضی جملہ نہیں ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دونوں قول غلط ہیں اور تیسرا صحیح ہے چنانچہ جلالین نے دونوں اقوال کو کہا ہے کہ وہ نصارائے نجران کے تھے اور تیسرے قول کو کہا ہے کہ وہ مومنین کا تھا اور اسی تیسرے قول کو جناب ابن عباسؓ نے ذمہ داران طور پر موافق حقیقت کہا ہے [1] اور ظاہر ہے کہ انہیں اس کا علم پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا [2] مگر اس پر بحث کرنے سے منع کیا گیا ہے اس لئے کہ کوئی غلط بات کہہ رہا ہو اور آپ کو اصل بات معلوم ہو مگر اس کی بات کو غلط اور اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کا کوئی ذریعہ آپ کے پاس نہ ہو تو ایسی صورت میں اس سے الجھنا اور اس کی غلط بات کو رد کرنے کی کوشش کرنا لاحاصل ہے اس بحث سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

''اور کسی چیز کو کبھی نہ کہو کہ میں کل کروں گا مگر (اس شرط کے ساتھ کہ) اللہ چاہے اور اپنے پروردگار کو یاد کرو جب بھول جاؤ اور کہو کہ ممکن ہے میرا پروردگار میری رہنمائی کرے اس سے زیادہ صحیح طریقہ کار کے لئے''۔

انشاء اللہ کہنے کا حکم

آئندہ کے وعدہ کے ساتھ ہمیشہ انشاء اللہ کہنا اس آیت کی تعمیل ہے مگر صحیح محل اس کا یہی ہے کہ انسان خود اس کام کو کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ پھر اس کے ساتھ انشاء اللہ کہے لیکن کرنے کا ارادہ نہ ہو اور صرف مصلحتہً یا غلط معنی میں اخلاقاً وعدہ کرتا ہے اور پھر وعدہ خلافی کے الزام سے بچاؤ کے لئے بہانہ کی صورت سے انشاء اللہ کہتا ہے، یہ منشائے قرآنی کے خلاف ہے۔

بعض لوگوں نے اسے قصہ اصحاب کہف سے متعلق قرار دیتے ہوئے یہ روایت بیان کی ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگوں

---

[1] ۔قال ابن عباس: انا من القلیل الذی یعلمون ذٰلك کانوا سبعة و ثامنهم کلبهم (تبیان)

[2] ۔الاظهر ان یکون عوف ذٰلك من جهة النبی ﷺ (مجمع البیان)

نے آ کر اصحاب کہف کا واقعہ دریافت کیا تھا آپ نے فرمایا کہ کل بتاؤں گا مگر انشاء اللہ نہیں کہا تو دوسرے دن وحی اتری ہی نہیں اور اس لئے آپ اس وعدہ کو پورا نہیں فرما سکے۔

ہمارے نزدیک یہ روایت درست نہیں ہے اور اس آیت کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ اسی قصہ اصحاب کہف سے متعلق ہے بلکہ اس کا قرینہ موجود ہے کہ وہ اس واقعہ سے تعلق نہیں رکھتی اور وہ یہ ہے کہ اگر اس کا تعلق اس واقعہ سے ہوا تو بالکل شروع ہی میں یہ آیت آتی اور اگر شروع میں نہ آتی تو پورے واقعہ کے بیان کرنے کے بعد آتی بیچوں بیچ میں اس آیت کا آنا تو صاف بتلاتا ہے کہ جیسے بہت سی بے جوڑ آیات ترتیب قرآن میں اپنے محل سے ہٹا کر رکھ دی گئی ہیں، ویسے ہی یہ آیت بھی یہاں بے جوڑ رکھ دی گئی جس کے متعلق پتہ نہیں کہ وہ کس موقع کی نازل شدہ ہے۔

پھر سورہ کے آغاز پر نظر کیجئے، جہاں کسی سوال کا جواب دیا گیا ہے، وہاں اس قسم کے الفاظ موجود ہیں کہ یستفتونك لیفتنوك یسالونك وغیرہ وغیرہ مگر یہ اصحاب کہف کا واقعہ بیان کرتے وقت اس قسم کا کوئی لفظ نہیں ہے بلکہ انداز بیان بتاتا ہے کہ خالق از خود اس واقعہ کی پوری حقیقت بیان کر رہا ہے جس کے ذیل میں ان غلطیوں کی اصلاح ہے جو عام طور پر اہل کتاب کے درمیان ہیں یا ان کے اختلاف اقوال کی طرف اشارہ ہے ہرگز اس سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ کسی سوال کا جواب یا کسی فرمائش کی تعمیل ہے۔

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿٢٥﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۪ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿٢٦﴾

''اور وہ لوگ اپنے غار میں رہے تین سو برس اور بڑھ گئے اس پر نو ۹ کہیے کہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنا رہے؟ اس کو آسمانوں اور زمین کی غیب کی خبر ہے وہ کتنا دیکھنے والا اور سننے والا ہے نہیں ان کے لئے اسے چھوڑ کر کوئی سرپرست اور وہ نہیں شریک کرتا اپنے فیصلہ میں کسی کو''۔

تین سو کہنے کے بعد نو برس کی زیادتی کا جو الگ سے بیان ہوا ہے اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ شمسی حساب سے تین سو برس تھے اور قمری حساب سے ۳۰۹ برس ہوتے تھے۔[1]

اس کی تائید میں ہمارے یہاں جناب امیرؑ کا ارشاد بھی وارد ہوا ہے[2] اس تعداد کے بتانے کے بعد یہ ارشاد کہ ''اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنا رہے؟ اس کے لئے آسمانوں اور زمین کی خبر ہے وہ کتنا دیکھنے والا اور سننے والا ہے''۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل کتاب کی جماعت کو اس کے ماننے میں تامل تھا اس لئے یہ کہا گیا کہ ہم جو کہہ رہے ہیں اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے علم سے کہہ رہے ہیں جو غیب کے علم کا مالک ہے۔

---

[1] ۔ فلثلاثمائة الشمسية ثلث مائة وتسع قمرية (جلالين)

[2] ۔ روى ان يهود يا سائل على بن ابى طالب عن مدة لبثهم فاخبر بما فى القرآن فقال: انا نجد فى كتابنا ثلاثمائة فقال ذٰلك لبنى الشمس وهٰذا البنى القمر (مجمع البيان)

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾

''اور پڑھیے اسے جو آپ پر وحی بھیجی گئی ہے آپ کے پروردگار کی کتاب میں سے، اس کی باتوں کا بدلنے والا کوئی نہیں اور نہیں پائے گا بجز اس کے کوئی جائے پناہ''۔

ملتحدا کے معنی میں قدیم مفسرین سے اختلافی طور پر کئی لفظ وارد ہیں مگر مطلب سب کا ایک ہی ہوتا ہے یعنی جائے پناہ[1] جو ہم نے ترجمہ کیا ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۚ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

''اور صبر و تحمل سے کام لے کر اپنے کو رکھئے ان کے ساتھ جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں کہ اس کی رضا کے طالب ہیں اور اپنی نظروں کو ان سے آگے نہ بڑھایئے اس طرح کہ زندگانی دنیا کی آرائش کو نصب العین بنایا اور کہا نہ مانیے اس کا جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے بے خبر چھوڑ رکھا ہے اور جو اپنی نفسانی خواہش کا پیرو ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے''۔

رؤسائے نجد میں سے ایک عینیہ بن حصن تھا کہا جاتا ہے کہ اس نے اور اس کے کچھ ہمرائیوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک دفعہ کہا کہ یہ غریب، پریشان حال افراد کو آپ اپنے پاس کیوں بیٹھنے دیتے ہیں؟ اس پر یہ آیت اتری اور اس سے کہ جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے بے خبر چھوڑ رکھا ہے'' وہی مراد ہے۔[2]

ہماری قدیم تفسیر بتاتی ہے کہ وہ خاص غریب مسلمان جن کا رسولؐ کے پاس بیٹھنا ان رؤسا کو ناگوار تھا، جناب سلمان فارسیؓ تھے انہی کے بارے میں یہ آیت اتری[3] جناب شیخ الطائفہؒ نے بھی اس کو بطور ایک قول کے نقل کیا ہے[4] اس طرح یہ آیت جناب سلمانؓ اور ان کے ساتھیوں سے متعلق ہے علامہ طبرسیؒ نے ساتھیوں کے لفظ کے اجمال کو تفصیل سے بدلا ہے اور ابوذر و عمارؓ وغیرہ کے نام لئے ہیں اور کہا ہے کہ یہ نادار

---

[1] ۔ملجأً عن مجاهد و قيل حوزا عن ابن عباس و قيل مرئلا عن قتادة و قيل معدلا و محيصا عن زجاج وابي مسلم والا قوال متقاربة في المعنى (مجمع البيان)

[2] ۔هو عينية بن حصن و اصحابه (جلالين)

[3] ۔نزلت في سلمان الفارسي كان عليه كساء فيه يكون طعامه و هو دثاره ورداؤه كان كسائده من صوف (علي بن ابراهيم)

[4] ۔قيل انها نزلت في سلمان و اصحابه (تبيان)

صحابہ تھے، اس لئے رئیسوں کو ان کا صحبت رسولؐ میں رہنا ناپسند تھا۔ [1]

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾

''اور کہیے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے، بلاشبہ ہم نے ظالموں کے لئے تیار کر رکھی ہے وہ آگ جسکا سر پردہ انہیں گھیرے ہوئے ہے اور اگر فریاد کریں تو ان کی فریاد رسی ہو ایسے پانی سے جو مثل پگھلے ہوئے تانبے کے ہو کہ چہروں کو بھون دے، کیا بُرا پینے کا پانی ہے اور کیا بری وہ آرام گاہ ہے''۔

جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے یہ تکلیفی طور پر اختیار دینا یعنی دونوں باتوں کی اجزت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ تہدیدی انداز میں ہے [2] اسی لئے اس کے بعد فوراً ظالموں کے لئے عذاب کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کفر اختیار کرنا بڑا ظلم ہے جس کی سزا یہ ہے۔ [3]

اس اعلان اختیار کے ساتھ ساتھ سزا کا بیان کرنا اس کا اظہار ہے کہ طاعت و معصیت دونوں کی زمہ داری تم پر ہے اور تمہارے ارادہ و اختیار سے وابستہ ہے اگر اطاعت کرو گے تو نجات پاؤ گے اور مخالفت کرو گے تو عذاب میں مبتلا ہو گے، یہ اختیار کا اظہار عقیدہ جبر کے بالمقابل ہے۔

آخر میں دوزخ کو آرام گاہ کہنا اس کے بعد والی آیت کے جوڑ پر ہے جس میں جنت کے لئے کہا گیا ہے حسنت مرتفقاً بہت اچھی ہے یہ آرام گاہ ورنہ ظاہر ہے کہ دوزخ آرام کی نہیں بلکہ تکلیف کی جگہ ہے [4]۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ﴿۳۰﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۳۱﴾

---

[1] ۔نزلت فی سلمان و ابی ذر و صهیب و عمّار و خباب و غیرهم من فقراء اصحاب النبی ﷺ (مجمع البیان)

[2] ۔صورته صورة الامر و المراد به التهدید (تبیان)

[3] ۔وعید من الله سبحانه و انذار لذلك عقبه بقوله: انا اعتدنا (مجمع البیان)

[4] ۔مرتفقا تمیز منقول من الفاعل ای قبح مرتفقا وهو مقابل لقوله الا تی فی الجنة: حسنت مرتفقا والا فانّ ارتفاق فی النار (جلالین)

''بلاشبہ وہ ایمان لائے اور نیک اعمال کے پابند رہے تو یقیناً ہم اکارت نہیں کریں گے اجر وثواب کو اس کے جو اچھے اعمال کرے۔ یہ وہ ہیں جن کے لیے ہمیشہ کی زندگی والے بہشتی ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہونگی، اُنہیں پہنائے جائیں گے ان میں سونے کے کنگن اور سبز کپڑے سندس اور استبرق کے۔ ان میں مسندوں پر گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے ہوں گے۔ کیا کہنا اس ثواب کا اور کتنی اچھی ہے یہ آرام گاہ''۔

بوقت نزولِ قرآن ملک عرب میں جو کپڑے بہت قیمتی تھے انہی کا نام لیا گیا ہے جس میں انتہائی دیدہ زیب لباس کی طرف ذہن کو منتقل کرنا منظور ہے۔

سندس اور استبرق کی تشریحات جو ہوئی ہیں [1] اُن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مختلف قسم کے باریک اور موٹے ریشم کے کپڑے ہوتے تھے اور اُن کی بناوٹ میں سونے کے تار بھی ہوتے تھے۔

چونکہ قرآن میں صراحت ہے بہشت ہر وہ چیز ہوگی جس کی خواہش ہو، اس لیے نعمات جنت کو نہ جنس طعام وشراب میں اُن چیزوں میں محدود سمجھنا چاہیے جن کے نام قرآن میں ہیں اور نہ ملبوسات میں اُن سے مخصوص سمجھنا چاہیے بلکہ ہر زمانہ اور ہر ملک کے باشندوں کے لحاظ سے جس قسم کی طلب ہو، اسے مہیا کیا جانا لازمی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿٣٢﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿٣٣﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿٣٥﴾ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿٣٦﴾

''اور پیش کیجیے ان کے سامنے مثال دو ۲ آدمیوں کی جن میں سے ایک کے ہم نے دو باغ قرار دیئے انگور کے اور ان دونوں کو گھیر دیا کھجوروں سے اور ان دونوں باغوں نے اپنے پھل دیئے اور اس میں کچھ بھی کمی نہیں کی اور ہم نے ان کے بیچ بیچ نہریں جاری کیں اور اس کی ملکیت میں بہت مقدار پھلوں کی تھی تو اس نے اپنے ساتھی سے کہا جب کہ وہ اس سے گفتگو کر رہا تھا کہ میں تم سے مال میں زیادہ اور آدمیوں کی تعداد میں بھی بڑھا ہوا ہوں اور وہ اپنے باغ میں داخل ہوا اس حال میں کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والا تھا، اُس نے کہا مجھے نہیں گمان کہ یہ کبھی بھی مٹ جائے

---

[1] ۔سندمارق من الدیباج واستبرق ما غلظ منه وفی اٰیة الرحمن: بطائنها من استبرق (جلالین) من سندس واستبرق ای من الدیباج الرقیق والغلیظ وقیل انّ الاستبرق فارسی معرب وقیل هو الدیباج المنسوج من الذهب (مجمع البیان)

اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت آنے والی ہے اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف پلٹایا گیا تو انجام کار اس سے بہتر پاؤں گا،،

ایک مالدار اور ایک غریب دو ساتھیوں کی باہم گفتگو

اس طرح کا تمثیلی انداز انجیل وغیرہ قدیم آسمانی کتب میں بہت زیادہ ہے قرآن مجید نے بھی یہ طریقہ اختیار کیا ہے جو حقیقتوں کے ذہن نشین کرنے کا عمدہ ذریعہ ہے [1] مگر جناب عباسؓ کی یہ روایت ہے کہ یہ بنی اسرائیل میں سے دو ۲ شاہزادوں کی سرگزشت ہے جو وقوع میں آئی تھی اور تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے کہ وہ ایک مالدار صاحب جائداد اور اس کے غریب پڑوسی کا ذکر ہے۔ بہرحال جو مقصد تمثیل ہے، اس میں اس اختلاف نوعیت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿٣٧﴾ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿٣٨﴾ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٣٩﴾ فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿٤٠﴾ اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿٤١﴾

،،کہا اس سے کے ساتھی نے اُس سے گفتگو کے دوران میں کیا تم کفر اختیار کرتے ہو اُس ذات کے ساتھ جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے پھر تمہیں مرد کی صورت میں بنایا، رہا میں، تو وہ اللہ میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ شریک نہیں رہتا، اور کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو کہتے جو اللہ چاہے وہ ہوتا ہے، نہیں طاقت کسی کو سوا اللہ کے سہارے کے۔ اگر تم مجھے دیکھتے ہو کہ میں تم سے مال اور اولاد میں کم ہوں تو بہت ممکن ہے کہ میرا پروردگار مجھے تمہارے باغ سے بہتر عطا کر دے اور اس (باغ) پر آسمان سے بجلیاں [2] بھیج دے جس سے یہ صاف چکنی زمین [3] ہو جائے یا اس کا پانی خشک ہو جائے تو پھر تم کسی طرح اُسے حاصل نہ کر سکو،،

---

[1] ۔ضرب اللہ لعبادہ مثلا یستفیئھم بہ الیٰ طاعتہ و یزجرھم عن معصیۃ و کفران نعمتہ (مجمع البیان)

[2] ۔حسبانا جمع حسبانۃ ای صواعق (جلالین)

[3] ۔زمین بے گیا لغزا انندۂ پائے (شاہ ولی اللہ) زمین پھسلنی (شاہ رفیع الدین)

وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ﴿۴۲﴾ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾

''اور گھیرے میں لے لیا گیا اُس کے پھلوں کو تو ہو گیا وہ اس عالم میں کہ ہاتھ ملتا تھا اُس دولت پر جو اُس نے اس باغ میں صرف کی اور وہ اپنی چھتوں کے ساتھ گرا ہوا تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ کاش میں اپنے پروردگار کے ساتھ شریک قرار نہ دیتا اور نہ تھی اُس کے لیے کوئی جماعت جو اُس کی مدد کرے اللہ کو چھوڑ کر اور نہ خود مدد حاصل کرنے کے قابل تھا۔ اب اس وقت ثابت ہو گیا کہ اختیار فقط اللہ کے لیے ہے جو ایک ثابت حقیقت ہے، وہی بہتر ہے باعتبار ثواب کے اور وہی بہتر ہے بلحاظ انجام کے،،

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''آخر اس کے باغ پر وہی ہوا جو اس نیک کی زبان سے نکلا تھا۔ رات کو آگ لگ گئی آسمان سے سب جل کر ڈھیر ہو گیا۔ مال خرچ کیا پونجی بڑھانے کو وہ اصل بھی کھو بیٹھا'' (موضح القرآن)

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾

''اور ان کے سامنے پیش کیجئے مثال دنیا والی زندگی کی کہ جیسے وہ پانی جسے ہم نے اوپر سے اتارا تو اس کے سبب سے زمین کے نباتات (کثرت کی وجہ سے) ایک دوسرے میں کلا بتو ہو گئے [1] اس کے بعد وہ چورا چورا ہو گئے کہ ہوائیں انہیں ادھر ادھر اڑا رہی ہیں اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

''مال اور اولاد دنیوی زندگی کی رونق ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تمہارے پروردگار کے یہاں ثواب کے لحاظ سے اور بہتر ہیں آسرے کی حیثیت سے''۔

---

[1] ۔ فالتفّ بعضه ببعض حسنا و غضاضة (تبیان و مجمع البیان)

ان آیات میں مال اور اولاد زندگی کی رونق لیکن مآل کی اُمید اعمال سے کا ذکر آیا ہے

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿۴۸﴾

''اور وہ دن کہ جب ہم پہاڑوں کو متحرک بنا دیں گے اور دیکھو گے زمین کو کھلا ہوا صاف اور ان سب کو اکٹھا کر کے لائیں گے تو ان میں سے کسی کو چھوڑا نہیں ہوگا اور وہ پیش کئے گئے ہوں گے تمہارے پروردگار کے سامنے قطار باندھے ہوئے تم ہمارے پاس آئے ہو اسی طرح جیسا کہ ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا ہاں تم نے گمان ایسا کیا تھا کہ ہم ہرگز تمہارے لئے کوئی وعدہ گاہ قرار نہ دیں گے''۔

دیکھو گے زمین کو کھلا ہوا صاف یعنی نہ اس پر کوئی عمارت ہوگی نہ درخت نہ پہاڑ [1] دوسری ان الفاظ میں ارشاد کیا ہے کہ: ''فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾'' چٹیل میدان جس میں کوئی کجی اور ابھار کہیں نظر نہ آتا ہوگا (طٰہٰ: ۱۰۶۔۱۰۷)

اس طرح جیسے پہلے پیدا کیا تھا یعنی بالکل بے کسی اور بے بسی کے عالم میں [2] اور پھر لباس اور سامان زینت سے بالکل بے بہرہ [3] جیسے اس دن تھے کہ جب پہلی دفعہ دنیا میں آئے تھے۔

علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں دونوں مفہوم دو اقوال کی صورت میں درج کئے ہیں۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

''اور زمانہ عمل [4] رکھ دیا گیا ہوگا تو گناہگاروں کو پاؤ گے خوف زدہ اس سے کہ جو اس کے اندر ہے اور کہتے ہوں گے وائے برحال ما، یہ کسی تحریر ہے کہ جو چھوٹی اور بڑی کسی بات کو نہیں چھوڑتی بغیر اس کے کہ اس پر حاوی ہو اور انہوں نے جو کچھ عمل کیا تھا اسے سامنے موجود پایا اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا''۔

قرآن مجید نے طرح طرح اللہ کے افعال میں عدل کے لازمی ہونے کا اعلان کیا ہے مگر اہل سنت کی اکثریت نے بلا وجہ اسے اصول

---

[1] ۔ای ظاھرۃ لیس علیا شیء من جبل او بناء او شجر یترھا عن عیون الناظرین (مجمع البیان)

[2] ۔یعنی جئتم الی الوضع الذی لا یملك الامر فیه الا الله کما خلقنا کم اول مرۃ لا تملکون شیئا (تبیان)

[3] ۔ای فرادیٰ صفاۃ عراۃ عزلاء (جلالین)

[4] ۔یعنی الکتب التی فیھا اعمالھم مثبتۃ (تبیان)

دین سے خارج کر رکھا ہے اس لئے ان آیات کی تشریح میں بڑی زحمت ومشقت اٹھانا پڑتی ہے ایک طرف اپنے تصورات کا دباؤ ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ قادر مطلق ہے وہ جو چاہے کرے اور دوسری طرف خداوند عالم جزاء وغیرہ کو بقدر عمل دینے میں یہ اعلان کرتا ہے کہ اللہ ظلم نہیں کیا کرتا اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو ظلم ہوتا۔ مثلاً نیکوکاروں کو جزاء کے بجائے، سزا دیتا تو ظلم ہوتا، بداعمالوں کو ان کے استحقاق سے زیادہ سزا دیتا تو ظلم ہوتا، بغیر کسی جرم کے کسی کو سزا دیتا تو ظلم ہوتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ قرآن مجید کے آیات اصول اشعریت کو منہدم کرنے والے ہیں مگر انہیں تو اپنی بات نباہنا ہے چنانچہ شاہ عبدالقادر اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

رب جو کرے ظلم نہیں سب اس کا مال ہے ہر ظاہر میں جو ظلم نظر آتا ہے وہ بھی نہیں کرتا، بے گناہ دوزخ میں نہیں ڈالتا اور نیکی ضائع نہیں کرتا اور جو کوئی کہے گناہ میں ہمارا کیا اختیار۔ سو یہ بات نہیں، اپنے دل سے پوچھ لے، جب گناہ پر دوڑتا ہے اپنے قصد سے دوڑتا ہے اور جو کئی کہے قصد بھی اسی نے دیا۔ سو قصد دونوں طرف لگ سکتا ہے اور جو کہے اس نے ایک طرف لگایا۔

سو بندے کی دریافت سے باہر ہے بندے سے معاملت ہے، اس کی سمجھ پر، بندہ بھی پکڑے گا اسے جو اس سے بدی کرے نہ کہے گا کہ اس کا کیا قصور؟ اللہ نے کروایا (موضح القرآن) دیکھتے ہیں آپ اس ژولیدہ بیانی کو؟

قرآن تو بعض باتوں کو صاف کہتا ہے کہ ایسا ہو تو ظلم ہوتا خدا ظلم قرار پاتا اور خدا ظلم سے بری ہے اس لئے وہ ایسا نہیں کرتا اور آپ کہتے ہیں جی نہیں جو بھی وہ کرے وہ حقیقت میں ظلم نہیں ہوگا لیکن ظاہر میں ظلم نظر آئے گا یعنی غلط طور پر اس لئے خدا وہ بھی نہیں کرتا۔

پھر وہاں آکر قصد کو خدا ہی تو ایک طرف لگاتا ہے آپ کہتے ہیں کہ ہے تو ایسا ہی مگر یہ بندے کی دریافت سے باہر ہے اس لئے بندے سے معاملت ہے اس کی سمجھ پر گویا اس بندے کی بے وقوفی سے اللہ فائدہ اٹھاتا ہے کہ تو اپنے کو غلط طور پر ذمہ دار سمجھتا ہے تو لے، میں تجھے سزا بھی دیئے دیتا ہوں حالانکہ واقعاً تو بے قصور ہے وہ تو سب میرا کیا ہوا ہے۔

افسوس اپنی بات نباہنے کے لئے کتنے صاحبانِ علم بے علمی سے اور کیسے سمجھدار لوگ ناسمجھی سے کام لیتے ہیں۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝۵۰

''اور جب کہا ہم نے فرشتوں کے آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا سوا ابلیس کے۔ وہ جنات میں سے تھا تو اس نے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی تو کیا تم لوگ اسے اور اس کی اولاد کو حوالی موالی بناؤ گے مجھے چھوڑ کر؟ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں، کیا بُرا بدل ہے یہ ظالموں کے لئے''۔

شیطان کا جنّات میں سے ہونا اور اس کے لئے نسل کا وجود

یہ آدم کا قصہ حکم سجدہ اور ملائکہ کی اطاعت اور ابلیس کی نافرمانی یہ سب تو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مذکور ہے مگر یہاں جو ایک بڑا

اہم اضافہ ہے وہ یہ ہے کہ:

کان من الجن ففسق عن امر ربہ۔

وہ جنات مین سے تھا تو اس نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی۔

بعض لوگوں نے خواہ مخواہ جن کے لفظ کو معنی لغوی ''پوشیدہ'' یعنی آنکھ سے چھپی ہوئی مخلوق کے معنی میں قرار دے کر فرشتوں پر بھی حاوی کر دیا ہے مگر میرے خیال میں یہاں فرشتوں کے ذکر کے بعد خصوصیت کے ساتھ ابلیس کو کہنا کہ وہ جن سے تھا اور پھر ''ف'' کے ساتھ جس کے معنی فارسی اور پرانی اردو میں پس کے کہے جاتے تھے اور اب ہم اس کا ترجمہ تو کے ساتھ کرتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ جن ملائکہ سے علیحدہ ایک خاص نوع ہے اور قرآن مجید کا درمیان میں یہ صراحت کرنا، درحقیقت اس شبہ کے دفعیہ کے لئے ہے کہ فرشتے تو ہوا و ہوس سے بری ہونے کی وجہ سے طبعاً معصوم ہوتے ہیں۔ پھر ابلیس سے یہ سرتابی ہوئی ہی کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ درحقیقت فرشتہ تھا ہی نہیں بلکہ جنات میں سے تھا اور اسی بنا پر اس سے یہ نافرمانی سرزد ہوئی اور اس بنا پر پہلے پارے میں جو اس واقعہ کے ذکر میں ابیٰ و استکبر کے ساتھ و کان من الکفرین ہے اس کا مطلب بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ ''اس نے انکار کیا اور تکبّر سے کام لیا اور وہ تھا ہی کافروں میں سے'' یعنی اس جماعت میں سے تھا کہ جو پہلے زمین میں کفر اور سرکشی کر چکی تھی اور یہ ایک اپنے انفرادی نیکوکاری کے حق کی بنا پر اس عذاب سے بچ گیا تھا جو اس جماعت پر نازل ہوا۔ اب سجدہ آدم کے سوال پر اس کی وہ طبیعت کفر و سرکشی ابھر آئی اور سجدہ آدم سے انکار کی صورت میں نمایاں ہوئی۔

''کیا برا بدل ہے ظالموں کے لئے'' کہ وہ اطاعت خالق کے بدلے پیروئ شیطان کرتے ہیں۔[1]

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۖ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

''میں نے انہیں سامنے کھڑا نہیں کیا تھا آسمان اور زمین کے پیدا کرتے وقت اور نہ خود ان کی خلقت کے وقت اور میں ایسا نہیں ہوں کہ گمراہوں کو اپنا دست و باز و بناؤں''۔

سامنے کھڑا کرنے کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں ضرورت نہیں تھی کہ ہم اپنے کاموں میں مدد کے واسطے انہیں بلائیں[2] اور ہو سکتا ہے کہ صرف اسرار کائنات سے ان کی ناواقفیت کا اظہار ہو مگر آیت کا تتمہ پہلے مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔[3]

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ

---

[1] ۔معناہ بئس ما لستبدلوا بعبادہ ربّہم و اطاعوا ابلیس عن الحسن و قیل بئس البدل طاعۃ الشیطان من طاعۃ الرّحمٰن عن قتادۃ (مجمع البیان)

[2] ۔قیل معناہ ما اشہدتہم مستغنا بہم (تبیان)

[3] ۔ھٰذا اخبار عن کمال قدرتہ و استغنائہ عن الاعوان و الانصار و یدل علیہ قولہ و ما کنت متّخذ الضلّین عضدا (مجمع البیان)

يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾

''اور وہ دن جب وہ کہے گا کہ پکارو میرے ان شریکوں کو جو تمہارے زعم ناقص میں تھے اس پر انہوں نے پکارا تو انہوں نے ان کی صدا پر لبیک نہ کہی اور ہم نے قرار دیا ان کے درمیان تباہی کا سامان اور دیکھا گنہگاروں نے آگ کو تو اب جانا کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور نہیں پایا انہوں نے اس سے دوری کا کوئی طریقہ''۔

موبقا کے لفظ کے معنی بعض تفاسیر میں جہنم کی ایک وادی کے نام کے طور پر کہے گئے ہیں [۱] مگر اس کے ثبوت کے لئے حدیث کی ضرورت ہے، اس لئے لغوی معنی کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے تباہی کا سامان جو بعض تفاسیر کے مطابق ہے۔ [۲]

تیسری تشریح یہ ہے کہ خندق آگ سے بھری'' (موضح القرآن)

مگر اس کے لئے بھی ثبوت کی ضرورت ہے۔

ایک چوتھی تفسیر اس کی جو ہماری قدیم تفسیر نے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے معنی پردہ کے ہیں۔ [۳]

یہ معنی الفاظ قرآنی سے کچھ زیادہ سمجھ میں آتے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ ان مشرکین اور ان شرکاء کے درمیان ہم نے ایک بڑا پردہ قرار دیا ہے کہ نہ وہ ان کی بات سنتے ہیں اور نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں۔

فَظَنُّوْٓا ء کے لفظی معنی تو ہیں گمان کیا مگر قرآن میں بہت جگہ ظن کا لفظ علم کے معنی میں آیا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ [۴]

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

''اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے طرح طرح سے ہر چیز کی مثال پیش کیا اور انسان جھگڑا کرنے میں ہر چیز سے زیادہ ہے۔

پہلا جملہ تھوڑا سے فرق الفاظ کے ساتھ یا بالکل ایسے ہی الفاظ میں متعدد جگہ قرآن میں آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لئے ہم نے ایک ہی بات کو بار بار مختلف طریقوں اور گوناگوں مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے [۵] اب یہاں آخری فقرہ کا مطلب یہ ہوگا کہ باوجود اتنے انتظام و اہتمام کے آدمی ہے کہ کسی طرح نہیں مانتا اور طرح طرح کی مین میخیں نکالتا ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَاۗءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ

---

[۱] ۔وادیا من اودیة جهنّم یهلکون فیها جمیعا (جلالین) یعنی وادی از وادیہائے دوزخ تابکی بدیگری نتواند رسید (فتح الرحمٰن)

[۲] ۔مهلکا (تبیان) کریں گے ہم درمیان ان کے جائے ہلاکت (شاہ رفیع الدین)

[۳] ۔موبقا ای سترا (علی بن ابراهیم)

[۴] ۔ای علموا فهذا ظن یقین (علی بن ابراهیم) ای ایقنوا (جلالین)

[۵] ۔فقال المعانی فی الجهات المختلفة فی هذا القرآن فتصریف المثل فیه تنقیله فی وجوه البیان علی تمکین الافهام (تبیان)

تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿٥٥﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنْذِرُوا هُزُوًا ﴿٥٦﴾

''اور نہیں مانع ہوا ان لوگوں کو اس سے کہ وہ ایمان لائیں جب کہ ان کے پاس ہدایت آئی اور طلب مغفرت کریں اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سوا اس انتظار کے کہ آئے ان کے سامنے اگلے لوگوں کا طریقہ یا ان کے پاس منہ در منہ عذاب آئے اور ہم نہیں بھیجتے پیغمبروں کو سوا خوش خبری دینے والے اور (عذاب سے) ڈرانے والے کے اور جو کافر ہیں وہ غلط دلائل سے بحث کرتے ہیں تا کہ ان سے حق کو شکست دیں اور انہوں نے بنالیا میری آیات کو اور جو انہیں ڈرایا گیا مذاق''۔

اگلے لوگوں کا طریقہ کیا مطلب؟ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

یعنی کچھ اور انتظار نہیں مگر یہ کہ پہلوں کی طرح ہلاک ہوویں یا قیامت کا عذاب آنکھوں سے دیکھیں (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے:

هی الا هلاك المقدّر عليهم

یعنی وہ ہلاکت جو ان کی تقدیر میں لکھی ہے۔

شیخ الطائفہ تحریر فرماتے ہیں:

من مجيئ العذاب من حيث لا يشعرون او مقابلة من حيث يرون (تبيان)

یعنی پہلوں کے طریقہ سے مراد یہ ہے کہ عذاب اچانک آئے اس طرح کہ انہیں خبر نہ ہو یا اس طرح سامنے آئے کہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔

علامہ طبرسیؒ تقریباً یہی الفاظ لکھتے ہیں۔[1]

اب یہ کہ انہیں ایمان سے مانع صرف یہ انتظار ہے کہ ان پر عذاب ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک سے آئے اس کی تشریح میں علامہ طبرسی فرماتے ہیں کہ:

یہ بطور استعارہ کے ہے یعنی وہ ایمان نہ لانے میں ایسے ہیں جیسے کسی کو انتظار ہو کہ عذاب آئے خواہ اس طرح یا اس طرح، دوسری جگہ کہا گیا ہے:

لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿٢٠١﴾ (شعراء)

---

[1] من تاتيهم العادة فی الاوّلين من عذاب الاستيصال حيث اتاهم العذاب من حيث لا يشعرون او طلب ان يأتيهم العذاب عيانا مقابلة من حيث يرونها (مجمع البيان)

وہ ایمان نہیں لائیں گے جب تک دردناک عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔

حالانکہ یہ وقت وہ ہوتا ہے کہ پھر ایمان لانا سودمند نہیں ہوتا۔

اور پھر مشرکین نے جیسا کہ قرآن مجید میں اور جگہ ہے فرمائشیں بھی ایسی کی تھیں مثلاً

اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾ (انفال)

خداوندا! اگر یہ تیری طرف سے آئی ہوئی واقعی حقیقت ہے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے یا ہماری طرف لا کوئی (اور) بڑا دردناک عذاب۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہوگا اس سے کہ جسے نصیحت کی جائے اس کے پروردگار کی آیات کے ساتھ تو وہ ان سے رو گردانی کرے اور بھول جائے اسے کہ جو اس کے ہاتھوں ہو چکا ہے، بلاشبہ ہم نے ان کے دلوں پر ڈال دیے ہیں پردے اس سے کہ وہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں گرانی کر دی ہے اور اگر نہیں ہدایت کی طرف بلایئے تو اس وقت میں وہ ہدایت قبول نہ کریں گے کبھی''۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾

''اور آپ کا پروردگار بڑا بخشنے والا ہے، رحمت والا اگر وہ انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں گرفت کے اندر لے تو ابھی بھیج دے ان پر عذاب مگر ان کے لئے ایک وعدہ کا دن مقرر ہے کہ نہیں پائیں گے اس سے اور کوئی جائے پناہ''۔

''وعدہ کا دن'' یعنی قیامت کہ اصل مکافات عمل کا دن وہ ہے۔[1]

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿۵۹﴾

''اور یہ ہیں وہ بستیاں جنہیں ہم نے تہس نہس کر دیا جب کہ ان لوگوں نے ظلم وستم سے کام لیا اور قرار دی ہم نے ان کی ہلاکت کے لئے ایک مقررہ معیاد''۔

ظاہر ہے کہ ظلم کا ارتکاب بستیوں کے باشندے کرتے ہیں اور ہلاک بھی وہی کئے جاتے ہیں نہ کہ وہ بستیاں۔ اس لئے بعد میں ضمیریں

---

[1] ۔ هو يوم القيامة والبعث (مجمع البيان)

سب جمع مذکر غائب کی لائی گئی ہیں جو ان بستیوں کے باشندوں کی طرف راجع ہیں۔ [1]

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿٦٠﴾

''اور جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جوان (ساتھی) سے کہ میں سفر جاری رکھوں گا یہاں تک کہ پہونچوں اس جگہ جہاں دو سمندر اکٹھا ہوتے ہیں یا مجھے مدتیں گزر جائیں اس سفر میں''۔

حضرت موسیٰؑ کا سفر اور اس کی درمیانی روئداد

یہاں سے جناب موسیٰ اور خضرؑ کا واقعہ شروع ہوتا ہے۔ یہ سفر کیوں شروع ہوا تھا؟ اس کا پس منظر کیا ہے؟ اس کا ذکر قرآن مجید میں کہہ دیا کہ میں تمام دنیا میں سب سے زیادہ صاحب علم ہوں یہ ایک طرح کا ترک اولیٰ تھا جس پر ان کی تنبیہ کے لئے انہیں جناب خضرؑ کے محل قیام کے طرف بھیجا گیا۔ [2]

یہ جوان کون تھے؟ تفسیر جلالین میں ہے:

یوشع بن نون و کان تبعه و یخدمه ویاخذ منه العلم

یہ یوشع بن نون تھے جوان کے پیچھے پیچھے رہتے تھے اور خدمت کرتے تھے اور ان سے علم حاصل کرتے تھے۔

مگر جناب شیخ الطائفہ نے فرمایا ہے کہ اس میں دو ۲ قول ہیں، ایک تو یہی ہے کہ وہ یوشع بن نون تھے اور دوسرا یہ ہے کہ یوشع کے فرزند تھے (تبیان)

مگر زیادہ تر مفسرین پہلے قول سے متفق ہیں۔ [3]

شاہ عبدالقادر نے لکھا:۔

''یہ جوان فرمایا یوشعؑ کو۔ حضرت موسیٰ کے خادم خاص تھے، پیچھے، ان کے روبرو پیغمبر ہوئے اور ان کے بعد خلیفہ ہوئے،، (موضع القرآن)

کاش شاہ صاحب موصوف یہ بھی بتا دیتے کہ خلافت خدا اور رسول ﷺ کے تقرر سے ہوئی تھی، یا جمہوریت کے اجماع یا شوریٰ سے؟

دونوں دریا کون تھے؟ اس لیے تفسیر جلالین میں ہے:۔

ملتقی بحر الروم و بحر فارس فیما یلی المشرق

مشرق کی سمت سے متصل جہاں دریائے روم اور فارس کا سنگم ہے۔

---

[1] ۔لانّ القریة هی المسکن نحو المدینة و البلدة و هی لا تستحق الهلاك و انّما یستحقّ الهلاك اهلها ۔(مجمع البیان)

[2] ۔سعید بن جبیر عن ابن عباس قال اخبرنی ابی بن کعب قال خطبنا رسول الله ﷺ فقال انّ موسٰی قام خطیبا فی بنی اسرائیل فسئل ایّ النّاس اعلم فقال انا فغضب الله علیه (مجمع البیان)

[3] ۔اکثر المفسرین علیٰ انه موسیٰ بن عمران و فتاه یوشع بن نون (مجمع البیان)

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۫ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۫ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿٦٣﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿٦٤﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

''تو جب دونوں ان دونوں سمندروں کے یکجا ہونے کی جگہ پر پہونچے تو وہ دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے تو اس نے دریا میں ایک سرنگ کی صورت سے اپنا راستا بنا لیا۔ اب جب وہ دونوں آگے بڑھے تو اُنہوں نے اپنے ساتھ والے جوان سے کہا کہ لاؤ ہمارا ناشتہ۔ ہمیں تو اپنے سفر میں بڑی مشقت اٹھانا پڑی۔ اُنہوں نے کہا کیا آپ نے دیکھا تھا جب ہم ایک چٹان کی پناہ لیے ہوئے تھے تو میں مچھلی کو بھول گیا اور نہیں بھولا یا مجھے اس کے ذکر کو مگر شیطان نے اور اس نے عجیب طریقہ سے راستا دریا میں بنا لیا، کہا یہی تو منزل ہے وہ جس کے طلب گار تھے تو وہ پلٹے اپنے نقشِ قدم کو ڈھونڈھتے ہوئے تو اُن دونوں نے پایا ہمارا بندوں میں سے ایک بندہ کو جسے ہم نے اپنی طرف سے خاص رحمت کے ساتھ نوازا اور اُسے ہم نے اپنی طرف سے علم عطا کیا،،

حضرت موسیٰؑ کا سفر اور اس کی درمیانی روئداد

جو لوگ مظاہر قدرت کی اعجوبہ آفرینی کے منکر ہیں، وہ معلوم نہیں ان آیات کے کیا معنی کہتے ہیں؟ لیکن قرآن صاف طور پر اس واقعہ کو عجیب کہہ کے بیان کر رہا ہے۔ اس لیے اُسے عجیب تو ماننا ہی پڑے گا۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''وہاں پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سو رہے اور یوشع دریا سے وضو کرنے لگے۔ انکی مچھلی زندہ ہو کر دریا میں نکل پڑی اور پانی میں بیٹھ گئی۔ وہاں طاق سا کھلا رہ گیا، ان کو دیکھ کر تعجب ہوا، چاہا کہ جب موسیٰؑ جاگیں تب ان سے کہیں۔ وہ جاگے تو دونوں آگے چل کھڑے ہوئے۔ یہ کہنا بھول گئی،، (موضح القرآن)

صورت واقعہ میں اصل بھول جناب یوشعؑ کی ظاہر ہوتی ہے۔ معیت کی بنا پر اُس کی نسبت دونوں کی طرف دی گئی:

آخر میں جناب موسیٰؑ کا یہ کہنا ہے کہ 'یہی تو وہ منزل ہے جس کے ہم طلب گار تھے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ خالق کی طرف سے اس ہستی کے جائے قیام کا جس سے ملاقات کے لیے حضرت موسیٰؑ کے لیے جا رہے تھے، پتہ یہی دیا تھا اور شاید یہ علامت بتائی گئی تھی کہ جس جگہ کو چیز تمہاری

نذر طاقِ نسیاں ہوجائے، وہیں وہ شخص ملے گا جس کی طلب میں ہم تم کو بھیج رہے ہیں۔ [1]

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰي مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿٦٨﴾ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿٦٩﴾ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿٧٠﴾

''ان سے موسیٰ نے کہ کہا کہ کیا میں آپ کا پیرو ہوں اس اقرار پر کہ آپ اُس علم سے جو آپ کو ملا ہے مجھے بھی صحیح راستے کی تعلیم دیجئے انہوں نے کہا تم میرے ساتھ صبر و برداشت سے کام نہیں لے سکو گے اور کیوں کر تم صبر و تحمل سے کام لوگے اس چیز پر جو تمہارے اطلاع کے دائرہ میں نہیں ہے انہوں نے کہا عنقریب اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر و تحمل کرنے والوں میں پائیے گا۔ اور میں کسی بات میں آپ کی عدول حکمی نہ کروں گا۔ انہوں نے کہا اچھا اگر تم میرے پیرو بنتے ہو تو مجھ سے کسی بات کا پوچھنا نہیں۔ جب تک میں خود اس کا تذکرہ تم سے نہ چھیڑوں۔

حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کی ابتدائی گفتگو

حضرت خضرؑ کا قول کہ ''صبر و برداشت سے کام نہ لے سکو گے'' قدرت کی نفی نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ان افعال کی تہہ تک نہ پہنچنے کی بنا پر انہیں غلط سمجھ کر بالارادہ ان پر اعتراض کرنا ان کا جناب خضرؑ کے نزدیک یقینی تھا جیسا کہ بعد میں وقوع میں آیا اور یہ اس بنا پر تھا کہ حضرت موسیٰؑ اسباب ظاہری پر عمل کرنے ہی کا منصب رکھتے تھے اور جناب خضرؑ خاص طور پر اللہ کی جانب سے باطنی حقیقتوں کے علم کے حامل اور اس کے تقاضا پر عمل کے پابند بنائے گئے تھے۔ [2]

غالباً یہی اس حدیث کا مقصد ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی وارد ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا معیار علم وہ تھا جو الواح توریت میں قلم بند تھا اور جناب خضرؑ کو وہ علم عطا ہوا تھا جو توریت میں نہیں تھا۔ [3]

آغاز سفر اور خضرؑ کا کشتی میں سوراخ کرنا اور پھر ایک لڑکے کو قتل کر دینا

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ

---

[1] ۔قال قتادة قيل لموسیٰ علیہ السلام اية لقياك اياه ان تنسیٰ بعض متاعك (تبیان)

[2] ۔انّما قال له ذٰلك لانّ موسیٰ كان يأخذ الامر على ظواهرها و الخضر كان يحكم بها علمه الله من بواطن الامر فلا يسهل على موسیٰ مشاهدة ذٰلك (تبیان)

[3] ۔قال الصّادق علیہ السلام كان عنده علم لم يكتب فى الالواح و كان موسیٰ يظنّ انّ جميع الاشياء الّتى يحتاج اليها فى تابوته و انّ جميع العلم ما كتب له فى الالواح. (مجمع البیان)

لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا ﴿۷۱﴾ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿۷۳﴾ فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾

تو وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب کشتی پر بیٹھے تو انہوں نے اس میں سوراخ کر دیا انہوں نے کہا کیا آپ نے اس میں سوراخ کر دیا اس لئے کہ آپ اس کے بیٹھنے والوں کو ڈبو دیں؟ یہ تو آپ نے بڑی سنگین بات کی انہوں نے کہا میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر و تحمل سے کام نہیں لو گے۔ مجھ سے مواخذہ نہ کیجئے ایسی بات پر جو مجھ سے بھولے سے ہوا اور نہ کیجے مجھ پر میری اس بات پر زیادہ سختی اس کے بعد پھر دونوں آگے بڑھے یہاں تک کہ جب ان دونوں کو ایک لڑکا ملا تو ان صاحب نے اسے قتل کر دیا۔ انہوں نے کہا کیا آپ نے ایک پاک جان کو بغیر کسی دوسری جان کے بدلے قتل کر دیا آپ نے بہت بُرا کام کیا۔

پھر دونوں آگے بڑھے یعنی کشتی سے اترے اور اب خشکی پر روانہ ہوئے۔ [1]

ان آیات میں آغاز سفر اور خضرؑ کا کشتی میں سوراخ کرنا اور پھر ایک لڑکے کو قتل کر دینے کا ذکر آیا ہے۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾

''انہوں نے کہا کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر و تحمل نہیں کر سکو گے؟ یہ کہنے لگے کہ اگر اس کے بعد اب میں کسی چیز کے متعلق آپ سے پوچھوں تو مجھے اپنی صحبت میں نہ رکھیے گا، بے شک آپ پہنچ گئے ہیں میری طرف سے معذوری کی حد تک؟

باتیں جو آنکھوں کے سامنے آتی تھیں، وہ تاب صبر باقی نہیں رکھتی تھیں اور بے ساختہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بول اٹھتے تھے۔ پہلی مرتبہ انہوں نے بھول کا عذر کیا اور ایک دفعہ کی بھول پر معافی کی درخواست کی کہ اگر اس دفعہ آپ نے مجھے اپنی صحبت سے جدا کر دیا تو یہ بڑی سختی ہوگی۔ گویا اس دفعہ کی ماعفی کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے مگر جب پھر ایسا ہی ہوا تو اب لجاجت کا انداز پیدا ہو گیا اور اب یہ اقرار کر لیا کہ بس اس دفعہ اور معاف کر دیجئے۔ اس کے بعد پھر اگر ایسا ہو تو آپ مجھ سے علیحدگی اختیار کر لیجئے گا۔'' آپ معذوری کی حد تک پہنچ جائیں گے یعنی میرے لئے عذر کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

شاہ عبدالقادر نے اس کے متعلق حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں جن سے مقصود ممکن ہے یہی ہو مگر یہ الفاظ بظاہر ادائے مطلب سے قاصر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''پوچھنا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھول کر ہوا اور دوسرا اقرار کرنے کو اور تیسرا رُخصت کو'' (موضح القرآن)

---

[1] ۔معناہ فخرجا من البحر فانطلقا یمشیان فی البرّ (مجمع البیان)

ان الفاظ سے ایسا پتہ چلتا ہے جیسے دوسرا اور تیسرا پوچھنا بھول کر نہیں بلکہ ارداۃً تھا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام جان کر ایسی صورت پیدا کر رہے تھے کہ انہیں ساتھ چھوڑنا پڑے مگر ظاہر ہے کہ قرآنی انداز بیان اس کے مطابق نہیں ہے جب کہ اتنی زحمت ومشقت کے ساتھ وہ انتہائی ذوق سے جناب خضر علیہ السلام سے استفادہ علمی کرنے کے آئے تھے اور اس کے لئے اقرار کیا تھا کہ وہ کچھ پوچھیں گے نہیں تو پھر وہ اب جان کر ایسی صورت کیوں پیدا کرتے کہ ان کا ساتھ چھوٹ جائے؟

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝ قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝

''اس کے بعد دونوں آگے بڑھے یہاں تک کہ ایک بستی والوں کے پاس پہنچے جہاں کے باشندوں سے انہوں نے کچھ کھانے کے لئے مانگا تو انہوں نے انکار کیا اس سے کہ وہ اُن کی مہمان داری کریں تو انہوں نے وہاں ایک دیوار پائی جو گرا چاہتی تھی .....اُسے بنا کر سیدھا کھڑا کر دیا۔اُنہوں نے کہا کہ آپ چاہتے تو اس کام کا کچھ معاوضہ لے لیتے، انہوں نے کا بس اب میری اور تمہاری جدائی ہے۔اب میں تمہیں بتلائے دیتا ہوں حقیقت اُن باتوں کی جن پر تم صبر وتحمل سے کام نہ لے سکے''۔

جنہوں نے کھانا کھلانے سے انکار کیا ان کے یہاں کی دیوار کی بلا معاوضہ تعمیر:

سابق میں شاہ عبدالقادر کے کلام سے ضمنی طور پر جو مفہوم پیدا ہوا تھا، اُسے اُنہوں نے یہاں صاف ظاہر کر دیا ہے، وہ کہتے ہیں:

''اب کے موسیٰ علیہ السلام نے جان کر پوچھا رخصت ہونے کو، یہ سمجھ لیا کہ یہ عالم میرے ڈھب کا نہیں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم وہ تھا جس میں پیروی کرے خلق تو اُن کا بھلا ہو۔حضرت خضر علیہ السلام کا علم وہ کہ دوسرے کو اُس کی پیروی ہی نہ آوے''۔(موضح القرآن)

حالانکہ وہ اگر اس ارادہ سے پوچھتے تو وہ یہ کہتے کہ بس جناب! اب مجھے آپ کے ساتھ نہیں رہنا ہے لیکن ایسا انہیں ہے، انہوں نے تو جیسے پہلے اعتراض کیا تھا، حسب عادت اب بھی ساختہ اعتراض کر دیا۔اس پر اُن کے اس سے پہلے اس اقرار کے مطابق کہ اگر اب ایسا ہو تو مجھے الگ کر دیجیے گا، جناب خضر علیہ السلام نے کہا کہ بس اب میری اور تمہاری جدائی ہے۔

پھر یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو ان افعال کو ایک بلا وجہ کا یا غلط کام سمجھ رہے تھے چنانچہ پہلی دفعہ صاف کہا: لقد جئت شیئاً امراً ''یہ آپ نے برا کام کیا'' دوسری دفعہ کہا: لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ''آپ نے بری بات کی ہے'' تیسری دفعہ اُن کے عمل کو بلا وجہ کی زحمت سمجھ رہے تھے تو ابھی ان افعال کے علمی پہلوؤں کا اندازہ کہاں ہوا تھا جو وہ سمجھتے کہ یہ علم ان کے ڈھب کا نہیں ہے۔علم کا پہلو تو اُس کے بعد نمایاں ہوا ہوا ہے جب حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ان تمام افعال کے وجوہ واسباب بتائے۔اس کے بعد جناب موسیٰ علیہ السلام یہ طے کر سکتے تھے کہ یہ علم اُن کے ڈھب کا

ہے یا نہیں۔

پھر اگر وہ اس علم کو اپنے لئے بے کار سمجھ لیتے تو خالق کا وہ مقصد جو اس سفر کے کرانے سے تھا کہ اُنہیں محسوس ہو کہ مجھ سے بڑھ کر عالم اس روئے زمین پر موجود ہیں، پورا کیوں کر ہوتا۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿٧٩﴾ وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿٨٠﴾ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٨٢﴾

”وہ کشتی تھی، وہ کچھ غریبوں کی تھی جو دریا میں کام کرتے تھے تو میں نے چاہا کہ اُسے ناقص بنا دوں اور اُدھر ایک بادشاہ ہے جو ہر (ثابت) کشتی پر زبردستی قبضہ کر لیتا ہے اور وہ جو لڑکا تھا اس کے ماں باپ مومن ہیں تو ہمیں خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ اُن دونوں کو سرکشی اور کفر میں مبتلا کر دے گا تو ہم نے چاہا کہ اُن کا پروردگار انہیں بدلے میں اس کے عطا کرے ایک ایسا لڑکا جو اس سے بہتر ہو پاکیزگی میں اور اس سے بڑھ کر صبر و محبت میں اور وہ دیوار جو تھی تو وہ اس شہر کے دو ۲ یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے ایک دفینہ تھا اُن دونوں کے لئے اور ان کا باپ نیک آدمی تھا۔ تو تمہارے پروردگار نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کی منزل تک پہنچیں اور خود نکالیں اپنے دفینہ کو، تمہارے پروردگار کی مہربانی سے اور یہ میں نے خود اپنی طرف سے نہیں کیا۔ یہ ہے وضاحت اُس کی جس پر صبر و تحمل نہ کر سکے“۔

جناب خضر علیہ السلام کی طرف سے حقیقتوں کا اظہار

”یہ میں نے خود اپنی طرف سے نہیں کیا“ گزشتہ تمام باتوں سے متعلق ہو سکتا ہے۔[1] یعنی یہ تمام اعمال میرے بحکم الٰہی تھے اور اس کے بعد یہ سوال ختم ہو جاتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچہ کی جان کیوں لی؟ میں نے کبھی کبھی اُس کے جواب میں کہا کہ ملک الموت تو ہر لمحہ کتنوں کی جان لے لیا کرتے ہیں۔

---

[1] ای ما ذکر من خرق السفینة وقتل الغلام واقامة الجدار (جلالین)

اصل یہ ہے کہ جو خالق جان ہے، وہ اپنی حکمت و مصلحت کی بناء اس جان کا علاقہ اس جسم سے قطع کرتا ہے تو کسی کو اس میں اعتراض کی کیا گنجائش ہے، جیسے ملک الموت اُس کی مشیت کی تکمیل کا ذریعہ ہوتے ہیں ویسے ہی جناب خضر علیہ السلام مشیت الٰہی کی تکمیل کا ذریعہ تھے اس میں کسی کو چوں و چرا کا کیا حق ہے!

اور اگر یہ فقرہ بس آدمی جز یعنی دیوار بنانے سے متعلق ہو تو اس فقرہ کا مطلب یہ ہے جو شاہ عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے:

''یعنی جو کام خدا کے حکم سے ہو اور اس کا کرنا ضروری ہو، اُس پر مزدوری نہیں ملتی'' (موضح القرآن)

قرآن مجید کی لفظ موسیٰ علیہ السلام سے عام معلومات کی بناء پر تصور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام ہی کا ہوتا ہے مگر جناب شیخ الطائفہؒ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ بن عمران نہیں بلکہ بنی اسرائیل میں ایک اور بزرگ موسیٰ بن میشا تھے۔ یہ واقعہ ان سے متعلق ہے۔ اس قول کے نقل کے بعد لکھا ہے: واللہ اعلم بذٰلك۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ قول ایسا نہیں ہے جو بالکل نا قابل لحاظ ہو بلکہ اس کی وجہ سے شخصیت کسی حد تک مشتبہ ہو جاتی ہے مگر علامہ طبرسیؒ نے ابن اسحاق کے حوالہ سے اس کی نسبت اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کی طرف دی ہے اور خود اس سے اختلاف کیا ہے اُسی تبادر کی بناء پر جسے ہم نے لکھا ہے۔ [1]

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝۸۳

''اور وہ لوگ آپ سے ذوالقرنین کے متعلق دریافت کرتے ہیں، کہیے کہ میں ابھی ان کا کچھ تذکرہ تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں''۔

قصۂ ذوالقرنین کی ابتداء:

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''یہ بھی یہود کے سکھانے سے مکّہ کے لوگ پوچھتے تھے پیغمبر کے آزمانے کو جیسے اصحاب کہف کا احوال۔ اس بادشاہ کو ذوالقرنین کہتے ہیں، اس واسطے کہ دنیا کے دونوں سروں پر پھر گیا تھا مشرق اور مغرب پر بعضے کہتے ہیں یہ لقب سکندر کا ہے، بعضے کہتے ہیں کہ کوئی بادشاہ پہلے گزرا ہے'' (موضح القرآن) تفسیر جلالین میں ہے: اسمه الاسکندر ولم یکن نبیّا: اس کا نام سکندر ہے اور پیغمبر نہ تھا۔

''ذوالقرنین کے ساتھ وجہ تسمیہ میں شاہ صاحب نے جو لکھا ہے، یہ ایک قول ہے جسے جناب شیخ الطائفہؒ نے پانچ قولوں کے آخر میں درج کیا ہے، پہلے چار قول یہ ہیں:

(۱) ان کے سر پر دو سینگوں کی شکل والی ایک چیز تھی۔

(۲) ان کے سر پر دونوں جانب تلوار پڑی تھی۔

(۳) ان کے دو گیسو تھے۔

(۴) قرنی الشمس یعنی آفتاب کے طلوع و غروب کے نقطوں کا انہوں نے مشاہدہ کیا جس کا ذکر یہیں پر قرآن مجید میں موجود ہے۔

---

[1] الذی علیه الجمهور انّه موسیٰ بن عمران وان اطلاقه یو جب صرفه الیٰ موسیٰ ابن عمران کما ان اطلاق محمّد ینصرف الیٰ نبینا ﷺ (مجمع البیان)

علامہ طبرسیؒ نے ان کے علاوہ بھی کچھ اقوال نقل کیے ہیں، ان کے یہاں ایک بیش قیمت اضافہ ہے کہ انہوں نے اس قول کی تائید میں کہ ان کے سر پر دو مرتبہ ضربت پڑی تھی، حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی طرف منسوب ایک حدیث بھی درج کی ہے۔[1]

ان کا نبی ہونا ہمارے یہاں بھی کوئی طے شدہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس علوی حدیث کا ظاہری یہی ہے کہ وہ پیغمبر نہ تھے، صرف اللہ کے ایک نیک بندے تھے مگر آئندہ الفاظ قرآنی سے ہمارا یہ رجحان ظاہر ہوگا کہ اُن سے جناب ذوالقرنین کے نبی ہونے کا ہی استفادہ ہوتا ہے۔

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۭ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَاۗءَۨ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾

''ہم نے اُسے زمین میں اقتدار عطا کیا، اور اسے ہر چیز کے لئے ذریعہ عطا کیا، تو اُس نے ایک ذریعہ سے کام لیا یہاں تک کہ جب وہ پہنچا سورج کے ڈوبنے کی جگہ تو پایا اُسے کہ وہ ڈوبتا ہے ایک مٹیالے چشمے میں اور اس کے پاس ایک قوم کو پایا۔ ہم نے کہا کہ اے ذوالقرنین! یا تو تم سزا دو اور یا اُن سے حسن سلوک کا طریقہ اختیار کرو۔ اس نے کہا کہ جو کوئی ظالم ہوگا اور جو ایمان لائے گا اور نیک اعمال کرے گا اسے اچھا صلہ ملے گا اور اپنے معاملہ میں ہم اس کے لئے آسانی کریں گے''۔

سبب کے لفظی معنی رسّی کے بھی ہوتے ہیں اور جس پر کوئی اثر مرتب ہو، اسے بھی سبب کہتے ہیں۔ بہرصورت ذریعہ کی لفظ کے ساتھ اس کا ترجمہ درست ہے جس پر سب تفسیریں منطبق ہوتی ہیں۔[2]

''زمین میں اقتدار عطا کیا اور ہر چیز کا ذریعہ دیا''۔ یہاں تک تو صرف بادشاہت ہی سمجھ میں آتی ہے لیکن بعد کے الفاظ کہ ہم نے ان سے یوں کہا اور انہوں نے یہ جواب دیا، ان سے بظاہر نبوت ثابت ہوتی ہے۔ جناب شاہ ولی اللہ صاحب نبوت کے منکر ہیں۔ اس لئے انہوں نے اسے تخاطب اور اس کے جواب پر محمول کرنے کے بجائے یہ کہا ہے کہ: ''ایں کنایت است از قدرت او بریں دو کار'' (فتح الرحمن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ارشاد کہ ''ہم نے کہا کہ خواہ تم سزا دو یا معاف کرو'' یہ کہنا زبان حال سے ہے یعنی اس کے ہاتھ میں یہ دونوں

---

[1] عن علی بن ابی طالب علیہ السلام انه کان عبدا صالحا احبت الله واحبته الله وناصح الله وناصحه الله امر قومه بتقوی الله فضربوه علیٰ قرنه ضربة بالسیف فغاب عنهم ما یشاء الله ثمّ رجع الیهم فدعاهم الی الله فضربوا علیٰ قرنة الاٰخر بالسیف فذلك قرناه (مجمع البیان)

[2] سببا طریقا یوصل الی مراده (جلالین) یقال للطریق الی الشئ سبب وللحبل سبب وللباب سبب (تبیان) از هر چیز سامانی (شاه ولی الله) ہر چیز سے راہ (شاہ رفیع الدین)

باتیں تھیں تو گویا اس سے کہہ رہی تھی کہ چاہے یوں کرو یا یوں کرو۔اس صورت میں وہ جواب بھی لفظی نہیں ہوگا بلکہ عملی ہوگا یعنی اس نے رویہ ایسا اختیار کیا کہ جو مجرم اور گنہگار رہوتا تھا، اس کے ساتھ وہ سختی کرتا تھا لیکن جو مومن اور نیکوکار ہوتے تھے، ان کے ساتھ وہ حسن سلوک کرتا تھا۔الفاظ قرآنی کا ظاہری مفہوم یہ نہیں لیکن اگر دلائل عقلی یا نقلی مجبور کریں تو تاویل کی جاسکتی ہے اور چونکہ ہمارے علم میں کوئی عقلی ونقلی دلیل نبوت ذوالقرنین کے خلاف نہیں ہے، اس لئے بلاضرورت تاویل کے کوئی معنی نہیں۔

شاہ عبدالقادر بھی یہاں اپنے والد ہی کے نقشِ قدم پر چلے ہیں۔چنانچہ وہ لکھتے ہے کہ:

''اس کو یہ کہا یعنی دونوں بات کی قدرت دی۔ہر بادشاہ کو ہر حاکم کو قدرت ملتی ہے، چاہے خلق کو ستاوے، چاہے اپنی خوبی کا ذکر جاری رکھے''۔(موضح القرآن)۔لیکن جلالین نے قلنا یا ذوالقرنین کے ساتھ لکھا ہے: بالھام یعنی یہ پیغام الہام کے ذریعہ سے پہنچایا۔اس کے بعد بھی نبوت ضروری نہیں ہے، ہاں ایک مرد صالح ہونا ان کا ظاہر ہوگا، جوان کے کردار سے بھی، جو قرآن نے اس آیت کے آخر میں پیش کیا ہے، ظاہر ہے۔علاّمہ طبرسیؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ نبّوت کے قائل ہیں، وہ ارشاد ربانی کو اس وحی کی طرح مانتے ہیں جو انبیاء پر ہوتی ہے اور منکر نبوت ہیں ،وہ وحی کے معنی الہام کے سمجھتے ہیں ، جیسا کہ مادرِ موسیٰ کے لئے آیا ہے وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى ہم نے مادرِ موسیٰ کی طرف بھیجی''۔(قصص.۷) بہرصورت ہم اپنا خیال پہلے لکھ چکے ہیں کہ الفاظِ قرآنی اُسی طرح کی گفتگو کو بتاتے ہیں جو انبیاء سے ہوتی ہیں اور نفی نبوت ذوالقرنین کی اب تک کوئی دلیل میری نظر سے نہیں گزری۔اس لئے ظاہر قرآن سے عدول کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

ہاں اب ارشادِ الٰہی کی نوعیت پر غور کرنا ہے۔یہ ارشاد کہ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا حکمِ تکلیفی تو ہو نہیں سکتا کہ خالق کی طرف سے دونوں باتیں جائز قرار دی جارہی ہوں کیوں کہ مطلق تعذیب کسی قوم کی بلاتفریق گنہ گار و بے گناہ خالق کی جانب سے جائز نہیں ہوسکتی۔اب اگر اس کے معنی صرف خبر کے سمجھے جائیں کہ تم کو دونوں باتوں کی قدرت حاصل ہے تو اس میں کوئی افادیت نہ ہوگی جب تک ایک کڑی مضمر نہ مانیں جو میرے خیال میں ظاہر ہے۔اس لئے اس کے اضمات میں کوئی حرج نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ کہنے کے ساتھ کہ ان دونوں باتوں کی تمہیں قدرت حاصل ہے، خالق انتباہ فرماتا ہے کہ اب تمہارا امتحان ہے اور دیکھنا ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔جنابِ ذوالقرنین علیہ السلام کا جواب بھی اس سے بالکل مرتبط ہے۔''آفتاب مٹیالے چشمے میں ڈوبتا ہے، یہ سائنس اور فن ہیئت وریاضی کے لحاظ سے مشکل چیز ہے۔اس لئے شاہ ولی اللہ نے اس کے تحت میں یہ فقرہ لکھا ہے''یعنی بحسب نظر مردمان''۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسی حقیقت واقعہ کا اظہار نہیں ہے بلکہ سورج کے ڈوبنے کی جو شکل آنکھوں کو نظر آتی ہے، وہ یہی ہے کہ پانی میں ڈوبتا ہے جس کا سمندر کا سفر کرنے والے جہاز پر سے برابر مشاہدہ کرتے ہیں۔تفسیر جلالین میں بھی یہی ہے کہ:

غروبها فی العین فی رأی العین، والّا فهی اعظم من الدّنیا

پانی میں اس کا ڈوبنا آنکھ کے مشاہدہ مین ہے ورنہ حقیقت میں تو وہ اس دنیا سے بڑا ہے۔جناب شیخ الطائفہؒ نے بس دو قول نقل کر دیئے ہیں، خود کچھ نہیں فرمایا ہے، مگر شاہ عبدالقادر صاحب جو لکھ رہے ہیں، اس کا مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آتا، وہ فرماتے ہیں: مغرب کی طرف اُس جگہ پہنچا کہ دلدل تھی۔نہ گزر آدمی کا، نہ کشتی، اللہ کے ملک کی حد نہ پاسکا''(موضح القرآن) مگر قرآن تو یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ وہ مٹیالے چشمے تک پہنچ کر رہ گئے ہیں۔وہ تو کہہ رہا ہے کہ اُنہوں نے سورج کو پایا مٹیالے چشمے میں ڈوبتا ہوا۔اس پر شاہ صاحب کی تفسیر کہاں منطبق ہوتی ہے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾

''پھر اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا، یہاں تک کہ جب وہ سورج نکلنے کی جگہ تک پہنچا تو پایا اُسے کہ وہ نکلتا ہے ایک ایسی قوم پر کہ نہیں رکھا ہے ہم نے اُن کے لئے اس سے کوئی پردہ۔ ایسا ہی تھا اور ہم جو کچھ اُس کے پاس ہے، اُس پر حاوی ہیں''۔

''نہیں رکھا ہے ہم نے اُن کے لئے اُس سے کوئی پردہ'' اس کے ذیل میں شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''شاید وہ لوگ جنگلی سے ہوں گے کہ گھر بنانا اور چھت ڈالنا ان میں دستور نہ ہوگا'' (موضح القرآن) تفسیر جلالین میں ہے:

هم الزنج..... ارضهم لا تحمل بناء ولهم سروب يغيبون فيها عند طلوع الشمس و يظهرون عند ارتقاعها۔

یہ قومِ زنج کے لوگ تھے۔ ان کی سرزمین کسی عمارت کو برداشت نہیں کرسکتی اور اُن کے یہاں سرنگیں ہوتی تھیں کہ سورج نکلنے کے وقت وہ اُن میں داخل ہوجاتے تھے اور جب سورج بلند ہوتا تھا تو وہ نکل آتے تھے۔ تبیان میں شیخ طوسیؒ کا بیان بھی اسی کے مطابق ہے، حالانکہ یہ الٹی بات معلوم ہوتی ہے۔ اگر تمازت آفتاب سے بچتا ہے تو سورج اونچے ہونے کے بعد سرنگوں میں داخل ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کہ پہلے جس کے قلم سے یہ الفاظ نکلے اس نے غلطی سے عند غروبہا کے بجائے عند ارتقاعہا لکھ دیا، پھر یہ غلطی رواں ہوگئی۔ علامہ طبرسیؒ فرماتے ہیں:

معناه انه لم يكن بها جبل ولا شجر ولا بناء لانّ ارضهم لم يكن يثبت عليها بناء فكانوا اذا طلعت الشمس يغورون فى المياه والاسراب واذا غربت تصرفو فى امورهم.(مجمع البيان)

اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سرزمین پر پہاڑ نہ تھے اور نہ کوئی درخت اور نہ کوئی عمارت، اس لئے کہ اُن کی زمین پر کوئی عمارت قائم نہیں ہوسکتی تھی تو جب آفتاب نکلتا تھا تو وہ پانیوں میں اور سرنگوں کے اندر چلے جاتے تھے اور جب ڈوبتا تھا تو اپنے کاموں میں مصروف ہوتے تھے۔

اس کے بعد ابوبصیر کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے درج کی ہے کہ انہیں گھر بنانے کا فن نہیں آتا تھا چنانچہ ہماری قدیم تفسیر میں بھی یہی ہے کہ لم يعلمو اصنعه البنا یعنی اُنہیں تعمیر کا کام آتا نہیں تھا (علی ابن ابراہیم)

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾

''پھر ایک اور راستہ اختیار کیا یہاں تک کہ جب وہ اُن دونوں رکاوٹ والی دیواروں کے بیچ میں پہنچا تو اُن دنوں کے اُدھر ایک قوم کو پایا جو تقریباً کوئی بات سمجھتے ہی نہیں تھے۔ اُنہوں نے کہا اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج

دنیا میں فساد کرنے والے ہیں تو کیا ہم آپ کے لئے کچھ رقم مقرر کر دیں اس شرط پر کہ آپ ہمارے اور اُن کے بیچ میں ایک رکاوٹ کی دیوار بنا دیجئے''۔

یاجوج وماجوج کا ذکر:

پہلی جو رکاوٹ والی دیواروں کا ذکر ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ کوئی مصنوعی قسم کی دیواریں نہیں بلکہ وہ ''دو آڑ دو پہاڑ تھے اُس ملک میں'' (موضح القرآن) یہ تفسیر جلالین سے ماخوذ ہے کہ اُس میں لکھا ہے:

جبلان بمنقطع بلاد الترك سدّ الاسكندر ما بينهما (جلالين)

یہ دو پہاڑ تھے ترکوں کے شہر کے ختم ہونے پر جن کے بیچ کے راستے کو سکندر نے بند کر دیا

جناب شیخ الطائفہؒ کا بیان بھی اس کے مطابق ہے جس کے لئے صدرِ اسلام کے مفسرین کا انہوں نے حوالہ دیا ہے۔

هما الجبلان الذّان جعل الرّدم ما بينهما في قول ابن عباس وقتادة والضحاك (تبيان)

وہ دو پہاڑ تھے جن کے درمیان دیوار اٹھائی گئی، یہ ابن عباس، قتادہ اور ضحاک کا قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ رکاوٹیں اُس وقت وجود نہیں رکھتی تھیں بلکہ ان رکاوٹوں کا ذکر اس جگہ کے تعارف کے طور پر ہے یعنی اُس جگہ پہنچے جہاں اس کے بعد رکاوٹ کے لئے دو دیواروں کی تعمیر ہوئی، اگر یہ رکاوٹ اُس وقت موجود ہوتی تو وہ یہ خواہش ہی کیوں کرتے کہ رکاوٹ کے لئے دیوار بنا دیجئے۔[1]

قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْۤ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾

''اُنہوں نے کہا جو مجھے اللہ نے وسعت عطا کی ہے وہ بہتر ہے، بس تم جسمانی طاقت کے ساتھ میری مدد کرو تو میں تمہارے اور اُن کے درمیان ایک موٹی دیوار بنا دوں گا۔ لاؤ میرے پاس لوہے کے ٹکڑے یہاں تک کہ جب اُنہوں نے دونوں پہاڑوں کے درمیانی حصّہ کو برابر کر لیا، کہا کہ پھونکو اس میں یہاں تک کہ جب اُسے آگ بنا دیا تو کہا کہ لاؤ میں اس پر ڈالوں پگھلا تانبا تو وہ اس پر چڑھ نہیں سکے اور نہ اُس میں سوراخ کر سکے''۔

دیوار کے بنانے کی ترکیب جو قرآن نے بتائی ہے، اس کی تشریح شاہ عبدالقادر یوں لکھتے ہیں:

''اوّل لوہے کے بڑے بڑے تختے بنائے، ایک پر ایک دھرتا گیا کہ دونوں پہاڑوں کے برابر ملا دیا، پھر تانبا پگھلا کر اس کے اوپر سے ڈالا اور وہ درزوں میں بیٹھ کر جم گیا، سب مل کر ایک پہاڑ سا ہو گیا'' (موضح القرآن)

---

[1] قيل اراه بالسّدّين الموضع الّذي فيه السّدان اليوم لانّه لو كان هناك سد لم يكن لطلبهم السّدّ معنى (مجمع البيان)

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

''انہوں نے کہا یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے تو جب میرے پروردگار کی طرف مقرر کردہ میعاد ہو جائے گی تو وہ اسے صاف چٹیل میدان [1] کر دے گا اور میرے پروردگار کا وعدہ سچا ہے''۔

مقرر کردہ میعاد کے معنی یہی سمجھے گئے کہ اس سے قیامت مراد ہے اور اس دیوار کا ٹوٹنا یاجوج و ماجوج کا نکلنا علاماتِ قیامت میں سے قرار پا گیا ہے، ترتیب بیان قرآن کے لحاظ سے اس کے بعد نفخ صور کا ذکر اس خیال کی تقویت کا باعث ہے۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾

''اور اس دن ہم انہیں چھوڑ دیں گے ایک دوسرے کے ساتھ تھپیڑے مارتے ہوئے اور صور پھونک دیا جائے گا تو اُن سب کو پورے طور پر ہم اکٹھا کر دیں گے اور اُس دن دوزخ کو کافروں کے سامنے پورے طور پر لے آیا جائے گا، جن کی آنکھیں میری یاد سے پردہ میں رہیں اور وہ سن نہیں سکتے تھے''۔

''اُس دن ہم انہیں چھوڑ دیں گے تھپیڑے مارتے ہوئے''۔ اس میں دو احتمال ہیں یہ بھی کہ وہ بیچ کی رکاوٹ دور ہو جائے گی، تو یاجوج و ماجوج اپنی کثرت تعداد کے ساتھ تھپیڑے مارتی ہوئی سمندر کی لہروں کی طرح چاروں طرف پھیل جائیں گے اور یہ بھی کہ تمام دوسری مخلوق باہمی اختلافات و تصادمات سے اُس وقت اس عالم میں ہوگی۔ [2]

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

''تو کیا انہوں نے کہ جو کافر ہیں ایسا ہی سمجھتا ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو سرپرست بنائیں؟ بلاشبہ ہم نے کافروں کی مہمانی کے لئے دوزخ کو تیار کر رکھا ہے''۔

ایک تفسیر کے لحاظ سے ''نُزُلًا'' کے معنی ''مُنزل'' کے ہوتے ہیں۔ [3] مگر دوسری تفسیر وہ ہے جس کے مطابق میں نے ترجمہ کیا ہے [4]

---

[1] ای مدکوکا... تربابالارض من قولهم نافة دكاء لاسنام لها (تبیان)

[2] ترکنا یاجوج وماجوج یوم القضآء امر السّدّ یموجون فی الدّنیا مختلطین لکثرتهم وقیل انّهه ارادسائر الخلق۔ (مجمع البیان)

[3] ای ماوی ومنزلا (تبیان)

[4] ای هی معدّة لهم کالنزّل المعدّ للضّعیف (جلالین)

اسے علامہ طبرسیؒ نے بطور نقلِ قول کے درج کیا ہے۔[1] مگر میرے نزدیک وہ محاورۂ عرب سے زیادہ قریب ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿۱۰۵﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾

''کہیے کیا ہم تم لوگوں کو بتائیں کہ اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ گھاٹے میں کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں اکارت گئی حالانکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے اعمال کر رہے ہیں، یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیات اور اُس کی بارگاہ میں حاضری کا انکار کیا تو اُن کے اعمال اکارت گئے۔ اب ہم روزِ قیامت اُن کا کوئی وزن نہ سمجھیں گے۔ یہ ان کی سزا ہے۔ دوزخ، اس کی وجہ سے کہ اُنہوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے پیغمبروں کا مذاق اڑایا''۔

اس زمانہ کے بعض مفکّرین کے اس تصور کا جو کافی پھیلتا جاتا ہے کہ نجات کے لئے اعمال کافی ہیں عقائد چاہے جو بھی ہوں، ذرا ان آیات کو سامنے رکھ کر جائزہ لیجئے۔ یہ اعمال جن کے اکارت ہونے کا ذکر قرآن کر رہا ہے، کیا فسق و فجور کی قسم کے برے اعمال ہیں؟ یہ تو ہیں باعث سزا۔ ان کے اکارت ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ جی یہ اعمال جن کا ذکر قرآن کر رہا ہے، بڑے اچھے اچھے کام ہیں اور اس لئے ان کے کرنے والے ان پر حسن انجام اور جزاء کے امیدوار ہیں مگر کفر و انکار کی بنا پر قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ ان اعمال کی کوئی جزاء نہیں ہوگی بلکہ انجام عذاب دوزخ کی صورت میں سامنے آئے گا اور اس لئے ان کو سب سے زیادہ خسارے میں کہا جا رہا ہے۔ اگر اعمال نیک کیے ہی نہیں تو خسارہ کا ہے کا؟ سرمایہ فراہم کیا ہی نہیں، خسارہ تو یہ ہے کہ پوری عمر ریاضت اور بخیالِ خود عبادت اور خدمت خلق وغیرہ میں گزاری مگر نتیجہ میں وہ سب بے کار ہوا اور اس کا ثمرہ کچھ نہیں ملا۔

اُمم سابقہ میں اس کی مثال میں یہود و نصاریٰ کے تارک الدّنیا عابدوں کو کہا گیا ہے اور اس امّت میں اس کی نمایاں مثال خوارجِ نہروان تھے جن زہدہ تقویٰ اور عبادت و ریاضت کو شہرہ آفاق مثالی حقیقت حاصل تھی مگر نص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق ان کا اسلام سے کوئی لگاؤ نہیں رہ گیا تھا۔[2] مگر یہ حکم ان جماعتوں سے مخصوص نہیں ہے، ہر شخص کو اپنے گرد و پیش میں بخیال خود عبادت میں غیر معمولی مشقتیں اٹھانے والے ملیں گے۔ آپ کو ان پر کتنا ہی ترس آئے کہ افوہ، اتنی محنت یہ کرتے ہیں اور یہ بربادی ہوگی، مگر کیا کیا جائے کہ جو ثواب عطا کرنے والا ہے، اُس نے

---

[1] قیل معناہ انّا جعلنا جھنم معدّۃ مھیّا للکافرین عندنا کما یھیا النزّل للضّعیف (مجمع البیان)

[2] قیل انّھم الیھود والنّصاری و قیل انّھم الرّھبان منھم وروی عن امیر المؤمنین علیہ السلام انہ قال ھم اھل حروراء من الخوارج فسالہ ابن الکواء عن ذلك فقالا بنت و اصحابك منھم (تبیان) روی العیاشی باسنادۃ قال قام ابن الکواء الیٰ امیر المؤمنین علیہ السلام سالھم عن اھل ھذہ الایۃ فقال اولئك اھل الکتاب کفروا بربّھم و ابتدعوا فی دینھم فحبطت اعمالھم وما اھل النّھر منھم ببعید یعنی الخوارج (مجمع البیان)

اپنے ثواب کو جس شرط کے ساتھ مقید کر دیا ہے وہ ان میں مفقود ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾

''یقیناً وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے، اُن کے لئے سامان مہمانی میں فردوس کے بہشت ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہاں سے منتقل ہونا نہ چاہیں گے''۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿١٠٩﴾

''کہیے کہ اگر سمندر روشنائی ہو جائے تو میرے پروردگار کے کلموں کے لئے تو سمندر ختم ہو جائے قبل اس کے کہ میرے پروردگار کے کلمے ختم ہوں، چاہے ہم ویسا ہی ایک اضافہ کے لے آئیں''۔

یعنی ایک سمندر کے ختم ہونے پر دوسرے سمندر کا اُس میں اضافہ بھی کر دیا جائے تو وہ کلمات رب کے لکھنے کے لئے کافی نہ ہوگا۔ کلماتِ الٰہی سے کیا مراد ہے؟ اس کے لئے علّامہ طبرسیؒ نے متعدد اقوال نقل کیے ہیں مگر کوئی بھی معصوم کی طرف مستند نہیں ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿١١٠﴾

''کہیے کہ میں تو بس تمہاری طرح ایک انسان ہوں (ہاں ایسا) جس کی طرف یہ پیغام آئے کہ تمہارا خدا ایک اکیلا خدا ہے، تو جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی امید رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ نیک اعمال انجام دیتا رہے اور اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے''۔

اس آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام بشریت کو بیان کیا گیا ہے۔

سُوْرَةُ مَرْيَمِ

مکیّہ.....۹۸.....آیات

اگر چہ جناب مریم سلام اللہ علیہا کا تذکرہ قرآن مجید کے دوسرے سوروں میں بھی آیا ہے مگر جتنی تفصیل کے ساتھ اس سورہ میں ذکر ہوا ہے کہیں نہیں ہے۔اس لئے اس سورہ کا نام ان خاتونِ معصومہ کی طرف نسبت کے ساتھ ہوگیا۔اس کے علاوہ اس سورہ میں جو مضامین درج ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

سورۂ مریم کے خاص خاص مضامین:

۱.....جناب زکریا علیہ السلام کی دعا،اس کی قبولیت اور جناب یحییٰ علیہ السلام کی ولادت۔

۲.....حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اوصاف وکمالات کے تذکرہ کے ساتھ ان کے ابن اللہ ہونے کی رو۔

۳.....حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ اور اپنے منہ بولے باپ سے گفتگو

۴.....حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر

۵.....جناب اسماعیل علیہ السلام صادق الوعد کا ذکر جو اس سورہ کے مختصات میں سے ہے۔

۶.....جناب ادریس علیہ السلام کا ذکر اور ان کی عالم بالا میں رفعت کا ذکر،یہ بھی بس اسی سورہ میں ہے۔

۷.....باغہائے بہشت کے اوصاف

۸.....اثبات معاد

۹.....دوزخ کی طرف سے عمومی طور پر گزر۔یہ بھی اسی سورہ میں ہے۔

۱۰.....ثبوت شفاعت

۱۱.....یہ کہ اللہ کے لئے اولاد کا تصوّر شان الوہیت کے خلاف ہے۔

۱۲.....ایک خاص اوصاف بلند رکھنے والی جماعت کی محبت فرض قرار دیے جانے کا پیشگی اعلان،جس کا نفاذ آیۂ مودّت سے ہوا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

كٓهٰيٰعٓصٓ ① ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ② اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ③ قَالَ

رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِیًّا ﴿۴﴾ وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ﴿۵﴾ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۗ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ﴿۶﴾

''کاف۔ہا۔یا۔عین۔صاد۔ذکر ہے آپ کے پروردگار کی رحمت کا اپنے بندے زکرّیا پر، جب کہ انہوں نے اپنے پروردگار کو چپکے چپکے پکارا۔کہا اے میرے پروردگار! یقیناً میرا عالم یہ ہے کہ میری ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں اور سر میں بڑھاپے سے شعلے بھڑک اٹھے ہیں اور میں تجھ سے اے میرے پروردگار! دعا کر کے بے نصیب تو (کبھی) نہیں رہا ہوں، اور بلاشبہ میں اپنے عزیزوں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔اب تو ہی عطا کر مجھے اپنی طرف سے ایک وارث جو میرا اترکہ پائے اور یعقوب کی اولاد کا ترکہ پائے اور اسے اے میرے پروردگار! اپنی پسند کے قابل بنا؟''

جناب زکریا علیہ السلام کی دعا اور میراث انبیاء کا ثبوت:

آخری فقرہ آیت کا انہیں یاد رکھنا چاہیے جو ایک ساختہ و پرداختہ حدیث کے معتقد ہیں کہ:

نحن معاشر الانبیآء لانرث ولا نورث: ہم گروہ انبیاء نہ کسی کا ورثہ پاتے ہیں اور ہمارا ورثہ کسی کو ملتا ہے۔

اگر ایسا ہوتا تو حضرت زکرّیا علیہ السلام اپنی دعا میں ترکہ کا ذکر زبان پر کیوں لاتے؟ اور کہا جائے کہ ترکہ سے مراد علم ہے [1] تو علم کیا چرانے یا غصب کرنے کی چیز ہے جو اس کے متعلق دور کے عزیزوں سے کوئی اندیشہ ہو؟ یہ اندیشہ صاف اس کا ثبوت ہے کہ وہ ترکہ از قبیل اموال اور اگر کہا جائے کہ یہ اندیشہ تخریب دین کا ہے [2] تو دین کی حفاظت کے لئے انہی کے ہاں اولاد ہونے کی کیا ضرورت ہے؟! اسکے لئے کوئی شخص اس نبی سے خاندانی تعلق نہ رکھتا ہو اور نظرِ خالق میں ان اوصاف کا حامل ہو، مبعوث ہو سکتا ہے اور دین کی حفاظت کر سکتا ہے۔

چونکہ جناب زکرّیا خود بھی نبی ہیں اور جس فرزند کے پیدا ہونے کے لئے دعا ہے، وہ بھی نبی ہوگا، تو یہ آیت دونوں جزوؤں کو خود ساختہ حدیث کے باطل کر دیتی ہے یعنی یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی وارث ہوتا بھی ہے اور دوسرے کو اس کی میراث پہنچتی بھی ہے اور چونکہ جو سچی حدیث ہو وہ قرآن کے خلاف کبھی نہیں ہو سکی، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ وہ حدیث غلط ہے جو صرف دخترِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو باپکی میراث سے محروم کرنے کے لئے وضع کی گئی تھی۔

ہمارے قدیم اکابر علماء و مفسرین نے بھی اس آیت کو اس باب میں مرکز استدلال قرار دیا ہے،

چنانچہ شیخ الطائفہؒ فرماتے ہیں:

---

[1] العلم و النبوّۃ (جلالین)

[2] خفت الموالی علی الدّین ان یضیّعوہ (جلالین)

فی الاٰیة دلالة علی انّ الانبیآء یورثون المال بخلاف ما یقول من خالفنا انّهم لایورثون لان زکریّا صرّح بدعائه و طلب من یرثه و یحجب بنی عمّه و عصبته من الولد و حقیقة المیراث انتقال ملك المورث الیٰ ورثه بعد موته بحکم الله و حمل ذٰلك علی العلم و النبوّة علیٰ خلاف الظّاهر لانّ النّبوة والعلم لا یورثان لانّ النّبوّة تابعة للمصلحة لامدخل النّسب فیها و العلم موقوف علی من یتعرض لهه و یتعلمه علی انّ زکریا انّما سأل ولیّا من ولده یحجب موالیه من بنی عمّه من المیراث و ذٰلك لایلیق الّا بالمال لانّ النبوة و العلم لا یحجب الولد غیره بحال علی ان اشتراطه ان یجعله رضیّا لایلبق بالنبوة لان النّبیّ لایکون الّا مرضیّا معصوما فلا معنی لمسئلته ذٰلك و لیس کذلك المال لانّه یرثه الرضی و غیر الرضی.(تبیان ج۔۵ص۶۔۱)

یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ انبیاء کی میراث مال میں ورثہ کو ملتی ہے برخلاف ہمارے مخالفین کے جن کا قول یہ ہے کہ ان کی میراث ورثہ کو نہیں ملتی، اس لئے کہ جناب زکریا نے اپنی دعا میں صراحت کی ہے اور خواہش کی ہے ایسے فرزند کی جو ان کا وارث ہو اور چچازاد بھائیوں اور دوسرے ان کے عزیزوں کو محجوب کردے۔ اور میراث کی حقیقت مورث کے مال کا منتقل ہونا ہے اس کے ورثہ کی طرف، اس کے مرنے کے بعد حکم الٰہی سے اور اسے محمول کرنا علم اور نبوّت پر ظاہر الفاظ قرآنی کے خلاف ہے اس لئے کہ نبوت اور علم میں میراث نہیں ہوتی کیونکہ نبوّت تو مصلحت کی پابند ہے، اس میں کسی رشتہ کا دخل نہیں ہے اور علم مخصوص ہوتا ہے، اس شخص سے جو اس کا درپے ہو اور حاصل کرے۔ اس کے علاوہ زکرّیا نے طلب کیا ہے ایک وارث اپنی اولاد میں سے جو ان کے دور کے عزیزوں کو جو بنی اعمام میں سے ہیں، میراث سے محروم کردے اور یہ بات مال ہی کے لئے ہوسکتی ہے کیوں کہ نبوّت اور علم میں اولاد کو دوسروں کو محجوب نہیں کرتی کسی صورت میں بھی پھر اُن کا شرف لگانا کہ اللہ اُسے پسند کے لائق بنائے، نبوّت کے ساتھ سازگار نہیں ہے، اس لئے کہ نبی تو ہوتا وہی ہے جو پسندیدۂ خالق اور معصوم ہو تو اس کے طلب کرنے کے کوئی معنی نہیں لیکن مال ایسی چیز نہیں ہے، اس کا وارث پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر ایک ہوسکتا ہے۔

اس کو ذرا بدلے ہوئے الفاظ میں علامہ طبرسیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مجمع البیان میں لکھا ہے۔

یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ یَحْیٰی ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّا ۝۷ قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِیًّا ۝۸ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَیْـًٔا ۝۹ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ۝۱۰

''اے زکریا علیہ السلام ہم تمہیں خوش خبری دیتے ایک لڑکے کی جس کا نام یحییٰ علیہ السلام ہے جس کا ہم نے اس کے پہلے کوئی ہمنام قرار نہیں دیا ہے، کہا اے میرے پروردگار! لڑکا میرے کہاں ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی انتہائی حد تک پہنچ چکا ہوں؟ کہا یوں ہی ہوگا تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ وہ مجھ پر آسان ہے

اور میں نے تمہیں اس کے پہلے پیدا کیا جب کہ تم کچھ تھے ہی نہیں۔ کہا پروردگار! میرے لئے کوئی نشانی قرار دے۔ کہا تمہارے لئے نشانی یہ ہے کہ تم لوگوں سے تین دن بات نہ کرو گے"۔

ولادت جناب یحییٰ علیہ السلام کی بشارت:

ان آیات میں جو مضمون ہے، وہ پہلے آچکا ہے اور وہاں ہم نے انسانی نفسیات کی اس بوقلمونی پر روشنی ڈالی ہے کہ خود ہی تو جناب زکریّا علیہ السلام دعا کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کو خدا کی قدرت کے لحاظ سے امر ممکن سمجھتے ہیں اور جب خدا کی طرف سے بشارت ملتی ہے تو اظہارِ تعجب کرنے لگتے ہیں کہ یہ کیوں کر ہوگا اور پھر اطمینان قلب کے لئے اللہ سے نشانی چاہتے ہیں کہ یہ امر خارقِ عادت یعنی استقرارِ عمل ہو تو میں اس نشانی سے سمجھ سکوں اور خالق نشانی یہ قرار دیتا ہے کہ اُس وقت تین دن تم ذکر الٰہی کے سوا کوئی بات نہ کر سکو گے۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۱۱﴾

"تو وہ عبادت گاہ سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے تو انہیں اشارہ سے کہا کہ صبح و شام تسبیح کرتے رہا کرو"۔

یعنی جب استقرار حمل ہوا تو وہ آیت الٰہی ظاہر ہوئی اور اب اُنہوں نے قوم سے جو گفتگو کی تو زبان سے نہیں بلکہ بس اشارہ سے بعض مفسرین کا قول ہے کہ انہوں نے زمین پر لکھ کر اس بات کو پہنچایا۔[1] میں اسے اس لئے قابل قبول سمجھتا ہوں کہ یہ پوری بات فقط اشاروں میں ادا نہیں ہو سکتی۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے یہاں عجیب و غریب بات لکھی ہے کہ:

چوں یحییٰ متولد شد و دو سالہ گشت (فتح الرحمٰن) جب یحییٰ پیدا ہوئے اور ان کی عمر دو برس کی ہوئی، یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ بچہ کی دو سال عمر ہونے کے بعد یہ بات کیوں پیدا ہوئی؟ میرا خیال یہ ہے کہ یہ حاشیہ غلطی سے اس آیت کے ساتھ درج ہو گیا ہے۔ وہ حقیقتاً اس کے بعد کی آیت سے متعلق جیسا کہ تفسیر جلالین میں زیر تحریر آیت کے تحت میں تو یہ لکھا ہے کہ:

فعلم منعه من كلامهم حملها بيحيىٰ

کلام سے قدرتی طور پر روک دیئے جانے سے وہ سمجھے کہ اُن کی زوجہ کے شکم میں یحییٰ کا حمل قائم ہو گیا ہے۔

اور اس کے بعد آئندہ آیت کی تمہید کے طور پر لکھا ہے:

وبعد ولادته بسنتين قال تعالىٰ يا يحيىٰ خذ الكتاب---- الخ

اور ان کی ولادت کے دو برس کے بعد ارشاد الٰہی ہوا، اے یحییٰ! لو قانون خداوندی کو-------

اب تو دل یہ کہتا ہے کہ وہ کتاب کی غلطی نہ تھی بلکہ جناب شاہ صاحب نے جلالین کو سامنے رکھ کر یہ حاشیہ لکھا ہے بغیر عقل و ذہن سے کام لئے ہوئے صرف ترجمہ کے طور پر تو جلالین کے اس فقرہ کو جو کہ آیندہ آیت سے متعلق تھا، انہوں نے آنکھ بند کر کے قبل کی آیت سے مرتبط قرار دے دیا۔ اس صورت میں اسے "خطائے بزرگان" کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

---

[1] اشار اليهم واولىٰ بيده وقيل كتب لهم فى الارض عن مجاهد (مجمع البيان)

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿۱۲﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِيًّا ﴿۱۳﴾ وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾

''اے یحییٰ! لو قانون خداوندی کو [1] طاقت کے ساتھ اور ہم نے اسے بچپنے ہی میں علم وحکمت عطا کیا اور مہر ومحبت اپنی طرف سے اور نیک نامی اور وہ پرہیز گار تھا اور نیک سلوک کرنے والا اپنے ماں باپ کے ساتھ اور وہ نافرمان سرکش نہیں تھا اور سلام ہے اس پر جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ دنیا سے اٹھے گا اور جس دن وہ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھایا جائے گا''۔

جناب یحییٰ علیہ السلام کے اوصاف:

اس کے قبل والی آیت کے ذیل میں بعض مفسرین کی یہ تشریح آچکی ہے کہ جب یحییٰ علیہ السلام دو برس کے تھے، اس وقت وہ منصب نبوت پر مامور ہوئے بعض نے تین برس لکھے ہیں۔ [2]

اس کے برخلاف شاہ عبدالقادر رکھتے ہیں: ''یعنی باپ ضعیف تھے اور یہ جوان تھی'' (موضح القرآن)

مگر جوان کو عربی میں صبی نہیں کہا جاتا۔

یا یحییٰ کے لفظ کے ساتھ جو خطاب ہے، وہ بوقت تخاطب کوئی لفظی خطاب نہیں تھا بلکہ حکم کُنْ کی طرح ارادہ الٰہی کی لفظی تعبیر ہے اور اس لئے اس کے ساتھ کسی لفظ کے مقدّر ماننے کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین یا مترجمین قرآنی الفاظ میں اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہیں۔ [3]

حناناً مّن لّدُنّا ''مہر ومحبت ہماری طرف سے'' وزکوٰۃ'' اس لفظ کے معنی میں اختلاف ہوا ہے بعض نے اُس کی تفسیر طہارت و پاکیزگی کے ساتھ کی ہے۔ [4] اور بعض نے اسے اس زکوٰۃ سے لیا ہے جو خیرات کی قبیل سے ہوتی ہے یعنی ان کی ذات اللہ کی طرف سے بندوں پر ایک خیرات کی حیثیت رکھتی تھی [5] اور تیسری تشریح یہ ہے کہ اس کا مفہوم وہ ہے جس کے لحاظ سے قرآن میں ہے: فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ یعنی اپنے آپ کو سراہو نہیں [6] (نجم: ۳۲)

---

[1] یعنی التورۃ الّتی انزلتہا علی موسیٰ (تبیان)

[2] صبیّا ابن ثلث سنین (جلالین)

[3] گفتیم اے یحییٰ (شاہ ولی اللہ)

[4] طہارت نفس (شاہ ولی اللہ) پاکیزگی (شاہ رفیع الدین)

[5] صدقۃ علیہم (جلالین)

[6] ای لاتزکّیناہ بحسن الثناء علیہ کما یزکّی الشہود الانسان (تبیان)

ہم نے جو ''نیک نامی'' کے ساتھ ترجمہ کیا ہے، وہ اس تشریح کے لحاظ سے ہے۔

علّامہ طبرسیؒ نے اس بارے میں متعدد مین کے پانچ قول نقل کیے ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾

''اور یاد کرو کتاب میں سے مریم علیہ السلام کو جب انہوں نے اپنے گھر والوں سے الگ مشرق کی جانب ایک گوشہ میں جا کر اُن کی طرف سے پردہ ڈال لیا تو ہم نے ان کی طرف اپنی جانب سے روح (فرشتے) کو بھیجا تو وہ ان کے سامنے بالکل آدمی کی صورت میں نمودار ہوا۔ انہوں نے کہا میں خدائے رحمٰن سے مانگتی ہوں پناہ تجھ سے اگر تو خوف خدا رکھتا ہو۔ اس نے کہا میں کوئی اور نہیں، تمہارے پروردگار کی طرف کا بھیجا ہوا ہوں کہ تمہیں ایک پاکیزہ فرزند عطا کروں۔ انہوں نے کہا میرے فرزند کہاں سے ہوگا حالاں کہ مجھے کسی انسان نے چھوا تک نہیں ہے اور میں بدکار نہیں ہوں۔ اس نے کہا ہاں یونہی ہوگا۔ تمہارے پروردگار نے کہا کہ وہ میرے لئے آسان ہے اور یہ اس لئے کہ ہم اُسے لوگوں کے لئے ایک معجزہ قرار دیں، اور اپنی طرف کی رحمت کا ثبوت اور یہ بالکل طے شدہ چیز ہے۔''

تذکرہ جناب مریم سلام اللہ علیہا اور ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تفصیلی حال:

فرشتے کے آنے کے موقع پر جلالین نے اچھا حاشیہ دیا ہے: بعد لبسها ثيابها ''جب وہ اپنے کپڑے پہن چکیں''۔

یہ فرشتوں کی شان پارسائی کے بھی لائق ہے اور جناب مریم علیہا السلام کی شان احترام کے بھی مطابق۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾

''تو وہ حاملہ ہوگئیں اُس (بچہ) کے ساتھ تو وہ اس کے سبب سے ایک دور جگہ پر گوشہ نشین ہوگئیں۔ اس کے بعد دردزہ انہیں کھجور کے درخت کے تنہ کے پاس لے گیا۔ انہوں نے کہا کاش میں مرجاتی اس کے پہلے اور بالکل نیست و نابود ہوگئی ہوتی''۔

عام طور پر موت کو ''باب نَصَرَ یَنْصُرُ'' سے لیا جاتا ہے اس طرح اس کا ماضی ومضارع مات یموت ہوتا ہے اور قرآن مجید میں یہ لفظ اس طرح کئی جگہ موجود ہے مثلاً: وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَی اللّٰہِ تُحْشَرُوْنَ (سورہ آل عمران۔۱۵۸)۔اس کے اعتبار سے یہاں جناب مریم علیہا السلام کے قول میں یالیتنی کے ساتھ مُتُّ کا لفظ ہونا چاہیے تھا مگر یہاں بغیر کسی اختلاف قرأت کے مِتُّ (میم کے کسرہ کے ساتھ) ہے۔

تعجب ہے کہ مفسرین جو لغت ونحو وصرف پر خاص توجہ رکھتے ہیں، یہاں پر خاموش ہیں۔بہرحال قرآن مجید کے دو طرح استعمال کرنے سے لازماً پتہ چلتا ہے کہ کلامِ عرب میں یہ لفظ دونوں طرح استعمال ہوا کرتے تھے۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّیْٓ اِلَیْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَیْكِ رُطَبًا جَنِیًّا ﴿۲۵﴾

تو اس نے انہیں آواز دی اُن کے نیچے سے کہ رنجیدہ نہ ہوئیے آپ کے پروردگار نے آپ کے نیچے ایک نہر پیدا کی ہے اور اپنی طرف کر کے حرکت دیجیے کھجور کی شاخ کو تو وہ گرانے لگے گی آپ پر تر وتازہ کھجوریں''۔

''اُس نے انہیں آواز دی'' کس نے؟ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں: "طفل یا جبرئیل واللہ اعلم"

ان کے بیٹے شاہ عبدالقادر نے تعیین کے ساتھ لکھا ہے: ''یہ آواز دی فرشتے نے'' (موضح القرآن)

جلالین نے بھی یہی لکھا ہے: ای جبرئیل کان اسفل منها: یعنی جبرئیل، جو اس جگہ سے جہاں وہ تھیں، نیچے تھے''

مگر ہماری قدیم تفسیر پہلے خیال کی مؤیّد ہے [1] اور شیخ الطائفہؒ نیز علّامہ طبرسیؒ نے بغیر ترجیح دونوں قول نقل کر دیئے ہیں۔

فَكُلِیْ وَاشْرَبِیْ وَقَرِّیْ عَیْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا ﴿۲۶﴾

''تو کھائیے، پیجئے اور آنکھیں خنک رکھیے، اس کے بعد اگر کسی آدمی کو دیکھیے تو کہیے کہ میں نے خدائے رحمٰن کے لئے چپ رہنے کی منّت مانی ہے تو میں آج کسی آدمی سے بات نہیں کروں گی''۔

''آنکھیں خنک رکھیے'' عربی کا محاورہ ہے جس کا ترجمہ لفظی تو یہی ہوگا مگر مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ خوش دل اور بے فکر رہیے۔اس کے بعد ہدایت یہ ہوتی ہے کہ ''کسی آدمی سے بات نہ کیجیے اور یوں کہیے'' تو بغیر بات کیے ہوئے کہنے کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ اشارہ سے ایسا ظاہر کیجیے کہ آپ نے چپ کا روزہ رکھا ہے۔یہ روزہ امم سابقہ میں رائج تھا جیسا کہ ہندوؤں میں بھی اب موجود ہے اور گاندھی جی رکھا کرتے تھے۔مگر اسلام میں اس قسم کے روزہ کا حکم منسوخ ہوگیا ہے، اس لئے شریعت اسلام میں اس طرح کی منّت بھی جائز نہیں ہے اس میں فرق اسلامی کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔چنانچہ شاہ عبدالقادر بھی لکھتے ہیں کہ:

''اُن کے دین میں یہ منّت درست تھی کہ بولنے کا بھی روزہ رکھتے۔ہمارے دین میں یہ منّت درست نہیں'' (موضح القرآن)

---

[1] فناداها عیسٰی (علی بن ابراهیم)

بے شک ایک سوال یہاں حل طلب یہ ہے کہ صورت حال سے ظاہر ہے کہ جناب مریم سلام اللہ علیہا نے ایسی کوئی منّت مانی نہیں تھی۔ اگر مانی ہوتی تو وہ خود ہی ایسا کہتیں۔ اس ہدایت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پھر ان کی یہ ہدایت کہ یوں کہنا کیا خلافِ واقعہ ایک بات اظہار کی ہدایت نہ ہو گی؟

اس صورت میں یا یہ سمجھا جائے کہ ان کو یہ ہدایت ضمناً اس بات کی ہدایت بھی ہے کہ اس طرح نذر ابھی کرلو[1] اور یا یہ سمجھا جائے کہ خطرات میں جیسے جناب مریم علیہا السلام کو درپیش تھے، اس طرح کے ''مصلحت امیز'' اظہار کی اجازت کی ہے جو اصول تقیہ کے مطابق بالکل درست ہے۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾ يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ
مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا
كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ۖ اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ
وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا ﴿۳۰﴾ وَّجَعَلَنِىْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَاَوْصٰنِىْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ
مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِىْ ۫ وَلَمْ يَجْعَلْنِىْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَىَّ يَوْمَ
وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾

''تو وہ اس (بچہ) کو گود میں اٹھائے اپنی قوم کی طرف لائیں۔ انہوں نے کہا اے مریم علیہ السلام! یہ تم نے بہت بُرا کام کیا ہے۔ اے ہارون کی بہن! تمہارے باپ برے آدمی نہ تھے اور نہ تمہاری ماں ہی بدکار تھیں۔ اس پر انہوں نے اُس بچہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ انہوں نے کہا ہم اُس سے کس طرح بات کریں جو ابھی گہوارے میں ہے۔ اس نے کہا میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور مجھے برکت والا قرار دیا ہے جہاں بھی میں ہوں اور مجھے مامور کیا ہے نماز اور زکوٰۃ پر، جب تک کہ میں زندہ رہوں اور نیک سلوک رکھنے والا اپنی ماں کے ساتھ اور مجھے اس نے بدنصیب، سرکش نہیں بنایا ہے اور اسلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں دنیا سے اٹھوں گا اور جس دن میں دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ابن اللہ ہونے کی رد:

''اے ہارون کی بہن''۔ اس تخاطب میں اختلاف ہے بعض مفسرین کہتے ہیں کہ ہارون سے مراد وہی حضرت ہارون علیہ السلام یعنی حضرت

---

[1] قال الجبائی: کان اللہ تعالیٰ امر بانّ ننذر تہ تعالیٰ الصّمت فاذا کلمھا احد قومی بانّھا نذرت صوما صمنا لانّہ لا یجوز ان یامرھا بانّھا نذرت ولم تنذر لانّ ذلک کذب (تبیان)

موسیٰ علیہ السلام کے بھائی مراد ہیں اور جناب مریم سلام اللہ علیہا انہی جناب ہارون سلام اللہ علیہا کی اولاد سے تھیں اور اُخت ھٰرون کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قبیلۂ ہارون کی ایک خاتون چونکہ عرب میں بنی تمیم کو تمیم اور بنی جرہم کو جرہم کہا جاتا ہے اسی طرح بنی ہارون کو ہارون کہا گیا ہے۔ [1]

اور بعض کے خیال میں یہ ہارون کوئی اور شخص ہے۔ اب وہ شخص کیسا تھا؟ ایک خیال یہ ہے کہ وہ کوئی بہت نیک آدمی تھا اور اُس کی طرف نسبت دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم جواب تک نیکی میں ہارون کی ایسی تھیں [2] اور تمہارے باپ ماں بھی اچھے اور پارسا لوگ تھے، اب تم نے یہ کیا کیا ہے؟ اور بعض کا تصور یہ ہے کہ یہ ہارون بہت برا آدمی تھا اور جناب مریم سلام اللہ علیہا کو انہوں نے اخت ھٰرون بزعم خود ان کے اس عمل کی برائی کے لحاظ سے کہا ہے۔ ہماری قدیم تفسیر اس کے مواقع ہے۔ [3]

علّامہ طبرسیؒ نے بھی یہ تمام اقوال بغیر کسی تصفیہ کے درج کر دیے ہیں اور جب کوئی مستند تشریح اسکی معصومین علیہم السلام سے ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے تو اس کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے؟

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٣٤﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ
يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٣٥﴾ وَاِنَّ
اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٣٦﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ
بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿٣٧﴾ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ
يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٨﴾

”یہ ہیں مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام، سچی بات میں وہ خواہ مخواہ شک کرتے ہیں۔ اللہ کیلئے یہ سزاوار نہیں کہ وہ بیٹا اختیار کرے۔ پاک ہے اُس کی ذات، جب وہ کوئی فیصلہ کرتا ہے تو وہ بس اس کیلئے کہتا ہے ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے اور یقیناً میرا اور تمہارا پروردگار اللہ ہے تو بس اُسی کی عبادت کرو۔ یہ صاف سیدھا راستہ ہے۔ اس پر ان جماعتوں نے اختلاف کر رکھا ہے تو وائے ہوں گے اور یہ سننے والے اُس دن جب ہمارے پاس آئیں گے مگر ظالم لوگ آج کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں“۔

اس پر ان جماعتوں نے آپس میں اختلاف کر رکھا ہے“ یعنی عیسائیوں کے مختلف فرقے اور مسلمان، سب کی الگ الگ باتیں ہیں۔ کوئی خدا کہتا ہے، کوئی خدا کا بیٹا، کوئی تین میں ایک اور اس سب کے برخلاف مسلمانوں کا قول ہے کہ وہ اللہ کے ایک خاص بندے ہیں اور بس۔ [4]

---

[1] قال السدی نسبت الیٰ ھارون اخی موسیٰ علیہ السلام لانّھا کانت من ولدہ کما یقال یا اخا بنی فلان (تبیان)

[2] ھو رجل صالح ای یا شبیھتہ فی العفّۃ (جلالین)

[3] انّ ھٰرون کان رجلا فاسقا زانیا فشتموھا بہ (علی بن ابراھیم)

[4] قال قوم ھو اللہ وھم العقوبتہ وقال آخرون ھو ابن اللہ وھم النسطوریۃ وقال قوم ھو ثالث ثلٰثۃ وھم الاسرأیلیۃ وقال قوم ھو عبداللہ وھم المسلمون (تبیان)

''اس دن کتنے دیکھنے اور سننے والے ہوں گے'' چونکہ غیب کی باتیں عالمِ آخرت میں سب منظرِ شہود پر آجائیں گی تو اب نہ ان کی نگاہوں میں کوئی دھندلاپن ہوگا اور نہ کانوں پر کوئی پردہ کیوں کہ نظریات نے اس وقت مشاہدات کا لباس پہنا ہوگا' جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے:

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿۲۲﴾

ہم نے تیری آنکھ سے پردے ہٹادیے ہیں، تو آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔ (سورۂ ق)

مگر اس دارِ دنیا میں وہ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں یعنی اس دن وہ یقین لائیں گے جب اُس یقین کی کوئی قیمت نہیں ہوگی لیکن آج جب کہ وہ باتیں ابھی پردۂ غیب میں ہیں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کے تقاضے سے وہ انہیں مان لیتے تو یہ ایمان معتبر ہوتا اور وہ ہدایت یافتہ قرار پاتے۔ [۱]

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور انہیں متنبہ کیجیے اُس رنج وحسرت کے دن سے جب کہ جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا اور وہ ہیں کہ بے خبری میں مبتلا ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے''۔

''رنج وحسرت کے دن سے'' یعنی جب گمراہ اور بے عمل افراد اعتقاد وعمل میں اپنی کوتاہی پر دستِ حسرت مل رہے ہوں گے۔ [۲]

اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾

''یقیناً ہم ہیں جو تمام زمین کے آخری مالک ہیں اور اُن کے جو اس پر بستے ہیں اور ہماری ہی طرف وہ بالآخر پلٹنے والے ہیں''۔

''وارث'' وہ ہوتا ہے جو دوسرے کے مرنے کے بعد اس کی املاک کا حقدار ہو، یہاں جتنے ہیں وہ فنا ہونے والے ہیں اور اس پر رہنے والی ذات صرف پروردگار عالم کی ہے [۳] اس لئے کہا گیا ہے کہ ہم ہیں جو زمین اور اس پر رہنے والوں کے وارث ہیں اور اسی کا مفہوم ادا کرتے ہوئے ہم نے اس کا ترجمہ ''آخری مالک'' کی لفظوں میں کیا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۘ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ

---

[۱] یعنی ان الکافرین فی الدّنیا اٰثروا الھدٰی علی الھدٰی فھم فی ذھاب عن الدین وعدول عن الحق والمراد انھّم فی الدّنیا جاھلون وفی الاٰخرۃ عارفون حیث لا تنفعھم المعرفۃ (مجمع البیان)

[۲] الیوم الّذی یتحسّر فیہ الناس علیٰ ما فراطوا فیہ من طاعتہ اللہ وعلیٰ ما ارتکبوا من معاصیۃ (تبیان)

[۳] ای یعود الینا التصرّف فی الارض وفی من علیھا من العقلا وغیرھم لا یبقیٰ لاحد ملك (مجمع البیان)

الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾

''اور ذکر کیجیے کتاب میں ابراہیم کا، بلا شبہ وہ ایک پیغمبر بڑے سچے تھے۔ جب انہوں نے کہا اپنے باپ سے کہ اے باپ! کیوں عبادت کرتے ہیں ایسی چیز کی جو نہ سنتی ہے اور نہ دیکھتی ہے اور آپ کو کچھ فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اے باپ! یقین مانیے کہ مجھے وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا ہے تو آپ میری پیروی کیجیے میں آپ کو سیدھے راستے پر لگاؤں گا۔ اے باپ! شیطان کو نہ پوجیے، یقیناً شیطان خدائے رحمٰن کا نافرمان ثابت ہوا ہے۔ اے باپ! مجھے ڈر ہے کہ آپ کو پہنچ جائے خدائے رحمٰن کا عذاب تو آپ شیطان کے شریک حال ہو جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ اور اپنے منہ بولے باپ سے گفتگو:

لغت میں آپ میں ''آب'' کے معنی باپ ہیں، اس لئے ترجمہ تو یہی لفظ لکھنا پڑے گا مگر ہر زبان میں ''باپ'' کا اطلاق صلبی باپ کے علاوہ بنظر احترام اور قسم کے بزرگوں پر بھی ہوا کرتا ہے اور چچا نانا پر باپ کا اطلاق تو خود قرآن مجید سے ثابت ہے جس پر اس تفسیر میں پہلے متنبیہ کیا جا چکا ہے، اس لئے احادیث اہلِ بیت علیہم السلام سے جو ثابت ہوا ہے کہ یہ شخص جس سے تخاطب ہے ابراہیم علیہ السلام کا صلبی باپ نہ تھا بلکہ چچا یا جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے، نانا تھا[1] اسے قرآن کے خلاف سمجھا نہیں جا سکتا۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿۴۸﴾

''اس نے کہا کیا تم میرے خداؤں سے اے ابراہیم! روگردانی کیے ہوئے ہو؟ اگر تم نے نہ مانا تو میں تمہیں سنگسار کروں گا اور پھر تمہیں مجھ سے مدتوں کے لئے چھوٹنا ہوگا۔ انہوں نے کہا خدا حافظ میں بہر حال آپ کے لئے اپنے پروردگار سے بخشش کی درخواست کروں گا۔ یقیناً وہ مجھ پر بڑا شفیق ہے اور میں خود آپ لوگوں سے اور جس کی آپ لوگ اللہ کے سوا دہائی دیتے ہیں علیحدگی اختیار کر لوں گا اور بس اپنے پروردگار سے دعا کرتا رہوں گا۔ غالباً میں اپنے پروردگار کی دعا سے بدنصیب نہیں رہوں گا''۔

---

[1] الّذی یقرله اصحابنا انّه کان جدّه لامّة لانّ اٰباء النبی ﷺ کلّهم کانوا مسلمین الیٰ اٰدم (تبیان) انّ الّذی یقوله اصحابنا انّ هذا الخطاب من ابراهیم علیه السلام انّما توجه الی من سمّاه الله ابا له لانّه کان جدّ ابراهیم لامة وانّ اباه الذی ولده کان اسمه تارخ (مجمع البیان)

آذر کے اتنے سخت تخاطب کے بعد جناب ابراہیم علیہ السلام کا جواب رواداری اور بزرگ کی بزرگداشت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

ان کا کہنا سلامٌ علیک، اس کا ترجمہ جو ہم نے کیا ''خدا حافظ'' اس تصور پر مبنی ہے کہ یہ سلام وداع ہے۔ [1]

دوسرا خیال یہ ہے کہ سلام علیک کا مطلب یہ ہے کہ آپ میری طرف سے اطمینان رکھیے میں آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ [2]

تیسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ آپ کے لئے میری طرف سے آداب وتسلیمات کا سلسلہ قائم رہے گا، کیوں کہ آپ کا مجھ پر تربیت و بزرگی کا حق ہے۔ [3]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وعدہ کو کہ ''میں اپنے پروردگار سے آپ کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کروں گا، پورا کیا جس کا سورۂ شعراء میں ذکر ہے:

اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾ ۔ میرے باپ کی بخشش کردے، وہ یقیناً کم کردہ راہوں میں سے تھا۔ (شعراء)

اور قرآن مجید میں دوسری کفار ومشرکین کے لئے طلبِ مغفرت کی مخالف میں رفع دخل کے طور پر اس کا حوالہ بھی دیا ہے کہ:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ (سورۂ توبہ)

اور ابراہیم علیہ السلام کا طلب مغفرت کرنا اپنے باپ کے لئے وہ نہ تھا مگر ایک وعدہ کی بنا پر جو انہوں نے اس سے کرلیا تھا مگر جب اُن پر بالکل ثابت ہوگیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے بیزاری اختیار کرلی یقیناً ابراہیم اللہ سے لولگانے والے بڑے متحمل آدمی تھے۔

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾

''تو جب وہ اُن لوگوں سے علیحدگی اختیار کر چکے، اور اُس سے کہ جن کی وہ لوگ اللہ کو چھوڑ کو پرستش کرتے تھے، تو ہم نے انہیں اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام ایسی اولاد عنایت کی اور ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا اور اُن لوگوں کو اپنی رحمت سے حصّہ عطا کیا اران کے آوازۂ شہرت کو حق بجانب طور پر بلند کیا''۔

علیحدگی ذہنی اور عملی پہلے ہی تھی اس لئے کہ انبیاء ومرسلین اپنی قوم کے عقائدِ فاسدہ اور اعمال سیئہ سے بری ہوتے ہیں، یہاں جس علیحدگی کا ذکر ہے، وہ جسمانی علیحدگی ہے یعنی اس کے بعد وہ وہاں سے ہجرت کرکے سرزمینِ شام کی طرف چلے گئے۔ [4]

---

[1] سلام توديع وهجر على الطف الوجوه وهو سلام متاركة ومباعدة (مجمع البيان) تیری سلامتی رہے، یہ رخصت کا سلام ہے (موضح القرآن)

[2] سلام عليك يعني انّي لا اصيبك بمكروه (جلالين)

[3] اى اكرام وبرّ بحقّ الابوة وشكر التربية (تبيان)

[4] بان ذهب الى الارض المقدّسة (جلالين) قيل انّه اعتزلهم بان خرج الى ناحية الشام (تبيان) اى فارقهم و هاجر هم الى الارض المقدسة (مجمع البيان)

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝۵۰ کا لغوی مفہوم کے لحاظ سے ترجمہ درج ہو چکا ہے جو عام مفسرین کی تفسیروں کے موافق ہے جس کی تشریح علامہ طبرسیؒ نے یہ فرمائی ہے کہ مختلف مذاہب کے افراد جناب ابراہیم علیہ السلام کی جلالت وعظمت پر متفق ہیں اور یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ وہ ان کے دین پر ہیں اور اسلام میں ان کی یاد اس طرح قائم کی گئی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو مفصّل درود کے الفاظ ہیں ان کا جزء ہے:

"كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَاٰلِ اِبْرَاهِيْمَ" (مجمع البیان)

یہ درود نماز جنازہ میں دوسری تکبیر کے بعد ہمارے یہاں عموماً پڑھا جاتا ہے۔

مگر ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر جو بسند عالی معصوم علیہ السلام سے وارد ہوئی ہے، یہ ہے کہ "ہم نے اپنی رحمت کا ایک حصّہ انہیں عطا کیا۔ اس سے مراد علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ذات گرامی ہے۔[1]

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝۵۱ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝۵۲ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝۵۳

"اور ذکر کیجئے اس کتاب میں موسیٰ کا۔ یقیناً وہ بڑے کھرے بنائے گئے تھے[2] اور نبی تھے بھیجے ہوئے۔ اور ہم نے انہیں طور کے دائیں جانب سے صدا دی اور ہم کلامی شرف دیتے ہوئے تقرّب عطا کیا اور انہیں اپنی رحمت سے ہارون ایسا بھائی نبی بناتے ہوئے عطا کیا۔"

ان آیات میں جناب موسیٰ و ہارون علیہما السلام کا ذکر آیا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝۵۴ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۖ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝۵۵

"اور ذکر کیجئے اس کتاب میں اسماعیل کا، بلاشبہ وہ وعدے کے سچے تھے اور وہ بھیجے ہوئے نبی تھے اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ تھے"۔

جناب اسماعیل علیہ السلام صادق الوعد کا تذکرہ:

عام خیال یہ ہے کہ یہ جناب اسماعیل علیہ السلام فرزند حضرت ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ ایک دوسرے بزرگوار تھے۔ جلالین نے لکھا ہے:

---

[1] حدثنی بذلك ابی عن الحسن بن علی العسکری علیہ السلام (مجمع البیان)

[2] ان الله اخلصه لطاعته (تبیان) بفتح اللّام یکون معناه اخلصه الله بالنبوّة واختاره للرّسالة (مجمع البیان) خالص کردہ شدہ (شاہ ولی اللہ)

رَسُوْلًا اِلٰی جرھم: وہ قبیلہ جرہم کی طرف بحیثیت پیغمبر مبعوث ہوئے تھے۔

اس سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ وہ جناب اسماعیل علیہ السلام فرزند خلیل تھے یا کوئی اور؟ اس لئے کہ جناب ہاجرہ اور اسماعیل علیہ السلام کے خانۂ کعبہ کے پاس آباد ہونے کے بعد قبیلہ جرہم ہی تھا۔ جس نے آ کر مکہ میں بود و باش اختیار کی تو ممکن ہے وہی جبان اسماعیل جو ذبیح اللہ ہیں، اس قبیلہ کی طرف مبعوث شدہ نبی ہوں جن کا ذکر ہو رہا ہے۔

جناب شیخ الطائفہؒ نے صراحۃً اس تذکرہ کو انہی حضرت اسماعیل علیہ السلام سے متعلق کیا ہے [1] مگر ہماری قدیم تفسیر جو علی بن ابراہیم قمی کی ہے، پہلے خیال سے متفق ہے۔

علاّمہ طبرسیؒ نے پہلے تو صاف اسے جناب اسماعیل علیہ السلام فرزند خلیل علیہ السلام کے بارے میں بتایا ہے اور دوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ وہ دوسرے اسماعیل فرزند حزقیل ہیں اور اس کے متعلق امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث نقل کی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ امام علیہ السلام کی طرف منسوب حدیث دونوں طرف موجود ہے، اس لئے تعارض کی بناء پر اس سے کسی قول کو ترجیح حاصل نہیں ہوتی۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝۵۶ۙ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝۵۷

''اور ذکر کیجئے اس کتاب میں ادریس علیہ السلام کا۔ وہ بلاشبہ بہت سچے نبی تھے اور ہم نے اُنہیں اونچے مقام پر بلند کیا''۔

جناب ادریس علیہ السلام اور ان کی رفعت جسمانی:

یعنی انہیں آسمان کی سیر کرائی جو ایک محدود درجہ تک کی معراج تھی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے بھی ترجمہ میں لکھا ہے: ''بمکانی بلند یعنی برآسمان''

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''بہشت کی سیر مانگی، پھر وہاں رہ گئے اللہ کے حکم سے'' (موضح القرآن)

اب جب انبیاء ماسلف میں آسمان کی طرف معراج کی مثال مسلم طور پر موجود ہے تو کتنے افسوس کی بات ہے کہ اہل سنّت میں سے ایک طبقہ معراج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بیت المقدس تک محدود کر کے افضل المرسلین کی منزل جو جناب ادریس علیہ السلام کی منزل سے بھی کم تر قرار دیتا ہے۔ رفعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تقاضا جو اَز رُوئے قرآن ثابت بھی ہے، یہ ہے کہ آپ کی منزل معراج کو جناب ادریس علیہ السلام سے بالاتر مانا جائے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۭ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۝۵۸ السجدة

''یہ ہیں پیغمبروں میں سے وہ جنہیں اللہ نے اپنی خاص نعمت سے نوازا ہے آدم کی اولاد میں سے اور اُن میں سے

---

[1] اسماعیل ابن ابراھیم (تبیان)

جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا اور ابراہیم اور اسرائیل کی اولاد میں سے اور اُن میں سے جن کو ہم نے رہنمائی کی اور منتخب کیا، جب اُن کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت ہوتی تھی تو وہ گر پڑتے تھے سجدہ میں اور روتے ہوئے''۔

ان آیات کو گزشتہ آیات کے ساتھ دیکھا جائے تو لف ونشرِ غیر مرتّب کی صورت ہے۔ وہاں ادریس علیہ السلام کا سب سے آخر میں ذکر تھا، یہاں سب سے پہلے ہے: مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ''آدم کی اولاد میں سے'' اور جناب ادریس علیہ السلام صرف اس کے تحت میں آتے ہیں اس لئے کہ اُنہیں بتایا جاتا ہے کہ وہ جناب نوح علیہ السلام سے مقدم اور ان کے اجداد میں سے تھے۔ [1]

اس کے بعد ہے کہ اُن کی نسل کا ذکر جو جناب نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی پر سوار تھے اِس میں جناب ابراہیم علیہ السلام ہیں اور پھر ذریّت ابراہیم کا ذکر ہے اس میں اسحاق علیہ السلام اور یعقوب ہیں اور پھر اسرائیل کا ذکر ہے، اس میں جناب موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام ہیں جن کا ذکر وسط میں ہے اور زکریا یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام ہیں جن کا ذکر اس سورہ بیس گزشتہ انبیاء سے مقدّم ہے۔

اب اس کے بعد از سرِ نو آغاز کلام کر کے جس جماعت کا ذکر ہو رہا ہے کہ ''اور اُن میں سے جنہیں ہم نے رہنمائی کے لئے منتخب کیا''۔ یہ انداز بتاتا ہے کہ یہ جماعت پہلے لوگوں سے الگ ہے جس کے خوف وخشیّت الٰہی کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے یہاں کی حدیث میں ہے کہ اس سے محمد وآل محمد علیہم السلام مراد ہیں۔ [2]

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴿۶۰﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ط اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿۶۱﴾

''اب اُن کے بعد اُن کی جگہ پر آئے ایسے ناخلف جنہوں نے نماز کو برباد کیا اور خواہشوں کی پیروی کی، تو یہ اس گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے، سوا اُس کے جو توبہ کرے اور ایمان اختیار کرے اور نیک اعمال کرے تو یہ لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور اُن کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہ ہوگی، جاودانی زندگی والے باغ جن کا وعدہ خدائے رحمٰن نے غیب کے طور پر اپنے بندوں سے کیا ہے یقیناً اس کا وعدہ سامنے آنے والا ہے''۔

باغہائے بہشت کی اوصاف:

نماز کو برباد کرنے کا مطلب ترک نماز بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ بعض افراد کا خیال ہے مگر اس سے زیادہ مفہوم لفظ سے قریب تر وہ ہے جس

---

[1] فکان لادریس شرف القرب من اٰدم لانّه جدّ نوح (تبیان)

[2] روی عن علی بن الحسین علیہ السلام انّه قال نحن عنینا بها (مجمع البیان)

کی تائید ہمارے رہنمایانِ دین کے ارشاد سے ہوتی ہے کہ اس سے مراد اوقاتِ فضیلت نماز کا لحاظ نہ کرنا اور اس کی ادائیگی میں تساہلی برتنا ہے۔

غیّ کے عام معنی تو گمراہی کے ہیں جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے جس میں ہم تنہا نہیں ہیں [1] اور اُس کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہے، دوسری جگہ:

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۔ اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے گناہ سے دوچار ہوگا، (یعنی گناہ کے انجام سے) فرقان۔ ۶۸

مگر دوسرا قول اس آیت میں ہے کہ غیّ آخرت کے کسی ہولناک مقام کا نام ہے، اس صورت میں اسے ترجمہ میں تبدیل نہ ہونا چاہیے بلکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ ''وہ غیّ سے دوچار ہوں گے۔ [2]

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾

''نہیں سنیں وہاں کوئی مہم بات، ہاں بس سلام کی صدا ہوگی اور اُن کے لئے ان کی مقرّرہ روزی ہے وہاں صبح اور شام یہ ہے وہ بہشت جس کا ورثہ بنائیں گے ہم اپنے بندوں میں سے اُسے جو پرہیزگار ہو''۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾

''اور ہم نہیں اترتے مگر آپ کے پروردگار کے حکم سے اُس کے قبضہ میں ہے جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو اس کے درمیان ہے اور آپ کا پروردگار بھولنے والا نہیں ہے، پروردگار آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کا، تو اُس کی عبادت کیجئے اور اُس کی عبادت کے لئے مشکلات کو برداشت کیجئے۔ کیا اُس کا کوئی دوسرا ہم نام آپ کو معلوم ہے؟!''

موجودہ نظم قرآنی اور سلسلہ آیات کو اہمیت دینے والے بھی ان آیات کا ربط گزشتہ سلسلہ کلام سے قائم نہیں کر سکے ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جبرئیل علیہ السلام ایک مدّت دراز تک وحی نہیں لائے، اُس کے بعد آئے تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے عرصہ تک نہ آنے کی شکایت کی اُس کے جواب میں اُنہوں نے یہ کہا۔

ہمارے مفسرین میں سے جناب شیخ الطائفہؒ نے قیل کہہ کر (بطور قوم ضعیف کے) درج کیا ہے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے ایک دفعہ فرمایا کہ آخر تم اتنا کم کیوں آتے ہو؟ زیادہ کیوں نہیں آتے! اس پر انہوں نے یہ جواب دیا۔ یہ قول ابن عباس، قتادہ

---

[1] خواهند یافت جزائے گمراهی (شاه ولی الله) قیل معناه یلقون مجازاة غیّهم (تبیان)

[2] ملاقات کریں گے غیّ کی (شاه رفیع الدین) هو وادٍ فی جهنم (جلالین) قال عبدالله بن مسعود الغیّ وادٍ فی جهنم (تبیان)

ضحاک، مجاہد اور ابراہیم کا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کا جزء بنا کر لکھ دیا ہے: ''فرشتگان گفتند''

شیخ الطائفہؒ نے اس قول کے ضعف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھی یہ نہیں بتایا کہ اس کے مقابل میں دوسرا قول کیا ہے جو قوت رکھتا ہے اور جب متقدمین کو کوئی چیز دست یاب نہیں ہوئی تو آج چودہ سو برس کے بعد ہم کہاں سے اُسے لا سکتے ہیں؟ بہر حال صورت حال یہ ہے کہ اس شان نزول سے ضمیر مطمئن نہیں ہے اور صحیح شان نزول کی تشنگی شدت سے محسوس ہوتی ہے جس کی سیرابی کا ابھی کوئی ذریعہ نہیں نکلا ہے۔

''اُس کے قبضہ میں ہے جو کچھ ہمارے آگے ہے''۔ اسے شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں ''قیامت'' اور جو ہمارے پیچھے ہیں، وہ فرماتے ہیں: ''یعنی از ابتدائے خلق آسمان وزمین'' (فتح القرآن)

یہ تفسیر جلالین کے مطابق ہے۔ اس میں کچھ اضافہ کے ساتھ ہے:

مابین ایدینا ای امامنا من الامور الاخرة وما خلفنا من امودالدّنیا وما بین ذلك ای مایکون من هذا الوقت الیٰ قیام الساعة ای له علم ذلك جمیعا۔

اس کے برخلاف شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''ہمارے آگے پیچھے کہا آسمان وزمین کو۔ اترتے ہوئے زمین آگے، آسمان پیچھے چڑھتے ہوئے وہ پیچھے، یہ آگے (موضح القرآن)

ایک تفسیری پیچیدگی جو اُس شان نزول کے لحاظ سے ہے، یہ ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے پوچھا اور فرشتہ نے یہ جواب دیا تو یہ جواب جزء قرآن کیوں کر ہو گیا؟ قرآن تو وہ کلام ہے جس کا ملک کو حامل بنایا جاتا ہے نہ کہ خود ملک کی بات چیت جو رسول ﷺ سے ہو، اس کا حل شاہ عبدالقادر نے یوں کیا ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے یہ کلام سکھایا جبرئیل علیہ السلام کو کہ جواب یوں کہو کلام ہے اللہ کا جبرئیل کی طرف سے جیسا: اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ہم کو سکھایا ہے''

مگر جیسا کہ ہم نے پارۂ اول میں سورۂ حمد کی تفسیر کے شروع میں تحریر کیا ہے: اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ جس سلسلۂ کا جز ہے، یعنی سورہ الحمد، اس کے پہلے اقراء تھا جو کلام عبد کو کلام الٰہی میں منسلک کرتا ہے۔ یہاں اُس طرح کی کوئی چیز نہیں ہے۔

بہر حال جیسا کہ پہلے میں اپنی بے اطمینانی ظاہر کر چکا ہوں، میں اس شان نزول سے مطمئن نہیں ہوں مگر جب ہمارے متقدّمین اس آیت کے محلِ تنزیل کا صحیح طور پر پتہ نہیں لگا سکے تو ہم اب کیوں کر پتہ لگا سکتے ہیں۔

''اللہ کے نام سے سب اُس کی صفت ہیں۔ یعنی کوئی ہے اُس صفت کا'' (موضح القرآن)

ہمارے مفسرین بھی اس سے متفق ہیں [1] اور یہ سوال کیا کہ ''کیا تمہیں اس کا ہم نام معلوم ہے''؟ صورۃً سوال ہے مگر حقیقۃً نفی مقصود ہے کہ اُس کا ہم نام کوئی نہیں ہے یعنی اُس کے صفات وکمالات، دوسری لفظوں میں اُلوہیت میں اُس کا شریک کوئی نہیں ہے۔ [2]

---

[1] سمیّا ای مثلا وشبها (تبیان)

[2] هٰذا استفهام بمعنی النّفی ای لا نعلم من یسمی بلفظة الله (مجمع البیان)

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾

''اور انسان کہتا ہے کہ کیا جب میں مرجاؤں تو پھر مستقبل میں زندہ ہوکر باہر لایا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یاد نہیں ہے کہ ہم نے اُس کو پیدا کیا اس کے پہلے جب کہ وہ کچھ تھا ہی نہیں تو قسم ہے تمہارے پروردگار کی ہم انہیں شیطانوں کے ساتھ ساتھ حشر میں لائیں گے، پھر اُن کو دوزخ کے اردگرد گھٹنوں کے بل گرتی ہوئی شکل میں حاضر کریں گے۔ پھر ہم ہر پارٹی میں سے الگ کریں گے کہ کون ان میں سے زیادہ خدائے رحمٰن کے مقابلہ میں سرکشی کرنے والا تھا؟ پھر ہم خوب واقف ہیں کہ ان میں کے کون اُس میں داخل ہونے کے زیادہ سزاوار ہیں''۔

اثبات معاد:

مذکورہ بالا آیات میں معاد کو ثابت کیا گیا ہے۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

''اور کوئی تم میں ایسا نہیں ہے، جو اُس کی طرف جائے نہیں، یہ تمہارے پروردگار کا یقینی طور پر طے شدہ فیصلہ ہے، پھر جو پرہیزگار ہوں گے، انہیں ہم نجات دیدیں گے اور ظالموں کو اس میں چھوڑ دیں گے اس عالم میں وہ گھٹنوں کے بل گئے ہوئے ہوں گے''۔

دوزخ کی طرف سے عمومی گزر:

اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسّرین کا تصور ہے کہ داخل جہنم سب ہی ہوں گے چاہے وہ مومنین ہوں [1] مگر دوسرے معنی یہ ہیں اور وہی درست معلوم ہوتے ہیں کہ گزریں گے اُدھر سے سب لیکن جو اہل ایمان میں وہ گزرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے [2] اور جو کافر ہی یا منافق، وہ اُس میں گر جائیں گے، ہماری قدیم تفسیر جو معصوم علیہ السلام سے وارد ہے اس کے موافق ہے۔ [3] اور دوسرے آیات قرآن بھی اسے تقویت دیتے ہیں جیسے:

---

[1] ای داخل جهنم (جلالین)

[2] قال قوم و هو الصّحیح انّ ورودهم هو وصولهم الیها و اشرافهم علیها من غیر دخول منهم فیها (تبیان)۔

[3] عن ابی عبدالله علیه السلام قال ماتسمع الرّجل یقول وردنا ماء بنی فلان فهو الورود ولم یدخلها (علی بن ابراهیم)

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ۝۱۰۱ (انبیاء)

جن پر ہمارا احسان پہلے سے ہے، یہ اُس سے دور رہیں گے۔ [1]

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا۝۷۳ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا۝۷۴ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ۭ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا۝۷۵

''اور جب اُن کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو کافر لوگ اُن سے کہ ایمان لائے، کہتے ہیں کہ دونوں گروہوں میں سے کون بہتر ہے، مکان کے لحاظ سے اور کون زیادہ اچھا ہے رونقِ محفل کے اعتبار سے، حالانکہ کتنی نسلیں ہم نے ان کے پہلے ہلاک کی ہیں جو ساز و سامان اور دکھاوے میں ان سے بہتر تھیں، کہیے کہ جو گمراہی میں ہوتا ہے تو بالکل ٹھیک ہے کہ سب کو فیض پہنچانے والا اُسے زیادہ عطا کرتا رہے، یہاں تک کہ جب آنکھوں سے دیکھیں گے وہ جس کا وعدہ وعید اُن سے ہوا ہے، خواہ یہیں کا عذاب اور خواہ قیامت، تب اُنہیں معلوم ہوگا کہ کون زیادہ بُرا ہے مکان کے اعتبار سے اور زیادہ کمزور ہے لاؤلشکر کے لحاظ سے''۔

یہ کفّار کی ذہنیت جو ان آیات میں اُن کے عمل سے نمایاں کی گئی ہے، اس کوتاہ اندیشی پر مبنی ہے کہ یہی دنیا سب کچھ ہے، لہٰذا جس کے پاس ساز و سامان دنیا زیادہ ہے، وہی کامیاب و کامران ہے [2] اس کے بالمقابل آخرت کا تصور اس ساز و سامان دنیا کو بے اعتبار قرار دیتا ہے جس کی تصدیق کے لئے ان آیات میں اور دوسرے مقامات پر قرآن میں گزشتہ امتوں کے انجام کی طرف ان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ ساز و سامان دنیا تو ان کے پاس اس سے زیادہ تھا۔ پھر انجام کیا ہوا؟

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ۭ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا۝۷۶

''اور جنہوں نے ہدایت حاصل کی، اللہ ان کی اور زیادہ ہدایت کا سامان کرتا ہے اور باقی رہنے والے نیک کام تمہارے پروردگار کے یہاں بہتر ہیں ثواب کے لحاظ سے اور بہتر ہیں مآل کے اعتبار سے''۔

---

[1] كيف يكون مبعوا عنها مع انّه يدخلها وذٰلك متناقض (تبيان)

[2] انّما تفاخروا بالمال وزينة الدّنيا ولم يتفكّروا في العاقبة (مجمع البيان)

الفاظ سے ظاہر ہے کہ پہلا حصولِ ہدایت باختیار خود ہے جس کے صلہ میں مزید توفیقات ان کے شامل حال ہوتے ہیں۔[1]

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾

''کیا دیکھا آپ نے اُسے جس نے ہماری آیات کے ساتھ کفر اختیار کیا اور کہا مجھے مال اور اولاد کی نعمت ضرور مل جائے گی۔ کیا اسے غیب کی خبر معلوم ہوئی ہے۔ اس سے اللہ کے یہاں سے کوئی عہد و پیمان حاصل کر لیا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہم جو وہ کہتا ہے، اسے لکھ لیں گے اور اس کے عذاب میں پورے طور اضافہ کریں گے اور جو کچھ وہ کہتا ہے، اس کے بعد ہم اس کے وارث ہوں گے اور وہ ہمارے پاس ایک اکیلا آئے گا۔''

کافر کے اس کہنے کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ اگر اس موت کے بعد دوبارہ زندگی ہے تو اس ازندگی میں بھی اسی طرح میری اولاد ہوگی اور مال و دولت حاصل ہوگا[2] اس کی رد کی گئی ہے کہ یہ مال و اولاد تو بس اس دنیا سے رخصت ہونے تک ہے۔ وہاں یہ کچھ نہیں ہوگا، وہاں تو ہر ایک اکیلا آئے گا۔

دوسرا مفہوم یہ بتایا گیا ہے کہ کافر کہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں ایمان لا کر کیا کروں، اپنے کفر پر قائم ہوں تب بھی مال اور اولاد جو میرا مطمح نظر ہیں، وہ تو میرے لئے اس حالت کفر میں بھی حاصل رہیں گے۔[3]

آخر کا فقرہ: نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ اس تشریح کے زیادہ مطابق ہے یعنی یہ مال اولاد جنہیں وہ کہتا ہے اس کے پاس ''تا بکے'' رہیں گے؟ اگر ان سب نے اس کی زندگی میں ساتھ بھی دیا تو وہ خود بیٹھا نہیں رہے گا۔ آخر میں وہ چلا جائے گا اور اس کے بعد نتیجہ میں تو وہ مال اور اولاد سب ہمارے ہی قبضہ میں ہوگا، جب تک چاہیں رکھیں اور جب چاہیں ختم کر دیں۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ شاہ رفیع الدین نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''وارث کریں گے ہم اُس چیز کا جو کہتا ہے''۔

یہ ترجمہ نُوْرِثُهٗ کے لفظ کا ہے جو قرآن میں نہیں ہے، نُوْرِثُهٗ کا نہیں جو قرآن میں ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾

اور انہوں نے بنائے ہیں اللہ کو چھوڑ کر بہت سے خدا کہ وہ ان کے لئے شان و شوکت کا باعث ہوں ہرگز ایسا نہ ہوگا

---

[1] ان یفعل بہم الّالطاف یستکشرون عندھا الطّاعات (تبیان)

[2] لا تبیّن علیٰ تقدیر البعث ما لا وّولدا (جلالین) اگر پھر جیوں گا تو یہی مال اور اولاد وہاں بھی ہوگا۔ (موضح القرآن)

[3] قیل اعطیٰ فی الدّنیا اذا اقمت علیٰ دین اٰبائی وعبادۃ الھی اعطیٰ اما لا وّولدا (مجمع البیان)

وہ عنقریب اُن کی عبادت سے انکاری ہوں گے''۔

کون؟ کس سے؟ اس میں دو قول ہیں [1] ایک قول یہ ہے کہ یہ کافر لوگ اہوالِ قیامت دیکھنے کے بعد ان معبودان باطل سے انکاری ہوں گے [2] اور دوسرے یہ کہ وہ معبودان باطل ان سے انکاری ہوں گے۔ [3]

قرآن مجید کی دوسری آیات سے دونوں باتوں کا وقوع ثابت ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا الشَّيٰطِيۡنَ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ تَؤُزُّهُمۡ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعۡجَلۡ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمۡ عَدًّا ﴿۸۴﴾ يَوۡمَ نَحۡشُرُ الۡمُتَّقِيۡنَ اِلَى الرَّحۡمٰنِ وَفۡدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوۡقُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرۡدًا ﴿۸۶﴾ لَا يَمۡلِكُوۡنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا ﴿۸۷﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کا کافروں تک بھیجا کہ وہ اُنہیں شدّت سے جنبش میں لاتے ہیں، تو جلدی نہ کرو ان پر تو گن گن کر اُن کی عمر کے دن پورے کر رہے ہیں جس دن پرہیزگاروں کو محشر کے دن خدائے رحمٰن کی طرف ہم سواریوں پر لائیں گے اور گنہ گاروں کو دوزخ کی طرف داخلہ کے لئے تشنگی کے عالم میں ہنکا کر لے جائیں گے۔ اُنہیں شفاعت کا کوئی اختیار نہ ہوگا مگر جس کے لئے اللہ کی طرف سے یہ منصب حاصل ہو گیا ہو''۔

ثبوت شفاعت:

''ہم نے شیطانوں کو کافروں کی طرف بھیجا''۔ یعنی اُنہیں اُن کی طرف جانے سے راستے میں رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ [4]

قرآن مجید میں جہاں بھی نفی شفاعت ہے، وہاں اکثر کسی طرح کا استثناء موجود ہے۔ اس آیت میں جو استثناء ہے اس سے ظاہر ہے کہ ہر کوئی ہستی یا کچھ ہستیاں ایسی ضرور ہیں جنہیں خالق نے شفاعت کا منصب عطا کیا ہے۔ ایک دوسرے معنی اس کے یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ بس اُس کی شفاعت ہو سکے گی جس نے اللہ کے یہاں سے وعدۂ مغفرت لے لیا ہو یعنی شہادتین کا قرار رکھتا ہو اسلام کی بنیاد ہے۔ [5]

اس صورت میں بھی چاہے شفاعت کرنے والے کے وصف پر کوئی روشنی نہ پڑے لیکن اجمالی طور پر اصل شفاعت کا ثبوت تو ہو ہی جاتا

---

[1] قیل فی معناہ قولان (تبیان)

[2] منکر خواہند شد پرستش کنندگان معبودان خود را (شاہ ولی اللہ)

[3] سیفکرون ای الالھۃ بعبادتھم ای یقرنھا (جلالین)

[4] ای خلنا بینھم وبین الشیاطین اذا وسوسوا بینھم ودعوھم الی الضّلال (مجمع البیان)

[5] عھدا ای شھادۃ ان لا الہ الّا اللہ (جلالین) یعنی مسلمان شدہ (شاہ ولی اللہ)

ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾ إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ أَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾

''اورانہوں نے یہ کہا کہ خدائے رحمٰن نے بیٹا قرار دیا ہے، ارے تم نے ایسی بری بات کہی ہے کہ جس سے عجب نہیں آسماں شگافتہ ہو جائیں اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر جائیں کہ انہوں نے خدائے رحمٰن کیلئے بیٹا تجویز کیا حالانکہ خدائے رحمٰن کیلئے سزاوار نہیں کہ وہ بیٹا بنائے۔ آسمانوں اور زمین میں کوئی نہیں مگر یہ کہ وہ خدائے رحمٰن کی بارگاہ میں ایک بندہ کی صورت میں آنے والا ہے۔ وہ ان کے احاطہ کئے ہوئے ہے اور اُس نے پوری طرح اُن کا جائزہ لیا ہے اور ہر ایک ان میں سے اس کے پاس قیامت کے دن اکیلا آئے گا''۔

خالق کے لئے تصور اولاد کے جرم کی اہمیت:

اس کے پہلے جب یہ الفاظ آئے تھے کہ اللہ نے بیٹا قرار دیا ہے تو بعض اہل نظر کی رائے اسکے مفہوم پر نظر کرتے ہوئے یہ درج کی گی تھی اور ہم نے بھی اس کے موافق رجحان ظاہر کیا تھا کہ اس کے معنی متبنیٰ بنانے کے ہیں جس کی تائید میں تلاش سے عیسائیوں کے ایک طبقہ کا خیال مل گیا تھا کہ وہ جناب عیسیٰ کو حقیقی بیٹا نہیں مانتے بلکہ متبنی سمجھتے ہیں مگر یہاں شروع کے الفاظ وہی کرتے ہوئے کہ: اتّخذ الرحمٰن ولدًا ''اللہ نے بیٹا قرار دیا ہے'' بعد میں جس ہولناک انداز میں اس قول کے شدید طور پر غلط ہونے کا اظہار کیا گیا ہے، وہ متبنی بنانے کے تصور پر منطبق نہیں کیوں کہ یہ بات غلط سہی مگر اسی شدّت سے عظمت الٰہی کو صدمہ نہیں پہنچاتی کہ اُس کے نتیجہ کو اتنے شدید انداز میں پیش کیا جائے۔ یہ تو ایسے ہی تصور کے ساتھ سازگار ہے کہ واقعی کسی کو اس کا بیٹا کہا جائے۔ اس سے نتیجہ الوہیت حضرت باری تعالیٰ اور اس کے جلال کو شدید صدقہ پہنچتا ہے جسے اس انداز میں پیش کرنا درست ہے جو یہاں قرآن مجید نے اختیار کیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾

''بلاشبہ وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے، اُن کے لئے خدائے رحمٰن محبت قرار دینے والا ہے''۔

ایک خاص جماعت کی محبت کے فرض قرار دیئے جانے کا پیشگی اعلان:

''قرار دینے والا ہے''، یعنی فطری طور پر دلوں کو ان کی جانب مائل کرنے والا اور ان کی محبت دلوں میں ڈالنے والا ہے[1] یا حکمی طور پر ان کی محبت کا فریضہ عائد کرنے والا ہے۔

الفاظ قرآن یہی بتاتے ہیں اور مزید نگاہ دوڑائی جائے تو خلیل علیہ السلام کی دعا اپنی ذریت کے لئے اسی قرآن میں ملے گی کہ:

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ: قرار دے انسانوں کے دلوں کو کہ وہ ان کی طرف مائل ہوں۔ (ابراہیم۔ ۳۷)

پھر متفق علیہ احادیث کی روشنی میں اس کا مصداق آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود بھی ہے جن کی محبت فریضہ ایمانی کی حیثیت رکھتی ہے مگر معلوم نہیں جلالین نے کس بنیاد پر یہ معنی دیئے ہیں کہ:

ودّفيما بينهم يتوآدون ويتاحابّون و يحبّهم الله تعالىٰ: محبت آپس میں وہ کہ ایک دوسرے سے محبت اور الفت رکھیں اور خداوند عالم ان سے محبت رکھتا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے بھی حاشیہ میں یہ غیر متبادر لکھے ہیں کہ:

''یعنی بایکدیگر دوست باشند'' (فتح الرحمٰن)

ان سے اچھے ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر ہیں جنہوں نے بڑے شک اور تذبذب کیساتھ سہی مگر جو اصل آیت سے معنی سمجھ میں آتے ہیں اور جو دوسرے دلائل کے مطابق ہیں، وہ بھی درج کر دیے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''یعنی ان سے محبت کرے گا یا ان کے دل میں اپنی محبت پیدا کرے گا یا خلق کے دل میں ان کے محبت'' (موضح القرآن)

قدیم مفسرین میں سے ربیع بن انس کا قول ہے جسے جناب شیخ طوسیؒ نے نقل کیا ہے:

اذا احبّ الله عبدا طرح محبته فی قلوب اهل السمآء و فی قلوب اهل الارض (تبیان)۔

''جب اللہ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کی محبت ڈال دیتا ہے اہلِ آسمان کو دلوں میں اور اہل زمین کے دلوں میں۔

علّامہ طبرسیؒ نے متعدد احادیث درج کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آیت آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے بارے میں ہے، جن کے گل سرسید حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔ ایک روایت جناب ابن عباسؓ سے ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں ہے۔

فما من مؤمن الّا و فی قلبه محبه لعلیؑ:

کوئی بھی مومن نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے دل میں علی علیہ السلام کی محبت ہے۔

دوسری ابوحمزہ ثمالی کی روایت ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا تم اللہ سے دعا کرو کہ:

اللّٰهم اجعل لی عندك عهدو اجعل لی فی قلوب المومنین ودّا:

خداوند! مجھے اپنے یہاں ایک خاص منصب عطا کر اور میرے لئے مومنین کے دل میں محبت قرار دے۔

---

[1] پیدا خواهد کرد برائے ایشان دوستی (شاہ ولی اللہ) کرے گا واسطے ان کے رحمٰن محبّت (شاہ رفیع الدّین)

حسب ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں یہ مناجات کی اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس طرح کا مضمون جابر بن عبداللہ انصاریؓ کی روایت میں بھی وارد ہے۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

"اور ہم نے اُسے آپکی زبان کے ذریعے اس لئے آسان بنادیا ہے کہ آپ اس کے ذریعہ سے پرہیزگاروں کو خوش خبری سنائیں اور اس کے ساتھ اہل عناد کو عذاب سے متنبہ کریں اور کتنی ہی ہم نے ان کے پہلے نسلیں ہلاک کیں، کیا اُن سے کسی کو بھی اب تم دیکھتے ہو یا اُن کی کوئی ہلکی سی بھی آواز سنتے ہو؟

قرآن کو "آسان" کہہ کے تفسیر سے بے نیازی کا دعویٰ کرنے والے دیکھیں کہ قرآن نے اس آسانی کو زبان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ کیا ہے [1] اسلئے اس زبان کے بیان کو چھوڑ کر اگر قرآن کو بطور خود دیکھیے تو اُسے آپ کا آسان سمجھنا غلط ہوگا اور اسے بطور خود سمجھ کر نتائج آپ نکالیں گے، وہ بھی غلط ہوں گے۔

[1] آسان ساختیم قرآن را بزبان تو (شاہ ولی اللہ) آسان کیا اس قرآن کو ساتھ زبان تیری کے (شاہ رفیع الدّین)

سُوْرَۃُ طٰہٰ

مکی ----۱۳۵----آیات

نام اس سورہ کا پہلے ہی لفظ پر ہو گیا ہے جس سے سورۃ کا آغاز ہوا ہے۔

سورۂ طٰہٰ کے خاص مضامین:

اس میں خاص طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مبعوث برسالت ہونا، ان کا دربار فرعون میں جانا، ساحروں سے مقابلہ ہونا اور اس کا انجام بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے جس میں دوسرے مقامات پر جو بیان ہوا ہے اس پر خاص اضافے ہیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جناب ہارون علیہ السلام کے لئے دعا، ولادت کے بعد ان کا تابوت میں رکھ کر سپرد دریا کیا جانا اور اس کا نتیجہ فرعون ایسے سرکش سے جناب موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو معجزہ کا عقلی معیار جس پر ہم نے مقدمہ تفسیر میں کافی روشنی ڈالی ہے۔ سامری کی گوسالہ سازی اور اس کا انجام، اس کے علاوہ نفئ شفاعت سے استثناء جس سے ثبوت شفاعت مستفاد ہوتا ہے۔ جناب آدم علیہ السلام کو جنت میں رکھتے وقت وہاں کے فوائد کا بیان کرنا اور شیطان کی ضرر رسانی سے یہ کہہ کر ڈرانا کہ کہیں یہ اس جنت سے تمہارے نکلنے کا باعث نہ ہو جائے جو اس کی دلیل ہے کہ درخت کے پاس جانے سے ممانعت جس کی خلاف ورزی شیطان کے کہنے سے ہوئی، یہ نہی ارشادی تھی، نہ کہ مولوی جس کی مخالفت منافی عصمت ہو۔ اوقات نماز کی طرف اشارہ --------وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

طٰهٰ ۝۱ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝۳ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝۴

''طا۔ ہا۔ ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نہیں اتارا ہے کہ آپ زحمت و مشقّت اٹھائیں بلکہ نصیحت کے لئے اس کے واسطے جو ڈرے۔ اتارا جانا اُس کی طرف سے جس نے زمین اور اونچے آسمانوں کو پیدا کیا''۔

لفظ ''طٰہٰ'' جس سے آغاز سورہ ہوا ہے، وہ مثل الٓمٓ اور حٰمٓ اور کٓھٰیٰعٓصٓ وغیرہ کے ہے جنہیں مقطّعات قرآنیہ کہتے ہیں اور جن کے متعلق پہلے پارہ میں بحث آ چکی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ رازہائے سربستہ ہیں جن کے معنی ہماری سمجھ سے باہر ہیں اور ان کے معنی سمجھنے کے ہم مکلّف بھی نہیں ہے۔ اس طرح لفظ طٰہٰ کو بھی قدرت کا ایک راز سمجھنا چاہیے، مگر معلوم نہیں کیوں اسے خاص طور پر حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک نام سمجھ لیا گیا ہے اور اس لئے اہل بیت معصومین علیہم السلام کے لئے آل طٰہٰ ویٰسٓ کی ترکیب مستعمل ہے اور طٰہٰ کے معنی اکثر طیب وطاہر کے لئے جاتے ہیں،

ابھی تک میرا ذہن اس کے ماخذ کی دریافت سے قاصر ہے۔

شان نزول میں وارد ہوا ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سورہ کے اترنے سے پہلے عبادت خدا بڑی مشقت اٹھاتے تھے۔ اِسی کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ یہ قرآن اس لئے آپ پر نہیں اتارا گیا ہے کہ آپ اس قدر زحمت و مشقّت برداشت کریں یعنی عبادت میں زحمت شاقّہ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔[1]

اس سے مختلف دوسری شان نزول بھی آئی ہے مگر وہ کسی معصوم علیہ السلام کی زبانی وارد نہیں ہے۔[2] جب کہ پہلی شان نزول کے لئے معصومین علیہ السلام کی زبانی روایت موجود ہے۔[3]

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۵

''وہ سب کو فیض پہنچانے والا ہے[4] اُس کا عرش پر اقتدار قائم ہے''۔

چونکہ پہلے پارہ میں ثُمّ استویٰ علی العرش آچکا ہے، اس لئے اس کی تشریح جتنی ممکن ہے، وہ ہو چکی ہے۔ بہرحال وہ عرش پر قائم ہے مگر ایسا قائم ہونا۔ جو اس کی ذاتِ لامکان کے شایان شان ہو[5] اور جس سے جسمیت لازم نہ آتی ہو، اس لئے کہ وہ جسم و جسمانیت سے بری ہے۔[6]

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝۶ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفَى ۝۷ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۝۸

''اُس کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اور جو زمین کے نیچے ہے اور اگر تم زور سے زور بات کہتے ہو تو (خیر کہو) یقیناً اللہ چپکی کی بات اور اس سے بھی زیادہ چھپی ہوئی چیز کو جانتا ہے۔ کوئی خدا نہیں سوائے اس اللہ کے۔ اُسی کے ہیں تمام اچھے نام''۔

''چپکے کی بات'' سے بھی زیادہ چھپی چیز، دل ہی دل میں یاد الٰہی کرنا اُس کی نیّت ہے، خدا اس سب سے واقف۔[7] اور جب وہ اس

---

[1] لتتعب بما فعلت بعد نزوله من طول قيامك لصلوٰة اللّيل اى خفّف عن نفسك. (جلالين)

[2] قال الحسن هو جواب للمشركين حين قالوا انّه شقّى (مجمع البيان)

[3] عن ابى عبدالله وابى جعفر عليهما السلام قالا كان رسول الله ﷺ اذا صلىٰ قام على اصابع رجليه حتىٰ تورما فانزل الله (على ابن ابراهيم)

[4] اى هوا الرّحمن (مجمع البيان)

[5] استواء يليق به (جلالين)

[6] امّا الاستواء بمعنى الجلوس على الشئ فلا يجوز عليه تعالىٰ لانّه من صفة الاجسام والاجسام كلها محدثة (تبيان)

[7] اخفى منه اى ما حدّثت به النفس وما خطر ولم تحدث به (جلالين)

سب سے واقف ہے تو اسے پکارنے میں آواز زیادہ بلند کرنے کی کیا ضرورت ہے۔[1]

چونکہ اس سے پہلے خالق کا ذکر ''الرحمٰن'' سے ہوا ہے اور اس رحمٰن کی لفظ سے مشرکین وحشت محسوس کرتے تھے جس کا کئی جگہ قرآن مجید میں تذکرہ ہے تو اسی وحشت کو دور کرنے کے لئے سمجھایا گیا ہے کہ رحمٰن ایک اچھی صفت کی حامل لفظ ہے اور جتنے اچھے صفات ہیں، وہ خالق کی ذات میں ہیں، اس لئے رحمٰن بھی وہی اللہ ہے۔

اس میں وحشت کی کونسی بات ہے؟[2]

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝

''اور کیا پہنچا ہے تم تک واقعہ موسیٰ علیہ السلام کا؟ جب اُنہوں نے ایک آگ دیکھی تو اپنے بال بچّوں سے کہا کہ تم ٹھہرو میں نے ایک آگ دیکھی ہے، بہت ممکن ہے کہ میں تمہارے پاس اُس میں سے کچھ آگ لے آؤں یا اُس آگ پر کوئی رہنمائی حاصل کروں، تو جب اس کے پاس پہنچ گئے تو انہوں نے صدا دی گئی کہ اے موسیٰ علیہ السلام! میں تمہارا پروردگار ہوں تو اپنی دونوں جوتیاں اتار دو۔ بلاشبہ تم مقدّس ومحترم وادی طویٰ میں ہو اور میں نے تمہیں منتخب کیا ہے تو غور سے سُنو اُسے جو وحی ہوتی ہے، بلاشبہ میں اللہ ہوں، کوئی خدا نہیں سوا میرے تو میری عبادت کرو اور میری یاد کے لئے نماز ادا کرو، یقیناً قیامت آنے والی ہے، چاہتا ہوں کہ پوشیدہ رکھوں اُسے تاکہ ہر نفس کو معاوضہ ملے اس کا جو وہ کوشش کرے تو تمہیں اُس سے روکے نہ کوئی جو اُس پر ایمان نہیں رکھتا اور جو اپنی نفسانی خواہشوں کا پیرو ہے کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے''۔

جناب موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کا تفصیلی بیان ----آگ لینے کو جانا اور پیغمبری پانا:

---

[1] فلا تجهر نفسك يرفع الصّوت (مجمع البيان)

[2] کافر جب رحمن سنتے تو کہتے تم ایک کو ٹھہراؤ، کبھی کسی کو پکارتے ہو، کبھی کسی کو (موضح القرآن)

آگ کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے متعلّقین سے دو باتیں کہیں، اس لئے کہ اجاڑ اشدّت سے تھا اور راستہ بھی بھول گئے تھے [1]

یہاں پر ایک شاعر کا شعر بطور عوامی مثل کے اردو زبان والوں کے زبان زد ہے کہ:

خدا کے فضل کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ جائیں آگ کو لینے پیمبری مل جائے

اس کا مضمون زیادہ مکمل طور پر حدیث معصوم علیہ السلام میں وارد ہوا ہے:

قال الصّادق علیہ السلام حدثنی ابی عن جدّی عن امیر المومنین علیہ السلام قال: کن لما ترجو ارجی منك لما ترجوا فان موسیٰ بن عمران خرج تقتبس لاهله نارا فکلّم الله عزّوجلّ فرجع نبیّا و خرجت ملکة سبا کافرة فاسلمت مع سلیمان و خرج سحرة فرعون یطلبون الغرّة لفرعون فرجعوا مؤمنین. (مجمع البیان)

امام جعفر صادق علیہ السلام نے کہا مجھ سے میرے والد نے میرے دادا کی زبانی امیر المومنین علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ فرمایا جس کی (بظاہر اسباب) تمہیں امید نہ ہو اُسکے حصول کے اس زیادہ امیدوار جتنے اس کے جس کی بظاہر امید ہو، دیکھو موسیٰ بن عمران گئے اپنے گھر والوں کے لئے آگ لینے، تو اللہ نے ان سے کلام کیا اور وہ نبی ہو کر پلٹے اور ملک سبا کی ملکہ نکلی اس عالم میں کہ وہ کافر تھی اور سلیمان علیہ السلام کے ساتھ وہ درجۂ اسلام پر فائز ہوگئی اور فرعون کے یہاں کے جادوگر نکلے تھے فرعون کے غلبہ کی خاطر اور نتیجہ میں ایمان قبول کیا۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۣ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ﴿۲۲﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرَى ﴿۲۳﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾

''اور یہ تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ!؟ کہا وہ میرا عصا ہے جس کا میں سہارا لیتا ہوں اور اُس سے اپنی بکریوں پر درخت سے پتے گراتا ہوں اور میرے لئے اس میں اور دوسرے فائدے بھی ہیں۔ کہا اسے پھینک دو اے موسیٰ! اس پر انہوں نے اُسے پھینک دیا تو ایک دم وہ ایک سانپ ہو گیا جو دوڑ رہا تھا۔ اس نے کہا پکڑ لو اُسے ڈرو نہیں۔ ہم ابھی اُسے پہلی صورت پر پلٹا دیں گے اور اپنا ہاتھ اپنے بازو کی طرف سمیٹو۔ وہ باہر آئے گا چمکتا ہوا بغیر کسی برائی کے جو دوسرا معجزہ ہوگا تاکہ ہم دکھائیں تمہیں اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے کچھ۔ جاؤ فرعون کی طرف کہ اس نے بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔

---

[1] وکان فی شتآء وقد امنع علیه القدح وضلّ عن الطریق (تبیان)

عصا اور ید بیضاء:

''بغیر کسی برائی کے'' اس کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ جسم میں سفید کا نمودار ہونا مرض ہوتا ہے جس سے پناہ مانگی جاتی ہے تو یہ ظاہر کر دیا گیا کہ یہ ہاتھ کی سفیدی ضیاء ونور کی حیثیت سے ہوگی جس سے کسی قسم کے (معاذ اللہ) عارضہ کا تصور پیدا نہ ہوگا۔[1]

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾

''کہا انہوں نے پروردگار! میرا سینہ کو کشادہ کر دے اور میرے لئے میرے کام کو آسان کر دے اور میری زبان سے گرہ کھول دے کہ وہ لوگ میری بات سمجھ لیں اور میرے لئے میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو قرار دے دے۔ ان کے ذریعہ سے میری کمر کو مضبوط بنا اور انہیں میرے کام میں شریک کر دے کہ ہم بہت زیادہ تیری تسبیح کریں اور بہت زیادہ تجھے یاد کریں یقیناً تو ہمارے حالات کا دیکھنے والا ہے''۔

جناب موسیٰ علیہ السلام کی مناجات اور ہارون کو اپنا وزیر اور شریک کار بنانے کی التجا:

احادیث سے ثابت ہے کہ ایسے ہی الفاظ میں دعاء ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی اور اپنے بھائی علی بن ابی طالب علیہ السلام کیلئے اپنے ساتھ وزیر اور شریک کار بنائے جانے کی دعاء فرمائی جس کا جواب سمجھنا چاہیے اللہ سبحانہ کی طرف سے ان الفاظ میں کہ:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴿١﴾ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ﴿٢﴾ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ﴿٣﴾ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ﴿٤﴾ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿٥﴾ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴿٦﴾

کیا ہم نے آپ کے سینہ کو کشادہ نہیں کیا اور آپ کے اُس بوجھ کو جو آپ کی پشت کو شکستہ کیے دے رہا تھا، آپ سے اتارا نہیں اور آپ کے ذکر کو بلند نہیں کیا؟ یقیناً مشکلوں کے ساتھ ہی آسانی ہوتی ہے یقیناً مشکلوں کے ساتھ ہی آسانی ہوتی ہے''۔

(یعنی یہ سب باتیں تو بغیر آپ کی دعا کے پہلے ہی آپ کیلئے حاصل ہو چکی ہیں، اب رہا آخری جزء، وہ بھی خالق کی طرف سے تو مقرر ہو چکا ہے، اس کا اعلان عام ہے فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴿٧﴾ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴿٨﴾ اب جب حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر پلٹے تو بعد کا انتظام حسب منشائے پروردگار کر دینے کی زحمت کیجیے اور اپنے جانشین کے تقرر کا اعلان کر دیجیے اور پھر بارگاہِ پروردگار کا رخ کرتے ہوئے دنیا سے اٹھ جایئے، اسی فرمانِ اعلان کی تجدید تھی جو پیغمبر پر حکم تاکیدی يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط (مائدہ ٦٧) کے الفاظ میں آئی جس

---

[1] من غیر سوء ای من غیر برص (تبیان) فی قول الجمیع (مجمع البیان)

کی تعمیل میں رسول نے غدیر خم کا تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا اور آخر میں یہ اعلان کیا کہ: من کنت مولاہ فھذا علیّ مولاہ جس پر یہ آیت اتری کہ: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (سورہ مائدہ۔ ۳)

یہ پورا واقعات کا حلقہ بحلقہ ایک سلسلہ ہے جس کی ہر کڑی کے ثبوت کیلئے کتبِ فریقین میں شہادتیں کر کے ایک دم یعنی بلا کسی تشبیب کے آیت کے ذیل میں ''آمدم برسر مطلب'' کے طور پر قیدیوں قصیدہ شروع فرما دیتے ہیں جس کا ابتداء میں بیان کیا ہوا فلسفہ بھی عجیب وغریب ہے کہ:

''ایسے بڑے پیغمبر ان کو خالق کی طرف سے خیال نہیں ہوتا۔ ایک پیش کار چاہیے کہ خلق کو بیچ میں سمجھاوے۔ ہمارے پیغمبر کے آگے ابو بکر تھے۔ اوّل پیغمبر کے وقت سب لوگ انکے سمجھانے سے ایمان میں آئے (موضح القرآن)

واہ واہ، جناب شاہ صاحب! واہ واہ۔ دعائے موسوی میں من اھلی اور اخی دو دو نسبتوں کے بعد اُسی کی مطابقت کرتے ہوئے اہل بیتؑ اور اخؑ (بھائی) کی خصوصیت کو نظر انداز کرنا۔ سرکار والا ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ گویا خداوند عالم اور قرآن دونوں غیر جمہوری مزاج رکھتے ہیں کہ خاندانی خصوصیت کو سامنے لاتے ہیں اور آپ جمہوریت نواز ہیں کہ خاندان کو نظر انداز فرمانا چاہتے ہیں۔ چاہے اس کے ساتھ اہلیت بھی نظر انداز ہو جائے۔ بے شک ''ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے ابو بکر تھے'' کے فقرہ میں اس ''تھے'' کی تعریف نہیں ہوسکتی یعنی یہاں دعا وعا اور بارگاہ الٰہی سے تقرر وقرّر کا سوال نہ تھا۔ یہ شروع سے یہاں ہو گئے تھے لیکن یہ بات اگر ''تھے'' اور ''ہو گئے'' سے ہو جایا کرتی تو بجائے حضرت موسیٰ کو بارگاہ الٰہی میں التجا کی کیا ضرورت تھی؟

حضرت ہارون علیہ السلام کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آگے نہ تھے؟ یہ التجا تو بتاتی ہے کہ یہ منصب خود ''ہو جانے'' سے کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیار وانتخاب سے بھی وابستہ نہیں ہے۔ وہ خود نہ اپنا وزیر مقرر کر سکتے ہیں، نہ جانشین، جب تک خالق کی طرف سے اس کی نامزدگی نہ ہو۔ یہ تو سواد اعظم کے جمہوری تصور کے بالکل خلاف وہ نص والا تصور ہے جسے تنزیل قرآن کے وقت سے اس وقت تک شیعہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں جو دنیا کی نظر میں اُن کا سب سے بڑا قصور ہے مگر کیا کیا جائے کہ سنّتِ انبیاء اور قرآن مجید کے تصریحات اسی کے آئینہ دار ہیں۔

قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی ﴿۳۶﴾ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْکَ مَرَّۃً اُخْرٰی ﴿۳۷﴾ اِذْ اَوْحَیْنَآ
اِلٰٓی اُمِّکَ مَا یُوْحٰٓی ﴿۳۸﴾ اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ فَلْیُلْقِهِ الْیَمُّ
بِالسَّاحِلِ یَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّیْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَیْتُ عَلَیْکَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی
عَیْنِیْ ﴿۳۹﴾ اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُکَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی مَنْ یَّکْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰکَ اِلٰٓی
اُمِّکَ کَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّیْنٰکَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰکَ
فُتُوْنًا ۫ فَلَبِثْتَ سِنِیْنَ فِیْٓ اَهْلِ مَدْیَنَ ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی ﴿۴۰﴾

''ارشاد ہوا کہ تمہاری مانگ تمہیں عطا ہوئی اے موسیٰ! اور ہم نے تم پر ایک دفعہ اور بڑا کرم کیا ہے جب ہم نے

تمہاری ماں کی طرف جو وحی بھیجنا تھی، وہ بھیجی یہ کہ تم اس صندوق میں ڈال کر اُسے دریا میں ڈال دو تو دریا اُسے پھینک دے ساحل پر کہ اُسے اٹھالے وہ جو میرا بھی دشمن ہے اور اس کا بھی دشمن ہے اور میں نے تمہارے لئے اپنی طرف سے محبت والفت پیدا کی، اور اس لئے کہ تم خاص میری نگرانی میں پروان چڑھو، جب تمہاری بہن چلیں اور جا کر کہا کہ کیا میں تم لوگوں کو ایسی شخصیت بتاؤں جو اس کی پرورش کرے، اس طرح ہم نے تم کو تمہاری ماں کی طرف واپس بھیج دیا تا کہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور تم نے ایک آدمی کو جان سے مار ڈالا تو ہم نے تم کو رنج وملال سے چھٹکارا دیا اور تمہارا پورے طور پر امتحان لیا تو تم کئی برس مدین والوں میں رہے، پھر ایک خاص تقدیر کے فیصلہ پر ادھر آئے۔ اے موسیٰ علیہ السلام!''

جناب موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے واقعات اور مدین جانا اور مراجعت:

یہاں پوری تاریخ ماضی ہے جو بطور خطاب جناب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے دہرائی گئی ہے، پہلے ولادت کے بعد تابوت میں سپرد دریا کیا جانا اور نتیجہ بیان کیا گیا ہے اور پھر جناب موسیٰ علیہ السلام کا مدین جانا اور پھر مراجعت ان واقعات کی کڑیاں اور بہت سے تفصیلات قرآن مجید میں دوسرے مقام پر مذکور ہیں۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿٤١﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿٤٢﴾ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٤٣﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٤﴾ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿٤٥﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿٤٦﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۬ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٤٧﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٤٨﴾

''اور میں نے تمہیں خود اپنے لئے تیار کیا ہے، جاؤ تم اور تمہارا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ اور مجھے یاد کرنے میں سستی نہ کرنا۔ جاؤ تم دونوں فرعون کی طرف! یقیناً اُس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے تو اُس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا کہ شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈرے، ان دونوں نے کہا کہ پروردگار! ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہمارے مقابلہ میں پیش قدمی کرے [1] یا یہ کہ سرکشی سے کام لے۔ ارشاد ہوا کہ ڈرو نہیں۔ میں تم دونوں کے ساتھ سنتا ہوں گا اور دیکھتا ہوں گا تو جانا اس کے پاس۔ جا کر کہنا کہ ہم دونوں تمہارے پروردگار کے پیغمبر ہیں تو ہمارے ساتھ بنی

---

[1] الفرط التقدّم امام القوم الی الماء.....فالاصل فیه التقدّم (تبیان)

اسرائیل کو روانہ کردو اور انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ ہم تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف کا معجزہ لے کر آئے ہیں [1] اور سلام ہو اُس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ ہماری طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ عذاب ہے اُس پر جھٹلائے اور روگردانی کرے"۔

فرعون سے گفتگو میں نرمی اور رواداری برتنے کا حکم:

دعوت وتبلیغ کے لئے اس خاص ہدایت کے ساتھ کہ "نرمی کے ساتھ گفتگو کرنا" یہ ارشاد کہ لعلّه یتذکّر او یخشیٰ شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈرے، عالم الغیب کی طرف سے اُس امید کا اظہار نہیں ہے جو پوری ہونے والی تھی بلکہ اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ سخت کلامی اور درشت انداز میں گفتگو خود اکثر قبول حق میں رکاوٹ بن جاتی ہے کہ اگر وہ نصیحت قبول کرنے والا ہوتا تو بھی اب قبول نہیں کرتا جس کی بنا پر اب اُس کی گمراہی یا گمراہی میں شدّت اختیار کرنے کی ذمّہ داری اس داعی حق کی غلط انداز سے گفتگو پر ہوتی ہے لہٰذا عموماً انداز گفتگو ایسا ہونا چاہیے کہ جس سے امکان اس کے اثر پذیر ہونے کا ہو۔ اب یہ اور بات ہے کہ یہ امکان اُس کے عناد کی وجہ سے وقوع میں نہ آئے جیسا کہ فرعون کے بارے میں علم الٰہی میں یہی تھا کہ وہ اثر قبول نہ کرے گا جو بعد میں ظہور میں آیا۔ مگر داعی حق کا عمل ایسا ہونا چاہیے جیسے وہ اس شخص کے راہ راست پر آنے سے مایوس نہیں ہے، اس لئے وہ ممکن حد تک اُس سے نرمی برتتا ہے۔ [2]

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾
قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ
وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾ كُلُوْا وَارْعَوْا
اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ
وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾

"اُس نے کہا تو کون ہے پروردگار تم دونوں کا اے موسیٰ علیہ السلام! اُنہوں نے کہا ہمارا پروردگار وہی وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کا وجود عطا کیا ہے، پھر منزل تک پہنچانے کا سامان کیا ہے، کہا تو گزشتہ نسلوں کا کیا ہے؟ انہوں نے کہا ان کا علم میرے پروردگار کے یہاں ہے ایک نوشتہ میں۔ نہ میرا پروردگار بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔ وہ وہ ہے

---

[1] بآیة من ربك ای بمعجزة ظاهرة (تبیان)

[2] ای کون علی الرّجآء والطمع لا علی الباس من فلاحه فوقع التعبّد لهما علی هذا الوجه لانّه ابلغ لهما فی دعائه الی الحقّ (مجمع البیان)

جس نے قرار دیا تمہارے لئے زمین کا بچھونا اور چلائیں تمہارے لئے اُس میں راہیں اور آسمان سے پانی اتارا تو ہم نے اُس سے مختلف نباتات کے جوڑے نکالے۔ کھاؤ خود بھی اور چراؤ اپنے مویشیوں کو، یقیناً اس میں نشانیاں صاحبانِ عقل کے لیے، اِسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اُسی میں پلٹائیں گے اور اسی سے تمہیں دوبارہ نکالیں گے"

جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی گفتگو:

آیات کے اسلوب سے ظاہر ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کو جو خطاب فرعون سے تھا، اسے نقل کرتے ہوئے ان کے کلام کو کہ "وہ وہ ہے جس نے قرار دیا تمہارے لئے زمین کا بچھونا اور تمہارے لئے اُس میں راستے بنائے اور آسمان سے پانی اتارا"، یہاں تک اس بات کو پہنچا کر خالق نے خود اپنی زبان سے اپنی قدرت کا اظہار وقت نزول قرآن کے آدمیوں کو مخاطب کر کے فرمانا شروع کر دیا ہے[1] اور اسی سلسلہ میں آیندہ آیت سے تذکرۂ فرعون یوں شروع ہوا ہے کہ:

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى۔

ہم نے اسے اپنی تمام قدرت کی نشانیاں دکھائیں مگر اُس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔

اور اُس کے بعد پھر موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام سے فرعون کا مکالمہ شروع ہو گیا۔

رب کے متعلق پوچھنے اور یہ سننے کے بعد کہ وہ وہ ہے جس نے ہر شے کی صورت گری کی ہے، فرعون کا یہ سوال کہ:

فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى: تو گزشتہ نسلوں کا کیا حال ہے؟

اس کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ اس نے ایسا تصور کیا کہ جب وہ رب ہے تو جن کو اس نے پیدا کیا، ان سب کو باقی رہنا چاہیے، وہ آخر ختم کیوں ہو گئے؟ اس کا جواب جناب موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا کہ ان کا علم میرے پروردگار کو ہے نہ وہ بھٹکتا ہے، نہ تو وہ بھولتا ہے یعنی یہ باتیں حکمت الٰہی سے متعلق ہیں اور "خالق نے بعد کے تتمّہ میں جو اس نے اب کے لوگوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے، آخر تک اس کا جواب ذرا تفصیل سے دیا ہے کہ وہ سب بالکل ختم تھوڑی ہو گئے ہیں۔ ہم نے نظام یہی مقرر کیا ہے کہ اس زمین سے یعنی خاک سے جو جزءِ زمین ہے پیدا کرتے ہیں اور پھر اسی زمین کے اندر لے جاتے ہیں اور پھر قیامت میں اُن کو اسی زمین سے دوبارہ برآمد کریں گے جو اس سفر کی آخری منزل ہو گی۔

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿٥٦﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٥٧﴾ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٨﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾

"اور ہم نے اپنی قدرت کی سب نشانیاں دکھائیں، اس پر بھی اُس نے جھٹلایا، اور انکار کیا، اس نے کہا کیا تم اے

---

[1] قال تعالیٰ تتمیماً لما وصفه به موسیٰ خطاباً لاهل مکّته (جلالین)

موسیٰ! ہمارے پاس آئے ہو اس لئے کہ ہمیں اپنے جادو کے زور سے ہماری سرزمین سے نکال دو تو ضرور تمہارے مقابلہ میں ویسا ہی جادو ہم بھی لائیں گے، تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدہ کا وقت قرار دو جس کے خلاف نہ ہم کریں اور نہ تم، ایسی جگہ جو بیچ میں ہو، انہوں نے تمہارے لئے وعدہ کا دن آرائش والا دن ہے اور یہ کہ تمام لوگ دھوپ چڑھے جمع کر لئے جائیں تو فرعون پلٹا اور پلٹ کر اُس نے اپنے منصوبہ کا پورا انتظام کیا اور پھر آیا''۔

ساحروں کے مقابلہ کا اہتمام:

''سب نشانیاں دکھائیں'' یعنی وہ معجزات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت تک عطا ہوئے تھے، وہ سب دکھلا دیے گئے، نہ یہ کہ جو اللہ کی نشانیاں ازل سے ابد تک ظاہر ہوتی رہیں یا رہیں گی، وہ سب فرعون کو دکھا دی گئیں۔ ایسا نہیں بلکہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کچھ معجزات اس کے بعد ظاہر ہوئے، وہ بھی اس وقت فرعون کو دکھائے گئے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾

''کہا اُن لوگوں سے موسیٰ علیہ السلام نے کہ ارے وائے ہو تم پر، بہتان نہ باندھو اللہ پر جھوٹا کہ قلع قمع کر دے وہ تمہارا عذاب سے اور بے شک ناکام ہوا وہ جس نے بہتان باندھا تو اُن لوگوں میں آپس میں بحث ہونے لگی اور کچھ چپکے چپکے باتیں کیں۔ کہا یہ دونوں جادوگر ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنے جادو سے تم لوگوں کو تمہاری سرزمین سے نکال دیں اور تمہارے مذہب کو تباہ کر دیں تو اپنی تمام تیاریاں مکمل کر لو۔ پھر صف بندی کر کے آجاؤ اور یقیناً بہتری آج وہی حاصل کرے گا جو غلبہ حاصل کر لے''۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿٦٥﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿٦٧﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿٦٨﴾ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿٦٩﴾

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿۷۰﴾

''اُن لوگوں نے کہا اے موسیٰ علیہ السلام! یا تم پھینکو یا ہم ہوں پہلے پھینکنے والے، انہوں نے کہا نہیں بلکہ تم ہی پھینکو تو ایک دم ان کی رسیاں اور لکڑیاں ان کے آگے ایسی معلوم ہونے لگیں ان کے جادوں سے کہ وہ دوڑ رہی ہیں، تو اپنے دل میں موسیٰ علیہ السلام نے ذرا محسوس کیا۔ ہم نے کہا ڈرو نہیں، بلاشبہ غالب آنے والے تم ہی ہو اور تکلیف اور پھینک دو جو تمہارے سیدھے ہاتھ میں ہے۔ وہ نگل جائے گا اُسے جو انہوں نے بنایا ہے وہ ایک جادوگر والی ترکیب ہے اور جادوگر نتیجہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا جب بھی وہ آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ سب جادوگر سجدہ میں گر پڑے، کہنے لگے ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ کے پروردگار پر''۔

معجزہ کا عقلی معیار:

''ایسی معلوم ہونے لگیں ان کے جادوں سے''۔ اس سے نتیجہ نکالا گیا ہے کہ حقیقت میں وہ سانپ کی طرح دوڑ نہیں رہی تھیں بلکہ یہ کوئی کرتب تھا کہ نظر ایسا آرہا تھا جیسے ''ڈھٹ بندی'' میں ہوتا ہے۔[1]

موسیٰ علیہ السلام کو ڈر کس بات کا ہوا؟ امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں فرمایا ہے:

لَمْ يُوجِسْ مُوسَى خِيفَةً عَلَى نَفْسِهِ، اَشْفَقَ مِنْ غَلَبَةِ الْجُهَّالِ وَدُوَلِ الضَّلالِ (خطبہ نمبر ۴)

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی جان کے لئے خطرہ محسوس نہیں کیا بلکہ انہیں خوف ہوا گمراہی کے تسلّط اور جاہلوں کے غالب آنے کا۔

اسی کو شیخ الطائفہؒ نے اس طرح لکھا ہے کہ:

انّما خاف دخول الشّبيهة على قومه۔

انہیں خوف بس اس کا ہوا کہ ان کی قوم شبہ میں نہ پڑ جائے۔

اور پھر اسی کو جلالین نے بھی لکھ دیا ہے:

اى خاف من جهة انّ سحر هم من جنس معجزته ان يلبتس امره على النّاس فلا يؤ منوا به

یعنی اُنہیں خوف ہوا اس وجہ سے کہ اُن کا جادو نوعیت میں اُن کے معجزہ کی قسم کا ہے تو کہیں لوگوں پر معاملہ مشتبہ نہ ہوجائے۔ جس سے وہ ان پر ایمان نہ لائیں۔

خالق نے جن الفاظ میں انہیں بعد میں اطمینان دلایا ہے، وہ بھی اس توجیہ کے بالکل مطابق ہیں۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ

---

[1] انّما قال يخيّل لانّهما لم تكن تسعىٰ حقيقة وانما تحركت لانهّ قبل انهّ كان جعل داخلها زبيق فلمّا حميت بالشمس طلب الزّبيق الصّعود فتحركت العصىّ والحبال (تبيان)

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿۷۱﴾ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۷۳﴾

''کہا اُس نے کہ تم لوگ اُس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں، یقیناً یہی تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے تو میں ضرور اب تمہارے ہاتھوں اور پیروں کو قلم کراؤں گا مختلف سمتوں سے اور ضرور تمہیں سولی دوں گا کھجور کے درختوں پر اور ضرور تم جانو گے کہ ہم میں سے کس کا عذاب سخت اور پائدار ہے۔ اُن لوگوں نے کہا کہ ہم ہرگز تجھے مقدّم نہیں کریں گے اُس پر جو ہمارے پاس آ گیا کھلے دلائل میں سے اور اُس ذات پر جس نے کہ ہمیں پیدا کیا ہے، تو کر ڈال جو تجھے کرنا۔ تو بس اسی دنیوی زندگی کو ختم کرے گا۔ بلاشبہ ہم ایمان لائے ہیں اپنے پروردگار پر تاکہ وہ ہماری خطاؤں کو اُس جادوگری کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، بخش دے اور اللہ بہتر اور بہت زیادہ پائدار ہے''۔

ساحروں کی فرعون سے گفتگو:

فرعون نے کہا کہ ''تمہارا بڑا ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے'' اس سے پہلی ہی نگاہ میں جو سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ان سے کہہ رہا ہے کہ میں سمجھتا ہوں یہ تم لوگوں کی ملی بھگت تھی اور موسیٰ علیہ السلام کوئی اور نہیں۔ تمہارے ہی گروہ کے تھے جنہوں نے تمہیں جادو سکھایا ہے، اس لئے اتنی جلدی تم اُن کے سامنے سپر انداختہ ہو گئے یہی ہمارے مستند مفسرین کی تفسیر بھی ہے۔[1] مگر شاہ عبدالقادر معلوم نہیں کیوں لکھ رہے ہیں کہ:

''یہ شاید رب کو کہنے لگا'' (موضح القرآن)

بے شک جادوگروں کا یہ کہنا کہ ''اللہ ہماری خطاؤں کو معاف کرے اور اُس جادو کرنے کو جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے جو شاہ صاحب نے ان لفظوں میں لکھا ہے کہ:

''جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نشان دیکھ کر سمجھ گئے تھے کہ وہ جادو نہیں مقابلہ نہ کرتے پھر فرعون کی خاطر سے کیا'' (موضح القرآن)

---

[1] انه یعنی موسیٰ لکبیرکم ای رئیسکم و مقدّمکم (تبیان) معناہ انّه استاذ کم و انتم تلامذته وقد یعجز التلمیذ عما یفعله الاستاذ (مجمع البیان)

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾

''بلاشبہ جو اپنے پروردگار کی بارگاہ میں مجرم ہونے کی حالت میں آئیں تو یقیناً اُسے استحقاق ہوگا دوزخ کا جس میں نہ وہ مرتا ہوگا اور نہ وہ زندہ رہتا ہوگا اور جو اُس کے پاس مومن ہونے کی حالت میں آئے کہ نیک اعمال انجام دیے ہوں تو یہ وہ ہیں جن کے لئے بڑے اونچے درجے ہیں، زندگی جاوید والے بہشت جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے، یہ صلہ ہے اُس کا جو پاک باز رہا ہے''۔

مجرم کے مقابلہ میں ''مومن'' کا لفظ ہوتا تو ہم کہتے کہ پہلے مجرم سے مراد کافر ہے مگر یہاں اس کے مقابلہ میں مومنا قد عمل الصّالحات ہے لہٰذا اُس کے مقابلہ میں جو مجرم ہے، اُس میں دونوں داخل ہیں، کافر بھی اور وہ مسلمان بھی جس نے اعمال صالحہ کی پابندی نہ کی ہے اور اسی لئے ہم نے ''له جهنم'' کا ترجمہ یہ کیا جو واقعاً اس لفظ کے معنی ہیں کہ ''اُسے استحقاق ہوگا دوزخ کا''۔

اس استحقاق کے ساتھ اب دو صورتیں ہیں کہ ایک یہ کہ وہ بخشا نہ جائے اور داخل جہنم ہو ہی جائے جیسا کہ کفّار کے لئے ہے اور ان گناہوں کے مرتکبین کے لئے جن کی شفاعت نہ ہو اور کسی طرح بھی مغفرت نہ ہو اور یہ بھی کہ وہ شفاعت کے ساتھ یا کسی عمل خیر کے صلہ میں یا صرف تفضّل ربّانی سے بخش دیا جائے۔ یہ اُن کے لئے ہے جو اصولِ عقائد کے اقرار کے ساتھ کسی حد تک بداعمال ہیں اور ان کی بداعمالی اُس درجہ پر نہ ہو جو شفاعت وغیرہ سے محروم کر دیتا ہے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾

''اور جو ہم نے وحی بھیجی موسیٰ علیہ السلام کی طرف کہ رات کے وقت میرے بندوں کو لے کر روانہ ہو تو طے کرنا ان کے لئے ایک راستہ دریا کے اندر خشک کہ نہ ڈر ہوگا تم کو کسی نقصان کا اور نہ کوئی خطرہ تمہیں ہوگا تو پیچھا کیا اُن لوگوں کا فرعون نے اپنی افواج کے ساتھ تو ڈھانپ لیا اُسے سمندر نے جیسا اُسے ڈھانپنا تھا اور گمراہ کیا فرعون نے اپنی قوم کو اور انہیں صحیح راہ نہیں دکھائی''۔

فرعون اور اس کی فوج کا غرق دریا ہونا:

ضرب کے معنی راستہ طے کرنے کے بھی ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ (نساء ۱۰۱) اسی لئے ہم نے

طریقہ کے ساتھ "فاضرب" کا لفظ ہے، اُس کا ترجمہ کیا "طے کرنا" مگر ضرب کے معنی مارنے کے بھی ہیں اور یہاں واقعہ یہ تھا کہ حکم ہوا دریا پر عصا سے ضرب لگاؤ۔ وَ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ، اسی ضرب سے راستا بنا تھا تو یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ضرب لگا کہ بنی اسرائیل کے لئے خشک راستہ بناؤ[1] مگر الفاظ قرآنی میں ضرب یعنی مارنے کا تعلق دریا کے ساتھ نہیں بلکہ راستے کے ساتھ ہے، اس لئے علامہ طبرسیؒ نے اس کے ساتھ اس مفہوم کا اضافہ کیا کہ ضرب عربی میں سکہ ڈھالنے کے لئے بھی آتا ہے تو حکم یہ ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے سمندر میں ایک راستہ بنا دو۔[2]

آخری الفاظ: اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى "گمراہ کیا فرعون نے اپنی قوم کو اور صحیح راہ نہیں دکھائی" ناظر ہیں فرعون کے اُس قول کی طرف جو اس نے اپنی قوم والوں سے کہے تھے کہ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ "میں تم کو صحیح راہ دکھاؤں گا"۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿٨٠﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿٨١﴾ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿٨٢﴾

"اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو نجات دی تمہارے دشمن سے قول و قرار کیا تم سے طور پر کے دائیں پہلو کا اور اتارا تم پر من و سلویٰ کہ کھاؤ ان اچھی غذاؤں سے جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اور اس کے بارے میں زیادتی نہ کرو کہ نازل ہوگا تم پر غضب میرا اور جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ ہلاک ہوا اور بلاشبہ میں بخشنے والا ہوں اس کو جو توبہ کرے اور ایمان اختیار کرے اور نیک اعمال کرے، پھر راہ راست پر قائم رہے"۔

ان واقعات کی تفصیل دوسرے مقامات پر جہاں جہاں ان امور کا ذکر ہے درج ہوئی ہے، "کھاؤ ان اچھی غذاؤں سے" یعنی اگر کھانا چاہو تو کھاؤ، کوئی ممانعت نہیں ہے۔[3]

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٨٣﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿٨٤﴾ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ

---

[1] المعنى واضرب بعصاك البحر يجعل طريقا فكأنّه قيل اجعل طريقاً بالضرب بالعصا (تبيان)

[2] كانه قد ضرب الطريق كما يضرب الدّينار (مجمع البيان)

[3] صورته صورة والمراد به الاباحة (تبيان و مجمع البيان)

رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِیْ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَاۤ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَی السَّامِرِیُّ ﴿۸۷﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰی ۙ فَنَسِیَ ﴿۸۸﴾ اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَاَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰكِفِیْنَ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰی ﴿۹۱﴾

''اور کیا بات ہوئی اے موسیٰ علیہ السلام کہ تم جلد بازی سے کام لے کر اپنی قوم کو چھوڑ آئے تو اُنہوں نے کہا وہ میرے پیچھے ہی ہیں اور میں جلدی تیری بارگاہ میں حاضر ہو گیا کہ تو خوشنود ہو۔ ارشاد ہوا تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے بعد تمہاری قوم کو ہم نے آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے اُنہیں گمراہ کر دیا ہے تو واپس آئے موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصّہ میں افسوس کرتے ہوئے کہا ارے میری قوم والو! کیا اللہ نے تم سے بہت اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا مدّت تم پر بہت طولانی ہوگئی یا ارادۃً تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غضب نازل ہو تو تم نے مجھ سے وعدہ خلافی نہیں کی مگر ہمیں اس جماعت کے بہت سے زیور اکٹھا کر کے لانے پر آمادہ کیا گیا اور یہ طرح ڈالی سامری نے تو اُس نے نکالا ان لوگوں کے لئے ایک مجسّمہ بچھڑے کا جس میں سے گائے کی آواز پیدا ہوتی تھی تو ان لوگوں نے کہا یہ تمہارا خدا ہے اور موسیٰ کا خدا ہے جسے وہ بھول گئے تو کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ اُن سے ہارون نے اس کے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اے میری قوم والو! تم اس کی وجہ سے آزمائش میں پڑے ہو اور یقیناً تمہارا پروردگار وہ ہے جو سب کو فیض پہنچانے والا ہے تو تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کی تعمیل کرو، اُنہوں نے کہا ہم اس کی عبادت میں برابر لگے ہیں یہاں تک کہ موسیٰ ہماری طرف واپس آئیں''۔

سامری کی گوسالہ سازی اور اس کا انجام:

ابتدائی الفاظ: وَمَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ یٰمُوْسٰی ''کیا بات ہے اے موسیٰ علیہ السلام کہ تم جلد بازی سے کام لے کر اپنی قوم کو چھوڑ آئے'' (سورۂ طٰہٰ۔ ۸۳)

اس تشریح کا پتہ دیتے ہیں کہ دراصل جناب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جب بلایا گیا ہے تو یہ حکم ہوا تھا کہ تم اپنی قوم کے ساتھ آنا لیکن یہ محسوس کر کے کہ پوری قوم کے تیار ہونے میں بہت دیر لگے گی، وہ اُن سے یہ کہہ کر میں جاتا ہوں تم میرے پیچھے آؤ، خود چلے گئے اور یہاں قوم سامری

کے جال میں پھنس کر رہ گئی۔ [1]

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿٩٢﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿٩٣﴾
قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿٩٤﴾

''انہوں نے کہا اے ہارون! تمہیں کون امر مانع تھا کہ جب تم نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے تو تم میرے پیچھے نہ چلے آئے۔ تو کیا تم نے میرے حکم کی مخالفت کی؟ انہوں نے کہا اے میرے مانجائے!
میری داڑھی اور میرے سر کے بال نہ پکڑیئے، مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں گے تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا خیال نہ کیا''۔

اس کا ایک مطلب جو جناب ہارون علیہ السلام کے جواب سے مرتبط ہے، یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہہ رہے تھے کہ تم اُن ثابت قدم افراد کو جو گوسالہ پرستی سے الگ رہے تھے، لے کر میرے پاس کیوں نہ آ گئے۔ [2]

اس پر جناب ہارون علیہ السلام نے کہا کہ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ آپ کہیں گے تم نے جماعت میں انتشار پیدا کر دیا، شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:
''چلتے وقت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام کو نصیحت کر گئے تھے کہ سب کو متفق رکھیو۔ اس واسطے انہوں نے بچھڑا پوجنے والوں کا مقابلہ نہ کیا، زبان سے سمجھایا، وہ نہ سمجھے'' (موضح القرآن)

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً
مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿٩٦﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ
فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۖ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ
الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿٩٧﴾ اِنَّمَآ
اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿٩٨﴾

''کہا اچھا، تیرا معاملہ ہے اے سامری! اس نے کہا میں نے ایسی چیز دیکھی جو ان لوگوں نے نہیں دیکھی تو میں نے ایک مٹھی خاک لے لی (خدا کے) بھیجے ہوئے (فرشتے) کے قدم کے نیچے سے تو اس کو میں نے ڈال دیا اور ایسا میرے نفس نے مجھے آمادہ کیا۔ انہوں نے کہا اچھا جا۔ اب تیرے لئے اس زندگی میں یہ ہے کہ تو کہتا رہے کہ کوئی چھوئے نہیں اور یقیناً تیرے لئے ایک وعدہ کا دن ہے اور وہ جس کے خلاف تو جا نہیں سکتا اور دیکھ اپنے خدا کو جس

---

[1] تعجل موسیٰ بینهم شوقا الی ربّه وخلفهم لیحلقوا به (مجمع البیان)
[2] قال ابن عباس: معناه بمن اقام علی ایمانه (تبیان)

کی عبادت میں تو لگا رہا کہ ہم اسے جلائیں گے، پھر اس کی خاک کو دریا میں بہا دیں گے، تم لوگوں کا اصل خدا تو بس اللہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ ہر شے پر علم کے اعتبار سے حاوی ہے''۔

اس گوسالہ کے لئے سامری سے یہ تخاطب کہ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ ''دیکھ اپنے اس خدا کو، حالانکہ سب کا خدا اللہ ہے اور وہی سامری کا بھی حقیقت میں خدا ہے، اس اعتبار سے ہے کہ اس نے اسے خدا بنایا تھا۔ [1]

اسے مخاطب کر کے متوجہ کرنا کہ جو تیرا معبود تھا، دیکھ اسے آگ میں جلائیں گے، پھر اس کی خاک کو دریا میں بہا دیں گے'' ظاہر ہے کہ اس گوسالہ کہ کوئی زمین سزا دینا نہیں ہے کیوں کہ وہ بے جان اور بے شعور ہونے کی بنا پر بے خطاب ہے بلکہ یہ اس کے عبادت گزار کے لئے ایک سخت سرزنش اور بہت بڑی سزا ہے اس کے اس آیت پر بڑی تیز روشنی پڑتی ہے جو پہلے پارے میں آچکی ہے کہ دوزخ کے لئے کہا گیا ہے: وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ، اس کا ایندھن آدمی ہیں اور پتھر جس کی قوی تفسیر یہی ہے کہ وہی پتھر جن کی وہ عبادت کرتے تھے ان کے ساتھ ساتھ آتش کیے جائیں گے، اس کے علاوہ یہ جلانا اور اس کا جل جانا اور دریا میں بہانا اور اس کا بہہ جانا اس کی دلیل بھی ہے کہ وہ مجبور اور بے بس ہے اور اسے خدا سمجھنا غلط تھا۔ [2]

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾
مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَاۗءَ لَهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾
يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ
اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾

''اس طرح ہم بیان کرتے ہیں آپ کے سامنے خبروں میں سے اور ہم نے عطا کی ہے آپ کو اپنی طرف سے یادداشت جو اس سے روگردانی کرے گا تو وہ برداشت کرے گا قیامت کے دن ایک بوجھ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور بہت برا ہوگا ان کے لئے قیامت کے دن یہ بار جس دن صور پھونکا جائے گا اور مجرموں کو محشر میں لائیں گے ہم اس دن اس عالم میں کہ آنکھیں ان کی نیلی ہوں گی، چپکے چپکے آپس میں کہتے ہوں گے کہ تم نہیں رہے ہو مگر دس ۱۰ دن۔ ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہہ رہے ہیں، جب کہ ان میں کا سب سے زیادہ سمجھدار آدمی یہ کہتا ہوگا کہ تم نہیں رہے ہو مگر ایک دن''۔

''آنکھیں نیلی ہوں گی'' پیاس سے یا یہ کہ بے نور ہوں گی، ان میں چمک نہ رہے گی۔ نیلاہٹ ہی نیلاہٹ محسوس ہوگی یا کہ یہ اس سے

---

[1] الٰهك يعنى معبودك فى نفسك (تبيان)

[2] نبّه بذٰلك علىٰ انّه ما يمكن سحقه واحراقه لا يصلح العبادة (مجمع البيان)

بس بدشکل ہونے کا اظہار ہے کہ سیاہ ہوں گے اور آنکھیں نیلی۔ یہ تینوں احتمال ہیں جنہیں جناب شیخ الطائفہ نے تبیان میں درج کیا ہے

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾

''اور وہ آپ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ انہیں میرا پروردگار بالکل سرمہ کر کے چٹیل میدان بنا دے گا جس میں تمہیں کجی نظر نہ آئے گی اور نہ بلندی۔ اس دن وہ لوگ پکارنے والے کی آواز کے پیچھے خوب آئیں گے جس میں ذرا بھی انحراف نہ ہوگا اور تمام آوازیں خدائے رحمٰن کے سامنے مدّھم پڑ جائیں گی تو سنو گے سوا قدموں کی چاپ کے۔ اس دن سفارش کوئی فائدہ نہ دے گی سوا اس کے جس کو خدائے رحمٰن کی اجازت اور اس کے کہنے سے راضی ہو''۔

ثبوت شفاعت:

پہلے کئی جگہ توجہ دلائی گئی ہے۔ یہاں پھر دیکھیے۔ نفی شفاعت میں استثناء ہو گیا[1] جس کے بعد مستثنیٰ میں ثبوتِ شفاعت ظاہر ہے۔[2] اس کے بعد مطلق طور پر یہ کہنا کہ اسلام میں شفاعت کوئی چیز نہیں، از روئے قرآن صراحتاً غلط ہے۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَ قَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

''وہ جانتا ہے اسے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور ان کا علم اس پر حاوی نہیں ہے اور چہرے جھک گئے ہوں گے اس زندہ نظام عالم کو قائم رکھنے والے کے سامنے اور ناکام ہوا وہ جس نے ظلم کا بوجھ اٹھایا اور جو نیک کام کرے اس حالت میں کہ وہ باایمان ہو تو وہ نہیں ڈرے گا زیادتی سے اور نہ کمی سے''۔

''اسے جو ان کے آگے ہے یعنی مستقبل خواہ امور دنیا ہوں جو بعد میں ہوں گے اور خواہ قیامت اور جو ان کے پیچھے ہے یعنی ماضی''[3]

---

[1] الّا شفاعة من اذن الله له ان يشفع ورضى قوله فيها من الانبيآء والاولياء الصالحين والشهدآء (مجمع البيان)۔

[2] یعنی اس کی سفارش چلے گی (موضح القرآن)

[3] اى يعلم ما بين ايدى الخلائق من امور القيامة واحوالهم ويعلم ما سبق فى ما تقدمهم (تبيان)

بعض نے یوں کہا ہے ''جو ان کے آگے ہے، وہ آخرت ہے اور اس کے احوال و اہوال اور جو پیچھے ہے، وہ یہ دنیا ہے۔[1]

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾

''اور اسی طرح اتارا ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنا کر اور اس میں طرح طرح سے عذاب کی خبریں دیں، شاید وہ پرہیزگاری اختیار کریں یا یہ ان میں کچھ نصیحت کا اثر کریں''۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

''تو وہ بلند و برتر ہے۔ اللہ جو سلطنت کا حقیقی مالک ہے اور جلدی نہ کیا کیجیے قرآن میں قبل اس کے پہنچائیں کی طرف اس کی وحی اور کہیے کہ پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما''۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''جبرئیل علیہ السلام جب قرآن لاتے، حضرت ان کے پڑھنے کے ساتھ خود بھی پڑھنے لگتے کہ بھول نہ جاؤں اس کو پہلے منع فرمایا تھا، سورۃ قیامت میں اور تسلی کر دی تھی کہ اس کا یاد رکھوانا اور لوگوں تک پہنچوانا ذمہ ہمارا ہے۔ پھر تقید کیا''۔ (موضح القرآن)

مگر یہ روایت ہمارے طرق سے وارد نہیں ہوئی ہے اور عدم امکان سہو نسیان پیغمبر خدائے کے لئے اس کے منافی ہے۔

ہماری تفسیر میں اس جملہ کے دو معنی اور ہیں: ایک یہ کہ وحی کے اترنے میں دیر ہو تو اس کے لئے جلدی نہ کیا کیجیے۔

دوسرے یہ کہ جب خالق کی طرف سے مکمل تشریح نہ آجائے، لوگوں تک اس حصۂ قرآن کے پہنچانے میں جو اترا ہے، جلدی نہ کیا کیجیے۔[2]

علامہ طبرسیؒ نے بلا تبصرہ تینوں قول نقل کر دیے ہیں۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ

---

[1] ما بين ايديهم من امور الأخرة وما خلفهم من احوال الدّنيا (مجمع البيان)

[2] اى لا تسئال انزاله قبل ان ياتيك وحيه وقبل معناه لا تلقه الى الناس قبل ان ياتيك بيان تاويله (تبيان)

يٰٓاٰدَمُ هَلۡ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الۡخُلۡدِ وَمُلۡكٍ لَّا يَبۡلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنۡهَا فَبَدَتۡ لَهُمَا سَوۡاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخۡصِفٰنِ عَلَيۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَنَّةِ ۛ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾

''اور اس کے پہلے آدم علیہ السلام سے ہم نے عہد و پیمان لیا تو وہ بھول گئے اور انہیں پایا ہم نے ان میں مضبوط ارادہ اور جب ہم نے کہا فرشتوں سے کہ سجدہ کرو آدم علیہ السلام کو تو ان سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کیا تو ہم نے کہا اے آدم! بلاشبہ یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے تو ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو بہشت سے نکلوا دے تو تم زحمت و مشقت میں ہو۔ بلاشبہ اس میں تمہارے لئے یہ کہ تم بھوکے نہیں ہوتے اور نہ برہنہ ہوتے اور نہ دھوپ کھاتے ہو تو شیطان نے وسوسہ انگیزی کی۔ کہا اے آدم! کیا میں تمہیں بتاؤں ہمیشہ کی زندگی والا درخت اور ایسی سلطنت کا ذریعہ جو کبھی بوسیدہ نہ ہو تو اُن دونوں نے اُس میں سے کھالیا تو ظاہر ہو گئے ان کے لئے اُن کے وہ اعضاء جو چھپانے کے ہیں اور وہ دونوں جوڑنے لگے اپنے اوپر بہشت کے درختوں کے پتّے اور کہا نہ مانا آدم نے اپنے پروردگار کا، تو بہک گئے، پھر اللہ نے انہیں عزّت دی تو اُن کی توبہ قبول کی، اور انہیں صحیح راستہ دکھایا''۔

جناب آدم علیہ السلام کا ترک اولیٰ:

مذکوہ بالا جنّت میں رہنے کے جو فوائد اور وہاں سے نکلنے میں جو نقصان دکھائے گئے ہیں، وہ امر کی دلیل وافی ہیں کہ انہیں جو حکم ہوا تھا، وہ مولوی نہ تھا، ارشادی تھا جیسا کہ پہلے پارے میں تشریح کی گئی ہے یعنی اس کی تعمیل دنیوی فوائد ہیں اور ترک میں مضرتیں ہیں جن کی فہرست یہاں ان کے سامنے پیش کی گئی ہے اس طرح کہ:

(۱) فتشقٰی یعنی تمہیں زحمت و مشقّت برداشت کرنا پڑے گی کہ یہاں تو بعطائے الٰہی مفت میں تمہیں ہر طرح کی نعمت ملی ہوئی ہے اور زمین کی دنیا جو عالم اسباب ہے، وہاں جب تک محنت و مشقّت نہ کرو گے دانہ مُنہ تک نہ جائے گا۔

اس ذیل میں خاص طور پر حضرت آدم علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا کہ تم مشقّت میں پڑ جاؤ گے، حالانکہ درخت کے قریب جانے، جنّت سے نکالے جانے اور زمین پر اتارے جانے میں جناب حوّا بھی شریک تھیں، یہ اس نظام فطری کی بناء پر ہے جس کے مطابق شریعت اسلام کا حکم ہے کہ تحصیل معاش کا تعلق مرد سے ہے اور زوجہ کی کفالت اس کے ذمّہ ہے۔ [1]

(۲) یہاں بھوک نہیں لگتی

---

[1] فتشقیٰ معناہ تتعب بانّ تاکل من کدّ یمینك وما تکسبہ لنفسك وقیل فتشقیٰ علیٰ خطاب الواحد والمعنیٰ فتشقیٰ انت وزوجك وقیل خصّ بالشقآء لانّ الرّجل یکدّ علیٰ زوجتہ (تبیان)

(۳) یہاں پیاس نہیں لگتی

(۴) یہاں مفت میں جسم پر لباس ہے۔

(۵) دھوپ کی تکلیف اٹھانا نہیں پڑتی۔

دنیا میں یہ سب برکتیں ختم ہو جائیں گی۔

اب جب کہ وہ حکم ارشادی تھا تو نافرمانی کا لفظ تو بالکل درست ہے کیوں کہ حکم پر عمل نہ کرنے ہی کو نافرمانی کہتے ہیں[1] مگر اس نافرمانی میں وہ بات نہیں رہتی جو منافی عصمت قرار پائے۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

''ارشاد ہوا کہ دونوں اتر و اس میں سے ایک ساتھ تم سب ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ اب اگر تمہارے پاس میری طرف کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریگا، وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ زحمت اٹھائے گا اور جو میری نصیحت سے روگردانی کرے گا تو اس کے لئے سخت زندگی ہوگی اور اسے ہم حشر میں روز قیامت اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا: پروردگار! کے کیوں تو نے مجھے حشر میں اندھا اٹھایا حالانکہ میں آنکھوں والا تھا؟ ارشاد ہوگا اسی طرح ہماری نشانیاں تیرے پاس آئیں تو تو نے انہیں بھلاوے میں ڈالا اور اسی طرح اب آج تو بھلایا جا رہا ہے اور یوں ہی ہم سزا دیں گے اسے جو حد سے تجاوز کرے اور ایمان نہ لائے اپنے پروردگار کی نشانیوں پر اور بلاشبہ آخرت کا عذاب سخت تر اور زیادہ دیر پا ہے''۔

یہ ارشاد جمع کے عنوان سے کہ ''تم سب ایک دوسرے کے دشمن ہو گے'' حالانکہ اس کے پہلے خطاب تثنیہ آدم اور حوّا علیہما السلام سے تھا، ابلیس کی شرکت سے ہے جو آپ مستقل طور پر نکال دیا گیا تھا۔[2]

اب جب کہ ان تینوں سے خطاب ہو تو اس کے لئے یہ کافی ہے کہ ابلیس اور اس کی اولاد، آدم و حوّا علیہما السلام اور ان کی اولاد آدم و حوّا اور ان

---

[1] المعصية مخالفة الامر سواء كان واجبا اوندبا (تبیان مجمع البیان)

[2] یعنی اٰدم و حوا و ابلیس وذرّیّة (تبیان)

کی اولاد کی دشمن ہے جس کی صراحت دوسری جگہ موجود ہے کہ: "انّ هذا عدّو لكما" یہ (ابلیس) تم دونوں (یعنی آدم وحواء) کا دشمن ہے۔
بعض کا خیال ہے کہ خود آدم اور حوا علیہما السلام کی اولاد میں جو ایک دوسرے کے دشمن ہیں، وہ مراد ہیں۔ [1]

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾

''کیا ان کے لئے رہ نمائی کا سرمایہ نہیں ہے یہ کہ کتنی ہلاک کر دیں ہم نے ان کے پہلے والی نسلیں کہ یہ چلتے پھرتے ہیں ان کے رہنے کے گھروں میں یقیناً اس میں نشانیاں ہیں صاحبانِ عقل کے لیے''۔

ہمارے مفسرین اس یہد کی لفظ کو ہدایت ہی سے قرار دیتے ہیں [2] جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے بعض علمائے اہل سنّت کے تشریحات بھی اس کے مطابق ہیں [3] مگر بعض لم یہد کے معنی یہ لیتے ہیں کہ ان پر امر ظاہر نہیں ہوا [4] اس کے لئے لغت سے ثبوت کی ضرورت ہے کہ یہد کے لفظ کے معنی نمایاں ہونے کے آئے ہیں یا نہیں؟

''یہ چلتے پھرتے ہیں اُن کے گھروں میں'' یعنی وہ تباہ شدہ بستیاں ان کے سفیروں میں ان کی راہ میں پڑتی ہیں۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾

''اور اگر نہ ہوتا ایک قول جو تمہارے پروردگار کی طرف سے پہلے ہو چکا اور ایک مدّت مقرّر نہ ہوتی تو عذاب لازمی طور پر آ کے رہتا''۔

یعنی اس اُمّت کے بھی اعمال تو ویسے ہی ہیں جیسے اعمال کی وجہ سے اُمم سابقہ پر عذاب نازل ہوتا رہا ہے مگر خالق نے قول دے دیا ہے کہ اس رحمۃ اللّعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت پر دنیا میں بحیثیت مجموعی عذاب نازل نہ ہوگا۔ اور ان کے لئے قیامت کی میعاد مقرر کر دی ہے، اس لئے عذاب نازل نہیں ہوتا۔ [5]

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾

''تو آپ صبر کیجئے اُس پر کہ جو وہ کہتے ہیں اور اپنے پروردگار کے حمد کے ساتھ نماز پڑھیے، سورج نکلنے سے پہلے اور

---

[1] بعضكم بعض الدرة (جلالين) بعض اولادشما بعض را ددشمن باشند (شاه ولی الله)
[2] فاعل يهد مضمر يفسّره كم اهلكنا و المعنىٰ ولم يهد لهم اهلكنا من قبلهم من القرون (تبيان) المعنى افلم يبيّن لهم طريق الاعتبار كثرة اهلاكنا القرون (مجمع البيان)
[3] آيا راه نمود ايشان را (شاه ولی الله) کیا پس راہ نہیں دکھاتا ان کو (شاه رفيع الدين)
[4] افلهم يهد يتبيّن (جلالين) فی سفرهم الى الشام وغيرها (جلالين)
[5] لولا كلمة سبقت من ربك تاخير العذاب عن هؤلاء الكفار الىٰ يوم القيمة (مجمع البيان)

غروب سے پہلے اور رات کے کچھ اوقات میں بھی نماز پڑھیے، اور دن کے حصول میں شاید کہ آپ خوش ہوجائیں''۔

اوقات نماز کی طرف اشارہ:

اس آیت میں اجمالی طور پر اقات نماز کا ذکر ہے جس میں ایک دفعہ قبل طلوع وغروب نمازیں بتائی ہیں۔ یہ نماز صبح ہے جو قبل طلوع آفتاب ہوتی ہیں اور قبل غروب متفق علیہ طور پر نماز عصر ہے اور رات کے کچھ حصوں میں یہ۔ یہ بلا اختلاف مشترک طور پر مغرب اور عشاء کا وقت ہے جو فقہ امامیہ ہی پر منطبق ہے جو مغرب کے بعد سے نصف شب تک دونوں نمازوں کا وقت قرار دیتی ہے۔

ہاں اس کے بعد جو اطراف النّھار کی لفظ ہے اس کے لئے مفسرین اہلِ سنت کہتے ہیں کہ اس سے ظہر کا وقت مراد ہے کہ وہ نصف اوّل کا آخر اور نصف دوم کے شروع کا حصّہ ہے [1] مگر ہر صاحبِ زبان سمجھ سکتا ہے کہ دن کے دونوں طرف دونوں کنارے ہوتے ہیں۔ نصف اوّل اور آخر کے کنارے اگر طرف ہوا کریں تو وسط اور طرف کا فرق ختم ہوجائے۔

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں:

''دن کی حدوں پر یعنی پہر پہر پر وقت ہیں نماز کے سوائے پہلے پہر کے''۔ (موضح القرآن)

اوّل تو دن اور رات کی پہروں کی طرف تقسیم کوئی من جانب اللہ نہیں ہے بلکہ ہمارے ہندوستان کے عرف عام کی چیز ہے۔ پھر یہ کہ اطراف کے معنی پہروں کے کس لغت میں ہیں؟ جب کہ ان میں کا دوسرا پہر طرف میں واقع نہیں ہوتا اور پہلا پہر واقعی طرف کہا جاسکتا ہے، اسے آپ خارج کیے دیتے ہیں۔

ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہاں اوقات الگ الگ بیان ہو ہی نہیں رہے ہیں بلکہ تفنن فی التعبیر کے طور پر ایک ادبی انداز میں دو مقابل ٹکڑوں میں اجمالی طور پر ان اوقات کو بے ان کیا گیا ہے جن میں نمازیں ہوتی ہیں۔

پہلا ٹکڑا (قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا) ''طلوع آفتاب کے پہلے اور غروب کے پہلے'' اس کے انداز تین نمازوں کا وقت آ گیا۔ نماز صبح طلوع آفتاب کے پہلے اور ظہرین غروب کے پہلے۔ پھر دوسرا ٹکڑا یہ کہ اوقات شب میں اور اطراف روز میں نمازیں پڑھو اس میں مغرب اور عشاء اوقات شب میں ہوتی ہیں۔ اور صبح اور ظہرین اطراف نہار میں ہیں اور اس طرح کہ آغاز نہار طلوع صبح سے لیا جائے جو نہار شرعی اور مدّتِ امتدادِ صوم ہے اور اسی طرح بئر یعنی کنویں سے پانی کھینچنے میں دفع نجاست کے لئے جب تَرَاوُح کا حکم ہوتا ہے جس میں نھاراً کا ملاً یعنی پورے دن چار آدمیوں کے پانی کھینچنے کا حکم ہے، اسے طلوع فجر سے لیا جاتا ہے۔ طلوعِ آفتاب سے نہیں اس طرح ایک طرف نہار میں نماز فجر ہوتی ہے اور دوسری طرف نہار میں زوال کے بعد سے مغرب تک ہے ظہر وعصر واقع ہے۔ اس طرح اس ٹکڑے میں سب نمازیں آجاتی ہیں جس میں کوئی زحمت نہیں ہے۔

یہ دونوں الگ الگ فقرے ہیں جن میں وقت کا دو حیثیتوں سے بیان ہے۔ نہ یہ کہ دوسرا جزء تتمہ ہو پہلے فقرہ کا اور کوئی مضائقہ نہیں کہ صبح

---

[1] ای صلّ الظھر لانّ وقتھا دخل بزوال الشمس فی طرف النصف الاول وطرف النصف الثانی (جلالین)

کا پہلا قبل الشمس میں بھی اظہار ہوا اور پھر اطراف النہّار کے تخت میں بھی وہ درج ہو جائے۔ اسی طرح ظہرین کا قبل غروبہا کی لفظ سے بھی بیان ہو، پھر اسی اطراف النہّار کی لفظ کے تحت میں بھی ہو جائے۔

ادبی طور پر تفنّن تعبیر میں اس طرح کی تکرار کوئی قابل انکار چیز نہیں ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝۱۳۱ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۭ لَا نَسْـَٔـلُكَ رِزْقًا ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ۝۱۳۲

''اور نہ ڈالو اپنی نگاہ اُس پر جس سے ہم نے ان میں سے بہت سوں کو بہرہ مند کیا ہے دنیوی زندگی کی زیب وزینت سے تاکہ اس سے ان کی آزمائش کریں اور تمہارے پروردگار والا رزق بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے اور اپنے والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر صبر و برداشت کے ساتھ برقرار رہو۔ ہم تم سے نہیں مانگتے ہم ہی تمھیں روزی پہنچاتے ہیں اور انجام کی بہتری پرہیزگاری سے وابستہ ہے''۔

اگر خاص طور پر خطاب رسولؐ سے بھی جیسا کہ اس مبینہ شان نزول سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک یہودی سے کچھ اناج بطور قرض طلب فرمایا۔ اس نے کہا کچھ گروی رکھیے تو دوں گا۔ اس پر رسولؐ کو بہت رنج ہوا، تو یہ آیت بطور تسلّی نازل ہوئی۔ پھر بھی مقصود اس سے خاص رسولؐ کی ذات نہیں ہے بلکہ سب ہی افراد ہیں جو قرآنی تعلیم کو سننا اور اس پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہوں۔[1]

طرق اہل سنت سے ابی بن کعبؓ کی طرف نسبت ہے کہ انہوں نے اس آیت کے سلسلہ میں کہا:

فمن لم یتعزّ بعزآء اللہ تقطّعت نفسہ حسرات علی الدّنیا ومن یتبع بصرہ ما فی ایدی النّاس یطل حزنہ ولا یشفیٰ غیظہ ومن لم یر اللہ علیہ نعمۃ الّا فی مطعمہ و مشربہ نقص علمہ ودنا عذابہ۔

جو اللہ کی دی ہوئی تسلّی سے دلاسا قبول نہ کرے اس کا دنیا پر غم وغصّہ سے کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگا اور جس کی نگاہ درپے رہے گی اس کی جو دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں ہے، اس کا رنج وملال طولانی ہوگا اور اسے سکون نہیں مل سکتا اور جو اللہ کی نعمت کا تصور صرف سامان اکل وشرب میں رکھتا ہو، اس کا علم ناقص ہوگا اور عذاب اس سے قریب ہوگا۔

ہمارے یہاں امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت اتری تو خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تشریح میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے (مجمع البیان)

آخر میں جو آیا ہے کہ ''اپنے والوں کو نماز کا حکم دو'' اگر حکم عام بھی ہو جیسا کہ وہ حقیقۃً ہے، تب بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے اولیٰ ہیں کہ اس کی تکمیل فرمائیں، حالانکہ آپ کے اہل بیت وہ تھے جن کے لئے اس کی ضرورت نہ تھی مگر فرمان رب کے احترام میں ابوسعید خدریؓ کی مشہور و

---

[1] نہی اللہ تعالیٰ نبیّہ محمّدا والمراد بہ جمع المکلّفین (تبیان)

معروف روایت ہے کہ اس آیت کے اترنے کے ۹ مہینے ہر نماز کے وقت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی و فاطمہ علیہما السلام کے دروازہ پر تشریف لے جاتے اور فرماتے تھے: الصّلوٰۃ رحمکم اللہ. اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ آپ کے اہل اور اہل بیت کا اس گھر والوں میں انحصار ہے، کسی دوسرے گھر میں کوئی ایسا نہیں ہے جو آپ کے اہل اور اہل بیت کا مصداق ہو۔

وَقَالُوْا لَوْلَا یَاْتِیْنَا بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّہٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِھِمْ بَیِّنَۃُ مَا فِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ﴿۱۳۳﴾

''اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں لاتے ہمارے پاس کوئی نشانی اپنے پروردگار کی طرف سے! اور کیا آیا نہیں ان کے پاس کھلا ہوا ثبوت گزشتہ کتابوں میں ہے''۔

''کوئی نشانی'' یعنی جو ان کی فرمائش ہو، ورنہ نشانیاں یعنی معجزات تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برابر پیش کرتے ہی رہے تھے [1] اور قرآن ہی کیا کم حقیقت کی نشانی تھا مگر وہ صرف دھاندلی کے طور پر اور کبھی بطور تمسخر نئی قسم کے معجزوں کی فرمائش کرتے تھے تو اُس کی جا بجا قرآن مجید میں ایک خاص انداز میں روکی گئی ہے یہاں یہ کہا گیا ہے کہ انہیں ایمان لانا ہوتا تو گزشتہ دور کے انبیاء کے بیانات ہی جو اس پیغمبر کے بارے میں موجود ہیں، اُن کے ایمان کے لئے کافی تھے، وہ انبیاء تو اسی قسم کے معجزات لائے تھے جس کی یہ فرمائش کرتے ہیں تو اُن پر یہ کب ایمان لائے ہوئے ہیں جو ایسے ہی معجزات کی فرمائش اب اس رسول پر ایمان لانے کے لئے وہ کر رہے ہیں۔

وَلَوْ اَنَّآ اَھْلَکْنٰھُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِہٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰی ﴿۱۳۴﴾

''اور اگر ہم انہیں ہلاک کر دیتے کسی عذاب سے اس کے پہلے تو وہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار! کیوں نہ تو نے کوئی پیغمبر ہمارے پاس بھیجا کہ ہم تیری آیتوں پیروی کرتے قبل اس کے کہ ذلیل اور رسوا ہوں''۔

یعنی خلق کو ہمارے مقابلے میں عذر پیش کرنے کا موقع ہوتا اور ہماری حجّت ان کے مقابلہ میں تمام نہ ہوتی، مطلب یہ ہے کہ پیغمبروں کے آنے کا مقصد اتمام حجّت ہوتا ہے جیسا کہ پہلے ارشاد ہو چکا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ

ہم نے پیغمبر بھیجے ثواب اور عذاب کی خبریں دیتے ہوئے کہ لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی حجّت ان پیغمبروں کے بعد نہ رہے۔ (نساء۔ ۱۶۵)

اور اس آیت سے مثل بہت سی دوسری آیات کے صاف پتہ چلتا ہے کہ خالق قول قبیح سے جس پر کوئی اعتراض یا اس کی جائز شکایت کر سکے، منزّہ و مبرّا ہے یہی وہ وجوب عدل ہے جس یک اعتقاد کو شیعہ فرقہ کے خصوصی جرائم میں سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] یریدون الایۃ الّتی یقترحونھا لانّہ اتی بالآیات (تبیان)

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾

''کہہ دیجئے کہ ہر ایک انتظار کرنے والا ہے لہٰذا تم بھی منتظر رہو تو تمہیں عنقریب معلوم ہوگا کہ کون سیدھی راہ والے ہیں اور کون وہ ہیں جنہوں نے صحیح راستہ پالیا ہے''۔

''ہر ایک انتظار کرنے والا یعنی ہم بھی اور تم بھی''[1] منتظر ہیں کہ ہم سے جو اللہ کے وعدے ہیں کہ دین اسلام کا غلبہ ہوگا، اُن کے پورے ہونے کا وقت آئے اور تم اس کے منتظر ہو کہ ہماری اصل نسل قطع ہو جائے اور تمہیں دنیا میں پھلنے پھولنے کا موقع ملے۔ اب دیکھنا ہے کہ کس کی توقّع پوری ہوتی ہے؟!

یاد رہے کہ یہ آیت امام منتظر عجل اللہ فرجہ الشریف کے انتظار کا سنگ بنیاد ہے۔ اب جو جماعت اس انتظار کو چھوڑ بیٹھی ہے وہ گویا قرآن کے چیلنج کی شکست تسلیم کرتی ہے اور نتیجہ کے اعتبار سے کفّار و مشرکین یا منافقین کی توقع کے پورے ہونے کی قائل ہے جو قرآن کے منشاء کے صریحی خلاف ہے۔

---

[1] ای کلّ واحد منّا و منکم (تبیان)

سُوْرَۃُ الْاَنْبِیَآءِ

مکیّہ.....۱۱۲.....آیات

اس سورہ کا نام ویسا ہی ہے جیسے اس سے پہلے سورۂ ہود اور سورۂ ابراہیم کے نام ہو چکے ہیں، بایں معنی کہ متعدّد انبیاء کا ذکر مسلسل اور بھی سوروں میں آیا ہے جیسے سورۂ صآفّات اور صٓ وغیرہ مگر یہ نام اسی سورہ کا قرار پایا ہے۔ اِس سورہ میں حسب ذیل خصوصی مضامین ہیں

سورۂ انبیاء کے خاص مضامین:

۱------خدا کے افعال کھیل یعنی عبث نہیں جو حکمت الٰہی کا تقاضا ہے۔

۲------حق اور باطل کے ٹکراؤ میں نتیجتاً حق غالب اور باطل پاش پاش ہوتا ہے۔

۳------فرشتوں کے اوصاف۔

۴------اگر کوئی خدا ہوتے تو آپس میں کش مکش ہوتی جو علم کلام کی زبان میں ''برہان تمانع'' کہلاتا ہے۔

۵------توحید الٰہی انبیاء کا متّفقہ پیغام ہے۔

۶------ہر ذی حیات کی زندگی پانی سے۔

۷------آسمانوں کے ٹھوس جسم نہ ہونے بلکہ سیّال مادّہ کی نوعیت سے ہونے کی طرف اشارہ۔

۸------ہر متنفّس کے لئے موت کا ذائقہ چکھنا لازمی۔

۹------قیامت میں میزانِ اعمال۔

۱۰------حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی اور قوم سے گفتگو۔

۱۱------حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں پھینکا جانا اور اُس کا سرد ہو جانا۔

۱۲------زراعت کے بارے میں حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے فیصلے۔

۱۳------حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ تمام چیزوں کا تسبیح الٰہی میں مصروف ہو جانا۔

۱۴------حضرت سلیمان علیہ السلام کی دوش ہوا پرواز۔

۱۵------جناب ایوب علیہ السلام کا امتحان اور اُن کا صبر۔

۱۶------حضرت یونس علیہ السلام کی تسبیح۔

۱۷------جناب زکریا علیہ السلام کی دعا۔

۱۸------یاجوج اور ماجوج کا ذکر۔

۱۹------انجام کار میں نیکوکاروں کا مکمل اقتدار۔

۲۰------خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رحمۃ للعالمین ہونا.....وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۚ﴿۱﴾ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۙ﴿۲﴾ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۳﴾ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۴﴾

''قریب آ گیا ہے لوگوں کے لئے اُن کے حساب کتاب کا وقت اور وہ ہیں کہ بے خبری میں مبتلا ہیں، بے اعتنائی کرنے والے نہیں آتی اُن کے پاس کوئی تازہ بتازہ یاد دہانی مگر یہ کہ وہ اسے سنتے ہیں اس طرح کہ وہ کھیل کود میں مصروف ہیں اس عالم میں کہ ان کے دل غفلت میں مبتلا ہیں اور وہ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں، وہ ظالم لوگ کہ کیا یہ ہے کہ سوا ایک آدمی کے جو تمہارا ہی ایسا ہے۔ک یا تم جادو کی طرف متوجّہ ہوتے ہو، حالانکہ تم دیکھتے ہو؟'' اُس نے کہا کہ میرا پروردگار جانتا ہے ہر بات کو جو آسمان اور زمین میں ہے اور وہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

قال ربّی یعلم القول میں قَالَ کے بجائے دوسری قرأت قُلْ ہوئی ہے[1] جس کی بنا پر آخری آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ'' کہیے میرا پروردگار جانتا ہے''۔

تعجّب ہے کہ جناب شیخ الطائفہؒ نے متن میں قَالَ لکھا ہے مگر تشریح قُلْ کے لحاظ سے کی ہے اور لطف یہ ہے کہ علّامہ طبرسیؒ نے اس تضاد میں بھی اُن کی پیروی کی ہے۔[2]

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۵﴾ مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾

---

[1] قرأ هل الکرفة الّا ابابکر وخلفاء قال ربّی علیٰ وجه الخبر والباقون قل ربّی علیٰ وجه الامر (تبیان)

[2] قل یا محمّد ربّی الخ (تبیان ومجمع البیان)

''بلکہ کہا اُنہوں نے کہ یہ خوابہائے پریشان ہیں، بلکہ اس نے غلط تہمت لگائی ہے، بلکہ وہ شاعر ہے، اچھا تو وہ ہمارے سامنے کوئی معجزہ پیش کردے جس طرح اگلے پیغمبر بھیجے گئے۔ان کے پہلے بھی وہ بستیاں جنہیں ہم نے ہلاک کردیا ایمان نہیں لائی تھیں تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے''؟ اُن کا بدل بدل باتیں کہنا، پہلے یہ کہ خوابہائے پریشاں ہیں، پھر یہ کہ اس نے غلط تہمت لگائی ہے، پھر اس کے بجائے یہ کہ وہ شاعر ہے۔یہ اس کی دلیل ہے کہ وہ اس غیر معمولی کلام سے حیرت میں مبتلا تھے کہ گھبرا کے ایک بات کہتے ہیں، پھر خود محسوس کرتے ہیں کہ بات بنی نہیں تو اس کے بجائے دوسری بات کہتے ہیں، اُس کے بھی غلط ہونے کا احساس ہوتا ہے تو تیسری بات کہتے ہیں[1] چونکہ جو اصل حقیقت ہے کہ وہ خالقِ بشر کا نازل کیا ہوا کلام ہے، اُس کے ماننے اور ظاہر کرنے کے لئے وہ تیّار نہیں ہیں تو پریشان ہو ہو کے وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن کے غلط ہونے کا خود اُنہیں احساس ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ۝

''اور ہم نے آپ کے پہلے نہیں بھیجے مگر آدمی ہی جن کی طرف ہم وحی بھیجیں تو دریافت کرو صاحبانِ علم سے اگر تم نہیں جانتے اور نہیں بنایا تھا ہم نے انہیں ایسے مجسمے جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے۔پھر ہم نے ان سے جو وعدہ کیا تھا، اسے سچ کر دکھایا تو اُنہیں اور جن کو ہم نے چاہا چھٹکارا دیا اور حد سے تجاوز کرنے والوں کو ہم نے ہلاک کردیا''۔

اہل ذکر سے سوال کا حکم:

''ان سے جو وعدہ تھا، اسے ہم نے سچ کر دکھایا، یعنی نصرت کا جو وعدہ اور اُسی وعدے کا پورا کرنا ہے جس کا بعد کو بیان ہے۔[2]

''چھٹکارا دیا انہیں''، یعنی خود اُن پیغمبروں کو''اور جن کو ہم نے چاہا'' یہ ان پیغمبروں پر ایمان لانے والے افراد ہو سکتے ہیں جو اُن کے ساتھ تھے۔[3]

اس کے لئے اھل الذّکر کی طرف رجوع کا حکم دیا گیا ہے، جہاں جہاں اھل الذّکر کی لفظ قرآن میں آئی ہے کہ اُن سے پوچھو، وہاں اُس کے مفہوم میں اختلاف ہوا ہے اور ہر جگہ قریب بحقیقت یہ تفسیر ہے کہ ہیں اھل الذّکر کے معنی ہیں اھل العلم اور ظاہر ہے کہ

---

[1] بل الانتقال من غرض الیٰ اٰخر فی المراضع الثلثة (جلالین) قول متحیّر قد یہرہ ما سمع فمرّة یقول ساحر و مرّة یقول شاعر ولا یحزم علیٰ امر واحد (تبیان و مجمع البیان)

[2] صدقناھم الوعد یعنی الانبیآء الماضین ما وعدناھم بہ من النصرہ النّجاة (تبیان)

[3] ای المصدّقین لھم (جلالین)

مصداق اتم اس کا اسلام کے حقیقی رہنمایاں معصومین علیہم السلام ہیں اور اس لئے ہمارے آئمہ علیہم السلام نے اکثر فرمایا ہے کہ ہم اھل الذّکر ہیں پھر جب کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خود قرآن میں ذکر کا لقب موجود ہے تو اس لحاظ سے بھی آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اھل الذّکر ہوئے [1] اور قرآن کو الذّکر کہا گیا ہے، اس طرح بھی اھل الذّکر وہی ہستیاں ہیں جنہیں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مستقل طور پر قرآن کا ساتھی بتایا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰

''ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب اتاری ہے جس میں تمہاری نصیحت ہے تو کیا تم عقل سے کام نہیں لوگے''۔

فیہ ذکرکم کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے، وہ ایک تفسیر کے مطابق ہے [2] لیکن ایک معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ اس میں تمہاری عزّت ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے کہ:

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ: وہ ضرور آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے ایک بہت بڑا شرف ہے۔ (زخرف۔ ۴۴)

علامہ طبرسیؒ نے اسی تفسیر کو مقدّم قرار دیا ہے۔ [3]

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝۱۱ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝۱۲ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ۝۱۳ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۱۴ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ۝۱۵

''اور کتنی ہی ہم نے قلع قمع کر دیں بستیاں جو ظالم تھیں اور اُن کے بعد دوسری قوم پیدا کی اور جب اُنہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس کیا تو ایک دم وہ اس سے (بچنے کے لیے) دوڑ بھاگ کرنے لگے۔ اب دوڑ بھاگ نہ کرو اور رہو اُسی عیش و عشرت میں جو اَب تک رہا ہے اور اپنے انہیں محلّات میں، شاید تمہاری پوچھ گچھ کچھ ہو۔ اُنہوں نے کہا ہائے غضب! بلاشبہ ہم ظالم تھے تو یونہی وہ دُہائی مچاتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے ان کو کٹا چھٹا، خاموش و افسردہ کیا''۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝۱۶ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝۱۷ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ

---

[1] اختلف فی المعنی باھل الذّکر علیٰ اقوال فروی عن علی علیہ السلام انہ قال نحن اھل الذّکر وروی ذلک عن ابی جعفر علیہ السلام ویریدہ انّ اللہ تعالیٰ سمّی النبیّ ذکرا لرسولا (مجمع البیان)

[2] پند شما (شاہ ولی اللہ)

[3] ای فیہ شرفکم ان تمسّکتم بہ (مجمع البیان)

فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

''اور انہیں پیدا کیا ہم نے آسمان اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو تفریحی طور پر اگر ہم چاہتے دل بستگی کا سامان تو اُسے بناتے اپنے پاس سے، اگر ایسا کرنا چاہتے بلکہ ہم حق کو باطل سے ٹکراتے ہیں تو وہ اسے توڑتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ ایک دم نیست و نابود ہو جاتا ہے اور تمہارے لئے وائے ہو اس سے جو تم باتیں کہتے ہو''۔

افعال الٰہی عبث نہیں، حق و باطل کے تصادم کا عام انجام:

دل بستگی کے سامان سے مراد بیوی بچّے ہیں[۱] اور اگر ایسا کرنا ہوتا تو اُسے اپنے پاس سے بناتے، یعنی فرشتوں اور حوروں سے ایسا سامان اپنے لئے مہیا کرتے۔[۲]

اس مناسبت سے آخری فقرہ کا مطلب شاہ عبدالقادر کی الفاظ میں یوں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ غیب سے ایک قدرت کا ملہ کا نمونہ بھیجتا ہے جھوٹ کے مٹانے کو۔ اُن کالموں کو تم کہتے ہو 'خدا کا بیٹا''۔ (موضح القرآن)

''تمہارے لئے وائے ہو اُس سے جو تم باتیں کہتے ہو'' یعنی اللہ کی طرف زوجہ اور اولاد کی نسبت دیتے ہو۔[۳]

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾

''اور اُس کے ہیں وہ سب آسمانوں اور زمین میں ہیں اور جو اس کے پاس ہیں، وہ اس کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں، رات اور دن کی تسبیح کرتے ہیں، سست نہیں ہوتے''۔

فرشتوں کے اوصاف:

یہ فرشتوں کے اوصاف[۴] جن کی فطرت ایسی ہے کہ وہ لگاتار عبادت کرتے ہیں ۲ نہ ان کے جسم ایسے ہیں کہ ان میں تھکن پیدا ہو، نہ طبیعتیں ایسی ہیں کہ ایک حالت پر رہنے سے اُکتا جائیں اور تنوّع کو دل چاہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ

---

[۱] یعنی زن و فرزند (فتح الرحمن) کھلونا یعنی بیٹا (موضح القرآن)

[۲] من عندنا من الحور العین والملائکة (جلالین)

[۳] تصفون اللہ من اتّخاذ الاولاد (تبیان) من اتخاذ الصاحبة والولد (مجمع البیان)

[۴] یعنی الملئکة (علی ابن ابراھیم) ۱۲ دائمون علیه (تبیان)

لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾

''کیا انہوں نے زمین سے ایسے خدا بنائے ہیں کہ جو دوبارہ زندہ کرتے ہوں؟ اگر دونوں میں اللہ کے علاوہ کئی خدا ہوتے تو وہ دونوں تباہ و برباد ہو جاتے، تو پاک ہے اللہ جو عرش کا مالک ہے اُس سے، جو وہ بیان کرتے ہیں''۔

توحید کی مشہور دلیل اور ''برہان تمانع'':

''اگر اُن دونوں میں''، یعنی زمین اور آسمان میں ''کئی خدا ہوتے تو وہ دونوں تباہ و برباد ہو جاتے''۔ اس سے متکلّمین نے نصی شرک پر برھان تمانع مرتّب کیا ہے اور غالباً اسی لئے جلالین نے دونوں جگہ لفسدتا کی تشریح میں لفظ تمانع صرف کی ہے''۔

خرجتا من نظامها المشاهد لوجود التمانع بينهم علىٰ وفق العادة عند تعدّد الحاكم من التمانع فى الشئ وعدم الاتفاق عليه۔

دونوں خارج ہو جاتے اپنے نظم و ترتیب سے جس کا مشاہدہ ہو رہا ہے اس لئے کہ ان خداؤں میں تمانع ہوتا جیسے کہ عموماً حاکموں کے کئی ہونے کی صورت میں ہوتا ہے کہ کسی بات میں ان کے درمیان تمانع ہوتا ہے اور اس پر وہ متفق نہیں ہوتے۔

اسی طرح شیخ الطائفہؒ نے بھی ایک دفعہ لفظ تمانع صرف کی ہے۔ فرماتے ہیں:

لو صح الٰهان اوالٰهة لصحّ بينهما التّمانع فكان يؤدّى ذلك الىٰ انّ احدهما اذا اراد فعلا واراد الاٰخر ضدّه ان يضع مراد هما فيؤدّى الىٰ اجتماع الضدّين اولا يقع مراد هما فينتقض كونهما قادرين اويقع مراد احدهما فيؤدّى الىٰ نقض كون الاٰخر قادرا (تبیان)

اگر دو یا کئی خدا ہونے کا امکان ہوتا تو ان دونوں کے درمیان تمانع ایک دوسرے کے خلاف (ارادہ) بھی ممکن ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جب ایک نے ایک کام کا ارادہ کیا اور دوسرے نے اُس کے خلاف کا ارادہ کیا تو یا دونوں کا مقصد وقوع میں آئے تو نتیجہ یہ ہو کہ دو متضاد باتیں ایک ساتھ ہوں یا دونوں کا مطلب پورا نہ ہو تو دوسرا صاحبِ قدرت قرار نہیں پائے گا۔

علّامہ طبرسیؒ نے صاف لکھ دیا ہے کہ: هٰذا هو دليل التمانع الّذى نبى عليه المتكلّمون مسئالة التّوحيد۔

یہ وہی دلیل تمانع ہے جس پر متکلّمین نے توحید کے مسئلہ کی بنیاد رکھی ہے۔

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾

''جو کچھ وہ کرے، اُس کے متعلق اُس سے نہیں پوچھا جائے گا، بے شک ان سے پوچھ گچھ کی جائے گی''۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ سے بالاتر کوئی حاکم نہیں ہے کہ وہ اس سے حاکمانہ طور پر باز پُرس کرے اور یہ جتنے ہیں جنہیں دنیا والے معبود قرار دے رہیں ہیں، اللہ کے بندے ہیں، اس لئے ان سے جواب دہی ہوگی، یہ اور بات ہے کہ جواب دہی کے بعد وہ بے گناہ قرار پائیں جیسے دوسری جگہ تفصیل سے جناب مسیح علیہ السلام سے سوال و جواب جو روز قیامت ہوگا، مذکور ہے۔

آیت کا ترجمہ بالکل صاف ہے چنانچہ شاہ رفیع الدین نے بھی لکھا ہے ''نہیں سوال کیا جاتا اُس چیز کہ کرتا ہے'' مگر ان کے والد بزرگوار جناب شاہ ولی اللہ نے معلوم نہیں کسی غوط میں یہ ترجمہ کر دیا ہے کہ ''پرسیدہ نمی شود خدا از آنچہ صفت فی کنند'' معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت آیت کے الفاظ بجائے عمّا یفعل کے عمّا یصفون اُن کے ذہن میں آئے۔ بلاشبہ ''یہ خطائے بزرگان'' کی بڑی اعلیٰ مثال ہے۔

بہرحال ''جو کچھ وہ کرتا ہے، اُس کے متعلق اس سے پوچھا نہیں جائے گا''۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ کے افعال کا واقعاً بھی کوئی معیار نہیں ہے۔ وہ جو چاہے کرے، اُس کے لئے روا ہے جیسا کہ جمہور اہل سنّت کا جو عدل کے منکر ہیں، اُس کے بارے میں تصور ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ اس کی قدرت وقوّت ہے، جس کی بنا پر اس سے کوئی دوسری طاقت سوال کرنے والی نہیں ہے اور یہ خود اُس کا علم وحکمت اور شانِ کمال ہے کہ سوا خیر کے کسی شر کا تصور اس کے افعال میں درست نہیں ہے۔

ایک مفہوم اس کا اور سمجھا گیا ہے کہ چونکہ اُس کے افعال سب عدل وحکمت پر مبنی ہوتے ہیں لہٰذا اُس سے پوچھنے کی گنجائش ہی نہیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اور دوسرے چونکہ غلط باتیں بھ کرتے ہیں لہٰذا اُن سے مواخذہ کا موقع ہوتا ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟[1] مگر ہمارے نزدیک پہلا ہی مفہوم زیادہ درست ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾

''کیا اُنہوں نے اُسے چھوڑ کر بہت سے خدا بنائے ہیں؟ کہیے کہ اپنی دلیل پیش کرو، یہ اُن کی تعلیم ہے جو میرے ساتھ ہیں اور اُن کی تعلیم جو میرے پہلے تھے بلکہ ان میں اکثر اشخاص حق کو جانتے نہیں تو وہ بے اعتنائی اختیار کیے ہوئے ہیں، اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کے پہلے کوئی پیغمبر مگر یہ کہ اُس کی طرف ہم نے وحی بھیجی کہ کوئی خدا سوا میرے نہیں تو میری عبادت کرو''۔

توحید الٰہی تمام پیغمبروں کا متفقہ پیغام:

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''پہلے اُن معبودوں کا ذکر فرمایا جو برابر خدا کے کوئی سمجھے اگر دو حاکم ہوتے تو جہاں خراب ہوتا۔ اب اُن کا ذکر فرمایا جو خدا کے نائب ٹھہراتے ہیں اس پر مالک کی سند چاہیے، اُس کے بغیر کیونکہ نائب ہووے''۔ (موضح القرآن)

''میرے ساتھ والوں کی تعلیم'' یعنی قرآن جو میرے ساتھ والوں کو تعلیم دینے والی کتاب ہے اور ''میرے پہلے والوں کی تعلیم'' یعنی

---

[1] معنا انّ جمیع افعا له حکمة وصواب ولا یقال للحکیم لم فعلت الصواب و هم یُسالون لانّهم یفعلون الحقّ و الباطل (مجمع البیان)

توریت اور انجیل سب میں اللہ کی وحدت ہی کا اعلان ہے، شرک کی حمایت کوئی کتاب نہیں کرتی [1]، اور تمام پیغمبر یہی تعلیم دیتے رہے۔

یہ وہ چیز ہے جسے علمائے متکلمین ''اجتماع انبیاء ومرسلین'' سے استدلال کی صورت سے پیش کرتے رہے ہیں۔ اس بنا پر کہ رسالت وجودِ خدا پر موقوف ہے لہٰذا اقوالِ مرسلین سے وجودِ خدا پر استدلال نہیں ہوسکتا۔ اُس پر صرف عقلی دلائل ہی سے استدلال ہوسکتا ہے لیکن انبیاء کی سچائی معجزات سے ثابت ہونے کے بعد اُن کے اقوال سے توحید پر استدلال میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

اس استدلال کو جناب امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے ایک کلام میں جو نہج البلاغہ کے اندر ہے بالکل عقلی لباس پہنا کر اس طرح پیش فرمایا ہے:

لو کان مع اللہ الٰہ لا تنا رسلہ ولرا ینا اٰثار قدرتہ.

اگر اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہوتا تو اس کے پیغمبر بھی ہمارے پاس آتے اور اس کی قدرت کے آثار بھی ہم دیکھتے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ خدائے رحمٰن نے اولاد بنائی ہے۔ پاک ہے اس کی ذات بلکہ وہ معزز بنے ہیں وہ اس پر کسی بات میں سبقت نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرنے والے ہیں۔ وہ جانتا ہے اُسے جو ان کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ سفارش نہیں کرتے مگر اس کی کہ جسے وہ پسند کرے اور وہ اس کے ڈر سے سہمے ہوئے رہتے ہیں اور جو ان میں سے کہے کہ اسے چھوڑ کہ میں خدا ہوں تو اسے ہم دوزخ کی سزا دیں گے، اسی طرح سزا دیتے ہیں ظالموں کو''۔

معصومین علیہم السلام کی توصیف:

فرشتوں کو مشرکین اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اس لئے عموماً اسے فرشتوں ہی سے متعلق قرار دے دیا گیا ہے [2] اور اس فقرہ کو کہ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ (سورۂ انبیاء) ملائکہ کی صفت قرار دیا جاتا ہے مگر جب کہ اولاد قرار دیا جانا فرشتوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ جہاں فرشتوں کی نسبت مشرکین کے تصور کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے وہاں صراحۃً کہا گیا ہے کہ وہ اس کے لئے بنات (بیٹیاں) قرار

---

[1] ذکر من معی ای امّتی وھو القراٰن وذکر من قبلی من الامم وھو التورٰتہ ولا انجیل وغیرھما من کتب اللہ لیس فی واحد منھا انّ مع اللہ الٰھا ممّا قالوا (جلالین)

[2] ولدا من الملٰئکۃ (جلالین)

دیتے ہیں۔ اولاً قرار دینے سے زیادہ تر یہودی عقیدہ عزیز کے متعلق اور عیسائیوں کا عقیدہ مسیح کے متعلق ذہن میں آتا ہے تو اس عباد مکرمون اور اس کے بعد کے اوصاف کو ان بندگان الیٰ یعنی انبیاء مرسلین پر بھی کیوں حاوی نہ سمجھا جائے؟ اس طرح وہ فقط ملائکہ نہیں بلکہ انبیاء کی بھی عصمت کی دلیل ہوگی جب کہ شفاعت جس کا بعد میں تذکرہ ہے، وہ بلاشبہ انبیاء سے متعلق ہے۔

بحیثیت واقعہ انہیں کسی ناپسندیدہ بات کے ارتکاب سے بری کہہ دینے کے بعد اب جو اصولوں کا اعلان ہے ''جو ان میں سے کہے کہ اسے چھوڑ کر میں خدا ہوں تو اسے ہم دوزخ کی سزا دیں گے''۔ وہ اصول کی ہمہ گیری کو پوری قوت کے ساتھ ظاہر کرنے کے لئے بطور مفروضہ ہے جیسے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے بظاہر مخاطب ہو کر اعلان کیا ہے: لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (زمر۔ ۶۵) اگر آپ شرک کیجیے تو ضرور آپ کے اعمال سب اکارت ہو جائیں گے'' لہٰذا اس کے لئے پہلے کلام کو ملائکہ سے متعلق کرنے کے بعد مصداق کے تلاش کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سے مراد ابلیس ہے جو ملائکہ کی صفوں میں شامل تھا مگر اس نے اپنی عبادت کی طرف دعوت دی۔ [1]

چونکہ قرآن نے ملائکہ کی شان وہ بتلا دی ہے جس کا پہلے ذکر ہے تو ابلیس سے حقیقتاً اس کے ملائکہ میں سے ہونے کے مفروضہ پر ایسا کردار ظاہر ہی کیوں کر ہو سکتا تھا؟

واقعہ یہ ہے کہ نہ ابلیس ملک تھا اور نہ یہاں کو کہا جا رہا ہے، وہ کسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے بلکہ وہ جیسا کہ ہم نے کہا اور اس کی نظیر قرآن سے پیش کی، صرف بحیثیت، مفروضہ ہے جس سے اصول کی ہمہ گیری پر زور دینا مقصود ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۪ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾

''کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین سب ملے ہوئے تھے تو ہم نے ان میں شگاف پیدا کیا اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے قرار دیا تو کیا یہ ایمان نہیں لائیں گے؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ قرار دیے کہ وہ ان لوگوں کو لے کر ڈانواڈول نہ ہو اور ان کی درمیانی خلاؤں میں راستے بنائے۔ شاید کہ وہ ہدایت پائیں اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا اور دن اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ ہر ایک ایک دائرہ میں تیر رہا ہے۔''

ہر ذی حیات کی خلقت یا بقاء پانی سے، آسمانوں کے ٹھوس جسم نہ ہونے کی طرف اشارہ:

''ہر زندہ چیز کو پانی سے قرار دیا''۔ اس کا جو بالکل ظاہری مفہوم ہے، وہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ ان کی خلقت نطفہ سے ہوئی اور نطفہ کو بھی

---

[1] وھو ابلیس دعا الیٰ عبادۃ وامر بطاعتہ (جلالین)

خالق نے دوسرے مقامات پر مآء ہی سے تعبیر کیا ہے [1] اور یہ بھی کہ پانی اس کا سب حیات ہے۔ [2]

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاْئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾

''اور آپ کے پہلے بھی کسی آدمی کے لئے ہمیشہ کی زندگی ہم نے قرار نہیں دی۔ تو کیا اگر آپ دنیا سے اٹھ جائیں تو وہ ہمیشہ کی زندگی پا جائیں گے؟ ہر متنفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور ہم تم لوگوں کو برائی اور بھلائی کے ساتھ آزمائش میں مبتلا کرتے ہیں اور ہماری ہی طرف تم پلٹو گے''۔

ہر متنفس کے لئے موت کا مزہ چکھنا ضروری ہے:

آیت کا پس منظر جلالین نے یہ لکھا ہے: قال الکفار ان محمدا یموت۔ کافروں نے کہا کہ محمدؐ عنقریب مرجائیں گے۔

شاہ عبدالقادر نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ: ''کافر کہتے تھے اس شخص تک ہے یہ دھرم، جہاں یہ مرا پھر کچھ نہیں''۔ (موضح القرآن)

دیکھا جائے تو دونوں باتیں ایک دوسرے کا تیمہ ہیں۔ جلالین کی تفسیر ''کافروں نے کہا یہ عنقریب مرجائیں گے'' یہ کوئی واقعہ کی اطلاع تھوڑی تھی۔ اس کہنے میں یہی تمنا مضمر ہے کہ بس یہ مرجائیں تو ان کا دین ختم ہوجائے۔ اس کو علاّ طبرسیؒ نے یوں کہا ہے کہ:

قالوا نتربّص به ریب المنون (مجمع البیان) انہوں نے کہا ہمیں انتظار ہے ان کے لئے موت کی کارگزاری کا

خالق کریم نے مذکورہ بالا آیات میں اس کے جواب میں کئی باتیں کہی ہیں:

۱۔ یہ نئی بات کیا ہے جو انہی کے لئے انتظار ہے اس کے پہلے جتنے انبیاء آئے، سب ہی کو ایک دن موت سے دوچار ہونا پڑا۔

۲۔ اس پر کہ وہ خوش نصیب ہو رہے ہیں کہ یہ مرجائیں گے، کہا جا رہا ہے کہ ارے یہ مرجائیں گے تو کیا تم ہمیشہ کے لئے رہ جاؤ گے۔ اے دوست بر جنازہ دشمن چو بگذری شادی مکن کہ بر تو ہمیں ماجرا رود۔

۳۔ موت ہر متنفس کے لئے ہے جس کے ساتھ آزمائش اس کی ہے کہ اس دارِ دنیا میں کردار کیا رہتا ہے؟

ظاہر ہے کہ رسولؐ دنیا سے اٹھیں گے تو پوری زندگی قابل تعریف گزار کر۔ تم اپنی خبر لو کہ دنیا سے جاؤ گے تو کیا کرتوت چھوڑ کر جاؤ گے۔

۴۔ اس دنیا سے اٹھ کر سب کسی اور طرف تھوڑی جائیں گے۔ ہماری ہی طرف پلٹیں گے تو ہم اس دار دنیا والے کردار کے لحاظ ہی سے ان کا انجام ان کی آنکھوں کے سامنے لائیں گے تو یہ سوچنے کی بات ہے کہ وہاں انجام کس کا کیا ہوتا ہے؟!

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾

---

[1] المعنی انّ کلّ شیء صار حیّا فهو مجعول من المآء (تبیان) پیدا کردیم از آب (شاہ ولی اللہ)

[2] ای المآء سبب لحیٰوته (جلالین)

''اور جب کافر لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ کا مذاق اڑاتے ہیں'' کیا یہی وہ ہے جو تمھارے خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے''؟ اور ان کا عالم یہ ہے کہ وہ خدائے رحمٰن کے ذکر سے منکر ہیں''۔

''خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے'' یعنی ان کی برائی کرتا ہے اور ان کی عبادت پر نکتہ چینی کرتا ہے۔[1]

اس کا جواب ایک خاص انداز میں یوں گیا ہے کہ ان بتوں پر حرف گیری کو مورد الزام قرار دیتے ہیں جن کا ان پر نہ کوئی احسان ہے اور نہ کوئی ویسا کارنامہ ہے اور یہ خود وہ ہیں جو اس خدا کا انکار کرتے ہیں جو حقیقتاً ان کا ولی نعمت ہے اور ان کی پشت جس کے احسانات کے بار سے خمیدہ ہے۔[2]

ایک دوسرا پہلو اس جواب کا میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ ان کے بتوں کا ذکر برائی کے ساتھ ہوتا ہے وہ ان کو ناگوار ہو تو محل تعجب نہیں۔ لیکن رسولؐ تو جب مثبت پہلو اختیار کر کے خدائے رحمٰن کی حمد وثناء کرتے ہیں تو اس پر پھر بھی ان کو اعتراض ہے اور یہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں اظہار حق کسی صورت سے گوارا نہیں تو ان کی اس خوئے انکار واعتراض کا کہاں تک خیال کیا جائے؟

یہی حال ہے متعصب مخالفین مذہبِ حق اس وقت بھی کہ ان کے پیشواؤں کو برا کہا جائے۔ یہ انہیں ناگوار ہو تو پھر ایک بات ہے مگر ان سے تعرض کیے بغیر فضائل اہلِ بیت رسول علیہم السلام اور بالخصوص مناقب حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام بیان کیے جائیں تو وہ بھی انہیں ناگوار ہوتے ہیں۔ اس کا آخر کیا علاج ہے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِیْكُمْ اٰیٰتِیْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۸﴾ لَوْ یَعْلَمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا حِیْنَ لَا یَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾ بَلْ تَاْتِیْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۴۰﴾

''آدمی کا خمیر ہوا ہے جلد بازی سے عنقریب میں اپنی نشانیاں تمہیں دکھلاؤں گا تو تم جلدی سے کام نہ لو اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو؟ کاش جانیں وہ جو کافر ہیں اُس وقت کا عالم جب وہ نہ روک سکیں گے اپنے چہروں سے آگ کو اور نہ اپنی پشت سے اور نہ اُن کی مدد ہوگی بلکہ وہ ساعت اُن پر اچانک آئے گی تو اُنہیں ششدر کر دے گی تو وہ اُسے پلٹا نہیں سکیں گے اور نہ اُنہیں مہلت ملے گی''۔

''جلد بازی سے خمیر ہوا ہے'': اس کے معنی میں کافی اختلاف ہے، قرینِ قیاس یہی مفہوم ہے جلد بازی اُس کی طبیعت میں داخل ہے اور یہی بعد کے فقرہ سے مناسبت رکھتا ہے کہ میں عنقریب اپنی نشانیاں تمہیں دکھلاؤں گا تو تم جلد بازی سے کام نہ لو''۔[3]

---

[1] یادھی کندیعنی باھانت (شاہ ولی اللہ) یعیبھا (جلالین)

[2] انّھم نعیبون حجد الھیّۃ من لا نعمۃ لہ وھم یجحدون الالھیۃ ''من کلّ نعمۃ فھو منہ وھٰذا نھایۃ الجھل (تبیان)

[3] قال قتادۃ معناہ خلق الانسان عجولا .....والّذی قالہ قتادۃ اقوی الوجوہ (تبیان)

''نہ روک سکیں گے اپنے چہروں سے آگ کو اور نہ اپنی پشت سے'' یعنی وہ چاروں طرف سے انہیں گھیرے ہوئے ہوگی۔[1]

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۱﴾

''اور مذاق اڑایا گیا بہت سے پیغمبروں کا جو آپ سے پہلے تھے تو آ گئے آیا ان کے جنہوں نے اُن سے تمسخر کیا تھا، وہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے''۔

یعنی عذاب الٰہی کی خبریں سن کر ہی وہ مذاق اڑاتے تھے، اب وہی عذاب اُن کے سامنے آ گیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے اور اُس نے انہیں گھیر لیا۔

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾ بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

''کہیے کہ کون تمہاری حفاظت کرسکتا ہے رات اور دن میں اللہ سے؟ بلکہ وہ اپنے پروردگار کی یاد سے بے اعتنائی اختیار کرنے والے ہیں؟ یا کیا اُن کے خدا ایسے ہیں کہ ہمارے علاوہ وہ اُن کی حفاظت کرسکیں وہ تو خود اپنی مدد نہیں کرسکتے اور نہ ہماری طرف سے ان کیلئے ہمدم ہے۔[2]

بلکہ ہم نے انہیں اور ان کے باپ دادا کو مال ومنال سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا ہے یہاں تک کہ وہ لمبی عمروں تک جیا کیے ہیں۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آرہے ہیں گھٹاتے ہوئے اس زمین کو اس کے اطراف وجوانب سے تو کیا وہ غالب آسکتے ہیں''؟

شروع میں جو ہے کہ ''کون تمہاری حفاظت کرسکتا ہے رات اور دن میں اللہ سے''؟ اس کے بظاہر یہی معنی ہوتے ہیں کہ اللہ کے عذاب سے تمہاری کون حفاظت کرسکتا ہے؟[3] لیکن ایک معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ رات اور دن میں جو حادثے پیش آتے ہیں، ان سے تمہیں کون بچا سکتا ہے[4] مگر اس صورت میں من اللہ کے معنی بدلا من اللہ کے ہوں گے یعنی اللہ کے بدلے میں دوسرا کون ہے جو تمہیں ان خطروں سے بچا سکے؟ بعد میں جو ہے

---

[1] یعنی انّ النّار یحیط بھم من جمیع وجوھھم (تبیان) من جمیع جوانبھم (مجمع البیان)

[2] معناہ لا یصحبھم صاحب یمنعھم منّا (تبیان)

[3] ای من یحفظکم من باس الرّحمٰن وعذابہ (تبیان)

[4] قیل من عوارض الاوقات (مجمع البیان)

کہ ''کیا اُن کے کچھ خدا ہیں جو ہمارے علاوہ ان کی حفاظت کریں''۔ یہ اس دوسرے معنی کے ساتھ زیادہ چسپاں ہے، پھر یہ کہ ''نہ ہماری ہی طرف سے ان کا کوئی ہمدم ہے'' یعنی ہم بذات خود بچاتے ہیں۔ ہماری طرف سے بھی کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے جو اُن کے ساتھ رہے اور ہر خطرہ سے بچائے۔

آخر میں جو ہے کہ ''ہم چلے آرہے ہیں گھٹاتے ہوئے زمین کو اس کے اطراف و جوانب سے''..... یہ مضمون دوسرے مقام پر بھی ہے اور وہاں بھی اور یہاں بھی عام مفسرین یہ مطلب قرار دیتے ہیں کہ ہم اسلامی فتوحات کے ذریعہ سے کفّار کے قبضہ والی زمینوں کو گھٹاتے چلے جاتے ہیں۔[1] مگر وہاں بھی ہم نے اس تفسیر سے بے اطمینانی ظاہر کی ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں کئی قول درج کرتے ہوئے اسے سب سے آخر میں لکھا ہے لیکن پہلے ایک مفہوم یہ ہے کہ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ حوادثِ ارضی وسماوی آیا کرتے ہیں جن سے زمین کے اکثر حصّے تباہ و برباد ہوجاتے ہیں، بعض احادیث میں اس کی تفسیر موت علماء سے ہوئی ہے مگر اس کا آیت کے قبل اور بعد والے الفاظ سے کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾

''کہیے کہ میں تو تمہیں وحی الٰہی کی بنا پر عذاب سے ڈراتا ہوں اور بہرے لوگ پکار نہیں سنتے جب وہ ڈرائے جاتے ہیں اور اگر انہیں ایک دفعہ بھی ذرا سا تمہارے پروردگار کا عذاب چھو جائے تو وہ کہیں گے کہ وائے برحال ما ہم بے شک ظالم تھے''۔

پہلے جملہ میں خطاب ہے۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ تم بہرے ہو، اس لئے نہیں سنتے مگر یہ انداز سخت کلامی کا ہوتا لہٰذا دوسرے جملہ کو بصیغۂ غائب عمومی طور پر لایا گیا ہے کہ جو بہرے ہوا کرتے ہیں، وہ پکارنے والے کی آواز کو نہیں سنا کرتے۔ اس کے بعد آخر تک صیغے غائب کے ہیں جیسے کہ کسی اور جماعت کا ذکر ہے حالانکہ مراد وہی مخاطب افراد ہیں جن سے آغاز کلام میں تخاطب تھا۔ یہ بھی ایک قسم ہے قرآن مجید کے اندازِ رواداری کی جس سے دنیا سبق حاصل کرسکتی ہے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾

''اور ہم قیامت کے دن ترازو قائم کردیں گے جو معیار عدالت ہوگی تو کسی متنفّس پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا اور اگر ایک رائی کے دانہ بھر بھی ہوگا تو اسے ہم لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے''۔

عموماً ''الموازین القسط'' کا ترجمہ ایسا ہوتا ہے جو اضافی ترکیب کو ظاہر کرتا ہے[2] حالانکہ اس صورت میں عربی قواعد کے لحاظ سے

---

[1] نقص ارضهم بالفتح على النّبي ﷺ (جلالین)

[2] درمیان نہم ترازوئے عدل (شاہ ولی اللہ) رکھیں گے ہم ترازوئیں عدل کی (شاہ رفیع الدین) انصاف کی میزانیں (مولانا مقبول احمد صاحب)

موازین پر الف لام نہیں ہونا چاہیے۔ موجودہ حالت میں اسے اضافت نہیں، بیان سمجھنا چاہیے جس سے نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ترازوئیں معیار عدالت ہی کی ایک تعبیر ہیں۔ [1]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾

''اور ضرور بالضرور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو عطا کیا حق اور باطل سے اختیار کا سامان روشنی اور نصیحت بنا کر پرہیز گاری کے لئے جو اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہیں اور وہ قیامت سے خوف زدہ اور یہ ایک برکت والا نصیحت نامہ ہے جسے ہم نے اتارا ہے تو کیا تم اس کا انکار کیے جاؤ گے''؟

''یہ یعنی قرآن [2] ''برکت والا'' بایں معنی کہ وہ منسوخ ہونے والا نہیں لہٰذا اس کے فیوض و برکات لازوال ہیں۔ [3]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۴﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾

''اور ہم نے ابراہیم کو راہ راست پر چلنے کی سمجھ عطا کی پہلے ہی سے اور ہم ان پر مطلع تھے، جب انہوں نے اپنے باپ، اور اپنی قوم والوں سے کہا کہ یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی عبادت میں تم لگے ہوئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا۔ کہا تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ انہوں نے کہا تم ہماری طرف واقعی کوئی سچا پیغام لائے ہو یا تفریح کر رہے ہو؟ کہا نہیں بلکہ واقعی تمہارا پروردگار وہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے جس نے اُنہیں پیدا کیا ہے اور اس کی گواہی دینے والوں میں

---

[1] قال قتادة نضع العدل فی المجازاة بالحقّ (تبیان)

[2] ثم اخبر عن القرآن فقال ''هٰذا ذکر مبارك'' ای القرآن (تبیان)

[3] اراد به القرآن لانّه ثابت نافع دائم نفعه الی یوم القیٰمة (مجمع البیان)

سے ہوں اور بخدا میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک کاروائی کروں گا جب کہ تم پیٹھ پھرا کر گئے ہوئے ہو گے''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی اور اس کے پہلے اور بعد قوم سے گفتگو:

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''یہ علاج ہونا انہوں نے چپکے سے کہا، پھر جب وہ شہر سے باہر گئے میلے میں، تب تنہائی میں جا کر سب کو توڑا''، (موضح القرآن)

اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری جملہ: تاللہ لا کیدنّ اصنامکم جس کا ترجمہ ہم نے کیا کہ ''بخدا میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک کاروائی کروں گا''۔ یہ سابق سلسلہ گفتگو میں انہوں نے زور سے نہیں بلکہ چپکے سے یا دل ہی میں کہا تھا جسے وہ سُن یا سمجھ نہیں سکتے تھے، یہ صورت واقعہ بالکل قرین قیاس ہے جسے متعلق علامہ طبرسیؒ نے قدیم مفسرین کا بھی قول نقل کیا ہے۔ [1]

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

''تو انہوں نے اُن بتوں کو چورا کر دیا سوا اُن میں کے ایک بڑے کے، شاید وہ اُن کی طرف رجوع کریں۔ اُن لوگوں نے کہا کہ ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا؟ وہ بلاشبہ ظالموں سے ہے، لوگوں نے کہا کہ ایک جوان کو ہم نے سنا ہے کہ وہ اُن کی نسبت بات کیا کرتا ہے جس کا نام ابراہیمؑ ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ اچھا اُسے لوگوں کی نظروں کے سامنے لاؤ، شاید کہ وہ گواہی دیں''۔

ایک خیال ہے یہ ہے اور وہ ترتیب کلام میں قرب لفظی کی وجہ سے ذہن میں آتا ہے کہ الیہ یرجعون کے معنی یہ ہوں کہ وہ اس بڑے بت کی طرف رجوع کریں یعنی وہ اپنی حماقت سے یہ دیکھ کر کہ وہ ''چشم دید گواہ'' کے طور پر کھڑا ہے، اُس سے مجرم کا پتہ لگانے میں رجوع کریں اور وہ بول سکتا نہیں تو انہیں شرمندگی ہوگی اور اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہیں قائل کرنے کا موقع ملے گا کہ جو بول تک نہیں سکتے، خدا کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ مگر میرے خیال میں وہ احمق سہی، پھر اتنے احمق نہیں تھے کہ یہ نہ جانتے کہ وہ بت بول نہیں سکتے۔ اس لئے قرینہ عقلی کی بنا پر میری نظر میں اس کو قوّت ہے کہ یہ ضمیر خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف راجع ہے کہ وہ ان کی طرف رجوع کریں تو پھر یہ کہیں کہ اس بڑے بت سے پوچھ لو اور وہ ان کے جواب میں کہیں کہ یہ بول نہیں سکتے تو یہ نفیٔ الوھیّت پر اُس سے استدلال کریں جیسا کہ بعد میں ہوا۔ [2]

قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا

---

[1] قیل انّما قال ذٰلك فی سرّ من قومه.....عن قتادة و مجاهد (مجمع البیان)

[2] لعلّهم یرجعون الیٰ ابراهیم فیسألونه عن جال الاصنام فینبئهم علیٰ جهلهم (مجمع البیان)

فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

''اُن لوگوں نے کہا کیا تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کیا ہے؟ اے ابراہیمؑ! کہا بلکہ یہ اُن کے اس بڑے بُت نے کیا ہے تو اُن سے خود پوچھ لو اگر وہ بات کرتے ہوں۔ یہ سُن کر انہوں نے اپنے دل میں غور کیا۔ کہا یقیناً تم خود ہی حد سے آگے بڑھے ہو۔ انہوں نے سر جھکا کر کہا تم جانتے ہو کہ یہ بات نہیں کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسے کی پوجا کرتے ہو جو نہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچائے اور نہ تمہیں نقصان پہنچا سکے۔ افسوس ہے تم پر اور اُس پر جس کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، تو کیا تم عقل سے کام نہیں لو گے''؟

بُت شکنی کے کام کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ ''ان میں کے بڑے نے کیا ہے'' اسے اہل سنت کی بعض احادیث میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان کا (معاذ اللہ) ایک جھوٹ قرار دیا گیا ہے مگر قطع نظر کرتے ہوئے اُس دلیل عقلی قطعی سے جو عصمت انبیاء پر قائم ہے، آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی حدیث بھی بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کلام قطعاً جھوٹ نہیں تھا، اس لئے کہ اُنہوں نے اس بات کو شرط کے ساتھ مشروط کر دیا تھا کہ اگر یہ بات کرتے ہوں۔ جب یہ بات مسلم ہوگئی کہ وہ بات نہیں کر سکتے یعنی کوئی کام نہیں کر سکتے تو اس سے ظاہر ہے کہ یہ کام بھی ان کا کیا ہوا نہیں ہوسکتا۔[1] مگر اس سے پرستش کرنے والوں کی آنکھوں کو کھل جانا چاہیے کہ جب یہ کسی گفتار و کردار پر قادر نہیں ہیں تو اس سے ظاہر ہے کہ ''انہیں خدا سمجھنا درست نہیں ہے۔

اس کے لئے علمی و فنّی زبان میں میری نظر میں یہ پہلو ہے کہ صدق و کذب کا سوال خبر میں ہوتا ہے جس سے مقصود حکایت واقع ہو لیکن مقام مناظرہ میں مخالف سے کوئی بات منوانے کے لئے جو بات کہی جائے اُس سے مقصود حکایت واقع ہوتی ہی نہیں لہٰذا وہ ایک قسم انشاء ہے اور حقیقت یہ ہے کہ علمائے نحو وغیرہ نے جو اقسام انشاء درج کیے ہیں، وہ کسی حصر عقلی پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ استقراری طور پر انہوں نے چند اقسام کا ذکر کیا ہے جن کے علاوہ بہت سے اقسام ہوسکتے ہیں اور ہیں۔

''اپنے دل میں غور کیا'' اس کو ہم اپنے محاورہ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ''انہوں نے اپنے گریبان میں منہ ڈالا'' اور پھر جو ''کہا'' ہے اُس کے معنی ہم زبان سے کہنے کے نہیں سمجھتے بلکہ دل میں کہنے کے سمجھتے ہیں ورسر جھکا کر پھر جو ''کہا'' ہے وہ زبان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مخاطب ہو کر کہا ''تم جانتے ہو کہ یہ بات نہیں کرتے ہیں''۔

---

[1] قال الصّادق علیہ السلام: واللہ ما فعله کبیرهم وما کذب ابراهیم علیہ السلام فقیل و کیف ذٰلك قال انّما قال فعله کبیرهم هو ان نطق وانّه لم ینطق فلم یفعل (علی بن ابراهیم)

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ﴿۷۰﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾

''انہوں نے کہا کہ اسے آگ میں جلا دو اور اگر تمہیں کرنا ہے تو اپنے خداؤں کی مدد کرو ہم نے کہا اے آگ سرد ہوجا اور ابراہیم پر سلامتی رہے اور اُنہوں نے ان کے ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تو ہم نے انہی کو گھاٹا اٹھانے والا کر دیا اور اُنہیں اور لوط کو ہم نے چھٹکارا دے کر پہنچایا اُس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے برکت عطا کی ہے تمام لوگوں کے لیے''۔

خلیل خدا کا آگ میں پھینکا جانا اور آگ کا سرد ہوجانا:

یعنی شام کے ملک میں پہنچا دیا جہاں اللہ نے طرح طرح کی نعمتیں پیدا کی ہیں۔[1]

عام طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کا ذمہ دار نمرود کو قرار دیا جاتا ہے مگر قرآن مجید نے نمرود کا تذکرہ، وہ بھی نام کے ساتھ نہیں، ایک دعویدار الوہیت بادشاہ کے وصف کے ساتھ، بس ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ایک بحث اور مکالمہ کی شکل میں کیا ہے لیکن اس آگ میں جلانے کا فیصلہ کر دیا، یوں کہنا چاہیے کہ وہ نام نہاد جمہور کا ایک پنچایتی فیصلہ تھا جو داعی حق کے خلاف کیا گیا تھا۔

''ہم نے کہا: اے آگ سرد ہوجا اور ابراہیم پر سلامتی رہے''۔ یہ کہنا الفاظ کا زبان پر جاری کرنا نہیں بلکہ ارادہ تکونیہ کی ایک لفظی تعبیر ہے جسے دوسری جنہوں پر قول ''کُن'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہر جگہ یہ ہے کہ ''ارادۂ الٰہی سے بلا توقف و تاخیر'' ایسا ہو گیا۔[2]

''سلامتی رہے ابراہیم علیہ السلام کے لیے'' یعنی برودت نقطۂ اعتدال پر ہو جو اپنی شدّت سے ابراہیم علیہ السلام کے لئے ضرر رساں نہ ہو۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾

''اور ہم نے انہیں اسحاق کیسی اولاد عطا کی اور مزید برآں یعقوب۔ اور ان سب کو نیکوکار بنایا''۔

''مزید براں'' بایں معنی کہ دعا ان کی سارہ کے بطن سے فقط اپنے بیٹے کے لئے تھی مگر خالق نے اس کی قبولیت میں ان کی آیندہ نسل کے سامانِ بقاء کا اضافہ کر دیا کہ اسحاق علیہ السلام ہی پر اُن کی ذریّت ختم نہ ہو بلکہ پھر اسحاق علیہ السلام کے یہاں یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے اور سلسلہ نسل کا آگے بڑھا۔[3]

جناب ابن عباس وغیرہ نے بھی اس کا یہی مفہوم قرار دیا ہے۔[4]

---

[1] بکثرة الانهار والاشجار وهی الشام (جلالین)

[2] لم یکن یکن هناك امر علی الحقیقة والمعنی انّه فعل ذٰلك كما قال: كونوا قردةً خاسئین ای صیرهم كذٰلك من غیر ان امرهم بذٰلك (تبیان) المراد انّا جعلنا النّار بردا علیه وسلامة لا یصیبه من اذاها شئ (مجمع البیان)

[3] نافلة ای زیادة علیٰ ما دعا الله الیه (تبیان) ق

[4] قال ابن عباس وقتادة نافلة راجع الیٰ یعقوب فانّه زاده من غیر دعاء فهو نافلة (مجمع البیان)

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝۷۳

''اور ہم نے انہیں امام بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق ہدایت کرتے ہیں اور ان کی جانب وحی بھیجی نیک کاموں کے کرنے اور نماز ادا کرنے اور کوٰۃ دینے کی اور وہ صرف ہماری عبادت کرتے تھے''۔

وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۝۷۴ۙ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۷۵ۧ

''اور لوط علیہ السلام کو ہم نے حکمت اور علم عطا اور اُنہیں چھٹکارا دیا اُس بستی سے جو گندے کام کرتی تھی، بلاشبہ وہ بڑے بڑے، بدکار لوگ تھے اور انہیں ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا۔ بلاشبہ وہ نیکوکاروں میں سے تھے''۔

جناب لوط علیہ السلام کو کیوں کر چھٹکارا اور اُس پر قوم پر عذاب کس نازل ہوا؟ اس کی تفصیل قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ہے۔

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝۷۶ۚ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۷۷

''اور نوح کو جب پکارا انہوں نے اس سے پہلے تو ہم نے اُن کی دعا پر لبّیک کہتے ہوئے اُنہیں اور اُن کے ماننے والوں کو بڑے کرب واذیّت سے چھٹکارا دیا اور ان کو فتح عنایت کی اُس قوم پر جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ بلاشبہ وہ بہت برے لوگ تھے تو ان سب کو ہم نے ڈبو دیا''۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝۷۸ۙ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝۷۹ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝۸۰

''اور داؤد اور سلیمان جب کہ وہ دونوں فیصلہ کر رہے تھے کھیت کے بارے میں، جب لوگوں کی بھیڑیں اُس پر راتی راتا گئیں اور ہم اُن کے فیصلہ کے دیکھنے والے تھے تو ہم نے اُسے سلیمان کو سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا تھا اور داؤد کے ساتھ پہاڑوں سے ہم نے تسبیح پڑھوائی اور طائروں سے اور ہم اس کو کرنے والے

تھے اور ہم نے اُنہیں لکھائی کاریگری لباس کی تمہارے لئے جو تمہیں تمہاری جنگ کے صدموں سے بچائے تو کیا تم شکر گزار ہو گے"؟

زراعت سے متعلق جناب داؤد وسلیمان علیہما السلام کا فیصلہ:

قرآن کو صرف قرآن سمجھنے کا ادّعاء کرنے والے کیا اس واقعہ کی گم شدہ کڑیوں کا پتہ لگا سکتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام نے کیا فیصلہ کیا اور سلیمان علیہ السلام کا کیا فیصلہ تھا جسے کہا گیا ہے کہ ہم نے انہیں سکھایا اور کیا بغیر یہ معلوم ہوئے انہیں کوئی تشنگی محسوس نہیں ہوتی؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی ساخت ایسی رکھی گئی ہے کہ دنیا معلمین قرآن سے بے نیاز نہیں ہو سکتی، چنانچہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب داؤد علیہ السلام نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اُس زراعت کے عوض میں وہ بھیڑیں کے مالک زراعت کو دوبارہ درست کرنے کے ذمہّ دار ہوں اور جب تک وہ زراعت اپنی اصلی حالت پر آئے، اس زراعت کے مالک کو یہ حق ہو کہ وہ اُن بھیڑوں کے دودھ وغیرہ سے فائدہ اٹھائے اور جب وہ زراعت اصلی حالت پر آ جائے تو وہ بھیڑوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دے یہی فیصلہ تھا جسے خالق کریم نے صحیح قرار دیتے ہوئے اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔

یہ بعض تفاسیر میں روایت ہے مگر اس سے ذہن میں ایک خلش یہ پیدا ہوتی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نبی خدا نے فیصلہ غلط کس طرح کیا؟ جب کہ قرآن میں یہیں پر بعد میں جناب داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام دونوں کے لئے آیا ہے: **وکلا اتینا حکماً وعلماً** (ان میں سے) ہر ایک کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا تھا"۔ مگر تفسیر علی ابن ابراہیم قمیؒ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی جو حدیث ہے، اس میں ہے کہ سب لوگ فیصلہ کے لئے جناب داؤد علیہ السلام کے پاس آئے تو آپ نے خود فیصلہ کرنے کے بجائے، فریقین کو سلیمان علیہ السلام کے پاس بھیج دیا اور انہوں نے وہ فیصلہ کیا اور اسی کو حضرت داؤد علیہ السلام نے نافذ کر دیا۔ اس سے مقصود اس کا اظہار تھا کہ جناب داؤد علیہ السلام کے بعد اُن کے صحیح جانشین جناب سلیمان علیہ السلام ہیں۔ اس طرح باپ بیٹے میں کوئی اختلاف لازم نہیں آتا۔

اس کی نظیر ہمارے یہاں بعض روایات میں ہے کہ کبھی جناب امیر علیہ السلام سے کسی نے بخیال خود کوئی بڑا مشکل سوال کیا تو حضرت نے امام حسن علیہ السلام سے فرمایا کہ تم اس کا جواب دو۔ جناب داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے اس واقعہ کی نوعیت یہی تھی۔

جناب داؤد علیہ السلام کی زرہ سازی:

جناب داؤد علیہ السلام کے زرہ بنانے کا ذکر جس انداز میں ہے، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں اس وقت تک زرہ ایجاد ہی نہیں ہوئی تھی اور دشمنوں کی تلواروں سے بچنے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ سب سے پہلے قدرت کی طرف سے جناب داؤد علیہ السلام کو اس صنعت کا علم دیا گیا جس کے بعد دنیا زرہیں بنانے لگی۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝

''اور سلیمان علیہ السلام کے قبضہ میں ہم نے تیز وتند ہوا کو کیا کہ وہ ان کے حکم سے چلتی تھی اس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے برکت قرار دی تھی اور ہم ہر چیز کو جاننے والے تھے اور جنّات میں کچھ وہ تھے جو اُن کے لئے (دریاؤں میں) غوطہ زنی کرتے تھے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے اور ہم اُن کے نگہبان تھے''۔

جناب سلیمان علیہ السلام کا دوش ہوا پر پرواز کرنا:

معجزاتِ انبیاء کو خلافِ فطرت سے کہہ کر ان کا انکار کرنے والے تو معلوم نہیں ان آیات کے کیا کیا معنی کہتے ہوں گے مگر ان آیات قرآن سے صاف ظاہر ہے کہ یہ غیر معمولی قدرت تھے جو جناب سلیمان علیہ السلام کے لئے وقوع میں آئے تھے۔ ''ہوا اُن کے قبضہ میں دی گئی تھی اور اُن کے حکم سے چلتی تھی، اس کی تفصیل بھی دوسری جگہ قرآن میں موجود ہے کہ وہ صبح کو ایک مہینے کی راہ تک تختِ سلیمان کو لے کر جاتی تھی اور شام کو ایک مہینے کی راہ تک، اور جنّات اُن کے قبضہ میں دیے گئے تھے، اس کے بھی مزید تفصیلات دوسری جگہ موجود ہیں، اس لئے قرآن پر ایمان رکھنے کے ساتھ ان واقعات کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۚ﴿۸۳﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ ۡ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾

''اور ایوب علیہ السلام کو جب انہوں نے اپنے پروردگار کو صدا دی کہ مجھے بڑی اذیّت ہوگئی ہے اور تمام رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا تو ہے، تو ہم اُن کی دعا قبول کی اور جو اذیّت انہیں تھی، اُسے دور کیا اور انہیں اُن کی جو اولاد تھی، وہ عطا کی اور اُن کے ساتھ اتنے ہی اور، مہربانی کی بنا پر اپنی جانب سے اور انتباہ کے طور پر عبادت گزاروں کے لیے''۔

جناب ایوب علیہ السلام کا امتحان اور ان کا صبر:

جناب ایوب علیہ السلام کی دعا ایک انتہائی لطیف پیرایہ کہ حامل ہے کہ بندہ بس اپنی تکلیف بیان کرتا ہے اور خالق کے عمومی لطف وکرم کا اظہار کرتا ہے اس کے علاوہ لفظوں میں اظہار مطلب کچھ بھی نہیں کرتا[1] جسے میرا انیسؔ اعلی اللہ مقامہ نے یوں ادا کیا ہے:

کریم! جو تجھے دینا ہے بے طلب دیدے
فقیر ہوں، پر نہیں عادت سوال مجھے

یہی انداز دوسری جگہ قرآن میں جناب موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ہے کہ: رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ. (قصص۔ ۲۴) چونکہ تیرا فیض وکرم میرے شامل حال رہا ہے بہرحال میں اس وقت ضرورت مند ہوں۔

---

[1] هو من لطيف الكنايات في طلب الحاجة (مجمع البيان)

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۖ﴿۸۵﴾ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور اسماعیل علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام اور ذوالکفل علیہ السلام کو۔ یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے اور اُنہیں ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، بلاشبہ وہ نیکوکاروں میں تھے''۔

ذوالکفل کے متعلق شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''ایوب علیہ السلام کے بیٹے تھے، ایک شخص کے ضامن ہوکر کئی برس قید رہے'' (موضح القرآن)

ذوالکفل کی وجہ تسمیہ میں جلالین نے لکھا ہے:

سمّی ذالکفل لانّه تکفل بصیام جمیع نهاره و قیام جمیع لیله وان یقضی بین النّاس وما یغضب فوقّیٰ بذٰلك وقیل لهم یکن نبّیا۔

ان کا نام ذوالکفل اس لئے ہوا کہ وہ کفیل یعنی ذمہّ دار ہوئے کہ تمام دنوں کو روزہ رکھیں گے اور راتیں نماز میں گزاریں گے اور یہ کہ وہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں گے اور کبھی انہیں غصّہ نہیں آئے گا تو انہوں نے اسے پورا کیا اور کہا گیا ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔

مگر جناب شیخ الطائفہؒ فرماتے ہیں:

معنی وصفه بالکفل انّه ذو الضّعف ای ضعف ثواب غیر ممّن فی زمانه لشرف عمله۔

اُن کے لقب میں کفل کی لفظ کے معنی یہ ہیں کہ وہ دونا پانے والے ہیں یعنی اپنے زمانہ کے تمام لوگوں کے ثواب کا دونا اپنے عمل کی بلندی کی وجہ سے۔

کفل کا یہ مفہوم قرار دینے میں شاید قرآن مجید کی یہ آیت سامنے ہے کہ:

یُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ۔ (حدید ۲۸)۔

وہ اُسے اپنی رحمت کے دونے حصّے عطا کرے گا۔

مگر دونے کے معنی تو یہاں کفلین کے تثنیہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ کفل کے معنی تو دونے کے نہ ہوئے علامہ طبرسیؒ نے ان کی شخصیّت کے بارے میں اور زیادہ اقوال نقل کر دیئے ہیں جن میں سے معصوم علیہ السلام کی طرف کسی کی نسبت نہیں ہے۔

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۖ﴿۸۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾

''اور مچھلی والے کو جب وہ غصّہ میں بھرے ہوئے گئے تو وہ سمجھے کہ ہم اُن پر سختی نہ کریں گے تو اُن تاریکیوں میں

اُنہوں نے آواز دی کہ کوئی خدا نہیں سوا تیرے۔ پاک ہے تیری ذات بلاشبہ میں ظالموں میں سے تھا تو ہم نے اُن کی دعا قبول کی اور انہیں اُس رنج وغم سے چھٹکارا دیا اور اس طرح ایمان والوں کو ہم چھٹکارا دیتے ہیں''۔

حضرت یونس علیہ السلام کی شکم ماہی کے اندر تسبیح:

''مچھلی والے'' سے مراد جناب یونس علیہ السلام ہیں [1] جن کو مچھلی نے نگلا تھا جس کا ذکر خود قرآن مجید میں دوسری جگہ موجود ہے۔ غصّہ میں بھرے ہوئے گئے تو کیا ہوا جس کے بعد انہوں نے یہ دعا کی؟ یہ درمیان کی کڑی یہاں صراحۃً درج نہیں ہے، صرف یونس علیہ السلام کو ذوالنّون ''مچھلی والے'' کہنے سے اس کی طرف اشارہ ہو گیا اور یہ وہ ہے کہ مچھلی نے ان کو نگل لیا۔ اس سے وہ تاریکیاں پیدا ہوئیں جن میں گھبرا کر انہوں نے دعا کی۔ ایک تو رات، اور پھر دریا کی موجیں اور پھر شکم ماہی۔ [2]

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾

''اور زکرّیا کو جب اُنہوں نے صدا دی اپنے پروردگار کو پروردگارا! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو بہترین ورثہ دار ہے تو ہم نے اُن کی دعا قبول کی اور انہیں یحییٰ ایسا فرزند عطا کیا اور ان کی بیوی کو ان کی خاطر ٹھیک کر دیا، یہ لوگ نیکیوں کی طرف لپکتے تھے اور ہمیں امید وبیم دونوں حالتوں میں پکارتے تھے اور وہ ہمارے لئے جھکنے والے تھے''۔

جناب زکریا علیہ السلام کی دعا اور اس کی قبولیت:

''اکیلا نہ چھوڑنا، یعنی بے اولاد [3] ''اُن کی بیوی کو ٹھیک کر دیا، اس کی تفصیل قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے ملتی ہے کہ وہ بانجھ تھیں۔ خالق نے اس نقص کو دور کر دیا اور اُن میں اولاد پیدا ہونے کی صلاحیّت ہو گئی اور پھر عمر بھی اُن کی زیادہ ہو چکی تھی، اس لئے اصلحنا کے معنی بعض لوگوں نے یہ لئے ہیں کہ اُن کا دور شباب واپس آ گیا اور بعض نے نہ معلوم کیوں اس درستی کو اخلاق کی درستی قرار دیا ہے۔ [4]

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾

---

[1] ھو یونس (علی ابن ابراھیم) النون الحوت وصاحبھا یونس بن متی (تبیان)

[2] ظلمۃ اللّیل وظلمۃ البحر وظلمۃ بطن الحوت (جلالین) اظھر فی اقوال المفسّرین (تبیان)

[3] ای وحیدا بل ارزقنی ولدا (تبیان)

[4] بان کانت عقیمۃ فحوّلنا ھا ولودا عن قتادۃ وقیل کانت حرمۃ فرددنا علیھا شبابھا عن ابی مسلم وقیل کانت سیّئۃ الخلق فجعلنھا ھا حسنۃ الخلق (مجمع البیان)

''اور اس خاتون کو جس نے اپنے مرد کے تصرّف سے بچایا تو ہم نے اُس میں اپنی روح کا ایک حصّہ پھونک دیا اور اُسے اور اُس کے بیٹے کو تمام جہانوں کے لئے قدرت کی ایک نشانی قرار دیا''۔

''اپنی روح'' میں اضافت ویسی ہی ہے جیسی خلقت آدم علیہ السلام کے اعلان کے وقت ملائکہ سے کہا گیا تھا: فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ ''جب میں اس کو تیار کرلوں اور اس میں اپنی روح کا ایک حصّہ پھونک دوں'' (حجر۔۲۹) اس نسبت میں شرف وفضلیت کے اظہار کا پہلو ضرور ہے اور جیسی ''من روحی'' میں اضافت آدم علیہ السلام کے لئے ہے، وہی من روحنا کی لفظ میں اضافت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے یہاں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام چونکہ سلسلہ ظہور انبیاء میں مرکز انتخاب الٰہی ہونے میں نمبر ا تھے لہٰذا انہیں صفت انتخاب کے پہلے پہل ظہور میں آنے سے لقب صفی اللہ ملا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب آخر میں اس ''روحنا'' کے لفظ کی بنا پر روح اللہ ہو گیا مگر لفظ کے اختصاص کی وجہ سے صفت کا اشتراک ختم نہیں ہوتا جیسے معنی کے لحاظ سے صفی خدا ہر نبی ہے، ویسے ہر رسول کی روح اس مرتبہ فضلیت کی ہے کہ وہ ''روح اللہ'' قرار پا سکتا تھا۔ جب کہ من روحی اور من روحنا کی اضافت جناب آدم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان مشترک ہے اور دونوں میں من موجود ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ روح اس معیار کے تمام بندگان الٰہی میں پائی جاتی ہے تو اس سے عیسائیوں کا الوہیّت عیسیٰ علیہ السلام پر استدلال بلا وجہ ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۭ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾

''بے شک یہ تمہاری ملّت ہے، ایک ملّت۔ اور میں تمہارا پروردگار ہوں، تو میری عبادت کرو اور اُن سب نے اپنے معاملات کو جدا جدا کر رکھا ہے (بہر حال) سب ہماری ہی طرف پلٹنے والے ہیں''۔

''امت'' جس کا ترجمہ ہم نے ''ملت'' کے ساتھ کیا ہے، اس کے معنی بعض مفسرین نے دین کے لئے ہیں۔[1]

اس طرح اس کا مطلب یہ ہوتا کہ صحیح دین خلق خدا کا ایک ہے اور اقتراق واختلاف بعد والوں ذہنی جدّت طرازیوں سے پیدا ہوا ہے جنہیں اصطلاح قرآنی میں اھواء کہا جاتا ہے اور معیار حق نہیں ہو سکتے، (ولو اتبع الحقّ اھوآء ھم لفسدت السّمٰوٰت الارض) (مومنون۔۷۱)

علامہ طبرسیؒ نے قدیم مفسرین کے حوالہ سے اُس کی یہ تفسیر پیش کرتے ہوئے اس کی تشریح بہت خوب فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:

انّ ھٰذا دینکم دین واحد عن ابن عباس ومجاھد والحسن واصل الامّة الجماعة الّتی علیٰ مقصد واحد فجعلت الشریعة امة واحدة لاجتماعھم بھا علی مقصد واحد (مجمع البیان)

یعنی تمہارا دین ایک اکیلا دین ہے۔ یہ تفسیر ابن عباس، مجاہد اور حسن سے منقول ہے اور اصل میں امّت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کا ہدف نگاہ ایک ہو تو قانون الٰہی ایک امّت اس معنی میں ہے کہ اُس سے پوری جماعت ایک ہدف نگاہ پر متفق ہو جاتی ہے۔

---

[1] ھٰذہ ای ملّة الاسلام امّتکم (جلالین)

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿۹۴﴾

''تو جو شخص نیک کام کرے درآں حالیکہ وہ صاحب ایمان ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہ ہوگی اور ہم اس کے لکھ لینے والے ہیں''۔

یہاں بھی مثل دوسرے مقامات کے حسن عمل کے صلہ کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، اس کے بعد یہ تصور کہ:

''ہوگی نجات اس کی عمل جس کے نیک ہوں کافر ہو وہ عقیدہ ہیں یا دیندار ہو'' غلط ہے۔ [۱]

''ہم اس کے لکھنے والے ہیں'' یعنی بعد میں وہ خود چاہے بھول جائے لیکن ہمارے یہاں اُس کا نیک عمل بہرحال محفوظ ہے اور اُس کا صلہ ملنا ضروری ہے۔

''ہم'' کہہ کر اپنی طرف نسبت لکھنے کی ویسی ہی ہے، جیسے قبض روح کی نسبت اپنی طرف دی ہے جب کہ یہ دوسری جگہ صاف اُسے فعل ملائکہ اور خاص طور پر ملک الموت کا کام قرار دیا ہے، اسی طرح قرآن مجید میں دوسری جگہ کاتبان اعمال کا ذکر ہے جو فرشتے ہیں مگر چونکہ اُن کا لکھنا بحکم الٰہی ہے، اس لئے اُس کی نسبت خالق نے اپنی جانب دی ہے۔ [۲]

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۹۷﴾

''اور جس بستی کو ہم نے تہس نہس کر دیا اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ پھر واپس نہ آئے یہاں تک کہ جب یاجوج وماجوج کھول دیے گئے اور وہ ہر بلندی سے امنڈ پڑیں گے اور سچّا وعدہ قریب آجائے گا تو ایک دم کافروں کی نگاہیں پتھرا جائیں گی: وائے برحال ما! ہم اس سے بےخبری میں رہے بلکہ ہم بڑے ظلم کے مرتکب تھے''۔

یاجوج اور ماجوج کا ذکر:

حرام کے معنی سب ہی جانتے ہیں کہ وہ حلال کے مقابل ہے یعنی جو جائز نہ ہو۔ اب یہ کس بات کو کہا جارہا ہے کہ حرام ہے؟ انّھم لا یرجعون ''کہ واپس نہ ہوں'' یعنی واپس نہ ہونا حرام ہے تو واپس آنا لازم ہے۔

ہماری قدیم تفسیر بتاتی ہے کہ یہ آیت ''رجعت'' کے وقوع کا پتہ دیتی ہے [۳] مگر جو رجعت کے قائل نہیں، وہ کیا کریں؟ تو کوئی صاحب

---

[۱] انّما شرط الایمان لانّ ھٰذہ الاشیآء لو فعلھا الاکافر لم ینتفع بھا (تبیان)

[۲] ای نامر ملائکۃ ان یکتبوا ذلك (مجمع البیان)

[۳] لازائدۃ—ای ممتنع رجوعھم الی الدّنیا (جلالین) محال است—آں کہ باز گردند یعنی بدنیا (شاہ ولی اللہ)

"لا" کو غائب کرتے ہیں یعنی "لا یرجعون" کا ترجمہ کرتے ہیں' وہ جو رجعت کا ہونا چاہیے کہ "اس دنیا میں ناممکن ہے کہ وہ واپس آئیں"[1] اور کوئی صاحب حرام کے معنی واجب کے قرار دیتے ہیں یعنی لازم ہے کہ وہ اب واپس نہیں آئے گی۔

ترجموں میں یہ زمین آسمان کا فرق خود ظاہر کرتا ہے کہ نقطۂ حقیقت ان کی نظر سے دور ہے اور اصل دروازوں سے ہٹ کر آدمی کو قرآن فہمی میں یہ ٹھوکریں کھانا ہی چاہئیں مگر تعجب علّامہ طبرسیؒ سے ہے کہ انہوں نے وہی اقوال جو اکثریت کے یہاں ہیں، قدیم مفسرین کے حوالہ سے درج کر دینے پر اکتفا فرمائی ہے۔ جن میں سے کوئی الفاظ آیت پر منطبق نہیں ہے اور خود اپنے یہاں جو تفسیر موجود ہے اور وہ بالکل الفاظ قرآنی کے مطابق ہے' اسے انہوں نے بطور نقلِ قول بھی درج نہیں کیا ہے۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾

"بلاشبہ تم اور وہ چیزیں جن کی تم عبادت کرتے ہو، اللہ کو چھوڑ کر، دوزخ کا ایندھن ہیں تمہیں وہاں پہنچنا ہے"۔

"جن چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو" اس سے مراد بت ہیں کہ جو بے جان چیزیں ہیں، انہیں دوزخ میں ڈالنا، ان کو سزا دینا نہیں ہے بلکہ ان کے عبادت گزاروں کو تکلیف پہنچانا ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ہے **وقودھا الناس والحجارۃ** اس کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر"۔

لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

"اگر خدا ہوتے تو وہ اس (دوزخ) میں نہ جاتے اور سب ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان کی اس میں چیخ پکار ہوگی اور وہ اس میں سنیں گے نہیں"۔

"وہ اس (دوزخ) میں نہ جاتے" اس میں دو احتمال ہیں جو دونوں بحسب واقعہ درست ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ جو ان کے معبود ہیں، وہ بھی دوزخ میں پھونک دیے جائیں گے تو "وہ" کی ضمیر انہی (معبودوں) کی طرف راجع ہے کہ اگر یہ واقعی خدا ہوتے تو جہنم میں کیوں کہ جھونکے جا سکتے تھے؟[2] دوسرے یہ کہ خود کافروں کی طرف ضمیر راجع ہو کہ اگر وہ اصنام خدا ہوتے تو ان کی عبادت کرنے والوں کا یہ انجام کیوں ہوتا کہ وہ دوزخ میں ڈالے جائیں۔

"سنیں گے نہیں" اس محاورہ کے معنی میں ہے کہ انکی چیخ و پکار سے کان پڑے آواز سنائی نہ دیتی ہوگی[3] اور بعض نے کہا کہ آگ کے شعلوں کے زور و شور سے انہیں کچھ سنائی نہ دیتا ہوگا[4] ان کے علاوہ مزید دو معنی بیان کیے گئے ہیں: ایک یہ کہ وہ سنیں گے نہیں یعنی کوئی ایسی چیز جو

---

[1] لازم ہے اوپر اُس بستی کے کہ وہ نہیں پھرتے (شاہ رفیع الدین)

[2] یحتمل ان یکون ارادما وردت الاصنام جھنم (تبیان)

[3] یعنی اپنے چلانے کے شور سے (موضح القرآن)

[4] لا یسمعون شیا لشدۃ غلیانھا (جلالین)

دل خوش کن اور کارآمد ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ آگ کے صندوقوں میں بند ہوں گے کہ ان تک کوئی اِدھر اُدھر کی آواز جاتی ہی نہ ہوگی۔ [1]

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۙ﴿۱۰۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۚ﴿۱۰۲﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

''بلاشبہ وہ جن کیلئے ہماری طرف سے بھلائی پہلے مقرر ہو چکی ہے، یہ اس سے دور رہیں گے، وہ اس کی آواز نہیں سنیں گے اور وہ اس میں کہ جسے انکا جی چاہتا ہے ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، انہیں وہ سب سے بڑی گھبراہٹ کوئی رنج نہ پہنچائے گی اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے۔ یہ تمہارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا تھا''۔

چونکہ قرآن مجید میں ایک جگہ ہے:

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا: اور کوئی تم میں ایسا نہیں جس کا گزر دوزخ پر نہ ہو۔ (مریم۔۷۱)

اس لئے یہاں دور رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اِدھر سے گزر کر جب آگے بڑھ جائیں گے تو پھر ہمیشہ کے لئے اہلِ جنت اس دوزخ سے دور رہیں گے [2]۔ مگر ہماری قدیم تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت اس آیت کے تکملہ کی حیثیت رکھتی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مقبول بارگاہ الٰہی طبقہ ایسا ہے جو ادھر سے گزرے گا بھی نہیں۔ [3]

اس تفسیر میں الفاظ اگرچہ ایسے ہیں کہ یہ آیت اس آیت کو منسوخ کر دیتی ہے مگر چوں کہ نسخ احکام شرعیہ میں ہوتا ہے۔ احوال و اہوال قیامت کے متعلق جو خبریں ہیں ان میں نسخ کا لفظ ایک تعبیر ہو سکتی ہے اسی امر کی یہ افراد اس حکم سے خارج ہیں اور اس کا سمجھنا یوں زیادہ آسان ہے کہ اس آیت (اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا) میں جو کچھ عموم ہے، وہ کُم کے مخاطب میں ہے کہ تم میں سے کوئی ایسا نہیں جو دوزخ کی طرف نہ جائے۔ لیکن یہ آیت بتلاتی ہے کہ ایک طبقہ جس کی طرف رحمت الٰہی نے سبقت کی ہے اور وہ وہی ہو سکتے ہیں جو خود السّابقون والسّابقون اور السّابقون الی الخیرات کے مصداق ہیں، وہ اس ''کُم'' یعنی ''تم'' کی مخاطب جماعت سے از اوّل خارج ہیں لہٰذا اس آیت کے مضمون کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اب ترتیب قرآن چونکہ مطابق تنزیل نہیں ہے، اس لئے یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آیات گزشتہ سلسلۂ کلام سے مربوط ہی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ آیات اُس سے الگ ہوں اور ''جن کے لئے بھلائی لکھی جا چکی ہے'' اس سے وہی خاص درجہ والے اہل ایمان مراد ہوں جو معصوم ہیں بغیر اس کے کہ اس کی نظر کسی سوال اور اس کے جواب پر ہو لیکن جب ان کا تعلق گزشتہ آیات سے مانا جائے تو یہ پریشان نزول قرین قیاس ہے کہ چونکہ گزشتہ آیات میں آیا تھا کہ جن جن کی اللہ کے سوا عبادت کی جاتی تھی، وہ سب ہی دوزخ میں ڈالے جائیں گے تو اس سے یہ

---

[1] ای لا یسمعون ما یسرّ هم ولا ما ینفعون به ـــ وقیل یجعلون فی توابیت من النار فلا یسمعون شیئا (مجمع البیان)

[2] یعنی ایک بار گزر کر پھر ہمیشہ دور رہیں گے (موضح القرآن)

[3] ناسخة لقوله: وان منکم الّا واردها (علی بن ابراهیم)

بلاشبہ پیدا کیا گیا کہ پھر جناب مسیح علیہ السلام اور جناب عزیز علیہ السلام وغیرہ بھی اس کے مستوجب ہیں کہ دوزخ میں ڈالے جائیں، تو اس تصوّر کے دفعیہ کے لئے یہ آیات نازل ہوئیں۔ [1]

پھر بھی جو مفہوم آیت ہے، وہ ان اشخاص سے مخصوص نہیں ہو جائے گا بلکہ جو اس پایہ کے یا ان سے برتر، جو ہر عصمت میں ان کے ساتھ مشترک افراد ہوں، سب ہی اس میں داخل ہوں گے۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

''جس دن ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جس طرح کاغذ خطوط کے لئے لپیٹا جاتا ہے، جس طرح ہم نے پہلے پہل مخلوق کو پیدا کیا تھا۔ اب اسے ہم پلٹائیں گے بھی۔ یہ وعدہ ہے ہمارے ذمہ یقیناً ہم ایسا کر کے رہیں گے''۔

ایک تفسیر یہ ہے کہ سجل فرشتہ کا نام ہے اور کتب سے مراد نامہ ہائے عمل ہیں [2] اب ترجمہ یہ ہوگا کہ ''جیسے سجل نامہ ہائے عمل کو لپیٹتا ہے'' ہماری قدیم تفسیر بھی جو غالباً معصوم علیہ السلام سے وارد ہے، اس کے مطابق ہے۔ [3]

جناب شیخ الطائفہؒ نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ سجل پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاتب کا نام ہے اور یہ معنی ہیں کہ جیسے سجل خطوط کو لپیٹتے ہیں [4] لیکن وہ تفسیر جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ سجل وہ کاغذ ہے جو لفافہ کی طرح خطوط پر لپیٹا جاتا ہے، قدیم مفسرین میں سے زیادہ کی طرف نسبت رکھتی ہے۔ [5]

وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

''اور بے شک ہم نے توریت کے بعد زبور میں بھی یہ لکھ دیا ہے کہ زمین کے ورثہ دار میرے نیک بندے ہوں گے''۔

انجام کار میں نیکوکاروں کا مکمل اقتدار:

ہم نے جو ترجمہ کیا ہے جس کے رو سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذکر کے معنی اس مقام پر توریت کے ہیں، اکثر مفسرین کے قول کے مطابق ہے

---

[1] نزل لمّا قال ابن الزّبعدمی عبد عزیز و المسیح و الملائکة فهم فی النّار علیٰ مقتضیٰ ما تقدم (جلالین)

[2] السجل اسم ملك للكتب صحيفة ابن اٰدم عند موته (جلالین)

[3] قال السجل اسم ملك الّذی یطوی الكتب (علی بن ابراهیم)

[4] فی روایة اخریٰ السجل كاتب كان لرسول الله ﷺ (تبیان)

[5] السجل صحيفة فيها الكتب عن ابن عباس و مجاهد و قتادة و الكلبی (مجمع البیان)

مگر علّامہ طبرسیؒ نے اس کے قبل دو قول اور نقل کیے ہیں: ایک یہ کہ زبور کے معنی تمام انبیاء کی کتابیں ہیں اور ذکر سے مراد لوح محفوظ ہے، اسے بعض متداول تفاسیر اہل سنت میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔[1]

دوسرے یہ کہ ذکر تو توریت ہی ہے اور زبور سے مراد وہ سب کتابیں ہیں جو توریت کے بعد نازل ہوئیں پھر آخر میں ایک عجیب قول یہ نقل کیا ہے کہ ذکر سے مراد قرآن ہے اور بعد کے معنی قبل کے ہیں یعنی تمام کتابیں جو قرآن سے پہلے تھیں، ان میں سب میں یہ بات درج ہے لیکن یہ تمام اقوال خلاف ظاہر ہیں، ظاہری مفہوم وہی ہے جو پہلے لکھا گیا ہے۔

اب وہ بات کیا ہے جو ان سب کتابوں میں درج ہے؟

شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں: یعنی در آخر زمان پیغمبری مبعوث شود و امت او برزمین غالب شود (فتح الرحمٰن)

مطلب یہ ہے کہ آخری زمانہ میں ایک پیغمبر بھیجا جائے گا اور اس کی امّت تمام روئے زمین پر غلبہ حاصل کر لے گی۔

مگر ''ورثہ دار'' کا لفظ جس غلبہ کا پتہ دیتی ہے، وہ سب سے آخری مختتم غلبہ ہے جو پھر مغلوبیّت سے تبدیل نہ ہو اور شاہ صاحب کے پیش نظر جو غلبے ہیں، وہ سب مغلوبیت سے تبدیل نہ ہو اور شاہ صاحب کے پیش نظر جو غلبے ہیں، وہ سب مغلوبیت سے تبدیل ہو گئے لہٰذا انہیں ہمارے ساتھ مل کر اس ''وارث ارض'' کا انتظار کرنا چاہیے جس کا غلبہ مختتم حیثیت رکھتا ہو اور جس کے بعد کوئی دوسری جماعت روئے زمین پر غالب نہ آ سکے۔ وہ مہدی آخر الزمان علیہ السلام کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا[2] امام محمد باقر علیہ السلام کی حدیث بھی نتیجتاً اس کے مطابق ہے۔[3]

بعض مفسرین اہل سنت نے شاید اس نتیجہ سے بچنے کے لئے ایک دور از فہم تفسیر کر دی ہے کہ ارض سے مراد سرزمین جنّت ہے اور صالحون سے مراد تمام نیکوکار لوگ ہیں۔[4]

إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ ﴿١٠٦﴾ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿١٠٧﴾

''بلاشبہ اس میں ایک پیغام ہے ان کے لئے جو عبودیّت خالق کا احساس رکھتے ہوں اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا ہے مگر رحمت بنا کر تمام جہانوں کے لئے''۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رحمۃ اللعالمین ہونا:

قرآن کے الفاظ صاف اس رحمت کی ہمہ گیری کو ظاہر کر رہے ہیں اور اُس میں کسی قید کا پتہ نہیں چلتا بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کی آواز ہے جو خود ربّ العالمین ہے اور وہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض کو اتنا ہی وسیع بتا رہا ہے۔

اب بعض مفسرین اُس کی وسعت کو اپنی کوتاہ کے حدود میں مقید کر دیں[5] تو اس کی ذمہ داری نہ خالق پر ہے۔ نہ اُس پر جو

---

[1] الزبور بمعنی الکتاب ای کتب اللہ المنزلۃ من بعد الذّکر بمعنی ام الکتاب الّذی عند اللہ (جلالین)

[2] قال: القائم علیہ السلام اصحابہ (علی ابن ابراھیم)

[3] عن ابی جعفر علیہ السلام انّ ذٰلک وعد للمؤمنین بأنّھم یرثون جمیع الارض (تبیان)

[4] الارض ارض الجنّۃ ..... عام فی کلّ صالح (جلالین)

[5] العالمین الانس والجنّ امؤمنین بک (جلالین)

رحمۃ للعالمینؐ بن کر آیا تھا حالانکہ صدراوّں کے مفسرین میں جناب ابن عباسؓ نے اس کو بلاتفریق مذہب وملّت سب کے لئے ہمہ گیر بتایا تھا۔[1]

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

''کہہ دیجئے کہ میرے پاس یہی وحی آتی رہی ہے کہ تم سب کا خدا بس ایک خدا ہے، تو کیا تم اس کی بارگاہ میں سر جھکاتے ہو؟ اس کے بعد اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دیجئے کہ میں نے تم کو برابر سے باخبر کر دیا اور مجھے نہیں معلوم کہ جلد یا بدیر (بہرحال) وقوع میں آئے گا وہ جس سے ڈرایا جاتا ہے''۔

''تم کو برابر سے باخبر کر دیا ہے'' اس کی تشریح جناب شیخ الطائفہؒ نے بالکل درست فرمائی ہے:

تتساوون فی العلم به لم اظهر بعضكم علیٰ شئ كتمته عن غيره

تم اس کے علم میں بالکل برابر ہو۔ میں نے یہ نہیں کیا ہے کہ کسی ایک کو کوئی ایسی بات بتائی ہو جسے دوسرے سے چھپایا ہے۔

مگر موصوف نے اس سے نتیجہ ایک عجب وغریب نکالا ہے:

هو دليل علیٰ بطلان قول اصحاب الرّموز وان للقرآن بواطن خصّ بالعلم بها اقوام (تبیان)

یہ رموز واشارات والے لوگوں کے قول کے غلط ہونے کی دلیل ہے اور اس کی رد ہے کہ قرآن کے اندر کچھ اندرونی مطالب ہیں جن کا علم خاص اشخاص کو دیا گیا ہے۔

ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے، یہ بات اور ہے کہ باطنی جماعت نے رموز واشارات کے دائرہ کو غیر معقول حد تک وسیع کیا ہے مگر بنیادی طور پر یہ خیال کہ علم قرآن میں سب برابر ہیں، درست نہیں ہے۔ نہ قرآن کی اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ یہاں تو مخاطب حقیقتاً منکرین توحید ہیں اور پیغام توحید کے متعلق کہا جارہا ہے کہ میں نے تم سب کو یہ پیغام یکساں طور پر پہنچایا ہے اور جس حد تک کہ اتمام حجّت کے لئے ضروری ہے، میری تبلیغ تم سب کے لئے برابر سے ہوئی ہے۔ نہ یہ کہ حقائق ومعارف قرآنی آپ نے سب کو یکساں طور پر بتائے تھے اور جتنا بتایا ہو، اُسے سب یکساں طو پر سمجھے بھی ہوں، ورنہ راسخون فی العلم کے گروہ کی کوئی خصوصیت نہ ہوتی اور اس آیت کے کوئی معنی نہ ہوتے کہ

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ

بلکہ وہ کھلی ہوئی آیات ہیں اُن اشخاص کے سینوں میں جنہیں علم عطا ہوا ہے۔ (عنکبوت۔۴۹)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کوئی خاص طبہ ہے جن کے سینوں میں علم قرآن کا ذخیرہ ہے، ہر کس وناکس اُس سے بہرہ ور نہیں ہے۔

اس کے علاوہ متعدد احادیث معصومین علیہم السلام نے قرآن مجید میں باطنی اسرار اور تہ در تہ رموز واشارات کا پتہ دیا ہے جس کے بعد اس کا مطلق طور پر انکار مشکل ہو گیا ہے۔

---

[1] رحمة للبرّ والفاجر والمؤمن والكافر (مجمع البیان)

علامہ طبرسیؒ نے اس آیت کی تشریح ایسی کی ہے جس کے بعد اس کا تعلق علم سے کچھ رہتا ہی نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

اٰذنتکم ای اعلمتکم بالحرب علیٰ سوٰی ایذانا علیٰ سواء اعلا مه نستوی نحن و انتم فی علمه (مجمع البیان)

میں نے تم کو برابر سے آگاہ کر دیا یعنی جنگ کا اعلان صاف الفاظ میں کر دیا ہے جسے ہمارے آدمی بھی خوب سمجھ گئے اور تم بھی۔

اگر چہ موصوف کے پیش نظر جناب شیخ الطائفہؒ کا ارشاد ہے۔ چنانچہ بعد میں اُس کا خلاصہ بطور قول ضعیف درج کیا ہے مگر اس کا کوئی انتقادی جائزہ نہیں لیا ہے جیسا بحمدہ باوجود اختصار کے سیر حاصل طور پر ہم نے جائزہ لیا ہے۔

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾

''بلاشبہ وہ جانتا ہے اسے بھی کہ جو با آواز بات ہو اور جانتا ہے اُسے بھی کہ جو تم کو چھپاتے ہو اور مجھے نہیں معلوم ممکن ہے وہ آزمائش ہو تمہارے لئے اور عارضی فائدہ ہو ایک وقت تک کے لیے''۔

''مجھے نہیں معلوم'' یعنی ظاہری اسباب سے انسان نہیں جانتا [۱] جیسے ہمارے محاورہ میں آتا ہے۔

''نجانے'' اور ''کیا معلوم'' وغیرہ، چاہے کہنے والا کسی غیر معمولی ذریعہ سے جانتا بھی ہو کہ ایسا ہی ہے۔

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''کہیے کہ پروردگار تو فیصلہ کر دے حق کے ساتھ۔ اور ہمارا پروردگار سب کو فیض پہنچانے والا وہ ہے جس سے مدد طلب کی جائے اس پر جو تم کہتے ہو''۔

قرآن مجید میں متداول اس آیت کے شروع میں قُل ہی ہے جس کا ہم نے ترجمہ کیا ''کہیے'' اور ترجمہ کا عام اصول یہ ہے کہ وہ متداول لفظوں کے مطابق ہوتا ہے جیسا کہ ہمارے جلیل القدر مفسرین نے تفسیر میں بھی اس کی پابندی کی ہے [۲] مگر بعض مترجمین نے یہاں ترجمہ قال کے لفظ کا کیا ہے [۳] جو بعض قاریوں کی قرأت بتائی جاتی ہے [۴] کہ انہوں نے پڑھا ہے: قٰلَ رَبِّ احْكُمْ الخ اس میں دو تبدیلیاں ہیں قُل کے بجائے قال اور ربّ (بغیر یا) کے بجائی: ربّی (ی کے ساتھ) مگر ہم اسے بہتر سمجھے سے قاصر ہیں۔

''مدد طلب کی جائے اس پر جو تم کہتے ہو''۔ یعنی جن غلط عقائد کا تم ادعا کرتے ہو [۵] یا میری ایذا رسانی کے جو منصوبے بناتے ہو۔

---

[۱] وان ادری ای وما ادری لعلّه کنایة عن غیره (مجمع البیان)

[۲] قل یا محمد (تبیان) ای فوّض امورك یا محمد الی الله (مجمع البیان)

[۳] پیغامبر گفت (شاہ ولی اللہ) کہا پیغمبر نے (شاہ رفیع الدّین)

[۴] وفی قراءت قال (جلالین)

[۵] من کذّبکم علی الله فی قولکم: اتّخذ ولدا وعلیٰ فی قولکم ساحر وعلی القرآن فی قولکم شعر (جلالین)

سُوْرَةُ الْحَجِّ

اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے [1] لیکن اکثر نسخہ ہائے قرآن میں اس ''سورہ'' کی پیشانی پر ''مدنیہ'' لکھا ہوا ہے۔ آیات کی تعداد ۷۸ ہے۔

حج کا ذکر پہلے بھی کئی دفعہ آچکا، اس سورہ میں بھی ہے مگر نام یہ اسی سورہ کا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ خاص مضامین جو اس سورہ میں ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

سورۂ حج کے خاص خاص مضامین:

۱.....قیامت کا انتہائی ہولناک زلزلہ۔

۲.....انسانی تخلیق اور زندگی کے مختلف بدلتے ہوئے ادوار کے تصوّرات وتغیّرات سے حیات بعد الموت کے امکان پر روشنی۔

۳.....اختلافِ عقائد کا اصل فیصلہ قیامت میں جو اس کی دلیل ہے کہ عقیدوں کا اختلاف نجات پر اثر انداز ہوتا ہے۔

۴.....حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ندائے حج اور قیامت تک اس کا اثر۔

۵.....شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم جو اس کی دلیل ہے کہ تعظیم غیر اللہ کو مطلق طور پر شرک سمجھنا غلط ہے۔

۶.....دفاعی جنگ کی اجازت اور اس کی بین الاقوامی طور پر ضرورت۔

۷.....اللہ کے یہاں کا ایک دن ایک ہزار برس کے برابر۔

۸.....پیغمبروں کی تمناؤں میں شیطان کی دراندازی۔

۹.....مکھی کی مثال دے کر قدرتِ الٰہی کے سامنے انسان کی عاجزی کا ثبوت۔

۱۰.....دین میں عسر وحرج کی نفی۔

۱۱.....''مسلم'' نام کی ابتداء.....وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

---

[1] مکیۃ عن ابن عباس و عطا الّا ایات و قال الحسن ھی مدنیّۃ غیر ایات نزلت فی السّفر و قال بعضھم غیر ستّ ایات و قال بعضھم غیر اربع ایات (مجمع البیان)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ① يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ②

''اے انسانو! اپنے پروردگار کی ناراضی سے بچو۔ بلاشبہ قیامت کا زلزہ بہت بڑی چیز ہے جس دن تم اُسے دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی بھول جائے گی اُسے کہ جسے وہ دودھ پلاتی ہے اور ہر حاملہ کا حمل ساقط ہوجائے گا اور تم لوگوں کو دیکھو گے مدہوش نشہ ہیں، حالانکہ وہ نشہ میں نہیں ہیں مگر اللہ کا عذاب بہت سخت ہے''۔

قیامت کا زلزلہ

''قیامت کا زلزلہ'' اس کے معنی اُس تلاطم اور تہلکے کے بھی ہوسکتے ہیں، جو قیامت میں ہوگا اور اس صورت میں یہ چیزیں جو بعد میں ہے کہ ہر دودھ پلانے والی بھول جائے گی اُسے جسے وہ دودھ پلاتی ہے اور ہر حاملہ کا حمل ساقط ہوجائے گا اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ اس دن نفسا نفسی کا عالم ہوگا اور اُس کی شدّت ایسی ہوگی جس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ اگر کوئی دودھ پلانے والی ہو تو اُس بچّہ کو بھول جائے جیسے وہ دودھ پلاتی اور حاملہ کا حمل ساقط ہوجائے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اُس دن ایسی عورتیں ہوں گے جو دودھ پلاتی ہیں اور ایسی عورتیں جنہیں حمل ہے۔[1]

لیکن بہت سے مفسرین نے قیامت کا زلزلہ کا مطلب یہ لیا ہے کہ قیامت کے پہلے ایک زلزلہ ایسا آئے گا۔[2] اس صورت میں زلزلہ کے نتائج جو بیان ہوئے ہیں انہیں بطور واقعہ سمجھنا چاہیے کہ ''دودھ پلانے والی اپنے بچّہ کو بھول جائے گی اور حاملہ عورت کا حمل ساقط ہوجائے گا اور لوگ عذاب کی شدّت اور اس کے اثر سے مدہوش نظر آتے ہوں گے''۔ علامہ طبرسیؒ نے دونوں نقل کردیئے ہیں، کسی کو ترجیح نہیں دی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ③ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ④

''اور انسانوں میں وہ بھی ہے جو اللہ کے بارے میں بے جانے بوجھے بحث کرتا ہے اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتا ہے جس کے لئے یہ بات طے شدہ ہے کہ جو اُس کا ساتھ دے، وہ اُسے گمراہ کرکے چھوڑے گا اور اُسے آتش دوزخ کے عذاب کا راستہ دکھائے گا''۔

---

[1] هٰذا تهويل ليوم القيمة وتعظيم لما يكون فيه من الشدّة على وجه لو كان هناك مرضعة لشغلت عن الذى ترضعه ولو كان هناك حامل لاسقطت من هول ذٰلك اليوم وان لم يكن هناك حامل ولا مرضعة (تبيان)

[2] اى الحركة الشديدة للارض الّتى يكون بعدها طلوع الشمس من مغربها الّذى و هو من اشراط السّاعة (جلالين) زلزله كه نزديك قيامت باشد (شاه ولى الله)

ہم نے جو ترجمہ کیا ہے، وہ اس پر مبنی ہے کہ کتب علیہ والا جملہ شیطان مرید کی ہے جو ایک تفسیر ہے [1] دوسری تفسیر کے مطابق یہ اس شخص کو کہا گیا ہے جو بلا وجہ اللہ کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یوں کیا جائے گا کہ ''اُس کے لئے یہ بات طے شدہ ہے۔'' یہ دوسرا قول ہے [2] جو بعید نہیں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝

اے انسانوں! اگر تمہیں دوبارہ اٹھائے جانے میں شک ہو تو (اس پر غور کرو کہ) ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے پھر جمے ہوئے خون سے، پھر گوشت کے لوتھڑے سے جسے صورت دی گئی ہے اور ایسے سے بھی جسے صورت نہ دی گئی ہو تا کہ تمہارے لئے ظاہر کریں اور ماؤں کے پیٹ میں جو چاہتے ہیں ہم رکھتے ہیں، ایک مقررہ مدت تک۔ پھر تمہیں بچہ کی صورت میں باہر لاتے ہیں پھر نشوونما دیتے ہیں کہ تم اپنی پوری قوت کی منزل تک پہنچو اور کوئی تم میں سے وہ ہے جسے اٹھا لیا جاتا ہے اور کوئی تم میں سے پہنچ جاتا ہے انتہائی عمر کی منزلوں تک، یہاں تک کہ علم و دانش کے بعد پھر ایسا ہو جاتا ہے کہ کچھ جانتا بوجھتا نہیں اور تم دیکھو گے زمین کو خشک تو جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ لہلہا اٹھتی ہے اور نشوونما پیدا کرتی ہے اور ہر قسم کے خوشنما نباتات اگاتی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ بس اللہ ایک برقرار، نہ بدلنے والی ذات ہے اور وہ بلاشبہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور یقیناً اللہ انہیں جو قبروں میں ہیں زندہ کرے گا''۔

ادوارِ انسانی کی تبدیلیوں سے حیات بعد الموت کے امکان پر روشنی:

---

[1] قفلی علی الشیطان (جلالین)

[2] قیل معناہ کتب علی المجادل بالباطل (مجمع البیان)

پہلے جو کہا گیا ہے کہ ''مٹی سے پیدا کیا'' یہ پوری نوع کے آغاز کا ذکر ہے یعنی ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کے بعد والے ''پھر'' سے وہ نظام ہے جو ان کی اولاد کی خلقت میں جاری ہے۔

''لنبین لکم'' ''تاکہ تمہارے لئے ظاہر کریں''۔ یعنی مبداء خلقت میں مٹی سے پیدا کرنے کے بعد پھر یہ تدریجی نظام تخلیق جو اولاد آدم میں جاری ہے اور جو اب تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے اس نظام کے قرار دینے کا مقصد یہی تھا کہ تم پر اللہ کی قدرت نمایاں ہو [1] اور معلوم ہو کہ وہ جس طرح چاہے پیدا کر سکتا ہے لہٰذا قیادت میں دوبارہ پیدا کرنے کے امکان میں بھی تمہیں کوئی شک وشبہ پیدا نہ ہو۔ [2]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۙ﴿۸﴾ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۹﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۰﴾

''اور انسانوں میں وہ بھی ہے جو اللہ کے بارے میں بحث کرتا ہے بغیر کسی علم اور بغیر کسی رہنمائی اور بغیر کسی روشن کتاب کے موڑے ہوئے اپنے شانے کو تاکہ اللہ کی راہ سے بھٹکائے۔ اس کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور اسے قیامت کے دن ہم آگ کا مزہ چکھائیں گے۔ یہ اس وجہ سے ہے جو تیرے ہاتھ کر چکے ہیں اور یقیناً اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے''۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾

''اور انسانوں میں وہ بھی ہے جو اللہ کی عبادت کنارے پر کھڑا کرتا ہے۔ اگر اس کے لئے کوئی بھلائی ہوتی ہے تو وہ اس سے مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش سامنے آتی ہے تو اپنا منہ اٹھائے ہوئے پلٹ جاتا ہے۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں کے گھاٹے میں ہے۔ یہ کھلا ہوا خسارہ ہے''۔

''عبادت کنارے پر کھڑا کرتا ہے'' اس کی تشریح دوسرے جملہ میں موجود ہے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''یعنی دنیا کی نیکی پاوے تو بندگی پر قائم رہے اور تکلیف پاوے تو چھوڑ دے۔ ادھر دنیا گئی ادھر دین گیا۔ کنارے پر کھڑا ہے یعنی ابھی نہ اس طرف ہے نہ اس طرف ہے جیسا کہ کوئی مکان کے کنارے پر کھڑا ہو، جب چاہے نکل جاوے'' (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے:

---

[1] لندلکم علیٰ مقدورنا بتصریفه فی ضروب الخلق (تبیان)

[2] لنبین لکم کمال قدرتنا لتستدلوا بها فی ابتداء الخلق علیٰ اعادته (جلالین)

علیٰ حرف ای شك فی عبادته مشبه بالحال علیٰ حرف جبل فی عدم ثباته۔

علیٰ حرف کے معنی یہ ہیں کہ اپنی عبادت میں شک کی حالت پر ہے، اس شک کو تشبیہ دی گئی ہے پہاڑ کے کنارے سے ڈانوڈول اور بے ثبات ہونے ہیں۔

جناب شیخ الطائفہؒ نے اس طرح فرمایا کہ:

ای فی النّاس من یوجه عبادته الی الله علیٰ ضعف فی العبادة کضعف القیام علیٰ حرف وذلك من اضطرابه فی استیفآء النّظر المئودی الی المعرفة فادنیٰ شبهة تعرض له ینقادلها ولا یعمل فی حلّها۔

یعنی لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے جو اپنی عبادت کو اللہ سے متعلق کرتا ہے مگر اس عبادت میں کمزوری ہوتی ہے اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس غور فکر میں جو معرفت تک پہنچاتی ہے ڈانواڈول ہے تو ذرا بھی شک وشبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ شبہ کے سامنے جھک جاتا ہے اور اس کے حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

ہماری قدیم تفسیر کا اجمال اس پوری تفصیل پر حاوی ہے۔ علی بن ابراہیم قمیؒ نے لکھا ہے اور بظاہر معصوم کی طرف نسبت ہے:

علیٰ حرف قال علیٰ شكّ: علیٰ حرف فرمایا (یعنی) شک کی حالت میں۔

اس صورت میں قرآن مجید کی بعد کی تفصیل اس مفہوم کی تشریح تکمیل ہوگی مگر علامہ طبرسیؒ نے اسکے علاوہ حسن بصری کا یہ قول نقل کیا ہے:

الدّین حرفان احدهما اللّسان والثانی القلب فمن اعترف بلسانه ولم یساعده قلبه فهو علیٰ حرف.(مجمع البیان)

دین کے دو کنارے ہیں، ایک زبان اور دوسرے دل تو جو زبان سے اقرار کرے اور اُس کا دل اُس کا ساتھ نہ دے رہا ہو تو وہ ایک کنارہ پر ہے۔

اس صورت نے قرآن مجید کے بعد کے جملے اس حرف کے مفہوم کی تشریح قرار نہ پائیں گے بلکہ اس کے نتیجہ کو ظاہر کرنے کے والے ہوں گے کہ چونکہ اُس کا ایمان صرف زبانی ہے، دل اُس کا ہم آہنگ نہیں ہے، تو اس میں ثباتِ قدم بھی نہیں ہے۔ جب دنیا کے منافع نظر آتے ہیں، تو قدم جمائے رکھتا ہے۔ اور ذرا سختی پیش آئی تو بس دین سے منحرف ہونے کی سوچنے لگتا ہے یا منحرف ہو ہی جاتا ہے۔

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾

''پکارتا ہے اللہ کو چھوڑ کر اسے کہ جو اسے نہ نقصان پہنچاتا ہے اور نہ اسے کوئی نفع پہنچاتا ہے، یہی سخت گمراہی ہے، وہ پکارتا ہے ایسے کو جس سے نقصان کا امکان اس کے فائدے سے زیادہ ہے۔ ''کیا برا ہے آقا اور کتنا برا ساتھی''

مَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ جس سے نقصان کا امکان اس کے فائدہ سے زیادہ ہے، صاف ہے اور اس میں کوئی پیچیدگی نہیں مگر بعض مفسرین کو اقرب کے لفظ میں دشواری محسوس ہوئی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُن اصنام کی پرستش میں کوئی فائدہ ہے مگر

وہ دور ہے اور ضرر جو ہے، وہ ان کی بہ نسبت نزدیک ہے۔ اس تصور کے دفعیہ کے لئے انہوں نے کہا ہے کہ عرب میں یہ محاورہ ہے کہ جو چیز کوئی وجود نہ رکھتی ہو، اسے بعید کہتے ہیں تو اس بعید کے محاورہ کو سامنے رکھ کر قرآن مجید نے ضرر کے لئے قریب کی لفظ استعمال کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں نفع بالکل نہیں ہے۔ [1]

ہمیں نہ عرب کا یہ محاورہ معلوم ہے اور درصورتیکہ بعید میں اس قسم کا محاورہ ہو تو اس کے مقابلہ میں ضرر کو قریب کہنا پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا اور محاورات قیاسی چیز نہیں ہوتے کہ ان میں عقلی تقابل سے تصرف صحیح ہوا کرے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾

''بلاشبہ اللہ داخل کرتا ہے انہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، یقیناً اللہ کرتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے''۔

اور چاہتا اسی کو ہے جو حکمت کاملہ کا تقاضا ہوتا ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾

''جو سمجھتا ہو کہ اللہ ہرگز دنیا اور آخرت میں ان کی مدد نہیں کریگا تو وہ کوئی رسی بلندی تک کھینچ کر لے جائے، پھر اسے کاٹ ڈالے۔ اس کے بعد دیکھے کہ اس کی ترکیب اس کے غم وغصہ کو دور کرتی ہے؟''۔

میں نے جو ترجمہ کیا ہے کہ ''ان کی مدد نہیں کرے گا'' یہ اس بنیاد پر ہے کہ ضمیر لن ینصرہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف راجع ہے، جو ابن عباسؓ وغیرہ کا قول ہے۔ [2] اس صورت میں بعد کے جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کا گمان غلط ثابت ہوگا اللہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد ضرور کرے گا۔ اس سے اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو کوئی چارہ کار نہیں سوا اس کے کہ یہ اپنے گلے میں پھندا ڈال کر لٹک جائے اور پھر وہاں سے گر کر جان دے دے۔ آخری فقرہ کا مطلب تقریباً سب نے یہی لیا ہے مگر مجھے اس میں تامل ہے۔ اس لئے کہ الفاظ قرآنی میں رسی لٹکانے اور اس کے کاٹنے کا ذکر ہے۔ خود اس کے لٹکنے اور گر کر مرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے اور پھر بالکل آخری الفاظ کہ ''اس کے بعد دیکھے کہ یہ ترکیب اس کے غم وغصہ کے سبب کو دور کرتی ہے''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رسی کا لٹکانا اپنی جان دینے کے لئے نہیں تھا بلکہ اس اپنے غم وغصہ کے سبب کو دور کرنے کی کوئی ترکیب تھی۔ اس لئے میرے ذہن میں اسکا مطلب یہ آتا ہے جو ہمارے اس محاورہ میں ادا ہوتا ہے کہ زمین آسمان کے قلابے ملالے، اس کے بعد بھی وہ

---

[1] وان کان لا نفع عندہ ولکن العرب تقول لما لا یکون ھذا بعید ونفع الصنم بعید لانہ لا یکون فلما کان نفعہ بعیدا قیل لضرہ انہ اقرب من نفعہ علی معنی انہ کاین (مجمع البیان)

[2] ای محمد نبیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (جلالین) فالھاء فی قولہ ینصرہ اللہ عائد الی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (تبیان) عن ابن عباس وقتادۃ والمعنی من کان یظن ان اللہ لن ینصر نبیہ محمدا ولا یعینہ علی عدوہ (مجمع البیان)

اللہ کی اس مدد کو نہیں روک سکتا جو اس کے غم وغصہ کی باعث ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر خود اس شخص کی طرف راجع ہے یعنی ''جو یہ گمان کرتا ہے کہ خدا اس کی مدد نہیں کرے گا''۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''دنیا کی تکلیف میں جو کوئی خدا سے ناامید ہو کر اس کی بندگی چھوڑ دے اور جھوٹی چیزیں پوجے، جن کے ہاتھ نہیں برا بھلا وہ اپنے دل کے ٹھہرانے کو یہ صورت قیاس کر لے جیسے ایک شخص اونچی رسی سے لٹک رہا ہے۔ اگر چڑھ نہیں سکتا، تو قع تو ہے کہ رسی اوپر کھینچے تو چڑھ جاوے، جب رسی توڑے تو پھر کیا توقع۔ رسی کہا اللہ کی امید کو طرف آسمان کے یعنی اونچان کے''۔ (موضح القرآن)

میں پہلے قول کو زیادہ قرین قیاس سمجھتا ہوں، اس میں یہ الجھاؤ نہیں ہے جو آپ کو مذکورہ عبارت میں نظر آ رہا ہے، پھر دینی حقیقت یہ ہے کہ کافر کو تو رحمت خدا سے مایوس ہونا ہی چاہئے تو اس کی اس بات پر مذمت کیوں ہوگی کہ وہ گمان رکھتا ہے کہ اللہ اس کی دنیا و آخرت میں مدد نہیں کرے گا۔ اسے چونکہ وہ کافر ہے، گمان کیسا، یقین ہونا چاہئے کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا۔ یہ اس کا گمان یا یقین بالکل صحیح ہے تو اس پر مذمت کیوں ہو؟

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿١٦﴾

''اور اسی طرح ہم نے اسے اتارا ہے کھلی ہوئی نشانیوں کی صورت میں اور اس بنا پر کہ اللہ منزل مقصود تک پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے''۔

بے شک چونکہ وہ حکیم علی الاطلاق ہے، اس لئے بلا وجہ ترجیح سے کام نہیں لیتا کہ کسی کو مقصد تک بالخصوص پہنچا دے بلکہ یہ اس کا پہنچانا جو جبری طور پر نہیں ہے بلکہ توفیق خاص کی صورت سے ہوتا ہے، خود اس شخص کے حسن نیت، سچے ذوق وشوق اور راہ طلب میں امکان بھر قدم زنی سے ہوتا ہے (وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا) (عنکبوت ۶۹)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿١٧﴾

''بلاشبہ جو ایمان لائے ہیں اور جو یہودی ہیں اور صابی اور عیسائی اور مشرکین، یقیناً ان سب کے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا قیامت کے دن، بلاشبہ اللہ ہر چیز پر حاضر وناظر ہے''۔

اختلافِ عقائد کا اصل فیصلہ قیامت میں:

''فیصلہ کرے گا'' یعنی اپنا فیصلہ نمایاں کر دے گا ان کے آخری انجام کو سامنے لا کر۔[1] اب قابل توجہ ہے یہ پہلو کہ اگر نجات کا تعلق صرف اعمال سے ہوتا اور عقائد کا اس میں دخل نہ ہوتا تو ان عقائد کو جماعتی نشان بنا کر ان گروہوں میں فیصلہ کا اعلان کیوں ہوتا کہ دنیا دیکھے کہ ان

---

[1] بادخال المؤمنین الجنّة وغیرھم النّار (جلالین)

میں کس کا کیا انجام ہوتا ہے۔[1]

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ؕ ﴿۱۸﴾ السجدة

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کے لئے سجدہ میں ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی اور بہت سے وہ ہیں جن پر عذاب مقرر ہو گیا ہے اور جسے اللہ ذلیل کرے، اسے عزت دینے والا کوئی نہیں، بلاشبہ اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے''۔

کائنات کی ہر شے اللہ کے لئے سربسجود:

جہاں اختیار کا دخل نہیں بلکہ قوانین قدرت کی تکوینی وقہری اطاعت ہے، وہاں تفریق اور امتیاز کا گزر نہیں بلکہ وہاں سب ہی اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہیں، اگر انسان بھی دوسرے اشیائے کائنات کی طرح جو ہر اختیار سے عاری ہوتا تو یہاں بھی ''نافرمان'' کا وجود غیر ممکن ہوتا مگر وہ تو نظام حکمت الٰہی میں ''فاعل مختار'' بنایا گیا ہے، اس لئے اختیاری حدود میں یہاں یہ فرق ہو گیا کہ بہت سے تو سجدہ میں سرنگوں ہیں، اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو نافرمان ہیں اور چونکہ یہ نافرمانی ان کے ''سوء اختیار'' کا نتیجہ ہے، اسی لئے اس کا انجام یہ ہے کہ ان پر عذاب مقرر ہے۔

اب یہاں ایک بحث طلب بات یہ آ گئی ہے کہ پہلے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں اور پہاڑ کے ذکر کے قبل ذی شعور مخلوقات کا بھی ذکر تھا کہ من فی السموت ومن فی الارض جو لوگ آسمانوں میں ہیں اور جو لوگ زمین میں ہیں''۔ اب آسمان پر تو خیر، فرشتے ہیں، ان کے بلا استثناء سربسجود ہونے میں کوئی شک نہیں مگر زمین پر کے لوگ کون ہیں؟ وہ تو انسان ہی ہیں جن میں اس کے بعد صراحت ہے کہ کچھ سجدہ کرتے ہیں کچھ نہیں۔ اس مشکل کے ذہن میں آنے کی وجہ سے جناب شیخ الطائفہ کو کہنا پڑا کہ:

وان کان ظاھرہ العموم فالمراد بہ الخصوص لانّا علمنا انّ کثیرا من الناس کافرون باللہ تعالیٰ

بظاہر تو اس میں عموم ہے مگر مراد اس سے خاص گروہ ہے کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے انسان اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

مگر نظر غائر رہنمائی یہ کرتی ہے کہ من فی الارض میں انسان کا ذکر ہے، شمس و قمر و نجوم وغیرہ کے ساتھ جہاں سجدہ کی نوعیت فطری اطاعت کی ہے جو تکوینی طور سے انجام پاتی ہے، جس میں ارادہ و اختیار کو دخل نہیں ہے، یہ پیدائش کے وقت مثل تمام کائنات کے ہر انسان بھی کرتا ہے۔ اس میں مومن و کافر کی تفریق نہیں ہے۔ وہ انسان بھی جو اس کا شدید منکر ہے، عین انکار کی حالت میں اپنی تمام جسمانی و روحانی طاقتوں کے ساتھ خالق کے قانون مشیت کے مطابق چل رہا ہے جو اس طرح کا سربسجود ہونا ہے، جیسے کائنات کا ہر ذرہ سربسجود ہے اور بعد میں جو کثیر من الناس

---

[1] یضطرّ الی العلم بصحۃ الصحیح حیث یبیضّ وجہ المحق ویسودّ وجہ المبطل (تبیان)

کہا گیا، وہاں ارادی واختیاری اطاعت وعبادت مراد ہے۔ یہاں بہت سے وہ ہیں جو نافرمان ہیں اور عبادت کا فرض انجام نہیں دیتے۔[1] تو ان کے لئے کہا گیا ہے کہ ''ان پر عذاب مقرر ہو گیا ہے''۔

اگر فاعل خیر وشر اللہ ہوتا، اس انسان کے اختیار کو دخل نہ ہوتا تو بر بنائے عدالت عذاب کی کوئی وجہ نہ تھی، اس سے ظاہر ہے کہ وہ ذلت جسے بعد میں کہا گیا ہے کہ ''جسے اللہ ذلت دے، اس کا عزت دینے والا کوئی نہیں'' ان کے اس استحقاق کی بنا پر ہے جو ان کے اختیاری کردار سے متعلق ہے اور اس لئے وہ مشیت بھی جسے کہا گیا ہے کہ اللہ جو چاہتا کرتا ہے، بلا وجہ نہیں ہے بلکہ یہ مشیت بروجہ استحقاق بمقتضائے عدل ہے۔[2]

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۫ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۚ﴿۱۹﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ؕ﴿۲۰﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۫ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾

''یہ دو فریق ہیں جو اپنے پروردگار کے بارے میں باہم گر مقابل ہیں، تو جنہوں نے کفر اختیار کیا ان کے لئے آگ کے کپڑے قطع کئے جائیں گے، ان کے سروں پر گرم پانی انڈیلا جائے گا جس سے ان کے پیٹ کے اندر کی تمام چیزیں اور کھالیں گل جائیں گی اور ان کے لئے لوہے گرز ہوں گے۔ جب چاہیں گے اس سے نکل کر رنج وصدمہ سے چھٹکارا پائیں تو پھر اس میں پلٹا دیئے جائیں گے اور چکھو عذاب جلنے کا''۔

''یہ دو فریق ہیں''.....فریق کے لئے قرآن مجید میں خصم کی لفظ ہے، یہ واحد کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے اور جمع کے لئے بھی۔[3] چونکہ لفظ یہ واحد ہے اس لئے دو فریق کے لئے تثنیہ کی لفظ استعمال ہوئی ہے۔ خصمان مگر چونکہ درحقیقت وہ دو شخص نہیں ہیں بلکہ دو گروہ ہیں جن میں کثیر افراد ہیں، اس لئے بعد میں فعل جمع لایا گیا ہے: اختصموا جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ''باہم دگر مقابل ہیں'' اور ایک جگہ تو قرآن میں یہ لفظ بطور واحد لا کر فعل جمع لایا گیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ میں آیا ہے۔ هَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ. (یعنی) کیا ان فریقوں کی خبر آپ تک پہنچی ہے، جب وہ ان کے پاس عبادت گاہ میں داخل ہوئے۔ (سورۂ ص۔۲۱)

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ؕ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۲۳﴾ وَهُدُوْٓا

---

[1] ایک سجدہ ہے کہ سب اس میں شامل ہیں، آسمان وزمین جو کوئی ہے، وہ یہ کہ اللہ کی قدرت میں بے بس ہیں اور ایک سجدہ ہر ایک کا جدا۔ وہ یہ کہ اس کو جس کام کا بنایا اس کام میں لگے۔ یہ بہت آدمی کرتے ہیں، اور بہت نہیں کرتے، اور خلق سارے کرتے ہیں (موضح القرآن)

[2] یکرم من یشاء اذا استحق ذالك (تبیان)

[3] یستوی فیه الواحد والجمع والذّکر والانثی (مجمع البیان)

اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴿۲۴﴾

''بلاشبہ اللہ داخل کرے گا انہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں اُنہیں پہننے کو ملیں گے کنگن سونے کے اور موتی اور ان کے کپڑے وہاں ریشم کے ہوں گے اور ان کی ہدایت ہوئی پاک و پاکیزہ گفتگو کی طرف اور اُن کی ہدایت ہوئی اُس کے راستے کی طرف جو حمد وثناء کا حق دار ہے''۔

''ان کے کپڑے وہاں ریشم کے ہوں گے''۔ اس مقام پر شاہ ولی اللہ نے عجیب حاشیہ دیا ہے، ''یعنی در دنیا'' (فتح الرحمٰن) حالانکہ اس کے پہلے جو ذکر ہے وہ جنّت کے لباس کا ہے۔ دنیا کا نہیں اور پھر دنیا میں تو ریشم کا لباس مردوں کے لئے حرام ہی قرار دیا گیا ہے جیسا کہ جلالین نے بھی لباسهم فيها حرير کی تشریح میں لکھا ہے:

هو المحرم لبسه على الرجال فى الدّنيا: وہی جس کا پہننا مردوں پر دنیا میں حرام ہے۔

اور اس سے غالباً اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے جس پر صاف الفاظ میں جناب شیخ الطائفہؒ نے روشنی ڈالی ہے چونکہ دنیا میں وہ حکم الٰہی کے دباؤ سے ریشم پہننے سے محروم رہے تھے تو خالق نے جنت میں جہاں تکلیف کا کوئی تصور نہیں اور وہ دار الجزاء ہے، ریشمی لباس عطا فرمانے کا اعلان کیا اور قرآن کے وعدہ پر ایمان رکھنے والوں کے لئے اس اطمینان دہانی کے ذریعہ سے چند روزہ دنیا میں (اس لباس) سے پرہیز کو طبیعت پر آسان بنا دیا[1] پھر شاہ صاحب یہ کیا فرما رہے ہیں کہ اہلِ جنت کا لباس دنیا میں ریشم ہوگا، مجھے شبہ ہوتا ہے بلکہ گمان غالب ہے کہ یہ ''در دنیا'' کاتب کی غلطی ہے۔ شاہ صاحب نے لکھا ہوگا ''یعنی از دیبا'' اور اس طرح اُن کا مقصد اس آیت کے مضمون اور دوسری جگہ جو ارشاد ہوا ہے: من استبرق اس میں مطابقت ظاہر کرنا ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۭ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۵﴾

''بلاشبہ وہ جو کافر ہیں اور روکتے ہیں اللہ کے راستے اور اُس مسجد حرام سے جسے ہم نے تمام لوگوں کے لئے قرار دیا ہے، برابر ہیں اُس میں مجاور وہاں کے اور باہر سے آنے والے اور جو اُس میں ظلم و تعدّی کے ساتھ غلط روی کرنا چاہے ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے''۔

کعبہ پر سب کا برابر سے حق:

---

[1] حرّم الله على الرّجال لبس الحرير فى الدّنيا و شرّقهم اليه فى الأخرة (تبيان)

''برابر ہیں اس میں مجاور وہاں کے اور باہر سے آنے والے'' یعنی وہاں ملکی اور غیر ملکی کا سوال نہیں ہے [1] کعبہ پر سب کا حق ہے اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ حجاز کا جو بھی فرمان روا ہو، اُسے اپنے کو وہاں کی عبادت گاہوں کا تمام مسلمانان عالم کی طرف سے امین سمجھنا چاہیے لہٰذا وہاں کی عبادت گاہوں پر اُسے اپنے کسی خاص مسلک یا فقہ کے مسلّط کرنے کا بھی حق نہیں ہے، جب کہ وہاں تمام اسلامی دنیا کے افراد کا برابر حق ہے۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرٰهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَالْقَآئِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿٢٦﴾ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ﴿٢٧﴾ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۚ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيرَ ﴿٢٨﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٢٩﴾

''اور جب ہم نے معیّن کیا ابراہیم کے لئے خانہ کعبہ کی جگہ کو کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو پاک رکھنا طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو تو وہ آئیں گے تمہاری آواز پر پیادہ پا اور ہر لاغر سواری پر کہ آئیں گی (وہ سواریاں) ہر دور و دراز راستے سے تاکہ لوگ اپنے فائدوں کے لئے حاضر ہوں اور اللہ کے نام کا ورد کریں مقرّرہ دنوں میں، اس پر کہ اُس نے انہیں چوپایوں سے روزی عطا کی تو کھاؤ اُن سے اور محتاج، غریبوں کو بھی کھلاؤ، پھر وہ اپنے جسم کی کثافت دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اُس قدیم گھر کا طواف کریں''۔

سب سے پہلے ندائے حج اور اس کی تاثیر کے لئے اللہ کی ضمانت:

یہ ''ندائے حج'' گویا ''صدا بصحرا'' کے طور پر بلند کرائی گئی تھی جب کہ مکّہ کے گرد و پیش آبادی نہ تھی مگر خالق نے اُسی وقت اس کی اثر انگیزی کی ضمانت کر لی تھی کہ نتیجہ کے اعتبار سے یہ صدا بصحرا نہ ہوگی بلکہ دائمی اثر کی مالک ہوگی، اس آواز پر سعید روحیں لبیک کہیں گی، اُسی دور میں نہیں بلکہ قیامت تک اس آواز پر آنے والے آئیں گے۔

''لاغر سواریوں پر'' کیا مطلب؟ یعنی تیز رفتار سواریوں پر چونکہ اس زمانہ میں مرکب از قسم شتر وغیرہ ہوتے تھے اور وہ جتنے دبلے ہوتے تھے، اتنی رفتار ان کی تیز ہوتی تھی، اس لئے بطور کنایہ تیز رفتاری کے اظہار کے لئے ضامر یعنی لاغر کی لفظ لائی گئی ہے۔

اب دورِ زمانہ کے لحاظ سے جس طرح ''دور دراز'' کے مفہوم میں وسعت ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ موجودہ دور میں وہ کرہ کے

---

[1] العاکف المقیم فیہ والباد الّذی نیتا بہ من غیر اھلہ (مجمع البیان) سواء بینھم النزول والدخول الحرم (علی بن ابراھیم)

دوسرے رخ یعنی امریکہ کو اپنے دائرہ میں لیتا ہے اور کسی مستقبل کے وقت میں جب دوسرے سیّاروں پر قانون اسلام کے ماننے والے بسنے لگیں تو اس دور دراز والی پیشین گوئی کا دامن انہیں بھی اپنے اندر لے لے گا اور علی کل ضامر میں جو تیز رفتاری مضمر ہے، اس کے حدود بڑھتے ہوئے موٹروں تک آئے اور پھر ہوائی جہازوں تک پہنچے اور اس سے بھی تیز رفتار مثلاً راکٹ پر سفیر ہونے لگے تو وہ بھی اس لفظ کے حدود میں داخل ہوگا۔

''بیت عتیق'' کے ایک لغوی معنی تو یہی ہیں جیسے ہم نے ترجمہ کیا ہے ''قدیم گھر'' لیکن ایک روایت میں ہے کہ عتیق کی لفظ عتق سے ہے جس کے معنی آزاد کرنے کے ہیں، چونکہ طوفانِ نوح میں غرق ہونے سے یہ جگہ محفوظ اور عذاب الٰہی سے آزاد رہی، اس لئے اس کا نام ''البیت العتیق'' ہوا[1] اس کے علاوہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کافروں کے تسلّط سے آزاد رہا اور یہ بھی کہ اُسے تباہ کرنے کوششوں کو ناکام کر کے بچاتا رہا۔ ان اقوال کو علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں درج فرمایا ہے۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۙ﴿۳۰﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾

''یہ بات ہے، اور جو اللہ کی حرمتوں کی عزّت کرے تو اُس کے لئے اُس کے پروردگار کے نزدیک وہ بہتر ہے اور تمہارے لئے چوپائے حلال ہیں سوا اُس کے کہ جو تم سے بیان کیے جاتے رہتے ہیں تو بتوں کی ناپاکی سے پرہیز کرو اور جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو، اللہ کے دین حنیفی کو اختیار کرتے ہوئے، اُس کے ساتھ شرک نہ کرنے والے ہو کر اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرے وہ گویا آسمان سے گرا تو اُسے اچک لیں پرندے یا ہوائیں اُسے کسی دور دراز جگہ پر پھینک دیں''۔

اللہ کی حرمتوں کی عزت:

''اللہ کی حرمتوں کی عزت'' اس کے معنی عموماً یہ کہے گئے ہیں کہ جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے ان کے ترک کا پابند رہے[2] لیکن جب غور کیا جاتا ہے تو اس آیت میں جو حرفات کی لفظ ہے، وہ اس کے بعد والی آیت میں شعاء کی لفظ سے معنی میں متحد ہے چنانچہ بعض اکابر اہل سنّت نے حرمات اللہ کا ترجمہ ہی شعائر اللہ کے ساتھ کیا ہے[3] اور حقیقت میں لغت کے لحاظ سے بھی حرام اور محترم دونوں کا مادّہ ایک ہی ہے بلکہ جتنی الفاظ اس قسم کی ہیں، اُن کے ساتھ کوئی شرعی حکمِ حرمت وابستہ ہے جیسے بیت حرام اور مسجد حرا، اُس میں محترم ہونے کے لحاظ سے بھی حرمت ہے اور

---

[1] انما سمّی عتیقا لانّه اعتق من الغرق (علی بن ابراهیم)

[2] بان یترك ما حرّم الله (تبیان)

[3] هر که تعظیم کُند شعائر خدارا (شاه ولی الله)

پھر اُس میں شکار حلال ہے۔ اشھر حُرُم جس کے ذیل میں ہم کہتے ہیں ''محرم الحرام'' کیا معنی؟ کہ اُس میں جدال وقتال حرام ہے۔ عورتوں میں محرم اور نامحرم، محرم کون؟ جن سے نکاح حرام ہے، اس طرح حُرُمات اللہ میں قانون الٰہی کی حرمت بھی داخل ہے جس کے تحت میں محرّمات یعنی منہیّات سے بچنے کی پابندی ہے اور وہ محترم چیزیں جن کی اہانت حرام ہے، انہی کو بعد کی آیت میں ''شعائر اللہ'' کہا گیا ہے۔

قول الزّور کا ترجمہ ''جھوٹی بات'' لغت کے لحاظ سے ہے لیکن ہماری قدیم تفسیر میں یہ ہے کہ قول الزّور سے گانا مراد ہے [1] اور بتوں کی ناپاکی کے ساتھ اس کا جوڑ اس لحاظ سے ہوسکتا ہے کہ شاید وہ پوجا گانے بجانے کی صورت سے کرتے تھے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر قسم کی زبان و دہن کی بے راہ روی جو خالق کو ناپسند ہے، اس سے مراد وہ اس طرح اُس کا ایک عام مفہوم ہوجائے جس میں جھوٹ اور گانا دونوں داخل ہیں۔ [2]

پھر جھوٹ میں خاص اہمیت عدالت میں جھوٹی گواہی کی ہے اور اس کا بُت پرستی کے ساتھ جوڑ گناہ کی اہمیت دکھانے کے لئے ہے جیسے کہ ایک مقام پر والدین کے ساتھ حسن سلوک کو توحید الٰہی کے ساتھ مقرون کیا گیا ہے اور سورۂ نساء کی پہلی آیت میں رشتوں کے لحاظ کو تقوائے الٰہی کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے متعلق حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد وارد ہوا ہے۔ [3]

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾

''یہ ہے حقیقت حال اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم و تکریم کرے تو وہ عظمت الٰہی سے دلوں کے تاثر لازمی نتیجہ ہے''۔

شعائرِ الٰہیہ کی تعظیم کا حکم:

شعائر یعنی وہ علامتیں جن سے ذہن خدا کی طرف متوجہ ہو، جس طرح ''علامت'' کی لفظ علم سے ہے کہ وہ علم کا ذریعہ ہوتی ہے اسی طرح شعائر کی لفظ شعور سے ہے جو علم و ادراک ہی کے ہم معنی ہے۔

''دلوں کے تاثر کا لازمی نتیجہ ہے'' یا ''دلوں کے تاثر ایک جزء ہے''۔ یہ دونوں ہی مفہوم من سے پیدا ہوسکتے ہیں [4] اور اصل عملی پرہیز گاری کو اس وقت تک نہ اعتبار ہے، نہ اُس میں استحکام جب تک اس کے پس پشت دلوں کا احساس نہ ہو، اس لئے بھی تقویٰ کا بڑا تعلق دل ہی کے ساتھ ہے جو اصطلاح قرآنی میں مرکز شعور کا نام ہے، نہ کہ وہ دل جس کا ''ناگہانی موت'' میں انگریزی نام لے کر کہا جاتا ہے کہ فیل ہوگیا۔ شعائر اللہ کی تعظیم کا قرآنی حکم اُس تصور کی عمارت کا مسمار کرنے والا ہے جو دینی تقدّس کے مرکزوں کی تعظیم اور خصوصیت سے بوسہ لینے کے وقت ایک حلقہ سے ''شرک، شرک'' کی آوازیں بلند کراتا ہے۔

---

[1] قول الزّور الغناء (علی بن ابراھیم)

[2] روی اصحابنا انّہ یدخل فیہ الغناء وسائر الاقوال المنھیۃ بغیر حق (تبیان)

[3] روی ایمن بن حزیم عن رسول اللہ انّہ قام خطیبا فقال: ایھا الناس عدلت شھادۃ الزور بالشرک باللہ ثم قرأ۔ فاجتنبوا الرّجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور۔ یرید انّہ قد جمع فی الأیۃ بین عبادۃ الوثن و شھادۃ الزّور (مجمع البیان)

[4] اضافۃ التقویٰ الی القلوب لانّ خفیفۃ التقویٰ تقوی القلوب (مجمع البیان)

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾

''تمہارے لئے ان میں فائدے ہیں ایک مقرّر مدت تک، پھر ان کی جگہ اسی قدیم گھر کی طرف ہے''۔

حیواناتِ قربانی مجملہ شعائر اللہ:

چونکہ شعائر اللہ کے ایک فرد کی خصوصیت کے ساتھ اسی سورہ میں نام لیا گیا ہے اور وہ قربانی کے جانور ہیں تو بظاہر اس آیت کا مضمون اُنہی سے متعلق ہے یعنی قربانی کے جانوروں کے احترام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ذبح ہونے سے پہلے انہیں اچھوتا سمجھ لیا جائے کہ ان سے فائدہ اٹھانا بار برداری یا دودھ سے غذا وغیرہ کی شکل میں جائز نہ ہو بلکہ ذبح یا نحر ہونے کے وقت تک ان سے فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ [1]

البیت العتیق یعنی خانۂ کعبہ جس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے اور یہاں مقصود اُس سے خاص خانۂ کعبہ نہیں بلکہ اس کے حدود ہیں جسے بظاہر الی کی لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے جس سے ترجمہ ہوا ''قدیم گھر کی طرف'' کیوں کہ بعض صورتوں میں قربانی خاص کعبہ کے پاس یعنی مکّہ ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں منیٰ ہیں جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ہے۔ [2]

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ؕ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

''اور ہر قوم کے لئے ہم نے ایک عبادت کا طریقہ مقرّر کیا ہے تا کہ وہ اللہ کا نام لیں چوپایوں پر جو اللہ نے ان کی روزی کے لئے مقرّر کیے ہیں تو تمہارا خدا بس ایک خدا ہے لہٰذا اُسی کی بارگاہ میں سر جھکاؤ اور خوش خبری دو ان لوگانے والوں کو کہ جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو اُن کے دل دہل جاتے ہیں اور جو صبر کرنے والے ہیں اُن مصائب پر جو انہیں درپیش ہوں اور جو نماز ادا کرتے ہیں اور جو ہم نے انہیں عطا کیا ہے، اُس میں سے خیرات کرتے ہیں''۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾

---

[1] منافها کرکوب ظهرها وشرب البانها اذا احتاج الیها وهوا المودی عن ابی جعفر (تبیان) الیٰ اجل مسمیٰ وقت نحرها (جلالین)

[2] قال اصحابنا ان کان الهدی للحج فمحله منیٰ وان کان للعمرة المفردة فمحلّه مکّة قبالة اعکبة (مجمع البیان)

''اور قربانی کے اونٹ، اُنہیں ہم نے تمہارے لئے اللہ کے شعائر میں سے قرار دیا ہے، تمہارے لئے اُن میں بھلائی ہے تو اللہ کا نام لو اُن کو لائن لگا کر کھڑے کرنے کی حالت میں تو جب وہ کروٹ کے بھل زمین پر گر جائیں تو کھاؤ اُن میں سے اور ہر قسم کے محتاجوں کو، جو دستِ سوال دراز نہیں کرتے اور جو دست سوال دراز کرتے ہیں کھلاؤ، اسی طرح ہم نے انہیں تمہارے قبضہ میں دیا ہے، شاید کہ تم شکر گزار ثابت ہو''۔

''کھاؤ'' اور ''کھلاؤ'' یہ دونوں کوئی حاکمانہ فرمان نہیں ہیں کہ کھانا اور کھلانا بھی احکام حج میں سے ہوا۔ اصل واجب تو قربانی کا مصرف کیا ہو؟ اس کے لئے یہ بطور اجازت کہا گیا ہے یعنی تم خود بھی کھا سکتے ہو اور دوسروں کو کھلا بھی سکتے ہو اور اس اجازت کی صراحتہً ضرورت اس لئے ہوئی کہ زمانۂ جاہلیت میں قربانی کے کھانے کو حرام سمجھا جاتا تھا۔[1]

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

''ان کے گوشت اور خون ہرگز اللہ کو نہیں پائیں گے مگر تمہاری پرہیز گاری اسے پالے گی۔ اس طرح ہم نے تمہارے قبضہ میں انہیں دیا ہے تا کہ تم اللہ کی بڑائی کو محسوس کرو، اس بات پر کہ اُس نے تمہیں صحیح راستہ دکھایا اور خوش خبری دو نیک اعمال والوں کو''۔

اصل چیز قربانی کی ظاہری شکل نہیں بلکہ اصل خوشنودیِ خدا کی فکر:

''ان کے گوشت اور خون ہرگز اللہ کو نہیں پائیں گے، یعنی اسے رسم و عادت کے طور پر انجام دینے سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ حکم الٰہی کی تعمیل اور رضائے الٰہی کی تحصیل مقصود ہونا چاہیے۔

یہ حکم اس نذر و نیاز کے کھانے پر بھی حاوی ہے جو مقرّبین الٰہی کی طرف نسبت دے کر تیار کیا جاتا ہے اور دسترخوان پر چنا جاتا ہے، اس میں بھی ان ظاہری رسموں کو بنیادی حیثیت حاصل نہیں ہے، نہ کھانے کی نوعیت کو بلکہ اصل چیز خلوص اور اُن ہستیوں کے ساتھ قلبی لگاؤ ہے جس کا لازمی نتیجہ ان کی پیروی کا احساس ہونا چاہیے۔ وہاں بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کو تمہاری ان میٹھی پوریوں سے ذائقہ اندوز ہونا نہیں ہے اور سیّدہ سلام اللہ علیہا کو تمہاری اس صنحک کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت عباسؑ کو اس حاضری کی خواہش نہیں ہے بلکہ اصل چیز ان ہستیوں کے ساتھ دلی تعلّق کا احساس ہے جو انسان کی زندگی میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے مگر جس طرح اس قرآنی اعلان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ قربانیاں بے کار ہیں اور بند کر دینے کے قابل ہیں اسی طرح کسی مصلح کا اس کہنے سے کہ یہ نذر و نیاز کا کھانا معصومینؑ تک نہیں پہنچتا، یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس نذر و نیاز کا مخالف ہے اور اس سب کو بند کر دینے کا حامی ہے، بلکہ اُس قرآنی آواز کا مطلب ہوگا کہ ان قربانیوں کے ساتھ تقویٰ کا جو ہر ہونا چاہئے۔ اُسی طرح نذر و نیاز کے لئے یہ کہنے کا مطلب ہوگا کہ ان نذروں اور نیازوں کے ساتھ اُن ہستیوں کی عظمت کا احساس اور اُن کے

---

[1] ھٰذا اذن ولیس بامر لانّ اھل الجاھلیّۃ کانوا یحرّمونھا علیٰ نفوسھم (مجمع البیان)

حقوق کا تصور ہونا چاہیے جن کے نام پر یہ نذر کی جاتی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۚ﴿۳۸﴾

''بلاشبہ اللہ دفاع کرتا ہے اُن کی طرف سے جو ایمان لائیں، بلاشبہ اللہ کسی خیانت کرنے والے ناشکرے کو دوست نہیں رکھتا''۔

یادرکھنا چاہیے کہ خداوند کریم نے اپنی طرف کے حکم جہاد کو دفاع کی لفظ سے تعبیر کیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ جہاد کے معنی جارحانہ جنگ کے نہیں ہیں۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ﴿۳۹﴾ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾

''اجازت دی جاتی ہے اُنہیں جن سے جنگ کی جارہی ہے اس بنا پر کہ اُن پر ظلم ہوا ہے، اور بلاشبہ اللہ اُن کی مدد پر قادر ہے، وہ جو اپنے گھروں سے نکالے گئے بغیر کسی جرم وخطا کے سوا اس کے کہ اُن کا قول یہ تھا کہ ہمارا مالک اللہ ہے اور اگر نہ ہوتا اللہ کا دفع کرنا، بعض کو بعض کے ساتھ تو گرادیئے جاتے راہبوں کے ٹھکانے اور گرجے اور یہودیوں کے عبادت کدے اور مسجدیں جن میں اللہ کے نام کا بہت ورد ہوتا ہے اور یقیناً اللہ مدد کرے گا اُس کی جو اس کی مدد کرے، بلاشبہ اللہ طاقت والا ہے، غالب آنے والا، وہ جنہیں ہم اگر اقتدار عطا کریں زمین میں تو وہ نماز کی پابندی کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیک باتوں کی ہدایت کریں گے اور بُرے کاموں سے روکیں گے اللہ کے ہاتھو ں میں تمام باتوں کا انجام ہے''۔

دفاعی جنگ کی اجازت اور اس کی بین الاقوامی طور پر ضرورت:

یہ آیت اسلام کے قانون جہاد اور اس کے شرائط میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اس کے قبل کی آیت میں جہاد کو دفاع کے نام سے تعبیر کرکے جس طرف ضمنی اشارہ تھا کہ کہ ابتدائے جنگ دوسری طرف سے ہے، اُسے اس آیت میں صاف طریقہ پر ظاہر کیا گیا ہے ان لفظوں میں کہ اُذن للّذین یقاتلون یہاں یقاتلون مجہول کا صیغہ ہے، اگر یقاتلون ہوتا (''ت'' کے کسرہ کے ساتھ) تو وہ معرف کا صیغہ ہوتا، اُس صورت

میں یہ معنی ہوتے کہ اُنہیں اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ کی جارہی ہے اس سے ظاہر ہے کہ جنگ کی ابتداء کرنے والے دوسرے ہیں۔

پھر اگر یہ ہوتا کہ انہیں حکم دیا جاتا ہے تو یہ سمجھنے کی گنجائش تھی کہ ان شرائط کے نہ ہونے کی صورت میں بھی جنگ جائز ہے، ہاں واجب نہیں ہے، مگر اُذن کی لفظ جس سے یہ ارشاد شروع ہوتا ہے بتلاتی ہے کہ بغیر اس کے جنگ جائز ہی نہیں ہے کیوں کہ اذن کے مقابلہ میں ممانعت ہوتی ہے، صرف عدم حکم نہیں مطلب یہ ہے کہ اب تک جنگ ممنوع تھی۔ باوجودیکہ مظالم کا سلسلہ جاری تھا جو بانھم کی لفظ سے ظاہر ہے کہ پھر بھی ابتداء جنگ کی اُدھر سے نہ تھی لہٰذا جنگ کی اجازت نہ ملی تھی۔ اب چونکہ ابتداء جنگ کی اُدھر سے ہوگئی تو اب جنگ کی اجازت ہورہی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلسلۂ آیات جہاد کی سب سے پہلی آیت ہے۔ اب جتنی آیات قرآن میں قتال کے متعلق ہیں، وہ سب دورانِ سلسلۂ جنگ سے متعلق ہیں۔ آغاز جنگ سے اُن میں کوئی بھی آیت متعلق نہیں ہے۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ یہ آیت جہاد کے بارے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾

''اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو اُن کے پہلے جھٹلایا ہے نوح علیہ السلام کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیم علیہ السلام کی قوم اور لوط علیہ السلام کی قوم اور مدین کے باشندوں نے اور موسیٰ کو جھٹلا گیا تو میں نے کافروں کو مہلت دی اور پھر اُن کو گرفت میں لے لیا تو کیسی میری سزا تھی''۔

منجملہ اور طریقوں کے جو قرآن میں اپنے پیغمبر ﷺ کی تسلی کے لئے اختیار کیے گئے ہیں، ایک طریقہ یہ ہے کہ جو متعدد آیات قرآنی میں مختلف مقامات پر ہے، یعنی یہ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ اس کے پہلے برابر ہر پیغمبر کو جھٹلایا گیا تو جو ہمیشہ ہوتا رہا، وہی آپ کے ساتھ ہورہا ہے۔ [1]

ہر جگہ تہذیب کی نسبت اُس پیغمبر کی قوم کی طرف دی گئی ہے مگر موسیٰ کے یہاں تکذیب کی نسبت قوم کی طرف نہیں ہوئی بلکہ صیغۂ مجہول کے ساتھ تکذیب کے وقوع کا ذکر کیا، اس لئے کہ موسیٰ کی قوم والے تو بنی اسرائیل تھے، اُنہوں نے بعد میں پریشان بہت کیا جس کے تذکرے قرآن مجید میں جابجا ہیں مگر شروع میں جناب موسیٰ علیہ السلام پر ایمان انہوں نے ہی اختیار کیا، تکذیب کرنے والے فرعون اور اُس کی قوم والے تھے نہ کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوام والے۔ [2]

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾

---

[1] قال لنبيّه مسلّيا له تكذيب قومه له وقلّه قبولهم منه (تبيان)

[2] ثم قيل و قوم موسىٰ لانّ قومه بنى اسرائيل و كانوا منو به وانّما كذّب به قوم فرعون (تبيان)

''تو کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے نیست و نابود کر دیا اس عالم میں کہ وہ ظالم تھے، اب وہ گری ہوئی ہیں اپنی چھتوں پر اور کتنے کنویں ہیں جو بے کار پڑے ہیں اور مضبوط محلّات''۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۭ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾

''کیا وہ اطراف زمین میں چلے پھرے نہیں ہے کہ اُن کے لئے ایسے دل و دماغ ہوتے جن سے وہ سمجھتے یا کان جن سے وہ سنتے کیوں کہ اصل اندھاپن آنکھوں کا نہیں ہے مگر اندھاپن تو دلوں کا ہے جو سینوں کے اندر ہوتے ہیں اور وہ آپ سے عذاب کی جلدی کرتے ہیں اور اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا اور بلاشبہ ایک دن تو آپ کے پروردگار کے یہاں کا تم لوگوں کے شمار کیے ہوئے برسوں کے برابر ہے''۔

اللہ کے یہاں کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر:

جلدی اسے ہوتی ہے جسے وقت کے نکلنے کا اندیشہ ہو، خالق کو جلدی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُس کے تو سب کام حکمت کے مطابق ہوتے ہیں، لوگوں کی خواہشوں یا ان کے طعن و تشنیع سے متاثر ہو کر نہیں ہوتے، جو اُس کا وعدہ ہے، وہ پورا ہو کر رہے گا، چاہے کتنی ہی مدّت گزر جائے، بہرحال اُس کے پورے ہونے کا یقین رکھنا چاہیے۔

اگر اسے پیش نظر رکھا جائے تو ظہور مہدی آخر الزمان علیہ السلام کے طول مدّت پر کوئی وحشت و پریشانی پیدا ہو سکتی۔

تمہاری طویل سے طویل مدت اس کے حساب سے مختصر ہی ہے، اسے یوں کہا گیا ہے کہ ''ایک دن پروردگار'' کے یہاں کا اس کے شمار کئے ہوئے ہزار برس کے برابر ہے''۔

شاہ ولی اللہ نے اسے کچھ اور طرح سمجھا ہے، وہ کہتے ہیں:

''یعنی اگر خواہد کا ہزار سال دریک روز تمام کند، س امہال بسبب عجز نیست بلکہ بنا بر مصالحی کہ جزاو کسی نمی داند'' (فتح الرحمٰن)

یہاں ان کے فرزند شاہ عبدالقادر نے بھی ان کا تتبّع کیا ہے وہ لکھتے ہیں: ''یعنی ہزار برس کا کام ایک دن میں کر سکتا ہے'' (موضح القرآن)

اس کے برخلاف بعض مفسرین نے اُس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آخرت کا ایک دن عذاب کا دنیا کے ہزار برس کے برابر ہوتا ہے۔ [1]

---

[1] ان یوما عند ربّك من ایّام الآخرة من العذاب کالف سنة ممّا تعدّون فی الدنیا. (جلالین)

بہرصورت جہاں تک بیان قرآنی کے اندر سے ظاہر ہوتا ہے، یہ ایک دن اور ہزار سال صرف قلت وطول مدّت کی تعبیر ہیں۔ اس میں ایک اور ہزار یا دن اور سال کو بنیادی مقصدیت حاصل نہیں ہے، اس لئے بعض مذاہب باطلہ اور بالخصوص بہائی اور قادیانی جماعت نے ان اعداد و شمار پر جو عمارتیں کھڑی کی ہیں، وہ کسی مستحکم بنیاد پر مبنی نہیں ہیں۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾

''اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں میں نے مہلت دی اس عالم میں کہ وہ ظلم وستم کی مرتکب تھیں پھر میں نے ان کو گرفت میں لے لیا اور آخر میں رجوع تو میری ہی طرف ہوتا ہے''۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۵۱﴾

''کہیے کہ اے لوگو! میں تو بس تمہارے لئے کھلا ہوا تنبیہ کرنے والا ہوں تو جو ایمان لائیں اور نیک اعمال بجالائیں، اُن کے لئے بخشش ہے اور عزّت کے ساتھ روزی اور جو ہمارے آیات کے مقابلہ میں عاجز کرنے کی کوشش کریں تو یہ دوزخ والے لوگ ہیں''۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۗ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۗ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾

''اور انہیں بھیجا ہم نے آپ کے پہلے کوئی رسول اور نہ نبی مگر یہ کہ جب اس نے توقعات باندھے تو شیطان نے اس کی توقع (کے پورے ہونے) میں دراندازی کی تو اللہ ختم کر دیتا ہے اُسے کہ جو شیطان دراندازی کرتا ہے، پھر مضبوط کرتا ہے اپنی نشانیوں کو اور اللہ جاننے والا ہے، ہر کام ٹھیک ٹھیک انجام دینے والا تاکہ وہ اُسے کہ جو شیطان دراندازی کرتا ہے قرار دے آزمائش کا ذریعہ، اُن کے لئے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں

اور بلاشبہ ظالم لوگ بڑی سخت تفرقہ اندازی میں ہیں اور تاکہ وہ جنہیں علم عطا ہوا ہے جائیں کہ وہ آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے تو وہ اُس پر ایمان لائیں تو اس کے لئے ان کے دل کے خشوع وخضوع سے جھک جائیں اور بلاشبہ اللہ انہیں کہ جو ایمان لائیں سیدھے راستے تک پہنچانے والا ہے''۔

پیغمبروں کی تمناؤں میں شیطان کی دراندازی:

جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، اس میں نہ کوئی پیچیدگی ہے اور نہ کوئی پہلو ایسا ہے جو شانِ رسالت کے خلاف ہو مگر جمہور اہل سنّت نے اس کی شان نزول جو تحریر کی ہے، اس میں شان رسالت پر بڑا حرف آتا ہے اور اس کے لئے ترجموں میں بھی بڑا خلفشار نظر آتا ہے۔ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

چوں آرزوئی بخاطر..... افگند شیطان چیزی رادر آرزوی پس دور می کند خدا آنچہ شیطان انداختہ ست باز محکم می کند خدا آیات خودرا۔

جب کوئی آرزو دل میں کرتا ہے تو شیطان ڈال دیتا ہے کوئی چیز اُس کی آرزو میں تو دور کر دیتا ہے خدا اُسے جو شیطان نے ڈالا ہے پھر مضبوط کر دیتا ہے اپنی آیات کو۔

''جس وقت آرزو کرتا تھا، ڈال دیتا تھا شیطان بیچ آرزو اُن کی کہ پس موقوف کر دیتا ہے اللہ جو ڈالتا ہے شیطان''۔

شاہ ولی اللہ نے اس کی تشریح یوں فرمائی ہے:

مثلاً آں حضرت ﷺ بخواب دید نا کہ ہجرت کردہ اند بزمینی کہ نخل بسیار دارو پس وو ہم۔ بجانب یمامۂ در ہجرت رفت و در نفس الا مر مدینہ بود و مثلاً آں حضرت ﷺ بخواب دید نہ کہ بمکہ آمدہ اند و حلق و قصر می کنند پس وہم آمد کہ درہماں سال ایں معنی واقع شود و در نفس الا مر بعد از سالہای چند متحقق شد و در امثال ایں صورت امتحاں مخلصان دو منافقان درمیان می آید (فتح الرحمٰن)

مثلاً حضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ ایک ایسی زمین کی طرف ہجرت فرمائی ہے جہاں کھجور کے درخت بہت ہیں تو حضرت ﷺ کو یمامہ کی طرف ہجرت کا تصور ہوا اور واقع میں وہ زمین مدینہ تھی اور مثلاً حضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ مکہ میں آئے ہیں اور حلق و تقصیر فرما رہے ہیں تو خیال ہوا کہ یہ اسی سال ہوگا اور درحقیقت وہ چند سال کے بعد وقوع میں آیا اور ایسی صورت میں نرے کھرے مسلمانوں اور منافقوں کا امتحان ہو جاتا ہے۔

اس کا تتبع ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر نے کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''نبی ﷺ کو ایک حکم اللہ سے آتا ہے، اس میں ہرگز تفاوت نہیں ہے اور ایک اپنے دل کا خیال اس میں در آئے، کبھی خیال ٹھیک پڑا، کبھی نہ پڑا، جیسے حضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ مدینہ سے مکہ میں گئے، عمرہ کیا، خیال میں آیا کہ اب کی لڑائی میں۔ اُس میں نہ ہوا، پھر اللہ جتا دیتا ہے''۔ (موضح القرآن)

ان دونوں بزرگوں کے ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ جو خواب پیغمبر خدا ﷺ دیکھتے تھے، اس کے ساتھ جو خیال یا تصور آپ کو ہوتا تھا اسے قرآن میں تمنّیٰ کی لفظ سے ادا کیا ہے۔ اس صورت میں القی الشیطان فی امنیّتہ کا مطلب ہوگا کہ وہ خیال وتصوّر معاذ اللہ شیطان کا پیدا

کیا ہوا ہوتا تھا یا پھر یہ مطلب لیا جائے کہ اُس خواب ہی کو اللہ نے تمنّیٰ کی لفظ سے یاد کیا ہے تو یہ نتیجہ ہوگا کہ رسول ﷺ کے خواب ان کی آرزوؤں کی پیداوار ہوتے تھے اور پھر اُس خواب کی تعبیر جو آپ کے ذہن میں آتی تھی وہ نعوذ باللہ شیطان کی کارفرمائی سے ہوتی تھی مگر جو حقیقت ایمانی ہمارے ذہن میں ہے، وہ یہ ہے کہ رسول ﷺ کی سمجھ میں نہ آئے مگر شاہ صاحبان کا تصور یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ اس کا خواب کا مطلب سمجھنے میں غلطی کر جاتے تھے مثلاً ہجرت کے لئے آپ نے یہ خیال تھا کہ وہ یمامہ کی طرف ہوگی اور مکہ میں داخلہ کے لئے سمجھا تھا کہ اُسی سال ہوگا مگر اس صورت میں قرآن کے بعد والے ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ اللہ شیطان کی دراندازی کو ختم کر دیتا ہے اور پھر اپنی آیات کو مستحکم کر دیتا ہے اور جب کہ بخیال شاہ صاحب قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ وہ غلط تصور شیطان کی طرف سے تھا تو پھر خالق اسے کیوں کہہ رہا ہے کہ یہ اللہ کی طرف مومنوں کا امتحان تھا اور پھر یہ ارشاد کیوں کر درست ہے کہ انّه الحق من ربّك ''وہ آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک حق بات تھی'' جب کہ ان کے نزدیک وہ تصور اللہ کی طرف سے تھا ہی نہیں بلکہ وہ معاذ اللہ شیطان کی دسیسہ کاری کا نتیجہ تھا۔ غرض شاہ صاحبان باوجود یکہ اپنی تشریح میں اُس عام غلط روایت سے جو اس آیت کی تفسیر میں کہیں سے آ گئی ہے جس کا ذکر ابھی آئے گا، بچے ہیں، پھر بھی موصوفین کی تشریح حقیقت کے مطابق نہیں ہے اور شان رسول ﷺ کے موافق بھی نہیں ہے۔

لیجئے! اب جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو، حضرتین جلالین صاحبان کی زبان سے آیت کی تشریح اُس شانِ نزول کے ساتھ سن لیجئے، جس سے شاہ صاحبان نے اپنی گزشتہ تشریح میں بچنے کی کوشش کی تھی وہ لکھتے ہیں:

اذا تمنّیٰ قرأ القی الشیطان فی امنیّه قرء ته مالیس من القراٰن ممّا یرضاہ المرسل الیهم (نعوذ باللہ من ذٰلك)

''جب وہ (نبی اور رسول) تمنا کرتا ہے کتاب الٰہی پڑھتا ہے''

شیطان اُس کی تمنا میں یعنی پڑھنے میں ڈال دیتا ہے ایسی چیز جو اس کتاب کا جزء نہیں ہے جس سے وہ لوگ جن کی طرف وہ رسول بھیجا گیا ہے خوش ہو جائیں۔

اب سنئے بطور واقعہ اس کی نظیر ان علمائے اہل سنّت کی زبان سے:

وقد قرأ النبیّ ﷺ فی سورة النجم بمجلس من قریش بعد ''افریتم اللّات و العزّیٰ و منوة الثّالثة الاخریٰ بالقاء الشیطان علیٰ لسانه ﷺ من غیر علمه ﷺ تلك الفرانیق العلیٰ وانّ شفاعتن لترتجیٰ ففرحوا بذٰلك ثمّ اخبرہ جبریل بما القاہ الشیطان علیٰ لسانه من ذٰلك فحزن فسلّی بهٰذہ الأیة لیطمئنّ۔

رسول خدا ﷺ نے سورہ نجم میں قریش کے ایک مجمع کے اندر اس آیت کے بعد کہ کیا تم نے دیکھا ہے لات اور عزّیٰ اور ان کے علاوہ تیسرے منات کو شیطان کے آنحضرت ﷺ کی زبان پر جاری کر دینے سے بغیر آنحضرت ﷺ کے علم میں یہ الفاظ پڑھ دے کر بڑے خوبصورت بلند مرتبہ مجسمے ہیں اور یقیناً ان کی شفاعت کی اُمید ہے تو اس سے وہ پورا مجمع مشرکین کا بڑا خوش ہوا پھر جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو بتایا کہ شیطان نے آپ کی زبان پر کیا الفاظ جاری کر دیئے تو آپ کو بہت رنج ہوا، اس پر آپ کو تسلّی دینے کے لئے یہ آیت اتری کہ آپ کو اطمینان ہو۔

ہمارے مفسرین اسے قطعاً باطل سمجھتے ہیں، قدیم ترین تفسیر میں جو زیادہ تر معصومین علیہم السلام کے احادیث پر مبنی ہے، اسے اہل سنّت کی

روایت قرار دیا ہے۔[1]

امّا الاحادیث المرویة فی هٰذا الباب فهی مطعونة و مضعفة عند اصحاب الحدیث وقد تضمّنت ما ینزّه الرّسل منه (مجمع البیان)

اس سلسلہ میں جن حدیثوں کی روایت ہوئی ہے وہ سب علمائے حدیث کے نزدیک مجروح ہیں اور اُنہیں ضعیف قرار دیا گیا ہے اور اُن کا مضمون ایسا ہے جس سے اللہ کے پیغمبر بری ہوتے ہیں۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾

''اور ہمیشہ رہیں گے وہ جو کافر ہیں شک وشبہ میں اُس سے یہاں تک کہ آئے ان پر قیامت اچانک یا آئے ان پر عذاب اُس دن کا جو بڑا سخت ہوگا''۔

''اس دن'' سے مراد بعض مفسرین کے خیال ہیں جنگ بدر والا دن ہے اور بعض نے اُسے قیامت سے متعلق قرار دیا ہے۔[2]

بعد والی آیت اگر مقام تنزیل میں اسی سے متّصل ہے تو وہ دوسرے خیال کو تقویت پہنچاتی ہے بہرحال اس طرح کی جتنی آیات ہیں، وہ سب عمومیت کے ساتھ تمام کافروں سے متعلق نہیں ہیں، یا وہ کچھ خاص افراد تھے یا اس قسم کے کفّار جن کا کفر ارادی اور عنادی تھا جس کی تشریح بعض دوسرے مقامات پر اس تفسیر میں ہو چکی ہے۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۵۷﴾

''سلطنت اُس صرف اللہ کی ہوگی، وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے گا تو جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے وہ آرام والے بہشتوں میں ہوں گے اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا تو اُن کے لئے ایک بڑا عذاب ہے، ذلیل کرنے والا''۔

پہلی آیت میں ''وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے گا'' اب وہ فیصلہ کیا ہوگا؟ وہ یہ جو اس آیت کے ذیل میں اور پھر دوسری آیت میں ہے[3] اس فیصلہ میں بھی دیکھ لیجئے کہ بہشت کو تنہا ایمان سے نہیں بلکہ اس کے ساتھ نیک اعمال سے وابستہ کیا ہے اور عذاب کو بس کفر اور تکذیب آیات سے وابستہ کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس صورت میں اعمال زیر بحث ہی نہیں ہیں یعنی چاہے بظاہر نیک اعمال کتنے ہی ہوں لیکن کفر کی

---

[1] انّ العامة رودانّ رسول الله صلی الله علیه وآله کان فی الصّلوٰة فقرا سورة النّجم (علی بن ابراهیم)

[2] هو یوم بدر الاخیر فیه للکفّار کالریح العقیم الّتی لا تاتی بخیر او هو یوم القیٰمة لا لیل له (جلالین)

[3] یفصل بین المومنین و الکافرین ثم بین حکمه (مجمع البیان)

صورت میں فیصلہ وہی ہے جو بیان ہوا ہے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝۵۸ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝۵۹

''اور جنہوں نے ہجرت کی اللہ کی راہ میں، پھر قتل ہو گئے یا مر گئے تو ضرور اللہ انہیں عطا کرے گا اچھی روزی اور یقیناً اللہ بہترین روزی عطا کرنے والا ہے۔ وہ ضرور اُنہیں داخل کرے گا ایسی جگہ جسے وہ پسند کریں گے اور بلاشبہ اللہ جاننے والا ہے، بڑا برداشت کرنے والا''

ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۶۰

''یہ بات ہے [1] اور جو سزا دے ویسی ہی جیسی اُسے سزا ملی ہے، پھر اُس کے خلاف زیادتی سے کام لیا جائے تو بلاشبہ اللہ اس کی مدد کرے گا، یقیناً اللہ معاف کرنے والا ہے، بڑا بخشنے والا''۔

پہلے جو ہوا تھا، وہ حقیقتاً سزا نہیں تھا بلکہ ابتدائی ظلم تھا لیکن عرب کا محاورہ اس طرح ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر ''مشاکلۃ'' سے کام لیتے ہیں یعنی جس لفظ سے ایک طرف کے عمل کا ذکر کرتے ہیں، اُسی لفظ سے اس کے مقابل والے ردّعمل کا ذکر کر دیتے ہیں جیسے: کما تدین تدان جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''جیسا کرنا ویسا بھرنا'' [2]

اس کی نظیریں قرآن مجید میں بھی بکثرت ہیں اُسی طریقہ پر یہاں بھی ادھر کا عمل چونکہ بطور عقاب یعنی سزا ہے تو اُدھر کے کام کا ذکر بلفظ ''عقاب'' کیا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ اُدھر سے جو تشدّد بطور ظلم ہوا ہے، اُس کے عوض میں ادھر سے جو تشدّد بطور سزا ہو، اور جو حق ہے، اب اس کے مقابل میں اگر پھر اُدھر سے ظلم و زیادتی ہوگی تو خدا اُسی اسلامی جماعت کا ساتھ دے گا جس پر ابتداءً ظلم ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ آخری جملہ کہ ''اللہ معاف کرنے والا ہے'' کہ وہ ''بدلہ لینا'' بھی ایک ''ترک اولیٰ'' کی حیثیت ضرور رکھتا ہے یعنی بہتر یہی تھا کہ بدلہ نہ لیا جائے مگر چونکہ یہ بدلا انسانی فطرت کا ایک عام تقاضا اور اپنے حق کا مطالبہ ہے، جسے بطور قانون روکنا بھی عدل کے خلاف ہے، اس لئے خالق اُسے جائز قرار دیتا ہے اور بلندی نفس کے خلاف پہلو کو اُس کے نظر انداز کرتا ہے۔ اس محل پر عفو و مغفرت کے معنی یہی ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ

---

[1] الامر ذٰلك الّذی قصصنا علیك (جلالین)

[2] کفو الهم، الجزاء بالجزاء والاوّل لیس بجزآء وانّما هو لازدواج الکلام (تبیان)

بَصِيْرٌ ﴿٦١﴾

''یہ اس بنا پر ہے کہ اللہ رات کو دن کے اندر لے جاتا ہے اور دن کو رات کے اندر لے جاتا ہے اور بلاشبہ اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا''۔

سابق آیت کے تعلق سے کہ ایک وقت اُس فریق نے اسے تکلیفیں پہنچائی تھیں، اب یہ فریق اس کا بدلہ لے رہا ہے اور اب اس کے خلاف وہ تشدد سے کام لیں تو اللہ اس فریق کی مدد کرے گا جو پہلے مظلوم تھا۔ اس کے بعد یہ الفاظ کہ ''یہ اس بنا پر ہے کہ اللہ رات کو دن کے اندر لے جاتا ہے اور دن کو رات کے اندر لے جاتا ہے'' بالکل اسی محاورہ کے مطابق ہیں کہ ''دنیا میں ہوتا یہی ہے کبھی کے دن بڑا اور کبھی کی راتیں''..... اگر وہ پہلے طاقتور تھے اور یہ بے بس''، اسی لئے انہوں نے ان کو ستایا تو یہ صورت حال نالۂ وفریاد کا سننے والا ہے اور اُن کی حالت کو دیکھنے والا۔ [1]

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٦٢﴾

''یہ اس بنا پر ہے کہ اللہ بس قرار حقیقت ہے اور جس کی وہ اُس کے سوا دُہائی دیتے ہیں، وہ سب حقیقت ہے اور بلاشبہ اللہ ہی ہے جو بلند و بزرگ ہے''۔

گزشتہ سلسلہ ہی کی اس آیت کو بھی ایک کڑی سمجھا جائے تو مطلب یہ ہے کہ اللہ جب ان کا مددگار ہے تو آخر میں اُن کی فتح ہونا لازمی ہی ہے اس لئے کہ اللہ ایک لازوال حقیقت ہے اور دوسرے فریق کی پشت پر جو معبودانِ باطل ہیں، وہ خود ہی مٹنے والے ہیں اور اللہ ہے جو بلند و بزرگ ہے۔ اس لئے آخر میں کامیابی بہرحال اہل حق کی ہے اور گردشِ لیل ونہار سے نظام دنیا کے عبوری مراحل میں وقتاً فوقتاً اہل حق کو اگر شکستیں ہوتی بھی ہیں تو آخر میں از روئے قرآن یہی ماننا پڑے گا کہ اہل حق کی مکمل فتح ہوگی اور وہی روزِ منتظر ہے جس کے لئے امامِ منتظر کا تصور اسلامی مسلّمات کا لازمی نتیجہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿٦٣﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٦٤﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اتارا آسمان سے پانی تو زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ اللہ لطف و کرم والا ہے، خبر رکھنے والا، اُس کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اور بلاشبہ اللہ ہی وہ بے نیاز ہے جو تعریف کا حق دار ہے''۔

---

[1] سمیع لدعآء المؤمنین بصیر بہم (مجمع البیان)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٥﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے قابو میں دیا ہے جو کچھ زمین میں ہے اور کشتیوں کو جو سمند میں چلتی ہیں اُس کے حکم سے اور وہ روکے ہوئے ہے آسمان کو اس سے کہ وہ گرے زمین پر مگر اُس کے حکم سے، بلاشبہ اللہ لوگوں کے ساتھ شفیق ہے، بڑا مہربان''۔

اب چاہے اس وقت کے سائنسی مسلّمات کے ماتحت کوئی اسی بات کی کہ ''وہ روکے ہوئے ہے آسمان کو اس سے کہ وہ گرے زمین پر'' ان الفاظ سے تعبیر کرے کہ وہ اس کشش کے نظام کو قائم رکھے ہوئے ہیں جس سے اجرام سماویہ اور زمین کے درمیان فاصلہ ہے۔ وہ چاہے تو اس کشش کے توازن کو ختم کر دے اور اجرام سماویہ اس زمین سے ٹکرا جائیں۔ اسی طرح کی تعبیر یا تشریح مفاد قرآنی کے خلاف نہ ہوگی، جب تک کہ اصل مقصد قائم رہے کہ پورا نظام اللہ کے ارادہ سے قائم ہے، جب وہ چاہے اس پورے نظام کو باطل کر دے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۫ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿٦٦﴾

''اور وہ ہے جس نے تمہیں زندگی عطا کی، پھر تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں زندگی دے گا، یقیناً آدمی بڑا ناشکرا ہے''۔

اس زندگی و موت کی ادل بدل کے بعد آدمی کو ''ناشکرا'' کہنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ پورا نظام اللہ کی طرف نعمت اور رحمت ہے اور یہ بھی اس کا ثبوت ہے کہ موت انسان کے لئے کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ وہ ایک نعمتِ خداوندی ہے، اُس طرح جیسے اس کے پہلے اور بعد کی زندگی اُس کی نعمت ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ درمیان میں پہلی زندگی کے بعد ایک وقفۂ سکون ہے منزل حیاتِ ابد تک بڑھنے کے لیے۔

ہمارا ترجمہ ''بڑا ناشکرا'' اس پر مبنی ہے کہ کفور کی لفظ کفرانِ نعمت سے ہے مگر ہوسکتا ہے یہ کفر سے ہو، تب ترجمہ اور مطلب یہ ہوگا کہ بڑا کافر ہے کہ اللہ کی قدرت کاملہ کا مشاہدہ کرتے ہوئے بھی موت کے بعد زندگی کو غیر ممکن سمجھتا ہے یا سرے ہی سے خدا کا منکر ہے۔ [1]

مگر ہماری نظر میں پہلے ہی پہلو کو ترجیح ہے کیوں کہ گزشتہ منزلوں میں سے حیات اوّل اور پھر موت، یہ تو خیر مشاہدہ میں ہے لیکن دوسری حیات مشاہدہ میں کب ہے اور اُسے کافر کب مانتا ہے جو یہ کہا جائے کہ اس سب کا مشاہدہ کرتے ہوئے کیوں انکار کرتا ہے؟ اسے تو وہی مانے گا جو اصطلاحی حیثیت سے مومن ہو، وہ پھر کفران نعمت والے ہی معنی سے کفور ہوگا جس کے معنی وہی ''بڑے ناشکرے'' کے ہیں۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى

---

[1] لکفور ای جحود فانّه مع هٰذه الادلّة الدّالة علی الخلق یجحد الخالق (مجمع البیان)

رَبِّكَ ؕ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۶۷﴾ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾

''ہر قوم کے لئے ہم نے ایک طریقہ عبادت قرار دیا جسے وہ اختیار کیے ہوئے ہیں، اس لئے اُنہیں آپ سے جھگڑا نہ کرنا چاہیے اور آپ اپنے پروردگار کے راستے کی طرف بلاتے رہے بلاشبہ آپ صحیح رہنمائی کے جادہ پر وہ ہیں اور اگر وہ آپ سے خواہ مخواہ بحث کریں تو کہیے کہ اللہ تمہارے کرتوت سے خوب واقف ہے۔ اللہ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اُس میں کہ جس میں تم باہم اختلاف کرتے رہتے تھے''۔

مختلف طریقے عبادت کے اللہ کی طرف سے آتے رہے نہ کہ مختلف معبود:

اس آیت کے ذیل میں سب سے پہلی بات تو یہ سمجھا چاہیے کہ اس میں طریقۂ عبادت کا ذکر ہے، معبود باطل کا نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اس کا تعلق اُن جماعتوں سے نہیں ہے جو اجرام پرستی، اصنام پرستی، آتش پرستی وغیرہ کسی بھی قسم کی غیر اللہ پرستی میں مصروف ہیں، اُن کے لئے قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ ان کی یہ عبادتیں ہماری طرف کی قرار دی ہوئی ہیں بلکہ یہ اُنہی مذہبی جماعتوں کا تذکرہ ہوسکتا ہے جو اپنا معبود اللہ ہی کو قرار دیتی ہیں مگر طریق عبادت میں مسلمانوں سے اختلاف رکھتی ہیں۔

قطع نظر عقیدۂ تثلیث وغیرہ کے جو توحید کے منافی ہے مگر وہ اُسے کھینچ تان کر توحید کے تحت میں لاتے ہیں، تعیّن معبود میں اُن کو مسلمانوں سے اختلاف نہیں ہے مگر طریقۂ عبادت ان کا مسلمانوں سے مختلف ہے۔ آیت کا تعلق انہی جماعتوں کے ساتھ ہے۔ وہ مسلمانوں سے اختلاف نہیں ہے مگر طریقۂ عبادت اختیار کیا ہے اور اس پر وہ مسلمانوں سے بحث وجدال کرتے تھے۔ ان سے کہا جارہا ہے کہ آخر اس بات پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جھگڑا کرنے کیا معقولیت ہے؟ تم نے جو طریقہ اختیار کیا تھا، وہ دل بخواہ تو نہ تھا خالق ہی نے مقرر کیا تھا۔ اب اگر اُسی خالق نے اپنی طرف سے ایک پیغمبر بھیج کر طریقۂ عبادت کو بدل دیا ہے تو اس کے تسلیم کرنے میں تمہیں کیا عذر ہے اور کس بنا پر تم ان سے برسر پیکار ہوتے ہو۔ [1]

اس سے وہ افراد کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے جو یہ تبلیغ کرنے لگے ہیں کہ نجات کسی ایک فرقہ سے مخصوص نہیں بلکہ ہر فرقہ کے صاحب کردار لوگ نجات کے مستحق ہیں یا یہ کہ مذاہب کا اختلاف صرف راستوں کا ہے۔ منزل سب کی ایک ہے جو سیاست کے تقاضوں سے آج کل کا ایک بڑا چلتا ہوا نعرہ بن گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذاہب سب حق ہیں، اس لئے کہ اگر قرآن کو یہ کہنا ہوتا تو وہ اس اعلان کے بعد کہ سب طریقے ہمارے ہی مقرر کردہ ہیں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہتا کہ آپ دوسروں سے نہ الجھئے اور ان سے منازعات نہ کیجئے۔

مگر وہ ایسا نہیں کہتا بلکہ ان جماعتوں کو کہتا ہے کہ وہ آپ سے ظاہر ہے کہ اُسے اُن مذاہب کو حق ثابت کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ وہ اہل مذاہب جو ایک ''نئی بات سمجھ کر اسلام کے پیش کردہ طریقۂ عبادت کی مخالفت کررہے ہیں، اُن کی تنبیہ مقصود ہے کہ جیسے وہ طریقہ عبادت تھیں اس

---

[1] دراین آیہ اشارہ است کہ اختلاف شرائع بسبب اختلاف عصوراست و ہمہ شرائع حقند ودرزمان خود معمول بہ است پس نزاع درحقیقت آں نبایدکرد۔ (فتح الرحمن)

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے اللہ نے بتایا تھا، اسی طرح اب اُس نے اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی اس طریقہ کی تعلیم دی ہے تو اب یہی طریقہ واجب العمل ہوگا جو بعد میں بتایا گیا ہے، نہ کہ وہ پہلا طریقہ جو کہ منسوخ ہو گیا اور اسی لئے اس کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرمایا ہے کہ آپ اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیتے رہے اگر وہ باہر ہوتی کہ ہر مذہب والوں کے لئے ان کا طریقہ حق ہے تو پھر اُن کو دوسرے طریقہ کی طرف دعوت دینے کی ضرورت ہی کیا رہتی ہے اور پھر اس کے بعد یہ کہ ''یقیناً آپ سیدھے ہدایت کے جادہ پر ہیں''۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس راستے کو اختیار نہ کرنے والے گمراہ ہیں اور گمراہوں کا منزل تک نہ پہنچنا ظاہر ہے۔

اس کے بعد پھر آخری فقرہ ملاحظہ ہو۔ اگر سب حق پر ہوتے تو روز قیامت فیصلہ کا سوال ہی کیا تھا،، سب کو سیدھے جنّت میں پہنچ جانا چاہیے۔ یہ ارشاد کہ روز قیامت تمہارے درمیان فیصلہ ہوگا، اس کی دلیل کافی ہے کہ اس اختلاف میں کوئی نجات پانے ولا ہے اور باقی نجات سے محروم رہنے والے ہیں یہی وہ فیصلۂ عدل الٰہی ہے جس کے لئے قیامت کا حوالہ دیا جا رہا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۷۰

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ جانتا ہے اُسے کہ جو آسمان اور زمین میں ہے یقیناً یہ سب ایک نوشتہ میں محفوظ ہے، بلاشبہ یہ اللہ پر آسان بات ہے''۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝۷۱

''اور وہ عبادت کرتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر اُس کی جس کے لئے اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور نہ اُس کے متعلق انہیں کوئی علم ہے اور ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے''۔

اس کے قبل اُن جماعتوں کا ذکر تھا جن کا معبود اللہ ہے مگر طریقۂ عبادت دوسرا ہے اور اب یہ وہ ہیں جنہوں نے معبود ہی غلط تراش لیا ہے جس کی کوئی بنیاد ہی نہیں، من جانب اللہ نہیں ہے اور اسی کو یوں کہا گیا ہے کہ اللہ نے اس کے لئے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ پھر ان کے لئے سندِ حقانیّت بھلا کیا ہو سکتی ہے؟

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۷۲

''اور جب اُن کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں، درآنحالیکہ وہ بالکل صاف ہیں تو تم اُن لوگوں کے چہروں

میں جو کافر ہیں ناگواری محسوس کرو گے، قریب ہوگا کہ وہ حملہ کر بیٹھیں۔ اُن پر جو ہماری آیات کو پڑھ کر سناتے ہیں کہیے کہ کیا میں اس سے زیادہ بری خبر تمہیں سناؤں! وہ آتشِ دوزخ ہے جس کا اعلان کیا ہے اللہ نے اُن کے لئے جو کافر ہیں اور کیا بری ہے وہ منزل''۔

یہ تبلیغ جو رسول کرتے ہیں، حقیقت میں تو کوئی بری بات ہے ہی نہیں مگر کافر اسے برا سمجھتے اور ناگوار محسوس کرتے ہیں تو اُن کے مزعومہ کی بنا پر کہا جارہا ہے کہ اس سے زیادہ بری خبر میں تمہیں سناتا ہوں، اور وہ ابدی آگ ہے جو تمہارے اس انکار کا نتیجہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾

''اے انسانو! سمجھانے کو بطور مثال ایک بات کہی جاتی ہے، اسے دھیان سے سنو، یہ جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر دہائی دیتے ہو، ہرگز ایک مکھی کو پیدا نہیں کر سکتے چاہے وہ سب اس کے لئے اکٹھا ہو جائیں اور اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس سے چھڑا نہیں سکتے، طالب و مطلوب دونوں ہی کمزور''۔

مکھی کی مثال سے انسان کی عاجزی کا ثبوت:

ان آیات میں خداوند قدوس نے معبودان باطل کی کمزوریوں کا ایک مثال کے ذریعہ اظہار کیا کہ تو ایسے ہیں کہ جو ایک مکھی کے پیدا کرنے پر بھی قدرت نہیں رکھتے۔

''طالب و مطلوب'' سے مراد وہ مکھی اور یہ معبودان باطل بھی ہو سکتے ہیں [1] اور وہ معبودان باطل اور یہ ان کے پجاری بھی۔ [2]

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۷۴﴾

''اُنہوں نے نہیں سمجھا اللہ کی اُس شان کو جو اُس کے شایان ہے، بلاشبہ اللہ طاقت ور ہے، غالب آنے والا''۔

یہ اللہ کی شان سے تغافل ہی تو ہے کہ اُس طاقتور، غالب ذات کو چھوڑ کر اُن کی دہائی دیتے ہیں جو ایک مکھی تک کے مقابلہ میں بے حس ثابت ہوں جیسا کہ اس کے قبل کی آیت میں تذکرہ ہوا ہے [3] اور اسی لئے اُن اصنام کی عاجزی کے تذکرہ کے بعد اس آیت کا اختتامی جملہ یہ ہے کہ

---

[1] انّ الطالب الصّنم و المطلوب الذّباب (مجمع البیان)

[2] الطالب العبد و المطلوب المعبود (جلالین) یعنی عابد و معبود (فتح الرحمن)

[3] اذا شرکوا به مالم یمتنع من الذّباب ولا ینتصف منه (جلالین)

انّ اللہ لقوی عزیز ''اللہ طاقتور ہے، غالب آنے والا'' یعنی اُسے کوئی بے بس نہیں بنا سکتا۔[1]

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

''اللہ منتخب کرتا ہے فرشتوں میں سے بھی اُنہیں کہ جن کو وہ بھیجے اور آدمیوں میں سے بھی، بلاشبہ اللہ سننے والا ہے دیکھنے والا جانتا ہے اُسے جو ان کے سامنے ہے اور اُسے جو اُن کے پیچھے ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات کو رجوع ہوتا ہے''۔

انبیاء کا انتخاب نوع انسان سے نہ کسی دوسری نوع سے:

فرشتوں میں سے جنہیں بھیجتا ہے، وہ اُس کی وحی پہنچانے والے ہوتے ہیں، انبیاء و مرسلین کی طرف اور انسانوں میں سے جنہیں بھیجتا ہے، وہ انبیاء و مرسلین ہیں جو افراد انسانی کی ہدایت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔

''اصطفاء'' یعنی انتخاب اور چننے کی لفظ ایک ساتھ دو حقیقتوں کی مظہر ہے۔

ایک یہ کہ صفات کی بلندیاں اُس فرد میں کہ جسے وہ منتخب کرے بنفس خود اُس کے وجود کے ساتھ ساتھ موجود ہوتی ہیں، انہی صفات کی بنا پر وہ رسول بنایا جاتا ہے۔ انتخاب کا لازمی تقاضا یہی ہے بلکہ اس کے معنی ہی ہیں اس ایک کا چھانٹنا جو اس منصب کے لائق ہے[2] ایسا نہیں ہے کہ ''دل بخواہ'' کسی ایک کو اس نے رسول بنالیا اور اب رسالت ملنے کی وجہ سے وہ عصمت وغیرہ سے متصف ہو گیا۔

دوسرے یہ کہ ماہیّت و حقیقت میں رسول ایک ایسی نوع کی فرد ہوتا ہے جس کے بہت سے افراد ہیں۔ اس لئے ان افراد میں انتخاب کا مفہوم متحقق ہوتا ہے اور رسالت و امامت وغیرہ اصل خلقت کے بعد ایک منصب ہے جس سے بر بنائے اوصاف جعل متعلق ہوتا ہے یہی ''اصطفاء'' کی لفظ کا تقاضا ہے اور یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ارشاد الٰہی: انّی جاعلك للنّاس اماما اور پھر اُن کے سوال و من ذرّیّتی اور خالق کے جواب:

لاینال عهدی الظّالمین کا تقاضا ہے کہ نہ یہ انبیاء و مرسلین یا ائمہ کی کوئی الگ نوع ہے جو مبدأ خلقت سے نوع انسان سے امتیاز رکھتی ہے کیوں کہ اس صورت میں بھی اصطفاء و انتخاب کا مفہوم متحقّق نہیں ہوتا اور نہ خلقت اولیٰ کے بعد پھر جعل امام اور عطائے نبوّت وغیرہ کے الفاظ جو قرآن مجید میں صاف درج ہیں، ان کا کوئی مفہوم باقی رہتا ہے۔

پھر اسی آیت سے اُس نوع مشترک کا تعیّن بھی ہو جاتا ہے جیسے کہ پہلا اصطفاء جن کے درمیان ہے، ان میں مشترک حقیقت ملکیّہ ہے، اس لئے ارشاد ہوا: من النّاس جسے دوسرے مقام پر اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (سورۂ فصلت۔ ۶) کے الفاظ سے بھی ظاہر کیا ہے۔

---

[1] قادر لا یقدر۔ احد علیٰ مغالبته (مجمع البیان)

[2] سورۂ کہف۔ ۱۱۰

اب اس نوع مشترک میں جو پہلے من الملائکۃ اور پھر من النّاس سے ظاہر کی گئی ہے، اصطفاء بعض اشخاص کا جو ہوتا ہے، وہ یقیناً شخصیات فردیہ کی بنا پر ہے، نہ کہ انفصال نوعی کی بنا پر۔ اس لئے بشر مثلکم کے ساتھ جو یوحی الیّ کی لفظ ہے، وہ ''فصلِ مقسّم'' کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ امتیاز فردی کو نمایاں کرتی ہے۔

آخری فقرہ یہ بتلاتا ہے کہ یہ فرشتے اور پیغمبر بھی باوجود یکہ خاص امتیاز رکھتے ہیں، پھر بھی اللہ کے مقابلہ میں بے بس اور اُس کی نگرانی اور احتساب کے قیود میں مقیّد ہیں تو مشرکین کے ان معبودوں کا کیا ذکر کہ جو کسی خاص امتیاز و خصوصیّت کے حامل ہیں ہی نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ السجدة وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝

''اے ایمان لانے والو! رکوع و سجود کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور نیک اعمال بجالاؤ، شاید کہ تم ہر طرح کی بہتری حاصل کرلو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اُس کے لئے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تم کو امتیاز بخشا ہے اور دین میں تمہارے لئے کوئی دشواری قرار نہیں دی ہے، وہ تمہارے مورث اعلیٰ ابراہیم کا دین ہے۔ انہوں نے ہی تمہارا نام ''مُسلم'' رکھا ہے پہلے سے اور اس میں بھی تاکہ پیغمبر تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ ہو تو نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ سے وابستہ رہو، وہ تمہارا حاکم ہے تو کتنا اچھا حاکم ہے اور کتنا اچھا مددگار''۔

دین میں عسر و حرج کی نفی اور مسلم'' نام کی ابتداء:

هو سمّٰکم المسلمین کی ضمیر باعتبار قرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف راجع معلوم ہوتی ہے اور وہ اس واقعہ کے مطابق ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں اس کے پہلے آچکا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام خانۂ کعبہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے تو اُن کی عرض تھی بارگاہ الٰہی میں:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (بقرہ:۱۲۸)

پروردگار! ہمیں اپنی بارگاہ میں مسلم قرار دے اور ہمارے اولاد میں سے بھی ایک گروہ قرار دے جو تیرے لئے مسلم ہو۔

جس کی تفسیر پہلے بھی لکھی جا چکی ہے۔ ہم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے مگر بعض مترجمین و مفسرّین اس ضمیر کو اللہ کی طرف راجع کرتے

ہیں [1] اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ''اس نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے''۔ یہ دونوں احتمال تقریباً برابر کے ہیں اور دونوں واقعیت کے مطابق ہیں اور یہ دونوں قول قرون اولیٰ سے پائے جاتے ہیں [2] مگر لفظی قرب جو اس ضمیر کو ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حاصل ہے، میرے نزدیک پہلے احتمال کو ترجیح دینے کے لئے کافی ہے۔

اس کے بعد جو ہے من قبل ''پہلے سے'' تو پہلی صورت میں اس سے اشارہ ہوگا اسی واقعہ بنائے کعبہ کی طرف اور دوسری صورت میں ''پہلے'' کے معنی ہوں گے، ان آسمانی کتابوں میں جو گزشتہ انبیاء پر نازل ہوئیں [3] پھر وفی ھٰذا ''اور اس میں'' اسے قریبی طور پر اسی نام کے معاملہ سے متعلق ہونا چاہیے یعنی یہ پہلے سے بھی نام تھا اور اس مذہب یا اس کتاب (قرآن) میں بھی تمہارا نام ''مسلم'' ہے [4] مگر اسے بعض لوگ سابق میں جو حکم تھا: جاھدوا فی اللہ اُس سے متعلق قرار دیتے ہیں اور ہٰذا سے اشارہ قرآن ہی کی طرف لیتے ہیں یعنی اللہ کے بارے میں جہاد کرو اور اس قرآن کے بارے میں۔ [5]

یہاں خداوندی عالم کے لئے جو ھو مو لٰکم کی لفظ ہے، اُس کے معنی بلا تکلف حاکم اور مختار کے لئے جاتے ہیں [6] مگر یہی لوگ جب حدیث غدیر میں من کنت مولاہ فعلیؑ مولاہ پر بحث کرنے لگتے ہیں تو سرے سے منکر ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولیٰ کے معنیٰ یعنی حاکم کے ہیں ہی نہیں۔

---

[1] ھو ای اللہ (جلالین) خدا نام نہاد شما را مسلمانان (شاہ ولی اللہ)

[2] قابل ابن عباس و مجاھد انّ سماکم المسلمین فھو کنایۃ عن اللہ وقال ابن زید ھو کنایۃ عن ابراھیم (تبیان)

[3] یعنی در کتب سابقہ (فتح الرحمن)

[4] اور بیچ اس کتاب کے بھی نام رکھا گیا مسلمان (شاہ رفیع الدین)

[5] و در قرآن نیز جہاد کنید (شاہ ولی اللہ)

[6] متولّی امور کم (جلالین) اوست خداوند شما پس نیکو خداوند است (شاہ ولی اللہ)

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ

مکّیہ----۱۱۸----آیات

چونکہ آغاز اس سورہ کا ''المؤمنون'' یعنی اہل ایمان کے ذکر سے ہے، اس لئے اس کا یہ نام ہوا اور اس سلسلہ میں جماعت مومنین کے اوصاف بلند کا اتنا جامع اور بسیط سلسلہ ہے جس کی نظیر کسی دوسرے سورہ میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں جو خاص خاص مضامین میں وہ حسب ذیل ہیں۔

سورۂ مومن کے خاص خاص موضوعات:

۱.....مراتب تخلیق انسان

۲.....خلقت انسان پر خالق کا ایک خاص انداز سے اپنی تعریف کرنا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بہترین شاہکار قدرت ہے۔

۳.....طوفانِ نوح اور کشتی کا تذکرہ اُن تفصیلات کے ساتھ جن میں سے بعض پہلے نہیں آئے تھے۔

۴.....حق انسانی آراء وخواہشات کا تابع نہیں ہوسکتا۔

۵.....آیات توحید میں ''برہان تمانع'' کی زیادہ واضح تقریر۔

۶.....برائی کے مقابلہ میں اچھائی کی تعلیم جو مناسب موقع پر ''مقاومتِ مجہول'' کا ماخذ ہوسکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ
اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ﴿۴﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ
حٰفِظُوْنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ﴿۶﴾
فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ﴿۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ
وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ﴿۹﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ

الْوٰرِثُوْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱﴾

''ضرور بالضرور دین کی بھلائی حاصل کی اُن ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں رجوع قلب رکھتے ہیں، جو بیہودہ باتوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں، جو ادائے زکوٰۃ کا فرض انجام دینے والے ہیں، جو اپنے پوشیدہ اعضاء کی حفاظت کرنے والے ہیں سوا اپنی بیویوں کے یا جو اُن کی مملکت میں کنیزیں ہیں [۱] کہ اس پر وہ قابل ملامت نہیں ہیں مگر جو اس کے آگے جانا چاہیں تو یہ لوگ تجاوز کرنے والے قرار پائیں گے اور وہ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا لحاظ رکھتے ہیں، جو اپنی نمازوں کی پابندی کرنے والے ہیں، یہی وہ حق دار ہیں جو بہشت کے ورثہ دار ہوں گے، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے''؟

نجات کے حق دار اور اہل ایمان کے اوصاف:

قرآن مجید میں ہر جگہ فلاح و نجات کو ایمان اور عمل صالح دونوں سے وابستہ کیا گیا ہے۔

یہاں سرنامہ اُوصاف مومنوں کو قرار دے کر اعمال صالحہ کی اجمال کو تفصیل کے ساتھ تبدیل کر دیا گیا ہے اس جامعیّت کے ساتھ کہ اُس میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق النّاس بھی آ جائیں اور اوامر کے ساتھ نواہی کی پابندی کا بھی تذکرہ ہو جائے چنانچہ صلوٰۃ حق اللہ کی نمائندہ ہے تو زکوٰۃ اور امانت داری اور غرباء پروری کے اوصاف حق العباد کی نمائندگی کر رہے ہیں، اسی طرح ادھر یہ سب از قبیل اوامر ہیں اور اُدھر اپنے پوشیدہ اعضاء کی حفاظت کا ذکر زنا کاری وغیرہ ایسے منہیّات سے پرہیز کا ترجمان ہے۔

اس میں حفاظت اعضائے نہانی کا عام حکم دے کر بیویوں اور کنیزوں کا استثناء دونوں قسم کے جنسی جرائم کے حرام ہونے کا اظہار ہے یعنی زنا کاری اور لواطہ بلکہ بعید نہیں ہے کہ جلق وغیرہ کے غیر فطری حرکات بھی اس میں میں داخل ہوں [۲] اور یہاں تو صراحۃً مردوں ہی کے طبقہ کا ذکر ہے مگر دوسری جگہ قرآن میں والحافظین فروجھم کے ساتھ: والحافظات کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس سے ایک جدید مسئلہ کے حکم کا استنباط بھی آسان ہے جو سائنس کی بدولت پیدا ہوا ہے یعنی ٹیوب کے ذریعہ سے کسی شخص کا نطفہ عورت کے رحم تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ از روئے قرآن حرام ہی قرار پائے گا، اس لئے کہ عموم: والحافظات سے استثناء صرف ان کے ازواج کا ہے، اور کسی کا نہیں، باقی ہر ایک سے ان کو حفظ فرج واجب ہے خواہ ذریعہ کوئی انسانی حصہ جسم نہ ہو بلکہ بے جان آلہ ہو۔ یہ سب صورتیں ناجائز ہیں۔

ہاں اگر شوہر کسی زخم وغیرہ کی وجہ سے مادۂ تولید بصورت متعارف پہنچانے سے قاصر ہو اور اس شوہر کا یہ مادّہ ٹیوب وغیرہ کے ذریعہ سے داخل کیا جائے تو بعید نہیں ہے کہ وہ الاّ علیٰ ازواجھم کے استثناء میں داخل ہو اور اسے جائز سمجھا جائے۔

ہاں ازواج کا لفظ عام ہے، اس میں دائمی عقد جو نکاح کہلاتا ہے اور عارضی جو متعہ ہے، دونوں داخل ہیں۔

قرآن مجید کے ارشاد: اوما ملکت ایمانھم کے بعض نئی روشنی والے اور دنیا کے عام رجحانات کے دباؤ سے مرعوب مسلمان جو کنیزوں

---

[۱] المراد بہ الاماء لانّ الذّکور من المماليك لا خلاف فی وجوب حفظ الفرج منھم (تبیان)

[۲] کالاستمناء بیدہ (جلالین)

کے ساتھ تعلقات ازدواجی قائم کرنے کے جواز سے انکار کرتے ہیں اُن کے انکار کی کوئی حقیقت نہیں ہے جب کہ قرآن صاف ازواجھم کے ساتھ ساتھ برابر ما ملکت ایمانھم یعنی مملوکہ کنیزوں کا ذکر کر رہا ہے جس سے ظاہر ہے حلّیّت تصرف کے دو مستقل سبب ہیں۔

ایک زوجیّت اور دوسرے ملوکیّت لہٰذا یہ سمجھنا چاہیے کہ کنیزوں کے ساتھ عقد کر کے اُن کی رضا سے تصّرف کیا جائے گا، از روئے قرآن درست نہیں ہے۔

''اللّغو'' جس کا ترجمہ ہم نے ''بیہودہ باتوں'' کے ساتھ کیا ہے، اس کی تفسیر ہمارے یہاں غناء یعنی گانے کے ساتھ ہوئی ہے[1] مگر یہ ایک روایت ہے۔ دوسری روایات اور وہ بھی معصوم علیہ السلام سے ہیں، یہ ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دوسروں کی سخت کلامی اور دشنام طرازی کے مقابلہ میں چشم پوشی سے کام لے۔[2]

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴿۱۶﴾

''اور ہم نے انسان کو پیدا کیا نچوڑ سے مٹی کے، پھر اُسے قرار دیا نطفہ کی صورت میں ایک پُرسکون جگہ پر، پھر نطفہ کو منجمد خون کی شکل میں لائے، پھر اُس منجمد خون کو گوشت کے ایک لوتھڑے کی صورت عطا کی، پھر اُس گوشت کے لوتھڑے کو کچھ ہڈّیوں کی صورت دی، پھر اُن ہڈیوں پر گوشت کا لباس پہنایا، پھر اُسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا۔ تو بڑا برکت والا ہے وہ جو خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے، پھر تم اسکے بعد مر جاؤ گے اور اس کے بعد پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے''۔

خلق انسانی پر خالق کی نوازش:

سلسلۂ تخلیق کے بیان میں تخلیق فرد و نوع کے منازل کو سمو دیا گیا ہے یعنی سب سے پہلے جو کہا گیا ہے کہ نچوڑ سے مٹی کے پیدا کیا، وہ آغاز نوع بشر کا ذکر ہے جو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے متعلق ہے[3] اور پھر نطفہ، علقہ، مضغہ، عظام اور لحم کی منازل سے گزرتا ہوا خلقاء اخر پر ختم ہونے والا سلسلۂ نسل آدم کی ہر ہر فرد سے متعلق ہے۔[4]

---

[1] یعنی الغناء والملاھی (علی بن ابراھیم)

[2] عن ابی عبداللہ علیہ السلام انّ یتقول الرّجل علیك بالباطل اویاتیك بمالیس فیك فتعرض عنه الله (مجمع البیان)

[3] خلقنا الانسان اٰدم (جلالین)

[4] ثمّ جعلنا الانسان وھو من ولد من نسل اٰدم (تبیان)

احسن الخالقین کا لفظ جس کے معنی ہیں ''خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر'' اس کا پتہ دیتا ہے کہ خلق کرنے کی صفت کسی نہ کسی درجہ تک اللہ کے سوا دوسروں کے لئے بھی ثابت ہے [1] جس کے شواہد قرآن مجید میں اور بھی موجود ہیں۔ اس طرح یہ تصور کہ انسان کو کسی درجہ میں بھی، یہاں تک کہ خود اپنے افعال کا خالق ماننا بھی شرک کی حیثیت رکھتا ہے، از روئے قرآن غلط ثابت ہوتا ہے۔

تخلیق انسان کے تذکرہ کے بعد، اُس کو اپنے کو احسن الخالقین کہنا، اس کی دلیل ہے کہ انسان اشرف المخلوقات یعنی اس کی تمام خلقت میں سب سے بہتر ہے اور ایسا نقش اکمل ہے جس پر نقاش ازل کو ناز ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا نمونہ وہی کامل افراد ہیں جو واقعی ہر حیثیت سے خالق کا بلند ترین شاہکار ثابت ہوتے ہیں۔ اُنہیں اس نوع کے افراد کا ملہ سمجھنا وہ نقطۂ حقیقت ہے۔ جواز روئے قرآن درست ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ﴿١٧﴾

''اور ہم نے تمہارے اوپر سات راستے پیدا کیے ہیں اور ہم خلقت سے بے خبر نہیں رہا کیے''۔

یہاں قرآن مجید میں سات آسمانوں کو سات راستوں سے تعبیر کیا ہے [2] یہ اور بات ہے کہ اُس وقت تک یہ راستے فرشتوں ہی کے لئے ہوں [3] مگر جب قرآن نے جو انسانوں کے لئے اترا ہے، ہم انسانوں کو یہ راستے بتلائے ہیں تو اسے قیامت تک ظرف ارتقاء میں کسی دور کے سالکوں کے لئے وہ نوردی کا محرّک کیوں نہ سمجھا جائے اور اگر خالق اُس رہبر کو جو اس قرآن کا حامل ہے، اُسی دور میں عملی طور سے ان راستوں کا سالک بنا بھی دے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴿١٨﴾ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۖ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿١٩﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿٢٠﴾

''اور ہم نے اتارا آسمان سے پانی ایک معین مقدار میں تو اُسے ہم نے زمین میں ٹھہرایا اور بلا شُبہ ہم اُس کو لے جانے پر بھی قادر ہیں تو ہم نے اُس سے پیدا کیے تمہارے لئے باغ کھجوروں اور انگوروں کے جس سے تمہیں بہت پھل ملتے ہیں اور اُس میں سے تم غذا حاصل کرتے ہو اور وہ درخت جو نکلتا ہے طور سیناء سے جو اُگاتا ہے سامان تیل کا اور کھانے والوں کے لئے ایک خاص قسم کی غذا''۔

اس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زمین میں دریاؤں وغیرہ کی صورت میں جو پانی ہے، یہ اصل میں ابر سے برسا ہوا ہے جسے آسمان سے

---

[1] فیہ دلالہ علی انّ الانسان قد یخلق علی الحقیقۃ لانّہ لولم یوصف بخالق الّا اللہ لما کان لقولہ ''احسن الخالق'' معنی (تبیان)

[2] السّمٰوٰت (علی ابن ابراھیم)

[3] طرائق ای سمٰوت جمع طریقۃ لانّہا طرق الملائکۃ (جلالین) قال الجبائی۔ لانّہا طرق الملئکۃ (تبیان)

اتارنے کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔[1]

علم فقہ کی بعض ادنیٰ کتابوں میں بھی اس تصور کا وجود ملتا ہے کہ روئے زمین کے تمام پانی کی اصل آب باراں ہے۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

''اور بلاشبہ تمہارے لئے چوپایوں میں سرمایۂ بصیرت ہے، ہم تمہیں سیراب کرتے ہیں اُس سے جو اُن کے اندر ہے اور تمہارے لئے ان میں بہت فائدے ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو اور اُن پر اور کشتیوں پر سوار ہوتے ہو''۔

''جو کچھ ان کے اندر ہے، اس سے مراد مسلماً دودھ ہے[2] اور اس لئے اگرچہ بطن کے عام معنی پیٹ کے ہوتے ہیں اور اسی لئے عام مترجم یہاں بھی ترجمہ یہی کرتے ہیں کہ ''جو اُن کے پیٹوں میں ہے[3] مگر چونکہ ہماری اُردو کے محاورہ میں دودھ کو پیٹ کے اندر نہیں کہا جاتا، اس لئے ہم نے ترجمہ میں ''پیٹ'' کا لفظ نہیں لکھا، اصل لغت کے اعتبار سے بطن باطن کے معنی میں ہے جو ظاہر کے مقابل ہے اس لئے اس لفظ سے صرف ''اندر'' کے معنی کا سمجھنا بالکل درست ہے۔

یہی غلطی ہے جو حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ایک ارشاد کے ذیل میں راوی کے ایک فقرہ کے ترجمہ میں ہوئی ہے کہ:

''انّ ھٰھنا لعلما جماً و اشارۃ الیٰ بطنہ''

ترجمہ کیا جاتا ہے ''یہاں علم کا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور اشارہ کیا اپنے شکم کی طرف''..... یہاں بقرینۂ مقام عربی میں جو بطن کا لفظ ہے، اس کے معنی ''شکم'' قرار دینا درست نہیں ہیں بلکہ ''سینہ کے اندر'' کہنا جو ہمارا محاورہ ہے اور سینہ کی طرف اشارہ کیا جائے تو بھی عربی میں بطن کا لفظ کا استعمال درست ہوگا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾

''اور بے شک ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام کو اُن کی اپنی قوم کی طرف تو انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت

---

[1] یعنی الانہار والعیون والآبار (علی بن ابراھیم)

[2] ارادانا جعلنا ما فی ضروعھا من الدّین سقیا لکم (مجمع البیان)

[3] از آنچہ در شکم (ایشان) است (شاہ ولی اللہ) بیچ پیٹوں ان کے ہے (شاہ رفیع الدین)

کر واللہ کی، نہیں ہے کوئی خدا سوا اُس کے۔ کیوں تم نجات کی فکر نہیں کرتے تو اُس جماعت نے ان کی قوم میں سے جو کافر تھی کہا کہ یہ نہیں ہے مگر تمہارا ہی ایسا آدمی جو چاہتا ہے تم پر بڑائی حاصل کرے اور اگر اللہ ایسا ہی چاہتا تو وہ فرشتے اتارتا ہم نے ایسی بات نہیں سنی اپنے پہلے باپ داداؤں میں۔ یہ نہیں ہے مگر ایک شخص جس میں کچھ دیوانگی ہے۔ تو ایک مقررہ مدّت تک کے انجام کا انتظام کرو''۔

کافروں کے حلق سے یہ کسی طرح نہیں اترتا تھا کہ جو ہماری ہی طرح انسان ہیں، وہ اللہ کے رسول ہو جائیں۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ کو رسول بنانا ہوتا تو کسی فرشتہ کو اتارتا مگر اس کے جواب میں قرآن شروع سے آخر تک دیکھا جائے تو کسی نبی یا رسول نے یہ نہیں کہا کہ ہمیں انسان نہ سمجھو، ہم حقیقت میں فرشتے ہی ہیں یا اس سے بڑھ کر کوئی الگ قسم کی مخلوق ہیں۔ یہ صرف ہمارا ظاہری لباس ہے جو تم سے ملتا جلتا ہے، اس صورت میں کافروں کی زبان بند ہو جاتی مگر یہ جواب مقصد خالق کے خلاف اور حقیقت کے لحاظ سے غلط تھا۔ اس لئے یہ کبھی نہیں کہا گیا۔ اس سے اُن مسلمین یا مومنین کی آنکھیں کھلنا چاہئیں جو تلے ہوئے ہیں یہ ثابت کرنے پر کہ انبیاء اور ائمہ نوع انسان میں داخل نہیں بلکہ ایک الگ قسم کی مخلوق ہوتے ہیں جو انسان سے ذاتاً الگ ہے۔ یہ تصور قرآن کے بالکل خلاف ہے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿٢٦﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿٢٧﴾ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٨﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ﴿٢٩﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ﴿٣٠﴾

''اُنہوں نے کہا اے میرے پروردگار! میری مدد فرما کہ اُنہوں نے مجھے جھٹلایا تو ہم نے اُن کی طرف وحی بھیجی کہ تم کشتی بناؤ، ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہماری وحی کے مطابق تو جب ہمارا حکم نافذ ہوا اور تندور سے پانی اُبلے تو سوار کر دو اس میں ہر قسم کے دو جوڑے اور اپنے گھر والوں کو سوا اُن میں سے ایسے اشخاص کے جن کے لئے ہماری طرف سے پہلے ہی بات طے ہو چکی ہے اور جو ظالم ہیں، اُن کے بارے میں تم مجھ سے کوئی گفتگو نہ کرنا وہ یقینی غرق ہو کر رہیں گے، تو جب تم اور تمہارے ساتھ والے کشتی پر سوار ہو جائیں تو کہنا کہ شکر اللہ کا جس نے ہم کو ظالم قوم سے نجات دی اور کہنا کہ پروردگار! مجھے اتارنا برکت والی جگہ پر اور تو اتارنے والوں میں سب سے بہتر ہے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اور بلاشبہ ہم آزمائش کیا کرتے ہیں''۔

کشتیٔ نوح علیہ السلام:

''میری مدد فرما کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا'' تو ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ کشتی بناؤ'' اس میں مدد فرمانے کی التجاء کے ساتھ یہ جزٗ کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا اور پھر اس پر فائے تفریع کے ساتھ مرتّب کر کے کشتی بنانے کا حکم کچھ یہ پتہ دیتا ہے کہ مدد سے اُن کی مراد یہی تھی کہ اس قوم پر عذاب نازل کیا جائے، مگر دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے کہ ہم نے وحی بھیجی کہ بس جتنے ایمان لا چکے ان سے زیادہ ایمان نہیں لائیں گے، تو اب کشتی بناؤ اُس سے سمجھ میں آتا ہے کہ پہلے جو انہوں نے اپنی قوم کی تکذیب کی بنا پر مدد کی درخواست کی تھی، اس کا مطلب اس طرح کا تھا کہ انہیں توفیق خیر عطا فرما کہ یہ اس تکذیب سے باز آجائیں۔ پھر کچھ افراد کے ایمان لانے کے بعد اللہ نے یہ اطلاع دی کہ جن میں صلاحیت قبول حق کی تھی اور جن کے ضمیر میں کچھ زندگی تھی، وہ ایمان لے آئے، اب اس کے بعد امید نہ رکھو کہ کوئی ایمان لائے گا، لہٰذا اب ان مومنین کی نجات کے سامان کے لئے کشتی بناؤ اور باقی افراد جو مستحق عذاب ہیں، وہ غرق ہوں گے، ان میں سے کسی کے لئے کوئی سفارش نہ کرنا۔

''وہ اشخاص جن کے لئے پہلے سے بات طے ہوئی ہے'' یعنی فیصلۂ قدرت ہے کہ وہ عذاب سے نہیں بچیں گے، یہ زوجہ تھی جناب نوح علیہ السلام کی اور ایک لڑکا اور اس طرح عملی طور پر اس اصول کا اعلان ہو گیا کہ ذاتی اوصاف ایمان و کفر اور طاعت و معصیت کے مقابلہ میں نہ نسب کا اعتبار ہے، نہ سبب کا۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿٣١﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٣٢﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿٣٣﴾ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ ۙ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿٣٤﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿٣٥﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿٣٦﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿٣٧﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّمَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٣٨﴾

''پھر ان کے بعد ہم نے ایک اور نسل پیدا کی تو ان میں ایک پیغمبر انہی میں سے بھیجا کہ عبادت کرو اللہ کی، تمہارا کوئی خدا نہیں سوا اس کے تو کیوں تم نجات کی فکر نہیں کرتے اور اس کی قوم کے بڑے بڑے آدمیوں نے جو کافر تھے اور جنہوں نے آخرت میں حضوری کو جھٹلایا تھا اور جنہیں ہم نے عیش و عشرت کا سامان دیا تھا، کہا کہ نہیں ہے یہ

مگر تمہارا ہی ایسا ایک آدمی جو کھاتا ہے انہی کھانوں میں سے جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے اسی قسم میں سے جو تم پیتے ہو اور اگر تم کہنا مانو گے اپنے ہی ایسے ایک آدمی کا تو بلا شبہ تم گھاٹے میں رہو گے۔ کیا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ تم جب مر جاؤ گے اور خاک اور بوسیدہ ہڈیوں کی شکل میں ہو جاؤ گے تو پھر تم برآمد کئے جاؤ گے؟ حاشا وکلاّ، بہ دور ہے یہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، کچھ نہیں ہے سوا اس دنیوی زندگی کے۔ یہیں مرنا ہے اور جینا اور ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے کچھ نہیں ہیں۔ وہ نہیں ہے مگر ایک شخص جو اللہ کے سر جھوٹی باتیں منڈھتا ہے اور ہم اس پر یمان لانے والے نہیں ہیں''۔

دیکھتے چلے جایئے! پیغمبروں کا پیغام بھی ہر دور میں ایک ہی رہتا ہے اور کافروں کے اعتراضات اور نکتہ چینیاں بھی ہمیشہ یکساں ہی رہی ہیں، چاہے وہ عہد جاہلیت کے کافر ہوں یا اس علم اور سائنس کی ترقی والے دور کے۔ خواہ زمانہ وحشت کے ہوں یا دور تہذیب کے۔ خواہ عصر ظلمت کے ہوں یا اس ہنگام برق ونور کے۔ شیوۂ کافری ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے، چاہے ظاہری انداز اس کا کچھ بدلتا رہا ہو۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿٣٩﴾ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ﴿٤٠﴾
فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤١﴾

''اس نے کہا اے میرے پروردگار! میری مدد فرما کہ انہوں نے مجھے جھٹلایا، ارشاد ہوا کہ ذرا ہی میں وہ وقت آئے گا کہ انہیں پشیمان ہونا پڑے، تو لے لیا انہیں سخت آواز نے حق بجانب طور پر تو کر دیا ہم نے انہیں بھوسا، تو لعنت ہو اس ظالم گروہ پر''۔

اس مقام پر قرآن مجید نے اس قوم اور اس کے رسول کا نام نہیں لیا ہے مگر جو عذاب ان پر نازل ہوا یعنی صیحہ جس کا ترجمہ ہو ''سخت آواز'' وہ چونکہ دوسری جگہ قرآن میں قوم ثمود کے لئے مذکورہ ہے، اس لئے ایسا سمجھا جاتا ہے کہ اس قوم سے مراد ثمود اور اس پیغمبر سے مراد حضرت صالح علیہ السلام ہیں۔ [1] حالانکہ یہ ممکن ہے کہ صیحہ کی اور قوم کے لئے بھی ہلاکت کا سبب ہوا ہو اور یہاں ثمود نہیں بلکہ وہ دوسری قوم مراد ہو جس کا نام نہیں لیا گیا۔

بعض لوگوں نے اس سے کہ قوم نوح کے بعد بلا فاصلہ اس قوم کا ذکر ہے کہ ان کے بعد دوسری قوم پیدا کی، اس سے مراد قوم عاد کو لیا ہے اور وہ نبی جن کا ذکر ہے، جناب ہودؑ ہیں کیوں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو نبی مبعوث ہوئے، وہ جناب ہود علیہ السلام ہی تھے۔ [2]

علامہ طبرسیؒ نے اس کو بطور مختار لکھا ہے اور پہلے کو بطور قول ضعیف درج کیا ہے۔ [3] مگر مجھے اس کے قبول کرنے سے یہ چیز سد راہ ہے کہ قوم عاد کی ہلاکت کا سبب خود قرآن مجید میں ہے کہ وہ ''ریح صرصر'' یعنی تیز آندھی تھی ''صیحہ'' کا ذکر قوم ثمود ہی کے یہاں ہے تو یا وہ مراد ہوں اور یا جیسا ہم نے امکان ظاہر کیا کوئی دوسری قوم جس کی ہلاکت بھی صیحہ سے ہوئی ہے اور یہ تصور کہ جناب نوح علیہ السلام کے بعد بلا فاصلہ جناب ہود علیہ السلام ہی مبعوث ہوئے تھے، بظاہر کسی نص قطعی پر مبنی نہیں ہے۔

---

[1] یعنی قوم حضرت صالح کو (شاہ رفیع الدین) معلوم ہوا کہ یہ قصہ ہے ثمود کا کہ چنگھاڑ سے وہی مرے ہیں (موضح القرآن)

[2] قیل هود لانه المرسل بعد نوح علیہ السلام (تبیان)

[3] یعنی عادا قوم هود لانه المبعوث بعد نوح علیہ السلام و قیل یعنی ثمود لانهم اهلکوا بالصیحة عن الجبائی (مجمع البیان)

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾

''پھر ہم نے پیدا کیں ان کے بعد دوسری قومیں، نہ کوئی قوم اپنی مقررہ عمر سے آگے بڑھتی ہے اور نہ پیچھے رہتی ہے، پھر ہم نے اپنے پیغمبر بھیجے لگا تار۔ جب کسی قوم کے پاس اس کا پیغمبر آیا انہوں نے اس کا انکار کیا تو ہم نے یکے بعد دیگرے ان کا خاتمہ کیا اور ہم نے انہیں قصہ پارینہ بنا دیا تو لعنت ہو ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے''۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

''پھر ہم نے بھیجا موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو اپنے معجزات اور کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ فرعون اور اس کے بڑے بڑے آدمیوں کی طرف تو انہوں نے غرور سے کام لیا اور وہ بڑے گھمنڈ والے لوگ تھے تو انہوں نے کہا۔ کیا ہم ایمان لائیں اپنے ہی ایسے دو آدمیوں پر حالانکہ ان دونوں کی قوم والے خود ہماری پوجا کرتے ہیں تو انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا تو وہ لوگ ہلاک کئے جانے والوں میں شامل ہو گئے اور بے شک موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب عطا کی۔ شاید کہ وہ لوگ ہدایت قبول کریں''۔

''خود ہماری پوجا کرتے ہیں''، لفظی معنی یہی ہیں اور جب کہ فرعون خدائی کا دعویدار تھا تو بر بنائے واقعہ یہ بعید بھی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل اس کی مورتی کی پوجا کرتے ہوں جیسا کہ ایک قول ہے اور ہو سکتا ہے کہ انتہائی فرماں برداری کو بطور مبالغہ پوجا کرنے سے تعبیر کیا گیا ہو۔ [1]

وہ یعنی قوم فرعون تو ہلاک ہو گئی۔ اب یہ جنہیں کہا گیا ہے کہ ''شاید وہ ہدایت قبول کریں'' قوم موسیٰ و ہارون یعنی بنی اسرائیل ہیں۔ [2]

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۵۱﴾ وَاِنَّ

---

[1] ای مطیعون طاعة العبد لمولاہ قال الحسن کان بنو اسراءیل یعبدون فرعون (مجمع البیان)

[2] ای قومه بنی اسرائیل (جلالین)

هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ﴿۵۲﴾

''اور ہم نے مریم سلام اللہ علیہا کے بیٹے اور ان کی ماں کو ایک قدرت کی نشانی بنایا اور ان دونوں کو پناہ دی ایک ٹیلے کی طرف جو سکون و آرام اور میٹھے پانی والا تھا، اے پیغمبرو! کھاؤ اچھی غذائیں اور نیک کام کرو اور بلا شبہ میں تمہارے اعمال کا جاننے والا ہوں اور یہ تمہاری قوم ہے ایک قوم اور میں تمہارا پروردگار ہوں۔ تو میرے غضب سے بچو''۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور جنابِ مریم سلام اللہ علیہا قدرت خدا کی ایک نشانی:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں کو ''ایک قدرت کی نشانی'' کہا۔ نہ کہ ''دو قدرت کی نشانیاں'' اس لئے کہ جو پہلو ہے اعجاز کا، وہ دونوں میں الگ الگ نہیں ہے بلکہ وہ ایک ہے بغیر مرد کے اولاد کا ہونا جس سے وہ ماں بھی نشانی قدرت ہوئی اور یہ بیٹا بھی۔[۱] چنانچہ دوسری جگہ الٹ کر بھی یونہی کہا ہے کہ ہم نے مریم سلام اللہ علیہا اور ان کے بیٹے کو ایک نشانی قرار دیا تمام جہانوں کے لئے۔[۲]

ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ہستیوں میں دو پہلو قدرت الٰہی کے ظہور کے تھے، عیسیٰؑ میں یہ کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور جناب مریم سلام اللہ علیہا میں یہ کہ وہ بغیر کسی مرد کے ماں بنیں۔ لہٰذا جناب مریم سلام اللہ علیہا ذاتاً قدرت کی خاص نشانی نہ سہی مگر اس بیٹے کی ماں ہونے کے لحاظ سے وہ بھی مستقل قدرت کی نشانی ہیں، اس لئے قرآن مجید میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اور مریم سلام اللہ علیہا دونوں قدرت کی نشانیاں تھے بلکہ ایک جگہ عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں کہا اور ایک جگہ مریم سلام اللہ علیہا اور ان کا بیٹا کہا۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک اس رشتہ کے لحاظ سے جو دوسرے کے ساتھ رکھتا تھا، آیت الٰہی ہے۔ لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں ایک آیت تھے، اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر ایک ان میں کا آیت الٰہی تھا اور اس طرح دونوں کو ملا کر یہ کہنا کہ دونوں ایک آیت تھے، مطلب اس کا وہی ہوتا ہے کہ یہ دونوں خدا کی آیات تھے، ایک آیت اور دو آیات کہنے میں مفہوم کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔[۳]

فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ﴿۵۴﴾

''تو وہ اپنے مذہب کے لحاظ سے مختلف کتابوں (کی طرف نسبتوں) میں بٹ گئے، ہر گروہ کے لوگ اس سے جو ان کے پاس ہے، خوش ہیں تو چھوڑ دیجئے ان کو ان کی غفلت کے عالم میں ایک خاص وقت تک''۔

''وہ'' یعنی جنہیں ایک قوم اور ایک ملت ہونا چاہئے تھا، بٹ گئے بہت سے فرقوں میں کہ کوئی توریت کو مانتا ہے، انجیل کو نہیں اور کوئی ان

---

[۱] لم یقل اٰیتین لانّ الاٰیة فیهما واحدة ولادبة من غیر مخل (جلالین)

[۲] هٰذا مثل قوله: وجعلناها وابنها اٰیة للعالمین (مجمع البیان)

[۳] الاٰیة هٰهنا فی عیسٰی انّه ولد من غیر فعل ونطق فی المهد وفی امّة انّها حملته من غیر ذکر و برّ أها کلامه فی المهد من الفاحشته. (تبیان)

دونوں کو مانتا ہے، قرآن کو نہیں"۔

عام قرأت جس کے مطابق تمام قرآنی نسخوں میں اعراب لگے ہوئے ہیں... زُبُراً... کا لفظ ہے جس کے لحاظ سے وہ ترجمہ ہوتا ہے جو ہم نے کیا ہے اور وہ اکثر تفاسیر کے مطابق ہے۔[1] مگر تعجب ہے کہ کچھ مفسرین ومترجمین نے ایک شاذ قرأت جو زُبُراً ہے، اس کے اعتبار سے ترجمہ کر دیا ہے اور وہی تشریح کی ہے۔[2] جو نہ ہونا چاہئے۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝۵۵ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۵۶

"کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو ان کے مال اور اولاد میں اضافہ کرتے ہیں، تو ان کے لئے تیزی کے ساتھ بھلائیوں کا سامان کرتے ہیں؟ بلکہ انہیں شعور نہیں ہے"۔

یعنی یہ مال واولاد کی فراوانی ان کے لئے استحقاق عذاب میں اضافہ کا باعث ہے جس پر اگر انہیں شعور ہو تو فکر مند ہونا چاہئے نہ کہ مطمئن۔[3]

ایک حدیث قدسی میں جو بطریق ائمہ اہل بیت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد ہوئی ہے، اس آیت کے تحت میں اہل ایمان کے لئے انتباہ کیا گیا ہے کہ انہیں تکالیف ومصائب سے گھبرانا نہیں چاہئے کہ وہ بارگاہ الٰہی میں مزید قرب کا سبب ہو سکتے ہیں اور دنیا کے راحت وآرام اور اموال کی فراوانی سے خوش نہیں ہونا چاہئے کہ یہ چیزیں بارگاہ الٰہی سے دوری کا باعث ہو سکتی ہے۔[4]

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝۵۷ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝۵۸ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ۝۵۹ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا

---

[1] زُبُراً ای کتبا وھو جمع زبور عن الحسن وقتادۃ و مجاھد (مجمع البیان) المعنی تفرّقوا کتبا دانوا بھا و کفروا بما سوا ھا لیھود دانوا بالتوراۃ و کفروا بالانجیل والقرآن و النصاریٰ دانوا بالانجیل و کفروا بالقرآن (تبیان)

[2] زُبَرا حال من فاعل تقطع اوا حزابا متخالفین کالیھود والنصریٰ وغیرھما (جلالین) متفرق ساختند امتان کار خود را درمیان خویش پارہ پارہ (شاہ ولی اللہ) کاٹ لیا انہوں نے کام اپنا درمیان اپنے ٹکڑے ٹکڑے (شاہ رفیع الدین) من قرأ زبرا بفتح الباء وھو ابن عامر فمعناھا جماعات لانہ جمع زبرۃ (تبیان)

[3] لایشعرون ان ذٰلك استدراج لھم (جلالین) یعنی نعمت نیست بلکہ استدراج است (فتح الرحمن)

[4] السکونی عن ابی عبداللہ علیہ السلام عن ابیہ عن آبائہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان اللہ تعالیٰ یقول: یھزن عبدی المئومن اذا قترن علیہ شیئا من الدنیا وذٰلك اقرب لدمنی ویفرح اذا بسطت لہ الدنیا وذٰلك ابعدلی عنی ثم تلاھٰذہ الآیۃ۔ ثم قال: ان ذٰلك فتنۃ لھم (مجمع البیان)

وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿٦٠﴾ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿٦١﴾

''بلاشبہ وہ جو اپنے پروردگار کی ہیبت سے خوف زدہ رہتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے ساتھ شرک نہیں کرتے اور جو دیتے ہیں جو دینا ہوتا ہے اس عالم میں کہ ان کے دل ترسان ولرزاں ہوتے ہیں اس سے کہ انہیں اپنے پروردگار کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ یہ لوگ نیکیوں میں تیزی کرتے ہیں اور ان کے انجام دینے کے لئے آگے آگے رہتے ہیں''۔

ظاہر میں تصور ہوتا ہے کہ تیزی کرنے میں بھی سبقت مضمر ہے۔[1] تو دوسرے جملہ وھم لھا سابقون کا کیا مفاد ہے، مگر غور کیا جائے تو تیزی کرنے میں سبقت کی کوشش ہے اور ھم لھا سابقون میں اس کے نتیجہ کا اظہار ہے کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ ایک یہ بھی پہلو ہے کہ تیزی کرنا بجائے خود عمل کی نوعیت ہے اور سابقون دوسروں کے مقابلہ میں ان کا آگے رہنا ہے، ایک تفسیر یہ ہے کہ تیزی عمل میں ہے اور اس کے نتیجہ میں جو سبقت ہے وہ جنت کی طرف ہے۔[2]

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾

''اور ہم کسی متنفس کو احکام نہیں دیتے مگر اس کے مقدور بھر اور ہمارے پاس ایک نوشتہ ہے جو حق ہی بات کہتا ہے اور ان پر ظلم نہیں ہوتا''۔

یعنی اللہ ہر ایک کی طاقت کے پیمانہ سے واقف بھی ہے اور جس حد تک وہ مجبور ہے، اس پر مواخذہ ظلم ہے جس سے وہ بمقتضائے عدل بری بھی ہے لہٰذا ناممکن ہے کہ مقدور سے زیادہ کسی پر پابندی عائد کرے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں وہ عقل وذہن کا تصور بھی داخل ہے جو جسمانی طور پر یا فقدانِ ذرائع واسباب سے ہو جس کی وجہ سے اس کے دماغ میں یا تو معارف حقہ کے سمجھنے کی صلاحیت بالکل ہی نہیں ہے یا کسی نہ کسی حد تک کم ہے لہٰذا خواہ وہ ظاہری طور پر منکرین میں داخل ہو یا عمر بھر شک وشبہ میں گرفتار رہے ہے، ہم چاہے اپنے قانون شرع کے تقاضوں کے مطابق اسے زمرۂ کفّار میں داخل کریں اور وہی سلوک کریں جو اس طبقہ کے ساتھ ہونا چاہیے لیکن اصل میں یہ خدا ہی جانے کہ کون واقعہ زیادہ مستحق سزائے خروی ہے اور کون کم مستحق ہے اور کون بالکل ہی مستحق سزا نہیں ہے، بہرحال اللہ کے پیمانۂ عدل کے تمام گمراہ جماعتوں کے افراد میں بھی مجازاۃ کے اعتبار سے فرق ہونا لازمی ہے۔

بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿٦٣﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْـَٔرُوْنَ ﴿٦٤﴾ لَا تَجْـَٔرُوا الْيَوْمَ

---

[1] یجتھدون فی السبق الیھا رغبۃ الیھا (تبیان)

[2] ھم من اجل تلك الخیرات سابقون الی الجنّۃ (تبیان)

اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿۶۶﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿۶۷﴾

''بلکہ اُن کے دل اس سے بے خبری کے عالم میں ہیں اور اس کے علاوہ اُن کے دوسرے کرتوت ہیں جو وہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان کے دولت مندوں کو ہم عذاب کی گرفت میں لیتے ہیں تو وہ ایک دم چیخ اٹھتے ہیں، اب آج چیخو چلّاؤ نہیں، تمہیں ہماری طرف سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ ارے میری آیات تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم پچھلے پیروں پلٹ جاتے تھے غرور سے کام لیتے ہوئے قصّوں کہانیوں میں لگ کر چھوڑ دیتے تھے''۔

تھجُرُون کا ترجمہ ''چھوڑ دیتے تھے'' ایک تفسیر کے مطابق ہے، دوسری تفسیر کے اعتبار سے ترجمہ ہوتا ''بیہودہ بکواس کرتے ہو''[1]

اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۰﴾

''کیا اُنہوں نے اس کلام پر غور نہیں کیا یا اُن کے پاس ایسی چیز آئی ہے جو اُن کے پہلے والے باپ داداؤں کے پاس نہیں آئی تھی؟ یا انہوں نے اپنے پیغمبر کو پہچانا نہیں ہے اس لئے وہ انکار کرتے ہیں؟ یا وہ کہتے ہیں کہ اس میں دیوانگی ہے؟ بلکہ وہ تو حق لے کر آیا ہے اور ان میں کے زیادہ تر لوگ حق کو ناپسند کرتے ہیں''۔

یہ تردّد و تردید کا انداز اس حقیقت کے اظہار کے لئے ہے کہ یہ کلام ایسا دلائل حقانیت کا حامل ہے کہ کسی صاحب عقل کو اس کا انکار نہیں کرنا چاہیے اور اس کے خلاف جتنے وجوہ انکار ہو سکتے ہیں، وہ سب بے جا اور غلط ہیں۔

''انہوں نے غور نہیں کیا تو کیوں''؟ وہ نئی چیز ہے؟ تو ایسا بھی نہیں۔ وہ اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے ہیں؟ یہ بھی غلط ہے۔ وہ چالیس سال ان کے درمیان زندگی گزار چکا۔ وہ دیوانہ ہے؟ ایسا بھی نہیں۔ اس نے تو انسان کو درس آگہی دے کر عقل کو جوہر عطا کیا ہے، آخر میں ان سب باتوں کے غلط ہونے کو ہدایتِ عقل کے حوالے کر کے اصلیت بتادی کہ یہ کتاب چونکہ حق پر مشتمل ہے اور ان میں اکثر حق کے دشمن ہیں، اس لئے وہ جان بوجھ کر اس کا انکار کرتے ہیں اور کچھ بھی نہیں ہے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۱﴾

''اور اگر حق ان کی نفسانی خواہشوں اور ذاتی خیالات کا تابع ہو جائے تو آسمان اور زمین جو اُن کے اندر ہیں سب

---

[1] تهجرون الحق بالاعراض عنه و تجهجرون ای تفحشون فی المنطلق (مجمع البیان)

تباہ و برباد ہو جائیں بلکہ ہم نے ان کے سامنے اُن کی نصیحت کا سبق پیش کیا ہے مگر وہ اپنے سبق سے روگردانی کرتے ہیں''۔

حق انسانی آراء اور خواہشات کا تابع نہیں ہوسکتا:

غور کیا جائے تو انسانی خواہشوں سے دنیا میں فساد تو سمجھ میں آتا ہے لیکن اس فساد کی لپیٹ میں آسمان بھی آجائے، یہ سمجھ میں نہیں آتا، لیکن جب ہم قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر اھوآء کے لفظ کا استعمال دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ انسان کے طبع زاد خیالات جو عقائد باطلہ کی شکل میں ہیں انہیں بھی قرآن مجید نے اھوآء کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور اسی لئے ہم نے اھوآء کے لفظ کے ترجمہ میں دو الفاظ صرف کئے ہیں'' نفسانی خواہشوں اور ذاتی خیالات''۔

اب اس میں جب تمام عقائد باطلہ آگئے جن کے ساتھ توحید اور عدل کسی کی کوئی حقیقت نہیں رہتی اور قرآن میں دوسری جگہ تعدد آلہہ کے لئے موجود ہے: لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا[1] (انبیاء۔ ۲۲) اگر خدائے حقیقی کے علاوہ اور خدا ہوتے تو زمین و آسمان کا نظام درہم برہم ہو جاتا اور اس کے بعد حق کے تابع اھوآء ہونے کے بعد زمین و آسمان کا نظام درہم برہم ہو جانا بالکل عقل و منطق کے مطابق ہے۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۳﴾ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾

''اچھا! کیا آپ ان سے معاوضہ کے طلب گار ہیں؟ تو آپ کے پروردگار کی طرف کا معاوضہ زیادہ بہتر ہے اور وہ روزی عطا کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے اور یقیناً آپ اُن کو کو سیدھے راستے کی طرف بلاتے ہیں اور بلاشبہ وہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اُس راستے سے منحرف ہیں''۔

''جیسے خالق عالم کو قرآن میں دوسری جگہ احسن الخالقین ''خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے'' اور یقیناً آپ اُن کو سیدھے راستے کی طرف بلاتے ہیں اور بلاشبہ وہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اُس راستے سے منحرف ہیں''۔

جیسے خالق عالم کو قرآن میں دوسری جگہ احسن الخالقین ''خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر'' کہا گیا ہے، ویسے ہی اس روزی رسان کو یہاں خیر الرّٰزقین ''روزی دینے والوں میں سب سے بہتر'' کہا گیا ہے۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ اللہ کی دی ہوئی طاقت اور اس کے پیدا کیے ہوئے رزق سے کسی دوسرے کو خالق اور رازق کہنا یا سمجھنا بھی شرک نہیں ہے۔[2]

---

[1] سورۂ انبیاء۔ ۲۲

[2] فی ھٰذا دلالۃ علیٰ انّ فی العباد من یرزق غیرہ باذن اللہ (مجمع البیان)

''وہ اس راستے سے منحرف ہیں'' یعنی باطل ہیں، اس لئے کہ حق دو مختلف سمتوں میں نہیں ہوسکتا۔ [1]

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۵﴾

''اور اگر ہم اپنی رحمت اُن کے شامل حال کرتے اور جس مصیبت میں وہ ہیں اُس کو دور کر دیتے تو وہ اور زیادہ اپنی سرکشی میں اندھا دھند سرگرم ہوتے''۔

کہا گیا ہے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہو چکے تو مکّہ میں شدید قحط پڑا۔ اس وقت ابوسفیان وغیرہ نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کے کہا کہ آپ تو اپنا خالق کائنات سے تعلق بتاتے ہیں تو پھر اس مصیبت کو ہم سے دور کیوں نہیں کراتے؟ اس پر آیت اتری۔

مطلب یہ ہے کہ مصیبت پڑنے پر تو عموماً خدا یاد آتا ہے مگر یہ ایسے ہیں کہ مصیبت پڑنے پر بھی اللہ سے لَو نہیں لگاتے بلکہ سرکشی پر قائم رہتے ہیں تو اگر مصیبت دور ہو جائے، تب تو اُن کے سرکشی میں اور اضافہ ہو جائے گا مگر یہ شان نزول کوئی مستند حیثیت نہیں رکھتی، جب کہ یہ شان نزول ثابت نہیں ہے تو یہ عام خدا فراموش بندوں کا کردار ہوسکتا ہے اور ایک خیال یہ ہے کہ وہ آخرت سے متعلق ہے کہ وہاں انسان آرزو کرے گا کہ میں پھر دنیا میں واپس ہوں تو نیک اعمال کروں گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آخرت کا عذاب ان سے ہٹ جائے اور وہ دنیا میں واپس ہوں تو پھر بھی وہ صحیح راستے کو اختیار نہیں کریں گے۔ [2]

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۷۶﴾ حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۷﴾

''اور ہم نے اُنہیں سزا میں گرفتار کیا ہے، پھر بھی اُنہوں نے اپنے پروردگار کے سامنے عاجزی نہ کی اور نہ وہ تضرّع وزاری سے کام لیتے ہیں، یہاں تک کہ جب ہم سخت عذاب والا دروازہ کھول دیں گے تو اُنہیں ایک دم نا امید ہو جانا پڑے گا''۔

یعنی ابھی تو یہ عذاب استیصال نہیں ہے، صرف بیدار کرنے کے لئے ایک جھنجھوڑی ہے مگر اس پر ان کی آنکھ نہ کھلی تو پھر وہ عذاب آجائے گا جس کے بعد کوئی امید نجات ہو ہی نہیں سکتی۔ [3]

وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۸۰﴾

---

[1] لانّ طریق الاستقامة واحد وما نحالفه فکثیر (رازی)

[2] کما قال: ولو ردّوا لعادا لما نهو عنه (تبیان)

[3] الا بلاس الیاس من کلّ خیر (رازی)

''اور وہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے کان، نگاہیں اور دل پیدا کیے، تم بہت کم شکر گزار ہوتے ہو اور وہ وہ ہے جس نے تمہیں اطراف زمین میں پھیلا دیا اور اُس کی طرف تم سمت کر جاؤ گے اور وہ وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے اور شب و روز کی آمد و رفت اُسی کی کارگزاری ہے تو پھر تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے''؟

ذرأکم کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ''پھیلا دیا'' یہ اس لفظ کے ایک معنی کے لحاظ سے ہے [1] لیکن دوسرا قول یہ ہے کہ ذرأ کے معنی خَلَق کے ہیں یعنی تم کو زمین میں پیدا کیا ہے [2] مگر میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ ذرأ کے معنی خَلَق کے ہوتے ہیں تو اس صورت میں من الارض ہوتا کہ اُس نے زمین میں تمہیں پھیلا دیا۔

اختلاف کا ترجمہ ''آمد و رفت'' بھی ایک معنی کے لحاظ سے ہے۔ [3]

دوسری تشریح یہ ہے کہ اس اختلاف کا وہی مفہوم جس کے لحاظ سے عام طور پر ہماری زبان میں اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے یعنی ایک دوسرے کے خلاف ہونا، بعض ترجمے اس کی طرف ناظر معلوم ہوتے ہیں۔ [4]

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ﴿۸۱﴾ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۸۲﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸۳﴾

''بلکہ اُنہوں نے کہی ایسی بات جیسی پہلے والوں نے کہی، اُنہوں نے کہا کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک اور متفرق ہڈیوں کی شکل میں ہو جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟ ہم سے بھی یہ وعدہ ہوا ہے اور ہمارے باپ داداؤں سے بھی اس سے پہلے، یہ نہیں ہیں مگر پہلے والوں کی من گڑھت باتیں''۔

''اُنہوں نے کہی ویسی ہی بات'' یعنی اس دور کے کافروں کے پاس کوئی بنیاد اعتراض اور کوئی نئی دلیل دعوت رسول کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہی باتیں ہیں جو ہر دور میں انبیاء کی دعوت کے خلاف کہی گئیں اور یہ اس کی دلیل ہے کہ تمام انبیاء کا پیغام ایک ہی رہا ہے:

اُن کا یہ کہنا کہ ہم سے یہ وعدہ ہوا ہے اور ہمارے باپ داداؤں سے یہ بھی اس کی دلیل ہے اور پہلے والوں کی سی باتیں کہنا بھی اس کا ثبوت ہے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾

---

[1] قال ابو مسلم: یحتمل بسطکم فیها ذریّة بعضکم من بعض حتی کثرتم (رازی)

[2] خلکم واوجدکم (تبیان)

[3] کما یقال اذا اتی الرّجل الدار مرّة بعد مرّة هو یختلف فی هٰذه آرار (تبیان)

[4] اس کے سبب سے رات اور دن کا ادلنا بدلنا ہے (مقبول ترجمہ)

سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾

''کہیے کہ کس کی ہے زمین اور جو اُس میں رہتے ہیں، اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ کی، پھر اس کے بعد بھی کیا تم نصیحت نہ مانو گے؟ کہیے کہ کون پروردگار ہے، ساتوں آسمانوں کا اور پروردگار ہے اُس بڑے تخت سلطنت کا؟ وہ کہیں کہ پھر بھی کیا تم پرہیزگار نہ بنو گے؟ کہیے کہ کس کے ہاتھ میں ہے ہر چیز اقتدار اور وہ پناہ دینے والا ہے اور اُس کے مقابلہ میں پناہ نہیں دی جاسکتی، اگر تم جانو؟ وہ کہیں گے اللہ کے ہاتھ میں، کہیے کہ پھر بھی تم طلسم باطل میں گرفتار رہو گے؟ بلکہ ہم حق ان کے سامنے لے آئیں ہیں اور بلاشبہ وہ جھوٹے ہیں''۔

وحدانیّتِ رب کی دلیل جن مقدّمات پر مبنی ہے یعنی ان آثار قدرت کا مشاہدہ اور اُن کا اللہ کے ساتھ مخصوص ہونا، وہ سب مشرکین کے لئے بھی مسلم ہیں یعنی آثار قدرت کو وہ اپنے اصنام سے وابستہ کرنے کا کوئی توہم بھی نہیں رکھتے اور یقینی طور پر سمجھتے ہیں کہ کائنات میں کارگزاری صرف اللہ کی ہے مگر جب نتیجہ کی منزل آتی ہے تو وہ بھٹک جاتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر معبود دوسروں کو بنا لیتے اور اُن کی پرستش کرنے لگتے ہیں، اس فکر و عمل کے تضاد کو قرآن مجید نے یہاں ان الفاظ میں اور بعض دوسرے مقامات پر انہی سے ملتے جلتے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے اور ان کے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

چونکہ اس کے پہلے حشر و نشر کے بارے میں اُن کے متعجّبانہ سوال کا جو درحقیقت انکار کی حیثیت رکھتا تھا ذکر ہے، اس لئے علامہ طبرسی علیہ الرحمۃ نے اسے اُسی حشر و نشر پر ان کے سوال کا جواب قرار دیا ہے کہ جو ان سب باتوں پر قادر ہے، وہ مردوں کو بھی زندہ کرنے پر قادر ہے [1] لیکن چونکہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہوئی ہے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ آیات مقام تنزیل میں بھی قبل والی آیات کے بعد ہی اتری ہیں تاکہ اُن سے یہ نتیجہ برآمد کیا جائے۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ ۚ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۹۲﴾

''اللہ نے کوئی بیٹا نہیں بنایا ہے اور نہ اُس کے ساتھ کوئی خدا ہے، اس وقت تو ہر خدا اپنے مخلوقات کو اپنی طرف جاتا اور اُن میں ایک کا دوسرے پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا، پاک ہے خدا اُس سے جو وہ اُس کی طرف منسوب کرتے ہیں، ان دیکھے اور دیکھے سب کا جاننے والا تو وہ بالاتر ہے اُس سے جو یہ شرک کرتے ہیں''۔

---

[1] من قدر علیه قدر علیٰ احیآء الموتیٰ لانّه لیس ذٰلك باعظم منه (مجمع البیان۔)

اثباتِ توحید میں برہانِ تمانع کی زیادہ واضح تقریر:

علم کلام میں جو ''برہان تمانع'' کہا جاتا ہے جسے بہت آسان لفظوں میں بچوں کو سمجھانے کی یوں کوشش کی جاتی ہے کہ ''اگر کئی خدا ہوتے تو اُن میں آپس میں جھگڑا ہوتا۔ ایک خدا کچھ کہتا تو دوسرا خدا کچھ کہتا تو کوئی چیز پیدا نہ ہوسکتی۔ اس ''برہان'' کا اصل ماخذ قرآن مجید کی یہ آیت قرار دی جاتی ہے کہ:

لو کان فیھما آلھۃ الّا اللہ لفسدتا۔ (انبیاء۔ ۲۲)

اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں ایک اللہ کے علاوہ کئی خدا ہوتے تو وہ دونوں درہم برہم ہوجاتے۔

مگر میرے خیال میں اُس سے زیادہ صاف یہ مضمون اس آیت میں ہے، وہاں پھر الگ سے یہ سوچنے سمجھنے کی بات رہ جاتی ہے کہ کئی خداؤں کے ہونے سے وہ دونوں (زمین و آسمان) درہم برہم کیوں ہوجاتے؟ مگر یہاں یہ وجہ صاف خود الفاظ قرآنی میں بتائی جارہی ہے کہ ''ہر خدا اپنی مخلوقات کو اپنی طرف لے جاتا، یعنی اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتا اور ہر ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا'' یعنی اپنے ہی قائم کردہ نظام کو کامیاب بنانا چاہتا تو کائنات کا پورا نظام جو اس وقت ایک واحد کی شکل میں نظر آرہا ہے، افراتفری کی نذر ہوجاتا۔ کائنات کے اندر باوجود اُس کی کثرت کے نظام کی وحدت کا ہونا منتظم کے واحد ہونے کے قطعی دلیل ہے۔

اس کی کافی تشریح ہماری قدیم تفسیر میں جو زیادہ تر اقوال معصومین علیہم السلام پر مبنی ہے یعنی تفسیر علی بن ابراہیم میں جسے تفسیر قمی بھی کہتے ہیں، موجود ہے اور علامہ طبرسیؒ نے بھی فلسفی انداز میں اُس کی وضاحت کی ہے اور اُسے مثل اُس دوسری آیت کے برہان تمانع کا ماخذ قرار دیا ہے۔[1]

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿۹۳﴾ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ﴿۹۵﴾

''کہیے کہ اے میرے پروردگار! اگر میری آنکھوں سے مجھے دکھلا دے وہ موقع جس سے انہیں ڈرایا جارہا ہے تو اے میرے پروردگار! مجھے ظالم جماعت میں شامل نہ کرنا اور بلاشبہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ جو انہیں اطلاع دے رہے ہیں، اُسے آپ ہی کی آنکھوں کے سامنے لے آئیں''۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے یہ دعا کرانا اُس عذاب کی ہولناکی کا اظہار ہے کہ وہ جنہیں اُس عذاب کی خبر دی جارہی ہے، وہ ڈریں یا نہ ڈریں لیکن وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو حقیقت میں بے گناہ ہے، اُس عذاب سے ڈر رہا ہے اور اپنے سچے رہنے کی دعا کرتا ہے[2] حالانکہ یہ یقینی ہے کہ وہ عذاب جب بھی آئے، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔[3]

پھر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اس مکان کا اظہار کہ اگر میرے سامنے یہ عذاب آجائے اور خالق کی طرف سے اپنی قدرت کا اظہار کہ

---

[1] ھو مثل قولہ: لو کان فیھما آلھۃ الّا اللہ لفسدتا (مجمع البیان)

[2] ای لا تجعلنی فی جملۃ من یشملھم العذاب لظلمھم (تبیان)

[3] فی ھٰذہ دلالۃ علی جواز ان یدعو الانسان ما یعلم ان اللہ یفعلہ لا محالۃ... وذٰلک الاظھار الرّغبۃ الی اللہ تعالیٰ (مجمع البیان)

ہاں ہوتو سکتا ہے کہ ہم آپ کے سامنے ہی اُسے لے آئیں، ان کو جو اصل میں مستحق عذاب ہیں ایک تنبیہ ہے کہ اس عذاب کو دور نہیں سمجھنا چاہیے لیکن جو بات اللہ کی قدرت میں ہو وہ ضروری نہیں کہ وقوع میں بھی آجائے، اس لئے دوسری جگہ خود پیغمبر ﷺ سے خالق کریم نے یہ ضمانت کر لی ہے کہ:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (انفال۔۳۳)

اللہ ایسا نہیں ہے کہ انہیں عذاب کرے دار نحالیکہ آپ ان میں موجود ہیں۔

یعنی وہ تو قدرت کا اظہار تھا کہ وہ چاہے تو عذاب آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی نازل کر دے مگر اللہ آپ کو اطمینان دلائے دیتا ہے کہ ایسا ہونے والا نہیں ہے کہ آپ کی موجودگی میں اُن پر عذاب آجائے۔

یہ بھی ایک بڑی وہ خصوصیت ہے جو ہمارے پیغمبر ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے کے عملی نتیجہ کے طور پر خالق کی طرف سے آپ کو حاصل ہے، اُمم سابقہ میں برابر اُن انبیاء کی آنکھوں کے سامنے اُن کی امتوں پر عذاب آتا رہا مگر ہمارے رسول ﷺ کا وجود تمام کفار کے لئے نزولِ عذاب سے مانع ہو گیا اور اب بھی عذاب نہیں آرہا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ ان کا ایسا نائب خلق میں موجود ہے جس کی بدولت یہ نظام قائم و برقرار ہے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾

''برائی کو ختم کیجئے ایسے طرزِ عمل سے جو بہتر سے بہتر ہو۔ ہم خوب جانتے ہیں جو جو وہ کہتے ہیں اور کہیے کہ اے میرے پروردگار! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں شیطانوں کے وسوسوں سے اور پناہ مانگتا ہوں تجھ سے اے میرے پروردگار! اس سے کہ وہ میرے قریب آئیں''۔

برائی کے مقابلہ میں بھلائی کرنے کی تعلیم:

پہلی آیت صحیح حدود میں ''مفاومت مجہول'' اور مخالفین اسلام کے مقابل میں بمناسبت حکمت و مصلحت ''رواداری'' کی تعلیم ہے، جیسا کہ جناب شیخ الطائفہؒ فرماتے ہیں:

اذا ذکرو المنکر من القول .....الشرك.....ذکرت الحجة فی مقابلته و ذکرت الموعظة الّتی تصرف عنه الیٰ ضدّة من الحق علیٰ وجه اللطّف و الدّعاء الیه و الحث علیه (تبیان)

جب وہ بری باتیں شرک آمیز کہیں تو آپ اُن کے مقابلہ میں دلیل بیان کریں اور اس طرح کا وعظ و نصیحت پیش کریں جو انہیں اُس سے پلٹا سکے اُس کے مخالف پہلو کی طرف جو حق ہے رواداری کے ساتھ اور دعوت دینے کے طور پر اور ترغیب و تحریص کی صورت میں اس کے ساتھ یہ ارشاد کہ ''ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ تو تبلیغ حق کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر نرمی ہی برتیے، اُن کی سخت کلامی یا دشنام طرازی یا باطل پروری سے ہم خوب واقف ہیں اور وقت آنے پر ہم اُس کی سزا دیں گے۔ [1]

---

[1] نحن اعلم بما یستحقّون به من الجزاء فی الوقت الّذی یصلح الاخذ بالعقوبة (تبیان)

بعد کی دو آیات اگر مقام تنزیل میں بھی پہلی آیت سے متصل ہیں تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جذبۂ انتظام پیدا کرنا اور سخت کلامی کے جواب میں جوش دلانا کہ تم اُس سے زیادہ سخت کلامی سے کام لو، یہ سب شیطان کی تحریکیں ہوتی ہیں، اُس سے پناہ مانگنا چاہیے۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی ایک کے سر پر موت آ کھڑی ہو تو وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار! مجھے پلٹا دو، شاید میں اب نیک اعمال کروں اُس میں کہ جو میں چھوڑ آیا ہوں، ہرگز نہیں۔ یہ ایک لفظ ہے جو وہ بس کہہ رہا ہے اور اُن کے آگے اب برزخ کا زمانہ ہے اُس دن تک کہ جب وہ جزا سزا کے لئے اٹھائے جائیں گے''۔

''یہ ایک لفظ ہے جسے وہ کہہ رہا ہے'' یعنی اس سے کوئی فائدہ نہیں یا اس کی کوئی اہلیت نہیں [۱] اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ کافر کا قول ہے: رب ارجعون اس میں خطاب پروردگار سے ہے اور پھر جمع کا صیغہ ''تم لوگ مجھے پلٹا دو''۔ اس کے لئے بعض ہندوستانی مذاق کے اہل قلم نے یہ کہہ دیا ہے کہ یہ جمع بطور تعظیم ہے [۲] مگر یہ ہماری اُردو میں ہوتا کہ تعظیماً ''تم'' اور ''آپ'' کہیں مثلاً دام ظلّك کے بجائے کسی بزرگ کو دام ظلّکم کہیں، جدید عربی میں بھی کسی حد تک اس کا رواج ہو چلا ہے مگر عربی قدیم میں جو قرآن کی زبان ہے، ایسا نہیں ہوتا ہے انبیائے کرام کے تخاطب بارگاہ الٰہی میں قرآن میں موجود ہیں، ہر جگہ واحد کا صیغہ ہے مثلاً رب اغفر لی، هب لی، اٰتنا وغیرہ وغیرہ یہاں تک کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بھی ہے: ربّ زدنی علما... والحقنی بالصّالحین۔ حالانکہ خالق کی عظمت کے تقاضے انبیاء سے زیادہ کس کے پیش نظر ہوں گے؟ اس لئے اس اختلاف اسلوب کا ایک لطیف پہلو بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ کافر نے گھبرا کر خدا کو پکارا: رب جیسے ہم کہیں ''اے اللہ'' اور پھر ملائکہ سے خطاب کر کے کہا: ارجعون ''مجھے واپس کر دو دنیا کی طرف'' [۳]

اس آیت کے مضمون سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے جو احادیث سے بھی ثابت ہے کہ موت کے ساتھ ہی انسان کو اپنے اچھے اور برے انجام کا پتہ چل جاتا ہے۔ [۴]

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَاۗءَلُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

''تو جب صور پھونکا جائے گا تو اُن کے درمیان کوئی خونی رشتے نہیں ہوں گے اُس دن اور نہ آپس میں اُن میں پوچھ گچھ ہوگی''۔

یعنی کوئی کسی کا خبر گیر نہ ہوگا، نفسی نفسی کا عالم ہوگا۔ ''نہ اُن میں آپس میں کچھ پوچھ ہوگی''۔ یہ اُس آیت کے خلاف نہیں ہے کہ:

---

[۱] کلام یقوله ولا فائدة فی ذٰلك وقیل معناه یقولها بلسانه ولیس لها حقیقة (مجمع البیان)

[۲] ربّ ارجعون، اس میں واؤ جمع کا نہیں ہے بلکہ تعظیم کا ہے (مولانا مقبول احمد صاحب)

[۳] استغاثوا اولا بالله ثمّ رجعوا الیٰ مسئلة الملائکة (مجمع البیان)

[۴] فی الأیة دلالة علیٰ انّ احدا لا یموت حتّی یعرف اضطرارا منزلة عند الله وانّه من اهل الثواب او العقاب (تبیان)

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَاءَلُوْنَ (صافات۔۲۷) (طور۔۲۵)

اور ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوگا آپس میں پوچھ گچھ کرتا ہوا۔

اس لئے کہ دونوں دو مختلف وقتوں کے تذکرے ہیں، صور کی قیامت خیز آواز ایک دم آئے گی تو لوگ دہشت زدہ، ششدر اور حیران ایسے ہوں گے کہ کوئی دوسرے سے پوچھ گچھ نہیں کر سکے گا، پھر جب اپنے آپے میں آئیں گے اور اب ایک طویل المیعاد دور سے گزر رہے ہوں گے جو آخری انجام کے سامنے آنے تک ہے تو اب ایک دوسرے سے گفتگو بھی ہوگی اور سوال و جواب بھی جس کا متعدد موقعوں پر قرآن مجید میں ذکر ہے۔[1]

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰٓى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

”تو جس کے نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا تو یہ لوگ ہر طرح کی بہتری حاصل کرنے والے ہوں گے اور جس کا پلہ ہلکا ہوگا تو یہ وہ ہیں جنہوں نے اپنے کو گھاٹے میں مبتلا کیا ہے، وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، آگ ان کے چہروں کو جھلسا رہی ہوگی اور ان کی شکلیں اس میں بگڑ گئی ہونگی کیا ایسا نہیں ہے کہ میری آیات تمہارے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو تم انہیں جھٹلاتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر ہماری کم بختی غالب آ گئی تھی اور ہم گمراہ لوگ تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم کو یہاں سے نکال دے، پھر اگر ہم ایسا کریں تو بے شک ہم سراسر ظالم ہوں گے، ارشاد ہوا کہ اب چپکے اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے کوئی بات نہ کرو، بلاشبہ میرے بندوں میں سے جو کچھ کہتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے تو تو ہمیں بخش دے اور رحمت ہمارے شامل حال فرما۔ اور تو بہترین رحم کرنے والا ہے، اس پر تم ان کا مذاق اڑاتے تھے، یہاں تک کہ اُنہوں نے تمہیں میری یاد دلانا چھوڑ دی اور تم ان پر ہنستے تھے، بے شک میں نے اب آج اُن کو صلہ عطا کیا ہے اُن کی صبر و برداشت کا یقیناً وہی

---

[1] المقیامة احوال ومواطن.....وهذا معنى قول ابن عباس لما سئل عن الايتين فقال: هذا تارات يوم القيامة (مجمع البيان)

کامیاب ہیں''۔

انسو کم ذکری کا ایک مفہوم وہی ہے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ ''انہوں نے تمہیں میری یاد دلانا چھوڑ دی'' اور ایک یہ مفہوم ہے کہ ان کو بنانے اور مذاق اُڑانے کی دُھن نے تمہیں میری یاد سے بالکل غافل کر دیا۔[1]

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾

''اس نے کہا کہ تم لوگ زمین میں کتنے برس رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم ایک دن یا دو دن کے کچھ حصّہ میں رہے تو جو گننے والے ہوں ان سے پوچھ لے۔ ارشاد ہوا کہ نہیں رہے تم مگر بہت کم اگر تم جانتے۔ تو کیا تم سمجھے تھے کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا اور یہ کہ تم ہماری طرف پلٹ کر نہیں آؤ گے''؟

یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ دور کائنات میں وقفۂ حیات عنصری انسان کا کتنا مختصر ہے، پھر بھی وہ اسے اہمیت دیتا ہے اور آخرت کے دور حیات ابدی کی فکر نہیں کرتا۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿۱۱۶﴾ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

''تو بلند ہے اللہ جو حقیقی سلطنت کا مالک ہے، کوئی خدا نہیں سوا اس کے، وہ جو بزرگ مرتبہ عرش کا مالک ہے اور جو اللہ کے سوا کسی خدا کی دہائی دے جس کے لئے اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے تو اُس کا حساب کتاب بس اُس کے پروردگار کے یہاں ہوگا، بلاشبہ کفر اختیار کرنے والے دین و دنیا کی بہتری نہیں پائیں گے اور کہیے کہ اے میرے پروردگار! بخش دے اور رحم فرما اور تو سب سے اچھا رحم کرنے والا ہے''۔

اس سورہ کے آغاز و انجام میں مناسبت قابل لحاظ ہے کہ آغاز سورہ کا تھا قد افلح المؤمنون سے اور انتہا تقریباً ہو رہی ہے لایفلح الکافرون پر اس طرح مثبت اور منفی دونوں پہلو سامنے لا کر گویا موضوع کلام کو مکمل کیا گیا لیکن حسن اختتام کے لئے آخر میں پھر اہل ایمان کو دعائے مغفرت و رحمت کی تلقین کے لئے ایک آیت کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

---

[1] معناہ لتشاغلکم بالسخریۃ نسیتم ذکری (تبیان)

سُوْرَۃُ النُّوْرِ

مدنیہ..... ۶۴ .....آیات

چونکہ بعض احادیث میں خواتین کو سورۂ نور کی خاص طور پر تعلیم دینے کا حکم ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سورہ شروع سے اسی نام سے موسوم ہے، اگرچہ وہ آیت جسے آیۂ نور کہتے ہیں: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ... الخ موجودہ ترتیب کے لحاظ سے درمیان میں ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حیثیت اس سورہ میں اسی آیت کو دی گئی ہے جس کی بناء پر اس سورہ کا نام ''سورۂ نور'' ہوگیا۔ اس کے علاوہ دوسرے مضامین اس سورہ میں حسب ذیل ہیں۔

سورۂ نور کے خاص خاص مضامین:

۱.....جنسی گناہ (زنا) کی حد شرعی

۲.....تہمت زنا عائد کرنے والے کی حد شرعی۔

۳.....ثبوت کے لئے چار گواہان عادل کی شہادت عینی کی ضرورت ورنہ تہمت عائد کرنے والے پر حد شرعی جاری ہوگی۔

۴.....لعان یعنی شوہر کی طرف سے اپنی زوجہ پر الزام زنا لگانے کی صورت میں شرعی قانون۔

۵.....ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک پر اس قسم کی تہمت لگانے والوں کی مذمّت۔

۶.....ایسی غلط خبر سُن کر اس کا چرچا کرنے والوں کی شدید مذمّت۔

۷.....گھروں میں بلا اجازت داخلہ کی ممانعت۔

۸.....سلام کا حکم

۹.....اجنبی مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے پر نظر ڈالنے کی ممانعت۔

۱۰.....خواتین کے پردہ کا حکم اور اس کی اہمیت

۱۱.....نکاح کی ترغیب

۱۲.....غلام و کنیز کے مکاتبہ کا حکم

۱۳.....عبادت الٰہی کے لحاظ کے ساتھ تجارت کا حکم

۱۴.....کافروں کے اعمال کا بے کار ہونا۔

۱۵.....ہر ذی روح کی خلقت پانی سے۔

۱۶.....صاحب ایمان صالحین سے مکمل اقتدار کا وعدہ۔

۱۷.....گھر کے خاص افراد یہاں تک کے بچوں سے بھی ایک حد تک پردہ۔

۱۸.....ضعیف العمر خواتین کے برقع، چھوڑنے کی اجازت کے باوجود پردہ داری کی ضرورت۔

۱۹.....صاحبان ایمان کی شان۔

۲۰.....رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے امتیازی طور پر تعظیم واحترام کا حکم.....وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ①

''یہ ایک سورہ ہے جسے ہم اُتار رہے ہیں اور ان احکام کو نافذ کر رہے ہیں اور ہم اس میں کھلی ہوئی آیات اتار رہے ہیں کہ شاید تم نصیحت قبول کرو''۔

آیات کے ایک مجموعہ کے لئے ''سورہ'' اور سورہ کے اجزاء کے لئے ''آیات'' کی اصطلاح جو مسلمانوں میں ہے، اس کا سب سے زیادہ واضح ماخذ اس سورہ کا آغاز ہوسکتا ہے اس لئے عموماً ترجمہ انزلنا اور فرضنا اور پھر انزلنا کا جو سب ماضی کے صیغے ہیں، لوگ زمانہ گزشتہ ہی کے ساتھ کرتے ہیں [1] مگر ہم نے حال کے ساتھ کیا ہے، اس لئے کہ ہمارے خیال میں یہ ویسا ہے جیسے عقود میں نکاح کے انکحت اور قبلت اور خرید وفروخت کے لئے بعت اور اشتریت سب ماضی کے صیغے ہوتے ہیں مگر مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ اسی وقت ان الفاظ سے یہ نکاح یا بیع واقع کیا جارہا ہے یہی حیثیت ان الفاظ سے اس تنزیل اور فرض کے عمل کا آغاز ہو رہا ہے جس کا اعلان کیا جارہا ہے بے شک جہاں تک میری نظر ہے مفسرین نے اس پہلو سے تعرض نہیں کیا ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ②

''زنا کار عورت اور زنا کار مرد، ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور تمہیں اُن پر اللہ کی اطاعت میں ترس نہ آئے اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو اور ان دونوں کی سزا کے موقع پر مومنین میں سے ایک جماعت کو موجود ہونا چاہیے''۔

جنسی گناہ (زنا) کی حدِ شرعی:

یہ ''زنائے غیر محصنہ'' یعنی غیر شوہر دار عورت اور غیر صاحب زوجہ مرد کی سزا ہے۔ یہ مجرم کی سزا ہے اصلاح خلق کے لئے ضروری ہے، اس میں جذبات کو دخل دینا درست نہیں ہے، ''رحم دلی'' جو فرائض میں سدّ راہ ہو اچھی چیز نہیں ہے۔

---

[1] یہ ایک سورہ جس کو ہم نے نازل کیا، جس کو ہم نے فرض گردانا، اس میں کھلے کھلے اصول نازل کیے (مقبول ترجمہ)

بے شک وہ منظر بڑا دردناک ہوتا ہے جب ایک شخص پر کوڑے پڑ رہے ہوں، ایک جاندار جسم تکلیف سے مضطرب ہو ہو کر بے تاب ہو رہا ہے، تلوار سے گردن اُڑا دیا جانا شاید آسان ہے، نسبت اس طریقہ قتل کے جو اس تدریجی عذاب کے ساتھ ہے اور اس سے ہم محسوس کرتے ہیں کہ اسلام نے اس جنسی ظلم کو جو عزت ناموس پر ڈاکہ ڈال کر ہوتا ہے، قتلِ نفس سے زیادہ اہمیت دی ہے۔

اب کوئی یہاں رحم دلی کا مظاہرہ کرے کہ یہ تڑپ ایک آدمی کی ہم سے دیکھی نہیں جاسکتی لہٰذا ہم اس سزا کو ختم کرادیں، یا کم از کم اس موقع سے ٹل جائیں، اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں تو رحمٰن ورحیم خالق اس رحم وکرم کو پسند نہیں کرتا اور اس کے برخلاف ارشاد ہو رہا ہے کہ تمہیں اس موقع پر موجود ہونا چاہیے،

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۪ وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۳

''زنا کار مرد نہیں نکاح کرے گا سوا زنا کار یا مشرک عورت کے اور زنا کار عورت نہیں نکاح کرے گا اس سے سوا زنا کار یا مشرک کے اور ایمان والوں پر یہ چیز حرام قرار دی گئی ہے''۔

ایک قول تو تفسیر میں موجود ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے [1] اس صورت میں فقہ کے احکام پر اُس کے منطبق ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ورنہ اس آیت کی روشنی میں اگر علمائے اسلام کے فقہی نظریات پر غور کیا جائے تو سخت دشواری محسوس ہوگی، اس لئے کہ زانی اور زانیہ جن کی سزا بیان ہوئی ہے، غیر مسلم جماعت میں کے تو ہیں نہیں، ہیں تو وہ مسلمانوں ہی میں سے اور اس جرم کے بعد وہ بس فاسق ہی ہوں گے۔ کافر تو ہو نہیں جائیں گے اور ظاہر ہے کہ کسی مسلمان مرد سے مشترک عورت کا یا مسلمان عورت سے مشرک مرد کا نکاح نہیں ہوسکتا، پھر یہ کیوں کر کہا جارہا ہے کہ زانی کا نکاح زانیہ یا مشرکہ سے ہوگا اور زانیہ سے بس زانی یا مشرک نکاح کرے گا؟

ثبوتِ زنا کے لئے چار عینی گواہوں کی ضرورت، عدم ثبوت پر الزام لگانے والوں پر حد شرعی کا اجراء:

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۴ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۵

''اور وہ جو پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں، پھر اس پر چار گواہ پیش کریں تو انہیں اسّی کوڑے لگاؤ اور اُن کی کوئی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور یہ لوگ فاسق ہیں، سوا اُن کے جو اس کے بعد توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

---

[1] قال سعید بن المسیّب کان ذٰلك حکم کلّ زان وزانیة ثمّ نسخ (تبیان)

ایک خیال یہ ہے کہ یہاں سے وہ سلسلۂ آیات کا ہے جو بروایت مشہور امّ المومنین عائشہ کی پاک دامانی کے خلاف الزام لگائے جانے پر نازل ہوا، حالانکہ موجود ترتیب کے لحاظ سے اس کے بعد بلا فاصلہ ایسے احکام درج ہیں جن کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں، بہرصورت اگر یہیں سے وہ سلسلہ مانا جائے، تب بھی شان نزول کی تخصیص کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ جو احکام شرعیہ اس ذیل میں بیان ہوئے ہیں، وہ خاص محل سے متعلق ہوجائیں بلکہ اُن احکام کی نوعیت عام قوانین الٰہیہ کی ہوتی ہے جو زمان ومکان کے قیود سے بری ہوتے ہیں۔[1]

کوڑوں میں ایک قول یہ ہے کہ وہ ننگی پیٹھ پر لگیں گے لیکن ہمارے یہاں کی میں یہ ہے کہ وہ کپڑوں کے اوپر سے لگیں۔[2]

آخر میں جو استثناء ہے اس کا ظاہر یہی ہے کہ وہ صدق دل سے توبہ کرلیں تو اب وہ فاسق بھی نہیں کہلائیں گے اور اُن کی گواہی بھی قابل قبول ہوجائے گی یہی بہت سے فقہائے جمہور کے علاوہ ہمارے آئمہ طاہرین علیہم السلام کا بھی ارشاد ہے۔[3]

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

''اور جو اپنی بیویوں پر زنا کاری کا الزام لگائیں اور اُن کے پاس خود اُن کے سوا کوئی گواہ نہ ہوں تو ان میں سے کسی ایک گواہی معتبر یوں ہوگی کہ وہ اللہ کی قسم چار دفعہ کھا کر کہے وہ یقیناً سچوں میں ہے اور پانچویں دفعہ یہ کہ اللہ کی لعنت اُس پر اگر وہ جھوٹا ہو اور عورت سے حد شرعی ختم کردے گی یہ صورت کہ وہ چار دفعہ اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ وہ (مرد) یقیناً جھوٹوں میں سے ہے اور پانچویں دفعہ یہ کہ اللہ کا غضب ہو اس (عورت) پر اگر وہ (مرد) سچوں میں سے ہو''۔

لعان کی صورت اور اُس کی ترکیب:

یہ وہی چیز ہے جسے فقہ ''لِعَان'' کہتے ہیں، اس کے قرآن مجید سے جتنے احکام معلوم ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں:

(۱) مرد محکمۂ عدالت شرعی میں استغاثہ دائر کرتا ہے کہ اس کی عورت زنا کی مرتکب ہوئی ہے اس پر اس سے گواہ طلب کیے جائیں گے،

---

[1] قال سعید بن جبیر هٰذه الاٰیة نزلت فی عائشة وقال الضحاك فی نسآء المؤمنین وهوا الاولیٰ لانّه اعم فائدة وان کان یجوز ان یکون سبب نزولها فی عائشة فلا تقصر الاٰیة علیٰ سببها (تبیان)

[2] علیه ثبابه وهو قول ابی جعفر علیه السلام (تبیان)

[3] قول ابی جعفر وعلیه السلام وابی عبدالله (مجمع البیان)

وہی چار جو جرم زنا کے ثبوت کے لئے ضروری ہیں، اگر وہ کہے کہ میں خود شاہد عینی ہوں اور گواہ میرے پاس نہیں ہیں تو اس سے کہا جائے گا کہ تم اس طرح قسم کھاؤ جس کا ذکر قرآن مجید میں بالتفصیل موجود ہے۔

(۲) اگر عورت اس قسم کے بعد خاموش رہے اور کوئی اپنی صفائی پیش نہ کر سکے تو جرم ثابت ہو جائے گا اور حد شرعی جاری ہوگی۔

(۳) لیکن اگر عورت ارتکاب جرم سے انکار کرے تو پھر اُس سے اس طرح قسم لی جائے جو صراحۃً متن قرآن میں درج ہے اب اُس پر حد شرعی جاری نہ ہو سکے گی مگر اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ قرآن سے ظاہر نہیں ہوتا، جو فقہ کا مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ اب وہ عورت اس مرد پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائے گی، ان دونوں میں افتراق ہو جائے گا اور لعان کے وقت سے عدّہ کے دن گزار کر پھر وہ دوسرے جس مرد سے چاہے عقد کر سکے گی۔ [۱]

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾

''اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ کا لطف و کرم اور اس کی مہربانی اور یہ کہ اللہ ہے توبہ قبول کرنے والا صحیح کام کرنے والا''۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اسے سننے والے کی عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے، مختصر سمجھ لیجئے کہ بس غضب ہو جاتا تم ہلاکت ابدی میں گرفتار ہو جاتے، دوزخ کے عذاب میں مبتلا ہوتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ [۲]

پھر یہ لطف و کرم گزشتہ احکام سے بھی متعلق ہو سکتا ہے کہ زنا کاری کا حرام قرار دینا اور اس پر اتنی سخت سزا مقرر کرنا اور پھر اُس کا غلط الزام لگانے پر بھی ایسی ہی شدید سزا کا اعلان، یہ سب اللہ کا فضل و کرم ہے جو نہ ہوتا تو تمام جامعہ بشری جنسی بے راہ روی کی اس تباہی و ہلاکت میں مبتلا ہو جاتا جس کا مشاہدہ آج بھی اپنی آنکھوں سے ان قوموں میں کیا جا سکتا ہے جہاں یہ احکام نہیں ہیں۔ [۳]

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱﴾

''بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے بدکاری کی جھوٹی تہمت لگائی، وہ تم ہی میں سے ایک جماعت ہے، اسے تم لوگ اپنے لئے برا نہ سمجھو بلکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہے، ہر آدمی کے لئے ان میں سے وہ ہے جتنا اس نے گناہ کیا اور جو اُس کے بڑے حصّہ کا ذمہ دار ہے اُن میں سے، اس کے لئے بہت بڑی سزا ہے''۔

---

[۱] لا تحلّ له ابدا و كان عليها العدّة من وقت لعانها (مجمع البيان)

[۲] لولا فضل الله عليكم و رحمة لفضحكم بما تر كبون من الفاحشة و اما جلكم بالعقوبة و اهلكتم و ما يجرى مجراه (تبيان)

[۳] جواب لولا محذوف و تقديره لولا فضل الله عليكم بالنّهى عليكم بالنّهى عن الزنا و الفواحش و اقامة الاحدود لتهالك لناس ولفدا النسل و انقطع الانساب (مجمع البيان)

واقعہ ''افک'' اور اس قسم کی تہمت لگانے والوں کی مذمّت:

یہاں سے سلسلہ شروع ہوتا ہے ان آیات کا جو امّہات المومنین یعنی ازدواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے کسی خاتون کی پاک دامانی کے خلاف تہمت لگائے جانے کے واقعہ سے متعلق ہے۔

جمہور کی روایت یہ ہے کہ وہ خاتون جناب عائشہؓ تھیں اور یہ آیات انہی کی نسبت واقعہ افک سے متعلق ہیں مگر ایک شیعہ تفسیر جس کی تائید میں معصوم علیہ السلام سے روایت بھی ہے یہ ہے کہ ان آیات کا تعلق جناب ماریہؓ قبطیہ سے ہے اور الزام لگانے والی شخصیت جناب عائشہؓ کی تھی [1] پھر بھی زیادہ تر شیعہ مفسرین اس بارے میں جمہور ہی کے ہم آواز ہیں اور اس کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی میں جناب عائشہؓ رفع حاجت کے لئے اونٹ سے اتری تھیں، وہاں اُن کے گلے کا ہار گر گیا جس کی تلاش میں ذرا دیر لگی، قافلہ والوں کو اس کی خبر نہ تھی، قافلہ روانہ ہو گیا، اب جو وہ ہار لے کر واپس آئیں تو قافلہ جا چکا تھا، اتفاق سے صفوانؓ بن معطل سلمی ایک صحابی بھی پیچھے رہ گئے تھے، انہوں نے جناب عائشہؓ کو حیران و پریشان دیکھا تو انہیں اپنے اونٹ پر سوار کر لیا اور جب کہ قافلہ دوپہر کے آرام کے لئے ایک منزل پر ٹھہرا تھا، وہ جناب معظّمہ کو لے کر وہاں پہنچ گئے، یہ قصّہ محدث زہری نے خود جناب عائشہؓ کی زبانی بیان کیا ہے جسے جناب شیخ الطائفہؒ نے بھی تبیان میں درج کیا ہے اور اس سب کو علامہ طبرسیؒ نے بھی مجمع البیان میں دہرایا ہے۔

اس روئداد کی بنا پر منافقین نے تہمت کا پہاڑ کھڑا کر دیا مگر یہ منافقین فقط عبداللہ بن ابی وغیرہ تھوڑی تھے، ان میں ایسے صحابہ بھی تھے جو جنگ بدر میں شریک ہو چکے تھے جیسے مسطح بن اثاثہ اور ان میں جناب حسان بن ثابت بھی ہیں۔ یہ سب افراد وہ ہیں جنہیں قرآن مجید۔ عذاب عظیم کا مستوجب بتا رہا ہے۔

اب یہ دو روایتیں موجود ضرور ہیں مگر انصاف کا فیصلہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ بہت بڑا جرگہ ہے جسے متنبہ کیا جا رہا ہے اور یہ اسی مشہور روایت پر منطبق ہے نہ کہ کسی گھریلو واقعہ پر جس میں ایک بیوی نے دوسری بیوی پر الزام لگایا ہو۔

اس لئے اس محل پر ہم تفسیر قمی کی روایت کو جسے انہوں نے تمام فرقۂ شیعوں کی طرف منسوب کیا ہے اور حدیث معصوم علیہ السلام کا حوالہ دیا ہے قبول کرنے سے قاصر ہیں۔

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ⑫

''کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم لوگوں نے اسے سنا تو با ایمان مرد اور با ایمان عورتیں اپنوں کی نسبت اچھا ہی گمان رکھتے اور کہتے کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے''۔

---

[1] ان العامة رووا انّها نزلت فی عائشه .....واما الخاصة فانّهم رو واانّها نزلت فی مارية لقبطية وما رمتهابه عائشه (علی بن ابراهيم)

ایسی خبر کو سُن کر اس کا چرچا کرنے والوں کی سرزنش:

یہ حکم کسی شخصی خصوصیت کا حامل نہیں ہے بلکہ ایک عام اصول ہے یعنی عوام کا رجحان تو یہ ہے کہ چاہے نیکی کے کتنے ہی مشاہدے کسی سے ہو چکے ہوں مگر ایک بدکاری کی خبر اگر اڑتی ہوئی کسی کے متعلق سُنی تو بس اس کے چرچے کرنے لگے، ایسے وثوق کے انداز میں جیسے کہ وہ مشاہدہ ہے قرآن کہتا ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے بلکہ کسی کی نیکی پر اپنے اعتماد کو مضبوط رکھنا چاہیے اور اُس اعتماد کی بنا پر ایسی خبروں کو جھٹلانا چاہیے جو اُس کی نیکی کو مجروح بناتی ہیں۔

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾

''کیوں نہیں لائے وہ اس پر چار گواہ اب جب گواہ نہیں لائے تو اللہ کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں''۔

گواہوں کے نہ لانے پر جو جھوٹے ہونے کا اعلان ہے، وہ کسی واقعیت کا اظہار نہیں ہے اور عنداللہ کے معنی علم الٰہی کے نہیں ہے، وہ اس لئے کہ گواہ کا نہ لاسکنا اس دعوے کے واقعی غلط ہونے کی دلیل نہیں ہوتا اور علم الٰہی کسی گواہی سے وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ حکماً جھوٹا ہونا ہے اور عنداللہ کا مطلب یہ ہے کہ قانون خداوندی کے لحاظ سے وہ جھوٹے ہیں یعنی جو جھوٹے الزام لگانے کی سزا ہے، اُس کے یہ مستحق ہیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾

''اور اگر اللہ کا فضل و کرم تم پر نہ ہوتا اور اُس کی رحمت دنیا اور آخرت میں تو جس بارے میں تم نے چرچا کیا، اُس میں تم پر عذاب آجاتا جب کہ تم اُس حکایت کو اپنی زبانوں پر لا رہے تھے اور اپنے منہ سے کہہ رہے تھے وہ بات جس کا تمہیں خود علم نہیں ہے اور تم اُسے بڑی معمولی چیز سمجھ رہے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات تھی''۔

یعنی عام لوگ غیبت کو تفریح طبع کے طور پر معمولی کام سمجھ کر کرتے ہیں اور اس طرح افواہی الزاموں کا ایک دوسرے سے چرچے کرنے کو وقت گزاری کا دلچسپ مشغلہ سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اس وقت ایک ''گناہ کبیرہ'' کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں جو شاید زنا سے کم نہ ہو۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ ﴿۱۷﴾ وَيُبَيِّنُ

اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۸﴾

''اور کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم نے اسے سنا تو کہتے کہ ہمیں زیبا نہیں کہ یہ بات زبان سے نکالیں حاشا وکلّا یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تمہیں سمجھاتا ہے کہ اب دوبارہ کبھی ایسی بات نہ کرنا تم باایمان ہو، اور اللہ تمہارے لئے اپنی باتیں صاف صاف پیش کرتا ہے اور اللہ جاننے والا ہے بڑی سوجھ بوجھ والا''۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾

''بلاشبہ وہ جو چاہتے ہیں کہ بدکاری کی مسلمانوں کی جماعت میں اشاعت ہو، اُن کے لئے دنیا اور آخرت میں درد ناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم جانتے نہیں ہو''۔

''بدکاری کی اشاعت کے یہ معنی ہوتو سکتے ہیں کہ یہ کام عوام میں پھیل جائے یعنی کثرت سے لوگ اس کا ارتکاب کرنے لگیں جیسا کہ بعض مترجمین نے یہی ترجمہ کیا ہے [۱] مگر بقرینۂ مقام اس کے معنی اس چرچے اور ذکر کی اشاعت کے معلوم ہوتے ہیں چنانچہ حدیث بھی اس کی مؤید ہے [۲] اور ہمارے معتبر مفسرین نے یہی تشریح کی ہے۔ [۳]

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾

''اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل وکرم تم پر اور اُس کی رحمت اور یہ کہ اللہ بڑا شفیق ہے، مہربان''! یعنی تم خود سمجھ لو کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو نتیجہ کیا ہوتا یعنی عذاب آجاتا یا نہیں؟

میں تو اسے سوالیہ انداز میں پڑھ کر لفظاً اس کے لئے جزا کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا مگر نحویین کو ترکیب بنانے کے لئے جزا کو مخذوف ماننا پڑتا ہے اس لئے مترجمین کو بھی اکثر اس کا تتبع کرنا پڑا ہے، وہ بریکٹ میں لکھ کر سہی [۴] اور مفسرین بھی کہہ دیتے ہیں کہ جزاء مخذوف ہے۔ [۵]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ

---

[۱] ایمان لانے والوں میں بے حیائی کی باتیں رائج ہوں (مولوی مقبول احمد صاحب)

[۲] عن هشام عن ابی عبدالله قال من قال فی مؤمن ما رایت عیناه وما سمعت اذفاه کان من الذین قال الله فیهم: انّ الذین یحبون ان تشیع الفاحشه الخ (علی بن ابراهیم)

[۳] ان تشیع الفاحشة ان یفشو ویظهر والزّنا والقبائح فی النّاس اٰمنوا بانّ یسبوها الیهم ویقذفوهم بها (مجمع البیان)

[۴] اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو وہ تم پر جلد عذاب نازل کرتا) مقبول ترجمہ

[۵] لعاجلکم بالعقوبة.....وجواب لولا محذوف لدلالة الکلام علیه (جمع البیان)

مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

''اے ایمان لانے والو! قدم بقدم نہ چلو اور جو شیطان کے قدم بقدم چلے گا تو وہ بلاشبہ شرم ناک کام اور برائی کے لئے کہتا ہے اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل و کرم تم پر اور اُس کی رحمت تو تم میں سے ایک بھی کبھی پاک وصاف نہ رہتا مگر اللہ جسے چاہتا ہے، اس کے نفس کو پاک رکھتا ہے اور اللہ سننے والا، بڑا جاننے والا''۔

دوسروں کی بدگوئی میں ایک جذبہ اپنے حسن عمل کے پندار کا نمایاں ہوتا ہے۔ اس آیت میں اُسے ختم کیا جارہا ہے یعنی راہ نیک پر استقامت میں اکثر شرائط ومقتضیات معصیت کے فقدان اور موانع کے سدّ راہ ہونے کا بھی دخل ہوتا ہے جو خالق کی طرف سے ایک توفیق ہوتی ہے، لہٰذا انسان کو اس پر نازاں نہ ہونا چاہیے کہ ہم اس معصیت سے بری ہیں، کیا معلوم کہ اسے بھی خراب ماحول ملتا اور توفیقِ رب شامل نہ ہوتی تو یہ بھی کیسے کیسے جرائم کا ارتکاب کرتا اس لئے کہ کسی دوسرے کو مبتلائے گناہ دیکھ کر اسے اچھالنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ خود اسے مناسب انداز میں نصیحت کرنا چاہیے اور خدا سے دعا کرنا چاہیے کہ وہ توفیق خیر اُس کے شامل حال فرمائے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نیکی اور بدی دونوں صرف خدا کی جانب سے ہیں اور انسان کی قوت ارادی کچھ ہے ہی نہیں، اگر ایسا ہوتا تو امر بالمعروف اور نہی المنکر کا نظام ہی نہ ہوتا اور برے کو اُس کی برائی پر تنبیہ بھی درست نہ ہوتی اور سزا بھی حق بجانب نہ پڑتی۔

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾

''اور قسم نہیں کھانا چاہیے [1] تم میں سے اُنہیں جن کو اللہ نے مال و دولت کی فراوانی اور گنجائش عطا کی ہے اس بارے میں کہ وہ دیں صاحبان قرابت اور عزیزوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو اور چاہیے کہ وہ معاف کردیں اور درگزر سے کام لیں، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں بخش دے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

اہل سنت کی مشہور روایت کے مطابق گذشتہ آیات کی شان نزول کے تناسب سے اس آیات کا تعلق ایک ایسے شخص سے لیا گیا ہے جس نے جناب عائشہؓ پر تہمت لگانے اور اس کا چرچا کرنے میں حصّہ لیا تھا، حالانکہ حضرت ابوبکرؓ اس شخص کی کفالت کرتے تھے اس واقعہ کے بعد انہوں نے عہد کرلیا کہ اب میں اس شخص کے ساتھ کوئی سلوک نہ کروں گا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور متنبہ کیا گیا کہ کسی غلطی پر بھی مستطیع افراد کو یہ نہیں چاہیے کہ غربا کے ساتھ حسن سلوک ترک کردیں۔

علامہ طبرسیؒ نے ان صاحب کا نام مسطح لکھا ہے جو اہل بدر میں سے تھے اور اسی ذیل میں قدیم معتزلی عالم جبائی کا تبصرہ درج کیا ہے کہ

---

[1] لایتلاء القسم (تبیان) نہ قسم کھا بیٹھیں (تاج العلماء)

اس سے ثابت ہوتا کہ بدر والے صحابہ بھی گناہوں سے بری نہ تھے۔[1]

ہمارے یہاں کی ایک قدیم تفسیر ایسا ظاہر کرتی ہے کہ یہ آیت مستقل حیثیت رکھتی ہے گزشتہ واقعہ سے مرتبط نہیں ہے اور اس میں صاحبان قرابت سے مراد وہی قرابت داران رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جنہیں آیت خمس میں ذوی القربیٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔[2]

جناب شیخ الطائفہؒ نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ وہ ایک عام حکم ہے مال دار لوگ کسی وجہ سے خفا ہو کر غرباء پر حسن سلوک ترک کرنے کی قسم نہ کھالیا کریں۔[3]

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٤﴾ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ﴿٢٥﴾

''وہ جو تہمت لگاتے ہیں پاک دامن، بے خبر، با ایمان خواتین کو، ان پر لعنت ہے دنیا اور آخرت میں اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے، جس دن ان کے خلاف گواہی دیں گی خود ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیر ان تمام کاموں کے متعلق جو وہ کرتے تھے، اس دن اللہ ان کی پوری پوری جزاء سزا انہیں پہنچائے گا اور انہیں معلوم ہوگا کہ اللہ ہی وہ حق ہے جو روشن و نمایاں ہے''۔

اس قرآنی لعنت والی آیت کو پڑھتے وقت یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ افراد جن پر لعنت ہو رہی ہے، صحابہ ہی کی معزز جماعت میں ہیں اور معمولی صحابی نہیں بلکہ ان میں سے بعض مہاجرین ہیں اور بعض اہل بدر، اس کے بعد بھی قرآن نہ صرف یہ کہ لعنت کر رہا ہے بلکہ صراحۃً روز قیامت کے عذاب کی اطلاع بھی دے رہا ہے۔ اگر اہل بدر کا مغفور ہونا کوئی قطعی فیصلہ ہوتا تو اس عذاب کی اطلاع کے کوئی معنی نہ تھے۔

اس نتیجہ سے بچنے کی بس ایک ترکیب ہے اور وہ یہ کہ ان بعد والی آیات کو قصّہ افک سے متعلق نہ لیا جائے بلکہ یہ سمجھا جائے کہ یہ علیحدہ آیات ہیں جو عمومی طور پر تہمت زنا عائد کرنے والوں سے متعلق ہیں، جیسا کہ ہمارے علماء ہیں امین الاسلام طبرسیؒ کا رجحان معلوم ہوتا ہے[4] اور

---

[1] قال الجبائی فی قصّة مسطح دلالة علیٰ انّه قد یجوز ان یقع المعاصی ممن شهد بدرا (مجمع البیان)

[2] هم قرابة رسول الله ﷺ (علی بن ابراهیم)

[3] قال قوم هٰذا نهی عام لجمیع اولی الفضل والسّعة ان یحلفوا الّا یؤتوا اولی القربیٰ والمساکین و الفقراء وهو اولیٰ واتمّ فائدة (تبیان)

[4] بدأ سبحانه فبیّن حکم القاذف اوّلا واوجب علیه الحدّ وردّ شهادته ثم عقبة بحدیث الافك اللتصاله به ثم ذکر صنفا اٰخر من القذفة وهم المنافقون بقوله: انّ الّذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الّذین اٰمنوا وبین ما لهم من الغضب واللعنة ثم عم الجمیع بالوعید فی قوله: ان الّذین یرمون المحصنات الغافلات (مجمع البیان)

مجھے بھی اس کے ماننے میں کوئی عذر نہیں ہے مگر اس صورت میں پھر اس میں ان افراد کے لئے جن کی نسبت تہمت لگائی جاتی ہے جو مدحیہ الفاظ ہیں المحصنٰت الغافلات المؤمنات ان سب کو بھی اس واقعہ سے متعلق افراد پر منطبق کرنا درست نہ ہوگا۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾

''ناپاک باتیں ناپاک لوگوں کے لئے ہوتی ہیں اور ناپاک آدمی ناپاک باتوں کے لئے اور صاف ستھری باتیں صاف ستھرے آدمیوں کے لئے ہوتی ہیں اور صاف ستھرے آدمی صاف ستھری باتوں کے لئے یہ لوگ بری ہوتے ہیں اس سے جو وہ لوگ کہتے ہیں، اُن کے لئے بخشش ہے اور عزّت دار روزی''۔

عربی زبان میں خصائل و عادات اور اوصاف کے لئے مؤنث ضمیریں اور موصوف اشخاص کے لئے مذکر ضمیریں استعمال ہوتی ہیں جیسا کہ متنبی شاعر نے بھی کہا ہے:

انّ الکرائم کفّوها الکرمأ: شریفانہ اوصاف کے لئے شریف لوگ ہی ہوتے ہیں''۔

اس بنا پر بہت سے مفسرین اہل سنّت نے بھی اس آیت میں خبیثات اور طیّبات کے معنی بری اور اچھی باتیں اور خبیثین اور طیبین کے معنی برے اور اچھے آدمیوں کے لئے ہیں اور اس طرح مطلب آیت کا یہ ہوتا ہے کہ یہ بدگوئی اور اتہام اور پاک دامن افراد کی نسبت بدکاری کی حکایات کو شہرت دینا خبیث ہی افراد کا شیوہ ہوسکتا ہے، اچھے آدمی اس قسم کی حرکتوں سے بری ہوتے ہیں لیکن بعض اہل سنت نے ان مؤنث اور مذکر لفظوں سے فائدہ اٹھا کر اس کے معنی یہ قرار دیے ہیں کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے، اس طرح انہوں نے بلا استثناء تمام ازواجِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضلیت کا ایک پہلو پیدا کیا ہے۔

چونکہ اس کا ظاہری مفہوم قطعی طور پر واقعیت کے خلاف ہے جس کی مثال تمام مسلمانوں میں متفق علیہ اور بنصّ قرآن ثابت شدہ زوجۂ نوح علیہ السلام اور زوجۂ لوط علیہ السلام اور دوسری طرف آسیہؑ زوجۂ فرعون کی شکل میں موجود ہے اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض ازواج کو شیعہ ممدوح نہیں سمجھتے اس لئے علمائے شیعہ کو اس کا جواب دینے کی ضرورت پڑی ہے چنانچہ جناب تاج العلماءؒ نے اس آیت سے متعلق حاشیہ میں لکھا ہے: ''یعنی شایان یہی ہے اگرچہ اتفاق سے کبھی ایسا نہ ہو جیسے فرعون کو آسیہؑ ملی یا حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی ان کی بیویاں اور عائشہ اور حفصہ ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گلے منڈھی گئیں''۔

ہمارے نزدیک اوّل تو جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے مؤنث اور مذکر کے الفاظ سے عورت اور مرد کا سمجھنا ہی ضروری نہیں ہے، پھر اگر ایسا ہو

بھی جیسا کہ علامہ طبرسیؒ نے اس کی روایت، ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف بھی منسوب بتائی ہے [1] تو جس طرح کا الزام یہاں محل بحث ہے یعنی جنسی جرم کا ارتکاب، اس سے ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاک ہونے پر جب علمائے شیعہ بھی متفق ہیں کیوں کہ اس طرح کے جرمِ ناموس سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزّت پر حرف آتا ہے تو پھر اضافی طور پر اس پاکیزگی کے قبول کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟ لیکن اس سے زندگی کے تمام شعبوں اور ایمان اور عمل کے تمام پہلوؤں میں ان کی بلندی و رفعت کسی کے نزدیک بھی ثابت نہیں ہے، ورنہ تمام مسلمانوں کو بلا استثناء ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معصوم ماننا چاہیے جس کا میرے علم میں کوئی بھی قائل نہیں ہے لہٰذا کلی پاکیزگی جس سے یہ آیت آیۂ تطہیر بن جائے اہل سنت کے نزدیک بھی ثابت نہیں اور جزئی پاکیزگی یعنی ایک خاص جرم سے برأت شیعوں کو بھی تسلیم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۷ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۲۸

''اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت حاصل نہ کر لو اور سلام نہ کر لو اس کے رہنے والوں کو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے، شاید کہ تم نصیحت قبول کرو، تو اگر اُن میں کسی آدمی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو اُن میں جب تک کہ تمہیں اجازت نہ مل جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہ تمہارے اخلاق کی درستی کا زیادہ ثبوت ہوگا اور اللہ اُن کاموں کو جو تم کرتے ہو جاننے والا ہے''۔

گھروں میں بلا اجازت داخل ہونے کی ممانعت اور اسلام کا حکم:

ان آیت میں اہل خانہ کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں داخلہ کو منع کیا ہے اور اسے اخلاق کے منافی قرار دیا ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝۲۹

''تمہارے لئے کوئی حرج نہیں ہے کہ تم داخل ہوا ایسے مکانات میں جن میں کوئی بود و باش نہیں رکھتا ہو جس میں تمہارے فائدہ کا کوئی سامان ہے اور اللہ جانتا ہے اُسے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو''۔ ''غیر مسکونۃ'' کی تشریحات مختلف ہوئی ہیں جیسے سفر کے راستوں میں مسافروں کے لئے سرائیں ہوتی ہیں یا ایسے کھنڈر میں جن میں ایسا انسان رفع حاجت کے لئے جانا چاہتے ہیں یا تجارتی مراکز جن میں لوگوں کی خریداری کے لئے سامان ہوتا ہے

---

[1] ھو المروی عن ابی جعفر و ابی عبداللہ علیہما السّلام (مجمع البیان)

لیکن بہتر یہ ہے کہ الفاظ قرآنی کے عموم کا جو تقاضا ہے، اسے باقی رکھا جائے اور ان تمام چیزوں کو اس میں داخل سمجھا جائے۔

چونکہ اجازت لینے کا حکم اس خطرہ سے ہے کہ وہاں کوئی نامحرم ہو جس کی ہمارے بے دھڑک چلے جانے سے بے پردگی ہوتی ہو۔ ان مقامات پر یہ خطرہ نہیں ہے لہٰذا اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں۔ [1]

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿۳۰﴾

''ایمان لائے ہوئے مردوں سے کہیے کہ وہ ذرا بند رکھیں اپنی آنکھیں اور بچائے رہیں اپنے اعضائے پوشیدہ۔ یہ اُن کے اخلاق کی درستی کا زیادہ ثبوت ہے، یقیناً اللہ باخبر ہے اس سے جو وہ کرتے ہیں''۔

اجنبی مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے پر نظر ڈالنے کی ممانعت:

''ذرا بند رکھیں''، یعنی نامحرم اشخاص یا نہ دیکھنے کے لائق اعضاء یا فحش مناظر سے نگاہ الگ رکھیں [2] ورنہ آنکھیں کھلی رکھنے کے لئے عطا ہوئی ہیں، بند رکھنے کے لئے نہیں۔

اعضائے پوشیدہ کے بچائے رکھنے کا مفہوم دوسرے مقامات پر تو زنا کاری سے پرہیز ہے مگر یہاں حدیث معصوم علیہ السلام بتاتی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان اعضاء کو نگاہ خلق سے بچانا لازم ہے جس سے ستر عورتیں کا وجوب مستفاد ہوتا ہے جو مرد اور عورت دونوں کے لئے اسلام کا ایک ضروری حکم ہے [3] اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا مفہوم عام لیا جائے جس میں دونوں باتیں داخل ہو جائیں، حرام کاری سے بچنا بھی اور ان اعضاء کو نگاہ اغیار سے بچانا بھی۔ [4]

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِيْنَ

---

[1] قال قوم هی جمیع ذٰلك حملوه علیٰ عمومه لانّ الاستئذان انّما جاء لئلّا یهجم علیٰ مالا یجوز من العورة وهوا الاقوٰی لانّه اعمّ فائدة (تبیان) الاولیٰ حمله علی الجمیع (مجمع البیان)

[2] عن عورات انسآء وما یحرم النّظر الیه (تبیان)

[3] عن ابی بصیر عن ابی عبدالله قال کلّ ایة فی القراٰن فی ذکر الفروج فهو من الزّنا الّا هٰذه الایة فانّها من النظر ولا یحل لرجل مؤمن ان ینظر الیٰ فرج اخیه ولا یحلّ للمرأة ان ینظر الیٰ فرج اختها (علی بن ابراهیم)

[4] عن الحرام وعن ابدائها حیث تریٰ (تبیان)

زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

''اور ایمان والی عورتوں سے کہیے کہ اپنی نگاہوں کو ذرا بند رکھیں اور اپنے پوشیدہ اعضائے کی حفاظت کریں اور اپنے بناؤ سنوار کو ظاہر نہ کریں سوا اُس کے جو اوپر سے نمایاں ہو اور چاہیے کہ اپنی اوڑھنیوں کو لٹکا کر گریبان پر ڈال لیں اور اپنے بناؤ سنوار کو ظاہر نہ کریں کسی پر سوا اپنے شوہروں یا اپنے باپ داداؤں یا اپنے شوہروں کے باپ داداؤں یا اپنی اولاد..... یا اپنے شوہروں کی اولاد یا اپنے (نسبی) بھائیوں یا اپنے بھتیجوں یا اپنے بھانجوں یا اپنی عورتوں یا اپنے اُن غلاموں اور اُن نوکر چاکر مردوں کے جن میں جنسی خواہش باقی نہیں رہی ہے یا ان بچوں کے جو عورتوں کے پوشیدہ خصوصیات سے واقف نہیں ہیں، اور اپنے پیر نہ ماریں کہ جو بناؤ سنوار وہ چھپائے ہوئے ہیں، معلوم ہو اور تم سب اے اہل ایمان! اللہ سے لو لگاؤ، شاید تم دین و دنیا کی بہتری حاصل کرو''۔

خواتین کے پردہ کا حکم اور اس کی اہمیت:

قبل کی آیت میں جو مردوں سے متعلق تھی اور اس آیت میں جو عورتوں سے متعلق ہے، دو حکم مشترک ہیں: ایک غض بصر یعنی آنکھوں کو ذرا بند رکھنا جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مردوں کو غیر عورت پر نظر کرنا ناجائز ہے، اسی طرح عورت کو غیر مرد پر بالکل یکساں صورت ہے مگر افسوس ہے کہ پردہ دار خواتین بھی جواب دنیا میں بڑی اقلیت کی شکل میں ہیں، انہیں بھی پہلے حکم کا احساس ہے کہ غیر مرد کی نظر ہم پر نہ پڑے اور غیر مرد اگر عورت کو دیکھے تو وہ قابل اعتراض ہے لیکن وہ خود غیر مردوں پر نظر کریں اسے وہ اپنے لئے قابل اعتراض بات نہیں سمجھتیں یہ تفریق از روئے قرآن بالکل غلط ہے۔

دوسرے حفظ فروج یعنی جنسی گناہ سے پرہیز یا نظر اجانب سے محفوظ رکھنا یا دونوں باتیں، اس میں بھی مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے جس طرح مردوں کے لئے ایک دوسرے کے سامنے بالکل برہنہ ہونا یا دوسرے کو برہنہ دیکھنا اسلام میں ممنوع ہے، اسی طرح عورت کے لئے یہ حکم ہے۔

اس میں استثنائی صورت وہی حالت اضطرار کی ہے اور اضطرار کے نتیجہ میں جو حکم ہو، وہ مقدار ضرورت پر منحصر ہوتا ہے لہٰذا ناگزیر علاج یا

بچہ کی ولادت کے موقع پر استثناء ہوگا تو صرف اس لیڈی ڈاکٹر قابلہ کا جو معالج ہے۔ ان حالتوں میں وسعت کی کوئی گنجائش شرعاً نہیں ہے مگر غالباً خواتین کے طبقہ میں اس پر بھی عمل پورے طور پر نہیں ہے۔

قرآن مجید کا حکم جو ''حفظ فروج'' کی لفظوں کے ساتھ ہے، اس جدید طریقہ کو بھی حرام قرار دیتا ہے جو ٹیوب سے کسی معلوم یا لامعلوم مرد کے نطفہ کے داخل کرنے کا ہے، اس طریقہ سے بھی شوہر کے سوا کسی شخص کا نطفہ داخل کرنا جائز نہیں ہے۔

ان دونوں مرد اور عورت میں مشترک پابندیوں کے علاوہ مزید حکم عورتوں کے لئے پردہ کا ہے جس میں مکاتب فقہیہ کے اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کتنا ہی استثناء کیا جائے مگر وہ اُس بے پردگی کے ساتھ ہرگز نہیں دے سکتا جو تہذیب جدید کے نتیجہ میں دنیا کے اندر پھیلی ہوئی ہے۔

اس آیت میں جو حکم پردہ ہے اس کے حدود پر مکمل بحث کے لئے ہماری کتاب ''اثبات پردہ'' دیکھنے کی ضرورت ہے۔

''پیر نہ ماریں'' اس کے ایک معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ زمین پر پیر زور سے رکھنے کی ممانعت ہے جس سے پازیب وغیرہ کی جھنکار دوسروں کے کان تک جاتی ہے اور ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد ایک پیر کا دوسرے پیر پر مار کے چلنا ہے جس سے خاص طور پر جھنکار پیدا ہو۔[1]

ایک تصور یہ بھی گوش زد ہوا ہے کہ اس سے مقصود ناچ کی ممانعت ہے کیوں کہ اُس کا پیروں کے زمین پر مارنے سے تعلق ہے مگر اس صورت میں آخری فقرہ کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ ناچ تو بذات خود ممنوع ہے، اُس کی ممانعت اس بنا پر نہیں ہے کہ پیروں کے زیور کی جھنکار باہر جائے گی، یہ کہنا کہ لیعلم ما یخفین من زینتھن ''کہ جو بناؤ سنگار وہ چھپائے ہوئے ہیں، معلوم ہو'' بتلاتا ہے کہ وہ پیروں کا زمین پر مارنا یا ایک پیر کا دوسرے سے ٹکرانا بذات خود ممنوع نہیں ہے بلکہ اس بنا پر ممانعت ہو رہی ہے کہ چھپے ہوئے زیور کی آواز دوسروں کے کانوں تک نہ جائے اور اسے ضمنی طور پر لازماً یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ خود خلخال (پازیب یا چھاگل) پر نظر نامحرموں کی نہ پڑنا چاہیے[2] اور اس سے دل چاہے تو یہ نتیجہ نکالئے کہ پھر خود پیروں کا اور جسم کے دیگر حصّوں کا نامحرموں کی نگاہوں کا مرکز بننا کیوں کر درست ہوسکتا ہے؟!

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾

''اور شادی کرو بے شوہر عورتوں اور نیک چلن اشخاص کی اپنے غلاموں اور کنیزوں میں سے۔ اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ اپنے فضل وکرم سے انہیں مالدار بنادے گا اور اللہ گنجائش والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

نکاح کی ترغیب:

ہماری زبان میں جتنے الفاظ ہیں جیسے ''کنواری'' اور ''بن بیاہی'' یا ''غیر شادی شدہ'' وہ اُس وسعت کے حامی نہیں ہیں جو عربی

---

[1] لا تضرب احدی رجلیھا بالاخریٰ لیقرع الخلخال بالخلخال (علی بن ابراھیم)

[2] معناہ لا تضرب امرأۃ برجلھا لیعلم صوت الخلخال فی رجلھا کما کان یفعلھا نساء اھل الجاھلیۃ وذٰلك یدلّ علیٰ انّ اظھار الخلخال لا یجوز (تبیان)

میں ''ایامیٰ'' کی لفظ کو حاصل ہے، اس میں کنواری لڑکیاں بھی داخل ہیں اور بیوہ عورتیں بھی۔ اردو محاورہ کی اس تنگی کی وجہ سے ہمیں ترجمہ میں ایک ''محاورہ سے خارج'' لفظ ''بے شوہر'' کا استعمال کرنا پڑا تا کہ اس کی وسعت ''عقد بیوگان'' کے حکم کو ظاہر کر سکے۔[1]

اس وسعت کے پیش نظر آیت کا مفاد یہ ہو گیا کہ صنف اناث میں کسی فرد کو بلا شوہر نہیں رہنا چاہیے۔ اب جو چیز ہمارے عمومی تصوّرات میں نکاح سے سدّ راہ ہوتی ہے وہ لڑکی کے عقد میں خود اس کا بے روزگار ہونا۔ قرآن کہتا ہے کہ اسے بالکل نہیں سوچنا چاہیے بلکہ اسے خدا پر چھوڑنا چاہیے، وہ اس وقت اگر محتاج ہیں تو اللہ اپنے فضل و کرم سے اُنہیں غنی کر دے گا مگر کیا کیا جائے کہ ہم آج اُس توکّل کے جوہر سے محروم ہیں۔ اس لئے قرآن کی اس تنبیہ کے باوجود ان اسباب ظاہری کو ضرور دیکھتے ہیں جس سے شاید کوئی مستثنیٰ نہ ہو لیکن حدیث میں وارد ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ بد گمانی اور اس پر بے اعتمادی ہے[2] نعوذ باللہ من ذٰلك۔

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۳﴾

''اور ضبط نفس سے کام لینا چاہیے اُنہیں جن کے لئے شادی کا موقع نہ ہو، یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل و کرم سے انہیں وسعت عطا فرمائے اور جو تمہارے مملوکہ غلاموں کنیزوں میں بالمعاوضہ آزادی کا معاہدہ چاہیں یا اُن کے ساتھ معاوضہ لے کر آزاد کرنے کا معاہدہ کر لو، اگر جانوں اُن میں کسی طرح کی بھلائی اور اُنہیں ہیں کچھ عطا کرو اللہ کی طرف کے مال سے جو اس نے تمہیں دیا ہے اور اپنی جو کنیزوں کو اگر وہ اپنے کو محفوظ رکھنا چاہتی ہیں، بدکاری پر مجبور نہ کرو، صرف اس لئے کہ تم کچھ دنیوی زندگی کا سامان حاصل کرو اور جو کوئی زبردستی کرے گا اُن پر تو اللہ اُن کے مجبور کیے جانے کے بعد بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

غلام و کنیز کے مکاتبہ کا حکم:

اس آیت میں ایک ساتھ کئی احکام کا ذکر ہے:

پہلے یہ کہ اگر کسی شخص کے لئے ایسا امکان نہیں ہے کہ وہ شادی کرے تو اسے ضبط نفس سے کام لینے کی ضرورت ہے اور ایسا نہ ہونا چاہیے

---

[1] ''جمع ایم'' وھی المرأۃ التی لازوج لھا سواء کانت بکرا اوشیّبا (تبیان)

[2] قال ابو عبداللہ من ترائی التزویج مخافۃ العلیۃ اسآء الظنّ برتبہ یقول سبحانہ : ان یکونو افقرآء یعنھم اللہ من فضلہ (مجمع البیان)

کہ اپنی خواہش نفس کی تسلّی کیلئے حرام ذرائع اختیار کرے۔

ضبطِ نفس اور حرام کاری سے پرہیز ہی وہ ''عفت'' ہے جس کے لئے خالق کا مطالبہ ہے۔

دوسرے مکاتبہ کا حکم جو اس دور کے لئے تھا جب غلام اور کنیز ہوا کرتے تھے، اس کے احکام کی تفصیل کتب فقہیہ میں مذکور ہے۔

تیسرا حکم، اس دور حالات کے لحاظ سے اس کا پس منظر یہ تھا کہ بعض اشخاص اپنی کنیزوں سے طوائف کا پیشہ کراتے تھے تا کہ ان کی کمائی سے خود فائدہ اٹھائیں۔ انہیں منع کیا گیا ہے کہ یہ تمہارا عمل ناروا ہے۔

اب کنیزیں نہیں ہیں تو ایسے اشخاص ہو سکتے ہیں جو اپنے زیر اثر یا زیر پرورش لڑکیوں سے یہ ناروا کام کرائیں، وہ آیت کے اس حکم میں داخل ہیں۔

اس حکم کے ذیل میں تفسیری لحاظ سے تشریح طلب یہ فقرہ ہے کہ ''اگر وہ محفوظ رہنا چاہتی ہیں''۔ اس سے ایسا توہم ہو سکتا ہے کہ یہ اس ممانعت میں شرط ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں مفہوم شرط کی بحث میں واضح کیا گیا ہے، یہ شرط اشتراط کی غرض سے نہیں ہے بلکہ ایک تو ان مالکوں یا سرپرستوں کے طرز عمل کی شرمناک قوت کے ساتھ اظہار مقصود ہے کہ وہ ناقص العقل ہونے کے باوجود پارسائی اختیار کرنا چاہتی ہیں تو کتنے غضب کی بات ہے کہ تم انہیں اس کے خلاف مجبور کرو اور پھر یہ کہ وہ خود اپنے کو محفوظ نہیں رکھنا چاہتیں تو مجبور کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب وہ خود ان کی طرف متوجہ ہیں، بے شک یہ مالک اعانت جرم کے مرتکب ہیں، اس لئے یہ بھی گنہ گار ہیں۔

اب بعض احادیث رہنمایان دین میں ہے کہ:

انّ لکلّ عضو من ابن اٰدم حظّا من الزنا فزنا العین النظر الی الحرام۔

زنا کاری میں آدمی کے اعضائے جسم میں سے ہر ایک کا ایک حصّہ ہے تو آنکھ کی زنا کاری (نامحرم پر) نگاہ ہے۔

اس حدیث معصوم علیہ السلام کے لئے اس حکم کے بعد کہ وہ اوپر کا لباس برقع وغیرہ اتار سکتی ہیں، ارشاد ہوا ہے کہ: وان یستعففن خیر لھنّ ''وہ عفت و پارسائی اختیار کریں تو ان کے لئے بہتر ہے، یعنی ایسی ضعیف العمر عورتیں بھی مکمل پردہ اپنا قائم رکھیں تو بہتر ہے، اس کو کہا گیا ہے کہ وہ ''عفت و پارسائی اختیار کریں'' اس سے ظاہر ہے کہ بے پردگی عفت و پاک دامانی کے خلاف ہے تو زیر تحریر آیت میں جو ارشاد ہوتا ہے کہ وہ محفوظ رہنا چاہتی ہیں تو کتنی شرمناک بات ہے کہ تم انہیں خلاف عفت عمل پر آمادہ کرو، اس کے احاطہ میں میرے نزدیک وہ مرد بھی آتے ہیں جو اپنی عورتوں کو ترقی پسندی کی خاطر پردہ سے نکلنے پر مجبور کرتے ہیں۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ ''اللہ ان کے مجبور کئے جانے کے بعد بخشنے والا ہے، بڑا مہربان'' اس بخشش اور مہربانی کا تعلق ان بے چاریوں سے ہے جنہیں مجبور کیا گیا ہے، نہ کہ ان ظالموں کے ساتھ جو مجبور کرنے والے ہیں۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٤﴾

اور بے شک ہم نے تم لوگوں کی جانب کھلی ہوئی نشانیاں بھیجی ہیں اور مثالیں ان لوگوں کی جو تمہارے پہلے گزر گئے

اور نصیحت پرہیز گاروں کے لئے''۔

''مثال ان لوگوں کی''یعنی پہلے کی امتوں پر کس کس طرح ان کی بداعمالیوں سے عذاب نازل ہوا تا کہ تمہیں ان مثالوں سے سبق ملے اور تم ان بداعمالیوں سے پرہیز کرو۔[1]

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۙ﴿۳۵﴾

''اللہ آسمان اور زمین کا اجالا ہے، اس کی روشنی کی مثال اس گلوب کی سی ہے جس میں چراغ ہو، وہ چراغ ایک شیشہ کی چمنی کے اندر ہو، وہ شیشہ ایسا ہو جیسے چمکتا ہوا تارا، وہ روشن ہوتا ہو ایک بابرکت درخت زیتون سے جو نہ مشرق کی طرف کا ہے اور نہ مغرب کی طرف کا کہ کچھ دور نہیں اس کا تیل آپ ہی آپ بھڑک اٹھے، چاہے اس سے آگ چھوبھی نہ جائے روشنی بالائے روشنی، اللہ اپنی روشنی کی طرف رہنمائی کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہ مثالیں پیش کرتا ہے لوگوں کے لئے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔

آیۂ نور:

چونکہ اجالے کا کام چیزوں کو سامنے لانا ہے اور خالق وہ ہے جس نے کتم عدم سے کائنات کو عالم شہود میں جلوہ گر کیا، اس لئے اس کی ذات حقیقت نور کی مصداق اتم واکمل ہے۔ پھر یہ کہ نور رہنمائی کا کام کرتا ہے اور رہنمائے حقیقی اللہ ہے اس لئے بھی وہ نور اکمل ہے۔[2] ورنہ جسے ہم عرف عام میں ''نور'' کہتے ہیں یہ تو مخلوق اور اس کی بعض مخلوقات کا اثر ہے۔

اب اس کے بعد جو ''اس کا نور'' کہا ہے تو اس سے مراد اس کی طرف کی ہدایت اور تمیز حق و باطل ہے جو نور کا حاصل ہوتا ہے۔ اب خواہ یہ تمیز اس کی طرف کی کتاب سے ہو یا اس کی طرف کے رہنما کے ذریعہ سے جو نور بنا کر بھیجا گیا ہے، اور اس لئے اس کی تفسیر قرآن سے بھی ہوئی ہے اور ذات حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی اور اس فیض ربانی سے بھی جو مومن کے دل کو چراغ ہدایت سے روشن کرتا ہے۔

اب اس کے بعد عربی ادب کے اسلوب کے موافق اس نور کی کمال ضیاباری کے لئے جس چراغ سے تشبیہہ دی گئی ہے، اس میں اس دور کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ روشنی کا انتظام کیا گیا ہے۔

---

[1] غفور للمکرھات لاللمکرہ لان الورز علیہ رحیم بھنّ (مجمع البیان)

[2] قیل فی معناہ قرلھن احدھما ان اللہ ھادی اھل السّمٰوٰت والارض... والثانی انہ منور السموات والارض (تبیان)

آج کل کے دور والوں کو یہی مضمون سمجھایا جائے تو اس زمانہ میں جتنا زیادہ سے زیادہ اہتمام روشنی کے تیز کرنے کا سائنس کے ذرائع سے ہوسکتا ہے، وہ سب اس مطلب کے اظہار کا ذریعہ ہوگا۔

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

''ان گھروں میں جن کے لئے اللہ نے طے کر دیا ہے کہ وہ بلند کئے جائیں اور ان میں اللہ کو یاد کیا جائے، اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں ان میں صبح وشام وہ افراد جنہیں کوئی بیوپار اور کوئی بیچ کھوچ کرنے کا مشغلہ اللہ کو یاد کرنے اور نماز کو قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں بناتا، وہ ڈرتے ہیں اس دن سے جس میں دل اور نگاہیں الٹ پلٹ ہوجائیں گی تاکہ اللہ انہیں معاوضہ دے بہترین اعمال کا جو انہوں نے کئے اور انہیں اور زیادہ عطا کرے اپنے فضل وکرم سے اور اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے بے سان گمان کے''۔

عبادت الٰہی کے اوقات کا لحاظ رکھنے کے ساتھ تجارت کی تعریف:

یہ جو تعریف کی گئی ہے کہ وہ افراد جنہیں کوئی بیوپار اور کوئی بیچ کھوچ کا مشغلہ اللہ کو یاد کرنے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں بناتا، اس سے خود صحیح عقل یہ نتیجہ نکال سکتی ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تجارت وغیرہ کسب معاش کے کام انجام نہیں دیتے بلکہ ان کاموں کی انجام دہی کے ساتھ وہ حقوق اللہ اور حقوق الناس دونوں میں سے کسی کو فراموش نہیں کرتے، یہی اس کا مفہوم اہل بیت علیہم السلام کی تفسیر میں بتایا گیا ہے۔[1]

اب یہ گھر کون ہے؟ اس کی تفسیر خانۂ خدا یعنی مسجدوں سے بھی ہوئی ہے اور یہ بھی کہا وہ انبیاء کے گھر ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کسی نے حضرت علی وفاطمہ علیہما السلام کے گھر کی طرف اشارہ کرکے پوچھا کہ یہ گھر بھی ان گھروں میں سے ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نعم من افاضلها ''ہاں، ان میں کے امتیازی فضیلت رکھنے والے گھروں میں سے ہے (مجمع البیان)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا

---

[1] روی عن ابی جعفر علیہ السلام وابی عبداللہ علیہ السلام انه قال: مدح قوما اذا دخل وقت الصّلوٰة ترکوا تجارتهم و بیعهم واشتغلوا بالصّلوٰة.(تبیان)

جَآءَهٗ لَمۡ يَجِدۡهُ شَيۡـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ فَوَفّٰٮهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ۙ﴿۳۹﴾

''اور جنہوں نے کفر اختیار کیا، ان کے اعمال مثل سراب کے ہیں ایک ریگستانی میدان میں جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس گیا تو اسے کچھ نہ پایا اور اللہ کو اس کے پاس پایا تو اس نے اس کا پورا پورا حساب لے لیا اور اللہ بڑا تیز حساب لینے والا ہے''۔

کافروں کے اعمال خیر وخیرات کا بے کار ہونا:

یہ اعمال جن کی مثال سراب سے دی جارہی ہے، برے اعمال تو ہو نہیں سکتے، اس لئے کہ برے اعمال میں کوئی چمک دمک ہے ہی نہیں جس سے پیاسا پانی سمجھے، یہ بظاہر اعمال خیر ہی ہو سکتے ہیں جن پر جزاء کی امید کی جاسکتی ہے اور اس لئے وہ پانی کی طرح لہریں مارتے نظر آتے ہیں اور پیاس بجھانے کی امید دلاتے ہیں۔[1] مگر قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ وہ مثل سراب کے ثابت ہوں گے جس کے پاس پیاسا دوڑ کر جاتا ہے تو سوا التہاب میں اضافہ کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہوتا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اعمال خیر کے سودمند ثابت ہونے کے لئے اسلام وایمان ضروری شرط ہے، اس کے بعد یہ خیال کتنا غلط ہے جو اس دور میں کافی پھیل رہا ہے کہ اصل چیز اعمال ہیں، اگر اعمال اچھے تو انسان بہتر سے بہتر جزاء کا استحقاق رکھتا ہے چاہے وہ کسی بھی مذہب وملت سے متعلق ہو یا لا مذہب ہو۔ یہ خیال از روئے قرآن کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

اَوۡ كَظُلُمٰتٍ فِىۡ بَحۡرٍ لُّجِّىٍّ يَّغۡشٰٮهُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ يَدَهٗ لَمۡ يَكَدۡ يَرٰٮهَا ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَجۡعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوۡرًا فَمَا لَهٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ﴿۴۰﴾

''یا مثل اندھیروں کے گہرے سمندر کے جس پر لہر پر لہر آ کر چھا رہی ہو جس کے اوپر سے بادل ہو اندھیرے ایک کے اوپر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو اسے دیکھنے کا امکان بہت کم ہے اور جس کے لئے اللہ روشنی قرار نہ دے، اس کے لئے کوئی روشنی نہیں ہے''۔

اس طرف نور علیٰ نور روشنی بالائے روشنی اور اس طرف ظلمات بعضها فوق بعض ''تاریکیاں ہیں، ایک کے اوپر ایک'' اب عقل صحیح کا فیصلہ کیا ہے؟ کدھر جانا چاہئے؟

جب اپنا ہاتھ نکالے تو اسے دیکھنے کا امکان بہت کم ہے، یہ اس معنی میں ہے جیسے ہمارے یہاں محاورہ ہے کہ ''ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا''۔

---

[1] یعنی التی یعتقدون الھا طاعات و قربات (تبیان) یعملون و یعتقدون الھا طاعات (مجمع البیان)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۴۲﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں وہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پرندے صف باندھے ہوئے ہر ایک جانتا ہے اپنی نماز اور تسبیح کو اور اللہ جاننے والا ہے اس کا جو وہ کرتے ہیں اور اللہ کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے''۔

آسمان اور زمین میں سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں، یعنی ہر عیب و نقص سے اس کے بری ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔[1]

کل قد علم صلاته و تسبیحه، اس میں علم جو فعل ماضی ہے، اس میں جو ضمیر پوشیدہ ہے، اس کا مرجع ایک تفسیر کے لحاظ سے اللہ ہے۔[2] اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ''ان میں سے ہر ایک وہ یعنی اللہ جانتا ہے اس کی نماز اور تسبیح کو'' مگر بعد میں موجود ہے، **واللہ علیم بما یفعلون**، ''اللہ جانتا ہے اسے جو وہ کرتے ہیں'' پھر ایک ہی مطلب کے دو جملوں کے لانے سے فائدہ کیا حاصل ہوگا؟ اس لئے ہمارے نزدیک دوسرے قول کو ترجیح ہے کہ علم کی ضمیر کل کی طرف راجع ہے جو اس فعل ماضی سے پہلے بلا فاصلہ مذکور ہے۔ اب معنی وہی ہوتے ہیں جو ہم نے ترجمہ میں لکھے ہیں کہ ہر ایک جانتا ہے اپنی نماز اور تسبیح کو یعنی ہر ایک کا جو طریقہ تسبیح کا ہونا چاہئے، وہ اس سے خوب واقف ہے۔

اس کے ضمن میں بہت سے زعم خودی میں مبتلا انسانوں پر تعریض بھی ہے کہ بہت سے ''اشرف المخلوقات'' کی نوع میں داخل افراد اس احساس و شعور سے خود اختیاری طور پر محروم ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ کائنات کی دوسری چیزوں کا واقف ہونا فطرت الٰہی کے نتیجہ میں از خود ہے لیکن انسان کے ''اشرف المخلوقات'' ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اُس جوہر کو جو دوسری کائنات کی چیزوں میں بجز فطرت ہے، ارادی و اختیاری طور پر حاصل کرے۔

یہ مفہوم بھی قدیم تفاسیر میں درج ہے، یہ اور بات ہے کہ انہوں نے اسے قول ضعیف کے طور پر درج کیا ہے۔[3] مگر مجھے وہی درست معلوم ہوتا ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے پہلے قول کو قوت دیتے ہوئے اس کی توجیہہ فرمائی ہے کہ اشیائے کائنات کی تسبیح کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کے جلال و کمال کا ثبوت ہے، اور ہر شے کس کس حیثیت سے اس کے جلال و کمال کو ظاہر کر رہی ہے، اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔[4] مگر اس توجیہ سے بھی مجھے اتفاق نہیں ہے، اس لئے کہ اشیاء کی دلالت ذات الٰہی کے جلال و کمال پر تو وہی ہے جس کو عقلائے زمانہ سمجھ سکتے ہیں، تب ہی دلالت کا مفہوم متحقق

---

[1] خدا ہی کی پاکیزگی ظاہر کرتے ہیں۔ (تاج العلماء)

[2] معناہ ان جمیع ذلك قد علم الله تعالیٰ صلاته (تبیان)

[3] قیل کل قد علم صلاته ای صلوٰة نفسه (تبیان)

[4] هو اجود لانّ الاشیآء کلّها لا یعلم کیفیته دلالتها علی الله و انما یعلم الله تعالیٰ ذلك (مجمع البیان)

ہوگا، ورنہ خود اللہ تعالیٰ کو اپنے جلال وکمال کو سمجھنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت تھوڑی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۭ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ۝۴۳ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۴۴

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ حرکت میں لاتا ہے بادل کو، پھر اس کے اجزاء کو جمع کرتا ہے پھر اسے تہہ بتہہ بناتا ہے، تو تم دیکھو گے بڑے بڑے بوندوں کو کہ وہ نکلتے ہیں اس کے اندر سے اور اتارتا ہے پہاڑوں کی بلندی سے ابر جس میں اولے ہوتے ہیں تو گراتا ہے انہیں جس پر چاہتا ہے اور ہٹائے رکھتا ہے انہیں جس سے چاہتا ہے، نزدیک ہے کہ اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کی طاقت ختم کردے اور رات اور دن کو پلٹے کھلاتا ہے، بلاشبہ اس میں آنکھ کھولنے کا سامان ہے نگاہ والوں کے لئے''۔

یہ صاف صاف مطالعۂ کائنات کی دعوت ہے جس کا ترقی یافتہ نام ''سائنس'' ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ان چیزوں کا علم حاصل کرنا بھی اللہ کو مطلوب ہے تاکہ ان سے ذہن ان کے خالق کی طرف متوجہ ہو۔[1]

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَاۗبَّةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓي اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴۵

''اور اللہ نے پیدا کیا ہر نقل وحرکت کرنے والے جاندار کو ایک خاص شان کے پانی سے تو ان میں کوئی وہ ہے جو اپنے پیٹ کے بھل چلتا ہے اور کوئی دو پیروں پر چلتا ہے اور کوئی چار پر، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

ہر جاندار کی خلقت پانی سے:

دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ : اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے قرار دیا ہے (انبیاء۔۳۰)

اس کے معنی عموماً یہ سمجھے گئے ہیں کہ آغاز تخلیق پانی سے ہوا ہے اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ بقائے ہر ذی حیات کی پانی سے وابستہ ہے۔ عام

---

[1] فی الآیة دلالة علیٰ وجوب النظر وفساد التقلید (تبیان)

طور پر اس آیت کو بھی جو یہاں ہے اسی مفہوم میں لیا گیا ہے مگر وہاں المآء کا لفظ بطور جنس وارد ہوا ہے۔ وہ مفہوم قرین قیاس ہے اور یہاں مآء بطور نکرہ ہے جس کے معنی ایک پانی کے ہیں لہٰذا بعض مفسرین کو تاویل کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اس طرح کہ یہاں مآء کا لفظ جمع کے معنی میں ہے، کہ پانیوں سے۔ [1]

مگر ابھی مطلب حل نہیں ہوتا، اس لئے کہ جنس کے لحاظ سے پانی بہت سے نہیں ہوتے، وہ ایک ہی جنس ہوتی ہے لہٰذا مفرد لفظ ہی ہونا چاہئے مگر الف لام (ال) کے ساتھ جیسے دوسرے مقام پر المآء ہے مگر یہاں المآء نہیں ہے مآءٍ ہے، اس لئے یہاں میرے نزدیک زیادہ ترجیح دوسرے قول کو ہے جسے بطور قول ضعیف درج کیا گیا ہے کہ یہاں پانی سے مراد نطفہ ہے جو ظاہر ہے کہ ہر ہر فرد کا الگ الگ ہوتا ہے۔ [2] جسے دوسرے مقامات پر مآء مھین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہاں پانی سے مراد وہ پانی نہیں ہے جو پیا جاتا ہے اور جو بقائے حیات کا سبب ہے یا جس سے سائنس کی رو سے ابتدائی تخلیق ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے ہماری اختیار کردہ تفسیر ہی کو اختیار کیا ہے اس لئے پہلے مآء کی تفسیر نطفہ سے کی ہے، پھر اس دوسرے مفہوم کو بطور قول ضعیف درج کیا ہے۔ [3]

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۶﴾

''بلاشبہ ہم نے اتاریں پردہ کشائی کرنے والی آیات اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدے راستے پر چلنے کی توفیق دیتا ہے''۔

اگر مُبَيِّنَات (یائے مشدد کے فتحہ کے ساتھ) ہوتا تو معنی ہوتے کھلی ہوئی واضح نشانیاں'' جیسا کہ بعض تفاسیر میں اس کے معنی دیئے ہیں۔ [4] مگر متداول قرأت جس کے مطابق عام طور پر اعراب لگائے گئے ہیں مُبَيِّنَات (ی کے کسرہ کے ساتھ ہے) جو اسم فاعل ہے تو ہم نے ''پردہ کشائی کرنے والی'' کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یعنی وہ آیات جو حقیقتوں کو نمایاں کرنے والی ہیں۔ [5]

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ ؕ اَفِيْ

---

[1] من مآء ای من میاہ (علی بن ابراھیم)

[2] قیل من مآء ای من نطفة ذکرہ الحسن وجعل قولہ "کل دآبة خلقا فی من خلق من نطفة (تبیان)

[3] قیل عنیٰ بہ المآء لان اصل الخلق من المآء (مجمع البیان)

[4] ای دلالات واضحات بینات (مجمع البیان)

[5] تظھر بھا المعانی... حتی تعلم مفصلة (تبیان)

قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۵۰

''اور وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور پیغمبر پر اور ہم نے اطاعت کی، پھر اس کے بعد ایک جتھا ان میں کا روگردانی اختیار کرتا ہے اور یہ لوگ ایمان والے ثابت نہیں ہوتے اور جب انہیں اللہ اور اس کے پیغمبر کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کردے تو ایک دم یہ نظر آتا ہے کہ ان میں کی ایک جماعت روگردانی اختیار کرتی ہے اور اگر حق میں ان کا فائدہ ہو تو آئیں گے اس کی طرف سر جھکائے ہوئے۔ کیا ان کے دلوں میں کوئی بیماری ہے یا وہ شک میں مبتلا ہو گئے ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ اللہ ان کے ساتھ زیادتی کرے گا یا اس کے پیغمبر؟ (ہر گز نہیں) بلکہ یہ لوگ خود زیادتی کرنے والے ہیں''۔

ایمان کے خلوص کی علامت یہ ہے کہ وہ بے لوث ہو لیکن جب اس میں خود غرضی نمایاں ہوئی تو یہ اس کی دلیل ہوگی کہ ایمان دل میں جاگزیں نہیں ہے۔

یہ جو منافقین کا کردار بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو حکم بنانے پر اسی وقت راضی ہوتے ہیں جب وہ سمجھتے ہیں کہ فیصلہ ان کے موافق ہوگا ورنہ وہ رسول ﷺ کے فیصلہ سے انحراف کر جاتے ہیں، کیا یہی حالت اکثر مدعیان ایمان کی اس وقت بھی نظر نہیں آتی؟

عالم دین یعنی وہ مجتہد جسے وہ نائب امام کہتے ہیں، ادھر اس کا فتویٰ ان کے مفاد کے خلاف ہوا اور بس تقلید چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے، یہاں تک کہ استخارہ جسے وہ خدا کا حکم سمجھتے ہیں، اگر ان کی مرضی کے مطابق ہوا تو مانا اور اگر ان کی خواہش کے خلاف ہوا تو دوسرے عالم کے پاس جا کر استخارہ دکھلانے کے لئے تیار ہو گئے، کیا یہ استخارہ پر اعتقاد کا ثبوت ہے؟ اور اگر وہ استخارہ کو واقعی اللہ کا حکم مانتے ہیں تو کیا یہ خود اللہ کے ساتھ مذاق نہیں ہے۔ نعوذ من ذلك

اس تذکرہ کے آغاز میں یہ بات بس اب قابل تشریح ہے کہ اذا دعوا الی اللہ ورسولہ میں دو کا تذکرہ ہے کہ ''جب انہیں خدا اور رسول کی طرف دعوت دی جاتی ہے مگر پھر واحد کا صیغہ آجاتا ہے، کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کردے۔ یہاں تثنیہ نہیں کیا گیا کہ ''وہ دونوں ان کے درمیان تصفیہ کردیں'' یہ کیوں؟ یہ اس لئے کہ لفظاً اگرچہ وہ دو ہیں مگر مقام فیصلہ میں وہ ایک ہیں، یعنی جو رسول ﷺ کا فیصلہ ہے وہی حقیقت میں اللہ کا فیصلہ ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ

جس نے پیغمبر کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی (نساء۔ ۸۰)

تو مقام فیصلہ میں اللہ رسول ﷺ سے الگ نہیں ہے۔ [1]

---

[1] انما افرد قوله: ليحكم بعد قوله: الى الله ورسوله لانه حكم واحد يوقعه النبي ﷺ بامر الله (تبيان)

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥١﴾ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٥٢﴾

''ایمان والوں کی جب انہیں اللہ اور اس کے پیغمبر کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دیں، بس یہ بات ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم نے سنا اور اطاعت کی اور یہی لوگ دین و دنیا کی بہتری حاصل کرنے والے ہیں اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرے اور اس سے ڈرے اور اس کی مخالفت سے بچے، تو یہی لوگ کامیاب ہیں''۔

یہ ان منافقین کے مقابل کا کردار ہے جو مومنین کے وصف میں پیش کیا جا رہا ہے اور یہی کردار ان کے صحت ایمان اور خلوص کی علامت ہے۔

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ أَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۖ قُلْ لَا تُقْسِمُوا ۖ طَاعَةٌ مَعْرُوفَةٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٥٣﴾

''اور وہ اپنی ممکن طاقت بھر اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر آپ انہیں حکم دیں گے تو وہ ضرور نکلیں گے، کہیے کہ قسمیں نہ کھاؤ، یہ تو فرماں برداری کا عام تقاضا ہی ہے۔ بلاشبہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، اس سے واقف ہے''۔

میں نے جو ترجمہ کیا ہے، وہی الفاظ قرآنی سے میری سمجھ میں آتا ہے لیکن دوسرے مفسرین نے اس کے دو معنی اس سے الگ کہے ہیں۔ ایک یہ کہ خالق نے اُن کے جواب میں یہ کہا ہے کہ یہ اطاعت کا زبانی اقرار تو پہلے ہی جب تم نے اظہار ایمان کیا تو اُس وقت ہو چکا ہے مگر کہاں تک وہ حقیقت کے مطابق ہے، اُسے اللہ جانتا ہے۔

دوسرے یہ کہ قسمیں کھانے سے کیا فائدہ؟ تم عملی طور پر اطاعت اور اچھی گفتگو کرو تو وہ قسمیں کھا کھا کر اس کے اقرار کرنے سے بہتر ہے اسے جناب شیخ الطائفہ نے بطور قول دوم نقل کیا ہے۔[1]

حالانکہ جس میں طاعة وقول مّعروف کے الفاظ ہیں، وہ دوسری آیت ہے، اس کی تفسیر کو یہاں درج کرنا میرے خیال میں تو مسامحہ ہی ہے لطف یہ ہے کہ علامہ طبرسیؒ نے مسامحہ میں بھی جناب شیخ کا اتباع کیا ہے۔[2]

---

[1] قیل فی معناہ قولان: احدھما ھذہ طاعة معروفة منکم یعنی بالقول دون الاعتقاد والثانی طاعة وقول معروف امثل من ھذا القسم (تبیان)

[2] قیل معناہ لیکن منکم طاعة والقول المعروف (مجمع البیان)

تیسرا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ اطاعت تو اللہ کو پسند ہے ہی، اس کے اظہار کی ضرورت کیا ہے۔[1]

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۵۴

''کہہ دیجیے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور اس پیغمبر کی اطاعت کرو، اب اگر تم روگردانی کرو تو اُس کے اوپر تو وہ ہے جو اُس پر بار ڈالا گیا ہے اور تمہارے اوپر وہ ہے جو تم پر بار ڈالا گیا ہے اور اگر تم اُس کی اطاعت کرو تو سیدھا راستہ حاصل کرو گے اور پیغمبر کے ذمہ نہیں ہے مگر صاف طور پر پہنچا دینا''۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۵۵

''اللہ کا وعدہ ہے تم میں اُن افراد سے جو با ایمان ہیں اور نیک اعمال کرتے رہے ہیں کہ وہ اُنہیں روئے زمین پر خلیفہ قرار دے گا جس طرح اُنہیں خلیفہ بنایا تھا جو اُن کے پہلے تھے اور ضرور اقتدار عطا کرے گا ان کے سوا اُس دین کو جو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور ضرور اقتدار عطا کرے گا ان کے اُس دین کو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور ضرور بدل دے گا اُنہیں اُن کے ہراس کے بعد امن واطمینان، وہ میری عبادت کریں گے اس طرح کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور جو اسکے بعد کفر اختیار کرے تو یہی فاسق لوگ ہوں گے''۔

صاحبِ ایمان صالحین سے مکمل اقتدار کا وعدہ:

ظاہر ہے کہ یہ خطاب کافروں سے نہیں، مسلمانوں سے ہے لیکن جو وعدہ کیا جا رہا ہے، وہ اُن سب سے نہیں بلکہ اُن میں خاص افراد سے ہے، ان خاص افراد کو جو وصف بیان کیا جا رہا ہے کہ وہاں با ایمان ہیں اور نیک اعمال والے ہیں تو یہ وہ عام ایمان اور عمل صالح نہیں ہوسکتا جس کا ہر مسلمان کو حامل ہونا چاہیے بلکہ وہ خاص مرتبہ ایمان حقیقی اور حقیقی عمل صالح کا ہے جو خاص افراد ہی میں ہوا کرتا ہے۔

جناب شیخ طوسیؒ نے اس آیت کے ذیل میں کافی بسیط بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے استخلاف کے معنی اُس خلیفہ بنانے کے ہیں ہی نہیں جو اسلامی اُمّت کے سربراہ کے مفہوم میں لیا جاتا ہے بلکہ گزشتہ اقوام کے بجائے اب اس قوم کو با اقتدار بنانا ہے جس کی نظیریں قرآن مجید میں بکثرت ہیں مثلاً:

---

[1] تابع داری پسند ہے (تاج العلماء)

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ ؕ [1]

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَیَسْتَخْلِفَكُمْ فِی الْاَرْضِ [2]

وَرَبُّكَ الْغَنِیُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا یَشَآءُ [3]

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً [4]

ان تمام آیات میں اس لفظ کے معنی ایک کے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں تو یہی یہاں بھی مراد ہے۔ اس صورت میں یہ وعدہ زمانۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی میں پورا ہو گیا جب کہ جزیرۃ العرب میں مسلمانوں کا غلبہ ہو گیا۔ لہٰذا اسے فتوحات سے متعلق کرنا درست نہیں ورنہ ماننا پڑے گا کہ ابھی تک وہ وعدہ پورا نہیں ہوا کیوں کہ معمورۂ ارض کا زیادہ تر حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں نہیں ہے۔ اس صورت میں اہل بیت علیہم السلام کے اس ارشاد کو قبول کرنا چاہیے کہ یہ وعدہ زمانۂ امام مہدی علیہ السلام سے متعلق ہے جب کہ اسلام کو تمام بسیط ارض پر غلبہ حاصل ہو گا۔ [5]

تفسیر کے ذیل میں اتنا بیان کافی ہے، ورنہ اصل میں تو اس آیت پر پوری بحث علم کلام کی کتابوں میں بحث امامت کے ذیل میں ہوتی ہے۔ [6]

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۵۷﴾

''اور نماز ادا کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور پیغمبر کی اطاعت کرو، شاید تم پر رحمت کا نزول ہو''۔

''انہیں جو کافر ہیں، ہرگز نہ سمجھو قابو سے باہر ہو جانے والے اطراف زمین میں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور کیا بری جگہ وہ ہے''۔

''قابو سے باہر ہو جانے والے'' یعنی میرے عذاب سے بچ کر نکل جانے والے، ایسا ہرگز انہیں نہ سمجھو، حقیقت یہ ہے کہ وہ دنیا میں کہیں جا کر میری گرفت سے باہر نہیں نکل سکتے۔ [7]

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ وَالَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا

---

[1] فاطر۔ ۳۹

[2] اعراف۔ ۱۲۹

[3] انعام۔ ۱۳۳

[4] فرقان۔ ۲۶

[5] فانّ التمکین فی الرض علی الاطلاق لم یحصل فهو منتظر اانّ الله عزّوجل لا یخلف وعده (مجمع البیان)

[6] قد استرفینا ما یتعلق بالأیة فی کتاب الامامة فکلا نطول بذکره ههنا (تبیان)

[7] ای لا یفوقون (جلالین)

الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ؕ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾

''اے ایمان لانے والو! اُن غلاموں کو جو تمہاری ملکیت میں ہوں اور اُن بچوں کو بھی تم میں سے جو حد بلوغ تک نہیں پہنچے، لازم ہے کہ تین وقتوں میں تمہارے پاس اجازت لے کر آئیں: نماز صبح کے پہلے تک اور اُس وقت جب تم دوپہر کو اپنے کپڑے اتار دیتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔ یہ تین وقت تمہارے لئے پردہ داری کے ہیں۔ ان اوقات کے علاوہ تم پر اور اُن پر کوئی سختی نہیں ہے۔ تمہیں آپس میں ایک دوسرے کی طرف چکر لگانا ہی ہیں، اس طرح اللہ تمہارے لئے آیات کو صاف صاف پیش کرتا ہے اور اللہ جاننے والا ہے، بڑی سوجھ بوجھ والا''۔

گھر کے خاص افراد یہاں تک کہ بچوں سے بھی ایک حد تک پردہ:

عام حکم پردہ کے بعد جو اغیار اور بالغ نامحرموں سے ہے، اب خاص الخاص گھر کے دوسرے آدمیوں، یہاں تک کہ نابالغ بچوں تک سے بھی اتنے پردہ کی تاکید کی جارہی ہے کہ انہیں بھی اُن حالات میں جب تم لباس شب خوابی میں ہوتے ہو، تمہارے پاس آزادی کے ساتھ نہیں آنا چاہیے بلکہ ہماری قدیم تفسیر سے، جو زیادہ تر اقوال معصومین علیہم السلام پر مبنی ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محرم عورتیں ماں بہن تک اس حکم میں داخل ہیں۔ [1]

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾

''اور جب لڑکے تم میں کے بالغ ہو جائیں تو انہیں اُسی طرح اجازت لینا چاہیے جیسے اُن کے پہلے دوسرے لوگ لیا کیے ہیں، اس طرح اللہ اپنی آیات کو تمہارے لئے واضح طور پر پیش کرتا ہے اور اللہ جاننے والا ہے، بڑی سوجھ بوجھ والا''۔

یعنی نابالغ لڑکوں کو تو بس اُن تین وقتوں میں اجازت لینے کی ضرورت ہے مگر اب جب وہ بالغ ہو گئے تو اب وہ دوسرے نامحرم مردوں کی طرح ہو گئے، اب کسی وقت بھی بغیر اجازت اُنہیں اندر آنا درست نہیں کیوں کہ اب اُن سے عورتوں کو ویسا ہی پردہ کرنا چاہیے جیسا تمام اجنبی مردوں سے لازم ہے۔

---

[1] انّ اللہ نہی ان یدخل احد فی ھٰذہ الثلثہ الاوقات علیٰ احد لا اب ولا اخت ولا امّ ولا خادم الا باذن (علی بن ابراھیم)

بہر حال ہوائے زمانہ کے خلاف جو مطلق پردہ کی مخالف ہے، مذکورہ بالا آیات سے مجموعی طور پر حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

(۱) صرف غیر ممیّز بچوں سے کسی حال میں پردہ نہیں ہے۔

(۲) وہ بچے جو ابھی حد بلوغ تک نہیں پہنچے ہیں مگر طفل ممیز کی حیثیت رکھتے ہیں، اُن سے خاص حالات میں جب کہ انسان عریاں نہیں تو نیم عریاں ہوتا ہے، پردہ لازم ہے، لیکن دوسرے حالات میں جب تک وہ طفل یعنی نابالغ ہیں، پردہ واجب نہیں ہے۔

(۳) وہ بچے جو اب بالغ ہو گئے ہیں، ان سے پورے طور پر پردہ لازم ہے اور چونکہ لڑکے کا بلوغ شرعی ۱۵ برس میں اور لڑکی کا نو برس میں ہو جاتا ہے لہٰذا پندرہ برس کے لڑکے سے پردہ ویسا ہی لازم ہے جیسا کہ کسی بھی نامحرم مرد سے لازم ہوتا ہے اور نو ۹ برس کی لڑکی پر اُسی طرح پردہ واجب ہے جس طرح کسی بھی عورت پر نامحرم مردوں سے پردہ واجب ہوتا ہے لہٰذا ۱۵ برس کے لڑکے اور ۹ برس کی لڑکی کا جن دونوں کو عرف عام میں بچہ ہی سمجھا جاتا ہے، آپس میں کھیلنا اور ساتھ رہنا، اُسی طرح شرعاً حرام ہے۔ جس طرح کسی بھی غیر مرد اور غیر عورت کا آپس میں بغیر پردہ کے میل جول ناجائز ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا فَلَیْسَ عَلَیْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَهُنَّ غَیْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِیْنَةٍ ؕ وَاَنْ یَّسْتَعْفِفْنَ خَیْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۶۰﴾

''اور وہ از کار افتادہ عورتیں جو تعلقات ازدواجی کا کوئی تصور نہیں رکھتیں، ان پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ اپنے اوپر کے کپڑے اتار کر رکھ دیں درانحالیکہ آرائش کر کے ادھر اُدھر نہ پھیریں اور اگر پارسائی سے کام لیں تو ان کے لئے بہتر ہے اور اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

ضعیف العمر عورتوں کے لئے برقع چھوڑنے کی اجازت کے باوجود پردہ داری کی تاکید:

''از کار افتادہ'' کے معنی؟ یعنی ضعیف العمری کی وجہ سے جن کے یہاں اور جن کی طرف میلانات جنسی کا کوئی تصور ہی نہیں رہا ہے۔[1] یہ اوپر کے کپڑے مثلاً برقع یا چادر اتار کر سامنے آئیں تو ناجائز نہیں مگر پھر شرط یہ ہے کہ ''آرائش کر کے ادھر اُدھر پھریں نہیں اور پھر بغیر اس کے بھی فضیلت اسی میں ہے وہ اُس طرح بھی سامنے نہ آئیں۔

''اگر پارسائی سے کام لیں''..... یہ پارسائی بقرینہ سابق کیا ہے؟ یہی کہ برقع وغیرہ کے اوپر کے کپڑے بھی نہ اتاریں، معلوم ہوا کہ یہ اوپر کے لباس کا اُترنا ایسی ضعیف العمر عورتوں کے لئے بھی پارسائی کے خلاف چیز ہے، چہ جائیکہ جوان جہاں عورتیں تقریباً نیم برہنہ عالم میں ماری ماری پھرا کریں اور پھر ''پارسا'' کی پارسا بنی رہیں۔

لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ وَّلَا

[1] هن المسنات من النسآء اللاتی قعدن عن التزویج لانّه لان یرغب فی تزویجهن (مجمع البیان)

عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اندھے پر کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے اور نہ خود تم اس بات میں کہ کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھپیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا جس گھر کی کنجیاں تمہارے ہاتھ میں ہیں یا اپنے دوست کے یہاں سے۔ نہیں ہے تم پر کوئی گناہ کہ تم کھاؤ اکھٹا یا الگ الگ تو جب کچھ گھروں میں داخل ہو تو اپنے آدمیوں کو سلام کرو۔ ہدیہ ہے کہ اللہ کی طرف کا مبارک، پاکیزہ۔ اس طرح اللہ آیات تمہارے لئے واضح طور پیش کرتا ہے شاید تم عقل سے کام لو''۔

بعض مفسرین نے پہلے جملہ کو جس میں معذورین کا ذکر ہے، الگ کر دیا ہے۔ اب یہ بات مجمل رہے گی کہ اندھے وغیرہ میں کس بات میں گناہ نہیں کہ تم ان کے گھروں سے کھاؤ۔

بعض نے قبل کے اجمال کو جہاد وغیرہ سے متعلق کیا ہے [1] اس صورت میں یہ بعد کے ذکر سے بالکل ہی غیر متعلق ہوگا۔

بعض نے یہ مطلب قرار دیا ہے کہ ان معذورین کے ساتھ کھانے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ نہ سوچو کہ وہ معذور ہونے کی وجہ سے کم کھائیں گے اور ہم زیادہ کھالیں گے مگر وہاں تو یہ ہے کہ اُن معذورین پر کوئی گناہ نہیں۔ دوسروں کا ذکر کہاں ہے کہ تم پر کوئی گناہ نہیں۔

ایک تصور یہ ہے کہ یہ پورا سلسلۂ کلام ایک ڈال ہے یعنی ان معذورین پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے گھروں سے اپنی ضرورت بھر کھائیں [2] اور تم میں سے دوسرے لوگوں کیلئے بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ان گھروں سے جن کا ذکر بعد کو ہوا ہے کھائیں۔

سردست اصل الفاظ قرآن سے یہ آخری مفہوم ہی زیادہ قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے خصوصاً جب کہ اس کی نسبت ہمیں معصومین علیہم السلام کی طرف بھی مل رہی ہے اگرچہ اس نسبت کی نقل میں یہ فروگزاشت معلوم ہوتی ہے کہ بعد والے گھروں کی تخصیص ان معذورین کیلئے بھی کر دی گئی ہے

---

[1] جہاد و جماعت وغیرہ کا (حواشی تاج العلماء)

[2] الّذی روی عن اھل البیت علیہم السلام انہ لا باس بالا کلّ لھٰؤلاء من بیوت من ذکرھم اللہ بغیر اذنھم قد حا جتھم من غیر اسراف (تبیان)

اس کے معنی یہ ہیں کہ معذور اور غیر معذور سب کا ایک حکم ہے تو خصوصیت سے قبل میں ان معذورین کے خاص طور پر ذکر کی ضرورت کیا تھی؟

مجھے معذورین اور غیر میں الفاظ قرآنی سے یہ فرق محسوس ہوتا ہے کہ معذورین کیلئے سب ہی گھروں سے بقدر ضرورت کھانے یعنی اپنی جائز ضرورت پوری کرنے کا حق ہے اور دوسروں کیلئے خاص اُن گھروں سے جو بعد میں بیان ہوئے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ فقہی حیثیت سے مسلمہ اصول وقواعد کی بناء پر اُن معذور اشخاص کے دوسروں کے گھروں سے کھانے کو بھی ہم شرائط کے ساتھ مشروط کریں اور دوسروں کو جو اپنے عزیزوں' یہاں تک کہ دوستوں کے گھروں سے کھانے کی اجازت دی گئی ہے، اُس پر بھی کچھ شرائط عائد کریں جن کی تحقیق کا یہ محل نہیں ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٦٢﴾

''ایمان والے بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہوں اور جب اس (پیغمبر) کے ساتھ کسی مشترک معاملہ پر غور میں مصروف ہوں تو جائیں نہیں جب تک آپ سے اجازت نہ لے لیں، یقیناً وہ جو آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جو اللہ اور اس کے پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں تو جب وہ آپ سے اپنی کچھ ضروریات کی وجہ سے اجازت مانگیں تو ان میں سے جسے چاہیے اجازت دے دیجیے اور ان کیلئے اللہ سے بخشش کی دعا کیجیے، بلا شبہ اللہ بخشنے والا ہے' بڑا مہربان''۔

صاحبان ایمان کی شان:

''مشترکہ معاملہ'' سے مقصود یہ ہے کہ کوئی ایسا معاملہ جس میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو اکٹھا کیا ہے کہ وہ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں یا اپنے اپنے خدمات کو اس مہم کے لئے پیش کریں[1]

بعض صحابہ اس موقع پر اثنائے گفتگو میں یا مشورہ کے درمیان چپکے سے کھسک جاتے تھے، خالق نے اس بدتمیزی پر ٹوکا ہے اور انہیں ہدایت کی ہے کہ وہ آدابِ مجلس اور احترام رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کسی ضرورت سے جانا بھی چاہیں تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت حاصل کریں، پھر جائیں.

''جسے چاہیے اجازت دیجیے کے ساتھ یہ کہنا کہ ''اُن کیلئے بخشش کی دعا کیجیے'' یہ پتہ دیتا ہے کہ یہ اجازت لے کر جانا بھی ایک نامناسب اور خلاف ادب بات ہے کہ اُس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی اس ضرورت کو جس کے لئے جا رہے ہیں، اُس مقصد سے جس کے لئے وہ جمع کیے

---

[1] هو الّذی یقتضی الاجتماع علیه والتّعاون فیه (تبیان)

گئے ہیں، زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

''نہ بناؤ پیغمبر کے پکارنے کو اپنے درمیان اُس طرح جیسے تم میں ایک دوسرے کو پکارتا ہے۔ اللہ جانتا ہے تم میں کے ان لوگوں کو جو پناہ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں تو ڈرنا چاہیے انہیں جو اُس حکم سے انحراف کرتے ہیں اس بات سے کہ پہنچے انہیں کوئی آزمائش یا پہنچے انہیں دردناک عذاب''۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے امتیازی طور پر تعظیم واحترام کا حکم:

یعنی پیغمبر کو نام یا نسب کے ساتھ عام آدمیوں کی طرح نہ پکاریں بلکہ آپ کے منصب اور القاب کو سرنامۂ خطاب قرار دے کر آپ کی تعظیم وتکریم کے تقاضا کو پورا کریں۔[1]

یہ تعظیم واجلال کی صاف دعوت ہے جسے ایک طبقہ معیار توحید کے منافی قرار دیتا ہے۔

''ان لوگوں کو جو پناہ لیتے ہوئے کھسک جاتے ہیں'' یعنی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبہ سے گھبرا کر ایک دوسرے کی پشت کے پیچھے چھپتے ہوئے مسجد سے نکل جاتے تھے[2] اس پر خالق کریم نے تنبیہ کی ہے اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۶۴﴾

''معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ جانتا ہے اُسے جس پر تم ہو اور جس دن وہ اس کی طرف پلٹیں گے تو وہ بتائے گا انہیں جو کچھ وہ کرتے رہے تھے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔

''جانتا ہے اسے جس پر تم ہو'' یعنی ایمان دل سے ہے یا نمائشی؟ اور پھر نیک اعمالی اور بداعمالی کے اعتبار سے جو تمہارا عالم ہے[3] اس سب سے اللہ خوب واقف ہے۔

---

[1] یقول لا تقولو ایا محمّد ولا یا ابا القاسم لکن قولو ایا نبی اللہ ویا رسول اللہ (علی بن ابراھیم)

[2] کان ینقل علیھم طول خطبۃ النبی ﷺ یوم الجمعۃ فیلو ذون ببعض اصحا بہ فخرجون من المسجد فی استتار من غیر استیذان وفیہ معنی التھدید بالمجازاۃ (مجمع البیان)

[3] ما انتم علیہ من الخیرات والمعاصی ومن الایمان والنّفاق لا یخفی علیہ شیء من احوالکم (مجمع البیان)

سُوْرَۃُ الْفُرْقَانِ

مکیّہ.....۷۷.....آیات

اس سورہ کی پہلی ہی آیت میں لفظ فرقان وارد ہے اس مناسبت سے اس سورہ کا نام الفرقان ہوا حالانکہ یہ لفظ اور سوروں میں بھی وارد ہوا ہے لیکن اس کی نظیریں پہلے آ چکی ہیں کہ وہ ذکر ہے متعدد سوروں میں مگر نام اس کی مناسبت سے ایک ہی سورہ کا ہوا۔ مضامین اس سورہ میں حسب ذیل ہیں۔

سورۂ فرقان کے خاص خاص مضامین:

۱-----تعلیمات پیغمبر خدا اور قرآن مجید کے لئے مشرکین کی پریشان خیالیاں۔

۲-----آتش دوزخ کے کیفیات کا تفصیلی بیان۔

۳-----تمام پیغمبروں کا بشر اور بشری ضروریات کا پابند ہونا۔

۴-----پیغمبر کی بارگاہ الٰہی میں شکایت کہ آپ کی اُمت نے اس قرآن کو پس پشت ڈال دیا۔

۵-----قرآن مجید کے بتدریج اُتارے جانے کی حکمت۔

۶-----بداعمال انسانوں کا جانوروں سے بدتر ہونا۔

۷-----پانی کے ذریعۂ طہارت ہونے کا بیان۔

۸-----میٹھے اور کھاری پانی کے سنگم میں قدرتِ الٰہی کا ظہور۔

۹-----اللہ کے بندوں کی شان.....وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۝۱ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ○

''اپنے کمال ذات کے ساتھ قائم و برقرار ہے وہ جس نے قرآن اتارا اپنے بندہ پر تا کہ وہ تمام جہانوں کے لئے

تنبیہہ کرنے والا ہو، جس کے لئے بادشاہت ہے آسمانوں اور زمین کی اور اس نے کوئی اولاد یقیناً نہیں کی اور نہ اُس کا سلطنت میں کوئی شریک ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا تو اس کا پورے طور پر پیمانہ مقرر کیا''۔

تبارک کے لفظ کا ترجمہ ان الفاظ میں بہت آسان تھا کہ ''بابرکت ہے وہ ذات'' مگر اردو میں برکت کا لفظ اُس مفہوم کو ادا نہیں کرتا جو عربی میں اس لفظ کے تحت میں موجود ہے۔

بس ایک محل استعمال اس لفظ کا اردو میں ہے جو اس کے اصل معنی سے قریب ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کھانے یا۔ پیسے میں بڑی برکت ہے، اس میں دوام وقرار کا پہلو نمایاں ہے، جو اس کے عربی میں معنی جو ہیں ان کے مطابق ہے۔[1]

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝۳

''اور انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر ایسے خدا بنائے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں اور نہ وہ اپنے لئے کسی نقصان پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ فائدہ پر اور نہ موت پر اختیار رکھتے ہیں اور نہ زندگی پر اور نہ دوبارہ زندہ اٹھانے پر''۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ۝۴ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۵ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۶

''اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نہیں سوا ایک جھوٹ کے جسے اس نے گھڑا ہے اور اُس پر کچھ دوسرے لوگوں نے اُس کی مدد کی ہے، اس طرح انہوں نے ظلم اور غلط بیانی کا ارتکاب کیا ہے اور انہوں نے کہا یہ پرانی داستانیں ہیں جنہیں اس نے لکھ لیا ہے تو وہ اسے لکھوائی جاتی ہیں صبح وشام، کہیے کہ اُسے اتارا ہے اُس نے جو آسمانوں اور زمین کے بھیدوں سے واقف ہے، بلاشبہ وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

تعلیماتِ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کے لئے مشرکین کی پریشان خیالیاں:

چونکہ اُن کی غلط اندیشیوں کا منشا یہ تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر وہ معلومات آتے تھے جو اُن کے نزدیک قوم عرب میں سے کسی کو نہیں

---

[1] تقدّس و جلّ بما لم یزل علیه من الصّفات ولا یذال کذٰلك (تبیان) ثبّت و قام فیما لم یزل ولا یزال عن جماعة من المفسرین (مجمع البیان)

ہو سکتے اور پھر کچھ باتیں ایسی تھیں جو ان کہنے والوں کے حدود علم سے باہر تھیں اس لئے اُن باتوں کو جو ان کے علم میں نہ تھیں، وہ آپ کی طبع زاد یا ''دروغ'' کہتے تھے اور جو اُن کے علم میں تھیں مگر اُن کے نزدیک آپ کو اُن کا علم ہونا چاہیے، ان کے لئے کبھی یہ کہتے تھے کہ کچھ اور لوگ بتاتے ہیں اور کبھی یہ کہ پُرانے نوشتے کچھ لوگوں کے ہاتھ آ گئے ہیں اور وہ لوگ آپ کے پاس آ کر اُنہیں بول بول کر لکھوا دیا کرتے ہیں، اس اُن کے ذہنی پس منظر کے مقابلہ میں خالق نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ ان کے ذاتی معلومات بے شک نہیں ہیں مگر جو عالم الغیب خالق ہے، وہ اُن پر بذریعہ وحی نازل کرتا ہے، اس لئے اُن میں وہ باتیں بھی ہیں جو تمہیں معلوم ہیں اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمہارے نزدیک اُن کا علم نہ ہونا چاہیے اور وہ باتیں بھی ہیں جو تمہارے حدود علم میں نہیں، اس لئے اُنہیں اُن کا طبع زاد اور دروغ قرار دیتے ہو لیکن تم کو معلوم ہونا چاہیے۔ نہ یہ اُن کے ذہن کی اختراع ہے اور نہ کسی آدمی یا آدمیوں کو بتائی ہوئی ہیں اور نہ پرانے نوشتوں سے حاصل کردہ ہیں، یہ تمہارے تصوّرات سب بے بصیرتی اور خام خیالی کا نتیجہ ہیں۔

شروع میں آیت کے مضمون سے تو ذہن میں یہی آتا ہے کہ یہ سب کہنے والے کھلے ہوئے کفار و مشرکین ہونگے مگر آیت کا اختتامی جملہ: کان اللہ غفورا رّحیما: ''بلاشبہ وہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان'' میرے ذہن میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ ظاہری مسلمان ہیں جو اصطلاحاً منافق کہلاتے ہیں، اُنہی کی باہمی سرگوشیوں کی پردہ کشائی کی گئی ہے کیوں کہ انہیں کے لئے کم از کم دنیا میں اس کی عفو و مغفرت ایسی کارفرما ہے کہ وہ اُنہیں نہ سزا دیتا ہے اور نہ اُنہیں نام بنام ان کے راز افشا کر کے رسوا کرتا ہے۔ [1]

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ﴿۷﴾ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۸﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹﴾

''اور اُنہوں نے کہا یہ پیغمبر عجیب ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں نہ اس پر کوئی فرشتہ اتارا گیا کہ وہ اُس کے ساتھ ساتھ ڈرانے والا ہوتا یا اُس پر کوئی خزانہ اتارا جاتا یا اُس کے لئے کھنا باغ ہوتا جس سے وہ کھاتا اور ظالموں نے کہا کہ تم پیروی نہیں کرتے مگر ایک آدمی کی جو کسی آسیب میں گرفتار ہے، دیکھیے کیسی کیسی باتیں آپ کے لئے انہوں نے کیں تو وہ گمراہ ہوئے ایسے کہ قدرت نہیں رکھتے اب راستے پر''۔

یعنی یہ اُن کا بدل بدل کر باتیں کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ آپ کے خلاف کیا معقول بات کہیں جو قابل قبول ہو، اُنہیں اپنی مخالفت کے حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ملتا۔ [2]

---

[1] کان غفورا معناہ الّذی یعلم السّر فی السّمٰوٰت والارض لا یعاجلھم بالعقوبۃ بل یستر علیھم (تبیان)

[2] قیل معناہ لا یستطیعون سبیلا الیٰ ابطال امرك (تبیان)

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ⑩

''قائم و برقرار ہے وہ ذات جو اگر چاہے تو آپ کیلئے اُس سے بہتر قرار دیدے، وہ بہشت جن کے نیچے سے نہریں رواں ہوں اور وہ آپ کے لئے عالی شان محلّات قرار دے''

یعنی حکمت الٰہی اس کی متقاضی نہیں ہے کہ اُس کے پیغمبر کچھ غیر معمولی عیش و آرام اور اقتدار ظاہری کی زندگی گزاریں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ وہ محنت و مشقّت کرتے ہوئے نظر آئیں اور سختیاں بھی جھیلیں۔

مطلب یہ ہے کہ جسے وہ نقص قرار دے رہے ہیں کہ یہ کھاتا پیتا ہے اور بازاروں میں نقل و حرکت کرتا ہے یہی اللہ کے نزدیک اُن کا جوہر ہے کہ اس طرح وہ دنیا کے لئے مثال بنتے ہیں ورنہ قدرت الٰہی میں تو یہ کوئی مشکل کام نہ تھا کہ وہ اُنہیں ایسی بلند معیار کی عیش و آرام والی زندگی دیتا۔ جس پر دنیا عش عش کرتی۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ⑪ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ⑫ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ⑬ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ⑭

''بلکہ اُنھوں نے قیامت کو جھٹلایا اور ہم نے اُس کے لئے جو قیامت کو جھٹلائے تیار رکھا ہے دوزخ کی آگ کو، جب وہ اُنہیں دیکھے گی دور سے بھی تو وہ سنیں گے اُس کے غیظ و غضب کی آواز اور شدید چنگھاڑ اور جب وہ ڈالے جائیں گے اس کی کسی تنگ جگہ میں لوہے میں جکڑے ہوئے تو اُس وقت وہ ہائے واویلا کریں گے، آج ایک دفعہ واویلا نہ کرو بلکہ بہت دفعہ ہائے واویلا کرو۔''

اگر یہ آیت ترتیب تنزیل میں بھی قبل کی آیات سے متّصل ہے تو اُس کا ربط یہ ہے کہ اصل میں یہ چیز نہیں ہے کہ رسول کا بازاروں میں پھرنا اور آب و طعام کا محتاج ہونا ہی اُن کے لئے ایمان میں سدّ راہ ہو، بلکہ اصل تو یہ ہے کہ اس دنیا کی مادّی زندگی کے آگے وہ کسی دور حیات کے قائل نہیں ہیں اس واسطے طرح طرح کی باتیں کر کے ایمان سے گریز کر رہے ہیں۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا ⑮ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ⑯

''کہئے کہ کیا یہ اچھا ہے یا وہ زندگی جاوید والا بہشت جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ ہے وہ ان کے اعمال کا صلہ اور

آخری ٹھکانا ہے، ان کے لئے وہاں وہ ہے جو وہ چاہیں ہمیشہ ہمیشہ رہتے ہوئے یہ تمہارے پروردگار کے ذمہ ایک وعدہ ہے جس کا مطالبہ کیا جائے''۔

''یہ'' یعنی عذاب جہنم جس کے شدائد کا ذکر پہلے ہوا ہے۔[1] کیا یہ اچھا ہے یا پرہیزگاروں کا انجام بخیر جو بہشت کی نعمتوں کی صورت میں ہوگا؟ خود تمہاری عقل کیا کہتی ہے؟ کسے تمہیں اختیار کرنا چاہئے؟

وعدا مسئولا..... کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، وہ اس پر مبنی ہے کہ یہ سوال بمعنی طلب ہے علامہ طبرسیؒ نے کئی قول نقل کئے ہیں، سب اسی محور پر گردش کرتے ہیں۔[2]

بعض لوگوں نے اسے سوال بمعنی استفسار سے لیا ہے کہ اس کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔[3] مگر میرے خیال میں اس صورت میں مسئولا عنه ہونا چاہئے نہ کہ خالی مسئولا جو کہ قرآن میں ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿١٧﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿١٨﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿١٩﴾

''اور جس دن وہ حشر میں ان سب کو لائے گا اور انہیں جن کو وہ اللہ کو چھوڑ کر پوجا کرتے تھے تو وہ کہے گا کہ کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا یا وہ خود راستے سے بھٹک گئے؟ تو وہ کہیں گے کہ پاک ہے تیری ذات، ہمارے لئے یہ زیبا نہیں تھا کہ ہم تجھے چھوڑ کر کوئی اہالی موالی بنائیں مگر تو نے انہیں اور ان کے باپ داداؤں کو خوب مال و دولت دیا یہاں تک کہ وہ یاد دہانیوں کو بھول گئے اور وہ تباہ ہونے والے لوگ تھے۔ اس طرح انہوں نے جھٹلا دیا تمہیں اس میں جو تم کہتے ہو تو تم نہ ہٹانے پر قدرت رکھتے ہو اور نہ مدد پر اور جو تم میں سے ظلم کا مرتکب ہو، اسے ہم بڑا عذاب چکھائیں گے''۔

''جن کی اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے عبادت کی تھی'' ان کا جو جواب قرآن نے بیان کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایسے ہی اشخاص ہیں

---

[1] بمعنی ما ذکرہ من السّعیر و اوصافه (تبیان)

[2] قال ابن عباس معناہ انّ اللہ سبحانه وعدلهم الجزاء فسألوہ الوفاء وقیل معناہ انّ الملائکة سألوا اللہ تعالیٰ ذٰلك لهم وقیل انّهم سألوا اللہ تعالیٰ فی الدّنیا الجنّة بالدّعا فاجابهم فی الاٰخرة الیٰ ما سألوہ (مجمع البیان)

[3] یہ وعدہ اس سے پوچھ گچھ کے قابل ہوگا (تاج العلماء)

جوخود اپنی عبادت کرنے والوں کے دعادی باطلہ اور غالیانہ عقائد واقوال سے راضی نہ تھے اور اس لئے اس کی تفسیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور جناب عزیر علیہ السلام وغیرہ معصومین علیہم السلام کے نام لئے گئے ہیں۔[1] مگر حقیقت یہ ہے کہ بے جان معبود بھی یعنی بت اگر شعور کے مالک ہوں۔تو وہ بھی اپنے عبادت گزاروں سے راضی نہ ہوں اور خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ روز قیامت ان میں بھی شعور ماضی وحال پیدا کردے اور ان سے یہ سوال و جواب ہو جیسا کہ دوسرا قول ہے۔

مگر وہ خود قرآن مجید کی ان دوسری آیات کے ساتھ سازگار نہیں ہے جن میں بتوں کا بھی اپنے عبادت گزاروں کے ساتھ دوزخ میں جھونکا جانا مذکور ہے، اس لئے میں پہلے ہی قول کو درست سمجھتا ہوں۔[2]

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۝۲۰

''اور انہیں بھیجا ہم نے آپ کے پہلے پیغمبروں کو مگر یہ کہ وہ بھی کھانا کھاتے تھے، اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہم نے تم میں سے ایک کو دوسرے کے لئے ذریعہ آزمائش بنایا ہے، کیا تم لوگ صبر و برداشت سے کام لوگے؟ اور آپ کا پروردگار خوب دیکھنے والا ہے''۔

یہ ان کی اس بات کا جواب ہے جو چند آیات کے پہلے آچکی ہے، کہ یہ پیغمبر عجیب ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔[3] کہا جارہا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، جتنے انبیاء پہلے آئے ہیں، وہ سب ایسے ہی تھے۔

''ایک دوسرے کے لئے ذریعہ آزمائش''، یعنی یہی تو تمہارا امتحان ہے کہ اپنے ایسے انسانوں کے سامنے ان کے کمالات اور معجزات سے ان کے نمائندہ خالق معلوم ہونے کے بعد تم سر جھکاتے ہو یا نہیں اور ان کا بھی امتحان ہے کہ وہ انسان ہوتے ہوئے عصمت کے اس نقطہ پر کس طرح باقی رہتے ہیں جو ان کے شایان شان ہے۔اس طرح تمہارے اور ان کے دونوں کے صبر کا امتحان ہے۔

ان جنہوں نے بشر کہہ کے رسول ماننے سے انکار کیا، وہ بھی اس امتحان میں ناکام ہوئے اور جو آج رسول یا امام مانتے ہوئے ان کی بشریت سے انکار کررہے ہیں یا بشر کے آگے کوئی نوع تجویز کرتے ہیں، وہ بھی اس امتحان میں ناکام ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ۝۲۱

---

[1] قال مجاهد یعنی عیسیٰ وعزیر (تبیان)

[2] قیل یعنی الاصنام عن عکرمة والضحاك (مجمع البیان)

[3] هو جواب لقولهم: مالهٰذا الرّسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق (تبیان)

''اور وہ جنہیں ہم سے ملنے کی کوئی توقع نہیں، کہتے ہیں کہ کیوں نہ ہم پر فرشتے اتارے گئے یا ہم اپنے پروردگار کو آنکھوں سے دیکھتے؟ انہوں نے اپنے دل میں گھمنڈ کیا اور بڑی سرکشی سے کام لیا''۔

یہ ان کا کہنا ہے کہ ''ہم پر'' فرشتے کیوں نہ اترے یا اپنے پروردگار کو ہم نے اپنی آنکھوں سے کیوں نہ دیکھا'' اس کے اندر یہ جذبہ کارفرما ہے کہ ایک اپنے ایسے آدمی کے سامنے سر جھکانا ہماری شان کے خلاف ہے یہی ذہنی پس منظر ہے جس کی پردہ کشائی قرآن نے استکبروا فی انفسھم کہہ کر کی ہے یعنی یہ کہنا تکبر اور اپنے اُوپر گھمنڈ کے باعث سے ہے جس کا نتیجہ ''خواری'' کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٢٢﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿٢٣﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ﴿٢٤﴾

''جس دن فرشتوں کو آنکھوں سے دیکھیں گے، اس دن گنہگاروں کے لئے کوئی خوشخبری نہیں ہوگی اور وہ کہیں گے ارے یہ تو مکمل محرومی رہی اور ہم متوجہ ہوں گے ان کے اعمال کی طرف جو انہوں نے کئے ہیں تو کر دیں گے انہیں بالکل بے حقیقت، اس دن بہشت والے اچھے ہوں گے قرار گاہ کے لحاظ سے اور بہتر ہوں گے جائے استراحت کے اعتبار سے''۔

فرشتوں کا عام لوگوں کے سامنے آنا قیامت سے وابستہ:

یہ قیامت کے دن کا حوالہ ہے ان کے یہاں جیسا کہ اس کے قبل کی آیت میں گزرا، دو باتیں تھیں، ایک یہ کہ فرشتے ہم پر اتریں اور دوسرے ہم خود اپنے پروردگار کو آنکھوں سے دیکھیں۔ اگر قیامت کے ہنگامہ میں پروردگار کے دیدار کا تصور صحیح ہوتا تو خالق اپنے جواب میں قیامت کے دن کی کیفیت میں اس کا ذکر کرتا مگر قیامت کے دن بھی جس چیز کو ثابت کیا گیا ہے وہ فرشتوں کا آنکھوں سے دیکھنا ہے جو کہ ممکن ہے لیکن اللہ کا آنکھوں سے دیکھنا، وہ تو جس طرح اس دنیا میں ناممکن ہے، ویسے ہی قیامت میں بھی لہٰذا اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

اب یہ فرشتوں کا دیکھنا بھی جس کے وہ آرزومند تھے، قیامت میں وقوع میں تو آئے گا مگر وہ ان پر بہت مہنگا پڑے گا کیوں کہ اس دن ان کی بداعمالیوں کی سزا تو ملے ہی گی، جو دنیا میں اچھی قسم کے کام کئے ہوں گے، انہیں بھی اس دن وہ اپنے کفر کی وجہ سے دیکھیں گے کہ اکارت گئے اور جو محنت ان کے سلسلہ میں کار خیر سمجھ کو انہوں نے کی تھی، وہ برباد ہوگئی۔

وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ''وہ کہیں گے، کون کہیں گے؟ اس میں اختلاف ہے، ایک تفسیر یہ ہے کہ وہ کافر یہ کہیں گے اس کے لحاظ سے ہم نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ ارے! یہ تو مکمل محرومی ہے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ فرشتے کہیں گے اور مطلب یہ ہے کہ آج کسی قسم کی خوشی یا سکون و آرام کی چیز تم پر حرام ہے۔[1]

---

[1] یقولون حجرا محجورا ای حراما محرّما قال قتادۃ والضّحاك ھو من قول الملٰئکۃ یقولون حراما محرّما علیکم البشرٰی (تبیان)

کافروں ہی کا قول قرار دیتے ہوئے بھی ایک دوسرا تصور یہ ہے کہ حجرا محجورا ایک محاورہ ہے کہ جب کوئی جان لینے آئے تو امان مانگنے کے لئے یہ الفاظ کہتے ہیں جن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہماری جان کا لینا تم پر حرام ہے۔[1]

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴿۲۵﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿۲۶﴾

''اور جس دن بادل کے ساتھ ساتھ آسمان شق ہو جائے گا اور فرشتے اتارے جائیں گے جیسا اتارا جانا چاہئے، اس دن اقتدار کل حقیقی معنی میں سب خدائے رحمٰن سے مخصوص ہوگا اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا''۔

دنیا کے بادشاہوں کی جو سلطنت کہلاتی ہے، وہ تو نام کی ہے اور وہ نام بھی اس دنیا تک ہے۔ اصل اقتدار خالق کائنات کا یہاں بھی ہے مگر وہ مجاز کے تہ در تہ پردوں کی وجہ سے بہت سی دھندلی نظر والوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ قیامت کے دن وہ بالکل بے حجاب طور پر سب کے سامنے ہوگا اور تب سب کو پتہ چلے گا کہ حقیقی سلطنت کس کی ہے۔[2]

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾

''اور جس دن ظالم آدمی اپنے ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹتا ہوگا، کہے گا کاش میں پیغمبر سے رسم وراہ رکھتا، کاش میں فلاں شخص کی بات نہ مانتا، اس نے مجھے نصیحت قبول کرنے سے بھٹکایا بعد اس کے وہ مجھ تک پہنچی، اور شیطان انسان کو بڑا بے سہارا چھوڑ دینے والے''۔

وہ فلاں شخص جو قیامت تک گمراہی کا ذمہ دار ہے:

آخر والی آیت کے آخری جز سے تو ذہن کہتا ہے کہ قبل والی آیت میں ''فلاں شخص'' سے مراد شیطان ہی ہے، لیکن اس لفظ کے ابہام میں ایسا انسان بھی مراد ہو سکتا ہے جو شیطان ہی کی طرح گمراہ کرے اور وقت آنے پر اس کا کردار بھی وہی ہوگا جو شیطان کا بتایا گیا ہے کہ وہ انسان کو بے سہارا چھوڑ دیا کرتا ہے۔[3]

غور کرنے پر اس پہلے سے مزید تقویت اسی کو ہوتی ہے کہ جب بعد میں صاف شیطان کا نام موجود ہے تو قبل میں فلان کی لفظ کے ساتھ ابہام رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ اس ابہام سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے ہر دور میں کوئی بھی ایسا شخص مراد ہے جس نے کسی کو بھی حق کے قبول کرنے سے

---

[1] كانوا يقولون فى الدّنيا اذا لقوا من يخافون عنه القتل حجرا محجورا دماؤنا عن مجاهد (مجمع البيان)

[2] اى الملك الّذى هو الملك حقّا ملك الرحمٰن يوم القيامة (تبيان)

[3] يتناول كلّ خليل مضلّ عن الدّين (مجمع البيان)

روکا ہوا اور اپنی باتوں سے اسے گمراہ کیا ہو جس میں سب سے مقدم وہ ہوگا جس نے شروع ہی میں کوئی جملہ ایسا کہہ دیا ہو یا کوئی کاروائی ایسی کر دی ہو جو قیامت تک کے ایک بڑے طبقہ کی گمراہی کا سبب بن جائے تو یہ فلاں شخص اس کا مستحق ہوگا کہ قیامت تک ہر گمراہ ہونے والا فلاں کی جگہ اس کا نام لے۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿٣٠﴾

''اور پیغمبر کہیں گے اے میرے پروردگار! میری امت نے اس قرآن کو بالکل ترک کر دیا تھا''۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہِ الٰہی میں شکایت:

یہ پیغمبر جو اپنی امت کا شکوہ کر رہا ہے، کسی اور دور کا پیغمبر نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔[1] جو القرآن کی لفظ سے ظاہر ہے اور یہ امت جس کا شکوہ ہے، وہ غیر مسلم نہیں ہیں جنہوں نے قرآن کو کلام ربانی مانا ہی نہیں بلکہ وہ مسلمان ہیں جو اسے اپنی کتاب مانتے ہیں مگر اس پر عمل نہیں کرتے یہ ان کا شکوہ وہ کر رہا ہے جسے گناہگاروں کی سفارش کے منصب پر مامور کیا گیا ہے۔

کسی شاعر نے آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ستم ڈھانے والوں کے لئے جو کہا تھا:

ویل لمن خصماؤہ شفعاؤہ.

غضب ہے ان کے لئے کہ جو ان کی سفارش کرنے والے ہیں، وہی ان کے خلاف فریق ہیں۔

یہ کیا یہاں پر منطق نہیں ہے.....؟

یاد رہے کہ شکوہ اور سفارش، دو متضاد چیزیں ہیں، اس لئے یہ وہی بدنصیب گناہگار ہو سکتے ہیں جو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت سے محروم ہوں اور اس صورت میں وہ ظالمین بھی جن کا اس کے قبل ذکر تھا کہ وہ اپنی بوٹیاں کاٹ رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کاش میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک راستہ رکھتا ہوتا۔ مسلمان ہی ہیں ''نخالص مسلمان'' اور اب وہ فلاں بھی جس کے دوست بنائے جانے پر وہ ہاتھ مل رہے ہیں، کہیں دور پر نہیں ہوگا۔ آس پاس ہی ہوگا جس کی پیروی نے انہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نصوص و ہدایات پر عمل کرنے سے باز رکھا اور سب سے بڑھ کر یہ نص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں اجماع اور شوریٰ وغیرہ کا ڈھونگ رچایا۔

یہی وہ ہے جو الفاظ آیت سے ہمارے ذہن میں آتا ہے مگر عام مفسرین اس پورے سلسلہ کو مکہ کے مشرکین سے متعلق قرار دیتے ہیں جو قرآن کو سن کر کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے اور سمجھنے کا کیا ذکر سننے ہی کے لئے تیار نہ تھے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿٣١﴾

''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے ایک دشمن قرار دیا گنہ گاروں میں سے اور کافی ہے آپ کا پروردگار بحیثیت

---

[1] قال الرّسول محمّد ﷺ (جلالین)

رہنما و مددگار''۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا نے ہر ایک نبی کا اپنے جبر وقہر سے کسی کو دشمن بنایا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ ایسے لوگ ہوا کئے ہیں جنہیں ان کے کردار کی وجہ سے اللہ دشمنان خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں محسوب کرتا رہا۔[1]

ہمارے یہاں تفسیر میں اس کے متعلق جتنے اقوال ہیں سب کا ہر پھر کر مطلب یہی ہوتا ہے۔

بے شک علامہ طبرسیؒ نے ایک دوسرا پہلو پیدا کیا ہے، جو بحسب واقعہ بھی درست ہے، اور الفاظ قرآنی سے بعید بھی نہیں، وہ یہ ہے کہ خالق نے اپنے رسولوں کو بھیجا اور انہیں مامور فرمایا ایسی باتوں کے کہنے پر جو ان لوگوں کی افتادِ طبع کے خلاف اور ان کے ذہن پر بار تھیں جیسے ان کے غلط عادات وافعال پر اعتراض اور ان کے معبودوں کی مذمت جس سے وہ لوگ ان رسولوں کے دشمن ہو گئے تو چونکہ ان کی دشمنی کا باعث جو باتیں تھی وہ اللہ کے حکم سے تھیں، اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے ہر رسول کا بہت لوگوں کو دشمن بنا دیا۔[2]

ہم نے اس آیت کو گزشتہ آیات کے ساتھ ملا کر دیکھا تو وہ گزشتہ آیات کے اس مضمون کے ساتھ جسے ہم نے ترجیح دی ہے، چسپاں نظر آتی ہے، خصوصاً آخر کے فقرے کی وجہ سے کہ کافی ہے آپ کا پروردگار بحیثیت رہنما و مددگار'' کیوں کہ نبی کی دشمنی اور خالق کی رہنمائی میں بظاہر کوئی ربط نظر نہیں تھا لیکن جب سابق میں جو فلاں تھا اس کے کردار میں جو قرآن نے بتایا ہے، یہ دیکھتے ہیں کہ لقد اضلنی عن الذکر' اس نے بھٹکایا نصیحت قبول کرنے سے'' تو اب اس کے اضلال کے ساتھ اللہ کا ہادی یعنی رہنما ہونا بالکل مرتبط ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دشمن بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہی فلان ہے کہ جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نصب العین ہے قیامت تک کے لئے خلق خدا کی ہدایت کا سامان کرنا (لن تضلو بعدی) اور یہ فلان جو آپ کا اور آپ کے اس مقصد کا دشمن ہے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور اس طرح خلق خدا کی گمراہی کا سامان کرتا ہے تو اس کے مقابلہ میں ارشاد ہو رہا ہے کہ کافی ہے آپ کا پروردگار بحیثیت رہنما و مددگار'' یعنی لاکھ یہ گمراہی کا سامان کرے، پھر بھی توفیق الٰہی اور ہدایت ربانی سے ایک گروہ راہ ہدایت پر قائم و برقرار رہے گا، چاہے وہ اقلیت میں ہو تو تاریخ ہدایت کی سنت مستمرہ یہ رہی ہے کہ حق کے جادہ پر قائم رہنے والے کم ہوتے ہیں، جو قرآن کی کثیر التعداد آیات سے ظاہر ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿٣٢﴾

اور کافر لوگ کہتے ہیں کہ ان پر پورا قرآن اکٹھا کیوں نہیں اتارا گیا (ہاں) اسی طرح مقصد یہ ہے کہ ہم اس سے آپ کے دل میں ثبات واستقلال پیدا کریں اور (اسی لئے) ہم نے اسے پوری طرح ٹھہر ٹھہر کر سنایا ہے''۔

قرآن مجید کے بتدریج اتارے جانے کی حکمت:

---

[1] المعنی انّ اللہ حکم بانّہ علیٰ ھٰذہ الصّفۃ .....وقیل جعلنا ببیاننا انّھم اعداؤھم کما یقال اجعلہ لصّا او خَئنا وقیل معناہ امرنا ان یسمّوھم اعداء (تبیان)

[2] وکانت ھٰذہ اسباب داعیۃ الی العداوۃ فاذا امرہ بھا فقد جعلھم عدوّالہ (مجمع البیان)

نکتہ چینی کے لئے تو کوئی بہانہ چاہئے چنانچہ ایک بات منکرین قرآن نے یہ کہہ دی کہ آخر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں اتر رہا ہے؟ ایک دم پوری کتاب کیوں نہیں آ گئی، خالق نے پہلے خود رسول ﷺ کے لئے اس کی مصلحت بیان کی ہے کہ وقتاً فوقتاً مختلف حالات میں جو آپ کو مشکلات پیش آتی ہیں، ان میں یہ ہر ہر وقت پر وحی کا اترنا اور قرآن مجید کی آیات کا آنا آپؐ کے لئے نفسانی طور پر بڑی ڈھارس کا باعث ہوتا ہے اور آپ کے لئے مشکلات کے مقابلہ میں بڑا سہارا رہتا ہے۔[1] چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جب چند روز وحی کے آنے میں تاخیر ہوتی تھی تو رسول پریشان ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی یہ پریشانی اضطراب کی حد تک پہنچ گئی ہے۔

وَلَا يَأْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿٣٣﴾

''اور وہ آپ کے سامنے کوئی خاص بات نہیں لاتے، مگر یہ کہ ہم حقیقت پیش کر دیتے ہیں اور زیادہ تشریح کی صورت میں''

مخالفین کے مقابلہ میں دوسری مصلحت یکجائی طور پر ایک کتاب کی صورت میں قرآن نہ اترنے کی یہ ہے کہ حسب موقع جیسی بات یہ کہیں فوراً اس کا جواب دے دیا جائے اور سننے والوں کے ذہن کو بلند سے بلند مطالب حقہ سے بہرمند کیا جائے۔[2]

اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿٣٤﴾

''وہ جو دوزخ کی طرف منہ کے بھل روانہ کیے جائیں گے، یہ بدترین عمل کے لحاظ سے اور زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں راستے کے اعتبار سے۔''

یحشرون علیٰ وجوھھم کا عموماً مطلب یہی کہا گیا ہے، وہ منہ کے بھل محشور ہوں گے[3] اور اس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ منہ کے بھل کھینچے جا رہے ہوں گے اور ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ منہ کے بھل چل رہے ہوں گے، یہ حدیث صحاح اہل سنّت میں وارد ہوئی ہے جسے ہمارے علماء نے بھی نقل کیا ہے[4] قرآن مجید میں بھی ایک دوسری جگہ صراحۃً ہے کہ

يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ۭ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ

جس دن وہ آگ میں چہروں کے بھل کھینچے جا رہے ہوں گے، چکھو اس آگ کا مزہ۔ (سورۂ قمر۔ ۴۸)

---

[1] ای لیقویٰ بہ قلبك وتزداد بصیرۃ وذٰلك انّہ اذا کان یأتیہ الوحی متجدّدا فی کلّ حادثۃ وکلّ امر کان ذٰلك اقویٰ لقلبہ وازید فی بصیرتہ (مجمع البیان)

[2] ای لم ینزّل القراٰن جملۃ واحدۃ لانّھم لا یأتونك بشئی یریدون بہ ابطال امرك الّا جئناك بالحق الّذی یبطلہ واحسن تفسیرا ممّا یأتونك بہ واجود معانی (تبیان)

[3] افتادو بدروی خویش (شاہ ولی اللہ)

[4] فی الحدیث: انّ الّذی امشاھم علیٰ اقدامھم قادر علیٰ ان یمشیھم علیٰ وجوھھم (تبیان) اورادہ لبخاری فی الصحیح (مجمع البیان)

مگر وہاں دوزخ میں کھینچے جانے کا ذکر ہے اور یہاں موقف حشر کی طرف جانے کا جس کیلئے ایک مقام پر قرآن مجید میں ہے:

مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ: (قمر۔۷) پکارنے والے کی آواز کی طرف سر جھکائے۔

اور ایک جگہ ہے:

نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ: (سجدہ۔۱۲) اپنے سر جھکائے ہوئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مختلف مقامات پر مختلف موقعوں کی تصویریں ہیں کیوں کہ دور قیامت کے احوال واہوال کا سلسلہ طولانی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۚ﴿۳۵﴾ فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ؕ﴿۳۶﴾

''اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عنایت کی اور اُن کے ساتھ اُن کے بھائی ہارون کو وزیر بنایا، اس کے بعد کہا کہ تم دونوں بھائی اس جماعت کی طرف جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، اس کے بعد ہم نے ان لوگوں کو تہس نہس کر دیا۔''

ظاہر ہے کہ درمیان کی کڑیاں سلسلۂ بیان میں چھوڑ دی گئی ہیں، اس لئے کہ وہ قرآن ہی میں مختلف موقعوں پر بیان ہوتی رہی ہیں یعنی وہ اس حکم کے بعد جو اُن کے پاس گئے اور اپنی رسالت کا اظہار کیا تو اُس جماعت کو جھٹلایا اور ان کا مقابلہ کیا جس کے ذیل میں ساحروں کا پورا واقعہ ہے اور جناب موسیٰ کا مصر سے نکلنا اور فرعون کا اپنی قوم والوں کے ساتھ ان کا تعاقب کرنا اور سامنے دریا کا آنا اور جناب موسیٰ علیہ السلام کے لئے بحکم الٰہی عصا کی ضرب سے دریا کا شگافتہ ہونا اور موسیٰ کا مع بنی اسرائیل کے اُس پار جانا اور فرعون اور اُس کے تمام قوم کا اس دریا میں ڈوب جانا، بس یہ آخری انجام وہ ہے جسے یہاں قرآن نے یوں کہا ہے کہ ہم نے ان کو پورے طور پر تہس نہس کر دیا۔[1]

وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۚ﴿۳۷﴾ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾

''اور نوح کی قوم والے، جب اُنہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو ہم نے اُنہیں غرق کر دیا اور اُنہیں لوگوں کے لئے ایک نشانی قرار دیا اور ہم نے ظالموں کے لئے دردناک عذاب تیار رکھا ہے اور عاد اور ثمود اور رس والے اور ان کے بیچ میں بہت سی نسلیں اور ہر ایک کے لئے ہم نے مثالیں پیش کیں اور پھر ہم نے ہر ایک کو پوری طرح تہس نہس کر دیا۔''

''نوح علیہ السلام کی قوم نے براہ راست تو نوح علیہ السلام کی تکذیب کی مگر چونکہ پیغام تمام پیغمبروں کا بنیادی طور پر ایک ہوتا ہے، اس لئے ایک

---

[1] فی الکلام حذف ای فذهبا الیهم فلم یقبلوا منهما وجحدوا ثبوتهما فدمّرناهم (مجمع البیان)

کے ساتھ تمام پیغمبروں کی تکذیب ہوتی ہے۔[1]

رس کے معنی کنویں کے ہیں[2] اس کنویں کا واقعہ کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے پیغمبر کو اُس کنویں میں ڈال دیا[3] دوسری روایت یہ ہے کہ وہ لوگ اُس کنویں کے اردگرد بیٹھے تھے کہ وہ زمین دھنس گئی اور وہ سب مع مکانات کے زیر زمین چلے گئے[4] تیسرا قول یہ ہے کہ وہ اُس کنویں کے پاس کی بستی میں رہتے تھے۔ اُن کا پتہ دینے کے لئے کنویں کا نام لیا گیا ہے۔[5]

مثالیں پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ امتوں پر جس جس طرح عذاب نازل ہوا، اُس کے تذکرے دوسری قوموں کے سامنے پیش کیے گئے تاکہ وہ اس سے سبق لیں اور سمجھیں کہ ہم نے اس طرح کفر کیا اور بداعمالیاں اختیار کیں تو ہم بھی عذاب میں گرفتار ہوں گے[6] پھر جب اُنہوں نے اس سے اثر نہیں لیا تو آخر ایسا عذاب آیا کہ وہ تہس نہس ہو گئے۔

وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝۴۰

''اور یہ گئے ہیں اُس بستی میں جس پر بری طرح کا مینھ برسایا گیا تھا، تو کیا وہ اسے آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی حشر ونشر ہوگا۔''

فریقین کی تفسیریں متفق ہیں کہ بستی سے مراد قوم لوط کی سرزمین ہے جس پر پتھروں کی بارش کا عذاب نازل ہوا تھا۔[7]

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۝۴۱ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۭ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝۴۲

''اور جب وہ آپ کو دیکھیں گے تو بس آپ کا مذاق اڑائیں گے'' کیا یہ وہ ہے جسے اللہ نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟ وہ تو قریب تھا کہ ہمیں ہمارے خداؤں سے بھٹکا ہی دے۔ ''اگر ہم اُن پر استقلال کے ساتھ جمے نہ رہتے، اور اُنہیں معلوم ہوگا جب عذاب آنکھوں سے دیکھیں گے کہ کون راستے سے زیادہ بھٹکا ہوا ہے۔''

---

[1] لانّ الانبیآء یصدق بعضھم بعضا ..... فمن کذّب بواحد منھم فقد کذّب بھم جمیعھم (تبیان)

[2] رہنے والے کنویں کے (شاہ رفیع الدّین)

[3] کہتے ہیں کہ ایک امّت نے اپنے رسول کو کنویں میں بند کر دیا پھر ان پر عذاب آیا، تب وہ رسول خلاص ہوا (موضح القرآن)

[4] اسم ئبرو نبیّھم شعیب وقیل غیرو کانو اقعودا حولھا فانھارت بھم ومنازلھم (جلالین)

[5] رہنے والے کنویں کے (شاہ رفیع الدّین)

[6] ای کلا بیّنا لھم انّ العذاب نازل بھم ان لم یؤ منو اعن مقاتل (مجمع البیان)

[7] ھی سدوم قریۃ قوم لوط (علی بن ابراھیم) ھی عظمیٰ قویٰ قوم لوط (جلالین) قریۃ قوم لوط امطروا بالحجارۃ (مجمع البیان)۔

ان کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کو یہ کہنا کہ وہ ہمیں گمراہ کر دیتا، بالکل ویسی ہی دھاندلی ہے جو ''خرد کو جنون اور جنوں کو خرد'' کہنے یا سمجھنے میں ہوا کی ہے، چونکہ ایسوں کو قائل معقول کرنا عموماً بے سود ہوتا ہے، اس لئے خالق نے اُن کی بات کے مقابلہ میں صرف مستقبل کا حوالہ دیا ہے کہ جب عذاب سامنے آئے گا، تب سمجھیں گے کہ کون بھٹکا ہوا تھا؟ وہ جو ایمان اختیار کرتے ہیں یا یہ جو ایمان سے منحرف ہیں۔ [1]

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾

''کیا آپ نے دیکھا ہے اُسے کہ جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنائے رکھا؟ تو کیا آپ اس کے ذمہّ دار ہو سکتے ہیں؟ یا آپ کیا ایسا سمجھتے ہیں کہ ان میں سے زیادہ تر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ نہیں ہیں یہ مگر مثل چوپایوں کے بلکہ ان سے زیادہ گمراہ ہیں۔''

پست کردار انسانوں کا جانوروں سے بدتر ہونا:

چوپایوں کے مثل کردار میں ہیں جیسے اُن کے افعال صرف خواہشات اور جذبات کی بنا پر ہوتے ہیں، امتیاز حق و باطل سے بحث نہیں ہوتی، ویسے ہی یہ لوگ صرف جذبات کی رو میں بہتے اور خواہشات کے جھکڑوں میں اڑتے ہیں، امتیاز حق و باطل سے اُنہیں تو کوئی مطلب نہیں تو ان میں چوپایوں میں فرق ہی کیا ہوا؟ اور ''چوپایوں سے بدتر ہیں'' اس لئے کہ وہ جانور عقل و شعور رکھتے ہیں نہیں اور یہ کمبخت عقل و شعور کی طاقتیں رکھتے ہوئے ان سے کام نہیں لیتے پھر یہ کہ جانور بھی ان غذاؤں سے جو ان کے لئے مضر ہیں، طبعی طور پر پرہیز کرتے ہیں اور یہ جان بوجھ کر وہ باتیں کرتے ہیں جو اُن کے لئے ہلاکت دنیا و دین کی باعث ہیں.

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا اپنے پروردگار کو کہ اُس نے کیوں کر سائے کو پھیلایا اور اگر وہ چاہتا تو تھما ہوا کر دیتا، پھر ہم نے سورج کو اُس کا رہنما قرار دیا۔ پھر اسے اپنی طرف سمیٹا تھوڑا تھوڑا کر کے۔''

اُس کے مضمون کو عام سمجھنے کے ساتھ پھر بھی بعض حضرات ایسے مفرد تخاطب کا روئے خطاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی طرف لیتے ہیں [2] جو ہمارے نزدیک بلا وجہ ہے جس پر مختلف مقامات پر اسی تفسیر میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

---

[1] ای من اخطاء طریقا عن الھدٰی اھم ام المؤمنون (مجمع البیان)

[2] یقول اللہ تعالیٰ لنبیّہ محمّد ﷺ متوجہ الیٰ جمیع المکلفین الم تر یا محمّد ﷺ (تبیان)

سورج کو اُس کا رہ نما قرار دیا یعنی سایہ سورج کے اِدھر اُدھر ہونے سے گھٹتا بڑھتا ہے [1] اب خواہ یہ اِدھر اُدھر ہونا خود سورج ہی کی گردش ہو جواب سے پہلے کا تصور تھا یا زمین کی گردش سے ہو جواب کا مسلّم الثّبوت تصور ہے۔

''اگر وہ چاہتا تو اسے تھما ہوا کر دیتا'' یعنی وہ سایہ ایک حال پر رہتا، گھٹتا بڑھتا نہیں، یہ بھی ان میں سے کسی ایک تصور سے وابستہ نہیں ہے، بہر حال وہ چاہتا تو اس شے کو جس کی حرکت سے سایہ گھٹتا بڑھتا ہے، ساکن کر دیتا اور چونکہ سایہ کا گھٹتا بڑھتا رہنا اس کی حرکت سے ہے تو جب وہ شے ساکن ہو جاتی تو یہ ایک حال پر ٹھہر جاتا، نہ گھٹتا، نہ بڑھتا۔ [2]

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾

''اور وہ وہ ہے جس نے تمھارے لئے رات کی پوشش بنائی اور نیند کو آرام اور دن کو چہل پہل بنایا''۔

اس سے ظاہر ہے کہ بعض والیان ملک اور رؤسا کا یہ دستور جو ہم نے دیکھا ہے اور ان کے پہلے شاید سلاطین روزگار کا ہوگا کہ وہ رات کو جاگتے اور دن کو سوتے تھے، یا کوئی اب ایسا کرے وہ اصولِ فطرت کے بالکل خلاف ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾ لِّنُحْيِيَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾

''اور وہ وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا خوش خبری دیتا ہوا اس کی رحمت کے آگے آگے اور ہم نے آسمان سے پانی جو پاک اور پاک کرنے والا ہے تا کہ اس سے زندہ کریں مردہ زمین کو اور اسے پلائیں مخلوقات میں سے چوپایوں اور بکثرت آدمیوں کو''۔

پانی کا ذریعہ طہارت ہونا:

پانی کے لئے طہور کا لفظ قرآن میں آیا ہے اور زمین کے لئے حدیث کے لئے حدیث میں آئی ہے اس طرح کہ ارشاد حضرت رسالتؐ ہے:

جعلت لی الارض مسجدا و طهورا:

میرے لئے زمین محل سجدہ اور طہور بنائی گئی۔

یہ طہور کا لفظ طہارت سے مبالغہ کے ساتھ ہے جس کے لفظی معنی تو زیادہ پاک کے ہوئے لیکن شیعہ سنّی دونوں فریقوں کے یہاں اس

---

[1] الظّلة یتبع الدّلیل الّذی هو الشمس کما یتبع السا ئر فی المفا دة الدّلیل (تبیان) یعنی بہرحال صفت کہ آفتاب تقاضا می کندمی رود (فتح القرآن)

[2] قادر علیٰ تسکین الشمس حتیٰ یبقی الظّل ممدودا (مجمع البیان)

کے معنی مُطَهِّرِ یَتْ کا جزء داخل ہے جس کی بنا پر طھور کے معنی ہوں گے بجائے خود طاہر ہونے کے ساتھ دوسری چیزوں کو طاہر کرنے والا۔[1] یہ مفہوم اس لفظ سے کس طرح نکلتا ہے؟ یہ بحث شرح لمعہ سے لے کر جواہر الکلام تک فقہ کی استدلالی کتابوں میں کافی وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ۝۵۰

اور ہم نے اسے ان کے درمیان طرح طرح سے پیش کیا ہے تا کہ وہ نصیحت قبول کریں، پھر زیادہ تر لوگوں نے نا شکرے پن کے سوا (کسی دوسرے راستے کے اختیار کرنے سے) انکار کیا''۔

پہلی ہی نظر میں اس کا کوئی تعلق قبل کی آیت سے ہمارے ذہن میں نہیں آیا بلکہ صرفناہ کی ضمیر کا مرجع بلاغور وخوض ہمارے ذہن نے اس ہدایت یا تعلیم وتلقین اور نصیحت کو قبول کیا اور اس لئے ہم نے صرفناہ کا ترجمہ ''طرح طرح سے پیش کیا'' کے الفاظ میں کر دیا اور کچھ مترجمین ومفسرین اس سے متفق ملے[2] مگر اس کے برخلاف ایک تشریح اس آیت کی اسے قبل والے مضمون سے متعلق کرتے ہوئے اسطرح ہوئی ہے کہ صرفناہ کی ضمیر پانی کی طرف راجع ہے۔اب معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے اس (پانی) کو ان کے درمیان مختلف صورتوں سے گردش دی۔[3] مگر اکثر ناشکرے پن سے کام لیتے ہیں کہ بارش کو ستاروں وغیرہ سے متعلق کرتے ہیں اور ہماری قدرت کی کارفرمائی کے منکر ہیں[4] مگر یہ تشریح ہمارے ذہن سے چسپاں نہیں ہوتی خصوصاً بعد کی آیات کو دیکھتے ہوئے لہٰذا ہم نے ترجمہ اس تفسیر کا تتبع نہیں کیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۝۵۱ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲

''اور اگر ہم چاہتے تو ہر گاؤں میں ایک عذاب الٰہی کی اطلاع دینے والا بھیجتے تو آپ کافروں کا کہا نہ مانیے اور اس کے ذریعہ سے اُن کے مقابلہ میں بہت بڑا جہاد کرتے رہیے۔''

ابھی تک انہیں ایک رسول کے آنے پر اتنا تعجب ہے، یہ تو اب حکمت الٰہی متقاضی ہوئی کہ اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام دنیا کے لئے اکیلا رسول بنا کر بھیجا جائے ورنہ اس کے پہلے تو ایک ایک وقت میں کئی کئی نبی ہوا ہی کیے تھے، اگر خدا چاہتا تو اب بھی ایسا ہی کرتا۔اس میں حیرت و استعجاب کی کیا بات ہے۔

دوسرا رخ اس آیت کے مفہوم میں یہ سمجھا گیا ہے کہ یہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا پر ایک طرح سے اپنے خصوصی فضل وکرم کا اظہار ہے کہ ہم چاہتے تو ان کاموں کے لئے جو آپ کے ذمے میں بہت سے انبیاء بھیجتے اور کام تقسیم ہو جاتا مگر ہم نے آپ کو اُن تمام فرائض کا حامل بنایا ہے تا کہ

---

[1] طھورا ای طاھرا مطھّرا مزیلا للاحداث النجاسات مع طھارتہ فی نفسہ (تبیان) مطھّرا (جلالین) پاک کرنے والا (شاہ رفیع الدین)

[2] گوناگوں بیان کردیم پند (شاہ ولی اللہ) طرح طرح سے بیان کیا ہم نے اُس کو (شاہ رفیع الدین)

[3] قیل معناہ قسمناہ بینھم یعطی المطر (تبیان) صرّفناہ ای المطر (مجمع البیان)

[4] جحود النّعمۃ حیث قالوا امطرنا بنوء کذا (جلالین)

آپ کا درجہ اجر وثواب میں بڑھے۔[1]

یہ معنی کچھ ہمارے دل کو لگتے نہیں ہیں۔ پہلا مطلب زیادہ ذہن نشین ہے۔

جاھدھم بہ ''اس قرآن کے ذریعہ سے جہاد کرتے رہیے'' اس سے ظاہر ہے کہ یہ جہاد تلوار سے نہیں ہے بلکہ دلائل حق کو پیش کر کے باطل عقائد کا رد کرنے کا جہاد ہے جو علما کا کام ہوتا ہے۔[2]

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾

''اور وہ وہ ہے جس نے دریاؤں کو اکٹھا کیا ہے۔ یہ شیریں وخوش گوار ہے اور یہ نمکین کھاری ہے اور اُن دونوں کے درمیان اس نے درمیانی پردہ اور مستقل رکاوٹ قائم کی ہے۔''

میٹھے اور کھارے پانی کے سنگم میں قدرتِ الٰہی کا ظہور:

یہ قدرت الٰہی کی کارفرمائی ہے ہر آدمی اس وقت بھی دیکھ سکتا ہے ہر اُس جگہ جہاں کسی ندی کا سمندر کے ساتھ اس طرح اتّصال ہو کہ دونوں برابر برابر جاری ہوں جیسے وہ مقام جسے عراق کے راستے میں زائرین دیکھتے ہیں خلیج فارس سے دریائے دجلہ کے اتصال کا کہ وہاں کھاری اور میٹھا پانی دونوں کا ندھے سے کاندھا ملائے رواں ہیں اور نہ وہ کھاری اس میٹھے میں مخلوط ہو کر اس کی شیرینی میں خلل ڈالتا ہے۔ نہ یہ میٹھا اُس کھاری میں مل کر اُس کے کھاری پن میں کمی کرتا ہے۔ یہی قدرتی رکاوٹ ہے جسے قرآن نے ''برزخ'' اور حجرا محجورا'' سے تعبیر کیا ہے جو کوئی جسمانی رکاوٹ نہیں بلکہ صرف قانون خداوندی کی رکاوٹ ہے۔[3]

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿۵۴﴾

''اور وہ وہ جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا تو اسے خونی اور سسرالی رشتے کا مرکز بنایا اور تمہارا پروردگار بڑی قدرت والا ہے۔''

نسبتی رشتہ کے ساتھ ازدواجی رشتہ بھی تقاضائے فطرت:

یہاں ابتدائے آفرینش سے انسان کو نسب یعنی خونی رشتے اور صِھر یعنی سسرالی رشتے کا مرکز بنانا اس پر انتباہ ہے کہ رہبانیت یعنی ازدواجی رشتوں سے آزادی کی تعلیم فطرت کے تقاضوں کے خلاف ہے اور اسی لئے دین فطرت کے رہنما نے اعلان فرمایا کہ لا رھبانیۃ فی الاسلام اور نیز یہ کہ:

---

[1] یعنی نبی کا آنا تعجب نہیں، اللہ چاہے نبیّوں کی بہتات کر دے، ہر بستی میں ایک نبی ہو (موضح القرآن)

[2] فی ھذا دلالۃ علیٰ انّ من اجلّ الجھاد واعظمہ منزلۃ عند اللہ سبحانہ جھاد المتکلّمین فی حلّ شبہ المبطلین (مجمع البیان)

[3] حجرا محجورا ای حراما محرّما ان یفسدا الملح العذاب (مجمع البیان)

النکاح من سنّتی فمن رغب عن سنّتی فلیس منّی۔
شادی بیاہ میرے آئین کا جز ہے تو جو میرے آئین سے روگردانی کرے، وہ مجھ سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾

''اور وہ عبادت کرتے ہیں اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی جو اُنہیں نہ نفع پہنچاتی ہے اور نہ اُنہیں نقصان پہنچاتی ہے اور کافر اپنے پروردگار کے خلاف پشت پناہی کرنے والا ہے۔''

کس کی پشت پناہی؟ بلاتکلّف جو ذہن میں آتا ہے، وہ یہ کہ ایک کافر دوسرے کافر کی پشت پناہی کرتا ہے، اس طرح وہ اللہ کے مقابلہ میں جتھ بندی کرتے ہیں لیکن بعض نے کہا ہے کہ یہ کافر شیطان کا پشت پناہ بنتا ہے۔[1]

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۶﴾

''اور ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا۔''

اس حصّہ کا مقصد وہی ہے جو ماعلی الرسول الّا البلاغ (نہیں پیغمبر پر مگر تبلیغ کر دینا) کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام زبردستی لوگوں کو راہ راست پر لانا نہیں ہے۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾

''کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا مگر جو چاہے کہ اپنے پروردگار کی طرف راستہ بنائے۔''

اجرِ رسالت جو طلب ہو اللہ کی طرف پہنچنے کا ذریعہ ہے:

ہر نبی نے مطلق طور پر اجر کی نفی کی ہے۔ کہیں کوئی ''اگر'' ''مگر'' نہیں ہے لیکن ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے نفی اجر میں یہاں بھی ایک ''مگر'' کی لفظ لگی ہوئی ہے، اسے ملایئے قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (سورۂ شوریٰ۔ ۲۳) کے ساتھ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا مگر ذوی القربیٰ کی محبّت'' تو نتیجہ نکلے گا کہ وہ ''ذوی القربیٰ'' جن کی محبّت اجر رسالت ہے اللہ کی طرف پہنچنے کا راستہ اور اُس کی جانب سے خلق خدا کے لئے وسیلہ ہیں اور اب تیسری آیت میں جو صراحۃً ''سوال اجر'' کا اثباتی انداز میں اقرار کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ:

مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ (سبا۔ ۴۷) میں نے جو تم سے اجر مانگا ہے، وہ تو تمہارے ہی لئے ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اجر جس کی تمام انبیائے نے نفی کی ہے وہ وہ ہے جس کا فائدہ اجر طلب کرنے والے یعنی پیغمبر کی طرف راجع ہو۔ یہی وجہ ہے جو بلندی عمل پر اثر انداز ہوتا ہے، اس قسم کا کوئی اجر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی طلب نہیں فرمایا، انہوں نے حکم خدا سے جو

---

[1] معینا للشیطان بطاعتہ (جلالین) قال الحسن و مجاھد و ابن زید: یظایر الشیطان علیٰ معصیۃ اللہ (تبیان)۔

چیز بطور اجر طلب فرمائی، وہ وہ ہے جو خود ان کے مقصد رسالت کا جزء ہے یعنی خلق خدا کی ہدایت اور اُن کے لئے سامان نجات کی فراہمی اور وہ ''ذوی القربیٰ کی محبّت'' انہی مفادوں کی حامل ہے، اس لئے اس اجر کا سوال پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل کی بے غرضی پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرَا ۚ﴿۵۸﴾ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۛ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۹﴾

''اور بھروسا کیجئے اُس زندہ پر جو کبھی مرنے والا نہیں اور اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجئے اور اپنے بندوں کے گناہوں سے اُس سے زیادہ باخبر کون ہوگا؟ وہ جس نے آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان میں جو کچھ ہے سب کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر جلوہ گر ہوا، وہی رحمٰن ہے اس کے متعلّق کسی باخبر آدمی سے دریافت تو کرو۔''

کوئی کسی پر بھروسا کرے تو اندیشہ یہ ہوگا کہ ایک وقت میں ہوسکتا ہے یہ مدد کرنے والا دنیا سے اٹھ جائے تو پھر کون مدد کرے گا؟ مگر اللہ کا بندہ جو اللہ پر بھروسا کرتا ہے، اُسے اندیشہ کبھی نہیں اس لئے کہ جس پر اُس کو بھروسا ہے، اس کی حیات لازوال ہے جس پر موت کی دسترس نہیں۔

كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا کے لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ ''کافی ہے وہ اپنے بندوں کے گناہوں پر بحیثیت باخبر کے، مگر اس مفہوم کے لئے اُردو زبان میں ہمارے خیال میں وہی الفاظ ہیں جن کے ساتھ ہم نے ترجمہ کیا ہے یعنی ''اُس سے زیادہ باخبر کون ہوگا''؟

اس کے بعد چونکہ مشرکین عرب رحمٰن کے لفظ سے وحشت کرتے تھے اور اس بنا پر قرآن میں طرح طرح سے رحمٰن کے لفظ سے ان کی وحشت دور کی گئی ہے چنانچہ ایک طرف ہر سورہ کے ساتھ بسم اللہ کی آیت اتاری جس میں اللہ کا وصف ''رحمٰن'' قرار دے کر رحیم کے ساتھ توصیف کی تاکہ انہیں محسوس ہو کہ رحمٰن وہی اللہ ہے اور اس کے مفہوم میں (ہمہ گیری کے وصف کے اضافہ کے ساتھ سہی) وہی ''رحمت'' ہے جو رحیم کے وصف میں ہے، کوئی نئی چیز نہیں ہے لہٰذا اس کو یہاں بتایا جا رہا ہے کہ رحمٰن کوئی اور نہیں ہے، وہی ہے جو خالقِ کائنات ہے اور اسی کا پس منظر وہ ہے جسے صاف طور پر اس کے بعد والی آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿۶۰﴾ السجدة

''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ رحمٰن کیا چیز ہے؟ کیا جس چیز کو تم کہو ہم سجدہ کرنے لگیں اور اس سے اُن کی وحشت میں اضافہ ہوتا ہے۔''

یہی اُن کی جہالت اور یوں کہا جائے کہ لکیر کا فقیر ہونا ہے جس میں اکثر عوام مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ لفظوں کے استعمال میں بھی ''تقلید آباء'' سے ہٹنا نہیں چاہتے، وہ تھی جس کے لئے قرآن نے اپنی ایک مہم یہ بنالی کہ وہ اللہ کے ساتھ ساتھ لفظ ''الرحمٰن'' سے بھی انہیں مانوس بنائے اور ان

کی اس وحشت کو بہر صورت دور کرے۔ یہ چیز اس آیت میں اور اس کے پہلے اور اس کے بعد کی آیات میں برابر کارفرما ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾

''قائم ودائم ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اُن میں روشن چراغ اور چمکتا ہوا چاند قرار دیا''۔

''روشن چراغ'' سے مراد آفتاب ہے جس کے لئے دوسری جگہ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴿١٣﴾ (سورۂ نباء۔ ۱۳) اور تیسری جگہ صاف طور پر جَعَلْنَا الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿١٦﴾ کہا گیا ہے۔ (سورۂ نوح)

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾

''اور وہ وہ ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا اس کے لئے جو نصیحت قبول کرے یا شکر گزار ہونا چاہے۔''

دوسری جگہ اس نعمت کی صاف لفظوں میں تشریح کی ہے کہ اگر دن ہی دن ہوتا تو تم کیسے بے چین ہوتے اور اگر رات ہی رات ہوتی تو کیسے پریشان ہوتے۔ اُس کی بڑی نعمت ہے کہ نہ رات ہی یکساں طور پر قائم رہتی ہے اور نہ دن ہی برقرار۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿٦٣﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿٦٤﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿٦٥﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿٦٦﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿٦٨﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿٦٩﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٧٠﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿٧١﴾ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿٧٢﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿٧٣﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا

قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾

''اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستہ (قدم رکھ کر) چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے تخاطب کرتے ہیں تو وہ سلامتی کی دعا دیتے ہیں اور جو پروردگار کے لئے رات گزارتے ہیں سجدہ اور قیام میں اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار! دور رکھ ہم سے دوزخ کے عذاب کو یقیناً اُس کا عذاب وہ ہے جس پیچھا چھڑانا مشکل ہے وہ بہت برا ٹھکانا اور جگہ ہے اور وہ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ شاہ خرچی زیادہ کرتے ہیں اور نہ کنجوس اور وہ اس کے بیچ میں اعتدال کے درجہ پر ہوتا ہے اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور خدا کی دہائی نہیں دیتے اور اُس نفس کی جس کی اللہ نے حرمت قرار دی ہے ناحق جان نہیں لیتے اور زنا کاری نہیں کرتے اور جو ایسا کرے گا، وہ بڑے گناہ کا مرتکب ہوگا، اُسے روز قیامت دونا دوں سزا دی جائے گی اور اُس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذلیل بنا کر رکھا جائے گا، سوا اُس کے کہ جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک اعمال کرے اور یہ وہ ہیں جن کی غلطیوں کو اللہ بدل دیتا ہے نیکیوں کے ساتھ اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان اور جو توبہ کرے گا اور نیک اعمال کرے گا تو وہ پورے طور پر اللہ سے لو لگائے گا اور وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب لغو باتوں کی طرف گزر ہوتا ہے تو اپنے شان و وقار کو لئے ہوئے (دامن بچائے) گزر جاتے ہیں اور وہ کہ جب اُنہیں ان کے پروردگار کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ بہروں اور اندھیروں کی طرح منہ کے بھل گر نہیں پڑتے اور وہ جو کہتے ہیں کہ پروردگارا ہمیں عطا کرنا ہماری بیویوں اور بچوں کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیش رو بنا۔ یہ وہ ہیں جنہیں ان کے صبر و تحمل کے صلہ میں بہشت میں اونچا درجہ ملے گا اور وہاں اُن سے سلام اور آداب و احترام کے ساتھ پیش آیا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، بہت اچھا ہے وہ مقام اور ٹھکانا رہنے کا''۔

اللہ کے بندوں کی شان:

ذرا اس طویل سلسلۂ اوصاف کا محل ورود دیکھئے جس میں زندگی کے تمام شعبوں میں مثالی کردار کا نمونہ پیش کیا گیا ہے، یہ سب رحمٰن کے تعارف میں ہے جس سے مشرکین عرب وحشت محسوس کرتے تھے، پہلے رحمٰن کا تعارف اُس کی قدرت کے کرشموں کے ذریعہ کیا گیا کہ وہی تو وہ ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کیے۔ وہی تو وہ ہے جس نے رات اور دن کا نظام قائم کیا اور اب اُس کا وہ تعارف ہے جو اُس کے بندوں کا مثالی کردار دکھلا کر کیا جا رہا ہے کہ دیکھو! رحمٰن وہ ہے جس کے بندے اس شان کے ہوتے ہیں۔

بس یہی ہم سے اس دور میں اور ہر دور کے مسلمانوں سے اُس دور میں اسلام کا مطالبہ ہے کہ وہ اس شان کے حامل ہوں کہ اُنہیں دکھا کر اُن کے معبود حق کا تعارف کیا جا سکے کہ دیکھو اُس خدائے واحد کو دیکھو! خاتم الانبیاء کے ماننے والے اس شان کے ہوتے ہیں اور اگر یہ معیار برحق ہے اور جب قرآن نے اُسے پیش کیا ہے تو اس کے برحق ہونے میں شبہہ ہی کیا ہو سکتا ہے؟ تو پھر اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والوں اور اپنے

کو شیعہ علی علیہ السلام بلکہ امامیۂ اثنا عشریہ میں محسوب ہونے والوں پر ذمہ داری زیادہ ہے کہ وہ اپنا کردار ایسا پیش کریں کہ خود مسلمانوں کو بھی دکھایا جا سکے کہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والے علی علیہ السلام کی رہبری قبول کرنے والے اور بارہ ۱۲ معصوم رہبروں کی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد پیروی کرنے والے اس شان کے ہوتے ہیں۔ کیا ہم اس معیار پر پورے اترتے ہیں؟ افسوس اور ہزار افسوس۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝

"کہیے کہ میرا پروردگار تمہاری پرواہ نہیں کرتا اگر تم دعا نہ مانگو، اب تم نے جھٹلایا ہے تو اس کے نتائج تمہیں بھگتنا ہوں گے"۔

مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد بھی اگر تمہاری اس کی بارگاہ میں دعا، التجا نہ ہو تو اس کی خصوصی رحمتیں اکثر متوجہ نہیں ہوتیں، چہ جائیکہ تم تو انکار و تکذیب سے کام لے رہے ہو، اب تو تمہیں عذاب کے سوا کوئی اور توقع رکھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

یہ ہمارا ترجمہ اور تشریح ایک تفسیر کے مطابق ہے [۱] مگر علامہ طبرسیؒ نے اس کے بجائے دوسرے کئی معنی نقل کیے ہیں:

ایک یہ کہ اسے تمہیں حق کی طرف دعوت دینا نہ ہوتا تو تمہیں کوئی اس کا حق نہ تھا کہ اسے تمہاری پرواہ ہو۔ اس طرح دعاء کی اضافت مفعول کی طرف ہوگی۔

دوسرے یہ کہ اگر تم اللہ کو خدا نہ کہو یعنی اس کی خدائی نہ ہو تو وہ تمہاری کوئی پرواہ نہ کرے گا۔

تیسرے یہ کہ اگر تمہارا بتوں کی دہائی دینا نہ ہوتا یعنی تم مشرک نہ ہوتے تو اسے تمہاری کوئی پرواہ نہ ہوتی یعنی وہ تمہیں مبتلائے عذاب کرنے کا ارادہ نہ کرتا۔ ایک اور چوتھے ۴ معنی بلخی صاحب کی طرف منسوب ہیں کہ اگر تم لوگ باہم ایک دوسرے کو شرک اور گمراہی کی طرف دعوت نہ دو تو اللہ کو تم سے کیا مطلب یعنی وہ تمہیں سزا کیوں دے؟ ہماری نظر میں یہ سب اقوال خلاف ظاہر ہیں اور جس مفہوم کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے، اس کی تائید میں معصوم علیہ السلام کا ارشاد بھی موجود ہے۔ [۲] لہٰذا قابل ترجیح وہی ہے۔

****
*****
***
*

---

[۱] لو کان دعاء و کم ایّاہ فی الشّدائد فیکشفھا (جلالین) اگر نہ باشدہ عبادت شما (شاہ ولی اللہ) اگر نہ ہوتی التجا تمہاری (شاہ رفیع الدین)

[۲] روی العیاشی باسنادہ عن برید بن معویۃ العجلی قال قلت لابی جعفر علیہ السلام کثرۃ القراء افضل ام کثرۃ الدّعآء قال کثرۃ الدّعا افضل و ترا ھذا الأیۃ (مجمع البیان)

تفسیر فصل الخطاب

جلد سوم

مصنف

سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب-----تفسیر فصل الخطاب

جلد----------سوم

مصنف---------سید العلما علامہ سید علی نقی النقوی ؒ لکھنوی

پروف ریڈنگ------مولانا عابد عسکری

کمپوزنگ----------(قائم گرافکس۔جامعہ علمیہ۔ڈیفنس۔کراچی)

ترتیبِ نو---------مجاہد حسین حر

نیٹ سیٹنگ---------قلب علی سیال

سال اشاعت------2011

ناشر----------مصباح القرآن ٹرسٹ

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر

۲۴۔الفضل مارکیٹ۔اردو بازار۔لاہور

ابتدائیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ.

قارئین کرام! تفسیر فصل الخطاب کی دوسری جلد پیش خدمت ہے لیکن افسوس صد افسوس کہ سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی اب ہم میں نہیں رہے۔ میں نے ۲۹ مارچ ۱۹۸۶ کو تفسیر کے چند خصوصی نسخے لے کر سرکار ممدوح کی خدمت میں حاضری دی تو معلوم ہوا کہ آپ علیل ہیں اور کسی سے نہیں ملتے۔ بہت دکھ ہوا اور تشویش بھی بہر حال میں نے اپنا وہ نام کہلا بھجوایا جس نام سے آپ مجھے یاد فرمایا کرتے تھے۔ آدمی واپس آیا، اس نے بیٹھک کھول دی اور مجھے انتظار کرنے کو کہا، تھوڑی دیر میں مولانا برآمد ہوئے، کافی دیر گفتگو ہوئی اور پھر خورد و نوش کا سلسلہ بھی چلا۔ میں نے تفسیر کے دو نسخے پیش کیے، تیسرے پر تبرک کے طور پر ان سے دستخط کروالئے اور ساتھ لے آیا۔ مولانا نے تفسیر کو تھوڑی دیر دیکھا اور فرمایا: ''دیر آید درست آید''۔ کسے خبر تھی کہ یہ مولانا سے آخری ملاقات ہے اور پھر کبھی شرف نیاز حاصل نہ ہوگا۔

سید العلماء ۳۰، ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء رحلت فرما گئے اور عین عید الفطر کے دن مدفون ہوئے۔ خداوند عالم ان کو جوار معصومین میں جگہ عطا فرمائے۔

آہ! وہ شمع جو ۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء لکھنؤ میں روشن ہوئی تھی، گل ہوگئی۔

افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں مگر وہ ہم میں روحانی طور پر موجود اور ہمارے دل و دماغ پر محیط ہیں۔ آج بھی ان کے علمی نکات ہم کو یاد آتے ہیں اور دین و دیانت اور اخلاق و شرافت سے ہماری محبت کو مستحکم کرتے ہیں۔ اب ایسی صلح کل ہستیاں کہاں ہیں جو علم و عمل کے میدان میں اسلامی تعلیمات و اقدار کی امین ہوں اور دنیا کی مشکلات میں ہمارے مژدہ فتح مبین ہوں۔

تفسیر فصل الخطاب کی پہلی جلد کی اشاعت کے تھوڑے دنوں بعد ہی ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' لاہور نے جو تفسیر نمونہ کے ناشر ہیں خواہش ظاہر کی کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کی ان کو اجازت دے دی جائے۔ مختلف مواقع پر اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی لیکن نتیجہ خیز نہ ہوسکی۔ ستمبر ۱۹۹۰ء کے آخری دنوں میں میری بیرون ملک سے واپسی پر پھر گفتگو ہوئی اور طے پایا کہ تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت مصباح القرآن ٹرسٹ کی طرف سے اور پیشکش ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کی طرف سے ہو۔ چنانچہ ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے دوسری جلد کا کتابت شدہ مسودہ مصباح القرآن ٹرسٹ کے حوالے کر دیا تا کہ اشاعت کا کام مصباح القرآن ٹرسٹ کے اہتمام و انصرام کے تحت انجام پا سکے اور تفسیر فصل الخطاب کی جلدیں بہ سرعت شائع ہوتی رہیں۔ الحمد للہ کہ مصباح القرآن ٹرسٹ نے اب نئے سرے سے مکمل تفسیر کی کمپوزنگ کروائی ہے اور قارئین کی سہولت کیلئے اشاعتِ ھذا میں تین جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب کو مکمل شائع کر دیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تفسیر کی دوسری جلد حاضر خدمت ہے، امید ہے کہ قارئین اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور تعاون فرمائیں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

سید علی اکبر رضوی

صدر ادارہ ترویج علوم اسلامیہ

کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

سرکار سید العلماء علامہ علی نقوی النقوی اعلی اللہ مقامہ کے خطیبانہ و مؤلفانہ فیوض و برکات کا سلسلہ لگ بھگ پچاس سال پر محیط ہے۔ آپ کی تقریر و تحریر میں بیان و زبان کی سادگی اور مفاہیم و مطالب کی گہرائی یکساں طور پر موجود رہی ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کو برصغیر پاک و ہند کے جمہور مسلمین میں عموماً اور شیعہ مومنین میں خصوصاً مقبولیت اور ادب و احترام نصیب ہوا کہ باید و شاید!

سید العلماء کے آثار علمی میں ''شہید انسانیت'' سمیت دسیوں باعظمت کتابیں، آپ کے کئی ایک مجموعہ ہائے تقاریر اور مختلف دینی موضوعات پر کم و بیش پانچ سو رسالے موجود ہیں۔ تاہم آج سے ۲۵ برس قبل جب آپ کا مقدمہ تفسیر قرآن منظر عام پر آیا تو آپ کے تبحر علمی تحقیقی صلاحیت اور ذمہ دار قلم کی رعایت سے اپنے بیگانے ہر ایک کی نظریں آپ کی تفسیر قرآن کی طرف لگ گئیں۔

اس سلسلے میں خاص و عام کے ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ آپ کی تفسیر آئندہ جلد کی تلاش میں پاکستان کے لوگ ہندوستان جاتے اور وہاں کے لوگ پاکستان آتے، نیز دیگر ممالک میں مقیم مسلمان اس کے لئے ہندو پاک کے کتب خانوں سے برابر رابطہ رکھتے تھے۔ آخر کار ان ہزاروں منتظر اور متلاشی نگاہوں کی تسکین کا سامان یوں ہوا کہ سید العلماء کے ایک نہایت ہی مخلص قدر شناس غلام محمد بٹ نے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۸ء تک کی مدت میں ثمر بگ (مقبوضہ کشمیر) سے آپ کی تفسیر قرآن ''فصل الخطاب'' کی سات جلدیں شائع کر کے اس اہم فرض کی تکمیل کا اعزاز حاصل کر لیا۔

اس اثناء میں مذکورہ تفسیر کی پاکستان میں اشاعت کی ضرورت کا احساس فرماتے ہوئے سید العلماء نے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ کراچی کے صدر سید علی اکبر رضوی کو بھی اس کی اشاعت کے حقوق مرحمت فرما دیئے۔ چنانچہ اس ادارے نے تفسیر فصل الخطاب کی جلد اول شائع کر دی لیکن بوجوہ یہ سلسلہ کچھ آگے نہ بڑھ سکا لہٰذا سید علی اکبر رضوی نے مصباح القرآن ٹرسٹ کی شاندار تفسیری و علمی خدمات کو دیکھتے ہوئے ایک معاہدے کے تحت اس تفسیر کی اشاعت کا عظیم کام اس ٹرسٹ کے حوالے کر دیا۔ بنابریں مصباح القرآن ٹرسٹ نے تفسیر فصل الخطاب کی اشاعت کو خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ جلد اول جو کہ کراچی کے ادارہ ترویج علوم اسلامیہ نے شائع کی تھی، کے ختم ہونے پر مصباح القرآن ٹرسٹ نے اسے دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کی، اس کی اصلاح و تزئین میں مقدور بھر کوشش کی گئی، اس کے باوجود ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ ہمیں اپنی تجاویز و آراء سے مستفید فرمائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آخر میں دردمندانہ گزارش بھی کرتے ہیں کہ تفسیر ہذا کی ترویج میں ہمارے ساتھ ہر ممکن تعاون فرما کر قرآن و عترت کی نصرت اور سید العلماء کی قدردانی کا حق ادا کرنے میں کوشاں رہیں۔

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

ضرورت تفسیر

قرآن مجید جب خود نور، ہدایت، بصیرت، آسان، واضح اور اَحسن (و بہترین) تفسیر ہے تو پھر تفسیر کی کیا ضرورت ہے؟ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات قرآن میں ہے:

وَلَا یَاۡتُوۡنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئۡنٰکَ بِالۡحَقِّ وَاَحۡسَنَ تَفۡسِیۡرًا.(فرقان--۳۳)

اور یہ لوگ کوئی بھی مثال نہ لائیں گے مگر یہ کہ ہم اس کے جواب میں حق اور بہترین بیان (وتفسیر) لے آئیں گے

فَاِنَّمَا یَسَّرۡنٰہُ بِلِسَانِکَ لَعَلَّھُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ.(دخان--۵۸)

درحقیقت ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان پر بالکل آسان قرار دیا ہے، شاید وہ نصیحت قبول کریں۔

وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَھَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ.(قمر--۱۷)

''اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی جو نصیحت قبول کرے''۔

قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا غَیۡرَ ذِیۡ عِوَجٍ لَّعَلَّھُمۡ یَتَّقُوۡنَ.(زمر--۲۸)

''عربی زبان کا قرآن جس میں کوئی کجی نہیں، شاید کہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں''۔

قرآن مجید نے نہ فقط اس سوال کا جواب دیا ہے بلکہ یہ بھی بتادیا ہے کہ مفسر قرآن کون ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡھِمۡ وَلَعَلَّھُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ.(نحل--۴۴)

''اے رسول! ہم نے قرآن کو آپ پر نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے اُن تمام احکام وغیرہ کو بیان کریں (اور ان کی توضیح وتشریح کریں) جو ان کی طرف بھیجے گئے ہیں شاید وہ غور وفکر سے کام لیں''۔

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا.(فاطر--۳۲)

''پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا انہیں جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا''۔

مذکورہ آیات میں واضح طور پر بتادیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے لئے مفسر کی ضرورت ہے اور مفسر قرآن سب سے پہلے خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے ان کے بعد وہ مفسر قرآن ہیں جو وارث قرآن، وارث علم قرآن اور وارث علم پیغمبرؐ ہیں یعنی اہل بیت وعترت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ جیسا کہ خود پیغمبرؐ نے بھی فرمایا:

''اِنِّیۡ تَارِکٌ فِیۡکُمُ الثَّقَلَیۡنِ------ کِتَابَ اللّٰہِ وَ عِتۡرَتِیۡ اَھۡلَ بَیۡتِیۡ------''

میں آپ لوگوں کے پاس دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک کتاب خدا (قرآن مجید) اور دوسری اپنی عترت (یعنی اہلبیت)۔

اہل بیت وعترت پیغمبرؐ کے بعد تفسیر قرآن کی ذمہ داری اُن علماء پر ہے جو انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کے حقیقی وارث اور "اَلْعُلَمَآءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَآءِ" کے مصداق ہیں۔

انہی علماء میں سے ایک حضرت آیۃ اللہ علامہ السید علی نقی النقوی المعروف "علامہ نقن" ہیں۔ جنہوں نے تفسیر فصل الخطاب لکھ کر احسن طریقہ سے فریضۂ الٰہی انجام دیا۔

تفسیر فصل الخطاب سے قرآن مجید کا ترجمہ وحاشیہ مرتب کرتے وقت جس حد تک میں نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا ہے تو تفسیر کی مختلف اقسام (مثلاً تفسیر رُوائی، تفسیر عرفانی اور تفسیر اجتہادی) میں سے فصل الخطاب کو تفسیر اجتہادی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ علامہ موصوف نے اس تفسیر میں ان تمام علوم سے استفادہ کیا ہے جو ایک جامع اور اجتہادی تفسیر کے لئے ضروری ہیں۔

یہ تفسیر اگرچہ سابقہ کتابت کے مطابق چند مرتبہ مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہو چکی ہے لیکن اب خداوند عالم نے خادمین ادارہ مصباح القرآن لاہور مخصوصاً جناب محترم شیخ محمد امین صاحب کو یہ توفیق عنایت فرمائی کہ وہ اسے کمپوز کروا کر خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ کمپوز اور اصلاح کا کام جناب محترم مجاہد حسین حر صاحب کے سپرد کیا گیا انہوں نے اپنی حد تک کوشش کی لیکن اتنے بڑے کام میں نواقص اور غلطیوں کا باقی رہنا فطری امر ہے۔ قارئین محترم سے گزارش ہے کہ نواقص کے سلسلہ میں راہنمائی فرمائیں تا کہ بعد والے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے۔

دعا ہے کہ خداوند عالم بانیٔ ادارہ مصباح القرآن حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین مرحوم علامہ سید صفدر حسین نقوی النجفی قدس سرہ کے درجات بلند فرمائے۔ ان کے قائم کردہ تمام ادارات کو ترقی وکمال عطا کرے مصباح القرآن و دیگر ادارات کی تاسیس میں ان کے معاون خاص محترم جناب سیٹھ نوازش صاحب دام عزہ کو صحت وسلامتی اور طول عمر عطا کرے۔

علامہ مرحوم کے قائم کردہ تمام اداروں کے سرپرست اعلیٰ اور ان کے روحانی جانشین حضرت آیۃ اللہ حافظ ریاض حسین نقوی النجفی دامت برکاتہ کو صحت وسلامتی اور طول عمر بابرکت عطا فرمائے اور ان کا سایہ ہم سب کے سروں پر قائم ودائم رکھے۔ تمام معاونین وخادمین ادارہ مصباح القرآن مخصوصاً جناب محترم محمد امین صاحب کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

سید فیاض حسین نقوی

جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس۔ کراچی

ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مارچ ۲۰۱۱ء

تفسیر فصل الخطاب

چند تاثرات

ڈاکٹر محسن نقوی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ وَعَلٰی اٰلِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاھِرِیۡنَ الَّذِیۡنَ اَذۡھَبَ اللّٰہُ عَنۡھُمُ الرِّجۡسَ وَطَھَّرَھُمۡ تَطۡھِیۡرًا.

ہماری خوش نصیبی ہے کہ برصغیر پاک و ہند کی عظیم ترین علمی شخصیات میں سے فردِ وحید و عالم جلیل سید العلماء علامہ سید علی نقی النقوی (۲۶ رجب ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء۔ ۲۹ رمضان ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۹۸۸ء) کی تفسیر فصل الخطاب کی طبع نو کے موقع پر اس کے بارے میں کچھ خیالات کے اظہار کا موقع ہمیں فراہم ہوا۔

ایک پوتے کے لئے اپنے جدّ (سیّد العلماءؒ ہمارے والد کے چچا تھے) کی کسی کتاب پر لکھنا وہ بھی ''سید العلماءؒ'' جیسی علمی شخصیت کی کتاب، اُس پر مستزاد ''تفسیر القرآن'' جیسا وسیع و دقیق موضوع اِس بے بضاعت کے لئے بہت مشکل کام تھا لیکن توفیق اِلٰہی (عزّوجل) اور ولی العصر، صاحب الزمان علیہ الصلاۃ والسلام اور اُن کے اجدادِ کرام، صلوٰۃ اللہ علیہم کی ہدایت کے توسل سے کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں قرآن مجید کے اردو تراجم کی ابتداء سید العلماءؒ کے اجداد میں سید علی نقویؒ (۱۲۰۰ھ/ ۱۲۵۹ھ بمطابق ۱۷۸۵ء--۱۸۴۳ھ) ابن سید دلدار علی غفرانمآبؒ کے حصّے میں آئی۔ آپ کا ترجمۂ قرآن شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین سے پہلے قرار پاتا ہے۔ اس ترجمے کی زبان قدیم لیکن سلیس اور بامحاورہ ہے۔ اس کا ایک نسخہ پیر ابراہیم ٹرسٹ کراچی کی لائبریری، ناظم آباد میں موجود ہے۔

یوں تو علمائے شیعہ نے قرآنِ مجید کے بہت سے ترجمے اور حواشی قلم بند کئے جن میں مولانا فرمان علی (۱۸۵۳ء--۱۹۱۶ء) اور مولانا مقبول احمد اعلی اللہ مقامہما (۱۸۷۰ء--۱۸۸۶ء) کے تراجم وحواشی کو خاص شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ۔ اسی طرح اردو تفاسیر میں مولانا عمار علی رحمۃ اللہ علیہ (۱۸۲۸ء--۱۹۷۵ء) کی تفسیر ''عمدۃ البیان'' (۳ جلدیں) ایک متوسط حجم کی تفسیر شمار کی جاتی ہے ۔ تقسیم ہند کے بعد مولانا امداد حسین کاظمیؒ (۱۹۰۱ء--۱۹۷۵ء) کا ترجمہ و حاشیہ تفسیر متقین ہماری نظر میں فرمان علیؒ اور مقبول احمدؒ کے تراجم وحواشی پر بوجوہ فوقیت رکھتا ہے۔ اردو تفاسیر میں اس کے بعد علامہ حسین بخش جاڑا صاحب کی تفسیر ''انوار النجف'' تفسیر کے شائقین کا مرکز رہی، اسی طرح علامہ ذیشان حیدر جوادیؒ کا ترجمہ و حاشیہ بھی اس بناء پر بنظر استحسان دیکھا جاتا ہے کہ ترجمہ انتہائی رواں اور حواشی عام قاری کے لئے سہل ہیں۔ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی (دام ظلہ الوارف) کی زیر نگرانی تیار ہونے والی ''تفسیر نمونہ'' کا ترجمہ انتہائی دیانت وعرق ریزی سے کیا گیا اور اس نے خاص حد تک ایک ایسی تفسیر کی کمی پوری کر دی جو طلباء، کالج و یونیورسٹی کے پروفیسروں اور علماء کے لئے ''حوالے'' کا کام دے اور وہ اس کے ذریعے اپنی ''قرآن فہمی'' میں اضافہ کر سکیں۔ فجزاء ہم اللہ أحسن الجزاء. جس دوران تفسیر نمونہ کی جلدیں طبع ہو کر آ رہی تھیں اُسی دوران سید العلماءؒ کی تفسیر ''فصل الخطاب'' پہلے سات جلدوں میں کشمیر سے چھپی، پھر ایک جلد ادارۂ ترویج علوم اسلامیہ سے اور بعد ازاں مصباح القرآن ٹرسٹ نے اس کا پورا سیٹ اچھے انداز میں طبع کیا۔

قرآن مجید کے طالب علم کی حیثیت سے عالم اسلام میں مختلف مکاتب فکر و فقہ کی تفاسیر شائع ہونے کے ساتھ زیر مطالعہ رہتی ہیں تو اپنے مکتب فکر کی اردو تفاسیر وحواشی بھی ہمیشہ زیر نظر رہتے ہیں جو اپنی قدر و قیمت میں کچھ کم نہیں جن میں سے بعض کا ذکر ماقبل ہم کر چکے۔

سید العلماءؒ کی تفسیر کی خاص بات جس نے ہمیں متاثر کیا وہ اس کا ''تفسیری ترجمہ'' ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سید العلماءؒ کی ساری محنت وژرف نگاہی آیات کے ترجمے میں مضمر ہے اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

سید العلماءؒ کسی بھی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے صرف عربی زبان، نحو و بلاغت، معانی و بدائع کو مدّنظر نہیں رکھتے بلکہ اہل بیت علیہم السلام کی احادیث اور اُن کو مدّنظر رکھ کر لکھی جانے والی تفاسیر مثلاً شیخ طوسیؒ کی التبیان، محسن فیض الکاشانی کی الصافی، تفسیر قمی علامہ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان وغیرہ میں پیش کئے گئے مطالب کو اردو ترجمے میں سمو دیتے ہیں اور تائیداً متعلقہ تفسیر کی متعلقہ عبارت کو مختصراً نقل کر دیتے ہیں۔ تفسیری مواد اس ترجمے ہی کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسی لئے ترجمے میں لفظ پر لفظ نہیں رکھا ہے

بلکہ اُسے اُردو محاورے کے مطابق ادا کیا ہے۔ نمونے کے طور پر بعض مقامات پیشِ خدمت ہیں:

(۱) سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۱۹ کے ایک جزء:

وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ

اس کا ترجمہ سید العلماءؒ نے یہ کیا ہے : اور جب تخلیہ ہوتا ہے تو تمہارے خلاف غیظ وغضب سے اپنی بوٹیاں کاٹتے ہیں۔

اس کے بعد حاشیے میں پہلے مولانا فرمان علیؒ کا ترجمہ دیا ہے ''تم پر غصے کے مارے انگلیاں کاٹتے ہیں''۔ پھر ان ہی کا حاشیہ نقل کیا ہے: اس ''الانامل'' کے اصلی معنی پوروں کے ہیں مگر چونکہ اردو محاورہ میں پوروں کا کاٹنا نہیں بولتے ہیں اس وجہ سے یہ ترجمہ کیا گیا ہے۔

بعد ازاں سید العلماءؒ وضاحت کرتے ہیں: مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو میں تو انگلیاں کاٹنا بھی محاورہ نہیں ہے، اس لئے ہم نے ترجمہ بوٹیاں کاٹنے کے ساتھ کیا ہے'' (فصل الخطاب، ج ۳، ص ۳۷)

علامہ جوادیؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب اکیلے ہوتے ہیں تو غصّے سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ تفسیر نمونہ کے اردو ترجمے میں ہے: جب وہ تنہائی میں ہوتے ہیں تو شدید غیظ وغضب سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگ جاتے ہیں۔ (ج ۳ ص ۶۴) سید العلماء کا ترجمہ عربی سے قریب اور اردو محاورے کے مطابق ہے۔

(۲) سورۂ آلِ عمران ہی کی آیت ۱۵۴ کے پہلے جزء میں فرمایا:

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ ...

علامہ جوادیؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: ''اس کے بعد خدا نے ایک گروہ پر پُرسکون نیند طاری کر دی اور ایک کو نیند بھی نہ آئی کہ اسے صرف اپنی جان کی فکر تھی''

اس ترجمے میں ایک تو ''غم'' کا ذکر نہیں ہے، دوسرے تا کہ ''اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ'' میں جو عمومیت ہے وہ مفقود ہے۔ تیسرے قرآن مجید کے الفاظ ''وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ...'' کا ترجمہ مبہم ہے ''اور ایک کو----'' یہاں مفرد کا گمان ہوتا ہے اگر ''گروہ'' کا اضافہ ہوتا اور ''ایک'' کی بجائے ''دوسرے'' ہوتا تو قرآنی الفاظ کی رعایت بھی ہوتی اور مطلب واضح ہوتا۔

سید العلماءؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: پھر اُس نے رنج وغم کے بعد تم پر سکون واطمینان اُتارا نیند کی صورت سے جو تم

میں سے ایک گروہ پر طاری ہو رہی تھی اور ایک گروہ ایسا تھا جسے اپنی جانوں کی فکر تھی۔ (ج ۳ ص ۷۴)

اس کی تائید میں انہوں نے علامہ طبرسیؒ کی تفسیر مجمع البیان کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

(۳) سورۂ نساء کی آیت ۹۱ کا ایک جزء ہے:

كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا.

علامہ جوادیؒ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: یہ جب بھی فتنے کی طرف بلائے جاتے ہیں اُلٹے اس میں اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔

الفاظِ قرآن میں ''بلائے جاتے ہیں'' کسی لفظ کا ترجمہ نہیں ہے۔

شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی نے ترجمہ یوں کیا ہے: جب کبھی لوٹائے جاتے ہیں وہ فساد کی طرف تو اس کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

''اُرْكِسُوْا فِيْهَا'' کے بنیادی معنی: ''یعنی وقعوا فیہا'' (التبیان للطوسیؒ) یعنی ''پڑ جانا'' واقع ہو جانا اس کو تائیداً نقل کر کے سید العلماءؒ نے ترجمہ یوں کیا ہے: اور جب فتنہ پردازی کا دوبارہ موقع ملے تو وہ اس میں بالکل جُٹ جائیں گے۔ (فصل الخطاب ج ۳ ص ۲۶۹) ''جُٹ جانا'' اُردو محاورہ ہے جس میں تن دہی سے کسی کام میں دلچسپی سے لگے رہنے کا مفہوم ہے اور یہی ''اُرْكِسُوا فِيْهَا'' کا درست ترجمہ ہے۔

ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

درج بالا سطور سے سید العلماءؒ کی تفسیر فصل الخطاب کی چند خصوصیات مستفاد ہوتی ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ الفاظِ قرآنی کی بالالتزام رعایت

۲۔ لفظی ترجمے کی بجائے محاوراتی ترجمہ اور لکھنوی اردو محاورے کی مطابقت

۳۔ ترجمے میں عقلی و منطقی اظہار اور ربط کا لحاظ

۴۔ طوالت سے گریز

۵۔ مستند تفاسیر کے طویل اقتباسات سے گریز

۶۔ تفاسیر کے مختصر اقتباسات سے استشہاد

۷۔ احادیث کے طویل مندرجات کی بجائے محض متعلقہ حصّے کا اقتباس و اشارہ

۸۔ تاریخی واقعات کی طرف اشارہ اور تفصیل سے اجتناب

۹۔ تفسیر میں نہ اتنی طوالت کہ قاری پر بار ہو جائے اور نہ ایسا اطناب کہ وہ حاشئے میں شمار ہو۔

۱۰۔ وہ مضامین جن کی ادائیگی عوام میں خلافِ ادب سمجھی جاتی ہے اُس کے لئے ایسے الفاظ کا استعمال جن سے وہ دائرۂ ادب و ستر سے باہر بھی نہ نکلیں اور مطلب بھی ادا ہو جائے۔ مثلاً سورۂ نساء کی آیت ۶ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

''بلوغ کا تعلق تو عمر کے ساتھ ہے جو لڑکے میں ۱۵ برس اور لڑکی میں ۹ برس ہے یا خاص کیفیات جو علامت بلوغ کی حیثیت سے معتبر ہیں''۔ (ج ۳، ص: ۱۴۴)

۱۱۔ فقہی آیاتِ احکام کی وضاحت میں فقہی مسائل کو اپنی پوری فقہی مہارت سے بیان فرمایا ہے مگر اس کو بہت قابلِ فہم انداز میں تحریر فرمایا تا کہ مسائل سمجھ میں آسکیں۔ مثلاً سورۂ نساء کی آیات اِرث۔

قابل مبارک باد ہیں مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور کے مسئولین و منتظمین جو قرآنِ مجید کی خدمت کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ علومِ اہل بیت علیہم السلام کو بھی نشر کر رہے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ اِن سے فرمان خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں: قرآن و اہل بیتؑ جب تک اِن سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے'' پر عمل بھی کروا رہا ہے اور ثقلین کی خدمت بھی۔

ایں سعادت بہ زور بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے مساعی کو قبول فرمائے اور انہیں ''ثقلین'' کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

خادم الثقلین

ڈاکٹر محسن نقوی

۲۶ مارچ ۲۰۱۱ء کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے

* * * * * * * * * * * * * * * * * *

فہرست کتاب

عنوان	صفحہ نمبر
سُوْرَۃُ الشُّعَرَآءِ	21
سورۂ شعرا کے خاص خاص مضامین	21
آغاز تذکرۂ حضرت موسیٰ علیہ السلام	23
جنابِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون سے گفتگو	24
ساحروں سے مقابلہ	27
دریا میں شگاف، موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون کی معہ	
افواج غرقابی	30
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق اور اپنی قوم سے گفتگو	31
خالق سے مناجات	32
حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ	34
قوم کا جواب اور گفتگو	34
انجام کار	35
حضرت ہود علیہ السلام کا موعظۂ وتبلیغ	36
قوم کا جواب اور اس کا انجام	38
حضرت صالح علیہ السلام کا وعظ ونصیحت کرنا	39
ناقہ اور اس کا پے کیا جانا	39
حضرت لوط علیہ السلام کا قوم کو زجر وتوبیخ کرنا	40
قوم کا انکار اور اس کی پاداش	41
جناب شعیب علیہ السلام کا وعظ وپند	41
قوم کا انکار اور اس کی سزا	42
قرآن کا قلبِ پیغمبر پر اترنا	43
عرب کے مقابلہ میں غیر عرب کی بے تعصّبی اور حق پرستی	44
دعوت عشیرہ کا حکم	46

عنوان	صفحہ نمبر
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤ اجداد کا ایمان	47
حق پرستوں کے سوا عام طور پر شاعروں کی مذمّت	49
سُوْرَۃُ النَّمْلِ	50
سورۂ نمل کے خاص خاص مضامین	50
موسیٰ علیہ السلام کا آگ لینے کو جانا اور پیمبری ملنا	52
جناب موسیٰ علیہ السلام کا خوف اور خالق کی تنبیہ	52
کافروں کا باوجود یقین انکار	54
انبیاء کے لئے ورثہ کا ثبوت	54
چیونٹی کا واقعہ اور جناب سلیمان علیہ السلام سے گفتگو	55
ہُدہُد کا واقعہ اور ملکہ سبا کی خبر لانا	57
جناب سلیمان علیہ السلام کا ملکہ کے نام خط لکھنا	57
ملکہ سبا کا عمائدین سلطنت سے مشورہ	58
ملکہ سبا کے تحائف پر جناب سلیمان علیہ السلام کا جواب	59
تختِ بلقیس کا چشم زدن میں آنا	60
ملکہ کا حاضر ہونا اور متعلقہ واقعات	61
قبیلہ ثمود اور جناب صالح علیہ السلام کا حال	63
جناب صالح علیہ السلام کے خلاف منصوبہ سازی اور اس کی ناکامی	64
جنابِ لوط علیہ السلام کی نصیحت، قوم کی مخالفت اور اس کا انجام	65
غیر اللہ کی عبادت کرنے والے کو مسلسل تازیانے	66
علم غیب کا اللہ سے مخصوص ہونا اور اسکا مطلب	68
منکرین قیامت کے سوالات اور ان کے جواب	69
دابّۃ الارض کا ذکر	72
قیامت کے پہلے رجعت کا سوال	73

عنوان	صفحہ نمبر
صور کے اثر سے کچھ افراد کا استثناء	74
زمین کی حرکت کا ثبوت	76
سُوْرَۃُ الْقَصَصِ	78
سورۂ قصص کے خاص خاص مضامین	78
مظالم فرعون	79
مادرِ موسیٰ کی طرف وحی اور اُس کی تفصیل	80
زوجۂ فرعون کی گفتگو اور جناب موسیٰ علیہ السلام کی پرورش	82
قبطی کے قتل کا واقعہ	85
حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف ودہشت کے عالم میں مصر سے نکلنا	87
دختران جناب شعیب علیہ السلام کا واقعہ	88
جنابِ شعیب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو	91
وادیٔ ایمن	92
جناب ہارون کی بحیثیت گواہ ضرورت	94
فرعون کا ہامان کو فرمان اور آخری انجام	96
چشم پوشی اور رواداری کی مدح	101
خالق کے فیصلے کے خلاف اپنے اختیار کو صرف کرنا ایک طرح کا شرک ہے	106
قارون کا کردار اور اس کا انجام	108
انجام بخیر اُن کا جو دنیا میں قہر وغلبہ کے درپے نہ ہوں	110
پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے مرکز کی طرف واپسی کی اطمینان دہانی	112
سُوْرَۃُ الْعَنْکَبُوْتِ	113
سورۂ عنکبوت کے خاص خاص مضامین	113
جناب نوح علیہ السلام کی عمرِ تبلیغ ساڑھے نو سو برس قبل از طوفان	118
حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق	118
قوم کا ظالمانہ رویہ	120
جناب ابراہیم علیہ السلام پر اللہ کی نوازش	122
قوم لوطؑ کی عذاب الٰہی سے تباہی	124
قوم شعیبؑ اور مختلف اقوام پر عذاب الٰہی کا یکجائی تذکرہ	125
اہل کتاب سے بھی بحث میں رواداری	127

عنوان	صفحہ نمبر
قبل رسالت کی زندگی بعد والے دعوے کی حقانیت	128
حرم الٰہی کا مثالی امن قدرت خدا کی نشانی	133
سُوْرَۃُ الرُّوْمِ	135
دنیا کے معاملہ میں نکتہ رسی دین کے بارے میں بے خبری	136
اوقات نماز کی طرف اشارہ	138
اسلام کا دین فطرت ہونا	141
وہ ارشاد الٰہی جس کی بنا پر فدک ہبہ کیا گیا	143
سود میں خسارہ اور زکوٰۃ میں فائدہ	143
اللہ پر بتقاضائے عدل واجب ہونا	145
دور برزخ کا قیامت میں فراموش ہونا	147
سُوْرَۃُ لُقْمٰنَ	149
سورۂ لقمان کے خاص خاص مضامین	149
حرمت غناء	150
آغاز وصایائے لقمانؑ	151
حقوق والدین میں ماں کے حق پر خصوصی زور	152
حق ایمانی نہیں بلکہ انسانی	152
کلمات الٰہی کی کثرت ووسعت	156
وہ باتیں جن کا علم بس اللہ کو ہے	158
سُوْرَۃُ السَّجْدَۃِ	159
سورۂ سجدہ خاص مضامین	159
ملک الموت کا ذکر	162
سجدہ واجبہ	164
مومن اور فاسق یکساں نہیں	164
سُوْرَۃُ الْاَحْزَابِ	168
سورۂ احزاب کے اہم مضامین	168
منہ بولا رشتہ اسلام میں حقیقت نہیں رکھتا	170
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مومنین پر اختیار کلّی	171
جنگ خندق کا ہولناک موقع اور مسلمانوں کی حالت	173

عنوان	صفحہ نمبر
منافقین کا کردار	175
پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہترین نمونہ عمل	176
جنگ خندق کا سرانجام	177
بنی قریظہ کا انجام	178
ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتیاز خاص	179
خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے کے بعد جمہور مسلمین کے اختیار کی نفی	184
ختم رسالت	186
طلاق کے بعد عدّہ نہ ہونے کی صورت	188
ازدواج بصورت ہبہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امتیازی خصوصیت	189
ازدواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے پردے کی پابندی	191
وہ مَحرم افراد جن سے عورتوں کے لئے پردہ نہیں	192
پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود کی تعلیم	192
خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا پہنچانے پر لعنت	193
خواتین کے چہرے کے پردے کا حکم	194
قیامت کا علم اللہ سے مخصوص	195
سُوْرَۃُ سَبَإٍ	199
سورۂ سبا کے خاص خاص مضامین	199
حضرت داؤدؑ کے لئے لوہے کا نرم ہونا	202
دیمک سے سلیمانؑ کی موت کا انکشاف	203
ملک سباء والوں کی ناشکری اور ان کا انجام	204
انتہائی رواداراانہ اعلان	206
مزید رواداری	207
رسالت خاتم الانبیاء کی ہمہ گیری	207
اموال اور اولاد کے ساتھ حسن عمل کی قدر و قیمت میں اضافہ	210
اجر رسالت کا طلب ہونا مگر فائدہ افراد امت کا	214
سُوْرَۃُ فَاطِرٍ	217
سورۂ فاطر کے خاص خاص مضامین	217
کلمہ طیب اور عمل صالح	220

عنوان	صفحہ نمبر
مساوات مطلق خلاف فطرت	225
منتخب افراد کا وارث کتاب ہونا	226
گناہ کے بعد فوری سزا ہوتی تو کوئی باقی نہ رہتا	230
سُوْرَۃُ یٰسٓ	231
سورہ یٰسین کے خاص خاص مضامین	231
ایک خاص داعی حق کے تذکرہ کا آغاز	234
دعوت حق دینے والے مومن کی گفتگو کا تتمہ	234
اُس مومن کی حق گوئی کا نتیجہ	235
اس قوم کا انجام	235
خالق کا افسوس اور اس کا مطلب	236
ہر چیز میں جوڑے	237
آسمانوں کے ٹھوس جسم نہ ہونے کا ثبوت	238
غریبوں کی خبر گیری کے خلاف جواب میں دھاندلی	239
قیامت کے جسمانی ہونے پر تمام انبیاء کا اتفاق	240
زبانوں کی بجائے ہاتھ پیروں کی گواہی کی نوعیت	241
پیرانہ سالی کی کیفیت کو یاد دلانے کا مقصد	242
مشرکین کے اعتراض کی نوعیت جو معاد جسمانی کا ثبوت ہے	245
سُوْرَۃُ الصّٰفّٰتِ	246
سورۂ صافات کے خاص خاص مضامین	246
آفتابوں کی کثرت	247
ذبح عظیم	257
آل یاسین پر سلام	260
سُوْرَۃُ صٓ	267
سورۂ ص کے خاص خاص مضامین	267
حضرت داؤدؑ کا فیصلہ اور اُس پر ان کو انتباہ	272
قرآن کے بابرکت ہونے کے معنی	274
گھوڑوں کے معائنہ اور آفتاب کے پلٹنے کا بیان	275
جناب ایوب علیہ السلام اور ان کے صبر کا تفصیلی تذکرہ	277

عنوان	صفحہ نمبر
سُوْرَۃُ الزُّمَرِ	283
سورۂ زمر کے خاص خاص مضامین	283
تحقیق کا دامن چھوڑنا غلط	284
گناہ گاروں کو ناامید نہ ہونا چاہئے رحمت خدا سے	299
سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنِ	307
فرعون کی طرف سے حضرت موسیٰؑ پر بے دینی اور فساد پھیلانے کا الزام	315
مومن آل فرعون کا تذکرہ	316
ہامان کا بحکم فرعون اونچا محل بنانا تاکہ خدائے موسیٰؑ کا پتہ لگائے	319
حضرت پیغمبر خداؐ کی مغفرت کی دعا تقاضائے عبودیت	324
اوقات نماز کی طرف اشارہ	325
دُعا سے انکار کرنے والوں کو شدید تہدید	327
عذاب آنے کے بعد ایمان لانا بے سود	333
سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃِ	334
سورۂ حٰم سجدہ کے خاص خاص مضامین	334
قیامت میں اعضاء جسمانی گواہی دیں گے	340
سجدۂ واجب	344
خالق کے ثبوت عدل کی دلیل	347
سُوْرَۃُ الشُّوْرٰی	350
سورۂ شوریٰ کے خاص خاص مضامین	350
ذوی القربیٰ کی محبّت کا بطور اجر رسالت مطالبہ	357
حضرت پیغمبر خداؐ کے حکم کا بفیضِ الٰہی ہونا	365
سُوْرَۃُ الزُّخْرُفِ	366
سورۂ زخرف کے خاص خاص مضامین	366
حضرت علیؑ کا اسم با مسمّٰی ہونا	367
اللہ کے لئے نفی اولاد کی دلیل	369
ملائکہ کے صنف اناث میں ہونے کی رد	369
کلمۂ باقیہ منصب امامت	371
اموال دنیا کی پستی وحقارت	373

عنوان	صفحہ نمبر
سُوْرَۃُ الدُّخَانِ	382
سورۂ دخان کے خاص خاص مضامین	382
قرآن کا ایک خاص بابرکت رات میں نازل ہونا	383
شب قدر میں خاص حکیمانہ فیصلوں کا صادر ہونا اور حقیقت زار کی قطعی دلیل	383
سُوْرَۃُ الْجَاثِیَۃِ	389
سورۂ جاثیہ کے خاص خاص مضامین	389
بداعمال لوگ خوش اعمال لوگوں کے برابر نہیں	393
سُوْرَۃُ الْاَحْقَافِ	397
سورۂ احقاف کے خاص خاص مضامین	397
ایمان پر برقرار رہنے کا اجر	401
والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ماں کے حق پر خصوصی توجہ دہانی	402
الوالعزم پیغمبروں کی تعداد	407
سُوْرَۃُ مُحَمَّدٍ	408
سورۂ محمّد کے خاص خاص مضامین	408
دشمنوں سے جنگ کی صورت میں مسلمانوں کو ہدایتیں	410
خدا کی مدد کرو تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور ثابت قدمی عطا کرے گا	411
پیغام جہاد سن کر بعض مسلمانوں کی حالت	415
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبوں میں بعض حاضر ہونے والوں کی حالت	417
قرآن میں غور فکر سے کام لینے کی دعوت	417
مسلمانوں کا لب ولہجہ ان کی پردہ کشائی کے لیے کافی	419
سُوْرَۃُ الْفَتْحِ	422
سورۂ فتح کے خاص خاص مضامین	422
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے قبل اور بعد کے جرائم کی معافی کے معنی	423
تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم	425
کچھ مسلمان باوجود اصرار جہاد میں ساتھ نہیں لیے گئے	427
بیعت شجرہ کا ذکر اور خالق کا اعلان خوشنودی	429
حدیبیہ میں جنگ نہ ہونے دینے کا سبب	432
صلح حدیبیہ سے غیر مطمئن افراد کو مطمئن بنانے کی کوشش	432

عنوان	صفحہ نمبر
سُوْرَۃُ الْحُجُرَاتِ	436
سورۂ حجرات کے خاص خاص مضامین	436
پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش دستی کی سخت ممانعت	437
فاسق کے خبر دینے پر تحقیق کی ضرورت	439
تولّی اور تبرّا کا حکم	440
مسلمانوں کو باغی جماعت سے جنگ کرنے کا حکم	441
مؤمنین سے تمسخر اور بدگمانی کی ممانعت	442
تجسس، بدگمانی اور غیبت سے ممانعت	442
اسلامی مساوات کے ساتھ معیار امتیاز کا بیان	443
اسلام آسان ہے اور ایمان مشکل	444
قبول ہدایت کے ساتھ راہ راست اختیار کرنا اللہ کا احسان	445
سُوْرَۃُ قٓ	446
سورۂ ق کے خاص خاص مضامین	446
پیغام آنحضرتؐ کے ماننے میں کفار کے ذہن کے لیے دو رکاوٹیں	447
دوبارہ کی زندگی سے کفار کا تعجب دور کرنے کے لیے مثالیں	448
قوم نوحؑ کے ساتھ اصحاب رس اور اہل ایکہ کا ذکر	449
آخرت میں کفر ختم مگر اس دن کا ایمان معتبر نہیں	450
اوقات نماز کا بیان	454
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام جبر کرنا نہیں ہے	455
سُوْرَۃُ الذّٰرِیٰتِ	456
سورۂ ذاریات کے خاص خاص مضامین	456
جزا و سزا پر قسموں کے ساتھ زور	457
مشرکین کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف باتوں میں اضطراب	458
پرہیزگاروں کا کردار	458
آسمانوں میں روزی بھی اور خدا کا عذاب بھی	459
قوم لوط پر عذاب کا نزول	461
گزشتہ کئی قوموں پر عذاب کا مختصر تذکرہ	463
مومن اور کافر کے معنی	467

عنوان	صفحہ نمبر
یاددہانی کا اہل ایمان کے لیے فائدہ	468
مقصد خلقت انسان اور جنات	469
سُوْرَۃُ الطُّوْرِ	472
نعمات بہشت کے اوصاف	477
پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی	479
قرآن کا مثل لانے کی دعوت	480
سُوْرَۃُ النَّجْمِ	485
سورۂ نجم کے خاص خاص مضامین	485
پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت عملی و قولی	486
مشرکین کے اس مزعومہ باطل کی رد کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں	491
نتائج کا انحصار سعی و کوشش پر	499
سُوْرَۃُ الْقَمَرِ	505
سورۂ قمر کے خاص خاص مضامین	505
شق القمر ہونا	506
قوم نوحؑ اور طوفان نوحؑ کی نوعیت	508
قوم عاد پر دائمی طور پر منحوس دن کا عذاب ہونا	509
قوم ثمود و ناقہ صالحؑ اور عذاب الٰہی کا آنا	511
قوم لوطؑ پر عذاب اور اس کا مختصر پس منظر	513
زمانہ رسولؐ کے مشرکین کو سخت ترین الفاظ میں انتباہ	514
سُوْرَۃُ الرَّحْمٰنِ	517
سورۂ رحمٰن کے خاص خاص مضامین	517
تخلیق انسان و تعلیم کا بیان	518
خالق کی طرف سے توازن کا قیام	520
زمین اور اس کے نباتات خداوندی نعمتیں	520
دو مشرق اور دو مغرب	521
دو دریاؤں کی آمیزش اور ان سے موتی اور مونگے برآمد	522
ہول قیامت	528
نعمات جنّت کا ذکر	528

عنوان	صفحہ نمبر
سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ	532
سورۂ واقعۃ کے خاص خاص مضامین	532
قرآن کے مس حروف کے لیے طہارت کی شرط	539
تینوں قسم کے لوگوں کے انجام کا خلاصہ	540
سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ	541
سورۂ حدید کے خاص خاص مضامین	541
منافقوں کی بے بسی اور محتاجی	546
مسلمانوں کو انتباہ کہ وہ امتداد زمانہ سے گھبرکر بددل نہ ہوجائیں	547
دنیاوی زندگی کی بے حقیقتی اور بے اعتباری کی مثال	549
حال کی ہر بات پہلے سے لوح قلم قضاؤ قدر میں محفوظ ہوتی ہے	550
تمام انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کتاب اور میزان کا اترنا	551
عیسائیوں کی نیک دلی مگر ان کی ایجاد کردہ رہبانیت کی مذمت	552
سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ	555
سورۂ مجادلہ کے خاص خاص مضامین	555
ظہار کے حکم شرعی کا بیان اور اس کے کفارے کا ذکر	556
سُوْرَةُ الْحَشْرِ	566
سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ	575
سُوْرَةُ الصَّفِّ	585
سورۂ صف کے خاص خاص مضامین	585
حضرت موسیٰؑ کی اپنی قوم کو فہمائش	587
دین الٰہی کے مددگار ہونے کی دعوت اور حوارئین حضرت عیسیٰؑ کی مثال	589
سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ	590
سورۂ جمعہ کے خاص خاص مضامین	590
پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت	592
جمعہ کی نماز کا حکم	594
سُوْرَةُ الْمُنَافِقُوْنَ	596
سُوْرَةُ التَّغَابُنِ	601
سورۂ تغابن کے خاص خاص مضامین	601

عنوان	صفحہ نمبر
منزل تخلیق میں سب کی یکسانی	602
اہل وعیال جو صحیح راستے پر جانے سے روکیں درحقیقت دشمن ہیں	606
اموال اور اولاد، ذریعہ آزمائش	607
سُوْرَةُ الطَّلَاقِ	608
سورۂ طلاق کے خاص خاص مضامین	608
طلاق کے موقع پر دو عادلوں کی بحیثیت گواہ موجودگی ضروری	610
یائسہ وغیرہ اور حاملہ کا عدہ	611
احکام رضاعت	612
سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ	615
سورۂ تحریم کے خاص خاص مضامین	615
اپنے اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچانے کے معنی	619
خالص توبہ	620
کفار اور منافقین کے مقابلے میں سختی کی ضرورت	621
سُوْرَةُ الْمُلْكِ	623
سورۂ ملک کے خاص خاص مضامین	623
موت وحیات ذریعہ آزمائش	624
زمین کی صفت	628
سُوْرَةُ الْقَلَمِ	632
سورۂ قلم کے خاص خاص مضامین	632
حضرت یونسؑ کے ترک اولیٰ کا اظہار	640
سُوْرَةُ الْحَآقَّةِ	641
سورۂ حاقۃ کے خاص خاص مضامین	641
سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ	647
سورۂ معارج کے خاص خاص مضامین	647
پچاس ہزار برس کا ایک سال	648
سُوْرَةُ نُوْحٍ	655
سورۂ نوح کے خاص خاص مضامین	655
حضرت نوحؑ کی بارگاہ الٰہی میں مناجات	659

عنوان	صفحہ نمبر
سُوْرَةُ الْجِنِّ	660
سورۂ جن کے خاص خاص مضامین	660
سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ	666
سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ	671
سورۂ مدثر کے خاص خاص مضامین	671
اللہ اکبر کے معنٰی	672
ایک شخص خاص کا تذکرہ	674
سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ	680
دیدار خدا بصیرت سے نہ کہ بصارت سے	683
سُوْرَةُ الدَّهْرِ	686
اس واقعہ کا ذکر جس کی بنا پر یہ سورہ نازل ہوا ہے	688
نعمات بہشت کا مفصل ذکر، کردار کی جزا کے طور پر	689
سُوْرَةُ الْمُرْسِلٰتِ	692
سُوْرَةُ النَّبَاِ	697
خاص بڑی خبر کا ذکر	697
سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ	701
سُوْرَةُ عَبَسَ	705
سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ	709
سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ	713
سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ	715
سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ	718
سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ	721
سُوْرَةُ الطَّارِقِ	725
سُوْرَةُ الْاَعْلٰى	727
سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ	729
سُوْرَةُ الْفَجْرِ	731
سُوْرَةُ الْبَلَدِ	734
سُوْرَةُ الشَّمْسِ	737
سُوْرَةُ الَّيْلِ	739
سُوْرَةُ الضُّحٰى	741
سُوْرَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ	744
سُوْرَةُ التِّيْنِ	745
سُوْرَةُ الْعَلَقِ	747
سُوْرَةُ الْقَدْرِ	750
سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ	751
سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ	754
سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ	755
سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ	757
سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ	758
سُوْرَةُ الْعَصْرِ	759
سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ	760
سُوْرَةُ الْفِيْلِ	762
سُوْرَةُ قُرَيْشٍ	764
سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ	765
سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ	766
سُوْرَةُ الْكَافِرُوْنَ	768
سُوْرَةُ النَّصْرِ	769
سُوْرَةُ اللَّهَبِ	770
سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ	771
سُوْرَةُ الْفَلَقِ	773
سُوْرَةُ النَّاسِ	774

****

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے

* * * * * * * * * * * * * * * * * *

سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ

مکّیہ.....۲۲۷.....آیات

اس سورہ کی اختتامی آیات میں شاعروں کی صنف کا ذکر ہے، اس لئے اس سورہ کا نام اس صنف کی نسبت سے ہوا۔

سورۂ شعرا کے خاص خاص مضامین:

۱.....جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی گفتگو جس کا تفصیلی بیان اس سورہ کے مختصات میں سے ہے۔

۲.....ساحروں سے مقابلہ، پھر دریا میں شگاف، نبی اسرائیل کا پار ہو جانا اور فرعون کا مع اپنی افواج کے غرق ہونا جو دوسرے مقامات پر بھی مذکور ہے۔

۳.....حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق اور اپنی قوم سے گفتگو، پھر اپنے خالق سے مناجات۔

۴.....حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ، قوم کا جواب اور تفصیلی گفتگو۔

۵.....حضرت ہود علیہ السلام کا موعظ و تبلیغ، قوم کا جواب اور ان لوگوں کا انجام۔

۶.....حضرت صالح علیہ السلام موعظ و نصیحت، ناقہ اور اس کا پے کیا جانا اور نتیجہ۔

۷.....حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو زجر و توبیخ، قوم کا انکار اور اس کی پاداش۔

۸.....جناب شعیب علیہ السلام کا وعظ و پند، قوم کا انکار اور اس کی سزا۔

۹.....قرآن کا قلب پیغمبرؐ پر اترنا۔

۱۰.....عرب کے مقابلہ میں غیر عرب کی بے تعصّبی اور حق پرستی۔

۱۱.....دعوت عشرہ کا حکم

۱۲.....رسولؐ کے آباؤ اجداد کا ایمان اور عبادت گزار ہونا.....وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

طٰسٓمّٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ③ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا

خٰضِعِيْنَ ۝۴

''طا، سین، میم۔ یہ کھلی ہوئی کتاب کی آیات ہیں۔ شاید آپ جان دے دیں گے اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لاتے، اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ایک نشانی ایسی اتاریں کہ زبردستی ان کی گردنیں اُس کے سامنے جھک جائیں۔''

یعنی جبری ایمان خالق کے نظامِ حکمت کے خلاف ہے، اس لئے دنیا میں کافر کا وجود ہے، پھر اُن کے ایمان نہ لانے سے آپ اتنا رنج کیوں کرتے ہیں؟

وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ۝۵ فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۶

''اور نہیں آتی اُن کے پاس خدائے رحمٰن کی طرف سے کوئی تازہ ہدایت مگر یہ کہ وہ اُس سے بے اعتنائی اختیار کرتے ہیں چنانچہ اُنہوں نے جھٹلایا تو عنقریب آئیں گی اُن کے سامنے خبریں اُس کی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔''

یعنی عذاب الٰہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے، پہلے وہ خبروں کی حیثیت رکھتا تھا اور اب وہ مجسّم طور پر اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝۷ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۸ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۹

''کیا اُنہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ کتنے ہم نے ہر عمدہ قسم کے نباتات اُس میں پیدا کیے ہیں، یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے، مگر اُن میں کے زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بلاشبہ تمہارا پروردگار غالب ہے، بڑا مہربان۔''

غلبہ کے باوجود اُس کی مہربانی، دنیا میں یہ ہے کہ وہ باوجود قدرت کاملہ کے عذاب نازل نہیں کرتا، اس طرح یہ غلبہ اور رحم کی صفات دونوں کافروں ہی کے تعلق سے ہیں [1] اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عزیز ''غالب'' کہنا کفّار کے مقابلہ میں ہو اور رحیم کہنا مومنین کے لحاظ سے ہو [2] اور ایک صورت یہ ہے کہ دونوں صفات کو مستقل سمجھا جائے جو بجائے خود ذات الٰہی کے اسمائے حسنیٰ میں ہیں اور تعلق ہر ایک کا کوئی خاص مانا ہی نہ جائے [3]۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۰ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا

---

[1] یعنی نہ ماننے پر جلد عذاب نہیں بھیجتا (موضح القرآن)

[2] العزیز ذو القدرۃ ینتقم من الکافرین الرحیم یرحم المؤمنین (جلالین)

[3] العزیز ای القادر الذی لا یعجزو الغالب الذی لا یغلب الرحیم ای المنعم علی عبادہ بانواع النعیم (مجمع البیان)

يَتَّقُوْنَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ﴿۱۲﴾ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ﴿۱۴﴾ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۷﴾

''اور جب پکارا آپ کے پروردگار نے موسیٰ کو کہ جاؤ اس ظالم فرعون کی قوم کی طرف کہ وہ پرہیزگاری کیوں اختیار نہیں کرتے؟ انہوں نے کہا پروردگار! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے اور میرا دم الجھتا ہے اور میری زبان میں روانی نہیں ہے تو ہارون کو بھی تو بھیج اور ان کا میرے خلاف ایک الزام ہے، تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے مار ڈالیں، کہا ہرگز نہیں۔ اچھا تم دونوں ہمارے معجزوں کے ساتھ جاؤ۔ تمہارے ساتھ سننے والے ہیں، تو جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس اور کہو کہ ہم تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف کے پیغمبر ہیں کہ تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو روانہ کردے''۔

آغاز تذکرۂ حضرت موسیٰ علیہ السلام:

''ان کا میرے خلاف ایک الزام ہے'' یعنی اس قبطی کے قتل کرنے کا جو ایک اسرائیلی سے لڑ رہا تھا اور جناب موسیٰ علیہ السلام نے اس اسرائیلی کی مدد کیلئے اسے گھونسا مارا جس سے اتفاقاً وہ مر گیا[1] اس واقعہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ آچکا ہے۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۲۰﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۱﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾

''اس نے کہا کیا ہم نے تمہیں پالا نہیں بچپنے میں اور تم نے ہم میں اپنی عمر کے کئی سال گزارے اور پھر وہ کارنامہ کیا جو تمہیں کرنا تھا اور تم ناشکرگزاروں میں ثابت ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے وہ کیا تھا اس وقت جب میں کھویا ہوا تھا تو میں بھاگا تم سے جب میں تم سے ڈرا۔ اس کے بعد میرے پروردگار نے مجھے علم عطا کیا اور مجھے پیغمبروں میں سے قرار دیا اور تم یہ احسان مجھ پر جتا رہے ہو جب کہ تم نے تمام بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے''۔

---

[1] ای لھم علیّ دعویٰ ذنب (مجمع البیان) یعنی قتل القبطی (تبیان)

جنابِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون سے گفتگو:

یہ کارنامہ جس کا اس گفتگو میں حوالہ ہے، وہی قبطی کو قتل کا ذکر خود جناب موسیٰ کی زبانی پہلے آچکا ہے اور اس کا تفصیلی تذکرہ سورۂ قصص میں اس کے بعد آئے گا۔

اور یہ جو حضرت موسیٰ کے قول میں ہے اس وقت تک ''کھویا ہوا تھا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک ربّانی ہدایت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ جو بعثت کے بعد ہوتا ہے۔[1]

اور حقیقت امر یہ ہے کہ عصمتِ انبیاء تو ابتدائے عمر سے ہوتی ہے مگر احاطہ علمی میں بفیض ربّانی ارتقاء ہوتا رہتا ہے اور ہر درجہ بالا کے لحاظ سے قبل کے درجہ کو یہ حضرات اپنے لئے ''گم شدگی'' کی لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٣﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿٢٤﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿٢٥﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٦﴾ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿٢٧﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٨﴾

''فرعون نے کہا یہ تمام جہانوں کا پروردگار کیا چیز ہے؟ انہوں نے کہا آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا پروردگار اگر تم یقین کرو۔ اس نے اپنے اردگرد والوں سے کہا کہ تم سن نہیں رہے ہو؟ انہوں نے کہا سب کا پروردگار اور تمہارے اگلے باپ داداؤں کا بھی پروردگار۔ وہ کہنے لگا یہ تم لوگوں کا رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ضروری دیوانہ ہے انہوں نے کہا مشرق اور مغرب اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا پروردگار اگر تم عقل سے کام لو''۔

بہت دفعہ اس پر روشنی ڈالی جاتی رہی ہے کہ قرآن مجید نے واقعات کی وہ کڑیاں جنہیں انسان کا ذہن خود سمجھ سکتا ہے، چھوڑ دی ہیں۔ یہاں یہی صورت ہے۔

خالق کے ارشاد میں پہلے آچکا ہے کہ فرعون کے پاس جا کر کہو: انا رسول ربّ العالمین، ہم تمام جہانوں کے پروردگار کے پیغمبر ہیں.....اب اس سے سننے والوں کو خود ہی سمجھ لینا چاہئے کہ وہ گئے اور انہوں نے فرعون سے یہی الفاظ کہے کہ انا رسول ربّ العالمین ''ہم رب العالمین کی طرف کے رسول ہیں'' اب فرعون کی جو گفتگو یہاں بیان ہوئی ہے، وہ اسی کے تعلق سے شروع ہوتی ہے کہ اس نے کہا: وما ربّ العالمین ''یہ ربّ العالمین، یعنی چہ؟'' اور اب اسی ربّ العالمین کی تشریح ہے جسے جناب موسیٰ علیہ السلام نے ربّ السموت والارض وما بینھما اور پھر ربکم اور ربّ ابائکم الاوّلین اور پھر ربّ المشرق والمغرب وما بینھما کے تعبیرات کے ساتھ پیش کیا ہے۔

---

[1] من الضآلّین عمّا اتانی اللہ بعدھا من العلم والرّسالۃ (جلالین) اعلم یوحی الیّ تحریم قتلہ (مجمع البیان)

پھر یہ انداز دیکھنے کا ہے کہ فرعون اُن کے حق آ گیں جملوں پر طرح طرح کی باتیں کر رہا ہے اور دل آزادی کے طریقے اختیار کر رہا ہے اور ہر بات پر آپ اُس کی کہی اور اپنی سنی ہوئی بات کو جیسے ان کہی اور اَن سنی قرار دے کر اپنی ہی پہلی بات کو تعبیر بدل کر پیش کر دیتے ہیں۔

وہ اپنے مجمع سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ''سن رہے ہو؟ یہ کیا کہہ رہا ہے۔''؟ اور آپ جیسے اب پورے مجمع سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں، ''ہاں سنو! کیا کہہ رہا ہوں؟ یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ سب کا پروردگار ہے اور تمہارے باپ داداؤں کا بھی۔'' وہ ان کے قول اِنّا رسول ربّ العالمین کی بنا پر طنزیہ طور پر مجمع سے کہتا ہے کہ ''یہ تمہارا رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے ضرور دیوانہ ہے'' اور آپ فرما دیتے ہیں۔ ''ارے، وہ مشرق اور مغرب سب کا پروردگار ہے اگر تم عقل سے کام لو۔''

مجنون کا لفظ سننے کے ساتھ ان کنتم تعقلون کی بلاغت دیکھیے، یہ گویا اشارہ ہے اس کی طرف کہ میں خیر، تم سب کو دیوانہ تو نہیں کہتا، اس لئے کہ واقعی دیوانے ہوتے تو مستوجب سزا ہی کب ہوتے مگر افسوس تم عاقل ہوتے ہوئے عقل سے کام نہیں لیتے یعنی تمہارے افعال و اعمال ضرور عاقلانہ ہیں جس پر تم کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ ہے انبیاؑ کا طریقہ دعوتِ حق میں کہ مخالفین کے طعن و تشنیع، بہتان و افتراء، سب کو سنو اور بات اپنی کہتے رہو اور اُس پر زور دیتے رہو، آخر میں جب تعصّب و عناد کا جوش ختم ہوگا تو وہ تمہاری باتوں کو سننے اور اُن پر غور کرنے لگیں گے اور پھر بہت سی سعید روحیں اُس پیغام کو قبول بھی کر لیں گی۔

ایک دوسرا تصور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون دونوں کی زبان پر جاری شدہ فقرات کے متعلق یہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر ایک مسلسل حیثیت رکھتی تھی۔ جب فرعون نے کہا: وما ربّ العالمین تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پرزور انداز میں تابڑ توڑ یہ جملے کہے: ربّ السّمٰوٰت والارض وما بینھما ان کنتم موقنین۔ ربّکم وربّ ابائکم الا وّلین، ربّ المشرق والمغرب وما بینھما ان کنتم تعقلون۔ وہ آسمان اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کا پروردگار ہے اگر تم یقین کرو، وہ تمہارا پروردگار اور تمہارے آباؤ اجداد کا پروردگار ہے۔ وہ مشرق اور مغرب اور اُن کے درمیان کی تمام چیزوں کا پروردگار ہے اگر تم عقل سے کام لو۔'' یہ زوردار تقریر ایک مسلسل بارانِ حقیقت کی حیثیت رکھتی تھی اور فرعون یہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ کہیں اس کا اثر اُس کے گرد و پیش کے لوگوں پر نہ ہو جائے۔ اس لئے وہ بیچ بیچ میں اپنی جماعت کو مخاطب کر کے برابر اُس کے اثر کو دور کرنے کی کوشش کے لئے وہ جملے بول رہا تھا۔[1]

اس کے معنی یہ ہیں کہ جیسے کسی تقریر کی ریکارڈنگ ہوتی ہے تو بیچ بیچ میں جو آوازیں اِدھر اُدھر کی آ رہی ہوں، وہ بھی پردۂ گوش سے ٹکراتی رہتی ہیں بس اُسی انداز میں قرآن مجید نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کے دوران جہاں جہاں فرعون نے کوئی فقرہ کہا تھا، اسے بھی ہمارے سامعہ تک پہنچا دیا ہے۔

میرے نزدیک یہ تصور بھی قرآن مجید کے اُس معجزانہ معیارِ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے، جس نے دنیا کو نئے پیرایوں سے روشناس کرایا ہے، بعید نہیں ہے۔

---

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک بات کہے جاتے تھے اللہ کی قدرتوں کا پتہ بتانے کی اور فرعون بیچ میں اپنے سرداروں کو ابھارتا تھا کہ ان کو یقین نہ آ جائے (موضح القرآن)

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾

''اس نے کہا اگر تم نے میرے سوا کوئی خدا بنایا تو میں تمہیں قید میں ڈال دوں گا، انہوں نے کہا چاہے میں تمہارے سامنے کھلی ہوئی چیز پیش کردوں۔ کہا لاؤ اُسے اگر تم سچّے ہو اس پر پھینک دیا اُنہوں نے اپنا عصا تو ایک دم وہ کھلا ہوا اژدہا ہو گیا اور اپنا ہاتھ نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے لئے چمکتا ہوا ظاہر ہوا''۔

جب فرعون جناب موسیٰ علیہ السلام کی باتوں کا کوئی توڑ نہ کر سکا تو یہ عاجزی کا مظاہرہ تھا کہ وہ اپنے سطوت و اقتدار شاہی سے اُنہیں ڈرانے لگا[1] مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سے بالکل ڈرے نہیں بلکہ اس کی اُس دھمکی کو نامعقول ثابت کرنے کے لئے کہا کہ میں اگر کوئی معجزہ تمہارے سامنے پیش کردوں تب بھی مجھے قید خانے میں ڈال دو گے؟ اس کے جواب میں وہ یہ نہیں کہہ سکا کہ ہاں اگر معجزہ بھی تم نے پیش کر دیا تو بھی ایسا کروں گا اس کا طنطۂ شاہی اس سوال سے دھیما ہو گیا، اور اب وہ بحسب ادّعائے خود جو خدائے وقت تھا، تذبذب کا شکار ہو گیا، جو اُس کی ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ اگر تم سچے ہو تو جو کہتے ہو، وہ پیش کرو، اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم سچّے ثابت ہوئے تو مجھے ماننا ہی پڑے گا، اب اگر معجزہ دکھانے کے بعد وہ نہ مانے جیسا کہ اس نے نہیں مانا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود اپنے ضمیر کی عدالت کے فیصلہ کے مطابق مجرم ہے۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾

''اُس نے اُن عمائد سے جو اس کے اردگرد تھے کہا کہ بلاشبہ یہ ایک بڑا ماہر جادوگر ہے جو چاہتا ہے کہ اپنے جادو سے تمہاری اس سرزمین سے تمہیں باہر نکالے تو تم مجھے کیا رائے دیتے ہو؟ انہوں نے کہا اسے اور اس کے بھائی کو روک رکھیے اور تمام شہروں میں آدمی بھیجئے جمع کرنے والے جو ہر ماہر بڑے جادوگر کو آپ کے پاس حاضر کریں''۔

''تمہیں اس زمین سے باہر نکالے'' اس کے مخاطب بنی اسرائیل بھی ہو سکتے ہیں کہ اُس ازارہ سیاست اُن کا ہمدرد بن کر یہاں تم اپنے گھر بار میں چین سے بیٹھے ہو، یہ شخص چاہتا ہے کہ تمہیں اس دیس سے نکال کر بے گھر اور بے در بنا دے اور یہ بھی امکان ہے کہ اس کے مخاطب اُسی کی قوم کے افراد ہوں اور مطلب یہ ہو کہ وہ تم پر غلبہ حاصل کر کے بجبر و قہر تمہیں اس بستی سے نکال باہر کرے گا۔[2]

---

[1] لمّا طال علیٰ فرعون الاجتماع من موسیٰ تھدّدہ (تبیان)

[2] یحتمل ان یکون اراد یخرجکم من دیارکم ویتعلّب علیکم (تبیان)

علامہ طبرسیؒ نے اسی مفہوم کو اختیار کیا ہے۔[1]

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿٣٨﴾ وَّقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُم مُّجْتَمِعُونَ ﴿٣٩﴾ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِن كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ﴿٤٠﴾ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا لِفِرْعَوْنَ أَإِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ ﴿٤١﴾ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٢﴾

''چنانچہ وہ تمام جادوگر جمع کیے گئے ایک مقرر شدہ دن کو اور عوام النّاس سے کہا گیا ہے کہ چاہو تو تم سب بھی جمع ہو جاؤ، اُمید ہے کہ ہم سب جادوگروں کی پیروی کریں اگر وہ غلبہ حاصل کریں تو جب وہ جادوگر آئے تو اُنہوں نے فرعون سے کہا کہ اگر ہم غالب آئے تو کیا ہمارے لئے کوئی خاص صلہ ہوگا؟ اس نے کہا ہاں ضرور، اس وقت میں تم مقرّبین بارگاہ میں شامل کیے جاؤ گے''۔

ساحروں سے مقابلہ:

ان آیات سے جناب موسیٰ علیہ السلام کا ساحروں سے مقابلہ کا آغاز ہوتا ہے۔

قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم مُّلْقُونَ ﴿٤٣﴾ فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ ﴿٤٤﴾ فَأَلْقَىٰ مُوسَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴿٤٥﴾ فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ ﴿٤٦﴾ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٧﴾ رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿٤٨﴾

''موسیٰ نے ان سے کہا کہ پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو، چنانچہ انہوں نے اپنی رسیّاں اور اپنی لکڑیاں پھینکیں اور کہا فرعون کے اقبال کی قسم یقیناً ہم غالب آنے والے ہیں، اس پر موسیٰ نے اپنا عصا پھینک دیا تو وہ ایک دم نگلنے لگا اُسے جو وہ جھوٹ بنا رہے تھے تو تمام جادوگر سجدہ میں گر پڑے، کہنے لگے ہم اس ربّ عالمین پر جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے ایمان لائے''۔

قرآن مجید میں متعدّد مقامات پر جو الفاظ ہیں، وہ پتہ دیتے ہیں کہ ساحران فرعون کے جادو کی نوعیت اُس سحر کی نہ تھی جس سے کسی شے کی واقعی صورت تبدیل ہو جاتی ہے بلکہ اس کی نوعیت اُس جادو کی تھی جس سے دیکھنے والوں کا حاسّہ متاثر ہوتا ہے جس کو ''شعبدہ بازی'' اور ہماری

---

[1] من ارضکم وديارکم ويتغلّب عليها بسحره (مجمع البيان)

زبان میں ''ڈھٹ بندی'' کہتے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ہے:

يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۶﴾ اُن کے جادو سے تصور ایسا ہوتا تھا جیسے وہ رسّیاں دوڑ رہی ہیں (سورۂ طٰہٰ)

یہاں یہ ہے کہ:

تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ

عصائے موسیٰ نگلنے لگا اُسے جو اُنہوں نے جھوٹ بنایا تھا۔ یہ الفاظ بھی کچھ ایسا ہی پتہ دیتے ہیں۔ [1]

علامہ کنتوری جناب سیّد غلام حسین اعلی اللہ مقامہ نے اپنی سوانح عمری میں ایک جگہ مسمریزم کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے استاد جناب ممتاز العلماء سید نقی صاحب قبلہ اس کے حرام ہونے پر مصر تھے اور فرماتے تھے کہ یہ جادو ہے، علامہ کنتوری لکھتے ہیں کہ میں اس وقت تو گفتگو میں قائل نہیں ہوا مگر بعد میں ایک حدیث میری نظر سے گزری ایسی جس سے میری سمجھ میں آیا کہ ساحرانِ فرعون کا جادو اسی مسمریزم کی جنس سے تھا۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۹﴾ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۚ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾

''فرعون نے کہا تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دوں، یقیناً وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے، اب بہت جلد تمہیں معلوم ہوگا میں ضرور ضرور تمہارے ہاتھ اور پیر مختلف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور تم کو سولی دلوا دوں گا۔ انہوں نے کہا کوئی حرج نہیں، یقیناً ہم پلٹ کر اپنے پروردگار کے پاس جائیں گے ہمیں امید ہے کہ ہمارا پروردگار غلطیوں کو معاف کر دے گا اس لئے کہ ہم سب سے پہلے ایمان لا رہے ہیں''۔

''وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے'' بظاہر تو یہ ضمیر خود حضرت موسیٰ کی طرف راجع ہے، یعنی تم نے موسیٰ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اتنی جلدی ہار مان لی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جادوگری کے فن میں تمہارا استاد یہی ہے [2] مگر شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''تمہارا بڑا کہا رب کو یعنی موسیٰ اور تم ایک استاد کے شاگرد ہو'' (موضح القرآن)

اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔

اُن کا کہنا کہ ''ہم سب سے پہلے ایمان لا رہے ہیں، یعنی موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت کو تسلیم کرنے والے اس وقت سب سے پہلے ہم ہیں۔ [3]

اس پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں کچھ لوگ اسی وقت ایمان لا چکے تھے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی سرزمین مصر سے مدین کی

---

[1] ای انّ العصا تناول جمعی ما موّھوا بہ (مجمع البیان)

[2] ای استاذکم وعالمکم (مجمع البیان)

[3] اوّل المئومنین فی زماننا (جلالین)

طرف گئے نہیں تھے اور مومن ال فرعون کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے، اس لئے ساحر لوگ اب ایمان لائے تو وہ سب سے پہلے ایمان لانے والے تو نہیں ہوں گے مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ساحر سب تو باہر دور دور سے آئے ہوئے تھے۔ انہیں تو پہلے کے حالات اور جناب موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے واقعات معلوم نہ تھے، وہ یہی سمجھے کہ اب ہم جو ایمان لا رہے ہیں تو ہم سب سے پہلے جناب موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت پر ایمان لانے والے ہیں۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾

''اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو لے کر رات کے وقت چل کھڑے ہو یقیناً تمہارا پیچھا کیا جائیگا، تو فرعون نے تمام شہروں میں جمع کرنے والے بھیجے کہ یہ ایک چھوٹی سی ٹکڑی ہے اور بے شک ان لوگوں نے ہمیں غصّہ دلایا اور بے شک ہم پوری طرح چوکنّا ہیں''۔

تمہارا پیچھا کیا جائے گا'' یہ پس منظر بتانا ہے فرعون اور اس کے ساتھیوں کے غرق ہونے کا کہ وہ تمہارا تعاقب کریں گے اور اس طرح دریا تک پہنچ کے غرق ہوں گے۔[1]

''جمع کرنے والے بھیجے'' یعنی فوج ولشکر فراہم کرنے والے، حاذرون جس کا ترجمہ ہم نے ''چوکنّا'' کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پوری طرح ان لوگوں کے تدارک کیلئے آمادہ اور تیار ہیں۔[2]

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾

''تو ہم نے ان کو نکالا باغوں اور چشموں اور خزانوں اور اچھے اچھے مکانوں سے اور ان سب چیزوں کا ورثہ دار بنی اسرائیل کو بنایا''۔

یعنی بنی اسرائیل کے تعاقب کے لئے وہ اپنے باغوں اور چشموں وغیرہ کو چھوڑ کر روانہ ہوئے تو پھر واپس آنا نصیب نہ ہوا اور بنی اسرائیل ان چیزوں کے وارث ہوئے یعنی اُن کے فنا ہونے کے بعد یہ باقی رہے اور پھر انہیں ویسا ہی جاہ واقتدار و مال نعمت حاصل ہوا۔ نہ یہ کہ وہی مصر کے باغات وغیرہ انہیں مل گئے، اس لئے کہ یہ فلسطین کی سرزمین کی طرف روانہ ہوئے مگر چونکہ ظاہر الفاظ قرآن یہی ہے کہ وہی تمام چیزیں، جو فرعون کی قوم والے چھوڑ گئے تھے، بنی اسرائیل کو مل گئیں، اس لئے بعض مفسرین نے یہ کہا کہ یہ چیزیں انہیں حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے دور میں

---

[1] یتّبعکم فرعون وجنودہ فیلحقون دراء کم البحر فانجا کم واغرقھم (جلالین)

[2] ای ذوو اداۃ قوۃ مستعدون (مجمع البیان)

ملیں اور بعض نے کہا ہے کہ فرعون وغیرہ کے غرق ہونے کے بعد پھر بنی اسرائیل مصر کی طرف واپس ہوئے علّامہ طبرسیؒ نے حتم وجزم کے انداز میں اسی کو لکھا ہے [1] مگر قرآن مجید میں تیہ وغیرہ کا تذکرہ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام دونوں کی اسی صحرا نوردی کے عالم میں وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔ اس لئے یہ قول درست معلوم نہیں ہوتا۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ جو عام اصولِ فطرت وعادت کے مطابق ہے کہ جماعت بنی اسرائیل کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلنے کے ساتھ پس افتادہ یا معذور یا ایسے افراد جو ہم خیال نہ ہوں، ہجرت نہ کر سکے ہوں یا ارادۃً انہوں نے ہجرت نہ کی ہو، مصر میں رہ گئے ہوں۔ اب فرعون اور اس کی قوم کے غرق ہونے کے بعد وہ ان کی جائدادوں پر قابض ہو گئے ہوں یا یہ کہ جب بنی اسرائیل نے جو جناب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نکلے تھے، یہ دیکھا کہ فرعون والے لوگ غرق ہو گئے تو ان میں سے ایک گروہ مصر واپس ہو گیا ہو اور ایک گروہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ فلسطین کی طرف روانہ ہوا ہو جس کے واقعات قرآن مجید میں دوسری جگہوں پر مذکور ہیں۔

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾
قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۲﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ
الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۳﴾ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۴﴾
وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۷﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۸﴾

''تو ان لوگوں نے صبح ہوتے ہی ان کا پیچھا کیا تو جب دونوں جماعتیں ایک دوسرے کو دکھائی دینے لگیں تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا کہ یقیناً ہم پکڑ لئے جائیں گے (موسیٰ نے کہا) کہ یقیناً میرے ساتھ پروردگار ہے جو مجھے صحیح راستہ بتائے گا تو ہم نے وحی بھیجی موسیٰ کی طرف کہ اپنے عصا کو دریا پر مارو چنانچہ وہ شگافتہ ہو گیا تو ہر حصّہ مثل پہاڑ کے کھڑا ہو گیا اور نزدیک لائے ہم وہاں دوسری جماعت کو اور موسیٰ اور ان کے ساتھ والی پوری جماعت کو ہم نے نجات دے دی، پھر ہم نے غرق کر دیا دوسروں کو، یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے اور ان میں کے زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بلاشبہ تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی''۔

دریا میں شگاف، موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون کی معہ افواج غرقابی:

اب قرآن مجید کے اتنے تفصیلی بیان بلکہ الفاظ میں مکمل تصویر کشی کے بعد کہ عصا کے مارنے سے دریا ایسا شگافتہ ہوا کہ ہر حصّہ مثل بڑے پہاڑ کے کھڑا ہو گیا اور اسے بڑی نشانی یعنی معجزہ کہنے کے بعد بھی ماضی قریب یا حال کا بخیال خود روشن خیال طبقہ یہ کہے کہ یہ کوئی غیر فطری بات نہ تھی

[1] انّ اللہ سجانہ ردّ بنی اسرائیل الیٰ مصر بعد ما اغرق فرعون وقومہ واعطاھم جمیع ما کان لفرعون وقومہ من الاموال القفار المساکن والدّیار (مجمع البیان)

بلکہ مدوجزر کا طبعی کرشمہ تھا جو ہوا کرتا ہے' تو کیا یہ طبقہ بھی انہی میں سے نہیں جن کے لئے قرآن مجید نے کہہ دیا تھا کہ ''ان میں کے زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں''؟

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا نَعْبُدُ
اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ اَوْ
يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ قَالَ
اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ
اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۷﴾ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ
وَيَسْقِيْنِ ﴿۷۹﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿۸۰﴾ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْٓ
اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۸۲﴾

''اور پیش کیجیے ان کے سامنے ابراہیمؑ کا واقعہ جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ کس کی تم پوجا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم پوجتے ہیں مورتیوں کو اور اسی پر استقلال کے ساتھ قائم ہیں، کہا کہ یہ تم لوگوں کی سنتے ہیں جب تم پکارتے ہو فائدہ بخشتے ہیں یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ انہوں نے کہا بلکہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایسا ہی کرتے پایا ہے کہا تو کیا تم نے آنکھ کھول کر دیکھا کہ تم اور تمہارے اگلے باپ دادا بھی جسے پوجتے ہیں، وہ ہے کیا؟ بہرحال یہ سب میرے دشمن ہی کی حیثیت رکھتے ہیں سوا تمام عالمین کے اس پروردگار کے جس نے مجھے پیدا کیا، اس کے بعد وہی مجھے راستہ بتاتا ہے اور وہ جو مجھے غذا دیتا ہے اور پینے کے لئے پانی دیتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے صحت دیتا ہے اور جو مجھے بے جان کرے گا اور پھر جان عطا کرے گا اور جس سے مجھے امید ہے کہ وہ جزاؤ سزا کے دن جو میری غلطی ہو، اسے معاف کرے گا''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق اور اپنی قوم سے گفتگو:

اس سے نتیجہ نکالنا غلط ہے کہ انبیاؤ مرسلین سے غلطیاں ہوتی ہیں بلکہ یہ احساس عظمت الٰہی ہے کہ معصوم ہونے کے باوجود اس کی بارگاہ میں اپنے کو غلطیوں سے بالاتر نہیں سمجھتے۔

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي
الْاٰخِرِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ

الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾

''اے میرے پروردگار! مجھے علم وحکمت عطا فرما اور مجھے نیکوکاروں میں شامل فرما اور میرے لئے سچائی کی زبان آیندہ نسلوں میں قرار دے اور مجھے بہشت کے حقداروں میں محسوب فرما اور میرے باپ کو بخشش دے، بلاشبہ وہ گمراہوں میں تھا اور مجھے رسوا نہ کر اس دن جب سب اٹھائیں جائیں گے، جس دن نہ مال فائدہ دے گا اور نہ اولاد سوا اس کے جو اللہ کی بارگاہ میں سالم دل کے ساتھ حاضر ہو''۔

خالق سے مناجات:

یہ جناب ابراہیم علیہ السلام کی مناجات میں اپنے پروردگار میں اپنے چچا کیلئے جسے وہ باپ کہتے تھے جو دعا ہے، اس کا پس منظر اور اس پر تبصرہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے، ایک جگہ ان کا اپنے اس بزرگ سے اثنائے گفتگو میں یہ کہنا ہے کہ سوف استغفر لك ربّي مطلب یہ ہے کہ تم میرا کہنا چاہے نہ مانو مگر میں اپنے پروردگار سے تمہاری بخشش کیلئے دعا کروں گا، وہ پس منظر ہے اور اس کی بنا پر مناجات کے ذیل میں یہ دعائے مغفرت ہے اور تیسری جگہ مشرکین ومشرکات کے لئے دعائے مغفرت کی ممانعت کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعائے مغفرت کی توجیہہ ہے کہ:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ (توبہ۔ ۱۱۴)

ابراہیم علیہ السلام کا دعائے مغفرت کرنا اپنے باپ کے لئے صرف ایک وعدہ کی وجہ سے تھا جو انھوں نے اس سے کیا تھا تو جب یہ بالکل صاف معلوم ہوا کہ یہ اللہ کا دشمن ہے تو انہوں نے اُس سے بے تعلقی اختیار کر لی۔

''سچائی کی زبان میرے لئے قرار دے آئندہ نسلوں میں'' اس کے یہ معنی بھی سمجھے گئے ہیں کہ میرے لئے سچی نیک نامی قرار دے یعنی حق بجانب طور پر میرا ذکر خیر باقی رہے چنانچہ دنیا کے تین بڑے مذاہب جو تقریباً تمام عالم پر چھائے ہوئے ہیں یعنی یہود، عیسائی اور مسلمان سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جلالت قدر پر متفق ہیں۔ [1]

اور یہ بھی کہ میری نسل میں ایک سچا دعوت حق دینے والا پیدا کر [2] اب چونکہ اس دعا کی قبولیت کا اعلان دوسری جگہ ان الفاظ میں ہے کہ وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾ (سورۂ مریم) جس میں هُم کی ضمیر جو جمع مذکر کو ظاہر کرتی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ اُن کی اولاد اسحاق علیہ السلام ویعقوب علیہ السلام کی طرف پھیر دی گئی ہے اور اس میں ''لسان صدق'' کے ساتھ ''علیّا'' کا لفظ ہے جس کے وصفی معنی تو بلند کے ہیں مگر

---

[1] ثناء حسنا (جلالین) پدید آوری براي من ذکر نیک در پسیناں (شاہ ولی اللہ) لانّ الیهود یقرّون ببُوته و کذٰلك النّصاریٰ وسائر الامم. (تبیان)

[2] وقیل انّ معناہ: واجعل لی ولدصدق فی الأخر الأمم یدعوا الی اللہ ویقوم بالحقّ وهو محمّد ﷺ (مجمع البیان)

نام کی حیثیت سے وہ ایک شخصیّت کی طرف ذہن کو موڑتی ہے لہٰذا کوئی قابل انکار بات نہیں ہے کہ اس لسان صدق کا مصداق آخری رسولؐ کے اُس سب سے پہلے تصدیق کرنے والے کو سمجھا جائے جس نے آخری رسولؐ کی تصدیق کے ضمن میں پورے سلسلۂ انبیاء کی جو اس سے پہلے تھا مکمل ترین عملی تصدیق کردی اور وہ علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ذات گرامی ہے جسے خالق نے پیغمبر کے ساتھ ''شاہد'' ہونے کے لئے پیدا ہی کیا تھا اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ (سورۂ ہود ۱۷)۔ ممکن ہے یہی شاہدِ رسالت وہ لسان صدق ہو جو علی علیہ السلام ہے اور جس کے آنے سے دعائے ابراہیمی کی استجابت پایہ تکمیل کو پہنچی۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۰﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۹۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿۹۴﴾ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿۹۵﴾ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۹۹﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

''اور بہشت قریب لایا جائے گا پرہیزگاروں کے اور دوزخ سامنے لایا جائے گا گمراہوں کے اور ان سے کہا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کرتے تھے۔ کہا وہ تمہاری مدد کرتے ہیں یا خود مدد حاصل کرتے ہیں تو اوندھے منہ ڈال دیے گئے اس (دوزخ) میں وہ اور تمام گمراہ لوگ اور شیطان کی افواج سب کے سب۔ کہا انہوں نے جب کہ اُن میں آپس میں جھگڑا ہو رہا تھا کہ خدا کی قسم ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے جب تمہیں پروردگار عالمیاں کے برابر قرار دیتے تھے اور ہمیں نہیں گمراہ کیا مگر نابکاروں نے تو اب نہیں ہیں ہمارے لئے کوئی سفارشی اور نہ کوئی مہربان دوست تو کاش ہم دوبارہ بھیجے جاتے تو ایمان لانے والوں میں ہوتے، یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے اور اُن میں کے زیادہ لوگ مومن نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے بڑا مہربان بھی۔''

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۰۷﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۱۰﴾

''نوحؑ کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا جب ان سے اُن کے بھائی نوحؑ نے کہا کیوں تم پرہیز گاری اختیار نہیں کرتے؟ میں تمہارے لئے ایک امانت دار پیغمبر ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ نہیں ہے کسی پر سوا پروردگار عالمیان کے تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا سنوں۔''

حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ:

''نوح علیہ السلام کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔'' اس طرح کی آیات جناب نوح علیہ السلام اور جناب ہود علیہ السلام وغیرہ کی قوموں کے لئے کئی جگہ قرآن مجید میں ہیں اور جیسا کہ وہاں بھی لکھا گیا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ اس قوم کے پاس جناب نوح علیہ السلام کے علاوہ اور بھی انبیاء آئے ہوں، اسی طرح قوم ہود علیہ السلام کے پاس جناب ہود علیہ السلام کے علاوہ بھی دوسرے پیغمبر آئے ہوں جن کے نام ہمیں معلوم نہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جناب نوح علیہ السلام یا ہود علیہ السلام وغیرہ ہی کی تکذیب کو تمام پیغمبروں کی تکذیب قرار دیا ہو اس لئے کہ پیغام تمام پیغمبروں کا ایک ہے تو جس نے اس کی تکذیب کی اس نے سب کی تکذیب کی [1] حدیث معصوم اس پہلے تصور کی موید ہے۔ [2]

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۵﴾

''انہوں نے کہا کیا ہم تم پر ایمان لائیں اس صورت حال میں کہ تمہاری پیروی کی ہے نہایت پست طبقہ کے لوگوں نے، کہا تو جو کردار انہوں نے اختیار کیا، اسے میں کیا جانوں؟ ان کا حساب کتاب سوا اللہ کے کسی پر نہیں، اگر تم شعور سے کام لو اور میں ایمان لانے والوں کو پاس سے بھگا دینے والا تو نہیں ہوں سوا صاف صاف عذاب الٰہی سے ڈرا دینے والے کے۔''

قوم کا جواب اور گفتگو:

ایک نبی یا رسول کا کام پیغام حق کا پہنچانا ہے، قبول کرنا یا نہ کرنا دوسروں کا کام ہے، اب کون لوگ قبول کرتے ہیں اور کون قبول نہیں کرتے ہیں، اسکی ذمہ داری اُس رسول پر کیا ہوسکتی ہے؟ اگر امراء ایمان نہیں لائے اور غرباء ایمان لے آئے تو اسے وہ رہنما کیا کرے؟ وہ کیا ان غریبوں کو جو ایمان لائے ہیں یہ کہہ کر بھگا دے کہ جاؤ تم تو پست طبقہ کے اشخاص ہو، تمہارا ایمان لانا میرے مشن کو نقصان پہنچائے گا۔ ایک مصلح ربّانی اور حجّت الٰہی کی یہ شان نہیں ہوسکتی۔

جناب نوح علیہ السلام کا جواب: **وما علمی بما کانوا یعملون**، اس کا ایک ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ مجھے کیا خبر وہ کیا کام کرتے رہے ہیں: اس

---

[1] انّما کذّبوھم جمیعا لانّھم کذّبوا کلّ من دعا الیٰ توحید اللہ (تبیان)

[2] قال ابو جعفر علیہ السلام یعنی بالمرسلین نوحاً والانبیآء الّذین کانوا بینہ وبین آدم (مجمع البیان)

سے ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ اُن لوگوں نے جو کہا تھا واتّبعك الا رذلون، ''تمہاری پیروی کی ہے پست طبقہ کے لوگوں نے'' اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ بہت رذیل پیشے کرتے رہے ہیں، کپڑا بننا، کوڑا صاف کرنا، جوتیاں ٹانکنا وغیرہ۔ یہ وہی ذہنیّت ہے کہ پیشے کی پستی سے آدمی نیچ ذات کا ہو جاتا ہے جو ہمارے ہندوستان میں اونچی اور نیچی جاتیوں کی صورت میں اب تک قائم ہے۔ جناب نوح علیہ السلام نے اس کے جواب میں یہ کہا ہے کہ مجھے اس سے کیا مطلب کہ وہ کیا پیشہ پہلے کرتے رہے ہیں۔ [1]

مجھے تو دعوت حق دینے سے مطلب ہے جو پہلے اسے قبول کرے گا وہ مومنین کی جماعت میں شامل ہو جائے گا، میں اُنہیں اپنے پاس سے ان کے پیشوں کی وجہ سے بھگا نہیں سکتا۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۲﴾

''ان لوگوں نے کہا اگر تم اے نوحؑ! باز نہ آئے تو تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا، انہوں نے کہا اے میرے پروردگار! میری قوم والوں نے مجھے جھٹلایا ہے، اب تو میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے اور مجھے اور اُنہیں جو میرے ساتھ ایمان لائے ہیں، نجات عطا فرما چنانچہ ہم نے انہیں اور جو اُس بھری ہوئی کشتی میں ان کے ساتھ تھے نجات دے دی، پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو غرق کر دیا، یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے، پھر بھی اُن میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔''

انجام کار:

ان آیات میں قوم نوح کی نافرمانی اور ہٹ دھرمی کے نتیجہ میں ان کے انجام کار کو بیان کیا گیا ہے۔

كَذَّبَتْ عَادُ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

---

[1] ای ما اعلم اعمالهم وصنایعهم ولم اکلّف ذٰلك (تبیان)

وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۳۱﴾ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَّجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳۵﴾

''قبیلۂ عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا، جب اُن سے اُن کے بھائی ہود نے کہا کہ کیوں تم پرہیز گاری اختیار نہیں کرتے؟ میں تمہارے لئے پیغمبر ہوں امانت دار تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ کسی پر نہیں ہے سوا پروردگار عالمیان کے یا تم بے کار ہر بلندی پر کوئی نہ کوئی یادگار تعمیر کرتے ہو اور بڑے بڑے محل تعمیر کرتے ہو، شاید کہ تم ہمیشہ زندہ رہو گے اور جب حملہ آور ہوتے ہو تو ظالمانہ طور پر حملہ کرتے ہو تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور ڈرو اُس سے جس نے تمہیں نوازا اُن چیزوں کے ساتھ جنہیں تم جانتے ہو، تمہیں مویشیوں اور اولاد اور باغوں اور چشموں کے ساتھ نوازا، اب مجھے تمہارے لئے بہت بڑے (ہولناک) دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔''

حضرت ہود علیہ السلام کا موعظۂ وتبلیغ:

اس پورے انبیاء کے تذکرہ میں جو ایک مسلسل حیثیت رکھتا ہے اور جس کی ساخت پتہ دے رہی ہے کہ وہ مقام تنزیل میں ایک ساتھ ایسے ہی تسلسل کے ساتھ اُترا ہے، خاص طور پر دیکھنے کی بات بنیادی حیثیت سے تمام انبیاء کے پیغام کی وحدت ہے، جن الفاظ سے تبلیغ کا آغاز نوح علیہ السلام کرتے ہیں، انہی الفاظ سے ہود علیہ السلام کرتے ہیں، انہی الفاظ سے صالح علیہ السلام کرتے ہیں اور وہی پیغام ہے جو اَب حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیش فرما رہے ہیں۔

اُس بنیادی پیغام کے بعد جو توحید اور نفی شرک کا ہے، پھر ہر نبی کی قوم خصوصی طور پر جن عملی جرائم میں مبتلا ہے، اس کے خلاف ہدایت و تلقین ہوتی ہے، اس میں ہر ایک کی دعوت میں کہی ہوئی باتیں حسب ضرورت جدا جدا ہیں لیکن جو دعوت رسالت کا سنگ بنیاد اور اصل اصول ہے، وہ سب میں ایک ہی ہے، اس میں ذرہ بھر اختلاف نہیں ہے۔

''بے کار ہر بلندی پر کوئی نہ کوئی یادگار تعمیر کرتے ہو'' جیسے آج کل بھی اونچے اونچے مینار رائج ہیں جو سکونت وغیرہ کے کسی کام میں نہیں آتے، بس صرف نام کے لئے ہوتے ہیں، ایسے ہی شاید وہ لوگ کثرت سے بناتے تھے جیسا کہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''اُن لوگوں کو بڑا شوق تھا اونچے مضبوط منارے بنانے کا جن سے کچھ کام نہ نکلے'' (موضح القرآن)

علاّمہ طبرسیؒ فرماتے ہیں:

ای بناء لا تحتاجون الیه لسکنا کم وانّما تریدون والبعث بذٰلك واللعب واللّهو (مجمع البیان)

یعنی ایسی عمارت جس کی تمہیں اپنی سکونت کے لئے کوئی ضرورت نہیں ہے بس تمہارے پیش نظر صرف بے کار کا خرچ اور دل چسپی وتفریح ہے۔

اس کے ساتھ اس ذیل میں اُنہوں نے ایک حدیث درج کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے مکان مسکونہ میں بھی صرف شان وشوکت

یا حسن و جمال کی خاطر ایسے اجزاء بنوانا جن کا ضروریات سکونت میں کوئی دخل نہیں ہے، یہ بھی خالق کے منشا کے خلاف ہے۔ یہ انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر سے برآمد ہوئے تو ایک اونچا گنبد دیکھا، آپ نے فرمایا یہ کیا ہے؟ اصحاب میں سے کسی نے کہا یہ فلاں انصاری کا مکان ہے، آپ خاموش ہو گئے، تھوڑی دیر میں وہ انصاری آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجمع کو سلام کیا، اوروں نے جواب دیا مگر حضرتؐ نے بے رخی اختیار فرمائی۔ انہوں نے آپ کے چہرہ سے ناگواری کے آثار محسوس کیے اور انہیں فکر ہوئی، دوسرے اصحاب سے اس کا ذکر کیا، انہوں نے بتایا کہ حضرتؐ نے تمہارا یہ اونچا گنبد دیکھا تھا اور پوچھا تھا کہ کس کا ہے؟ تو ہم نے تمہارا نام لیا، یہ سن کر وہ انصاری صحابی گئے اور انہوں نے گنبد اپنا منہدم کرا دیا، جب حضرتؐ پھر اُدھر سے گزرے تو وہ گنبد نظر نہ آیا تو فرمایا وہ گنبد کیا ہوا جو یہاں تھا؟ لوگوں نے بتایا کہ سرکار کی ناگواری محسوس کر کے انہوں نے اُسے منہدم کرا دیا۔

حضرتؐ نے فرمایا: ان لکل بناء یبنی وبالا علی صاحبه یوم القیٰمة الّا مالا بدّ منه

ہر عمارت جو تعمیر کی جائے اپنے بنوانے والے کے لئے وبال جان ہوگی سوا اتنے کے جو ضروریات زندگی میں ہو۔

اس حدیث سے صرف ضعف سند کی بنا پر مقر تلاش کر کے اس طرح کی عمارتوں کا جواز حاصل کیا گیا ہے مگر اسلام کے اصل معیاری تصور کے خلاف تو اسے ماننا ہی پڑتا ہے۔

بے شک تفسیری حیثیت سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ قرآن مجید میں سکونتی مکانات کا ''بڑے بڑے محل'' کہہ کر بعد کا ذکر ہے، اس لئے قبل میں جو ہے کہ ''اونچے مقامات پر بے کار یادگار بناتے ہو'' یہ پہلی ہی قسم کی تعمیریں ہیں جن سے سکونت کے مفاد کا کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ انصاری والا گنبد جس کا روایت میں ذکر ہے، اُسے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صرف یادگار کے طور پر بنوایا گیا تھا، اس لئے اُسے اس آیت کے تحت میں داخل نہیں ہونا چاہیے، ہاں دوسرے جملہ کے ماتحت مورد مذمت اور باعث ناگواری پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو سکتا ہے کہ: وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ''بڑے بڑے محل بنواتے ہو شاید تم دنیا میں ہمیشہ رہو گے'' لیکن یہ ایک فنّی بحث ہے، عملی نتیجہ بہرحال یہ ہے کہ اپنے ذاتی مکان میں بھی صرف تزک و احتشام اور عمارت کے شان دار ہونے کے لئے ایسے اجزاء کا بنوانا خالق کو پسند نہیں ہے۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾

''انہوں نے کہا ہمارے لئے برابر ہے تم نصیحت کرو یا نصیحت کرنے والوں میں نہ ہو، یہ نہیں ہے کچھ بھی سوا اگلے زمانے والوں کی باتوں کے اور ہم بھی گرفتار عذاب ہونے والے نہیں ہیں اس طرح ان لوگوں نے ان کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا، یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے مگر ان میں کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔''

قوم کا جواب اور اس کا انجام:

امتوں کا یہ کہنا کہ یہ نہیں ہیں کچھ بھی سوا اگلے زمانہ والوں کی باتوں کے، یہ بھی اُسی حقیقت کی بناء پر ہے کہ انبیاء کا بنیادی پیغام ہمیشہ سے ایک ہی رہا اور گویا ایک ہی بات ہے جسے ہر داعی حق دُہراتا رہا۔

جیسا کہ پہلے اجمالاً انتباہ کیا گیا ہے، بہت سے سوروں کی طرح اس سورہ کی ایک خاص ساخت ہے وہ یہ کہ ہر نبی کے پیغام اور اُس کے نتیجہ کے تذکرہ کے بعد یہ الفاظ آئے ہیں کہ: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳۹﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ : ''یقیناً اس میں بڑی نشانی ہے مگر ان میں زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی ہے۔'' اس آخری فقرہ میں جو دو لفظ ہیں: اَلْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ تو عزیز کے مفہوم میں قہر و غلبہ ہے، اور یہ ہر جگہ نمایاں ہے اس عذاب سے جو تکذیب پیغمبر کرنے والوں پر نازل ہوا مگر اس کے ساتھ جو الرّحیم کا لفظ ہے، وہ بعض جگہ تو آسانی سے سمجھ میں آتا ہے جیسے قوم نوح علیہ السلام پر عذاب نازل ہونے کے ساتھ جناب نوح علیہ السلام کے ہمراہیوں کا جو کشتی میں ان کے ساتھ تھے، اس طوفان عذاب سے نجات پانا جیسا کہ یہاں علّامہ طبریؒ نے لکھا ہے۔

''العزیز فی اھلاك قوم نوح بالغرق الرّحیم فی انجاته نوحا ومن معه فی الفلك''

قہر و غلبہ والا ہے ہلاک کرنے میں قوم نوحؑ کے غرق کی صورت میں، مہربان ہے نجات دینے میں نوحؑ اور ان کے ساتھ والوں کو غرق سے۔

مگر چونکہ ہر نبی کے پیغام اور اس کی قوم کے معذّب ہونے کے ذکر کے بعد ایک ہی الفاظ ہیں لہٰذا مفہوم ایسا ہونا چاہیے جو ہر جگہ یکساں طور پر منطبق ہو لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ عزیز تو ہر مقام پر اس قوم کی ہلاکت ہی کے لحاظ سے کہا گیا ہے مگر رحیم یعنی مہربان، یہ انّ فی ذلك لاٰیة کے مفہوم سے متعلق ہے، ''یقیناً اس میں نشانی ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عبرت حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔ عبرت یعنی سبق انہیں نہیں ہے جو ہلاک ہو گئے بلکہ دوسرے کے لئے ہے جو بعد میں رہ جائیں اور ان کے انجام پر مطلع ہوں، یہ عبرت چونکہ آنکھ کھولنے کا ذریعہ اور راہ ہدایت پر آنے کا وسیلہ ہے، اس لئے وہ یقیناً خالق کے لطف و کرم کا نتیجہ ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۴۳﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَتُتْرَكُوْنَ فِیْ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِیْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِیْمٌ ﴿۱۴۸﴾ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ ﴿۱۴۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ وَلَا تُطِیْعُوْۤا اَمْرَ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِیْنَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

''قبیلۂ ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا، جب اُن سے اُن کے بھائی صالح نے کہا کیوں تم پرہیز گاری اختیار نہیں

کرتے؟ میں تمہارے لئے پیغمبر ہوں امانت دار تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ نہیں ہے کسی پر سوا پروردگار عالمیان کے۔ کیا تم اس سب میں جو یہاں ہے، اطمینان کے ساتھ چھوڑ دیے جاؤ گے، باغوں، چشموں اور کھیتوں میں اور اُن کھجور کے درختوں کے ساتھ جن کے نازک نازک شگوفے ہیں اور تم پہاڑوں کو تراش کر بڑے چین کے ساتھ مکانات بناتے ہو تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور حد سے تجاوز کرنے والوں کے کہنے پر نہ چلو، جو زمین میں خرابیاں پھیلاتے ہیں اور درستی نہیں کرتے۔''

حضرت صالح علیہ السلام کا وعظ و نصیحت کرنا:

''قبیلۂ ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا''، اس کے متعلق قوم نوح علیہ السلام اور عاد علیہ السلام کے ذکر میں جہاں یہی الفاظ آئے ہیں تشریح آچکی ہے۔

''کیا تم اس سب میں جو یہاں ہے، اطمینان کے ساتھ چھوڑ دیے جاؤ گے؟

یہاں سب کیا کیا ہے؟ انہی اللہ کی نعمتوں کی تفصیل بعد میں ہے: باغوں، چشموں، کھیتوں اور کھجور کے درختوں میں''۔ [1]

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾

''لوگوں نے کہا کہ تم تو بس ایسوں میں سے ہو جو بار بار آسیب میں مبتلا ہوئے ہیں، نہیں ہو تم مگر ہماری طرح کے ایک آدمی تو کوئی معجزہ لاؤ اگر تم سچے ہو۔ کہا یہ ایک اونٹنی ہے، ایک دن پینے کا پانی اس کے لئے ہوگا اور ایک مقررہ دن تمہیں پانی لینے کا حق ہوگا اور اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا، نہیں تو تم پر بڑے دن والا عذاب آجائے گا تو انہوں نے اسے پے کر ڈالا، جس پر وہ بعد میں پچتائے تو ان پر عذاب آ گیا، یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے اور اُن میں کے زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔''

ناقہ اور اس کا پے کیا جانا:

المسحّرین کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے ''بار بار آسیب میں مبتلا ہونے والے'' یہ ایک تفسیر کے موافق ہے [2] جس کے کلام عرب میں

---

[1] عدّد نعمة الّتی کانوا فیها (تبیان و مجمع البیان)

[2] المسحّر هو الّذی قد سحر مرّة بعد اخری حتیٰ یختل عقله و یضطرب رایه (تبیان)

شواہد موجود ہیں مگر اس کے علاوہ اس لفظ کے کئی دوسرے مفہوم کہے گئے ہیں [1] جنہیں ہم بعید سمجھتے ہیں۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطِ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٦٠﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٦١﴾ إِنِّي
لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٦٢﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٦٣﴾ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ
إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٤﴾ أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٥﴾ وَتَذَرُونَ
مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ ۚ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ﴿١٦٦﴾

''لوطؑ کی قوم نے جھٹلایا پیغمبروں کو جب ان سے ان کے بھائی لوطؑ نے کہا کیوں تم پرہیزگاری اختیار نہیں کرتے؟ بلاشبہ میں تمہارے لئے دیانت دار پیغمبر ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، نہیں ہے میرا معاوضہ کسی پر سوا پروردگار عالمیان کے ارے تم مخلوق الٰہی میں سے صنف ذکور کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے ہو اور جنہیں تمہارے شریک زندگی ہونے کے لئے تمہارے پروردگار نے پیدا کیا ہے، انہیں چھوڑے ہوئے ہو بلکہ تم حدود سے تجاوز کرنے والے لوگ ہو۔''

حضرت لوط علیہ السلام کا قوم کو زجر و توبیخ کرنا:

''پیغمبروں کو جھٹلایا'' کی تشریح بار بار ہو چکی ہے۔ ان آیات میں ایک بار پھر حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کو ڈرانے کا ذکر کیا گیا ہے۔

قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَا لُوطُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ ﴿١٦٧﴾ قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُمْ مِنَ
الْقَالِينَ ﴿١٦٨﴾ رَبِّ نَجِّنِي وَأَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٦٩﴾ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ﴿١٧٠﴾ إِلَّا
عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ﴿١٧١﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ ﴿١٧٢﴾ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا ۖ فَسَاءَ
مَطَرُ الْمُنْذَرِينَ ﴿١٧٣﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٧٤﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ
لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٧٥﴾

''اُن لوگوں نے کہا: تم اے لوطؑ! اگر باز نہ آئے تو تمہیں نکال باہر کیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ میں بلاشبہ تمہارے کردار سے دشمنی رکھنے والوں میں ہوں، پروردگار! مجھے اور میرے گھرانے والوں کو اُس سے جو یہ کرتے ہیں، نجات دے، تو ہم نے انہیں اور اُن کے تمام گھرانے والوں کو نجات دی سوا ایک بڑھیا کے جو رہ جانے والوں میں

---

[1] قیل معناہ من المخدو عین وقیل من المخلوقین المعلّلین بالطعام والشراب عن ابن عباس وقیل معناہ انت مجوّف (مجمع البیان)

تھی، پھر دوسروں کو ہم نے تہس نہس کر دیا اور ان پر ایک بڑی ہولناک بارش کی تو کتنی بری بارش تھی اُس جماعت پر جن کو ڈرایا جا چکا تھا، یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے اور اُن میں کے زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔''

قوم کا انکار اور اس کی پاداش:

''بڑھیا'' سے مراد ان کی بیوی ہے [1] جیسا کہ قرآن مجید کی دوسری آیات سے ثابت ہے اور ''بڑی ہولناک بارش'' سے مراد خاص طرح کے پتھروں کی بارش ہے [2] جس کی قرآن مجید میں دوسرے مقام پر صراحت ہے۔

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۶﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿۱۸۲﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۸۴﴾

''ایکہ کے رہنے والوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا جب کہ اُن سے شعیبؑ نے کہا تم پرہیزگاری اختیار کیوں نہیں کرتے؟ یقیناً میں تمہاری طرف بھیجا ہوا امانت دار پیغمبر ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، نہیں ہے میرا معاوضہ کسی پر سوا پروردگار عالمیان کے، ناپ پوری کرو اور گھاٹا کرانے والوں میں نہ ہو اور ٹھیک ترازو سے تولو اور لوگوں کو اُن کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں خرابی پھیلاتے نہ پھرو اور اُس سے ڈرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور پہلے والی مخلوق کو۔''

جناب شعیب علیہ السلام کا وعظ و پند:

قرآن مجید میں دوسرے مقام پر شعیب علیہ السلام کی سکونت کا مقام مدین بتایا گیا۔ یہ ایکہ اس کے قریب ہی کی کوئی بستی ہو سکتی ہے [3] اس کا ذکر پہلے بھی سورۂ حجر میں آچکا ہے اور وہاں اس کی تشریح کی جا چکی ہے اور چونکہ جناب شعیب علیہ السلام خاص وہاں کے باشندوں میں نہیں تھے، اس

---

[1] امرأته (جلالین)

[2] الحجارة من السّماء وهو قوله: وامطرنا عليهم مطرا (مجمع البیان)

[3] هي غيضة شجر قرب مدين (جلالین)

لئے جناب ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام کے لئے جو لفظ اخوھم ان کے بھائی کا صرف کیا گیا تھا، وہ یہاں شعیب علیہ السلام کے لئے صرف نہیں کیا گیا[1] جس طرح جناب موسیٰ علیہ السلام کے لئے اخوھم نہیں کہا گیا، اس لئے کہ وہ بنی اسرائیل میں سے تھے اور فرعون جس کی طرف پیغام پہنچانے پر مامور ہوئے تھے، قبطی قوم کا تھا۔[2]

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۱۸۶﴾ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾ قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾

''ان لوگوں نے کہا تم بس ایسوں میں ہو جن پر بار بار جادو کا اثر ہوا ہوا اور تم نہیں ہو ہر گز ہماری طرح ایک آدمی اور ہم تمہیں جھوٹوں میں سے خیال کرتے ہیں تو ہم پر آسمان کا ایک ٹکڑا گرا دو اگر تم سچے ہو، انہوں نے کہا میرا پروردگار تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے اس طرح اُن لوگوں نے اُنہیں جھٹلایا تو انہیں سائبان کے دن والے عذاب نے اپنی گرفت میں لے لیا، یقیناً وہ ایک بڑے سخت دن کا عذاب تھا، بلاشبہ اس میں بڑی نشانی ہے اور اُن میں سے زیادہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار زبردست بھی ہے، بڑا مہربان بھی۔''

قوم کا انکار اور اس کی سزا:

''سائبان کے دن والے عذاب نے''، یہ انداز تعبیر بتاتا ہے کہ تاریخ دور جہالت میں کوئی خاص موقع یوم الظّلّة کے نام سے مشہور تھا۔

''سائبان'' کا لفظ کی تشریح یہ ہوئی ہے کہ ابر نمودار ہوا جو مثل سائبان کے تھا، لوگ جو دھوپ کی شدّت سے بے قرار تھے، وہ تیزی کے ساتھ اُدھر دوڑے کہ اس کی چھاؤں میں سکون حاصل کریں جب وہ سب اس کے نیچے پہنچ گئے تو اس میں سے بجائے پانی کے آگ برسنے لگی جس نے ان کو جلا کر خاک کر دیا۔[3]

ایک قدیم مفسّر کا قول ہے کہ یہ لوگ مدین کے علاوہ تھے جن پر عذاب آیا اور جناب شعیب علیہ السلام دو گروہوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے جن پر دو مختلف طرح کے عذاب نازل ہوئے۔[4]

---

[1] لم یقل اخوھم لانّه لم یکن منھم (جلالین)

[2] کان من بنی اسرائیل وکانو ھم قبطا فلم یسمه الله بانّه اخوھم (تبیان)

[3] ھی سھابة الظّلتھم بعد حرّ شدید اصابھم فامطرت علیھم نارا فاحترقوا (جلالین)

[4] اصحاب الایکة وھم غیر اھل مدین فی قول قتادہ قال ارسل شعیب الیٰ امتین (تبیان)

اور یہ ''سائبان کے دن والا عذاب'' اُمتوں کے عذاب کی پوری تاریخ میں ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ ''وہ ایک بڑے سخت دن والا عذاب تھا''[1]

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۷﴾

''اور بلا شبہ یہ اُسی پروردگار عالمیان کی طرف سے اتاری ہوئی چیز ہے جسے روح امین نے آپ کے دل پر اتارا تا کہ آپ عذاب الٰہی سے ڈرانے والوں میں ہوں، کھلی ہوئی عربی زبان میں اور بلا شبہ وہ اگلے والوں کی کتابوں میں درج ہے اور کیا ان کے لئے یہ ثبوت کافی نہیں ہے کہ اُسے بنی اسرائیل کے باخبر لوگ جانتے ہیں۔''

قرآن کا قلبِ پیغمبر پر اترنا:

''روح امین'' کا لفظ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے لقب کی حیثیت رکھتا ہے۔[2]

ہر پیغمبر کی زبانی جو پیغام اس سورہ میں ہے، اس میں خالق کا تعارف ربّ العالمین کے نام سے ہوتا رہا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کے ساتھ گفتگو میں بھی جو باہمی ردو بدل ہوتا ہے اس میں بھی رب العالمین کے دائرہ کی وسعت نمایاں کی گئی ہے۔ اور اب اس پورے پس منظر میں ''آمدم برسر مطلب کے طور پر اس سے قرآن کی حقانیت پر روشنی ڈالی جارہی ہے اور اسی لئے ہم نے ترجمہ میں ''اسی پروردگار عالمیان'' کے الفاظ درج کیے ہیں کیوں کہ جیسے مفرد الفاظ میں الف ولام عہد کا ہوتا ہے جس سے اشارہ کے معنی پیدا ہوتے ہے، اسی طرح اضافت کی صورت میں بھی بعض مقامات پر عہد کے معنی پیدا ہوتے ہیں جس سے اشارہ ''فرد خاص'' کی طرف ہوتا ہے جس کا قرینہ یہاں شروع سے آخر تک اسی سورہ میں موجود ہے۔

قرآن مجید کا محل تنزیل ''قلب'' کو بتانا اس حقیقت کا قرآنی ثبوت ہے کہ قرآن مکتوبی شکل میں نازل نہیں ہوا تھا، ورنہ وہ ہاتھ پر اترا ہوا کہا جاتا، دل پر نہیں بلکہ اکثر اوقات ملک کی زبان کا بصورت تلفظ ذریعہ ہونا بھی ضروری نہ تھا، ورنہ اس کا تعلق سمع سے قرار پاتا، قلب سے نہیں، اس لئے اکثر اوقات مجمع کے اندر قرآن اترتا تھا مگر کوئی صدا نہ تھی کہ لوگ سنتے۔

بے شک اس آیت سے یہ بھی ثابت ہے کہ دل پر جو القاء ہوتا تھا وہ بھی فقط معانی کا نہیں بلکہ الفاظ ہوتے تھے، اور اس کا ثبوت بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ کے الفاظ ہیں، اس لئے کہ معانی کی کوئی زبان نہیں ہوتی، زبان کا تعلق الفاظ کے ساتھ ہے لہٰذا قرآن دل پر اترا تھا مگر معانی کی شکل میں نہیں جنہیں رسول اپنی زبان میں بیان فرماتے یہ حیثیت احادیث کی ہوتی ہے بلکہ وہ الفاظ ہی کی شکل میں رسولؐ کے دل پر اترا ہے اور

---

[1] کان من اعظم الایّام فی الدّنیا عذابا وذٰلك قوله: انّه کان عذاب یوم عظیم (مجمع البیان)

[2] الرّوح الامین جبرئیل (مجمع البیان)

اسی بناء پر کلام رسولؐ نہیں بلکہ کلام خدا ہے۔

''وہ اگلے والوں کی کتابوں میں درج ہے'' اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ آپ کا مبعوث ہونا اگلی کتابوں میں درج ہے یعنی ان میں اس کی خبر دی گئی ہے۔[1]

اور یہ بھی کہ یہ قرآن اپنے مطالب ومضامین کے لحاظ سے سابق کی کتابوں میں موجود ہے[2] میری نظر میں پہلی تشریح زیادہ قوت رکھتی ہے۔

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۹﴾

''اور اگر ہم اسے اتارتے غیر عرب کسی شخص پر اور وہ اسے ان کے سامنے پڑھتا تو یہ اس پر ایمان نہ لاتے''۔

عرب کے مقابلہ میں غیر عرب کی بے تعصبی اور حق پرستی:

اس آیت کے مضمون سے ظاہر ہے کہ اس کا کوئی خاص پس منظر ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''کافر کہتے تھے کہ قرآن آیا ہے عربی زبان میں اس نبی کی زبان بھی عربی ہے۔ شاید آپ ہی کہتا ہے۔ اگر غیر زبان والے پر عربی آتا تو یقین کرتے۔ فرمایا کہ دھوکے والے کا جی کبھی نہیں ٹھہرتا، تب وہ شبہ نکالتے کہ کوئی سکھا جاتا ہے''۔ (موضح القرآن)

دوسرا پہلو یہ ہے کہ عربوں کی تنگ نظری کا اظہار ہے کہ ان میں قومی تعصب اتنا ہے کہ اگر کوئی غیر عرب نبی بنا کر بھیجا جاتا تو کبھی تسلیم نہ کرتے[3] مگر دنیا کی اور قومیں فراخ حوصلہ ہیں کہ رسولؐ کے عرب ہونے کے ساتھ انہوں نے سر جھکانے میں عذر نہیں کیا، حدیث معصوم علیہ السلام اس پہلو کو ثابت کرتی ہے۔[4]

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۲۰۱﴾ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

''یونہی ہم اسے پہنچاتے ہیں ان بداعمالوں کے دلوں میں۔ یہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک آنکھوں سے نہ دیکھیں دردناک عذاب کو چنانچہ وہ ان پر ایک دم آجائے گا اس حالت میں کہ انہیں احساس بھی نہ ہوگا، تب وہ کہیں گے کہ کیا ہمیں مہلت ملے گی''؟

---

[1] ای ذکر القرآن لتنزّل علی آل محمّدﷺ (جلالین)

[2] یہ قرآن مذکور ہے سچ کتابوں کے پیغمبروں کی (شاہ رفیع الدین)

[3] ما کانوا مؤمنین انفة من اتباعه (جلالین)

[4] قال الصادق علیہ السلام: لو انزل القرآن علی العجم ما آمنت به العرب وهو نزل علی العرب فآمنت به العجم فهذه فضیلة العجم (علی بن ابراهیم)

جبر کا پہلو پیدا ہونے سے دلچسپی رکھنے والے سلکناہ کی ضمیر کو بلا تکلف شک، انکار اور تکذیب کی طرف موڑ دیتے ہیں [1] مگر پرستاران حق کا ضمیر کا مرجع قرآن کو قرار دیتے ہیں اور یہ خود سلسلہ آیات سے قرین قیاس یوں ہے کہ اس کے بعد دوسری ضمیر یہ ہے کہ لا یومنون بہ ''وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے''؟ کس پر؟ شک اور انکار اور تکذیب پر؟ اس ضمیر کیلئے دنیا مجبور ہے کہ قرآن یا ذاتِ نبوی کی طرف راجع کرے تو پھر پہلی ضمیر کو ادھر عائد کرنے سے کیا مجبوری ہے؟ مطلب یہ ہے کہ ان کے دلوں کو تو اس قرآن کی حقانیت کا احساس ہے جو ہمارے ودیعت کیے ہوئے ضمیر کا فطری تقاضا ہے تاکہ ان پر حجت تمام ہو مگر اس کے جاننے اور سمجھنے کے باوجود اسے مانتے نہیں ہیں۔ [2]

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ﴿۲۰۷﴾

''تو کیا یہ ہمارے عذاب میں جلدی کرتے ہیں؟ کیا تم دیکھتے ہو، اگر ہم نے برسوں انہیں فائدہ اٹھانے کا موقع دیا اور پھر ان پر آ گیا وہ جس سے انہیں ڈرایا جاتا رہا تھا تو یہ تمام ساز و سامان دنیا جس سے فائدہ اٹھاتے رہے تھے ،اس دن انہیں کیا فائدہ پہنچائے گا''؟ [3]

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾

''اور ہم کسی بستی کو ہلاک نہیں کرتے سوا اس صورت کے کہ اسے کچھ عذاب الٰہی سے ڈرانے والے آ چکے ہوں، یاددہانی کی غرض سے اور ہم کبھی ظالم نہیں رہے''۔

یعنی بغیر ہدایت اور اتمام حجت کے ہلاک کرنا ظلم ہوتا اور ظلم سے ذات باری بری ہے۔ ''یاددہانی کی غرض سے'' یعنی سابق امتوں کے ہلاک ہونے کا جو بیان ہے وہ تمہاری یاددہانی کے لئے ہے اور اس اصول کا ثابت کرنا ہے کہ ہماری طرف سے ظلم نہیں ہوتا بلکہ جو جس پاداش کا مستحق ہے وہ اسے دی جاتی ہے [4] بکثرت آیات کے علاوہ یہ ایک ہی آیت ہمارے دو اصولوں کی حقانیت کیلئے کافی ہے، ایک عدل اور دوسرے افعال الٰہی کا معدل باغراض ہونا جو حقیقت میں مبحث عدل ہی کا ایک مسئلہ ہے۔ [5]

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾

---

[1] ادخلنا التکذیب بہ (جلالین) در آوریم انکار را (شاہ ولی اللہ)

[2] فالھآء کنایۃ من القراٰن ومعناہ امرناہ فی قلوبھم باخطارہ ببالھم لتقوم الحجۃ علیھم (تبیان) اوقعنا فی قلوب الکافرین ـــ مع ذٰلک لا یؤمنون بہ (مجمع البیان)

[3] ما استفھامیۃ بمعنی ای شئی (جلالین)

[4] معناہ ماذٰلک الّذی قصصناہ من انزال الالم بالامم الخالیۃ الاّ ذکری لکم تتعظون بھا ثم بیّن انّ ذٰلک کان عدلا (تبیان)

[5] ففی سبحانہ عن نفسہ الظّلم وفی ھٰذا التکذیب لمن زعم انّ کلّ ظلم و کفر فی الدنیا فھو من خلقہ وارادتہ (مجمع البیان)

''اور اُسے شیطانوں نے نہیں اتارا ہے اور نہ اُن پر یہ کھپ سکتا ہے اور نہ وہ اس پر قدرت رکھتے ہیں، یقیناً وہ تو سننے سے روک ہی دیئے گئے ہیں۔''

یعنی عالم بالا کی باتوں کا سننا ان کے امکان میں ہے ہی نہیں۔[1]

اکثر آیات کی تنزیل کے پس منظر میں کچھ مشرکین اور دوسرے مخالفین اسلام کی گفتگوئیں ہیں، خواہ انہوں نے وہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا دوسرے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر ان کے منہ پر کہی ہو اور خواہ آپس میں انہوں نے اس قسم کی بات چیت کی ہو۔[2]

یہ اور بات ہے کہ بعض جگہ شان نزول میں اُس کہنے والے کا نام راویوں نے بتا دیا ہے اور بعض میں نہیں بتایا ہے لیکن قرآن مجید کا انداز بیان اس کا پتہ دے رہا ہے، یہاں ایسا ہی ہے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿۲۱۳﴾

''تو اللہ کے ساتھ کسی کو خدا کے نام سے نہ پکارو، نہیں تو سزا کے مستوجب ہو گے۔''

ہم نے دوسرے مقامات پر جیسا کہ لکھا ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ جو واحد حاضر کا صیغہ قرآن میں ہو اس کا مخاطب رسولؐ ہی کو مانا جائے بلکہ اکثر تخاطب غیر معیّن سے خطاب ہوتا ہے، کسی کو خدا کے نام سے نہ پکار، یعنی کوئی شخص ایسا نہ کرے، ورنہ سزا کا مستوجب ہوگا مگر بعض لوگ ہر ایسے موقع پر مخاطب رسولؐ ہی کو قرار دے لیتے ہیں، اس صورت میں بھی مقصود دوسروں ہی کا متنبہ کرنا ہوگا[3] اس کی بھی نظیریں قرآن مجید میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔

علّامہ طبرسیؒ نے یہاں خصوصیّت کے ساتھ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخاطب ہونے کو خاص اہمیّت دی ہے اس رخ سے کہ جب اتنی بڑی شخصیت کو اس بارے میں ایسی سخت تہدید کی جا رہی ہے تو دوسروں کا کیا ذکر ہے[4] نتیجہ اس کا بھی بہرحال وہی ہے کہ مقصود اس سے دوسروں کی تنبیہ ہے۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾

''اور اپنے قریبی خاندان والوں کو اندیشۂ عذاب سے باخبر کیجئے اور اپنا بازو جھکایئے مومنین سے اُس کے لئے جو آپ کا پورا پورا پیرو ہے۔''

دعوت عشیرہ کا حکم:

---

[1] انہم عن السمع لکلام الملئکۃ محجوبون بالشّہب (جلالین)

[2] مانزلت بہ ای بالقرآن الشیاطین کایزعمہ بعض المشرکین (مجمع البیان)

[3] نہی نبیّۃ وارادبہ المکلّفین (تبیان) یہ فرمایا رسول کو اور سنایا دوسروں کو (موضح القرآن)

[4] انّما افردہ بالخطاب لیعلم انّ العظیم الشّان اذا اوعد فمن دونہ کیف حالہ واذا حذّر ھو فغیرہ اولیٰ بالتحذّر (مجمع البیان)

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ''دعوت عشیرہ'' ہوئی، اُس کی روایت کتب شیعہ اور کتب اہل سنّت دونوں میں متفقہ طور پر موجود ہے [1] جس کی تفصیلی روئداد ہماری کتاب ''تاریخ اسلام'' حصّہ اول میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

''بازو جھکانا'' بطور محاورہ عربی میں تواضع واخلاق سے پیش آنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے [2] مگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مثل کو اصل اور مجاز کو حقیقت بنادیا جب اپنے متبع کامل حضرت علی ابن طالب علیہ السلام کے لئے کعبہ میں بت شکنی کے موقع پر اپنے بازو جھکا دیئے اور دوش مبارک پر بلند کر کے تطہیر کعبہ کا کام انجام دیا۔

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّهٗ هُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۲۰﴾

''تو اگر وہ آپ کا کہنا نہ مانیں تو کہہ دیجئے کہ میں بے تعلّق ہوں اُس سے جو تم کرتے ہو اور بھروسا کیجئے اُس پر جو زبردست ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا مہربان بھی ہے، جو دیکھتا ہے آپ کو جب آپ کھڑے ہوتے ہیں اور آپ کی گردش کو سجدہ کرنے والوں میں، یقیناً وہ سننے والا ہے بڑا جاننے والا۔''

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤ اجداد کا ایمان:

تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ''آپ کی گردش سجدہ کرنے والوں میں''، محل وقوع کے لحاظ سے اس کا مطلب جو سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ کہ نماز گزاری کی حالت میں جو بارگاہ الٰہی میں قیام، رکوع اور سجود کی مختلف حالتوں میں آپ کی گردش ہے، اسے اللہ دیکھتا ہے۔ [3]

دوسرا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ دوسرے نمازیوں کے اندر نگرانی حال کے لئے آپ کی گردش [4] لیکن بجائے خود محل وقوع ترتیبی سے قطع نظر کر کے جس کا تمام قرآن میں کلّیۃً موافق تنزیل نہ ہونا قطعی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا سوا کچھ سوروں اور آیات کے جن کی ترکیبی ساخت اُن کے موافق تنزیل ہونے کی گواہی دے رہی ہے، باقی کسی جگہ بھی وثوق نہیں ہوسکتا کہ یہ آیت یا یہ آیات محل وقوع کے لحاظ سے اصل تنزیل کے موافق ہیں تو ان آیات میں نفس مضمون جس جس مفہوم کا حامل ہوسکتا ہے، کسی کو محل وقوع کو سند بنا کر رد نہیں کیا جاسکتا چنانچہ یہاں یراك حین تقوم ''دیکھتا ہے آپ کو جب آپ کھڑے ہوتے ہیں''، اس کا یہ مفہوم بھی دل نشین ہے کہ آپ دعوت حق کے لئے جس پامردی کے ساتھ کھڑے ہیں، وہ ہمارے زیر نظر ہے جو ایک تفسیر ہے۔ [5]

---

[1] اشتهرت القصّة بذٰلك عندل الخاص والعام (مجمع البیان)

[2] ای الن جانبك وتواضع وحسّن اخلاقك معهم (مجمع البیان)

[3] تقلّبك فی ارکان الصّلوٰة (جلالین) یعنی از قیام بر کوع بسجود (فتح الرحمٰن)

[4] یعنی جب تو تہجد کو اٹھتا ہے اور یاروں کی خبر لیتا ہے یا دیکھتا ہے یا غافل (موضح القرآن)

[5] قیل حین تقوم للا نذار واداء الرسالة (مجمع البیان)

اور تقلّبك فی السّاجدین ''آپ کا گردش کرنا سجدہ گزاروں میں'' اس کا یہ مفہوم بھی ہے کہ آپ کا پشت در پشت عبادت گزاروں کے صلب سے گزرتے رہنا، جس کا نتیجہ قطعی طور پر یہ ہے کہ حضرتؐ کے آباؤ اجداد سب موحّد اور نماز گزار تھے جو اہل حق کا متفق علیہ تصور ہے۔[1]

جناب ابن عباسؓ کی تفسیر بھی اس سے ملتی جلتی ہے[2] اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی حدیث بھی اس کے موافقت میں ہے۔[3]

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴿۲۲۳﴾

''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ؟ وہ اترتے ہیں ہر جھوٹی تہمت لگانے والے گناہ گار پر۔ وہ غور سے سنتے ہیں اور اُن میں کے زیادہ تر جھوٹے ہوتے ہیں''۔

مشرکین کی اس بات کا کہ وہ قرآن مجید کی نسبت کہتے تھے کہ ''یہ شیطان کی طرف کی باتیں ہیں'' پہلے قرآن مجید کی عظمت کو نمایاں کرتے ہوئے یہ جواب دیا گیا تھا کہ قرآن میں الوہی زبان ہے اور اس کی طرف کے غیبی مضامین ہیں، بھلا شیطانوں کے بس میں اُن پر اطلاع حاصل کرنا کہاں ہے؟ اور اب اس ذیل میں خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کے خلاف ایک پہلو جو تھا کہ معاذ اللہ ان پر شیطان اترتے ہیں اُس جواب میں کہا جا رہا ہے کہ شطان ایسے پاکیزہ نفوس پر نہیں اُترا کرتے وہ اُترتے ہیں تو جھوٹے اور گناہ گار اشخاص پر اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا باطن و ظاہر اتنا پاک ہے کہ شیطانوں کا ان سے کوئی واسطہ ہو ہی نہیں سکتا۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

''اور شعراء اُن کی پیروی کرتے ہیں گمراہ لوگ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر جنگل میں سرگرداں پھرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں ایسی باتیں جو کرتے نہیں سوا اُن کے جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے اور اللہ کو بہت یاد کرتے رہے اور مظالم جھیلنے کے بعد انہوں نے بدلا لیا اور عنقریب معلوم ہوگا اُنہیں جنہوں نے ظلم ڈھائے ہیں کہ

---

[1] قال قوم من اصحابنا انّه اراد تقلّبه من اٰدم الیٰ ابیه عبدالله فی ظهر الموحّدین لم یکن فیهم من یسجد لغیر الله (تبیان)

[2] عن ابن عباس رضی اللہ عنہ انّ معناه اخرجك من نبی الیٰ نبیّ حتیٰ اٰخر (تبیان)

[3] هو المرویّ عن ابی جعفر و ابی عبدالله صلوٰت الله علیهما قال فی اصلاب النّبیین نبیّ بعد نبیّ حتیٰ اخرجه من صلب ابیه من نکاح غیر سفاح من لدن اٰدم (مجمع البیان)

پلٹا کھا کے وہ کس انجام کی طرف جاتے ہیں''۔

حق پرستوں کے سوا عام طور پر شاعروں کی مذمّت:

مشرکین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کبھی ''کاہن'' کہتے تھے اور کبھی ''شاعر'' گزشتہ آیات میں کاہنوں کی مذمّت تھی کہ ان کی باتیں شیطان کے القاء سے ہوتی ہیں اور وہ اکثر غلط ہوتی ہیں اور اس آیت میں شاعروں کی مذمّت ہے۔

اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے ان شاعروں کو جو حق کی حمایت میں اشعار نظم کرتے ہیں، چونکہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں مشرکین کی طرف سے ایک جماعت شاعروں کی بھی تھی جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں اشعار سے گستاخیاں کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام مسلمانوں کی ہجوئیں نظم کرتے تھے [1] ادھر سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت میں جناب حسّان بن ثابت وغیرہ نے ان کے جواب دینا شروع کیے، ان آیات میں پہلی جماعت کے مقابلہ میں جو اکثریت رکھتی تھی بطور استثناء اسی دوسری جماعت کی مدح ہے۔

اس مدح کا آخری جملہ ہے: وَانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ''اور مظالم جھیلنے کے بعد انہوں نے بدلا لیا''۔ یعنی بہت دن خاموش رہے اور ضبط و صبر کے ساتھ سنتے رہے اور اس کے بعد مجبوراً جواب دینے پر تیار ہوئے اور اب اس سے چسپاں ہے یہ تہدیدی فقرہ کہ: وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ اور جو ظلم ڈھاتے رہے، انہیں بہت جلد معلوم ہوگا کہ اُن کا انجام کیا ہوگا؟

اب یہاں تو جن ظالموں کا ذکر تھا، وہ وہی شعراء ہیں مگر اس اعلان کی عمومیت ہر ظالم و ستم گار کو لے لیتی ہے کہ وہ اس ظلم و ستم کے انجام کو پیش نظر رکھے۔

---

[1] قال ابن عباس رضی اللہ عنہ یرید شعرآء المشرکین وذکر مقاتل اسماءھم (مجمع البیان)

سُوْرَةُ النَّمْلِ

مکیّہ----۹۳----آیات

نمل عربی میں چونٹیوں کو کہتے ہیں، چونکہ اس سورہ میں جناب سلیمان علیہ السلام اور چونٹیوں کے لشکر اور پھر ان کی سردار جو چیونٹی تھی، اس کی اپنی بولی میں جو گفتگو تھی اس کا ذکر ہے اس لئے اس سورہ کا نام یہ ہوا۔

سورۂ نمل کے خاص خاص مضامین:

۱----جناب موسیٰ کا آگ لینے جانا اور پیمبری کا ملنا اور اس وقت عصا کے اژدہا بننے سے ان پر خوف و دہشت کا طاری ہونا خداوند عالم کی جانب سے اس پر تنبیہ۔

۲----کافروں کا یقین کے باوجود جان بوجھ کر انکار کرنا۔

۳----انبیاء کے لئے ورثہ کا ثبوت۔

۴----ہدہد کا غائب ہونا، ملک سبا کی خبر لانا، جناب سلیمان علیہ السلام کا خط لکھنا، اس خط کا پورا مضمون اور اس کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے جس کے بعد سورہ ہائے قرآن کی تعداد کے مقابلہ میں سورۂ برات میں بسم اللہ کے نہ ہونے سے جو ایک کی کمی ہوگئی تھی، وہ پوری ہوگئی یعنی اب جتنے سورے قرآن مجید کے ہیں، گنتی کے لحاظ سے اتنی دفعہ قرآن میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کی آیت ہے۔

۵----ملکہ سبا کا عمائد سلطنت سے مشورہ، پھر جناب سلیمان علیہ السلام کے پاس تحفے بھیجنا، جناب سلیمان علیہ السلام کا تحفے واپس کرنا اور تہدیدی خط لکھنا۔

۶----تخت بلقیس کا چشم زدن میں جناب سلیمان علیہ السلام کے پاس آنا پھر بلقیس کا حاضر خدمت ہونا اور متعلقہ حالات۔

۷----دابّۃ الارض کا ذکر۔

۸----قیامت کے پہلے رجعت کا ثبوت۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۱﴾ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ﴿۲﴾

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝٣

''طا، سین، یہ ہیں آیات قرآن اور ایک روشنی کتاب کی رہ نمائی اور خوش خبری ان ایمان لانے والوں کے لئے جو نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے ہیں اور دورِ آخرت کا یقین رکھتے ہیں''

''بڑی روشن کتاب'' اور ''قرآن'' دو الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ یہ دو عنوان ہیں جن کا معنی ایک ہے جو باعتبار پڑھے جانے کے قرآن ہے اور باعتبار لکھے جانے کے کتاب ہے، پھر اس میں روشنی کی صفت کے اضافہ نے مزید افادیت پیدا کر دی ہے۔[1]

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ۝٤ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝٥

''بلاشبہ وہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے'' ہم نے ان کے کاموں کو ان کے لئے آراستہ کر رکھا ہے تو وہ اندھے پن میں مبتلا ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے اور وہ آخرت میں بڑا گھاٹا اٹھانے والے ہیں''۔

یہ کہنے کے بعد کہ ''ہم نے آراستہ کر رکھا ہے'' فوراً ہی عذاب کی خبر دینا اس کا ثبوت ہے کہ پہلے جملہ میں آراستہ کرنا بطور جبر نہیں ہے ،ورنہ وہ مستحق سزا کیوں ہوتے؟ بلکہ جیسا کہ دوسرے مقامات پر تشریح کی گئی ہے، بداعمالیوں کے نتیجہ میں قدرتی طور پر احساس جرم کا ختم ہو جانا مراد ہے جس کی تعبیریوں کی گئی ہے۔

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝٦

''اور بلاشبہ یہ قرآن آپ کو سکھایا جاتا ہے ایک بڑے حکمت والے صاحب علم کی طرف سے''۔

اس حقیقت کا اظہار دو غلط تصوروں کے مقابلہ میں ہے:

ایک یہ کہ یہ قرآن خود آپ کے ذہن کی پیداوار ہے جو منکرین مذہب کے ایک گروہ کا تصور ہے اور شاید بعض ترقی پسند ذہن کے نام نہاد مسلمان بھی آج کل ایسا سمجھنے لگے ہیں۔

دوسرے یہ کہ کوئی اور آدمی ہے جو آپ کو یہ معلومات بہم پہنچاتا ہے یا اس کلام کو تصنیف کر کے آپ کو دے دیتا ہے جیسا کہ بعض مشرکین اس وقت کے جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا تو ایسا کہہ دیتے تھے کہ جس کا ذکر قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ہے۔

قرآن دونوں کی رد کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ وہ ان کا طبع زاد بالکل نہیں ہے بلکہ ایک دوسری ہستی کا سکھایا ہوا ہے مگر وہ ہستی کوئی از قسم مخلوق نہیں ہے بلکہ وہ خالق کائنات ہے جو انہیں اس قرآن کی تعلیم دیتا ہے۔

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖٓ اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا ۭ سَاٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ

---

[1] القرآن والکتاب معناهما واحد وصفه بالصفتين (مجمع البیان)

قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ⑦

''جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے گھروں والوں سے کہا کہ میں نے ایک آگ محسوس کی ہے تو ابھی میں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر لاتا ہوں یا تمہارے لئے آگ کا ایک لوکا لاتا ہوں کہ تم تاپ سکو''۔

موسیٰ علیہ السلام کا آگ لینے کو جانا اور پیمبری ملنا

چونکہ سردی کی شدت تھی، اس لیے تا نپنے کے لئے آگ کی تلاش تھی اور شاید جنگل میں راستہ بھی بھول گئے تھے، اس لئے چاہتے تھے کہ ایسا ملے جو راستہ بتاوے۔ [1]

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑧ يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ⑨ وَاَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ⑩ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑪ وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِيْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ⑫

''تو جب وہ اُس کے پاس آئے تو آواز دی گئی کہ برکت والا (قائم ودائم) ہے وہ جس کا جلوہ آگ میں ہے اور جس کا جلوہ اس کے اردگرد ہے اور پاک ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اے موسیٰ علیہ السلام! یقیناً میں اللہ ہوں جو عزت والا، بڑی سمجھ بوجھ والا ہے اور اپنے عصا کو پھینکو تو جب اسے دیکھا کہ وہ حرکت کر رہا ہے جیسے کہ وہ سانپ ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر مڑے اور پھر نہیں پلٹے۔ اے موسیٰ علیہ السلام! ڈرو نہیں، میں وہ ہوں کہ میرے پاس پیغمبروں کو ڈر نہیں ہوتا، سوا اُس کے جو کوئی تجاوز کرے۔ پھر برائی کو اچھائی سے تبدیل کرے تو بلا شبہ میں بخشنے والا مہربان ہوں اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو تو وہ چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی برائی کے نو معجزوں میں، انہیں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف جاؤ، یقیناً وہ بداعمال لوگ رہے ہیں''۔

جناب موسیٰ علیہ السلام کا خوف اور خالق کی تنبیہ:

بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا : جس کا ترجمہ میں نے یوں کیا ہے کہ ''برکت والا (قائم ودائم) ہے وہ جس کا جلوہ آگ میں

---

[1] یخبر الطّریق.....لانّه کان اضلّ الطّریق (مجمع البیان)

ہے اور جس کا جلوہ اس کے اردگرد ہے''۔اس کی تشریح میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ آگ میں جو جلوہ تھے، وہ فرشتے تھے اور اُس کے آس پاس خود موسیٰ علیہ السلام تھے یا اس کے برعکس۔[1]

بعض نے کہا ہے کہ آگ میں جن کا جلوہ تھا، وہ بلند مرتبہ فرشتے تھے اور اردگرد ان سے کم درجہ کے یا ویسے ہی فرشتے تھے۔[2]

بعض نے کہا کہ آس پاس فرشتے اور موسیٰ علیہ السلام دونوں تھے۔

میرا ترجمہ اس لحاظ سے ہے کہ من اسم موصول جس کا ترجمہ ہے ''وہ'' اس سے خود اُس ذات کا اُس محل میں ہونا کیوں سمجھا جائے جس کی بناء پر خداوند عالم کے علاوہ دوسری شخصیتوں کے تصور کی ضرورت ہو۔ بلکہ اُس کی جلوہ نمائی قدرت کے مظاہروں کی صورت میں، جو تمام کائنات پر حاوی ہے، اُس کی ایک شکل یہاں کیوں نہ مانی جائے؟ جب ہی اُس سے متّصل بلا فاصلہ آیا: سبحان اللہ ربّ العالمین کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ آگ میں بذات خود وہ حلول کیے ہوئے تھا اور اگر من فی النّار ومن حولها سے مراد فرشتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوتے تو اس کے ساتھ اس جملہ کی ضرورت ہی کیا تھی؟

آخر میں جو ہے ''ڈرو نہیں، میں وہ ہوں کہ میرے پاس پیغمبروں کو ڈر نہیں ہوتا'' اس میں ظاہری نگاہ کلیم اللہ کے لئے کچھ نقص کا پہلو محسوس کر سکتی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ تم کیسے پیغمبر ہو کہ میرے پاس ڈر رہے ہو، یعنی یہ ڈرنا شانِ رسالت کے خلاف ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ واقعاً تو جناب موسیٰ علیہ السلام ہیں پیغمبر اور پیغمبر معمولی نہیں، اولوالعزم پیغمبر تو اگر ڈرنا پیغمبروں کی شان نہیں ہے تو وہ ڈر کیوں رہے ہیں؟ یعنی یہ امر وقوع میں آ ہی کیوں رہا ہے؟

اور تم تو معصوم ہو اس لئے کہ مرسلین میں سے ہو، مرسلین کے لئے میرے پاس ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

علّامہ طبرسیؒ نے بھی تقریباً اُنہی کے الفاظ درج کر دیئے ہیں، اب اس کے بعد پھر استثناء کیسا؟ اسے وہ فرماتے ہیں کہ استثناء منقطع ہے یعنی معصومین علیہم السلام کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں، ہاں جو گناہ گار ہوں اُنہیں ڈرنا چاہیے مگر وہ گنہ گار جو خوگرِ گناہ ہو گئے ہیں ایسے کہ احساس گناہ ہی نہیں رہا، وہ نہیں ڈرتے، ڈرتے وہ ہیں جنہوں نے گناہ کئے ہوں مگر اُن کا ضمیر مردہ نہیں ہوا، اس لئے اپنے مجرم ہونے کا احساس ہوتا ہے تو اُس پر پشیمان ہوتے ہیں اور پھر تلافی کی فکر ہوتی ہے، ایسے لوگوں کو خود ہوتا ہے اور وہ خوف نتیجہ خیز بھی ہے کہ اللہ کی نظرِ کرم اُن پر متوجہ ہوتی ہے اور وہ اس خوش خبری کے مستحق ہوتے ہیں کہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون یعنی نتیجہ میں نہ اُن کے لئے کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن وملال میں مبتلا ہوں گے۔[3]

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ وَجَحَدُوْا بِهَا

---

[1] من فی النّار ای موسیٰ ومن حولها ای الملائکة او العکس (جلالین)

[2] کسی کہ در آتش است ملائکہ کہ دران نور مصوّر بصورت آتش بودند و کسیکہ گرد آتش بودند ملائکہ فرو تر از ایشاں بودند (فتح الرحمٰن)

[3] لا یخاف لدیّ المرسلون لانّهم لا یفعلون قبیحا ولا یخلون بواجب بل هم منزهون عن جمیع ذٰلك (تبیان)

وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴﴾

''تو جب ہماری روشن نشانیاں اُن کے پاس آئیں تو انہوں نے کہا یہ کھلا ہوا جادو ہے اور اُنہوں نے جان بوجھ کر صاف ظلم وستم اور گھمنڈ سے اُن کا انکار کیا حالانکہ اُن کے نفوس کو اُن کا یقین تھا تو دیکھو کیا ہوا انجام ان فسادیوں کا۔''

کافروں کا باوجود یقین کے انکار کرنا:

یہ ''فساد'' ضروری نہیں کہ کوئی مزید اُن کی کارستانی ہو بلکہ اُن کا حق سے جان بوجھ کر انحراف ہی جو دوسروں کے گمراہ کرنے لئے ہی ہوا کرتا ہے بہت بڑا فساد ہے جس کی مرتکب جماعت مفسدین والے انجام کی مستحق ہو جاتی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

''اور ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو علم عطا کیا اور انہوں نے کہا کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہم کو بہت سے اپنے باایمان بندوں سے زیادہ دیا ہے اور سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے وارث ہوئے اور کہا ''اے لوگو! ہمیں چڑیوں کی بولی کا علم عطا ہوا ہے اور ہر چیز میں حصہ ملا ہے۔ یقیناً یہ کھلا ہوا لطف وکرم ہے۔''

انبیاء کے لئے ورثہ کا ثبوت:

داؤد علیہ السلام بھی نبی اور اُن کے وارث سلیمان علیہ السلام بھی نبی۔ اس طرح اُس مزعومہ حدیث: نحن معاشر الانبیآء لانرث ولا نورث کے دونوں جزؤوں کی مخالفت قرآن سے ثابت ہوتی ہے، اسی نشیب کو محسوس کرتے ہوئے مترجمین ومفسرین جمہور یہاں ترجمہ سے الگ کچھ نہ کچھ ذیل دینے کی کوشش کرتے ہیں جیسے شاہ رفیع الدین ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''وارث یعنی قائم مقام ہوا سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کا۔''

اب معلوم نہیں ''وارث'' کے معنی قائم مقام کس لغت سے لئے گئے ہیں۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''وارث ہوا یعنی نبی ہوا اور بادشاہ ہوا باپ کی جگہ اور بیٹے تھے، جو اس مقام پر نہ ہوئے''۔ (موضح القرآن)

جلالین صاحبان نے ورث سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام میں اضافہ فرمایا: النبوّۃ والعلم۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ورثہ اور میراث اور وارث، ان سب سے متبادر متروکہ جائداد اور اموال کا اپنے پیش رو کے بعد مالک ہونا ہے۔ علم یا نبوت وغیرہ قابل انتقال چیزیں نہیں جو میراث بن سکیں۔ اسی بناء پر علامہ طبرسیؒ نے تحریر فرمایا:

فی ھٰذا دلالة علیٰ انّ الا نبیأء یورثون المال کتوریث غیرھم

اس آیت میں دلالت ہے اس پر کہ پیغمبر لوگوں کا ورثہ مال کا اُن کے وارث تک پہنچاتا ہے جیسے دوسروں کا۔

پھر وہ دوسرے اقوال کہ علم یا نبوت مراد ہے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ھٰذا خلاف الظّاھر والصّحیح عند اھل البیت علیہم السلام ھو الاوّل (مجمع البیان)

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

''اور جمع کیے گئے سلیمان علیہ السلام کے سامنے اُن کے افواج جنّات اور آدمیوں اور پرندوں میں سے تو اُن کی قواعد ہو رہی تھی یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کے میدان میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ، کہیں سلیمان علیہ السلام اور اُن کی افواج بے خیالی میں تمہیں پامال نہ کر دیں تو وہ مسکرائے اُس کی بات پر ہنستے ہوئے اور کہا، اے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا جو تو نے مجھے عطا کی ہے اور میرے ماں باپ کو شکر گزار رہوں اور میں ایسا اچھا کردار رکھوں جو تجھے پسند ہو اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔''

چیونٹی کا واقعہ اور جناب سلیمان علیہ السلام سے گفتگو:

معجزات و کرامات یعنی قدرت الٰہی کے غیر معمولی نظام کے جو منکر ہیں، انہیں چیونٹی کا گفتگو کرنا اور جناب سلیمان علیہ السلام کا اُسے سننا اور سمجھنا سمجھ میں نہیں آتا، چنانچہ جناب نیاز فتحپوری نے واد النّمل کا مطلب لیا ہے ایک ایسا مقام جہاں قبیلہ بنی نمل کے مکانات تھے اور نملة کے معنی لئے ہیں اس قبیلہ کی ایک عورت جس نے اپنے قبیلہ والوں کو متنبہ کیا مگر کاش انہیں عربی زبان کی اس معمولی سی بات کی طرف توجہ ہوتی کہ قبیلہ ہاشم کی عورت ''ہاشمیہ'' کہلاتی ہے، ''ہاشمہ'' نہیں اور قبیلہ بنی اسد کی ''اسدیہ'' ہوگی ''اسدہ'' نہیں۔ اسی طرح بنی نمل کی عورت ''نملیّة'' ہوگی ''نملة'' نہیں۔

اس کے علاوہ آدمیوں کے لئے یہ کہنا کہ ''وہ فوج تمہیں بے خیالی میں روند نہ ڈالے، اس لئے اپنے گھروں میں داخل ہو جاؤ'' بے معنی سی

بات ہے۔

اگر کسی قبیلہ پر حملہ کرنا ہے جسے مجازاً ''پامال کرنا'' کہہ سکتے ہیں تو وہ گھروں کے اندر بھی ہوں گے تو بھی پامال ہوں گے اور اگر حملہ نہیں کرنا ہے تو آدمیوں کو بے خیالی کے عالم میں کیوں روندا جائے گا؟ یہ تو بے چاری چیونٹیاں ہی ہیں جو کتنی ہمارے پیروں کے نیچے آتی رہتی ہیں اور ہمیں خبر نہیں ہوتی۔

پھر یہ کسی آدمی کی بات ہوتی تو وہ کون ایسی خاص چیز تھی کہ اُس پر جناب سلیمان علیہ السلام خوش ہوتے، مسکراتے اور خالق سے اُس کا شکر ادا کرنے پر مناجات کرنے لگتے، یہ تو چیونٹی ہی کے لبوں سے نکلی ہوئی بات ہوسکتی ہے جس کا یہ جزء کہ تمہیں کہیں بے خیالی میں روند نہ ڈالیں، جناب سلیمان علیہ السلام کی پوری فوج کے متعلق اس حسنِ کردار کی گواہی تھی کہ وہ ارادۃً کسی مخلوق کو ضرر نہیں پہنچاتے۔ اس پر جناب سلیمان علیہ السلام کو مسرّت حاصل ہوئی اور اُنہوں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اُس سے حسن کردار کو مکمل طور پر قائم رکھنے کے لئے توفیق کی درخواست کی۔

علّامہ طبرسیؒ نے اس پہلو کی طرف ٹھیک ہی توجہ کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس سفر میں جناب سلیمان علیہ السلام اپنی فوج کے ساتھ دوش ہوا پر نہ تھے بلکہ خشکی میں مرکبوں پر سوار جارہے تھے، اس لئے چیونٹیوں کے پامال ہوجانے کا اندیشہ تھا۔[1]

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآىِٕبِيْنَ ﴿٢٠﴾ لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاْذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢١﴾ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿٢٢﴾ اِنِّيْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَّلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٣﴾ وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿٢٤﴾ اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿٢٥﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿٢٦﴾

''اور پرندوں کی جانچ کی تو کہا کیا بات ہے ہدہد مجھے نظر نہیں آرہا ہے یا وہ واقعی غیر حاضر ہے؟ بلاشبہ میں اُسے سخت سزا دوں گا یا اُسے ذبح کردوں گا اور نہیں تو وہ میرے سامنے (اپنی صفائی میں) کھلا ہوا کوئی ثبوت پیش کرے تو کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس نے آکر کہا میں نے وہ ایک بات معلوم کی ہے جو آپ کو نہیں معلوم اور میں سبا سے ایک یقینی اطلاع آپ کے لئے لایا ہوں، میں نے ایک عورت کو پایا ہے جو اُن پر بادشاہت کرتی ہے اور اُسے ہر چیز کا ذخیرہ عطا ہوا ہے اور اُس کا ایک بڑا تختِ سلطنت ہے۔ میں نے اُسے اور اُس کی قوم کو پایا کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر

---

[1] ھٰذا یدلّ علیٰ انّ سلیمان و جنودہ کانو ارکبانا علی الارض (مجمع البیان)

سورج کی پوجا کرتے ہیں اور شیطان نے اُن کے اعمال کو اُن کی نظروں میں سنوار دیا ہے تو اصل راستے سے ان کو روک دیا ہے جس سے وہ ایسے گمراہ ہو گئے ہیں کہ سجدہ نہیں کرتے اللہ کو جو آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزوں کو باہر لاتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم چھپاؤ اور جو ظاہر کرو، اللہ کہ جس کے سوا کوئی خدا نہیں جو بڑے عرش کا مالک ہے۔''

ہُدہُد کا واقعہ اور ملکہ سبا کی خبر لانا:

خوارق عادات کو بلا وجہ تاویلات کا نشانہ بنانا، آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ چنانچہ شیخ الصوفیہ جناب ابن عربی نے طیر ایک بڑی تیز رفتار پلٹن کا نام اور ہدہدؑ انہی میں سے کسی آدمی کا نام قرار دے دیا ہے مگر قرآن مجید کا انداز بیان ایسے موقعوں پر ایسے دور از کار تاویلات کے قبول کرنے سے انکاری ہے۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

''اُنہوں نے کہا ہم ابھی دیکھیں گے کہ تو نے سچ کہا ہے یا جھوٹوں میں سے ہے؟ میرا یہ خط لے کر اُسے اُن کے یہاں ڈال دے، پھر اُن کے پاس سے ہٹ آ تو پھر دیکھ کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں''۔

جناب سلیمان علیہ السلام کا ملکہ کے نام خط لکھنا:

یہ حقیقت ہے کہ انبیاء و مرسلین ذاتی طور پر غیب کے مالک نہیں ہوتے، خالق خصوصی طور پر بطور اعجاز جتنا علم عطا فرمائے، وہ اور بات ہے چنانچہ اسی لئے جناب سلیمان علیہ السلام کو ہدہد کے اُس بیان پر پورا اعتماد نہیں ہوا اور اُنہوں نے کہا ہم دیکھیں گے تو سچ کہتا ہے یا جھوٹ؟

تولّ عنهم کا ترجمہ ''ہٹ آ'' بعد والے جملہ کی رعایت سے ہے کیوں کہ اگر خط دے کر مقصود یہ ہوتا ہے کہ بس وہ پلٹ آئے جیسا کہ بعض تراجم سے سمجھ میں آتا ہے [1] تو وہ دیکھتا کیوں کر کہ وہاں کیا ہوتا ہے؟ وہ آپس میں کیا چہ چا کرتے ہیں اور اُس کا کیا جواب تجویز کرتے ہیں؟

''ہٹ آ'' کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی نگاہوں کے سامنے سے ہٹ کر قریب ہی رہنا کہ تجھے معلوم ہو سکے کہ وہاں کیا باتیں ہوتی ہیں جو اکثر مفسرین کی تشریح ہے۔ [2]

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۹﴾ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا

---

[1] روبگردان از یشان (شاہ ولی اللہ) پھر اُن کے پاس سے (رفیع الدین)

[2] انصرف عنهم وقف قريبا منهم (جلالین) ای استتر منهم قريبا منهم (مجمع البیان)

اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾

''اُس (ملکہ) نے کہا کہ اے سردارو! میرے اوپر ایک معزّز خط ڈالا گیا ہے، وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور اس کا مضمون یہ ہے کہ سہارے سے اللہ کے نام کے جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے (یہ مطالبہ کیا جاتا ہے) کہ تم لوگ میرے خلاف گھمنڈ سے کام نہ لو اور (چپکے) میرے پاس مسلمان ہو کر آ جاؤ، اس نے کہا کہ اے سردارو! تم مجھے میرے معاملہ میں رائے دو میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتی جب تک کہ تم لوگ مجھے آ کر رائے مشورہ نہ دو''۔

ملکہ سبا کا عمائدین سلطنت سے مشورہ:

حسب دستور قرآن مجید نے درمیانی کڑیاں سننے والے کی عقل پر چھوڑ دی ہیں[1] جناب سلیمان علیہ السلام نے ہدہد سے کہا کہ میرا خط لے جا۔ بس اب خود سمجھ لیجئے کہ وہ گیا تو اب اس نے کیا کیا؟ آدمی ہوتا تو لے جا کر دربانوں کو دیتا یا درمیانی منزلوں سے گزرتا ہوا، اطلاع دے کر ہی نہیں، بلکہ اجازت لے کر بلقیس تک پہنچتا مگر یہ تو پرندہ تھا، اُس نے لے کر جا کر خط کو جہاں پر بلقیس تھی، وہیں پر ڈال دیا، بہرحال ایک اُسے خط نظر آیا، اٹھا کر پڑھا تو مضمون خط سے وہ متاثر ہوئی۔ اور جیسے کچھ دہشت زدہ بھی ہوئی اور اُس کی اہمیت محسوس کی، اس لئے ارکان دولت کو جمع کر کے اُس خط کو اُن کے سامنے پڑھا اور یہ گفتگو کی۔

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾

''ان لوگوں نے کہا کہ ہم طاقت ور ہیں اور سخت جنگ کرنے والے اور اختیار پورا آپ کو ہے تو آپ غور کیجئے کہ کیا فرمان دیتی ہیں''۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے نہ جسمانی طاقت کی کمی ہی اور نہ دل کے حوصلہ اور ہمت کی، اس لئے ہماری کمزوری کے خیال سے سر جھکانے کا تصور نہ کیجئے۔ ہاں ہم آپ کے تابع فرمان ہیں، اس لئے کسی مصلحت سے آپ ملائم طرز عمل اختیار کریں تو ہم اس میں آپ کی اطاعت کریں گے۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

''اس (خاتون) نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اُسے تباہ کر دیتے ہیں اور اُس کے عزت

---

[1] فی الکلام حذف لانّ تقدیرہ فمضی الھدھد بالکتاب فالقاء الیھا فلما راتہ قالت (تبیان)

دار باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور ایسا ہی واقعاً وہ کرتے ہیں اور میں اُن کے پاس ایک تحفہ بھیجتی ہوں اور پھر دیکھتی ہوں کہ میرے فرستادے کیا خبر لاتے ہیں''۔

بظاہر اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ خط لکھنے والا دنیا طلب ہے تو تحفوں کو دیکھ کر خوش ہوگا اور قبول کرے گا اور اگر اُسے صرف دینی اصلاح مدّنظر ہے جیسا کہ اُس کے خط کا مضمون ہے تو وہ ان تحفوں کی کوئی قدر و قیمت نہ سمجھے گا[1] چنانچہ جب جناب سلیمان علیہ السلام نے تحفے واپس کیے تو بس اسی سے بلقیس کو اُن کی حقانیت کا یقین ہو گیا اور وہ مع ارکان دولت کے مسلمان ہونے کے لئے تیار ہو گئی جیسا کہ بعد سے ظاہر ہے۔

بادشاہوں کے کردار کو بیان کرنے کے بعد کہ جب وہ کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اُسے تباہ کر دیتے ہیں اور اُس کے عزّت دار باشندوں کو ذلیل کر دیتے ہیں، آخر میں یہ جملہ: و كذلك يفعلون، اُسے عام مفسرین نے بلقیس کے قول کا تتمہ قرار دیا ہے[2] مگر ہماری قدیم تفسیر یہ بتاتی ہے کہ بلقیس کا کلام اس کے پہلے تک تھا اور پھر اس کے بعد آئے گا، بیچ میں جملہ معترضہ کے طور پر خالق نے بادشاہوں کے کردار کے متعلق اُس کے قول کی تصدیق فرمائی ہے کہ جیسا اس نے کہا تھا، واقعی وہ ایسا کرتے ہیں۔[3]

بعد والے ہمارے مفسرین نے بھی یہ معنی درج کیے ہیں۔[4]

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

''اور جب وہ (فرستادہ) سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا کیا تم مال سے مجھے کچھ مدد پہنچاؤ گے تو مجھے اللہ نے جو عطا کیا ہے وہ اُس سے جو تمہیں عطا کیا ہے بہتر ہے بلکہ اپنے تحفہ کے ساتھ تم ہی لوگ خوش ہو سکتے ہو، پلٹ جاؤ اُن کے پاس۔ اب ہم ایسی فوجیں لے کر اُن کی طرف آئیں گے جن کے مقابلہ کی اُن میں تاب نہ ہوگی اور ہم اُن کو ذلیل حالت میں وہاں سے نکال باہر کریں گے۔''

ملکہ سبا کے تحائف پر جناب سلیمان علیہ السلام کا جواب:

''اپنے تحفہ کے ساتھ تم ہی لوگ خوش ہو سکتے ہو'' یعنی تم میں سے ایک دوسرے کو تحفہ بھیجے تو وہ خوش ہوگا، اس لئے کہ اُسے مال دُنیا کے

---

[1] بم يرجع المرسلون من قبول الهدية او ردّها ان كان ملكا قبلها او بنيّا لم يقبلها (جلالين)

[2] یعنی یہ بادشاہ بھی ایسا ہی کریں گے (موضح القرآن)

[3] فقال الله عزّ و جل: كذٰلك يفعلون (علی بن ابراهيم)

[4] قال الله تعالىٰ تصديقها لقولها (تبيان) صدّقها الله فيما قالت فقال: و كذٰلك اى كما قالت هى (مجمع البيان)

اضافہ کی فکر ہے مگر مجھے خدا نے اس سے بے نیاز کیا ہے لہٰذا میں تمہارے اس تحفہ سے خوش نہیں ہوسکتا۔ [1]

قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۡ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ﴿۴۰﴾

''انہوں نے کہا معزز حاضرین! کون ہے تم میں جو اُس کا تخت یہاں لے آئے قبل اس کے کہ وہ لوگ مسلمان ہوکر میرے پاس آئیں؟ جنّات میں سے ایک دیو نے کہا'' میں اُسے آپ کے پاس لے آؤں گا اس سے پہلے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوں اور میں اس پر طاقت رکھنے والا امانت دار ہوں''۔ اُس شخص نے جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا کہا'' میں اُسے آپ کے پاس لے آؤں گا اس سے پہلے کہ آپ کی نظر اُدھر سے اِدھر ہو''۔ تو جب اُنہوں نے اُسے اپنے پاس رکھا دیکھا تو کہا کہ یہ میرے رب کے لطف وکرم سے ہے تا کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر گزاری کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں اور جو شکر گزار ہوگا، وہ اپنے فائدہ کے لئے شکر گزار ہوگا اور جو کفرانِ نعمت کرے گا تو بلاشبہ میرا پروردگار عزّت والا ہے، بے نیاز۔''

تختِ بلقیس کا چشم زدن میں آنا:

جیسا کہ بار بار توجہ دلائی گئی ہے، قرآن مجید کا یہ عام طریقہ ہے کہ وہ واقعات کی درمیانی کڑیوں کو مخاطب کے ذہن پر چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے، چنانچہ یہاں درمیان کے واقعات جو سلسلہ کلام سے ظاہر ہیں، یہ ہیں کہ بلقیس کے قاصد گئے۔ انہوں نے جناب سلیمان علیہ السلام کے یہاں کا پورا ماجرا سنایا جس کا بلقیس پر یہ اثر ہوا کہ وہ سلیمان علیہ السلام کی تجویز کے مطابق مع اپنے عمائد دولت کے اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوگئی اور جناب سلیمان علیہ السلام کی طرف روانہ ہوگئی جس کی خبر جناب سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچ گئی اور وہ وقت بھی آ گیا جب کہ وہ سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچ جائے گی، اب اس وقت کی بات یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ کون تم میں ایسا ہے جو اُن کے آنے کے پہلے بلقیس کا تختِ سلطنت میرے پاس حاضر کردے۔ [2]

---

[1] لفخر کم من زخارف الدّنیا (جلالین) تفرحون اذا اهدی بعضکم الیٰ بعض داماً انا قلا افرح بها اشاره الیٰ قلة اکتراثه باموال الدّنیا (مجمع البیان)

[2] فلمّا رجع الیها الرّسول عرفت انّها لا تقاومة فتجهّزت للمیر الیه واخبر جبرئیل سلیمان انّها خرجت من الیمن مقبلة الیهم فقال سلیمان (مجمع البیان)

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۱﴾

''(سلیمان علیہ السلام نے) کہا اُس کے لئے اُس کے تخت کی ذرا صورت بدل دو، دیکھیں وہ صحیح صورت حال سمجھ لیتی ہے یا اُن آدمیوں میں سے ہوتی ہے جو سمجھ نہیں پاتے۔''

ملکہ کا حاضر ہونا اور متعلقہ واقعات:

جناب سلمان علیہ السلام کا اپنے کارندوں کو یہ حکم دینے کا مقصد بلقیس کی ذہانت کا امتحان منظور تھا۔ [1]

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾

''تو جب وہ آئی تو کہا گیا کہ کیا ایسا ہی ہے تمہارا تخت؟ اس نے کہا یہ تو جیسے وہی ہے اور ہمیں تو اس کے پہلے حقیقت معلوم ہو چکی اور ہم مسلمان ہو چکے ہیں، اور اُنہوں نے روکا اُسے غیر اللہ کی عبادت سے جو کرتی تھی، بلاشبہ وہ کافروں میں سے تھی۔''

قرآن مجید کے سیاق سے صاف ظاہر ہے کہ یہ فقرہ کہ ''ہمیں تو اس کے پہلے حقیقت معلوم ہو چکی اور ہم مسلمان ہو گئے ہیں''، بلقیس کے قول کا تتمہ ہے۔ مطلب یہ کہ معجزہ تو ہم نے اب دیکھا مگر ہم تو ہدیوں کو بھیج کر ہی جس کردار کا مشاہدہ کر چکے تھے، اُسی سے آپ کی حقانیت سمجھ چکے اور اُسی وقت اسلام لا چکے ہیں [2] مگر بعض مفسرین نے نہ معلوم کیوں ''یہ تو جیسے وہی ہے'' پر ختم کر کے اس کے بعد کے جملہ کو جناب سلیمان علیہ السلام کا قول قرار دے دیا ہے [3] جس مجھے لفظی اور معنوی کسی طرح بھی مناسبت محسوس نہیں ہوتی۔

اس کے بعد کا جملہ: وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ، اس میں بھی اختلاف ہو گیا ہے۔ صدّ فعل ماضی ہے جس کی بصورت متعدی استعمال ہونے پر معنی ہوتے ہیں ''روکا'' یہاں اُس کے ساتھ مفعول اس کا نمایاں ہے جو ضمیر مؤنث ہے اور اس لئے اُسکا مرجع بلا شبہ بلقیس ہے۔ اب معنی ہوئے ''روکا اسے''، یعنی بلقیس کو لیکن اس فعل کا فاعل یعنی روکنے والا کون ہے؟

ہم نے جو ترجمہ کیا ہے وہ اس پر مبنی ہے کہ فاعل ضمیر ہے جو سلیمان علیہ السلام کی طرف پھرتی ہے۔ اب یہ ترجمہ ہوا کہ ''انہوں نے

---

[1] ارادبذلك اختبار عقلها (تبیان) بلقیس کی عقل آزمانا بھی اور اپنا معجزہ دکھانا (موضح القرآن)

[2] داده، شد مارا دانش بحقیقت سلیمان (شاه ولی الله) یعنی اس معجزہ کی حاجت نہ تھی (موضح القرآن)

[3] قال مجاهد هو من قول سلیمان (تبیان)

روکا اُسے''[1]

اور بعد میں جو ما کانت من دون اللہ ہے، وہ دوسرا مفعول ہے جس کے ساتھ عموماً عن کا لفظ آتا ہے لیکن یہ عن کا لفظ کبھی حذف بھی ہو جاتا ہے جس کی نظیریں خود قرآن مجید میں موجود ہیں۔

اس کے خلاف دوسرا قول یہ ہے کہ صدّ کا فاعل یہی ہے: ما کانت تعبد من دون اللہ اور دوسرا مفعول کہ کا ہے سے روکا؟ محذوف ہے۔ اب ترجمہ یہ ہوگا کہ اللہ کے سوا جس کی وہ عبادت کرتی تھی، اس نے روکا، کا ہے سے؟ اسے عقل سے سمجھیے یعنی اللہ کی عبادت سے[2] مگر یہ ''وندان تو جملہ درد ہانندٗ چشمان تو زیر ابرونند'' کی سی بات معلوم ہوتی ہے اور پھر اس جملے کے پہلے ہی یہ آ چکا ہے کہ اُس نے کہا ہم پہلے ہی آپ کی حقّانیّت سمجھ گئے اور مسلمان ہو چکے تو اب اس کہنے کا کیا محل ہے کہ اُس کے معبودانِ باطل نے اسے روکا معبودِ حقیقی کی عبادت سے؟ اس لئے میرے نزدیک پہلی ہی تشریح زیادہ قابل قبول ہے۔

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾

''کہا گیا اُس سے کہ داخل ہو ایوان میں تو جب اس نے اسے دیکھا تو پانی کی لہریں سمجھی اور پائنچے پنڈلیوں سے اونچے کر لئے، انہوں نے کہا ارے یہ محل کی زمین ہے جس میں شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا اے میرے پروردگار میں نے اپنے نفس کے اوپر ظلم کیا تھا اور اب میں ایمان لائی ہوں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اللہ پر جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔

اس نے اس واقعہ پر کیوں کہا کہ اب میں ایمان لائی ہوں؟

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''اس کو اپنی عقل کا قصور اور ان کی عقل کا کمال معلوم ہوا۔ سمجھی کہ دین میں بھی جو یہ سمجھے ہیں، صحیح ہے'' (موضح القرآن)

ایک خیال یہ ہے کہ یہاں درمیان کی ایک کڑی محذوف ہے یعنی جب وہ بیٹھی تو جناب سلیمان علیہ السلام نے اسے دعوت اسلام دی۔ اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے چونکہ وہ متعدد معجزات دیکھ چکی تھی۔ اس نے یہ کہا[3] مگر مجھے اس میں تائل ہے۔ کیوں کہ وہ تو اپنے تخت ہی کو دیکھ کر کہہ

---

[1] صدّها سليمان عمّا كانت تعبد من دون الله (تبيان) بازداشت سليمان آں زن راد (شاه ولی الله) بند کیا اُس کو اُس چیز سے کہ تھی عبادت کرتی (شاہ رفیع الدّین)

[2] صدّها عن عبادة الله ما كانت تعبد (جلالين) اى منعها عبادة الشّمس عن الايمان بالله تعالىٰ بعد روية تلك المعجزة عن مجاهد (مجمع البيان)

[3] قيل انّها لمّا جلست دعاها سليمان الى الاسلام وكانت قدرات الأيات والمعجزات فاجابت واسلمت (مجمع البيان)

چکی تھی کہ میں اس کے پہلے اسلام لا چکی ہوں، جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے اور یہ حضرات بھی اس کی تشریح اسی طرح کر چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت جو قالت یعنی ''کہا'' ہے اور زبان سے کہنا نہیں بلکہ حقانیت کے مزید احساس کے ساتھ اس نے اپنے دل میں کہا کہ میں کتنے عرصے تک اپنے نفس پر ظلم کرتی رہی اور خدایا اب سلیمان علیہ السلام کے ساتھ میں اس پروردگار پر ایمان لائی جو تمام کائنات کا مالک ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

''اور ہم نے ثمود کی طرف بھیجا ان کے بھائی صالح کو کہ عبادت کرو اللہ کی تو وہ دو فریق ہو گئے جو آپس میں بحث کرنے لگے''۔

یعنی کچھ کافر ہو گئے اور اس کے بعد آپس میں بحث شروع ہو گئی۔ [1]

قبیلہ ثمود اور جناب صالح علیہ السلام کا حال:

یاد رہے کہ بعض لوگ ہر تعمیری یا اصلاحی صدا کو بھی یہ کہہ کر دبانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے قوم میں افتراق پیدا ہوگا مگر واقعہ یہ ہے کہ ہر نبی اور رسول آنے کے بعد افتراق ہی پیدا ہوا ہے، اتحاد قائم نہیں رہا ہے تو اگر یہ خطرہ کوئی وزن رکھتا ہوتا تو اللہ کسی پیغمبر کو بھیجتا ہی نہ اور کوئی پیغمبر اپنا پیغام پہنچاتا ہی نہ۔

قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

''انہوں نے کہا اے قوم والوں کیوں تم بھلائی کے پہلے برائی کے لئے جلدی کرتے ہو، کیوں نہیں بخشش کے طلب گار ہوتے اللہ سے شاید تم پر رحم کیا جائے''۔

معلوم ہوتا ہے جیسے دوسرے مقامات پر مشرکین کا قول نقل ہوا ہے انہوں نے ہٹ دھرمی اور تمسخر کے طور پر یہ کہا تھا کہ خدا سے کہیے کہ وہ عذاب کیوں نہیں نازل کرتا، اس پر جناب صالح علیہ السلام بطور ایک مخلص ہمدرد کے یہ فہمائش کر رہے ہیں کہ کتنے غضب کی بات ہے کہ تم اپنے منہ سے اپنے لئے عذاب مانگتے ہو۔ تمہیں تو اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی کے لئے التجا کرنا چاہیے۔ یہ کیا جہالت ہے جو تم کر رہے ہو۔ شیعہ سنی دونوں مفسرین یہی کہتے ہیں [2] مگر میری سمجھ میں اس کا ایک دوسرا پہلو یہ آتا ہے کہ برائی کے لئے جلدی کرنے سے مراد اُن کا عملی منصوبہ ہے۔ اس پر جناب صالح علیہ السلام نے یہ فہمائش کی کہ اگر تم نے ایسا کیا تو پھر عذاب کے آنے میں دیر نہ ہوگی لہٰذا ایسا نہ کرو بلکہ بجائے ایسا کردار اختیار کرنے کے

---

[1] یعنی منهم مومن صالح و منهم کافر (تبیان)

[2] کان هٰؤلاء الجهّال اذا خوّفوا بالعقاب قالوا علیٰ وجه الانکار لصحة متیٰ هو (تبیان) حیث قلتم ان کان ما اتیتنا به فاتنا بالقاب (جلالین)

جو جلد عذاب کو لے آئے اپنی سابقہ غلطیوں کی معافی مانگ لو کہ خدا کی طرف کی بخشش تمہارے شامل حال ہو اور تم نجات کے مستوجب بن جاؤ۔

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ؕ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾

''اُنہوں نے کہا ہم تو تم سے اور تمہارے ساتھ والوں سے بڑی نحوست دیکھ رہے ہیں۔

اُنہوں نے کہا تمہاری اصل نحوست تو اللہ کے یہاں ہے، ہاں تم وہ لوگ ہو جو امتحان میں ڈالے گئے ہو''۔

مطلب یہ ہے کہ دنیوی راحت و تکلیف کے تو بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں جن میں سے ایک ابتلاؤ آزمائش ہے مگر اصل سعادت وشقاوت انسان کی تو انجام میں ظاہر ہوگی جو اللہ کے یہاں ہے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً ۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾

''اور اس شہر میں نو (۹) شخص تھے جو ہمیشہ مفسدہ پردازی کرتے تھے اور کبھی ٹھیک کام نہیں کرتے تھے، انہوں نے کہا کہ آپس میں اللہ کی قسم کھا کر عہد و پیمان کرو کہ ہم انہیں اور ان کے گھر والوں کو سب کو راتا راتا ختم کر دیں گے، پھر ان کے وارث سے کہیں گے کہ ہم اس گھر والوں کی ہلاکت میں شریک نہ تھے اور یقین مانو کہ ہم سچے ہیں اور (اس طرح) انہوں نے ایک منصوبہ بنایا اور ہم نے بھی ایک منصوبہ بنایا اور انہیں اُس کی خبر نہ تھی تو دیکھو اُن کے منصوبہ کا انجام کیا ہوا؟ یہ کہ ہم نے اُنہیں اور ان کی تمام قوم کو تہس نہس کر دیا تو یہ ہیں اُن کے گھر ویران وسنسان اُن کے ظلم کی وجہ سے، بلاشبہ اس میں نشانی ہے اُن کے لئے جو جانیں ہم نے نجات دے دی انہیں جو ایمان لائے تھے اور پرہیزگاری سے کام لیتے تھے۔''

جناب صالح علیہ السلام کے خلاف منصوبہ سازی اور اس کی ناکامی:

میں نے جو ترجمہ کیا ہے کہ ''انہوں نے ایک منصوبہ بنایا اور ہم نے بھی ایک منصوبہ بنایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے منصوبے کا توڑ کا ہم نے انتظام کیا۔ اب یہاں یہ توڑ کیا تھا؟ اس کی تفصیل قرآن مجید میں نہیں ہے۔ روایات مختلف ہیں اور اُن میں سے کوئی معصوم کی طرف مستند نہیں

ہے[1] لہٰذا وثوق کے ساتھ کیا کہا جا سکتا ہے؟

فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا ط ''یہ ہیں ان کے گھر ویران اور سنسان ان کے ظلم کی وجہ سے'' اس کے بعد جو ارشاد ہوا: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ''بلاشبہ اس میں نشانی ہے اُن کیلئے جو جانیں۔'' اس میں قیامت تک کے انسانوں کو نتیجہ نکالنے کی دعوت ہے کہ دیکھو! ظلم کا انجام کیا ہوتا ہے؟[2]

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ط بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ج اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ز قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ج فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۵۸﴾

''اور (بھیجا ہم نے) لوط کو جب اُنہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ کیا تم ایسی بدکاری کے مرتکب ہوتے ہو اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو؟ ارے تم نفسانی خواہش عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے پوری کرتے ہو بلکہ تم انتہائی جہالت سے کام لینے والے لوگ ہو تو اُن کی قوم کا کوئی جواب نہ تھا سوا اس کے کہ انہوں نے کہا نکال دو لوط کے گھرانے والوں کو اس بستی سے، یہ لوگ بڑے پاکباز بنے ہوئے ہیں تو ہم نے اُن کے گھر والوں کو نجات دی سوا ان کی بیوی کے جس کی قسمت میں ہم نے لکھ دیا تھا کہ وہ یونہی رہ جانے والوں میں ہوگی اور ان پر ہم نے ایک خاص بارش کی تو کتنی بری بارش تھی ان لوگوں کی جنہیں ڈرایا جا چکا تھا۔''

جنابِ لوط علیہ السلام کی نصیحت، قوم کی مخالفت اور اس کا انجام:

''ایسی بدکاری کے مرتکب ہوتے ہو اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو'' اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور پھر یہاں بھی بعد میں صراحت ہے کہ وہ بجائے عورتوں کے صنف ذکور سے نفسانی جذبے کی تسکین کرتے تھے جو قوم لوط کا عام کردار تھا اور اسی لئے عرف عام میں اس گناہ کے مرتکب کو ''لوطی'' کہتے ہیں اور ''اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو''۔ اس کا مطلب بعض نے کہا کہ اس فعل کی بُرائی تم کو معلوم ہے[3] اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کا

---

[1] دخلوا علیٰ صالح لیقتلوہ فانزل اللہ سبحانہ الملئکۃ فرموا کلّ واحد منہم بحجر حتّٰی قتلوہ وسئلم صالح من مکرھم، ابن عباس وقیل انّ اللہ امر صالحا ان یخرج من بینہم ثم استاصلھم بالعذاب وقیل نزلوا فی سطح جبل ینتظر بعضھم بعضا لیأتوا صالحا فھم علیھم الجبل (مجمع البیان)

[2] روی عن ابن عباس انّہ قال: اجد فی کتاب اللہ انّ الظّلم یخرّب البیوت وتلا ھذہ الأیۃ (مجمع)

[3] ای تعلمون انّھا فاحشۃ (مجمع البیان)

مطلب یہ ہے کہ تمہاری برائی اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ ایک دوسرے کی آنکھوں کے سامنے ایسا فعل شنیع کرتے ہو۔[1]

جناب لوط علیہ السلام اور اُن کے گھر والوں کے متعلق یہ کہنا کہ ''یہ لوگ بڑے پاک باز بنے ہوتے ہیں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بُرے ہیں ، اس لئے کہ ہماری اس فعل شنیع میں ہمارے ساتھ نہیں ہوتے[2] یہی ہر دور کے گنہ گاروں کی ذہنیت ہوتی ہے کہ وہ نیکوں کو اپنے لئے نا قابل برداشت سمجھتے ہیں اور یہی معصومین علیہم السلام سے اہل دنیا کی مخالفت کا راز ہے۔

زوجہ لوط علیہ السلام کے لئے یہ لفظ کہ وہ رہ جانے والوں میں ہوگی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عذاب سے اسے چھٹکارا نہ ہوگا..... آخر میں جو بارش کا ذکر ہے، وہ پتھروں کی بارش ہے جس کی صراحت قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر موجود ہے۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۵۹

''کہیے کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے اور سلام اُس کے اُن بندوں پر جنہیں اُس نے منتخب کیا، کیا اللہ بہتر ہے یا جنہیں وہ شریک کرتے ہیں؟''

اس آیت میں اجمال کے ساتھ اس خطبہ کا مکمل خاکہ دے دیا گیا ہے جو کسی تقریر یا تحریر کے شروع میں اسلامی جماعت کے خطباء یا مصنّفین کو سکھانا منظور ہے[3] اور اس میں عَبْدِہٖ کے بجائے عِبَادِہٖ کہہ کر رسولؐ کے ساتھ آل کو شریک کرنے کا اشارہ مضمر ہے۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۝۶۰

''یا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی اتارا تو ہم نے اس سے خوش نما باغ اُگائے۔ تمہارے لئے ممکن نہیں تھا کہ تم ان کے درختوں کو اگاؤ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (حق سے) منحرف ہیں۔''

غیر اللہ کی عبادت کرنے والے کو مسلسل تازیانے

اس کا تعلق انیسویں پارے کی آخری آیت سے ہے جس کا آخر میں سوال تھا کہ اللہ بہتر ہے یا جنہیں وہ شریک کرتے ہیں؟ اسی کے تسلسل سے یہ کہا جا رہا ہے اور جس کی قدرت کی نشانیاں ہیں جو تمہارے سامنے ہیں۔

آخری لفظ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، وہ اس پر مبنی ہے کہ یہ لفظ عدول سے ہے جس کے معنی انحراف کے ہیں اور یہ ہماری قدیم تفسیر کے

---

[1] ینظر بعضکم بعضا (جلالین)

[2] الباقین فی العذاب (جلالین) یتطهّرون من ایتان الرّجال فی ادبارهم (مجمع البیان)

[3] اللہ کی تعریف اور پیغمبر پر سلام بھیج کر اگلی بات شروع کرنی لوگوں کو سکھادی (موضح القرآن)

مطابق ہے اور بعض مترجمین اہلِ سنت بھی اس کے موافق ہیں [1] مگر کچھ لوگوں نے اُسے اُس ''عَدَل'' سے لیا ہے جس کے معنی عدیل یعنی ہمسر قرار دینے کے ہیں اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ ایسے ہیں جو (خدا کا) مدّمقابل تجویز کرتے ہیں۔ [2]

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦١﴾

''یا وہ جس نے زمین کو رہنے کی جگہ بنایا اور اُس کے بیچ بیچ میں ندیاں بنائیں اور اُس کے لیے پہاڑ پیدا کیے اور دو دریاؤں کے بیچ میں پردہ رکھا۔ کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی خدا ہے بلکہ اُن میں سے زیادہ علم نہیں رکھتے۔''

دو دریاؤں کے بیچ ''یعنی کھاری اور میٹھے میں جو پہلو بہ پہلو رواں ہوتے ہیں، اس نے اپنی قدرت کا ایسا پردہ حائل کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے میں مخلوط نہیں ہوتے۔ [3]

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٦٢﴾

''یا وہ کہ جو دعا قبول کرتا ہے بے بس، بے قرار کی جب وہ اُسے پکارتا ہے اور دور کرتا ہے مصیبت کو اور تمہیں زمین میں ایک دوسرے کی جگہ پر لاتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی خدا ہے؟ بہت کم تم سمجھانے کا اثر لیتے ہو۔''

يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ کا ترجمہ ہم نے کیا ہے، یہ خود قرآن میں اس لفظ کا دوسری جگہ جہاں استعمال ہوا ہے، اس کے مطابق ہے اور بعض مفسرین اس بات میں ہم سے متفق ہیں [4] مگر بعض لوگوں نے اس کے معنی یہ قرار دیئے ہیں کہ ''تمہیں زمین میں اقتدار عطا کیا ہے'' یعنی کافروں کو بے دخل کر کے تمہیں ان مقامات کے بندوبست کا ذمّہ دار بنایا ہے۔ [5]

میں اس سے متفق نہیں ہوں، اس لئے کہ اس صورت میں خطاب خاص مسلمانوں سے ماننا پڑیگا جو خلاف ظاہر ہے۔

اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٣﴾ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ

---

[1] یعدلون عن الحق (علی بن ابراھیم) کم می روند (شاہ ولی اللہ)

[2] یعدلون باللہ غیرہ لجھلھم (تبیان) یشرکون باللہ غیرہ (مجمع البیان)

[3] لا یختلط احدھما بالآخر (جلالین)

[4] بسازو شمارا جائے نشین نخستیاں در زمین (شاہ ولی اللہ)

[5] یجعلکم خلفآء من الکفّار بلادھم (مجمع البیان)

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٦٤﴾

''یا وہ جو تمہیں راستہ دکھاتا ہے خشکی اور تری کے اندھیروں میں اور جو ہواؤں کو بھیجتا ہے خوش خبری دیتے ہوئے اپنی رحمت کے آگے؟ کیا اور خدا ہے اللہ کے ساتھ؟ بالاتر ہے اللہ اُس سے جو وہ شرک کرتے ہیں، یا وہ جو پہلی دفعہ مخلوق کو پیدا کرتا ہے، پھر اُس کو دوبارہ اٹھائے گا اور جو تمہیں آسمان وزمین سے روزی عطا کرتا ہے؟ کیا کوئی خدا ہے اللہ کے ساتھ؟ کہیے کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو۔''

''آسمان وزمین سے روزی عطا کرتا ہے'' یعنی آسمان سے پانی برستا ہے' اُسے زمین جذب کرتی ہے اور زمین سے نباتات روئیدہ ہوتے ہیں لہٰذا جو روزی انسان تک پہنچتی ہے' اس میں آسمان اور زمین دونوں کی شرکت ہے۔[1]

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٦٥﴾ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۚ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿٦٦﴾

''کہیے کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے' وہ کوئی غیب کو نہیں جانتا سوا اللہ کے اور اُنہیں خبر نہیں کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے؟ بلکہ رفتہ رفتہ آخرت کی منزل میں جا کر اُنہیں پورا علم ہوگا ہاں (ابھی) وہ اس کے متعلق شک میں مبتلا ہیں بلکہ وہ اُس کی طرف سے اندھے ہیں۔''

علم غیب کا اللہ سے مخصوص ہونا اور اسکا مطلب:

جن جن باتوں کے متعلق قرآن میں ہے کہ انہیں سوا اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور یہاں مطلق غیب کو کہا گیا ہے کہ اُسے کوئی نہیں جانتا سوا اللہ کے، اُس سب میں یہ مطلب ہے کہ عام انسانی ذرائع اُن کے ادراک سے قاصر ہیں، ذاتاً علم اُن کا صرف اللہ کو ہے لیکن وہ جتنا مناسب سمجھے، اتنا علم جسے چاہتا ہے اور اس کا اہل جانتا ہے، اُسے عطا فرماتا ہے، اُس کی نفی ان آیات سے نہیں ہوتی۔[2]

ادّارك علمهم کی تشریح میں بہت الفاظ نظر کے سامنے ہیں[3] لیکن میرے نزدیک سب سے واضح تشریح علّامہ طبرسیؒ نے کی ہے[4] جس کے مطابق میں نے ترجمہ کیا ہے۔

---

[1] من السّماء بالغیب والمطر ومن الارض بالنّبات والزّرع (تبیان)

[2] الّا اللہ وحدہ او من اعلمہ اللہ تعالیٰ (مجمع البیان)

[3] ای بلغ الحق او تتابع وتلاحق (جلالین) پی در پی متوجہ شد علم ایشان (شاہ ولی اللہ) مختلف ہوا ہے علم ان کا، (شاہ رفیع الدّین) یعنی عقل دوڑا کر تھک گئے، آخرت کی حقیقت نہ پائی، کبھی شک کرتے ہیں کبھی منکر ہوتے ہیں (موضح القرآن)

[4] ای تتابع علمهم وتلاحق حتیٰ کمل علمهم فی الاخرة بما اخبروا به فی الدّنیا (مجمع البیان)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

''اور کافر لوگوں نے کہا کہ کیا جب ہم خاک ہو جائیں گے اور ہمارے باپ دادا، تب ہم برآمد کیے جائیں گے؟ یہ ہم سے پہلے بھی وعدہ وعید کیا گیا اور ہمارے باپ داداؤں سے بھی اس کے پہلے، یہ نہیں ہیں سوا اگلے زمانے والوں کی کہانیوں کے، کہیے کہ چلو پھر و زمین میں دیکھو کہ کیا ہوا انجام گنہگاروں کا اور آپ ان پر رنج نہ کیجئے اور دل تنگ نہ ہو جیے اس سے جو وہ ترکیبیں کرتے ہیں۔''

منکرین قیامت کے سوالات اور ان کے جواب:

یہ متعجّبانہ قول کافروں کا قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دفعہ کی اُن کی بات نہ تھی بلکہ وہ برابر یہ کہا کرتے تھے۔

''کیا ہم برآمد کیے جائیں گے'' یعنی قبروں سے زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے؟[1] اسی کا نام ''بعث'' ہے اور اسی کو ''قیامت'' کہتے ہیں۔ اسی لئے دوسرے بعض مواقع پر کفّار کے اس مقولہ میں مخرجون کے بجائے مبعوثون آیا ہے۔ مطلب دونوں کا ایک ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ انبیائے الٰہی نے ہر دور میں قیامت بعد الموت اور قیامت کا یہی تصوّر پیش کیا ہے جو اسلام میں ہے۔

جواب کافروں کے اس قول کا قرآن میں بحسب موقع گوناگوں انداز میں دیا گیا ہے یہاں جو جواب دیا گیا ہے، اُس میں ذہن کے اندر ایک خلش یہ محسوس ہوتی ہے کہ انبیاء جو اطلاع دیتے رہے اور جس پر وہ استعجاب کر رہے ہیں، وہ تو دوسری زندگی یعنی حیات بعد الموت ہے اور اس دنیا میں چل پھر کے جو اُنہیں نظر آئے گا، وہ اس دنیا کی تباہی اور بربادی ہے تو اس سے اُن کے سوال کا کیا جواب ملے گا؟ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ اُن کے سوال کا جواب نہیں ہے بلکہ ان کے مقابلہ میں ایک طرح کا استدلال ہے کہ دیکھو انہی انبیاء نے اُن پر عذاب نازل ہونے کی بھی تو خبریں دی تھیں، وہ کس طرح صحیح ثابت ہوئیں، اُسے تم چل پھر کر آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو، تو اس سے سمجھ لو کہ وہ سچے نبی تھے لہٰذا اُن کی دی ہوئی خبریں جو آخرت کے متعلق ہیں، وہ بھی درست ہیں۔

دوسرا ایک مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ تمہارے قبل والوں کو بھی یہ خبر دی گئی تھی اور اُنہوں نے بھی تمہاری ہی طرح اس کا انکار کیا تو دیکھو کہ اس انکار کا انجام کیا ہوا؟ یہ کہ وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے جس کا تم چل پھر کر مشاہدہ کر سکتے ہو تو اب تم جو انکار کر رہے ہو تو تمہیں بھی اس انجام سے ڈرنا چاہیے۔[2]

---

[1] مخرجون من القبور (مجمع البیان)

[2] کیف کان عاقبة المجرمین بانکارهم وهی هلا کهم بالعذاب (جلالین)

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٧١﴾ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٧٢﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٧٣﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ وعید کب پورا ہوگا اگر تم لوگ سچے ہو؟ کہیے کہ بہت ممکن ہے نزدیک ہو گیا ہو کچھ حصہ اس کا جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو اور بلاشبہ آپ کا پروردگار بڑے فضل و کرم والا ہے تمام لوگوں پر مگر اُن میں کے زیادہ شکر گزار نہیں ہیں۔''

جس کے لئے تم جلدی کرتے ہو'' وہ اُن کے لئے عذاب ہی تو ہے۔ عذاب اصل تو وہ ہوگا جو آخرت میں ہوگا لیکن اس کا پیش خیمہ عذاب دنیا ہے، وہ ان کافروں پر جلد ہی اس کے بعد آنے والا تھا' اسی کو کہا گیا ہے کہ ''بہت ممکن ہے''[1]

خالق کے کلام میں چونکہ حقیقی طور پر اظہار شک نہیں ہوسکتا، اس لئے جب وہ کہے کہ ''بہت ممکن ہے'' تو اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ یقیناً یہ بات ہونے والی ہے۔[2]

آخر میں اللہ کے فضل کا جو حوالہ ہے اور پھر النّاس کے لفظ کے ساتھ جس میں مومن اور کافر سب داخل ہیں، وہ اُس کی بناء پر ہے جو وہ کافروں پر عذاب کے نازل کرنے میں تاخیر فرماتا ہے کہ جتنا ہو سکے ان کو موقع دے دیا جائے کہ شاید وہ راہ راست پر آجائیں۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٤﴾ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٥﴾

''اور بلاشبہ آپ کا پروردگار جانتا ہے اُسے جو اُن کے سینے چھپائے ہوئے ہیں اور اُسے جو ظاہر کرتے ہیں اور کوئی چیز آسمان اور زمین میں پوشیدہ نہیں مگر یہ کہ وہ ایک کھلے ہوئے نوشتے میں ہے۔''

یہ ''کتاب مبین'' جس کا ترجمہ ہم نے ''کھلے ہوئے'' یعنی واضح نوشتے کے ساتھ کیا ہے' قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے اور عموماً اس سے مراد لوح محفوظ ہوتی ہے۔[3]

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٧٦﴾ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٧﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ

---

[1] فحصل لهم القتل ببدر وباقي العذاب يأتيهم بعد الموت (جلالين)

[2] عسى من الله واجبة (تبيان)

[3] هو اللّوح المحفوظ ومكنون علمه تعالىٰ (جلالين)

الْعَلِيْمُ ﴿۷۸﴾

''بلاشبہ یہ قرآن بیان کرتا ہے بنی اسرائیل کے سامنے اکثر وہ باتیں جن میں وہ باہم اختلاف رکھتے ہیں اور بلاشبہ وہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لئے، بلاشبہ آپ کا پروردگار اُن کے درمیان فیصلہ کرتا ہے اپنے حکم سے اور وہ عزت والا ہے، بڑا جاننے والا۔''

یہ گویا جواب ہے اُس کا جو عیسائی علماء کہتے ہیں کہ قرآنی مندرجات ماخوذ ہیں بائبل وغیرہ قدیم کتابوں سے جس کے لئے زمانۂ سابق میں ''ینابیع الاسلام'' عیسائی مشنریوں کی طرف سے نکلی تھی اور پھر ڈاکٹر ٹسڈل نے نوشتہ جات کو اپنے انداز میں نیاز صاحب فتح پوری نے ''ماخذ القرآن'' کے نام سے ''نگار'' لکھنؤ کے ایک خاص شمارہ کی صورت میں شائع کیا۔ حالانکہ قرآن مجید کے مندرجہ واقعات کا بائبل سے موازنہ کیا جائے تو خود اس سے اس خیال کا غلط ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے اُن واقعات کو بائبل سے اخذ نہیں کیا ہے بلکہ ان کی غلطیوں کی تصحیح کی ہے جیسا کہ قصّہ آدم علیہ السلام اور قصّہ داؤد علیہ السلام کا بائبل اور قرآن دونوں میں مطالعہ کرنے سے ظاہر ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اہل کتاب کو جن باتوں میں خود شک تھا، اُن کی حقیقتوں کو قرآن نے نمایاں کیا ہے اور اس کا اس آیت میں اعلان بھی کر دیا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ بائبل وغیرہ کے مندرجہ بیانات سے قرآنی مندرجات میں جو فرق ہے وہ معاذ اللہ غیر شعوری طور پر نہیں ہے جیسا کہ نقل در نقل میں فطری طور پر ہو جاتا ہے بلکہ وہ شعوری طور پر اس مقصد سے ہے کہ اہل کتاب کے سامنے جو اصل حقیقت ہے، اسے ظاہر کیا جائے، اس صورت میں جو واقعات دونوں میں مشترک مل جائیں، اُنہیں ''اخذ'' کہنے کا کسی کو حق نہیں، بلکہ اس حد تک جو دونوں میں مشترک ہے، اسے تصدیق و توثیق کہا جا سکتا ہے۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ﴿۷۹﴾ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۸۰﴾ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

''تو اللہ پر بھروسا کیجئے بلاشبہ آپ کھلے ہوئے حق پر ہیں، یقیناً آپ مُردوں کو آواز نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو صدا پہنچا سکتے ہیں جب وہ پیٹھ پھرا کر روگردانی کریں اور نہ آپ اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہٹا کر راستہ دکھا سکتے ہیں۔ آپ نہیں سنا سکتے سوا اُن کے جو ہماری نشانیوں کے ماننے کے لئے تیار ہوں تو یہی اسلام قبول کرنے والے ہوتے ہیں۔''

بہرا آدمی بھی اگر قریب ہو اور ادھر رخ کیے ہوئے ہو تو امید ہو سکتی ہے کہ وہ بات سن لے یا لبوں کی حرکت اور اشاروں سے سمجھ لے لیکن اگر وہ بہرا بھی ہے پیٹھ پھرائے ہوئے بھاگ بھی رہا ہے تو اب کہاں اُمید کی جا سکتی ہے کہ اس تک ہماری آواز پہنچے اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو۔[1]

---

[1] اذا اعرض وادبر و تباعد انقطع الطمع فی السماعه (مجمع البیان)

آخر میں من یؤمن بآیٰتنا کا جو ترجمہ میں نے کیا ہے کہ ''جو ہماری نشانیوں کے ماننے کے لئے تیار ہوں'' وہ اس بناء پر ہے کہ ایمان لانے کی منزل تو آواز حق سنانے کے بعد ہوگی اور جنہیں آواز سنائی جارہی ہے، اُن کی جو صفت بیان ہورہی ہے، وہ آواز سنانے کے قبل ہونا چاہیے اور وہ ماننے کے لئے تیار ہونا ہی ہے۔

اس تیاری میں وہ عقل و شعور بھی داخل ہے جو صلاحیت فہم پیدا کرے اور وہ قبول حق کا جذبہ بھی جو جان بوجھ کر انکار پر آمادہ نہ ہونے دے۔

سنانے کے بعد کا نتیجہ وہ ہوگا جو بعد میں ہے: فھم مسلمون تو یہی اسلام قبول کرنے والے ہوتے ہیں یعنی وہ ایمان کا اقرار کر کے مسلمان ہو جاتے ہیں۔

جناب شیخ الطائفہؒ نے پہلے تو اسی کے مطابق تشریح کی ہے مگر اس کے بعد انہوں نے یؤمن بآیٰتنا کے معنی لے لئے ہیں ''ایمان لے آئے ہیں'' اور یہ مطلب لیا ہے کہ آپ کا سنانا کارآمد اُنہی میں ثابت ہوتا ہے جنہوں نے ایمان قبول کیا ہے اور دوسروں کے لئے آپ کا سنانا، نہ سنانے کے برابر ہے اس لئے کہ وہ فائدہ نہیں اُٹھاتے اور اس کے لئے انہوں نے ھدی للّمتّقین کی مثال دی ہے کہ قرآن حقیقت میں تو ہدایت سب کے لئے ہے جیسا کہ دوسری جگہ کہا گیا ہے: ھدی للّناس ''تمام آدمیوں کے لئے ہدایت'' مگر چونکہ فائدہ اس سے متقین ہی اٹھاتے ہیں اس لئے وہاں کہا گیا ہے: ھدی للّمتّقین مگر ہمارے نزدیک یہاں وہی مفہوم زیادہ چسپاں ہے جو اُن کے پہلے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے [1] اور جو ہمارے ترجمہ کا مطلب ہے۔

نظر غائر بتاتی ہے کہ ہمارے اس مفہوم کی صورت میں بھی ھدی للّمتّقین کی مثال درست ہے، اس لئے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے عمل کے لحاظ سے تو سناتے سب ہی کو تھے مگر فائدہ اُس سے وہی اٹھاتے تھے جو اپنے حسن فطرت سے حق کو قبول کرنے پر تیار تھے، باقی لوگوں پر آپ کا سنانا اثر انداز نہیں ہوتا تھا، اس لئے کہا گیا ہے کہ آپ بس اُنہی کو سناتے ہیں جو ایمان لانے کے لئے تیار ہوں اور اس کی مثال وہی ہے کہ قرآن کے لئے کہا گیا ہے: ھدی للّمتّقین حالانکہ اس کی ہدایت سب کے لئے عام ہے۔

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾

''اور جب اُن پر حکم آجائے گا تو ان کے لئے ہم زمین سے ایک چلنے پھرنے والا برآمد کریں گے جو اُن سے بات کرے گا اس بناء پر کہ لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے۔''

دابّۃ الارض کا ذکر:

لغوی حیثیت سے دآبّۃ ہر زمین پر چلنے والے کو کہتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

---

[1] لاتسمع الّا من یطلب الحقّ بالنّظر الیٰ اٰیاتنا فلا یلبث ان یسلم (تبیان)

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا.

کوئی زمین پر چلنے والا نہیں ہے سوا اس کے کہ اللہ پر اس کی روزی کی ذمہ داری ہے۔ (ہود۔٦)

یہ قرآن مجید میں کئی جگہ ہے۔

یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ دآبّۃ کے ساتھ ارض یعنی زمین کا ذکر تقریباً ہر جگہ آتا ہے، گویا محاورہ میں یہ لفظ بغیر ارض کے ذکر کے مکمل نہیں ہوتا۔ اس لئے یہاں بھی دآبۃ من الارض کہنے سے یہ سمجھنا کوئی ضروری نہیں کہ یہ کوئی جانور ہوگا جو زمین کو شگافتہ کر کے اس کے اندر سے برآمد کیا جائے گا مگر عرف عام میں دآبۃ کا لفظ چوپایہ کے لئے آتا ہے اور فقہ میں یہ لفظ گھوڑے کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس لئے مترجمین و مفسرین اہل سنّت اس دابّۃ کے لفظ کی تشریح جانور کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ [1]

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''قیامت سے پہلے صفا پہاڑ مکّہ کا پھٹے گا، اس میں سے ایک جانور نکلے گا، لوگوں سے باتیں کرے گا کہ اب قیامت نزدیک ہے اور پکے ایمان والوں کو اور چھپے منکروں کو جدا کر دے گا نشان دے کر'' (موضح القرآن)

مگر لغوی معنی کے لحاظ سے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ کوئی جانور ہو بلکہ بہت ممکن ہے کہ وہ کنایہ کسی انسان کامل سے ہو جیسا کہ ہماری بعض کتابوں میں روایت ہے جو اُسے زمانہ رجعت سے متعلق قرار دیتی ہے [2] جب کہ اس کے بعد کی آیت زیادہ واضح طور پر رجعت سے متعلق ہے لیکن رجعت کے تفصیلات خود غیر واضح ہیں اور دآبّۃ کی پوری حقیقت تقریباً متشابہات میں سے ہے بہرحال قرآن مجید کا انداز بتاتا ہے کہ وہ کوئی غیر معمولی مظاہرہ قدرت الٰہی ہوگا جو دنیا کو متنبہ کرنے کے لئے کہ وہ عذاب الٰہی کے مستحق ہیں، سامنے آئے گا۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿٨٣﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٨٥﴾

''اور جس دن ہم اٹھائیں گے ہر قوم میں سے ایک دستے کو اُن میں سے جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں تو انہیں تنبیہ کی جائے گی، یہاں تک کہ جب وہ آئیں گے تو ارشاد ہوگا کہ کیا تم نے میری آیات کو جھٹلایا اس حالت میں کہ تمہارا علم اُس پر حاوی نہ تھا یا کیا تھا جو تم کرتے تھے؟ اور حکم چل گیا ہوگا اُن پر اس لئے کہ وہ ظلم کے مرتکب ہوئے تھے تو وہ اب بات نہیں کرتے ہوں گے۔''

قیامت کے پہلے رجعت کا سوال:

---

[1] برآورو برای ایشاں جانوری از زمین (شاہ ولی اللہ) نکالیں گے واسطے اُن کے ایک جانور زمین سے (شاہ رفیع الدین)

[2] عن ابی بصیر عن ابی عبداللہ علیہ السلام (علی بن ابراہیم)

یہ موقع کونسا ہوگا جس میں ہر قوم میں سے ایک دستے کو لایا جائے گا؟ مفسرین جمہور جواب دیں گے کہ قیامت مگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام فرماتے ہیں کہ قیامت تو وہ موقع ہے جب سب اٹھائے جائیں گے جیسا کہ قرآن میں ہے:

فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۔ اُن میں سے ایک کو بھی ہم نے نہ چھوڑا ہوگا۔ (کہف۔ ۴۷)

لہٰذا یہ موقع کوئی اور ہے اور وہ رجعت کا ہے جو قیامت کے پہلے ہوگی اور اس میں بس کامل الایمان افراد اور بڑے سخت کافر و منافق ہی اٹھائے جائیں گے، درمیانی قسم کے لوگ نہیں۔

جلالین نے فوجاً کی تشریح میں لکھا ہے:

وھم رؤساؤھم المتبوعون: یہ اُن کے وہ سرعنہ لیڈر ہوں گے جن کی پیروی کی جاتی تھی۔

اس صورت میں بعید نہیں ہے کہ بعد میں جو یہ ہے کہ ''تم نے میری آیات کو جھٹلایا'' ان آیات سے مراد وہی احکام ہوں جن کا تعلق انہی ہستیوں سے تھا جنہیں خالق نے مرکز ہدایت واطاعت قرار دیا تھا مگر یہ دوسر اُن آیات سے انحراف کر کے خود اُن منصبوں پر قابض ہو گئے۔[1]

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾

''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات بنائی اس لئے کہ وہ اُس میں سکون حاصل کریں اور دن کو روشن بنایا، بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو ایمان لانے پر آمادہ ہوں۔''

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ﴿۸۷﴾

''اور جس دن صور پھونکا جائے گا تو گھبرا جائیں گے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سوا اُس کے جسے اللہ چاہے اور سب اُس کی طرف آئیں گے سر جھکائے ہوئے۔''

صور کے اثر سے کچھ افراد کا استثناء:

یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں صور پھونکنے کا دو جگہ ذکر ہے، ایک جگہ کہا گیا ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (زمر۔ ۶۸)

صور پھونکا گیا ہوگا تو آسمانوں اور زمین میں جتنے ہیں سب بے حس و حرکت ہو کر گر جائیں گے

وہاں بھی یہ استثناء موجود ہے کہ الاّ من شاء اللہ ''سوا اُس کے جسے اللہ چاہے'' اور یہاں جو یہ اثر بتایا گیا ہے کہ آسمان و زمین والے سب گھبرا جائیں گے، یہاں بھی یہ استثناء ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کچھ نفوس ایسے ہیں جن پر نہ اُس صور کا اثر ہوگا اور نہ اس صور کا۔ یہ نفوس وہی ہو

---

[1] من قال بالاوّل قال المراد بالآیات الائمۃ الطاھرۃ (مجمع البیان)

سکتے ہیں جو تمام نوع بشر میں افضل اور مقصود کل کائنات ہوں، جن کے لئے پیدا ہونے کے بعد پھر فنا و زوال نہیں ہے۔

شاہ عبدالقادر نے صور پھونکے جانے کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ایک بار صور پھونکے گا جس سے خلق مر جائے گی۔ دوسرا پھونکے گا تو جی اٹھیں گے، اس کے بعد صور پھونکے گا تو گھبرائیں گے اور پھر پھونکے گا تو بے ہوش ہو جائیں گے اور پھونکے گا تو ہشیار ہوں گے۔ صور پھونکنا بہت بار ہے۔'' (موضح القرآن)

لیکن جب قرآن مجید نے جن دو صوروں کا ذکر کیا ہے، اُن کی تاثیر میں استثناء موجود ہے تو وہ جتنی بار بھی پھونکے گا، اس کے اثر سے اُن نفوس کو ہم مستثنیٰ سمجھ سکتے ہیں جو الاّ من شآء اللہ کا مصداق ہیں۔

شاہ صاحب نے گھبراہٹ والے صور کو تیسرے (۳) نمبر پر رکھا ہے اور موت والے کو پہلا (۱)، اس کے برخلاف بعض قدیم مفسرین ترتیب اس طرح بتاتے ہیں کہ پہلا (۱) وہ جس سے گھبرا جائیں گے، دوسرا (۲) وہ جس سے بے جان ہو کر گر جائیں گے، یہ وہ ہے جسے قرآن میں کہا گیا ہے صعق من فی السّمٰوٰت الارض اس کے علاوہ بے ہوشی والے کسی صور کا پتہ نہیں ہے، تیسرا (۳) وہ جس سے زندہ ہو جائیں گے۔[1]

دوسری طرف جلالین کا نقطۂ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں دو جگہ درج ہونے والے صور بھی ایک ہی ہیں چنانچہ ففزع من فی السّمٰوٰت ومن فی الارض کے تحت میں لکھا ہے:

ای خافوا الخوف المفضی الی الموت کما فی اٰیة اخریٰ: فصعق۔

یعنی وہ خوف زدہ ہو جائیں گے ایسا خوف جو باعث موت ہوگا جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: فصعق

علامہ طبرسیؒ کا بھی پہلا تصور یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ فزع کی تفسیر کی ہے:

ای ماتو الشدة الخوف والفزع یعنی خوف اور گھبراہٹ کی شدّت سے وہ مر جائیں گے

اور پھر دوسرا قول نقل کیا ہے کہ صور تین (۳) مرتبہ پھونکا جائے گا لیکن اگر اُس صور کا اثر آخر میں موت کی شکل میں ظاہر ہونے والا ہے تو آخر قرآن کو اس کی کیا ضرورت تھی کہ وہ اس نتیجہ کو جو شدید ہے چھوڑ کر اُس خفیف اثر کو نمایاں کرے جو شروع میں ہونے والا ہے؟ پھر جب کہ دوسری جگہ جو صعق کا لفظ ہے وہ بھی صراحۃً موت کا اظہار نہیں کرتا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے قرآن مجید میں یہی لفظ آیا ہے: ''خرّ موسیٰ صعقا'' حالانکہ برق طور سے ان کو غش آیا تھا، موت طاری نہیں ہوئی تھی۔

اب یہ من شآء اللہ کون ہیں جن پر کسی بھی صور کا اثر نہیں ہوگا؟ اس کے لئے جلالین نے پہلے تو رجم بالغیب کے طور پر جبرئیل و میکائیل و اسرافیل کے نام لکھ دیے ہیں مگر اس کی دلیل کیا ہے؟ کچھ نہیں۔ پھر جناب ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ: ھم الشّھدآء احیآء عند ربّھم یرزقون یہ شہدا ہیں اس لئے کہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے یہاں رزق پاتے ہیں۔

ہمیں جناب ابن عباسؓ کے اس قول سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہے لیکن اگر شہداء ہیں تو وہ ہستیاں جو عام شہداء سے بلاشبہ افضلیت و برتری رکھتی ہوں بدرجہ اولیٰ اس کی مصداق ہوں گی۔

---

[1] قیل النفخة الاولیٰ نفخة الفزع والثانیة نفخة الثالثة نفخة القیام (تبیان)

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾

''اور تم دیکھتے ہو پہاڑوں کو، سمجھتے ہو اُنہیں قائم و برقرار، حالانکہ وہ بادلوں کی طرح رواں دواں ہیں، یہ اللہ کی صنّاعی ہے جس نے ہر شے کو پائدار بنایا ہے بلاشبہ وہ خوب جانتا ہے اُسے جو تم کرتے ہو۔''

زمین کی حرکت کا ثبوت:

موجودہ سائنس کے تصورات سے پہلے اس آیت کو قیامت کے بیان کے سلسلے میں داخل کیا جاتا تھا کہ پہاڑ حرکت میں آجائیں گے [1] مگر آیت کا دوسرا ٹکڑا کہ یہ اللہ کی صنّاعی ہے، اس تصور کو غلط قرار دیتا ہے۔

اب جدید سائنس کے اس انکشاف پر کہ زمین متحرک ہے، نمایاں طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن مجید نے اس آیت میں حرکت زمین کی حقیقت کا انکشاف کیا ہے جسے قدیم علماء اس لئے نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اُس وقت کے مسلّمات کے خلاف تھا اور قیامت کے لئے تو ارشاد ہوا ہے: (سورۂ طٰہٰ آیت ۱۰۵ میں)

ینسفها ربی نسفا ''(انہیں پہاڑوں کو) میرا پروردگار پوری طرح سرمہ بنادے گا'' تو پھر اُنہیں دیکھ کر قائم و برقرار کون سمجھے گا اور وہ بادلوں کی طرح رواں دواں کہاں ہوں گے جب کہ اُن کا بصورت جسمانی وجود ہی نہ ہوگا۔

جناب ابن عباس ؓ کی تفسیر موجودہ نظریہ کی تائید کرتی ہے، اس لئے کہ انہوں نے اسے حال ہی سے متعلق قرار دیا ہے، نہ کہ مستقبل قیامت سے۔ [2]

یہ اور بات ہے کہ بعد والوں نے اس میں بھی اپنی طرف سے گویا نوٹ دے کر قیامت ہی سے متعلق قرار دے دیا ہے [3] جو اُن کے اپنے وقت کی فلکی سائنس (عالم ہیئت) سے تاثر کا نتیجہ تھا۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ؕ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۰﴾

''جو نیک کام کرتا ہے، اُسے اس سے بہتر ملے گا اور وہ اُس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے اور جنہوں نے برائی کی وہ اوندھے منہ آگ میں گرائیں جائیں گے۔ کیا تمہیں جو کچھ تم کرتے تھے، اُس سے الگ کوئی سزا مل رہی ہے؟''

''برائی'' کے لفظ کے اطلاق کی صورت میں چوں کہ مشکل یہ پڑتی ہے کہ پھر گناہ کی سزا آتش جہنم قرار پاتی ہے حالانکہ ہمیں معلوم ہے

---

[1] تبصرها وقت النفخة (جلالین) یہ ہوگا قیامت میں (موضح القرآن)

[2] قال ابن عباس: تحسبها قائمة وهی تسیر یرا حثیثا سریعا (تبیان)

[3] ذٰلك اذا زیلت الجبال عن اماکنها قبل التلاشی کما فی قوله: وتکون الجبال کالعهن المنفوش (مجمع البیان)

قرآن مجید کی دوسری آیات سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور بعض میں کچھ معیادی سزا ہوتی ہے، اس لئے مفسرین مجبور ہوئے ہیں کہ یہاں سیّئہ سے مراد سب سے بڑا گناہ یعنی کفرہ شرک مراد لیں اور اس میں وسعت بھی دی جائے تو ایسی چیزوں کے انکار تک جو ایمان میں دخیل ہوں اور جن سے آخرت وابستہ ہو، اس لئے علامہ طبرسیؒ نے پہلے بالسّیئۃ کے تحت میں لکھا ہے:

ای بالمعصیۃ الکبیرۃ التی ھی الکفر والشرک۔ یعنی بڑی نافرمانی کا ارتکاب کیا جو کفر و شرک ہے

اور پھر آگے وہ احادیث درج کی ہیں جو اہل بیت رسولؐ سے عدوات کے متعلق ہیں کہ اس کا نتیجہ بھی بلاشبہ آتش دوزخ ہے مگر قرآن مجید میں اس آیت کے آخر میں جو هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ فقرہ ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سزا کا تعلق اعمال سے ہے جو وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں نہ کہ عقیدہ کے کسی لازمی جزء سے جو ایک استمراری حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں وہ تجدّد و تسلسل نہیں ہے جو مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ کے الفاظ سے نمایاں ہے، اس لئے ہم کیوں نہ یہ سمجھیں کہ یہ سزا خالق کی نافرمانی کی ہے، اگر ملے، لیکن کسی وجہ سے خواہ عفو و کرم کی بناء پر اور خواہ توبہ و انابت سے اور خواہ شفاعت سے سزا نہ ملے تو اور بات ہے۔ پھر یہ کہ فی النّار میں کمیت و کیفیت کے اعتبار سے فرق ہوسکتا ہے۔ اس لفظ کی وحدت سے اُس سزا کی نوعیت میں وحدت کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ۡ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۹۲﴾

''مجھے تو بس یہ حکم ہوا ہے کہ اس شہر کے پروردگار کی عبادت کروں جس نے اسے محترم قرار دیا ہے اور اُسی کی ہر چیز اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں اسلام اختیار کرنے والوں میں ہوں اور یہ کہ میں قرآن پڑھ کر سنا دوں، اب جو ہدایت پائے گا وہ اپنے لئے ہدایت پائے گا اور جو گمراہی پر برقرار رہے تو کہیے کہ میں تو بس خوف دلانے والوں میں سے ہوں۔''[1] بظاہر سلسلہ تنزیل میں یہ آیت کسی ایسے سیاق کلام میں تھی جہاں رسولؐ سے تخاطب کے ذیل میں قل آتا ہے یعنی یوں کہیے مگر وہ یہاں پہنچ گئی، اس لئے اب اس میں قل کا جزء نہیں رہا لیکن یقیناً مراد اس سے یہی ہے[2] اور اس لئے خواہ جناب شیخ الطائفہؒ کی یاد کی غلطی سے اور خواہ کاتب کی کارستانی سے اثنائے تفسیر میں متن آیت میں قُلْ کا لفظ اس طرح درج ہوگیا ہے جیسے کہ وہ آیت میں موجود ہے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

''اور کہیے کہ سب تعریف اللہ کے لئے ہے وہ بہت جلد تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے گا تو تم انہیں پہچان لوگے اور نہیں ہے تمہارا پروردگار غافل اُس سے جو تم لوگ کرتے ہو۔''

---

[1] قل سبحانہ لنبیّہ ﷺ قل لھم (مجمع البیان)

[2] قال سبحانہ لنبیّہ ﷺ قل لھم (مجمع البیان)

سُوْرَۃُ الْقَصَصِ

مکّیہ----۸۸----آیات

چونکہ اس سورہ میں زیادہ تر انبیاؑ وامم سابقہ کے واقعات ہی کا بیان ہے اُس لئے اس کا نام ''قصص'' ہوا۔

سورۂ قصص کے خاص خاص مضامین:

۱.....مظالم فرعون۔

۲.....مادر موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی اور اس کی تفصیل۔

۳.....زوجہ فرعون کی گفتگو اور جناب موسیٰ علیہ السلام کی پرورش۔

۴.....قبطی کے قتل کا واقعہ۔

۵.....حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف ودہشت کے عالم میں مصر سے نکلنا۔

۶.....دخترانِ جناب شعیب علیہ السلام کا واقعہ۔

۷.....جناب شعیب علیہ السلام کے پاس جانا اور اُن سے گفتگو۔

۸.....وادی ایمن۔

۹.....عہدۂ پیغمبر میں حضرت ہارون علیہ السلام کی شرکت کے لئے دعا اور اس کی قبولیت۔

۱۰.....دربار فرعون میں جانا اور اس موقع کی گفتگو۔

۱۱.....فرعون کا ہامان کو اونچے قصر کی تعمیر کے لئے کہنا اور پھر اُن کا انجام۔

۱۲.....چشم پوشی اور رواداری کی مدح۔

۱۳.....یہ کہ خالق کے فیصلہ کے خلاف اپنے اختیار کو صرف کرنا ایک قسم کا شرک ہے۔

۱۴.....قارون کا کردار اور اس کا انجام۔

۱۵.....انجام خیر اُن کے لئے جو دنیا میں قہر وغلبہ کے درپے نہ ہوں۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

طٰسٓمّٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ③

''طا۔سین۔میم۔ یہ روشن کتاب کی آیات ہیں۔ ہم آپ کے سامنے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کچھ خبریں سچائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اُن کے لئے جو ایمان لائیں۔''

یہ ویسا ہی ہے جیسے آغاز سورۂ بقرہ میں پورے قرآن کے لئے کہا گیا: هدًى للّمتقين ''یہ ہدایت ہے پرہیز گاروں کے لئے'' حالانکہ مقصود اُس سے سب ہی کی ہدایت ہے مگر چونکہ فائدہ اٹھانے والے اس سے پرہیز گار ہی ہیں، اس لئے یہ کہا گیا ہے۔ اُسی طرح یہ خبریں سب کے لئے ہیں مگر فائدہ اٹھانے والے اُن سے وہی ہیں جو ایمان لائیں تو یوں کہا جا رہا ہے کہ ''اُن کے لئے جو ایمان لائیں''[1]

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ④

''بلاشبہ فرعون نے دنیا میں گھمنڈ کیا اور اُس کے رہنے والوں کو متفرق جماعتوں میں تقسیم کر دیا کہ ایک گروہ کو اُن میں سے وہ کمزور بناتا تھا، اُن کے لڑکوں کو ذبح کرتا تھا اور اُن کی عورتوں کو زندہ رکھ لیتا تھا، یقیناً وہ خرابی پھیلانے والوں میں سے تھا۔''

مظالم فرعون:

یہ ''مکیاولی'' سیاست ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' وہ ہے جسے قرآن نے فرعون کے نمبر ایک جرم کے طور پر پیش کیا ہے لیکن دنیائے مغرب اور مشرق میں حکمرانوں اور خصوصاً بڑی طاقتوں کی وہی سیاست آج تک برقرار ہے۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ⑤ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ⑥

''اور ہمارا مقصود یہ ہے کہ احسان کریں اُن پر جنہیں دنیا میں دبایا یا پیسا گیا تھا اور انہی کو پیشوا قرار دیں، اُنہی کو آخر میں قابض و متصرّف بنائیں، اُنہیں زمین میں اقتدار عطا کریں اور فرعون اور ہامان اور اُن کے تمام لاؤلشکر کو اُن کی جانب سے وہ شے دکھلائیں جس سے وہ ڈرتے تھے۔''

قبل کی آیت کے لحاظ سے محل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ''ارادہ بھی ماضی سے متعلق ہو، اس لئے بعض مترجمین نے ترجمہ اسی طرح کیا ہے

---

[1] لانّهم منتفعون به (تبیان)

[1] مگر قرآن کے الفاظ میں مضارع کا صیغہ ہے جو حال و مستقبل کو بتاتا ہے اس لئے دوسرے مترجمین کو اُسی کے مطابق ترجمہ کرنا پڑا ہے۔ [2]

ہم سمجھتے ہیں کہ ذکر ماضی کے ذیل میں خالق نے اپنے مستقبل اصول کا اعلان فرمایا ہے کہ ہمیشہ ہماری سنّت یہی ہے اور اس صورت میں بعد میں جو فرعون اور ہامان کا نام ہے وہ بھی بمناسبت سیاق ہے اور مراد اُس سے ہر دور کے فرعون صفت اور ہامان منش افراد ہیں جس کے لئے معصوم رہنمایان دین کے ارشادات بھی موجود ہیں جنہیں علاّمہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں درج فرمایا ہے۔

اب یہاں اس عام اصول کے ذیل میں جو حسب ذیل فقرے ہیں: ''اُنہیں امام بنائیں گے''، اُنہیں آخر میں قابض و متصرّف بنائیں گے''، انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں گے۔'' ان الفاظ کو سامنے رکھیے اور پھر اس امّت کے لئے جو خصوصی اعلان ہوا ہے کہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ (نور۔۵۵)

اللہ کا وعدہ ہے اُن سے جو تم میں سے ہے ایمان رکھتے ہوں اور نیک اعمال کے پابند رہیں کہ وہ اُنہیں روئے زمین میں خلیفہ بنائے گا اُس طرح جیسے خلیفہ بنایا اُنہیں جو اُن سے پہلے تھے اور ضرور وہ اُن کے لئے اُس دین کو بااقتدار بنائے گا جسے اُس نے ان کے لئے منتخب کیا اور اُنہیں خوف و دہشت کے بدلے امن و سکون عطا فرمائے۔

یہ وعدہ اُنہی افراد امّت کے لئے ہوگا جنہیں دنیا میں دبایا گیا اور پیسا گیا اور انہی کے واسطے آخر میں یہ وعدہ الٰہی پورا ہوگا۔ وہی امام خلق ہوں گے اور وہی وارث زمین ہوں گے نہ کہ وہ جو قہر و غلبہ کے مالک ہو کر دوسروں پر مظالم ڈھائیں اور اپنے اقتدار کی خاطر حق پرستوں کو سولیوں پر چڑھائیں، قید خانوں میں بند رکھیں یا تلواروں کے گھاٹ اتاریں۔ یہ تو کردار کے لحاظ سے جنودِ فرعون و ہامان میں داخل ہیں، جنہیں آخر میں اپنے منصوبوں کے خلاف مظلوموں کا اقتدار دیکھنا نصیب ہوگا، وہی مظلومین کے لئے قرآن کی روشنی میں ہماری دعا ہے: عجّل اللہ فرجھم۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

''اور ہم نے مادر موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ تم اُسے دودھ پلاؤ، اسکے بعد جب اس کے لئے تمہیں خطرہ محسوس ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا اور ڈرو نہیں اور نہ رنج کرو۔ ہم بلاشبہ اسے واپس پلٹائیں گے تمہاری طرف اور اُسے پیغمبروں میں سے قرار دیں گے۔''

مادرِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی اور اُس کی تفصیل:

عام خیال یہی ہے کہ یہاں اس قلبی القاء کو جو خالق کی جانب سے نیک بندوں کے لئے ہوتا ہے وحی کی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس

---

[1] اور ارادہ کرتے تھے ہم یہ (شاہ رفیع الدین)

[2] می خواہیم (شاہ ولی اللہ)

لئے بعض مترجمین نے وحی کا ترجمہ یہاں الہام کے ساتھ کیا ہے۔[1]

شاہ عبدالقادر نے لکھا ہے:

''اُن کی ماں کے دل میں پڑ گیا یا خواب میں دیکھا'' (موضح القرآن)

یہ ترڈدوتردید کا انداز انہوں نے جلالین سے اخذ کیا ہے جنہوں نے لکھا ہے:

اوحینا وحی الھام اومنام: ہم نے وحی بھیجی الہام والی وحی یا خواب والی۔

ہماری قدیم تفسیر میں ہے کہ ندائے آسمانی آئی جس میں انہیں یہ باتیں بتائی گئیں اور یہ صندوق بھی قدرتی طور پر آسمان سے اُترا تھا۔[2]

قرآن مجید نے مادر موسیٰ علیہ السلام کو پہنچائے ہوئے پیغام میں جتنے تفصیلات بتائے ہیں کہ:

۱----پہلے تو دودھ پلاتی رہنا۔

۲----جب خطرہ قریب آجائے تو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دینا

۳----ڈرنا نہیں

۴----غم نہ کرنا

۵----ہم پھر اُسے تم تک واپس لائیں گے

۶----ہم اسے پیغمبروں میں قرار دیں گے۔

یہ تفصیلات نہ خطور قلبی کی حیثیت کے ہیں، نہ خواب کے۔ اتنی باتوں کے خواب میں بھی کہنے کے لئے کوئی شخص ہونا چاہیے۔ اس لئے ہمارے نزدیک تو یہ خالق کی طرف کی ویسی ہی وحی ہے جو صاحبان منصب کے لئے ہوتی ہے اور یہ اُس تصور کے شواہد میں سے ہے جو ہماری مستقبل نظر یہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ طبقہ خواتین میں بھی وقتاً فوقتاً کچھ صاحب منصب شخصیتیں ہوتی رہی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس منصب کا نام تعینی طور پر ہمیں معلوم نہ ہو، کوئی بعید نہیں ہے کہ اس دور میں وہ صاحب منصب ذات اُنہی مادرِ موسیٰ علیہ السلام کی ہو۔

جناب شیخ الطائفہؒ نے خواب اور نبوّت دونوں کی صراحۃً نفی کی ہے لیکن اس کی نوعیت کو پھر معیّن نہیں کیا ہے۔[3] لیکن قدماء کے یہاں بھی یہ قول موجود ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے آکر باقاعدہ یہ حکم الٰہی پہنچایا۔[4]

فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ۝۸

''تو اُسے اٹھالیا فرعون کے گھر والوں نے تا کہ وہ اُن کے لئے دشمن اور سرمایہ رنج وغم ہو۔ یقیناً فرعون اور ہامان اور

---

[1] الہام فرستادیم (شاہ ولی اللہ)

[2] انزل اللہ علیٰ موسیٰ التابوت ونودیت امّہ ضعیہ فی التابوت (علی ابراھیم)

[3] لیس وحی نوم ولا نبوّۃ فی قول قتادۃ وغیرہ (تبیان)

[4] قیل اتاھا جبرئیل بذٰلك (مجمع البیان)

اُن کے لاؤلشکر والے (سب) خطا کار تھے۔''

قرآن کا عام انداز بیان جو ہے کہ وہ واقعات کی کڑیوں کو فہم خلائق کے سپرد کر کے آگے بڑھ جاتا ہے، وہی یہاں بھی ہے، اس کے قبل کہا گیا تھا کہ مادر موسیٰ علیہ السلام کو وحی بھیجی گئی کہ تم اُسے دودھ پلاؤ یہاں تک کہ جب تمہیں خطرہ محسوس ہو تو اُسے دریا میں ڈال دینا۔ اب خود سمجھ لیجئے کہ یہ سب کچھ ہوا، کچھ روز جناب موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے پاس رہے اور وہ انہیں دودھ پلاتی رہیں [1] اس کے بعد اُنہیں خطرہ محسوس ہوا کہ بس اب فرعون کے آدمی آتے ہیں اور وہ بچہ کو لے جا کر قتل کر دیں گے تو اُنہوں نے فرمان ربّانی کے مطابق اُنہیں صندوق میں رکھ کر دریا میں بہا دیا اور وہ صندوق بہتے بہتے عین فرعون کے محل کے نیچے پہنچا، بس اب اس کے بعد قرآن بتا رہا ہے کہ کیا ہوا؟ [2]

اُس صندوق کو فرعون کے آدمیوں نے دریا سے نکال لیا، یہاں ارشاد ہوا ہے: لیکون لھم عدوّا و حزنا ''تا کہ وہ اُن کے لئے دشمن جان اور باعث رنج وغم ثابت ہوں۔'' اسے علمائے معانی و بیان نیز مفسرین دوسرے مقامات پر جہاں ضرورت ہوتی ہے، اس کی مثال میں پیش کرتے ہیں کہ کبھی قہری طور پر مترتب شدہ نتیجہ عرض وغایت کے طور پر ذکر کر دیا جاتا ہے کیوں کہ ظاہر ہے کہ اُن کا بچہ کو اٹھانا اس مقصد سے نہ تھا کہ یہ اُن کے دشمن ثابت ہوں بلکہ انہوں نے تو اس لئے اٹھایا تھا کہ وہ مثل اولاد کے اُن کے یہاں پلیں، بڑھیں اور اُن کے خاندان کے ایک فرد کے طور پر زندگی گزاریں مگر چونکہ ہوا یہ کہ وہ بڑے ہو کر اُس انقلاب کے بانی ہوئے جس کے خطرات سے اب تک فرعون نے بے شمار، بے قصور بچوں کی جانیں لی تھیں، اس لئے یہ کہا گیا کہ انہوں نے اس لئے اُنہیں پالا کر دشمن ثابت ہوں۔ [3]

پھر بعد میں بتایا گیا کہ یہ قدرت کا انتظام اُن کے مظالم کا انتقام لینے کے لئے تھا، اس لئے کہ وہ بڑے خطاوار تھے۔ وہ اپنی تباہی و بربادی میں کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہیں۔

وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ط لَا تَقْتُلُوْهُ ص عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝٩

''اور فرعون کی بیوی نے کہا کہ ارے، میرے اور تمہارے لئے آنکھ کی ٹھنڈک ہے، تم لوگ اسے قتل نہ کرو بہت ممکن ہے کہ یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنائیں اور اُنہیں حقیقت کی خبر نہ تھی''۔

زوجۂ فرعون کی گفتگو اور جناب موسیٰ علیہ السلام کی پرورش:

اس کے پہلے کہا گیا ہے کہ آل فرعون نے اسے اٹھا لیا اور اب بیوی کا ذکر اس سے الگ کر کے امرأۃ فرعون کے الفاظ سے کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ بیوی آل فرعون میں داخل نہیں تھی اور بعض مترجمین نے جو وہاں کسی خاص مقصد سے آل فرعون کا ترجمہ ''اہل خانہ'' سے کر دیا

---

[1] لما ارضعت ثلثة اشهر ...وخافت عليه نوضعته فى تابوت واغلقته والقته فى بحر النيل (جلالين)

[2] فى الكلام حذف لان تقديره انّ امّ موسىٰ طرحته فى البحر ومضىٰ فى البحر الىٰ ان بلغ قصر فرعون (تبيان)

[3] اى ليكون لهم فى عاقبة امره كذٰلك لا نّهم اخذوه لهذا كما يقال لمن كسب مالا فادّاه ذالك الىٰ الحتف والهلاك انّما كسب فلان لحتفه وهو لم يطلب المال للحتف (مجمع البيان)

ہے [1] وہ درست نہیں ہے۔

سلسلہ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ دریا سے نکالنے کے بعد فرعون اور اس کے ارکانِ دولت یا فوجیوں نے چاہا کہ بچہ کو قتل کر دیں اس وقت زنِ فرعون آگے بڑھی [2] اور اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا: قرّة عين لي ولك یعنی ''اے، یہ پیارا پیارا بچہ تو میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک بن سکتا ہے''۔ اس پر شوہر چپ ہو گیا تو اب اُس کے سکوت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے دوسرے لوگوں سے مخاطب ہو کر منع کر دیا کہ اسے نہ مارو۔ یہ ہمارے لئے نفع بخش ہوگا، یا ہم اسے بیٹا بنالیں گے''۔ یہاں ''ہم'' کی لفظ میں اُس نے شوہر کو اپنے ساتھ شریک کر لیا کہ یہ بھی اس فیصلہ میں مجھ سے متفق ہیں، اب کس کی مجال تھی جو قتل کرتا۔

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۰ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۚ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۱ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰۤى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝۱۲ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳

''اور موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا دل بے تاب ہو گیا، قریب تھا کہ وہ اُس راز کو نمایاں کر دیں اگر ہم اُن کے دل کو مضبوط نہ کرتے تا کہ وہ ایمان والوں میں ثابت ہوں اور اُنہوں نے اُس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے جاؤ تو اُس نے اُسے دور سے دیکھا درحالیکہ اُن لوگوں کو خبر نہ تھی اور ہم نے اس پر اناؤں کو پہلے سے حرام کر دیا تھا تو اس (بہن) نے کہا کہ کیا میں تم لوگوں کو ایک گھرانا بتاؤں، جو پال دے اس کو تمہارے لئے اور وہ اُس کے خیر خواہ ہوں گے تو پلٹایا ہم نے اُس کی ماں کی طرف تا کہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور تا کہ وہ جانیں کہ اللہ کا وعدہ سچّا ہے مگر اُن میں سے زیادہ لوگ جانتے نہیں''۔

فارغا کی لفظ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے ''بے تاب'' یہ ایک تشریح کے مطابق ہے [3] دوسری تشریح ایک ہے [4] جس کے لحاظ سے یہ معنی ہوں گے کہ اُن کا دل (موسیٰ علیہ السلام کے تصور میں) محو تھا، تیسری تشریح [5] کے مطابق فارغ کے معنی ''بے فکر'' کے ہوتے ہیں کیوں کہ وحی ربّانی سے انہیں بچّہ کی سلامتی اور پھر واپسی کا یقین ہو گیا تھا مگر بعد کے جملہ سے کہ اللہ اُن کا دل مضبوط نہ کرتا تو وہ اُسے نمایاں کر دیتیں، پہلے مفہوم کو زیادہ

---

[1] برگرفتند آن را اہل خانہ فرعون (شاہ ولی اللہ)

[2] قال ابن عباس: انّ اصحاب فرعون لما علموا بموسیٰ جآء وا ليقتلوه فمنعتهم وقالت لفرعون: قرّت عين لّي ولك (مجمع البيان)

[3] خالی از صبر (شاہ ولی اللہ) خالی صبر سے (شاہ رفیع الدین)

[4] اى خاليا من كلّ شيء الّا من ذكر موسىٰ اى صار فارغاله عن ابن عباس وقتادة والضحاك (مجمع البيان)

[5] قيل فارغا من الحزن لعلمها بانّ ابنها ناج (مجمع)

قوّت حاصل ہے۔

یہ انتظام قدرت تھا اُنہیں اُن کی والدہ تک دوبارہ پہنچانے کا کہ القائے ربّانی سے وہ کسی انّا کی طرف رُخ نہ کرتے تھے، اس باطنی ہدایت کو جس کی بنا پر وہ کسی دودھ پلانے والی کی طرف رُخ نہ کرتے تھے، خالق نے یوں تعبیر کیا ہے کہ ''ہم نے اُن پر اناؤں کو پہلے سے حرام کر دیا تھا۔ یہ ایک طرح کا حکم تکوینی تھا، نہ کہ حکم تکلیفی جو سن وسال سے تعلق رکھتا ہو۔[1]

ہمارے نزدیک یہ جملہ صریحی ثبوت ہے اس کا کہ وہ پہلے کی سب باتیں کہ تم ان کو دودھ پلاتی رہو اور جب خطرہ قریب ہو تو دریا میں ڈال دینا اور ڈرنا نہیں اور رنجیدہ نہ ہو۔ ہم اُسے پھر تم تک پہنچا دیں گے اور اُسے آگے چل کر رسول بنائیں گے..... یہ سب ذہنی تصورات قلبی خطورات نہ تھے جیسا کہ بعض کا تصور ہے بلکہ وہ سب خداوندی پیغام تھے جو اُن تک کسی ذریعہ خاص سے پہنچائے گئے تھے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾

''اور جب وہ شباب کی منزل تک پہنچے اور پورے قدوقامت پر آ گئے تو ہم نے انہیں حکمت اور علم عطا کیا اور اسی طرح ہم صلہ دیتے ہیں نیک اعمال افراد کو''۔

حکمت اور علم کا عطا کرنا قرآن مجید میں نبوّت عطا کرنے کی ایک تعبیر ہے جس کی صراحت بعض قدیم مفسرین کے کلام میں موجود ہے مگر یہاں پر جلالین نے یہ اضافہ کیا ہے کہ:

قبل ان یجعله نبیّا: قبل اس کے کہ وہ نبی بنائے جائیں۔

یہ شاید اس بنا پر ہے کہ نبوّت تو اُس وقت ملی ہے جب وہ آگ لینے گئے تھے جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

خدا کے دین کا موسیٰ علیہ السلام سے پوچھیے احوال
کہ جائیں آگ کو لینے پیمبری مل جائے

مگر یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ حکمت اور علم کا عطا کرنا نبوّت کے منصب ہی کی تعبیر ہے اور وہ مصر سے نکلنے کے پہلے نبی ہو چکے تھے اور واپسی میں جب آگ لینے گئے تو وہ رسالت کے منصب پر فائز کئے گئے جیسا کہ ہمارے یہاں کی بعض دوسری احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نبوّت کا منصب رسالت کی منزل سے فروتر ہے، پھر بھی آیت کے آخری فقرہ کذٰلك نجزی المحسنین سے یہ ثابت ہے کہ اُس کے پہلے بھی حسن عمل اُن کی زندگی کا وصف تھا اور جلالین کی بھی وہ تشریح اس حیثیت سے بیش قیمت ہے کہ خالق کے اس ارشاد کے بعد کہ اُن کو ہم نے علم وحکمت عطا کر دیا، اُن کے اُس عمل کو جو اس کے بعد ہی مذکور ہے کہ اُنہوں نے ایک مومن کی حمایت کرتے ہوئے قبطی کو مارا جس سے وہ مر گیا، کوئی ایسا عمل نہیں سمجھا جا سکتا جو شانِ نبوّت کے خلاف ہو اور پھر آخری جملہ: کذٰلك نجزی المحسنین اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں حسن عمل منصب الٰہی کا نتیجہ نہیں ہوتا کہ چونکہ وہ نبی ہو گئے اس لئے معصوم ہیں بلکہ اُن کا منصب حسن عمل مرتب ہے کہ چونکہ وہ معصوم ہیں، اس لئے اللہ نے نبی بنایا ہے اور جزء کا مفہوم یہاں ان کی صلاحیت ذاتی کے تقاضا کو پورا کرتا ہے۔

---

[1] فهٰذا تحریم منع لا انّ هناك نهیا عن الفعل (مجمع البیان)

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۚ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۖ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۵ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ فَغَفَرَ لَهٗ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۱۶ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ۝۱۷

''اور وہ شہر کے اندر گئے ایسے وقت جب وہاں کے لوگوں کو خبر نہ تھی تو وہاں دیکھا دو آدمیوں کو آپس میں لڑتے ہوئے، یہ اُن کے دوستوں میں سے تھا اور یہ اُن کے دشمنوں میں سے تو اس نے جو اُن کے دوستوں میں سے تھا فریاد کی اُن سے اُس کے خلاف جو اُن کے دشمنوں میں سے تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے اُسے گھونسا مار دیا تو اس نے اس کا فیصلہ کر دیا، کہا یہ شیطان کی کارستانی کا نتیجہ ہے، بلا شبہ وہ کھلا ہوا گمراہ کرنے والا دشمن ہے، کہا اے میرے پروردگار! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا اب تو مجھے بخش دے تو اُس نے اُنہیں بخش دیا، بلا شبہ وہ بڑے بخشنے والا ہے، بڑا مہربان، کہا اے میرے پروردگار! اس بنا پر کہ تو نے مجھے اپنی نعمت سے نوازا ہے میں کبھی گنہ گاروں کا پشت پناہ نہیں ہوں گا۔''

قبطی کے قتل کا واقعہ:

فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ''موسیٰ علیہ السلام نے اُسے گھونسا مار دیا تو۔۔۔اس نے اس کا فیصلہ کر دیا'' اس سے ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصد اس قبطی کی جان لینے کا نہ تھا بلکہ بس گھونسا ہی مارا تھا، اب وہ گھونسا ہی رہتا تو اس میں زیادہ اہمیت پیدا نہ ہوتی، ایک وقتی بات تھی جس سے اُس اسرائیلی کو تقویت ہو جاتی اور وہ قبطی گھبرا کے بھاگ جاتا مگر ایک گھونسے ہی میں وہ آدمی جو ایک دم ختم ہو گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معاملہ کی نزاکت کا احساس ہوا کہ اب یہ بات فرعون تک ضرور پہنچے گی اور اس کے نتیجہ میں دیکھئے کیا ہوتا ہے؟

اُس کے مر جانے پر جو فوراً اضطراری کیفیت جناب موسیٰ علیہ السلام پر طاری ہوئی، وہ خود اس کا ثبوت ہے کہ یہ اُن کا مقصود نہ تھا، ورنہ اُن کو اپنی کامیابی پر خوش ہونا چاہیے تھا۔ اب عمل شیطان جو کہہ رہے ہیں وہ اس غیر ارادی نتیجہ کو یعنی گھونسا مارنا تو میرا کام تھا، مگر اُس کا اتنا مہلک ہونا، یہ غیر ارادی بات ہے، جو شیطان کی کارستانی ہی کہی جا سکتی ہے۔

اسی اضطراب میں انہوں نے خالق سے یہ مناجات کی۔ یہ اندیشہ کسی عذاب اخروی یا غضب الٰہی کا نہ تھا بلکہ فرعون کے عتاب کا اندیشہ تھا جسے سمجھنا چاہیے کہ حکم تقیہ کی مخالفت تھی جو قہری طور پر اُن سے سرزد ہو گئی تھی جس کے لئے اللہ سے بخشش کے طلب گار تھے۔ غور کیا جائے تو یہاں

بخشش کا مطلب خالق کی طرف سے اُس کے نتائج بد سے بچانے کا انتظام تھا اور چونکہ قانون الٰہی کی خلاف ورزی کا سنگین جرم نہ تھا اس لئے فوراً ہی اللہ نے اپنی بخشش کا اعلان فرما کر فرعون کے ساتھ سے جو اندیشے جناب موسیٰ علیہ السلام کو ہو سکتے تھے اُن سے حفاظت کو اپنے ذمے لے لیا۔

اب ایک ضمنی بات اس مقام پر قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ انبیاء اور اہل ولایت کے دوست کی تعبیر قرآن مجید نے لفظ ''شیعہ'' کے ساتھ کی ہے جس میں مخالفین اکثر کچھ ذم کے پہلو نکالنے کی کوشش کرتے رہے ہیں مگر قرآنی اصطلاح کے اعتبار سے وہ قابل فخر لقب ہے اور اس لئے آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے اس پر اپنے شیعوں کو مبارک باد دی ہے۔ [1]

اس سے یہ تلخ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے کہ جسے رسولؐ و آل رسول علیہم السلام کے شیعہ ہونے سے انکار ہو، اسے پھر ان کے ''عدو'' ہونے کا تمغہ قبول کرنا ہوگا کیوں کہ قرآن نے من شیعتہ کے مقابل کی صفت من عدوہ قرار دی ہے اور کوئی نہیں۔

فَاَصْبَحَ فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓى اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾ فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

دوسرے دن صبح کو نکلے وہ اُس شہر میں خوف زدہ، نتیجہ کے منتظر، ایک دفعہ دیکھا کہ جس نے کل اُن سے مدد طلب کی تھی، وہی پھر اُن کو چیخ چیخ کر مدد کے لئے پکار رہا ہے، موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کہا تو بلا شبہ کھلا ہوا گمراہ ہے۔ اب جو انہوں نے چاہا کہ حملہ کریں اُس پر جو اُن دونوں کا دشمن تھا تو اُس نے کہا کیا تم چاہتے ہو کہ مجھے قتل کر دو جس طرح کل ایک آدمی کو قتل کیا؟ تم نہیں چاہتے سوا اس کے کہ سرکش ہو کر رہو دنیا میں اور تم اصلاح کرنے والے نہیں ہونا چاہتے''

یہ کس نے کہا؟ بظاہر جس پر حملہ کرنا چاہا تھا، اُسی نے کہا جس سے پتہ چلا کہ کل کے اُس شخص کے قتل ہو جانے کا راز کھل چکا ہے لیکن شاہ ولی اللہ نے ترجمہ میں لکھا ہے ''گفت فریاد کنندہ۔''

اور حاشیہ پر لکھا ہے: یعنی چوں موسیٰ او را غوی مبین گفت دانست کہ غضب کردہ بر سر من می آید۔

یعنی جب موسیٰ علیہ السلام نے اس کو ''کھلا ہوا گمراہ'' کہا تو اس نے جانا کہ وہ غصّہ کرتے ہوئے میرے سر پر آ رہے ہیں۔

اور ان کے پہلے جلالین نے لکھا ہے:

---

[1] روی ابو بصیر عن ابی عبد اللہ علیہ السلام انّہ قال لیهتکم الاسم قال قلت ومالاسم؟ قال "الشیعة" اما سمعت اللہ سبحانہ یقول: فاستغاثہ الّذی من شیعتہ علی الّذی من عدوّہ (مجمع البیان)

قال المستغيث ظاناً انّه يبطش به لمّا قال له۔

جس نے فریاد کی تھی، اس نے یہ کہا اُس گمان پر کہ یہ اُس پر حملہ کر رہے ہیں چونکہ انہوں نے کہا ''تو بلاشبہ گمراہ ہے۔''

جناب شیخ الطائفہؒ نے انکشاف کیا ہے کہ یہ اصل میں جناب ابن عباسؓ وغیرہ کا قول ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کی مدد کے لئے چلے تھے، اس نے اس غلط فہمی پر کہ یہ اُس پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، یہ جملہ کہہ کر راز فاش کر دیا۔

بہرحال جس طرح ان آیات کا مفہوم اس مقام پر سمجھا جاتا ہے، اُس میں ایک بات نا قابل فہم معلوم ہوتی ہے یا یوں کہا جائے کہ ان کڑیوں کا باہمی تسلسل دشوار محسوس ہوتا ہے، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر کہ وہی اسرائیلی جو کل ایک شخص سے لڑ چکا ہے اور جس کی حمایت میں اب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پریشانی میں مبتلا ہوئے ہیں، آج پھر دوسرے آدمی سے جو فرعون کے قبیلے والا ہے، لڑ رہا ہے، یہ سمجھ گئے کہ فسادی یہی اسرائیلی ہے اور اس لئے اس سے کہا: اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ ''تو کھلا ہوا گمراہ ہے'' یعنی لڑا کا ہے کہ ایک ایک سے لڑتا ہے۔ اب پھر اُنہوں نے ارادہ کیا کہ جو اُن دونوں کا دشمن ہے اور بلاشبہ اس سے مراد وہی قبطی ہے جس سے وہ اسرائیلی آج لڑ رہا ہے، اس پر حملہ آور ہوں، کہوں؟ جب کہ ان کے نزدیک یہ ثابت ہو گیا کہ یہی اسرائیلی فسادی ہے اور اُسی کی روز گزشتہ حمایت کرنے سے وہ پریشانی میں مبتلا ہیں تو وہ اب اس قبطی پر حملہ آور ہونے کے لئے کیوں آگے بڑھے؟ اس لئے یہاں علامہ طبرسیؒ کی تشریح درست معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی باہمی آویزش کو دیکھ کر اس اظہار کے بعد کہ وہی اسرائیلی مفسدہ پرداز ہے، اب وہ آگے اس لئے بڑھے تھے کہ اُس قبطی کو اُس اسرائیلی سے الگ کر کے بیچ بچاؤ کر دیں مگر چونکہ انہوں نے اسرائیلی کو زور سے ڈانٹا تھا، اس لئے وہ یہ سمجھا کہ یہ مجھ پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور اس نے وہ جملہ کہہ کر کل کے قتل کا راز فاش کر دیا اور بات فرعون تک پہنچ گئی جس پر انہوں نے اُن کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔

علامہ طبرسیؒ نے اس قول کی نسبت کہ یہ جملہ کہنے والا اسرائیلی تھا۔ جناب ابنِ عباسؓ اور دوسرے مفسرین کی طرف دی ہے اور دوسرے قول کو کہ جملہ قبطی نے کہا تھا بطور قول شاذ کے نقل کیا ہے۔[1]

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۡ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝۲۰

''اور آیا شہر کے آخری حصّے سے ایک شخص دوڑتا ہوا، اس نے کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! تمام بڑے آدمی تمہارے خلاف سازش کر رہے ہیں کہ تمہیں قتل کر دیں تو تم باہر نکل جاؤ، یقیناً میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف و دہشت کے عالم میں مصر سے نکلنا:

بعض کا خیال ہے کہ یہ وہی ''مومن آل فرعون'' تھا جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ ہے بلکہ سورہ اسی کے عنوان پر معنون

---

[1] عن ابن عباس و اکثر المفسرین وقال الحسن هو من قول القبطی (مجمع البیان)

ہے "سورۃ المؤمن" حالانکہ اس کے اصل نام میں اختلاف ہے [1] مگر نام کی کیا اہمیت ہے۔ اصل تو کام ہے جو اس نے انجام دیا اور وہ اس کے مکمل ایمان نہیں تو بڑی حد تک خدا ترسی کی دلیل تو ہے ہی۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۚ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢١﴾

"اور جب نکلے وہ وہاں خوف زدہ، نتیجہ کے منتظر کہا اے میرے پروردگار مجھے چھٹکارا دے اس ظالم جماعت سے۔"

الفاظ آیت سے جناب ابن عباس ؓ کی یہ تشریح بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ مصر سے نکلتے وقت جناب موسیٰ علیہ السلام کو راہ معلوم نہ تھی کہ کدھر جائیں تو منزل تک پہنچیں گے [2] بلکہ میں الفاظ آیت سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کے پیش نظر کوئی منزل تھی ہی نہیں، جدھر اُنہیں جانا ہے، وہ بس اللہ کے بھروسے پر نکل کھڑے ہوئے تھے اور نصب العین صرف اس وقت فرعون کے شکنجہ سے نکلنا تھا اور یہی وہ مناسبت ہے جس کے لحاظ سے امام حسین علیہ السلام طلب بیعت کے بعد جب مدینہ سے نکلے ہیں تو آپ اس آیت کے تلاوت فرما رہے تھے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ مدینہ سے یہ منصوبہ بنا کر نہیں نکلے تھے کہ آپ کو کوفہ جانا ہے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿٢٢﴾ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۖ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۭ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ۭ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ﴿٢٣﴾ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿٢٤﴾

"اور جب وہ مَدْیَنْ کی طرف روانہ ہوئے تو کہا امید ہے کہ میرا پروردگار مجھے سیدھے راستے کی طرف لے جائے گا اور جب وہ مدین کے پانی پر پہنچے تو پایا اس پر ایک جماعت کو آدمیوں کی کہ وہ مویشیوں کو پانی پلا رہی ہے اور ان سب سے الگ دو (۲) عورتوں کو پایا کہ وہ الگ کھڑی ہیں۔ انہوں نے کہا تم دونوں کی کیا صورت حال ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم اس وقت نہیں پلائے جائیں گے جب تک یہ چرواہے اپنے جانوروں کو پلا کر لے نہ جائیں اور ہمارے باپ بہت سن رسیدہ بوڑھے ہیں تو انہوں نے ان دونوں کے جانوروں کو پانی پلا دیا، پھر سایہ میں چلے گئے اور کہا اے میرے پروردگار! میں اس کا جو تو مجھ پر نعمت اُتارے، محتاج ہوں۔"

دختران جناب شعیب علیہ السلام کا واقعہ:

ان آیات کے ابتدائی جملہ سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ وہ روانہ تو ہوئے تھے مصر سے بغیر کسی منزل مقصود کے مگر پھر راستے میں انکے ذہن میں مدین کی طرف جانے کا خیال پیدا ہوگیا اور اس القائے ربانی سے وہ خوش ہوئے کہ ادھر جانے کا نتیجہ میرے لئے اچھا ہوگا۔

---

[1] كان الرّجل حزقيل مؤمن آل فرعون وهو ابن عمّ فرعون وقيل رجل اسمه شمعون وقيل سمعان (مجمع البيان)

[2] قال ابن عباس خرج موسىٰ متوجّها نحو مدين وليس له علم بالطّريق الّا حسن ظنّه بربّه (مجمع البيان)

''مدین کا پانی'' یعنی وہ کنواں جس سے لوگ پانی بھر کے بستی کے اندر لے جاتے تھے اور اپنے مویشیوں کو بھی سیراب کرتے تھے۔

''وہ دو عورتیں الگ کھڑی ہیں'' اس کا کیا مطلب؟ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے جانوروں کو پانی پینے کے لئے آگے بڑھنے سے روکتی ہیں تا کہ دوسرے لوگ پلا لیں، تب وہ پانی پلانے کے لئے جائیں جو بحیثیت واقعہ بعد کے خود قرآنی بیان سے جو اُن لڑکیوں کی زبانی ہے، ظاہر ہے اور یہ بھی کہ وہ اپنی بکریوں کو دوسروں کی بکریوں سے لگ ہٹاتی تھیں کہ کہیں وہ اُن میں مل نہ جائیں، بحیثیت واقعہ یہ سب باتیں ٹھیک ہوسکتی ہیں اور ہر ایک موافق میں مفسّر کا قول بھی ہے [1] مگر خود الفاظ قرآنی کی مطابقت کے لحاظ سے قریب تر پہلا ہی مفہوم ہے۔

ما خطبکما جس کا ترجمہ میں نے کیا ہے ''تم دونوں کی کیا صورت حال ہے''؟ اس سوال میں دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ تم اپنے مویشیوں کو لئے الگ کیوں کھڑی ہو؟ دوسرے یہ کہ تم عورت ذات ہوکر آخر مردوں کی اس بھیڑ میں مویشیوں کو پانی پلانے کیوں آئی ہو؟ اس کے لئے کسی مرد کو آنا چاہیے تھا، اُن صاحبزادیوں کے جواب میں ان دونوں باتوں کے متعلق وضاحت ہے۔

الگ کھڑے ہونے کا سبب تقاضائے نسوانیت کے ساتھ احساس شرافت ہے کہ اس بھیڑ بھاڑ اور دھکم پیل میں جانا ہماری شان کے خلاف ہے جب یہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا کر لے جائیں، اور بھیڑ ختم ہو، تب ہم پانی پلائیں، چاہے اس میں کتنی ہی دیر کھڑا رہنا پڑے اور مضارع منفی میں جو تجدد و استمرار کا حامل ہے، یہ مفہوم مضمر ہے کہ ہم روز ایسا ہی کرتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور یہ کہ ہم کیوں آئے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے گھر میں مردوں میں بس ہمارے والد ہیں اور وہ بہت بوڑھے ہیں، وہ خود آ نہیں سکتے تو پھر کون آئے؟ مجبوراً یہ خدمت ہم کو انجام دینا پڑتی ہے، ضمناً اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ وہ دونوں ناکتخدا ہیں، ابھی اُن کی شادی نہیں ہوئی ہے۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ ۫ قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵﴾

''تو آئی ان دونوں میں کی ایک راستہ چلتی ہوئی شرم کے ساتھ، کہا کہ میرے والد تمہیں بلا رہے ہیں تا کہ تمہیں معاوضہ دیں اُس کا جو تم نے ہمارے لئے پانی پلا دیا تو جب وہ اُن کے پاس آئے اور تمام واقعات ان سے بیان کئے تو انہوں نے کہا کہ نہ ڈرو، تم نجات پا گئے اس ظالم جماعت سے''۔

حسب دستور قرآن مجید نے درمیان کی کڑیاں فہم مخاطبین و سامعین پر چھوڑتے ہوئے آگے کی بات بیان کردی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب جناب موسیٰ علیہ السلام نے ان لڑکیوں کے لئے پانی بھر دیا تو وہ اپنے والد بزرگوار کے پاس خلاف امید اس وقت سے پہلے پہنچ گئیں جس وقت وہ روزانہ پہنچا کرتی تھیں تو انہوں نے پوچھا کہ آج تم جلدی کیوں کر آ گئیں؟ انہوں نے واقعہ بیان کیا، انہوں نے کہا ارے، اس آدمی کو بلا کر لاؤ کہ اس نے ہمارے لئے اتنی زحمت اٹھائی ہے۔ اب ہمیں اس کا کچھ معاوضہ ادا کرنا چاہئے لہٰذا اب ان میں سے ایک جناب موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی جس کا اس

---

[1] تمنعان غنمهما من الورود على الماء عن السدى وقيل تذود ان الناس عن مواشيهما عن قتادة وقيل تكفّان غنمهما من ان تختلط بأغنام النّاس عن الحسن (مجمع البيان)

آیت میں تذکرہ ہے۔

اب معانی بیان میں جیسے ایک صنعت ہوتی ہے، رد العجز علی الصدر، اس طرح بیان قرآنی میں ہمیں اول بآخر نسبتے وارد کی کیفیت نظر آتی ہے کہ جب جناب موسیٰ مصر سے نکلے تھے تو ان کی کیفیت قرآن میں یہ بیان ہوئی تھی کہ "خائفا یترقب" (خوف زدہ نتیجہ کے منتظر) اور بارگاہ الٰہی میں مناجات تھی رب نجنی من القوم الظالمین پروردگار مجھے اس ظالم جماعت سے نجات دے، اب ان بزرگوار پیر مرد نے واقعات سن کر جو اطمینان بخش الفاظ کہے وہ اسی ترتیب سے یوں ہیں کہ "لا تخف" (خوف نہ کرو) نجوت من القوم الظالمین" (تم اس ظالم جماعت سے نجات پا گئے)۔

اب مشہور روایت جسے عام طور پر "مسلّمات" کی حیثیت حاصل ہے، وہ تو یہ ہے کہ یہ بزرگوار جناب شعیب علیہ السلام تھے اور چونکہ سرزمین مدین کے نبی کی حیثیت سے قرآن مجید میں بھی جناب شعیب علیہ السلام کا نام آیا ہے، اس سے اس مسلّمے کو تقویت بھی ہوتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس واقعہ میں شعیب علیہ السلام کا نام نہیں لیا ہے اور اقوال تفسیر میں ان پیر مرد کے بارے میں متعدد ہیں۔[1] لہٰذا کسی ایک بات کو مسلمات میں سے سمجھنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۫ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ﴿۲۶﴾
قَالَ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ
اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ ؕ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ
مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ؕ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ
عَلَيَّ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۲۸﴾

"اُن میں کی ایک نے کہا "اباجان! ان کو مزدوری میں رکھ لیجئے بہترین شخص جسے آپ مزدوری کے لئے رکھیں، وہی ہے جو طاقت ور بھی ہو اور امانت دار بھی۔ انہوں نے کہا کہ میں تم سے اپنی دونوں بیٹیوں میں سے اس ایک کا عقد کرنا چاہتا ہوں اس شرط پر کہ تم آٹھ برس تک میری خدمت انجام دو گے، اس کے بعد اگر دس پورے کر دو تو وہ تمہارا احسان ہوگا اور میں تمہیں کوئی ناگوار زحمت نہیں دینا چاہتا، اللہ نے چاہا تو تم مجھے خوش کردار لوگوں میں سے پاؤ گے۔ انہوں نے کہا اچھا یہ میرے اور آپ کے درمیان طے ہے۔ دونوں میں سے جو بھی مدت میں پوری کر دوں مجھ پر کوئی الزام نہ ہوگا اور اللہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس کا گواہ ہے"۔

---

[1] قیل کان الشیخ ابو هما شعیبا وقال الحسن بل کان رجلا مسلما علیٰ دین شعیب اخذ الّذین عنه و شعیب مات قبل ذٰلك وقال قوم انّه کان ابن اخی شعیب (تبیان)

جنابِ شعیب علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو:

یہاں دو باتیں بقرینۂ واقعات ذہن میں آتی ہیں: ایک یہ کہ گھر کے اندر یہ چرچا تھا اور ان لڑکیوں کے والد نے لڑکیوں کے علم میں یہ کہا تھا کہ میں ایسا آدمی چاہتا ہوں جو اس پیرانہ سالی میں میری مدد کرے اور اس سے میں ان لڑکیوں میں سے ایک کی شادی کر دوں گا، جب ہی اس صاحبزادی کے یہ کہنے پر کہ بس ان کو آپ مزدوری پر رکھ لیجئے، وہ بزرگوار یہ سمجھے کہ یہ ان سے شادی پر تیار ہے اور انہوں نے جناب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اجیر کرنے کی پیش کش کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کی پیش کش کر دی۔

دوسرا (۲) امر یہ ہے کہ چونکہ جناب موسیٰ علیہ السلام کے پاس بلانے کے لئے ایک صاحبزادی گئی تھیں اور وہاں تعبیر ان سے احدھما (ان دونوں میں کی ایک) کی لفظ کے ساتھ ہوئی تھی تو یہ احدھما کا لفظ جیسے اس ایک صاحبزادی کی طرف اشارہ کے لئے ایک اصطلاح بن گئی یعنی اسی صاحبزادی نے پھر ان کو اس طرف توجہ دلائی کہ انہی کو اجیر بنا لیجئے جس سے والد نے محسوس کیا کہ یہ ان کی شریک حیات بننے پر رضامند ہے لہٰذا اسی سے جناب شعیب علیہ السلام نے (یا جوان بزرگوار کا نام ہو) عقد کرنے کے لئے جناب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ''ایجاب'' کیا اور انہی کے لئے جناب موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے قبول ہوا۔ جس کی طرف ہماری قدیم تفسیر اور ائمہ معصومین علیہم السلام کے ارشاد سے بھی صحیح رہنمائی ملتی ہے۔ [۱]

اس طرح یہ احدھما کا لفظ یہاں پر واحد غیر معین کے لئے نہ تھی جو تعین منکوحہ کے منافی ہو بلکہ وہ بسیاق واقعات اس وقت متعین تھی جس کی تعین کے لئے بعد میں کسی تحقیق و دریافت کی ضرورت نہ تھی۔

تعجب ہے کہ ہمارے اکابر علماء نے اپنی تفاسیر میں ان دونوں پہلوؤں پر توجہ نہیں فرمائی ہے۔

بہت ممکن ہے کہ ان صاحبزادی کے جناب موسیٰ علیہ السلام کے پاس جانے میں قرآن نے علی استحیاء (شرم کے ساتھ) کی لفظ سے جس کیفیت کا اظہار کیا ہے، وہ اسی تصور سے ہو جو ان کے ذہن میں موجود تھا کہ انہی کے ساتھ میری شادی ہوگی۔

بہرصورت متعدد مقامات کی طرح قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ ہر دور میں شرافت کا معیار لڑکیوں میں شرم و حیا ہی رہا ہے نہ کہ اس دور کی طرح کوشش کر کے لڑکیوں کو بے شرم و بے حیا بنانا موجودہ دور کے ترقی پسندانہ نظام کی امتیازی خصوصیت ہے۔

قدیم مفسرین میں حسن کی زبانی جس سے غالباً حسن بصری مراد ہیں، اس علی استحیاء کے مفہوم کا بہت اچھا تجزیہ وارد ہوا ہے۔ [۲]

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ

---

[۱] قلت له جعلت فداك ايّتهما زوّجه شعيب من بناته قال الّتي ذهبت اليه فدعته وقالت لا بيها يا ابت استاجره انّ خير من استاجرت القوىّ الامين (على بن ابراهيم) عن صفوان بن يحيىٰ عن ابي عبد الله عليه السلام قال سئل ايّتهما الّتي قالت انّ ابي يدعوك قال الّتي تزوّج بها (مجمع البيان)

[۲] فو الله ما كانت ولا جة ولا خرّاجة ولكنّها كانت من الخفرات اللّواتي لا يحسن المشي بين ايدى الرّجال والكلام معهم (مجمع البيان)

لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۰﴾ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ط فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ط يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ قف اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ز وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ط اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

''تو جب موسیٰ علیہ السلام اُس مدّت کو پورا کر چکے اور اپنے بیوی بچوں کو لے کر چلے تو طور کی جانب سے ایک آگ محسوس کی، کہا اپنے گھر والوں سے کہ ٹھہرو میں نے ایک آگ محسوس کی ہے، شاید میں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر لاؤں یا کوئی چنگاری آگ کی کہ تم لوگ تاپو تو جب وہاں گئے تو آواز آئی اُس وادی کی داہنی جانب سے اس مبارک سرزمین میں درخت سے کہ، اے موسیٰ علیہ السلام! میں اللہ ہوں تمام جہانوں کا پروردگار اور یہ کہ تم اپنا عصا پھینک دو تو جب انہوں نے اُسے دیکھا کہ وہ حرکت کر رہا ہے جیسے ایک سانپ ہے تو پیٹھ پھرا کر مڑے اور پھر پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اے موسیٰ! آگے بڑھو اور ڈرو نہیں، تم محفوظ ہو، اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو۔ وہ نکلے گا سفید چمکتا ہوا بغیر کسی برائی کے اور پھر سمیٹ لو اپنے بازوؤں کو خوف سے تو یہ دونوں دلیلیں ہیں تمہارے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اُس کے ارکان سلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لئے، بلاشبہ وہ بداعمال لوگ رہا کیے ہیں۔''

وادیٔ ایمن:

جناب موسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا کہ میں کوئی خبر لاؤں، اس کا مطلب یہ ہے کہ شاید وہاں آگ کے پاس کوئی شخص ایسا ملے جس سے راستہ معلوم ہو جائے اس لئے کہ رات کا اندھیرا بھی تھا، سردی بھی تھی اور وہ راستہ بھی بھول گئے تھے، سمجھ میں نہ آتا تھا کدھر جائیں۔[1]

اُن بزرگوار نے جن کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ جناب شعیب علیہ السلام تھے، آٹھ برس کی لازمی شرط کی تھی اور پھر کہا تھا کہ اگر دس برس پورے کر دو تو یہ تمہاری خوشی سے وابستہ ہے، جناب موسیٰ علیہ السلام نے اُس وقت یہ اقرار کیا تھا کہ بہرحال ان میں سے جو بھی مدّت پوری کر دوں، مجھ پر کوئی الزام نہ ہوگا۔ اب قرآن کے یہ الفاظ ہیں کہ ''انہوں نے جب وہ مدّت پوری کر دی۔'' اب یہ کونسی مدّت ہے؟ اس کی تعیین قرآن مجید کے الفاظ سے نہیں ہوتی، صحابہ کرام کی دو روایتیں ہیں جو جناب موسیٰ علیہ السلام کی شان کے مطابق ہیں کہ انہوں نے وہی آخری مدّت دس برس والی پوری

---

[1] روی انّه کان قد ضلّ عن الطّریق (تبیان)

کی۔[1]

اس آواز کے متعلق جو درخت سے آئی تھی، ہم نے ''مقدمہ تفسیر'' میں کلام الٰہی کی بحث میں تشریح کی ہے کہ وہ جناب باری تعالیٰ کی خلق کی ہوئی آواز تھی۔ بحیثیت اپنے کلام کے جس کا محل وہ درخت تھا، کلام کا محل، نہ کہ اس کے متکلم کا جو کسی محل میں حلول سے اپنے کمال ذات کی بنا پر بری ہے۔[2]

عصا کے سانپ کی شکل اختیار کرنے پر جناب موسیٰ علیہ السلام کی جو کیفیت ہوئی، اس کے متعلق عرض ہے کہ انبیاء عام بشری تاثرات سے بری نہیں ہوتے جیسے بھوک، پیاس، درد۔ یہ کیفیات عام طور سے طبعی اسباب کے ماتحت انسان پر طاری ہوتی ہیں، ویسے ہی ڈر، وحشت، گھبراہٹ کیفیات ہیں، ان کا طاری ہونا بھی بشریت کا تقاضا ہے۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ جیسے کوئی غیر معمولی تقریب ہونے والی ہوتی ہے تو اُس محکمے کی طرف سے اُس کے لئے متعلقہ افراد کو مشق کرائی جاتی ہے جسے ''ریہرسل'' کہتے ہیں۔ اسی طرح چونکہ علم الٰہی میں ان کے لئے ساحروں کی مہم درپیش ہوگی تو اُن کے لئے پہلے پیغام نبوّت کے ساتھ اُس موقع کے لئے تیار کیا گیا چنانچہ اس وقت خود اپنے پھینکے ہوئے عصا کے اژدھا بن جانے سے جو دہشت طاری ہوئی تھی وہ اژدھا بنا، ہاں وہاں جیسا کہ الفاظ قرآن نے ظاہر کیا ہے، اُس وقت ذرا سا خوف پیدا ہوا تھا جب ساحروں کی رسّیاں سانپوں کی طرح حرکت کرنے لگی تھیں مگر اس کے لئے حضرت علی علیہ السلام نے اپنے کلام میں جو نہج البلاغہ میں ہے، فرمایا ہے۔

ما اشفق موسیٰ خیفة علیٰ نفسه وانّما اشفق من غلبة الجهّال ودولة الضّلال:

موسیٰ علیہ السلام نے جو خوف محسوس کیا تھا اپنے لئے نہ تھا بلکہ اس لئے تھا کہ کہیں ساحروں کا کرتب خلق خدا کی گمراہی میں شدّت کا باعث نہ ہو جائے۔

اس کی تائید خالق کی اس اطمینان دہانی سے ہوتی ہے کہ:

انّك انت الاعلیٰ نتیجہ میں غالب تم ہی رہو گے

یعنی اس طرح گمراہی کے استیصال کا سامان ہو جائے گا۔

خالق کا یہ ارشاد کہ ''یہ دونوں دلائل ہیں تمہارے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اس کے ارکان سلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لئے'' اس میں مضمر ہے یہ حکم کہ تم یہاں سے سیدھے فرعون کی طرف جاؤ جسے صراحۃً دوسری جگہوں پر اذهب الیٰ فرعون کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور قرآن مجید میں نقل واقعات میں ایسا تنوّع اور گوناگوں انداز بیان ''نقل بالمعنیٰ'' کے جواز کی بہت بڑی دلیل ہیں جس کے نظائر قرآن مجید میں بکثرت موجود ہیں۔

---

[1] روی الواحدی باسنادہ عن ابن عباس قال سألت ای الاجلین قضیٰ موسیٰ قال اوفاهما وابطاهما وبالاسناد عن ابی ذر قال قال رسول اللہ ﷺ اذا سئلت ای الاجلین قضیٰ موسیٰ فقل خیرهما وابرّهما (مجمع البیان)

[2] فعل الکلام فیها لا انّ اللہ تعالیٰ کان فی الشجرة لانّه لا یحویه مکان ولا یحلّ فی جسم (تبیان)

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ﴿۳۳﴾ وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْٓ ۫ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ﴿۳۴﴾ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا ۚ بِاٰیٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

''کہا پروردگار! میں نے اُن میں سے ایک کو مار ڈالا تھا تو ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں اور میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان کے فصیح ہیں تو انہیں میرے ساتھ بھیج مددگار بنا کر کہ وہ میری تصدیق کریں۔ میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔ ارشاد ہوا کہ ہاں ہم تمہارے بازو کو مضبوط کریں گے تمہارے بھائی کے ساتھ اور ہم تم دونوں کو غلبہ عطا کریں گے تو ہماری طرف کی نشانیوں کی وجہ سے اُن کی دسترس تم پر نہ ہوگی، تم دونوں اور جو تمہاری پیروی کریں گے، غالب آنے والے ہیں۔''

جناب ہارون علیہ السلام کی بحیثیت گواہ ضرورت:

جناب موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا ویسی ہی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا جو پہلے پارے میں آچکی ہے کہ ان کی طرف ایسا رسول بھیج جس کے یہ اوصاف ہیں، یعنی یہ نہیں ہے کہ رسول کا انتخاب وتقرر اُن کی دعا سے ہوا ہے بلکہ جو منظور قدرت تھا اس کو بالقائے ربانی پیغمبر نے اپنی دعا بنا کر پیش کر دیا۔[1]

جناب موسیٰ علیہ السلام کی اس خواہش سے جواز روئے قرآن ثابت ہو رہی ہے، یہ پتہ چلتا ہے کہ جب جھٹلانے والوں کی کثرت ہو تو کوئی ایک ایسا ضرور ہونا چاہیے جو اُن کے مقابلہ میں رسول کی تصدیق کرے، اس کے لئے موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ میرے ساتھ ہارون کو بھیج جو اس مہم کی تکمیل کرے اسی طرح آخری رسول کو بھی جنہیں قرآن مجید نے مثلِ موسیٰ علیہ السلام کہا ہے (کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولا) آغاز رسالت سے پہلے ہی لمحہ میں اُس کی تصدیق کے لئے موجود ہو جسے قرآن مجید نے یوں ظاہر کیا ہے کہ:

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ.(ھود۔۱۷)

وہ جو اپنے پروردگار کی طرف سے کھلا ہوا ثبوت حقانیت رکھتا تھا اور اُس کے پیچھے پیچھے تھا ایک گواہ جو اس کا جز تھا۔

اب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مثل موسیٰ علیہ السلام تھے تو لازماً گواہ مثل ہارون ہوگا جس پر منطبق ہوتی ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ متفقہ حدیث بھی کہ انت منّی بمنزلة ھٰرون من موسیٰ (یعنی) تم کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے تھی۔

خالق نے دعا قبول فرمائی یعنی جو اُس کا فیصلہ پہلے ہی سے تھا، جس کے مطابق وہ دعا تھی اُس کا اعلان فرما دیا تو مقام حقیقت میں دعا اُس فیصلے پر مبنی تھی اور مقام ظاہر میں خالق کا فیصلہ دعا پر مرتب ہوا لہٰذا وہ اس کی قبولیت قرار پایا، بالکل یونہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا آخری رسولؐ کے

---

[1] قیل انّ موسیٰ ما سأل ذٰلك الّا باذن الله لانّه لا یجوز ان یسأل بنی ان یرسل معه انسانا اٰخر نبیّا (تبیان)

لئے اور عطائے امامت پر! ومن ذرّیتی کہہ کے اپنی اولاد کے لئے، ان سب کی نوعیت متحد ہے یعنی دعا مشیّت خالق پر مبنی تھی اور نتیجہ کا ظہور دعا پر مترتّب ہوا، اس لئے کہنے والے نے ہمارے رسولؐ کے لئے کہا تو غلط نہیں کہا کہ ''دعائے خلیل ونوید مسیحا''

بالکل اسی طرح رسولؐ کا حضرت علی علیہ السلام کے لئے دعا کرنا اور آیۂ تطہیر کے نزول سے پہلے جیسا کہ فریقین کی احادیث میں ہے، اہل بیت معصومینؑ کو زیر چادر لے کر بارگاہ الٰہی میں غرض کرنا کہ: اللّٰھمّ ھٰؤلاء اھلی ''پروردگارا! یہ میرے اہل ہیں''۔ اور بعض روایات میں ہے کہ اس کے بعد کہا:

اذھب عنھم الرّجس وطھّرھم تطھیرا۔

ان سے نجاست کو دور رکھ اور انہیں پاک رکھ جیسا پاک رکھنے کا حق ہے۔

اور اس کے بعد آیۂ تطہیر کا نازل ہونا جیسا کہ حدیث کساء کی اس باسند شکل میں ہے جسے ہمارے دوست اور اس وقت ایران کے ایک بزرگ مرجع تقلید آیۃ اللہ سید شہاب الدین مرعشی معروف بہ آقا نجفیؒ نے شائع فرمایا ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن ترجمہ کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں چھپ چکے ہیں۔

''ہماری طرف کی نشانیوں کی وجہ سے ان کی دسترس تم تک نہ ہوگی، یعنی معجزات جو تمہیں عطا ہوئے ہیں، ان سے ان پر ہیبت طاری ہو جائے گی، اس کی وجہ سے وہ تمہارے خلاف کوئی اقدام نہ کرسکیں گے۔ [1]

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٦﴾ وَقَالَ مُوْسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٣٧﴾

تو جب ان کے پاس آئے موسیٰ علیہ السلام ہماری کھلی نشانیوں کے ساتھ تو انہوں نے کہا یہ نہیں ہے مگر گھڑا ہوا جادو اور ہم نے اپنے اگلے باپ داداؤں کے دور میں نہیں سنا اور موسیٰ نے کہا میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون اس کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے اور کس کے لئے آخرت کی کامیابی ہوگی، بلاشبہ ظالم لوگ دین اور دنیا کی بہتری نہیں پائیں گے''۔

حسب دستور درمیان کی کڑی واقعہ کی قرآن نے عقل کے حوالے کردی کہ جب خالق کا فرمان ہوگیا تو موسیٰ علیہ السلام نے تعمیل کی اور اب سنو [2] جب وہ ان کے پاس گئے تو یہ ہوا۔

چونکہ اس کے پہلے فرعون کے ساتھ ملا ئہ یعنی اس کے عمائد سلطنت کا ذکر ہو چکا ہے، اس لئے یہاں بھی صیغے جمع ہی کر کے صرف ہوئے ہیں کہ وہ ان کے پاس گئے۔

---

[1] ما یجری علیٰ ایدیکما من المعجزات فیخافکما فرعون وقومہ لاجلھا (مجمع البیان)

[2] التقدیر فمضیٰ موسیٰ الیٰ فرعون وقومہ (مجمع البیان)

اب جناب موسیٰ علیہ السلام نے کہا، مطلب تو اس کا صاف یہ ہے کہ میرا پروردگار جانتا ہے کہ میں ہدایت پر ہوں اور تم گمراہ، اور حقیقت کے انکار کی بناء پر ظالم ہو، اس لئے نجات نہیں پا سکتے، مگر اس کے بجائے جو حقیقت ہے، وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ میرا پروردگار خوب جانتا کہ کون راہ ہدایت پر ہیں اور کون ظالم ہے اور جو ظالم ہوں، وہ نجات نہیں پا سکتے۔ یہ روادانہ گفتگو اس پیغمبر کی ہے جسے دنیا نے غیظ وغضب کا پتلا سمجھ رکھا ہے اور اس رواداری کے نمونے قرآن مجید میں بکثرت نظر آتے ہیں جو ہمارے رسالہ ''قرآن کا معیار تہذیب اور روادارانہ گفتگو'' میں درج ہیں۔ وہی انداز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس کلام میں نظر آ رہا ہے۔ [1]

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿۴۲﴾

''اور کہا فرعون نے اے عمائدورؤسا! مجھے تمہارے لئے اپنے سوا کسی خدا کا علم نہیں ہے۔ تو اے ہامان! میرے لئے اینٹوں کا بھٹا لگوا دو اور ایک اونچا قصر بنواؤ، شاید میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کا پتا لگا سکوں اور میں تو انہیں جھوٹوں ہی میں سے سمجھتا ہوں اور اس نے اور اس کی افواج نے دنیا میں ناحق گھمنڈ سے سے کام لیا اور انہوں نے سمجھا کہ وہ ہماری طرف پلٹ کر نہیں آئیں گے تو ہم نے اس کو اور اس کی افواج کو گرفت میں لے کر دریا میں ڈال دیا تو دیکھو کیسا انجام تھا ظالموں کا اور انہیں ہم نے قرار دیا ایسا پیشوا جو آگ کی طرف بلاتے تھے اور قیامت میں ان کی مدد نہ ہوگی اور ان کے پیچھے لگا دی ہم نے اس دنیا میں لعنت اور روز قیامت وہ بدحال لوگوں میں ہوں گے''۔

فرعون کا ہامان کو فرمان اور آخری انجام:

یوں تو غور کرنے پر سب ہی کو معلوم ہوگا کہ انکار خدا کا سرمایہ لاادریت اور لاعلمی کے سوا کچھ نہیں ہے مگر خود ادّعائے الوہیّت رکھنے والا یہ کہے کہ مجھے اپنے سوا کسی کو خدا کا علم نہیں ہے۔ اس میں اصل خدا کے متعلق تو خیر بس جہل ہی ثابت ہوتا ہے جو نئی بات نہیں ہے مگر ضمناً خود اپنی خدائی کی تو قطعی نفی ہو جاتی ہے کیوں کہ جو واقعی خدا ہو اسے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر خدا کی تلاش کے لئے یہ کوشش وکاوش

---

[1] هٰذا كما يقال على سبيل المظاهرة الله اعلم بالمحقّ منّا والمبطل (مجمع)

کہ ایک اونچا محل تعمیر کیا جائے، یہ وہی مادّہ پرستانہ ذہنیت ہے جس کا مظاہرہ تہذیب وتمدن کی ہزاروں برس کی ترقی کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ ماضی قریب میں روس کے وزیر اعظم خروشچوف نے کیا کہ ہم نے اپنے ہوابازوں کو خلا میں بھیج کر خوب تلاش کر لیا، خدا ہمیں کہیں نہیں ملا، حقیقت کے لحاظ سے فرق ہی کیا ہوا؟ پرانے زمانے کا خروشچوف محل کی چھت پر چڑھ کر ڈھونڈھتا تھا اور اپنے ذوق انکار کو تسلی دے لیتا تھا اور نئے زمانے کے فرعون خلائی جہازوں پر آدمی بھیج کر ڈھونڈھواتے ہیں اور اپنے انکار کی بھوک کو تسلی دیتے ہیں لیکن حقیقی خدا جو ہوتا ہے، وہ مکان میں محدود ہی نہیں الٰہذا وہ جسے ملتا ہے رگِ گردن سے زیادہ قریب مل جاتا ہے اور جسے نہیں ملتا وہ محلوں پر چڑھ کے اور آسمانی خلاؤں کو طے کرنے کے بعد بھی اسے نہیں ملتا، بس تلاش کرنے والوں کی ذہنیت کا پتہ چل جاتا ہے کہ منکرین کی انسانیت ہے ابھی اُس نقطے پر جہاں پرانے زمانے کے فرعون کی تھی۔

''انہیں ہم نے قرار دیا ایسا پیشوا جو آگ کی طرف لے جانے والے ہیں''۔ یہاں قرار دینے کے معنی حکم لگانے اور ایسا جاننے کے ہوتے ہیں جیسے کہا جائے فلاں عالم نے اسے کافر قرار دیا۔

یہاں جناب شیخ طوسیؒ نے کافی بسیط تبصرہ کیا ہے۔ فرمایا ہے کہ قرار دینے کی چار قسمیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱) مقام تخلیق میں ایسا بنانا جیسے ارشاد ہوا:

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ ہم نے رات اور دن کو قرار دیا دو نشانیاں۔ (بنی اسرائیل۔ ۱۲)

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت قرار دیا۔ (انبیاء۔ ۳۲)

(۲) ایک صورت سے دوسری صورت پر کر دینا جیسا کہ ارشاد ہوا:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا پھر نطفہ کو منجمد خون کی شکل میں لائے۔ (مؤمنون)

(۳) حکم لگانا کہ یہ ایسا ہے، اس کی مثال یہی آیت ہے۔

(۴) کسی کے بارے میں اعتقاد کرنا کہ وہ ایسا ہے جیسے اس نے اسے جاہل قرار دیا یعنی جاہل سمجھا۔ اس کی انہوں نے قرآنی مثال کوئی نہیں دی۔

تعجب علّامہ طبرسیؒ سے ہے کہ انہوں نے تقریباً ہر جگہ تفسیر تبیان کا تتبع کرنے کے باوجود اتنے سیر حاصل تبصرہ کو جو تبیان میں ہے یہاں بطور خلاصہ بھی درج ذیل نہیں کیا ہے بلکہ اپنی طرف سے ایسا مختصر سرسری تبصرہ کر دیا ہے جیسے کہ اس مقام پر جناب شیخ الطائفہؒ کے افادات بالکل ان کے سامنے نہ تھے۔

ہاں ایک بڑا تعجب جناب شیخ سے بھی ہے کہ ایک نمایاں قسم قرار دینے کی انہوں نے چھوڑ دی اور وہ ''عطائے منصب'' ہے جیسے:

(۱) اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔ (بقرہ۔ ۳۰) میں زمین میں ایک جانشین قرار دینے والا ہوں۔

(۲) اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (بقرہ۔ ۱۲۴) میں تمہیں تمام انسانوں کا امام قرار دیتا ہوں۔

(۳) اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ۔ (ص۔ ۲۶) ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ قرار دیا ہے۔

(۴) اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا (بقرہ۔ ۲۴۷) اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔

ان تمام مقامات پر قرار دینے کے معنی اس منصب پر مقرر کرنے کے ہیں لیکن زیر تبصرہ آیت میں جو فرعون وغیرہ کے بارے میں ہے،

بہر حال قرار دینے کے معنی وہی حکم لگانے کے ہیں۔اس کے سوا کوئی دوسرے معنی اس محل پر منطبق نہیں ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی بعد اس کے کہ پہلی نسلوں کو فنا کیا بصارتوں کا مجموعہ لوگوں کے لئے اور ہدایت اور رحمت بنا کر شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں''۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اور آپ تو موجود نہ تھے مغربی سمت میں جب ہم نے موسیٰ سے اس معاملہ کو طے کیا اور آپ اُس موقع پر موجود نہ تھے بلکہ ہم نے کتنی نسلیں پیدا کیں اور انہیں طولانی عمریں ملیں اور آپ مَدیَنْ والوں میں بھی سکونت پذیر نہ تھے کہ ہماری آیات کی آپ تلاوت کرتے ہوں مگر ہم نے رسول بھیجے تھے اور آپ طور کے پہلو میں بھی نہ تھے جب ہم نے آواز دی تھی مگر یہ آپ کے پروردگار کی طرف کی رحمت ہے تا کہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جن کے پاس آپ کے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں''۔

''آپ وہاں نہیں تھے'' اور ''آپ اُس موقع پر حاضر نہ تھے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آپ کو اطلاعات ملتی ہیں، ورنہ آپ کے پاس ان کے علم کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔[1]

''ان کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ہے'' اس سے مراد پوری عرب قوم نہیں ہے کیونکہ ان کے اسلاف تک حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذریعہ سے ابراہیمی تعلیمات پہنچے جن کے بقایا آثار اب تک مناسک حج وغیرہ کے ذیل میں موجود تھے بلکہ اب اُن کی اس وقت کی نسل میں جو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھی عرصۂ دراز سے کوئی خداوندی ہدایت پہنچانے والا نمایاں طور پر نہ آیا تھا۔اسی لئے اس دور کو ''دورِ فترت'' کہتے ہیں۔اب ان میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے جو اپنی عالم گیر رسالت کی فیض رسانی کا آغاز ان سے کر رہے تھے۔

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ

---

[1] لولا ما اعلمناك به لم تهتد (تبيان) اخبرناك به ليكون لك معجزة (مجمع البيان)

اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۫ وَقَالُوْٓا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۱﴾

''اور ایسا نہ ہو کہ انہیں کوئی مصیبت آئے اس کی سزا میں جو وہ اپنے ہاتھوں سے کرتے رہے ہیں تو وہ کہیں کہ کیوں نہ تو نے ہماری طرف کوئی پیغمبر بھیجا تو ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور ایمان لانے والوں میں سے ہوتے تو جب ان کے پاس حق ہماری طرف سے آیا تو وہ کہنے لگے کہ کیوں نہ انہیں ویسا ہی ملا جیسا موسیٰ کو ملا تھا، کیا انہوں نے انکار نہیں کیا اس کا جو اس کے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا یہ دونوں جادو ہیں جو آپس میں متفق ہو گئے ہیں اور کہا ہم ہر ایک کے منکر ہیں۔ کہیے کہ پھر تم لا و اللہ کی طرف کی کوئی کتاب جو ان دونوں سے زیادہ صحیح راستہ بتانے والی ہو تو میں اس کی پیروی کروں اگر تم سچے ہو۔ اب اگر وہ آپ کی بات نہ مانیں تو جان لیجیے کہ وہ اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں اور کون گمراہ ہوگا زیادہ اس سے کہ جو اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کرے اللہ کی طرف کی ہدایت کو چھوڑ کر؟ بلا شبہ اللہ منزل مقصد تک نہیں پہنچاتا ظالم لوگوں کو اور ہم نے ان سے کہنے کا سلسلہ جاری رکھا شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں''۔

''ایسا نہ ہو کہ انھیں کوئی مصیبت آئے اس کی سزا میں جو وہ اپنے ہاتھوں سے کرتے رہے ہیں تو وہ کہتے'' یعنی جب ان کے اعمال کی انہیں دنیا میں کوئی سزا ملتی تو وہ اس دنیا میں یوں کہتے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ روز قیامت جب انہیں سزا ملتی تو وہ یوں عذر پیش کرتے ---- بہرصورت مطلب یہ ہے کہ بغیر خالق کی طرف رہنما کے بھیجے ہوئے خلق خدا پر حجت تمام نہ ہوتی اور انہیں یہ عذر پیش کرنے کا حق ہوتا جیسا کہ چھٹے پارے میں آچکا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (نساء ۱۶۵)

پیغمبر بھیجے ہیں بشارت وانذار کرنے والے تا کہ لوگوں کے پاس پیغمبروں کے بھیجنے کے بعد اللہ کے سامنے کوئی دلیل نہ رہے۔

''یہ دونوں جادو ہیں جو آپس میں متفق ہیں'' یعنی وہ پہلی نازل ہونے والی کتاب اور بعد کی آنے والی۔ ان کی تعیین میں اقوال مفسرین

مختلف ہیں۔[1]

جیسے قرآن مجید کیلئے دس (۱۰) سوروں کے مثل لانے کی دعوت کے بعد کہا گیا تھا:

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ (هود)

اگر وہ تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہیں (کہ ایسے دس سورے پیش کریں) تو (پھر ان سے کچھ کہنا بے کار ہے) تم لوگ (یعنی جو حق طلبی کی راہ میں ہو) یہ سمجھ لو کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔

ویسے ہی یہاں کہا گیا ہے کہ وہ توریت اور قرآنی دونوں کے منکرین ہیں تو اب ہم ان سے کہتے ہیں کہ اچھا ان سے بہتر کی کسی کتاب کا پتہ تم دو جو سرمایۂ ہدایت ہو (اور ظاہر ہے کہ وہ ایسا نہیں کریں گے پھر بھی مانیں گے نہیں) تو اب سمجھ لو کہ ان کا انکار کسی وجہ معقول پر مبنی نہیں ہے۔ وہ صرف ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے اَھْوَآء اصطلاح قرآنی میں ایسے ہی خیالات کو کہا جاتا ہے جو بے بنیاد ہوں اور جو دھاندلی، تعصّب اور ہٹ دھرمی سے انکار کرے تو پھر اللہ اُس کی ہدایت نہیں کرتا ہے یعنی اس کے بعد وہ ہدایت ربّانی سے کوئی فیض اپنے سوٗ اختیار سے حاصل نہیں کر سکتا، اس لئے یوں سمجھنا چاہیے کہ ہدایت ربّانی اس کے لئے ہے ہی نہیں جس بنا پر قرآن مجید کے لئے شروع سورہ بقرہ میں کہہ دیا گیا ہے "ھدی للّمتقین" وہ ہدایت ہے فکر نجات رکھنے والوں کے لئے" حالانکہ وہ ہدایت تمام انسانوں کے لئے ہے مگر جو اثر پذیر نہیں ہوتے، اُن کے لئے وہ ہدایت نہیں ہے متقین اُس سے اثر لیتے ہیں لہٰذا نتیجتاً وہ اُنہی کے لئے ہدایت بنتا ہے۔[2]

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿۵۳﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۡ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۡ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ﴿۵۵﴾

"جنہیں ہم نے کتاب اس کے پہلے عطا کی ہے، وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جب اُن کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، بلاشبہ یہ حق ہے ہمارے پروردگار کی طرف سے ہم تو اس کے پہلے ہی اسلام قبول کیے ہوئے ہیں یہ وہ ہیں جنہیں اُن کا صلہ دُہرا عطا ہوگا اس لئے کہ اُنہوں نے صبر سے کام لیا اور وہ برائی کا بھلائی سے دفعیہ کرتے ہیں اور جب وہ فضول باتیں سنتے ہیں تو ان سے بے اعتنائی اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ تمہیں سلام، جاہلوں سے ہمیں

---

[1] قال ابن عباس ارادا التّورٰۃ والقرآن وقال الضحاك ارادا الانجیل والقرآن وقال عکرمۃ ارادا التّورۃ والانجیل (تبیان)

[2] قیل انّھم اذلم یھتدوا بھدی اللہ فکانّہ لم یھدھم (مجمع البیان)

مطلب نہیں ہے۔''

چشم پوشی اور رواداری کی مدح:

یہ ان حقیقت پسند یہود و نصاریٰ کا ذکر ہے جو قرآن مجید کی حقانیت سے متاثر ہوتے اور بلا توقف اس پر ایمان لاتے ہیں۔ ان کے لئے دہری جزاء کا اعلان شاید اس لئے ہے کہ وہ صحیح معنی میں سابق کی کتاب پر بھی ایمان لائے اور اب اسی کے نتیجہ میں اس کتاب پر بھی انہوں نے ایمان اختیار کیا اور چونکہ معرفت حق اور اعلان حق کے تقاضوں پر عمل میں ہمیشہ مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اس لئے ان کے ثواب کے ساتھ ان کے کردار میں صبر کے پہلو کو نمایاں کیا گیا اور بعض مفسرین نے دہری جزاء کی تشریح یہی کی ہے کہ انہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی اور صبر سے کام لیا تو دہری جزاء ان کے کردار کے دونوں پہلوؤں سے متعلق ہے۔ [1]

''ہم تو پہلے ہی اسلام قبول کیے ہوئے ہیں'' یعنی جب گزشتہ کتاب سماوی پر ایمان لائے جس میں اس رسولؐ کا صاف صاف ذکر موجود ہے تو اس کتاب پر ایمان کے ساتھ اس رسولؐ کی رسالت کو تسلیم کر لیا جواب معیار اسلام ہے۔ [2]

آخر کی آیت جو بظاہر سلسلہ تنزیل میں قبل سے متصل ہی ہے، اسی برائی کو بھلائی سے دفع'' کرنے کی تشریح ہو سکتی ہے یعنی فریق مخالف بیہودہ گوئی اور سخت کلامی کر رہا ہے مگر یہ اس سے چشم پوشی کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ ارے بھئی بحث بے کار ہے، ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان کو اسلامی سلام کر کے رخصت کرتے ہیں [3] اور یہ خدا حافظی سلام بالکل شیعی طرز پر سلام، سلام علیکم ہی ہے جو بآواز اس طرح کہا گیا کہ وہ سن سکتے تھے اور اب جیسے الگ ہٹ کر دل ہی دل میں یا آہستہ یہ کہا کہ لا نبتغی الجاھلین یعنی ہم جاہلوں کو منہ نہیں لگاتے۔ ان سے ہمیں کیا مطلب!

اس سے بڑھ کر رواداری کی تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے؟

''بھلائی سے برائی کا دفعیہ کرتے ہیں''------ یہ کردار بھی اپنے صحیح محل پر قرآن ہی کی تعلیم ہے [4] جسے دنیا نے ''مقاومت مجہول'' یا ''عدم تشدد'' وغیرہ کے ماتحت اختیار کیا لیکن اس کے محل کو پہچاننا ضروری ہے۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٥٦﴾

''آپ جسے چاہیں، اسے سیدھے راستے پر نہیں لگا سکتے، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگاتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کون ہدایت قبول کرنے والوں ہیں''۔

---

[1] مرّتین احداھما لقبر لھم الطاعۃ والثانیۃ الصبر علیھا (تبیان)

[2] ذٰلك انّ ذکر النبیّ والقراٰن کان مکتوبا عندھم فی التّورٰۃ والانجیل (مجمع البیان)

[3] سلام متارکۃ لا تحیۃ ای سلمتم منّا من الشتم وغیرہ (جلالین)

[4] ای یدفعون سیّئۃ من اساٰء الیھم بحسناتھم (علی بن ابراھیم)

آخری جملہ نے بتادیا کہ اللہ کی ہدایت کوئی جبری حیثیت نہیں رکھتی بلکہ یہ جو تعصب وعناد سے خالی ہیں اور طلب حقیقت کی تڑپ رکھتے ہیں، انہی کو وہ اپنی توفیق شامل حال فرماتا ہے اور راہ حق تک پہنچانے کے اسباب فراہم کرتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم خود انہیں اپنے راستے دکھاتے ہیں۔ (عنکبوت۔۶۹)

اہل سنت کے اکثر مفسرین نے اسے خواہ مخواہ جناب ابوطالب علیہ السلام سے متعلق قرار دیا ہے کہ رسول خداؐ کی بڑی خواہش تھی کہ وہ ایمان لائیں، اس پر خالق نے یہ ارشاد کیا مگر مذہب حق کے لحاظ سے یہ روایت درست نہیں، اس لئے کہ جناب ابوطالب علیہ السلام شروع دن سے مومن تھے [1] چنانچہ یہاں پر علامہ طبرسیؒ نے کافی طاقت کے ساتھ اس روایت شان نزول کی رد کی ہے۔

وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾

''اور انہوں نے کہا کہ اگر آپ کے ساتھ ہو کر اس نظام ہدایت کی پیروی کریں تو ہماری سرزمین سے جھپٹا مار کر ہم کو نکال دیا جائے گا اور کیا ہم ہی نے ان کے لئے مہیّا کیا ہے ایسا امن والا محترم مقام جہاں ہر قسم کے پھل لائے جاتے ہیں ہماری طرف کے رزق کی حیثیت سے مگر اُن میں کے زیادہ علم نہیں رکھتے۔''

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''مکّے کے لوگ کہنے لگے کہ ہم مسلمان ہوں تو سارے عرب ہم سے دشمنی کریں۔ اللہ نے فرمایا اب اُن کی دشمنی سے کس کی پناہ میں ہو، یہی حرم کا ادب ہے، اللہ تب بھی پناہ دینے والا ہے۔'' (موضح القرآن)

ہماری تفسیر بھی اسی کے مطابق ہے۔ [2]

جناب شیخ طوسیؒ نے اس میں یہ اضافہ فرمایا ہے کہ باوجودیکہ تم کافر ہو، پھر بھی ہم نے حرم کی برکت سے تم پر نعمتیں ارزانی فرمائی ہیں تو اگر ایمان لے آؤ تو ہم کس طرح تمہیں اپنی رحمت سے محروم کریں گے۔ [3]

علّامہ طبرسیؒ نے اُسے ذرا لفظ بدل کر تشریح کے ساتھ اس طرح لکھا ہے:

ای اولم نجعل لهم مكّةنی امن وامان قبل هٰذا ودفعنا ضرر النّاس عنهم حتیٰ كانوا فيه فلمّا ذا يخافون زوالا الٰان افلا نقدر علیٰ دفع ضرر النّاس عنهم لوٰا منوا وانّ الايمان والطّاعة اولیٰ بالا من والسّلامة

---

[1] عن ابی عبداللہ علیہ السلام وابی جعفر علیہ السلام انّ ابا طالب كان مسلما عليه اجماع الا ما میّة لا يختلفون فيه ولهم علیٰ ذٰلك ادلّة قا طعة مرحبة للعلم (تبیان)

[2] نزلت فی قریش حين دعا هم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الی الاسلام والهجرة قالو ان نّتبع الهدیٰ معك نتخطّف من ارضنا (علی ابراهيم)

[3] انّا جعلنا الحرم اٰمنا لحرمة البيت مع انّهم كفّار يعبدون الا صنام حتّیٰ اٰمنو علیٰ انفسهم واموالهم فلو امنو لكان اخریٰ بانّ يومنهم اللہ واولیٰ بان يمكن هم من مرادهم (تبیان)

عن حالة الكفر (مجمع البيان)

یعنی کیا ہم نے اُن کے لئے مکہ کو اس کے پہلے امن وامان میں نہیں رکھا اور اُن سے لوگوں کی ضرر رسانی کی دفعیہ نہیں کیا جس سے وہ ابتک وہاں رہے تو اب وہ کیوں یہاں سے ہٹائے جانے سے ڈرتے ہیں؟ کیا ہم اُن سے لوگوں کی ضرر رسانی کو دفع کرنے پر اگر یہ ایمان لے آئیں قادر نہیں ہیں حالانکہ ایمان اور فرماں برداری سے استحقاق امن وسلامتی کا زیادہ پیدا ہوتا ہے بہ نسبت کفر کی حالت کے۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَ كُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾

اور کتنی ہی بستیاں ایسی جو اپنے عیش وعشرت سے اترائی ہوئی تھیں ہم نے تہس نہس کر دیں تو یہ اُن کے مکانات ہیں جو ان کے بعد بھی آباد نہیں ہوئے سوا کم کے اور ہم تھے آخر میں اُس متروکے پر تصرّف رکھنے والے۔''

بَطِرَتْ کا بامحاورہ ترجمہ اترانا ہی ہے جو ہم سے پہلے کیا جا چکا ہے [1] مگر اس اترانے سے منعم حقیقی کو بھول جانا کفران نعمت ہوتا ہے جو ہماری قدیم تفسیر میں اس کے معنی بتائے گئے ہیں۔ [2]

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اور نہیں ہے تمہارا پروردگار بستیوں کو ہلاک کرنے والا جب تک کہ اُن کی مرکزی آبادی [3] میں کوئی پیغمبر بھیج دے جو اُن پر ہماری آیات کی تلاوت کرے اور ہم نہیں ہیں بستیوں کو ہلاک کرنے والے سوا اس کے کہ اُن کے باشندے مظالم وجرائم کے مرتکب ہوں۔''

یعنی جب تک حجّت الٰہی تمام نہیں ہوتی، بندوں کو استحقاق سزا نہیں ہوتا اور عذاب جب آتا ہے تو وہ اُن کی ارادی بداعمالیوں کا نتیجہ ہوتا ہے، بلاوجہ نہیں ہوتا۔

یہ اسی اصول عدل کا بیان ہے جس پر کثیر التعداد آیاتِ قرآن میں زور دیا گیا ہے۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ

---

[1] اترائی تھیں بیچ معیشت اپنی کے (شاہ رفیع الدین)

[2] بطرت معیشتها ای کفرت (علی بن ابراهیم)

[3] امّها ای اعظمها (جلالین) بیچ بڑے شہر اُن کے (شاہ رفیع الدین)

مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿٦١﴾

''اور جو چیز تمہیں ملے، وہ زندگانی دنیا ہی کا سرمایہ اور یہیں کی آرائش تو ہے اور جو اللہ کے یہاں ہے وہ بہتر اور زیادہ پائدار ہے، پھر تم کیوں عقل سے کام نہیں لیتے؟ تو کیا وہ جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہے تو وہ اُسے پا کر رہے گا، مثل اُس کے ہے جسے ہم نے اس دنیوی زندگی کا سامان دیا ہے، تو پھر قیامت کے دن اُسے (خدا کے سامنے) حاضر کیا جائے گا۔''

یہ گزشتہ اُن کے جواب کا بظاہر تکملہ ہی ہے یعنی وہ جو کہتے تھے کہ اگر ہم ایمان لے آئیں تو دوسرے عرب قبائل ہم پر یورش کر دیں گے اور مکّہ سے ہم کو نکال دیں گے، اس کا جواب پہلے تو یہ دیا گیا کہ یہ تمہارا خوف بے بنیاد ہے۔ اللہ ہی اس وقت بھی تمہاری حفاظت کرے گا اور اب ان آیات میں کہا جا رہا ہے کہ اگر بالفرض ایمان لانے سے تمہیں دنیوی نقصان یا تباہی بھی درپیش ہوتی ہے تو آخرت کی نجات کی خاطر وہ کوئی چیز نہیں ہے اُسے گوارا کرنا چاہیے، اور نجات آخرت کے مفاد کو مقدم سمجھا چاہئے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿٦٢﴾ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿٦٤﴾

''اور جس دن وہ اُنہیں پکارے گا اور فرمائے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے متعلق تم گمانِ باطل رکھتے تھے؟ کہیں گے وہ جن پر عذاب کا حکم نافذ ہو چکا کہ اے ہمارے مالک! یہ ہیں جنہیں ہم نے گمراہ کیا تھا جیسے ہم گمراہ تھے، ویسے ہی ہم نے انہیں گمراہ کیا۔ اب ہم تیری طرف برأت کرتے ہیں۔ یہ ہماری پرستش نہیں کرتے تھے اور کہا کہ پکارو اپنے بنائے ہوئے شریکوں کو تو وہ پکاریں گے تو وہ اُن کو جواب دیں گے اور عذاب کو آنکھوں سے دیکھیں گے، کاش وہ ہدایت پاتے۔''

اکثر آیات ہیں جن کے آخر میں لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ، لَوْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اور لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ وغیرہ ہے، ان میں یہ اختلاف برابر رہتا ہے کہ میں اس لَو کے معنی ''کاش'' کے سمجھتا ہوں جس کی نظیریں کلام عرب میں موجود ہیں لہٰذا جملہ اس پر پورا ہو جاتا ہے اور کچھ اس کے جواب میں محذوف ماننے کی ضرورت نہیں رہتی اور اس میں، میں تنہا نہیں ہوں بلکہ میرے موافق اور پہلے کے افراد ہیں [1] لیکن دوسرے مفسرین اکثر اُسے ''اگر'' کے معنی میں لے کر اُس کے جواب کو محذوف سمجھتے ہیں اور اُس کے لئے اپنے ذہن سے کچھ الفاظ تجویز کر کے انہیں مقدر

---

[1] کاش ایشاں راہ یاب می بودند (شاہ ولی اللہ کاشکے وہ ہوتے راہ پانے والے (رفیع الدین)

مانتے ہیں جس میں اُن کی سمجھ کے اختلاف سے اختلاف بھی ہوتا ہے چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔[1]

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٦٥﴾ فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿٦٦﴾ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ﴿٦٧﴾

''اور جب وہ اُنہیں پکار کر کہے گا کہ کیا جواب دیا تھا تم نے پیغمبروں کو؟ تو اب اس دن خبریں اُن پر تاریک ہوگئی ہوں گی تو وہ آپس میں پوچھ گچھ بھی نہ کرسکیں گے مگر جو اللہ کی طرف لو لگائے تھا اور ایمان لایا تھا اور نیک اعمال کرتا رہا تھا تو اُمید ہے کہ وہ فلاح پانے والوں میں ہوگا''۔

مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ کا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کیا لبیک کہی تھی تم نے پیغمبروں کے سوال پر یعنی اُنہوں نے جو تمہیں دعوت و ایمان وعمل دی تھی، اُسے تم نے کس حد تک قبول کیا؟ جناب شیخ الطائفہؒ نے یہی مفہوم تحریر فرمایا ہے[2]

دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے کہ پیغمبروں سے سوال ہوگا: مَاذَآ اَجَبْتُمْ ''تمہاری آواز پر کیا لبّیک کہی گئی''؟

ظاہر ہے کہ خداوند عالم کو اپنے علم کے لئے نہ اُن سے دریافت کرنا ہے، نہ ان سے، ہم تو دونوں جگہ کی آیات کو سامنے رکھ کر ایسا محسوس کرتے ہیں جیسے پیغمبروں کا زبان مقال سے نہیں تو ''زبان حال'' سے ایک استغاثہ خالق کریم کی عدالت میں دائر ہے اور اب جیسے یہ مقدّمے کی کاروائی ہے جس میں مستغیث کا بیان بھی لیا جارہا ہے (مَاذَآ اَجَبْتُمْ) اور اب مستغاث علیہم کا بیان لیا جارہا ہے (ماذا اُجبتم) اور ظاہر ہے کہ دنیا میں یہ سوال ہوتا تو کیسی کیسی صفائیاں پیش کرنے کی کوشش ہوتی اور بحث کی جاتی جسے مگر یہ تو قیامت کا ہنگام ہے، اب تو سوا عاجزانہ خاموشی یا مجبوراً نہ اقرار کے کوئی چارۂ کار نہیں ہے جسے یوں کہا گیا ہے کہ فعميت عليهم النبآء یعنی اب اُن کے لئے کسی سوال و جواب کا موقع ہی نہیں رہا جس کے بعد اُن کے بارے میں عدالت کو فیصلہ سنانا ہوگا جو ظاہر ہے، اس لئے اُس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٦٩﴾

''اور آپ کا پروردگار پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور منتخب کرتا ہے۔ اُنہیں کوئی اختیار نہیں۔ پاک ہے اللہ اور بلند ہے اُس سے جو وہ شرک کرتے ہیں، اور آپ کا پروردگار جانتا ہے جو اُن کے سینوں میں چھپا ہے اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں''۔

---

[1] لو انّهم كانوا يهتدون فى الدّنيا ما رأوه فى الاخرة (جلالين) جواب لو محذوف تقديره لو انّهم كانوا يهتدون ...لا عتقدوا انّ العذاب حق (مجمع البيان)

[2] ماذا اجبتم المرسلين فيما دعوكم اليه من توحيد الله سبحانه وعدله واخلاص العبادة له (تبيان)

خالق کے فیصلے کے خلاف اپنے اختیار کو صرف کرنا ایک طرح کا شرک ہے:

اللہ کے اختیار و اقتدار کے مقابلہ میں انسانوں کی جو بے بسی کا اعلان ہے، اُس میں مومن و کافر کی تفریق کے کوئی معنی نہیں۔

اللہ کے اختیار و اقتدار کے مقابلہ میں انسان کے حق خود ارادی اور تصور جمہوریت کی مطلق طور پر نفی ہے مگر سواد اعظم کے بعض مفسرین اپنی طرف نشیب محسوس کرتے ہوئے اختیار کی نفی میں مشرکین کی قید لگا دیتے ہیں [1] جس کے یہاں پر کوئی معنی ہی نہیں۔

ہمارے یہاں کی تفسیر یہ ہے کہ اس سے انتخاب امام میں اللہ کے اختیار کا اظہار مقصود ہے۔ [2] اور اب ایک آخری جملہ بہت ہولناک ہے یعنی اللہ کے مقابلہ میں اپنا یا کسی کا اختیار ماننا یا جتانا یا اس سے کام لینا ایک طرح کا شرک ہے (پناہ بخدا)

اس کے بعد جو اللہ کے ظاہر و باطن پر حاوی ہونے کا ذکر ہے، وہ اللہ کے اختیار خصوصی کے سبب کا اظہار ہے کہ مخلوق تو ظاہر کو دیکھتی ہے، اس لئے اُس کا انتخاب جو ہوگا، اس میں غلطی کا امکان نہیں ہے۔ [3]

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۷۰

''اور وہ اللہ ہے اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اُس کے لئے سب تعریف ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اس کی حکومت ہے اور اُسی کی طرف تم پلٹ کر جاؤ گے''۔

جب حکومت اس کی ہے [4] تو نائب حکومت مقرر کرنا کس کا کام ہونا چاہیے؟ حاکم کا یا رعایا جس پر حکومت ہے؟

گزشتہ اور موجودہ، یہ تینوں آیات نظام حکومت دینی کا پورا اصول مقررہ کر دیتی ہیں، جو حکومت اس کے مطابق ہو وہ صحیح معنی میں ''اسلامی حکومت'' ہوگی۔ خواہ اس کا نام شخصی حکومت رکھا جائے یا جمہوری۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝۷۱ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۷۲ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ

---

[1] ما کان لهم للمشکرین (جلالین)

[2] یختار الله الامام ولیس لهم ان یختاروا (علی بن ابراهیم)

[3] اقام سبحانه البرهان علیٰ صحة اختیار (مجمع البیان)

[4] اور است فرماں روائی (شاہ ولی اللہ)

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

''کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر اللہ رات کو روز قیامت تک کے لئے ہمیشہ قرار دیدے تو کون خدا اللہ کے سوا ہے جو تمہاری طرف روشنی کو لائے؟ تو کیوں سماعت نہیں کرتے ہو؟ کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے وہ دن ہی کو قیامت تک کے لئے ہمیشہ قرار دے دے تو کون خدا ہے سوا اللہ کے جو تمہاری طرف رات کو لائے جس میں تم آرام کرو تو کیوں دیکھتے نہیں ہو؟ اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات اور دن قرار دیئے ہیں تا کہ تم اس میں آرام کرو اور (کسب معاش کر کے) اُس کے فوائد کے خواہاں ہو اور شاید کہ تم شکر گزار ہو''۔

یعنی نظام حیات کے لئے اس تنوّع کی ضرورت ہے جو رات اور دن کی شکل میں نمودار ہے اس نظام میں جتنی دن کی اہمیت ہے، اتنی ہی رات کی۔ رات اور دن، دونوں کا ایک ساتھ نام لے کر پھر لفّ ونشر مرتّب کے طور پر اُن دونوں کے فوائد بیان کیے ہیں، رات تا کہ اُس میں آرام کرو اور دن جس میں کسب معاش کر کے اس کے فوائد کے خواہاں ہو۔[1]

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۷۴﴾ وَنَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۷۵﴾

''اور جس دن وہ اُنہیں پکارے گا اور کہے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کے متعلق تم گمان باطل رکھتے تھے اور ہم ہر امّت میں سے ایک گواہ لائیں گے تو ہم کہیں گے کہ لاؤ اپنی دلیل تب انہیں معلوم ہوگا کہ حق اللہ کا ہے اور جو کچھ غلط باتیں وہ گھڑتے تھے، سب اُن سے غائب ہو جائیں گی''۔

''ہر اُمت''، یعنی ہر دور کے لوگ اُن میں سے ایک گواہ لایا جائے گا جو خدا کے دیئے ہوئے علم سے اُن سب جو خدا کو دیئے ہوئے علم سے اُن سب کے حال پر حاضر و ناظر ہوگا، جس کے علم اور اُس کے اظہار میں غلطی نہیں ہو سکتی قرآن مجید کی اس آیت سے ایسے کسی گواہ کا ہر دور میں موجود ہونا لازمی ثابت ہوتا ہے۔[2]

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ ۤ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ

---

[1] لانّ اللیل للسکون و النهار للتصرّف و الحرکة (تبیان) لتسکنوا فیه ای فی اللیل و لتبتغوا من فضله ای فی النهار (مجمع البیان)

[2] هم عدول الاٰخرة الّذین لا یخلو زمان منهم (تبیان)

الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۷۷﴾

''قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا، اس نے ان لوگوں پر بلاوجہ چھا جانے کی کوشش کی اور ہم نے اُسے اتنے خزانے عطا کئے تھے کہ اس کی کنجیاں ایک طاقت ور جماعت سے بھی مشکل سے اٹھتی تھیں جب اُس سے اُس کی قوم والوں نے کہا کہ خوش نہ ہو، یقیناً اللہ خوش ہونے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو اللہ نے تمہیں دیا ہے، اس سے آخرت کا سامان کرو اور اپنا حصّہ دنیا سے بھی نہ بھولو اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ نیک سلوک کیا ہے اور زمین میں خرابیاں پھیلانا نہ چاہو۔ یقیناً اللہ خرابیاں پھیلانے والوں کو دوست نہیں رکھتا''۔

قارون کا کردار اور اس کا انجام:

بغیٰ علیھم کا جو ترجمہ میں نے کیا ہے ''ان لوگوں پر بلاوجہ چھا جانے کی کوشش کی'' یہ جناب شیخ طوسیؒ کی تشریح کے مطابق ہے جسے علامہ طبرسیؒ نے بعینہ ''اللغته'' کے زیر عنوان درج کر دیا ہے۔[۱] بعض لوگوں نے اس کا مفہوم ظلم و تعدّی کا قرار دیا ہے[۲] اور ظاہر ہے کہ بلاوجہ چھا جانے کی کوشش بھی ایک ظلم و تعدّی کی حیثیت رکھتی ہے۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَلَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾

''اس نے کہا یہ تو مجھے ملا ہے بس ایک علم کی وجہ سے جو میرے پاس ہے اور کیا اُسے یہ علم نہیں کہ اللہ نے اس کے قبل ایسی نسلوں کو ہلاک کر دیا جو اُس سے زیادہ طاقت ور اور زیادہ سرمایہ دار تھیں اور گنہ گاروں سے ان کے گناہوں کے متعلق کچھ پوچھنا نہیں ہے''۔

''یہ مال و دولت مجھے ایک علم کی وجہ سے ملا ہے'' اس کی تشریح میں یہ بہت قرین قیاس ہے جو ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں وارد ہے کہ وہ فن کیمیا سے واقف تھا اور اسی سے اس نے اپنی دولت بڑھائی تھی[۳] اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ وہ علوم دینیہ کا بہت بڑا عالم تھا۔[۴]

علامہ طبرسیؒ نے اس کے علاوہ بھی اقوال اس کی تشریح میں درج کیے ہیں، مثلاً علم سے مراد فن تجارت سے واقفیت اور اکتساب مال اور

---

[۱] انّ البغی طلب العلو بغیر حق ولذا قیل لولاۃ الجور بغاۃ (تبیان و مجمع البیان)

[۲] تعدی کرد بر ایشان (شاہ ولی اللہ)

[۳] کان یعمل الکیمیاء (علی بن ابراھیم)

[۴] کان اعلم بنی اسرائیل بالتورٰۃ بعد موسیٰ و ھٰرون (جلالین)

فراوانی دولت کے گروں سے واقفیت ہے، اس صورت میں بھی علم خود قارون کی صفت ہوگی جسے اس نے اپنی دولت مندی کا سبب قرار دیا ہے۔

اس کے برخلاف بعض لوگوں نے علم سے مراد اللہ کا علم لیا ہے کہ اس نے میرے اوصاف سے واقفیت کی بناء پر مجھے اس دولت کا حق دار جانا ہے تو کسی دوسرے کو اس میں دخل دینے کا کیا حق ہے، مگر اس صورت میں اوتیتہ کے بجائے جو صیغہ مجہول ہے اور معنی یہ ہیں کہ ''مجھے دیا گیا ہے'' صیغۂ معروف مثلاً اتانی ربّی ''مجھے میرے پروردگار نے دیا ہے'' زیادہ موزوں ہوتا اور پھر علم بی یا علم عنّی ہوتا جس کے معنی یہ ہوتے کہ اس نے مجھے اس علم کی بناء پر جو میرے متعلق ہے، دولت عطا کی، مگر الفاظ قرآن میں: علیٰ علم عندی: اس کے معنی وہی ہوتے ہیں کہ مجھے ہدایت ملی ہے اس ہنر کے سبب سے جو میرے پاس ہے۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝۷۹ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝۸۰

''تو وہ نکلا اپنی قوم والوں کے سامنے ساز و سامان کے ساتھ، کہا اُن لوگوں نے جو زندگانی دنیا کے طلب گار تھے کہ کاش ہمارے لئے ہوتا ویسا ہی جیسا قارون کو ملا، یقیناً وہ بڑا نصیب والا ہے اور کہا اُن لوگوں نے جنہیں علم عطا ہوا تھا کہ وائے ہو تم پر۔ اللہ کے یہاں کا صلہ بہتر ہے اُس کے لئے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرے اور نہیں اس کو پاتے مگر صبر و برداشت کرنے والے''۔

ہے تو یہ شخصی واقعہ مگر وہ ایک عام کردار ہے دو (۲) قسم کے پست و بلند ذہنیت رکھنے والے افراد کا ہر اُس موقع پر جب وہ کسی انسان کے دنیوی تزک و احتشام پر نظر ڈالیں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ اس قسم کا رشک اور ایسی تمنا بے صبری کی دلیل ہے اور ناسمجھی بھی ہے، جو سمجھدار ہیں، وہ اللہ کی عطا پر جو اُنہیں اس دنیا میں ہے شاکر رہتے ہیں اور دوسروں کے جاہ و حشم کو دیکھ کر مرعوب نہیں ہوتے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ۝۸۱ وَاَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸۲

''تو ہم نے غرق کر دیا اُسے اور اُس کے گھر والوں کو زمین میں تو اب اللہ کو چھوڑنے کے بعد کوئی جماعت نہ تھی جو اُس کی مدد کرتی اور نہ وہ خود ہی اپنے لئے کچھ کر سکتا تھا اور وہ جو کل اُس کے درجے پر ہونے کی آرزو کر رہے تھے، اب کہنے لگے ارے اللہ جس کے لئے چاہتا ہے روزی میں کشادگی کرتا ہے اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگی کرتا

ہے۔ اگر اللہ ہم پر احسان نہ فرماتا تو ہمیں بھی زمین میں غرق کر دیتا۔ ارے اب ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کافر لوگ کبھی فلاح نہیں پاتے''۔

یعنی دولت مندی فلاح ونجات کی ضامن نہیں اور جسے اُس نے تنگی میں ڈالا ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ تنگ دستی اُس کے لئے نعمت ہو اور وہ انجام کے لحاظ سے اُن بڑے دولت مندوں سے ہزار درجے بہتر ہو۔

کانّہ جس کا ترجمہ عموماً ''گویا'' کی لفظ سے ہوتا ہے اور یہاں بھی لفظی ترجمہ ''گویا'' کیا جا سکتا ہے مگر ہم نے اس کا مطلب خیز ترجمہ کیا ہے کہ ''اب ایسا معلوم ہو رہا ہے''۔ حالانکہ حقیقت میں یہ ایک یقینی واقعیت ہے کہ کافر لوگ فلاح نہیں پاتے مگر چونکہ یہ جاہل لوگ وہ ہیں جو اس کے پہلے یہ تمنا کرتے تھے کہ وہ قارون ایسے ہوتے تو وہ پہلے اس حقیقت سے کہ اصل معیار فلاح ایمان ہے بالکل ہی غافل تھے بلکہ جیسے یقین رکھتے تھے کہ دولت مندی ہی اصل معیار فلاح ونجات ہے، اب قارون کے انجام کو دیکھ کر اُنہیں کچھ کچھ اپنے پہلے تصور کی کمزوری کا حساس ہوا ہے تو اب وہ شک وتذبذب کی منزل میں آ گئے ہیں اور یوں کہنے لگے ہیں کہ ارے اس مشاہدہ کے بعد تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دولت معیار نجات نہیں ہے بلکہ معیارِ نجات ایمان ہے جس سے کافر لوگ، چاہے وہ دولت مند ہوں، محروم ہیں۔

یہ آخری جملہ کہ ''لایفلح الکافرون'' ان آیات کے ابتداء میں جو بہت سے الفاظ آئے ہیں، اُن کے ساتھ مل کر اس تصور کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے کہ قارون کا جو انجام ہوا، وہ صرف اس کی دولت کی وجہ سے ہوا جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اسلام مطلق دولت مندی کے خلاف ہے، حقیقت یہ ہے کہ دولت مندی اگر ادائے فرائض اور قولی وعملی طور پر شکر نعم الٰہی کے ساتھ ہو تو وہ کوئی مستوجبِ سزا امر نہیں ہے جب کہ اسی آخری آیت میں صراحۃً موجود ہے کہ کشائش عطا کرنے والا بھی اللہ ہی ہے تو وہ اس پر سزا کیوں دے گا؟! مگر دولت مندی کے ساتھ جب بخل، آخرت فراموشی اور فساد فی الارض اور کفرانِ نعمت کے جراثیم جمع ہوں جن کا مذکورہ آیات میں قارون کے سلسلے میں تذکرہ موجود ہے تو وہ اُس انجام کی مستوجب ہو سکتی ہے جو قارون کا دنیا کی آنکھوں کے سامنے آیا۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾

''وہ آخرت کا گھر، اُسے ہم قرار دیتے ہیں، اُن کے لئے جو زمین میں دوسروں پر چھانے کی خواہش نہیں رکھتے اور نہ فساد اور انجام کی بہتری پرہیزگاروں کے لئے ہے''۔

انجام بخیر اُن کا جو دنیا میں قہر وغلبہ کے درپے نہ ہوں:

اس آیت کو معصومین علیہم السلام نے بڑے اثر انگیز انداز میں اور خود اپنے قلبی تاثرات کے ساتھ وعظ ونصیحت کے موقع پر پیش فرمایا ہے چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام کی زبان سے نہج البلاغہ کے ایک کلام کے ذیل میں یہ آیت آئی ہے اور تفسیر علی بن ابراہیم میں اپنی سند متصل کے ساتھ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد حفص بن غیاث سے تخاطب میں درج کیا گیا ہے کہ:

یا حفص ما منزلة الدّنیا من نفسی الا بمنزلة المتیة اذا اضطررت الیها اکلت منها.

اے حفص: دنیا کی حیثیت میرے نزدیک نہیں ہے سوا مردار کے کہ جب اضطراری شکل ہو تو اس میں سے ذرا سا کھالو۔

یاحفص انّ الله تبارك وتعالیٰ علم مالعباد یاتون والیٰ ماهم صائرون فعلم منهم عند اعمالهم السّیئة بعلمه السابق فیهم فلا یغرنّك ترك الطلب ممّن لا یخاف الفوت ثمّ تلاقولة: تلك الدّار الاٰخرة وجعلو یبکی ویقول: ذهبت والله الامانی عندهٰذا الاٰیة.

اے حفص! اللہ تعالیٰ کو پہلے سے معلوم تھا کہ بندے کیا کریں گے اور ان کا انجام کیا ہوگا اس طرح اُن کے برے اعمال اُس کے علم میں تھے تو تمہیں دھوکا نہ ہونا چاہیے، اس کے چھوڑے رہنے سے جسے ہاتھ سے نکلنے کا ڈر نہیں ہے، پھر حضرت نے یہ آیت پڑھی اور گریہ فرمانے لگے اور کہنے لگے بخدا تمام آرزوئیں ختم ہوگئیں اس آیت کے ہوتے ہوئے۔

ایک روایت میں ہے کہ جسے علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں نقل فرمایا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام اپنے دور خلافت میں بازاروں میں ایک ایک دوکاندار کو قرآن مجید کی یہ آیت دکھلاتے تھے اور فرماتے تھے، یہ آیت ہر قسم کے اقتدار کے مالک افراد کے لئے خواہ حکام ہوں یا جن کو بھی کسی حلقہ میں کچھ افراد انسانی پر بالادستی حاصل ہو، خالق کی طرف کا انتباہ ہے۔ (مجمع البیان)

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾

''جو نیک کام کرے، اُسے اُس سے بہتر صلہ ملے گا اور جو بُرا کام کرے تو اُنہیں جو بُرے کام انجام دیتے ہیں، پاداش نہیں ملے گی سوا اُس کے جو وہ کرتے تھے''۔

چونکہ جزاء میں اضافہ کر دینا ظلم نہیں ہے بلکہ کرم و تفضّل ہے جو امر مستحسن ہے اور سزا میں اضافہ ظلم ہے جو قبیح ہے اور خالق کے لئے روا نہیں [1] لہٰذا نیکی کا بدلہ اس سے بہتر ملے گا اور بدی کا بدلہ بس اتنا ہی۔

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۸۵﴾ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾

---

[1] لایزاد فی عقابهم علیٰ قدر استحقاقهم بخلاف الزیادة فی الفضل علی الثواب المستحق فانّه یکون تفضّلا (مجمع البیان)

''بلاشبہ وہ جس نے قرآن پہنچانے کا فریضہ آپ کے ذمے عائد کیا، وہی آپ کو واپسی کی منزل پر دوبارہ لائے گا، کہیے کہ میرا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ کون ہدایت لے کر آیا ہے اور کون کھلی ہوئی گمراہی میں ہے اور آپ اس کے امیدوار نہیں تھے کہ آپ پر کتاب اتاری جائے۔ یہ تو بس آپ کے پروردگار کی رحمت ہے تو آپ کبھی کافروں کے پشت پناہ نہ بنئے گا اور وہ آپ کو روکیں نہ اللہ کی آیات سے بعد اس کے کہ وہ آپ پر نازل ہو چکی ہیں اور دعوت دیجئے اپنے پروردگار کی طرف اور مشرکوں میں شامل نہ ہو جیے اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے خدا کو نہ پکاریئے۔ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ ہر چیز فنا ہونے والی ہے سوا اُس کے چہرے کے۔ اُسی کی حکومت ہے اور اُسی کی طرف تم لوگوں کو پلٹ کر جانا ہے۔''

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے مرکز کی طرف واپسی کی اطمینان دہانی:

معاد واپسی کی منزل سے مراد بظاہر مکہ معظّمہ ہے جس سے جدائی کا حضرتؐ کو صدمہ تھا[1] مگر ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد آخرت ہے۔[2] آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی تفسیر میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ اس سے مراد اسی دار دنیا میں ان حضرات کا دوبارہ پلٹنا ہے جسے **رجعت** کہتے ہیں[3] لیکن جناب شیخ الطائفہؒ نیز علاّمہ طبرسیؒ نے متعدد اقوال درج کرنے کے باوجود اسے نہیں لکھا ہے۔[4]

شروع کی آیت کے بعد جو آیات ہیں، جن کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مقام تنزیل میں یونہی متصل تھیں، ان میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مخاطب رسولؐ ہوں اور مقصود دوسروں کی تنبیہ ہو اور ہم نے اتّصال کی وجہ سے اسی لحاظ سے ترجمہ میں ''آپ'' کی لفظ کے ساتھ تخاطب کیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خطاب مخاطب غیر معین سے ہو جیسا کہ اکثر آیات میں ہمارے نزدیک قطعاً ایسا ہی ہے۔ اس صورت میں میرے عام دستور کے مطابق ان آیات میں ضمیر خطاب کا ترجمہ آپ کے بجائے ''تم'' کے ساتھ ہوگا۔

بہر حال آخر میں جمع کا صیغہ تُرجعون تم کو پلٹ کر جانا ہے، اس کی دلیل ہے کہ مقصود عام مسلمانوں ہی کو متنبہ کرتا ہے، ذات رسول مقصود نہیں ہے۔[5]

---

[1] الیٰ مکّۃ وکان قد اشتاقھا (جلالین) یہ آیت اتری ہجرت کے وقت، یہ تسلی فرمائی کہ پھر مکّے آؤ گے (موضح القرآن)

[2] یعنی آخرت (فتح الرحمن)

[3] عن علی بن الحسین علیہ السلام یرجع الیکم بنیکم وامیر المومنین والائمہ علیہم السلام (علی بن ابراھیم)

[4] قال الحسن معناہ الی المرجع یوم القیٰمۃ وقال مجاھد الی الجنّۃ وقال ابن عباس الی الموت وفی روایۃ اخریٰ عن ابن عباس الیٰ مکّۃ والاظھر من الاقوال لواذّك الیٰ معاد فی النشاۃ الثانیۃ الی الجنّۃ (تبیان)

[5] وان کان الخطاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فالمراد غیرہ (مجمع البیان)

سُوْرَۃُ الْعَنْکَبُوْتِ

مکّیہ ----۶۹---- آیات

چونکہ اس سورہ میں ایک آیت اس مضمون کی ہے کہ کافروں کے بنائے ہوئے منصوبے کبیت العنکبوت ''مکڑی کے جالے کی طرح ہیں'' وانّ اوھن البیوت لبیت العنکبوت ''اور تمام گھروں میں سب سے زیادہ کمزور مکڑی کا گھر ہوتا ہے''۔اس کی مناسبت سے اس سورۃ کا نام عنکبوت یعنی مکڑی کی طرف نسبت دے کر ہو گیا۔

سورۂ عنکبوت کے خاص خاص مضامین:

۱.....ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کا حکم لیکن اگر وہ توحید و اطاعت الٰہی کے تقاضوں میں سدّ رہ ہوں تو پھر ان کی اطاعت حرام۔

۲.....جناب نوح علیہ السلام کا ساڑھے نو برس تبلیغ کرنا، پھر طوفان کا آنا۔

۳.....جناب ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق اور قوم کا ظالمانہ رویّہ۔

۴.....متعدّد اقوام پر مختلف قسم کے عذابوں کا یکجائی تذکرہ۔

۵.....قبل بعثت پیغمبر خدا کی زندگی میں بعد بعثت آپ کی حقّانیت کا پس منظر۔

۶.....اصل آیات قرآنی صفحۂ کاغذ پر نہیں بلکہ خاص اہل علم کے سینوں میں ہوتی ہیں۔

۷.....حرم الٰہی کا مثالی امن خدا کی قدرت کی نشانی۔

۸.....جو اللہ کی راہ میں جدّ و جہد کرتے ہیں اللہ خود انہیں اپنے راستے دکھاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

الٓمّٓ ① اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ② وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ③

''الف۔لام۔میم۔کیا لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ چھوڑ دیئے جائیں گے بس اتنا کہنے پر کہ ہم ایمان لائے اور اُن کی آزمائش نہیں ہوگی؟ حالانکہ ہم نے آزمائش میں ڈالا انہیں جو ان کے پہلے تھے تو اب بھی اللہ ضرور معلوم کرے گا انہیں جو سچّے ہیں اور معلوم کرے گا جھوٹوں کو''۔

''معلوم کرے گا'' کئی طرح کے الفاظ پہلے کئی جگہ آ چکے ہیں اور اُن کی تشریح کی جا چکی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ امتیاز عملی حیثیت سے وقوع میں آ جائے اور چونکہ علم بر بنائے واقعہ ہوتا ہے۔ لہٰذا علم الٰہی کا اس کے مطابق ثبوت سامنے آ جائے لیکن اگر یہ امتیاز وقوع میں آیا ہی نہیں تو وہ علم الٰہی میں بھی کیوں ہوگا اس لئے کہ علم خلاف واقعہ تو ہو نہیں سکتا۔

شاہ ولی اللہ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اس طرح کہ فلیعلمنّ اللہ الّذین صدقوا و الیعلمن الکٰذبین کا ترجمہ کیا ہے: ''البتّہ متمیز نکند خدا آنان راکہ راست گفتند و البتہ متمیز کند دروغ گویان را۔''

شاہ رفیع الدین نے ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ ''البتہ ظاہر کر دے گا اللہ ان لوگوں کو جو سچ بولے اور اللہ ظاہر کرے گا جھوٹوں کو۔''

جلالین نے فلیعلمنّ اللہ کے تحت میں تشریحی ضمیمہ لگایا ہے علم مشاھدۃ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقوع کے قبل بھی اللہ کو علم ہے مگر وہ علم غیب ہے اور جب وقوع میں آ جائے گا تو وہ علم شہود ہو جائیگا۔

معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت سب کے ذہن میں ایک ہے، تعبیریں مختلف ہیں اور اس لئے میرا نظریہ یہ ہے کہ فلیعلمن اللہ کا ترجمہ تو وہی ہونا چاہیے جو اس کے لفظی معنی ہیں یعنی اللہ معلوم کرے یا اللہ جانے اور ان باتوں کو تشریحی حیثیت سے کہنا چاہیے کہ اس معلوم کرنے اور جاننے کا مطلب کیا ہے؟

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۴

''کیا سمجھے ہوئے ہیں وہ جو بُرے کام کرتے ہیں کہ وہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے؟! کتنا بُرا ہے وہ حکم جو وہ لگاتے ہیں۔''

''ہمارے قابو سے نکل جائیں گے۔'' اس کے لئے جو الفاظ قرآن کے ہیں، وہ تمثیلی و تشبیہی ہیں، یعنی کوئی آگے آگے بھاگ رہا ہو اور دوسرا اُسکا پیچھا کرے مگر یہ اُس تک نہ پہنچ سکے، وہ آگے بڑھ جائے اور یہ اس کے پکڑنے میں عاجز ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ منظر جو جسمانی حیثیت رکھتا ہے، یہاں نہیں ہے لیکن جو اُس کا نتیجہ ہے کہ وہ شخص قبضے میں نہ آئے، وہ نتیجہ یہاں مقصود کلام ہے [1] اس لئے ہم نے ترجمہ یہی کیا کہ کیا وہ ہمارے قابو سے نکل جائیں گے؟

بعض مقامات پر قرآن مجید نے اس مطلب کو ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ لیسوا بمعجزین ''جو ہمیں بے بس نہیں بنا سکتے۔''

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۵ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶

''جو اُمید رکھتا ہے اللہ سے ملنے کی تو بلاشبہ اللہ کی مقرر کردہ میعاد آنے ہی والی ہے اور وہ سننے والا ہے، بڑا ماننے والا، اور جدوجہد [2] میں مقابلہ کرتا ہے، وہ مقابلہ کرتا ہے اپنے لیے، بلاشبہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔''

---

[1] ان یفرقونا فوت السّابق لغیرہ ویعجزونا فلا نقدر علیٰ اخذھم (مجمع البیان)

[2] جاھد الشیطان بدفع وسوستہ واغوائہ وجاھد اعداٰء الدّین الاحیائہ وجاھد نفسہ الّتی ھی اعدیٰ اعدائہ (مجمع البیان)

''جہاد'' کے لفظی معنی جدوجہد میں مقابلہ ہی کے ہیں، اب وہ اپنی نفسانی خواہشوں کا مقابلہ ہو جو ''جہاد اکبر'' ہے یا دشمنان دین کا اسلحہ جنگ سے مقابلہ ہو جو فقہ کی اصطلاح میں جہاد کہلاتا ہے اور حقیقت میں یہ میدان جنگ کا جہاد بھی جہاد نفس کے عام مفہوم کا ایک جزئیہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

''اور جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے تو ہم یقیناً اُن کی غلطیوں کو نظر انداز کریں گے اور انہیں بدلہ دیں گے بہترین اس معیار پر جو اُن کے اعمال کا تھا۔''

میں اس کا مطلب یوں سمجھتا ہوں کہ جس طرح ایک امتحان کے بہت سے پرچے ہوتے ہیں، اُن میں کسی ایک پرچے میں اگر آدمی فیل ہے، تب تو وہ امتحان میں ناکامیاب قرار پاتا ہے، چاہے بعض پرچوں میں اس کے فرسٹ کے نمبر ہوں لیکن اگر فیل کسی ایک پرچے میں بھی نہیں ہے فی صدی ۳۳ نمبر تو ہر ایک ہی میں لایا ہے تو پھر اب اس کی کامیابی کا معیار اُس کے تمام پرچوں کو سامنے رکھ کر مقرر ہوگا لہٰذا اگر اُس کے ایک پرچے میں کمزوری بھی ہے تو مجموعی نمبروں میں آگے وہ کمزوری نظر انداز ہو جاتی ہے اور مجموعی نتیجہ کے لحاظ سے وہ فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوتا ہے، بس یونہی سمجھیے کہ کچھ واجبات کا ترک یا محرمات کا ارتکاب اور سب سے بڑھ کر ایمان سے محرومی، یہ تو وہ ہے جو انسان کے آخرت میں ناکام ہونے کا باعث ہے جس کے بعد وہ نجات سے محروم ہو جاتا ہے اور ایسے لوگ وہ ہیں جو الّذین اٰمنو وعملو الصّالحات کے عنوان ہی سے خارج ہیں لیکن ایک صورت یہ ہے کہ انسان اُن باتوں کا مرتکب نہیں ہے اور جو ہر ایمان سے عاری نہیں ہے، اس طرح کسی درجہ پر الّذین اٰمنو وعملوا الصّالحات کے تحت میں داخل ہے لیکن اس کے بعد شعبے اعمال کے تو بہت ہیں کچھ حقوق اللہ ہیں، اُن میں بھی کچھ عبادات جسمانی ہیں، کچھ عبادات مالی ہیں اور اس کے علاوہ حقوق النّاس ہیں، اُن میں بھی مختلف انواع واقسام ہیں، ان سب کے لحاظ سے کچھ شعبوں میں ایسی کمزوری ہے کہ اگر اُنہی کے معیار پر اُسے نتیجہ دیا جائے تو وہ بہت پست درجے میں ہوگا لیکن ایسی صورت میں خالق اُس کی مجموعی زندگی کے لحاظ سے اُس کے عملی شعبوں کو سامنے رکھ کر جن میں اُس کے عمل کا معیار اونچا ہے، اُن کے لحاظ سے آخرت میں مرتبہ عطا کرنا ہے، اس طرح وہ کمزوریاں نمایاں نہیں ہوتیں جو اُس کے عمل کے بعض شعبوں میں ہیں، یہ ہے جو کہا گیا کہ ''ہم ان کی غلطیوں کو نظر انداز کریں گے اور انہیں بدلہ دیں گے بہترین اُس معیار پر جو اُن کے اعمال کا تھا۔''

بعض مفسرین اس مفہوم کو نہیں سمجھتے ہیں اور ژولیدہ بیانی میں مبتلا ہوئے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر نے لکھا ہے:

''یعنی ایمان کی برکت سے نیکیاں ملیں گی اور برائیاں معاف ہوں گی''۔

گویا: احسن الّذی کانوا یعملون کے معنی ہیں ایمان مگر قرآن تو ایمان کے پہلو میں حرف عطف کے ساتھ عمل صالح کا ذکر پہلے کر چکا ہے۔ پھر اب عمل سے خود ایمان مراد لینے کا کیا محل ہے؟

جلالین کی سمجھ میں احسن (افعل التفضیل) کی تشریح کچھ آئی ہی نہیں تو لکھ دیا:

احسن بمعنی حسن و نصبہ بنزع الخافض الباء۔

احسن کے معنی حسن کے ہیں اور اسے نصب یوں ہے کہ حرف جر محذوف ہے
دوسرے مفسرین کے بیانات بھی مجھے الجھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ۝۹

''اور ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرے اور اگر وہ دونوں تم سے اس بات پر لڑائی جھگڑا کریں کہ تم میرے ساتھ اسے شریک کرو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے تو پھر ان کا کہنا نہ مانو۔ میری ہی طرف تم سب کو پلٹنا ہے تو میں تمہیں بتاؤں گا جو کچھ تم کرتے تھے اور ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، ضرور ہم انہیں نیکوکاروں میں داخل کریں گے''۔

کلّیۃ ''نیکوکار'' معصومین علیہم السلام ہیں۔ انکے علاوہ جو جس حد تک ایمان اور حسن عمل کے درجے پر ہو، وہ ان کے ساتھ محشور ہوگا [1] جو اس کی فلاح ونجات کی نشانی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝۱۱

''اور انسانوں میں بعض ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، اس کے بعد جب اللہ کی راہ میں اسے ایذا پہنچائی جاتی ہے تو وہ آدمیوں کی آزمائش کو اللہ کے عذاب کے مثل سمجھ لیتا ہے اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے مدد آئے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ کیا اللہ خوب واقف نہیں ہے اس سے جو تمام دنیا والوں کے دلوں میں ہو اور ضرور اللہ جانے گا انہیں کہ جو ایمان رکھتے ہیں اور ضرور جانے گا منافقوں کو''

آغاز کلام سے خیال ہوسکتا ہے کہ یہ کمزور دل والے دین داروں ہی کا ذکر ہے جو مومن تو ہیں مگر ثبات قدم اور سکون دل سے پورے طور پر بہرہ یاب نہیں ہیں مگر اختتام آیت اور پھر بعد کی آیت نے صاف کر دیا ہے کہ یہ منافق لوگوں کا ذکر ہے [2] جو حقیقت میں ایمان لائے ہی نہیں ہیں

---

[1] فی الصالحین الانبیآء والاولیاء بان یحشر ھم معھم (جلالین)
[2] ھٰذا الّذی ذکرہ صفۃ المنافقین (تبیان)

بلکہ مصلحۃً جماعت میں شامل ہیں اور اس لئے ذرا سی سختی پڑتی ہے تو وہ گھبرا کر راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ اب ہوسکتا ہے کہ آپ یہ قاعدہ لازم وملزوم ایسے کرداروں کا مشاہدہ کر کے ہی فیصلہ کریں کہ یہ حقیقی مومنین نہیں ہو سکتے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ط وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ط اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ز وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اور کہا اُنہوں نے جو کافر ہیں اُن سے کہ جو ایمان لائے ہیں کہ ہمارے مسلک کی پیروی کرو اور ہم تمہارے گناہوں کو اپنے اوپر اٹھالیں۔ حالانکہ وہ اُن کے گناہوں کو کچھ بھی اٹھانے والے نہیں، یقیناً وہ جھوٹے ہیں اور بلاشبہ وہ اٹھائیں گے اپنے بوجھوں کو اور اپنے بوجھوں کے ساتھ کچھ اور بوجھ اور اُن سے باز پرس ہوگی قیامت کے دن اُس کی جو وہ غلط باتیں گھڑتے تھے۔''

کافر حقیقۃً آخرت کے قائل تھے ہی نہیں، بطور تمسخر مسلمانوں سے کہتے تھے کہ بے کار تم پیغمبر کی پیروی کر کے عذاب آخرت کے دھڑکے میں رہتے ہو، ہمارا ساتھ دو اور ہم ذمہ دار ہیں کہ تمہاری طرف سے وہاں کے بوجھ ہم اٹھائیں گے [1] اس کی اس آیت میں رد کی گئی ہے۔ یہ گناہوں کا اٹھانا جس کی نفی کی گئی ہے، باختیار خود اُن کے گناہوں کی ذمہ داری لے کر اُنہیں گناہوں کی پاداش سے بچا دینا ہے اور پھر جو کہا گیا ہے کہ ''یہ بوجھ بھی اٹھائیں گے اور دوسروں کے بوجھ بھی۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں دوسروں کے ورغلانے کی سزا ملے گی اور اس طرح خود اپنے گناہوں کی سزا بھی پائیں گے اور دوسروں کے گناہوں کی بھی جو ان کے ورغلانے سے مرتکب جرم ہوئے مگر اس کے نتیجہ میں وہ مرتکبین بری نہیں ہوں گے۔ [2]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ط فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾

''اور ہم نے فوج کو بھیجا اُنکی قوم کی طرف تو وہ اُن میں پچاس کم ایک ہزار برس رہے پھر اس قوم کو طوفان نے اپنی گرفت میں لے لیا درانحالیکہ وہ ظالم وگنہ گار تھے تو ہم نے اُنہیں اور کشتی والوں کو نجات دی اور اُسے نشانی قرار دیا تمام جہانوں کے لیے۔''

---

[1] کان الکفّار یقولون للمؤمنین کو نو امعنا فانّ الّذی تخافون انتم لیس بشئی فان کان حقّا فتحمّل نحن ذنوبکم (علی بن ابراھیم)

[2] یعنی بارگمراہ شدن وگمراہ کردن بردارند و بار تابعان از سرایشان دفع نہ کند (فتح الرحمن)

جناب نوح علیہ السلام کی عمرِ تبلیغ ساڑھے نوسو برس قبل از طوفان:

وہ کشتی اپنی اس کارکردگی کے لحاظ سے تو نشانی تھی ہی کہ اتنا ہمہ گیر طوفان اور اُس سے اُس کشتی نے اپنے ساکنوں کو ساحل نجات تک پہنچا دیا اس کے علاوہ خود اس کشتی کا تمام جہانوں کے لئے (جس میں آج تک کی عمر زمانہ کے حدود داخل ہیں) نشانی ہونا اس کے بقاواستحکام کے لحاظ سے بھی ہوسکتا ہے، چنانچہ اخباروں میں ہزاروں برس گزرنے کے بعد آج تک یہ خبریں گردش کرتی رہی ہیں کہ کوہ آرارات پر اس کشتی کا مشاہدہ کیا گیا ہے اور وہ اب تک وہاں موجود ہے۔

اس اُمّت محمدی کے لئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت کو کشتی نوح کے مثل بتایا ہے تو یہ اہل بیتؑ بھی یہی صفت رکھتے ہیں کہ ان کے کارنامے بھی عالمین کے لئے آیت الٰہی تھے اور آخر عمر زمانہ تک ان کے سلسلہ کی ایک فرد کا باقی رہنا بھی اللہ کی ایک بڑی نشانی کی حیثیت رکھتا ہے جس سے انکار وہی کریں گے جو آیات الٰہی سے انکار کے پہلے عادی رہے ہیں۔

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾

''اور (ہم نے بھیجا) ابراہیمؑ کو جب اُنہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے غضب سے بچو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو، تم اُسے چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو، وہ کچھ بہت ہی توہین اور جھوٹ بناتے ہو، یقیناً یہ جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، تمہاری روزی پر قدرت نہیں رکھتے تو اللہ سے رزق کے طلبگار رہو اور اس کی عبادت کرو اور اُس کے شکر گزار رہو، اُسی کی طرف تو تمہیں پلٹ کر جانا ہے اور اگر تم جھٹلاؤ تو تمہارے پہلے بہت سی قوموں نے جھٹلایا اور نہیں ہے پیغمبر کے ذمہ مگر کھلی ہوئی تبلیغ۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق:

آخری آیت ممکن ہے کہ سلسلہ واقعہ ابراہیم علیہ السلام سے الگ ہو، ہمارے رسولؐ کے زمانے کے مشرکین سے تخاطب ہو جیسا کہ ہمارے یہاں کی تفاسیر میں بتایا گیا ہے۔[1]

---

[1] انقطع خبر ابراهيم وخاطب الله امّة محمد ﷺ وقال وان تكذّبو (على بن ابراهيم) وان تكذبو ااى وان تكذّبو ا محمدا ﷺ (مجمع البيان)

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾

''کیا اُنہوں نے نہیں دیکھا کہ کس طرح اللہ پہلی دفعہ مخلوق کو پیدا کرتا ہے، پھر اُسے دوبارہ پلٹاتا ہے، بلاشبہ یہ اللہ پر آسان ہے، کہیے کہ چلو پھر دنیا میں تو دیکھو کہ کس طرح اللہ نے مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کیا، پھر اللہ آخرت کی زندگی دیتا ہے، بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس میں مشاہدے کا تعلق پہلے جز سے ہے یعنی اللہ کا پہلی دفعہ پیدا کرنا اور پھر اُسے دلیل قرار دیا ہے غیب یعنی آیندہ کے دوبارہ زندہ کرنے کی [1] جیسا کہ دوسری جگہوں پر صاف یہ دلیل و مدلول کا عنوان نمایاں ہے جیسا کہ جب پوچھا گیا من یحی العظام وھی رمیم کون زندہ کرے گا ہڈیوں کو جب وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گی'' ارشاد ہوا قیل یحییھا الّذی انشاٰھا اوّل مرّۃ'' کہیے وہی زندہ کریگا جس نے پہلی دفعہ اُنہیں پیدا کیا۔'' (یٰسین۔۷۹)

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۫ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾

''وہ جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم کرتا ہے اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے اور تم زمین میں اور نہ آسمان میں اس کے قابو سے باہر نہیں ہو سکتے اور اللہ کو چھوڑ کر تمہارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار اور جنہوں نے اللہ کی نشانیوں اور اُس کی بارگاہ میں حاضری کا انکار کیا، یہ وہ ہیں جو میری رحمت سے نا اُمید ہو گئے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

''نا اُمید ہو گئے'' یعنی وہ اس لائق ہیں کہ نا اُمید ہو جائیں [2] اور ہو سکتا ہے کہ یہ ''نا اُمید ہو گئے'' اُن کے ضمیر کی گواہی ہو اس بات پر کہ وہ مستحق رحمت الٰہی نہیں ہیں۔ [3]

---

[1] لانّ من قدر علی الانشآء والابتداء فھو علی الاعادۃ اقدر (مجمع البیان)

[2] اخبر انّہ سبحانہ ایسھم من رحمتہ وجنّتہ او یکون معناہ یجب ان یئیسوا من رحمتہ (مجمع البیان)

[3] اخبار عن ویاسھم من رحمتہ (تبیان)

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

''تو نہیں تھا اُن کی قوم کی طرف سے کوئی جواب سوا اس کے کہ انہوں نے کہا اُنہیں قتل کر دو یا انہیں آگ میں جلا دو تو اللہ نے انہیں آگ سے نجات دی، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو ایمان لائیں۔''

قوم کا ظالمانہ رویہ:

اگر اس مقام پر ترتیب کو مطابق تنزیل سمجھا جائے تو اس کے قبل سب حضرات ابراہیم علیہ السلام کی تقریر تھی جو انہوں نے اپنی قوم کے سامنے بیک وقت مختلف اوقات میں کی تھی اور اب کہا جا رہا ہے کہ ان باتوں کا جواب ان کے پاس کوئی نہیں تھا سوا اس کے کہ وہ ان کو آگ میں جلا دینے پر تیار ہو گئے جس کی فی الجملہ تفصیل قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ہے مگر چونکہ ترتیب کے مطابق تنزیل ہونا ثابت نہیں، اس لئے گزشتہ آیات میں نفس مضمون کے لحاظ سے ہم تفریق محسوس کرتے ہیں:

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ۔ سے لے کر وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾ تک جناب ابراہیم علیہ السلام کی تقریر ہے اس کے بعد

(۱) اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ ..... الآخر

(۲) قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا ..... الآخر

(۳) يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ..... الآخر

(۴) وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ..... الآخر

(۵) وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ..... الآخر

یہ پانچ آیات علیحدہ سے نازل شدہ ہیں جو بظاہر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقریر کا جزء نہیں ہیں اور اب فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ ..... الآخر جناب ابراہیم علیہ السلام کی اس تقریر سے بلا فصل متصل ہے جو ان پانچ آیات کے قبل تھی [۱] اور اس کے بعد جو آیت آئے گی، اس میں پھر جناب ابراہیم علیہ السلام کی تقریر کی کچھ کڑیاں درج ہیں۔

ترتیب آیات میں یہ پاشانی و پریشانی یہاں کچھ نئی نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں نمایاں طور پر مختلف مقامات پر موجود ہے اور اس لئے ایک دفعہ بچارے خواجہ حسن نظامی صاحب نے یہ لکھ دیا تھا کہ حضرت عثمان ایڈیٹر اچھے نہ تھے تو اس جمہور اہل سنت میں ان کے خلاف بڑا شور مچا مگر کیا کیا جائے کہ محسوس اس کو قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والا کرتا ہے، چاہے اسے محسوس کرے مگر زبان سے کہنے کی ہمت نہ کرے۔ اس لئے کہ جرات اظہار کی نعمت قدرت کی طرف سے ہر ایک کو یکساں طور پر ارزانی نہیں ہوتی ہے۔

---

[۱] اوپر سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کلام چلا آ رہا تھا۔ اسی کے موافق اللہ تعالیٰ نے بیچ میں کتنی باتیں فرمائیں، پھر اس قوم کا جواب ذکر کیا (موضح القرآن)۔

جناب خلیل علیہ السلام کے ذکر میں یہاں صرف ان لوگوں کے اس کہنے کا بیان ہے کہ ''انہیں قتل کر دو یا آگ میں جلا دو''۔ اس کا نتیجہ کہ پھر کیا ہوا کہ؟ وہ یہاں ایک لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے کہ اللہ نے انہیں آگ سے نجات دی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری صورت اختیار کی گئی۔ [1]

جیسا کہ دوسرے مقامات پر جہاں آگ میں جلانے کا ذکر ہے، میں نے انتباہ کیا ہے، عام طور سے آگ میں جلانے کے حکم کی نسبت نمرود کی طرف دی جاتی ہے، یہ قرآن مجید سے کہیں ثابت نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پنچائتی فیصلہ تھا جو اجتماعی طور پر کیا گیا تھا۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۲۵

''اور انہوں نے کہا کہ تم نے اللہ کو چھوڑ کر اختیار کیا ہے بس کچھ بتوں کو آپس کی محبت کی وجہ سے اس دنیوی زندگی میں پھر قیامت کے دن تم میں سے ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمہارا ٹھکانا آگ میں ہوگا اور تمہارے کوئی مددگار نہ ہوں گے''۔

مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ جزء جناب ابراہیم علیہ السلام کی تقریر کا آگ میں پھینکے جانے کے قبل ہی کا ہے۔ اس کے بعد تو جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے، چونکہ حجت تمام کی جا چکی تھی لہٰذا جناب ابراہیم علیہ السلام نے اس قوم سے علیٰحدگی اختیار کی اور وہاں سے ہجرت کر کے سرزمین شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں بعد کے اس جزء سے کہ ''آپس میں محبت کی وجہ سے اس دنیوی زندگی میں'' ہم سمجھتے ہیں کہ شروع میں جو ہے کہ تم نے اللہ کو چھوڑ کر بس کچھ بتوں کو اختیار کیا ہے، ان بتوں سے مراد سچ مچ کے بت یعنی بے جان مورتیاں نہیں ہیں بلکہ وہ لیڈر ہیں جن کے پیچھے وہ چل رہے تھے اور انہیں کہا گیا ہے کہ یہ بس کچھ بت ہی ہیں جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر معبود بنائے ہوئے ہو۔

روز قیامت کا یہ حوالہ کہ وہاں تم میں سے ایک دوسرے سے انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا [2] جیسا کہ اس کے پہلے ابتدائی پاروں میں ایک دوسرے سے تبرّے کا ذکر آیا ہے صاف اس بات کی دعوت ہے کہ اسی دنیا میں پیشواؤں کے کردار کا خوب جائزہ لے لو اور آخرت کے پہلے یہیں پیشوایانِ باطل کا انکار، ان سے تبرّا اور اُن پر لعنت کرو۔

قرآن مجید میں بار بار لعنت اور دعوت لعنت کے بعد قرآن پر کسی ایمان رکھنے والے کو تبرّا اور لعنت کو دشنام یا گالی سے تعبیر کرنا کسی طرح روا نہیں ہو سکتا۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲۶

''اور اُن کی بات کو مانا لوطؑ نے اور اُنہوں نے کہا میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے کے لئے تیار ہوں، یقیناً

---

[1] فی الکلام خذف و تقدیرہ انّھم اوقدو نارا و طرحوہ فیھا (تبیان)

[2] ای یتبرّأ القادۃ من الاتّباع .....ویلعن الاتباع القادۃ (مجمع البیان)

وہ عزت والا ہے، حکمت والا۔''

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''حضرت لوط بھتیجے تھے حضرت ابراہیمؑ کے۔ اُس قوم میں کسی نے نہ مانا اُن کے سوا'' (موضح القرآن) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر کیا موقوف ہے، جناب نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام کسی بھی پیغمبر کا ذکر قرآن میں دیکھ لیجئے۔ اُس پر ایمان لانے والی اتنی چھوٹی اقلیت ہے جو انگلیوں پر شمار کیے جانے کے قابل ہے۔

تمام انبیاء میں بلاشبہ ہمارے پیغمبرؐ اس بارے میں بھی سب پر فوقیت رکھتے ہیں کہ آپ کے پیغام پر آپ کی زندگی میں جتنوں نے لبّیک کہی، اُتنی تعداد میں لبّیک کہنے والے کسی پیغمبر کو نصیب نہیں ہوئے اب ان لبّیک کہنے والوں میں بھی اگر ہم کہیں کہ خالص اور مخلص اور اعلیٰ مرتبہ کے آخر تک ثابت قدم رہنے والے صرف چند ہی افراد تھے تو اسے سنّت انبیاء وامم پر نظر رکھنے کے بعد کوئی عجوبہ اور قابل انکار چیز نہیں سمجھنا چاہیے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٢٧﴾

''اور ہم نے اُنہیں عطا کیے اسحاق اور یعقوب اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب قرار دی اور ہم نے اُن کا صلہ دنیا میں بھی عطا کیا اور بلاشبہ وہ آخرت میں نیکوکاروں میں تھے۔''

جناب ابراہیم علیہ السلام پر اللہ کی نوازش

آخرت کا صلہ تو اجر وثواب ہے۔ دنیا کا صلہ اس جملہ سے ظاہر ہوا کہ اُن کی نسل میں نبوّت اور کتاب عطا کی، اس میں بقائے نسل کی بھی ضمانت ہے اور پھر اُس منصب الٰہی کے برقرار رہنے کی خواہ بنام نبوّت ہو یا کسی دور میں بنام ''امامت'' ہو۔ اس کے ساتھ ''نیک نامی'' بھی شامل ہو تو کوئی حرج نہیں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت پر دنیا کے تین بڑے یہود، نصاریٰ اور مسلمان سب متّفق ہیں یہ بات کسی دوسرے کو حاصل نہیں۔ [1]

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٨﴾ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٩﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٣٠﴾

''اور لوطؑ کو جب انھوں نے کہا اپنی قوم سے کہ تم لوگ ایک ایسی سیاہ کاری میں مبتلا ہو جس میں تم سے پہلے دنیا کی

---

[1] اجرہ فی الدّنیا وھو الذّکر الحسن والولد الصّالح عن ابن عباس (مجمع البیان)

کوئی قوم مبتلا نہیں ہوئی۔ ارے تم مردوں سے نفسانی خواہش پوری کرتے ہو اور راہزنی کرتے ہو اور اپنے مجمع میں بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو تو ان کی قوم والوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا سوا اس کے کہ انہوں نے کہا لاؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم سچے ہو۔ انہوں نے کہا پروردگار! میری مدد کر اس تباہ کار جماعت کے مقابلے میں''۔

''ابراہیم علیہ السلام کو'' اور ''لوط علیہ السلام'' کو یہ سب پہلے والے ارسلنا کے ماتحت ہے یعنی ہم نے بھیجا نوح علیہ السلام کو ان کی طرف۔ پھر کہا گیا ''اور ابراہیم علیہ السلام کو'' اب اسی پر عطف کے ساتھ کہا جا رہا ہے ''اور لوط علیہ السلام کو''۔ [1]

''راہ زنی'' ایک مستقل جرم بھی ہو سکتا ہے مگر چونکہ وہ تشریح کے طور پر وارد ہوا ہے، اس فاحشة ''سیاہ کاری'' کی جس کے لئے کہا گیا ہے کہ تم سے پہلے کوئی قوم اس کی مرتکب نہیں ہوئی اور وہ راہ زنی عام حیثیت کا ایسا جرم ہے یقیناً پہلے بھی ہوتا رہا ہوگا، اس لئے بعض مفسرین کی یہ تشریح قابل قبول معلوم ہوتی ہے کہ یہ راہ زنی بھی اس جنسی شہوت کی تسکین کے ماتحت تھی کہ وہ حسین لڑکوں کو اس راستے پر گزرنے والے قافلوں سے اغوا کر کے لے آتے تھے اور اس لئے قافلوں نے اس راہ سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ [2]

ایک بہت ہی لطیف تفسیر اس کی یہ کی گئی ہے کہ وہ عورتوں سے قطع تعلق کی بناء پر انسانی مردم شماری میں اضافہ نہ کرتے ہوئے میدان حیات میں آنے والی نسلوں کے قافلے کو روکتے تھے۔ [3]

''مجمع میں بدکاری کا ارتکاب'' بھی بظاہر گذشتہ جرم ہی کی اور زیادہ شرمناک صورت کا اظہار ہے کہ تمہاری بے حیائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ جانوروں کی طرح آپس میں اس جرم کا ارتکاب مجمع عام میں کرتے ہو اور ممکن ہے کسی دوسری قسم کی بے حیائی مراد ہو۔ [4]

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ۡ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

اور جب ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ابراہیمؑ کے پاس آئے خوش خبری لے کر تو انہوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہم اس بستی والوں کو ہلاک کرنے والے ہیں، بلاشبہ اس کے باشندے ظالم و گنہگار ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس میں تو لوطؑ بھی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس میں کون کون ہے؟ ہم انہیں اور ان کے گھرانے کو نجات دیں گے مگر ان کی زوجہ، وہ رہ جانے والوں میں ہوگی''۔

---

[1] فرستادیم لوط علیہ السلام را (شاہ ولی اللہ)

[2] تقطعون السبيل طريق المارة لفعلكم الفاحش لمن يمرّ بكم فترك الناس المرّ بكم (جلالین)

[3] قيل يقطعون سبيل الولد بايتان الذكران في الادبار (تبیان)

[4] شاید یہی بدکاری لوگوں میں کرتے ہوں گے اس بات کی شرم بھی نہ رہی تھی یا کچھ اور ٹھٹھے اور چھیڑ کرتے ہوں گے (موضح القرآن)

یعنی وہ ہلاک ہونے والوں میں سے نہیں نکل سکے گی، انہی میں رہ جائے گی۔ [1]

جناب ابراہیم علیہ السلام کے پاس آنے کا مقصد تو انہیں ولادت فرزند کی خوش خبری دینا تھا [2] مگر اثنائے گفتگو میں خود جناب ابراہیم علیہ السلام کے دریافت کرنے پر کہ تمہاری اصل مہم کیا ہے؟ انہوں نے اس کا ذکر کر دیا کہ ہم قوم لوطؑ پر عذاب نازل کرنے کے لئے آئے ہیں۔

وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۫ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾

''اور جب ہمارے بھیجے ہوئے لوطؑ کے پاس آئے تو انہیں ان کی وجہ سے رنج ہوا اور وہ الجھن میں مبتلا ہو گئے اور ان لوگوں (فرستادگان الٰہی) نے کہا ڈرو نہیں اور رنجیدہ نہ ہو۔ ہم تمہیں اور تمہارے گھرانے کو نجات دینے والے ہیں مگر تمہاری بیوی رہ جانے والوں میں ہے۔ ہم اس بستی کے رہنے والوں پر آسمان سے عذاب اتاریں گے، اس لئے کہ وہ بدکاری کرتے رہے ہیں، اور ہم نے اس کی ایک کھلی ہوئی نشانی چھوڑی ان کے لئے جو عقل سے کام لیں''۔

قوم لوط کی عذاب الٰہی سے تباہی:

یہ آیات بتاتی ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم اپنی کارستانیوں سے باز نہ آئی بالآخر تباہ ہو کر رہی۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۳۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِىْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۳۷﴾ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۠ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۙ﴿۳۸﴾ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِى الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِيْنَ ﴿۳۹﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ

---

[1] الباقین فی العذاب (جلالین)

[2] یبشر و نہ باسحٰق ومن ورآء اسحٰق یعقوب (مجمع البیان)

وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾

''اور مدین والوں کی طرف ان کے بھائی شعیب کو تو انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت کرو اللہ کی اور روز آخرت کی امید رکھو اور دنیا میں خرابیاں پھیلاتے نہ پھرو تو ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا تو انہیں زلزلے نے اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ اپنے گھروں میں مردہ ہو کر گر گئے اور اسی طرح ہلاک کیا ہم نے) عاد اور ثمود کو اور یہ تمہارے لئے ان کی سکونت کے مقامات سے نمایاں ہے اور شیطان نے ان کاموں کو بنا سنوار کے ان کے سامنے پیش کیا تھا تو انہیں سیدھے راستے سے روک دیا حالاں کہ وہ آنکھیں رکھتے تھے اور قارون، فرعون اور ہامان کو اور ان کے پاس آئے موسیٰ کھلی ہوئی دلائل لے کر تو انہوں نے تکبر سے کام لیا اور وہ بچ کے جانے والوں میں نہ تھے تو ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا تو ان میں کوئی وہ ہے جس پر ہم نے تیز آندھی بھیجی اور ان میں کوئی وہ ہے جس کا ایک مہیب آواز نے کام تمام کیا اور ان میں کسی کو ہم نے زمین میں غرق کر دیا اور کسی کو ہم نے پانی میں ڈبویا اور اللہ ایسا نہیں کہ ان پر ظلم کرے مگر وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے''۔

قوم شعیب علیہ السلام اور مختلف اقوام پر عذاب الٰہی کا یکجائی تذکرہ:

یہاں سے خالق کائنات قوم لوط کا تباہ ہونا ایک مثال بنا کر بتا رہا ہے کہ صرف قوم لوط علیہ السلام ہی نہیں بلکہ جس قوم نے بھی خدا کے نمائندوں کی نافرمانی کی اور خدائی قوانین کی خلاف ورزی کی تو وہ عذاب الٰہی کا شکار ہو کر رہی۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

''مثال ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر حوالی موالی مقرر کیے ہیں، مکڑی کی سی ہے جس نے ایک مکان تیار کیا اور یقیناً تمام مکانوں میں سب سے زیادہ کمزور مکڑی کا بنایا ہوا مکان ہوتا ہے۔ کاش وہ جانیں''

''کاش وہ جانیں''، یعنی انہیں معلوم ہو کہ اُن کے معبودانِ باطل کا سہارا اتنا بے حقیقت ہے، نہ یہ کہ وہ جانیں کہ مکڑی کا جالا اتنا مضبوط ہوتا ہے، کیوں کہ یہ کون نہیں جانتا، وہ تو ہر ایک کو معلوم ہے۔ [1]

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴۲﴾ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ

---

[1] لا یجوز ان یکون متعلقا بقوله: وانّ او هن البیوت لبیت العنکبوت لانهم کانوا یعلمون انّ بیت العنکبوت واه ضعیف (مجمع البیان)

وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۴﴾

''بلاشبہ اللہ جانتا ہے اسے جو اسے چھوڑ کر کسی کو بھی معبود بناتے ہیں اور وہ عزت والا ہے، بڑی سوجھ بوجھ والا۔ یہ باتیں ہیں جنہیں ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور سوا صاحبان علم کے انہیں کوئی سمجھتا نہیں، اللہ نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا حق کے ساتھ یقیناً اس میں نشانی ہے ایمان لانے والوں کے لیے''۔

اُتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

''پڑھ کے سنایئے یہ کتاب جو آپ پر وحی کے ذریعہ بھیجی گئی ہے بلاشبہ نماز بدکاری اور برائی سے روکتی ہے اور بلاشبہ اللہ کو یاد رکھنا بڑی سے بڑی چیز ہے اور اللہ جانتا ہے اُسے جو تم لوگ کرتے ہو''۔

نماز کی خاصیت جب کہ اُس نسخۂ شفا کے اتارنے والے نے یہ بتادی ہے کہ وہ بدکاری اور برائی سے روکتی ہے تو اگر ایسا مشاہدہ ہو کہ نماز کی پابندی ہے مگر منکرات کا ارتکاب بھی ہے تو قرآن کا تقاضا عقلی طور پر یہ ہے کہ وہ نماز صورۃً نماز ہے لیکن حقیقت کے لحاظ سے وہ نماز ہے ہی نہیں۔ اس کے لئے معصومینؑ کے بھی متعدد ارشادات ہیں جنہیں علامہ طبرسیؒ نے درج فرمایا ہے مثلاً رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

من لم ینهه صلوٰة عن الفحشاء و المنکر لم یزد من الله الّا بعدا.

جس کی نماز اُسے بدکاری اور برائی سے نہ روکے تو اللہ سے اس کی دوری بڑھتی ہی جائے گی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من احبّ ان یعلم قبلت صلوٰته ام لم تقبل فلینظر هل منعته صلوٰته عن الفحشاء و المنکر فیقدر ما منعته قبلت منه۔ (مجمع البیان)

جو معلوم کرنا چاہے کہ اُس کی نماز قبول ہوئی یا نہیں تو وہ دیکھے کہ اُس نے اُسے بدکاری اور برائی سے روکا یا نہیں تو جس حد تک اس نے برائی سے روکا ہو اسی حد تک وہ قبول ہوئی۔

وَلَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۖۗ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

''اور بحث نہ کرو اہل کتاب سے مگر ایسے طریقے پر جو بہتر سے بہتر ہو سوا اُن کے جو اُن میں سے ظالم ہوں اور کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور تمہاری طرف نازل کیا گیا اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا

ایک ہی ہے اور ہم اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں اور اسی لئے ہم نے آپ کی طرف کتاب اُتاری اور جنہیں ہم نے کتاب دی تھی، وہ اُس پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں بھی ایسے ہیں جو اس پر ایمان لائے اور ہماری آیتوں کا جان بوجھ کر انکار نہیں کرتے مگر کافر لوگ''

اہل کتاب سے بھی بحث میں رواداری:

بعض ''جہاد پسند'' مفسرین کے رویہ پر ہم اکثر احتجاج کرتے رہے ہیں اور یہاں بھی اس کا محل ہے کہ اُنہوں نے کہہ دیا ہے کہ جہاد کا حکم آنے سے یہ حکم منسوخ ہو گیا مگر یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔[1]

بعد میں جو استثناء ہے کہ ''سوا اُن کے جو اُن میں ظالم ہیں'' تو یہ امر ظاہر ہے کہ ہر کافر اور منکر حق ایک معنی سے تو ظالم ہے ہی مگر یہاں مطلب یہ ہے کہ بحث میں وہ ظالمانہ رویہ اختیار نہ کرے، جسے ہٹ دھرمی کہتے ہیں تو پھر اب اُس سے بحث ہی بے کار ہے اور اب بحث کو ختم کرنے کے لئے کوئی سخت جملہ زبان سے نکل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کیوں کہ اُس کی ہٹ دھرمی نے اب یہ امید باقی ہی نہیں رکھی ہے کہ وہ راہ حق اختیار کرے گا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ بعد میں جو کہا گیا ہے کہ یوں کہو، یہ اُس روادارانہ انداز گفتگو کو بطور مثال پیش کرنا ہے۔ نہ یہ کہ ہر بات کے جواب میں یہی الفاظ کہے جائیں۔

آخر کی آیت میں اُس روادارانہ گفتگو کا نتیجہ ہے کہ پھر بہت سے لوگ اس سے متاثر ہو کر ایمان اختیار کر لیتے ہیں جن کی مثالیں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) میں بھی ہیں اور اُن کے غیر یعنی کھلے ہوئے مشرکین میں بھی اُن افراد کی صورت میں جو پہلے والے راستے کو چھوڑ کر حق پر آ گئے ہیں۔

''آیتوں کا انکار جان بوجھ کر نہیں کرتے مگر کافر لوگ'' اس کافر سے مراد وہ ہیں جو دانستہ کفر کو کفر سمجھتے ہوئے اختیار کیے ہوئے ہیں یعنی حق کے منکشف ہونے کے بعد پھر بھی اُس کو قبول نہیں کرتے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور آپ اس کے پہلے کوئی نوشتہ نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے اُسے لکھتے تھے اس صورت میں باطل پرستوں کو شک کا موقع ہوتا بلکہ یہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں اُن لوگوں کے سینوں میں جنہیں علم عطا ہوا ہے اور ہماری آیتوں کا جان بوجھ کر انکار نہیں کرتے مگر ظالم لوگ''

---

[1] لا دلیل علیٰ ما قال و کیف و قد امر بالعدل الذی ھو احسن و المواجب الذی لا یجوز غیرہ (تبیان)

قبل رسالت کی زندگی بعد والے دعوے کی حقانیت

قرآن مجید میں شروع سے آخر تک دیکھا جائے کسی نبی کے بارے میں اس پر زور نہیں دیا گیا ہے کہ اُس نے پڑھا لکھا نہ تھا لیکن ہمارے پیغمبرؐ کی زندگی کے اس پہلو پر بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ اور انبیاء کے معجزات از قبیل خوارق عادات جسمانی حیثیت رکھتے تھے مثلاً عصا کو اژدہا بنانا۔ مادرزاد اندھے کو شفا دینا اور اس طرح کی باتیں لیکن ہمارے رسولؐ کو علمی معجزہ کتاب کا عطا ہوا تھا۔ دوسرے انبیاء کے معجزات جن فنوں سے متعلق تھے، اگر وہ انبیاء ان فنوں کو کبھی حاصل کر چکے ہوتے مثلاً حضرت موسیٰؑ کبھی جادو کا فن سیکھ چکے ہوتے۔ حضرت عیسیٰؑ طب یونان کے مدرسوں میں پڑھ چکے ہوتے تو اِس سے اُن کی سچائی کا وزن کم ہو جاتا، اِسی طرح ہمارے رسولؐ اس کے پہلے کتابت وتحریر کا مشغلہ رکھتے ہوئے تو ان کے معجزے کی قوت ختم ہو جاتی، اسی لئے ان کے واسطے اس پہلو پر زور دینے کی ضرورت ہوئی اور یہاں اس آیت میں اُس کا فلسفہ یہی بتایا جا رہا ہے کہ اگر آپ لکھتے پڑھتے ہوتے تو باطل پرستوں کے لئے شک کرنے کا ایک مشغلہ ہاتھ آ جاتا لیکن جب آپ کی زندگی کھلی ہوئی کتاب کی طرح اُن کے سامنے ہے کہ آپ کبھی لکھتے پڑھتے نہیں دیکھے گئے تو اب اُنہیں ماننا چاہئے کہ آپ کا علم منجانب اللہ ہے اور یہ کتاب خالق کی نازل کردہ ہے۔ صنعت بشری کا کوئی دخل نہیں ہے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن اس بارے میں قبل بعثت کی آپ کی زندگی کا حوالہ دے رہا ہے اور اسی کی اثباتِ حقانیت کے لئے ضرورت ہے لیکن اب بعد بعثت اور جب قرآن کے لفظوں میں عِلْمُكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمْ کا مرحلہ انجام پا گیا تو اب یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں کہ آپ قرأت وکتابت سے قاصر تھے یعنی ضرورت ہو کہ کچھ لکھا ہوا آپ خود پڑھیں تو خود پڑھ نہیں سکتے تھے یا ضرورت پڑے کہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھیں تو لکھ نہیں سکتے تھے، جی نہیں۔ اب اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ جس طرح اب تک آپ کوئی کتاب دنیا کو نہیں سناتے تھے، مگر اب سنا رہے ہیں تو یہ اس کا ثبوت ہے یہ وحی الٰہی ہے، اُس طرح اب تک کچھ پڑھ نہیں سکتے تھے اور اب پڑھ رہے ہیں، کچھ لکھ نہ سکتے تھے اور اب لکھ رہے ہیں تو اب اسے یا تعلیم ربانی سمجھنا پڑے گا اور یہ عمل بھی معجزہ ہوگا اور متفق علیہ حدیث کی بنا پر جو بخاری اور مسلم میں بھی موجود ہے، یہ معجزہ وقوع میں آتا جب رسولؐ نے دواۃ وقرطاس طلب فرمایا تھا مگر حسبنا کتاب اللہ کی صدا سدّ راہ ہوئی اور سیاسی مصالح اس نوشتے کے وجود میں آنے کے مزاحم ہوئے جس سے گمراہی کا ایک بڑا دروازہ کھلا رہ گیا ہے جسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بند کرنا چاہتے تھے اور وہی آج تک مسلمانوں کی تباہی کا واحد سبب ہے۔

اس نکتے پر کہ یہ آیت ماقبل بعثت سے متعلق ہے، بعد بعثت نفی قرأت وکتابت کا کوئی ثبوت نہیں، ہمارے پہلے کے بعض اکابر علماء متوجہ ہو چکے ہیں چنانچہ علامہ طبرسی لکھتے ہیں:

قال الشریف الاجل المرتضیٰ علم الهدیٰ ﷺ هٰذه الآیة تدلّ علی انّ النبی ﷺ ما کان یحسن الکتابة قبل النبوة فامّا بعد النبوّة فلا تعلّق له بالریبة و التهمة فیجوز ان یکون قد تعلّمها من جبرئیل بعد النبوّة (مجمع البیان)

جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰ طاب ثراہ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت سے پہلے فن تحریر سے واقف نہیں تھے مگر نبوت کے بعد شک وشبہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تو ہو سکتا ہے آپ نے جبرئیلؑ سے نبوت کے بعد یہ علم حاصل کر لیا ہو۔

بس آخری جملہ میں ہمارا ذوق دینی اور حقیقت پروری متقاضی ہے کہ من جبرئیل کے بجائے من اللہ سبحانہ کہا جاتا یعنی معلم رسولؐ کا اللہ کو

سمجھنا چاہئے، نہ کہ جبرئیلؑ امین کو۔

آخر میں یہ فقرہ بڑی خاص توجہ کا مستحق ہے: بل ھو ایت بیّنٰت فی صدور الذین اوتوا العلم۔ شاہ ولی اللہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے:۔

بلکہ قرآن آیات روشن است محفوظ در سینہ ہائے آنانیکہ دادہ شدہ است ایشاں را علم۔

بلکہ قرآن روشن آیتیں ہیں محفوظ اُن کے سینوں میں جنہیں علم دیا گیا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب تک قرآن ہے، اُس وقت تک یقیناً کوئی سینہ بھی ہے جس میں اُس کا علم محفوظ ہو اور ان افراد کو چھوڑ کر صرف کاغذ پر لکھے ہوئے نقوش سے اصل قرآن نہیں ملے گا اور اب جو قرآن مجید میں دوسری جگہ آیا ہے۔

ہم نے اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں تو اس حفاظت کا تقاضا یہ ہوگا کہ وہ ایسے کسی سینے کو باقی رکھے گا جس میں قرآن محفوظ ہو مگر چونکہ شاہ صاحب کے پیش نظر اپنے مسلمات وعقائد کے ماتحت رسولؐ کے بعد کوئی ایسے سینے نہیں ہیں، اس لئے جیسے وہ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے پریشان سے ہوئے ہیں اور اس بنا پر حاشیہ تحریر فرماتے ہیں۔

مترجم گوید بعض مفسّران گفتہ اند کہ مراد از "الذین اوتوا العلم" تنہا ذات پیامبر است صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

میں کہتا ہوں کہ بعض مفسروں نے کہا ہے کہ جنہیں علم ملا ہے، اس سے مراد اکیلے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں واللہ اعلم۔

اس انداز سے نقل قول خود پتہ دیتا ہے کہ شاہ صاحب کو اُس کے ضعف کا احساس ہے، پھر معلوم نہیں اس تنکے کا سہارا لینے کی ضرورت کیوں ہے؟

پھر خود رسولؐ بھی مراد ہوں تو حضرتؐ کی رہنمائی کے مقابلہ میں حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ تو غلط ہی ہوگا اور اگر بالفرض منطوق آیت یہ نہ بھی بتاتا ہو کہ رسولؐ کے بعد کچھ سینے ایسے ہیں تو جب قرآن سے رہنمائی رسولؐ پر موقوف تھی، اس لئے کہ اُس کی حقیقت اُنہی کے سینے میں تھی تو جب وہ دنیا سے تشریف لے جائیں تو آپ کا فرض رسالت ہے کہ آپ اُس ذخیرے کو دوسرے سینے میں منتقل کرتے جائیں جو خدا و رسولؐ کے علم میں اس لائق ہو اور وہی پھر مرکز قرآن ہونے میں پیغمبر کا جانشین ہوگا۔

اب جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے تشریف لے جانے سے پہلے متفق علیہ حدیث میں یہ اعلان فرماتے ہیں کہ:۔ انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی ما ان تمسّکتم بھما لن تضلّوا بعدی تو اس کے سمجھنے میں کیا تامل ہے کہ رسولؐ اس طرح اُن سینوں کی نشان دہی فرما رہے ہیں جو آپ کے بعد حامل قرآن ہیں اور اسی لئے تفسیر اہل بیت علیہم السلام میں ہے الذین اوتوا العلم سے مراد ائمہ طاہرین علیہم السلام ہیں [1]۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ

[1] ھم الائمۃ علیھم السلام (علی بن ابراھیم) عن ابی جعفر و ابی عبداللہ علیھما السلام (مجمع البیان)

ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾

''اورانہوں نے کہا کہ ان پران کے پروردگار کی طرف سے کچھ خاص نشانیاں کیوں نہیں اترتیں، کہئے کہ نشانیاں بس اللہ کے پاس ہیں اور میں تو بس کھلا ہوا عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر یہ کتاب اتاری جو اُن کے سامنے پڑھی جاتی ہے، بلاشبہ اس میں رحمت اور یاددہانی ہے اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں''۔

یعنی ان کو فرمائشی معجزے دکھانے کی کیا ضرورت ہے جب کہ اتمام حجت کے لئے ایک معجزہ جو ہر دور میں رسالتِ پیغمبر کا زندہ ثبوت ہے موجود ہے۔[1]

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

''کہئے کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہونے کے لئے کافی ہے، وہ جانتا ہے اُسے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور جو باطل پر ایمان لائے ہیں اور اللہ کے ساتھ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں، یہ لوگ گھاٹا اٹھانے والے ہیں''۔

ایمان اور کفر جب مطلق طور پر بولے جائیں تو وہ دونوں متضاد ہیں، ایمان کے معنی ہیں حق کو ماننا اور کفر حق کا انکار کرنا لیکن اضافت کی صورت میں جب استعمال ہو تو ہر کفر کو ایمان اور ہر ایمان کو کفر کہا جاسکتا ہے جیسے یہاں حقیقتاً کفر ہے جسے ایمان بالباطل کہا گیا ہے اور آیۃ الکرسی میں ایمان کو کفر بالطاغوت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ استعمال بطور اضافت ہی صحیح ہوتا ہے ورنہ جیسا کہ شروع میں کہا گیا مطلق طور پر ایمان کو کفر اور کفر کو ایمان نہیں کہا جاسکتا۔[2]

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ ۙ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

''اور وہ آپ سے عذاب میں جلدی کرتے ہیں اور اگر نہ ہوتی ایک مقررہ مدت تو آجاتا اُن پر عذاب اور وہ آئے گا اُن پر اچانک درآں حالیکہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی۔ وہ آپ سے عذاب میں جلدی کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ

---

[1] فی ھذا دلالۃ علی ان القرآن کاف فی المعجزو انہ فی اعلیٰ درجات الاعجاز (مجمع البیان)

[2] انما وصفھم بالایمان مقیدا بالباطل کما یقال فلان کافر بالطاغوت مقیدا وانما الاطلاق لایجوز فیھما (تبیان)

دوزخ گھیرنے والا ہے کافروں کو جس دن چھا جائے گا اُن پر عذاب اُن کے اوپر سے اور اُن کے پیروں کے نیچے سے اور وہ ارشاد فرمائے گا کہ چکھو اُسے جو تم اعمال کرتے تھے''۔

جب پہلے کہہ دیا گیا ہے کہ ایک مقررہ مدت ہے اور بعد میں یہ کہا گیا ہے کہ ایسا دن آنے والا ہے تو بیچ میں جو یہ فقرہ آ گیا ہے کہ:۔ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ، اس کا یہ ترجمہ درست نہ ہوگا کہ ''دوزخ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو'' جس سے منکرین آخرت یہ نتیجہ نکالیں کہ کافروں کی بداعمالیاں جن میں وہ ہیں بس یہی دوزخ ہیں جب کہ عربی زبان میں اسم فاعل کبھی بمعنی حال ہوتا ہے اور کبھی بمعنی استقبال تو اس قبل اور بعد کے لفظی قرائن کی بنا پر کیوں نہ مستقبل ہی کے معنی میں لیا جائے جو حقیقت ہے، اور پھر جب کہ بالکافرین پر وقف نہیں بلکہ (لا) کی علامت بنی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ٹھہرنا نہیں چاہئے یعنی بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے اور اس کے بعد بلا فاصلہ یہ ہے کہ ''جس دن گھیرے گا اُن کو عذاب اُن کے اوپر سے اور اُن کے پیروں کے نیچے سے'' تو اس کے بعد لَمُحِيْطَةٌ※ کا صیغہ اسم فاعل حال کے لئے بھی ہو تو وہ حال اس وقت کا نہیں ہے جو دار دنیا میں ہے بلکہ حال اسی مستقبل کے دن کا ہے جو آخرت میں آنے والا ہے یعنی جس دن عذاب ان کے اوپر سے آئے گا اور نیچے سے اور یہ کہا جائے گا کہ چکھو اُسے جو تم اعمال کرتے رہے تھے تو اُس دن کا حال یہ ہوگا کہ دوزخ انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ اس کو جناب شیخ طوسیؒ نے دوسرے توجیہات کے ذیل میں درج فرمایا ہے۔[1] مگر میرے نزدیک وہ کوئی زبردستی کی توجیہ نہیں بلکہ بالکل الفاظ کا ظاہری مفہوم ہے اور اس کے بعد اس کی گنجائش نہیں ہے کہ اس حال کو دار دنیا سے متعلق کر کے اس کے آگے آخرت کا انکار کیا جائے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۵۸﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اے میرے ایمان لانے والے بندو! میری زمین بہت وسیع ہے تو میری ہی عبادت کرو ہر متنفس موت کا مزہ چکھنے والا ہے، پھر میری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے اور جو ایمان لائیں اور اچھے اعمال انجام دیں، انہیں ہم بہشت کے اونچے درجوں میں جگہ دیں گے جن کے نیچے سے نہریں رواں ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور کتنا اچھا صلہ ہے اُن عمل کرنے والوں کا جنہوں نے صبر و برداشت سے کام لیا اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں''۔

توحید الٰہی اور عبادتِ معبودِ حقیقی میں اگر ایک جگہ رکاوٹیں ہیں تو ہجرت کے لئے تیار ہو اور وطن کی زندگی کو قربان کر دو[2] اور اگر اس راہ میں جان دینے کی ضرورت ہو تو مرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤ اس لئے ایک دن تو موت آنا ہی ہے، پھر وہ اس کی راہ میں کیوں نہ ہو جس کے بعد آخرت میں بہترین مراتب حاصل ہوں گے۔

---

[1] وجہ ثالث انّها تحیط بهم یوم یغشاهم العذاب.... الخ (تبیان)

[2] قال ابو عبداللہ علیہ السلام اذا عصی اللہ فی الارض انت فیها فاخرج منها الیٰ غیرها (مجمع البیان)

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٠﴾

''اور کتنی ہی چلنے پھرنے والی مخلوق ہے جو اپنی روزی خود اٹھا کر نہیں لا سکتی، اللہ ہی روزی دیتا ہے اُسے بھی اور تمہیں بھی اور وہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

اگر یہ آیت مقام تنزیل میں اسی طرح گذشتہ آیت سے متصل ہے تو اس آیت کے تعلق سے اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے آخر میں اگر راہ حق پر برقرار رہنے اور عبودیت الٰہی کے فرائض کو انجام دینے میں معاشی مشکلات کا اندیشہ ہے کہ کھائیں گے کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ سب کا روزی رسان اللہ ہے، اُس پر بھروسا کرے۔ شان نزول کی ایک روایت اس کے موافق ہے۔[1]

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٦١﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٢﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٦٣﴾

''اور اگر اُن سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو تابع حکم بنایا، وہ کہیں گے اللہ نے، تو پھر وہ کس وجہ سے منحرف ہوتے ہیں؟ اللہ وسعت دیتا ہے روزی میں اپنے بندوں میں جس کے لئے چاہتا ہے اور اُس کے لئے (جب چاہتا ہے) تنگی کرتا ہے، یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے اور اگر اُن سے پوچھو کہ کس نے اتارا آسمان سے پانی تو زندہ کیا اُس سے زمین کو اُس کے مردہ ہونے کے بعد، تو کہیں گے اللہ نے کہئے اللہ کا شکر بلکہ اُن میں زیادہ سمجھتے نہیں''۔

قرآن مجید میں یہاں اور متعدد مقامات پر اس کا اظہار ہے کہ مشرکین اللہ کو جانتے اور مانتے ہیں اور کائنات عالم کے نظام کو اُس سے وابستہ سمجھتے ہیں، بس جو چیز نہیں سمجھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ جب ایسا ہے تو معبود بھی بس اُسی کو ہونا چاہئے اور کسی کو نہیں قرآن نے برابر بس یہی سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اسی کو کہا جا رہا ہے کہ وہ سمجھتے نہیں۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ

---

[1] قيل الأية نزلت فى اهل مكة المؤمنين منهم فانهم قالو الرسول الله ليس لنا بالمدينة اموال ولا منازل فمن اين المعاش فانزل الله الأية۔ (تبيان)

كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٤﴾

''اور یہ دینوی زندگی نہیں ہے مگر تماشا اور کھیل اور یقیناً آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے کاش وہ جانیں''۔

''تماشا اور کھیل'' یعنی بے ثبات اور ناپائیدار [1] نہ کہ بے حقیقت یا بے مقصد جس کے لحاظ سے دوسرے مقامات پر اس کارگاہ ہستی کے لہو ولعب (کھیل اور تفریح) ہونے کی نفی کی گئی ہے کہ اس معنی سے لہو ولعب ہونے کا تصور آفریدگار کی شانِ حکمت کے خلاف ہے۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٥﴾ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾

''تو جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ سے دعا کرتے ہیں خالص اُس کی عبادت کرتے ہوئے، اس کے بعد جب وہ انہیں نجات دے کر خشکی میں پہنچا دیتا ہے تو ایک دم وہ شرک کرنے لگتے ہیں، اچھا تو وہ کفران نعمت کر لیں اُس کا جو ہم نے اُنہیں دیا ہے، اور فائدہ اٹھا لیں اس کے بعد اُنہیں معلوم ہوگا''۔

ہم نے جو ترجمہ کیا ''کفرانِ نعمت کر لیں'' اور ''فائدہ اٹھا لیں'' اس پر مبنی ہے کہ لِيَكْفُرُوْا اور وَلِيَتَمَتَّعُوْا میں لام، لام امر ہے جسے علامہ طبرسیؒ نے بھی مقام تشریح میں مقدم رکھا ہے اور ہمارے بھی دل کو وہ زیادہ لگتا ہے اور یہ امر حکم کے مقصد سے نہیں ہے بلکہ تہدیدی طور پر ہے [2] جس کی نظیریں قرآن مجید میں موجود ہیں۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ لام غایت ہے جس کے معنی ہوتے ہیں ''تا کہ'' اُس کی بناء پر ترجمہ یہ ہوگا ''تا کہ وہ کفرانِ نعمت کریں'' اور ''فائدہ اٹھائیں'' جیسا کہ دوسرے مترجمین کا رجحان معلوم ہوتا ہے۔ [3]

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک امن والا محترم شہر قرار دیا حالانکہ اُس کے اردگرد سے لوگوں پر جھپٹے مارے جاتے رہتے ہیں تو کیا وہ غلط باتوں کو مانیں گے اور اللہ کی نعمت کا انکار کریں گے''۔

حرم الٰہی کا مثالی امن قدرت خدا کی نشانی

یعنی ''مکے کے لوگ اللہ کے گھر کے طفیل دشمنوں سے پناہ میں تھے اور سارے ملک عرب میں فساد تھا، بتوں کے جھوٹے احسان مانتے ہیں اور یہ سچا احسان نہیں مانتے''۔

---

[1] لا بقاء لها ولا دوام كما يزول اللّهو واللّعب. (تبيان)

[2] ان جعلت اللام للامر فمعناه التهديد (مجمع البيان)

[3] تابہرہ مند شوند (شاہ ولی اللہ)

اب اسے خواہ قدرت کی کارفرمائی سمجھا جائے اور خواہ حکم الٰہی کا نفوذ واثر کہ جب اِدھر اُدھر بدامنی کے شعلے بھڑک رہے ہوں تو بیچوں بیچ اُس کے ایک مختصر قطعہ زمین اُن شعلوں کی لپٹ سے اس طرح محفوظ رہے جیسے چاروں طرف پانی کا طوفان اور اُس کے درمیان ایک جزیرہ اور درصورتیکہ کہ حکم الٰہی کا اثر ونفوذ مانا جائے تو اس میں ایک یہ لمحہ فکریہ ہے کہ ایک شعبے میں انسان اُس کے قانون کو مان لیتا ہے تو کس طرح عافیت نصیب ہوجاتی ہے تو اگر تمام حیات کے شعبوں میں اُس کے قانون کی پیروی ہوتو کیا پوری دنیا جنت نہ بن جائے؟

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہے اُس سے کہ جو اللہ پر غلط باتیں منڈھے یا حق کو جھٹلائے، جب وہ اس کے پاس آیا، کیا دوزخ میں ٹھکانا نہیں ہے کافروں کا''۔

یہ قرآن کا وہ انداز بحث ہے جس سے وہ مخاطب جماعت پر بغیر صریحی طور پر کوئی ضرب لگائے ہوئے اُسے غور کرنے پر آمادہ کرتا ہے جیسے دوسری جگہ ہے:

وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ (سورۂ سبا)

ہم میں اور تم میں بہرحال کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گمراہی میں۔ ویسے ہی یہاں جو دو (۲) فقرے ہیں، ان میں اپنے کو اور مخاطب جماعت کو بالکل ایک سطح پر رکھ کر بات کہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میں اللہ کی طرف سے رسالت کا غلط دعویٰ کرتا ہوں تو مجھ سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں اور اگر میرا دعویٰ سچا ہے اور تم اُسے جھٹلاتے ہو تو تم سے بڑھ کے کوئی ظالم نہیں، اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ ہم میں اور تم میں اتنا بڑا ظالم کون ہے؟ بعض مفسرین دونوں چیزوں کو مشرکین سے متعلق قرار دیتے ہیں [1] ''کون زیادہ ظالم ہے اُس سے کہ جو اللہ پر افتراء کرے'' یعنی شرک کرے اور ''حق کو جھٹلائے یعنی پیغمبر کی بات نہ مانے اور رسالت کا انکار کرے مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تشریح اُس وقت کچھ زیادہ چسپاں ہوتی جب ''او'' کے بجائے ''و'' ہوتا۔ اس لئے کہ وہ افتراء اور یہ تکذیب مشرک میں تو دونوں باتیں ایک ساتھ پائی جاتی ہیں۔ اس کے لئے یہ نہ کہا جاتا کہ افتراء کرے یا جھٹلائے لیکن قرآن میں ''او'' ہے جس کے معنی ہیں دونوں میں سے ایک بات یہ ہماری بیان کردہ تشریح کے زیادہ مطابق ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾

''اور جنہوں نے ہماری راہ میں جدوجہد کی، اُنہیں ہم اپنی راہوں پر لگاتے ہیں یقیناً اللہ اچھے کردار والوں کے ساتھ ہے''۔

یاد رکھنا چاہئے کہ تلوار وغیرہ کی جنگ جسے عام طور پر ''جہاد'' کہتے ہیں اور علم فقہ کی بھی اصطلاح ہے، وہ ''جہاد'' کے لفظ سے جس کے اصلی معنی جدوجہد ہی کے ہیں جو ہم نے ترجمہ کیا ہے، کوئی لازمی تعلق نہیں رکھتا، ہاں وہ اُس کے عمومی مفہوم کی ایک قسم ہے جب کہ وہ ناگزیر ہوجائے اور اس کے شرائط حاصل ہوں۔

---

[1] ممّن افترىٰ على الله كذبا اى ___ جحد بايات الله ___ او كذّب بالحق لما جاءهٗ من نبوّة محمّد صلى الله عليه وآله وسلم (تبيان)

سُوْرَۃُ الرُّوْمِ

مکّیہ ----٦٠---- آیات

چونکہ اس سورے میں شروع ہی میں رومیوں کی وقتی شکست کا حال اور پھر مستقبل قریب میں اُن کی فتح کی پیشین گوئی درج ہوئی ہے، اس لئے اس کا ''سورۂ روم'' نام ہوا، اس کے علاوہ قدرت کی نشانیوں پر ایک ایک کا نام لے کر مختصر مرقع کشی کے ساتھ نگاہوں کو متوجہ کرنے اور گذشتہ امتوں کے انجام پر متنبہ کر کے جو قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی طرح طرح کے انداز میں مذکور ہے، خاص چیز جس کی صاف صراحت کی گئی ہے، وہ اسلام کا دین فطرت ہونا اور اس کے تقاضوں کا ناقابل تبدیل ہونا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

الٓمّٓ ﴿١﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿٢﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿٣﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۭ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿٤﴾ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٥﴾ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦﴾

''الف۔لام۔میم۔روم والے قریبی سرزمین میں مغلوب ہو گئے اور وہ اپنے اس مغلوب ہونے کے بعد بہت جلد پھر غالب آجائیں گے چند ہی برس کے اندر، اللہ ہی کے ہاتھ میں معاملہ ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی اور اُس دن مسلمان خوش ہوں گے اللہ کی مدد سے وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہ عزت والا ہے، بڑا مہربان۔ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا مگر زیادہ تر لوگ جانتے نہیں''۔

روم والے عیسائی تھے جو اپنے اصول مذہب کے لحاظ سے مسلمانوں کے ساتھ زیادہ قرب رکھتے تھے اور فارس والے مشرک آتش پرست تھے، اس لئے ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کو شکست ہوئی تو مسلمانوں کو رنج ہوا۔ اُس وقت تسلی کے لئے یہ سورہ اور اُس کی یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں قرآن نے ایک غیب یعنی آیندہ کے متعلق اور وقت کی قید کے ساتھ کہ چند ہی سال میں ایسا ہوگا، یہ پیشین گوئی کی تھی جس پر اہلِ ایمان نے اُسی وقت یقین کر لیا ہوگا مگر منافقین اور مخالفین اسلام کے لئے فطری طور پر وہ ایک بڑا ہی حقانیت اسلام کی آزمائش یا

(نعوذ باللہ) اُسے غلط ثابت کرنے کا ایک سرمایہ مل گیا جس کی وجہ سے اُنہوں نے وہ آٹھ دس برس کی مدت دن گن گن کر گزاری ہوگی مگر دنیا کی تاریخ موجود ہے اور ہر ایک اب اس وقت بھی حساب لگا کر دیکھ سکتا ہے کہ اس سورے کے نازل ہونے سے اتنی ہی مدت کے بعد یہ واقعہ جس کی خبر قرآن نے دی تھی وقوع میں آ گیا اور اس طرح یہ آیت باعتبار اپنے اخبار بالغیب جس طرح اُس زمانے کے لوگوں کے لئے ایک برہان حقانیت تھی اُسی طرح آج بھی ہر محقق کے لئے وہ ایک برہان کی حیثیت رکھتی ہے۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝۷

''وہ جانتے ہیں بس دینوی زندگی کے سطحی پہلو کو اور وہ آخرت سے بے خبر ہیں''۔

دنیا کے معاملہ میں نکتہ رسی دین کے بارے میں بے خبری

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''یعنی ظاہر دنیا مین جس کا غلبہ دیکھیں، کہیں اللہ اُس سے خوش ہے'' (موضح القرآن)

مگر افسوس ہے کہ یہی ذہنیت مسلم اکثریت کی رہی اور یہ کہ قہر وغلبہ کو دلیل حقانیت سمجھ لیا۔

پھر اس ارشاد قرآنی کو ذرا وسیع دائرہ میں لے جایئے تو قرآن مجید جیسے ایک بڑی حیرت ناک ہی نہیں، عبرت ناک واقعیت پیش کر رہا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے ذہین مفکر، فلسفی جو کتنی فلسفہ کی گتھیاں سلجھا دیں اور دینوی معاملات میں بڑے نکتہ رس کاروباری دنیا کے ماہرین، وہ خدا اور روز آخرت کے بارے میں ایسی سطح پر آ جائیں کہ معمولی باتوں کو جنہیں عام عقل والے سمجھ سکتے ہیں، وہ کسی طرح سمجھانے سے بھی نہ سمجھیں اور آخرت سے بالکل بے خبر رہیں۔ اس مفہوم کو ہمارے پہلے کے بہت قدیم مفسرین نے بہت روزمرہ کی مثالوں سے واضح کیا ہے۔[1]

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۭ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝۸ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۹ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوا السُّوْٓآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا

---

[1] ای یعلمون من منافع الدنیا ومضارّها ومتی یزرعون و متی یحصدون و کیف یجمعون و کیف یبنون وھم جھّال بالاٰخوۃ فعمروا دنیاھم وخرّبوا اٰخرتھم عن ابن عباس (مجمع البیان)

يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾

''کیا انہوں نے اپنے دلوں میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو پیدا نہیں کیا مگر صحیح طور پر اور ایک مقررہ مدت کے لئے اور یقیناً زیادہ تر لوگ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضری سے منکر ہیں۔ کیا وہ اطراف زمین میں پھرے نہیں ہیں کہ دیکھیں کیا انجام ہوا اُن کا جو ان کے پہلے تھے۔ وہ ان سے زیادہ طاقت ور تھے اور اُنہوں نے زمین کو تہ و بالا کر دیا تھا اور اُس میں عمارتیں بنائی تھیں اُس سے زیادہ جتنی اُنہوں نے بنائی ہیں اور اُن کے پیغمبر اُن کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے تو اللہ ایسا نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرے مگر وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے، پھر جنہوں نے برائی کی تھی، اُن کا انجام بہت برا ہوا اس لئے کہ انہوں نے آیات الٰہی کو جھٹلایا اور وہ اُس کا مذاق اڑاتے تھے''۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾

''اللہ پہلے پہل پیدا کرتا ہے خلائق کو، پھر دوبارہ اُنہیں پلٹا کر لاتا ہے، پھر اُسی کی طرف تمہاری حاضری ہوگی اور جس دن قیامت برپا ہوگی تو گناہ گار لوگ دم بخود ہو جائیں گے اور نہ ہوں گے ان کے ''خیال کیے ہوئے'' شریکوں میں سے اُن کے کوئی سفارشی اور وہ اپنے شریکوں سے منکر ہوں گے اور جس دن قیامت برپا ہوگی اُس دن وہ الگ الگ ہو جائیں گے تو جو ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے، وہ ایک خاص بہشت میں خوش خوش ہوں گے اور جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور آخرت کی حاضری کو تو وہ عذاب میں حاضر کیے جانے والے ہوں گے''۔

''پہلے پہل پیدا کرتا ہے'' یہ تو پہلی زندگی اسی دار دنیا کی ہوگئی اور پھر ''انہیں پلٹا کر لاتا ہے'' یہ حیات بعد الموت ہے اور پھر اُس کی طرف تمہاری حاضری ہوگی یہ میدانِ محشر میں حساب و کتاب کے لئے لایا جانا ہے۔

اب چونکہ درمیان والی حیات بعد الموت کے بعد ثم ''پھر'' کے لفظ کے ساتھ جو ذرا فاصلے کا پتہ دیتا ہے بارگاہ الٰہی میں حاضری کا ذکر ہے، اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ درمیان والی زندگی کا ذکر قبر میں سوال و جواب کے لئے زندہ کیے جانے سے متعلق ہے [1] اور ممکن ہے کہ وہ وہی

---

[1] یجوز ان المراد بہ احیاؤھم فی القبر للمسئالۃ (تبیان)

زندگی ہو جو حشر ونشر کے ہنگام میں قبروں سے برآمد ہونے کی صورت میں ہوگی اور ''پھر'' اس کی طرف تمہاری حاضری ہوگی'' یہ موقف حساب وکتاب میں کھڑا ہونا ہے جس کے بعد جزا وسزا کی منزل ہے [1] اور ان دونوں میں فاصلہ زمانہ کے لحاظ سے چاہے نہ ہو لیکن نوعیت کے فرق کی وجہ سے بیچ میں ثُم کہا گیا ہے جو بعض مقامات پر صرف ذکر میں ترتیب کے لئے بھی آتا ہے جس کی نظیریں بہت ہیں۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ سن چکے۔ اب اس کے بعد یہ سنو۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

''تو تسبیح ہے اللہ کی جب تم شام کرتے ہو اور جب صبح کرتے ہو اور اُسی کی حمد ہے آسمانوں اور زمین میں اور رات گئے اور جب تمہیں دوپہر کا وقت ہوتا ہے''

اوقات نماز کی طرف اشارہ

اس آیت میں نماز پنج گانہ کے اوقات کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے:۔

مراد آنست کہ در ہر وقتی از ایں اوقات دلائل تنزیہ او از رذائل و اتصاف او بحمائد متجدد می گردد پس مامور شدند بصلٰوۃ.

مقصود یہ ہے کہ ان اوقات میں سے ہر ایک میں تمام برائیوں سے اُس کے بری ہونے اور تمام خوبیوں سے اس کے متصف ہونے کے ثبوت تازہ ہوتے رہتے ہیں لہٰذا اُن میں نماز کا حکم ہوا۔

اس صورت میں یہ بات قابل لحاظ ہے اس میں حِيْنَ تُمْسُوْنَ نماز صبح اور عشیئا نماز عشاء چونکہ وقت فضیلت اُس کا بلاشبہ تاخیر کے ساتھ ہے، بس اُس کے بعد ایک لفظ ہے حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ جس میں فقہ اہل بیتؑ کے مطابق ظہر وعصر دونوں کا وقت آجاتا ہے لیکن اگر اسے نہ مانا جائے اور عصر کے وقت کو ظہر سے جدا قرار دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آیت صرف چار نمازوں کو بتا رہی ہے۔ پانچویں کا ذکر ہی نہیں ہے۔

اس کے لئے بعض مفسرین نے یہ عجیب ستم ظریفی کی ہے کہ عشیئا سے مراد عصر لے لی ہے اور تُمْسُوْنَ میں مغرب اور عشاء دونوں کو درج کیا ہے [2] مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عشاء کا وقت دن ختم ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ دن کے آخری حصے میں نہیں ہے پھر یہ کہ خواہ تُظْهِرُوْنَ سے ظہر وعصر دونوں مراد ہوں اور خواہ تُمْسُوْنَ سے مغرب وعشاء دونوں مراد لی جائیں دونوں باتیں فقہ اہل بیتؑ ہی کے لحاظ سے درست ہوتی ہیں کہ اصل وقت ظہر وعصر کا بھی ایک ساتھ شروع ہوتا ہے، صرف ترتیب لازم ہے اور اصل وقت مغرب اور عشاء کا بھی اسی طرح ایک ساتھ ہوتا ہے۔ فقہ اہل سنت کے لحاظ سے نہ ظہر کے ساتھ عصر کا وقت آتا ہے، نہ مغرب کے ساتھ عشاء کا بلکہ درمیان درمیان فاصلہ ہے تو وہاں ظہر وعصر کو ایک لفظ کے

---

[1] یعیدھم بعد الموت احیا کما کانو اثمّ الیہ یرجعون یجازیہم باعمالھم (مجمع البیان)

[2] حین تمسون فیہ صلوتان المغرب والعشا ___ وعشیّا فیہ صلوۃ العصر (جلالین)

ساتھ بیان ہونا چاہئے نہ مغرب اور عشاء کو بلکہ سب کا بیان الگ الگ ہونا چاہئے حالانکہ قرآن مجید میں کہیں ایسا نہیں ہے۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾

''وہ نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے اور نکالتا ہے بے جان کو جاندار سے اور وہ زندہ کرتا ہے زمین کو اُس کے مردہ ہونے کے بعد اور اسی طرح تم بھی نکالے جاؤ گے، اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک دم تم چلتے پھرتے ہوئے انسان ہو گئے اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تمہارے لئے تمہارے نفوس سے جوڑے قرار دیئے تا کہ سکون حاصل کرو تم اُن سے اور اُس نے تمہارے درمیان محبت اور مہربانی قرار دی یقیناً اُس میں نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو غور و فکر کریں اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے پیدا کرنا آسمانوں اور زمین کا اور مختلف ہونا ہے تمہاری زبانوں اور رنگوں کا یقیناً اُس میں نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لئے اور اُس کی نشانیوں میں سے تمہارا سونا ہے رات اور دن میں اور تمہارا روزی طلب کرنا ہے اس میں، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو سنیں اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ دکھاتا ہے تمہیں بجلی ڈر اور آسرے کے لئے اور آسمان سے پانی برساتا ہے تو اُس سے زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد، یقیناً اس میں

نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو عقل سے کام لیں اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اُس کے حکم سے برقرار ہیں اور پھر جب تمہیں ایک دفعہ زمین کے اندر سے وہ بلائے گا تو ایک دم تم نکل کھڑے ہو گے اور اُس کے ہیں سب لوگ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب اُس کی اطاعت کرنے والے ہیں اور وہ ہی وہ ہے جو پہلی دفعہ خلائق کو پیدا کرتا ہے۔ پھر دوبارہ زندہ کرے گا اور وہ اُس کے لئے بہت آسان ہے اور اُس کے لئے بلند ترین وصف ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہ عزت والا ہے، حکمت والا''۔

قدرت الٰہی کی نشانیوں میں زبانوں کے اختلاف کے بیان سے ایک تصور ذہن میں یہ آتا ہے کہ سوا اُن زبانوں کے جو باہمی میل جول سے بنی ہیں جیسے اردو، باقی جو اصل زبانیں مختلف ملکوں کی ہیں وہ شروع شروع قدرتی طور پر من جانب اللہ پیدا ہوئی ہیں، پھر ان میں رفتہ رفتہ ترقی انسانوں کی کارگزاری سے ہوئی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قدرت کی طرف سے مختلف ملکوں کے زبان و دہن کی ساخت اُن زبانوں میں دخل رکھتی ہو۔[1]

''سونا ہے رات اور دن میں اور تمہارا روزی طلب کرنا اُس میں'' بظاہر یہ آخر والی ضمیر نہار یعنی دن کی طرف راجع ہے، چونکہ کاروبار تجارت اور زراعت کا فطری موقع دن ہوتا ہے لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ جیسے سونے کا عمومی وقت رات کا ہوتا ہے لیکن دن کو بھی آدمی سو رہتا ہے، اُسی طرح تحصیل معاشی کا عام وقت دن ہے لیکن رات کے کچھ حصے میں بھی یہ کام ہوتا ہے۔[2]

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۹﴾

''اُس نے تمہارے لئے مثال پیش کی ہے خود تمہاری، کیا تمہارے جو ملکیت میں غلام ہیں اُن میں سے کچھ اُس دولت میں جو ہم نے تم کو دی ہے تمہارے ساتھ حصہ دار ہیں کہ تم سب اس میں برابر کا حق رکھتے ہو اور تم اُن سے اس طرح ڈرو جس طرح اپنے آپس کے آدمیوں سے ڈرتے ہو؟ اس طرح ہم باتیں تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیں بلکہ جو ظالم ہیں، انہوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے بغیر واقفیت کے تو کون ہدایت کرسکتا ہے اس کی جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے اور اُن لوگوں کے لئے کوئی مددگار نہ ہوں گے''۔

پیش کردہ مثال کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہارے غلام تمہارے اموال میں برابر کے حصہ دار نہیں ہیں تو اللہ کے بندوں کو تم اس کے

---

[1] ان کانت اللغات توقیضیة فهو الذی فعلها وان کانت مواضعة من قبل العباد فهو الذی یسرها (مجمع البیان)

[2] قیل انّ اللّیل والنّهار معاً وقت النّوم دوقت ابتغاء الفضل (مجمع)

قلم رور بوبیت میں اُس کے شریک کیوں مانتے ہو اور خدائی کا درجہ کس لئے دیتے ہو؟ [1]

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۙ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٣١﴾ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿٣٢﴾

''تو اپنا رخ سیدھا رکھو دین حق کے لئے سب راستوں سے ہٹ کر، اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، یہی سیدھا دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں۔ اُس سے لو لگائے رہو اور اُس سے ڈرو اور نماز پڑھتے رہو اور مشرکوں میں سے نہ ہو، اُن میں سے جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈال دیا اور وہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ہر جماعت اُس سے جو اُن کے پاس ہے خوش ہے۔''

اسلام کا دین فطرت ہونا

''خوش ہے'' یعنی اُس کیش کو جسے وہ بطور ''دین'' اختیار کئے ہوئے، سچا سمجھتے ہیں۔ [2]

یہ سمجھنا اگر فطری طور پر قصور ذہن کا نتیجہ ہوتا تو قابل معافی تھا جیسا کہ مجنون مرفوع القلم ہوتا ہے لیکن چونکہ اس میں ذہنی تساہلی اور فرض تحقیق کے انجام دینے میں کوتاہی کارفرما ہے لہٰذا وہ باعث معذوری نہیں ہے۔

وَإِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا أَذَاقَهُمْ مِنْهُ رَحْمَةً إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٣٤﴾ أَمْ أَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوا بِهِ يُشْرِكُونَ ﴿٣٥﴾

''اور جب لوگوں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اپنے پروردگار سے لو لگاتے ہوئے اُس سے دعا کرتے ہیں، پھر جب وہ اپنی طرف سے اُنہیں کچھ مہربانی کا مزہ چکھاتا ہے تو اُن میں سے ایک فریق ایک دم شرک کرنے لگتا ہے تاکہ جو

---

[1] المعنی انکم اذلم ترضوا العبید کم ان یکونوا شرکآء لکم فی اموالکم واملاککم فکیف ترضون لربکم ان یکون لہ شرکآء فی العبادۃ (مجمع البیان)

حاصل مثل ایں است کہ مملوک یا مالک برابر نمی شود پس مملوک خدا را شریک او نتواں گفت (فتح الرحمٰن)

[2] کل فریق بدینہم معجبون مسرورون یظنون انہم علیٰ حق (مجمع البیان)

ہم نے اُنہیں عطا کیا ہے، اُس کا کفرانِ نعمت کریں تو اچھا فائدہ اٹھالو، اس کے بعد تمہیں معلوم ہوگا۔ کیا ہم نے اُن پر کوئی ثبوت اُتارا ہے کہ وہ اُن کے سامنے بولتا ہو، اُس کے ساتھ جو وہ شرک کرتے ہیں''۔

''شرک اعتقادی'' نہ سہی تو ایک طرح کا شرک عملی اُس کی اطاعت کو چھوڑ کر شیطان کی اطاعت کرنا یا نفسانی خواہش کی پیروی کرنا بھی ہے جسے دوسری جگہ قرآن مجید میں ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ: مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ''جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنایا'' اس معیار پر جا پہنچے تو جو کردار قرآن نے ان آیتوں میں اور متعدد جگہ قرآن میں اور بھی، مشرکین کا پیش کیا ہے، وہ مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ ''مومنین کرام'' میں بھی نظر آتا ہے یا نہیں؟

جب تک لڑکی کی شادی نہیں ہو رہی تھی، خدا یاد تھا، دعائیں اُس سے مانگی جا رہی تھیں اور جب ماشاء اللہ وہ دن آیا اور فضلِ خدا سے شادی کا ہنگام آیا تو اب خدا سے مطلب نہیں۔ وہ باتیں اب کی جا رہی ہیں جو اُسے ناراض کرنے والی اور شیطان کو خوش کرنے والی ہیں۔ گانا بجانا اور ناچ رنگ اور وہ بھی رات بھر اب شیطان ہی شیطان ہے، خدا کا نام نہیں۔ یہ کیا اسلام اور ایمان کا تقاضا ہے؟

اس ناشکرے پن پر اُس نے تہدیدی انداز میں کہا ہے کہ ''اس کے بعد تمہیں معلوم ہوگا''۔[1]

اب ہوسکتا ہے اسی دنیا میں معلوم ہو جائے کہ کفرانِ نعمت کے نتیجہ میں سلب نعمت ہو جائے اور شادی ''ناشادی'' سے بدل جائے اور خواہ آخرت میں معلوم ہو، جب وہاں کا عذاب سامنے آئے۔

اب خدا کی نعمتوں کے مقابلہ میں یہ کردار اگر اجتماعی طور پر پوری قومِ مسلم نے اختیار کیا ہے تو اُس کے نتائج بھی سلب نعمت کی صورت میں پوری قوم کے سامنے آئیں گے، چاہے اُس پر اب کتنے ہی دردمندانہ انداز میں ''شکوہ'' کیا جائے مگر پھر ''جواب شکوہ'' بھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود ہی دینا پڑے گا۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

''اور جب ہم چکھاتے ہیں لوگوں کو مہربانی کا ذائقہ تو وہ اُس سے خوش ہو جاتے ہیں اور جو کچھ وہ اپنے ہاتھوں کر چکے ہے، اُس کی پاداش میں اُن پر کوئی مصیبت آتی ہے تو ایک دم وہ نا اُمید ہو جاتے ہیں، اور کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ وسعت دیتا ہے روزی میں جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگی کرتا ہے (جس کے لئے چاہتا ہے) یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو ایمان لائیں۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ

---

[1] ای فانتفعوا بهذه النّعم الدنیویة کیف شئتم فسوف تعلمون ما فیه من کفرکم و معصیتکم (مجمع البیان)

وَجْهَ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾

''تو قرابت دار کو اُس کا حق دیجئے اور مسکین اور مسافر کو، یہ بہتر ہے اُن لوگوں کے لئے جو رضائے الٰہی کے طلب گار ہوں اور یہی لوگ ہر طرح کی بہتری پانے والے ہیں''۔

وہ ارشاد الٰہی جس کی بنا پر فدک ہبہ کیا گیا

روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت مستقل طور پر حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے اتری ہے اور اُس کے اترنے کے بعد حضرتؐ نے فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو بلا کر فدک ہبہ فرمایا تھا، یہ روایت فریقین کے یہاں متفقہ حیثیت سے موجود ہے۔

بے شک بعد کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ قرابت داروں، محتاجوں اور مسافروں کو یہ عطا کرنے کا حکم ہے سب ہی کے لئے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس پر عمل کرنا اپنی جانب سے اُس کی عملی مثال قائم کرنے کے لئے تھا۔ اس طرح اُس کی دوسری تفسیر بھی جو عموم کا پتہ دیتی ہے [1] اس متفق علیہ روایت کے خلاف نہیں ہے۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور جو تم لوگ سودی روپیہ دوتا کہ وہ لوگوں کے مال میں مل کر اضافہ پائے تو وہ اللہ کے یہاں اضافہ کا باعث نہیں ہوگا اور جو تم زکوٰۃ دو جس سے اللہ کی خوشنودی چاہتے ہو تو یہ وہ لوگ ہوں گے جو دونا دون پائیں گے''۔

سود میں خسارہ اور زکوٰۃ میں فائدہ

انسان سود کھاتا ہے اس لئے کہ مال و دولت میں اضافہ ہو اور اللہ کی طرف کے حقوق مالیہ زکوٰۃ و خمس دینے سے اس لئے گریز کرتا ہے کہ اس سے مال میں کمی ہوگی مگر خالق ارشاد فرماتا ہے کہ اس سود سے چاہے اس دنیا میں کچھ دولت بڑھ بھی جائے مگر اللہ کے یہاں اُس میں خسارہ ہی خسارہ ہے اور اس زکوٰۃ و خمس سے مال میں وقتی طور پر کمی ہو جاتی ہے مگر نتیجہ میں اس سے دونا دون اضافہ ہی ہوتا ہے کہ اس دنیا میں بھی مال میں برکت ہوتی ہے اور خدا کے یہاں ثواب تو اتنا گنا ملتا ہے کہ انسان اُس کی حد ہی مقرر نہیں کر سکتا اس لئے حدیث میں ہے:۔ ما نقص مال من صدقة (مجمع البیان) کسی مال میں خیرات سے کمی نہیں ہوتی۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾

''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں روزی دی، پھر تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ کیا

---

[1] قیل انه خطاب له ﷺ ولغیره والمراد بالقربیٰ قربی الرّجل وهو امر بصلة الرحم بالمال والنفس عن الحسن (مجمع البیان)

تمہارے (مانے ہوئے) شریکوں میں کوئی ہے جو اس میں سے کچھ بھی کام انجام دے؟ پاک ہے اس کی ذات اور بلند ہے اُس سے جو وہ شرک کرتے ہیں''؟

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾

''خرابی نمایاں ہوگئی ہے خشکی اور تری میں اُن کاموں سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کیے تا کہ وہ چکھائے اُنہیں کچھ اُن کے اعمال کا مزہ شاید کہ وہ پلٹیں'' یعنی توبہ کریں۔[1]

لوگوں کے اعمال سے دو (۲) طرح خشکی اور تری میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ایک یہ کہ اُن کی بداعمالیوں کے نتیجہ میں تنبیہی طور پر زلزلے اور طوفان وغیرہ آئیں یا زراعتوں کی تباہی اور قحط سالی کا دور دورہ ہو۔[2]

دوسرے اُس طرح جس کا تجربہ آج دنیا کو ہو رہا ہے کہ لوگوں کی نفع اندوزی کی ہوس سے اجناس کی کمی ہو جائے۔ریلوں کے ڈرائیور اور جہازوں کے کپتان وغیرہ ادائے فرائض میں کوتاہی سے اکثر لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ ﴿٤٢﴾ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ ﴿٤٣﴾ مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِأَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ ﴿٤٤﴾ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْ فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ﴿٤٥﴾

''کہئے کہ چلو پھر وزمین میں، پھر دیکھو کہ کیا انجام ہوا اُن کا جو اس کے پہلے تھے؟ وہ زیادہ تر مشرک تھے، تو تم اپنا رُخ سیدھا رکھو صحیح دین کے لئے قبل اس کے کہ وہ دن آئے اللہ کی طرف سے جسے پلٹنا نہیں ہے، اُس دن وہ الگ الگ ہو جائیں گے، جو کفر اختیار کرے، اُس کفر سے نقصان اُسی کو ہوگا اور جو اچھے اعمال کرے تو وہ لوگ خود اپنے لئے سامان کر رہے ہیں تا کہ وہ انہیں جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کرتے رہے اپنے فضل و کرم سے صلہ دے اور یقیناً وہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا''۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يُرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ وَلِيُذِيقَكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَلِتَجْرِيَ

---

[1] یتوبون (جلالین)

[2] قبل بالعدل ینبت اللہ الزرع ویدر الضرع وبالظلم یکون القحط وضیق الرزق (تبیان)

الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو خوش خبری دینے والی بنا کر اور اس لئے کہ چکھائے تمہیں مزہ اپنی رحمت کا اور اس لئے کہ چلیں کشتیاں اُس کے حکم سے اور اس لئے کہ تم اس کے فضل و کرم سے روزی حاصل کر سکو اور شاید تم شکر گزار ثابت ہو''۔

اس میں ہواؤں کے جتنی قسم کے نمایاں فائدے ہیں، اُن کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ہواؤں کا خوش خبری دینا زبان سے نہیں ہوتا بلکہ چونکہ اُن کی رفتار سے بارش کی اُمید پیدا ہوتی ہے، اس لئے اُن کی طرف خوش خبری کی نسبت دی گئی ہے، جس طرح اپنے ارادہ خاص سے اُن کے چلانے کو بھیجنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔[1]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

''اور ہم نے بھیجے آپ کے قبل بہت سے پیغمبر اُن کی قوم کی طرف تو وہ اُن کے پاس معجزے لائے تو جو گناہ گار ثابت ہوئے، اُن سے ہم نے بدلا لیا اور ایمان والوں کی مدد کرنا ہمارے ذمے ایک لازم الادا حق تھا''۔

اللہ پر بتقاضائے عدل واجب ہونا

جن کا تصور یہ ہے کہ اللہ پر کسی امر کو واجب کہنے کا مطلب اُس کی قدرت کو محدود کرنا ہے، وہ خود اللہ سبحانہ کے اس ارشاد پر توجہ کریں کہ كان حقا علينا نصر المؤمنين جس کا بالکل تحت اللفظی مگر مطلب خیز ترجمہ یہی ہوتا ہے جو میں نے کیا ہے کہ ایمان والوں کی مدد کرنا ہمارے ذمے ایک لازم الادا حق تھا''[2] اب اس مطلب کو چاہے کوئی کسی زبان میں ادا کرے مگر عربی میں علی کا لفظ لازمی ذمہ داری ہی کا پتہ دیتا ہے تو کسی بھی نقطہ نظر والے کو اس وجوب ولزوم کے پہلو کا چھوڑنا ممکن ہی نہیں ہے۔[3] مگر یہ وجوب ولزوم کسی دوسری بالا دست طاقت کی طرف سے نہیں ہے تاکہ اس کی قدرت قاہرہ اور ربوبیت مطلقہ کے خلاف ہو بلکہ یہ اس کے تقاضائے عدل وحکمت کی بنا پر اور کمال ذات وافعال کا نتیجہ ہے۔ یہی مطلب یہ کہنے کا ہے کہ اللہ پر عدل واجب ہے، تکلیف بلا بیان یا تکلیف مالا یطاق ناممکن ہے۔ اس کے معنی قدرت کی نفی کے نہیں ہیں بلکہ تقاضائے کمال ذاتی کے اظہار کے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ

---

[1] فكانّها نا طقات باللّسان لما فيها من الدّلالة عليه وارسال الرّياح تحريكها واجراؤها فى الجهات المختلفة (مجمع البيان)

[2] اى اوجبنا على انفسنا ان ننصر المؤمنين من عبادنا (تبيان)

[3] كان واجبا علينا نصرهم باعلاء الحجّة ودفع الاعداء عنهم (مجمع البيان) بود نصرت مسلمانان لازم بدما (شاہ ولی اللہ) تھا لازم اوپر ہمارے (شاہ رفیع الدین)

كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ
اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ
لَمُبْلِسِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ
ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾ وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ
مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾

''اور وہ وہ ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے تو وہ بادل کو لاتی ہیں، اس کے بعد اُسے آسمان میں جس طرح چاہتا ہے پھیلا دیتا ہے اور اسے مختلف ٹکڑوں کی شکل میں لاتا ہے تو بڑی بڑی بوندوں کے مینھ کو دیکھو گے کہ وہ اس کے اندر سے نکلتا ہے تو جب وہ اُسے پہنچاتا ہے جس حد تک اپنے بندوں میں سے وہ چاہتا ہے تو وہ ایک دم خوش ہو جاتے ہیں، اگرچہ وہ اس سے پہلے کہ یہ اُس کی طرف سے اُن پر اترے، ناامید تھے تو دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کو کس طرح وہ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد، یقیناً وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ تو ہر چیز پر قادر ہے اور اگر ہم ایسی ہوا بھیج دیں کہ وہ اُس (کھیتی) کو زرد دیکھیں تو اس کے بعد وہ کفر اختیار کریں گے''۔

حیات بعد الموت کے لئے قرآن مجید جو مثالیں پیش کرتا ہے، وہ بھی اُن غیر اسلامی جزا و سزا کے تصورات کو ختم کرنے کے لئے کافی ہیں جو آج کل کے بعض مادیت یا بخیال خود ''عقلیت'' کے پرستار دعویدارانِ اسلام حشر و نشر کے بارے میں قرآن مجید کے سر منڈھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۲﴾ وَمَآ اَنْتَ
بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۵۳﴾

''تو یقیناً آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہیں جب وہ پیٹھ پھیر کر منحرف ہوں اور نہ آپ اندھوں کو اُن کی گمراہی سے ہٹا کر راستے پر لگا سکتے ہیں، آپ تو نہیں سنا سکتے مگر اُنہیں جو ہماری آیتوں کا اعتبار کریں تو وہی اسلام قبول کرتے ہیں''۔

ظاہر ہے کہ حضرت کوئی قبرستانوں میں جا کر واقعی مردوں کو تو آواز دیتے نہیں تھے، آپ تو جیتے جاگتے لوگوں ہی کو دعوت حق دیتے تھے مگر چونکہ کفار و مشرکین آپ کے کلام کو توجہ سے نہیں سنتے اس لئے بطور استعارہ اُن کی تعبیر مردوں سے کی گئی جس کی نظیر قرآن مجید میں دوسری جگہوں پر بھی موجود ہے اور اسی لحاظ سے اُنہیں بہرا اور اندھا بھی کہا گیا ہے۔[1]

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ

---

[1] شبه الكفّار لترك تاثّرهم فيما يدعوهم اليه النبي ﷺ تارة بالاموات وتارة بالصّمّ (مجمع البيان)

بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ﴿۵۴﴾

''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا کمزور، پھر کمزوری کے بعد طاقت دی، پھر طاقت کے بعد کمزوری اور بڑھاپے کا دور قرار دیا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ بڑا جاننے والا ہے، قدرت والا''۔

یہاں بقرینۂ سیاق ''جو چاہتا ہے'' سے انواع مخلوقات مراد نہیں بلکہ گونا گوں کیفیات مراد ہیں۔[1]

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۚ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾

''اور جس دن قیامت بپا ہوگی، گنہ گار لوگ قسمیں کھائیں گے کہ وہ تھوڑی دیر سے زیادہ نہیں رہے، ایسے ہی وہ تو (پہلے بھی) بے راہ روی میں مبتلا تھے اور کہیں گے وہ جنہیں علم اور ایمان عطا ہوا تھا کہ تم اللہ کے نوشتے کے مطابق دوبارہ کی زندگی تک اس عالم میں رہے چنانچہ یہ وہ دوبارہ کی زندگی کا دن ہے مگر تم جانتے نہیں تھے تو اُس دن ظالموں کو اُن کی عذر خواہی کچھ فائدہ نہ دے گی اور نہ اُنہیں تلافی کا موقع دیا جائے گا''۔

دور برزخ کا قیامت میں فراموش ہونا

دور برزخی میں ایک طرح کی زندگی ثابت ہے اور یہ برزخ والا دور وہی ہے جو موت کے بعد سے قیامت کی دوبارہ زندگی تک ہے مگر قرآن مجید کی اس آیت اور اس مضمون کی دوسری آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور کی زندگی کا آیندہ کے دورِ حیات سے جو قیامت میں ہوگا کوئی ربط نہیں ہے یعنی جو کچھ اس درمیانی دور میں ہوا، وہ اُس وقت یاد نہیں ہوگا کہ جب قیامت میں اُٹھیں گے، اُنہیں بالکل احساس نہیں ہوگا کہ اس سے پہلے کس عالم میں تھے۔[2]

بے شک جو دار دنیا کی پہلی زندگی ہی میں جانتے اور مانتے تھے کہ موت آئے گی اور پھر برزخ ہوگا اور پھر قیامت میں حیات ثانیہ ہوگی، وہ اپنے اُنہیں معتقدات کی روشنی میں حقیقت کا انکشاف کر سکیں گے کہ ہمیں تو پہلے سے قدرت کا پروگرام معلوم تھا کہ مرنے کے بعد قیامت تک عالم برزخ میں رہنا پڑے گا اور پھر تمام اہل دنیا کی عمر ختم ہونے کے بعد قیامت کا دن ہے جس دن تازہ زندگی ہوگی تو یہ وہی قیامت کا دن ہے جس کی ہمیں پہلے سے خبر تھی مگر تم نے پہلے ہی اس علم کو حاصل نہ کیا تھا، اس لئے آج تم یہ جہالت کی باتیں کر رہے ہو۔

بعض مفسرین نے اس کو دور برزخی سے متعلق قرار ہی نہیں دیا ہے بلکہ یہ مطلب قرار دیا ہے کہ آخرت کی سختیاں دیکھ کر وہ دنیا کی زندگی کو

---

[1] مایشآء من ضعف وقوۃ (مجمع البیان)

[2] مالبثوا فی القبور (جلالین) یعنی قبر کا رہنا تھوڑا معلوم ہوگا (موضح القرآن)

یاد کریں گے کہ افسوس وہ کتنی مختصر تھی۔[1] مگر میرے خیال میں بہ ظاہر قرآن کے خلاف ہے اور اہل علم و ایمان کا جو جواب درج کیا گیا ہے، وہ بھی اس کے ساتھ چسپاں نہیں ہے۔

بے شک اس قسم کی آیات سے عالم برزخ والے عذاب کا سمجھنا مشکل ہے، اس لئے کہ یہ آیات اُس دور میں بالکل بے خبری کا پتہ دیتی ہیں اور ظاہر ہے کہ عذاب میں بغیر شعور و احساس کے کوئی معقولیت نہیں ہے، اس لئے بعض اہل فکر نے اِن آیات سے عذاب برزخ کی نفی پر استدلال کیا ہے مگر اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ عذاب قبر تو میعادی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے اُس میعاد کے ختم ہونے کے بعد اُن پر بے حسی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور یہ سوال و جواب اُس بے حسی کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کے موقع کا ہے لہٰذا اس میں اور عذاب قبر میں کوئی منافات نہیں ہے۔[2]

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۶۰﴾

''اور ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال پیش کی ہے اور اگر آپ اُن کے پاس کوئی بھی معجزہ لائیے تو کافر لوگ ضرور یہی کہیں گے کہ تم لوگ نہیں ہو مگر غلط راستے پر، اسی طرح اللہ مہر کرتا ہے ان لوگوں کے دلوں پر جو جانتے بوجھتے نہیں تو آپ صبر و تحمل سے کام لیجیے یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور آپ کو جوش میں نہ لائیں وہ جو یقین نہیں کرتے''۔

---

[1] من استدل بهٰذه الاٰية على نفى عذاب القبر فقد ابعد الما تيّنا انّه يجوز ان يريد وا انّهم لم يلبثوا بعد عذاب الله الا ساعته (مجمع البيان)

[2] من استدلال بهذا الاية على نفى عذاب القبر فقد العبد لما تيّنا انّه يجوز ان (مجمع البيان)

سُوْرَةُ لُقْمٰنَ

مکّیہ ----۳۴----آیات

چونکہ جناب لقمان علیہ السلام کا ذکر خاص اسی سورے میں ہے، اس لئے اس کا نام اُن کے نام پر ہوا۔

سورۂ لقمان کے خاص خاص مضامین:

۱۔''لہوالحدیث'' کی حرمت جس کی تفسیر غنا یعنی گانے کے ساتھ ہوئی ہے۔

۲۔جناب لقمان کے مواعظ ونصائح۔

۳۔ادائے شکر کے حکم میں اللہ کے ساتھ والدین کا ذکر۔

۴۔مخالفت پروردگار میں والدین کی اطاعت حرام، پھر بھی حسن سلوک کی ہدایت۔

۵۔کلمات الٰہی کی کثرت ووسعت۔

۶۔غیب کی اُن باتوں کا ذکر جن کا علم بس اللہ کو ہے۔وغیرہ وغیرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

الٓمّٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ② هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ③ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ④ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ⑤

''الف۔لام۔میم۔ یہ آیتیں ہیں حکمت بھری کتاب کی۔ ہدایت اور رحمت اچھے اعمال والوں کے لئے جو نماز پڑھتے، زکوٰۃ دیتے اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، یہ لوگ سیدھے راستے پر ہیں اپنے پروردگار کی طرف سے اور یہ لوگ ہر طرح کی بہتری پانے والے ہیں''۔

ان ابتدائی آیات کا مضمون سورۂ بقرہ کے ابتدائی آیات میں آچکا ہے اور اس کی تشریح وہاں کی جا چکی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ

وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝٦ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٧

''اور انسانوں میں ایسا شخص بھی ہوتا ہے جو تفریحی باتوں کا خریدار ہے تا کہ اللہ کے راستے سے بغیر واقفیت کے بھٹکائے اور اُس کا مذاق اڑائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے اور جب اُس کے سامنے ہماری آیتیں پیش ہوتی ہیں تو وہ منہ موڑتا ہے تکبر سے کام لیتا ہوا جیسے کہ اُس نے سنا ہی نہیں، جیسے کہ اس کے کانوں میں گرانی ہے تو اسے خوشخبری دو نادون عذاب کی''۔

حرمتِ غناء

لھو الحدیث جس کا ترجمہ ہم نے ''تفریحی باتوں'' کے ساتھ کیا ہے، اُس کی تفسیر گانے بجانے اور شراب خواری وغیرہ کے ساتھ ہوئی ہے زیادہ قوت اسی کو ہے کہ اُس سے مراد غِنَاء یعنی گانا ہے۔[1]

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۝٨ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٩ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝١٠ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝١١

''یقیناً وہ جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کرتے رہے، اُن کے لئے آرام والے بہشت ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہے اور وہ عزت والا ہے، حکمت والا، اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر کسی ستون کے جسے تم دیکھو اور زمین میں اس نے پہاڑوں کو رکھا کہ وہ تمہیں لئے ہوئے ڈانواڈول نہ ہو اور اس میں ہر طرح کے چلنے پھرنے والے پھیلا دیے اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا تو اس سے ہم نے ہر قسم کی چیزیں اگائیں۔ یہ تو ہے اللہ کی تخلیق۔ اب تم مجھے دکھاؤ جو اس کے علاوہ دوسروں نے پیدا کیا ہو بلکہ ظالم لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں''۔

''بغیر کسی ستون کے جسے تم دیکھو'' اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اتنے بڑے آسمانوں کے لئے کوئی ستون ہوتا تو وہ تمہیں دکھائی دیتا، جب تمہیں دکھائی نہیں دے رہا ہے تو یقین جانو کہ اس نے بغیر کسی ستون کے صرف اپنی قدرت سے اسے بلند کیا ہے اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ

---

[1] اکثر المفسّرین علیٰ انّ المراد بلھو الحدیث الغنآء وھو قول ابن عباس وابن مسعود وغیر ھما وھو المرویّ عن ابی جعفر وابی عبداللہ علیہما السلام (مجمع البیان)

اس میں ایسے ستون نہیں ہیں جو تمہیں دکھائی دیں۔ اس میں ستون ویسے ہیں جو تمہیں دکھائی نہیں دیتے۔ علامہ طبرسیؒ نے پہلے مفہوم کو ترجیح دی ہے مگر وجہ ترجیح کچھ درج نہیں فرمائی۔ [1]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾

''اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی کہ اللہ کا شکر ادا کرو اور جو شکر ادا کرے گا وہ اپنے لئے اور جو کفرانِ نعمت کرے گا تو بلاشبہ اللہ بے نیاز ہے قابل تعریف''۔

جناب لقمان کے بارے میں اختلاف ہے، بعض اُن کو نبی کہتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ وہ نبی نہ تھے اللہ کے بس ایک نیک بندے تھے جنہیں اللہ نے خاص دانش مندی کا جوہر عطا کیا تھا۔ [2]

قرآن مجید کا انداز بیان کہ ''ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی'' اور پھر ان کے ساتھ ایک طرح کا تخاطب جو وحی کا انداز رکھتا ہے، ذہن میں نبوت کے تصور کو تقویت دیتا ہے۔ علامہ طبرسیؒ نے اور بھی اقوال درج کیے ہیں اور ایک حدیث نبوی بھی کہ وہ نبی نہیں تھے مگر یہ حدیث کسی معتبر سند کے ساتھ نہیں ہے۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾

''اور جب لقمان نے اپنے بیٹے سے نصیحت کرتے ہوئے کہا اے بیٹے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے''۔

آغاز وصایائے لقمانؑ

یہاں سے حضرت لقمان کی وصیتیں شروع ہو رہی ہیں اور یہ وہی پیغام توحید ہے جو تمام انبیاء کا پیغام رہا ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۫ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾

''اور ہم نے انسان کو اُس کے ماں باپ کے بارے میں ہدایت کی جس کو اس کی ماں نے بزمانۂ حمل اٹھایا دُہری

---

[1] الصّحیح الاوّل (مجمع البیان)

[2] قال ابن عباس و مجاهد و قتادة لم یکن لقمان نبیّا و قال عکرمة کان نبیّا (تبیان)

دُہری تکلیفوں کے ساتھ اور دو برس میں اس کی دودھ بڑھائی ہوئی کہ میرا اور اپنے ماں باپ کا شکر گزار رہنا، میری ہی طرف تو آخر میں پلٹنا ہے اور اگر وہ تجھ سے کوشش کے ساتھ یہ چاہیں کہ میرے ساتھ شریک کرا اُسے جس کا تجھے کوئی علم نہیں ہے تو ان کا کہنا نہ ماننا اور دنیا میں اُن کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے رہنا اور پیروی اُن کے راستے کی کرنا جنہوں نے مجھ سے لو لگائی، پھر میری طرف تم لوگوں کو پلٹنا ہے تو میں تمہیں بتلاؤں گا جو تم کرتے تھے"۔

حقوق والدین میں ماں کے حق پر خصوصی زور

یہ آیات اگر تنزیل میں بھی اس طرح وارد ہوئیں تھیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جناب لقمان علیہ السلام کی گفتگو کا تذکرہ چھیڑ کر خالق نے بیچ میں بطور جملۂ معترضہ کے حقوق والدین کی طرف متوجہ فرمایا ہے جس کی مناسبت شاہ عبدالقادر صاحب اس طرح بتاتے ہیں کہ:۔

"باپ نے اللہ کا حق بتایا، اللہ نے باپ کا" (موضح القرآن)

مگر یہ تناسب اس آیت کے پورے مضمون سے کچھ دل کو لگتا نہیں اس لئے زیادہ تصور یہ ہوتا ہے کہ یہ آیت مقام تنزیل میں اس گفتگو کے درمیان نہ تھی۔

حق ایمانی نہیں بلکہ انسانی

آخر میں یہ کہنے کے بعد کہ "اگر وہ دونوں (ماں باپ) تمہیں مشرک بنانے کی کوشش کریں تو اُن کا کہنا نہ ماننا، پھر یہ کہ "دنیا میں اُن کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا" یہ بتاتا ہے کہ یہ حسن سلوک کا حکم اُنہی مشرک ماں باپ کے ساتھ ہے جو اُسے بھی شرک کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک حق ایمانی نہیں، حق انسانی ہے۔

يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿١٦﴾

"اے بیٹے! یقیناً اگر رائی کے ایک دانے بھر بھی کچھ ہو اور وہ کسی پتھر کے نیچے ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں تو اسے بھی اللہ لائے گا اور وہ باریک نگاہ والا ہے، خوب واقف"۔

اب پھر سلسلہ جناب لقمان علیہ السلام کے مواعظ کا شروع ہو گیا۔

یہ رائی کے دانے بھر ..... کسی پتھر کے نیچے ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں ..... کیا چیز؟ اس کے لئے ہماری قدیم تفسیر میں یہ ہے کہ "روزی" مراد ہے۔[2] دوسری تشریح یہ ہے کہ انسان کا عمل نیک یا بد، کتنے ہی پردوں میں ہو مگر خدا سے چھپ نہیں سکتا۔[3]

---

[1] ای احسن الیھما وارفق بھما فی الامور الدّنیاویۃ وان وجبت مخالفتھما فی ابواب الدّین لمکان کفرھما (مجمع البیان)

[2] قال من الرزق (علی بن ابراھیم)

[3] من خیر اوشرّ یات بھا اللہ ویحاسب علیھا ویجازی (تبیان)

بعض لوگوں نے شاید انداز بیان میں کچھ تہدیدی انداز محسوس کرتے ہوئے اس میں ''برے عمل'' کی خصوصیت سمجھی ہے۔[1]
علامہ طبرسیؒ نے تفسیر عیاشی کے حوالہ سے امام جعفر صادقؑ کی حدیث اس کی تائید میں پیش کی ہے۔ اس صورت میں زمین کے ساتھ ''آسمان'' کا ذکر صرف بطور محاورہ ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ سات (۷) پردوں میں بھی ہو تو چھپے گا نہیں۔

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۚ﴿۱۷﴾ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۚ﴿۱۸﴾ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۧ﴿۱۹﴾

''اے بیٹے! نماز قائم رکھو اور اچھے کاموں پر آمادہ کرو اور برائی سے روکو اور جو تمہیں مصیبت درپیش ہو، اس پر صبر کرو۔ یقیناً یہ اہم باتوں میں سے ہے اور لوگوں کے لئے اپنا رخسارہ نہ جھکاؤ اور زمین میں اتراتے نہ پھرو، یقیناً اللہ شیخی رکھنے والے، اکڑنے والے کو دوست نہیں رکھتا اور اپنی رفتار میں اعتدال قائم رکھو اور اپنی آواز دھیمی رکھو، یقیناً بدترین آواز گدھے کی آواز ہوتی ہے''۔

''صلوٰۃ'' جس کا ترجمہ ہماری زبان میں ''نماز'' ہوتا ہے جناب یحییٰؑ اور جناب عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے اذکار سے بھی گذشتہ شریعتوں میں اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ارکان و اجزاء میں اس کے مختلف شریعتوں کے لحاظ سے کچھ تبدیلی ہوتی رہی ہو جس سے اس کی اصل حقیقت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ کا ترجمہ ''اہم باتوں میں سے ہے'' ایک تشریح کے مطابق ہے۔[2] دوسری تشریح کے مطابق یہ ترجمہ درست ہوگا ''مضبوط ہمت کے کاموں میں سے ہے''۔[3]

''لوگوں کے لئے اپنا رخسارہ نہ جھکاؤ، یہ ترجمہ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ کا ہماری قدیم تفسیر کے مطابق ہے خاص کر کلمات معصومینؑ سے ماخوذ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مالداروں کے سامنے طمع مال میں تذلل اختیار نہ کرو۔[4] مگر اس کی دوسری تشریح یہ ہے کہ لوگوں کی طرف سے اپنا منہ نہ موڑو۔[5] یعنی غرور و تکبر سے کام نہ لو۔ ہماری رائے میں اس مفہوم کے لئے عن الناس ہوتا تاکہ اعراض کے معنی پیدا ہوں لیکن وہاں ہے للناس یہ لفظ پہلے ہی مفہوم سے مناسبت رکھتا ہے۔

---

[1] الخصلة السّيئة (جلالين) خطبۂ (شاہ ولی اللہ)
[2] اى معزوماتها الّتى عليها لوجوبها (جلالين) ایں مقدمہ از کارہائے مقصود است (شاہ ولی اللہ) یہ بڑے کاموں میں سے ہے (رفیع الدین)
[3] العزم العقد على الامر بتوطين النّفس على فعله (تبیان)
[4] اى لا تذلّ للنّاس طمعا فيما عندهم (على بن ابراهيم)
[5] معناه لا تعرض بوجهك عن النّاس تكبّرا ذكره ابن عباس (تبیان)

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴿۲۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۲۱﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہیں فائدہ پہنچانے پر مجبور کیا ہے تمام چیزوں کو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو فراواں کیا ہے اور آدمیوں میں بعض ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر علم اور بغیر ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اُس کی جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ (نہیں) بلکہ ہم پیروی کریں گے اُس کی جس پر ہم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا ہے، کیا چاہے انہیں شیطان بلایا کرتا ہو آتش دوزخ کی طرف''

''اللہ نے تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو فراواں کیا ہے'' اس کی تشریحیں بہت ہوئی ہیں۔

۱۔ظاہری وہ نعمتیں ہیں جو سب ہی کی آنکھوں کے سامنے ہیں جیسے خلق کرنا، زندہ رکھنا اور قدرت واختیار عطا کرنا وغیرہ اور باطنی جو بغیر غور وفکر کے معلوم نہیں ہوسکتیں۔

۲۔ابن عباسؓ کا قول: ظاہری جو انسانوں کو معلوم ہیں اور باطنی جو بندگان خدا کے علم سے باہر ہیں۔

۳۔جناب ابن عباسؓ ہی کی روایت بطور حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہری نعمت اسلام اور انسان کا خلقتاً درست ہونا اور رزق عطا ہونا اور باطنی ہمارے غلط کردار کی پردہ پوشی۔

۴۔ظاہری' دنیا کی نعمتیں اور باطنی آخرت کی نعمتیں۔

۵۔ظاہری' اعضاء وجوارح اور باطنی قلب ودماغ کا کام کرنا۔

۶۔ظاہری' قدوقامت کی درستی اور باطنی نعمت الٰہی۔

۷۔ظاہری' قرآن کی تنزیل اور باطنی اس کی تاویل۔

۸۔حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد: ظاہری نعمت حضرت پیغمبر خداؐ کہ آپ نے معرفت الٰہی اور توحید میں رہنمائی فرمائی اور باطنی نعمت ولایت اہل بیتؑ۔

علّامہ طبرسیؒ فرماتے ہیں:۔ان اقوال میں باہم کوئی منافات نہیں ہے اور یہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں اور آیت کو ان سب پر محمول کرنا صحیح ہے۔مشرکین کی جانب سے آباؤاجداد کے راستے پر چلنے کی دلیل بہت جگہ قرآن مجید میں آئی ہے اور اس کا جواب انداز بدل بدل کر دیا گیا ہے مگر مطلب سب کا یہ ہے کہ انسان کو خود اپنی عقل وضمیر کے فیصلے پر چلنا چاہئے۔باپ دادا اگر غلط راستے پر تھے یا انہوں نے عقل سے کام نہ لیا ہو تو اُس

کے وہ ذمہ دار ہونگے تم اُن کے راستے پر آنکھ بند کر کے کیوں چلو؟

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۲۲﴾ وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۳﴾ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۲۴﴾

''اور جو سر اسر توجہ رکھے اللہ کی طرف اُس حالت میں کہ اچھے اعمال رکھنے والا ہو تو اُس نے مضبوط سہارا پکڑا اور اللہ کی طرف تمام چیزوں کی آخر میں رجوع ہے اور جو کفر اختیار کرے تو آپ کو اُس کے کفر سے صدمہ نہ ہو۔ ہماری ہی طرف اُنہیں پلٹنا ہے تو ہم اُنہیں بتائیں گے جو وہ کفر کرتے تھے کہ یقیناً اللہ سینوں کے اندر کی باتوں کا جاننے والا ہے۔ ہم اُنہیں تھوڑے دن فائدہ اٹھانے کا موقع دیتے ہیں، پھر اُنہیں زبردستی سخت عذاب کی طرف لے جائیں گے''

چونکہ وَجْهِ کے معنی چہرے کے ہیں، اس لئے اکثر نے يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ کے ترجمے میں مُنہ کا ذکر ضروری سمجھا ہے۔(۱) مگر چونکہ توجہ کے لفظ میں خود وجہ داخل ہے اور پھر اُس کے ساتھ الی اللہ ہے جس سے اللہ کی طرف کے معنی پیدا ہوتے ہیں، اس لئے جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، وہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بعض مفسرین کا ذہن جیسے لِوَجْهِ اللّٰهِ کے محاورے کی طرف گیا ہے، انہوں نے اس کی تشریح میں خلوصِ عبادت اور رضائے قلبی ملحوظ رکھنے کا ذکر کیا ہے مگر یہاں وَجْهِ کی نسبت اللہ کی طرف ہے ہی نہیں بلکہ بندہ کی طرف ہے لہٰذا اُس کا لِوَجْهِ اللّٰهِ والے محاورے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۶﴾

''اور اگر اُن سے پوچھئے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور وہ کہیں گے اللہ نے۔ کہئے کہ شکر خدا مگر اُن میں سے بیشتر علم نہیں رکھتے۔ اللہ کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ بلا شبہ اللہ بے نیاز ہے، قابل تعریف''۔

اُن کے اس اقرار پر کہ آسمان اور زمین کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے، اُن بتوں نے نہیں جن کی عبادت کرتے ہیں، یہ جملہ کہ الحمد للہ اس کا مفہوم میری سمجھ میں جو آتا ہے، وہ یہی کہ خدا کا شکر کہ اتنا تو تمہاری سمجھ میں بھی آیا اور تم نے بھی تسلیم کر لیا جس کے بعد اُن کی بت پرستی کی پوری

عمارت خود اُن کے اس اقرار سے زمین بوس ہوگئی۔[1] ایک تصور یہ ہے کہ اُن کے اس جواب کو سن کر اب اُن سے کچھ نہیں کہا جاتا بلکہ حق پرست آدمی اب اپنی جگہ آہستہ کہتا ہے: الحمد اللہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا شکر کہ ہم صحیح راستے پر قائم ہیں اور پھر جیسے دل ہی دل میں اُن کی حماقت پر اظہار افسوس کرتا ہے کہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت کا یہ لوگ علم نہیں رکھتے یا یہ کہ یہ لوگ ہمارے متعلق اس کا علم نہیں رکھتے کہ ہم اصل ہدایت کے راستے پر ہیں۔[2] نتیجہ دونوں باتوں کا ایک ہے۔اس کے بعد پھر اپنی ہی جگہ یہ کہا ہے کہ ''اچھا'' یہ نہیں مانتے تو اللہ کا کیا بگڑتا ہے؟ تمام کائنات زمین و آسمان اُس کے تابع فرمان ہیں۔اُسے ان کے ماننے کی کوئی ضرورت تو ہے نہیں۔وہ بے نیاز مطلق ہے۔[3]

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۷﴾

''اور اگر وہ جو زمین میں درخت ہیں، سب قلم ہو جائیں اور سمندر سب روشنائی بن جائے جس میں سات سمندر اور شامل ہوں، تب بھی اللہ کے کلمے ختم نہیں ہوں گے، یقیناً اللہ عزت وغلبہ والا ہے، حکمت والا''۔

کلمات الٰہی کی کثرت ووسعت:

''زمین کے درخت قلم ہو جائیں اور سمندر روشنائی بن جائیں، اب اس کے بعد کی کڑی لفظوں میں مذکور نہیں ہے[4] سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ ان سے اللہ کے کلمے لکھے جائیں تو (اب اس کا نتیجہ بیان ہوا ہے کہ) اس کے بعد بھی وہ کلمے ختم نہیں ہوں گے''۔''کلمات الٰہی'' کی ایک تفسیر ''معلومات الٰہی'' کے ساتھ ہوئی ہے[5] اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ اُس سے دو باتیں مراد ہیں جو اللہ کے احاطہ قدرت میں ہیں۔صدر اوّل کے ایک مفسّر کی زبانی جو تشریح ہوئی ہے، اُس میں یہ دونوں باتیں کچھ اضافہ کے ساتھ سموئی ہوئی ہیں۔[6]

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۲۸﴾

''تم سب کا پیدا کرنا اور تمہارا دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا نہیں ہے مگر مثل ایک متنفّس کے، یقیناً اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا''۔

مطلب یہ ہے کہ حشر ونشر کے بارے میں کوئی اس بنا پر استعجاب کرے کہ بھلا اتنی بے شمار مخلوق ایک دم کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے؟ تو یہ استبعاد بالکل غلط ہے، اس لئے کہ قدرت کے سامنے ایک اور ایک لاکھ اور ایک ارب اور اس سے زیادہ اُن میں کوئی فرق نہیں ہے۔

---

[1] الحمد للہ علیٰ ظھور الحجّة علیھم بالتوحید (جلالین)

[2] الحمد للہ علیٰ ھدایتہ وتوفیقہ لنا بالمعرفة بل اکثرھم لا یعلمون انّکم وفقکم اللہ لمعرفتہ (تبیان)

[3] ھو الغنیّ عن حمد الحامدین وعن کلّ شیٔ (مجمع البیان)

[4] فیہ حذف لانّ المعنی یکتب بھا کلام اللہ (تبیان)

[5] المعبر بھا عن معلوماتہ (جلالین) یعنی معلومات (فتح الرحمٰن)

[6] قال قتادة ــ لقد ماء البحر قبل ان تنفد عجائب اللہ وحکمتہ وخلقہ علمہ (تبیان)

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ مشرکین نے یہ کہا تھا کہ پہلے اللہ نے جو پیدا کیا تھا، وہ تو رفتہ رفتہ نطفہ، علقہ، مضغہ اور پھر لحم کی صورت میں منزل بہ منزل لیکن قیامت کے لئے کہا جا رہا ہے کہ ہم ایک دم زندہ ہو جائیں گے، یہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔[1] مگر میری سمجھ میں الفاظ آیت سے وہی پہلو آتا ہے جو پہلے عرض کیا گیا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۙ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۳۰﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور اس نے قابو رکھا ہے سورج اور چاند کو، ہر ایک چل رہا ہے ایک مقرّرہ مدّت تک اور یہ کہ اللہ تمہارے اعمال کا جاننے والا ہے۔ اللہ ہی بس حق ہے اور جو کچھ وہ اُس کے سوا پکارتے ہیں، وہ بے حقیقت ہے اور یہ کہ اللہ اونچا ہے، بڑا''۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۲﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کشتیاں سمندر میں چلتی ہیں اللہ کے فضل و کرم سے تا کہ وہ تمہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے کے لئے جو شکر گزار ہو اور جب اُن پر دریا کی لہریں مثل سائبانوں کے چھاتی ہیں تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں خالص اس کا اعتقاد رکھتے ہوئے مگر جب وہ اُن کو خشکی کی طرف نجات دے کر پہنچا دیتا ہے تو اُن میں سے کچھ ہی ہیں جو اعتدال کے راستے پر قائم رہتے ہیں اور جان بوجھ کر انکار نہیں کرتا ہماری نشانیوں کا مگر ہر غدّار ناشکرا''۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا

---

[1] قال مقاتل انّ کفّار قریش قالو انّ اللہ خلقنا اطوارا نطفة علقة مضغة لحما فکیف یبعثنا خلقا جدا فی ساعة واحدة فانزلت الایة (مجمع البیان)

يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۳۳﴾

''اے انسانو! اپنے پروردگار (کے غضب) سے بچو اور ڈرو اس دن سے جب نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو کوئی فائدہ پہنچا سکے گا اور نہ بیٹا باپ کو کچھ فائدہ پہنچانے والا ہوگا، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے تو تمہیں دنیاوی زندگی فریب میں مبتلا نہ کرے اور نہ تمہیں دھوکا دینے والا اللہ کے بارے میں دھوکا دے''۔

یجزی کے لفظ سے ذہن میں جزا کے معنی آتے ہیں مگر محاورۂ عرب میں اس کے معنی فائدہ پہنچانے کے ہوتے ہیں۔[۱] غرور یعنی دھوکا دینے والا اور وہ بھی الف لام کے ساتھ جو کسی خاص شخصیت کی طرف اشارہ کو بتلاتا ہے، وہ دراصل تو از روئے قرآن شیطان ہے لیکن ہر شخص یا ہر چیز جو امیدوں کے سبز باغ دکھا کر طاعت الٰہی میں سرگرم ہونے سے روکے، وہ اس لفظ کا مصداق ہے جیسا کہ بعض قدیم مفسرین نے اس کی تشریح کی ہے۔[۲]

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۳۴﴾

''بلاشبہ اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہ مینھ برساتا ہے اور وہ اُسے جو ماؤں کے پیٹ میں ہے جانتا ہے اور کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کل وہ کیا حاصل کرے گا؟ اور کوئی متنفس نہیں جانتا کہ کس سرزمین پر اُسے موت آئے گی، یقیناً اللہ جاننے والا ہے، بڑا باخبر''۔

وہ باتیں جن کا علم بس اللہ کو ہے:

مذکورہ بالا پانچ چیزیں وہ ہیں جو خصوصیت سے اس علم غیب کی حیثیت رکھتی ہیں جسے اللہ کے ساتھ خصوصیتِ خاص حاصل ہے۔[۳] بے شک انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کو حسب مصلحت خالق ان چیزوں کا کلاً۔۔۔ یا جزءً جس طرح چاہتا ہے اظہار معجزہ وغیرہ کے لئے علم عطا فرماتا ہے اور اس اعتبار سے ائمہ طاہرین علیہم السلام کے لئے کثیر التعداد احادیث میں ''ما کان'' (ماضی) کے علاوہ مایکون (مستقبل) کے علم کا ثبوت موجود ہے جس کا کثرت روایات وواقعات کی بنا پر انکار ممکن نہیں ہے۔

---

[۱] یعنی لا یغنی فیہ احد عن احد ___ یقال جزیت عنك اذا اغنیت عنہ (تبیان)

[۲] قیل ھو تمنّیك المغفرۃ فی عمل المعصیۃ عن سعید بن جبیر (مجمع البیان)

[۳] ھٰذہ الخمسۃ الاشیاء لم یطلع علیھا ملك مقرّب ولا نبیّ ﷺ مرسل وھی من صفات اللہ عزّوجل (علی بن ابراھیم)

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ

مکّیہ ----۳۰----آیات

قرآن مجید میں چار سورے ہیں جن میں ایک ایک ایسی آیت ہے جس کے پڑھنے پر سجدہ واجب ہوتا ہے پڑھنے والے پر بھی اور سننے والے پر بھی۔ان سوروں کو عزائم کہتے ہیں، باقی اور کچھ سوروں میں جو سجدے ہیں، وہ مستحب ہیں۔

عزائم یعنی واجب سجدے والے سوروں میں سب سے پہلا سورہ یہ ہے۔اس کا نام ''سورۂ سجدہ'' ہوا۔

سورۂ سجدہ کے خاص خاص مضامین:

۱۔ہزار برس کے برابر ایک دن۔

۲۔ملک الموت کا ذکر۔

۳۔مومن اور فاسق یکساں نہیں۔

۴۔عذاب آخرت کے پہلے ایک اور عذاب کا اعلان۔

۵۔آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کی شان

۶۔وہ موقع جس کے بعد توبہ قبول نہیں.....وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

الٓمّٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳﴾

''الف۔لام۔میم۔اس کتاب کا اتارا جانا، اس میں کوئی شک نہیں، تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے ۔کیا وہ کہتے ہیں کہ اُس نے اسے گڑھ لیا ہے۔بلکہ وہ آپ کے پروردگار کی طرف سے حق ہے تاکہ آپ متنبہ کریں اس قوم کو جس کے پاس آپ کے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا، شاید وہ ہدایت حاصل کریں''۔

''اُس قوم کو'' یہاں ''قوم'' سے مراد عام محاورہ والی قوم یعنی عرب مراد نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی ہیں ''لوگ'' اور مراد وہ تمام افراد انسانی

ہیں جن کو دعوت اسلام دینے کے لئے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مامور ہوئے تھے۔

اس صورت میں اس ارشاد سے کہ آپؐ کے پہلے کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا، یہ مراد نہیں ہے کہ کبھی بھی اُن کے بعید ترین اسلاف کی رہنمائی بھی نہیں ہوئی جب کہ مشرکین عرب جو اہل مکّہ تھے، اُن کے اسلاف کو حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ اور اُن کے فرزند حضرت اسماعیلؑ کی رہ نمائی حاصل ہو چکی تھی جس کے مٹے ہوئے نقوش اُن میں ارکان حج وغیرہ کی صورت میں موجود تھے اور اُن کے دوسرے ہم جد بنی اسرائیل کی رہنمائی حضرت ابراہیمؑ کے بہت بعد بھی حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور ان دونوں بزرگواروں کے درمیان کے کثیر التعداد انبیاء سے ہو چکی تھی اور قرآن مجید کے اس اعلان کی بنا پر کہ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ''کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی متنبہ کرنے والا نہ گزرا ہو'' دنیا کی دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں میں بھی دور قدیم میں ضرور خداوند عالم کی طرف کے رہنما ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں ائمہ طاہرین علیہم السلام کے تقریباً متواتر احادیث کی بنا پر یہ مسلم ہے کہ زمین حجت خدا سے خالی نہیں رہتی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ نمایاں نہ ہو اور عامہ خلائق اُس سے واقف نہ ہوں لہٰذا حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے بعد سے غیر بنی اسرائیل میں بھی اوصیائے حضرت ابراہیمؑ موجود تھے جو دین حنیف ابراہیمی کے محافظ تھے اور بنی اسرائیل میں بھی اوصائے حضرت عیسیٰؑ کا سلسلہ قائم تھا جن کے ہاتھوں دونوں طرف کی وراثت رہ نمائی اور اُس سے متعلقہ امانتیں جنہیں ''مواریث انبیاء'' کہنا چاہیے ہمارے رسولؐ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچیں لہٰذا اُن دوسرے آیات قرآن اور پھر اُن احادیث معصومینؑ کی روشنی مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ ''آپ سے پہلے اُن کے پاس کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا'' اس کے معنی یہ ہیں کہ مدت مدید سے جو قبل کے اکثر تعلیمات کو فراموش کر دینے کے لئے کافی ہے، کوئی اُدھر کا معصوم رہ نما نمایاں طور پر اُن کے سامنے نہیں آیا، اب اُن تمام نقوش محوشدہ کو تازہ کرنے کے لئے حضرت مبعوث ہوئے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵

''اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو چھ (٦) دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر برقرار ہوا اور اُسے چھوڑ کر تمہارا نہ کوئی مالک ہے اور نہ سفارشی تو کیا تم نصیحت قبول نہ کرو گے؟ وہ تمام معاملات کا انتظام کرتا ہے آسمان سے لیکے زمین تک۔ پھر وہ معاملات اُس کے سامنے پیش ہونگے اُس دن جس کی مقدار تمہاری گنتی کے ایک ہزار برس کے برابر ہوگی''۔

''ہم نے جو ترجمہ کیا ہے کہ ''وہ معاملات اُس کے سامنے پیش ہوں گے'' ظاہر الفاظ قرآن کے لحاظ سے صاف ہیں، چونکہ پہلے یدبّر الامر آچکا ہے تو بعد میں یعرج کے لفظ کے اندر ضمیر مضمر ہے، وہ اُسی الامر کی طرف راجع ہوگی جس کا مفہوم ''معاملات'' کے لفظ سے ظاہر ہوتا

ہے ہماری قدیم تفسیر اس کے مطابق ہے اور بعض قدیم تر جمے بھی [1] مگر علامہ طبرسیؒ نے یہ معنی قرار دیئے ہیں کہ فرشتہ آسمان سے اُس کے فیصلوں کو لے کر اترتا ہے اور پھر وہ (فرشتہ) اُن امور کو وہاں پہنچا کر اوپر چڑھ جاتا ہے [2] مگر جب پہلے ملک کا کوئی ذکر آیت میں نہیں ہے تو یہ مفہوم کیوں کر سمجھا جا سکتا ہے۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ﴿۶﴾ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ﴿۷﴾ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ﴿۸﴾ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴿۹﴾

”یہ ہے اَن دیکھی اور دیکھی سب چیزوں کا جاننے والا، عزت والا، مہربان جس نے ہر چیز کی بہترین تخلیق کی ہے اور شروع میں انسان کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اُس کی نسل قرار دی ایک ذلیل قسم کے پانی کے نچوڑ سے پھر اُس کے جسم کو تیار کیا اور اس میں اپنی روح کا ایک جزء پھونکا اور تمہارے لئے سننے کی طاقت اور نگاہیں اور دل قرار دیئے۔ بہت کم تم شکر ادا کرتے ہو“۔

یہ جو دوسرا ثم یعنی ”پھر“ کا لفظ ہے، یہ بظاہر ترتیب واقعہ کے لئے نہیں بلکہ ترتیب ذکر کے طور پر ہے کہ اس کے بعد یہ بات سنو، ترتیب واقعہ کی بنا پر اس لئے نہیں ہے کہ اس کے پہلے نسل آدم کی تخلیق کا ذکر تھا اور یہ الفاظ کہ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ پہلی نظر میں یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ پتلا تیار کیا اور اس میں روح پھونکی جو ابوالبشر حضرت آدمؑ کی تخلیق سے متعلق ہے جیسا کہ دوسری جگہ خلقت آدم کے قبل والے اعلان میں یہی الفاظ ہیں کہ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ اور بالکل ویسے ہی الفاظ یہاں ہیں لہٰذا ذہن میں یہی آتا ہے کہ یہ آدمؑ کی خلقت کا ذکر ہے جیسا کہ جلالین نے لکھا ہے:۔

ثمّ سوّٰہُ ای خلق اٰدم:۔ پھر اس کے جسم کو تیار کیا یعنی آدمؑ کو پیدا کیا۔

مگر ایک مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں جسم تیار کیا اور روح پھونکی۔ اس طرح وہ نسل آدم سے متعلق قرار پا سکتا ہے اور اب ثم کا ترتیب واقعہ کے لئے بھی سمجھنا درست ہوگا۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۭ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ﴿۱۰﴾ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ

---

[1] یعرج الیہ یعنی الامور الّتی یدبّرھا (علی بن ابراھیم) بالامی رود آن کار بسوئے خدا (شاہ ولی اللہ)

[2] ثم یعرج الیہ ذٰلك الملك ای یصعد الی المکان الّذی امرہ اللہ تعالیٰ ان یصعد الیہ (مجمع البیان)

تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾

''اور اُنہوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں کھو جائیں گے تو کیا ہم از سرِ نو پیدا ہوں گے؟ بلکہ وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضری کے منکر ہیں، کہئے کہ تمہاری مدّت زندگی کو پورا کرتا ہے، موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف پلٹ کر جاؤ گے''۔

ملک الموت کا ذکر

یاد رکھنا چاہئے کہ اصل وفات دینے والا یعنی مدت زندگی کو پورا کرنے والا اللہ ہے جیسا کہ سورہ زمر آیت ۴۲ میں صاف ارشاد ہے:۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا : اللہ تمام نفوس کی مدت کو پورا کرتا ہے اُن کی موت کے وقت۔

مگر چونکہ اس کام پر اُس نے مَلَكَ الْمَوْتِ کو مقرر کیا ہے، اس لئے زیرِ تحریر آیت میں اُس فعل کی نسبت بصورت جمع ملائکہ کی طرف دی گئی ہے (تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ) اس لئے کہ مَلَكَ الْمَوْتِ اس پورے کارخانے کے سربراہ ہیں اور اُنکی ماتحتی میں بہت سے فرشتے ہیں جو اُن کے حکم سے قبض روح کرتے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ ذرائع وسائل کی طرف فعل کی نسبت سے یہ مانتے ہوئے کہ اللہ اصل فاعل ہے، شرک لازم نہیں آتا، اسی طرح اگر کوئی اصل مددگار اللہ کو مانتے ہوئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا ائمہ طاہرین علیہم السلام کو بحیثیت وسیلہ مددگار کہے یا اُن سے مدد کا طالب ہو تو اس سے شرک لازم نہیں آتا اور وہ سورۂ حمد کے جملہ ایاك نستعین کے بھی خلاف نہیں ہوگا۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اور کاش تم دیکھتے جب گنہگار لوگ اپنے سر جھکائے ہوں گے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پروردگار ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا، اب تو ہمیں دوبارہ پلٹا تو ہم اچھے اعمال کریں گے۔ ہم اب یقین حاصل کیے ہوئے ہیں''۔

اصول یہ ہے کہ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ کے آثار جو اخروی عذاب کا پتہ دیتے ہیں، اُن کے مشاہدہ کے بعد جو ایمان کا اقرار ہو، وہ قابل قبول نہیں ہے اور یہاں تو قیامت کا ہنگام ہے جب کہ ہر غیب عالم شہود میں آ گیا ہے تو اب کتنا ہی دیکھ لیا اور سن لیا اور یقین حاصل کر لیا ہو، اس کا کوئی حاصل نہیں۔ نہ اب دورِ آخرت کے بعد دورِ تکلیف جو دنیا میں گزرا پلٹ کر آ سکتا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اور اگر ہم چاہتے تو ہر متنفس کو منزلِ ہدایت عطا کر دیتے مگر یہ میری طرف کی حتمی بات ہے کہ میں دوزخ کو جنات

اور انسانوں سب سے بھر دوں گا تو چکھو اس کی سزا جو تم بھولے ہوئے تھے ہمارے اس دن کی حاضری کو بے شک اب ہم بھی بھول گئے تم کو اور چکھو ہمیشہ کی زندگی کا عذاب اُس کی وجہ سے جو تم اعمال کرتے تھے"۔

"ہر متنفس کو منزل ہدایت عطا کر دیتے" یعنی جبری طور پر اُسے صحیح راستے پر لگا دیتے، خواہ اس طرح کہ وہ پیدا ہوتے ہی ایسے کہ گناہ کا ارتکاب نہ کرتے۔[1] یا بعد میں کوئی معجزہ ایسا دکھا دیا جاتا کہ وہ سب زبردستی ایمان اختیار کر لیں۔[2]

ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ اگر چاہتے تو اُن کی خواہش کے مطابق دوبارہ انہیں دنیا میں بھیج دیتے کہ وہ اعمال خیر کر کے نجات کے مستحق بن جائیں مگر حشر ونشر کے بعد جب کہ دورِ عمل ختم ہو چکا ایسا کرنا ہمارے اصول کے خلاف ہے۔[3] ورنہ یہ سلسلہ کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا۔

ایک اور معنی یہ سمجھ میں آتے ہیں کہ اس کا ربط سابق کی آیتوں سے ہے کہ ہم چاہتے تو اس قیامت کے یقین کو معتبر مان لیتے اور ہر ایک کو ہدایت یافتہ تسلیم کر لیتے اور سب کو بہشت میں جگہ دے دیتے مگر یہ اُس دورِ تکلیف اور پھر اُس کے نتیجہ میں جزا وسزا کے حتمی اعلان کے خلاف ہوتا جو پہلے ہو چکا ہے اور جس کے لئے دوزخ کی تخلیق کی گئی ہے اور اس صورت میں دوزخ کی تخلیق ہی عبث ہوتی۔

مجھے بعد کے فقرے اس مفہوم کے ساتھ زیادہ چسپاں معلوم ہوتے ہیں خصوصاً بالکل آخر کا جملہ "اب چکھو اس عذاب کو اُس کی وجہ سے جو تم اعمال کرتے تھے"۔ یہ بالکل اس قبل والے گروہ سے خطاب معلوم ہوتا ہے جو کہہ رہا تھا کہ اب ہم یقین لے آئے اور ہمیں دار دنیا میں بھیج تو ہم نیک اعمال کریں تو کہا جا رہا ہے کہ جو دورِ عمل تھا، اس میں تم نے عمل نہ کیا تو اب کیا ہوتا ہے جب کے دورِ مجازاۃ ہے، اب تو اُنہی سابق اعمال کی سزا بھگتنا ہے۔ اس کے سوا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ﴿١٥﴾ السجدة تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿١٦﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٧﴾

"ہماری آیتوں پر بس وہ ایمان لاتے ہیں کہ جب اُنہیں ان (آیتوں) کے ساتھ نصیحت کی جائے تو وہ سجدے میں گر جاتے اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ غرور سے کام نہیں لیتے اور ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں کہ پکارتے رہتے ہیں اپنے پروردگار کو ڈر اور امید میں اور جو ہم نے اُنہیں دیا ہے، اُس سے وہ خیرات کرتے ہیں تو کوئی آدمی نہیں جانتا جو اُن کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک پوشیدہ رکھی گئی ہے صلے میں

---

[1] لو شئنا ان نجعلهم كلّهم معصومين لقدرنا (علی بن ابراهيم)

[2] بأن نفعل امرا من الامور يلجئهم الى الاقرار بالتوحيد ولكن ذٰلك يبطل الغرض بالتكليف (مجمع البيان)

[3] قال الجبائي يجوز ان يكون المراد ولو شئنا لاجبنا هم الىٰ ما سألو اولردونا الىٰ دار التكليف ليعملو بالطّاعات ولكن حقّ القول منّي ان اجازيهم بالعقاب فلا ارّدهم (تبيان)

اُس کے جو وہ اعمال کرتے تھے''۔

سجدہ واجبہ:

یہ اس سورۂ سجدہ کے وہ آیات ہیں جن میں سے پہلی (نمبر ۱۵) کے آخری لفظ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ کی تلاوت سے پڑھنے والے پر بھی سجدہ واجب ہے اور سننے والے پر بھی۔ اگر ان تمام آیات کو ایک سلسلہ کا مانا جائے جو بعید نہیں ہے تو مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن تو ہر آدمی مومن بن جائے گا مگر اُس وقت کا ایمان بے کار ہے، وہ سب کافروں میں محشور ہوں گے۔ مومن تو اصل وہ ہیں جو اس دنیا میں آیات الٰہی سے متاثر ہوں اور اس تاثر کے عملی تقاضے یہ ہیں جو بعد میں بیان ہوئے ہیں۔ حکم سجدہ جو یہاں ہے وہ بندۂ خدا کی طرف سے اُس کا ایک مظاہرہ ہے کہ ہم اسی دنیا میں ایمان اختیار کیے ہوئے ہیں اور تیری آیتوں سے متاثر ہو کر تیری بارگاہ میں سربسجود ہیں۔ یہ کہ ''اُن کے پہلو اُن کے بستروں سے الگ رہتے ہیں'' یعنی راتوں کو اُس ہنگام میں کہ جب یادِ الٰہی سے غافل افراد اپنے بستروں پر دراز محوِ خواب رہتے ہیں، اُن کے پہلو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بستر آشنا نہیں ہوتے۔

علامہ طبرسیؒ نے متعدد احادیث درج کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیات نماز شب کی فضیلت سے متعلق ہیں۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ ﴿۱۸﴾

''تو کیا جو مومن ہے، وہ مثل اس کے ہے کہ جو بداعمال ہو؟ وہ برابر نہیں ہیں''۔

مومن اور فاسق یکساں نہیں

اس آیت کی شانِ نزول حدیث معصومؑ میں یہ وارد ہوئی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؑ اور ولید بن عقبہ میں بحث ہوگئی۔ اُس نے جاہلیت کے معیار کے مطابق کچھ باتوں پر فخر کیا، حضرت علیؑ نے اُس کے جواب میں جو اسلامی معیار ہے، وہ پیش کیا کہ قابل فخر یہ باتیں نہیں ہیں۔ اصل چیز ایمان اور عمل صالح ہے اُس پر حضرت علیؑ کے قول کی تصدیق میں یہ آیت اُتری جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس محل پر مومن سے مراد حضرت علی بن ابی طالبؑ ہیں اور فاسق سے مراد ولید بن عقبہ ہے۔[1] جس کے فاسق ہونے کا اظہار قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں موجود ہے: اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا ''اگر فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اُس کی تحقیق کر لیا کرو'' اس میں مفسرین اہل سنت نے بھی فاسق کا مصداق ولید کو بتایا ہے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۰﴾
وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾

---

[1] فی روایۃ ابن ابی الجارود عن ابی جعفر علیہ السلام (علی بن ابراھیم)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۲۲﴾

''اب وہ جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کرتے رہے، اُن کے لئے آرام والے بہشت ہیں بطور ضیافت ان اعمال کے سبب سے جو وہ کرتے تھے، رہے وہ جو بد اعمال ہیں، اُن کا ٹھکانا آتش دوزخ میں ہوگا۔ جب بھی اس میں سے نکلنا چاہیں گے، دوبارہ اس میں پلٹا دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائیگا کہ چکھو اس آگ کا مزہ جسے تم جھٹلاتے تھے اور ہم اُنہیں اس بڑے عذاب کے پہلے قریبی دور میں عذاب چکھائیں گے شاید کہ وہ اپنے عمل میں تبدیلی کریں اور کون زیادہ ظالم ہوگا اس سے کہ جسے اُس کے پروردگار کی آیتوں کے ذریعے نصیحت کی جائے، پھر وہ اُن سے روگردانی کرے۔ بلاشبہ ہم گنہ گاروں سے بدلا لینے والے ہیں''۔

''قریبی دور'' کے عذاب سے عام تفسیروں میں دارِ دنیا کا عذاب مراد لیا گیا ہے اور یہ بعد کے فقرے سے مناسبت بھی رکھتا ہے کہ ''شاید وہ اپنے عمل میں تبدیلی پیدا کریں''۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تنبیہی عذاب ہے، نہ کہ وہ عذاب جس کے بعد اصلاح عمل کی گنجائش ہی نہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۳﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

''اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا کی تو تم شک میں نہ ہو اس کا سامنا ہونے میں اور ہم نے اُسے ہدایت قرار دیا بنی اسرائیل کے لئے اور اُن میں سے ہم نے کچھ پیشوا قرار دیئے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں جب کہ انہوں نے صبر سے کام لیا اور وہ ہماری آیتوں پر یقین کرتے تھے''۔

''ہم نے موسیٰؑ کو کتاب عطا کی'' اس کے ساتھ یہ جملہ کہ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ ''تم شک میں نہ ہو اس کا سامنا ہونے میں''۔ اس میں یہ ضمیر ''اُس'' کدھر راجع ہے؟ یہ تفسیر کا مشکل مسئلہ بن گیا ہے۔

جناب ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق یہ ضمیر جناب موسیٰؑ کی طرف راجع ہے اور ہمارے پیغمبرؐ سے مخاطب ہو کر کہا جا رہا ہے کہ آپ کو اس میں بالکل شک نہ ہونا چاہیے کہ جن سے آپ ملے تھے، وہ موسیٰؑ ہی تھے اور یہ ملاقات شبِ معراج ہوئی تھی۔[1] یا بعد میں غیر معین طور پر تخاطب ہو جس کا مطلب یہ ہو کہ کسی کو اس ملاقات میں جو مابین موسیٰؑ و حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوئی، شک نہ ہونا چاہیے۔

بہرصورت ضمیر کے جناب موسیٰؑ کی طرف راجع ہونے کی صورت میں اس کا تعلق کتاب کے عطا کیے جانے کے ساتھ جو اس فقرے کے پہلے ہے اور بنی اسرائیل کے لئے ذریعہ ہدایت ہونے کے ساتھ جو اس فقرے کے بعد ہے اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا ہے۔

---

[1] یعنی لقآء موسیٰ لیلۃ الاسرآء بک الی السمآء فی ماذکرہ ابن عباس (تبیان) وقد التقیا لیلۃ اسرآء (جلالین)

دوسرا قول یہ ملتا ہے کہ یہ ضمیر کتاب کی طرف راجع ہے۔[1] لیکن یہ مفہوم اُس وقت واضح ہوتا ہے جب فی مریۃ منہ ہوتا، مطلب یہ ہوتا کہ اس میں تمہیں کوئی شک نہ ہونا چاہیے کتاب کے ساتھ لقآء کا لفظ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید اس کا مفہوم یوں بنایا جاسکے کہ توریت اور موسیٰؑ کی باہمی ملاقات میں تمہیں شک نہ ہونا چاہئے۔ جناب شاہ ولی اللہ نے بالکل بے جوڑ طور سے ضمیر کو قرآن کی طرف راجع کر دیا ہے[2] اور حسن بصری نے بالکل نئی کہی ہے کہ یہ ضمیر اذیت کی طرف راجع ہے یعنی موسیٰؑ کو کتاب پا کر بڑی اذیتیں اٹھانا پڑیں مگر جب اس کے پہلے اذیت کا ذکر کہیں نہیں ہے تو یہ ضمیر کیوں کر پھیری جائے۔ ہاں اس مفہوم کے قبل اور بعد کے مضمون سے مرتبط ہونے کی وجہ سے اُسے یوں قبول کیا جاسکتا ہے کہ ضمیر تو جناب موسیٰؑ ہی کی طرف راجع ہو مگر لقآء کے معنی درپیش ہونے کے لئے جائیں کہ انہوں نے اس سلسلہ میں کیا کیا اذیتیں اٹھائیں، اُن میں تمہیں کوئی شک نہ ہونا چاہئے۔

بہر حال تفسیر معصومؑ کی تشنگی یہاں بہت محسوس ہو رہی ہے جو ہمارے دسترس سے باہر ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾ اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ؕ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾

''یقیناً تمہارا پروردگار فیصلہ کرے گا اُن کے درمیان قیامت کے دن اُس میں کہ جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے اور کیا اُنہیں نہیں معلوم کہ ہم نے اُن کے پہلے کتنی نسلیں ہلاک کیں جن کے رہنے کے مکانات میں یہ چلتے پھرتے ہیں، یقیناً اس میں بڑی نشانیاں ہیں تو کیا وہ سنتے نہیں ہیں''؟!

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

''اور کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی کو لے جاتے ہیں بنجر زمین تک تو اس سے نکالتے ہیں ایسی کھیتی جس سے اُن کے چوپائے غذا حاصل کرتے ہیں اور وہ خود تو کیا وہ دیکھتے نہیں''؟ یعنی یہ اللہ کی نعمتیں اُن کی آنکھوں کے سامنے تو وہ اُن پر حقیقت میں آنکھوں سے نظر کیوں نہیں ڈالتے۔[3]

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۸﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ

---

[1] دھوکا نہ کرو اُس کے ملنے میں یعنی کتاب کے یا موسیٰ (موضح القرآن)۔

[2] پس مباش درشبہہ از ملاقات قرآن (شاہ ولی اللہ)

[3] افلا ینظرون نعم اللہ تعالیٰ علیہم (مجمع البیان)

الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾

''اور وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ فتح کب ہوگی اگر تم سچے ہو؟ کہئے کہ فتح کے دن کافروں کو اُن کا ایمان فائدہ نہ دے گا اور نہ اُنہیں مہلت ملے گی تو ان سے بے اعتنائی کیجئے اور منتظر رہئے وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں''۔

ہمارے یہاں کی روایت یہ ہے کہ یہ آیت رجعت سے متعلق ہے اور یہ سوال وجواب اُسی سلسلہ کے ذیل میں ہے (علی بن ابراہیم)۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ ''فتح'' سے مراد فیصلہ ہے جیسے ارشاد ہوا ہے: رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ 'پروردگارا! فیصلہ کردے ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے''۔ (اعراف:۸۹)

اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ آپ جو کہتے ہیں کہ ''اللہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا تو آخر یہ فیصلہ کب ہوگا؟ اور ایک تصور جو بالکل سطحی نگاہ سے سمجھ میں آسکتا ہے، یہ ہے کہ یہ فتح مکہ سے متعلق ہے۔[۱] مگر فتح مکہ کے دن تو یہ عمل نہیں ہوا کہ ایمان کو بے کار قرار دیا گیا ہو اور توبہ قبول نہ کی گئی ہو۔ فیصلہ مراد ہونے کی صورت میں بعض لوگوں نے فیصلۂ تقدیر مراد لیا ہے جس کا ظہور جنگ بدر میں ہوا کہ بہت سے ان میں کے قتل ہوئے اور بہت سے ذلت کے ساتھ قید ہوئے مگر روز بدر بھی حکم تو یہ نہ تھا کہ جواب ایمان لائے اس کا ایمان فائدہ نہ دے اور توبہ اُس دن کی قبول نہ ہو۔

بعض نے جزا وسزا والا فیصلہ مراد لیا ہے جو قیامت میں ہوگا[۲] اور بعض نے اُسے مجملاً نزول عذاب کے معنی میں لیا ہے۔[۳] بہر حال ہم جو رجعت کے قائل ہیں، پہلی تفسیر کو بلا تکلف قبول کر سکتے ہیں اور جو رجعت کے قائل نہیں ہیں، اُنہیں ان آخر کے دو پہلوؤں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ہی مضمون آیت کے لحاظ سے صحیح ہوسکتا ہے۔ ''یہ کہ وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں'' اس میں ظاہر ہے کہ اُن کا انتظار اپنے مفید مطلب کسی نتیجہ کے لئے ہوسکتا ہے مثلاً یہ کہ پیغمبر خدا دنیا سے اٹھ جائیں یا اور کسی طرح اپنے مقصد میں ناکام ہوں اور شکست کھا جائیں[۴] اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بطور طنز اس نتیجہ کے لئے جو بعد میں اُن کے واسطے قہراً یہ فیصلہ قدرت ہوگا اُن کی طرف انتظار کی نسبت دی گئی ہے جس کی نظریں قرآن مجید میں موجود ہے۔

---

[۱] الفتح القضاء دون الحکم وقیل انّه اداد به فتح مکّه (تبیان)

[۲] قال السدی الفتح هو القضآء بعذابهم فی الدنیا وقال مجاهد هو الحکم بالثواب والعقاب لکم القیامة (مجمع البیان)

[۳] بانزال العذاب (جلالین)

[۴]

سُوْرَۃُ الْاَحْزَابِ

مکّیہ ----۷۳----آیات

"احزاب" "حزب" کی جمع ہے اور حذب کے معنی پارٹی کے ہیں تو احزاب کے معنی پارٹیاں اور اس پر الف لام استغراق کا ہے، اس طرح آج کل کے محاورے کے مطابق بالکل لفظی ترجمہ اس کا ہوا "آل پارٹینز"۔

چونکہ جنگ اُحد کی شکست کے بعد مشرکین قریش نے جو اہل مکہ تھے محسوس کیا کہ ہم تنہا رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں سربر نہیں ہو سکتے تو دوسرے قبائل عرب کو جو مخالف رسولؐ ہونے میں اُن کے ساتھ متحد ہو سکتے تھے، انہوں نے اپنے ساتھ لے کر متفقہ طور سے مدینہ پر چڑھائی کی، اس موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ سے باہر نکل کر جناب سلمان فارسی رضوان اللہ علیہ کے مشورے کے مطابق سامنے ایک خندق کھدوائی تا کہ وہ لوگ چاروں طرف سے گھیر نہ سکیں اور مقابلہ ایک طرف سے ہو، اس لئے اس جنگ کو عام طور سے ہمارے محاورے میں "جنگ خندق" کہا جاتا ہے اور تاریخ کی اصطلاح میں "غزوۂ احزاب" ہے۔ اس سورہ میں اس غزوہ کے موقع پر عام مسلمانوں پر کیا خوف و دہشت کا عالم طاری تھا، اس کا بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اور اس ذکر میں کئی دفعہ احزاب کے لفظ کا استعمال ہوا ہے، اس لئے اس سورے کا نام "احزاب" ہوا۔

سورۂ احزاب کے خاص خاص مضامین:

۱۔ یہ کہ اپنی زبان سے کوئی رشتہ لگانے سے حقیقی رشتہ دار کے احکام جاری نہیں ہوتے۔ اس ذیل میں ظہار کی طرف اشارہ ہے جس میں آدمی بیوی کو ماں کہہ دیتا ہے جو فقہ کا مستقل باب ہے اور جس پر اس کے بعد اٹھائیسویں پارے کے شروع میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۔ متبنیٰ کے حکم کا بیان اور یہ کہ اُسے "بیٹا" کہنا غلط ہے اور اس پر بیٹے کے احکام جیسے وراثت اور محرمیت مرتب نہیں ہوتے۔

۳۔ ازواج رسولؐ کے "امّہات المؤمنین" ہونے کا اعلان اور اُن سے بعد وفاتِ رسولؐ نکاح کرنے کی دائمی ممانعت۔

۴۔ جنگ خندق کے خاتمے کے بعد بنی قریظہ کا انجام۔

۵۔ ازواج رسولؐ کو سخت تنبیہیں اور یہ کہ اُن میں کی کوئی مرتکب گناہ ہوگی تو اُسے دونی سزا دی جائیگی۔

۶۔ پردے کا عام حکم اور خاص طور پر ازواج رسولؐ کے لئے اپنے گھروں کے اندر رہنے کا حکم۔

۷۔ آیۂ تطہیر۔

۸۔ عورت اور مرد کی معیار عمل اور اجر و ثواب میں یکسانی۔

۹۔ خدا اور رسولؐ کے فیصلے کے بعد جمہور مسلمین کے اختیار کی نفی۔

۱۰۔ واقعہ زینب بنت جحش۔

۱۱۔ ہمارے رسولؐ کا خاتم الانبیاء ہونا۔

۱۲۔ پردے کے عام حکم سے مستثنیٰ محرم افراد کا بیان۔

۱۳۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود کی تعلیم۔

۱۴۔ خدا اور رسولؐ کو ایذا پہنچانے والوں پر لعنت۔

۱۵۔ بار امانت اور انسان پر قرعۂ فال۔ وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ﴿۲﴾ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۳﴾

''اے پیغمبر! اللہ کی ناراضگی سے بچتے رہیے اور کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مانئے یقیناً اللہ جاننے والا ہے، حکمت والا اور پیروی کیجئے اُس کی جو آپ کے پاس وحی بھیجی جاتی ہے آپ کے پروردگار کی طرف سے یقیناً اللہ اس سے جو تم لوگ کرتے ہو باخبر ہے اور اللہ پر بھروسا کیجئے اور اللہ کافی ہے کارساز ہونے کے لیے''۔

بیچ کے اس جملے کے روئے خطاب سے کہ ''اللہ اُس سے جو تم لوگ کرتے ہو باخبر ہے'' ظاہر ہے کہ آغاز آیت میں جو رسولؐ کو مخاطب کیا گیا ہے، اُس سے تنبیہ خود رسولؐ کو مقصود نہیں ہے بلکہ اور لوگوں کو۔[1]

جناب شیخ الطائفہؒ نے شان نزول یہ درج کی ہے کہ ابوسفیان اور کچھ افراد رسالت مآبؐ کے پاس کچھ گفتگو کے لئے آئے تو بعض پرجوش صحابہ نے جو بظاہر وہی ہو سکتے ہیں جو پہلے ہی صلح حدیبیہ کے خلاف تھے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پرزور طریقے پر یہ چاہا کہ آپ ان لوگوں کو قتل کرا دیں اس پر یہ آیت اتری۔

اس صورت میں ظاہر ہے کہ یہاں منافقین اُنہی افراد کو کہا گیا ہے جنہوں نے ایسا مشورہ دیا تھا۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ

---

[1] هٰذا هُوَ الّذی قال الصّادق علیه السّلام انّ الله بعث نبیه بایّاك اعنی واسمعی باجارة فالمخاطبة للنّبی صلّی الله علیه وآله والمعنی للنّاس (علی بن ابراهیم)

بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ ۝۴

''اللہ نے کسی آدمی کے لئے دو (۲) دل اس کے سینے میں نہیں رکھے ہیں اور تمہاری اُن بیویوں کو جنہیں تم ظہار کے عنوان سے ماں کہدو، تمہاری ماں نہیں بنایا ہے اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا بیٹا قرار دیا ہے، یہ سب تمہاری اپنے منہ سے باتیں ہیں اور اللہ حق بات کہتا ہے اور وہ صحیح راستے کی ہدایت کرتا ہے''۔

منہ بولا رشتہ اسلام میں حقیقت نہیں رکھتا:

''کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں ہیں'' ان لفظوں کا مفہوم تو بالکل ظاہر ہے اور بحیثیت واقعہ یہ حقیقت بھی سب کو معلوم ہے کہ کسی آدمی کے سینے میں دو دل نہیں ہوتے مگر اس آیت میں یہ بات کیوں کہی گئی ہے اور اس کا پس منظر کیا ہے؟ اس میں اتنا اختلاف ہے کہ انسان کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ سات آٹھ پہلو علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں درج کیے ہیں جن میں بس ایک معصومؑ کی طرف نسبت رکھتا ہے اور بجائے خود بہت دل نشین ہے کہ ایک سینے میں دو دل نہیں ہیں لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ انسان ایک آدمی کے ساتھ محبت کرے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اس کے دشمن سے بھی محبت کرے۔ [1]

پھر بھی یہ بات تشنۂ بیان ہے کہ اس کا اس آیت کے دوسرے اجزاء سے کیا تعلق ہے؟ سب کو ملا کر ذہن میں جو مطلب آتا ہے، وہ یہ ہے کہ یہ باتیں خلاف فطرت ہونے کی بناء پر غلط ہیں۔ محبت کا کسی ایک سے ہونا اور پھر اس کے دشمن سے بھی محبت رکھنا۔ دوسرے کی اولاد کو اپنی اولاد قرار دینا اور بیوی کو ماں بنانا تو جو یہ باتیں کرتا ہے وہ خلاف فطرت باتوں کا ادعا کرتا ہے۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ؕ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵

''اُنہیں اُن کے باپ کی طرف نسبت دے کر پکارو، یہ زیادہ درست ہے اللہ کے نزدیک اب اگر ان کے باپ تمہیں معلوم نہ ہوں تو تمہارے دینی بھائی اور حوالی موالی ہیں اور تم پر کوئی گناہ نہیں اس میں جو تم نے غلطی سے کیا ہو مگر جو تمہارے دلوں نے ارادہ کیا ہو اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

''منہ بولا بیٹا'' کوئی غیر بھی ہوسکتا ہے مثلاً کسی دوست یا عزیز کا بچہ اور خود اپنا غلام یا غلام زادہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُس کی عزت افزائی کے لیے یا بربنائے محبت ''بیٹا'' کہنے لگے۔ ان کے اکثر اصلی باپ کا نام اور پتہ معلوم نہیں ہوتا تھا، اس لئے دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اگر باپ اُن کے معلوم نہیں ہیں تو پہلی صورت میں جب کہ تم سے اُن کا کوئی رشتہ واقعہ نہیں ہے تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور دوسری صورت میں تمہارے موالی ہیں جو آزاد کردہ غلام یا غلام زادہ کے معنی میں ہوتا ہے اور چچازاد بھائی کا رشتہ بھی ہوسکتا ہے، جو اموالی کے دوسرے معنی ہیں اور اس صورت میں کہ

---

[1] قال ابو عبداللہؑ ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ یحبّ بھذا قوما و یحبّ بھذا اعداءھم (مجمع البیان)

جب نسبًا وہ چچازاد بھائی ہوں تو قریب تر وارث نہ ہونے کی صورت میں اُنہیں میراث بھی مل سکتی ہے مگر جو واقعی اُن کا نسبی رشتہ ہے، اس کے حساب سے، نہ کہ بیٹا کہنے کی بناء پر۔ بہرحال یہ سب صورتیں اس میں داخل ہیں۔[1]

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤی اَوْلِیٰٓىِٕكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝۶

''پیغمبر مومنین پر خود اُن سے زیادہ اختیار رکھتے ہیں اور اُن کی بیویاں اُن (مومنین) کی مائیں ہیں اور قرابت دار آپس میں قانون الٰہی کے دائرے میں ایک دوسرے کی وراثت کے زیادہ حق دار ہیں مومنین اور مہاجرین سے یہ اور بات ہے کہ اپنے دوستوں کے ساتھ کچھ حسن سلوک کرو۔ یہ قانون الٰہی میں درج شدہ چیز ہے''۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مومنین پر اختیار کلّی

پہلا جزء ''پیغمبر مومنین پر خود اُن سے زیادہ اختیار رکھتے ہیں'' یہ اعلان جس کا مترجمین و مفسرین اہل سنت بھی یہی مفہوم قرار دینے پر مجبور ہوئے۔(۱)۔ اسلامی سیاست کی اصل بنیاد ہے جس میں خداوندی اختیار کے مقابلہ میں عوام کے اقتدار و اختیار کی کلیۃً نفی ہوتی ہے، چاہے وہ شخصی طور پر ہو یا چند نفوس کے مشورے کے طور پر ہو یا تمام افراد کے متفقہ فیصلے کی صورت میں ہو، اس لئے کہ شریک شوریٰ یا شریک اجماع جو افراد ہوں گے، وہ مومنین ہی تو ہوں گے، جب اُن میں سے ہر ایک کے اختیار کی نفی ہوگئی تو ظاہر ہے کہ نفی کا اظہار زیرو (۰) سے ہوتا ہے۔ یہ زیرو چار پانچ ہوں یا بے شمار ہوں، بہرحال ان سے کبھی کسی عدد کی تشکیل نہیں ہوسکتی یعنی بے شمار افراد کا مجموعہ بھی بے اختیار ہوگا۔ اُس کو حق اختیار حاصل نہیں ہوسکتا۔

''اُن کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں'' عزت و احترام میں جس کا خاص جزیہ ہے کہ نکاح اُن کے ساتھ پیغمبرؐ کے بعد کبھی روا نہیں مگر پردے کے حکم سے مستثنیٰ نہیں ہیں جو اسی سورے کی بعد کی آیتوں سے ظاہر ہوگا۔

اس کے بعد مختصر طور پر قرابت داروں کی میراث کا بیان ہے جس کا ربط قبل کے مضمون سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اس غلطی کے دفعیہ کے لئے ہے کہ جب ازواج رسولؐ مومنین کی مائیں ہیں تو میراث بھی ماں کی حیثیت سے انہیں ملنا چاہئے تو اُن کی نفی کی جارہی ہے کہ جس طرح ماں ہونے کے باوجود پردے سے مستثنیٰ نہیں ہیں، اسی طرح ایسا نہیں ہے کہ اصل قرابت داروں کو چھوڑ کر اُنہیں میراث مل جائے یا اُن کی میراث اُن کے قرابت داروں کو چھوڑ کر دوسرے مسلمانوں کو بحیثیت اولاد کے مل جائے۔

بعد میں جو استثناء ہے:۔ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤی اَوْلِیٰٓىِٕكُمْ مَّعْرُوْفًا ''یہ اور بات ہے کہ اپنے دوستوں کے ساتھ کچھ حسن سلوک کرو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ بحیثیت میراث تو قرابت داروں کے جو نزدیک و دور کے طبقے ہیں، اُسی لحاظ سے ملے گا لیکن اگر انسان اپنی زندگی میں اپنے ذاتی تعلقات کی وجہ سے کسی کے ساتھ حسن سلوک کرے یا اپنے بعد کے لئے وصیت کر جائے تو اصول میراث اُس میں سدراہ نہیں ہوتے، یہ اور

---

[1] ای بنو عمّکم اولکم ولاوھم اذا کنتم اعتقتموھم عن رق (تبیان)

بات ہے کہ وصیت میں حد مقرر ہے کہ بلا اجازت ورثہ ثلث میں نافذ ہوگی۔ اس سے زیادہ میں نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ﴿۷﴾ لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۸﴾

''اور جب ہم نے پیغمبروں سے عہد و پیمان لیا اور آپ سے اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ فرزند مریم سے اور ان سب ہی سے مضبوط عہد لیا تا کہ وہ پوچھے سچوں سے اُن کی سچائی کے متعلق اور اس نے تیار رکھا ہے کافروں کے لئے دردناک عذاب''۔

سیاق کلام کے لحاظ سے سچوں سے مراد انبیاء معلوم ہوتے ہیں جو صحیح صحیح اپنی دعوت و کارگزاری اور اپنی اپنی قوم کے رویہ کا اظہار کریں گے مگر اس کے عموم میں اصولی طور پر اللہ کا ہر بندہ داخل ہے کہ سب سے جواب دہی اُن کی سچائی کے بارے میں ہوگی اور اُسی کے لحاظ سے اُنہیں جزا ملے گی۔ اب اسی میں ضمناً جھوٹوں کے لئے تنبیہ بھی ہے کہ اُنہیں اُن کے جھوٹ کی پاداش ملے گی۔

علامہ طبرسیؒ نے بطور حدیث امام جعفر صادقؑ نقل کیا ہے جو میرے خیال میں بہت بڑا مسامحہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جناب شیخ طوسیؒ نے یہ عبارت تحریر فرمائی ہے کہ:۔

يكون فيه تهديد الكاذب فانّ الصّادق اذا سئل عن صدقه فيجازى بحسبه فكيف يكون صورة الكاذب(تبيان)

اس میں جھوٹے آدمی کے لئے تنبیہ بھی ہوتی ہے اس لئے کہ سچے سے جب اُس کی سچائی کے متعلق دریافت کی جائے گا تو اسی کے اعتبار سے اُسے جزا ملے گی تو پھر جھوٹے کے لئے صورت حال کیا ہوگی؟

ہمارے جناب طبرسیؒ نے جو شیخ کی عبارتوں کا بغیر حوالہ بجنسہ درج کرنے کے عادی ہیں فانّ الصادق کو قال الصادق پڑھ کر یوں درج فرمایا کہ:۔

يكون فيه تهديد الكاذب قال الصّادقؑ اذا سئل عن صدقة على اى وجه قاله فيجازىٰ بحبه فكيف يكون حال الكاذب.(مجمع البيان)

اس میں جھوٹے آدمی کے لئے تنبیہ بھی ہوتی ہے امام جعفر صادقؑ نے فرمایا جب سوال کیا جائے گا اس کی سچائی کے متعلّق کہ اُس نے کس طرح سے کہا تھا تو اسی لحاظ سے اُسے جزاء ملے گی تو کیا حالت ہوگی جھوٹے کی۔

اب اس عبارت میں الصادق کو جو صدق کا اسم فاعل تھا اس کی وصفی حیثیت سے ہٹا کر الصادقؑ قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں سئل عن صدقه کا نائب فاعل لفظی طور پر غائب ہوگیا۔ انہی ملکوں سے بچنے کے لئے میں پابند ہوں کہ کسی کی کتاب سے کوئی بھی چیز لوں تو اُس کا پورا حوالہ درج کردوں جس میں شخصیت کا بھی کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس پر بعض لوگوں کو مجھ سے شکایت ہے کہ اس سے بعض اشخاص کو

اہمیت حاصل ہو جاتی ہے مگر میرے نزدیک میرے اظہار حقیقت سے یہ نتیجہ اگر برآمد ہوتا ہے تو وہ بہتر ہے اس سے کہ انسان ایسے خطروں میں مبتلا ہو جن کا دوسری صورت میں امکان ہوتا ہے جس کی افسوسناک مثالیں میری نظر میں کئی ہیں اور سردست تفسیر مجمع البیان کی یہ مثال جس کے لئے بہت کافی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۚ﴿۹﴾ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ﴿۱۰﴾ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴿۱۱﴾ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾

''اے ایمان لانے والو! یاد کرو اللہ کے فضل و احسان کو جو تم پر ہوا، جب تمہاری طرف آئیں فوجیں تو ہم نے اُن کے مقابلے پر بھیجا ایک ہوا کو اور اُن فوجوں کو جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، اُس کو دیکھنے والا ہے، جس وقت آئے وہ تمہاری طرف اوپر سے اور نیچے سے اور جب آنکھیں پتھرا گئیں اور دل کھینچ کر گلوں تک آ گئے اور تم اللہ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے اس وقت آزمائش ہوئی ایمان لانے والوں کی اور وہ بڑے سخت زلزلے میں مبتلا کیے گئے اور جب منافق لوگ اور وہ جن کے دلوں میں بیماری تھی کہنے لگے کہ ہم سے اللہ اور اس کے پیغمبر نے وعدہ نہیں کیا تھا مگر دھوکا دینے کے لئے۔

جنگ خندق کا ہولناک موقع اور مسلمانوں کی حالت

یہ جنگ خندق اور مسلمانوں کے گفتار و پندار اور کردار کی تصویر ہے [1] اور اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ فرشتے بدر کے بعد پھر خندق میں بھی اترے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اُس دن اُنہوں نے جنگ نہ کی ہو۔ صرف مسلمانوں کی ہمت افزائی کے لئے آتے ہوں۔ [2]

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ؕ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ

---

[1] یعنی یوم الاحزاب وھو یوم الخندق (تبیان)

[2] قیل انّ الملائکۃ لم یقاتلوا یومئذ ولکن کانو ایشجّعون المئومنین ویجبّنون الکافرین (مجمع البیان)

اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۶﴾ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷﴾

''اور جب ایک گروہ نے اُن میں سے کہا کہ اے مدینہ کے رہنے والو! تمہارے ٹھہرنے کا موقع نہیں ہے تو واپس چلو اور کچھ لوگ اُن میں پیغمبر سے اجازت مانگ رہے تھے کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں، حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں ہیں۔ نہیں چاہ رہے ہیں وہ مگر بھاگنا اور اگر اُسے (مدینے) میں اُن پر حملہ کر کے داخل ہو جایا جاتا اس کے اطراف وجوانب سے پھر، اُن سے چاہا جاتا ہنگامہ برپا کرنا تو یہ ایسا بھی کر گزرتے اور اس میں زیادہ توقف نہ کرتے حالانکہ انہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا اس کے پہلے کہ وہ پیٹھ نہیں پھرائیں گے اور اللہ سے جو عہد ہو، اُسے پوچھا جائے گا، کہئے کہ تمہیں بھاگنا کبھی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ اگر تم بھی مرنے سے یا مارے جانے سے اور اس وقت میں بھی تمہیں (زندگی دنیا سے) بہرہ مند ہونے کا موقع نہیں دیا جائے گا مگر بہت کم۔ کہئے کہ کون تمہیں بچائے گا اللہ سے اگر چاہے وہ تمہارے لئے کوئی مصیبت یا چاہے تمہارے ساتھ مہربانی (بہر حال تم اس کے رحم وکرم ہی پر ہو اور وہ نہیں پائیں گے اپنے لئے اللہ کو چھوڑ کر دوست اور نہ مددگار''۔

ایک باخبر بزرگوار کی زبان سے جن کے یہاں کی مسلم شخصیتیں اکثر تاریخ کے بے لوث بیانات سے مجروح ہوتی ہیں، یہ سننے میں آیا کہ تاریخ بڑی بے درد ہوتی ہے۔ کسی شخصیت کا لحاظ نہیں کرتی مگر اسے کیا کیا جائے کہ بیان واقعات میں قرآن مجید بھی ممدوح کی زبان میں ایسا ہی بے درد نظر آتا ہے کہ اُس خیر القرآن کے ''مہر وماہ'' قسم کے افراد کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتتا اور کس کس طرح ایسا کردار سامنے لاتا رہتا ہے کہ قرآن پر ایمان لانے کی صورت میں اُن کے ساتھ انسان کو حسنِ ظن قائم رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۸﴾ اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ

سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۹﴾ يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ؕ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۲۰﴾

''اللہ جانتا ہے تم میں سے روکنے والوں کو اور اپنے بھائی بندوں سے یہ کہنے والوں کو کہ ہماری طرف آؤ اور وہ جنگ کے موقع پر نہیں آتے مگر بہت کم، بخل کرتے ہوئے تمہارے اوپر تو جب خوف کا موقع آئے تو تم انہیں دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں، دیدے گھما گھما کے جیسے وہ آدمی جسے موت کی سختی سے غش آجائے۔ اس کے بعد جب خوف چلا جائے تو تیز زبانوں سے تم لوگوں کو باتیں سنائیں گے۔ دولت کو ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہیں۔ یہ لوگ ایمان لائے ہی نہیں تو اللہ نے اُن کے اعمال اکارت کر دیئے۔ اور یہ اللہ پر آسان ہے اُن فوجوں کو وہ سمجھتے ہیں کہ گئی نہیں ہیں اور اگر وہ فوجیں آجائیں تو وہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ صحرائی عربوں کے ساتھ رہ کر جنگلوں میں تمہاری خبریں دریافت کرتے ہوتے اور اگر وہ تم میں ہوتے تب بھی جنگ نہ کرتے مگر بہت کم''۔

منافقین کا کردار

''بخل کرتے ہوئے تمہارے اوپر'' یعنی تمہاری مدد میں بخل کرتے ہوئے جان سے بھی اور مال سے بھی۔(۱) پھر اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ میں جو خیر ہے اس کے معنی مال کے ہوتے ہیں اس لئے ہم نے ترجمہ کیا ''دولت کو ہاتھ سے دینے کے لئے تیار نہیں''۔ دوسروں نے بھی ترجمہ اس کے مطابق کیا ہے۔(۲) مطلب یہ ہے کہ ان کی کوشش رہتی ہے کہ مال غنیمت میں انہیں زیادہ سے زیادہ حصہ ملے۔(۳)

مگر ایک خیال میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ بخل کے ساتھ جس چیز کو روکا جائے، اُس کے لئے ''ب'' آتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے: اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ. علیٰ نہیں جب کہ شُحّ بخل ہی کے معنی میں ہے تو قیاس یہ کہتا ہے کہ اس لفظ میں بھی یہی ہونا چاہئے چنانچہ پہلی جگہ جو اشحة علیکم آیا ہے، اُس کے معنی یہ نہیں ہوئے کہ تمہارے ساتھ بخل کرتے ہیں بلکہ اُس کی تشریح میں ہر ایک نے یہ لکھا ہے کہ تمہاری مدد میں جان و مال کے ساتھ بخل کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ب اُس چیز کے لئے آئے گا جس کے ساتھ بخل کیا جائے اور علیٰ اُس کے لئے جس سے بخل کیا جائے اب جو خیر کے ساتھ علیٰ آیا ہے کہ اشحة علی الخیر تو اس خیر کے معنی مال و دولت کے کیوں قرار دیئے جائیں جس کے ساتھ وہ بخل کرتے ہیں بلکہ خیر کے معنی نیک کاموں کے کیوں نہ لئے جائیں جس میں صرف کرنے سے وہ بخل کرتے ہیں مگر یہ پہلوان مفسرین کے جیسے پیش نظر نہیں ہے۔

---

(۱) او بخلاء بالقتال معهم وقيل بخلاء بالنفقة فی سبيل الله والنصرة (مجمع البيان)

(۲) بخل کنان بدمال (شاہ ولی اللہ)

(۳) ای الغنيمة يطلبونها (جلالين)

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾

''تمہارے لئے پیغمبر خدا کی ذات میں اچھا نمونہ پیروی کے لئے موجود ہے اُس کے لئے جو اللہ اور روز آخرت کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو خوب یاد رکھے''۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہترین نمونہ عمل

یعنی جس طرح قول رسولؐ وحی الٰہی کا ترجمان ہے، اُسی طرح فعل رسولؐ۔ آپ کے تمام افعال کو مرضی الٰہی کے مطابق ماننا لازم ہے اور ہم اُن کی پیروی کریں تو بہر حال یہ پیروی ہماری اللہ کو پسند ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ فعل واجب نہ ہو، مستحب یا کم از کم مباح ہوگا کیوں کہ ظاہر ہے کہ رسولؐ صرف واجبات ہی کو عمل میں نہیں لاتے تھے بلکہ مستحبات کو بھی اکثر ترک نہیں فرماتے تھے اور جو جائز امور از قبیل مباحات ہوں، وہ بھی جب اُن کا محل ہو عمل میں لاتے تھے لہٰذا اُس کے تعیین کہ کون واجب ہے اور کون مستحب اور کون امر مباح۔ یہ صرف عمل رسولؐ کو دیکھ کر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے بیانِ رسولؐ یا دوسرے دلائل شرعیہ کو دیکھنے کی ضرورت ہوگی۔[۱] اگر مقام تنزیل میں آیت اسی محل پر ہے تو گذشتہ اور آئندہ کے ربط سے مقصود اس پر متنبہ کرنا ہے کہ تم آخر شدائد اور مصائب کے وقت اتنے بے تاب کیوں ہو جاتے ہو؟ رسولؐ کو دیکھو! یہ کس طرح ان حالات میں صبر و تحمل کا نمونہ رہتے ہیں اور سکون و اطمینان کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔[۲]

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾

''اور جب خاص ایمان والوں نے اُن فوجوں کو دیکھا تو انہوں نے کہا یہ وہ وعدہ ہے جو ہم سے اللہ اور اس کے پیغمبر نے کیا تھا اور اللہ اور اُس کے پیغمبر نے سچ کہا تھا اور اس نے اُن کے ایمان اور سر تسلیم خم کرنے میں اور اضافہ کر دیا''۔ عام مسلمانوں کا تو وہ حال تھا جو پہلے آچکا ہے لیکن اُس وقت بھی ایک سچی صاحب ایمان جماعت ایسی تھی جس نے سکون و اطمینان کا دامن نہیں چھوڑا اور ان کے ذہن میں کوئی شک و تذبذب کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔ یہ ہیں وہ خاص الخاص مومنین جن کا حال اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ

---

[۱] ای اقتداءً حسن فی جمیع ما یقولہ ویفعلہ متی فعلتم مثلہ کان ذٰلک حسنا ولا یدلّ علیٰ وجوب الاقتداء بہ فی افعالہ وانما یعلم ذٰلک بدلیل اٰخر (تبیان)

[۲] اقتداء بہ فی القتال والثّبات فی مراطنہ (جلالین) کما فعل ھر یوم احد ـــــ فھلّا فعلتم مثل ما فعل ھو (مجمع البیان)

وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾

''ایمان والوں میں کچھ اشخاص ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا اُسے جو انہوں نے اللہ سے عہد و پیمان کیا تھا تو اُن میں کچھ وہ ہیں جنہوں نے اپنا وقت پورا کرلیا اور ان میں سے کچھ انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے بات میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی تا کہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کا صلہ دے اور منافقین کو چاہے سزا دے یا اُن کی توبہ قبول کرے، یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

''جنہوں نے اپنا وقت پورا کرلیا'' یعنی شہید ہو گئے۔[1] اور کچھ وہ ہیں جو انتظار کر رہے ہیں یعنی شوق شہادت میں وہ ان افراد سے کم نہ تھے مگر وہ اس موقع پر درجہ شہادت پر فائز نہیں ہوئے آئندہ کا انتظار کر رہے ہیں۔

فریقین کی روایت میں ہے کہ مِّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ کے جملے کا جناب حمزہؓ و جعفرؓ سے تعلق ہے کہ اوّل الذّکر جنگ احد میں اور دوسرے بزرگ جنگ موتہ میں شہید ہو گئے اور کچھ انتظار کر رہے ہیں، اس فقرے کا تعلق حضرت علیؑ سے ہے جو پیش آمدہ غزواتِ رسولؐ میں باوجود کارہائے نمایاں انجام دینے کے شہید نہیں ہوئے۔[2]

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿۲۵﴾

''اور پلٹا یا اللہ نے کافروں کو اُن کے غم و غصہ کے ساتھ کہ اُن کا کوئی بھی بھلا نہ ہوا اور بچا یا اللہ نے مومنین کی جماعت کو جنگ کی زحمت سے اور اللہ طاقت ور ہے، عزت والا''۔

جنگ خندق کا سرانجام

جنگ خندق میں بس ایک پہلوان عمرو بن عبدود کے قتل ہونے سے جسے حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے قتل کیا تھا تمام مشرکین مرعوب ہو گئے اور ان کی فوجیں واپس چلی گئیں، اس لئے بعض تفاسیر میں وارد ہوا ہے کہ اس آیت کی تنزیل یعنی معنی تنزیلی یہ ہے کہ کفی اللہ القتال بعلی علیؑ کے ذریعہ سے تمام مسلمانوں کو اللہ نے جنگ کی زحمت سے بچایا[3] اور اہل تفسیر اہل بیت عصمت علیہم السلام بھی اسی مفہوم کے مطابق ہے۔[4]

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ

---

[1] بانجام رسانید قرار داد خود را (شاہ ولی اللہ) پورا کر چکا کام اپنا (رفیع الدین) یعنی شہید شدند (فتح الرحمن) ذمہ پورا کر چکا یعنی جہاد ہی میں جان دے چکا (موضح القرآن)

[2] روی انّ الاٰیة نزلت فی حمزة بن عبد المطلب وجعفر بن ابی طالب علیہ السلام (تبیان) من علی علیہ السلام قال فینا نزلت: رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه فانا والله المنتظر وما بدّلت تبدیلا (مجمع البیان)۔

[3] هی قراءة ابن مسعود وکذلك هو فی مصحفه (تبیان)

[4] هو المروی عن ابی عبد الله علیہ السلام (مجمع البیان)

قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿۲۶﴾ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۷﴾

''اور اُس نے اتار دیا اہل کتاب میں سے اُن کو جنہوں نے اُن کی مدد کی تھی، اُن کے قلعوں سے اور اُن کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ ان میں سے کچھ کو تم قتل کر رہے تھے اور کچھ کو قید کر رہے تھے اور تمہیں قابض بنایا اُن کی زمین اور اُن کے مکانات اور اُن کے اموال اور اس زمین پر جسے تم اپنے زیر قدم لائے نہ تھے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

بنی قریظہ کا انجام

یہ یہود میں بنی قریظہ کا تذکرہ ہے۔[1] جنہوں نے رسولؐ سے اس کے قبل عہد وفاداری کرنے کے بعد اب اس جنگ احزاب میں مشرکین کا ساتھ دیا، اس لئے اب اُن کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی۔ ایک قدیم مفسر نے بنی نصیر کا نام لے دیا ہے مگر یہ غلط ہے اس لئے کہ وہ پہلے ہی مدینہ سے نکالے جا چکے تھے۔[2]

يٰۤاَيُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۲۸﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

''اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیاوی زندگی اور اُس کی سجاوٹ کی طلبگار ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا دوں اور تمہیں اچھے عنوان سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے پیغمبر اور منزل آخرت کی طلب گار ہو تو جو تم میں سے اچھے اعمال کرتی رہیں گی، اُن کے لئے اللہ نے بڑا ثواب تیار رکھا ہے''۔

حمید الدین فراہی صاحب جو تفسیر میں نظم قرآن پر بڑا زور دیتے ہیں، معلوم نہیں جنگ خندق اور ازواج رسولؐ کو اس انتباہ میں کیا رشتہ قرار دیتے ہیں، ہم کلیتہً اس نظم یعنی ترتیب کو قابل لحاظ نہیں سمجھتے۔ اس لئے بھی کہ موجودہ ترتیب تنزیل کے مطابق ہے ہی نہیں اور اس لئے بھی کہ اکثر آیات متفرق طور پر کچھ حالات کے تحت نازل ہوئے ہیں۔ اس لئے ضروری نہیں ہے کہ اُن کا قبل کے آیات سے کوئی جوڑ ہو چنانچہ اب یہ سلسلہ آیات کا جو شروع ہو رہا ہے، گذشتہ سلسلہ آیات سے قطعاً غیر متعلق ہے لہٰذا خود ان آیات کی شان نزول تلاش کرنے کی ضرورت ہے کہ ازواج رسولؐ میں کیا چہ می گوئیاں ہوئی تھیں، یا اُنہوں نے پیغمبر خداؐ سے کیا فرمائشیں کی تھیں جن کی بنا پر یہ آیات نازل ہوئی ہیں جو شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں۔ ''حضرتؐ کے ازواج نے دیکھا کہ لوگ آسودہ ہوئے، چاہا کہ ہم بھی آسودہ ہوں بعضوں نے بول چال کی حضرتؐ نے قسم کھائی کہ ایک

---

[1] نزل فی بنی قریظة (علی بن ابراهیم) هم بنو قریظة من الیهود (تبیان)

[2] کانوا اقدا جلوا قبل ذٰلك (مجمع البیان)

مہینے گھر میں نہ جائیں۔ پھر مہینے کے بعد یہ آیت اتری"۔

تفسیر جلالین میں ہے:

طَلِبِيْنَ مِنْهُ زِيْنَةَ الدُّنْيَا مَا لَيْسَ عِنْدَهٗ۔ انہوں نے حضرتؐ سے دنیوی آرایش کے ایسے سامان کا مطالبہ کیا جو حضرتؐ کے پاس نہ تھا۔ اس کے بعد ہمارے یہاں یہ روایت ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے اپنے ازواج کے سامنے جب یہ آیت پڑھ کر سنائی تو سب سے پہلے ام المومنین جناب ام سلمہ رضوان اللہ علیہا نے کہا کہ میں تو خدا اور رسول کو چاہتی ہوں۔ دوسری تمام ازواج رسولؐ اُن کی پیش قدمی کی قدر کرتی ہوئی اُن سے گلے ملیں اور پھر سب نے یہی بات کہی۔[1]

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰

"اے زنان پیغمبر! جو تم میں سے کسی نمایاں جرم کا ارتکاب کرے گی، اُسے دہری سزا دی جائیگی اور یہ بات اللہ کے لئے بہت آسان ہے"۔

ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتیاز خاص

یعنی دنیا کے لئے اس کا فلسفہ سمجھنا دشوار نہیں ہے کیوں کہ زوجیت رسولؐ جب ایک بہت بڑا شرف ہے تو پھر اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری بھی شدید ہونا چاہئے۔ اگر ان تقاضوں پر عمل نہ ہو اور کسی گناہ کا ارتکاب ہوا تو دوسروں کی بہ نسبت اُن کے گناہ کی سزا دونی ہے، اس لئے کہ جب وہ گناہ ہے تو خود اس عمل کی سزا تو ہے ہی اور پھر رسولؐ کے ساتھ رشتہ ازدواج کی توہین بھی ہے۔

اب اس سے سادات، اولاد رسولؐ کی آنکھیں کھلنا چاہئیں کہ اُن کا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُلبی رشتہ ہے تو پھر اُن کی ذمہ داری بھی زیادہ ہے۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ اب ہمیں اس رشتے کی بنا پر کچھ چھوٹ ملے گی بلکہ اُن کے اعمال کا احتساب زیادہ شدت کے ساتھ ہونا چاہئے کیونکہ اصول بہرحال اصول ہے۔ جب سببی رشتے سے گناہ کی سزا میں اضافہ ہو جاتا ہے تو نسبی رشتے سے کیوں نہ ہوگا؟

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ۝۳۱

"اور جو تم میں سے اللہ اور اُس کے پیغمبر کے اطاعت کرے اور نیک اعمال کرتے رہے اُسے ہم اُس کا ثواب بھی دونا عطا کریں گے اور اس کے لئے ہم نے عمدہ روزی تیار رکھی ہے"۔

قبل والے پارے کے آخر میں یہ آیا ہے کہ ازواج رسولؐ میں سے کوئی اگر گناہ کی مرتکب ہوگی تو اُسے سزا دونی دی جائے گی۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ گناہ بھی ہے اور رسولؐ کے رشتے کی توہین بھی۔

---

[1] فکانت امّ سلمة اول من قامت وقالت قد اخترت اللہ ورسولہ وقمن کلّھن فعانقتہ وقلن مثل ذٰلك (علی بن ابراھیم)۔

اب اس آیت میں اس کے بالمقابل حسن عمل کے لئے بھی وعدہ دونے ثواب کا ہوا ہے۔

یہاں جناب شیخ الطائفہؒ نے ایک سوال جیسے اٹھایا ہے مگر جواب اس کا لکھنے سے رہ گیا یا نقل در نقل سے کتابت میں ساقط ہوگیا۔ وہ سوال یہ ہے کہ وہ سزا بالاستحقاق تھی تو یہ جزاء دونی کیا صرف اس لئے لازم ہے کہ اللہ نے وعدہ کرلیا ہے؟ سیاق کا تقاضا یہ ہے کہ جیسے وہ سزا بالاستحقاق تھی، ویسے ہی یہ جزأ بھی بالاستحقاق ہو۔ [1]

ہم غور کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ سزا دونی کیوں تھی؟ اس لئے کہ گناہ بھی ہے اور رشتہ رسولؐ کی توہین بھی ہے تو اس کے بالمقابل اگر زندگی بھر یہ پیش نظر رہا کہ ہمیں رسولؐ سے کیا تعلق ہے؟ اس لئے ہمیں اپنی پوری زندگی اس معیار تقویٰ پر گزارنا ہے جو اس رشتے کا تقاضا ہے تو اس پوری زندگی میں جو اطاعت کا اجر ملتا ہے، وہ بھی ملنا چاہیے اور پھر رسولؐ کے ساتھ عمر بھر کا لحاظ رکھنے سے حفظ کرامت واحترام رسولؐ کا اجر بھی خاص طور پر ملنا چاہیے اس کے علاوہ پیغمبر خداؐ سے رشتہ خاص ہونے کی بنا پر ان کے افعال کی دوسرے تقلید کرتے ہیں اور یہ اصول کہ جو ٹھیک طریقہ شروع کرے جس پر دوسرے چلیں۔ اس کے ثواب میں وہ شریک ہوگا اور جو برا طریقہ اختیار کرے اس پر جتنے چلیں اُن کے عذاب میں وہ شریک ہوگا (من سنّ سنة حسنّة كان له اجر من عمل بها الىٰ يوم القيامة ومن سنّ سنّة سيّئة كان عليه وزر من عمل بها الىٰ يوم القيامة) اور یہ وجہ ایسی ہے جو قبل والی سزا کے دونے ہونے کا بھی ایک مستقل سبب ہوسکتی ہے اور اس سے معلوم ہوگا کہ ثواب اور عذاب دونوں میں دونا کہنا بھی اقل درجہ کے لحاظ سے ہے، ورنہ بہت ممکن ہے کہ وہ عذاب اور ثواب دونے سے بہت زیادہ ہو جس کا پورا اندازہ اس وقت نہیں کیا جا سکتا۔

اب وہ بدی پر عذاب کا دونا ہونا اور اطاعت گزاری پر ثواب کا دونا ہونا جب اس اصول پر ہے تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جن کا رشتہ اس سے بھی زیادہ نمایاں ہو یعنی اولاد کا رشتہ جو سادات کا ہے تو جیسا کہ قبل میں بھی مجملاً عرض کیا گیا، اُن کے لئے بھی یہی بات سمجھنا ناگزیر ہے کہ بہ نسبت دوسروں کے اُن کے کردار کی برائی اور اچھائی دونوں کا وزن زیادہ ہوگا۔ یہ کوئی ہمارا طبع زاد نکتہ نہیں ہے بلکہ خود بزرگان سادات نے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے جس کے ذیل میں حدیث معصومؑ بھی ہے۔ [2]

اور عقل سلیم کی مدد سے اس میں وسعت دی جائے تو ہر ایسا شخص جس کے کردار کو لوگ مثال بنائیں خواہ دینوی سبب سے جیسے صاحبان اقتدار یا دینی حیثیت سے جیسے علماء واعظین، ان پر بھی یہی حکم جاری ہوگا کہ اُن کی ذمہ داری زیادہ ہوگی اور اُن کے کردار کی جزا یا سزا بھی دوسروں سے بڑھ کر ہوگی۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ

---

[1] الاجر مرّتين ليس يجب بالوعد بل انّها هو مستحق (تبيان)

[2] عن ابي حمزة الثمالي عن زيد بن علیؑ انه قال: انّي لاوجو للمحسن منّا ان يضاعف له الثّواب ضعفين وعلى المسيئ منّا ان يضاعف العذاب ضعفين كما اوعد ازواج النبيﷺ ـــــ عن علي بن الحسينؑ انّه قال له رجل: انّكم اهل بيت مغفور لكم قال فغضب وقال نحن احرىٰ ان يجري فينا ما اجرى الله في ازواج النبيﷺ دون ان نكون كما تقول، انّا المحسنا ضعفين من الاجر والمسيئنا ضعفين من العذاب ثمّ قرأ الاٰية (مجمع البيان)

فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾

''اے پیغمبر کی بیویو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم پرہیزگار رہتی ہو تو نرمی کے ساتھ بات نہ کرو تا کہ اسے جس کے دل میں بیماری ہے کچھ توقع پیدا ہو، اور نیک بات کہا کرو اور استقلال کے ساتھ اپنے گھروں کے اندر رہا کرو اور زمانہ جاہلیت کی طرح بن ٹھن کے جلوہ دکھاتی نہ پھرو اور نماز ادا کرتی رہو اور زکوٰۃ ادا کرتی رہو اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی فرماں بردار رہو۔ اللہ کا بس یہ ارادہ ہے کہ تم لوگوں سے ہر گناہ کو دور رکھے اے اس گھر والو! اللہ تمہیں پاک رکھے جو پاک رکھنے کا حق ہے''۔

قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ کے معنی ہم نے لکھے ہیں کہ ''استقلال کے ساتھ اپنے گھروں کے اندر رہو''۔ یہ اکثر مفسرین و مترجمین کی تشریح کے مطابق ہیں۔[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام عورتوں کے لئے تو گھر کی چار دیواری کا پردہ واجب نہیں ہے بلکہ برقع و چادر میں نہاں ہو کر وہ جائز ضروریات کے لئے گھر سے باہر نکل سکتی ہیں لیکن ازواج رسولؐ کے لئے کہا جا رہا ہے کہ تم اور عورتوں کی سطح پر نہیں ہو لہٰذا تم پر پردے کی پابندی زیادہ ہے۔ تم کو اپنے گھروں میں بیٹھے رہنا چاہیے۔

آخری حصہ جو اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ سے ہے، اگرچہ موجودہ ترتیبی صورت میں گذشتہ آیت کا ایک جز ہے مگر مسلماً وہ مقام تنزیل میں تنہا اترا ہے جس کی شان نزول متفقہ طور پر مستقلاً درج ہے: اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ اس میں جو تفسیری حیثیت سے مرکزی لفظ ہے، وہ اَهْلَ الْبَيْتِ ہے جس کا ترجمہ اکثریت والے مفسرین صرف اَهْلَ اور بَيْتِ کے الفاظ کو دیکھ کر ''اہل خانہ'' یا خالص ہندوستانی زبان میں ''گھر والی'' سے کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس میں درمیان میں ایک الف لام ہے جو بیت پر داخل ہے (البیت) اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

یہ الف لام جو یہاں فرد خاص کی طرف اشارہ کے لئے آیا ہے۔[2] سامنے رکھا جائے تو اُس کے معنی ہو جائیں گے ''اس گھر والے'' جیسے الیوم کے معنی ''آج''، یعنی یہ سا دن۔ اب دیکھنے کی ضرورت ہوگی کہ رسولؐ کا اشارہ کس گھر کی طرف تھا۔ چار دیواری والا گھر یا کوئی اور؟

سنی اور شیعہ تمام محدثین کے روایات جو اس آیت کے شان نزول میں وارد ہوئے ہیں، متفق ہے کہ حضرتؐ نے ایک چادر کے نیچے علیؑ و فاطمہؑ، حسن و حسین علیہم السلام کو لیا اور اُس وقت یہ آیت اتری۔ رسولؐ نے یہ چادر کا حصار کیوں کھینچا؟ اس لئے کہ اَهْلَ الْبَيْتِ ''اس گھر والے'' کے

---

[1] امرهنّ بالاستقرار فی بیوتهنّ والمعنی ابقین فی منازلکن والزمنها (مجمع البیان) بمانید (شاہ ولی اللہ) ثکی رهو (شاہ رفیع الدین) اصله اقررن من قرات بفتح الرّاء (جلالین)

[2] التعریف فیه للعهد والمراد به بیت النبوّة (مجمع البیان)

الفاظ میں ''اس گھر'' کا اشارہ چار دیواری میں منتشر نہ ہو۔ یہ چادر کا حصار قرآن کی آیت کے آغاز والے کلمہ حصر انما کی جو انحصار کا پتہ دیتا ہے، مجسم شکل میں تفسیر تھی۔ اس کے بعد صرف اَھْلَ اور بَیْتِ کے لغوی معنی کی بنا پر چار دیواری والے گھر کے افراد کو مصداق قرار دینا کہاں درست ہوسکتا ہے؟

رہے سہے مفروضہ ابہام کو جناب ام سلمہ رضوان اللہ علیہا نے جو اُس معنی میں گھر والیوں کی ایک نمایاں فرد تھیں اپنے عمل سے دور کر دیا جب وہ چادر کے قریب آئیں اور چاہا کہ اُس میں داخل ہوں اور اُس مجسم خلق عظیم نے کہ جس نے مسجد میں بالکل اپنے پہلو میں کسی کو بٹھانے میں عذر نہیں کیا، مقصد الٰہی کے تحفظ کے لئے ایسی ممتاز بیوی کے ہاتھ سے گوشہ چادر کو جھٹکا دے کر کھینچ لیا اور فرمایا کہ تم جہاں ہو اچھی ہو مگر اس چادر میں تمہاری جگہ نہیں ہے۔ اس کے بعد کسی اس صنف کی فرد کو اس لفظ اھل البیت کا مصداق سمجھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ اسی لئے جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے معزز صحابیٔ رسولؐ جناب زید بن ارقم سے جب دریافت کیا گیا کہ ازواج رسولؐ اھل البیت میں داخل ہیں یا نہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ زوجہ اپنے شوہر کا جز عارضی طور پر ہوتی ہے لیکن جب کسی وجہ سے رشتہ زوجیت قطع ہو جائے تو وہ دوسرے گھر کا جز ہو جاتی ہے۔ یہ اھل البیت تو وہ ہیں جو مستقل طور پر بیت رسالت والے ہیں۔ اس سے الگ کبھی نہیں ہو سکتے یہ اُن کا فیصلہ جو منطقہ استدلال کے ساتھ ہے اس بحث کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

''اور یاد رکھنا اسے جو تمہارے گھروں میں آیات الٰہی اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی رہتی ہیں یقیناً اللہ لطف و کرم والا ہے، بڑا باخبر''

یہ پھر ازواج رسولؐ سے خطاب ہے [1] اور مطلب یہ ہے کہ یہ اصلاح خلق کے تعلیمات دنیا بھول جائے تو بھول جائے مگر تمہیں تو جو ہر وقت انہیں سنتی رہتی ہو، ہمیشہ ہمیشہ انہیں یاد رکھنا چاہئے اور کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

---

[1] ثمّ عاد تعالیٰ الیٰ ذکر النسآء (تبیان)

''اپنے معاملات کو سپرد خدا کرنے والے مرد اور ایسی ہی عورتیں اور ایمان کا جوہر رکھنے والے مرد اور یہ جوہر رکھنے والی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور اطاعت گزار مرد اور اطاعت گزار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور اثر پذیر دل رکھنے والے مرد اور اثر پذیر دل رکھنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنے اندام نہانی کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، اُن کے لئے اللہ نے مہیا رکھی ہے بخشش اور بڑا اجر وثواب''۔

اسلام اور ایمان کا ایک اصطلاحی مفہوم ہے جس میں اسلام آسان اور ایمان مشکل ہے۔ اسلام ظاہر سے وابستہ ہے اور ایمان دل سے متعلق چیز ہے جس کے لحاظ سے قرآن مجید میں ایک جگہ ہے:۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

صحرائی عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں کہئے کہ تم ایمان نہیں رکھتے ہو۔ ہاں یہ کہو کہ ہم اسلام لائے اور بھی ایمان تو تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ (حجرات۔ ۱۴) اس کے لحاظ سے تو اجر آخرت ایمان کے ساتھ وابستہ ہے، نہ کہ صرف اسلام کے ساتھ جس کے اثرات قانونی طور پر دنیا میں حاصل ہوتے ہیں مگر حقیقت معنی کے لحاظ سے جو مفہوم لغوی کی حیثیت رکھتی ہے معاملات کو سپرد خدا وہی کرے گا جو تہہ دل سے ایمان اختیار کیے ہوئے ہو۔ اس لئے بس مفہوم لفظی کے لحاظ سے یہ دونوں الگ الگ وصف ہیں مگر عالم مصداق میں دونوں متحد ہیں اسی طرح صحیح ایمان واسلام رکھنے والوں میں وہ سب ہی اوصاف ہوں گے جن کا ذکر بعد کو ہے۔ لہٰذا یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ بہت سی جماعتوں کا ذکر ہے جن میں ایک مومنین ہیں، ایک مسلمین ہیں، ایک قانتین ہیں، ایک صادقین ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بلکہ وہ ایک ہی جماعت ہے جس کے مرد بھی ان اوصاف کے حامل ہیں اور عورتیں بھی۔

قرآن مجید میں اکثر جگہ اختصار پسندی کے باوجود یہاں اتنی تفصیل کے ساتھ ہر وصف میں الگ سے اُس وصف رکھنے والی عورتوں کا ذکر اس ''گرانی مجمل'' کا ردعمل ہے جس میں اس دنیا کی ذہنیت اُس وقت کیا، کسی حد تک اب بھی مبتلا ہے کہ عورتوں کی کوئی ذمہ دار انفرادی حیثیت نہیں بلکہ وہ بے چاری تو بس مردوں کی تابع مہمل ہیں۔ قرآن مجید صراحتاً اس آیت میں ہر جگہ اُن کا تذکرہ کر کے یہ احساس پیدا کرنا چاہتا ہے کہ احساس فرائض کی منزل مرد اور عورت ہر ایک کی مستقل حیثیت رکھتی ہے اور اس لئے جواب دہی بھی ہر ایک کی اور باز پرس مستقل طور پر ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ بعض صورتوں میں فرد اقویٰ ہونے کی بنا پر مرد کی ذمہ داری دُہری ہو جائے اور اس کی جواب دہی بھی زیادہ سخت ہو۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝۳۶

''اور کسی باایمان مرد کو یہ حق نہیں اور نہ باایمان عورت کو کہ جب اللہ اور اُس کے پیغمبر نے کوئی بات طے کر دی تو اُنہیں اپنے معاملہ میں کوئی اختیار ہو اور جو اللہ اور اُس کے پیغمبر کی نافرمانی کرے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہوا''۔

خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے کے بعد جمہور مسلمین کے اختیار کی نفی

یہ آیت تمام امور میں خدا اور رسولؐ کے فیصلے کے بعد مسلمانوں کے حق خود ارادی کی خواہ انفرادی طور پر ہو یا مل جل کر اجماع یا شوریٰ کی صورت میں ہو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نفی کا اعلان ہے۔ اس کے بعد ایک جگہ مسلمانوں کی تعریف جو ہوئی ہے کہ:۔ امرھم شوریٰ بینھم۔ وہ اپنے امور باہمی مشورے سے طے کرتے ہیں تو یہ اُنہی امور سے متعلق ہوسکتا ہے جس میں خدا اور رسولؐ کی طرف سے کوئی فیصلہ نہ ہوا ہو۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۳۷﴾

''اور وہ موقع جب آپ کہہ رہے تھے اُس سے جس کو اللہ نے اپنی نعمت سے نوازا تھا اور آپ نے بھی اُسے نعمت سے نوازا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دو اور اللہ سے ڈرو اور آپ اپنے دل میں چھپا رہے تھے اُسے جسے اللہ نمایاں کرنے والا تھا اور آپ لوگوں سے ڈر رہے تھے اور اللہ اُس کا زیادہ سزاوار ہے کہ آپ اُس سے ڈریئے تو جب زید اُس (خاتون) سے ضرورت پوری کر چکے تو ہم نے آپ سے اُس کی شادی کر دی تا کہ ایمان لانے والوں پر کوئی تنگی نہ رہے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں جب وہ اُن سے مطلب پورا کر چکے ہوں اور اللہ کی بات انجام تک پہنچ کر رہتی ہے''۔

ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ جناب زینبؓ بنت جحش حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں، جناب زید بن حارثہ بطور غلام آپؐ کے پاس آئے تھے مگر اُن کے ضمیر کی طہارت اور حق پسندی ایسی تھی کہ اسلام کی طرف سبقت کرنے والوں میں صف اول میں وہ ہیں، حضرتؐ نے انہیں نہ صرف آزاد کیا بلکہ مقام نسبت میں اپنی فرزندی کا شرف عطا فرمایا، یہاں تک کہ وہ رسولؐ کے بیٹے کہے جانے لگے اور پھر اسلامی مساوات کو عملی شکل میں پیش کرنے کے لئے آپؐ نے اُنہی اپنی پھوپھی زاد بہن کو رضامند کر کے اُن کی شادی اُن کے ساتھ کر دی، اُس طرح وہ ایک حیثیت سے خاندان بنی ہاشم کا جز بن گئے مگر بعد میں اُن دونوں کے باہمی تعلقات ناخوشگوار رہنے لگے اور جناب زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کا ارادہ کیا۔ خالق غیبی طور پر حضرتؐ کو مطلع فرما چکا تھا کہ یہ خاتون ایک وقت میں آپؐ کے حلقہ زوجیت میں داخل ہوگی۔ اب جو اُن کی باہمی نزاع کا معاملہ رسولؐ کی خدمت میں پیش ہوا تو حضرتؐ نے دل میں تصور فرمایا کہ یہی موقع ہے جس کے لئے مجھے بتایا گیا تھا تو جب یہ طلاق دیں گے تو میں اُن کے ساتھ عقد کر لوں گا مگر آئین کے مطابق کہ ایک حاکم شرع کا فرض ہے کہ حتی الامکان باہمی تعلقات کے سدھارنے کی کوشش کرے اور طلاق سے مانع ہو چونکہ طلاق ایسی چیز ہے جسے عموماً اللہ پسند نہیں فرماتا لہٰذا حضرتؐ نے زیدؓ سے فرمایا کہ اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں برقرار رکھو اور اللہ سے ڈرو یعنی طلاق کا جسے اللہ ناپسند فرماتا ہے اقدام نہ کرو۔ اسی کو خالق نے ارشاد فرمایا ہے کہ'' آپ دل میں چھپاتے تھے اُسے

جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا''۔اس کے علاوہ حضرت کو یہ بھی تصور تھا اگر میں طلاق کے بعد زینبؓ سے شادی کروں گا تو دنیا کہے گی کہ یہ کیسے ہیں کہ ایسی عورت کو جو پہلے ان کی بہو تھی، انہوں نے اپنی بیوی بنالیا۔ یہ خوف ایک طرح کے حجاب کی حیثیت رکھتا تھا جو کوئی بری صفت نہیں مگر چونکہ یہاں خالق کو اپنے رسولؐ کو اس محل امتحان میں لاکر ایک غلط ذہنیت کو ختم کرنا تھا، اس لئے اس شرم وحجاب کے کام میں لانے سے روک دیا گیا اور کہا کہ مقصد الٰہی کو جو ایک غلط ذہنیت کی اصلاح ہے، مقدم سمجھنا چاہیے، اس کو یوں کہا گیا ہے کہ ''اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اُس سے ڈریئے''۔[1]

''جب زیدؓ نے اپنا مطلب پورا کرلیا'' یعنی ازدواجی زندگی بسر کر چکے اور اس میں یہ مضمر ہے کہ اُن کا دل اُن سے بھر گیا کہ اب اُنہیں رغبت انہیں باقی رکھنے کی اپنے حلقہ زوجیت میں نہیں رہی تو ''ہم نے آپ کے ساتھ اُن کی شادی کردی''۔ اب اُس خاتون کو جو کبیدہ خاطری پیدا ہوئی تھی، اُس کی تلافی ہوئی ایسی کہ وہ عمر بھر فخر کرتی رہیں کہ کسی کی شادی اُس کے والدین یا دوسرے عزیز کرتے ہوں گے اور میری شادی رسول اللہؐ سے اللہ سبحانہ نے کی ہے۔[2]

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ﴿۳۸﴾ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۳۹﴾

''پیغمبر پر کوئی سختی نہیں اُس چیز میں جو اللہ نے اُس کے لئے قرار دی ہے، جیسا اللہ کا طریقہ ہے اُن میں جو اس کے پہلے گزر چکے ہیں اور خدا کی بات ایک فیصلہ تقدیر ہے جو معین کردیا گیا ہے۔ وہ جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اُس سے ڈرتے ہیں اور کسی سے سوا اللہ کے نہیں ڈرتے اور اللہ حساب کرنے کے لئے کافی ہے''۔

زمانہ جاہلیت میں جو اب بھی غیر مُسلم حلقوں میں باقی ہے، متبنیٰ بالکل اپنا بیٹا سمجھا جاتا تھا، اس کے لحاظ سے متبنیٰ کی مطلقہ بیوی سے اُس شخص کو جس نے متبنیٰ بنایا ہے، نکاح ناروا تھا۔ اسلام نے چونکہ متبنیٰ بنانے کو بے معنی قرار دیا، اس لئے اپنے رسولؐ کو مامور فرمایا کہ وہ زید بن حارثہ کی مطلقہ بیوی سے عقد فرمائیں۔ اس پر مشرکانہ رسم ورواج کے خوگر افراد نے شور مچادیا کہ انہوں نے اپنی سابقہ بہو سے نکاح کرلیا اُن کے اس اعتراض کو بے معنی قرار دیتے ہوئے یہ کہا جارہا ہے کہ جو اللہ نے قانون قرار دیا ہے، رسولؐ اُس پر عمل کریں تو اس پر اعتراض کے کوئی معنی نہیں ہیں جیسا کہ اللہ کا طریقہ ہے اُن میں جو اس کے پہلے گزر گئے ہیں یعنی شریعت اسلام کا یہ حکم کوئی نیا نہیں ہے بلکہ انبیاء ماسلف کی شریعتوں میں بھی ایسا ہی تھا۔[3] یہ مشرکین دور جاہلیت کا کرشمہ تھا کہ انہوں نے متبنیٰ پر اصل بیٹے کے احکام جاری کردیئے تھے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ

---

[1] ارادخشية الاستحياء لانّ الحياء كان غالبًا على شمه الكريمة كماقال سبحانه انّ ذٰلكم كان يوذالنّبيّ فيستحيي منكم (مجمع البيان)

[2] فى الحديث انّ زينب كانت تفتخر على سائر نسآء النّبيّ ﷺ وتقول زوّجنى الله من النّبى ﷺ وانتنّ انّما زوجكنّ اولياء كنّ (مجمع)

[3] يعنى ما امرنا به محمّدا امن هٰذه النبيّ والعادات مثل سنّة من تقدّم من الانبيآء (تبيان)۔

اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۴۰﴾

''محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے پیغمبر اور انبیاء کے لئے مہر اختتام ہیں اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''

ختم رسالت

''تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں یعنی اپنی واقعی اولاد کے سوا تم میں سے کسی کو بیٹا کہہ دیں تو اُن کے وہ واقعی باپ نہیں ہو جاتے۔ نہ یہ کہ جو واقعی اُن کی اولاد ہو، اس کے بھی باپ نہیں ہیں۔[۱] ختم کے معنی تمام کرنے کے ہیں مہر لگانے کو عربی میں ختم اور مہر کو خاتم جو کہا جاتا ہے، وہ اسی لئے کہ مہر اختتام پر لگتی ہے اور اس لئے بلاشبہ یہ آیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری رسول ہونے کی دلیل ہے۔[۲] مگر قادیانی جماعت کے لوگ جو مرزا غلام احمد صاحب کو نبی بنانے کے درپے ہیں، وہ اس آیت میں خاتم کے ایسے معنی قرار دینا چاہتے ہیں جس سے ہمارے رسولؐ کے بعد بھی نبی کے آنے کی گنجائش باقی رہے جو تمام امت اسلامیہ کے نزدیک باطل اور خلاف ضرورت دین ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا ﴿۴۱﴾ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا ﴿۴۲﴾
هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَمَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَكَانَ
بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ﴿۴۳﴾ تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِیْمًا ﴿۴۴﴾

''اے ایمان لانے والو! اللہ کو بہت یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو، وہ وہ ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اُس کے فرشتے تاکہ تمہیں نکالیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور وہ ایمان لانے والوں پر مہربان ہے۔ اُن کا آپس کے میل جول میں ادب قاعدہ جب وہ اُس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے سلام ہوگا اور اُس نے اُن کے لئے عمدہ صلہ تیار کر رکھا ہے''۔

''صبح و شام اُس کی تسبیح کرو''۔ اس تسبیح سے مراد شب و روز کی نمازیں ہو سکتی ہیں جیسا کہ متعدد مفسرین کا خیال ہے، چونکہ احادیث معصومینؑ میں بھی نماز کی تعبیر سبحۃ'' سے ہوئی ہے اور بعض دوسرے آیات میں بھی تسبیح کے معنی نماز کے سمجھ میں آتے ہیں۔[۳]

مسلمانوں میں سے افراد شیعہ عموماً ائمہ معصومینؑ کے لئے صلوات اللہ علیہ اور علیہ السلام وغیرہ کہنے کا دستور رکھتے ہیں بلکہ علیہ السلام کا لفظ تو کبھی دوسرے شہداء اور مقربین کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اہل سنت عموماً اس پر معترض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

---

[۱] قد ولد لہ ﷺ اولاد ذکور ابراھیم علیہ السلام والقاسم علیہ السلام والطیب علیہ السلام والمظھر علیہ السلام فکان اباھم وقد صحّ انّہ قال فی الحسن علیہ السلام ان ابنی ھٰذا سیکہ وقال ایضا الحسن علیہ السلام والحسین علیہ السلام ابناء ھٰذا ان اماما ان قاما او قعدا (مجمع البیان)

[۲] یعنی لا نبیّ بعد محمّد صلّی اللہ علیہ وآلہ (علی بن ابراھیم) یعنی بعد از وے ہیچ پیغمبر نباشد (فتح الرحمٰن)

[۳] سمّی الصّلوٰۃ تسبیحا لما فیھا من التّسبیح والتنزیہ (مجمع البیان)

یہ چیز انبیاء مرسلین کے لئے مخصوص ہے۔قرآن مجید کی اس آیت سے خالق کا صلوٰۃ وسلام ممتاز درجہ کے مومنین کے لئے ثابت ہورہا ہے۔[1] اس لئے انبیاء سے اسے مخصوص سمجھنا بے بنیاد ہے۔

تَحِيَّتُهُمْ کے معنی ہم نے آپس کے ''ادب قاعدہ'' کے کہے ہیں مگر بعض علمائے اہل سنت نے اسے بھی اللہ سے متعلق کیا ہے۔[2] ہمارے نزدیک پہلا مفہوم الفاظ آیت سے زیادہ قریب ہے اور اکابر مفسرین اس بارے میں ہم سے متفق ہیں۔[3] علامہ طبرسیؒ نے پہلے تو یہی تشریح کی ہے پھر ایک صحابی کی طرف نسبت کے ساتھ یہ نقل کیا ہے کہ مومن کو اُس کی موت کے وقت ملک الموت سلام کرتے ہیں۔[4] مگر اس کا اسناد صحابی نے رسولؐ کی طرف نہیں کیا ہے چنانچہ علام طبرسیؒ نے بھی اُسے بطور نقل قول درج کیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿۴۷﴾ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾

''اے پیغمبر! یقیناً ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہ بنا کر، خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا، دعوت دینے والا اللہ کی طرف اُس کے حکم سے اور ایک روشنی دینے والا چراغ اور خوش خبری دیجئے ایمان والوں کو کہ اُن کے لئے اللہ کی طرف سے بڑا فضل وکرم ہے اور کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مانیئے اور اُن کی ایذا رسانی کا خیال نہ کیجئے اور اللہ پر بھروسا کیجئے۔اور اللہ کافی ہے کارسازی کے لیے''۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے کہ ہر وقت کا نبی اُس امت کے کردار کے لئے بطور گواہ قیامت میں پیش ہوگا اور ہمارے رسولؐ اس امت کے بھی گواہ ہیں جو اُن کے رویہ کو جو آپ کے ساتھ اور آپ کے بعد رہا اللہ کی بارگاہ میں پیش کریں گے[5] اور آپ تمام دوسرے انبیاء پر بھی گواہ ہیں کہ اُن کی کارگزاریوں کی تصدیق فرمائیں گے اور جیسا کہ دوسرے محل پر یہ لفظ آیا ہے اس کے معنی میں نمونہ عمل بننا بھی مضمر ہے، آخر میں جو ہے: دَعْ اَذٰىهُمْ جس کے معنی یہ ہوئے کہ ''اُن کی اذیت کو چھوڑیے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی طرف اعتناء کیجئے۔[6] جس کو ہم نے ترجمہ میں یوں ادا کیا ہے کہ ''اُن کی ایذا رسانی کا خیال نہ کیجئے''۔پھر آخر کے جملے کی مناسبت سے اُس میں یہ پہلو بھی مضمر ہے کہ اُس سے اپنے لئے یا

---

[1] یعنی اللہ اُن پر سلام بھیجے گا (موضح القرآن)

[2] تحيّتهم منه تعالىٰ يوم يلقونه سلام بلسان الملائكة (جلالين)

[3] اى ما يحيي بعضهم بعضا يوم يلقون الله سلام (تبيان) آپس میں بھی یہی دعا اُن کی ہے اور ہوگی (موضح القرآن)

[4] عن البراء بن عازب انه قال يوم يلقون ملك الموت لا يقبض روح مومن الا سلم عليه (مجمع البيان)

[5] اى شاهدا علىٰ امّتك فيما يفعلونه من طاعة الله او معصية لو ايمان به او كفر به ليشهدلهم يوم القيامة اوعليهم فاجازيهم بحسبه (تبيان)

[6] ازنظر اعتبار مگنر از رنجانيدن ايشان را (شاه ولى الله) لاتجازهم عليه (جلالين)۔

اپنے مقصد کے لئے کسی گزند کا اندیشہ نہ کیجئے۔ اللہ پر بھروسا کیجئے اللہ کافی ہے کارسازی کے لیے۔[1]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۴۹﴾

''اے ایمان لانے والو! جب تم باایمان خواتین سے نکاح کرو، پھر اُنہیں طلاق دے دو اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھ لگاؤ تو اس طرح تمہاری طرف سے اُن پر کوئی عدہ نہیں ہے جس کے دنوں کو تم گنو تو اُنہیں کچھ دے دلا دو اور اُنہیں مناسب طور پر رخصت کرو''۔

طلاق کے بعد عدّہ نہ ہونے کی صورت

جب طلاق قبل دخول ہو تو وہ عورت بائنہ ہوتی ہے۔ اس صورت میں نہ اُس پر عدہ کی پابندی ہے، نہ شوہر کو حق رجوع حاصل ہے لہٰذا اب رخصت کر دینے کے سوا کوئی صورت نہیں ہے۔ یہ کہ ''کچھ دے دو'' اُس صورت میں ہے جب کوئی مہر مقرر نہ ہوا ہو لیکن اگر مہر مقرر ہو گیا ہو تو اس صورت میں نصف مہر دینا ہوگا جس کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ موجود ہے (وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ). (بقرہ۔ ۲۳۷)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۰﴾

''اے پیغمبر! ہم نے آپ کے لئے حلال کی ہیں آپ کی وہ بیویاں جن کے مہر آپ نے ادا کر دیے ہیں اور جو آپ کی ملکیت میں ہیں اُس میں سے جو اللہ نے کفار سے حاصل شدہ اموال میں آپ کا خاص حق قرار دیا ہے اور آپ کے چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھی کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کی خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں

---

[1] اعرض عن اذاهم فانّی سا کفیك امرهم (مجمع البیان)

نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہے اور کوئی بھی باایمان عورت اگر وہ اپنا نفس پیغمبر کو ہبہ کردے اگر پیغمبر چاہیں کہ اُسے تعلقات ازدواجی قائم کریں، یہ بات تمام دوسرے مسلمانوں سے الگ آپ کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہم جانتے ہیں جو ہم نے اُن پر احکام مقرر کیے ہیں اُن کی بیویوں اور مملوکہ کنیزوں کے بارے میں تاکہ آپ پر کوئی تنگی نہ ہو اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان"۔

ازدواج بصورت ہبہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امتیازی خصوصیت

اس میں تمام احکام عمومی قانون کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں مخاطب اگرچہ رسولؐ ہیں مگر وہ حکم تمام مسلمانوں کے لئے ہے، بس ایک چیز ہے جسے کہہ دیا ہے کہ وہ صرف رسولؐ کے لئے ہے اور لوگوں کے لئے نہیں اور اُسے آپ کا ایک اعزاز سمجھنا چاہیے۔ وہ یہ ہے کہ دوسروں کے لئے نکاح میں جو ایجاب وقبول کے صیغے ہیں، اُن میں ہبہ کے لفظ کا استعمال درست نہیں ہے یعنی عورت یا اُس کا وکیل اگر انکحت یا زوجت کے بجائے وھبت کا لفظ کہے کہ میں اپنے کو تمہیں ہبہ کرتی ہوں یا وکیل ہبہ کا لفظ استعمال کرے تو یہ درست نہیں ہے، اس کے علاوہ کچھ نہ کچھ مہر ہونا ضروری ہے لیکن رسولؐ کے لئے جن کو دین ودنیا کے آقا اور مولا ہونے کی حیثیت من جانب اللہ حاصل ہے، اس کی بنا پر بنظر اعزاز عورت اگر یہ الفاظ کہے میں اپنے کو آپ کو ہبہ کرتی ہوں اور رسولؐ اُسے منظور فرمائیں تو یہ صحت ازدواج کے لئے کافی ہے۔ دوسروں کے یہاں استحقاق کے ہوتے ہوئے عورت معاف کردے تو کوئی حرج نہیں مگر رسولؐ کے یہاں ازوال ہی بغیر مہر اپنے نفس کی پیش کش کردے تو درست ہے۔[1] یہ پیغمبرؐ کے مخصوصات میں سے ہے جس کی قرآن مجید میں صراحت ہے۔[2]

اور جناب ابن عباسؓ نے صاف اُس کی وضاحت کی ہے۔[3]

اب یہ امر کہ ایسی کوئی خاتون آپ کے ازواج میں تھیں یا حضرتؐ کو صرف حق اس کا خالق نے دیا تھا لیکن حضرتؐ نے اس حق کا استعمال کبھی نہیں فرمایا اور اگر کوئی خاتون اس طرح کی تھیں تو وہ کون تھیں؟ یہ تاریخی بحث ہے جس میں شدید اختلاف ہے۔ اس کا تفسیر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا ﴿۵۱﴾

"آپ جسے چاہیں اُن میں سے چھوڑ دیں اور اپنے پاس رکھیں، اُسے اُن میں سے جس کو چاہیں اور جن کو الگ کردیا ہے اُن میں سے پھر کسی کی آپ کو خواہش ہو تو آپ پر کوئی تنگی نہیں ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ صورت ہے اُس

---

[1] النکاح بلفظ الھبۃ من غیر صداق (جلالین) یعنی بغیر مہر در نکاح آید (فتح الرحمن) بخش دیو ے یعنی بغیر مہر کے (شاہ رفیع الدین)

[2] فلا تحلّ الھبۃ الّا لرسول اللہ (علی بن ابراھیم)

[3] روی عن ابن عباس انّہ لا تحلّ امرأۃ بغیر مھر وان وھبت نفسھا الّا لنبیّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم خاصۃ (تبیان)۔

کی کہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور وہ سب اُس پر جو آپ انہیں عطا کریں رضا مند رہیں اور اللہ جانتا ہے اُسے جو تم لوگوں کے دلوں میں ہے اور اللہ جاننے والا ہے، بڑا برداشت کرنے والا"۔

شان نزول جس کی الفاظ آیت سے تصدیق ہوتی ہے اور جسے علامہ طبرسیؒ نے بھی درج کیا ہے، یہ ہے کہ بعض ازواج حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس آذوقہ کو جو اُنہیں ملتا تھا ناکافی سمجھتی تھیں اور خرچے کے لئے مزید پیسے کی طلبگار تھیں اور ان میں سے بعض نے شاید اتنی شدت اختیار کی کہ حضرتؐ نے اُن کے یہاں جانا چھوڑ دیا اور ایک ماہ تک تعلقات ترک رکھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ رَّقِيْبًا ۝۵۲

"اب اس کے بعد اور عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں ہیں اور نہ یہ کہ آپ اُن کے بدلے میں دوسری بیویاں اختیار کریں، چاہے اُن کا حسن و جمال کتنا ہی آپ کو پسند ہو، سوا اُن کے جو آپ کی ملکیت میں ہوں اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے"۔

"اس کے بعد اور عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں" اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور اسی بنا پر دو قول ہیں ایک یہ کہ جو اقسام بیان ہو چکی ہیں، ان کے علاوہ دوسری عورتیں آپ کے لئے حلال نہیں ہیں، نہ اس طرح کہ آپ مزید اضافہ کریں اور نہ اس طرح کہ انہی میں سے کسی سے علیحدگی اختیار کر کے دوسری کو حبالہ زوجیت میں لائیں۔ دوسری بس جو خواتین اس وقت آپ کی زوجیت میں ہیں انہی کو رہنا ہے نہ ان میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے، نہ تبدیلی۔[1] ہمارے نزدیک پہلے مفہوم کا بھی لازمی نتیجہ یہ دوسرا امر ہے اس لئے الگ الگ دو قول بیکار ہیں۔ بہر حال ایسی آیتیں جن میں پیغمبر خداؐ پر سختی کے ساتھ کوئی پابندی عائد کی گئی ہے یا آپ کو کسی اقدام پر روکا ٹوکا گیا ہو، انہیں ٹھنڈے دل سے غیر مسلم بھی دیکھیں تو اُنہیں محسوس ہوگا کہ یہ معاذ اللہ خود رسولؐ کا کلام نہیں بلکہ اُس بالا دست طاقت کی طرف سے ہے جو اُن پر حکمراں کی حیثیت رکھتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِىِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِى النَّبِىَّ فَيَسْتَحْىٖ مِنْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْىٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ

---

[1] ای من بعد النسآء اللّواتی احللنا هنّ لك فی قوله: انّا احللنالك وقیل معناه لایحلّ لك النّسآء من بعد نساتك اللّاتی خیر تهن فاخترن الله ورسوله (مجمع البیان)

تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ﴿۵۳﴾ اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۵۴﴾

''اے ایمان لانے والو! پیغمبر کے گھروں کے اندر نہ جاؤ جب تک کہ تمہیں بلایا نہ جائے کھانے کی طرف، نہ یہ کہ انتظار کرتے ہوئے کھانے کے پکنے کا مگر جب بلایا جائے تو اندر جاؤ، اس کے بعد جب کھالو تو اِدھر اُدھر چلے جاؤ اور نہ باتوں میں لگے ہوئے رہو، یقیناً یہ بات پیغمبر کی اذیت کا باعث ہوتی ہے مگر وہ تم سے کہتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں اور اللہ کو حق کے کہنے سے شرم نہیں آتی اور جب ان خواتین سے کوئی چیز مانگو تو اُن سے پردے کے پیچھے سے مانگو یہ تمہارے دلوں اور اُن کے دلوں کے پاک رکھنے کا زیادہ باعث ہے اور تمہیں یہ جائز نہیں ہے کہ پیغمبر کو ایذا پہنچاؤ اور نہ یہ کہ اُن کی بیویوں سے اُن کے بعد بھی کبھی شادی کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ اگر تم نے کسی چیز کو ظاہر کر دیا اُسے چھپاؤ بہر حال اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔

ازدواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے پردے کی پابندی

ان آیات پر اور ایسی متعدد دوسری آیتوں پر جو دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں موجود ہیں نظر کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیسی قوم سے سابقہ پڑا تھا جس کے افراد معمولی معمولی تہذیب وتمدن کے تقاضوں سے بھی واقف اور اُن پر عامل نہ تھے۔ اب چاہے ایسے تمام افراد کو بھی ایک بڑا معزز لقب دے کر کلی طور سے ''عدول'' کی سند دے دی جائے اور انہیں رفعت کے بام بلند پر پہنچا دیا جائے مگر قرآن مجید تو اُن کی پستی کردار کے نمونوں سے بھرا ہوا ہے۔

پہلی آیت کے ٹکڑے کے بعد یہ آیت کہ ''تم چاہے اپنے دل کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اس سے خوب واقف ہے'' بتلا رہی ہے کہ کچھ صحابہ نیت رکھتے تھے اور شاید آپس میں بصیغہ راز یہ خیال ظاہر کرتے تھے کہ بعض ازواج رسول کو رسولؐ کی آنکھ بند ہونے پر اپنے حبالہ عقد میں لائیں گے، اسی پر خالق نے اتنے سخت الفاظ میں تنبیہ کی ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۵۵﴾

''اُن (خواتین) پر کوئی پابندی نہیں ہے اُن کے باپ داداؤں کے بارے میں اور نہ اُن کے بیٹوں پوتوں کے بارے میں اور نہ اُن کے بھائیوں اور نہ اُن بھتیجوں اور نہ اُن کے بھانجوں اور نہ اپنی (قوم کی) عورتوں اور نہ اپنی مملوکہ کنیزوں کے بارے میں اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ ہر چیز پر حاضر وناظر ہے''۔

وہ محرم افراد جن سے عورتوں کے لئے پردہ نہیں

ان کے بارے میں ''کوئی پابندی نہیں''، یعنی ان سے پردے کا حکم نہیں ہے لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اس فہرست میں چچا اور ماموں کا ذکر نہیں ہے حالانکہ مسلماً وہ محرم افراد میں داخل ہیں۔ تو یا یہ کہا جائے کہ چونکہ بھتیجوں اور بھانجوں کا ذکر ہے اور درجہ قرابت میں اوپر کی طرف چچا اور ماموں اُن کے بالکل برابر ہیں، اس لئے قرآن سے بضمیمۂ عقل یہ صنفیں بھی سمجھ میں آجاتی ہیں جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔[1] مگر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا اس لئے کہ اگر دلیل شرعی ان کے محرم ہونے پر نہ ہو تو بھتیجے اور بھانجے کے حکم میں انہیں ملحق کرنا قیاس ہوگا جو ہمارے یہاں باطل ہے اور یا یہ کہا جائے کہ ان صنفوں کا پردے سے مستثنیٰ ہونا قرآن سے نہیں بلکہ سنت سے ثابت ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ ماخذ احکام صرف قرآن مجید نہیں ہے۔ بہت سے احکام شرعیہ سنت سے ثابت ہیں۔ اس کے بعد مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ یعنی مملوک، اسے غلام و کنیز دونوں کو شامل کیا جائے تو یہ ثابت ہوگا کہ اپنے غلاموں سے بھی پردہ واجب نہیں ہے۔ مفسرین اہل سنت کے یہاں یہ تعمیم ہے ہی۔[2]

مگر تعجب ہے کہ اُن کے تتبع میں ہمارے علامہ طبرسیؒ نے بھی یہ تعمیم کردی۔[3] لیکن چونکہ اس کے قبل عورتوں کا ذکر ہے کہ ''اپنی ہم قوم خواتین''، جس کے معنی یہ ہیں کہ غیر اقوام کی خواتین سے بھی پردہ کرنا چاہئے اور اس کے بعد بلا فاصلہ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ہے تو بعید نہیں کہ مملوکہ سے مراد کنیزیں ہوں یعنی عورتوں کی جنس میں ان سے پردہ نہیں ہے۔ اگرچہ غیر مسلم ہوں چنانچہ اکابر علمائے شیعہ کے نزدیک ترجیح اسی قول کو ہے کہ اگر مملوکہ عورتوں کی صنف سے ہے تو پردہ نہیں ہے لیکن مرد یعنی غلام ہو تو پردہ اس سے لازم ہے۔[4]

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۵۶﴾

''یقیناً اللہ اور اُس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں پیغمبر پر، اے ایمان لانے والو! تم بھی اُن پر درود بھیجو اور سلام جو حق ہے سلام بھیجنے گا''۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود کی تعلیم

صلوٰۃ جس کا ترجمہ ہم ''درود'' کرتے ہیں ایک ہی ہے مگر اللہ اور ملائکہ اور انسانوں کی طرف انتساب سے حقیقت اُس کی مختلف ہو جاتی ہے۔ اللہ اور ملائکہ کی طرف سے اُس کے معنی ہیں رحمتوں کا نازل کرنا جس میں بس یہ فرق ہے کہ اصل مرکز رحمت اللہ ہے اور فرشتے اُس کی رحمتوں کے پہنچانے والے ہیں جیسے توفّی کی نسبت قرآن مجید میں اللہ کی طرف بھی ہے اور فرشتوں کی طرف بھی مگر اصل فاعل اُس کا اللہ ہے اور

---

[1] لم یذکر العمّ والخال لانّه مفهوم من الکلام لانّ قرباهم واحدة (تبیان)

[2] من الاماء والعبید ان یروهنّ ویعلّموهنّ من غیر حجاب (جلالین)

[3] من السید والاماء (مجمع البیان)۔

[4] قال قوم من النّساء والرّجال وقال آخرون من النّساء خاصة وهو الاصح (تبیان)

واسطہ وقوع اُس کا فرشتے ہیں، اُسی طرح یہاں بھی ہوسکتا ہے مگر ہم؟ ہمارے اختیار میں بس دعائے رحمت ہے جس کا اظہار ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ اللّٰھم صل علیٰ محمد وال محمد یا اس کے ساتھ اور مزید الفاظ شامل کرکے جو شیعہ اور سنی دونوں فریقوں کے یہاں وارد ہیں۔ ایک تصور یہ ہے کہ ملائکہ کی طرف بھی صلوٰۃ کا انتساب دعائے رحمت ہی کے لحاظ سے ہے۔[1] جو بعید نہیں ہے۔

آخری جز: وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کے معنی صلوٰۃ کی مناسبت سے ذہن میں سلام کے آتے ہیں جیسا کہ ہم نے بھی ترجمہ کیا ہے مگر ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کا مطلب یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرو اور صدق دل سے انہیں قبول کرکے اُس کے تقاضوں پر عمل کرو۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں یہ جملہ بلا شبہ اسی معنی میں آیا ہے:۔

لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

وہ مومن قرار نہیں پائیں گے جب تک کہ اپنے درمیان کی تمام نزاعوں میں آپ کا فیصلہ کرنے والا قرار نہ دیں اور پھر جو آپ فیصلہ کریں اُس سے یہ اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور جو حق ہے سر تسلیم خم کرنے کا اُس طرح تسلیم کریں۔ (نساء۔ ٦٥)

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝٥٧ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝٥٨

”یقیناً وہ جو اللہ اور اس کے پیغمبر کو اذیت پہنچاتے ہیں، اُن پر اللہ نے دنیا اور آخرت میں لعنت کی ہے اور اُن کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار رکھا ہے اور وہ جو با ایمان مردوں اور با ایمان عورتوں کو اذیت دیتے ہیں بغیر کسی جرم وخطا کے جو انہوں نے کیا ہو، وہ بے شک ایک بڑے بہتان اور کھلے ہوئے گناہ کا بار اٹھاتے ہیں“۔

خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا پہنچانے پر لعنت

ایذاء اگر بدگوئی اور الزامات بے جا کی صورت سے ہو تو وہ داخل بہتان ہوگی اور عملی ایذا ہے تو بہرحال گناہ عظیم ہوگی۔ غور کیا جائے تو لعن بالکل صلوٰۃ کے مقابل کی ہی چیز ہے جس کی نسبت اللہ ملائکہ اور انسانوں کی طرف اُنہی حیثیتوں سے ہوگی جن کا بیان صلوٰۃ کے ذیل ہو چکا ہے۔ وہاں جیسے رحمت کا نزول کرنا ہے، یہاں رحمت سے دور کرنا ہے اور وہاں جیسے دعائے رحمت ہے، یہاں اُس کے مقابل کی بددعا ہے۔[2]

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝٥٩

---

[1] صلوٰۃ الملائکۃ علیہ مسئلتہم اللہ تعالیٰ (تبیان)

[2] معنی لعنہم اللہ ای حلّ بہم وبال اللّعن بالا بعاد من رحمۃ اللہ وقول القائل لعن اللہ فلانا معناہ الدّعآء علیہ بالا بعاد من رحمۃ (تبیان)

''اے پیغمبر! کہہ دیجئے اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہ اپنے سر پر سے گھونگھٹ لٹکا لیا کریں اپنی چادروں کا۔ یہ زیادہ مناسب ذریعہ ہے اس کا کہ اُن کی پہچان ہو جائے تو اُنہیں ایذا نہ دی جائے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

خواتین کے چہرے کے پردے کا حکم

یہ حکم کہ سر پر سے گھونگھٹ نکال کر چادروں کو لٹکا لیا کریں، پردے میں چہرے کے چھپانے کا حکم ہے جس کے بعد پردے سے چہرے کو مستثنیٰ کرنا غلط معلوم ہوتا ہے چنانچہ علمائے تفسیر نے بھی عموماً اس کی تشریح میں چہرے کے چھپانے کا ذکر صراحتاً کیا ہے۔[1] ''یہ ان کے پہچاننے کا ذریعہ ہے'' یعنی یہ اُن میں اور بازاری عورتوں میں امتیاز کا باعث ہے جس کی وجہ سے بدمعاش لوگ انہیں چھیڑنے کی ہمت نہ کریں۔ ''بخشنے والا ہے، بڑا مہربان'' یعنی اب تک جو ہوا وہ ہوا، اس کی سزا دی نہ جائے گی۔[2] مگر اب سے اس کی پابندی لازم ہے۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿۶۱﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۶۲﴾

''اگر باز نہ آئے منافق لوگ اور وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور مدینے میں غلط افواہیں پھیلانے والے تو ہم آپ کو اُن کے خلاف حرکت میں لے آئیں گے، پھر وہ اس (مدینہ) میں آپ کے پاس نہ رہ سکیں گے مگر بہت کم۔ وہ موردِ لعنت ہیں جہاں بھی وہ پائے جائیں پکڑے جائیں اور پوری طرح قتل کیے جائیں جیسا ہوا اُن کے بارے میں جو ان سے پہلے تھے اور اللہ کے طریقہ کار میں بھی تبدیلی نہ پاؤ گے''۔

منافقین کے ساتھ ''اور'' ''اور'' کہہ کے جن کا ذکر ہے، بظاہر یہ الگ الگ جماعتیں نہیں ہیں بلکہ منافقین ہی ہیں جن کا متعدد اوصاف کے لحاظ سے تعارف کرایا گیا ہے کہ اُن کے دلوں میں بیماری ہے اور وہ بہت بڑی بیماری یہی نفاق ہے اور اب اس بیماری کے نتیجہ میں اُن کا یہ کردار ہے کہ وہ مدینہ میں غلط افواہیں پھیلاتے ہیں، انہی کو کہا جا رہا ہے کہ یہ اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو کھلے ہوئے کفار و مشرکین کے ساتھ ہو چکا ہے[3] اور اُسی کو اللہ کا وہ طریقہ کار کہا گیا ہے جو تبدیل نہیں ہوتا۔[4]

---

[1] قال الحسن الجلابیب اللاحف ستدلیها المرأة علیٰ وجها (تبیان) الجلباب خمار المرأة الّذی یغطی راسها ووجها اذا خرجت لحاجة (مجمع البیان) ای یوضین علی الوجوه اذا خرجن (جلالین) بدوگزارند بدخود چادر ہائے خود (شاہ ولی اللہ)

[2] غفور الماسلف منهنّ من ترك التستر رحیما بهنّ اذ سترهنّ (جلالین)

[3] هم المنافقون الّذین كانوا یرجفون فی المدینه بالاخبار الكاذبة المضعفة لقلوب المسلمین (مجمع البیان)۔

[4] الطریقة الّتی اجرها بامر الله تعالیٰ فاضیف الیه لانّه فعلها بامر الله (تبیان)

يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿۶۳﴾

''آپ سے لوگ قیامت کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہیئے کہ اس کا علم بس اللہ کے پاس ہے اور آپ کو کیا خبر؟ ممکن ہے قیامت نزدیک ہی ہو''۔

قیامت کا علم اللہ سے مخصوص

اس سے اور نیز بعض دوسرے آیات سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن کا علم تعین کے ساتھ اللہ نے اپنی کسی مخلوق کو نہیں دیا ہے اور اس سے ایک وسیع بحث میں نقطہ حقیقت کا پتہ چلتا ہے اور وہ انبیاؤ مرسلین کے لئے علم غیب کی بحث ہے۔ نقطہ حقیقت یہ ہے کہ بعطائے الٰہی علم غیب انبیاؤ ائمہؑ کے یقیناً حاصل ہوتا ہے جس کا شاہد ایک تو خود لفظ نبی ہے جس کے معنی ہی خبر دینے والے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ انبیاء کے ذمے جو خبر دینا تھا، وہ مشاہدات کی خبر نہ تھی۔ یہ غیب ہی کی خبریں ہوتی تھیں جو انبیاء کی زبانی خلق تک پہنچتی تھیں اور اسی بناء پر ہمارے رسولؐ کے القاب میں بشیر و نذیر ہے جس کے دونوں جز صراحتاً قرآن مجید میں موجود ہیں۔ یہ بشارت اور انذار دونوں اخبار بالغیب کے دو شعبے ہیں اور یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ انبیاء دوسروں کو کیوں کر خبر دے سکتے تھے اگر اللہ کی طرف سے اُنہیں ان باتوں کا علم عطا نہ ہوتا لہٰذا سبب کلّی کے طور پر انبیاء سے علم غیب کی نفی تو انکار نبوت کی مرادف ہے لیکن یہ اطلاع ان کو بعطائے الٰہی ہوتی تھی، لہٰذا اللہ کی مصلحت جس غیب کو پردے میں رکھنے کی ہو، اُس پر انہیں دسترس نہیں ہوسکتا۔ اس کے بھی بہت سے شواہد قرآن و حدیث میں موجود ہیں، جس کے بعد بعض افراد کا یہ جملہ تو بالکل بے معنی قرار پاتا ہے کہ حضرات معصومینؑ کو تمام باتوں کا ''علم حضوری'' ہوتا ہے یہ افراد درحقیقت علم حضوری کے معنی سے واقف نہیں ہیں۔

ان امور میں جو خدا نے کلیۃً پردۂ غیب میں رکھے ہیں، قیامت کے دن کا تعین کے ساتھ علم ہے جو اس آیت سے صراحتاً ثابت ہے اور جب حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جن کے علم کی وسعت یقیناً: بلا استثناء تمام حلقہ معصومینؑ میں سب سے زیادہ تھی، یہ علم اُس نے عطا نہیں فرمایا تو اور کون ہوسکتا ہے جسے یہ علم حاصل ہو۔ اسی لئے کہہ دیا گیا ہے: کذب الوقانون یعنی ''جھوٹے ہیں وقت مقرر کرنے والے'' اس طرح جو پیش گوئیاں قیامت کے متعلق وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہیں، وہ بلاشبہ جھوٹ ہی ہوا کرتی ہیں، اُن کی سچائی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿۶۴﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۶۵﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿۶۷﴾ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾

''بلاشبہ اللہ نے مورد لعنت قرار دیا ہے کافروں کو اور اُن کے لئے ایک بھڑکتی آگ تیار رکھی ہے جس میں وہ ہمیشہ

ہمیشہ رہیں گے۔نہیں پائیں گے کوئی دوست اور نہ مددگار، جس دن اُن کے چہرے آگ میں اُلٹ پلٹ کیے جائیں گے، وہ کہیں گے کاش ہم اللہ کی اطاعت کرتے اور پیغمبر کی اطاعت کرتے اور اُنہوں نے کہا پروردگار ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تو انہوں نے ہم کو صحیح راستے سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے پروردگار! اُنہیں دہری سزا دے اور اُنہیں بڑی لعنت میں گرفتار فرما''۔

''اُن کے چہرے آگ میں اُلٹ پلٹ کیے جائیں گے'' اس کا ایک مفہوم یہ نکالا گیا ہے کہ شدت تکلیف اور درد والم سے چہروں کے رنگ میں بار بار تبدیلی ہو رہی ہوگی اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جیسے کباب کی سیخ آگ پر الٹی پلٹی جاتی ہے تا کہ حرارت آتش اپنا پورا اثر کرے، وہی کیفیت اُن کی سمجھنا چاہئے۔[1] آخری الفاظ سے ظاہر ہے کہ دنیا میں جن کے ساتھ بڑی عقیدتیں تھیں، آخرت کی منزل میں اُن کے پیرو اُن پر لعنت کر رہے ہوں گے۔ کاش دنیا ہی میں سوچ سمجھ کر اُن کے پیچھے چلے ہوتے اور اللہ نے جن کو شروع ہی سے اُن کے اوصاف و کردار کی وجہ سے مورد لعنت قرار دیا تھا، اُن کو دنیا ہی میں مستحق لعنت سمجھ لیتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿۶۹﴾

''اے ایمان والو! اُن لوگوں کی طرح نہ ہو تو جنہوں نے موسیٰ کو اذیت پہنچائی تو اللہ نے انہیں بری ثابت کیا اُس سے جو انہوں نے کہا تھا اور وہ اللہ کے یہاں آبرو رکھنے والے تھے''۔

حضرت موسیٰؑ پر کیا اتہام لگا تھا جس سے اللہ نے انہیں بری ثابت کیا؟ اس کے لئے ایک روایت اہل سنت کے صحاح میں بھی ہے اور شیعہ طریق روایت سے بھی وارد ہوئی ہے۔[2] یہ اور بات ہے کہ ہمارے دور کی عقل اُسے خلاف فطرت کہہ کے قبول نہ کرے اور سچ پوچھئے تو ہماری عقل کو بھی جلالتِ شانِ رسولؐ کے کچھ خلاف محسوس ہونے کی بنا پر اُس کے قبول کرنے میں تأمل ہے وہ یہ ہے کہ خود حضرت موسیٰؑ کا دستور تو یہ تھا جو اُن کے شایانِ شان یہ ہے کہ وہ نظر خلائق سے الگ جا کر غسل فرماتے تھے مگر چونکہ بنی اسرائیل عموماً ملاء عام میں برہنہ غسل کرنے کے عادی تھے تو انہوں نے جناب موسیٰؑ کے تنہائی میں غسل کرنے سے یہ ہوا اڑا دی کہ ان میں جسمانی نقص ہے، اس لئے وہ سب کے سامنے برہنہ نہیں ہوئے۔ اس کی صفائی کے لئے قادر مطلق نے یہ انتظام کیا کہ ایک دن نہاتے وقت حضرت موسیٰؑ نے اپنے کپڑے اتار کر جس پتھر پر رکھے تھے، وہ پتھر ان کے نہانے کی حالت میں وہاں سے ہٹ کر ایسی جگہ پہنچ گیا جو عام نگاہوں کے سامنے تھی۔

حضرت موسیٰؑ مجبوری اپنے کپڑے لینے کے لئے اُس پتھر کی طرف گئے تو بنی اسرائیل کو پتہ چل گیا کہ اُن کا تصور بے بنیاد تھا جس کے بعد اُن کی زبان بندی ہوگئی اور حضرت موسیٰؑ جس طرح تنہائی میں غسل فرمایا کرتے تھے، اُسی طرح پھر غسل فرمانے لگے۔ جناب شیخ الطائفہؒ کے

---

[1] معناہ تقلّب وجوہ ھٰؤلاء ــ فتسودّو اتصفّروا تصیر کالحۃ ــ وقیل معناہ تنفلّ وجوھھم من جھۃ الیٰ جھۃ فی النّار فیکون ابلغ فیما یصل الیھامن العذاب (تبیان)

[2] حدثنی ابی عن النضر بن سوید عن صفوان عن ابی بصیر عن ابی عبداللہ علیہ السلام (علی بن ابراھیم)

کلام سے بھی اس کی قبولیت اور عدم قبولیت میں تأمل ظاہر ہوتا ہے۔[1]

انہوں نے اس کے علاوہ آیت کے پس منظر میں ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جناب موسیٰؑ کو متہم کیا کہ ہارونؑ کو معاذ اللہ انہوں نے قتل کیا۔ خداوند عالم نے اُن کی طرف سے صفائی کا ثبوت دینے کے لئے حضرت ہارونؑ کو دوبارہ زندہ کیا اور انہوں نے بتایا کہ وہ بحکم خدا اپنی طبیعی موت کے ساتھ دنیا سے اٹھے۔ جناب موسیٰؑ پر اس کی ذمہ داری کوئی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ بھی قول ہیں جنہیں علامہ طبرسیؒ نے نقل کیا ہے لہٰذا وثوق کے ساتھ اصل واقعہ کی تعیین نہیں ہوسکتی اور عملی طور پر ہماری لئے نتیجہ خیز یہ ہے کہ تم اُن کی طرح نہ ہونا جنہوں نے موسیٰؑ کو اذیت دی تھی اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی ہر ہر فرد کو یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس کا کوئی قول یا فعل اپنے پیغمبرؐ کی ایذاء کا باعث نہ ہو۔ یہ ہماری زندگی سے متعلق چیز ہے۔ موسیٰؑ کی قوم والوں نے موسیٰؑ کو خاص اذیت کیا دی تھی؟ یہ ہماری تاریخی معلومات میں اضافہ کا سبب ہوسکتا ہے۔ اُس کے پورے طور پر سمجھنے سے ہماری عملی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ﴿۷۰﴾ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۱﴾

''اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور ٹھیک ٹھیک بات کہا کرو، وہ تمہارے لئے تمہارے کاموں کو درست کرے گا اور تمہارے لئے تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرے، اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی''۔

عام حکم یہی ہے کہ ''ٹھیک بات کہا کرو'' اس سے خارج کچھ صورتیں بطور مستثنیات ہوسکتی ہیں جن میں نمایاں محل تقیہ کا ہے مگر ہماری قوم کے بعض افراد نے جو اندھا دھند محل تقیہ کا قرار دے لیا ہے کہ کچھ لوگ خفا ہوجائیں گے جن سے ان کے کچھ منافع وابستہ ہیں، عوام ناراض ہوجائیں گے، کسی عزیز یا دوست کی دل شکنی ہوگی اگر صحیح بات کہہ دی جائے تو اس غلط استعمال نے مخالفین تقیہ کو تقیہ کے بدنام کرنے کا موقع دے دیا ہے۔ یہ اصول یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تقیہ دفع ضرر کے لئے ہوسکتا ہے جلب منفعت کے لئے نہیں، ضرر میں بھی موازنہ کرنے کی ضرورت ہے کہ کتمانِ حق کی مضرّت زیادہ ہے یا وہ ضرر جو اظہار کی صورت میں ہوگا۔ بغیر اس کا موازنہ کیے ہوئے آنکھ بند کرکے اس کا استعمال تقیہ نہیں بلکہ حکم تقیہ کا مذاق اڑانا ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۷۳﴾

---

[1] اجاز البلخی حدیث الصخرۃ ــــ وقال قوم ذٰلك لایجوز لائن فیه اشتهاز النبی سوء ته علیٰ رءوس الاشهاد (تبیان)

''ہم نے اس امانت کو پیش کیا آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے تو انہوں نے اس کا بار اٹھانے سے انکار کیا اور اُس سے خوف زدہ ہو گئے اور انسان نے اسے برداشت کر لیا، بلاشبہ وہ بڑا ظالم ہے، بڑا نادان تا کہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے اور باایمان مردوں اور باایمان عورتوں پر نظر توجہ مبذول فرمائے اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

''امانت'' بظاہر تکالیف شرعیہ کی ذمہ داری ہے۔[1] جسے فطرت انسانی نے صلاحیتوں کے اعتبار سے قبول کیا اور ظالم و جاہل اس اکثریت کے اعتبار سے کہا گیا ہے جو باوجود صلاحیت کے مقام عمل میں اُس ذمّہ داری کو پورا نہیں کرتا[2] اور ایک تصور یہ ہے کہ **ظلوم و جھول** کا لفظ مقام مذمت میں نہیں بلکہ ہمدردانہ ہے کہ اس نے اس ذمہ داری کے بار کو برداشت کر کے کتنا اپنے کو زحمت میں ڈال دیا۔[3]

سوال و جواب کی نوعیت کے متعلق جناب شیخ الطائفہؒ نے شعرائے عرب کی نظیریں پیش کر کے اس کی وضاحت کی ہے کہ آسمان اور زمین وغیرہ جو بے جان ہیں، اُنہیں امانت کے پیش کرنے میں مخاطب کیوں کر بنایا جا سکتا ہے۔ اُن نظیروں سے ظاہر ہے کہ وہاں کوئی زبانی سوال و جواب نہیں ہوتا بلکہ یہ خطاب کسی حقیقت کے اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہاں بھی کسی وقوع میں آنے والی مقام خارج میں روئداد کا بیان نہیں ہے کہ ہم نے آسمان اور زمین کے سامنے کسی خاص وقت لفظی طور پر اس ذمہ داری کو پیش کیا، انہوں نے انکار کیا اور انسان نے اُسے قبول کر لیا، اسکے بعد **حملھا** کے معنی میں جس کا ترجمہ عموماً ہوتا ہے، برداشت کیا یا اٹھا لیا، ایک قول اُنہوں نے یہ درج فرمایا ہے کہ **حمل** امانت کے معنی اُس امانت میں خیانت کرنے کے ہوتے ہیں۔[4] جس میں ضمنی طور پر جنات کو بھی نصوص قرآنی کی بناء پر داخل کرنا پڑے گا باقی کائنات میں کافرونافرمان کا وجود نہیں ہے کیوں کہ اُن سب کی اطاعت احکام تکوینیہ کے ماتحت فطری طور پر ہے۔ انسان ہی بس ایسا ہے کہ اسے اختیاری اطاعت کرنا تھی، اس لئے اس میں اکثریت اس دین فطرت سے منحرف ہے اور بس ایک اقلیت ہے جو اُس پر قائم و برقرار رہتی ہے۔ اس لئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اکثریت جو منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کی ہے، مبتلائے عذاب ہوتی ہے وہ اقلیت جو مؤمنین و مومنات کی ہے نجات یافتہ ہوتی ہے۔

---

[1] یعنی استعداد تکلیف باوامر ونواھی (فتح الرحمن)

[2] یعنی بالفعل عدالت وعلم ندارد وقابلیت آنہارا دارد (فتح الرحمن) الانبیآء والاولیاء والمومنون عن عموم ھٰذہ الاٰیۃ خارجون (مجمع البیان)

[3] ظلوما لنفسہ بما حملہ (جلالین) یعنی اپنی جان پر ترس نہ کھایا (موضح القرآن)

[4] قیل معنی حملھا الانسان ای خانھا (تبیان)

سُوْرَةُ سَبَإٍ

مکّیہ ----۵۴----آیات

چونکہ ملک سبا کے باشندوں پر انعامات خداوندی اور اُن لوگوں کے کفران نعمت کا ذکر اس سورے میں ذرا تفصیل کے ساتھ ہے جو کسی دوسرے سورے میں نہیں ہے، اس لئے اس سورے کا یہ نام ہوا۔

سورۂ سبا کے خاص خاص مضامین:

۱۔حضرت داؤدؑ کے لئے لوہے کا نرم ہونا۔
۲۔تخت سلیمانؑ کی آمدورفت کا پیمانہ اور جنات کی اُن کے لئے مختلف اشیاء کی صناعی۔
۳۔شکرگزاروں کی قلت۔
۴۔عصائے حضرت سلیمانؑ کا دیمک کی نذر ہونا اور اُس سے اُن کی وفات کا حال معلوم ہونا۔
۵۔یہ کہ ابلیس کی وسوسہ انگیزی انسان کے لئے بجز جبر نہیں اور اُس سے متاثر ہونے نہ ہونے کا یقین آخرت پر انحصار۔
۶۔قرآن مجید کا انتہائی روادارانہ اعلان ''یا ہم گمراہ یا تم'' ''یا ہم ہدایت یافتہ یا تم''۔
۷۔مزید رواداری کا مظاہرہ کہ ہمارے جرائم کے تم ذمہ دار نہیں اور جو تم کرو اُس کے ذمہ دار ہم نہیں۔
۸۔رسالت پیغمبرؐ اسلام کی ہمہ گیری کے اعلان کے ساتھ ختم رسالت کا ثبوت۔
۹۔اموال اور اولاد کے ساتھ حسن عمل کی قدر و قیمت میں اضافہ۔
۱۰۔اجرِ رسالت کی طلب مگر فائدہ اُس کا افراد امّت ہی کے لئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝۱ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ ۝۲

''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اُسی کی تعریف

ہوگی آخرت میں اور وہی حکمت والا ہے، بڑا باخبر جانتا ہے اُسے کہ جو زمین کے اندر جاتا ہے اور جو اس سے باہر نکلتا ہے اور جو آسمان سے اُترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے اور وہ مہربان ہے، بڑا بخشنے والا"۔

"جو زمین کے اندر جاتا ہے" جیسے آب باران اور "جو اس سے باہر نکلتا ہے" از قسم نباتات پھر "جو آسمان سے اترتا ہے" وہ بھی آب باران ہے اور "جو اُس میں چڑھتا ہے" وہ بندوں کے اعمال ہیں۔[1] بعض نے کہا ہے کہ آسمان پر چڑھنے والے جو ہیں، وہ فرشتے ہیں[2] اور کوئی حرج نہیں کہ اس کے عموم میں دونوں کو داخل سمجھا جائے جیسا کہ بعض کا رجحان ہے۔[3]

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۳﴾ لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۴﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿۵﴾

"اور کافر لوگوں کا قول ہے کہ قیامت ہمیں کبھی درپیش نہیں ہوگی، کہئے کہ کیوں؟! وہ ضرور تمہارے سامنے آئے گی قسم میرے پروردگار کی جو غیب کا جاننے والا ہے اس کی نظر سے اوجھل نہیں ایک ذرہ بھر بھی آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ کوئی اُس سے چھوٹی چیز ہے اور نہ بڑی مگر یہ کہ وہ ایک روشن نوشتے میں محفوظ ہے تاکہ وہ بدلا دے انہیں جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کرتے رہے، یہ ہیں وہ جن کے لئے بخشش ہے اور باعزت روزی اور جو ہماری آیتوں کے مقابلہ کی کوشش کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے لئے سخت قسم کی دردناک سزا ہے"۔

قیامت کے ذکر کے ساتھ علم الٰہی کا بیان کہ وہ ایک ایک ذرہ سے واقف ہے، جیسے ہر دور والے بعض فلسفیوں کے اس اعتراض کا جواب ہے جو انداز بدل بدل کے پیش کیا گیا ہے اور اُس کی اُن کے خیال میں بڑی "عقدۂ مالا ینحل" ہونے والی تقریر وہ ہے جو "شبۂ آکل و ماکول" کے نام سے مشہور ہے اور اُسی کو اَن پڑھ جاہل قسم کے عرب محسوس شکل میں پیش کرتے تھے کہ کہیں سے بہت بوسیدہ ہڈیاں لاکر اُنہیں ریزہ ریزہ کر دیتے تھے اور کہتے تھے جب ہم اس طرح سڑ گل گئے اور ریزہ ریزہ ہو گئے تو بھلا کون وہ ہوسکتا ہے جو انہیں از سر نو پہلی ہی ترتیب کے مطابق عالم ظہور میں لے آئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں میں یہ امتیاز کہ کون کس جسم کا جز تھا؟ ہمارے لئے ناممکن ہے کہ ہمارا علم محیط نہیں ہے مگر عالم الغیب کے لئے جو ہر ذرے سے واقف ہے ملے جلے ہوئے مختلف اجسام کے ذرات میں یہ مشخص کرنا کہ کون کس کا اصل جز ہے؟ عقلی طور پر بالکل دشوار نہیں ہے۔

---

[1] ما یدخل فیها وما ینزل من السّماء یعنی المطر وما یخرج منها قال النّبات وما یعرج فیها یعنی اعمال العباد (علی بن ابراهیم)

[2] ما یعرج فیها من ملك (تبیان)

[3] ما یعرج ای یصعد فیها من الملائكة واعمال العباد (مجمع البیان)

وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۶

''اور جنہیں علم عطا ہوا ہے، وہ سمجھتے ہیں اُسے جو آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے کہ وہ حق ہے اور وہ رہنمائی کرتا ہے صاحب عزت تعریفوں کی مستحق ذات کے راستے کی طرف''۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۷ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ۝۸

''اور کافر لوگ ''آپس میں'' کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہیں بتائیں ایسا آدمی جو تمہیں خبر دیتا ہے کہ اُس وقت جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے کہ تم از سرِ نو پیدا ہو گے۔ کیا یہ اللہ پر جھوٹ تہمت لگاتا ہے یا اس میں دیوانہ پن ہے بلکہ وہ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے عذاب اور سخت گمراہی میں ہیں''۔

اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَاۗءِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝۹

''تو کیا انہوں نے نہیں دیکھا اُسے جو اُن کے سامنے اور اُن کے پیچھے ہے آسمان اور زمین؟ اگر ہم چاہیں تو اُن کے ساتھ ایسا کریں کہ زمین ایک دم دھنس جائے یا اُن پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیں، یقیناً اُس میں نشانی ہے، اُس بندے کے لئے جو اُس کی طرف لَو لگانے والا ہو''۔

یعنی ہماری قدرت کی طرف نظر کریں تو اُن کو ہماری باتوں کے جھٹلانے کے انجام سے ڈرنا چاہئے۔[1] علامہ طبرسیؒ نے اس میں گذشتہ آیات کے ساتھ ربط پیدا کرنے کے لئے یہ اضافہ کیا ہے کہ وہ اس پر نظر کرتے تو سمجھتے کہ ہم مردوں کے زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں، اس کا انکار نہ کرتے۔[2]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ۝۱۰ۙ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱

---

[1] افلا یحذرون هٰذا ویرتدعون من التکذیب بآیات الله (تبیان)

[2] افلا یرتدع هٰؤلاء من التکذیب بآیات الله والانکار لقدرته علی البعث (مجمع البیان)۔

''اور بلاشبہ عطا کی ہم نے داؤد علیہ السلام کو فضیلت، اے پہاڑو! تسبیح کرو ان کے ساتھ اور پرندو اور نرم کیا ہم نے اُن کے لئے لوہا کہ بناؤ وسیع زرہیں اور کڑیوں کے جوڑنے میں تناسب کا خیال رکھو اور تم لوگ نیک کام کرتے رہو۔ میں تمہارے اعمال کا دیکھنے والا ہوں''۔

حضرت داؤدؑ کے لئے لوہے کا نرم ہونا

یہاں جناب داؤد علیہ السلام کے تین معجزوں کا ذکر ہے:۔

ایک یہ کہ اُن کی صدائے تسبیح کے ساتھ پہاڑوں سے بھی صدائے تسبیح بفرمان الٰہی جو حکم کن کی طرح ہوتا تھا بلند ہوتی تھی۔ یہ تسبیح نہ وہ تسبیح شانی ہے جو کائنات کی ہر چیز میں مخلوق الٰہی ہونے کے تقاضا سے موجود ہے، ورنہ خاص داؤد کے لئے اُس کو اللہ کے حکم خاص کا نتیجہ قرار دینے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اور نہ یہ طبعی طور پر صدائے بازگشت کی قسم کی چیز ہے جو پہاڑوں کے اندر کوئی آواز بلند ہونے پر پیدا ہوتی تھی، ورنہ پھر بھی بطور خاص اللہ کے حکم تکوینی کے ذکر کا محل نہ تھا بلکہ یہ ویسی صدائے تسبیح ہے جیسی روایتوں میں ہے کہ ہمارے رسولؐ کے ہاتھ میں آکر سنگریزے تسبیح کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ پرندے اُن کے قبضے میں تھے اور پہاڑوں پر اس کا عطف معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ ''الجبال'' کا لفظ بصورت نصب اس کے پہلے نہیں ہے۔[1] لہٰذا یہاں پر فعل کو مقدم ماننا پڑے گا جو ''سخرنا'' ہے جو فطری طور پر یہاں سمجھ میں آتا ہے۔[2] لیکن بعض لوگ اسے جبال پر بلحاظ محل عطف قرار دے کر یہ معنی قرار دیتے ہیں کہ پرند بھی اُن کے ساتھ تسبیح میں مصروف ہوتے تھے۔[3]

تیسرے یہ کہ اُن کے ہاتھ میں آکے لوہا نرم ہوجاتا تھا۔[4] اور وہ بتعلیم ربانی اُس سے زرہیں بناتے تھے اور تعلیم کا اللہ کی طرف سے ہونا ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ قدر فی السرد ''زردہ کی کڑیوں میں تناسب کا خیال رکھنا۔[5]

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ؕ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۱۲﴾ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ

---

[1] ان الحمل علی لفظ المنادیٰ اشکل (تبیان)

[2] مسخرش ساختیم مرغان را (شاہ ولی اللہ)

[3] عطفا علی محلّ الجبال ای ودعوناها تسبیح معه (جلالین)

[4] فصار فی یده کالشّمع یعمل به ما شآء من غیر ان یدخل النّار (مجمع البیان)

[5] اندازہ نگہدار در بافتن حلقہ ها (شاہ ولی اللہ) اندازہ رکھ ایک دوسرے کے پرونے میں (رفیع الدین)

الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾

''اور سلیمان کے قبضے میں ہم نے دیا ہوا کو جس کا صبح کا سفر ایک مہینے کی راہ کا تھا اور شام کا سفر اُس کا ایک مہینے کی راہ کا اور اُن کے لئے ہم نے تانبے کا چشمہ جاری کیا اور جنات میں سے کچھ ایسے تھے جو اُن کے پروردگار کے حکم سے اُن کے کارندے بنے ہوئے تھے اور جو اُن میں سے ہمارے حکم سے منحرف ہوا، ہم چکھائیں گے اُسے آگ کے عذاب کا مزہ۔ وہ اُن کے لئے بناتے تھے جو وہ چاہتے تھے محرابیں اور مجسمے اور پیالے حوضوں کے ایسے اور گڑی ہوئی دیگیں اے داؤد کے گھرانے والو! شکر ادا کرو اور میرے بندوں میں کم ہیں جو شکر گزار ہوں''۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿۱۴﴾

''تو جب ہم نے اُن پر موت کا حکم جاری کیا تو اُنہیں پتہ نہیں دیا اُن کے مرنے کا مگر دیمک نے جو کھا رہی تھی اُن کی لاٹھی کو تو جب وہ گرے تو جنات سمجھے کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت آمیز سزا میں اتنے عرصے تک نہ رہتے''۔

دیمک سے سلیمانؑ کی موت کا انکشاف

اس کی تفصیل مفسرین کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ وہ اپنے عصا پر تکیہ کر کے کھڑے ہوئے اور اُنہوں نے جنات سے کہا کہ جب تک میں کھڑا رہوں تم اس کام میں مصروف رہنا۔ جنات اُس کام میں لگ گئے اور یہاں کھڑے ہی کھڑے اُن کی روح قبض ہوگئی اور وہ اسی طرح کھڑے رہے اور جنات سرگرمی سے مصروف عمل رہے، یہاں تک کہ اتنی مدت گزر گئی کہ اُس عصا میں دیمک لگی اور اُس دیمک نے اُس عصا کو کھالیا جس سے وہ ٹیک لگائے ہوئے تھے، اور عصا ٹوٹا تو اُن کا جسم زمین پر گرا اور اب جنات کو احساس ہوا کہ یہ تو مدت ہوئی دنیا سے اُٹھ گئے اور ہم بے خبری سے بلاوجہ اس کام میں لگے رہے۔ الفاظ قرآنی اس تفصیل پر بلاتکلف منطبق ہیں۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجٰزِيْۤ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿۱۷﴾

''قبیلہ سبا کے لئے اُن کے بود و باش والے مقام پر ایک قدرت کی نشانی تھی، دو ۲ باغ دائیں اور بائیں کہ کھاؤ

اپنے پروردگار کی طرف کے رزق سے اور اس کا شکر ادا کرو، پاک وصاف شہر ہے اور پروردگار ہے جو بخشنے والا ہے تو انہوں نے روگردانی کی تو ہم نے اُن پر زور وشور کا سیلاب بھیجا اور اُن کے اُن دونوں باغوں کے بجائے دو باغ کر دیئے، بدمزہ پھلوں اور جھاؤ کے کچھ درختوں اور بہت تھوڑی سی بیریوں والے۔ یہ ہم نے اُنہیں سزا دی اس کی کہ اُنہوں نے ناشکرا پن کیا اور کیا ہم سزا دیتے ہیں ناشکرے کے سوا کسی کو''۔

ملک سباء والوں کی ناشکری اور ان کا انجام

''کھاؤ پیو اپنے پروردگار کے رزق سے اور اس کا شکر ادا کرو'' ایک تصور یہ ہے کہ یہ لفظی پیغام تھا جو انبیاء کی زبانی اُن تک برابر پہنچتا رہا۔[1] اور دوسرا تصور ذہن میں یہ آتا ہے کہ یہ اُن نعم الٰہی کا بزبان حال پیغام تھا جس کے لئے چشم بینا کے ساتھ گوش شنوا کی ضرورت تھی۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ﴿۱۸﴾ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾

''اور ہم نے قرار دیں اُن کے درمیان اور اُن بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت عطا کی مسلسل آبادیاں اور اُن میں آمدورفت کا سلسلہ قائم کیا، چلو پھرو ان میں رات دن امن وعافیت سے تو اُنہوں نے کہا پروردگار! ہمارے سفروں میں فاصلے قرار دے اور اُنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تو اُنہیں ہم نے افسانہ بنا دیا اور اُن کے پورے طور پر پرخچے اُڑا دیئے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر صبر وشکر کرنے والے کے لیے''۔

یہ کفرانِ نعمت اور ظلم جس کے نتیجہ میں اتنی سخت سزا دی گئی، ویسا ہی تھا جیسے بنی اسرائیل نے من وسلویٰ کے بجائے پیاز لہسن وغیرہ کی فرمائش کی اور اُس پر اُن کو سخت سزا دی گئی۔[2]

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۲۱﴾

''اور سچا ثابت کر دیا اُن کی نسبت شیطان نے اپنا خیال تو انہوں نے اُس کی پیروی کی سوا ایمان والوں کی ایک

---

[1] فی کلّ قریة نبیّ یدعوهم الی الله سبحانه یقولون لهم: کلوا من رزق ربّکم واشکروله (مجمع البیان)

[2] کما قالت بنو اسرائیل: فادع لنا ربك یخرج لنا ممّا تنبت الارض الخ (تبیان)

جماعت کے اور اُسے اُن پر قابو نہیں ہوا مگر اس لئے کہ ہم جانیں کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس کے متعلق شک میں ہے اور تمہارا پروردگار ہر چیز پر نگہبان ہے''۔

یعنی شیطان کی دسترس اللہ نے صرف اس لئے اُن پر ہونے دی کہ اُن کا امتحان ہو جائے اور مومن اور غیر مومن میں امتیاز سامنے آجائے، اُس کو یوں کہا ہے کہ ہم جانیں کون مومن ہے اور کون غیر مومن۔[1]

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿٢٢﴾

''کہئے کہ پکارو اُنہیں جن کو تم سمجھتے ہو اللہ کے علاوہ، وہ نہیں قدرت رکھتے ایک ذرے بھر پر بھی آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہیں ہے ان کے لئے اُن دونوں میں کچھ شرکت اور نہیں ہے اُن کا اُن میں سے کوئی مددگار''۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٢٣﴾

''اور اُس کے یہاں سفارش فائدہ نہیں دیتی مگر اُس کی جسے وہ اجازت دے، یہاں تک کہ جب اُن کے دلوں سے اضطراب دور کر دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ کیا کہا تھا تمہارے پروردگار نے؟ وہ کہیں گے کہ اُس نے حق کہا تھا اور وہ اونچا ہے، بہت بڑا''۔

جیسا کہ متعدد مقامات پر ہم نے متنبہ کیا ہے، جب نفی شفاعت کے ساتھ بہت سی جگہ قرآن میں استثناء موجود ہے ''مگر جسے وہ اجازت دے'' جسے وہ پسند کرے'' جس سے وہ راضی ہو اور اسی طرح کے الفاظ تو اس کے بعد مطلق شفاعت کا انکار کرنا قطعاً غلط ہے۔

یہاں جو استثناء ہے: اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک وہی جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے:۔

''جسے وہ اجازت دے'' اس صورت میں اذن کا تعلق شفاعت کرنے والے کے ساتھ قرار پاتا ہے دوسرے یہ کہ ''جس کے لئے وہ اجازت دے'' یعنی بداعمالی کا درجہ ایسا نہ ہو کہ اُس کی شفاعت اللہ کو ناپسند ہو۔ اس صورت میں اذن کا تعلق اُس شخص سے ہوگا جس کی شفاعت کی جائے۔

فزع عن قلوبهم کے معنی اضطراب دور کرنے کے یوں ہیں کہ فَزَعَ (بغیر تشدید) کے معنی اضطراب کے ہیں، باب تفعیل میں لے جانے سے اُس میں دور کرنے کے معنی پیدا ہو گئے۔[2]

مطلب یہ ہے کہ جب احوال قیامت کے ہنگامی اثر پر کچھ وقت گزرنے سے تھوڑا دل ٹھہرے گا تو یہ سوال و جواب ہوگا۔

---

[1] لنعلم علم ظهور (جلالین) فعبّر عن تمییزہ بین الفریقین بالعلم (تبیان)

[2] فزع عن قلوبهم کشف عن قلوبهم (علی بن ابراهیم) ای کشف الفزع عن قلوبهم (مجمع البیان)

اب ''وہ کہیں گے'' کون؟ ایک تشریح یہ ہے کہ فرشتے کہیں گے۔[1] اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپس میں یہ سوال وجواب ہو۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّاۤ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾

''کہئے کہ کون تمہیں روزی عطا کرتا ہے آسمانوں اور زمین سے؟ کہئے کہ اللہ اور بلاشبہ یا ہم اور یا تم، ہدایت پر ہیں یا کھلی ہوئی گمراہی میں''۔

انتہائی روادارانہ اعلان

یہ حقیقت حال کے بارے میں شک کا اظہار نہیں ہے بلکہ ایک حکیمانہ انداز ہے مخاطب کے لئے حقیقت حال پر غور کرنے کی دعوت کا جو اُسے ناگوار بھی نہ ہو۔[2] اور اس میں یہ ایک اصول مضمر ہے کہ اختلاف وتصادم رائے کی شکل میں حق دونوں سمتوں میں نہیں ہوسکتا۔ ایک ہی سمت میں ہوگا۔

شاہ عبدالقادرؒ نے لکھا ہے:

''یعنی دونوں فرقے تو سچ نہیں کہتے، ایک مقرر سچا ہے، ایک مقرر جھوٹا ہے تو لازم ہے کہ سوچو اور سچی بات پکڑو، اس میں اُن کا جواب ہے جو اس زمانہ میں بعض لوگ کہتے ہیں، دونوں فرقے ہمیشہ سے چلے آرہے ہیں، کیا ضرور ہے جھگڑنا'' (موضح القرآن)

خیر جہاں تک جھگڑنے کا تعلق ہے، اس سے تو قرآن مجید نے بھی روکا ہے لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (سورۂ شوریٰ۔ ۱۵) اور یہاں بھی بعد والی آیتوں کا مطلب یہی ہے مگر دونوں کا بیک وقت سچا نہ ہونا اور اس لئے بحث ونظر کی ضرورت لازماً ثابت ہے۔

یہ بعض لوگ اب اس زمانے میں بہت بڑھ گئے ہیں جو کہنے لگے ہیں کہ مذاہب سب ایک ہی منزل تک پہنچانے والے راستے ہیں اور سب ہی ٹھیک ہیں مگر یہ خیال نہ عقلاً درست ہے اور نہ قرآن اُسے درست قرار دیتا ہے۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۶﴾

''کہئے کہ تم سے جواب دہی نہیں ہوگی اُس کی جو ہم جرم کریں اور نہ ہم سے جواب دہی ہوگی اُس کی جو تم کرتے ہو، کہئے کہ ہم سب کو ہمارا پروردگار یکجا کریگا، پھر ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور بڑا فیصلہ کرنے والا

---

[1] قالت الملائكة (تبیان)

[2] انّما قال ___ علیٰ وجه الانصاف فی الحجاج دون الشّك (تبیان) وقیل انّما قال علیٰ وجه الاستعطاف والمداراة لیسمع الكلام وهٰذا من احسن ما ینسب به المحقّ نفسه الی الهدیٰ وخصمه فی الضّلال لانه كلام من لا یكاشف خصمه بالتضلیل بل ینسبه الیه علیٰ احسن وجه ویحثّه علی النّظر ولا یجب النّظر الّا بعد التردّد (مجمع البیان)

ہے، جاننے والا''۔

مزید رواداری

یہ رواداری کا انداز بھی قابل ملاحظہ ہے کہ خود اپنی طرف بطور مفروضہ بے محابا جرم کا انتساب کر دیا جاتا ہے اور فریق مخالف کے بارے میں کہنا یہی ہے کہ جو تم جرم کرو، اُس کی جواب دہی ہم سے نہ ہوگی مگر اس لئے کہ اُسے ناگوار نہ ہو اُس کی طرف جرم کی نسبت نہیں دی جاتی بلکہ ''عمل'' کا لفظ کہا جاتا ہے کہ جو تم کر رہے ہو، اُس کی جواب دہی ہم سے نہ ہوگی۔

''سب کو یکجا کرے گا'' موقف حساب میں اور پھر فیصلہ کے بعد تفریق ہو جائے گی (فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ)

قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾

''کہئے کہ مجھے دکھاؤ وہ جنہیں تم نے اس کے ساتھ شریک بنا کر ملایا ہے۔ حاشا کلاّ، وہی اللہ ہے جو عزت والا ہے، حکمت والا''۔

''دکھاؤ'' کا یہ مطلب بھی بالکل درست ہے کہ اُن کی قدرت و طاقت کے کچھ آثار ہماری نظروں کے سامنے لاؤ اور یہ اعلان نفی کا پرزور انداز ہے یعنی اگر کہیں اُس کے شریک معبودوں کا وجود ہے تو ہمیں بھی دکھاؤ کہ اُن کے کیا کارنامے ہیں؟ پھر چونکہ وہ معبود از قبیل اجسام قرار دے رہے تھے تو خود اُن کے دکھانے کا مطالبہ بھی درست ہے۔ پھر بھی ان کی صورتوں کا دکھانا مراد تھوڑی ہو سکتا ہے یہ کونسا مشکل ہے وہ اُنگلی سے اشارہ سے دکھا دیتے کہ یہ ہیں۔ اس صورت میں بھی یہ جزء اس کے ساتھ لازمی ہے کہ اُن میں صفات الوہیت دکھاؤ کیا ہیں؟ رہ گیا خدائے حقیقی تو واقعہ یہ ہے کہ اُس کے وجود کے وہ بھی قائل تھے اور اُس کے غیب الغیوب ہونے سے بھی واقف تھے کہ وہ دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اُس کے جواب میں وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ جس خدا کو تم کہتے ہو، اگر وہ ہے تو ہمیں دکھاؤ اور آج کوئی منکر خدا بھی ہم سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ اگر وہ ہے تو ہمیں آنکھوں سے دکھاؤ، اس لئے کہ ہم جسے ''خدا'' کہتے ہیں، اس کے تصور کا جزء لازمی یہ ہے کہ وہ دکھائی نہیں دے سکتا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

''اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا ہے مگر تمام نوع انسانی کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر لیکن زیادہ تر لوگ جانتے نہیں''۔

رسالت خاتم الانبیاء کی ہمہ گیری

یہ آیت ہمارے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے عام ہونے کی دلیل ہے کہ وہ صرف کسی ملک مثلاً حجاز اور کسی قوم مثلاً عرب کے لئے نہ تھی بلکہ تمام نوع انسانی کے لئے تھی۔ اس کے ساتھ جب اس میں سے قید زمان و مکان نکال دی جائے تو اسی سے ختم نبوت کا ثبوت بھی ہو جائے گا اور حقیقت یہ ہے کہ کآفة کے معنی میں غیر کی ضرورت نہ ہونے کا پہلو مضمر ہے کیوں کہ کف کے معنی روکنے اور باز رکھنے کے ہیں چنانچہ قدر

کفاف کے معنی ہیں ''ضرورت بھرا'' اور نحو میں ماء کافّۃ وہ ہوتی ہے جو عمل سے روک دیتی ہے۔

کافۃ للناس کے معنی درحقیقت یہی ہیں کہ آپ کی ذات سے نبوت ورسالت کے مقصد کی تکمیل ہوگئی۔ اب نہ اُسی دور میں کسی اور نقطہ ارض پر کوئی اور نبی یا رسول ہے اور نہ آئندہ کسی دور زمانہ میں کوئی نبی یا رسول آنے والا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٩﴾ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٣٠﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ وعید آخر کب پورا ہوگا اگر تم لوگ سچے ہو، کہئے کہ تمہارے لئے وعدہ وعید ہے ایک ایسے دن کا جس سے نہ تم ایک گھڑی پیچھے جا سکتے ہو، نہ آگے بڑھ سکتے ہو''۔

اگر یہ آیت مقام تنزیل میں اسی جگہ کی ہے تو چونکہ بشارت کے نتیجہ میں وعدہ ثواب اور انذار میں وعید عذاب مضمر ہے جسے کہا گیا ہے کہ زیادہ تر لوگ جانتے نہیں یعنی اُس آخرت کے دن کا تصور نہیں رکھتے۔[1] تو وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ وعید جو تمہارا ہے آخر کس دن وقوع میں آئے گا؟ اس کے جواب میں جو کہا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ وقت تو راز الٰہی ہے مگر ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ ٹلنے کا نہیں ہے اور وہ علم الٰہی میں ایسا مقرر و معین ہے کہ ایک ساعت اِدھر اُدھر نہیں ہوسکتا۔ عربی کے لحاظ سے میعاد مصدر میمی ہے جس کے معنی وعدے کے ہیں اور وہ دن قیامت کا ہے۔[2]

بعض جماعتوں نے میعاد کا لفظ کے اردو معنی لے کر آیت کا یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ قیامت تک ایک دن کی میعاد ہے اور پھر دن کے لئے کچھ اور آیات کے ضمیمے سے یہ کہا ہے کہ وہ ایک ہزار برس کا ہے، اس لئے دین اسلام اور امت محمدی کی عمر ایک ہزار برس ہے۔ اس کے بعد کوئی دوسرا رہبر آئے گا اور یہ شریعت منسوخ ہوجائے گی، یہی نہیں بلکہ اُس رہبر کا آنا ہی قیامت کا قائم ہونا ہوگا اور اُسی کو قرآن میں لقاء اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہائی لٹریچر میں اس پر بڑی عمارتیں کھڑی کی گئی ہیں جو قطعی بے بنیاد ہیں اس لئے کہ عربی میں میعاد کے وہ معنی ہیں ہی نہیں جو کہ اردو میں ہیں۔

میعاد کے معنی جیسا کہ پہلے آیا، وعدے کے ہیں اور اس طرح دن کا لفظ اس درمیانی دور کی پیائش کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ وعدہ جس دن کا ہے اُس کی تعیین کے لئے جسے سورۂ فاتحۃ الکتاب یعنی سورۂ حمد ہی میں یوم الدین کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور دوسرے مقامات پر یوم البعث، یوم التناد، یوم الحشر، یوم الجمع بلکہ یوم المیعاد سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور وہ یوم القیامۃ ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ وَلَوْ تَرٰٓى

---

[1] قيل لا يعلمون مالهم فى الأخرة فى اتّباعك من الثواب والنّعيم وما عليهم فى مخالفتك من العذاب الاليم (مجمع البيان)

[2] وهو يوم القيامة (جلالين)

اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖۚ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ِۨالْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ۝۳۱ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ۝۳۲ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۳۳

''اور کافروں نے کہا کہ ہم ہرگز اس قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اُس پر جو اس کے آگے ہے اور کاش تم دیکھتے اُس موقع کو جب ظالم کھڑے کیے جائیں گے اُن کے پروردگار کے سامنے اُن میں کا ایک دوسرے سے سوال و جواب کر رہا ہوگا، کہیں گے وہ لوگ جو دبے ہوئے تھے اُن سے کہ جو بڑے بنے ہوئے تھے۔ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو ہم ایمان لے آئے ہوتے، بڑے لوگ کہیں گے ان دبے ہوئے آدمیوں سے کہ کیا ہم نے تم کو ہدایت پانے سے روکا تھا جب کہ وہ تمہارے پاس آ گئی بلکہ تم خود جرم کے ذمہ دار تھے اور کہیں گے جو دبے ہوئے تھے اُن سے جو بڑے تھے کہ کچھ نہیں بلکہ یہ زمانہ کا نیرنگ ہے جو تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اُس کے لئے برابر دار قرار دیں اور دل میں چھپائے ہوں گے اور وہ سب پچھتاوے کو جب عذاب کو انہوں نے دیکھا ہوگا اور ہم نے زنجیریں ڈال دیں اُن کی گردنوں میں جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا۔ کیا انہیں سزا مل رہی ہے سوا اس کے جو وہ اعمال کرتے تھے''۔

یہ انسان کی عام کمزوری ہے کہ جب کچھ بن نہیں پڑتا تو وہ پوری ذمہ داری تقدیر و زمانے کی گردش پر ڈال دیتا ہے۔ یہاں بھی آخر میں یہی ہوا کہ ایک دوسرے کو ذمہ دار ٹھہراتے ٹھہراتے آخر میں رخ مڑ گیا ہے ''زمانہ کے نیرنگ'' کی طرف مگر زمانہ کا نیرنگ آدمی کو افعال کی ذمہ داری سے بری تھوڑی کر دیتا ہے اور انسان کے ضمیر کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ خود اپنے فعل کا ذمہ دار ہے، اس لئے وہ لیڈر جو کہہ رہے تھے کہ ہم سے کیا مطلب؟ تم خود گمراہ ہوئے اور یہ پیرو جواب اس سب کو تقدیر کے حوالے کر رہے ہیں، اپنی جگہ سب ہی دل میں ندامت محسوس کر رہے ہیں کہ ہم یقیناً مجرم ہیں اور جو سزا مل رہی ہے، اُس کے حق دار ہیں یہ اُس وقت ہے جب اسروا کے معنی چھپانے کے ہوں اور دوسرا قول یہ ہے کہ اسروا کے معنی ہیں اظہار کرنا جس کی نظیریں بھی کلام عرب میں ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ سب ہی اب پچھتاوا ظاہر کر رہے ہیں خواہ ان باتوں کے ذریعہ سے

جواُن کی زبان پر ہیں جو خود اُن کے احساس جرم کی غماز ہیں اور خواہ ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر لعنت وملامت کے طور پر۔[1]

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۳۴ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝۳۵ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۶ وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۡ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ جَزَاۗءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۝۳۷ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰۗىِٕكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ۝۳۸

''اور ہم نے نہیں بھیجا کسی بستی میں کوئی پیغمبر مگر یہ کہ وہاں کے دولت مندوں نے کہا کہ ہم اُس پیغام کو جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو۔نہیں مانتے اور انہوں نے کہا کہ ہم مال اور اولاد میں بڑھے ہوئے ہیں اور ہمیں کوئی سزا نہیں مل رہی ہے۔ کہئے کہ میرا پروردگار جس کے لئے چاہے رزق میں وسعت دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی کرتا ہے مگر زیادہ تر لوگ علم نہیں رکھتے اور تمہارے مال اور اولاد تمہیں ہماری بارگاہ میں نزدیک کرنے والے نہیں ہیں مگر وہ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرے تو ان کے لئے بیش از بیش جزا ہے اُن کے اعمال کے عوض میں اور وہ بہشت کے اونچے درجوں میں اطمینان کے عالم میں ہوں گے اور جو ہماری آیتوں کے مقابلہ کی کوشش کرتے ہیں تو یہ لوگ عذاب میں حاضر کیے جائیں گے''۔

اموال اور اولاد کے ساتھ حسن عمل کی قدر و قیمت میں اضافہ

دولت مند لوگ اپنے مال اور دولت کو گویا اپنی حقانیت اور بے جرمی کا ثبوت قرار دیتے ہیں یعنی اگر ہم ایسے مجرم ہوتے تو جیسا کہ پیغمبر لوگ بتاتے ہیں تو ہمارے پاس یہ مال اور اولاد کی فراوانی کیوں ہوتی؟ ان آیات میں اس تصور کی رد کی جارہی ہے یعنی مشیت الٰہی سے کسی کو دولت ملنا یا محروم رہنا اکثر بطور امتحان عمل ہوتا ہے جسے جاہل لوگ اللہ کی رضا اور ناراضگی کا ثبوت قرار دیتے ہیں اور یہی وہ جہالت ہے جسے کہا جارہا ہے کہ ''زیادہ تر لوگ علم نہیں رکھتے''۔[2] پھر اسی کو زیادہ صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ مال اور اولاد کی کثرت سبب قرب الٰہی نہیں ہے۔ اصل چیز انسان میں ایمان وعمل صالح ہے۔ یہ ذخیرہ جس کے پاس زیادہ ہو وہ تقرب الٰہی کے درجہ پر فائز ہے۔ اب اس کے ساتھ مال اور اولاد بھی ہو تو کیا

---

[1] فيه وجهان معناه اظهرو النّدامة والأخران المعنى اخفوا فمن قال بالاوّل قال معناه اظهر المترفون النّدامة على الاضلال واظهر الاتّباع النّدامة على الضّلال وقيل معناه اقبل بعضهم على بعض يلومه ويظهر ندمه (مجمع البيان)

[2] ان الاموال والاولاد عطاء من الله سبحانه يستحقّ به الشّكر عليه وليس ذٰلك الاكرام والتفضيل (مجمع البيان)

کہنا اور یہ اُنہیں بھی عمل صالح کے ذخیرہ میں اضافہ کا باعث بنالے تو وہ مال اور اولاد بھی بالواسطہ قرب الٰہی کا ذریعہ بن جائیں گے۔

اس عمل صالح کی بنا پر جو اُس نے اُن کے ذریعہ سے انجام دیا اور اس لئے اموال اور اولاد کے باعث تقرب ہونے کی نفی میں اس کا بطور استثناء اظہار کیا (اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً)

اب ان افراد کے لئے جو ایمان کے ساتھ عمل صالح کا جوہر رکھتے ہیں، ارشاد ہے کہ ان کی کارگزاری کے صلے میں جَزَآءُ الضِّعْفِ ہے جس کا ترجمہ ہم نے دونی جزاء نہیں کیا باوجودیکہ ضِعْف کے ظاہری معنی دونے کے ہیں۔ اس لئے دونی کہنے سے جزا کی زیادتی محدود ہو جاتی حالانکہ اعمال خیر کی جزاء تو بنصّ قرآن کم از کم دس گنی ہوتی ہے اور مال کے ذریعہ سے جو نیک عمل ہوتا ہے یعنی راہ خدا میں انفاق، اس کے لئے بھی تو سات سو گنے کا اعلان کیا گیا اور اس کے بعد کہا گیا: (وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ) اللہ جسے چاہتا ہے اور زیادہ عطا کرتا ہے۔ (۲۶۱)

ہمارا ترجمہ ''بیش از بیش'' ان تمام صورتوں کو سمیٹ لیتا ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۳۹﴾

''کہئے کہ میرا پروردگار روزی میں وسعت دیتا ہے جس کے لئے اپنے بندوں میں سے چاہتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی کرتا ہے اور جو تم لوگ خیرات کرو، وہ اس کی جگہ پر عطا کرے گا اور وہ بہترین روزی دینے والا ہے۔

یعنی راہ خدا میں خرچ کرتے وقت فقر و فاقہ کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ اس کی کمی کو پورا کرنے کا ذمّہ دار ہے۔ [۱]

اس میں یہ توسعہ بالکل درست ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ کمی دنیا ہی میں پوری ہو جائے بلکہ اخروی اجر و ثواب بھی اس مال دنیا کا بہترین جانشین ہے اس کے لئے جو آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ [۲] تو اللہ اس کی کمی کو پورا ضرور کر دے گا خواہ دنیا ہی میں اور خواہ آخرت میں۔ [۳]

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۴۰﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾

''اور جس دن وہ اُن سب کو حشر میں لائے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے؟ وہ

---

[۱] خدای عوض آن دهد (شاه ولی الله) وہ بدلا دیتا ہے اس کا (رفیع الدین)

[۲] ليس المراد ان يخلف فی دار الدّنيا علىٰ كلّ حال لانّ الله تعالىٰ يفعل ذٰلك بحسب المصلحة وانّما ارادانّه يعوّض عليه امّا فی الدّنيا بانّ يخلف بدله او يثيب عليه (تبيان)۔

[۳] اما فی الدّنيا بزيادة النعمة و امّا فی الآخرة بثواب الجنّة۔ (مجمع البيان)

کہیں گے پاک ہے تیری ذات ہمیں جو تعلق ہے، وہ تجھ ہی سے ہے نہ کہ ان سے بلکہ وہ جنات کی پرستش کرتے تھے ان میں کے زیادہ لوگ انہیں مانتے تھے تو آج کے دن تم میں کا ایک دوسرے کے لئے کسی نفع یا نقصان پر قدرت نہ رکھے گا اور ہم کہیں گے ظالموں سے کہ چکھو اُس آگ کا مزہ جسے تم جھٹلاتے رہے تھے"۔

اس آیت سے بالکل یہ تفریق نمایاں ہے کہ ملائکہ اور ہیں اور جن دوسرے ہیں اور اس لئے شیطان کو جو قرآن میں کہا گیا ہے كَانَ مِنَ الْجِنِّ "وہ جنات میں سے تھا" اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ملائکہ میں سے نہیں تھا بلکہ بعض مفسرین نے زیر تحریر آیت میں جن سے مراد شیطان ہی لیا ہے کہ اس کی وسوسہ انگیزی سے انہوں نے غیر اللہ کو معبود بنالیا ہے۔ [1]

اس طرح یہ آیت خود براہ راست شیطان کو فرشتوں سے خارج اور اُن کا مدمقابل بنا رہی ہے۔

اب چونکہ خالق نے سوال یہ کیا تھا کہ کیا یہ تمہاری عبادت کرتے تھے؟ اس کے جواب میں اُن کا یہ کہنا کہ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ "نہیں بلکہ وہ جنات کی عبادت کرتے تھے" اس سے بظاہر تو ذہن میں یہی معنی پیدا ہوتے ہیں کہ وہ ملائکہ کی عبادت کرتے ہی نہ تھے مگر کچھ مفسرین نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ وہ ملائکہ کی عبادت شیطان کی تحریک سے کرتے تھے اس لئے فرشتوں نے کہا ہے کہ وہ دراصل جنات کی عبادت کرتے تھے ہماری نہیں۔ [2]

بعض نے کہا ہے کہ شیاطین نے جنات ہی کی شکل کی کچھ مورتیاں بنائی تھیں اور اُن سے کہا تھا کہ یہ فرشتوں کے مجسمے ہیں تو انہوں نے فرشتوں کے تصور میں جنات کی عبادت کی۔ [3]

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾

"اور جب اُن کے سامنے ہماری واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص نہیں ہے مگر ایسا آدمی جو چاہتا ہے تمہیں منحرف کرے اُس سے جس کی تمہارے باپ دادا عبادت کرتے آئے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہے مگر گڑھا ہوا جھوٹ اور کافر لوگ حق کو کہتے ہیں جب وہ اُن کے پاس آیا کہ یہ نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو"۔

وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ؕ ﴿۴۴﴾

---

[1] قيل المراد بالجنّ ابليس وذرّيته واعوانه (مجمع البيان)

[2] اى يطيعونهم فى عبادتهم ايّانا (جلالين) يعنى عبادت ملائكه بجهت وسوسۂ شياطين بود پس گويا عبادت شيطان كردند (فتح الرحمن)

[3] قيل انّهم صوّروا لهم صورة قوم من الجنّ وقالوا هٰذه صورة الملائكة فاعبدوها (تبيان)

وَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۵﴾

''اور ہم نے انہیں کچھ کتابیں نہیں دی ہیں جنہیں وہ پڑھتے ہوں اور آپ کے پہلے ہم نے اُن کی طرف کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) نہیں بھیجا اور اُن کے پہلے والوں نے جھٹلایا اور جو کچھ اُنہیں ہم نے دیا تھا، اُس کے دسویں حصے تک بھی یہ نہیں پہنچے ہیں تو انہوں نے میرے پیغمبروں کو جھٹلایا تو کیسی تھی میری طرف کی سزا''۔

''آپ کے پہلے'' یعنی ماضی قریب میں کافی طولانی مدت سے نہ یہ کہ اس قوم میں پہلے کبھی بھی کوئی رسول نہیں آیا جو اس اعلان قرآنی کے خلاف ہے کہ کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی رسول نہ آیا ہو اور پھر اگر کبھی کوئی رسول نہ آیا ہو تو یہیں دوسری آیت میں اُن کے سابق اسلاف کے تکذیب رسل کا حال کیوں بیان ہوتا؟

چوں کہ کفران نعمت سلب نعمت کا سبب ہوتا ہے تو اس قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا، اُنہیں ایذائیں دیں اور انہیں قتل کیا، اس لئے ایک عرصے تک کے لئے وہ ہدایت ربانی سے محروم کر دیئے گئے۔

اس امت نے بھی جب اپنے پیغمبر کے معصوم جانشینوں کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا تو پردۂ غیبت ڈال کر آخری رہنما کے فیوض سے بہت حد تک اُنہیں محروم کر دیا گیا۔

ایک خیال یہ ہے کہ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی کتابیں اُن کے پاس نہیں آئیں اور کوئی پیغمبر پہلے بھی نہیں آیا جسے انہوں نے مان لیا ہو اور ایسی ہی باتیں نہ کہی ہوں جو آپ کے لئے کہہ رہے ہیں۔[1] مگر قرآن مجید کے الفاظ سے یہ مطلب کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔

علامہ طبرسیؒ نے یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ ہم نے اُنہیں کوئی ایسی کتابیں نہیں دی ہیں جنہیں وہ آپ کے خلاف بطور سند پیش کر سکیں اور آپ کے پہلے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جس کی تعلیم کا تقاضا یہ ہو کہ وہ آپ کا انکار کریں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ﴿۴۶﴾

''کہئے کہ میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، وہ یہ کہ تم اللہ کے لئے دو دو مل کر اور اکیلے اٹھو اور پھر غور کرو کہ اس تمہارے رفیق (رسول) میں کوئی دیوانگی نہیں ہے مگر تمہیں ہوشیار کرنے والا اس عذاب کے پہلے جو بہت سخت ہوگا''۔

کتنا ملائم اور کتنا روادارانہ انداز ہے؟ حاکمانہ فرمان نہیں بلکہ مشفقانہ نصیحت بس ایک بات کی اور وہ یہ ہے کہ برائے خدا ایک ایک یعنی بطور خود تنہائی میں فرصت کے لمحات میں خود سوچو اور اجتماعی طور پر باہم تبادلہ خیالات میں بھی اس پہلو پر غور کرو۔ اگر ذرا بھی کوئی عناد اور دھاندلی

---

[1] یجوز ان یکون المراد وما ارسلنا الیھم قبلك یا محمّد من نذیر الّا وفعلوا بہ وقالوا لہ مثل ما قالوا لك (تبیان)

سے کام نہ لے تو یہ انداز اُسے غور کرنے کی تحریک پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ دو، دو یا ایک یعنی اجتماعی طور پر یا انفرادی حیثیت سے قوموا اُس کا ترجمہ ہم نے ''کھڑے ہو'' نہیں کیا بلکہ ''اٹھو'' یعنی اس کا مطلب وہ کھڑا ہونا نہیں ہے جو بیٹھنے اور لیٹنے کے مقابل میں ہوتا ہے بلکہ اُس سے مقصود اس غور وخوض پر آمادہ ہونا اور ذہنی کاہلی سے کام لے کر اپنی موجودہ حالت یا دیرینہ کیش پر قانع ہو کر پڑے نہ رہنا ہے۔[1]

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۴۷﴾

''کہئے کہ میں نے تم سے جو اجر طلب کیا ہے، وہ تو تمہارے ہی لئے ہے۔ میرا اصل معاوضہ تو نہیں ہے مگر اللہ پر اور وہ ہر چیز پر حاضر وناظر ہے''۔

اجر رسالت کا طلب ہونا مگر فائدہ افراد امت کا

چونکہ تمام انبیاء نے جیسا کہ قرآن سے ظاہر ہے ہمیشہ کہا کہ ہم تم سے کوئی اجر نہیں چاہتے اور اس میں کوئی استثناء نہیں کیا مگر ہمارے پیغمبرؐ کی زبانی بحکم الٰہی یہ اعلان ہوا کہ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى یعنی آپ نے ایک استثناء کر دیا کہ مودت ذوی القربیٰ کا بطور اجر میں طلب گار ہوں تو اس سے شبہ ہو سکتا تھا کہ آپ کا عمل ویسا بے لوث اور خالص نہیں رہا جیسا دوسرے انبیاء تھے۔ اس شبہ کو اس آیت میں دور کیا گیا اور بتایا گیا ہے کہ وہ اجر جو خلوصِ عبادت کے خلاف ہو سکتا ہے، وہ ہے جس کا نفع اُس عمل کرنے والے کی ذات کو پہنچے لیکن میں نے جو اجر مانگا ہے، وہ اپنی ذات کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ اجر ایسا ہے جو خود تمہارے لئے فائدہ رسان ہے یعنی وہ ذوی القربیٰ وہ ہیں جن کی محبت تمہارے لئے ذریعہ نجات بنے گی جس کی تشریح پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث سے ہو جاتی ہے کہ مثل اهل بيتي كمثل سفينة نوح من ركبها نجا و من تخلف عنها غرق و هوىٰ اور دوسری حدیث کہ انی تارك فيكم الثقلين كتاب الله وعترتي اهل بيتي ما ان تمسكتم بهما لن تضلّوا بعدي: اب اگر نجات کی اور ضلالت وگمراہی سے علیحدگی کی ہر مسلمان کو ضرورت ہے تو ان ذوالقربیٰ کی محبت بھی ہر مسلمان کی اپنی ضرورت ہے جس کی تکمیل اجر رسالت طلب کر کے کی گئی ہے۔ یہ بھی درحقیقت خود مسلمانوں کی ایک خدمت اور اُن کے ساتھ ایک بڑا لطف وکرم ہے۔ اس لئے بعد میں کہا گیا کہ میرا اجر اعمال کا جن میں خود یہ اجر رسالت کی طلب بھی ہے، اللہ کے ذمے ہے، وہ مجھے اسی سے ملے گا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۴۸﴾ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ﴿۴۹﴾ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ

---

[1] ليس معنى القيام هنا القيام على الارجل وانّما المراد به القعد للاصلاح والاقبال عليه (مجمع البيان)

فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ۝۵۰

''کہئے کہ بلاشبہ میرا پروردگار حق کو اتارتا ہے، وہ بڑا غیبوں کا جاننے والا ہے، کہئے کہ حق آ گیا اور جو خود غلط ہے، وہ نہ پہلے پہل پیدا کرسکتا ہے اور نہ دوسری دفعہ پلٹا سکتا ہے، کہئے کہ اگر میں گمراہ ہوں تو میری گمراہی کی ذمہ داری خود مجھ پر ہے اور اگر میں ہدایت پاؤں تو وہ ثمرہ ہے اس کا جو میرا پروردگار میری طرف وحی بھیجتا ہے بلاشبہ وہ سننے والا ہے، بالکل نزدیک''۔

يَقْذِفُ بِالْحَقِّ کا ترجمہ جو ہم نے کیا ہے ''حق کو اتارتا ہے'' یہ ایک طرح کی مجبوری کا نتیجہ ہے کہ کوئی مناسب لفظ جو قذف کے خصوصیات کا حامل ہو، اردو میں دستیاب نہیں ہوا۔ درحقیقت قذف کے معنی میں اُس طرح کا قوت کے ساتھ پھینکنا یا ڈالنا مضمر ہے جیسے گولا پھینکا جاتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ اس کے ساتھ علی الباطل کا لفظ ہے کہ وہ حق کو باطل کی طرف پھینکتا ہے۔[1] اور قوت کے ساتھ ڈالنا جیسے گیند وغیرہ میں ہوا بھری جاتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

العلم نور یقذفه الله فی قلب من یشاء.

علم ایک نور ہے جس کے دل میں چاہتا ہے اللہ اُسے ڈالتا ہے۔ اب یہاں چونکہ اُس کے ساتھ علی الباطل وغیرہ کا لفظ نہیں ہے اس لئے اگر ترجمہ میں پھینکنا یا ڈالنا کہیں تو مفہوم کچھ ذہن میں نہیں آتا لہٰذا بس اُس کے ایک جز مفہوم کو لے کر ''اتارتا ہے'' ترجمہ کیا گیا اور اسی لئے بعض نے اس کے محل نزول کے لئے انبیاء کا نام لیا کہ وہ اُسے اپنے پیغمبر پر اتارتا ہے۔[2] مَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ کا ترجمہ جو ہم نے لکھا ہے کہ ''جو خود غلط ہے وہ نہ پہلی دفعہ پیدا کرسکتا ہے اور نہ دوسری دفعہ پلٹا سکتا ہے'' یہ اس پر مبنی ہے کہ باطل سے مراد وہ ہیں جو اللہ کے علاوہ معبود بنائے گئے ہیں اور بعض دوسرے مترجمین نے بھی ترجمہ اس کے مطابق کیا ہے۔[3] مگر بعض نے اس طرح تشریح کردی ہے جو یبدأ اور یعید سے متعلق ہوسکتی ہے نہ کہ یبدی و یعید کے لفظوں سے جو کہ قرآن میں ہیں۔[4]

اس سے بہتر وہ ہے جو علامہ طبرسیؒ کا رجحان معلوم ہوتا ہے کہ باطل سے مراد کفر ہی وغیرہ ہے اور مَا يُبْدِئُ وَمَا يُعِيْدُ کا مطلب یہ ہے کہ اب اس میں کسی کارگزاری کی سکت باقی نہیں رہی۔ نہ وہ کسی چیز کو شروع کرسکتا ہے۔ نہ دوبارہ انجام دے سکتا ہے۔[5] مگر چونکہ دوسرے مقامات پر یبدئ و یعید خالق کا وصف قرار دیا گیا ہے جس سے اُس کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے، اس لئے اس کی نفی سے بھی ذہن میں یہی معنی آتے ہیں لہٰذا جیسے خدائے حقیقی کے لئے الحق کا لفظ عام طور پر استعمال ہوتا ہے چنانچہ ہمارے محاورے کا جز ہے ''حق سبحانہ'' جو قرآن کے مطابق ہے تو کیوں نہ باطل سے مراد اس کے مقابل والے غلط معبود ہوں، اس لئے میرے نزدیک اُسی مفہوم کو قوت ہے جس کے لحاظ سے ترجمہ ہوا ہے۔

---

[1] ای یلقیه علی الباطل کما قال تعالیٰ: بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغه (تبیان)۔

[2] یلقیه علیٰ انبیائه عن قتادة ومقاتل (مجمع البیان)

[3] آفرینش نمی کند معبود باطل و نه دیگر بار آفریند (شاہ ولی اللہ) نہ پہلی بار پیدا کرتا ہے معبود باطل نہ دوبارہ کرتا ہے (رفیع الدین)

[4] ما یبدئ الباطل الکفر و ما یعید ای لم یبق له اثر (جلالین)

[5] ای ذهب الباطل ذهابا لم یبق منه ابداء و الاعادة و الاقبال و الادبار (مجمع البیان)

اس کے بعد رسولؐ کو جس اعلان کا حکم دیا گیا ہے، وہ درحقیقت ایک عام اصول کا اعلان ہے کہ جو غلط کام کرے اُس کا ذمہ دار بالکل اپنے کو سمجھنا چاہئے اور جو صحیح کام کرے اس کا انجام دینے والا اپنے ارادہ سے تو یہی شخص ہے، اس لئے اُسے اس کا اجر ملتا ہے مگر اس میں توفیق وہدایت ربانی کا دخل ہوتا ہے، اب چونکہ یہ اعلان پیغمبرؐ خدا کی زبانی کرایا گیا ہے اور آپ کے لئے ہدایت ربانی کا خصوصی ذریعہ وحی کی صورت میں ہے اس لئے اس کا نام لیا گیا۔ دوسروں پر وحی تو نہیں ہوتی، پھر بھی توفیق الٰہی اسباب کی فراہمی میں آسانی نیز القائے ذہنی کی شکل میں ہوا کرتی ہے نیز پیغمبر خداؐ پر نازل شدہ وحی سے حضرتؐ کی زبانی جو ارشادات خلق خدا تک پہنچے، اُن سے بھی رہنمائی ہوتی ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے اس کا ایک بہت عمدہ مفہوم بتایا ہے جو بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین پیغمبر خداؐ کو اپنے خیال ناقص کے مطابق گمراہ کہتے تھے تو اُن کے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ اُن سے کہہ دیجئے کہ میں گمراہ ہوں تو یہ خود میرے لئے ہلاکت کا سبب ہے۔ تمہیں اُس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور اگر میں راہ ہدایت پر ہوں تو یہ اللہ کی وحی کا نتیجہ ہے جس سے مجھے بھی فائدہ پہنچے گا اور تمہیں بھی، اس صورت میں یہ اسی طرح کا روادارانہ تخاطب ہے جس کی نظیریں اور جگہ ہیں کہ اگر میں مجرم ہوں تو اُس کی ذمہ داری مجھ پر ہے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اور جو تم کر رہے ہو اس کی جواب دہی تم سے ہوگی، تم کو اس کی فکر کرنا چاہئے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۙ﴿۵۱﴾ وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۖ﴿۵۲﴾ وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۭ﴿۵۳﴾ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ۚ﴿۵۴﴾

''اور کاش تم دیکھو وہ موقع جب وہ گھبرائے ہوئے ہوں گے مگر نکلنے کا موقع نہ ہوگا اور وہ قریبی جگہ سے پکڑ لئے جائیں گے اور وہ کہیں گے کہ ہم اس پر ایمان لائے اور اب کہاں انہیں دسترس ہوسکتی ہے اس مقام پر سے جو دور ہے اور وہ پہلے تو اس کا انکار کرتے رہے اور اندھا دھند تیر مارتے رہے دور و دراز مسافت سے اور رکاوٹ ڈال دی گئی ان کے درمیان اور اُس کے درمیان جس کے یہ خواہش مند ہیں جیسا کہ کیا گیا اُن کے ایسوں کے ساتھ اس کے پہلے، وہ بھی سخت قسم کے شک وشبہ میں مبتلا رہے تھے''۔ ''قریبی جگہ سے پکڑ لئے جائیں گے'' یعنی اللہ کو اُنہیں گرفت میں لانے کے لئے کسی جستجو کی زحمت اٹھانا نہیں ہے۔ وہ ہر وقت اُس کے قبضے میں ہیں اور بعد میں جو ہے کہ ''اب کہاں اُنہیں دسترس ہوسکتی ہے'' اس مقام پر سے جو دور ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے کا محل تو دنیا میں تھا اور دینوی زندگی کا دور اب اُن سے دور ہو چکا ہے۔

سُوْرَۃُ فَاطِرٍ

مکّیہ ----۴۵----آیات

اس سورے کا دوسرا نام ''سورۃ الملائکہ'' ہے جو تفسیر علی بن ابراہیم اور مجمع البیان وغیرہ میں درج ہے چونکہ بسم اللہ کے بعد پہلی آیت کی ابتداء میں ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تو اس فقرے کی بنا پر ''سورۂ فاطر'' نام ہوا اور پھر دوسرا فقرہ ہے: جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا الخ اس کی بناء پر سورۃ الملائکۃ نام ہوا، حالانکہ فرشتوں کا تذکرہ ظاہر ہے کہ دوسرے سوروں میں بھی ہے مگر سورۂ ہود وغیرہ میں اس پر انتباہ ہو چکا ہے کہ نام کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ذکر صرف اسی سورہ میں ہو۔ ہاں فرشتوں کے بال و پر اور اُن کے پروں کی تعداد کہ وہ دو دو اور تین تین ہیں اور چار چار بھی اور بعض میں اس سے زیادہ یہ ذکر صرف اسی سورے میں ہے۔

سورۂ فاطر کے خاص خاص مضامین:

۱۔ کلم طیب (اچھی بات چیت) کا خالق کی طرف بلند ہونا اور اعمال نیک کا اس میں بلندی پیدا کرنا۔

۲۔ کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا یعنی ہر ایک پر اُس کے اعمال کی ذمہ داری ہے۔

۳۔ اللہ سے ڈرنا صرف واقعی صاحبانِ علم کا کام ہے۔

۴۔ منتخب افراد کا وارث کتاب ہونا۔

۵۔ اگر اللہ جرائم کی سزا عام طور پر دنیا میں دینے لگے تو روئے زمین پر چلنے پھرنے والا کوئی نہ رہے مگر اس نے پاداش عمل کا اصل دن بعد کو رکھا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ①

''سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا جن کے دو دو، تین تین اور چار چار شہپر ہیں، اللہ اپنی خلقت میں جو چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

فرشتوں کو قرآن میں رُسُل کہا گیا ہے جو رسول کی جمع ہے مگر یہ ''رسول'' اُن اصطلاحی معنوں میں نہیں ہے جو پیغمبروں کو رسول کہنے میں ہیں۔ اُس میں تعلیم و تربیت اور رہنمائی وغیرہ کے پہلو ہیں اور یہ رسول بس لغوی معنی میں ہیں جن کی قاصد کے طور پر پیغام رساں کی حیثیت ہے۔[1]

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲

''اللہ لوگوں کے لئے جو رحمت ارزانی فرمائے، اُسے روکنے والا کوئی نہیں اور جسے وہ روکے تو اُس کے بعد اُسے بھیجنے والا کوئی نہیں اور وہ غالب ہے، بڑی سوجھ بوجھ والا''۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۳

''اے انسانو! یاد کرو اللہ کی نعمت جو تم پر ہے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔ جو تمہیں آسمان اور زمین سے روزی عطا کرے؟ اس کے سوا کوئی خدا نہیں تو تم کہاں حیران سرگردان پھرتے ہو''۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۴

''اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو جھٹلائے گئے بہت سے پیغمبر آپ سے پہلے اور اللہ ہی کی طرف رجوع ہونا ہے تمام معاملات کی''۔

یہ بھی اپنے پیغمبرؐ کی تسلی کا ایک انداز ہے کہ آپ کو ان لوگوں کے انکار سے اتنا صدمہ و ملال نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تو ہوتی آئی ہے، کوئی نئی بات نہیں ہے۔[2]

''اور اللہ ہی کی طرف رجوع ہونا ہے تمام معاملات کی'' یعنی آپ کو جھٹلا کر وہ اللہ کی گرفت سے تو نکل نہیں سکتے، آخرت میں تو اُنہیں اس جھٹلانے کی سزا ملنا یقینی ہے اور وہ چاہے تو دنیا میں بھی اپنی نصرت و مدد اپنے پیغمبرؐ کے شامل حال فرمائے گا۔[3]

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۵ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ؕ ۝۶

''اے لوگو! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے تو یہ زندگانی دنیا تمہیں فریب میں مبتلا نہ کرے اور اللہ کے بارے میں تمہیں

---

[1] رسلا بعضهم الى بعض و بعجهم الى البشر (تبيان)

[2] فلك اسوة بهم (تبيان)

[3] فيجازى من كذب رسله وينصر من كُذّب من رسله (مجمع البيان)

دھوکا دینے والا دھوکا نہ دے، یہ حقیقت ہے کہ شیطان تمہارا دشمن ہے تو اُسے دشمن سمجھو، وہ اپنی جماعت کو اس کی دعوت دیتا ہے کہ وہ دوزخ والے ہو جائیں''۔

''اللہ کا وعدہ'' یعنی جو اُس نے جزاؤ سزا کے ایک دور کا اعلان کیا ہے، وہ بہر حال پورا ہو کر رہے گا۔[1]

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۬ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷

''جنہوں نے کفر اختیار کیا، اُن کے لئے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، اُن کے لئے بخشش ہے اور بڑا اجر و ثواب''۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝۸

''تو کیا وہ شخص جس کے لئے اُس کی بداعمالی دلآویز بنی ہوئی ہو تو وہ اُسے اچھا سمجھتا ہو؟ تو بے شک اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے، ہدایت فرماتا ہے تو آپ کی جان نہ جائے اُن پر افسوس میں، یقیناً اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں''۔

''کیا وہ شخص''؟ اس کے بارے میں سوال کس بات کا ہے؟ اُسے ہر ایک آدمی اپنی عقل سے سمجھ لے اور جو وہ تجویز کرے اس کے بارے میں شاید وہ درست ہی ہوگا مثلاً یہ کہ کیا وہ خوش اعمال شخص کی طرح ہو سکتا ہے؟[2] یا یہ کہ کیا وہ کسی ہمدردی کا مستحق ہے اور اُس کے انجام بد پر افسوس کرنا چاہئے؟[3] علامہ طبرسیؒ نے پہلی نوعیت کے مفہوم کو اختیار کیا ہے۔[4]

اب جو شخص اپنی بداعمالی کو اچھی بات سمجھ رہا ہے، اُس کی اس کج نگاہی کا نتیجہ یہ ہے اُس پر مصلح کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تو یہی باعث ہے اس کا کہ اللہ اپنی توفیقات کو اُس سے سلب کر لے اور اُسے گمراہی میں چھوڑ دے جیسے کہا گیا ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے، عادل ہونے کی بناء پر اس کا یہ چھوڑ دینا بلا وجہ نہیں ہو سکتا اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے یعنی اپنی توفیقات شامل حال کرتا ہے۔ یہ بھی بلا وجہ نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک بات اُس طریق کے ذاتی حسنِ اختیار اور سوء اختیار کا نتیجہ ہوا کرتی ہے اور اسی بنا پر اس جماعت کی تباہی پر جو اپنے ہاتھوں ہے، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بر بنائے ہمدردی رنج و غم سے روکا گیا ہے۔

---

[1] ان وعد اللہ من البعث والنشر والجنّۃ والنّار والجزاء والحساب صدق کائن لامحالۃ (مجمع البیان)

[2] من مبتدا خبرہ کمن ھداہ اللہ (جلالین) آیا مثل مومن صالح باشد (شاہ ولی اللہ)

[3] خبر من محذوف وتقدیرہ یتحسّر علیہ (تبیان)

[4] ای ھو کمن علم الحسن والقبیح وعمل بما عمل ولم یزیّن لہ سوء عملہ (مجمع البیان)

وَاللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝۹

''اور اللہ وہ ہے جس نے ہوائیں روانہ کیں تو وہ ابر کو حرکت میں لاتی ہیں تو ہم اُسے لے جاتے ہیں ایک مردہ بستی کی طرف تو اُس سے زندہ کرتے ہیں زمین کو اُس کے مردہ ہونے کے بعد اسی طرح (حشر میں) مردوں کو اٹھایا جائے گا''۔

حشر ونشر کے جسمانی ہونے پر اور وہ بھی اس دورِ حیات کے بعد دوسری زندگی کی صورت میں قرآن مجید نے جا بجا مثالیں پیش کر کے زیادہ سے زیادہ وضاحت کی ہے۔[1] مگر کیا کیا جائے کہ اس کے بعد بھی قرآن کو کتاب الٰہی ماننے والے کچھ ایسے موجود ہیں جو اُسے صرف روحانی حیثیت یا اسی دار دنیا میں پیش آنے والے اچھے اور برے نتائج میں محدود سمجھتے ہیں جس طرح یہ تفریط باطل ہے، اُسی طرح الفاظ پر جمود کی یہ افراط کہ بعض لوگوں نے اسے تمثیل سمجھنے کے بجائے اس طرح حقیقت سمجھا کہ حشر سے پہلے مسلسل بارش ہوگی کہ اُسی بارش سے لوگ دوبارہ زندہ ہو جائیں گے یعنی زمین سے نباتات کی طرح اگیں گے۔[2]

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِیْعًا ؕ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ ؕ وَالَّذِیْنَ یَمْكُرُوْنَ السَّیِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ یَبُوْرُ ۝۱۰

''جو عزت چاہتا ہے تو عزت تو تمام بس اللہ کے لئے ہے، اُس کی طرف بلند ہوتے ہیں، اچھے اچھے کلمے اور اچھا عمل، وہ اُسے بلند کرتا ہے اور جو برائیوں کے منصوبے بناتے ہیں اُن کے لئے بہت سخت عذاب ہے اور اُن کے منصوبے ملیا میٹ ہوتے ہیں''۔

طیب کلمے اور عمل صالح

''اچھا عمل، وہ اُسے بلند کرتا ہے'' اس کی تشریح جو عام مفسرین نے کی ہے، اُس کے لحاظ سے بلند کرتا ہے'' کے ساتھ جو ضمیر پوشیدہ ہے جس کا ترجمہ ہوا ''وہ'' ------ یہ اللہ کی طرف راجع ہے، قبل والے ٹکڑے سے ملا کر مطلب یہ ہوا کہ اُسی کی طرف بلند ہوتے ہیں اچھے اچھے کلمے اور اچھے عمل کو (بھی) وہ (یعنی خدا) بلند کرتا ہے''۔

اس کے برخلاف ہماری قدیم تفسیر میں اخبار معصومینؑ سے استشہاد کے ساتھ جو تفسیر ہے، اُس کی نحوی ترکیب بہت سیدھی ہے۔ یعنی

---

[1] ای کما فعل ھٰذا بھٰذہ الارض الجدیۃ من احیائھا ب منشو الخلائق بعد موتھم ویحشرھم للجزآء من الثواب والعقاب (مجمع البیان)

[2] قبل انّ اللہ تعالیٰ اذا اراد احیاء الخلق المطر السمآء اربعین یوما غینبت بذٰلك الخلق نباتا (تبیان)

العمل الصالح مبتدا ہے اور یرفع کی ضمیر پوشیدہ اُسی کی طرف راجع ہے اور ہٗ جو ضمیر مفعول اُس سے ملی ہوئی ہے، یہ سابق کے الکلم الطیّب کی طرف راجع ہے اب معنی یہ ہوں گے کہ نیک عمل اس پاکیزہ کلمے کو بلندی عطا کرتا ہے، یوں کہنا چاہیے کہ پاکیزہ کلمے کو جو ایمان کا ترجمان ہے عمل صالح پر پرواز عطا کرتا ہے۔

علی بن ابراہیم کی اس قدیم تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں جو حدیث درج ہے، وہ حسب ذیل ہے:۔

عن ابی جعفر علیہ السلام قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انّ لکلّ عمل مصداقا من عمل یصدّقه و یکذّبه فاذا قال ابن آدم و صدق قوله بعمله رفع قوله بعمله الی الله و اذا قال و خالف قوله عمله ردّ قوله علی عمله الخبیث و هو به فی النّار.

امام محمد باقر علیہ السلام کی روایت ہے کہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر عمل کی سچائی ثابت ہونے کا ذریعہ ہوتا ہے کوئی عمل جو اُسے سچ ثابت کرے یا جھوٹ قرار دے تو جب آدمی کہے اور اپنے قول کو عمل سے سچ ثابت کرے تو اس کا قول اُس کے عمل کے سبب سے اللہ کی طرف جاتا ہے اور جب کہے اور اُس کا عمل اس کے فعل کے مخالف ہو تو اس کا قول اس کے ناپاک عمل کی طرف پلٹایا جاتا ہے اور وہ اسے دوزخ میں گرا دیتا ہے۔

مگر ہمارے اکابر مفسرین نے اپنے دستور کے مطابق تفسیر قمی سے استفادہ نہیں کیا۔ ہاں علامہ طبرسیؒ نے ایک تیسرے معنی لکھے ہیں جو بعید نہیں ہیں۔ اس میں العمل الصالح تو مبتدا ہوتا ہی ہے لیکن یرفع کی ضمیر پوشیدہ پہلے والے کلم طیب کی طرف راجع ہے اور جو مفعول ہے اور جو مفعول کی ضمیر "ہٗ" ہے، وہ عمل صالح کی طرف راجع ہے۔ اب معنی یہ ہوں گے کہ عمل صالح میں بلندی پیدا کرتا ہے وہ کلم طیب یعنی کلمہ توحید جو اس حقیقت کے بالکل مطابق ہے کہ ایمان شرط قبول عمل صالح ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۱﴾

"اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے، پھر نطفے سے، پھر تمہیں مرد اور عورت کے جوڑے کی شکل میں بنایا اور کوئی عورت حاملہ نہیں ہوتی اور نہ اُس کے یہاں وضع حمل ہوتا ہے مگر اُس کے علم سے اور نہ کوئی عمر پانے والا عمر پاتا ہے اور نہ اُس کی عمر میں کمی ہوتی ہے مگر یہ کہ وہ ایک نوشتے میں موجود ہے، یقیناً یہ اللہ پر آسان ہے"۔

"مٹی سے پیدا کیا" یعنی پہلے فرد کو [1]۔ پھر "نطفے سے" یعنی اُن کی اولاد میں یہ طریق تخلیق جاری ہوا۔ [2] مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ کی تفسیر مفسرین نے یہ کی ہے کہ جسے طولانی عمر ملتی ہے وہ بھی ایک ایک نوشتے میں ہے اور جسے کم عمر ملتی ہے، وہ بھی ایک نوشتے

---

[1] بخلق ابیکم آدم منه (جلالین)

[2] بخلق ذرّیّته منها (جلالین)

میں ہے حالاں کہ قبل کے جملے میں ''طول'' کے اظہار کے لئے قرآن میں کوئی لفظ نہیں ہے مگر بعد میں جو نقص یعنی کمی کا ذکر ہے، اس سے مناسبت کی بنا پر قبل میں طولانی کا اضافہ کر دیا گیا۔[1] ہماری قدیم تفسیر پھر ہماری رہنمائی ایک دوسرے پہلو کی طرف کرتی ہے اور وہ یہ کہ جسے پوری عمر ملتی ہے یعنی جتنی از اول مقرر تھی، اُس میں کمی نہیں ہوتی، اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جس کی عمر میں کسی سبب سے کمی ہو جاتی ہے، وہ بھی اُس کے یہاں درج ہے۔

یہ مفہوم مسئلہ بدار کے مطابق ہے کہ تقدیر کے بعض فیصلے بعض اسباب سے بدل جاتے ہیں جیسے صدقہ جو عمر میں زیادتی کا باعث ہے۔[2]

یہاں پر علامہ طبرسیؒ نے بھی بغیر حوالہ ایک ایسا قول درج کر دیا ہے جو نتیجتاً اس کے موافق ہے۔[3] اس صورت میں پہلے جو مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ ہے، اس کا مطلب اس کی مناسبت سے یہ سمجھنا چاہیے کہ پہلے ملی ہوئی عمر کے علاوہ جسے مزید عمر ملتی ہے، اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جس کی عمر میں کمی ہوتی ہے، اُسے بھی۔ میں نے جو ترجمہ کیا ہے وہ ایسا ہے کہ اس مطلب پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ؕ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ⑫

''اور نہیں یکساں ہیں دونوں دریا کہ یہ خوش گوار میٹھے پانی کا ہے خوش مزہ اور یہ کھاری بدمزہ ہے اور ہر ایک میں سے تم تازہ گوشت کھاتے ہو اور زیور برآمد کرتے ہو جسے پہنتے ہو اور اُس میں کشتیوں کو تم دیکھو گے پانی کو چیرتی ہوئی تا کہ تم اُس کے فضل و کرم سے کسب معاش کرو، اور شاید کہ تم شکر گزار ہو''۔

''دونوں دریا یکساں نہیں ہیں'' اور پھر ''ہر ایک میں فائدے ہیں'' اسے شاہ عبدالقادر استعارہ قرار دیتے ہیں اس طرح کہ:۔

''یعنی کفر اور اسلام برابر نہیں، خدا کفر کو مغلوب ہی کرے گا اگر چہ تم کو دونوں سے فائدہ ملے گا، مسلمانوں سے قوت دین اور کافروں سے جزیہ'' (موضح القرآن)

مگر سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ یہاں صرف اللہ کی نعمتوں اور اُس کی قدرت کی کارفرمائیوں کی طرف نظروں کو متوجہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی تمثیل وغیرہ اس میں مدنظر نہیں ہے۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ⑬ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا

---

[1] ای ما یزاد فی عمر طویل العمر (جلالین) زندگانی دادہ نمی شود ہیچ دراز عمری (شاہ ولی اللہ)

[2] ھو ردّ علیٰ من ینکر البداء (علی بن ابراھیم)

[3] قبل ھو ما یعلمہ اللہ ان فلانا اوا طاع لبقی الیٰ وقت کذا واذا عصیٰ نقص عمرہ (مجمع البیان)

اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ ﴿۱۴﴾

''وہ رات کو دن کے اندر لے جاتا ہے اور دن کو رات کے اندر لے جاتا ہے اور اُس نے قابو میں رکھا ہے سورج اور چاند کو ہر ایک ایک مقررہ میعاد تک چل رہا ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا مددگار۔ اُس کی سلطنت ہے اور جنہیں وہ اُسے چھوڑ کر پکارتے ہیں، ذرا سی چیز پر بھی قدرت نہیں رکھتے، اگر اُنہیں پکارو تو تمہاری پکار کو وہ سنیں گے نہیں اور اگر سنیں بھی تو تمہاری التجا کو قبول نہیں کریں گے اور قیامت کے دن وہ تمہارے شرک سے بیزاری کا اعلان کریں گے اور ایسے شخص کی سی جو پورے طور پر باخبر ہو، کوئی دوسرا تمہیں صحیح اطلاع نہیں دے سکتا''۔

یعنی خداوند عالم کے برابر جو ہر بات سے واقف ہے، کون تمہیں صحیح اطلاع دے سکتا ہے۔[1] اور اس لَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيْرٍ کے فقرے کا استعمال اکثر کسی اہم بات کہنے کے بعد بطور ضرب الامثل ہوتا ہے، مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم سے پوچھو ہم سے زیادہ ترتم کو صحیح اطلاع اس کی کوئی دوسرا نہیں دے سکتا۔[2] مگر یہ بات محتاج تحقیق ہے کہ یہ مثل پہلے سے موجود تھی اور قرآن مجید نے اسے بطور مثل ہی استعمال کیا ہے یا یہ جملہ پہلے پہل قرآن میں آیا اور پھر بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۱۵﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۱۷﴾

''اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ، بے نیاز ہے جو قابل تعریف ہے، اگر وہ چاہے تو تم کو ختم کر دے اور نئی مخلوق کو پیدا کرے اور یہ اللہ پر کوئی دشوار امر نہیں ہے''۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ؕ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

''اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا اور اگر کوئی گراں بار اُس کے اٹھانے کے لئے پکارے تو اُس میں سے کچھ بھی دوسرے کے ہاتھوں، اٹھایا نہ جائے گا چاہے رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ آپ خوف آخرت سے ہوشیار بس انہی کو کرتے ہیں[3]۔ جو اپنے پروردگار سے بے دیکھے ڈرتے ہوں اور نماز کے پابند ہوں اور جو پاک

---

[1] ۔ای لا یخبرك بما فیه الصلاح والفساد والمنافع والمضار مثل الله سبحانه (مجمع البیان)

[2] ۔بمنزلۂ مثل است، چون سخن بلیغ گویند و تحقیق بنهایت رسانند، این کلمه گویند (فتح الرحمٰن)

[3] ۔ معناه لیس ینتفع بتخویفك یا محمد الّا الّذین یخافون ربّهم (تبیان)

بازرہے، وہ بس خود اپنے فائدے کے لئے پاک بازرہے گا بالآخر اللہ ہی کی طرف جانا ہے''۔

''آپ بس انہی کو ہوشیار کرتے ہیں'' یہ ویسا ہی ہے جیسے قرآن مجید کو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْن کہا گیا ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہوا:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا.

''آپ بس اُنہی کو ہوشیار کرتے ہیں جو آخرت کا دھڑکا محسوس کریں''۔

چونکہ فائدہ پیغمبرؐ کے انداز وتبلیغ سے وہی اٹھاتے ہیں، اس لئے انہی لوگوں سے اُس کا تعلق بتلایا گیا ہے ورنہ جیسے قرآن ہدایت سب کے لئے ہے، ویسے ہی رسولؐ اپنے امکان بھر سب ہی کو ہوشیار کرتے ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴿٢٠﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ﴿٢١﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿٢٢﴾ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿٢٣﴾

''اور نہیں یکساں ہے اندھا اور آنکھوں والا اور نہ اندھیرا اور نہ اجالا اور نہ سایہ اور دھوپ اور نہیں یکساں ہیں زندے اور مردے، یقیناً اللہ سنائے گا جسے چاہے اور آپ نہیں سنا سکتے انہیں جو قبروں میں ہیں۔ آپ نہیں ہیں مگر ڈرانے والے''۔

یعنی آپ کا کام جبر کرنا نہیں ہے، جبر پر قدرت رکھنے والا اللہ ہے مگر وہ بھی جبر سے کام نہیں لیتا اس لئے کہ وہ اُس کے تقاضائے حکمت کے خلاف ہے۔

ہاں نتیجہ میں بر بنائے عدل تفریق لازم ہے جیسے اندھا اور آنکھوں والا، اندھیرا اور اجالا وغیرہ یکساں نہیں ہیں، ویسے ہی مومن وکافر، مطیع وعاصی سب کو یکساں نہیں رکھا جاسکتا۔[1] لہٰذا نتیجہ میں یہ سیکولر تصوّر کہ انجام سب کا بخیر ہے، درست نہیں ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ؕ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿٢٤﴾ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿٢٦﴾

''ہم نے بھیجا ہے آپ کو حق کے ساتھ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور کوئی قوم نہیں مگر یہ کہ اُس میں کوئی ڈرانے والا گزرا ہے اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو اُن کے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا تھا۔ آئے اُن کی طرف اُن کے پیغمبر معجزے اور کتابیں اور روشن دستور حیات لے کر پھر میں نے گرفت میں لیا اُنہیں جو کافر تھے تو کیسا تھا میرا عذاب''۔

---

[1] لا یستوی المؤمن الکافر والحقّ والباطل والعالم والجاهل (مجمع البیان)۔

''کوئی قوم نہیں مگر یہ کہ اُس میں کوئی ڈرانے والا گزرا ہے''۔ قرآن کا یہ عمومی اعلان اس کا ثبوت ہے کہ شرق وغرب میں جہاں جہاں انسان بستے ہیں، اُن کے پاس کبھی نہ کبھی شروع میں کوئی رہنما ضرور آیا جس کے تعلیمات کو بھلا کر وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے ہیں۔ [1]

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿۲۷﴾ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا تو ہم نے اُس سے نکالے مختلف رنگ کے پھل اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ ٹکڑے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں اور انسانوں اور چلنے پھرنے والے جانوروں اور چوپایوں میں بھی اسی طرح مختلف رنگ ہیں، اللہ سے اس کے بندوں میں سے بس عالم لوگ ڈرتے ہیں، بلاشبہ اللہ عزت والا ہے، بخشنے والا''۔

مساوات مطلق خلاف فطرت

یہ خلائق کا اختلاف عقلاً خالق کے فاعل مختار ہونے کی تو دلیل ہے ہی، اُس کے ساتھ ضمناً یہ نوع انسانی میں ''مساوات مطلق'' کے خلاف فطرت ہونے کی دلیل بھی ہے۔ جب تمام کائنات میں ہر شے کے اندر خاصیتیں اور صلاحیتیں مختلف ہیں تو انسان سب یکساں کیوں کر سمجھے جا سکتے ہیں بلکہ لازماً ان میں صلاحیتوں کے لحاظ سے اختلاف ہوگا تو سب کو ایک لکڑی سے ہانکنا کیوں کر صحیح ہوگا؟۔

قرآنی اصول کے مطابق یؤت کل ذی فضل فضله یعنی ہر صاحب فضیلت کو اُس کی فضیلت کے لحاظ سے امتیاز ہونا چاہئے چنانچہ ایک بڑا اہم معیار فضیلت کا علم ہے، اُس کا یہاں خصوصیات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ﴿۲۹﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۳۰﴾

''یقیناً وہ جو کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُنہیں دیا ہے اُس سے پوشیدہ طور پر اور ظاہر بظاہر خیرات کرتے ہیں، وہ امید وابستہ کیے ہوئے ہیں ایسی تجارت سے جو کبھی برباد نہیں ہوگی تاکہ

---

[1] قال الجبائی: فی ذلك دلالة علی انه لا احد من المكلّفين الّا وقد بعث الله اليهم رسولا وقد اقام الحجّة علی جميع الاهم (تبیان و مجمع البیان)

وہ اُنہیں پورے اُن کے ثواب عطا کرے اور اپنے فضل و کرم سے اُنہیں اور زیادہ دے، بلاشبہ بخشنے والا ہے، عمل کی قدر کرنے والا''۔

وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۳۱﴾

''اور ہم نے آپ کی طرف بذریعہ وحی جو کتاب بھیجی ہے، وہ حق ہے تصدیق کرنے والی اُس کی جو اُس کے پہلے ہے، یقیناً اللہ اپنے بندوں سے باخبر ہے، دیکھنے والا''۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ ؕ ﴿۳۲﴾

''پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا اُنہیں جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا، اس لئے کہ ان میں کچھ اپنے نفوس پر ظلم کرنے والے ہیں اور کچھ معتدل قسم کے ہیں اور اُن میں سے بعض بھلائیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں اللہ کے حکم سے یہی تو بہت بڑی فضیلت ہے''۔

منتخب افراد کا وارث کتاب ہونا

یعنی انتخاب کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بندگانِ خدا میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں لہٰذا سب وارث کتاب ہونے کے لائق نہیں ہو سکتے۔ صحیح مفہوم یہی ہے۔

اس کے برخلاف علمائے اہل سنت چونکہ امت میں کسی ایسے برگزیدہ افراد کے وجود کا تصور نہیں رکھتے لہٰذا وہ پوری امت والوں کو وارث کتاب قرار دے کر اُنہی میں ظالم اور متعدل اور سابق الی الخیرات کے اقسام نکالتے ہیں۔[1] جس کے بعد انتخاب الٰہی کا کوئی منشاء ہی باقی نہیں رہتا۔

ہمارے اور علمائے اہل سنت کے نقطہ نظر میں الفاظ قرآنی کے مفہوم کے اعتبار سے بنیادی فرق یہ ہے کہ ہم منھم کی ضمیر ھم کا مرجع اس کے پہلے والی لفظ ''عبادنا'' کو قرار دیتے ہیں، اب وہ مطلب ہوگا جو ہم نے وارث کتاب ہونے کے لئے اپنے بندوں میں سے کچھ کو منتخب کیا ہے، کیوں کہ ان بندوں میں سے ایسے بھی ہیں جو ظالم ہیں اور کچھ درمیانی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو خیرات کی طرف سابق ہیں اس لئے انتخاب کی ضرورت ہوئی اور ظاہر ہے کہ منتخب گروہ وہی تیسرا ہے جو اعلیٰ طبقہ ہے۔ ان میں نہ ظالم ہیں، نہ درمیانی قسم کے لوگ۔ اب ظاہر ہے کہ درمیانی وہ قرار

---

[1] ھم امّتك فمنھم ظالم لّنفسه بالتقصیر فی العمل به ومنھم مّقتصد یعمل به فی اغلب الاوقات ومنھم سابق بالخیرٰت بصمّ الی العمل به التعلیم والارشاد فی العمل (جلالین) یعنی یہ امت، ان میں تین درجے بنائے، ایک گنہ گار، ایک میانہ، ایک اعلیٰ (موضح القرآن)

پائیں گے جن میں کچھ ظلم ہے اور کچھ نیکوکاری۔ ان کے مقابل میں وارث کتاب جو آخری قسم ہے وہ قرار پائے گی جن میں ظلم کا شائبہ نہ ہوا اور وہی اصطلاحی طور پر معصوم کہلاتے ہیں۔

دوسرے لوگ اس۔ منھم کی ضمیر کا مرجع الذین اصطفینا کو قرار دیتے ہیں، اس صورت میں انہی منتخب شدہ وارث کتاب افراد میں ظالمین وغیرہ ہوں گے۔ پھر معلوم نہیں انتخاب الٰہی کا حاصل کیا ہوا؟

ظاہر ہے کہ ہمارا نقطہ نظر زیادہ اور واضح اور مطابق عمل ہے اور قدیم مفسرین میں جناب ابن عباسؓ کا قول جو مکرمہ نے نقل کیا ہے، اس کے موافق ہے۔ [1]

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿٣٣﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ﴿٣٤﴾ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿٣٥﴾

''ہمیشہ کے قیام والے بہشتوں میں داخل ہوں گے، انہیں پہنتائے جائیں گے ان میں سونے کے کنگن اور موتی اور اُن کے کپڑے ریشم کے ہوں گے اور وہ کہیں گے شکر اُس اللہ کا جس نے ہم سے رنج وغم دور کیا، بلاشبہ ہمارا پروردگار بخشنے والا ہے، اچھے اعمال کی قدر کرنے والا، جس نے ہم کو اتارا اپنے فضل وکرم سے دائمی قیام والی جگہ پر جس میں ہمیں نہ کوئی زحمت ہوتی ہے اور نہ ہمیں کوئی ذرا سی بھی تھکن ہوتی ہے''۔

گذشتہ آیت میں متعدد قسمیں تھیں، اس آیت سے متصل قریبی ذکر تیسری قسم کا ہے جو سابق بالخیرات ہے، ہمارے نزدیک تو یہ بشارت الٰہی انہی سے متعلق ہے لیکن جنہوں نے ایک دم سب امت کا ظالمین کی ایک قسم سمیت منتخب و برگزیدۂ خدا بنا دیا ہے، وہ اس بشارت کو بھی تمام امت سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ [2]

مگر جناب ابن عباسؓ وغیرہ اس سے متفق نہیں ہیں [3]۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴿٣٦﴾ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ

---

[1] ۔ قال عکرمة عن ابن عباس انّ لمصطفین هم الانبیآء والظالم لنفسه هو المنافق (تبیان)

[2] ۔ یدخلونها ای الثلثة (جلالین) آخر میں سب بہشتی ہیں (موضح القرآن)

[3] ۔ عکرمة عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ___ المقتصد و السابق بالخیرات فی الجنّة والمنافق فی النار وقال الحسن و مجاهد ۔ الظّالم لنفسه اصحاب المشئمة ۔ (تبیان

اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۳۷﴾

''اور جنہوں نے کفر کیا، اُن کے لئے دوزخ کی آگ ہے، اُن کو قضا بھی نہیں آئے گی کہ مرجائیں اور نہ اُن سے اُن کے عذاب میں کمی ہوگی۔ اسی طرح ہم سزا دیں گے ہر ناشکرے کو اور وہ اس میں چیختے ہوں گے، اے ہمارے پروردگار! اب ہم نیک اعمال کریں گے اُس کے علاوہ جو کرتے رہے تھے۔ کیا ہم نے تم کو عمر دی نہیں اتنی جس میں کسی کو نصیحت قبول کرنا ہو تو وہ قبول کرلے اور تمہارے پاس ڈرانے والا رسول بھی آیا، اب مزہ چکھو کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے''۔

میں تو سیاق قرآنی سے محسوس کر رہا ہوں کہ سابقین بالخیرات کو مژدۂ جنت دینے کے بعد یہ دوزخ کا وعید اُنہی تین قسموں میں سے اُس گروہ کے لئے ہے جس کا پہلے ظَالِمٌ لِّنَفْسِه کہہ کر تعارف کرایا گیا تھا اور اس لئے یہ الذین کفروا کھلے ہوئے کافر نہیں بلکہ اسی امت کی بھیڑ میں چھپے ہوئے کافر ہیں اور اس لئے آخر میں کفر کا لفظ چھوڑ کر ان کی تعبیر ظالموں ہی سے کی گئی ہے کہ فما للظالمین من نصیر مگر وہ جو انتخاب الٰہی اور اس پہلی خوشخبری کو تمام امت سے متعلق قرار دیتے ہیں، وہ اس پر مجبور ہیں کہ اس وعید جہنم کو اس پوری امت سے ہٹا کر ویسے ہی کفار سے متعلق کریں جو کسی رخ سے بھی اس امت میں سمجھے نہ جاسکے اور وہ غیر مسلمین ہی ہو سکتے ہیں، مسلمان نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۳۸﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ؕ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ؕ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾

''بلاشبہ اللہ آسمان اور زمین کی ان دیکھی چیزوں کا جاننے والا ہے، یقیناً وہ دلوں کی باتوں سے خوب واقف ہے، اس نے تم لوگوں کو زمین پر اگلے والوں کی جگہ پیدا کیا، اب جو کفر اختیار کرے گا، اُس کے کفر سے اُسی کو نقصان پہنچے گا اور نہیں اضافہ کرتا کافروں کو اُن کا کفر اُن کے پروردگار کے یہاں ناراضگی کے سوا اور نہیں اضافہ کرتا کافروں کے لئے اُن کا کفر سوا خسارے کے''۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۴۰﴾

''کہئے کہ کیا تم نے غور کیا ہے اپنے (بنائے ہوئے) شریکوں پر جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو مجھے دکھادو، انہوں نے زمین میں کیا چیزیں پیدا کی ہیں یا اُن کی آسمانوں میں کوئی شرکت ہے؟ یا ہم نے انہیں کوئی کتاب دی ہے تو وہ ایک دلیل رکھتے ہیں اس کی؟ بلکہ ظالم لوگ ایک دوسرے کو توقعات نہیں دلاتے سوا دھوکے اور فریب کے''۔

توقعات اس کے کہ یہ معبودانِ باطل آخرت میں ان کے کام آئیں گے۔[1]

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾

''یقیناً اللہ تھامے ہوئے ہے آسمانوں اور زمین کو اس سے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹیں اور اگر وہ ہٹیں تو کوئی اُس کے بعد اُن کی روک تھام نہیں کرسکتا، یقیناً وہ برداشت کرنے والا ہے، بڑا بخشنے والا''۔

آخری یہ الفاظ یہ تصور پیدا کرتے ہیں کہ تمہاری بداعمالیوں کا تقاضا تو یہی تھا کہ آسمان وزمین اپنی جگہ سے ہٹ کر تباہ وبرباد ہوجائیں مگر خالق کا عفو وتحمل وہ ہے جو تمہارے کرتوت کو نظر انداز کرتا ہے اور عذاب نازل نہیں کرتا۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَاۗءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۲﴾ اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۭ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾

''اور انہوں نے اپنی کوشش بھر سخت سے سخت قسمیں اللہ کی کھائیں کہ اگر اُن کے پاس کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) آئے تو وہ کسی بھی قوم سے زیادہ ہدایت یافتہ ثابت ہوں گے، اس کے بعد جب اُن کے پاس ڈرانے والا آیا تو اُس نے اُن میں اضافہ نہیں کیا سوا وحشت کے، دنیا میں گھمنڈ اور بُری طرح کی سازشوں کی صورت میں اور بری قسم کی سازش ضرر نہیں پہنچاتی مگر اپنے کرنے والے کو تو انہیں کیا انتظار ہوسکتا ہے سوا اگلے والوں کو پیش آنے والے دستور کے، اس لئے کہ تم ہرگز اللہ کے دستور میں تبدیلی نہیں پاؤ گے اور نہ کبھی اللہ کے دستور میں تغیر پاؤ گے''۔

وہ دستور کیا رہا ہے؟ یہ کہ بداعمالیوں پر عذاب میں گرفتار ہوں تو انہیں بھی اپنی بداعمالیوں پر اس کا منتظر رہنا چاہیے۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي

---

[1] بقولهم الاصنام تشفع لهم (جلالين)۔

الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿۴۴﴾

''کیا وہ اطراف زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ دیکھتے کیا انجام ہوا اُن کا جو ان کے پہلے تھے وہ ان سے زیادہ طاقت ور تھے اور اللہ کو کوئی چیز بے بس نہیں بنا سکتی آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ بڑا جاننے والا ہے، قدرت رکھنے والا''۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

''اور اگر اللہ لوگوں کو اُن کی بداعمالیوں کی وجہ سے گرفت میں (فوراً) لے لیا کرتا تو اس روئے زمین پر کسی نقل و حرکت کرنے والے کو چھوڑتا ہی نہ مگر وہ تو انہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دیتا ہے تو جب اُن کی مدت پوری ہوگی تو اللہ اپنے بندوں کا دیکھنے والا تو ہے ہی''۔

گناہ کے بعد فوری سزا ہوتی تو کوئی باقی نہ رہتا

''گرفت میں (فوراً) لے لیا کرتا'' یعنی بس ادھر معصیت سرزد ہوئی اور اُدھر عذاب خداوندی آجایا کرتا۔[1] تو پھر کوئی متنفس روئے زمین پر باقی ہی نہ رہتا۔

''اللہ اپنے بندوں کا دیکھنے والا تو ہے ہی'' یعنی کہیں جا کر وہ اُس سے چھپ تو سکتے نہیں، جہاں وہ ہوں گے، وہی جس طرح چاہے گا عذاب میں گرفتار کر دے گا اور اُن کے اعمال اُس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ کتنی ہی وہ چھپانے کی کوشش کریں، وہ خوب واقف ہے کہ وہ کیسے عذاب کے مستحق ہیں۔[2]

---

[1] ای جزاء علیٰ معاصیھم عاجلا (تبیان)

[2] ھو بصیر بمکانھم فیؤاخذھم حیث کانوا وقیل بصیر باعمالھم فیجازیھم علیھا (مجمع البیان)

سُوْرَۃُ یٰسٓ

مکّیہ ----۸۳----آیات

عام طور پر سورۂ یٰسین کا تعلق ہے حالت احتضار و موت سے سمجھا جاتا ہے، اس لئے عوام کسی اچھے بھلے آدمی کے پاس سورۂ یٰسین پڑھنے سے وہم مانیں گے اور اسے ایک طرح کی بدشگونی سمجھیں گے مگر تفسیر مجمع البیان میں میں نے جو منقولہ احادیث کا مطالعہ کیا جو روایتیں خصوصیات کے ساتھ عالم سکرات یا موت کے وقت پڑھنے سے متعلق ہیں، اُن میں سے کوئی ائمہ معصومینؑ کے ذریعہ سے نہیں ہیں بلکہ ایک روایت جناب ابی بن کعب پر ختم ہو جاتی ہے اور یہ کے راوی خلیفہ اول جناب ابوبکر ہیں اور جو حدیث معصومؑ کی ہے، اُس میں اس سورے کو صحیح و سالم آدمی کے لئے ذریعہ سلامتی و طول عمر بتاتا ہے۔ ہاں اُس بیمار کے لئے جس کی قضا آئی ہو، باعث مغفرت قرار دیا ہے۔ اس حدیث سے بجائے خود بھی اس سورے کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ ابوبصیر کی روایت ہے امام جعفر صادقؑ سے جس کے ابتدائی جملے جو مقصود پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں، حسب ذیل ہیں:۔

انّ لکلّ شیء قلبا وقلب القراٰن یٰسٓ فمن قرأ یٰسٓ فی نہارہ قبل ان یمسی کان فی نہارہ من محفوظین والمرزوقین حتّٰی یمسی ومن قراٰنی لیلۃ قبل ان ینام وکلّ بہ الف ملک یحفظونہ من کلّ شیطان رجیم ومن کلّ اٰفۃ (مجمع البیان)

ہر چیز کا ایک دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل یٰسین ہے تو جو دن کو شام ہونے سے پہلے یٰسین پڑھے، وہ اُس دن محفوظ اور رزق سے بہرہ یاب ہوگا اور جو رات کو سونے سے پہلے پڑھے تو ایک ہزار فرشتے اس پر مقرر ہوں گے جو اُس کی ہر شیطان سے اور ہر آفت سے حفاظت کریں گے۔

سورہ یٰسین کے خاص خاص مضامین:

۱۔ ہمارے پیغمبرؐ کے پہلے زمانۂ فترت تھا یعنی مدت سے خدا کی طرف سے کوئی رہنما نہ آیا تھا۔

۲۔ ہر شے کا امام مبین میں سمایا ہونا۔

۳۔ حضرت عیسیٰؑ کے دور کے کچھ مبلغین حق کا تذکرہ۔

۴۔ ایک داعی حق کا تذکرہ اور اُس کا انجام۔

۵۔ خلق خدا کا داعیان حق کے ساتھ افسوس ناک رویہ۔

۶۔ ہر چیز میں نر اور مادہ کی طرف اشارہ۔

۷۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ اجرام سماوی کسی ٹھوس جسم میں جڑے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ایک خلا میں گردش کرتے ہیں۔

۸۔ مناظر قیامت۔

۹۔ دہنوں کا خاموش ہونا اور اعضائے جسم کا کلام کرنا۔

۱۰۔ عمر طولانی ہونے کے اغلبی تقاضے۔

۱۱۔ پیغمبرؐ خدا کا شاعری سے بے تعلق ہونا۔

۱۲۔ حیات بعد الموت کے منکروں کی طرح طرح فہمائش۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

يٰسٓ ۝١ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝٢ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٣ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝٤ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝٥ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝٦

''یٰسین۔ قسم اس باحکمت قرآن کی، بلاشبہ آپ پیغمبروں میں سے ہیں سیدھے راستے پر یہ اتارا ہوا ہے اُس عزت والے کا جو بڑا مہربان ہے تاکہ آپ ڈرائیے اُس قوم کو جس کے باپ دادا کو ڈرایا نہیں گیا تھا تو وہ بے خبری کے عالم میں ہیں''۔

''باپ دادا کو نہیں ڈرایا گیا تھا'' یعنی قریبی باپ دادا کو جن کے سامنے نمایاں طور پر کوئی ہادی دین نہ تھا۔[1]

چونکہ ان کے قبل والے آباؤ اجداد نے ہادیان دین کو جھٹلایا اور اُن کے ساتھ بدسلوکی سے کام لیا، اس لئے یہ نعمت سلب ہوگئی اور ہادیان دین پوشیدہ کر دیئے گئے۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٧ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝٨ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝٩ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝١٠ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ۝١١

''اُن میں سے زیادہ افراد کو عذاب کا استحقاق ہو چکا ہے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم نے اُن کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں تو انہوں نے اُن کی ٹھڈیوں تک کو کس لیا ہے تو وہ مجبوراً سر اٹھائے ہوئے ہیں اور ہم نے اُن کے آگے دیوار کھڑی کر دی ہے اور اُن کے پیچھے دیوار کھڑی کر دی ہے تو ہم نے اُن کو ڈھانپ دیا ہے تو اُنہیں

---

[1] ای لم ینذروا فی زمن الفترۃ (جلالین)

دکھائی نہیں دیتا اور اُن پر برابر ہے، خواہ آپ اُنہیں ڈرائیں یا آپ اُنہیں نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے، آپ تو اُسے ڈرا سکتے ہیں جو یاد دہانی سے اثر لے اور بے دیکھے خدائے رحمن کا تصور رکھے تو اُسے خوش خبری دیجئے۔ بخشش اور باعزت ثواب کی"۔

آخر کے جملے سے بات صاف ہوگئی کہ پہلے کی سب باتیں اُن کی اختیاری بے اعتنائی اور حق سے روگردانی کی بنا پر ہیں، نہ یہ کہ وہ باتیں باعث ہوئی ہیں اُن کے اثر قبول نہ کرنے کی۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ؕ وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۲﴾

"بلاشبہ ہم مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور لکھتے ہیں اُسے جو وہ کر چکے اور جو اُن کے اثرات ہیں اور ہر چیز کا احاطہ کیا ہے ہم نے روشن مرتبے والے امام ہیں"۔

"امام مبین" کی تشریح عام طور پر مفسرین "لوح محفوظ" کے ساتھ کرتے ہیں جس میں ہمارے مفسرین بھی داخل ہے۔[1] اور لوح محفوظ کو امام کہنا اس لحاظ سے ہے کہ وہ مرکزی محل ہے جہاں خالق نے اپنے علم و مشیت کو محفوظ کیا ہے۔ یوں ہماری قدیم تفسیر میں یہ ہے کہ اس سے مراد امیر المومنین ہیں۔[2] اور پھر لازماً ہر دور کا امام معصومؑ۔ غور کیا جائے تو پہلا مفہوم اصل لفظ سے دور مگر سیاق کلام کے مطابق ہے اور دوسرا اصل لفظ سے قریب مگر سیاق کلام سے دور ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْیَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْهِمُ اثْنَیْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلَیْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَاۤ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَاۤ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا یَعْلَمُ اِنَّاۤ اِلَیْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَیْنَاۤ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْۤا اِنَّا تَطَیَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَیَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا طَآىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

"اور اُن کے سامنے بطور مثال حال بیان کیجئے ایک خاص بستی والوں کا، جب اُن کے پاس بھیجے ہوئے پیغام رساں

---

[1] معناہ احصیناہ فی کتاب ظاھر وھو اللوح المحفوظ۔ (تبیان)

[2] ذکر ابن عباس عن امیر المؤمنین علیہ السلام انہ قال انا واللہ الامام المبین (علی بن ابراھیم)

آئے، جب ہم نے ان کی جانب دو بھیجے تو اُنہوں نے اُن دونوں کو جھٹلایا تو تقویت کی ہم نے تیسرے کے ساتھ تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، اُن لوگوں نے کہا کہ تم نہیں ہو مگر ہمارے ایسے انسان اور خدائے رحمٰن نے کوئی چیز اتاری وتاری نہیں ہے، تم نہیں ہو مگر جھوٹ بولتے، اُنہوں نے کہا ہمارے ذمہ نہیں ہے مگر صاف صاف تبلیغ کر دینا، اُنہوں نے کہا ہم نے تو نحوست محسوس کی ہے تمہارے سبب سے۔ اگر تم باز نہ آؤ گے تو ہم تمہیں سنگ سار کریں گے اور ہماری طرف سے تمہیں دردناک سزا ملے گی، اُنہوں نے کہا تمہاری نحوست تمہارے ساتھ۔ کیا اگر تمہیں نصیحت کی جائے (تو تمہیں یہی کرنا چاہیے) بلکہ تم ظلم وتعدی سے کام لینے والے لوگ ہو''۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰی قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اور آیا شہر کے دور ترین حصے سے ایک شخص دوڑتا ہوا، کہا اے میری قوم والو! ان پیغمبروں کی بات مانو! پیروی کرو ایسے شخص کی جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا اور وہ ہدایت کے راستے پر ہیں''۔

ایک خاص داعی حق کے تذکرہ کا آغاز

اس آنے والے کا نام اہل تفسیر نے حبیب نجار بتایا ہے۔[1] اور یہ حضرت عیسیٰؑ کے دور کا ذکر ہے۔

وَمَا لِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا وَّلَا یُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّیْٓ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾

''اور مجھے کیا ہے کہ میں عبادت نہ کروں اُس کی جس نے مجھے پیدا کیا اور اُسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے کیا میں اُسے چھوڑ کر ایسے خداؤں کو اختیار کروں کہ اگر خدائے رحمٰن مجھے کوئی ضرر پہنچانا چاہے تو اُن کی سفارش مجھے کچھ بھی فائدہ نہ پہنچائے میں ایمان لایا ہوں تمہارے پروردگار پر تو میری بات کان لگا کر سنو''۔

دعوت حق دینے والے مومن کی گفتگو کا تتمہ

جو شخص اس پارے کو (جب کہ وہ علیحدہ ہو) اٹھا کر اس کے شروع کی ان آیتوں کو پڑھے یا ان کو ترجمہ دیکھے، اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آئے گا کہ یہ کون کہہ رہا ہے؟ مگر یہ قرآن کو پارہ پارہ کرنے والے تیس حصوں میں تقسیم کرنے والوں کی بدسلیقگی کا نتیجہ ہے جنہوں نے اس سلسلے کی پہلی آیت کو بائیسویں پارے کا جزء بنا دیا۔ اُسے ملا کر دیکھیے تو سمجھ میں آئے گا کہ یہ اس شخص کے قول کا جز ہے جو بیرون شہر سے آیا تھا اور کہا تھا کہ ''حق

---

[1] عن ابن عباس وجماعت من المفسّرین (مجمع البیان)

کا پیغام لانے والوں کو قتل نہ کرو بلکہ اُن کی پیروی کرو"۔

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾

"کہا گیا کہ بہشت میں داخل ہو جا، اس نے کہا کاش میری قوم والے جانتے کہ کاہے سے میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور مجھے معزز لوگوں میں قرار دیا"۔

اُس مومن کی حق گوئی کا نتیجہ

مومن مذکور کی گفتگو کے بعد بلا فاصلہ یہ ارشاد کہ بہشت میں داخل ہو جا مفسرین کے اس خیال سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے کہ اُس گفتگو کے نتیجہ میں اُن بے دینوں نے اُس مومن کو شہید کر ڈالا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُسے یہ نوید مل رہی ہے کہ بہشت میں داخل ہو جا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ شہادت کا صلہ یہ ہے کہ اُس انسان سے پھر حساب کتاب کچھ نہ ہو بلکہ عالم برزخ کے منقضی ہونے کے انتظار کی ضرورت بھی نہ ہو اور وہ اُسی وقت بہشت میں داخل کر دیا جائے۔

اس موقع پر سورہ والفجر کی وہ آخری آیت بھی یاد کر لیجئے کہ:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾

اور اُس کی یہ تفسیر کہ یہ امام حسین علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

ایک دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ بات فوراً ہونا ضروری نہیں بلکہ اس کے بعد جب بھی وہ دنیا سے اٹھا تو اُس کی موت کے ساتھ یہ حکم ہوا۔

تیسرا یہ کہ درمیان میں شہادت کا ہونا بھی حد فاصل نہیں بلکہ اُس کی اس دعوت حق کے ساتھ ہی دنیا سے اٹھا لیا گیا اور اُسے زندگی ہی میں بہشت میں داخل کر دیا گیا۔

افسوس ہے کہ حدیث معصوم موجود نہیں، اس لئے وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾

"اور نہیں اُتارا ہم نے اُس کی قوم پر اُس کے بعد کوئی لشکر آسمان اور نہ ہم اُتارنے والے ہیں۔ نہ تھی مگر ایک مہیب آواز جس سے وہ ایک دم بجھ کر رہ گئے"۔

اس قوم کا انجام

ترتیب آیات کے مطابق تنزیل ہونے کی صورت میں جو یہاں پر باعتبار مضمون بعید نہیں ہے، اُسی مومن کی قوم کا ذکر ہے جس نے

دعوتِ حق دی تھی اور پھر شہید ہو کر فوراً یا زندگی ہی میں اُس کے بعد داخل بہشت کر دیا گیا اور اب یہ اُس کی قوم کا انجام ہے کہ وہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئی جس کے لئے ارشاد ہو رہا ہے کہ یہاں فرشتے عذاب نازل کرنے کے لئے نہیں اتارے گئے بلکہ بس قدرت نے ایک مہیب صدا پیدا کر کے انہیں ہلاک کر دیا۔ ظاہر ہے کہ خدا عذاب نازل کرنے کے لئے لاؤ لشکر کا محتاج نہیں ہے ''نہ ہم اتارنے والے ہیں'' اس کا مطلب یہی ہے کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے، ہماری قدرت ان اسباب کی محتاج نہیں نہ یہ کہ وہ ایسا کر نہیں سکتا، یا اس کا کوئی عہد و پیمان ہے کہ وہ ایسا کبھی نہ کرے بلکہ جو اُس کی مصلحت متقاضی ہوئی تو اس نے ایسا کر بھی دیا جیسا کہ قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لئے فرشتے بھیجے گئے تھے۔

یٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ ۚ مَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۳۰﴾ اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ اَنَّهُمۡ اِلَيۡهِمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۳۱﴾ وَاِنۡ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيۡعٌ لَّدَيۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ ﴿۳۲﴾

''ہائے افسوس ان بندوں کے حال پر، کوئی پیغمبر ان کے پاس نہیں آتا مگر یہ کہ وہ اُس کا مذاق اڑاتے رہے ہیں، کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ان کے پہلے کتنی نسلیں ہم نے ختم کر دیں وہ اب اُن کی طرف پلٹ کر نہیں آئیں گے، کوئی اُن میں نہیں ہے مگر یہ کہ سب ہمارے پاس حاضر کیے جائیں گے''۔

خالق کا افسوس اور اس کا مطلب

بعض مفسرین نے افسوس والی آیت کو تتمہ قرار دیا ہے اسی مومن کے قول کا جس کا ذکر قبل والے پارے کے آخر سے شروع ہوا تھا اور اس پارے کے شروع والی آیت اسی کے تتمہ کی تھی۔[1] مگر ہمیں اس کے قبول کرنے میں موجود ترتیب قرآن کے لحاظ سے اگر وہ موافق تنزیل ہو جو اس مقام پر مضمون آیات کے لحاظ سے بعید نہیں ہے، یوں تأمل ہے کہ اُس مومن کی تقریر اس پارے کے شروع والی آیتوں پر جو ہم نے یکجائی درج کی ہیں، ختم ہو گئی اور اس کے بعد کی آیتوں میں خالق کا ارشاد ہے تو کیوں نہ اسے بھی خالق ہی کی زبانی مانا جائے اور یہ تصور کہ یہ خداوند عالم کو افسوس کیوں کر ہوتا ہے۔ یہ تو ایک تاثر کا نام ہے جس سے خالق کی ذات کو بری ماننا چاہیے، بے بنیاد ہے اس بنا پر کہ رحمت اور غضب وغیرہ سب ہی کیفیات از قبیل تاثرات ہوتے ہیں اور انفعالات نفسانی کی حیثیت رکھتے ہیں جس طرح ان سب کی نسبت خداوند عالم کی طرف تصرّف عقلی کے ساتھ ہوتی ہے، ویسے ہی افسوس جو خالق کے وصف کے طور پر بیان نہیں ہو رہا ہے بلکہ اُن کے حال کے بجائے خود قابل افسوس ہونے کا اظہار ہے۔[2]

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الۡاَرۡضُ الۡمَيۡتَةُ ۖ اَحۡيَيۡنٰهَا وَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهَا حَبًّا فَمِنۡهُ يَاۡكُلُوۡنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلۡنَا فِيۡهَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ وَّفَجَّرۡنَا فِيۡهَا مِنَ الۡعُيُوۡنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاۡكُلُوۡا

---

[1] قیل هو قول الّذی جآء من اقصی المدینة (تبیان)

[2] هٰذا من قول الله سبحانه والمعنی اللهمّ حلّوا محلّ من یتحسّر علیه (مجمع البیان)

مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَیْدِیْهِمْ ؕ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

''اور ایک بڑی نشانی ہے اُن کے لئے وہ مردہ زمین جسے ہم نے زندہ کر دیا اور اس سے برآمد کیا اُن کے لئے اناج تو اس سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں اور ہم نے اُس میں قرار دیئے ہیں باغ کھجور اور انگوروں کے اور اُس میں سے ہم نے چشمے جاری کیے ہیں تا کہ وہ اس کے پھلوں سے کھائیں اور اسے ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا ہے تو وہ پھر بھی شکر گزار نہیں ہوتے''۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾

''پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑے پیدا کیے زمین کے نباتات میں اور خود اُن میں اور اُن چیزوں میں سے جو وہ نہیں جانتے''۔

ہر چیز میں جوڑے

چونکہ سابق زمانہ میں سوا کھجور کے عام نباتات میں نر اور مادہ کا تصور نہ تھا اس لئے ازواج کے معنی اقسام و انواع کے قرار دے لئے گئے۔[1] مگر اب علم جدید نے بہت حد تک اُس مفہوم کی پردہ کشائی کر دی ہے جسے قرآن مجید نے آج سے چودہ سو برس قبل اپنی معجز زبان میں پیش کر دیا تھا۔

وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ ۖۚ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۳۸﴾ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾

''اور ان کے لئے ایک خاص نشانی رات ہے جس سے دن کی کھال کھینچ کر ہم الگ کر دیتے ہیں تو ایک دم اُن پر تاریکی چھا جاتی ہے اور سورج چل رہا ہے اپنی قرارگاہ پر۔ یہ فیصلہ ہے اُس صاحب عزت کا جو باخبر ہے اور چاند کی ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ پلٹتا ہے ایسی صورت میں جیسے پرانی ٹہنی، نہ سورج کے لئے یہ صحیح ہے کہ وہ چاند کو پا جائے اور نہ یہ کہ رات دن سے آگے نکل جائے اور سب ایک خاص حلقے میں تیر رہے ہیں''۔

---

[1] خلق الاصناف والاشکال من الاشیآء (مجمع البیان) الاصناف کلها (جلالین) اجناس را تمام آن (شاہ ولی اللہ)

آسمانوں کے ٹھوس جسم نہ ہونے کا ثبوت

آخری فقرے پر تیرہویں صدی کے شروع کے علماء میں شاہ عبدالقادر کا تبصرہ قابل قدر ہے:۔

''ہر ستارہ ایک ایک گھیرا رکھتا ہے، اُسی راہ پر تیرتا ہے معلوم ہوا کہ ستارے آپ چلتے ہیں، یہ نہیں کہ آسمان میں گڑے ہوں اور آسمان چلتا ہے۔ نہیں تو تیرنا نہ فرماتے'' (موضح القرآن) یہ تبصرہ اس لئے بہت قابل قدر ہے کہ اُس دور میں ہر فرقہ کے علماء جس علم ہیئت کو پڑھتے تھے، اُس میں یہی پڑھایا جاتا تھا کہ ستارے آسمان میں جڑے ہوئے ہیں اور آسمان گردش کرتے ہیں۔ اُس اپنی نصابی تعلیم کے بندھن سے آزاد ہوکر الفاظ قرآنی سے یہ استفادہ کرنا یقیناً آزاد ذہن سے سوچنے کی بہت بڑی علامت ہے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾

''اور اُن کے لئے ایک نشانی قدرت کی یہ ہے کہ ہم نے اِن کی نسل کو سوار ہونے کا موقع دیا بھری ہوئی کشتی میں اور اُن کے لئے اسی طرح کی اور چیزیں پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوں اور اگر ہم چاہیں تو انہیں ڈبو دیں تو نہ کوئی اُن کی فریاد کو پہنچنے والا ہو اور نہ وہ چھڑائے جا سکیں سوا ہماری رحمت اور ایک مدت تک مہلت دینے کے''

بعض مفسرین نے بھری ہوئی کشتی سے مراد کشتی نوحؑ لی ہے اور ''اس طرح کی اور چیزیں'' اس سے مراد دوسری کشتیاں اور جہاز وغیرہ ہیں جو اُسی صورت پر بنائے جاتے ہیں۔[1] یہ قول شروع والی صدیوں کے بعض مفسرین کی طرف بھی منسوب ہے۔[2] لیکن زیادہ واضح تفسیر یہ ہے کہ کشتی سے مراد بطور اسم جنس عام کشتیاں ہی ہیں۔[3] اور ''اس طرح کی چیزیں'' اس سے مراد دوسری سواریاں ہیں خواہ وہ زمین پر چلنے والی ہوں۔[4]

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۶﴾

''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ڈرو اُس سے جو تمہارے آگے ہے اور اُس سے جو تمہارے پیچھے ہے۔ شاید کہ رحمت الٰہی تمہارے شامل حال ہو اور ان کے پاس کوئی آیت اُن کے پروردگار کی آیتوں میں سے نہیں آتی مگر یہ

---

[1] ای سفینۃ نوح ___ مثلہ ای مثل فلک نرج وما عملوہٗ علیٰ شکلہ (جلالین)

[2] قال قتادۃ والضحاک المعنی بقولہ سفینۃ نوح (تبیان)

[3] ھی السّفن الجاریۃ فی البحار (مجمع البیان)

[4] ھی الدّوابّ والانعام (علی بن ابراھیم)

کہ وہ اس سے روگرانی کرتے ہیں''۔

''جو تمہارے آگے ہے'' اور ''جو تمہارے پیچھے ہے'' اس میں قدیم مفسرین کے دو قول ہیں جنہیں جناب شیخ الطائفہؒ نے بلاتبصرہ نقل کر دیا ہے۔ ایک یہ کہ ''جو تمہارے آگے ہے'' اس سے مراد وہ عذاب ہیں جو قبل کی اُمّتوں پر آ چکے ہیں اور اس سے ڈرنا یہ ہے کہ تم ویسے اعمال نہ کرو اور ''جو تمہارے پیچھے ہے'' یعنی آخرت۔ دُوسرے ''جو تمہارے آگے ہے'' یعنی جو گناہ آیندہ تمہارے تصور میں ہوں، اُن سے پرہیز کرو اور ''جو پیچھے ہے'' یعنی جو گناہ پہلے کر چکے ہو، اُن سے ڈر کر بارگاہ الٰہی میں توبہ کرو۔ علامہ طبرسیؒ نے امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث نقل کی ہے وہ پہلے جز میں اس سے متفق ہے یعنی ''جو آگے بنے'' اس سے مراد وہ گناہ ہیں جن کا کرنا پیش نظر ہے اور جو تمہارے پس پشت ہے، اس کے لئے معصومؑ نے فرمایا خَلَقَكُمْ مِنَ الْعُقُوْبَةِ اس سے مراد وہ سزا ہے جو اس پر مرتب ہوگی۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خیرات کرو اُس سے جو اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے تو وہ کافر ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم کھلائیں اسے جسے اللہ چاہتا تو کھلا ہی دیتا تم نہیں ہو مگر کھلی ہوئی گمراہی میں''۔

غریبوں کی خبر گیری کے خلاف جواب میں دھاندلی

یعنی قدرت کی طرف سے جب ان کی تقدیر میں محتاجی لکھی ہے تو ہم پر ان کے پیٹ بھرنے کی ذمہ داری کیوں کر عائد ہو سکتی ہے۔ اس منطق کو دوسرے لفظوں میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے کہ اگر اللہ کو ان کی شکم پری منظور ہوتی تو وہ خود انہیں رزق عطا کرتا جب اس نے انہیں محروم رکھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُسے ان کا بھوکا رکھنا منظور تھا تو پھر ہم انہیں دے کر ان کے پیٹ بھرنے کا سامان کیوں کریں؟[1] مگر یہ غلط ہے اس لئے کہ اُسی نے ان کے اموال میں ان محروموں کا حق قرار دیا ہے تو انہیں اُس کے روکنے کا کیا حق ہے؟

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

---

[1] اذا لم یطعمه دلّ علیٰ انّه لم یشا اطعامه فنحن اذا احقّ بذٰلك (تبیان)

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۵۴﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ وعید کب سامنے آئے گا اگر تم لوگ سچے ہو، وہ نہیں انتظار کر رہے ہیں مگر ایک مہیب آواز کا جو اُنہیں اپنی گرفت میں لے لے اسی عالم میں کہ وہ یونہی جھگڑا کرنے میں مصروف ہوں تو وہ نہ وصیت کر سکیں اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف واپس جا سکیں اور صور پھونکا جائے گا تو ایک دم وہ اپنی قبروں سے اپنے پروردگار کی طرف دوڑتے ہوں گے اور کہیں گے وائے ہو ہمارے حال پر، کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے اُٹھایا؟ یہ وہ ہے جو خدائے رحمن نے وعدہ وعید کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ سچ بتایا تھا۔ نہ تھی سوا ایک مہیب آواز کے جس کے بعد ایک دم وہ ہماری بارگاہ میں حاضر تھے تو آج کسی متنفس کے حق میں کچھ کمی نہ ہوگی اور نہ تمہیں سزا ملے گی سوا اُس کے جو تم اعمال کرتے تھے''۔

قیامت کے جسمانی ہونے پر تمام انبیاء کا اتفاق

حشر میں اٹھائے جانے کے بعد اُن کا یہ قول کہ یہ وہ ہے جو خدائے رحمٰن نے وعید کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ سچ بتایا تھا'' یا ایک تفسیر کے مطابق فرشتوں کا یہ کہنا۔[1] اس کی دلیل ہے کہ تمام پیغمبروں نے ہمیشہ حشر ونشر کی یہی صورت بتائی ہے جسے تمام مسلمان مانتے ہیں اور ترقی یافتہ آزاد ذہن والے مفکرین جو اس سے الگ کوئی تصور جزا وسزا کا پیش کرتے ہیں، وہ انبیاء مرسلین کی بتائی ہوئی کیفیت کے بہر حال خلاف ہے لہٰذا اسلام میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿۵۶﴾ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿۵۷﴾ سَلٰمٌ قف قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿۵۸﴾ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''بلاشبہ بہشت والے اس دن اپنے اپنے مشغلے میں خوش ہوں گے، وہ اور اُن کی بیویاں سائبانوں میں تختوں کے چوکوں پر لگے بیٹھے ہوں گے۔ اُن کے لئے اُس میں پھل ہوں گے اور اُن کے لئے جو وہ فرمائش کریں مہیا ہوگی۔ مہربان پروردگار کی زبانی اُن پر سلام ہوگا اور تم الگ ہو جاؤ اے گنہگارو''!

یدعون کا ترجمہ ''آرزو کریں گے'' کے ساتھ محاورۂ عرب کے مطابق کیا تو جا سکتا ہے مگر اس محاورہ ہی کی بنا پر اس آرزو کے ساتھ دوسرے پر اُس کے اظہار کا جز مضمر ہوتا ہے۔[2] لہٰذا میں نے ترجمہ میں ''فرمائش'' کے لفظ کو زیادہ مناسب سمجھا ہے۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۰﴾

---

[1] قالت الملئکة (علی بن ابراھیم)

[2] قال ابو عبیدة تقول العرب: ادع علیّ ما شئت ان تمنّ ما شئت (تبیان)

وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِیْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾

''کیا میں نے تم سے پہلے سے نہیں کہہ دیا تھا اے اولاد آدم کہ شیطان کی پرستش نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے اور یہ کہ میری عبادت کرنا یہ سیدھا راستہ ہے اور اس نے (پھر بھی) گمراہ کر دیا تم میں سے بہت سی مخلوق کو تو کیا تم سمجھتے نہیں تھے''۔

یعنی پہلے سے جانتے تھے کہ یہ تمہارا دشمن ہے جسے خلقت آدم وحوا کے بعد ہی خالق نے بتا دیا تھا اور شیطان کی دشمنی سے ڈرایا تھا جس کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے پھر تم جانتے بوجھتے ہوئے اس کے کہنے میں آ کر گمراہ کیوں ہوئے؟

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾

''یہ ہے وہ دوزخ جس سے تم کو ڈرایا جاتا تھا۔ آج اس کی گرمی کو اٹھاؤ سزا میں اس کی جو تم انکار کرتے تھے''۔

ماضی اور حال کے صیغوں کے اختلاف سے صاف نمایاں ہے کہ وہ دور اور تھا جس میں آج کی خبر دے کر ڈرایا جاتا تھا اور وہ بھی ''جاتا تھا'' ماضی استمراری کے عنوان سے جس کا مطلب یہ ہے کہ برابر ایسا ہوتا رہتا تھا جس میں ایک لاکھ چوبیس ہزار اور قیامت تک کے اُن کے جانشینوں کا دور ہے۔[1] اور یہ اس کے بعد کا دوسرا دور ہے جو ''آج'' ہے اور جس کے مناظر اُن کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾

''آج ہم مہر لگا دیں گے اُن کے دہنوں پر اور بات کریں گے ہم سے اُن کے ہاتھ اور گواہی دیں گے اُن کے پیر اُن اعمال کی جو وہ کرتے تھے''۔

زبانوں کی بجائے ہاتھ پیروں کی گواہی کی نوعیت

یعنی ان کی زبانیں خاموش ہو جائیں گی تو ہاتھ پیر جن کا کام دنیا میں بات کرنا نہ تھا، ان کے خلاف اُن کی بداعمالیوں کی گواہی دے رہے ہوں گے۔[2] اب یہ گواہی کیوں کر دے رہے ہوں گے؟ خالق اُن میں قوت گویائی پیدا کر دے گا؟ یا اُن میں آواز خلق فرما دے گا؟ یہ زبان مقال سے نہیں ہوگا بلکہ کچھ ایسے علامات اُن میں ظاہر ہوں گے جو اُن بداعمالیوں کا ثبوت ہوں؟ جناب شیخ الطائفہؒ نے کہا ہے کہ ان میں سے ہر بات ممکن ہے۔[3] اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کیفیت کے بارے میں یقینی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

---

[1] کنتم توعدون بها فی دار التکلیف (تبیان و مجمع البیان)

[2] ای نستنطق الاعضاء الّتی لا تنطق فی الدّنیا تشهد علیهم و تحتم علیٰ افواههم الّتی عهد منها النّطق (مجمع البیان)

[3] کلّ ذٰلك جائز (تبیان)

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿٦٦﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٦٧﴾

''اور اگر ہم چاہتے تو اُن کی آنکھوں کو ناپید کر دیتے پھر وہ دوڑ کر راستہ چلنا چاہتے تو انہیں دکھائی کہاں سے دیتا اور اگر ہم چاہتے تو اُن کی جگہ پر اُنہیں مسخ کر دیتے تو وہ نہ آگے بڑھ سکتے اور نہ پیچھے پلٹ سکتے''۔

مطلب یہ ہے کہ رحمت الٰہی اس کی متقاضی ہے کہ مختتم عذاب میں ہو ورنہ سزا دینے کی بہت صورتیں تھیں جن میں سے بعض کا یہاں تذکرہ ہے۔[1]

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ؕ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٦٨﴾

''اور جسے ہم زیادہ عمر دیتے ہیں، اُسے خلقت میں اُلٹ دیتے ہیں تو کیا تم عقل سے کام نہیں لو گے''؟!

پیرانہ سالی کی کیفیت کو یاد دلانے کا مقصد

اُس کی مناسبت گذشتہ آیت کے مضمون سے جو ذکر آخرت کے سلسلہ میں ہے یوں بیان کیا گیا ہے کہ دیکھو جوانی کے بعد بڑھاپا آتا ہے اور طاقتیں کمال کی منزل پر پہنچ کر رو بہ زوال ہو جاتی ہیں جو خدا اس پر قادر ہے، وہ موت کے بعد زندگی دینے پر بھی قادر ہے۔[2]

مجھے یہ مناسبت کچھ زیادہ ذہن نشیں محسوس نہیں ہوتی۔ ہماری قدیم تفسیر سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا تعلق سابق کے سلسلہ کلام سے نہیں ہے بلکہ وہ رد ہے دہریوں کی جو منکر خدا ہے۔[3] دہریوں کا تصور یہ ہے کہ مادے کے اجزاء ہی ہیں جن کے اجتماع سے کائنات کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کا ایک انداز تھا جو بعد میں ڈارون کے ''فلسفہ نشوو ارتقا'' کی شکل میں نمودار ہوا۔ ردیوں ہے کہ اگر مادہ کی طبیعت میں ترقی ہے تو انسان شباب کے بعد نشیب کی منزل میں کیوں آتا ہے اور پھر کبھی تو یہ عالم ہو جاتا ہے کہ اُس کی تمام فکر و نظر کی طاقتیں بھی مفقود ہو جاتی ہیں۔ یہ مشاہدہ اس کا ثبوت ہے کہ ارتقاء مادہ کا کوئی طبیعی فعل نہیں ہے بلکہ خالق کے فیض و عطا کا نتیجہ ہے اور اس لئے جب چاہتا ہے۔ اس نعمت کو سلب کر لیتا ہے۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿٦٩﴾ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٠﴾

''اور ہم نے انہیں شاعری نہیں سکھائی ہے اور نہ وہ ان کے لئے زیبا ہے، وہ نہیں ہے سوا یاد دہانی اور صاف روشن قرآن کے تاکہ اُسے خوف دلائیں جس میں زندگی ہو اور حجت تمام ہو جائے کافروں پر''۔

---

[1] المعنی ولو نشآء لعذبناھم بنوع اٰخر من العذاب (مجمع البیان)

[2] افلا تتدبرون فی انّ اللہ تعالیٰ قادر علیٰ اعادۃ کما قدر علیٰ ذٰلك (مجمع البیان) افلا یعقلون انّ القادر علیٰ ذٰلك المعلوم عندھم قادر علی البعث فیؤمنون (جلالین)

[3] ردّ علی الزّنادقۃ الذّین یبطلون التوحید (علی بن ابراھیم)

عرب جاہلیت کے یہاں معیار فصاحت و بلاغت شعر تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ اسالیب بیان پر قدرت کا سرچشمہ شاعری ہے لہٰذا حکمت الٰہی کا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تقاضا یہ تھا کہ آپ کے خداداد کمالات میں شاعری کی جگہ نہ ہو۔ تاکہ آپ جو قرآن پیش فرمارہے ہیں اور وہ فصاحت کے بلندترین نقطہ پر ہے اُس میں یہ شبہ نہ ہو کہ یہ آپ کے ملکہ شاعری کا نتیجہ ہے جس طرح آپ کا معجزہ چونکہ کتاب کی نوعیت کا تھا لہٰذا آپ کو کتابت کے فن سے الگ رکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے فن کتابت کی کوئی تنقیص نہیں ہوتی، اسی طرح اس سے کہ ''ہم نے ان کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ وہ ان کے لئے زیبا ہے'' اس فن کی کوئی تنقیص مدنظر نہیں جب کہ رسولؐ کے علاوہ دیگر ہمارے معصومینؑ علیہم السلام کی شعر گوئی مسلم ہے اور خود پیغمبرؐ نے اکثر اشعار کی مدح فرمائی اور کچھ شعراء کی ہمت افزائی فرمائی۔

جناب شیخ الطائفہؒ فرماتے ہیں:۔

ما علّمنٰه الشعر لانّه لو علّمناه ذٰلك لدخلت به الشبهة على قوم فى ما اٰتى به من القراٰن و انّه قدر على ذلك لما فى طبعه من الفطنة للشعر (تبیان)

ہم نے انہیں شاعری نہیں سکھائی ہے اس لئے کہ اگر ہم انہیں یہ ملکہ عطا کرتے تو اِس سے ایک طبقہ کو شبہ ہوتا اس قرآن میں جسے وہ لائے ہیں اور وہ یہ سمجھتے کہ آپ اس پر قادر ہوئے اس شاعری کے سلیقہ کی وجہ سے جو آپ کی طبیعت میں ہے۔ علامہ طبرسیؒ نے تحریر فرمایا ہے:

قد صحّ انّه كان يسمع الشعر و يحث عليه و قال لحسان بن ثابت لا تزال يا حسان مؤيدا بروح القدس ما نصرتنا بلسانك (مجمع البیان)

یہ بات پایۂ صحت تک پہنچی ہے کہ آنحضرتؐ اشعار سنتے تھے اور شعر کہنے کی ترغیب دیتے تھے اور آپ نے حسان بن ثابت سے فرمایا اے حسان برابر روح القدس تمہیں مدد دیتے رہیں گے جب تک تم اپنی زبان سے ہماری مدد کرتے رہو گے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اُن کے لئے پیدا کیا اُن چیزوں میں سے جنہیں ہمارے ہاتھوں نے بنایا چوپایوں کو تو وہ اُنہیں اپنی ملکیت میں رکھتے ہیں اور ہم نے اُنہیں اُن کے قابو میں دیا تو اُن میں سے اُن کی سواری میں کام آنے والے بھی ہیں اور اُن میں بعض میں سے اُن کی غذا بھی ہے اور اُن کے لئے اُن میں مختلف فائدے کی چیزیں اور پینے کے دودھ بھی ملتے ہیں تو وہ کیوں شکرگزار نہیں ہوتے''؟

چونکہ کھانے اور پینے کا جو گوشت اور دودھ سے متعلق چیزیں ہیں، ذکر صراحتاً پہلے اور بعد ہوا ہے اور سوار ہونے کا بھی تو اب جو اُس کے علاوہ مختلف فائدہ والی چیزیں کہا گیا تو یہ پہننے، اوڑھنے اور بچھانے کے کام کی چیزیں ہوں گی جیسے کھال، اون اور بال۔[1]

---

[1] من منافعها لبس اصرافها و اشعارها و اوبارها (مجمع البیان)

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾

''اورانہوں نے اللہ کوچھوڑ کر بہت خدا بنالئے کہ شاید انہیں مدد مل سکے، وہ اُن کی مدد پر قدرت نہیں رکھتے اور اُن کی پوری فوج اُن کے لئے موجود ہے تو اُن کی باتیں آپ کے لئے رنج کا باعث نہ ہوں، بلاشبہ ہم جانتے ہیں اُسے جو وہ چھپاتے ہیں اور اُسے جو وہ ظاہر کرتے ہیں''۔

''اُن کی پوری فوج اُن کے لئے موجود ہے'' کس کی فوج کس کے لیے؟ بعض نے پہلی ضمیر بتوں کی طرف پلٹائی ہے اور دوسری بُت پرستوں کی طرف جس سے اُن بتوں کی کثرت کا اظہار ہے۔[۱] اور مُحْضَرُوْن ''ان کے لئے موجود ہے'' اس کا مطلب یہ کہا گیا ہے کہ وہ بھی اُن کے ساتھ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔[۲] دوسری تفسیر یہ ہے کہ پہلی ضمیر بت پرستوں کی طرف راجع ہے اور دوسری بتوں کی طرف مطلب یہ ہے کہ وہ بت تو اُن کی پوری فوج اُن بتوں کی مدد کے لئے کمر بستہ رہتی ہے۔[۳] حقیقت یہ ہے کہ باتیں بحیثیت واقعہ یہ سب درست ہیں، وہ بت ان کے واقعی اتنی کثرت کے ساتھ ہیں کہ ایک اچھی خاصی فوج کی حیثیت رکھتے ہیں مگر باوجود اس کثرت کے انہیں فائدہ نہیں دے سکتے۔ یہ بھی قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے ثابت ہے کہ وہ بت بھی اُن کے ساتھ دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے اور ان کے سامنے وہاں حاضر وموجود ہوں گے۔ یہ بھی کہ یہ اپنے لاؤلشکر کے ساتھ ہر وقت اُن بتوں کی حمایت پر کمر بستہ رہتے ہیں مگر یہ بھی اُنہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ سب باتیں ٹھیک ہیں۔[۴] اور ہر ایک پر الفاظ قرآنی بلاتکلف منطبق ہیں مگر الفاظ قرآن سے بوقت واحد دونوں رخ مراد نہیں ہوسکتے لہٰذا یہ کہ مراد الٰہی ان الفاظ سے کیا ہے؟ اس کے لئے ہم العلم عند اللہ کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿۷۸﴾ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

---

[۱] ایں بتاں بدای ایشاں لشکری حاضر کردہ شدہ اند (شاہ ولی اللہ)

[۲] محضرون فی النّار معهم (جلالین)

[۳] هم لهم ای للالهة جند محضرون (علی بن ابراهیم) قال قتادة یعنی هم یغضبون للاوثان فی الدّنیا (تبیان)

[۴] فلا الجند یدفعون عنها الاحراق ولا هی تدفع عنهم العذاب (مجمع البیان)

وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰى ۚ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾

''کیا آدمی نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اُسے نطفے سے پیدا کیا جس کے بعد اب وہ زیادہ بحث کرنے والا ہے اور اس نے ہمارے لئے ایک مثال پیش کی اور خود اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا کہ کون زندہ کرے گا ان ہڈیوں کو جب کہ وہ بالکل بوسیدہ ریزہ ریزہ ہیں؟ کہیئے کہ انہیں زندہ کرے گا وہی جو انہیں پہلی دفعہ وجود میں لایا تھا اور وہ ہر مخلوق سے خوب واقف ہے وہ جس نے تمہارے لئے سرسبز و شاداب درخت سے آگ پیدا کی تو ایک دم تم اُسے سلگا کر بھڑکاتے ہو، کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کے ایسے اور پیدا کر دے؟ کیوں نہیں جب کہ وہ بڑا پیدا کرنے والا بڑا جاننے والا ہے''۔

مشرکین کے اعتراض کی نوعیت جو معاد جسمانی کا ثبوت ہے

مشرکین کے اعتراضات و استبعادات جو جا بجا قرآن مجید میں موجود ہیں اور جس جس طرح قرآن نے ان کا جواب دیا ہے اور مثالوں سے واضح کیا ہے، سب اُسی معاد کی قطعی دلیل ہیں جسے عام مسلمان مانتے ہیں۔ نہ جو ترقی پسند فلسفی قسم کے بخیال خود ''ذی علم مسلمان'' اُس کا تصور پیش کرتے ہیں۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

''اس کی بات تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو چاہتا ہے، کہہ دیتا ہے ''ہو جا'' اور فوراً ہی وہ ہو جاتی ہے تو پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اقتدار ہے اور اُسی کی طرف تم پلٹ کر جاؤ گے''۔

یوں الگ سے بھی ان آیات کا مفہوم مکمل ہے جس کے تمام اجزاء دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں موجود ہیں لیکن گذشتہ سلسلۂ کلام کے ربط سے یہ اُس کا تتمہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو ہر بات پر قادر اس طرح کہ اُس کے ارادہ کے ساتھ ہی جو اُس کا مقصد ہو، وہ بلا فاصلہ وجود میں آجائے تو دوبارہ اس خلق کا وجود میں لانا اُس کے دائرہ قدرت سے باہر کیوں کر سمجھا جا سکتا ہے۔[1]

---

[1] من قدّر علیٰ کلّ شئی قدر علیٰ احیاء العظام الرّمیم وعلیٰ خلق کلّ شئی وافنائہ واعادتہ (مجمع البیان)

سُوْرَۃُ الصّٰفّٰتِ

مکّیہ ----۱۸۲---- آیات

اس سورہ میں بسم اللہ کے بعد پہلا ہی لفظ ''والصافات'' ہے اسی پر اس کا نام ہو گیا۔

سورۂ صافات کے خاص خاص مضامین:

۱۔ خدا مشرقوں کا پروردگار ہے جس سے مشرقوں کی کثرت اور ضمناً سورجوں کی کثرت ظاہر ہوتی ہے جس سے تھوڑے ہی عرصے پہلے تک دنیا بے خبر تھی۔

۲۔ سیاروں کے ذریعے شیطانوں کے لئے عالم بالا پر جانے سے رکاوٹ کا سامان اور ''شہاب ثاقب'' کا تیر باران۔

۳۔ پیشواؤں اور پیروؤں کی ایک دوسرے کو لعنت ملامت جس کا ذکر طرح طرح سے قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی ہے۔

۴۔ اہل بہشت کی بہشت میں جانے پر بالیدگی اور آپس کی گفتگو۔

۵۔ بہشت سے دوزخ کا منظر دیکھنے کا امکان اور منکر آخرت کے انجام کا مشاہدہ۔

۶۔ درخت زقّوم کا ذکر جو اس کے بعد سورۂ واقعہ میں بھی ہے۔

۷۔ حضرت نوحؑ کی فریاد اور اس کی بنا پر خالق کا اُنہیں اور اُن کے ساتھ والوں کو نجات دینا۔

۸۔ حضرت ابراہیمؑ کی اپنی قوم سے گفتگو، پھر بت شکنی اور نتیجتاً آگ میں پھینکا جانا۔

۹۔ قربانی جناب اسماعیلؑ کا مفصل تذکرہ اور فدیہ کا آنا۔

۱۰۔ ذبح عظیم۔

۱۱۔ جناب الیاسؑ کا ذکر۔

۱۲۔ جناب یونسؑ کا ذکر اور آپ کی قوم کی کثرت تعداد، عذاب آنے کے بعد اس کا رد ہونا اور اُن کا ایمان لانا۔

۱۳۔ متعدد انبیاء پر باری باری سلام۔

۱۴۔ نتیجہ میں پیغمبروں کے مشن کی مختتم کامیابی کا اعلان جس کا پورا نتیجہ سامنے آنا باقی ہے اور اُسی کا اہل ایمان کو انتظار ہے۔

۱۵۔ ختم سورہ پر وہ آیات جو بطور آداب تلاوتِ قرآن کے بعد پڑھے جاتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ﴿۲﴾ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۳﴾ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ؕ﴿۵﴾

''قسم ہے پورے طور پر صف باندھنے والی ہستیوں کی، پھر بڑی شدت کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کرنے والیوں کی، پھر ذکر الٰہی کی تلاوت کرنے والیوں کی کہ یقیناً تمہارا خدا ایک ہے جو آسمانوں اور زمینوں اور اُن کے درمیان کی چیزوں کا مالک اور تمام مشرقوں کا پروردگار ہے''۔

آفتابوں کی کثرت

یہ اوصاف جنہیں سرنامہ قرار دے کر قسم کھائی گئی ہے، بظاہر فرشتوں سے متعلق ہیں جو مختلف فرائض اور انتظامات پر مامور ہیں۔

ان کے وصف ''صف بستہ'' میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ وہ عبادت الٰہی میں صف بستہ رہتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اپنے پر و بال کو ملا کر ہوا میں پرواز کرتے ہیں۔[۱] اور ڈانٹ ڈپٹ سے مراد یہ لی گئی ہے کہ وہ بادلوں کو ڈانٹ ڈانٹ کر اُن کے راستوں پر لگاتے ہیں۔(۱) مگر ہماری قدیم تفسیر جو اکثر و بیشتر روایات معصومینؑ پر مبنی ہے، یہ بتلاتی ہے کہ اس میں انبیاء و مرسلین اور تمام عبادات گزار فرض شناس بھی داخل ہیں کہ وہ عبادت الٰہی میں صف بستہ ہوتے ہیں اور ہر ایک کو معاصی الٰہیہ پر نہی عن المنکر کے طور پر حسب ضرورت ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیتے ہیں۔[۲]

آیات مذکورہ کے آخر میں جو ہے: ورب المشارق ''تمام مشرقوں کا پروردگار'' تو جب تک دنیا کا یہ تصور تھا کہ سورج بس ایک ہے اور اس لئے منطق میں اس کلی کے لئے جو فرد واحد میں منحصر ہو، مثال میں آفتاب ہی کا نام لیا جاتا تھا، اس وقت تک علمائے تفسیر مجبوراً ''تمام مشرقوں'' سے مراد اسی آفتاب کے موسموں کے اختلاف کے ساتھ مختلف نقاط سے طلوع ہونے کے مقامات لیتے تھے۔[۳] مگر اب جب کہ یہ ثابت ہو گیا کہ جتنے تارے ثوابت کہلاتے ہیں، وہ سب درحقیقت اپنے اپنے نظام سیارات کے لئے آفتاب کی حیثیت رکھتے ہیں تو اب مشرقوں کی کثرت کا تصور بالکل آسان ہو گیا ہے اور تیرہ سو برس پہلے ہمارے رہنمایان دین نے بھی آفتابوں کی کثرت کا پتہ دے دیا تھا۔[۴]

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ ۙ﴿۶﴾ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ﴿۷﴾
لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۖ﴿۸﴾ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ

---

[۱] اختلف فی معنی الصّافات علی وجوہ احدھا انّھا الملائکۃ تصفّ انفسھا صفوفا فی السّماء کصفوف المؤمنین فی الصّلوٰۃ وثانیھا تصفّ اجنحتھا فی الھواء (مجمع البیان)

[۲] الملٰئکۃ نرجو السحاب (جلالین)

[۳] الملٰئکۃ والانبیاء ومن یصفّ للہ وعبدہ فالزّاجرات زجر الّذین یزجرون الناس والتّالیات ذکر الذین یقرءون الکتاب (علی بن ابراھیم)

[۴] لھا کلّ یوم مشرق ومغرب (جلالین)

عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝٩ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝١٠

''بلاشبہ ہم نے نیچے والے آسمان کو آراستہ کیا خاص آرائشی ستاروں سے اور حفاظت کے واسطے ہر سرکش شیطان سے، وہ کان نہیں لگا سکتے عالم بالا کی باتوں کی طرف اور اُنہیں تیر پڑتے ہیں ہر طرف سے دفع کرنے کے لئے اور اُن کے لئے لازمی سزا ہے سوا اُس کے جو ایک دم اچک لے جائے تو اس کا پیچھا کرتا ہے ایک ٹوٹنے والا تارا''۔

دوسرے آیات قرآنی کی بنا پر عام طور سے ذہن میں یہی رہا ہے کہ ''شہاب ثاقب'' جو ٹوٹنے والے تارے ہیں، انہی کو شیطانوں کے لئے آسمانوں پر جانے سے رکاوٹ کا ذریعہ بنایا گیا ہے اور وہی وہ تیر ہیں جو شیطانوں پر پڑتے ہیں مگر یہاں کے مذکورہ آیات میں ستاروں کو جو آسمانوں کی آرائش کا ذریعہ ہیں۔ شیطان سے حفاظت اور عالم بالا کی باتوں کے سننے سے رکاوٹ کا ذریعہ بتانے کے بعد ''شہاب ثاقب'' یعنی ٹوٹنے والے تارے کا ذکر الگ سے کیا گیا ہے کہ وہ آسمانی راز کو اچک لے جانے کے بعد شیطان کا پیچھا کرتا ہے۔ یہ اجمالی طور پر قرآن کا مفہوم یقینی ہے لیکن اُس کی تفصیلی کیفیت سمجھنا ہمارے بس کی بات معلوم نہیں ہوتی۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ۝١١ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ۝١٢ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ۝١٣ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ۝١٤ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝١٥ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝١٦ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝١٧ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ۝١٨ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝١٩ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝٢٠ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝٢١

''تو اُن سے خود پوچھو کیا وہ خلقت میں زیادہ طاقت ور ہیں یا اور جو ہم نے پیدا کیے؟ ان کو ہم نے لیسدار مٹی سے پیدا کیا مگر آپ حیرت میں ہیں اور وہ مذاق اڑاتے ہیں اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اثر نہیں لیتے اور جب کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو ہنسی اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہے کچھ سوا کھلے ہوئے جادو کے، کیا جب ہم مرجائیں گے اور خاک اور ہڈیوں کی شکل میں ہوں گے تو ہم زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے پہلے کے باپ دادا بھی؟ کہئے کہ ہاں اور تم ذلیل وخوار ہوگے بس وہ ایک نعرہ ہوگا جس کے بعد وہ ایک دم دیکھ رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ارے وائے ہو ہم پر یہ جزا وسزا کا دن ہے؟ (ہاں) یہ وہ فیصلے کا دن ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے''۔

''آپ حیرت میں ہیں اور وہ مذاق اڑاتے تھے'' یعنی اتنے کھلے ہوئے دلائل حقانیت کے ہوتے ہوئے اُن کا انکار ایسی خلاف توقع

بات ہے کہ آپ حق بجانب طور پر اُس سے حیرت میں ہیں کہ یہ ایسی کھلی ہوئی حقیقتوں کو تسلیم نہیں کرتے اور اُن کی بوا العجبی یہ ہے کہ وہ آپ کی اس حیرت پر آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔[1]

اُن کا یہ کہنا کہ جب ہم مرجائیں گے اور خاک اور ہڈیوں کی شکل میں ہوں گے تو کیا ہم زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے، جو یہیں نہیں بلکہ ذرا ذرا سے اختلاف الفاظ کے ساتھ متعدد جگہ ہے اور ہر جگہ ہم نے اس پہلو پر توجہ دلائی ہے، یہ اس کی دلیل ہے کہ انبیاؤ مرسلین قیامت کا جو تصور پیش کرتے تھے، وہ یہی تھا جسے عام مسلمان متفقہ طور پر مانتے ہیں اور فلسفی حضرات یا اس زمانے کے بخیال خود روشن خیال جس جس طرح اُس کا تصور پیدا کرتے ہیں، وہ تعلیم انبیاء کے خلاف ہے، ورنہ قرآن کا اُن کے استعبادات کے جواب میں یہ کہہ دینا کافی تھا کہ ہم کب کہہ رہے ہیں کہ یہ جسم بوسیدہ ہونے کے بعد دوبارہ اٹھایا جائیگا؟ بس جھگڑا ختم ہوجاتا مگر قرآن طرح طرح سے یہی سمجھا رہا ہے کہ ہاں ایسا ہی ہوگا اور وہ قدرتِ الٰہی سے بعید نہیں ہے۔

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝۲۲ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۝۲۳ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ۝۲۴ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ۝۲۵ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ۝۲۶

''اکٹھا کر کے لے جاؤ ان کو جو ظلم کرتے رہے، اُن کے تمام ہم جنسوں اور اُنہیں جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے تو اُنہیں راستہ دکھاؤ دوزخ کا اور ٹھہراؤ انہیں۔ یقیناً اُن سے پوچھ گچھ ہوگی کہ کیا بات ہے اب تم ایک دوسرے کی کوئی مدد نہیں کرتے بلکہ وہ تو اب سر جھکائے ہوئے ہیں''۔

یہ تفصیلات دیکھیے اور اپنے ضمیر سے فیصلہ لیجئے کہ کیا ان میں کسی تاویل، مجاز اور استعارہ کے تصور کی گنجائش ہے؟

اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا کے ساتھ جو ہے: وَاَزْوَاجَهُمْ، اُس کے کھلے ہوئے معنی تو ہیں ''اور اُن کی بیویوں کو'' جو ایک قول ہے مگر اہل تحقیق کی اکثریت نظائر قرآنی کی مدد سے اُس کا مفہوم یہ لیتی ہے کہ یہ ہر گنہ گار کو اُس کے قبیل کے دوسرے مجرموں کے جتھے میں محشر میں لائے جانے کا حکم ہے۔[2] اور اسی لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ہے۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝۲۷ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ۝۲۸ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۲۹ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ۝۳۰ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ۝۳۱

---

[1] عجبت یا محمّد ﷺ من تکذیبهم ایّاك وهم یسخرون من تعجبك (مجمع البیان)

[2] فیکون معنی ان صاحب الزّنا یحشر مع اصحاب الزّنا وصاحب الخمر مع اصحاب الخمر انی غیر هم (مجمع البیان)

فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ ﴿۳۲﴾ فَاِنَّهُمْ يَوْمَىِٕذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۴﴾

''اور اُن میں سے ایک دوسرے کی طرف مڑا آپس میں سوال و جواب کرتے ہوئے، کہنے لگے کہ تم ہمارے پاس دائیں جانب سے آتے تھے۔ انہوں نے کہا بلکہ تم ایمان لانے کے لئے تیار ہی نہ تھے اور ہمیں تم پر کوئی زور تھوڑی تھا تو ہم پر ہمارے پروردگار کی بات پوری ہوگئی۔ اب ہم بھی مزہ چکھ رہے ہیں، تو ہم نے تمہیں بہکایا، بے شک ہم خود بھی بہکے ہوئے تھے۔ اس طرح وہ سب عذاب میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہیں، یقیناً ہم ایسا ہی کرتے ہیں گنہ گاروں کے ساتھ''۔

''دائیں'' اور ''بائیں'' کو عربی میں یمین ویسار اور یمین و شمال کہتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ جسے اُس کا نامہ عمل بائیں دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور اُس کے مقابل میں: من اوتی کتابہ بشمالہ ''جسے اُس کا نامہ عمل بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور نجات یافتہ گروہ کو اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ''اور دوسروں کو اصحاب الشمال کہا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یمین یعنی دائیں جانب ''یمن و برکت'' اور خیر و فلاح کی علامت ہے تو یہاں جو کہا گیا ہے كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ''تم ہمارے اس دائیں جانب سے آتے تھے'' اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ تم اس طرح ہمیں نصیحت کے انداز میں سمجھاتے تھے کہ جیسے وہ بڑے خیر و برکت کی باتیں ہیں۔ [1]

دوسرا تصور یہ ہے کہ دائیں ہاتھ میں قوت ہوتی ہے تو مطلب یہ ہے کہ تم بڑے زور و شور سے ہمارے گمراہ کرنے کو آتے تھے۔ [2] مگر میرے نزدیک اس صورت میں تأتو ننا بالیمین ہوتا جیسا کہ دوسری جگہ قرآن میں ہے: فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے بڑے زور سے اُن بتوں پر ضرب لگائی، مگر یہاں عن الیمین ہے۔ یہ عن کا لفظ سمت ہی کا اظہار کرتا ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے یہ دونوں مطلب بغیر کسی تبصرہ کے درج کر دیئے ہیں۔

تیسرا مطلب جو مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے، یہ کہا گیا ہے کہ دائیں میں بایاں بھی داخل ہے مطلب یہ ہے کہ ادھر اُدھر ہر طرف سے تم آ کر ہمیں گھیرتے تھے اور گمراہ کرتے تھے۔ [3]

آخر میں چوتھا مطلب جو ہے، وہ اس پر مبنی ہے کہ یمین یہ دائیں بائیں والا ہے ہی نہیں بلکہ وہ قسم کے معنی میں ہے یعنی قسمیں کھا کھا کر تم ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اُسے عَن کا مفہوم پیدا کرنے کے لئے جو سمت کو بتلاتا ہے یوں کہا گیا ہے کہ تم قسموں کے رخ سے ہماری طرف آتے تھے تاکہ ہم تم پر اطمینان کر لیں۔ [4] یہ بھی کچھ زبردستی کی ذہنی کاوش معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] العرب تتیمّن بما جاء من جهة الیمین (تبیان)

[2] یعنی ہم پر چڑھے آتے تھے بہکانے زور سے اور رعب سے۔ داہنا ہاتھ زور کا ہے۔ (موضح القرآن)

[3] یعنی واز جانب چپ نیز بجہت گمراہ کردن (فتح الرحمن)

[4] عن الیمین عن الجهة الّتی کنّا نامنکم منها بحلفکم انّکم علی الحق (جلالین)

اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝٣٥ وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ۝٣٦ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٣٧ اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ۝٣٨ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٣٩ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝٤٠

''وہ ایسے لوگ تھے کہ جب اُن سے کہا جاتا تھا سوا اللہ کے کوئی خدا نہیں تو وہ گھمنڈ سے کام لیتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا ہم اپنے خداؤں کو ایک دیوانے شاعر کی خاطر سے چھوڑ دیں؟ بلکہ وہ حق کے ساتھ آیا ہے اور اس نے پیغمبروں کی سچائی ثابت کی ہے۔ یقیناً تم لوگ دردناک عذاب کا مزہ چکھنے والے ہو اور تمہیں سزا نہیں ملے گی سوا اُس کے جو تمہارے اعمال تھے مگر اللہ کے نکھارے ہوئے بندے''۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ۝٤١ فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ۝٤٢ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝٤٣ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝٤٤ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۝٤٥ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝٤٦ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ۝٤٧ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ۝٤٨ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ۝٤٩

''یہ وہ ہیں جن کے واسطے معینہ روزی ہے طرح طرح کے پھل اور وہ نوازے ہوئے ہیں باغہائے بہشت میں تختوں پر ایک دوسرے کے مقابل، اُن پر لطیف شراب کے جام گردش کر رہے ہوں گے سفید سفید پینے والوں کے لئے سراسر لذت، نہ اُس میں بدحواسی ہے اور نہ اُس سے اُن میں بہکنے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اُن کے پاس نگاہوں کو مقید رکھنے والی بڑی آنکھوں والیاں ہوں گی جو پردوں میں چھپے ہوئے شترمرغ کے انڈوں کی سی ہوں گی''۔

ہمارے ہندوستانی مذاق میں حسین چہرے کے رنگ کی تعریف سرخ وسفید ہوتا ہے، عرب میں زرد وسفید رنگ بہت اچھا سمجھا جاتا تھا اور شترمرغ کے انڈوں کا رنگ ایسا ہی ہوتا ہے۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝٥٠ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ۝٥١ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ۝٥٢ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ۝٥٣ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ۝٥٤ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۝٥٥ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ۝٥٦ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝٥٧ اَفَمَا نَحْنُ

بِمَيِّتِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۵۹﴾

''تو اُن میں کا ایک دوسرے کی طرف مڑے گا آپس میں سوال و جواب کرتے ہوئے، اُن میں سے ایک نے کہا کہ میرا ایک رفیق تھا، وہ کہتا تھا کہ کیا تم سچ مانتے ہو کہ جب ہم مرجائیں گے اور خاک اور ہڈیوں کی صورت میں ہوں گے تو کیا ہمیں جزا و سزا ملے گی؟ کہے گا کہ کیا تم جھانک کر دیکھو گے؟ اب اُس نے جھانک کر دیکھا تو اُسے بیچوں بیچ دوزخ میں پایا، کہا خدا کی قسم تو مجھے ہلاک کیا ہی چاہتا تھا اور اگر میرے پروردگار کا فضل و کرم نہ ہوتا تو میں بھی اسی گروہ میں موجود ہوتا تو (اب بتا) کیا ہم نہیں مرنے والے ہیں مگر بس پہلی دفعہ والی موت اور کیا ہم سزا پانے والوں میں نہیں ہیں''؟

صاف یہ آیت جزا و سزا کے اُسی تصور کی تصدیق کرتی ہے جو عموماً مسلمانوں کے مذہبی طبقے میں عوام اور تقریباً تمام خواص میں مسلّم ہے اور ضروریات دین اسلام میں سے ہے اور اب ہر فلسفی قسم کا تصور کتنے ہی ترقی یافتہ غلافوں میں لپیٹ کر اس کے علاوہ پیش کیا جائے، قرآن مجید کے انہی تازیانوں کی زد میں ہوگا، جن کا اس مکالمے کی شکل میں اُس جزا و سزا کی تکذیب کرنے والوں یا مشکوک بنانے والوں کی تنبیہ کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۰﴾ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿۶۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۳﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿۶۴﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۶۵﴾ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾

''بلاشبہ یہ ہے بڑی کامیابی، یہ ایسی چیز ہے جس کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے کیا یہ مہمانی کے طور پر بہتر ہے یا زقوم کا درخت؟ یقیناً ہم نے اُسے مصیبت بنایا ہے ظالموں کے لئے۔ وہ ایک درخت ہے جو دوزخ کی تہہ سے برآمد ہوتا ہے، اُس کی پھنگی ایسی ہے جیسے شیطانوں کے سر۔ وہ اُس میں سے کھائیں گے تو اُس سے پیٹ بھریں گے، پھر اُن کے لئے اُس پر سے گرم پانی کی آمیزش ہوگی پھر اُن کی دوزخ کی طرف بازگشت ہوگی''۔

''یہ'' یعنی آخرت کی جزا و سزا کا تصور اس دنیا میں قائم رکھنا جو منکر معاد سے تخاطب میں سابق کے آیات سے نمایاں ہوتا ہے اور اُس کے نتیجہ میں وہ جزاء جس کا بطور سامان ضیافت اُس سے قبل کے آیات میں ذکر آیا ہے، بہت بڑی کامیابی ہے اور پھر ایک تازیانہ تنبیہ کے طور پر یہ سوال ہے کہ یہ سامانِ ضیافت اچھا ہے یا وہ سامان جس کا بطور سزا بعد میں ذکر ہو رہا ہے؟

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿۶۹﴾ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ

اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ۙ﴿۷۱﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۚ﴿۷۲﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۙ﴿۷۳﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۚ﴿۷۴﴾

''اُنہوں نے اپنے باپ داداؤں کو گمراہ پایا تو وہ بھی بے تحاشا اُنہی کے نقش قدم پر دوڑتے رہے حالانکہ ان کے پہلے والے زیادہ تر لوگ گمراہ ہی تھے اور بے شک ہم نے اُن میں خوف دلانے والے (پیغمبر) بھیجے تھے تو دیکھو کیا انجام ہوا اُن کا جنہیں خوف دلایا گیا تھا سوا اللہ کے اُن بندوں کے جو نکھارے ہوئے ہیں''۔

''باپ دادا گمراہ تھے'' تو ظاہر ہے کہ وہ بھی اُن کے پیچھے دوڑنے سے گمراہ ہی قرار پائیں گے اور اس پر اُن کا سرمایہ استدلال فقط باپ دادا کی اندھا دھند تقلید تھی جیسا کہ اُن کا قول قرآن مجید میں کئی جگہ یہی نقل ہوا ہے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو یہی کرتے دیکھا اور دیکھا جائے تو ہر دور میں باطل پرست عوام اپنے عمل کی صحت کے لئے یہی دلیل پیش کرتے ہیں۔

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ۖ﴿۷۵﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۖ﴿۷۶﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۖ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۖ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۸۲﴾

''اور ہمیں صدا دی نوح نے تو کتنے اچھے ہم لبیک کہنے والے تھے اور ہم نے اُنہیں اور اُن کے گھر والوں کو سخت تکلیف سے نجات دی اور اُن کی نسل ہی وہ تھی جنہیں ہم نے قائم و برقرار رکھا اور اُن کا ذکر خیر بعد والوں میں باقی رکھا۔ سلام ہو نوح پر تمام جہانوں میں۔ اسی طرح ہم اچھے کردار والوں کو جزا دیتے ہیں بلاشبہ وہ ہمارے باایمان بندوں میں سے تھے، پھر دوسروں کو ہم نے غرق کر دیا''۔

تَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ جو اس سورے میں برابر ہر تذکرہ کے بعد آیا ہے، اس کا یہ ترجمہ کہ ''اُن کا ذکر خیر ہم نے بعد والوں میں باقی رکھا''۔ یہ ایک تفسیر کے مطابق ہے جو مجھے ذہن سے زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔[1]

دوسرا مفہوم یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے اُن کے لئے آخری زمانہ والوں میں یہ شرف رکھا کہ اُن پر سلام ہوگا یعنی یہ جملہ ہر رسول کے تذکرہ کے بعد اُس کی تمہید ہے جس پر یہ ذکر ختم ہوا ہے۔

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿۸۳﴾ اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ۚ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ

---

[1] ای ترکنا علیہ ذکرا جمیلا واثنینا علیہ فی امّۃ محمّدﷺ عن ابن عباس ومجاھد وقتادۃ (مجمع البیان)

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾

''اور اُنہی کے پیروں میں ابراہیم تھے، جب وہ اپنے پروردگار کے سامنے آئے صحیح وسالم دل لئے ہوئے جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم والوں سے کہا کہ تم کا ہے کی عبادت کرتے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کے دوسرے خداؤں کو تم نے مقصود بنالیا ہے تو کیا خیال ہے تمہارا تمام جہانوں کے پروردگار کے بارے میں''؟

ترتیب لفظی کے لحاظ سے تو اِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ کی ضمیر حضرت نوحؑ کی طرف راجع ہے کہ جو ہر مقصد کے لحاظ سے اُنہی کے راستے کے سالک حضرت ابراہیمؑ بھی تھے اور اس سے حضرت نوحؑ کی افضلیت حضرت ابراہیمؑ سے ضروری طور پر ثابت نہیں ہوتی کیوں کہ حقیقت میں سب پیرو، اس حق کے ہیں جو ازل سے ایک ہی ہے اور اُسی کے پیرو تمام انبیا و مرسلین ہیں لہٰذا ترتیب زمانی کے لحاظ سے ہر بعد والے کو قبل والے کا پیرو کہنا درست ہے۔ نوحؑ کو کہہ دیجئے کہ آدمؑ کے پیرو تھے تو اس سے حضرت آدمؑ کی باعتبار فضیلت اوصافِ کمال بلندی کا اظہار مقصود نہ ہوگا۔ اسی طرح حضرت نوحؑ کا پیرو حضرت ابراہیمؑ کو کہہ دیا ہے تو اس سے باعتبار فضیلت حضرت نوحؑ کی برتری ثابت نہیں ہوتی اور اسی صورت سے ہمارے رسولؐ کو مخاطب کر کے قرآن مجید میں جو ارشاد ہوا ہے:۔

وَاتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا:۔ پیروی کیجئے ابراہیم کی ملت کی جو غلط راستوں سے ہٹے ہوئے تھے۔

اس سے جناب ابراہیمؑ کی افضلیت کا اظہار مقصود نہیں ہے جب کہ حقیقت ثابت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے قبل کے پیغمبروں سے افضل و برتر ہیں اور ہمارے پیغمبرؐ بلا استثناء افضل الانبیاء والمرسلین ہیں۔

ایک قدیم مفسر نے غالباً ترتیب آیات کو لازمی طور پر موافق تنزیل نہ سمجھتے ہوئے جو ایک حقیقت ثابت ہے من شیعتہ کی ضمیر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی طرف راجع کی ہے اور ہمارے یہاں کے بعض روایات میں ضمیر حضرت امیر علی بن ابی طالبؑ کی طرف راجع بتائی گئی ہے۔[1] بہر حال نتیجہ سب کا ایک ہے جب کہ اصل راستہ سب ہی کا متحد ہے۔ آخر میں جو ہے ''تو کیا خیال ہے تمہارا تمام جہانوں کے پروردگار کے بارے میں'' اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تم جو اُس کے ساتھ شریک کر رہے ہو تو کبھی یہ سوچو کہ وہ جو خالق کائنات اور اصل پروردگار ہے، اس کی تمہیں کیا سزا دے گا؟

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا تم نے اُسے ایسا ہی عاجز و قاصر سمجھ رکھا ہے جیسے تم نے بت بنا رکھے ہیں یہ دونوں مفہوم اس جملے کے بیان کیے گئے ہیں۔[2]

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ ﴿۹۰﴾ فَرَاغَ

---

[1] قال الفراء معناد وانّ من شیعتہ محمّد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم لابراھیم وقدوری عن اھل البیت علیھم السلام انّ من شیعتہ علیؑ لابراھیم (تبیان)

[2] ای لیصنع بکم مع عباداتکم غیرہ ___ وقیل ماتظنّون بربکم انّہ علیٰ ایّ صفۃ ___ حین شبھتم بدھذہ الاصنام (مجمع البیان)

اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۹۱﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ ﴿۹۳﴾ فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿۹۴﴾ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿۹۵﴾ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

''اس کے بعد اُنہوں نے ستاروں پر ایک نگاہ ڈال کر کہا کہ میں بیمار پڑنے ولا ہوں، اس پر وہ لوگ پیٹھ پھرا کر اُن کے پاس سے چلے گئے، تب انہوں نے اُن کے خداؤں کی طرف پوشیدہ طور پر رخ کیا، کہا کیوں تم کھاتے نہیں تمہیں کیا ہے کہ تم بولتے نہیں؟ اس کے بعد اُن کی طرف متوجہ ہوئے مارتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ سے تو وہ لوگ اُن پر ٹوٹ پڑے۔ اُنہوں نے کہا کہ کیا تم لوگ عبادت کرتے ہو اُس کی جو تم خود تراشتے ہو حالانکہ اللہ نے پیدا کیا ہے تمہیں بھی اور انہیں بھی جو تم بناتے ہو''۔

ستاروں کی طرف نگاہ ڈالنے کے پس منظر کے لئے جلالین نے لکھا ہے:۔

وکانو انّجامین: وہ لوگ نجومی تھے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''وہ لوگ نجومی تھے، اُن کے دکھانے کو تاروں کی طرف دیکھ کر کہا یا نجوم کی کتاب میں دیکھ کر کہا میں بیمار ہوں یا ہوا چاہتا ہوں (موضح القرآن)

اب کون کہہ سکتا ہے کہ جناب ابراہیمؑ کو اس کے بعد کسی طرح کی علامت پیدا نہیں ہوئی مگر صحیح بخاری میں حضرت ابراہیمؑ کے لئے یہ آ گیا ہے کہ کذب ثلث کذبات ''انہوں نے (معاذ اللہ) تین جھوٹ بولے اُن میں سے ایک موقع یہ ہے۔ بہر حال صحیح بخاری پر ایمان رکھنے والے اپنے ایمان کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ انبیاء و مرسلین معصوم ہوتے ہیں اور دروغ بیانی معیار عصمت کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم اس روایت کو قبول کرنے سے قاصر ہیں۔[1]

جناب شاہ صاحب رقم طراز ہیں کہ:۔

''یہ ایک جھوٹ ہے اللہ کی راہ میں، عذاب نہیں ثواب ہے'' (موضح القرآن)

ہم تو جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اسے جھوٹ ماننے کے لئے تیار ہی نہیں اور ایسی حدیث کو جو خلیل حق کی طرف جھوٹ کی نسبت دے جھوٹا سمجھتے ہیں۔ مگر سچائی کے بلند بانگ دعویداروں کو جو تقیہ کو جھوٹ کہہ کر جماعت شیعہ پر اعتراض کیا کرتے ہیں، شاہ صاحب کے اس افادۂ عالیہ کو یاد تو رکھنا ہی چاہیے کہ جھوٹ بھی کبھی اللہ کی راہ میں ہوتا ہے اور وہ عذاب نہیں ثواب ہوتا ہے۔ جناب ابراہیمؑ کا بتوں سے بطور طنز و استہزاء یہ کہنا کہ ''کیوں! تم کھاتے نہیں ہو'' اس کا پس منظر یہ بتایا گیا ہے کہ اُس دن ان کا کوئی تہوار تھا جس میں وہ عیدگاہ گئے ہوئے تھے اور کھانا بتوں کے سامنے رکھ گئے تھے بطور تبرک کہ جب وہ واپس آئیں گے تو اس کھانے کو سب کھائیں گے۔

---

[1] لا یجوز ذٰلك علی الانبیاء لانّه یرفع الثقة بقولهم جلّ امناء الله تعالیٰ واصفیاءه عن ذلك (مجمع البیان)

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿۹۷﴾ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ﴿۹۹﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

''اُن لوگوں نے کہا ہے کہ اس شخص کے لئے ایک عمارت بناؤ تو اس کو آگ میں ڈال دو، اس طرح انہوں نے ان کے لئے ایک منصوبہ بنایا جس کے نتیجہ میں ہم نے اُنہی لوگوں کو پست کیا اور انہوں نے کہا کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں، وہ مجھے منزل تک پہنچائے گا۔

پروردگار! مجھے نیک قسم کی اولاد عنایت فرما''۔

عمارت بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ایک خاص احاطہ تیار کرو جس میں لکڑیاں جمع کر کے آگ روشن کرو۔[1]

شہرت عامہ میں اُس آگ کو ''آتش نمرود'' کہا جاتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر اقبال نے بھی کہہ دیا ہے:۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشالبِ بام ابھی

مگر قرآن مجید نے نمرود کے تعلق سے بس حضرت ابراہیمؑ کا مکالمہ درج کیا ہے جب انہوں نے کہا میرا پروردگار جلاتا ہے اور مارتا ہے، اُس نے کہا میں بھی ایسا کر سکتا ہوں، اُنہوں نے کہا اللہ آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال دے، اس پر وہ لاجواب ہو گیا لیکن آگ میں جلانے کی نسبت قرآن نے ہر جگہ قوم کی طرف دی ہے، یہاں بادشاہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اُس کے بعد کیا نتیجہ ہوا؟ یہاں صرف اُن کے منصوبہ کی ناکامی کا ذکر ہے لیکن وہ کیوں کر ناکام ہوا؟ اُس کا یہاں کوئی ذکر نہیں ہے۔ دوسری جگہ آگ کے سرد ہونے کا ذکر ہے۔

یہاں بے شک سلسلہ کلام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بس اس کے بعد اُنہوں نے وہاں سے ہجرت کا فیصلہ کر لیا مگر اس ہجرت کے ساتھ ہی انہوں نے اولاد کی دعا کیوں کی؟ اس کے متعلق مجھے ابھی تک تفاسیر میں کچھ نہیں ملا۔ ممکن ہے اس وقت اپنی تنہائی کا احساس ہوا ہو لیکن ظاہر ہے کہ اولاد ہوتی بھی تو وہ پوری قوم کا مقابلہ کر کے اُن کی حفاظت کہاں کر سکتی تھی۔ ہاں ممکن ہے یہ تصور ہوا ہو کہ اگر عنایت الٰہی خصوصی انتظام حفاظت کے ساتھ شامل حال نہ ہوتی تو میں بے نام و نشان دنیا سے گزر جاتا اور میرے اس مشن کو باقی رکھنے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ اس لئے دل میں تمنا پیدا ہوئی ہو کہ کاش میرے اولاد ہو جائے تو اگر مجھے ختم بھی کر دیا جائے تو میری اولاد میرے بعد اس مشن کو برقرار رکھے اور اسی لئے اولاد میں جس کی بارگاہ الٰہی میں تمنا کی من الصالحین کی قید لگائی کہ اگر اولاد ایسی ہوئی جو میرے مقصد کو پورا نہ کر سکے تو بے کار ہے۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ

---

[1] ابنوا له بنيانا فاملاؤه خطبا واضرموه بالنّار (جلالين) یعنی آنجا آتش بیسار جمع نمائید (فتح الرحمٰن)

اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ؕ قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ
اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۰۲﴾ فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ﴿۱۰۳﴾ وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰۤاِبْرٰهِیْمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدْ
صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ﴿۱۰۶﴾
وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۰۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ سَلٰمٌ عَلٰۤی اِبْرٰهِیْمَ ﴿۱۰۹﴾
كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ
نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَبٰرَكْنَا عَلَیْهِ وَعَلٰۤی اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّیَّتِهِمَا مُحْسِنٌ
وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِیْنٌ ﴿۱۱۳﴾

''تو ہم نے اُنہیں بشارت دی ایک بڑے قوت برداشت رکھنے والے بیٹے کی۔ اس کے بعد جب وہ ذرا دوڑ دھوپ کے سن تک پہنچا تو انہوں نے کہا اے بیٹا! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ اب تم غور کرو کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا اے بابا! کیجئے جو آپ کو حکم ہو رہا ہے، اللہ نے چاہا تو مجھے آپ صبر کرنے والوں میں پائیے گا۔ تو جب وہ ہمہ تن اطاعت پر تیار ہو کر آئے اور انہوں نے ان کو پیشانی کے بھل لٹایا اور ہم نے اُنہیں صدا دی کہ اے ابراہیم! تم نے خواب سچ کر دکھایا، بلاشبہ ہم یونہی جزا دیتے ہیں نیکوکاروں کو یقیناً یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی اور ہم نے اُن کا فدیہ بھیج دیا ایک عظیم قربانی کے سبب سے اور ہم نے اُس کی یاد قائم رکھی بعد والوں میں۔ سلام ہو ابراہیمؑ پر ہم یونہی جزا دیتے ہیں نیکوکاروں کو، یقیناً وہ باایمان بندوں میں سے تھے اور ہم نے اُنہیں خوشخبری دی اسحاق کی جو نبی ہوگا اچھے آدمیوں میں سے اور برکت عطا کی اُنہیں اور اسحاق کو اور اُن کی اولاد میں نیکوکار بھی ہونگے اور کھلے ہوئے اپنے نفس پر ظلم کرنے والے بھی''۔

ذبح عظیم

ان آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی اُس قربانی کا تذکرہ ہے جو انہوں نے اپنے فرزند کے ذبح پر تیار ہو کر پیش کی تھی۔

یہود اور نصاریٰ کا دعویٰ ہے کہ یہ فرزند جناب اسحاقؑ تھے لیکن اسلامی روایات اس بارے میں مختلف ہیں جو ہمارے علماء کے یہاں بھی وارد ہیں مگر زیادہ قوت اسی کو ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ تھے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مورث اعلیٰ ہیں۔

بعض اہل نظر و تلاش کو بائبل میں بھی اس کی تائید ملی ہے اس بنا پر کہ اس فرزند کی قربانی کے وقت جناب ابراہیمؑ کی جو مناجات مذکور ہے، اس کے الفاظ یہ بیان کیے جاتے ہیں کہ ''میں اپنا اکلوتا بیٹا تیری بارگاہ میں پیش کرتا ہوں'' اور یہ متفقہ حقیقت ہے کہ جناب اسماعیلؑ پہلے پیدا ہوئے تھے۔ بالکل ظاہر ہے کہ چھوٹا بیٹا کبھی ''اکلوتا'' قرار نہیں پاتا۔ ہاں جب تک چھوٹے کی ولادت نہ ہو، بڑا اکلوتا فرزند ہوا کرتا ہے اور جناب ابراہیمؑ

اس فرزند کو جسے قربانی کے لئے لا رہے ہیں ''اکلوتا'' کہہ رہے ہیں تو اس سے ظاہر ہے کہ وہ جناب اسماعیلؑ ہیں، جناب اسحاقؑ نہیں ہیں۔

پھر جیسا کہ میں نے ''تاریخ اسلام'' حصہ اول میں لکھا ہے ''اگر یہ قربانی'' جناب اسحاقؑ سے متعلق ہوئی تو اُس کی یادگاریں بنی اسرائیل کے مذہبی رسوم میں ہوتیں اور اُس کے آثار شام و فلسطین کی سرزمین پر پائے جاتے مگر ایسا نہیں ہے۔ اُس قربانی کی یادگار ''عید قربان'' کی صورت میں مسلمانوں ہی میں قائم ہوئی اور اُس کے آثار عرفات اور منیٰ وغیرہ میں سرزمین مکہ پر پائے جاتے ہیں جہاں جناب اسماعیلؑ کی بود و باش تھی۔ اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ یہ قربانی جناب اسماعیلؑ سے متعلق تھی مگر قرآن مجید میں چونکہ واقعہ قربانی کے پہلے بشارت فرزند کا ذکر ہے اور دوسرے مقام پر بشارت کا ذکر جناب اسحاقؑ کے متعلق کیا گیا ہے، اس لئے بعض لوگ توہم کرتے ہیں کہ قربانی کا تعلق جناب اسحاقؑ سے ظاہر ہوتا ہے مگر یہ اس سلسلہ کے تمام مذکورہ آیات کو جو ہم نے اسی لئے ایک ساتھ درج کیے ہیں، پیش نظر نہ رکھنے کا نتیجہ ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ان آیات میں بشارت کا ذکر دو دفعہ ہے۔ ایک دفعہ **غلام حلیم** ''قوت برداشت رکھنے والے فرزند'' کی بشارت ہے جس کے سلسلہ میں قربانی کا واقعہ درج ہے اور دوسری دفعہ اس قربانی کے بعد بشارت کا ذکر ہے جو صراحتاً اسحاقؑ سے متعلق ہے۔ اس لئے قرآن کے اس بیان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ پہلی بشارت اور قربانی کا تذکرہ اسحاقؑ سے پہلے پیدا ہونے والے جناب اسماعیلؑ سے متعلق ہے اور بعد میں پھر جو بشارت ہوئی ہے، وہ جناب اسحاقؑ سے متعلق ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے اس کے علاوہ مزید دو دلیلیں پیش کی ہیں:۔ ایک یہ کہ قرآن میں ایک جگہ جناب اسحاقؑ کی بشارت کے ساتھ ارشاد ہوا ہے:۔ **وَمِنْ وَّرَاءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ** یعنی اُسی بشارت میں جناب اسحاقؑ کے فرزند یعقوبؑ کی بشارت ہوگئی تھی، اس کے معنی یہ ہیں کہ اُسی وقت اس فیصلے کا اظہار ہو گیا تھا کہ جناب اسحاقؑ زندہ سلامت باقی رہیں گے، یہاں تک کہ اُن کی شادی ہوگی اور فرزند متولد ہوگا، پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ بچپنے ہی کے دور میں اُن کے ذبح کا حکم ہو؟!

دوسرے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد پایہ ثبوت کو پہنچا ہوا ہے کہ **انا ابن الذبیحین** یعنی میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں۔ اس میں ایک ذبیح جناب اسماعیلؑ ہیں اور دوسرے آپ کے والد جناب عبداللہ، وہ بھی ذبح سے فدیہ کے ذریعہ سے بچ گئے تھے۔ اگر پہلے ذبح کا واقعہ جناب اسحاقؑ سے متعلق ہو تو حضرتؐ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا؟

بڑا اہم فقرہ اس سلسلہ آیات میں **فدیناہ بذبح عظیم** کا ہے۔ اس کی تفسیر میں عموماً مفسرین اہل سنت ''ذبح عظیم'' سے مراد وہ دنبہ لیتے ہیں جو بطور فدیہ آیا تھا مگر کہاں ''ذبح عظیم'' کا پر عظمت لفظ اور کہاں ایک دنبہ، وہ چاہے جنت کا کیوں نہ ہو، **عظیم** کے لفظ سے ذہن میں تو مرتبہ ہی کی عظمت آتی ہے اس لئے دنبے کے ساتھ یہ **عظیم** کا لفظ بظاہر کھپتا نہیں، اس کے کھپانے کے لئے ان حضرات کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ اس ''ذبح عظیم'' ایسا دو لفظی لفظ کا ترجمہ اتنا طویل الذیل فرماتے ہیں:۔

''گوسفندی مہیا برائے ذبح، بزرگ جثہ'' اے سبحان اللہ خود اُن کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر کو ''یہ بزرگ جثہ'' ترجمہ دل کو نہیں لگا تو انہوں نے لکھا ''یعنی بڑے درجہ کا بہشت سے آیا'' (موضح القرآن) مگر کیا بہشت سے آنے کی وجہ سے دنبے کا ایسا درجہ ہو گیا کہ وہ نبی زادے کے مقابلہ میں عظیم بن جائے؟

اس کے مقابل شیعی عام تصور یہ ہے کہ ''ذبح عظیم'' سے حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام مراد ہیں جس کے لحاظ سے ڈاکٹر اقبال

نے کہا ہے:۔

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنی ''ذبح عظیم'' آمد پسر

اب ''عظیم'' کے لفظ کا اطلاق تو بالکل برمحل معلوم ہوتا ہے مگر حضرت امام حسینؑ کا فدیہ اسماعیل ہونا ذہن کے لئے قابل قبول معلوم نہیں ہوتا لیکن میرے خیال میں دشواری بذبح عظیم کی ''ب'' کو صلہ کا لینے سے ہو رہی ہے جو فدیہ کا مفہوم پیدا کرتا ہے، کیوں نہ اسے سببیّہ لیا جائے جس کے موافق ہم نے ترجمہ کیا ہے ''ایک عظیم قربانی کے سبب سے'' مطلب یہ ہے کہ چونکہ اسماعیل ہی کی نسل ہیں وہ عظیم تر قربانی ہونے والی تھی جو خالق کی طرف سے مکمل مثالِ قربانی بن سکے اور ابھی وہ نسل عالم وجود میں آنا باقی تھی لہٰذا اس قربانی کو محل عزم تک لا کر فدیہ بھیج دیا گیا۔ اب کوئی دشواری نہیں ہے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۚ﴿۱۱۴﴾ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۚ﴿۱۱۵﴾ وَ نَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۚ﴿۱۱۶﴾ وَ اٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ۚ﴿۱۱۷﴾ وَ هَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۚ﴿۱۱۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ۖ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۚ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۚ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ﴿۱۲۲﴾

''اور بلاشبہ ہم نے اپنا فضل و کرم مبذول کیا موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام پر اور اُنہیں اور اُن کی قوم کو سخت اذیت و تکلیف سے چھٹکارا دیا اور ہم نے اُن کی مدد کی تو فتح پانے والے وہی ثابت ہوئے اور اُن دونوں کو ہم نے واضح کتاب عطا کی اور اُن کو سیدھے راستے پر لگایا اور اُن کا ذکر خیر ہم نے بعد والوں میں باقی رکھا۔ سلام ہو موسیٰ اور ہارون پر، یقیناً ہم یونہی جزا دیتے ہیں نیکوکاروں کو بلاشبہ وہ دونوں ہمارے باایمان بندوں میں سے تھے''۔

ہر پیغمبر کے حال کے بعد ایسا جملہ ہے جس کا ترجمہ ایک تفسیر کے لحاظ سے جسے ہم نے ترجیح دی یہ ہے کہ ''ہم نے اُن کا ذکر خیر باقی رکھا بعد والوں میں۔ دوسری تفسیر کی بنا پر ترجمہ یہاں یہ ہوگا کہ ہم نے اُن کا ذکر بعد والوں میں اس طرح رکھا کہ سلام ہو موسیٰؑ اور ہارونؑ پر۔

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۘ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور یقیناً الیاسؑ بھی پیغمبروں میں سے تھے، جب اُنہوں نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ کیوں تم پرہیز گاری اختیار نہیں کرتے؟ کیا تم بعل (بت) کی پرستش کرتے ہو اور اُس بہترین خالق اللہ کو چھوڑے ہوئے ہو جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے پہلے والے آباؤ اجداد کا بھی پروردگار ہے تو اُن لوگوں نے انہیں جھٹلایا تو بلاشبہ وہ لوگ عذاب میں لائیں جائیں گے سوا اللہ کے اُن بندوں کے جو نکھارے ہوئے ہوں اور ہم نے اُن (الیاس) کا ذکر خیر بعد والوں میں باقی رکھا۔ سلام ہو آلِ یاسین پر۔ یقیناً ہم اسی طرح جزا دیتے ہیں نیکوکاروں کو بلاشبہ وہ ہمارے باایمان بندوں میں تھے''۔

آل یاسین پر سلام

اس میں جو ال یاسین ہے، اس کے اندر ایک عجیب ذہنی کش مکش پیدا ہوتی ہے، چونکہ یہ الیاس (پیغمبر) کے ذکر میں ہے اور بالکل اُس محل پر ہے جہاں اُس کے قبل برابر اُس پیغمبر کا نام لے کر سلام ہوتا تھا تو بلاشبہ ذہن میں یہی آتا ہے کہ یہ جناب الیاس پر سلام ہے مگر یہ خود لفظ اپنے حروف اور متفقہ رسم الخط کے اعتبار سے قواعد کتابت کے لحاظ سے بالکل الیاس سے الگ ہے۔ ایک تو اس میں آخر میں ی اور ن زائد ہے جو الیاس میں نہیں ہے۔ دوسرے الیاس الف لام داخل لفظ ہے اس لئے ملا کر لکھا جاتا ہے لیکن ال یاسین میں ''ال'' پڑھے گا اور یٰس وہ لفظ ہے جس کے نام کا ایک سورہ قرآن میں موجود ہے اور اُس کے آغاز میں یہی لفظ ہے اس طرح کہ یٰس والقرآن الحکیم انك لمن المرسلین اور چونکہ یٰسٓ اور قسم کے بعد بلا فاصلہ تخاطب ہمارے رسولؐ سے ہے، اس لئے عام طور پر مسلمانوں میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے القاب میں درج ہوتا ہے۔

اب علمائے اہل سنت سباق وسیاق کلام میں قبل وبعد الیاس کا ذکر ہونے اور اس سے اس جملہ کے چسپاں ہونے کی وجہ سے اس کا ترجمہ ''الیاس پر سلام ہو'' کے ساتھ کر دیتے ہیں۔[1] اور آخر میں ی اور ن جو زائد ہے، اُس کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ الیاس ہی کا دوسرا تلفظ ہے۔[2] اور کوئی کہتا ہے کہ الیاس اور اُن کے تابعین مل کر بہت سے الیاس ہو گئے تو اُنہیں الیاسین کہہ دیا گیا۔[3] لیکن آخر یہیں ایسا کیوں ہوا؟ نوحؑ اور اُن کے تابعین مل کر نوحین اور ابراہیم اور اُن کے تابعین مل کر ابراہیمیں کیوں نہیں ہوئے؟

ہماری احادیث دوسرے پہلو کو ترجیح دیتی ہیں اور جو قرآنی رسم الخط سے یہ لفظ سمجھ میں آتا ہے ال یاسین اُسی کو درست بتاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ال یٰس سے مراد آل محمد علیہم السلام قرار پاتے ہیں اور صدر اسلام کے قاریان قرآن کی ایک جماعت اس لفظ کو اسی طرح پڑھتی تھی۔[4] اور ترجمان القرآن جناب ابن عباس رضوان اللہ علیہ کی رائے اس کے مطابق ہے۔[5]

---

[1] سلام باد بدالیاس (شاہ ولی اللہ) سلام ہو جیوا و پر الیاس کے (رفیع الدین)

[2] الیاس کو الیاسین بھی کہتے ہیں جیسے طور سینا اور طور سینین (موضح القرآن)

[3] قیل ھو ومن اٰمن معه فجمعرا معه تغلیبا (جلالین)

[4] قرأ نافع وابن عامر ویعقوب سلام علیٰ ال یاسین (تبیان)

[5] قال ابن عباس ال یاسین ال محمدؐ یاسین من اسمائه ﷺ (مجمع البیان)

بعض اہل سنت نے اس قرأت کی صورت میں بھی اُسے جناب الیاس علیہ السلام سے متعلق کرنا چاہا ہے، اس طرح کہ یاسین اُن کے باپ کا نام تھا[1] مگر الیاس کے باپ کا نام یاسین ہونا کسی روایت سے ثابت نہیں ہے۔

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

''اور بلاشبہ لوط علیہ السلام بھی پیغمبروں میں سے تھے جب کہ ہم نے اُنہیں اور اُن کے گھر والوں کو چھٹکارا دیا سوا ایک بڑھیا (ان کی بیوی) کے جو رہ جانے والوں میں سے تھی، پھر دوسروں کو ہم نے تہس نہس کر دی اور تم لوگ خود اُن کی طرف سے گزرتے ہو، صبح کو بھی اور رات کو بھی تو کیا پھر بھی نہیں سمجھتے''۔

چونکہ قوم لوط کی بستیاں مشرکین کی تجارتی شاہ راہ میں پڑتی تھیں، جب وہ شام کے ملک کی طرف جاتے تھے، اس لئے اُنہیں مخاطب کر کے توجہ دلائی گئی کہ تم اُن تباہ شدہ بستیوں کے نشان بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو، پھر بھی عبرت حاصل نہیں کرتے۔[2]

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾

''اور یقیناً یونس بھی پیغمبروں میں سے تھے جب کہ وہ بھری ہوئی کشتی کی طرف مضطربانہ گئے، اس کے بعد قرعہ پڑا تو وہ پھینک دیئے گئے تو اُنہیں مچھلی نے نگل لیا اس عالم میں کہ وہ اپنے کو ملامت کر رہے تھے تو اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو اُس کے پیٹ میں رہتے اُس دن تک کہ جب سب دوبارہ زندہ کئے جائیں گے تو ہم نے اُن کو (نکال کر) خشک زمین پر ڈالا اس حال میں کہ وہ نڈھال تھے اور اُن پر ہم نے اگایا کدو کا ایک درخت

---

[1] ال یاسین بھی پڑھا ہے کسی نے تو یاسین اُن کے باپ کا نام ہے (موضح القرآن) علیٰ قراءۃ ال یاسین بالمدای اھل والمرادبہ الیاس ایضاً (جلالین)

[2] خطاب لمشرکی العرب ای تمرّون فی ذھابکم ومجیئکم الی الشام علیٰ منازلھم۔ (مجمع البیان) قوم لوط کی بستیاں الٹی ہوئی نظر آتی تھیں شام کی راہ میں (موضح القرآن)

اور اُنہیں ہم نے بھیجا ایک لاکھ یا اس سے زیادہ کی طرف چنانچہ وہ ایمان لائے تو ہم نے اُن کو ایک مدت تک پھلنے پھولنے کا موقع دیا''۔

یہ جناب یونسؑ کا واقعہ ہے جس کی شروع اور درمیان کی بہت سی کڑیاں بنظر اختصار قرآن مجید نے یہاں پر چھوڑ دی ہیں اور بعض کو خود دوسرے مقامات پر بیان کیا ہے اور بعض کا حدیثوں میں بیان ہوا ہے۔

قرعہ کیوں ڈالا گیا؟ اس کا پتہ قرآن مجید سے نہیں چلتا۔ مفسرین نے دو وجہیں لکھیں ہیں:۔ ایک یہ کہ کشتی طوفانی ہوئی، اس پر اُن لوگوں کے ذہن میں یہ آیا کہ کوئی آدمی اس پر ایسا سوار ہے جس کے سبب سے یہ کشتی طوفانی ہوئی ہے، اُسے دریا میں پھینک دیا جائے تو سب لوگ محفوظ ہو جائیں گے۔

دوسرے یہ کہ مچھلی سامنے آئی منہ کھولے ہوئے اس طرح جیسے کسی کی طلبگار ہے اور اس طرح قرعہ ڈالا گیا اور وہ جناب یونسؑ کے نام پر نکلا۔ یہ دونوں قول جناب شیخ الطائفہؒ نے تبیان میں نقل کیے ہیں علامہ طبرسیؒ نے بھی دو قول کیے ہیں:۔

پہلا یہ کہ کشتی ڈوبنے کے قریب ہوئی، اُس وقت یہ ہوا۔

دوسرے یہ کہ کشتی رک گئی، چلتی نہ تھی، کسی بڑے بوڑھے نے کہا کہ کوئی اس میں اپنے مالک سے بھاگا ہوا ہے، اس بنا پر قرعہ ڈالا گیا اور تین دفعہ قرعہ پڑنے پر ہر دفعہ جناب یونسؑ کے نام پر نکلا۔

''ایک لاکھ یا اس سے زیادہ''..... چونکہ کلام الٰہی میں کوئی لفظ اظہار تردد کے لئے نہیں ہوسکتا اور کلام عرب میں اوبل یعنی ''بلکہ'' کے معنی میں آتا ہے لہٰذا یہاں بھی یہی معنی ہیں، نتیجہ کلام یہی ہے کہ وہ ایک لاکھ سے زیادہ تھے۔ اب اس سے کتنے زیادہ؟ اس کو بیان نہیں کیا گیا اس لئے کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

''تو ذرا اُن سے پوچھیے کہ کیا آپ کے پروردگار کے لئے بیٹیاں ہیں اور اُن کے لئے بیٹے ہیں؟ یا ہم نے فرشتوں کو عورت بنایا درحالیکہ وہ لوگ دیکھ رہے تھے، معلوم ہونا چاہیے کہ یہ اپنی دروغ بافی سے کہتے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہے اور وہ بلاشبہ ضرور جھوٹے ہیں، کیا اُس نے بیٹیوں کو بیٹوں کے مقابلہ میں پسند کیا ہے؟ تم لوگوں کو کیا ہے؟ کیسا فیصلہ کرتے ہو؟ سمجھانے سے سمجھتے کیوں نہیں؟ یا کیا تمہارے پاس کوئی کھلی ہوئی دلیل ہے تو وہ اپنی دستاویز پیش کرو اگر تم سچے ہو''۔

یعنی اصل اولاد کا تصور ہی اللہ کے لئے غلط ہے خواہ وہ بیٹا ہو یا بیٹی مگر مزید ستم ظریفی اُن کی یہ ہے کہ یہ خود بیٹیوں سے نفرت کرتے ہیں اور اللہ کے لئے جس اولاد کے قائل ہیں یعنی فرشتے، اُنہیں بیٹیوں کی صنف سے سمجھتے ہیں جو اُن کی حماقت بالائے حماقت یا دروغ اندر دروغ ہے۔ آخر کہاں سے ان کو پتہ چلا کر ملائکہ صنف اناث سے ہیں، یہ ایسی واہی تواہی باتیں بغیر ثبوت آخر کیوں کرتے ہیں؟!

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۙ﴿۱۵۸﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

''اور قرار دیا اُنہوں نے اس کے درمیان اور جنات کے درمیان رشتہ نا تا، حالانکہ خود جنات خوب جانتے ہیں کہ وہ (جزا وسزا کے لیے) حاضر کیے جائیں گے، پاک ہے اللہ اُس سے جو وہ بیان کرتے ہیں سوا اللہ کے نکھارے ہوؤں کے''

یعنی یہ اللہ کے نکھارے ہوئے بندے جو اوصاف اللہ کے بیان کرتے ہیں، وہ اس کی شان کے لائق ہیں۔[1]

جنات کے ظاہری معنی تو یہی قوم جن کے ہیں جیسا کہ اکثر مترجمین ترجمہ کرتے ہیں۔[2] مگر بعض مفسرین کا خیال ہے کہ جنات سے مراد یہاں فرشتے ہیں چونکہ جن کے لغوی معنی پوشیدہ ہونے کے ہیں اور فرشتے بھی نظر سے پوشیدہ ہیں، اس لئے اُنہیں بھی جن کہا جاتا ہے، اس طرح اس آیت میں گزشتہ آیات والے مضمون کی تکرار ہے اور کچھ نہیں۔

یہ سمجھنے کی شاید ان مفسرین کو اس لئے ضرورت پڑی کے مشرکین قریش کے عقائد میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ جنوں کو اللہ کی اولاد قرار دیتے تھے مگر چونکہ مشرکین کے عقائد کا کوئی ذخیرہ خود ان کا لکھا ہوا ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے تو قرآن کے اس بیان کو ہم اس تاریخی واقعیت کی دلیل کیوں نہ سمجھیں کہ مشرکین کا کوئی گروہ شیاطین وجنات کے متعلق بھی اس طرح کا تصور رکھتا تھا کہ اُن میں اور خدا میں کوئی رشتہ ہے چنانچہ بعض مفسرین نے ایک لامذہب گروہ کا ایسا تصور بیان کیا ہے۔[3]

جب کہ ملائکہ کے بناتِ الٰہی ہونے کے متعلق اُن کے غلط عقیدہ کا ابھی تفصیل کے ساتھ ذکر ہو چکا ہے تو پھر حرف عطف کے ساتھ جو مغایرت کا پتہ دیتا ہے ان الفاظ سے کہ ''اور انہوں نے جنات اور اللہ کے درمیان رشتہ قرار دیا ہے'' یہ کیوں سمجھا جائے کہ یہ پہلی ہی والی بات ہے جسے دوبارہ کہا جا رہا ہے، پھر بعد کا جملہ کہ جنات خوب جانتے ہیں کہ وہ حاضر کیے جائیں گے اور دوسرے مقامات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ **محضرون** کا لفظ زیادہ تر عذاب کے محل پر صرف ہوتا ہے یعنی سزا دینے کے لئے لائے جائیں گے، یہ جملہ ملائکہ پر جو اطاعت کے سوا معصیت سے واقف نہیں ہیں اور ان کے یہاں ثواب وعذاب بلکہ حساب وکتاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کسی طرح چسپاں معلوم نہیں ہوتا، غالباً اسی وجہ

---

[1] یعنی بیان ایشاں موافق واقع است (فتح الرحمن)

[2] میان خدائی تعالیٰ ومیان جنّیاں (شاہ ولی اللہ) درمیان خدا کے اور درمیان جنوں کے (شاہ رفیع الدین)

[3] قول الزنادقة ان الله تعالىٰ وابليس اخوان وان الله خلق النور والخير والحيوان النافع وابليس خلق الظلمة والشر والحيوان الضّار عن كلبي وعطيّة (مجمع البيان)

سے اس قول کے قائل نے اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ کی ضمیر کو کہ ''وہ حاضر کیے جائینگے'' جنات سے ہٹا کر اُن کہنے والوں کی طرف عائد کیا ہے جس کی بنا پر معنی یہ ہوں گے وہ جنات جانتے ہیں کہ اس بات کے کہنے والے عذاب میں گرفتار کیے جائیں گے۔[1] مگر مجھے یہ تمام تکلفات بلاضرورت اور خلاف حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔

کچھ مفسرین نے جنات کے ساتھ رشتے کو ملائکہ کے دختران الٰہی ہونے کے تصور سے الگ مگر اُسی کے ضمیمہ کے طور پر مانا ہے اس طرح کہ اُن کا مزعومہ یہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں جنیہ عورتوں کے بطن سے یعنی اللہ اور جنات کی شرکت سے فرشتے پیدا ہوئے ہیں۔[2] مگر اُن کے اس مبینہ خیال کی رد مقصود ہوتی تو یہ سببی رشتہ ویسا ہوتا جسے عربی میں ''مھر'' کہتے ہیں، نسبی رشتہ نہ ہوا اور قرآن کہہ رہا ہے کہ اُنہوں نے اللہ اور جنات کے درمیان ''نسب'' قرار دیا ہے۔

نسب اور مھر الگ الگ چیزیں ہیں جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۰) فرقان۔ ۵۴)

لہٰذا یہ بیان بھی قابل قبول نہیں ہے۔

فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾

''یقیناً تم اور جس چیز کی تم عبادت کرتے ہو، تم سب اُس پر گمراہ نہیں کر سکتے سوا ایسے کے کہ جو دوزخ کی گرمی کا اٹھانے والا ہو''۔

یعنی گمراہ کرنے والے ہمیشہ جسے گمراہ کرتے ہیں، وہ وہی ہوتا ہے جو اپنی بد باطنی سے گمراہ ہونے کے لئے تیار ہوتا ہے، اس لئے کسی کے گمراہ کرنے سے جو شخص گمراہ ہوا ہے گمراہ ہونے کی ذمہ داری سے یہ کہہ کر بچ نہیں سکتا کہ میں کیا کروں؟ فلاں شخص نے مجھے گمراہ کیا۔[3]

ارے وہ لاکھ گمراہ کر رہا تھا! یہ کیوں گمراہ ہوا؟ لہٰذا گمراہ ہونا خود اُس کا فعل ہے جس پر یہ مستحق سزا ہے اور وہ گمراہ کرنے والا بھی سزا کا مستوجب ہے کہ اُس نے کیوں گمراہ کیا؟

بعض مفسرین جو انسانی افعال کی ذمہ داری خدا پر عائد کرنا چاہتے ہیں، اُنہوں نے یہ مطلب قرار دیا ہے کہ تم گمراہ نہیں کر سکتے مگر اُسے جو اللہ کے علم میں گمراہ ہونے والا ہے۔[4] گویا اس کا گمراہ ہونا علم الٰہی کی وجہ سے ہے۔ تمہارے گمراہ کرنے سے نہیں مگر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ اس گمراہ کرنے والے کو سزا ملنا چاہیے اور نہ گمراہ ہونے والے کو، اس لئے کہ یہ عدل الٰہی کے خلاف ہوگا۔[5]

---

[1] انّهم اى قائلى ذٰلك (جلالين)

[2] کافر کہتے ہیں فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں جنوں کی عورتوں سے پیدا ہوئیں۔ (موضح القرآن)

[3] المعنى انّ من يقبل هذا القائل وينقادله فهو يصلى الجحم (تبيان)

[4] من هو صال الجحيم فى علم الله تعالىٰ (جلالين)

[5] یعنی تم انسان اور تمہارے تئیں شیطان کے مرضی اللہ کے گمراہ نہیں کر سکتے گمراہ وہی ہوگا جسکو اُس نے دوزخی لکھدیا ہے۔ (موضح القرآن)

تعجب ہے کہ علامہ طبرسیؒ نے دونوں مفہوم بغیر کس محاکمہ کے درج کر دیئے ہیں جسے ''ترک اولیٰ'' تو ضرور سمجھا جا سکتا ہے۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

''اور ہم میں سے کوئی نہیں مگر یہ کہ اُس کا ایک خاص مقام ہے اور بلاشبہ ہم پرے جمائے ہوئے ہیں اور بلاشبہ ہم تسبیح کرنے والے ہیں''۔

چونکہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہے، اس لئے نہیں سمجھا جا سکتا کہ یہ آیتیں کس موقع کی ہیں اور اُن کے پہلے کون سی آیات تھیں جن سے ان کا ربط ہے؟ بہرحال یہ خود ان آیات کے مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ فرشتوں کی زبانی کلام ہے اور مترجمین مفسرین سب ہی کو یہ محسوس ہوا ہے کہ ان آیتوں کا تعلق یہاں قبل کی آیتوں سے کوئی نہیں اس لئے اُنہیں یہ اضافہ کرنا پڑا ہے کہ فرشتوں نے یہ کہا؟ مگر انہوں نے کب اور کیوں کہا؟ اس کہنے کا پس منظر کیا ہے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں، شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''یہاں سے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی زبان سے فرمایا جیسے دعائیں فرمائی ہیں آدمیوں کی زبان سے''

پھر گذشتہ آیات سے ربط قائم کرنے کی یوں کوشش کی ہے کہ ''کافر کہتے ہیں فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں جو جنوں کی عورتوں سے پیدا ہوئیں، سو جنوں کو اپنا حال معلوم ہے اور فرشتے یوں کہتے ہیں''۔[1] (موضح القرآن) مگر کافروں کا یہ مزعومہ ہونا خود ثابت نہیں اور قرآن مجید کے الفاظ کے خلاف ہے جس پر پہلے روشنی ڈالی جا چکی ہے پھر جیسے پہلے الجنۃ نام لے کر اُن کے علم کا اظہار ہوا ہے، ویسے ہی اس کے بعد فرشتوں کا نام لے کر اس قول کا ذکر ہونا چاہیے تھا، پہلے بیان ہو جنات کا اور پھر فرشتوں کا ذکر ہوئے بغیر قول نقل ہو فرشتوں کا یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔

وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

''اور یقیناً وہ کہتے تھے کہ اگر ہمارے پاس کوئی یادداشت ہوتی پہلے والوں کی طرف سے تو ضرور ہم اللہ کے نکھارے ہوئے بندے ہوتے، اب انہوں نے اس کا انکار کیا تو اُنہیں (اس کا انجام) معلوم ہوگا''۔

پھر اب یہ اُس فرشتوں کے ذکر سے غیر متعلق تذکرہ شروع ہو گیا مشرکین کا[2] یعنی یہ جب بنی اسرائیل وغیرہ کے انبیاء کا ذکر سنتے تھے تو کہتے تھے کہ ہمارے پاس بھی ایسی ہدایتیں آئی ہوتیں تو ہم میں ایمان اور عمل کی کمی نہ ہوتی مگر اب جب اُن میں نبی مبعوث ہوا تو اُنہوں نے اُسے نہ مانا اور کفر اختیار کیا۔ المخلصین لام کے فتحہ کے ساتھ ہے، اس لئے ہم نے ترجمہ کیا ''نکھارے ہوئے'' مگر تعجب ہے کہ جلالین نے اس کو لام کے کسرہ کے ساتھ قرار دے کر اُس کی شرح یوں کی ہے کہ: المخلصین العبادۃ لہ عبادت کو خالص کرنے والے اُس کے لئے اور اس سے

---

[1] فرشتگان گفتند (شاہ ولی اللہ)

[2] یعنی اہل مکّۃ کانوا یقولون (مجمع البیان) ہمہ آئینہ کافرانِ عرب می گفتند (شاہ ولی اللہ)

زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جناب شیخ طوسیؒ نے بھی یوں تشریح کی ہے کہ:۔ الّذین اخلصوا العبادۃ لہ (تبیان) جنہوں نے عبادت کو اس کے لئے خاص رکھا اور علامہ طبرسیؒ نے بھی بس اخلصوا کو یخلصون کر کے اُسی کو دہرا دیا، بہرحال اصل قرآن میں جب تک المخلصین کو الخلصین سے نہ بدلا جائے، اس وقت تک ہم اس کے موافق ترجمہ کرنے سے قاصر ہیں۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۴﴾ وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۵﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۷﴾ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾

''اور ہمارا قول پہلے ہو چکا ہے اپنے بندوں کے لئے جو پیغمبر بنائے گئے ہیں کہ فتح وظفر اُنہی کی ہوگی اور بلاشبہ ہماری ہی فوج وہ ہے جو غالب آئے گی تو ان سے ایک مدت تک بے اعتنائی کیجئے اور اُنہیں دیکھتے رہیے عنقریب وہ خود دیکھیں گے تو کیا وہ ہمارے عذاب کے لئے جلدی کرتے ہیں تو جب وہ اُن پر نازل ہو جائے گا تو بڑی بری صبح ہوگی اُن کی جو ڈرائے جاتے ہیں اور (ہاں) ایک مدت تک اُن سے بے اعتنائی کیجئے اور دیکھیے کہ عنقریب وہ خود دیکھیں گے، پاک ہے آپ کا پروردگار جو غلبہ کا مالک ہے اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں اور سلام ہو پیغمبروں پر اور شکر ہے اللہ کا جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔

یہ قول الٰہی جو پیغمبروں کے لئے اگر شخصی طور پر ہر ہر فرد کے لئے مانا جائے تو اکثر وہ مشاہدہ کے خلاف نظر آئے گا لہٰذا ماننا پڑتا ہے کہ یہ قول مجموعی طور پر سلسلہ مرسلین کے لئے ہے کہ اُن کا مشن یعنی دین حق غالب آ کر رہے گا جس کے ظہور کی دنیا منتظر ہو یا نہ ہو، ہم یقینی طور پر منتظر ہیں۔

آخری فقرات:

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یوں تو تلاوت قرآن کے اختتام پر کہے جاتے ہیں مگر حدیث یہ ہے کہ انسان ہر محل ومجلس میں گفتگو ختم کر کے یہ جملہ کہے تو ثواب عظیم حاصل ہوگا۔[1]

---

[1] روی الاصبغ بن نباتة عن علیؑ وقد روی ایضا مرفوعا عن النبیﷺ قال من اراد ان یکتال بالمکیال الاوفیٰ من الاجر یوم القیٰمة فلیکن اٰخر کلامه فی مجلسه: سبحان ربّك ربّ العزّة عمّا یصفون وسلام علی المرسلین والحمد الله رب العالمین (مجمع البیان)

سُوْرَۃُ صٓ

مکّیہ----۸۸----آیات

صٓ ایک حرف ہے مقطعات قرآنیہ میں سے جس سے اس سورہ کی ابتدا ہوئی ہے اس لئے اس سورہ کا نام یہی ہو گیا ہے۔

سورۂ ص کے خاص خاص مضامین:

۱۔مشرکین کو اللہ کے ماننے سے انکار نہ تھا اُسے ایک ''ماننا اُن سے نزدیک عجیب بات تھی۔

۲۔مشرکین کی دلیل کہ یہ ہم نے پہلے کسی سے نہیں سنا۔

۳۔مشرکین کی حیرت کہ آخر یہ ایک آدمی (یعنی رسولؐ) کیا خصوصیات رکھتا ہے کہ اللہ نے اس پر اپنا کلام اتارا ہے؟

۴۔حضرت داؤدؑ کے پاس دو فریقوں کا آکر مقدمہ پیش کرنا حضرت داؤدؑ کا فیصلہ اور اُس پر اُن کو انتباہ۔

۵۔بائبل کے بیان کردہ واقعہ اوریائے حتّی کی تصحیح اور جناب داؤد کی عصمت کردار کا تحفظ۔

۶۔مساوات کلی خلاف عدل۔

۷۔جناب سلیمانؑ کا تفصیلی تذکرہ۔

۸۔گھوڑوں کے معائنہ اور آفتاب کے پلٹنے کا بیان۔

۹۔عطائے ملک کے لئے دعا اور اُس کی قبولت۔

۱۰۔جناب ایوبؑ اور اُن کے صبر کا تفصیلی تذکرہ جو اس سورے کے مختصات میں سے ہے۔

۱۱۔بعض غیر معروف انبیاء جیسے یسعؑ اور ذوالکفل کا اجمالی ذکر۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۝١ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝٢ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ۝٣

''صاد قسم قرآن کی جو نصیحت کا حامل ہے بلکہ وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا سرکشی اور پھوٹ ڈالنے میں مصروف ہیں کتنی ہی نسلیں ان کے پہلے ہم نے ہلاک کیں تو اُنہوں نے پکارا اور اب چھٹکارے کا وقت نہ تھا''۔

صٓ تو حروف مقطعات سے ہے جو قدرت کے سربستہ راز ہوتے ہیں، اس کے بعد قسم کھائی ہے، اگر اس قسم پر وقف مطلق نہ ہوتا تو سمجھ میں یہ آتا کہ اس کے بعد درمیان میں ایک جملہ معترضہ ہے کہ باوجود یکہ یہ قرآن نصیحتوں کا حامل ہے، پھر بھی کافر سرکشی سے کام لیتے ہیں اور اختلاف کا ذوق رکھتے ہیں اس لئے تسلیم نہیں کرتے۔

''نصیحت کا حامل'' یہ ترجمہ ایک تفسیر کے مطابق ہے لیکن قرآن مجید میں بعض جگہ ذکر کا عزوشرف کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے انه لذكر لك ولقومك (یعنی) ''یہ آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے عزوشرف ہے'' اور اس لئے ذی الذکر کر کے ایک معنی کہے گئے ہیں ''عزوشرف والا''۔[1]

اب اس کے بعد جو شے قسم کھا کے کہی جارہی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے پہلے اپنی بداعمالیوں سے بہت قومیں ہلاک ہوئیں اور جب ہلاکت کے آثار آنکھوں کے سامنے بالکل آ گئے تب انہوں نے فریادی کی مگر اب تلافی مافات کا وقت گزر چکا تھا، اس لئے چیخ پکار سے کچھ نہ ہوا۔ اسی طرح تمہاری بھی ابھی آنکھیں نہیں کھلتیں، جب عذاب آ جائے گا، اس وقت چیخو چلاؤ گے جس کا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

یہ مفہوم اس پورے کلام کا اُس وقت درست ہوگا، جب والقرآن ذی الذکر پر وقف نہ ہو مگر یہاں تمام قرآنوں میں وقف مطلق کی علامت بنی ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلا کلام یہاں پر ختم ہو گیا ہے اس کے بعد مستقل جملہ ہے لہٰذا بعض لوگوں نے قسم کھا کر جو بات کہی جارہی ہے، اُسے محذوف مانا ہے مگر اُس میں اختلاف ہے، کوئی یہ مانتا ہے کہ قسم ہے اس قرآن کی کہ جو آپ کا پیغام ہے وہ بالکل حق ہے۔[2] اور کوئی یہ کہ قسم اس قرآن کی کفار مکہ جو بہت سے خدا مانتے ہیں، وہ غلط ہے۔[3]

ہمارے نزدیک اگر درمیان کے اُس وقف کو نظر انداز کر دیا جائے اس بنیاد پر کہ ان علامات اوقاف کو تعبداً قبول کرنے کا لزوم ثابت نہیں ہے تو وہی پہلی تشریح درست ہے کہ اصل مورد قسم یہ جملہ ہے کہ ''اپنی بداعمالیوں سے اس کے پہلی کئی قومیں ہلاک ہوئیں یہ مفہوم قدیم مفسرین میں سے بعض کی زبانی ایک قول کی صورت میں نقل ہوا ہے۔

اس پر قواعد نحوی کے لحاظ سے یہ اعتراض دوراز کار ہے کہ جواب قسم میں لانا ہونا چاہیے یہاں ہے کم اهلكنا من قبلهم من قرن یوں نہیں ہے لكم اهلكنا الخ اور كم کا لفظ چونکہ کے مفعول ہے، اس پر لام تاکید آ نہیں سکتا کیوں کہ اہل نحو ہر چیز کو جس طرح چاہتے ہیں کچھ نہ کچھ پوشیدہ مان کر اپنے قواعد کے مطابق کر لیتے ہیں یہاں وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتے، اس لئے کہ وہ كم کو مبتدا مان لیں اور اهلكنا میں ضمیر مفعول کو پوشیدہ مان لیں، اس طرح تقدیر کلام یہ ہوگی کہ لكم اهلكنا من قبلهم احزاب ان کی مبینہ نحوی دشواری دور ہو جائے گی لیکن جب کہ حسب ذیل امور کو پیش نظر رکھا جائے:

(۱) صٓ پر کوئی وقف علامت نہیں ہے جب کہ بعض مقامات پر مقطعات قرآنیہ کے جو حروف ہیں، اُن پر قرآن مجید میں وقف ہے یہاں اس کے بعد والقرآن ذی الذکر پر وقف مطلق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صٓ سے لے کر یہاں تک ایک بات کہی گئی ہے جو یہاں

---

[1] ای ذی الشرف عن ابن عباس رضی اللہ عنہ (مجمع البیان)

[2] قسم القرآن ـــــ کہ آنچہ بآں دعوت می کنی راست است (شاہ ولی اللہ)

[3] جواب هذا القسم محذوف ایها الامر کما قال اهل مکة من تعدّد الالهة (جلالین)

پر پوری ہوئی ہے۔

(۲) بعید نہیں ہے کہ فرمان معصوم اقرأ و کما یقرأ الناس اوقاف کو بھی شامل ہو جس پر عام طور سے افراد ملت حقہ اثنا عشریہ کا عمل ہے۔

(۳) مقطعات قرآنیہ کے متعلق قول معصومؑ یہی ہے کہ وہ اسرار ربانی ہیں، صٓ بھی اُنہی مقطعات قرآنیہ میں سے ہے۔ اور اس کے بعد بس قسم پر بات ختم ہوگئی ہے اور کوئی دوسرا جملہ نہیں ہے۔ ان تمام امور کی بنا پر میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ یہاں اصل جملہ جو قسم کے ساتھ کہا گیا ہے، وہ یہی ہے جو حرف صٓ کے اندر مضمر ہے اور جو بصورت راز پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچایا گیا ہے اور جس کے سمجھنے کی عام لوگوں کو ضرورت نہیں ہے لہٰذا اُن کو اُس کے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہیے۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۫ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝۴ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝۵ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝۶ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝۷ ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ۭ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝۸

''اور انہوں نے تعجب کیا اس سے کہ اُن کے پاس ایک ڈرانے والا (پیغمبر) انہی میں سے آیا اور کافروں نے کہا یہ بڑا جھوٹا جادوگر ہے، کیا اس نے بہت سے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا، یقیناً یہ ضرور ایک عجیب چیز ہے اور اُن میں کے بڑے لوگ آئے کہ چلو اور اپنے خداؤں پر صبر و برداشت کے ساتھ قائم رہو، یقیناً یہی چیز ہے جسے نصب العین ہونا چاہیے۔ ہم نے یہ بات نہیں سنی اس بعد والی نسل میں یہ نہیں مگر گڑھی ہوئی ایک چیز۔ کیا ہم میں سے اُس پر کتاب اُتاری گئی ہے؟ بلکہ وہ میری کتاب سے شک میں ہیں بلکہ انہوں نے ابھی میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا ہے''۔

اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ کا ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ ''یقیناً یہی ایک چیز ہے جسے نصب العین ہونا چاہیے'' یہ اس پر مبنی ہے کہ ھذا کا اشارہ اس بات کی طرف ہو جو اُنہوں نے کہی تھی کہ ''اپنے خداؤں پر صبر و برداشت کے ساتھ قائم رہو'' اور چونکہ یہی اس کے پہلے بلا فاصلہ مذکور ہے لہٰذا اس کا مشار الیہ ہونا ذہن سے زیادہ قریب ہے مگر دوسری تفسیر یہ ہے کہ ھذا کا اشارہ اُس بات کی طرف موجود رسولؐ اپنے پیام کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ رسولؐ کا اس میں کوئی منصوبہ ہے مثلاً غلبہ و اقتدار کا حاصل ہونا اور قوم کو اس پیغام کے ذریعہ سے اپنا تابع بنانا۔[1]

علامہ طبرسیؒ نے اس کے علاوہ بھی کئی مطلب درج کیے ہیں، مگر میرے نزدیک سب بعید ہیں، جو صاف سیدھا مطلب ہے، وہ وہی ہے۔

---

[1] معناہ ھٰذا الّذی یدعیہ محمّد ﷺ ویدعوھم الیہ لشیء یرادبہ امر مامن الاستعلاء علینا والریاسۃ فینا والقھر لنا (تبیان)

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۚ﴿۹﴾ اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ﴿۱۰﴾ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ﴿۱۱﴾

’کیا ان کے پاس تمہارے باعزت، عطا بخش پروردگار کی رحمت کے خزانے ہیں؟ یا کیا اُن کے لئے سلطنت ہے آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں تو پھر چڑھیں رسیوں کو پکڑ کے یہاں تو بس شکست خوردہ گروہوں کی قسم سے ایک لشکر سامنے نظر آرہا ہے‘‘۔

مفسرین کا غالباً اس بنا پر کہ یہ سورۂ مکہ کا نازل شدہ ہے، یہ بیان ہے کہ مشرکین کو بطور پیشین گوئی خبر دی گئی ہے کہ یہ لاؤ لشکر جو نظر آرہا ہے، نتیجہ میں شکست کھائے گا جس کا وقوع بعد میں بدر کی جنگ میں ہو گیا اور ھنالك جس سے اشارہ ایسے منظر کی طرف ہوتا ہے، جو سننے والے کی آنکھوں کی سامنے ہو، اس سے اشارہ اسی آیندہ کے منظر کی طرف ہے جب اُن کے بڑے بڑے سورماؤں کے لاشے زمین پر پڑے ہونگے۔ [1]

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ﴿۱۲﴾ وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الْاَحْزَابُ ﴿۱۳﴾ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴿۱۴﴾ وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۱۶﴾

’’اُن کے پہلے جھٹلایا نوح کی قوم نے اور قبیلہ عاد نے اور فرعون نے جو میخوں والا تھا اور قبیلہ ثمود اور لوط کی قوم اور ایکہ والوں نے، یہی سب گروہ تھے، کوئی نہیں مگر یہ کہ اُس نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو وہ میری سزا کا مستوجب ہوا اور (اب) یہ نہیں انتظار کر رہے ہیں، سوا ایک سخت نعرے کے جس کے بعد کچھ دیر نہ ہوگی اور انہوں نے کہا کہ پروردگار! جو ہماری تقدیر ہو وہ حساب کتاب سے پہلے ہی ہمارے سامنے لے آ‘‘۔

فرعون کے ساتھ ’’میخوں والا‘‘ کا لفظ جس انداز میں ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ نزول آیت کے وقت فرعون کے ساتھ میخوں کا تصور شہرت عام کی حیثیت رکھتا تھا مگر بعد میں امتداد زمانہ سے وہ چرچے گم ہو گئے تو مفسرین کے لئے یہ میخیں ناقابل فہم ہو گئیں، اس لئے کثرت اقوال سے جن میں کوئی بھی قول مستند نہیں ہے، اُن کی نوعیت کے متعلق کچھ بھی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اب تو اسے فرعون کا بس ایک لقب سمجھا جا سکتا ہے جس کی وجہ تسمیہ ہمیں معلوم نہیں۔

قرآنی رسم الخط میں بعض جگہ بڑا عجوبہ معلوم ہوتا ہے مگر عجوبہ سمجھتے ہوئے بھی اُس کی پابندی کرنا پڑتی ہے چنانچہ یہ لفظ جس کا ترجمہ ہوا

---

[1] اخبر الله سبحانه وهو بمكة انّه سيهزم جند المشركين فجاء تاويلها يوم بدر وهناك اشارة الىٰ بدر ومصارعهم بهار (مجمع البيان)

''ایکہ والوں'' اسے فطری طور پر کوئی بھی عربی داں لکھے تو اصحاب الایکۃ لکھے گا جو بالکل درست ہوگا مگر معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں کاتب یہاں اصحاب کے بعد الف لکھنا بھول گیا اس لئے یہاں پر یہ لفظ اصحب لیئکۃ بغیر درمیانی الف کے ہی لکھی جائے گی۔

یہ تذکرہ بہت جگہ قرآن مجید میں ہے کہ کافر لوگ عذاب آنے کا مطالبہ کرتے ہیں اس کی نوعیت کا سمجھا لب ولہجہ سے متعلق ہے جو ظاہر ہے کہ صفحہ کاغذ پر نہیں آتا، اس میں ایک جھنجھلاہٹ کی کیفیت سمجھ میں آتی ہے جیسے انبیا سے بار بار عذاب کی خبروں کو سن کر وہ غصے سے کہیں کہ کان پک گئے سنتے سنتے کہ عذاب آئے گا اور وہ ایسا ہوگا اور ویسا ہوگا، آخر وہ عذاب آ ہی کیوں نہیں جاتا۔

اور دھیمی آواز میں یہ ایک تمسخر کا پیرایہ ہوسکتا ہے کہ عذاب، عذاب، یہ عذاب آ ہی جائے کہ دیکھ لیں اور وہ کیسا ہوتا ہے۔

اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾ اِنَّا سَخَّرْنَا
الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ﴿۱۸﴾ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾
وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾

''جو یہ کہتے ہیں اس پر صبر کیجئے اور ہمارے طاقت والے بندے داؤد کو یاد کیجئے، بلاشبہ وہ بڑا لولگانے والا تھا۔ ہم نے پہاڑوں کو اُس کے قبضے میں کیا تھا کہ وہ تسبیح کرتے تھے شام اور صبح کے اوقات میں اور پرند تمام اکٹھا ہوجاتے تھے، سب اُس کی آواز میں آواز ملاتے تھے اور ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کیا تھا اور اُسے حکمت اور فیصلہ کن گفتگو عطا کی تھی''۔

وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ
مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ
وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَاۤ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾ اِنَّ هٰذَاۤ اَخِيْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً
وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ
بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى
بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا
فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ﴿۲۴﴾ السجدة فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا
لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾

''اور کیا آپ تک پہنچی اُن متخاصمین کی خبر جب وہ دیوار پھاند کر محراب عبادت میں پہنچے جب وہ داؤد کے پاس اندر

پہنچ گئے تو وہ اُن سے ڈر گئے، انہوں نے کہا ڈریئے نہیں، ہم متخاصمین ہیں جن میں ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے تو آپ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجئے اور کسی کی رورعایت نہ کیجئے اور ہمیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت کیجئے۔ یہ میرے بھائی ہیں، ان کے پاس ننانوے گوسفند ہیں اور میرے پاس ایک ہی گوسفند ہے، اس پر بھی انہوں نے کہا کہ یہ مجھے دے دو اور گفتگو میں میرے اوپر چھا گئے (داؤدؑ) نے کہا کہ یہ ان کی تم پر زیادتی ہے جو اپنے (اتنے) گوسفندوں کے ہوتے ہوئے تمہارا گوسفند طلب کیا اور یقیناً بہت سے میل جول رکھنے والے ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں سوا اُن کے جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں اور بہت کم ہیں اور اب خیال کیا داؤد نے کہ ہم نے ان کا امتحان لیا ہے تو وہ اپنے پروردگار سے بخشش کے طلب گار ہوئے اور سجدے میں گر گئے اور توبہ وانابت کرنے لگے تو ہم نے اُن کے لئے اسے معاف کر دیا اور یقیناً اُن کے لئے ہمارے یہاں تقرب ہے اور انجام کی بہتری"۔

حضرت داؤدؑ کا فیصلہ اور اُس پر ان کو انتباہ

یہ وہی اوریائے حتی کی بیوی کا واقعہ ہے جسے مروجہ توریت میں ایسے عنوان سے پیش کیا گیا ہے کہ نبی خدا کی عصمت اُس سے ختم ہو جاتی ہے یعنی معاذ اللہ انہوں نے ناجائز طور پر اُس کی بیوی پر قبضہ کر لیا اور پھر حکمت عملی سے اُس شخص کو قتل کرا دیا اور عدہ گزرنے سے پہلے اس کے ساتھ عقد کر لیا۔ اسرائیلیات کے اثر سے مسلمانوں کے کتب میں بھی یہ تذکرہ آ گیا ہے مگر روایت کا قرآن کے مقابلہ میں کیا اعتبار؟ اور قرآن مجید میں اُس کی جتنی اصلیت ہے وہ پیش کر دی گئی ہے اور وہ ایسی ہے جس سے کسی ایسے فعل کا صدور جو خلاف قانون اور خلاف شرع ہو جناب داؤدؑ سے ظاہر نہیں ہوتا۔[1]

صرف ایسی خواہش ظاہر ہوتی ہے جس کا نہ ہونا بہتر تھا لہٰذا اس کا بس "ترک اولیٰ" کہہ سکتے ہیں۔ گناہ کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور اسی لئے قرآن مجید نے اُس کے تذکرہ کے ختم کرتے ہی اعلان فرما دیا کہ یہ ایک ایسا امر تھا جس سے اُن کے تقرب میں کوئی کمی آئی اور نہ حسن انجام میں کسی طرح کا نقص واقع ہوا بلکہ اگر ترتیب تنزیل مانی جائے تو فوراً اس کے بعد اُن کے لئے ایک منصب کا اعلان ہو گیا کہ یاداؤد انا جعلنا خلیفۃ فی الارض جس کی تفسیر ابھی آتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصل قضیہ میں جناب داؤدؑ سے کوئی ترک اولیٰ بھی قرآن سے ظاہر نہیں ہوتا بلکہ صرف مستغیث کا بیان سن کر بغیر دوسرے فریق کا بیان سنے ہوئے، آپ نے جو حکم جاری کر دیا، یہ وہ ترک اولیٰ تھا جس پر وہ متنبہ ہو کر استغفار کرنے لگے، جناب شیخ الطائفہؒ نے اپنے مختار کی حیثیت سے اس کو ترجیح دی ہے۔[2]

میرے خیال میں اگر اوریائے حتی کا واقعہ توریت میں موجود نہ ہوتا اور اُس کا اہل کتاب میں عموماً چرچا نہ ہوتا جس کے اثر سے علمائے

---

[1] اس میں کسی کا خون نہیں کیا، بے ناموسی نہیں کی (موضح القرآن)

[2] اولیٰ الوجوہ ما قدّمناہ ترک النّدب فی ما یتعلّق بادب القضآء (تبیان)

اسلام نے بھی ایسی روایات درج کر دی ہیں یعنی اس واقعہ سے بالکل خالی الذہن ہوتے تو واقعی الفاظ قرآنی سے ہماری سمجھ میں کسی ایسے عمل کا وقوع ثابت نہ ہوتا جو قابل بحث ہوا اور پھر ہم ترک اولیٰ اُسی کو سمجھتے جو جناب شیخ الطائفہؒ نے اختیار کیا ہے مگر جب کہ یہ واقعہ ہے کہ وہ حکایت اُس وقت موجود تھی اور ذہن کا اُس سے خالی ہونا ممکن نہیں ہے تو اب ذہن میں اس سے زیادہ قریب تصور یہی ہے کہ قرآن مجید کو اُس واقعہ کی اصل شکل کا پیش کرنا منظور تھا اور متخاصمین کے بیان کردہ مقدمہ کی روئداد سے وہ صورت واقعہ سمجھ میں آتا ہے جسے جناب داؤدؑ کا ترک اولیٰ سمجھا جا سکتا ہے۔

جناب داؤدؑ کی نسبت اُس غلط حکایت کا خود مسلمانوں میں کتنی شدت سے چرچا مدت تک رہا، اُس کا ثبوت خود جناب شیخ طوسیؒ کی درج کردہ حدیث سے ہوتا ہے جس میں جناب امیرؑ کو شدت کے ساتھ اس روایت کے بیان کرنے والوں کو تہدید فرمانا پڑی ہے اس طرح کہ آپ نے فرمایا کہ جو ایسا کہے گا، اُس پر میں دو طرح کی حد شرعی جاری کروں گا، ایک وہ جو کسی پر زنا کاری کی تہمت لگانے سے جاری ہوتی ہے اور ایک جو کسی پیغمبر کی توہین پر جاری ہونا چاہیے۔[1]

علامہ طبرسیؒ نے بھی اس حکایت کی سختی کے ساتھ رد فرمائی ہے اور کہا ہے کہ اس میں حضرت داؤدؑ کا جو کردار بتایا گیا ہے وہ ایک شخص عادل کی عدالت کے منافی ہے، چہ جائیکہ شانِ نبوت جس میں عصمت جزلازم ہے۔[2]

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾

''اے داؤدؑ ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ مقرر کیا ہے تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے بلاشبہ جو لوگ بھٹکتے ہیں اللہ کے راستے سے اُن کے لئے سخت عذاب ہے اس سے کہ اُنہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا''۔

خلیفہ کا ترجمہ جناب شاہ ولی اللہ نے ''بادشاہ'' کے لفظ سے کر دیا جس سے خود اُن کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین مطمئن نہیں ہوئے اور اُنہوں نے ''نائب'' کے لفظ کے ساتھ ترجمہ کیا جو زیادہ حقیقت سے قریب ہے مگر اس کے ساتھ اقتدار سلطنت کا مفہوم بھی ملحوظ رکھنا ہو گا ورنہ بحیثیت رہنمائے خلق سرسلسلہ انبیاء جو حضرت آدمؑ ہیں، اُنہی کے لئے اعلان ہو گیا تھا اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ''میں زمین میں ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں'' تو پھر جناب داؤدؑ کی خصوصیت کیا ہے؟ اس لئے یہاں بقرینہ مقام و بقرینہ تخصیص خلیفہ کے مفہوم میں بہ نیابت الٰہی اقتدار سلطنت کو مضمر ماننا پڑے گا۔

---

[1] روی عن علی علیہ السلام انہ قال لا اولیٰ برجل یقول ان داؤد ارتکب فاحشۃ الاضربتہ حدّین احدھما القذف والاٰخر لاجل النبوّۃ (تبیان)

[2] جلّ انبیاء اللہ عن ذٰلک (مجمع البیان)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿۲۷﴾ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾

''اور ہم نے پیدا کیا آسمان اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو غلط طور پر یہ گمان ہے اُن لوگوں کا جو کافر ہیں، وائے ہو اُن کے لئے جو کافر ہیں آتش جہنم سے۔ کیا ہم اُنہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے مثل زمین میں فساد پھیلانے والوں کے قرار دیں یا پرہیزگاروں کو مثل فاسق وفاجر لوگوں کے قرار دیں''؟

اس میں قرآن مجید نے دو حیثیتوں سے خالق کے لئے وجوب عدالت کا اظہار کیا ہے اور کافروں سے تخاطب کر کے یہ کہا کہ کیا ہم ایسا کریں گے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ عقل عدالت کو خالق کے لئے لازم قرار دیتی ہے اور خالق عقل کے اس فیصلے کو مستند قرار دیتا ہے۔ یہ بھی اس سے ظاہر ہے کہ خالق کی عدالت کا انکار، اُس کے لئے فعل عبث کی تجویز اور ظلم کی نسبت کفار کا شیوہ ہے۔ اہل ایمان کی شان یہ نہیں ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾

''یہ وہ کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر اتارا ہے، بابرکت تا کہ وہ اُس کی آیتوں میں غور کریں اور تا کہ عقل والے نصیحت حاصل کریں''۔

قرآن کے بابرکت ہونے کے معنی

''برکت'' کے معنی عربی میں ''دیرپا'' ہونے کے ہیں، اس لئے کتاب کے بابرکت ہونے میں یہ پہلو بھی مضمر ہے کہ وہ تاعمر زمانہ باقی رہنے والی ہے، کبھی منسوخ ہونے والی نہیں اور یہ بھی کہ وہ فنا ہونے والی نہیں بلکہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے جسے دوسری جگہ ان الفاظ میں کہ انا لہ لحافظون (حجر۔۹)۔ (یقیناً ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) سے ظاہر کیا گیا اور یہ بھی کہ جتنا غور کیا جاتا رہے اس کے حقائق ونکات کا انکشاف ہوتا رہے گا، وہ کبھی ختم ہونے والے نہیں جسے کلام معصوم میں ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ:۔

لا تنقضی عجائبہ ولا تغنیٰ غرائبہ: اُس کے عجیب عجیب مطالب ختم ہونے والے نہیں، اس کے نادر مضامین فنا پذیر نہیں ہیں۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾ اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ﴿۳۱﴾ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾ رُدُّوْهَا عَلَيَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾

''اور ہم نے داؤدؑ کو سلیمانؑ (کا ایسا بیٹا) عطا کیا، وہ بہت اچھا بندہ تھا، جب اُسے شام کے وقت تیز رفتار گھوڑوں کا معائنہ کرایا جا رہا تھا تو اُس نے کہا کہ میں نے ان گھوڑوں کی محبت کو اختیار کیا اپنے پروردگار کی یاد سے غافل ہو کر

یہاں تک کہ وہ (سورج) پردے میں چھپ گیا۔ واپس لاؤ اُنہیں میری طرف تو وہ اُن کی پنڈلیوں اور گردنوں کو قطع کرنے لگا''۔

گھوڑوں کے معائنہ اور آفتاب کے پلٹنے کا بیان

خیر کا لفظ بعض جگہ قرآن مجید میں مال و دولت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اس لئے یہاں بھی ترجمہ مال و دولت کے ساتھ ہوسکتا ہے اور کیا گیا ہے۔[1]

مگر جناب شیخ الطائفہؒ نے اکابر مفسرین کا قول کلام عرب کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ خیر کا لفظ عربی محاورے میں خیل یعنی گھوڑوں کے معنی میں آتا ہے۔[2] اور علامہ طبرسیؒ نے اس کے لئے کلام عرب سے کئی شاہد درج کیے ہیں، بہرحال صورت واقعہ یہ بتائی گئی ہے۔ جو الفاظ قرآن سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جناب سلیمانؑ گھوڑوں کے معائنے میں ایسے محو رہے کہ نماز عصر کا وقت گزر گیا اور سورج غروب ہوگیا۔ اس پر وہ پشیمان ہوئے اور اب اس غفلت کے کفارے کے طور پر انہوں نے ان سب کی قربانی کر کے گوشت راہ خدا میں تقسیم کر دیا۔ اکثر مفسرین کا خیال یہی ہے[3] اور یہی مفہوم ذہن سے زیادہ قریب ہے۔ بعض لوگوں نے معنی یہی کہے ہیں کہ ان کی گردنوں اور پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرنے لگے[4] مگر قبل کی صورت حال سے اس کا تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔

ہاں ایک تفسیر آیت کی جس کی موافقت میں امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی زبانی روایت آئی ہے۔ اگر مان لی جائے تو مسحا بالسوق والاعناق کا یہ مفہوم بھی ذہن سے قریب ہوسکتا ہے وہ تفسیر یہ ہے کہ جیسے توارت کی ضمیر آفتاب کی طرف راجع ہے، ویسے ہی ردوھا کی ضمیر بھی آفتاب کی طرف عائد ہے مطلب یہ ہے کہ جب انہیں احساس ہوا کہ سورج ڈوب گیا اور نماز عصر ان کی قضا ہوگئی تو انہوں نے خدا سے دُعا کی کہ آفتاب ان کے لئے پلٹا دیا جائے چنانچہ آفتاب پلٹا اور انہوں نے نماز عصر ادا کی۔[5]

مجھے جناب امیرؑ کی طرف اس روایت کی نسبت میں تامل یوں ہے کہ اس صورت میں ردھا علی ہونا چاہیے تھا (یعنی)، اے اللہ! پلٹا دے اسے مجھ پر، نہ کہ ردوھا علی جو جمع حاضر کو صیغہ ہے کہ ''پلٹا دو اُسے مجھ پر''۔ یہ کون ہیں جن سے وہ آفتاب پلٹانے کے لئے کہیں؟

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾ فَسَخَّرْنَا لَهُ

---

[1] دوست داشتم ایں اسپاں را از قبیل رغبت مال (شاہ ولی اللہ) دوست رکہا محبت مال کو (رفیع الدین)

[2] العرب تسمّی الخیل الخیر (تبیان) حبّ الخیر ای الخیل (جلالین)

[3] ای ذبحھا وقطع ارجلھا (جلالین)

[4] ہاتھ پھیرنا بالوں پر اور گردنوں کو (شاہ رفیع الدین)

[5] قیل معناہ انّہ سال اللہ تعالیٰ ان یرد الشمس علیہ فردّھا علیہ حتی صلّی العصر فالھاء فی ردّوھا یۃ عن الشمس عن علی بن ابی طالب علیہ السلام (مجمع البیان)

الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾
وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ
حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾

''اور ہم نے سلیمانؑ کی آزمائش کی اور ڈال دیا اُن کے تخت پر ایک جسم، پھر انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کی، کہا پروردگار! مجھے بخش دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا کر دے جو میرے بعد کسی کی شان کے لائق نہ ہو، یقیناً تو بڑا عطا کرنے والا ہے تو ہم نے ہوا کو اُن کے قبضے میں دے دیا کہ وہ اُن کے حکم پر جہاں وہ چاہیں بآہستگی رواں ہوتی تھی اور شیطانوں کو جن میں ہر عمارت بنانے والا اور غوطہ لگانے والا تھا اور دوسرے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہ ہماری عطا ہے تو خوب احسان کرو یا بے اندازہ روک رکھو، بلاشبہ اُن کے لئے ہمارے یہاں تقرب کا درجہ تھا اور انجام کی بہتری''۔

ان تمام آیتوں کی تشریح کے لئے واقعہ کے مستند تفصیلات کی ضرورت ہے جو افسوس ہے کہ ہمارے دسترس میں نہیں ہے۔ تفسیری روایات جو ان امور میں وارد ہوئی ہیں، وہ اتنی غیر مستند ہیں کہ اُن سے کوئی وثوق حاصل نہیں ہوسکتا۔ ان میں سے ایک جو کسی حد تک قابل قبول ہے، یہ ہے کہ اُنہوں نے ایک دفعہ یہ کہہ دیا کہ میری ستر بیویاں ہیں، ہر ایک کے پاس جاؤں گا تو میرے ستر بیٹے ہوں گے مگر اس کے ساتھ انشاء اللہ نہیں کہا۔ یہی بات قدرت کو ناپسند ہوئی اور اُن تمام بیویوں کے پاس جانے پر ان میں سے کسی کے یہاں اولاد نہیں ہوئی اور ایک کے یہاں ہوا تو مردہ بچہ جسے اُن کے تخت پر لا کر ڈال دیا گیا۔ اب اُنہیں توجہ ہوئی کہ میں نے انشاء اللہ نہیں کہا تھا اور اس پر انہوں نے توبہ و انابت کی، اس کے علاوہ بعض قصے بیان ہوئے ہیں جو زیادہ مہمل و دل حزن ہیں۔

بہر حال جو چیز قطعی دلائل سے ثابت ہے یعنی عصمت انبیاء اُس کے خلاف افواہی باتیں جن کا کوئی معتبر ماخذ نہیں، وزن ہی کیا رکھتی ہیں؟ جناب شیخ الطائفہؒ نے بھی ان افواہی باتوں کو بیان کر کے بس اس مسلمہ دینی حقیقت یعنی عصمت انبیا کو یاد دلایا ہے اور پھر اُن بیانات پر کوئی محاکمہ نہیں کیا ہے۔

ایک بات آدمؑ سے لے کر سلیمانؑ تک برابر دیکھنے کی ہے کہ جو ترکِ اولیٰ اُن سے ایسا ہوا اور اُنہوں نے توبہ و انابت کی، اُس کے بعد بجائے سزا کے وہ اُن کے منصب پر بھیج دیئے گئے جسے حضرت آدمؑ یا اُس کے بعد اُن کے لئے کسی منصب خاص کا اعلان ہو گیا جیسے جناب داؤدؑ اور یہاں جناب سلیمانؑ باوجود یکہ باپ والی حکومت کے مالک تھے، اب اُنہوں نے وہ سلطنت طلب کی جو اُن کے مخصوصات میں سے ہو اور خداوند عالم نے نہ صرف اُن کی درخواست کو قبول فرمایا بلکہ اس کے ساتھ اُن کے لئے تقرب خاص اور حسن انجام کا اعلان بھی فرما دیا۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ﴿۴۱﴾
اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿۴۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ

مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾

''اور یاد کرو ہمارے بندے ایوبؑ کو جب اُنہوں نے پکارا اپنے پروردگار کو کہ مجھے گرفتار کیا ہے شیطان نے سختی اور تکلیف میں۔ اپنا پیر مارو، یہ نہانے کے لئے پانی ہے ٹھنڈا اور پینے کا اور ہم نے اُنہیں عطا کی اُن کی آل اولاد اور اُن ہی کے ایسے اُن کے ساتھ اپنی رحمت سے اور یادگار صاحبانِ عقل کے لیے''۔

جناب ایوب علیہ السلام اور ان کے صبر کا تفصیلی تذکرہ

''مجھے گرفتار کیا ہے شیطان نے'' اس کا کیا مطلب؟ چونکہ ہمیں جو اُن کی تکلیف معلوم ہے عوارض جسمانی اور آفات ارضی وسماوی کے قبیل سے ہے تو اس شیطان کا کیا دخل؟ اس لئے بعض نے یہ کہا ہے کہ یہاں یہ عوارض اور مصائب وآلام مراد نہیں ہیں بلکہ ذہنی کشاکش جو سابق اللہ کی نعمتوں کے زوال اور مصائب کی فراوانی کے تصور سے ہوتی ہے جس میں انسان کو اپنے ایمان میں تزلزل محسوس ہوتا ہے، وہ مراد ہے۔ اسے وہ شیطان کی وسوسہ انگیزی کہہ رہے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ وہ ان تصورات کو بے جا اور اس فکر کو غلط سمجھتے ہیں۔[1] مگر اس صورت میں ان کی مناجات کے جواب میں صرف ان تکلیفوں کے زوال کا بیان جیسے کافی معلوم نہیں ہوتا بلکہ مزید کچھ ان کے استحکام ایمان کے سلسلہ میں اطمینان دہانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ شیطان کی وسوسہ انگیزی کو اُنہوں نے اپنے متعلق نہیں کہا ہے بلکہ شیطان کی وسوسہ انگیزی نے عام لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اُن کی بیماری کی وجہ سے اُن کو اچھوت سمجھ لیں اور اُن کے قریب جانے سے پرہیز کریں۔ اس قول کے باوجود یکہ نسبت امام جعفر صادقؑ کی طرف بھی ہے مگر ہمارے علماء نے اُسے قبول نہیں کیا ہے اس تصور کی بنا پر کہ انبیاء کو کسی ایسے مرض میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے جس سے لوگ نفرت کریں۔[2] لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ اگر مرض واقعی قابل نفرت نہ ہو مگر لوگ پروپیگنڈے کی بنا پر اور عداوت وعناد سے بے جا طور پر الگ رہنے لگے ہوں اور دوسرے لوگوں کو الگ رہنے کو کہتے ہوں جیسا کہ شیطان کی طرف اُس کے اسناد سے ظاہر ہے تو اس میں شانِ رسالت پر کیا اثر پڑتا ہے جب کہ اُس میں شانِ عصمت کا تحفظ ہو رہا ہے۔

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

''اور اپنے ہاتھ میں ایک گچھا لے کر اُسے مارو اور اپنی قسم کی مخالفت نہ کرو، بے شک ہم نے اُسے صبر کرنے والا پایا بڑا اچھا بندہ، یقیناً وہ لو لگانے والا تھا''۔

ان واقعات کے بیان میں قرآن مجید کے اندازِ تذکرہ سے ظاہر ہے کہ یہ واقعات بوقت نزول قرآن مجید عام طور پر معلوم ومشہور تھے۔

---

[1] مسّنی الشیطان ای وسوسنی وذکّرنی ما کنت فیہ من نعم اللہ فی الاھل والولد والمال وکیف زال ذٰلک کلّہ (تبیان)

[2] قال اھل التحقیق انّہ لا یجوز ان یکون بصفۃ یستقذرہ النّاس علیھا لانّ فی ذٰلک تنفیرا (مجمع البیان)

اس لئے قرآن صرف اجمالاً بلکہ اشارۃً اُن کا ذکر کر کے آگے بڑھ جاتا ہے جس سے وہ لوگ جو اُس پر مطلع نہیں ہیں، پورے واقعہ کو سمجھ نہیں سکتے۔ ہم ایسے دور افتادہ افراد تفصیلات کے لئے اب روایات کے دست نگر ہو گئے ہیں چنانچہ اس واقعہ کے سلسلے میں جو معلوم ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی بات پر حضرت ایوبؑ نے اپنی زوجہ کے لئے قسم کھائی تھی کہ وہ سو چھڑیاں یا تازیانے لگائیں گے لیکن وہ بیوی بظاہر مقربانِ الٰہی میں سے تھیں لہٰذا خالق نے ایسی صورت بتائی ہے کہ اُن کی قسم بھی پوری ہو جائے اور اُس خاتون کو کوئی خاص تکلیف بھی نہ ہو۔ [1]

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿۴۷﴾ وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ﴿۴۸﴾

''اور یاد کرو ہمارے بندگان خاص ابراہیمؑ واسحاقؑ اور یعقوبؑ کو جو خاص دسترسوں اور نگاہوں والے تھے۔ ہم نے اُنہیں عالمِ آخرت کی یاددہانی کی پرخلوص صفت کے ساتھ مخصوص کیا اور بلاشبہ وہ ہمارے نزدیک نیک آدمیوں میں تھے اور یاد کرو اسماعیل، یسع اور ذوالکفل کو اور ہر ایک نیک آدمیوں میں سے تھا''۔

بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ کی ترکیب نحوی اور اُس کے مضمرات میں بہت سے پہلو ہیں جنہیں علامہ طبرسیؒ نے درج فرمایا ہے لیکن واضح مفہوم یہی ہے کہ الدار سے مراد عالمِ آخرت ہے اور اُس کی یاددہانی اُن کا امتیازی وصف ہے جسے خالصة کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ اس طرح ذکری الدار خالصة کے ابہام کی تشریح ہے۔ اس کے موافق نے ترجمہ کیا ہے۔ [2]

هٰذَا ذِكْرٌ ۭ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۹﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ﴿۵۰﴾ مُتَّكِـــِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿۵۱﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿۵۲﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾

''یہ بڑا اہم تذکرہ ہے اور بلاشبہ پرہیزگاروں کے لئے انجام کی بہتری ہے۔ وہ جاودانی بہشت جس کے دروازے اُن کے لئے کھلے ہوں گے۔ وہ تکیوں سے لگے ہوئے بیٹھے ہوں گے، منگوا رہے ہوں گے اُن میں بکثرت فواکہ اور پینے کے شرابت اور اُن کے پاس نگاہوں کو محدود رکھنے والی ہم عمر حوریں ہوں گی۔ یہ وہ ہے جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے حساب کے دن کے واسطے۔ یقیناً یہ ہماری طرف کا مخصوص رزق ہے جس کے لئے ختم ہونا نہیں ہے''۔

---

[1] قیل انّه کان خلف علیٰ امرأته لامر انکوه لئن عوفی لیضربنها مائة (تبیان)

[2] الخالصة بمعنی الخلوص والذّکری بمعنی التذکیر ای خلص لهم تذکیر الدّار وهو انّهم کانو اینذکرونها بالتأهب لها ولیزهدون فی الدّنیا کما هو عادة الانبیآء (مجمع البیان)

''یہ ایک بڑا اہم تذکرہ ہے''۔ یہ ترجمہ ایک تفسیر کے مطابق ہے۔[1] اس کے علاوہ بعض مقامات پر ذکر کے معنی شرف اور درجہ امتیازی کے بھی آئے ہیں۔ اس طرح انبیاء کے تذکرہ کے بعد اس لفظ کا یہ مطلب ہوگا یہ جوان بزرگوں کو خصوصیات حاصل تھے، یہ اُن کے لئے ایک خاص عزت و امتیاز کی حیثیت رکھتے تھے۔[2] اور یوں اس کے علاوہ انجام کی بہتری کلیۃً حسن عمل سے وابستہ ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ بعد کو ہوا ہے۔ حوروں کے لئے متعدد جگہ اس طرح کے وصف سے جس کے لئے یہاں قاصرات الطرف کا لفظ ہے جس کا ترجمہ ہم نے کیا ''نگاہوں کو محدود رکھنے والی''۔[3]

اور سورۂ رحمن میں اس کے علاوہ مقصورات فی الخیام ''خیموں کے اندر محدود رہنے والیاں'' اس طبقہ (صنف نازک) کے لئے خالق کی نظر میں جو پسندیدہ معیار ہے، اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اس صنف کے لئے خالق کی نگاہ میں وہ کوئی خوبی نہیں ہے جسے آج کل ''ایڈوانس'' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے ''سوشل'' کہہ کے تعریف کی جاتی ہے جو موجودہ دور ارتقاء کی ذہنیت کی ترجمان ہے۔

هٰذَا ؕ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ۙ﴿۵۵﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۵۶﴾
هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ۙ﴿۵۷﴾ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ؕ﴿۵۸﴾ هٰذَا فَوْجٌ
مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾

''یہ تو ہے (ایک طرف) اور یقیناً سرکشوں کے لئے انجام کی برائی ہے، دوزخ جس کی گرمی وہ اٹھائیں گے تو کیا برا وہ ٹھکانا ہے۔ اب یہ ہے تو اُسے انہیں چکھنا ہے، گرم پانی اور پیپ اور اسی صورت کی ملتی جلتی ہوئی چیزیں۔ یہ ایک بڑا انبوہ ہے جو تمہارے ساتھ داخل ہو رہا ہے۔ کوئی ''خوش آمدید'' ان کے لئے نہیں ہے انہیں تو اس آگ کی گرمی برداشت کرنا ہے''۔

''یہ ایک بڑا انبوہ ہے جو تمہارے ساتھ داخل ہو رہا ہے'' اس سے ظاہر ہے کہ پہلا عذاب جو بیان ہوا ہے، وہ لیڈروں اور غلط پیشواؤں کا ہے اور وہ جو اُن کے ساتھ داخل ہونے والے ہیں بے چارے اُن کے پیرو ہیں۔ بعد کی آیت سے کچھ ایسا سمجھ میں آتا ہے کہ لا مرحباً بهم ''کوئی خوش آمدید ان کے لئے نہیں ہے'' یہ ان لیڈروں کا قول ہے جن سے خطاب ہوا تھا کہ ''یہ ایک بڑا انبوہ ہے جو تمہارے ساتھ داخل ہو رہا ہے'' اسے سن کر جیسے وہ کہتے ہیں۔[4] کہ ہمیں اس انبوہ سے کوئی غرض نہیں ہے، کوئی ''خوش آمدید'' ان کے لئے نہیں ہے۔ یہ کم بخت تو دوزخ کے مستحق ہے، اس پر وہ اُن سے کہیں گے جو بعد کو ہے۔

قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۟ قف لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ؕ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾

---

[1] هٰذا ذکر لهم بالثناء الجمیل هنا (جلالین)

[2] ای شرف لهم وذکر جمیل وثناء حسن یذکرون به فی الدّنیا ابدا (مجمع البیان)

[3] ما بسات العین علیٰ ازواجهنّ (جلالین)

[4] انّ القادة والرؤساء یقولون للاتباع لا مرحبا بهؤلاء انّهم یدخلون النّار (مجمع البیان)

قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿٦١﴾

''انہوں نے کہا بلکہ تم، تمہارے لیے ''خوش آمدید'' نہ ہو، تم ہی یہ دن ہمارے سامنے لائے تو کیا برا ٹھکانا ہے (پھر کہا) اے ہمارے پروردگار! جو ہمارے سامنے اُسے لایا اسے دردناک عذاب کر اس آگ میں''۔

چونکہ لیڈروں نے اصل دوزخی ان اپنے پیروؤں کو قرار دیا تھا، اس لئے اب یہ اُن کی جانب سے اُس کا جواب ہے۔[1] جو بل سے شروع ہو رہا ہے، یعنی ہم اصل دوزخی کیوں ہونے لگے، بلکہ تم نے ہمیں گمراہ کیا اور تمہاری اطاعت سے یہ روز بد ہمارے سامنے آیا ہے۔[2] اور اس لئے وہ پروردگار عالم سے کہہ رہے ہیں کہ انہیں دونی سزا دے۔ خود ان کی گمراہی کی بھی اور ہمارے گمراہ کرنے کی بھی۔

وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴿٦٢﴾ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴿٦٣﴾ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾

''اور انہوں نے کہا کہ کیا بات ہے ہم اُن اشخاص کو نہیں دیکھتے جنہیں ہم بہت برے آدمیوں میں شمار کرتے تھے۔ ہم نے اُن کا (بلاوجہ) مذاق اڑایا تھا یا نظریں اُن کے دیکھنے سے چوک رہی ہیں؟ یقیناً ایسا ہی واقعی ہونا ہے دوزخ والوں کا آپس کا جھگڑا''۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٦٥﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿٦٦﴾

''کہہ دیجیے کہ میں تو بس ڈرانے والا ہوں، اور کوئی خدا نہیں سوا اللہ کے جو یکتا، زبردست، آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کا پروردگار، عزت کا مالک، بخشنے والا ہے''۔

قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿٦٧﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿٦٨﴾ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٦٩﴾ اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٠﴾

''کہئے یہ بہت بڑی خبر ہے جس سے تم بے اعتنائی اختیار کرتے ہو مجھے تو کوئی علم نہیں تھا عالم بالا کے رہنے والوں کا جب وہ سوال و جواب کر رہے تھے، میری طرف وحی نہیں ہوتی سوا اس کے کہ میں صاف صاف ڈرانے والا ہوں''۔

اس کو اگر قبل کے تذکرہ سے متعلق کیا جائے تو وہ سوال و جواب اہل دوزخ کے تابعین و متبوعین کا ہوگا مگر ملا اعلیٰ کا لفظ اُس پر زیادہ

---

[1] تابعان گویند (شاہ ولی اللہ) پہلے وہ تھے جو دنیا میں سردار تھے، پچھلے وہ جو ادنیٰ تھے (موضح القرآن)

[2] ای حملتمونا علی الکفر الّذی اوجب لنا هذا العذاب (مجمع البیان)

منطبق نہیں اور اگر بعد کے تذکرے سے متعلق سمجھا جائے تو ملا اعلیٰ سے مراد فرشتے ہوں گے جن میں اور ابلیس میں سجدہ آدم کے باب میں اختلاف عمل نمودار ہوا اور پھر خالق اور ابلیس کے درمیان سوال و جواب ہوا۔ بعض لوگوں نے اُسے اُس سوال سے متعلق کیا ہے جو فرشتوں کی طرف سے اعلان خلافت آدمؑ کے متعلق ہوا۔[1] مگر ملائکہ کی عصمت کو دیکھتے ہوئے اس سوال و جواب کو اختصام یعنی آپس کے جھگڑے کے لفظ سے تعبیر کیا جانا دل کو لگتی ہوئی بات نہیں ہے، پھر جب کہ خلافتِ آدمؑ والے اعلان کا یہاں قبل اور بعد میں کہیں ذکر نہیں ہے لیکن اس کے بعد بلا فاصلہ سجدہ آدمؑ کے حکم اور ابلیس کے انکار کا ذکر موجود ہے، تو بلا وجہ اسے کسی دوسرے واقعہ سے متعلق کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿٧١﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ
مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿٧٢﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿٧٣﴾ اِلَّآ
اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٤﴾ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ
لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ﴿٧٥﴾ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ
خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿٧٦﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿٧٧﴾ وَّاِنَّ
عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٧٨﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿٧٩﴾ قَالَ
فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿٨٠﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿٨١﴾ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ
لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٢﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٨٣﴾ قَالَ فَالْحَقُّ ۚ وَالْحَقَّ
اَقُوْلُ ﴿٨٤﴾ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٥﴾

''جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک انسان مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں تو جب میں اسے تیار کرلوں اور اُس میں اپنی خاص روح میں کا ایک جزء پھونک دوں تو اُس کے سجدے میں گر جانا تو جتنے فرشتے تھے سب نے سجدہ کیا سوا ابلیس کے اُس نے گھمنڈ کیا اور وہ کافروں میں سے تو تھا ہی۔ ارشاد ہوا اے بلیس! کون امر تجھے مانع ہوا اس سے کہ تو سجدہ کرے اُسے جسے میں نے خود اپنی قدرت خاص سے پیدا کیا ہے؟ تو کیا تو نے گھمنڈ سے کام لیا ہے یا تو واقعی اونچے طبقے والے افراد میں سے تھا؟ اُس نے کہا میں اُس سے بہتر تو ہوں ہی، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا تھا اور اُسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ اس پر ارشاد ہوا تو نکل جا اُس میں سے کہ تو (ہمیشہ کے لیے) راندا ہوا ہے اور یقیناً تجھ پر میری لعنت ہے روز قیامت تک۔ اُس نے کہا پروردگار! مجھے مہلت

---

[1] یعنی بالملا الا علی الملائکة اختصموا فی اٰدم حین قیل لهم: انّی جاعل فی الارض خلیفة فی قول ابن عباس وقتادة والسدی (تبیان) یختصمون فی شان آدم حین قال الله: انّی جاعل فی الارض خلیفة (جلالین)

دے اُس دن تک کہ جب سب دوبارہ زندہ ہوں گے۔ کہا تجھے موقع دیا جاتا ہے مقررہ وقت والے دن تک۔ اُس نے کہا تو قسم ہے تیرے عزت وجلال کی کہ میں اُن سب کو گمراہ کروں گا سوا تیرے خاص نکھارے ہوئے بندوں کے۔ ارشاد ہوا کہ پھر یہ حقیقت ہے اور جو حقیقت ہو وہی میں کہتا ہوں کہ میں لازماً بھر دوں گا دوزخ کو تجھ سے اور اُن سے جو اُن میں سے تیری پیروی کریں گے''۔

اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ تو نے گھمنڈ سے کام لیا ہے یا واقعی تو اونچے طبقے والے افراد سے تھا، اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ کوئی اونچا طبقہ ایسا تھا جو سجدہ آدمؑ پر مامور نہ تھا مگر بعض حضرات نے اس عالین کے لفظ کو اس مفہوم میں لیا ہے جیسے فرعون کیلئے قرآن میں آیا ہے: علا فی الارض ''اُس نے روئے زمین پر بڑا بننے کی کوشش کی'' اسی طرح ایک جگہ ہے: تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ ''وہ آخرت کا گھر اُن کے لئے ہے جو روئے زمین پر بڑا بننے کی کوشش نہیں کرتے۔[1] مگر اس صورت میں اُس کا مفہوم استکبرت ''کیا تو نے تکبر کیا'' سے ملتا جلتا ہوگا تو اُسے حرف عطف کے ساتھ یوں ہونا چاہیے تھا کہ استکبرت و کنت من العالین مگر وہاں ام کے لفظ کے ساتھ آیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ استکبار کے مقابل کی کوئی چیز ہے اور بعض مستند مفسرین کی تشریح ہمارے موافق ہے۔[2]

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿۸۶﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿۸۸﴾

''کہئے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ اس پر نہیں مانگتا اور نہ میں زبردستی کی باتیں کرنے والوں میں سے ہوں۔ یہ نہیں ہے سوا نصیحت وہدایت کے تمام دنیا جہان کے لئے اور کچھ مدت کے بعد تمہیں اس کا حال معلوم ہوگا''

''نہ میں زبردستی کی باتیں کرنے والوں میں سے ہوں'' یعنی بغیر مستحکم دلائل کے خواہ مخواہ ادعائے رسالت کروں، ایسا نہیں ہے۔[3] اور ایک مفہوم یہ کہا گیا ہے کہ میں خالق کی طرف سے مامور ہوا ہوں ورنہ میں بلاوجہ از خود یہ زحمت کیوں اُٹھاتا۔[4]

---

[1] استکبرت یا ابلیس ای طلبت المتکبّر با متناعك من السّجود له ام کنت من العالمین الّذین یعلون علی الحقّ تجبّرا و تکبرا (تبیان)

[2] ام کنت من الّذین تعلوا اقدارهم عن السّجود فتعالیت عنه (مجمع البیان)

[3] ای ولست ممن یتعسّف فی طلب الامر الّذی لا یقتضیه العقل (تبیان) المتقوّلین القرآن من تلقاء نفسی (جلالین)

[4] من المتکلفین لهذا القرآن من تلقاء نفسی وقیل معناه انّی ما اتیتکم رسولا من قبل نفسی ولم اتکلّف هذا الّا بامر امرت به (مجمع البیان)

سُوْرَۃُ الزُّمَرِ

مکّیہ----۷۵----آیات

''زُمر'' زُمرہ کی جمع ہے جس کے معنی گروہ کے ہیں، چونکہ اس سورہ کے دوران میں اہل جنت اور اہل جہنم دونوں کے لئے کہا گیا ہے کہ بصورت زمر یعنی گروہ در گروہ اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف جائیں گے، اس لئے اس سورے کا نام زُمر ہوا۔

سورۂ زمر کے خاص خاص مضامین:

۱۔ مشرکین کی اپنی بت پرستی کے لئے یہ توجیہ کہ ہم ان کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو اللہ سے قریب کریں جیسا اپنے الفاظ میں اس وقت کے تعلیم یافتہ بت پرست بھی اکثر اپنی بت پرستی کی توجیہ میں کہا کرتے ہیں۔

۲۔ انسانوں کی تین تاریکیوں کے اندر درجہ بدرجہ تخلیق۔

۳۔ کوئی دوسرے کا بار نہیں اٹھائے گا۔

۴۔ عالم اور جاہل برابر نہیں۔

۵۔ صبر کرنے والوں کے لئے اجر بے حساب۔

۶۔ سب کی سننا چاہیے اور اُس میں جو بہتر ہو اُسے قبول کرنا چاہیے۔

۷۔ رسولؐ سے خطاب کہ آپ کو بھی سب کی طرح موت سے دوچار ہونا ہے۔

۸۔ وفات بصورت موت اور بصورت خواب۔

۹۔ گناہ گاروں کو ناامید نہ ہونا چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ① اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ② اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ
دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ

فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۙ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝۳

''کتاب کا اتارا جانا ہے اللہ کی طرف سے جو عزت والا، صحیح کام کرنے والا ہے یقیناً ہم نے آپ پر یہ کتاب اُتاری ہے سچائی کے ساتھ تو اللہ کی عبادت کیجئے خالص رکھتے ہوئے دین کو اُس کے لئے۔ معلوم رہے کہ خالص دین کا مرکز صرف اللہ ہے اور جنہوں نے اُس کے علاوہ سرپرست بنا لئے ہیں (کہتے ہیں کہ) ہم اُن کی عبادت نہیں کرتے ہیں مگر اس لئے کہ ہم کو اللہ کی بارگاہ میں قریب کریں، بلاشبہ اللہ فیصلہ کرے گا اُن کے درمیان اُس میں کہ جس کے بارے میں وہ اختلاف رکھتے ہیں۔ یقیناً اللہ منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا ایسے کو جو جھوٹا بڑا ناشکرا ہو''۔

تحقیق کا دامن چھوڑنا غلط

اہل حق کی جزا اور اہل باطل کی سزا ہی وہ مختتم فیصلہ ہے جس کے لئے قیامت کی پوری کارگاہ ہے۔ اس فیصلے کے لئے قیامت کا حوالہ بہت سے مقامات پر قرآن میں ہے جس میں رواداری بھی ہے اور حقانیت کے ایک خاص پہلو کا اظہار بھی۔ رواداری تو یہ ہے کہ یہ معاملہ جب قیامت میں طے ہونا ہے تو دنیا میں اس سوال پر جنگ وجدال سے کیا فائدہ ہے؟ ''موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود'' پر عمل کرو اور آپس میں مل جل کر رہو۔ مذہب کی بنا پر لڑائی جھگڑا بالکل بے کار کی بات ہے۔ اس کے ساتھ حقانیت کے جس پہلو کا اظہار ہے، وہ یہ ہے کہ آج کل کے بعض ترقی یافتہ افراد کا یہ کہنا کہ مذاہب سب درست ہیں۔ اعمال بس درست ہونا چاہئیں، یہ بالکل غلط ہے۔ حق ان میں سے ایک ہی ہے جس کا فیصلہ جزا و سزا کی شکل میں روز قیامت سامنے آئے گا لہٰذا اس دنیا میں تحقیق کا دامن چھوڑنا غلط ہے اور جسے اُن کا ضمیر مستحکم دلیل کے ساتھ حق بتائے، اُس حق سے دوسروں کو متعارف بنانا بھی خلق خدا کے ساتھ خیر خواہی ہے لہٰذا اہل حق کو مذہب حق کی تبلیغ کرنا بھی درست ہے مگر اُنہی حدود میں جو قرآن مجید کے انداز بیان سے جا بجا سامنے آتے ہیں۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝۴ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝۵

''اگر اللہ چاہتا کہ کوئی اولاد اختیار کرے تو اپنی مخلوقات میں سے جسے چاہتا منتخب کر لیتا۔ پاک ہے اُس کی ذات وہ تو بس ایک بڑا غالب وقاہر اللہ ہے۔ اُس نے آسمانوں اور زمین کو سچائی کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ لپیٹتا ہے رات کو دن پر اور لپیٹتا ہے دن کو رات پر اور وہ قابو میں رکھے ہوئے ہے سورج اور چاند کو، ہر ایک چل رہا ہے ایک مقررہ مدت تک معلوم رہے کہ وہ عزت والا بڑا بخشنے والا ہے''۔

آغاز آیت مثل بعض دیگر آیات کے یہ بتاتا ہے کہ وہ بطور متبنّٰی بیٹا بنانے کی نفی میں ہے مگر اُس کے ساتھ سبحٰنہ کا لفظ اور پھر اُس

کے خدائے واحد ہونے کا تذکرہ بتاتا ہے کہ وہ حقیقی اولاد کی نفی ہے جو شانِ الوہیت کے خلاف ہے بہر حال نتیجتاً دونوں تصورات کی رد ہو جاتی ہے خواہ کوئی کہتا ہو کہ واقعی عیسیٰؑ اُس کے بیٹے ہیں یا یہ کہتا ہو کہ اُس نے اُنہیں بیٹا بنایا ہے۔ ہیں دونوں ہی باتیں غلط۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝٦

''اُس نے تم سب کو پیدا کیا ایک متنفس سے، پھر اُس سے اُس کے شریک زندگی کو پیدا کیا اور تمہارے لئے اُتارا چوپایوں میں سے آٹھوں قسموں کو، وہ تمہیں پیدا کرتا ہے تمہاری ماؤں کی شکموں میں ایک طرح کی تخلیق، پھر دوسری طرح کی تخلیق کے ساتھ تین اندھیرے پردوں میں۔ یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار۔ اُس کے لئے سلطنت ہے، کوئی خدا نہیں سوا اُس کے، تو کدھر منحرف ہوتے ہو''۔

چوپایوں کی آٹھ قسمیں: گائے، بھینس، اونٹ، بکری اور بھیڑ، ہر ایک میں نر اور مادہ جن کا ذکر سورۂ انعام میں ہو چکا ہے۔[1]

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۫ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝٧

''اگر تم ناشکرا پن اختیار کرو تو یقین جانو اللہ تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لئے ناشکرے پن کو پسند نہیں کرتا اگر تم شکر گزاری کرو تو وہ تمہارے لئے اُسے پسند کرتا ہے اور کوئی ایک بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا پھر تمہارے پروردگار کی طرف تم سب کی رجوع ہوگی اور وہ تمہیں بتائے گا جو کرتے تھے، یقیناً وہ دلوں کی باتوں کا جاننے والا ہے''۔

''اللہ تم سے بے نیاز ہے'' یعنی تمہاری شکر گزاری سے اُس کا کوئی فائدہ نہیں اور ناشکرے پن سے، اس کا کوئی نقصان نہیں ہے ''وہ اپنے بندوں کے لئے ناشکرے پن کو پسند نہیں کرتا'' یعنی بحیثیت مربی کے وہ اُس کے درپے ہے کہ اس کے بندے خصائل حسنہ سے آراستہ ہوں اور یہ بُری خصلتوں سے دور ہوں اور ناشکرا پن بری چیز ہے اور وہ ان کے لئے اسے ناپسند کرتا ہے، بے شمار آیات قرآن کی طرح انسان کے فاعل مختار ہونے کی دلیل ہے، اس لئے کہ جب وہ کفرانِ نعمت سے راضی نہیں اور شکر گزاری سے راضی ہے تو اگر افعالِ انسانی اُس کے جبر سے ہوتے تو کفرانِ نعمت کا وجود ہی ناممکن ہے۔

---

[1] ھی الّتی فسّرناھا فی سورۃ الانعام (علی بن ابراھیم)

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۝٨

''اور جب آدمی پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اپنے پروردگار کو پکارتا ہے اُس سے لو لگاتے ہوئے، پھر جب وہ اپنی طرف سے اُسے کوئی نعمت عطا کرتا ہے تو وہ بھول جاتا ہے اُسے جس کے واسطے وہ پہلے پکار رہا تھا اور اللہ کے لئے شریک قرار دیتا ہے کہ اُس کے راستے سے گمراہ کرے۔ کہو کہ فائدہ اٹھالو اپنے ناشکرے پن سے تھوڑے دن یقیناً تو دوزخ والوں میں سے ہے''۔

''کہو'' یہ کسی شخص خاص سے خطاب نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ بات اس سے کہی جائے تو بالکل درست ہے لیکن عام طور پر مفسرین ایسے خطاب کا مخاطب رسولؐ کو قرار دیا کرتے ہیں چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی کیا ہے۔[1] جو میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ پھر ''فائدہ اٹھالے'' یہ کہنا حکم کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ تجھ کو اس دنیا میں تھوڑے دن فائدہ اٹھا لینے دیا جائے گا پھر اُس کے بعد دوزخ میں جلنا ہے۔[2]

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝٩

''آیا وہ شخص جو عبادت کرنے والا ہے، رات کے لمحات میں سجدے کی حالت میں اور قیام میں کہ آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار رہتا ہے؟ کہئے کہ کیا برابر ہیں وہ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے؟ بس نصیحت تو صاحبان عقل ہی قبول کرتے ہیں''۔

اکثر آیتوں میں اس طرح کے سوال سے آغاز ہوا ہے جس کا انداز بتاتا ہے کہ اس کے قبل بھی ایسا ہی کچھ سوال تھا مگر موجودہ ترتیب میں وہ نظر نہیں آتا، اس لئے اُس سوال کے مقابل کا رُخ الفاظ سے ظاہر نہیں ہوتا۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرا رخ سننے والے کے ذہن پر چھوڑ دیا گیا ہو بہرحال اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص اور وہ جو ایسا نہیں ہے، برابر نہیں ہیں۔[3]

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا

---

[1] قال اللہ تعالیٰ لنبیّہ قل لہ یا محمّد ﷺ علیٰ سبیل التّھدید (تبیان)

[2] ھذا امر معناہ الخبر کقولہ اذا لم تستحی فاصنع ما شئت (مجمع البیان)

[3] آیا آن ناسپاس مشرک بہتر است یا کسی کہ (شاہ ولی اللہ) فانّہما لا یستاویان ابدا (تبیان)

حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾

''کہہ دیجئے کہ اے وہ میرے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے پروردگار سے ڈرو، ان کے لئے جنہوں نے نیک کام کیے اس دنیا میں بھلائی ہے اور اللہ کی زمین وسیع ہے، صبر کرنے والوں کا ثواب بس پورا پورا اُن کے اندازے سے زیادہ ہی دیا جائے گا''۔

اکثر آیتوں میں قُل کے بعد جو بات ہوتی ہے، وہ رسولؐ کی زبانی ہوتی ہے جیسے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ کہیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو''۔ یہاں ''میری'' کے معنی ہیں رسول کی پیروی قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کہیے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ خدمات کا نہیں مانگتا سوا صاحبان قرابت کی محبت کے'' یہ مانگنا رسولؐ کا مانگنا ہے اور صاحبان قرابت رسولؐ کے صاحبان قرابت ہیں مگر بعض مقامات پر قُل کے بعد والی بات خود اللہ کی زبانی ہوتی ہے، تب اس میں یہ جز مضمر ماننا پڑے گا کہ آپ میری طرف سے کہئے، یہاں ایسا ہی ہے ''کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو''۔ یہ خدا کی طرف سے تخاطب ہے کیوں کہ وہ بندے اُسی کے ہیں۔ رسولؐ اپنی طرف سے کہتے تو عباداللہ کہتے عبادی نہ کہتے، تعجب ہے کہ اکابر مفسرین نے اس پہلو پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿۱۱﴾ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲﴾ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳﴾ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِيْ ﴿۱۴﴾ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۵﴾ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴿۱۶﴾

''کہہ دیجئے کہ مجھے حکم یہ ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اُس کی خالص اطاعت کرتے ہوئے اور مجھے حکم ہے کہ میں اول نمبر کا مسلمان ہوں، کہئے کہ میں ڈرتا ہوں اگر نافرمانی کروں اپنے پروردگار کی، ایک بڑے دن کے عذاب سے، کہئے کہ میں صرف اللہ کی عبادت کرتا ہوں اس کے لئے اپنی عبادت کو خالص رکھتے ہوئے تو تم اُسے چھوڑ کر جس کی چاہو عبادت کرو، کہئے کہ گھاٹا اٹھانے والے وہ ہیں جنہوں نے گھاٹا پہنچایا اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کھلا ہوا گھاٹا ہے اُن کے لئے اُن کے اوپر سے سائبان ہیں آگ کے اور اُن کے نیچے سے بھی ایسے ہی تختے ہیں آگ کے یہ ہے جس سے ڈراتا ہے اللہ اپنے بندوں کو۔ اے میرے بندو! تو ڈرو تم مجھ سے''۔

اول المسلمین کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے ''اول نمبر کا مسلمان'' اس میں کسی تبصرہ و توجیہ کی ضرورت نہیں ہے اور اس کی نظریں قرآن مجید میں بکثرت ہیں مگر جنہوں نے اس کا ترجمہ ''پہلے مسلمان'' کے ساتھ کیا ہے یعنی اس اُنہیں کو باعتبار زمانہ قرار دیا ہے اِس اولیت میں توجیہ سے کام لینے کی ضرورت پڑی ہے جیسا کہ جناب شیخ الطائفہؒ نے لکھا ہے:۔

انّما امر ان یکون اوّل المسلمین وان کان من قبله مسلمون کثیرون لانّ المراد به اوّل المسلمین من هٰذه الامّة (تبیان

آپ کو حکم ہوا کہ آپ مسلمانوں میں سب سے پہلے ہوں، حالانکہ آپ کے پہلے بہت مسلمان تھے مگر مقصود یہ ہے کہ اس امت میں سب سے پہلے اسلام کا نمونہ آپ ہوں۔

حالانکہ ممدوح اس کے قبل کے جملے: امرت ان اعبد الله مخلصًا له الدین کے تحت میں لکھ چکے ہیں کہ:۔

الاٰیة وان توجهت الی النبی ﷺ الّا انّ المراد بها جمیع المکلّفین

آیت کا روئے خطاب اگرچہ رسولؐ کی طرف ہے مگر مراد اس سے تمام افراد مکلفین ہیں۔

اس صورت میں دوسرے جملے میں: اول المسلمین ہونے کا حکم، اُسے بھی پھر تمام مکلفین سے متعلق ہونا چاہیے مگر ظاہر ہے کہ مکلفین میں سے ہر فرد اس امت میں بھی سب سے پہلا مسلمان ہونے والا فرد نہیں ہوسکتا، پھر اس حکم کے کیا معنی؟ ہم نے جو معنی قرار دیئے ہیں اُن میں کوئی دشواری نہیں ہے، اس لئے کہ مطلوب اول خالق کی طرف سے ہر بندے کے لئے یہی ہے کہ وہ اول نمبر کا مسلمان ہو۔ یہ اور بات ہے کہ اس مقصد کو بدرجہ اتم اکمل پورا کرنے والی وہی ذات ہوگی جو اس خطاب کی مخاطب اول ہے۔

وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۙ﴿۱۷﴾ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴿۱۸﴾

''اور جنہوں نے باطل معبودوں سے پرہیز کیا کہ وہ اُن کی عبادت کریں اور اللہ سے لو لگائی اُن کے لئے خوش خبری ہے تو دے دو خوش خبری میرے اُن بندوں کو جو بات غور سے سنتے ہیں تو جو اُس کا بہترین جزء ہے، اُس کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کی اللہ نے خاص طور پر رہنمائی کی ہے اور یہ ہیں صاحبانِ عقل''۔

یہ رجحان کہ انسان اپنے کانوں پر پہرے بٹھائے کہ جو اُس کی دل پسند باتیں ہوں، اُنہی کو سنے اور جن باتوں کو وہ ناپسند کرتا ہے یا سمجھتا ہے کہ وہ میرے نقطہ نظر کے خلاف ہے وہ نہ سُنے۔

قرآن کہہ رہا ہے کہ سنو سب کی، پھر اپنی عقل اور قوت نظر و استدلال سے فیصلہ کرو کہ کیا ماننے کے قابل ہے تو اسے قبول کرو اور کیا مسترد کرنے کے لائق ہے تو اُسے مسترد کردو۔

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ؕ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ﴿۱۹﴾

''کیا جس پر عذاب کا فیصلہ قلم بند ہو گیا ہے تو کیا آپ اُسے چھڑا دیں گے جو آگ میں ہے''۔

یہ بھی ایک انداز کلام ہے، پہلے جملے کا بس مبتدا کہہ کر کہ جیسے کلام کو نا تمام چھوڑ دیا گیا ہو، پھر دوبارہ ایک نئے جملے سے اُس کی خبر کا اظہار کیا گیا۔

پہلے جیسے یہ کہا جا رہا تھا کہ کیا جس پر عذاب کا فیصلہ ہو چکا، وہ بھلا ٹل بھی سکتا ہے؟ مگر یہ فیصلہ تو اس شخص کے عناد اور اُس کی بداعمالی کی بنا پر ہوتا ہے جس میں وہ مستقل طور پر مبتلا ہے تو کہا جا رہا ہے کہ وہ تو اپنے ہاتھوں خود جیسے جہنم میں اسی وقت پڑا ہوا ہے۔ آپ کا اس میں اختیار ہی کیا ہے؟ [۱] آپ کے بس میں اُس کا بچانا تھوڑی ہے جو آپ اس غم میں گھلے جا رہے ہیں کہ یہ لوگ ہدایت قبول کیوں نہیں کرتے۔ [۲]

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ﴿۲۰﴾

''مگر وہ جو اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے اُن کے لئے بالائی منزل پر کے محل ہیں جن پر اور محل بنے ہوئے ہیں جن کے نیچے سے نہریں رواں ہیں، یہ اللہ کا وعدہ ہے اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا''۔

چونکہ اس کے پہلے بداعمال جماعت کے عذاب میں یہ آیا تھا ''اُن کے اوپر سے سائبان ہیں آگ کے اور اُن کے نیچے سے بھی ویسے ہی تختے ہیں آگ کے'' تو اس آیت میں جیسے اُس کے بالمقابل خوف الٰہی رکھنے والوں کے منازل کی یہ مرقع کشی کی گئی ہے کہ ''اُن کے لئے بالائی منزل پر کے محل ہیں جن پر اور محل ہیں''۔ وہاں اس کے بعد تھا ''یہ وہ ہے جس سے ڈراتا ہے اللہ اپنے بندوں کو'' یہاں اس کے بعد ہے ''یہ اللہ کا وعدہ ہے، اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا''۔ [۳]

یہاں ان دونوں آیتوں کے مضمون کا باہمی تناسب اس کی گواہی دیتا ہے کہ آیات کا یہ سلسلہ اسی ترتیب سے نازل ہوا تھا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان کی طرف سے پانی اُتارا تو اُسے روانہ کر دیا چشموں کی صورت سے زیر

---

[۱] اقیم فیہ الظّاھر مقام المظھو ـــــ والمعنی لا تقدر علیٰ ھدایتہ فتقذہ من النّار (جلالین)۔

[۲] انما قال ذٰلك للنّبی ﷺ لحصرہ علیٰ اسلام المشرکین والمعنی انّك لا تقدر علی ادخال الاسلام فی قلوبھم نسآء واام ابو افلا علیك اذلم یؤمنو افانّما اتو اذٰلك من قبل نفوسھم (مجمع البیان)

[۳] لھم غرف من فوقھا غرف فی مقابلۃ ما قال للکافرین: لھم من فوقھم ظلل من النّار و من تحتھم ظلل (تبیان)

زمین، پھر اُس سے کھیتی برآمد کرتا ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو اُسے زرد دیکھو گے، پھر وہ اُسے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے، یقیناً اس میں یاددہانی ہے صاحبانِ عقل کے لئے''۔

اس میں یاددہانی کا ہے کی ہے؟ فاعل مختار۔ بااقتدار خالق کے وجود کی بھی اور انسان کے اس دار دنیا میں بچپن، جوانی اور پیری کے انقلابات سے گزر کر آخری انجام کی بھی۔[1]

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۲﴾

''تو کیا پوچھنا اُس کا جس کے سینے کو اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک اُجالے کے اوپر ہے۔ اب وائے ہے اُن پر جن کے دل یادالٰہی کی طرف سے سخت رہیں۔ یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں''۔

''سینے کو اللہ نے کھول دیا ہے'' یعنی اپنی توفیق شامل حال کر کے اُسے ایسا حوصلہ عنایت کیا کہ وہ شبہات و وساوس، تقلید آباء، ماحول کے دباؤ، ہمرنگی جماعت ان تمام جذبات اور اُن کے دباؤ سے آزاد ہو کر حق کو قبول کر لے۔[2]

قرآن مجید کے ان الفاظ اور اُن کے مفہوم کو سامنے رکھا جائے جو متعدد مقامات پر قرآن میں موجود ہیں تو پھر سورۂ الم نشرح میں رسولؐ کو مخاطب کر کے جو یہی الفاظ صرف کیے گئے ہیں، اُن کی وہ تفسیر غلط ثابت ہوگی جو صحیح بخاری وغیرہ کے احادیث سے ثابت ہوتی ہے کہ ملک نے اگر رسولؐ کے سینے کو چاک کیا اور دل کو نکال کر اُسے (معاذ اللہ) آلائشوں سے پاک کیا جو شان رسولؐ کے خلاف بھی ہے اور محاورات عرب اور استعمالات قرآنی کے مخالف بھی ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾

''اللہ نے بہترین کلام اُتارا ہے، وہ کتاب ایک جو پوری ایک ہی طرح کی ہے، برابر دُہرائی جانے والی جس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جسم پر اُن کے جو اپنے پروردگار کا خوف رکھتے ہیں، پھر اللہ کی طرف سے اُن کی

---

[1] اذا تفکّروا فی ذٰلک عرفوا الصّانع المحدث وعلموا صحة الابتدآء والبعث والاعادة (مجمع البیان)

[2] ای من لطف اللہ علیه حتّی امن وعرف اللہ ووحّدہ وسندق نبیّه (تبیان) شرح الصّدر یکون بثلثة اشیآء احدها بقوة الادلّة الّتی نصبها اللہ تعالیٰ وهٰذا یختصّ بالعلمآء والثانی بالطاف الّتی تجدّدله حالا بعد حال کما قال: والذین اهتدوا زادهم هدی والثالث بتوکید الادلّه وحل الشبعه والقآء الخواطر (مجمع البیان)

کھالیں اور اُن کے دل نرم ہو جاتے ہیں، اللہ کی یاد کی طرف۔ یہ اللہ کی طرف کی رہ نمائی ہے جس سے وہ منزل مقصد تک پہنچا تا ہے جسے چاہتا ہے اور جسے گمراہی میں چھوڑ دے، اس کا کوئی رہ نما نہیں ہے''۔

''مقدمہ تفسیر'' اور نیز ''تفسیر قرآن'' میں محکم اور متشابہات کی بحث میں ہم نے اس آیت کو پیش کیا ہے کہ پوری کتاب کو یہاں ''متشابہ'' کہا گیا ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ اُس کے سب اجزاء ایک دوسرے کے مانند ہیں۔ اُن میں کوئی فرق نہیں ہے۔[1]

اس مفہوم کو ترجمہ میں ہم نے یہاں مدنظر رکھا ہے مشائی کی تشریح بھی پہلے ہو چکی ہے۔

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۲۴﴾

''تو کیا پوچھنا اُس کا جو اپنے کو بچائے عذاب کی برائی سے قیامت کے دن، اور کہا جائے گا ظالموں سے کہ چکھو اُسے جو تم کرتوت کرتے تھے''۔

آیت کے ابتدائی الفاظ سے جو ہماری اور بعض دوسرے مترجمین و مفسرین کی سمجھ میں آیا ہے وہ تو یہی ہے کہ پرہیزگاروں کا ذکر ہے۔[2] مگر بعض مفسرین نے اس کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ جو اپنے چہرے کو سپر بنائے عذاب کی برائی کا روز قیامت یعنی منہ کے بھل اُس میں گرا دیا جائے۔[3] جناب شیخ طوسیؒ کی تفسیر بھی یہی ظاہر کرتی ہے۔[4] اور علامہ طبرسیؒ کی تشریح بھی اس کے مطابق ہے۔[5] مگر ابھی تک میری سمجھ میں آیت سے یہ مفہوم نہیں آتا ہے۔

اس دوسری تفسیر کے لحاظ سے قِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ میں الف لام عہد کا لینا چاہیے یعنی اُنہی ظالموں سے یہ کہا جائے گا کہ چکھو اسے اور ہمارے ترجمے کے لحاظ سے پہلی جماعت نیکوکاروں کی ہے جو نجات یافتہ ہے اور یہ اُس کے مقابل والی جماعت ہے جس سے یہ کہا جائے گا۔

كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

''جھٹلایا اُنہوں نے جو اُن کے پہلے تھے تو آ گیا اُن پر عذاب ایسی صورت سے جس کا اُنہیں کوئی تصور بھی نہ تھا تو اللہ نے چکھایا اُنہیں رسوائی کا مزہ اس دنیاوی زندگی میں اور آخرت کا عذاب ضرور اور بھی بڑا ہے کاش وہ

---

[1] ای یشبہ بعضہ بعضا (جلالین۔

[2] احتدازمی کند روئے خود (شاہ ولی اللہ) جو کوئی بچاتا ہے منہ اپنے کو (رفیع الدین)

[3] یتّقی یلقی ــ بان یلقی فی النار مغلولۃ یدہ الی عنقہ (جلالین)

[4] فی التفسیر انّ الکافر یلقی فی النّار مغلولا لا یمکنہ ان یتّقی النار الّا بوجھہ (تبیان)

[5] تقدیرہ افحال من یدفع عذاب اللہ بوجھہ یوم القیمہ کحال من یاتی اٰمنا لا تمسہ النّار (مجمع البیان)

جانیں"۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۲۸﴾

"اور ہم نے پیش کی ہیں لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں، شاید کہ وہ نصیحت قبول کریں، عربی زبان کا قرآن جس میں کوئی کجی نہیں، شاید کہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں"۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾

"بیان کی ہے اللہ نے ایک مثال کہ ایک آدمی ہے جس کے مالک کئی پست اخلاق اشخاص ہیں آپس میں جھگڑا کرنے والے اور ایک آدمی ہے جو بس ایک شخص کا ہے کیا یہ دونوں یکساں ہیں؟ شکر خدا کا بلکہ اُن میں کے زیادہ لوگ جانتے نہیں"۔

یہ ایک انداز بیان قرآن کا ہے۔ ایک سوال کیا اور پھر جیسے اُس کا جواب اُدھر والوں نے حسب ذیل خواہ دیا یا زبان سے چپ رہے مگر اُن کے ضمیر نے اُس کا اقرار کیا جو فطرت کا تقاضا ہے اور اس کے بعد ارشاد ہوا: الحمدللہ جو ہم چاہتے تھے تم نے مان لیا۔ اب تم نتیجہ خود سمجھ لو۔

یہاں جو سوال ہے وہ یہ ہے کہ جسے ایک مالک کے سامنے سر جھکانا ہے، وہ بہتر ہے یا وہ جو بہت سے افراد کی ملکیت کے شکنجہ میں ہے اور کش مکش میں گرفتار ہے؟ جواب اس کا صرف ایک ہے کہ وہ پہلا بہتر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک خدا کے بندے بہتر ہیں اُن سے جو بہت سے معبودوں کے سامنے سر جھکاتے ہوں۔ یہی اس سوال کا مقصد ہے۔[1] اقبال نے اسے یوں کہا ہے:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿۳۱﴾

"آپ کو بھی دنیا سے اٹھنا ہے اور وہ بھی یقیناً مرنے والے ہیں، پھر تم لوگ قیامت کے دن اپنے پروردگار کے یہاں تصفیہ کرلوگے"۔

اس کے پہلے جز کے ذیل میں جو ایک توہم "حیات النبیؐ کے مسئلے سے متعلق پیدا ہوتا ہے یا کچھ لوگ غلط فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اُس پر امامیہ مشن لکھنؤ سے رسالے کی صورت میں میری ایک تقریر شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے "مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" اور واقعۂ وفات رسولؐ"

---

[1] شبہ الکافر بشر کآء متنازعین مختلفین والمؤمن عبدالھا واحدا (تبیان)

اُس میں اُس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ موجود ہے۔

آخری فقرے سے صدر اوّل کے بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بعد رسولؐ خود امت رسولؐ کے درمیان جو تفرقے پیدا ہونے والے تھے، اُن کے متعلق کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن اُن کا تصفیہ ہوگا اب یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ ان جھگڑوں سے اگر نجاتِ آخرت کا کوئی تعلق نہ ہو تو پھر روز قیامت اُن کے تصفیے کے کیا معنی رہتے ہیں؟

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَ كَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِىْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

''تو اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ لگائے اور سچائی کو جب وہ اُس کے پاس آئے جھٹلائے۔ کیا دوزخ میں ٹھکانا کافروں کا نہیں ہے''؟

دوسرے مقامات پر قرآن مجید میں اس مضمون کے ادا کرنے میں او کا لفظ ہے یعنی کون ظالم ہوگا اُس سے زیادہ جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا سچائی کا انکار کرے جب وہ اُس کے پاس آئے؟ اس صورت میں یہ جملہ قرآن کی اُس ''تہذیب گفتگو اور معیار رواداری'' کے تحت میں ہوگا۔ جس پر ہمارا ایک مستقل رسالہ ''امامیہ مشن لکھنؤ'' سے شائع ہو چکا ہے۔ اس طرح قرآن مجید خود فریق مخالف کے لئے لمحہ فکریہ پیدا کرتا ہے کہ خود اُن کے ضمیر کی خلش اُن کو حق اور باطل پر غور کرنے کی تحریک کرے یہ رواداری اس لئے ہے کہ حقیقت یہی تھی کہ وہ لوگ سچائی کو جھٹلا رہے تھے مگر کھل کر یہ نہیں کہا جاتا بلکہ رسولؐ کو اُن کے برابر کی سطح پر رکھ کر کہا جاتا ہے کہ اگر (معاذ اللہ) انہوں نے غلط طور پر رسالت کا دعویٰ کیا ہے تو ان سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں اور اگر تم سچائی آنے کے بعد اس کا انکار کرتے ہو تم سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں اور جو ظالم ہو وہی کافر بھی ہے اور اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اب تم غور کرو کہ دوزخ میں جانے کا مستحق کون ہے؟ مگر یہاں والی آیت میں چونکہ اَو نہیں ہے وَ ہے، اس لئے مفسرین نے دونوں فقروں کو اسی فریق مخالف سے متعلق قرار دیا ہے کہ وہی خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں اور وہی سچائی کو جھٹلاتے ہیں۔

وَالَّذِىْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۴﴾ۚ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِىْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِىْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

''اور جو سچائی کو لے کر آئے اور اُس کی تصدیق کرے تو یہ لوگ اصل پرہیزگار ہیں اُن کے لئے اُن کے پروردگار کے یہاں وہ ہے جو وہ چاہیں، یہ صلہ ہے اچھے اعمال والوں کا تاکہ اللہ اُن کے بُرے سے بُرے کاموں کو جو انہوں نے کیے تھے نظر انداز کر دے اور اُنہیں اُن کا اجر دے اُن بہترین اعمال کے معیار پر جو اب وہ کرتے رہے''۔

''سچائی کو لے کر آئے اور اُس کی تصدیق کرے'' یہاں بعض مفسرین نے ان دونوں صفتوں کا موصوف الگ الگ قرار دیا ہے۔ کسی نے کہا ''جو سچائی کو لے کر آئے'' یعنی پیغمبر اور ''جو اُس کی تصدیق کرے'' یعنی مومنین، کسی نے کہا ''جو سچائی کو لائے'' وہ جبرئیلؑ ہیں اور ''جنہوں نے

تصدیق کی'' وہ رسولؐ ہیں لیکن جناب شیخ طوسیؒ کو اس سے اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ الذی جو اسم موصول ہے اگر دہرایا گیا ہوتا تو دو موصوف تلاش کیے جاتے، یہاں ایک الذی ہے جس کی دو صفتیں ہیں لہٰذا سچائی کو لانے والا اور اُس کی تصدیق کرنے والا ایک ہی شخص ہے اور وہ رسولؐ ہیں۔[1]

علامہ طبرسیؒ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔[2]

مگر مجھے اس مبتداء کی خبر: أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۴﴾ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ جو ایک جیسا کلام معلوم ہوتا ہے اور جس میں ترتیب موافق تنزیل نہ ہونے کی بحث پیدا کرنا زبردستی کا کام ہے، جس کا ترجمہ ہو چکا ہے کہ ''یہی پرہیز گار لوگ ہے، اُن کے لئے اُن کے پروردگار کے یہاں وہ ہے جو اچھے اعمال والوں کا صلہ ہے''۔ اور پھر یہ کہ ''اللہ اُن کے بُرے سے بُرے کاموں کو جو اُنہوں نے کیے تھے نظر انداز کر دے گا اور اُنہیں اجر دے گا اُن کے بہترین اعمال کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے''۔

اس سب پر نظر کرتے ہوئے وہی قول درست معلوم ہوتا ہے کہ اَلَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ ''جو سچائی کو لائے'' رسولؐ ہیں اور لصدق به ''جو اُس کی تصدیق کرے'' وہ سچے قسم کے مومنین ہیں جب ہی یہ بعد والے فقرات چسپاں ہوں گے لیکن اگر اَلَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ پورے سے رسولؐ کی ذات مراد لے لی جائے تو بعد کی خبر کو آپ ہی کی ذات سے وابستہ کرنا پڑے گا جس میں اول تو واحد کو جمع سے تبدیل کرنے کے لئے کوئی نکتہ سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرے یہ اوصاف مجھے شان رسولؐ کے مطابق نظر نہیں آتے لہٰذا میں الذی کے دوبارہ دہرائے جانے کو ایسی اہم بات نہیں سمجھتا جتنی اُن آخری فقرات کی نوعیت کو اہم سمجھتا ہوں۔

لطف یہ ہے کہ علامہ طبرسیؒ ان فقرات کی شرح میں جیسے یہ بھول گئے کہ وہ اس پورے کلام کے سرنامہ کو رسولؐ سے متعلق کر چکے ہیں لہٰذا یکفر الله عنهم اسوأ الذی عملوا کی تشریح میں لکھتے ہیں:

ای اسقط الله عنهم عقاب الشرك والمعاصی الّتی فعلوها قبل ذٰلك بایمانهم واحسانهم ورجو عهم الی الله تعالیٰ

یعنی اللہ نے اُن سے شرکت اور اُن گناہوں کی سزا کو جو وہ پہلے کر چکے تھے معاف کر دیا، اس ایمان اور حسن عمل اور اللہ کی طرف پلٹ کر آجانے سے جو اب اُنہوں نے اختیار کیا۔

اس کے بعد ہر ذی حس مسلمان یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کا تعلق معاذ اللہ رسولؐ کی ذات کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۶﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي

---

[1] لو کان غیرہ لقال: والذی جآء بالصّدق والّذی صدّقه به۔ (تبیان)

[2] هٰذا اقوی الاقوال (مجمع البیان)

انْتِقَامٍ ﴿۳۷﴾

''کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے؟ اور آپ کو وہ اُس کے سوا دوسروں سے ڈراتے ہیں اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے، اُسے کوئی منزل تک پہنچانے والا نہیں اور جسے اللہ منزل تک پہنچائے، اُسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، کیا اللہ سب سے زبردست سخت بدلا لینے والا نہیں ہے''۔

چونکہ جیسا اس کے بعد کی آیت میں آئے گا اور قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر بکثرت آیات سے ثابت ہے، وہ اللہ کے وجود کے قائل تھے تو پہلے جملے میں کہ کیا اللہ اپنے بندوں کے لئے کافی نہیں ہے؟ توحید پر ایک عقلی استدلال ہے کہ جب خدا کا وجود دلائل عقلی کی بنا پر ماننا ضروری ہے تو وہ ضرورت ایک خدا کے ماننے سے پوری ہوجاتی ہے جس کے تم بھی قائل ہو تو پھر دوسرے خداؤں کے ماننے کی ضرورت کیا ہے؟

اس کے علاوہ مشرکین پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ڈراتے رہتے تھے کہ ہمارے معبودوں کی جو تم مخالفت کرتے ہو، اچھا نہ ہوگا۔[۱] یا جیسا کہ سورۂ ہود میں ہے جناب ہودؑ سے کہا:

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے بعض خداؤں نے تم کو کچھ نقصان پہنچا دیا ہے۔

یعنی تم جذبہ انتقام میں ہمارے معبودوں کی مخالفت کرتے ہو، تو اُن کے ذہن کو اُس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ جب میرا پروردگار وہ اللہ ہے جسے تم بھی مانتے ہو تو تمہارے طبع زاد معبود کیا بنا سکتے ہیں؟

اس صورت میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لینے کے بجائے عبدہ کہنے میں وہ خصوصیت مضمر ہے جو آیہ معراج سبحان الذی اسریٰ بعبدہ میں نظر آتی ہے۔[۲]

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۳۸﴾

''اور اگر ان سے پوچھیے کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ کہیں گے اللہ نے، کہئے تو پھر کیا تم نے دیکھا ہے اُنہیں جن کی تم دہائی دیتے ہو، اگر اللہ مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو کیا، یہ اُس کی طرف کے نقصان کو دور کر دیں گے یا وہ میرے ساتھ رحمت شامل حال کرنا چاہے تو کیا یہ اُس کی رحمت کو رد کر دیں گے؟ کہئے کہ اللہ میرے لئے کافی ہے، اُسی پر بھروسہ کرتے ہیں کرنے والے''۔

---

[۱] یخوفونك بالذین من دونه خطاب للنّبی بان الکفّار یخوفه بالاوثان الّتی کانوا یعبدونها (تبیان)

[۲] یعنی به محمدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یکفیه عداوة من یعادیه وینا ویه (مجمع البیان)

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳۹﴾ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۴۰﴾

''کہئے اے میری قوم والو، تم اپنی جگہ کام کرتے رہو، میں اپنا کام کرتا ہوں اِس کے بعد معلوم ہوگا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اُسے رسوا کرے اور کس پر آتا ہے وہ عذاب جو برقرار رہنے والا ہے''۔

''اپنی جگہ اپنے کام کرتے رہو'' یعنی جس جس طرح میری مخالفت اور مزاحمت کر رہے ہو کرتے رہو جس میں اُن کا ظلم و تشدد جو وہ رسولؐ اور آپ کے متبعین کے ساتھ کرتے تھے، سب داخل ہے۔[1] اور میں اپنا کام کرتا رہوں گا'' اس کے بعد انجام دیکھو کیا ہوتا ہے؟

اس چیلنج میں دلیل حقانیت میں مضمر ہے اور ایک لرزہ براندام کر دینے والی تہدید و تخویف بھی ہے ''رسوا کرنے والا عذاب'' دنیا کا اور ''برقرار رہنے والا'' آخرت کا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۴۱﴾

''یقیناً ہم نے آپ پر کتاب تمام انسانوں کے لئے حق کے ساتھ اُتاری تو جو ہدایت حاصل کرے گا وہ اپنے لئے اور جو گمراہی اختیار کرے گا، وہ اپنا نقصان کرے گا اور آپ کوئی ان کے ٹھیکیدار نہیں ہیں''۔

یعنی زبردستی اُنہیں مومن بنانا آپ کا کام نہیں ہے۔ آپ کا کام ہدایت کرنا ہے۔ اُن کے ایمان لانے سے آپ کا ذاتی کوئی فائدہ نہیں ہے اور اُن کے کفر اختیار کرنے سے آپ کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ آپ کا کہنا ماننے سے اُنہی کا فائدہ ہے اور نہ ماننے سے اُنہی کا نقصان ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾

''اللہ لیتا ہے جانوں کو اُن کے مرنے کے وقت اور جنہیں موت نہیں آئی، اُن کے سونے کے عالم میں تو روک لیتا ہے اُسے جس پر موت کا فیصلہ کر دیا اور چھوڑ دیتا ہے دوسری کو ایک مقررہ مدت تک، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں اُن کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں''۔

اس آیت سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ توفی کے معنی موت کے نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ اس عالم حواس ظاہری سے نفس کو بے تعلق بنانے کے لئے آتی ہے، اس لئے سونے میں بھی کہا گیا ہے کہ اللہ توفی کرتا ہے یعنی جاگنے میں جیسا تعلق اس دنیا سے تھا وہ ایک حد تک قطع ہو جاتا ہے، جب

---

[1] علی قدر جھدکم وطاقتکم فی ھلاکی وتضعیف امری (مجمع البیان)

اس قطع تعلق کو اس سرزمین کے عالم سے قرآن توفی سے تعبیر کر رہا ہے تو اگر عیسیٰؑ کے لئے دنیا سے آسمان پر اٹھائے جانے کے لئے توفی کا لفظ کا استعمال ہو تو یہ اُن کے لئے موت کی دلیل ہوگی۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۳﴾ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۴۴﴾

''کیا اُنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور سفارشی بنائے ہیں، کہئے کہ کیا چاہے وہ ایسے ہوں کہ جو نہ کسی چیز پر قدرت رکھتے ہوں؟ اور نہ عقل وشعور رکھتے ہوں کہئے کہ سفارش پوری کی پوری اللہ کے قبضے میں ہے اسی کے لئے مخصوص ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور اُسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے''۔

یہ فقرہ کہ ''سفارش پوری اللہ کے قبضے میں ہے'' غور طلب ہے، ظاہر ہے کہ اللہ سے اوپر کوئی طاقت نہیں ہے جس سے اللہ سفارش کرے ماننا پڑے گا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے یہاں سفارش کرنے والے وہی ہیں جنہیں اُس نے مقرر کیا ہے اور وہ بھی اُس کی اجازت سے سفارش کرتے ہیں۔[1] جیسا کہ دوسری جگہ ہے: لَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى اور مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ، اس طرح یہ آیت بھی کلی طور پر نفی شفاعت کے بجائے ثبوت شفاعت کی دلیل ہے۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اور جب اللہ کا وحدت کے ساتھ ذکر ہوتا ہے تو جز بز ہوتے ہیں اُن کے دل جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور جب اُن کا ذکر ہوتا ہے جو اُس کے علاوہ ہیں تو وہ ایک دم خوش ہو جاتے ہیں کہو کہ اے خدا! اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے دکھائی دینے والی اور نہ دکھائی دینے والی چیزوں کے جاننے والے! تو اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرے گا اُس میں کہ جس میں وہ باہم اختلاف رکھتے تھے''۔

قبل کا تخاطب ضروری نہیں کہ رسولؐ سے ہو، اس لئے اُس کا ترجمہ ہم نے ''کہو'' کے ساتھ کیا، جو لوگ رسولؐ کو مخاطب قرار دیتے ہیں، وہ بھی کہتے ہیں کہ مقصود اُس سے سب ہی لوگ ہیں۔[2]

---

[1] ای لا یشفع احد الّا باذنہ (مجمع البیان)

[2] ھذا امر من اللہ تعالیٰ لنبیّہ محمد ﷺ والمراد بہ جمیع المکلّفین (تبیان)

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۴۸﴾

''اور اگر اُن کے پاس جنہوں نے ظلم سے کام لیا سب کچھ ہو جو روئے زمین پر ہے، پھر ایسا ہی اُس کے ساتھ مزید ہو اور ہو تو وہ اُس عذاب سے بچنے کے لئے جو قیامت کے دن ہوگا، اُسے تاوان میں دے دیں اور اُن کے سامنے آئے گا اللہ کی طرف سے وہ دن جس کا اُنہیں خیال بھی نہیں تھا اور ظاہر ہوں گی اُن کے سامنے برائیاں اُس کی جو اُنہوں نے کیا تھا اور اُن کے سر پر آیا ہوگا وہی (عذاب) جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے''۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۫ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۵۰﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۱﴾

''تو جب انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے، پھر جب ہم اُسے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ مجھے بس ایک خاص ہنر کی وجہ سے ملی ہے بلکہ وہ ایک آزمائش ہے مگر اُن میں سے زیادہ تر لوگ نہیں جانتے۔ ایسا ہی کہا اُن لوگوں نے جو ان کے پہلے تھے تو انہیں کچھ فائدہ نہیں دیا اُس نے جو وہ کرتے تھے تو اُنہیں پہنچیں گی برائیاں اُس کی جو انہوں نے کیا ہو اور یہ بے بس کرنے والے نہیں ہیں''۔

''مجھے تو ایک خاص ہنر کی وجہ سے ملی ہے'' یہ اس کا ایک ترجمہ ہے جو پہلی دفعہ اس فقرے کو دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے اور صدر اول کے بعض مفسرین کے قول کے مطابق ہے۔[1]

لیکن اس کے ایک معنی یہ بھی کہے گئے ہیں اور ہو سکتے ہیں کہ مجھے یہ نعمت جو ملی ہے، وہ خاص بات نہیں ہے۔ وہ تو قرائن بھی بتا رہے تھے اور میں جانتا تھا کہ یہ مجھے ملے گی اور ایک تیسرے معنی یہ کہے گئے ہیں اور وہ میرے نزدیک بعید ہیں کہ اللہ جانتا تھا کہ میں اس کا مستحق ہوں۔ اسی طرح یہ مفہوم کہ یہ نعمت مجھے ملی ہے اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ خدا مجھ سے راضی و خوشنود ہے، جب ہی مجھے نعمتوں سے نوازتا ہے۔[2]

---

[1] قال الحسن معناہ انّی اوتیتہ بحیلتی وعملی (تبیان)

[2] علی علمی برضاہ عنّی فلذٰلك اٰتانی ما اٰتانی من النّعم (مجمع البیان)

اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

''اور کیا انھیں نہیں خبر کہ اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں وسعت دیتا ہے اور (وہی جب چاہتا ہے) تنگی دیتا ہے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائیں''

اگر یہ آیت مقام تنزیل میں پہلے سے متصل ہے تو یہ مطلب ہے کہ ہنر سے کچھ نہیں ہوتا۔ خوش حالی اور تنگ دستی مشیت الٰہی سے وابستہ ہے اور بعد والے دونوں معنوں کے ساتھ جو گزشتہ آیات میں درج ہیں اس آیت کا مضمون یوں چسپاں ہے کہ خوش حالی اور تنگ دستی رضائے الٰہی کی دلیل نہیں ہے وہ تو اور وجوہ سے مثلاً آزمائش کے طور پر بھی ہو سکتی ہے۔ اسے نہ حق دار سمجھنے کی دلیل سمجھا جاتا ہے، نہ رضا مندی خدا کی۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾

''کہہ دیجئے کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو، یقیناً اللہ سب ہی گناہوں کو بخش دیا کرتا ہے یقیناً وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے''۔

گناہ گاروں کو نا امید نہ ہونا چاہئے رحمت خدا سے

اس طرح کی ایک آیت جو گذشتہ پارے میں آچکی ہے: قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ''کہہ دیجئے کہ اے وہ میرے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے پروردگار سے ڈرو'' وہاں یہ لکھا جا چکا ہے کہ قل یعنی کہئے'' یا ''کہہ دیجئے'' کے بعد جو قرآن میں آتا ہے، وہ کبھی تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی ہوتا ہے جیسے: قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی ''کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو'' اور قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ''کہئے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ خدمات کا نہیں مانگتا سوا صاحبان قرابت کی محبت کے'' یہاں کہیے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ رسول مخاطب افراد سے اپنی جانب سے یہ کہیں اور کبھی قل کے بعد کا کلام اللہ کی زبانی ہوتا ہے مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ رسول مخاطب افراد تک خدا کی جانب سے یہ پیغام پہنچا دیں۔ یہاں ایسا ہی ہے یعنی رسولؐ اطلاع دیتے ہیں کہ خالق یہ ارشاد فرما رہا ہے کہ اے میرے ایسے بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے یعنی گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو۔

اس آیت کو قرآن مجید کی تمام آیتوں میں سب سے زیادہ سرمایہ امید بتایا گیا ہے۔[1] جو اس کے مضمون سے ظاہر ہے مگر یہ اُس وقت ہے جب بعد کی آیتوں کا تعلق اس سے نہ مانا جائے جو لب ولہجہ کے اختلاف سے بعید نہیں ہے۔

---

[1] قال عبداللہ بن عمر وبن العاص ۔ ارجی اٰیۃ فی کتاب اللہ وھو المروی عن علیؑ ایضا (تبیان) عن امیر المومنین علیؑ انہ قال مافی القرآن اٰیۃ اوسع من یاعبادی الذین اسرفوا الاٰیۃ (مجمع البیان)

وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾

''اور اپنے پروردگار کی طرف توبہ وانابت کرو اور اُس کے سامنے سر جھکاؤ اس سے پہلے تم پر عذاب آئے اور پھر تمہاری مدد نہ ہوگی اور پیروی کرو اُس بہترین پیغام کی جو تمہاری طرف اتارا گیا ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے قبل اس کے کہ تم پر اچانک عذاب آجائے اور تمہیں احساس بھی نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ کوئی متنفس کہے ہائے افسوس اُس پر جو میں نے اللہ کے معاملہ میں کمی کی اور یہ کہ میں تو مذاق اڑاتا تھا یا کہے کہ اگر اللہ مجھے ہدایت کرتا تو میں پرہیزگاروں میں سے ہوتا یا کہے اس وقت جب عذاب کو دیکھے کہ کاش میرے لئے واپسی ہوتو میں اب اچھے اعمال والوں میں سے ہوں ہاں کیوں نہیں! تیرے پاس میری آیتیں آئیں تو تو نے اُنہیں جھٹلایا اور گھمنڈ سے کام لیا اور تو کافروں میں سے تھا''۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اور قیامت کے دن اُن لوگوں کو جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے، دیکھو گے کہ اُن کے منہ کالے ہوں گے، کیا گھمنڈ رکھنے والے کے رہنے کا ٹھکانا دوزخ نہیں ہے؟ اور اللہ اُنہیں جو پرہیزگار رہے، اللہ کامیابی کے ساتھ نجات دے گا، اُنہیں کوئی برائی چھو بھی نہیں جائے گی اور نہ اُنہیں کوئی صدمہ وملال ہوگا''۔

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۫ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۶۲﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۳﴾

''اللہ ہر چیز کو وجود میں لانے والا ہے اور وہ ہر چیز پر صاحب اختیار ہے، اس کے لئے کنجیاں ہیں آسمان اور زمین کی اور جنہوں نے اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر اختیار کیا، یہی وہ ہیں جو گھاٹا اٹھانے والے ہیں''۔

''مفاتیح'' اور ''مقالید'' دونوں لفظوں کے معنی کنجیوں کے ہیں یوں تو عام طور پر دونوں لفظوں میں یہ فرق بتایا گیا ہے کہ مفتاح کھولنے والی کنجی کو کہتے ہیں اور مقلاد جس کی جمع مقالید ہے بند کرنے والی کنجی کو مگر اکثر بغیر اس خصوصیت کو مدنظر رکھے ہوئے دونوں لفظوں کا ایک ہی عام یعنی کنجی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، یہاں ایسا ہی ہے۔[1] ''اُس کے ہاتھ میں کنجیاں ہیں'' یعنی روزی اور رحمت کے دروازے اُسی کے ارادے سے کھلتے ہیں۔[2]

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٥﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٦﴾

''کہئے تو کیا تمہارا مطالبہ مجھ سے یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت کروں اے جاہلو!؟ اور بے شک وحی بھیجی گئی ہے آپ کی طرف اور اُن کی طرف بھی جو آپ سے پہلے تھے کہ اگر تم شرک کرو تو تمہارے سب اعمال اکارت جائیں گے اور تم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو گے بلکہ بس اللہ ہی کی عبادت کیجیے اور شکر گزاروں میں سے ہو جایئے''۔

کسی بھی نبی کی طرف جو یہ وحی ہوئی اور پھر ہمارے نبیؐ کی طرف اس میں حکیمانہ انداز سے نبیؐ کو مخاطب کر کے دوسروں کے لئے سرمایہ انتباہ فراہم کیا جاتا تھا یعنی بظاہر نبیؐ مخاطب ہوتا تھا اور مقصود اس سے دوسرے ہوتے تھے جیسا کہ ہمارے قدیم مفسرین نے صراحتاً تشریح کی ہے اور صرف طبع زاد طور پر نہیں بلکہ حدیث معصومؑ کی سند کے ساتھ جو بالکل فیصلہ عقل کے مطابق ہے۔[3] اور اسی کے موافق جناب ابن عباسؓ کی تشریح بھی ہے۔[4]

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٧﴾

''اور اُنہوں نے اللہ کی شان کا ویسا اندازہ نہیں کیا جیسا کرنا چاہیے اور (واقعہ یہ ہے کہ) زمین پوری اُس کی مٹھی

---

[1] یعنی مفاتیح السّمٰوت والارض (علی بن ابراھیم) المقالید المفاتیح (تبیان)

[2] یرید مفاتیح السّمٰوت والارض بالرزق والرحمۃ علی ابن عباس (مجمع البیان)

[3] قال الصادقؑ ان اللہ تعالیٰ بعث نبیہ بایاک اعنی واسمعی یاجارۃ (علی بن ابراھیم)

[4] قال ابن عباس ھٰذا ادب مر اللہ تعالیٰ لنبیّہ وتھدید لغیرہ ان اللہ تعالیٰ من الشرک ومداھنۃ الکفار (مجمع البیان)

میں ہوگی قیامت کے دن اور آسمان سب بھی لپٹے ہوئے ہوں گے اُس کے ہاتھ میں پاک ہے وہ اور بالاتر ہے اُس سے جو وہ شرک کرتے ہیں''۔

عربی میں بھی اور ہماری اُردو میں بھی مٹھی میں ہونا اور ہاتھ میں ہونا کنایہ ہوتا ہے قبضہ وقدرت وملکیت سے۔مثلاً ہم یہ کہتے ہیں پورا شہر میری مٹھی میں ہے یا وہ آدمی بالکل میرے قبضے میں ہے تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہوتا ہے کہ جسمانی طور پر وہ آپ کے ہاتھ یا مٹھی میں ہو، بس ایسا ہی یہاں سمجھنا چاہیے۔[1]

اس سے ہرگز اُس کی ذات کے لئے جسمیت کا تصور درست نہیں ہے جیسا کہ نجدی جماعت کے مورث اعلیٰ ابن عبدالوہاب نے اپنے پیشوا ابن تیمیہ کی پیروی میں اپنے یہاں کے مزعومہ صحاح کے بعض احادیث کی بنا پر کیا ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿٦٨﴾

''اور صور پھونکا گیا ہوگا تو وہ جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں سب ہی بے حس وحرکت ہوکر گر گئے سوا اُن کے جنہیں اللہ چاہے، پھر وہ دوبارہ پھونکا گیا تو وہ ایک دم کھڑے ہوکر دیکھنے لگے''۔

مشہور یہ ہے کہ صور پھونکا جائے گا تو سب بلا استثناء فنا ہوجائیں گے، قرآن سے کسی ایسے صور کا پتہ نہیں چلتا، آخری صور کے پہلے جو زندہ کرکے کھڑا کرنے والا ہے، قرآن مجید میں دو صوروں کا ذکر ہے ایک کا ذکر یوں ہے کہ وہ پھونکا گیا ہوگا فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (سورۂ نمل۔۸۷) آسمان اور زمین میں جتنے تھے وہ سب پریشان اور مضطرب ہوگئے وہاں بھی استثناء ہوا ہے کہ الا من شاء اللہ ''سوا اُن کے جنہیں اللہ چاہے'' پھر دوسرا صور یہ ہے جس کا اثر بتایا گیا ہے۔فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ۔(سورۂ زمر۔۶۸) جس کا ترجمہ ہم نے یہ کیا کہ ''بے حس وحرکت ہوکر گر جائیں گے'' جو یہاں موت کی نوعیت سے ہے۔[2] اور اس کا استعمال بے ہوشی کی صورت میں بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ ہے: خر موسیٰ صعقا ''موسیٰ بے ہوش ہوکر گر گئے'' یہاں بھی استثناء موجود ہے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نفوس مطمئنہ ایسے ہیں جن پر اُس مضطرب کرنے والے صور کا اثر نہیں، اور کچھ نفوس باقیہ ایسے ہیں جن پر اس دوسرے بے جان کرنے والے صور کا اثر نہیں پھر وہ کون سا صور ہے جس میں بلا استثناء سب فنا ہوجائیں گے؟

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''ایک بار نفخ صور ہے عالم کے فنا ہونے کا، دوسرا ہے زندہ ہونے کا، تیسرا ہے بے ہوشی کا، بعد حشر کے چوتھا خبردار ہونے کا، اس کے بعد اللہ کے سامنے جائیں گے'' (موضح القرآن)

---

[1] معنی الآیۃ ان الارض باجمعھا مقدورہ کما یقبض علیہ القابض فیکون فی قبضتہ و کذٰلك قولہ والسّمٰوٰت مطویّات بیمینہ ای فی مقدورہ طیھا (تبیان)

[2] ای مرت من شدّۃ تلك الصیحۃ ـــــ یقال صعق فلان اذا مات بحال ھائلۃ شبیھۃ بالصیحۃ العظیمۃ (مجمع البیان)

مگر قرآن مجید سے اس کا پتہ کہیں نہیں چلتا۔

نُفِخَ، فَزِعَ اور صَعِقَ وغیرہ کی صورت کے الفاظ میں جو ہر جگہ ماضی کا صیغہ ہے، اس کی نظیریں واقعات قیامت کے بیان میں قرآن مجید کے اندر بکثرت ہیں، ان سب میں مستقبل کے واقعات کو یقینی ہونے کی بنا پر بصورت ماضی بیان کیا گیا ہے لیکن مقصود اُس سے مستقبل ہی ہوتا ہے، اس لئے بعض مترجمین نے ترجمہ میں ماضی کا ترجمہ مضارع یا مستقبل کے الفاظ سے کیا ہے۔ [1]

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ﴿۶۹﴾ وَوُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا یَفْعَلُوْنَ﴿۷۰﴾

''اور چمک اٹھی زمین اپنے پروردگار کے نور سے اور رکھ دیے گئے نامہ ہائے اعمال اور پیغمبر اور تمام گواہ حاضر کیے گئے اور فیصلہ کر دیا گیا اُن کے درمیان حق کے ساتھ اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا اور ہر متنفس کو پورا پورا دیا گیا اُس کے اعمال کا بدلا اور وہ خوب واقف ہے اُس سے جو وہ کیا کیے ہیں''۔

یہاں شروع میں عدالت الٰہی کی تصویر کشی میں بالکل ایک کچہری کا منظر پیش کیا گیا ہے اور آخر میں جو ہے ''وہ خوب واقف ہے اس سے جو وہ کیا کیے ہیں''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب مظاہرہ دنیا کو عدل الٰہی کا مشاہدہ کرانے کے لئے ہے ورنہ اللہ خود ہر ایک کے کردار اور جزا و سزا کے معیار سے واقف ہے۔

پہلا جملہ ایسا تصور پیش کرتا ہے کہ جیسے عدالت کی کرسی پر جج آ کر بیٹھ گیا، اس مرقع کشی میں بھی مستقبل کا ذکر بصیغہ ماضی کیا گیا ہے۔

گواہ ہونا امت پر اُن روحانی پیشواؤں ہی کا کام ہے جو خود گناہوں سے بری ہوں چنانچہ انبیاء اپنی اُمتوں کے شاہد تھے جیسا کہ ارشاد ہوا:

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا﴿۱۵﴾ (مزمل)

یقیناً ہم نے تمہاری طرف ایک پیغمبر بھیجا تھا جو تم پر گواہ ہے اُسی طرح جیسے فرعون کی طرف پیغمبر بھیجا تھا۔

اور جناب عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی ہے:

وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ

اور میں اُن پر اُس وقت تک کا گواہ ہوں جب تک میں اُن میں موجود تھا۔

اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ارشاد ہوا:

اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِیْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ شَهِیْدًا﴿۴۱﴾ (نساء)

جس وقت ہم ہر امت کے گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو اُن کا گواہ بنا کر لائیں گے۔

---

[1] دمیدہ شود صور (شاہ ولی اللہ) پھونکا جاوے گا صور (شاہ رفیع الدین)

اب اگر شھدا کا انحصار انبیاء ہیں ہوتا تو زیر تحریر آیات میں بالنبیین کہہ دینا کافی تھا لیکن یہاں النبیین کے ساتھ حرف عطف کے ساتھ الشھداء کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں کے علاوہ بھی اس معیار پر کچھ افراد ہیں جنہیں یہ گواہی کا منصب عطا کیا گیا ہے۔

جمہور اُمت ''شہدا'' یعنی گواہوں کے تصور سے محروم ہے مگر ہم ان ''شہدا'' کو جانتے ہیں جو اصطلاحی طور پر نبی نہیں ہیں مگر معیار کمال عصمت پر فائز ہیں، یہ ہیں خاتم الانبیاء کے حقیقی جانشین ائمہ طاہرین علیہم السلام یہی وہ شہداء ہیں جو علاوہ انبیاء کے گواہی کے لئے لائے جائیں اور وہی قرآن میں دوسری جگہ اس خطاب کے مخاطب صحیح ہیں کہ:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (بقرہ..۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی گروہ قرار دیا تا کہ تم تمام لوگوں پر گواہ ہو اور پیغمبر تمہارے اوپر گواہ ہوں۔

جس کی تفسیر پہلے آ چکی ہے۔[۱]

دوسرے لوگ جو ایسے معصومین کے وجود کا تصور نہیں رکھتے، وہ اسے عام نیک آدمیوں کے معنی میں لیتے ہیں مگر غیر معصوم کیسا ہی نیک آدمی ہو، خود اُس کے اعمال میں صحیح وغلط اور جائز و ناجائز کی آمیزش ہوگی تو اُسے خود گواہی کی زد میں آنا ہے، پھر وہ گواہ ہونے کے قابل کیوں کر ہوسکتا ہے؟

ان میں سے بعض مفسرین نے اس سے مراد اُمت محمدؐ یہ کو لیا ہے مگر عام اُمت کے کردار کو دیکھ کر حافظ شیرازی کی ہم نوائی کرتے ہوئے کہنا پڑتا ہے ''وائے گر در پس امروز بود فردائی''۔

اُمت محمدیہ ہے بھی تو گواہی کے لائق ان میں کے وہی افراد ہو سکتے ہیں جو خالق کی نظر میں مثالی کردار کے حامل ہوں۔

بعض نے پوری امت کو گواہ بنانے کی خاطر گواہی کی نوعیت کو بدل دیا ہے کہ امت محمدیہ بحیثیت گواہ خود انبیاء کی خدمات کی تصدیق کے لئے آئے گی۔[۲]

سبحان اللہ! اس صورت میں بعد کے فقرے کو کیا کہا جائے گا کہ قضی بینھم بالحق ''فیصلہ کر دیا جائے گا اُن کے درمیان حق کے ساتھ''۔ کیا پیغمبروں اور اس امت کے درمیان کوئی جھگڑا ہو رہا تھا جس کے فیصلے کا اعلان کیا جا رہا ہے؟

حقیقت میں یہ سب باتیں حق ناشناسی پر مبنی ہیں۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى

---

[۱] الشھداء الائمۃ علیھم السلام (علی بن ابراھیم)

[۲] ای امّۃ محمّد ﷺ یشھدون الرّسل بالا بلاغ (جلالین)

الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾

''اور لے جائے گئے وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا دوزخ کی طرف گروہ در گروہ، یہاں تک کہ جب وہ وہاں آئے تو اُس کے دروازے کھل گئے اور اُن سے اُس کے محافظوں نے کہا کہ کیا نہیں آئے تمہارے پاس کچھ پیغمبر تم میں کے جو تمہیں پڑھ کر سنائیں تمہارے پروردگار کی آیتیں اور تمہیں ڈرائیں تمہارے اس دن کے سامنے آنے سے؟ اُنہوں نے کہا کیوں نہیں مگر کافروں پر قدرت کی طرف سے عذاب کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ کہا گیا کہ داخل ہو دوزخ کے دروازوں میں وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہتے ہوئے، کتنا برا ٹھکانا ہے گھمنڈ کرنے والوں کا''۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴿۷۳﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاۗءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۷۴﴾

''اور لے جائے گئے وہ جو اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے تھے بہشت کی طرف گروہ در گروہ یہاں تک کہ جب وہ وہاں آئے اور اُس کے دروازے کھولے جا چکے تھے اور اُن سے اُس کے محافظوں نے کہا سلام ہو تم پر تم پاک رہے، اب تم داخل ہو یہاں ہمیشہ کے لئے اور انہوں نے کہا شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ہمیں حق دار بنایا اس سرزمین کا کہ ہم بہشت میں جہاں چاہیں ٹھہریں تو کتنا اچھا ہے صلہ عمل کرنے والوں کا''۔

یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں سلام ہے کہ الفاظ ہیں جو شیعوں کے یہاں رائج ہیں معلوم نہیں مسلم اکثریت نے اسے ترک کر کے السلام علیکم ہی کو اپنا شعار کیوں بنا لیا ہے؟

''ہمیں حق دار بنایا ہے اس سرزمین کا'' یعنی سرزمین بہشت کا اس لئے کہ زمین وہی تو نہیں ہے، جس پر ہم ہیں بلکہ ہر شے جس پر کسی کے قدم ہوں، وہ اُس کے لئے زمین ہے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ زمین ہے اور جو ہمارا آسمان ہے، اہل آسمان کے لئے وہ زمین ہے تو جو اہل بہشت ہوں گے، اُن کے لئے بہشت کی وہی سطح جس پر اُن کے قدم ہوں گے زمین کی حیثیت رکھتی ہوگی۔

وَتَرَى الْمَلٰۗىِٕكَةَ حَاۗفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۵﴾

''اور دیکھو گے فرشتوں کو عرش کے اردگرد گھیرا کیے ہوئے کہ وہ تسبیح کرتے ہیں اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ

اوران کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا گیا اور کہا گیا شکر ہے اللہ کا جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔

ہم تو سمجھتے ہیں یہ آیت بھی قیامت کے متعلق ہے اور ''اُن کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا گیا'' یہ ''اُن'' کی ضمیر فرشتوں کی طرف راجع نہیں ہے بلکہ سابق میں جو اہل جنت اور اہل نار دونوں فریقوں کا ذکر ہوا تھا اُن سے متعلق ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے سمجھا ہے۔[1] اور بعض نے اُسے مجمل طور پر خلائق سے متعلق کیا ہے۔[2]

علامہ طبرسیؒ نے کئی احتمال بطور تردید و تردد نقل کر دیئے ہیں مگر کسی میں اسے فرشتوں سے متعلق قرار نہیں دیا ہے۔[3] لیکن شاہ ولی اللہ نے ضمیر کو فرشتوں کی طرف راجع کر دیا ہے، اور حاشیہ پر لکھ دیا ہے ''یعنی در اختصام ملا اعلیٰ'' (فتح الرحمٰن)

مطلب یہ ہے کہ اور جگہ یہاں سے کافی دور پر ایک سورے میں جو قرآن میں ''ملا اعلیٰ'' کے جھگڑے کا ذکر ہے، اُس سے متعلق ہے حالانکہ ''اختصام'' یعنی جھگڑا جس کا حوالہ دیا ہے، اُس کا یہاں اس سے پہلے کہیں ذکر نہیں ہے۔

اُن کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر بھی مرجع ضمیر میں ان سے متفق ہیں مگر اس کی تشریح وہ عجیب و غریب انداز میں یوں کرتے ہیں کہ:۔

''فرشتوں میں فیصلہ یہ کہ ہر ایک اپنے قاعدے پر ایک تدبیر بولتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ ایک کی بات جاری کرتا ہے، وہی ہوتی ہے حکمت کے موافق یہ فیصلہ اب بھی ہے اور قیامت میں بھی'' (موضح القرآن)

مطلب یہ ہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک فرشتے اللہ کو طرح طرح کی رائیں دیتے ہیں، وہ کسی کو منظور کر لیتا ہے اور کسی کو رد مگر قرآن مجید نے تمام فرشتوں کو یہ سند عطا کی ہے کہ:۔

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ (انبیاء)

وہ اللہ پر کچھ کہنے میں سبقت نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر کاربند ہوتے ہیں۔

پھر یہ تصور کہ وہ غلط رائے بھی دے جاتے ہیں جنہیں خداوند عالم رد کر دیتا ہے، کہاں درست ہو سکتا ہے؟ خدا اور فرشتوں میں فرمان روائی اور فرمان برداری کا رشتہ ہے، نہ کہ وہ اُس کی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں جو اُسے طرح طرح کی رائیں دیتے ہیں۔

---

[1] ای قضی بین الخلائق بالحق ای العدل فیدخل المؤمنون الجنّة و الکافرون النّار (جلالین)

[2] ای فصل بین الخلائق بالعدل لا ظلم فیه علی احد (تبیان)

[3] ای فصل بین الخلائق بالحق و قیل بین الانبیاء و الامم و قیل بین اهل الجنّة و النّار (مجمع البیان)

سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنِ

مکّیہ ----۸۵---- آیات

چونکہ اس سورے میں ''مومن آل فرعون'' کا تفصیلی تذکرہ ہے اس لئے اس سورے کا نام یہ ہوا۔ اس کے علاوہ اس سورے میں حسب ذیل مضامین ہیں خواہ مستقل طور پر اور خواہ اُسی مؤمن کی زبانی۔

۱۔ حاملانِ عرش کا ذکر اور اُن کا اہل ایمان کے لئے استغفار۔

۲۔ دو دفعہ کی موت اور دو دفعہ کی زندگی۔

۳۔ قدرت کی طرف سے حق بجانب لمن الملك کی صدا اور کائنات کے سناٹے کا بزبان خاموشی معترفانہ جواب۔

۴۔ فرعون کی طرف سے حضرت موسیٰؑ پر بے دینی اور فساد پھیلانے کا الزام۔

۵۔ جناب یوسفؑ کے بعد لوگوں کا غلط تصور کرنا ان کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔

۶۔ فرعون کا ہامان کو ایک اونچے محل کے بنانے کا حکم تا کہ خدائے موسیٰؑ کا پتہ لگایا جائے۔

۷۔ اہل دوزخ کی وہاں کے محافظوں سے التجاء اور اُن کا جواب۔

۸۔ خدا کی طرف سے اپنے پیغمبروں کی امداد کا قطعی وعدہ۔

۹۔ دعا کا حکم اور اُس سے انکار کرنے والوں کی شدید تہدید۔

۱۰۔ کوئی پیغمبر کوئی معجزہ بغیر حکم الٰہی نہیں دکھا سکتا۔

۱۱۔ خالق کی سنت قدیم کہ عذاب آنے کے بعد ایمان لانا بے سود ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۲﴾ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۳﴾

''حا۔ میم۔ اس کتاب کا اُتارا جانا ہے اللہ کی طرف سے جو عزت والا، علم والا ہے، جو گناہ معاف کرنے والا اور توبہ

قبول کرنے والا، سخت سزا والا، بخشش وعطا والا ہے، سوا اُس کے کوئی خدا نہیں، اسی کی طرف آخر کار جانا ہے''۔

قابل التوب کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے ''توبہ قبول کرنے والا'' یہ اس تصور پر مبنی ہے کہ توب کا لفظ تَابَ یَتُوْبُ کے مصدر کی حیثیت رکھتا ہے لیکن دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ توبہ کی جمع ہے جیسے کَلِمَة کی جمع کَلِمَ اس کی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ''توباؤں کا قبول کرنے والا ہے۔[1]

مجھے پہلا ترجمہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ علامہ طبرسیؒ بھی بظاہر اسی سے متفق ہیں۔[2]

مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۝۴ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۠ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۡ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝۵ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝۶

''بلا وجہ بحث وتکرار نہیں کرتے آیات الٰہی کے بارے میں مگر وہی جو کافر ہوں تو تمہیں دھوکا نہ دے اُن کا مختلف شہروں میں دندناتے پھرنا۔ اُن کے پہلے نوح کی قوم اور اُن لوگوں کے بعد بہت سی جماعتوں نے جھٹلایا اور پھر قوم نے اپنے پیغمبر کے بارے میں ارادہ کیا کہ وہ اُسے گرفت میں لے لے اور باطل کے سہارے پر بحث تکرار کی تاکہ شکست دیں اُس سے حق کو تو میں نے اُنہیں گرفت میں لے لیا تو کیسا تھا میرا عذاب اور یونہی تمہارے پروردگار کی بات پوری ہونا ہے ان کے بارے میں اور جنہوں نے کفر اختیار کیا، وہ سب دوزخی لوگ ہیں''۔

''تمہیں دھوکا نہ دے اُن کا مختلف شہروں میں دندناتے پھرنا'' یہ جملہ دوسری جگہ بھی آیا ہے جس کا مفاد ہر مقام پر یہ ہے کہ دنیوی قہر وغلبہ کو دلیل حقانیت نہ سمجھنا چاہیے، اس کے لئے عاد وثمود وغیرہ مثالیں دی گئی ہیں کہ اُنہیں بھی تو اقتدار حاصل تھا، پھر کس طرح وہ سب تباہ برباد ہو گئے۔

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝۷ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ

---

[1] التّوب یحتمل وجھین (تبیان)

[2] یقبل توبة من تاب الیه من المعاصی (مجمع البیان)

جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۸ وَقِهِمُ السَّیِّاٰتِ ط وَمَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ط وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝۹

''وہ جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اُس کے اردگرد ہیں، تسبیح کرتے ہیں اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ اور اُس پر ایمان رکھتے ہیں اور بخشش کی دعا کرتے ہیں اُن کے لئے جو ایمان لائے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! تو حاوی ہے ہر چیز پر رحمت اور علم کے ساتھ تو بخش دے اُنہیں جو تجھ سے لو لگائے ہیں اور جنہوں نے پیروی کی ہے تیرے راستے کی اور بچا اُن کو دوزخ کے عذاب سے اور اے ہمارے پروردگار! اُنہیں داخل کر ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے بہشتوں میں جن کا تو نے وعدہ کیا ہے اور جو اُن کے آباؤ اجداد اور بیوی بچوں میں سے اس لائق ہوں، یقیناً تو عزت والا ہے، حکمت والا اور اُنہیں غلطیوں سے بچا اور اُس دن جسے تو نے غلطیوں سے بچایا، اُس پر تو مہربان ہو اور یہی بڑی کامیابی ہے''۔

ملائکہ کی دعاؤں میں یہ فقرہ کہ قِهِمُ السیئات اُس کے لفظی معنی وہی ہیں جو ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ اُنہیں غلطیوں سے بچا اور اس مناسبت سے یومئذ کا ترجمہ ہونا چاہیے ''آج'' یعنی اس دار دنیا میں لیکن دوسرا تصور یہ ہے کہ قِهِمُ السیات کے معنی یہ ہیں کہ برائیوں کی سزا سے بچا۔ اس صورت میں یومئذ کے معنی ہوں گے اُس دن یعنی آخرت میں۔ اس صورت میں حذف کے ماننے کی ضرورت ہوتی ہے۔[1] جس کی بادی النظر میں کوئی خاص وجہ معلوم نہیں ہوتی لیکن اس مفہوم کو تقویت پہنچتی ہے اس فقرے کے محل وقوع سے کیوں کہ اس کے پہلے سب دعائیں آخرت سے متعلق ہیں۔ ''بخش دے'' اور ''اُنہیں عذاب جہنم سے بچا اور اُن کے باپ داداؤں اور اولاد میں سے جو اس لائق ہوں، اُنہیں بہشت میں داخل کر، یہ سب چیزیں بعد والی منزل سے متعلق ہیں جو انجام کار ہے۔ اس کے بعد یہ کہ اُنہیں گناہوں سے بچا'' یہ دار دنیا کی اس زندگی سے متعلق ہے تو جیسے یہ رفتار کلام میں آگے بڑھ کر پیچھے کی طرف پلٹنا ہے مگر اس صورت میں جب کہ اس سے گناہوں کی سزا مراد ہو، ایک طرح کی تکرار محسوس ہوتی ہے کہ پہلے آچکا ہے قِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ''اُنہیں بچا دوزخ کی سزا سے'' تو اب پھر یہ کیوں کہا جا رہا ہے کہ گناہوں کی سزا سے بچا کیوں کہ وہ سزا عذاب دوزخ ہی تو ہے۔

ہاں اس صورت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دوزخ تو بڑے بڑے گناہوں کی سزا ہے لیکن سیات جیسا کہ بعض جگہ الفاظ قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے، وہ معمولی گناہ ہیں جن کی سزا دوزخ میں مستقل طور پر داخل نہیں ہے بلکہ اس سے کم تر سزا مثلاً دنیا میں کسی مصیبت کی صورت میں سزا دے دی جائے، یا عذاب قبر کی صورت میں تو دوزخ کی سزا سے بچانے کی دعا کے بعد قدم آگے بڑھا کر جیسے غلطیوں کی نتائج بد سے بچانے کی دعا کی گئی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُنہیں برے کاموں کے برے انجام سے بچا اور اس کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ بڑی کامیابی ہے۔

---

[1] وقهم السّیّات معناہ وقهم عذاب السّیّات (تبیان)۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰہِ اَکْبَرُ مِنْ مَّقْتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَی الْاِیْمَانِ فَتَکْفُرُوْنَ ﴿۱۰﴾

''بلاشبہ وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا، اُنہیں پکار کر کہا جائے گا کہ اللہ کی ناراضگی زیادہ بڑی چیز ہے خود اپنے سے تمہاری ناراضگی سے جب کہ تمہیں بلایا جاتا تھا ایمان کی طرف تو تم کفر اختیار کرتے تھے''۔

اس کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ تم اپنی مرضی کے خلاف کرتے، بہتر تھا اس سے کہ تم نے خدا کی مرضی کے خلاف عمل کیا جس کے نتیجہ میں آج مستوجب عذاب ہوئے۔ اس کے علاوہ دوسرے مفہوم قرار دیئے گئے ہیں جو الفاظ قرآنی سے کچھ بعید نہیں ہیں چنانچہ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:۔

یعنی دردوزخ بدخود دعائے بدمی کنندوی گویند کاشکے معدوم شدند۔

یعنی وہ اپنے کو خود دوزخ میں کوستے ہوں گے کہ کاش وہ نیست ونابود ہوجائیں۔

پھر کہا ہے کہ دوسرے معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ:۔

یعنی قبول نہ کردن ایمان عداوت باخود است اگرچہ ایں رانہ نمی دانستند پس جزائے ایں عداوت نفس خود عداوت خداشد ایشان را (فتح الرحمٰن)

یعنی ایمان کا قبول نہ کرنا خود اپنے سے ایک دشمنی ہے اگرچہ وہ اس کو جانتے نہ تھے اب اُسی اپنے ساتھ دشمنی کی سزا خدا کی عداوت کی صورت میں ملی ہے۔

زیادہ تر مفسرین کا ذہن اسی طرف گیا ہے کہ یہ اُن کی اپنے نفس سے ناراضگی آخرت میں ہے جب کہ اُنہوں نے اپنی دنیا کی بداعمالیوں کی سزا اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔[1]

شاہ صاحب نے جو پہلا مطلب لکھا ہے اس کا ماحصل بھی یہ ہے۔

دوسرا مطلب جو اُنہوں نے لکھا ہے، اُس کے موافق جناب شیخ الطائفہؒ نے ایک قدیم مفسر کا قول یوں نقل کیا ہے کہ:۔

قال البلخی لمّا ترکوا الایمان و صاروا الی الکفر فقد مقتوا انفسھم.

بلخی نے کہا ہے کہ جب اُنہوں نے ایمان ترک کیا اور کفر کی طرف گئے تو انہوں نے اپنے ساتھ دشمنی کی۔

ہمیں اس مفہوم کے قبول کرنے میں اس لئے تأمل ہے کہ پھر اللہ کا اُن سے ناراض ہونا تو نتیجہ ہوا اُن کی اس اپنے نفس کے ساتھ عداوت کا۔ اُسے اُس کے بالمقابل قرار دے کہ مقة الله اکبر ''اللہ کا ناراض ہونا تم سے اُس سے بڑھ کر ہے جتنا تم اس سے ناراض ہو'' کہنا بے محل ہو گا۔ ہم نے پہلے جو مفہوم لکھا ہے، اُس کا ماحصل یہ ہے کہ دار دنیا میں تم اپنے افعال سے خود دشمنی اختیار کر لیتے، وہ آسان تھا اس سے کہ تمہارے اعمال کے نتیجہ میں اللہ تم سے ناراض ہو جس کا نتیجہ اب تمہیں آنکھوں سے نظر آرہا ہے۔

شیخ الطائفہؒ نے کچھ لوگوں کی زبانی ایک قول اس سب سے الگ یوں نقل کیا ہے:۔

---

[1] ۔ قال مجاھد وقتادۃ والسّدی وابن زید مقتوا انفسھم وھین عانیو العذاب (تبیان)

قال قوم لمقت اللہ اکبر من مقت بعضکم لبعض (تبیان)

ایک جماعت نے کہا ہے کہ اللہ کی دشمنی اُس سے بڑی ہے جتنا آپس میں تم ایک دوسرے کو دشمن رکھتے۔

ہمارے نزدیک یہ مفہوم بہت بعید ہے جس پر الفاظ آیت کو محمول نہیں کیا جا سکتا۔

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۱۱﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴿۱۲﴾

''اُنہوں نے کہا اے ہمارے مالک! تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی اور دو دفعہ زندہ کیا تو ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں، اب کیا نکلنے کی کوئی صورت ہے؟ یہ اس وجہ سے ہو رہا ہے کہ جب اللہ کو اُس کی وحدت کے اظہار کے ساتھ پکارا جاتا تھا تو ہم انکار کرتے تھے اور اگر اُس کے ساتھ شرک کیا جائے تو تم مان لیتے تھے تو اب فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے جو بلند ہے، بزرگ''۔

دو دفعہ موت اور دو ۲ دفعہ زندگی، اس کی تشریح شاہ عبدالقادر یوں کرتے ہیں: ''پہلے خاک تھے یا نطفہ تو مردے ہی تھے، پھر جان پڑی تو جی گئے، پھر مرے پھر جیے، یہ ہوئیں دو موتیں اور دو حیاتیں'' (موضح القرآن)

لیکن رجعت کی بنا پر جو احادیث اہل بیتؑ بتواتر ثابت ہے، یہ دو موتیں اور دو زندگیاں بالکل ظاہر ہیں۔ پہلی موت قبل رجعت اور دوسری بعد رجعت پہلا زندہ ہونا اُس موت سے رجعت میں اور دوسرا دوسری موت سے قیامت میں، چنانچہ ہمارے یہاں کی ایک حدیث اس آیت کو متعلق بہ رجعت قرار دیتی ہے مگر جناب شیخ طوسیؒ اُس حدیث کو بظاہر نا قابل لحاظ قرار دیتے ہیں اور اُنہوں نے بطور ایک قول کے نقل کرتے ہوئے اُس سے اختلاف کا رجحان ظاہر کیا ہے اور بعد بحث و تمحیص اسے بطور احتمال قبول کیا ہے مگر دوسرا برابر کا احتمال یہ ہے کہ پہلی موت اس دار دنیا کی زندگی کے بعد والی موت ہے اور اس کے بعد کی زندگی جو سوال منکر و نکیر کے لئے قبر میں ہوں گے جس کے بعد پھر موت طاری ہوگی اور اُس کے بعد قیامت میں جزا و سزا کے لئے مختتم زندگی ہوگی، اس احتمال کے موجود ہونے کے بعد کم از کم اس آیت سے استدلال رجعت پر نہیں ہو سکتا اور علامہ طبرسیؒ نے اس مفہوم کو جو رجعت سے متعلق ہے بطور احتمال یا نقل قول بھی درج نہیں کیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ رِزْقًا ۭ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

''وہ وہ ہے جو تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمہارے لئے آسمان سے روزی اُتارتا ہے اور نہیں نصیحت حاصل کرتا مگر وہ جو اللہ سے لو لگائے تو پکارو اللہ کو اُس کی خالص عبادت کرتے ہوئے چاہے کافر لوگ ناپسند کریں''۔

''آسمان سے روزی اُتارتا ہے'' یعنی بارش جس سے روزی پیدا ہوئی ہے۔[1]

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۙ﴿۱۵﴾ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۭ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۭ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۷﴾

''اونچے درجوں والا، عرش کا مالک، اُتارتا ہے خاص روح کو اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے تاکہ وہ ڈرائے بارگاہ الٰہی میں حاضری والے دن سے، جس دن وہ باہر نکلیں گے، اللہ پر اُن کی کوئی بات چھپی ہوئی نہ ہوگی، آج سلطنت کس کی ہے؟ ایک اکیلے غالب، زبردست اللہ کی۔ آج ہر متنفس کو معاوضہ ملے گا اُس کا جو اُس نے کیا ہے، آج کوئی ظلم نہیں ہے، یقیناً اللہ جلد حساب لینے والا ہے''۔

رفیع الدرجٰت جس کے معنی ہوئے ''اونچے درجوں والا'' اس کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ خود اُس کے درجے بہت بلند ہیں کیوں کہ وہ لامحدود ذات ہے جہاں درجوں کا تصور ہی نہیں ہوسکتا بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے بندگانِ خاص کو جو عطا فرماتا ہے، وہ بڑے اونچے درجے ہیں۔[2] اس لئے بعض نے اُس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ وہ درجوں کا بلند کرنے والا ہے۔[3]

یہ لفظی طور پر تو رافع الدرجات کے معنی ہوتے ہیں مگر اُس عقلی قرینے کی بنا پر تصرّف ذہنی کے ساتھ لازم معنی یہ ہوتے ہیں جنہیں بطور ترجمہ قرار دے دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ سیدھی بات یہ ہے کہ درجوں کے لفظ میں چونکہ صریحی ارتقاء محسوس ہوتا ہے بس اُسے نظر انداز کر کے اُس کا مطلب یہ لیا جائے کہ اُس کے اوصاف کمال انتہائی بلند و برتر ہیں جسے علامہ طبرسیؒ نے ایک قول کے طور پر درج کیا ہے۔[4] 'اُتارتا اُتارتا ہے خاص روح کو اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے'' ان بندوں سے مراد انبیاء ہیں، خواہ روح سے مراد وحی ہو اور خواہ خاص فرشتہ جو وحی لاتا ہے اور خواہ نبوت، نتیجہ سب کا ایک ہے۔

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ۭ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ﴿۱۸﴾

---

[1] من الغیث والمطر الّذی ینبت ماھو رزق للخلق (تبیان و مجمع البیان)

[2] قیل معناہ رفیع طبقات الثّواب التی یعطیھا الانبیآء والمؤمنین فی الجنّۃ (تبیان)

[3] بلند کنندۂ مراتب (شاہ ولی اللہ)

[4] قیل معناہ انّہ علی الصفات (مجمع البیان)

''اور اُنہیں ڈرایئے قیامت کے دن سے [1] جب کہ دل کھینچ کر گلوں میں آ گئے ہوں گے غم وغصہ سے بھرے ہوئے، ان ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارش کرنے والا جس کا حکم مانا جائے''۔

قیامت کو ازفۃ کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اُسے دور نہ سمجھنا چاہیے، وہ قریب ہی ہے جیسا کہ دوسری جگہ ہے: ازفت الازفۃ یعنی قیامت نزدیک ہو چکی ہے، اس لئے کہ عمر عالم کے لحاظ سے ہزاروں برس کا فاصلہ بھی کوئی چیز نہیں ہے، اس لئے آج سے ایک ہزار برس پہلے بھی وہ قریب تھی اور آج بھی قریب ہے پھر بھی ہم اُسے کسی اپنے حساب والی مدت میں محدود نہیں کر سکتے۔

جیسا کہ دوسرے مقامات پر نفی شفاعت کے ساتھ الا نے آ کر ثبت شفاعت کا تصور قائم رکھا ہے اُسی طرح یہاں نفی شفاعت کے ساتھ یطاع کے لفظ نے یہ معنی پیدا کیے ہیں کہ خالق کی نگاہ میں اُس سے بالاتر ذات کوئی نہیں ہے جو بطور حکم سفارش کرے اور خدا اُس کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہو بلکہ جو شفیع ہوں گے وہ اُس کے بندے ہوں گے جو اُس کی مرضی کے حدود کے اندر شفاعت کریں گے۔ [2]

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴿١٩﴾ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿٢٠﴾

''وہ جانتا ہے آنکھوں کی مجرمانہ جنبش اور جو سینوں میں باتیں چھپی ہوں اور اللہ فیصلہ کرتا ہے حق کے ساتھ اور جنہیں وہ پکارتے ہیں، اُس کے سوا وہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کر سکتے یقیناً اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا''۔

خائنۃ الاعین جس کا ترجمہ ہم نے ''مجرمانہ جنبش'' کیا ہے، اُس کی تشریح میں مفسرین نے یہ پہلو بھی لکھا ہے کہ جنبش پوشیدہ طور پر ہے جس میں کسی کو دھڑکا ہو کہ کوئی دوسرا دیکھ نہ لے۔ [3] حالانکہ لفظ خائنۃ الاعین میں ''پوشیدہ'' کا مفہوم ہمیں محسوس نہیں ہوتا کیوں کہ اصطلاح قرآنی میں ہر گناہ ایک خیانت کی حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ قرآن میں ارتکاب گناہ کرنے کی ایک جگہ تعبیر تختانون انفسکم کے لفظوں سے کی گئی ہے اسی لئے ہم نے ترجمہ میں صرف ''مجرمانہ'' کا لفظ لکھا ہے۔

ہاں ممکن ہے کہ اللہ کے لئے خصوصی علم کے اظہار سے یہ مطلب نکل آئے کہ وہ جنبش نظر اس طرح تھی کہ عام افراد اُسے اکثر محسوس نہیں کر سکتے۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿٢١﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ

---

[1] یوم الأزفة یعنی یوم القیامة (علی بن ابراھیم)

[2] انما اراد نفی شفیع یطاع ولیس فی ذلك نفی شفیع یجاب (مجمع البیان)

[3] ای یعلم ما یختان به الاعین من النظر الی غیر ما یجوز النّظر الیه علی وجه السّرقة (مجمع البیان)

رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾

''کیا وہ اطراف زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کیا انجام ہوا اُن کا جو ان سے پہلے تھے؟ وہ ان سے زیادہ تھے قوت میں اور دنیا میں اپنی نشانیوں کے لحاظ سے تو اللہ نے اُن لوگوں کو اپنی گرفت میں لے لیا اُن کے گناہوں کی سزا میں اور اُنہیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ اس لئے کہ اُن کے پاس اُن کے پیغمبر معجزے لے کر آئے تھے جس پر انہوں نے کفر اختیار کیا تو اللہ نے اُنہیں گرفت میں لے لیا، یقیناً وہ طاقت ور ہے، سخت سزا دینے والا''۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْۤا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْیُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَمَا كَیْدُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾

''اور بلاشبہ ہم نے بھیجا موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں اور کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ فرعون، ہامان، اور قارون کی طرف تو اُنہوں نے کہا یہ بڑا جادوگر ہے جھوٹا تو جب وہ آئے اُن کے پاس ہماری طرف سے حق کو لے کر تو اُنہوں نے کہا کہ جنہوں نے ان کے ساتھ ایمان اختیار کیا، ان کے بیٹوں کو قتل کر دو اور اُن کی عورتوں کو زندہ رکھ لو اور نہیں ہے کافروں کی منصوبہ بندی مگر گمراہی میں''۔

فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرنا، ایک تو جناب موسیٰؑ کی ولادت سے پہلے تھا اس پیش گوئی کے پیش نظر کہ ان میں ایک وہ بچہ پیدا ہونے والا ہے جس سے فراعنہ کی سلطنت کا زوال ہوگا اور اسی لئے جناب موسیٰؑ کی حفاظت کے لئے خالق کی طرف سے یہ انتظام ہوا کہ اُنہیں دریا میں بہا دیا جائے اور اس طرح فرعون کے منصوبے کو شکست ہوگئی، دوسری دفعہ جس کا اس مقام پر تذکرہ ہے، جناب موسیٰؑ کی بعثت کے بعد بنی اسرائیل کے لئے بطور سزا یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان کے بیٹوں کو قتل کیا جائے اور ان کی عورتوں کو کنیز بنا کر رکھ لیا جائے۔ [1]

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْۤ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ وَقَالَ مُوْسٰۤی اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾

''اور فرعون نے کہا کہ مجھے موسیٰؑ کو قتل کرنے دو اور وہ اپنے پروردگار کو مدد کے لئے پکاریں، مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل نہ دیں یا یہ کہ اس سرزمین پر فساد رونما کریں اور موسیٰ نے کہا کہ میں مانگتا ہوں اپنے پروردگار

---

[1] اقتلوا ابناء الّذین امنوا بموسیٰ ومن معه: قال قتادة کان هٰذا الامر بقتل الابنآء والاستحیآء للنسّآء امر امن فرعون بعد الامر الاوّل (تبیان) هذا القتل غیر القتل الاوّل لئلا ینشأ منهم من یزول ملکه علیٰ یده ثم ترک ذلك فلمّا ظهر موسیٰ علیہ السلام عاد علیٰ تلك العادة (مجمع البیان)

اور تمہارے پروردگار سے پناہ ہر اُس گھمنڈ والے سے جو روز حساب پر ایمان نہ رکھتا ہو"۔

فرعون کی طرف سے حضرت موسیٰؑ پر بے دینی اور فساد پھیلانے کا الزام

یوں تو جیسا اس کے پہلے سورۂ اعراف میں آیا ہے فرعون کے یہاں کے عمائد نے جیسے فرعون سے خود تقاضا کیا تھا کہ موسیٰؑ کے خلاف تدارکی کارروائی کی جائے ان الفاظ میں کہ:۔

کیا موسیٰ اور اُن کی قوم والوں کو چھوڑ دیجیے گا کہ وہ لوگ اس سرزمین میں فساد پھیلائیں اور وہ آپ کو اور آپ کے خداؤں کو چھوڑ دیں"۔

اُن کے جواب میں فرعون نے یہی ارادہ ظاہر کیا تھا کہ:

ہم اُن کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور اُن کی عورتوں کو زندہ رکھ لیں گے اور ہم اُن پر پورا قابو رکھتے ہیں۔

مگر یہاں یہ الفاظ کہ "مجھے موسیٰؑ کو قتل کرنے دو" یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ سب یا اُن میں سے کچھ خود موسیٰؑ کے قتل کرنے سے اختلاف رکھتے تھے۔[1]

بلکہ یہ بھی کچھ پتہ چلتا ہے کہ جیسے وہ یہ تصور بھی رکھتے تھے کہ شاید جناب موسیٰؑ جس خدا کی طرف دعوت دے رہے ہیں، وہ حقیقتاً درست ہو اور وہ اُس سے بددعا کر کے فرعون کا تختہ نہ الٹ دیں، جب ہی اس نے اُن کے جواب میں کہا کہ "مجھے اُنہیں قتل کرنے دو اور وہ کریں اپنے خدا سے دعا" یعنی اطمینان رکھو کہ وہ بددعا کر کے میرا کچھ نہیں بنا سکتے۔[2] اور اسی بنا پر اُسے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ اُس کے گردوپیش والوں پر اثر انداز نہ ہو رہے ہوں، اس لئے اُس نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل نہ دیں، دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ کچھ لوگ اُن سے متاثر ہو کر گرویدہ ہو جائیں اور کچھ فرعون کے طرف دار ہو جائیں اسی طرح اُس قوم میں انتشار اور باہمی تصادم ہو، اس خطرے کے احساس سے اُس نے دوسرا فقرہ کہا کہ "یا وہ اس سرزمین پر فساد رونما کریں"۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۚ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝۲۸

"کہا ایک باایمان شخص نے فرعون کے خاندان والوں میں سے جو اپنے ایمان کو چھپائے رکھتا تھا کہ کیا ایک شخص کو اس بات پر قتل کرو گے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور وہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے معجزے بھی لے کر آیا ہے اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اُس کے جھوٹ سے اُسی کو نقصان پہنچے گا اور اگر وہ سچا ہوا تو تم کو پہنچے

---

[1] لأنهم كانوا يكفونه عن قتله (جلالين)

[2] يدلّ على ان في خاصة فرعون كان قوم يمنحونه من قتل موسىٰ عليه السلام ومن معه ويخوّفونه ان يدعو ربه فيهلك (تبيان)

گا کچھ وہ عذاب جس کی تمہارے لئے وہ پیشن گوئی کرتا ہے، بلاشبہ اللہ منزل تک نہیں پہنچاتا ہے اُسے جو حد سے تجاوز کرنے والا، بڑا جھوٹا ہو"۔

مومن آل فرعون کا تذکرہ

ہم نے جو ترجمہ کیا ہے وہ اس پر مبنی ہے کہ مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ کا لفظ رجل مؤمن کا وصف ہے مگر دوسرا قول یہ ہے کہ مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ کا لفظ بعد والے یَكْتُمُ اِيْمَانَهٗ سے متعلق ہے یعنی وہ شخص جو بنی اسرائیل میں تھا اور اپنے ایمان کو فرعون والوں سے چھپائے ہوئے تھا، اس بنا پر رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ کے لفظ پر ایک طرح کے وقف کی علامت بنائی گئی ہے اور اس صورت میں مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ کو یَكْتُمُ اِيْمَانَهٗ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا۔

پہلا مفہوم ظاہر الفاظ سے زیادہ سمجھ میں آتا ہے اور اس لئے اکابر مفسرین نے اُسی کو قوت دی ہے۔[1] جناب ابن عباسؓ وغیرہ قدیم مفسرین کے اقوال بھی اُس کے موافق ہیں۔

ہاں، اس میں اختلاف ہے کہ یہ وہی مومن ہے جس کا دوسری جگہ قرآن میں ذکر ہے کہ اُس نے جناب موسیٰؑ کو اُن کے قتل کے منصوبے سے آگاہ کیا جس پر وہ مصر سے باہر نکلے یا وہ ایک دوسرا مؤمن تھا[2] میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ ان دونوں واقعوں میں بڑا فاصلہ ہے۔ وہ قتل کے منصوبے سے آگاہ کرنے والا واقعہ اُس دور سے متعلق ہے جب حضرت موسیٰؑ قصر فرعون میں پرورش پا کر ابھی مصر ہی میں تھے اور مدین نہیں گئے تھے اور یہ "مومن ال فرعون" کا وعظ و نصیحت اس دور کا ہے جب وہ مدین سے واپس آ کر اب دعوتِ دین دینے لگے ہیں۔ پھر وہ واقعہ جناب موسیٰؑ کی بعثت کے پہلے کا ہے، اس لئے وہاں اُس شخص کے ذکر میں قرآن کے اندر بس رَجُلٌ "ایک آدمی" کا لفظ ہے۔ مومن کا لفظ نہیں ہے اور یہ واقعہ بعد بعثت کا ہے اس لئے یہاں رجل مومن کا لفظ ہے لہٰذا ان دونوں کو ایک سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بہرصورت خالق نے جو اُس مؤمن کا وصف یَكْتُمُ اِيْمَانَهٗ کے ساتھ یعنی وہ اپنے ایمان کو چھپائے رکھتا تھا' کہا ہے، مدحیہ انداز رکھتا ہے"۔

یہی کتمانِ ایمان بشرط ضرورت "تقیہ" کہلاتا ہے جس کا جواز و استحسان از روئے قرآن ناقابل انکار ہے۔

يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾

"اے میری قوم والو! تمہیں سلطنت حاصل ہے اس قلم رو میں غلبہ رکھے ہوئے مگر کون ہماری مدد کرے گا اللہ کے عذاب کے سامنے اگر وہ آ جائے۔ فرعون نے کہا میں تمہیں رائے نہیں دیتا سوا اُس کے جو میں سمجھتا ہوں اور میں

---

[1] الاوّل اظہر فی اقوال المفسّرین (تبیان)

[2] قال ابن عباس لم یکن من اٰل فرعون مؤمن غیرہ وغیر امرأۃ فرعون وغیر المؤمن الّذی جاء من اقصی المدینۃ یسعیٰ قال انّ الملأ یأتمرون بك لیقتلوك وقال السّدی ومقاتل کان ابن عم فرعون کان اٰمن بموسیٰ وھو الذی جاء من اقصی المدینۃ یسعیٰ (مجمع البیان)

نہیں بتاتا تمہیں سوا صحیح راستے کے''۔

اس مومن نے اپنے ایمان کو کسی حد تک چھپاتے ہوئے جو حکیمانہ انداز نصیحت اور حضرت موسیٰؑ کے خلاف کسی تشدد کا قدم اٹھانے سے روکنے کا اختیار کیا، اُس میں خیر خواہانہ طریقہ پر اُنہیں مخالفت حق کے انجام سے ڈرایا ہے کہ کہیں یہ تمہاری تباہی اور تمہاری سلطنت کے زوال کا باعث نہ ہو جائے۔

فرعون کے جواب میں نمایاں کمزوری نظر آتی ہے کہ وہ اُس مومن کے عقلی استدلال کا جواب نہیں دے سکا اور اُس نے صرف اپنی ''انا'' کو نمایاں کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ میں اسی کو صحیح سمجھتا ہوں جو میں کر رہا ہوں۔

فرعون نے کہا تھا کہا مَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ''میں ہدایت نہیں کرتا مگر صحیح راستے کی طرف'' اس کے مقابلے میں دوسری جگہ قرآن مجید میں آیا ہے:۔ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾ ''فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور ہدایت نہیں کی'' (طٰہٰ)

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ﴿۳۰﴾ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾ وَيٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾

''اور وہ جو ایمان لایا تھا کہنے لگا کہ اے میری قوم والو! میں تمہارے لئے ڈرتا ہوں دوسرے گروہوں کے ایسے دن سے جیسا حال ہوا نوح کی قوم کا اور عاد اور ثمود اور اُن کا جو اُن کے بعد تھے اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں چاہتا اور اے میری قوم والو! میں ڈرتا ہوں تمہارے لئے اُس دن سے جب ایک دوسرے کو پکارتا ہوگا جس دن پیٹھ پھراؤ گے بھاگتے ہوئے۔ تمہارا اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے اُسے ہدایت کرنے والا کوئی نہیں ہو سکتا''۔

''دوسرے گروہوں کے ایسے دن سے'' انہی گروہوں کا بیان بعد کو ہے! قوم نوح، عاد اور ثمود وغیرہ نہ یہ کہ الاحزاب ان کے علاوہ کوئی اور جماعت ہے۔ [۱]

''جس دن پیٹھ پھراؤ گے۔۔۔۔۔۔ یہ وہ دنیا والے میدان جنگ کا فرار نہیں ہے بلکہ میدان قیامت کا ذکر ہے کہ یہ کافر آگ کے شعلوں کو دیکھ کر یا حساب کی سختی سے بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ [۲] مگر ظاہر ہے کہ وہاں بھاگنے کی گنجائش کہاں ہوگی؟ کہاں بھاگ کر جائیں گے؟ اس کو کہا گیا ہے کہ ''تمہارا اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا''۔

---

[۱] فسر ذلك فقال مثل داب قوم نوح (تبیان)

[۲] یوم تولّون مدبرین عن موقف الحساب الی النّار (جلالین)

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۖ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾

''اور اس کے قبل یوسفؑ تمہارے پاس کھلی ہوئی دلیلوں کے ساتھ آئے تو برابر تم شک وشبہ میں مبتلا رہے اُس سے جس کے ساتھ وہ آئے تھے یہاں تک کہ جب وہ دنیا سے اُٹھے تو تم نے کہا کہ ہرگز اللہ ان کے بعد کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا۔ اسی طرح اللہ گمراہی میں چھوڑتا ہے اُسے جو حد سے آگے بڑھنے والا، شک وشبہ میں گرفتار ہو، جو آیات الٰہی کے بارے میں تکرار کرتے ہیں بغیر کسی دلیل کے جو اُن کے پاس آئی ہو، یہ بڑی ناپسند چیز ہے اللہ کے نزدیک اور اُن کے نزدیک جو ایمان لائے اسی طرح اللہ مہر لگا دیتا ہے ہر سرکش، گھمنڈ والے کے دل پر''۔

گذشتہ آیات کو دیکھتے ہوئے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ یہ مومن آل فرعون ہی کے کلام کا جز ہے مگر معلوم نہیں کیوں مفسرین اسے حضرت موسیٰؑ کا کلام قرار دیتے ہیں۔[1]

بے شک علامہ طبرسیؒ کا خیال یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مومن آل فرعون کے کلام کا جز ہے اس لئے کہ من قبل کی تشریح میں اُنہوں نے لکھا ہے: ای من قبل موسیٰ ان سے پہلے یعنی موسیٰ سے پہلے'' اگر جناب موسیٰؑ کا کلام سمجھتے تو تشریح میں لکھتے: ای من قبلی ''یعنی میرے پہلے''۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ اللہ مہر لگا دیتا ہے'' تو سیاقِ کلام سے ظاہر ہے کہ سرکشی اور گھمنڈ جس کا نتیجہ ہے احکام الٰہی میں تکرار اور ان سے سرتابی کرنا، یہ جرم ان لوگوں سے سرزد ہو چکا تو اب یہ مہر لگانا جس کے معنی سلب توفیقات کے ہیں اُس کی سزا میں ہے۔[2] نہ کہ یہ مہر اُس سرکشی اور گھمنڈ میں مبتلا ہونے کا سبب ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۙ﴿۳۶﴾ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿۳۷﴾

---

[1] ثم قال حاکیا ما قال لهم موسیٰ (تبیان)

[2] یفعل ذلك عقوبة علی کفره (مجمع البیان)

''اور فرعون نے کہا اے ہامان! میرے لئے ایک اونچا محل تعمیر کر دو جس سے ممکن ہو کہ میں ان راستوں، آسمان کے راستوں تک پہنچ کر موسیٰؑ کے خدا کو دیکھ لوں اور بلاشبہ یقینی طور پر میں اُسے جھوٹا سمجھتا ہوں اور اس طرح فرعون کی نگاہ میں اُس کی بداعمالی سج گئی تھی اور وہ صحیح راستے سے ہٹ گیا تھا اور فرعون کا منصوبہ نہ تھا مگر تباہی کی راہ میں''۔

ہامان کا بحکم فرعون اونچا محل بنانا تا کہ خدائے موسیٰؑ کا پتہ لگائے

یہ ہامان کون تھا؟ ایک قدیم تصور یہ ہے کہ وہ فرعون کا وزیر تھا۔[1] دوسرا تصور یہ ہے کہ وہ محکمہ تعمیر کا افسر تھا، یہاں جو اُس سے فرعون کی فرمائش ہے، وہ اس تصور کے موافق ہے اور تعمیر کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ معمار ہو جو خود تعمیر کرے بلکہ وہ افسر جو اپنے عملے سے اس کام کو انجام دلوا دے، اُس کا مخاطب ہو سکتا ہے لیکن دوسرے مقامات پر قرآن نے جس اہمیت کی صورت سے فرعون کے ساتھ اُس کا نام لیا ہے اور ایک جگہ افواج کی نسبت ان دونوں کی طرف دی گئی ہے (وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَحْذَرُوْنَ) [2]۔ اُس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فرعون کے مظالم میں برابر کا شریک اور تقریباً اُس کے برابر اقتدار کا مالک ہے۔ یہ پہلے ہی تصور کی صحت کا پتہ دیتا ہے کہ وہ اُس کا وزیر تھا اور بحیثیت وزیر کے بھی اس تعمیر کا حکم اُسے درست ہے کہ وہ متعلقہ محکمہ کے ذریعے سے اس کام کو انجام دلوا دے۔

اب وہ اُس ماضی بعید کے فرعون کا تصور تھا کہ خدائے موسیٰؑ کو وہ کسی اونچے محل کی چھت پر سے تلاش کرنا چاہتا تھا اور اُس کی صدائے بازگشت ہمیں ماضی قریب میں روس کے خروشچوف کے اس اعلان کے ساتھ سنائی دی کہ ہماری ہوابازوں نے خلا میں جا کر خوب تلاش کیا، خدا کہیں نہیں ملا۔

ان دونوں میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ خدا کو جسم سمجھ کر آسمانوں میں ساکن سمجھتے ہیں لیکن پہلے والے فرعون کی مزید براں یہ حماقت تھی کہ وہ اپنے خدا ہونے کے ادعا کے ساتھ اُس خدا کو بلند عمارت پر سے دیکھنا چاہتا تھا اور اپنا یہ گمان ظاہر کر رہا تھا کہ وہ غلط ہے لیکن اس تلاش سے خود اُس کی خدائی تو یقینی طور پر ختم ہو جاتی ہے اور اُس کے اس گمان سے بھی خود اُس کی خدائی کا غلط ہونا یقینی ہو جاتا ہے کیوں کہ اگر وہ خدا ہوتا تو اُسے دوسرے خدا کے وجود کا تصوّر بحدّ تو ہم بھی کیوں ہوتا۔

وَقَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ
الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ ۫ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا
یُجْزٰٓی اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ
یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾ وَیٰقَوْمِ مَا لِیْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَی
النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَی النَّارِ ﴿۴۱﴾ تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ

---

[1] قیل انّه کان وزیرہ (تبیان) ھو وزیرہ وصاحب امرہ (مجمع البیان)

[2] سورۃ قصص۔ ٦

بِهٖ عِلْمٌ ۫ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۴۴﴾

''اور وہ جو ایمان لایا تھا کہنے لگا کہ اے میری قوم والو! تم میری پیروی کرو تو میں تمہیں سیدھی راہ کی طرف لے جاؤں گا اے میری قوم والو! یہ دنیوی زندگی بس کچھ وقتی فائدہ ہے اور بلاشبہ آخرت ہی مستقل قیام کا گھر ہے، جو کوئی برائی کرے گا اُسے سزا بس اتنی ہی ملے گی اور جو نیک کام کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت درحالیکہ باایمان ہو تو یہ لوگ بہشت میں داخل ہوں گے، وہاں بے اندازہ اُنہیں رزق عطا ہوگا اور اے میری قوم والو! کیا ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف دعوت دیتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف دعوت دیتے ہو، تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور شریک کروں اُسے جس کا مجھے کوئی علم نہیں ہے اور میں تمہیں بلاتا ہوں اُس عزت والے کی طرف جو بخشنے والا ہے، یقیناً جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو، اُس کی طرف دعوت نہ کارآمد ہے، دنیا میں نہ آخرت میں اور یقیناً تم سب کو پلٹنا ہے اللہ کی طرف اور بلاشبہ جو حد سے بڑھے ہوئے ہیں آگ والے ہیں تو جلد ہی تم یاد کرو گے اُسے جو میں کہتا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، یقیناً اللہ بندوں کا دیکھنے والا ہے''۔

مذکورہ بالا تقریر پر نظر کرتے ہوئے جو بالکل مبلغانہ حیثیت رکھتی ہے پتہ چلتا ہے کہ وہ ماضی کا ایک دور تھا جسے قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے کہ: کان یکتم ایمانہ ''وہ ایمان کو اپنے چھپائے رکھتا تھا'' مگر اس کے بعد ہدایت خلق کو امکانی حد تک اپنا فریضہ سمجھتے ہوئے رفتہ رفتہ اُس نے تقیہ کے پردے کو چاک کیا اور بہرحال تقیہ میں ان حدود کی مراعات لازم ہے کہ کب تک تقیہ کا محل رہتا ہے اور کب فریضہ دینی اُس کے ترک کا متقاضی ہو جاتا ہے؟

ظاہر ہے کہ داعیان اگر ہمیشہ تقیہ کرتے رہتے تو پیام حق ہم تک پہنچتا ہی کیوں کر؟ اور اس سے ہمارے رہنمایان دین کی سیرت کے سلسلہ میں یہ سوال ختم ہو جاتا ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے ۶۰ھ میں تقیّہ سے کام کیوں نہیں لیا؟

انہی فرائض کی باعتبار محل تبدیلیوں ہی کی وجہ سے تو کتاب کافی نہیں ہے بلکہ بصیرت دینی والی سوجھ بوجھ رکھنے والے رہنما اشخاص کی قولی وعملی رہنمائی کی ضرورت ہے۔

قرآن مجید نے بھی اس مومن کی تقریروں کو الگ الگ حصوں میں درج کیا ہے اور اُن کے مضامین سے ظاہر ہے کہ وہ سب ایک ہی وقت کی تقریر کے ٹکڑے نہیں ہیں بلکہ مختلف مواقع کی تقریروں کے مضمون ہیں چنانچہ یہ آخری تقریر جس میں آخر میں یہ جملہ ہے کہ ''جلد ہی تم یاد کرو گے اُسے جو میں کہتا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں ''یقیناً اللہ بندوں کا دیکھنے والا ہے'' بالکل اُس وقت کی معلوم ہوتی ہے، جب

اُس مومن کی جان لینے کا منصوبہ بن گیا ہے جس کا ذکر اس کے بعد کی آیت میں ہے۔

فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝۴۵ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۡ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝۴۶

''تو اللہ نے بچایا اُس کو برائیوں سے اُس کی جو اُنہوں نے منصوبہ بنایا تھا اور فرعون والوں کو گھیر لیا برائی نے عذاب کی۔ آگ جس کے سامنے وہ لائے جاتے ہیں صبح اور شام اور جب قیامت برپا ہوگی، داخل کرو فرعون والوں کو سخت ترین عذاب میں''۔

''بچایا اُس کو'' یعنی مومن آل فرعون کو۔ مضمون آیت سے ظاہر ہے کہ اُس مؤمن کی جان لینے کا منصوبہ بنایا گیا مگر اللہ نے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا۔

ہمارے وہ اکابر مفسرین جیسے جناب شیخ طوسیؒ اور علامہ طبرسیؒ جنہوں نے قدیم ترین علی بن ابراہیم قمیؒ کی تفسیروں کو جو زیادہ تر احادیث معصومینؑ پر مبنی ہیں اپنا ماخذ نہیں بنایا ہے، اُنہوں نے ایک قدیم سنی مفسر قتادہ کا قول نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مومن آل فرعون جناب موسیٰؑ اور اُن کے ساتھ والے بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکل کر دریا پار کر کے نجات پا گیا جب کہ فرعون اور اُس کے ساتھ والے غرق ہو گئے۔ [1]

دوسری روایت علامہ طبرسیؒ نے کسی گمنام شخص کی نقل کی ہے کہ وہ مومن بھاگ کر ایک پہاڑ پر چلا گیا اور فرعون نے اُس کے گرفتار کرنے کے لئے آدمی بھیجے تو اُنہوں نے دیکھا کہ وہ نماز میں مصروف ہے اور جنگل کے جانور اُس کے گرد پہرا باندھے ہوئے حفاظت کر رہے ہیں، اس سے وہ آدمی خوف زدہ ہو کر واپس گئے۔ [2]

بلاشبہ ان دونوں روایتوں میں سے ہر ایک کا مضمون الفاظ قرآن کے ظاہری مفہوم کے مطابق ہے لیکن تفسیر علی بن ابراہیم میں امام جعفر صادقؑ سے یہ روایت وارد ہوئی ہے کہ اُن ظالموں نے اُس مومن کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا مگر اس کے باوجود اسے دین حق سے منحرف نہیں کر سکے۔ [3]

اس حدیث کو دیکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ اصل منصوبہ اُس کی جان لینے کا نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ بجر و قہر اُسے دین حق سے منحرف کریں لیکن اس میں وہ ناکام ہوئے تو بالآخر اُسے تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہ قتل کر دینا اُس ظالم کے منصوبے کا کامیاب ہونا نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت وہ عملی طور پر شکست کا اقرار ہوتا ہے جیسا کہ حضرت امام حسینؑ کو شہید کر دینے کو یزید کی کامیابی سمجھنا درست نہیں ہے بلکہ وہ حصول بیعت میں اُس کی

---

[1] قال قتادہ صرف اللہ عنہم سوء مکرھم و کان قیطا من قوم فرعون فنجا مع موسیٰ (تبیان)

[2] قیل انّھم ھمّوا بقتلۃ فھرب الیٰ جبل فبعث فرعون لجلین فی طلبہ فوجداہ فانّما یصلّی و حولہ الرحوش صفوفا فخافا ورجعا ھارمن (مجمع البیان)۔

[3] قال ابو عبداللہؑ واللہ لقد قتلوہ اربا اربا لکن وقاہ اللہ ان نفنوہ فی دینہ (علی بن ابراھیم)۔

ناکامی کا ثبوت ہے۔

آخر میں جو ہے کہ ''فرعون اور اس کے ساتھ والے آگ کے سامنے صبح وشام لائے جاتے ہیں'' اس کے لئے ترتیب کلام سے ظاہر ہے کہ یہ صورت قیامت کے پہلے ہے اُس دور میں جسے عالم برزخ کہتے ہیں۔[1]

وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ ۙ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۸﴾

''اور جب وہ آتش دوزخ میں آپس میں بحث کرتے ہوں گے تو کمزور لوگ اُن سے جو بڑے بنے ہوئے تھے کہیں گے کہ یقیناً ہم تمہارے پیچھے پیچھے چلنے والے تھے تو کیا تم آگ کے عذاب سے کچھ بچاؤ گے کہ ہم تو سب ہی اُس میں ہیں یقیناً اللہ نے اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ سنایا ہے''۔

یہ چھوٹے اور بڑے آدمیوں کی آپس کی گفتگوئیں قرآن مجید میں ہر جگہ خاص انداز میں ہیں اور سب کا نتیجہ یہ ہے کہ آخرت میں یہ لیڈر لوگ جو عوام کو گمراہ کرتے ہیں، اُن بیچارے عوام کے کسی طرح بھی کام نہ آئیں گے۔ اس لئے سادہ لوح عوام کو چاہیے کہ ہر لیڈر کے جوش دلانے پر جوش میں نہ آجایا کریں بلکہ خوب سوچ سمجھ لیں کہ کیا یہ شخص اپنے اوصاف کے لحاظ سے اس لائق ہے کہ اُس کی پیروی کی جائے بلکہ جہاں تک ممکن ہو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر حق و باطل اور صحیح وغلط میں امتیاز کرنے کی کوشش کریں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۴۹﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾ۧ

''اور کہا اُن لوگوں نے جو آگ میں ہیں دوزخ کے نگہبانوں سے کہ اپنے پروردگار سے دعا کرو کہ کسی دن ہم سے عذاب میں کچھ تخفیف کرے، اُنہوں نے کہا کہ کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آتے نہیں رہے تھے؟ اُنہوں نے کہا کیوں نہیں! کہا پھر خود ہی دعا مانگو اور کافروں کی دعا نہیں ہے مگر گم شدہ''۔

یعنی یہ دعا کسی منزل مقصود تک پہنچنے والی نہیں۔ سفارش کے جواب میں فرشتوں کی طرف سے رسولوں کا تذکرہ کس مناسبت سے ہے؟ اس کے لئے شاہ عبدالقادر کی یہ نکتہ رسی بعید نہیں ہے کہ:۔

''دوزخ کے فرشتے کہیں گے سفارش کرنا ہمارا کام نہیں۔ ہم تو عذاب پر مقرر ہیں، سفارش کام ہے رسولوں کا۔ سو رسولوں سے تو برخلاف

---

[1] فی الآیة دلالة علی صحة عذاب القبر (تبیان)

ہی تھے"۔ (موضح القرآن)

بعض لوگوں کا خیال ہے فرشتوں کا بس یہ مطلب تھا کہ جب تم نے پیغمبروں کی تکذیب کی تو کافر قرار پائے اور کافر کی شفاعت نہیں کی جاسکتی۔[1]

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ ﴿٥١﴾

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ﴿٥٢﴾

"بلاشبہ ہم اپنے پیغمبروں کی مدد کریں گے اور اُن کی جو ایمان لائے اس دنیا والی زندگی میں بھی اور اُس دن جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے، جس دن ظالموں کو اُن کی عذر خواہی فائدہ نہ پہنچائے گی اور اُن کے لئے لعنت ہے اور اُس آخری منزل کی برائی ہے"۔

دنیا والی زندگی میں نصرت کا حتمی وعدہ ہو رہا ہے مگر اکثر مشاہدات اس بارے میں ذہن کو غیر مطمئن کرتے ہیں۔

ہمارے یہاں کی ایک حدیث ہے کہ یہ وعدہ رجعت میں پورا ہوگا۔[2] اور یہ مشاہدہ اس کی دلیل ہے کہ یہ دار دنیا کے اس پہلے دور حیات سے متعلق نہیں ہے۔

دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ نصرت کے لئے ظاہری غلبہ و فتح کی ضرورت نہیں ہے بلکہ حقانیت کا نمایاں کرنا بھی بڑی نصرت ہے جو بہر حال دنیا اور آخرت دونوں میں خدا پرستوں کے شامل حال رہتی ہے۔

علامہ طبرسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

يعنى نصرهم بوجوه النصر قد يكون بالحجّة و قد يكون ايضا بالغلبة فى المحاربة و ذٰالك يحسب ما تقتضيه الحكمة و يعلمه سبحانه من المصلحة و يكون ايضاً بالالطاف و التائيد و تقرية القلب و يكون باهلاك العدوّ و كلّ هٰذا قد كان الانبيآء و المؤمنين من قبل الله تعالى فهم منصورون بالحجّة علىٰ من قالفهم وقد نصروا باهلاك عدوهم و انجائهم مع من اٰمن معهم و قد يكون بالنصر بالانتقام كما نصر يحيٰى بن زكريّا لمّا قتل به من قتل سبعون الفافهم لا محالة منصورون فى الدّنيا باحدهٰذا الوجوه.(مجمع البيان)

یعنی ہم اُن کی مختلف طرح مدد کرینگے کبھی دلائل کے ذریعہ سے اور کبھی جنگ میں غالب آنے کی صورت سے، جیسا جس وقت حکمت الٰہی کا تقاضا ہو اور خداوند عالم مصلحت جانے اور کبھی خاص مہربانیوں اور تائید اور دل کو تقویت پہنچانے کی شکل میں اور کبھی دشمن کو ہلاک کرنے کے طور پر اور یہ سب صورتیں پیغمبروں اور صاحبان ایمان کے لئے اللہ کی جانب سے وقوع میں آتی ہیں کہ دلائل کے ذریعہ سے تو وہ ہمیشہ ہی دشمنوں پر غالب

---

[1] فانا لاتشفع الكافر (جلالين)

[2] عن ابى عبدالله عليه السلام ـــــ ذٰلك والله فى الرجعة اما علمت انّ انبيآء كثيرة لم ينصروا فى الدّنيا وقتلوا والائمّة بعدهم قتلوا ولم ينصروا وذلك فى الرجعة (على بن ابراهيم)۔

رہے اور مخالفین کے مقابلہ میں فتح بھی پائی اور اُن کے دشمنوں کو ہلاک بھی کیا گیا اور اہل ایمان کی معیت میں اُن کو نجات دی گئی اور کبھی مدد ہوئی ہے اس طرح کہ انتقام لیا گیا جیسے یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کی مدد ہوئی کہ اُن کے عوض میں ستر ہزار آدمی قتل ہوئے بہرحال دنیا میں ایک نہ ایک طریقے پر اُن کی مدد ہوتی رہی۔

جناب شیخ طوسیؒ نے اسے مختصر طور پر اس طرح فرمایا ہے جس میں بس دو صورتوں کا ذکر ہے:

النّصر ای المعونة علی العدوّ هو علی ضربین نصر بالحجة و نصر بالغلبة فی المحاربة بحسب ما یعلم الله تعالیٰ من المصلحة و تقتضیه الحکمة.(تبیان)

نصرت یعنی دشمن کے مقابلہ میں مدد، اس کی دو قسمیں ہیں، دلائل کے ذریعہ سے مدد اور جنگ میں غالب آنے کی صورت سے مدد جیسا اللہ مصلحت جانے اور جو اُس کی حکمت کا تقاضا ہو۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿۵۳﴾ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۵۴﴾

''اور بلاشبہ ہم نے موسیٰؑ کو ہدایت کا سامان عطا کیا اور ہم نے بنی اسرائیل کو اس کتاب کا وارث بنایا ہدایت اور نصیحت کا سرمایہ بنا کر صاحبانِ عقل کے لیے''۔

عام طور پر الھدیٰ ''ہدایت کا سرمایہ'' بھی توریت کو بتایا گیا ہے اور الکتاب بھی وہی توریت۔[1] مگر جب کہ بعد میں الکتاب یعنی توریت کے لئے پھر ھدیٰ موجود ہے تو پہلا لفظ الھدیٰ سے بھی توریت کا سرمایہ ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ پہلے الھدیٰ سے مراد وہ صلاحیت جوہر ہے جو باعث عطائے نبوت و رسالت ہے جیسے دوسری جگہ کہا گیا ہے: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔[2] ''اللہ خوب جانتا ہے اپنی رسالت کا منصب کہاں رکھے'' اور پھر الکتاب سے بے شک توریت مراد ہے جو عملی طور پر خلق کے لئے سرمایہ ہدایت تھی۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۵۵﴾

''تو صبر سے کام لیجیے یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کی مغفرت کے لئے دعا کیجیے اور اپنے پروردگار کے حمد کے ساتھ شام و سحر تسبیح کیجیے''۔

حضرت پیغمبر خداؐ کی مغفرت کی دعا تقاضائے عبودیت

---

[1] الھدیٰ التوراۃ والمعجزات (جلالین)

[2] انعام۔ ۱۲۴

گناہ ہو یا نہ ہو بارگاہ الٰہی میں مغفرت گناہ کی دعا خود ایک تقاضائے عبودیت ہے جس کی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تعلیم دی گئی ہے۔ اس سے عقیدہ عصمت پر کوئی ضرب نہیں لگتی۔

بعض مفسرین اہل سنت نے بھی حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے کہ گناہ سے استغفار کی ہدایت حضرتؐ کو اس غرض سے ہے کہ دوسرے آپ کی پیروی کریں۔[1] یعنی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ معاذ اللہ آپ سے گناہ سرزد ہوتا ہے۔

ہمارے علماء نے ظاہر ہے کہ اس کو زیادہ پُرزور واضح انداز میں لکھا ہے۔[2]

''شام وسحر'' تسبیح کے لئے مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد نماز ہائے پنجگانہ ہیں اور شام سے مراد زوال سے لے کر اس کے بعد رات تک کا وقت ہے چنانچہ تفسیر جلالین میں ہے:۔

بالعشی ھو من بعد الزوال والابکار الصلوٰۃ الخمس

شام کو یعنی زوال کے بعد سے اور صبح کو یہ سب پنجگانہ نمازیں ہیں۔

اوقات نماز کی طرف اشارہ

اس صورت میں قابل غور امر یہ ہے کہ چار نمازوں کو ایک ساتھ العشی کے ساتھ ادا کیا ہے اور ابکار کے ساتھ ایک تنہا۔ یعنی صبح کو۔ آخر اس کی کوئی وجہ ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ صرف فقہ اہل بیت علیہم السلام کی رو سے سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ چار نمازوں کا وقت یعنی ظہرین و مغربین کا اس طرح مسلسل ہے کہ درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہے جو وقت نماز ہونے سے خارج ہو، اس طرح کہ زوال کے بعد سے مغرب تک ظہرین کا وقت اور مغرب سے نصف شب تک مغربین کا وقت۔ چونکہ یہ پورا وقت کسی نہ کسی نماز کا ہے، اس لئے اس سب کو ایک لفظ بالعشی سے ادا کر دیا ہے اور ایک نماز یعنی صبح جو کہ جدا ہے، نہ اُس کے قبل کوئی اور نماز ہے نہ اُس کے بعد۔ اس لئے اُس کا علیحدہ ذکر کیا ہے جیسا کہ دوسری جگہ زیادہ واضح لفظوں میں ایسا ہی کیا گیا ہے۔ (اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ)۔[3] لیکن اہل سنت کے مکاتب فقہی کے لحاظ سے ظہر اور عصر کے وقت کے بیچ میں بھی فاصلہ ہے اور مغرب اور عشاء کے بیچ میں بھی فاصلہ ہے۔ اب اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ صبح کی نماز کا علیحدہ ذکر کیا جائے اور ان چاروں نمازوں کو بالعشی کے لفظ میں سمو دیا جائے اس صورت میں بالعشی کے معنی صرف وقت عشاء کے ہوں گے ظہر اور عصر اور مغرب کو اس کے تحت میں داخل کرنے کی کوئی وجہ معقول نہیں ہے اور اس صورت میں اس آیت سے صرف دو نمازوں کا حکم ثابت ہوگا۔ نماز پنجگانہ کا استفادہ اُس سے درست نہیں ہو سکتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۵۶﴾

---

[1] واستغفر لذنبك ليستنّ بك (جلالين)

[2] هذا تعبد من الله سبحانه لنبيّه بالدعاء والاستغفار لكي يزيد في الدّرجات والتّصبر سنّة لمن بعده (مجمع البيان)

[3] بنی اسرائیل۔ ۷۸

''یقیناً وہ لوگ جو آپ سے اللہ کی آیتوں کے بارے میں بغیر کسی ثبوت کے جو اُن کے پاس آیا ہو، تکرار کرتے ہیں، اُن کے سینوں میں کچھ نہیں سوا ایک گھمنڈ کے جس میں وہ کامیاب ہونے والے نہیں ہیں تو اللہ سے پناہ مانگیے، یقیناً وہ سننے والا ہے، دیکھنے والا''۔

''اللہ سے پناہ مانگئے'' یعنی اُن کے گھمنڈ کے مقابلہ میں آپ بھی ویسا ہی طرز عمل اختیار نہ کیجیے بلکہ اُن کے منصوبوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ سے پناہ طلب کیجیے۔[1] اور خود ہدایت ربانی کے مطابق حکمت اور موعظہ حسنہ وغیرہ کے طریقے کے پابند رہیے، آپ کی اور اُن کی باتیں خدا سنتا اور آپ کے اور اُن کے طرز عمل کو وہ دیکھتا ہے۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾

''بلاشبہ آسمان اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑی چیز ہے لیکن زیادہ تر لوگ جانتے نہیں''۔

یعنی قیامت میں دوبارہ پیدا کرنا انسانوں کو اُس کے لئے کونسا مشکل ہے جس نے پوری کارگاہ عالم علوی وسفلی اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کی ہے مگر ''زیادہ تر لوگ جانتے نہیں'' یعنی اپنی جہالت سے معاد کا انکار کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ استدلال اُنہی کے مقابلہ میں ہے جو کہ کائنات کا خالق اللہ کو مانتے ہیں لیکن پھر حیات بعد الموت کے جیسے ''معاذ'' کہتے ہیں، منکر تھے جیسا کہ مشرکین عرب تھے۔[2]

آج کل کے لامذہبوں کے مقابلے میں یہ استدلال نہیں ہے جو تخلیق کائنات کے لئے اُس باشعور ذات کا تصور ہی نہیں رکھتے جسے خدا کہا جاسکے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اور یکساں نہیں اندھا اور آنکھوں والا اور جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں اور وہ جو بد اعمال ہوں بہت کم تم لوگ نصیحت قبول کرتے ہو''۔

نصیحت قبول کرنے کا مطلب خود اس حقیقت کو اپنی اصلاح نفس کے لئے سمجھنا بھی ہے کہ بد اعمالیاں ترک کر کے اچھے اعمال سے آراستہ ہوں تاکہ اچھے انسان بنیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں ظہور نتیجہ کے دن یعنی روز جزاء کی طرف ذہن کو منتقل کرنا ہو جیسا کہ شاہ

---

[1] امر نبیّہ بان یستعیذ باللہ من شرّ ھٰؤلاء المخاصمین (تبیان)

[2] انّھم اذا اقرّوا بان اللہ تعالیٰ خلق السّمٰوات والارض فکیف انکروا قدرتہ علیٰ احیاء الموتیٰ (مجمع البیان)

عبدالقادر نے لکھا ہے:۔

''یعنی ایک دن چاہیے کہ ان کا فرق کھلے'' (موضح القرآن)

اس کے بعد کی آیت مقام تنزیل میں اس سے متصل ہوتو وہ اس پہلو کو تقویت پہنچاتی ہے۔

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾

''یقیناً قیامت آنے والی ہے، اُس میں کوئی شک نہیں مگر زیادہ تر لوگ ایمان نہیں رکھتے''۔

لَارَيْبَ فِيْهَا ''اس میں کوئی شک نہیں'' یہ ویسا ہی ہے جیسے سورۂ بقرہ کے آغاز میں قرآن کے لئے ہے۔ لَارَيْبَ فِيْهِ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں کوئی شک کرنے والا نہیں ہے۔ شک کرنے والے تو ہیں مگر مطلب یہ ہے کہ حقیقت ایسی ہے کہ اس میں شک کسی کو ہونا نہیں چاہیے۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

''اور تمہارے پروردگار نے کہا کہ مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا، بلاشبہ جو میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں، وہ ذلت وحقارت کے ساتھ دوزخ میں داخل ہوں گے''۔

دُعا سے انکار کرنے والوں کو شدید تہدید

سیاق آیت سے صاف ظاہر ہے کہ دعا کرنا تقاضائے عبودیت ہونے کی بنا پر خود ایک بڑی عبادت ہے اور خدا سے دعا کو گویا اپنی شان کے خلاف سمجھ کر بے نیازی اختیار کرنے والوں کو دوزخ کا حق دار بتایا جارہا ہے۔

دعا کی قبولیت کا وعدہ تو حتمی طور پر ہے لیکن دعا کرنے والا اگر حکمت وعدل الٰہی پر ایمان رکھتا ہے تو بوقت دعا خواہ وہ لفظوں میں کہے یا اُس کے ذہن میں ہو جو اُس کے اس ایمان کا تقاضا ہے کہ میرا مطلب اگر تیرے نظامِ عالمی کے مصالح کے خلاف نہیں ہے تو اُس کو پورا کردے۔

اگر دعا اس تقاضائے ایمانی کے تحفظ کے ساتھ ہے تو پھر مقصد حاصل نہ ہو تو سمجھنا چاہیے کہ وہ حکمت الٰہی کے تقاضا کے خلاف ہے لہٰذا اُس کا پورا نہ ہونا اس کی دعا کو قبول کرنے کے کسی وقت بھی منافی نہیں ہے کیونکہ دعا ہی اس شرط کے ساتھ تھی کہ خالق کے تقاضائے حکمت کے خلاف نہ ہو۔[1]

بعض لوگوں نے عبادت کو اُس کے اصل معنی میں رکھ کر قبل کے لفظ دعائیں تصرف کیا ہے کہ اُس کے معنی عبادت کے ہیں اور ''قبول کروں گا'' کے معنی اُس پر ثواب عطا کرنے کے ہیں۔[2] اس طرح اُس سے دعا کرنے کا لزوم ثابت نہیں ہوگا مگر ہمارے خیال میں یہ ظاہر کے

---

[1] من یدعو اللہ ویسألہ فلا بدّ لہ ان یشترط المصلحۃ امّا لفظا او اضمادا (مجمع البیان)

[2] ادعونی استجب لکم ای اعبدونی اتیبکم بقرینۃ مابعدہ (جلالین)

خلاف ہے، زیادہ ذہن سے قریب وہی پہلا مفہوم ہے اور احادیث معصومین علیہم السلام اُس کی موافقت میں ہیں۔ اس ذیل میں علامہ طبرسیؒ نے حسب ذیل احادیث درج کی ہیں:

معوية بن عمّار قال قلت لابی عبدالله علیہ السلام جعلنی الله فداك ما تقول فی رجلین دخل المسجد جمیعا کان احدهما اکثر صلوٰة و الاٰخر اکثر دعآء ایّهما افضل قال کل حسن قلت قد علمت و لکن ایهما افضل قال اکثرهما دعاء لا تسمع قول الله ادعونی استجب لکم الیٰ آخر الاٰیة قال وهی العبادة الکبریٰ.

معاویہ بن عمار کی روایت ہے میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا: آپ پر قربان! کیا ارشاد ہے؟ آپ کا اُن دو اشخاص کے بارے میں جو ایک ساتھ مسجد میں داخل ہوئے۔ ایک نے نمازیں زیادہ پڑھیں اور دوسرے نے دعا زیادہ مانگی۔ ان میں کون زیادہ بہتر ہے؟ فرمایا دونوں ہی باتیں ٹھیک ہیں میں نے کہا یہ تو مجھے معلوم ہے لیکن ان میں بہتر کون ہے؟ فرمایا جس نے دعا زیادہ مانگی کیا سن نہیں رہے ہو ارشاد خداوندی کہ مجھ سے دعا مانگو میں قبول کرونگا تا آخر آیت پھر فرمایا کہ یہ سب سے بڑی عبادت ہے۔

روی زرارة عن ابی جعفر علیہ السلام فی هٰذه الآیة قال هو الدّعا فافضل العبادة الدّعاء۔

زرارہ کی روایت ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کے بارے میں فرمایا یہ دعا ہے تو بہترین عبادت دعا ہے۔

روی حنان بن سلمان عن ابیه قال قلت لابی جعفر ایّ المعبادة افضل قال ما من شئی احبّ الی الله من ان یسأل و یطلب ما عنده و لا یحبّ الله عزّ و جلّ من یستکبر عن عبادته و لا یسأل ما عنده.

حنان بن سلیمان کی روایت ہے اپنے والد کی زبانی اُنہوں نے کہا میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے کہا کونسی عبادت سب سے بہتر ہے فرمایا اللہ کو اس سے زیادہ کوئی بات پسند نہیں کہ اُس سے سوال کیا جائے اور اُس کی نعمت کو طلب کیا جائے اور اللہ اُسے دوست نہیں رکھتا جو اُس کی عبادت کے مقابلے میں گھمنڈ کرے اور اُس کی نعمت کا سوال نہ کرے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی ہے تا کہ تم اُس میں سکون حاصل کرو اور دن کو دیکھنے والا بنایا ہے یقیناً اللہ انسانوں پر بڑے فضل و کرم والا ہے مگر زیادہ تر لوگ شکر ادا نہیں کرتے''۔

''دن کو دیکھنے والا بنایا'' یعنی روشن جس میں چیزیں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ۫ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۲﴾ كَذٰلِكَ یُؤْفَكُ الَّذِیْنَ كَانُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۶۳﴾

''یہ ہے تمہارا پروردگار جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، کوئی خدا نہیں سوا اُس کے تو کہاں منحرف ہوتے ہو؟ اس طرح تو وہ منحرف ہوتے ہیں جو آیات خداوندی کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں''۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۴﴾ هُوَ الْحَیُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۵﴾

''اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو محل قیام اور آسمان کو بطور عمارت قرار دیا اور تمہاری صورت گری کی تو اچھی اچھی صورتیں تمہاری بنائیں اور تمہیں طرح طرح کی پاک صاف غذائیں عطا کیں۔ یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار تو قائم و برقرار ہے وہ اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، وہ زندہ، سوا اُس کے کوئی خدا نہیں تو اُس کو پکارو عبادت کو اُس سے مخصوص رکھتے ہوئے۔ تعریف ہے اُس اللہ کی جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ ۫ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۶﴾

''کہہ دیجیے کہ مجھے ممانعت ہوئی ہے اس سے کہ میں عبادت کروں اُن کی جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو، جب کہ میرے پاس میرے پروردگار کے پاس سے کھلی ہوئی دلیلیں آ چکیں اور مجھے حکم ہے کہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کی بارگاہ میں اسلام اختیار کروں''۔

''اسلام اختیار کرو'' یعنی کلی اطاعت اور یہ ضروری نہیں ہے کہ اس ممانعت اور حکم کو بطور تکلیف شرعی اس دور کی پیداوار سمجھا جائے بلکہ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے لئے پہلے آ چکا ہے:۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ (سورۂ بقرہ) جب اُن سے اُن کے پروردگار نے کہا اسلام اختیار کرو اُنہوں نے کہا میں نے اسلام اختیار کیا تمام جہانوں کے پروردگار کے لئے اس کی تشریح ہم نے اس آیت کے ذیل میں کی ہے کہ وہ قول لفظی نہیں ہے جو کسی خاص وقت پر ہوا ہو بلکہ وہ حکم کُن کی طرح کا اشارہ قدرت ہے جس کے بعد یہ سوچنے کا سوال نہیں کہ اُس کی تعمیل کب سے ہوئی ویسا ہی یہاں امر اور اُسی کے تناسب سے اُس کے قبل کی نہی کو سمجھنا چاہیے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْۤا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰۤى

اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۶۸﴾

''وہ وہ ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر تمہیں بچے کی صورت میں باہر لاتا ہے، پھر (رکھتا ہے) یہاں تک کہ تم سن بلوغ تک پہنچو، پھر یہاں تک کہ تم بوڑھے ہو اور تم میں کوئی پہلے ہی اُٹھالیا جاتا ہے اور اُس وقت تک کہ تم مقررہ عمر تک پہنچو اور شاید تم عقل سے کام لو۔ وہ وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو جب کسی بات کا فیصلہ کر دیتا ہے تو بس اُس سے کہتا ہے ہو جا، وہ ہو جاتی ہے''۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''یعنی اتنے احوال تم پر گذرے، شاید ایک حال اور بھی گزرے اور وہ مر کر جینا'' (موضح القرآن)

اس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ مختلف مراتب تخلیق پر توجہ دہانی اعتقاد کی منزل میں ایمان بالآخرۃ کی دعوت کے مقصد سے ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے تمام فقروں کی تشریح کے بعد لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کے تحت میں لکھا ہے:

فتعقلوا ما انعم الله به عليكم من انواع النّعم و اراد منكم اخلاص العبادة.

تم عقل سے کام لے کر سمجھو اللہ کی ان گوناگوں نعمتوں کو اور جو اللہ تم سے چاہتا ہے کہ تم خالص عبادت اُس کی کرو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اصلاح عمل کی دعوت ہے اور عبادت میں شرک سے روکنا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں میں باہم کوئی تضاد نہیں ہے لہٰذا نتیجتاً آیت کو ان دونوں پہلوؤں پر حاوی سمجھا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ﴿۶۹﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۰﴾ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ﴿۷۱﴾ فِي الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۳﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۴﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿۷۵﴾ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۶﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کو جو آیات خداوندی کے بارے میں بے جا تکرار کرتے ہیں، کیسے منحرف ہو رہے ہیں جنہوں نے کتاب کو جھٹلایا اور اُس پیغام کو جس کے ساتھ ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا تو اُنہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا، جب طوق اُن کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں وہ کھینچتے جاتے ہوں گے۔ گرم پانی میں پھر آگ میں جھونکے جائیں گے۔ پھر اُن سے کہا جائے گا کہ کہاں ہیں جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر شریک مانتے تھے، اُنہوں نے کہا

وہ تو ہم سے غائب ہو گئے بلکہ ہم اس کے پہلے کسی چیز کو (خدا کہہ کر) پکارتے ہی نہ تھے۔ اس طرح اللہ گمراہی کا نتیجہ دکھائے گا کافروں کو۔ یہ اس لئے کہ تم دنیا میں ناحق خوش ہوتے تھے اور اتراتے پھرتے تھے، داخل ہو دوزخ کے دروازوں میں ہمیشہ وہاں رہتے ہوئے تو کتنا بُرا ٹھکانا ہے گھمنڈ کرنیوالونکا''۔

یہ سلسلہ تفصیلی حالات آخرت کا مثل دوسرے مقامات کے بہت سے سلسلہ وار آیات کے جو تفصیلات پر مشتمل ہیں اُن خیالات کا قلع قمع کرانے کے لئے کافی ہے جو قدیم وجدید فلسفیوں کی بلند پروازی ذہن نے اختراع کیے ہیں وہ اس لئے کہ قرآن کا صریحی انکار لازم نہ آئے اور عذاب اُخروی کی اُس شکل کو جو اُن کے مزعومہ عقلی تصورات کے خلاف ہے، ماننا بھی نہ پڑے، قرآن مجید کے اُن تذکروں کو جو اُخروی نعمت یا عذاب سے متعلق ہیں، مختلف طرح مجاز یا تمثیل پر محمول کر کے بظاہر اپنے اسلام کو سنبھالتے ہیں لیکن قرآن کے درج کردہ تفصیلات کو دیکھنے کے بعد کوئی معقول ذہن اُن کے اس تصور کو قبول نہیں کر سکتا بلکہ آزاد عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ یا تو اُن حضرات کے ان تاویلات وتصورات کو لغو دلائل سمجھا جائے یا قرآن مجید کے بیانات کو معاذ اللہ مہمل سمجھا جائے۔ اب ہر نام نہاد مسلمان فیصلہ کرے کہ اُس کا اسلام ان میں سے کس کو گوارا کرتا ہے؟

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۷۷﴾

''تو صبر و برداشت سے کام لیجیے، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے تو خواہ وہ انجام جس کی ہم اُنہیں اطلاع دیتے رہے ہیں، ہم آپ کو آنکھوں سے دکھلا دیں اور خواہ آپ کو (اس سے پہلے) دنیا سے اُٹھا لیں۔ بہر صورت انہیں ہماری طرف پلٹنا ہے''۔

یعنی عذاب آخرت تو کہیں گیا نہیں ہے۔[1] بالفرض اس دنیا میں ان پر عذاب نہ آئے، وہاں کے عذاب میں تو اُنہیں مبتلا ہونا ہی ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۭ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۷۸﴾

''اور ہم نے آپ سے پہلے بہت پیغمبر بھیجے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا ذکر ہم نے آپ سے کیا ہے اور اُن میں سے کچھ وہ ہیں جن کا ذکر آپ سے نہیں کیا اور کسی پیغمبر کو یہ مقدور نہیں تھا کہ وہ کوئی معجزہ پیش کرے مگر اللہ کے حکم سے تو جب اللہ کی طرف کا حکم آجاتا ہے تو سچائی کے ساتھ فیصلہ ہو جاتا ہے اور اس موقع پر وہ جو باطل پر ہیں گھاٹا اٹھاتے ہیں''۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَكُمْ فِيْهَا

---

[1] الینا یرجعون یوم القیامۃ فنفعل بہم مایستحقرنہ من العقاب (مجمع البیان)

مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿٨٠﴾
وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿٨١﴾

''اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے چوپائے بنائے ہیں تا کہ اُن میں سے کچھ پر تم سوار ہو اور کچھ سے تم غذا حاصل کرو اور تمہارے لئے اُس میں فائدے ہیں اور یہ مقصد ہے کہ تم اُن پر جو تمہارے دلوں میں ارادہ ہو، اُس تک پہنچ سکو اور اُن پر اور کشتیوں پر تم سوار ہوتے ہو اور وہ تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے تو کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے''؟

''اُن پر جو تمہارے دلوں میں ارادہ ہو، اُس تک پہنچ سکو'' خواہ بار برداری مقصود ہو تو دوسری چیزیں اُن پر لاد کر پہنچا سکو۔[1] اور خواہ خود جانا ہو تو سوار ہو کر وہاں پہنچ سکو جس منزل مقصد تک پہنچنے کی تمہاری نیت ہو۔[2]

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ
كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا
يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَلَمَّا جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ
وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٨٣﴾ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ
وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿٨٤﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ
سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٥﴾

''تو کیا وہ اطراف زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھیں کیا ہوا انجام اُن کا جو ان کے پہلے تھے، جو تعداد میں ان سے زیادہ اور طاقت میں اور دنیا میں چھوڑے ہوئے نشانوں کے لحاظ سے ان سے بڑھے ہوئے تھے تو کوئی فائدہ اُنہیں پہنچایا اُس نے جو وہ دولت کماتے رہے تھے تو جب اُن کے پاس اُن کے پیغمبر معجزے لے کر آئے تو وہ اپنے پاس جو علم تھا اُس میں مگن رہے اور مبتلا ہو گئے اُس (عذاب) میں جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے تو جب ہمارے عذاب کے آثار آنکھوں سے دیکھے تو کہنے لگے کہ ہم اللہ پر جو ایک ہے ایمان لاتے ہیں اور جسے اُس کے ساتھ شریک کرتے تھے، اُس کا انکار کرتے ہیں تو اُنہیں کچھ فائدہ نہ پہنچاتا تھا یہ ایمان اُن کا جب کہ اُنہوں نے عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیا یہی طریقہ ہے اللہ کا جو جاری رہا ہے اُس کے بندوں میں اور اُس موقع پر کافر لوگ

---

[1] ھی حمل الاثقال الی البلاد (جلالین)

[2] ای ترکیوھا وتبلغوا المواضع الّتی تقصدونھا لحوایجکم (تبیان)

گھاٹا اٹھاتے ہیں''۔

عذاب آنے کے بعد ایمان لانا بے سود

''اپنے پاس جو علم تھا'' اُس میں مگن رہے، یعنی حصول دنیا کے طریقوں میں جو اُنہیں مہارت تھی اُسے وہ اپنا بہترین جوہر سمجھ کر خوش رہے۔ اس صورت میں عنھم کی ضمیر خود اُن قبل والے لوگوں کی طرف راجع ہے اور بعض مفسرین کا یہی خیال ہے۔[1]

ضمیروں میں اس قول سے اتفاق رائے کے ساتھ ''اُن کے پاس جو علم تھا'' اُس کی تشریح میں دو قول اور نقل ہوئے ہیں:۔ ایک یہ کہ وہ اُس میں مگن رہے جو اُن کا مزعومہ تھا کہ حشر ونشر کچھ بھی نہیں اور یہی دنیا سب کچھ ہے دوسرے یہ کہ جو اُن کا زعم تھا شرک اور انکار توحید کا۔ دونوں صورتوں میں اُن کے اس مزعومہ کا اطلاق اُن کے ''جہل مرکب'' کی بنا پر ہے کہ وہ اُسے علم سمجھ رہے ہیں۔[2] مگر دوسری تفسیر اس کی یہ کی گئی ہے کہ عندھم کی ضمیر رسل کی طرف راجع ہے، اس صورت میں ترجمہ ہوگا کہ ''وہ تفریح کرنے لگے اُس سے جو اُن پیغمبروں کے پاس علم تھا یعنی مذاق اُڑانے لگے۔[3]

تیسری تفسیر یہ ہے کہ فرحوا کی ضمیر پیغمبروں کی طرف راجع ہے یعنی جب پیغمبر معجزات لے کر آئے اور پھر اُنہوں نے تکذیب کی اور خالق نے اُس پر اپنے انبیاء کو اُس عذاب کی اطلاع دی جو اُن جھٹلانے والوں پر نازل ہوگا تو وہ پیغمبر اس اللہ کے دیے ہوئے علم سے خوش ہوئے۔[4]

ہمیں یہ تشریح بہت بعید معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ اس کے درمیان کی کڑیاں الفاظ قرآنی سے بالکل ذہن میں نہیں آتیں۔

---

[1] یعنی علم معاش (فتح الرحمٰن)

[2] فاطلق علیه لفظ العلم علی اعتقادهم (مجمع البیان)

[3] فرحوا ای الکفّار بما عندهم ای الرّسل من العلم فرح استهزآء (جلالین)

[4] فی الکلام حذف و تقدیره لمّا جآء تهم رسلهم بالبیّنات فجحدوها وانکروا دلالتها دعا الله تعالیٰ الرسل باهلاك القوم و نجاة الرسل فرح الرسل بما عندهم من العلم بذٰلك (تبیان)

سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃِ

مکیہ----۵۴----آیات

قرآن مجید میں چار سوروں میں ایک ایک آیت ایسی ہے جس کے پڑھنے سننے کے بعد فوراً سجدہ واجب ہوتا ہے، ان سوروں میں پہلی کی ابتداء الٓمٓ سے ہے، اس لئے وہ الٓمٓ سجدہ کہلاتا ہے اور اُس کی پیشانی پر صرف السجدہ نام لکھتے ہیں جو اکیسویں پارے میں ہے اور اس دوسرے سورے کی ابتداء حٰمٓ سے ہے، اس لئے اسے حٰمٓ السجدہ کہتے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا اس سورے کا نام نہیں ہے۔

سورۂ حٰم سجدہ کے خاص خاص مضامین:

۱۔رسولؐ کی بشریت کا اعلان اُنہی لفظوں میں جو اس کے پہلے سولہویں پارے میں سورۂ کہف کے آخر میں آچکی ہیں۔

۲۔آسمان مبداء تخلیق میں دھوئیں کی صورت میں تھا۔

۳۔قبیلہ ثمود کی اللہ نے ہدایت کی تو اُنہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی جس سے ظاہر ہے کہ اللہ کی ہدایت جبری طور پر نہیں ہوتی۔

۴۔آنکھوں، کانوں اور کھالوں کا مجرموں کے خلاف گواہی دینا۔

۵۔صبر وضبط اور رواداری کی تعلیم اور یہ کہ صفت بڑے ہی خوش نصیب لوگوں کا حصہ ہے۔

۶۔آیات الٰہی کے ذیل میں ایک پلہ میں تمام آفاق اور ایک پلہ میں نفس انسانی۔

باقی دوسرے مضامین ہیں ایسے جو بہت سے سوروں میں آتے رہتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۴﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴿۵﴾

''حا۔میم۔ یہ نازل شدہ ہے اُسی سب کو فیض پہنچانے والے بڑے مہربان کی طرف سے، ایسی کتاب جس کی

آیتیں کھلی ہوئی صاف صاف قرار دی گئی ہیں عربی زبان کے قرآن کی شکل میں اُن لوگوں کے لئے جو واقف ہیں، خوش خبری دینے والا اور (عذاب) ڈرانے والا تو اُن میں سے اکثر نے روگردانی کی اور وہ سنتے ہی نہیں اور اُنہوں نے کہا کہ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اُس سے جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے آپ کے درمیان پردہ حائل ہے تو آپ اپنی سی کیجیے۔ ہم اپنی سی کیے جائیں گے"۔

آخر کے جملے میں جو مضمون اُن کی زبانی ہے، وہ بعض جگہ خالق نے خود اُن کے لئے الفاظ استعمال فرمائے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جان بوجھ کر انکار، ہٹ دھرمی اور تعصب کی وجہ سے سمجھنا چاہیے کہ اُن کے دلوں پر مہر ہے، اُن کے کانوں پر پردے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یعنی صلاحیت اُن میں باقی نہیں ہے۔ اگر یہ خالق کے ارشادات اُن کے گوش زد ہوئے ہیں تو اُن کا یہ سب کچھ کہنا رسولؐ سے بطور طنز بھی ہوسکتا ہے کہ جب آپ ہمارے لئے یہ سب کچھ کہہ چکے تو اب ہمیں کیوں سمجھاتے ہیں؟ ہم سمجھنے والے ہیں ہی نہیں اور ہوسکتا ہے، اُنہوں نے خود ہی اپنے انکار کو عزم بالجزم کے طور پر قائم رکھنے کے اظہار کے لئے بطور استعارہ یہ سب الفاظ کہے ہوں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

"کہئے کہ میں تمہاری ہی طرح کا ایک بشر ہوں (مگر) ایسا کہ میری جانب پیغام بھیجا جاتا ہے کہ تم سب کا خدا بس ایک ہی خدا ہے تو اُس کی طرف سیدھا رُخ رکھو اور اُس سے بخشش کے طلب گار رہو اور وائے ہو اُن مشرکوں کے لئے جو خیرات نہیں دیتے اور وہ آخرت کے منکر ہیں"۔

چونکہ خیرات نہ دینے کا ذکر مشرکین کے ساتھ متعلق ہونا سمجھ میں نہیں آتا اس لئے بقول شاہ عبدالقادر:۔

"بعض کہتے ہیں یہاں زکوٰۃ سے کلمہ کہنا مراد ہے، زکوٰۃ کے معنی ستھرائی" (موضح القرآن)

مگر یزکون یا یتزکون ہوتا تو اس مفہوم کی گنجائش نکل بھی سکتی تھی، یؤتون کے ساتھ جس کے معنی ہیں "دیتے ہیں" الزکوۃ کا لفظ صاف اس حق مالی کے دینے کا اظہار کرتا ہے جس کا نام "زکوٰۃ" ہے اس صورت میں مفسرین کے اندر کافی پریشان خیالی محسوس ہوتی ہے۔

بعض نے یہاں اُس علم کلام کے مسئلہ سے کام لیا ہے کہ کفار فروع کے ساتھ بھی مکلف ہیں، پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے نہ دینے کا ذکر خاص طور پر کیوں ہو رہا ہے؟ وہ نماز کب پڑھتے ہیں جو زکوٰۃ دیا کریں۔

بعض نے کہا ہے کہ قریش والے حجاج پر کافی خیرات کرتے تھے مگر مسلمانوں کو محروم رکھتے تھے [1] اس کا شکوہ کیا جا رہا ہے۔

---

[1] قال القراء (تبیان)

اور بھی بعض اقوال علامہ طبرسیؒ نے درج کیے ہیں۔[1]

سیاق الفاظ اجازت نہیں دے رہے ہیں، ورنہ اس زحمت سے رہائی مل جائے اگر ہم یہ مان لیں کہ اس سے خاص الخاص مشرکین جو غیر مسلم ہوں مراد نہیں ہیں بلکہ مسلمانوں کا ایک ایسا طبقہ جو کسی نہ کسی طرح شرک و کفر کا مرکب ہے جسے ابان بن تغلب کی ایک روایت بتا رہی ہے جو امام جعفر صادقؑ کی طرف نسبت رکھتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۸

''بلاشبہ وہ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، اُن کے لئے اُن کا صلہ ہے جو ختم ہونے والا نہیں ہے''۔

''جو ختم ہونے والا نہیں'' یہ لفظ غیر ممنون کا ترجمہ اس بنا پر ہے کہ ممنون کے معنی لئے جائیں ''قطع ہو جانے والا''۔[2]

دوسری تفسیر یہ ہوئی ہے کہ اللہ اُن کی جزاء بطور استحقاق عطا کرے گا۔ کسی احسان کے طور پر نہیں جو اُن پر جتایا جائے۔[3] کیوں کہ احسان کا جتایا جانا احسان کی خوش گواری کو ختم کر دیتا ہے۔[4]

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۹ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝۱۰ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَاۗىِٕعِيْنَ ۝۱۱ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاۗءٍ اَمْرَهَا ۭ وَزَيَّنَّا السَّمَاۗءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ڰ وَحِفْظًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝۱۲

''کہئے کہ کیا تم لوگ انکار کرتے ہو اُس ذات کا جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا اور اُس کے لئے برابر دار مقرر کرتے ہو؟ وہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور اُس نے اُس (زمین) میں اُس کے اوپر سے پہاڑ بنائے اور اُس میں برکت عطا کی اور اُس میں اُس کی روزی کے سامان چار دن کی مدت میں مقرر کیے۔ یہ تمام دریافت کرنے والوں کے لئے یکساں طور پر جواب ہے۔ پھر اُس نے آسمان کی طرف رخ کیا، اس حالت میں کہ اُدھر دھواں ہی دھواں تھا تو کہا اُس سے اور زمین سے کہ آؤ خواستہ یا نخواستہ تو دونوں نے کہا ہم آتے ہیں خوشی خوشی تو اُس نے اُن

---

[1] الذین اشرکوا بالامام الاوّل وھم بالائمّۃ الاٰخرین کافرون (علی بن ابراھیم)

[2] ای لم جزاء علیٰ ذٰلک غیر مقطوع بل ھو متصل دائم (مجمع البیان)

[3] ای یلامنّ من اللہ علیھم بما یاجرھم بہ (علی بن ابراھیم)

[4] یجوز ان یکون معناہ انّہ لا اذی فیہ من المنّ الذی یکید الصنیعۃ (تبیان)

کے سات آسمانوں پر تقسیم ہونے کا انتظام کیا دو دن میں ہر ہر آسمان میں وحی بھیجی اُس کے معاملات کی اور ہم نے نیچے والے آسمان کو چراغوں اور حفاظت کے سامان سے زینت بخشی، یہ بندوبست ہے اُس غلبہ واقتدار والے کا جو بڑا علم والا ہے''۔

چھ دن میں آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کا ذکر بائبل میں بھی ہے مگر اُس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ وہ اس لگاتار محنت سے تھک گیا تو ساتویں دن اُس نے کمر سیدھی کی اور آرام کیا۔ قرآن نے بس اس آخری جز کو جو جلال وکمال الٰہی کے خلاف تھا رد کر دیا اور ارشاد کیا:۔

مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ﴿۳۸﴾ (سورۂ ق) ہمیں تھکن چھو بھی نہیں گئی۔

بے شک چھ دن میں پیدا ہونے کا تذکرہ متعدد مقامات پر قرآن نے بھی کیا ہے جو بظاہر ان تمام امور کے تدریجی طور پر وقوع میں آنے کا اظہار ہے لیکن دنوں کی پوری حقیقت و کیفیت جب کہ شمس وقمر اُس وقت موجود نہ تھے جن سے ہمارے دن اور رات بنتے ہیں، اسے ''متشابہات'' میں داخل سمجھا جائے تو بعید نہیں اور جب اس چھ دن کے اصل معنی ہم نہیں سمجھتے تو اس تفریق کو کیوں کر سمجھ یا سمجھا جا سکتے ہیں کہ زمین کے لئے چار دن اور آسمان کے لئے دو دن ہمارے معتبر مفسرین بھی خاموش نظر آتے ہیں۔

''کہا اُن دونوں آسمان اور زمین سے کہ آؤ خواستہ یا ناخواستہ۔ اُنہوں نے کہا کہ آتے ہیں ہم خوشی خوشی'' یہ کہنا اور اُن کا جواب دینا لفظی باتیں نہیں ہیں بلکہ وہ کہنا وہی حکم کُن ہے اور یہ جواب بلا توقف اُس کے وقوع میں آنے کی تعبیر ہے۔[1] جیسے امانت کا آسمان وزمین پر پیش کرنا اور اُن کا انکار۔ یہ کسی خاص وقت پر ہونے والے سوال وجواب کا اظہار نہیں بلکہ انسان کے علاوہ اس بار امانت کے اٹھانے سے دوسرے مخلوقات کی عدم صلاحیت فطرت کی تعبیر ہے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴿۱۳﴾ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴿۱۴﴾

''تو اگر وہ روگردانی کریں تو کہہ دیجیے کہ میں نے ڈرا دیا تمہیں اُس کے آسمانی عذاب سے جو قبیلہ عاد وثمود والے آسمانی عذاب کا سا ہو، جب اُن کے پاس پیغمبر آئے اُن کے سامنے سے اور اُن کے پیچھے سے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار چاہتا تو فرشتے اُتارتا تو ہم اُس کے جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو منکر ہیں''۔

''اُن کے سامنے سے اور اُن کے پیچھے سے''۔ اس کے ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ یہ لوگ اُن کی طرف متوجہ ہو کر منہ در منہ اُن کی بات

---

[1] لیس هناك امر بالقول على الحقيقة ولا جواب لذلك بالقول بل اخبر الله سبحانه بخلقه السّموات والارض وانشائه لها من غير تعذّر ولا كلفة ولا مشقّة (مجمع البيان)

سنیں یا اُن کی طرف سے منہ موڑے رہیں کہ وہ ان کے پسِ پشت سے پکار رہے ہوں۔[1] وہ بہرصورت پیغام الٰہی ان تک پہنچائے جاتے تھے مگر یہ مفہوم قرآن کے الفاظ سے سمجھ میں آنا مشکل ہے اس سے زیادہ ذہن سے نزدیک یہ مفہوم ہے کہ پیغمبر اُن کے آگے بھی آئے یعنی اُن کے گزرے ہوئے آباؤ اجداد کے پاس اور اُن کے پیچھے یعنی بعد میں بھی آئے۔[2]

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۶﴾

''تو قبیلہ عاد، اُنہوں نے دنیا میں ناحق گھمنڈ سے کام لیا اور کہا کون ہم سے زیادہ ہے طاقت میں؟ کیا اُنہوں نے یہ نہ دیکھا کہ اللہ جس نے اُنہیں پیدا کیا، وہ اُن سے طاقت میں زیادہ ہے اور وہ ہماری آیتوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے تھے تو ہم نے اُن پر تیز و تند ہوا بھیجی کچھ خاص منحوس دنوں میں تاکہ اُنہیں رسوائی کی سزا کا مزہ چکھائیں اس زندگی میں اور بلاشبہ آخرت کا عذاب زیادہ سوال کرنے والا ہے اور اُن کی کوئی مدد نہ ہوگی''۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸﴾

''اور قوم ثمود، اُن کی ہم نے رہنمائی کی تو اُنہوں نے اندھے پن کو راہ راست پانے پر ترجیح دی تو اُنہیں ذلت و حقارت کے سخت عذاب نے گرفتار کرلیا اُن کے کرتوتوں کے نتیجے میں اور جو ایمان لائے تھے اور پرہیزگار رہے تھے، اُنہیں ہم نے نجات دی''۔

''ہم نے رہ نمائی کی تو انہوں نے اندھے پن کو ترجیح دی'' اس سے ظاہر ہے کہ اللہ کا ہدایت کرنا بصورت جبر نہیں ہے، ورنہ اُس سے تکلف ممکن ہی نہ ہوتا۔[3] اور جہاں کافروں سے ہدایت ربانی کی نفی کی گئی ہے کہ اگر ہم ہدایت کرتے تو سب ہی ایمان لے آتے، وہاں وہ ہدایت ہے جو زبردستی منزل تک پہنچا دینے کے معنی میں ہے مگر اس طرح کا مجبور کرنا اللہ کی شان حکمت اور انسان کی مطلوبہ منزل شرافت کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ ایک درجہ درمیانی ہے جو توفیقاتِ خاصہ کا شامل حال کرنا ہے جس کی رسولؐ سے نفی کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

---

[1] ای مقبلین علیهم و مدبّرین عنهم (جلالین)

[2] فمنهم من تقدّم زمانه ومنهم من تاخّر عنه (تبیان)

[3] فی الأیة دلالة علی بطلان قول المجبّرة (تبیان)

آپ جس کی چاہیں اُس کی ہدایت نہیں کر سکتے، وہ تو اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

مگر یہ ''چاہنا'' بلا وجہ نہیں ہوتا بلکہ خود اُس بندے کا ذوق طلب اُسے اس کا حقدار بناتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

جو ہمارے بارے میں جدوجہد کرتے ہیں اُنہیں ہم اپنے خاص راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔غرض قرآن مجید کے مطالعے سے عقلی تدبر کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے کہ ہدایت کے متعدد معنی یا مختلف مدارج ہیں، کوئی عمومی طور پر ثابت ہے خدا کے لئے بھی اور رسولؐ کے لئے بھی، کوئی خدا کے ساتھ مخصوص ہے، رسولؐ کے بس میں نہیں مگر جس کی مطلق طور پر نفی ہوئی ہے اور وہ جبری ہدایت ہے۔کوئی خدا کی طرف سے ہے مگر اُس میں عمومیت نہیں بلکہ صلاحیت ظرف اور مصالح کے ساتھ مشروط ہے۔اس اختلاف معانی یا مراتب کے نظر انداز کرنے سے بہت لوگ پریشان خیالی میں مبتلا ہوتے ہیں۔صحیح یہ ہے کہ محل اور موقع کے لحاظ ہر جگہ اس لفظ کے وہ معنی سمجھنا چاہئیں جو اُس موقع پر موزوں و مناسب ہوں۔

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿١٩﴾ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢١﴾ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٢﴾ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿٢٤﴾

''اور جس دن دشمنانِ خدا قیامت میں آگ کی طرف لے جائے جائیں گے تو انہیں ہر طرف سے لایا جائے گا، یہاں تک کہ جب وہ وہاں آئیں گے تو اُن کے خلاف اُن کے کان اور اُن کی آنکھیں اور اُن کی کھالیں گواہی دیں گے اُس کی جو وہ کرتے تھے اور وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی تو وہ کہیں گے کہ ہمیں گویائی عطا کی اللہ نے جس نے ہر چیز کو گویائی دی ہے اور اُس نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اُسی کی طرف تمہارا پلٹنا ہے اور تم چھپنے کی کوشش نہیں کرتے تھے اس سے کہ تمہارے خلاف کہیں تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں گواہی نہ دیں مگر تمہارا خیال تھا کہ اللہ بہت سی باتوں سے جو تم کرتے ہو، آگاہ نہیں ہے اور یہی تمہارا خیال جو تم نے اپنے پروردگار کی نسبت کیا تمہارے لئے تباہ کن، بنا تو تم گھاٹا اٹھانے والوں میں

ہوئے۔اب اگر وہ برداشت کریں تو بھی آگ اُن کا ٹھکانا ہے اور اگر وہ راضی کرنے کی کوشش کریں تو بھی اُن سے راضی ہوا نہیں جا سکتا''۔

قیامت میں اعضاء جسمانی گواہی دیں گے

آنکھوں، کانوں اور جسم کی کھالوں کا گواہی دینا اُس حجت کا سد باب ہے جسے دنیا میں ایک شاعر نے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟

حدیث معصومؑ بتاتی ہے کہ یہ حجت روز قیامت پیش کی جائے گی اور اُس وقت خالق کی طرف سے اُن کی زبانیں بند ہو جائیں گی اور اعضائے جسمانی اُن کی بداعمالیوں کی گواہی دینے لگیں گے، وہ حدیث یہ ہے:۔

قال صادقؑ فيقولون يارب هٰؤلاء ملآئكتك يشهدون لك ثمّ يحلفون بالله مافعلوا من ذٰلك شيئاوهوقول الله :يوم يبعثهم الله جميعافيحلفون له كما يحلفون لكم فعتد ذٰالك يختم الله على السنّتهم وينطق جوارحهم ...(علی ابن ابراهيم)

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ اُس وقت وہ کہیں گے پروردگارا! یہ تیرے ہی تو فرشتے ہیں، وہ تیری سی گواہی دے رہے ہیں، پھر وہ خدا کی قسم کھائیں گے کہ اُنہوں نے یہ کچھ نہیں کیا، چنانچہ قرآن میں ہے: جس دن وہ اُنہیں اٹھائے گا تو وہ اُس کے سامنے اسی طرح قسمیں کھائیں گے جیسے تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تو اُس وقت اللہ اُن کی زبانوں پر مہر لگا دے گا اور اُن کے اعضاء گواہی دیں گے۔

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۲۵

''اور ہم نے اُن کے لئے مقرر کیے کچھ ساتھی تو اُنہوں نے ان کے لئے بنا سنوار کر پیش کیا اُسے جو اُن کے سامنے ہے اور جو اُن کے پیچھے ہے اور اُن پر بات پوری ہو گئی اُن بہت سی قوموں کے ذیل میں جو جنات اور آدمیوں میں سے ان کے پہلے گزر گئیں، بلاشبہ وہ گھاٹا اُٹھانے والے تھے''۔

''ہم نے ان کے واسطے مقرر کیے کچھ ساتھی''۔ یہ ساتھی حقیقت میں اس مقصد سے تو مقرر نہیں کیے گئے تھے مگر چونکہ اُن ساتھیوں نے کام یہی کیا، اس لئے اس نتیجہ کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جس کی یہ مثال ایسے موقع پر علماء کے درمیان زبان زد ہے اور اس تفسیر میں بھی بار بار آئی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے واقعہ میں کہا گیا: فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (قصص۔۸) ''فرعون کے گھرانے والوں نے اُنہیں دریا سے نکال لیا تا کہ وہ اُن کے لئے دشمن جان اور سبب رنج و ملال ہوں'' حالانکہ فرعون والوں کا مقصد حضرت موسیٰؑ کی پرورش سے یہ نہ

تھا کہ وہ اُن کے لئے دشمن جان ثابت ہوں، اسی طرح یہاں یہ ساتھی اس لئے اُنہیں نہیں دیے گئے تھے مگر چونکہ نتیجہ یہی سامنے آیا لہٰذا اُسے اس طرح کہا گیا۔

''بات پوری ہوگئی'' وہی جو آغاز آفرینش میں شیطان سے خالق نے کہہ دیا تھا کہ: لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴿۸۵﴾ (سورۂ ص)

میں دوزخ کو تم سے اور تیرے پیروؤں سے بھر دوں گا۔

''سامنے اور پیچھے'' یعنی دنیا و آخرت کے بارے میں جو ان کے تصورات تھے کہ دنیا سب کچھ ہے اور آخرت کچھ نہیں، اس میں اُن ساتھیوں نے جو اُنہیں تقدیر سے مل گئے تھے، ہاں میں ہاں ملائی بلکہ کبھی انہی لوگوں نے اُنہیں گمراہ کر کے ایسے خیالات پیدا کر دیے۔[1] یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ برے ساتھیوں کا ملنا خود ان کی بداعمالی کے نتیجے میں سلب توفیق کی بناء پر ہوا۔[2] اس کے مقابلہ میں اچھے ماحول اور اچھے ساتھیوں کا ملنا ایک توفیق الٰہی ہوتا ہے اُن کے لئے جن میں اللہ آثار خیر و سعادت پاتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ﴿۲۶﴾ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ﴿۲۸﴾

''اور کہا اُن لوگوں نے جو کافر ہیں کہ اس قرآن کی نہ سنو اور اس کے پڑھے جانے میں اِدھر اُدھر کی فضول باتیں کیا کرو، شاید تم فتح پاؤ، تو ضرور ضرور ہم چکھائیں گے ان کافروں کو سخت عذاب کا مزہ اور اُنہیں سزا دیں گے ان بدترین اعمال کے لحاظ سے جو وہ کرتے تھے، یہ سزا ہے دشمنانِ خدا کی آگ، جس میں اُن کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گھر ہے، سزا میں اس کی کہ وہ ہماری آیتوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے تھے''۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ﴿۲۹﴾

''اور کہا اُن لوگوں نے جو کافر تھے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں دکھلا اُن دونوں قسم کے اشخاص کہ جنات اور آدمیوں میں سے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا ہم اُنہیں پیروں کے نیچے روندیں تا کہ وہ پستی میں مبتلا ہوں''۔

---

[1] مابين ايديهم من امر الدّنيا وايتان الشهوات وما خلفهم من امو الاخرة بقولهم لابعث ولاحساب (جلالين)

[2] انّما فعل ذٰلك عقوبة لهم على مخالفتهم ونظره ومن يعش عن ذكر الرحمٰن نقيض للشيطانا فهو له قرين (مجمع البيان)

بعض مفسرین نے ''دونوں قسم کے اشخاص'' کے بجائے سوچ کر دو شخصیتیں نکالی ہیں کہ اہل دوزخ اُنہی کو آنکھ سے دیکھنے کا مطالبہ کر رہے تھے، جنات میں سے ابلیس اور آدمیوں میں سے قابیل جس نے سب سے پہلے خونریزی کی بنیاد قائم کی۔[1]

اس کے لئے کوئی حدیث ثبوت میں مل جائے تو ٹھیک ہے جیسا کہ ایک روایت میں اُس کی نسبت جناب امیر علیہ السلام کی طرف آئی ہے۔[2] مگر حضرتؑ کی طرف اس ارشاد کا استناد پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا ہے، بہرصورت مقصود اُس سے سب ہی ایسے اشخاص ہیں جو دوسروں کی گمراہی کا سبب ہوں۔[3]

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴿۳۲﴾

''وہ جنہوں نے کہا کہ ہمارا مالک اللہ ہے اور پھر مضبوطی کے ساتھ جمے رہے، اُن پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ افسوس کرو اور خوش ہو اس بہشت سے جس کا وعدہ تم سے ہوتا رہا تھا۔ ہم تمہارے مددگار ہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور تمہارے لئے اُس میں وہ ہے جو تمہارے نفوس خواہش رکھتے ہوں اور تمہارے لئے وہاں وہ ہے جو طلب کرو سامان ضیافت کے طور پر بڑے بخشنے والے مہربان کی جانب سے''۔

''اُن پر فرشتے اترتے ہیں'' یعنی موت کے وقت اُن کو فرشتے آکر یہ بشارت دیتے ہیں۔[4]

دوسرا تصور یہ ہے کہ حشر کے موقع پر قبور سے اٹھائے جاتے وقت یہ بشارت اُنہیں مل جاتی ہے۔[5]

تیسرا قول یہ ہے کہ تین دفعہ ایسا ہوگا، موت کے وقت اور قبروں میں اور پھر قبروں سے اُٹھائے جانے کے وقت۔[6]

علامہ طبرسیؒ نے پہلے قول کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

روی ذٰلك عن ابی عبداللہ علیہ السلام (یعنی) اس کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے آئی ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۳﴾

---

[1] ای ابلیس قابیل الّذین منا الکفر و القتل (جلالین)

[2] روی ذٰلك عن علی علیه السلام (تبیان)

[3] اراد بذٰلك کلّ من ابدع الکفر و الضّلالة من الجنّ و الانس (مجمع

[4] عند الموت (جلالین)

[5] قال الحسن تستقبلهم اذا خرجوا من قبورهم فی الموقف بالبشارة (تبیان)

[6] قیل ان البشری تکون فی ثلثة مواطن: عند الموت و فی القبر و عند البعث (مجمع البیان)

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝۳۴ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝۳۵

''اور کون ہوگا بات میں بہتر اُس سے کہ جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک اعمال بجالائے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں اور بھلائی اور بُرائی یکساں نہیں ہے، تم برائی کا دفعیہ زیادہ سے زیادہ بھلائی سے کرو تو ایک دم یہ نتیجہ ہوگا کہ تمہارے اور جس کے درمیان دشمنی ہے، وہ ایسا ہو جائے جیسے وہ بڑا جگری دوست ہے اور یہ طریقہ کار سکھایا نہیں جاتا مگر اُن کو جو برداشت سے کام لیں اور اسے نہیں سکھایا جاتا مگر اُسے جو بڑے نصیب والا ہو''۔

اس قرآن کی آیت میں عدم تشدد والے مقابلے کا پورا فلسفہ موجود ہے مگر عوام کو لازمی طور پر اس کا پابند نہیں بنایا جا سکتا، اس لئے شریعت اسلام نے قصاص اور مقابلہ بمثل کا حق دیا ہے، یہی اسلام کی وہ جامعیت اور اعتدال کی خصوصیت ہے جو اس کی ہمہ گیر اور دائمی ہونے کی ذمہ دار ہے۔ معصوم رہنمایان دین نے یہ توضیح فرمائی ہے کہ ہر شخص کے مقابلہ میں یہ طریقہ کار کامیاب اور مستحسن نہیں ہوتا بلکہ اس عدم تشدد کے مقابلے کے لئے فریق مخالف میں کچھ شرافت کا جوہر ہو، تب نتیجہ حسب دل خواہ مرتب ہوتا ہے، ورنہ ممکن ہے کہ ظلم کی ہمت افزائی ہو اور ایسی صورت میں یہ طریقہ کار اختیار کرنا صحیح نہ ہوگا۔

ایک تشریح یہ ہے کہ ''برائی'' سے مراد سخت کلامی اور بدزبانی ہے اور ''بھلائی'' سے مراد ''رواداری'' تہذیب اور شائستگی ہے۔[1] یعنی تمہارا مخالف تم سے بحث میں کیسی ہی سخت کلامی کرے، تم رواداری کا دامن نہ چھوڑو تو بہت ممکن ہے کہ اُس کی سختی و درشتی بھی پھر نرمی اور رفتہ رفتہ محبت و الفت سے تبدیل ہو جائے۔ اس صورت میں اس حکم کو عام بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ عموماً اپنا کردار ایسا ہی رکھنا چاہیے۔

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۶

''اور اگر شیطان کا ورغلانا تمہیں منحرف کرنا چاہے تو اللہ سے پناہ مانگو، بلاشبہ وہ سننے والا ہے، جاننے والا''۔

سابقہ آیت کے سیاق کی مناسبت سے اگر ترتیب نزول میں بھی یہ آیت اُس سے متصل ہو تو یہاں شیطان کے ورغلانے سے مراد جوش انتقام اور غصے کا غلبہ قرار پاتا ہے۔[2] اور اگر سیاق سے قطع نظر کیا جائے تو یہ ایک عام بات ہے کہ جب طبیعت کسی بے راہ روی کی طرف مائل ہو تو اللہ سے پناہ مانگو۔

یہ پناہ حقیقتاً تو تصور صادق کے ساتھ اللہ کو یاد کر لینا ہے اور لفظی مظہر اُس کا یہ الفاظ ہیں کے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم جو تلاوت قرآن میں خاص طور پر وارد ہوئے ہیں اور یوں بھی انسان کو اُنہیں زبان پر جاری کرنا چاہیے۔

---

[1] قیل معنی الحسنة ھھنا المداراۃ و السنّة المراد بھا الغلظة فادّب اللہ تعالیٰ عبادة بھٰذا الادب (تبیان)

[2] یعنی کبھی بے اختیار غصہ چڑھ آوے تو یہ شیطان کا دخل ہے (موضح القرآن)

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۳۷﴾ فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْـَٔمُوْنَ ﴿۳۸﴾ السجدة

''اور اُس کی نشانیوں میں سے رات ہے اور دن اور سورج اور چاند، تم سجدہ نہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو اور سجدہ کرو اُس اللہ کو جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر تم بس اُسی کو مستحق عبادت سمجھتے ہو تو اگر وہ گھمنڈ سے کام لیں تو بلاشبہ جو تمہارے پروردگار کے پاس ہیں وہ رات اور دن اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ تھکتے نہیں ہیں''۔

سجدۂ واجب

یعنی وہ تمہاری عبادت سے بے نیاز ہے، اُسے سجدہ کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔

یہ دو آیتیں وہ ہیں جن میں سجدہ واجب ہے، ہمارے علماء کے نزدیک ان میں سے پہلی آیت کی آخری لفظ **تعبدون** پر سجدہ واجب ہے۔[1] اور یہ اس لئے قرین قیاس ہے کہ اصل سجدہ کا حکم **واسجدوا** یعنی سجدہ کرو اسی میں ہے، بعد والی آیت تو اس کا ایک طرح کا تتمہ ہے اور جمہور کے علماء زیادہ تر دوسری آیت کے آخری لفظ **لا یسئمون** پر سجدہ واجب جانتے ہیں کہ پورا مضمون مع تتمہ ختم یہاں پر ہوتا ہے۔

ہمارے علماء کے قول کی موافقت میں ہمارے ائمہ معصومینؑ کے ارشادات ہیں اور بعض صحابہ کا قول بھی ہے اور قراء سبعہ میں سے ایک قاری کا وہ مسلک بھی ہے۔[2] فقہی حیثیت سے احتیاط یہ ہے کہ دونوں جگہ سجدہ کرلے، پہلا بقصد وجوب اور دوسرا بطور احتیاط اور اگر دونوں میں قصد قربت پر اکتفاء کرے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ؕ اِنَّ الَّذِيْۤ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾

''اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تم زمین کو دیکھو گے بالکل افسردگی کے عالم میں تو جب ہم اُس پر پانی برساتے ہیں تو وہ لہلہانے لگتی ہے اور اُس میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ جس نے اُسے زندگی دی، وہی مردوں کا زندہ کرنے والا ہے یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

ابتداء یہ سب آیتیں تصور مبدأ یعنی خالق کی طرف ذہن کو موڑنے کے مقصد سے تعلق رکھتی تھیں لیکن اس آیت کے آخر میں ذہن کو تصور معاد کی طرف موڑ دیا گیا ہے اور ایسے تمثیلات قرآن کی ایک مستحکم دلیل ہیں کہ قرآن اُسی جسمانی تصور قیامت کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے نہ کہ جسے فلاسفہ یا آج کل کے ترقی پسند ذہنیت والے بتاتے ہیں۔

---

[1] السجود عندا اصحابنا عند قوله: ان كنتم ايّاه تعبدون (تبيان)

[2] عن ابن مسعود والحسن عند قوله: ان كنتم ايّاه تعبدون وهو اختيار عمرو بن العلا وهو المرويّ عن ائمّتنا (مجمع البيان)

اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۭ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۴۰﴾

''یقیناً وہ لوگ جو ہماری آیتوں کے بارے میں کج روی سے کام لیتے ہیں ہم پر چھپے ہوئے نہیں ہیں تو کیا جو آگ میں ڈال دیا جائے، وہ بہتر ہے یا جو قیامت کے دن امن واطمینان کے ساتھ آئے جو تمہیں منظور ہو، وہ کرو، یقیناً وہ جو تم کرو، اُس کو دیکھنے والا ہے''۔

آیتوں کے بارے میں کج روی یہی ہے کہ اُن پر غور نہیں کرتے اور ایمان اختیار نہیں کرتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ﴿۴۱﴾ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾

''یقیناً جن لوگوں نے اس قرآن کا انکار کیا جب کہ وہ اُن کے پاس آیا حالانکہ وہ یقیناً ایک باعزت کتاب ہے، باطل کا اُس کے پاس گزر نہیں، نہ اُس کے سامنے سے اور نہ اُس کے پس پشت سے، اُتارا ہوا ہے اُس ذات کی طرف سے جو حکمت والی ہے، ہر تعریف کی حق دار''۔

''جن لوگوں نے انکار کیا'' اس مبتداء کی خبر محذوف ہے بعض لوگوں نے قرینہ کلام سے اُسے معین کیا ہے کہ ''وہ ہم سے چھپ نہیں سکتے۔[۱] اُس کے قبل کی آیت میں کہا گیا تھا، بعض نے کہا ہے کہ ''ہم اُنہیں سزا دیں گے''[۲] اور بھی جملے تجویز کیے گئے ہیں جو مقدر مانے جائیں۔[۳] ممکن ہے کہ ایسے مقامات پر حذف میں حکمت یہی ہو کہ ایسوں کے لئے جو بھی ایسی سزا تجویز کرے گا، وہ درست ہی ہوگی۔

''باطل کا اُس کے پاس گزر نہیں، نہ سامنے سے اور نہ پس پشت سے'' ہمارے نزدیک تو آخر کا فقرہ بس اُسی ''گزر نہیں'' کے مفہوم میں قوت پیدا کرنے کے لئے ہے یعنی کسی رُخ سے اُس میں غلطی کا امکان نہیں۔ بعض لوگوں نے یہ معنی کہے ہیں کہ نہ اُس کے پہلے کوئی کتاب الٰہی ایسی ہے جو اسے غلط کہے اور نہ اس کے بعد اس کے غلط ہونے کا کوئی ثبوت آیا ہے۔[۴] میرے نزدیک یہ مفہوم ذہن نشین نہیں ہے۔

جناب شیخ الطائفہؒ نے اس سلسلہ میں پانچ قول درج کیے ہیں جنہیں علامہ طبرسیؒ نے بھی مجمع البیان میں نقل کر دیا ہے۔

مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۴۳﴾

---

[۱] پوشیدہ نیستند (شاہ ولی اللہ)

[۲] نجازیہم (جلالین)

[۳] ھلکوا بہ وفسقوا بہ ونحوہ (تبیان)

[۴] ای لیس قبلہ کتاب یکذبہ ولا بعد (جلالین)

''نہیں کہا جاتا آپ سے مگر وہی جو کہا جاتا رہا اُن پیغمبروں سے جو آپ سے پہلے تھے، بلاشبہ آپ کا پروردگار بخشنے والا بھی ہے اور دردناک سزا والا بھی''۔

یعنی جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور یہ چاہنا بلا وجہ نہیں ہوتا بلکہ معیار استحقاق کے مطابق ہوتا ہے۔[1]

یہ بھی پیغمبر خدا ﷺ کو تسلی دہانی ہے کہ جو دل شکن باتیں آپ سے کہی جاتی ہیں، یہ قبل والے انبیاء سے برابر کہی جاتی رہی ہیں۔[2]

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾

''اور اگر ہم اُسے عربی کے علاوہ کسی زبان کا قرآن بنا کر اتارتے تو وہ کہتے کہ اُس کی آیتیں صاف صاف کیوں نہیں رکھی گئیں، یہ غیر عربی زبان کا کلام اور عرب انسان! کہیے کہ وہ اُن کے لئے جو ایمان لائیں ہدایت ہے اور علاج اور جو ایمان نہیں رکھتے، اُن کے کانوں میں گرانی ہے اور وہ اُن کے لئے اندھا پن ہے یہ وہ ہیں جنہیں پکارا جا رہا ہے بہت دور کی جگہ سے''۔

''بہت دور کی جگہ سے پکارا جا رہا ہے'' کہ کچھ سنائی دیتا ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔[3] یہی عالم اُن کا ہے کہ صدا تو کان میں جا رہی ہے مگر بے توجہی کے سبب سے اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہا جا رہا ہے؟

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۴۵﴾

''اور ہم نے موسیٰ ؑ کو کتاب عطا کی تو اُس میں اختلاف کیا گیا اور اگر نہ ہوتی اللہ کی طرف کی بات جو پہلے کہی جا چکی تھی تو اُن کے درمیان مختتم فیصلہ ہو گیا ہوتا اور بلاشبہ وہ اُس میں شدید قسم کے شک وشبہ میں گرفتار ہیں''۔

''اگر نہ ہوتی اللہ کی طرف کی بات جو کہی جا چکی ہے'' یہ جملہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ہے اور ہر جگہ اُس میں دو تصور ہیں: ایک یہ کہ طے شدہ بات یہ ہے کہ فیصلہ قیامت میں ہوگا۔ دوسرے یہ کہ یہ طے ہو چکا ہے کہ رسولؐ کی بدولت اس امت پر مختتم عذاب نہیں آئے گا یہاں بھی کوئی وہ کہتا ہے۔[4] اور کوئی یہ[5] یہاں موقع کے لحاظ سے ہم یہ محاکمہ کر سکتے ہیں کہ اگر اس جملے کو موسیٰؑ ہی کی قوم سے متعلق رکھا جائے تو پہلے تصور

---

[1] الذو مغفرة للمؤمنين وذو عقاب اليم للكافرين (جلالين)

[2] عزّى سبحانه نبيّه ﷺ على تكذيبهم (مجمع البيان)

[3] يسمع الصّرت ولا يفهم المعنى (تبيان)

[4] لا يعاجلهم بالعقوبة وانّه يؤخرّهم الى يوم القيمة (تبيان)

[5] فى تاخير العذاب عن قومك وانّه لا يعذّبهم وانت فيهم (مجمع البيان)

کو معین سمجھنا چاہیے اور اگر بعد کا جملہ اس امت سے متعلق قرار دیا جائے تو دوسرے تصور کو قوت حاصل ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾

''جو نیک کام کرے، وہ اپنے لئے کرے گا اور جو برائی کرے، وہ اپنے ہی نقصان کا باعث ہوگا اور تمہارا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے''۔

خالق کے ثبوت عدل کی دلیل

بکثرت آیات واحادیث کی طرح یہ بھی ثبوت عدل کی دلیل ہے۔

اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ؕ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِىْ ؕ قَالُوْٓا اٰذَنّٰكَ ؕ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ ﴿۴۷﴾ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۴۸﴾

''اُسی کی طرف ہر پھر کے پہنچنا ہے قیامت کا علم، اور کوئی پھل اپنے غلافوں سے نمایاں نہیں ہوتے اور کسی ماں کے پیٹ میں کوئی بچہ نہیں ہے اور نہ وہ اُس کے یہاں پیدا ہوتا ہے مگر اُسی (اللہ کے) علم کے ساتھ اور جس دن وہ اُنہیں آواز دے گا کہ کہاں ہیں میرے شریک؟ وہ کہیں گے ہم تجھے بتا چکے کہ ہم میں سے اس کی گواہی دینے والا کوئی نہیں اور غائب ہو گئے اُن سے وہ جنہیں وہ پہلے پکارا کرتے تھے اور وہ سمجھے کہ اُن کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے''۔

''میرے شریک'' یعنی وہ جنہیں تم میرا شریک قرار دیتے تھے اور یہ قرآنی نظیر بڑی قوی سند ہے، اس کی اکثر غیر کے مزعومات کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ لفظ صرف کر دیا جاتا ہے جو دوسروں کے معتقدات کے مطابق ہے۔ اب اگر کوئی مسلمان مثلاً غلام محمد قادیانی کو اپنے انداز تحریر کی بنا پر ''نبی قادیان'' یا کسی جمہوری نظام والے خلیفہ مسلمین کو ''خلیفہ وقت'' کہہ دے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا نہیں جا سکتا کہ وہ خود ان الفاظ کے مطابق اعتقاد رکھتا ہے۔

''وہ آواز دے گا کہ کہاں ہیں میرے شریک''؟ اب خواہ وہ قضا میں صدا پیدا کر کے ندا دے جس کے یہی الفاظ ہوں یا جیسا کہ جناب شیخ الطائفہؒ کا تصور ہے'' اس کی طرف کا کوئی منادی صدا دے اور وہ کہے کہاں ہیں اللہ کے شریک؟ [1] لیکن چونکہ وہ صدا اُس کے حکم سے تھی تو نقل بالمعنی کے طور پر اب اُس نے قرآن میں اُسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ''میرے شریک کہاں ہیں''؟

---

[1] ای ویوم ینادیهم منادا این شرکاء الله الّذین کنتم تعبدونهم من دون الله و توجّهون العبادة الیهم (تبیان)

لَا يَسْئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ۫ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ﴿۴۹﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۫ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۰﴾ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴿۵۱﴾

''آدمی بھلائی کی دعا کرنے سے تھکتا نہیں اور اگر برائی پہنچ جاتی ہے تو ایک دم نراسا، بے اُمید ہو جاتا ہے اور اگر ہم اُسے اپنی طرف سے کسی مہربانی کا مزہ چکھاتے ہیں، اُس سختی کے بعد جو اُسے درپیش ہوئی تھی تو وہ کہے گا کہ یہ میرا حق ہے اور میں نہیں سمجھتا قیامت کو کہ وہ برپا ہونے والی ہے اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف پلٹایا گیا تو یقیناً میرے لئے اُس کے یہاں بھی بھلائی ہی ہوگی تو ہم بتائیں گے اُنہیں جو کافر رہے کہ اُنہوں نے کیا کیا تھا اور اُنہیں چکھائیں گے سخت سزا کا کچھ مزہ اور جب ہم آدمی کو نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ روگردانی کرتا ہے اور پہلوتہی سے کام لیتا ہے اور جب اُسے برائی درپیش ہوتی ہے تو لمبی چوڑی دعا کرتا ہے''۔

یہ سب باتیں اُسی وقت کے آدمیوں کا تذکرۂ ماضی نہیں ہیں بلکہ یہ اوصاف کے چوکھٹے ہر دور کے لئے قرآن نے پیش کر دیے ہیں کہ ہر زمانے میں اپنے کردار کے محاسبے کی جنہیں توفیق ہو وہ اپنے کردار کی تصویر اس چوکھٹے میں لگا کر دیکھ لیں کہ وہ اُس کے ٹھیک مطابق نہیں ہوتی اور ایسے موقعوں کے پیش کرنے کے موقع پر قرآن نے کوئی جماعتی لقب سرنامہ اوصاف نہیں بنایا ہے بلکہ الانسان کا لفظ کہہ کر بین الاقوامیت پیدا کی ہے کہ اس کے حکیمانہ انتباہ سے ہر مذہب وملت کا آدمی فائدہ اٹھا سکے۔

آخری جملے میں الفاظ قرآنی ذودعاء عریض کا لفظی ترجمہ تو ''چوڑی دعا والا'' ہے مگر اردو محاورے کے لحاظ سے ہماری زبان میں دو الفاظ ساتھ ''لمبی چوڑی'' بولے جاتے ہیں تو وہ مفہوم ادا ہوتا ہے اور یہ علمی حقیقت کے بھی مطابق ہے یعنی لمبان کے لئے چوڑان ضروری نہیں ہے مگر چوڑان کے لئے عقلی طور پر لمبان لازمی وصف ہے۔[1]

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾

''کہئے کہ کیا تم نے غور کیا ہے اگر یہ اللہ کی طرف سے ہوا، پھر تم نے اس کا انکار کیا تو اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو ایسی شدید مخالفت میں مبتلا ہو''۔

---

[1] لانّ العرض یدلّ علی الطّول ولا یدلّ الطّول علی الارض اذقد یصحّ طومل ولا عرض لہ ولا یصحّ وعریض لا طول لہ (تبیان)

صاف یہ کہنے کے بجائے کہ اس صورت میں تم سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا، جو واقعہ ہے اور حقیقت میں یہی کہنا مقصود ہے۔[1] یوں بات کو پھرا کر کہنا کہ اُس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو ایسی شدید مخالفت میں مبتلا ہو، ایک انداز رواداری نہیں ہے تو کیا ہے؟

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۵۳

''ہم اُنہیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں جو تمام کائنات میں ہیں اور خود اُن میں ہیں یہاں تک کہ اُن کے لئے ثابت ہو جائے کہ وہ بالکل حقیقت ہے، کیا تمہارے پروردگار کے لئے یہ امر کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے''۔

خدا کی قدرت کی نشانیوں میں ایک پلّے میں ہیں آفاق یعنی تمام کائنات اور دوسرے پلّے میں خود نفس انسان۔

بات یہ ہے کہ کائنات کا ادراک کچھ حواس کا محتاج ہے لہٰذا جس کے حواس معطل ہیں یا انہیں کارفرمائی کا موقع نہ ملا ہو، اُس کے لئے کائنات والا ذریعہ کارآمد نہیں ہوتا لیکن نفس انسان اُس سے کسی بھی ہنگام اور کسی محل پر جدا نہیں اور اُس کے ادراک کے لئے کسی حاسّہ کی ضرورت نہیں اس لئے کوئی شخص ایسا تصور میں نہیں لایا جا سکتا جس کے احاطہ ادراک میں یہ آیت الٰہی نہ ہو۔

پھر یہ کہ دوسری کائنات خدا کی مخلوق ہونے کی بنا پر اُس کے وجود کا پتہ دیتی ہے اُس طرح جیسے تصویر مصور کا پتہ دیتی ہے اور عمارت معمار کا یعنی مقام علم میں ذہن کو اُس کی طرف منتقل کرتی ہے مگر نفس انسانی کو اس کے ساتھ ساتھ خالق نے عالم امکان میں کچھ اپنے اوصاف کا آئینہ بنا دیا ہے لہٰذا یہ اللہ کی جانب ذہن کو اُس طرح منتقل کرنا ہے جیسے تصویر اس شخص کے پہچاننے کا ذریعہ ہوتی ہے جس کی تصویر ہے۔ اب جتنا نفس کامل ہو، اتنا اُس کی معرفت کا زیادہ ذریعہ ہے، اس لئے ایسے نفوس میں سے ہر ایک ''وجہ اللہ'' کا مصداق ہو جاتا ہے کہ جس طرح چہرہ کسی شخص کی معرفت کا ذریعہ ہوتا ہے، اُسی طرح اس شخص کے اوصاف کو دیکھ کر معرفت الٰہی حاصل ہوتی ہے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۝۵۴ۧ

''معلوم ہونا چاہیے کہ وہ لوگ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضری کے بارے میں شک و شبہ میں گرفتار ہیں، معلوم ہونا چاہیے کہ یقیناً وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے''۔

تمام اشیاء کو گھیرے ہونا علم و قدرت دونوں لحاظ سے ہے لہٰذا محیط کا لفظ اسمائے حسنیٰ جن کی تعبیر ''صفات ثبوتیہ'' سے کی جاتی ہے، اُن میں سے دو وصفوں پر حاوی ہے اور چونکہ اللہ کی بارگاہ میں حاضری یعنی قیامت کے بارے میں جتنے استبعادات و اعتراضات ہیں، اُن میں سے کچھ اُس کے احاطہ علمی کے پیش نظر رکھنے سے دور ہوتے ہیں اور کچھ احاطہ اختیار یعنی قدرت کو یاد رکھنے سے ختم ہوتے ہیں، اگر اس کے علم کلی اور قدرت عمومی دونوں کو سامنے رکھا جائے تو کسی قسم کا اعتراض و استبعاد درست معلوم نہ ہو لہٰذا اس ایک لفظ ''قرانی محیط'' میں اُن تمام کی رد مضمر ہے۔

---

[1] ای فلا احد اضلّ منکم (مجمع البیان)

سُوْرَةُ الشُّوْرٰی

مکّیہ ----۵۳---- آیات

چونکہ اس سورے میں یہ فقرہ ہے "وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ" جس پر وہاں تبصرہ ہوگا، اس لئے اس سورہ کا یہ نام ہوا۔

سورۂ شوریٰ کے خاص خاص مضامین:

۱۔اصول دین میں تمام انبیاء کا متحد ہونا۔

۲۔رسولؐ کو انتہائی روادارانہ اعلان کی ہدایت کہ اللہ ہمارا بھی پروردگار ہے، تمہارا بھی، ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں، تمہارے لئے تمہارے اعمال۔

۳۔آیۂ مودّت جس کا مفہوم ہے ذوی القربیٰ کی محبت کا بطور اجر رسالت مطالبہ۔

۴۔انتقام لینے کے حق کے ساتھ معافی کی تعریف۔

۵۔اقسام کلام الٰہی۔

۶۔پیغمبرؐ کے علم کا بفیض الٰہی ہونا۔وغیرہ وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

حٰمٓ ① عٓسٓقٓ ② كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ③ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ④"

''حا، میم، عین، سین، قاف۔اسی طرح وحی بھیجتا ہے آپ کی طرف اور اُن کی طرف جو آپ کے پہلے تھے وہ اللہ جو عزت والا ہے، صحیح کام کرنے والا، اُس کا ہے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اور بلند ہے، بڑا بزرگ مرتبہ''۔

''اسی طرح''، یعنی جیسے اب تک وحی آپ پر آتی رہی ہے، ویسے ہی یہ سورہ آپ پر بذریعہ وحی اُتارا جارہا ہے، اسی طرح باعتبار رفعت بھی وصف ہوسکتا ہے یعنی جیسی حقائق ومعارف سے بھری ہوئی وحی اب تک ہوتی رہی ہے، ویسی ہی یہ ہورہی ہے۔[1]

---

[1] معنی التشبیه فی کذٰلك ان بعضه کبعض فی انّه حکمة وصواب (تبیان)

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝٥ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝٦

''نزدیک ہے کہ آسمان اپنے اوپر سے شگافتہ ہوجائیں اور فرشتے اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اُن کے لئے جو دنیا میں ہیں طلب مغفرت کرتے ہیں معلوم ہونا چاہیے۔ کہ یقیناً اللہ وہی بڑا بخشنے والا، مہربان اور جنہوں نے اُس کے سوا سرپرست بنائے ہیں، اللہ اُن سب پر نگران ہے اور آپ اُن کے ذمہ دار نہیں ہیں''۔

کیوں؟ ایک تصور یہ ہے کہ'' آسمان اور زمین شگافتہ ہوجائیں'' کیوں؟ ایک تصور یہ ہے کہ اس سے عظمت الٰہی کا اظہار منظور ہے اور دوسرے یہ کفار ومشرکین کی گستاخیوں اور بداعمالیوں کی شدت کا اظہار ہے کہ یہ ایسی ہیں کہ ان سے آسمان شگافتہ ہوجائیں۔ [1]

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝٧

''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف بذریعہ وحی بھیجا ہے عربی زبان کا قرآن تاکہ آپ متنبہ کریں مکّہ اور اُس کے اردگرد والوں کو اور ڈرائیں سب کو اکٹھا کیے جانے کے دن سے جس میں کوئی شک نہیں ایک گروہ بہشت میں جائے گا اور ایک گروہ دوزخ میں''۔

آپ کی ہدایت کا تعلق صرف مکّہ والوں سے نہیں بتایا گیا ہے بلکہ ''اردگرد'' کہہ کے وسعت پیدا کردی گئی ہے، چونکہ جیسا کہ مذہبی روایات بتاتی ہیں اور اُمّ القویٰ کہہ کے یہاں قرآن نے ارشاد کیا ہے مکّہ وسط میں ہے، اس لئے اُس کے اردگرد کا احاطہ تمام معمورۂ ارض پر حاوی ہے بلاتفریق سمت وجہت اور بلا اختلاف ملک واقلیم۔ [2]

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝٨

''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ سب کو ایک مذہب پر قرار دے دیتا لیکن وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کا نہ کوئی سرپرست ہے اور نہ کوئی مددگار''۔

---

[1] فی معناہ قولان احدھما ___ من عظمۃ اللہ جلّ جلالہ ولشانی ___ استعظاما للکفر باللہ والعصیان لہ (تبیان)

[2] من سائر النّاس وقوی الارض کلھا (مجمع البیان) ای ھل مکّۃ و سائر النّاس (جلالین) آس پاس اُس کے اول عرب، بعد اُس کے ساری دنیا (موضح القرآن)

''اگر اللہ چاہتا'' یعنی جبری طاقت سے مگر ایسا کرنا اُس کے نظام حکمت اور انسانی شرافت کے خلاف ہے۔[1] جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۚ﴿۹﴾ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۾ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۱۰﴾ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۱۱﴾ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

''کیا اُنہوں نے اس کو چھوڑ کر سرپرست اختیار کیے ہیں تو اصل سرپرست اللہ ہی ہے اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور کوئی چیز بھی جس کے بارے میں تم میں اختلاف ہو تو اُس میں فیصلہ اللہ کے حوالے ہے۔ یہ ہے اللہ میرا پروردگار، اُس پر میں بھروسا کرتا ہوں اور اُسی سے لو لگاتا ہوں، آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا، اُس نے تمہارے لئے تمہارے نفوس میں سے بیویاں قرار دیں اور چوپایوں میں بھی جوڑے بنائے ہیں اور وہ سننے والا ہے، دیکھنے والا، اُس کی ملکیت میں کنجیاں ہیں آسمانوں اور زمین کی۔ وسعت دیتا ہے رزق میں جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگی بھی کرتا ہے یقیناً وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰۤى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾

''اُس نے مقرر کیا ہے تم لوگوں کے لئے وہی دین جس کی اُس نے ہدایت کی تھی نوحؑ کو اور جو بذریعہ وحی ہم نے بھیجا آپ کی طرف اور جس کی ہم نے ہدایت کی ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو کہ دین قائم رکھنا اُس کے متعلق تفرقہ میں

---

[1] معناہ الاخبار عن قدرتہ بأنہ لوشآء ان یلجئھم الی الایمان ودین الاسلام لکان قادر اعلیٰ ذٰلك وفعل لکنّ ذٰلك یبطل الغرض بالتکلیف (تبیان)

نہ پڑنا، مشرکین کو بہت شاق ہے جس کی طرف آپ اُنہیں دعوت دیتے ہیں، اللہ جسے چاہتا ہے اپنی بارگاہ میں منتخب کرتا ہے اور جو اُس سے لو لگاتا ہے اُسے وہ اپنی طرف رہبری کرتا ہے''۔

اس سے ظاہر ہے کہ اصول دین میں تمام انبیاء متحد ہیں اور اُن کے پیغام میں اختلاف قطعاً نہیں ہے۔

''اُس کے متعلق تفرقہ میں نہ پڑنا'' یہ فرقہ بندی کی پیش بندی کے طور پر ممانعت تھی۔[1] جس کے روکنے کا خدا اور رسولؐ نے انتظام کیا تھا مگر مسلمانوں نے اُس انتظام کو قبول نہ کیا اور بدنصیبی سے اُس تفرقے میں پڑ گئے جس سے روکے گئے تھے۔

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِىَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِىْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾

''اور وہ لوگ تفرقہ میں نہیں پڑے مگر صرف اُس کی ضد سے بعد اس کے کہ اُن کے پاس علم آ گیا اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف کی پہلے سے طے شدہ بات مقررہ مدت تک کے لئے نہ ہوتی تو اُن کے درمیان فیصلہ ہو گیا ہوتا اور یقیناً وہ جنہیں اُن کے بعد کتاب عطا ہوئی تھی اس کے بارے میں شک وشبہ میں گرفتار ہیں''۔

''پہلے سے مقررہ بات'' یعنی یہ کہ اصل سزا کے لئے قیامت کا دن مقرر ہے یا منظور قدرت یہ ہے کہ اُنہیں کچھ عرصے تک کی مہلت دی جائے۔[2]

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

''تو بس اسی کے لئے آپ دعوت دیتے رہیے اور مضبوطی سے جمے رہیے جیسا کہ آپ کو حکم ہے اور اُن کے خواہشوں کی پیروی نہ کیجیے اور کہئے کہ جو کوئی بھی کتاب، اللہ نے اُتاری ہے، میں اُس پر ایمان رکھتا ہوں اور میں مامور ہوں کہ تمہارے درمیان عدالت سے کام لوں۔ اللہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے۔ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال ہیں، کوئی بحث درکار نہیں ہے ہمارے تمہارے

---

[1] لا تختلفوا فیہ (مجمع البیان)

[2] ۔ای لو لا وعد اللہ تعالیٰ واخبارہ بتبقیتھم الیٰ وقت معلوم (مجمع البیان)

درمیان۔ اللہ ہم سب کو اکٹھا کرے گا اور اُسی کی طرف بالآخر جانا ہے''۔

بعض لوگوں نے خواہ مخواہ اس قرآنی اعلان کے ساتھ یہ نوٹ دیا ہے کہ یہ حکم جہاد کے قبل کی بات تھی۔[1] حالانکہ اسلامی حکم جہاد کی جو نوعیت قرآن سے ثابت ہوتی ہے، اُس کے لحاظ سے ان آیات میں جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ بدلی نہیں ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿١٦﴾

''اور وہ جو اللہ کے بارے میں بلاوجہ بحث کرتے ہیں بعد اس کے کہ اُسے قبول کیا جاچکا، ان کی دلیل اُن کے پروردگار کے نزدیک غلط ہے اور اُن پر غضب ہے اور اُن پر سخت عذاب ہے''۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ''بعد اس کے کہ اسے قبول کیا جاچکا اُس کے دو مطلب کہے گئے ہیں اور دونوں ہو سکتے ہیں۔ پہلے یہ کہ بہت سے حقیقت پسند افراد اس دعوت حق کو قبول کر چکے ہیں۔[2] دوسرے یہ کہ اللہ پیغمبرؐ کی دعا کو کہ وہ اُن کی نصرت کرے، قبول کر چکا ہے اور اُس کی بنا پر بدر وغیرہ میں کامیابی عطا فرمائی ہے۔[3]

علامہ طبرسی نے تعیناً پہلے ہی معنی کو اختیار کیا ہے۔[4] اور بظاہر وہ ذہن سے زیادہ قریب ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ﴿١٧﴾ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿١٨﴾ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿١٩﴾

''اللہ وہ ہے جس نے اُتارا ہے کتاب کو حق کے ساتھ اور ترازو کو اور تمہیں کیا خبر شاید قیامت نزدیک ہی ہو، جلدی کرتے ہیں اُس کے لئے وہ جو اُس پر یقین نہیں رکھتے اور وہ جو ایمان لائے ہیں، ڈرتے ہیں اُس سے اور جانتے ہیں کہ وہ حق ہے، بلاشبہ وہ جو قیامت کے بارے میں تکرار کرتے ہیں، کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں، اللہ اپنے بندوں پر لطف و کرم والا ہے جسے چاہتا ہے روزی عطا کرتا ہے اور وہ طاقتور ہے، زبردست''۔

اس آیت میں کتاب اور میزان یعنی ترازو کے الفاظ تشریح طلب ہیں کتاب کے جو ظاہری معنی ہیں اور ترازو کا جو ظاہری مفہوم ہے،

---

[1] قبل انّ ذٰلك كان قبل الامر بالقتال (تبیان)

[2] یعنی جمعی در دائرہ اسلام داخل شدند (فتح الرحمن)

[3] الثانی معناہ من بعد ما استجیب للنبی دعاؤہ (تبیان)

[4] ای من بعد ما دخل النّاس فی الاسلام (مجمع البیان)

اُس میں کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی، اس لئے شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''ترازو فرمایا دین حق کو جس میں بات پوری ہے، نہ کم، نہ زیادہ'' (موضح القرآن)

تفسیر جلالین میں ہے: المیزان العدل۔ میزان سے مراد عدالت ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید کی متعدد آیتیں ایسی ہیں جن میں کتاب کے ساتھ حرف عطف ہے اور کسی چیز کو اُس کے ساتھ بتایا گیا ہے جیسے:۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ (مائدہ)

تمہارے پاس نور آیا اور کتاب روشن۔

اور یہاں اُس کے ساتھ میزان کو کہا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دین کی تشریح و تکمیل دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ اب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں تو کتاب خدا کے ساتھ خود حضرتؐ کی سنت ہے جس میں قول و عمل وغیرہ حضرتؐ کا ہے لیکن آپ کے بعد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متفق علیہ حدیث نے صاف کتاب کے ساتھ اپنے عترت و اہل بیت کو بتا دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم الفاظ قرآنی کی تشریح اس کے مطابق نہ کریں اور یہ نہ سمجھیں کہ کتاب، دین کی وہ تشریح ہے جو بذریعہ الفاظ ہے اور میزان وہ نمونہ عمل ہے جس کا اتباع دین کے کمال کا معیار ہے۔ ہماری قدیم تفسیر جس کے ساتھ بظاہر حدیث معصومؑ کا حوالہ ہے اس تشریح کے مطابق ہے۔[1]

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿۲۰﴾

''جو آخرت کی کھیتی چاہتا ہے، ہم اُس کی کھیتی میں اضافہ کرتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اُسے ہم اس میں سے عطا کرتے ہیں اور آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا''۔

''جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے'' بمقابلہ آخرت یعنی آخرت کا سامان نہ کرنا چاہتا ہے، نہ کرتا ہے، اُس کی دنیا چاہے بن جائے مگر آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا لیکن اگر آخرت کے ساتھ دنیا کا بھی طلبگار رہے تو اُس میں کوئی مضائقہ نہیں اور بہت ممکن ہے کہ اُس کی دنیا بھی قابل رشک طور پر آراستہ ہو اور آخرت بھی قابل غبطہ ہو جیسا کہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:۔

المال والبنون حرث الدّنيا و العمل الصّالح حرث الأخرة و قد يجمعهما الله لاقوام (علی بن ابراهيم)

مال اور اولاد زینہ دنیا کی کھیتی ہے اور نیک اعمال آخرت کی کھیتی ہیں اور کچھ لوگوں کے لئے اللہ کبھی دونوں کو یکجا کر دیتا ہے۔

اور خود قرآن نے اہل ایمان کی مثالی تمنا بارگاہ الٰہی میں دعا کے طور پر یہی بتائی ہے کہ:۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (سورۂ بقرہ۔۲۰۱)

پروردگارا ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی۔

لہٰذا آخرت کے ساتھ دنیا کی طلب باعث محرومی آخرت کہاں ہو سکتی ہے؟

---

[1] قال یعنی الامام (علی بن ابراهیم)

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

''کیا اُن کے کچھ (بنائے ہوئے) شریک ایسے ہیں جنہوں نے اُن کے لئے دین کا کوئی ایسا طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی ہے اور اگر فیصلے کے متعلق طے شدہ بات نہ ہوتی تو اُن کے درمیان فیصلہ کر دیا گیا ہوتا اور ظالم لوگ، یقیناً اُن کے لئے دردناک عذاب ہے''۔

''اگر طے شدہ بات نہ ہوتی'' علماء مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ فیصلہ ہے کہ جزا و سزا قیامت میں ہوگی۔[1] لیکن اگر یہ ہمیشہ طے شدہ بات ہوتی تو امم سابقہ پر عذاب کیوں آیا کرتا بلکہ اس امت کی خصوصیت ہے کہ وجود پیغمبرؐ مانع عذاب ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (الانفال۔ ۳۳)

اللہ ایسا نہیں کہ اُن پر عذاب نازل کرے درانحالیکہ آپ اُن میں موجود ہیں۔ یہی وہ طے شدہ بات ہے۔[2] اور اس کے بعد ہر دور میں کسی ایسے جانشین رسول کا وجود جو جز رسولؐ ہے مانع عذاب ہے اس لئے ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ **کلمة الفصل** سے مراد ہر زمانے کا امام ہے۔[3] اور اب ظالم لوگوں سے مراد وہ ہوں گے جو اس کلمے یعنی امام کا انکار کریں۔[4]

تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾

''تم دیکھو گے ظالموں کو خوف زدہ اُس سے جو اُنہوں نے کیا اور اُس کا خمیازہ اُنہیں اُٹھانا ہے اور جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، باغہائے بہشت میں ہوں گے اُن کے لئے وہ ہوگا جو وہ چاہیں اُن کے پروردگار کے یہاں، یہی بڑا فضل و کرم ہے۔ یہ وہ ہے جس کی خوشخبری دیتا ہے اللہ اپنے اُن بندوں کو جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کرتے رہیں کہئے کہ میں تم سے اس پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا سوا صاحبان قرابت کی محبت کے اور جو کوئی نیک

---

[1] ای القضاء السّابق بانّ الجزاء یوم القیٰمة (جلالین)

[2] ای لولا انّ اللہ حکم بتاخیر العذاب لھٰذہ الامہ الیٰ الاٰخرة (مجمع البیان)

[3] الکلمة الامام والدلیل علیٰ ذلك قوله: وجعلها کلمة باقیة فی عقبه لعلّهم یرجعون (علی بن ابراهیم)

[4] یعنی الّذین ظلموا هٰذه الکلمة (علی بن ابراهیم)

کام کرے گا ہم اسے اُس میں بھلائی اور زیادہ عطا کریں گے، یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا ہے، قدردان"۔

یہ موجودہ نظم قرآنی میں بالکل نمایاں بات ہے کہ جتنی آیتیں اہل بیت کرامؑ سے خصوصیت رکھنے والی تفسیر اور حدیث کے لحاظ سے متفق علیہ طور پر بطور مستقل آیت کے شہرت رکھتی ہیں جیسے آیہ اکمال دین اور تمام نعمت اور آیہ تطہیر، وہ سب بحالت موجودہ دوسری طویل آیتوں کا جزء بنی ہوئی ہیں اور اُن کا مستقل آیت ہونا محسوس نہیں ہوتا چنانچہ آیہ مودت (قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى) مذکورہ بالا دوسری آیت کے اندر اس طرح گھلا ملا کر درج ہوئی ہے کہ اُس کی منفرد حیثیت کوئی محسوس نہیں ہوتی، بہرحال شانِ نزول وغیرہ کی روایات کے لحاظ سے یہ امر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ وہ ایک مستقل آیت ہے جو بالانفراد نازل ہوئی ہے اور اپنی ایک خاص شان نزول رکھتی ہے۔

اس کے بعد مرحلہ اُس کے معنی کا ہے۔ مفسرین جمہور اُس کا ترجمہ ایسا کرتے ہیں جس سے اُس کا کوئی تعلق اہل بیت رسولؐ سے نہ رہ جائے چنانچہ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:۔ باید کہ پیش گیرید دوستی درمیان خویشاوندان۔ چاہیے کہ مقدم رکھو دوستی عزیزوں کے درمیان۔ حاشیے میں لکھا ہے "یعنی با من صلۂ رحم کنید" (فتح الرحمن) مطلب یہ ہے کہ مجھ سے جو تمہاری قرابت ہے اُس کا لحاظ کرو اور اُس کے تقاضے کو پورا کرو۔ پہلے ترجمے میں گنجائش تھی کہ مخاطب مسلمان ہوں اور عزیزوں سے مراد خود مسلمانوں کے رشتہ دار ہوں مگر حاشیے سے پتہ چلا کہ رسولؐ کفار و مشرکین کو اپنی رشتہ داری کا واسطہ دے کر طالب رحم ہیں۔ اُن کے صاحبزادے ترجمہ کرتے ہیں "مگر دوستی بیچ قرابت کے" اس سے تو کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا مگر دوسرے صاحبزادے صاف کر دیتے ہیں کہ "یعنی میں تمہارا بھائی ہوں ذات کا، مجھ سے بدی نہ کرو۔ (موضح القرآن)

جلالین کا پیچیدہ لفظوں میں مطلب کچھ اور معلوم ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

اسألكم ان تؤدّوا قرابتي هي قرابتكم ايضا فان له في كلّ بطن من قريش قرابته.

میرا سوال تم سے یہ ہے کہ میرے قرابت داروں سے محبت کرو جو تمہارے بھی قرابت دار ہیں اس لئے کہ قریش کے ہر قبیلے میں حضرتؐ کے کچھ عزیز تھے۔ یعنی اُنہیں یہ محسوس ہوا ہے کہ اس سے رسولؐ کے عزیز مراد ہیں مگر اُنہوں نے مشرکین کو مخاطب بناتے ہوئے اسے حضرتؐ کے ان عزیزوں سے متعلق قرار دیا ہے جو مشرکین کے حلقے میں رہ گئے تھے۔

ذوی القربیٰ کی محبّت کا بطور اجر رسالت مطالبہ

یاد رکھنا چاہیے کہ نظریہ، مسلک اور اصول کے اختلاف میں قرابت کا واسطہ دینے کے کوئی معنی نہیں، اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار و مشرکین کو اپنی قرابت کا واسطہ دے کر یہ خواہش کریں کہ میری مخالفت نہ کرو تو اصولاً انہیں بھی اپنی قرابتوں کا واسطہ دے کر حق ہوگا کہ وہ آپ سے کہیں کہ آپ ہمارے بتوں کی مذمت نہ کیجئے اور جو ہمارے طور طریقے ہیں، اُن کی مخالفت نہ کیجیے اور اگر اُن کے لئے اس طرح کا واسطہ دینا صحیح نہیں ہے تو پیغمبر خداؐ کی شان کے بالکل خلاف ہوگا کہ آپ اُنہیں اپنی قرابت کا واسطہ دے کر مخالفت سے روکیں اور (معاذ اللہ) اُن سے رحم کی التجا کریں۔ آپ بطور خود بھی ایسا نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ اللہ آپ کو اس پر مامور فرمائے۔

بہرحال ہمارے یہاں متفق علیہ ہے اور کچھ فراخ حوصلہ علمائے اہل سنت بھی اس میں ہم سے متفق ہیں کہ یہاں فی القربیٰ سے مراد

رسول خداؐ کے وہ ذوی القربیٰ مراد ہیں جنہیں ہم ''آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' اور ''اہل بیت رسولؐ'' کہتے ہیں۔[1] ایک تصور یہ ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اجر رسالت کچھ مانگا نہیں گیا ہے بلکہ الگ سے جیسے کہا جارہا ہے کہ ہاں بس قرابت داروں سے محبت رکھو مگر یہ تصور دوسرے آیات قرآن کی روشنی میں درست معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ ایک جگہ کہا گیا ہے کہ:

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ: میں نے جو اجر مانگا ہے، وہ تمہارے فائدے کے لئے ہے۔(سبا۔ ۴۷)

اس سے ظاہر ہے کہ آپ نے کچھ اجر مانگا ہے اور یہ اسی صورت میں درست ہے کہ جب استثناء کو متصل مابین یعنی آیت کا یہ مطلب لیں کہ میں کوئی دوسرا اجر نہیں مانگتا، بس یہ اجر تم سے طلب کرتا ہوں اور اس دوسری آیت میں شان رسولؐ کا تحفظ کیا گیا ہے کہ کسی معاوضے کا طلب کرنا رسولؐ کے خلوصِ عمل کے خلاف اُس وقت ہوتا ہے جب آپ ایسا اجر مانگتے جس کا فائدہ خود آپ کو حاصل ہو اور جب اجر رسالت ایسا طلب ہوا ہے جو خلق خدا ہی کے فائدے کے لئے ہے تو اس کا طلب کرنا شان رسولؐ کے خلاف نہیں ہے۔ ایک تیسری آیت میں اُس فائدے کی تشریح ہے اجر کی نفی کے ساتھ کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، استثناء کیا گیا ہے یہ کہ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (فرقان۔ ۵۷) یعنی وہ فائدہ خلق خدا کا یہ ہے کہ اُن کے لئے تقرب الٰہی اور اُس کی مغفرت کا اس طرح ایک ذریعہ ہاتھ آتا ہے یعنی یہ ذوی القربیٰ وہ ہیں جو دنیا کو رسولؐ کے بعد اللہ کی رضا حاصل کرنے کی راہیں بتانے والے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دینی رہنمائی کرنے والے ہیں۔

جب کہ جمہور کے نزدیک یہ پوری آیت ایک ڈال ہے اور بیچ کے جملے یعنی قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ کو وہ مشرکین سے متعلق قرار دیتے ہیں تو آخر کے فقرات کو وہ کیا کریں گے کہ ''جو کوئی نیک کام کرے گا ہم اُس میں بھلائی اور زیادہ عطا کریں گے یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا ہے، قدردان''؟ جب کہ قرآن مجید نے دوسرے مقامات پر صاف بتلایا ہے کہ مشرکین وکفار کے اعمال جو کارہائے نیک کے قبیل سے ہیں، سب رائیگاں ہیں اور اُن کا کوئی اجر نہیں تو پھر یہ فقرات کفار ومشرکین کے ساتھ تخاطب کے ذیل میں کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ لیکن یہ تفسیر جس کی تائید میں خود بیان رسولؐ موجود ہے اور یاد رکھنا چاہیے کہ دوسری تفسیر کوئی ایسی نہیں جس کی موافقت میں خود پیغمبر خداؐ کی کوئی حدیث وارد ہوئی ہو تو مطلب صاف ہے کہ یہی ذوی القربیٰ کی محبت وہ نیک کام ہے جس کی مناسبت سے کہا جارہا ہے کہ جو کوئی نیک کام کرے گا ہم اُسے اور زیادہ عطا کریں گے یعنی اُس شخص کے اعمال خیر میں برکت ہوگی اور ثواب میں اضافہ ہوگا جو مومنین سے اللہ کا دوسرے مقامات پر بھی وعدہ ہے اور ہمارے یہاں معصومؑ کی حدیث اس کی تائید میں موجود ہے۔[2]

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾

''کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اللہ پر تہمت لگائی ہے تو اگر اللہ چاہے تو آپ کے دل پر مہر لگا دے اور اللہ باطل کو

---

[1] قال علی بن الحسین علیہ السلام وسعید بن جبیر وعمرو بن شعیب معناہ الّا ان تردّوا قرابتی وھو المرویّ عن ابی جعفر وابی عبداللہ علیہما السّلام وھو الاختیار عندنا وعلیہ اصحابنا (تبیان)

[2] صحّ عن الحسن بن علی علیہ السلام انّہ خطب النّاس فقال فی خطبتہ انّا اھل البیت الّذین افترض اللہ مردّتہم علی کلّ مسلم فقال: قل لّا اسئلکم علیہ اجرا الّا المودّۃ فی القربیٰ ومن یقترف حسنۃ نزدلہ فیہا حسنا فاقتراف الحسنۃ مردّتنا اھل البیت (مجمع البیان)

مٹاتا ہے اور حق کو اپنی باتوں سے حق ثابت کرتا ہے یقیناً وہ دلوں کے اندر کی باتوں کا جاننے والا ہے''۔

اس آیت میں اتنے مختصر الفاظ میں وہ پوری دلیل اعجاز درج ہے جسے متکلمین طول طویل تقریروں سے پیش کیا کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ خالق کریم کی طرف غلط طور پر منسوب کر کے اگر معجزانہ شان کی کوئی چیز پیش کی جائے تو وہ قادر مطلق اس کو باطل ثابت کرنے کا سامان ضرور کرے گا اور جب ایسا نہیں ہوا اور اُس کی طرف سے اس کے حق ہونے ہی کے ثبوت پیش ہوتے رہے تو ماننا پڑے گا کہ حقیقاً وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

اس صورت میں کہ جب اسے سابق آیۂ مودت سے غیر متعلق قرار دے کر الگ سے دیکھا جائے تو ہمارے نزدیک قوت اس مفہوم کو ہے اگر چہ شیخ الطائفہؒ نے مفہوم آیت کے متعلق دوسرے اقوال کے ساتھ اسے بطور ایک قول کے درج کیا ہے۔[1] لیکن الفاظ قرآن سے زیادہ موافقت اور دلیل عقلی کی مطابقت اسی مفہوم کو حاصل ہے لیکن اگر اس محل پر ترتیب کے مطابق تنزیل سمجھیں تو بعید نہیں ہے تو اس کا ربط آیہ مودت سے ہوسکتا ہے اُس کے اس مفہوم کے لحاظ سے جو ہمارے نزدیک قطعی حیثیت رکھتا ہے اور جس کو مناسب تشریح کے ساتھ پیش کیا جا چکا ہے اور جس کی بنا پر آیۂ مودت کے مخاطب مشرکین نہیں بلکہ اہل اسلام ہیں تو اب یہ کہنے والے غیر قوم کے افراد نہیں بلکہ مسلمانوں ہی میں کے وہ اشخاص ہوں گے جنہیں ان ذوی القربیٰ سے پُرخاش تھی اور وہ اُن کی محبت کے اجر رسالت ہونے کو قبول نہیں کرتے تھے تو اُنہوں نے آپس میں یہ بات کہی ہو یا اپنے دلوں میں کہا ہو کہ اے لیجیے! اُنہوں نے اپنے قرابت داروں کو ہمیشہ کے لئے مسلمانوں پر مسلّط کر دیا۔ ہمارے اس تصور کو تقویت آیت کے آخری ٹکڑے سے ہوتی ہے کیوں کہ اگر کھلے ہوئے مشرکین ہوتے تو وہ یہ بات اعلانیہ کہتے، اُن سے اس تہمہ کا تعلق نہیں ہوسکتا کہ ''وہ اُن کے دلوں کے اندر گھلے ملے ہوئے ہیں۔ اب اس سلسلہ میں بعد کی آیتیں بھی کھپ جائیں گی جو ابھی آپ کے سامنے آئیں گے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ وَیَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَیَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَیَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ﴿۲۶﴾

''اور وہ وہ ہے جو اپنے بندوں سے توبہ کو قبول کرتا ہے اور معمولی برائیوں سے درگزر کرتا ہے اور جانتا ہے اُسے جو تم کرتے ہو اور قبول کرتا ہے دعا کو اُن کی جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں اور اُنہیں اور زیادہ عطا کرتا ہے اپنے فضل و کرم سے اور کافر لوگ، اُن کے لئے سخت عذاب ہے''۔

اگر ہمارے تصور کو جو اس سے پہلے کی آیت میں ہم نے پیش کیا ہے قبول کر لیا جائے تو آیۂ مودت سے یہاں تک پورا سلسلہ ایک ڈال ہو جائے گا اور اب یہاں کے ختم سلسلہ پر جو ''کافر لوگ'' کا لفظ ہے تو یہ وہ کھلے ہوئے کافر نہیں بلکہ یہی دلوں کے اندر والے کافر ہوں گے جن کے لئے اس سے پہلے کہا گیا تھا کہ اللہ دلوں کے اندر کی باتوں کا جاننے والا ہے اور اب کہا جا رہا ہے کہ ''جانتا ہے اُسے جو تم کرتے ہو''۔

---

[1] قیل المعنی انه قال لنبیّه ﷺ لو حدّثت نفسك بان تفتری علی الله کذبا بالطبعت علی قلبك و اذهبت الوحی الّذی اٰیتك لاتی امحو الباطل وحقّ الحقّ (تبیان)

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۷﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۸﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾

''اور اگر اللہ روزی میں تمام اپنے بندوں کے لئے کشائش ہی رکھے تو وہ دنیا میں سرکشی اختیار کریں مگر وہ ایک مقدار مقرر میں جو چاہتا ہے اتارتا ہے، یقیناً وہ بندوں کے حالات کا جاننے والا ہے، دیکھنے والا، اور وہ وہ ہے جو پانی برساتا ہے بعد اس کے کہ وہ مایوس ہو چکے ہیں، اور اپنی رحمت پھیلاتا ہے اور وہ سرپرست ہے، تعریفوں کا مستحق اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے پیدا کرنا آسمان اور زمین کا اور جو اُس نے اُن دونوں میں چلنے پھرنے والے پھیلا دیئے ہیں اور وہ جب چاہے گا، اُن کے اکٹھا کرنے پر قادر ہے''۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۖ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾

''اور جو مصیبت تم کو پہنچے، وہ اُس کی وجہ سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے کیا ہے اور بہت سی باتوں کو وہ چھوڑ دیتا ہے اور تم دنیا میں اُسے بے بس نہیں بنا سکتے اور تمہارا اللہ کو چھوڑ کے نہ کوئی دوست ہے اور نہ مددگار''۔

اگر وحدت سیاق آیات قرآنی میں قابل لحاظ ہے تو اس پورے خطاب کو مشرکین سے متعلق ماننا چاہیے کہ جو مصائب اُنہیں پہنچ رہے ہیں، وہ اُن کے کرتوت نتیجہ ہیں مگر بعض مفسرین جو اکثر سیاق آیات پر بہت زور دیتے ہیں، یہاں شروع کے خطاب کو مومنین سے متعلق کرتے ہیں، اس لئے کہ اُس میں معافی کا اعلان ہے جو اُن کے نزدیک مشرکین سے کسی طرح متعلق نہیں ہو سکتے اور یہاں سے کہ ''تم دنیا میں اُسے بے بس نہیں بنا سکتے'' تخاطب مشرکین سے قرار دیتے ہیں۔[1] بظاہر ہمارے علامہ طبرسیؒ بھی اس سے متفق ہیں۔[2]

ہمارے نزدیک اس کی کوئی وجہ نہیں، اس لئے کہ عفو کے معنی مغفرت کے کیوں سمجھے جائیں کہ اس سے آخرت میں بھی پھر مواخذے کی نفی ہو جائے بلکہ چونکہ شروع میں دنیاوی مصیبت کا ذکر ہے تو عفو کے بس یہی معنی ہیں کہ بہت سے گناہوں کی سزا دنیا میں نہیں ملتی اُن کو آخرت پر اٹھا رکھا جاتا ہے۔ اس کا انطباق بلاشبہ مومنین سے زیادہ کفار و مشرکین پر ہے۔ اس طرح جیسے الفاظ قرآن دونوں آیتوں کے شروع سے آخر تک ایک ڈال ہیں، ویسے ہی معنی بھی ایک ڈال ہو جاتے ہیں اُن میں یہ تفریق نہیں ہوتی کہ پہلی آیت میں مخاطب مومنین ہوں اور دوسری میں مخاطب مشرکین ہوں جب کہ دونوں جگہ كُمْ كُمْ اور انتم کی ضمیریں ہیں جن کے معنی ہیں تم، تم ------ نہ پہلی آیت میں ''اے مومنو'' ہے، نہ

---

[1] ما اصابکم خطاب للمؤمنین ـــــ وما انتم یا مشرکین (جلالین)

[2] وما انتم یا معشر المشرکین (مجمع البیان)

دوسری آیت میں ''اے مشرکو''۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿٣٢﴾ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿٣٣﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴿٣٤﴾ وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿٣٥﴾

''اور اُس کی نشانیوں میں سے دریاؤں میں وہ بڑی بڑی کشتیاں ہیں جو مثل پہاڑوں کے دریا میں نظر آتی ہیں۔ اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کر دے تو وہ اُس کی سطح پر رکی رہ جائیں، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر برداشت کرنے والے کے لئے جو شکر گزار ہو یا چاہے تو وہ اُنہیں تباہ ہی کر دے اُن کے اعمال کے نتیجے میں اور بہت سی باتوں کو معاف کر دے اور اس لئے کہ وہ جو ہماری نشانیوں کے بارے میں تکرار کرتے ہیں، جانیں کہ اُن کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے''۔

ان آیات کے دوران میں پھر معافی کا بیان ہے مگر یہاں معافی کو خاص مومنین سے متعلق نہیں کیا جاتا بلکہ اُس کا مطلب یہی لیا جاتا ہے کہ ہنگامی سزا کہ بداعمالی کے نتیجے میں غرق کر دے، کبھی دے دی جاتی ہے مگر اکثر یہ وقتی سزا نہیں دی جاتی۔[1] یہ مزید شاہد ہے اس کا کہ قبل کی آیتوں میں بھی خطاب خاص مومنین سے نہیں ہے اور معافی سے مراد یہی ہے کہ دنیا میں اُس کی سزا نہیں دی جاتی۔

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٣٩﴾ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٠﴾

''اور جو چیز تمہیں ملتی ہے، وہ اس زندگی دنیا کا سرمایہ ہے اور جو کچھ اللہ کے یہاں ہے، وہ اچھا اور زیادہ پائیدار ہے اُن کے لئے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے ہیں، اور وہ جو بڑے گناہوں اور شرمناک

---

[1] یعفو اعن کثیر اخبار منہ تعالیٰ انّہ یعفو عن معاصیہم لا یعاجلہم اللہ بعقوبتہا (تبیان)

کاموں سے پرہیز رکھتے ہیں اور جب اُنہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں اور جنہوں نے اپنے پروردگار کے فرمان کو مانا ہے اور نماز کے پابند رہے ہیں اور اُن کے معاملات ان کے درمیان باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں اور جو اُس میں سے ہم نے اُنہیں دیا ہے، خیرات کرتے ہیں اور وہ جو بدلا لیتے ہیں جب اُن پر ناحق کوئی زیادتی کرے اور برائی کا بدلا تو ویسی ہی برائی ہے مگر جو معاف کر دے اور تعلقات اچھے رکھے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہے بلاشبہ وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا''۔

علمائے جمہور نظام حکومت میں شوریٰ کی بنیاد اس آیت پر قائم کرتے ہیں حالانکہ اس کے پہلے فرمان الٰہی کو تسلیم کرنے کا ذکر موجود ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ شوریٰ ایسے ہی دینوی امور میں ہے جہاں فرمان الٰہی کوئی موجود نہیں ہے جیسا کہ دوسری جگہ اس کے پہلے یہ ارشاد الٰہی آچکا ہے کہ:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ

کسی مسلمان مرد اور مسلمان عورت کے لئے یہ نہیں کہ جب اللہ اور اُس کا رسولؐ کوئی فیصلہ کر دے تو انہیں اپنے معاملے میں اختیار ہو۔(احزاب۔۳۶) جب فیصلہ خالق کے سامنے اختیار کی مطلق نفی ہوگئی تو نہ ایک ایک فرد کو اختیار ہے نہ مجموع امت کو لہٰذا نص کے مقابلے میں نہ اجماع درست ہے اور نہ شوریٰ۔ اس جملے کے بعد کہ ''بدلا لیتے ہیں جب اُن پر ناحق کوئی ظلم وتعدی کرے'' فوراً بلا فاصلہ یہ کہنا کہ ''برائی کا بدلا تو ویسی ہی برائی ہے مگر جو معاف کر دے اور تعلقات خوشگوار بنالے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہے، صاف بتا رہا ہے کہ پہلے جو بدلا لینے کا ذکر ہے، وہ بطور پابندی نہیں ہے بلکہ اجازت کے طور پر ہے کہ اگر چاہے تو بدلا لے۔[1] مگر معاف کر دے تو بہت اچھا ہے۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾

''اور جو اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلا لے تو یہ لوگ وہ ہیں جن پر کوئی الزام نہیں ہے، الزام تو اُن پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق دنیا میں ستم ڈھاتے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے، بے شک وہ جو صبر سے کام لے اور بخش دے تو یہ بڑی ہمت کا کام ہے''۔

ان آیات میں مجموعی طور پر اسلامی دستور کے اُسی نقطہ اعتدال کا بتا دیا گیا ہے کہ قصاص کا قانون ضرور ہے مگر اس قانون میں قصاص کا حق دیا گیا ہے۔ اُسے فرض قرار نہیں دیا گیا ہے، قصاص نہ لیتے ہوئے معاف کر دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ اللہ کے نزدیک خاص فضیلت کا درجہ رکھتا ہے جس کی مدح یہاں یوں کی گئی ہے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے تو جو اس طرح کرے وہ جیسے اللہ کی طرف سے ''شاباشی'' کا مستحق ہے جس کا لازمی

---

[1] ھی الرخصة التی صاحبھا فیھا بالخیار ان شآء فعل وان شاء ترك (علی بن ابراھیم)

نتیجہ یہ ہے کہ اُسے اس معاف کرنے کا بڑا اجر ملے گا۔[1] مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ کے دوسرے معنی جنہیں علامہ طبرسیؒ نے اختیار کیا ہے، یہ ہیں کہ یہ دائمی اللہ کا حکم ہے جو قابل منسوخ نہیں۔[2] میرے نزدیک پہلے مفہوم کو زیادہ قوت ہے، اس لئے میں نے اُس کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۴﴾ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۶﴾

''اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے تو اُس کا اُس کے بعد کوئی مددگار نہیں اور ظالموں کو دیکھو گے جب اُنہوں نے عذاب کو دیکھا ہوگا تو وہ کہیں گے کہ کیا واپسی کا بھی کوئی راستہ ہے؟ اور تم انہیں دیکھو گے کہ وہ دوزخ کی طرف لائے جائیں گے سر جھکائے ہوئے، ذلت کے عالم میں کنکھیوں سے دیکھتے ہوں گے اور کہیں گے وہ جو ایمان لائے کہ گھاٹا اٹھانے والے بڑے وہ ہیں جو خود اپنے کو اور اپنے عزیز واقارب کو قیامت میں گھاٹا پہنچائیں معلوم ہونا چاہیے کہ ظالم لوگ برقرار رہنے والے عذاب میں ہیں اور اُن کے کوئی دوست نہیں ہیں جو اُن کی مدد کریں اللہ کو چھوڑ کر اور جسے اللہ گمراہی میں چھوڑ دے، اُس کے لئے کوئی راستہ نہیں''۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾

''اپنے پروردگار کے فرمان کو قبول کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جسے اللہ کی طرف سے پھر پلٹنا نہیں ہے، تمہارے لئے اُس دن کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور نہ تمہارے لئے انکار کی کوئی گنجائش ہوگی''۔

نکیر کا ترجمہ ''انکار کی گنجائش'' ایک تشریح کے مطابق ہے۔[3] اس کے ساتھ یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ اس نوعیت عذاب سے انکار

---

[1] عزم الامور ھو الاخذ باعلاھا فی باب نیل الثّواب والاجر و احتمال الشدائد علی النّفس و ایثار رضا اللہ علی ما ھو مباح (تبیان)

[2] ای من ثابت الامور الّتی امر اللہ تعالیٰ بھا فلم ینسخ (مجمع البیان)

[3] انکار لذنوبکم (جلالین) نہیں واسطے تمہارے انکار (شاہ رفیع الدین)

کر کے اُس میں تبدیلی کرانا ممکن نہ ہوگا۔[1] دوسری تشریح یہ ہے کہ انکار کے معنی ''اعتراض'' کے ہیں، اس طرح مطلب یہ ہوگا کہ کوئی ایسا نہ ہوگا جو اس پر اعتراض کر سکے۔[2]

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿۴۸﴾

''تو وہ اگر روگردانی کریں تو ہم نے آپ کو اُن کا نگہبان مقرر کر کے نہیں بھیجا ہے، آپ کے ذمے نہیں ہے سوا تبلیغ کر دینے کے اور ہم جب آدمی کو اپنی طرف سے کچھ رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اُس پر خوش ہو جاتا ہے اور اگر اُنہیں کوئی برائی پہنچتی ہے اُن اعمال کی بدولت جو اُنہوں نے کیے ہیں تو بلاشبہ یہ آدمی ناشکرا ثابت ہوتا ہے''۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

''اللہ کے لئے سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی، پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے عطا کرتا ہے یا لڑکے اور لڑکیاں دونوں قسمیں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے یقیناً وہ بڑا جاننے والا ہے ہر طرح کی قدرت رکھنے والا''۔

''جاننے والا ہے'' مصالح کا اور ''قدرت رکھنے والا ہے'' اُن کے تقاضوں کے مطابق عمل پر۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾

''اور کسی آدمی کے لئے یہ بات حاصل نہیں کہ اللہ اُس سے بات کرے مگر بطور وحی یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیجے تو وہ اُس کے حکم سے جو چاہے وحی پہنچائے، یقیناً وہ بلندی والا ہے، صحیح کام کرنے والا''۔

آخر میں فرشتوں کو بھیج کر وحی کا تذکرہ کرنا اس کا ثبوت ہے کہ پہلے جو وحی کا تذکرہ آیا ہے، وہ وحی بغیر توسط ملک ہے جیسی وحی معراج میں ہمارے رسولؐ پر ہوئی جس کا صرف اجمالی تذکرہ قرآن میں یوں ہے کہ:۔

---

[1] ای انکارو تغییر للعذاب (مجمع البیان)

[2] قیل معناہ من نصیر ینکر ما یحلّ بکم (تبیان)

فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی ﴿۱۰﴾ (سورۂ نجم)

اُس نے اپنے بندہ خاص پر وحی کردی جو اُسے کرنا تھی۔ اور اس سے یہ بھی ظاہر کرنا کہ ہر وحی خداوندی جو رسولؐ پر ہوئی، وہ قرآن میں نہیں ہے، اس وحی کی ترجمانی اکثر بیان پیغمبرؐ سے ہوئی ہے جو جز سنت ہے اور جہاں حالات خود رسولؐ کے لئے اظہار کے متقاضی نہ تھے، وہ آپ نے اپنے ورثہ داران علم کے سپرد کردیے جو ائمہ معصومینؑ ہیں اور وہ آپ کے بعد وقتاً فوقتاً اُس کا اظہار فرماتے رہے اور اس طرح سنت رسولؐ اور ان رہنمایان دین کے اقوال کو احکام شرعیہ میں ماخذ بنائے بغیر صرف قرآن کو کافی سمجھ لینا کسی طرح درست نہیں ہے۔

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۲﴾ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَی اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف بھیجی بصورت وحی اپنے فرمان کی ایک روح، آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کس کا نام ہے مگر ہم نے اسے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم ہدایت کرتے ہیں جسے چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے اور بلاشبہ آپ رہنمائی کرتے ہیں سیدھے راستے کی طرف، اللہ کے راستے کی طرف جس کی مخصوص ملکیت ہے سب کچھ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے تمام معاملات کو''۔

حضرت پیغمبر خداؐ کے حکم کا بفیضِ الٰہی ہونا

ذات ممکن کا کوئی کمال اپنا نہیں ہے بلکہ عطیہ پروردگار ہے، اب صلاحیت ظرف کو دیکھتے ہوئے اس کی عطا ہے کہ کس کو کتنا دیتا ہے اور اُس کا زیادہ عطا کرنا خود وسعت ظرف کی دلیل ہے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُس نے وہ علم عطا فرمایا جو اولین و آخرین میں کسی کو نہیں دیا، یہ اُس کا عطا فرمانا، اُن کے کمال صفائے جوہر کا ثبوت ہے جس کے لئے نور کے سوا لغت میں کوئی دوسرا لفظ موزوں نہیں ہے مگر اُس نور پر جو بارش کرم پروردگار ہو اُس کا مرکز بہرحال فیاض مطلق ہے ورنہ باعتبار ذات جب وجود اپنا نہیں تو کون کمال اپنا ہوسکتا ہے۔

بس یہی وہ ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ'' آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کس کا نام ہے''؟ لیکن اس سے باعتبار ظرف زمان کسی دورِ حیات کو مقرر کرکے یہ سمجھنا کہ چالیس برس کی عمر کے پہلے معاذ اللہ آپ کتاب الٰہی اور ایمان سے کوئی واقفیت نہیں رکھتے تھے، ناروا جسارت ہی نہیں بلکہ حقیقت واقعہ کے خلاف ہے۔ جب کہ سابق دور کا ایک رسول گہوارے میں کہہ رہا ہے کہ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴿۳۰﴾ (سورۂ مریم) تو خاتم الانبیاء کے بارے میں یہ تصور کہاں صحیح ہوسکتا ہے کہ وہ نزول قرآن سے پہلے کتاب الٰہی اور ایمان کسی بات سے واقف نہ تھے لیکن وہ کتاب لفظی نہیں ہے بلکہ وہ آئین حیات ہے جس کا علم نبی کو ثبوت کے ساتھ بدو فطرت سے ہوتا ہے۔

سُوْرَۃُ الزُّخْرُفِ

مکّیہ ----۸۹---- آیات

اثنائے سورہ میں ایک جگہ زُخرُفا کا لفظ آیا ہے، اُس پر اس سورے کا نام ہوگیا۔

سورۂ زخرف کے خاص خاص مضامین:

۱۔ وہ لوح محفوظ میں علی حکیم ہے جو ایک خاص شخصیت کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے۔

۲۔ نعم الٰہیہ کے ذیل میں اُن حیوانات کے ذکر میں جو انسان کی سواری کے کام میں آتے ہیں، تعلیم کہ جب اُن کی پشت پر سوار ہوتو یوں کہو۔

۳۔ بیٹی کی پیدائش پر اہل جاہلیت کی کیفیت اور پھر خدا کے لئے بیٹیاں تجویز کرنے کی حماقت۔

۴۔ ملائکہ کے صنف اناث میں ہونے کی رد۔

۵۔ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں اُن کے پیغام توحید کا ''کلمہ باقیہ'' کی صورت میں محفوظ ہونا اور برقرار رہنا۔

۶۔ مخالفین پیغمبر اسلامؐ کا یہ کہنا کہ قرآن کسی بڑے آدمیوں پر کیوں نہیں اُترا اور اُس کا جواب۔

۷۔ اموالِ دنیا کی پستی وحقارت۔

۸۔ فرعون کا اپنی سلطنت اور دولت کو معیار حقانیت قرار دینا، اور اُس کی غلطی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۳﴾ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۴﴾

''حا۔میم۔ قسم اس روشن کتاب کی ہم نے اس کو عربی زبان والا قرآن بنایا ہے، شاید کہ تم عقل سے کام لو، بلاشبہ وہ اصل نوشتے میں ہمارے یہاں بلند مرتبہ ہے، حکمت والا''۔

حضرت علیؑ کا اسم با مسمّٰی ہونا

سیاق کلام کی بنا پر ترتیب آیات کو دیکھتے ہوئے مفسرین جمہور ہی نہیں بلکہ ہمارے بھی کچھ مفسرین نے اس ضمیر کو کہ وہ علی حکیم ''بلند مرتبے والا ہے، حکمت والا'' قرآن ہی کی طرف راجع کیا ہے اور اُم الکتاب ''اصل نوشتے'' سے مراد لوح محفوظ قرار دی ہے۔[1] حالانکہ اُنہیں یہ اقرار ہے کہ یہ ایک مجازی تصرف کے ساتھ ہے کیوں کہ یہ دونوں وصف علی اور حکیم عموماً کسی ذی حیات ہستی کے ہوتے ہیں۔[2] ایک بات یہ ہے کہ قرآن کی توصیف میں خود قرآن کی قسم کے کیا معنی؟ مگر اس کی شاہ ولی اللہ نے ایک لطیف انداز میں یوں توجیہ کی ہے۔

قسم خوردن بچیزی برای اثبات ہماں چیز یا لازم آن چیز کنائیست بآنکہ آن چیز خود دلیل خود است چنانکہ گویند قسم بلب میگون و زلف شبگونِ توکہ تو معشوق دل آرامی (فتح الرحمٰن)

کسی چیز کی قسم خود اُس چیز یا اُس کے کسی لازمے کے ثبوت کے لئے اشارہ ہوتا ہے اس طرح کہ وہ چیز خود اپنی دلیل ہے جیسے کہا جائے کہ تمہارے سرخ لبوں اور سیاہ زلفوں کی قسم کہ تم دلربا معشوق ہو۔

پھر بھی الفاظ آیت سے بلاشبہ ذہن مڑتا ہے ایک ایسی ذات کی طرف جو اسم با مسمی علی ہے اور علم و حکمت کا خزانہ دار ہونے کی وجہ سے حکیم بھی ہے ہماری قدیم تفسیر اسی کے موافق ہے۔[3]

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۝۵

''تو کیا ہم تمہاری طرف سے بالکل چشم پوشی کر لیں اس سے کہ تم حد سے تجاوز کرنے والے لوگ رہے ہو''۔

یعنی تم جو چاہے کرو، ہم تمہاری ہدایت سے ہاتھ تو نہیں اٹھا سکتے، ہدایت کا سامان کرتے رہنا اور پیغمبروں کا بھیجنا تو ہمارے لئے ضروری ہے۔[4] اور یہ ایک تہدیدی خطاب بھی ہوسکتا ہے کہ کیا تمہاری زیادتیوں پر ہم چشم پوشی ہی کرتے رہیں اور تمہیں اس کی سزا نہ ملے؟[5]

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝۶ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۷ فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۸

''اور کتنے ہی پیغمبر ہم نے بھیجے پہلے والے لوگوں میں اور نہیں آتا تھا کوئی پیغمبر اُن لوگوں کے پاس مگر یہ کہ وہ اُس کا مذاق اڑاتے تھے تو ہم نے ہلاک کر دیا اُنہیں جو طاقت میں اُس سے زیادہ تھے اور پہلے لوگوں کی مثال سامنے گزر ہی چکی ہے''۔

---

[1] انّہ مثبت فی امّ الکتاب ___ لعلیّ علی الکتب قبلہ حکیم ذو حکمۃ بالغۃ (جلالین)

[2] وصف اللہ تعالیٰ القرآن بہاتین الصفتین علی سبیل التّوسّع لانہما من صفات الحیّ (مجمع البیان)

[3] یعنی امیر المؤمنین (علی بن ابراہیم)

[4] افنترک عنکم الوحی صفحا فلا تامرکم ولا تنہاکم ولا نرسل الیکم رسولا (مجمع البیان)

[5] المعنی افنضرب ذکر الانتقام منکم والعقوبۃ لکم (تبیان)

اس کا بظاہر گذشتہ آیات سے ربط ہے یعنی ہمیشہ پیغمبروں کا مذاق اُڑایا گیا اور طرح طرح کی بدسلوکیاں کی گئیں مگر اس کی وجہ سے ہم نے پیغمبروں کا بھیجنا ترک تھوڑی کر دیا تو اب کیوں کر پیغمبر نہ بھیجتے [1] یا گذشتہ امتوں کو برابر مبتلائے عذاب کرتے رہے تو تم کہاں بچ سکتے ہو؟

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۙ﴿۹﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۙ﴿۱۰﴾ وَالَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَالَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ۙ﴿۱۲﴾ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ ۙ﴿۱۳﴾ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اور اگر ان سے پوچھیے کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ کہیں گے کہ اُنہیں پیدا کیا اُس زبردست نے جو علم والا ہے، جس نے قرار دیا تمہارے لئے زمین کو گہوارہ استراحت اور قرار دیئے تمہارے لئے اُس میں راستے شاید کہ تم منزل تک پہنچ جاؤ اور جس نے اتارا آسمان سے پانی ایک خاص مقدار مقرر میں تو ہم نے اُس سے بے جان زمین میں زندگی پیدا کی اسی طرح تم لوگ بھی باہر نکلو گے اور جس نے تمام قسم کی چیزوں کو پیدا کیا اور تمہارے لئے کشتیوں اور چوپایوں میں سے وہ چیزیں پیدا کیں جن پر تم سوار ہوتے ہو تا کہ تم اُن کی پشت پر بیٹھ کر اپنے پروردگار کے احسان کو یاد کرو جب تم اُس پر بیٹھو اور کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اسے ہمارے قبضے میں کیا اور ہمارے اپنے بس میں نہ تھا اور بلاشبہ ہمیں اپنے پروردگار کی طرف پلٹ کر جانا ہے''۔

یہ پوچھنے پر کہ آسمان وزمین کو کس نے پیدا کیا اُن کا جواب تو مجملاً یہ ہوگا کہ اللہ نے .....اس کے بعد اللہ کے جو اوصاف ہیں، وہ سب خالق نے خود ارشاد فرمائے ہیں۔ اس لئے اس ذیل میں ہے کہ ''ہم نے اُس سے بے جان زمین میں زندگی عطا کی .....اسی طرح تم بھی باہر نکلو گے'' یعنی دوبارہ زندہ ہو کر قبروں سے برآمد ہو گے۔ یہ سب وہ تھوڑی کہیں گے، اگر یہ سب وہ کہہ دیں تو مبدأ و معاد سب ہی کا اقرار نہ ہو جائے پھر اختلاف ہی کیا رہ جائے؟

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ۧ﴿۱۵﴾

''اور اُنہوں نے اُس کا ایک جز اُس کے بندوں میں سے قرار دیا، یقیناً انسان بڑا کھلا ہوا ناشکرا ہے''۔

---

[1] فلم نضرب عنهم صفحا لاستهزائهم برسلهم بل كرّرنا الحجيج واعدنا الرسل (مجمع البيان)

''جز'' سے مراد یہاں اولاد ہے۔[1] اور اس لفظ کے اطلاق میں نفی ولد کی دلیل عقلی کی طرف اشارہ ہے کہ خدا ناقابل تقسیم ہے لہٰذا اُس کے اولاد جو اُس کے ایک جز کی حیثیت رکھتی ہے، کیوں کر ہو سکتی ہے؟

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿١٦﴾ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿١٧﴾ اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿١٨﴾

''کیا اُس نے اُن چیزوں میں سے جنہیں اُس نے پیدا کیا ہے، اپنے لئے بیٹیاں قرار دی ہیں اور تمہیں بیٹیوں سے نوازا ہے؟ اور اُن میں سے جب کسی کو خوش خبری دی جاتی ہے اُس کی جسے وہ خدا کے لئے وصف قرار دیتا ہے تو اُس کے چہرے کا رنگ اُڑ جاتا ہے اور وہ رنج و غم سے سناٹے میں ہو جاتا ہے، یا وہ جسے گہنے پہنا کر پالا جاتا ہے اور وہ بحث میں قوت گویائی سے خالی ہے''؟

اللہ کے لئے نفی اولاد کی دلیل

خداوند عالم تو ہر قسم کی اولاد سے بری ہے مگر اس میں مشرکین کی ذہنیت کے اس مضحکہ خیز پہلو کا اظہار ہے کہ وہ جسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، اُسے خاص طور پر اللہ کے لئے وصف قرار دیتے ہیں یعنی ان کے یہاں بیٹیاں ہوں تو بری مگر خدا کے لئے وہ اسے صحیح سمجھتے ہیں کہ فرشتے اُس کی بیٹیاں ہیں۔ دوسری جگہ اس ذہنیت کی دوسرے طریقے سے رد کی گئی ہے یہاں اُس کی رکاکت کے ایک پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔

آخری جملہ چونکہ اُن کی غلط ذہنیت کے بیان سے متصل ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ اُس میں اُنہی کے تصور یا اُس وقت کے معاشرے کا اظہار ہو، اس لئے اُس کی کوئی لازوال حیثیت نہ مانی جائے۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴿١٩﴾

''اور اُنہوں نے فرشتوں کو جو اللہ کے بندے ہیں، عورت قرار دے دیا ہے، کیا وہ اُن کی پیدائش کے وقت موجود تھے؟ ان کی یہ گواہی قلم بند رہے گی اور اُن سے جواب طلبی ہوگی''۔

ملائکہ کے صنف اناث میں ہونے کی رد

یہ اُن کی رد کا تیسرا رخ ہے پہلے تو دلیل عقلی کی طرف اشارہ ہوا تھا کہ اولاد اپنے ماں باپ کا ایک جز ہوتی ہے تو ان کا اللہ کے لئے اولاد کو

---

[1] اولاد را (شاہ ولی اللہ) ایک جز یعنی اولاد (شاہ رفیع الدین) لانّ الولد جزء الوالد (جلالین) قالت قریش ان الملئکة هم بنات الله (علی بن ابراهیم)

تجویز کرنا، اُس کے لئے اجزاء کو ثابت کرنا ہے جو ناممکن ہے یہ دلیل بیٹے اور بیٹی کی تفریق کے بغیر ہر قسم کی اولاد کی نفی کے لئے ہے۔

دوسرا رخ یہ تھا کہ ان کی یہ عجیب بات ہے کہ اپنے لئے لڑکی کو برا سمجھتے ہیں مگر خدا کے لئے لڑکیاں تجویز کرتے ہیں۔

اب تیسری بات یہ ہے کہ قطع نظر اللہ کی طرف انتساب کے خود اپنی جگہ فرشتوں کو اُنہوں نے صنف اناث میں کیوں کر سمجھ لیا ہے؟ یہ بھی ایک طرح کا بہتان اور اس لئے جرم ہے جس کی ان سے جواب طلبی ہوگی۔

لطف یہ ہے کہ جس طرح کی طبع زاد بات اُن مشرکین کی تھی، اُس کی رد کرتے ہوئے بالکل ویسی ہی بات شاہ عبدالقادر نے لکھ دی ہے فرماتے ہیں: ''یہ جو فرمایا کہ بندے رحمان کے ہیں یعنی بیٹیاں نہیں، ورنہ معلوم ہے کہ فرشتے، اگرچہ نہ مرد نہ عورت۔ پر بولی مردانی بولتے ہیں''۔ (موضح القرآن)

اس پر وہی قرآنی سوال عائد ہوتا ہے کہ کیا وہ فرشتوں کی پیدائش کے وقت موجود تھے؟

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۲۰﴾

''اور انہوں نے کہا کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے، اُنہیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ بس اٹکل پچو بات کرتے ہیں''۔

ان کا استدلال نظامِ جبر کے تصور پر مبنی ہے خالق نے اُن کے اس قول کو جہالت کا نتیجہ قرار دیا ہے، یہ چیز کہ انسانی افعال جبر و اختیار کے درمیان کی ایک منزل میں ہیں، اُن کے مبلغ کے حدود سے باہر تھی لیکن یہ تو اس آیت سے ظاہر ہی ہے کہ اُن کے اس تصور کو کہ ہمارا فعل اللہ کی مشیت پر مبنی ہے، خدا نے جہالت قرار دیا ہے مگر علمائے جمہور جنہوں نے افعال انسانی کو مخلوق الٰہی قرار دیا اور اس طرح وہ واقعی مشیت الٰہی کو انسانی عمل کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، یہاں مشکل میں ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''یہ تو سچ ہے کہ بے چاہے خدا کے کوئی چیز نہیں، پر اُس کا بہتر ہونا نہیں نکلتا'' (موضح القرآن)

حالانکہ مشرکین کے قول میں بہتر ہونے نہ ہونے کا تو ذکر ہی نہیں تھا، اُنہوں نے بس یہی کہا کہ بے خدا کے چاہے ہمارا شرک وقوع میں نہیں آسکتا تھا، اسی کو آپ فرما رہے ہیں کہ یہ سچ ہے مگر قرآن نے اُسے بے علمی کا نتیجہ کہا اور اتنا نہیں بلکہ اللہ اُنہیں اُٹکل پچو باتیں کہنے والے کہہ رہا ہے۔ اب کسی کا اُن کی بات کو سچ کہنا قرآن کو معاذ اللہ غلط کہنا نہیں تو کیا ہے؟

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا

بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴿۲۵﴾

''کیا ہم نے اُنہیں اس کے پہلے کوئی کتاب دی تھی کہ وہ اُس سے وابستہ ہوں؟ بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر دیکھا ہے اور ہم اُنہی کے نقش قدم پر چل کے منزل تک پہنچیں گے اور اسی طرح ہم نے آپ کے پہلے کسی بستی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر دیکھا ہے اور ہم اُنہی کے نقشِ قدم کی پیروی کرتے رہیں گے، کہئے کہ چاہے میں لایا ہوں تمہارے پاس اُس سے جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے زیادہ صحیح چیز؟ اُنہوں نے کہا اُس پیغام کو جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو نہیں مانتے تو ہم نے اُن سے بدلا لیا تو دیکھو کہ کیسا انجام ہوا اُن جھٹلانے والوں کا''۔

ان آیات میں آباء واجداد کی تقلید کو قابل مذمت گردانا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ﴿۲۶﴾ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ﴿۲۷﴾ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴿۲۸﴾ بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ﴿۲۹﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ﴿۳۰﴾

''اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم والوں سے کہا کہ میں اُس سے جس کی تم عبادت کرتے ہو بے تعلق ہوں سوا اُس کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے کہ وہی مجھے منزل مقصد تک پہنچانے والا ہوگا اور اُس کو بنایا اُس نے ایسا کلمہ جو اس کی نسل میں باقی رہنے والا ہے شاید کہ وہ پھر واپس ہوں بلکہ میں نے عیش وآرام اُٹھانے کا موقع دیا اُن کے باپ دادا کو یہاں تک کہ اُن کے پاس حق آیا، اور کھلی ہوئی ہدایت کرنے والا پیغمبر تو جب اُن کے پاس حق آیا، اُنہوں نے کہا یہ جادو ہے اور ہم اُسے نہیں مانتے''۔

کلمۃ باقیہ منصب امامیت

عام طور پر مفسرین كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ اُس نے اس کلمہ توحید کو اُن کی نسل میں باقی رکھا۔[1] لیکن ہمارے یہاں کی ایک حدیث میں کلمة باقية کے معنی منصب امامت بتائے گئے ہیں جو نسل ابراہیمؑ میں قیامت تک باقی رہے گا۔[2]

---

[1] ای کلمة التوحید (جلالین) ساخت خدا تعالیٰ کلمۂ توحید (شاہ ولی اللہ)

[2] ھی الامامة الی یوم الدّین عن ابی عبداللہ (مجمع البیان)

اکابر اہل سنت میں سے بعض مفسرین نے ذریت ابراہیمی کے تحت میں آل محمد علیہم السلام کا نام لیا ہے اور بعض نے صراحت کی ہے ''قیامت تک''[1] جس کے معنی یہ ہیں کہ اس سلسلہ کی ایک فرد خاص آخر دورِ زمانہ تک باقی رہے گی۔

ہماری قدیم تفسیر میں باقی رہنے والے کلمے کا مطلب بتایا گیا ہے سلسلہ معصومینؑ اور ''پھر واپس ہوں'' یعنی اس دنیا سے اُٹھنے کے بعد اُن کی دوبارہ رجعت ہو۔[2] جس کا ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے متواتر احادیث نے پتہ دیا ہے، بے شک اُس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ یہ آیت اس سیاق کلام کا جز نہیں ہے جس کے ماننے میں کوئی خرابی نہیں ہے جب کہ اُس کی متعدد نظیریں قرآن مجید میں موجود ہیں۔

یوں عام مفسرین ''شاید کہ وہ پھر واپس ہوں'' اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہ کافر جو مکہ والے ہیں، اس توحید کے سبق کو جسے بھول گئے ہیں یاد کر کے دوبارہ اس راستے پر آجائیں۔[3]

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿٣١﴾ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿٣٢﴾

''اور اُنہوں نے کہا کہ یہ قرآن ان دونوں بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اُتارا گیا؟ کیا وہ لوگ تمہارے پروردگار کی رحمت کا بٹوارا کریں گے؟ ہم نے اُن کے درمیان اِس دینوی زندگی میں اُن کے اسباب معاش تقسیم کر دیئے ہیں اور ایک کو دوسرے سے کئی کئی درجے بلندی دی ہے تا کہ ایک دوسرے کو اپنے قبضے میں لا کر کام لے اور تمہارے پروردگار کی رحمت بہتر ہے اُس مال و دولت سے جو یہ جمع کرتے ہیں''۔

اُن کا کہنا کہ ''یہ قرآن اِن دونوں بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ اُتارا گیا'' اس میں تمام مفسرین متفق ہیں کہ ''دونوں بستیوں'' سے مراد مکہ اور طائف ہیں کہ یہاں کے لوگ دولت مند تھے۔[4] اور یہ محاورہ زمانہ جاہلیت سے چل رہا تھا جو آج تک جاری ہے کہ دولت مندوں کو بڑا آدمی کہا جاتا ہے۔

خالق نے اُن کی بات کا جواب دیا ہے، وہ یہ ہے کہ رسالت و نبوت کا تعلق نفس کی بلندی سے ہے، وہ ہر کس و ناکس کو نہیں مل سکتی اور یہ دینوی مال و دولت اِس دنیا میں ہر ایک کو زیادہ سے زیادہ مل سکتی ہے، یہ پیش خدا رفعت مرتبہ کا ثبوت نہیں ہے۔ نہ اس سے نبوت و رسالت کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔

---

[1] قال السّدّی فی اٰل محمّد علیہم السلام وقال الحسن عقبہ ولدہ الی یوم القیٰمۃ (تبیان)

[2] یعنی لعلّھم یرجعون ای الائمّۃ الی الدّنیا (علی بن ابراھیم)

[3] لعلّھم اھل مکّۃ (جلالین) تا بود کہ کافران رجوع کنند (شاہ ولی اللہ)

[4] ۔القریتین مکّۃ والطائف (علی بن ابراھیم) یعنی یکی از متمولان مکّہ و طائف (فتح الرحمن)

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ''اللہ نے روزی دنیا کی تو ان کی تجویز پر نہیں بانٹی۔ پیغمبری کیوں کر دے ان کی تجویز پر'' (موضح القرآن)
کاش اُسی اصول کو یہ حضرات پیغمبرِ خدا کی جانشینی کے لئے بھی پیش نظر رکھیں۔

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَزُخْرُفًا ؕ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾

''اور اگر یہ نتیجہ نہ ہوتا کہ سب ایک ہی طرح کے ہو جائیں تو جو اللہ کے منکر ہیں، ہم اُن کے گھروں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے اور زینے بھی جن پر وہ چڑھتے اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت جن پر وہ گاؤ سے لگے بیٹھے ہوتے اور طرح طرح کی آرائشیں اور یہ سب ہوتا مگر اسی دنیا کا ساز و سامان اور آخرت تمہارے پروردگار کے یہاں پرہیزگاروں کے لئے ہے''۔

اموال دنیا کی پستی وحقارت:

یعنی دولت و اسباب دنیا کی بے وقعتی تو اللہ کے نزدیک ایسی ہے کہ وہ کافروں کو زیادہ سے زیادہ یہ چیزیں عطا کر دیتا اور کوئی کافر پریشان حال ہی نظر نہ آتا مگر اس میں ایک اجتماعی مضرت یہ تھی کہ پھر عامہ خلائق جو اتنے بلند نظر نہیں ہوتے کہ حق کو حق ہونے کی بنا پر اختیار کریں اندھا دھند کفر کو اس لئے اختیار کرتے کہ وہ آرام دنیا کا ضامن ہے، پھر تقریباً کوئی ایمان کے راستے پر نہ آتا اس لئے حکمت الٰہی اس کی متقاضی ہوئی کہ کبھی کبھی کفار بھی پریشان حال نظر آئیں اور اہل ایمان بھی کبھی دولت مند نظر آئیں تاکہ کفر یقینی طور پر دینوی کامیابی کا ضامن نہ سمجھا جائے اور دنیا کو پھر بھی یہ احساس رہے کہ دولت عطا کرنے والا اصل میں خداوند عالم ہے لہٰذا یہ نہیں ہے کہ اگر ایمان لے آئیں تو لازماً دولت سے محروم ہو جائیں۔

ہماری قدیم تفسیر میں حدیث معصوم بھی اِسی مفہوم کے مطابق ہے۔[1] اور صدر اول کے عام مفسرین کے اقوال بھی اسی محور پر گردش کرتے ہیں۔[2]

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَاِنَّهُمْ

---

[1] قال الصّادق علیه السلام لرفعل الله ذٰلك لمّا امن احدولكنّه جعل فی المؤمنین اغنیاء وفی الكافرین فقرآء وجعل فی الكافرین اغنیآء وفی المؤمنین فقراء ثم امنحنهم بالامر والنّهی والصّبر والرضاء (علی بن ابراهیم)

[2] ای لولا ان یجتمع الناس علی الكفر فیكونو اكلّهم كفّار اعلیٰ دین واحد لیلهم الی الدّنیا وحرصهم علیها عن ابن عباس والحسن وقتادة والسّدی (مجمع البیان)

لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور جو خدا کی یاد سے اندھا رہتا ہے، اُس پر ہم ایک شیطان حاوی کر دیتے ہیں تو وہ اُس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور وہ اُنہیں راہ راست سے ہٹاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ صحیح راستے پر ہیں یہاں تک کہ جب وہ ہمارے پاس آتا ہے تو کہتا ہے کہ کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق اور مغرب کا فاصلہ ہوتا کہ کتنا برا ساتھی ہے اور اب تم لوگوں کو آج ہرگز کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اس سے کہ تم سب عذاب میں شریک ہو''۔

آیت سے ظاہر ہے کہ شیطان کا سزاوں ہونا جو کنایہ ہے سلب توفیقات سے یہ یاد الٰہی سے اندھے رہنے کا نتیجہ ہے۔[1] اس لئے یہ اندھا رہنا اُس شیطان کے سبب سے نہیں ہے۔ پھر شیطان کے سزاوں ہونے کے بعد بھی یہ شخص اُس کی فرمان برداری میں مجبور محض نہیں ہے بلکہ جب اپنی قوت ارادی سے کام لے تو اُس کی مخالفت کر سکتا ہے، اس لئے وہ سزا کا مستوجب ہے اور عذاب میں وہ شیطان اور یہ آدمی دونوں شریک ہیں۔ شیطان کا شریک عذاب ہونا اِس کا ثبوت ہے کہ اُس شیطان کو اللہ نے اس پر مامور نہیں کیا تھا بلکہ سزاول کرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اُس کی شیطنت میں سدراہ نہیں ہوا اور اُسے گمراہ کرنے اور اسے گمراہ ہونے دیا۔

پھر اس شرکت سے کسی کا عذاب ہلکا نہیں ہوتا کہ اس کو ایک طرح کا فائدہ سمجھا جائے۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِى الْعُمْىَ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿۴۱﴾ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۳﴾ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾

''تو کیا آپ بہروں کو آواز سنائیے گا یا اندھوں کو راستہ دکھائیے گا اور اُنہیں جو کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں تو اگر آپ کو ہم لے بھی جائیں تو ہم اُن سے بدلا ضرور لیں گے یا آپ ہی کو ہم دکھا دیں گے جو ہم نے اُن کو اِطلاع دی ہے اور ہم اُن کے مقابلے میں پوری قوت رکھتے ہیں تو آپ مضبوطی کے ساتھ وابستہ رہئے اُس سے جو ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی ہے، بلاشبہ آپ سیدھے راستے پر ہیں اور یقیناً یہ اعزاز ہے آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے اور

---

[1] قال الحسن وھو خذلان عقوبة له علی الاعراض حین علم انّه لا یفلح (مجمع البیان)

تم سب سے اُس کے متعلق پوچھا جائے گا اور آپ پوچھیے اُن پیغمبروں سے جنہیں ہم نے آپ کے پہلے بھیجا تھا کیا ہم نے خدائے رحمٰن کے علاوہ کوئی خدا مقرر کیے ہیں جن کی عبادت کی جائے''

''اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ'' کا ترجمہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ ایک نصیحت ہے آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے [1] اس عام فہم مفہوم کے مطابق ہے جو قرآن مجید میں تذکرہ اور ذکریٰ کے ایسے الفاظ کا ہوا کرتا ہے لیکن دوسری تشریح جو بعض مفسرین اہلسنت نے بھی کی ہے [2] اور جسے جناب شیخ الطائفہؒ نے ترجیح دی ہے کہ علامہ طبرسیؒ کا بھی وہ مختار ہے، یہ ہے کہ ذکر کے معنی شرف کے ہیں، مطلب یہ ہے جیسا ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ یہ آپ کے لئے اور آپ کے قوم کے لئے بڑا اعزاز ہے، آپ کے لئے اعزاز یہ کہ آپ کو ایسی کتاب عطا ہوئی ہے اور آپ کی قوم کے لئے کہ اُس کی ہدایت کا ایسا سامان کیا گیا ہے۔ [3]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۫ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۵۰﴾

''اور ہم نے موسیٰؑ کو بھیجا اپنی طرف کے معجزوں کے ساتھ فرعون اور اس کے یہاں کے عمائدین کی طرف تو اُنہوں نے کہا کہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف کا بھیجا ہوا ہوں تو جب وہ اُن کے پاس آئے ہمارے معجزوں کے ساتھ تو وہ ایک دم ان پر ہنسنے لگے، اور ہم اُنہیں کوئی معجزہ نہیں دکھاتے تھے مگر یہ کہ وہ اس کے ساتھ والے دوسرے معجزے سے بڑا ہوتا تھا اور ہم نے اُنھیں اپنے عذاب کی گرفت میں لیا، شاید کہ وہ اپنے راستے سے پلٹیں اور اُنہوں نے کہا اے جادوگر! اپنے پروردگار سے دعا کر اس ذریعہ سے جو اس نے تجھے دیا ہے۔ ہم اب ہدایت قبول کریں گے تو جب ہم نے اُن سے عذاب کو دور کیا تو ایک دم وہ لوگ اپنے عہد کو توڑ دیتے تھے''

''موسیٰؑ کو فرعون اور اُس کے یہاں کے عمائدین کی طرف بھیجا'' حالانکہ وہ بھیجے گئے تھے بنی اسرائیل کو نجات دینے اور اُن کی ہدایت کے لئے مگر چونکہ وہ فرعون اور اس کے عمائدین کے زیر اقتدار تھے اور انہیں مغلوب کر کے ہی وہ نجات پا سکتے تھے اس لئے ان کا نام اس تذکرے میں

---

[1] پند است (شاہ ولی اللہ)

[2] الشرف لّك ولقومك (جلالین)

[3] شرف لك بما اعطاك عزّوجل من الحكمة ولقومك بما عوضيهم له من ادراك الحق به (تبیان)

لیا گیا۔[1] ''اُس ذریعہ سے جو اُس نے تجھے دیا ہے'' یعنی منتر وغیرہ جن سے تم یہ عجیب چیزیں دکھاتے ہو۔ اُنہی کو پڑھ کر دعا کرو۔ دُوسرے معنی اس کے یہ کہے گئے ہیں کہ اُس اقرار کے مطابق ہے جو اُس کا تم سے وعدہ ہے کہ اگر ہم ایمان لائیں گے تو وہ عذاب کو ہم سے دور کر دے گا۔[2]

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

''اور آواز بلند کی فرعون نے اپنی قوم میں، کہا اے میری قوم والو! کیا میرے قبضے میں مصر کی سلطنت نہیں ہے اور یہ نہریں میرے زیر قدم رواں ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ (خود غور کر کے سمجھو کہ) کیا میں اِس سے بہتر ہوں جو بے قدر ہے اور تقریباً اپنا مافی الضمیر ظاہر نہیں کر سکتا تو کیوں ایسا نہیں ہوا کہ اس پر سونے کے زیور اترتے یا اس کے ساتھ فرشتے اترتے جو ساتھ ساتھ رہتے، تو اُس نے یوں ورغلایا اپنی قوم کو تو اُنہوں نے اس کا کہنا مانا یقیناً وہ سب بداعمال لوگ تھے تو جب اُنہوں نے ہمیں صدمہ پہونچایا تو ہم نے اُن سے بدلہ لیا تو اُن سب کو ڈبو دیا اور اُنہیں گزری ہوئی نسل اور نمونہ عبرت بعد والوں کیلئے بنا دیا''

اُس نے جناب موسیٰؑ کیلئے جو یہ کہا کہ ''تقریباً اپنا مافی الضمیر کو ظاہر نہیں کر سکتا'' اس کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ اُن کی زبان میں جو پہلے لکنت تھی، وہی اس کے علم میں تھی، ورنہ بعثت کے بعد اُن کی اس دعا سے کہ: وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ''میری زبان کی گرہ کو کھول دے'' یہ لکنت دور ہو گئی تھی۔[3]

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ۭ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾

''اور جب مریمؑ کے فرزند کی مثال پیش کی گئی تو ایک دم یہ نظر آیا کہ آپ کی قوم والے اس سے روگردانی اختیار کر

---

[1] خصّ الملأ بالذکر وان کان ایضا مرسلا الیٰ غیرھم لان من عداھم تبع لھٰؤلآء (تبیان)

[2] ھو انّه ضمن لنا انّا اذا امنّا بك ان یکشف العذاب عنّا (مجمع البیان)

[3] انّما عیّرہ بما کان فی لسانه قبل (مجمع البیان)

تے ہیں اور اُنہوں نے کہا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ؟ اُنہوں نے یہ بات نہیں کہی ہے آپ سے مگر صرف بحثا بحثی کے طور پر بلکہ وہ بڑے جھگڑالو لوگ ہیں وہ تو نہیں ہیں سوا ایک بندے کے جسے اپنی نعمت سے ہم نے نوازا اور انہیں ایک مثالی شخصیت بنایا بنی اسرائیل کے لئے"

یہ آیت بھی ایسی ہے کہ پورا مطلب اِس کا اِس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک کہ معتبر طور پر شان نزول سے وہ پس منظر معلوم نہ ہو کہ پیغمبر خدا کی زبان سے حضرت عیسیٰؑ کی کیا توصیف ایسی ہوئی جس پر مشرکین نے یہ سوال کیا کہ ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ؟ کچھ لوگوں نے اِس کا ربط اس آیت سے قرار دیا ہے جس میں خالق نے فرمایا ہے کہ ان کے معبودان باطل بھی دوزخ میں ڈال دیے جائیں گے مگر اس کے ساتھ آپ نے جناب عیسیٰؑ کی مدح وثناء فرمائی تو اس پر اُنہوں نے کہا کہ آخر ہمارے معبود کیوں ایسے برے ہو گئے کہ وہ دوزخ میں ڈالے جائیں اور عیسیٰؑ نہیں جن کی ایک جماعت پرستش کر رہی ہے اس پر یہ آیت اتری۔ بعض دوسرے حضرات نے اس کے علاوہ مختلف طرح نشانہ بازی کی ہے مگر اُن میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جس پر وثوق کے ساتھ ذہن قائم ہو جائے۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦١﴾ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٢﴾

"اور اگر ہم چاہتے تو بجائے تمہارے فرشتے بناتے جو زمین میں متمکن ہوتے اور یقیناً وہ قیامت کی بڑی نشانی ہے تو اس میں کوئی شک نہ کرو اور میری پیروی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے اور تمہیں شیطان منحرف نہ کرے، یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے"

"وہ قیامت کی بڑی نشانی ہے" موجودہ ترتیب قرآن کے سیاق کے لحاظ سے کچھ قبل حضرت عیسیٰؑ کا ذکر ہے تو مطلب یہ ہے کہ ان کا زمین پر اترنا آخر زمانہ میں ہوگا جس کے بعد بس قیامت ہوگی [1] اور اس صورت میں ہمارے یہاں کی ایک روایت اس کے مطابق ہے کہ وہ آیت بھی حضرت مہدی امام آخر الزمانؑ سے متعلق ہے۔ کیوں کہ حضرت عیسیٰؑ کا زمین پر اُترنا حضرتؑ کے ظہور کے بعد ہی ہوگا۔

وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿٦٣﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦٤﴾ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ

---

[1] هو قول ابن عباسؓ ومجاهد قتادة والضحاك والسدی وابن درید (تبیان) ای ان نزول عیسیٰ من اشراط الساعة یعلم بها قربها (مجمع البیان)

لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿٦٥﴾

''اور جب عیسیٰؑ معجزے لے کر آئے تو کہا کہ میں تمہاری طرف حکمت لے کر آیا ہوں اور یہ مقصد ہے کہ تمہارے لئے واضح کروں بعض وہ امور جن میں تم اختلاف رکھتے ہو تو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو یقیناً اللہ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے تو اس کی عبادت کرو یہ سیدھا راستہ ہے تو مختلف جماعتوں میں آپس میں اختلاف ہو گیا تو وائے ہو ان کے لئے جو ظالم ہیں ایک بڑے دردناک دن کے عذاب سے''

حضرت عیسیٰؑ کا یہ کہنا کہ ''تمہارے لئے واضح کروں بعض وہ امور جن میں تم اختلاف رکھتے تھے'' یعنی جن کا دین میں دخل ہے اور ایک قول یہ ہے کہ بعض یہاں کل کے معنی میں ہے [1] یہ میری سمجھ میں نہیں آتا اور بعض زبان عرب کے علما نے اس کا انکار کیا ہے۔ [2]

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٦﴾ اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٧﴾

''کیا انتظار ہے اِن کو سوا قیامت کہ وہ ان پر اچانک آ جائے اس عالم میں کہ اُنہیں خبر نہ ہو، دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوا پرہیزگاروں کے''

یعنی ایمان وتقویٰ کے رشتے سے جو دوستی ہے، بس وہ برقرار رہے گی دنیا والے رشتے وہاں سب قطع ہو جائیں گے۔

يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿٧٠﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٧١﴾ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٧٢﴾ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٧٣﴾

''اے میرے بندو! تم پر آج کوئی ڈر نہیں اور نہ تم افسوس کرو گے، وہ جو ایمان لائے ہماری آیتوں پر اور سراطاعت جھکاتے رہے، جاؤ بہشت کے اندر تم اور تمہاری بیویاں خوش خوش اُن پر دور چل رہے ہوں گے بڑے بڑے ساغروں اور پیالوں کے جو سونے کے ہوں گے اور وہاں اُنہیں وہ ملے گا جو اُن کے دل چاہیں اور جس سے آنکھیں

---

[1] قال قوم البعض یراد به ههنا الکل کانّه قال ولابیّن لکم جمیع ما تختلفون فیه وقیل المراد به من امر دینکم دون امر دنیا کم (تبیان)

[2] قال الزجاج: والصحیح انّ البعض لایکون فی معنی الکل (مجمع البیان)

لذت حاصل کریں اور تم لوگ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہو گے اور یہ ہے وہ بہشت جس کے تم حق دار بنے ہو اُن اعمال سے جو تم کرتے تھے، تمہارے لئے اُس میں بہت طرح کے فواکہ ہیں جن میں سے تم کھاؤ گے''۔

اگر یہ پورا سلسلہ آیات کا مقام تنزیل میں سابق والی آیت سے متصل ہے تو اُس میں اِلْتِفَاتٌ مِنَ الْغَیْبَةِ اِلَی الْخِطَابِ والی صنعت ہے یعنی پہلے جو کہا گیا تھا ''جگری دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوا پرہیزگاروں کے'' اب اُنہی پرہیزگاروں کی طرف روئے خطاب ہو گیا اور اُن سے کہا جا رہا ہے ''اے میرے بندو''! تا آخر مضمون آیات، اس دوران میں پھر ایک ''التفات'' ہے جس میں غیبت اور خطاب کی دورنگی ہے کہ یطاف علیھم ''اُن پر دور چل رہے ہوں گے'' یہاں ضمیر جمع غائب کی ہے اور پھر آخر میں جمع حاضر انتم فیھا خالدون ''تم لوگ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہو گے''۔

اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا یُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِیْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۷۶﴾

''بلاشبہ گنہگار لوگ دوزخ کے عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، وہ اُن سے ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اُس میں مایوسی کے عالم میں دم بخود ہوں گے اور ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا مگر وہ خود ظلم کرنے والے تھے''۔

وَنَادَوْا یٰمٰلِكُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّكَ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾

''اور اُنہوں نے آواز دی کہ اے مالک! تمہارا پروردگار ہمارا فیصلہ ہی کر دے، وہ کہنے لگے تم یوں رہو گے''۔

مالک یعنی وہ فرشتہ جو دوزخ کے انتظام پر مقرر ہے جیسے رضوان خازن جنّت ہیں۔

''فیصلہ کر دے'' یعنی ہم کو ایسی موت دیدے جس سے شعور و احساس باطل ہو جاتا ہے۔[1]

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَمْ اَبْرَمُوْۤا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰی وَرُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾

''بلاشبہ ہم نے تمہارے سامنے حق کو پیش کر دیا ہے مگر تم میں سے زیادہ تر حق کو ناپسند کرتے ہیں کیا اُنہوں نے ایک بات طے کر لی ہے تو بلاشبہ ہم بھی طے کیے ہوئے ہیں، یا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اُن کے پوشیدہ امور اور چپکے چپکے والی باتیں نہیں سنتے کیوں نہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے اُن کے پاس رہ کر لکھتے رہے ہیں''۔

''اُنہوں نے ایک بات طے کر لی ہے'' جو اُن کے کردار سے ظاہر ہے کہ وہ اس پیغام حق کو نہیں مانیں گے'' ''ہم بھی طے کیے ہوئے ہیں'' کہ اُنہیں دوزخ کی سزا دیں گے اور اُس کا طے کرنا درحقیقت عدل و حکمت کے تقاضا کو پورا کرتا ہے مگر بہ مقتضائے بلاغت سزا کو اُن کے کردار

---

[1] ای نموت (علی بن ابراھیم) ای لیمتنا حتّٰی نتخلّص من العذاب (تبیان)

کی مناسبت سے اُسی لفظ کے ساتھ یاد کیا ہے۔[1] جس کی نظیریں قرآن میں مَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ اور يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا و كِيْدًا (وغیرہ) کی شکل میں موجود ہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿٨١﴾ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿٨٣﴾

''کہئے کہ اگر خدا کا کوئی بیٹا ہوتو میں سب سے پہلا عبادت کرنے والا ہوں، بَری ہے آسمان اور زمین کا پروردگار جو عرش کا مالک ہے اس سے جو وہ وصف قرار دیتے ہیں تو اُنہیں چھوڑو کہ بحث کرتے رہیں اور تفریح کرتے رہیں تا کہ اُن کے سامنے آئے اُن کا وہ روزِ بد جس کی اُنہیں خبر دی جارہی ہے''۔

پہلے جملے کے بہت سے معنی کہے گئے ہیں لیکن بظاہر زیادہ سمجھ میں آنے والا مفہوم یہ ہے کہ یہ ایک ناممکن مفروضے کی صورت میں اُس کے نتیجہ کا اظہار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے کوئی ضد تھوڑی ہے کہ خدا کے کوئی واقعی اولاد ہو اور میں اُسے نہ مانوں۔ اگر اُس کے اولاد ہو تو مجھے بھی اُس کی عبادت میں کیا عذر ہے؟ میں اول نمبر کا عبادت گزار ہوں گا مگر حقیقت یہ ہے کہ اُس کے لئے کوئی اولاد ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ اُس کی شانِ توحید کے خلاف ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿٨٤﴾ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٨٥﴾ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٨٦﴾

''اور وہ وہ ہے جو آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا ہے اور وہ صحیح کام کرنے والا بڑا جاننے والا ہے اور بڑی برکت والا ہے وہ جس کے لئے آسمان اور زمین اور اُن کے درمیان والی کائنات کی سلطنت ہے اور اُس کے پاس قیامت کا علم ہے اور اُسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے اور جنہیں وہ لوگ پکارتے ہیں اُسے چھوڑ کر وہ سفارش کا اختیار نہیں رکھتے مگر وہ جو سچائی کے ساتھ گواہی دے اور وہ اُسے جانتے ہوں''۔

یہ استثناء منقطع ہے معنی یہ ہیں کہ وہاں۔ ایسے لوگ جن کا بعد میں ذکر ہے، جو خدا کی مرضی سے واقف ہوتے ہیں، وہ شفاعت کا حق رکھتے ہیں۔

---

[1] يكون ذٰلك على وجه الازدواج فى الكلام (تبيان)

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

''اور اگر اُن سے پوچھئے کہ اُنہیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ کہیں گے اللہ نے تو وہ اِدھر اُدھر کہاں بھٹکتے پھرتے ہیں؟ اکثر آپ کا کہنا رہا ہے کہ اے میرے پروردگار! یہ لوگ کسی طرح ایمان نہیں لاتے تو اُن سے چشم پوشی کیجیے اور کہئے بس خدا حافظ! کہ عنقریب اُنہیں خود معلوم ہوگا''۔

قیلہٖ کے لفظ میں یہ بات مانی ہوئی کہ قیل بھی قول کی طرح مصدر ہے جس کے معنی ہیں ''کہنا'' نیز یہ کہ یہ ضمیر رسولؐ کی طرف راجع ہے کہ آپ کا یہ کہنا ہے۔ اب اس کے بعد یہ واو کیسا ہے اور قیل کو اعراب میں ''زیر'' کیوں کر ہو گیا ہے؟ اس کا سمجھنا بڑا دشوار ہو گیا ہے۔

ایک خیال یہ ہے کہ کچھ پہلے جو تھا: عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ ''اُس کے پاس قیامت کا علم ہے'' یہ تو عطف ہے اسی ساعہ کے لفظ پر مطلب یہ ہوا کہ اُس کے پاس قیامت کا علم ہے اور پیغمبرؐ کے اس کہنے کا۔[1] یہ خیال اگرچہ بعض قدیم علمائے تفسیر کی زبانی نقل ہوا ہے مگر اسے میرے ذہن نے بالکل قبول نہیں کیا۔

دوسرے یہ کہ واو رُب کے معنی میں بسا اوقات، اس کے مطابق بعض مترجمین نے ترجمہ کیا ہے۔[2] اور معنوی طور پر اُس کا مفہوم سمجھ میں آتا ہے، اس لئے میں نے ترجمہ اُس کے موافق کیا ہے مگر اس صورت میں اس کے قبل والی آیت پر لا کا نشان جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وقف نہ کیا جائے، ملا کر پڑھا جائے صحیح معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں بعد والی آیت کا کوئی ایسا لگاؤ قبل کی آیت سے نہیں ہے کہ یہ اُس کے مضمون کا جز ہو۔

تیسرے یہ کہ یہ واؤ قسم کا ہے۔[3] اس صورت میں ربط سابق کی آیت سے ہوگا اگرچہ مطلب بنانے میں پھر بھی کافی ذہنی کاوش صرف کرنا پڑتی ہے اس طرح کہ ''قسم ہے رسولؐ کے اس قول کی ----- کیسی عجیب ہے ان لوگوں کی فریب خوردگی کہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا اور ان کے معبودوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور پھر خالق کو چھوڑ کر مخلوق ہی کی عبادت پر اصرار کرتے ہیں'' (تفہیم القرآن)

میرے خیال میں اس مفہوم کو اختیار کرنا اس صورت میں ناگزیر ہے جب کہ بیچ والے ''لا'' کے نشان کو تعبدی طور پر یقینی حیثیت سے قبول کرنا لازم سمجھا جائے۔

---

[1] قال ابو علی عطف علیٰ قولہ: وعندہ علم الغیب وعلم قیلہ (مجمع البیان)

[2] بسامی گوید پیغامبر (شاہ ولی اللہ) بہت کہا کرتا ہے پیغمبر (رفیع الدین)

[3] اس کے قول کی قسم ہے (موضح القرآن)

سُوْرَةُ الدُّخَانِ

مکّیہ ----۵۹---- آیات

اس سورے میں "دخان مبین" کے لفظ کے ساتھ بطور عذاب الٰہی جو ایک دھویں یا قحط سالی کا ذکر ہے، اُس پر اس سورے کا نام ہوا۔

سورۂ دخان کے خاص خاص مضامین:

۱۔قرآن کا ایک خاص بابرکت رات میں نازل ہونا۔

۲۔اس رات میں خاص حکیمانہ فیصلوں کا ہونا جس کی بنا پر اس کا نام "شب قدر" ہوا۔

۳۔تنبیہی عذاب کے بعد صحیح راستے پر آنے کا وعدہ اور اُس کی مخالفت کے نتیجہ میں مختتم عذاب۔

۴۔فرعون اور اُس کی قوم کا رویہ اور اُن کا انجام۔

۵۔فرعون والوں کی بداعمالی کا اظہار اس طرح کہ اُن پر آسمان اور زمین نے گریہ نہیں کیا جو اس کی دلیل ہے کہ خدا کے مقرب بندے دنیا سے اُٹھیں تو مستحق گریہ ہیں۔

۶۔حیات بعد موت کے منکروں کا غلط مطالبہ اور اُس کا جواب۔

۷۔آخری فیصلہ قیامت میں۔

۸۔دوزخ کے آب وغذا کا ہولناک تذکرہ۔

۹۔بہشت کی مختلف نعمتوں کا تذکرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے"

حٰمٓ ﴿۱﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿۳﴾ فِيْهَا
يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ﴿۴﴾ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۵﴾ رَحْمَةً مِّنْ
رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶﴾ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ
كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۷﴾ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ

الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸﴾ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ﴿۹﴾

''حا۔میم۔قسم اس کھلی ہوئی کتاب کی۔ہم نے اس کو اتارا ہے ایک مبارک رات میں یقیناً ہم عذاب سے ڈرانے والے رہے ہیں، اُس میں فیصلہ ہوتا ہے ہر حکیمانہ بات کا جو ہماری طرف کی بات ہوتی ہے، بلاشبہ ہم تھے بھیجنے والے تمہارے پروردگار کی رحمت کے طور پر، یقیناً وہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا، پروردگار آسمان اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کا اگر تم یقین کیے ہوئے ہو، کوئی خدا نہیں سوا اُس کے وہ زندہ کرتا ہے اور وہ مارتا ہے تمہارا پروردگار اور تمہارے پہلے والے باپ دادوں کا پروردگار مگر وہ ایک شک وشبہ میں مبتلا، تفریح اور مذاق میں لگے ہوئے ہیں''۔

قرآن کا ایک خاص بابرکت رات میں نازل ہونا

''مبارک رات'' یعنی ''شب قدر'' جو ماہ رمضان میں ہوتی ہے، اُس میں قرآن کے اُتارے جانے کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقام پر ہے اور جیسا کہ ہم نے ''مقدمہ تفسیر'' میں لکھا ہے، یہ تنزیل اول پورے قرآن کی بحیثیت مجموعی ہے جو لوح محفوظ سے بیت معمور کی طرف ہوئی ہے اور وہاں سے پھر تدریجی طور پر وقتاً فوقتاً پیغمبر خداؐ پر تیئس برس میں یعنی بعثت سے تا آخر عمر اترتا رہا ہے۔[1]

اس کے علاوہ بھی علامہ طبرسیؒ نے اس سلسلے میں کئی قول نقل کیے ہیں جن میں سے کسی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔''اس میں فیصلہ ہوتا ہے ہر حکیمانہ بات کا'' اس لئے اس کا نام ''شب قدر'' ہوا ہے اس علم کلام کے ایک مسئلے کا فیصلہ ہوجاتا ہے اور وہ بداء ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تقدیرات الٰہیہ میں اکثر صورتوں میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔جیسے کسی کی عمر کم تھی اور صدقہ وخیرات سے اس کی عمر میں اضافہ ہوگیا کسی کی عمر میں ایسی ہی کسی وجہ سے کمی ہوگئی۔اہل سنت اس کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ تقدیرات سب ازلی ہیں یعنی ازل میں ہر بات طے ہوگئی ہے۔اب ان میں تبدیلی نہیں ہوتی۔

شب قدر میں خاص حکیمانہ فیصلوں کا صادر ہونا اور حقیقت زار کی قطعی دلیل

اس محل پر اصل مسئلہ بداء پر کوئی بحث مدنظر نہیں ہے مگر زیر نظر آیت کے مفہوم کی حد تک ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر تبدیلی نہیں ہوتی تو ہر شب قدر میں بنص قرآن جو فیصلے ہوتے ہیں، وہ کیا ہو سکتے ہیں؟ ان فیصلوں کا ہونا ثبوتِ بداء کی قطعی دلیل ہے۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّا كَاشِفُوا

---

[1] هی لیلة القدر انزل الله القرآن فیها الی البیت المعمور جملة واحدة ثم نزل من البیت المعمور علیٰ رسول الله صلی الله علیه وآله فی طول عشرین سنة (علی بن ابراهیم)

الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۱۶﴾

''تو منتظر رہیے اس دن کے جب آسمان سے نمایاں طور پر ایک دھواں آئے گا جو لوگوں پر چھا جائے گا۔ یہ ایک بڑی دردناک سزا ہے۔ اے ہمارے پروردگار اس عذاب کو ہم سے دور فرما، ہم یقیناً ایمان لائیں گے، انہیں نصیحت کہاں سے حاصل ہوگی، حالانکہ ان کے پاس صاف صاف ہدایت کرنے ولا ایک پیغمبر آیا، پھر بھی انہوں نے اس سے روگردانی کی اور کہا سکھایا ہوا ایک دیوانہ ہے۔ یقیناً ہم خود اس عذاب کو ہٹا دیں گے، یقیناً پھر یہی کروگے جس دن ہم سب سے بڑا ہلا بول دیں گے، بلاشبہ ہم پورا بدلا لے لیں گے۔''

یہ دھواں جس کا ان آیات میں ذکر ہے اور جس پر اس سورے کا نام ہوا ہے، بعض کے نزدیک قیامت میں ہوگا، [۱] مگر پھر یہ جملہ کیسا ہے کہ ''ہم ذرا اس عذاب کو ہٹائیں گے یقیناً تم پھر یہی کروگے'' اس لئے کہ قیامت کے عذاب سے نہ کسی آہ وزاری سے تخفیف کا امکان ہے، اور نہ اس کے بعد پھر کوئی دور ہے جس میں وہ پھر یہی کریں گے۔ خصوصاً جب کہ اس کے بعد البطشۃ الکبریٰ کا ذکر ہے جس کا ترجمہ ''بڑے گرفت'' کے ساتھ کیا جاتا ہے اور ہم نے اس لفظ کی شدت کے اظہار کے لئے اس کو ناکافی سمجھتے ہوئے ترجمہ کیا ''سب سے بڑا ہلا'' قیامت کے بعد وہ ''گرفت'' یا ''ہلا'' کون ہوسکتا ہے؟۔ ایک تفسیری روایت جو صحابہ میں سے عبداللہ بن مسعود کی زبانی وارد ہوئی ہے، یہ ہے کہ مشرکین کی آنکھیں کھولنے کے لئے رسول خداؐ نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی: اللّٰھم سنین کسنین یوسف ''خداوندا ویسی قحط سالی ہوجائے جیسی یوسف کے زمانے میں ہوئی تھی'' اس کی بنا پر خالق نے اس تنبیہی عذاب کی اطلاع دی جس میں کیفیت یہ ہوگئی کہ نظروں کے سامنے دھواں چھایا ہوا رہتا تھا [۲] لیکن تاریخ میں ہمیں قبل بعثت کی قحط سالیوں کے کچھ حال تو ملتے ہیں، بعد بعثت کی اس قحط سالی کے حالات کچھ نظر نہیں آتے۔ ہماری قدیم تفسیر (علی بن ابراہیم قمی) اسے قیامت سے پہلے دورِ رجعت سے متعلق قرار دیتی ہے جس میں رجعت کے ماننے والوں کے لئے کوئی وجہ انکار نہیں ہے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۸﴾ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹﴾ وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿۲۰﴾ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿۲۱﴾

''اور ہم نے آزمائش کی ان کے پہلے فرعون کی قوم کی اور ان کے پاس آیا ایک معزز پیغمبر کہ میرے سپرد کرو اللہ کے بندوں کو، میں تمہارے لئے ایک امانت دار پیغمبر ہوں اور یہ کہ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو، یقیناً میں تمہارے

---

[۱] قیامت میں یہ دھواں گھیرے گا (موضح القرآن)

[۲] قحط انداخت تا از شدّت جوع یا از کثرت انجرہ چوں دودی محسوس می شود (فتح الرحمن)

سامنے لا رہا ہوں ایک کھلی ہوئی دلیل اور میں اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگا سے مانگتا ہوں پناہ اس سے کہ تم مجھے پتھروں کا نشانہ بناؤ اور اگر تم میری بات پر یقین نہیں کرتے تو مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرلو''

یعنی تشدد نہ کرو اور جارحیت سے کام نہ لو۔[1]

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِیْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِیْهَا فٰكِهِیْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۫ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِیْنَ ﴿۲۹﴾

''تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ ''یہ بڑے مجرم لوگ ہیں'' (اچھا) تو تم میرے بندوں کو لے کر رات کو نکلو، یقیناً تمہارا پیچھا کیا جائے گا اور تم دریا کو اس حالت میں کہ وہ خشک ہو گیا ہوگا چھوڑ دو، بے شک وہ لشکر غرق ہونے والا ہے، کتنے ہی انہوں نے چھوڑے باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور بڑے عمدہ مقامات اور اسی طرح کے آرام و آرائش کے سامان جن میں وہ بڑے خوش خوش رہ رہے تھے اور ہم نے ان چیزوں کا مالک بنایا دوسری قوم کو تو نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین اور نہ انہیں مہلت مل سکی''

ان آیتوں میں جن واقعات کا ذکر ہے، ان کی تفصیل قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر موجود ہے۔ آخری جملہ فرعون کی بداعمالی کے اظہار میں بطور کنایہ ارشاد ہوا ہے اس سے ظاہر ہے کہ جو شخص کردار کے لحاظ سے اللہ کے یہاں بلند مرتبہ رکھتا، ہو، وہ مستحق گریہ ہے اور اس پر آسمان بھی روئے گا اور زمین بھی چنانچہ جلالین نے بھی اس کے تحت میں لکھا ہے:

بخلاف المؤمنین یبکی علیهم بموتهم مصلّاهم من الارض و مصعد عملهم من السّماء.

برخلاف مومنین کے کہ ان کے دنیا سے اٹھنے پر زمین کے وہ قطعات بھی روئے ہیں جن پر وہ نمازیں پڑھتے تھے اور آسمان کے وہ حصے بھی جہاں سے اُن کے اعمال بلند ہوتے تھے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں۔ ''حدیث میں فرمایا کہ مسلمان کے مرنے پر روتا ہے دروازہ آسمان کا جس سے اس کی روزی اُترتی اور زمین جہاں وہ نماز پڑھتا ہے'' (موضح القرآن) خاص ظہور اس کا حدیث اور تاریخ کے لحاظ سے حضرت امام حسین علیہ السلام کے بارے میں ہوا کہ آپ پر آسمان اور زمین دونوں نے گریہ کیا جس کا اس آیت کے ذیل میں قدیم اہل تفسیر نے بھی ذکر کیا ہے۔[2] اور آپ کے ساتھ حدیث میں جناب یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کا نام بھی ہے۔[3]

---

[1] فاترکونی لامعی ولا علیّ (مجمع البیان)

[2] قال السدی لمّا قتل الحسین علیه السلام بکت السّماء علیه (بتیان)

[3] قال او ما بکّت السّماء و الارض الّا علیٰ یحییٰ بن ذکریّا و الحسین بن علی علیہما السلام (علی بن ابرهیم) روی ذوارة بن اعین عن ابی عبدالله قال بکّت السماء یحیٰی بن ذکریا و الحسین بن علیٰ اربعین صباحا (مجمع البیان)

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝٣٠ مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝٣١ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰي عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝٣٢ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰۗؤٌا مُّبِيْنٌ ۝٣٣

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو نجات دی ذلت آمیز عذاب سے جو فرعون کی طرف سے تھا، یقیناً وہ سرکش تھا ظلم و تعدی کرنے والوں میں سے اور ہم نے پوری واقفیت کے ساتھ انہیں تمام دنیا کے مقابلے میں ترجیح دی اور ہم نے انہیں وہ قدرت کی نشانیاں دکھلائیں جن میں کھلی ہوئی آزمائش تھی''

یہ ترجیح جس کا بنی اسرائیل کے لئے اعلان ہوا ہے اسی دور زمانہ سے مخصوص تھی [1] اس لئے کہ اُمت محمدیہ کو بلاشبہ ان پر خالق نے فوقیت دی، اس کے علاوہ یہ ترجیح کچھ باتوں کے لحاظ سے ہے جیسے خدا کے پیش نظر انبیاء کا قرب الٰہی ان کی کثرت کو دیکھتے ہوئے۔ [2]

اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ لَيَقُوْلُوْنَ ۝٣٤ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ۝٣٥ فَاْتُوْا بِاٰبَاۗىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٣٦ اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ ۡ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝٣٧

''بلاشبہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہے مگر پہلی ہی دفعہ کا مرنا اور ہم دوبارہ جلائے جائیں گے (اچھا) تو لاؤ ہمارے باپ داداؤں کو اگر تم سچے ہو، کیا وہ (مادی طاقت کے اعتبار سے) بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور جو ان سے پہلے تھے ؟ ہم نے ان کا ستیاناس کر دیا، یقیناً وہ گنہ گار لوگ تھے''

حیات بعد الموت کا ذکر سن کر جو آخرت میں ہوگا ان کا یہ کہنا کہ اگر تم لوگ سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو زندہ کر کے لاؤ، دھاندلی کے سوا کچھ نہ تھا، اس لئے کہ وہ زندہ کرنا بطور سیر و تفریح نہیں ہے۔ وہ تو جزا و سزا کے لئے دور زمانہ کے اختتام پر ہے، اس وقت ان کی فرمائشوں کی بنا پر ان کے باپ داداؤں کو زندہ کیوں کیا جائے؟ چونکہ یہ ان کا سوال بالکل ہی جہالت پر مبنی تھا اور اتفاق سے ان کا کہنے والا ابوجہل ہی بتایا گیا ہے۔ [3] اس لئے اس کے جواب میں پہلے گزشتہ سرکش قوموں کا انجام یاد دلا کر انہیں عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا ہے کہ تم بھی ویسے ہی عذاب کے مستحق ہو جیسا ان قوموں پر عذاب آیا۔ [4]

---

[1] قال قتادة و مجاهد على عالمي زمانهم (بتيان)

[2] فضّلناهم بالتورٰته و كثرة الانبيآء منهم (مجمع البيان)

[3] هذا القول جهل من ابي جهل (مجمع البيان)

[4] من تجاهل في الحجاج الّذي يجري مجرى الشعب ... فانّه ينبغي ان يعدل عن مقابلة ___ ولذٰلك عدل تعالىٰ معهم الىٰ هٰذا الوعد الشّديد (تبيان)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۲﴾

''اور ہم نے نہیں پیدا کیا آسمان اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزوں کو بے کار، تفریحی طور پر ہم نے اُنہیں پیدا کیا مگر حق بجانب طور پر لیکن ان میں کے زیادہ لوگ علم نہیں رکھتے، یقیناً فیصلے کا دن ان سب کا مقرر شدہ وقت ہے، جس دن کوئی دوست کسی دوست کو فائدہ نہ پہونچا سکے گا اور نہ ان کی مدد ہوگی، مگر جس کے شامل حال اللہ کی رحمت ہو یقیناً اللہ زبردست ہے، بڑا رحم وکرم والا''

یہاں پر ترتیب آیات کو مطابق تنزیل مانتے ہوئے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ گزشتہ ابوجہل کے مطالبے کا اصل جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شروع سے آخر تک اللہ کا کوئی کام بطور کھیل اور تفریح کے نہیں ہوتا۔ نہ اس نے پہلے بلاوجہ بطور تفریح کے کائنات کو خلق کیا تھا، نہ دوبارہ مردوں کو زندہ کرنا بطور تفریح ہوگا۔ پہلی دفعہ خلق کرنا بھی بامقصد تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر لوگ اس مقصد سے بے خبر ہیں اور دوبارہ زندہ کرنا بھی بامقصد ہوگا جس میں اعمال کی پاداش کا فیصلہ سامنے لایا جائے گا۔ یوم الفصل کے لفظ سے ظاہر ہے۔ اس فیصلے کے دن میں کوئی دوست کسی دوست کو فائدہ نہ پہونچا سکے گا یعنی وہ جن کی دوستی دنیوی رشتے سے ہو لیکن جو محبت بحکم الٰہی ہو، اس سے کیوں فائدہ نہ پہونچے گا۔[1] یا جو شفاعت کے ذریعے سے باذن خدا تعالیٰ فائدہ پہنچائیں۔[2]

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴿۴۴﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿۴۵﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ﴿۴۶﴾ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَاۗءِ الْجَحِيْمِ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ﴿۴۸﴾ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿۴۹﴾ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾

''یقیناً زقوم کا درخت گنہ گار کی غذا ہے، پگھلے ہوئے تانبے کی طرح شکموں میں جوش کھائے گا کھولتے ہوئے پانی کے جوش کی طرح ''پکڑو اسے'' پھر لے چلو اس کو بیچوں بیچ دوزخ میں، پھر اس کے سر پر گرم پانی ڈالو، چکھ تو تو بڑا عزت والا ہے، بڑے مرتبے والا۔ یقیناً یہ وہ ہے جس میں تم لوگ شک وشبہ کرتے تھے''

آخری فقرہ جو کافر سے تخاطب میں ہے کہ تو تو بڑا عزت والا ہے، بڑے مرتبے والا، یہ طنز ہے اس کے غلط تصورات پر جو دنیا میں تھے،

---

[1] من والی غیر اولیاء اللہ لا یغنی بعضھم عن بعض (علی بن ابراھیم)

[2] لا ینافی ما تذھب الیہ من اثبات الشفاعۃ للنبی ﷺ والائمۃ والمومنین لان الشفاعۃ لا تحصل الّا بامداللہ تعالیٰ (مجمع البیان)

ورنہ حقیقتاً عزت اور بزرگی اہل ایمان سے مخصوص ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۙ﴿۵۱﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۚ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ
وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۚ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ ۗ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ؕ﴿۵۴﴾ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ
فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ۙ﴿۵۵﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَوَقٰىهُمْ
عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۙ﴿۵۶﴾ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۵۷﴾

''بلاشبہ پرہیزگار لوگ امن وسکون کی جگہ پر ہوں گے، بہشتوں اور چشموں میں، پہنیں گے سندس اور استبرق کے کپڑے، آمنے سامنے بیٹھے ہوئے اسی صورت سے اور ان کی شادی کر دیں گے ہم بڑی آنکھوں والی حوروں کے ساتھ، وہ منگواتے وہاں طرح طرح کے پھل امن واطمینان کے ساتھ۔ نہیں چکھیں گے ان میں ذائقہ موت کا سوا پہلے والی موت کے اور اس نے بچایا انہیں دوزخ کے عذاب سے فضل وکرم کی بنا پر جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے اور یہ بڑی کامیابی ہے''۔

''پہلی موت کے سوا وہ وہاں موت کا مزہ نہ چکھیں گے'' یہ اس طرح کا استثناء نہیں ہے جس سے اس نفی کی عمومیت کو صدمہ پہونچے اور مطلب یہ ہو کہ بس ایک موت ہے جو ابھی آنا ہے بلکہ یہ اصطلاحی طور پر استثنائے منقطع کہلاتا ہے جس کا مطلب یہاں یہ ہوتا ہے کہ جو موت آنا تھی وہ بس پہلے آچکی اب کسی موت سے انہیں دوچار ہونا نہیں ہے۔ [1]

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

''تو ہم نے اس کو آپ کی زبان پر بالکل آسان قرار دیا ہے، شاید وہ نصیحت قبول کریں، اچھا تو انتظار کیجئے یقیناً وہ بھی انتظار میں ہیں''۔

یعنی انجام ان کے کفر کا آپ کے سامنے بھی آئے گا اور ان کے بھی سامنے آنا ہے۔ اگرچہ وہ اس کا تصور نہیں رکھتے تو انتظار کیا کریں گے مگر سامنے ان کے اسی طرح آنا ہے جس طرح کسی منتظر کے سامنے آئے جب کہ وہ اپنے کردار سے اس کا سامان کیے ہوئے ہیں۔ اس لئے مجازاً یوں کہا گیا ہے کہ وہ بھی منتظر ہیں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ آپ منتظر رہیے ان کی تباہی و بربادی کے جو ہو کر رہے گی اپنے خیال خام میں آس لگائے ہیں آپ کے لئے روز بد کی جو آنے والا نہیں ہے۔

---

[1] تقدیرہ: ولکن الموتة الاولی قد ذاقوھا (تبیان)

سُوْرَةُ الْجَاثِيَةِ

مکّیہ ----۳۷----آیات

اس سورے کے درمیان میں ''جاثیۃ'' کا لفظ ہے (وترٰی کل امۃ جاثیۃ) بس اُس پر اس سورے کا نام ہو گیا۔

سورۂ جاثیہ کے خاص خاص مضامین:

۱۔قدرت کی نشانیوں میں آسمان، زمین، زمین میں چلنے پھرنے والی مخلوق، شب و روز کی ادل بدل آسمان سے اُترنے والی روزی یعنی بارانِ رحمت جس سے روزی پیدا ہوتی ہے۔

۲۔بے توجہی اختیار کرنے والوں، انکار کرنے والوں اور مذاق اڑانے والوں کی تنبیہہ وتہدید۔

۳۔مسلمانوں کو ہدایت کہ وہ منکروں کی طرف توجہ نہ کریں۔

۴۔رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کی طرف سے ایک قانون کا پابند بنایا گیا ہے یعنی شریعت من جانب اللہ ہے، رسول کا کام بھی اتباع ہے ۔ابتداع یعنی ایجاد نہیں۔

۵۔کیا بد اعمال لوگ انجام میں خوش اعمال لوگوں کے برابر رکھے جائیں؟

۶۔انکار آخرت کرنے والے دہریوں کی رد۔

۷۔نامۂ اعمال

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۵﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾

''حا، میم۔ اس کتاب کا اُتارا جانا ہے اللہ کی طرف سے جو عزت والا حکمت والا ہے، یقیناً آسمان اور زمین میں نشانیاں ہیں ایمان والوں کے لئے اور تمہاری تخلیق میں اور جو وہ پھیلاتا ہے چلنے پھرنے والی مخلوق، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین کریں اور رات دن کی آمد و رفت اور اس میں جو اللہ نے آسمان سے روزی اُتاری تو اس سے زمین کو زندہ کر دیا اس کے بے جان ہونے کے بعد اور ہواؤں کی گردش میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیں، یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم آپ کے سامنے حق کے ساتھ پیش کرتے ہیں تو اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کس بات پر وہ ایمان لائیں گے''؟

متعدد سوروں کے آغاز میں کتاب کے اُتارے جانے کی نسبت عزت و حکمت والے اللہ کی طرف کتاب کی عظمت کے اظہار کے لئے ہے کہ دیکھو یہ کتاب کس کی طرف سے ہے اور چونکہ یہ پہلو بہت اہم ہے، اس لئے اسے بار بار دہرایا گیا ہے اور یہ تکرار جان بلاغت ہوتی ہے۔

علامہ طبرسیؒ نے اس تکرار کی مثال میں اسے پیش کیا ہے کہ بندہ دعائیں کرتا ہے تو ہر دعا کے شروع میں اللّٰھم ، اللّٰھم کہتا ہے۔ اس کے اظہار کے لئے ہے کہ جس سے وہ کہہ رہا ہے، وہ کتنی عظیم ذات ہے۔[1]

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۙ﴿۷﴾ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۸﴾ وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹﴾ مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِىْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰﴾ هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾

''وائے ہو ہر گنہ گار جھوٹے کے لئے جو سنتا ہے آیات الٰہی کو کہ وہ اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں، پھر وہ تکبر سے کام لیتا ہوا ہٹ دھرمی کرتا ہے جیسے کہ انہیں اس نے سنا ہی نہیں تو اسے خوش خبری دیجیے دردناک عذاب کی اور جب ہماری نشانیوں میں سے کسی کا اسے علم ہوتا ہے تو اسے مذاق کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ یہ وہ ہیں کہ ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

اُن کے آگے دوزخ ہے اور جو کچھ انہوں نے کمایا ہے، وہ انہیں کچھ فائدہ نہ پہنچائے گا اور نہ وہ جو انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر حوالی موالی بنائے ہیں اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ یہ ایک ہدایت ہے اور وہ جو اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں، ان کے لئے دردناک قسم کا عذاب ہے

---

[1] یقول القائل اللّٰھم اغفر لی اللّٰھم ارحمنی اللّٰھمّ غافنی اللّٰھم واتبع لی فی رزقی فیاتی بمایوذن ان تعظیمہ لربّہ ضعقد بکلّ مایدعوبہ (مجمع البیان)

۔''''ہماری نشانیوں میں سے کسی کا علم ہوتا ہے'' یہ الفاظ عمومیت رکھتے ہیں، خواہ مشاہدہ کے ذریعے سے علم ہو کہ خود اس کی آنکھوں کے سامنے وہ معجزہ آیا یا اس کا تذکرہ اس کے گوش زد ہوا، بہر حال وہ اسے مذاق کا ذریعہ بنالیتا ہے لیکن ایک تفسیر یہ ہے کہ علم کے معنی یہاں مشاہدے ہی کے ہیں۔[1]

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اللہ وہ ہے جس نے تمہارے قبضے میں کیا ہے دریا کو تا کہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں رواں ہوں اور تا کہ تم اس کے فضل و کرم سے جو کچھ ملے حاصل کرلو اور شاید تم شکر گزار ہو اور تمہارے قبضے میں کیا اس نے وہ جو آسمانوں میں ہے اور وہ جو زمین میں ہے، یہ سب اس کی طرف سے ہے، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں''

کشتیوں کے دریا میں چلنے کے ساتھ یہ کہ ''اس کے فضل و کرم سے جو ملے اسے حاصل کرو'' اس بنا پر ہے کہ اس زمانے میں دریاؤں کے سفر عموماً تجارت کے لئے ہوتے تھے۔ سخر لکم کا لفظ متعدد جگہ قرآن مجید میں ہے جس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اس نے یہ چیزیں تمہارے فائدے کے لئے پیدا کیں لیکن اس کا اصل مفہوم وہی ہے جو ہم نے ترجمہ کیا ہے ''تمہارے قبضے میں کیا ہے'' اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ چیزیں ہمارے ارادے کی پابند ہوں۔ اب یہ ہمارے علم و اقتدار کی کوتاہی ہے کہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ لِیَجْزِیَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

''کہئے ان سے جو ایمان لائے ہیں کہ وہ بخشے رہیں انھیں جو امید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی تا کہ وہ بدلا دے کسی بھی قوم کو ان اُاعمال کا جو وہ کرتے رہے تھے، جو نیک کام کرے گا وہ اپنے فائدے کے لئے اور جو برائی کرے گا تو وہ اپنا نقصان کرے گا، پھر تم سب کو اپنے پروردگار کی طرف پلٹنا ہوگا۔

''بخشے'' کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ انہیں معاف کردیں، ورنہ آئندہ کے بدلے کا کیوں ہوتا؟ بلکہ انہیں نظر انداز کریں بایں معنی کہ ان کے بے ہودہ باتوں کا سختی کے ساتھ جواب نہ دیں اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ان کے لئے خالق سے بد دعا بھی نہ کریں جیسا کہ ہماری قدیم تفسیر میں ہے۔[2] ''اللہ کے دن'' یعنی وہ دن جن میں اس کی طرف کے کچھ کارنامے انجام پائیں خواہ اس کے بندگان خاص کے ہاتھوں جیسے انبیاء اور

---

[1] یعنی ازرائی فوضع العلم مکان للرؤیۃ (علی بن ابراھیم)

[2] یقول لا تدعوا علی ائمّۃ اعود حتّٰی یکون اللّٰہ الّذی یعاقبھم (علی بن ابراھیم)

ائمہ دین جن کے واقعات اب ماضی بن چکے ہیں، اس لئے ان کی یاد تازہ کرنے کا حکم ہے (وذکرھم بایام اللہ) اور خواہ خالق کے ارادہ خاص سے بعد میں وقوع پذیر ہونے والے ہوں جیسے کارگاہ حساب و کتاب، حشر ونشر وغیرہ یہ مستقبل کی چیزیں ہیں، ان سے متعلق ہے امید اور اس کے موافق سامان فراہم کرنا اور ان ایامِ الٰہی کی امید نہ رکھنے والے وہ ہیں جو آئندہ کی زندگی کا تصور ہی نہیں رکھتے اور آخرت کے قائل ہی نہیں۔

غور کیا جائے تو امام منتظرؑ کے ظہور کا عہد بھی ایام الٰہی کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اس لئے ان امید نہ رکھنے والوں میں وہ بھی آتے ہیں جو اس کے منکر ہیں بلکہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ''وہ بدلا دے کسی بھی قوم کو اس کا جو وہ کرتے ہیں'' اس کے دونوں رخ ہیں، ان منکروں کو سزا بھی وہی دینے والا ہے اور ان صبر کرنے والوں کو اور چشم پوشی کرنے والوں کو جزا بھی۔ [1] جیسا کہ بعد والی آیت میں دونوں پہلو نمایاں ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٦﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٧﴾

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی اور اُنہیں پاک غذاؤں سے رزق عطا کیا اور اُنہیں تمام دنیا جہاں سے زیادہ عطا کیا اور اُنہیں کھلے ہوئے دلائل دین کے عطا کیے تو اُنہوں نے باہم اختلاف نہیں کیا مگر بعد اس کے کہ اُن کے پاس علم آچکا آپس کے ظلم وتعدی کی وجہ سے یقیناً تمہارا پروردگار فیصلہ کرے گا اُن کے درمیان قیامت کے دن اُس میں کہ جو وہ باہم اختلاف رکھتے تھے''۔

بنی اسرائیل کے لئے فضلنا کا لفظ قرآن میں متعدد مقامات پر آیا ہے اور ہم نے ہر جگہ اُس کی تشریح کی ہے کہ اس کے معنی کثرت عطا یا بعض باتوں میں ترجیح کے ہیں، نہ کہ بحیثیت مرتبۂ بلندی جو کہ اپنے معصوم رہنماؤں کی بدولت جو افضل خلائق تھے، بلاشبہ اُمت محمدیہ کے لئے حاصل ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰي شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨﴾ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿١٩﴾ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿٢٠﴾

''پھر ہم نے آپ کو ایک واضح راستے پر دین کے قرار دیا ہے تو اس کی پیروی کیجئے اور اُن کے غلط خیالات کی پیروی

---

[1] یحتمل معنین ...احدھما یجاز یھم یعنین الکفّار...الثانی ...لیجز یھم اللہ یعنی المؤمنین ویعظم اجرھم علیٰ حتما لھم وصبرھم (تبیان)

نہ کیجئے جو علم نہیں رکھتے۔ وہ اللہ کے مقابلے میں آپ کو کچھ فائدہ ہرگز نہیں پہنچائیں گے اور یقیناً ظالم لوگ ایک دوسرے کے پشت پناہ ہو جاتے ہیں اور اللہ پشت پناہ ہوتا ہے پرہیزگاروں کا۔ یہ بصیرتوں کا سرمایہ ہے لوگوں کے لئے اور ہدایت اور رحمت اُن کے لئے جو یقین کریں''۔

یہ راستہ جس پر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قائم تھے اور اُسی کے مبلغ تھے، کچھ اصول ہیں جن سے ماننے کا تعلق ہے، یہ ''اصولِ دین'' کہلاتے ہیں اور کچھ عملی احکام ہیں جن کا مجموعہ اسی قرآنی لفظ یعنی ''شریعت'' ہی کے نام سے موسوم ہے۔ اس جگہ جو لفظ شریعة ہے، وہ ان دنوں پر حاوی ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وضع کردہ نہیں ہے بلکہ خالق کی طرف سے مقرر ہے جس کی تبلیغ اور تعلیم پر آپ مامور ہیں، اس لئے میں نے اُسے اُس عشرے کے بیانات کا سرنامہ قرار دیا تھا جس سے متعلق مجموعہ ''پرسنل لا نا قابل تبدیل'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ أَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

''کیا سمجھتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے جرائم کا ارتکاب کیا ہے کہ ہم اُنہیں قرار دیں مثل اُن کی جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور اچھے اعمال کرتے رہے، یکساں ہو اُن کی زندگی اور اُن کی موت؟ کتنا بُرا ہے یہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں۔ اور اللہ نے آسمان اور زمین کو حق بجانب طور پر پیدا کیا''۔

بداعمال لوگ خوش اعمال لوگوں کے برابر نہیں

سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ، اُس کے معنی ایک یہ کہے گئے ہیں کہ ان کافروں کی زندگی اور موت یکساں ہے یعنی اُن کی زندگی بے سود ہونے میں مثل موت ہے۔[1] یہ بات بجائے خود تو درست ہے مگر اس کا قبل کے کلام سے بظاہر کوئی ربط نہیں ہے۔ پھر اس صورت میں سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ہونا چاہیے کہ یہ خود مبتدا اور خبر پر مشتمل ایک مستقل جملہ ہو مگر یہاں سواءً نصب یعنی دو زبر کے ساتھ ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ نجعلهم کے تحت میں بطور مفعول ہے اس طرح جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ قبل ہی کے فقرے کا تتمہ ہے یعنی کیا بداعمال لوگوں کو ہم مثل صاحبِ ایمان اور نیک اعمال لوگوں کے قرار دیں کہ ان سب کی زندگی اور موت یکساں ہو؟ یہ مفہوم بالکل درست ہے اور اس سے عدولی کرنے کی کوئی وجہ نہیں چنانچہ علامہ طبرسیؒ کا بظاہر مختار یہی ہے۔[2]

فرماں بردار اور نافرمان کو برابر قرار دینا، فرماں بردار پر ایک طرح کا ظلم ہے اور خدا ہر طرح کے ظلم سے بری ہے۔

---

[1] اخبر على الكفّار و قال سواء محياهم و مماتهم ـــــ لأن الحيّ متى لم يفعل الطّاعات فهو بمنزلة الميّت (تبيان)

[2] اى يستوى محيا القبليتين و مماتهم يعنى احسبوا ان حيوتهم و مماتهم كحيوة المومنين و موتهم (مجمع البيان)

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾

''تو کیا دیکھا آپ نے اُسے کہ جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنایا ہے اور اللہ نے علم کی بنا پر اُسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور اُس کے کان اور اُس کے دل پر مہر لگا دی اور اُس کی نگاہ پر پردہ ڈال دیا ہے تو اللہ کے بعد کون اُس کی ہدایت کر سکتا ہے تو کیوں تم سمجھانے کا اثر نہیں لیتے''۔

خواہش نفس کو خدا بنانا اُس کا ارادی فعل ہے اور علم الٰہی بحیثیت ایک واقعہ کے اُس سے متعلق ہے۔ وہ اُس کا سبب نہیں ہے اور بعد کی باتیں سب اس علم پر مبنی ہیں لہٰذا اُن سے جبر کا ثبوت نہیں نکلتا۔

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾

''اور اُنہوں نے کہا کہ نہیں ہے سوا اس دنیوی زندگی کے، یہی مرنا ہے، یہی جینا ہے اور ہمیں ہلاک نہیں کرے گا مگر یہی دورِ زمانہ حالانکہ اُنہیں اس کا کوئی علم نہیں ہے، نہیں رکھتے وہ مگر ایک وہم و گمان''۔

اس میں جن کافروں کے قول کا ذکر ہے، وہ اسلام کے دونوں بنیادی اصول مبدأ اور معاد یعنی خالق اور آخرت دونوں کے منکر ہیں اور اُن کے انکار کا سرمایہ اُس وقت بھی اور ڈیڑھ ہزار برس گزرنے کے بعد آج بھی لاعلمی کے سوا کچھ نہیں ہے جسے وہ ایک علمی فیصلے کی صورت سے پیش کرتے ہیں۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾

''اور جب اُن کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں کھلی ہوئی صاف تو ان کی دلیل کچھ نہیں ہوتی سوا اس کے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے باپ داداؤں کو لاؤ اگر تم سچے ہو، کہئے کہ اللہ تمہیں زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، پھر تمہیں یکجا کرے گا قیامت کے دن جس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے اور اللہ کے لئے سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور جس دن قیامت برپا ہوگی، اُس دن گھاٹا اٹھائیں گے باطل پرست لوگ''۔

اُن لوگوں کی یہ جہالت کہ ہمارے باپ داداؤں کو زندہ کر کے لاؤ، جس کی نسبت خاص طور پر ابوجہل کی طرف ملتی ہے، پہلے بیان ہو چکی

ہے اور وہاں بھی اُس کا جواب تقریباً یہی دیا گیا تھا کہ یہ زندہ کرنا اور مارنا تفریحی طور پر نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کی طرف کے نظامِ حکمت کا ایک عمل ہے جو جزا و سزا کی ضرورت کی بنا پر ہوتا ہے لہٰذا بلا وجہ تمہارے باپ دادا کیوں زندہ کیے جائیں؟ پھر رسولؐ کی زبانی اس قول میں یہاں یہ پہلو بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ میرا کام نہیں ہے، یہ زندہ کرنا اور مارنا اور پھر زندہ کرنا اللہ کا کام ہے جو تمہاری خواہشوں کا پابند نہیں ہے۔

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۚ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

''اور ہر قوم کو دیکھو گے گھٹنوں کے بل گرے ہوئے۔ ہر قوم کو دعوت دی جائے گی اُس کے نامہ اعمال کی طرف، آج تمہیں بدلا مل رہا ہے اُس کا جو تم کرتے تھے۔ یہ ہماری طرف کا نوشتہ ہے جو تمہارے خلاف سچائی کے ساتھ بول رہا ہے، ہم لکھتے رہتے تھے اُسے جو تم کرتے تھے''۔

''کتاب'' کی زیادہ ذہن میں آنے والی واضح تشریح یہی ہے کہ اُس سے نامہ اعمال مراد ہے جس کے موافق ہم نے ترجمہ کیا ہے ''نامہ اعمال کی طرف دعوت دی جائے گی''، یعنی اُس نامہ عمل کے مطابق جو اُس کی قسمت کا فیصلہ ہوگا، اُس کا اُسے پابند بنایا جائے گا۔[1] بعد والی آیت کا مضمون اسی تفسیر سے مطابقت رکھتا ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ کتاب سے مراد وہ کتاب سماوی ہے جو اُس کے لئے اُتاری گئی تھی۔[2] اور کتاب تفسیر یہ ہے کہ کتاب سے مراد وہ فرائض ہیں جو اُن پر عائد تھے[3] مگر یہاں قیامت کا ذکر ہو رہا ہے، کتاب سماوی یا فرائض کی طرف دعوت تو دارِ تکلیف سے متعلق تھی، نہ کہ قیامت کے دن سے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۰﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۫ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿۳۲﴾

''تو وہ جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کرتے رہے اُنہیں اُن کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے

---

[1] قیل معناہ الیٰ کتابہا الّذی کان یستغسخ لہا ویثبت فیہا اعمالہا (تبیان)

[2] قیل الیٰ کتابہا المنزّل علی رسولہا (مجمع الالبیان)

[3] الیٰ ما یجب علیہم من اعمالہم (علی بن ابراہیم)

گا، یہی ہے کھلی ہوئی کامیابی اور رہ گئے وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا تو کیا میری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی نہیں جاتی تھیں تو تم نے غرور سے کام لیا اور تم گنہ گار لوگ تھے اور جب کہا جاتا تھا کہ بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے؟ ہم نہیں رکھتے مگر تھوڑا سا گمان اور ہمیں یقین نہیں ہے"۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾

"اور وہ اُن کے سامنے آئیں برائیاں اُس کی جو اُنہوں نے کیا تھا اور گھیر لیا اُنہیں اُس نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے اور کہا گیا کہ آج ہم تمہیں بھلاوے میں ڈالتے ہیں جس طرح تم نے بھلایا تھا اپنے اس دن کے سامنے آنے کو اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے اور تمہارے کوئی مددگار نہیں ہیں، اس لئے کہ تم نے آیات الٰہی کا مذاق اڑایا اور تمہیں دنیوی زندگی نے فریب میں مبتلا کیا تو اب آج وہ یہاں سے نکل نہیں سکتے اور نہ اُن سے رضا جوئی کا مطالبہ ہوسکتا ہے تو شکر ہے اللہ کا جو مالک ہے آسمانوں کا اور مالک ہے زمین کا، مالک تمام جہانوں کا اور اسی کے لئے بزرگی ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی عزت والا ہے، بالکل صحیح کام کرنے والا"۔

"اُن کے سامنے آئیں برائیاں" یعنی وہ برائیاں معلوم تو دنیا میں بھی تھیں مگر اب آخرت میں اُن کے نتائج مشاہدے کی صورت میں آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ "یہ کہا گیا" اس کے لئے ضروری نہیں کہ لفظ کہا جائے بلکہ عملاً یہی ثابت ہو رہا ہے تو وہ سب سے بڑا کہنا ہے۔ دنیا میں وہ بھلائے رہے غفلت سے اور آج اُس کی پاداش میں اُنہیں بھلایا جا رہا ہے یعنی اُن کی آہ و ویلا پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی اور نظر رحمت مبذول نہیں ہوتی بر بنائے عدل و حکمت لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ "نہ اُن سے رضا جوئی کا مطالبہ ہوسکتا ہے" یعنی اب دور تکلیف گزر چکا ہے اور اب اس کا امکان نہیں کہ وہ توبہ و انابت کر کے اور اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا کر کے اللہ کی رضا حاصل کر سکیں۔[1] یہ دامنِ انسانیت کے لئے اُن کے انتہائی بُرے داغ ہونے کا ثبوت ہے کہ اُن کے انجام کی تباہی و بربادی پر حمد و شکر الٰہی ادا ہو رہا ہے۔

---

[1] ای لا یطلب منهم العتبیٰ والاعتذار لانّ التکلیف قد زال (تبیان و مجمع البیان)

سُوْرَةُ الْاَحْقَافِ

مکّیہ ----۳۵----آیات

قبیلہ عاد اور اس کے پیغمبر جناب ہود علیہ السلام کا ذکر تو قرآن مجید میں بکثرت سوروں میں ہے اور ایک سورہ بھی انکے نام پر ہے لیکن ان کے محل قیام کی نوعیت کے لحاظ سے اس سورے میں ان کا تعارف احقاف کی نسبت کے ساتھ کرایا گیا ہے جس کے معنی ریگ کے ٹیلوں کے ہوتے ہیں۔

قرآن مجید کے سوروں میں بنیادی مقصد تعلیم ہے، اس لیے مطلب کے ذہن نشین کرنے کے لیے ایک ہی تذکرہ لفظ بدل بدل کر بہت سوروں میں کیا گیا ہے چنانچہ اس سورے میں بھی حسب ذیل مضامین ہیں جو بلا شبہ دوسرے سوروں میں اکثر موجود ہیں جیسے:

سورۂ احقاف کے خاص خاص مضامین

۱.....کائنات بے کار پیدا نہیں ہوئی ہے، نہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

۲.....اللہ کے سوا کسی دوسرے کے آثار قدرت تم دکھا نہیں سکتے۔

۳.....تمہارے معبود قیامت میں تمہارے کام نہیں آئیں گے۔

۴.....رسول کوئی انوکھا پیغام لے کر نہیں آئے ہیں، نہ اپنی طرف سے کچھ کہتے ہیں۔

۵.....راہ حق میں ثابت قدم رہنے کی تعریف۔

۶.....والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم اور ماں کے حق پر خصوصی توجہ دہانی۔

۷.....حمل اور دودھ بڑھائی کی مجموعی مدّت جو ایک دوسری آیت قرآنی کے ساتھ مل کر ایک خاص حکم فقہی کی بنیاد ہے۔

۸.....جنّات کے ایک گروہ کا آیات قرآنی سننے پر تاثر اور پھر اس کی تبلیغی کارگزاری۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے"

حٰمٓ ① تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ② مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ ○

''حا میم۔اس کتاب کا اتارا جانا ہے اللہ کی طرف سے جو غالب ہے، صحیح کام کرنے والا۔ہم نے نہیں پیدا کیا آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو مگر حق بجانب طور پر اور ایک مقررہ مدت تک کے لیے اور جنہوں نے کفر اختیار کیا، ان تنبیہوں سے جو انہیں کی جاتی ہیں روگردانی کرنے والے ہیں''۔

''حق بجانب طور پر'' یعنی نہ تو بے کار و بے مقصد اور غلط طور پر [1] اور ''یعنی قیامت سے پہلے تک کے لیے۔[2]

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۴

''کہیے کیا تم نے غور کیا ہے جنہیں تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو، مجھے دکھلاؤ انہوں نے زمین کی چیزوں میں سے کیا پیدا کیا ہے یا ان آسمانوں میں کوئی شرکت ہے؟ یا کوئی علمی روایت اگر تم سچے ہو'' یعنی پہلے کی کسی کتاب میں دکھادو یا پہلے کے کسی صاحب علم کا بیان ہی پیش کردو جس میں بتایا گیا ہو کہ اللہ کے سوا کسی نے کائنات کی کسی چیز کو پیدا کیا ہے۔[3]

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَاۗىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝۵ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَاۗءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝۶

''اور کون اس سے زیادہ گمراہ ہوگا کہ جو اللہ کو چھوڑ کر اسے پکارے جو قیامت تک اس کی آواز پر لبیک نہیں کہے گا اور وہ ان کی عبادت سے بے خبر ہیں اور جب لوگ محشر میں جمع ہوں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی پوجا پاٹ سے منکر ہوں گے''۔

پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا سمجھ کر اُس کی دُہائی دے [4] جیسا کہ مشرکین معبودانِ باطل سے فریاد کرتے ہیں۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۙ هٰذَا

---

[1] ۔لم نخلقها عبثا ولا سدى (تنیان)

[2] ۔اجل مسمّى يعنى يوم القيامة (مجمع البيان)

[3] ۔بقية من علم يوثر عن الاولين (جلالين)

[4] ۔يوجّه عبادته (تنیان)

سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷

''اور جب اُن کے سامنے ہماری کھلی ہوئی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کافر لوگ حق کے لیے کہتے ہیں، جب وہ ان کے پاس آیا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے''۔ کافروں کا جادو کہنا قرآن میں بہت جگہ آیا ہے جو ان کے اس احساس کا ترجمان ہے کہ وہ غیر معمولی چیز یعنی ''خارق عادت'' ضرور ہے''۔

یہ درحقیقت اس کے معجزہ ہونے کا ایک طرح اقرار ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۭ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۸

''کیا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے جھوٹ گڑھ لیا ہے تو کہیے کہ اگر میں نے اسے جھوٹ گڑھا ہے تو تم اللہ کے مقابلے میں میرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے، وہ خوب جانتا ہے جو تم چرچے کرتے ہو، وہ کافی ہے بحیثیت گواہ کے میرے اور تمہارے درمیان۔ وہ بڑا بخشنے والا ہے مہربان''۔

یہاں ان کے جواب میں جو کہا گیا ہے، وہ درحقیقت ''معجزہ'' کی حقانیت پر اہم عقلی دلیل کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی طرف نسبت دے کر اگر غلط دعویٰ کیا جائے تو یقیناً اللہ کو اس کا علم ہوگا لہٰذا وہ اسے باطل کر یگا، اب اگر وہ ایسا نہ کرے تو سمجھنا چاہئے کہ دعویٰ سچا ہے اور اس کے ثبوت میں جو پیش کیا گیا ہے۔، وہ حقیقت میں معجزہ ہے اس دلیل عقلی پر ہمارے ''مقدمہ تفسیر'' میں بسیط تبصرہ موجود ہے۔ ''کافی ہے بحیثیت گواہ'' یعنی اس کی طرف سے ثابت ہو جائے گا کہ دعوی سچّا ہے یا جھوٹا [1] رہ گیا یہ کہ وہ تمہیں پھر اس کو جھٹلانے کی سزا کیوں نہیں دیتا؟ تو یہ اس لیے ہے کہ وہ تمہیں موقع دیتا ہے کہ شاید اب تم اپنے انکار سے باز آجاؤ تو وہ معاف کر دے کیونکہ وہ ''غفور الرحیم'' ہے۔ [2]

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۭ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۹

''کہیے کہ میں پیغمبروں میں کوئی انوکھا نہیں ہوں اور مجھے نہیں خبر کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ میں تو نہیں پیروی کرتا مگر اُس کی جو میری طرف وحی ہوتی ہے اور میں نہیں ہوں مگر صاف صاف ڈرانے والا''

''انوکھا نہیں'' یعنی میری تعلیم اصولی طور پر کوئی نہیں بلکہ بنیادی طور پر وہی تعلیم ہے جو ہمیشہ انبیاء و مرسلین دیتے چلے آئے یا صرف یہ مقصود ہو کہ پہلے پہل مجھ ہی کو رسالت نہیں ملی ہے بلکہ پہلے بھی انبیاء و مرسلین آتے رہے ہیں۔ زیادہ تر مفسرین یہی مفہوم قرار دیتے ہیں۔ [3]

---

[1] ۔یشھد منّا والمبطل (تبیان)

[2] ۔لا یعجل بالعقوبۃ قال الزجاج ھذا دعاء لھم الی التوبۃ (مجمع البیان)

[3] ۔قال ابن عباس و مجاھد و قتادۃ معناہ ما کنت باول رسول بعث (تبیان) قد سبق مثلی قبلی کثیر فکیف تکذّبونی (جلالین)

''اور مجھے نہیں خبر'' یعنی ذاتی طور پر بغیر اللہ کی طرف سے علم ملے ہوئے ''میرے ساتھ کیا جائیگا اور تمہارے ساتھ''۔ اس میں بظاہر کہنا یہ ہے کہ میں نہیں سمجھ سکتا تم پر کیا عذاب نازل ہوگا؟ مگر ان کے ساتھ اپنے کو شریک کر دینا کہ ''میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ'' یہ ایک کھلا ہوا انداز رواداری ہی ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَ كَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۰

''کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے؟ اگر وہ اللہ کی طرف سے ہوا اور تم نے اس کے ساتھ کفر اختیار کیا حالاں کہ بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے ایسے ہی پیغمبر کے آنے کی گواہی دی ہے تو وہ تو ایمان لایا اور تم نے سرکشی سے کام لیا ہے بلاشبہ اللہ ظالم لوگوں کو منزل مقصود تک پہنچایا نہیں کرتا''

''کیا تم نے غور کیا ہے اگر ایسا ہوا'' اس کا مطلب بظاہر اس طرح کا استدلال ہے جو امامؑ نے ایک منکر خدا سے کہا تھا کہ اگر خدا نہ ہوا تو ہم اور تم برابر یعنی اقرار خدا سے ہمیں کوئی نقصان تو پہنچے گا نہیں اور اگر خدا ہوا اور تم اس کا انکار کر رہے ہو، تو تم اپنے انجام پر غور کرو۔[1]

بنی اسرائیل کے گواہ سے مراد سابق زمانے کے پیغمبر موسیٰؑ و عیسیٰؑ بھی ہو سکتے ہیں لیکن مفسرین اہل سنت اس سے مراد لیتے ہیں وہ یہودی مثلاً عبداللہ بن سلام جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا اس کی رد میں کہا گیا ہے کہ یہ سورہ مکّیہ ہے اور ابن سلام نے مدینہ میں اسلام قبول کیا ہے۔[2] اس کے علاوہ میرے ذہن میں ایک یہ پہلو ہے کہ اب تو پیغمبر خدا ذاتاً موجود تھے تو جو ایمان لاتے تھے وہ آپکی شخصیت پر لہٰذا گواہی کے ساتھ علیہ کا لفظ ہونا چاہئے علیٰ مثلہ سے ظاہر ہوتا ہے جو گواہی تھی وہ اوصاف کے ساتھ تھی جو آپ پر منطبق ہیں۔ یہ انبیائے ماسلف کی گواہیاں ہو سکتی ہیں۔ پھر یہ کہ مدینہ میں یہودیوں کے علاوہ جو تھے، وہ انصار تھے، یہ بیچارے پہلے ہی ایمان لا چکے تھے، اسی بنا پر تو آپؐ کی ہجرت ہوئی اور وہ انصار کہلائے تو پھر ان سے کس طرح کہا جاتا کہ وہ ایمان لائے اور تم نے سرکشی سے کام لیا۔ اس لیے قوت پہلے قول کو معلوم ہوتی ہے کہ اس سے انبیائے بنی اسرائیل مراد ہیں مگر اس سے'' کچھ ذہن میں خلش محسوس ہوتی ہے شَاهِدٌ کی تنکیر وحدت سے جس سے معنی ہوئے ''ایک گواہ بنی اسرائیل میں سے'' حالانکہ گواہی دینے والے انبیائے بنی اسرائیل تو بہت ہیں اور خصوصیت کے ساتھ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ مراد ہوں تو وہ بھی دو (۲) ہیں نہ کہ ایک اور وہ بھی جیسے غیر معروف کوئی اسرائیلی۔ یہ الفاظ انبیا کی گواہی پر کچھ کھپتے نہیں اس لیے کیوں یہ سمجھا جائے کہ عبداللہ بن سلام نہیں جو مدینے میں اسلام لایا، کوئی یہودی یا عیسائی جس کا نام ہمیں نہیں معلوم، اس نے مکّہ میں اسلام اختیار کیا تھا اور قرآن اس کی گواہی اور ایمان اختیار کرنے کو مشرکین کے سامنے پیش کر کے ان کی قبائلی عصبیت کی بنا پر جیسے غیرت دلا رہا ہے کہ دیکھو ایک دوسری نسبی شاخ بنی اسرائیل کے آدمی نے تو گواہی دی اور ایمان اختیار کیا اور تم جو رسول خداؐ کے ہم جدی یعنی بنی اسماعیل میں سے ہو سرکشی سے کام لے رہے ہو!۔

---

[1] ۔اخبرونی ماذا حالکم جواب الشرط بما عطف علیہ الستم الظالمین دلّ علیہ: انّ اللہ لا یھدی القوم الظالمین (جلالین)

[2] ۔قال مسروق الشاھد من بنی اسرائیل ھو موسیٰ علیہ السلام قال لانّ السورۃ مکیۃ ابن سلام اسلم بالمدینۃ (تبیان)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ؕ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ⑪

''اور کہا انہوں نے جو کافر ہیں انکے لیے جو ایمان لائے ہیں کہ اگر یہ کوئی اچھی بات ہوتی تو یہ ہم پر اس میں سبقت نہ کرتے اور جب انہوں نے اس سے صحیح راستہ نہ پایا تو وہ یہ بھی کہیں گے کہ یہ پرانا جھوٹ ہے'' یہ اُن کی عجیب وغریب منطق تھی کہ وہ اپنے کو معیار حق اور دوسروں کو معیار باطل قرار دے رہے تھے کہ اگر یہ صحیح راستہ ہوتا تو یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ دوسرے اس میں آگے بڑھ جائیں اور ہم اس میں پیچھے رہیں حالانکہ حق خود ناقابل تبدیل معیار ہے۔ دوسروں نے اگر اس کے اختیار کرنے میں سبقت کی تو یہ ان کے خوش نصیب ہونے کی دلیل ہے اور یہ اگر اس کے اختیار کرنے میں پیچھے رہے تو یہ ان کی بدنصیبی کی دلیل ہے۔

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۚ ⑫

''اور اس کے پہلے موسیٰ کی کتاب پیش رو بن کر آئی تھی اور رحمت اور یہ ایک تصدیق کرنے والی کتاب ہے عربی زبان میں تاکہ متنبّہ کرے انہیں جو ظالم ہیں اور خوش خبری نیک اعمال لوگوں کے لیے''۔

اس کے پہلے کی کتاب یعنی توریت کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ ان مشرکین کا اس قرآن کو نہ ماننا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کے پہلے انہوں نے توریت کو کب مانا؟[1] اور توریت کو ''پیش رو'' اس لیے کہا گیا ہے کہ کتب سماوی میں جو چار ہیں، وہ سب سے مقدم ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۚ ⑬ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑭

''بلاشبہ وہ جنہوں نے کہا کہ ہمارا مالک اللہ ہے، پھر اس اقرار پر برقرار رہے، انہیں کوئی ڈر نہیں ہے اور نہ انہیں افسوس ہوگا۔ یہ بہشت والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے، صلے میں اس کے جو وہ کرتے تھے''۔

ایمان پر برقرار رہنے کا اجر

یہ تعریف ان کی جو حق پر قائم رہتے تھے اور باطل کے سامنے سر نہیں جھکاتے، دوسری لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے بیعت یزید سے انکار پر قائم رہتے ہیں۔ دنیا والے اُنہیں ''ضدی'' کہتے ہیں اور اپنی بات پر قائم رہنے کی تعبیر یوں کرتے ہیں کہ ''ضد سے کام لیا'' مگر قرآن اس کی تعریف کر رہا ہے اور ان کے کردار کو مثالی حیثیت سے پیش کر رہا ہے۔ ''خوف'' سے جس کی نفی ہوئی ہے دنیا کے مصائب کا ڈر مراد نہیں ہے یہ ڈر تو

---

[1] ۔فی الکلام محذوف یتمّ به المعنیٰ تقدیرہ فلم یهتدوا به (مجمع البیان)

خاصان خدا کے لیے انواع ابتلاء میں سے ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ.

اور ضرور ہم تمہاری آزمائش کریں گے کسی نہ کسی چیز کے ساتھ: ڈر، بھوک اور مال، جان اور پھلوں کا نقصان۔ (البقرۃ-۱۵۵)

پھر جب اس آیت میں انواع ابتلا میں سب سے پہلے خوف کا ذکر ہے تو اس کی نفی کیوں کر ہو سکتی ہے بلکہ ڈر سے مراد انجام کی ناکامی کا ڈر ہے اور آخرت کے مواخذے کا اور رنج وہاں کے ہولناک مناظر کو دیکھ کر۔[1] اس کے علاوہ یہ رنج جسکی اُن سے نفی ہوتی ہے، اپنے کئے ہوئے پر پچھتاوا بھی ہو سکتا ہے یعنی یہ افسوس کہ ہم نے ایسا کیوں کیا؟ نہ غم و رنج جو نقصان جان و مال اور عزیزوں کے داغ اٹھانے کا لازمی نتیجہ ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ؕ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْۤ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

اور ہم نے انسان کو ہدایت کی ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی۔ اس کی ماں نے اسے پیٹ میں رکھا زحمت کے ساتھ اور اسے جنم بھی دیا زحمت کے ساتھ اور اس کے پیٹ میں رہنے اور دودھ سے چھوٹنے کی مدت تیس (۳۰) مہینے ہوئی، یہاں تک کہ جب وہ جوان ہوا اور چالیس (۴۰) برس تک پہنچا تو اس نے کہا اے میرے پرودگار! مجھے توفیق عطا کر کہ میں شکر ادا کروں تیرے اس احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا اور یہ کہ میں نیک کام کروں اور میرے لیے میری اولاد میں نیکی قائم رکھ۔ میں تجھ سے لو لگائے ہوں اور میں سر تسلیم خم کیے ہوئے ہوں، یہ وہ ہیں کہ ہم قبول کریں گے اُن سے بہترین اعمال جو انہوں نے کئے ہوں اور ان کی غلطیوں سے درگزر کریں گے، جنّت والوں میں۔ یہ سچا وعدہ ہے جو برابر سے ہوتا رہا تھا"۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ماں کے حق پر خصوصی توجہ دہانی

حمل اور دودھ سے چھوٹنے کی مجموعی مدت چونکہ یہاں تیس (۳۰) مہینے بتائی گئی ہے اور دوسری جگہ قرآن میں رضاعت یعنی دودھ پلانے کی مدت: حولین کاملین "دو سال پورے" بتائی گئی ہے۔ (۳۰) مہینے سے دو (۲) سال نکالنے کے بعد چھ (۶) مہینے بچتے ہیں جس سے

---

[1] ۔لا خوف علیہم من العقاب فی الآخرۃ ولا یحزنون مناھوال القیامۃ (تبیان)

علماء نے یہ استنباط کیا ہے کہ کم از کم مدت حمل از روئے قرآن چھ مہینے ہے۔[1] یہ تو مفہوم آیت ہے جو عام ہے اور اس سے یہ حکم شرعی ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی بچہ شادی ہونے کے بعد چھ (۶) مہینے گزرنے پر پیدا ہو تو اسے حلال سمجھا جائے گا اور وہ اسی باپ کی اولاد سمجھا جائے گا جس سے اس عورت کی شادی ہوئی۔ یہ ہے مفہوم کی وسعت کا نتیجہ مگر چونکہ واقعات کی دنیا میں مذہبی تاریخ میں یہ آیا ہے کہ یہ بات اولین حضرت یحییٰؑ کے لیے تھی کہ وہ ماں کے پیٹ میں بس چھ (۶) مہینے رہے اور اس امت میں یہ چیز حضرت امام حسینؑ کے لیے ہوئی کہ آپ بطن مادر میں چھ (۶) مہینے رہے، اس لیے بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ یہ آیت امام حسینؑ کی شان میں اتری ہے[2] اور یہ بھی ایک روایت ہے اُن آیات میں سے جن سے ان کی آنکھیں کھلنا چاہئیں جو ائمہ معصومینؑ کے بحیثیت انسان تذکرہ پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ وہ دیکھیں کہ قرآن ان حضرات کا تذکرہ انسان ہی کہہ کر کرتا ہے۔

وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِیْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ ۚ وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ۖ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۖ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۱۸﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِیُوَفِّیَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور وہ جس نے اپنے ماں باپ سے کہا ''افوہ! میں تم دونوں سے عاجز آ گیا، کیا تم مجھے امید دلاتے ہو کہ میں (پھر اٹھا قبر سے) نکالا جاؤں گا حالانکہ کتنی ہی نسلیں میرے پہلے گزر چکی ہیں اور وہ دونوں اللہ سے فریاد کرتے رہے، ارے وائے ہو تجھ پر ایمان لے آ۔ بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے تو وہ یہی کہتا رہا کہ یہ نہیں ہے مگر پرانے قصّے۔ یہ وہ ہیں جن پر عذاب کا فیصلہ نافذ ہو چکا ہے ان قوموں کے ضمن میں جو آدمیوں اور جنّات میں سے اُس کے پہلے گزر چکی ہیں۔ بلاشبہ وہ لوگ گھاٹے میں تھے اور ہر ایک کو جو انہوں نے عمل کیے ہیں۔ اسی لحاظ سے درجے حاصل ہوتے ہیں اور یہ اس لیے کہ اُنہیں اُن کے اعمال کا پورا پورا بدلا مل جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائیگا''۔

شان نزول جو مستند طریقے سے وارد نہیں ہوئی، صرف ایک نقل قول کی حیثیت کی رکھتی ہے، اس محل پر عبدالرحمان بن ابوبکر کا نام آیا ہے اور کتب تاریخ میں ملتا ہے کہ جب عبدالرحمان بن ابوبکر نے بیعت یزید سے انکار کیا تو امیر شام نے کہا کہ اس شخص کے بارے میں تو یہ آیت قرآن اتری ہے۔[3] اس پر جناب عائشہ نے انکار کیا اور بتایا کہ نہیں، یہ آیت دوسرے شخص کے بارے میں آئی ہے، ان کے لیے نہیں رہے۔ بہرحال

---

[1] ۔اکثر مدۃ الرضاع اربعۃ وعشرون شھرا واقلّ مدۃ الحمل ستتہ اشھر (تبیان)

[2] ۔کان الحسینؑ فی بطن امہ ستتہ اشھر وفصالہ اربعۃ وعشرون شھر اوھو قول اللہ :وحملہ وفصالہ ثلاثون شھراً (علی ابن ابراھیم)

[3] ۔قیل انّ الآیۃ نزلت فی عبدالرحمٰن بن ابی بکر (مجمع البیان)

آیت کا مضمون کسی خاص نام سے وابستہ نہیں ہے۔ جو کوئی بھی ایسا ہو، اُس کے لیے یہ باتیں ہیں جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۝۲۰

''اور جس دن کافر لوگ آگ کے سامنے لائے جائیں گے، تم نے اپنی سب دولتیں اپنی دنیاوی زندگی میں ختم کر دیں اور ان سے فائدہ اٹھایا۔ اب آج تمہیں ذلت کے عذاب کی سزا ملے گی اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق سرکشی سے کام لیتے تھے اور اس لیے کہ تم بداعمالی میں مبتلاء تھے''۔

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ؕ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖۤ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۲۱

''اور یاد کرو عاد کی برادری والے کو جب انہوں نے اپنی قوم کو احقاف میں متنبہ کیا اور بہت سے متنبہ کرنے والے ان کے آگے اور پیچھے گزر چکے ہیں کہ عبادت نہ کرو کسی کی سوائے اللہ کے۔ میں تمہارے لیے ڈرتا ہوں ایک بڑے دن کے عذاب سے''

احقاف اُس خطے کا نام تھا جو قبیلہ عاد کا مسکن تھا، چونکہ احقاف ریت کے ٹیلوں کو کہتے ہیں اور وہاں بڑے بڑے ٹیلے تھے، اس لیے اس کا نام ''احقاف'' ہوا۔ اس کے محل وقوع کے بارے میں قدیم مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے ان اقوال کو شیخ الطائفہ نے تبیان میں درج فرمایا ہے اور عاد کی برادری والے سے مراد جناب ہودؑ ہیں جو اسی قوم سے تھے اور اس کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ ''بہت سے پیغمبر ان کے آگے اور پیچھے گزر چکے ہیں'' اس سے جناب ہودؑ کا دور بتانا ہے کہ وہ وسطی دور سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ ان کے قبل بھی بہت سارے انبیاء آ چکے تھے اور ان کے بعد بھی بہت سے انبیا آئے۔ نہ یہ کہ جب وہ آئے تو بہت سے انبیا ان کے قبل اور بعد گزر چکے تھے کیوں کہ جب وہ انبیاء ان کے بعد تھے تو اس وقت ان کے لیے گزرنے کا اطلاق کیا صحیح ہو سکتا ہے؟

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۲۲ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝۲۳

''ان لوگوں نے کہا کہ کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہمیں ہمارے خداؤں سے منحرف کر دو تو لے آؤ'' ہم پر اسے جس سے ہمیں دھمکاتے ہو اگر تم سچے ہو۔ کہا (اس کا) علم بس اللہ کو ہے اور میں تو تم تک اسے پہنچاتا ہوں جس پیغام کے

ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے مگر میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ جہالت سے کام لیتے ہو"

"علم بس اللہ کو ہے" یعنی عذاب کا صحیح وقت کہ کب آئے گا؟ میرے حدود علم سے باہر ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ؕ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۴﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۵﴾

"تو جب انہوں نے اسے ایک بادل کی صورت میں جو ان کی وادیوں کی طرف رخ کیے ہوئے تھا دیکھا تو کہنے لگے یہ بادل ہے جو ہم پر پانی برسائے گا بلکہ یہ وہ ہے جس کے لیے تم جلدی کر رہے تھے ایک ہوا جس میں دردناک عذاب ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنے پروردگار کے حکم سے تباہ و برباد کر دے گی چنانچہ ان کا یہ عالم ہو گیا کہ سوائے ان کے مکانات کے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس طرح ہم سزا دیتے ہیں گناہگار لوگوں کو"

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۲۶﴾

"اور ہم نے انہیں اقتدار دیا تھا اتنے حلقے میں کہ جس میں تمہیں اقتدار نہیں دیا ہے اور اُن کے لیے ہم نے طاقت سماعت اور نگاہیں اور دل قرار دیئے تھے تو نہیں فائدہ پہنچایا انھیں انکی سماعت نے اور نہ نگاہوں نے اور نہ دلوں نے کچھ بھی جبکہ وہ آیاتِ الٰہی کا جان بوجھ کر انکار کرتے تھے اور گرفتار کیا انہیں اسی نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے"

یعنی وہی عذاب جس کی خبروں کو سن کر وہ ہنسی میں اڑاتے تھے، اب انہیں گھیرے ہوئے تھا۔ "کان، آنکھیں اور دل سب انہیں دیے گئے تھے یعنی تمام ذرائع ادراک جن سے وہ آیات الٰہی اور قدرت کی نشانیوں کو سن بھی سکتے تھے، دیکھ بھی سکتے تھے اور ان پر غور بھی کر سکتے تھے، یہ چیزیں اگر انہیں دی نہ گئی ہوتی تو وہ معذور تھے مگر یہ سب چیزیں انہیں دی گئی تھیں اور انہوں نے ان سب سے فائدہ نہیں اٹھایا[1] اس لیے وہ عذاب الٰہی کے مستحق ہیں۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾

---

[1] ۔لم ينفعهم جميع ذالك لانّهم لم يعتبروبها ولا فكروا فيها (تبيان)

''اور ہم نے ہلاک کیا ہے تمہارے گرد و پیش کی بستیوں کو اور بار بار (حق کی) نشانیاں پیش کی تھیں، شاید وہ پلٹیں تو کیوں نہ انکی مدد کی انہوں نے جنہیں انہوں نے تقرب کے طور پر اللہ کے سوا خدا بنا رکھا تھا بلکہ وہ ان سے غائب ہو گئے اور اب یہ ہے ان کا جھوٹ اور جو کچھ وہ من گھڑت باتیں بناتے تھے''۔

یعنی یہ نتائج ان کی باطل پرستی اور غلط روی کے ہیں جو تمام دنیا کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۰﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾ وَمَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾

''اور جب ہم نے موڑا آپ کی طرف جنات کے کچھ افراد کو جو غور سے قرآن سن رہے تھے تو جب وہ آپ کے پاس آئے، آپس میں کہنے لگے خاموش سنتے رہو تو جب آپ پڑھ چکے تو وہ اپنی قوم کی طرف پلٹے ہدایت کرتے ہوئے، کہنے لگے اے ہماری قوم والو! ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد اتاری گئی ہے تصدیق کرتی ہوئی اُس کی جو اس کے پہلے ہے، وہ ہدایت کرتی ہے حق کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف۔ اے ہماری قوم والو! البیک کہو اللہ کی طرف بلانے والے کی صدا پر اور اس پر ایمان اختیار کرو کہ وہ بخشے کچھ تمہارے گناہ اور تمہیں پناہ دے دردناک عذاب سے اور جو لبیک نہ کہے اللہ کی طرف بلانے والے کی صدا پر تو وہ دنیا میں قبضہ قدرت سے باہر نکلنے والا نہیں ہے اور نہ اس کے لیے اسے چھوڑ کر کوئی حوالی موالی ہوں گے۔ یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں''

قرآن مجید کے متعدد آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت پیغمبرؐ خدا کے دائرہ رسالت میں جنات بھی تھے [1] لیکن دوسرے آیات سے یہ بھی بلاشبہ ثابت ہے کہ پیغمبروں کو اور جو رہنمائے خلق ہوں اُس مخلوق کا ہم جنس ہونا چاہیے، جو عقلی طور پر بھی ضروری ہے۔ ان دونوں باتوں کو دیکھتے ہوئے ہم نے ایک محل پر اسی تفسیر میں یہ رائے قائم کی ہے کہ کتابی رہنمائی اور اقوال سے ہدایت کے دائرہ میں تو دوسری جنس یا دوسری نوع کے افراد بھی داخل ہو سکتے ہیں مگر عملی رہنمائی انہی کو حاصل ہو سکتی ہے جو جنس و نوع میں متحد ہوں، یعنی دعوت اطاعت میں اتحاد جنس و نوع کی شرط نہیں ہے لیکن دعوتِ اتباع میں شرط ہے اور نوع انسانی کو چونکہ دعوت اتباع بھی ہے لہٰذا رسول اور امام کو لازماً انسان اور بشر کی نوع میں داخل ہونا ضروری ہے۔

---

[1] ۔ کان مبعوثا الی الجن کما کان مبعوثا الی الانس (مجمع البیان)

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾

''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے عاجز نہیں ہوا، وہ قادر ہے اس پر بھی کہ مُردوں کو زندہ کرے، کیوں نہیں؟ یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے اور جس دن کافر لوگ آگ کے سامنے لائے جائیں گے، کیا یہ سچ نہیں ہے؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں؟ قسم ہمارے پروردگار کی، اُس نے کہا کہ پھر چکھو اس عذاب کو اس وجہ سے کہ تم انکار کرتے تھے''

مشرکین عرب اللہ کو مانتے تھے اور اسے خالق آسمان وزمین بھی جانتے تھے لیکن حیات بعد الموت ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس لیے قرآن نے بار بار ابتدائی تخلیق کو جسے وہ مانتے تھے، ان کے سامنے پیش کر کے انہیں متنبہ کیا ہے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

''تو صبر و برداشت سے کام لیجئے جس طرح صبر کیا اور اولوالعزم رسولوں نے اور ان کے لیے جلدی نہ کیجئے، گویا وہ جب دیکھیں گے اُسے جس عذاب کی انہیں خبر دی جا رہی ہے تو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ نہیں رہے تھے (دنیا میں) مگر دن کے ایک مختصر حصے میں یہ پیغام پہنچا دینا ہے تو ہلاکت میں کیا فاسق لوگوں کے علاوہ کوئی اور پڑیں گے؟''

الوالعزم پیغمبروں کی تعداد

بعض نے اولوالعزم کے لغوی مفہوم کے لحاظ سے یعنی ''ہمّت والے'' کہا ہے کہ سب ہی انبیا اور اولوالعزم تھے اور من الرسل میں من بیانیہ ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ صاحب ہمّت لوگ جو تمام پیغمبر تھے، مگر دینی اصطلاح یہ ہے کہ اولوالعزم، رسولوں میں سے کچھ خاص پیغمبر تھے اور اس طرح من تبعیض کے لیے قرار پاتا ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ رسولوں میں سے وہ جو صاحب عزم تھے۔ اب یہ اولوالعزم پیغمبر کون ہیں؟ ان میں اختلاف ہے لیکن جو ہمارے ائمہ معصومین علیہم السلام سے مروی ہے، وہ یہ کہ یہ وہ صاحب شریعت پیغمبر ہیں جن کے لائے ہوئے قانون سے سابق شریعت منسوخ ہوئی ہے وہ یہ پانچ ہیں: حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ اور آخر میں ہمارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ [1]

---

[1] ۔ھو المروی عن ابی جعفر علیہ السلام وابی عبداللہ علیہ السلام (مجمع البیان)

سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ

مدنیہ----۳۸----آیات

چونکہ اس سورے کے شروع کی دوسری ہی آیت میں ہمارے پیغمبر خاتم الانبیاءﷺ کا نام نامی درج ہے، اس سورے کا نام حضرتؐ کے نام پر ہوا۔

سورۂ محمد کے خاص خاص مضامین:

۱.....دشمنوں سے جنگ کی صورت میں مسلمانوں کو ہدایتیں۔

۲.....شہدائے راہ حق کے لیے حسن انجام کی بشارتیں۔

۳.....خدا کی مدد کرو تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔

۴.....کافروں کی لذائذِ دنیا سے متمتع ہونا مثل چوپایوں کے ہے لیکن انجام ان کا دوزخ ہے۔

۵.....رسولؐ کے خطبوں میں بعض حاضر ہونے والوں کی حالات۔

۶.....پیغام جہاد سن کر بعض مسلمانوں کی حالت۔

۷.....کچھ ذمہ دار مسلمانوں کو انتباہ کہ اقتدار حاصل ہونے کے بعد ان کا کردار کیا ہوگا؟

۸.....قرآن میں غور وفکر سے کام لینے کی دعوت اور اس کے خلاف جانے کی مذمت۔

۹.....منافقین کا لب ولہجہ، ان کی پردہ کشائی کے لیے کافی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ① وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ②

''وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، اُس نے ان کے اعمال کو اکارت کر دیا اور جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیئے اور اس پر جو محمدؐ پر اتارا گیا، ایمان لائے اور وہ سراسر حق ہے ان کے پروردگار

کی طرف سے تو اُس نے اُن کی غلطیوں سے درگزر کیا اور اُن کی حالت کو درست کیا''

اضل اعمالھم جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ''ان کے اعمال کو اکارت کر دیا''.....اس میں ظاہر ہے کہ اعمال سے مراد وہی اعمال ہیں جو ذاتاً خیر ہیں اور شرائط صحت کے وجود کی صورت میں باعث ثواب ہوتے ہیں۔[1]

لیکن چونکہ ایمان بنیادی طور پر شرط نجات ہے جو ان میں مفقود ہے لہٰذا ان کے عمال اکارت ہو جاتے ہیں یعنی ان کا کوئی اجر انہیں حاصل نہ ہوگا۔اس میں کوئی پیچدگی نہیں ہے لیکن بعض حضرات نے اسے علم کلام کے مسئلہ ''احباط'' سے مرتبط کر کے ذرا پیچیدہ طور پر توجیہ کی ہے کہ وہ کفار ان کے اعمال کو غلط طور پر انجام دیتے ہیں مثلاً وہ خیرات کرتے ہیں تو کفار و مشرکین پر کرتے ہیں یا غلط مقاصد میں صرف کرتے ہیں اس لیے ان کا ثواب نہیں ملتا۔ہمارے نزدیک اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ تشریح غلط ہے اس بنا پر کہ کتنے ہی بجائے خود اچھے کاموں میں وہ صرف کریں اور مؤمنین وصالحین ہی کو دیں، تو کیا انہیں باوجود کفر اس پر اجر و ثواب ملے گا؟

جناب شیخ طائفہؒ نے اس کی تشریح یوں فرمائی ہے کہ اللہ ان کے اعمال پر یہ حکم لگاتا ہے کہ یہ گم ہیں یعنی کالعدم ہیں بظاہر اس کا نتیجہ وہی ہے جو عرض کیا گیا۔دوسری بات آیت میں قابل غور یہ ہے کہ سرنامہ کلام ہے: الذین آمنوا وعملوا الصالحات اس کا مطلب ہوا نیکوکار مسلمان۔اب اس کے بعد مزید جو کہا گیا ہے: وآمنوا بما نزّل علیٰ محمد وھو الحق من ربھم 'اور ایمان لائے اس پر جو حضرت محمد ﷺ پر اتارا گیا اور وہ سراسر حق ہے ان کے پروردگار کی جانب سے'' تو کیا اس سے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ یہ کوئی خاص نازل ہونے والی اہم بات ہے جسے نیکوکار مسلمانوں کے لیے حسن انجام کی شرط قرار دیا گیا ہے۔اس کے ساتھ جب ہمیں مل جاتا ہے قرآن میں ایسی اہم بات کا پتہ جس کے لیے رسولؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:۔

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (المائدہ-٦٧)

''پہنچا دیجیے اسے جو آپؐ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا گیا ہے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو کچھ اس کی رسالت پہنچائی ہی نہیں۔

تو دل یہ کہتا ہے کہ وہ ما نزل علیٰ محمد جسے ''ایمان اور عمل صالح'' کے ساتھ خصوصیت سے کہا گیا ہے۔وہ یہی "ما انزل الیك من ربك" والا اہم پیغام ہوسکتا ہے جس کے پہنچائے بغیر رسولؐ کی پوری تبلیغ کالعدم ہو رہی تھی تو ایک مسلمان کا اسلام بغیر اس کے مانے ہوئے کب نتیجہ خیز ہوسکتا ہے!۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝

''یہ اس بنا پر ہے کہ جنہوں نے کفر اختیار کیا، انھوں نے باطل کی پیروی کی اور جنہوں نے ایمان اختیار کیا، انہوں نے اپنے پروردگار کی طرف کے حق کی پیروی کی۔اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کے اوصاف بیان کرتا ہے''۔

---

[1] ۔اعمالھا الّتی کان فی زعمھم انّھا قربۃ وانّھا تنفعھم کالعتق والصدقۃ وقری الضیف.(جمع البیان)

امثال کا ترجمہ اوصاف کے ساتھ اس لفظ کے ان معنی کے مطابق ہے جو متعدد جگہ قرآن مجید میں موجود ہیں جیسے:

مثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (الرعد ۳۵)

(تا آخر آیت) ظاہر ہے کہ وہاں کوئی مثال نہیں دی گئی ہے بلکہ معنی یہی ہیں کہ اس جنت کا وصف یہ ہے یہی معنی یہاں بھی ہیں۔[۱]

علامہ طبرسیؒ نے امثال کو مثالوں ہی کی معنی میں لے کر کئی مفہوم درج کیے ہیں جن میں سے کوئی بھی دل کو لگنے والا نہیں ہے۔

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ ذٰلِكَ ؕ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا۠ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۴ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝۵ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝۶

''تو جب تمہاری مڈبھیڑ کافروں سے ہو تو ایک دم گردنیں اڑاؤ یہاں تک کہ جب خوب مار لو تو پھر قیدی بناؤ، اس کے بعد یا احسان کرو یا فدیہ لے لو یہاں تک کہ جنگ موقوف ہو۔ یہ صورت حال اور اگر اللہ چاہتا تو خود ان سے انتقام لیتا۔ مگر اسکا مقصد تو یہ ہے کہ تم میں سے ایک کی دوسرے کے ذریعے سے آزمائش کرے اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہو گئے تو وہ ہرگز ان کے اعمال کو اکارت نہ کرے گا۔ وہ ان کو منزلِ مقصود تک جلد پہنچائے گا اور ان کی حالت درست کرے گا اور انہیں بہشت میں داخل کرے گا جس کا ان سے تعارف اُس نے کر دیا تھا''۔

دشمنوں سے جنگ کی صورت میں مسلمانوں کو ہدایتیں

گردنیں اڑانے سے مراد بطور محاورہ قتل کرنا ہے۔ چونکہ زیادہ تر قتل کا عنوان اس دور میں گردن کا قطع کرنا ہوتا تھا اس لیے قتل کی تعبیر اس لفظ سے کی ہے۔[۲]

''جب خوب مار لو'' یعنی کثیر التعداد افراد کو قتل کر لو[۳] جس سے پوری جماعت چور چور ہو جائے۔[۴]

تو پھر باقی ماندہ افراد کو قیدی بناؤ۔ اس کے بعد تمہیں اختیار ہے کہ ''احسان کرو'' یعنی یوں ہی رہا کر دو یا فدیہ لے لو۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں قیدی بنانے اور فدیہ لے اور فدیہ لے کر چھوڑنے پر اظہار ناراضگی ہے۔ درحقیقت ایسے مقامات پر سمجھنے میں دشواری ترتیب کے مطابق

---

[۱] ۔یکون التقدیر یضرب اللہ للناس صفات اعمالھم (تبیان)

[۲] ۔المعنی اقتلوھم (مجمع البیان) عبر بضرب الرقاب لان الغالب فی القتل ان یکون بضرب الرقاب... (جلالین)

[۳] ۔اکثرتم فیھم القتل (جلالین)

[۴] ۔جب چور کر دو ان کو (شاہ رفیع الدین)

تنزیل نہ ہونے سے پیدا ہوئی ہے۔اس لیے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مذمت کن حالات میں ہوئی تھی اور یہ صراحت کہ تمہیں اختیار ہے، چاہے چھوڑ دو یا فدیہ لے لو، کس موقع پر تھی؟

''اگر اللہ چاہتا تو خود ان سے انتقام لیتا'' یعنی دشمنوں پر وہ عذاب نازل کر دیتا تو تمہیں جہاد کی ضرورت نہ ہوتی مگر پھر تمہارے جوش ایمانی اور نصرت حق کا امتحان کیوں کر ہوتا؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝٧ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝٨ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝٩

''اے ایمان لانے والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدمی عطا کرے گا اور جنہوں نے کفر اختیار کیا تو ان کے لیے ہلاکت ہے اور اس نے ان کے اعمال کو برباد کر دیا ہے۔یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے ناپسند کیا اسے جو اللہ نے اتارا تو اُس نے اُن کے تمام اعمال کو اکارت کر دیا''۔

خدا کی مدد کرو تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور ثابت قدمی عطا کرے گا

چونکہ اللہ بے نیاز مطلق ہے ذاتاً اس کی کوئی مدد نہیں کی جا سکتی لہٰذا اس کی مدد کے معنی ہیں تبلیغ دین میں جدوجہد اور جب موقع ہو تو میدان جنگ میں نصرت یعنی یہ دین یا اس کے پیغمبر کی مدد اللہ کی مدد ہے۔اب اس نے اپنی مدد کے ساتھ جو وعدہ کیا ہے، وہ یہ کہ تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔اس کے بعد کسی فرد یا جماعت میں ثابت قدمی نظر نہ آئے تو ماننا پڑے گا کہ وہ درحقیقت اللہ کی مدد نہیں کر رہے ہیں اور کچھ مفادات کی خاطر میدان میں نظر آتے ہیں۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۙ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝١٠ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝١١ۧ

''تو کیا وہ اطراف زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کیسا انجام ہوا ان کا جو ان کے پہلے تھے۔اللہ نے انہیں تہس نہس کر دیا اور ان کافروں کے بھی ویسے ہی انجام ہیں۔یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ سرپرست ہے ان کا جو ایمان لائے اور کافروں کا کوئی سرپرست نہیں ہے''

''چونکہ عذاب الٰہی کی شکلیں مختلف ہوا کی ہیں، سب پر ایک ہی طرح عذاب نہیں ہوا کیا، اس لیے ممکن ہے اس وقت کے کافران اقسام عذاب میں مبتلا ء نہ ہوں جو پہلی امتوں پر آتے رہے، یہاں ممکن ہے یہ انکا استیصال حکم تشریعی کے ذریعے سے یعنی مسلمانوں کو حکم جہاد

دے کر ہو جیسا کہ قبل کی آیتوں سے ظاہر ہے مگر نتیجہ اس کا بھی وہی تباہی و بربادی ہے، اس لیے کہا گیا امثالھا ''ویسے ہی انجام ہیں''

إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ⑫

''اللہ داخل کرے گا انہیں کہ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں اور جنہوں نے کفر اختیار کیا، وہ فائدہ حاصل کر رہے ہیں اور کھا رہے ہیں جیسے چوپائے کھاتے ہیں اور دوزخ ان کی جگہ ہے''۔

آخر کا جملہ نتیجے میں انہیں چوپایوں سے بدتر قرار دیتا ہے، اس لیے کہ چوپائے دنیا میں جو کھاتے پیتے اور مزے کرتے ہیں، اس کے بعد کوئی سزا آخرت میں انہیں ملنے والی نہیں ہے اور یہ دنیا کی زندگی میں مثل چوپایوں کے ہیں اور آخرت میں ان کا ٹھکانا دوزخ میں ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ⑬

''اور بہت سی بستیاں ہیں جو آپ کی اُس بستی سے جس نے آپ کو نکلنے پر مجبور کیا تھا؟ زیادہ طاقت ور تھیں۔ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا تو کوئی ان کا مددگار نہیں''۔

اس ''بستی'' سے مراد مکّہ معظّمہ ہے جہاں سے آپ حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے نکلنے پر مجبور ہوئے۔[1]

اور نکالنے کی نسبت ان کی طرف اسی اعتبار سے ہے کہ وہ اگر ایمان لاتے اور تبلیغ دین کے راستے میں جو آپ کی زندگی کا من جانب اللہ مشن تھا رکاوٹیں پیدا کرنے کی برابر کوشش نہ کرتے تو آپ اہل مدینہ کی دعوت کو کیوں قبول کرتے اور وہاں سے نکلنے پر آمادہ کیوں ہوتے؟!

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ⑭

''تو کیا جو اپنے پروردگار کی طرف کے کھلے ہوئے راستے پر ہو، وہ اس کی طرح ہے جسے اس کی بداعمالیوں آراستہ و پیراستہ محسوس ہوتی ہیں اور جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی ہے''۔

''کھلے ہوئے راستے پر ہو'' یعنی اس کا ضمیر مطمئن ہو کہ جس راستے پر وہ قائم ہے، بالکل صحیح ہے۔ اب اُس کے مقابلے میں کون ہے؟ جسے اس کی بداعمالیاں آراستہ و پیراستہ محسوس ہوتی ہیں'' کچھ لوگ اس سے مشرکین کو سمجھتے ہیں مگر معصومؑ کی حدیث یہ بتاتی ہے کہ اس سے منافق مراد ہیں۔[2]

---

[1] ۔یعنی اهل مکه الذین اخرجوك منها (علی ابن ابراهیم)

[2] ۔هو المروی عن ابی جعفر (مجمع البیان)

اور اب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بداعمالیوں کے آراستہ پیراستہ محسوس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو سیاسی پالیسی اختیار کیے ہوئے ہیں، وہ اس کو بڑی عقل مندی سمجھتے ہیں اور اس پر خوش ہیں۔ خالق کا ارشاد ہے کہ ''کیا یہ دونوں یکساں ہے؟'' اور اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ یکساں نہیں ہیں بلکہ پہلے والے نجات پائیں گے اور یہ ہلاکتِ ابدی میں گرفتار ہونگے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ⑮

''(کیا) مثال اس بہشت کی جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے جس میں نہریں ہیں ایسے پانی کی جس میں ذرا بھی رنگ میں تبدیلی نہیں اور نہریں ہیں ایسے دودھ کی جس کا مزہ نہیں بدلا اور نہریں ہیں ایسی شراب کی جو پینے والوں کے لیے خوش ذائقہ ہے اور نہریں ہے صاف کیے ہوئے شہد کی اور ان کے لیے ان میں ہر طرح کے پھل ہیں اور بخشش ہے اُن کے پروردگار کی طرف سے، اُس کی سی ہے جو ہمیشہ آگ میں رہنے والا ہو اور جنہیں پینے کو گرم پانی ملے تو وہ ان کی آنتوں کے ٹکڑے اڑا دے''؟

اس میں دو باتیں عقل سے سمجھنے کی ہیں؛

ایک تو یہ کہ یہ جملہ خبریہ نہیں بلکہ سوالیہ ہے کیونکہ پہلے جنت اور اس کے اوصاف ہیں اور پھر کاف حرف تشبیہ کے ساتھ جس کے معنی مثل کے ہوتے ہیں دوزخ کا ذکر ہے اور اس کے کیفیات اور ظاہر ہے کہ بہشت مثل دوزخ کے نہیں ہے لہٰذا آیت کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ وہ مثل اس کے ہے تو اسے ماننا لازم ہے کہ یہ استفہام انکاری ہے یعنی وہ سوال جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس لیے شروع میں ترجمے کے اندر ہم نے بریکٹ میں ''کیا'' کا لفظ رکھی ہے اور حرف استفہام کا حذف کرنا انداز تلفظ کی مدد سے ہر زبان میں جاری وساری ہے جیسے کوئی آپ کی توقع کے خلاف آجائے اور آپ کہیں ''آپ آگئے''؟ اسی طرح مثل الجنۃ سے لے کر آخر تک لکھنے کے بعد سوالیہ نشان بنا دیجئے (؟) بنا دیجئے اور اس انداز سے تلفظ کیجئے تو استفہام کا مطلب نکل آئے گا۔ اس میں اصول تکلم کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پہلی جگہ مکان کے اوصاف ہیں جو بہشت ہے اور دوسری جگہ ''ک'' (حرف تشبیہ) کے بعد مکینوں یعنی اہل دوزخ کا ذکر ہے۔ یہاں بھی مطلب ظاہر ہے کہ ان بہشتوں کے رہنے والے ان دوزخ کے رہنے والوں کے مثل نہیں ہیں۔ اسے علماء یوں کہتے ہیں کہ یہاں پر جملے کا مبتدا مقدر یعنی پوشیدہ ہے۔[1]

حالانکہ ہمارے نزدیک لفظی طور پر نہ اس کے مذکور ہونے کی ضرورت ہے نہ مقدر جب کہ مطلب عقل کی مدد سے سمجھ میں آجاتا ہے، چاہے الفاظ ہوں یا نہ ہوں۔

---

[1] ۔ کمن ھو خالد فی النار خبر مبتدا مقدر ایامن ھو فی ھٰذا النعیم (جلالین)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ⑯

''اوران میں ایسے بھی ہیں جو(بظاہر) آپ کی باتوں کو سنتے ہیں، یہاں تک کہ جب آپ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ان سے جنہیں علم ملا ہے' کہ یہ انھوں نے ابھی کیا کہا تھا؟ یہ وہ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے اور جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی ہے''

یادرکھنا چاہیے کہ یہ کسی غیر مسلم گروہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ مسجد میں رسولؐ کے خطبوں میں شریک ہونے والوں اور زیر منبر بیٹھنے والے گروہ صحابہ ہی کا ذکر ہے کہ ان میں ایک جماعت ایسی ہے اور اس جماعت کے لیے قرآن کا اعلان ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ آئندہ زندگی میں کبھی ایمان لانے والے نہیں ہیں تو اب قرآن کی روشنی میں بلا استثناء پوری جماعت کو عدالت کا تمغہ دینا کہاں درست ہوسکتا ہے؟

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ⑰

''اور جنہوں نے ہدایت قبول کی، اس نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا اور انہیں ان کے شایان شان پرہیز گاری عطا کی''

برابر یہ بات دیکھنے کی ہے کہ جہاں جہاں دلوں پر مہر کرنے یا گمراہی میں اضافے کا ذکر ہے، وہاں بطور فعل اختیاری ان کے کفر، انحراف اور راہ حق سے روگردانی وغیرہ کا ذکر ہے اور جہاں ہدایت میں اضافے وغیرہ کا ذکر ہے، وہاں پہلے اُن کے ہدایت قبول کرنے کا ذکر ہے، اس سے ظاہر ہے کہ وہ اُن کا قبل والا کفر، انحراف اور یہ ان کا شروع کا ہدایت قبول کرنا خود ان کا ارادی عمل ہے۔نہ وہ جبر الٰہی کا نتیجہ ہے نہ یہ اور پھر بعد میں جو بیان ہوا ہے' جس کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے، وہاں ان کے خود اختیاری طور سے غلط راہ پر جانے کا اثر یا اس کی سزا ہے اور یہاں ان کے حسن اختیار کا نتیجہ یا اس صلہ ہے۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ⑱

''تو کیا انتظار ہے ان کو سوا اس کے کہ قیامت ان پر ایک دم آجائے تو اس کی علامتیں تو آہی گئی ہیں تو جب وہ آہی جائے گی تو انہیں نصیحت قبول کرنے کا موقع کہاں ہوگا؟

یعنی قیامت کے آنے کے بعد تو وہ دور تکلیف ختم ہوجائے گا اور اب جز اُوسزا کی منزل ہوگی لہٰذا ایمان یا توبہ کوئی قابل قبول نہ ہوگا۔[1]

---

[1] ۔ای لا تنفعهم (جلالین)

علاماتِ قیامت احادیث میں متفرق طور پر بھی وارد ہوئے ہیں اور ایک طویل حدیث جناب سلمان فارسیؓ کی حضرت پیغمبر خداؐ کی زبانی ہے جو اہل سنت کی کتب میں سے محی الدین ابن عربی کی کتاب ''محاضرۃ الابرار ومسامرۃ الاخیار'' معروف بہ ''کتاب مسامرات'' میں میری نظر سے گزری ہے اور وہ ہماری قدیم تفسیر علی ابن ابراہیم قمی میں بھی اسی آیت کے تحت میں درج ہے مگر ان علامتوں میں زیادہ تر وہ ہیں جو صدیوں سے برابر سامنے آتی رہی ہیں لہٰذا انہیں دیکھ کر بھی قیامت کے قرب کا کوئی پیمانہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾

''تو جانیے کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور اپنے گناہ کے لیے اور باایمان مردوں اور باایمان عورتوں کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہیے اور اللہ جانتا ہے تم لوگوں کی گردش اور تمہارے جائے قرار کو''

درگاہ الٰہی میں اپنے کو گناہگار قرار دیتے ہوئے دعائے مغفرت تقاضائے عبودیت ہے۔ وقوع گناہ پر موقوف نہیں ہے، چنانچہ مفسرین اہل سنت نے بھی یہاں اس پہلو کو اختیار کیا ہے؛۔ تفسیر جلالین کے الفاظ یہ ہیں؛۔ (قِيْلَ لَهٗ ذالكَ مَعَ عِصمتِهٖ لِنَسْتُنَّ بِهٖ اُمَّتِهٖ) حضرتؐ سے باوجود آپ کے معصوم ہونے کے یہ کہا گیا تا کہ آپ کی امت اس طریقے کی پیروی کرے۔ خداوند عالم عظمت وجلال کا جتنا شدت وقوت کے ساتھ احساس ہوگا، اتنا ہی بندہ اپنے کو اس کی بارگاہ میں تقصیروار سمجھے گا۔ معصومینؑ کے استغفار اور توبہ وانابت کی نوعیت یہی ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ فَاَوْلٰى لَهُمْ ﴿۲۰﴾ ۚ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۬ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۬ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴿۲۱﴾ ۚ

''اور جو ایمان لائے کہتے ہیں کہ کوئی سورہ کیوں نہیں اتارا جاتا تو جب کوئی بالکل واضح سورہ اتارا جاتا ہے اور اس میں مرنے مارنے کا ذکر ہوتا ہے تو دیکھیے گا کہ انہیں جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھ رہے ہوں گے جیسے موت سے بے ہوش ہو جانے والا دیکھتا ہے تو بہتر تھا ان کے لیے اطاعت کرنا اور اچھی گفتگو اور پھر جب لڑائی ٹھن جائے تو اگر اللہ سے سچی وفاداری کرتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا''۔

پیغام جہاد سن کر بعض مسلمانوں کی حالت

بعد والے مضمون سے ظاہر ہے کہ ''کوئی سورہ کیوں نہیں اتارا جاتا؟'' اس کے معنی یہ تھے کہ کوئی سورہ ایسا جس میں جہاد کا حکم ہو کیوں نازل نہیں ہوتا، چنانچہ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''مسلمان سورت مانگتے تھے یعنی کافروں کی ایذا سے عاجز ہوکر آرزو کرتے تھے کہ اللہ حکم دے جہاد کا تو جو ہو سکے کر گزریں، جب حکم آیا جہاد کا تو کچھ لوگوں پر بھاری پڑا۔ مردے کی طرح بے رونق آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ہم کو کاش کہ اس حکم سے معاف رکھیں، بے حد خوف میں آنکھ کی رونق نہیں رہتی جیسے مرتے وقت'' (موضع القرآن)

بعض کا خیال ہے کہ جب وحی نازل ہونے میں دیر ہوتی تھی اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے کوئی نازل شدہ قرآن کا حصہ گوش زد نہیں ہوتا تھا تو صحابہ کا دل گھبراتا تھا لہٰذا تقاضا ہوتا تھا کہ کوئی سورہ آخر عرصے سے کیوں نہیں اترا؟ [1]

لیکن اگر کہیں ایسے آیات اُتر آئے جن میں جہاد کا حکم ہوا تو یہ عالم ہو جاتا تھا جس کا ذکر بعد میں ہے۔

اولیٰ لھم طاعۃ وقول معروف کا ترجمہ میں نے کیا ''بہتر تھا ان کے لیے اطاعت کرنا اور اچھی گفتگو'' اس میں **اولیٰ** کے وہی معنی لیے گئے ہیں جو عام طور پر اس لفظ میں سمجھ آتے ہیں یہاں تک کہ اردو میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہیں۔ ہاں اس صورت میں یہ پورا ایک جملہ ہوتا ہے جیسا کہ تفسیر جلالین میں **اولیٰ لھم** کے بعد لکھا ہے:۔

مبتدا خبرہ طاعۃ و قول المعروف (یہ مبتدا ہے جس کی خبر طاعۃ وقول معروف ہے)

لہٰذا **اولیٰ لھم** پر آیت کے پورے ہونے کا نشان ○ نہیں ہونا چاہیے اور پھر ج کی علامت جس کے معنی یہ ہے کہ ٹھہرنا جائز ہے اور وہ وصل یعنی ملا کر پڑھنے سے بہتر ہے۔ غالباً ان علامتوں کی وجہ سے زیادہ مفسرین ومترجمین کا رجحان یہ ہے کہ **اولیٰ** کا لفظ **ویل** کی طرح عربی میں ملامت اور سرزنش کے محل پر استعمال ہوتی ہے جس کا ترجمہ اردو میں یوں ہوگا ''وائے ہوان پر'' [2]

اور پھر **طاعۃ وقول معروف** الگ ہے جس کے لیے کچھ محذوف مان کر جملہ پورا ہوتا ہے۔ [3]

ہم جہاں تک سمجھتے ہیں یہ علامتیں توفیقی وتعبدی حیثیت نہیں رکھتیں یہ قاریوں کے تفسیری رجحان کے مطابق علامتیں قرار دی گئی ہیں۔ اس لیے یہیں دیکھ لیجئے کہ اگر وا قفا اولیٰ وہی ''بہتر'' کے معنی میں ہے اور **طاعۃ وقول معروف** اس کی خبر ہے تو وصل معین ہونا چاہیے کہ وقف نہ کرو اور اگر **ویل لھم** کے معنی میں ہے ''وائے ہوان پر'' اور س الگ جملہ ہے تو وقف معین ہونا چاہیے۔ یہ جائز اور بہتر ہونے کے کیا معنی ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامت قرار دینے والے کی نظر میں ترجیح تو اسی کو ہے کہ اس کے معنی ہیں ''وائے ہوان پر'' اسلیے اس پر آیت کا نشان بنایا ہے مگر ایک احتمال اسکے نزدیک دوسرا ہے جو اس کے خیال میں کمزور ہے، اس لیے ج کی علامت اس پر رکھی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تفسیری فیصلے آیتوں کی علامتوں کی بنیاد پر نہیں ہوئے ہیں بلکہ علامتی نشان تفسیری تصورات کی بنیاد پر لگائے گئے ہیں لہٰذا آج اور ہمیشہ ہر تفسیری صلاحیت رکھنے والے کو حق ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ان تفسیری علامات کی بندش کا اسیر نہ رکھے اور مفہوم آیت کو دیگر قرآنی دلائل، حدیث ولغت، عقلی قرائن اور روایت کے ذریعہ سے سمجھنے کی کوشش کرے۔

---

[1] ۔لانھم کانوبالنسون بنزول الوحی ویسترحشون من ابطائہ (تبیان)

[2] ۔ھذا تھدید و وعید (مجمع البیان)

[3] ۔وائے ایشان را۔ حال ایشان بحسب ظاھر وفرمان بر داریست (شاہ ولی اللہ) وائے ہے واسطے ان کے۔ مطلب ان کی فرمان برداری ہے (رفیع الدین)

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ﴿۲۳﴾

''تو کیا ایسا نہیں کہ بہت ممکن ہے جب تم صاحب اقتدار ہو تو زمین میں فساد برپا کرو اور اپنے رشتوں کے تقاضے کے خلاف بدسلوکیوں سے کام لو۔ یہ وہ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے تو انہیں بہرا بنا دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا''۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبوں میں بعض حاضر ہونے والوں کی حالت

اس سے ملتے جلتے الفاظ میں ایک آیت دوسرے پارے میں آئی ہے:

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ (بقرہ--۲۰۵)

وہاں بہت سے مفسرین نے تولیٰ کے معنی روگردانی کرنے کے لکھ دیئے مگر ہم نے وہاں بھی اس کا ترجمہ صاحب اقتدار ہونے کے ساتھ کیا اور اب اس آیت میں تو دوسرے حضرات بھی ان تولیتم کے معنی یہی قرار دے رہے ہیں کہ اگر تم صاحب اقتدار ہو۔[1]

اس کے بعد سیاق وسباق کو دیکھئے تو صاف پتہ چلے گا کہ جن کے آیندہ صاحب اقتدار ہونے کے امکان کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے، وہ وہی ہیں جو اس وقت صحبت رسولؐ میں رہ کر بھی آپ کے فیوض سے محروم ہیں اور میدان رزم میں دشمنوں کے مقابلے میں کمزوری دکھاتے ہیں، یہی وہ ہیں جو بعد میں صاحب اقتدار ہو کر اہل حقوق کے حقوق کو برباد کریں گے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾

''تو کیا وہ قرآن میں غور فکر سے کام نہیں لیتے یا کچھ دلوں پر ان کے قفل لگے ہوئے ہیں''۔

ہم نے پہلے بھی لکھا ہے کہ یہ مسلم ہونے کے باوجود کہ ترتیب قرآن مطابق تنزیل نہیں ہے بعض سوروں کی شناخت ایسی ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ سورے یکجائی طور پر اسی شکل میں اترے تھے چنانچہ یہ سورہ بھی پورا ایک ہی طرز واسلوب کا حامل ہونے کی بنا پر اسی طرح کا ہے۔

قرآن میں غور فکر سے کام لینے کی دعوت

اب اس آیت کو جس محل پر وہ ہے، قبل اور بعد سے ملا کر دیکھیے تو محسوس ہوگا کہ قرآن پر غور نہ کرنے کی شکایت جو کی جارہی ہے، یہ کفار ومشرکین سے نہیں ہے بلکہ انہی مسلمانوں سے ہے جن کا قبل اور بعد میں ذکر ہے اور پھر جیسے جھلا یا ہوا جملہ کہ ''ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں، انہی کے قرآن کے اشاروں کو نہ سمجھنے کی اور یاد نہ رکھنے پر تازیانہ ہے۔

یاد رکھیے کہ قرآن الفاظ قرآن کو نہ سننے یا حفظ نہ کرنے کی شکایت نہیں کر رہا ہے بلکہ اس کے معنی واشارات پر غور نہ کرنے کی شکایت کر رہا ہے، چاہے الفاظ کے حفظ کرنے میں کتنی ہی محنت کی جائے۔

---

[1] ۔متولی امور مردمان شوید (شاہ ولی اللہ)۔ اگر والی ہو تو حکم کے (رفیع الدین)

جناب شیخ طوسیؒ اوران کے تتبع میں علامہ طبرسیؒ نے اس سے اپنے فرقے کی اخباری جماعت کے مدمقابل میں ظواہر قرآن کی حجیت پر استدلال کیا ہے کہ اگر قرآن مجید کے مطلب کا سمجھنا الفاظ قرآن سے بالکل ممکن نہ ہوتا تو قرآن پر غور نہ کرنے کی شکایت کیوں کی جاتی؟[1]

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِىْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۖ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾

''وہ جو اپنے پیچھے کی طرف پلٹ گئے بعد اس کے کہ ان کے لیے ہدایت کا راستہ ظاہر ہو گیا تھا، شیطان نے انہیں ورغلایا اور انہیں ڈھیل دی۔ یہ اس بنا پر کہ انہوں نے کہا ان سے جنہوں نے ناپسند کیا اسے جو اللہ نے اتارا تھا' ہم کسی نہ کسی حد تک تمہارا ساتھ دیں گے اور اللہ ان کی اندرونی کاروائی کو جانتا تھا تو کیا ہوگا عالم اس وقت جب فرشتے ان کی قبض روح کریں گے۔ مارتے ہوں گے ان کے چہروں اور ان کی پشت پر۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے پیروی کی اس کی جو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہے اور اس کی پسند کو ناپسند کیا تو اس نے ان کے اعمال کو برباد کر دیا''۔

ان آیات میں دیکھنے والے کے لیے بڑے لمحات فکریہ ہیں:۔ شروع سے سورے کے مندرجہ مضامین کو دیکھیے تو اس میں غیر مسلمین کے مسائل سے کوئی بحث نہیں ہے بلکہ تمام تر کچھ مسلمانوں کے کردار کا ذکر ہے۔ اب اس کے بعد ان اجزاء کو غور سے دیکھیے۔ کچھ ہے جسے اللہ نے اس سورے کے شروع میں آیت نمبر ۲ میں پھر آیت نمبر ۹ میں اور اب آیت نمبر ۲۶ میں بما نزّل علیٰ محمّد اور ما انزل اللہ اور ما نزّل اللہ کہا ہے (یعنی) ''وہ جسے اللہ نے اتارا۔[2]

پھر ایک جماعت سرغنہ افراد کی ہے جنہوں نے اپنے مفادات کے لحاظ سے ناپسند کیا اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اس منصوبے میں ان کے ساتھ شریک ہوئے اور کسی حد تک ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے کوئی خفیہ منصوبہ بنایا جسے کہا جا رہا کہ ''اللہ ان کی اندرونی کارروائی سے واقف ہے۔ انہوں نے پہلے کچھ نیک اعمال کیے تھے جنہیں کہا جا رہا ہے کہ اب وہ برباد ہو گئے اور اس پوری جماعت کے لیے مرتد ہونے کی سند تو اس پورے مضمون کے شروع ہی میں ارتدوا علیٰ ادبارھم کی لفظوں میں موجود ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ

---

[1] ۔ فی ذالك حجة علیٰ بطلان قول من یقول لا یجوز تفسیر شیء من ظاهر القرآن الّا بخبر او سمع (تبیان)

[2] ۔ المروی عن ابی عبداللہ علیہ السلام ۔ کرهوا ما نزل اللہ ولایة علی ابن ابی طالب (مجمع البیان)

لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ۝۳۰ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَاْ اَخْبَارَكُمْ ۝۳۱

''کیا وہ سمجھتے ہیں وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ اللہ کبھی ان کے دلی کینوں کو ظاہر نہیں کرے گا اور اگر ہم چاہیں تو ہم آپ کو انہیں دکھا دیں تو آپ ان ناک نقشے سے انہیں پہچان لیجیے۔ اور بہر حال ان کے طرز گفتگو سے آپ انہیں ضرور پہچان لیں گے اور اللہ تم سب کے اعمال کو جانتا ہے اور یقیناً ہم تم لوگوں کی آزمائش کریں گے یہاں تک کہ معلوم کریں تم میں سے جہاد کرنے والوں اور، صبر و برداشت رکھنے والوں کو اور آزمالیں تمہارے حالات''۔

مسلمانوں کا لب ولہجہ ان کی پردہ کشائی کے لیے کافی

چاہے مفسرین جمہور کی پیروی میں ہمارے کچھ اکابر نے بھی گزشتہ آیات کو جماعت یہود وغیرہ سے متعلق کر دیا ہو لیکن آزاد چشم و گوش و ہوش سے ان آیات کو ئی دیکھنے سنے اور سمجھے تو کسی رخ سے وہ غیر مسلم جماعتوں سے متعلق محسوس نہیں ہوں گی، صاف وہ اپنوں کی جماعت میں شامل افراد سے متعلق ہیں جو اپنے دلوں کے منصوبے دلوں میں چھپائے رکھتے ہیں اور انہی کی آزمائش کی ضرورت ہے اور وہ سب سے بڑی آزمائش میدان جنگ میں ہوئی۔ چاہے وہ شروع کی جنگ احد ہو یا آخر میں ہونے والا معرکۂ حنین، دونوں کی روئیدادیں صفحاتِ تاریخ ہی نہیں، صفحات قرآن پر بھی ثبت ہیں۔

''آپ ان کے ناک نقشے سے انہیں پہچان لیجیے گا اور ان کے طرز گفتگو سے معلوم ہو جائے گا'' یہ کیا یہود کے افراد ہو سکتے ہیں؟ یقیناً یہ وہی ہیں جو مؤمنین کی جماعت میں شامل ہیں اور رسولؐ کی محفل میں بیٹھ کر بڑھ چڑھ کر گفتگوئیں کرتے ہیں مگر ان کے طرز گفتگو سے بہت موقعوں پر پتہ چل جاتا ہے کہ جسے خدا اور رسولؐ بلند کرنا چاہتے ہیں، یہ اس کی بلندی کو پسند نہیں کرتے اور یہی ان کے نفاق کی بہت بڑی علامت ہے جس کے لیے بعض صحابہ کرام کے اقوال بھی ہیں۔[1]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ۝۳۲

''جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور پیغمبر سے اختلاف کیا بعد اس کے کہ ان پر ہدایت کا راستہ واضح ہو گیا تھا، اور ہرگز اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور وہ ان کے اعمال کو اکارت کر دے گا''۔

پورے سورے کے گزشتہ مضامین کو سامنے رکھ کر کفر اللہ کی راہ سے روکنے اور پیغمبر سے اختلاف، ہر ایک کے معنی پر غور کرنا چاہیے

---

[1] ۔عن ابی سعد الخدری قال: لحن القول بعضهم علی ابن ابیطالب علیہ السلام قال و کنّا نعرف المنافقین علی عهد رسول الله ﷺ ببعضهم علی ابن ابی طالب وروی ذالك عن جابر ابن عبدالله الانصاری وعن عبادة ابن صامت (مجمع البیان)

(الگ الگ الفاظ کو لغت اور عام اصطلاحات کی روشنی میں دیکھ کر نہیں) اور پھر نتیجہ نکالنا چاہیے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ ﴿٣٣﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ﴿٣٤﴾

''اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور طاعت کرو پیغمبر کی اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو، بلاشبہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، پھر مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر ہیں، انہیں اللہ کبھی نہیں بخشے گا''۔

درمیان میں اہل ایمان کو مخاطب کر کے یہ کہنے کہ سے اپنے اعمال کو برباد نہ کرو، اس سے پہلے اور بعد جو کفر اختیار کرنے والوں کا ذکر ہے، کیا وہ غیر مسلم ہیں؟

اگر وہ اعمال کی بربادی اس کفر سے ہوتی جو غیر مسلم جماعت میں ہوتا ہے تو مسلمان سے درمیان میں کیوں کہا جاتا کہ اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اعمال کی بربادی اور بعد میں بخشش کی محرومی کا جو اعلان ہے، وہ کسی ایسی وجہ سے ہے جو اس جماعت میں جو ظاہر کی بنا پر الذین اٰمنوا کی مصداق ہے، پائی جا رہی ہے۔

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ ۖ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ ۗ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ﴿٣٥﴾

''تو کمزوری نہ دکھاؤ اور صلح کی اپنی طرف سے دعوت نہ دو درانحالیکہ تم برتر ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال کو رائگاں نہیں کرے گا''۔

پہلے جملے کو دیکھتے ہوئے سمجھ میں آجاتا ہے کہ اپنی طرف سے صلح کی دعوت جس کی ممانعت ہوئی ہے، وہ وہ ہے جو ہمت ہارنے کی بنا پر ہو، نہ کہ کچھ بلند مقاصد کے تحفظ یا امن پسندی یا اتمام حجت کی خاطر اور آخری فقرے سے ظاہر ہے کہ یہ عاجزی نہ کرنے کی دعوت اس یقین دہانی کے ساتھ نہیں ہے کہ تمہیں مادی فتح ضرور حاصل ہوگی بلکہ صرف اس لیے کہ یہ ایک فریضہ ہے جسے تمہیں انجام دینا چاہیے اور اگر تم نے ظاہری شکست بھی کھائی یا اس راہ میں ختم بھی ہو گئے تو تمہارے اعمال کا اجر تو ضائع نہیں ہو سکتا۔ اس لیے الاعلون کا ترجمہ ہم نے یہ نہیں کیا کہ تم ضرور غالب آؤ گے جو بعض لوگ سمجھے ہیں۔[2] بلکہ اس کا ترجمہ واقعاً یہی ہے تم برتر ہو یعنی اہل حق العلون کا مصداق بہرصورت ہیں چاہے فتح پائیں یا وقتی طور پر شکست سے دوچار ہوں۔

إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ ۖ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَلَا

---

[1] ۔لاتبطلوا اعمالکم بالشك والنفاق عن عطا... مجمع البیان)

[2] ۔انتم القاهرون الغالبون فی قول مجاهد (تبیان)

يَسْئَلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾ اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ﴿۳۷﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾

''دینوی زندگی تو بس کھیل اور تفریح ہے اور اگر تم ایمان لاؤ اور پرہیزگاری اختیار کرو تو تمہیں تمہارے اجر عطا کریں گا اور تم سے تمہارے اموال نہیں ماں گے گا۔ اگر وہ تم سے انہیں مانگتے ہوئے اصرار سے بھی کام لے تو تم بخل سے کام لوگے اور وہ تمہارے دلی کینوں کو نمایاں کر دے گا، دیکھ لو تمہارا تو یہ عالم ہے کہ تمہیں دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو تم میں ایسے ہیں جو بخل کرتا ہے تو وہ اپنے ہی سے بخل کرتا ہے اور اللہ بے نیاز ہے اور تم خود محتاج ہو اور اگر تم روگردانی کرو تو وہ تمہارے بدلے دوسری قوم کو لے آئے گا، پھر وہ تمہارے ایسی نہیں ہوگی''۔

عرب مسلمانوں کو پہلی صدی کے آخر سے موالی وراعجام پر رشک آنے لگا کہ وہ مسلم سیاست ہی پر نہیں بلکہ علمی افق پر بھی چھائے جاتے ہیں۔ اس تعصب کے جذبے کو بنی امیہ نے عرب قومیت کا جذبہ نہیں ابھار کر بہت تقویت پہنچائی جس کے زیر اثر آج تک جمہوریت کے بہت سے مصنفین عجموں کو بہت کوستے ہیں اور ان پر اسلام کے مسخ کرنے کا الزام لگاتے ہیں لیکن قرآن اپنے معجزانہ انداز میں اس پر پہلے ہی انتباہ کر رہا تھا کہ اگر تم نے پوری وفاداری سے کام نہ لیا تو وہ تمہاری بدلے دوسری قوم کو لیے آئے گا۔ ہماری قدیم تفسیر میں جو اکثر کلماتِ معصومینؑ پر مبنی ہے۔ اس دوسری قوم کی تفسیر موالی ہی کے ساتھ ہوئی ہے۔ [1] جناب شیخ طوسیؒ نے جو متعدد قول نقل کیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے اہل ایران مراد ہیں۔ [2] علامہ طبرسیؒ نے متعدد حدیثیں درج کی ہیں، ان میں طرق اہل سنت سے ایک حدیث نبویؐ ہے جس میں ایرانیوں کو دوسری قوم کا مصداق بتایا گیا ہے اور دو (۲) حدیثوں میں جو معصومین علیہم السلام سے ہیں موالی کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔ [3]

---

[1] ۔علی ابناء اموالی المتقدمین (علی ابن ابراهیم)

[2] ۔قیل مثل سلمان واشباهه منابنآء فارس (تبیان)

[3] ۔روی ابو هریرة ان انا اصحاب رسول الله ﷺ قالو یارسول الله ﷺ من هؤلآء الذین ذکر الله فی کتابه وکان سلمان الی جنب رسول الله فضرب یده علی فخذ سلمان فقال هذا وقومه ...روی ابو بصیر عن ابی جعفر علیہ السلام قال ان تتولو یا مشعر العرب یستبدل قوماً غیرکم یعنی الموالی...عن ابی عبدالله علیہ السلام قال: قد رالله ایدل بهم خیراً منهم الموالی (مجمع البیان)

سُوْرَةُ الْفَتْح

مدنیہ----۲۹----آیات

اس سورے کا آغاز چونکہ ''فتح مبین'' عطا کرنے کے اعلان سے ہوا ہے، اس لیے اس سورے کا یہ نام ہوا۔

سورۂ فتح کے خاص خاص مضامین:

۱.....رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کر کے قبل اور بعد کے جرائم کی معافی جس کی بقدر ضرورت تشریح کی جائے گی۔

۲.....تعظیم رسول کا حکم۔

۳.....پیغمبر خداؐ سے بیعت اللہ سے بیعت اور آپ کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ۔

۴.....کچھ مسلمانوں کی رسول کے لئے بداندیشیاں کہ آپ اب زندہ واپس نہیں آئیں گے۔

۵.....کچھ مسلمانوں سے ان کے اصرار کے باوجود جہاد میں لے جانے سے انکار اور اس کی وجہ۔

۶.....معذورین کے لیے معافی کا اعلان۔

۷.....بیعت شجرہ کا ذکر اور خالق کا اعلان خوشنودی۔

۸.....آئندہ اموال غنیمت کے حصول کی اطلاع۔

۹.....حدیبیہ میں جنگ نہ ہونے دینے کا سبب۔

۱۰.....صلح حدیبیہ سے غیر مطمئن افراد کو مطمئن بنانے کی کوشش۔

۱۱.....حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی صریحی اعلان کے ساتھ آپ کے حقیقی ساتھیوں کی شان اور ان کا کردار۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ﴿۱﴾ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ﴿۲﴾ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ﴿۳﴾

یقیناً ہم نے آپ کو ایک بڑی نمایاں فتح عطا کی تا کہ اللہ نظر انداز کرا دے جو کچھ جرائم آپ کے پہلے والے ہوں یا

بعد والے اور وہ اپنی نعمت کو آپ پر مکمل کر دے اور آپ کو منزل مقصود تک پہنچائے اور اللہ آپ کی مدد کرے زبردست''۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے قبل اور بعد کے جرائم کی معافی کے معنی

یہ بات متفق علیہ ہے کہ یہ سورہ صلح حدیبیہ کے بعد بلا فاصلہ اترا ہے۔اس صورت میں اس فتح سے مراد کیا ہے؟ مادی نقطۂ نظر والے مفسرین جو فتوحات کے معنی ممالک کو زیر نگین کرنے اور طاقت سے طاقت کو شکست دینے کے سمجھتے ہیں، اس فتح سے مراد لیتے ہیں اس کے بعد والی فتح مکّہ وغیرہ کو اور اس لیے شاہ ولی اللہ نے فتحنا کا ترجمہ کیا ہے ''حکم کردیم برائی تو بفتح ظاہر'' مگر ظاہر ہے کہ فتح کے معنی تو فتح دینے ہی کے ہیں، حکم فتح جاری کرنے کے نہیں ہیں اور فتح کا اعلان بصیغہ ماضی کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وقوع میں آ چکی، نہ کہ بطور وعدہ مستقبل ،اگرچہ مستقبل کا بصورت ماضی اظہار حتم وجزم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے مگر بلاشبہ وہ مجازی حیثیت رکھتا ہے جسے بلاوجہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس لیے درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صلح حدیبیہ ہی ہے جسے خالق نے ''فتح مبین'' سے تعبیر کیا ہے جس کی تائید میں صدر اول کے اقوال بھی موجود ہیں۔[1]

اس سے اس حقیقت تک رسائی ہوتی ہے کہ اسلام مادی فتوحات کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی روحانی فتح کو جو عزیمت واستقامت اور اخلاق وکردار کے میدان میں ہو اور جس سے مخالفت ذہنیت کو شکست ہو اور اسی اعتبار سے ہم کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے لیے دائمی فتح مانتے ہیں ہر یزید کی دائمی شکست جو بالکل قرآنی رہنمائی کے مطابق ہے۔

دوسرا امر جو اس آیت میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، یہ جملہ ہے کہ لیغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ'' نظر انداز کرادے خدا جو کچھ جرائم آپ کے پہلے والے ہوں یا اس کے بعد والے''۔ یہاں ان لوگوں کو کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی جن کی نظر میں عصمت انبیاؑ کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اس لیے جناب شاہ ولی اللہ کو تو اس پر کوئی تشریحی نوٹ لکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔شاہ عبدالقادر نے نوٹ دیا تو یہ کہ:،

''یعنی تجھ کو اس تحمل سے درجے بڑھیں اور یہ بات اللہ نے کسی کو نہیں فرمائی کہ اگلے پچھلے گناہ بخشے اگرچہ بہت بندے ہیں۔اس میں نڈر کر دینا ہے'' (موضع القرآن)

''یعنی ان کے نزدیک رسولؐ بڑی فضیلت یہ ہے کہ آپ کے لیے یہ اعلان ہو گیا اور اللہ نے آپ کے نڈر ہونے کا اندیشہ محسوس نہیں فرمایا مگر آخر یہ سب گناہ آئے کہاں سے جن کے لیے معاف کرنے کا اعلان ہوا ہے؟

بے شک جلالین کے ضمیر ایمانی میں اس سے خلش محسوس ہوئی، اس لیے لکھ دیا کہ:

وهو ماول العصمة الانبيآ بالدليل العقلي القاطع من الذنوب.

اس میں تاویل کی ضرورت ہے گناہوں سے انبیا کے معصومؑ ہونے کی وجہ سے جو قطعی دلیل عقلی سے ثابت ہے۔

---

[1] ۔قال القراء الفتح قد يكون صلحاً...وقال الزهري لم يكن فتح اعظم من صلح الحديبيه (مجمع البيان)

مگر یہ تاویل کیا ہے؟ اس سے وہ کترا کر آگے بڑھ گئے۔

میری نظر میں یہاں جو مفہوم ہے، اس کے لیے تمہیداً ایک پہلو پر توجہ دلانا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ گزشتہ اور آئندہ جرائم کی اس مغفرت کو قرآن نے نتیجہ اس فتح کا قرار دیا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ نے بھی ترجمہ میں لکھا ہے:۔

دعا عاقبت فتح آنست کہ بیامرزو ترا خدا آنچہ کہ سابق گزشت از گناہ تو و آنچہ پسماند۔ اس فتح کا نتیجہ یہ ہے کہ بخش دے آپ کے لیے خدا جو پہلے ہو چکے آپ کے گناہ اور جو اس کے بعد ہوں۔

تفسیر جلالین میں ہے کہ

وَ اللّام للعلّة الغائبة فمدخولها مسبّب لا سبب۔

(لیغفر میں) لام نتیجہ و، مقصد کو ظاہر کرتا ہے تو اس کے بعد جو شے ہے وہ اس فتح کے سبب سے ہے نہ یہ کہ وہ اس کا سبب ہے۔

اب ہر شخص سوچ سمجھ سکتا ہے کہ بارگاہ الٰہی میں انسان کے جو گناہ ہیں، ان کا اور دشمنوں کے مقابلے میں نمایاں فتح حاصل ہونے کا کیا ربط ہے؟ دشمنوں کے مقابلے میں فتح ہوئی اور اس کے نتیجے میں جو آپ کے گزشتہ گناہ ہوئے ہیں اور جو آئندہ ہوں گے سب معاف ہو گئے۔ ان دونوں میں باہم کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔

اس بنا پر صحیح نقطہ نظر یہ معلوم ہوتا ہے جسے میں اپنے ضمیر ایمانی اور عقل انسانی کے سہارے پر یقینی سمجھتا ہوں کہ یہاں ذنب سے مراد وہ باتیں ہیں ہی نہیں جنہیں اللہ گناہ سمجھتا ہے بلکہ یہ اطلاق ان لوگوں کے مزعومہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہے جن کے مقابلے میں یہ فتح ہوئی اور وہ مشرکین ہیں کہ اس کے پہلے ان کی نگاہ میں آپ کے بڑے گناہ تھے جن کا وہ چرچا کیا کرتے تھے مگر آپ کی اس فتح کے بعد جو اس وقت اخلاقی حیثیت سے حاصل ہوئی ہے اور اس کے بعد فتح مکے میں ظاہری طور پر بھی حاصل ہو جائے گی۔ اس طرح ان کی زبانیں بند ہو گئی یہ رفتہ رفتہ اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے جائیں گے اور نتیجہ میں جو کچھ آپ کر چکے، وہ بھی صحیح قرار پائے گا اور جو کچھ آئندہ کریں، اس پر بھی حرف گیری نہ ہو۔ اس طرح اللہ کے بخشنے کا مطلب اس کی طرف سے ایسا کرنا ہے کہ اب کوئی آپ کو مجرم کہنے والا نہ ہوگا۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ؕ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۴ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝۵ وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝۶ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۷

وہ وہ ہے جس نے ایمان والوں کے دلوں میں سکون واطمینان اتارا تا کہ وہ اپنے موجودہ ایمان کے ساتھ ایمان میں مزید ترقی کریں اور اللہ کے لیے آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، اور حکمت والا تا کہ وہ باایمان مردوں اور باایمان عورتوں کو داخل کرے ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں رواں ہیں اور ان کی طرف سے ان کی غلطیوں کا کفارہ کر دے اور یہ ہے اللہ کے نزدیک ایک بڑی کامیابی اور منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو جو سب اللہ کی نسبت برے خیالات رکھتے ہیں سزا دے انہی کے خلاف ہوگا اس برائی کا انجام اور اللہ ان پر غضبناک ہے اور ان پر لعنت کرتا ہے اور اس نے ان کے لیے مہیا رکھا ہے دوزخ کو اور وہ بہت برا انجام ہے اور اللہ کے لیے ہیں آسمانوں اور زمین کے لشکر اور اللہ زبردست ہے، بڑی سوجھ بوجھ والا''۔

حدیبیہ کی صلح کے بارے میں مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے میں چہ می گوئیاں ہوئیں اور بہت سے افراد کو شک کا دورہ پڑا۔ ان کے مقابل وہ افراد تھے جنہیں اس صلح کی حقانیت میں قطعی کوئی تردد نہ تھا۔ انہی کو کہا جا رہا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں سکون واطمینان اتارا۔[1]

إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٨﴾ لِّتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ ۚ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٩﴾

''یقین جاننا چاہیے کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے آپ کو گواہ بنا کر اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا تا کہ تم لوگ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے پیغمبر پر اور اس کی مدد کرو اور اس کی عزت کرو اور اس کی ذات (خدا) کی تسبیح کرو صبح اور شام''۔

علم معانی و بیان میں توصنعت التفات کو صرف بعض انداز کلام کی تبدیلیوں میں محدود کیا گیا ہے مگر بلند پایہ فصیح پیرایہ ہائے کلام میں بہت قسم کے نمونے تبدیل کے ملتے ہیں چنانچہ یہاں خطاب سے خطاب ہی کی طرف منتقل ہونا ہے مگر پہلا واحد حاضر کا خطاب ہے رسولؐ کی طرف روئے سخن کے ساتھ اور دوسرا عامۂ خلائق سے جمع حاضر کے ساتھ ''آپ کو بھیجا ہے'' رسولؐ سے خطاب اور اس سے ملا کرتا کہ تم لوگ ایمان لاؤ دوسروں سے خطاب۔ اس کا نام ان کے یہاں چاہے ''التفات'' نہ ہو مگر یہ ہے اس نوعیت کی چیز جس کی نظیریں قرآن مجید میں اور بھی موجود ہیں۔ شاھد کے معنی تو گواہ ہی کے ہیں، قرآن میں ہر رسول کے لیے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی امت پر شاہد ہوتا ہے اور ہمارے رسولؐ اپنی تمام امت پر بھی شاہد ہیں اور اس کے علاوہ ایک سلسلہ شاہدوں کا جو انبیاء تھے، آپ کے پہلے تھا اور ایک سلسلہ آپ کے بعد قرآن مجید سے ظاہر ہوتا ہے اور آپ ان قبل والوں پر بھی شاہد ہیں اور بعد والوں پر بھی۔

تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم

اب یہ گواہی خواہ روز قیامت لفظی طور پر ہو ان کی کارگزاری کے متعلق جیسے ایک افسر بالا اپنے پورے عملے کی رپوٹ پیش

---

[1] ۔ھم الذین لم یخالفوا رسول اللہ ﷺ ولم ینکروا علیہ الصلح (علی ابن ابرھیم)

کرتا ہے اور خواہ جیسا کہ اس کی حقیقت کا ہم تصور کرتے ہیں؟ وہ نمونۂ عمل اور کسوٹی کی حیثیت سے ہے جس کی مطابقت اور عدم مطابقت سے مقدار صحت وکمال عمل کا ثبوت ہوتا ہے۔

رسول خداؐ پر ایمان اور ان کی نصرت کے حکم کے ساتھ جو تیسرا حکم **توقروہ** کے لفظ کے ساتھ ہے اس میں صاف تعظیم رسولؐ کا حکم ہے جس کے بعد کسی مسلمان کو حق نہیں کہ وہ تعظیم رسول کے کسی طریقے کو شرک قرار دے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۱۰

''یہ لوگ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ ہی سے بیعت کر رہے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے تو جو عہد کو توڑے گا وہ توڑ کے اپنا ہی نقصان کرے گا اور جو پورا کرے گا اسے جو اس نے اللہ سے عہد و پیمان کیا ہے تو اللہ اسے بہت بڑا صلہ عطا کریگا''۔

یہ پیغمبرؐ کے نمائندۂ خالق بلکہ نائب خالق ہونے کا وہ بلند پایہ اعلان ہے تو آپ کی ذمہ دارانہ حیثیت ہی نہیں بلکہ عصمت عملی کا عظیم الشان ثبوت بھی ہے۔ اس لیے کہ اللہ جس ہاتھ کو اپنا ہاتھ کہے، اور وہ وہ نہیں ہے جو ظلم و تعدی کرے، جو غلط کام کا انجام دے اور گناہ کا مرتکب ہو۔

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ؕ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۱۱ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖۚ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ۝۱۲ وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ۝۱۳ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۴

''عنقریب کہیں گے آپ سے وہ جو ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گئے صحرائی عربوں میں سے کہ ہمیں روکے رکھا ہمارے مال اور گھر والوں کے جھمیلوں نے تو ہمارے لیے بخشش کی دعا کر دیجئے، یہ اپنی زبانوں سے کہتے ہیں وہ جو ان کے دلوں میں نہیں ہے، کہیے تو پھر کون تمہارے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز پر بھی قدرت رکھتا ہے اگر وہ

تمہارے نقصان چاہے یا تمہارا نفع چاہے بلکہ اللہ جو تم کرتے ہو، اس سے باخبر ہے بلکہ تم نے تو خیال کیا تھا کہ پیغمبرؐ اور ایمان والے لوگ اب کبھی بھی اپنے گھروں کی طرف واپس نہیں آئیں گے اور یہی سبز باغ لبھا رہے تھے تمہارے دلوں میں اور تم نے برے خیال باندھ رکھے تھے اور تم لوگ ہلاک ہونے والی جماعت تھے اور جو ایمان نہ لایا ہو اللہ اور اسکے پیغمبرؐ پر، تو یقیناً ہم نے کافروں کے لیے دوزخ تیار رکھا ہے اور اللہ کے لیے تو آسمان اور زمین کی سلطنت ہے، وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور بلاشبہ اللہ بڑا بخشنے والا ہے، مہربان''۔

پیچھے رہنے والوں سے مراد فریقین کی روایتوں کی رو سے وہ ہیں جنہوں نے حدیبیہ والے سفر میں جو مکّہ معظّمہ کی طرف تھا، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جانے سے پہلوتہی کی تھی اور ان کی اس کوتاہی کی سزا یہ دی گئی کہ اب وہ خیبر کی مہم میں رسولؐ کے ساتھ جانے سے روک دیے گئے۔[1]

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ؕ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ⑮

''وہ پیچھے رہنے والے عنقریب کہیں گے اس وقت جب تم اموال غنیمت کی طرف جاؤ گے کہ ان پر قبضہ کرو، ارے ہمیں بھی اپنے پیچھے آنے دو، وہ اللہ کی بات کو بدلوانا چاہتے ہیں، کہہ دیجئے کہ ہرگز تم ہمارے پیچھے نہیں آسکتے، اسی طرح اللہ نے پہلے کہہ دیا ہے۔ اس پر وہ کہیں گے بلکہ تم لوگ ہم سے جلتے ہو (نہیں) بلکہ وہ ہمیشہ سے ایسے (بدمغزے) رہے کہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا مگر بہت کم''۔

کچھ مسلمان باوجود اصرار جہاد میں ساتھ نہیں لیے گئے

چونکہ خیبر میں کافی مال غنیمت کے ملنے کی امید تھی، اس لیے وہ عرب جو حدیبیہ میں نہیں گئے تھے اب اس جنگ میں ساتھ چلنے کے لیے بے تاب تھے، مگر گزشتہ مہم میں ان کے نہ جانے کی سزا یہ دی گئی اب انہیں اس جنگ میں ساتھ جانے سے روک دیا گیا۔ اب چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اپنے گذشتہ کردار کو یاد کرکے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر پشیمان ہوتے مگر اس کے بجائے وہ الٹے یہ کہتے ہیں کہ دوسرے مسلمان ہم سے جلتے ہیں جو ہمیں ساتھ آنے نہیں دیتے۔ یہ بدمغزاپن نہیں تو اور کیا ہے؟

''وہ اللہ کی بات کو بدلوانا چاہتے ہیں'' یعنی اللہ نے پہلے سے یہ طے کر دیا تھا کہ خیبر کے مال غنیمت ان کے ہاتھ آئیں گے جو حدیبیہ

---

[1] ۔لما رجع رسول اللہ ﷺ الی المدینۃ من الحدیبیہ خز اخیبر افاستاذنہ المخلفون من الاعراب ان یخرجوا معہ (علی ابن ابراھیم (یعنی آنانکہ در سفر حدیبیہ موافقت نہ کردند (فتح الرحمٰن)

والے سفر میں ساتھ جائیں گے۔[1]

علامہ طبرسیؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے ایسا تصور کیا ہے کہ کلام اللہ سے مراد خالق کا وہ اعلان ہے جو رسولؐ کی زبانی کرایا گیا تھا:۔

فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ۭ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ (توبہ۔۸۳)

کہہ دیجئے کہ تم اب کبھی میرے ساتھ کسی مہم پر نہیں نکلو گے اور میرے ساتھ مل کر کبھی بھی کسی دشمن سے جنگ نصیب نہیں ہوگی تم پہلی مرتبہ گھر میں بیٹھے رہنے کو پسند کر چکے تو اب بیٹھے رہو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ۔

مگر یہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اعلان ان لوگوں کے لیے ہوا تھا جو تبوک کی مہم میں نہیں گئے تھے اور وہ حدیبیہ اور جنگ خیبر کے بہت بعد فتح مکّہ معظّمہ اور جنگ حنین سب کے بعد ۹ھ کی بات ہے جس کے بعد پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی غزوے پر تشریف ہی نہیں لے گئے اس طرح اس اعلان کی عملی تصدیق ہوئی کہ تمہیں اب کبھی یہ سعادت نصیب نہیں ہوگی کہ میرے ساتھ کسی مہم میں چل سکو، اس صورت میں یہ اعلان اس کلام اللہ کے لفظ سے کہاں مراد ہوسکتا ہے جو اس سے کئی سال پہلے کی مہم سے متعلق ہے؟[2]

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ⑯

"کہیے ان پیچھے بیٹھے رہنے والے صحرائی عربوں سے کہ عنقریب تمہیں بلایا جائے گا ایسی جماعت کے مقابلے کے لیے جو سخت طاقت ور ہوگی ان سے تمہیں جنگ کرنا ہوگی یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کریں تو اب اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تمہیں اچھا صلہ عنایت کرے گا اور اگر تم نے روگردانی کی جیسے پہلے روگردانی کر چکے تو تمہیں سخت سزا دی جائے گی"۔

یعنی اب اس وقت ان اموال غنیمت کی خاطر تو تمہیں نہیں لے جایا جاسکتا مگر تمہیں اصلاح عمل کا ایک موقع دیا جائے گا اور اس میں اگر تم نے وفاداری کا ثبوت دیا تو پھر یہ پہلے کی غلطی نظر انداز کر دی جائے گی اور اگر پھر تم نے ایسی کمزوری دکھائی تو اس کے بعد عذاب کے سوا کوئی صورت نہیں ہے

"اب یہ موقع کب تھا؟ یہاں مفسرین اہل سنت اجمال قرآن سے فائدہ اٹھا کر اسے جنگ فارس یا روم یا کسی اور مہم سے متعلق کرتے ہیں جو بعد رسولؐ واقع ہوئی ہے۔[3]

---

[1] ۔یعنی ماوعدبہ اھل الحدیبیۃ ان غنیمۃ خیبر لھم خاصۃ (تبیان)

[2] ۔کیف تکون ھذہ الاٰیۃ مرادۃ بقول "کلام اللہ وقد نزلت بعد دیار بع سنین (مجمع البیان)

[3] ۔قیل ھم بنو حنیفۃ اصحاب الیمامۃ وقیل فارس والروم (جلالین)

مگر یہ تو اس وقت صحیح ہوتا جب یہ اعلان بالکل حیات پیغمبرؐ کے آخری دور میں ہوا ہوتا جس کے بعد پھر رسولؐ نے کوئی لڑائی لڑی ہی نہیں مگر جب یہ فتح خیبر کے پہلے کا اعلان ہے کہ اس جنگ میں تم نہیں لے جائے جاؤ گے۔ اس کے بعد ایک سخت معرکہ سامنے آئے گا، اُس میں تمہارے کردار کے جوہر دیکھے جائیں گے۔ اور بالاتفاق اس کے بعد رسولؐ کو معرکہ حنین درپیش ہوا تو آخر اس اعلان کو درمیانی واقعات سے ایک دم چھلانگ لگا کر بعد رسولؐ کی لڑائیوں سے متعلق کرنے میں کیا معقولیت ہے؟ جب کہ صدر اول کے کچھ مفسرین اسے حنین سے متعلق قرار بھی دے رہے ہیں۔[1]

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾

''اندھے پر کوئی سختی نہیں ہے اور نہ لنگڑے پر سختی ہے اور نہ بیمار پر سختی ہے اور جو اللہ اس کے پیغمبر کی اطاعت کرے تو وہ اسے داخل کرے گا ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں اور جو روگردانی کرے گا۔ اسے وہ دردناک عذاب کی سزا دے گا''۔

چونکہ سابق میں جہاد سے پہلوتہی کرنے والوں کی مذمت تھی، اس لیے معذور قسم کے افراد کے ذکر کی ضرورت ہوئی کہ ان لوگوں کے لیے معافی ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾

''اللہ راضی ہوا ہے ایمان والوں سے جب کہ وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے تو اس نے جانا اسے جو ان کے دلوں میں ہے تو اتارا سکون واطمینان ان پر اور انہیں عنایت کی ایک قریبی فتح اور بہت سے اموال غنیمت جن پر وہ قابض ہوں اور اللہ زبردست ہے، صحیح کام کرنے والا''۔

بیعت شجرہ کا ذکر اور خالق کا اعلان خوشنودی

یہ بیعت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ معظمہ کے قریب پہنچ کر اسی سفر جس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ ہوئی ہے، ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر لی تھی، اس لیے اس کو ''بیعت شجرہ'' کہتے ہیں اور اسی کے متعلق یہ آیت اتری ہے جس کا آغاز لقد رضی اللہ سے ہے ''یعنی اللہ راضی ہوا ہے'' اس لیے

---

[1] ۔ قال سعید بن جبیر وعکرمہ وقتادۃ ھم ھوازن بحنین (تبیان) لا معنیٰ لحمل ذالك علی مابعدوقانہ (جمع البیان)

اس کو ''بیعت الرضوان'' بھی کہتے ہیں۔خیال کیا جاتا ہے کہ تمام افراد جنہوں نے اس وقت بیعت کی تھی، سب رضائے الٰہی کے مستحق ہو گئے مگر اس آیت میں یہ فقرہ کہ فعلم مافی قلوبھم'' اس نے جانا اسے جو ان کے دلوں میں ہے'' پوری طرح قابل توجہ ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ اس آیت میں کہا گیا ہے، وہ رسمی اسلام اور اس کے ساتھ اس رسمی بیعت سے وابستہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ایمان سے وابستہ ہے جسے بس اللہ جانتا ہے۔ورنہ مسلماً جو ایک منافقین کی جماعت وجود رکھتی تھی، بیعت کرنے والوں میں تو وہ بھی شامل تھی۔[1]

معلوم ہونا چاہیے کہ مال غنیمت ظاہری اسلام سے مل جاتا ہے مگر رضائے الٰہی ظاہری اسلام یا رسمی بیعت سے قطعاً متعلق نہیں ہے۔اس لیے تاریخ میں صرف درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں کی فہرست دیکھ کر سب کو رضائے الٰہی کا مستحق قرار دینا درست نہیں ہے۔

پھر یہ جو ارشاد ہو کہ ''اتارا سکون واطمینان اُن پر'' اور اس سکون واطمینان اُتارنے کا ذکر اس سورے میں پہلے بھی ہو چکا ہے اور وہاں بتایا جا چکا ہے کہ اس سکون واطمینان کی خاص علامت یہ تھی کہ اس صلح کے بارے میں ان کے دلوں میں شکوک وشبہات کا ہجوم نہ ہوا۔اب یہی اس آیت میں رضائے الٰہی کا معیار قرار دیا جا رہا ہے لہٰذا جن کے دلوں میں شکوک کا غلبہ نمایاں ہو جائے، وہ اس کا مصداق قرار نہیں پا سکتے۔

''انہیں عنایت کی ایک قریبی فتح''۔معلوم ہونا چاہیے کہ حدیبیہ کے بعد جو بلا فاصلہ ہوئی ہے، وہ فتح خیبر ہے تو یہ وعدہ الٰہی اس کے ہاتھ سے پورا ہوا جس کے ہاتھوں یہ فتح ہوئی ہے جس کے لیے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متفق علیہ حدیث خیبر: لاعطین الرایۃ الخ کے آخر میں فرمادیا تھا: یفتح اللہ علی یدیہ'' اللہ اس کے ہاتھوں یہ فتح عنایت کرے گا''۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٢٠﴾ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢١﴾

''اللہ نے تم سے وعدہ کیا بہت سے اموال غنیمت کا جن پر تم قابض ہو گے تو سر دست تمہیں یہ عنایت کر دیے، اور ان لوگوں کے دست تعدی کو تم سے کوتاہ کر دیا اور اس لیے کہ وہ ایمان والوں کے لیے قدرت کی ایک نشانی ہو اور وہ تمہیں صحیح راستے کی ہدایت کرے اور دوسرے اموال بھی جن پر تمہیں دسترس نہیں ہو ا، وہ اللہ کے قبضے میں ہیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے''

ان اموال غنیمت کے بعد پھر آخر میں جو دوسرے اموال کا ذکر ہے، اسے بھی خاص مقصد کے ماتحت جنگ روم وایران کے اموال غنیمت سے متعلق کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کے بعد خود عہد رسولؐ میں اموال غنیمت حاصل ہوتا تھا اور ہوئے، انہی کو کیوں مراد نہ سمجھا جائے؟

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿٢٢﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾

---

[1] ۔قد بائع النبی ﷺ جماعۃ من المنافقین فلا بد من تخصیص الآیۃ علیٰ کل حال (تبیان)

''اور اگر کافر لوگ تم سے جنگ کرتے تو وہ پیٹھ پھراتے، پھر نہ ملتا انہیں کوئی دوست اور نہ مددگار، یہی اللہ کا دستور تھا جو پہلے سے جاری ہے اور تم ہرگز اللہ کے دستور میں تبدیلی نہیں پاؤ گے''۔

یعنی حدیبیہ میں حکمت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ پیغمبرؐ بغیر جنگ کے واپس جائیں ورنہ جنگ ہوتی تو کفار مقابلے میں ٹھہر نہ سکتے تھے۔ وہ اسی طرح شکست کھاتے جیسے پہلے شکست کھاتے رہے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾

''اور وہ وہ ہے جس نے ان کے ہاتھوں کو روک دیا تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے مکے کے علاقے میں جب کہ تمہیں ان کے مقابلے میں پورا دسترس عطا کر دیا تھا اور اللہ اس کا جو تم کرتے ہو، دیکھنے والا ہے''۔

یوں تو اس سے مراد حدیبیہ کے موقع پر جنگ کا وقوع میں نہ آنا بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ علامہ طبرسیؒ کا نظریہ معلوم ہوتا ہے۔[1]

مگر عام طور پر اس کے تحت میں یہ واقعہ درج کیا گیا ہے کہ اسی حدیبیہ والی مہم میں بعض کا قول ہے کہ چالیس۔[2]

اور بعض کا قول ہے ستر (۷۰)۔[3]

یا اسی (۸۰)۔[4]

آدمی ادھر کے بھیجے ہوئے آئے تھے کہ مسلمانوں پر حملہ کر کے قتل و غارت کا بازار گرم کریں مگر ان کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ سب گرفتار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لائے گئے تو آپ نے سب کو معاف کر دیا جس کا اخلاقی اثر مخالفین اسلام پر بہت پڑا۔

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ؕ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۲۵﴾

وہ وہی ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا اور تمہیں مسجد حرام سے روکا اور ان قربانی کے جانوروں کو جو کہ ساتھ تھے مانع ہوئے اس سے کہ وہ اپنے محل تک پہنچیں اور اگر نہ ہوتے کچھ باایمان مرد اور کچھ باایمان عورتیں کہ تم نادانستہ ان کی

---

[1] ۔(ذکر اللہ منہ علی المؤمنین بحجزہ بین الفریقین حتیٰ لم تقیتلا وحتی انفق بینہم الصلح (مجمع البیان)

[2] ۔قال ابن عباس کان المشرکون بعثوا اربعین رجلا لیصیبوا من المسلمین فاتی بہم رسول اللہ ﷺ فخلی سبیلہم (تبیان)

[3] ۔بعد از انعقاد صلح ہفتاد تن از اوباش قریش خواستند کہ بے خبر بر صحابہ تاخت آرند (فتح الرحمٰن)

[4] ۔فان ثمانین منہم طافو بعسکرکم...جلالین)

پامالی کا سبب ہوجاتے تو تم پر ان کے سبب سے گناہ ہوتا لاعلمی میں تا کہ اللہ اپنی رحمت میں جسے چاہے داخل کرے۔ اگر وہ الگ ہوجاتے تو ہم سزا دیتے ان میں سے کفر اختیار کرنے والوں کو دردناک عذاب کے ساتھ"۔

حدیبیہ میں جنگ نہ ہونے دینے کا سبب

یہ اس جماعت کو صلح حدیبیہ سے غیر مطمئن تھی، ان کی سطح ذہن کے مطابق مصلحت اس صلح کی بتائی جارہی ہے۔

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

"بعض مسلمان چھپے تھے مرد اور زن اور بعض ابھی مسلمان ہونے مقدر تھے اس روز کی فتح میں وہ پیسے جاتے۔ آخر دو (۲) برس کی صلح میں جتنے مسلمان ہونے تھے سب ہو چکے اور نکلنے والے نکل آئے تب اللہ نے مکّہ فتح کرادیا" (موضع القرآن)

ہمارے یہاں کی ایک حدیث میں جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے اس آیت کی تشریح یہ ہوئی ہے کہ کافروں کے صلب میں جو باایمان نسل علم الٰہی میں تھی، اس کا خیال خونریزی سے مانع تھا۔ اس صورت میں تَزَيَّلُوْا "اگر وہ الگ ہوجاتے" اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نسل عالم شہود میں آچکی ہوتی تو عذاب سے مانع کوئینہ ہوتا۔ [1]

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۟ (۲۶)

"جب ان لوگوں نے جو کافر ہیں اپنے دلوں میں حمیت کا جذبہ پیدا کیا، وہ جاہلیت والی حمیت تو اللہ نے اپنا سکون اتارا اپنے پیغمبر پر اور ایمان والوں پر اور انہیں پابند رکھا پرہیزگاری کی بات کا اور وہ اس کے زیادہ حق دار اور اس کے لائق تھے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔

صلح حدیبیہ سے غیر مطمئن افراد کو مطمئن بنانے کی کوشش

بلاشبہ کفار قریش کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس منصوبے سے کہ آپ مکّہ معظّمہ میں داخل ہوکر مراسم عبادت انجام دیں ناگواری محسوس کرنا، اس حمیت جاہلیت ہی کا نتیجہ تھا کہ جنہیں ہم مکّہ سے نکال چکے ہیں اور ان سے جنگ کرتے رہے ہیں، وہ اب ہماری آنکھوں کے سامنے بلامزاحمت مکّہ میں داخل ہوں لہٰذا وہ باوجود طاقت مقابلہ نہ ہوکے "حرکت مذبوحی کے طور پر مزاحمت کے لیے تیار ہوئے۔

اس کے مقابلے میں اللہ نے اپنی طرف سے سکون اتارا اپنے پیغمبرؐ پر ایمان والوں پر یعنی انہوں نے ان کی اس جہالت کے مقابلے میں ضبط وتحمل سے کام لیا، عام طور پر اہل تفسیر بس اتنے ہی پر نظر ڈالتے ہیں مگر اس حمیت جاہلیت کے مقابلے میں اسی نوعیت کی ایک حمیت مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ میں بھی تو کارفرما تھی، یعنی وہ ان کی اس جاہلیت کے مقابلے میں سکوت وسکون اور برداشت کو خود اپنی عزت

---

[1] ۔ کان اللہ ودائع مومنون فی اصلاب قوم کافرین (علی بن ابراھیم)

قومی کے خلاف سمجھتے تھے، چنانچہ جو حمیت کے معنی ہیں کسی بات کو اپنی شان کے خلاف سمجھنا۔ [1]

ان کی ترجمانی صلح کی مخالفت میں ان الفاظ سے ہو رہی تھی کہ ''لم تعطی الدنیۃ فی دیننا'' ''ہم اپنے دین کے بارے میں اس ذلت کو کیوں برداشت کریں'' لہٰذا اللہ کی طرف کے سکون واطمینان کی منزل وہی ثابت قدم اور مطمئن افراد مانے جاسکتے ہیں جو نہ کافروں کی حمیت جاہلیت کے مقابلے میں جوش سے کام لیں اور نہ اس اپنی جماعت کی اس حمیت سے جو بنام ''حمیت دینی'' تھی متاثر ہو کر اپنے ہوش ایمانی کو ہاتھ سے دیں بلکہ رسولؐ کے ساتھ ساتھ اس صلح پر مطمئن رہیں چنانچہ بعد میں بلا فاصلہ جو آیت ہے اس سے بھی صاف نظر آتا ہے کہ مقابل میں وہ جماعت پیش نظر ہے جو اس صلح سے غیر مطمئن تھی کیونکہ انہی کے دل میں یہ بھی تھا اور زبان پر آرہا تھا کہ رسولؐ نے تو خواب دیکھا تھا کہ آپ مکّہ معظّمہ میں داخل ہونگے تو اس صلح کے ساتھ بے نیل مرام واپسی کیوں ہو رہی ہے، ان کے اس وسواس کا دفعیہ اس کے بعد کی آیت میں کیا گیا ہے بلکہ ہم تو محسوس کرتے ہیں کہ آخر سورہ تک بعد کی آیتیں بھی اس جماعت اور اس کے ترجمان کی گفتگو کے پس منظر میں اتری ہیں کیونکہ اس گفتگو کا یہ جز بھی تھا کہ کیا آپ خدا کے رسولؐ نہیں ہے؟ کیا ہم حق پر نہیں ہے؟ اب بعد کی آیتوں کے الفاظ دیکھئے کہ اللہ نے اپنے رسولؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اور پھر یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ والوں کی یہ شان ہونا چاہیے یعنی جس سے پوری جماعت کی مدح میں بڑے زور کے ساتھ ایک قصیدے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے وہ اس پس منظر میں اس جماعت کے بہت افراد پر تازیانے کی حیثیت رکھتا ہے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾

''اللہ نے اپنے رسول کو حقیقتاً بالکل ہی سچا خواب دکھایا کہ تم لوگ انشاء اللہ ضرور مسجد حرام میں داخل ہو گے اطمینان کے ساتھ اپنے سروں کو منڈوائے اور اپنے کچھ بال یا ناخن کترے ہوئے تمہیں کچھ خوف نہ ہوگا، پھر بھی اس نے جانا وہ جو تم نہیں جانتے تھے تو اس کے پہلے اس نے ایک دوسری فتح عطا کر دی''

غیر مطمئن مسلمانوں کے دلوں میں بڑا وسوسہ یہ تھا اور وہ زبانوں پر بھی آرہا تھا کہ رسولؐ نے روانگی سے پہلے اپنا خواب بیان کیا تھا کہ ہم لوگ مکے میں داخل ہوئے ہیں مگر یہاں اس کے خلاف ہو رہا ہے تو اسے صاف کہا گیا ہے کہ وہ خواب بالکل سچا تھا۔ ایسا ضرور ہو کر رہے گا مگر یہ ضروری نہیں کہ اسی سال ایسا ہو۔ خدا کے وعدے پر اعتبار رکھو اور شک وتذبذب کو اپنے دل میں راہ نہ دو۔

الفاظ قرآن کے لحاظ سے اس کے پہلے جو فتح عطا کی، اس سے مراد یہی صلح حدیبیہ بھی ہوسکتی ہے جو اخلاقی اور اصولی فتح کی حیثیت رکھتی تھی، مطلب یہ ہے کہ اس وقت اس نوعیت کی فتح دے دی لیکن ایک تفسیر اس کی یہ ہے کہ اس پہلی فتح سے فتح خیبر مراد ہے۔ [2]

---

[1] ۔الحمیۃ الانفۃ من الشئ (جلالین)

[2] ۔یعنی فتح خیبر (علی ابن ابراھیم)

جناب شیخ طوسیؒ نے صدر اول کے مفسرین کے دونوں قول نقل کئے ہیں۔ [1]

خالق کا خود اپنی مشیت کے فیصلے کے بعد میں ظاہر ہونے کے اعلان کے ساتھ جبکہ اس کے لیے اس کے وقوع میں شک وشبہ کا تو ہم بھی نہیں کیا جاسکتا انشاء اللہ کہنا اس سنت کو قائم کرنے کا عملی اہتمام ہے کہ بعد میں ہونے والی کسی بات کے کہنے میں چاہے کتنی ہی تمہارے لیے یقینی ہو انشاء اللہ ضرور کہہ لیا کرو، جب کہ انسان جسے یقینی سمجھتا ہے، وہ بھی اکثر بے حقیقت ثابت ہوجاتا ہے۔ [2]

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ﴿۲۸﴾

''وہ وہ ہے جس نے اپنے پیغمبر کو صحیح رہنمائی اور سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے اس لیے کہ اُسے ہر دین پر غالب کرے اور اللہ سے بڑھ کر کون گواہ ہوگا''

ایسی ہی آیت سورہ برأت میں دسویں پارے میں آچکی ہے جس کا بنیادی مضمون یہی ہے اور پھر اس کے بعد اٹھائسویں پارے میں سورہ صف میں آئے گی۔

یہاں محل وقوع کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ انکی رسالت کو سچے دل سے تسلیم کرتے ہو تو ان کی باتوں میں شک وشبہ کو راہ نہ دو اور ان کے عمل اور فیصلے پر چوں وچرا نہ کرو اور درمیان میں ناگوار صورت حال بھی پیش آئے تو مایوس نہ ہو اور سمجھو کہ نتیجے میں اللہ کی بات پوری ہو کر رہے گی۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۚۖ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۚۛ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۲۹﴾

''محمد اللہ کے پیغمبرؐ ہیں اور وہ جو ان کے ساتھی ہیں، کافروں کے مقابلے میں سخت، آپس میں بڑے ترس والے ہیں، تم انہیں دیکھو گے رکوع اور سجود میں مصروف، کہ وہ طلب گار ہیں اللہ کی طرف کے فضل وکرم اور خوشنودی

---

[1] ۔قال ابن زید یعنی بذالك فتح خیبر وقال الزهری هو فتح الحدیبیه (تبیان)

[2] ۔قال ابو العباس تغلب استثنی الله فیما یعلم لیستثنی الناس فیما لا یعلمون (مجمع البیان)

کے۔ان کی شان ان کے چہروں میں نمایاں ہے سجدے کے نشان سے۔یہی ان کی توصیف ہے توریت میں اور اُن کی توصیف انجیل میں اس کھیتی کی طرح ہے جس کے ادھر ادھر کو پلٹیں پھوٹیں اس کے بعد وہ پھپھکی اور اپنے قدوقامت پر کھڑی ہوئی ،کہ کاشت کرنے والوں کے لیے خوش آیند ہے تا کہ غم وغصہ میں مبتلاء کرے اس سے کافروں کو ،اللہ کا وعدہ ہے ان سے کہ جو ان میں با ایمان اورنیک اعمال رکھنے والے ہوں بخشش اور بڑے اجروثواب کا''۔

قرآن مجید کی آیت ہے،اس لیے اس کے مضمون کی حقانیت میں مسلمانوں کے اندر کوئی دو(۲) رائیں تو ہو ہی نہیں سکتیں مگر بس اتنا نظر کا پھیر ہے کہ کوئی بس جسمانی معیت کو اصل قرار دے اور پھر سمجھ لے کہ یہ سب توصیفات انہی کے ہیں، چاہے وہ اوصاف پائے جارہے ہوں یا نہیں اور کوئی اصل ان توصیفات کو قرار دے اور جن میں یہ اوصاف از روئے مشاہدہ اور بر بنائے تواتر اخبار نظر آئیں انہی کو سمجھیں کہ وہ حقیقتاً رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی ہیں۔نہ کہ وہ جنہیں تاریخ کے آئینے میں دیکھا جارہا ہے وہ کفار کے مقابلے میں نرم ہیں اور اپنے آدمیوں کے مقابلے میں سخت ہیں،جن کا وقت بجائے رکوع سجود کے کبھی بازاروں کی گشت میں گزرتا ہوا اور کبھی سیاسی جوڑ توڑ میں یا جو رضائے الٰہی کے مقابلے میں مفادات دنیوی کو ترجیح دیتے رہے ہیں،ایسے لوگ ہر وقت رسولؐ کی معیت میں نظر آئیں مگر پیغمبر کے واقعی ساتھی نہیں ہیں۔

آخر میں خالق نے جو 'امنوا واعملو الصالحات'' جو ایمان پر قائم رہیں اور نیک اعمال کرتے رہیں کے ساتھ منھم کا لفظ ارشاد فرمایا ہے'' اُن میں سے'' یہ عدالت صحابہ کی عمومیت کے قلعے کو چونکہ مسمار کردینے والی ہے،اس لیے تفسیر جلالین میں دفع دخل کیا گیا ہے اس طرح کہ:منھم ای الصحابہ لبیان الجنس لا للتبعیض لان کلھم بالصفات المذکورۃ۔

مطلب یہ ہے کہ یہ من بیانیہ ہے جس کا ترجمہ ''یعنی'' سے ہوتا ہے اس طرح کہ اللہ کا وعدہ ہے ایمان اور عمل صالح رکھنے والوں سے یعنی انہی سے جو پہلے بیان ہوئے من تبعیضیہ نہیں ہے کہ جس سے ثابت ہو کہ اس جماعت میں کچھ لوگ اس صفت سے متصف نہیں۔اس کی دلیل کیا ہے؟ فرماتے ہیں:۔اس لیے کہ وہ تو سب اس صفت سے متصف تھے،اسے کہتے ہیں 'مصادر علی المطلوب''یعنی دعوے کو دلیل میں پیش کردینا جو منطقی طور پر غلط ہوتا ہے اور اسے یوں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ قرآن کو اپنے عقیدہ کا تابع بنانا ہے حالانکہ عقیدے کو قرآن کا تابع ہونا چاہیے۔

شاہ عبدالقادر کے ذوق کو بھی من بیانیہ کی تاویل قابل قبول معلوم نہیں ہوئی۔انہوں نے اسے من تبعیضیہ ہی قرار دیا ہے مگر فرماتے ہیں:۔

''حضرت کے سب صحابہ ایسے ہی تھے مگر خامی آنے کا اندیشہ رکھا حق تعالیٰ بندوں کو ایسی خوشخبری نہیں دیتا کہ نڈر ہوجاویں۔مالک سے اتنی شاباشی بھی غنیمت ہے''(موضح القرآن)

سمجھے آپ؟ کیا مطلب ہوا؟ تھے تو وہ سب ایسے مگر خالق نے اس واقعیت کا اظہار خلاف مصلحت سمجھا لہٰذا مصلحتاً فرمادیا کہ جو ان میں سے ان اوصاف کے ہوں،ان سے وعدہ ہے۔اب معلوم نہیں خالق کے اس عمل کو تقیہ سمجھا جائے یا کیا؟ اور تقیہ بھی کن سے؟ وفادار بندوں یعنی خود صحابہ سے؟ سچ ہے انسان کو سخن پروری میں کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔

سُوْرَۃُ الْحُجُرَاتِ

مدنیہ----۱۸----آیات

''حجرات''یعنی چھوٹے چھوٹے رہنے کے ٹھکانے جنہیں آج کل کی زبان میں ''کوارٹر'' کہہ سکتے ہیں ''کمرے'' اور ہمارے معیار زندگی کے لحاظ سے ''کوٹھریاں'' ایسے ہی مکانات میں ازواج رسول کا قیام تھا اور جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت الشرف گویا ''محل'' یا ''حرم سرائے'' میں ہوتے تھے تو ان میں سے کسی میں تشریف فرما ہوتے تھے۔ چونکہ اس سورے کی ایک آیت میں ان لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے جو بدتمیزی سے ''حجرات'' کے پیچھے کی دیواروں کی طرف سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پکارتے تھے اس لیے اس سورے کا یہ نام ہوا۔

سورۂ حجرات کے خاص خاص مضامین:

۱.....پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش دستی کرنے کی شدید ممانعت۔

۲.....رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پر آواز بلند کرنے کی ممانعت اور رسولؐ کے سامنے آواز کو دھیما رکھنے کی ہدایت جس سے تعظیم رسولؐ میں اہتمام ظاہر ہے۔

۳.....فاسق کے خبر دینے پر تحقیق کی ضرورت۔

۴.....اچھائی سے محبت اور برائی سے نفرت یعنی تولا وتبرا کی تلقین۔

۵.....مسلمانوں کو اس جماعت سے جو باغی ہو جنگ کرنے کا حکم۔

۶.....آپس کی یکجہتی کے لیے ہدایت، ایک دوسرے سے تمسخر نہ کرے، پھبتیاں نہ کسے، بدگمانی سے کام نہ لے، دوسرے کے کاموں کا کھوج نہ کرے۔

۷.....غیبت کی ممانعت اور شدید مزمت۔

۸.....اسلامی مساوات کے ساتھ معیار امتیاز کا بیان۔

۹.....اسلام آسان ہے اور ایمان مشکل ہے۔

۱۰.....ایمان کا اصلی معیار۔

۱۱.....اپنے اسلام اور ایمان کا اللہ پر احسان جتانا غلط ہے بلکہ یہ اللہ کا احسان اپنے اوپر ماننا چاہیے کہ اس نے قبول ہدایت کے ساتھ راہ راست کو اختیار کرنے یا اس پر قائم رہنے کی توفیق کرامت فرمائی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ①

''اے ایمان لانے والو! اللہ اور رسول کے سامنے پیش دستی نہ کرو اور اللہ سے ڈرو یقیناً اللہ سننے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش دستی کی سخت ممانعت

اس آیت کی شان نزول میں عجیب لطیفہ نظر آتا ہے کہ شیعوں کی قدیم تفسیر میں تو اسے بنی تمیم کے وفد سے متعلق قرار دیا ہے جو رسولؐ کی خدمت میں آئے تو آپ اندر تشریف رکھتے تھے، وہ باہر سے حضرت کا نام لے لے کر پکارنے لگے کہ باہر نکلیے اور پھر جب حضرت برآمد ہوئے تو ان کے آدمی آپ کے آگے آگے چلنے لگے اور بات کرنے لگے تو آپ کی صدا پر اپنی صدا بلند کر کے اور بات چیت میں بغیر کسی تعظیم و تکریم کے جیسے آپس میں گفتگو کرتے ہیں ویسے ہی آپؐ کا نام لے لے کر تخاطب کرنے لگے۔ اس پر یہ اور اس کے بعد کی آیتیں نازل ہوئیں۔[1]

مگر اہل سنت کی مشہور تفسیر جلالین میں ہے:۔

نزلت فی مجادلة ابی بکر وعمر علی النبی ﷺ فی تامیر الاقرع بن جابس والقعقاع بن معبد۔

یہ آیت نازل ہوئی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی باہمی زوردار بحث کے بارے میں جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے پر ہو رہی تھی کہ اقرع بن حابس سردار مانا جائے یا قعقاع بن معبد؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ موقع نزول تو وہی ہے جب بنی تمیم کا وفد آیا تھا مگر یہ شدید تنبیہ جو آیت میں کی گئی ہے، اس وقت کے ان نومسلم افراد کے کسی عمل پر نہ تھی بلکہ جناب شبلی نعمانی کی زبان میں اسلام کے جو ''مہر و ماہ'' ہیں، ان کے کردار پر تھی۔

جناب شیخ طوسیؒ نے شان نزول تو کچھ درج نہیں کی ہے۔ اصل مضمون آیت کی ہمہ گیری پر روشنی ڈالی ہے اور نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہر کام جو خدا اور رسول کے خلاف کیا جائے، وہ ان کے مقابلے میں ایک طرح پیش دستی ہے۔[2]

ہمارے نزدیک یہ بات از روئے حقیقت درست ہونے کے باوجود ان آیات کو دیکھتے ہوئے جو اسی سورے میں اس سے متصل نظر آتی ہیں اس محل پر مقصود معلوم نہیں ہوتی بلکہ پورا سلسلہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں بے ادبیوں کی روک اور آپ کی تعظیم و تکریم کی اہمیت ذہن نشین کرنے ہی کے مقصد کا حامل نظر آتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ② اِنَّ

---

[1] ۔ نزلت فی وفد بنی تمیم (علی ابن ابراھیم)

[2] ۔ الاولیٰ حمل الآیة علیٰ عمومھا فکل شئ اذا فعل خلاف اللہ ورسولہ فھو تقدم بین ایدیھما (تبیان)

الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝٣

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ ان سے زور زور سے باتیں کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ زور سے بات کرتے ہو کہیں تمہارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو، بے شک وہ جو اپنی آوازیں رسول خدا کے پاس دھیمی رکھتے ہیں، یہ وہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پرہیز گاری کے لیے آزمالیا ہے ان کے لیے بخشش ہے اور بڑا اجر وثواب''۔

وہ جو رسولؐ اور ائمہ اور مقربین بارگاہ الٰہی کی تعظیم کو شرک کا مرادف سمجھتے ہیں، آنکھ کھول کر دیکھیں کہ اس تعلیم قرآن اور سخت ترین انداز میں اس کی مخالفت پر زجر وتوبیخ اور تخویف وتہدید، یہ تعظیم رسولؐ کی بحد لزوم دعوت ہے یا نہیں؟

تعظیم کو منع کرنے کا مطلب ہے برتاؤ میں کسی قسم کے بھی امتیاز کا نہ برتنا۔ اگر خالق کو یہ مدنظر ہوتا تو وہ رسول کے لیے خصوصی طور پر اس قسم کے امتیاز کا مطالبہ کیوں کرتا؟۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝٤ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٥

''بلاشبہ یہ لوگ جو آپ کو حجروں کے پیچھے سے آواز دیتے ہیں، ان میں زیادہ لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اور اگر وہ اتنا صبر وضبط سے کام لیتے کہ آپ خود ان کے پاس نکل کر آئیں تو ان کے لیے بہتر تھا اور اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان''۔

''سورۂ حجرات'' نام اس سورے کا جو ہوا ہے، وہ اسی آیت سے جس کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے کہ جب حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اندر رہتے تھے تو جاہل عرب پیچھے کی دیوار کی طرف سے آکر بدتمیزی سے آپ کو آواز دیتے تھے اسی سلسلے میں یہ آیت اتری ہے:۔

اس سے اور ایسی ہی دوسری آیتوں سے جو قرآن کریم میں، پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیسی بدتمیز قوم سے ساتھ پڑا تھا مگر یہ آپ کا خلق عظیم'' تھا کہ آپ اسے برداشت کرتے تھے لیکن خالق کریم قرآن کریم کی آیتوں کے ذریعے سے انہیں متنبہ کرتا تھا تاکہ ان لوگوں کی اصلاح وہ مقصد بھی جس پر آپ مامور ہیں، پورا ہو جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝٦

''اے ایمان لانے والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو کہ کہیں کسی جماعت کو تم ناواقفیت سے ضرر نہ پہنچا دو، پھر تمہیں اپنے کیے پر پشیمان ہونا پڑے''

فاسق کے خبر دینے پر تحقیق کی ضرورت

چونکہ ''عادل'' اور ''فاسق'' دونوں شرع اسلامی کی اصطلاح لفظیں ہیں جن کے حدود شرائط پر مکمل بحثیں فقہ میں ہوئی ہیں، اس لیے ان کا ترجمہ کسی دوسری لفظ سے مناسب معلوم نہیں ہوتا، بلکہ ترجمے میں بھی بعینہ وہی لفظیں درج کر دی جانا چاہئیں، اب یہ فاسق جس کی خبر پر اس طرح عمل کرنے سے روکا گیا تھا، چاہے معلوم ہو کون ہے؟ اور وہ ولید بن عتبہ ہے مگر الفاظ آیت میں لفظ فاسق کئی خاص شخص کے نام کے طور پر تو آئی نہیں ہے بلکہ بطور وصف کلی طور پر آئی ہے لہٰذا وہ اور اس کی دلیل ہے کہ اس دور میں رسولؐ کے گرد و پیش رہنے والی جماعت میں فاسق کے لفظ کے مصداق کا وجود ہے اور اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ بس ایک ہی شخص تھا۔

چونکہ حکم بہر حال ایک قانون کلی کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے لہٰذا اصول فقہ ہمیں یہ منظر نظر آتا ہے کہ اسی آیت سے خبر واحد کی حجیت پر جب کہ راوی عادل ہو استدلال کیا جاتا ہے جسے جناب شیخ مرتضیٰ انصاری کی رسائل میں دیکھا جا سکتا ہے اور اسی سے جناب شیخ الطائفہ اور ان کے تتبع میں علامہ طبرسیؒ نے عدم حجیت پر استدلال کیا ہے۔

پہلے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ فاسق کی خبر میں تحقیق کا حکم دیا گیا ہے یعنی اسے آنکھ بند کر کے باور نہ کرو۔ اب اگر عادل کی خبر میں بھی ایسا ہی ہے تو پھر فاسق اور عادل میں فرق ہی کیا ہوا؟

دوسرے استدلال کی بنیاد اس پر ہے کہ تحقیق کا حکم اس خطرے کی بنا پر ہوا ہے کہ تم بلا وجہ اس پر عمل کر کے کسی غلط کاری میں مبتلا نہ ہو اور یہ خطرہ خبر عادل میں بھی ہے لہٰذا اس کو بھی بغیر تحقیق قبول نہ کرنا چاہیے

اس کی اصل تحقیق و تنقیح تو اصول فقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ تفسیر میں اس پر کسی بسیط بحث کا محل نہیں ہے لیکن اس استدلال کے متعلق یہاں مختصراً عرض یہ ہے کہ عقلی طور پر یہ خطرہ ہے کہ کہیں نتیجتاً غلطی نہ ہو، یہ تو مسلمہ طور پر ''ظنون خاصہ'' جنہیں ''امارات'' کہتے ہیں جیسے بینہ یعنی دو عادلین کی گواہی وغیرہ ان میں بھی ہے، اس لیے کہ جب عادل کا معیار جو اصطلاح شرع میں ہے، معصوم ہونے کا مرادف نہیں ہے تو جیسے حد تواتر تک نہ پہونچے ہو عادلوں کی خبر میں جسے ''خبر واحد'' کہتے ہیں، مخالفت واقع کا امکان ہے، ویسے ہی دو (۲) عادلوں کی گواہی میں مگر چونکہ شریعت نے اسے معتبر قرار دیا ہے تو اس پر عمل میں ندامت کا سوال پیدا نہیں ہوتا جب کہ ضمیر مطمئن ہے کہ خدا نے جس چیز کو حجت یعنی قابل عمل قرار دیا ہے، ہم نے اس پر عمل کیا ہے۔ یہاں فاسق کی خبر میں عمل کو منع کرنے میں کہا گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ناواقفیت سے غلط کام کرو تو اپنے کیے پر نادم ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اسے حجت قرار نہیں دیا ہے لیکن عادل کی خبر میں چاہے مخالفت واقع کا عقلاً امکان ہو، ندامت نہیں ہوگی کیونکہ عمل کی بنیاد ایک معتبر چیز پر ہے وہ خبر عادل ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ﴿۷﴾ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑧

''اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر یہ بہت سی باتوں میں تمہارا کہنا مانے تو تم زحمت میں پڑھ جاؤ مگر اللہ نے محبوب بنایا ہے تمہارے لیے ایمان کو اور اسے تمہارے دلوں میں آراستہ کیا ہے اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تمہیں ناگواری پیدا کی ہے، یہی لوگ وہ ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں اللہ کے فضل و کرم سے اور اللہ بڑا جاننے والا ہے، ٹھیک کام کرنے والا ہے''۔

تولّی اور تبرّا کا حکم

اس آیت سے ظاہر ہے کہ اچھائی سے محبت اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک برائی سے نفرت نہ ہو یہی قرآنی اصول تولا وتبرا کا سنگ بنیاد ہے اور ان دونوں پہلوؤں کے یکجا رکھنے والوں کے لیے قرآن کا اعلان ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ ''یہی لوگ راہ راست پر ہیں'' پھر سمجھ لیجیے ایمان سے محبت ہونا چاہیے اور کفر، فسق، اور معصیت سے نفرت اور ظاہر ہے کہ یہ غرض بغیر کسی محل کے قائم نہیں ہوسکتی، ان سے نفرت کے معنی ہوں گے ان افراد سے نفرت جو ان باتوں کے حامل ہوں صحیح راستہ یہی ہے باقی سب گمراہی۔

اس کے علاوہ آیت کے مرکزی مضمون کو بھی یاد رکھنا چاہیے یعنی پیغمبر مسلمانوں کے مشورے پر عمل کے پابند نہیں ہیں،

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں:۔

''یعنی تمہارا مشورہ قبول نہ ہو تو برا نہ مانو، رسول عمل کرتا ہے اللہ کے حکم پر، اسی میں تمہارا بھلا ہے، اگر تمہاری بات مانا کرے تو ہر کوئی اپنے بھلے کی کہے گا کس کس کی بات پر چلے'' (موضح القرآن)

ایک تلخ حقیقت جو آیت سے نمایاں ہے کہ ایمان کے مقابلے میں تین (۳) وصف ہیں کفر، فسوق اور عصیان اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح اعتقادی خامی جس کا نام کفر ہے ایمان کے تقاضے کے خلاف ہے، اسی طرح عملی کمزوریاں جن کا نام باختلاف مدارج فسق اور عصیان ہے، یہ بھی ایمان کے خلاف ہیں۔ [1]

لہٰذا گناہوں میں سرشار رہتے ہوئے اس تصور میں مگن رہنا کہ بحمدہ ہم مؤمن تو ہیں، خیال خام کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ⑨ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ⑩

''اور اگر مسلمانوں میں سے دو (۲) گروہ آپس میں لڑنے لگیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔ اب اگر ایک نے

---

[1] ۔فی الایۃ دلالۃ علی ان اضداد الایمان ثلثہ کفر وفسوق وعصیان (تبیان)

دوسرے کے خلاف ظلم وتعدی کی ہے تو جس نے تعدی کی ہے، اُس سے جنگ کرو اس حد تک کہ وہ حکم الٰہی کی طرف واپس آئے تو اگر واپس آجائے تو پھر دونوں میں صلح کرادو انصاف کے ساتھ اور انصاف سے کام لو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہی تو ہیں تو اپنے بھائیوں میں صلح کراؤ اور اللہ سے ڈرو، شاید اس کی رحمت تمہارے شامل حال ہو''

مسلمانوں کو باغی جماعت سے جنگ کرنے کا حکم

یہ وہ آیت قرآنی ہے جو ''قتال بغاۃ'' یعنی مسلمانوں میں سے جو لوگ حکومت اسلامی کے خلاف باغی ہو جائیں، ان سے جنگ کے بارے میں ہے جس کے اجمال کی تفصیل اور اس کے تحتی قوانین شرعی کے لیے علمائے اہل سنت اقرار رکھتے ہیں کہ وہ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ان جنگوں سے جو جمل وصفین میں آپ نے لڑی تھیں معلوم ہوئے ہیں۔

جناب شیخ الطائفہؒ نے ایک بات پر متنبہ کرنا ضروری سمجھا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں کا شمار مومنین میں، اس جنگ کے قبل کے لحاظ سے ہے لیکن اس جنگ کے بعد بھی وہ دونوں مومنین کا مصداق رہیں گے، یہ اس سے ثابت نہیں ہوتا۔[1]

میرا تصور یہ ہے کہ حقیقی ایمان جو معیار نجات ہے، وہ تو طائفتان من المؤمنین کہنے سے پہلے بھی ثابت نہیں ہوتا بلکہ المؤمنین یہاں جماعتی لقب کے طور پر ہے جو اقرار ایمان سے حاصل ہو جاتا ہے، ورنہ اگر اس معیار کے سب مومن ہوتے تو وہ آپس میں خونریز جنگ کرتے ہی نہ لیکن جہاں تک ظاہری اسلام اور اس کے قانونی احترام کا سوال ہے، وہ آیت کے مضمون کے لحاظ سے جنگ کے بعد بھی برقرار معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ ان بغاۃ کے احکام عام کفار سے مختلف کیوں ہوتے اور اگر بعد کی آیت کو قبل والی آیت کا تتمہ سمجھا جائے جیسا کہ اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برادری کا رشتہ بھی جو جنگ کے قبل تھا، وہ جنگ کے بعد بھی قائم ہے جس کے تقاضوں کے واپس لانے اور بحال کرنے کے لیے صلح کرانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ⑪

''اے ایمان والو! کوئی مردوں کی جماعت دوسری جماعت کے ساتھ تمسخر نہ کرے، بہت ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ کوئی عورتیں دوسری عورتوں کے ساتھ تمسخر کریں، بہت ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ اپنے آدمیوں پر چوٹیں کرو اور نہ برے خطابوں کے ساتھ یاد کرو کتنا برا نام ہے آدمی کا کہ ایمان لانے کے بعد فاسق

---

[1] ۔لادلالۃ فی ھذا علی انھما اذا اقتلا بقیا علی الایمان (تبیان)

کہلائے اور جو توبہ نہ کرے گا وہی ظالم لوگ ہیں''۔

مؤمنین سے تمسخر اور بدگمانی کی ممانعت

یہاں کی کئی آیتوں مسلمانوں کے درمیان یکجہتی قائم رکھنے اور باہم اسباب منافرت کے سدّ باب کے لیے تعلیمات ہیں جن کی مخالفت سے باہمی رنجش پیدا ہوتی ہے۔ رنجش آگے بڑھ کر کسی نوعیت کے تصادم کی صورت اختیار کرتی ہے ان میں سے پہلی بات ہے دوسرے کے ساتھ تمسخر یہ وہ مذاق ہوتا ہے جس کے ساتھ توہین کا پہلو شامل اور اس میں ہوتا ہے اپنے کو بالاتر سمجھنا اور دوسرے کی تحقیر اس لیے کہا گیا کہ تمہیں حق نہیں ہے کہ کسی کو اپنے سے کمتر سمجھو، بہت ممکن ہے کہ وہ تم سے اللہ کے نزدیک بہتر ہوں، دوسرے چوٹیں کرنا جس میں اکثر صورت یہ ہوتی کہ اس شخص کا نام نہیں لیا جاتا مگر انداز ایسا ہوتا ہے کہ سب سمجھتے ہیں کہ یہ اسی پر ہے اور وہ بھی یہی سمجھتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ جواب نہ دے یا نہ دے سکتا ہو مگر اس کے دل کو تکلیف تو ہوتی ہے۔

تیسرے (۳) برے خطابوں کے ساتھ پھبتیاں کسنا یہ بسا اوقات بعد میں اتنی مشہور ہو جاتی ہیں کہ تقریباً نام کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں جس کی ذمہ داری اس پہلے شخص پر ہوتی ہے جس نے اس کی ابتدا کی ہے۔

بعض لوگ بسا اوقات ایسا وقتی تفریح کے طور پر کرتے ہیں مگر آیت کے آخری الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ سب گناہ ہیں ایسے جو اصطلاح شرع میں ''فاسق'' ہونے کا باعث ہوتے ہیں اور جن سے توبہ کرنے کی ضرورت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ⑫

''اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے پرہیز کرو، یقیناً بعض گمان بڑے گناہ ہوتے ہیں اور کھوج نہ کرو اور تم میں سے ایک دسرے کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں کا کوئی دوست رکھتا ہے کہ اپنے بھائی کا جب وہ مردہ ہو جائے تو اس کو گوشت کھائے۔ اسے تم نے بھی برا سمجھا ہے اور اللہ سے ڈرو یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے والا بہت مہربان ہے۔''

تجسس، بدگمانی اور غیبت سے ممانعت

اسباب منافرت میں درجہ بدرجہ تین (۳) منزلوں پر ممانعت کے پہرے بٹھائے گئے ہیں۔ اگر پہلی رکاوٹ کامیاب ہو گئی تو شاید دوسری منزل آئے ہی نہیں اور دوسری پر قدم رک جائیں تو شاید تیسری منزل تک جو شدید تر گناہ کی ہے، آدمی کے قدم نہ پہنچیں۔

پہلی منزل ہے بدگمانی کرنا پہلی دیوار ممانعت کی یہاں کھڑی کی گئی ہے دوسری (۲) منزل ہے بدگمانی پیدا ہونے کے بعد جستجو کہ ہم اس کا پتہ لگائیں، اسے منع کیا گیا کہ تجسس نہ کرو۔ اب اگر اس کی اخلاف ورزی ہوئی اور تجسس سے پتہ چل گیا یا بغیر تجسس ہی اتفاق سے پتہ لگ جائے تو اب جو بہت سخت گناہ ہے اس سے روکا جا رہا ہے کہ تمہیں برائی معلوم بھی ہوگی، تو خبردار اس کا چرچا نہ کرو، دوسروں سے اس کا ذکر نہ کرو۔ یہ غیبت

ہے جو اس طرح کی بری چیز ہے جیسے مردہ بھائی کا گوشت کھانا جسے یقین ہے کہ ہر ایک کا ضمیر ناپسند کرتا ہے تو جب اسے ناپسند کرتے ہو تو پھر غیبت سے پرہیز کرو کہ وہ بھی ایسی ہی چیز ہے۔

آخر میں بخشش اور مہربانی کا اعلان اس شخص سے متعلق معلوم ہوتا ہے جس کی غیبت کی جارہی ہے کہ تمہیں کیا خبر، اسکے جس گناہ کا تم چرچا کررہے ہو، وہ بخشا جاچکا ہو اور وہ اللہ کے یہاں اس داغ سے پاک وصاف ہو چکا ہو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

''اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں قرار دیا ہے اس لیے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو، یقیناً تم میں زیادہ عزت والا اللہ کے یہاں وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہو، بلاشبہ اللہ بڑا جاننے والا ہے، خبر رکھنے والا''۔

اسلامی مساوات کے ساتھ معیار امتیاز کا بیان

یہی وہ غلط وجوہِ امتیاز کے مقابلے میں مساوارت اسلامی اور غلط تصور مساوات کے مقابلے میں معیار امتیاز کو ثابت کرنے والی آیت ہے جس نے تمام دنیا کی تہذیبوں کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کو بلند ترین درجہ بخشا ہے۔ اس کے تحت میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روز فتح مکّہ برملا یہ اعلان فرمایا کہ:۔

یا ایھاالناس ان اللہ قد اذھب عنکم بالاسلام نخوۃ الجاھلیۃوتفاخرھابآبائھاان عربیہ لیس باب دوالۃ انماھولسان الناطق فمن تکلم بہ فھو عربی الاانکم من آدم وآدم من تراب وا کرمکم عنداللہ اتقا کم

(علی ابن ابراھیم)

اے انسانو! اللہ نے اسلام کے ذریعے سے تمہارے جاہلیت والے گھمنڈ اور آباؤ اجداد کی طرف نسبت کی بنا پر جو فخر کی جاتا تھا، وہ ختم کر دیا۔ آگاہ ہونا چاہیے کہ عرب ہونا باپ اور ماں کی لحاظ سے نہیں ہوتا بلکہ صرف ایک وصف کی لحاظ سے ہوتا ہے جو گویائی ہے تو جس میں یہ وصف ہے، وہ عرب ہے! آگاہ ہو کہ تم سب آدم کی اولاد ہو آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ تم میں عزت اس کی زیادہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔

درمیان میں جو فقرات ہیں، وہ عرب کی اس تصور فوقیت کے خلاف انتباہ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے تو اس کے خلاف روشنی ڈالی گئی ہے کہ گویائی کا وصف نسلی طور پر کسی قوم کی ملکیت سمجھنا غلط ہے۔ اصل ونسل کے لحاظ سے جسے تم عرب نہیں سمجھتے، وہ بھی اس وصف کا حامل ہوسکتا ہے لیکن آخر میں جو معیار امتیاز ہے، اس کو واضح کیا گیا ہے کہ اس میں عرب اور غیر عرب کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ کردار کا سانچہ ہے جسے ''تقویٰ'' کہتے ہیں، وہ خود کسی کام کا نام نہیں ہے بلکہ اس سانچے میں ڈھلے ہوئے جو کام ہوتے ہیں، وہ وہیں ہوتے ہیں جو مرضی خدا کے مطابق اور ہر حال میں جو انسان کا فرض ہے، اس کے موافق ہوتے ہیں۔

دنیا میں جو غلط اقدار امتیاز کے قائم تھے اور اب بھی ایک طبقہ میں ہیں جیسے رنگ کے لحاظ سے تفریق کہ گورے اونچے ہیں، کالے نیچے

اور نسل کے لحاظ سے امتیاز، ان تفرقوں کو اسلام نے مٹایا ہے، اس اعتبار سے اسے ''دین مساوات'' کہنا صحیح ہے مگر اپنی طرف سے اس نے اوصاف شخصی کے لحاظ سے امتیازات قائم کیے ہیں جن میں سب سے بڑا معیار امتیاز یہی تقویٰ ہے جس کے تحت میں جو افعال ہوتے ہیں، وہ ''اعمال صالحہ'' کہلاتے ہیں۔ اس میں جو بلند درجہ رکھتا ہے، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے اونچا ہے۔

چونکہ دنیا دراصل ان امتیازات کو بھلا دیا تھا، اس بنا پر اس نے اپنی طرف سے غلط اقدار امتیاز کے قرار دے لیے تھے لہٰذا قرآن نے مساوات پر اتنا زور نہیں دیا ہے جتنا ان امتیازات کو نظر انداز کرنے والوں کے خلاف عدم مساوات پر زور دیا ہے اور طرح طرح سے مثالیں دے دے کر سمجھایا ہے کہ دیکھو یہ دونوں برابر نہیں، مثلاً اندھیرا اور اجالا یکساں نہیں، زندہ اور مردہ برابر نہیں سایہ اور دھوپ برابر نہیں، میٹھے اور کھاری دریا برابر نہیں وغیرہ وغیرہ نہیں تو تم انسانوں میں کیوں ان امتیازات کو نظر انداز کرتے ہو کہ مومن اور کافر یکساں نہیں۔ خوش اعمال اور بد اعمال برابر نہیں، عالم اور جاہل یکساں نہیں، ہدایت یافتہ اور گمراہ یکساں نہیں اور اس سب کے آخر میں نتیجے لے لحاظ سے نجات یافتہ اور غیر نجات یافتہ یکساں نہیں ہیں جیسے قرآن مجید نے یوں کہا ہے کہ:۔ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (یعنی) ''دوزخ والے اور بہشت والے یکساں نہیں ہیں، بہشت والے ہی وہ ہیں جو نتیجہ کامیاب ہیں''۔ (حشر۔۲۰)

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾

''صحرائی عربوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے، کہیے کہ تم ایمان نہیں لائے ہو، مگر یہ کہو کہ ہم مسلمان ہوئے اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل ہوا نہیں ہے اور اگر اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو تو وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''

اسلام آسان ہے اور ایمان مشکل

اس آیت کا مضمون بتایا ہے کہ ایمان کا درجہ اسلام سے بالاتر ہے۔ اسلام آسان ہے اور ایمان مشکل۔ اسلام ظاہر سے وابستہ ہے اور ایمان دل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس طرح منافق مسلم کی ایک قسم ہو سکتی ہے، مومن کی نہیں، جب ظاہر و باطن دونوں ہم آہنگ ہوں تو وہ اسلام بھی ہے اور ایمان بھی اور اس کا اثر دنیا میں بھی حاصل ہوگا اور عقبیٰ میں بھی ظاہر ہوگا اور اطاعت خدا اور رسول ﷺ میں یہ ہم آہنگی داخل ہے، اس لیے اس پر جزائے اعمال اور مغفرت کو مرتب کیا گیا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾

''ایمان لانے والے تو بس وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں، پھر شک و شبہ میں مبتلا نہ ہوں اور

اپنے مالوں جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں یہ ہیں بس سچے لوگ"۔

شک ضمیر کی خامی کی علامت ہے۔ اگر معرفت حق میں ضمیر مطمئن ہے اور پوری بصیرت کے ساتھ ایمان اختیار کیا ہے تو پھر شک کا گزر دل و دماغ میں کیوں ہو؟

شروع کے "انّما" کلمہ حصر سے بھی یہ ظاہر ہوتا تھا کہ صاحب ایمان بس یہ ہیں اور آخری فقرہ تو صاف بتاتا ہے کہ اگر شکوک وشبہات کا رفرما ہیں تو یہ نہیں کہ ایمان کے درجے کی کمی کے باعث ہوں بلکہ وہ دعویٰ ایمان کے جھوٹے ہونے کی علامت ہوں گے۔

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

"کہیے کہ کیا تم اپنے دین سے اللہ کو آگاہ کرتے ہو؟ حالاں کہ اللہ آگاہ ہے اس سے کہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ وہ آپ پر احسان جتاتے ہیں اس کا کہ وہ مسلمان ہوئے، کہیے کہ مجھ پر اپنے مسلمان ہونے کا احسان نہ جتاؤ بلکہ اللہ کا احسان ہے تم پر کہ اس نے تمہیں ایمان کا راستہ بتایا اگر تم سچے ہو، یقیناً اللہ جانتا ہے آسمانوں اور زمین کے غیب کو اور اللہ جو تم کرتے ہو، اس کا دیکھنے والا ہے"۔

قبول ہدایت کے ساتھ راہ راست اختیار کرنا اللہ کا احسان

کچھ لوگ بڑھ چڑھ کر گویا سینوں پر ہاتھ مار کر اپنے ایمان کا پرزور فخریہ انداز میں ادّعا کرتے تھے جیسے کہ انہوں نے اتنا بڑا کارنمایاں انجام دیا کہ وہ ایمان لائیں اور پھر اُن میں سے کچھ اُسے اس طرح پیش کرتے تھے کہ جیسے انھوں نے خدا اور رسولؐ پر بڑا احسان کیا۔ ان میں سے اول تو اکثر اپنے دعوے میں سچے بھی نہ تھے اور اُن کا ایمان بس نمائشی تھا اور اگر بالفرض وہ باایمان ہیں تو ان کا یہ تصور کہ ہم نے خدا اور رسولؐ پر کوئی احسان کیا، غلط تھا اور خود یہ تصور ان کے ایمان کی خامی کی دلیل ہے۔ اگر وہ سچے مومن ہوتے تو یہ تصور ہرگز نہ کرتے بلکہ وہ سمجھتے کہ ایمان اختیار کر کے ہم نے حق پرستی کا وہ فریضہ ادا کیا جو عقل وضمیر کے تقاضے سے ہمارے ذمے تھا اور اُس کے لیے خدا کی توفیق ہمارے شاملِ حال ہوئی۔ یہ اُس کا احسان ہم پر ہے جس کا ہمیں شکر لازم ہے۔

سُوْرَۃُ قٓ

مکّیہ----۴۵----آیات

شروع میں مقطّعات قرآنیہ کے قبیل سے جو حرف قافؔ ہے، اسی پر اس سورے کا نام ہوا۔

سورۂ ق کے خاص خاص مضامین:

۱.....پیغام رسولؐ کے ماننے میں کفار کے ذہن کے لیے دو (۲) رکاوٹیں۔

۲.....دوبارہ زندگی سے کفار کا تعجب دور کرنے کے لیے مثالیں۔

۳.....قوم نوحؑ کے ساتھ اصحاب رسؔ اور اہل ایکہؔ کا ذکر۔

۴.....اللہ کا رگ گردن سے زیادہ قریب ہونا۔

۵.....آخر میں کفر ختم مگر اُس دن کا ایمان معتبر نہیں۔

۶.....خلقت آسمان وزمین کے بعد خالق کا تھک جانا، جو بائبل میں ہے، اس کی ردّ،

۷.....آخرت کے مناظر۔

۸.....رسولؐ کا کام جبر کرنا نہیں ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝۱ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝۲ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝۳

''قاف۔ قسم ہے بڑے مرتبے والے قرآن کی بلکہ انھیں تعجب ہے کہ انہی میں سے ایک ڈرانے والا (رسول) آیا تو کافروں نے کہا کہ یہ ایک عجیب چیز ہے، کیا اس وقت جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہوجائیں گے؟ یہ واپس آنا بعید از امکان ہے''۔

اس کے پہلے سورہ صٓ میں اس طرح کی صورت کلام ہے کہ حرف صٓ پھر قرآن کی قسم اور اُس کے بعد کافروں کا ذکر بَلْ کے لفظ کے ساتھ (صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ) اور یہاں وہی صورت ہے کہ حرف قٓ ہے۔ پھر قرآن کی قسم

ہے اور پھر ''بلکہ'' کے ساتھ کافروں کا ذکر ہے اب چونکہ قسم کے لیے جواب کی ضرورت ہوتی ہے جو کوئی جملہ ہوتا ہے اور بلکہ سے پہلے بھی کسی جملے کی ضرورت ہے، اس لیے یہاں ایسا جملہ محذوف مانا جاتا ہے جس کو قرینہ مقام سے سمجھا جا سکتا ہے مثلاً یہ کہ آپ خدا کے رسولؐ ہیں یا آپ جو دوسری زندگی کی اطلاع دے رہے ہیں وہ بالکل درست ہے کیونکہ یہی دونوں چیزیں وہ ہیں جن پر بعد میں ان کے تعجب کا اظہار کیا گیا ہے۔ [1]

پیغام آنحضرتؐ کے ماننے میں کفار کے ذہن کے لیے دو رکاوٹیں

اور یہ یہاں بھی ہوسکتا ہے جیسے ہم نے سورۂ صٓ میں ترجیح دی ہے کہ وہ جملہ حرف صٓ میں جو ایک رمز کی حیثیت رکھتا ہے مضمر سمجھا جائے۔ ایسی صورت میں وہ ایک رازِ الٰہی ہوگا جس کے سمجھنے کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔

رسول کے انہی میں سے آنے پر تعجب کے ساتھ بلا فاصلہ مرنے کے بعد واپس آنے پر اظہارِ حیرت اس کا پتہ دیتا ہے کہ رسولوں کے بنیادی پیغام میں دوسری زندگی جس کا نام معادؔ ہے، اُس شکل میں جو مسلمانوں کا عام عقیدہ ہے، ایک رکن اساسی کی حیثیت رکھتی تھی جس پر کفار اظہارِ پریشانی کرتے تھے۔

اس کے علاوہ یہ پتہ چلتا ہے کہ پیغام رسولؐ کے ماننے میں سب سے بڑی ان کے لیے دو (۲) رکاوٹیں تھیں، ایک یہ تصور کہ بشر کیوں کر رسول ہوسکتا ہے جو رسول ہوا سے تو بس ملک ہونا چاہیے۔ [2]

دوسرے معاد جسمانی جس پر وہ گھبرا کر کہتے تھے ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے۔

اب جس طرح وہ شخص جو اس طرح کی معاد جسمانی کا شکر ہو، وہ ذہنی حیثیت سے اُنہی کفار کے ساتھ شریک ہے، اسی طرح جو رسول اور ائمہؑ کو بشر کے علاوہ ملک یا کوئی دوسری نوع مانے، وہ بھی درحقیقت اسی ذہنیت کا حامل ہے جو ان کفار کی تھی۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝۴ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝۵

''ہمیں معلوم ہے جو زمین اُن میں کمی کرتی ہے اور ہمارے پاس وہ نوشتہ ہے جو محفوظ رکھنے والا ہے بلکہ انھوں نے حق کو جب اُن کے پاس آیا جھٹلایا تو وہ پریشان خیالی کی کیفیت میں مبتلا ہیں''

یہ تتمہ ہے اُسی اُن کے اظہارِ تعجب کے مقابلے میں خالق کے جواب کا کہ ہمیں دوبارہ پلٹانے میں دشواری تو اس وقت ہوتی اگر منتشر اجزائے جسم پر ہمارا علم محیط نہ ہوتا لیکن جب ہم جانتے ہیں کہ کس جسم کے اجزا کہاں کہاں ہیں اور کس شکل میں ہیں تو ہمیں پھر اُن کو دوبارہ اصل صورت پر لانے میں کیا دشواری ہے؟ [3]

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝۶

---

[1] ۔ جواب قسم محذوف یدل علیہ اذا متنا و کنا ترابا تقدیرہ انکم منعوثون وقیل تقدیرہ ان محمد رسول اللہ (مجمع البیان)

[2] ۔ عجبوا ان یکون المنذر منھم حسبوا انہ لا یوحیٰ الا الیٰ ملک (مجمع البیان)

[3] ۔ ای علمنا الذی تاکل الارض مولحومھم لا یخفیٰ علینا شیءٌ منہ (تبیان)

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۙ﴿۷﴾ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴿۸﴾ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۙ﴿۹﴾ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۙ﴿۱۰﴾ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿۱۱﴾

''کیا انھوں نے نہیں دیکھا آسمان کو جو ان کے اوپر ہے کہ کس طرح ہم نے بنایا ہے اُسے اور آراستہ کیا اس کو اور اُس میں کوئی شگاف نہیں ہے اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اُس میں پہاڑ قائم کیے اور اُس پر ہر طرح کی خوشنما چیزیں اُگائیں ۔ یہ آنکھ کھولنے کو ذریعہ اور یاد دہانی کا سامان ہے اللہ کی طرف توجہ رکھنے والے ہر بندے کے لیے اور ہم نے آسمان سے پانی اُتارا برکت والا تو اُس سے اُگائے باغ اور کاٹی ہوئی زراعت کے دانے اور اونچے اونچے کھجور کے درخت جن میں تہہ بہ تہہ میوے پیدا ہوتے ہیں بندوں کی روزی کے لیے اور اس سے ہم نے مردہ، بے جان زمین کو زندہ کیا۔ یونہی (آدمیوں کا قبروں سے) نکلنا ہوگا''۔

دوبارہ کی زندگی سے کفار کا تعجب دور کرنے کے لیے مثالیں

اُن کے اس اظہار تعجب کے جواب میں کہ کیا اُس وقت جب ہم مرجائیں گے اور خاک ہوجائیں گے یہ واپس آنا بہت بعید از امکان بات ہے، قرآن نے ان نگاہوں کو بارش اور اُس کے اثرات کی طرف موڑا ہے کہ دیکھو زمین کے ذرات کس طرح ملتے ہیں اور اُن سے مل کر نباتات برآمد ہوئے ہیں، اس پر تمھیں حیرت نہیں ہوتی تو ایسا ہی سمجھو کہ جب اللہ چاہے تو وہ انہی خاک کے ذرات کو اکٹھا کر کے اس ذی روح مخلوق کو پھر پیدا کر دے۔[1]

قرآن مجید کا منکرین معاد سے اس طرح بحث کرنا معاد جسمانی کی قطعی دلیل ہے اگر بعض مسلمان فلاسفہ قدیم وجدید کا تصور صحیح ہوتا کہ بس روحانی لذت والم ہے۔ ثواب وعذاب اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے تو قرآن کو مخالفین سے بحث میں ان مثالوں کے پیش کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۙ﴿۱۲﴾ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۙ﴿۱۳﴾ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

''ان کے پہلے نوحؑ کی قوم نے جھٹلایا اور رسّ والوں نے اور ثمود اور عاد اور فرعون اور لوط کی قوم والوں اور ایکہ والوں اور تبع کی قوم، ان میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو میری طرف کے اعلان عذاب کے مستحق

---

[1] ۔جوابا لقولهم :ءاذامتنا و كنا ترابا ذالك رجع بعيد فقال الله كما ان الملء انزلناه من السماء فتخرج النبات من الارض كذالك انتم تخرجون من الارض...على ابن ابراهيم)

ہوئے"۔

قوم نوحؑ کے ساتھ اصحاب رس اور اہل ایکہ کا ذکر

رسؔ کے لیے بتایا گیا ہے:

هی بئر کانوا مقیمین علیها بمواشیهم یعبدون الاصنام ونبئهم قبل حنظله بن صفوان وقیل غیره.

یہ ایک کنواں تھا جس کے پاس اپنے مویشیوں کے ساتھ وہ لوگ قیام کیے ہوئے تھے اور بتوں کی پرستش کرتے تھے اور ان کے پیغمبر کہا گیا ہے کہ حنظلہ بن صفوان تھے اور بعض نے کسی دوسرے کو کہا ہے۔

ہماری قدیم تفسیر میں ہے کہ:

هم الذین هلکو الانهم استغنوا الرجال بالرجال والنساء بالنساء (علی ابن ابراهیم)

یہ وہ ہیں جو ہلاک ہوئے اس لئے کہ مردوں نے مردوں کے ساتھ اور عورتوں نے عورتوں کے ساتھ تعلقات ازدواجی پر انحصار کرلیا۔

جناب شیخ طوسیؒ نے رسؔ کی تعیین میں کئی قول نقل کیے ہیں اور علامہ طبرسیؒ نے امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ روایت کی ہے کہ وہ لوگ تھے جن کی عورتوں میں تلذذ بالمثل (مساحقہ) کا رواج تھا۔[1]

یہ صراحتاً تفسیر علی بن ابراہیم کے ایک جزؑ کے موافق ہے مگر بظاہر دوسرا جو اس کے ساتھ تلازم رکھتا ہے۔

ایکہ کے معنی سیٹھوں کے جنگل کے ہیں، کہا جاتا کہ اس سے مراد اہل مدین ہیں جن میں جناب شعیبؑ مبعوث ہوئے تھے۔ تبع کی قوم والوں سے اہل یمن مراد ہونا ظاہر ہے۔

اَفَعَیِینَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ؕ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ﴿۱۵﴾

"تو کیا ہم پہلی دفعہ تخلیق میں عاجز آئے تھے؟ بلکہ وہ از سرنو پیدائش کے بارے میں شک وشبہ میں گرفتار ہیں"۔

یعنی جب پہلی مرتبہ کائنات کے پیدا کرنے پر قادر ثابت ہو چکے ہیں تو پھر از سرنو پیدائش میں بھی کوئی شک وشبہ ہونا نہیں چاہیے یہاں تک برابر سلسلہ چلتا رہا انہی کفار کی رد کا جو حیات بعد الموت اور معاد جسمانی پر جس کی انبیاؑ و مرسلین برابر اطلاع دیتے رہے ہیں حیرت واستعجاب کا اظہار کررہے تھے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾ اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ﴿۱۷﴾ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ﴿۱۸﴾ وَجَآءَتْ سَکْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ

---

[1] ۔قیل کان سحق النساء فی اصحاب الرس وروی ذالك عن ابی جعفر وابی عبدالله علیہما السلام (مجمع البیان)

مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿١٩﴾

''اور ہم نے پیدا کیا ہے آدمی کو اور ہم جانتے ہیں جو اُس کے دل میں وسوسے پیدا ہوتے ہیں اور ہم اُس سے رگ گردن سے زیادہ قریب ہیں۔ جب کہ لے رہے ہوں گے دو ۲ لینے والے دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے، کوئی بات اُس کی زبان سے نہیں نکلتی مگر یہ اُس کے پاس نگراں تیار موجود ہیں اور آیا موت کے سکرات کا عالم حق کے ساتھ یہی وہ چیز تھی جس سے تو بہت بچتا تھا''۔

''رگ گردن سے زیادہ قریب'' ہونا جسمانی طور پر نہیں ہے بلکہ یہ علم واطّلاع کے احاطے کی ایک تعبیر ہے کہ ہمیں باخبر ہونے میں اُس کے حالات سے کوئی دیر نہیں لگ سکتی۔ [1]

''دائیں اور بائیں'' بیٹھنے والوں سے مراد کاتبانِ اعمال ہیں [2] جو ہر وقت کے انسان کے کردار کو محفوظ کرتے ہیں۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿٢٠﴾ وَجَاۗءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَاۗىِٕقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿٢١﴾ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاۗءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿٢٢﴾

''اور صور پھونکا گیا ہوگا، یہ وہ عذاب کا دن جس سے تمہیں ڈرایا جاتا رہا ہے۔ ہر متنفس آیا اس طرح کہ اس کے ساتھ ایک پیچھے پیچھے ہنکانے والا ہے اور ایک گواہ۔ تو بے خبری کے عالم میں رہا اس سے تو اب ہم نے تیری آنکھ سے پردہ ہٹا دیا تو آج نگاہ تیز ہے''۔

آخرت میں کفر ختم مگر اس دن کا ایمان معتبر نہیں

پہلے جو باتیں پردہ غیب میں تھیں ، اس لیے دنیا میں یہ ان کا منکر تھا، آج وہ سب مشاہدے کی صورت میں آنکھ کے سامنے آچکی ہیں، اس لیے اُن کے ماننے میں آج مومن اور کافر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ [3]

لیکن اب آج کا ماننا نتیجہ خیز نہیں ہے اور ہلاکت ابدی سے بچا نہیں سکتا۔

اسی طرح ہر غیب پردہ غیب کے ہٹنے کے بعد جب عالم شہود میں آجائے تو آج کے منکر اس وقت سب ہی مان لیں گے مگر اس وقت کا ماننا معتبر نہ ہوگا

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ﴿٢٣﴾ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿٢٤﴾ مَّنَّاعٍ

---

[1] ۔اقرب الیہ بالعلم (مجمع البیان)

[2] ۔یعنی الملکین الموکّلین بالانسان عن یمینہ وشمالہ (تبیان)

[3] ۔المراد بہ جمیع المکلفین برھم وفاجرھم لان معارف الجمیع ضروریہ (تبیان)

لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبِ۝۲۵ الَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِیٰهُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ۝۲۶

''اور اس کے ساتھ والا کہہ رہا ہوگا کہ یہ وہ ہے جو میرے پاس مدت سے تیار ہے تم دونوں ڈالو دوزخ میں ہر عناد رکھنے والے بڑے ہی کافر کو جو خیرات سے ہاتھ روکنے والا، حدود سے تجاوز کرنے والا اور شک وشبہ میں (دوسروں کو بھی) ڈالنے والا تھا، جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا خدا بنایا تو تم ڈالو اُس کو سخت عذاب میں''۔

ساتھ والا کہہ رہا ہوگا'' زیادہ مفسرین اس کی تفسیر ''فرشتے'' کے ساتھ کرتے ہیں۔[1]

اور ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں ہے کہ اس سے مراد شیطان ہے۔[2]

اِس صورت میں یہ وہ ہے جو میرے پاس مدت سے تیار ہے، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ وہ ہے جو میں تجھے بہکا کر اور غلط راستوں پر تیرے لیے مدتوں سے سامان مہیا کیا ہے۔

بہرصورت بعد کا خطاب کہ ''تم دونوں ڈالو'' یہ خالق عظیم کا فرمان ہے۔

چونکہ القیا تثنیہ کا صیغہ ہے، اس لیے ہم نے ترجمہ کیا:۔

''تم دونوں ڈالو''.....اب یہ دونوں کون ہیں؟

شاہ ولی اللہ نے ترجمہ کیا ہے:۔ گویم اے دو (۲) فرشتہ''۔

حالاں کہ الفاظ قرآن میں ''اے دو فرشتو'' کی ہم معنی کوئی لفظ نہیں ہے۔ حاشیے میں وہ لکھتے ہیں:۔

عادت بادشاہانست کہ اسیر پیش ایشاں دو کس گرفتہ می آرند از اں جہت دو فرشتہ را خطاب.....(فتح الرحمٰن) بادشاہوں کا عام طریقہ یہ ہے کہ قیدی کو اُن کے سامنے دو شخص لیے ہوئے آتے ہیں اس لیے دو فرشتوں سے خطاب ہوگا۔

یہ ایک طبع زاد بات ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔

بعض مفسرین کی سمجھ میں کوئی دو (۲) ایسے نہیں آئے کہ جن سے یہ خطاب ہو لہٰذا انھوں نے گھبرا کر کہہ دیا کہ یہ تثنیہ باعتبار تکرار عمل ہے اور القی کی تکرار کے معنی میں ہے یعنی ''ڈالو، ڈالو'' مگر ظاہر ہے کہ تثنیہ کا صیغہ فاعل کے لحاظ سے ہوتا ہے نہ کہ فعل کے بار بار ہونے سے۔ دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ تثنیہ کا صیغہ ہے ہی نہیں بلکہ نون تاکید خفیفہ کے ساتھ مفرد کا صیغہ ہے اور کلام عرب میں کبھی نون خفیفہ الف سے بدل جاتی ہے۔[3]

بعض کا خیال ہے کہ عرب میں محاورہ ہے کہ اکثر ۲ کو مخاطب کرتے ہیں جس میں ۲ کی کوئی خصوصیت مقصود نہیں ہوتی جیسے متعلقۂ امراء القیس کے آغاز میں فقا نبك ''ٹھہرو (تم دونوں) ہم روئیں'' اور دوسرے شعراء کے یہاں ''خَلِیْلَیَّ'' ''اے میرے دونوں دوستو'' اور صَاحِبَیَّ اے میرے دونوں ساتھیو.....اسی محاورے کے مطابق یہاں بھی خطاب دو (۲) سے ہے، چاہے مخاطب ایک ہی ہو یا دو (۲) سے زیادہ

---

[1] ۔ فرشتہ ھم نشین او (شاہ ولی اللہ) ہم نشین اس کا یعنی فرشتوں میں سے (رفیع الدین)

[2] ۔ قرینہ ای شیطان (علی ابن ابراھیم)

[3] ۔ ای الق الق او القین فابدلت النون الفا (جلالین)

کی جماعت ہو۔

اور بھی پہلو ہیں جنہیں دوسرے مفسرین جمہور کے علاوہ ہمارے شیخ الطائفہؒ اور علامہ طبرسیؒ نے بھی درج فرمایا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دو (۲) کا مصداق صاف طور پر سمجھ میں نہیں آرہا ہے تو کیا حرج ہے کہ یہ سب لوگ ہمارے یہاں کی اس تشریح کو قبول کرلیں جو حدیث رسولؐ: یا علی انت قسیم النار والجنة کی تائید اور معصوم کی طرف استناد کے ساتھ بسند متصل وارد ہوئی ہے کہ یہ خطاب محمد وعلی علیہما السلام سے ہوگا جو کارگاہ حشر ونشر کے از جانب خدا منتظم ہوں گے اور یہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے مسندات میں سے ہے یعنی آپ نے اپنے اباؤ اجداد طاہرین علیہم السلام کے سلسلہ ذہبی سے اس کی روایت حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی فرمائی ہے۔ [۱]

قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۲۷﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿۲۸﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿۳۰﴾

''اس کے ساتھ والوں نے کہا کہ پروردگارا! میں نے اس کو سرکشی پر آمادہ نہیں کیا مگر یہ خود ہی گمراہی میں تھا۔ ارشاد قدرت ہوا میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، میں نے تو پہلے ہی تم سب کو عذاب کی اطلاع دی تھی۔ میرے یہاں بات بدلتی نہیں اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں، جس دن ہم دوزخ سے کہیں گے کیا اب تو بھر گیا ہے؟ اور وہ کہے گا اور اضافہ ہوسکتا ہے''؟

یہاں قرینہ یعنی اس کے ساتھ والے کی تفسیر سب نے شیطان کے ساتھ کی ہے۔ [۲]

یا اس کے علاوہ شیطان صفت آدمی بھی۔ [۳]

اس سے تائید ہوتی ہے ہمارے یہاں کی اس تفسیر کی جو اس کے قبل والی آیت وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ میں ہوئی تھی۔ وہاں خواہ مخواہ ان لوگوں نے شیطان کو فرشتہ بنا دیا تھا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ کو مفہوم عام طور پر طلب زیادتی کا لیا گیا ہے، اس لیے صحیح بخاری میں اس کے تحت میں شان الٰہی کے خلاف حدیث آگئی ہے کہ معاذ اللہ وہ اپنی ٹانگیں دوزخ میں ڈال دے گا جس کے بعد دوزخ کا پیٹ بھر جائے گا اور وہ کہے گا قط قط یعنی بس بس۔

ہمارے یہاں کی تفسیر کہتی ہے کہ یہ استفہام انکاری ہے یعنی اضافے کی اب کی گنجائش ہی کہاں ہے کیونکہ خالق کا پہلے سے اعلان تھا کہ لاملانّ جھنم میں دوزخ کو بھر دوں گا تو اب خطاب الٰہی ہو رہا ہے کہ تو بھر گیا؟ اور اس کا جواب ہے کہ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ

اور حقیقت امر یہ ہے کہ یہی بنیادی طور پر غلط ہے کہ اس کو لفظی سوال وجواب مانا جائے بلکہ وہ اس حقیقت کا ایک تمثیلی پیرایہ میں اظہار

---

[۱] ۔عن محمد بن علی ابن الحسین علیہم السلام عن ابیہ عن جدہ عن علی ابن ابی طالب قال رسول اللہ (علی ابن ابرھیم)

[۲] ۔یعنی شیطان (رفیع الدین) یہ ساتھی شیطان ہے.....موضع القرآن)

[۳] ۔یعنی از شیطان الانس والجن (فتح الرحمٰن)

ہے کہ خالق نے جوازل ہی میں اورکم سے کم سجدۂ آدم سے انکار پر شیطان سے مخاطب ہوکر اپنے فیصلے کا اعلان فرمادیا تھا کہ میں دوزخ کو تیرے پیرووں سے بھردوں گا، وہ بالکل وقوع میں آ گیا۔ [1]

''اور بہشت آراستہ کیا جائے گا پرہیزگاروں کے لیے بغیر دوری کے۔ یہ وہ ہے جو کہ وعدہ کیا جاتا رہا ہے تم (میں) سے اللہ کی طرف توجہ رکھنے والے کے لیے جو محفوظ رکھنے والا ہو، جو بے دیکھے خدائے رحمٰن سے ڈرتا ہے اوراس دل کے ساتھ آئے جو لولگانے والا ہے، داخل ہوتم لوگ اس میں سلامتی کے ساتھ۔ یہ ہمیشہ کے قیام کا دن ہے ان کے لیے اس میں وہ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اورزیادہ کی گنجائش ہے''۔

بہشت پرہیزگاروں کے لیے آراستہ کیا جائے گا بغیر دوری''یعنی اس کی نعمتوں کے حصول میں کوئی دیر نہ ہوگی اورنہ اس تک پہونچنے میں کوئی زحمت درپیش ہوگی۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ ؕ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۶﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴿۳۷﴾

''اور کتنی ہلاک کیں ہم نے ان کے پہلے ایسی قومیں جو ان سے زیادہ طاقت میں توانہوں نے تمام ملکوں کو چھان ڈالا تھا، کیا کوئی بھاگنے کا راستہ ہے؟ یقیناً اس میں یاداشت ہے۔ اس کے لیے جس کے پاس دل ہو یا کان لگائے ہو اس طرح کہ وہ حاضرالذہن ہو''۔

پہلے آچکا ہے کہ دل کے معنی محاورے میں عقل کے ہوتے ہیں۔ [2]

نہ کہ ڈاکٹروں والا دل جو چلتے چلتے رک جاتا ہے تو موت واقع ہوجاتی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾

''اور ہم نے آسمانوں اورزمینوں اور ان دونوں کے درمیان کی چیزوں کو چھ (٦) دن میں پیدا کیا اور ہمیں تھکن چھو بھی نہیں گئی''۔

یہ مضمون قرآن میں بہت جگہ آچکا ہے اور ہر جگہ اس پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ چھ (٦) دن وہ نہیں ہوسکتے جو طلوع وغروب آفتاب سے پیدا ہوتے ہیں کیوں کہ اس تخلیق سے پہلے سورج اور چاند وغیرہ کچھ تھا ہی نہیں۔

اس کے علاوہ متعدد جگہ اس تذکرہ کے بعد یہ صراحت جو ہے کہ ہمیں اس میں تھکن نہیں ہوئی، یہ اس لیے ہے کہ جماعت یہود کا یہ تصور

---

[1] ۔الاظہر ان الکلام خرج مخرج المثل (تبیان)

[2] ۔معنی القلب ھنا العقل عن ابن عباس (مجمع البیان)

تھا جو بائبل میں ہے کہ اس نے چھ دن میں آسمان وزمین کو جو پیدا کیا وہ تھک کے چور ہو گیا اور ساتویں دن اس نے آرام کیا۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾

''تو جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس پر صبر کیجیے اور اپنے پروردگار کے حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے سورج نکلنے سے پہلے اور مغرب کے پہلے اور رات کے کچھ حصے میں بھی اس کی تسبیح کیجیے اور سجدہ کرنے کے بعد''۔

اوقات نماز کا بیان

بظاہر مقام تنزیل میں اس کا تعلق قبل کی آیت سے کوئی نہیں ہے۔

اگر آخر کا فقرہ نہ ہوتا ''سجدہ کرنے کے بعد جس کے دوسرے معنی ہوئے نماز کے بعد۔[1]

تو بلا تکلف سمجھا جا سکتا تھا کہ یہاں اوقات نماز کا بیان مقصود ہے مگر اس فقرے سے خیال ہوتا ہے کہ یہ ویسی ہی تسبیح ہے جیسی تعقیبات نماز پر پڑھی جاتی ہے مگر بعض علمائے اہل سنت بھی آخری جملے کو نوافل سے متعلق کرنے کے بعد باقی اجزائے آیت سے اوقات نماز واجب مراد لیتے ہیں۔ اس صورت میں مثل دوسرے مقامات کے جہاں اوقات نماز کی طرف اشارہ ہوا ہے، یہاں بھی یہ دیکھنے کی بات ہے کہ قرآن نے الگ الگ تین ہی وقت بتائے ہیں جو شیعوں کی فقہ والے اوقات کے مطابق ہے، پانچ وقت الگ الگ نہیں چنانچہ جلالین نے بھی ان اوقات کی جو تشریح کی ہے وہ یوں ہے کہ:۔

قبل طلوع الشمس ای الصلوٰۃ الصبح وقبل الغروب ای الظهر والعصر ومن اليل فسبحه ای صلّ العشائين).

سورج نکلنے سے پہلے یعنی نماز صبح اور غروب سے پہلے یعنی دونوں نماز ظہر اور عصر اور رارت کے ایک حصے میں تسبیح کرو یعنی مغرب وعشاء یہ وہی صبح اور ظہرین اور مغربین کا فقہی تصور ہے جو اہل بیتؑ کی تعلیم کے مطابق ہے، اس میں نماز صبح کا وقت الگ ہے۔ اس کے بعد زوال آفتاب سے غروب کے بعد سے دو (۲) نمازوں کا وقت ہے ظہر اور عصر جن میں بس ترتیب معتبر ہے کہ ظہر پہلے ہو اور عصر بعد کو ہو اور غروب کے بعد سے دو (۲) نمازوں کا وقت ہے جنہیں ہم مغربین کہتے ہیں اور انہوں نے عشائین کہا ہے۔

بہر صورت وہ مغرب وعشاء ہیں۔ ان میں بس ترتیب کے لازم ہونے کی بنا پر شروع کا وقت بقدر نماز مغرب، مخصوص مغرب کے ساتھ ہے اور آخر کا بقدر نماز عشاء کے ساتھ ہے۔ باقی درمیان کا وقت جیسے وہاں ظہرین میں مشترک ہے، ویسے یہاں مغربین میں۔ قرآن مجید جہاں جہاں اوقات نماز کا اجمالی بیان ہے، وہ اجمال اسی تفصیل کے موافق ہے۔

وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۴۱﴾ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ

---

[1] ۔عقب نماز نیز (شاہ ولی اللہ)

بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿۴۳﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ؕ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿۴۴﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۟ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿۴۵﴾

''اور غور سے سنو (اس دن کا حال) جب پکارنے والا صدا دیگا قریبی جگہ سے جس میں ایک خاص زوردار آواز کو سنیں گے حق کے ساتھ وہ (قبروں) سے نکلنے کا دن ہوگا، یقیناً ہم ہی تو جلاتے اور مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف پلٹنا ہے جس دن زمین شگافتہ ہونے سے وہ تیزی کے ساتھ برآمد ہوں گے۔ یہ وہ حشر ونشر ہے جو ہم پر بالکل آسان ہے ہمیں معلوم ہے جو کچھ وہ کہتے ہیں اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں بنائے گئے تو بس یاد دہانی کرتے رہیے قرآن کے ساتھ اسے جو میرے اعلان عذاب سے ڈرتا ہو''

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام جبر کرنا نہیں ہے

یہاں بھی ذوق جنگ رکھنے والوں نے کہہ دیا ہے کہ یہ ارشاد حکم جہاد آنے سے قبل کے لیے تھا۔[1]

حالانکہ یہ اور ایسے ہی ملتے جلتے ہوئے الفاظ قرآن مجید میں شروع سے آخر تک کثرت سے ملتے ہیں۔ اس سب کو کیوں کر کہہ دیا جائے کہ یہ ہدایت وقتی پالیسی کے طور پر تھی۔ کوئی اصولی تعلیم نہیں تھی، حقیقت یہ ہے کہ خداوند عالم نے جو بلاشبہ جبر پر قادر ہے، جب خود جبر سے کام نہیں لیا بلکہ اختیاری ایمان کا مطالبہ کیا تو رسولؐ پر جبر کا فریضہ کیوں کر عائد ہوسکتا ہے۔[2]

---

[1] ۔قال الزجاج انما قال اللہ النبی ﷺ ذالك قبل یامرہ بالقتال (تبیان)

[2] ۔بجبار بمسلط قادر علی قلوبھم فتجبرھم علی الایمان (مجمع البیان)

سُوْرَۃُ الذّٰرِیَاتِ

مکیّہ.....۶۰.....آیات

چونکہ اس سورہ کی ابتدائی لفظ والذاریات ہے۔اس لیے اس کا یہی نام ہو۔مضامین اکثر وہی ہیں جو دوسرے سوروں میں آتے رہے ہیں اس لئے کہ مکی سوروں میں زیادہ تر کفار ومشرکین کو تعلیمی انداز سے حقیقتوں کو ذہن نشین کرانا تھا لہٰذا ان میں اکثر ایک ہی بات کو طرح طرح سے دھرایا گیا ہے۔

سورۂ ذاریات کے خاص خاص مضامین:

۱.....جزأ وسزا پر قسموں کے ساتھ زور دینا۔

۲.....رسولؐ خدا کے خلاف مشرکین جو باتیں کہتے ہیں،ان کا اضطراب واختلاف۔

۳.....پرہیزگاروں کو جو اہل بہشت ہیں کردار۔

۴.....آسمان میں روزی بھی اور خدا کا عذاب بھی۔

۵.....جناب اسحاقؑ کی بشارت دینے والے فرشتوں کی آمد اور اس موقع کے کیفیات۔

۶.....قوم لوط پر عذاب کا نزول۔

۷.....گزشتہ کئی قوموں پر عذاب الٰہی کا مختصر مختصر تذکرہ

۸.....یاد ہانی کا اہل ایمان کے لیے فائدہ۔

۹.....مقصد خلقت انسان وجنات،

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا،بڑا مہربان''

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ﴿۱﴾ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ﴿۲﴾ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۙ﴿۳﴾ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ﴿۴﴾
اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۭ﴿۶﴾

''قسم ان غبار اڑانے والیوں کی بڑی شدت کے ساتھ جو سکتی ہے،پھر بوجھ اٹھانے والیوں کی،پھر دھیمی رفتار سے چلنے والیوں کی،پھر احکام الٰہی کی تقسیم کرنے والی ہستیوں کی،یہ جو تمہیں آیندہ کے لیے وعدہ وعید کیا

جاتا ہے۔ یہ لازماً سچا ہی ہے اور بلاشبہ جزا وسزا لازماً وقوع میں آنے والی ہے''۔

مذکورہ قسموں کی ایک تشریح یہ ہوئی ہے کہ:۔

''اوّل آندھی چلتی ہے کہ غبار اڑتا ہے اور بادل بنتے ہیں پھر اس میں پانی بنتا ہے، اس بوجھ کو لیے ہوئے پھرتیاں ہیں، پھر برسنے کے قریب نرم ہوا چلتی ہے، پھر ہانک کر ہر جگہ کا حصہ وہاں پہنچاتی ہے موافق حکم کے'' (موضح القرآن)

اس کے معنی یہ کہ شروع سے لیکر آخر تک یہ سب ہواؤں ہی کا ذکر ہے مگر فریقین کے کتب تفسیر میں فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ''دھیمی رفتار سے چلنے والیوں'' کی تشریح کشتیوں کے ساتھ ہوئی ہے۔[1]

اور المقسّمات امرا کی تشریح فرشتوں کے ساتھ بھی ہوئی ہے جو کاموں کو تقسیم کیے ہوئے ہیں۔[2]

اور انہی کشتیوں کا وصف بھی قرار دیا گیا ہے کہ وہ پانی کو چیر کر ادھر ادھر بانٹ دیتی ہیں۔[3]

علی ابن ابراہیم قمی نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث درج کی ہے کہ ابن الکوّا (ایک منافق) نے امیر المؤمنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے ان قرآنی جملوں کی تفسیر دریافت کی تھی تو حضرتؑ نے، الذاریات ذروا، کی تشریح فرمائی: الریاح، یعنی ہوائیں اور الحاملات وقرا، ۔بادل الجاریات یسرا، فرمایا ھی السفن، یہ کشتیاں ہیں اور والمقسمات امرا، فرمایا۔الملائکۃ؛

اس حدیث کو جناب شیخ طوسیؒ نے تبیان میں درج فرمایا ہے:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝٧ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝٨ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۝٩

''قسم ہے آسمان کی جو روشوں والا ہے، یقیناً تم لوگ مختلف باتیں کہنے میں لگے ہوئے ہو، جن سے منحرف ہوتا ہے وہ جو گم کردہ راہ ہو''۔

جزا وسزا پر قسموں کے ساتھ زور

''مختلف باتیں''، یعنی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے اعلان رسالت کے خلاف حضرت کی حقانیت کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہوئے طرح طرح کی باتیں کہتے ہیں، کبھی شاعر، کبھی ساحر، کبھی مجنون، اس لیے کہ خود ان کا ضمیر ان میں سے کسی بات سے مطمئن نہیں ہے۔قرآن کے بارے میں اُس کی قوت اعجاز سے متاثر ہونے پر سچی کتاب اور کلام الٰہیہ ماننے کی خاطر کیا کیا کہتے ہیں؛ کبھی جادو، اور شاعری، کبھی کہانت اور کبھی پرانے لوگوں سے ملی ہوئی تحریریں اور کبھی کسی کے سکھائے پڑھائے ہوئے سبق۔[4]

یہ سب اس لیے کہ دوسرے جو متاثر ہو کر راہ حق پر آنا چاہتے ہیں، نہ آئیں اور راہ راست سے منحرف رہیں۔

---

[1] ۔السفن تجری علی وجہ الماء (جلالین)

[2] ۔بفرشتگان تقسیم کنندہ کار (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔پھر بانٹنے والیوں کی ایک چیز کی یعنی پانی کی (شاہ رفیع الدین)

[4] ۔فبعضکم یقول ھو شاعر وبعضکم یقول مجنون وفی القرآن یقولونہ انہ سحر و کھانۃ ورجز وماسطرہ الاولون (مجمع البیان)

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ﴿۱۱﴾ يَسْئَلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ؕ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۴﴾

''غارت ہوں اٹکل پچو باتیں کرنے والے جو ایک بڑی بےخبری کے عالم میں مدہوش ہیں، پوچھتے ہیں کہ جزا و سزا کا دن کب آئے گا؟ وہی سا دن جب انہیں آگ میں سزا دی جائے گی، چکھو اس اپنی سزا کا مزہ یہی وہ ہے جس کی تم جلدی کرتے تھے''

مشرکین کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف باتوں میں اضطراب

یہ ''کب'' کا سوال واقعی اگر حقیقت طلبی کے لیے ہوتا تو سمجھانے کے انداز میں جواب دیا جاتا مگر یہ ''کب، کب'' کی رٹ تو وہ بطور انکار یا تمسخر لگائے رکھتے تھے۔ اس لیے جھلائے ہوئے انداز میں جواب دیا گیا۔ [1]

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۵﴾ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶﴾ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۱۹﴾

''پرہیزگار لوگ باغوں اور چشموں میں لیتے ہوئے جو انہیں ان کے پروردگار نے عطا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس سے پہلے (کے دور حیات میں) نیکوکار رہے تھے۔ اور وہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور پچھلے پہروں کو وہ طلب مغفرت کرتے تھے اور ان کے اموال میں حق تھا مانگنے والے محتاج اور نہ مانگنے والے کے لیے''۔

پرہیزگاروں کا کردار

سائل کے ساتھ جو ''محروم'' کا لفظ ہے اس سے اردو داں طبقے کے ذہن میں تو محرومی کا تصور ہی آئے گا کہ جس کی مراد پوری نہ ہو مگر تفاسیر میں اس کی جو تشریح آئی ہے وہ یہی ہے جس کے مطابق میں نے ترجمہ کیا ہے کہ محروم وہ حاجتمند شخص ہے جو اپنی خودداری کی وجہ سے دست سوال دراز نہیں کرتا۔ [2]

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَفِي السَّمَآءِ

---

[1] ۔یسال هولاء الکفار علی وجه الانکار لذالك لاعلی وجه الاستفادة لمعرفته فاجیبوا بما یسؤهم (تبیان)

[2] ۔الذی لایسأل لتعففه (جلالین)

رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿۲۳﴾

''اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تم میں تو کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟ اور آسمان میں تمہاری روزی بھی ہے جو تم سے وعدہ وعید کیا جاتا ہے تو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی کہ بلاشبہ وہ حق ہے جیسے کہ تم بات کرتے ہو''۔

آسمانوں میں روزی بھی اور خدا کا عذاب بھی

آسمان میں روزی بھی ہے اور وہ بھی جو تم سے وعدہ وعید کیا جاتا ہیں:۔ اس کا مطلب کیا ہے؟ شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔

(یعنی پیش از وجود خارجی در عالم ملکوت رزق وعقوبت وامثال آں متصور می شود..... فتح الرحمان) مطلب یہ ہے کہ وجود خارجی سے پہلے عالم بالا میں رزق اور سزا وغیرہ سب کی صورتیں وجود میں آجاتی ہیں،

یہ افلاطون والا تصور ہے کہ آسمانوں میں مادے سے الگ ہر واقعہ کی صورت وجود رکھتی ہے جو اشراقین کی کے اثرات سے صوفیا میں مقبول ہوا شاہ عبدالقادر نے اس کا لباس ذرا بدلا ہے، وہ کہتے ہی:۔

آنے والی جو بات ہے اس حکم کا آسمان سے اترتا ہے'' (موضح القرآن)

جلالین نے ان دونوں فقروں کا مفہوم الگ الگ کر دیا ہے فی السماء رزقکم'' آسماں میں تمہاری روزی ہے'' اس کو تعلق مشاہدے واحساس سے قرار دیا ہے اس طرح کہ: ای المطر المسبب عن النبات الذی ھو رزق۔

یعنی باران جو سبب ہوتا ہے نباتات کے روئیدہ ہونے کا جو رزق ہیں۔

اور ما توعدون'' جو تم سے وعدہ وعید کیا جاتا ہے'' اس کے تحت میں لکھا ہے:۔ ای مکتوب ذاك فی السمآءِ'' یعنی وہ آسمان میں تحریر ہے۔

ہمارے نزدیک سب سے زیادہ واضح یہ بات ہے کہ توعدون کا لفظ وعید سے ہے جس کے معنی خبر عذاب کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ آسمان ہی سے روزی بھی اترتی ہے جس سے تمہاری زندگی ہے اور آسمان ہی سے عذاب بھی آتا ہے جو تباہی و بربادی کا سبب ہوتا ہے۔ [1]

''وہ حق ہے جیسے کہ تم بات کرتے ہو'' اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو تم کہتے ہو، وہ باتیں لازماً حق ہیں، بلکہ خود یہ فعل کہ تم بات کر رہے ہو، اس میں تمہیں کوئی شک نہیں ہے ایسے ہی اللہ کی یہ بات حق ہے۔ [2]

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا

---

[1] ۔ما توعدون به من العذاب ينزله الله عليكم اذا استحققتموه (تبیان)

[2] ۔ای مثل نطقكم الذی تنطقون به (مجمع البیان)

سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿۲۶﴾
فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ
وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾

''کیا آپ کو معلوم ہوا ہے واقعہ ابراہیم کے معزز مہمانوں کا وہ جب ان کے پاس آئے تو سلام کیا انھوں نے جواب سلام دے کر کہا کہ کچھ لوگ اجنبی لوگ ہیں تو اپنے گھر والوں کے پاس گئے اور ایک موٹے تازے بچھڑے کے کباب لا کر ان کے پاس رکھے اور کہا کیوں آپ لوگ کھاتے نہیں؟ (جب انہوں نے اس کے بعد بھی کچھ نہ کھایا) تو ان سے انہوں نے ڈر محسوس کیا۔ انھوں نے کہا ڈریئے نہیں اور انہیں ایک صاحب علم بچے کی خوش خبری دی''۔

یہ جناب اسحاق علیہ السلام کے متولّد ہونے کی بشارت کا ذکر ہے جو اس کے پہلے جو دھویں پارے میں بھی آ چکا ہے۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا
كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾

''تو ان کی بیوی نے آتے ہی ایک چیخ ماری جس کے بعد اپنا منہ پیٹ لیا اور کہا بڑھیا بانجھ؟! انہوں نے کہا ہاں یوں ہی تمہارے پروردگار نے کہا ہے یقیناً وہ صحیح صحیح کام کرنے والا ہے، بڑا جاننے والا''۔

یقیناً وہ صورت حال سے واقف بھی ہے اور مصلحت وحکمت کے تقاضے کے مطابق ہی عمل کرنے والا، لہٰذا ہر بات کو جانتے ہوئے جو مناسب ہو، اس کام کو انجام دیتا ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾
لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾

''انھوں نے کہا تو آخر تمہاری مہم کیا ہے اے بھیجے جانے والو انھوں نے کہا ہم بھیجے گئے ہیں ایک خاص گناہگار قوم کی طرف کہ اس پر گرائیں ایسے سخت مٹی کے پتھر جن پر نشان پڑے ہوئے ہیں حد سے گزرے ہوؤں کے لیے''

چونکہ پاروں کی تقسیم میں جیسا کہ پہلے بھی ایسے موقع پر لکھا جا چکا ہے کہ معانی کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے لہٰذا ایک ہی سلسلہ مضمون کا ایک جز قبل والے پارے میں چلا گیا ہے اور اس سے تعلق رکھنے والا دوسرا جز بعد والے پارے میں ہے اس لیے اس آیت کا مضمون اُس وقت تک سمجھ میں نہیں آئے گا جب تک کہ پہلے پارے کی آخری آیتوں کو نہ پڑھا جائے چنانچہ یہاں کلام کا سلسلہ جو پہلے آ چکا ہے اس سے سمجھ یہ میں آتا ہے کہ جب فرشتے جو قوم لوط پر عذاب نازل کرنے جا رہے تھے اثنائے رہ گزریں جناب ابراہیمؑ کے پاس ٹھہر گئے اور فرزند کی بشارت دی تو ان کے انداز سے جناب ابراہیمؑ یہ سمجھ گئے کہ یہ خدا کی طرف کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں جن کے بھیجے جانے کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔ یہ بشارت

اُنہوں نے ضمناً دے دی ہے لہٰذا اُنہوں نے کہا آخر تمہاری مہم کیا ہے۔ اگر وہ اُس بشارت کو ہی اصل مہم سمجھ لیتے تو اس سوال کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اب جیسا کہ ہم اس تفسیر میں پہلے لکھ چکے ہیں قرآن مجید نے ایک ہی واقعہ کو متعدد جگہ جس جس طرح بیان کیا ہے، اس نے ناقلین واقعات کے لیے نقل بالمعنی کی بڑی وسیع گنجائش پیدا کر دی ہے چنانچہ ملائکہ نے اپنی مہم کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے قرآن میں قوم لوطؑ کا نام موجود ہے کہ ہم ان پر عذاب لے کر آئے ہیں اور یہاں ان کا ذکر بس قوم مجرمین کی لفظوں میں ہے اور وہ وہی قوم لوطؑ ہے۔ [1]

قوم لوط پر عذاب کا نزول

قوم لوط کے لیے عام طور پر جس عذاب کی شہرت ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی بستیوں کا طبقہ الٹ دیا گیا یہاں ان پر جس عذاب کا ذکر ہے بس پتھروں کی بارش کا ہے لیکن چودھویں پارے میں ان الفاظ میں کہ:۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (حجر..... ۷۴) تین مسلسل عذابوں کا ذکر ہے:۔

(۱) صیحہ ''صدائے مہیب۔''

(۲) طبقہ الٹ دیا جانا۔

(۳) پتھروں کی بارش۔

اس سلسلہ میں صیحہ بظاہر ان کے لیے مستقل عذاب تھا جس سے وہ برباد ہو جائیں جیسا کہ بعض قوموں کے لیے یہ صیحہ ہی مستقبل عذاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب اس کے بعد جو دو چیزیں ہیں، ان میں ذرا ذہن میں یہ خلش پیدا ہوتی ہے کہ جب طبقہ الٹ دیا گیا تو اب پتھروں کی بارش کا کیا حاصل ہے؟

اس کے لیے یہ تشریح قابل قبول معلوم ہوتی ہے کہ جو شہر کے اندر موجود تھے، وہ بستی کا طبقہ الٹ جانے سے ہلاک ہو گئے اور جو کہیں دوری پر تھے، ان کا کام پتھروں نے جو برسائے گئے تمام کیا۔ [2]

پتھروں کا یہ وصف کہ ان پر نشان لگا ہوا ہے، اس کی تشریح جناب ابن عباس کی زبانی یہ آئی ہے کہ سفید پتھر ہے تو اس میں سیاہ نقطہ ہے اور سیاہ پتھر تو اس میں سفید نقطہ ہے۔ [3]

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۳۷﴾

''تو ہم نے نکالا انہیں جو اس میں ایمان والوں میں سے تھے تو ہم نے انہیں پایا سوا ایک گھر کے مسلمانوں

---

[1] ۔ قال الملئکة ارسلو الیٰ قوم لوط لاھلاکھم (تبیان)

[2] ۔ قیل ارسلت الحجارۃ علی الغائبین وقلبت القریۃ بالحاضرین (مجمع البیان)

[3] ۔ یکون الحجر ابیض فیہ نقطۃ سوداء او یکون الحجر اسود فیہ نقطۃ بیضاء (ابن جریر)

میں سے اور ہم نے اس میں ایک بڑی نشانی چھوڑی ان لوگوں کے لیے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں''۔

ظاہر ہے کہ اس کے پہلے اس پارے میں اور پھر اس پارے کی پہلی آیت میں جو گزری، یہ تو ان فرشتوں اور حضرت ابراہیمؑ کی باہمی گفتگو تھی۔ اس کے بعد کی صورت حال اور اس کے سلسلہ کے واقعات یہاں مذکور نہیں ہیں۔ دوسرے سوروں میں ہیں اور اب سننے والا سمجھ لے کہ وہی ہوا جو دوسرے مقامات پر بیان ہوا ہے کہ وہ قوم لوط کی بستی میں گئے اور جناب لوط کے مہمان ہوئے اور وہاں وہ واقعات پیش آئے کہ قوم لوط کے افراد اپنی ہوسنا کی کا نشانہ ان فرشتوں کو بنانے کے لیے جو خوبصورت لڑکوں کی شکل میں آئے تھے جناب لوطؑ کے گھر پر آ گئے اور وہ ان سے پریشان ہوئے اور انہیں سمجھانے کی بھی کوشش کی کہ میرے مہمانوں کی آبروریزی کر کے مجھے رسوا نہ کرو مگر وہ ان کی نصیحت کے ماننے پر کسی طرح امادہ نہ ہوئے جس پر جناب لوطؑ کو بہت اضطراب ہوا تو فرشتوں نے تسلی دی کہ گھبرایئے نہیں یہ آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ ہم آدمی زاد ہیں ہی نہیں۔ ہم تو آپ کے پرودگار کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں، اس کے بعد کی روداد خالق نے خود ان فرشتوں کی زبانی بیان کیا ہے کہ ''ہم نے نکالا'' یعنی تلاش کیا کہ اس بستی میں کچھ اور مخلوق بھی رہتے ہیں یا نہیں تو سوا ایک گھر کے نہ پایا۔ یہ گھر وہی جناب لوطؑ کا گھر تھا جس میں وہ فرشتے آئے تھے مگر دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کی بھی ایک فرد کا استثنا ہوا ہے اور وہ ان کی بیوی تھی جو عذاب سے بچ نہ سکی۔ اس کے علاوہ اور کون اس گھر کا آدمی عذاب سے بچایا گیا؟ اس کا ذکر قرآن میں نہیں ہے چونکہ ان کی دو بیٹیوں کا بائبل میں ذکر آیا ہے تو شاید اس لیے بعض قدیم تفاسیر میں جناب لوطؑ کے ساتھ ان کی دو بیٹیوں کو بھی بتایا گیا ہے۔ [1]

جو لوگ عذاب سے بچ گئے، ان کے لیے پہلے کہا ''مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ'' جو اس میں ایمان والوں میں سے تھا'' اور پھر بعد میں انہی کے لیے کہا غیر بیت من المسلمین'' سوائے ایک گھر کے مسلمانوں میں سے''۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ حقیقت میں جو سچا اسلام ہے، اسی کا نام ''ایمان'' ہے۔ واقفیت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

چاہے اصطلاح میں فرق ہو گیا ہو جس کی بنا پر قرآن مجید میں دوسری جگہ اعراب سے کہا گیا لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا ''تم ایمان نہیں لائے یہ کہو کہ ہم نے اسلام قبول کی'' مگر اسی کے آخر میں ہے وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ ''ابھی ایمان تمہارے دلوں میں پہنچا نہیں ہے''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''مسلم'' کے لفظ کا اطلاق تو بنائے ظاہر ہو جاتا ہے مگر ایمان اس وقت ہوتا ہے جب یہی حقیقت دل کے اندر بھی پہنچ جائے۔

علامہ طبرسیؒ نے دونوں کے فرق کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے کہا ہے کہ چونکہ ان میں دونوں وصف جمع تھے یعنی دل سے تصدیق بھی جو کہ ایمان ہے اور عملاً اطاعت بھی جو کہ اسلام ہے۔

اس لیے ان کا یکے بعد دیگرے دونوں صفتوں سے وصف کیا گیا ہے اور جو مؤمن ہو گا، وہ مسلّم بہر حال ہو گا۔ [2]

آخر میں جو ہے کہ ''ہم نے ایک بڑی نشانی چھوڑی''..... یہ نشانی اس نازل ہونے والے عذاب کے اثرات ہیں جو بعد میں دیکھنے والوں کے لیے سامان عبرت کے طور پر اس سرزمین اور اس کے اطراف میں مدتوں موجود رہے۔

---

[1] ۔ھم لوط وابنتاہ (ابن جریر)

[2] ۔وصفھم اللہ بالایمان ولاسلام جمیعا لانہ لامؤمن الّا وھو مسلم (مجمع البیان)

وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۴۰﴾

''اور موسیٰؑ میں جب ہم نے انہیں بھیجا فرعون کی طرف کھلے ہوئے ثبوت کے ساتھ تو اس نے اپنی طاقت کے برتے پر روگردنی کی اور کہا جادوگر ہے یا دیوانہ تو ہم نے اسے اور اس کی فوج کو گرفت میں لے کر ان سب کو دریا میں ڈال دیا اس عالم میں کہ اس پر پھٹکار برستی رہے گی''۔

''اور موسیٰؑ'' یہ عطف ہے اس پر جو اس کے پہلے تھا: ''ترکنا فیھا اٰیۃ'' اور ہم نے اس میں نشانی چھوڑی ہے یعنی عبرت کا نمونہ تو ویسا ہی عبرت کا نمونہ موسیٰؑ کے واقعے میں ہے۔[1]

اس سورے میں ذکر واقعات میں صاف یہ پہلو نمایاں ہے کہ واقعات بیان کرنا نہیں بلکہ ان واقعات کی یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو اس سے پہلے متعدد سوروں میں ان واقعات کی تفصیل پڑھ چکے ہیں، انہیں مختصر اشاروں سے وہ سب باتیں یاد آجائیں گی جو شاید وقتی طور پر ان کے حافظے سے محو ہوگئی ہوں، چنانچہ ''سلطان مبین ''کھلے ہوئے ثبوت'' کے لفظ میں عصا ید بیضا اور فرعون کے متنبہ کرنے والے نو معجزے جن کا ذکر قرآن مجید نے پہلے کیا ہے، سب مندرج ہیں۔

گزشتہ کئی قوموں پر عذاب کا مختصر مختصر تذکرہ

تولّٰی برکنہ کا یہ ترجمہ کہ اس نے اپنی طاقت کے برتے پر روگردانی کی'' ایک تشریح کے مطابق ہے۔[2]

جیسا کہ عوامی محاورہ ہمارا یہاں ہے کہ ''اس کا کھونٹا مضبوط ہے''۔

بعض نے اس کا مفہوم ہی فوج ولشکر قرار کیا ہے مگر یہ بظاہر اس کا ضمنی جز ہے۔ اسی طرح ''قوم اور ساتھی''..... یہ سب ایک بادشاہ کی طاقت میں داخل چیزیں ہیں۔

ایک تصور یہ ہے کہ ''ب'' تعدیہ کا ہے جیسے جآءٓ'' کے معنی آیا'' اور جآءَ بہ کے معنی ''لایا''.....اسی طرح تولّٰی کے معنی ''روگردانی ہوا'' اور جب اس کے ساتھ ''ب'' آگئی تو معنی ہوگئے کہ اس نے اپنی فوجوں کو روگردان کیا''۔

اس کے بالکل بالمقابل یہ خیال ہے ''تولّٰی برکنہ'' اس پورے کے بس یہ معنی ہیں کہ اس نے روگردانی کی جیسے ہمارے یہاں محاورہ ہے ''پہلو تہی'' کرنا۔ ویسے ہی یہ رکن جیسے ''پہلو'' کے معنی میں ہے۔ تفسیر صافی میں علامہ محسن فیض کا مختار یہی معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے تولّٰی برکنہ'' کے تحت میں پہلے نہیں لکھا ہے:

فاعرض عن الایمان بہ ''اس نے ان پر ایمان سے روگردانی کی'' اور اس کی مثال میں یہ قرآنی جملہ پیش کیا ہے: وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ''اور اس نے پہلو کے ساتھ دوری اختیار کی'' جس کا مطلب وہی پہلو تہی کرنے کا ہے۔

---

[1] ۔ای وفی موسی ایضاً آیۃ (مجمع البیان عطف علی قولہ: ترکنا فیھا آیۃ (تبیان)

[2] ۔صل الرکن الجانب والناحیۃ التی یعتمد علیھا ویقوی بھا (ابن جریر)

اس نے کہا ''ساحر ہے یا دیوانہ''..... یہ بظاہر ایک وقت کی بات ہے ہی نہیں بلکہ جیسے قرآن مجید میں اہل کتاب کا مقولہ نقل کیا ہے کہ: لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ کَانَ ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی (بقرہ۔۱۱۱) ''جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا سوا اس کے جو یہودی یا نصرانی ہو'' تو حقیقت یہ ہے کہ یہودی کہتے ہیں کہ وہ جنت میں جائے گا جو یہودی ہو اور عیسائی یہ کہتے ہیں کہ وہ جنت میں جائے گا جو عیسائی ہو۔ ان میں سے کوئی اپنے ساتھ دوسرے کا نام نہیں لیتا مگر قرآن نے دونوں کے مقولوں کو سمو کر یہ کہا کہ ان کا ادّعا تو یہ ہے کہ وہ جائے گا جو یہودی یا عیسائی ہو۔ ویسے ہی یہاں کہا گیا کہ فرعون نے ایک دفعہ یہ کہا تھا کہ اِنَّ رَسُوْلَکُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْکُمْ لَمَجْنُوْنٌ ''یہ پیغمبر جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، دیوانہ ہے، (شعرا کی آیت ۲۷) اور دوسری دفعہ کہا: اِنَّ ھٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ''یہ بڑا ماہر جادوگر ہے جو اسی شعرا کی آیت ۳۴) میں اور دوسرے مقامات پر ہے قرآن میں ان دونوں وقتوں کی باتوں کو سمو کر یہاں کہا ہے کہ ''جادوگر ہے یا دیوانہ''۔

ڈوبے تو سب مگر پھٹکار میں اکیلے فرعون کی طرف ضمیر پھیری گئی اس لیے کہ ان سب کو ڈبونے اور ہلاکت ابدی میں گرفتار کرنے کا باعث وہ تھا جیسا کہ سورۂ ہود میں صراحۃ ارشاد ہوا ہے کہ: یَقْدُمُ قَوْمَہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَاَوْرَدَھُمُ النَّارَ (آیت ۹۸)۔

وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا کہ اُسی نے اُن سب کو دوزخ میں پہنچایا ہے''۔

وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْھِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْہِ اِلَّا جَعَلَتْہُ کَالرَّمِیْمِ ﴿۴۲﴾

''اور (قبیلہ) عاد میں جب کہ ان پر ہم نے بے نتیجہ قسم کی ہوا بھیجی، وہ کسی چیز کو جس پر سے گزرے چھوڑتی نہیں مگر یہ کہ اسے بنا دیتی ہے مثل سوکھی ہوئی گھاس کے چورے کے''

سلسلہ وہی ہے کہ قوم لوط والے عذاب میں نشانی ہے اور فرعون کے قصے میں اور قبیلہ عاد میں..... بے نتیجہ قسم کی ہوا۔ اسے عقیم کے لفظ سے تعبیر کیا جو بانجھ عورت کو کہتے ہیں۔ اب ہوا کو جب عقیم کہا تو مطلب یہ ہوگا کہ اس سے وہ نتائج جو ہوا کے ہوتے ہیں جیسے باران کا لانا ،نباتات کا روئیدہ کرنا، یہ پیدا نہیں ہو سکتے۔[1]

حدیث میں ہے کہ ایسی ہوا سے پناہ مانگنا چاہیے۔[2]

رمیم کا لفظ قرآن مجید میں یوں تو ہڈیوں کے لیے آئی ہے ''حیات بعد الموت'' کے منکر کافروں کے قول می کہ: مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ '' (یٰسین۔۷۸) کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا ان کے بوسیدہ ہو کر چورا ہونے کی حالت میں۔

مگر مفسر طبری کے جامع البیان میں پتہ چلتا ہے کہ اصل میں یہ لفظ اس گھاس کے لیے آتی ہے جو خشک ہو کر بالکل چورا ہو جائے۔[3]

اس صورت میں مشرکین کے کلام میں جو اُس کا استعمال ہے، وہ بطور استعارہ ہے جس کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے:

---

[1] ۔لا تلقح المشجر ولا تثبات النبات...علی ابن ابراھیم)

[2] ۔فی فقیہ عن امیر المؤمنین علیہ السلام: الریاح خمسۃ فیھا الریح لا عقیم فتعوّذ باللہ من نشرھا (صافی)

[3] ۔الیھم فی کلام العرب ما یبس من نبات الارض ودیس (ابن جریر)

وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾

''اور قبیلہ ثمود میں جب کہ ان سے کہا گیا (دنیا کی نعمتوں سے) بہرہ مند ہو، ایک خاص وقت تک تو انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی تو انہیں گرفت میں لے لیا بجلی نے جو گری درانحالیکہ وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، تو اس کے بعد اٹھ نہیں سکے۔ اور نہ انہیں مدد ملنا ممکن ہوئی۔

''اور قبیلہ ثمود میں بسلسلہ سابق عطف ہے کہ ان میں بھی نشانی ہے..... کہا گیا..... جیسا کہ پہلے اس سورے کا اسلوب یہی ہے کہ واقعات بیان نہیں کیے جاتے۔ ان کی طرف مجمل اشارہ کر کے انہیں یاد دلایا جاتا ہے۔ اب پہلے جہاں جہاں اس واقعہ کا ذکر ہے، اس سب کو یاد کر لیجیے۔

جناب صالح علیہ السلام کا مبعوث ہونا، قوم کا معجزے کی درخواست کرنا، اس پر ایک ناقہ کا برآمد ہونا اس کے متعلق خاص ہدایتوں کا ہونا، اور قوم کا نافرمانی کرنا، یہاں تک کہ اس ناقے کو پے کر ڈالنا اس پر اعلان عذاب کے ساتھ تین دن کی مہلت کا ملنا اور اس پر بھی ان کی آنکھوں کا نہ کھلنا تو عذاب کا آجانا جس کا مذکورہ دو (۲) آیتوں میں ذکر ہے

چونکہ بجلی کے گرنے سے شدید کڑک کی آواز ضرور ہوتی ہے لہٰذا دوسری جگہ اس کڑک کو ''صیحة'' کہا گیا ہے اور یہاں اس صیحة'' کے ساتھ بجلی گری اس کا نام لیا گیا ہے۔ ان دونوں میں باہم کوئی منافات نہیں ہے۔

وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۚ ﴿۴۶﴾

''اور نوحؑ کی قوم کو (ہم نے ہلاک کر دیا) یہ بداعمال لوگ تھے''

پہلے سلسلہ تھا کہ قوم لوط ؑ میں نشانی چھوڑی..... اور فرعون کے واقعہ میں اور عاد میں اور ثمود میں اس سب کا خلاصہ سننے والے کے ذہن میں آ گیا کہ یہ سب ہلاک کیے گئے تو اب اس پر عطف کر کے کہا گیا اور قوم نوح کو..... اب یہ کیوں کر ہلاک کیے گیے۔ اسے دوسرے سوروں میں دیکھ لیجیے۔

جامع البیان طبری میں ''قوم نوح'' کے لفظ کے منصوب ہونے کی تین (۳) وجہیں لکھی ہیں۔ ایک یہ کہ ''اخذتهم الصاعقه میں جو هم کی ضمیر ہے اور وہ مفعول ہے اس پر عطف ہو مگر یہ میرے نزدیک اس وقت درست ہوتا جب ان لوگوں کو بھی بجلی ہی نے ہلاک کیا ہوتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جسے میں نے اختیار کیا ہوتا۔

تیسری صورت یہ کہ یہاں ایک فعل حذف مانا جائے کہ نوح کو یاد کرو، فطری طور پر جو ذہن میں مفہوم آتا ہے، وہ درمیانی ہے۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور آسمان ہم نے اس کو بنایا بڑی طاقت کے ساتھ یقیناً اور ہم زیادہ وسعت دینے والے ہیں اور زمین اسے ہم نے بچھایا تو کتنے اچھے بچھانے والے ثابت ہوئے اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے، شاید کہ تم سبق حاصل کرو''

اب یہ ایک مستقل سلسلہ خالق کی صنعت کی طرف نگاہ کو متوجہ کرنے کے لیے ہے اور جس کا کوئی لفظی ربط سابق کے ساتھ بطور عطف کے قرار دینا ضروری نہیں ہے اور بعض لوگوں نے سابق پارے میں جو آیا تھا: وفی الارض آیات للموقنین ''زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے، اس پر عطف لیا ہے۔ یہ نہ صرف بلا وجہ ہے بلکہ درست بھی نہیں ہے اس لیے کہ اس سے اگر اس کا ربط ہوتا تو السمآء کا لفظ مجرور ہوتا جس کا مطلب یہ ہوتا کہ آسمان میں بھی نشانیاں ہیں۔ دوسرے اس آسماں کے ذکر کے بعد پھر زمین کا ذکر نہ ہوتا۔

اس سے ظاہر ہوتا کہ وہ مستقل جملے ہیں جن کا سابق سے کوئی لفظی ربط نہیں ہے،

ایدٍ کا جو ہم نے ترجمہ کیا بڑی طاقت کے ساتھ یہ ایک معنی کے لحاظ سے ہے۔

دوسرے معنی اس کے نعمت کے ہیں تو یہ ترجمہ ہوگا کہ آسمان کو ہم نے بڑے لطف و مہربانی کے ساتھ پیدا کیا مگر خلقت فلکی سے عام ذہن پر نعمت کا اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا قدرت کا لہٰذا ہماری نظر میں ایدٍ کا مفہوم آیت میں قوت ہی کا ہے جس کے موافق ہم نے ترجم کیا اور حدیث معصومؑ اس کے مطابق ہے۔ یہ صدوق کی روایت ہے توحید میں محمد بن مسلم سے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ ایدٍ کے کلام عرب میں دونوں معنی ہیں طاقت بھی اور نعمت بھی مگر حسب ذیل دو آیتوں میں اس کے معنی قوت ہی کے ہیں: واذکر عبدنا داؤد ذا الایدٍ 'ہمارے بندے داؤدؑ کو یاد کرو جو طاقت والے تھے اور ''والسمآء بنینٰھا بایدٍ .....ایدٍ کے اسی معنی سے تائید کا لفظ ہے۔ ارشاد ہوا: وایدھم بروح منہ ''اس نے انہیں قوت پہنچائی اپنی طرف کی روح سے''

آسمان کے ساتھ یہ کہنا: انا لموسعون ''یقیناً ہم اور زیادہ وسعت دینے والے ہیں۔'' اس میں یہ مفہوم زیادہ ذہن میں آتا ہے کہ ہماری قدرت اتنی ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ عظیم مخلوق پیدا کرنے پر بھی ہم قادر ہیں۔ [1]

بعض اشخاص نے اسے وسعت رزق کا معنی قرار دیا ہے مگر وہ سیاق کلام سے غیر مرتبط ہے ہاں وسعت دینے کے معنی ہوں تو یہ مفہوم ہوسکتا ہے کہ آسمان میں ہم وسعت پیدا کرنے والے ہیں۔ [2]

اسے اگر انکشافاتِ جدید کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ مفہوم بآسانی نکل سکتا ہے کہ اجرام سماویہ میں ہماری قدرت سے اضافہ ہوتا رہتا ہے

زمین کو بچھونا کہنے سے جیسا پہلے آچکا ہے ریاضی کے اس مسئلے کا کوئی تعلق نہیں کہ زمین کروی شکل کی ہے کیوں کہ وہ پوری کروی یا جو بھی ہو ہمارے لیے ایک فرش کی حیثیت رکھتی ہے،

ہر چیز کے ہم نے جوڑے قرار دیئے ہیں'' اس سے واقعیت کا اظہار مراد ہوسکتا ہے جو جدید تحقیقات سے ثابت ہوئی ہے کہ ہر شے میں نر اور مادہ یا فاعل اور منفعل کی تفریق ہے مگر اصول کافی میں امام رضا علیہ السلام کا جو خطبہ وارد ہوا ہے، اس میں ہے کہ مختلف چیزوں کے درمیان اس

---

[1] ۔ای قادرون علی خلق ماھو اعظم منھا عن ابن عباس رضی اللہ عنہ (مجمع البیان)

[2] ۔لموسعون السمآءِ (صافی)

نے تضاد قرار دیا ہے اور ایک کے مقابلے میں: دوسرا نور کے مقابلے میں ظلمت اور خشکی کے مقابلے میں تری اور سخت کے مقابلے میں نرم اور سرد کے مقابلے میں گرم..... یہ جو ہر چیز کے مقابلے میں کوئی دوسری چیز ہے جو اسی نے قرار دی ہے،

اس کے بعد فرمایا: وذالك قوله ومن كل شی خلقنا زوجين لعلكم تذكرون.....(صافی)

یہ ہے ارشاد خداوندی کہ ہم نے ہر چیز جوڑے قرار دیئے ہیں، شاید کہ تم سبق حاصل کرو۔

یہ سبق کیا ہے عقیدت سے متعلق یہی کہ ہر چیز میں اس نے جوڑے بنائے ہیں تو اس سے سمجھ لو کہ اس کا کوئی جوڑا نہیں ہے۔ اور اس مفہوم کی بنا پر جو نر و مادہ والا تھا، یہ عملی سبق ملتا ہے کہ جب اسی تفریق کے پیش نظر دو صنفیں مرد اور عورت کی قرار دی گئی ہیں تو اس سے سمجھنا چاہیے کہ تلذذ بالمثل جو قوم لوطؑ میں عام تھی فطرت کائنات کی مخالفت اور دو صنفوں کی پیدائش کی غرض کو نقصان پہنچانا ہے۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۵۰ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۵۱

''تو بھاگو اللہ کی طرف میں تمہیں اس سے کھلا ہوڈرانے والا ہوں۔ اور اللہ کے علاوہ دوسرا خدا قرار نہ دو میں تمہیں اس سے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں''

بہت سے الفاظ بغیر کسی اضافت کے بولے جائیں تو سننے والے کو مذموم معلوم ہوں گے مگر کسی اضافت کے بعد ان میں حسن پیدا ہو جائے گا، اسی طرح بعض الفاظ بغیر اضافت حسن کے حامل ہے مگر کسی اضافت کے بعد ان میں برائی پیدا ہو جاتی ہے، اس کی سب سے بڑی مثال کفر اور ایمان ہے۔ کفر یا کافر کو سن کر انسان کو نفرت پیدا ہوتی ہے لیکن قرآن نے کئی جگہ جس طرح اس لفظ کا استعمال کیا، مثلاً **ومن يكفر بالطاغوت** ''جو طاقت باطل سے کفر کرے'' اس کے بعد یہ لفظ انتہائی حسن کی حامل ہوگئی اس طرح ایمان یا مومن کا لفظ انتہائی حسن کی حامل معلوم ہوتا ہے لیکن جب اس کی اضافت باطل کی طرف ہو جائے تو وہ مذمت ہو جائے گی۔

مومن اور کافر کے معنی

اس کے بعد صبر کے لفظ کو لیجیے، یہ نہایت ممدوح چیز ہے لیکن قرآن نے اس لفظ کا جس طرح استعمال کیا ہے ''**فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ**'' (البقرہ ۱۷۵) کتنے لوگ دوزخ کی آگ پر صبر کرنے والے ہیں'' تو اس میں شدید مذمت ہوگئی۔ فرار یعنی بھاگنے کا لفظ ایسا ہے کہ بجائے خود یہ کانوں کو برا معلوم ہوتا ہے؟ لیکن معصیت الٰہی سے فرار اور کفر و شرک سے فرار، باطل سے فرار اس کے بعد یہ لفظ حسن کا حامل ہوگیا۔ یہاں لفظ فرار کا استعمال اسی طرح ہوا ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ اللہ کی طرف فرار کرو اب اس کے معنی ہوگئے برائیوں سے بچنا اور اچھائیوں کو اختیار کرنا، معصیت الٰہی سے گریز کرنا اور اطاعت الٰہی کی پابندی کرنا۔[1] اب اس فرار کا کیا کہنا، یہ فرار ہے اللہ کی طرف اس کی ناراضگی کے ڈر سے۔ اس لیے رسول اللہؐ کی زبانی اس کا پیغام دیتے ہوئے کہا جا رہا ہے کہ میرا کام اس سے ڈرانا ہے۔ تاکہ تم اس کے گناہوں سے فرار کرو۔

---

[1] ۔ فرّوا من عقابه الى الايمان التوحيد و ملاذمة الطاعة (صافی)

حقیقت اللہ کی طرف فرار کی یہی ہے مگر ہر حقیقت کے لیے ایک عملی مظاہرہ ہوتا ہے اور مقام نسبت میں کعبہ اللہ کا گھر ہے اس لیے ایک حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف بھی ملتی ہے اور کافی اور معانی الاخبار میں امام محمد باقرؑ علیہ السلام سے مروی ہے کہ اس سے مراد حج کو جانا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ وہی حج ہوگا جس کے ساتھ لوبا لکل اللہ سے لگی ہوئی ہے اور وہ انسان کی عملی زندگی پر اثر انداز ہو سکے وہ حج نہیں جو اکثر ہمارے مشاہدے میں آیا کرتا ہے، وہ حج تو ایسا ہے جسے پھر اللہ کی طرف فرار کی ضرورت ہے ''ہست استغفار ما محتاج استغفار ما''

كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۵۳﴾

''یونہی ان کے پہلے جو تھے، ان کے پاس کوئی پیغمبر نہیں آیا مگر انہوں نے کہا ''جادوگر'' ہے یا ''دیوانہ''۔ کیا انہوں نے ایک دوسرے کو اس کی وصیت کر دی ہے بلکہ یہ خود ہی سرکشی میں مبتلا ہیں''۔

جادوگر ہے یا دیوانہ'' یہ ایک ہی وقت میں بطور اظہار شک کے دونوں باتیں نہیں کہی ہیں بلکہ جیسا کہ قصہ حضرت موسیٰؑ میں روشنی ڈالی گئی ہے، ان کی مختلف اوقات کی باتوں کو سمو کر اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔ جادوگر'' کہنا اندرونی طور پر ایک غیر معمولی طاقت کے احساس کا نتیجہ ہے اور ''دیوانہ'' کہنا دوسروں کو ان کی باتوں پر توجہ کرنے سے روکنے کے لیے ہے ہر نبی کو ایک ہی طرح کے حالات سے سابقہ پڑا اور ایک ہی طرح کی باتیں منکروں سے سنیں، اس حقیقت کا ذرا جھلائے ہوئے انداز میں پہلے بطور رسول اظہار کیا گیا ہے ''ارے کیا ان لوگوں میں نسل در نسل اگلوں نے پچھلوں کو یہ وصیت کر دی'' کہ تم بھی ایسا کرنا اور ایسی ہی باتیں کہنا۔[1] پھر قرآن نے جیسے اس کا جواب نفی میں دیا کہ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ جو چیز ان باتوں کی باعث ہوتی ہے یعنی تعصب عناد، بدکیشی یا سرکشی، وہ ان سب میں مشترک ہے لہٰذا ان کا نتیجہ بھی سب میں یکساں نظر آتا ہے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿۵۴﴾ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾

''تو اب آپ ان سے منہ پھیر لیجیے، اب آپ مورد الزام نہیں ہے اور یاد دہانی کرتے رہیے کہ یاد دہانی اہل ایمان کے لیے فائدے کا باعث ہوگی''۔

یاد دہانی کا اہل ایمان کے لیے فائدہ

اس کا مطلب یہ کہ جو ایمان نہیں لائے ہیں، اب آپ کی طرف سے ان پر اتمام حجت ہوگئی اور ان کے سلسلے میں آپ کا فریضہ پورا ہوگیا..... آپ پر کوئی الزام کوتاہی کا عائد نہیں ہوتا۔ ہاں ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھئے کہ جو اہل ایمان ہیں وہ تو اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے اور ان کے ایمان میں جلا ہوتی رہے گی۔ اس میں اگر صرف پہلی ہی آیت پر بات ختم ہو جاتی تو اس سے یہ پہلو ضرور نکلتا تھا کہ بس اب رسول نے اس قوم سے کنارہ کشی اختیار فرما کر ان کے پاس سے کہیں دور چلے جائیں اور امم سابقہ میں ایسا اسی وقت ہوتا تھا جب اس قوم پر عذاب نازل ہونے والا ہو، لہٰذا آپ کو اس حکم دینے سے کہ اب علیحدگی اختیار کیجیے یہ تصور پیدا ہوتا تھا کہ اب اس پر عذاب نازل ہو جائے گا مگر دوسری آیت

---

[1] ۔قتادة: اوصى اولهم آخرهم بالتكذيب (ابن جرير)

میں بتایا کہ نہیں رسولؐ کو اپنا کام جاری رکھنا چاہیے کہ جو پاک روحیں ہیں وہ تو اس سے فائدہ اٹھاتی رہیں۔

دونوں آیتوں سے یکے بعد دیگرے جو دو (۲) تاثر پیدا ہوئے ہیں اس حقیقت کے اظہار کا ایک تمثیلی انداز تھا جو بطریق اہل سنت حضرت علی ابن ابی طالبؑ کا نام لے کر آیا ہے کہ آپ مکان سے برآمد ہوئے اس طرح کہ سر پر عمامہ تھا اور پیراہن کو اپنے جسم مبارک پر لپیٹے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ جب یہ آیت اتری کہ بس اب روگردانی کیجیے کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہ تھا جسے یہ یقین نہ ہوا ہو کہ اب عذاب آجائے گا کیوں کہ رسولؐ کو حکم ہوا ہے کہ اب ان سے الگ ہو جائیں مگر جونہی یہ آیت اتری کہ یاد دہانی کرتے رہیے.....تو بس ہمارے دل کو اطمینان ہو گیا کہ اسکا یہ مطلب نہیں ہے۔ اسے سیوطی نے تفسیر درمنثور میں کلبی کے حوالے سے درج کیا ہے اور اس طرح کی روایت ابن لاہو یہ اور ابن مردودیہ نے حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی ہے۔ ہمارے علامہ طبرسیؒ نے بھی اس کو مجاہد کے حوالے سے درج کیا ہے جس کا مآخذ غالباً جامع البیان طبری ہے جس میں پہلے تو قتادہ سے نقل سے کیا ہے کہ جب پہلی آیت اتری تو اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہت شاق ہوا اور خیال ہوا کہ وحی کا سلسلہ اب قطع ہو رہا ہے اور عذاب آیا ہی چاہتا ہے اس کے بعد دوسری آیت نازل ہوئی۔ اور پھر مجاہد کی روایت حضرت علی علیہ السلام کے متعلق نقل کی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام ایک خاص شان سے نکلے اور اس تاثر کا اظہار فرمایا۔ بہر حال اس دوسری آیت کے ملانے کے بعد پہلے جملے کی نوعیت ویسی تسلی دہانی کی ہو گئی کہ جو قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر طرح طرح سے ہے کہ آپ ان کی نافرمانیوں سے پریشان نہ ہوئے جیسے، ان کے نہ ماننے کی کوئی جواب دہی آپ سے نہیں ہو سکتی۔ اور نہ آپ کو کوئی ملامت ہو سکتی ہے [۱] آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ [۲]

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

''اور میں نے نہیں پیدا کیا جنات اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں''

مقصد خلقت انسان اور جنات

یہاں جنات کا پہلے اور انسان کا نام بعد کو لینا شاید اس بنا پر ہو کہ جنات کی خلقت پہلے ہوئی جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ.

جنات کو ہم نے پہلے گرم اور زہریلی ہوا سے پیدا کیا ہے (حجر آیت ۲۷)

اب یہ دیکھنا ہے کہ غرض خلقت جو عبادت بتائی گئی ہے اس سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ ایک عبادت تو وہ ہے جو بتقاضائے فطرت تمام کائنات پر حاوی ہے یعنی ہر چیز پر قدرتی طور پر اس نظام کے موافق چل رہی ہے جس پر خدا کو اس کا چلنا منظور ہے مگر وہ جبری اطاعت ہے۔ یہ عبادت تکوینی ہے جس میں اس شے کے ارادہ و اختیار کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس قسم کی عبادت اور سجدہ ریزی کا تمام اشیاء کے لیے قرآن مجید میں ذکر ہے۔

یہ اس محل پر مراد نہیں ہے ورنہ جن وانس کی خصوصیت نہ ہوتی، کہا جاتا ہے کہ تمام کائنات ہم نے عبادت کے لیے پیدا کی ہے

---

[۱] ۔بل الائه واللوم عليهم حيث لا يقبلون ما تدعونهم اليه (تبيان)

[۲] ۔فقد بلغت ونذرت (مجمع البيان)

اور اختیار اطاعت مگر بغیر مزاحم طاقتوں کے کرنے والے فرشتے ہیں۔اس بندگی میں وہ رفعت نہیں ہے جو اس مخلوق کی اطاعت میں ہوگی جو مقابل کی طاقتوں کو کچل کر اللہ کی عبودیت کے راستے چلتا رہے، یہ وہ عبادت ہے جس کے لیے جن وانس کی تخلیق ہوئی جسے ''عبادت تشریعی'' کہنا درست ہے یعنی مقصود اس نوع کی تخلیق کا ہے کہ یہ اپنے ارادۂ واختیار سے عبودیت خدا کے تقاضوں کو پورا کرے اور چونکہ ارادۂ واختیار وابستہ ہے اس سے کہ اس شخص کو فعل وترک دونوں پر قدرت ہو لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں میں کچھ عبادات گزار نظر آتے ہیں اور زیادہ تر وہ ہے جو اس کی عبادت سے سرتابی کرنے والے ہیں۔ان سرتابی کرنے والوں کا وجود ان افراد کی بلندی کا ثبوت ہے جو اپنی سعادتمندی سے اپنی زندگی خالق کے احکام کی تعمیل میں صرف کرتے ہیں۔یہ نہیں ہے کہ خالق اپنی غرض کے پورا کرنے میں ناکام رہا۔اب جو اس غرض خلقت کو پورا کریں گے، وہ خالق کی طرف سے اس کی رحمت کے مورد ہوں گے جس کا نتیجہ آخرت میں درجوں کی بلندی ہے اس طرح اس آیت کا مضمون اس ارشاد الٰہی کے مطابق ہوگا کہ ''لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ '' ان میں برابر اختلاف رہے گا سوان کے جن پر تمہارے پروردگار کی رحمت ہے اور اس نے تو انہیں اسی کے لیے پیدا کیا تھا (ھودؑ ۱۱۸۔۱۱۹)

یعنی اس رحمت کے استحقاق کے لیے مگر وہ خود اپنے سو اختیار سے اس محروم رہتے ہیں۔

معصوم کی تشریح اسی کے مطابق ہے [1] مگر مسلم اکثریت کا ذہن جبر واختیار کے مسئلے میں چونکہ زیادہ تر جبر کی طرف مائل رہا ہے لہٰذا ان کے قدیم مفسر ابن جریر طبری نے اپنے راویوں کے جو تشریحات درج کے ہیں ان کا نتیجہ بعض کا یہ نکلتا ہے کہ عبادت غرض خلقت صرف ان کے لیے ہے جو اطاعت گزار ہیں اور جو بدنصیب نافرمان ہیں ان کی غرض خلقت ہی نافرمانی ہے اور بعض کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو نافرمانی کر رہے ہیں وہ بھی ایک طرح کی عبادت ہی کر رہے ہیں کہ فیصلہ تقدیر کو پورا کر رہے ہیں لیکن ان دونوں صورتوں میں جزا وسزا نظام عدل کے مطابق قرار نہیں پاتی جب کہ نافرمان بچارے بھی غرض خلقت کو پورا کر رہے ہیں یا ایک طرح کی عبادت انجام دے رہے ہیں تو پھر ان کو سزا کا ہے کی ہے؟

فرقہ امامیہ جس طرۂ امتیاز عدلیہ ہوتا ہے، اس قسم کے تشریحات کو قبول کرنے سے قاصر ہے۔قرآن مجید کی ایک آیت میں جو ہے کہ: ولقد ذرانا لجھنم کثیر من الجن اولانس ۔''ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے انسان اور جنات کو پیدا کیا ہے۔(الاعراف۔۱۷۹) وہاں لام جس کا ترجمہ ''لیے'' ہے، جو لام غرض نہیں ہے جو مقصد کا اظہار کرتا ہے بلکہ لام عاقبہ ہے جس سے وقوع میں آنے والے انجام کا مجازاً اظہار ہوا کرتا ہے یعنی نتیجہ تخلیق کے بعد جو وقوع میں آیا، وہ یہ تھا، نہ یہ کہ وہ پیدا اس لیے ہوئے تھے [2]

مَآ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ ﴿۵۸﴾

''میں ان سے کسی روزی کا طلب گار نہیں ہوں اور نہ میں اس کا خواہاں ہوں کہ وہ مجھے کھانا دیں، یقیناً اللہ وہی روزی دینے والا ہے، مضبوط طاقت والا''

---

[1] ۔خلقھم لیفعلو اما یسترحبون بہ رحمتہ فیر حمھم (صافی)

[2] ۔انہ خلق الخلق کلھم لعبادتہ تصیر عاقبۃ کثیر منھم الیٰ جھنم بسوء اختیارھم (تبیان)

پہلے پارے کے شروع میں ممارزقناھم ینفقون کے تحت میں آچکا ہے کہ رزق جس کا ترجمہ ''روزی'' ہوتا ہے وہ ہر شے ہے جس سے کسی زندہ شخص کی بقا وابستہ ہے کھانا اس کے تحت میں داخل ہے لہٰذا یہاں پہلے تو ہر قسم کی ضرورت سے اپنی بے نیازی کا اظہار کیا ہے اور پھر خصوصیت سے جس چیز کی ضرورت دنیا میں کسی ذی روح کو سب سے زیادہ ہوتی ہے یعنی غذا اس کی واضح طور پر نفی کی ہے۔ اس کا ربط پہلی آیت سے یوں ہوتا ہے کہ عام طور پر کوئی غلام اور کنیز وغیرہ بناتا ہے وہ اس لیے کہ ضروریات کے پورا کرنے میں اس کی مدد کریں مگر یہاں اس نے جو انسان وغیرہ کو پیدا کیا ہے، وہ خود مدد حاصل کرنے کے لیے نہیں ہے کیوں کہ تو بے نیاز مطلق ہے.....اسے کوئی ان کی احتیاج نہیں ہے [1] وہ عبادت جس کے لیے اس نے جن وانس کو پیدا کیا ہے اس کا فائدہ جو رحمت الٰہی ہے اسی مخلوق کو پہنچتا ہے، خالق کو نہیں۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ پہلے فقرے کا مطلب یہ کہ کسی ایک بندے سے میں اس کا طلب گار نہیں ہوں کہ میرے دوسرے بندوں کو روزی دیں، نہ اس کا طلب گار ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ مگر یہ مفہوم آیت کے الفاظ سے ذہن میں نہیں آتا۔ بعد والی آیت میں اللہ کا نام لینا ایک قسم کی دلیل ہے کہ میں بھلا رزق کا طلب گار کہاں ہوسکتا ہوں، میں تو اللہ ہوں جس کی ذات مطلق بے نیاز ہے اور وہ خود فیض رسان خلائق ہے۔ ملاحسن فیض کو جیسے یہ الفاظ ذات الٰہی پر کھبتے نہیں محسوس ہوئے کہ میں ان سے کسی رزق کا طلب گار نہیں ہوں، اس لیے دبی زبان سے یہ تصور ظاہر کیا ہے کہ شاید اس اعلان کی ہدایت رسول کو ہوئی ہو [2] مگر میرے خیال میں جب کہ سابق کی آیت کے ربط سے اس کا مناسب مفہوم موجود ہے تو اسے الگ قرار دینے اور وہ بھی ایک عدد ''قل'' کو درمیان میں محذوف ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جبکہ اس صورت میں مناسب یہ معلوم ہوتا کہ ''منھم'' ''ان سے'' کے بجائے ''تم سے'' کسی رزق کا طلب گار نہ ہوں۔

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۵۹﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۶۰﴾

''تو یقیناً ان لوگوں کا جو ظالم ہیں، وہی حصہ ہے جیسا ان کے ساتھ والوں کا تھا تو وہ لوگ مجھ سے جلدی نہ کریں، تو وائے ہو، ان لوگوں کے لئے کافر ہیں، اس دن سے جس کا ان سے وعدہ وعید ہوتا'' ہے۔

ذنوب کے معنی تو بڑے ڈول کے ہوتے ہیں اور اس حصے کو بھی کہتے ہیں جس کا کسی کو استحقاق ہو تو لفظی معنی تو وہ ہوئے جو ترجمہ کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو انجام ان کا ہوا وہی ان کا ہے۔ ساتھیوں سے مراد ان کے ہم کیش پہلے والے ہیں جو کفر اور بداعمالی میں ان کی طرح تھے [3]

ایک دفعہ ظالم کہہ کے پھر کافر کہنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ظلم سب سے بڑا یہی ہے کہ وہ اللہ کے مقابلے میں کفر اختیار کیے ہوئے ہیں اور حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔

---

[1] ۔انی لم اخلقھم الماجۃ بی الیھم (علی ابن ابراھیم)

[2] ۔یحتمل ان یقدر قل فیکون بمعنی قولہ: قل لا اسئلکم علیہ اجرا (صافی)

[3] ۔اصحابھم الذین ھلکوا مثل قوم نوح وعاد وثمود (مجمع البیان)

سُوْرَةُ الطُّوْرِ

''مکّیہ .....۴۹.....آیات''

ادھر کے سوروں میں عموماً نام سورے کا پہلی ہی لفظ پر جو سورے کے شروع میں ہے مقرر ہو گیا ہے اور مضامین ان سوروں کے جو مکے میں نازل شدہ ہیں بنیادی طور پر مبدا و معاد سے متعلق ہیں اور بشارت سے زیادہ انداز پر توجہ ہے۔ پہلے عذاب آخرت کا سخت سے سخت طریقہ پر اندیشہ پیدا کیا گیا ہے اور پھر اس کے مقابلے میں جو پرہیزگار ہیں ان کے خوش گوار انجام کا مسحور کن انداز میں تذکرہ ہے۔ درمیان میں نیک اعمال اہل ایمان کی اولاد کے لیے جو ایمان میں ان کے ساتھ شریک ہیں، خصوصی طور پر ان کے مراتب میں شرکت کا اعلان ہے جس پر تبصرہ اسی آیت کے ذیل میں ہوگا۔

آخر میں مشرکین کی مختلف طرح پریشان خیالیوں اور چہ می گوئیوں کا جو وہ وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے ایک ایک دو دو جملوں میں حوالہ دیتے ہوئے متعجبانہ انداز کے ساتھ سوالات کی صورت میں ان کے غلط ہونے کا اظہار ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

وَالطُّوْرِ ۙ﴿۱﴾ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ﴿۲﴾ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ﴿۳﴾ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۙ﴿۴﴾ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۙ﴿۵﴾ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ﴿۸﴾

''قسم ہے طور کی اور یک لکھی ہوئی کتاب کی چمک دار ورق میں اور قسم اس گھر کی جو آباد ہے اور اس چھت کی جو بلند ہے اور اس سمندر کی جو جوش زن ہے کہ تمہارے پروردگار کا عذاب ایک ایسی واقعیت ہے جس کا ٹالنے والا کوئی نہیں''۔

طور کے اصل معنی پہاڑ کے ہیں، اس لیے پہلے جو کئی جگہ آیا ہے کہ بنی اسرائیل کے اوپر پہاڑ کو بلند کیا۔ وہاں بظاہر خاص وہ کوہ طور نہیں ہے مگر عام طور پر لفظ طور سے ذہن اسی حضرت موسیٰؑ والے خاص پہاڑ کی طرف جاتا ہے جسے طور سینا اور قرآن میں ایک جگہ "طور سینین" کہا گیا ہے یہاں قسم میں الف لام عہد کے ساتھ جو فرد خاص کی طرف اشارہ ہے کے لیے ہوتا ہے۔ اشارہ اسی کی طرف ہوسکتا ہے۔ رق کے معنی لغت کے لحاظ سے وہ کھال ہے جس پر اس وقت لکھا جاتا تھا، جب کہ کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا تو کھال ہی کے باریک سے باریک ورق بنائے جاتے تھے جس کی بنا پر بعض تعویزوں کے ساتھ دعاوں کی کتابوں میں ہوتا ہے کہ پوست آہو پر لکھا جائے اور اس کے معنی اصل'' چمک دمک' بھی داخل ہے اسلئے بعض اہل لغت نے اس کے معنی میں کھال کا نام خصوصیت کے ساتھ نہیں لیا ہے۔ اب چونکہ طور کے ساتھ اس

کتاب کا ذکر ہے لہٰذا ذہن میں یہ آتا ہے کہ جس کتاب کی قسم کھائی گئی ہے۔ وہ توریت ہے جس پر دوسرے مقامات پر کتاب کا اطلاق قرآن میں ہوا بھی ہے اور وہ اُتری بھی تھی لیکن تحریر کی شکل میں قرآن کی طرح نہیں، جو غیر مکتوبی صورت میں اترتا تھا اور بعد کو قید کتابت میں آتا تھا۔

لیکن دوسرا قول اس جملے کی تشریح میں یہ بھی ہے کہ اس سے قرآن مراد ہے اور تیسرا یہ کہ اس سے لوح محفوظ مراد ہے۔ کلام معصومؑ کوئی جو فیصلہ کن ہو، موجود نہیں ہے مگر جو قرینۂ لفظی کی بنا پر قابل ترجیح ہوسکتا ہے وہ پہلا ہی تصور ہے۔ ہاں ایک بات ذہن میں یہ آتی ہے کہ چونکہ مخاطب مشرکین مکّہ ہیں جنہیں علم اور کتابت قلم سے مانوس بنانا بھی قرآن کی ایک مہم تھی جو سورۂ اقراء سے ظاہر ہے تو مقام قسم میں بھی مطلق کتاب ان دل لبھانے والے تعبیری خصوصیات کے ساتھ بھی مراد ہوسکتی ہے۔

بیت معمور کے بارے میں حدیثوں میں یہ ہے کہ وہ عالم بالا میں کئی ملائکہ کے لیے اسی طرح مرکز طواف ہے جس طرح کعبہ انسانوں کے لیے زمین پر ہے۔ اس میں روایتیں مختلف ہیں کہ وہ آسمان اول پر ہے یا چوتھے آسمان پر یا ساتویں آسمان پر۔ ان روایات کو ملا محسن فیض نے تفسیر صافی میں درج کیا ہے۔ جامع البیان طبری میں بھی قدیم روایات درج ہیں وہ بس اسی محور پر گردش کرتے ہیں جن میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کے ارشادات بھی ہیں اور ان میں ہے کہ یہ کعبہ کی بالکل محاذات میں ہے اور اس کا نام ''ضراح'' ہے۔

''بلند کی ہوئی چھت'' کے تو بہت نمایاں معنی آسمان ہی کے ہیں اور دریا ظاہر میں کوئی مخصوص نہیں ہے، اس سے جنس مراد ہوسکتی ہے اور سمندر میں نمایاں طور پر نظروں کو جوش کھانے کی کیفیت تو محسوس ہوتی ہی ہے۔ مگر چونکہ اسکی صفت یہاں **مسجور** آئی ہے اور یہ لفظ زیادہ تر تنور کو ایندھن سے پُر کرنے کے معنی میں آتی ہے اور اس لیے قرآن مجید میں دوزخ میں ڈالے جانے کے لیے آیا ہے ''**ثم فی النار یسجرون**'' جس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ پھر آگ میں وہ ایندھن کے طور پر ڈال دیے جائیں گے اور نہج البلاغہ سجر کا لفظ آگ کے بھڑکانے کے معنی میں آیا ہے۔ امیر المومنینؑ اپنے خطبے میں فرماتے ہیں:۔

''**فتجرنی الیٰ النار سجرھا جبارھا لغضبہ**''

اور تو مجھے کھینچ کر ڈالے گا اس آگ کی طرف جسے **جبار وقھار** نے اپنے غضب کے لیے بھڑکایا ہے۔

اب یہاں یہ **مسجور** صفت سمندر کے لیے آئی ہے جو آگ سے نہیں، پانی سے بھرا ہوتا ہے اسلیے کہا گیا ہے کہ اس دریا سے مراد وہ وسمندر ہے جو مرکز زمین میں ہے جس کے لیے بتایا جاتا ہے کہ اس کے نیچے مشتعل ہونے والے پگھلے ہوئے مواد ایسے ہیں کہ وہ گرمی سے جوش کھاتا ہے۔

جہاں تک ہم دیکھتے ہیں قسمیں کثرت کے ساتھ مکی سوروں میں ہے۔ مدنی سوروں میں نہیں ہے اس لیے کہ مدینہ میں تو زیادہ تر وہ جماعت مخاطب تھی جو آپ کی رسالت کو مان چکی تھی لہٰذا ان کے لیے آپ کا کہنا اور بتانا کافی تھا لیکن مکّہ میں مخاطب مشرکین کی جماعت تھی جنہوں نے آپ کی رسالت کو نہیں مانا تھا لہٰذا صرف آپ کے کہنے سے خبروں کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس لیے ان سے باتیں اتنی شدت کے ساتھ قسمیں کھا کھا کر کہی گئی ہیں جس پس پشت قبل کے چالیس برس کا ان کا یہ مشاہدہ اور ان کا یہ اعتراف بھی تھا کہ یہ شخص سچا ہے۔ اب یہ سچا جب ایک بات کو اتنی قسمیں کھا کھا کر سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا ہے تو اسی وقت اور پھر اس سے زیادہ فرصت کے لمحات میں وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ یہ خبریں غلط نہیں ہوسکتیں۔ پھر اتنی مسلسل قسمیں بتقاضائے بلاغت ان کی توجہ مبذول کرنے کے لیے ہیں کہ ایک دم جو کہنا ہے وہ کہا جاتا تو رواداری میں نذر تغافل ہوجاتا اور جب اس فصاحت کے ساتھ جو نقطۂ اعجاز پر ہے اتنی قسمیں ان کے سامنے آرہی ہیں تو وہ متوجہ ہوکر سنیں گے کہ

اس کے بعد کیا کہا جاتا ہے؟

اب یہاں ان قسموں کے ساتھ جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ عذاب کی خبریں سن کر مذاق نہ اڑاؤ، وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو وقوع میں لازمی طور پر آنے والی ہے اور اس کا ٹالنے والا کوئی نہیں ہے۔

يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝٩ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝١٠ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝١١

''جس دن آسمان پورے طور پر حرکت میں آجائے گا اور پہاڑ پوری طرح رواں رواں ہوں گے تو وائے ہو اس دن کو جھٹلانے والے پر جو بڑی ہی (غلط قسم کی) سرگرمی میں تفریح محسوس کرتے ہیں''۔

قیامت کے حشر ونشر سے پہلے جو موجودہ نظام کائنات کی ابتری اور آخر میں فنا کا تذکرہ قرآن میں متعدد آیتوں میں ہوا ہے ان میں یکے بعد دیگرے رونما ہونے والے مختلف حالات جستہ جستہ بیان ہوئے ہیں، کہیں آسمان کے شق ہونے کا ذکر ہے، کہیں پہاڑوں کے سرمۂ ہوجانے کا، کہیں روئی کے گالوں کی طرح فضا میں اڑنے پھرنے کا ذکر ہے۔ یہاں میرے خیال میں ابتدائی درجہ کا بیان ہے جب ابھی ان کی جسمانی کیفیت پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ صرف ان کی حرکت کی مقدار میں شدت اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی ہے ہاں پہاڑوں کے رواں دواں ہونے میں یہ تصور کرسکتے ہیں کہ یہ وہ حرکت نہیں ہے جو زمین کے ساتھ ساتھ ہے، جس کے لیے ایک جگہ قرآن مجید میں کہا گیا ہے

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ. (نمل۔۸۸)

اور پہاڑوں کو تم دیکھتے ہو تو انہیں ایک جگہ منجمد سمجھتے ہو حالاں کہ وہ اس طرح رواں ہیں جیسے بادل رواں ہوتے ہیں،

بلکہ یہاں مراد یہ ہے کہ وہ زمین سے اکھڑ کر بذات خود رواں دواں ہوں گے۔ یہ ایک طرح کا انتشار ہے جس کی شدت کا اظہار دوسری جگہ "كَالعِهْنِ الْمَنْفُوشِ" دھنکی ہوئی روئی'' روئی کی لفظوں میں کیا گیا ہے اور پھر اس سے زیادہ انتشار کی کیفیت کو ایک مقام پر ''هَبَآءً مُّنْبَثًّا'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی جب وہ بے حقیقت ذرات کی طرح ہوں گے جو کسی روشن دان وغیرہ سے فضا میں بکھرے نظر آتے ہیں[1] دنیا اسی نظام کی تباہی کو اصل قیامت سمجھتی ہے، اس لیے قیامت کی پیشن گوئیاں یوں ہوا کرتی ہیں کہ آفتاب کی گرمی کم ہو رہی ہے لہٰذا قیامت آنے والی ہے یا کچھ ستارے ایک دوسرے کے قریب ہو رہے ہیں ٹکرانے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے قیامت آجائے گی۔ حالاں کہ قیامت نام صرف اس تباہی و بربادی کا نہیں ہے بلکہ اس کے بعد جو تعمیر جدید ہوگی اس کا نام ہے۔

وہ تباہی و بربادی تو پیش خیمہ ہوگی، اس نئی تخلیق کا قیامت کا نام ہی قیامت قیام یعنی اٹھ کھڑے ہونے پر ہے جس کا تعلق حیات بعد الموت سے ہے جس کے لیے قرآن مجید نے کہا ہے:۔

يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (المطففین۔٦) ''جس دن سب لوگ پروردگار عالم کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے۔

مگر چونکہ وہ تباہی و بربادی اس کی تمہید ہوگی اس لیے قرآن مجید نے بھی اکثر ان تباہیوں کا ذکر کر کے بعد والی منزل کو یاد دلایا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اس کے بعد کہا ہے کہ وائے ہو اس دن کو جھٹلانے والوں کے لیے یعنی ان کی اصل شامت اعمال اس دن سامنے آئے گی جو حساب و کتاب کی منزل ہے اور اس کے بعد داخلۂ دوزخ۔

---

[1] ۔تسیر الجبال عن اماکنھا من الارض فتصیر ھباء منبثا (ابن جریر)

خوض کے اصل معنی تو دریا وغیرہ میں اُترنے کے ہیں[1] اسی کی ہم معنی لفظ غور ہے جو ہماری اردو میں اس کے ساتھ مثل تابع مہمل کے آتی ہے یعنی غور وخوض۔ اور عربی میں کسی کام یا گفتگو میں بہت انہماک کے ساتھ مصروف ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور قرآن میں اکثر مذموم باتوں میں سرگرمی کے ساتھ لگے رہنے کے معنی میں آئی ہے چنانچہ یہاں بھی کہا جارہا ہے کہ جن باتوں میں کھیل اور تفریح سمجھ کر وہ انہماک کے ساتھ لگے ہوئے تھے وہ قیامت میں ان کی ہلاکت ابدی کا موجب یا باعث ہورہی ہیں۔

يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ﴿١٣﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٤﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿١٥﴾ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾

''جس دن وہ دھکیلے جائیں گے دوزخ والی آگ کی طرف شدت کے ساتھ۔ یہ وہ آگ ہے جسے تم جھٹلاتے تھے۔ کیا یہ جادو ہے یا تمہیں دکھلائی نہیں دیتا؟ اس میں جلتے رہو۔ اب تم ضبط کرو یا نہ کرو، تمہارے لیے یکسان ہے، بس وہی تو تمہیں سزا مل رہی ہے جو تمہارے اعمال ہوا کرتے تھے،،۔

اہل لغت نے 'صلی' کے معنی ملازمت یعنی لگے رہنے کے لکھ دیے ہیں مگر موارد استعمال سے پتہ چلتا ہے کہ اس لفظ کا ستعمال آگ کے ساتھ ہوتا ہے تو لگے رہنے کی خصوصیت برقرار نہیں رہتی۔ اس لیے تاپنے کی بھی تعبیر اس لفظ سے کرتے ہیں بہرحال ہم نے اپنے ترجمے میں اس لغوی مفہوم کو بھی مدنظر رکھا ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ﴿١٧﴾ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿١٨﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْۗـــًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٩﴾ مُتَّكِـــِٕيْنَ عَلٰي سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿٢٠﴾

''یقیناً پرہیزگار لوگ باغہائے بہشت میں ہیں اور آرام میں لطف اندوز ہوتے ہوئے اس سے جو انہیں ان کے پروردگار نے دیا ہے اور بچایا ہے انہیں ان کے پروردگار نے دوزخ کے عذاب سے کھاؤ اور پیو۔ مبارک تمہیں ان اعمال کی بدولت جو تم کرتے تھے گاؤ تکیے سے لگے ہوئے ان تختوں پر جو ترتیب کے ساتھ بچھے ہوئے ہوں گے اور ہم نے شادی کی ہوگی بڑی آنکھوں والی حوروں کے ساتھ''۔

''فاکھین کا ترجمہ لطف اندوز ہوتے ہوئے'' ایک تشریح کی بنا پر ہے۔ دوسری تشریح یہ ہے کہ یہ لفظ فاکھة سے ہے فاکہہ وہ شخص ہے جس کے پاس فواکھات یعنی میوے بہت سے ہوں[2] ھنیئا کا لفظ عرب روزمرہ میں متداول ہے چنانچہ جب کوئی پانی پیتا ہے تو دوسرا

---

[1] ۔الدخول فی الماء بالقدم (تبیان)

[2] ۔عندھم فاکھته کثیرة وذالك نظیر قول لعرب للرجل یکون عنده کثیر رجل تامر (ابن جریر)

کہتا ہے ھنیئا وعافیۃ۔اس کے معنی میں دعائے خوش گواری مضمر ہے۔قرآن مجید میں یہ لفظ چار مقام پر آئی ہے، چونکہ اس کی قائم مقام کوئی لفظ اردو محاورے کا جزو نہیں ہے، اس لیے اس کا ترجمہ دشوار ہے ''مبارک ہو'' کے ساتھ ترجمہ مجبوری کا نتیجہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿۲۱﴾

''اور جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ان کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ہم نے ان کی اولاد کو اُن سے ملا دیا اور ان کے اعمال میں کچھ بھی کمی نہیں کی۔ ہر آدمی اپنے اعمال کے ساتھ گرھویں ہے''۔

اس آیت میں ایک تصور یہ ہے کہ یہ آیت صاحبان ایمان کے بچوں کے بارے میں ہے جو نابالغ ہیں کہ یہ بچے مؤمنین کے حسن عمل کی وجہ سے ان کے درجے میں ان کے پاس پہنچا دیے جائیں گے مگر قرآن مجید کے یہ الفاظ کہ ان کی اولاد نے ان کی پیروی کی، یہ بتلاتے ہیں کہ وہ کمسن اور نابالغ بچے نہیں ہیں بلکہ نالغ اور عاقل اور ذمہ دار افراد ہیں جن کے ایمان کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے باپ کی پیروی کی یا نہیں۔اس عقلی پہلو کا تحفظ کرتے ہوئے یوں تشریح کی گئی کہ وہ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے جو بالغ ہے، ایمان وعمل میں ان کے ساتھ دیا تو اب وہ بچے بھی جو نابالغ ہی میں دنیا سے اٹھ گئے ان سے ملا دئے جائیں گے [1]

اس صورت میں لفظ ذریت میں یہ تفریق کہ پہلی ذریت اور ہے جو بالغ ہے اور دوسری ذریت وہ جو نابالغ ہے۔یہ الفاظ آیت سے ذہن میں نہیں آتی۔میرے نزدیک اس سے زیادہ سلجھا ہوا جو مفہوم ہے۔وہ یہ ہے کہ اولاد ایمان اور عمل صالح میں ان بزرگوں کے پیچھے تو رہیں مگر مراتب عمل کے لحاظ سے یہ بالکل اس نقطے پر نہیں ہے۔اس میں کمزوری پائی جاتی ہے باپ کے حسن عمل کی وجہ سے ان کی کمزوری کو نظر انداز کر دیا جائے گا اور انہیں اسی درجے پر پہنچا دیا جائے گا جو ان کے باپ کا ہے۔طبری نے جامع البیان میں اگرچہ پہلے مفہوم کو بھی ایک طریقے سے ابن عباسؓ کی زبانی نقل کیا ہے مگر زیادہ طرق سے جناب ابن عباسؓ سے یہی دوسرا مفہوم وارد ہے اور خود طبری نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ہمارے علماء نے جناب ابن عباس سے اس کو نقل کیا ہے [2] اور اس کے مطابق حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیتؑ کی روایتیں بھی درج ہیں۔

مآ التنا کے لفظ کا مادہ الت ہے جس کے معنی کم کرنے کے ہیں۔ایک جگہ قرآن مجید میں ہیں:۔وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـــًٔا. (حجرات۔۱۴) اگر تم اللہ اور رسول کی پیروی کرو گے تو وہ تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہ کرے گا۔

یہاں ما التنا ماضی منفی ہے۔سابق جملے کے ساتھ اس کا ربط یہ ہے کہ ہم نے ان کے اعمال میں کچھ کمی نہیں کی ہوگی، یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اولاد کا ان کے بزرگوں کے ساتھ ملحق کیا جانا ہے ان بزرگوں کے حسن عمل کے حق بجانب صلے کا یک جز ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو ان کے عمل کی جزا میں ایک طرح کی کمی ہو جاتی اور پھر اسی کے ساتھ مرتبط ہے کہ ہر انسان جو کچھ اس نے کیا ہے اس کے ساتھ گروی ہے جسطرح جو شے رہن ہے محفوظ رہتی ہے جب تک کہ وہ رقم نہ ملے۔اسی طرح ہر انسان کے اعمال خدا کے یہاں محفوظ رہتے ہیں کہ ان کا مناسب صلہ اسے مل جائے۔

---

[1] ۔یقول الذین ادرك ذریتهم الایمان فعملوا بطاعتی الحقهم بایمانهم فی الجنة اولادهم الصغار تلحقهم به (ابن جریر)

[2] ۔عن ابن عباس ان التابعین الحقو بدرجة اباءهم وان قصرت اعمالهم تکرمة لاباءهم (تبیان)

ایک دوسری تشریح یہ ہوئی کہ اولاد کو جو ان کے ساتھ ملحق کیا جائے گا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ باپ کی جزا میں کچھ کمی کر کے اولاد کو ملحق کیا جائے گا۔نہیں ان بزرگوں کی جو جزا تھی وہ پوری پوری ان کو ملے گی اوپھر مزید فضل وکرم یہ ہے کہ یہ اولاد ان کے ساتھ پہنچادی جائے گی۔

وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۲﴾ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ﴿۲۳﴾ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۲۴﴾

''اور ہم نے انہیں مدد پہنچائی پھلوں سے اور گوشت کے ساتھ جس طرح کی انہیں خواہش ہو،اس میں ایک دوسرے سے لے رہے ہوں گے ایسی شراب سے بھرے ہوئے شاعر جن میں نہ بیہودہ قسم کی کوئی بات ہے نہ گناہگار ٹھہرانے کی اوران کے پاس چکر لگا رہے ہوں گے ایسے نوجوان خدمت گار جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی ہوں''۔

نعمات بہشت کے اوصاف

چونکہ اس کے پہلے ان صاحبان ایمان کا ذکر ہے جن کے ساتھ ان کی اولاد ملحق کی گئی اس لیے اس ضمیر کو بھی انہی سے متعلق قرار دیا گیا ہے [1] لیکن چونکہ عموماً ترتیب کا مطابق تنزیل ہونا یقینی نہیں ہے لہٰذا تناسب الفاظ سے ذہن میں یہ آتا ہے کہ قبل میں جو متقین کے لیے سلسلہ کلام تھا جس کا آخری جملہ یہ تھا: زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۲۰﴾ اس پر یہ عطف ہو کہ شادی کی حوروں کے ساتھ اور انہیں مدد پہنچائی۔

مدد کے اصل معنی تو اضافے کے ہوتے ہیں، چونکہ جو مدد بھی پہنچائی جائے اس سے قوت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لیے کسی طرح کی بھی تقویت کو خواہ غذا سے ہو اور خواہ فوج ولشکر سے ہو مدد کہا جاتا ہے یہاں نعمات جنت کی عطا کو جو افزائش کے ساتھ ہے، اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اب اضافے کے لفظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض نے اس میں پے در پے کا مفہوم محسوس کیا ہے [2] نزع کے معنی سلب کرنے اور اکھاڑنے کے ہیں، جب اسے باب تفاعل میں لے گئے تو تنازع کا لفظ ہوا جس سے اردو میں بھی 'نزاع' کا لفظ ہے اور اکثر عوام 'تنازع' غلطی سے ''ز'' پر زبر کے ساتھ کہہ دیتے ہیں جس میں باہمی کشاکش بطور مخالفت ہوتی ہے۔اور اس لیے قرآن میں اس کا بطور مذمت ذکر ہوا ہے اور ممانعت کی گئی ہے کہ:

لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا آپس میں نزاع نہ کرو ورنہ تم میں کمزوری پیدا ہوگی (انفال۔۴۶)

بہشت میں ناگواری کا گزر نہیں اس لیے وہاں ساغر کی گردش کو جو ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کی طرف خوش دلی کے ساتھ منتقل ہوتا ہے، اس لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔لغو کے ساتھ تاثیم کا لفظ ایک اور جگہ قرآن مجید سورۂ واقعہ آیت نمبر ۲۵ میں بہشت کے وصف میں: لایسمعون فیھالغوولاتأثیما۔ چونکہ اثم کے معنی گناہ کے ہیں لہٰذ تاثیم کے معنی گناہگار ٹھہراتے ہوئے جو ہم نے ترجمہ کیا ہے۔اب مطلب اس کا یہ ہوا کہ وہ شراب ایسی ہے کہ اُسے پی کر انسان گناہگار ٹھہرایا نہیں جاسکتا اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اسے پی کر رندوں میں کوئی جھگڑا کھڑا نہیں ہوتا جس میں ایک دوسرے کو گناہگار ٹھہرائے۔ جتنے کھانے پینے کے اشیاء کے نام نعمات جنت کے ذیل میں قرآن میں لیے گئے ہیں، سب ذہن کو منتقل کرنے کے لئے اُن اشیاء کی طرف جو دنیا میں انسانی خواہشوں کا مرکز ہیں مگر یہاں اُن میں منافع کے ساتھ مفاسد اور اچھائی کے ساتھ

---

[1] ۔امددناھُوُ لاءِ الَّذِيْنَ وَرَسُوْلِهٖوَاتبعتھم ذریتھم بایمان (ابن جریر)

[2] ۔پے در پے کنیم (شاہ ولی اللہ)

برائی کے پہلو بھی ہیں، نعمات جنت ان برائیوں سے خالی ہیں۔

جو چیز دنیا میں حرام ہے جیسے شراب، وہ اس برائی کی بنا پر ہے جو اس میں پائی جاتی ہے، جنت والی شراب چونکہ اس برائی سے پاک ہے لہٰذا نہ اس کا پینا گناہ ٹھہرایا جا سکتا ہے نہ اس کے سبب سے یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو گناہگار قرار دے۔ بہشت کی ہر شے چونکہ نقائص دنیوی سے پاک ہے لہٰذا حوریں ہیں تو پاک و پاکیزہ اور نوکر چاکر کے طور پر جو نوجوان کام کر رہے ہیں انہیں یہاں اور دوسرے مقامات پر ان کے حسن و جمال کو نمایاں کرتے ہوئے موتیوں سے تشبیہ دی ہے اور وہ بھی وہ نہیں جو استعمال میں رہیں کہ میلے ہو جائیں بلکہ جو کسی غلاف یا ڈبیا میں محفوظ ہوں اور بعض نے صدف کے اندر ہونے کے ساتھ تشریح کی ہے [1] کہ وہ بالکل ہی تر و تازہ ہوں گے۔ اور سورۂ دہر میں ان کے چاروں طرف پھرنے کے منظر کی بنا پر انہیں لؤلؤ منثوراً ''بکھرے ہوئے موتی'' کہا گیا ہے اور سورۂ واقعہ میں ان کے ہمیشہ بہار ہونے کے وصف کی بنا پر وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ''ہمیشہ کی زندگی رکھنے والے لڑکے'' کہا گیا ہے۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿٢٥﴾ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿٢٦﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿٢٧﴾ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿٢٨﴾

''اور ان میں سے ایک نے دوسرے کی طرف رخ کیا، آپس میں سوال و جواب کرتے رہے، کہنے لگے کہ ہم پہلے ہی سے اپنے گھر بار میں ڈرتے رہتے تھے تو اللہ نے ہم پر احسان فرمایا اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچایا، یقیناً ہم پہلے سے اسے پکارا کرتے تھے، یقیناً وہ اچھا ہی اچھا کرنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

مضمون گفتگو میں یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ حساب کتاب کے بعد کی منزل ہے، جب فیصلہ الٰہی نمایاں ہو گیا اور انہیں بہشت میں جگہ مل گئی تو آپس میں وہ یہ بات چیت کرنے لگے جو اس وقت بالکل بامحل ہے مگر جناب ابن عباسؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ وہ اس وقت کا ذکر ہے جب وہ قبروں سے برآمد ہوں گے [2] مگر ابھی جب پورا نتیجہ سامنے نہیں آیا تو اس خوف کو تو اب تک قائم رہنا چاہیے۔ اس لیے اس گفتگو کا اس وقت محل معلوم نہیں ہوتا۔ سموم کے معنی چونکہ گرم ہوا کے ہوتے ہیں اس لیے اردو محاورے میں ووقٰنا عذاب السموم کا ترجمہ زہریلی کیا گیا ہے ''وہ دوزخ کی بھاپ بھی نہ لگی'' (موضح القرآن) مگر دوسرا تصور یہ ہے کہ سموم بھی دوزخ کا ایک نام ہے [3] ہم نے ترجمہ اس کے مطابق کیا ہے۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿٢٩﴾ ؕ

''تو یاد دہانی کرتے رہیے کہ آپ اپنے پروردگار کے فضل و کرم سے نہ کاہن ہیں اور نہ دیوانہ''

---

[1] ۔مصون فی الصدف لانہ فیہا احسن منہ فی غیرھا (جلالین)

[2] ۔عن ابن عباس: اذا بعثوا فی النفخۃ والثانیۃ (ابن جریر)

[3] ۔السموم من اسماء جھنم عن الحسن (مجمع البیان)

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی

مشرکین حضرتؐ کی ہدایت کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے کبھی کاہن کہہ دیتے تھے کہ وہ لوگ بھی ایک طرح کی عیب کی کچھ خبریں غلط یا صحیح سناتے تھے مقفّٰی اور مسجّع عبارتوں میں اور کبھی دیوانہ کہہ کے ٹالتے تھے کہ ان کی باتیں توجہ کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے ان دونوں باتوں کی نفی کرکے کہا گیا ہے کہ آپ یاد دہانی کرتے رہیے، یعنی ان کی باتوں کی پرواہ نہ کیجیے۔

ہمارے نزدیک تو بس یہی پہلو نکلتا ہے، طبری نے اس کے علاوہ یہ مفہوم نکالا ہے کہ چونکہ یہ باتیں نہیں ہیں بلکہ آپ خدا کے سچے رسولؐ ہیں لہٰذا اطمینان رکھیے کہ خدا آپ کی مدد کرے گا [1] کاھن، کسے کہتے ہیں؟ اس میں ذرا اختلاف ہے، بعض نے یہ خصوصیت بتائی ہے کہ وہ گزشتہ خبریں سناتے تھے، اس لیے بعض واقعات بتاتے ہیں کہ نسب کی تحقیق کے لیے رجوع ہوتی تھی کہ یہ فلاں شخص کا بیٹا ہے یا نہیں؟ اور بعض نے گزشتہ اور آیندہ کی تفریق کے بغیر کہا ہے کہ وہ کسی موکل کی مدد سے جواز قبیل جنات وغیرہ ہوتا تھا غیب کی خبریں سناتے تھے۔ جناب شیخ مرتضیٰ انصاریؒ نے علامہ حلیؒ کی قواعد کے حوالے سے بطور اپنے مختار کے کاہن کی یہ تعریف لکھی ہے کہ وہ کسی جن کے ذریعے سے جسے اپنا مددگار بنالیتا ہے، غیب کی خبریں حاصل کرتا ہے اور سناتا ہے۔ بعض آیات قرآنی سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کہانت کا تعلق جنات کے ساتھ ربط قائم کرنے سے تھا۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿۳۱﴾

''کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے، یہی انتظار ہے اس کے لیے کہ وہ موت کے حادثہ کا شکار ہوجائے، کہیے کہ انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں''

یعنی تم میرے لیے جس روزِ بد کے لیے منتظر ہو، وہ تمہاری امیدوں کہ مطابق تمہیں دیکھنا نصیب نہیں ہوگا اور میں عذاب الٰہی سے تمہارے خاتمے کا منتظر ہوں جو عنقریب تمہارے سامنے آئے گا چنانچہ وہ مشرکین اس کے بعد جنگ بدر وغیرہ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مقابلہ کرکے ہلاک ہوئے۔

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۳۲﴾

''کیا (سچ مچ) ان کی عقلوں کا تقاضا ان سے یہ ہے یا وہ بے حد سرکش لوگ ہیں''۔

مطلب یہ ہے کہ درحقیقت وہ بھی اپنی عقل سے کام لیں تو یہ باتیں نہ کہیں مگر وہ تعصب میں اندھے ہورہے ہیں، خود اپنے عقل وضمیر کے تقاضوں کے خلاف باتیں کہتے ہیں، یہ سب سے بڑی ان کی حد سے گزری ہوئی سرکشی ہے۔ ایک معنی احلام کے ''خوابہائے پریشاں کے لئے گئے ہیں اس طرح اُن کے غلط خیالات کو خوابہائے پریشان سے تعبیر کیا گیا ہے [2] اس صورت میں مطلب ہوگا کہ وہ جو باتیں کہتے ہیں، کیا اس کا سبب ان کے جھوٹے خواب ہیں۔ جو یہ باتیں کہتے ہیں یا بلاوجہ سرکشی سے کام لیتے ہے؟

---

[1] ۔ لكنّك رَسُوْل الله وَالله لا يخذلك لكنه ينصرك (ابن جریر)

[2] ۔ گویا منظور خیالات است زیر خوابہای پریشان نیزیك نوع خیال اند (قاموس قرآن)

میرے نزدیک یہ معنی اس محل پر بعید ہیں۔

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلۡ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۳﴾ فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۴﴾

''یا وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اسے گڑھ لیا ہے؟ بلکہ وہ ایمان لانے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں تو پھر وہ ایسا ہی کلام لے آئیں، اگر وہ سچے ہیں''

قرآن کا مثل لانے کی دعوت

اسے گڑھ لیا ہے'' یعنی قرآن کو یہ ویسی ہی تحدی یعنی دعوائے بے مثالی اور جواب لانے کی دعوت کے مطالبہ کی آیت ہے جیسی قرآن مجید میں پورے قرآن اور اس کے دس (۱۰) سوروں اور آخر میں ایک سورے کے جواب کا مطالبہ برابر ہوتا رہا اور دنیا اس کے جواب سے قاصر رہی۔

اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَيۡرِ شَىۡءٍ اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾ اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ بَلۡ لَّا يُوۡقِنُوۡنَ ﴿۳۶﴾

''کیا وہ خود بخود پیدا ہوئے ہیں یا وہ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ یا انہوں نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے''۔

من غیر شیءٍ کے لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ بغیر کسی چیز کے مگر بظاہر مطلب اس کا یہ ہے کہ ''بغیر کسی مبدا کے'' اس لیے ہم نے ترجمہ کیا ''خود بخود''۔ بعض لوگوں نے اس کی تشریح میں کہا ہے ''بغیر کسی ماں باپ کے''[1] مگر نہ وہ ''ماں باپ'' منکر تھے نہ قرآن کی کوئی مہم ہے کہ وہ ماں باپ کے وجود کا اقرار کرائے، جس چیز کے وہ منکر ہو سکتے ہیں اور جو قرآن میں ایمان کی پہلی بنیاد ہے، وہ مبدا اول کا اقرار ہے کہ کوئی ان کا پیدا کرنے والا ہے لہٰذا ضمیر کو بیدار کرنے والے انداز میں یہاں جو سوال ہے وہ اسی سے متعلق ہے اسی سے دوسرے جز کا جوڑ ہے کہ ''وہ خود بخود پیدا ہوئے ہیں'' یعنی کوئی ان کا خالق ہے ہی نہیں یا وہ خود اپنے خالق ہیں؟ عقلی حیثیت سے دونوں ہی باطل ہیں۔

بعض نے من غیر شیءٍ کے معنی قرار دیے ہیں ''بغیر کسی وجہ کے'' یعنی بے کار اور عبث اسے جناب شیخ طوسیؒ نے نقل کیا ہے اور علامہ طبرسی کا مختار یہی معلوم ہوتا ہے[2] مجھے اس مناسبت دوسرے جملوں سے اتنی محسوس نہیں ہوتی جتنی پہلے والے مفہوم کی۔ سب سے آخر جملہ بَلۡ لَّا يُوۡقِنُوۡنَ کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں ان کے دل و دماغ کو تو کسی پیدا کرنے والے کے وجود کا یقین ہے مگر وہ بطور فعل ارادی کے یقین نہیں کرتے یعنی جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں جسے ''کفر جحود'' کہتے ہیں۔ دوسرا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ وہ غور فکر اور تحقیق و تفتیش نہیں کرتے تا کہ

---

[1] ۔ای من غیر اباءٍ ولا امهات (ابن جریر)

[2] ۔لغیر شیٍ ای خلقوا باطلا یحاسبون والا یومنون ولا ینهون (مجمع البیان)

انہیں یقین حاصل ہو تو چونکہ یقین کی کیفیت پیدا ہونے میں ان کی ارادی کوتاہی کا دخل ہے، اس لیے وہ مورد الزام اور مستحق سزا ہیں۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

''یا ان کے پاس آپ کے پروردگار کے خزانے ہیں یا یہی پورے اقتدار کے مالک ہیں''۔

اللہ مرکز امید بھی ہے اور مرکز خوف بھی ہے۔ یہ کفار اللہ سے بالکل بے نیاز بنے ہوئے ہیں۔ نہ یہ اس سے کوئی آسرا وابستہ کرتے ہیں، نہ اس سے کوئی دھڑکا محسوس کرتے ہیں، اس لیے ان میں کوئی تحریک اس کی طرف رجوع کی پیدا نہیں ہوتی۔ تو بظاہر انہی دونوں محرکات کے مقابلے میں یہ دونوں جملے ہیں یعنی تمام اسباب اور آرام اور آسائش کے وسائل ان کے پاس ہیں لہٰذا وہ اللہ کے کسی بات میں محتاج نہیں۔

اس لیے وہ اسے اپنے لیے مرکز امید نہیں بناتے یا کیا وہ پورے اقتدار کے مالک ہیں۔ اسلیے اس کے غضب سے ان کو کوئی خوف معلوم نہیں ہوتا، ظاہر ہے کہ دونوں باتیں غلط ہے لہٰذا ان کی یہ بے نیازی اور بے خوفی دونوں خلاف عقل ہیں۔

اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾

''کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس سے وہ (آسمانی رازوں کو) سن لیتے ہوں تو جو ان میں سے ایسا ہو، وہ کھلی ہوئی دلیل پیش کرے''

یعنی رسول تو جو دعوت دیتے ہیں، وہ آسمانی پیغام کی بنا پر اور اس کے ثبوت میں معجزات پیش کرتے ہیں۔ یہ جو انکار کرتے ہیں وہ کس بنا پر ہے؟ کیا ان میں بھی کوئی ایسا ہے جو وہاں کی باتیں جا کر سنتا ہو تو آخر ہمیں بھی بتاؤ اور اس کا ثبوت پیش کرو۔

اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۳۹﴾

''کیا اس کے لیے مخصوص طور پر بیٹیاں ہیں اور تمہارے لیے مخصوص طور پر بیٹے ہیں''۔

یہ مشرکین کے اس مزعومہ کی رد ہے جس کی رد کئی طرح قرآن مجید میں آتی رہی ہے کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔

پہلے آچکا ہے کہ یہ بات ہر طرح بے بنیاد ہے، اول تو انہیں کس نے بتایا کہ ملائکہ صنف اناث سے ہیں۔ پھر مطلق اولاد چاہے بیٹا ہو، اور چاہے بیٹی اللہ کی شان الوہیت کے خلاف ہے۔ پھر یہ کہ یہ خود اپنے لیے بیٹیوں کو ناپسند کرتے ہیں.....تو یہ عجیب تصور ہے کہ ان کے لیے تو بیٹے پسندیدہ ہیں اور اللہ کے لیے بیٹیاں جو انہیں ناپسند ہیں۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۰﴾

''یا آپ ان سے کوئی معاوضہ مانگتے ہیں تو وہ ایک بڑے مالی نقصان سے گراں بار ہیں''

یعنی انکی مخالفت اور ناگواری کا کیا سبب ہے؟ تو ایسا بھی نہیں ہے، آپ جو ان کی اصلاح و ہدایت میں جان کھپا رہے ہیں تو ان سے کسی معاوضہ کے طلب گار نہیں ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ رسول کو مشرکین کے مقابلے میں ہمیشہ یہی کہنے کی ہدایت ہوئی ہے اور آپ کا یہی قول رہا ہے کہ ہم تم سے کسی معاوضہ کے طلب گار نہیں ہیں۔ معاوضہ جو طلب کیا گیا ہے (قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى..... شوریٰ۔ ۲۳) وہ ان سے جو آپ کی رسالت کو تسلیم کر کے باقرار خود مؤمنین میں داخل ہو گئے اور انہیں پھر دوسری جگہ بتایا گیا کہ وہ

معاوضہ جو میں نے تم سے مانگا ہے، اور اپنے فائدے کے لیے نہیں، تمہارے ہی فائدے کے لئے ہے (مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ..... سبا۔ ۴۷) اور دوسری جگہ اس فائدے کی تشریح کر دی گئی کہ وہ تمہیں اللہ تک پہنچانے کا وسیلہ ہے (اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا...الفرقان۔ ۵۷)

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۱﴾

''یا خود ان کے پاس غیب کا علم ہے تو وہ اسے قلم بند کرتے ہیں''؟

کیا یہ بات ہے اس وجہ سے وہ آپ کی باتوں کو غور سے سنتے نہیں کہ انہیں ضرورت نہیں ہے؟

اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ؕ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾

''یا یہ لوگ کوئی داؤ چلنا چاہتے ہیں، تو جو لوگ کافر ہیں وہ خود اپنے داؤ میں (پھنستے) ہیں''۔

''یا ان کے لیے (سچ مچ) اللہ کے سوا کوئی اور خدا ہے؟ پاک ہے اللہ کی ذات اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں''۔

شروع سے آخر تک یہ جتنے سوالات ہیں، سب انکاری حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی ایسا بھی نہیں ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے..... یہ سب باتیں غلط ہیں

وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿۴۴﴾

''اور اگر وہ آسماں کا ایک ٹکڑا گرتے دیکھیں تو وہ کہیں گے یہ ابر ہے جو تہہ بتہہ کر دیا گیا ہے''۔

یعنی وہ اندیشہ ہائے عذاب سے بالکل مطمئن ہیں، یہاں تک کہ عذاب آتے ہوئے دیکھیں تو انہیں امیدوں کے سبز باغ ہی لہلہاتے نظر آئینگے۔ جامع البیان طبری میں اس کا ربط اس آیت سے قائم کیا گیا ہے جو موجودہ ترتیب کے لحاظ سے بہت دور پر یعنی ستر ہویں سورے (یعنی بنی اسرائیل) میں ہے کہ مشرکین کہتے ہیں کہ اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ یہ نہ ہو جائے۔ یہ نہ ہو جائے اسی میں ہے۔ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا ، یا جیسا کہ آپ کا خیال ہے آسمان کو ہم پر ٹکڑے ٹکڑے اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (اسراء۔ ۹۲) کر کے گرا دیجیے۔ یا خدا اور فرشتوں کو گواہی میں لا کر کھڑا کیجیے۔ ایک قدیم مفسر ابن زید ہیں، انہوں نے ایک دوسری آیت یاد دلائی ہے کہ مشرکین نے کہا: فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (شعراء۔ ۱۸۷) ہم پر آسماں کے کچھ ٹکڑے گرا دیجیے، اگر آپ سچے ہیں۔ اس آیت میں خالق کا ارشاد ہے کہ یہ سب ہو بھی جائے تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے، آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی حقیقت کا انکار ہی کریں گے اور کہیں گے یہ تو ابر ہے جو تہہ بتہہ ہو کر گرا پڑا ہے۔

فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿۴۵﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۶﴾

''تو چھوڑ دو انہیں، یہاں تک کہ سامنا ہو انہیں، اس دن کا جس میں وہ بے حس وحرکت ہو کر گر جائیں گے، جس دن ان کی منصوبہ سازی انہیں کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے گی اور نہ ان کو مدد ملے گی''

صعق اصل میں آسمانی دھماکے یا کڑاکے کو کہتے ہیں، گرتی ہوئی بجلی میں چونکہ یہ کڑک شدت کے ساتھ ہوتی ہے اس لیے اسے بھی صاعقہ کہتے ہیں اور اس کڑک کے اثر سے غش آجائے جیسے حضرت موسیٰ کو آیا تھا تو وہاں بھی یہ لفظ صرف کی گئی ہے (فخر موسیٰ صعقا) اور جو اس سے زیادہ درجہ کڑاکے کا ہو کہ ہلاکت ہو جائے، وہاں بھی جیسے وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ...زمر ـ ٦٨) ..... یہاں فیہ یصعقون میں بے حس وحرکت ہونے کا بظاہر یہی درجہ مراد ہے کہ نفخ صور سے سب بے جان ہو کر گر جائیں گے۔ وہی وہ دن ہوگا، جب ان کی منصوبہ سازی اور ترکیبیں کچھ نہ چل سکیں گی۔

وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٧﴾

اور یقیناً ان کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ہے، اس کے پہلے بھی ایک بڑا عذاب ہے لیکن ان میں سے زیادہ جانتے نہیں''۔

قیامت کے پہلے ''کون عذاب ہے''؟ اس کے لیے ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر بتاتی ہے کہ یہ رجعت کے دور سے متعلق ہے [1] جو رجعت کے قائل نہیں ہیں ان کے لیے پہلی ہی نظر میں یہ سمجھنا آسان ہے کہ اس سے عالم برزخ والا عذاب مراد ہے جسے ''عذاب قبر'' کہتے ہیں .....زیادہ تر قدیم تشریحات جن میں تین طرق سے جناب ابن عباسؓ کا قول نقل ہوا ہے اس کے موفق ہیں اور اسی کو طبری نے خود ترجیح دی ہے کہ عذاب کافی ہے، پہلے جو بالکل اس سے متصل ہے وہ یہی عذاب قبر ہے اور یوں اس کے علاوہ دو قول نقل کئے ہیں، ایک مجاہد کا ہے کہ اس سے بھوک مراد ہے اور دوسرا ابن زید کا ہے کہ اس سے دنیوی مصائب اموال اور اولاد کا تلف ہونا مراد ہے۔ یہ مصائب اگرچہ مومنین کو بھی پیش آتے ہیں مگر ان کے لیے وہ رحمت ہوتے ہیں کہ بسا اوقات اس سے ان کے کچھ گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے تو ان مصائب کا فائدہ ہوتا ہے اس دنیا سے پاک وصاف ہو جاتے ہیں اور کبھی ان مصائب پر جو صبر وہ کرتے ہیں، وہ آخرت میں ان کے ارتفاع درجات کا سبب ہوتا ہے۔

لیکن عذاب آخرت سے قریبی اتصال ہونے کی وجہ سے عذاب قبر ہی مرجح معلوم ہوتا ہے۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿٤٨﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿٤٩﴾

''اور اپنے پروردگار کے فیصلے کے لئے ضبط وصبر سے کام لیجیے کہ آپ ہماری نگہبانی میں ہیں اور اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے جب کھڑے ہوں اور رات کے کچھ حصے میں اور ستاروں کے آسمان سے پیٹھ پھرانے کے بعد''۔

''فیصلے کے لیے ضبط وصبر سے کام لیجیے'' اس کی دوسری تعبیر انتظار ہے جس کے ساتھ راغب اصفہانی نے اس آیت کی تشریح کی ہے۔

---

[1] ۔ عذاب رجعته بالسيف (علی ابن ابرهيم)

حمد کے ساتھ کا جو حکم ہے اس کے لیے اہل سنت میں ایک قدیم قول عوف بن مالک کا ہے کہ جب بھی سو کر اٹھیں تو یہ وظیفہ سکھایا گیا ہے کہ کہیں: سبحانك اللهم وبحمدك۔

حافظ ابن جریر طبری جو مفسر ہی نہیں بلکہ فقہٴ اہل سنت میں یہ درجہ رکھتے تھے کہ ابوحنیفہ، شافعی مالک اور احمد بن حنبل کی فقہوں سے آزاد ہو کر ایک مستقل فقہی مسلک رکھتے تھے، انہوں نے اس قول کو رد کیا ہے کہ اس وظیفہ کو رد کیا ہے اس وظیفہ کا پڑھنا نہ سو کر اٹھنے کے وقت وارد ہے اور نہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے وقت اس وظیفہ کا حکم ہے اور خود اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ یہ قرآن نے اپنے انداز میں نماز پنجگانہ کے اوقات بتائے ہیں اور کھڑے ہونے سے مراد دوپہر کے سونے کے بعد جسے قیلولہ کہتے ہیں اٹھنا مراد ہے اور اس وقت جو تسبیح پڑھنے کا حکم ہے وہ نماز ظہر اور رات کے کچھ حصے میں یہ مغرب اور عشا ہیں اور ستاروں کے آسمان سے رخصت ہونے کے وقت، یہ نماز صبح ہے۔ اس میں ذرا سی کمی جو ہے کہ عصر کا نام نہیں آتا، وہ یوں ہی دور ہوگی کہ جیسے رات کے ایک حصے میں جو حکم ہے اس میں مغرب عشاء دونوں یعنی مغربین، انھوں نے بتائی ہے اسی طرح دوپہر کے سونے کے بعد اٹھ کر جو فقط ظہر کا نام ہے، اس کے ساتھ عصر کو بھی منضم کیا جائے جس کے معنی ہوئے ظہرین اور اس کے طرح یہ آیت بھی مثل دوسری آیت کے جن میں نماز کے اوقات کی طرف اشارہ ہے اور ہم ہر جگہ اس پہلو کو نمایاں کرتے رہے ہیں۔ پانچ نمازوں کے لیے وقت تین ہی بتا رہی ہے۔ ایک ظہرین، دوسرے مغربین اور تیسرے صبح جو فقہ ائمہؑ کے مطابق ہے پانچ وقت الگ الگ قرآن میں کہیں بیان نہیں کیے گئے ہیں۔

یہ اس صورت میں ہے جب ان آیات کے مضمون کو فرائض پنج گانہ سے متعلق سمجھا جائے جو نفس الفاظ آیات کے لحاظ سے بعید نہیں ہے مگر ائمہ معصومینؑ کے احادیث جنہیں طبرسیؒ نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے۔ ان آیتوں کو نوافل اور بالخصوص نماز شب اور نافلہ صبح سے متعلق قرار دیتے ہیں جس کے بعد واجب نمازوں سے ان کا تعلق نہیں رہتا۔

سُوْرَةُ النَّجْمِ

مکّیہ.....۶۲.....آیات

چونکہ اس سورے کا آغاز النجم (ستارے کی قسم) سے ہے، اس لیے یہی اس کا نام ہوا۔

سورۂ نجم کے خاص خاص مضامین:

۱.....پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عملی وقولی عصمت۔

۲.....تذکرۂ معراج۔

۳.....دو کمان بلکہ اس سے کم۔

۴.....اس وحی کا اجمالی ذکر جس کی تفصیل قرآن میں نہیں ہے۔

۵.....جبرئیل کا سدرۃ المنتہیٰ پر رہ جانا اور پھر واپسی میں ان سے ملاقات ہونا۔

۶.....مشرکین کے اس مزعومۂ باطل کی رد کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔

۷.....عدم حجیت ظن

۸.....گناہان کبیرہ وصغیرہ میں تفریق۔

۹.....کوئی ایک دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا

۱۰.....نتائج کا انحصار سعی وکوشش پر

یہ سورہ عزائم، یعنی اس سوروں میں جن میں سجدہ واجب ہے موجودہ ترتیب قرآن کے لحاظ سے تیسرا سورہ ہے جس کی بالکل آخری آیت کی آخری لفظ پر پڑھنے اور سننے والے پر سجدہ واجب ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ﴿۲﴾ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ؕ﴿۳﴾
اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ﴿۴﴾

''قسم ہے ستارے کی جب وہ جھکے، نہ تمہارا ساتھی (پیغمبر) گمراہ ہوا ہے اور نہ وہ بہکا، بھٹکا ہے اور وہ نفسانی خواہشوں سے بات نہیں کرتا، نہیں ہوتی وہ مگر وحی جو بھیجی جاتی ہے''

نجم کے معنی جو عام طور پر ذہن میں آتے ہیں ستارے کے ہیں اور الف لام اس پر ''عہد'' کا آنے سے جو فرد خاص کی طرف اشارہ کیے ہوئے ہوتا ہے اس سے خاص ستارہ مراد ہوسکتا ہے؟ اور عموما کلام عرب میں النجم ستارۂ ثریا کے لیے آتا ہے جو قریب صبح غروب ہوتا ہے اور اس طرح اس کا غروب طلوع صبح کی علامت ہوتا ہے، ہوسکتا ہے اس لحاظ سے اُس کی قسم کھائی گئی ہو۔

بعض نے اس کی تشریح قرآن کے ساتھ کی ہے مگر قرآن کے لیے یہ تو ہے کہ وہ نجوما یعنی رفتہ رفتہ اترا جو حقیقت واقعہ ہے لیکن اس کا نام النجم لغت کے لحاظ سے ذہن میں نہیں آتا نہ قرآن میں اس کا کسی جگہ یہ نام ملتا ہے، اس لیے طبری نے بھی پہلے ہی مفہوم کو ترجیح دی ہے [1] جو سند متصل کے ساتھ ابن عباس سے منقول ہے۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت عملی وقولی

''تمہارا ساتھی گمراہ نہیں ہوا ہے، اور نہ بہکا، بھٹکا ہے'' ان الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح کی بات پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کہی گئی تھی جس کی یہ رد کی جارہی ہے،

ہمارے یہاں اس طرح کے مضمون آئے ہیں کہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اہل بیتؑ کے فضائل میں جو احادیث ارشاد فرماتے تھے تو ان کے لیے منافقین کہتے تھے کہ یہ اپنے قرابت داروں کی محبت میں (معاذ اللہ) گمراہ ہوگئے ہیں، اُس پر قرآن کے یہ آیات اترے ہیں ان روایات کو ملا محسن فیض نے تفسیر صافی میں درج کیا ہے۔

''وہ خواہش نفس سے باتیں نہیں کرتے، وہ ہی کہتے ہیں جو ان پر وحی ہوتی ہے''

اس میں قرآن مجید کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ الفاظ قرآن آپ کے مطابق نطق یعنی ''بات کرنے'' سے متعلق ہیں جس میں آپ کے وہ ارشادات بھی داخل ہیں جو ''احادیث'' کہلاتے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ قرآن وحی لفظی کے طور پر نازل ہوا ہے اور آپ کے احادیث وحی معنوی کے طور پر مرضی الٰہی کے مطابق ہیں اور اس طرح یہ آیت حضرتؐ کی عصمت قولی کا ثبوت ہے۔ چونکہ مکیّہ سورہ ہے اس لیے عام طور پر مخاطب مشرکین کو سمجھا گیا ہے لیکن اگر مخاطب مشرکین ہو تو بھی ہم تو اس کو کلام الٰہی مانتے ہیں لہٰذا یہ ارشاد کہ ''وہ گمراہ نہیں ہیں اور نہ بہکتے ہیں'' ہمارے نزدیک قیامت تک کے مسلمانوں کے سامنے آپ کی عصمت عملی کی خالق کی طرف سے سند ہے کہ آپ کسی قسم کی بھی عملی وقولی غلطی سے بری ہیں۔ اب کوئی مسلمان ہوکر بھی کسی وقت کسی حالت میں بھی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ سمجھے کہ بہک کر یا بھٹک کر کوئی کام کر رہے ہیں تو وہ خالق کے اعلان کو جھٹلانے والا ہوگا۔ اسی طرح آپ کی کسی قول کو کسی نفسانی جذبے پر مبنی قرار دینا قرآنی اعلان سے انحراف ہوگا۔

ایک دوسرا رخ دونوں آیتوں میں باہمی ربط کا یہ ہے کہ حقیقت کے خلاف جو بات ہوتی ہے اس کے دو سبب ہوتے ہیں۔ یا نادانستہ نیز

---

[1] ۔ الصواب من القول فی ذالك عندی ما قاله مجاهد من انه عنیٰ بالنجم فی هذا المرضع الثریا (ابن جریر)

فکر کے نشانہ حقیقت سے اچٹنے اور رفتار قدم کے بہک کر ہٹنے کی وجہ سے یا کسی نفسانی جذبے سے مغلوب ہو کر دانستہ حقیقت کے خلاف راستے پر گفتار یا کردار سے چلنے کی وجہ سے پہلے جملے میں پہلی قسم کی کجروی کی نفی کی گئی ہے۔ اور دوسرے جملے سے دوسرے قسم کے غلطی کی نفی ہے کہ یہ نفسانی خواہش سے کلام نہیں کرتے۔

اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اب آپ اپنی خداداد عقل اور بصیرت سے کام نہیں لیتے تھے جیسا کہ بعض لوگوں نے توہم کیا ہے بلکہ اس میں اس عقل بصیرت کے نتیجے کے لازمی طور پر صحیح ہونے کی توثیق اور آپ کی عصمت ذہنی کی بھی تصدیق ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝۵ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۝۶ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝۷ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝۸ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝۹ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ۝۱۰

''اسے سکھایا پڑھایا بڑی مضبوط طاقتوں والے صاحب قدرت نے، تو ٹھہرے وہ اور وہ اطراف آسمان کے بلند ترین نقطے پر، پھر زیادہ قریب ہوئے اور زیادہ قریب ہوئے تو وہ تھے دو کمان یا اس سے کمتر کے فاصلے پر یا اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کر دی جو اسے وحی کرنا تھی''۔

ان آیات میں سلسلہ کلام پہونچ گیا ہے معراج کے ذکر کے آغاز کی طرف ایک خود معراج عام انسان کے ذہن کی سطح سے بہت اونچی ہے اور پھر قرآن میں اس کا تذکرہ ہے تو وہ بھی ضمیروں کے ساتھ اس لیے ضمیروں کی تعین میں اور جو اسم مظہر ہے اس کے مصداق میں مفسرین سرگردان نظر آتے ہیں۔

''مظبوط طاقتوں والے صاحب قوت'' سے مراد عام طور پر جبرئیل امینؑ سمجھے گئے ہیں مگر ان کی طرف معلم رسول اکرم ہونے کی نسبت سے ذہن میں خلش پیدا ہوتی ہے۔ ہاں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ واسطہ فی التعلیم ہونے کی بنا پر ان کی جانب تعلیم کی نسبت دی گئی ہے۔ اس کے بعد جو دنا فتدلیٰ ہے تو اس کا مطلب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جبرائیل اور حضرتؐ اس نقطے تک پہونچے جسے ''اُفق الاعلیٰ'' کہا گیا ہے اور پھر حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے بھی آگے بڑھے یہاں تک کہ مرکز جلال الٰہی سے اتنے متصل ہوئے جسے محسوسات کے دائرے میں لا کر سمجھانے کی خاطر دو کمان یا اس سے کم کہا گیا ہے اور یہ ''یا'' کا لفظ اظہار تردد اور شک کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ ''بلکہ'' کے معنی میں ہے تاکہ قرب رسولؐ دو کمان میں محدود نہ ہو جائے۔ بلکہ اس سے کمتر اور ''کمتر'' کی کوئی حد نہیں بتائی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سننے والا فہم و خیال و تصور میں جتنا چاہئے آگے بڑھ جائے بس ممکن ممکن رہے اور واجب واجب۔ مخلوق مخلوق رہے اور خالق خالق۔ اب قریب ہونے کے لفظ سے جب اس مرکز جلال خداوندی کا تصور ہو گیا تو یہ ضمیر اس کی طرف ہے کہ ''اسنے اپنے بندے پر وحی کی جو اسے کرنا تھی'' اب اس وحی کا اجمالی تذکرہ قرآن میں ہے لیکن تفصیل نہیں ہے کہ وہ کیا وحی تھی؟ اس سے ظاہر ہے کہ تمام وحی قرآن میں منحصر نہیں ہے بلکہ بعض وحی ایسی ہے جو قرآن میں مندرج نہیں ہے لہٰذا ''اہل قرآن'' یعنی ''پرویزی جماعت'' کا یہ تصور کہ وحی قرآن میں منحصر ہے، از روئے قرآن درست نہیں ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝۱۱ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝۱۲

''ان کے دل نے دھوکا نہیں کھایا اُس میں جسے انہوں نے دیکھا تو کیا تم ان سے بحث کرو گے اس میں جسے انہوں

نے خود دیکھا''۔

چونکہ عام قرائت جس کے مطابق قرآن میں اعراب لگے ہیں وہ ''کَذَبَ (بغیر تشدید) ہے اس صورت میں مفہوم یہی ہوگا جو ہمارے ترجمے میں ہے اور بعض اہل قلم اس سے متفق ہیں[1]

دوسرے بعض لوگوں نے غیر متداول ایک قرأت کی بنا پر جس میں ''کذّب (تشدید کے ساتھ) ہے، یہ معنی قرار دیے ہیں کہ دل نے جھٹلایا نہیں جسے انہوں نے دیکھا[2] اب جو خدا کے دیدار کو درست سمجھتے ہیں، وہ اسے خود اللہ سبحانہ کے دیکھنے کے معنی میں قرار دے لیتے ہیں جسکے لیے انھیں اپنے راویوں کی روایتیں بھی مل جاتی ہیں لیکن ہم جو اس حقیقت پر ایمان لائے ہوئے ہیں کہ رویت صفات جسم سے ہے اور اللہ جسم سے ہے اور اللہ جسم جسمانیات سے بری ہے لہٰذا اُس کی رویت ممکن نہیں ہے یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ یہ دیدار خداوند عالم کی ذات سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ آیات یعنی قدرت کی خاص نشانیوں سے متعلق ہے جو معراج میں آپ کی آنکھوں کے سامنے آئیں۔

کچھ روایات میں اس سے مراد لیا گیا ہے جبرئیل امینؑ کو دیکھنا مگر یوں جبرئیل کو دیکھنا تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ تو روئے زمین پر حضرت کے پاس آتے رہتے تھے تو کہا جاتا ہے کہ وہ تو کسی دوسری مانوس شکل میں جیسے وحیہ کلبی وغیرہ کی صورت میں آتے تھے۔ معراج میں وہ اپنی اصل شکل میں نظر آئے جس میں ان کے چھ سو (۶۰۰) پر تھے۔ کچھ روایتیں اس سلسلے کی ہمارے بعض مفسرین نے درج کر دی ہیں جو صحیح و مستند نہیں ہیں۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾

''اور ضرور بالضرور انہوں نے انہیں دیکھا دوسری دفعہ کے اترنے میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جس کے پاس بہشت بریں ہے جب کہ سدرہ پر چھا رہا تھا وہ (نور) جو چھا رہا تھا، نہ نظر چوکی اور نہ آگے بڑھی۔ اس نے اپنے پروردگار کی نشانیوں میں سے بڑی سے بڑی دیکھیں''۔

اب یہ ضمیر جیسا کہ بعد میں ہم مزید تشریح کریں گے جبرئیل امینؑ کی طرف راجع ہے جن کا ذکر سب سے پہلے ہوا تھا، اس کا مطلب عموماً یہ لیا جاتا ہے کہ اصل شکل میں انہیں پہلے دیکھا تھا، اُسی طرح پھر دوبارہ اُن کی اصلی شکل میں اُنہیں دیکھا اس خاص محل رفیع میں جسے ''سدرۃ المنتہیٰ'' کہا جاتا ہے اور وہیں بہشت بریں ہے اور یہاں ایک خاص نور تھا جو اس سدرے پر چھا رہا تھا۔

اور پھر زور دیا جاتا ہے کہ نگاہ ان کی چونکی نہیں کہ جو دیکھنے کی چیزیں ہیں، وہ نہ دیکھیں اور نہ وہ نگاہ حد سے آگے بڑھی کہ جتنا دیکھا تھا اس سے آگے بڑھکر اس عین ذات کے دیکھنے کی کوشش ہو جو دیکھنے کی نہیں ہے اور خدا کی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں تھیں جو اس سفر معراج

---

[1] ۔قلب خطانه کرد در آنچه دید (قاموس قرآن)

[2] ۔ما کذب فؤاد محمد، محمدا الذی رای ولا کنه صدقه (ابن جریر)

میں انہیں نظر آئیں۔

یہ وہ مطلب ہے جو خود الفاظ قرآن سے ہماری سمجھ میں آتا ہے۔اب اس کے بعد جامع البیان طبری کی طرف ہم رجوع کرتے ہیں تو اس میں کئی روایتیں جناب ام المومنین حضرت عائشہ سے ہیں جن میں انہوں نے شدت سے اس کی رد کی ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کا دیدار ہوا اور انہوں نے اس پر استدلال کیا ہے قرآن کیا آیت سے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۖ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۔(زمر۔۱۰۳) نگاہیں اسے پا نہیں سکتیں اور وہ تمام نگاہوں پر حاوی ہے'' جس سے علمائے شیعہ نفی رویت پر استدلال کرتے ہیں اور جس کے بعد مسلمانوں کی اکثریت کو جو اپنے کتب صحاح کی بنا پر قیامت میں انتظار ہے، وہ بھی غلط ثابت ہوتا ہے اس لیے کہ آیت قرآن نے عمومی طور پر نگاہوں سے اس کے پانے کی نفی کی ہے۔اس میں دنیا اور آخرت کی قید نہیں ہے۔

اس منزل پر ہم مجبور ہیں کہ آیات کے ذیل میں علامہ سید محمد حسین طباطبائی سے اختلاف کریں جنہوں نے اپنی تفسیر ''المیزان'' میں فریقین کی کچھ حدیثوں کی بنا پر جنہیں ہم معتبر نہیں سمجھتے یہ راہ کی ضمیر خدا کی طرف راجع کر دی ہے اور کہہ دیا ہے کہ حضرتؐ نے اللہ کو دو دفعہ دیکھا۔ایک دفعہ جانے میں اور دوسری دفعہ آنے میں مگر موصوف نے نفی رویت پر اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے کے لیے کہہ دیا ہے کہ آپ نے اللہ کو دل کی آنکھوں سے دیکھا۔نہ کہ کاسۂ سر کی آنکھوں سے مگر ہمارا تصور یہ ہے دل کی آنکھوں سے تو آپ اپنی زندگی کی ہر لمحۂ حیات میں اُسے دیکھتے رہے جبکہ ان کے وصی امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے جب کسی نے پوچھا: هل رأيت ربك ''کیا آپ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے''؟ تو آپ نے خاص بلیغانہ انداز میں پہلے تو اس کو اس کے لیے حیران کن جواب دے دیا کہ ''كيف اعبد من لم ارہ'' بھلا میں عبادت کیوں کروں گا اس کی جسے دیکھا نہیں'' اور پھر اس کی حیرت کو دور کرنے کے لیے تشریح فرمائی کہ: لاتراہ العیون بالابصار ولکن تراہ القلوب بحقائق الایمان ''اس سے آنکھیں ان نگاہوں سے نہیں دیکھتیں مگر اسے دل ایمان کی حقیقتوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

حضرت علیؑ تو عمر بھر اسے اپنے دل کی گہرائیوں سے دیکھتے رہے ان سے جو بالاتر ذات ہے یعنی حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، انہوں نے بس اسے معراج میں جا کر دو دفعہ (۲) دل کی نگاہوں سے دیکھا؟ یہ تصور ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔

بہرحال اسے جناب جبرئیل امین سے متعلق کرنے کے بعد ایک تصور یہ ہے کہ اس کا ربط ما كذب الفؤاد ما رأى سے ہے۔ان کے دل نے دھوکا نہیں کھایا اُس میں جسے انہوں نے دیکھا ''اُس سے مراد وہی حضرت جبرئیل امینؑ لیے جاتے ہیں جنہیں اس وقت چھ سو پروں کے ساتھ دیکھا تھا اور دوبارہ پھر یوں ہی دیکھا مگر ہم کہتے ہیں کہ اس کا ربط فاستوى وهو بالافق الاعلىٰ کے ساتھ کیوں نہ لیا جائے کہ جبرئیل امینؑ اور آپؐ وہاں ٹھہرے جو افق الاعلیٰ ہے یعنی اطراف آسمان کا بلند ترین نقطہ اور جبرئیلؑ وہیں رہ گئے اور آپ اس کے آگے پہنچے جو، قاب قوسین او ادنیٰ کا نقطہ تھا اور وہاں وحی ہوئی جو بغیر توسط جبرئیلؑ تھا جس کی خبر فرشتے کو بھی نہ ہوئی اور اب جب آپ واپس ہوئے تو دوسری مرتبہ جبرئیل امینؑ کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا اور اب یہاں سے پھر جبرئیلؑ آپ کے ہمرکاب ہوئے جس کے ذکر کو قرآن مجید نے ضروری نہیں سمجھا کہ یہ سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے اس کے معنی یہ ہے کہ وہ آخری آسمان پر جس کے آگے آسمان کوئی نہیں وہ جناب جبرئیل کی آخری حد ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد کا نقطہ وہ ہے جو اصطلاح مذہب میں عرش کہلاتا ہے.....اس کا بلند ترین نقطہ وہ قاب قوسین والا تھا جہاں رسولؐ پہنچے اور چونکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ واپسی میں دوبارہ جناب جبرئیلؑ کو دیکھا تو درمیان کے اس جزء کو کہ دل نے دھوکہ نہیں کھایا اس میں کہ

جسے انہوں نے دیکھا ان آیتوں سے متعلق سمجھا جا سکتا ہے جو سدرۃ المنتہیٰ اور نزل قاب قوسین کے درمیان میں تھی جس کے لیے بعد میں ہے کہ اپنے پروردگار کی آیتوں میں سے جو بڑی سے بڑی تھیں، انہیں دیکھا۔ اس میں جناب جبرئیلؑ کی کسی شکل خاص کا تذکرہ نہیں ہے۔

اس صورت میں یہ آیت اس حدیث کے مطابق ہوگی کہ سدرۃ المنتہیٰ کے قریب پہونچ کر جناب جبرئیلؑ رک گئے کہ اب آگے جانے کا میرے لیے امکان نہیں ہے اور جب وہ وہاں رکے رہے یہاں تک کہ حضرتؐ واپس تشریف لائے اور دوبارہ انہیں وہاں دیکھا۔[1]

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿١٩﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿٢٠﴾ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿٢١﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿٢٢﴾

''کیا تم نے دیکھا ہے لات اور عزی اور آخر والے تیسرے منات کو، کیا تمہارے لیے لڑکے ہیں اور اس کے لیے لڑکیاں، یہ تو اس صورت میں ایک غیر منصفانہ فیصلہ ہے''۔

لات اور عزیٰ اور منات سب مشرکین کے اصنام ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے منات کو عزیٰ کہنا ہو سکتا ہے کہ مرتبے کے لحاظ سے وہ خود ان کے نزدیک بھی لات اور عزٰی کا ہم رتبہ نہیں تھا[2] ''کیا تم نے دیکھا ہے'' مطلب یہ ہے کہ اگر تم غور سے انہیں دیکھو تو وہ خود تمہاری سمجھ میں آجائے کہ یہ ''بے جان'' بے بس، بے شعور اور خود تمہارے بنائے ہوئے بت ہرگز الوہیّت کے لائق اور عبادت مستحق نہیں ہیں۔

اس کے بعد جو لڑکے اور لڑکی کا ذکر ہے تو دوسرے مقامات پر تو یہ مشرکین کے اس مزعومے کے سلسلے میں آیا ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا کی لڑکیاں کہتے تھے مگر یہاں بتوں کا ذکر کے بعد آیا ہے اور یہاں سلسلۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بتوں کو بھی اللہ کی لڑکیاں قرار دیتے تھے۔ اور پھر اُس کے بعد فرشتوں کا ذکر آئے گا۔ یہ اسی بنا پر ہو سکتا ہے کہ وہ ان بتوں کے متعلق خیال کرتے تھے کہ یہ کچھ فرشتوں کی شبیہیں ہیں اور چونکہ فرشتوں کو وہ خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اس لیے وہ انہیں خدا کی بیٹیاں کہتے تھے[3] وہ چونکہ ان بتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اس لیے انہوں نے ان کے نام اللہ کے ناموں سے مشتق کر کے رکھے تھے۔[4]

ایک قدیم ماخذ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لات اور منات دونوں کو عزی کی بیٹیاں سمجھتے تھے۔ وہ ماخذ یہ ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل نے جب مسلمان ہوا تو یہ اشعار کہے:

عزلت اللّات و لعزّى جميعا
كذٰلك يفعل الجلد الصّبور
بلا العزّى ادين و لا ابنتيها

---

[1] ۔فی العلل عنه لما بلغ السدرة وقف جبرئيل دونها وقال يا محمد ﷺ هذا موقفی الذی وضعنی الله عزوجل فيه ولن اقدر علیٰ ان تقدمه ولكن امض انت امامك الیٰ السماء فتقدم رسول الله الیٰ سدرة و تخلف جبرئيل علیہ السلام (صافی)

[2] ۔صفة ذم للثالثة... جلالين ۔منات سومی بی قدردا (شاہ ولی اللہ)

[3] ۔انكار لما قالت قريش ان الملئكة بنات الله هذا الاصنام هيا كلها (صافی)

[4] ۔ قالو من اللات ومن العزيز العزی وان عمولانهن بنات الله تعالیٰ عنه وقول (ابن جرير)

و لاضمّی بنی عمروا زور

یعنی ''میں نے لات اور عزی دونوں کو ان کے منصب سے ہٹا دیا۔ ایسا ہی باہمت بہادر کو کرنا چاہیے۔ تو نہ اب عزے پر مجھے اعتقاد ہے اور نہ اسکی دونوں بیٹیوں پر اور نہ بنی عمرو کے دونوں بتوں کی اب میں زیارت کروں گا''۔ اب اسے اگر اس تصور کے ساتھ کہ وہ ان بتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے ملائیں تو یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ عزی کو (معاذ اللہ) خدا کی شریک حیات مانتے ہوں اور لات ومنات کر لڑکیاں اور اس بنا پر قرآن مجید نے اولاد ہونے کی نفی کے ساتھ بیوی کی بھی نفی کی ہے (ولم یتخذ صاحبةً ولا ولداً) اور یا یہ کہ عزی کو خدا کی لڑکی مانتے ہوں بلا واسطہ اور منات کو بالواسطہ یعنی نواسی۔

پھر بھی اس شاعر کے قول کی بنیاد پر ان کا ملائکہ کے ساتھ کوئی رشتہ ثابت نہیں ہوتا جو قرآن کے سلسلہ کلام سے مستفاد ہوتا ہے۔ ہاں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ پہلے ان کے اس تصور کی رد ہے کہ یہ اصنام خدا کی بیٹیاں ہیں اور پھر بعد میں ان کے دوسرے تصور کی رد ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیا ہیں مگر یہ ظاہر کے خلاف ہے زیادہ ذہن سے قریب وہی تصور ہے کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے جس کا متعدد مقامات پر قرآن مجید میں ذکر ہے اور ان بتوں کو ان کی شبیہ ہونے کی بنا پر اللہ کی بیٹی سمجھتے تھے۔ جو طبری کے متعدد روایات سے مستفاد ہے۔

إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدَىٰ ﴿٢٣﴾

''یہ نہیں ہیں مگر کچھ نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں جن پر اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ وہ پیروی نہیں کرتے مگر وہم گمان کی اور جو اُن کے دلوں کی خواہش ہوتی ہیں اور بلاشبہ ان کے پاس ان کے پروردگار کے پاس سے صحیح رہنمائی آ چکی ہے''۔

مشرکین کے اس مزعومہ باطل کی رد کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں

جیسا کہ پہلے ابن جریر کا بیان آ چکا ہے کہ انہوں نے ان بتوں کے نام اسمائے الٰہیہ سے لے کر رکھے تھے اس تصور پر کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور پھر یہ معبود قرار دے کر وہ خود انہیں خدا بھی کہتے تھے تو کہا جا رہا ہے کہ نام جو بتوں کے تم نے رکھے ہیں وہ بھی تمہارے طبع زاد ہیں اور انہیں خدا سمجھنا یا ان کا خدا سے رشتہ جوڑنا، یہ بھی تمہاری من مانی بات ہے [1] ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جس کا ثبوت ہو۔ یہاں ظن ایسے خیال کو کہا گیا ہے جس کا کوئی منشاء ہی نہ ہو بلکہ ''دل بخواہ ہو'' یعنی اس کی بنیاد اپنے نفس کی خواہش پر ہو لہٰذا حقیقت میں اس کا تعلق ایسی چیزوں سے ہے ہی نہیں جن میں کوئی نتیجہ کسی حقیقت کے متعلق ایسی دلیل سے نکالا گیا ہو جو اس کے ثبوت پر اتنی طاقتور روشنی ڈالتی ہے جس میں کمزور دھندلکا امکان خلاف کار رہتا ہے۔ یہاں ظن کا لفظ جو ہے، وہ اس ظن سے مختلف ہے جس پر اصول فقہ میں حجیت ظن کے عنوان سے بحث کی جاتی رہی ہے۔

''بلاشبہ ان کے پاس ان کے پروردگار کے پاس سے صحیح رہ نمائی آ چکی ہے'' یعنی اس کی طرف کے رہنما ان بتوں کی نفی کرتے رہے اور بلاشرکت غیر اللہ ہی کی طرف دعوت دیتے رہے۔ اور اب یہ آخری پیغمبر بھی معجزوں کے ساتھ جو اس کی حقانیت کی دلیل ہیں، انہیں بتا رہا ہے کہ

---

[1] ۔ای لیس تسمیتکم لھذا الاصنام بانھا الھة وانھا بنات اللہ الا اسماء لا معانی تحتا (مجمع البیان)

یہ قابل عبادت نہیں ہیں [1] اور ان کے سلسلے میں ان کے مزعومات مثلاً وہ یہ کہ خدا کی بیٹیاں ہیں یا فرشتوں سے صورت میں مشابہ ہیں۔ یہ سب بے بنیاد ہیں تو اب انہیں اسے مان لینا چاہیے اور اب اپنے سابق دھڑے پر باقی رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿۲۴﴾ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴿۲۶﴾

''کیا انسان کے لیے وہ ضرور حاصل ہوگا جو وہ آرزو کرے تو اللہ کے قبضے میں ہے انجام بھی اور آغاز بھی اور کتنے ہی فرشتے ہیں آسمان میں کہ اُن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتی مگر بعد میں اس کے کہ اللہ جس کے لیے چاہے، اجازت دے اور وہ راضی ہو''۔

چونکہ بعد میں فرشتوں کی سفارش کے بذات خود کارگر نہ ہونے کا ذکر ہے، اس لیے آرزوؤں سے مراد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان بتوں کی پرستش اس امید سے کرتے تھے کہ وہ فرشتے جن کی صورت پر اپنے خیال میں انہوں نے یہ مورتیاں بنائی تھیں پیش خدا ہماری سفارش کریں گے [2] تو کہا جا رہا ہے کہ خود وہ فرشتے بغیر اس کی رضا اور اجازت کے سفارش نہیں کرتے [3] تو یہ بت کہاں سفارش کر سکتے ہیں [4]

مگر بعض لوگوں نے اس آیت کی تشریح اتنی دور لے جا کر کی ہے کہ اس کا کوئی تعلق قبل والی آیتوں سے نہیں رہ گیا ہے۔ انہوں نے یہ مطلب کہا ہے کہ کیا حضرت محمد ﷺ کو یہ آرزو تھی کہ انہیں نبوت و رسالت مل جائے اب اُس کے بعد الفاظ آیت کا تقاضا پھر یہ ہے کہ یہ مطلب نکالا جائے کہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ منصب آرزوؤں سے نہیں ملتا ہے بلکہ اللہ خود اپنی نگاہ غیب میں جسے اس کا مستحق پاتا ہے، اسے یہ منصب عطا کرتا ہے مگر ان بعض نے اب اسے چھوڑ کر اُس کا مطلب یہ نکالا ہے کہ تمہارے نزدیک اُنہیں یہ آرزو تھی تو سن لو کہ ان کی آرزو ہم نے اُنہیں عطا کر دی ہے [5]

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴿۲۷﴾ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ﴿۲۸﴾

''یقیناً جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ فرشتوں کے نام لڑکیوں کے سے رکھتے ہیں، حالاں کہ انہیں اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ وہ نہیں پیروی کرتے مگر بلا وجہ کے خیال کی اور یقیناً ایسا خیال حقیقت تک پہونچنے کی ضرورت کو بھی پورا نہیں کرتا۔

نام رکھنے کے معنی یہی ہوں جیسا ہم نے ترجمہ کیا ہے تو گزشتہ آیات کے ربط سے مطلب یہ ہوگا کہ اُنہوں نے ان مورتیوں کے جو

---

[1] ۔البیان بالوحی الذی اوحینا ہ الیٰ محمد ﷺ ان عبادتہا لا تنبغی وانہ لا تصلح للعبادۃ الا اللہ الواحد القہار (ابن جریر)

[2] ۔ما تمنی من شفاعۃ الاصنام ۃ (مجمع البیان)

[3] ۔لا یشفعون الا باذن من اللہ وضاہ (تبیان)

[4] ۔فکیف یشفع الاصنام لعبادتہم (صافی)

[5] ۔قال ابن زید ...وان کان محمد ﷺ تمنی ہذا فذالک کلہ (ابن جریر)

لڑکیوں کے نام سے رکھے ہیں وہ فرشتوں کے تصور پر مبنی ہیں کہ انہیں یہ لڑکیاں سمجھتے ہیں اور پھر وہی بات ہے جو پہلے آ چکی ہے کہ یہ ان کا تصور کسی علم پر مبنی نہیں ہے بلکہ بلا وجہ ہے اور اس کے بعد کا جملہ جو بلکہ ایک کلیہ کی صورت رکھتا ہے لہٰذا وہ اصول فقہ کی ایک بحث کا مرکز بن گیا کہ عدم حجیت ظن ہے اس سے استدلال ہو گیا اور جناب شیخ مرتضیٰ انصاریؒ نے بھی رسائل میں تاسیس اصل کے محل پر اس آیت کو پیش کر دیا عام اصول کا تقاضا یہی ہے کہ ظن معتبر نہیں ہے لہٰذا اس سے ان لوگوں کی رد ہو جائے گی جو مطلق ظن کو احکام شرعیہ میں معتبر قرار دیتے ہیں ہاں اس عام اصول سے استثناء ان ظنون سے ہو جائے گا جنہیں خصوصیت کے ساتھ شرع نے قرار دیا ہے تو اب نتیجہ ان کا یعنی ان پر عمل کا صحیح ہونا ظنی نہیں بلکہ قطعی ہو گا لہٰذا وہ عمل بالظن میں داخل ہی نہیں ہو گا اور اب کلیہ یہ ہو گیا کہ علم پر عمل ہو یا ''علمی'' پر اور ''علمی'' سے مراد یہی ہے کہ ذاتاً تو وہ ظن ہے مگر شروع کے معتبر قرار دینے کی وجہ سے نتیجہ اس کا جو صحت عمل ہے، وہ علم پر مبنی ہوتا ہے، نہ کہ صرف ظنؔ پر۔

مگر جیسا کہ گزشتہ ظن والی آیت میں ہم کہہ چکے ہیں کہ جس محل پر یہ فقرہ قرآن مجید میں آیا ہے، اس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ وہ ظن ہے ہی نہیں جس میں کوئی دور بین ''واقع'' کو دکھا رہی ہو لیکن اس میں ذرا دھندلکا سا ہو کہ کمزور احتمال مخالف پہلو کا بھی ہے بلکہ یہاں ظن ایسا ہے کہ اس میں کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جو واقعہ پر جھوٹ ڈال رہی ہو بلکہ بالکل آنکھ بند کر کے اپنے ایک مفروضہ کو واقعیت سمجھ لیا گیا ہے اور اب الظن پر جو الف لام ہے، وہ بتقاضائے محل عہد کا ہو گا کہ ایسا ظن حقیقت سے ذرا بھی بہرہ یاب نہ کرے گا لہٰذا اس میں وہ ظنون داخل نہیں ہیں جو کسی ایک منشاء صحیح پر مبنی ہوں جو فطری طور پر حقیقت کے متعلق صحیح طور پر انسان کے ذہن کا رجحان پیدا کرتی ہے۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۲۹﴾ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿۳۰﴾

''تو روگردانی کیجیے اس سے جو ہماری یاد سے روگردانی کر رہا ہے اور سوا اس دنیوی زندگی کے کچھ اس کا مقصد نہیں ہے، یہ ان کے علم کی پہونچ کی آخری حد آپ کا پروردگار خوب واقف ہے اس سے جو اس کے راستے سے ہٹا ہوا ہے اور وہ خوب واقف ہے اس سے جو اس صحیح راستے کو پائے ہوئے ہے''۔

یہ دونوں آیتیں اس طرح کی ہیں جیسی متعدد مقامات پر قرآن میں آیتیں ہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے ہدایات کے گویا بے اثر ہونے اور مشرکین کے قبول حق نہ کرنے سے بہت صدمہ ہوتا تھا تو طرح طرح کے انداز سے خالق نے آپ کو سمجھایا ہے کہ آپ رنج کیوں کرتے ہیں؟ وہ راہ راست پر نہیں آتے ہیں تو کم بخت خود ہی دوزخ میں جانے کا سامان کر رہے ہیں، آپ کیا کر سکتے ہیں؟ یہاں یہ انداز اختیار کیا گیا ہے کہ جاہل، ان کا مبلغ علم اپنی ان باطل کشیوں کے آگے سچی حقیقتوں تک نہیں جاتا اور پھر حق طلبی کا جذبہ بھی نہیں، بس دنیوی زندگی اچھی طرح بسر ہو جائے یہی ان کا انتہائے مقصد ہے تو آپ کیا کر سکتا ہیں؟ خود ہی دیکھ رہے ہیں کہ کون راہ راست سے ارادۃً منحرف رہتا ہے، اور کون اسے قبول کرتا ہے ان دونوں کا حساب تو ہمارے ذمے ہے اور وہ انجام سب کے سامنے آئے گا

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا

وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۚ﴿۳۱﴾

''اور اللہ کے لیے وہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے تا کہ انہیں جو برے اعمال کریں وہ سزا ان اعمال کی دے اور جو اچھے کام کریں ان کو اچھائی کے ساتھ جزا عطا کریں''،

آسمان اور زمین کے اندر کی ہر چیز اس کی ملک ہے، اسے جزا و سزا کے اعلان کی تمہید بظاہر اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ کوئی اس کے دائرۂ اقتدار سے نکل نہیں سکتا کہ اُس کی طرف کی مکافات سے بچ جائے اور پھر اس کی وسعت قدرت میں کمی بھی نہیں کہ وہ انہیں جزا و سزا نہ دے سکے۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۧ﴿۳۲﴾

''وہ جو پرہیز کرتے ہیں بڑے گناہوں اور سیاہ کاریوں سے، سوا اتفاقی معمولی غلطیوں کے یقیناً تمہارا پروردگار بخشش میں سمائی رکھنے والا ہے، وہ تمہیں خوب جانتا ہے کہ اس نے تمہیں خاک سے پیدا کیا اور جب تم ماؤں کے پیٹ میں بچوں کی شکل میں تھے تو اپنے نیکوکار ہونے کے دعوے نہ کرو، وہ خوب واقف ہے ان سے جو واقعی پرہیز گار ہو''۔

یہ اس مشرکین والے تذکرے سے جو پہلے تھا الگ ہے بلکہ گزشتہ آیت میں تھا کہ حسن عمل رکھنے والوں کو میں اچھی جزا عطا کروں گا تو ان حسن عمل رکھنے والوں کا بیان ہے، وہ کون ہوتے ہیں''۔ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ ،کی لفظیں قرآن مجید میں پہلے بھی آئی ہیں مگر وہاں اس کے ساتھ حرف الا استثناء نہیں ہے۔ ہاں ایک تیسری جگہ کبائر کے لفظ کے ساتھ اس کے مقابلے میں سیات کا لفظ آیا ہے: نساء آیت ۳۱ میں؛

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ۔ اور یہاں اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ کے ساتھ حرف استثنا (الا) کے ساتھ لمم کا لفظ ہے جس کا ترجمہ ہم نے کئی تشریحوں کو سمو کر ''اتفاقی معمولی غلطیوں'' کے ساتھ کیا ہے۔ فقہ میں ایک اصطلاح گناہ کبیرہ اور صغیرہ کی موجود ہے مثلاً عدالت کی جو شروع میں نبض قرآن گواہیوں میں معتبر ہے اور فقہ جعفری کی رو سے امام جماعت اور طلاق کے وقت جن کی موجودگی ضروری ہے، ان گواہوں میں معتبر اس کی تعریف کی جاتی ہے کہ کبائر کا ارتکاب نہ ہو اور صغائر پر اصرار نہ ہو، اس تفریق کا ماخذ ان آیات کو قرار دے کر کبائر سے ذہن میں گناہان کبیرہ آتے ہیں، اس لیئے ان کے مقابلے میں وہاں جو سیئات کا لفظ ہے اور یہاں جو الا کے ساتھ لمم کا استثناء ہے، اس سے گناہان صغیرہ مراد ہوں گے۔

اس صورت میں استثنا متصل نہیں ہوسکتا جس میں الا کے ذریعہ سے کسی ایسی چیز کو خارج کیا جاتا ہے جو بغیر اس لفظ کے قبل والے حکم کے عنوان میں داخل تھی، یہاں ایسا نہیں ہے اس لیے کہ پہلے جب گناہان کبیرہ کا ذکر تھا تو ان میں گناہان صغیرہ داخل ہی کہاں تھے جو استثنا کے ذریعے سے انہیں خارج کیا جائے اور چونکہ یہ اصول ہے گناہ صغیرہ بھی اصرار کی صورت میں کبیرہ ہو جاتا ہے لہٰذا ہماری قدیم تفسیر میں اس کے ساتھ

قید لگائی ہے نادانستہ کی [1] استثنائے منقطع کا بامحاورہ ترجمہ ہماری زبان میں ''ہاں'' کے لفظ کے ساتھ ہوسکتا ہے جس سے پہلی ہی بات میں ذرا وضاحت یا تاکید ہوتی ہے اب یہ معنی ہوں گے کہ وہ بڑے گناہوں اور شرمناک کاموں سے بالکل پرہیز کرتے ہیں ہاں صغیرہ گناہ اتفاقاً ہو جائے تو ہو جائے۔ اب اس سے یہ فقرہ وابستہ ہو جائے گا کہا، ان ربك واسع المغفرة ''تمہارے پروردگار کی بخشش میں بڑی وسعت ہے''، یعنی ایسے گناہ بخش دیے جاتے ہیں جو مطابق ہے سابق آیت کے اس جملے سے کہ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ''اگر بڑے گناہوں سے پرہیز کرو تو ہم تمہاری معمولی غلطیوں کا کفارہ کرنے کا مطلب قرآن میں وہی بخش دینا ہوتا ہے جسے عربی میں مغفرت کہتے ہیں..... الا اللمم کے کچھ اور مفہوم بھی کہے گئے ہیں، ان میں بھی زیادہ تر استثناء منقطع ہی قرار پاتا ہے۔

ایک یہ ہے کہ قبل اسلام جو ہو چکا ہو وہ چکا، اس کے باز پرس اب نہ ہوگی جیسے ''جمع بین الاختیین'' دو بہنوں کو ایک ساتھ زوجیت رکھنے کی ممانعت میں قرآن میں آیا تھا ''الا ماقد سلف'' سوا اس کے جو پہلے ہو چکا اور اپنے باپوں کی بیویوں سے ازدواج کی ممانعت میں بھی ہے الا ماقد سلف ان دونوں میں یہ معنی نہیں کہ جو کچھ ہو چکا اس کا باقی رکھنا اب درست ہے، تاکہ استثنائے متصل ہو بلکہ یہ مطلب ہے کہ جو پہلے ہو چکا اس کی باز پرس اب نہ ہوگی [2] میری نظر میں یہ تشریح ظاہر لفظ سے بہت بعید ہے۔ تیسری تشریح یہ ہوئی ہے کہ کوئی گناہ عمل میں نہیں آیا مگر انسان اس کے قریب پہونچ گیا، خواہ صرف ارادے کے ساتھ یا اس کے ابتدائی اسباب عمل میں لے آیا لیکن اصل گناہ ہونے نہیں پایا۔

بعض نے اس کا تعلق الفواحش سیاہ کاریوں سے مراد لیا ہے جن کا نام زنا ہے، اس میں ایک آخری منزل ہے جو بالکل زنا کاری کی ہے، اس سے استثنا ہوا ہے، اس کے ابتدائی مراحل کا جنہیں ''مقدماتِ زنا'' کہا جا تا سکتا ہے جیسے آنکھ سے دیکھنا، ہاتھ سے چھونا، اس راستے پر چلنا یہ سب لمم میں داخل ہیں ان کی معافی کا اعلان ہوا ہے، جب کہ اصل عمل وقوع میں نہ آیا ہو طبری کی جامع البیان میں اس مضمون کی کئی روایتیں ہیں جن میں سے ایک میں تو بس ابن مسعود کا قول ہے اور دوسری روایت میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے طور پر یہ مضمون وارد ہوا ہے اور اس کے موافق دوسرے افراد کے اقوال ہیں۔

جو ابن مسعود کے قول کے الفاظ ہیں، وہ ہمارے طرق سے ائمہ معصومینؑ کی زبانی بھی وارد ہوئے ہیں مگر ان میں اللّمم کی تشریح کے طور پر ان امور کا ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن ابن مسعود کی روایت میں اللّهم کی تشریح کے طور پر یہ مضمون درج ہے [3]

چوتھی تشریح جس کے متعلق معصومینؑ کے ارشادات ہیں کہ اتفاقی طور پر وقتاً فوقتاً جو گناہ ہوتے ہیں مگر انسان ان کا خوگر نہیں ہے وہ لمم کے لفظ کا مصداق ہیں۔ کافی باب اللمم میں ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں: الهنة بعد الهنة اى الذنب بعد الذنب يلم به العبد۔ خوگر نہ ہونے کے معنی میں ایک حدیث میں ہے لیس من سلیقة [4] لمم کے جو لغوی معنی ہیں؛ اس کے بھی یہ مطابق نہیں ہے راغب کے

---

[1] ۔هو مايلم به العبد من ذنوب صغار بجهالته (على ابن ابراهيم)

[2] ۔الذى المرابه من الشم ولفواحش فى لاجاهلية قبل الاسلام فان الله قد عفاهم عنه فلا يوخذهم به (ابن جرير)

[3] ۔ان ابن مسعود قال زنا العين النظر وزنا لشفتين التقبل وزنا ليدين البطش وزنا الرجلين المشى وبصدق ذالك الفرج ويكذبه فان تقدم بفرجه كان زانيا والافهو اللمم (ابن جرير)

[4] ۔فى الكافى عن الصادقؑ اللمم يلم الرجل يلم الذنب ثم يستغفر الله ...عند من الظلم العبد بعد الذنب ليس من سليقته اى من طبيعته (صافى)

لفظ یہ ہیں کہ ؛فلان یفعل کذا لمما ای حینا بعد حین۔فلان شخص اسے لمما کرتا ہے وقتاً فوقتاً۔اس صورت میں استثنا متصل قرار پاتا ہے اس لیے کہ اتفاقی اور وقتاً فوقتاً ہونا جس کے لیے معافی ثابت ہورہی ہے،اس میں کبائر اور صغائر کی تفریق نہیں ہے۔

اور بھی مفہوم کہے گئے ہیں مگر ہم جہاں تک سمجھتے ہیں پہلی تشریح زیادہ قوت رکھتی ہے اس لیے کہ کبیرہ اور صغیرہ کی تفریق یہ کوئی علماء وفقہا کی بتائی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ معصوم رہنمایان دین کے اقوال سے یہ تفریق ثابت ہوئی ہے چنانچہ امیر المؤمنین علی ابن ابی طالبؑ کے بھی ایک کلام میں جو نہج البلاغہ میں ہے گناہوں کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں: من کبیرادعہ علیہ نیرانہ ومن صغیرارصدعلیہ غفرانہ'' کوئی بڑا ہے کہ اس پر اس نے اپنے یہاں کے آگ کا اعلان کیا ہے اور کوئی چھوٹا ہے کہ اس پر اپنی مغفرت کی امید دلائی ہے اس میں انداز کلام پتہ دیتا ہے کہ یہی آیتیں سامنے رکھ کر یہ بات کہی گئی ہے اور اس میں کبیرہ کا معیار وہی معلوم ہوتا ہے کہ جس پر خالق نے آتش دوزخ کا اعلان کیا ہے، وہ کبیرہ ہے۔

دوسری حدیثیں بھی اس پر دلالت کرتی ہیں چنانچہ کافی میں امام جعفرؑ کی حدیث ہے کہ:۔

الکبائر التی اوجب اللہ علیہا النار۔کبائر وہ ہیں جس کا نتیجہ اس نے آتش دوزخ قرار دیا ہے وسائل باب اجتناب الکبائر میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا ارشاد ہے جس سے ان آیات کی تفسیر سمجھنا چاہیے:۔من اجتنب الکبائر وھی ما اوعد اللہ علیہ النار ان کان مؤمنا کفر اللہ عنہ سیئاتہ۔جو کبائر سے پرہیز کریں اور وہ وہ ہیں جن پر اس نے آتش جہنم کا وعید کیا ہے۔اگر وہ مؤمن ہے تو اللہ اسے اس کے سیئات (معمولی برے کاموں) کا کفارہ کردے گا۔

عقاب الاعمال میں امام محمد باقر علیہ السلام کی حدیث ہے راوی کا بیان ہے کہ:۔سالت اباجعفر علیہ السلام عن الکبائر فقال کل من اوعداللہ علیہ النار۔میں نے حضرت علیہ السلام سے کبائر کے متعلق دریافت کیا،تو فرمایا: ہر وہ گناہ جس پر اللہ نے آتش دوزخ کا اعلان فرمایا ہے اس کی تائید اہل سنت کے ان روایات سے ہوتی ہے جن میں اللمم کے معنی میں کہا گیا ہے کہ مادون الحدین حد الدنیا وحد الآخرہ۔جو دونوں قسم کی سزاؤں سے کم تر رہے ہیں دنیا کی حد اور آخرت کی حد۔ان شاگرد عکرمہ نے اس کی توضیح کی ہے، کل ذنب لیس فیہ حد فی الدنیا ولا عذاب فی الآخرت فھو اللمم۔وہ گناہ جسکے لیے نہ دنیا میں کوئی حد شرعی ہے اور نہ آخرت میں سزا کا اعلان ہوا ہو وہ لمم ہے قرآن کریم کی ان دو لفظوں میں کہ؛ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ ،جس میں فواحش کی تفسیر زنا کے ساتھ ہوئی ہے یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ کبائر سے مراد وہ ہیں جس میں عذاب آخرت کا اعلان ہوا ہے اور رفواحش وہ ہیں جس پر دنیا میں حد شرعی قرار دی گئی ہے۔

اس کی موافقت میں ہمارے یہاں کافی کی حدیث باب اللمم میں امام جعفر الصادق علیہ السلام سے ہے کہ؛الفواحش الزنا والسرقتہ۔فواحش زنا اور چوری ہیں۔اب دونوں قسم کی سزائیں جس گناہ پر مرتب نہ کی گئی ہوں وہ گناہ صغیرہ بالمم ہے جس کے لیے یہ اعلان ہے کہ؛۔ان ربك واسع المغفرۃ۔تمہارے پروردگار کی مغفرت میں وسعت ہے'' اور یہ مغفرت کا اعلان اس پابندی یعنی کبائر وفواحش سے پرہیز کے صلے کے طور پر ہے۔لہٰذا وہ بر بنائے توبہ نہیں ہے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ اسی وقت تک ہے جبکہ اتفاقی طور پر ہو لیکن اگر اصرار ہو گیا تو پھر گناہ صغرہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے۔رہ گئی انسان کی بذات خود توبہ یا شفاعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں تو کبیرہ اور صغیرہ کی تفریق نہیں ہے بلکہ شفاعت کے تعلق سے تو ایک حدیث پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے۔کہ:۔انی ادخرت شفاعتی اھل الکبائر من امتی۔میں نے اپنی شفاعت کو اٹھا رکھا ہے اپنی امت کے ان افراد کے لیے جو گناہان کبیرہ کے مرتکب ہوں۔

اور اس آیت قرآن میں بھی گناہان کبیرہ اور صغیرہ کی تفریق نہیں ہے کہ:۔یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَالْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ .....(زمر۔۵۳)اے میرے بندوجنھوں نے گناہوں کے ساتھ اپنے اوپر ظلم اٹھایا اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو یقیناً اللہ تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے یقیناً وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اور کافی باب الاصرار علی الذنب میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے :لا صغیرة مع الاصرار ولا کبیرة من الاستغفار ،اصرار کے ساتھ کوئی گناہ صغیرہ نہیں رہتا اور استغفار کے ساتھ کوئی گناہ کبیرہ نہیں رہتا۔

اور فرق یہ محسوس ہوتا ہے کہ اجتناب کبائر کی صورت میں صغائر پر مغفرت کا وعدہ قطعی ہے جس میں توبہ واستغفار کی قید نہیں اور کبائر میں درِصورت توبۂ واستغفار کے ساتھ مغفرت کا وعدہ ہے اور درصورت عدم توبہ شفاعت کے ساتھ اور کبھی بغیر شفاعت صرف تفضّل الٰہی سے امکان مغفرت ہے جو یغفر کے ساتھ من یشاء کی قید سے ظاہر ہے جس سے مؤمن میں دونوں کیفیتوں کا امتزاج ہوجاتا ہے جو تقاضائے ایمان ہے۔الایمان نصفان نصف خوف ونصف رجاء،''ایمان کے دو برابر کے حصے ہیں ایک حصہ خوف اور ایک حصہ امید۔

یغفر کے اعلان سے رجا اور لمن یشاء کی قید سے خوف اس خوف میں سب سے زیادہ دخل حقوق الناس کا ہے کہ ان میں بغیر ان صاحب حق کے معاف کئے ہوئے رحمت الٰہی بھی شاید قدم آگے نہ بڑھائے اور شفاعت کرنے والے بھی شفاعت میں توقف کریں۔ نعوذباللہ من سخط الرحمٰن وعذاب النیران۔

اس کے بعد اس آیت میں بلا فاصلہ یہ تخلیق کا ذکر کہ وہ خوب جانتا ہے جب اس نے (پہلے) تمہیں زمین سے پیدا کیا (یعنی تمہارے مورث اعلیٰ حضرت آدمؑ کو) پھر ان کی نسل کو آگے بڑھایا ایسی صورت سے (جس کی آخری منزل جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، یہ ہے) کہ تم ماں کی پیٹ میں بچے کی شکل میں تھے، یہاں یہ بات غور طلب ہوجاتی ہے کہ آخر اس کا کبائر سے پرہیز اور صغائر کے ارتکاب کی صورت مغفرت والے ذکر سے کیا تعلق ہے مگر یہاں جناب طبری نے بھی جن کی بالغ نظری کا مجھے اعتراف ہے باوجود اپنی تفسیر کے اتنے بسیط اور وسیع ہونے کی توجہ نہیں کی نہ انہیں بظاہر صحابہ وتابعین یعنی اور قدیم مفسرین کے اقوال اس سلسلے میں ملے جن کے اپنے دسترس بھر وہ نقل کرنے کے پابند ہیں۔

ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ گناہان کبیرہ سے پرہیز کی صورت میں صغائر پر جو مغفرت کا وعدہ ہے، اس سے متعلق ہے اور گویا ان لوگوں کو جو ایسے گناہگار ہوں ڈھارس دینا ہے اور ان کی طرف سے ایک عذر کا بیان ہے کہ آخر ہم ہی تو تمہارے خالق ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ تم عام طور پر صرف نور سے پیدا نہیں ہوئے جس میں تقاضائے گناہ موجود ہی نہ ہو،تم تو ابتدا میں مٹی سے پیدا ہوئے ہو اور پھر نظام افزونی نسل میں نطفے وغیرہ سے آگے بڑھ کر ماں کی پیٹ میں بچے کی شکل میں پہونچے ہو،تو اس کے بعد تو بہت بڑے کامل عقل والے ہیں وہ جنہیں خالق رہبری کے منصب کے لیے چنتا ہے وہ ہوتے ہیں جو صغائر سے بھی بری ہوں۔تم میں ہر ایک تو ایسی کامل عقل کا مالک نہیں ہے تو ایسی غلطیاں تمہارے فطری جذبات کے ساتھ نادانی کا نتیجہ ہیں لہٰذا ان پر زیادہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ تو خالق نے اپنی طرف سے ان لوگوں کی دل جوئی کی۔اب آدمیوں میں کچھ بخیال خود بڑے پارسا اور پرہیز گار ایسے ہوتے ہیں جنہیں اپنی پابندی احکام شریعت کا بڑا زعم ہے کہ وہ دوسروں کی ذراسی غلطیوں کو بہت اچھالتے ہیں اور انہیں بڑا ہولناک بنا کر پیش کرتے ہیں اور پھر اپنے کو مثال بنا کر پیش کرتے ہیں جس سے اپنی برتری کا مظاہرہ ہوتا ہے، ایسے لوگوں کو مخاطب کر کے متنبہ کیا جارہا ہے کہ اپنی پاکی

دامن کی حکایت کو اتنا دراز نہ کرو۔ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم فیصلہ کریں کہ کون کس حد تک واقعی پرہیزگار ہے۔ اس طرح ان کے یہاں ''رجاء'' کے ساتھ خوف کا پہلو پیدا کر دیا کہ کہیں تم ہی اللہ کے یہاں متقین کی فہرست سے خارج نہ ہو گئے ہو۔ بحمد اللہ جس طرح ہم نے تمام اجزا آیت کے باہمی ارتباط اور مطالب میں مسلسل ہونے کی تشریح کی ہے، وہ بڑی بسیط تفسیروں میں بھی ہمارے علم میں اتنی وضاحت کے ساتھ نہیں ہے۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ تَوَلّٰى ﴿٣٣﴾ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿٣٤﴾ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿٣٥﴾

''تو کیا دیکھا تم نے اسے جو پلٹ گیا اور ذرا سا دیا اور پھر رک گیا، کیا اس کے پاس علم غیب ہے کہ وہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے''؟

خود ان آیتوں کا مضمون بتا رہا ہے کہ ان کا تعلق کسی واقعہ سے ہے جو ان کے لیے شان نزول کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ طبری نے جامع البیان میں قدیم مفسرین کے حوالے سے درج کیا ہے کہ یہ شخص ولید بن مغیرہ تھا جس نے پہلے اسلام قبول کیا، جس پر اس کے دوست نے جو مشرکین میں سے تھا اسے برا بھلا کہا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ ولید نے کہا مجھے آخرت کے عذاب کا ڈر ہو، اس نے کہا کہ تم مجھے کچھ رقم دو اور میں تمہاری طرف سے آخرت کے عذاب کو اپنے اوپر لے لوں، یہ بے وقوف اس کے کہنے میں آ گیا اور اس سے ایک اقرار نامہ لکھوا کر اسے کچھ رقم دی اور اسلام سے منحرف ہو گیا۔ پھر اور تھوڑی رقم اس کو دی اور پھر جیسے اپنی حماقت کا احساس ہوا یا پیسے کی محبت دامن گیر ہوئی تو مزید رقم دینے سے منحرف ہو گیا۔ اُسی شخص کا ان آیتوں میں ذکر ہے۔ کیا اس کے پاس علم غیب ہے''؟ یعنی یہ احمق جس نے دوسرے کی بات کو مان لیا وہ اس کے عذاب کو اپنے اوپر لے لے فردائے قیامت کے کارخانے کا حال جانتا ہے؟ کہ وہاں ایک دوسرے کا بوجھ اٹھا لے تو دوسرا عذاب سے بچ جائے گا [1]

بعض نے ولید کے تعین میں شک کا اظہار کیا ہے اسطرح کہ وہ کوئی دوسرا [2] ہمارے بعض تفاسیر میں یہاں جناب عثمان اور ان کے برادر رضاعی کا نام آیا ہے۔ [3]

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِىْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿٣٦﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰٓى ﴿٣٧﴾ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿٣٨﴾ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿٣٩﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿٤٠﴾ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴿٤١﴾ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿٤٢﴾

''کیا اس تک خبر نہیں پہنچائی گئی اس کی جو موسیٰ ؑ کے اور وفاداری کرنے والے ابراہیمؑ کے صحیفوں میں ہے کہ کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسروں کا بوجھ نہیں اٹھائیگا اور یہ کہ کسی آدمی کے لیے نتیجہ خیز نہیں ہے مگر وہی کوشش جو وہ

---

[1] ۔اعندھذا الذی ضمن لہ صاحبہ ان یتحمل عنہ عذاب اللہ فی الآخرۃ علم الغیب فھو یری حقیقتہ قولہ بما وعد (ابن جریر)

[2] ۔ھو الولید ابن المغیرۃ ی غیرہ (جلالین)

[3] ۔فی المجمع نزلت الا یات السبع یعنی ھذہ وما بعدھا فی عثمان وکان یتصدقا وینفق فقال لہ اخوہ من الرضاعۃ عبداللہ ابن ابی سرح۔ اعطنی ناقتک برحلھا وانا اتحمل عنک ذنوبک کلھا (صافی)

کرے اور پھر اسی کے مطابق اس کا پورا پورا بدلا دیا جائے گا اور یہ کہ آخر میں پہونچنا اللہ ہی تک ہے''۔

نتائج کا انحصار سعی وکوشش پر

یہاں سے تقریباً آخر سورہ تک نحوی قاعدہ کے لحاظ سے تو اسی شخص کو تنبیہ ہے جس کا ذکر تھا کہ کیا اسے یہ نہیں معلوم۔ یہ نہیں معلوم.....مگر یہ ایک بلیغ انداز قرآن مجید کا ہے جس سے ہم میں سے ہر ایک کو متنبہ کرتا ہے کہ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم ہے یہ نہیں معلوم ہے یعنی ہم تم سے کہتے ہیں یہ باتیں معلوم ہونی چاہیں، ان سب سے پہلا اصول یہی ہے کہ الا تزر وازرۃ وزر اخریٰ ''کوئی دوسرے کو بوجھ نہیں اٹھا سکتا''۔

یعنی ہر ایک بداعمالیوں کا خود ذمہ دار ہے، کوئی دوسرا اس ذمے داری کو اپنے سر نہیں لے سکتا۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ لیس للانسان الا ما سعیٰ ''ہر آدمی کے لیے نتیجہ وہ کوشش ہے۔ جو وہ انجام دے'' یعنی اُس کے سامنے جو نتائج آئیں گے وہ اس کے سعی وعمل سے آئیں گے۔ یہ اصول قرآنی کے لحاظ سے اتنا ہمہ گیر ہے کہ ہر شعبہ عمل میں جو کسی نتیجہ کا طلب گار ہو اس کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ وہ پوچھے کہ اس میں کیوں کر کامیابی ہو سکتی ہے تو اس کے سامنے یہ آیت پڑھ دی جائیں۔ کہ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى.

یہاں تک کہ اس کلیہ میں مقصد کے صحیح اور غلط ہونے کا سوال بھی نہیں ہے۔ یہ الگ سے سمجھنا چاہیے کہ مقصد کیا ہونا چاہیے۔ ہر مقصد کے حصول کا ذریعہ یہی ہے کہ اس راہ کو عملی طور پر اختیار کی جائے جو اس مقصد تک پہنچانے والی ہے۔ اب کوئی طالب مال ہوا اور پوچھے کہ اموال کیوں کر حاصل ہوں تو اُس کے جواب میں یہی کہیے کہ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى. اُس طرح کوئی طالبعلم ہو، کوئی طالب شہرت ہو، کوئی تجارت میں اپنی کامیابیوں کا طلبگار ہو اور اس طرح کوئی طالب نجات ہو تو ہر ایک کے سوال کا یہی جواب ہے اور جب اس جملے میں یہ وسعت ہے تو آخر میں جو یجزاہ جزاء الاوفیٰ ہے'' اسے پورا پورا صلہ ملے گا'' اُسے اجر آخرت سے مخصوص نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ جس کا جو ہدف نگاہ ہو، اُس کی سعی کا نتیجہ ہے جس کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ اُسے اس کوشش کا ثمرہ یا صلہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور قرآن مجید کی کئی آیتیں اس کی مؤید ہیں جیسے:۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ...(شوریٰ۔۲۰)

''جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس میں اس کے لیے صلہ دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی چاہے اسے اس میں سے ملے گا اور اس کا آخرت میں حصہ نہ ہوگا''۔ یہ اس لیے کہ اس کا نصب العین صرف دنیا تھی۔ آخرت سے اسے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ ورنہ اگر آخرت کے ساتھ دنیا مطلوب ہو تو اس کی تو اسلام نے دعوت دی ہے اور اسے مثالی نقطۂ نظر سے قرار دیا ہے کہ:،

اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (بقرہ۔۲۰۱) ''ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی۔

اس کلیہ کے خلاف کہ لیس لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى. ایک طرف تو جناب ابن عباسؓ کا قول طبری نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، دوسری آیت سے موجودہ ترتیب کے لحاظ سے اس سے قبل سورۂ طور میں آئی ہے کہ:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ

''جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ انکی پیروی کی تو ہم انکے ساتھ ان کی ذریت کو ملحق کر دیں گے''۔

یعنی ان کے اعمال میں جو کمزوری ہے اسے نظر انداز کر کے بلند مرتبہ عطا کریں گے تو یہاں معلوم ہوتا ہے کہ بزرگوں کے ان کے اعمال

سے اولاد کو فائدہ پہنچ رہا ہے مگر ہم یہ ان اسلاف کے اعمال کے جز کا تتمہ ہے کہ ان کی اولاد ان کے ساتھ ملحق ہو لہٰذا اسے بغیر سعی نہیں سمجھنا چاہیے۔

دوسری طرف منسوخی کا تصور اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ بعض عبادات میں نیابت شرع میں ثابت ہے..... جبکہ قرآن میں حکم کلیہ ہے تو اسے از قبیل مستثنیٰ سمجھا جا سکتا ہے جس سے اصل حکم منسوخ پھر بھی نہیں ہوتا،[1] بعض نے اسے زبردستی اس کلیے کے مطابق بنانے کے لئے کہا ہے کہ جس نے قرابت یا دوستی کی بنا پر نیابتاً میت کی طرف سے عبادات کیے۔ اس کے دل میں محبت تو اس میت ہی نے اپنے برتاؤ سے پیدا کی ہے، لہٰذا وہ بھی اس کی ایک کوشش کا نتیجہ ہے[2] مگر ہم نے اس کے لیے زبردستی کے لفظ کا استعمال اس بنا پر کیا کہ نماز اجارہ وغیرہ کو کیا کہا جائے گا جو شریعت میں ثابت ہے۔ پھر بغیر اجارہ اس نیابت کے ساتھ عبادت کرنے والے ایسے بلند ظرف بھی ہو سکتے ہیں کہ میت نے ان کے ساتھ کوئی حسن سلوک نہ کیا ہو بلکہ بدسلوکی کا برتاؤ رکھا ہو اور وہ پھر بھی اس کا رخیر کو اسے فائدہ پہنچانے کے لیے انجام دیں تو کیا ان کی یہ عبادتیں قابل قبول نہ ہونگی لہٰذا زیادہ درست وہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان چیزوں کو از قبیل مستثنیات سمجھا جائے۔

یہ بھی ہم سمجھ سکتے ہے کہ صدر اول میں اصطلاحات پورے طور پر منقح نہیں ہوئے تھے لہٰذا کبھی کبھی مطلق کی تقیید اور عام کی تخصیص کی بھی نسخ سے تعبیر کی جاتی تھی اور لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ. اس ہمہ گیری بعد بھی جو ہم نے بتائی کہ وہ دنیا اور آخرت کے ہر شعبے پر حاوی ہے پھر بھی ایک عمومی اصول کی حیثیت رکھتا ہے جس میں عقلی و نقلی طور پر دونوں سے قیود اور مستثنیات کی بہت گنجائش ہے مثلاً دنیوی مقاصد میں چاہے وہ رزق ہو، چاہے وہ تحصیل علم ہو اور ایسا ہی جو مقصد ہو اس کے ساتھ خالق کی طرف کے غیر مشروط فیصلۂ تقدیر سے ٹکراؤ نہ ہونے کی شرط لازمی ہے ورنہ ہر مقصد میں جو وسیع عالمی نظام کے تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے اگر ٹکرا جائے تو لاکھ سعی کرے، نتیجہ برآمد نہیں ہوگا اسی طرح آخرت میں ایک طرف سے تو ہم کلیہ بنا سکتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ حسنِ عمل والی سعی رائگاں جانا بر بنائے عدل ممکن نہیں ہے مگر سعی و عمل کے بغیر یا مقدار سعی سے زیادہ کسی صورت میں جزا کا حصول چونکہ تفضّل ہے اسلیے اس کی اس آیت سے نفی ہو سکتی ہے۔ اس طرح حسن عمل کے ساتھ جزا کا نہ ملنا تو چونکہ خلاف عدل ہے اس لیے نہیں ہو سکتا مگر سوئے عمل والی سعی کے نتیجہ میں سزا کا ملنا ضروری نہیں ہے لہٰذا اس آیت کی وجہ سے شفاعت وغیرہ کا سدباب نہیں ہوگا۔

ان الیٰ ربک المنتہیٰ کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ''آخر میں پہنچنا تمہارے پروردگار کی طرف ہے'' اس طرح یہ لمنتہیٰ کا لفظ ویسا ہو گیا جیسے قرآن مجید میں مصیر کا لفظ ہے (والی اللہ المصیر) اس کے تحت میں یہ بھی تمام معاملات کی انتہا اس کے فیصلے پر ہے جیسا کہ ارشاد ہوا (والی اللہ ترجع الامور) ہمارے ائمہ معصومینؑ نے اس کے ماتحت اس کا ایک تقاضا یہ بتایا ہے کہ جب بات خدا تک پہونچ جائے تو سر تسلیم خم کر دو پھر زیادہ قیل و قال نہ کرو اور ذات الٰہی اور اس کے اوصاف کی حقیقت سمجھنے میں فلسفہ آزمائی نہ کرو[3]

---

[1] ۔من قال اللہ غیر منسوخ الحکم قال انہ علی منع النیابتہ فی الطاعات الا ما قام الدلیل علیہ (مجمع البیان)

[2] ۔ماجاء فی الاخبار من ان الصدقہ والحج ینفعان المیت فذالک انما ھو لمحبتہ زرعھا المیت فی القلب النادی لہ النائب عنہ فھو من جملۃ سعیہ (صافی)

[3] ۔فی الکافی التوحید عن الصادق علیہ السلام ان اللہ یقول: وان ربک المنتہیٰ کلام الی اللہ فامسکوا وفی التوحید عن الباقر علیہ السلام قیل لہ ان للناس قدا کثروا فی الصفتہ الی اللہ فما تقول قال مکروہ اما تسمع اللہ عزوجل یقول وان اللہ الیٰ ربک المنتہیٰ تکلموا فیما دون ذالک (صافی)

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾

''اور یہ کہ وہی ہے جس نے ہنسایا ہے اور رلایا ہے اور یہ کہ وہی ہے جس نے مردہ کیا اور زندہ کیا اور یہ کہ وہی ہے جس نے مرد اور عورت کے جوڑے پیدا کیے ایک خاص نطفے سے جب وہ بہایا جاتا ہے اور یہ اس کے ذمے ہے دوسری دفعہ کا پیدا کرنا اور یہ کہ اُس نے غنی بنایا اور فقیر کیا ہے اور یہ وہی شعریٰ (ستارے) کا پروردگار ہے''۔

یہ اور..... یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں کہ صحف ابراہیمؑ اور صحف موسیٰؑ میں یہ بھی ہے اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ قبل کی مناسبت سے جو ان میں کی ایک کی تعلیم بیان کی گئی ہے کہ ایک دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور یہ کہ ہر انسان کے لیے نتائج اس کے سعی اور عمل سے وابستہ ہیں تو اب اسی سلسلے میں ان صحیفوں کے اور مندرجات جنہیں دنیا بھولی ہوئی ہے یاد دلائے جانے لگے جس کے ذیل میں یہ نتیجہ پنہاں ہے کہ اسباب پر بھروسے کے ساتھ اس خالق اسباب کو نہ بھولو جس کے ہاتھ میں سلسلہ اسباب کی پہلی کڑی ہے۔

تم سمجھتے ہو حالات ہنساتے اور رلاتے ہیں، دنیا حالات سے آگے بڑھتی ہے تو دہر یا زمانے کو کہتی ہے کہ انقلابات دہر ہیں اور وہ کرتے ہیں اور مسبب الاسباب کو بھول جاتی ہے۔ آدمی زہر کو قاتل سمجھتا ہے اور انگبین کو باعث شفا سمجھتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اصل زندگی اور موت اس کے ہاتھ میں ہے۔ پیدائش کے لیے ماں باپ کا ہونا بھی ایک سبب ہے اس کا قرار دیا ہوا اور پھر اسی سے سمجھ لو کہ جس کے ہاتھ میں یہ زندگی اور موت ہے تو وہ دوسری زندگی دینے پر جزاؤ سزا کے لیے بھی قادر ہے جو بتقاضائے عدل اس کا ایک فریضہ ہے جو اس آیت میں علیہ کا لفظ علیٰ کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے جس کے معنی ہیں اس پر ہے دوسری دفعہ زندہ کرتا ہے۔

تم سمجھتے ہو کہ حسن تدبیر اور سوء تدبیر سے دولت اور عزت ہوتی ہے۔ ہاں ہیں یہ بھی اسباب اس لیے سعی کا حکم ہوا ہے مگر اس میں بھی نتیجہ اس کے ہاتھ میں ہے، دولت دینے والا اور غریب رکھنے والا وہی ہے اور کچھ لوگ اس کا سبب ستاروں کے قرار دے لیتے ہیں اور اسلیے مشرکین عرب کا ایک طبقہ ستارۂ شعریٰ کی پرستش کرنے لگا تو سن لو کہ شعریٰ کا مالک بھی وہی ہے۔

اغنی کے ساتھ جو اقنی کی لفظ ہے، اس میں دو معنی اور ہیں، ایک یہ کہ ساز و سامان کا مالک بنایا'' بعض نے ترجمہ اس کے موافق کیا ہے [1] دوسرے یہ کہ راضی و خوشنود کیا'' جس کے موافق تفسیر اور ایک روایت میں جناب امیرؑ کا ارشاد نقل ہوا ہے اور اس میں یہ تشریح ہے کہ اس نے دولت مند بنایا اور اپنی سعی و کوشش سے خوشنود کیا [2] ظاہر ہے کہ یہ ارشاد نقل شدہ اگر بطریق صحیح ہم تک پہنچ جائے تو سر تسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے مگر یہ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ اور ان دونوں تشریحوں میں اقنیٰ اور اغنیٰ کا تقریبا ہم معنی یا اس کا تتمہ ہو جاتا ہے حالانکہ اس کے پہلے کے تمام جملوں میں تضاد کا پہلو نمایاں ہے، خندہ و گریہ، موت و زندگی، مرد عورت۔ لہٰذا میرا ذہن اس معنی کو قبول کرتا ہے جسے طبری نے نقل

---

[1] ۔ اقنی واعطی المتخذفتیة... جلالین) تونگر کر دو سدر مایہ دار (ولی اللہ) دولت مند کیا اور خزانے والا کیا (رفیع الدین)

[2] ۔ المیزان: از امیر المؤمنین صلوات اللہ علیہ..... اغنی کل انسان بعیشة ارضاہ بکسب یدہ (قاموس قرآن)

اقوال میں سب سے آخر میں درج کیا ہے کہ اغنیٰ کے معنی ہیں دولت مند بنایا اور اقنی کے معنی ہیں فقر وفاقہ میں مبتلاء کیا جس کے موافق آیات خود قرآن مجید متعدد مقامات پر موجود ہیں [1] لہٰذا میں نے اُسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

ستارۂ شعریٰ کا نام خصوصیت کے ساتھ لینے کی ایک وجہ بیان کی گئی ہے کہ قبیلہ قریش کے گزشتہ اسلاف میں سے ابو کبشہ تھا اور مشرکین رسولؐ کو بطور طعن وتشنیع ابن ابی کبشہ کہتے تھے کہ انہوں نے بھی ایسا ہی نیا مذہب ایجاد کیا ہے اس لیے یہاں معبود حقیقی کا رب الشعریٰ کہہ کے تعارف کرایا ہے کہ میں شعریٰ کی عبادت کا نہیں بلکہ اس کی عبادت کا داعی ہوں جو شعریٰ کا بھی مالک ہے [2]

وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ِۨالْاُوْلٰى ۙ﴿۵۰﴾ وَثَمُوْدَا فَمَاۤ اَبْقٰى ۙ﴿۵۱﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ؕ﴿۵۲﴾ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ۙ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ۚ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾

''اور یہ کہ اُس نے پہلے والے قبیلہ عاد کو ہلاک کر دیا اور قبیلہ ثمود کر تو ان پر ترس نہیں کھایا اور نوح کی قوم کو اس کے پہلے کہ وہ اور بھی زیادہ ظالم اور سرکش تھے۔ اور قوم لوط کی بستیوں کو اوپر سے نیچے گرایا تو ان پر چھائی وہ آفت کہ چھائی تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں میں شک کرو گے''؟

چونکہ اس سے پہلے اس فقرے میں ہے کہ ''وہ شعری'' کا مالک ہے اور شعری مشرکین کے ایک گروہ کا معبود ہے، ذہن سننے والے کا مشرکین کی جماعت کی طرف مڑ جاتا ہی ہے، اس لیے اب سابق کی مشرک جماعتوں کا دنیا میں کیا کیا انجام ہوا، ان کا ان آیتوں میں مسلسل ذکر ہوا ہے۔ عاد کے لیے اولیٰ کی صفت آنے کی وجہ بتائی گئی ہے کہ اس قبیلہ عاد کے کچھ لوگ جا کر مکے کی سرزمین پر بس گئے تھے۔ وہ اس عذاب کے نازل ہونے کے موقع پر وہاں موجود نہ تھے۔ وہ بعد میں آپس میں لڑ لڑ کر تباہ ہوئے [3]

قبیلہ ثمود کے لیے فما ابقی کے لفظ کو ہم نے بقیا سے لیا ہے جس کے معنی ترس کے ہیں لیکن دوسرے لوگوں نے اس کو باقی رکھنے کے معنی میں لیا ہے کہ انہیں باقی نہیں رکھا۔ ہمارے نزدیک پہلا مفہوم زیادہ مناسب ہے۔ المؤتفکۃ یعنی قوم لوطؑ کی بستیوں کے لیے فما ھویٰ کے لفظ کا ان کی نوعیت عذاب کے لحاظ سے اوپر سے نیچے گرانے کے ساتھ ترجمہ کیا گیا ہے لیکن اس کے معنی تباہ اور برباد کرنے کے بھی ہو سکتے ہیں ''ان پر چھایا جو کہ چھایا'' اس سے دوسری نوعیت عذاب کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے یعنی پتھروں کی بارش۔

ان تمام قوموں کو ہلاکت کے بعد اللہ کی نعمتوں کو یاد دلایا ایک بڑا سخت تازیانہ ان قوموں اور افراد کے کردار پر ہے جس کی چوٹ انہیں محسوس کرنا چاہیے جو اس وقت دار دنیا میں موجود ہیں اور انہی کے کردار کے حامل ہیں کہ ایسوں کا وجود انسانیت کی پشت پر ایک بوجھ ہے جس کا

---

[1] ۔ قال ابن زید: اغنی فاکثر واوقنی اقل قرأ۔ یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ ویقدر لہ (ابن جریر)

[2] ۔ کان المشرکین میمو الدین ابن ابی کبشہ الخانۃ ایاھم فی الدین لما خالف ابو کبشہ غیرہ فی عبادۃ الشعریٰ (مجمع البیان)

[3] ۔ کان ھلاک عاد الآخرۃ ینبغی بعضھم علی بعض فتقانوا بالقتل ... ابن جریر)

اتر جانا باقی ماندۂ افراد انسانی کے لیے بہت بڑی نعمت الٰہی ہے جس میں انہیں کوئی شک وشبہ نہیں ہونے چاہیے۔اس پہلو پر ہم نے ایسے موقع پر پہلے بھی توجہ دلائی ہے جہاں قرآن مجید میں ایسی قوموں کی تباہی کے بعد کہا ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. یعنی ان کی تباہی ایسی چیز ہے جس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿۵۶﴾ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾

''یہ بھی ایک ڈرانے والا رسول ہے پہلے ہی ڈرانے والوں کے قبیل سے۔قیامت قریب آ گئی ہے جس کا اللہ کے سوا پردہ کشائی کرنے والا کوئی نہیں ہے''۔

اصطلاح قرآن میں رسول کو نذیر کہتے ہیں تو یہ آیت ویسی ہی ہے جیسے: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ نہیں ہے محمد ﷺ مگر ایک پیغمبر جن کے پہلے بھی پیغمبر آ گئے (سورہ آل عمران ۔ ۱۴۴) دوسری جگہ ہے :۔وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ. اور آپ کے پہلے بھی ہم نے پیغمبر بھیجے قبل کے لوگوں میں۔(حجر۔۱۰)

تیسری جگہ ہے:۔

مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ (احقاف۔۹) میں پیغمبروں میں کوئی انوکھا نہیں ہوں۔

سب کا مطلب یہ ہے کہ رسول کا بھیجا جانا کوئی نئی بات نہیں ہے، پہلے بھی رسول برابر ہوتے رہے ہیں۔

دوسرا تصور جسے طبری نے ترجیح دی ہے [1] کہ اس کے پہلے چونکہ عاد اور ثمود وغیرہ کی بربادی کا ذکر ہے تو اب یہ فرمانا اس امت کی تنبیہ کے لیے ہے کہ کہیں تمہارا انجام بھی ویسا ہی نہ ہو، جیسا ان کا ہوا مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس صورت میں ''نذیر'' کے بجائے 'انذار، ہونا چاہیے تھا کہ اب جو تمہیں ڈرایا جاتا ہے یہ ویسا ہی ڈرانا ہے جیسا کہ پہلے بھی ہوا تھا۔تو تمہیں بھی ڈرنا چاہیے کہ کہیں ویسا ہی عذاب تم پر نہ آ جائے۔مگر یہاں اس کے بعد قیامت کے قرب کا اعلان ہے۔ہمارے نزدیک رسول اللہ کے تشریف لانے کے ساتھ بلا فاصلہ قیامت کا ذکر اس کی دلیل ہے کہ آپ کے اور قیامت کے درمیان کوئی پیغمبر نہیں ہے اور اس طرح یہ ختم رسل کا ایک ثبوت ہے۔

یہ اس صورت میں ہے جب ازفه کے معنی قیامت کے ہیں اس لیے کہ اسے متعدد جگہ قرآن میں قریب کہا گیا ہے اور ایک یہ لفظ قیامت کے لیے بطور نام آئی ہے۔ارشاد ہوا ہے: وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ جس کا مطلب یہی ہے کہ انہیں قیامت کے دن سے ڈرایئے۔ (مؤمن۔۱۸) اب لیس کے ساتھ یہ فقرہ جو ہے کہ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ . (نجم۔۵۸) اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کا ہٹانے والا سوا اللہ کے کوئی نہیں مگر قیامت کے ساتھ ''ہٹانے'' کا کوئی تصور چسپاں نہیں رہتا اور ہم نے یہ ترجمہ کیا کہ اللہ کے سوا اس کی پردہ کشائی کرنے والا کوئی نہیں۔اب پردہ کشائی بایں معنی کہ اسے سامنے لایا جائے یعنی قیامت کا برپا کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں یا اس کے صحیح وقت کو تعین کے ساتھ بتانے والا کہ وہ کب آئے گی؟ کوئی نہیں۔اور یا مانا جائے کہ مشرکین کے لیے اس دنیا ہی میں کسی تباہی کے نزدیک ہونے کا اعلان

---

[1] ۔قوله هذا ايكون اشارة الىٰ ما تقدمها من الكلام اولىٰ واشبهه (ابن جرير)

ہو، جیسی امم سابقہ پر جن کا ذکر پہلے ہو، تباہی آئی۔ اس طرح کاشفہ کا ترجمہ ''ہٹانے والا'' درست ہوگا۔ یعنی وہ بری ساعت جو قریب ہے اس کا ہٹانے والا سوا اللہ کے کوئی نہیں ہے۔

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿٦١﴾
فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿٦٢﴾ السجدة

''تو کیا اس تذکرے سے تم تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو اور تم غرور سے سر اٹھائے چلتے ہو تو اب اللہ کے لیے سجدہ کرو اور عبادت گزار رہو''۔

حدیث جس کا ترجمہ ہم نے ''تذکرے'' کے ساتھ کیا ہے، اس سے مراد قبل میں جو کچھ بیان ہوا اس کی طرف اشارہ تو ہو سکتا ہے مگر چونکہ قرآن مجید میں متعدد آیات میں خود قرآن مجید کے لیے اس لفظ کا استعمال ہوا ہے جیسے سورۂ واقعہ آیت ۸۱، ۸۲ میں:

اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿٨١﴾ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿٨٢﴾ تو کیا اس ''تذکرے'' سے تم لوگ منحرف ہو اور اپنی روزی بنائے ہو کہ اس کو جھٹلاتے ہو۔

اور سورۂ ''مرسلات'' کے آخر میں:

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ '' تو کس تذکرے پر اس کے بعد تم ایمان لاؤ گے؟

اس لیے یہاں بھی ''اس تذکرے'' سے قرآن مراد لیا گیا ہے [1] سامدون کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے، صحاح جوہری کے مطابق ہے کہ سمد سمودا رفع رأسہ تکبرا۔ اور دوسرے مترجمین نے مختلف ترجمے کیے ہیں [2]

اس آیت کے آخر میں دو سجدۂ عبادت کا حکم ہے، اُس کی تعمیل میں سجدہ یہاں پر شریعت اسلام میں فقہ جعفری کی رو سے واجب ہے [3] جسے احترام فرمان الٰہی کی ایک رمزی علامت کے طور پر تعبدی حکم سمجھنا چاہیے۔

---

[1] ۔افمن هذا القرآن ایها الناس تعجبون (ابن جریر)

[2] ۔بازی کنند هستید (شاه ولی الله) تم غفلت مینهو (رفیع الدین)

[3] ۔علی ما یذهب الیه اصحابنا (تبیان)

سُوْرَۃُ الْقَمَرِ

مکّیہ ..... ۵۵ ..... آیات

چونکہ پہلی ہی آیت میں چاند کے شق ہونے کا ذکر ہے، اس لیے اس کا نام سورۂ قمر ہوا۔

سورۂ قمر کے خاص خاص مضامین:

۱.....قیامت کا قریب آنا اور شق القمر ہونا۔

۲.....اتمام حجت ہو جانا اور اس کے بعد پیغمبروں کے فرض کا پورا ہو جانا۔

۳.....قیام قیامت کا ابتدائی ہولناک منظر۔

۴.....قوم نوح اور طوفان کی نوعیت۔

۵.....کشتی نوح کا ستاروں کے سہارے ہی نہیں بلکہ اللہ کی نگاہوں کے اشارے پر چلنا۔

۶.....قوم عاد پر عذاب اور اس کا ایسے دن آنا جو دائمی طور پر منحوس ہے۔

۷.....قوم ثمود اور ناقۂ صالح اور قوم کو ہدایت کہ ایک دن چشمے کا پانی اس کے حصے کا ہوگا، کوئی اس دن چشمے پر نہ جائیں اور ایک دن ان لوگوں کا ہوگا۔ قوم کی نافرمانی اور ناقے کو پے کر ڈالنا اور پھر عذاب الٰہی کا آنا اور اس کا مختصر پس منظر۔

۸.....قوم لوط پر عذاب کا آنا اور اس کا مختصر پس منظر۔

۹.....قوم فرعون پر عذاب کا بہت مجمل تذکرہ

۱۰.....زمانۂ رسولؐ کے مشرکین کو سخت ترین الفاظ میں انتباہ۔

۱۱.....اس کی طرف اشارہ کہ ان کے افعال تو وہی ہیں جن کی وجہ سے قوموں پر عذاب نازل ہوتا رہا اور انکے پاس اس عذاب سے بچنے کے لیے کوئی روک نہیں ہے، مگر کچھ ہے جو ان کے عذاب کو آخرت پر اٹھا رکھا ہے جس کا سبب دوسری جگہ ہے کہ رحمۃ للعالمین کے قدم کی برکت ہے جو اس دنیا میں اس طرح کا عذاب نازل نہیں ہوتا۔

۱۲.....نامۂ اعمال کو یاد دلانا کہ یہ نہ سمجھو کہ تمہاری کوئی بات نظر انداز کر دی جائے گی، وہ سب محفوظ ہے۔

۱۳.....آخر میں پرہیزگاروں کو مژدہ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ① وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ② وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ③ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ④ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ⑤

''قیامت نزدیک آ گئی اور چاند دوٹکرے ہوگیا اور اگر وہ کوئی بھی معجزہ دیکھیں تو روگردانی کریں گے اور کہیں گے کہ یہ ایک جادو ہے جو مستقل طور پر قائم ہے اور انہوں نے جھٹلایا اور اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر بات میں یکسوئی ہونا ہے اور ان کے پاس خبریں ایسی آ چکی ہیں جو ان کے باز لانے کے لیے کافی ہیں، پراثر حکمت تو نہیں فائدہ دیتے انہیں ڈرانے والے''۔

شق القمر ہونا

چونکہ پہلے جملے میں قیامت کا ذکر ہے اس لیے معجزات انبیاؑ کے منکرئ روشنی والے لوگ چاند کے شق ہونے کو ان علامات سے متعلق قرار دیتے ہیں جو قیامت سے پہلے ظاہر ہوں گی۔ اس صورت میں شق القمر کے اظہار میں جو ماضی کا صیغہ ہے، اسے یقینی ہونے کی بنا پر مستقبل کی تعبیر سمجھا جائے گا۔ جو مجاز ہے مگر اس کی نظیریں قرآن میں بکثرت موجود ہے اس لیکن چونکہ معجزات پیغمبر اسلام ﷺ میں شق القمر کا معجزہ متواتر موجود ہے اس لیے مجاز قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، رہ گیا قیامت کا قریب ہونا، وہ تو بعثت رسولؐ ہی کو قرب قیامت کی علامت بتایا گیا ہے اور خود قیامت کے قریب ہونے کا اعلان ہے، یہاں تک کہ قیامت کا ایک نام ہی یوم الآزفہ ہوگیا جس کے معنی نزدیکی گھڑی کے ہیں، اور پھر اس کے بعد والی آیتوں میں معجزے کا ذکر ہے کہ کتنے ہی معجزے دکھائے جائیں، یہ نہیں مانیں گے اس لیے ظاہر قرآن سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ معجزہ شق القمر کا بیان ہے۔

بے شک یقینی طور پر جو ثابت ہے کہ وہ اجمالی طور پر شق ہونا ہے جو تمام روایات میں مشترک حیثیت رکھتا ہے لیکن تفصیل اس کی کہ یہ کس نوعیت سے ہے جو ایک ایک دو دو روایتوں میں مذکور ہے، اسے پورے طور پر ثابت نہیں سمجھا جا سکتا جب کہ اس تفصیلی کیفیت کے بارے میں اختلاف بھی ہے۔

رہ گیا سائنس سے اس کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرنا، تو ہمارے نزدیک کسی بھی معجزہ کی نوعیت کا سائنس سے سمجھنے کی کوشش کرنا دور از کار ہے۔

ہماری قدیم تفسیر میں اسے بطور مسلمات درج کیا ہے اور جناب شیخ طائفہؒ نے تبیان میں کثرت روایات کے اظہار کے بعد اس پر تمام مسلمانوں کا اجماع بتایا ہے اور کہا ہے کہ اس میں میخیں نکالنا اس طرح کہ اگر ایسا ہوتا تو دوسرے ممالک میں بھی دیکھا جاتا بالکل بے کار کی باتیں ہیں۔ اس لیے کہ اس کا ظہور ایک مختصر وقت کے لیے شب کے کسی حصے میں ہوا تھا جس وقت بہت سے ملکوں کے لوگ سوتے ہوتے ہیں اور جاگتے بھی ہوں تو پہلے سے اس کا اعلان نہ ہوا تھا کہ لوگ زیر آسمان آ کر اس کے دیکھنے کے لیے آسمان پر مسلسل نظر رکھیں (تبیان) بہر حال جیسا کہ میں نے اپنی بعض کتابوں میں لکھا ہے شق القمر ویسا عمومی معجزہ رسولؐ کا نہیں ہے جسے بطور برہان رسالت تمام خلائق کے لیے پیش کیا گیا ہو بلکہ

انکا اصل معجزہ قرآن ہے جس پر برابر تحدی ہوئی ہے کہ کوئی اس کے مقابل کی چیز پیش کر دے۔

تاہم ہمارے یہاں کی تفاسیر میں اگر چہ تفسیر برہان میں ہمارے ائمہ علیہم السلام کی تین ہی حدیثیں نقل ہوئی ہیں مگر علامہ ابن شہر آشوب نے لکھا ہے کہ سواعطا اور حسن اور بلخی کے تمام مفسرین ومحدیثین کا اس پر اجماع ہے اور علامہ مجلسیؒ نے بھی بحار میں تفصیل کے ساتھ اس سلسلہ کے روایات نقل کیے ہیں۔

اہل سنت کے مفسریں میں حافظ ابن جریر طبری بے جامع البیان میں اس سلسلہ میں جو روایتیں درج کی ہیں، ان میں صحابہ رسولؐ میں انس بن مالک سے سات روایتیں ہیں۔ عبداللہ ابن مسعود سے آٹھ روایتیں ہیں۔ عبداللہ ابن عمر سے ایک۔ خذیفہ بن الیمان سے تین، جس میں سے آخری روایت میں نام نہیں لکھا ہے بلکہ ابوسنان نے بیان کیا ہے کہ ؛ قدم رجل المدائن ایک صاحب مدائن آئے، وہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے یہ کہا۔ ''کھڑے ہوئے'' کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انہوں نے خطبہ پڑھا اور خطبہ پڑھنا گورنر کے ایسے ذمہ دار شخص کا کام ہوتا ہے اور یہ معلوم ہے کہ جناب خذیفہ گورنر بنا کر مدائن بھیجے گئے تھے اور سابق کی دو روایتیں جو صراحۃً حذیفہ کے نام پر مشتمل ہیں مضمون میں اس سے متحد ہیں، اس لیے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب حذیفہ ہی تھے۔ جبیر ابن مطعم سے دو روایتیں اور ابن عباسؓ سے پانچ روایتیں ہیں۔ ان میں ان صحابہ کا چشم دید بیان درج ہے مگر روایتی حیثیت سے ان میں سے بعض میں یہ کمزوری ہے کہ وہ عہد رسولؐ میں کم سن تھے اور یہ واقعہ مکّہ معظّمہ کا ہے جس دیکھنے والے مہاجرین ہو سکتے ہیں جو مکّہ کی زندگی کے شاہد بن سکتے ہوں اس لیے صحابہ کے بیان کا اس واقعہ کے تذکرے میں وہی وزن ہے جو تابعین کے اقوال اس سلسلے میں موجود ہیں جیسے مجاہد اور قتادۃ اضحاک اور ابراہیم وغیرہ۔

بنیادی طور پر اعتقاد رسالت کا رکن نہ ہونے کے بعد بھی چونکہ معجزات رسولؐ میں وہ ایک اہم حیثیت کا معجزہ ہے اور کسی بھی معجزہ کو عقل سے اس کی توجیہہ نہ ہونے کی بنا پر رد کرنا درست نہیں ہے، اس لیے ایک مسلمان سے اس کا انکار درست نہیں ہے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۙ﴿۶﴾ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۙ﴿۷﴾ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ﴿۸﴾

''تو آپ اُن سے منہ موڑ لیجیے کہ جب پکارنے والا پکارے گا ایک سخت ناگوار انجام کے لیے اس عالم میں کہ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی، نکلیں گے قبروں سے جیسے چاروں طرف پھیلی ہوئی ٹڈیاں ہوتی ہے ، دہشت کے ساتھ نظریں جمائیں ہوئے پکارنے والے کی طرف اس وقت کافر کہہ رہے ہوں گے کہ یہ بڑا دشوار دن ہے''۔

مُّهْطِعِيْنَ کے لفظ کے دو معنی اس محل پر چسپاں ہیں۔ ایک جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا ہے اور اقرب الموارد کی تشریح اس کے مطابق ہے کہ ''دہشت زدہ صورت سے نگاہیں جمائے دیکھ رہے ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ پکارنے والے آواز پر تیزی سے دوڑ رہے ہوں گے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ آپ ان سے روگردانی کیجیے'' اس حکم پر پہلی بات ختم ہوگئی یعنی ان پر اتمام حجت ہو چکا، اب اپ ان سے بحث

وتکرار نہ کیجیے۔[1] اس کے بعد حشر ونشر کا ذکر ہونے لگا۔ مطلب یہ ہوا کہ بس اب ان کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ ۝٩ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝١٠ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝١١ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝١٢ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰي ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝١٣ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝١٤ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝١٥ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝١٦ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝١٧

''ان کے پہلے نوح کی قوم والوں نے جھٹلایا تو ہمارے بندے پر دروغ گو ہونے کا الزام لگایا اور کہا دیوانہ ہے اور انہیں سختی سے ڈرایا ڈپٹا گیا تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ میں ان کے مقابلے میں بے بس ہوں تو مدد فرما تو ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیئے برستے پانی کے ساتھ اور ہم نے زمین میں سے چشمے جاری کر دیئے تو وہ سب پانی (ادھر ادھر کا) مل گیا ایک تقدیری فیصلے کے مطابق اور ہم نے ان (اپنے بندے نوح) کو سوار کیا تختیوں اور میخوں والی (کشتی) پر جو ہماری نگاہوں کی اشاروں پر چلتی تھی صلے کے طور پر اس شخص کے لیے جس کی ناشکری کی گئی اور ہم نے اس کو اس ایک قدرت کی نشانی کے طور پر چھوڑ رکھا تو کیا ہے کوئی جو اس سے آ لڑے؟ تو دیکھا کیسا تھا میرا عذاب اور میری طرف ڈرانے والا اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی جو نصیحت قبول کرے؟''

قوم نوحؑ اور طوفان نوحؑ کی نوعیت

سابق والے تذکرے کے بعد یہ کہنا کہ ان سے پہلے نوحؑ کی قوم نے جھٹلایا، اس کی دلیل ہے کہ اس کے پہلے جو شق القمر اور قوم کے جھٹلانے کا جو ذکر تھا وہ رسول اللہ ﷺ کے دور کا ایک واقعہ تھا اور اسی کو اس وقت کے لوگوں نے جھٹلایا تو کہا جا رہا ہے کہ ان کے پہلے اس جرم تکذیب کا ارتکاب کیا اور اسی سلسلہ میں ان کا انجام اور پھر عاد اور ثمود وغیرہ سب کا ذکر ہے کہ ان سب نے جھٹلایا تو ان کا کیا انجام ہوا ہے اسی طرح آخر تک پورا سورۃ شق القمر کو دیکھ کر اس کے نہ ماننے والوں کے ذکر سے مرتبط ہے اور بیچ بیچ میں ہر تذکرے کے بعد اس دور کے لوگوں کو انتباہ ہے اس سب کا قیامت کے تذکرے سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔

اس کشتی کے ذکر کے بعد یہ جملہ کہ اسے ہم نے قدرت کی نشانی کے طور پر چھوڑ دیا، (بعد والوں کے لیے) یہ اس کے بعد واقعات یعنی

---

[1] ۔ھؤلاء ما قبله وبه تتم الكلام (جلالين)

عاد وثمود وغیرہ کے ذکر میں نہیں ہے اور یہ جملہ بعض دوسرے مقامات پر بھی قرآن مجید میں اس کشتی کے تذکرے کے بعد ہے، اس کے ذیل میں ہم نے قبل میں بھی لکھا ہے کہ اس کشتی کے دیکھے جانے کی اطلاع بعض اخباروں میں شائع ہو چکی ہے اور طبری نے جامع البیان میں اپنے زمانے تک کے لیے لکھا ہے کہ امت محمدیہ کے بعض افراد نے اس کشتی کا مشاہدہ بھی کیا تھا۔[1]

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ کے فقرے میں جو نذر کا لفظ ہے یہ عام طور پر نذیر کی جمع ہوتی ہے جس کے معنی ڈرانے والے کے ہوتے ہیں اور عموماً یہ لفظ قرآن میں پیغمبر کے لیے آئی ہے، تو مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے رسولؑ کیسے تھے یعنی انھوں نے عذاب سے ڈرایا تھا، وہ صحیح نکلا یا نہیں؟

مگر یہاں ایک تصور یہ ہے کہ وہ نذر کی مصدر ہے جس کے لیے اقرب الموارد میں یہ تصریح کی ہے کہ وہ مصدر غیر قیاسی ہے اور مجمع البیان میں اسے اسم مصدر قرار دیا ہے جو مصدر کی جگہ پر آیا ہے اب مطلب یہ ہوگا کہ میرا ڈرانا کیسا نکلا؟

لِمَنْ كَانَ كُفِرَ کا جو ترجمہ ہم نے کیا ''صلہ ہے اسکا جس کی ناشکری کی گئی'' اور مراد اس سے جناب نوحؑ ہوں گے۔[2]

یہ كُفِرَ کے لفظ پر منطبق ہے جسکے مطابق قرآن میں اعراب لگا ہوا ہے مگر دوسری تشریح یہ ہے کہ یہ سزا ہے اسکی جس نے کفر کیا، اس صورت میں کفر کے بجائے اس لفظ کو كَفَرَ ماننا پڑتا ہے۔ طبری نے دونوں قول بغیر رد و قدح کے درج کیے ہیں اور بلاشبہ اس اعراب سے قطع نظر کرتے ہوئے معنوی طور پر یہ دوسرا تصور زیادہ واضح ہے۔

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿١٨﴾ إِنَّآ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿١٩﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿٢٠﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٢١﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٢٢﴾

''جھٹلایا قبیلۂ عاد نے تو کیسا تھا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ ہم نے ان کی طرف بھیجا ایک تیز سرد سی ٹھٹھرا دینے والی ہوا کو ایسے دن میں جو ہمیشہ کے لیے منحوس تھا۔ وہ اکھاڑ پھینکتی تھی آدمیوں کو جیسے جڑ سے اکھڑے درختوں کے تنے ہوں تو کیسا تھا میرا عذاب اور میرا ڈرانا اور بلاشبہ ہم نے آسان بنایا ہے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے تو کیا کوئی ہے نصیحت قبول کرنے والا؟''

قوم عاد پر دائمی طور پر منحوس دن کا عذاب ہونا

قوم عاد پر عذاب جس ہوا کے ذریعے سے ہوا، اس کے اوصاف جو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوئے ہیں اس میں ایک وصف تو صرصر کے لفظ میں مضمر ہے کیوں کہ عربی میں صر، سردی کے معنی میں ہے اور، صرصر، میں تکرار حروف سے مبالغہ پیدا ہوا ہے اور تفسیر صافی میں امام محمد باقرؑ کی ایک حدیث میں بھی اسے سرد بتایا گیا ہے مگر نہ صرف سردی اس کی ایسی تھی، بلکہ یہاں اس کا دوسرا وصف بتایا گیا ہے کہ

---

[1] ۔ نظرت الیھا اوائل ھذہ الآیۃ نظراً (ابن جریر)

[2] ۔ ای فعلنا ذالك جزا النوح (صافی)

وہ تیز وتند ایسی تھی کہ آدمیوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی تھی جیسے اکھڑے ہوئے کھجور کے درختوں کے تنے ہوں۔ایک جگہ ہے'' تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا (الاحقاف۔۲۵)'' ہر چیز کو وہ برباد کرتی تھی ،اپنے پروردگار کے حکم سے''،اس کے بعد یہ حکم الٰہی کا کرشمہ سمجھنا چاہیے کہ ان کے مکانات باقی رہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ۔ یہ حکم الٰہی اس لیے تھا کہ کہ وہ مکانات بعد والوں کے لیے باعث عبرت ہوں۔

قوم عاد کے عذاب والے دن کا نحس کہا گہا اور اس کے ساتھ مستمر کی لفظ صرف کی گئی اس لفظ کو بعض لوگ طاقت ور کے معنی میں لیتے ہیں جیسے قرآن میں آچکا ذومرۃ'' طاقت والا'' اسی مرہ کی لفظ سے یہ مستمر ہے۔تب صرف یہ معنی نکلیں گے کہ وہ سخت منحوس دن تھا اور بعض اسے استمرار بعض دوام وبقا سے لیتے ہیں تب معنی یہ ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے منحوس دن تھا اب اس نحوست کے لیے ایک تصور یہ ہے کہ وہ نحوست انہی کے لیے تھی..... ہمیشہ کے لیے۔کیوں کہ یہ عذاب ان پر آیا اس کی بربادی قیامت سے متصل ہے۔

اور ایک یہ کہ ایام ہفتہ میں سے وہ دن قیامت تک کے لیے سب کے واسطے منحوس قرار پا گیا۔اور اسے مطلق بدھ یا مہینے کے آخر کا بدھ بتایا گیا ہے تفسیر صافی میں کئی حدیثیں درج کی ہیں جن میں اسے چہار شنبہ کا دن قرار دیا ہے۔علل الشرائع کی حدیث امام جعفر صادقؑ سے ہے کہ وہ عذاب آٹھ دن قائم رہا تھا جن میں پہلا دن چہار شنبہ تھا اور آخری دن بھی چہار شنبہ تھا۔اس لیے میرا نظریہ یہ رہا ہے کہ ہفتے کے دنوں کی سعادت ونحوست تو کچھ ثابت ہوتی ہے لیکن مہینے کے دنوں میں سعد اور نحس اور میانہ کے جو نقشے چھپا کرتے ہیں ان کا کوئی معتبر ماخذ نہیں ہے۔

جو لوگ سعادت اور نحوست کے منکر ہیں،ان کی تائید کے لیے بھی کچھ احادیث موجود ہیں چنانچہ تحف العقول میں حسن بن مسعود کی روایت ہے کہ میں امام علی النقی علیہ السلام کی خدمت میں گیا۔راستے میں میری انگلی زخمی ہوگئی اور مرکب جس پر سوار تھا،اس نے بھی مجھے بہت پریشان کیا اور راہ میں بھیڑ بھاڑ لوگوں کی اتنی تھی کہ میرے کپڑے پھٹ گئے۔اس حال میں پہنچا تو میں نے امام کے سامنے یہ جملہ کہا: كفاني الله شرك من يوم ما اشبك،'' اے کمبخت دن تو کیسا منحوس تھا،خدا ہی نے تیرے شر سے میری جان بچائی۔

حضرت نے یہ جملہ سن کر فرمایا: ياحسن هذا وانت تغشانا ترمي بذنبك من لاذنب له؛'' اے حسن! یہ عالم ہے جب کہ تم ہمارے پاس آیا کرتے ہو،تم اپنے گناہ کا الزام ایسے پر عائد کرتے ہو جو بے گناہ ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ امام کے اس جملے سے میری عقل واپس آئی اور اپنی غلطی کا احساس کیا۔میں نے عرض کی کیا حضور! میرے لیے خدا سے مغفرت کی دعا کیجیے۔حضرت نے فرمایا:۔ياحسن !ماذنب الايام حتىٰ صرتم تشاءمون بها اذا جوزيتم باعمالكم فيها۔'' اے حسن! دنوں کا کیا قصور ہے جو تم انہیں منحوس قرار دیتے ہو،جب کہ ان میں تمہارے اعمال کی سزا ملے۔

پھر فرمایا:۔لاتعدولا تجعل للايام صنعا في حكم الله۔'' اب ایسا نہ کرنا اور دنوں کی کارگزاری نہ سمجھنا اللہ کے فیصلے میں۔

اس کے علاوہ وسائل الشیعہ کتاب الحج میں ابواب آداب السفر کے آٹھویں باب میں یہ روایت ہے کہ اہل بغداد میں سے ایک شخص نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو لکھا اور مہینے کی آخری بدھ میں سفر کرے اس لیے کہ شگون ماننے والوں کی مخالفت کرنا چاہتا ہو تو وہ ہر آفت وبلا سے محفوظ رہے گا اور خداوند عالم اسے اس کے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے گا۔وہاں اہم واقعات کے انتساب سے مبارک اور منحوس ماننا جیسے ولادت معصومینؑ کی تاریخوں کو مبارک سمجھنا یا وفات کی تاریخوں کو اور اسی میں ایام عزاء داخل ہیں بُرا سمجھنا،یہ دوسری چیز ہے اور اس کی تائید بھی وسائل کی

ایک حدیث سے ہوتی ہے جس میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ پیر منحوس دن ہے اس لیے کہ اس میں ہمارے رسولؐ نے رحلت فرمائی اور وحی کا دروازہ بند ہوا۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿٢٣﴾ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿٢٤﴾ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿٢٥﴾ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿٢٦﴾ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿٢٧﴾ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿٢٨﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿٢٩﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٣٠﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿٣١﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٣٢﴾

''قبیلہ ثمود نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا تو انھوں نے کہا کہ کیا ہم اپنے میں سے ایک عدد آدمی کی پیروی کریں۔ اس صورت میں تو ہم بالکل گمراہ اور دیوانے ثابت ہوں گے۔ کیا ہم میں سے اسی پر وحی خداوندی اتری ہے بلکہ یہ ایک گھمنڈ یا بڑا جھوٹا ہے۔ انھیں بہت جلد کل ہی معلوم ہوجائے گا کہ کون گھمنڈ یا جھوٹا ہے۔ ہم ایک خاص اونٹنی بھیجتے ہیں ان کے لیے ذریعہ آزمائش بنا کر تو انہیں دیکھتے رہو (کہ وہ کیا کرتے ہیں؟) اور ضبط وصبر سے کام لو اور انہیں بتادو کہ پانی ان کے درمیان تقسیم ہوگیا ہے۔ گھاٹ پر ہر باری میں اس کا حق دار حاضر ہوگا تو اب لوگوں نے اپنے آدمی کو للکارا تو اس نے پکڑ کر (اس اونٹنی کو) پے کر ڈالا تو کیسا تھا میرا عذاب اور میرا ڈرانا اور ہم نے ایک بار دھماکا یا تھا تو وہ ہوگئے بھرے ہوکھلیان میں خشک گھانس کی بھوسی کی طرح اور بلاشبہ ہم نے آسان قرار دیا ہے اس قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے تو کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا''۔ ''ڈرانے والوں کو جھٹلایا''۔ اس کی نظیر قبل میں کئی مقام پر آچکی ہے اور وہاں لکھا جاچکا ہے کہ یا تو سمجھا جائے کہ اس قبیلے میں جناب صالح ؑ سے پہلے بھی کچھ انبیا آئے تھے اور یہ آخری تھے جن کے مقابلے میں ان کے کفر وتکذیب کا پانی سر سے اونچا ہوگیا تو ان پر عذاب نازل ہوگیا اور یا یہ کہ چونکہ تمام پیغمبروں کا بنیادی پیغام ایک ہی ہے، اس لیے ایک کا جھٹلانا سب ہی کو جھٹلانا ہے۔

قوم ثمود و ناقہ صالح اور عذاب الٰہی کا آنا

پھر یہاں چونکہ نذر کی لفظ ہے جو ایک قابل لحاظ تشریح کے مطابق مصدر کے طور پر استعمال ہورہی ہے لہٰذا ہم اس جملے میں بھی اسے مصدر ہی لے سکتے ہیں کہ قبیلہ ثمود نے انذار یعنی رسولؐ کی تبلیغ کو جھٹلایا، اس کے بعد وہ ایک رسول یا بہت رسولوں کی بحث پیدا ہی نہیں

ہوں گی۔

''کیا ہم اپنے میں سے ایک آدمی کی پیروی کریں''؟ اس کا مفہوم ہمارے نزدیک تو وہی ہے، جو دوسرے مقامات پر بہت نمایاں ہے کہ انہیں رسول کے بشر ہونے کی وجہ سے ماننا دشوار ہو رہا تھا وہ کہتے تھے کہ ہم میں سے ایک آدمی اور ہم اسے پیغمبر مان کر اس کی اطاعت کریں۔یعنی اگر فرشتہ ہوتا یا کسی اور نوع کا مخلوق ہوتا تو ہم اسے ماننے کے لیے بلا عذر تیار ہو جاتے مگر دوسرے لوگوں کا ذہن ''ہم'' اور ''ایک'' کی طرف گیا ہے کہ ہم جماعت اور یہ ایک فرد یعنی ان کے نزدیک اصولاً فرد کو جماعت کا پیرو ہونا چاہیے۔نہ کہ جماعت اپنی کثرت کے باوجود ایک فرد کی پیروی کرے۔یہ ان کے نزدیک نا قابل قبول تھا۔اس مفہوم کے ہوتے ہوئے یہ ان کے لیے سرمۂ چشم ہے جو نظام دین میں جماعت کی پیروی کو ''اصول ثابتہ'' میں سے قرار دے کر دین میں جمہوریت کے قائل ہو گئے ہیں۔انہیں محسوس ہونا چاہیے کہ یہ کافرانہ ذہنیت ہے۔

سعر کے معنی مفسر طبری نے مشقت وزحمت کے لکھے ہیں لیکن یہاں اس سے زیادہ جنون کے معنی چسپاں ہیں جس کا شاہد قرآں مجید میں دوسرے مقام پر موجود ہے۔

اب جب ان کی سمجھ میں کوئی خصوصیت نہیں تھی کہ ہم ہی میں کا ایک آدمی خدا کی طرف سے پیغمبر ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دعوی ان کے نزدیک غلط ہے تو اس غلط دعوی کا محرک کیا ہے؟ وہ گھمنڈ ہے یعنی یہ غرور کہ دوسروں کو میری پیروی کرنا چاہیے، جیسا کہ دوسری جگہ جناب نوحؑ کے لیے ان کا مقولہ ہے کہ ان یتفضل علیکم وہ ہم پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ پیشوا ہو اور تم سب اس کے پیرو ہو، خالق نے جواب میں کہا کہ عنقریب کل معلوم ہوگا کہ کون گھمنڈ کرنے والا ہے۔مطلب یہ ہے کہ اصل گھمنڈ تو یہ ہے کہ جو شخص اپنے صفات کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ خالق نے اسے پیشوائی کے لیے منتخب کیا، تم لوگ اس کے سامنے سر جھکانے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہو جیسے شیطان نے سجدہ آدمؑ سے بر بنائے تکبر انحراف کیا تھا تو ویسے ہی تکبر کرنے والا وہ ہے جو قابل تعظیم کی تعظیم نہ کرے اور جس کی پیروی اسے کرنا چاہیے، اس کی پیروی سے انحراف کرے۔

اونٹنی کے ذریعہ آزمائش ہونے کا پس منظر روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جناب صالحؑ سے فرمائش کی کہ ہم اس وقت آپ پر ایمان لائیں گے جب اس پہاڑ کے اندر سے جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ایک اونٹنی نکل کر ہمارے سامنے آئے۔

چونکہ قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ سنت الٰہیہ یہ رہی ہے کہ جب کسی خاص قسم کے معجزہ کی فرمائش ہوتی تھی اور وہ معجزہ آجاتا تھا اور لوگ نہیں مانتے تھے تو دنیاوی عذاب نازل ہو جاتا تھا۔علم الٰہی تو تھا ہی کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے تو یہ انجام ہوگا اس لیے کہا گیا کہ اچھا بطور اتمام حجت یہ کر کے دیکھ لو اور پھر ضبط وصبر کے ساتھ نتیجہ کا انتظار کرو اور ہماری اطاعت کی آزمائش اسی ناقے کے ذریعے سے ہے۔وہ یہ ہے کہ چشمے پر باری مقرر رہے گی، ایک دن وہ ناقہ جا کر پانی پیے گا، اس دن کسی آدمی کو وہاں سے پانی پینے کا حق نہ ہوگا۔اور دوسرے دن وہ ناقہ پانی پینے نہیں جائے گا۔یہ لوگ پانی لینے جائیں، پیغمبر نے اس کا اعلان کر دیا۔انھوں نے کچھ دن اس پر عمل کیا مگر پھر ان کے لیے یہ بات نا قابل برداشت ہوگئی اور انھوں نے طے کر لیا کہ ہم اس ناقے کو دنیا میں باقی رہنے نہیں دیں گے۔

کل شرب محتضر کا جو ترجمہ ہم نے کیا ہے کہ ہر ایک کو اپنی باری میں چشمے پر آنا ہوگا۔یہ مفہوم دوسروں نے بھی سمجھا ہے مگر ایک دوسرا مفہوم اس کا یہ کہا گیا ہے کہ ہر دن پینے کی چیز ان کے لیے مہیا ہوگی یعنی ایک دن تو پانی پینے کی ان کی باری ہوگی اور دوسرے دن پانی پر جانا ان

کے لیے ممنوع ہے اس دن انہیں اونٹنی کو دوھ کر اس سے دودھ حاصل کرنے کا حق ہوگا۔[1]

کھشیم المحتظر کے معنی میں بڑے ہی اختلافات ہیں لیکن واضح مفہوم وہی ہے جس کے مطابق اس مرکب اضافی کے دونوں جزوں کے لحاظ سے میں نے ترجمہ کیا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ﴿٣٣﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿٣٤﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ﴿٣٥﴾ وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٣٧﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿٣٨﴾ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿٤٠﴾

''اور لوطؑ کی قوم نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا بلاشبہ ہم نے ان پر ایک سخت پتھراؤ کرنے والی اندھی بھیجی سوا لوطؑ کے خاندان والوں کے کہ انہیں پچھلے ہی کو نجات دے دی فضل و کرم سے اپنی کئے اسی طرح ہم صلہ دیتے ہیں اُنہیں جو شکر گزار ہوں اور انہوں نے ڈرادیا تھا انہیں ہماری سخت گرفت سے تو وہ ڈرانے کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا رہے اور انہوں نے ان پر ڈول ڈالے ان کے مہمانوں کے بارے میں تو ہم نے ان کی آنکھوں کو ختم کردیا تو چکھو میرے عذاب اور میرے ڈرانے کا مزہ اور صبح تڑکے آگیا ان پر عذاب جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے تو چکھو میرے عذاب اور میرے ڈرانے کے مزے کو اور بے شک ہم نے آسان بنایا قرآن کو نصیحت کے لیے تو کیا کوئی ہے سبق لینے والا''۔

قوم لوطؑ پر عذاب اور اس کا مختصر پس منظر

''ڈرانے والوں کو جھٹلایا'' اس پر ابھی ابھی تبصرہ آچکا ہے، یا یہ سمجھا جائے کہ ان میں جناب لوط کے پہلے بھی کچھ نبی آئے تھے یا یہ کہ بنیادی پیغام چونکہ سب انبیا کا ایک ہے لہٰذا ایک جھٹلانا سب کا جھٹلانا ہے..... یا نذر کو مصدر لیا جس کی نظریں اس سورے میں ہیں تو معنی یہ ہوں گے کہ ہمارے ڈرانے کو جھٹلایا..... ہاں یہاں ایک تشریح اور بھی ہے جس سے نذر کے معنی ہوں ڈرانے والے'' مگر انبیا کا بکثرت قصور ضروری نہ ہو، وہ یہ کہ نذر کے معنی ہوں ڈرانے والے تذکرے، جو بنی کی زبان پر آتے ہیں تو مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے ان سبھوں کو جھٹلایا۔[2] پہلے مجملاً جھٹلانے کے نتیجہ کا اظہار ہے، کچھ درمیانی واقعات کی تفصیل کی طرف اجمالی اشارہ ہے اس کا بھی صاف بیان دوسرے سوروں میں ہے۔

---

[1] ۔عن مجاهد يحضرون الماء اذا غابت واذا جائت حضروا اللبن (ابن جرير)

[2] ۔ كذبت قوم لوط بايات الله التي انذرهم وذكرهم بها ...ابن جرير اى الانذار وقيل هو جمع نذير يعنى الآيات التي انذرهم بها موسیٰ (مجمع البيان)

چونکہ حصباً ءسنگ ریزوں کو کہتے ہیں اور حاصب وہ آندھی ہے جس کے ساتھ سنگ ریزے ہوں اور ظاہر یہ ہے کہ اسی خارق عادت کی حد تک غیر معمولی شدت سے پتھروں کی بارش کا تصوّر وابستہ ہے لہٰذا یہاں جو بات کہی ہے اُس کی پرزور تعبیر ہے جو دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ اُن پر پتھروں کی بارش ہوئی۔

''ان کی آنکھوں کو ختم کر دیا'' اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ بصارت زائل ہوگئی چنانچہ تفسیر جامع الجامع میں ہے کہ اب وہ گھر سے باہر نکلنا چاہتے تو انہیں گھر کا دروازہ دکھائی نہیں دے رہا تھا حضرت لوطؑ نے انہیں پکڑ کر گھر سے باہر نکالا! ایک تصور یہ ہے کہ آنکھیں بالکل بے نشان ہوگئیں[1] طمس کے معنی چونکہ مٹانے کے ہیں لہٰذا اس لفظ کا قریبی مفہوم یہ ہوسکتا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾

''اور فرعون والوں کے سامنے بھی ڈرانے والی چیزیں آئیں تو انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں گرفت میں لے لیا اس طرح جیسے ایک زبردست اقتدار والا طاقتور اپنی گرفت میں لے''۔

اس اجمال میں جناب حضرت موسیٰؑ کے تمام معجزات سمٹے ہوئے ہیں اور پھر گرفت کی لفظ میں ان کے ڈوبنے کا پورا حال مضمر ہے جس کی تفصیل قرآن میں دوسرے مقامات پر ہے، یہاں فقط اسے ان اشاروں سے یاد دلایا گیا ہے۔

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴿۴۶﴾

''تو کیا تمہارے کافر ان لوگوں سے بہتر ہیں یا تمہیں معافی کا پروانہ مل گیا ہے، کتابوں میں یا وہ کہتے ہیں کہ ہم بڑی یکدل جماعت ہیں جو فتح حاصل کر کے رہے گی، یہ جماعت بہت جلدی شکست کھائے گی اور یہ سب پیٹھ پھرائیں گے ہاں ان کی (اصل) سزا کا وقت مقرر ہے قیامت والی گھڑی کا اور وہ گھڑی سخت مصیبت اور بہت زیادہ تلخ منزل ہے''

زمانہ رسولؐ کے مشرکین کو سخت ترین الفاظ میں انتباہ

''شروع کیا گیا کلام اکفارکم قریش کی طرف رخ کر کے پھر جیسے متکلم نے ان کی طرف سے منہ موڑ لیا کہ یہ تو کسی سنجیدہ گفتگو کے لائق ہی نہیں ہیں لہٰذا دوسروں سے کہا جانے لگا۔ اس ذیل میں جن جن باتوں سے وہ تصور کر سکتے تھے کہ ہم اس انجام سے جو گزشتہ قوموں کا ہوا، دوچار نہیں ہوں گے، ان میں سے ایک ایک کو لے کر سوالیہ انداز میں اسے غلط قرار دیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ ایسا بھی نہیں ہے کہ تم

---

[1] ۔فسخناها وسويناها كساوالوجه (صافی)

اوصاف وکردار میں ان قوموں سے بہتر ہو، ایسا بھی نہیں ہے کہ تمہیں کتب سماوی میں نجات کا پروانہ مل گیا ہو، پھر سب سے زیادہ ان کو جس چیز پر ناز تھا، اسے دوسری طرف رخ کر کے کہا گیا ہے کہ یہ ان کا زعم کہ ان جماعت کی کثرت اور یک جہتی انہیں بچالے گی، بھی غلط ہے یہ کثرت یک دلی عارضی ہے۔ ہوائے انقلاب کا ایک جھونکا ان کے تتر بتر ہونے کے لیے کافی ہے۔

یہ شکست اور یہ انتشار اسی دنیا میں جلد ہی بدر کے میدان میں سامنے آ گیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ روایت میں ہے کہ جب وہ لوگ بھاگ رہے تھے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عجیب پر جوش خوشی کے ساتھ اسی آیت پڑھ رہے تھے سیھزم الجمع ویولون الدبر۔ بعد میں کہا گیا ہے کہ یہ علامتی طور پر ان کی سزا ہے، اصل ان کی سزا قیامت میں ملے گی جو بہت زیادہ سخت ہوگی۔

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾

''یقیناً مجرم لوگ گمراہی اور دیوانگی میں ہیں، اس دن (معلوم ہوگا) جب آگ میں پھینکے جائیں گے اپنے منہ کے بھل چکھو دوزخ کا مزہ''۔

پہلے قوم ثمود کے حال میں آچکا ہے کہ انہوں نے کہا کہ کیا ہم اپنے ایسے آدمی کی پیروی کریں، یہ تو ہماری گمراہی اور دیوانگی ہوگی، اب یہاں بھی سعر کی لفظ گمراہی کے ساتھ ہی ہے بظاہر یہی معنی ہیں بعد میں جو آگ کا ذکر ہے، وہ اس کا نتیجہ ہے جو انجام میں ورنما ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سعر آگ سے جلنے ہی کے معنی میں ہو جس کا اطلاق حال میں باعتبار انجام مستقبل کر دیا گیا ہے [۱]

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴿۵۰﴾

''بے شک ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے ایک پیمانہ خاص پر اور نہیں ہے ہماری بات مگر ایک دم مثل چشم زدن کے''۔

''پیمانہ خاص'' ابتدا انتہا اور مدت بقاء کے لحاظ سے [۲]

اس کا تعلق قضاؤ قدر کے مسئلہ کے ساتھ لیا گیا ہے اور اس کے لیے طبری نے صدر اول کے مفسرین کے کئی قول نقل کیے ہیں کہ وہ مجرم جن کا اس کے پہلے ذکر تھا، وہ ہیں جو تقدیر کے بارے میں جناب رسولؐ سے بحث کر رہے تھے۔

''ہماری بات نہیں ہے مگر مثل ایک چشم زدن کے''۔ یہ وہی باتیں ہیں جن کے لیے دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے کہ وہ کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو بس حکم ''کن'' کے ساتھ وہ وقوع میں آجاتا ہے [۳] اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد قیامت کا لانا ہے [۴]

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾

---

[۱] ۔فی سعر یعنی فی عذاب النار سعرھم ومعناہ انھم یصیرن الیہ (تبیان)

[۲] ۔لہ وقت واجل ومدۃ (علی ابن ابراھیم)

[۳] ۔القمی یعنی یقول کن فیکون (صافی)

[۴] ۔وما امرنا بمجیئ الساعۃ فی السرعۃ الا کطرف البصر عن ابن عباس (مجمع البیان)

وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّ كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾

''اور ہم نے سب ہی تمہارے ہم کیشوں کو ہلاک کر دیا تو کیا کوئی ہے سبق لینے والا، اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا نامۂ ہائے عمل میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی ہے''۔

یعنی نیکی چاہے چھوٹی ہو یا بڑی ہو، وہ بھی نامہ عمل میں درج ہوتی ہے اور برائی چاہے چھوٹی ہو یا بڑی، وہ بھی اس میں درج ہوتی ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ﴿۵۴﴾ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۵۵﴾

''یقیناً پرہیز گار لوگ بہشتوں اور نہروں میں ہیں، سچائی کے محل میں اس بادشاہ حقیقی کے دربار میں جو بڑا صاحب قدرت ہے''۔

''سچائی کے محل میں''، یعنی جہاں سچوں کے سوا جھوٹوں کا گزر نہیں تو وہاں کسی زبان پر کوئی گفتگو نہیں جو حقیقت کے خلاف ہو جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ۔(طور۔ ۲۳) ''نہ وہاں کوئی بے کار گفتگو نہ گناہگار ٹھہرانے والی بات چیت'' اور ایک جگہ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا۔ (واقعہ۔ ۲۵) نہ وہاں کوئی لغو بات سننے میں آئیگی اور نہ گناہگار ٹھہرانے کی''[1]

زیادہ ذہن سے قریب یہی معنی ہیں، ورنہ اس کے علاوہ کئی قول اس کی تشریح میں اور ہیں، مثلاً یہ کہ اس کا مطلب ہے ایسا مقام جو واقعی بہت اونچے درجے کا ہے ہر حیثیت سے پسندیدہ یا یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دائمی طور پر برقرار رہنے والی جگہ ہے یا یہ کہ اللہ کا وعدہ اس محل کے داخلے سے سچائی ثابت ہوا ہے۔[2]

---

[1] ۔فی المجلس حق لا لغو فیہ ولا تاثیم (تبیان)

[2] ۔قیل صفہ بالصدق لکونہ رفیعا مرضیا وقیل لدوام النعیم وقیل لان اللہ صدق وعدہ اولیائہ فیہ (مجمع)

سُوْرَۃُ الرَّحْمٰنِ

مدنیّہ.....۷۸.....آیات

اس طرف کے بہت سے سوروں کی طرح اس سورے کا نام سورے کی پہلی ہی لفظ پر ہوگیا ہے۔اس میں خدا کی نعمتوں اور قدرت کی نشانیوں میں سے ایک ایک کا ذکر کر کے انسان وجن کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ اس ذیل میں جن مضامین کا تذکرہ ہوا ہے۔

سورۂ رحمٰن کے خاص خاص مضامین:

۱.....تخلیق انسان وتعلیم بیان۔

۲.....نظام شمسی کا ارادۂ الٰہی کے ساتھ قیام۔

۳.....نباتات خالق کے لئے سربسجود۔

۴.....خالق کی طرف سے توازن کا قیام۔

۵.....خلق خدا کے لیے نمونہ عمل۔

۶.....زمین اور اس کے نباتات سب انسان کے لیے خداوندی نعمتیں ہیں جنہیں یاد رکھنا چاہیے۔

۷.....انسان کی تخلیق خاک سے اور جنات کی آگ سے۔

۸.....دو مشرق اور دو مغرب۔

۹.....دو دریاؤں کی آمیزش اور ان سے موتی مونگے کی برآمد۔

۱۰.....سب چیزوں کو فنا اور وجہ الٰہی کو بقاء۔

۱۱.....قدرت الٰہی کے مقابلے میں انس وجن کی بے بسی۔

۱۲.....ہول قیامت۔

۱۳.....دوزخ کا منظر۔

۱۴.....نعمات جنت کا ذکر جس کا سلسلہ آخر سورۂ تک ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''۔

اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾

''سب کو فیض پہنچانے والا، اسی نے قرآن سکھایا، انسان کو پیدا کیا، اسے بیان کرنا سکھلایا''۔

تخلیق انساں و تعلیم کا بیان

تخلیق کے ساتھ بیان کے علم کا وابستہ کرنا پتہ دیتا ہے کہ اس سے وہ جوہر خاص مراد ہے جس سے انسان کا امتیاز دوسرے انواع حیوان سے ہے جس کی تعبیر علمائے منطق ''ناطق'' کے ساتھ کرتے ہیں۔

چونکہ اس سورے میں دنیا اور آخرت دونوں کی نعمتوں کا ذکر ہے، وہ بھی جو مؤمن و کافر سب کے لیے عام ہیں اور وہ بھی جو مؤمنین کے لیے خاص ہیں، اس لیے آغاز سورہ کا لفظ ''رحمٰن'' کے ساتھ ہوا۔

چونکہ مشرکین الرحمٰن سے بہت خوف محسوس کرتے تھے اور پوچھتے تھے کہ یہ رحمٰن کون ہے؟ اور پھر قرآن کے لیے کہتے تھے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی تعلیم کوئی آدمی دیتا تو پہلے جملے میں ان دونوں کا جواب ہوسکتا تھا۔ رحمٰن کا تعارف بھی جو آخر سورہ تک اس کی نعمتوں کے شمار سے قائم ہے اور اس کا بھی کہ انہیں قرآن کی تعلیم دیتا ہے؟ جواب ہے کہ وہی خدائے رحمٰن جس کی یہ سب نعمتیں ہیں اس نے قرآن کی تعلیم دی ہے۔ [1]

رحمٰن کی لفظ کے ساتھ قرآن کا تذکرہ یہ تصور پیدا کرتا ہے کہ غائبہ کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ وجود خارجی میں مؤخر ہوتی ہے مگر وجود ذہنی میں مقدم ہوتی ہے تو خلقت انسانی کی بے شمار منزلیں طے کرنے کے بعد اگرچہ ظاہر میں رسول آیا جسے قرآن عطا ہو مگر خالق کا جو ہمہ گیر فیض کا مرکز ہے مقصود اول ایسی ہی ہستی کو پیدا کرنا تھا جو اس کے ہمہ گیر فیض کا جو ''رحمٰن'' کی لفظ سے ظاہر ہے مظہر اتم ہوتی ہوئی رحمت اللعالمین ہو جس پر یہ کتاب اترے جو ''ھدی للناس'' ہے اور اس لیے وہ نوع انسان کا، مقصد تخلیق ہے جس کا پہلے ذکر کے پھر انسان کی تخلیق ہے لہٰذا اس کو آخر عمر بشر تک اس کی رہنمائی کے لیے غیر منسوخ حیثیت سے باقی و دائم رہنا چاہیے۔

وہ بیان جو عام معنی میں مطلق نوع انسان کی خصوصیت ہے اور جو تخلیق کے ساتھ وابستہ ہے خصوصی طور پر کچھ افراد انسانی کے لیے وحی اور الہام سے جو اس کی تعلیم ہے وہ علمه البیان کی مصداق اتم ہے اس بنا پر ایک تفسیر کے لحاظ سے تو الانسان سے مراد یہ معصوم ہستیاں ہیں [2] اور وہ ان افراد کے لیے سرمہ چشم ہے جو معصومین علیہم السلام کو انسان کہنے کے روادار نہیں ہیں۔

درصورتیکہ نوع سے متعلق لیا جائے اور بیان سے مراد وہ جوہر امتیازی لیا جائے جس کی تعبیر منطق میں ناطق کی لفظ سے کی گئی ہے مگر اس ''ناطق'' کی تشریح کیا ہے حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ حیوان کی بولیاں بھی ان کا ایک طرح کا نطق ہیں جس سے اظہار مطالب ہوتا ہے جس طرح حضرت داؤد و سلیمانؑ کے لیے ہے علمناہ منطق الطیر'' ہمیں طائروں کی گفتگوؤں کا علم دیا گیا ہے'' اور ہدہد طائر اور پھر چیونٹی سے حضرت سلیمانؑ کی گفتگو کی صراحت ہے۔ پھر یہ نطق کیا ہے جو انسان سے مخصوص ہے۔

منطق کے مورث اعلیٰ ارسطو چونکہ اپنے فلسفی معقولات کی دنیا کے اسیر تھے لہٰذا انھوں نے ''ناطق'' کے معنی ''مدرک کلیات'' فارسی

---

[1] ۔لما کانت هذا السورة مشتملة علی تعداد النعم الدنیویه ولآخرة صدرها بالرحمٰن (صافی)

[2] ۔عن ابی الحسن الرضا۔ ذالك امیر المؤمنین علیہ السلام علمه بیان کل شئ یحتاج الناس الیه ...علی ابن ابراهیم)(وقیل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (تبیان)

میں ''دریابندۂ معقولات کے قرار دئے مگر اہل دین کی زبان میں جو چیز ہے، وہ نظری طور پر امتیازی حق و باطل اور عملی حیثیت سے امتیاز حلال وحرام ہے۔اس لیے دینی حلقے کے قدیم مفسرین کے تعبیرات اس محور پر گردش کرتے ہیں مثلاً قتادہ کی جو کئی روایتیں ہیں، ان میں ایک میں ہے'' علمه الله الدنیا والآخرة تبین حلاله وحرامه ''اسے دنیا کی اور آخرت کی وضاحت کا علم دیا اور اپنے حلال وحرام کو بیان کیا۔

دوسری میں ہے کہ'' الدنیا والآخرة'' تیسری میں ہے'' تبین له الخیر والشر ومایاتی ومایدع ''اس کے لیے خیر وشر نمایاں ہوا اور جسے اختیار کرے اور جسے ترک کرے۔

مفسر طبری نے اس سب کی ہمہ گیر انداز میں اس طرح وضاحت کی ہے۔

ان الله علم الانسان مابه الحاجة الیه من امر دینه ودنیاه من حلال والحرام والمعائش والنطق وغیر ذالك مما به الحاجة الیه لان الله جل ثناؤه لم یخصص بخبره ذالك انه علمه من البیان بعضنا دون بعض بل عم فقال علمه البیان.....(جامع البیان)

اللہ نے انسان کو تعلیم دی ان باتوں کی جن کی اسے ضرورت ہے اپنے دین و دنیا کے امور میں سے خواہ امتیاز حلال وحرام ہو بسر زندگی کے طریقے اور اظہار خیال اور جو کچھ اسے ضرورت ہو، اس لیے کہ خالق نے اس اعلان میں کہ اس نے بیان کی تعلیم دی کسی ایک چیز کو امتیازی طور پر مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ عام طور سے کہا ہے کہ اسے بیان کی تعلیم دی۔

ہاں عام طور پر یہ تعلیم عطائے قوت کے طور پر ہوتی ہے جو باختلاف مدارج رونما ہوتی ہے اور کچھ امتیازی ہستیوں کے لیے یہ تعلیم عطائے فعلیت کی صورت سے ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے دوسروں کی رہنمائی ہو۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝۵ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ۝۶

''سورج اور چاند ایک معیّن حساب کے ماتحت چل رہے ہیں اور بیلیں اور درخت سجدہ ریز ہیں''۔

خالق کے مقرر کردہ حساب سے پورا نظام ثوابت وسیارات چل رہا ہے اور بیلیں اور درخت اس کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اپنے منازل حیات کو طے کرتے ہیں یہی ان کا سجدہ ریز ہونا ہے۔

جب کہ یہ معلوم ہے کہ کلام عرب میں بیلوں کو نجم کہتے ہیں تو ان لوگوں کا تصور جو نجم کو آسمان کے ستارے کے معنی میں لیتے ہیں [1] جبکہ درخت سے اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے، بلا وجہ ہے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ ۝۷ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ۝۸ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ۝۹

''اور آسمان کو اس نے اونچا کیا اور توازن قائم رکھنے کا اصول مقرر کیا تا کہ تم توازن قائم رکھنے میں سرکشی نہ کرو اور تم انصاف سے ٹھیک طریقے پر تولا کرو اور تولنے میں دوسروں کا خسارا نہ کرو''

---

[1] ۔عن مجاهد قال نجم السماء...ان قتادة یعني نجم السمآء (ابن جریر)

خالق کی طرف سے توازن کا قیام

''آسمان کو اونچا کیا'' کے معنی یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ پہلے نیچا تھا، پھر اسے اونچا کیا بلکہ یہی معنی ہو سکتا ہے کہ اس نے اسے اونچا پیدا کیا [1] ''میزان'' کہتے ہیں ترازو کو مگر ترازو عدالت قائم رکھنے کا ذریعہ ہوتی ہے اس لیے یہاں حقیقت شناس مفسرین نے ووضع المیزان کے معنی یہی کیے ہیں کہ اس نے عدالت کا معیار مقرر کیا ہے۔ [2]

اور چونکہ عدالت کا معیار دین اور شریعت ہے اور آسمانوں کی بلند قرار دینے میں جس نظام کی طرف اشارہ ہے وہ نظام تکوینی ہے، اس لیے بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عدل سے نظام تشریعی مراد ہو جس میں عدالت کی اتنی اہمیت ہے کہ حدیث نبوی میں عدل پر آسمان وزمین کے نظام کا دارومدار بتایا ہے۔ [3] اور اسی پر اس ہدایت عام کی بنیاد ہے جسے تاکیدی طور پر کہا گیا ہے کہ لین دین میں ترازو کو ٹھیک رکھو، جس کی بنا پر جناب ابن عباسؓ ان آیتوں کو بازار میں پڑھ کر دوکانداروں کو تاکید کرتے تھے کہ ناپ تول میں ناانصافی ایسا جرم ہے کہ بعض امم سابقہ پر اسی کی وجہ سے عذاب نازل ہوا تھا۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ﴿۱۰﴾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ﴿۱۱﴾ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿۱۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾

''اور زمین کو اس نے بنایا تمام خلائق کے لیے جس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت، خاص طرح کے غلافوں والے اور دانے کھانے کے کام آنے والے جو پتوں کے اندر ہوتے ہیں اور خوشبودار پھول تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کس کو تم جھٹلاؤ گے؟''

زمین اور اس کے نباتات خداوندی نعمتیں

اس پورے سورے کی ساخت اسی طرح ہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مخاطب جماعت کو تازیانے لگائے گئے ہیں کہ تم کس کس اللہ کی نعمت کو جھٹلاؤ گے اور نظم ونثر ہر ایک میں ادبی پیرایوں سے واقف افراد محسوس کرتے ہیں کہ یہ تکرار میدان مقصد میں ہر بار ایک مہمیز ہوتی ہے جس کی دھمک سے مخاطب دماغ میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔

آغاز سورے کا غذائے روحانی کے ذکر سے ہوا تھا جو علم ہے اور سب سے آخر میں اب اس غذا کا ذکر ہو رہا ہے جو رزق جسمانی ہے تو اب یہ جملہ اس سب سے متعلق ہے کہ تم دونوں کس کس نعمت کا اپنے پروردگار کی انکار کرو گے؟

''تم دونوں'' کون یہ ابھی کھل جائے گا جب انسان اور جنات کی خلقت کا ذکر ہوگا اور پھر بعد میں صراحتہً مخاطب بنایا جائے گا یا معشر الجن والانس ''اے جنات اور انسانو!'' یہی وہ ہیں جن پر مجاہدۂ نفس کے ساتھ خود اختیاری عبادت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے اور ارشاد ہوا ہے''

---

[1] ۔خلقتہا مرفوعة (صافی)

[2] ۔وضع العدل بین خلقه فی الارض (ابن جریر)

[3] ۔بالعدل قامت السمٰوٰت والارض (صافی)

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْن.(الذاریات:۵۶) ''میں نے جنات اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا ہے سوا اس مقصد سے کہ میری عبادت کریں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾

''اس نے آدمی کو پیدا کیا کھنکھناتی ہوئی مٹی سے مثل ٹھیکرے کے اور جنات کو پیدا کیا آگ کے شعلے سے تو تم (دونوں) اللہ کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟''

پہلے انسان یعنی ابوالبشر کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی اس کے تفصیلات یہاں بیان نہیں کیے گئے ہیں بلکہ جیسے نسل انسانی کی تخلیق کے بیان میں کبھی نطفہ کہہ دیا یا کبھی اس کے بعد کی کیفیت کے لحاظ سے علقہ کہہ دیا۔ کبھی مضغہ (گوشت کا لوتھڑا) کہا ہے۔ یہ سب یکے بعد دیگرے کیفیتیں ہوئی ہیں، ویسے ابوالبشر کی تخلیق کے منازل میں کبھی تو تراب کہا جو ابتدائی حالت تھی، کبھی حمإ مسنون جو تر کی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں، کبھی طین کہا ہے جو گیلی مٹی کو کہتے ہیں اور اس کے بعد جب پتلا بن گیا اور وہ بالکل خشک ہو گیا کہ اس میں ہوا کے چلنے سے کھنکھنانے کی آواز پیدا ہونے لگی تو اس وقت کے لحاظ سے صلصال کہا جاتا ہے اور اگرچہ یہ خشک ہونا اس کا ہوا سے ہوا ہے لیکن اب وہ سخت ایسا ہے جیسے ٹھیکرے ہوتے ہیں جو آگ میں پکائے جاتے ہیں۔

ان تمام منزلوں کو تفصیل سے حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے ایک اپنے خطبے میں جو نہج البلاغہ میں شروع ہی میں ہے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾

''پروردگار دو مشرقوں کا اور دو مغربوں کا تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کس کو تم جھٹلاؤ گے''۔

دو مشرق اور دو مغرب

جب تک امریکا کا انکشاف نہیں ہوا تھا اس وقت تک کے معلومات کی حد تک دو مشرق اور دو مغرب کے معنی لیے جاتے تھے، گرمیوں کے موسم کا مشرق اور جاڑے کے موسم کا مشرق [1] اور بعض کہتے تھے کہ سورج اور چاند دونوں کے مشرق اور مغرب مراد ہیں۔ [2] لیکن امریکا کے معرض انکشاف میں آنے کے بعد دو مشرق اور دو مغرب بہت نمایاں ہو گئے ہیں جس طرح رب المشارق والمغارب کا مفہوم بہت سے سورجوں کے انکشافات سے نمایاں ہو گیا ہے جسے میں ''تفسیر بالرأی'' میں داخل نہیں سمجھتا جس کی وضاحت میں مقدمۂ تفسیر میں کی ہے۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

---

[1] ۔مشرق السمآء ومشرق الصیف (جلالین)

[2] ۔قیل المراد بالمشرقین مشرق الشمس والقمر وبالمغربین مغرب الشمس والقمر (مجمع البیان)

تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾

''اس دو دریاؤں کو جاری کیا اس طرح کہ وہ دونوں اکٹھا ہو گئے، ان کے درمیان ایک حد فاصلہ ہے وہ دونوں آگے نہیں بڑھتے، کس نعمت کو اللہ کی تم جھٹلاؤ گے نکلتے ہیں ان میں سے بڑے چھوٹے موتی تو اللہ کی نعمتوں میں سے کس کس کو تم جھٹلاؤ گے؟''

دو دریاؤں کی آمیزیش اور ان سے موتی اور مونگے برآمد

مرج عام معنی ایک چیز کی دوسرے کے ساتھ آمیزش کرنے کے ہیں جو تقریبا (مزج) کے معنی ہیں چنانچہ عام طور پر یہاں بھی یہی معنی کہے جاتے ہیں مگر قدیم مفسرین یہاں بتاتے ہیں کہ مرج کے معنی ہیں چھوڑ دینا اس لیے جانوروں کے لیے کہا جاتا ہے مرج فلان دابہ یعنی فلان شخص نے اپنے جانور کو چھوڑ دیا اور رہا کر دیا۔[1]

اور میں نے یہاں پر ترجمہ اسی مطابق کیا ہے، اس لیے اگر مرج کے معنی آمیزش کرنے کے لیے جائیں تو پھر یلتقیان کا کوئی خاص مفاد نہیں ہوگا دوسرے یہ ان کے درمیان برزخ یعنی حد فاصل ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ایک کے اجزا دوسرے میں نہیں ملتے تو پھر مرج کے اس معنی کی گنجائش کہاں ہے؟

اب یہ بحرین دو دریا ہیں کون؟ اس میں کچھ حضرات نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے کہ یہ ایک دریا ہے آسمان کا اور ایک زمین کا اور وہ ہر سال باہم ملاقات کرتے ہیں۔

کچھ حضرات فرماتے ہیں کہ یہ دریائے فارس اور دریائے روم ہیں۔

اس سے بہتر یہ تھا کہ اس کے تعیین کرنے میں خود اس آیت قرآن سے مدد لی جاتی جس میں دو دریاؤں کا ذکر ہے۔

هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا (فرقان-۵۳) یہ میٹھا ہے اور یہ بالکل نمکین کھاری ہے اور خدا نے ان کے درمیان پردہ اور رکاوٹ کا سامان قرار دیا ہے۔

یہ منظر سفر دریا کرنے والوں کی آنکھوں کے سامنے آتا بھی ہے جہاں میٹھا دریا اور کھاری دریا یعنی سمندر دور تک کاندھے سے کاندھا ملائے چلتے ہیں، ادھر رنگت اور، ادھر اور، ادھر سے کسی ظرف میں پانی لیجیے تو انتہائی کھاری جس کا پینا غیر ممکن اور ادھر سے لیجیے تو میٹھا نہایت خوشگوار نہ یہ اس میں ملتا ہے اور نہ وہ اس میں ملتا ہے۔

اس پر تمام یہاں کے الفاظ منطبق بھی ہیں یا نہیں؟

یوں تو مرجان موتی کے علاوہ ایک اور چیز کو بھی کہتے ہیں جس کا نام مونگا ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ وہ نباتات میں داخل ہے اور وہ دریا میں سے نہیں نکلتی مگر طبری نے بہت سارے اقوال نقل کیے ہیں جو ظاہر ہے کہ یہ سب عربی کے اہل زبان ہیں کہ لؤلؤ مرجان دونوں موتی ہیں صرف بڑے چھوٹے کا فرق ہے۔ اس لیے ہم نے ترجمہ اسی کے مطابق کیا ہے۔

---

[1] ۔اذا خلاها وترکها (ابن جریر)

اب ایک نظری دقت یہ ہے کہ موتی بس ایک دریا یعنی سمندر میں پیدا ہوتے ہیں، دو سے نہیں، اس کا حل یہ ہے کہ چونکہ دونوں دریاؤں کا ایک لفظ تثنیہ سے ذکر کیا گیا ہے اس لیے اگر جب کہ ان میں سے ایک سے موتی برآمد ہوتے ہیں، تب بھی مجموعی طور پر ان دونوں ہی سے پیدا ہوئے جن کی طرف ضمیر تثنیہ کی پھیری گئی ہے۔

یہ تو وہ تشریحیں ہوئیں جو لغت وعرف کی مدد سے عقل کے سہارے سے نکالی جا سکتی ہیں لیکن ایک تاویلی معنی راسخون فی العلم کی طرف نسبت رکھتے ہوئے ہم تک پہونچے ہیں کہ بحرین سے مراد حضرت علی وفاطمہ علیہما السلام ہیں اور برزخ یعنی درمیانی حد فاصلہ سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے جن کی تربیت دونوں کے شامل حال رہی ہے اور لؤلؤ مرجان حسن وحسین علیہما السلام ہیں جو دونوں سے برآمد ہوئے ہیں [1] یہ روایت صحابہ وتابعین میں کے کئی بزرگوں سے وارد ہے۔ [2]

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿٢٤﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٥﴾

''اور اسکے قبضے میں ہیں وہ کشتیاں جو سمندر میں چلتی ہیں بلند کیے ہوئے بادبانوں کے ساتھ مثل پہاڑوں کے تو اللہ کی نعمتوں میں سے کس کا انکار کروگے؟

اس کے قبضے میں ہیں اس لیے کہ ان کی رفتار ہواؤں سے وابستہ ہے جو اس کے حکم سے چلتی ہیں چونکہ سابق زمانوں میں زیادہ تجارتی مسافر سفر دریا سے وابستہ تھے اس لیے نعم الٰہیہ میں ان کشتیوں کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ہے۔

بعض جدید اہل فکر وقلم نے جواری کو آب جاری سے لے کر اس کے معنی ندیوں کے لیے ہیں اور منشآت فی البحر کے معنی یہ لیے ہیں کہ وہ ندیوں سمندروں کے اندر وجود میں آتی ہیں اور کالاعلام کے معنی پہاڑوں کے نہیں، بلکہ سبزہ زاروں کے ہیں۔ اور سمندر کی سطح پر وہ ندیاں جو اس الگ رنگ کی ہیں ایسی نظر آتی ہیں جیسے سطح زمین پر درمیان میں لہلہاتے ہوئے گھانس کے تختے ہوں اور اس کے لیے امریکا کے بحراوقیانوس کا پتہ دیا ہے کہ اس کی سطح پر ایسی ندیاں جاری ہیں جو برطانوی جزائر تک بہہ کر جاتی ہیں لیکن ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جہاں الفاظ کے معنی بدلنے کی ضرورت نہ ہو، صرف مصداق کی تلاش ہو جیسے رب المشرقین ورب المغربین، وہاں تو خیر، لیکن جہاں الفاظ کے معنی کا سوال ہو، وہاں ایسا مفہوم قرار دینا جس سے چودہ سو برس کے بعد بھی عام لوگ واقف نہ ہوں مگر چند آدمی جو امریکا کے انکشاف کے بعد کے دریا کے جغرافیہ کا مطالعہ کرتے رہے ہیں، بلاغت قرآنی کے خلاف ہے جس سے لکھنے والے کے وسعت معلومات کا پتا چل سکتا ہے مگر مراد الٰہی کی تشریح اسے نہیں سمجھا جا سکتا۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٨﴾

''ہر شخص جو اس (روئے زمین) پر ہے نیست نابود ہونے والا ہے اور باقی رہے گا تمہارے پروردگار کا چہرہ جو

---

[1] ۔علی وفاطمہ قال لاینبغی احدھما علی صاحبہ یخرج منھما اللؤلؤ والمرجان قال الحسن والحسین علیہما السلام (علی ابن ابراھیم)

[2] ۔روی عن سلمان فارسی وسعید بن جریر وسفیان الثوری (مجمع البیان)

بزرگی اور عزت والا ہے تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟

یوں تو نظام موت وحیات کا کلیًا نعمت الٰہی ہونا بالکل حقیقت ہے مگر یہاں چونکہ بعد میں وجہ الٰہی کے بقا کا بیان ہے، اس لیے بہت ممکن ہے کہ آخری جملے کا تعلق اسی سے ہوا۔ اب اس حقیقت کی بنا پر خداوند عالم جسم وجسمانیات سے بری ہے اس کے لیے وہ چہرہ نہیں ہوسکتا جو اعضائے جسمانی میں سے ہے اس لیے وجہ الٰہی وہ کامل آثار صنعت الٰہی ہیں جو مکمل ترین ذرائع معرفت الٰہی ہیں جن کا وجود مرکز فیض خلائق ہے۔ [1]

لہٰذا ان کی بقا اس کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اسکی تائید میں ہمارے آئمہؑ کے بعض احادیث بھی ہیں۔ اس کے خلاف دو قول ہیں ایک اہل باطل کا یعنی مجسمہ جو خدا کی جسمیت کی قائل ہیں۔ اس لیے وہ اس کا چہرہ اس طرح مانتے ہیں جیسے ہر شخص کا چہرہ ہوتا ہے حنبلی جماعت کا رجحان اس طرف رہا ہے جس کے پرزور نمائندہ اپنے وقت میں شیخ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن القیم الجوزی وغیرہ ہیں اور یہ بارہویں صدی ہجری کے بعد سے اب تک ابن عبدالوہاب اور ان کے نجدی علماء اور ہم خیال خاص وہابی عقیدے کے افراد جنہیں آل سعود کی پشت پناہی حاصل رہی اُس عقیدے کے علمدار رہے۔ ہمارے نزدیک یہ عقیدہ شان الٰہی کے خلاف ہے۔

دوسرا تصور جو ہمارے بعض علما کا ہے یہ ہے کہ وجھہ کے معنی ذات الٰہی کے ہیں جیسے کہ بسم اللہ سے مقصود ہے اللہ سے مدد حاصل کرنا اور یہ بیچ میں اسم کی لفظ صرف عظمت الٰہی کے پیش نظر رکھتے ہوئے ایک لفظی واسطہ ہے، ویسے ''كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ'' اور ''كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ'' دونوں آیتوں میں مطلب یہی ہے کہ ہر شے فنا ہونے والی ہے صرف ذات الٰہی ہے کہ جسے ہلاک وفنا نہیں ہے۔ اس میں شان الٰہی کے خلاف تو کوئی بات نہیں ہے مگر بعض شواہد اسی پہلے مفہوم کو تقویت دیتے ہیں۔

يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝

''آسمان اور زمین میں جتنے ہیں، سب اس سے سوال کرتے ہیں۔ ہر دن اس کی ایک خاص شان ہے، اللہ کی نعمتوں میں سے کس کا انکار کروگے''؟

یعنی کائنات کی کوئی ہستی اس کے فیض سے بے نیاز نہیں ہے۔ ہر ایک خواہ بزبان مقال یا بزبان حال اس کی بارگاہ میں دست سوال دراز کیے ہوئے ہے۔ یہ تو پہلے جز کا مفہوم بالکل صاف ہے۔ دوسرا جز کہ ہر دن اس کی ایک خاص شان ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ تغیر ذات باری میں محال ہے۔ اس لیے ہر دن جس کا مطلب ہے ہر دقیقہ، ہر ثانیہ اور ہر لمحے اس سے مراد اس کے کرشمہ ہائے قدرت اور مظاہر عمل ہی کر سکتے ہیں۔ [2]

ہر دم اس کا سلسلہ فیض جاری ہے اور مختصر ترین جز وقت میں بھی اس کا سلسلہ فیض قطع ہو تو یہ ''ہستی'' نیستی میں مبدل ہوجائے۔ اس میں تقدیروں کی تبدیلیاں بھی داخل ہیں جنہیں قرآن مجید کے سورۂ حجر میں ''محو واثبات'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور جس کا خاص موقع قرآن مجید نے شب وروز کو قرار دیا ہے۔

---

[1] ۔قال علی ابن حسین علیہ السلام نحن وجهه الذی یؤتی الله منه (علی ابن ابراهیم)

[2] ۔یحیٰ ویمیت ویرزق ویزید وینقص (علی ابن ابراهیم)

یہ خیال کہ تقدیرات سب ازل میں مقرر ہو گئے جن کے مطابق سب کچھ ہو رہا ہے۔ اب خالق کو کوئی فیصلہ کرنا نہیں ہے۔ نہ کوئی کام انجام دینا ہے جو انکار بدأ کا ماحصل ہے، خلاف قرآن ہے اور ہمارے نزدیک اسے وجود باری کا تعطل لازم آتا ہے جو شان الٰہی کے خلاف ہے، قبولیت توبہ استجابت دعا اور مغفرت ذنوب یہاں تک کہ قبول شفاعت جو تمام دینی حقائق مسلمہ ہیں اس سے وابستہ ہیں۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَا الثَّقَلٰنِ ﴿٣١﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٢﴾

''بہت جلدی اب ہم صرف تمہاری (خبر لینے کی) طرف متوجہ ہوں گے اے جنات وانسان تو آخر تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟''

یعنی ابھی تو دور تکلیف ہے۔ مختتم طور پر جزا وسزا کا دور نہیں ہے اور گزشتہ آیت کے تعلق سے ابھی نظم عالم کے بے شمار کام یہیں کرنا ہیں بہت جلد وہ وقت آئے گا اور سب کاموں کا دور ختم ہو جائے گا اور بس تمہاری جزا وسزا کا معاملہ ہمارے سامنے ہوگا۔

اب یہ ان مکلفین کے حسن عمل اور سوء عمل سے وابستہ ہے کہ کسی کے لیے یہ بشارت ہو اور کسی کے لیے انداز، مگر چونکہ وہ جن کا ضمیر مطمئن ہو اور وہ ایمان اور عمل دونوں اعتبار سے نجات اخروی کے مستحق ہوں نسبتہ کم ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے اکثریت کے لحاظ سے اسے تہدید ہی کہہ سکتے ہیں جس کے ساتھ اس کے بعد والی آیت کا بھی تناسب ہے اور ایسی تہدیدی آیتوں میں یہ اختتامی جملہ جو ہر فقرے کے بعد دہرایا جاتا ہے تہدید ہی کا جز بن جاتا ہے کہ جتنا ہو سکے تم ہماری نعمتوں کو جھٹلائے جاؤ۔ اب وہ دن آرہا ہے جب تمہاری خبر لی جائے گی۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿٣٣﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٤﴾

''اے جنات وانسان کے گروہ! اگر ایسا کر سکو کہ اطراف آسمان وزمین کے اندر سے گزر جاؤ تو گزرو! تم نہیں گزرو گے مگر کسی بڑے اقتدار سے تو آخر اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟''

اب تک تو بغیر اقتدار کا مطلب یہی سمجھا گیا کہ یہ تعلیق محال بالمحال کے طور پر ہے کہ یہ اقتدار تمہیں حاصل نہیں ہے لہٰذا اطراف زمین وآسمان سے نکلنا تمہارے لیے ممکن نہیں ہے [1] لیکن اب کے اہل نظر اس کے معنی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ قرآن نے کسی ایسے وقت کی خبر دی ہے جب انسان کو ایسے ذرائع مہیا ہو جائیں گے وہ اس زمین اور اس کے افلاک کے حدود سے باہر نکل جائے ایسے ذرائع ہی کا سلطان کی لفظ کے ساتھ استثنا کیا گیا ہے۔ [2]

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿٣٥﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ

---

[1] ۔ بقوة ولا قوة لكم على ذالك (جلالين)

[2] ۔ آیا ساختن ''آپلو'' برای رفتن بماہ رسیدن به سلطان است؟ آیا با آپلو بشر از اقطار زمین باز اقطار زمین وسموت هفتگان آنخارج نشدند؟ (قاموس قرآن)

رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾

''تم دونوں کی طرف بھیجا جائے گا ایک شعلہ آگ کا اور دھواں تو تم اس کے مقابلے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے''

عام طور پر نحاس کا ترجمہ ''دھواں'' جیسے ہم نے کیا ہے ہوتا رہا ہے اور اسے قیامت کے پہلے والے علامت میں سے سمجھا جاتا رہا ہے مگر سابق الذکر اہل قلم جنہوں نے گزشتہ آیات کا جدید فضا کے حدود میں پرواز کر کے آگے جانے والے ذرائع پر محمول کیا تھا، انہوں نے اس آیت کو خاص نحاس ''تانبے'' کے معنی میں لے کر اسے ان آخری حدود میں جو آسمانی ذرات کو بارش کے معنی میں لیا ہے اور کہا ہے کہ:

آیا نحاس کہ بمعنی مس، دود، وسرب مذاب آمدہ سنگہای آسمانی نیست کہ باسرعت ۴۸ ہزار کیلومیٹر در ساعت در فضا حرکت می کنند و مانند دانہ ہای شن وگاہی ہم بزرگ اند؟''

آپلود ارای حفاظ و سلطان است کہ آن سنگہا داشتہ در بدنۂ آن کاریگر نیست ''(قاموس القرآن)

اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان نے ایسا سامان کر لیا ہے کہ وہ ان آتشین پتھروں کی بارش سے بچ جاتا ہے مگر یہاں اس آیت میں الا بسلطان کا استثناء نہیں ہے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ تم اس کے مقابلے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾

''تو جب آسمان پھٹ جائے گا تو وہ ایک گلاب کے پھول کی طرح ہوگا مثل سرخ چمڑے کے تو اللہ کی نعمتوں میں سے کس کا انکار کرو گے؟'' تو اس دن کسی آدمی اور جن سے اس کے گناہ کے متعلق پوچھا نہیں جائے گا، تو اللہ کی نعمتوں میں سے کس کا انکار کرو گے؟''

گلاب کے پھول اور پھر سرخ چمڑے کی تشبیہوں سے اس شدت تپش کا اظہار ہوتا ہے جو اس دن چھائی ہوئی ہوگی، عرب کے معیار فصاحت کے لحاظ سے تشبیہ میں کسی خاص پہلو سے بس شباہت کا لحاظ ہوتا تھا، اس کے علاوہ یہ دیکھنا نہیں ہوتا تھا کہ وہ شے جنس میں اس کے مماثل ہے یا نہیں یا مرتبے میں اس سے اونچی چیز ہے یا نیچی۔ یہ سب مقام تشبیہ میں خارج از بحث باتیں ہوتی تھیں۔ جیسے امرأالقیس نے اپنے ایسے معیاری قصیدے میں جو مؤلفات میں سب سے مقدم ہے، ہرن کی مینگنیوں کی تشبیہ کالی مرچوں سے دی ہے جو ہمارے اردو زبان کے ذوق کے بالکل خلاف ہے مگر کسی ایک زبان میں دوسرے اہل زبان کے ذوق کا لحاظ غلط ہے۔ اس کے لیے پوری صورت لانے کے لیے کبھی دو چیزوں سے تشبیہ دی جاتی تھی چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہے کہ آسمان کے شق ہونے کے بعد جو رنگت ہوگی، اسکے لیے ورد اور دہان کی دو لفظیں صرف کی گئی ہیں۔ پہلے ورد جس کے لغت کے لحاظ سے ایک معنی وہی ہیں جو ہم نے ترجمے میں لکھے ہیں اور پھول جسے ہم گلاب کہتے ہیں۔ دوسری تشریح جس کے لیے طبری نے متعدد اقوال نقل کیے ہیں۔ یہ ہے کہ ورد ایک خاص رنگت کا سواری کا مرکب گھوڑا یا خچر ہوتا ہے، شاید فارسی میں اشقر اسی قسم کے گھوڑے کو کہتے ہیں۔ دوسرے کالدھان کے معنی ایک خاص طرح کے سرخی مائل زرد چمڑے کے لیے گئے ہیں۔ یہ عرب

کے لحاظ سے اس رنگ کے ذہن میں لانے کا قوی ذریعہ ہے اور دوسری تشریح یہ ہے کہ وہ تیل کے معنی والے میں سے ہے چونکہ تیل انڈیلنے کے بعد جو اس کا تلچھٹ ہوتا ہے، وہ اس کا رنگ ہوتا ہے اس میں ایک چمکیلا پن بھی ہوتا ہے۔[1] ہم سمجھتے ہیں جب ورد کی لفظ میں رنگ کا اظہار ہو رہی گیا تو اب تشبیہ میں اس اضافے سے مزید اس چمکیلے پن کا اظہار مقصود ہوگا۔ اور دریافت حال کے لیے پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ حساب و کتاب وغیرہ سب اتمام حجت کے لیے ہوگا، جس کا وقوع دوسرے آیات قرآنی سے ثابت ہے مثلاً؛

وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ.

''اور انھیں ٹھہراو، ان سے ابھی سوال ہوگا،

فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

''تو قسم تمہارے پروردگار کی، ہم ان سب سے دریافت کریں گے اور اس کے متعلق جو یہ کرتے تھے۔

تَاللّٰهِ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ.

''قسم خدا کی ضرور تم سے سوال ہوگا اس کے متعلق جو تم سے سوال ہوگا اس کے متعلق جو تم کرتے تھے۔

یہ حساب کتاب والا سوال ہے جو خلائق منظر عام پر مجرموں کو متعارف بنانے اور ان کے جرائم ثابت کر کے ان کے سزاؤں کے احکام نافذ کرنے کے لیے ہے۔

یہ سوال و جواب جس کے لیے ''جواب دہی'' کی کوئی لفظ موزوں ہے، ان کے لیے سزائے اخروی کے ایک جزء کی حیثیت رکھتی ہے۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾

''گناہگار لوگ تو اپنے چہروں ہی سے پہچان لیے جائیں گے تو پیشانی کے پٹے اور پاؤں پکڑے جہنم میں ڈال دیے جائیں گے بحوالہ (ترجمہ حافظ سید فرمان علی صاحب اعلی اللہ مقامہ) تو آخر اپنے پروردگار کی کس نعمت کو تم جھٹلاؤ گے، یہ دوزخ ہے جسے گناہگار لوگ جھٹلاتے تھے اب وہ اس کے اور گرم انتہائی کھولتے ہوئے پانی کے درمیان گردش کر رہے ہیں، تو آخر تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا جھٹلاؤ گے؟''

''گردش کر رہے ہوں گے'' یعنی کبھی اس آگ میں ڈالے جائیں گے اور کبھی اس گرم پانی میں۔ مسلسل یہ عذاب ان پر جاری رہے گا۔[2]

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾

---

[1] ۔عنی به الدهن فی اشراق لونه لان ذالك هو المعروف فی كلام العرب (ابن ابراهیم)

[2] ۔یعنی یطوفون مرة بین الجحیم ومرة بین الحمیم (مجمع البیان)

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّکِـِٕیْنَ عَلٰی فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾

''اس شخص کے لیے جو اپنے پروردگار کی عظمت وجلال سے ڈرتا رہے، دو (۲) دو (۲) باغ ہونگے تو اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا جھٹلاؤ گے؟''، جن میں رنگ برنگ کی چیزیں ہیں، تو پروردگار کی کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟'' ان میں دو دو چشمے رواں ہوں گے تو اپنے پروردگار کی کس نعمت کا جھٹلاؤ گے؟'' ان میں ہر پھل کے جوڑے ہوں گے تو اپنے پروردگار کی کس نعمت کا جھٹلاؤ گے؟'' گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے ایسے بچھونوں پر جن کے استر ریشم کے ہوں گے اور ان دو باغوں کے بالکل تیار پھل ان سے بہت نزدیک ہوں گے، تو اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کا جھٹلاؤ گے؟''

نعماتِ جنّت کا ذکر

مقام رتبہ میں مقام کا ترجمہ عظمت جلال کے ساتھ اس مجبوری سے ہے کہ جسمانی طور پر موقف یا منزل کی تعبیر اس کے لیے نہیں ہوسکتی عظمت وجلال میں اسکی علامت بھی ہے جس سے بندئے کو کوڈرتے رہنا چاہیے بعض لوگوں نے مقام ربه کی تشریح اس طرح کی ہے کہ اس کی برگاہ میں اپنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہے جسے قرآن میں کہا ہے:

یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (المطففین-٦)

جس دن سب لوگ پروردگار عالم کے سامنے کھڑے ہونگے متعدد افراد نے اس کے مطابق تشریح اور ترجمہ کیا ہے۔[1]

ہماری نظر میں یہ تشریح الفاظ کے ظاہری مفہوم سے بعید ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کا عملی تقاضا یہ ہے کہ وہ گناہوں سے پرہیز رکھے گا جیسا کہ جناب ابن عباسؓ نے کہا: وعداللہ جل ثناؤہ المؤمنین الذین خافو مقام ربه فادوفریضة الجنة۔

اللہ کا وعدہ ہے جنت کا ان مؤمنین سے جنہوں نے خوف خدا رکھا تو اس کے فرائض ادا کیے۔

دوسری صورت میں ان کے الفاظ یہ ہیں: الخائف من رکب طاعة اللہ وترك معصیة ''ڈرنے والا وہ ہوگا جو اطاعت الٰہی بجالائے اور معصیت خداوندی کو ترک کردے، اسی کے موافق قتادۃ اور بعض دوسرے حضرات کے اقوال ہیں جنہیں طبری نے درج کیا ہے مگر چند روایتیں جناب ابودرداؓ سے عجیب وغریب نقل ہوئی ہیں جن میں انہوں نے رسولؐ سے اس آیت کو سن کر پوچھا؛

ان زنی وان سرق، چاہے وہ بدکار ہو اور چور ہو۔

---

[1] ۔ایستاددن بحضور پروردگار خویش (شاہ ولی اللہ) کھڑے ہونے سے آگے پروردگار اپنے کے...شاہ رفیع الدین) للحساب (جلالین)

آپ نے جواب میں وہی آیت پڑھی اوران کے متعجبانہ طور پر دوبارہ اورتبارہ سوال کرنے پر بعد میں سخت سرزنش کے انداز میں فرمایا جس کا مطلب یہ تھا کہ چاہے ابودردا کو کتنا ہی ناگوار ہو[1] ہماری سمجھ میں تو یہی نہیں آتا کہ الفاظ قرآن سے جناب ابوالدردا کو اس تصور کی گنجائش کیوں محسوس ہوئی؟ کیا خوف الٰہی رکھتے ہوئے سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی ایسے شدید گناہوں کا ارتکاب کرے گا اور پھر رسولؐ اس کی تصدیق فرمائیں اور ابوالدردا کے اظہار تعجب پر سخت سرزنش فرمائیں۔ ہمارا ذہن اس روایت کو قبول کرنے سے قاصر ہے۔

اب جب کہ باغ بھی دو چشمے بھی دو وہاں کے پھل بھی دو دو قسم کے، اس سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کلام عرب میں دو کی لفظ کی تعداد یعنی کئی عدد ہونے کے اظہار کے لیے آتی ہے، اس میں دونے کی خصوصیت مدنظر نہیں ہوتی، بعض نے دو کی خصوصیت کو محفوظ رکھتے ہوئے دونے کی توجیہ اپنے ذہن کے مطابق کی ہے مثلاً یہ کہ ایک باغ قصر کے اندر اور ایک قصر کے باہر بیرونی احاطے میں یا یہ کہ ایک باغ خود اس کے رہنے کا ہے اور ایک اس کے متعلقین کا یا یہ کہ ایک سونے کا ہے اور ایک چاندی کا۔ ان سب کے لیے مستند کی تشفی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے جو مفقود ہے۔ باغوں کے وصف میں ذواتا افنان جو ہے تو افنان کے معنی شاخوں کے بھی ہوتے ہیں اور بعض نے یہی کہے ہیں مگر باغوں کے ساتھ اور وہ بھی جنت جس سے گھنے پن کا اظہار ہوتا ہے اس کے ساتھ شاخوں کا تصور ایک جز کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے زیادہ تر افراد نے افنان کو اقسام کے معنی میں لیا ہے یعنی رنگا رنگ اور گوناگوں.....اس صورت میں من کل فاکھۃ زوجان کو اس کی مزید تشریح ماننا لازم ہے۔

فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۚ﴿۵۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ۚ﴿۵۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾

''ان میں نظروں کو محدود رکھنے والیاں ہیں جنہیں ان سے پہلے کسی آدمی نے اور نہ کسی جن نے چھوا تک نہیں ہے۔ تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کا انکار کروگے؟''

کہ یاقوت اور بڑے بڑے موتی ہیں، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کا انکار کروگے؟''

حوریں آخرت میں صنف نازک کے کمال اوصاف کا نمونہ ہیں ان کے لیے خالق نے ہر جگہ ایسے اوصاف کہے ہیں جیسے یہاں قاصرات الطرف، 'نظروں کو محدود رکھنے والیاں' اور اس کے بعد مقصورات فی الخیام 'اپنے خیموں میں محدود رہنے والیاں' یہ اوصاف اس طبقے کے لیے خالق کی نگاہ جو اخلاقی اقدار معیار شرافت ہیں ان کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ حجاب میں ہے بے پردگی میں نہیں ہے۔

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۚ﴿۶۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾

''کیا اچھائی کا بدلہ اچھائی کے سوا کچھ اور ہے؟ تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟''

احسان کے معنی اردو میں جو ہیں، ان میں کسی کے ساتھ بلا استحقاق کسی حسن سلوک کا پہلو مضمر ہے عربی میں احسان کے معنی بس حسن عمل ہی کے ہیں، اس میں وہ بار منت مضمر نہیں ہے جو اردو کے لفظ احسان میں ہے۔ یہاں پہلا احسان ہے بندوں کی طرف سے اپنے خالق کی بارگاہ میں حسن اعتقاد اور حسن عمل کہ جسے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ایمان وعمل صالح اور کہیں ایمان واحسان'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور چوں کہ

---

[1] ۔زعم انف ابی الدرداء (ابن جریر)

ایمان شرط حصول جزا ہے مگر جزا جو ہے، وہ از روئے قرآن حسن عمل ہی کی ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں لفظ احسان ہے اس سے بھی مراد ''حسن کردار'' ہے اور پھر اس کے مقابل میں جو احسان ہے وہ اس کے صلے کی صورت میں حسن سلوک ہے جو ثواب آخرت کی شکل میں سامنے آئے گا جس کے تذکرے کے درمیان میں یہ آیت آئی ہے! یہ حل کہہ کر سوال زیادہ تر ایسے محل پر آتا ہے جہاں اس کے مضمون کا فیصلہ خود عقل وضمیر ووجدان سے ہوتا ہے یعنی اس کے خلاف ممکن نہ ہو، احسان کے بدلے احسان نہ ہونا ظلم ہے اور ایسا ہونا عدل الٰہی کے خلاف ہے اس لئے غیر ممکن الوقوع ہے۔ اس طرح یہ آیت بھی ثبوت عدل کے دلائل میں آسکتی ہے۔

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾

''اوران دو کے علاوہ دو باغ اور ہیں، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے (جو سرسبزی کی شدت اور کثرت کی وجہ سے) سخت سیاہ نظر آئیں گے، تو تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟ ان میں دو چشمے ہوں گے جو شش مارتے ہوئے تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟ ان میں پھل ہیں اور کھجور اور انار، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟''

گزشتہ سلسلہ آیات میں جو ایک بحث آئی تھی کہ دو سے مراد وہی ہیں یا کنایہ ہے کثرت تعداد سے اس سلسلہ آیات سے اس پہلے پہلو کو تقویت ملتی ہے، اس لیے کہ دو کے ساتھ تو اس کی مناسبت ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی دو ہیں لیکن ''کثرت'' کے ساتھ یہ کہ اور بھی بکثرت ہیں، کوئی خاص تناسب نہیں رکھتا۔

من دونهما کر ترجمہ جو ان کے علاوہ ہم نے کیا، اس دو باغوں اور ان میں کسی فرق کا پتہ نہیں چلتا نہ ان کے حق داروں میں مغائرت ثابت ہوتی ہے کہ وہ باغ کسی اور کے لیے ہیں اور یہ دو باغ کسی اور کے لیے ہیں۔ بلکہ جیسا کہ بعض کا خیال ہے ہر قصر میں اندر اور باہر دو دو باغ ثابت ہوتے ہیں اور ایک معنی لفظ دون کے نزدیک کے ہیں کہ ان دونوں باغوں کی نوعیت اور درجے میں کوئی فرق نمودار نہیں ہوگا۔

اس کے برخلاف ایک معنی دونهما کے یہ کہے گئے ہیں کہ ان سے کم درجے کے دو باغ ہیں، اور جیسا کہ ابھی سورۂ واقعہ میں آئے گا خود بہشت میں دو طبقے ہیں ایک اعلیٰ طبقہ جو السابقون السابقون کا ہے جو مقربین ہیں اور ایک طبقہ اصحاب الیمین کا اور ظاہر ہے کہ جب افراد کے مراتب میں فرق ہے تو ان کے باغوں میں بھی فرق ہونا چاہیے۔ [1] مُدْهَآمَّتٰنِ، کے معنی ہیں سیاہی مضمر ہے تو اس کی تشریح میں کہا گیا ہے کہ شدت کے ساتھ سرسبزی ہو تو اس میں سیاہی پیدا ہو جاتی ہے [2] ہو سکتا ہے اس میں درختوں کی کثرت اور سبز پتوں کی تہہ

---

[1] ۔ قال الحسن الاولیان السابقین والاخیرتان التابعین (تبیان)

[2] ۔ مسجودتان من شدت خضرتهما (ابن جریر)

درتہہ افراط کا دخل ہو۔[1] فاکھتہ ونخل ورمان میں تو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''نخل ورمان'' کھجور اور انار'' فاکہہ میں داخل نہیں ہیں لیکن دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ فواکہہ میں ہیں تو لیکن اہمیت کے لحاظ سے ان کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا گیا کہ حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطی جس کا مطلب یہ ہے کہ پابندی کرو عموماً نمازوں کی اور خصوصیت کے ساتھ صلوٰۃ وسطی کی جس کی تفسیر پہلے درج ہو چکی ہے۔

فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿٧٠﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧١﴾ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿٧٢﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٣﴾ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿٧٤﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٥﴾

''ان میں بڑی خوش کردار حسینائیں ہیں، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟'' وہ حوریں جو خیموں کے اندر محدود رہتی ہیں، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟'' جنہیں انسان اور جنات میں سے کسی نے انہیں چھوا تک نہیں، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟''

حسان جس سے بآسانی ذہنی تصور خوب صورتی کا ہوتا ہے، اس کے قبل خیرات کی لفظ کہنا بظاہر اس لیے ہے کہ حسن صورت سے مقدم حسن سیرت ہے چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب ام المؤمنین ام سلمہؓ کے دریافت کرنے پر یہی اس کی تشریح فرمائی[2] جیسا کہ گزشتہ سلسلہ آیات میں بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے قبل میں حوروں کا وصف یہ تھا کہ وہ اپنی نگاہوں کو محدود رکھتی ہیں اور اب یہاں یہ کہ وہ خود خیموں کے اندر محدود رہتی ہیں، یہ سب عصر حاضر کے ارتقائی تصور کے خلاف ہے جس کے معیار کے لحاظ سے وہ اس صنف کی کسی فرد کی تعریف میں کہتے ہیں کہ وہ بہت ''ایڈوانس'' ہے یا سوشل ہے۔ حالانکہ اس کے پہلے کی آیت میں بھی اور یہاں بھی ''چھوا تک نہیں'' اس کا مطلب یہی ہے کہ ان سے تعلق ازدواجی کسی کا اس کے پہلے قائم نہیں ہوا ہے جس طرح حضرت مریمؑ کی زبانی قرآن مجید میں ہے کہ ولم یمسسنی بشر 'مجھ کو کسی انسان نے چھوا نہیں''.....اس کا بھی مطلب یہی ہے کہ کسی نے بحیثیت شوہر مجھ میں تصرف نہیں کیا ہے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿٧٦﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٧﴾ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٧٨﴾

''گاؤ سے لگے بیٹھے ہوئے سبز رنگ کے بچھونوں اور خوبصورت گدوں پر، تو اپنے پروردگار کی نعمتوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے؟' قائم ودائم ہے نام تمہارے پروردگار کا جو عظمت وبزرگی والا ہے''۔

مطلب یہ ہے کہ تمہارا پروردگار قائم ودائم ہے مگر اس نام کا اضافہ ویسے ہی ہے جیسا کہ بسم اللہ میں جس کی ہم نے تفصیل کے ساتھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں تشریح کی ہے۔

---

[1] ۔ازبنوھی درختان سیاہ می نماید (قاموس القرآن)

[2] ۔خیرات الاخلاق حسان الوجوہ (ابن جریر)

سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ

مکیّہ.....۹۶.....آیات

پہلی ہی آیت میں واقعہ کی لفظ ہے، اسی پر سورے کا نام ہوا۔

سورۂ واقعۃ کے خاص خاص مضامین:

۱.....احوال واہوال قیامت۔

۲.....تین قسم کے لوگ، دو قسم والے اہلِ بہشت اور ایک قسم والے اہلِ دوزخ۔

۳.....اہل بہشت کا وجد آفریں۔

۴.....اہل دوزخ کا وحشت آفریں حال۔

۵.....انکار معاد سب سے بڑا جرم۔

۶.....ثبوت معاد کے لیے قدرت الٰہی کے حوالے اور اس کے مقابلے میں انسان کی عاجزی۔

۷.....نعمات الٰہی کی یاد دہانی سے شکر گزاری کی دعوت۔

۸.....قرآن کی توصیف۔

۹.....مس حروف قرآن کے لیے طہارت کی شرط۔

۱۰.....موت کے مقابلے میں انسان کی بے بسی۔

۱۱.....تینوں قسم کے لوگوں کے انجام کا خلاصہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝۱ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝۲ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝۳

''جب وہ وقوع میں آنے والی ساعت آ گئی اور اس کے وقوع میں کسی جھوٹ کا شائبہ نہیں، وہ نیچا دکھانے والی اور اونچا کرنے والی ہوگی''

یعنی کچھ جو دنیا میں اونچے تھے، اس دن پستی میں گرفتار ہوں گے اور کچھ جو دنیا میں نیچے سمجھے جاتے تھے آج ان کی برتری نمایاں ہوگی۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ﴿۴﴾ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ﴿۵﴾ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۙ﴿۶﴾

''جب زمین پوری طرح تھرا جائے گی اور پہاڑ پوری طرح ریزہ ریزہ اس طرح ہوجائیں گے کہ وہ فضا میں اڑتے ہوئے بے حقیقت ذرّے ہیں''۔

هباء کا لفظ پہلے قرآن میں آچکا ہے جس کے ترجمے کے لیے درحقیقت اردو میں کوئی لفظ نہیں ہے، اس کی تشریح پہلے ہوچکی ہے کہ کسی روشن دان سے دھوپ آرہی ہو تو اس دھوپ میں فضا کے اندر کچھ اڑتے ہوذرے نظر آئیں گے جنہیں ہاتھ سے پکڑنا چاہیں تو ہاتھ میں آتے کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی۔[1] هباء کی صفت دوسری جگہ قرآن میں منثور آئی ہے یعنی بکھرے ہوئے اور یہاں اس کی صفت منبث آئی ہے یعنی پھیلے ہوئے، مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔

وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ؕ﴿۷﴾ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ؕ﴿۸﴾ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ؕ﴿۹﴾ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۙ﴿۱۰﴾ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ﴿۱۱﴾ فِىْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ؕ﴿۱۲﴾

''تو تم تین قسم کے لوگ ہوگے اور دائیں طرف والے (کیا جانو) کیا ہے یہ دائیں طرف والے اور بائیں طرف والے (کیا جانو) بائیں طرف والے کیا ہیں؟ اور وہ جو سبقت کرنے والے پورے پورے سبقت کرنے والے ہیں، یہ لوگ خاص مقرب افراد ہیں نعمت کے خاص باغوں میں''۔

مشامۃ کی لفظ ہے تو شوم سے جس کے معنی نحوست کے ہیں مگر چونکہ بائیں سمت عرب میں منحوس سمجھا جاتا تھا اس لیے بائیں کو مشامۃ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسی سورے میں تھوڑی دور پر اس کے بعد انہی لوگوں کی تعبیر اصحاب الشمال سے کی گئی ہے جس کے لفظی معنی ہی ہوئے ''بائیں طرف والے''۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۙ﴿۱۳﴾ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ؕ﴿۱۴﴾ عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿۱۶﴾ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۙ﴿۱۷﴾ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۙ﴿۱۸﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ۙ﴿۱۹﴾ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۙ﴿۲۰﴾ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ؕ﴿۲۱﴾ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ۙ﴿۲۲﴾ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۚ﴿۲۳﴾ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾

''ایک بہت بڑی جماعت پہلوں میں سے اور بہت تھوڑے آخروں میں سے، ایک دوسرے سے بالکل

---

[1] ۔الهبا التي تدخل في الكرّة من شعاع الشمس (علي ابن ابراهيم)

ملے ہوئے طلا کارگاو سے لگے ہوئے ایک دوسرے کے آمنے سامنے، ان کے آگے گردش کررہے ہوں گے ہمیشہ کی زندگی والے لڑکے جام، صراحی سبو وساغر لیے ہوئے پاک صاف شراب جس میں دردسر ہوتا ہے اور نہ ہوش وخرد ہاتھ سے جاتا ہے اور پھل جووہ پسند کریں اور پرندوں کا گوشت جوان کی خواہش ہو اور بڑی آنکھوں والی خوب صورت حوریں صلے میں ان اعمال کے جووہ کرتے تھے''۔

چونکہ ہر نبی پر ایمان میں سبقت کرنے والے سابق ہیں اور ظاہر ہے کہ اولین میں انبیاء کی کثرت ہے اور آخری امت میں تو ایک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں تو چاہے آپ کی امت کی مردم شماری قیامت تک کتنی ہی بڑھ جائے مگر سبقت کرنے والے تو اس وقت کے معدودے چند ہوں گے لہٰذا اولین کے لیے سابقین کی جماعت میں کثرت ہے اور آخرین میں سابق افراد معدودے چند ہیں[1] اور ان میں بھی جو سب سے پہلا سبقت کرنے والا ہے وہ ایک ہی ہوسکتا ہے، زیادہ ہو ہی نہیں سکتے۔[2]

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾

''نہیں سنیں گے وہ اس میں کوئی بے کار اور گناہ گار بنانے کی بات مگر بس ایک گفتگو دعا اور اسلام''۔

الاّ کلمہ استثناء ہے اور استثناء کی دو قسمیں ہیں ایک استثنائے متصل جس میں الا کے بعد والی چیز جو مستثنیٰ کہلاتی ہے الا کے قبل والے عنوان کے تحت میں داخل ہوتی ہے اور اسے الا کے زریعے اس حکم سے خارج کیا جاتا ہے، یہاں ایسا نہیں ہے اس لیے کہ دعا سلام نہ لغو ہے اور نہ تأثیم یعنی گناہگار بنانے کی بات۔ لہٰذا یہ استثنا کی دوسری قسم ہے جسے منقطع کہتے ہیں۔ اس سے پہلی ہی بات میں ذرا زیادہ زور پیدا ہوجاتا ہے یعنی دعا وسلام کے سوا کوئی بات نہ سنائی دے گی تو لغو اور تأثیم والی بات کہاں گوش زد ہوگی۔

وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿۲۷﴾ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۲۹﴾ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿۳۰﴾ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿۳۱﴾ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿۳۲﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿۳۳﴾ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿۳۴﴾

''اور دائیں ہاتھ والے کیا کہنا دائیں ہاتھ والوں کا ایسے بیری کے درختوں میں جن میں کانٹے نہیں ہوں گے اور کیلے تہہ بہ تہہ اور دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور پانی بہتا ہوا اور پھل کثرت سے جو نہ ختم ہونے والے ہیں اور ان میں کوئی رکاوٹ ہے اور ایسے بچھونے جو اونچے اونچے ہیں''۔

اس سے پہلے ہی پارے کی اُس آیت میں کہ:

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ (بقرۃ۔۲۵)

جب انہیں وہاں کوئی کھانے کی نعمت ملے گی وہ کہیں گے یہ وہی ہے جو ہمیں پہلے ملی تھی حالانکہ وہ اب ملی ہے انہیں ملتی جلتی ہوئی۔

---

[1] ۔اناقال ذالك لان الذين سبقوا الى اجابة النبى قليل من كثير ممن سبق الى النبيين (تبيان)

[2] ۔السابق فى امة محمد على ابن ابى طالب (مجمع البيان)

لکھا جاچکا ہے کہ نعیم جنت کے ذیل میں جن پھلوں کے نام قرآن مجید میں لیے گیے ہیں، وہ نام اس لیے ہیں کہ عربی زبان والے ان سے متعارف تھے لیکن نعمات جنت کو ان پھلوں میں محدود نہیں سمجھنا چاہیے اس لیے ان پھلوں کے ذکر میں عربی کے جو نام ہیں ان کے متبادل ترجمے کی زیادہ اہمیت نہیں ہے، چنانچہ طلح کے ترجمے میں جو ہم نے کیلے کی لفظ لکھ دی ہے، یہ ایک تشریح کی بنا پر ہے کچھ لوگوں نے اس سے مختلف تشریحیں کی ہیں۔[1] فرش مرفوعۃ کا ترجمہ ''ایسے بچھونے اونچے اونچے ہیں'' یہ وہ مفہوم ہے جو لفظوں سے بلا تکلف ذہن میں آتا ہے بعض لوگوں نے بعد والی آیتوں کے تناسب سے جو اس کے معنی لیے ہیں، وہ ابھی درج کیے جائیں گے۔

اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿۳۶﴾ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿۳۷﴾ لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۳۸﴾

''یقیناً ہم نے انہیں پیدا کیا جیسا پیدا کرنا چاہیے تو انہیں کنوارا بنایا گرویدہ بنانے والیاں، برابر کے سن وسال والی دائیں ہاتھ والوں کے لیے''۔

''انہیں پیدا کیا'' هُنَّ ؟ ضمیر جمع مؤنث کی ہے جسے حوروں کی طرف پھرنا چاہیے مگر حوروں کا ذکر یہاں پہلے تھا، بیچ میں دوسرا ذکر آ گیا جو پہلے سلسلے سے الگ ہے اس لیے ابھی جو فرش مرفوعہ کی لفظ تھی جس کا ترجمہ بچھونوں کے ساتھ کیا گیا تھا اسے کہا گیا ہے کہ اس سے ازدواج یعنی بیویاں مراد ہیں کیوں کہ جیسا کہ قاموی (لغت کے ماہر) نے مصباح المنیر میں لکھا ہے عرب میں فرش کی لفظ رشتہ زوجیت کے اظہار کے لیے آتی ہے مگر جیسا کہ وہاں ہم نے اس فقرے کے ترجمے کے تحت میں لکھا ہے جس محل پر جملہ ہے وہاں اس سے ذہن میں وہی معنی آتے ہیں جن کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بستر کی لفظ سے فرش میں مضمر ہیں سننے والے کے ذہن میں ''ہم بستروں'' کا تصور پیدا ہوتا ہے، اس خطور ذہنی کو مدنظر رکھتے ہوئے فرش کی لفظ کے بعد ان ازواج کی توصیف شروع کر دی گئی۔

اب اگر ان ازواج سے حوریں ہی مراد ہیں جیسا کہ عام طور پر آخرت والی ازواج سے ذہن میں آتا ہے تو اَنْشَاْنٰهُنَّ سے یہ مطلب نکالنا بھی درست ہے کہ انہیں ایک دم عالم وجود میں لایا گیا ہے یعنی وہ بطور ولادت پیدا نہیں ہوتیں بلکہ حکم کن سے مکمل شکل میں ان کی تخلیق ہوئی ہے جیسے فرشتے کی ان کی بھی تخلیق تدریجی طور پر نہیں ہوتی کہ وہ پہلے مبدا خلقت میں بچہ ہوں اور پھر جوان ہوں لیکن طبری نے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں جن میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثیں ہیں کہ یہاں مراد حوریں نہیں ہیں بلکہ یہ مؤمنین کی صاحب ایمان دنیاوالی بیویاں ہیں جو دنیا میں چاہے جیسی ہوں، کتنی ہی بدصورت ہوں، کتنے ہی بچوں کی ماں ہوں، آخرت میں جو پیدا ہونگی تو ان کے یہ اوصاف ہوں گے۔ عرب کی لفظ ایک خاص قوم کے نسلی نژاد کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اخلاق واصاف کی جامعیت کے معنی میں ہے ا۔ (جمع عروب وهی المتجبة الی زوجها عشقاله.....جلالین)

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾

''بہت سے پہلے والوں میں سے اور بہت سے ہیں آخر والوں میں سے''

---

[1] ۔قیل لیس باطوز ولکنه شجر له ظل بارد ورطب عن الحسن وقیل هر شجر یکون بالیمین والحجاز من احسن الشجر منظرا (مجمع البیان)

چونکہ پہلے ایمان میں سبقت کرنے والوں کا ذکر تھا تو ان میں اکثریت پہلے والوں کی تھی لہٰذا۔ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ. وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ. تھا کہ ''کم افراد آخر والوں میں سے'' مگر اب سبقت کا سوال نہیں ہے۔اس لائق ہونا ہے کہ انسان داہنی طرف والوں میں شمار ہو،تو اب اس میں پہلے اور بعد والوں میں اکثریت اور اقلیت کا فرق نہیں ہے،سابق امتوں میں بھی بہت سے ہیں اور اس امت میں بھی بہت سے۔

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿۴۲﴾ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿۴۳﴾ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴿۴۴﴾

''اور بائیں ہاتھ والے (کیا جانو) کیا ہیں بائیں ہاتھ والے سخت تپش اور گرم پانی اور بہت تاریک دھویں کے سائے میں نہ سرد ہے اور نہ باعزت''۔

یہ دوزخ والوں کا حال ہے جنہیں پہلے اصحاب المشامۃ سے تعبیر کیا گیا تھا جس پر پہلے تبصرہ ہو چکا ہے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴿۴۶﴾ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۴۷﴾ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۴۸﴾

''یہ لوگ اس سے پہلے عیش وعشرت میں گرفتار تھے اور بہت بڑے گناہ پر ہٹ دھرمی سے کام لیتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور بس مٹی اور ہڈیوں کی شکل میں ہوں گے تو کیا ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور کیا ہمارے باپ دادا بھی''؟

بہت بڑے گناہ سے مراد ایک تفسیر کی بنا پر ''شرک'' ہے [1] جسے دوسری جگہ ظلم عظیم کہا گیا ہے اس طرح ان کے دوزخی ہونے کے اسباب میں معاد کے ساتھ توحید کا انکار آ گیا، جو دو باتیں ایمان باللہ والیوم الآخر کے تحت نجات کے لیے ضروری ہیں اور ایک تصور یہ ہے کہ ''حنث'' تاکیدی معاہدہ کو توڑتا ہے۔ [2] یعنی اس کے دائرہ میں ان ذمہ داریوں کا پورا نہ کرنا بھی ہے جو ان پر عقل وفطرت اور شریعت کی رو سے عائد ہیں۔

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿۵۴﴾ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿۵۵﴾

---

[1] ۔الحنث العظیم ای الشرک (جلالین)

[2] ۔نقض العھد المو کد بالحلف فھو التی ینقضون العقود التی یذمھم الوفاء بھا (تبیان)

هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۵۶﴾

''کہیے کہ بے شک اگلے اور پچھلے سب اکٹھا کیے جائیں گے مقرر دن کے موقع پر پھر تم اسے جھٹلانے والے گمراہو، کھاکے زقوم (تلخ ترین پھل) کے درخت سے تو اس سے پیٹ بھروگے، پھر اس پر گرم پانی تمہیں پینے کے لیے ملے گا تو اس طرح پیو گے جیسے انتہائی پیاسے اونٹ (بے تحاشا) پیتے ہیں۔ یہ ان کا سامانِ ضیافت ہوگا جزا وسزا کے دن''۔

قرآن مجید دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی اس معاد جسمانی کا تصور پیدا کر رہا ہے، جسے عام طور پر مسلمان مانتے ہیں۔ نہ صرف فلسفی قسم کی جزاوسزا جس کا جسم سے کوئی تعلق نہیں ہے پھر یہ کہ وہ سب کا ایک موقع پر اکٹھا ہونا بتاتا ہے، نہ کہ پوری عمر زمانہ میں یکے بعد دیگرے تناسخ وغیرہ کی صورت سے۔

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾

ہم نے تمہیں پیدا کیا تو تم اب یقین کیوں نہیں مانتے اچھا تو کیا تم نے غور کیا ہے کہ جو مادۂ تولید تم منتقل کرتے ہو، کیا تم اس تخلیق کو پیدا کرتے ہو یا یہ کہ ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ ہم نے تمہارے درمیان موت کا نظام قائم کیا ہے اور ہم بے بس نہیں ہو سکتے، اس میں کہ تمہاری تخلیق کی صورت کو بدل دیں اور تمہیں پیدا کریں اس عالم میں کہ جسے تم نہیں جانتے ہو اور پہلی دفعہ کی تخلیق تمہیں معلوم ہی ہے تو کیوں یاد نہیں رکھتے ہو''؟

پہلی دفعہ کی تخلیق حضرت آدمؑ کی جو مٹی کے پتلے میں روح پھونکی ہوئی تھی تو اب ان اجزا کو جو منتشر طور پر موجود ہیں، اکٹھا کر کے ان میں روح پھونکنا اس کے لیے کیوں ممکن نہیں ہے؟ اس مفہوم کو چھوڑ کر کوئی ایسے معنی نکالنا جو کسی غلط عقیدے کا ثبوت بن سکیں جو قرآن کی دوسری آیتوں کے خلاف ہے، مطلب پروری ہے، قرآن فہمی نہیں ہے، پھر یہ کہ اس محشر میں بھی جس کے مسلمان قائل ہیں کسی حد تک صورتوں کی تبدیلی کا تصور تو موجود ہی ہے۔[1]

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾

---

[1] ۔ما لا تعلمون من الصور کالقوت والخنازیر (جلالین)

''اچھا تو کیا تم نے غور کیا ہے کہ تم بوتے ہو تو کیا تم اس کھیتی کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں ؟ اگر تم چاہتے تو اسے خشک کر کے چورا بنا دیتے کہ تم حیرت میں پڑ جاتے کہ ہمیں بڑا مالی نقصان ہوا بلکہ ہم بالکل ہی بے نصیب رہے''۔

جب کہ اثبات معاد میں بچے کی پیدائش کے سلسلے میں یہ بات آ گئی کہ یہ ظاہری اسباب جو تم فراہم کرتے ہو، وہ نتیجے کے پیدا کرنے والے نہیں ہیں اصل پیدا کرنے والے ہم ہیں تو اب اس سے مناسبت رکھنے والی دوسری کارگزاریوں کا پتہ دیا جا رہا ہے کہ تم اپنے خیال میں اس کے اسباب فراہم کرتے ہو لیکن اس پر نتیجہ مرتب ہونا اور نہ ہونا کس کی قدرت میں ہے؟ وہ صرف اللہ ہی کے اختیار میں ہے'' فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ'' کا ایک ترجمہ یہ ہے کہ تم بے کار آپس میں باتیں بناتے ہو، یہ دونوں ترجمے پہلے سے ہوتے آئیں ہیں ۔ہمیں پہلا تعجب کے معنی والا زیادہ چسپاں معلوم ہوتا ہے۔

اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿٦٨﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿٦٩﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾

''تو کیا تم نے غور کیا ہے اس پانی پر جو تم پیتے ہو، کیا تم اسے ابر سے نیچے اتارتے ہو یا ہم اتارنے والے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اسے کھاری کر دیں، تو تم شکر گزار کیوں نہیں ہوتے''۔

اس میں قدرت کے ساتھ اسکے نعمت و احسان کے پہلو کو بھی نمایاں کر کے شکر گزاری کی دعوت دی جا رہی ہے۔

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿٧١﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿٧٢﴾ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿٧٣﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٧٤﴾

''تو کیا تم نے نظر کی ہے اس آگ پر جو تم روشن کرتے ہو تو کیا تم نے اسکے درخت کو پیدا کیا تھا یا ہم پیدا کرنے والے ہیں۔ ہم نے اسے یاد دہانی اور فائدہ اٹھانے کا ذریعہ قرار دیا ہے ضرورت مندوں کے لیے تو تسبیح کرو اپنے بزرگ پروردگار کے نام کی''۔

چونکہ دور قدیم میں ایک خاص درخت کی لکڑی سے آگ حاصل کی جاتی تھی [1] اس لیے کئی جگہ قرآن مجید میں آگ کے ساتھ درخت کا ذکر ہے۔ یاد دہانی کا ہے کی؟ سمجھ میں بھی آتا ہے کہ اس طرح پھر ذہن منتقل کیا گیا ہے آخرت کی اس آگ کی طرف جو مجرموں کے لیے مہیا ہے۔ [2]

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿٧٥﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿٧٦﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٧﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿٧٨﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿٧٩﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ

---

[1] ۔یعنی الشجر التی منقدح منها النار (تبیان)

[2] ۔عن قتادة تذکر النار الکبریٰ (ابن جریر)

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾

''تو میں کھاتا نہیں قسم ستاروں کے مقامات کی حالاں کہ تم جانو یہ بہت بڑی قسم ہے کہ یہ یقیناً ایک بڑے مرتبہ والا قرآن ہے ایک نظروں سے پوشیدہ کتاب کے اندر اسے نہیں چھو سکتے مگر پاک افراد، یہ اتارا ہوا ہے، تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے''

قرآن کے مس حروف کے لیے طہارت کی شرط

قرآن جس نظروں سے پوشیدہ کتاب کے اندر ہے وہ لوح محفوظ ہے، جو وہاں سے پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بتوسط ملک اترتا رہا ہے۔

''اسے پاک افراد کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا'' یہ ضمیر اگر ''کتاب مکنون'' کی طرح راجع ہو جیسا کہ جمہور مفسرین اہل سنت کا رجحان ہے تو وہ عالم بالا میں ہے اسے ہمارے لیے چھونے نہ چھونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اور اب چھونے کے معنی علم و ادراک کے ہیں اور وہ مطہر مخلوق جس کا اس تک دسترس ہے فرشتے ہیں۔ اب اس میں ہمارے لیے کوئی عملی ہدایت نہیں ہو سکتی لیکن دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ ضمیر ''قرآن مجید'' کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں بھی ایک مفہوم اس کا یہ ہے کہ اس کا پورا علم سوائے مطہرین یعنی معصوم ہستیوں کے کسی کو حاصل نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ کہ مس کے معنی جسمانی حیثیت سے چھونے ہی کے ہوں اس پر اس حکم فقہی کی بنیاد قائم ہوتی ہے کہ حروف قرآن کو بغیر طہارت یعنی وضو وغیرہ کے چھونا جائز نہیں ہے علمائے شیعہ کا مسلک یہی ہے [1] یہ کہ ''قسم نہیں کھاتا'' یہ ایک انداز ہے قسم کھانے ہی کا جب کہ اس کے ساتھ یہ ہے کہ یہ بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو جس کا تمہیں یقین ماننا چاہیے۔

اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾

''تو کیا اس بیان کو تم نظر انداز ہی کرتے رہو گے اور اپنی روزی یہی قرار دو گے کہ تم جھٹلاتے ہو''۔

''اپنی روزی یہی قرار دو گے''؟ یہ بظاہر بطور طنز ہے یعنی جیسے روزی انسان کے بقائے حیات کے لیے ضروری ہے، ویسے اس حیات بعد الموت کے تذکرے کو جھٹلانا تم ضروری سمجھتے ہو۔ اور ایک مطلب اس کا یہ سمجھا گیا ہے کہ اللہ جو تمہیں روزی عطا کرتا ہے اسکا تقاضا تم یہی سمجھتے ہو کہ تم اس کی باتوں کو جھٹلاتے رہو۔ [2]

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ وَاَنْتُمْ حِيْنَىِٕذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾

''تو کیوں نہیں؟ جب وہ روح نکل کر گلے تک پہونچ جائے گی اس عالم میں کہ تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے

---

[1] ۔عندنا ان الضمیر یعود الی القرآن فلا یجوز لغیر الطاھر مس کتابۃ القرآن (مجمع البیان)

[2] ۔تجعلون شکر اللہ علی رزقہ ایاکم التکذیب (ابن جریر)

ہو اور ہم تم سے زیادہ اس کے نزدیک ہوتے ہیں مگر تم دیکھتے نہیں ہو کیوں نہیں ، اگر تمہیں جزا وسزا ملنے والی نہیں ہے تو پلٹا دیتے تم اسے اگر تم سچے ہو''۔

مطلب یہ ہے کہ جب یہ موت اور حیات تمہارے قبضے میں نہیں کسی اور کے احاطہ قدرت میں ہے تو تمہیں اس قادر کی قدرت پر پابندی عائد کرنے کا کیا حق ہے؟ چاہے تو اسی وقت اس روح کو پلٹا دے اور چاہے تو ہزاروں لاکھوں سال کے بعد پلٹائے۔ یہ اس کی حکمت اور نظام کائنات کی مصلحت سے وابستہ ہے۔

فَاَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ۙ﴿۸۸﴾ فَرَوۡحٌ وَّرَيۡحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيۡمٍ ﴿۸۹﴾ وَاَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ ۙ﴿۹۰﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ ؕ﴿۹۱﴾ وَاَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡمُكَذِّبِيۡنَ الضَّآلِّيۡنَ ۙ﴿۹۲﴾ فَنُزُلٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ ۙ﴿۹۳﴾ وَّتَصۡلِيَةُ جَحِيۡمٍ ﴿۹۴﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الۡيَقِيۡنِ ۚ﴿۹۵﴾ فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ ﴿۹۶﴾

تو اب اگر وہ مقرب گروہ میں سے ہے تو راحت ،آرام ،روزی اور نعمت والا بہشت ہے اور اگر وہ داہنی طرف والوں میں سے ہے تو خیریت سمجھو، داہنی طرف والوں کی طرف سے لیکن اگر وہ جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہے تو پھر اس کا سامان ضیافت کھولتے ہوئے گرم پانی سے ہے اور دوزخ کی آگ کی تپش ہے، یقیناً یہ پوری پوری یقینی بات ہے تو تسبیح کرو اپنے بزرگ پروردگار کے نام کی''۔

تینوں قسم کے لوگوں کے انجام کا خلاصہ

سورے کے شروع میں جو تین قسم کے لوگ بیان ہوئے تھے، آخر سورہ میں ان کا انجام ہے جن میں سے دو نجات یافتہ ہیں مگر ان میں مقربین کا درجہ اونچا ہے لہٰذا ان کی جزا میں الفاظ زیادہ صرف ہوئے ہیں وہاں السابقون السابقون ان کا سزا نامہ ذکر تھا اور مقربین کا وصف تھا یہاں اسی وصف کو سرنامہ بیان قرار دیا گیا ہے۔ سَلٰمٌ لَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ کا ایک ترجمہ وہ ہے جو درج ہوا کہ جس میں مخاطب غیر متعین طور پر ہر سننے والا ہے کہ اطمینان رکھو، سلامتی ان کے لیے بھی ہے۔ دوسری تشریح یہ ہے کہ یہ النقات من الغیبہ الیٰ الخطاب ہے یعنی کسی کے متعلق دوسروں سے کچھ کہتے کہتے ایک دم روئے خطاب خود اس کی طرف لوٹا دیا جائے۔ یہاں پہلے دوسروں سے خطاب تھا کہ اصحاب یمین کا حال یہ ہے۔ اب خود ان سے کہا جانے لگا کہ سنو اے اصحاب ایمن تمہارے لیے سلامتی ہے اس طرح من بیانیہ ہوگا کہ تمکو سلامتی ہے اے اصحاب یمین۔ بعض لوگوں نے سلام کے معنی سلامتی نہیں بلکہ ''سلام'' ہی کے لیے کہ لک کا مخاطب رسولؐ کو قرار دیا ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ''داہنی طرف والوں کی طرف سے (اے رسولؐ) آپ پر سلام ہو یہ میرے نزدیک بعید ہے اور سیاق سباق کے ساتھ بالکل چسپاں نہیں ہے۔

سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ

مدنیّہ.....۱۹.....آیات

اس سورہ کے آخری حصے میں ایک جگہ لوہے کے اتارنے کا ذکر ہے، اسی پر اس سورے کا یہ نام ہو گیا۔

سورۂ حدید کے خاص خاص مضامین:

۱.....خدا کے اوصاف اول اور آخر اور ظاہر باطن جن کی تشریح اس آیت کی تفسیر میں ہوگی۔

۲.....خدا کے علم کی وسعت اور عمومیت۔

۳.....ایمان کے ساتھ بلا فاصلہ خیرات کا ذکر۔

۴.....فتح مکّہ سے پہلے جان و مال کی قربانی کرنے والوں کا جو درجہ ہے، وہ بعد میں قربانی کرنے والوں کا نہیں ہے۔

۵.....روز قیامت اہل بہشت کے نور کا ان کے آگے آگے اور داہنے پہلو میں پھیلنا۔

۶.....منافقین کی بے بسی اور محتاجی۔

۷.....مسلمانوں کو انتباہ کہ وہ امتداد زمانہ سے گھبرا کر بددل نہ ہو جائیں۔

۸.....دنیوی زندگی کی بے حقیقی اور بے اعتباری اور اس کی مثال۔

۹.....حال کی ہر بات پہلے سے لوح قضا و قدر میں محفوظ ہوتی ہے۔

۱۰.....حالات کے انقلاب سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

۱۱.....تمام انبیاؑ کے ساتھ کتاب اور میزان کا اترنا اور لوہے کا آسمان سے اترنا۔

۱۲.....عیسائیوں کی نیک دلی مگر ان کی ایجاد کردہ رہبانیت کی مذمت۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ②

''تسبیح کرتے رہے ہیں اللہ کی جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اور وہ زبردست ہے، بڑی سوجھ بوجھ والا، اسی

کے لیے سلطنت آسمانوں اور زمین کی، وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے''۔

آسمان اور زمین اور کائنات کی ہر چیز کی تسبیح کا ذکر قرآن مجید میں پہلے بھی آچکا ہے،

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝۳

''وہ اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔

اول اور آخر کے معنی کھلے ہوئے ہیں کہ جب کچھ نہ تھا تب وہ تھا اور جب کچھ نہ ہو، تب بھی وہ ہوگا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خود اس کی کوئی ابتدا نہیں اور نہ اس کی کوئی انتہا ہے جسے فلسفہ کی زبان میں کہتے ہیں ازلی اور ابدی اور دونوں کو ملا کر کہیں تو سرمدی۔

ظاہر و باطن کی لفظوں کے بہت سے پہلو ہیں جن میں سب سے زیادہ واضح یہ ہے کہ ظاہر ہے آثار اور دلائل قدرت کی بنا پر اور باطن یعنی پوشیدہ باعتبار ذات ہے..... کہ دکھائی نہیں دیتا۔

وہ ظہور ایسا ہے جو کائنات کی ہر چیز سے نمایاں ہے اور یہ پوشیدہ ہونا ایسا ہے جس کے احاطۂ عمومیت سے اس کے مخلوقات میں کوئی یہاں تک کہ انبیا و مرسلین اور ملائکہ مقربین بھی مستثنیٰ نہیں یعنی ان میں سے بھی کوئی نہیں جس کی آنکھوں کے سامنے وہ آیا ہو اور مذہب حق کی رو سے اس میں دور کی بھی کوئی قید نہیں، ازل سے وہ باطن ہی ہے اور ابد میں بھی وہ باطن ہی رہے گا۔ آنکھوں کے سامنے ظاہر کبھی نہیں ہوگا، چاہے وہ دنیا ہو یا آخرت، آج یا قیامت۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ظہور غلبہ مضمر ہے اس لیے اس کے ساتھ علیٰ کی لفظ آتی ہے کہ یہ اس پر ظاہر ہے اور بطن میں اندر کے معنی مضمر ہیں تو ظاہر باعتبار قدرت ہے کہ وہ ہر چیز پر حاوی ہے اور باطن باعتبار علم ہے کہ وہ اندر گہرائیوں تک پہنچا ہوا ہے۔

نہ اس کی قدرت کے احاطے سے کوئی باہر ہے اور نہ اس کے علم کے دائرے سے کوئی جز خارج ہے۔

خداوند عالم کے اسمائے حسنیٰ کی تشریح میں عمل کلام کی کتابوں میں اور بھی پہلو درج ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝۴

''وہ وہ ہے جس نے آسمان اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر متمکن ہوا عرش پر وہ ہے اسے جو زمین کے اندر جاتا ہے اور اسے کہ جو اس سے برآمد ہوتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کا جاننے والا ہے''۔

چھ دن سے مراد دن نہیں سمجھنا نہیں چاہیے جو طلوع و غروب آفتاب سے وابستہ ہیں بلکہ چھ دور سمجھے جا سکتے ہیں جن میں تدریجی طور پر یہ تخلیق مکمل ہوئی اور عرش پر متمکن ہونا جسمانی طور پر نہیں ہے جب کہ وہ جسم و جسمانیات سے بری ہے بلکہ اپنے اقتدار کا مرکز اعلیٰ جسے مقام نسبت میں جائے تخت کہنا چاہیے اسے بنایا۔

جو آسمان سے اترتا ہے" یعنی روزی جس کا سب سے بڑا ذریعہ ابر باراں ہے، جو بلند ہوتا ہے وہ بندوں کے اعمال اور دعائیں۔ اسی ذیل میں فرشتوں کا نام بھی لیا گیا ہے۔[1]

مگر وہ دونوں فقروں میں داخل ہیں۔ وہ اترتے بھی ہیں اور چڑھتے بھی ہیں۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۵ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ؕ وَهُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۶

"اس کے لیے سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور تمام معاملات کی اللہ ہی کی طرف رجوع ہے، وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور وہ سینوں کے اندر کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

دن کو رات میں اور رات کو دن میں داخل کرنے کا ذکر پہلے کئی جگہ آچکا ہے اور اسی کا حسی مشاہد موسموں کی تبدیلی میں ہوا کرتا ہے کہ اِدھر کا ایک حصہ اُدھر چلا جاتا ہے اور اِدھر کا ایک حصہ اُدھر آجاتا ہے اور اس سے ذہن کو افراد اور اقوام کے حالات کے انقلاب کی طرف بھی مڑنا چاہیے جو سب اللہ کے ارادے کے ماتحت ہے۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۷

"ایمان لاؤ اللہ اور اس کے پیغمبر پر اور خیرات کرو اس میں سے جس کا دوسری کے بعد اس نے تمہیں مالک بنایا تو جو تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے خیرات کی ان کے لیے بڑا صلہ ہے"۔

جو چیز ہماری ملکیت ہے تو وہ دوسروں سے ہمارے پاس آئی۔ اگر خود مکسوبہ ہے تو پہلے وہ دوسرے کے پاس تھی، اسی سے تو ہمیں حاصل ہوئی اور اگر موروثی ہے تو پہلے آباواجداد یا کسی دوسرے اس موروث کی تھی جس سے منتقل ہو کر ہمارے پاس آئی، بہرصورت ہمیشہ سے تمہاری ملکیت نہیں تھی، اس میں انتباہ اس پر بھی سمجھنا چاہیے کہ تمہارے ہاتھ میں بھی اُسے ہمیشہ نہیں رہنا ہے۔ تمہارے بعد یہ دوسروں کے پاس جائے گی[2]

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۸

"اور تمہیں کیا ہے کہ ایمان نہیں لاتے ہو اللہ پر حالانکہ پیغمبر تمہیں دعوت دے رہے ہیں کہ تم ایمان لاؤ اپنے پروردگار پر اور اس نے تم سے عہد پیماں لیا تھا کہ تم واقعی مسلمان ہوئے تھے"۔

آیت کے آخری جز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اقرار ایمان کر چکے تھے، پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بات ایسی ہے جس کو وہ

---

[1] ۔مایعرج فی السمآء ھن الملئکۃ ومایرفع الیھا من اعمال الخلق (تبیان)

[2] ۔فیہ سبحانہ بھذا علیٰ ان ما فی ایدینا یصیر لغیرنا کما صار الینا من قبلنا (مجمع البیان)

ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، اس لیے کہا جا رہا ہے کہ جب تم مسلمان ہو چکے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ رسول اللہ تم سے عہد پیمان لے چکے ہیں کہ جو بات تم سے کہی جائے اسے مانو گے پھر اب تم کیوں نہیں مان رہے ہو۔

عام مفسرین نے اس غرض سے کہ خطاب جماعت کفار سے قرار پائے اس پیمان کو عہد الست والا عالم ذر کا پیغام قرار دیا ہے اور ان کنتم مؤمنین کے معنی یہ لیتے ہیں کہ اگر تم کبھی بھی ایمان لانے والے ہو تو یہی بہترین موقع ہے ایمان لانے کا۔[1]

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۹ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۰

''وہ وہ ہے جو اتارتا ہے اپنے بندہ خاص پر کھلی ہوئی آیتیں تا کہ تمہیں نکالے اندھیروں سے روشنی کی طرف اور بلاشبہ اللہ تمہارے ساتھ شفیق ہے بڑا مہربان۔ اور تمہیں کیا ہے تم خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں حالاں کہ تر کہ آسمانوں اور زمین کا صرف اللہ کے لیے ہے، برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ جنہوں نے جرأت کی فتح سے پہلے اور جنگ کی ہو، یہ درجے میں زیادہ بڑے ہیں ان سے جنہوں نے اس کے بعد خیرات کی ہے اور جنگ کی ہے اور یوں تو ہر ایک کے لیے اللہ کا وعدہ بھلائی کا ہے اور اللہ جو تم کرتے ہو، اس کا جاننے والا ہے''۔

''اندھیرا ہے یعنی گمراہی سے روشنی، صحیح منزل ہدایت اور حقیقی علم و معرفت کی طرف جس سے حق اور باطل میں امتیاز کلی ہو جاتا ہے۔

چونکہ پہلے مسلمانوں کی مقدرت کم تھی، اس لیے اس وقت جان و مال سے جو کام آئے ان کی قدر و قیمت پیش خدا والوں سے زیادہ ہے، یوں بعد والوں سے زیادہ ہے، یوں بعد میں بھی دیا تو اس کا اجر ضائع نہیں ہو سکتا جیسا کہ بعد میں کہا گیا ہے کہ ''ہر ایک سے اللہ کا وعدہ بھلائی کا ہے۔ فتح سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک فتح مکہ ہے مگر حافظ ابن جریر طبری نے اسے ترجیح دی ہے کہ اس سے صلح حدیبیہ مراد ہے، غالباً اس لیے کہ سورہ فتح میں سے ''فتح مبین'' کہا گیا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝۱۱

''کون ہے جو اللہ کو اچھا قرضہ دے تو اسے بڑھا دے گا اُس کے لیے بہت بڑا صلہ ہے''۔

کچھ لوگ اس آیت کی اور ایسے ہی کے پہلے قرآن مجید میں جو اس مضمون کی آیتیں آئی ہیں انہیں خاص طور پر قرض دینے کی فضیلت میں پیش کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میں راہ خدا میں صرف کرنے کو بطور استعارہ قرض کہا گیا ہے کہ جیسے قرضہ آج دیں گے کل

---

[1] ۔ان کنتم تریدون ان تؤمنوا باللہ یوما من الایام فالآن احدی الاوقات (ابن جریر)

ملے گا، ویسے جو راہ خدا میں خرچ کرو گے اس کا عوض اللہ عطا کرے گا اور وعدہ کیا ہے کہ بہت بڑھا کر عطا کرے گا۔ ہاں بطور قرض بھی مومن کے کام آنا باعث ثواب ہے، لہٰذا وہ بھی اُس کے تحت میں داخل ہے، نہ یہ کہ قرض سے مراد قرض ہی دینا ہو۔

مطلق انفاق کو قرض سے تعبیر کرتے ہوئے اس کے ساتھ حسن کی قید بظاہر راہ خدا میں انفاق کے ان قیود کی طرف اشارہ ہے جو قرآن میں پہلے آ چکے ہیں کہ دکھانے کے لیے نہ ہو جس کو ریا کہتے ہیں، نہ اس کا چرچا دوسروں تک پہنچانے کے لیے جسے سمعہ کہتے ہیں اور جسے دے اس پر احسان نہ جتائے اور اس کی دل آزاری نہ کرے جیسے قرآن میں من و اذیٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾

''جس دن دیکھو گے بایمان مردوں اور بایمان عورتوں کو کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف دوڑتا ہوگا تمہارے لیے آج مبارک ہوں یہ باغہائے بہشت جن کے نیچے سے نہریں رواں ہیں، ہمیشہ ہمیشہ رہتے ہوئے ان میں، یہی بڑی کامیابی ہے''۔

چونکہ یہ اصحاب یمین ہیں جنہیں داہنی طرف سے بہشت میں جانا ہے لہٰذا نور سامنے اور داہنی طرف پھیل رہا ہوگا کہ اسی رخ پر وہ آگے بڑھتے جائیں۔[1]

اب دور آخر کی جتنی بھی چیزیں ہیں، ان میں نام وہی ہیں جن سے ہم متعارف ہیں لیکن حقیقت ان کی الگ ہے لہٰذا اس نور کی بھی پوری حقیقت سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

''جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے کہ ذرا ہمارا انتظار کرو ہم بھی تمہارے نور سے کچھ

---

[1] ۔ علی الصراط یوم القیامۃ وھو دلیلھم الی الجنۃ (مجمع البیان)

بہرہ مند ہوں کہا جائے گا کہ اپنے پیچھے واپس جاؤ اور کوئی نور ڈھونڈھو، تو ان کے درمیان ایک دیوار اٹھ جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا، اس کے ادھر رحمت ہوگی اور ادھر جو باہر کا رخ ہے ادھر عذاب ہی عذاب ہے، اب وہ ان سے پکار کر کہیں گے کہ ارے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ وہ کہیں گے کہ کیوں نہیں مگر تم نے اپنے کو گمراہی میں ڈالا اور نتائج کو دیکھنے لگے کہ آخر میں کیا ہوتا ہے اور شک وشبہ میں مبتلا رہے اور خیالات خام نے تمہیں دھوکے میں رکھا یہاں تک کہ اللہ کی طرف کا حکم آ گیا اور تمہیں اللہ کے بارے میں غافل رکھنے والے نے مبتلائے فریب رکھا تو آج نہ تم سے کوئی فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان سے جو (کھلم کھلا) کافر تھے، تم سب کا ٹھکانا آتش دوزخ ہے وہ تمہارے لیے اولیٰ وانسب ہے اور یہ کیا برا انجام ہے''۔

منافقوں کی بے بسی اور محتاجی

منافقین کے جواب میں جو مؤمنین کی زبان الفاظ بیان ہوئے، ان میں پہلی لفظ ہے ''فتنتم انفسکم'' جس کا ترجمہ ہم نے کیا ''اپنے کو گمراہی میں ڈالا'' چونکہ اصل معنی فتن کے ہیں سونے کو آگ میں ڈالنا، تاکہ کھرے کھوٹے کی آزمائش ہو۔ اب اس میں دو جز ہیں ایک آگ میں ڈالنا دوسرے اس کا مقصد یعنی آزمائش۔ اس بنا پر اس لفظ کا استعمال دو طرح ہونے لگا کبھی آزمائش کے معنی میں جس کی مثالیں قرآن مجید میں دی ہیں۔ جیسے:۔

اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّهُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ یَذَّكَّرُوْنَ (توبہ-۱۲۶)

''اور کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ان کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے ہر سال ایک دفعہ یا دو دفعہ پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (عنکبوت-۲)

کیا وہ سمجھتے ہیں کہ چھوڑ دئے جائیں گے کہ وہ بس کہتے رہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کی آزمائش نہیں ہوگی۔

اسی سے فتنہ کی لفظ ہے جس کا اطلاق ذریعہ آزمائش ہونے کی بنا پر اموال اور اولاد پر بھی قرآن میں کیا گیا ہے۔ گمراہی میں ڈالنا جیسے سورہ بروج میں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِیْقِ (بروج-۱۰)

جنہوں نے مؤمنین اور مومنات کو گمراہ کرنے کی کوشش کی، پھر توبہ نہ کی ان کے لیے دوزخ کی سزا ہے اور آگ میں جلنے کا عذاب ہے۔

یہاں ہمیں یہی معنی زیادہ موزون معلوم ہوتے ہیں۔

آخر میں آتش دوزخ کے لیے جو ہے: ھی مولٰکم یعنی اولیٰ کے نہ صرف ہمارے یہاں کی قدیم تفسیر میں ہیں [۱] اہل سنت کے یہاں بھی موجود ہیں [۲] اس نظیر کو یاد رکھنا چاہیے کہ روز غدیر رسولؐ خدا کے ارشاد ہیں:

---

[۱] ۔مولا کم قال ھی اولیٰ بکم (علی ابن ابراھیم)

[۲] ۔النار اولیٰ بکم (ابن جریر)

من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ وہاں یہ حضرات منکر ہوجاتے ہیں کہ ''مولیٰ'' کے معنی عربی میں ''اولیٰ'' نہیں ہیں مگر اس قرآنی نظیر کے بعد اس کا انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے جب کہ قبل میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سوال جو اس اعلان کے پہلے تھا یہی تھا کہ الست اولیٰ بکم من انفسکم جب مجمع نے کہا بلیٰ ''کیوں نہ ہو'' تب آپ نے وہ الفاظ کہے جن کے یہ معنی اس سوال کے بالکل مطابق ہیں!

اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُہُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ ۙ وَلَا یَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡہِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ وَ کَثِیۡرٌ مِّنۡہُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۱۶﴾

''کیا ابھی وقت نہیں آیا ان کے لیے جنہوں نے ایمان قبول کیا کہ ان کے دل متاثر ہوں اللہ کی یاد اور اس حق سے جو نازل ہوا اور وہ نہ ہوں ان کی طرح جنہیں ان کے پہلے کتاب ملی تھی تو مدت طولانی ہونے پر ان کے دل سخت ہوگئے اور ان میں زیادہ تر فاسق ہیں''۔

مسلمانوں کو انتباہ کہ وہ امتداد زمانہ سے گھبر کر بددل نہ ہوجائیں

آیت کے شروع کے الفاظ سے نمایاں ہے کہ یہ کافروں کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان کا ہے جو اپنے کو مؤمنین مخلصین سمجھتے ہیں اور انہیں متنبہ کیا جارہا ہے کہ کہیں ان میں سے اکثر صفت عدالت سے محروم ہوکر ''فاسقین'' میں داخل نہ ہوجائیں اور ''کیا ابھی وقت نہیں آیا'' کے الفاظ بتارہے ہیں کہ یہ جماعت اب تک اس منزل پر نہیں جو اس ''فسق'' سے اس کو بچا سکے۔ اس کے بعد ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ بلا استثنا اس جماعت کو عادل سمجھنا صریحی طور پر قرآن کے خلاف ہے یا نہیں؟

''خشوع'' دل و دماغ پر عظمت الٰہی کے اثر قائم ہونا ہے اور یہ اثر ایسا دیرپا ہونا چاہئے کہ امتداد زمانہ اس نقش کو نہ مٹا سکے۔

اب اسی میں یہ داخل ہے کہ خدا اور رسولؐ کے کسی وعدے کے پورے ہونے میں مدت کا طولانی ہوجانا انہیں اصل حقیقت کے انکار پر آمادہ نہ کردے جیسا کہ امام آخر کے ظہور کے انتظار کی مدت کا طولانی ہونا جس پر بہت سے گھبرا کر ان کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے بعض احادیث میں اس آیت کے مضمون سے اس انتباہ کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷﴾

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے بے جان ہونے کے بعد ہم نے تمہارے لیے یہ نشانیاں واضح طور پر پیش کردی ہیں، شاید تم عقل سے کام لو''۔

متعدد جگہ اس مشاہدے سے دوبارہ کی زندگی پر استدلال کیا گیا ہے اس لئے نفس آیت کے مضمون سے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ اس پر متوجّہ کرنا اثبات معاد کی خاطر ہے۔

مگر گزشتہ آیت کے ربط سے اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ جیسے وہ زمین مردہ کو زندہ کرتا ہے ایسے ہی گمراہ کو ہدایت دیتا ہے اور کافر کو توفیق ایمان عطا کرتا ہے [1] یا یہ کہ اسی طرح اللہ دلوں کو الطاف وتوفیقات سے نرم کرتا ہے [2] نتیجہ ان دونوں باتوں کا ایک ہی ہے۔

إِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿١٨﴾

''یقیناً امور خیر میں صرف کرنے والے مرد اور امور خیر میں صرف کرنے والی عورتیں درآنحالانکہ انہوں نے اللہ کو قرضہ حسنہ دیا، ان کے لیے اس میں اضافہ کر دیا جائے گا اور ان کے لیے معزز معاوضہ ہوگا''۔

یعنی وہاں کا اجر مزدور کی اجرت کی طرح کا نہیں جس میں اعزاز کی شان نہیں ہوتی بلکہ اعمال خیر کا معاوضہ عزت واکرام کے ساتھ ہوتا ہے جیسے امتحان میں پاس ہونے والے کا انعام۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿١٩﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے پیغمبروں پر، یہی لوگ صدیق اور شہید ہیں اپنے پروردگار کے یہاں، ان کے لیے ان کا صلہ اور ان کا نور ہے اور جنہوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، یہ لوگ دوزخ والے ہیں''۔

ظاہر میں تو ''صدیقون اور شہداء دونوں معطوف علیہ اور معطوف ہیں جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر طبری نے صدر اوّل کے کئی قول نقل کیے ہیں کہ پہلا جملہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ. پر ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد شہدا سے دوسرا جملہ ہے مگر جب کہ اجر اور نور کا ہونا ان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اسی سورے میں آچکا ہے وہی اصحاب یمین اس میں شریک ہیں تو اس تفریق کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿٢٠﴾

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دنیوی زندگی بس کھیل، تفریح میں محویت، بناؤ سنگار، آپس میں ایک دوسرے پر فخر،

---

[1] ۔ كذالك يحيٰ الكافر بالهدىٰ الىٰ الايمان بعد موته بالضلال (تبيان)

[2] ۔ قيل معنا اعملوا ان الله بين القلوب بعد قسرتها بالطاف وتوفيقات (مجمع البيان)

ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مال اور اولاد میں زیادتی کی کوشش ہے (عارضی) جیسے وہ بارش جس کی پیداوار کے نباتات نے کافروں کو حیرت میں ڈال دیا، پھر وہ خشک ہونے لگے اور تم دیکھو اس حال میں وہ زرد ہوگئی، پھر وہ سوکھ کر چورا ہو جائیں اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور (کچھ کے لیے) بخشش ہے اللہ کی طرف سے اور ثواب ہے اور دنیوی زندگی نہیں ہے مگر سرمایہ فریب"۔

دنیاوی زندگی کی بے حقیقتی اور بے اعتباری کی مثال

قرآن مجید میں کھیل اور تماشا ہونے کی نفی بھی کی ہے، وہ نفی باعتبار تخلیق ہے، وہ بے مقصد نہیں تھی لیکن جہاں اس دنیا کو لہو لعب کہا گیا ہے، وہ کہیں باعتبار ناپائیدار اور بے اختیار ہونے کے ہے اور یہاں مقصد حیات کو فراموش کر کے عام انسانوں کی سرگرمیوں کے اعتبار سے ہے۔

دنیا کی جہاں جہاں مذمت بھی ہے، وہ دنیاداروں کی دنیا ہے، نہ کہ دینداروں کی دنیا جو آخرت کی مختتم کامیابی کی تمہید ہے، وہ دنیا درحقیقت جزء دین ہے جس کا نتیجہ وہ ہوتا ہے جو آیت میں بعد کو مغفرة من الله ورضوان "اللہ کی طرف کی بخشش اور خشنودی" کی لفظوں سے بیان ہوا ہے، اس نتیجہ کا سامان بھی اس دنیا کے اسی ساز و سامان سے ہوتا ہے جو دنیاداروں کے لیے نتیجہ عذاب شدید ہوتا ہے۔

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾

"آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے پروردگار کی بخشش اس بہشت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کے برابر ہے، وہ تیار رکھا گیا ہے اس کے لیے جو اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائیں، یہ اللہ کا فضل کرم ہے جسے چاہتا ہے وہ اس پر مبذول فرماتا ہے، اور اللہ بہت فضل و کرم والا ہے"۔

اس آیت کا مضمون پہلے آچکا ہے اور وہاں اس پہلو پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ اللہ کی مغفرت اور جنت براہ راست ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ اس کی طرف سبقت کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر وہ کردار اختیار کرو اللہ کی طرف کی بخشش اور اس بہشت کے مستحق بنو جس کا وصف یہ ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۲۲﴾ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۙ﴿۲۳﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ

بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾

''کوئی مصیبت نہیں آتی زمین اور نہ خود تمہارے نفس میں مگر یہ کہ وہ ایک نوشتے میں ہے قبل اس کے کہ ہم اس کی تخلیق کریں، یقیناً یہ اللہ کے لیے آسان ہے، یہ اس لیے ہے کہ تم افسوس نہ کرو اس پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور خوش نہ ہو اس پر جو تمہاری طرف آئے اور اللہ ہر اترانے والے، فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا جو کنجوسی سے کام لیتے ہیں اور لوگوں کو کنجوسی پر آمادہ کرتے ہیں، اور جو گردانی کرے گا تو اللہ بے نیاز ہے تعریف کا حقدار''۔

حال کی ہر بات پہلے سے لوح قضاؤ قدر میں محفوظ ہوتی ہے

دنیا میں مصیبتیں جو آتی ہیں جیسے زلزلے، قحط سالیاں، مختلف قسم کے وبائی امراض اور اس دور کی شاید خاص وبا ہے ملک کے سیاسی یا فرقہ وارانہ فسادات، خود تمہارے نفس میں جیسے بیماریاں یا عزیزوں اور دوستوں کے داغ، وہ بس ایک نوشتے میں ہیں جسے مذہبی زبان میں لوح محفوظ کہتے ہیں، قبل اس کے کہ ہم اس کی تخلیق کریں'' کس کی تخلیق؟ جملے کی ساخت کے لحاظ سے قریب یہی ہے کہ ضمیر ''مصیبت'' کی طرف راجع ہو چنانچہ بعض نے ایسا ہی سمجھا ہے۔[۱] اور بعض نے اسے انفس کی طرف راجع کیا ہے[۲] مگر اس صورت میں پہلے جزء سے یعنی دنیا میں جو مصیبتیں آتی ہیں اس کا فعل نہ رہے گا۔'' اس کا مقصد یہ ہے'' یعنی نوشتے میں پہلے سے درج ہونے کا مقصد؟ بعض نے ایسا ہی خیال کیا ہے۔[۳]

مگر ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے اسلیے کہ نوشتے میں درج ہونا تو اللہ کے احاطۂ علمی کا ایک نتیجہ ہے وہ اس مقصد سے تھوڑی ہی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ تمہیں بتایا جا رہا ہے اس مقصد سے کہ اس دنیا کے عیش و آرام اور تکلیف کو کوئی اہمیت نہ دو، تقدیر الٰہی پر شاکر رہو، جو چیز ہاتھ سے جائے تو افسوس نہ کرو، یہ سمجھتے ہوئے کہ منظور خدا ایسا ہی تھا اور جو ملے اس پر اتراؤ نہیں کہ میں ایسا ہوں جسے اللہ نے اسطرح نوازا۔ یہ ''میں'' کا احساس شکر حق نہیں ہوگا بلکہ ایک قسم کا غرور ہوگا جو اللہ کو ناپسند ہے۔ حدیث میں ہے کہ: امام زین العابدین علیہ السلام نے فرمایا:

الزهد كله في آية من كتاب الله لكيلا تأسوا على ما فاتكم ولا تفرحوا بما آتاكم ... (مجمع البیان) زاہد ہونے کا پورا معیار کتاب الٰہی کی ایک آیت میں ہے کہ جو کچھ چلا جائے اس پر افسوس نہ کرو اور جو مل جائے اس پر خوش نہ ہو۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾

---

[۱] ۔بیافرانیم آن مصیبت (شاہ ولی اللہ)

[۲] ۔من قبل ان نبراء الانفس (ابن جریر)

[۳] ۔بین تعالیٰ لم فعل ذالك (تبیان)

''ہم نے اپنے پیغمبر کھلی ہوئی دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور اتارا ان کے ساتھ قانون حیات اور توازن واعتدال کا معیار تا کہ لوگ عدالت اور انصاف کو قائم رکھیں اور اتارا ہم نے لوہا جس میں طاقت جنگ کا مضبوط ذریعہ ہے اور بہت سے فائدے بھی ہیں اور اس لیے کہ اللہ جانے کہ اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب پر ایمان کی بنیاد پر کون لوگ مدد کرتے ہیں، یقیناً اللہ طاقتور ہے، غالب آنے والا۔''

تمام انبیا علیہ السلام کے ساتھ کتاب اور میزان کا اترنا

بینات جس کا ترجمہ ہم نے 'کھلی ہو دلیلوں' کے ساتھ کیا ہے، اصطلاح قرآنی میں جیسا کہ ہم نے ''مقدمہ تفسیر'' شواہد کے ساتھ لکھا ہے ''معجزات'' کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جو رسولوں کی حقانیت کی دلیل ہوتے تھے، اب اس کے ساتھ جو کہا گیا ہے کہ ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری تو یہ تحریری کتاب نہیں ہوسکتی کیوں کہ ایسی کتاب تو گنتی کے چند پیغمبروں کو ملی ہے اور یہاں عام طور پر رسولوں کے ساتھ کہا جا رہا ہے کہ ہم نے کتاب اتاری تو ہمارے نزدیک یہ کتاب کی لفظ ''کتب'' کے اس مفہوم کی حامل ہے جو خالق کی طرف سے مقرر شدہ قانون کے لیے صرف ہوتی ہے جیسے کہ کہا گیا ہے کہ، کتب علیکم الصیام ،ان الصلوۃ کانت علی المؤمنین کتاباموقوتاً۔ کتب علیکم فی القتلیٰ ۔ کتب علیکم اذاحضر احد کم الموت ان ترك خیرن الوصیته ...... اس لیے اس کا ترجمہ ہم نے قانون حیات کے ساتھ کیا۔

پھر اس کے ساتھ جو کہا گیا ہے ''میزان'' اتاری تو میزان کے لفظی معنی ترازو کے ہوتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ کوئی مادی ترازو آسمان سے نہیں اتری تو ''ترازو'' کیا ہوتی ہے؟ وزن یعنی تولنے کا ذریعہ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خریدار کو اس کے حق سے کم یا زیادہ نہ ملے، اس لیے یہاں میزان سے مقصود توازن قائم رکھنے کا سامان ہے جس سے کسی پر ظلم نہ ہوا اور کسی کا حق نہ مارا جائے پھر ہر ایک کے ساتھ اس کی سیرت کا نمونہ بھی جو توازن کی مجسم مثال ہوتا تھا جس کی بنا پر وہ ہستیاں خود بھی ''میزان'' کی حیثیت رکھتی تھیں۔

پھر کہا گیا ہے کہ ہم نے لوہا نازل کیا، اس کا مفہوم قرار تو یہ دیا جا سکتا ہے کہ ہم نے لوہا خلق کیا لیکن جناب ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت آدمؑ کے ساتھ عالم بالا سے ہتھوڑا اور پھاڑ وا وغیرہ بھی اترے تھے یہ زراعت وغیرہ کے سامان ہیں منافع للناس کے الفاظ کے تحت میں ہیں کہ پہلے بأس شدید یعنی جنگ کے سامان کی لفظ آئی ہے جس کا نمایاں ذریعہ قبل کے دور میں تلوار تھی اور اسی کا نام جناب آدمؑ کے ساتھ اترنے والے سامان میں نہیں ہے، اب اگر کوئی روایت سنائی دے کہ اس کے آخری رسولؐ پر کوئی تلوار آسمان سے اتری تو اسے مخالف قرآن نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ وہ اس کی تصدیق کرنے والی ہوگی۔

آخری جملہ اس لیے ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ اللہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کسی کی مدد کا محتاج ہے، یہ تو انسانوں کی فرض شناسی کا امتحان ہے کہ وہ اپنی قوت قاہرہ سے دشمنوں کے دفعیہ کے لیے کام نہیں لیتا، ورنہ اس کا ایک اشارہ قدرت تمام دنیا کی مخالف طاقتوں کو نیست نابود کرنے کے لیے کافی ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ

مُّهْتَدٍ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾

''اور بے شک ہم ہی نے نوح اور ابراہیم کو پیغمبر بنا کر بھیجا، اور انہی کی اولاد میں نبوت اور کتاب مقرر کی تو ان میں کے بعض ہدایت یافتہ ہیں اور ان میں کے بہتیرے بدکار ہیں''۔

(آیت کا ترجمہ منجملہ دیگر آیات کے علامہ السید علی نقی نقوی سے چھوٹ گیا تھا اس لیے حافظ سید فرمان علی صاحب اعلی اللہ مقامہ کے ترجمہ کلام سے نقل کیا گیا)۔۔۔۔ناشر

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِيَّةِ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾

''پھر ان کے پیچھے ان کے نقش قدم پر بھیجا ہم نے پیغمبروں کو اور عقب میں بھیجا حضرت عیسیٰؑ فرزند مریم کو اور انہیں ہم نے انجیل عطا کی اور جو ان کے پیرو ہیں، ان کے دلوں میں ہم نے ملنساری اور مہربانی رکھی اور رہبانیت جس کی انہوں نے طبع زاد طور پر ایجاد کی ہم نے اس کا قانون اور ان پر جاری نہیں کیا تھا مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب رہنا چاہیے تھی تو انہوں نے اس کا پورا خیال نہیں رکھا تو عطا کیا ہم نے انہیں جو ایمان لائے ان میں سے ان کا صلہ اور ان میں کے زیادہ بداعمال ہیں''۔

عیسائیوں کی نیک دلی مگر ان کی ایجاد کردہ رہبانیت کی مذمت

رہبانیت کی اس شکل میں جو عیسائیوں کے یہاں ہے، اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے اگر یہ فقرہ نہ ہوتا کہ جسے انہوں نے ایجاد کیا تھا تو پتا چلتا کہ ملنساری اور مہربانی کی طرح یہ قانون بھی بالکل اللہ کی طرف سے نافذ کیا ہوا تھا مگر اس فقرے کے بعد غلط فہمی پیدا نہیں ہو سکتی، اب مطلب ہوا کہ نرمی اور مہربانی کی جو اچھی صفتیں ہیں یہ اللہ نے ان میں رکھی ہیں جیسا کہ چھٹے پارے کے آخر میں بمقابلہ یہود مشرکین ان کی تعریف آ چکی ہے لیکن رہبانیت انکی ایجاد کردہ ہے اللہ کا حکم یہ تھا کہ اللہ کی مرضی کے پیرو ہیں یعنی لذائذ اور منافع دنیا سے اس حد تک بہرہ اندوز ہوں اور دنیا کی چہل پہل اور اجتماعی زندگی میں بھی حصہ لیں مگر ہر شعبہ زندگی میں منہیات سے پرہیز کرتے رہیں لیکن حدود کا تحفظ نہیں کر سکے اور اس طرح افراط تفریط سے کام لے رہبانیت کو اپنا لیا، اب ان میں سے جنہوں نے ایمان اختیار کیا یعنی نظام اسلامی کو قبول کر کے رہبانیت کو غلط سمجھ لیا ہے، ان کو ان کے اعمال خیر کی جزا ملے گی مگر وہ کم ہیں، اکثریت ان کی غلط راستے پر ہے۔ دوسرے مفسرین یہ مطلب لیتے ہیں کہ رہبانیت کو ہم نے تو ان پر عائد نہیں کیا تھا مگر انہوں نے رضائے الٰہی کی خاطر سے اسے اختیار کیا تو ہم اس سے خوش ہیں اور ان میں جو حضرت عیسیٰؑ پر ایمان رکھتے ہیں، انہیں اس رہبانیت کا بھی اجر ملے گا اس لیے کہ نیت اس کی حصول رضائے الٰہی تھی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ﴿۲۸﴾

''اے ایمان لانے والو اللہ سے ڈرو اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ کہ وہ تمہیں دو حصے اپنی رحمت کے عطا کرے اور تمہارے لیے ایک روشنی قرار دے جس کے ساتھ تم پھرو اور تمہیں بخشش سے نوازے اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے''۔

جن لوگوں نے گزشتہ آیت کے آخر میں جو ایمان کا ذکر تھا اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لایا ہے تو یہ خطاب انہی عیسائیوں سے ہے کہ حضرت عیسیٰؑ پر تم ایمان رکھتے تھے اب اللہ سے ڈرو اور اس ہمارے رسولؐ پر ایمان لاؤ تو تمہیں رحمت کے دو حصے ملیں گے ایک حضرت عیسیٰؑ پر ایمان کی وجہ سے اور ایک پیغمبر آخرؐ پر ایمان کے سبب سے اور تمہارے لیے بہتر ہوگا جس کے ساتھ تم راستا چلو گے یعنی تمہارا کردار دوسروں کے لیے نمونہ ہوگا اور تم دوسروں کی ہدایت کے لیے منارۂ نور ہو گے۔

ہمارے نزدیک اس کا لازم یہ ہے کہ جو ہمارے رسولؐ پر ایمان نہ لائیں، انہیں بھی رحمت الٰہی کا ایک حصہ ملے جب کہ وہ ایمان اب بھی قدر و قیمت کا حامل ہے حالاں کہ مسلمہ اسلامی اور دوسرے محکمات قرآن کی صراحت یہ ہے کہ اصل اس رسولؐ پر ایمان لانا ہے بغیر اسکے دوسرے انبیا کو ماننا نہ مصداق ایمان ہے اور نہ اعمال کا کوئی اجر ہے، لیکن جب کہ گزشتہ آیت میں ایمان سے مراد نظام اسلامی کو قبول کر کے رہبانیت کو غلط سمجھنا ہے تو یہ خطاب انہی سے ہے جو مسلمان ہو گئے ہیں اور ان سے کہنا کہ ایمان لاؤ ویسا ہے جیسے دوسری جگہ مسلمانوں سے خطاب کر کے کہا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (نساء-۱۳۶)

اے ایمان لانے والو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔

یعنی تم اقرار اسلام کر کے مؤمنین کی صف میں داخل ہوئے ہو تو اب سچے دل سے ایمان لے آؤ، بس وہی مطلب یہاں بھی ہوگا کہ مسلمان ہو گئے ہو تو اللہ سے ڈرو بھی یعنی تقوٰی اختیار کرو اور اس کے رسولؐ پر سچے دل سے ایمان لے آؤ.....اب کفلین من رحمتہ دو حصے اس کی رحمت کے، یہ دنیا اور آخرت دونوں میں اجر ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ ہے:

وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (عنکبوت۔ ۲۷)

''ہم نے انہیں ان کا اجر دنیا میں بھی دیا اور آخرت میں بھی وہ نیکوکاروں میں ہیں''۔

دوسری جگہ:

فاٰتاهم الله ثواب الدنيا وحسن ثواب الآخرة (آل عمران-۱۴۸)

''انہیں اللہ نے دنیا کا ثواب عطا کیا اور آخرت کے ثواب کی بھلائی۔

فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ. (نساء-۱۳۴)

اللہ کے پاس ہے دنیا اور آخرت کا ثواب۔

لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

''تا کہ اہل کتاب یہ نہ جانیں کہ یہ لوگ (مسلمان) اللہ کے فضل واحسان کے حصول پر کچھ قدر نہیں رکھتے اور اس لیے کہ فضل وکرم اللہ کے ہاتھوں ہیں، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل وکرم والا ہے''۔

اس آیت میں عموماً مفسرین ومترجمین پہلے لاکو زائد مان کر ترجمہ وتفسیر کی منزل سے گزرے ہیں۔[1] اب مطلب یہ ہوگا کہ اہل کتاب میں سے جو مسلمان نہیں ہوئے انہیں معلوم ہو کہ وہ اللہ کے فضل واحسان پر کچھ قدرت نہیں رکھتے۔

حالاں کہ قبل میں جب کہ یہ بتایا گیا جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں اور اس رسول کو مان لیں تو انہیں دہرا حصہ رحمت الٰہی کا ملے گا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں بھی رحمت الٰہی پر قدرت حاصل ہے اس طرح کہ وہ اسلام اختیار کر لیں تو پھر بھی لا کو زائد ماننے کی ضرورت نہیں بلکہ مطلب یہ ہوا کہ اہل کتاب یہ نہ جانیں کہ انہیں اللہ کے فضل پر کچھ قدرت حاصل نہیں ہے..... بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو کر اللہ کے فضل وکرم کے پورے پورے مستحق ہو سکتے ہیں۔

بہر حال ہم چونکہ قرآن مجید میں حروف زائدہ وجود کے جس مخالفین اسلام معترض ہیں منکر ہیں جیسا کہ مقدمہ تفسیر میں اس سلسلہ میں علامہ بلاغی کے افادات درج ہو چکے ہیں تو یہاں بھی ہم اسی مطلب کو درست سمجھتے ہیں جس میں لا کو زائدہ ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب ایک اختلاف دوسرا ہم میں اور دوسرے مفسرین میں یہ ہے کہ وہ لا کو زائد مان کر ان الفضل بید اللہ ''فضل وکرم اللہ کے ہاتھ میں ہے'' اس کا عطف الاّ یقدرون پر لیتے ہیں اس طرح وہ یعلم کے تحت میں ہوگا کہ انہیں معلوم ہو کہ وہ اللہ کے فضل وکرم پر کچھ قدرت نہیں رکھتے اور یہ معلوم ہو کہ فضل وکرم اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ہم اس کا عطف پہلے لِئَلَّا پر لیتے ہیں تا کہ انہیں یہ معلوم نہ ہو اور اس لیے کہ فضل وکرم اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

---

[1] ۔یفعل بکم هذالکی یعلم اهل الکتاب (ابن جریر) ای عملکم بذالك لیعلم (جلالین) تابدانند اهل کتاب (شاہ ولی اللہ) جانیناهل کتاب یه (شاہ رفیع الدین)

سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ

مدنیہ.....۲۲.....آیات

مجادلہ کے معنی شدت کے ساتھ بحث اور تکرار کرنے کے ہیں، چونکہ پہلی آیت میں ایک خاتون کا ذکر ہے جسے اس کے شوہر نے اپنی ماں کے مثل کہہ دیا تھا اور اس لیے اس سے قطع تعلق کرنا اس کے لیے ضروری ہو گیا تھا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس فریاد لے کر آتی تھی اور اس سلسلے میں اپنی مجبوریوں کو پیش کرتے ہوئے بحث کر رہی تھی کہ میری مشکل کا کوئی حل ہونا چاہیے اور اس بحث کو خداوند عالم نے یجادلك کی لفظ سے بیان کیا ہے کہ وہ آپ سے مجادلہ کر رہی تھی۔

سورۂ مجادلہ کے خاص خاص مضامین:

اس ذیل میں ظہار کے حکم شرعی کا بیان اور اس کے کفارے کا ذکر ہے اس علاوہ اس سورے میں حسب ذیل مضامین ہیں:۔

۱.....خدا اور رسولؐ کی مخالفت کا انجام۔

۲.....خفیہ مشوروں کے وقت اللہ کا حاضر و ناظر ہونا۔

۳.....خفیہ سرگوشیوں کی مذمت۔

۴.....نیک باتوں میں باہمی مشوروں کی اجازت۔

۵.....آداب مجلس کی تعلیم۔

۶.....اہل علم کی تعظیم تکریم کا حکم۔

۷.....آیہ نجوٰی، جس پر عمل صرف حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے کیا۔

۸.....اس وقت کے مسلمانوں کو تنبیہی تازیانے لگانے کے ساتھ اس حکم کی منسوخی۔

۹.....منافقین کی مذمت۔

۱۰.....خدا و رسولؐ کی مخالفت کرنے والے باپ بیٹے، عزیز و اقارب بھی ہوں تو ان کی محبت کا تقاضائے ایمان کے خلاف ہونا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے"

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ

تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ①

''سنی ہے اللہ نے بحث اس کی جو آپ سے اپنے شوہر کے بارے میں شدت کے ساتھ بحث کر رہی ہے اور اللہ سے شکوہ کر رہی ہے۔ اور اللہ آپ دونوں کی باہمی گفتگو سن رہا ہے، یقیناً اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے''۔

ظہار کے حکم شرعی کا بیان اور اس کے کفارے کا ذکر

احکام شرعیہ تدریجی طور پر نازل ہوئے ہیں اسلام میں واضع شریعت وقانون خداوند عالم ہے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مبلغ شریعت ہیں، واضع نہیں ہیں۔ جب تک کہ کوئی قانون اسلامی شریعت میں خالق کی طرف سے نافذ نہ کیا جائے اس وقت تک عمل یا توان احکام پر ہوگا جو سابق انبیا سے چلے آرہے ہیں، اس سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعرض نہیں فرمائیں گے، چنانچہ اب تک یہ قانون تھا کہ کوئی مرد بیوی کو کہدے کہ انت علی کظھر امی یعنی تم مجھ پر مثل میری ماں کی پشت کی ہو چونکہ پشت کو عربی میں ظھر کہتے ہیں۔ اس لیے مرد کے اس عمل کو ظہار کہا جاتا ہے تو پھر یہ عورت اس شوہر پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی، چونکہ خود یہ کوئی روزمرہ کی ضرورت کی بات نہیں تھی، اس لیے کوئی دوسرا حکم الٰہی بذریعہ وحی رسولؐ کے پاس آیا نہیں تھا اور نہ بعثت کے بعد سے اب تک اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آیا تھا تا کہ لوگ رسولؐ کے پاس آکر اس کے بارے میں دریافت کریں۔

اور مدینہ میں یہ صورت پیش آئی کہ جماعت انصار میں سے ایک صحابی اوس بن صامت نے جن کے متعلق ایک روایت میں تصریح یہ ہے کہ وہ جلیل القدر صحابی عبادہ بن صامت کے بھائی تھے اپنی بیوی سے کسی طرح یہ جملہ کہہ دیا کہ انت علی کظھر امی اور اب اس کے بعد خود بھی پریشان تھے کیوں کہ اس کا قانونی نتیجہ معلوم تھا، اس لیے ''خود کردہ را علاجے نیست'' کے مقولے کے پیش نظر یہ ہمت نہیں تھی کہ رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آکر اس اپنی غلطی کا اظہار کریں اور اس کا حل دریافت کریں بیوی نے کہا کہ میں رسولؐ کے پاس جاتی ہوں اور اس مشکل کو حل کرانے کی کوشش کرتی ہوں۔ اب اس خاتون کے نام میں ذرا سا اختلاف ہے کہ خولہ ہے یا خویلہ ہے اور باپ کے نام میں زیادہ نمایاں اختلاف ہے کہ بنت ثعلبہ ہیں یا بنت خویلد یا بنت صامت یا بنت دراج۔ بہر حال اس کی اصل قضیہ میں کوئی اہمیت نہیں۔

وہ رسول کے پاس آئیں اور صورت واقعہ بیان کی کہ میری شادی کو کافی زمانہ ہو گیا ہے۔ اتنی مدت کا میرا ان کے ساتھ ہے میں بوڑھی ہو چکی ہوں اور اولاد بھی ہمارے یہاں ہو چکی ہے۔ اب انہوں نے یہ حماقت کر دی، بتایئے اب کیا ہوگا؟ حضرتؐ نے جواب دیا ابھی تک جو عام قانون تھا اس کے مطابق اب تو تم ان پر حرام ہو گئیں، میں کیا کروں؟ بعض روایت میں ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا ' ' میرے پاس ابھی اس بارے میں کوئی حکم آیا نہیں ہے۔ رسول کی طرف سے مایوس کن جواب سن کر وہ اللہ سے فریاد کرتی ہے اور پھر پیغمبر سے اپنی وہی پریشانی اور مجبوری کہ اتنے دن کا ساتھ ہے اور بچے ہیں۔ میں کیا کروں؟ ایک روایت میں ہے کہ وہ اپنے حال زار کے بیان میں گریہ بھی کر رہی تھی۔ پھر حضرت جیسے اپنی بے بسی کا اظہار فرماتے ہیں اور پھر وہ خدا کو پکارتی ہے۔ یہ صورت واقعہ ہے جسے خالق کریم نے سورے کی اس پہلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔ طبری نے اس کے تفصیلات دور قدیم کے راویوں کی زبانی بیان کیے ہیں چونکہ رسولؐ کا اپنی بے بسی کے اظہار کے ساتھ یہ جواب اور اس کی مضطربانہ طور پر خالق سے فریاد کہ اس میں کی کوئی بات ہمارے نزدیک شان رسولؐ کے خلاف نہیں ہے لہٰذا اب ان روایات کے رد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

روایت بتاتی ہے کہ تیسری دفعہ حضرتؐ جیسے بالکل خاموش ہو گئے اور حضرت کے چہرے پر ایک خاص قسم کا تغیر محسوس ہوا اور یہ اس کی علامت تھی کہ وحی نازل ہونے والی ہے اور اس وقت یہ آیتیں اتریں ہم نے اس کی بحث اور خدا سے فریاد سب سنی۔ مطلب یہ تھا کہ اب ہم اس کا حل بتاتے ہیں جس سے اس کی پریشانی دور ہو۔ روایت بتاتی ہے کہ آپ کی خاموشی کو دیکھ کر وہ بھی اب جیسے خاموشی سے نتیجہ کی منتظر ہو گئیں کہ یہ آیتیں اتریں، حضرتؐ نے سر اٹھایا اور فرمایا اپنے شوہر کو جا کر میرے پاس بھیج دو۔ [1]

اب راوی کے بتانے کی ضرورت نہیں کہ آپ کے اس جواب سے کتنی اس کے نہال امید میں تازگی پیدا ہوئی اور کیسی مضطربانہ ومشتاقانہ تیزی کے ساتھ وہ اپنے گھر گئی اور اپنے شوہر کو بلا کر اپنے ساتھ لائی۔

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۳ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۴

”وہ جو تم میں سے اپنی عورتوں سے اظہار کرتے ہیں، وہ ان کی ماں تو نہیں ہیں، مائیں تو ان کی بس وہی تھیں جنہوں نے اپنے پیٹ سے انہیں پیدا کیا تھا۔ اور لوگ ایک بری بات زبان سے کہتے ہیں اور جھوٹ اور بلاشبہ اللہ بخشنے والا، بڑا مہربان ہے اور جو لوگ اپنی عورتوں سے اظہار کریں، پھر جو کچھ کہا ہے اس سے (پریشان ہو کر) رجوع کرنا چاہیں تو آپس میں تعلقات ازدواجی قائم کرنے سے پہلے ایک بندۂ آزاد کریں، یہ تمہیں سبق دیا جاتا ہے اور اللہ جو کچھ تم کرو اس سے واقف ہے۔ اب جس کے پاس نہ ہو تو پے در پے دو مہینے روزے رکھنا ہوں گے قبل اس کے ازدواجی تعلقات کے۔ اب جو اس پر قدرت نہ رکھتا ہو تو وہ ساٹھ غریبوں کو کھانا کھلائے۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ اور اس کے پیغمبر پر تمہارا ایمان پایہ ثبوت تک پہنچے اور یہ اللہ کی طرف کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے“۔

ان آیات سے ظہار کے متعلق حسب ذیل باتیں سمجھ میں آتی ہیں:۔

(۱) جس طرح متبنیٰ بنانے یعنی بیٹا کہہ دینے سے کوئی واقعی بیٹا نہیں ہو جاتا، ویسے ہی ماں کہہ دینے سے واقعی وہ عورت ماں نہیں بن جاتی، نسبی جو رشتے ہیں، وہ قدرتی اسباب سے وابستہ ہیں اور وہ تمہارے کہنے یا سمجھ لینے سے وابستہ نہیں ہیں۔

شریعت اسلام میں بس رضاعت ایک ایسی چیز ہے وجو بعض احکام میں نسبی رشتوں کے ساتھ مشترک ہو جاتی ہے۔ باقی کہہ دینے یا سمجھ

---

[1] ۔ادعی لی زوجك (ابن جریر)

لینے سے کوئی رشتہ قائم نہیں ہوتا۔

(۲) یہ کام یعنی بیوی کو ماں کہنا ظہار کا جو مطلب ہے اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ اور بہت برا عمل ہے۔اس لیے اس کو منکر اور زور کہہ یا یعنی خلاف واقعہ ہونے کے علاوہ بہت بڑی برائی اس میں یہ ہے کہ ایک طرح یہ ماں کی توہین ہے، چونکہ ماں کا احترام پیش خدا بہت اہمیت رکھتا ہے لہٰذا غلط محل پر ماں کی لفظ کا صرف بھی اسے ناپسند ہے۔

(۳) اب اس کے بعد کیا ہو؟ کیا بس اس قول کو لغو، مہمل اور بے اعتبار سمجھ لیا جائے اور کچھ نہیں اب یہ شوہر ہے اور وہ اس کی زوجہ؟ .....جی نہیں، یہ جو ماں کی بے حرمتی کی اور رشتہ ازدواج کی ناقدری بھی .....اس کی کچھ تو سزا ہونی چاہیے۔وہ یہ ہے کہ اب ابھی تو وہ اس کے لیے حرام ہے لیکن شرعی رمانہ جسے کفار کہتے ہیں، ادا کردے تو وہ اس کے لیے حلال ہو جائے گی۔اب وہ کفارہ کیا ہے؟۔

(۴) اس کے بیان سے پہلے یہ جملہ کہ **ثم یعودون لما قالوا** جس کا ترجمہ ہم نے یہ کیا ہے کہ جو کچھ کہا ہے اس سے (پریشان ہوکر) وہ رجوع کرنا چاہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ظہار کے بعد انہیں یکسوئی کے ساتھ صبر وسکون کے لمحات میں یہ غور کر لینا ہے وہ اس کے تقاضا پر قائم رہنا چاہتے ہیں یا اس کے ساتھ تعلقات کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں۔اگر رجوع کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ترکیب یہ ہے۔

(۵) کفارہ ادا کریں، وہ ترتیبی طور پر تین چیزیں ہیں، پہلے یہ کہ کسی کو جو قید غلامی میں ہے آزاد کرے یہ ظاہر ہے کہ ایسے صاحبان حیثیت کا کام ہے جو خود غلام یا کنیز کے مالک ہوں یا اتنا پیسہ رکھتے ہوں کہ خرید کر آزاد کر سکیں اور اب عرصہ دراز سے غالب معمورۂ ارض میں غلامی کے سد باب کی وجہ سے یہ چیز خارج از بحث ہوگئی لہٰذا کہا گیا کہ جس کے پاس یہ امکان نہیں ہے تو پھر دو مہینے کے پے در پے روزے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک مہینے کے روزے تو تمام وکمال ایک ساتھ ہوں، کوئی دن ناغہ نہ ہو اور اُس سے ملا ہوا دوسرے مہینے کے روزہ رکھ لے۔اب دوسرے مہینے کے باقی روزے کچھ تفریق کے ساتھ رکھ سکتا ہے۔بہر صورت ان تمام روزوں کے رکھنے کے لیے جسمانی صحت وطاقت کی ضرورت ہے لہٰذا اس کے ساتھ کہا گیا کہ اگر یہ نہ کر سکے تو پھر؟ آخری چیز یہ ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

طبری کی درج کردہ روایت میں ہے کہ جب اوس بن صامت رسولؐ کی خدمت میں آئے تو حضرتؐ نے یہ آیات پڑھ کر سنائے اور دریافت فرمایا کہ کیا تم طلاق دینا چاہتے ہو؟ انہوں نے انکار کیا تو حضرتؐ نے فرمایا تو پھر کفارہ دو اور وہ یہ ہے کہ بندۂ راہ خدا میں آزاد کرو۔انہوں نے کہا یہ میں کہاں کر سکتا ہوں تو حضرت نے فرمایا تو پھر پے در پے دو مہینے کے روزہ رکھو۔انہوں نے کہا ضعیفی سے میرا عالم یہ ہے کہ دن میں تین وقت کچھ نہ کچھ کھاؤں تو میری بصارت میں فرق محسوس ہوتا ہے۔فرمایا پھر ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔انہوں نے کہا اس کے لیے جتنا پیسہ درکار ہے وہ بھی میرے پاس نہیں ہے۔حضرتؐ نے فرمایا، خیر اس میں تمہاری مدد کی جا سکتی ہے۔چنانچہ آپ نے انہیں کچھ غلہ عنایت کیا جس سے انھوں نے کفارہ ادا کیا اور اس طرح اس خاتون کی دادرسی ہوگئی اور یہ ظہار کا قصہ رفع دفع ہو گیا۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ كُبِتُوا كَمَا كُبِتَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَقَدْ أَنزَلْنَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۚ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٥﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا

فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۧ ⑥

''یقیناً جولوگ اللہ اوراس کے پیغمبر کی مخالفت کرتے ہیں، وہ ویسے ہی ذلیل ورسواہوں گے جیسے وہ لوگ ذلیل ورسوا ہوئے جوان کے پہلے تھے اور ہم نے کھلی ہوئی نشانیاں اتاری ہیں، اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے جس دن ان سب کو وہ دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے گا تو انہیں بتائے گا جو انہوں نے کیا تھا۔ اللہ تو اس پر حاوی ہے اور وہ اسے بھول گئے ہیں اور اللہ ہر چیز پر حاضر وناظر ہے''

''وہ انہیں بتائے گا'' یعنی ان کے کرتوت ان کے سامنے لاکر انہیں سزا دے گا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَاۤ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۧ ⑦

''کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ جانتا ہے اسے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ کوئی تین آدمی آپس میں خفیہ باتیں نہیں کرتے مگر یہ کہ وہ انکا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ مگر یہ کہ وہ ان کے ساتھ ہے جہاں بھی وہ ہوں گے، پھر انہیں بتائے گا جو کچھ انہوں نے کیا ہے قیامت کے دن، یقیناً اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے''۔

ناداں بچے جیسے کسی بات کو جب تک دہرادہرا کران کے سامنے پیش نہ کی جائے نہیں سمجھتے ویسے ہی خالق کریم کے سامنے تمام افراد انسانی ہیں لہٰذا اللہ کے حاضر وناظر ہونے کی حقیقت کو وہ اس طرح سمجھا تا ہے جیسے بچوں کو کوئی بات سمجھائی جاتی ہے مگر افسوس ہے کہ صاحب عقل انسان اس کے بعد بھی نہیں سمجھتا۔ ورنہ یہ حقیقت اگر اس کے پیش نظر رہے تو وہ کوئی کام ایسا کیوں کرے جو اس مالک حقیقی کے قانون کے خلاف ہو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۫ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑧

''کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہیں خفیہ سرگوشی سے ممانعت کی گئی، پھر بھی جس سے انہیں منع کیا تھا، وہ دوبارہ

وہی حرکت کرتے ہیں اور آپس میں خفیہ میٹنگیں، گناہ اور ظلم وتعدی اور پیغمبر کی نافرمانی کے ساتھ کرتے ہیں اور جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو اس طرح سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے آپ کو سلام نہیں کیا اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ جو ہم کہتے ہیں، اس پر اللہ ہم پر عذاب نازل کیوں نہیں کرتا۔ ان کے لیے دوزخ کافی ہے جس کی تپش انہیں اٹھانا ہوگی تو وہ کتنا برا انجام ہے''۔

یہ کھلے ہوئے کفار ومشرکین نہیں ہوسکتے ورنہ انہیں پیغمبر منع کیوں کریں گے خفیہ سرگوشی سے اور ان سے پیغمبر کی اطاعت کا مطالبہ ہی کیوں ہو، اور ان سے یہ امید ہی کیوں کی جائے گی کہ وہ رسولؐ کو مناسب طور پر ادب وقاعدے کے ساتھ سلام کریں، یہ تو وہی ہوسکتے ہیں جو اسلامی جماعت میں داخل ہو چکے ہیں اس لیے پیغمبر کے پیغمبر ہونے کا اقرار کر کے آپ کی اطاعت کا جوا اپنے کندھوں پر رکھ چکے ہیں۔ مگر خفیہ میٹنگیں کرتے ہیں، اسلام پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کی ضرر رسانی کے لیے اور ان کی ان خفیہ کاروائیوں کی اطلاع رسولؐ کو ہوتی ہے تو آپ انہیں بلا کر متنبہ فرماتے ہیں کہ مجھے تمہاری خفیہ سرگوشیوں کی اطلاع ہے۔ دیکھو ایسا نہ کرو مگر وہ اس کے بعد بھی اپنے رویے میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے اور اس پر طرہ یہ کہ پیغمبر خدا ﷺ کے پاس آ کر بدتمیزی سے مثلاً حضرتؐ کا نام لے لے کر مخاطب ہوتے ہیں حالانکہ ان کی عظمت کا پاس ولحاظ وہ ہے کہ خداوند عالم نے اس عظمت وجلال ذات کے ساتھ ان سے نام لیکر تخاطب نہیں کیا اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ ہمارا طرز عمل ہوگا اور چونکہ واقعی تو وہ خدا کی خدائی اور رسولؐ کی رسالت پر ایمان رکھتے نہیں، اسلیے دل میں اپنے کہتے ہیں کہ اگر واقعی خدا کوئی چیز ہے تو ہمارا طرز عمل تو ایسا ہے کہ اسے ہم پر عذاب نازل کر دینا چاہیے تو اللہ آخر ہم پر عذاب کیوں نازل نہیں کرتا اور اللہ اپنی ستار العیوبی کو قائم رکھتے ہوئے ان کے نام کے بغیر اپنی علام الغیوبی کے ثبوت میں نہ صرف ان کی خفیہ سرگوشیوں بلکہ ان کے ذہنی تصورات کا بھی پردہ قرآن میں فاش کر دیتا ہے مگر جیسے کہہ دیتا ہے کہ ان کے افعال تو ایسے ہی ہیں کہ مستحق عذاب ہیں مگر حکمت ربانی کا تقاضا اس امت میں یہ ہے کہ ان پر دنیا کا عذاب نازل نہیں ہوگا۔ ان کے معاملے کو آخرت پر اٹھا رکھا جائے گا اور وہاں کا عذاب دوزخ کا ہے، وہ ان کے لیے کافی ہے۔

ہم ان آیات کے الفاظ سے بالکل یہی سمجھتے ہیں جو لکھا گیا مگر مفسرین جمہور ان آیات کو لے جا کر جماعت یہود پر منطبق کرتے ہیں۔

آپ کو سلام کرتے ہیں اسطرح جس طرح اللہ نے سلام نہیں کیا ہے'' اس کے لیے یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ السلام علیك کے بجائے السام علیك کہتے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ پر ہلاکت ہو [1] مگر اتنی بڑی سنگین گستاخی کو خداوند عالم بس ان الفاظ میں ظاہر کرے کہ اللہ نے آپ کو اس طرح سلام نہیں کیا''۔ یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

بس ایک جناب ابن عباسؓ ہیں جنہوں نے اس آیت میں منافقون کا نام لیا ہے مگر انہوں نے بھی سلام کی وہی کیفیت بتائی ہے کہ وہ السام علیک کہتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ ام المؤمنین عائشہ نے اسے محسوس کیا اور پیغمبر خدا ﷺ سے کہا کہ یہ کمبخت سلام کے بجائے سام کہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا میں محسوس کرتا ہوں اور اس لیے جواب میں صرف علیکم کہتا ہوں جس سے وہ بددعا انہی کی طرف پلٹ جاتی ہے۔

زہری کی روایت میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ ابل پڑیں اور جونہی انھوں نے اس طرح سلام کیا، وہ چیخ اٹھیں علیکم السامۃ واللعنۃ ''ارے ہلاکت اور پھر لعنت تم ہی کو ہوگی، مگر پیغمبر اکرمؐ نے منع فرمایا اور صبر تحمل کی ہدایت فرمائی۔

---

[1] ۔عن مجاهد: قال اليهود كانو يقولون السام عليك (ابن جرير)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۹

''اے ایمان لانے والو! جب آپس میں خفیہ باتیں کرو تو گناہ اور ظلم وتعدی اور رسول ؐ کی نافرمائی کی باتیں نہ کیا کرو اور نیکی اور پرہیزگاری کی باتیں کیا کرو اور اللہ سے ڈرو جس کی طرف دوبارہ زندگی کے بعد تم سب کو یکجائی طور پر جانا ہے''

اگر وہ جماعت یہود کی بات ہوتی تو مسلمانوں کو مخاطب کر کے اس حکم کی کیا ضرورت تھی اور پھر ایک طرح کی تھدید کے ساتھ اور حشر نشر کی یاد دہانی کے ساتھ؟ چونکہ منافقین وہ ہیں جو مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہیں اس لیے یایھا الذین آمنوا کہہ کر ضابطۂ قانونی کے ماتحت یہ پوری جماعت مراد ہوتی ہے جس میں منافقین بھی داخل ہیں، اس لیے ان کے انتباہ کے لیے مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ ہدایت کی گئی ہے جس میں بعد والے جملے سے یہ اصول بتا دیا گیا کہ ہر خفیہ قسم کی گفتگو ممنوع نہیں ہے بلکہ گر نیک مقاصد سے مصلحتہً خفیہ میٹنگ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے بلکہ وہ پسندیدہ پروردگار ہوگی۔

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَاۗرِّهِمْ شَيْـــًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰

''وہ خفیہ گفتگو شیطان کی تحریک سے ہوتی ہے تاکہ انہیں جو مؤمن ہیں باعث رنج ہو حالانکہ وہ انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی سوا اس کے کہ منظور خدا ہو اور اللہ کا بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو''

جب کہ گزشتہ آیت میں ایک قسم کی خفیہ گفتگو کی ممانعت کی گئی اور اس کے بالمقابل دوسری طرح کی خفیہ گفتگو کا بصیغہ امر حکم دیا گیا جو اس بناء پر کہ ممانعت کے مقابلے میں ہے حکم نہیں، بلکہ اجازت کے مفہوم میں ہوگا تو اب شیطانی تحریک کا نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے وہ پہلی ہی قسم کی سرگوشی ہوگی جس کی ممانعت کی گئی تھی۔ اس طرح یہ الف لام النجویٰ میں عہد کا ہوگا جس کی بنا پر ہم نے ترجمہ کیا ''وہ خفیہ گفتگو یعنی سرگوشی جو منافقین کرتے ہیں لہٰذا اب جو الذین آمنوا ہے، اس سے مراد وہ ہوں گے جو واقعی مومن ہیں اور اسطرح اخر میں جو کہا گیا ہے کہ مؤمنین کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے، اس سے مراد بھی یہی سچے مومن ہیں چنانچہ یہاں مفسر طبری بھی اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ [1]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۱۱

---

[1] ۔ اولیٰ الاقوال فی ذالك بالصواب قول من قال عنی به مناجاة المنافقین (ابن جریر)

''اے ایمان لانے والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجمعوں میں ادھر اُدھر ہٹ کر جگہ دو تو جگہ دے دیا کرو، اللہ تمہارے لیے کشائش پیدا کریگا اور جب تم سے کہا جائے کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو جاؤ اللہ بلندی نمایاں کرے بدرجہا ان کی جو تم میں ایمان رکھتے ہیں او جنہیں علم کا جوہر عطا ہوا ہے اور اللہ جو تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے''۔

بغیر تفاسیر کے مطالعے کے خود آیت کے الفاظ سے جو سمجھ میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبوں میں یا کسی مجلس مشاورت میں لوگ پہلو سے پہلو ملائے ہوئے بیٹھے ہیں اور ایک شخص ایسا آیا جو تقدم ایمان کے اعتبار سے اور علمی بلندی کے لحاظ سے قابل تعظیم و تکریم ہے مگر لوگ اسے جگہ نہیں دیتے کہ وہ آگے نہیں بڑھ سکتا، اس بدتمیزی پر قرآن نے تنبیہ کی ہے۔ ایک تو قابل احترام شخص کو دیکھ کر لوگوں کو خود ہی اس شعور سے کام لینا چاہیے تھا کہ اس کے احترام میں کھڑے ہو جائیں اور اسے آگے بڑھ کر شایان شان جگہ پر بیٹھنے کا موقع دیں اور پھر اس پر مزید یہ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجمع سے فرمائیں کہ دیکھو، وہ آ رہے ہیں، اٹھ کھڑے ہو اور انہیں آگے بڑھنے کے لیے جگہ دو مگر مجمع اس پر بھی ٹس سے مس نہ ہو تو یہ کتنی بدتمیزی کی بات ہوگی، اس لیے آخر کے جملے میں ایک تہدیدی انداز ہے کہ ''اللہ جو تم کرتے ہو، اس سے خوب واقف ہے'' یہ تو ہم نے وہ لکھا ہے جو خود الفاظ آیت سے سمجھ میں آتا ہے۔ اب تفسیر سامنے رکھتے ہیں اور اس پر نظر ڈالتے ہیں تو پہلے مجالس کی تشریح میں اختلاف ہو گیا کچھ لوگوں نے مجالس کی تشریح میں اختلاف ہو گیا، کچھ لوگوں نے مجالس کے معنی وہی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بزم کے قرار دئے، اور کچھ نے اُسے مجالس جہاد قرار دیا مگر یہ دوسری تشریح ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئی اس لیے کہ جہاد کے میدان ہوتے ہیں یا صفوف لشکر ہوتے ہیں، مجالس نہیں ہوا کرتے۔

پھر اس کے بعد جو ہے کہ جب کہا جائے کھڑے ہو جاؤ، اس کے معنی یہ لیے ہیں کہ جب کچھ کارہائے ضروری کے لیے اور نماز کے لیے کہا جائے تو اٹھ کھڑے ہوا کرو۔ اگر فقط یہی جملہ ہوتا تو بات اپنی جگہ صحیح تھی مگر یہ تو بیچ میں ہے، یہ جو مفہوم قرار دیا گیا ہے، مجھے اس کا ربط نہ تو قبل کے جملے سے محسوس ہوتا ہے اور نہ بعد کے جملے سے، اور میں تو وہی مفہوم سمجھ رہا ہوں جو خود الفاظ آیت سے سمجھ میں آیا تھا جو پہلے لکھا جا چکا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اے ایمان لانے والو! جب پیغمبر کے پاس آ کے بصیغہ راز کچھ بات کرو تو اپنی اس بات چیت سے پہلے کچھ خیرات دے دیا کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور زیادہ پاکیزگی کا ذریعہ تو اگر تمہارے پاس نہ ہو تو بلاشبہ اللہ

بخشنے والا، مہربان ہے۔ (ارے) کیا تم ڈر گئے اس سے کہ اپنی صیغہ راز والی باتوں کے پہلے خیرات دو، اب جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی تو بس نماز پڑھتے رہو اور زکوۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو، اور اللہ واقف ہے اس سے جو تم کرتے ہو"۔

یہ مشہور و معروف آیہ "نجوٰی" ہے جس کے لیے علی بن ابی طالب علیہ السلام کے مخصوص مناقب میں سے ایک یہ ہے کہ اس آیت پر سوا آپ کے کسی نے عمل نہیں کیا۔

واقعہ یہ تھا کہ اکثر صحابہ رُسولؐ حضرت سے اپنے تقرب کے اظہار کے لیے بلاوجہ جب موقع ملتا رسول کی خدمت میں آ کر چپکے چپکے باتیں کرتے تھے جسمیں اس کا مظاہرہ تھا کہ ہم بڑے حضرتؐ کے راز دار ہیں، یہ باتیں اکثر کسی افادیت کی حامل نہیں ہوتی تھیں، اس سے بلاوجہ رسولؐ کا قیمتی وقت برباد ہوتا تھا۔ حضرت بربنائے اخلاق کریمہ اسے برداشت کرتے تھے اور ان کی دل شکنی نہ فرماتے تھے۔ خداوند عالم نے ذرا ان کی تنبیہ کے لیے اور ان پر اور دوسروں پر بھی نمایاں کرنے کے لیے کہ وہ حقیقۃً کتنے پانی میں ہیں، ذرا سا ان کا امتحان لے لیا کہ جب رسولؐ کے پاس آ کے تمہیں اس طرح مخفی طور پر باتیں کرنا ہوں تو پہلے راہ خدا میں کسی غریب کو کچھ دے دو۔ اس میں کوئی کم زیادہ کی قید نہیں تھی مگر اب سناٹا ہو گیا اور جو لوگ روز آیا کرتے تھے اب ان میں سے کوئی نہیں آیا، حتر ام حکم الٰہی کے قائم رکھنے کے لیے صرف حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام تھے، جنہوں نے اس دوران میں کئی مرتبہ صدقہ دیا اور آ آ کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں تھوڑی تھوڑی دیر بیٹھے، جب خالق کی طرف سے جو امتحان کا مقصد تھا، وہ پورا ہو گیا تو دوسری آیت اتری جس کا مطلب یہ کہ اچھا بس اتنے ہی میں تمہارے خلوص و تقرب کا بھرم کھل گیا تم اتنے سے میں اڑ گئے، اب یہ حکم ہر طرف، اب جو عام فرائض ہیں، بس وہی ادا کرو اور خدا اور رسول کی طرف سے جو عام فرائض ہیں، بس وہی ادا کرو، یقیناً اس کے بعد زرا بھی جنہیں غیرت تھی ان کے آنے میں رسولؐ کی خدمت میں ذرا کمی ہو گئی اور رسول کے پاس آنے والوں کے خلوص کی حقیقت بھی نمایاں ہو گئی۔

محمد ابن جریر طبری نے مجاہد کی زبانی تو بس اتنا لکھا ہے کہ فلم نیاجه الاعلی ابن ابی طالب قدم دینارا تتصدقة به "تو اس کے بعد آپ سے اس طرح آ کر بات نہیں کی سوا علی ابن ابی طالب کے جنہوں نے ایک دینار الگ کیا اور اسے خیرات میں دیدیا۔

دوسری روایت میں خود علی ابن ابی طالبؑ کا فرمان درج ہیں: ان فی کتاب الله عزوجل الایة ماعمل بها احد قبلی ولایعمل بها احابعدی. کتاب الٰہی میں ایک آیت ایسی ہے کہ نہ اس پر کسی نے میرے پہلے عمل کیا اور نہ بعد میں اس پر عمل کرنے والا ہو گا۔

تیسری روایت میں بھی وہی پہلا مضمون ہے، چوتھی روایت میں حضرت علیؑ کا بیان ہے کہ میرے پاس ایک دینار تھا میں نے اسے بھنوالیا تو میرے پاس دس درھم ہو گئے۔ اب میں نے یہ کیا کہ حضرتؐ کے پاس جب بھی آتا تھا، ایک درہم کسی کو دیتا تھا۔ اس کے بعد یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ دوسرے تفاسیر اہل سنت جیسے کشاف اور تفسیر خازن اور تفسیر ابن کثیر، اور در منثور وغیرہ میں بھی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی یہ خصوصیت درج ہے۔ اب طبری کی ایک روایت میں تو یہ ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے چار مرتبہ صدقہ دیا جس کے بعد وہ حکم منسوخ ہوا۔

زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ حکم کتنے وقت تک رہا۔ ایک قول یہ ہے کہ دس دن تک یہ حکم رہا اور ایک یہ ہے کہ پورے ایک دن بھی نہ رہا، صرف چند گھنٹوں تک رہا اس کے بعد دوسری آیت نازل ہو گئی۔

درایۃً ان میں پہلی بات قابل ترجیح ہے، اس لیے کہ اس حکم کا جو مقصد تھا وہ اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا تھا، جب تک کافی مدت اس کا عمل کرنے کی دعویداران خلوص وتقرب کودی نہ جائے پھراس کی تائیداس روایت سے بھی ہوتی ہے جوحضرت علیؑ کی زبانی آچکی ہے کہ آپ کے پاس ایک دینار سے دس درہم ہوئے۔اس سے ذہن میں آتا ہے کہ حکم دس دن رہااورآپ نے روز ایک مرتبہ حضرت سے مکالمہ کرتے ہوئے ایک درہم دیئے۔اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہوگیا۔عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ علی ابن ابی طالبؑ کے لیے تین فضیلتیں ایسی ہیں کہ ان میں سے ایک میرے لیے ہوتی تو میرے لیے سرخ بال والی اونٹ سے زیادہ محبوب ہوتی۔ایک حضرت فاطمہ زہراعلیہاالسلام کے ساتھ شادی ،اوردوسرے خیبر میں علم کا عطا ہونا،اورتیسرے آیہ نجوٰی پر عمل میں منفرد ہونا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۶﴾ لَنْ تُغْنِىَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَىْءٍ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ ﴿۲۰﴾

’’کیاتم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جنہوں نے اتحاد عمل کیا ہے اس جماعت سے جس پر اللہ کا غضب ہے، نہ وہ ان میں ہیں اور نہ تم میں سے اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، حالاں کہ وہ جانتے ہیں، ان کے لیے اللہ نے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے، بہت برا ہے وہ جو وہ کرتے رہے ہیں، انہوں نے اپنی قسموں کو سپر بنالیا تو اللہ کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں تو ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔انہیں ان کے مال اور اولاد اللہ کے مقابلے میں کچھ فایدہ نہ پہنچائیں گے، یہ لوگ دوزخ والے ہیں کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جس دن اللہ انہیں دوبارہ اٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے یوں ہی قسمیں کھائیں گے جیسے تم لوگوں کے سامنے کھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ کسی صحیح پالیسی پر ہیں، آگاہ ہونا چاہیے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ان پر شیطان نے غلبہ پایا لیا ہے تو انہیں اللہ کی یاد کو بھلا دیا ہے۔یہ لوگ شیطان کے پارٹی والے ہیں آگاہ ہو کہ شیطان کی پارٹی گھاٹا اٹھانے والی ہے، یقیناً جو اللہ اور اس کے پیغمبر کی

مخالفت کرتے ہیں، یہ لوگ انتہائی ذلیل لوگوں میں سے ہیں''

قرآن مجید میں یہود کا جیسے مخصوص وصف جو مثل لقب ہو گیا ہے کہ وہ ''مغضوب علیھم ''یعنی موردِ غضب پروردگار ہیں، ۔منافقین جا کر ان کے ساتھ مشوروں میں شریک ہوتے تھے اور انہیں اپنی ہمدردی اور یک جہتی کا یقین دلاتے تھے اور جب مسلمان ان سے پوچھتے تو وہ قسمیں کھا کھا کر انکار کرتے تھے یہ آیتیں انہیں کے اس کردار کی مذمت میں ہیں۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۱﴾

''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ ضرور بالضرور میں اور میرے پیغمبرؑ غالب آئیں گے یقیناً اللہ طاقتور ہے، غالب آنے والا''۔

لکھ دیا ہے''اس کا قطعی فیصلہ ہے مگر یہ کسی ایک پیغمبر کے ظرف زندگی سے متعلق نہیں ہے بلکہ وہ پورا نظام جو اللہ کا قائم کیا ہوا اور اس کے پیغمبروں کا پہنچایا ہوا ہے اس کے آخر میں عالمگیر غلبہ کا ذکر ہے جس کا دوسرے مقامات پر''لیظھرہ علی الدین کلہ'' کی لفظوں میں اعلان ہے۔وہ مکمل طور پر دنیا کے سامنے نہیں آیا ہے۔اس کے لیے ایک خاص رہنما کا انتظار ہے جو دنیا کے سامنے آخر عمر دنیا میں آئے گا۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾

''کسی جماعت کو جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہو،نہیں پاؤ گے کہ وہ محبت رکھیں ان سے جو اللہ اور اس کے پیغمبروں کے مخالف ہیں، چاہے وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے یا اور بھائی ہوں یا ان کے قبیلے والے ہوں۔ یہ وہ ہوں گے کہ جن کے دلوں میں اس نے ایمان کو نقش کر دیا ہے اور ان کی تقویت کی ہے اپنی طرف کی روح سے اور انہیں داخل کرے گا ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں۔ یہ اللہ کی جماعت والے ہوں گے یقیناً اللہ کی جماعت والے غالب آنے والے ہیں۔''

منافقین کے مقابلے میں یہ ایمان والوں کی شان ہے۔ان کے ذکر میں کہا گیا تھا کہ یہ شیطان کی پارٹی والے ہیں۔اب ان کے مقابلے میں اس گروہ کو کہا جا رہا ہے کہ یہ اللہ کی طرف والے ہیں۔ان دونوں میں نتیجے کے لحاظ سے غلبہ ایمان والوں ہی کا ہونا ہے۔

سُوْرَۃُ الْحَشْرِ

مدنیّہ.....۲۴.....آیات

وہ حشرِ عمومی اولین اور آخرین کا ہے جو قیامت میں ہوگا، یہاں یہود کے ایک قبیلہ کو اجتماعی طور پر سزا دی گئی ہے اور اس کو سورۂ کی دوسری آیت میں حشر سے تعبیر کیا گیا اس پر سورہ کا یہ نام ہوا۔

اس ذیل میں ان اموال کے متعلق احکام کا بیان ہوا ہے جنہیں فقہ میں بھی قرآن مجید کی استعمال کردہ لفظ کے لحاظ سے فیٔ کہا جاتا ہے۔اس ضمن میں مہاجرین اور انصار کی توصیف ہے اور اس کے بعد منافقین اور ان کی ترکیبوں کا بیان ہے جو سورۂ بقرہ کے شروع والے حصے سے لے کر یہاں تک قرآن مجید کی ایک بڑی مہم معلوم ہوتی ہے۔اس سب کے بعد قرآن کی قوت تأثیر کا پُرزور الفاظ میں اظہار ہے۔آخر کی کئی آیتوں میں اوصاف الٰہی کا مسلسل تذکرہ ہے جس پر یہ سورۂ ختم ہوا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ②

''تسبیح خواں ہے اللہ کے لیے جو چیز بھی ہے آسمان میں اور جو چیز بھی ہے زمین میں ہے اور وہ غالب آنے والا، صحیح کام کرنے والے ہے۔وہ وہ ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان کو جنہوں نے کفر اختیار کیا، نکالا ان کے گھروں سے پہلے حشر میں، تم لوگوں کو تو گمان بھی نہیں بھی نہیں تھا کہ وہ نکلیں گے اور ان کا گمان یہ تھا کہ ان کے قلعے انہیں اللہ سے محفوظ رکھیں گے تو اللہ اُن کی طرف آیا ایسی راہ سے جس کا اُنہیں خیال نہیں تھا اور ان کے دلوں میں اس نے رعب ڈال دیا کہ وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے مسمار کر رہے تھے ایمان والوں کے ہاتھوں سے، تو اے نگاہ والو عبرت حاصل کرو''۔

جماعت یہود کے جو اہم قبیلے مدینہ میں آباد تھے، بڑے صاحبِ اقتدار، صاحبِ ثروت اور دفاعی اسلحہ سے مسلح تھے اور انہوں نے بڑے بڑے قلعے بنا رکھے تھے، جنہیں وہ ناقابل تسخیر سمجھتے تھے۔ ان میں سے ایک بہت مضبوط قلعہ قبیلہ بنی نضیر کا تھا۔ انہوں نے جب غداری کی اور رسول ؐ نے محاصرہ کیا تو جیسے اس آیت میں ہے، اللہ نے ان پر رعب ایسا طاری کیا کہ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے ان شرائط پر کہ وہ مدینہ سے باہر نکل جائیں گے اور جتنا مال دولت اونٹوں پر بار ہو سکے، وہ سب ساتھ لے جائیں گے، باقی ان کے مکانات اور جو سامان نہ جا سکے، ان سب پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگا۔ چنانچہ اس شرط کے مطابق ان کی جلاوطنی شام کے مل کی طرف ہوئی اور کچھ لوگ خیبر کی طرف چلے گئے۔ حشر کے معنی اکٹھا کرنے کے ہیں۔ اس اجتماعی جلاوطنی کو پہلے ''حشر'' کی لفظ سے تعبیر کرنے سے ذہن اس برے حشر کی طرف مڑتا ہے جو قیامت میں ہوگا اور جہاں اولین اور آخرین سب اکٹھا ہوں گے اور ہر ایک کو پوری سزا اس کے زندگی بھر کے جرائم کی ملے گی۔

اپنے گھروں کو کیوں مسمار کر رہے تھے؟ اس کے لیے ایک خیال یہ ہے کہ چونکہ منقولہ اموال کے ساتھ لے جانے کی اجازت ہوئی تھی اس لیے گھر کا دروازہ جو انہیں قیمتی معلوم ہوتا تھا یا کوئی خاص لکڑی کہیں پر قیمتی تھی تو وہ اس کو نکال کر اپنے ساتھ منقولہ اموال میں شامل کرتے تھے دوسرے یہ کہ قلعے کے کچھ حصے کو مسلمان توڑتے تھے وہ اپنے کسی گھر کو گرانے کر اسے درست کرتے تھے، یہ دونوں وجہیں طبری نے لکھی ہیں جن میں پہلی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

تیسری توجیہہ یہ ہے کہ وہ اپنے یہاں اندر گھروں کو تباہ کرتے تھے تاکہ مسلمان آسانی کے ساتھ ان میں قیام نہ کر سکیں اور مسلمان باہر کی عمارتوں کو گرا کر قلعہ کے اندر جانے کے لیے راستا بناتے تھے۔

وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝۳ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاۗقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۴

''اور اگر اللہ جلاوطنی کا فیصلہ ان کے لیے نہ کرتا تو انہیں یہیں اس دنیا میں انہیں سزا دیتا اور ان کے لیے آخرت میں تو عذاب ہے ہی۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے پیغمبر سے مخالفت کی اور جو اللہ کی مخالفت کرے گا تو یقیناً اللہ سخت سزا دینے والا ہے''۔

ظاہر ہے کہ جلاوطنی کی صورت میں جو سزا ہوتی وہ اور زیادہ سخت ہوتی یعنی مردوں کا قتل ہونا اور عورتوں اور بچوں کا اسیر ہونا جو جنگ میں ہوا کرتا تھا۔ [1]

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَاۗىِٕمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵

---

[1] ۔لعذبهم في الدنيا بالقتل والسبي (ابن جرير)

''طرح طرح کے کھجور کے درختوں میں سے جو تم نے قطع کیا یا جنہیں ان کی جڑوں پر چھوڑ دیا وہ اللہ کی اجازت سے ہے اور وہ اس لیے کہ وہ ان بداعمالوں کی رسوائی نمایاں کرے''۔

پہلے جو ذکر تھا ان کے مکانات کا، اب یہ ان کی باغات کا ذکر ہے جن میں بہت کھجور کے درخت تھے، ان میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہو گیا، کچھ لوگ جوش انتقام میں ان کے درختوں کو بھی کاٹنے لگے، اور کچھ لوگوں نے ہوش سے کام لیتے ہوئے کہا کاٹنے سے کیا فائدہ؟ اب یہ مسلمانوں کے قبضے میں آئیں گے تو ان سے وہ فائدہ اٹھائیں گے۔ خداوند عالم نے اس آیت میں دونوں کی بات رکھی کہ جنہوں نے کچھ درخت کاٹ دیے وہ بھی ٹھیک تھا، اس سے ان کے مالکوں کی رسوائی کا ایک مظاہرہ ہوا۔ اور جو انہیں باقی رکھنا چاہتے ہیں، وہ بھی ٹھیک ہے کہ مسلمان ان سے منتفع ہوں گے۔[1]

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝۶ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۷

''اور جو (مال) اللہ نے اپنے رسول کی طرف سے (نکال کر) پہنچایا تو تم لوگوں نے اس پر کوئی اونٹ گھوڑے تو دوڑائے نہیں ہیں مگر اللہ کی قدرت ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کو قابو دیدیتا ہے جس پر چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے، تو اللہ نے اپنے پیغمبر کو پہنچایا ان بستیوں کے باشندوں سے تو وہ بس اللہ کا ہے اور پیغمبر کا ہے اور صاحبان قرابت اور یتیموں اور مسکینوں اور پردیسی کا ہے تاکہ وہ ایسی دولت نہ ہو جو دست بدست گردش کرتی رہے ان لوگوں میں جو تم میں سے صاحب دولت ہیں اور جو رسول عطا کریں اسے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز آؤ اور اللہ سے ڈرو یقیناً اللہ سخت سزا والا ہے''۔

فئی کا معنی پلٹنے کے ہیں یہاں افآء کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں راجع کیا یعنی پلٹایا چونکہ ان اموال کے ذکر میں قرآن مجید نے لفظ افآء صرف کی ہے، اس لیے اسلامی فقہ میں ان اموال کا نام ہی اموال فئی ہو گیا۔

اب چونکہ جو پہلے مالک تھے، ان کا یہاں نام نہیں ہے بلکہ پہلے منھم ضمیر کے ساتھ ہے کہ ''ان لوگوں سے'' اور پھر من اہل القرای ''''ان بستیوں والوں سے'' تو چونکہ اس سورے کا آغاز بنی نضیر کے ذکر سے ہوا ہے لہٰذا بعض قدیم مفسرین نے اسے بنی نضیر ہی کے متروکہ اموال

---

[1] ۔نزل القرآن بتصدیق من نہی عن قطعة وتعلیل من قطعة من الاثم (ابن جریر)

سے متعلق قرار دیا، بعض نے یہود کے دوسرے قبیلے بنی قریظہ کے اموال سے متعلق قرار دیا ہے جن کی سرکوبی کی مہم اس کے بعد انجام پائی تھی۔

بہر حال بنی نضیر یا بنی قریظہ چونکہ مدینہ کے اندر ہی تھے اور بس مسلمانوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جا کر ان کا محاصرہ کر لیا، جہاد کے لیے نہ کوئی سفر ہوا اور نہ کوئی جنگ ہوئی۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور ادھر سے ان کے خلاف تادیبی فیصلہ جو ہونا تھا وہ ہوا تو ایسے اموال کا حکم یہ ہے کہ وہ خاص رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ان میں بطور مال غنیمت مسلمانوں کا حق نہیں ہے۔ رسولؐ خود ان اموال کو جس طرح چاہیں تقسیم فرمائیں اور جتنا جس کو چاہیں دے کسی کو چون چرا کا حق نہیں ہے۔ بغیر تفاسیر پر نظر کے جب ان دونوں آیتوں پر ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ سمجھ آتا ہے کہ یہ دونوں ایک ساتھ نازل شدہ ہیں اور دسری آیت میں پہلی کا تکملہ ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ (بقرہ-۹۷)

جو جبرئیل کا دشمن ہو تو انہوں نے تو اسے اللہ کے حکم سے اتارا ہے آپ کے دل پر (تا آخر مضمون آیت)

اس میں جو بات شروع کی گئی تھی وہ جیسے ختم نہیں ہوئی۔ دوسری آیت میں اسے مکمل کیا گیا کہ:

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ" (بقرہ-۹۸)

جو دشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور پیغمبروں اور جبرئیل و میکائیل کا تو یقیناً اللہ دشمن ہے کافروں کا۔

ایسے ہی یہاں کلام شروع ہوا ہے کہ:۔ وما افاء اللہ علی رسولہ منھم ''جو اللہ نے مال دلوایا اپنے پیغمبر کو ان سے'' اس کا تتمہ ابھی نہیں آیا کہ وہ مال کیا ہوگا؟ اور تبصرہ ہونے لگا ان مسلمانوں کے مطالبہ پر جو چاہتے ہیں کہ وہ بطور مال غنیمت تقسیم ہو تو کہا جا رہا ہے کہ اس میں تم نے کوئی مختلف سواریوں پر سوار ہو کے سفر تو کیا نہیں، نہ جنگ کی ہے جو اس میں تم سب کا حق ہو۔ وہ تو اللہ نے اپنی قدرت سے اپنے رسول کو دلوایا ہے۔ اب اس بات کو پورا کرنے کے لیے یہ دوسری آیت ہے کہ جو اللہ نے ان بستیوں کے رہنے والوں سے اپنے رسول کو دلوایا ہے وہ اللہ کا ہے اور اس کا رسول کا ہے اور صاحبان قرابت کا (تا آخر مضمون آیہ) یہ وہ ہے جو دونوں آیتوں سے پہلی نظر میں سمجھ میں آتا ہے۔

مگر طبری نے جس طرح تشریح کی ہے، کہ اس میں پہلی آیت الگ کر دی ہے کہ وہ اموال بنی نظیر یا بنی قریظہ کے بارے میں ہے اور دوسری آیت کو الگ کر دیا ہے کہ یہ کچھ دیہات کے مشرکین تھے، ان کے اموال کے بارے میں ہے اور معمر کا قول ہے کہ وہ جزیہ اور دیہات کے باشندوں کے خراج کے بارے میں ہے۔ یزید بن رومان کا قول ہے کہ یہ وہ ہے جن پر سواروں اور پیادوں کے ساتھ فوج کشی ہوئی ہو اور جنگ کر کے ان پر فتح حاصل کی گئی ہو، اور کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ ابتدائے اسلام میں مال غنیمت کا حکم تھا، پھر وہ منسوخ ہو گیا، سورۂ انفال کی آیت سے کہ:۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى (انفال-۴۱)

اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو تم مال غنیمت حاصل کرو اس کا پانچواں حصہ اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا اور صاحبان قرابت کا۔

بہر حال ہماری نظر میں اسی کو ترجیح ہے کہ یہ آیتیں ایک ساتھ کی ہیں اور ایک دوسرے کے تتمہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ جملہ کہ:۔ ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا۔ محل کے اعتبار سے تو یہ مال ہی سے متعلق ہے کہ رسول جس

کو جتنا دیں، اسے بس وہ لے لے، پھر زیادہ کا طلب گار نہ ہو اور جس کو نہ دیں وہ خاموش رہے، اس پر اعتراض نہ کرے مگر چونکہ عطا فقط عطائے مال نہیں ہے بلکہ احکام بھی اس کے تحت میں داخل ہیں اس لیے علما اس جملے کو بطور استدلال مطلق اطاعت رسول کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ ما آتا کم میں رسول کے مثبت احکام میں کہ رسول جس بات کی ہدایت فرمائیں اسے عمل میں لاؤ اور نہا کم میں حضرت کی ممانعتیں ہیں کہ جن کاموں سے روک دیں انہیں عمل میں نہ لاؤ۔ آخر میں بہت سخت تہدیدی الفاظ ہیں جن سے ظاہر ہے کہ مخالفت رسولؐ کی بہت سخت سزا ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ﴿۸﴾

''ان غریبوں کے لیے جو ہجرت کر کے آئیں ہیں، جو اپنے گھر و بار اور مال و دولت سے نکلنے پر مجبور ہوئے طلب گار ہوتے ہوئے اللہ کا فضل و کرم اور خوشنودی کے اور اس کے پیغمبر کی مدد کرتے ہوئے، یہ سچے لوگ ہیں''۔

بغیر حرف عطف یہ لام جو استحقاق یا ملکیت کا اظہار کرتا ہے بظاہر سابق میں ''اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ الخ تھا اسی کا بیان ہے کہ ان کے جو قرار دیا گیا ہے، وہ درحقیقت ان مہاجرین کے لیے ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں۔ عام طور پر مفسرین نے اسے اموال بنی نضیر سے متعلق قرار دیا ہے کہ وہ مہاجرین کے لیے رکھے گئے تھے۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۫ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ﴿۹﴾

''اور وہ جو پہلے سے اس دیار میں قیام کیے ہوئے تھے اور ان کے (آنے سے) پہلے ایمان لائے تھے، وہ محبت رکھتے ہیں ان سے جو ہجرت کر کے ان کی طرف آتے ہیں اور وہ اپنی بستیوں کے اندر رشک و حسد محسوس نہیں کرتے اس سے جو انہیں دیا گیا ہے اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں چاہیے وہ ضرورت مند ہوں اور جو اپنی نفسانی تنگدستی سے بچا رہے تو یہی لوگ دین و دنیا کے بہترین حاصل کرنے والے ہیں''۔

انصار کی تعریف ہے جنہوں نے مہاجرین کو اس مال کے عطا کرنے پر کوئی ناگواری محسوس نہیں کی تھی بلکہ سمجھے کہ یہ چونکہ یہاں بے سروسامانی کے ساتھ آئے ہیں، اس لیے ان کی امداد ضروری ہے اور رسولؐ نے جو انہیں ان اموال کے ساتھ مخصوص کیا، وہ بالکل درست ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۚ﴿۱۰﴾

''اور جو ان کے بعد آئے کہتے ہیں کہ پروردگارا! اپنی مغفرت میں شامل حال فرما، ہمارے لیے اور ہمارے ان بھائیوں کے جنہوں نے ایمان میں ہم پر سبقت کی اور ہمارے دل میں کینہ وعداوت نہ آنے دے اُن سے جو ایمان لائے ہیں۔ اے ہمارے مالک! یقیناً تو بخشنے والا ہے، بڑا مہربان''۔

چونکہ انصار کو یہ کہا گیا تھا کہ وہ ان مہاجرین کے آنے سے پہلے ایمان لائے تھے اس لیے ایک تصور یہ ہے کہ ان کے بعد جو آئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان لانے کے بعد جو باہر سے آئے تو یہ وہی مہاجرین کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور ان دونوں آیتوں میں ان کی باہمی خیر سگالی کا ذکر ہے۔ کہ انصار ان سے جلتے نہیں بلکہ ان کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اور وہ مہاجرین ان کو یوں دعائیں دیتے ہیں اور ہوسکتا ہے مراد بعد کے اسلام لانے والے ہوں جو اپنے سے تقدم رکھنے والے صاحبان ایمان کی فضیلت کے قائل ہیں اور انہیں یوں دعائیں دیتے ہیں[1] لیکن اس سے شخصیتوں میں امتیاز اور کسی منصب دینی کی اہلیت اور عدم اہلیت پر بحث کا سدباب نہیں ہوتا، نہ فاسقین یا ظالمین میں سے ثابت ہونے کے بعد جو اس کا تقاضا ہے، اس کی نفی لازم آتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۱﴾ لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو منافق ہیں کہ وہ اپنے بھائی نبدوں سے جو منکر اسلام ہیں اہل کتاب میں کہتے ہیں کہ اگر تم جلاوطنی کیے گئے تو ہم بھی تمہارے ساتھ شہر سے نکل جائیں گے اور تمہارے بارے میں کسی دوسرے کا کہنا نہیں مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نکلیں گے نہیں اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر مدد کریں بھی تو پیٹھ پھرائیں گے اور پھر ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی''۔

شروع سورہ سے جو آیتیں تھیں، ان سے ظاہر تھا کہ وہ مہم سر ہونے کے بعد کی آیتیں ہیں اور ان کے مضمون سے ظاہر ہے کہ وہ بنی نضیر سے متعلق ہیں۔ حالانکہ بعض نے وہاں بھی قریظہ کا نام لیا تھا مگر وہ درست نہیں ہے اور اب ان آیتوں کے مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ کسی آئندہ پیش ہونے والی مہم سے متعلق ہیں جو اہل کتاب یہودیوں کے سلسلہ میں ہیں۔ اسی لیے یہ سمجھنا درست ہے کہ اب یہ آیتیں بنی قریظہ سے متعلق ہیں کہ منافقین ان سے غلط دعوے کر کے انہیں رسولؐ کے مقابلے میں قدم جمائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ وقت آئے گا تو وہ ان کا ساتھ

---

[1] ۔عنی بالذین جاءوا من بعدھم والذین آمنوا من بعد الذین ثبتوا الدار (ابن جریر)

بالکل نہیں دیں گے مگر تعجب ہے کہ قدیم مفسرین ان آیات کو بھی بنی نضیر سے متعلق قرار دیتے ہیں۔[1] جو نظم سورہ کی بنا پر ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۳﴾ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۴﴾

''یقیناً تم لوگوں کا خوف ان کے دلوں میں اللہ سے زیادہ ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں۔ یہ سب مل کر بھی تم سے جنگ نہیں کریں گے مگر ایسی بستیوں میں جو قلعہ بند ہوں یا دیواروں کے پیچھے سے، ان کا اختلاف خود آپس میں بہت سخت ہے تم انہیں سب اکٹھا دیکھتے ہو، حالانکہ دل ان کے الگ الگ ہیں، یہ اس وجہ سے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے''۔

منافقین کا ذکر اس سے پہلے ختم ہو گیا اور تتمہ اس کا بعد کو بھی آئے گا۔ اب یہ خود اس یہود جماعت کا ذکر ہے جیسا کہ ہم نے بتایا۔ پہلے کے مفسرین بنی نضیر بتا رہے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ بنی قریظہ ہیں جن کی مہم بعد کو سر کی گئی۔ خدا سے ڈرتے رہتے تو ایمان لے آتے مگر خدا سے تو ڈرتے نہیں، تم سے ڈرتے ہیں اس لیے تم سے بچاؤ کے لیے قلعوں کی پناہ لیتے ہیں۔

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۵﴾

''جیسے وہ جو ان کے پہلے تھے، ابھی ماضی قریب میں انہوں نے اپنے کرتوتوں کا خمیازہ بھگتنا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

جو اختلاف ہمارے اور ان مفسرین کے درمیان تھا، وہ برابر چل رہا ہے۔ ہماری بنا پر مطلب صاف ہے۔ یہ جن کا ذکر ہے بنی قریظہ ہیں تو وہ پہلے جن کا انجام سامنے آ چکا وہ بنی نضیر ہیں جن کا ذکر اسی سورے کے شروع میں ہو چکا ہے۔ یہ لوگ چونکہ ان آیتوں کو بنی نضیر سے متعلق قرار دے رہے ہیں تو آپ سے ''قبل والے'' کوئی کہتا ہے اسی سے بنی قینقاع مراد ہیں، وہ یہودیوں کا قبیلہ جو سب سے پہلے جلاوطن کیا گیا تھا۔ اور کوئی کہتا ہے ان پہلے والوں سے مراد مشرکین مکہ ہیں جن سے بدر میں جنگ ہوئی تھی اور انہیں جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔[2]

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۷﴾

---

[1] ۔بعثوا الیٰ بنی نضیر حین نزل بهم رسول الله للحرب ان اثبتوا او تمنعو (ابن جریر)

[2] ۔اختلف اهل التأویل فی الذین عتوا بالذین من قبلهم فقال بعضهم علی بذالك بنوقینقاع وقال آخرون عنی بذالك مشرکوا قریش ببدر (ابن جریر)

''جیسے شیطان۔اس نے آدمی سے کہا کافر ہوجااور جب وہ کافر ہوگیا تو کہا میں تجھ سے بے تعلق ہوں میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے تو ان دونوں کا انجام یہ ہوا کہ وہ آگ میں ہیں ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہ سزا ہے ظالم لوگوں کی''۔

یہ شیطان سے تشبیہ منافقین کی ہے کہ وہ انہیں مخالفت پر قائم رہنے کے لیے آمادہ کررہے ہیں۔مگر وقت آنے پر ان کے ساتھ چھوڑ دیں گے جیسے شیطان آدمی کو ورغلاتا ہے، پھر جب اس پر مصیبت پڑتی ہے تو اس کے کام نہیں آیا کرتا''۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۸ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۹

''اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور کسی بھی متنفس کو دیکھنا چاہیے کہ اس کے کل کے لیے کیا سامان پہلے سے کرلیا ہے اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ باخبر ہے اس سے جو تم کرتے ہو، اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اللہ کو بھول گئے تو اس نے انہیں خود ان کو بھلا دیا اور یہ ہیں بداعمال لوگ''۔

دینی اصلاح اور قرآن کی زبانی میں قیامت کے لیے ''کل'' کی لفظ کا استعمال ہوا ہے جس بنا پر ہمارے محاورے میں ''فردائے قیامت'' کہا جاتا ہے۔انسان پہلے ارادی طور پر خدا کو بھولتا ہے پھر رفتہ رفتہ گناہوں کا خوگر ہوکر بری باتوں کی برائی کا احساس بھی سلب ہو جاتا ہے۔یہ درحقیقت ارادی کوتاہیوں کا ایک قہری نتیجہ ہوتا ہے، کبھی دلوں پر مہر لگ جانا، کبھی کانوں اور آنکھوں پر پردے پڑھ جانا اور یہاں اسے خود اپنے کو بھول جانے سے تعبیر کیا ہے ''خود اپنے کو بھول جانا'' یعنی بالکل غافل ہوجانا اور اپنے حقیقی مفاد کا ذہن میں نہ رہنا، یہ درحقیقت معاصی میں دیر پائی کی ایک قہری خاصیت ہے جسے قرآن نے اللہ کی طرف کی ایک سزا کے طور پر بیان کیا ہے۔

لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝۲۰

''دوزخ والے اور بہشت والے یکساں نہیں ہیں۔بہشت والے ہی نتیجہ میں کامیاب ہیں''۔

دنیا والی کامیابی تو عارضی چیز ہے۔وہ حقانیت کی ضامن نہیں ہے آخرت کی کامیابی اصل کامیابی ہے۔وہ اہل بہشت کے لیے ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱

''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے اثر پذیر ٹکڑے ہوجانے والا اللہ کی عظمت کے احساس سے اور یہ مثالیں ہیں جنہیں ہم پیش کرتے ہیں لوگوں کے لیے شاید کہ وہ غور فکر سے کام لیں''۔

یہ ایک بلیغ انداز ہے ان انسانوں کی بدذوقی یا سخت دلی کے اظہار کا جو قرآن سے اثر پذیر نہیں ہوتے اور انہیں اس سے عظمت الٰہی

کا تصور نہیں ہوتا جب کہ یہ کلام آ رہا ہے کہ اگر بالفرض پہاڑ پر اتارا جاتا تو وہ ٹکرے ہو جاتے یعنی یہ کلام متقاضی اس کا ہے کہ ہر ایک اس سے متاثر ہو اور آخر میں کہہ دیا گیا ہے کہ یہ حقیقت کے سمجھانے کے لیے ایک مثال ہے جو پیش کی جا رہی ہے۔ نہ وہ پہاڑ پر اتارا جائے گا اور نہ پہاڑ اس سے ٹکرے ہوگا۔ بعض اہل نظر نے اس آیت کو پہاڑوں کے شعور و ادراک کی دلیل کہا ہے جو میرے نزدیک مشکل ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۴﴾

''وہ وہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ ان دیکھی ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ وہ سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے، وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں، سلطنت کا حقیقی مالک، تمام نقائص سے بری، بے عیب، بے ضرر ذات، امن عطا کرنے والا، محافظ و نگہبان، غالب آنے والا، سرکشوں کو زیر کرنے والا، بزرگی کا مرکز، پاک ہے اللہ کی ذات اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں، وہ ٹھیک اندازے کے مطابق پیدا کرنے والا، نیستی سے نکال کر ہستی میں لانے والا، صورت گری کرنے والا، اس کے لیے اچھے سے اچھے نام ہیں، اس کی تسبیح کرتی ہے ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ غالب آنے والا ہے، صحیح کام کرنے والا''۔

ان دونوں آیتوں میں متعدد اسمائے حسنیٰ خداوند عالم کے مذکور ہیں جن میں سے قدوس پہلی مرتبہ یہاں آیا جس کے معنی ہیں ''بہت پاک'' اور مطلب وہی جو ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ وہ تمام نقائص سے بری ہے۔ سلام کی لفظ سلامتی کے مفہوم کی حامل ہیں وہ سراسر سلامتی ہے تو نہ اس میں کوئی عیب و نقص ہو سکتا ہے جو ذات کا کمال ہونے کی بنا پر توحید میں داخل ہے اور نہ اس سے دوسرے کو بلا وجہ ضرر پہونچ سکتا ہے جو عدل کے تحت کمالِ افعال سے تعلق ہے۔ مؤمن امن سے ہے جس کے معنی ہوئے امن عطا کرنے والا۔

خالق اور بارئ کا عام مفہوم یکساں محسوس ہوتا ہے چنانچہ ہندوستان میں گزشتہ صدی کی مشہور ابتدائی کتاب ''خالق باریٔ'' کے اس پہلے جملے کا مطلب یہی تھا کہ ان دونوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں مگر لغوی مفہوم کے اعتبار سے خالق کے معنی میں مضمر ہے صحیح پیمانہ مقرر کرنا اور بارئ کے معنی ہیں نیستی سے ہستی کے دائرے میں لانا اور مصور میں لباس صورت پہنانا، اس طرح یہ اسماء خالق، بارئ، مصور۔ ان میں باعتبار زمانہ کوئی ترتیب نہیں مگر تصوری طور پر پہلا منصوبہ تخلیق، دوسرا اصل تخلیق اور تیسرا نتیجہ تخلیق کا مظہر ہے۔

سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ

مدنیہ.....۱۳.....آیات

اثنائے سورہ میں ایک آیت کے اندر فامتحنوھن کی لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ان عورتوں کا امتحان لیا کرو، اسی پر اس سورے کا نام ''ممتحنہ'' ہوگیا۔

اس سورے میں پہلے کافروں کے ساتھ ساز باز میں شریک ہونے کی ممانعت ہے اور سمجھایا جارہا ہے کہ یہ لوگ تمہارے کبھی کبھی نہیں ہوسکتے اور جب موقع ملے گا تمہیں ہر طرح قول وعمل سے نقصان ہی پہنچائیں گے، ان کا تو بس نصب العین یہ ہے کہ تم بھی راہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر تمہاری اپنی اولاد یا رشتہ داریوں کا لحاظ ہو تو یاد رکھو یہ رشتہ داریاں تمہارے کام نہیں آئیں گی ۔پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیروؤں کا ذکر ہے کہ دیکھو انہوں نے کس طرح دینی تصورات پر رشتہ داریوں کے تقاضوں کو قربان کردیا، پھر دفع دخل کے طور پر حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے صفائی پیش کی گئی ہے کہ انہوں نے جس شخص کے لیے استغفار کیا تھا، وہ صرف وعدے کو پورا کرنے کے لیے تھا۔ ورنہ انہیں کوئی میلان قلبی اس کی طرف نہ تھا۔ اس کے بعد عام اصول بتایا جارہا ہے کہ مطلق طور پر غیر مسلم افراد سے میل ملاپ سے تمہیں روکا نہیں جارہا ہے، ان کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو حسن سلوک کرو اور معاملات میں اُن کے ساتھ انصاف کرو، انصاف بہرحال اللہ کے لیے پسندیدہ چیز ہے تمہیں جور وکا جارہا ہے، وہ ان لوگوں کی پارٹی میں شرکت سے جو تم سے برسر جنگ ہیں کہ تم ان سے تعاون نہ کرو اور جو ان کے ساتھ تعاون کریں گے وہ ظلم کی تقویت کا باعث ہوگا اور خود ظالموں میں محسوب ہوگا۔

آخر میں وہ عورتیں جو کافر شوہروں کو چھوڑ کر ادھر آئیں اور کہیں کہ ہم مسلمان ہورہے ہیں ان کے لیے ہدایت ہوئی ہے کہ یہ دیکھ لو کہ یہ شوہروں سے بگڑ کے صرف ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے آئی ہیں یا واقعی اسلام کی حقانیت سے متاثر ہوکر اسلام قبول کررہی ہیں، اگر دوسری صورت ہو تو انہیں ہرگز واپس نہ کرو، اس لیے کہ کفر اور اسلام کے اختلاف سے رشتہ قطع ہوجاتا ہے۔ نہ وہ ان کے شوہر رہ سکتے ہیں اور نہ یہ ان کی بیویاں ہوسکتی ہیں اور اب تم ان سے شادی کرسکتے ہو، اس ذیل میں کافر عورتوں سے شادی کرنے کی ممانعت کا عام حکم دیا گیا ہے۔

آخر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاس جو عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ مسلمان ہوجائیں ان کے لیے بتایا گیا ہے کہ کن شرائط پر ان سے بیعت حاصل کی جائے اور سورۃ کو ختم کرتے ہوئے یہودیوں سے تعاون کی ممانعت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۚ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۚ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ①

''اے ایمان لانے والو! میرے اور اپنے دشمن کو اپنے حوالی موالی کی حیثیت نہ دو، تم ان کے ساتھ محبت کے پینگ بڑھاتے ہو، حالانکہ انہوں نے کفر اختیار کیا اس کے ساتھ جو تمہارے پاس حق آیا اور ان کا عالم یہ ہے کہ وہ گھروں سے نکلنے پر مجبور کرتے ہیں پیغمبر کو اور تمہیں اس جرم میں کہ تم ایمان لاتے ہو اللہ پر جو تمہارا پروردگار ہے اگر تم نکلے تھے میری راہ میں جدوجہد کے لیے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے، تم خفیہ طور پر ان سے محبت کے پینگ بڑھاتے ہو اور میں خوب جانتا ہوں اسے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم میں ایسا کرے گا اس نے سیدھے راستے کو گم کر دیا''۔

''اگر تم نکلے تھے میری راہ میں جدوجہد کے لیے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے'' یہ قبل کے حکم سے متعلق ہے کہ جب تمہارا گھر سے بے گھر ہونا میری راہ میں تھا تو اب تم ان مشرکین سے ربط کیوں قائم کرتے ہو جو تمہارے گھر سے بے گھر ہونے کا باعث ہوئے۔

[1] الفاظ قرآن کے مضمون سے ظاہر ہے کہ یہ مدینے کے رہنے والے منافقین سے تخاطب نہیں ہے بلکہ یہ طبقہ مہاجرین کے کچھ افراد ہیں جو مشرکین کے ساتھ خفیہ طور پر تعلقات محبت بڑھانا چاہتے ہیں۔ یہ انہیں فہمائش کی جارہی ہے۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ اسکا تعلق حاطب بن بلتعہ کے ساتھ ہے انہوں نے مشرکین مکّہ کے نام خط لکھ کر حضرت کے نقل وحرکت کی جسے آپ مخفی رکھنا چاہتے تھے مخبری کرنے کی کوشش کی اب قریبی قیاس تو یہ ہے کہ یہ مخبری اس وقت ہوئی جب آپ فتح مکّہ کے لیے تشریف لے جارہے تھے مگر بعض روایات میں یہ صراحت ہے کہ یہ اس سفر مکّہ میں ہوا ہے جس کے نتیجہ میں صلح حدیبیہ ہوئی۔ خالق نے اپنے رسول کو اس مخبری کی اطلاع دی اور حضرت نے جناب امیرؑ کو اور بعض روایات کے مطابق آپ کے ساتھ کچھ دوسرے افراد کو بھیج کر اس خط کو برآمد کرالیا۔

اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ② لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ③

---

[1] ۔من المؤخر الذی معناہ التقدیم ووجہ الکلام ۔لا تتخذوا عدوی وعدو کم اولیاء ان کنتم خرجتم (ابن جریر)

''اگر وہ تمہیں پا جائیں تو تمہارا دشمن ہی ثابت ہوں گے، اپنے ہاتھوں اور اپنی زبان کو تمہاری طرف دراز کریں گے برائی کے ساتھ اور ان کی خواہش یہ ہوگی کہ کاش تم بھی کافر ہو جاؤ نہ تمہیں تمہاری قرابت دار اور نہ تمہاری اولاد کام دے گی قیامت کے دن وہ تم سے ان کو دور کر دے گا اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کا دیکھنے والا ہے''۔

چونکہ حاطب بن بلتعہ سے جب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلا کر پوچھا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی ؟ تو انہوں نے کہا حضور! خدا گواہ ہے کہ میں ایمان کے رستے سے ذرہ بھر منحرف نہیں ہوا ہوں اور نہ آپ کی اور آپ کے دین کی حقانیت میں مجھے ذرا بھی شک شبہ ہوا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اور حضرات مہاجرین جو ہیں وہ صاحب قوم قبیلہ ہیں، ان پر وقت پڑے تو ان کے عزیز و اقارب ان کی حمایت کریں گے، میرے کوئی قبیلے کے لوگ نہیں ہیں، اور مکّہ معظّمہ میں میرا مال اور میری اولاد ہے۔ میں نے خیال کیا کہ مشرکین پر ایک احسان کر دوں کہ بوقت ضرورت میرے کام آئے اور اس کی وجہ سے میرے اموال و اولاد محفوظ رہیں۔ بس یہ بات ہے جس کی وجہ سے میں نے یہ اقدام کیا۔

ان دونوں آیتوں میں اسی کا جواب ہے کہ ایک تو مشرکین سے کسی خیر سگالی اور خوشگوار اقدام کے بعد بھی کبھی بھی یہ امید نہ کرنا چاہیے کہ وہ تمہارے ساتھ کوئی رعایت کریں گے، ان کی تو بس تمنا یہ ہے کہ تم دین اسلام سے منحرف ہو کر کافروں میں شامل ہو جاؤ اور پھر یہ رشتے بس اس دنیا تک ہیں۔ آخرت میں یہ قوم و قبیلہ، اولاد سب تم سے الگ ہوں گے وہاں یہ تمہارے کام نہ آئیں گے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝۴

''تم لوگوں کے لیے بہت اچھی مثال عمل ہیں ابراہیمؑ اور ان کے ساتھ والوں میں جب انھوں نے اپنی قوم والوں سے کہا کہ یقیناً ہم بے تعلق ہیں تم سے اور اس سے جس کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو، ہم تم سے منکر ہیں اور ہماری تمہاری دشمنی منافرت ہمیشہ کے لیے نمایاں ہو گئی ہے جب تک کہ تم ایمان لاؤ ایک اللہ پر، ہاں بس ابرہیمؑ نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ میں تمہارے لیے دعائے مغفرت کروں گا مگر اللہ یہاں میں تمہارے لیے کچھ قدرت نہیں رکھتا، اے ہمارے پروردگار! تجھ ہی پر ہمارا بھروسہ ہے اور تجھ ہی سے ہماری لو لگی ہے اور تیری ہی طرف بازگشت ہے''۔

یہ آیت صاف نمایاں کرتی ہے کہ اسلام میں قومیت بنیاد محبت والفت نہیں ہے بلکہ ایمان بنیاد الفت ہے۔

جناب ابراہیمؑ کے ساتھ جو کہا گیا اور ان کے ساتھ والوں، تو ظاہر میں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو مؤمنین ان کے پیرو کی حیثیت سے ان

کے ساتھ تھے مگر واقعات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جناب ابراہیمؑ کے ساتھ اس سرزمین پر ساتھیوں کی کوئی جماعت نہ تھی اس لیے مفسرین اس کی تشریح میں کہتے ہیں کہ ''ان کے ساتھ والوں'' سے مراد دوسرے انبیاء ہیں کیوں کہ مسلک میں ان سے متحد تھے گر یہ بعید ہے۔ ہمارے نزدیک جب کہ دوسری جگہ یہ موجود ہے کہ فاٰمن له لوط 'لوط نے ان کی بات مانی'' تو بمقتضائے نمائندگی کی تعبیر لفظ جمع سے کر دی گئی ہو جو کچھ بعید نہیں ہے۔

اس آیت میں مؤمنین کی زبانی کفر نا بکم میں جو اعلان کفر ہے، وہ منجملہ کچھ دوسرے آیات کے تبصرہ ان کے محل پر کیا گیا ہے۔ اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ ایمان اور کفر دونوں باعتبار معنی لغوی اضافی چیزیں ہیں اصل اس میں حسن اور قبح متعلق کے لحاظ سے پیدا ہوتا ہے کہ کس پر ایمان ہے اور کس کے ساتھ کفر ہے؟

حضرت ابرہیمؑ کے استغفار اور اس کے پس منظر پر اس کے پہلے جہاں ذکر آیا ہے، روشنی ڈالی جا چکی ہے چنانچہ حافظ محمد بن جریر طبری نے یہاں ابراہیمؑ کے اس حسنہ میں ان لفظوں سے کہ انہوں نے باطل پرستوں سے کہا: 'بُرَءٰٓؤُا مِنكُمْ ''ہم تم سے بری یعنی بے تعلق ہیں اور اس کے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے استغفار کے ذکر میں جو ایک جگہ قرآن مجید میں ہے:

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ

(توبہ - ۱۱۴)'' جب ان پر ثابت ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے برأت کر لی'' تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لیے تبرا کا سبق حاصل کرنے کی دعوت دی ہے اور کہا ہے:۔

فكذلك انتم ايها المؤمنون بالله فتبرؤ من اعداء الله

(جامع البیان) تو اسی طرح تم اے اللہ پر ایمان لانے والو تبرا کرو دشمنان خدا سے۔

اَلّا قول ابراهيم عليه السلام لابيه''

سوا ابرہیمؑ کے قول کے اپنے باپ سے'' اسے استثنائے متصل قرار دے کر یہ مطلب نکالا گیا ہے کہ سب باتوں میں ابراہیمؑ کی پیروی کرو مگر ان کا یہ قول جو تھا کہ میں استغفار کروں گا تمہارے لیے۔ اس میں پیروی نہ کرو کیوں کہ یہ ان کی ایک شخصی بات تھی۔ [1]

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۵

''اے ہمارے پروردگار! ہمیں تختۂ مشق نہ بنانا ان لوگوں کا جو کافر ہیں اور ہمیں بخش دے اے ہمارے پروردگار! یقیناً تو غالب آنے والا ہے، صحیح کام کرنے والا''۔

''فتنہ'' کے معنی ذریعہ آزمائش کے ہیں۔ اسی کو ہم اپنی زبان میں ''تختہ مشق'' کہہ سکتے ہیں جو میں نے ترجمہ کیا ہے۔

دوسرا مطلب ذریعہ آزمائش نہ بنانے کا یہ کہا گیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ ہم پر غالب آ جائیں تو اسے دوسروں کے گمراہ کرنے کا ذریعہ

---

[1] (فلا تأسوا بذالك منه .....ابن جریر)

بنائیں کہ دیکھو اگر ہم حق پر نہ ہوتے تو ہمیں ان پر غلبہ کیوں حاصل ہوتا۔ [1]

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۶

''تمہارے لیے ان میں اچھا نمونہ عمل ہے اس شخص کے لیے جو اللہ اور روز آخرت سے امید وابستہ کیے ہو اور جو روگردانی کرے تو یقیناً اللہ بے نیاز ہے، ہر تعریف کا حقدار''۔

فیھم کی ضمیر بظاہر حضرت ابرہیمؑ اور ان کے ساتھیوں ہی کی طرف راجع ہے جن کا ذکر اس کے پہلے بلا فاصلہ تھا اور مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ کی طرف کے اجر وثواب اور آخرت کی نجات کا تصور رکھتے ہو تو اسی کردار کو اختیار کرو جس کا ابھی بیان ہوا۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۷

''بہت ممکن ہے کہ اللہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان جن سے تمہاری دشمنی ہے ان میں سے محبت پیدا کر دے اور اللہ بڑا قادر ہے اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان''

مطلب یہ ہے کہ ابھی جو ان کا رویہ معاندانہ ہے ان سے تعلقات محبت پیدا کرنا درست نہیں ہیں لیکن بالکل مایوسی کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں انقلاب ہو جائیں اور وہ پیغام حق کو قبول کر لیں، پھر تم میں اور ان میں باہمی محبت کا رشتہ قائم ہو جائے گا، اور غفور رحیم کے الفاظ مشرکین کے لیے اسطرح ہیں کہ جب وہ ایمان اختیار کر لیں گے تو ان کے گزشتہ افعال پر جو بحالت کفر انہوں نے کیے ہیں، اب باز پرس نہ ہوگی۔

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۸ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۹

''تمہیں اللہ ان لوگوں سے نہیں روکتا جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکلنے پر مجبور نہیں کیا کہ تم ان کے ساتھ نیکی کرو اور ان کے ساتھ انصاف کرو۔ یقیناً اللہ انصاف

---

[1] ۔بان لستلخھم علینا نیروا انھم علی الحق وانا علی الباطل (ابن جریر)

کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ بس تمہیں ان سے روکتا ہے جنہوں نے دین کے بارے میں تم سے جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا اور تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کے ساتھ پیٹھ ملائی کہ ان کے ساتھ تعاون کرو اور جو ان کے ساتھ تعاون کریگا تو یہ لوگ خود ظالم ہیں''۔

سلسلہ کلام سے ظاہر ہے کہ یہ آیت غیر مسلمین ہی میں دو قسم کے لوگوں میں تفریق کر رہی ہے، ایک وہ جو مسلمان تو نہیں ہیں مگر اسلام سے برسر پیکار بھی نہیں۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ ان کے ساتھ میل ملاپ سے اللہ کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ ان سے حسن سلوک کرو۔ کوئی وقت ان پر پڑے مصیبت کا تو ان کی مدد کرو، اور ان کا کوئی مقدمہ تمہاری عدالت میں پیش ہو تو جو انصاف کا تقاضا ہو، اس کے مطابق فیصلہ کرو، اور اس میں تعمیم ہے کہ چاہے ان کے مقابلے میں جو فریق ہو وہ اپنے مذہب وملت کا ہو جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے آیات سے بھی ظاہر ہے۔

یہ مطلب بالکل صاف ہے مگر ہر دور میں ایسے اشخاص ہوئے ہیں جنہیں ''رواداری'' پسند نہیں ہے ان کے حلق سے یہ چیز نہیں اترتی کہ بھلا غیر مسلم اور ان کے ساتھ نیکی کی جائے انصاف سے کام لیا جائے لہٰذا کچھ لوگوں نے ان مسلمانوں سے متعلق قرار دیا ہے جو مکّہ میں رہ گئے ہیں اور ہجرت نہیں کی ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ الفاظ کہ انہوں نے تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں گھروں سے نہیں نکالا ہے، بالکل ان پر چسپاں نہیں ہیں جو دین اسلام کو قبول کیے ہوئے ہیں صرف کسی مجبوری سے مکّہ چھوڑا نہیں ہے، کچھ لوگوں نے محسوس کیا ہے کہ ہے تو یہ غیر مسلمین ہی کے بارے میں تو کہہ دیا کہ یہ آیت منسوخ ہوگئی ہے احکام جہاد آنے کے بعد، مگر یہ سورہ سورۂ ممتحنہ جیسا کہ ظاہر ہے، اگر فتح مکّہ کے وقت کا نہیں ہے اسکے پہلے کا بھی ہے تو بھی حدیبیہ والے سفر کے موقع کا ہے جو ۶ھ میں ہے اور ظاہر ہے کہ احکام جہاد اس کے بہت پہلے سے نازل ہو چکے تھے لہٰذا یہ منسوخ ہونے کا تصور بھی بالکل غلط ہے۔ اس لیے ان اقوال کے نقل کرنے کے بعد حافظ طبری نے حقیقت پسندی سے کام لے کر اپنا فیصلہ جو لکھا ہے، وہ وہی ہے جسے ہم شروع میں درج کر چکے ہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

اولى الاقوال فى ذلك قول من قال عنى بذالك الاينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم فى الدين من جميع اصناف الملل والاديان ان تبروهم وتصلوهم وتقسطواليهم ،ان الله عزوجل عم بقوله الذين لم يقاتلوكم فى الدين ولم يخرجوكم من دياركم جميع من كان ذالك صفته فلم يخصص به بعضادون بعض ولامعنى لقول من قال ذالك منسوخ لان برأ المؤمن من اهل الحرب ممن بينه وبينه قرابة نسب اومن لاقرابة بينه وبينه ولانسب غير محرم ولامنتهىٰ عنه اذال، يكن فى ذالك دلالة له ولاهل الحرب عورة لاهل الاسلام اوتقوية لهم بكراع اوصلاح (جامع البيان-ج۲۸-ص-٦٦)

اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل ترجیح وہی قول ہے کہ مقصود اس سے یہ ہے کہ اللہ کی تمہیں ممانعت نہیں ہے ان لوگوں سے جنہوں نے تم سے جنگ نہیں کی دین کے بارے میں تمام اقوام ومذاہب کے افراد میں سے کہ تم ان سے نیکی کرو اور ان کے ساتھ صلہ رحم کرو اور اُن سے انصاف کرو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے عمومیت رکھی ہے اپنے اس ارشاد میں کہ جنہوں نے تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں گھروں سے تمہارے نہیں نکالا جن میں یہ وصف ہو اس میں کسی ایک کی خصوصیت نہیں ہے اور کوئی معنی نہیں اس قول کے کہ وہ منسوخ ہے، اس لیے کہ نیکی کرنا کفار کے ساتھ جن سے کوئی نسبی قرابت ہے یا نہیں بھی ہے حرام نہیں ہے نہ اس کی ممانعت ہوئی ہے جب کہ اس میں اُن لوگوں کو جن سے جنگ

ہورہی ہے اہل اسلام کے کسی راز کی اطلاع نہ دی جائے یا انہیں جنگ کے کسی سامان کے ساتھ مدد نہ دی جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑩

''اے ایمان لانے والو! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کا امتحان لے لو، اللہ خوب جانتا ہے ان کے ایمان کا حال۔ اب تمہیں اگر معلوم ہو کہ وہ واقعی باایمان ہیں تو انہیں کافروں کی طرف واپس نہ کرو، نہ وہ عورتیں ان مردوں کے لئے جائز ہیں اور نہ وہ مرد ان عورتوں کے لیے جائز ہیں اور انہیں ''جو انہوں نے خرچ کیا ہے اور تمہارے لیے کوئی حرج نہیں کہ تم ان سے نکاح کرو، جب تم اُنہیں اُن کے مہر ادا کر دو اور کافر عورتوں سے ازدواجی رشتہ قائم نہ کرو اور طلب کرو جو تم نے خرچ کی ہو اور وہ اب طلب کریں جو انہوں نے خرچ کیا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو وہ نافذ کرتا ہے تمہارے درمیان اور اللہ جاننے والا ہے، صحیح کام کرنے والا''۔

یہ امتحان کیا تھا؟ یہ کہ قسمیں دے دے کر ان سے پوچھا جاتا تھا کہ وہ شوہروں سے ناراضگی یا ایک سرزمین سے نفرت اور دوسری سرزمین کے شوق یا مال دنیا کی طمع میں مکّہ کو چھوڑ کر مدینہ نہیں آئی بلکہ صرف اللہ اور اس کے پیغمبر کی محبت میں یعنی سچے معنی میں دین کو اختیار کر کے آئی ہیں۔ اب جب معلوم ہو کہ وہ واقعی مسلمان ہوگئی ہیں تو واپس نہیں کی جائیں گی مگر چونکہ اس وقت ان مشرکین سے جنگ کی صورت نہیں بلکہ حدیبیہ میں معاہدہ ہو چکا ہے اس لیے ان کے شوہروں نے جو انہیں مہر وغیرہ دیا ہو ان شوہروں کو واپس کر دیا جائے۔

وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ﴿الممتحنة: ۱۰﴾ ''کافرہ عورتوں سے ازدواجی رشتہ قائم نہ رکھو'' اس ذیل میں مفسر طبری نے کئی صحابہ کا نام لیا ہے کہ اب تک ان کے حبالہ عقد میں مشرک عورتیں تھیں اس حکم کے نازل ہونے کے بعد انہوں نے اُن سے قطع تعلق کیا۔

اب یہاں چونکہ مشرکات نہیں کہا گیا ہے بلکہ کوافر کہا گیا ہے جس کے معنی ہوئے کافرات، اس لیے علماء اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی عورتوں کے ساتھ بھی نکاح کو اس آیت کی بنا پر ممنوع قرار دیتے ہیں وہ چاہے اس معنی میں مشرکات نہ ہوں جو اہل کتاب کے مقابلے میں ہے مگر ''مسلمات'' کے مقابلے میں کافرات تو وہ بھی ہیں۔

ہاں بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ان کے متعلق ہے جن کے نکاح میں پہلے سے مشرک عورتیں تھیں ابتدائی عقد کا اس میں ذکر نہیں ہے کہ ان سے نکاح نہ کرو مگر بظاہر مقصد کے لحاظ سے یہ کوشش لاحاصل ہے اس لیے کہ جب قبل کے تعلقات قائم رکھنے کا اسلام روادار نہیں ہے تو اس

سے ظاہر ہے کہ ان سے تعلق ازدواجی ناجائز ہے لہٰذا ان سے شادی کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اب جس طرح ادھر سے بعض عورتیں ادھر آجاتی تھیں، ویسے مسلمانوں کی کچھ عورتیں ادھر چلی جاتی تھیں تو کہا گیا ہے کہ جیسے پہلی صورت میں ان کو حق ہے کہ جو کچھ انہوں نے ان عورتوں پر خرچ کیا ہے وہ تم سے طلب کریں، ویسے ہی اس صورت میں تمہیں حق ہے کہ جو کچھ تم نے خرچ کیا ہے، وہ ان سے طلب کرو۔

وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ⑪

''اور اگر وہ تمہاری عورتوں میں کچھ تمہارے ہاتھ سے نکل کر کافروں کے پاس گئی ہوں اور پھر تم سزا دو تو جن کی عورتیں چلی گئی ہیں، انہیں دو جتنا انہوں نے خرچ کیا ہو اور ڈرو اللہ سے جس پر تم ایمان رکھتے ہو''۔

اب دوسری صورت میں جب کہ مسلمانوں کے پاس کچھ عورتیں بھاگ کر کافروں کے پاس چلی جائیں اور کافروں نے خدا کے اس فیصلے کو تسلیم نہیں کیا تو اب دوسرے مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ اب کافروں کا کچھ مال تمہیں مل جائے اور تم ان کے کیے کی سزا کے طور پر اسے قبضے میں رکھو تو ان کے شوہروں کو جن کی عورتیں ادھر چلی گئی ہیں جو کچھ انہوں نے خرچ کیا ہے، اس مال میں سے دیدو۔ یہ تمہارے ایمان کا تقاضا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ⑫

''اے پیغمبر! جب آپ کے پاس ایمان لانے والی عورتیں بیعت کرنے لیے آئیں، ان شرائط پر کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی اور چوری نہیں کریں گی اور زنا کاری نہیں کریں گی اور اپنی اولاد کی جان نہیں لیں گی اور کوئی بہتان نہیں باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پیروں کے بیچ میں اور آپ کے احکام کی جو نیکی کے ساتھ ہوں گے نافرمانی نہیں کریں گی تو ان سے بیعت لے لیجیے اور ان کے لیے اللہ سے دعائے مغفرت کیجیے۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان۔

شرائط بیعت کا یہ جز کہ کوئی بہتان نہیں باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پیروں کے بیچ میں'' اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسی بچے کو غلط طور پر اپنے شوہروں کے سر نہیں منڈھیں گی [1] اس موقع پر ہندہ بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان کی بیعت کا دلچسپ واقعہ علاوہ کتب تاریخ کے تفسیر طبری میں بھی موجود ہے کہ جب مکّہ کی عورتیں بیعت کے لیے رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو پہلے تو یہ ہندہ چھپی ہوئی خاموش بیٹھی رہی کہ کہیں یہ معلوم

---

[1] ۔لا یلحقن بازواجھن غیر اولادھم (ابن جریر)

ہوکر کہ میں بھی اس جماعت میں ہوں رسولؐ میرے قتل کا حکم نہ دیدیں مگر جب اسے یہ اطمینان ہوگیا آج پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سابق کردار کا کوئی انتقام لینے کے درپے نہیں ہیں اور رسولؐ نے بیعت کے یہ شرائط بتانا شروع کیے تو اس جملے پر کہ ''زنا کاری نہ کریں'' وہ بول اٹھی کہ کیا کوئی شریف عورت بھلا زنا کاری بھی کرتی ہے؟ رسولؐ نے بڑے معنی خیز انداز میں اس فقرے کو جیسے دہرایا۔ فرمایا ہاں بے شک شریف عورت کوئی زنا نہیں کرے گی۔

اس کے بعد ایسا جملہ اس کی زبان پر بے ساختہ آیا جو اس نمائش اسلام کے بعد اس کی غمازی کرتا ہے کہ جنگ بدر کے کینے دلوں سے نہیں نکل سکتے، جب یہ شرط پیش ہوئی کہ ''اولاد کی جان نہ لیں''۔ تو وہ پھر بول اٹھی کہ ہم کیا جان لیں گے آپ ہی نے جنگ بدر میں ان کی جانیں لے لیں (جامع الاخبار۔ ج ۲۸ ۔ص ۸۷) مگر رسول اکرمؐ کے بے پایاں حلم و تحمل نے اسے برداشت کرلیا اور اس کی بات کا جواب خاموشی کی صورت میں دیا۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ اسلام نے شرافت نسوانی کے تحفظ کے لیے مرد عورت دونوں کے درمیان جو خلیج حائل کی ہے، اس کا لحاظ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیعت ایسے اہم آئینی معاملے میں بھی قائم رکھا کہ بیعت کا عام طریقہ یہ تھا کہ بیعت کرنے والا ہاتھ بڑاتا تھا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس سے اقرار لیتے تھے جیسا کہ قرآن مجید کی آیت سے ظاہر ہے کہ یداللہ فوق ایدیہم مطلب یہ ہے کہ آپ کا ہاتھ جو ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے یہ اللہ کا ہاتھ ہے مگر خواتین کے لیے مسلماً یہ طریقہ نہیں رکھا گیا تاکہ رسول کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے مس نہ ہو۔ اب خواتین کی بیعت کا کیا یہ طریقہ تھا؟ اس کے لیے طبری کے روایات سے پتہ چلتا ہے کہ بس ان سے زبانی اقرار بیعت کرالیا جاتا تھا چنانچہ ایک روایت میں جو ام المؤمنین عائشہ سے ہے صراحت ہے کہ:

فکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اذا اقررن بذالك من قولهن قال لهن انطلقن فقد بایعتکن والاوالله مامست ید رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم یدامرئة قط غیران یبایعهن بالکلام (جامع الاخبار ج۔ ۲۸ص ۶۸)

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہ جب اس کا اقرار کرلیتی تھیں کہ اپنے قول سے تو ان سے فرماتے تھے کہ جاؤ میں نے تم سے بیعت لے لی اور بخدا رسول خداؐ ہاتھ کسی عورت کے ہاتھ سے مس نہیں ہوا بس آپ زبانی ان سے بیعت لیتے تھے۔ دوسری روایت ایک خاتون ایک خاتون امیمہ کی زبانی ہے جو انہوں نے بعد میں بیان کی ہے کہ میں نے حضرت سے کہا اپنا ہاتھ بڑھایئے، حضرتؐ نے فرمایا:۔

انی اصافح النساء ولکن ساخذ علیکن

یعنی میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا بس تم سے عہد و پیمان لے لیتا ہوں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ قَدْ یَىِٕسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا یَىِٕسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ۠ ﴿۱۳﴾

''اے ایمان والو! تعاون نہ کرو اُس جماعت سے جن پر اللہ غضب ناک ہے جو آخرت سے یوں نا امید ہیں جیسے کافر لوگ قبروں میں گڑے ہوئے، مردوں سے''۔

ادھر کے سورے جن کی ساخت ایک خاص طرح کی ہے جیسے ''سورۃ رحمان، سورہ واقعہ، وغیرہ ان کا خود انداز بتاتا ہے کہ وہ بوقت

واحد مجموعی طور پر نازل ہوئے ہیں مگر اس سورے کے مضامین اور پھر اس کی شان نزول جو معلوم ہوتی ہے، اس کے لحاظ سے اتنا زمانے کا فرق محسوس ہوتا ہے کہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ پورا سورہ ایک ساتھ نازل نہیں ہوا ہے بلکہ مختلف موقعوں پر نازل شدہ آیات کو جوڑ کر اس کی تشکیل ہوئی ہے چنانچہ شروع سے لیجیے تو آدھے سے زیادہ سورے کی آیات سفر حدیبیہ کے قبل سے متعلق ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روانگی کی خفیہ مخبری ہوئی اور اس پر تنبیہی طور پر دو آیات نازل ہوئے اس کے بعد مومنین کو خطاب کر کے جو کہا گیا تھا کہ عورتیں ادھر کی ادھر آئیں تو ان کا امتحان لو جس پر سورے کا نام ''ممتحنہ'' ہو گیا وہ حدیبیہ کے معاہدے کے بعد دوران معاہدہ کا ذکر ہے اور پھر رسول سے جو کہا گیا ہے کہ مسلمان عورتیں جو بیعت کرنے آئیں تو ان شرائط پر بیعت لیجیے جس کا بیان اس کے قبل ہوا وہ فتح مکّہ کے بعد کی آیت ہے کیوں کہ یہی وہ موقع ہے جب کہ تمام لوگ جواب تک مشرک تھے خواہ مرد ہوں یا عورتیں آ کر مسلمان ہوئے تھے اور ان سے بیعت لی گئی تھی اور اب یہ آخری آیت جس میں کہا جا رہا ہے ان کے ساتھ تعاون نہ کرو جن پر اللہ کا غضب ہے اور جیسا کہ پہلے آ چکا ہے قرآن کی اصطلاح ہے یہ کہ غضب الٰہی جن پر ہے ان سے مراد یہودی جماعت ہوا کرتی ہے اور اس لیے مفسرین یہاں بھی غضب اللہ علیھم سے مراد اسی جماعت کو قرار دیتے ہیں اب ظاہر ہے کہ مکّہ میں ب یہودی نہیں تھے، نہ حدیبیہ کے موقع پر، نہ فتح مکّہ کے موقع پر تھے مدینہ میں اور وہ اس سے بہت پہلے لہٰذا یہ آیت اُس مضمون سے متعلق ہے جو اس کے پہلے سورۂ حشر میں بیان ہوا تھا کہ منافقین ان یہودیوں کے ساتھ ساز باز کرتے ہیں۔ اور انہیں اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں جن آیات کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔ یہ آیت اسی دور کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہے۔ تعجب ہے کہ مفسر طبری نے اپنی تفسیر کے بسط وسعت کے باوجود اس پہلو پر کوئی روشنی نہیں ڈالی بس آخر کے جملے کا کیا مطلب ہے؟ اس میں دو قول نقل کر دیے ہیں:۔

پہلا مطلب جو کہا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جیسے کہ کفار جو دار دنیا میں ہیں، وہ اپنے مردوں سے ناامید ہیں کہ وہ ان کی طرف واپس نہیں آ سکتے ویسے ہی یہ لوگ جان بوجھ کر انکار حق کی بنا پر اپنی نجات سے ناامید ہیں اس صورت میں من اصحاب القبور فعل یئسوا سے متعلق ہے۔ اس کو اپنے محاکمہ میں انہوں نے رد کر دیا کہ مرنے والوں کی دوبارہ ملاقات سے مایوسی کافروں سے مخصوص تھوڑی ہے۔ مؤمنین کو بھی یہ امید نہیں ہے کہ مردے پھر آ کر ان سے ملیں گے تو قرآن کو ہی کیوں کہتا کہ وہ اصحاب القبور سے مایوس ہیں۔

دوسرے معنی جسے انہوں نے ترجیح دی ہے یہ ہیں کہ من اصحاب القبور۔ الکفار کی صفت ہے یعنی وہ کافر جو قبروں میں پہنچ گئے، اب رحمت خدا سے مایوس ہیں کیوں کہ اصلاح عمل کا وقت گزر چکا ویسے ہی یہ یہودی لوگ اپنے باطل پر ہونے کے احساس کی بنا پر نجات اخروی سے مایوس ہیں۔ میں پہلے مفہوم کو قابل قبول سمجھتا ہوں، اس طرح کہ کفار سے مراد منکرین قیامت ہیں جو حیات بعد الموت کا عقیدہ نہیں رکھتے۔ ان کے مقابلہ میں مومنین اصحاب قبور سے مایوس نہیں ہے کہ سمجھتے ہیں کہ وہ مرنے والے ہمیشہ کے لیے مرے ہیں بلکہ پھر زندہ ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس زندگی میں ہم پھر اس کے ساتھ ایک ہی جگہ پر ہوں لیکن اس زندگی کے منکروں کے لیے ان لوگوں سے جو دنیا سے اٹھ گئے کبھی بھی ملاقات کی امید نہیں ہو سکتی کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ زندگی بس یہی ختم ہو گئی۔ اب آیندہ کوئی دور نہیں ہے جو ان سے ملاقات ہو سکے۔

سُوْرَةُ الصَّفِّ

مدنیّہ.....۱۴.....آیات

تقریباً شروع ہی کے حصہ میں ایک آیت میں صفا کی لفظ ہے اسی پر سورے کا نام ہوگیا۔

سورۂ صف کے خاص خاص مضامین:

۱.....ایسے دعوے زبانی نہ کرو جن کی تصدیق عمل سے نہ ہو۔

۲.....راہ خدا میں اس طرح صف جما کر جہاد کی تعریف جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوتی ہے

۳.....حضرت موسیٰؑ کی اپنی قوم کو فہمائش۔

۴.....جناب عیسیٰؑ کی اپنی قوم کو آنے والے رسول کی بشارت یہ کہہ کر کہ اس کا نام احمدؐ ہوگا۔

۵.....دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرنے کا وعدہ جو پہلے بھی آچکا ہے۔

۶.....تجارت کے نام سے ایمان اور جہاد کی دعوت۔

۷.....دین الٰہی کے مددگار ہونے کی دعوت اور حوارین حضرت عیسیٰؑ کی مثال۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ①

جو چیز بھی آسمان میں ہے اور زمین میں ہے، اس نے اللہ کی تسبیح کی اور وہ غالب آنے والا ہے، صحیح کام کرنے والا''۔

ادھر کے زیادہ تر سوروں کی ابتداء، اس طرح کی تسبیح سے ہے اس لیے ان سوروں کو ''مسبّحات'' کہتے ہیں، تسبیح کرنے والے کے لحاظ سے تو ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم ہوتی ہے مگر وہ حقیقت جو ذات باری کے لحاظ سے ہے کہ وہ تمام نقائص سے بُری ہے۔ اس میں ماضی اور مضارع کے درمیان بس لفظی مفہوم کا فرق ہے نتیجہ کے لحاظ سے نہ وہ ماضی اور حال سے مختلف ہے اور نہ یہ مضارع جو حال اور مستقبل لفظی مفہوم کا فرق ہے نتیجہ کے لحاظ سے نہ وہ ماضی اور حال سے مختلف ہے اور نہ یہ مضارع جو حال اور مستقبل کو شامل ہے ماضی سے الگ چیز ہے، چونکہ خالق خود قیود زمانہ میں اسیر نہیں ہے لہٰذا اس کے جتنے کمالات ذات ہیں، ان میں جو فعل بھی صرف ہو، اس زمانہ بس لفظ کے لحاظ سے ہوتا ہے حقیقت کے لحاظ سے نہیں اس لیے اس کی ذات کے لیے قرآن میں اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿فاطر: ۱﴾ کے بھی وہی معنی ہیں جو وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا. (الأحزاب:۲۷) کے ہیں حقیقت کے لحاظ سے اس کے اور اس کے مطلب میں کوئی فرق نہیں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳

''اے ایمان لانے والو! کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو، یہ بہت بڑی ناراضگی کی بات ہے اللہ کے یہاں کہ تم کہو جو کرتے نہیں ہو''۔

یہ تو کلام کا انداز بھی بتاتا ہے اور تمام اقوال جو آیت کی تشریح میں ہیں، وہ بھی متفق ہیں کہ وہ باتیں جو کرتے نہیں اور کہتے ہیں ان سے مراد کارہائے خیر ہیں۔ اب اختلاف اس میں ہے کہ یہ مستقبل کے متعلق ہے کہ بڑھ چڑھ کر دعوئے کیے کہ ہم یوں ساتھ دیں گے ہم حکم دیا جائے اس کی پوری تعمیل کرینگے چنانچہ طبری کی روایات میں ہے کہ رسول سے پوچھا کہ ہمیں بتائے کہ اللہ کو سب سے زیادہ کون سا کام پسند ہے؟ اور جب راہ خدا میں جہاد کو کہا تو بہت سوں نے کوتاہی سے کام لیا۔ اس ذیل میں ایک روایت میں جنگ احد کا حوالہ بھی آیا ہے کہ وہاں مسلمانوں نے کس طرح میدان سے کنارہ کشی اختیار کی' اس پر تنبیہ کی جارہی ہے' اور کچھ ماضی سے متعلق قرار دیتے ہیں کہ آدمی دعوئے کرے کہ میں نے یوں کیا یوں کیا اور حقیقت میں ایسا نہ ہو۔ منافقین کو بھی کہا گیا کہ وہ مسلمانوں کو ساتھ دینے کا یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر وقت ہمیشہ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ طبری نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے مگر ہمارے نزدیک الفاظ آیت میں یہ سب ہی باتیں داخل ہیں اور سب اللہ کی ناراضگی کا باعث ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴

''یقیناً اللہ دوست رکھتا ہے انہیں جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پر اجما کر جیسے کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں''۔

چونکہ ان سوروں میں آیتوں کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی ترتیب شان نزول کے مطابق ہے اس لیے قبل کی آیتوں سے ارتباط بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں آیتوں کی تشریح میں بعض روایات ایسے تھے کہ صحابہ نے پوچھا تھا کہ اللہ کو سب سے زیادہ کون سی بات پسند ہے؟ تو کہا جاتا ہے کہ اس کے جواب میں یہ آیت اتری ہے لیکن اس صورت میں ماننا پڑیگا کہ اس کے قبل کی دو آیتیں جو سرزنش کی ہیں کہ کیوں ایسی باتیں کہتے ہو جن پر عمل کرتے نہیں ہو، وہ اس آیت کے بعد کی ہیں۔

ہم تو اس طرح کے سوروں میں ہر آیت سے وجدانی طور پر جو مطلب مستفاد ہوتا ہے' اسی کو مستند سمجھتے ہیں اور ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ ان الفاظ میں درحقیقت ثبات قدم کی تعریف ہے لہٰذا بعض لوگوں کا یہ خیال کہ قرآن میں پیادوں کی جنگ کی تعریف ہوئی ہے، سواروں کی نہیں کیوں کہ سواروں کے لیے جنگ میں پر اجمانے کا تصور نہیں ہوسکتا۔[1] حقیقت سے دور ہے۔ ہاں ثبات قدم کے علاوہ تمام مجاہدین کے یکدل اور یک جہت، ہم آہنگ ہونے کا پہلو بھی اس میں محسوس کیا جائے تو بعید نہیں ہے۔

---

[1] ۔لان الفرسان لا یصطفون وانما تصطف الرجالة (ابن جریر)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵

''اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم والو! کیوں مجھے ایذا پہنچاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں تمہاری طرف تو جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو (اور زیادہ) کج کر دیا اور اللہ منزل مقصد تک نہیں پہنچایا کرتا بے اعمال لوگوں کو''۔

حضرت موسیٰؑ کی اپنی قوم کو فہمائش

یہاں قوم سے مراد بنی اسرائیل ہیں جن کے لیے جناب موسیٰؑ نجات دہندہ کی حیثیت رکھتے تھے اور انہی کی ہدایت اور تعلیم آپ کا نصب العین تھی مگر یہ انہیں طرح طرح سے اپنی کج روی کے ساتھ اذیت پہنچاتے جس سے ان کو دکھ ہوتا تھا۔ انہی سے ان الفاظ میں خطاب ہے۔

اب یہاں بعد میں جو دلوں کو کج کرنے کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے، اس کے پہلے بطور فعل اختیاری کے خود ان کی طرف کج ہونے کی نسبت دی گئی ہے تو اب بعد میں جو کج کرنے کی نسبت ہے وہ بطور سزا سلب توفیقات کے معنی میں ہے اور یہی توفیق وہ ہدایت ہے جس کی فاسق گروہ سے نفی کی گئی ہے جس کی تشریح طبری نے بھی حقیقت پسندی کے ساتھ ان الفاظ میں کی ہے:۔ واللہ لا یوفق لاصابۃ الحق القوم الذین اختار الکفر علی الایمان (جامع البیان) اللہ حق تک پہونچنے کی توفیق انہیں نہیں دیتا جنہوں نے کفر کو ایمان پر ترجیح دی۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۶

''اور جب مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ نے کہا اے بنی اسرائیل! میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں تمہاری طرف تصدیق کرتا ہوا تو ریت کی جو میرے پہلے تھی اور خوش خبری دیتا ہوا ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا تو جب وہ آئے معجزے لے کر تو ان لوگوں نے کہا یہ کھلا ہوا جادو ہے''۔

اس میں جناب عیسیٰ علیہ السلام نے ہمارے پیغمبر کی بشارت دی ہے احمدؐ کی لفظ کے ساتھ جو ہمارے رسولؐ کا نام ہے اور ''جب وہ معجزے لے کر آئے'' اس سے قریب چونکہ حضرتؐ ہی کا نام ہے لہٰذا یہی مطلب ہے کہ جب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معجزے لے کر آئے'' تو کافروں نے کہا کھلا ہوا جادو ہے جو درحقیقت غیر معمولی یعنی خارق عادت ہونے کا اپنے کفریہ طریقے پر اقرار ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۷ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ

نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے کہ جو اللہ پر غلط تہمت لگائے درانحالیکہ اسے دعوت دی جارہی ہو اسلام کی طرف اور اللہ منزل مقصود تک نہیں پہنچاتا ظالم لوگوں کو، وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھادیں اپنے منہ سے اور اللہ اپنے نور کو کمال منزل تک پہونچانے والا ہے، چاہے کافر لوگ ناپسند کریں، وہ وہ ہے جس نے اپنے پیغمبر کو بھیجا رہنمائی اور حقیقت والے دین کے ساتھ کہ اسے ہر دین پر غالب کرے چاہے مشرک لوگوں کو ناپسند ہو''۔

اسلام کی طرف دعوت دی جانے کی صورت میں وہ اللہ پر غلط تہمت کیا لگاتے ہیں؟ مفسر طبری نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ وہ پیغمبر کو ساحر وغیرہ کہتے ہیں، اس کا اللہ پر افترا ہونا اس سمجھ آتا ہے کہ کس طرح کسی چیز کا اللہ کی طرف منسوب کرنا افترا ہے اسی طرح اس کی طرف کی کسی صحیح بات کو غلط کہنا بھی افترا ہے۔ اس طرح ساحر وغیرہ کچھ نہ کہیں، صرف انکار رسالت کریں تو وہ بھی اللہ پر افترا ہے۔

اس کے بعد کی دونوں آیتوں کا مضمون پہلے آچکا ہے جس کے ذیل میں تمام ادیان پر دین اسلام کے غالب کرنے کا اعلان ہے جس کے پورے ہونے کا، اہل ایمان کو یقین ہے اور اس دن کے آنے کا انتظار ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَیُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝۱۲ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۱۳

''اے ایمان لانے والو! کیا میں تمہیں پتہ بتاؤں اس تجارت کا جو تمہیں نجات دے دردناک عذاب سے (وہ یہ ہے کہ) تم ایمان لاؤ گے اللہ اور اس کے پیغمبر پر اور جہاد کرو گے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان کے ساتھ۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو، تو اللہ بخش دے گا تمہارے گناہوں کو اور تمہیں داخل کرے گا ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں رواں ہیں اور پاک و پاکیزہ مکانات میں ہمیشہ والی زندگی کے باغوں میں۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور دوسری بات (اس کے علاوہ) ہے جس کی تمہیں خواہش ہے اللہ کی طرف کی مدد اور قریبی فتح کامیابی اور کامرانی اور خوش خبری دے دیجیے ایمان والوں کو''۔

اسلام میں تجارت کے پسندیدہ خالق ہونے کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ آخرت کے بلند مقاصد کی تحریک تجارت کی لفظ کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہ جو مخاطب بنایا گیا ایمان لانے والوں کو اور پھر تجارت کی تشریح میں جس کی طرف دعوت دی گئی، کہا گیا ''ایمان لاؤ گے'' اس کی نظیر پہلے قرآن مجید میں آچکی ہے اور ہر جگہ اس کی توجیہہ یہ ہے کہ وہ ایمان جو سرنامہ خطاب میں آتا ہے اقرار ایمان زبان جس سے ہے اور پھر جس کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ، وہ ایمان واقعی ہے جو دل سے ہوتا ہے اس کے عملی تقاضوں کے ساتھ اور یہاں اس کا ایک اہم تقاضا بیان ہوا ہے راہ خدا میں جہاد۔ آخر میں جو ہے: وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ''اس کا عطف بعض لوگوں نے قبل والی تجارۃ کی لفظ پر لیا ہے ب معنی یہ ہوں گے کہ تمہیں ایک تجارت کا پتہ بتادوں اور ایک ایسی بات کا جس کی تمہیں خواہش ہے مگر یہ مفہوم درست نہیں معلوم ہوتا، اس لیے کہ تجارت جسے کہا گیا ہے وہ تو ان لوگوں کا ارادی عمل ہے جس کی طرف رہ نمائی خالق کی طرف سے ہوئی ہے اور یہ نصرت و مددان کا عمل نہیں ہے۔ یہ خالق کی طرف کی بات ہے جس کی رہ نمائی ان لوگوں کو تھوڑی ہونا ہے ہم نے جو ترجمہ کیا ہے مفسر طبری بھی اس کے موافق ہیں۔ [1]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝۱۴

''اے ایمان لانے والو! اللہ، کے مددگار بنو جیسا کہ عیسیٰ فرزند مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کی راہ میں میرے مددگار ہیں؟ حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں تو بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا جو ایمان لائے ان کی ہم نے مدد کی ان کی دشمن کے مقابلے میں آئے تو وہ غالب آئے''۔

دین الٰہی کے مددگار ہونے کی دعوت اور حوارئین حضرت عیسیٰؑ کی مثال

شروع میں مطالبہ انصار اللہ ہونے کا ہے بعد میں حواریوں کے جواب میں انصار اللہ کی لفظ ہے مگر بیچ میں جناب عیسیٰ کے جو الفاظ ہیں، ان میں انصار الی اللہ ہے اس کا مفہوم قبل اور بعد سے مختلف تو نہیں ہوسکتا۔ میں نے جو ترجمہ کیا ہے اس کے لحاظ سے قبل اور بعد میں ''جو اللہ کے مدد کی لفظیں ہیں، یہ درمیان کی تعبیر ان کی تشریح ہے یعنی آدمی براہ راست اللہ کی مدد کیا کریں گے؟! اللہ کی مدد کرنے کے معنی یہی ہیں کہ وہ انسان جو اس کی راہ میں یعنی اس کے مقصد میں گامزن ہیں ان کی مدد کی جائے۔ طبری نے اس کی جن الفاظ میں تشتریح کی ہے ان کا مفہوم گنجلک ہے اور قبل اور بعد سے غیر مرتبط بھی، وہ لکھتے ہیں:۔ یعنی من انصاری منکم الیٰ نصرۃ اللہ لی .....(جامع البیان) مطلب یہ ہے کہ کون ہیں تم میں سے جو میرے مددگار ہوں اس منزل تک کہ اللہ کی مدد میرے شامل حال ہو۔

---

[1] ۔ ھی فی موضع رفع ای ولکم اخریٰ فی العاجل مع ثواب الاٰخرۃ (ابن جریر)

سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ

مدنیّہ.....۱۱.....آیات

یہ سورہ بھی ''مسبحات'' سے ہے اور چونکہ اسمیں روز جمعہ خصوصی طور پر خاص نماز کا حکم ہے اس لیے اس کا نام یہ ہوا۔

اس میں تسبیح الٰہی کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمے خالق کی طرف سے جو کام ہیں، وہ بیان ہوئے ہیں جن کا اس کے قبل پہلے اور دوسرے اور چوتھے پارے میں بھی بیان ہوا تھا مگر یہاں ان کی بیان میں ایک خاص خصوصیت ہے جسکا بیان اس آیت کے ذیل میں بھی آئے گا۔

سورۂ جمعہ کے خاص خاص مضامین:

۱.....مزید خصوصیت یہ ہے کہ ان کاموں کے تذکرے کے بعد اس کا اظہار کر دیا گیا ہے کہ آپ کی رسالت زمانہ مستقبل کے آنے والوں پر بھی حاوی ہے۔

۲.....اہل کتاب کو جو کتاب ملی تھی، ان کے ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہونے کا ذکر ہے جس کے ضمن میں اس امت کو جنہیں یہ کتاب عطا ہوئی ہے، انتباہ ہے کہ تم ایسے نہ ہونا کہ اس کتاب کے ذمہ داریوں کو پورا نہ کرو۔

۳ ..... یہودیوں سے خطاب کر کے ان کے اس زعم کی کمزوری ظاہر کی گئی ہے کہ وہ من حیث الجماعت خدا سے اپنا خاص رشتہ سمجھتے ہیں اور پھر اس کی تصدیق کا معیار تمنائے موت کو قرار دیا ہے جو اس کے پہلے سورۂ بقرہ میں بھی ایک طرح آچکا ہے۔

۴.....آخر میں جمعہ کا حکم جس کے خصوصیات پر اس آیت کے تحت میں روشنی پڑے گی۔

۵.....صحابہ کے اس کردار پر سرزنش کہ وہ رسولؐ کو چھوڑ کر تجارتی باجے کی آواز سن کر چلے جاتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ①
هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ② وَّاٰخَرِيْنَ

مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۴

"تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، جو سلطنت کا مالک ہے، نقائص سے بری غالب آنے والا صحیح کام کرنے والا ہے، وہ ہے جس نے امیین کی قوم میں ایک پیغمبر انہی میں جو ان کے سامنے اس کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور انہیں پاکیزہ بناتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس کے پہلے کھلی گمراہی میں تھے، اور کچھ دوسرے لوگ ان میں کے جو ابھی ان سے نہیں ملے ہیں، اور وہ غالب آنے والا، صحیح کام کرنے والا ہے۔ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے جسے وہ چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل و کرم والا ہے"۔

پہلی آیت میں تسبیح کے ساتھ اللہ کے جتنے اوصاف اسمائے حسنیٰ کی صورت میں ہیں، وہ پہلے آتے رہے ہیں جن کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے بعد جو آیہ بعثت ہے، اس کا مضمون اسکے پہلے قرآن مجید میں تین جگہ آیا ہے۔

پہلے پارۂ اول الٓمٓ میں دعائے حضرت ابراہیمؑ کے ذیل میں:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (قرہ-۱۲۹)

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ-۱۵۱)

تیسرے پارہ چہارم میں (لن تنالوا) میں:۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران-۱۶۴)

اب یہ چوتھی جگہ وہ مضمون آیا ہے مگر یہاں اس کے محل وقوع میں خاص خصوصیت ہے۔ سورہ اوصاف الٰہی سے شروع ہوا۔ کائنات سب مصروف تسبیح ہے اللہ کے لیے، کون ہے، جو ملک یعنی سلطنت کا حقیقی مالک ہے۔ قدوس یعنی تمام عیوب و نقائص سے بری عزیز ہے اور حکیم ہے۔ اب انہی اوصاف الٰہی میں کہاں جا رہا ہے کہ وہ وہ ہے جس نے امیین میں ایسا رسول بھیجا، یعنی رسول کا تعارف یہ کہہ کر نہیں کرایا جاتا کہ وہ وہ ہے جسے اللہ نے بھیجا بلکہ اللہ کا تعارف کرایا جاتا ہے یہ کہہ کر کہ اللہ وہ ہے جس نے ایسا رسول بھیجا اسکا نتیجہ یہ ہے کہ یہ رسول اس شان کا ہے جسے دیکھ کر عظمت الٰہی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

اس کے بعد اُن کاموں کی فہرست پیش کی گئی ہے جو خالق کی طرف سے آپ کے ذمے ہیں جن کا ذکر اوصاف امتیازی کے طور پر پہلے تین جگہ آچکا ہے۔

''اگرچہ وہ اس کے پہلے کھلی گمراہی میں تھے''۔ یہ فقرہ پہلے کی تیسری آیت میں بھی تھا جس میں قبل اسلام دور جاہلیت کی پوری تاریخ مضمر ہے کہ دنیا کی کیا حالت تھی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے ان میں کیا انقلاب ہوا۔

آخر کا فقرہ جو اس جگہ خصوصیت کے ساتھ ہے: وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ اس سے ہمارے پیغمبر کی رسالت کے عموم زمانی کا استفادہ ہوتا ہے کہ آپ کی رسالت اسی نسل میں محدود نہیں ہے بلکہ بعد میں جتنے آئیں، وہ سب آپ کے دائرہ رسالت میں ہیں۔

پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت

اب چونکہ واقعہ یہ ہے کہ بعد کے آنے والے قوم عرب میں محدود نہیں ہیں بلکہ اور بھی قومیں ہیں، اس لیے مفسرین نے اس کی تشریح میں قوم ونژاد کی ہمہ گیری پر بھی روشنی ڈالی ہے جس کے لیے مفسر طبری نے کئی روایات تو ایسے درج کیے ہیں جن میں صراحت ہے کہ اس سے عجم مراد ہیں اور چونکہ اصطلاحاً جتنے غیر عرب ہیں، سب ہی عجم ہیں، اس سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ تمام اقوام عالم کے لیے آپ کی رسالت ہے اور دوسرا قول صاف صاف یہ ہے کہ:۔

عنی بذالك جمیع من دخل فی الاسلام من بعدی النبی ﷺ کائنا من کان الیٰ یوم القیامة (جامع البیان)

اس سے مراد تمام وہ ہیں جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سے اسلام داخل ہوئے چاہے جو بھی ہوں قیامت تک۔

یہ اگرچہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جس کے لیے قرآن مجید میں بہت بلند آہنگ کے ساتھ اعلان ہے کہ: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سبا-۲۸) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا ہے مگر تمام انسانوں کے لیے کافی ووافی رہبر مگر زیر تحریر آیت میں آخرین کے ساتھ جو منھم کی لفظ ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ انہی امیین میں سے اور لوگ، اس کے بعد اس آیت سے مذکورہ ہمہ گیری کا استفادہ مشکل ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵

''مثال ان کی جن پر توریت (کی ذمہ داری) کا بار ڈالا گیا، پھر وہ اسے اٹھا نہیں سکے مثل گدھے کے ہے جو بہت سی کتابیں اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہو کتنی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی کتاب کو اور اللہ منزل مقصد تک نہیں پہنچاتا ظالم لوگوں کو''

''بار ڈالا گیا'' یعنی توریت ان کی ہدایت کے لیے اتاری گئی، اب ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس پر عمل کریں مگر اُنہوں نے اس ذمہ داری کو پورا نہیں کیا یعنی اس پر عمل نہیں کیا، پھر یہ کہ اس کے بعد جن اللہ کے پیغمبروں پر ایمان لانا چاہیے تھا، ان پر ایمان نہیں لائے، جب کہ یہ پیغمبر اُس توریت کی تصدیق کرنے والے تھے اسے رد کرنے والے نہ تھے تو جب کہ انہوں نے اس توریت پر جس کے وہ حامل بنائے گئے تھے عمل نہیں کیا تو ان کی مثال اس گدھے کی سی ہوگئی جس پر کتابوں بوجھا لدا ہوا ہو مگر اس سے فائدہ کچھ بھی نہیں اٹھاتا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۶ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۷ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸

''اے یہودی مذہب رکھنے والو! اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تمام لوگوں کو چھوڑ کر تم ہی اللہ کے خاص لگاؤ رکھتے ہو تو موت کی آرزو مند ہو اگر تم سچے ہو اور وہ اس کے کبھی آرزو مند نہیں ہونگے ان اعمال کی وجہ سے جو پہلے وہ کرتے رہے اور وہ اس کے کبھی آرزو مند نہیں ہوں گے ان اعمال کی وجہ سے جو پہلے وہ کرتے رہے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے کہیے کہ موت جس سے تم بھاگتے ہو، وہ بہر حال تم تک پہونچے گی، پھر تم پلٹا جاؤ گے اس کی طرف جو ان دیکھی اور دیکھی سب باتوں کا جاننے والا ہے، تو وہ تمہیں بتائے گا ان اعمال کو جو تم کرتے تھے''۔

شروع کا خطاب مسلما جماعت یہود سے ہے لیکن خطاب ''یہود'' کی لفظ کے ساتھ نہیں کیا گیا ہے بلکہ قرآن نے یہودی جماعت کے لیے پہلے بھی کئی جگہ الذین هادو کی لفظ استعمال کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی کے نام کو جو ایک ''نژاد'' کا پتا دیتا ہے ایک مذہبی جماعت کے شایان شان لفظ کے ساتھ جو اللہ سے لو لگانے کا اظہار کرتی ہے۔[1]

تبدیل کر کے صرف حروف کی ساخت کی مشابہت سے ذہن کو ان کی جماعتی نام ''یہود'' کی طرف منتقل کیا ہے۔ غالبا اصل بنیاد اس لفظ کے استعمال کی یہی تھی جس کے بعد اس نے ایک وضع شاذ کی حیثیت اختیار کر لی اور معنی ہی اس لفظ کے ہو گئے کہ یہودی مذہب اختیار کیا[2] چونکہ جماعت یہود کا دعوی تھا جو پہلے قرآن مجید میں بیان ہو چکا ہے کہ :۔(مائدہ-۱۸) نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ : ہم اللہ کے بیٹے اور اس سے خاص محبت کا رشتہ رکھنے والے ہیں۔ اس لیے ان سے کہا گیا ہے کہ اگر ایسا ہے تو موت سے ڈرتے کیوں ہو؟ اس کا آرزو مند ہو کیوں کہ لقائے محبوب سے بڑھ کر خوش آئند بات اور کیا ہو سکتی ہے اور وہاں تمہیں بخیال خود کوئی کھٹکا بھی نہیں ہے۔ اس دنیا کے جھگڑوں بکھیڑوں اور مصائب و آلام سے چھوٹ کر بہشت عنبر سرشت کی نعمتیں ہیں تو پھر اس کا ڈر کیسا؟

اور اس کے بعد کہا گیا کہ یہ تو مشرکین یعنی آخرت کا تصور نہ رکھنے والے بت پرستوں سے بھی زیادہ دنیاوی زندگی پر جان دیتے ہیں اور ہر ایک کی آرزو ہے کہ وہ ایک ہزار برس اس دنیا میں رہے۔ اب اگر مسلمانوں میں بھی یہی بات ہو جائے تو وہ تمام سرزنشیں جو جماعت یہود کو کی گئی ہیں۔ ان مسلمانوں کے بھی حسب حال ہوں گی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ

---

[1] ۔قال موسی انا دینا الیك (ابن جریر)

[2] ۔ھود اخل شدن بدین یہودیت است گویند ھادو تھودیعنی بدین یہودیت داخل شد (قاموس قرآن)

وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۹ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۰

''اے ایمان لانے والو! جب پکارا جائے جمعہ کے دن والی نماز کے لیے تو دوڑ پڑو ذکر خدا کی طرف اور خرید وفروخت چھوڑ دو، وہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو، تو جب نماز ختم ہو جائے تو ادھر ادھر جاؤ اور اللہ کے فضل وکرم سے طلب معاش کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو، شاید کہ تم دین اور دنیا کی بہتری حاصل کرو''۔

جمعہ کی نماز کا حکم

اس میں پہلے نماز جمعہ کا حکم قرآن نے ان الفاظ میں دیا ہے کہ جب جمعہ کی نماز کے لیے پکارا جائے یعنی نماز جمعہ قائم ہو تو ذکر الٰہی یعنی نماز کے لیے دوڑ پڑو مگر اس حیثیت سے اس حکم میں اجمال ہے کہ اس نماز کے قیام کے شرائط کیا ہیں؟ یعنی کن صورتوں میں اس نماز کا قائم کرنا لازم ہے اور اس کے لزوم کی کیا نوعیت ہے؟ اس کی تفصیل قرآن مجید میں مذکور نہیں ہے۔ احادیث میں ہے اور ان سے نتائج کے برآمد کرنے میں علماء کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے۔

اہل سنت چونکہ رسولؐ کے بعد کسی امام معصوم کے قائل نہیں ہیں لہٰذا ان کے یہاں بعد پیغمبر خدا ہر آدمی جس طرح عام نماز کا امام ہو سکتا ہے، اسی طرح جمعہ کی نماز ہر امام کے پیچھے ہر مسجد میں ہو سکتی ہے مگر شیعہ بعد رسول چونکہ اصل جانشین رسولؐ کا انہی اماموں کو جانتے ہیں جو اللہ کی طرف سے مقرر تھے لہٰذا بہت سے اہم منصب رسولؐ کے ان نزدیک ان آئمہؑ کے لیے جس نوعیت کے ساتھ ثابت ہیں اس طرح دوسرے لوگوں کے لیے ثابت نہیں ہیں، اس ثابت نہیں ہیں لہٰذا اکثر علمائے شیعہ کے نزدیک احادیث معصومینؑ کی بنا پر قرآن مجید کے یہ احکام جو نماز جمعہ کے لیے ہیں اس شکل میں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نماز پڑھانے کی صورت میں تھے وہ اس وقت ہیں جب ان کے وہ جانشین یعنی ایمہ معصومین علیہم السلام ایسا موقع پاتے کہ نماز جمعہ کی امامت فرمائیں۔ باقی غیبت امام میں مختلف اقوال ہیں جن کے لیے ان رسائل عملیہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے جو مجتہدین کی طرف سے ان کے مقلدین کے لیے شائع ہوتے ہیں۔

اب یہ کہ جب نماز جمعہ کی اذان ہو جائے تو دوڑ پڑو، اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت پر حاضری میں تاخیر نہ ہونے پائے۔ لہٰذا گھر اگر مسجد کے قریب ہے ایسا کہ بغیر دوڑے پہونچ جائے گا یا پہلے سے مسجد میں موجود ہے اور اس کے سامنے اذان ہوئی تو بلا وجہ خاص اس حکم کی تعمیل کے لیے دوڑنا مقصود نہیں ہے، بس مطلب یہ ہے کہ وقت پر نماز میں حاضر ہو تو درصورت شرائط وجوب یہ حکم وجوبی ہے وَذَرُوا الْبَيْعَ یعنی خرید وفروخت چھوڑو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب خرید وفروخت حرام ہیں اور یہ تحریم بھی انہی شرائط کے ساتھ ہیں جن میں نماز میں شرکت واجب ہے۔ مگر اس کے بعد تیسرا حکم کہ جب نماز ختم ہو جائے تو ادھر ادھر منتشر ہو جاؤ، یہ صورۃً حکم ہے لیکن مراد اس سے اجازت ہے۔

چونکہ یہ عام اصول ہے کہ ممانعت کے بعد جو صیغہ امر آئے وہ صرف پابندی کے ختم ہونے کا اظہار کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ نہ کہ اس سے کوئی پابندی عائد کرنا منظور ہو۔ اسلیے یہ حکم صرف جواز کو ظاہر کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور چونکہ ممانعت خرید وفروخت سے ہوئی تھی لہٰذا اب اس

کے مقابلے میں یہ ہے کہ خدا کے فضل وکرم کے امیدوار ہونے کے لیے یعنی طلب معاش کے لیے جاؤ۔

اب یہ جانے کی اجازت بھی طلب معاش ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس جائز کام کے لیے جانا چاہتے ہو جاؤ۔ اب کوئی ممانعت نہیں ہے،

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۚ قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴿١١﴾

''اور جب وہ دیکھتے ہیں کوئی تجارت یا باجا گا جا تو منتشر ہو جاتے ہیں اس کی طرف اور آپ کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں، کہیے کہ جو اللہ کے یہاں ہے، وہ اس باجے گاجے، اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق پہچانے والا ہے''۔

واقعہ یہ تھا کہ جیسا کہ طبریؒ نے بھی اس کے متعلق متعدد روایات نقل کیے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز جمعہ کا خطبہ شروع فرما چکے تھے کہ باجے کی آواز آئی اور یہ علامت تھی اس کی کہ تجارتی قافلہ شام سے مال تجارت لے کر آیا ہے، بس اس کی آواز سننا تھی کہ صحابہ اٹھ اٹھ کر جانے لگے، یہاں تک کہ پیغمبر خدا کے سامنے صرف بارہ (۱۲) آدمی رہ گئے۔ کئی حدیثوں میں ہے کہ حضرت نے فرمایا اگر یہ اتنے آدمی نہ رہ جاتے تو فوراً عذاب الٰہی کے طور پر آگ کے شعلے بھڑکنے لگتے۔ [1]

---

[1] ۔لالتهب عليكم الوادي ناراً (ابن جرير)

سُوْرَةُ الْمُنَافِقُوْنَ

مدنیّہ.....۱۱.....آیات

کھلے ہوئے کافر اسلام کے لیے اتنے ضرر رساں اور خطرناک نہیں تھے، جتنے وہ جو ظاہر میں مسلمان ہو گئے تھے لیکن دل سے کافر تھے۔ان کا نام اصطلاح قرآن میں ''منافقون'' ہوتا ہے اور ان کا ذکر قرآن میں اس نام کے ساتھ نہیں بلکہ ان کے اوصاف کے ساتھ سورہ بقرہ کے آغاز ہی سے شروع ہو گیا تھا اور جا بجا ان کا ذکر کہیں صرف اوصاف کے ساتھ کہیں لفظ ''منافقون'' یا ''المنافقین'' کے ساتھ بار بار ہوتا رہا اور اب یہ پورا سورہ ن کے نام پر اتار دیا گیا جس میں ان کے اوصاف اور علامات بھی ہیں اوان کی باتوں کا جواب بھی''

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾

''جب منافقین لوگ آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ آپ ضرور اس کے پیغمبر ہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں''۔

ایک علمی بحث صدق وکذب کی تعریف میں ہے کہ بعض نے خبر دینے والے کے اعتقاد کے موافق ہونے کا اعتبار بھی صدق میں کیا ہے یعنی اگر بات اپنی جگہ حقیقت کے مطابق ہے لیکن وہ کہنے والے کے اعتقاد کے خلاف ہے تو وہ جھوٹ میں داخل ہیں اور اس کے ثبوت میں اس آیت کو پیش کیا ہے مگر یہ آیت اس کی دلیل نہیں ہے اس لیے کہ اصل ان کا جملہ جس کی خبر انہوں نے دی یہ نہیں تھا کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں بلکہ اصل جملہ یہ تھا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور گواہی کے معنی اعتقاد کے باب میں ہوتے ہیں اس بات پر اپنے ایمان کا اظہار مگر وہ لوگ جب یہ کہہ رہے تھے تو حقیقت میں انہیں ایمان اس کا نہیں تھا لہٰذا یہ اظہار کہ ہم گواہی دیتے ہیں خلاف واقعہ تھا اس بنا پر خالق نے انہیں جھوٹا کہا ہے کہ وہ بات واقعہ کے خلاف ہے نہ یہ کہ چونکہ انکے اعتقاد کے خلاف تھی۔اس لیے انہیں جھوٹا کہا اور بیچ کا جملہ ہمارے نزدیک خالق کی طرف سے اسی اظہار کے لیے ہے کہ جس بات کی گواہی وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم دے رہے ہیں، وہ بات تو بالکل صحیح ہے۔اللہ جانتا ہے کہ آپ اُس کے رسول ہیں مگر یہ جو اپنے لئے کہتے ہیں کہ ہم اس کی گواہی دیتے ہیں، یہ اظہار غلط ہے اس لئے اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ منافقین جھوٹے ہیں۔

بعض لوگوں نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ یہ بیچ کا جملہ بھی انہی کا ہے، مگر ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ان کے کلام کیا جز نہیں ہے۔

ایک تصور یہ ہے کہ کذب کی دو قسمیں ہیں: کذب خبری اور کذب مخبری ۔ جب بات جو کہی گئی ہے حقیقت کے مطابق نہ ہو تو وہ خبر کا جھوٹا ہونا ہے اور اگر کہنے والے کے نقطہ نظر سے وہ بات درست نہ ہو چاہے وہ خبر سچی ہو، مگر یہ خبر دینے والا جھوٹا ہے۔

اب بیچ کا جملہ جو کلام الٰہی میں ہے کہ اللہ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسولؐ ہیں، یہ خبر کی سچائی کا اظہار ہے اور آخر میں جو یہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں، وہ خبر دینے والوں کو غلط گو ہونے کا اظہار ہے۔

چونکہ بعد میں عبداللہ بن ابی اور اس کی خاص جماعت کے آدمیوں کی گفتگو ہے لہٰذا اس پورے سورے کو انہی کے بارے میں سمجھا گیا ہے مگر مورد نزول وہی افراد ہوں، تب بھی جو اوصاف منافقین کے بیان کیے گئے ہیں، عام طور پر ایسے دو رنگ افراد میں پائے جاتے ہیں جن میں شخص یا اشخاص خاص کی خصوصیت نہیں ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۲
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۳

''انہوں نے اپنی قسموں کو سپر بنایا ہے تو اللہ کے راستے سے روگردان ہو گئے ہیں، یقیناً بہت برا کام ہے جو وہ کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ وہ مسلمان ہوئے، پھر بھی کافر ہی رہے تو ان کے دلوں پر مہر لگ گئی ہے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی''۔

وہ قسمیں کھا کھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلانا چاہتے ہیں اس طرح اپنی حفاظت کا سامان کرتے ہیں ان خطرات سے جو ان کے دلوں کے بھید کھلنے کی صورت میں انہیں درپیش ہو سکتے ہیں اور انہیں بخیال خود ان قسموں کے ذریعے سے اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب انہیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا تو وہ اُنہیں راستے سے جو ان کے لیے باعث نجات ہو سکتا ہے دور ہی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جس کا انجام بہر حال ہلاکت ابدی ہے لہٰذا کہا گیا کہ بہت برا یہ کردار ہے جو وہ خود اختیار کیے ہوئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ زبان سے اقرار ایمان کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوئے اور اندر سے کافر ہی رہے۔ جس کی وجہ سے ان پر اثر ہدایت ربانی کا جو رسولؐ کے ذریعہ سے پہنچتی ہے نہیں ہوتا۔ اس تاثر کے ختم ہونے کو مہر سے تعبیر کیا ہے اور ہر جگہ کی طرح یہاں بھی اس مہر لگنے کو ان کے سوء اختیار کا نتیجہ قرار دیا ہے، نہ کہ اس کا سبب جس سے جبر کا تصور پیدا ہو۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۴

''اور جب انہیں دیکھے گا تو ان کی جسمانی شکلیں صورتیں آپ کو بہت خوشنما معلوم ہوگی اور اگر بات کریں گے تو ان کی گفتگو سننے کے قابل محسوس ہوگی (مگر اندر سے وہ ایسے ہیں) جیسے اڑانے لگائی ہوئی لکڑیاں ہوتی ہیں۔ جو زور سے آواز سنائی دے، ہر دفعہ سمجھیں گے اُن کے خلاف ہے۔ یہ ہیں خاص دشمن۔ ان سے ڈرتے رہیے۔ اللہ

انہیں غارت کرے، کہاں یہ بھٹکے پھرتے ہیں"۔

یہ لوگ صورت شکل سے بہت دیدۂ زیب اور شاندار نظر آتے ہیں اور باتیں بھی شیرین کلامی سے کرتے ہیں، گفتگو ایسی دل آویز ہوتی ہے کہ ان کی باتوں میں آدمی کا دل لگتا ہے مگر اندر سے ان میں ایمانی زندگی کا نام ونشان نہیں ہے جیسے وہ لکڑی جو اڑانے لگا کر کھڑی کی جائے کہ حیات نباتی بھی اس کی رخصت ہو چکی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ ان میں نفسیاتی کمزوری پائی جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے چور کی داڑھی میں تنکا جو زور زور کی آواز آئے، کیا مطلب؟ یعنی کوئی آیت ایسی جس کے الفاظ سخت ہوں اور تہدیدی انداز رکھتی ہو، بس ان کا دل دھڑکنے لگتا ہے کہ کہیں ہمارے ہی خلاف کسی سخت کاروائی کرنے کا حکم نہ ہو، چونکہ ان کا ضمیر اپنے کو اس لائق جانتا ہے کہ ان کے خلاف تادیبی کاروائی ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد رسول ؐ کو صاف الفاظ میں ہوشیار کیا گیا ہے کہ کھلے ہوئے کافر ایسے خطرناک دشمن نہیں ہے جتنے یہ منافق قسم کے لوگ۔ اب ختم آیت میں ان پر نفرین ہے جیسے انہیں غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے جو اس قسم کی نفرینوں کو شائستگی کے خلاف سمجھتے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝٥ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝٦

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تمہارے لیے پیغمبر خدا دعائے مغفرت کر دیں تو وہ اپنے سر گھماتے ہیں برابر ہے ان کے لیے آپ طلب مغفرت کیجیے ان کے لیے یا طلب مغفرت نہ کیجیے، اللہ ہرگز نہیں بخشے گا۔ یقیناً اللہ منزل تک نہیں پہنچاتا انہیں جو ایسے بدکردار ہوں"۔

جب ان کے کسی قول عملی جرم کا کچھ مسلمانوں یا کسی مسلمان پر انکشاف ہوجاتا ہے تو یہ ان سے کہتے ہیں کہ ارے، اب بھی غنیمت ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر اپنے لیے بارگاہ الٰہی میں استغفار کرالو۔ یہ سن کر وہ طنزیہ طور پر سروں کو حرکت دیتے ہیں اور اسے جیسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔

اللہ جو ان کے دلوں کے رازوں سے واقف ہے، وہ فرماتا ہے کہ آپ اپنے منصبی فریضہ کی بنا پر کہ آپ کو ظاہر پر نگاہ رکھنا چاہیے ایک مسلمان کے دعائے مغفرت کی خواہش پر دعائے مغفرت کر بھی دیجیے تو اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشنے گا۔

ایک جگہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر ستر دفعہ بھی آپ استغفار کیجیے تو اللہ ان کی مغفرت نہیں کرے گا۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝٧ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸

''وہی وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ روپیہ پیسہ نہ دو ان لوگوں کو جو رسولِ خدا کے پاس ہیں تا کہ یہ لوگ منتشر ہو جائیں حالاں کہ اللہ کے لیے خزانے ہیں آسمانوں اور زمین کے مگر منافق لوگ سمجھتے نہیں کہتے ہیں کہ ہم لوگ مدینے واپس ہوئے تو جو ہم میں غلبہ وعزت والا ہے، وہ ذلت وعاجزی والے کو نکال باہر کرے گا حالانکہ عزت اللہ اور اس کے پیغمبر کے لیے ہے اور ایمان والوں کے لیے مگر منافق لوگ جانتے نہیں''۔

یہ اس سورے کی مرکزی آیتیں ہیں جو ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں۔اس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ ایک غزوے سے واپسی میں ایک کنویں پر پانی بھرنے میں ایک انصاری اور ایک مہاجر کے درمیان جھگڑا ہو گیا جن میں انصاری کو چوٹ آ گئی۔

عبداللہ بن ابی جو مدینہ کے منافقین کا سرغنہ تھا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ میں آنے سے پہلے مدینہ کی بادشاہت کا خواب دیکھ رہا تھا بلکہ تاج تک اس کے لیے بن گیا تھا۔رسولؐ کے مدینہ میں آنے کے بعد اس نے ہوا کے رخ کو دیکھ کر اسلام قبول تو کر لیا مگر دل سے اسلام اور مسلمانوں کا بدترین دشمن رہا۔اسے اس واقعہ کی خبر ہوئی تو وہ آگ بگولا ہو گیا اور اس نے انصار کو مخاطب کر کے بڑی مفسدانہ تقریر کر ڈالی، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''تم نے ان پردیسیوں کو اپنے سر پر مسلط کیا، یہ تمہارے کیے کی سزا ہے۔اب بھی تم اپنا ہاتھ روک لو، اور ان کی مالی مدد نہ کرو تو یہ فاقے مرنے لگیں اور ادھر ادھر منتشر ہو جائیں اور پھر کہا کہ بس اب کی مدینے پہنچیں، تو پھر دیکھنا جو عزت والا ہے (یعنی وہ خود) وہ اس کو جو ذلت والا ہے (یعنی معاذ اللہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شہر سے نکال دے گا۔یہ الفاظ زید بن ارقم نے سنے جو اس وقت کم عمر تھے یعنی تازہ تازہ بلوغ کی سرحد تک پہنچے تھے، تو ان کی حمیت ایمانی کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوئے تو انہوں نے اسی وقت اس کے خلاف برہمی کا اظہار کیا اور پھر آ کر اپنے ایک بزرگ کے ذریعہ سے ان الفاظ کی اطلاع رسولؐ تک پہنچائی۔حضرتؐ نے بلا واسطہ بواسطہ عبداللہ بن ابی سے ان باتوں کے متعلق دریافت کیا تو وہ قسمیں کھانے لگا کہ یہ سب بالکل غلط ہے۔حضرتؐ نے بظاہر انتظار وحی میں خاموشی اختیار فرمائی۔لوگوں نے ایسا محسوس کیا ہو گا کہ آپ نے اس کے انکار کو تسلیم کر لیا اور زید کی بات کو غلط سمجھا اس پر عبداللہ کے ہوا خواہ اور مؤید کچھ دوسرے سادہ لوح مسلمان بھی زید کو سخت سست کہنے لگے کہ تم نے ایسی غلطی کیوں کہی؟ اس بیچارے کو اس سے بڑا سخت صدمہ ہوا، یہاں تک کہ گھر سے نکلنا موقوف کر دیا۔اس پر یہ سورہ نازل ہوا اور مذکورہ آیتوں میں ان باتوں کو جو عبداللہ بن ابی کی زبانی زید نے آ کر کہی تھی، انہی لفظوں میں دھرایا گیا۔پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید کو بلا کر وہ آیتیں سنائیں اور فرمایا اب تو خوش ہو؟ تمہاری پہنچائی ہوئی خبر کی خداوند عالم نے من وعن تصدیق کی ہے۔

گزشتہ آیت میں جو طلب استغفار کا ذکر تھا اسے بھی عبداللہ بن ابی سے متعلق قرار دیا گیا ہے کہ کسی نے اس سے کہا کہ جا کر رسول اللہؐ سے دعائے مغفرت کرا لو، اس پر اس نے سر کو انکاری طور پر گھمایا اور کہا تم لوگوں نے کہا کہ اسلام لے آؤ۔میں لے آیا، پھر کہا زکوۃ دیا کرو میں زکوۃ بھی دینے لگا۔اب کیا میں جا کر ان کے قدموں میں سجدے میں گر جاؤں؟

عبداللہ بن ابی کی سابق مفسدانہ تقریر میں جو دو جملے تھے، ان دونوں کو نقل کرتے ہوئے ہر جملے کے بعد اس کو جواب دیا ہے۔پہلا جملہ کہ انھیں تم نہ دو تو یہ فاقوں مرنے لگیں، اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی انسان ذاتاً مال ودولت پر اختیار نہیں رکھتا۔ذرائع رزق اللہ کے ہاتھ

میں ہے، لہٰذا کسی کو یہ گھمنڈ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ہاتھ روک لیں تو لازماً یہ فاقوں مرنے لگے گا۔ اور دوسری بات کو جو صاحب عزت ہے وہ دوسرے کو جس کے حصے میں ذلت ہے نکال باہر کریگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عزت اور ذلت دنیا کی نگاہ والی کوئی چیز نہیں ہے کافر و منافق کتنا ہی دولت مند ہو، کتنا ہی بخیال خود صاحب اثر ہو، اصل عزت کا مالک نہیں ہے، حقیقی عزت مخصوص ہے اللہ سے اور اس کے پیغمبرؐ سے اور ایمان والوں سے، تو جو ایمان سے محروم ہیں، وہ عزت سے بھی محروم ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۰ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۱

''اے ایمان دارو تمہارے مال اور تمہاری اولاد تم کو خدا کی یاد سے غافل نہ کرے اور جو ایسا کرے گا تو وہی لوگ گھاٹے میں رہیں گے (بحوالہ ترجمہ علامہ سید فرمان علی صاحب اعلی اللہ مقامہ) اور خیرات کرو اس سے جو ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے تو وہ کہے کہ اے میرے پروردگار! کیوں نہ تو نے مجھے مہلت دی اور تھوڑی سی مدت تک کہ میں خیرات کرتا اور نیکوکاروں میں سے ہوتا۔ اور ہرگز اللہ مہلت نہیں دے گا کسی کو جب اس کی عمر پوری ہو جائے اور اللہ جانتا ہے اسے جو وہ کرتے ہیں''۔

اب یہ جیسے ان کی باتوں سے قطع نظر کر کے سچے مسلمانوں سے خطاب ہے [1] کہ ان کو جو یہ کہتے ہیں، وہ کہنے دو، تم سنو کہ جتنی مدت حیات ہے اسے غنیمت سمجھو اور جتنا اللہ نے دیا ہے اس میں سے راہ خدا میں صرف کرو، ورنہ جب وقت گزر جائیگا تو افسوس ہوگا کہ ارے عمر جلد ہی ختم ہوگئی اور پھر اس افسوس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

---

[1] ۔ انفقوا ایها المؤمنون بالله ورسوله (ابن جریر)

سُوْرَةُ التَّغَابُنِ

مدنیّہ.....۱۸.....آیات

قیامت کے لیے اس سورے میں یوم التغابن کی لفظ صرف کی گئی ہے۔اسی لفظ پر اس سورے کو نام ہوا۔

سورۂ تغابن کے خاص خاص مضامین:

۱.....منزل تخلیق میں سب کی یکسانی، پھر مومن اور کافر کا فرق۔

۲.....تمام کائنات کا صحیح طور پر بامقصد پیدا ہونا اور اُس کی طرف سے جسمانی صورتوں کا مختلف ہونا۔

۳.....علم الٰہی کا حاوی ہونا۔

۴.....پہلے والوں کے انجام کی یاد دہانی۔

۵.....اللہ اور رسول اور اس نور پر جو ان کے ساتھ ہے، ایمان لانے کی دعوت۔

۶.....قیامت کے دن سب اکٹھا ہوں گے دنیا والی اپنی زندگی کے لحاظ سے کوئی فائدہ اٹھائے گا اور کوئی نقصان۔اسی کو تغابن کی لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

۷.....بعض بیویاں اور اولاد انسان کے دشمن ہوتے ہیں۔اس معنی سے کہ غلط راستے کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ان سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

۸.....اموال اور اولاد کا فتنہ یعنی ذریعہ آزمائش ہونا۔

۹.....اللہ کو قرض حسن دینے کی دعوت جو پہلے کئی جگہ آ چکی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ①

''تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، اسی کے لیے پورا پورا اقتدار سلطنت ہے اور اسی کے لیے ہر تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''

ابتدائی تمہیدی جملہ تو وہی ہے جو ادھر کے تقریباً ہر سورے میں ہے۔ اس کے بعد دنیا کے مدعیانِ سلطنت کے مقابلے میں اس کو واحد اقتدارِ سلطنت کا مالک ثابت کیا گیا ہے مگر جو ایسے اقتدار کا مالک ہوگا وہ اندھا دھند کام کریگا۔ اسے اس سے بحث نہیں ہوگی کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ کام اچھا ہے یا برا لیکن خدا جو کرتا ہے، اچھا ہی ہوتا ہے۔ [1]

اس لیے یہ کہہ کر کہ اسی کے لیے تعریف ہے، اس کے کاموں کا حسن ثابت کیا گیا ہے۔ یہ وہی اصول عدالت ہے جسے امامیہ توحید کے ساتھ ماننا ضروری سمجھتے ہیں جو منکر عدل ہیں، وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسے عمل کا پابند بنانا اس کی شان کے خلاف ہے اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ پابندی وہ شان کے خلاف ہے جو کسی بالادست طاقت کی طرف سے ہو لیکن قدرت کاملہ کے باوجود اپنے اختیار سے کمال حکمت کی بنا پر کوئی غلط کام نہ کرنا عین کمال ذات ہے چنانچہ اس آیت میں بھی لہ الحمد کہہ کے اس پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے کہ یہ اس کی قدرت کے نقص کا نتیجہ نہیں ہے قدرت تو اس کی ہر چیز پر ہے لیکن وہ کمال قدرت کے باوجود کرتا وہی ہے جو اس کی حکمت و عدالت کے شایانِ شان ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝۲

''وہ وہ ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا۔ اب تم میں سے کوئی کافر ہے اور تم میں سے کوئی مومن ہے اور اللہ جو تم کرتے ہو، اس کا دیکھنے والا ہے''۔

منزلِ تخلیق میں سب کی یکسانی

تخلیق کے ذکر کے بعد یہ جو کہا گیا کہ تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن۔ اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ اسی بات کو کہ اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے، کوئی نہیں مانتا اور کوئی مانتا ہے تو یہ کفر اور ایمان اسی بات سے متعلق ہے جس کا ذکر ہوا۔ [2]

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ خالق نے تو سب کو پیدا کیا، منزلِ تخلیق میں سب یکساں تھے۔ اس کے بعد اپنے سوءِ اختیار اور حسنِ اختیار سے یہ تفرقہ ہو گیا کہ کوئی مومن ہے اور کوئی کافر جیسے سورہ دہر میں ارشاد ہوا:۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا (دھر-۲،۳)

ہم نے انسان کو پیدا کیا ملے جلے ہوئے نطفے سے محل آزمائش میں لانے کے لیے تو اسے کان آنکھ کی طاقتیں دیں ہم نے اسے ایک خاص راستے کی طرف ہدایت کی، اب شکر گزار ہے یا ناشکرا۔

تخلیق یکساں، مقصدِ تخلیق ابتلا و امتحان یکساں، سمیع و بصیر قرار دیا یعنی صلاحیتیں قبول ہدایت کی سب میں رکھیں پھر ہدایت بھی سب کو ایک ہی راستے کی ہوئی، اب اس کے بعد جہاں سے اپنے اختیار کی منزل آئی، کوئی شکر گزار یعنی مومن ہے اور کوئی ناشکرا کافر۔ اور اب اختیار کا قدم درمیان میں آنے کے بعد جزا و سزا کی تفریق ہے جس پر آخری جملے سے متنبہ کیا گیا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَیْهِ

---

[1] ۔لان جمیع رحمت فی الخلد من الخلق لا یعرفون الخیر لا منه (مجمع البیان)

[2] ۔فمنکم کافر بخالقه وومنکم مومن (ابن جریر)

الْمَصِيْرُ ۝٣ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝٤

''اس نے آسمانوں اور زمین کو حقانیت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور تمہاری صورت گری کی تو بہت اچھی صورتیں بنائیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو ہے وہ اسے جانتا ہے اور جانتا ہے اسے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو اور اللہ سینوں کے اندر کی چیزوں کا جاننے والا ہے''

''حقانیت کے ساتھ'' یعنی نہ تو بے فائدہ اور نہ غلط طور پر۔ (بالعدل والانصاف .....ابن جریر) یہ دونوں باتیں مقتضائے حکمت کے خلاف ہیں جیسے ایک جگہ منفی طور پر کہا گیا ہے:۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا (ص-۲۷)

ہم نے آسمان اور زمین کو باطل طور پر پیدا نہیں کیا۔ جس کی ''وہاں باطل کہہ کر نفی کی گئی ہے، اسی کے مقابل جو پہلو ہے اس کا یہاں بالحق کہہ کر اثبات کیا گیا ہے۔

خالق عالم کا تصور پیدا کر کے انجام کو یاد دلایا گیا ہے کہ اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے اور پھر اس کے علم کی وسعت کو دکھا کر ہر ایک کو اس کے پوشیدہ اعمال کے محاسبے کا اندیشہ پیدا کیا گیا ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۫ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝٥ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۫ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝٦

''کیا تمہیں خبر نہیں پہنچی ان لوگوں کی جنہوں نے کفر اختیار کیا اس سے پہلے تو انہوں نے چکھا اپنے معاملے کا خمیازہ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ ان کے پیغمبر ان کے پاس آتے تھے کھلی ہوئی دلیلیں لے کر تو انہوں نے کہا کیا کچھ آدمی ایسے ہیں جو ہماری ہدایت کریں تو انہوں نے کفر اختیار، کیا اور روگردانی کی اور اللہ کو کوئی ضرورت نہ تھی اور اللہ بے نیاز ہے، قابل تعریف''۔

ہمیشہ کفار و مشرکین انبیاؤ مرسلین کے خلاف بات پیش کرتے رہے کہ یہ تو انسان ہیں، خدا بھلا کسی انسان کو اپنی طرف سے رہنما کیوں مقرر کرنے لگا؟! وہی بات ان سے پہلے والوں کی زبانی یہاں یاد دلائی گئی ہے کہ کیا کچھ بشر ایسے ہو سکتے ہیں جو ہماری ہدایت کریں؟

بعض جگہ تو اس کے جواب اطمینان بخش پیرائے میں دیا گیا ہے کہ واقعی شبہہ ذہن میں ہے تو دور ہو جائے لیکن یہاں اس کا جواب ایسا دیا گیا ہے کہ جیسے یہ کہنا صرف ایک بہانہ ہے کفر اختیار کریں لہٰذا یہاں یوں کہا جا رہا ہے کہ ان کا ہی کرتے رہیں گے۔ اچھا تو پھر یہ شوق سے کفر اختیار کریں۔ اللہ کو ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے وہ بے نیاز ہے۔ اسے تو جو صحیح طریقہ کار ہے، وہی اختیار کرنا ہے۔

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝٧

''وہ جو کافر ہیں، ان کا خیال ہے کہ ہرگز دوبارہ زندہ نہیں ہونگے، کہیے کہ کیوں نہیں قسم میرے پروردگار کی، تم لوگ دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے، پھر تمہیں بتایا جائے گا جو تم نے کیا ہوگا، اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے''۔

قبل سے تمہید اسی کی تھی جو بعد موت کے منکر ہیں، انہیں اس کا احساس پیدا کیا جائے یہاں چونکہ ان کی کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی ہے تا کہ اس کا جواب دیا جائے۔ نہ کوئی ان کا اعتراض ہے جسے رد کیا جائے بلکہ ان کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوگا جس کی بنیاد لاعلمی پر ہے لہٰذا اس کے مقابلے میں جیسے خبر دینے والے کی سچائی کے پس منظر میں جس کا انہیں اس کے پہلے اقرار رہا ہے پورے طور پر حتم و جزم کی صورت میں قسم اور لام ونون تاکید کے ساتھ اطلاع دینے پر کہ ایسا ضرور ہوگا اکتفاء کی گئی۔ آخر میں ذرا ذہن کو قدرت الٰہی کی طرف موڑا ہے کہ یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝٨

''تو ایمان لاؤ اللہ اور اس کے پیغمبر پر اور اس نور پر جو ہم نے اتارا ہے اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو باخبر ہے''۔

''اس نور'' سے مراد عام طور پر قرآن لیا گیا ہے [1] مگر ایسا یقینی طور پر متعین نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد تمام وکمال وہ دین وشریعت ہو جو آپ کے ذریعہ سے منجانب اللہ آئی ہو۔ خواہ وہ بصورت قرآن ظاہر ہو یا دوسری طرح آپ کے اقوال واعمال سے۔ ہاں ایک پہلو یہ ہے کہ چونکہ سیاق کلام یقیناً یہ ہے کہ اس صیغہ امر (آمنو) کا روئے خطاب مشرکین ہی کی طرف ہے جو خدا اور رسول سب ہی کے منکر تھے، ان کے مقابلہ میں جس چیز کو بطور تحدی پیش کیا گیا ہے اور جسے بطور معجزہ رسول سامنے لایا گیا ہے، وہ قرآن ہے لہٰذا ان کو دعوت رسول کی رسالت کے ساتھ ساتھ قرآن ہی پر ایمان کی دعوت دیے جانے کا محل تھا کہ جب رسول پر ایمان لے آئیں گے اور قرآن کو من جانب اللہ مان لیں گے تو دوسری چیزیں سامنے آئیں گے جو آپ کی زبان مبارک یا سیرت مبارکہ سے اُن کے سامنے پیش ہوں گی۔ لہٰذا یہ سمجھنا درست معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نور سے مراد قرآن مجید ہی ہے جس پر ایمان کی انہیں دعوت دی جارہی ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝٩ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝١٠

''جس دن تمہیں اکٹھا کیا جائے گا اس دن کے لیے جو اکٹھا کرنے ہی کے لیے ہے، وہ دن ہوگا ایک دوسرے

---

[1] ۔ھٰذا ھو القرآن (ابن جریر)

کے مقابلے میں نقصان اٹھانے کا اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک اعمال کرے، وہ اس کی معمولی غلطیوں کو نظر انداز کرے گا اور اسے داخل کرے گا ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں بہہ رہی ہیں ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا، وہ آتش دوزخ والے ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ بہت برا انجام ہے"۔

"غبن" تجارت میں یہ ہوتا ہے کہ ایک معاملہ میں بہت زیادہ فائدہ اٹھالے گا تو یہ غبن کہلاتا ہے اور دوسرے نے اسی معاملہ میں نقصان اٹھایا تو مغبون کہلاتا ہے۔ اسی غبن کو جب باب تفاعل میں لے جائے تو باہم ایک دوسرے کے مقابلے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا چاہتے ہے۔ یہاں کارگاہ عمل میں اگرچہ ایسا نہیں ہے کہ نیک اعمال لوگوں کا مقصد دوسروں کو نقصان پہنچانا ہو مگر چونکہ نتیجہ ہوا یہی کہ اہل بہشت کامیاب ہوئے اور اہل دوزخ خود اپنے سوء اختیار سے نتیجہ نا کامیاب ہوئے لہٰذا قیامت کے دن کو اس آیت میں "یوم التغابن" یعنی ایک دوسرے کو معاملت میں نقصان پہنچانے کے دن سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بعض لوگوں نے فائدہ اٹھانے کے پہلو کو نظر انداز کر کے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانا خاص اہل دوزخ ہی سے متعلق کیا ہے۔ اس طرح کہ وہ سرغنہ لوگ جنہوں نے دوسروں کو گمراہ کیا ان کے غبن یعنی نقصان کے درپے ہوئے کہ انہیں غلط راستے پر ڈال کر مستحق دوزخ بنایا اور انہوں نے کثرت کے ساتھ ان کی پیروی کر کے ان کے استحقاق سزا میں اضافہ کیا کہ ان کے گناہوں کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوئی۔ مگر خود الفاظ آیت میں چونکہ اس کے بعد بلا فاصلہ اہل بہشت کا ذکر ہے اور ان کے انجام بخیر ہونے کا ہے۔ اور بعد میں اہل دوزخ کا ذکر ہے اور ان کے برے انجام کا لہٰذا یہ دوسرا مفہوم اس محل پر بعید معلوم ہوتا ہے پھر جب کہ کلام عرب میں اس لفظ یعنی باب تفاعل کے استعمال میں دو طرفہ کا پہلو نظر انداز بھی کر جاتا ہے جس کی مثال تبارک وتعالیٰ کے الفاظ ہیں اور قدیم اہل تفسیر کی تشریح یہی ہے کہ اہل جنت کو نتیجہ فائدہ حاصل ہوا اور اس لیے غابن یعنی غبن پہنچانے والے ہیں اور اہل نار کو نقصان پہنچا اس لیے وہ مغبون یعنی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ يَهۡدِ قَلۡبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۱۱﴾

"کوئی مصیبت نہیں آتی مگر اللہ کی اجازت سے اور اللہ پر جو ایمان رکھتا ہو، وہ اس کے دل کو صحیح راستہ دکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے"۔

اجازت کے یہ معنی ہیں کہ اللہ اپنی قوت قاہرہ کو صرف کر کے رکاوٹ پیدا کر دے تو سبب جو باعث مصیبت ہے تاثیر نہیں کر سکتا اب یہ رکاوٹ پیدا نہ کرنا جسے اجازت سے تعبیر کیا ہے کبھی بطور امتحان ہوتا ہے، کبھی بطور سزا ہوتا ہے اور کبھی کچھ اہم مفادات کے لیے۔

بہر حال مقتضائے ایمان یہ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ اللہ کی طرف سے جو صورت اختیار کی گئی ہے وہ درست ہے یہی وہ صبر ہے جسے کہا گیا کہ ایمان رکھنے والوں کے دل کو اللہ صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ مگر یہ فیصلہ کہ اللہ کی طرف سے اس مصیبت کو آنا تھا پورے طور پر اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسانی قدرت و اختیار میں بظاہر اسباب جتنے عملی ذرائع ہیں، وہ اختیار کیے جا کے ہوں۔ اس آخر میں صبر کے حکم کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ شروع ہی میں انسان ہاتھ پیر رکھے بیٹھا رہے کہ جو منظور قدرت ہے وہ ہوگا۔ جد جہد سے کیا فائدہ جب کہ بعض قدرت

کے فیصلے خود انسان کے قوت عمل کے صرف کرنے سے مشروط ہوتے ہیں اور انسان کے قوت عملی کو تاہی اللہ ہی کے احکام کی خلاف ورزی ہے جو کہ سعی وعمل سے متعلق ہیں اور اسی ظلم وعدوان کے رفع کرنے کے لیے جہاد نظام شریعت کا مستقل عنوان ہے۔ یہ آیت بعد والے حکم کی تمہید ہو تو مطلب یہ ہے کہ مصیبتوں کے اندیشے کو قبول ایمان اور اطاعت خدا اور رسول میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۲﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو پیغمبر کی۔ اب اگر تم نے روگردانی کی تو ہمارے پیغمبر کے ذمے تو بس صاف صاف تبلیغ کر دینا ہے۔ اللہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور اللہ ہی پر بس ایمان والوں کو بھروسا کرنا چاہیے''

قرآن مجید میں بکثرت اعلان کیا گیا ہے کہ رسول کا کام حجت الٰہی تمام ہونے کی حد تک واضح اور صاف الفاظ میں تبلیغ کرنا ہے۔ اب اگر لوگ ایمان اختیار نہیں کرتے تو اس سے رسول پر کوئی الزام نہیں آ سکتا۔ مورد الزام وہ ہوں گے جو باوجود صاف طور پر حقیقتوں کے واضح ہونے کے پھر بھی انہیں نہیں مانتے اور رسول کی تبلیغ سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

آخر کا جملہ اس لحاظ سے کہ اس راہ میں جو مشکلات درپیش ہوں جن مصائب کا سامنا ہو، ان کے مقابلے میں اپنی امکانی جدوجہد کے ساتھ اہل ایمان کو اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اگر اس کی مصلحت ہوگی تو وہ ان مصائب کو دفع فرمائے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾

''اے ایمان لانے والو! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولادوں میں ایسے ہیں جو تمہارے دشمن ہیں تو ان سے ڈرتے رہو اور اگر معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو یقیناً اللہ بخشنے والا بڑا مہربان''۔

اہل وعیال جو صحیح راستے پر جانے سے روکیں درحقیقت دشمن ہیں

اس کی شان نزول جیسا کہ ابن جریر طبری نے کئی روایتوں سے اسے درج کیا ہے، کہ کچھ اشخاص جو مکّہ میں تھے کہ رسول خداؐ کی خدمت میں جائیں اور ان کے بیوی اور بچے مانع ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ وہاں جاؤ گے تو طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ انہی سے ہوشیار کیا جا رہا ہے کہ اہل عیال جو صحیح راستے پر جانے سے روکتے ہیں اور درحقیقت دوست نہیں ہیں، دشمن ہیں۔ ان سے ہوشیار رہنا چاہیے یعنی ان کے کہنے میں نہیں آنا چاہیے۔ بعد میں ان لوگوں نے چاہا کہ انہیں اس کی سزا دیں تو آخر کار جز آیا کہ نہیں خدا اسے پسند نہیں کرتا کہ تم انہیں سزا دو۔ انہیں معاف کر دو اور درگزر کرو تو خدا ہمارے گناہوں کو بخشے گا اور تم سے درگزر کریگا کہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس طرح پر کار خیر میں بیوی اور بچے سدراہ ہوں تو وہ اس حکم میں داخل ہیں یعنی وہ بجائے دوست ہونے کے دشمن جان ہوتے ہیں۔ ہاں مناسب حد تک احکام شرعیہ میں خود خالق نے بیویوں اور بچوں کا خیال کیا ہے جیسے کہ حج کی شرائط استطاعت میں یہ رکھ دیا کہ اتنی مدت تک کے لیے اہل وعیال کے

آزوقے کا سامان کرنا ضروری ہے بغیر اس کے حج واجب نہیں ہوگا لیکن اس کے علاوہ صرف ان کی محبت کا خیال کہ انہیں چھوڑ کر کیوں جائیں؟ یہ کوئی عذرِ شرعی نہیں ہے اور یہی منزل ہے کہ جہاں دیکھنا ہے کہ آدمی اہل عیال سے محبت زیادہ رکھتا ہے یا خداوندی احکام کی اطاعت کو مقدم سمجھتا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۶﴾

''تمہارے مال اور تمہاری اولاد ذریعہ آزمائش ہیں اور اللہ کے یہاں بڑا اجر وثواب ہے تو اللہ سے ڈرو جہاں تک تم سے ہو سکے اور سنو اور اطاعت کرو اور خیرات کرو تمہارے لیے بہتر ہے اور جو اپنے نفس بخل سے بچا رہے تو یہی لوگ دنیا اور آخرت میں بہتری حاصل کرنے والے ہیں''۔

اموال اور اولاد، ذریعہ آزمائش

ہماری اردو زبان میں ''فتنہ اور بلا'' دونوں لفظوں میں شدید مذمت مضمر ہے مگر عربی زبان میں دونوں کے مفہوم میں صرف امتحان وآمائش ہے۔ اب انسان اس آزمائش میں پورا اترا تو یہی سبب سعادت ہو سکتے ہیں اور اگر پورا نہ اترا تو یہ چیزیں انجام میں باعث ہلاکت ہو سکتی ہیں اور وہ اجر عظیم جو اللہ کے یہاں ہے، وہ انہی چیزوں کے صحیح مصرف میں صرف کرنے سے وابستہ ہے اور یہ صحیح مصرف میں صرف کرنا وہی اللہ سے ڈرنا یعنی تقویٰ ہے جسے بعد میں کہا گیا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ چونکہ ایک جگہ قرآن میں ہے:

اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (آل عمران-۱۰۲) اللہ سے ڈرو جتنا ڈرنے کا حق ہے۔

اس سے انسانوں کو پریشانی پیدا ہو سکتی تھی کہ بھلا ہم ''پورا حق'' اس سے ڈرنے کا کہاں ادا کر سکتے ہیں تو اس آیت کے ذریعے سے اس پہلی آیت کو منسوخ کر دیا مگر اس کی تعبیر منسوخ کرنے سے بظاہر درست نہیں ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت سے اسکی تشریح ہو گئی کیوں کہ پہلے ہی جو حکم ہوا تھا وہ قدرت وطاقت کے باہر تھوڑی تھا۔ اس میں بھی یہ شرط مضمر تھی کہ جہاں تک ہو سکے۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

''اگر تم اللہ کو قرض حسنہ دو تو وہ تمہارے لیے اسے بہت بڑھا دے گا اور تمہارے گناہوں کو بخشے گا اور اللہ بڑا قدردان حلم وتحمل سے کام لینے والا ہے۔ وہ ان دیکھی چیزوں کا جاننے والا ہے غالب آنے والا، صحیح کام کرنے والا ہے''۔

اللہ کو قرض دینے کا ذکر قرآن مجید میں کئی دفعہ آچکا ہے اور ہر جگہ یہ تشریح کی گئی ہے کہ اس سے کسی کو قرض دینا ہی مراد نہیں ہے بلکہ کسی بھی کار خیر میں رضائے الٰہی کے لیے صرف کرنا اللہ کو قرض دینا ہے جس کے نتیجہ میں اس نے اپنی طرف سے بڑھا کر دینے کا وعدہ کیا ہے جس میں ایک جگہ سات سو گنے کا اعلان تک ہے اور پھر کہہ دیا ہے کہ جس کے لیے چاہتا ہے اور زیادہ عطا کرتا ہے۔

سُوْرَةُ الطَّلَاقِ

مدنیّہ.....۱۲.....آیات

اس سورے میں شروع سے احکام طلاق کا بیان ہے، اس لیے اس کا یہ نام ہوا، اب کچھ امور اس ذیل میں اور کچھ اس کے ساتھ ساتھ بطور عام نصائح ومواعظ اور تبشیر وانذار کے بیان ہوئے ہیں۔

سورۂ طلاق کے خاص خاص مضامین:

۱.....طلاق اس حساب سے دیا جائے کہ اس سے ایام عدہ کا حساب ہو سکے۔

۲.....زمانہ عدہ میں ان عورتوں کو شوہروں کے گھر میں رہنے کا حق سوا استثنائی صورتوں کے۔

۳.....دو عادلوں کی گواہی کی ضرورت۔

۴.....طلاق میں تقوٰی کی ترغیب۔

۵.....اللہ پر توکل کی ہدایت۔

۶.....یائسہ وغیرہ کا عدہ۔

۷.....حاملہ کا عدہ۔

۸.....بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ طلب کرے تو وہ معاوضہ ادا کرنا چاہیے۔ یا پھر کسی اور سے پلوانا چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ①

''اے پیغمبر! جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو زمانہ عدہ کے لحاظ سے اور پورے عدے کے دنوں کا حساب رکھو اور

اللہ سے ڈرو جو تمہارا پروردگار ہے، انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں سوا اس کے کہ کھلے ہوئے شرمناک جرم کا ارتکاب کریں اور یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور جس نے اللہ کی مقرر حدوں سے ایک قدم آگے بڑھایا، اس نے اپنے اوپر ظلم کیا، تم نہیں جانتے، شاید اللہ اس کے بعد کوئی تازہ بات پیدا کرے''۔

ابتدا میں پکار کے کہا گیا ہے رسول ؐ سے مگر جو احکام دیے ان میں جمع مذکر حاضر کے صیغے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ احکام کا تعلق تمام افراد امت سے ہے۔ خاص پیغمبر خدا سے تعلق نہیں ہے۔ ہاں قدیم مفسر قتادۃ کی روایت میں جسے طبری نے درج کیا ہے کہ خود حضرت ؐ نے حفصہ کو طلاق دیا تھا، اس سلسلہ میں یہ سورہ نازل ہوا ہے لیکن مورد نزول کوئی ایک ہونے سے احکام میں خصوصیت پیدا نہیں ہوتی جب تک صراحۃ خصوصیت ثابت نہ ہو۔ احکام میں عمومیت ہی ہوتی ہے۔

''جب طلاق دو'' یعنی طلاق دینا چاہتے ہو [1] جیسے حکم وضو میں کہا گیا ہے:۔

اذا قمتم الی الصلوٰۃ :۔ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو'' اس کے یہ معنی نہیں کہ جب نماز کے لیے مصلے پر کھڑے ہو جاؤ، تب جا کر وضو کرو بلکہ معنی یہی ہیں جب نماز کے لیے کھڑا ہونا چاہتے ہو یعنی نماز ادا کرنا چاہتے ہو تو وضو ضرور کرو اور یہ احکام ان عورتوں سے متعلق ہیں جن سے خاص جنسی تعلق قائم ہو چکا ہو اس لیے کہ اگر طلاق قبل دخول ہو تو اس میں جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ تصریح موجود ہے، عدہ ہے ہی نہیں۔

''طلاق درزمانۂ عدّہ کے لحاظ سے'' یعنی عورت کے ماہواری ایام کے دنوں میں جو نجاست ہوتی ہے، اس دوران میں طلاق نہ ہونا چاہیے۔ اس حالت سے بری ہونے کی حالت میں جسے ''طہر'' کہتے ہیں طلاق ہونا چاہیے اور وہ طہر ایسا ہو جس میں شوہر نے مجامعت نہ کی ہو، تاکہ اسی کے لحاظ سے اس کے عدے کا شمار ہو سکے۔ ''اور عدہ کا پورا حساب محفوظ رکھو'' وہ عدے کی مقدار جو دوسری جگہ قرآن مجید نے بتائی ہے، ان عورتوں کے لیے جنہیں ایام ہوتے ہوں۔ ثلاثۃ قروءٍ یعنی اس کے بعد تین دفعہ ایام سے پاکیزگی کے دنوں کا پورے طور پر حساب محفوظ رکھو۔

جب یہ زمانہ پورا ہو جائے تو عدہ ختم ہو جائے گا۔ اب اگر مرد نے ان دنوں میں رجوع نہیں کی ہے یعنی اپنے قول یا عمل سے اس کا ثبوت نہیں دیا کہ اس نے دوبارہ تعلقات ازدواج قائم کر لیے ہیں، تو اب وہ اس شوہر کی زوجیت کے حلقے سے بالکل نکل جائے گی اور اسے عقد ثانی کرنے کا حق ہوگا۔

اللہ سے ڈرنے جو کا حکم بلا فاصلہ متصل ہے اس ممانعت سے کہ انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اللہ سے ڈرنے کا حکم اس ممانعت پر زور دینے کے لیے ہے اور اس پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے گھروں کی نسبت ان کی طرف دی گئی ہے کہ ابھی تک تو جو شوہر کا گھر تھا، وہ ان بیویوں کا تھا کہ یہ میں رہنے کی حق دار تھیں تو اب بھی جب کہ عدے میں ہونے کی وجہ سے ابھی بالکل رشتہ قطع نہیں ہوا ہے، سمجھو کہ وہ اپنے گھروں میں ہیں تو انہیں وہاں سے نکالنا نہیں چاہیے۔

''سوا اس کے کہ کھلے ہوئے شرمناک گناہ کی مرتکب ہوں''۔ اس کے لیے روایات میں تین چیزیں آئی ہیں۔ زنا کاری اور فحش کلامی

---

[1] ۔ المعنی اذا اردتم طلاق النسآء (مجمع البیان)

اور گھر والوں کو اذیت پہنچانا۔

بعد میں جو ہے کہ ''تمہیں نہیں خبر اللہ اس کے بعد کوئی صورت پیدا کرے''۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کے دل ایک دوسرے کی طرف راغب ہوجائیں اور اس لیے ان کے باہمی تعلقات مستقل طور پر خوشگوار ہوجائیں یہ اصل عدہ کے اندر رجوع کے حق کا مقصد بھی ہوسکتا ہے۔ اور اس زمانہ میں انکے گھر کے اندر رہنے کے حکم کی بھی وجہ ہوسکتی ہے۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَىْءٍ قَدْرًا ﴿۳﴾

''تو جب وہ اپنی مقررہ (عدہ والی) مدت تک پہونچ رہی ہوں تو اب یا تو انہیں رکھو اچھے طریقہ پر یا جدا ہی کردو انہیں اچھے طریقہ پر اور گواہ بناؤ دو عادلوں کو اپنے میں سے اور گواہی کو صحیح طریقے پر انجام دو خدا کے لیے۔ اس سے نصیحت حاصل ہوتی ہے اسے جو ایمان رکھتا ہو اللہ اور آخرت کے دن پر اور جو اللہ سے ڈرتے تو وہ اس کے لیے نکاسی کا راستہ پیدا کرتا ہے اور اسے روزی دیتا ہے اس طرح جو اس کے سان گمان میں بھی نہیں ہے اور جو اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اس کے لیے کافی ہے، یقیناً اللہ اپنے کام کا پورا کرنے والا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تعداد مقرر کی ہے''۔

طلاق کے موقع پر دو عادلوں کی بحیثیت گواہ موجودگی ضروری

بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ کے ایک معنی تو یہ ہوئے کہ وہ اپنی مقرر حد تک پہنچ جائیں لیکن اگر وہ مدت پوری ختم ہوجائے تو اس کے بعد رجوع کا حق ہی نہیں رہتا، اس لیے ہم نے یہ ترجمہ کیا کہ وہ اس مدت تک پہونچ رہی ہیں یعنی اس مدت کا اختتام قریب ہے تو ادھر یا ادھر فیصلہ کرلے کہ اب اسے زوجیت برقرار رکھنا ہے تو رجوع کرلے مگر پھر اچھے عنوان سے جدائی اختیار کرلے اور جدائی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو دن یا جو ساعتیں عدہ گزرنے کے باقی ہیں ان میں رجوع نہ کرے اور مدت گزر جانے دیں تو پھر قطعی طور پر جدائی ہوجائے گی'' اور دو (۲) عادلوں کو گواہ بنالو'' یعنی طلاق کے موقع پر دو عادلوں کی بحیثیت گواہ موجودگی ضروری ہے اور ان گواہوں کو ہدایت ہے کہ جب گواہی طلب کی جائے تو وہ صحیح طور پر گواہی دیں۔ اس طرح یہ اشهدوا ''گواہ بنالو'' کا حکم شروع میں جو'' فَطَلِّقُوْهُنَّ ''انہیں طلاق دو'' کی لفظ تھی، اس پر عطف کی حیثیت رکھتا ہے۔

بعد میں جو تقوٰی اور حصول رزق اور توکل وغیرہ کا ذکر ہے، وہ ہمارے خیال میں اس بنا پر کہ اگر ہر ایک تقوٰی کا پابند ہو، دوسر کے حق کی

ادئیگی میں کمی نہ کرے اور اپنے حق سے زیادہ کا مطالبہ نہ کرے تو ایسی صورتیں پیدا ہی نہ ہوں جو طلاق کی باعث ہوتی ہیں اور اللہ پر توکل ہو تو مالی پریشانی اس کی باعث نہ ہو کہ ایک دوسرے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

وَالّٰٓئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓئِيْ لَمْ يَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝۴ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ۝۵

''جو تمہاری عورتوں میں سے ایسی ہوں کہ ماہواری خون کے آنے سے ناامید ہوگئی ہوں اگر تمہیں شک ہو تو ان کا عدہ تین مہینے ہے اور ان کا بھی جن کے ماہواری خون نہیں آیا ہے۔

یائسہ وغیرہ اور حاملہ کا عدہ

اور حمل والیاں ان کے لیے مدت یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے اور جو اللہ سے ڈرے، وہ اس کے لیے اس کے معاملہ میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اللہ کا حکم اس نے تمہاری طرف اپنے علم سے اتارا ہے اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کی غلطیوں کی تلافی کرتا ہے اور اس کے اجر و ثواب کو بڑا کرتا ہے''۔

یہاں تین قسم کی عورتوں کا بیان ہے ان کا عدہ کیا ہوگا؟ پہلے سن رسیدہ عورتیں، یہاں یہ فقرہ کہ ''اگر تمہیں شک ہو'' نہ ہوتا تو صاف سمجھ میں آتا کہ یہ سن یاس جس کا ہو گیا ہو اور وہ عام عورتوں کے لیے پچاس برس اور قریشیہ کے لیے جن کی فرد کھلی خواتین سادات ہیں ''شرعاً ساٹھ (۶۰) برس مقرر ہیں۔ انکا یہ عدہ ہے مگر اس فقرے کی وجہ سے پتہ چلتا ہے کہ جو یقینی طور پر یائسہ ہوں ان کا یہ حکم نہیں ہے بلکہ یہ ان کا ہے جو اس عمر تک پہونچی ہیں مگر ماہواری کا ہونا بند ہو گیا ہے تو شک ہے کہ یہ کبرسنی کی وجہ سے پاک ہو گئی ہیں یا کسی عارضہ کی وجہ سے انہیں حیض آنا موقوف ہو گیا ہے ان کا عدہ تین (تین) مہینے ہے اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر معلوم ہو کہ ان کی عمر اس مقررہ حد سے باہر ہو گئی ہے اور اس میں شک نہیں ہے تو ان کا کیا حکم ہے؟ وہ یہاں مسکوت عنہ ہے۔ اکثر علمائے شیعہ اس کے قائل ہیں کہ ان کے لیے عدہ ہے ہی نہیں دوسرے وہ کمسن خواتین جو بلوغ شرعی کی عمر تک پہونچ چکی ہیں مگر اس کے بعد بھی ایام جاری نہیں ہوئے ہیں۔ ان کے لیے بھی اگر دخول کے بعد طلاق دیا جائے تو یہی عدہ ہے یعنی تین مہینے لیکن اگر وہ نابالغ ہیں یعنی حیض والی عمر ہوئی ہی نہیں ہے جس کی شرعامدت ۹ برس ہے تو وہاں بھی زیادہ تر ہمارے علماء اس کے قائل ہیں کہ ان کے لیے عدہ نہیں ہے۔

تیسرے حاملہ :۔ اگر حالت حیض میں طلاق دیا جائے تو عدہ اس وقت تک ہے جب تک وضع حمل ہو خواہ وہ وضع حمل جلدی ہو جائے یا کافی مدت کے بعد وضع حمل ہو۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا

عَلَيْهِنَّ ؕ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَ اْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ۝۶ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝۷

''انہیں مکان میں رکھو جیسے تم خود رہتے ہو اپنی مقدرت کے مطابق اور انہیں نقصان نہ پہنچاؤ، تاکہ ان پر تنگی کرو اور اگر حاملہ ہوں تو انہیں نان ونفقہ دو جب تک کہ ان کا وضع حمل ہو اور اگر وہ تمہارے بچے کو دودھ پلائیں تو انہیں جوان کا معاوضہ ہو وہ دو اور بھلائی کے ساتھ آپس میں طے کرلو اور اگر تم نے ایک دوسرے کو مشکل میں ڈالنا چاہا تو کوئی دوسری اسے دودھ پلائے گی اور جو مالدار ہو، وہ اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے اور جس پر روزی میں تنگی ہو، وہ پھر جتنا اللہ نے اسے دیا ہے اس میں خرچ کرے اللہ کسی پر اس کے مقدور سے زیادہ پابندی نہیں کرتا، جلد ہی اللہ دشواری کے بعد آسانی پیدا کرے گا''۔

اس کے قبل جو تھا کہ انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو، اس سے تو سمجھ میں یہی آتا تھا کہ جس مکان میں وہ تھیں اس میں ان کے قیام کو برقرار رہا چاہیے مگر اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ بالکل اسی مکان میں رکھنا ضروری نہیں ہے۔ ہاں یہ نہ ہونا چاہیے کہ خود تو عالی شان محل میں رہتا ہے اور انہیں ایک چھوٹے سے کھنڈر میں ٹھہرا دیا۔ نہیں بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق جیسی جگہ خود رہتا ہے، ویسی ہی جگہ ان کے قیام کا انتظام کرنا چاہیے۔

یہ اسی وقت ہے جب ''مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ '' کے یہ معنی لیے جائیں کہ جیسے تم خود رہتے ہو لیکن ایک دوسرے معنی یہ کہے گئے ہیں کہ جہاں تم خود رہتے ہو تو یہ پہلے ہی حکم کی دوسرے انداز میں وضاحت ہوگی۔

احکام رضاعت

رضاعت کے بارے میں ان بیویوں کے لیے جو حبالہ زوجیت میں برقرار ہیں دوسرے پارے میں کہا جا چکا ہے کہ انہیں اجرت کے مطالبہ کا حق ہے۔ چہ جائیکہ یہ جسے طلاق ہو گیا ہے اور اسے اب بچہ کے باپ کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے؟! وہ بغیر اجرت دودھ پلانے پر کیوں کر مجبور کی جا سکتی ہے؟ **واتمروا بینکم بمعروف** ''بھلائی کے ساتھ آپس میں طے کرلو یعنی یک جہتی کے ساتھ بچے کے مفاد کو بھی پیش نظر رکھتے ہوئے بغیر آپس کے جذبہ عناد سے کام لیے ہوئے اس معاملہ کو طے کر لینا چاہیے۔

بعد میں جو حسب حیثیت خرچ کا حکم ہے، وہ بھی انہی سے متعلق ہے جو بچوں کو دودھ پلائیں۔ [1]

---

[1] ۔ اوسبحانہ اھل التوسعہ ان یوسعوا علیٰ نسائھم المرضعات اولادھن علی قدر وسعتھم (مجمع البیان)

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝۸ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۝۹

''اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے سرکشی کی اپنے پروردگار کے حکم اور اس کے پیغمبرؑوں سے تو ہم نے ان کا سختی کے ساتھ حساب لیا اور انہیں عجیب غیر معمولی سزا تو انہوں نے چکھا اپنے کام کا خمیازہ اور ان کے معاملے کا انجام گھاٹا تھا''۔

اس تذکرے ماضی کا جو بار بار قرآن مجید میں کہا گیا ہے مفاد یہ ہے کہ بعد والے اس سے عبرت حاصل کریں اور خداوند عالم کے مقابلہ میں سرکشی کرنے سے پرہیز کریں،

اب ''بستی'' تو ایک قطعۂ ارض کو کہتے ہیں جو آباد ہو مگر جبکہ سورہ یوسف آیہ ۸۲ میں ہے ''وسئل القریۃ التی کنا فیھا'' اس بستی سے پوچھ لیجیے جہاں ہم تھے'' اور ظاہر ہے کہ دیوار و در سے پوچھا نہیں جائے گا، مطلب یہ ہے کہ بستی والوں سے پوچھ لیجیے۔ ویسے ہی یہاں یہ کہ بستی نے سرکشی سے کام لیا اور یہ انجام ہوا تو بستی سرکشی کیا کرے گی، یعنی اس بستی والوں نے سرکشی سے کام لیا۔

اس آیت کے اس سورے میں آنے کی بنا پر ابن جریر طبری نے خود بھی اور دوسرے لوگوں کی زبانی بھی یہ تشریح کی ہے کہ اس بستی نے طلاق کے سلسلے میں احکام الٰہی سے سرتابی کی تھی، اس لیے اس بستی پر عذاب نازل ہوا مگر ہمارے نزدیک ان تمام سوروں میں کچھ جز کم یا زیادہ اس بنیادی موضوع سے متعلق ہوتا ہے جس پر سورے کا نام ہے لیکن اس کے علاوہ بہت باتیں بطور کلیہ بمناسبت بیان ہو جاتی ہیں جن کا خصوصی تعلق اس موضوع سے نہیں ہوتا۔ بظاہر یہ تذکرہ بھی ایسا ہی ہے جس میں احکام الٰہی سے سرکشی کے عام انجام پر توجہ دلائی گئی ہے جسے احکام طلاق ہی سے متعلق ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝۱۰ۙ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۝۱۱

''اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے تو اللہ سے ڈرو اے عقل والوں جو ایمان لائے ہو! اللہ نے تمہاری طرف یاد دہانی اتاری ہے، ایک ایسا پیغمبر جو تمہارے سامنے اللہ کی کھلی ہوئی آیتوں کو پیش کرتا ہے تاکہ انہیں جو ایمان لائیں اللہ پر اور نیک اعمال کریں نکالے تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک کام کرتا رہے، وہ اسے داخل کریگا ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ

رہیں گے۔اللہ نے بہت اچھی رکھی ہے اس کے لیے روزی''۔

اس سلسلہ کے پہلے جز کو گزشتہ سے مرتبط کر کے دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ تو ان کے لیے دنیا کا عذاب تھا جو ان پر نازل ہوا اور اب آخرت کا عذاب ہے جو ان کے لیے تیار ہے[1] اس کے بعد صاحبان عقل کو پکار کر ان کا وصف قرار دینا کہ ''جو ایمان لائے ہو'' اس میں یہ پہلو مضمر ہے کہ اصل صاحبان عقل وہی ہیں جو ایمان اختیار کریں۔

یہ کہ ''تمہاری طرف یاد ہانی اتاری ہے، ایک ایسا پیغمبر'' اس میں اتارنے کی لفظ سے سمجھا گیا ہے کہ ذکر جس کا ترجمہ ہم نے ''یاد ہانی'' کیا اس سے مراد قرآن ہے مگر اتارنے کی لفظ کا کثرت استعمال کی وجہ سے قرآن کے ساتھ متعلق ہونا، اتنا واضح نہیں ہے جتنا رسولؐ کی لفظ کا پیغمبر سے متعلق ہونا جب کہ اس کے ساتھ آپ کا وصف خاص آیات الٰہی کی تلاوت کرنا بھی مذکور ہے اس لیے یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ آپ کا یاد ہانی والا کام اتنا نمایاں تھا کہ آپ کو مجسم ذکر کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور چونکہ شروع میں ذکر کی لفظ سے تعبیر کیا اس لیے ارسلنا یا بعثنا کے بجائے عموماً اس معنی کے لیے ''بھیجا ہم نے'' استعمال ہوتا ہے، یہاں انزلنا یعنی اتارا ہم نے کہا گیا۔تاریکی'' کو قرآن میں جمع کی لفظ ''ظلمات'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان سب کے مقابلے میں راہ ہدایت ایک ہوتی ہے اس لیے اس کو لفظ واحد ''نور'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔''اللہ نے اسے روزی بہت اچھی عطا کی ہے'' اس میں ایمان اور عمل صالح کو بھی روزی سمجھا جا سکتا ہے اس لیے کہ توفیق خیر اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور پھر اس کے صلے میں باغ بہشت اور وہاں کی نعمتیں، اس سے بہتر روزی اور کیا ہو سکتی ہے؟!

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ۬ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾

''وہ اللہ جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمین سے بھی انہی کی ایسی کہ ان کے درمیان حکم چلتا ہے تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ اللہ علم کے لحاظ سے ہر چیز پر حاوی ہے''۔

''انہی کی ایسی'' سے سمجھ میں یہی آتا ہے کہ تعداد میں جیسے آسمان سات ہیں ویسی ہی زمین بھی سات ہیں اور اس بھی زیادہ جو پہلو ذہن میں آتا ہے، وہ یہی کہ یہ سات طبقے تہہ در تہہ ایک دوسرے کے اوپر ہیں اور بعض نے اسے ہفت اقلیم کے تصور کے مطابق خیال کیا ہے، چونکہ قرآن مجید کا کام سائنسی معلومات کا فراہم کرنا نہ تھا بلکہ جو عام انسانوں کے ذہن میں مخلوقات ہیں، انہی کو یاد دلا کر ذہن کو ان کے خالق کی طرف موڑنا تھا۔اس لیے بعد میں امریکا کے انکشافات سے اس ہفت اقلیم میں اضافہ ہو جانے سے اُس آیت کے مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

''ان کے درمیان حکم چلتا ہے'' یعنی ارادہ الٰہی جسے ''حکم تکوینی'' کہتے ہیں مختلف قسم کا کائنات کی تخلیق یا اُن میں تغیر و تبدل کے متعلق ان آسمان اور زمین کے طبقات میں جاری رہتا ہے۔بعض لوگوں نے اس کی تشریح ''حکم تشریعی'' کے ساتھ کی ہے یعنی وہ احکام شریعت جن کی تعمیل کی ذمہ داری انسان کے ارادہ و اختیار کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے لیکن بعد میں قدرت الٰہی کا جو حوالہ دیا گیا ہے وہ اسی قسم کے احکام کے لیے موزون ہے جو ارادہ الٰہی کا فرمان ہونے کے ساتھ وابستہ ہیں۔

---

[1] ۔ھذا یدل علی ان المراد بالعذاب الاول عذاب الدنیا (مجمع البیان)

سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ

مدینہ.....۱۲.....آیات

چونکہ اس سورے کا آغاز واقعہ ''تحریم'' سے ہوا ہے، اس لیے اس سورے کا یہ نام ہوا۔

سورۂ تحریم کے خاص خاص مضامین:

۱.....رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو بیویوں کو شدید تنبیہ اور ضمناً ان کے انتہائی خطرناک ہونے کا بیان۔

۲.....اہل ایمان کی ذمہ داری کہ وہ اپنے ساتھ اپنے گھر والوں کو بھی (جہاں تک ممکن ہو) عذاب الٰہی سے بچائیں اس طرح کہ وہ معاصی الٰہیہ سے دور رہیں۔

۳.....پرخلوص توبہ کی ہدایت۔

۴.....پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل ایمان کے نور کا ذکر جو عرصہ قیامت میں پھیل رہا ہوگا جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔

۵.....کفار اور منافقین دونوں کے مقابلے میں جہاد کا حکم، اس کا بھی ذکر پہلے آچکا ہے۔

۶.....اچھے شوہروں کی بُری بیویوں کی مثال میں زوجہ نوحؑ اور زوجہ لوطؑ کو پیش کرنا جو موضوع سورہ کے لحاظ سے ازواج رسولؐ کے غرور شرف پر بڑا تازیانہ ہے۔

۷.....برے شوہر کی اچھی زوجہ فرعون کی مثال۔

۸.....ایک ایسی خاتون جس کا انتساب کسی شوہر کی طرف نہیں یعنی جناب مریمؑ جو ذاتی طور پر ایک بلند مرتبہ خاتون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے ساتھ ضمناً ان کی پاک دامنی کی تصدیق اور یہود کے گستاخانہ تصور کی رد قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر اور سورہ مریم میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ① قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ

وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ②

''اے نبی ! کیوں آپ حرام کیے لیتے ہیں اسے جو آپ کے لیے اللہ نے حلال قرار دیا ہے، آپ اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہیں اور اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان ۔ اللہ نے مقرر کر دیا ہے تم لوگوں کے لیے اپنی قسموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ اور اللہ تمہارا مالک ومختار ہے اور بڑا جاننے والا ہے، صحیح کام کرنے والا''۔

اتنا بس قرآن مجید سے مجملا پتہ چلتا ہے کہ بعض ازواج کی سخت ناراضگی سے پریشان یا کسی سازش سے مجبور ہو کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی جائز کام کو ترک کرنے کا حتمی طور پر اقرار فرمالیا تھا۔ خالق نے ان بیویوں کے موقف کو غلط قرار دیا اور رسولؐ کو ہدایت فرمائی کہ آپ اپنی پابندی ترک فرمائیں ۔ اب وہ معاملہ کیا تھا اور یہ بیویاں کون تھیں؟ اس بارے میں دو (۲) روایتیں ہیں ۔ ایک یہ کہ وہ جناب ماریہ قبطیہ کے ساتھ حضرت کا جنسی اختلاط تھا جس پر جناب حفصہ بنت عمر بہت برہم ہوئیں اور حضرتؐ کو مجبوراً قسم کھانا پڑی کہ میں اب ماریہ سے مطلب نہیں رکھوں گا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ بعض ازواج کے پاس کسی کا بطور تحفہ لایا ہوا شہد تھا اور حضرتؐ کو شہد بہت مرغوب تھا اس لیے ان بیوی کے پاس ذرا دیر تک تشریف فرما ہوتے تھے کہ وہاں آپ شہد کا شربت نوش فرماتے تھے۔ یہ بات دوسری بیویوں کو ناگوار ہوئی اور جناب عائشہ نے کچھ دوسری بیویوں کو اپنے ساتھ متفق کر کے یہ منصوبہ بنایا کہ جس کے پاس بھی رسولؐ تشریف لے گئے اس نے کہا کہ آپ کے منہ سے معافیر کی بو آتی ہے۔ یہ ایک پھول ہوتا ہے جس میں بساہند ہوتی ہے، تو جب شہد کی مکھی ان پھولوں سے شہد حاصل کرتی ہے تو اس شہد میں وہ بساہند آجاتی ہے، چونکہ حضرت کو گوارا نہ تھا کہ آپ کے جسم اطہر سے سوا خوشبو کے کوئی دوسرا اس قسم کا شائبہ بھی محسوس ہو، لہٰذا آپ نے قسم کھائی کہ اب اس شہد کا استعمال نہیں کروں گا۔

علمائے اہل سنت اس دوسری روایت کو مرجح قرار دیتے ہیں اور علامہ طبرسیؒ نے بھی پہلے اسی کو درج کیا ہے، پھر بطور نقل قول پہلی روایت کو۔ فقہی حیثیت سے عموماً یہ الفاظ کہ یہ مجھ پر حرام ہے، بے اثر ہوتے ہیں اور یہاں بعد میں یہ حکم الٰہی کہ قسم کا کفارہ دیدیجیے بتاتا ہے کہ حرام کہنے کے ساتھ حضرتؐ نے قسم کھائی تھی۔ [1] جیسا کہ جناب ماریہ سے متعلق واقعہ کی بعض روایتوں میں اس کی صراحت بھی ہے کہ حضرت نے حرام کہنے کے ساتھ واللہ کی لفظ بھی کہی تھی۔

دوسرا تصور یہ ہے کہ حرام کہنا خود ایک قسم کی قسم ہے اور اسی پر اللہ نے قسم کے کفارہ کی ادائیگی کا حکم دیا ہے خصوصیت کے ساتھ جب یہ الفاظ زوجہ سے متعلق ہوں تو بعض علمائے اہل سنت انہیں تین طلاقوں کا مرادف قرار دیتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ نیت دیکھی جائے گی۔ اگر ظہار کی نیت ہو تو ظہار سمجھا جائے گا اور اگر طلاق کی نیت ہو تو طلاق سمجھا جائے گا۔ ہمارے نزدیک طلاق وغیرہ ہر ایک کے لیے خاص الفاظ کے صیغے مقرر ہیں۔ بغیر ان صیغوں کے صرف نیت اور کچھ دوسرے الفاظ سے یہ چیزیں وقوع میں نہیں آتیں اور قسم بھی اسی وقت ہے جب اس کے ساتھ لفظاً قسم شرعی کھائی جائے ورنہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ [2]

---

[1] ۔ فی هذا دلالة علی انه قد خلف ولم یقصد علی قوله هی علی حرام لان هذا القول لیس یبین (مجمع البیان)

[2] ۔ قال اصحابنا الله لا یلزم شئ وجوهه کحرمه (مجمع البیان)

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝۳

''اور جب پیغمبر نے اپنی بیویوں سے ایک خفیہ بات کہی تو جب اس نے (کسی دوسرے کو) وہ بتلادی اور اللہ نے ان کو اس کی اطلاع دی تو آپ نے ایک حصہ اس کا (اس بیوی) سے بتایا اور کچھ حصے سے درگزر کیا، جب آپ نے اس (بیوی) کو اس کی خبر دی تو اس نے کہا کہ آپ کو یہ کس نے بتایا اس علم والے (اللہ) نے جو بڑا باخبر ہے''۔

قرآن مجید کے انداز بیان سے تو یہ بالکل ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ تذکرہ گزشتہ واقعہ سے کوئی تعلق رکھتا ہے لیکن جب بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ وہی جناب ماریہ کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی بات ہے جو حضرت نے جناب حفصہ سے بصیغہ راز کہی تھی اور انہوں نے اپنے سے یک جہتی رکھنے والے خاص فرد جناب عائشہ پر اس راز کا افشا کر دیا، خالق نے اپنے رسولؐ کو غیبی طریقے پر اس کی خبر کر دی اور آپ نے حفصہ کو بتایا کہ مجھے تمہاری اس افشاء راز کی اطلاع ہوگئی ہے مگر اب یہاں قرآن کے یہ الفاظ کہ کچھ بتایا اور کچھ سے درگزر کیا تو اس واقعے میں تو ایسی کوئی دو باتیں نظر نہیں آئیں جن میں سے ایک کہی گئی ہو اور ایک سے درگزر کیا ہو معلوم ہوتا ہے کہ اصل بات کچھ اور تھی۔ بہرحال اس صورت حال میں صحیح رویہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسے راز رکھنا منظور تھا اور اس کے افشاء پر ہی تنبیہ کی گئی ہے تو ہم بھی اس کے درپے نہ ہوں کہ اس راز کی بات کو معلوم کریں۔

بہرحال قرآن مجید صاف کہہ رہا ہے کہ اللہ نے حضرت کو اس سے مطلع کیا مگر قرآن میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس میں اس کی اطلاع دی گئی ہو اس سے ظاہر ہے کہ خدا کا ہر پیغام جو بذریعہ وحی رسولؐ تک پہنچتا تھا قرآن مجید میں درج نہیں ہے۔ پھر جب زوجہ مکرمہ نے پوچھا کہ آپ کو کس نے بتایا؟ اور آپ نے جواب دیا کہ اللہ نے، تو انہوں نے بھی یہ نہیں کہا کہ وہ قرآن کی آیت سنائے جس میں خدا نے آپ کو اس کی اطلاع دی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ بات از روئے اسلام ان خواتین کو بھی معلوم تھی کہ وحی الٰہی جو رسول پر اترتی ہے وہ قرآن میں منحصر نہیں ہے۔

اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَی اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ ۝۴

''اگر تم دونوں توبہ کر لو اللہ کی طرف (تو اچھا ہے) اس لیے کہ تم دونوں کے دل کج ہو گئے ہیں اور اگر تم دونوں ایکا کرو ان کے خلاف تو یقیناً اللہ ان کا مددگار ہے اور جبرئیلؑ اور مؤمنین کی وہ فرد جو بالکل نیک ہے اور سب فرشتے اس کے بعد پشت پناہ ہیں''۔

خطاب باتفاق مفسرین انہی دونوں بیویوں سے یعنی عائشہ اور حفصہ سے ہے چونکہ ان کے طرز عمل سے رسول کو سخت ایذا پہونچتی تھی، اس لیے خالق نے ان سے ایسے سخت عتاب کے ساتھ خطاب فرمایا ہے۔ اور جو اہتمام ہے ان کے مقابلہ میں ان کے انتہائی خطرناک ہونے کا

ثبوت ہے۔

دو آدمیوں کے دل ظاہر ہے دو ہی ہوں گے، مگر ان کے لیے جمع کی لفظ قلوب صرف کی گئی گونا گوں خواہشوں اور تمناؤں کے لحاظ سے جوان کے دلوں میں کروٹیں لیتی ہیں اور یا یہ کہ یہ ایک طرح کا محاورہ ہے کہ ایسے محل پر دو (۲) کے لیے بھی جمع ہی کی لفظ استعمال ہوتا ہے۔

مولاہ کی لفظ کے ساتھ صرف اللہ کا نام ہوتا تو مالک وسرپرست کا مفہوم زیادہ نمایاں ہوتا مگر جب کہ اس کے ساتھ جبرئیلؑ اور صالح المؤمنین کا ذکر ہے تو اس کے معنی مددگار ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔

بعد میں عام ملائکہ کے ذکر سے الگ پہلے جبرئیل کا نام لینا ان کی خصوصیت امتیازی کا اظہار ہے جو انہیں رسولؐ کے ساتھ حاصل ہے اور اسی طرح مؤمنین میں سے کسی فرد کو خصوصیت کے ساتھ صالح کہنا اس کے امتیاز خاص کا بلندی کردار کے لحاظ سے بھی اور رسولؐ کے مددگار خاص ہونے کے لحاظ سے بھی ترجمان ہے جس کی تشریح میں ہمارے یہاں کی حدیث میں جس کے موافق اہل سنت کے یہاں کی روایت بھی موجود ہے حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا نام آیا ہے۔ اور اس کی تائید میں رسول کے ساتھ آپ کی جان سپاری اور آپ کی زندگی کے پورے کارنامے ہیں مگر عام طور پر مفسرین اہل سنت اسے عمومی حیثیت سے مومنین کے معنی میں لیتے ہیں۔

عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝۵

''بہت ممکن ہے کہ اگر وہ تم بیویوں کو طلاق دیدیں تو اللہ انہیں تمہارے بدلے ایسی بیویاں عطا کرے جو (سچے معنی میں) مسلمان، باایمان، اطاعت میں سرگرم توبہ وانابت کرنے والیاں، عبادت گزار، روزہ دار، پہلے بیاہی ہوئی اور کنواریاں''۔

عسیٰ یوں تو افعال مقاربہ میں سے ہے جس کے معنی ہوئے ''نزدیک ہے'' مگر یہ نزدیکی ضروری نہیں کہ زمانہ کے لحاظ سے ہو جس کے معنی یہ ہوں کہ عنقریب ایسا ہوگا بلکہ اس لفظ کا استعمال ذہن سے اس بات کو قریب لانے کے لیے ہوتا ہے جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا ''بہت ممکن ہے''۔

اب ان بیویوں کے لیے جن کے بعد میں حاصل ہونے کا رسول کے لیے امکان قریب ظاہر کیا گیا ہے موجودہ افراد سے بہتر قرار دے کر جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان سے یہ نتیجہ تو ضرور نکلتا ہے کہ جن خاص بیویوں کو مخاطب کر کے تنبیہی طور پر یہ اعلان ہوا ہے ان میں یہ تمام اوصاف اس درجے پر یکجا نہیں ہیں جو ازواج رسولؐ میں ہونا چاہیں۔

آخر کے دو (۲) وصف ''دہاجو اور کنواری'' ایسے ہیں جن میں سے کوئی ایک صفت لازماً ہر عورت میں پائی جائے گی تو اس کے ذکر کا مقصد کسی ایسی فرد کے سر غرور کو جھکانا ہو سکتا ہے جس کا بہت بڑا سرمایہ فخر رسول کی زوجیت میں آنے کے وقت کنواری ہونا ہے اور ان دونوں وصفوں میں کسی کو معیار فضیلت نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ وہ اوصاف بدرجہ اتم موجود نہ ہوں جو پہلے بیان ہوئے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ

عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝٦

''اے ایمان لانے والو! بچاؤ اپنے آپ کو اپنے گھر والوں کو اس آگ سے جس کے ایندھن انسان ہیں اور پتھر، جس پر مقرر ہیں بڑے سخت گیر، متشدد قسم کے فرشتے جو اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اس میں جو اس نے انہیں حکم دیا اور وہی کرتے اس میں جو اس نے حکم دیا اور وہی کرتے ہیں جس پر وہ مامور ہوتے ہیں''۔

اپنے اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچانے کے معنی

بچانا اپنے کو آگ سے ان اعمال سے پرہیز کے ساتھ جو اس آگ کا موجب ہیں، یہ پرہیز اپنی نسبت انسان کا فعل ارادی ہے جو اس اختیار سے وابستہ ہے لیکن دوسروں کے لیے جو اس کے گھر والے ہیں، بس جدوجہد، وعظ و نصیحت اور زجر و توبیخ ہی کی حد تک اپنے اختیار میں ہے ورنہ جیسا کہ خود اس سورے کے آخر میں ہے، حضرت نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کو اور جیسا کہ پہلے آچکا ہے، حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کو عذاب سے نہ بچا سکے تو کوئی دوسرا قدرت کہاں رکھتا ہے کہ وہ بہرصورت اپنے گھر والوں کو عذاب سے بچائے؟

''اس آگ کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر'' یہ الفاظ پہلے پارے میں حقانیت قرآن کے منکروں کے عذاب کے سلسلے میں آچکے ہیں اور وہاں ہم نے ان کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ کافر اور ان کے معبود جو پتھروں کے بت تھے، وہ سب آتش جہنم میں جھونکے جائیں گے جس طرح لکڑی وغیرہ جو ایندھن ہے اور وہ آگ میں ڈالا جاتا ہے۔

اب یہاں مسلمانوں کو خطاب کر کے اس آگ سے بچنے اور گھر والوں کو بچانے کا حکم دیا جا رہا ہے تو یہاں وہ پتھر والے بت کہاں ہیں جو مشرکین کے معبود تھے تو اس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ الفاظ اس دوزخ کے تعارف کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں انسان اور وہ پتھر ہوں گے۔ اب چاہے ان دوزخ میں جانے والوں کے ساتھ وہ پتھر نہ ہوں۔

ایک دوسری تشریح جو دونوں جگہ ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ پتھروں سے مراد گندھک کے پتھر جو خود مشتعل زیادہ ہوں گے [1] آج کل کے بعض لوگ پتھر کا کوئلہ کہہ دیتے ہیں کہ ان کی آگ تیز اور دیرپا ہوتی ہے مگر وہاں کی آگ تو غضب الٰہی کے تقاضا سے مشتعل ہے جس کے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی تیزی اور دیرپا کو ذہن میں لانے کے لیے اس کا ذکر کیا گیا ہو۔

ایک طبقہ علماء کا بچشم اعمال کا قائل ہے اور آخرت کی جزا و سزا کو انہی اعمال کی بدلی ہوئی صورت قرار دیتا ہے، ان کی بنا پر یہ گندھک کے پتھر یا پتھر کا کوئلہ اس آگ کی تیزی کا اظہار ہے اور درصورتیکہ بت مراد ہوں تو بت اگرچہ صاحب کردار نہیں ہوتے لیکن چونکہ جو عمل بھی ان سے متعلق ہو یعنی پرستش، وہ آگ کے شعلوں کی شکل میں سامنے آیا لہٰذا کہا گیا کہ وہ پتھر بھی اس آگ کو ایندھن کی طرح بھڑکانے والے ہیں۔

آگ پر مقرر فرشتوں کا ''سخت گیر'' اور ''متشدد ہونا'' انکے عمل کے لحاظ سے ہے جس کی تشریح کے بعد کو کی گئی ہے کہ جس بات پر وہ مامور ہیں، اسے عمل میں لاتے ہیں اور اس کے لیے جیسے اشخاص کی ضرورت ہے، ویسے ہی وہ پیدا کیے گئے ہیں ورنہ فرشتے جذبات کے حامل نہیں ہوتے

---

[1] ۔ حجارۃ الکبریت تزید فی قوۃ النار (مجمع البیان)

کہ طبیعت کے تقاضے سے ایسے کام انجام دیں، وہ تو بس احکام الٰہی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۧ

''اے کافرلوگو! اب آج عذرخواہی نہ کرو تمہیں تو سزا مل رہی ہے بس وہی جو تمہارے اعمال رہے تھے''۔

چونکہ قبل کی آیت میں اہل ایمان کو تنبیہ وتخویف کرتے ہوئے دوزخ کا ذکر آ گیا تھا تو اس کے ساتھ اصل اہل دوزخ کا ذکر ہو رہا ہے جو کافر لوگ ہیں کہ اب وہ قیامت میں دوزخ کا سامنا ہونے کے بعد معذرت کر رہے ہوں گے کہ خداوندا! معاف کر دے۔ اب ہم کفر نہیں کریں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ اب توبہ وانابت کا وقت گزر چکا ہے۔ اب تو یہ جو تم نے دار تکلیف میں کیا تھا، اس کی سزا ہے جو تمہیں بھگتنا ہے۔

ہم تو اس کے معنی یہی سمجھتے ہیں کہ جو تم کرتے تھے اس کی یہ سزا ہے س کے اظہار کے لیے قرآن مجید میں جزا وسزا کے ذکر کے ساتھ اکثر بِ کا حرف آیا ہے کہ بما کانوا یکسبون (یا) بما کانو یعلمون جس سے بدلے کا مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے اور سبب کے معنی بھی نکلتے ہیں کہ یہ اس سبب سے ہے جو وہ کرتے تھے۔ ہمارے نزدیک جہاں ''ب'' احکام رضاعت نہیں ہے، اس کا بھی مطلب یہی ہے۔ مگر انہی اعمال کے مجسم شکل میں آنے کے جو قائل ہیں، وہ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ یہ وہی تمہارے اعمال ہیں جو اس شکل میں تمہارے سامنے ہیں۔ اب عذرخواہی سے کیا ہوتا ہے؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۸

''اے ایمان لانے والو! توبہ کرو اللہ کی بارگاہ میں خالص توبہ، بہت ممکن ہے کہ اللہ تمہاری برائیوں پر پردہ ڈال دے اور تمہیں داخل کرے ان بہشتوں میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، جس دن اللہ پیغمبر کی اور ان ایمان لانے والوں کی جو ان کے ساتھ ہیں ذلت نہیں ہونے دے گا، ان کا نور دوڑتا ہوگا ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب، وہ کہیں گے پروردگار! ہمارے نور کو ہمارے لیے مکمل فرما اور ہمیں بخش دے، یقیناً تو ہر چیز رقادر ہے''۔

خالص توبہ

''خالص توبہ'' یعنی جو صحیح احساس جرم کے ساتھ ہو جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ گزشتہ پر نادم ہو اور آئندہ اس کے ترک پر مستقل طور پر عازم ہو، اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن فرائض کے ادا کرنے سے اب تک غفلت رہی ہے، ان کو ادا کریں جن کا حق ان تک نہیں پہنچایا ہے ان کا حق ان تک پہنچایا جائے اور جس کے ساتھ کوئی قولی یا عملی زیادتی کی ہے اس سے معافی مانگے۔ غرض جس طرح جس خرابی کا تدارک ہو سکتا ہو اس

کا تدارک کریں اور یہ سب رضائے الٰہی کی خاطر ہو نہ کہ صرف کسی دنیوی مضرت کے احساس سے۔

اس کے بعد کہنا تو یہ ہے کہ اللہ رسولؐ اور صاحبان ایمان کی عزت وعظمت کو نمایاں کریگا لیکن مخالفین رسول اور اسلام کا مزعومہ یہ تھا کہ یہ لوگ بعد میں معاذ اللہ ذلیل ہوں گے تو انداز بیان نفی کا اختیار کیا گیا کہ خدا اپنے رسول اور ان کے ساتھ والے اہل ایمان کی ذلت نہیں ہونے دے گا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی عزت دنیا کی آنکھوں کے سامنے آئے گی اور اُس عزت کا بیان بعد کو ہے کہ جب وہ بہشت کی طرف بڑھ رہے ہوں گے تو ان کے سامنے اور داہنی جانب جدھر سے وہ جا رہے ہوں گے ان کا نور پھیل رہا ہوگا۔ اس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے جب کہ مضمون یہاں سے قریب ہی سورہ حدید میں آیا ہے۔

اب چونکہ یہ سب معلوم نہیں ہیں، ان میں حسن عمل کے مراتب میں فرق ہے اس لیے بعض کو محسوس ہوگا کہ ان کا نور ذرہ مدھم ہے تو وہ خدا سے دعا کریں گے کہ پروردگارا ہمیں بخش دے یعنی ہماری اس کمی کو نظر انداز فرما جو تیرے لئے کوئی دشواریات نہیں اور ہمیں پورا نور عطا فرمایہ کمی جو ہمارے نور میں ہے باقی نہ رہے۔ بعض قدیم مفسرین کی تشریح یہ ہے کہ شروع میں منافقین اور مؤمنین سب ہی کے سامنے نور ہوگا۔ پھر منافق جماعت کا نور بجھ جائے گا اور وہ ٹھوکریں کھانے لگیں گے تو مؤمنین یہ دعا کریں گے کہ جس کا مطلب اس صورت میں یہ ہوتا ہے کہ ہمارے نور کو بجھنے نہ دے۔ آخر تک اسے قائم رکھ۔ ہوسکتا ہے کہ شروع کا یہ نور اور پھر اس کا بجھ جانا ان کے ابتدائی اقرار اسلام اور پھر دل سے کافر رہنے کا محسوس طور پر اظہار ہو جو جزا و سزا کے بمناسبت عمل ہونے کا تقاضا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۹

''اے پیغمبر! کفار اور منافقین سے جہاد کیجیے اور ان کے مقابلے میں میں سختی سے کام لیجیے اور ان کا ٹھکانا دوزخ میں ہے اور وہ بہت برا انجام ہے''۔

کفار اور منافقین کے مقابلے میں سختی کی ضرورت

یہ آیت بالکل انہی الفاظ میں دسویں پارے کے اندر سورہ برأت میں آچکی کہ یہاں حکم ''قتال'' کی لفظ کے ساتھ نہیں ہے تاکہ لازمی طور پر اس کے معنی خونریز مقابلے کے ہوں بلکہ حکم جہاد کا ہے جس کے معنی جدوجہد کے ساتھ مقابلے کے ہیں لیکن ایک قسم اس کی قتال بھی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھلے ہوئے کافروں کے مقابلے میں تو دو قسم کے جہاد کیے۔ میدان جنگ میں تلوار والا جہاد بھی اور انہیں حق سے قریب لانے کے لیے دوسری نوعیتوں سے جہاد بھی لیکن منافقین کے مقابلے میں تلوار نہیں اٹھائی گئی۔ پھر بھی سیرت رسول کے اس جز کی تکمیل، وقت آنے پر ان کے حقیقی نائب نے کی جس کے ہر اقدام کو آپ نے اپنا اقدام قرار دیا تھا ان لفظوں میں کہ یا علیؑ حربک حربی'' اے علیؑ تمہاری جنگ میری جنگ ہے''، تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ تمہیں تین (۳) گروہوں سے جنگ کرنا ہوگی۔ ناکثین۔ اور قاسطین اور مارقین جن کے مطابق حضرت علیؑ کو تین لڑائیاں درپیش ہوئیں:۔ جمل، صفین، اور نہروان۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ

عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ﴿۱۰﴾

''کافر کے لحاظ سے اللہ نے مثال پیش کی ہے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی جو ہمارے بندوں میں سے دو (۲) نیک بندوں کی زوجیت میں تھیں تو انہوں نے ان سے غداری کی تو ان دونوں نے ان دونوں کو خدا کے عذاب سے کچھ نہیں بچایا اور کہا گیا کہ داخل ہو جاؤ دونوں آگ میں داخل ہونے والوں کے ساتھ''۔

یوں تو جیسا کہ درمیان کی آیتوں میں ہم نے کہا ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ یہ درمیان کے اجزا سورے کے اصل موضوع اور اس کے ابتدائی حصہ سے مرتبط ہوں مگر اس آیت کا مضمون جو تقریباً انجام سورہ ہے آغاز سورہ کے مضمون سے اتنا مرتبط ہے کہ یہ بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ان میں انہی دونوں بیویوں کے کردار پر تنبیہ ہو کہ انہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غداری کی کہ ان کے راز کا افشا کیا اور اس طرح انہیں اذیت پہنچائی اور پھر انہیں نتیجہ سے باخبر کیا جا رہا ہو کہ رسول خدا سے رشتہ زوجیت کا انہیں عذاب الٰہی سے بچا نہیں سکتا۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۱﴾ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴿۱۲﴾

''اور اہل ایمان کے لحاظ سے اللہ نے مثال پیش کی ہے زوجہ فرعون کی جب کہ اس نے کہا اے میرے پروردگار! میرے لیے ایک گھر بنا بہشت میں اور مجھے نجات دے فرعون اور اس کی گزاری سے اور مجھے نجات دے ظالم لوگوں سے اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال جس نے اپنی شرمگاہ کو (مرد کے تعلق سے) بچائے رکھا تو ہم نے اس میں اپنی طرف سے روح کا ایک جز پھونک دیا اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ پورے طور پر عبادت کرنے والوں میں تھی''۔

جب کہ موضوع سورہ کی مطابقت کے لحاظ سے ایک مثال پیش کر دی گئی تو اب اس کی مناسبت مزید دو (۲) مثالیں پیش کی جا رہی گزشتہ اور سب ملا کر تین قسم کی ہوئیں:۔ ایک مثال: بری عورتیں اور اچھے شوہر۔ یہ مثال پہلے آ چکی۔ دوسرے اچھی عورت کا برا شوہر: اس کی مثال زوجہ فرعون ہے جس کا نام قرآن میں نہیں ہے۔ مگر روایات کی بنا پر ان کا نام آسیہ مشہور و معروف ہے۔ ایک تیسری قسم جو یہاں بیان ہو رہی ہیں، وہ ایک مقدس اور پاک باز خاتون ہے جو کسی بھی مرد کے حلقہ زوجیت میں نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے اسے بلندی حاصل ہو مگر اپنے طبقہ کی وہ ایک بلند مرتبہ فرد ہے۔ وہ جناب مریمؑ ہیں۔ ان سب مثالوں کا مشترک نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے نتیجہ خیز اس کا ذاتی کردار ہے دوسرے فریق کی طرف نسبت سے اس میں بلندی یا پستی پیدا نہیں ہوتی۔

سُوْرَةُ الْمُلْكِ

مکیّہ.....۳۰.....آیات

اس میں پہلی ہی آیت میں چونکہ الملک کی لفظ ہے لہٰذا اسی پر اس کا نام ہوا۔

سورۂ ملک کے خاص خاص مضامین:

۱.....اللہ کی سلطنت کا اعلان جو ہمہ گیر بھی ہے اور لازوال بھی۔

۲.....تخلیق موت وحیات کا مقصد آذمائش اعمال۔

۳.....کائنات کا نظم وترتیب اور اس کی استحکام کے لحاظ سے یکسانی۔

۴.....آسمان کی ستاروں سے آرائش، چراغان اور شیاطین کے لیے سنگ باران۔

۵.....دوزخ کی کیفیت اور اس کا جوش وخروش۔

۶.....اہل دوزخ کا اقرار جرائم۔

۷.....اللہ کے لیے آہستہ اور با آواز گفتگو کی یکسانی۔

۸.....زمین کے فوائد اور پھر ہر وقت کے خطرات۔

۹.....اللہ سے انسان کسی وقت بے نیاز نہیں۔

۱۰.....جھٹلانے والوں کے انجام پر مختصر توجہ دہانی۔

۱۱.....صحیح طور پر سالکان حق کی قدر و قیمت۔

۱۲.....اللہ کی نعمتوں کا بالا جمال تذکرہ۔

۱۳.....قیامت کے وقت کا صحیح علم بس اللہ کو۔

۱۴.....عذاب الٰہی سے ہر وقت ڈرتے رہنے کی ضرورت۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ

وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ﴿۴﴾

''بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اعمال کے لحاظ سے بہتر ہے اور وہ زبردست ہے بخشنے والا جس نے سات آسمان بنائے تہہ پر تہہ تم اس بڑے فیض پہنچانے والے کی تخلیق میں کوئی بے نظمی نہیں پاؤ گے تو موڑو نگاہ کو کہ کیا تمہیں کوئی گڑبڑ دکھائی دیتی ہے، پھر دوبارہ نگاہ موڑو تو نگاہ تمہاری طرف ناکام واپس آئے گی اس عالم میں کہ وہ تھکی ہوئی ہے۔

موت وحیات ذریعہ آزمائش

تبارك کی لفظ اصل میں برک سے ہے جس کے معنی عربی لغت میں ہیں طائر کا پانی پر ٹھہرا رہنا اور پھر برکت کا مفہوم ہوا مال دولت کا نشوونما کے ساتھ قائم وبرقرار رہنا اس طرح خالق کے لیے اس لفظ سے اس کا لازوال طور پر بقاء ودوام بھی نکلتا ہے جو اس کے واجب الوجود ہونے کا تقاضا ہے اور اس کا مرکز خیرات ہونا بھی کہ وہ خالق رب کائنات ہے۔ عظمت یعنی بزرگی اور علو برتری، اس ذات کے مقام حقیقت میں شان ہے۔ نہ کہ اس لفظ کا مفہوم مگر قدیم مفسرین اس لفظ کی تشریح کے طور پر انہی پہلوؤں کو اتنا نمایاں کرتے ہیں کہ جیسے وہ اس لفظ کے اصل معنی ہیں اور ان کی بنا پر تبارک کا ترجمہ کبھی یہ ہوتا ہے کہ ''بلند وبرتر ہے وہ'' اور کبھی یہ کہ ''عظیم وبزرگ ہے وہ''.....۔علامہ طبرسیؒ باوجود یکہ اللغۃ کے عنوان کے ماتحت اس کی اصل وہی بتاتے ہیں جو ہم نے پہلے درج کیا ہے مگر المعنی کے زیر عنوان فرماتے ہیں۔ اخبر سبحانه عن عظمته وعلوشانه و كمال قدرته ''خداوند عالم نے اس میں اپنی بزرگ شان کی بلندی اور کامل قدرت کی اطلاع دی ہے''

''جس کے ہاتھ میں سلطنت ہے'' اس کی نظیریں کئی جگہ پہلے آچکی ہیں اور وہاں بتایا جا چکا ہے کہ ''ہاتھ'' کا مطلب یہ جسمانی ہاتھ نہیں ہوتا۔ خدا جسم اور جسمانیات سے بری ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حصہ سلطنت کسی کے لیے اس کے قدرت واختیار سے وابستہ ہے اور خود اس کے قدرت اور اختیار کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے سلاطین اس کے سامنے بے بس ہیں۔

''موت اور زندگی کو پیدا کیا'' یعنی یہ نظام مقرر کیا۔ اس کے لیے یہ فلسفی بحث دور از کار ہے کہ موت وجودی چیز ہے یا عدمی اگر عدمی ہے تو اس سے خلق کا تعلق کس طرح ہے اس لیے کہ وہ وجودی ہو یا عدمی، بہرحال سلسلہ زندگی کا قطع ہونا جس کا نام موت ہے، اسی کی طرف سے ہوتا ہے لہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ اس نے موت کو پیدا کیا۔ ''تا کہ تمہاری آزمائش کرے'' یہ آزمائش جو اس زندگی کا مقصد ہے یہ اپنے علم کے لیے نہیں ہے بلکہ موقع دینا ہے اس کے ظہور کا کہ کس میں اچھائی کی صلاحیتیں مضمر ہیں اور کس میں برائی کے جراثیم موجود ہیں جس سے انسان

کے اختیار کا جو ہر نمودار ہو جو اس کی صفت امتیازی ہے۔ ''وہ زبردست ہے'' یعنی طاقت کا مالک ہے لہٰذا مجرم اس کے قابو سے باہر نہیں ہو سکتا مگر اس کے ساتھ وہ غفور ہے بخشنے والا کہ توبہ کرنے والے کی توبہ کو قبول کرتا ہے اور کبھی بر بنائے تفضّل گناہگار کے گناہ سے درگزر کرتا ہے۔ انہی دو باتوں سے مؤمن میں خوف اور رجاء کے دونوں پلے برابر سے موجود رہتے ہیں۔ ''بے نظمی نہیں پاؤ گے'' یعنی تمام چیزیں ربط و نظام کے ساتھ ہیں اور ان میں مکمل تناسب پایا جاتا ہے۔ دوبارہ یعنی جتنی دفعہ چاہو، جائزہ لو اور تلاش کرو۔ تمہیں کوئی شگاف یعنی خلل اور خرابی نظر نہیں آئے گی۔ چاہے دیکھو کہ نظریں تھک جائیں اور یہی اس کا قرینہ ہے کہ مرتین جس کا ترجمہ ہم نے دوبارہ اور تبارہ سے کیا ہے کیوں کہ ایک دفعہ تو اس کے پہلے نظر موڑنے کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس سے مراد بھی بس دو ہی دفعہ نہیں ہے کیوں کہ دو تین دفعہ میں تو دیکھنے سے کوئی تھکن پیدا نہیں ہوتی۔ [1]

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ۝۵

''ہم نے نزدیک والے آسمان کو خاص چراغوں سے آراستہ کیا ہے اور انہیں شیطانوں کے لیے تیر باراں کا ذریعہ بنایا اور ان کے لیے ہم نے دوزخ کا عذاب تیار رکھا ہے''

خاص چراغوں سے مراد بلاشبہ ستارے ہیں۔ اب یہ تیر باراں کا ذریعہ کس طرح ہیں؟ پہلے بھی علما کی نظر اس پر گئی ہے کہ وہ ستارے اپنی منزل سے ہٹ کر شیاطین کے پیچھے نہیں جاتے بلکہ ان کا کوئی جز ہے جو ان کے بھگانے کے لیے تیر کی صورت سے حرکت میں آتا ہے اور یہ شہابے ہیں جنہیں ہم ٹوٹنے والے تارا کہتے ہیں۔ یہ نکل کر انہیں آسمان پر جانے سے روکتا ہے۔ آج کل جدید تحقیقات کے پرستار کہتے ہیں کہ ان ستاروں کا جز نہیں موجود ہیں بلکہ سابق میں کوئی ستارہ منفجر ہوا، اس کے اجزا ہیں جو بے حد شہابیوں کی صورت سے فضا میں گردش کرتے رہتے ہیں اور کبھی زمین کے حدود میں آجاتے ہیں۔ ان کی بارش شیطانوں کے آسمان پر جانے سے سدراہ ہے۔ بہر حال ظاہر قرآن میں ہر جگہ یہی ہے کہ یہ ستارے یا ان کے یہ اجزا شیطانوں کو عالم بالا پر جانے اور وہاں کے رازوں کے معلوم کرنے سے مانع ہوتے ہیں ہو سکتا ہے کہ یہ اس وقت کے لوگوں کو اس حقیقت کے ذہن نشین کرانے کے لئے ہو کہ یہ تصوّر کہ کاہن لوگ شیطان کے ذریعہ سے فضاؤ نور اور عالم بالا کے دیگر رازوں کو معلوم کر کے ہمیں صحیح معلومات بہم پہنچاتے ہیں، غلط ہے۔ آخر کا جملہ اس لیے ہے کہ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بس یہ تیر باراں ہی ان شیطانوں کے جرائم کی سزا ہے بلکہ یہ تو ان کی شرارت کے دفعیہ کا ایک سامان ہے اور اصل سزا ان کی وہی دوزخ ہے جو ہر کافر کے عذاب کے لیے مہیا اور تیار ہے چاہے وہ جنات کی قوم میں کے کافر ہوں جن میں شیاطین داخل ہیں اور خواہ وہ انسانوں میں ہوں جیسا کہ بعد کی آیت سے ظاہر ہے۔

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۶ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ۝۷ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ؕ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝۸ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا

---

[1] ۔ لا یرید حقیقۃ الشنیہ لقولہ وھو حسیر ولا بصیر حسیرا بمرتین (مجمع البیان)

مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ ۝۹ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْۤ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝۱۰ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ۝۱۱

''اوران کے لیے جنہوں نے اپنے پروردگار کے ساتھ کفر اختیار کیا، دوزخ کا عذاب ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے تو اس کا ہولناک شور سنیں گے اور وہ جوش میں ہوگا جیسے کہ غیظ وغضب کی شدت سے وہ پھٹا جاتا ہو جب اس میں کسی دستے کو ڈالا جائے گا تو وہاں کے پہریدار پوچھیں گے کیا تمہاری جانب کوئی ہدایت کرنے والا نہیں آیا؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں، ہدایت کرنے والا ضرور آیا مگر ہم نے جھٹلایا، اور کہا کہ اللہ نے کچھ اتارا ہی نہیں ہے۔ تم لوگ نہیں ہو مگر بڑی گمراہی میں ۔ اور انہوں نے کہا اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا۔ تو لعنت ہو ان دوزخ والوں پر''۔

عمومیت کے ساتھ کافروں کے انجام میں دوزخ کا اعلان کرتے ہوئے وہاں کی ہیبت ناک کیفیت کے ایک جز کا اظہار کیا جارہا ہے کہ نزدیک پہونچتے ہی انہیں اس کا شور سنائی دے گا۔ یوں ایک شور تو ان اہل جہنم کی فریادوں کا اور کرب واذیت سے نکلی ہوئی صداؤں کا بھی ہے جو پہلے وہاں پہنچ چکے ہیں مگر بعد والے الفاظ اس کا قرینہ ہے کہ یہ شور خود دوزخ کے جوش وخروش کے ساتھ شعلہ وری کا ہے جو اس وقت غضب الٰہی کا مظہر ہونے کی وجہ سے دل ہلا دینے والی مہیب آوازیں نکال رہا ہے۔ یا وہ فطری آوازیں اس کے جوش کے ساتھ شعلہ وری کی ایسی ہے جیسی دیگ کے کھولنے اور جوش مارنے کے وقت سنائی دیتی ہے جو ایک ادنی مثال ہے اس لیے کہ یہاں کی بڑی سے بڑی دیگ بھی اس دوزخ کے مقابلے میں پہنچ ہے جس میں ابتدائے خلقت سے لے کر آخر عمر دنیا تک مجرم معذب ہو رہے ہوں گے۔ اور یہ ہولناک آواز بھی ان کے عذاب میں اضافہ کا ایک ذریعہ ہوگی۔ [1]

مخالفین یا پہرہ داروں کا سوال حقیقت واقعہ معلوم کرنے کے لیے اس کا دریافت کرنا نہیں ہے بلکہ اتمام حجت کے لیے خود ان کی زبان سے اقرار کرانے کے لیے ہے کہ ہمارے پاس ہدایت کرنے والے آئے مگر ہم نے ان کی بات نہیں مانی۔ اس لیے ہم اس سزا کے واقعی مستحق ہیں جو ہمیں دی جارہی ہے اور یہ مقصد سوال کا حاصل ہوا ان کے جواب سے جو بعد میں درج ہے۔ ان کا کہنا کہ ''اگر ہم سنتے یا سمجھتے'' یہ سننے سمجھنے کی طاقتوں کے اپنے میں وجود کا انکار نہیں ہے ورنہ شاید وہ معذور قرار پاتے بلکہ یہ ہے کہ ان طاقتوں کے ہوتے ہوئے ہم نے ان سے کام نہیں لیا اور اسی لیے ان کا یہ کہنا کوئی معذرت نہیں بلکہ اعتراف قرار پایا جس کا قرآن نے ان لفظوں میں کہ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ اظہار کیا ہے۔ [2]

اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ ۝۱۲

''بلاشبہ جو لوگ ان دیکھے پروردگار سے ڈرتے ہیں، ان کے لیے بخشش ہے اور بڑا اجر وثواب''

---

[1] ۔فیعظم بسماع ذالك عذابهم لمایرد علی قلوبهم من هوله (مجمع البیان)

[2] ۔قال قدسمعواوعقلوولکنهم لم یطیعواولم یقبلواوالدلیل علی انهم قدسمعوانهم قدسمعووعقلوااولم یقبلواقوله فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ (علی ابن ابراهیم)

ظاہر یہی مفہوم ہے جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے کہ بالغیب کی لفظ اس ذات کے وصف کو ظاہر کرتی ہے جس سے ڈرنا ہے یعنی وہ پروردگار جو پردہ غیب میں ہے، جسے انہوں نے دیکھا نہیں مگر غیب پر ایمان کے ماتحت اسے مانا ہے اور یہ جانا ہے کہ وہ ان کے افعال اور اعمال کا نگراں ہے، اسی کے احتساب، ناراضگی اور آخر میں عذاب کا خوف ہے جس سے وہ اچھے افعال کے پابند اور برے افعال سے محترز ہیں، نتیجہ انہی کے لیے آخرت کے بڑے مراتب ہیں یہی مفہوم قرآن مجید کی دوسری آیتوں کے مطابق ہے؛ علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بالغیب کی لفظ کو ڈرنے والوں سے متعلق قرار دیا ہے کہ وہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہی نہیں بلکہ پردہ غیب میں تنہائی میں بھی اللہ سے ڈرتے ہیں کہ اس کی اطاعت کے پابند اور اس کے گناہوں سے دور رہتے ہیں مگر یہ خلاف ظاہر ہے اور مقام حقیقت میں وہ پہلے مفہوم کا لازمی نتیجہ ہے کیوں کہ جو دنیوی نقصان کے اندیشہ سے افعال خیر ہوں گے وہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہی ہوں گے۔ تنہائی میں نہ ہوں گے لیکن جب ان دیکھے پروردگار کا خوف محرک اعمال ہوگا تو اس میں سراً وعلانیا یعنی خفیہ اور علانیہ کا فرق نہیں ہوگا۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾

''اور تم چپکے چپکے اپنی بات چیت کرو یا اسے آواز کے ساتھ کرو۔ وہ تو سینوں کے اندر کی باتوں کا بھی جاننے والا ہے''۔

انسان بالکل چپکے چپکے یا بہت دھیمی آواز کے ساتھ اکثر اس لیے گفتگو کرتا ہے کہ دوسروں کو اس کا علم نہ ہو لیکن کسی دوسرے کو چاہے علم نہ ہو، اس خدا کو بہرحال علم ہے جو ظاہر و باطن پر حاوی ہے۔ آہستہ کا کیا ذکر، اگر بالکل زبان پر نہ آئے دل کے اندر ہی رہے، تب بھی وہ اس سے واقف ہے لہٰذا اگر یہ گفتگو اس کی مرضی کے خلاف اور اس کے احکام کے برعکس ہے تو یہ سات پردوں میں چھپ کر گفتگو کرے تب بھی اس کے احتساب کی گرفت سے نکل نہیں سکتا۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾

''کیا جس نے پیدا کیا ہے، وہ واقف نہ ہوگا؟ حالاں کہ وہ باریک بین، باخبر ہے''

یعنی تمہارا کتم عدم سے عالم وجود میں لانے والا اگر بے شعور اور بجائے خود کوئی بے خبر ہوتا جیسے مادہ یا طبیعت، تو تم مطمئن رہتے کہ جو چاہیں کریں کوئی پوچھنے والا نہیں یا وہ کوئی ناقص علم والا ہوتا جو ظاہری مخبروں کا محتاج ہوتو تم آہستہ سے باتیں کر کے اس کی گرفت سے آزاد رہ سکتے تھے لیکن جبکہ تمہارا خالق جو ہر باریک سے باریک بات کا دیکھنے والا ہے تو تم آہستہ باتیں کر کے اس پر پوشیدہ کیوں کر رہ سکتے ہو؟۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾

''وہ وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے قابل استعمال بنا دیا ہے کہ چلو اس کے کاندھوں پر اور کھاؤ اس (اللہ) کی (دی ہوئی) روزی سے اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے''۔

زمین کی صفت

زمین کی جو صفت بتائی گئی ہے ''قابل استعمال'' اس کے حدود ہر دور زمانہ میں باعتبار ادراک بشر اور ذرائع استعمال کے مختلف رہے ہیں اور ان میں برابر اضافہ ہوتا جارہا ہے جس سے اللہ کی اس مخلوق کے متعدد فیوض و برکات کا احساس اور زیادہ ہونا چاہیے، تاہم اس وقت کے انسانوں کے محدود ذرائع کی حد تک انہیں اس کی طرف دلائی جارہی ہے، اور قرآن مجید میں بکثرت مقامات پر نگاہ کو ادھر موڑا گیا ہے اور اس کے دوسرے فوائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہاں ان تمام فوائد کو اور جن کا آئندہ انکشاف ہوتا رہے ذلولاً کی لفظ میں جس کا ترجمہ ہم نے ''قابل استعمال'' کیا سمیٹ کر صراحۃً صرف اس فائدے پر توجہ دلائی گئی کہ ''چلو اس کے کاندھوں پر''۔ چونکہ کاندھوں کی لفظ بلندی کا پتہ دیتی ہے، اس لئے بعض لوگوں نے اُسی کو پہاڑوں کے معنی میں لیا ہے۔ مگر اس کی ضرورت نہیں ہے، انسان زیادہ تر جہاں چلے پھرے گا وہ زمین کی اندرونی تہوں کے مقابلے میں اوپر ہی کا حصہ ہوگا لہٰذا اسے پشت یا کندھا زمین کا کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کی روزی سے کھاؤ۔ یعنی اللہ نے زمین میں جو نباتات روئیدہ کیے ہیں۔ ان سے غذا حاصل کرو مگر یہ نہ بھولو کہ یہ نعمت کس کی دی ہوئی ہے اور یہ کہ اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ لہٰذا اپنے فرائض کا ادا کرنا ضروری سمجھو۔

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ﴿١٦﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ﴿١٧﴾

''کیا تمہیں ڈر نہیں اس سے جو آسمان میں ہیں کہ وہ تمہیں زمیں میں دھنسا دے تو وہ ایک دم ہچکولے کھانے لگے یا تمہیں ڈر نہیں اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھر برسانے والی ہوا بھیج دے تو بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میری طرف کا ڈرانا کیسا ہوتا ہے''۔

یعنی یوں تو زمین تمہارے لیے گہوارہ سکون بھی ہے اور روزی کا ذریعہ بھی مگر تمہیں اس کے ساتھ اسی سے جس نے یہ تمہارے لیے پیدا کی ہے، اس کے غضب کے تقاضوں سے ڈرتے رہنا چاہیے جس کی بہت صورتیں ہیں جن میں سے بعض کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔

خالق کے لیے یہ کہنا کہ آسمان میں ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وہاں (معاذ اللہ) جسمانی طور پر بود و باش رکھتا ہے کیوں کہ وہ لامکان ہے، جسم و جسمانیات سے بری ہے بلکہ چونکہ مقام نسبت میں عالم بالا کا سب سے بلند طبقہ اُس کا عرش یعنی ''پایۂ تخت'' قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے انسانوں کو اس کا تعارف یونہی کرایا جاتا ہے کہ وہ آسمان پر ہے اور اسی لیے اس کی طرف سے آنے کو نازل ہونا، اترنا کہتے ہیں اور دعاء یا اعمال خیر جو قابل قبول ہوں ان کے لیے عالم بالا کی طرف جانے کا تصور ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿١٨﴾

''اور ان کے پہلے جو تھے، انہوں نے جھٹلایا تو میری طرف کی سزا کیسی تھی''۔

اب جیسے روئے خطاب ان کی طرف موڑ لیا گیا اور دوسروں کی طرف متوجہ ہو کر کہا جانے لگا کہ جن عذابوں سے انہیں ڈرایا جارہا ہے، یہ کوئی نئے نہیں ہیں بلکہ امم سابقہ پر اس کے عذاب آتے رہے ہیں۔ اس کے لیے ان امتوں کے حالات پڑھ لیے جائیں و قرآن

مجید میں بکثرت مقامات پر درج ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ۛ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ ﴿۱۹﴾

''کیا انہوں نے نہیں دیکھا پرندوں کو اپنے اوپر پر پھیلاتے ہوئے اور سمیٹ بھی لیتے ہیں، انہیں نہیں سنبھالے رہتا (کوئی) سوا (خدائے) رحمان کے، وہی ہر چیز کی نگرانی کرنے والا ہے''۔

یوں تو طائروں کی ہوا میں پرواز، انسانوں اور بہائم وغیرہ کا زمین پر چلنا، مچھلیوں کا دریا میں تیرنا، سب کے طبعی اسباب ہیں لیکن تمام اسباب کا سلسلہ آخر میں تو خدا ہی تک پہنچتا ہے۔ اس نے طائر میں قوت پرواز دی اور ان کے جسم کو اس طرح کا بنایا کہ وہ ہوا میں بلند ہو سکے اور فضا میں اڑ سکے۔ اور یہ چیزیں تو براہ راست اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں جو چیزیں انسان نے سائنس کی مدد سے پیدا کی ہیں اور ان میں برابر ترقی ہوتی جا رہی ہے وہ کب ان قوانین سے آزاد ہیں جو اس کے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ ماننا نہ ماننا انسان کا کام ہے۔ قرآن کا مقصد نگاہوں کو موڑنا ہے، تاکہ وہ اس پر غور کریں جو حقیقت ہے اسے سمجھیں اور سمجھنے کے بعد اس خدائے واحد کی مانیں جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ۭ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ﴿۲۰﴾ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ﴿۲۱﴾

''آخر کون تمہارا لاؤلشکر ہے جو اللہ کو چھوڑ کر تمہاری مدد کرے۔ یہ کافر لوگ نہیں ہیں مگر دھوکے میں۔ آخر کون ہے یہ جو تمہیں روزی عطا کرے۔ اگر وہ اپنی روزی کو روک لے، بلکہ وہ ہٹ دھرمی کے ساتھ سرکشی اور حق سے وحشت پر جمے ہوئے ہیں''۔

مشرکین کو زعم باطل تھا کہ ان پر کوئی وقت پڑے تو ان کے اصنام ان کی مدد کریں گے دوسرے لوگوں کو بھی جتھے، اپنے پارٹی یا قوم قبیلے کا غرا ہوتا ہے۔ ان دونوں آیتوں میں سوال کے پیرایہ میں انہی لوگوں کے اس پندار باطل کو توڑا گیا ہے۔ اگر خدا کی طرف کا عذاب آئے تو یہ لاؤلشکر تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا اور اگر وہ اپنی طرف سے روزی کا دروازہ بند کر دے تو کوئی روزی دینے والا نہیں۔ دونوں آیتوں میں پہلے جیسے ان کی طرف منہ کر کے سوال ہے۔ اور پھر ادھر سے منہ موڑ کر دوسروں سے مخاطب ہو کر ان کے خیال کی رد کی ہے۔

اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰي وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۲﴾

''تو کیا جو اوندھے منہ چل رہا ہو زیادہ صحیح راستہ پائے گا یا وہ جو سیدھا راہ راست پر جا رہا ہو''۔

پہلی مثال کافروں کی ہے کہ وہ اندھا دھند آباؤاجداد کی تقلید میں منہ اوندھائے چل رہے ہیں نہ راستے کے نشیب و فراز پر ان کی نظر ہے، نہ نشان منزل پر نگاہ ہے تو وہ کیا منزل مقصد تک پہونچیں گے۔ اس کے برخلاف مؤمنین دلائل حق کو دیکھ کر معلوم کر چکے ہیں کہ صحیح راستہ کون ہے تو یہی وہ ہیں جو سیدھے منزل مقصد پہونچ سکتے ہیں۔

قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ هُوَ الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَاِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

''کہیے وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے سننے اور دیکھنے کی طاقتیں اور دل و دماغ قرار دیے مگر بہت کم تم شکر ادا کرتے ہو، کہیے کہ وہی ہے جس نے تمہیں ادھر ادھر پھیلایا ہے اور اسی کی طرف تمہیں سمیٹ کر لے جایا جائے گا''

سابق میں ان سے خطاب کر کے کچھ تازیانے تنبیہ کے لگائے تھے مگر یہ کہنے کے بعد کہ وہ ہٹ دھرمی کے ساتھ سرکشی اور قبول حق سے گریز پر جمے ہوئے ہیں۔ اب جیسے طور پر ان کی طرف سے منہ موڑ لیا اور اب رسول سے کہا جا رہا ہے کہ آپ ان سے بات کیجیے اور انہیں میری ربوبیت کے دلائل یاد لائیے اور ان کے کردار کی خامیوں پر توجہ دلائیے۔ انسان کی خلقت کو لفظ انشا سے تعبیر کیا ہے کہ یہ ان تغیرات کے ماوراء ایک چیز ہے جو مادے میں ہوتے رہتے ہیں اور جن سے جسم انسانی کی ساخت ہوتی ہے۔ اصل انسان وہ مجسمہ خاکی نہیں ہے بلکہ وہ ہے جسے سورۂ مؤمنون میں نطفہ علقہ کی منزلیں طے ہو کر کہہ دیا ہے کہ ''پھر کچھ اور کر دیا'' ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ ''کچھ اور کا مطلب یہی ہے کہ وہ نوعیت میں ان جسمانی تغیرات سے الگ ایک خداوندی تصرف تھا''۔ سننے اور دیکھنے کی طاقتیں یعنی حواس ظاہری اور افئدہ جس کا ترجمہ ہم نے ''دل و دماغ'' کے ساتھ کیا یعنی حواس باطنی اور تفکر و تعقل کی طاقت جو انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ سب اس لیے کہ انسان خود حقیقتوں کو سمجھ کر صحیح راستہ اختیار کرے۔ نہ یہ کہ تقلید کورانہ کے ساتھ جو جس نے کہہ دیا اسی کو مان لے اور اس پر جم جائے۔ یہی ان نعمتوں کی ناشکری ہے جس کا پہلی آیت کے آخر میں اظہار کیا گیا ہے، پھر مکافات عمل سے انہیں ہوشیار کیا جا رہا ہے کہ تمہیں تمام دنیا میں اس نے پھیلا دیا ہے مگر جب جزا و سزا کا ہنگام آئے گا تو تم سب سمٹ کر موقف حساب میں آ جاؤ گے اور تمہیں تمہارے برے اعمال کی سزا دی جائے گی۔

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۫ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۶﴾ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِیْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَقِیْلَ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿۲۷﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو (بتاؤ) کہ یہ وعدہ وعید پورا کب ہوگا؟ کہیے کہ اس کا علم تو بس اللہ کو ہے اور میں صرف صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں تو جب وہ اسے نزدیک دیکھیں گے تو کافروں کے چہروں کا برا عالم ہوگا اور کہا جائیگا یہی وہ جس کا تم تقاضا کرتے تھے۔''

ان کا یہ مطالبہ قطعاً سنجیدگی کے ساتھ نہ تھا کہ وہ واقعی قیامت کے وقت کو پوچھنا چاہتے ہوں بلکہ یہ انکار کا ایک پیرایہ تمسخر و استہزاء کا انداز تھا۔ اگر بالفرض وقت بتایا بھی جاتا تو وہ انکار پر قائم رہتے اور کہتے ہمیں کیا معلوم کہ جو آپ کہہ رہے ہیں، وہ درست ہے اور اس لیے ظاہر قرآن یہ ہے کہ یہ علم حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی عطا نہیں ہوا اس لیے کہ آپ کے فرائض میں اس کا دخل نہ تھا۔ آپ کا کام خلق خدا کو مکافات عمل کے ضروری ہونے پر متنبہ کرنا تھا جسے ثبوت خدا کے عقل بھی بتاتی ہے اور اس کی نوعیت بتانا تھی جو قیامت اور اُس کے احوال و اہوال کے بیان

کے ساتھ مؤثر ترین انداز میں پیش کی گئی۔ اس کی تصدیق کے لیے وہ دلائل تھے جو آپ کی رسالت کی حقانیت کو بتا رہے تھے جن پر غور کرنا اور ان کے تقاضا کے مطابق ایمان اختیار کرنا سننے والوں کا کام تھا اور جس سے ہٹ دھرمی کے طور پر انحراف کر کے وہ ان عذابوں کے مستحق ہو رہے تھے جو کفار مشرکین کے لیے یہ بتا رہے تھے اور اسی آخر میں کہا گیا ہے کہ جب وہ دن آ جائے گا تو تمہارا برا عالم ہوگا۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾

''کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے کہ اگر اللہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ختم بھی کر دے یا اپنی رحمت ہمارے شامل حال رکھے تو (بہر صورت) کافروں کو دردناک عذاب سے کون پناہ میں رکھے گا''۔

کافر لوگ آپس میں کہتے تھے کہ کسی طرح یہ اور ان کے مٹھی بھر ساتھی ختم ہو جائیں جنہوں نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے تو ہم آرام کی نیند سوئیں تو کہا جا رہا ہے کہ جب میرے ذریعے سے صدائے حق تم تک پہونچ چکی اتمام حجت ہو گیا تو اب اگر جائیں تو تم اس عذاب سے بچ تو نہیں سکتے جو کافروں کے مقرر ہے۔ ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ ہم مؤمن ہوتے ہیں امید و بیم کے درمیان رہتے ہیں جو تقاضائے ایمان ہے تو کافر لوگوں کے لیے تو امید کا کوئی پہلو ہے ہی نہیں، وہ عذاب سے کیوں کر بچ سکتے ہیں [1] مگر پہلا مفہوم ذہن نشین زیادہ ہے۔

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٩﴾

''کہئے کہ وہ خدائے رحمٰن ہے جس پر ہم ایمان لائے ہیں اور اُسی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اب تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ کون کھلی ہوئی گمراہی میں ہے''۔

چونکہ مشرکین لفظ رحمٰن سے وحشت کرتے تھے، اس لئے اس سورے میں بار بار اس کا نام رحمٰن ہی لیا گیا ہے اور کہا ہے کہ وہ یعنی جس کی طرف میں دعوت دیتا ہوں رحمان ہے۔

تمہیں جلد ہی معلوم ہوگا'' اس میں لب و لہجہ جیسے ملائم اختیار کر لیا ہے یعنی ابھی تم غور نہیں کر رہے ہو۔ اگر ذرا سوچو سمجھو اور غور کرو تو پتہ چل جائے گا کہ سیدھا راستہ کون سا ہے۔! کون اس راستے پر چل رہا ہے اور کون کھلی گمراہی میں مبتلاء ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿٣٠﴾

''کہیے کہ کیا تم نے غور کیا ہے اگر تمہارا پانی تہہ نشین ہو جائے تو کون ہے جو تمہارے لیے شریں پانی کے سوتے پھر جاری کر دے''۔

یعنی یہ پانی جس پر تمہاری زندگی موقوف ہے، اسی رحمٰن کی فیض سے وابستہ ہے۔ کنوؤں میں یہ سوتے پانی کے اسی کے حکم سے جاری ہوتے ہیں۔ اگر یہ بند ہو جائیں تو جب تک وہ نہ چاہے کوئی دوسرا ان کے جاری کرنے پر قدرت نہیں رکھتا۔

---

[1] نحن مع ایماننا بین الخوفة فمن یجیرکم مع کفرکم من العذاب (مجمع البیان)

سُوْرَةُ الْقَلَمِ

مکّیہ.....۵۲.....آیات

یہ سورہ ادھر کے دوسرے سوروں کے تناسب سے ایسا بڑا نہیں ہے مگر چونکہ آیتیں بہت چھوٹی چھوٹی ہیں لہٰذا تعداد ان کی بہ نسبت سابق کے سوروں کے کافی زیادہ ہے اور پہلی ہی آیت میں قلم کا ذکر ہے اور اس سے قبل نٓ کی لفظ ہے لہٰذا اس کا نام یہ دونوں ہوئے، سورہ قلم بھی اسے کہتے ہیں اور سورہ نون بھی۔

سورۂ قلم کے خاص خاص مضامین:

۱.....قسم کھا کر قلم اور اس کی افادیت کا ثبوت۔

۲.....حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (معاذ اللہ) دیوانہ کہنے والوں کی رد۔

۳.....حضرتؐ کی اخلاقی رفعت کا بتاکید بیان۔

۴.....اصول سے ہٹ کر کسی سمجھوتے کی ممانعت۔

۵.....ایک سرکش کافر کا کردار۔

۶.....ایک باغ کے مالکوں کا غلط طرز عمل اور اس کا انجام۔

۷.....اطاعت گزار اور نافرمان کے انجام میں فرق کا ضروری ہونا۔

۸.....قیامت کے سخت ہنگام کی یاد آوری۔

۹.....کافروں پر نعمتوں کی بارش بر بنائے مہربانی نہیں بلکہ تمہیدی عذاب ہے۔

۱۰.....مشرکین کو آپ سے مخالفت بلاوجہ ہے۔

۱۱.....آنحضرتؐ کو صبر و ثبات کی تلقین۔

۱۲.....حضرت یونسؑ کے ترک اولیٰ کا اظہار----وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۙ﴿۱﴾ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۚ﴿۲﴾ وَاِنَّ لَكَ

لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝٣ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝٤

''نون'' قسم ہے قلم کی اور اس کی جسے لوگ لکھتے ہیں، آپ اپنے پروردگار کے فضل وکرم سے دیوانے نہیں ہیں، یقیناً آپ کے لیے بڑا اجر ہے جس کا احسان آپ پر جتایا نہیں جائے گا اور بلاشبہ آپ عظیم اخلاق کے درجے پر فائز ہیں''۔

پہلی لفظ یعنی نٓ مقطعات قرآنیہ میں سے ہے جن کے معانی عموماً قدرتی راز کی حیثیت رکھتے ہیں اور چون کہ وہ مقطعات میں سے ہے اس لیے وہ بطور ایک لفظ کے قرآن میں لکھی گئی ہے بلکہ بطور ایک حرف کے جیسے مقطعات کے لکھنے کا عام اصول ہے کہ الف لام میم کو الٓمٓ اور حامیم کو حٰمٓ اور حا، میم، عین، س، قاف کو حٰمٓعٓسٓقٓ لکھتے ہیں۔ یہ لکھنے کا طریقہ اسی بنا پر ہے کہ انہیں رمز کے طور پر انفرادی حیثیت حاصل ہے اور اس کا علم اس نے انہی کو دیا تھا جو اس کے راز دار تھے،

اس کے بعد قلم کی قسم کھائی گئی ہے، اس سے مراد مطلق قلم ہو تو پھر مایسطرون ''جسے لکھتے ہیں'' اسے بھی مطلق ہونا چاہیے جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا کہ ''لوگ لکھتے ہیں''۔ چونکہ عرب میں عموماً لوگ اس فن سے بے بہرہ تھے لہٰذا قرآن نے قسم کے ن پیرائے میں اس کی رفعت اور اہمیت ان کے ذہن نشین کرائی۔ اب اگر کوئی قلم کا غلط استعمال کرے اور اس سے گمراہی خلق کا سامان فراہم کرے یا فساد پھیلانے کا کام لے تو اس سے اصل چیز کی افادیت متاثر نہیں ہوگی جیسے اللہ کی نعمتوں کا غلط استعمال جو ان کی اہمیت اور افادیت کو مجروح نہیں کرتا۔

بعض لوگوں کی نظر شاید اس پہلو کی طرف گئی ہے تو انہوں نے مایسطرون سے مراد وہ فرشتے لے لیے ہیں جو اللہ کی طرف کی وحی کو اور خلق کے اعمال کو لکھتے ہیں لیکن اس صورت میں قلم سے مراد بھی وہی فرشتے ہونا چاہئیں، قلم دنیا والے کا ہو اور لکھنے والے فرشتے ہوں جیسا کہ علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان معلوم ہوتا ہے ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

مجاہد نے جو جناب ابن عباسؓ کے شاگرد ایک قدیم مفسر ہیں قلم کی تشریح اس قلم کے ساتھ کی ہے جس سے قرآن لکھا جاتا ہے اس صورت میں مایسطرون سے مراد قرآن ہوگا۔ اب اس کا ربط پہلے والے مضمون سے یہ قرار دیا گیا ہے کہ خالق پہلے قرآن کی طرف نظروں کو موڑ کر اور اس کے بعد میں آپ کی اخلاقی عظمت کو پیش کر کے بیچ والی حقیقت پر زور دے رہا ہے کہ اگر یہ لوگ ان دونوں چیزوں پر غور کریں۔ اس کتاب کو دیکھیں جسے آپ پیش کر رہے ہیں اور خود آپ کو دیکھیں کہ آپ کتنے بلند اخلاق کے حامل ہیں تو انہیں اپنے اس الزام کا غلط ہونا سمجھ میں آجائے کہ معاذ اللہ آپ میں کسی قسم کی دیوانگی ہے۔ اسے خود آپ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے اور مقصود دوسرے لوگوں کی آنکھوں کا کھولنا ہے جو اس قسم کا غلط تصور رکھتے ہیں۔

''آپ کے لیے بڑا اجر ہے''۔ سیاق کی مناسبت سے اس کا مطلب یہ ہے کہ یقیناً ان لوگوں کی اس بات سے کہ وہ ''دیوانہ'' کہہ کر آپ کی ہدایت وتعلیم کو ناقابل قبول قرار دیتے ہیں اور آپ کے لیے ایسی غلط لفظ کا ستعمال کرتے ہیں آپ کو بڑی اذیت اور تکلیف ہوتی ہے جسے آپ برداشت کرتے ہیں۔ اس پر آپ کے لیے اللہ کے یہاں بڑا اجر ہے۔ حقیقت میں ربوبیت اور عبودیت کے رشتے کی بنا پر وہ تفضّل ہے لیکن خود اس نے جب اجر کہہ کے مقرر کیا ہے تو یہ اس کا ضامن ہے کہ اس پر احسان جتایا نہ جائیگا جو غیر ممنون کی ایک تفسیر ہے اور جس کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے۔

دوسری قسم تفسیر یہ ہے کہ ممنون کے معنی مقطوع کے ہیں یعنی وہ اجر ثواب دائمی ہوگا کبھی ختم نہ ہوگا۔

خلق کی لفظ ہماری زبان میں تو محدود ہے۔ہم اسے بس میل جول میں خاطر تواضع کے معنی میں لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہماری نزدیک اس میں سچائی کا بھی دخل نہیں ہے۔اگر ہمارا کسی سے کوئی کام ہے اور وہ سچائی کے ساتھ اپنی مجبوری کا اظہار کردے تو وہ ہمارے نزدیک بداخلاق ہے لیکن اگر وہ جھوٹا وعدہ کرلے چاہے وہ اسی وقت سمجھتا ہو کر اس پر عمل نہیں کرئے گا تو وہ خوش اخلاق ہے پہلا اس لیے بداخلاق قرار دیا گیا کہ اس نے ہمیں دھوکے میں نہیں رکھا۔صاف صاف اپنے موقف کا اظہار کردیا اور دوسرا اس لئے خوش اخلاق ہوگیا کہ اس نے میں تاریکی میں رکھا اور مبتلائے فریب رکھ کر پریشان کیا۔ایسی صورت میں ہم خالق کی اس سن کی قدر و قیمت کیا سمجھ سکتے ہیں لیکن حقیقت میں خلق کی لفظ محدود نہیں ہے وہ ہر شعبہ زندگی پر حاوی ہے۔ چاہے انفرادی زندگی ہو، چاہے منزلی زندگی ہو اور چاہے بیرونی اجتماعی زندگی ہو، رسول کو خالق نے ''خلق عظیم'' کی سند دے کر ہر شعبہ حیات میں آپ کی سیرت کی بلندی پر مہر تصدیق ثبت فرمائی ہے۔

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝ بِاَيِّيْكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝

''تو بہت جلدی آپ بھی دیکھ لیجیے گا اور انہیں بھی دکھائی دے جائے گا کہ تم میں سے کس میں دیوانگی ہے۔ یقیناً آپ کا پروردگار خوب جانتا ہے اسے جو اس کی راہ میں سے ہٹا ہوا ہے اور وہ زیادہ جانتا ہے انہیں جو سیدھے راستے پر ہیں''۔

رسولؐ کو مخاطب ہو کر یہ کہنا کہ آپ بھی دیکھ لیجیے گا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ معاذ اللہ آپ کو بھی اپنے متعلق شبہ تھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ نتائج سامنے آجائیں گے اور سب ہی دیکھ لیں گے یہ دیکھنا آپ کے لیے باعث تسلی ہوگا یعنی ان کی باتوں سے جو رنج پہونچ رہا ہے وہ دور ہوجائے گا اور ان کے لیے باعث حسرت و ندامت ہوگا جس کا عذاب آنے کے بعد کوئی حاصل نہ ہوگا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝ عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ۝

''تو آپ جھٹلانے والوں کا کہنا نہ مانیے، وہ چاہتے ہیں کہ آپ رورعایت سے کام لیں تو وہ بھی رورعایت کریں اور کہنا نہ مانیے ہر بڑے قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کا جو نکتہ چینی کرنے والا اور چغلیاں کھانے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا، خیر خیرات کو روکنے والا، ستم گر، گناہگار سرکش اور پھر اس کے بعد بداصل ہے، اس برتے پر کہ وہ مال اور اولاد والا ہے، جب ہماری آیتیں اس کے سامنے پیش ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ یہ

پرانے لوگوں کی داستانیں ہیں بہت جلد ہم اس کی سونڈ پر داغ لگا دیں گے''۔

قرآن مجید کے انداز بیان سے ظاہر ہے کہ یہ عام اوصاف نہیں ہیں بلکہ کسی شخص خاص کو ذکر میں صرف جو اپنے ان اوصاف کے ساتھ قوم میں مشہور معروف تھا، جو لفظیں اس شخص کے بارے میں صرف کی گئی ہیں، ان میں سے متعدد الفاظ کے لغت اور محاورے کے لحاظ سے کئی کئی معنی بتائے گیے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ترجمہ ان میں سے ایک ہی کے لحاظ سے ہوسکتا ہے۔

خصوصیت کے ساتھ عتل جس کا ترجمہ ہم نے ''موذی'' کی لفظ سے کیا ہے۔ اس کے معنی یہ بھی کہے گئے ہیں کہ وہ مختلف صورتوں سے لوگوں کو قید و بند میں مبتلا کراتا اور سزائیں دلواتا ہے اور اور یہ بھی کہ خود بہت کھاتا ہے اور دوسروں کو کھانا پسند نہیں کرتا اور یہ بھی بلاوجہ لڑتا جھگڑتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اصل میں یہ اس کلام کو کہتے ہیں جو بہت سخت ناگوار اور تکلیف دہ ہو۔

زنیم کے ایک معنی لیے گئے ہیں کہ وہ شریر شخص کہ جب شریر کی لفظ کہی جائے تو سب کا ذہن اسی کی طرف منصرف ہوجائے اور زیادہ تر وہ جس کے اصل باپ کا پتہ نہ ہو اور وہ غلط طور پر کسی خاندان میں داخل سمجھا جانے لگا ہو۔

''اس کا کہنا نہ مانیے'' اس سے ظاہر ہے کہ عام جھٹلانے والوں کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ اس شخص نے رسولؐ کے سامنے کوئی شرط پیش کی تھی کہ اگر آپ ایسا کیجیے تو ہم آپ کی مخالفت چھوڑ دیں گے اور وہ شرط ظاہر ہے یہی ہوسکتی تھی کہ آپ ہمارے بتوں کے خلاف تبلیغ چھوڑ دیں لیکن اگر آپ ایسا کرتے تو آپ کا مشن ہی پھر کیا رہ جاتا، اسی لیے اس کے مقابلہ میں ایسے سخت الفاظ صرف کیے گئے جن کا وہ مستحق تھا۔

آخر میں جو کہا گیا ہے کہ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ جس کا ترجمہ ہم نے کیا ہے ''ہم اس کی سونڈ پر داغ لگا دیں گے'' یوں تو سونڈ اصل میں ہاتھی کی ہوتی ہے۔ مگر ناک چونکہ عزت اور شرافت کا رمز سمجھی جاتی ہے اور وہ اپنے کو بڑا اور شاندار سمجھتا تھا، لہٰذا بطور طنز اس کی ناک کو سونڈ کہا گیا ہے اور یوں تو ناک پر داغ لگا دیں گے۔ اس کا مطلب عزت اور شرافت کا ختم کرنا اور ذلیل و رسوا کرنا ہوسکتا ہے اور اس کا آخرت سے بھی تعلق ہوسکتا ہے۔

مگر بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ جنگ بدر میں اس کی ناک پر تلوار پڑی اور اس طرح قرآنی خبر کی سچائی ثابت ہوتی ہے، یہ شخص کون ہے؟ اس کے لیے ولید بن مغیرہ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اور اسود بن یغوث کا اور اخنس بن شریق کا۔ اس کا اصل مضمون اور اس کے مقصد میں کوئی دخل نہیں ہے۔

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۙ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۙ﴿۲۰﴾ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ۙ﴿۲۱﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾

''ہم نے ان (مشرکین مکّہ) کو ویسے ہی آزمائش میں ڈالا ہے جیسے ایک خاص باغ والوں کو، جب انہوں نے قسم کھائی کہ وہ صبح ہوتے ہوتے اس کے پھل توڑ لیں گے اور وہ اس میں کوئی قید بھی نہیں لگا رہے تھے تو راتی رات اس

پر آ گئی ایک آفت تمہارے پروردگار کی ، جب کہ وہ سو رہے تھے تو وہ ہو گیا مثل اس کھیتی کے جو کاٹی جا چکی ہو تو انہوں نے صبح ہوتے ایک دوسرے کو آواز دی کہ چلو کھیتی کی طرف اگر تمہیں کاٹنا ہے''۔

کہا جاتا ہے کہ یہ یمن کے ایک باغ کا قصہ ہے۔علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:۔

كانت شيخ كان يمسك منهاقدر كفايته و كفاية اهله ويتصدق بالباقى فلمامات قال بنوه نحن احق بهالكثرة عيالنا ولا يسمعنا ان نفعل كما فعل ابونا وعزموا على حرمان المساكين فصارت عاقبتهم الى ماقص الله تعالىٰ فى كتابه...(مجمع البيان)

یہ واقعہ ایک بوڑھے آدمی کا تھا جو اس میں سے اپنے اور اپنے اہل عیال کے لیے کافی ہونے کی مقدار بھر محفوظ رکھتا تھا اور باقی کو خیرات میں دے دیتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے بیٹوں نے کہا کہ ہمارے اہل عیال زیادہ ہیں اس لیے ہم اس کے زیادہ حق دار ہیں اور ہم وہ نہیں کر سکتے جو ہمارے والد کرتے تھے اور انہوں نے مضبوط ارادہ کیا کہ وہ غریبوں کو محروم رکھیں گے تو ان کا انجام وہ ہوا جو خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہاں بیان کیا ہے۔

لایستثنون جس کا ترجمہ ہم نے کیا ''وہ کوئی قید نہیں لگا رہے تھے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اپنے منصوبے کی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ وہ اپنے اس ارادہ کے قطعی اظہار کے ساتھ انشاء اللہ بھی نہیں کہہ رہے تھے کہ اگر خدا نے چاہا تو وہ پورے باغ کے پھلوں کو توڑ کر اپنے گھر لائیں گے۔

آخر کے جملے میں ''کھیتی'' کی لفظ کے لیے کہا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس باغ میں درختوں کے بیچ بیچ میں کھیت بھی ہوں۔اس لیے انہوں نے حرث یعنی کھیتی کی لفظ استعمال کیا ہے۔

فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿٢٣﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴿٢٤﴾ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿٢٦﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿٢٧﴾

''تو وہ روانہ ہوئے اس حال میں چپکے چپکے آپس میں کہہ رہے تھے کہ دیکھو خبردار آج تیرے پاس اس باغ میں کوئی غریب فقیر آنے نہ پائے اور اس کنجوسی پر بالکل تل کر اس اطمینان کے ساتھ کہ وہ اس پر پوری قدرت رکھتے ہیں جلدی وہ وہاں پہونچے تو جب اسے (اس حال میں) دیکھا تو کہا یقیناً ہم بھٹک کر کہیں سے کہیں پہنچ گئے بلکہ ہم ہی نا کام و نا مراد ہیں''۔

یعنی جب انہوں نے خلاف توقع باغ کا یہ عالم دیکھا تو پہلے سمجھے کہ کوئی دوسرا باغ ہے ہم راستہ بھول کر ادھر آ گئے ہیں پھر غور سے دیکھا تو کہنے لگے ارے یہ تو ہمارا ہی باغ ہے اور بدنصیبی ہمارے شامل حال ہوگئی ہے کہ ہمارے باغ کا یہ عالم ہو گیا ہے۔

قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿٢٨﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا

ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

''جوان میں سے سب سے بہتر تھا کہنے لگا کہ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ کیوں تم اللہ کو یاد نہیں کرتے ہو انہوں نے کہا پاک ہے ہمارا رب یقیناً ہم ظالم ہیں تو ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے لعنت ملامت کرنے لگے، کہنے لگے وائے ہو ہم پر بے شک ہم سرکش تھے ممکن ہے اب ہمارا پروردگار ہمیں اس کے بدلے اس سے بہتر عطا کر دے یقیناً ہم اپنے پروردگار سے لو لگائے ہوئے ہیں۔ اس طرح ہوتا ہے عذاب خدا۔ اور بلاشبہ آخرت کا عذاب بہت زیادہ بڑا ہے اگر وہ جانیں''۔

کہا گیا ہے کہ یہ ان بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا جس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ یہ تمہارا رویہ غلط ہے۔ نہ وہ منصوبہ تمہارا درست ہے کہ غریبوں کو بالکل محروم کر دو۔ نہ تمہارا اپنے ارادے کی کامیابی پر اتنا اعتماد کہ تم اس کے ساتھ انشاء اللہ بھی نہیں کہتے۔ اب جب انجام سامنے آیا تو ایک دوسرے کو الزام دینے لگا کہ تم ہی نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا۔ ورنہ ہم ایسا نہ کرتے اور یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾

''یقیناً پرہیزگاروں کے لیے ان کے پروردگار کے یہاں نعمت کے گھنے ہوئے باغ ہیں کیا ہم اطاعت گزاروں کو مثل گناہگاروں کے کر دیں گے، تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسے حکم لگاتے ہو''۔

کافر لوگ کہتے تھے کہ ہم دنیا میں مزے کر رہے ہیں تو آخرت میں بھی ہم مزے میں رہیں گے اور یہ مسلمان اور پیغمبر کے گروہ میں لوگ یہاں سختیوں اور مصیبتوں میں ہیں تو دیکھنا یہ وہاں بھی تکلیف ہی اٹھائیں گے۔ اس کے جواب میں کہا جا رہا کہ یہ فیصلہ تمہارا بالکل خلاف عقل ہے وہ عالم تو جزو سزا کا ہوگا۔ اس میں یہ ممکن ہی نہیں کہ اطاعت گزار اور نافرمان یکساں ہو۔ چہ جائیکہ نافرمانوں کا انجام بہتر ہو یا فرمان بردار برے حال میں رہیں۔

اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۹﴾ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۴۱﴾

''کیا تمہاری کوئی خاص (آسمانی) کتاب ہے جس میں یہ تم پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے وہی ہے جو تم پسند کرتے ہو یا

کیا تم نے ہم سے کچھ قسمیں لے لی ہیں جو قیامت تک کے لیے ہیں کہ تمہارے لئے وہی ہے جو تم حکم لگاتے ہو۔ ان سے پوچھو کہ ان میں سے کون اس کا ضامن ہے؟ یا ان کے کچھ آدمی (ہمارے) شریک کار ہیں تو وہ اپنے شریکوں کو پیش کریں، اگر وہ سچے ہیں"۔

مطلب یہ ہے کہ عقل کا فیصلہ تو ان کے خلاف ہے جسے سابق جملوں میں ظاہر کیا گیا اور خلاف عقل ہونے کا اظہار یہ کہہ کر کیا گیا ہے۔ کیسے فیصلے کرتے ہو۔ اب بطور استفہام انکاری پوچھا جا رہا ہے کہ پھر تمہارے پاس اس کا ماخذ کیا ہے؟ کہاں سے یہ حکم لگاتے ہو؟ کیا توریت اور انجیل وغیرہ کے علاوہ جنہیں ہم جانتے ہیں، اس طرح کی کوئی خاص کتاب تمہاری ہے جس میں اُمّی گروہ کے لوگ تھے۔ ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہ تھی تو وہ کس کتاب میں لکھا ہوا دکھا سکتے تھے جو وہ کہہ رہے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ براہ رست تمہارا کوئی آدمی اللہ سے ملا ہے اور اس نے اس سے قسمیہ طور پر قیامت تک کے لیے یہ عہد و پیمان لے لیا ہو تو آخر وہ تمہارا نمائندہ جو اللہ سے ملا ہو کون ہے؟ اس کی صورت ہمیں دکھاؤ۔ یا نہ عقل کی بنا پر تمہارا یہ فیصلہ ہے، نہ کسی کتاب آسمانی میں تم نے یہ لکھا ہوا پایا ہے۔ نہ تم میں سے کسی نے منہ در منہ اللہ سے یہ عہد لیا ہے۔ تو اچھا ایک صورت یہ ہے کہ خود تم میں اس کے کچھ شریک کار ہیں جو خود ایسے فیصلے کرتے ہیں اور خاندان کے فیصلوں کا پابند ہے؟ تو وہ شریک کا اس کے کون ہیں؟ انہیں ہمارے سامنے لاؤ۔ یہ ایسے جھوٹے تھے کہ ڈھٹائی کے باوجود ادعاء بھی وہ ان کے پیش کرنے سے قاصر تھے۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾

"جس دن بڑی سختی کا ہنگام ہوگا اور کہا جائے گا سجدہ کرنے کو تو وہ سجدہ نہیں کریں گے ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی، ذلت ان پر چھائی رہی ہوگی حالاں کہ انہیں سجدے کی دعوت دی جاتی تھی اس وقت جب صحیح سالم تھے"۔

اس آیت میں لفظ ساق متشابہات میں سے ہے جس کے لیے روایتی دنیا میں آ گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی پر سے پردہ ہٹائے گا اور کہا جائے گا کہ سجدہ کر لیکن خداوند عالم کے جسم اور جسمانیات سے بری ہونے کی بنا پر قرآن مجید میں ان الفاظ سے کہ یکشف عن الساق جس کا لفظی ترجمہ یہی ہوا کہ پنڈلی کو کھولا جائے گا، یہ مفہوم نہیں سمجھا جا سکتا کہ خدا تعالیٰ خود اپنی پنڈلی کھول کر اہل محشر کو سجدے کی دعوت دے گا بلکہ کلام عرب میں یہ محاورہ ہے کہ سختی اور پریشانی کے موقع کا تصور پیدا کرنے کے لیے کشف ساق کی لفظ استعمال کرتے ہیں کیوں کہ پریشانی کے وقت گھبراہٹ میں راستہ طے کرتے ہیں، دامن اٹھا کے اس طرح پنڈلیاں نمایاں ہو جائیں قرآن مجید میں اس موقع کی سختی کے اظہار میں بطور کنایہ ان لفظوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ بہر حال یوں تو قیامت پوری ہی شدت و ہول کا مرقع ہے مگر یہ خاص موقع کوئی ایسا ہوگا جب یہ معاملہ پیش آئے گا۔ حکم الٰہی ہوگا کہ سجدہ کرو، مومنین جو صدق دل سے دنیا میں سجدہ ریز رہے تھے بلا توقف سجدے میں پیشانی رکھ دیں گے مگر منافقین جو دنیا میں سجدہ کرتے ہی نہ تھے یا کرتے بھی تھے تو بجبر و اکراہ نمائشی طور پر وہ اس وقت چاہیں گے کہ اظہار عبودیت کے طور پر سجدہ کریں مگر ان کی پشت مثل تختے کے سخت ہو جائے گی وہ سجدہ نہیں کر سکیں گے۔

فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾

''تو وہ چھوڑ دو مجھے اور انہیں جو اس کلام کو جھٹلاتے ہیں۔ ہم انہیں رفتہ رفتہ تباہی کی طرف لے جائیں گے اس طرح کی انہیں خبر بھی نہ ہوگی۔ اور میں انہیں ڈھیل دوں گا، یقیناً میری چال مضبوط ہوتی ہے۔''

یعنی کافروں کو اور رسولؐ کے پیغام حق کے جھٹلانے والوں کو جو نعمتوں کی بظاہر بارش ہو رہی ہے اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے یہ عذاب الٰہی کی ایک صورت ہے کہ یہ اس کی نافرمانی کرتا ہے اور پھر وہ اسے ایک نعمت دے دیتا ہے۔ اس طرح اس کی خدا فراموشی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور آخر میں ایک دم وہ عذاب آجاتا ہے جا وہ اپنے کفر اور معصیت کی وجہ سے مستحق تھا۔ اس کو قران مجید نے استدراج اور املاء کی لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔ اور اسی کو اپنے چال کہا ہے کہ وہ بے پناہ ہوتی ہے۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾

''تو کیا آپ ان سے کسی اجرت کے طلب گار ہیں کہ یہ مالی نقصان کے تصور سے زیر باری محسوس کر رہے ہیں یا ان کے پاس غیب کی خبریں ہیں جنہیں یہ لکھا کرتے ہیں''۔

یہ اب پھر گزشتہ انکاری سوالوں کے سلسلے کی دو کڑیاں آگئی ہیں کہ آخر وہ آپ کے پیغام حق سے اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟ کیا سمجھتے ہیں کہ اگر وہ آپ کو سچا رسول مان لیں گے تو ان سے آپ سے اپنے ہدایت پر کوئی ایسا مالی معاوضہ طلب کریں گے جس سے ان کی جیبوں پر بہت بڑا بوجھ پڑیگا اور وہ اس بار کو برداشت نہیں کر سکیں گے، تو یہ غلط ہے آپ ان سے کسی مالی معاوضہ کے طلب گار نہیں ہیں آپ تو انہی کی بہبودی کے لیے خالصاً لوجہ اللہ یہ سب مصائب برداشت کر رہے ہیں تو وہ پھر آپ کی مخالفت کیوں کر رہے ہی۔ اچھا تو کیا انہیں غیب پر کوئی دسترس حاصل ہوگیا ہے اور انہیں ذاتی طور پر علم ہوگیا ہے کہ اللہ نے آپ کو رسول نہیں بنایا ہے اور آپ کا دعویٰ سچا نہیں ہے؟ تو یقیناً ایسا بھی نہیں ہے۔ ہر پھر کر نتیجہ یہ ہے کہ ان کی مخالفت بے بنیاد ہے اور وہ بلا وجہ آپ کے پیغام کی مخالفت میں اتنی شدت کے ساتھ گرم ہیں۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ لَوْلَاۤ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾ فَاجْتَبٰىهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾

''تو اپنے پروردگار کے فیصلے کے مطابق ضبط و صبر سے کام لیجیے اور مچھلی والے (یونسؑ نبی) کی طرح نہ ہو جایئے جب کہ انہوں نے پکارا اس عالم میں کہ وہ غم و رنج میں گرفتار تھے اگر خبر نہ لیتی ان کی ان کے پروردگار کی طرف سے مہربانی تو وہ پھینکے جاتے بے آب و گیاہ کھلے ہوئے میدان میں اس حالت میں کہ وہ مذمت میں گرفتار ہوتے (مگر) اب ان

کے پروردگار نے انہیں منتخب افراد میں شامل رکھنے کے ساتھ نیکوکار بندوں میں داخل رہنے دیا"۔

یعنی اللہ نے جس طرح ان کے عذاب کا فیصلہ کیا ہے، اس کا وقت آنے تک ضبط وتحمل کے دامن کو تھامے رہیے اور اس طرح جلد بازی سے کام نہ لیجیے جیسا یونسؑ پیغمبر نے کیا تھا، اس واقعہ کی بہت سی کڑیاں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر پہلے آتی رہی ہیں۔ قوم کی مخالفت سے گھبرا کر انہوں نے بے تابی کے ساتھ بددعا کردی۔ خالق نے بتلایا کہ فلاں دن ان کی طرف عذاب بھیجا جائے گا چنانچہ اس دن سے پہلے آثار عذاب رونما ہوہی ہوئے.....اس پر ان لوگوں نے بڑے خاص طریقہ پر صدق دل سے توبہ کرلی۔

حضرت یونسؑ کے ترک اولیٰ کا اظہار

حضرت یونسؑ بجائے اس کے کہ اتنے بندگان خدا کے ہدایت یافتہ ہونے سے خوش ومسرور ہوتے اپنی بات جانے کی شرمندگی اور غصہ سے انہوں نے طے کرلیا کہ ان کی طرف واپس نہیں جاؤں گا۔ وہ دریا کے کنارے آئے اور پھر ایسا ہوا کہ کشتی کے دوسرے لوگوں نے دریا میں پھینک دیا اور حکم الٰہی سے انہیں فوراً ایک مچھلی نے نگل لیا۔ اب مچھلی کی پیٹ میں جاکر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اب قرآن مجید میں اس واقعے کی یہ کڑی ہے کہ انہوں نے پکارا.....کس طرح پکارا؟ اس کا ذکر سورۂ انبیا میں ہے کہ انہوں نے کہا:

لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۸۷

کوئی خدا نہیں سوا تیرے، یقیناً میں قصوروار ہوں" (انبیاء-۸۷)

اس پر ان کی توبہ قبول ہوتی۔ اسی کو قرآن مجید نے کہا ہے کہ اگر پروردگار کی طرف سے مہربانی انکے شامل حال نہ ہوتی تو وہ پھینکے جاتے بے آب وگیاہ کھلے ہوئے میدان میں اس حالت میں کہ وہ مذمت میں گرفتار ہوتے۔ اب یہاں ایک شبہہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ صافات آیت ۱۴۳، ۱۴۴ میں ہے کہ:۔

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ○ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ

اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں نہ ہوتے تو اس کے شکم میں قیامت تک رہتے۔

بظاہر اس محل پر جو کہا جارہا ہے، یہ اس کے خلاف ہے۔ اس کا جواب بعض اہل نظر نے یہ دیا ہے کہ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ کے معنی یہ ہیں کہ اپنی تمام زندگی میں جو اس مچھلی کے پیٹ میں جانے سے پہلے تھی اگر وہ تسبیح الٰہی کرنے والوں میں نہ ہوتے تب تو قیامت تک اس مچھلی کے شکم میں رہتے اور یہاں جو کہا جارہا ہے وہ اس وقت کی تسبیح ہے جو بطور توبہ ہے یہ کہ اگر اللہ کی قبول توبہ کے ساتھ رحمت شامل حال نہ ہوتی تو وہ چٹیل بیابان میں پھینکے جاتے حالت ندامت میں.....یعنی وہ پوری زندگی کی تسبیح تو قیامت تک اس کے پیٹ میں رہنے سے مانع تھی اور اس توبہ نے چٹیل بیابان میں پھینکے جانے کے ساتھ مذموم صورت میں ہونے سے انہیں بچایا۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝۵۱ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۵۲

"اور یقیناً جو کافر ہیں وہ اس وقت جب سنتے ہیں اس قرآن کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنی (تیز) نظروں (کے

زور سے) تزلزل کر دیں گے اور وہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ دیوانہ ہے، حالاں کہ وہ نہیں ہے مگر نصیحت تمام جہانوں کے لیے"۔

یعنی نگاہیں ان کی ایسی تند و تیز آپ پر پڑتی ہیں کہ کوئی اور ہوتو ان نگاہوں کی شدت سے خوفزدہ ہوکر اپنے موقف کو چھوڑ دے جیسا کہ کہا گیا ہے:۔

"گھور گھور کر دیکھتے کہ ڈر کر چھوڑ دے" (موضح القرآن) بعض نے کہا ہے کہ نظریں ایسی ہیں جیسے وہ ان نگاہوں سے آپ کو پیوند زمین کر دیں گے جس کے لیے علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی قدیم مفسر زجاج کے الفاظ نقل کئے ہیں کہ:۔

هذا مستعمل فی الکلام یقولون نظر الیٰ فلان نظراً یکادیم ونظراً یکادیأکلنی (مجمع البیان)

اس نے میری طرف ایسی نگاہ سے دیکھا کہ قریب تھا مجھے زمین پر گرادے اور ایسی نگاہ سے کہ قریب تھا مجھے کھا جائے۔

بعض علماؤ مفسرین نے اس ذیل میں نظر بد اور اس کے اثرات کا ذکر کیا ہے یقیناً نظر بد جسے اردو میں نظر لگانا بھی کہتے ہیں اس کی تاثیر نا قابل انکار ہے جس کے لیے احادیث بھی ہیں اور مشاہدہ میں آئے ہوئے واقعات بھی مگر مخالفت اور شدت عداوت کے ساتھ اس قسم کی نگاہ کا مجھے کوئی ربط محسوس نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کی نگاہ مزاج مخالفت کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔

سُوْرَةُ الْحَآقَّةِ

مکیّہ ..... ۵۲ ..... آیت

الحاقۃ کے لفظ ہی سے سورہ شروع ہوا ہے اور وہی اس کا نام ہوگیا ہے۔

سورۂ حاقۃ کے خاص خاص مضامین:

۱.....قیامت کے ناموں میں سے دو الحآقہ اور القارعہ۔

۲.....قیامت کا آنا یقینی۔

۳.....قیامت کے جھٹلانے والے کا مختصر طور پر انجام۔

۴.....قیامت کا ہولناک موقع۔

۵.....حاملان عرش۔

۶.....نامۂ اعمال۔

۷.....فرد قرارداد جرم۔

۸.....رسولؐ اگر رسالت کا غلط دعویٰ کرتے تو انہیں سخت سزا دی جاتی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔

اَلْحَآقَّةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الْحَآقَّةُ ۚ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ﴿۳﴾

''وہ ہو کے رہنے ولی بات، کیا ہے وہ ہو کے رہنے والی بات۔ اور تمہیں کیا خبر کہ وہ ہو کے رہنے والی بات کیا ہے؟''

یعنی وہ ہو کے رہنے والی بات جس کا نام قیامت ہے علم وتصور سے بہت بالاتر چیز ہے۔ اس اظہار اہمیت کے ساتھ سننے والوں کو بعد والے مضامین کے بتوجہ سننے کی تحریک ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ﴿۵﴾ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ﴿۶﴾ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۚ﴿۷﴾ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ﴿۸﴾

''قبیلہ ثمود اور عاد نے اس تباہ کن ساعت (قیامت) کو جھٹلایا تو ثمود جو تھے وہ بڑی زبردست آفت سے ہلاک کیے گئے اور عاد کے لوگ ہلاک کیے گیے ایک بہت تیز وتند سرد آندھی سے، جسے اس نے ان پر قائم رکھا گیا لگا تار سات ۷ رات اور آٹھ دن، تو تم (ہوتے) تو دیکھتے ان لوگوں کو زمین پر گرا ہوا اس طرح جیسے کھجور کے درخت کے اندر سے کھوکھلے تنے ہوں تو کیا تمہیں ان میں سے باقی رہنے والا کوئی بھی نظر آئے گا؟''۔

قبیلۂ ثمود کی ہلاک کرنے والی آفت کو قرآن نے دوسرے مقامات پر مختلف حالات کے لحاظ سے کہیں صیحۃ یعنی سخت مہیب اور ہولناک آواز بتایا ہے اور کہیں صاعقہ یعنی گرنے والی بجلی اور کہیں رجفۃ یعنی سخت زلزلہ کہا گیا ہے۔ اسی کو یہاں الطَّاغِيَةِ کہا گیا جس کا ترجمہ ہم کیا زبردست آفت، بظاہر یہ زبردست آفت کوئی ان تینوں باتوں سے الگ چوتھی بات نہیں ہے بلکہ انہی باتوں کی مجمل تعبیر ہے۔ آخر میں جو سوال ہے وہ صرف ایک انداز ہے اس امر کے اظہار کا کہ ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس وقت والے اس وقت کہاں تھے جو یہ دیکھتے کہ کوئی باقی رہا یا نہیں۔

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۚ﴿۹﴾ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ

فَاَخَذَ هُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴿۱۰﴾ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴿۱۱﴾ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾

''فرعون اوراس کے پہلے والوں اور (قوم لوطؑ کی) تہہ وبالا ہوجانے والی بستیوں (کے لوگوں نے) یہی غلطی کی اوراس طرح اپنے پروردگار کے پیمبر کی نافرمانی کی تو اس (خدا) نے انہیں حد سے زیادہ سخت گرفت میں لے لیا، جب پانی کا زور ہوا تو ہم نے تم لوگوں کو کشتی پر سوار کیا، تاکہ اسے تمہارے لیے یادگار واقعہ بنائیں اور اسے محفوظ رکھیں محفوظ رکھنے والے کان''۔

فرعون اوران قوموں کے عذاب کا تو بالکل مبہم طریقہ پر ذکر ہے اور پھر قوم نوحؑ کے عذاب کا جو طوفان کے ساتھ تھا نوعیت کے تعین کے ساتھ تذکرہ ہے کہ وہ پانی کے ساتھ تھا اور پھر کشتیٔ نجات کو یاد دلایا گیا ہے۔ تفصیلات اس کے بھی قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر ہیں۔ اصل میں بیان عذابوں کا براہ راست ذکر مقصود نہیں ہے بلکہ اسی قیامت کی اہمیت دکھانا ہے کہ اسی کے انکار سے یہ قومیں عذاب میں مبتلاء ہوئیں اور تباہ وبرباد ہوئیں۔ اب تم اس جرم کے مرتکب نہ ہو۔ یہ لوگ جو اس وقت ہیں اس دور میں نہ تھے جب وہ کشتی بنائی گئی تھی مگر چونکہ یہ انہی کی نسل سے ہیں جو اس کشتی پر سوار ہوئے تھے، اس لیے ان سے کہا گیا ہے کہ تم کو ہم نے اس کشتی پر سوار کر کے ساحل زندگی تک پہنچایا ورنہ آج تمہارا وجود نہ ہوتا۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾

''تو جب ایک دفعہ صور پھونکا جائے گا اور زمین اور پہاڑ وں کو اٹھا کر ایک ہی ضرب میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا تو اس وقت وہ ہوجانے والی بات ہوجائے گی اور آسمان شق ہوجائے گا، اس کا نظام اس وقت بالکل سست ہوجائے گا اور فرشتے اس کے اطراف میں ہوں گے اور تمہارے پروردگار کے عرش کو اس دن کے اوپر آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے، اس دن تم سب کی پیشی ہوگی اس طرح کہ تمہاری کوئی بات چھپی نہ رہے گی''۔

یہ ایک دفعہ والا ''صور'' اسے کوئی کہتا ہے کہ پہلا صور اور کوئی کہتا ہے کہ آخری..... ''ایک ہی ضرب میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا''۔ یہ ایک تصور کی بنا پر ترجمہ ہے..... دوسری تشریح یہ ہے کہ پہاڑ منتشر ہوکر ہوا ہوجائیں گے اور پوری زمین ایک ہوگی یعنی اس میں نشیب وفراز نظر نہیں آئے گا جیسے دوسری جگہ کہا گیا ہے:۔

فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ... لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ۔ (طٰہٰ-۱۰۵،۱۰۴)

چٹیل بیابان جس میں کہیں اور بلندی دکھائی نہ دے گی۔ عرش کو آٹھ اٹھائے ہوں گے، بالکل لفظی ترجمہ تو صرف یہی ہے۔ زیادہ جو معنی

ذہن میں آتے ہیں وہ یہی کہ آٹھ فرشتے جیسا کہ ہم نے ترجمہ کیا اور کہا گیا ہے کہ یوں تو حاملان عرش چار ہیں مگر اس دن کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے اٹھانے میں چار فرشتے اور شریک ہوں گے۔ جناب ابن عباس رضی اللہ عنہ کی زبانی ایک قول یہ ہے کہ آٹھ صفیں ملائکہ کی اٹھائے ہوئے ہوں گے جن کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے اسے علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مجمع البیان میں نقل کیا ہے..... بہر حال وہ آٹھ عدد فرشتے ہوں یا آٹھ صفیں ہوں اور بے شمار فرشتے ہوں..... جو بات ماننا ناگزیر ہے وہ یہ کہ اس سے صرف عرش الٰہی کی عظمت اور اہمیت کو دکھانا مقصود ہے..... جس سے جلال الٰہی کا اثر ذہن پر پڑے..... لیکن یہ بات ماننا صحیح نہیں ہے کہ خود خداوند عالم اس عرش پر ہوگا اس لیے کہ وہ جسم و جسمانیات سے بری ہے..... وہ نہ آج اس عرش پر بیٹھا ہے جسے چار اٹھائے ہوئے ہیں اور نہ اس دن جب کہ آٹھ یا بے شمار اٹھائے ہوں گے۔

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ۚ﴿۱۹﴾ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ۚ﴿۲۰﴾ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ۙ﴿۲۱﴾ فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ۙ﴿۲۲﴾ قُطُوْفُهَا دَانِیَةٌ ۚ﴿۲۳﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ ﴿۲۴﴾

''تو جیسے اس کا نامہ عمل دائیں ہاتھ میں دیا جاگا، وہ کہے گا آؤ پڑھو میرا نامہ عمل میں خوب جانتا ہے رہا کہ مجھے حساب دینا ہے تو یہ شخص اپنی پسند کے عیش و آرام کی زندگی میں ہوگا، بلند منزل بہشت میں جس کے بالکل تیار پھل لٹکے ہوئے ان کے نزدیک ہوں گے خوشگواری کے ساتھ کھاؤ پیو ان نیک کاموں کی بدولت جو تم گزرتے ہوئے دنوں میں کرتے رہے''۔

چونکہ نامۂ اعمال کا اپنے ہاتھ میں دیا جانا خود اس کی علامت ہے کہ وہ نیکوکار ہے اور اسے برزخ کی زندگی ہی میں جو موت سے لے کر قیامت تک کا دور ہے برابر رحمت الٰہی کے آثار اپنی نسبت نظر آتے رہے تھے، اس لیے بغیر خود پڑھتے ہوئے وہ خوشی خوشی دوسروں کی طرف اس نامہ اعمال کو بڑھا جائیگا کہ پڑھو میرا نامہ عمل میں نے ہمیشہ دنیا میں یاد رکھا کہ مجھے ایک دن اپنے پروردگار کو حساب دینا ہے، تو آج دیکھو میرا حساب کیسا صاف ہے۔ اب فوراً قدرت کی طرف سے اسے بہشت عنبر سرشت میں بھیج دیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ یہ نعمات بہشت تمہارے لیے موجود ہیں، اس پاک صاف زندگی کے لحاظ سے جو اپنے سابق دور حیات میں تم بسر کرتے رہے۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ ۚ﴿۲۵﴾ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ۚ﴿۲۶﴾ یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ ۚ﴿۲۷﴾ مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ ۚ﴿۲۸﴾ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ۚ﴿۲۹﴾ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۙ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ۙ﴿۳۱﴾ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ؕ﴿۳۲﴾

''اور جسے اس کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا کاش میرا نامہ اعمال مجھے نہ دیا جاتا اور مجھے خبر نہ ہوتی کہ میرا حساب کتاب کیا ہے؟ کاش پہلے مجھے موت آئی تھی وہی بس فیصلہ کن ہوتی (ہائے) میرے مال

نے مجھے کوئی فائدہ نہ دیا، میرا اثر اور اقتدار بھی سب برباد ہو گیا، پکڑ واسے اور ہاتھوں کو گردن سے ملا کر جکڑ دو، پھر دوزخ کی آگ میں ہمیشہ کے لیے ڈال دو، پھر ایک ایسی زنجیر میں جس کی لمبائی ستر ہاتھ ہے، اسے باندھ دو۔''

لَمْ اَدْرِ مَاحِسَابِيَهْ'' کا ایک مطلب یہ ہے جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا کہ یہ اس آرزو کا جو ہے کہ کاش میرا نامہ عمل مجھے نہ دیا جاتا، اسی پر عطف ہے یعنی کاش مجھے خبر نہ ہوتی کہ میرا حساب کتاب کیا ہے؟ اس لیے کہ اس میں سوا بداعمالیوں کے اور کچھ ہے ہی نہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں نے دنیا میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میرا حساب کتاب ہوگا، مقابل میں ان کے تو دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال لینے والے نے کہا تھا کہ میں پہلے ہی یقین رکھتا تھا کہ میرا حساب ہوگا۔ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ کا بھی یہ ایک ترجمہ ہے کہ میرا اثر و اقتدار سب برباد ہو گیا۔ دوسری تشریح کے مطابق کہ سلطان کے معنی دلیل و حجت کے ہوں ترجمہ یہ ہوگا کہ میری بحث و حجت سب ختم ہو گئی یعنی دنیا میں خوب اپنی صفائی پیش کیا کرتا تھا۔ اب آج اپنی صفائی کے لیے میرے پاس کوئی دلیل و حجت نہیں جسے میں پیش کر سکوں۔

اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۳۴﴾ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿۳۶﴾ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ﴿۳۷﴾

''یہ اللہ پر جو بزرگ و برتر ہے ایمان نہ رکھتا تھا اور کسی غریب کو کھانا دینے کی تحریک نہیں کرتا تھا تو آج اس کا کوئی مددگار نہیں ہے اور نہ زخموں سے بہتے ہوئے مواد کے سوا اس کی کوئی غذا ہے جسے نہیں کھانا پڑتا سوا خطا کاروں کے کسی کو''۔

یہ ان احکام کے ساتھ کہ '' پکڑو جکڑو اور زنجیر پہناؤ اور آگ میں جھونکو'' اب خالق کی طرف سے ان سزاؤں کی بنیاد کا بیان ہے جسے سمیٹ کر دو جملوں میں ادا کیا گیا ہے۔ ''اللہ پر ایمان نہ رکھتا تھا'' اس اجمال میں ایمان کے جتنے تقاضے ہیں، ان کے پورے نہ کرنے کی تفصیل درج ہے۔ اس طرح حقوق اللہ کا ادا نہ کرنا ہے۔ اور پھر طعام مسکین'' والے جملے میں حقوق الناس کا ادا نہ کرنا ہے۔

''کسی غریب کو کھانا دینے کی تحریک نہیں کرتا تھا'' اس میں آسان کی نفی کے ساتھ بدرجہ اولیٰ ''مشکل'' کی نفی مقصود ہے یعنی زبان کا ہلانا تو خود عمل کی بہ نسبت آسان ہوتا ہے۔ وہ خود بھلا کسی غریب کو کھانا کیا دیتا کسی دوسرے سے تحریک کرنا بھی اسے گوارا نہ تھا۔ اس آئینہ میں جو قرآن نے پیش کیا ہے ہر آدمی جو ایسا ہوا اپنا چہرہ پیش دیکھ سکتا ہے۔

فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۳﴾

''تو نہیں میں قسم کھاتا ہوں اس کی جو تمہیں دکھائی دیتا ہے اور جو تمہیں دکھائی نہیں دیتا، یقیناً ایک معزز پیغام رساں کا قول ہے، کسی شاعر کا کلام نہیں ہے، تم لوگ بہت کم ایمان لاتے ہو، نہ وہ کسی کاہن کی گفتگو ہے۔ بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو، وہ اتارا ہوا ہے تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے''۔

متعدد جگہ قرآن میں اقسم سے پہلے لا آیا ہے، ان مقامات پر ایک تصور تو یہ ہے کہ لا زائد ہوتا ہے یعنی لا اقسم کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''میں قسم کھاتا ہوں'' لا کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔ اس پر مخالفین اسلام معترض ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کے قرآن میں معاذ اللہ بے معنی حروف ہیں۔ اس اعزاز سے گھبرا کر ہی نہیں بلکہ پہلے بھی بعض اہل نظر قرآن میں حروف زائدہ کے منکر ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں علامہ بلاغی کے افادات ہم نے مقدمہ تفسیر میں درج کیے ہیں۔ رسولؐ یعنی معزز پیغام رساں سے مراد یہاں بقرینہ مقام حضرت پیغمبر اسلام ﷺ ہی مراد ہیں، بے شک بعض جگہ اس کا اطلاق حضرت جبرئیلؑ امین پر ہوا ہے کہ وہ رسول اللہ کے پاس اللہ کا پیغام لاتے ہیں مگر یہاں وہ مراد نہیں ہیں کیوں کہ شاعر اور کاہن وغیرہ وہ یہ لوگ جبرئیل کو نہیں کہتے تھے حضرت ہی کو کہتے تھے، یوں حقیقت میں جبرئیل کیطرف اور کہیں حضرتؐ کی طرف کلام کی نسبت ویسی ہی ہے جیسے قرآن مجید میں توفیٰ یعنی قبض روح کی نسبت کہیں ملائکہ کی طرف دی گئی ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: (انسآء-۹۷): اور کہیں ملک الموت کی طرف قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (سجدہ-۱۱) لیکن حقیقت میں وہ فعل اللہ کا ہے، جبکہ ارشاد ہوا، اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا (زمر-۴۲) اسی طرح نبی کریم ﷺ کیطرف قول کی نسبت اس لیے ہے کہ لوگوں تک وہ آپ کے ذریعہ سے پہنچتا تھا اور جبرئیلؑ کا قول تھا اس لیے کہ حضرتؐ تک وہ ان کے ذریعہ سے پہنچتا تھا لیکن اصل میں وہ اللہ کا قول ہے۔ اسے آخر کے جملے سے ظاہر کیا گیا ہے وہ اتارا ہوا ہے تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے، لہٰذا حقیقت میں وہ کلام الٰہی ہے۔ نہ وہ کلام جبرئیلؑ ہے اور نہ کلام رسول خدا ﷺ۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾

''اور اگر وہ ہم پر کوئی قول خود بنا کر منڈھتا ہے تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑتے، پھر اس کی رگ حیات کو کاٹ دیتے تو تم میں سے کوئی اس کے آگے سدّ راہ نہیں ہوسکتا تھا اور بلاشبہ یہ نصیحت ہے پرہیز گاروں کے لیے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں سے بہت سے جھٹلانے والے ہیں اور یقیناً یہ غم وغصہ کا باعث ہے کافروں کیلئے اور بلاشبہ وہ بالکل یقینی حقیقت ہے تو آپؐ (ان کی پروانہ کیجیے) اپنے پروردگار بزرگ کی تسبیح کرتے رہیے''۔

سابق جو کہا گیا تھا کہ یہ رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے، اسی پر زور دینے کے لیے کہا جارہا ہے کہ بھلا کیا مجال کہ یہ رسول اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر اس قول کو ہماری طرف منسوب کرے اگر وہ ایسا کرے تو ہم اس کو تمہارے سامنے سخت سزا دیں جس سے کوئی اسے بچا نہیں سکتا۔ یہ خاص حضرتؐ کی حقانیت کو بتاکید ظاہر کرنے کے لیے ایک انداز بیاں ہے، اس میں کسی عام اصول کا اعلان نہیں ہے کہ جو غلط دعویٰ نبوت کا کرے ہم اس کے ساتھ یہ سلوک کریں گے جب کہ اس غلط دعویدار کے دعوے کے غلط ہونے کے لیے پہلے سے ثبوت موجود ہو جیسے مسلم الثبوت سابق رسول کا اعلان کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ ایسے دعویدار کی حقانیت کے لیے اس اعلان قرآن سے استدلال درست نہیں ہے۔

سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ

مکیّہ.....۴۴.....آیات

بالکل آغاز میں ہی نہیں مگر شروع ہی کے حصے میں المعارج کی لفظ ہے، اس پر سورے کا نام ہوا۔

سورۂ معارج کے خاص خاص مضامین:

۱.....پچاس ہزار برس کا ایک دن،

۲.....قیامت کا ہولناک منظر۔

۳.....نفسی نفسی کا عالم۔

۴.....انسان کی طبعی کمزوریاں۔

۵.....مستثنیات۔

۶.....سچے نمازیوں کے اوصاف۔

۷.....خدا کے دائرہ کار سے کوئی نکل نہیں سکتا۔ وغیرہ وغیرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنانے والا بڑا مہربان ہے۔

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ؕ﴿۳﴾

''ایک طلب کرنے والے نے طلب کیا اس عذاب کو جو ہونے ہی والا ہے کافروں کے لیے، اسے کوئی ٹالنے والا نہیں ہے، اللہ کی طرف سے جو بلندی کے زینوں کا مالک ہے''

سوال کے ایک معنی تو پوچھنے کے بھی ہوتے ہیں اور اس لیے ایک تفسیر اس آیت کی یہ ہوئی ہے کہ ایک شخص نے دریافت کیا ہے اس عذاب کے متعلق جو آنے والا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دریافت کیا ہے؟ دوسرے مقامات پر جو کفار کی گفتگو میں ہیں، ان کی بنا پر تو پوچھنے کا تعلق اس کے وقت سے ہونا چاہیے کہ آخر وہ کب آئے گا جیسے وہ قیامت کے لیے کہتے تھے مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ.(سورہ یٰسٓ۔ ملك۔ سبأ۔ نمل) یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو'' مگر یہاں اس کے بعد بلا فاصلہ للکافرین کی لفظ ہے لہٰذا کہا

جاتا ہے کہ وہ یہ دریافت کرتے تھے کہ یہ عذاب آخر کن پر ہوگا؟ اس کا جواب دیا گیا للکافرین ''وہ عذاب کافروں کے لیے ہے''.....میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ اس صورت میں کہ یہ اس کا جواب ہے اس کے پہلے بعذاب واقع کی لفظ پر کسی وقف کی علامت ہونا چاہیے، نہ کہ لا جو عدم وقف کا رمز ہے لہٰذا اگر یہ سوال پوچھنے کے معنی میں ہے تو اس کا تعلق وقت ہی سے ہونا چاہیے کہ وہ کب ہوگا؟ اور پھر اس کا جواب بعد میں یہ ہوگا کہ وہ قیامت کے دن ہوگا جو ایسا ہولناک ہے۔

اس تفسیر کے برخلاف دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ سوال پوچھنے کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ طلب کرنے کے معنی میں ہے جیسا کہ دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے کہ ایک کافر نے کہا کہ:۔

اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (الانفال ۳۲-)

''پروردگارا اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا (خداوندا) اور کوئی دردناک عذاب لے آ''۔

چونکہ زیادہ تر مفسرین اسی تفسیر کے حق میں ہیں لہٰذا ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے اور وہ ہمارے یہاں کی ایک روایت کے موافق بھی ہے جسے علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع البیان میں اپنی سند خاص سے امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی درج کیا ہے کہ روز غدیر ولایت امیر المؤمنین علیہ السلام کے اعلان کے بعد نعمان بن حارث فہری حضرت رسول اکرمؐ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ یہ اعلان کیا؟ اللہ کی طرف سے کیا۔ اپنی طرف سے نہیں تب اسی نے وہ کہا جس کا ذکر سورۂ انفال میں ہے اور اسی کا تذکرہ یہ سورہ معارج میں ہے۔ کہا گیا ہے کہ اہل سنت کی تفسیر درمنثور میں بھی اس طرح کی روایت ہے۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ ﴿۴﴾

''فرشتے اور روح اس کی بارگاہ میں بلندی کی منزلیں طے کر کے حاضر ہوں گے ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس کی ہے''۔

پچاس ہزار برس کا ایک سال

یہ دن کون ہے؟ اس میں ایک تصور یہ ہے کہ اس سے روز قیامت مراد ہے جس کے بعد میں تعارف ہے اور اس کے کیفیات کا بیان ہے کہ وہ دن ایسا دن ہوگا اور پچاس سال کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس مدت کو دنیا کے دنوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ پچاس سال کی ہوگی نہ یہ کہ وہاں سورج اور چاند کی گردش سے ماہ و سال کی تشکیل ہوتی ہے اور بلندیاں طے کر کے ملائکہ اور روح کے اس کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اب تمام عمر کائنات کے باہمی رشتے قطع ہو چکے ہیں اور سب کی رجوع اسی کی طرف ہو چکی ہے.....تمام فرشتوں کی بارگاہ میں حاضری کے لیے دو آیتیں اور ہیں۔

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ

''اور دیکھو گے فرشتوں کو گھیرا لگائے ہوئے عرش کے اردگرد،

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا

جس دن روح اور ملائکہ ایک صف میں کھڑے ہوں گے۔

اس کی تائید کہ اس سے قیامت مراد ہیں اس حدیث سے ہوتی ہے جو امالی شیخ میں ایسی سند کے ساتھ جو امام جعفر صادق علیہ السلام تک پہونچتی ہے وارد ہوئی ہے کہ قیامت میں پچاس موقف ہیں جن میں سے ہر ایک موقف دنیا کے ایک ہزار سال کے برابر ہے اور پھر حضرت نے اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ ۔ یہ حدیث روضہ الکافی میں بھی حفص بن غیاث کی روایت کے ساتھ امام جعفر صادق علیہ السلام سے وارد ہوئی ہے۔

دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ اسی دور عالم سے متعلق ہے۔ اب چونکہ ایک جگہ قرآن مجید میں ہے:۔

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (حج-۴۷)

یقیناً تمہارے پروردگار کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے۔

اور اسی طرح سورہ سجدہ آیت پانچ میں بھی ہے کہ 'ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ایک ہزار سال ہے'۔ اور یہاں پچاس ہزار برس کہے گئے ہیں تو کہا گیا ہے کہ یہ ہزار اور پچاس ہزار سب بطور مثال ہے' ورنہ کائناتی منصوبے لاکھوں اور کڑوروں اور اربوں سال کے بھی ہوتے ہیں'۔

اس لیے قیامت کے آنے میں جلدی کا مطالبہ کرنا غلط ہے اور اس میں دیر کو اس کے سرے سے بے بنیاد ہونے کی دلیل قرار دینا محض جہالت ہے۔

روح سے مراد اور بظاہر تو جبرئیل امین ہی ہیں جن کے لیے سورہ شعراء آیت ۔ ۱۹۳ ۔ ۱۹۴ میں ارشاد ہوا ہے:۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (الشعراء۔۱۹۳)

اسے روح امین نے آپ کے دل پر اتارا ہے' اور سورہ بقرہ میں جبرئیلؑ کا نام لے کر کہا گیا ہے کہ نزلہ علیٰ قلبكَ 'انہوں نے آپ کے دل پر اسے اتارا ہے' اور ملائکہ کے عمومی میں داخل ہونے کے باوجود نام لے کر انہیں الگ ذکر کرنا ان کی اہمیت اور خصوصی امتیاز و رفعت کے اظہار کے لیے ہے۔

علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ کے خیال میں ظاہر یہ ہے کہ روح سے مراد وہ روح ہے جسے سورۂ بنی اسرائیل آیت ۔ ۸۵ میں کہا گیا ہے کہ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ ہے کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے' اور یہ روح ملائکہ سے الگ ہے اور سورۂ نحل آیت ۲ میں ہے:۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ ''فرشتے روح کو اس کے علم امر سے اتارتے ہیں'' مگر یہ روح کیا ہے؟ اور وہ فرشتوں کے ساتھ جا کر عرش کے پاس کیوں کر کھڑی ہوتی ہے، یہ چیز پھر تشنہ ہے۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝۵ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝۶ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝۷

''تو آپ اچھے طریقہ پر صبر و برداشت سے کام لیجیے، وہ لوگ اسے دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے نزدیک جانتے ہیں''

چونکہ کافروں کی اس قسم کی باتوں سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت تکلیف ہوتی تھی لہٰذا کہا گیا ہے اور وہ درحقیقت بطور سرکشی و عناد اذیت

پہنچانے کے لیے کہتے ہی تھے، اس لیے حضرت کو اس پر صبر و برداشت سے کام لینے کے لیے کہا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ لوگ چونکہ حقیقت میں اسے بعید از امکان سمجھتے ہیں اور اس کے وقوع پر یقین ہی نہیں رکھتے اس لیے مدت بھی انہیں دراز محسوس ہوتی ہے اور ہم یعنی خدا اور رسول اور مؤمنین سب اس کے وقوع کو یقین جانتے ہیں اس لئے ہمارے لئے طول مدّت بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ عذاب ہو یا وہ دن کوئی بھی ہمارے نزدیک دور نہیں ہے۔ بلکہ قریب ہی ہے جیسے کل ہونے والی بات بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ وقوع میں آئی ہوئی بات۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۙ﴿۸﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۙ﴿۹﴾ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۖ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ۙ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۙ﴿۱۲﴾ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۙ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۙ﴿۱۴﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ۙ﴿۱۵﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۖ﴿۱۶﴾ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۙ﴿۱۷﴾ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۙ﴿۱۸﴾

''جس دن آسمان مثل پگھلی ہوئی چاندی کے ہوگا اور پہاڑ مثل دھنکے رنگ برنگ اون کے ہوں گے اور کوئی دوست دوسرے دوست کو نہ پوچھے گا، حالاں کہ وہ انہیں دکھائے جا رہے ہوں گے۔ گناہگار شخص آرزومند ہوگا کہ کاش اس دن کے عذاب کے عوض میں وہ دے دیتا اپنے بیٹوں کو اور اپنی رفیقہ حیات کو اور اپنے بھائی کو اور اپنے بہت قریبی خاندان کو جو اس کے لیے جائے پناہ تھا اور روئے زمین پر جتنے ہیں سب کو پھر یہ اسے چھٹکارا دیتا ہرگز نہیں یہ تو بھڑکتی ہوئی آگ کا شعلہ ہے جو جوڑ بند کو الگ کر دے گا وہ اپنی طرف بلائے گا اسے جس نے روگردانی کی اور پیٹ پھرائی اور دولت اکٹھا کی اور اسے محفوظ جگہوں میں رکھا''۔

مھل کے معنی پگھلا ہوا تانبا بھی کہے گئے ہیں، پگھلا ہوا سونا چاندی اور بعض نے کہا ہے پگھلی ہوئی مختلف دھاتیں لیکن زیادہ تر اس کے معنی پگھلی ہوئی چاندی ہی کے کہے گئے ہیں۔ اب یہ تشبیہ کس بات میں ہے؟ یہ مبہم ہے۔

قرآن مجید میں احوال قیامت میں آسمان اور پہاڑ ہر ایک کے مختلف مقامات پر مختلف کیفیات وارد ہوئے ہیں، یہ مختلف اوقات میں یکے بعد دیگرے جو صورتیں رونما ہوں گی وہ ہیں۔ جن میں سے کبھی کسی صورت کو بیان کر دیا گیا ہے اور کبھی کسی صورت کو۔ ان میں ترتیب قائم کرنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ ''دھنکے ہوئے رنگ برنگے اون'' کی طرح ہوں گے، چونکہ خود پہاڑوں کے مختلف رنگ ہیں۔ یہاں ''دھنکے ہوئے کی صفت لفظ عھن کے اندر مضمر ہے اور دوسری جگہ عھن کی لفظ کے معنی سے اس صفت کو نکال کر الگ سے اس کا وصف قرار دیا گیا ہے کالعھن المنفوش اور پھر ایک جگہ تو ہے کہ وہ مثل ھبآءً منثورا ہو جائیں گے یعنی وہ بے حقیقت طرح کے ذرّے جو روشن دان وغیرہ سے جب دھوپ آ رہی ہو نظر آتے ہیں۔ کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا حالاں کہ وہ انہیں دکھائے جا رہے ہوں گے یعنی یہ نہیں ہے کہ وہ غائبانہ نہیں بھول گئے ہیں، ان کا خیال نہیں آتا۔ بلکہ وہ ان کے سامنے ہیں اور فرشتے انہیں توجہ دلا رہے ہیں کہ دیکھو تمہارا جگری دوست ہے مگر نفسی نفسی کا عالم وہ

ہوگا کہ کوئی ایک دوسرے کو نہ پوچھتا ہوگا کہ تم پر کیا گزر رہی ہے۔

تو جیسا ہر جگہ قرآن مجید میں اہل دوزخ کے اوصاف میں حقوق الناس کی عدم ادائیگی کو اہمیت دی گئی ہے، وہ یہاں بھی ہے کہ وہ آگ انہیں اپنی طرف بلا رہی ہوگی جو پیسے بچا بچا کر رکھیں اور خیر وخیرات میں بخل سے کام لیں اور پھر بعد کی آیتوں میں بھی جو بھی آئیں گی منفی اور مثبت دونوں طریقوں سے زور دیا ہے

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴿١٩﴾ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ﴿٢٠﴾ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ﴿٢١﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿٢٢﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ ﴿٢٤﴾ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿٢٥﴾ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِينَ هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ﴿٢٧﴾ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ﴿٢٨﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿٢٩﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿٣٢﴾ وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ﴿٣٣﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿٣٤﴾ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُكْرَمُونَ ﴿٣٥﴾

''یقیناً انسان چھوٹے دل والا پیدا ہوا ہے جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو بے قرار ہو جاتا ہے اور جب کچھ دولت ہاتھ آتی ہے تو بخل سے کام لیتا ہے سوا ان نماز گزاروں کے جو ہمیشہ نماز کے پابند رہتے ہیں اور جن کے مال میں ایک مقرر حق ہے سوال کرنے والے اور نہ سوال کرنے والے محتاج کے لیے اور جو جزا و سزا کے دن کو سچ مانتے ہے اور جو اپنے پروردگار کے طرف کی سزا سے ڈرتے رہتے ہیں یقیناً ان کے پروردگار کی سزا ایسی ہے جس سے مطمئن نہیں ہونا چاہیے اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کو محفوظ رکھتے ہیں سوا اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو ان کی ملکیت میں ہیں کہ اس میں ان پر کوئی الزام نہیں ہے تو جو اس سے آگے بڑھے تو یہ لوگ ستم گار ہیں اور وہ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کا لحاظ رکھنے والے ہیں اور وہ جو اپنی گواہیوں پر برقرار رہتے ہیں اور وہ جو اپنی نماز کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ بہشتوں میں عزت کے ساتھ جا گزیں ہیں''۔

''چھوٹے دل کا ہونے'' کی تشریح وہی ہے جو خود قرآن میں اس کے بعد کے جملوں میں ہے کہ جب کوئی مصیبت آتی ہے تو بے قرار ہو جاتا ہے، اس پر صبر نہیں کرتا اور جب کچھ بھی دولت ہاتھ آتی ہے تو بخل سے کام لیتا ہے اور چھوٹے دل کا پیدا کیا گیا ہے، اس کا یہ مطلب

نہیں کہ وہ اس طرح کی پیدائشی چیزیں ہیں کہ ان میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اس سے استثنا کیوں ہوتا اس استثنا کے معنی ہی ہیں کہ انسان اپنی نفسانی خواہش کا مقابلہ کر کے ان طبعی میلانات کو مغلوب کر سکتا ہے۔

ان میں جو ان برے اوصاف سے مستثنیٰ ہیں اول اور آخر نماز کا ذکر اس کی اہمیت کا ثبوت ہے پہلی جگہ باعتبار زمانہ اس کی مداومت کا ذکر اس کی اہمیت کا ثبوت ہے پہلی جگہ باعتبار زمانہ اس کی مداومت کا ذکر ہے کہ وہ ناغہ نہیں کرتے اور آخر میں باعتبار کیفیت اس کی ادائیگی کا ذکر ہے کہ وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں یعنی اس کے شرائط وارکان کو صحیح طریقے پر انجام دیتے اور اسے ایسے رجوع قلب سے ادا کرتے ہیں کہ جو اس کے مقاصد ہیں وہ بخوبی پایہ تکمیل تک پہونچیں۔

''ان کے اموال میں ایک مقرر حق ہے'' چونکہ مقرر کی لفظ سے سمجھ میں یہ آتا ہے کہ قانون الٰہی یعنی شریعت کے لحاظ سے وہ حق مقرر ہے اور یہ زکوٰۃ میں ہوتا ہے کہ اس نصاب معین ہے اور اس کے لحاظ سے مقدار مقرر ہے کہ وہ ادا کرنا لازم ہے، اس لیے بعض لوگوں نے اسے اس سورے یا ان آیات کے مدنی ہونے کی دلیل قرار دیا ہے چونکہ فریضہ زکوٰۃ مدینہ میں عائد ہوا ہے مگر تقرر کی لفظ سے یہ سمجھنا ضروری نہیں ہے کہ وہ خالق کی طرف سے مقرر ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے خود طے کر رکھا ہے کہ اپنے اموال میں سے اتنا وہ ضرورت مند کی امانت میں صرف کریں گے، بعد میں فریضہ زکوٰۃ کی صورت سے اس کی شرح مقرر ہوگئی مگر اس کے بعد بھی اہل خیر کے لیے یہ دروازہ کھلا رہا ہے کہ وہ خود اس سے زیادہ امداد محتاجان میں صرف کریں۔

''اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے'' اس میں زنا کاری سے بچنا بھی ہے اور عریانی سے بھی، اپنی امانتوں کا لحاظ رکھتے ہیں، ان میں وہ امانتیں بھی ہیں جو لوگ اس کے سپرد کرتے ہیں خواہ مال ہو یا کوئی منصب جو اسے تفویض کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے مشورہ لے رہا ہے تو اس کے لیے بھی وارد ہے کہ المستشار مؤتمن جس سے مشورہ لیا جا رہا ہے وہ ابھی امانت ہے جو اسکے سپرد کی گئی ہے، اس کا لحاظ یہ ہے کہ صحیح مشورہ دیا جائے اور وہ امانتیں بھی جو خدا کی طرف سے اس کے حوالے کی گئی ہے۔ اس میں اللہ کی سب نعمتیں داخل ہیں کہ یہ انہیں صحیح مصرف میں صرف کرتا ہے یا نہیں اولاد ایک امانت ہے کہ یہ ان کی صحیح تربیت کریں۔ اعضا وجوارح بھی امانت ہیں کہ یہ انہیں انہی مقاصد میں صرف کرے جن سے عطا کرنے والا راضی ہے اور جو اس کا مقصد عطا ہے۔

عہد کا لحاظ رکھتے ہیں، اس میں ایک وہ عہد پیماں ہے جو یہ خود دوسرے لوگوں سے کرتا ہے اور ایک عہد وہ بھی ہے جو بندۂ خدا ہونے کے لحاظ سے اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ اس نے اللہ سے کیا ہے کہ یہ اس کے احکام پر عمل کرے گا۔

''جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں'' یعنی جن باتوں کے وہ شاہد عینی ہیں ان پر جب گواہی طلب کی جائے تو وہ بے کم کاست سچ سچ گواہی دیں، کسی قسم کی حق پوشی سے کام نہ لیں اور جن باتوں کی وہ دینی حیثیت سے گواہی دیتے ہیں ان پر اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں مثلاً توحید ورسالت اس کے تقاضوں پر عمل کرنا بھی گواہیوں پر قائم رہنے میں داخل ہے۔

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿٣٦﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿٣٧﴾
اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿٣٨﴾ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ

مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾

''تو کیا ہو گیا ہے لوگوں کو جو کافر ہیں کہ وہ آپ کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں دائیں اور بائیں سے غول پر غول ؟ کیا ان میں سے ہر ایک یہ لالچ رکھتا ہے کہ وہ نعمتوں والے بہشت میں داخل کر دیا جائیگا ؟ ہرگز نہیں بلاشبہہ ہم نے انہیں پیدا کیا ہے اس سے جو وہ جانتے ہیں''۔

یوں تو یہ کہ دوڑے چلے آتے ہیں اسطرح ۔یہ منافقین کے حسب حال ہے جو اپنے نمائشی اسلام کے لیے اس طرح دوڑتے ہوئے رسولؐ کی طرف آتے ہیں جیسے بہشت کے سب سے حقدار وہی ہیں، اس لیے بعض حضرات نے اسے منافقین پر منطبق بتاتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ سورہ مدینہ کا نازل شدہ ہے کیوں کہ منافقین کا گروہ مدینہ میں ہی پیدا ہوا تھا اور قرآن کا الذین کفروا ''وہ جو کافر ہیں'' کہنا اس کے منافی نہیں ہے کیوں کہ حقیقت میں تو منافق بھی دل سے کافر ہیں چنانچہ علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کل امرء منھم ''ان میں سے ہر شخص'' کے تحت میں لکھ دیا ہے مگر ایک تو سورہ بالاتفاق مکی ہے اور پھر منافقین کے لیے تو دوسری جگہ ہے کہ وہ نماز تک میں بڑی سستی کے ساتھ آتے ہیں تو وہ ذوق شوق سے آپ کی طرف دوڑتے ہوئے کیوں آئیں گے؟

لہٰذا تمہارے لوگوں نے کہا ہے کہ یہ کافروں اور مشرکوں کا ذکر ہے کہ وہ رسولؐ کی دعوت تبلیغ کے وقت ادھر ادھر سے دوڑتے ہوئے آئے تھے رکاوٹیں پیدا کرنے کے لیے آپ کو طرح طرح سے پریشان کرنے کے لیے۔

آخر جملے کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ اپنے کردار کے باوجود ان کا داعیہ یہ ہے کہ آخرت اگر کوئی چیز ہے تو وہاں بھی یہی آرام سے رہیں گے جیسا کہ اس کے پہلے سورہ قلم میں آچکا ہے مگر جنت تو ایمان اور عمل صالح سے وابستہ ہے اور اسی سے انسان میں وہ پاکیزگی آتی ہے کہ جنت میں جانے کا مستحق ہے۔اور پھر یہ اپنے کردار کے لحاظ سے اس نجاست پر قائم ہیں جو ان کے مبدأ خلقت والے نجس مادے کا تقاضا ہے تو وہ اس طاہرین ومطہرین والی جنت میں کیوں کر جا سکتے ہیں۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾

''تو نہیں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی کہ ہم اس پر قدرت رکھتے ہیں کہ ان کے بدلے ان سے بہتر پیدا کر دیں اور ہمیں بے بس بنایا نہیں جا سکتا تو چھوڑئے انہیں کہ یونہی اپنی سرگرمیوں اور کھیل کود میں مصروف رہیں یہاں تک کہ ان کا سامنا ہو ان کے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ وعید کیا جا رہا ہے جس دن یہ

نکلیں گے قبروں سے تیزی کے ساتھ جیسے وہ بتوں کے معبودوں کے طرف دوڑتے ہیں، ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ،ذلت اور عاجزی ان پر چھائی ہوئی ہوگی، وہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ وعید کیا جارہا ہے''۔

قرآن مجید میں کہیں مشرق اور مغرب (واحد کے صیغے کے ساتھ) ہے تو وہ بظاہر ہے کہ اسی کرۂ ارض کے ایک حصے کے مشرق اور مغرب ہیں کہ جدھر سے آفتاب طلوع ہوتا ہے وہ مشرق ہے اور جدھر سے آفتاب غروب ہوتا ہے وہ مغرب ہے اور کہیں مشرقین اور مغربین (تثنیہ کی صورت میں) یہ لفظ ہے جس کے معنی ہیں دو مشرق اور دو مغرب ،اسے سابق زمانے میں یوں سمجھا جاتا تھا کہ یہ گرمی اور جاڑے کے لحاظ سے ہے کہ ان میں نمایاں طور پر موسم کے لحاظ سے محل طلوع اور محل غروب میں فرق ہوجاتا ہے اور اب یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کرۂ ارض کے دونوں طرف کے حصوں کے لحاظ سے ہے کہ جب اِدھر طلوع ہوتا ہے تو اُدھر غروب ہوتا ہے اور جب اُدھر طلوع ہوتا ہے تو اِدھر غروب ہوتا ہے اور یہاں مشارق اور مغارب (جمع کی صورت سے) جس کے معنی ہوئے بہت سے مشرق اور بہت سے مغرب ۔اسے یوں بھی سمجھا گیا ہے کہ ہر دن کا مشرق اور مغرب الگ الگ ہوتا ہے۔اور سورجوں کی کثرت کے لحاظ سے بھی وہ علم جدید کے مکتشفات میں سمجھا جاتا ہے لیکن ایمہ دینؑ نے پہلے ہی اس کا انکشاف کیا تھا جس پر مقدمہ تفسیر میں روشنی ڈالی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ جتنے سورج ہیں اتنے ان کے مشرق ہیں اتنے ہی ان کے مغرب ہیں۔

اب وہ بات ہے جو اس قسم کے ساتھ کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ قادر ہے کہ وہ ان سے بہتر پیدا کردے یعنی عذاب نازل کر کے اس پوری جماعت کا خاتمہ کردے اور ان کے عوض میں دوسرے خلق فرمادے جو اوصاف کے لحاظ سے ان سے بہتر ہوں۔

ان کے دوڑنے کی جو کیفیت بیان ہوئی ہے، وہ طنزیہ طور پر ہے کہ اس دنیا میں تو بڑے ذوق وشوق اور بڑی عقیدت کے ساتھ اپنے بتوں کی طرف جاتے ہیں۔اب اُس دن وہ قبروں سے نکل کر اور محشر کے حکم سے اُس کے قرار دیئے ہوئے مرکز حساب کی طرف اُسی تیزی سے جارہے ہیں جیسے کہ وہ اپنے بتوں کی طرف جاتے ہیں۔

نصب کی ایک تشریح ان نصب شدہ پتھروں یا ستونوں کے ساتھ کی گئی ہے جس کی طرف گھوڑا دوڑ کے میدان میں گھوڑے دوڑائے جارہے ہوں کہ ایک چاہتا ہے دوسرے کے آگے اس کو پھاند جائے ویسی تیزی کے ساتھ وہ اس وقت جارہے ہوں گے۔

سُوْرَةُ نُوْحٍ

مکیّہ.....۲۸.....آیات

اس سورہ میں چونکہ شروع سے لیکر آخر تک حضرت نوحؑ ہی کا حال ہے، اس لیے اس سورے کا نام یہ ہوا۔

سورۂ نوح کے خاص خاص مضامین:

اس میں خالق کی طرف سے حضرت نوحؑ کا ہونا، ان کا پیغام۔ اس پیغام پر قوم کا رویہ خود حضرت نوحؑ کی بارگاہ الٰہی میں مناجات کی شکل میں اور پھر ان کے لیے دعائے عذاب نتیجہ میں عذاب کا آنا اور اس کا مختصر بیان اور پھر آخر میں حضرت نوحؑ کی بارگاہ الٰہی میں دعا، بس انہی امور کا بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ①

''ہم نے بھیجا نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف کہ تم متنبہ کرو اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ ان پر دردناک عذاب آئے۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے آنے سے پہلے ہی اس قوم کا کفر و شرک اور بداعمالیاں انہیں عمومی طور پر عذاب الٰہی کا مستحق بنا چکی تھیں۔ حضرت نوحؑ انہیں اس سے خبردار کرنے کے لیے آئے تھے۔ اتمام حجت کے طور پر اور پھر اس لیے کہ ان میں سے کچھ ایمان لے آئے اور اپنی بداعمالیوں کو چھوڑ کر صحیح راستے پر آجائیں تو وہ اس عذاب سے محفوظ رہیں چنانچہ کچھ لوگ ایمان لائے ہی تھے، ورنہ وہ کون تھے جو ان کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے اور جن سے پھر نسل آگے بڑھی اور پھر وقتاً فوقتاً ان میں انبیا آئے۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ③ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ④

''انہوں نے کہا اے میری قوم والو! میں تمہیں صاف طور پر متنبہ کرنے والا (پیغمبر) ہوں کہ عبادت کرو اللہ کی

اور اس سے ڈرو اور میرا کہا مانو تو وہ کچھ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے، اور تمہیں ایک مقررہ مدت تک زندگی گزرنے کے لیے چھوڑ دے، یقیناً اللہ کی طرف کا مقررہ وقت جب آجاتا ہے تو وہ ٹالا نہیں جا سکتا اگر تم جانو''۔

''اللہ کی عبادت کرو'' یعنی صرف اسے اپنا معبود مانو اور غیر اللہ کی جو عبادت کرتے ہو، اسے ترک کرو، شرک نہ کرو، اس کی عظمت کے تقاضے کو محسوس کرو، اور اس کے عذاب کا خوف کرو اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا نمائندہ جو احکام تم تک پہنچائے، ان کی تعمیل کرو۔

''تمہارے کچھ گناہوں کو معاف کر دے'' یعنی ایمان لانے سے پہلے اب تک کے کفر کی حالت میں اور ان میں بھی حقوق اللہ قابل معافی ہیں لیکن حقوق الناس معاف نہیں ہوتے۔ [1] ''ایک مقررہ مدت تک زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دے'' اور پھر یہ کہ ''اللہ کی طرف کا مقرر وقت جب آجاتا ہے تو ٹالا نہیں جا سکتا'' اس سے یہ ظاہر ہے کہ ان کے لیے دو مدتیں مقرر ہیں۔ ایک مدت اس صورت میں ہے جب وہ ایمان لے آئیں اور اطاعت رسول کریں۔ اس صورت میں وہ اس عمر تک پہونچیں گے جس کے بعد ہر ایک کو موت آتی ہے اور ایک مدت اس صورت میں ہے کہ جب وہ اپنے کفر و انکار پر قائم ہیں تو اس وقت عذاب کا آنا ان کے لیے مقرر ہے اور وہ عذاب کا وقت جب آجائے تو وہ ٹل نہیں سکتا۔ علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ وہ جسے کہا ہے ٹل نہیں سکتا، اس سے مراد وہ وقت ہے جو ایمان لانے کی صورت میں ان کی موت کا مقرر ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

فی هذا دلالة علیٰ ثبوت الاجلین لانه شرط فی الوعد بالاجل المسمیٰ عبادة الله ولتقویٰ فلما لم یقم ذالك منهم اقتطعوا بعذاب الاستیصال قبل الاجل الاقصیٰ بالاجل الادنیٰ ثم قال ان اجل الله یعنی الاقصیٰ اذا جآء لا یؤخر (مجمع البیان)

اس سے پتہ چلتا ہے دو مدتوں کا اس لیے کہ اس نے مقرر مدت تک پہونچنے میں شرط رکھی عبادت اور تقوی کی تو جب ایسا انہوں نے نہیں کیا تو وہ ختم کر دئے گئے عذاب استیصال کے ساتھ اس دور والی مدت سے پہلے قریب والی مدت کے ساتھ پھر کہا کہ اللہ کی طرف کا وقت وہ دور والا جب آجاتا ہے تو پھر دیر نہیں ہوتی۔ ہمارے خیال میں پہلی صورت زیادہ الفاظ آیت کے مطابق ہے یعنی یہاں جسے کہا ہے وہ ٹل نہیں سکتا، وہ وہی درصورت عدم ایمان عذاب آنے کی گھڑی ہے جو خالق نے مقرر کر دی ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّنَهَارًا ۙ﴿۵﴾ فَلَمۡ یَزِدۡهُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا ﴿۶﴾ وَاِنِّیۡ
كُلَّمَا دَعَوۡتُهُمۡ لِتَغۡفِرَ لَهُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَهُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَاسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَهُمۡ
وَاَصَرُّوۡا وَاسۡتَكۡبَرُوا اسۡتِكۡبَارًا ۚ﴿۷﴾ ثُمَّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُهُمۡ جِهَارًا ۙ﴿۸﴾ ثُمَّ اِنِّیۡۤ اَعۡلَنۡتُ
لَهُمۡ وَاَسۡرَرۡتُ لَهُمۡ اِسۡرَارًا ۙ﴿۹﴾ فَقُلۡتُ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ﴿۱۰﴾
یُّرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَیۡكُمۡ مِّدۡرَارًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّیُمۡدِدۡكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِیۡنَ وَیَجۡعَلۡ لَّكُمۡ جَنّٰتٍ

---

[1] ۔ تبعیضیذ لاخراج حقوق العباد (جلالین)

وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾

''انہوں نے کہا اے میرے معبود میرے مالک! میں نے اپنی قوم کو دعوت دی رات دن تو انہیں میری دعوت نے اور بھاگنے میں اضافہ ہی کیا اور میں جب بھی انہیں دعوت دیتا ہوں کہ (وہ اس قابل ہوں کہ) تو ان کو بخش دے تو وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیتے اور اپنے کپڑے اپنے اوپر لپیٹ لیتے ہیں اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں اور پوری طرح تکبر اختیار کرتے ہیں۔ پھر (یہ کہ) میں بہت صاف طور پر دعوت دی اور پھر (ہر طرح دعوت دی) اعلانیہ بھی بالکل خفیہ طریقے پر بھی تو میں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے معافی مانگو، بلاشبہ وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ بھیجتا ہے بادل کو تم پر برستا ہوا اور تمہیں مدد پہنچاتا ہے مال کے ساتھ اور قرار دیتا ہے تمہارے لیے باغ اور قرار دیتا ہے تمہارے لیے نہریں، تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی عظمت کے قائل نہیں ہوتے، حالانکہ اس نے تم کو طرح طرح کی شکلوں سے گزار کر بنایا''۔

عمر بھر کی تبلیغ کے مراحل کو طے کرنے کے بعد اپنی انتہائی جانفشانی کے ساتھ فرضِ منصبی کی ادائیگی اور قوم کے رویہ کی روئداد بارگاہ الٰہی میں پیش کرتے ہیں، اب جس طرح انہوں نے ان سے امید قطع ہو جانے کا احساس کیا ہے اور اس سے ان پر عذاب نازل ہونے کی درخواست کی ہے اس کو بیان کیا جا رہا ہے اس ذیل میں ان کے طریقہ تبلیغ کا بیان بھی ہے۔ ''بھاگنے میں اضافہ ہی کیا'' یعنی حق کے راستے سے گزیراں تو وہ پہلے ہی سے تھے۔ اب میری دعوت وتبلیغ مسلسل کے ساتھ جب ان کا انحراف قائم رہا تو یہ گزیراں ہونے میں اضافہ ہے۔ انگلیاں اپنے کانوں میں دے لیتے ہیں اور اپنے کپڑے اپنے اوپر لپیٹ لیتے ہیں'' یہ انتہائی نفرت کی بنا پر بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی آواز ہم نہ سنیں گے اور ان کی صورت ہمیں نظر نہ آسکے، اور اس خطرے سے بھی کہ کہیں ان کی باتیں ہمارے دلوں پر کچھ اثر نہ کر جائیں جیسا کہ مشرکین مکّہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ کے وقت ایسی ہی صورتیں اختیار کرتے تھے۔ ''پوری طرح تکبر اختیار کرتے ہیں'' یعنی اس پیغام کو قبول کرنے میں ذلت محسوس کرتے ہیں کہ اس کے معنی اس کا قرار ہے کہ ہمارے باپ دادا اور ہم اب تک غلط راستے پر تھے۔ پھر پہلے قرآن مجید میں آچکا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ بہت ادنیٰ درجے کے لوگوں نے آپ پر ایمان اختیار کیا ہے تو ایمان لانے کو اس لیے بھی وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے کہ ہم ادنیٰ درجے کے لوگوں میں کیوں شامل ہوں۔ یہ سوا تکبر کے اور کیا تھا؟ دعوت ایمان کے ساتھ دنیوی نعمتوں کا وعدہ۔ وہ بھی ایک نفسیاتی طریقہ ان کو حق کی طرف مائل کرنے کا تھا کہ یہ اتنے بلند نظر نہیں ہیں کہ کہ حق کو صرف حق ہونے کی بنا پر اختیار کریں۔ نہ آخرت پر ایمان لا سکتے ہیں کہ وہ دنیوی مفادات کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دے سکیں تو انہیں خدا کے حکم سے دنیوی مفادات حاصل ہونے کی بھی خوشخبری بھی دی جا رہی ہے کہ اگر تم ایمان اختیار کرو گے تو اللہ تمہیں دنیوی نعمتوں سے بھی بہرہ مند کرے گا صاف طور پر دعوت دی یعنی دعوت عام، مجمعوں میں بھی دی ہے اور خصوصی طور پر بلا بلا کر اعلانیہ بھی گفتگو کی اور آہستہ آہستہ بھی سمجھایا یعنی کوئی طریقہ بھی افہام وتفہیم کا چھوڑا نہیں۔

یہ جملہ کہ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا. (نوح: ۱۳) س کے لفظی معنی تو یہ ہوتے ہیں کہ تم اللہ کی عظمت کے امیدوار کیوں نہیں ہوتے مگر چونکہ امیدوار ہونے کا جو مطلب عام طور پر ذہن میں آتا ہے وہ وقار وعظمت کے ساتھ محاورے میں چسپاں نہیں ہوتا اس لیے اس کے لازم معنی کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا کہ تم اللہ کی عظمت کے قائل ہوتے'' جلالین نے یہ مفہوم قرار دیا ہے کہ تم اس پر ایمان لا کر اس کے امیدوار

کیوں نہیں ہوتے کہ وہ تمہیں وقار عطا کریں یہ مفہوم للہ وقارا کی لحاظ سے تناسب نہیں رکھتا۔ ہماری قدیم تفسیر میں اور پھر بعد کے بھی بعض تفاسیر میں رجا! کے معنی خوف کے قرار دئے ہیں جو عظمت الٰہی کے احساس کا لازمہ ہے [1] اور کافروں کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ اس میں ایک طنز کی چاشنی ہوسکتی ہے جیسے کہ بعض جگہ قرآن میں عذاب کی اطلاع (انذار) کو بشرّ کے لفظ سے ادا کیا ہے جس کے لفظی معنی ہوئے ''خوشخبری دیجیے''

اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿١٥﴾ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿١٦﴾ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿١٧﴾ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿١٨﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ﴿١٩﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿٢٠﴾

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان طبق در طبق پیدا کیے اور ان میں سے چاند کو روشنی کا ذریعہ بنایا اور سورج کو چراغ اور اللہ نے نکالا زمین سے ایک خاص طرح پھر وہ تم کو اس میں پلٹا دے گا اور پھر تمہیں خاص طرح نکالے گا اور اللہ نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا تا کہ تم اس کے کشادہ راستوں میں چلو''۔

عظمت الٰہی کے احساس کا مطالبہ کرتے ہوئے اس کے کچھ آیات قدرت کی نشاندہی کی جارہی ہے کہ دیکھو اس کی عظمت کس طرح اس مخلوقات سے نمایاں ہے۔ چاند کو نور کہا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نور اس کا ذاتی ہو بلکہ آفتاب سے کسب نور کر کے وہ روشنی پھیلاتا ہے تو اسے نور کہنا درست ہے اور چاند کو ان آسمانوں میں کہنا اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ ساتوں آسمانوں میں ہو بلکہ ان میں سے ایک آسمان میں ہے تو یہ کہنا درست ہے کہ وہ آسمانوں میں ہو بلکہ ان میں ایک آسمان میں ہے تو یہ کہنا درست ہے کہ وہ آسمانوں میں ہے جیسے کسی خاندان کے کسی ایک آدمی کے یہاں کوئی تو کہے گا کہ میں اس خاندان میں آج گیا تھا اور کسی ضلعے کے ایک شہر میں کوئی ندی ہو تو کہا جائیگا کہ اس ضلع میں وہ ندی ہے.....زمین سے نکلا.....اسے بعض نے ابتدائے خلقت انسانی کے معنی میں لیا ہے کہ وہ مٹی سے پیدا ہوا ہے اور مٹی زمین سے نکالی گئی .....یہ زمین سے نکالنے کا قریبی تصور اور بعض نے کہا ہے کہ اجزائے ارضی سے نباتات پیدا ہوئے اور ان نباتات کو انسانوں نے کھایا جو ان کا جز بدن بنے اور نطفہ کی صورت اختیا کی اور پھر اس نطفے سے انسان کی تخلیق ہو تو یوں وہ زمین سے برآمد ہوا اور بعض اسے تشبیہ قرار دے رہے ہیں کہ جیسے ایک وقت میں نباتات کا وجود نہ تھا اور وہ زمین سے برآمد ہوئے ویسے ہی انسان ایک وقت میں موجود نہ تھا اور پھر سطح زمین پر اس کا وجود آیا.....مگر یہ وجہ شبہہ بہت بعید حیثیت رکھتی ہے اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ کے الفاظ کو اس پر محمول کرنا درست معلوم نہیں ہوتا.....اب اس ذیل میں سننے والوں کے ذہن کو معاد کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ جیسے زمین سے برآمد ہوتے ہو ویسے ہی اس زمین میں دفن ہو کر چلے جاؤ گے اور پھر اس زمین سے حشر میں تمہیں برآمد کیا جائیگا۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿٢١﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿٢٢﴾ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ

---

[1] ۔لا تخافون اللہ عظمتہ ...علی ابن ابراھیم (ولرجآء الخوف ھنا (تبیان)

وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿۲۳﴾ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾

''نوح نے (بارگاہ الٰہی میں) عرض کیا کہ اے میرے مالک ان لوگوں نے میرا کہنا نہ مانا اور ایسے آدمی کی پیروی کی جنہیں مال اور اولاد کے ملنے نے اور زیادہ خسارے میں مبتلا کیا اور انہوں نے (میرے خلاف) بڑا منصوبہ چلا رکھا ہے اور (عوام سے) کہا ہے کہ ہرگز نہ چھوڑنا اپنے خداؤں کو اور (خصوصیت کے ساتھ) نہ چھوڑنا ود کو اور نہ سواع کو اور یغوث اور یعوق اور نسر کو اور اس طرح سوں کو گمراہ کر دیا اب تو بھی ان کی گمراہی میں اور اضافہ کرتا رہ۔''

حضرت نوحؑ کی بارگاہ الٰہی میں مناجات

چونکہ حضرت نوحؑ کی عمر تبلیغ بنص قرآن بڑی طولانی ہوئی لہٰذا نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی متعدد مناجاتوں میں جو قرآن مجید میں جا بجا ہیں اور پھر عذاب الٰہی کے آنے مین اس کا ذکر ابھی آئے گا بیچ میں کتنا فاصلہ ہے بہرحال اب یہ ان کی مناجات ہے کہ انہوں نے بارگاہ الٰہی میں کہا ہے کہ یہ کس طرح میرا کہنا نہیں مانتے اور ایسے ادمیوں کی پیروی کی ..... یہ کون لوگ ہیں؟ رؤسا اور صاحبان مال و اولاد جو اپنی دولت اور خاندان کی وسعت سے عوام کو اپنا تابع فرماں بنائے ہوئے تھے اور انہوں نے تمام قوم کو جناب نوح کی طرف سے برگشتہ کر رکھا تھا اور ان کی تبلیغ کے مقابلے میں وہ اپنی تقریروں سے زہر افشانی کرتے تھے اور اپنے نمائندے انہوں نے ہر طرف بھیج رکھے تھے کہ لوگ جناب نوح کی ہدایت کو قبول نہ کریں جیسے حضرت نوحؑ نے یوں کہا ہے کہ انہوں نے میرے خلاف بڑا منصوبہ چلا رکھا ہے..... بت جن کے نام لیے گئے ہیں وہ ہین جن سے عرب بھی متارف تھے اور یہاں بھی مختلف قبیلے ان بتوں کی پرستش کر رہے تھے..... باقی ان یہاں خاص بت بھی ہو سکتے ہیں جن سے عرب واقف نہ تھے لہٰذا نہیں ان بتوں کے نام لینے سے پہلے اٰلِهَتَكُمْ ''اپنے خداؤں'' کے اجمال میں سمو دیا گیا ہے۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ﴿۲۵﴾
وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ
يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ
بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾

''چنانچہ وہ اپنے جرائم کی وجہ سے غرق کر دئے گئے جن کے بعد میں آگ میں ڈال دیئے گئے تو انہوں نے نہیں پائے اپنے لیے اللہ کو چھوڑ کر کوئی مددگار لوگ اور نوح نے کہا اے میرے مالک زمین پر ان کافروں میں سے کوئی باشندہ نہ چھوڑ مگر تو انہیں چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور اس کے یہاں سوائے بداعمال اور کافروں کے اولاد میں کوئی پیدا نہیں ہوگا اے میرے مالک! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور جو میرے گھر میں ایمان رکھتے ہوئے داخل ہو اور تمام باایمان مردوں اور بایمان عورتوں کو اور ظالموں کے لیے سوائے ہلاکت کے کسی بات میں اضافہ نہ کر''۔

''غرق کر دئے گئے جس کے بعد آگ میں ڈال دئے گئے'' اس میں ایک خیال تو یہ ہے کہ یہ فرعون اور اس کے لشکر کی ایک خصوصیت قرآن مجید میں بیان کی ہے اور ایک اس قوم نوح کی کہ وہ غرق ہونے کے ساتھ ہی عذاب جہنم میں ڈال دیئے گئے یعنی آخرت کا انتظار نہیں ہوا اور دوسرا خیال یہ ہے کہ یہ جہنم کے علاوہ جس میں داخلہ آخر میں ہوگا عالم برزخ کا عذاب ہے جس کا قرآن مجید نے تذکرہ کیا ہے۔

سُوْرَةُ الْجِنِّ

مکیّہ.....۲۸.....آیات

چونکہ اس سورے میں جنات میں سے ایک گروہ کا جو قرآن مجید کے آیات کو سن کر ایمان لایا، کافی حد تک مفصل تذکرہ ہے، اس لیے اس کا نام ''سورہ الجن'' ہوا۔

سورۂ جن کے خاص خاص مضامین:

جنّات کا وجود قرآن مجید کے متعدد نصوص اور متواتر احادیث کی بنا پر ایک مسلم دینی حقیقت ہے جس کے منکر صرف وہی ہو سکتے ہیں جو ہر ان دیکھی حقیقت کا انکار کریں جیسے ملائکہ اور سب سے بڑھ کر خالق جو بالکل ان دیکھی ذات ہے۔ قرآن مجید کے آیات کو سن کر جنات کے ایمان لانے کا چونکہ ایک تذکرہ سورہ احقاف میں ہے اس لیے بعض مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ یہاں جو جنات کا ذکر ہے وہ وہی جن ہیں جو اس واقعہ میں قرآن کے آیات کو سن کر ایمان لائے ہیں۔ [1]

مگر خود قرآن مجید میں دونوں واقعوں میں ان ایمان لانے والے جنات کی جو گفتگو اپنی قوم سے مذکور ہے اس کے مضامین سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے اور روایات میں دنوں جگہ کے آیات کی جو شان نزول درج ہے اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ ایک گروہ تھا جس کا ذکر سورہ جن میں ہے اور وہ کوئی دوسرا گروہ تھا جس کا ذکر سورہ احقاف میں ہے۔ وہ سورہ احقاف والے جنات وہ تھے جو حضرت موسیٰؑ وغیرہ پر ایمان لائے ہوئے تھے اور یہ جنات تھے جو اب تک مشرک اور بت پرست تھے اور کسی نبی یا رسول پر ایمان لائے ہوئے نہیں تھے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿۱﴾ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۙ﴿۲﴾ وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ

---

[1] ۔ھم الذین ذکروفی قولہ تعالیٰ واذا صرفنا الیک نفوا من الجن (جلالین)

صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝٣

''کہیے کہ مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنات میں کچھ اشخاص نے توجہ کے ساتھ سنا تو کہا کہ ہم نے عجیب طرح کا کلام سنا ہے جو راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور اب ہم اپنے پروردگار کا کوئی شریک قرار نہیں دیں گے اور ہمارے پروردگار کی عظمت بہت بالا و برتر ہے، نہ اس کی کوئی بیوی ہے اور نہ اولاد''۔

ان الفاظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ قرآن مجید کے کسی حصے کا تلاوت فرما رہے تھے اس وقت یہ جنات آپ کے پاس رکے اور انہوں نے غور سے قرآن کے ان اجزا کو سنا اور ایمان لے آئے، پھر جو اپنے تاثرات تھے وہ جا کر اپنی قوم سے بیان کیے اور خالق کریم نے بذریعہ وحی ان تفصیلات سے اپنے رسول ؐ کو آگاہ کیا.....اس وقت وہ اشخاص آپ کے سامنے آئے۔ نہ حضرت سے انہوں نے کوئی گفتگو کی، خاموشی کے ساتھ آئے اور رکے رہے پھر خاموشی کے ساتھ اپنی قوم کی طرف واپس گئے۔ اب وہ اجزاء قرآن کے کون سے تھے جن کی حضرت ؐ تلاوت فرما رہے تھے کہ ان سے انہوں نے اتنے نتائج اخذ کیے کہ تمام اصول اسلامی ان کے ذہن میں راسخ ہو گئے؟ ہو سکتا ہے کہ کچھ باتیں انہوں نے اس کلام سے سنیں اور پھر توفیق الٰہی نے ان کی بصیرت والی آنکھوں کو جو کھولا تو اپنے ضمیر کی رہ نمائی سے اور حقیقتیں ان کے دماغ میں راسخ ہوتی چلی گئیں جو ایک مومن کی شان ہے۔ شان نزول والی روایتوں میں تو یہ ہے کہ آپ نماز صبح پڑھ رہے تھے ظاہر ہے کہ ایک نماز میں کتنا قرآن سنا جا سکتا ہے مگر اس سے انہوں نے قرآن مجید کی اس غیر معمولی فصاحت و بلاغت اور بے مثال انداز بیاں کا بھی احساس کیا جو حد اعجاز پر ہے اس لیے انہوں نے عجبا کی لفظ صرف کی اور اس سے وہ ان تمام معارف حقہ تک پہونچے جو ایمان کے لیے ضروری ہیں جو ان کی تقریر سے ظاہر ہے۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝٤ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝٥ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝٦ وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝٧ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝٨ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝٩

''اور یہ کہ ہم میں کا بے وقوف اللہ کی نسبت غلط بکواس کیا کرتا تھا اور یہ کہ ہمارا خیال تھا کہ انسان اور جنات اللہ کی نسبت پرگز غلط باتیں نہیں کریں گے اور یہ کہ انسانوں میں کے کچھ لوگ جنات میں کے افراد کو ذریعہ پناہ بناتے تھے تو انہوں نے ان کی سرکشی میں اور اضافہ کر دیا اور ان آدمیوں کا بھی تمہاری طرح یہ خیال تھا کہ اللہ کسی کو پیغمبر بنا کر نہیں بھیجے گا اور یہ کہ ہم نے آسمان کو چھونا چاہا تو اسے پایا کہ وہ بھر دیا گیا پہرا دینے والوں اور ٹوٹنے والے ستاروں سے اور یہ کہ ہم جا کر بیٹھا کرتے خاص مقامات پر سننے کے لیے، تو جواب سننے کی کوشش کرے گا وہ

اپنے لیے ایک ٹوٹنے والے ستارے کو سدّ راہ پائے گا''۔

''بے وقوف'' سے بظاہر وہ خاص شیطان مراد ہے جو ابلیس کہلاتا ہے[1] اور عام جنات جو گمراہی کی باتیں کرتے تھے وہ مراد ہو سکتے ہیں اور چونکہ عام طور پر انسان جنات سے ڈرتے رہے ہیں، اور جنات کے تصرفات کے بہت قائل رہے لہٰذا تعویذوں اور عملیات کے ذریعہ سے جنات کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بھی سمجھنے لگے، یہ جن کہہ رہے ہیں کہ اس کی وجہ سے ان جنات کو اپنی طاقت وغیرہ پر اور زیادہ گھمنڈ ہو گیا اور وہ اپنے کو بہت بڑی چیز سمجھنے لگے تو ان کی سرکشی اور خدا فراموشی میں اضافہ ہو گیا لن یبعث اللہ احدا، کا بظاہر مطلب یہ ہے جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا کہ ہمیں تصور یہی تھا کہ اب اللہ کسی کو رسول بنا کر نہ بھیجے گا مگر اس وقت یہ غلط فہمی دور ہو گئی جب ہم نے جا کر یہ کلام سنا۔ معلوم ہوا کہ اللہ نے اس دور میں بھی ایک رسول بھیجا ہے جو ایسا عجیب کلام اس کی طرف پیش کر رہا ہے لیکن چونکہ بعث کے معنی جزا و سزا کے لیے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کے بھی ہوتے ہیں اس لیے بعض نے وہ مطلب سمجھا ہے۔[2] مگر بعد والے تذکرے کی مناسبت سے پہلے مطلب کو ترجیح حاصل ہے ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس رسول کے آنے کی وجہ سے ہی ہوا ہے کہ آسمان پر اتنے انتظامات ہوئے ہیں کہ ہم وہاں کی باتوں کو نہ سن سکیں۔

وَّاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴿۱۰﴾ وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآىِٕقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ﴿۱۲﴾ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾ وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۴﴾ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾

''اور یہ کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زمین کے رہنے والوں پر کوئی عذاب نازل کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے یا انہیں ان کے پروردگار نے صحیح راستا دکھانے کو کوئی انتظام کیا ہے اور یہ کہ ہمیں یقین ہو کہ ہم اللہ کو روئے زمین پر کہیں بے بس نہیں بنا سکتے اور نہ بھاگ کر بے بس بنا سکتے ہیں اور ہم نے جب صحیح رہ نمائی کی آواز سنی تو اس پر ایمان لے آئے تو جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے گا اسے کسی ناانصافی اور اپنے حق میں کسی زیادتی کا ڈر نہ ہوگا اور یہ کہ ہم میں سے کچھ فرماں پذیر ہیں اور ہم میں سے کچھ راہ راست سے ہٹے ہوئے ہیں تو جو فرماں برداری کریگا تو یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے صحیح راستہ اختیار کیا اور جو اس راہ سے ہٹے ہوئے ہیں وہ دوزخ کا ایندھن ہونے والے ہیں''۔

ان کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان پر جانے سے جو غیر معمولی رکاوٹیں ہم نے محسوس کیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا یہ کس وجہ

---

[1] ۔ارادو بسفیھم ابلیس (مجمع البیان)

[2] ۔لن یبعث احدا بعد موتہ (جلالین)

سے ہیں۔کیا اہل زمین پر ان کے رب کی طرف سے کوئی عذاب آنے والا ہے یا ان کی ہدایت کا کوئی خاص انتظام ہوا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں یہ معلوم تھا کہ آسمان پر شیاطین کے جانے سے یہ رکاوٹیں دوصورتوں میں ہوتی ہیں۔ایک جب عذاب اس کی طرف کا آنے والا ہو اور ایک جب کوئی نبی مبعوث ہونے والا ہو [1] اور اسی تلاش میں وہ نکلے تھے کہ اس کا سبب معلوم کریں تو انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وہ کلام حق سنا، جس پر وہ ایمان لے آئے۔

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ۙ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۙ﴿۱۷﴾ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۙ﴿۱۸﴾ وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ؕ﴿۱۹﴾

''اور یہ کہ اگر لوگ راہ راست پر برقرار رہتے تو ہم انہیں سیراب کرتے اچھی بارش سے تا کہ اس کے بارے میں ہم ان کی آزمائش کریں اور جو اپنے پروردگار کی یاد سے روگردانی کرے، اسے عذاب میں داخل کرے گا جو بڑھتا ہی جائے گا اور یہ کہ سجدہ کے مقامات اللہ سے مخصوص ہیں لہٰذا اللہ کے ساتھ کسی کو خدا نہ کہو اور یہ کہ جب بھی اللہ کا بندہ اس کا نام لیتا ہوا کھڑا ہوا قریب ہوا کہ لوگ اس پر ٹوٹ پریں''۔

جنات کا تذکرہ اور جو جو انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا اس کے قبل ختم ہوا۔بلاشبہہ اب جو مضمون ہیں وہ شروع والے اس جملے کے تحت میں ہے کہ اوحیٰ الیّ ''مجھ پر وحی بھیجی گئی ہے'' کیا؟ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ کہ جنات کے ایک گروہ نے غور سے سنا تا آخر مضمون اور دوسرے یہ کہ اگر یہ لوگ یعنی یہ انسان بھی جنہیں آپ ہدایت کر رہے ہیں اگر راہ راست پر برقرار رہتے تو ہم انہیں سیراب کرتے [2] کہا جاتا ہے کہ اس کے پہلے کئی سال تک قحط رہا اور پانی برسا تھا اس لیے یہ وعدہ کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ ایمان لے آئیں تو ان پر روزی کے دروازے کھول دئے جائیں گے اور پانی برسے گا اس لیے کہ پانی ہی پر تمام ضروریات حیات کا انحصار ہے لیکن اس باران رحمت کے نازل ہونے کے بعد بھی یہ دیکھنا ہے کہ وہ خدا فراموشی میں مبتلا تو نہیں ہو جاتے، اسلئے یہ کہا گیا ہے کہ تا کہ اس کے بارے میں ہم ان کی آزمائش کریں'' ۔اپنے پروردگار کی یاد سے روگردانی کرے اس طرح بھی کہ اس کے رسولؐ کے احکام کو نہ مانے اور اس طرح بھی کہ اس کی دی ہوئی روزی کو غلط طور پر صرف کرے تو پھر اس کے لئے روز افزوں عذاب کی وعید ہے۔

''مساجد'' مسجد کی جمع ہو سکتی ہے جو اسم ظرف ہے تو مسجد کے معنی ہوں گے عبادت گاہوں کے، مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کہیں کسی غیر کی عبادت نہ ہو۔اور مسجد کی جمع بھی ہو سکتی ہے یعنی وہ اعضا جن سے سجدہ کیا جاتا ہے، انہیں صرف نہ ہونا چاہیے سوا اللہ کے کسی غیر کی عبادت میں.....ٹوٹے پڑتے کے عنوان چونکہ دونوں ہو سکتے ہیں۔شوق ذوق سے ٹوٹے پڑنا کچھ لوگوں نے یہ مطلب لیا ہے کہ جب رسولؐ قرآن

---

[1] ۔ان مثل هذا لایکون الا لاحد الامرین (مجمع البیان)

[2] ۔هو معطوف علیه علی الستمع (جلالین) نیز بگو محمد ﷺ که وحی فرستاده شده است بسوی من که بنی آدم (شاه ولی الله) اور وحی کیا گیا ھے طرف میرے اگر یہ لوگ (رفیع الدین)

مجید پڑھ رہے تھے تو جنات ایک دوسرے شوق ذوق کے مارے ٹوٹ پڑ رہے تھے۔[1]

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ بطور عتاب ہے کہ آخر یہ کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حق کی دعوت کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو یہ لوگ ایذا رسانی کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں۔اس کا خمیازہ انہیں بھگتنا ہوگا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾ قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾ قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ﴿۲۳﴾

”کہیے کہ میں اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور اس کا کوئی شریک قرار نہیں دیتا، کہیے کہ میں تمہارے لیے نہ نقصان پہنچانے پر قابو رکھتا ہوں اور نہ راہ راست کا پابند بنانے پر اور کہیے کہ مجھے اللہ کے عتاب سے کوئی دوسرا نہیں بچا سکتا اور میں اسے چھوڑ کر کوئی جائے پناہ نہیں پا سکتا سوا اس کے کہ میں اللہ کی طرف سے تبلیغ کروں اور اس کے پیغاموں کو پہنچاؤں اور جو اللہ اور رس کے پیغمبر کی نافرمانی کریگا، اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے“۔

مطلب یہ ہے کہ تمہیں مجھ پر آخر اتنا غصہ کیوں آتا ہے؟ میں بس ایک پیغامبر ہوں جس کا کام پیغام کو پہنچانا ہے، تمہارا کوئی نفع نقصان میرے قبضے میں نہیں ہے تمہارا نفع نقصان کیا میں تو خود اپنے نفع نقصان پر قدرت نہیں رکھتا، میرے ذمے جو قرض ہے، وہ میں ادا نہ کروں تو خود مجھے اس کی طرف سے اس کی سزا ملے جس سے میں بچ نہیں سکتا اور جو میری بات نہ مانیں اور میرے پیغام کو قبول نہ کرے اس کا انجام دوزخ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾

”یہاں تک کہ جب دیکھ لیں گے اسے جس کی انہیں اطلاع دی جا رہی ہے تو انہیں پتہ چلے گا کہ کس کے

---

[1] ۔ای کادالجن یرکب بعضهم بعضا یزدحمون علیه حرصا منهم علی استماع القرآن عن ابن عباس وضحاك (مجمع البیان)

مددگار کمزور ہیں اور ساتھیوں کی تعداد کم ہے، کہیے کہ مجھے خبر نہیں کہ نزدیک ہے وہ جس کی میں اطلاع دے رہا ہوں یا میرا پروردگار کوئی طولانی مدت قرار دے گا، وہ غیب کا جاننے والا ہے تو وہ اپنے غیب پر کسی کو حاوی نہیں کرتا سوا اس پیغمبر کے جسے اس نے منتخب کیا ہے تو وہ اس کے سامنے سے اور اس کے پس پشت سے پہریدار بھیج دیتا ہے تا کہ معلوم ہو کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغاموں کو پہنچایا ہے اور وہ گھیرے ہوئے ہے انہیں چاروں طرف سے اور وہ ہر چیز کی گنتی پر حاوی ہے"۔

مشرکین کو غرہ تھا کہ رسولؐ کے پاس انے گنے چند اشخاص گردوپیش میں ہیں جو ان کی مدد کے لیے تیار ہو سکتے ہیں لیکن وہ کمزور و ناتواں ہیں، مدد کریں گے بھی تو کیا کر سکتے ہیں اور ہم ہر طرح طاقت ور ہیں ہماری تعداد بھی زیادہ ہیں تو کہا جا رہا ہے کہ ابھی وہ یہ کہہ لیں مگر آئے گا ایسا وقت جس سے ہم برابر خبردار و ہوشیار کر رہیں ہیں کہ اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور ساتھیوں کی تعداد کم ہے! ہاں اگر یہ پوچھیں کہ وہ وقت کب آئے گا تو رسول کو اس کی اطلاع نہیں دی گئی ہے کہ اس میں اب کتنے دن باقی ہیں، اور وہ بہت جلد ہی آئے گا یا دیر میں آئے گا؟ اس کا تعلق علم غیب سے ہے اور وہ ذاتاً صرف خدا کو ہے وہ رسول کو بتقاضائے حکمت جتنا مناسب سمجھتا ہے اتنا علم عطا کرتا ہے اس کے پاس جو وحی بھیجتا ہے اس میں اہتمام کرتا ہے کہ درمیان میں شیاطین کوئی کارگزاری نہ کر سکے یا اس میں کوئی جز چوری چھپے اڑا کر کاہنوں کو نہ بتا دیں اور رازِ الٰہی کو افشاں نہ کر دیں اور پھر اس طرح اللہ جانے یعنی بحیثیت واقعہ یہ بات یقینی ہو جائے کہ ان تک جو پہنچا ہے اور جو وہ پہنچا رہے ہیں وہ بالکل وہی ہے جو خالق نے ان تک پہنچانے کے لیے فرشتوں کے سپرد کیا تھا اور انہوں نے اسے خلق خدا تک پہنچایا ہے یوں اللہ کو اپنے علم کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے وہ تو ہر چیز پر حاوی ہے اور کائنات کے ذروں کی تعداد جانتا ہے تو اپنی وحی اور اس کی ادائیگی کو بھلا وہ نہ جانے گا؟۔

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ

مکیّہ.....۲۰.....آیات

''مزمل'' کے معنی چادر میں لپٹے ہوئے کے ہیں، چونکہ اس کا آغاز رسولؐ سے مزمل کی لفظ کے ساتھ کیا گیا ہے اس لیے اس سورے کا یہ نام ہوا۔

سورۂ مزمّل کے خاص خاص مضامین:

۱.....اس میں حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سپرد کرنے والی ذمہ داری کی اہمیت اور دشواری کو دکھاتے ہوئے آپ کو راتوں کی بیداری کے ساتھ عبادت میں کافی وقت گزارنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

۲.....مخالفین کی ایذا رسانیوں پر صبر وتحمل کی تلقین اور نتیجہ کو اللہ پر چھوڑنے کا حکم جس کے ساتھ مخالفین کو عذاب کی تھدید ہے۔

۳.....قرآن مجید کے ہولناک مناظر کا اجمالی تذکرہ

۴.....رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مثل موسیٰؑ مبعوث فرمانے کا اعلان اور مخالفین کو فرعون کے عذاب کی یاددہانی۔

۵.....آخر میں سابق میں جو تہجد کے اوقات کی پابندی عائد کی گئی تھی اس میں تخفیف کا اعلان اور نماز شب کی پابندی میں تخفیف جس کے متعلق مفسرین کا خیال ہے کہ وہ گزشتہ حصے سے تقریباً دس برس گزرنے کے بعد اترا ہے اور اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سورے میں پہلا رکوع مکی ہے اور بعد والا دوسرا مدنی ہے اس کے مضامین سے ظاہر ہے۔ اس نظیر کو سامنے رکھا جائے تو سورے کی پیشانی پر مکی لکھے جانے سے اس کے مضامین کے متعلق قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مکی زندگی سے متعلق ہے بلکہ وہ مدینہ کے نازل شدہ ہو سکتے ہیں۔ پھر اس سورہ کے متعلق ترتیب کے لحاظ سے بھی یقینی طور پر رائے قائم نہیں کی جا سکتی کہ وہ مکّہ ہی کا نازل شدہ سورہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ﴿۴﴾ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿۵﴾

''اے کپڑوں میں لپٹ کر لیٹنے والے! رات نماز میں گزاریئے مگر کچھ تھوڑا حصہ، آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم کر دیجیے یا اس پر اضافہ کر دیجیے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پوری طرح واضح کر کے پڑھا کیجیے، عنقریب ہم آپ

پر ایسے پیغام پہنچانے کا بوجھ ڈالنے والے ہیں جو بہت گراں ہے"۔

اس سورے کا ابتدائی حصہ اس وقت نازل ہوا جب آغاز رسالت کا دور تھا، حضرت رات کے ابتدائی حصے ہی میں آرام فرمانے کے لیے لیٹے تھے کہ خالق کریم کی طرف سے یہ آیات نازل ہوئے جن میں حضرت کو شب کو بیدار رہ کر نمازوں میں گزارنے کا حکم آیا ہے۔

یہ ہمارے رسول کی خصوصیت ہے جو قرآن مجید کے مطالعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ جس نبی یا رسول سے تخاطب ہوا ہے ہمیشہ نام لے کر تخاطب ہوا مثلاً یا آدم اسکن انت وزوجك الجنة ،یانوح اهبط بسلام منا وبركات عليك ،یاابرهيم قدصدقت الرؤیا وغیرہ وغیرہ لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کبھی نام لیکر خطاب نہیں ہوا بلکہ بعد میں تو زیادہ تر جو آپ کا منصب تھا اس کو سرنامہ خطاب قرار دیا یعنی یاایھا النبی اوریاایھا الرسول لیکن شروع میں بتقاضائے محبوبیت بے تکلفی کے ساتھ جس وقت جیسا انداز ہوا اس سے سرنامہ خطاب قرار دے دیا جیسے سورہ مدثر میں جو اس کے بعد میں ہے مگر پتہ چلتا ہے کہ وہ نازل اس سے پہلے ہوا تھا یاایھا المدثر کہہ کر تخاطب اور اس سورے میں یاایھا المزمل۔ [1] مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے حبیب اب اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے کا وقت نہیں ہے، اب تو خلق خدا کو جگانے کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی جارہی ہے لہٰذا اب تو آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ آپ کو نمازوں میں گزارنا ہے تا کہ افراد امت کے لیے مثال ہو اور وہ بھی رات کو زیادہ حصہ عبادت خدا اور یاد الٰہی میں گزاریں۔

اس کے ساتھ تلاوت قرآن مجید کے آداب کی تعلیم بھی ہے کہ اسے جلدی جلدی نہیں پڑھنا چاہیے بلکہ الفاظ وحروف کو نمایاں کر کے رک رک کر پڑھنا چاہیے۔امام جعفر الصادقؑ کا ارشاد ہے:۔اذامررت بآية فيها ذكر الجنة فاسئل الله الجنة واذامررت بآية فيها ذكر النار فتعوذ بالله من النار ، جب ایسی آیت سے گزر و جس میں بہشت کا ذکر ہے تو اللہ سے بہشت کا سوال کرو اور جب ایسی آیت سے گزرو جس میں جہنم کا ذکر ہے تو اللہ سے طلب کار پناہ ہو اس آگ سے۔ پیغام کو بوجھل اور گراں کہنا اُن کی لحاظ سے بھی ہے جن تک وہ پہنچا ہے کہ وہ اُن کے اب تک کے عادات وتصوّرات اور آباؤ اجداد سے چلے آتے ہوئے طریقوں کے خلاف ہے، اس لئے اُنہیں اُس کا قبول کرنا بڑا دشوار ہے، اُسی لحاظ سے زیادہ گراں رسولؐ کے لئے بھی ہے کہ آپ کو اُس کے پہنچانے میں دشواریوں کا سامنا ہوگا اور شدائد کا مقابلہ کرنا ہوگا۔روایات بتاتے ہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اُس کے بوجھ کا جسمانی طور پر بھی ظہور ہوتا تھا سخت جاڑے میں بھی وحی نازل ہوتی تھی حضرتؐ کی پیشانی پسینے سے تر ہو جاتی تھی۔اور اگر ناقے کی پشت پر آپ ہیں اور اُس وقت وحی نازل ہوئی تو ناقہ اپنا پسینہ زمین پر ٹکا دیتا تھا سیدھا کھڑا نہیں رہتا تھا۔یہ روایتیں زیادہ اُم المؤمنین عائشہ سے مروی ہیں۔

إِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلًا ﴿٦﴾ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ﴿٧﴾
وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ﴿٨﴾ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ
إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ﴿٩﴾ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ﴿١٠﴾
وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ﴿١١﴾

---

[1] ۔انما خوطب بهذا فی بدو الوحی ولم یکن قد بلغ شیئاً ثم خوطب بعد ذلك بالنبی والرسول (مجمع البیان)

''یقیناً رات کو بیدار رہنا ریاضتِ نفس میں بہت پر تاثیر ہے اور کلام کو زیادہ مضبوط بنانے کا سبب ہے بلاشبہ آپ کے لئے دن میں بہت مشغولیت ہے، اپنے پروردگار کے نام ورد رکھیے اور اُس کی طرف پوری طرح لو لگائیے۔ مشرق و مغرب کا پروردگار کوئی سوا اُس خدا کے نہیں ہے تو بس اُس پر بھروسا کیجئے اور مناسب عنوان پر ان میں قطع نظر کیجئے اور چھوڑ دیجئے مجھے اور ان جھٹلانے والے اہل دولت کو اور اُنہیں تھوڑے دن مہلت دیجئے۔''

یعنی دن کو بہت قسم کی مصروفیت رہتی ہے۔ اُس میں عبادت اتنی یکسوئی کے ساتھ نہیں ہوسکتی نہ اس طرح تلاوت قرآن ہوسکتی ہے جیسی رات کو لہٰذا رات کا وقت عبادت، تلاوت اور ذکر الٰہی کے لئے موزوں و مناسب ہے۔ پھر یہ کہ اس میں چونکہ طبیعت کی خواہش آرام کا زیادہ مقابلہ کرنا ہوتا ہے لہٰذا اس کا اجر و ثواب بھی زیادہ ہے اور اُس سے خود نفس میں شدائد کا مقابلہ کرنے کی طاقت بھی پیدا ہوتی ہے اور چونکہ یہ عبادت و تلاوت زیادہ یکسوئی کے ساتھ ہے لہٰذا قرآن کے مفادات پر غور کا بھی اس میں زیادہ امکان ہے اور پوری قوت کے ساتھ پھر تبلیغ و دعوت کا کام انجام دیا جاسکتا ہے، مخالفتوں سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ آپ کا حامی وہ ہے جو مشرق اور مغرب کا پروردگار ہے، آپ بس اس پر بھروسا کیجئے'' مناسب عنوان پر قطع نظر'' کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دعوت و تبلیغ کرنا اُنہیں چھوڑ دیجئے بلکہ یہ اُن کی بدزبانیوں اور ایذا رسانیوں پر جھنجھلانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے میں نپٹوں گا، ان کو مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ ہاں جلد بازی نہیں ہونا چاہیے۔.....تھوڑے دن کی انہیں مہلت دیجئے۔ وہ وقت جب آجائے گا تو اُن سے سمجھ لیا جائے گا۔

إِنَّ لَدَيْنَا أَنكَالًا وَجَحِيمًا ﴿١٢﴾ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٣﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ﴿١٤﴾

''بلاشبہہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور دوزخ کی آگ اور گلے میں پھنسنے والی خوراک اور دردناک عذاب، اُس دن جب کانپ رہی ہوگی زمین اور پہاڑ، اور پہاڑ بکھرنے والے ریگ کے تودے ہوجائیں گے''۔

یوں تو دنیا ہی میں عذاب آسکتا ہے لیکن اگر اُن کی پوری دنیا کی عمر مہلت میں ختم کردی جائے تب بھی یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ عذاب سے بچ گئے کیوں کہ خلق کے یہاں آخر میں عذاب کا سامان موجود ہے۔ اس کے لئے ابھی قیامت کے ہنگام کی ابتدائی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ زمین اور پہاڑ تھرّا رہے ہوں گے۔ پہاڑوں کی یہ کیفیت کہ اُن کی سختی و مضبوطی ختم ہوگئی.....اور وہ ایسے ہوگئے جیسے ریگ کے بکھرے ہوئے تودے۔ یہ پہلا اثر ہے ابتدائی جو پہاڑوں کے لئے قرآن نے بتایا ہے اور اس کے لئے ایک منزل وہ ہے جسے کہا ہے **کالعھن** '' جیسے دھنکے ہوئے اون کے ٹکڑے اِدھر اُدھر منتشر'' اور پھر اُس کے بعد ایک درجہ ہے جب وہ **ھباء منثورا** ہیں یعنی اُن ذروں کی طرح جو روشندان وغیرہ سے دھوپ آنے کی حالت میں نظر آتے ہیں اور پھر آخر میں تو وہ غائب ہی ہوجائیں گے.....زمین چٹیل میدان کی طرح ہوجائے گی، جس میں کوئی اونچ نیچ سے فرق دکھائی نہ دے گا (قَاعًا صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ لَّا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا .....طٰہٰ۔۱۰۶، ۱۰۷)

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ﴿١٥﴾ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ﴿١٦﴾ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ

يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴿۱۷﴾ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ ؕ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾

''ہم نے تمہاری طرف ایک پیغمبر بھیجا ہے تم پر گواہ بنا کر جیسے فرعون کی طرف ایک پیغمبر بھیجا تھا تو فرعون نے اُس پیغمبر کا کہنا نہ مانا تو ہم نے اُسے بڑی سختی کے ساتھ عذاب میں گرفتار کیا تو تم کیوں کر بچ جاؤ گے اگر تم نے کفر اختیار کیا اُس دن کے عذاب سے بچوں کو بوڑھے بنا دے جس سے آسمان پھٹ جائے گا۔ یہ اُس کا وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ یقیناً اس میں ایک بہت بڑی نصیحت ہے تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف کا راستہ اختیار کرے''۔

اس میں مجمل طور پر حضرت موسیٰؑ کی بعثت کا حوالہ دیا گیا ہے اور حقیقت ہے کہ ہمارے رسولؐ متعدّد وجوہ سے ''مثل موسیٰؑ'' کی حیثیت رکھتے تھے جس کے لئے بائبل میں بھی خود حضرت موسیٰؑ سے تخاطب میں کہ ''میں تمہارا ایسا نبی بھیجوں گا'' مگر یہاں تو اُن کی بعثت کا حوالہ مشرکین کو اُس انجام کی طرف متوجّہ کرنے کے لئے دیا گیا ہے جو فرعون کا ہوا اُن کی مخالفت کر کے وہ غرق دریا کر دیا گیا۔ اب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالفین کو متوجہ کر کے کہا جا رہا ہے کہ موسیٰؑ کی مخالفت کر کے تو دنیا ہی میں عذاب آ گیا تو تم پر بھی دنیا ہی میں عذاب آ سکتا ہے اگر دنیا میں عذاب نہ بھی آئے تو قیامت کے عذاب سے کیوں کر بچ سکتے ہو اور پھر ہول قیامت کا ایسے عنوان سے بیان ہوا ہے جو کسی حد تک اُس کی شدّت اُن کے ذہن میں لا سکے۔ اور ''گواہ'' اس حیثیت سے کہا گیا ہے کہ رسول حجّت خدا ہوتا ہے جس کے آنے کے بعد کافروں کے پاس اپنے کفر اور نافرمانوں کے پاس اپنی نافرمانی کے قابل معافی ہونے کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہ جاتا اور ان کا مستحق عذاب ہونا پورے طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾

''بلاشبہہ آپ کا پروردگار جانتا ہے کہ آپ تقریباً دو تہائی، آدھی اور (نہیں تو) ایک تہائی رات نمازیں پڑھا کرتے ہیں اور اُن میں سے بھی ایک گروہ جو آپ کے ساتھ ہیں اور اللہ خوب پیمانہ جانتا ہے رات اور دن (کی ہر بات) کا۔ اُسے معلوم ہے کہ تم لوگ اُس پر حاوی نہیں ہو سکتے لہٰذا اب خاص مہربانی اُس کی تمہارے شاملِ حال ہوئی ہے تو پڑھو جتنا آسانی کے ساتھ ممکن

ہے۔وہ جانتا ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوتے ہیں اور کچھ دوسرے لوگ سفر میں ہوتے ہیں، اللہ کی طرف کی روزی طلب کرتے ہیں اور کچھ دوسرے لوگ راہِ خدا میں جنگ کرتے ہیں لہٰذا جو آسانی سے (جس حال میں) ممکن ہو پڑھ لیا کرو اور پابندی کرو (واجب) نماز کی اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو نیک قرضہ دو اور جو کچھ اچھائی کا ذخیرہ اپنے لئے بھیج دو گے، اُسے پاؤ گے اللہ کے یہاں جو تمہارے لئے سب سے بہتر چیز ہوگی اور جس کا ثواب بہت بڑا ہوگا اور اللہ سے بخشش کے طلبگار رہو، یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، مہربان"۔

ایک روایت تو ایسی جو بتاتی ہے کہ پہلا عمل تو بس ایک سال رہا اور پھر سورے کا یہ آخری حصّہ نازل ہوگیا اور دوسری روایت یہ ہے کہ وہ طریقہ عبادت کا دس ۱۰ برس جاری رہا اور چونکہ گھڑی اور گھڑیال اُس وقت عام دنیا اور خصوصاً عرب ملک میں نہیں پائے جاتے تھے اس لئے کبھی اس خیال سے کہ تعمیل حکم میں کوتاہی نہ ہونے پائے کبھی کبھی پوری رات قیام و نماز میں گزر جاتی تھی [1] لہٰذا اس حکم میں تخفیف کر دی گئی اور کہا گیا اب اُتنا زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جتنا آسانی سے پڑھا جائے اتنا پڑھ لیا کرو۔

چونکہ وجوہ تخفیف میں جہاد کا بھی ذکر ہے اور وہ بھی قتال کی لفظ کے ساتھ (يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ) جس کے معنی تلوار وغیرہ سے مقابلے کے ہیں یعنی مرنے مارنے کی بات ہے اور اُس کا حکم مکّہ کی سرزمین پر یعنی ہجرت سے پہلے نہ تھا۔ اور زکوٰۃ کا بھی اُن اصطلاحی معنیٰ میں جس میں نصاب ہوتا ہے اور مقدار مقرّر رہے اور مستحقین معیّن ہیں مکّہ میں حکم نہ آیا تھا ان کی وجہ سے زیادہ ترجیح اسی قول کو حاصل ہے کہ یہ پہلے حکم سے تقریباً دس ۱۰ برس بعد مدینہ میں نازل ہوا ہے۔ "پڑھو جتنا آسانی کے ساتھ ممکن ہے" اس سے جیسا کہ زیادہ تر مفسّرین کا قول ہے نمازِ شب مراد ہے جس کی رکعتیں مقرر ہیں لہٰذا ان کا شمار آسان ہے۔ اُس میں بھی "پڑھو" کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ ممکن ہو اُتنی قرآن مجید کی زیادہ مقدار پڑھے۔ اب اگر اتنا ہی حکم رہتا تو ہم سمجھتے کہ کم از کم نماز شب واجب ہے لیکن چونکہ بعد میں پھر اعذار بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ جتنا آسانی سے ممکن ہے پڑھو، ہاں نماز کی پابندی کرو اور اب نماز سے مراد واجب نمازیں ہیں تو معلوم ہوا کہ نماز شب کی بھی بس افضلیت ہے، وجوب نہیں ہے۔ اصل واجب بس پنجگانہ نمازیں ہیں۔ انہیں پوری پابندی کے ساتھ بہر صورت ادا کرنا لازم ہے۔ اب جو لوگ بدّا پر معترض ہیں کہ اُن سے معاذ اللہ خداوند عالم کا پہلے جاہل ہونا اور پھر پشیمان ہونا لازم آتا ہے اُن کو اس آیت کے انداز بیان پر غور کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم ہونا ازل سے اور چیز ہے اور علم کے تقاضے کا معرض ظہور میں آنا باعتبار مصالح دوسری چیز ہے، جو بعد میں تبدیل کی جارہی ہے اس کا علم بھی پہلے سے تھا اور جس بنا پر تبدیلی ہو رہی ہے وہ بھی علم تھا۔ مگر مصلحت کا تقاضا پہلے وہ تھا خواہ بنظر امتحان ہو..... خواہ باوجود مشقّت تعمیل کرنے والوں کے صبر و ثبات کا اندازہ دنیا کو کرانے کے لئے ہو اور پھر بعد میں مصلحت تخفیف کی متقاضی ہوگئی۔ اور یوں کہنا چاہیے کہ حکم جہاد پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے مگر نوعیت جہاد میں فرق ہوگیا پہلے وہ اُس طرح تھا جس میں چمکتی ہوئی تلوار نظر نہیں آتی اور اب اس طرح ہوگیا جس میں تلوار بھی نظر آرہی ہے..... مگر اس جہاد کے ساتھ بھی وہ جہاد فرض نمازوں کی بلا ناغہ ادائیگی..... اور نافلۂ شب کی بطور افضلیت پابندی اور زکوٰۃ کی شرائط وجوب کے ہوتے ہوئے بطور فرض پابندی اور کارہائے خیر میں جتنا زیادہ ممکن ہو، اُتنا صرف کرنے کی بطور تاکید پابندی اس کے بعد بھی قائم ہے۔

---

[1] ۔کان الرجل یقوم ولا یلدی متی ینتصف الیل ومتی یکون الثلثان وکان الرجل یقوم حتی یصبح مخافۃ ان لا یحفظہ (علی بن ابراھیم)

سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ

مکیّہ.....۵۶.....آیات

چونکہ اس سورہ کا آغاز پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لفظ المدّثر کے ساتھ تخاطب ہوا ہے اس لئے اس کا یہی نام ہو گیا۔

سورۂ مدثر کے خاص خاص مضامین:

یہ سورہ ترتیب میں اگرچہ المزمّل کے بعد درج ہے مگر اس سے بہت پہلے ابتدائے زمانۂ بعثت میں اترا ہے۔

بعض نے تو کہا ہے کہ یہ سب سے پہلا سورہ ہے جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا، مگر اس سورے کے بعض مضامین سے جو ابھی آئیں گے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے پہلے قرآن کا کافی حصّہ نازل ہو چکا تھا جسے سن کر مخالفین نے اس کلام کی نوعیت پر غور کرنا شروع کر دیا تھا اور طرح طرح کی باتیں بنانے لگے تھے اور رسولؐ کو کبھی کاہن کہتے تھے اور کبھی شاعر، کبھی (معاذ اللہ) مجنوں اور اس کی تاثیر بھی کچھ ان کو محسوس ہونے لگی تھی کہ وہ آپ کو ساحر کہہ رہے تھے۔ اور اس لئے بعض مفسّرین اس کے قائل ہیں اور وہ بعید نہیں ہے کہ بالکل شروع میں تو سورہ ''اقراء'' کی پانچ آیتیں اتریں جن سے بعثت رسولؐ کی ابتدا ہوئی پھر کافی عرصے تک سلسلہ وحی کا بند رہا اور اُس کے بعد اس سورے کی ابتدائی سات آیتیں اتریں جو ابھی سامنے آئیں گی اور اس کے بعد جلدی جلدی وحی کے اجزاء اترنے لگے اور اکثر وہ چھوٹے سورے اترنے لگے جو تیسویں پارے میں درج ہیں۔ اس دوران میں متفرق آیت کی صورت میں وہ آیتیں بھی آئیں جن سے سورہ اقراء کی تکمیل ہوئی اور یہ آیات بھی آئے جن سے سورہ مدّثر ایک مکمّل سورہ ہو گیا۔

اس سورہ میں پہلے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ بس اب کھڑے ہو جائیں اور خلقِ خدا کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں، پھر قرآن کی عظمت اور علوشان کا بیان ہے، پھر جس شخص نے خاص طور پر یہ رائے ظاہر کی تھی یہ سحر ہے، اُس کو سختی کے ساتھ عذاب الٰہی سے خبردار کیا گیا ہے اور پھر دوزخ کا ذکر اور اُن فرشتوں کی تعداد ہے جو دوزخ پر مقرّر ہیں۔ پھر مختصر طور پر اہل بہشت کا ذکر ہے اور اُن کے حسنِ انجام کا اور قرآن سے وحشت کرنے والوں اور بھاگنے والوں کا ذکر ہے اور یہ کہ ہدایت وہ پائیں گے جن کے شامل حال توفیق ربّانی ہوگی جو اہلیت کے ساتھ وابستہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ۖ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۖ﴿۳﴾ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۖ﴿۴﴾ وَالرُّجْزَ

فَاهْجُرْ ﴿۵﴾ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ﴿۶﴾ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ﴿۷﴾

''اے چادراوڑھ کر لیٹنے والے، اٹھیے اور متنبّہ کیجئے اور اپنے پروردگار کی بڑائی کا اعلان کیجئے اور اپنے کپڑے کو پاک رکھئے اور نجاست سے بچتے رہیے اور احسان نہ کیجیے زیادہ حاصل کرنے کے لئے اور اپنے پروردگار کے لئے صبر و برداشت سے کام لیجئے''۔

کہا جاتا ہے کہ جبرئیل امینؑ کو دیکھ کر حضرت پیغمبر خداؐ خوف زدہ ہو گئے تھے اور گھر پر آ کر فرمایا مجھے اڑھاؤ اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئے اُس وقت یہ سورہ اُترا اور یا ایہا المدثر کہہ کے خطاب کیا گیا.....یعنی آپ اُس سے نہ ڈریے کہ جو آپ نے دیکھا ہے وہ شیطان کا کوئی وسوسہ ہوا اٹھیے اور خلق خدا کو عذاب الٰہی سے متنبہ کیجیے آپ تو اللہ کے رسول ہیں۔ علامہ طبرسی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:۔

فی ھٰذامافیه لان الله تعالیٰ لایوحی الیٰ رسوله الاباالبراھین النیرة والاٰیات البیّنة الدالة علیٰ ان مایوحیٰ الیه انّماھومن الله تعالیٰ فلایحتاج الیٰ شیء سواھاولایفزع ولایفرت (مجمع البیان)

اس روایت میں جو کمزوری ہے وہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جو وحی اپنے رسول کی طرف بھیجتا ہے وہ کھلے ہوئے دلائل اور نمایاں نشانیوں کے ساتھ ہوتی ہے جو پتہ دیتی ہیں کہ جو اُس پر وحی ہو رہی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے جس کے بعد کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے اور وہ گھبراتا نہیں اور نہ ڈرتا ہے۔ بہرحال اس جزء کو رد کرنے کے بعد بھی کہ حضرتؐ کو معاذ اللہ شیطان کے وسوسہ کا ڈر ہوا، بحیثیت واقعہ اس کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیے کہ جب یہ سورہ نازل ہوا ہے تو حضرتؐ چادر اوڑھ کر لیٹ چکے تھے۔ چنانچہ علامہ طبرسیؒ نے اس کے بعد ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ

انه کان قدتدثر بشملة صغیرة لمنام فقال قم یاایھا النائم من نومك فانذر قومك۔

آپ نے ایک چھوٹی سی چادر اوڑھی تھی تا کہ سوئیں، تو ارشاد ہوا کہ اے سونیوالے اپنی نیند چھوڑ کر اٹھیے اور اپنی قوم کو متنبّہ کیجیے۔

بہرحال جیسا کہ سورہ مزمّل کے ابتدائی حصّے میں لکھا جا چکا ہے ان دونوں خطابوں میں کہ یاایھا المدثر اور یاایھا المزمل ایک محبّانہ بے تکلفی ہے۔ مطلب یہی ہے کہ اب سونے اور لیٹنے کا زمانہ نہیں ہے اب تو آپ کو خلق خدا کو بیدار کرنا ہے.....لہٰذا بس اب اٹھیے اور اپنی قوم کو متنبہ کیجیے کہ اُن کا شرک اور اُن کی بداعمالیاں اُنہیں عذاب خدا کا مستحق بنا رہی ہیں۔

یہاں اٹھنے کا حکم دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بس اب کھڑے ہو جایئے اور جا کر لوگوں کے گھروں پر اسی پردۂ شب میں انہیں جگانا شروع کر دیجیے بلکہ یہی ہے کہ اب اپنے دور حیات میں مستقل طور پر آپ کو یہ کام انجام دینا ہے جس میں آپ کو آرام کا موقع کم حاصل ہوگا اور سرگرمی و عرق ریزی کے ساتھ جدوجہد اور شدائد کا مقابلہ زیادہ کرنا پڑے گا جسے ان آیات کے آخر میں کہا ہے کہ اپنے پروردگار کی طرف کے فرض کو ادا کرنے کے لئے آپ کو صبر و برداشت سے کام لینا ہوگا۔

اللہ اکبر کے معنیٰ

''اپنے پروردگار کی بڑائی کا اعلان کیجیے''.....یعنی یہاں کے لوگ جو دوسرے خداؤں کے سامنے سر جھکا رہے ہیں اُنہیں بتا دیجیے کہ ان میں سے کوئی عظمت کا مالک نہیں ہے، بزرگی صرف اُس ذات کے لئے ہے جو سب کا پروردگار ہے۔ اور اس حقیقت کے اظہار

کے لئے جو الفاظ اسلام میں عبادات کا ضروری جزء ہیں وہ اللہ اکبر کی ہیں۔

یہ اکبر افعل التفضیل کا صیغہ ہے زیادہ بڑا۔ اگر اس کے متعلق کوئی ذکر ہو جاتا کہ کس سے بڑا تو اس کی عظمت محدود ہو جاتی ہے، ایسے ہی محل وہ ہوتے ہیں کہ لفظوں کی کمی معنی میں زیادتی کا سبب ہوتی ہے، اب کسی کو بھی جو کسی وجہ سے بڑا سمجھے، اُس کی بڑائی کی نفی ہوگئی اور مطالبہ یہ ہے کہ جو چیز بھی تمہارے وہم وخیال وتصوّر میں آئے، اُس سے بڑی وہ ذات ہے جسے ہم معبود مانتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مسلمانوں نے اس نعرے کا اکثر غلط استعمال کر کے اس نعرے کی توہین کی اور اسے سب کو بنا دیا ہے جو حقیقت میں خود اُس کی عظمت محسوس نہ کرنے کا نتیجہ ہے مگر اُس سے بجائے خود اس نعرے کی عظمت اور اہمیت پر اثر نہیں پڑتا۔

درحقیقت اقراء اور مدّثر اور مزّمل سب میں علاوہ خلق خدا کے شرک وغیرہ معاصی سے روکنے کی کوشش کے احکام الٰہیہ میں جو سب سے اہم چیز نماز ہے اُس کے جزاؤ شرائط کی تعلیم بھی مضمر ہے۔ چنانچہ نماز کا ایک بڑا ضروری جزء اُسے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ اور پھر جیسا کہ پارہ اوّل کی تفسیر میں ہم نے لکھا ہے اقراء کے ساتھ ساتھ جو چیز لازمی طور پر ہر نماز میں پڑھنا ہے، سورۂ حمد اور اب ربك فكبّر کے ساتھ جو نماز کا پہلا جزء ہے کہ جس سے انسان نماز میں داخل ہوتا ہے وہ تکبیرۃ الاحرام اور اس کے ساتھ جو شرط لازم نماز کی ہے یعنی طہارت اُس کی طرف توجہ دو، مثبت اور منفی جزؤں کی صورت میں دلائی گئی ہے وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ''اپنے کپڑوں کو پاک رکھیے اور نجاست سے بچتے رہیے، اس میں دوسرا جزء لفظاً تو امر بھی ہے لیکن ہم نے اُسے منفی کے لفظ سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ اس میں نجاست کی نفی مضمر ہے، جس طرح توحید کے ساتھ نفی شرک کا لازمی تعلق ہے، ویسے ہی طہارت کے ساتھ نفی نجاست کا پہلو لازم ہے۔ فقہ اسلامی خواہ وہ اہل سنت کی یا شیعوں کی جسے ''فقہ اہل بیت کہنا چاہیے اور فقہ جعفری بھی کہتے ہیں، اس میں کتاب الصلوٰۃ سے پہلے کتاب الطہارت ہوتی ہے کیونکہ نماز کے حکم کی تعمیل ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ طہارت کے احکام کا علم اور اُن پر عمل نہ ہو۔

اب اس آئینی طہارت اور پرہیز از نجاست کے حکم کے ساتھ ان دونوں فقروں میں نفسانی واخلاقی اور عملی طہارت بھی مضمر ہے جس میں ورع وتقویٰ اور اخلاقی بلندی کی پوری دنیا سموئی ہوئی ہے اب چونکہ اس راہ میں شدائد ومصائب آنا ضروری ہے اس لئے آخر میں صبر وبرداشت سے کام لینے کی ہدایت ہوئی ہے جو پھر اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ہوتی رہی۔ یہ کوئی عاجزی اور کم ہمتی کی تلقین نہیں بلکہ ثبات قدم اور استقلال کی دعوت ہے جو مشکلات کی نوعیتوں کے بدلنے کے ساتھ ہر حال میں قائم وبرقرار ہے اور بزم اور رزم دونوں پر حاوی ہے۔

فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ﴿٨﴾ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ﴿٩﴾ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴿١٠﴾
ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ﴿١١﴾ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿١٢﴾ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ﴿١٣﴾
وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ﴿١٤﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ﴿١٥﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ﴿١٦﴾
سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿١٧﴾ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿١٨﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿١٩﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ
قَدَّرَ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ

اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾

'' تو جب صور پھونکا جائے گا تو یہ جس دن ہوگا بڑا دشوار دن ہوگا، کافروں پر وہ کوئی معمولی نہ ہوگا، چھوڑ دو مجھے اور اسے جسے میں نے تنہا پیدا کیا، اور اس کے لئے بڑا پھیلا ہوا مال وزر میں قرار دیا اور بیٹے کہ جو ہر وقت موجود رہتے ہیں اور ہر طرح کی آسانیوں کا سامان اُس کے لئے فراہم کیا، پھر بھی وہ لالچ رکھتا ہے کہ میں اُسے اور زیادہ دوں ہرگز نہیں، وہ ہماری آیتوں سے جان بوجھ کر دشمنی کرنے والا ہے میں تو اب جلد اُسے سخت عذاب کی راہ پر لے جاؤں گا، اُس نے سوچا کہ اندازہ کر کے کیا بات کہے تو اُس کی جان لی جائے، کیا اُس نے اندازہ لگایا پھر (سنو) اُس کی جان لی جائے کہ اُس نے کیسا اندازہ لگایا پھر اس نے غور سے دیکھا، پھر اُس نے منہ سکیڑا اور نفرت کی صورت بنائی پھر (سچائی کی طرف سے) پیٹھ پھیری اور غرور سے کام لیا تو کہنے لگا یہ بس (لوگوں سے) سنا سنایا جادو ہے۔ یہ نہیں ہے مگر آدمیوں کا کلام''۔

ایک شخص خاص کا تذکرہ

انداز کلام سے ظاہر ہے کہ یہ ایک شخص خاص کا ذکر ہے۔ گزشتہ آیتوں کی شان نزول میں جو روایتیں ہیں وہ نہ ہوتیں تو ہم سمجھ سکتے تھے کہ اسی شخص کے طرز عمل سے دل برداشتہ ہو کر رسولؐ اُس طرح منہ لپیٹ کر لیٹے تھے جو یہ سورہ نازل ہوا۔ مگر جیسا کہ کہا گیا وہ سات آیتیں ہیں جو پہلے نازل ہوئیں اور اس کے بعد جب اس شخص سے اس واقعہ کا ظہور ہوا تو یہ آیتیں اتریں۔ علامہ طبرسیؒ نے اس سلسلے میں جو دو روایتیں نقل کی ہیں اُن میں سے ایک میں تو یہ ہے کہ جب قریش دارالندوہ میں جہاں کسی بھی اہم موقع پر مجلس شوریٰ کی ضرورت ہوتی تھی جو جمع ہوتے تھے) جمع تھے کہ اُس نے از خود کھڑے ہو کر مجمع سے کہا کہ تم صاحبانِ عقل ہو اور تمہاری بات کا عرب میں وزن معلوم ہوتا ہے۔ یہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو کلام سناتے ہیں اُس سے عرب متاثر ہوتے ہیں اور تم لوگ مختلف باتیں اس کلام کے متعلق کہتے ہو تو یکسوئی کے ساتھ ایک بات طے کر لو یہی کیا کرو گے۔ اب بتاؤ تم لوگ کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے تو اُس نے یہ سن کر منہ سکیڑا اور کہا کہ ہم نے بے شمار شعر سنے ہیں یہ شعر والے انداز کا کلام ہے ہی نہیں۔ اُنہوں نے کہا اچھا کاہن ہے۔ اُس نے کہا تم برابر اُس سے باتیں کرتے رہے ہو، کبھی اس نے کاہنوں کی سی گفتگو کی؟ اُنہوں نے کہا دیوانہ کہیں گے، اُس نے کہا یہ بھی تم اُس کی گفتگو سے محسوس کرو گے کہ وہ دیوانوں کی سی باتیں نہیں ہیں۔ اُنہوں نے کہا اچھا تو ساحر کہیں، اُس نے کہا ساحر کس طرح سے ہے۔ کہا اس لئے کہ وہ دوستوں میں آپس کے تفرقہ ڈال دیتا ہے، اور جو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے انہیں ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے اور یہ کام جادوگروں کا ہوتا ہے۔ اُس نے کہا اچھا یہ ٹھیک ہے، بس یہی کہو کہ وہ جادوگر ہے۔ اب جو ملتا تھا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جادوگر کہہ کر تخاطب کرتا تھا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حضرتؐ نے قرآن مجید کے ایک سورے کی تلاوت شروع کی تھی مسجد میں کہ یہ شخص آ گیا اور کھڑے ہو کر سننے لگا۔ حضرتؐ کو جب محسوس ہوا کہ وہ غور سے سن رہا ہے تو آپ نے جو آیت پڑھ چکے تھے اسے دوبارہ پڑھا اور پھر اگلے حصے کی تلاوت کی تو ولید اپنے قوم قبیلہ میں گیا اور کہا بخدا میں نے محمدؐ سے ایک ایسا کلام سنا جو انسانوں کا یا جنوں کا کلام نہیں ہے، اس میں شرینی ہے اور بڑی دل فریبی ہے۔ اس

کے اوپر کا حصہ میوہ دار ہے اور نیچے سے بھی وہ سرسبز شاداب ہے اور یہ غالب آ کر رہے گا، کوئی اسے مغلوب نہیں کر سکتا۔ یہ کہہ کر گھر چلا گیا۔ قریش میں چرچا ہونے لگا کہ لو ولید تو گرویدہ ہو گیا (یعنی مسلمان ہو گیا) ان جتنے قریش کے لوگ سب گرویدہ ہو جائیں گے، کیونکہ ولید کو قریش میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ابوجہل نے کہا اسے ٹھیک کرنا میرے ذمہ ہے، چنانچہ وہ گیا اور بڑی رنجیدہ صورت سے اس کے پاس بیٹھا، اس نے کہا کیوں بیٹے! رنجیدہ کیوں ہو؟ کہا آپ ایسے بزرگ آدمی کو قریش کے لوگ بڑی لفظوں سے یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے محمدؐ کے کلام کی تعریف کی ہے۔ یہ سن کر ابوجہل کے ساتھ اٹھا اور اپنی قوم کے مجمع میں آیا اور اس سے گفتگو کی کہ تم شاعر کس طرح کہتے ہو، اور کاہن کس طرح کہتے ہو۔ اور دیوانہ کس طرح کہتے ہو، تو قریش نے کہا اچھا تو آپ کیا کہتے ہو اس نے کہا جادوگر ہے کہ خاندانوں میں تفرقہ ڈالتا ہے، میاں بیوی سے اور باپ کو اولاد سے اور ایک عزیز کو دوسرے عزیزوں سے چھڑا دیتا ہے تو وہ بس ساحر ہے۔ اسی کا قرآن مجید نے تذکرہ کیا ہے۔

یہ دونوں روایتیں انہوں نے الگ الگ درج کی ہیں لیکن سیرت ابنِ ہشام میں جو واقعہ درج ہے، اس میں ان دونوں روایتوں کے خاص اجزا بھی ترتیب کے ساتھ سموئے ہوئے ہیں اور اس اجتماع کا پس منظر بھی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ کا چرچا ہونے لگا تھا اور اب ان کے متعلق چہ می گوئیاں ہر طرف ہو رہی تھیں کہ حج کا زمانہ قریب آ گیا اور اب قریش کو فکر ہوئی کہ اس موقع پر تمام قبائل عرب کے لوگ آئیں گے لہٰذا ہم لوگوں کو اس کا سدباب کرنا چاہیے کہ ان کی تبلیغ سے وہ متاثر نہ ہوں۔ اس کے لیے دارالندوہ میں وہ اجتماع ہوا تھا اور اس پر ولید نے وہ تقریر کی جو پہلے بیان ہو چکی۔ آخر تم لوگ اس کلام کو کیا کہو گے؟ اور ایک ایک بات کو جو وہ لوگ کہتے تھے، اس نے رد کیا۔ اور اسی ذیل میں اس نے رسولؐ سے سنے ہوئے کلام کی تعریف میں وہ الفاظ کہے جو مجمع البیان کی دوسری روایت میں ہیں ابوجہل نے کہا کہ آپ سے لوگ ایسی بات سنیں گے تو پھر کون ہے جو ان کے کلام سے متاثر نہ ہوگا اور پوری قوم خود آپ سے ناراض ہو جائے گی لہٰذا آپ ہی کچھ نہ کچھ تو بات بتائیے کہ کیا کیا جائے اور اس پر سوچ سانچ کر اس نے وہ کہا جو قرآن مجید میں ذکر ہے۔

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾
عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا
عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ
الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ
اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ؕ وَمَا هِيَ
اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾

”بہت جلد میں اسے دوزخ کا مزہ چکھاؤں گا اور تم کیا جانو کہ دوزخ کیا چیز ہے! وہ رحم نہیں کرتا اور نہیں چھوڑتا، وہ کھالوں کو جلا کر سیاہ کر دینے والا، اس پر انیس (۱۹) کارکن مقرر ہیں اور ہم نے آتش جہنم کے ان کارکنوں کو نہیں

بنایا ہے مگر مگر فرشتہ اوران کی تعداد کونہیں قرار دیا ہے مگر آزمائش کا ذریعہ کافروں کے لیے تا کہ جنہیں پہلے کتاب عطا ہوچکی ہے انہیں یقین آجائے جو ایمان لائے ہیں ،ان کے ایمان میں اضافہ ہو جنہیں کتاب عطا ہوچکی ہے اور جو با ایمان ہیں، وہ کسی شک وشبہ میں گرفتار نہ ہوں اور وہ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور کافر لوگ نہ کہیں کہ اللہ کا اس بیان سے کیا مطلب ہے؟ اس طرح اللہ گمراہی میں ڈال دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت کرتا ہے جس کی چاہتا ہے اور تمہارے پروردگار کے لشکروں کو کوئی نہیں جانتا سوا خود اس کے اور یہ نہیں ہے مگر نصیحت انسانوں کے لیے''۔

چونکہ اُس شخص کو کفّار قریش بڑی اہمیت دیتے تھے اور اُس نے جانتے بوجھتے ہوئے اور ایک دفعہ حق کا اعتراف کرتے ہوئے پھر یہ معاندانہ رویّہ اختیار کیا تھا صرف اپنی وجاہت دنیوی کو قائم رکھنے کے لئے، اس لئے قرآن مجید نے یہاں بڑی سختی کے ساتھ اُس کے عذاب کا تذکرہ کیا ہے۔ دوزخ کی یہ صفت جو بیان کی گئی کہ لا تبقی ولا تذر اُس کا ترجمہ جو ہم نے کیا کہ وہ ''رحم نہیں کرتا اور نہیں چھوڑتا'' یہ ایک تشریح کی بنا پر ہے۔[1]

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ''وہ نہیں باقی رکھتا اور نہیں چھوڑتا'' اب باقی نہیں رکھتا کا مطلب چونکہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ختم کر دیتا ہے، اس لئے دوسرا جملہ کہ نہیں چھوڑتا۔ اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ ایک دفعہ ختم ہونے کے بعد بھی نہیں چھوڑتا بلکہ دوبارہ اُن کی رمق حیات کو تازہ احساس دے کر اُنہیں مزید تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں تا کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے: کلّما نضجت جلودھم بدّلنٰھم جلوداً غیرھا لیذوقوا العذاب ''جب اُن کی کھالیں گل جاتی ہیں تو نئی کھالیں انہیں دی جاتی ہیں تا کہ وہ عذاب کا مزہ چکھتے رہے''۔ (نساء۔۵۶)

لوّاحة للّبشر کے بھی دو ۲ معنی ہیں ایک یہ کہ ''وہ کھالوں کو جھلس کر سیاہ کر دینے والا ہے''[2] اس کی شدّت کا درجہ وہ ہے کہ کھالیں بالکل گل جائیں اور ضرورت ہو کہ دوسری کھالیں تازہ پیدا ہوں اور دوسرے یہ کہ وہ تمام آدمیوں کو جو وہاں داخل ہوں گے جلا دے گا[3] اور آدمیوں کے نام اس لئے لیے گئے کہ یہاں بات ایک آدمی ہی کی تھی ورنہ جنّات بھی جو داخل ہوں گے، انجام اُن کا بھی یہی ہے، اب یہ مضمون آیات سے بالکل ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی دفعہ وحی کی جو قسط نازل ہوئی اور سنائی گئی وہ اتنے پر ختم ہوگئی۔

اب مشرکین جن کے سامنے اُس کی تلاوت ہوئی وہ مذاق اڑانے لگے، ابوجہل نے قریش سے کہا ارے تم سب غارت ہو جاؤ۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ وہاں بس ۱۹ کارکن مقرر ہیں تو تم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ دس (۱۰)، دس (۱۰) آدمی اُن میں سے ایک ایک سے بھڑ جائیں اور اس طرح سب کا خاتمہ کر دیں۔ اس پر ابوالاسد جمحی جسے اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا کہنے لگا کہ اُن میں سے سترہ ۱۷ کے لئے تو میں اکیلا کافی ہوں۔ دو ۲ کو تم لوگ ختم کر دینا.....بس یہود و نصاریٰ میں کہ وہ افراد جس میں گزشتہ انبیاء کے تعلیمات کے کچھ مٹے ہوئے نقوش موجود تھے کہنے لگے یہ سب مذاق بے کار ہے۔ وہ (۱۹) کی تعداد میں سہی مگر وہ کوئی اُن آدمیوں میں جو تھوڑے ہوں گے یہ سب مل

---

[1] ۔ای لا تبقی علیھم بل تبلغ مجھودھم فی انواع العذاب (مجمع البیان)

[2] ۔محرقه تظاهر الجلد (جلالین) مغیّرة للجلود وقیل لائحة للجلود حتیٰ ندعها اشدّ مرادا فی اللیل (مجمع البیان)

[3] ۔سوزندا است آدمیانرا (شاہ ولی اللہ)

کر اُنہیں دبالیں.....خدا جنہیں مقرر کرے گا وہ ایسے کمزور کچھ تھوڑی ہوں گے آدمی کہ آدمی اُنہیں دبالیں.....اس پر کچھ ڈھلمل یقین قسم کے مسلمان بھی جو شک وشبہہ یا نفاق کے فرق میں گرفتار تھے، ایسے ہی ڈھیلے ڈھالے کافروں کے ساتھ مل کر کہنے لگے کہ بہرحال یہ تعداد بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ انیس ۱۹ ہوں گے کہ اُس کا مذاق اُڑایا جائے۔

اس پر یہ بعد کی آیت اتری.....جس میں پہلے اسی بات کو صاف طور پر کہا گیا کہ وہ انیس ۱۹ سہی مگر وہ تمہاری طرح آدمی تھوڑی ہیں کہ تم اُنہیں دبالو.....بحیثیت واقعہ یہ ہے کہ وہ انیس ۱۹ ہوں گے لیکن خدا چاہتا تو اس پورے کام کو ایک فرشتے سے لے سکتا تھا۔ اور اُس ایک کو تم سب مل کر مغلوب ومقہور نہیں کر سکتے۔ وہ تو فرشتے ہیں اور جو کام اُن سے لینا ہے اُس کے تناسب سے اللہ اُنہیں طاقت عطا کرتا ہے، تمہاری جسمانی طاقتیں اُن کا مقابلہ تھوڑی کر سکتی ہیں.....اور جو کچھ اس کہنے کا ردعمل ہو رہا ہے، اس کے سامنے لانے کے لئے تو اللہ نے اس تعداد کا اظہار کیا ہے کہ یہ کھل کر سامنے آجائے کہ اہل کتاب پر کیا اثر ہوتا ہے اور مومن پر کیا اثر ہوتا ہے اور کافروں اور منافقوں میں سے کس کس پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے.....گمراہ اور ہدایت یافتہ میں بحیثیت واقعہ امتیاز کا ظاہر ہونا بھی اللہ کا ایک مستقل مقصد ہوتا ہے۔

یوں وہ چاہتا نہیں کہ کوئی گمراہ ہو لیکن جس میں گمراہی کے جراثیم چھپے ہوئے ہیں، اُن کو ابھرنے کا موقع دینا بھی اُس کا ایک خاص طریقۂ کار ہے جس سے عذاب کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ﴿٣٣﴾ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ﴿٣٤﴾ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾
نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ﴿٣٦﴾ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ﴿٣٧﴾

''ہرگز نہیں قسم ہے چاند کی اور رات کی جب وہ پیٹھ پھرائے اور صبح کی جب وہ روشن ہو، بلاشبہہ وہ ایک بہت بڑی چیز ہے، وہ متنبّہ کرنے والی ہے انسانوں کو اُن کے لئے جو چاہے تم میں سے کہ آگے بڑھے یا پیچھے رہے''۔

چونکہ وہ دوزخ کا ذکر تھا اور یہ سب مذاق اُسی کے سلسلے میں اُڑایا جا رہا تھا، اس لئے ہرگز نہیں کا تعلّق بھی اُسی کے ساتھ ہے اور پھر یہ ضمیر کہ یہ بڑی چیز ہے، اُسی کی طرف راجع ہے [1] جب کہ ڈرایا جا چکا تو اب یہ کہنا کہ جو چاہے قدم آگے بڑھائے یا پیچھے رہے، اس کے معنی اجازت کے نہیں ہو سکتے کہ ہم تمہیں اختیار دیتے ہیں خواہ تم آگے بڑھو یا پیچھے رہو بلکہ یہ اُس اختیار کا ذکر ہے جو ایمان وکفر اور طاعت ومعصیت میں ہر ایک کو ہے اور جس کے سبب سے جزاؤ سزا کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿٣٨﴾ إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ﴿٣٩﴾ فِي جَنَّاتٍ
يَتَسَاءَلُونَ ﴿٤٠﴾ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ﴿٤١﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ﴿٤٢﴾ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ
الْمُصَلِّينَ ﴿٤٣﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ﴿٤٤﴾ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ﴿٤٥﴾
وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٤٦﴾ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ﴿٤٧﴾ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ

---

[1] ۔یعنی ان سقر التی ھی النّار لاحدی العظایم (مجمع البیان)

الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾

''ہر شخص اپنے اعمال کے ساتھ گرھویں ہے سوا دائیں طرف والوں کے، کہ وہ بہشتوں میں ہوں گے، سوال وجواب کرتے ہوں گے گناہگاروں سے کہ تمہیں کیا بات دوزخ میں لے گئی؟ وہ کہیں گے ہم نمازیوں میں داخل نہ تھے اور غریب محتاج کو کھانا نہیں دیتے تھے اور ہم بے ہودہ باتیں کرنے والوں میں شامل ہو کر بے ہودہ چرچے کرنے لگتے تھے، اور ہم روز جزاء کو جھوٹ کہتے رہے یہاں تک کہ یہ یقینی منزل ہمارے سامنے آ گئی، یہ لوگ ایسے ہیں کہ اُنہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہیں پہنچائے گی''۔

''ہر شخص اپنے اعمال کے ساتھ گرھویں ہے'' یعنی اُس کے حسن انجام اور بدانجامی کا تعلق اُس کے کردار سے ہے جس میں اصل چیز تو ایمان لانا ہے کہ اسی پر پورے تمام افعال کے نتیجہ خیز ہونے کا انحصار ہے اور ''ہم نمازیوں میں داخل نہ تھے'' یعنی ہم نے ایمان قبول نہیں کیا تا کہ نماز پڑھتے، اور وہ قابل قبول ہوتی۔ بغیر ایمان ایک تو نماز پڑھتے ہی کیوں اور پڑھتے بھی تو وہ قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی، علماء نے اس سے علم کلام کی اُس بحث میں استدلال کیا ہے کہ کفّار فروعِ دین کے احکام کے ساتھ مکلّف ہیں یا نہیں۔ اُن کا مقبول نظریہ یہ ہے کہ یہ احکام سب کے لئے ہیں مگر شرط صحت ایمان ہے۔ کافر کو اس کی بھی سزا ہوگی کہ وہ ایمان کیوں نہیں لایا اور اس کی بھی کہ اُس نے نماز وغیرہ جو فرائض تھے وہ کیوں ادا نہیں کیے..... یہ کہ وہ ایمان نہیں لایا تھا، اُسے ان احکام کی خلاف ورزی کی پاداش سے بچا نہیں سکتے جس طرح کوئی وضو یا غسل کرے ہی نہ تو وہ رتک نماز کی سزا سے بچ نہیں سکتا حالانکہ بغیر اس شرط کے نماز پڑھتا تو قبول نہ ہوتی مگر یہ شرط جب اُس کے اختیار میں تھی اور اُس نے اُسے ترکِ نماز کی سزا کا مستوجب ہے، اُسی طرح کافر ان احکام پر عمل پیرا نہ ہونے کی سزا کا بھی مستوجب ہے۔ [1]

حقوق اللہ کے ساتھ حقوق الناس کو کہیں نظر انداز نہیں کیا جاتا..... چنانچہ جیسے قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر یقیمون الصّلوٰۃ کے ساتھ یؤ تون الزکوٰۃ ہے ویسے ہی یہاں بدانجامی کے اسباب میں نمازیوں میں نہ ہونے کے ساتھ بھوکے کو کھانا نہ دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔

''یقینی زندگی سے مراد موت بھی ہو سکتی ہے'' یعنی مرتے دم تک ہم اُسی روش پر قائم رہے اور یہ ''جزاؤ سزا'' کی ساعت بھی مراد ہو سکتی ہے جسے وہ جھٹلاتے رہے تھے۔ انہیں شفاعت فائدہ نہ پہنچائے گی۔ کیونکہ یہ سب کافر تھے اور شفاعت کفّار کی جماعت کے لئے نہیں ہے۔

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۹﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿۵۰﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿۵۱﴾ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾ كَلَّا ؕ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۵۳﴾ كَلَّاۤ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾ وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾

---

[1] ۔فیہ دلالۃ علیٰ ان الکفّار مخاطبون بالعبادات الشرعیۃ لانہ حکایۃ عن الکفّار بدلالۃ قولہ و کنّا نکذّب بیوم الدین (مجمع البیان)

’’ تو انہیں کیا ہے کہ وہ نصیحت سے روگردانی کرتے ہیں جیسے وہ وحشی گدھے ہیں جو کسی شیر سے بھاگے ہوں بلکہ ہر ایک اُن میں سے چاہتا ہے کہ (براہ راست خود) اُسے کھلی ہوئی کتابیں دی جائیں۔ ہرگز نہیں بلکہ وہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔ ہرگز نہیں یہ ایک نصیحت ہے تو جو چاہے وہ اُسے یاد رکھے اور وہ یاد نہیں رکھیں گے جب تک کہ اللہ کو منظور نہ ہو۔ وہ ڈرے جانے کا حقدار ہے اور وہ بخشش والا ہے‘‘۔

یعنی نصیحت تو انہیں اُن کی خیر خواہی کے لئے کی جارہی ہے مگر یہ اُسے توجہ سے سننے اور فائدہ اٹھانے کے بجائے اُس سے اس طرح بھاگ رہے ہیں، چونکہ جنگلی گدھے ذرا بھی خطرہ محسوس کر کے بے تحاشہ بھاگتے ہیں ایسے منظر کی تشبیہہ اُن سے دی جاتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ خدا براہ راست اُن کے پاس خطوط بھیجے یا کتابیں اُن تک پہنچائے۔ اس میں ایک پہلو تکبّر کا بھی مضمر ہے کہ ہم ایک شخص کے کہنے پر جو ہم ہی میں سے ہے سر جھکا دیں، یہ ہماری شان کے خلاف ہے..... بعد میں قرآن مجید نے کہہ دیا ہے کہ ’’یہ چاہنا بھی‘‘ اُن کا ایک بہانہ ہے ایمان نہ لانے کا۔ حقیقت میں وہ اس آخرت کو مانتے ہی نہیں، اور اُس کا اندیشہ اپنے دل سے محسوس نہیں کرتے۔ ورنہ ایسی باتیں اُن کے لئے رسولؐ کی رسالت کو ماننے سے سدّ راہ نہیں ہوسکتی تھیں۔ بعد میں جو کلّا ہرگز نہیں کہا گیا، اللہ کا کام نہیں ہے..... اتمام حجّت ہو چکی جسے پھر کہا جارہا ہے کہ جو نصیحت کرنا تھی کر دی گئی۔ اب نہیں مانتے تو یہ جانیں ان کا کام۔ یہ چاہیں تو اس نصیحت کو یاد رکھیں مگر ان کا مستقل کرسار ایسا رہا ہے کہ اب وہ چاہیں ہی نہیں۔ اللہ کی توفیق بھی اُن کے شامل حال ہونے والی نہیں ہے..... وہ اس کا حقدار ہے کہ اس سے یہ لوگ ڈرتے رہیں کہ کب وہ ان پر عذاب نازل کر دے..... ہاں جو نیک راستے پر ہو اور ایمان اختیار کرے اُس سے جو غلطیاں بھی ہو جائیں اُن سے درگزر کرتا ہے، وہ بخشنے والا بھی ہے مگر ایسے باطل پر ایمان رکھنے والوں کو نہیں۔

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ

مکیّہ.....۴۰.....آیات

چونکہ قیامت کی قسم ہی سے سورہ شروع ہوا ہے، اس لئے سورے کا یہ نام ہوا اور یہی تقریباً اس سورے کا موضوع ہے۔ صرف درمیان میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کو اس کی فکر نہ ہونا چاہیے کہ آپ وحی کے کچھ اجزاء کو بھول جائیں گے۔ ہمارے ذمّے ہے کہ ہم اسے محفوظ رکھیں اور ہمیں بھروسا ہے آپ کے حافظہ پر کہ آپ محفوظ رکھیں گے تو آپ کو اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کہ آپ فراموش کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر آخر تک منکرین آخرت کے شبہات اور اعتراضات کا جواب ہے اور محاسبۂ اعمال کے ضروری ہونے کو ثابت کیا گیا ہے۔ اور یہ کہ انسان کے تمام افعال و اعمال اُس کے یہاں محفوظ ہیں اور انہیں ایک ایک کر کے اُس کے سامنے لے آیا جائے گا اور اُس کے مطابق مکافات ہوگی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝۱ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝۳ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝۴ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝۵ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝۶

''نہیں قسم میں کھاتا ہوں قیامت کے دن کی اور نہیں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی، کیا آدمی یہ سمجھتا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکیں گے، کیوں نہیں ہم قادر ہیں کہ اُس کی ایک پور کو بالکل ٹھیک ٹھیک (پھر) بنا دیں، بلکہ انسان چاہتا ہے کہ آئندہ کی زندگی میں خوب فسق و فجور کرے، وہ پوچھتا ہے قیامت کا دن کب ہوگا''؟

یعنی یوں تو قیامت ایک ایسی حقیقت ہے جس کی قسم کھائی جا سکتی ہے مگر تم اُس دن کو مانتے نہیں لہٰذا اس کی قسم کھانا بے کار ہے۔ پھر انسان کا وہ ضمیر جو خود اُسے بری باتوں پر ٹوکتا ہے وہ بھی ایک بڑی حقیقت ہے قسم کھانے کے قابل مگر تم نے اس ضمیر کو مردہ بنا رکھا ہے۔ اس لئے میں اُس کی بھی قسم نہیں کھاتا، بہرحال کسی بھی آدمی کا یہ کہنا کہ اُس کی ہڈیاں جب بوسیدہ ہو گئیں اور ریزہ ریزہ ہو کر منتشر ہو گئیں تو وہ کیوں کر دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے؟ غلط ہے اس لئے کہ وہ ہماری قدرت کو نظر انداز کر رہا ہے.....اسی کو دو ۲ فقروں میں بیان کیا گیا ہے کہ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم ہرگز اُس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے؟ کیوں نہیں.....ہم تو وہ ہیں اور ہماری قدرت ایسی ہے کہ ہم اُس کے بڑے بڑے اجزائے جسم کا کیا ذکر، اُس کی انگلیوں کی ان پوروں کو جن سے وہ بڑے چھوٹے ہر طرح کے کاموں کو انجام دیتا ہے بالکل اسی

طرح دوبارہ انہی منتشر اجزاء کو اکٹھا کر کے پیدا کر دیں گے حقیقت یہ ہے کہ اُس کے انکار کی کوئی بنیاد نہیں ہے بلکہ وہ جانتا ہے کہ قیامت کو مان لینے اور جزاؤ سزا کے قائل ہو جانے سے اُس کی آزادی ختم ہو جائے گی اور وہ طرح طرح کی اخلاقی و دینی پابندیوں میں مقید ہو جائے گا تو وہ صرف اپنی مطلق العنانی کو برقرار رکھنے کے لئے بطور انکار کہتا ہے کہ آخر قیامت کا دن کب ہوگا''؟

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝۷ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝۸ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝۹ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝۱۰ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝۱۱ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمُسْتَقَرُّ ۝۱۲

''تو جب نگاہ چندھیا جائے گی اور چاند کو گہن لگے گا اور سورج اور چاند اکٹھا ہو جائیں گے تو آدمی کہے گا کہ کہاں ہے بھاگنے کی جگہ؟ ہرگز نہیں، کوئی پناہ نہیں ہے، آج کے دن صرف تیرے پروردگار کی طرف پہنچ کر ٹھہرنا ہے''۔

مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں تمہیں وقت معلوم کرنا ہی نہیں ہے۔ نہ خالق کو اُس کا وقت بتانا ہے مگر ہاں پھر سن لو کہ وہ کیسا ہولناک موقع ہوگا۔ ''نگاہ چندھیا جائے گی'' یعنی وہ دہشت ناک منظر ایسا ہوگا اور ایسا ایک دم اچانک طور پر آ جائے گا کہ کوئی دیکھ بھی رہا ہو تو حیرت اور دہشت سے اُس کی نظر کچھ کام نہ کرے۔ آنکھیں اس کی کھلی کی کھلی رہ جائیں اور دکھائی نہ دے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

چاند کو گہن لگے گا یعنی اس کی روشنی ختم ہو جائے گی اور سورج اور چاند اکٹھا ہو جائیں گے یعنی نظام عالم الٹ جائے گا اور دونوں مغرب کی طرف سے طالع ہوں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مراد یہ ہو کہ آفتاب اور ماہتاب دونوں بے نور ہوں گے تو تاریک ہونے میں دونوں کی حیثیت ایک ہو جائے گی [1] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نظام شمسی میں ابتری ہونے سے چاند ایک دم اپنے مستقر سے ہٹ کر سورج میں داخل ہو جائے۔ اصل یہ ہے کہ صحیح کیفیت ان باتوں کی بھی سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بہرصورت خدا کو ماننے کے بعد جزاؤ سزا کی ضرورت عقل انسانی بغیر کد و کاوش کے سمجھ سکتی ہے اور جو شخص قدرت الٰہی کے کرشموں کو جو کائنات میں نمایاں ہیں سامنے رکھے اُس کے لئے انکار قیامت کی کوئی وجہ معقول نہیں ہے اور اُس کے انکار کی بنیاد صرف یہ ہے کہ یہ سب سننے سے اُس کے افعال و اعمال پر پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں جیسا کہ گزشتہ آیات میں پردہ کشائی کی گئی ہے۔

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝۱۳ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝۱۴ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝۱۵

''اُس دن انسان کو بتایا جائے گا جو کچھ اُس نے آگے رکھا اور پیچھے رکھا بلکہ انسان خود اپنے حال کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنے ہی بہانے کرے''۔

''جو کچھ آگے رکھا اور پیچھے رکھا'' اس کا یہ مطلب بھی لیا گیا ہے جو جناب ابن عباسؓ کا قول بیان ہوا ہے کہ آگے رکھا کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جو اعمال انجام دیئے اور پیچھے رکھا کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اعمال کے نتائج جو اس کے بعد بھی باقی رہے اور یہ مطلب بھی لیا گیا ہے کہ کن بداعمالیاں اُس نے کیں اور کن فرائض کو پس پشت ڈال دیا اور انجام نہیں دیا اور یہ بھی کہ اپنے اموال میں سے کیا اُس نے بطور ذخیرۂ آخرت بھیج دیا اور کتنا وارثوں کے واسطے اپنے بعد چھوڑ دیا۔ اور یہ بھی کہ کارہائے خیر میں سے کتنے نہیں کئے اور یہ بھی کہ خود اپنی زندگی میں کون سی باتیں پہلے

---

[1] ۔ای جمع بینہما فی ذہاب ضوئہما بالخسوف فیتکامل ظلام الارض علی اہلہا حتی یراہما کل احد بغیر نور وضیاء (مجمع البیان)

انجام دیں اور کونسی بعد انجام دیں..... یہ سب اُس دن نامۂ اعمال اور حساب و کتاب کے ذیل میں اُس کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور یوں تو وہ خود ہی اپنے ضمیر کے فیصلے کی بنا پر اپنے متعلق خود جانتا ہے۔ وہ دوسروں کو قائل کرنے کے لئے کتنے ہی دلائل اپنی صفائی میں پیش کرے اور طرح طرح کے بہانے بنائے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖؕ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗۚ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗۚ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗؕ﴿۱۹﴾

''اپنی زبان کو اُس کے ساتھ جنبش نہ دیجئے تا کہ جلدی آپ اُسے حفظ کرلیں، بلاشبہہ ہمارے ذمّے ہے اس کا محفوظ رکھنا اور اُس کا پڑھوانا تو جب ہم اُسے پڑھوائیں تو آپ اسی کے مطابق پڑھتے رہیں، پھر ہمارے ہی ذمّے ہے اُس کا واضح کرنا''۔

خود ان آیات کے مضمون پر نظر ڈالتے ہوئے عموماً یہی سمجھا گیا ہے کہ خالق نے اپنی ذمّہ داری بتائی ہے، وہ خود رسولؐ کی ذات سے متعلق ہے مگر جناب شاہ ولی اللہ نے ترجمہ میں اسی پہلو کو پیش نظر رکھنے کے باوجود تفسیری حواشی میں ایک پہلو اپنے منظور نظر صحابۂ رسولؐ کی مدح کا پیدا کیا ہے اور ضمناً قرآن مجید کے حافظوں اور مفسّرین کی تعریف کا بھی، اور لکھا ہے:-

ظاہر نزدیک بندہ آنست کہ معنی آیت چنیں باشد ہر آئینہ وعدہ لازم است بر ما جمع کردن قرآن در مصاحف وحفظ قرأت آں عصراً بعد عصر وایضاح وتفسیر معانی آں خدا تعالیٰ بر دست شیخین رضی اللّٰہ عنہما جمع آں کردود ہر زمانی قاریاں را توفیق دادکہ حافظ شدند وتجوید بخوانند ودر ہر زمانی مفسّراں را توفیق دادکہ در تفسیر آں سعی نمایند (فتح الرحمٰن)

میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ وعدہ ہمارا یہ ہے کہ ہمارے ذمے قرآن کا جمع کردہ مصحفوں کی صورت میں اور حفاظت اور پڑھوانا اُس کے یکے بعد دیگرے ہر زمانے میں اور اُس کے معانی ومطالب کا واضح کرنا اور اُس کی تفسیر چنانچہ خدائے تعالیٰ نے جناب شیخین کے ہاتھ سے اسے جمع کرایا اور ہر زمانہ میں اور ہر جگہ قاریوں کو توفیق دی کہ حافظ ہوں اور قرأت کے ساتھ اُسے پڑھیں اور ہر زمانے میں مفسّرین کو توفیق دی کہ اُس کی تفسیر میں کوشش کریں۔

ہماری قدیم تفسیر فتی میں آل رسولؐ کی اُن خدمتوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو مسلّم طور پر اُنہوں نے حفظ وتشریح قرآن کے ذیل میں انجام دی ہیں[1] اس سب کے برخلاف ایک پرانے مفسّر کوئی بلخی صاحب ہیں انہوں نے یہ رُخ اختیار کیا ہے کہ ان آیات میں روز قیامت ہی نامہائے اعمال کے پڑھنے میں بندہ جو جلد بازی کرے گا اُسے تنبیہہ کی گئی ہے۔ اسے علامہ طبرسی نے اس طرح نقل کیا ہے:-

قال البلخی الذی اختار انه لم یرد القرآن وانّما اراد قرأت العباد لکتبهم یوم القیٰمة یدل علی ذٰلك ماقبله ومابعده ولیس فیه شئی یدل علی انه القرآن ولاشئی من احکام الدّنیا وفی ذٰلك تقریع للعبد وتوبیخ له

---

[1] ۔ علی اٰل محمد جمع القرآن وقرأته (علی بن ابراهیم)

حين لا تنفعه العجلة يقول لا تحرّك لسانك بما تقرأ. من صحيفتك التي فيها اعمالك يعني اقرأ كتابك ولا تعجل وتثبت لتعلم الحجة عليك فانا نجمعها لك فاذا جمعناه فاتبع ما جمع عليك بالانقياد والاستسلام للتبعة فيه فانه لا يمكنك انكاره ثمّ ان علينا بيانه لو انكرت (مجمع البيان)

بلخیؒ نے کہا ہے کہ یہاں قرآن مراد ہی نہیں ہے بلکہ بندوں کا قیامت کے دن اپنے نامہ ہائے عمل کو پڑھنا مراد ہے اس کی دلیل اس کے پہلے اور بعد کی آیتیں ہیں اور کوئی ایسی چیز ان میں نہیں ہے جو اس کا پتہ دے کر اس سے قرآن یا کوئی دنیا کے شرعی احکام مراد ہوں اور اس میں بندے کی سرزنش ہے اس پر کہ وہ اُس نامۂ عمل کو جلدی جلدی کیوں پڑھ رہا ہے، اور اُس سے کہا جاتا ہے کہ اس نامۂ عمل کے پڑھنے میں تو اپنی زبان جنبش نے دے اور غور سے اسے پڑھ جلد بازی سے کام نہ لے، سمجھ کہ تجھ پر کیا کیا الزامات ہیں۔ ہم وہ سب تیرے لئے جمع کئے دیتے ہیں تو جو کچھ تیرے لئے یکجا فراہم کر دیا گیا ہے اس کو سر جھکا کے سکون کے ساتھ پڑھ اور اس کی جو سزا ہے اسے برداشت کر کہ تیرے لئے اُس سے انکار ممکن نہ ہوگا اور اگر انکار کرے تو ہمارے ذمے ہے اس کا بیان کرنا اور وضاحت سے پیش کرنا۔ مگر یہ مطلب کچھ دل کو لگتا ہوا نہیں ہے اور اس میں کچھ زبردستی کی بناوٹ محسوس ہوتی ہے، قبل اور بعد کی آیتوں میں بھی ابتدائی احوال واہوال قیامت کا ذکر ہے، نامہائے عمل کا کوئی ذکر نہیں ہے اور نامۂ عمل مراد لینے کے بعد بھی اس کا کوئی جوڑ قبل اور بعد کی آیتوں سے نہیں لگتا۔ خود ان فقرات کے مضمون سے صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اثنائے کلام میں جملہ معترضہ کے طور پر خود حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تخاطب ہے جیسا کہ عام طور پر مفسّرین نے سمجھا ہے۔ اس کے بعد سلسلۂ کلام قبل والے بیان کے ربط سے شروع ہوا ہے جو ابھی آئے گا۔ الفاظ قرآن کو رسولؐ تک پہنچانے اور محفوظ رکھنے کی ذمہ داری کے ساتھ یہ کہنا کہ پھر ہمارے ذمّے اس کی وضاحت کرنا بھی ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اصل الفاظ قرآن کے ساتھ اُن الفاظ کی وضاحت بھی جہاں ضرورت ہوتی تھی بذریعہ وحی کی جاتی تھی جو اس قرآن مجید کا جزء نہیں ہے مگر اس کی تنزیل بھی بصورت وحی ہوئی ہے، جس کے علم کا ذریعہ دوسروں کے لئے بیان رسولؐ ہے جو داخل سنّت ہے اس لئے ماخذِ دین کی حیثیت سے کتاب کے ساتھ سنّت کا اعتبار بہر صورت ناگزیر ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾

”ہرگز نہیں، حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ اس وقتی دنیا کو دوست رکھتے ہو اور آخرت کو نظر انداز کرتے ہو، اُس دن کچھ چہرے سرسبز و شاداب ہوں گے، اپنے پروردگار کی طرف نگران اور کچھ چہرے اُس دن بسورتے ہوئے ہوں گے یقین کئے ہوئے کہ اُن کے ساتھ پیٹھ کو توڑ دینے والی سختی ہوگی“۔

دیدار خدا بصیرت سے نہ کہ بصارت سے

مطلب یہ ہے کہ انکار آخرت حقیقت میں کسی عقلی فیصلے کی بنا پر نہیں ہے بلکہ ایک سبب تو اس کا وہ تھا جو پہلے بیان ہوا کہ آخرت کے تصوّر سے اُس افعال واعمال پر پابندیاں عائد ہوتی ہیں لہٰذا وہ حیلے حوالے کر کے اپنی مطلق العنانی کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جواب بیان ہو رہا ہے کہ اس کے وقت کے مفادات اُسے آنکھ سے نقد نظر آ رہے ہیں اور آخرت کے لئے آئندہ کا تصوّر ہے وہ ان لذائذ ومنافع

کو جو بظاہر اس وقت حاصل شدہ نظر آ رہے ہیں ترجیح دیتا ہے ان نعمتوں پر جنہیں وہ سنتا ہے کہ آخرت میں ملیں گے لہٰذا وہ ان پر ٹوٹتا ہے اور اس کا انکار کرتا ہے۔ جب آخرت آئے گی تو اس وقت دو قسمیں نظر آتی ہوں گی ایک چہرے اُن کے جو بشارتوں کے مستحق تھے اور اب ان بشارتوں کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے ہوئے دیکھ کر یہ چہرے ہشاش و بشاش پُر رونق ہوں گے۔ اب انہیں جو کہا گیا ہے اپنے پروردگار کی طرف نگران تو مسلمانوں میں سے وہ فریق جو دیدار کا قائل ہے اپنے یہاں کے احادیث کی بنا پر اس کا مطلب یہ لیتا ہے کہ وہ انہی آنکھوں سے اللہ سبحانہ کو دیکھ رہے ہوں گے اور ہم جو رویت خالق کو ان آنکھوں محال سمجھتے ہیں، جس کے لئے خود قرآن میں ہے لاتدرکہ الابصار'' نگاہیں اُسے پا نہیں سکتیں کیوں کہ رویت اجسام سے متعلق ہوتی ہے جس میں شکل وصورت اور رنگت ہو اور وہ کسی سمت اور کسی جگہ میں محدود ہے اور خالق جسم و جسمانیات سے بری ہے، نہ وہ کسی مکان میں ہے نہ شکل وصورت اور رنگت رکھتا ہے اس لئے اس کا آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اس کا یہ مطلب قرار دینا ضروری ہے کہ انہیں اپنے خالق کی رحمت کے جلوے ہر طرف نظر آ رہے ہوں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ ناظر کے معنی منتظر کے ہیں۔ اس پر ایک اعتراض یہ ہوا ہے کہ انتظار شاق و ناگوار چیز ہے اور اہل بہشت کی زندگی کسی تکلیف و ناگواری سے مکدّر نہیں ہو سکتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انتظار وہ شاق و ناگوار ہوتا ہے جس کے حصول کا یقین نہ ہو لیکن جس کا حصول یقینی ہو اس کا انتظار بھی لذیذ ہوتا ہے۔ دوسرا اعتراض لفظی قواعد کے لحاظ سے کیا گیا ہے کہ انتظار کے ساتھ الیٰ نہیں آتا اور یہاں کہا گیا ہے الیٰ ربہا ناظرۃ' اپنے پروردگار کی طرف نگران'' اس کے لئے علامہ طبرسیؒ نے شعرائے عرب کے اشعار نظیر میں پیش کئے ہیں کہ وہ نظر جو انتظار کے معنی میں ہو، اُس کے ساتھ بھی اِلیٰ آتا ہے۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ کاسۂ سر والی آنکھوں سے نہیں، بلکہ دل کی آنکھوں سے انہیں ہر طرف خدا دکھائی دے رہا ہوگا جو یقین کامل کے معنی میں ہے مگر اس صورت میں یہ عام اہل بہشت ہوں گے جو وہیں اللہ کو دیکھیں گے اور جو کامل یقین والے ہیں وہ اِس دنیا میں اُس کا جلوہ ہر طرف دیکھتے ہیں جیسا کہ حضرت امیر المؤمنین علیؑ بن ابی طالبؑ سے کسی نے پوچھا ہل رأیت ربک'' کیا آپ نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے''؟ حضرت نے فرمایا۔ و کیف اعبد ربا لم اراہ'' پھر میں عبادت کیوں کرتا ہوں اُس پروردگار کی جسے دیکھا نہیں ہے''۔ جب وہ ذرا اس جواب پر غور کرنے لگا تو آپ نے فرمایا لاتراہ العیون بالابصار ولکن تراہ القلوب بحقائق الایمان'' اسے آنکھیں ان نگاہوں سے نہیں دیکھتیں بلکہ اسے دل ایمانی بصیرتوں سے دیکھتے ہیں''۔ اہل سنّت کا وہ سمجھدار طبقہ جو اپنے یہاں کے احادیث صحیحہ کی بنا پر خالق کے دیدار کا انہی آنکھوں سے انکار نہیں کر سکتا، وہ بھی کہتا ہے کہ دیکھنے کی حقیقت کچھ اور ہوگی جس کا ہم یہاں ادراک نہیں کر سکتے۔ اس ''خارج از ادراک'' چیز کو ہم اگر بصارت کے بجائے بصیرت کہیں اور رویت کے بجائے ایمان و یقین کہیں تو پھر نزاع لفظی رہ جائے گی جو کوئی علمی حیثیت نہیں رکھتی۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ِۨالْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾

''ہرگز نہیں جب جان کھینچ کر حلق تک پہنچ جائے گی اور کہا جائے گا اب کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا اور پورا گمان ہو جائے گا اب جدا ہونا ہے اور پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ جائے گی تو تمہارے پروردگار ہی کی طرف کھینچ کر جانا ہوگا''۔

اب پھر اُن کے انکار آخرت کی رد ہے کہ تم اس وقت یہ سمجھ لو کہ مر کے چھٹکارا مل جائے گا مگر جب عالم احتضار ہوگا اور اس زندگی سے مایوسی

ہو چکے گی اُسی وقت پتہ چل جائے گا کہ بات ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ اُس کے بعد پروردگار کا سامنا کرنا ہے اور وہاں گزشتہ اعمال کی پاداش ملنا ہے۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾
اَوْلٰى فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٥﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾

''تو نہ اُس نے تصدیق کی اور نہ اُس نے نماز پڑھی بلکہ اُس نے جھٹلایا اور منہ موڑ لیا، پھر اٹھلاتا ہوا اپنے گھروں کی طرف چلا گیا (ہاں) یہ تیرے ہی لئے زیادہ سزاوار ہے اور تیرے ہی لائق ہے، پھر (سن لے کہ) یہ تیرے ہی لائق اور تیرے ہی لئے سزاوار ہے۔ کیا آدمی سمجھتا ہے کہ وہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا''؟

انداز کلام سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی خاص آدمی کا ذکر ہے۔ روایتیں بتاتی ہیں کہ وہ ابوجہل تھا کہ اُس نے گزشتہ آیتیں سنیں اور کچھ اثر نہ لیا بلکہ متکبّرانہ انداز سے سن کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اُسی سے کہا جارہا ہے کہ یہ رویّہ اختیار کرنا تیرے ہی اوپر کھپ بھی سکتا ہے اور تیرے ہی لائق اور تیرے ہی لئے موزوں بھی ہے یعنی کوئی صاحب عقل وفہم ہوتا تو وہ ضرور غور کرتا اور جو کچھ کہا جارہا تھا اُس سے اثر پذیر ہوتا۔ بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ اولیٰ لک عرب کے محاورے میں ''وائے'' اور یا ''تف'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اُس کے کچھ شواہد بھی پیش کیے ہیں اور بار بار کہنا گویا مسلسل تازیانے لگانا ہے۔ بعض نے کہا ہے وائے ہو تجھ پر اس زندگی میں اور وائے ہو موت کے ہنگام میں اور پھر وائے ہو عالم برزخ میں یعنی موت اور قیامت کے بیچ والے دور میں اور وائے ہو قیامت میں اور سزا کی منزل میں۔

بعض روایات میں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس رویّہ کو دیکھ کر یہ الفاظ اُس سے فرمائے تھے جس پر اُس نے کہا کہ یہ تم کاہے کا ہے سے مجھے ڈرا رہے ہو۔ بخدا میں قریش میں سب سے زیادہ بااثر آدمی ہوں آخر میں ایک کلیّہ کے طور پر استفہام کے پیرایہ میں انکار ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ وہ یونہی مطلق العنان چھوڑ دیا جائے گا۔ زندگی بھر جو چاہے کرے اور پھر اُس کی کچھ جزاؤ سزا نہ ہو، یہ غلط ہے۔ بہرحال زندگی میں اُسے کچھ فرائض انجام دینا ہیں جو اُس کے لئے مقرّر ہیں اور پھر انہی کے لحاظ سے اُسے پاداش ملنا ہے۔

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ
الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿٣٩﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿٤٠﴾

''کیا وہ شروع میں ایک منی کا ذرا سا پانی نُطفہ کا نہ تھا جو (عورت کے پیٹ میں) ڈالا جاتا ہے، پھر وہ گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں تھا تو اُس (خدا) نے اُس کے اعضاء جوارح بنائے پھر اس سے دو ۲ قسمیں مرد اور عورت کی پیدا کیں، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو پھر زندہ کرے''؟

یہاں وہ بالکل شروع والی منزل کو چھوڑ کر بات شروع کی ہے یعنی وہ آدم والی خلقت جو مٹی سے تھی، اُس کا ذکر نہیں کیا گیا اور جہاں سے توالد وتناسل کا سلسلہ شروع ہوا اُسی کو بیان کیا گیا اور پھر اُسی سے نتیجہ نکالا گیا کہ جو ان تمام تغیرات کے پیدا کرنے پر اور تخلیق میں ان تمام منازل کو طے کرانے پر قادر تھا، وہی دوبارہ اس آدمی کو جزاؤ سزا کے لئے زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اس کا انکار کرنا کسی آدمی کے لئے بے معنی ہے۔ اصل مضمون یہی تھا جس سے سورہ شروع ہوئی تھی، اُسی پر اب اُسے ختم کیا جارہا ہے۔

سُوْرَةُ الدَّهْرِ

''دہر'' اور سورۃ الانسان دونوں اس سورے کے نام ہیں جو اس کی پہلی ہی آیت کے دو الفاظ سے ماخوذ ہیں اور عرف عام میں یہ سورہ ''هَل اَتیٰ'' کہلاتا ہے جو اس کے ابتدائی الفاظ ہیں۔ چونکہ اس سورہ کے مکّی اور مدنی یا مجموعہ مکّی و مدنی ہونے میں بہت اختلاف ہے، اس لئے ہم نے پیشانی پر اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔

بہرحال اس میں تھوڑی سی تمہید کے بعد آل رسولؐ کے روزوں اور خیرات کا واقعہ درج ہے جو بہرحال مدینہ منوّرہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری حصے کا واقعہ ہے اس لئے اُس حصّے کو مدنی ماننا ناگزیر ہے۔ آخر کے آیات کے مضمون پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے ابتدائی دور سے متعلق ہیں لہٰذا اسے مکّی سمجھا جاسکتا ہے اور اس کی نظیریں سوروں میں بہت ہیں کہ مکّی سوروں میں مدنی آئتیں اور مدنی سوروں میں مکّی آئتیں درج ہیں۔ اس سورہ میں شروع میں انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ عالم امکان کے ایک دور میں کچھ بھی نہ تھا، پھر اس کی تخلیق (۲) مقصد تخلیق (۳) کفران نعمت کرنے والوں کا انجام مختصر الفاظ میں۔ (۴) نیکوکاروں کے لئے آخرت کی نعمتوں کا تذکرہ ذرا تفصیلی طور پر (۵) اُس واقعہ کا ذکر جس کی بنا پر یہ سورہ نازل ہوا ہے (۶) نعمات بہشت کا مفصل ذکر اُس کے کردار کی جزا کے طور پر (۷) پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشرکین کے کردار پر صبر و ثبات کی تلقین (۸) نمازوں کے اوقات کا مختصر بیان (۹) انسانی ارادہ اللہ کے ارادہ کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں۔ یہ اپنے ارادے میں کامیاب اُسی وقت ہوسکتا ہے جب اللہ کے ارادے سے ٹکراؤ نہ ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ① اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ② اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ③

''کیا انسان پر عالم امکان کے دور میں ایک وقت ایسا نہ تھا جب کہ وہ کوئی ذکر میں آنے والی چیز نہ تھا۔ ہم نے اس انسان کو ملے جلے ہوئے نُطفے سے پیدا کیا تا کہ اُس کو محلِّ آزمائش میں لائیں تو اُسے دیکھنے والا اور سننے والا بنایا۔ ہم نے اُسے ایک خاص راستے کی ہدایت کی اب یا تو وہ شکرگزار ثابت ہوتا ہے یا ناشکرا''۔

استفہام یعنی سوالیہ جملہ کبھی اقرار لینے کے لیے ہوتا ہے کبھی انکار کے لیے اس کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ لفظوں کے معنی بدلے جائیں جیسے بعض نے کہا ہے کہ هل یہاں قد کے معنی میں ہے۔ لفظیں بدلنے کی اس ضرورت نہیں ہے کہ زبان میں یہ انداز سوال

کا مقصد اقرار یا انکار کا حامل ہوا کرتا ہے تو اس کا مطلب چاہے اقرار ہو، چاہے انکار، بہر صورت لفظیں استفہام ہی کی ہوتی ہے اور یہاں مطلب یہی ہے کہ انسان کو توجہ دلائی جائے کہ وہ غور کرے کیا ایسا ایک دور نہیں تھا کہ انسان کے نام سے جس کا ذکر اب ہوتا ہے یہ وجود ہی نہیں رکھتا تھا کہ اس کا ذکر کیا جا سکے۔ حدیثوں میں ہمارے یہاں ایک عیاشی کی روایت ہے امام محمد باقر علیہ السلام سے جس میں الفاظ قرآنی میں مذکورا کی قید کو واضح کیا گیا ہے، فرماتے ہیں:۔ کان شیئاً ولم یکن مذکورا؛ وہ کوئی چیز تو تھا مگر اس کا ذکر نہیں تھا۔ دوسری روایت میں سعید حداد کی امام محمد باقر علیہ السلام سے ہے یہ الفاظ ہیں کہ:۔ کان مذکورا فی العلم ولم یکن مذکورا فی الخلق: علم الٰہی میں تو اس کا ذکر تھا مگر زبان خلق پر اس کا ذکر نہ تھا۔

تیسری روایت حمران بن اعین کی امام جعفر الصادق علیہ السلام سے ہے کہ:۔ کان مقدورا ولم یکن مکونا: وہ دائرہ قدرت میں تھا مگر احاطہ وجود میں نہ تھا۔ علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان المعدوم معلوم وان لم یکن مذکورا وان بالمعدوم یسمیٰ شیئاً ''نابود جو ہو وہ بھی علم میں ہوتا ہے اگرچہ ذکر اس کا نہ ہو اور جو معدوم ہو وہ بھی شے کا مصداق ہوتا ہے۔ اس صورت میں فلسفیوں کا یہ قول غلط ہو جاتا ہے کہ الشیئۃ تساوت الوجود ''شے ہونا موجود ہونے کے مرادف ہے''۔

بہر صورت انسان سے یہ اقرار لینے کا کہ وہ ایک دور میں قابل ذکر چیز نہ تھا اسے متوجہ کرنا ہے وہ ذاتاً ایسی چیز نہ تھا جس کا ذکر ہو سکے۔ یہ خالق کا احسان و کرم ہے کہ اس نے اسے قابل ذکر بنایا اور اب اسے یہ سوچنا چاہیے کہ اس منعم حقیقی کے اس احسان کے نتیجہ میں اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ ''ملے جلے ہوئے نطفہ سے'' یعنی اس میں ایک جز باپ کی طرف سے آتا ہے ایک ماں کی طرف سے آتا ہے اور دونوں سے مل کر اس انسان کی تشکیل ہوتی ہے۔ ''محل آزمائش میں لانے کے لیے'' یہ آزمائش اپنے علم کے لیے نہیں ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ کس میں کیا صلاحیتیں مضمر ہیں اور کس میں کیا جراثیم ہیں، بلکہ یہ آزمائش ان آثار کے علم ظہور میں آنے کے لیے موقع کا فراہم کرنا ہے جو اس دور حیات میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کو متوجہ رہنے کی ضرورت ہے کہ وہ آزمائش میں کیسے اترتا ہے اور اس میں کمی محسوس ہو تو اس کے پورا کرنے کی کوشش لازم ہے۔ اسی آزمائش کے لیے اُسے ''گوش شنوا'' اور ''چشم بینا'' عطا کی۔ یہ ''گوش چشم'' وہ نہیں ہیں حیوانات کی بھی عطا ہوئے ہیں بلکہ یہ کان اور آنکھیں وہ ہیں جو حق و باطل اور صحیح و غلط میں امتیاز کر سکتی ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ کو حق کو قبول کرتا ہے اور کون باطل کو قبول کرتا ہے اگر وہ حق و صحیح کو اختیار کرتا ہے تو وہ ''شاکر نعمت'' ہے اور اگر باطل و غلط کو اختیار کرتا ہے تو وہ کافر نعمت ہے جہاں تک خالق کا عمل تھا وہ سب کے ساتھ یکساں تھا۔ جہاں سے انسان کے اختیار کی کارگزاری شروع ہوئی دو قسمیں ہو گئیں، ایک شاکر اور ایک کفور۔ اب یہ تفرقہ قائم رہا جو آخر تک رہا کہ فریق فی الجنۃ وفریق فی السعیر ''ایک گروہ جنت میں اور ایک گروہ دوزخ میں''

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۠ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ④

''ہم نے تیار رکھی ہے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ''

اگرچہ عموماً بشارت کا درجہ انداز پر مقدم ہے اور پہلے ذکر میں ''شاکر'' پہلے تھا اور ''کفور'' بعد کو مگر چونکہ کافروں کی پاداش کا ذکر موضوع کے لحاظ سے یہاں ضمنی حیثیت رکھتا ہے جسے چند لفظوں میں ختم کر دینا ہے اس لیے اسے مقدم کر دیا گیا اور نیکوکاروں کے جس انجام کو جسے دور تک بیان کرنا ہے اور اسی ذیل میں اس واقعہ کا ذکر کرنا ہے اجس کے لیے ان تمام نعمتوں کا بیان ہوا ہے، اس لیے اسے بعد میں شروع کیا گیا ہے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ⑤ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ

يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝٦ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝٧ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝٨ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝٩ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝١٠

''یقیناً نیک لوگ ایسے (بہشت کی شراب کے) جام پئیں گے جن میں کافور کی شرکت ہوگی وہ چشمہ جس سے اللہ بندے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے شاخیں نکال نکال کر سیراب ہوں گے یہ وہ ہیں جو نذر کو پورا کرتے ہیں اور اس دن کا اندیشہ محسوس کرتے رہے ہیں جس کی مصیبت پھیلی ہوئی ہوگی اور وہ کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت کے ساتھ ساتھ غریب محتاج اور یتیم اور جنگ کے قیدی کو ہم تمہیں صرف اللہ کے رضا کے لیے کھلاتے ہیں، نہ تم سے جزا چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔ ہم ڈرتے ہیں اپنے پروردگار کی طرف سے اس دن کے عذاب کے ڈر سے جو بہت ترش رو اور سخت ہوگا''۔

اس واقعہ کا ذکر جس کی بنا پر یہ سورہ نازل ہوا ہے

قرآن مجید میں ایک فرد کی بھی مدح ہوتی ہے تو اکثر جمع کے صیغے استعمال ہوتے ہیں اور یہاں تو جن ہستیوں کے کردار کے لیے سند قبولیت کے طور پر سورہ اترا تھا وہ خود متعدد افراد تھے۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں نواسے حسنؑ اور حسینؑ بیمار ہوئے حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اور حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام دونوں بزرگواروں نے نذر کر لی کہ خداوند عالم بچوں کو صحت فرمائے گا تو وہ تین تین روزے رکھیں گے، گھر کی خادمہ جناب فضہ نے بھی نذر کر لی جب بچوں کو صحت حاصل ہوئی تو حالانکہ خود شاہزادوں نے اپنی صحت کے لیے نذر نہ کی ہو مگر وفائے نذر میں بزرگوں کے ساتھ یہ بھی شرکت کے لیے آمادہ ہوگئے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے تین دن کی وفائے نذر کے لیے جو اس گھر کی غذا معمولاً تھی یعنی جو فراہم کیے اور سیدہ عالم سلام اللہ علیہا نے اس کے تین حصے کیے۔ ایک حصے سے پہلے دن کی غذا تیار کی گئی۔ جب وقت افطار کا آیا تو دروازے پر سے آواز آئی میں ایک مسکین مدینہ سے بھوکا ہوں، مجھے کھانا چاہیے، روزہ داروں میں ہر ایک نے اپنا کھانا اس سائل کو دے دیا اور پانی سے افطار کر کے عبادت خدا میں مصروف ہوگئے اور دوسرے دن کے روزے کی نیت کر لی، دوسرے دن کھانا تیار ہوا اور افطار کے وقت سامنے آیا.....مگر آج یتیم کی آواز آئی.....اور وہ کھانا تیار ہوا حوالے کر دیا گیا.....اور تیسرے دن افطار کے وقت ایک اسیر جنگ کی آواز آئی.....آج کھانا اس قیدی کو دے دیا گیا.....یہی وہ کردار تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں ہوا اور اس کی بنا پر یہ سورہ یا کم از کم یہ سلسلہ آیات کا جس میں سے یہ آیتیں ہیں نازل ہوئیں۔ یہ جو ہے کہ ''ہم تم کو صرف اللہ کی رضا کے لیئے دیتے ہیں، نہ تم سے جزا چاہتے ہیں، نہ شکریہ'' یہ زبانی الفاظ ان ہستیوں کے نہیں ہو سکتے، اس کے کہ یہ مسکین، یتیم اور اسیر یہاں واحد نہیں آئے تھے جو ان سے یہ الفاظ کہے جاتے بلکہ ہر دن کھانا دینے میں جو ان کے دل کی آواز تھی اسے خالق نے اپنے الفاظ میں جز قرآن بنا یا دیا

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝١١ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝١٢ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا

زَمْهَرِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿۱۴﴾ وَيُطَافُ
عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ﴿۱۵﴾ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا
تَقْدِيْرًا ﴿۱۶﴾ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ﴿۱۷﴾ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى
سَلْسَبِيْلًا ﴿۱۸﴾ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا
مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ
سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ
شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾

''تو بچایا اللہ نے اس دن کی سختی سے اور انہیں ملایا تروتازگی اور مسرت سے اور انہیں صلہ دیا اس کا جو انہوں نے صبر کیا بہشت اور ریشم کے کپڑوں کے ساتھ جن میں وہ بیٹھیں تکیوں سے لگے ہوئے اونچی مسندوں پر، نہ دیکھیں گے وہاں سورج کی گرمی اور نہ سردی کی ٹھٹھر، اور ان پر جھکی ہوگی وہاں کی چھاؤں اور وہاں کے پھلوں کا حاصل ہوگا ان کے لیے آسان رکھا جائے گا اور اُن پر گردش کرائی جاتی ہوگی چاندی کے برتنوں کی اور ان ساغروں کی جو شیشے کے ہوں گے جنہیں صحیح اندازے کے ساتھ اُن کے سامنے لیا جائے گا اور انہیں پلائے جائیں گے وہ جام جن میں آمیزش ہوگی سونٹھ کی، اس چشمے سے جو وہاں ہے جس کا نام سلسبیل ہے اور ان کے سامنے گردش کر رہے ہوں گے وہ خدمت کرنے والے لڑکے جو ہمیشہ ایک ہی حال پر رہیں گے، جب تم انہیں دیکھو گے سمجھو گے بکھرے ہوئے موتی اور جب دیکھو گے تو اس موقع پر دیکھو گے منظر ایک بڑے عیش و آرام اور بڑے اقتدار کا اُن پر ہوں گے سبز باریک ریشم کے اور اطلس و دیبا کے اور انہیں پہنائے جائیں گے کنگن چاندی کے اور اُن کا پروردگار انہیں پلائے گا پاک و پاکیزہ شراب، یقیناً یہ تمہارا کچھ صلہ ہے اور تمہاری کوشش قدردانی کے قابل ہے''۔

نعمات بہشت کا مفصل ذکر، کردار کی جزا کے طور پر

تروتازگی کا تعلّق چہرے سے ہے اور مسرت کا دل سے اور دونوں میں لازم وملزوم کا تعلّق ہے، اور یہ سب رضائے الٰہی کے احساس سے ہے، یہ سب جزائیں اُن کے صبر کی بیان ہوئیں ہیں اور یوں تو صبر اُن کی پوری زندگی پر حاوی ہے مگر اس واقعۂ خاص میں پہلے تو روزے ہیں جنہیں قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ (اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ) لفظ صبر سے تعبیر کیا ہے اور پھر راہ خدا میں اطعام کے سلسلہ میں جو انہوں نے تین دن مسلسل بے غذائی برداشت کی، اُس نے اُس صبر کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا گرمی اور سردی کی تکلیف اعتدال کی حد سے گزرنے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، ہوائے جنّت نقطۂ اعتدال پر ہے اس لئے نہ وہاں سردی تکلیف دہ ہے نہ گرمی۔

شاخیں درختوں کی اُن کیطرف جھکی ہوئی ہوں گی، یہی چھاؤں کا جھکا ہونا ہے اوراسی سے پھلوں کے بآسانی حاصل ہونے کا تعلق ہے۔ چاندی کے ساتھ کہا گیا ہے شیشے کے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہیں تو وہ چاندی کے مگر اتنے صاف وشفاف اور نازک کہ شیشے کے معلوم ہوتے ہوں گے، پہلے چشمے کے وصف میں کہا گیا تھا کہ کافور ملا ہوگا اوراس چشمے کے وصف میں یہ سونٹھ کا پانی ملا ہوا ہوگا ان کا ذکر اس لئے ہے کہ عرب لوگ ان خوشبوؤں کو پسند کرتے تھے۔ ورنہ نہ اس کافور کو بالکل دنیاوی کافور کی طرح کا سمجھنا چاہیے۔ نہ اس سونٹھ کو بلکہ یہ اُس کے انتہائی خوشگوار ہونے کا اظہار ہے.....اب ہم اگر خوشگوار کا تصور کسی اور خوشبو سے وابستہ محسوس کرتے ہیں تو ہم اس خوشگواری کو اس سے تعبیر کر سکتے ہیں اسی طرح لباس میں جن کپڑوں کے نام لئے گئے ہیں، اگر اس دنیا میں اُس سے زیادہ بیش قیمت کوئی چیز آ گئی جس کا لباس اس سے اعلیٰ سمجھا جائے تو اس خاص قسم کے کپڑے کی خصوصیات نہ سمجھنا چاہیے بلکہ جو بلند سے بلند تصوّر لباس کا ہمارے ذہن میں آسکے وہ سمجھنے کا ہمیں حق ہے اس لئے کہ نعیم جنّت کا معیار یقیناً اس دنیا سے بالاتر ہے۔ شراب کے ساتھ طہورا کا لفظ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جن جن خرابیوں کی وجہ سے دنیا والی شراب کو حرام کیا گیا ہے بہشت کی شراب ان تمام خرابیوں سے مبرّا ہوگی، اس میں خوشگواری ہی خوشگواری ہے۔ یہ نقائص نہیں ہیں جو دنیا کی شراب میں پائے جاتے ہیں۔ وہ ان سب باتوں سے پاک صاف ہے۔ چونکہ اُن کی نیت اپنے کردار میں بے غرض تھی جس کے ساتھ دو ۲ چیزوں کی نفی کی گئی تھی (لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا) ''نہ تم سے ہم جزا چاہتے ہیں، نہ شکریہ'' تو خالق نے ان تمام جزاؤں کے تذکرے کے بعد اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ وہی دو (۲) چیزیں اپنی طرف نسبت دے کر کہہ دیں کہ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿الانسان: ۲۲﴾ ''یہ تو تمہارے عمل خیر کی کچھ جزاء ہے اور تمہاری کوشش ''مشکور'' ہے۔ اگرچہ فاعل کی طرف انتساب سے ''شکر'' کے مفہوم میں فرق ہو جاتا ہے۔ بندے کا شکر ادا کرنا اور ہے اور خدا کی طرف یہ نسبت دی جائے تو اس کا ترجمہ وہی ہو سکتا ہے جو ہم نے کیا کہ تمہاری کوشش ہمارے نزدیک قابل قدر ہے۔ ہم نے جزاءً کی تنوین کو تقلیل کا قرار دے کر ترجمہ میں ''کچھ'' کے لفظ کا اضافہ کر دیا یعنی عمل کی گرانی کے مقابلہ میں تمام نعیم جنّت سمٹ کر بھی اگر عمل کا پلّہ گراں رہے تو اس کمی کو دور کرنے کے لئے یہ ''مشکور'' کہنے کی سند ہی اُس بلند نظر صاحبانِ کردار کے نقطہ نگاہ سے کافی ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴿۲۳﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾

''ہم ہی نے آپ پر یہ قرآن تدریجی طور پر وقتاً فوقتاً نازل کیا ہے تو اپنے پروردگار حکم کی خاطر صبر کیجئے اور ان میں سے کسی بداعمال یا منکر ایمان کی بات نہ مانیے اور اپنے پروردگار کو یاد کیجئے صبح وشام اور رات کے ایک حصّہ میں سجدہ کیجئے اور اُس کی تسبیح کیجئے رات کے طویل حصّے میں''۔

اس کے شروع کے تین فقروں میں نماز ہائے فریضہ کے اوقت کا بیان ہے اور جہاں جہاں قرآن مجید میں اوقاتِ نماز کی طرف اشارہ ہے ان سے پانچ نمازوں کے لئے بیان تین اوقات کا کیا جاتا ہے چنانچہ وہاں بھی صبح کی نماز کا وقت بس الگ بیان ہوا ہے اور پھر اصیلؔ کے لفظ

سے بعد زوال سے لے کر مغرب تک وقت دو ۲ نمازوں کا بیان کیا گیا ہے جو ظہر وعصر ہیں اور رات کو سجدہ کرنے کا حکم میں مغرب اور عشاء دونوں نمازیں ہیں۔ پھر طویل حصّہ شب میں جو تسبیح کو کہا گیا ہے اُس سے بظاہر نماز شب مراد ہے بہر حال پانچ وقت کی نمازوں کے لئے تین اوقات کا اعلان کرنا فقہ جعفری ہی کے حکم پر منطبق ہے کہ زوال سے لے کر مغرب تک ظہرین کا وقت ہے جس میں صرف بلحاظ ترتیب شروع کا ایک جزء ظہر کا وقت مختص اور آخر کا ایک جزء عصر کا وقت مختص ہے۔ باقی وقت دونوں نمازوں میں مشترک ہے اور مغربین میں غروب کے بعد سے بنظر ترتیب شروع کا جزء مغرب سے اور آخر کا ایک جزء عشاء سے مخصوص ہے باقی پورا مغربین یعنی مغرب اور عشاء کا مشترک وقت ہے۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾

”یہ لوگ اس وقتی دور زندگی کو دوست رکھتے ہیں اور جو بھاری دن آگے آنے والا ہے، اسے چھوڑے ہوئے ہیں ہم نے انہیں پیدا کیا ہے اور اُن کے اعضاء وجوارح کا مضبوط نظام بنایا ہے اور جب ہم چاہیں تو اُن کی صورتوں کو پورے طور پر بدل دیں یقیناً اس میں ایک بڑی نصیحت ہے تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف کا راستہ اختیار کرے اور تمہارا چاہنا کچھ نہیں جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ یقیناً اللہ خوب جاننے والا ہے صحیح صحیح کام کرنے والا، جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور جو ظالم ہیں اُن کے لئے اُس نے دردناک عذاب تیار رکھا ہے“۔

یہ پہلے بھی آچکا ہے کہ یہ مفادات دنیا کی محبت ہے جس کی وجہ سے یہ پیام حق کو قبول نہیں کرتے اور آخرت کو یاد کر کے اُس کے تقاضے پورا نہیں کرتے، ان کو اپنی موجودہ طاقت وقوّت اور جماعت کی کثرت وغیرہ پر ناز ہے، حالانکہ کہ ہم جب چاہیں ان تمام چیزوں کو بدل دیں..... یہ بھی مفہوم ہوسکتا ہے کہ ان سب کو فنا کر دیں اور ان کی جگہ ایک دوسری قوم کو پیدا کر دیں جیسا کہ بعض جگہ قرآن مجید میں ہے اور یہ بھی کہ بطور عذاب ان کی صورتوں کو بدل دیں جیسا کہ بعض امم سابقہ پر عذاب ہوئے اور آخرت میں مختلف شکلوں میں محشور کریں جس کا احادیث میں بھی ذکر ہے اور قرآن مجید میں بھی، دوسری جگہ ارشاد موجود ہے۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ حق اور باطل، نیک اور بد کے راستوں میں کسی ایک کو اختیار کرنا انسان کا کام ہے لیکن وہ جس راہ کو اختیار کرے، اُس پر چلنے میں بالکل آزاد بھی نہیں ہے، اسباب شرائط اور مواقع کے سلسلوں کی کڑیاں اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ انسان اپنے اچھے اور بُرے مقاصد میں اُس حد تک کامیاب ہوتا ہے جس حد تک اللہ کی مشیّت سدّ راہ نہ ہو، جہاں سے اس کی مشیّت کارفرما ہوجاتی ہے یہ اپنے تمام منصوبوں میں ناکمیاب ہوجاتا ہے اور ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہو..... جہاں تک کہ اس کے سوء اختیار کا تعلّق ہے، یہ غلط راستہ اختیار کرے اصول عقائد میں کہ کافر ہو یا اعمال میں کہ فاسق ہو یہ دونوں باختلاف مراتب ظالمین میں داخل ہیں اور ظالمین کا انجام اُس کی طرف کا عذاب الیم ہے۔

سُوْرَةُ الْمُرْسِلٰتِ

مکیّہ.....۵۰.....آیات

چونکہ شروع ہی میں المرسلٰت کا لفظ ہے اس لئے یہ نام ہوا۔

اس سورے میں بھی منکرین آخرت کی رد ہے اور قیامت کے ہولناک مناظر کا ذکر ہے اور خالق کی قدرت کی کچھ نشانیوں کا بیان ہے اور منکرین کو مستقبل کے ہولناک دن سے ڈرایا گیا ہو اور پرہیزگاروں کے حسن انجام اور جھٹلانے والوں کے بُرے انجام پر سورے کو ختم کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۙ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۙ﴿۲﴾ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۙ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۙ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۵﴾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۙ﴿۶﴾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۷﴾

''قسم ہے اُن کی جو مسلسل بھیجی جاتی ہے، پھر وہ روزہ دار جھکڑ کے ساتھ چلتی ہے، اور چاروں طرف شدّت کے ساتھ پھیلا دیتی ہیں، پھر پوری طرح جدا جدا کر دیتی ہیں، پھر خدا کی یاد پیدا کرتی ہیں، حجّت تمام کرنے یا ڈرانے کے طور پر جو تم سے وعدہ وعید کیا جا رہا ہے یہ ضرور ہو کر رہنے والا ہے''۔

یہاں مسلسل قسمیں صفات کے ساتھ کھائی گئی ہیں اور موصوف کا پتہ نہیں کہ کون بھیجی جانے والیاں، کون رفتار سے چلنے والیاں، کون پھیلانے والیاں اور کون جدا کرانے والیاں اور کون خدا کی یاد پیدا کرنے والیاں..... اس لئے مفسّرین میں سے بعض نے ان کی تشریح میں فرشتوں کا نام لیا ہے اور کچھ نے انبیاء کو لیا ہے، کچھ نے خداوندی آیات یعنی قدرت کی نشانیوں یا قرآن کی آیتوں کو لیا ہے۔

انبیاء پر تو جمع مؤنث سالم کی لفظیں جس کے ترجمے میں ہر جگہ ' والیاں'' کہنا پڑا ہے کسی طرح منطبق نہیں ہوتی ..... فرشتوں کے لئے بھی وہ تو مشرکین کا تصوّر تھا کہ وہ لڑکیاں ہیں لیکن قرآن نے اُس کی رد کی ہے اور سخت ناگواری کا ظہار کیا ہے تو خود قرآن اُن کے لئے جمع مؤنث کے لفظ کیوں استعمال کرتا۔ بعض میں تفریق ہے کہ شروع کے فقرات میں ہوائیں مراد ہیں اور بعد میں فرشتے مراد ہو گئے ہیں یہ بھی ایک سلسلہ کے الفاظ ہونے کی وجہ سے کچھ سمجھ میں آنے والی بات معلوم نہیں ہوتی.....زیادہ ترجیح اسی کو ہوتی ہے کہ یہ ہواؤں ہی کی قسم ہے.....وہی مختلف طرح کے پے در پے بھیجی جاتی ہیں اور وہی تیز جھکڑ کے ساتھ چلتی ہیں۔ ان ہی میں کی بعض ہیں جو بادلوں کو چاروں طرف پھیلاتی ہے اور انہیں میں بعض ہیں جو برابر کو جدا جدا کر دیتی ہیں اور انہیں ذریعہ سے اگر باران رحمت ہے تو حجت الٰہی تمام ہوتی ہے اور انہیں کے

ذریعہ سے ایسی تباہی ہوتی ہے خواہ خود اس سے یا اس تباہ کن بارش سے جو اس کے سبب سے ہوئی ڈرانے کا کام ہوتا ہے اور خوف و دہشت طاری ہوجاتی ہے، بہرصورت قسمیں اسی پر ہیں کہ آخرت کی بار بار جو اطلاع دی جاتی ہے، وہ واقع میں آکر رہے گی۔

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝٨ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۝٩ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝١٠ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝١١ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ۝١٢ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۝١٣ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۝١٤ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝١٥

''تو جب ستارے بے نشان ہوجائیں گے اور جب آسمان کشادہ کردیا جائے گا اور جب پہاڑ سرمہ کردیئے جائیں گے اور جب پیغمبر حاضر کیے جائیں گے (آخر) کس دن کے لئے یہ اتنی مہلت دی گئی تھی فیصلے کے دن کے لئے اور تم کیا جانو فیصلے کا دن کیا ہے۔ وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے''۔

ستارے بے نشان ہوجائیں گے یعنی اُن کی روشنی ختم ہوجائے گی، لہٰذا وہ تاریک ہوں گے اور آسمان کشادہ کردیا جائے گا یعنی وہ شق ہوجائے گا جیسا کہ بعد میں آئے گا (اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ) اور اُس میں درمیان درمیان خلا ہوجائے گا جیسا کہ ابھی آئے گا (وَكَانَتْ اَبْوَابًا) اُس میں دروازے ہوجائیں گے، پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ کر ہوا میں منتشر ہوجائیں گے، اور پیغمبر حاضر کیے جائیں گے، اپنی کارگزاری اور قوم کے رویّہ کی روئداد سنانے کے لئے جسے قرآن کی بعض آیتوں میں ''شہادت'' یعنی گواہی کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ اب جو منکرین بار بار کہتے تھے آخر یہ سب پھر ہو کیوں نہیں جاتا، دیر کاہے کی ہے۔ .....اس کا جواب یہ ہے کہ وہ تمہارے تقاضوں سے تھوڑی ہوگا۔ اس کے لئے تو ایک دن مقرّر ہے جو فیصلے کا دن ہوگا.....اُس دن جھٹلانے والوں کی مکمل تباہی اور بربادی ہوگی۔

یہ آخر کا جملہ ''حاصل سورہ'' ہونے کے طور پر اُسی طرح بار بار دہرایا گیا ہے جیسے سورۂ رحمٰن میں فبایّ آلاء ربّکما تکذّبان کے لفظیں پے در پے دہرائی گئی ہیں اور سورۂ قمر وغیرہ میں بھی ایسے جملے ہیں جو ہر تذکرے کے بعد برابر دُہرائے گئے ہیں جو بتلاتے ہیں کہ یہ سورہ اس خاص طرز میں ایک دفعہ میں اتارا گیا ہے۔

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ۝١٦ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ۝١٧ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝١٨ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝١٩

''کیا ہم نے پہلے والوں کو ہلاک نہیں کیا، پھر انہی کے پیچھے بھیجیں گے بعد والوں کو، ایسا ہی کرتے ہیں ہم مجرموں کے ساتھ۔ وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے''۔

پہلے والوں سے مراد وہی عاد و ثمود وغیرہ زمانۂ سابق والی قومیں ہیں جو عذابِ الٰہی سے تباہ و برباد کردی گئیں کہا جارہا ہے کہ اُنہیں اور اُن کے انجام کو یاد کرو، وہی انجام ہونا ہے بعد والوں کا جو آیاتِ الٰہیہ کو جھٹلانے لگیں۔ یوں مختتم انجام کے لئے وہی دن مقرّر ہے جس کا یوم الفصل کے نام سے اعلان ہو چکا ہے۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۙ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۙ﴿۲۱﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۙ﴿۲۲﴾
فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾

''کیا ہم نے تم نے ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا، اور اُسے قابل اطمینان پر سکون جگہ رکھا ایک مقرّر مدت تک تو ثابت ہوئی اس سے ہماری قدرت، تو کیسی اچھی قدرت رکھنے والے ہم ہیں۔ وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے''۔

یعنی ابتدائے خلقت کو دیکھو تو انتہائے خلقت اور دوبارہ پلٹائے جانے کا انکار نہ کرو، اس کے بعد بھی جو انکار کریں وہ فیصلے کے دن تباہی اور بربادی کے سوا اور کاہے کے مستحق ہیں۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۙ﴿۲۵﴾ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ۙ﴿۲۶﴾ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ
وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ۭ﴿۲۷﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾

''کیا ہم نے زمین کو سمیٹ کر رکھنے والی چیز نہیں بنایا زندوں کو بھی اور مردوں کو بھی اور اس میں اُونچے اُونچے پہاڑ بنائے اور تمہیں خوشگوار پانی سے سیراب کیا، وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے''۔

پھر یہ خالق کی قدرت وحکمت کی نشانیاں ہیں جن کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ زمین ہے جو طرح طرح کے انسانی ضروریات کو پورا کرنے والے خزانے لئے اُن کے بود وباش کے لئے ہے اور اسی زمین کے اندر ان کے دفن ہونے کے لئے بھی گنجائش ہے اور پھر اونچے پہاڑ ہیں جن سے ان کے بہت سے ضروریات پورے ہوتے ہیں اور اسی زمین میں وہ پانی بھی فراہم کیا گیا ہے جس پر ان کی زندگی کا انحصار ہے، جوان کے پینے کے کام آتا ہے جس نے یہ سب کچھ کیا ہے اُس کی قدرت سے یہ کیوں بعید سمجھے کہ وہ پھر ان مُردوں کو دوبارہ زندہ کر کے جزاؤ سزا کی منزل میں لائے۔ اتنی نشانیوں کو قدرت کی دیکھنے کے بعد بھی جھٹلائیں تو پھر اُس دن وائے بحال اُن کے۔

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۚ﴿۲۹﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۙ﴿۳۰﴾
لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ۭ﴿۳۱﴾ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۚ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ
صُفْرٌ ۭ﴿۳۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾

''جاؤ'' اب اُسی کی طرف جسے تم جھٹلاتے تھے، جاؤ اُس چھاؤں کی طرف جو تین شاخوں والی ہے جو نہ آرام دینے والا ہے اور نہ آگ کے شعلوں سے بچانے والا، وہ آگ پھینکتی ہوگی اونچی عمارتوں کی ایسی چنگاریوں کو جو اچھلتی ہوئی یوں نکل رہی ہے جیسے زرد رنگ کی اونٹنیاں، وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے''۔

یہ چھاؤں کسی عمارت کی نہیں ہے بلکہ وہ دھواں ہے نیچے سے اجتماعی طور پر نکلتا ہے اور اونچا ہو کر اُس میں کئی شاخیں ہو جاتی ہیں۔ اسی کو کہا گیا ہے کہ تم ان چیزوں کو جھٹلاتے تھے اب انہی کا سامنا ہے۔ انہی کی طرف تم کو اپنے پیروں سے جانا ہے۔ اسی تباہی اور بربادی

سے تمہیں ڈرایا جاتا تھا اور اب وہی آج تمہارے سامنے ہے۔

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾

''یہ وہ دن ہے جب وہ بات نہیں کہہ سکیں گے اور موقع دیا جائے گا کہ وہ عذر خواہی کر سکیں وائے ہو اس دن جھٹلانے والوں کے لئے''۔

شروع میں حیلے حوالے کیے اور اپنی صفائی میں جو سمجھ میں آیا وہ کہا لیکن اب وہ منزل آ گئی جب سب حجتیں قطع ہو گئیں اور اُن کے خلاف ہر بات کا ثبوت پیش ہو چکا، یہاں تک کہ اُن کے اعضاء و جوارح کی گواہیاں بھی ہو گئیں تو اب سوا دم بخود رہنے کے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اب نہ اُن کے پاس کوئی دلیل ہے، نہ وہ کوئی عذر پیش کر سکتے ہیں۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾

''یہ فیصلے کا دن ہے ہم نے تمہیں اور پہلے کے تمام لوگوں کو اکٹھا کیا ہے، تو اگر تمہارے پاس کوئی ترکیب ہو تو میرے مقابلے میں وہ کرو، وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے''۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہر مشکل سے مقابلہ کے لئے تم ترکیبیں سوچا کرتے تھے اور کبھی اس میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے لیکن اب اس وقت میرے عذاب کی گرفت سے نکلنے کے لئے تمہارے پاس کیا ترکیب ہے؟ اگر کوئی ترکیب ہو تو اُسے اختیار کرو۔ اب آج سوا تباہی اور بربادی کے اور صورت ہی کیا ہے؟

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾

'' پرہیز گار لوگ سایوں میں ہیں اور چشموں میں اور طرح طرح کے پھلوں کے اندر جسے ان کا جی چاہے، شوق سے کھاؤ اور پیو صلے میں اُن اعمال کے جو تم کرتے تھے ہم اسی طرح جزا دیتے ہیں حسنِ عمل رکھنے والوں کو، وائے ہو اس دن جھٹلانے والوں کے لئے''۔

مجرموں کی بدانجامی کا مسلسل تذکرہ کرنے کے بعد اُن کی حسرت و ناکامی کو مکمل کرنے کے لئے بیان ہو رہا ہے، ان کے مقابل کی جماعت کے حال کا جس نے آخرت کو سچ سمجھا اور اُس کی تصدیق کا برابر اپنے اعمال سے بھی ثبوت دیا جس میں شروع میں ان کا ذکر بطور غائب ہے اور پھر اُن سے تخاطب کر کے نعیم جنّت سے بہرہ مند ہونے کی بشارت دی گئی ہے اور آخر میں پھر تازیانہ لگایا گیا ہے، جھٹلانے والوں کو۔

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾

''کھاؤ اور تھوڑے دن فائدہ اٹھالو (بہر حال) تم مجرم لوگ ہو، وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے''۔

وہ دن جب آجائے گا تو اس موقع کے تذکرے کرنے کے بعد اب دار دنیا میں ابھی جن کے لئے وہ وقت نہیں آیا ہے، اُن تمام کافروں اور بداعمال لوگوں کو مخاطب کر کے اعلان کیا جارہا ہے کہ اس دار دنیا میں عارضی طور پر جب تک موقع دیا جارہا ہے اتنے دن آرام اٹھالو اور اللہ کی نعمتوں سے جو اُس نے خلق فرمائی ہیں اٹھالو مگر یاد رکھو کہ تم مجرم لوگ ہو، انجام تمہارا وہی ہونا ہے جس کا بار بار جھٹلانے والوں کے لئے اعلان ہو رہا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ رکوع کرو تو وہ رکوع نہیں کرتے، وائے ہو اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے تو کون بیان ہے اس کے بعد جسے سن کر وہ ایمان لائیں''۔

رکوع سے مراد وہ احکام خداؤ رسولؐ کے سامنے جھکنا ہے، اگر وہ آخرت کو نہ جھٹلاتے ہوتے تو اُن کے عملی تقاضوں کو پورا کرتے اور احکام خداؤ رسولؐ کے سامنے جھکتے، مگر وہ تو آخرت کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے لہٰذا وہ ان احکام کے سامنے جھکتے بھی نہیں، لہٰذا اُس کا نتیجہ وہی ''وائے'' ہے جس کا مطلب ہے تباہی و بربادی۔ آخر میں کہا گیا ہے کہ قرآن اتنے واضح طور پر ان حقیقتوں کو پیش کر رہا ہے، اب اس کے بعد بھی یہ لوگ اس کو قبول نہیں کرتے تو وہ کون سا کلام ہوسکتا ہے جو ان کے سامنے آئے اور یہ اس کے ماننے کے لئے تیار ہو جائیں۔

سُوْرَةُ النَّبَاِ

مکیّہ.....۴۰.....آیات

پہلی ہی آیت میں النبأ العظیم ایک خاص بڑی خبر کا ذکر ہے، اس لئے اس کا یہ نام ہوا۔

نبأ یعنی خاص خبر سے مراد وہی قیامت کی خبر ہے جس کا منوانا اس مکی زندگی کے سوروں کی بڑی مہم ہے اور اُس کے منکروں سے بحث، اُن کی شبہات کا دفعیہ ہی ان سوروں کا خاص موضوع ہے۔ اس ذیل میں وہی خداوند عالم کی قدرت کے کرشمے اور اس کے مخلوقات صنائع کی طرف توجہ دہانی جس سے ایک ساتھ مبدأ اور معاد دونوں پر روشنی پڑتی ہے یعنی مستحق عبادت وہ خدا ہے جس نے یہ تمام چیزیں پیدا کی ہیں۔ نہ کہ تمہارے اصنام جو اِن میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے.....درمیان میں رسولؐ کی سچائی اور قرآن کی حقانیت پر توجہ دلائی گئی ہے اور آخر میں روز قیامت منکروں کی بے بسی اور عاجزی پر سورے کو ختم کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝١ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝٢ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝٣ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٤ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٥

''یہ لوگ کاہے کے بارے میں باہم سوال و جواب کر رہے ہیں؟ اس بڑی خبر کے بارے میں جس کے متعلق وہ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہرگز نہیں، عنقریب انہیں معلوم ہوگا، پھر (سنو) ہرگز نہیں عنقریب اُنہیں معلوم ہوگا''۔

خاص بڑی خبر کا ذکر

یوں تو لفظ نبیٔ ہی اکثر کے نزدیک جو اس لفظ کو آخر کے ہمزے کے ساتھ پڑھتے ہیں، نبأ سے مشتق ہے جس کے معنی خبر کے ہیں اور رسولؐ کا پیغام تمام تر اخبار غیبیہ ہی سے تعلق رکھتا ہے جس میں خدا، ملائکہ اور تمام کارگاہ قیامت سب غیب ہی کی خبریں ہیں جو اُنہیں سنائی جاتی تھیں۔ لیکن اس وقت سب سے بڑی موضوع بحث چیز اُن کے لئے وہی آخری چیز یعنی موت کے بعد دوسری زندگی اور قیامت اپنے اُن تفصیلات کے ساتھ جنہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُنہیں بتاتے تھے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جا رہا ہے کہ آخر یہ کون سی ایسی بات ہے جس میں اس قدر ''چہ مگوئیاں'' ہو رہی ہیں.....انکار کی تو تمہارے پاس کوئی بنیاد نہیں ہے بلکہ اُس کے وقوع کے شواہد جو بڑے ذہن نشین ہیں تمہارے سامنے پیش

ہوتے ہیں مگر تم نہیں مانتے.....تو نتیجہ کا انتظار کرو.....ایک وقت میں تم سب اُسے آنکھوں سے دیکھ لو اور پھر اُس کے منکروں کا اسی دنیا میں کیا انجام ہوتا ہے، اس کے دیکھنے کے لئے بھی تیار رہو۔ ممکن ہے اور پھر عنقریب معلوم ہوگا۔ ان دونوں کی طرف اشارہ ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ﴿۶﴾ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۖ﴿۷﴾ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ﴿۸﴾
وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ﴿۹﴾ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ﴿۱۰﴾ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۖ﴿۱۱﴾
وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ﴿۱۲﴾ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۖ﴿۱۳﴾ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ
الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۙ﴿۱۴﴾ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ﴿۱۵﴾ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ؕ﴿۱۶﴾

''کیا ہم نے زمین کو گہوارہ راحت نہیں بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی صورت قائم نہیں کیا، اور تمہیں دو صنفوں (مرد اور عورت) کے جوڑوں کی شکل میں پیدا نہیں کیا اور تمہاری نیند کو یکسوئی کا ذریعہ بنایا اور رات کو پوشاک اور دن کی تحصیل روزی کا ذریعہ بنایا اور تم پر سات مضبوط آسمان بنائے اور ایک بہت تپش اور روشنی سے بھرا ہوا چراغ پیدا کیا اور اپنے اندر سے نچوڑ نچوڑ کر موسلا دھار پانی برسانے والے ابر بنائے تا کہ اُن سے اناج کے دانے اور سبزیاں اور گھنے ہوئے باغ لگائیں''۔

جس نے یہ سب کارخانہ تمہارے ضروریات کے بالکل مطابق خلق کیا ہے، وہی کسی وقت اس نظام کو بدل دے اور اس پوری دنیا کو فنا کر دے تو تمہیں اس میں تعجب کیوں ہے؟

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۙ﴿۱۷﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۙ﴿۱۸﴾
وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۙ﴿۱۹﴾ وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ؕ﴿۲۰﴾ اِنَّ جَهَنَّمَ
كَانَتْ مِرْصَادًا ۖ﴿۲۱﴾ لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۙ﴿۲۲﴾ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۚ﴿۲۳﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ
فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۙ﴿۲۴﴾ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۙ﴿۲۵﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ؕ﴿۲۶﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ
حِسَابًا ۙ﴿۲۷﴾ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ؕ﴿۲۸﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۙ﴿۲۹﴾ فَذُوْقُوْا فَلَنْ
نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۧ﴿۳۰﴾

''یقیناً فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے، جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم لوگ آؤ گے فوج در فوج اور آسمان کھل جائے گا تو ہو جائے گا وہ بہت سے دروازوں کی صورت سے اور پہاڑ حرکت میں آجائیں گے تو وہ مثل پانی کی طرح چمکتی ہوئی بالو کے ہو جائیں گے، یقیناً دوزخ اُن کی گھات میں ہے جو ان سرکشوں کا آخری انجام ہے جس میں وہ

مدتوں رہیں گے، اس میں نہ وہ چکھیں گے کسی ٹھنڈک کا مزہ اور نہ پینے کی کوئی چیز سوا گرم پانی اور زخموں کے مواد کے۔ یہ اُن کے کئے کا حسب حال بدلہ ہے، یہ لوگ حسابِ آخرت کے سامنے آنے کا کوئی تصوّر نہ رکھتے تھے اور اُنہوں نے ہماری آیتوں کو پوری طرح جھٹلایا اور ہر چیز کو ہم نے ایک نوشتے میں گھیر دیا ہے تو چکھو اس کا مزہ کہ ہم تمہارے لئے تمہارے عذاب کو بڑھاتے ہی رہیں گے''۔

جب گزشتہ آیات میں نظم کائنات اور انسانی ضروریات حیات کو پورا کرنے کے لئے تمام کارخانۂ قدرت کے انتظامات پر توجہ دلا کر اللہ کی قدرت وحکمت پر روشنی ڈال دی گئی تو اب پھر اصل موضوع سورہ یعنی قیامت کے ذکر کو شروع کر دیا گیا کہ وہ فیصلے کا دن ہے، وہ جب آجائے گا تو تمہاری التجاؤں سے پھر نہ ٹل سکے گا۔ اب چونکہ صور بھی از روئے قرآن ایک سے زیادہ ہیں اور یہاں مطابق صور کہا گیا ہے کہ جب پھونکا جائے گا تو یہ ہوگا اور یہ ہوگا لیکن اس میں ترتیب ذکر کے مطابق ترتیب واقعہ ضروری نہیں ہے اس لئے لازم نہیں ہے کہ جس بات کو پہلے کہا گیا ہے، وہ پہلے ہو اور جسے بعد میں کہا گیا ہے وہ بعد میں ہو۔ بہر حال یہ سب باتیں صور پھونکے جانے کے بعد ہونا ہیں۔ قبروں سے نکل نکل کر موقف حساب میں آنا بظاہر بعد کی منزل ہے اور عام تباہی و بربادی جس میں پہاڑوں کی یہ حالت ہوگی اور آسمان کی یہ کیفیت ہوجائے گی۔ یہ شاید اس کے پہلے وقوع میں آنے والے حالات ہیں، قرآن اور حدیث سے تو پہلے بھی آسمان میں راستوں اور دروازوں کا ہونا سمجھ میں آتا ہے یہ اور بات ہے کہ اُن کی پوری نوعیت ہم نہ سمجھ سکیں۔ اب یہاں جو'' دروازے'' کہے گئے ہیں۔ تو جو دوسرے مقامات پر مجمل طور سے شگافتہ ہونے کا آسمان کے ذکر ہے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ایک جگہ سے شگافتہ نہیں بلکہ بکثرت دراڑیں ہوں گی اور شگاف ہوں گے۔ جنہیں دروازوں کی شکل میں سمجھنا چاہیے۔

اب جب کہ آسمان کو یقینی طور پر مان لیا گیا کہ کوئی ٹھوس جسم نہیں بلکہ فضا اور خلا ہے تو اس کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ آسمانی بلائیں ٹوٹ پڑیں گی کہ کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی اور ہر طرح کی آفتوں کے دروازے کھل جائیں گے اور پہاڑ اپنی جگہ سے اڑ اڑ کر منتشر ہوجائیں گے۔ اُن کی جگہ سپاٹ زمین ہوجائیگی۔ جیسے وہ بالو جو پانی کی طرح چمکتی ہے اور قریب جا کر معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہیں ہے ویسے ہی پہاڑ بے حقیقت بن جائیں گے اور اُن کی جگہ زمین ہی زمین ہوجائی گی، دوزخ گھات میں ہے یعنی بس صور پھونکے جانے کا انتظار ہے اور اس کے بعد اُن دوزخیوں کو دوزخ میں جانا ہے جن کا گویا دوزخ کو انتظار ہے اور وہ آخری سرنوشت جو اُن لوگوں کی جسے'' مآب'' کے لفظ سے ظاہر کیا گیا کہ آخری اور مختتم ٹھکانا ان کا وہی ہوگا۔ ''مدّتوں'' رہیں گے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ مدّتیں کبھی ختم ہوجائیں گی بلکہ انہیں اگر تقسیم کیا جائے طولانی حصّوں پر تو ہر حصّہ کے بعد ایک دوسرا حصّہ شروع ہوجائے گا اور یونہی یہ سلسلہ قائم و برقرار رہے گا ہوں وہ جنہیں عبوری مدّت کے لئے سزا دی گئی ہو، اُن کے لئے دوزخ کے قیام کی اتنی مدّت گزارنے کے بعد پھر وہاں سے منتقل کر دیا جائے گا۔ نہ وہ چکھیں گے کوئی ٹھنڈک کا مزہ یعنی سایہ میں جو ذرا سکون محسوس ہوتا ہے وہ بھی انہیں نصیب نہ ہوگا اور پینے کے لئے کوئی چیز سوا گرم پانی اور زخموں کے مواد یا دھوون کے سوا اُنہیں نہ ملے گا۔ ان کے دو ۲ جرم ہیں ایک یہ کہ خود اپنی جگہ بھی اُنہوں نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ ایک دن ایسا درپیش ہوسکتا ہے جب ان اعمال کا محاسبہ ہو اور اس طرح آخرت نام کی کسی چیز کا تصور ہی نہیں کیا اور دوسرے یہ کہ انہوں نے انبیاء کی خبروں کی جن میں انہیں اس سب کی اطلاع دی گئی تھی، سن کر بھی نہیں مانا اور اُنہیں جھوٹا کہتے رہے۔ پھر یہ سمجھتے رہے کہ اس وقت کی سب باتیں ہماری آئی گئی ہوجائیں گی اور کبھی ان کی جواب دہی نہیں ہوگی، حالانکہ ہماری طرف سے کوئی نامۂ اعمال میں ان کے برابر وہ درج ہوتی رہیں اور کوئی بات چھوٹی نہیں جو اس میں درج نہ ہو، اب چکھو اسے تمہارے عذاب میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہے گا، یعنی اب لاکھ توبہ تلّا کرو، منت وسماجت کرو، اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ عذاب کی شدّت اور گونا گونی میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿٣١﴾ حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ﴿٣٢﴾ وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿٣٣﴾ وَّكَاْسًا دِهَاقًا ﴿٣٤﴾

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾

"بلاشبہہ پرہیز گاروں کے لئے کامیابی ہے باغ اور انگور کی بیلیں اور نوخیز ہم عمر حوریں اور لبریز جام، وہاں وہ نہیں سنیں گے مہمل قسم کی گفتگو اور جھٹلانا، یہ صلہ ہے تمہارے مالک کی طرف کا بطور عطیہ ان کے حسب حال، وہ جو آسمان اور زمین اور اُن کے درمیان کی تمام چیزوں کا مالک ہے جس کی ہیبت سے بات کرنے تک کی انہیں قدرت نہیں ہے"۔

پہلے قسم کے لوگوں کے تقابل کے لحاظ سے جن کا حال یہ تھا کہ اُنہیں حساب و کتاب کا کوئی تصوّر نہ تھا اور جنہوں نے آیات الٰہی اور انبیاء کے تبلیغات کو جھٹلایا تھا۔ اب یہ پرہیز گار لوگ وہ ہیں جنہوں نے اس دن کا تصور رکھا اور اپنے اقوال و اعمال سے اس کا ثبوت دیا، یہ مختصر طور پر اُن کے حسن انجام اور عطا یائے پروردگار جو اُن کے ایمان اور اعمال صالحہ کی جزا کے طور پر اُن کے درجۂ ایمان و عمل کے تناسب سے عطا ہوئی ہے بیان ہے.....وہاں نہ لغو یعنی مہمل باتیں اُنہیں سنائی دیں گی اور جھٹلانا۔ یہاں اصل قرآن میں کذّاب کا لفظ ہے.....اسے بعض نے کذب کے ہم معنی کہا ہے لیکن دوسرے لوگوں نے اس کے معنی تکذیب کے کہے ہیں۔ ہم نے ترجمہ اُس کے مطابق کیا ہے۔ یعنی وہاں یہ نہیں ہوگا کہ ایک دوسرے کی بات کو رد کرے اور جھوٹا سمجھے۔[1] اس میں ایک اشارہ اس طرف ہوسکتا ہے کہ دنیا میں اُنہوں نے یہ اذیّت بھی بہت اٹھائی ہے کہ اُن کی باتوں کو جھوٹا کہا جاتا تھا.....اب آج اس طرح کی اذیّت سے انہیں دوچار ہونا نہیں ہے، آج کوئی ان کی بات کو جھوٹا کہنے والا نہیں ہے۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۖ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾

"جس دن فرشتے اور روح صف باندھے ہوئے کھڑے ہوں گے، وہ بات نہیں کریں گے مگر وہ جسے خدائے رحمٰن کی اجازت ہو اور ٹھیک بات کہے، وہ دن بالکل حقیقت ہے، تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف پلٹنے کا سامان کر رکھے، ہم نے تمہیں ڈرا دیا اُس قریبی عتاب سے، جس دن آدمی دیکھے گا کہ اُس کے ہاتھوں سے کیا کیا ہوا اور کافر کہے گا کہ کاش میں خاک ہوتا"۔

روح سے مراد جبرئیل امینؑ ہیں یا کوئی بڑا اہم فرشتہ جس کا ذکر دوسرے فرشتوں سے الگ بنظر خصوصیت کیا گیا ہے، اس پر سورۂ معارج کی تفسیر میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ وہاں پہلے الملائکہ کا لفظ ہے اور پھر روح کا..... اور یہاں الرّوح پہلے ہے اور ملائکہ بعد کو ہے۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے کوئی خاص فرق نہیں۔

---

[1] ۔ای لا تکذیب بعضھم لبعض.....وقیل کذبا عن ابی علی الفارسی (مجمع البیان)

سُوْرَةُ النَّازِعَاتِ

مکیّہ.....۴۶.....آیات

سورے کا پہلا ہی لفظ والنّازعات ہے، اس لئے سورے کا یہ نام ہوا۔

اس سورے میں بھی قسمیں کھانے کے بعد وہی قیامت کے آنے اور اُس کی تباہی و بربادی کا ذکر ہے۔ درمیان میں حضرت موسیٰؑ کا ذکر ہے اور فرعون نے جو اُن کو جھٹلایا اور اُنہیں مقابلہ کرا کے شکست دینے کی کوشش کی، اس کا کیا انجام ہوا، اس کے تذکرے کے ساتھ اس وقت کے رسول خداؐ کے مقابلہ میں مخالف طاقتوں کے انجام کی طرف اشارہ ہے، اور پھر اللہ کے صنائع و بدائع کا تذکرہ کر کے اُس کی قدرت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں قیامت کا وقت پوچھنے والوں کو یہ انتباہ ہے کہ اس منزل کو دور نہ سمجھنا چاہیے۔ تم تو اُسے اتنا نزدیک سمجھو جتنا آج کے بعد کل کا دن۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝۱ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝۲ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝۳ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝۴ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝۵ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝۶ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝۷

''قسم ہے اُن (فرشتوں) کی جو جسموں کے اندر سرایت کر کے روحوں کو کھینچتے ہیں اور ان جانوں کو آسانی کے ساتھ نکل لے جاتی ہیں اور جو احکام الٰہی کی تعمیل میں تمام اطراف میں یوں رواں دواں ہیں جیسے وہ تیر رہے ہیں اور جو تیزی کے ساتھ سبقت کرنے والے ہیں اور تمام انتظاماتِ کائنات کے کاموں کا بندوبست کرنے والے ہیں جس دن ایک بڑا زلزلہ آجائے گا اور اُس دن کے بعد ہنگامہ خیز مصیبت رونما ہوگی''۔

اگرچہ ہر ہر لفظ میں بہت بہت سے اقوال ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ ذہن نشین مفہوم یہی ہے۔ جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے، بے شک والمرسلات میں اس قول کو کہ اِس سے فرشتے مراد ہیں، ہم نے اس بنا پر رد کیا تھا کہ یہاں جمع مؤنث سالم کی ضمیریں صرف کی گئی ہیں اور فرشتوں کے لئے مشرکین کا تصوّر یہ تھا کہ وہ عورت ہیں لہٰذا قرآن مجید کے ان الفاظ کو اُن پر محمول نہیں کیا جاسکتا مگر اب یہاں ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہی لئے جائیں اور چونکہ محاورے میں اُن کے لئے اسی طرح کے الفاظ اہل عرب میں مستعمل ہوتے تھے اس لئے ان کے واسطے یہی الفاظ صرف کر دئے گئے ہیں جب کہ صراحۃً دوسری جگہ ان مشرکین کے قول کی رکاکت ظاہر کر دی گئی ہے کہ انہیں عورت سمجھنا اور انہیں خدا کی بیٹیاں کہنا غلط ہے وہ راجفة زلزلہ اور رادفة بعد والی مصیبت یوں دونوں سے مراد شاید پہلے اور دوسرے صور اور اُن سے پیدا ہونے والی تباہی و بربادی مراد ہے۔

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ﴿۸﴾ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ﴿۹﴾ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي
الْحَافِرَةِ ﴿۱۰﴾ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ﴿۱۱﴾ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا هِيَ
زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾

''کچھ دل اس دن لرز رہے ہوں گے نگاہیں ان کی جھکی ہوئی ہوں گی ،وہ کہیں گے کہ کیا ہم پہلی ہی صورت میں دوبارہ لائے جائیں گے،انہوں نے پھر کہا کہ یہ واپسی تو بڑے خسارے کی بات ہوگئی ،حالاں کہ بس ایک پُرزور ڈانٹ پڑے جس کے بعد کھلے ہوئے قیامت کے میدان میں وہ کھڑے ہوں گے''۔

وہ صور کی آواز ہے جسے یہاں ''ڈانٹ'' کہا گیا ہے یا یہ پر اثر حکم الٰہی کی تعبیر ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۱۵﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾ اِذْهَبْ اِلٰى
فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾
فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾
فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾

''کیا تمہیں موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کی خبر پہونچی ہے؟ جب اُن کے پروردگار نے انہیں مقدس طوبیٰ کی وادی میں پکارا جاؤ فرعون کی طرف کہ یقیناً اس نے سرکشی کی ہے اور اس سے کہو کہ کیا تجھے منظور ہے کہ پاکیزگی کا راستہ اختیار کرے اور میں تجھے تیرے پروردگار کی راہ بتاؤں تو تو اس کا ڈر اپنے دل میں پیدا کرے تو انہوں نے (جاکر) اسے بہت بڑی نشانی دکھائی تو اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی ،پھر پلٹا اور ان کی مخالفت میں سرگرمی دکھانے لگا اس طرح کہ اس نے مجمع کیا اور بلند آواز میں کہا کہ میں بہت بڑا تمہارا پروردگار ہوں،تو اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب گرفت میں لے لیا، یقیناً اس میں عبرت کا سرمایہ ہے اس کے لیے جو ڈرے''۔

اس میں مختصر طور پر جناب موسیٰؑ اور فرعون کی روائداد سنائی گئی ہے۔تفصیلات قرآن مجید کے دوسرے سوروں میں مذکور ہیں۔فرعون کی سرکشی میں اُس کے تمام مظالم جو بنی اسرائیل پر تھے وہ مضمر ہیں اور دعوائے خدائی تو یہاں بڑی صراحت اور شدت کے ساتھ مذکور ہے نشانیاں یعنی معجزات حضرت موسیٰ کو جو عطا ہوئے ان کی تعداد ایک جگہ قرآن مجید میں نو (۹) بتائی گئی ہے۔یعنی سب سے بڑی نشانی سے مراد ان کے عصا کا اژدھا بن جانا ہے اور ساحروں نے اپنی رسیوں اور لاٹھیوں سے جو سانپ بنائے تھے اس عصا کا اژدھا بن کر نگل جانا اور حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں آنے کے بعد پھر اس کا مثل سابق عصا بن جانا ہے۔ظاہر ہے کہ اس معجزہ ہونے میں کسی قدیم یا جدید منکر کی دھاندلی سوا عناد اور سرکشی کے اور کچھ

نہیں ہوسکتی اور اس پر طرّہ جو اپنی شکست کو مٹانے کے لیے انا ربکم الاعلی کے کھوکھلے نعرے کا بلند کرنا ہے۔ دنیا کا عذاب ہے غرق کی صورت میں سب کے سامنے آ گیا اور آخرت کے عذاب کا تصور وہی کریگا جو اس عذاب سے عبرت حاصل کرے۔

ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾

''کیا تم لوگوں کا پیدا کرنا زیادہ سخت مشکل کام ہے یا آسمان جس کو اس نے بنایا، اس کی چھت کو اونچا کیا اور اس میں توازن قائم کیا اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اُس کے دن کو نمودار کیا، اور اُس کے بعد زمین کا بچھونا اس نے بچھایا۔ اُس میں اُس کا پانی برآمد کیا اور چرنے کے قابل نباتات نکالے اور پہاڑوں کو جما دیا تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زندگی کے طور پر''۔

جب تک کہ کارگاہ عالم بالا کے کیفیات کا انکشاف نہیں ہوا تھا، الفاظ قرآن کے یہی معنی سمجھے جاتے تھے کہ ایک مجسم عمارت ہے جو بغیر ستونوں کے قائم ہے جس کی یہ چھت نیلی نیلی نظر آتی ہے لیکن جب دوربینوں اور خلائی سفروں سے کچھ ادھر کے کیفیات کا علم ہوا تو پتہ چلا کہ اس طرح کی کوئی عمارت نہیں ہے تو اب الفاظ قرآنی کی تشریح یہ سمجھ میں آنے لگی کہ عالم بالا میں جتنے ستارے ، سیارے شمسی نظام اور بے شمار کہکشاں ہیں ان تمام کو سماء یعنی آسمان کی لفظ سے تعبیر کیا ہے اور اسی کو کہا گیا ہے کہ اس پورے نظام کا قائم کرنا زیادہ مشکل کام تھا یا تمہیں دوبارہ پیدا کرنا تو جو خدا اس پر قادر تھا، وہ کیا تمہیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے؟ رات اور دن کی نسبت آسمان کی طرف اس لحاظ سے دی گئی ہے کہ اس کے سورج غروب سے یہ دونوں تبدیلیاں ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔ زمین کو آسمانی نظام کی تکمیل کے بعد کہنا ''ترتیب واقعہ کے اظہار کے لیے نہیں ہے بلکہ ''ترتیب ذکر'' کے طور پر ہے کہ وہ سن چکے، اب یہ سنے۔ اگرچہ بحیثیت واقعہ دونوں باتیں ایک ساتھ یا یہ اس کے پہلے ہوئی ہو۔ چرنے کی لفظ کا استعمال عموماً جانوروں کے لیے ہوتا ہے لیکن کبھی حقیقی طور پر نہ سہی مجازی حیثیت سے انسان کے لیے بھی نباتات سے غذا حاصل کرنے کے لیے ہوسکتا ہے جب کہ اس کی صورت شروع زمانے میں یہی تھی کہ جنگلوں اور باغوں میں گردش کر کے وہاں کے نباتات سے پیٹ پالے۔ دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی اس کے صنعتوں کی یاد آوری سے جس طرح اس کی قدرت کا دکھلانا ہے، اسی طرح حکمت کا بھی کہ اس نے جو چیز پیدا کی ہے ہیں جب وہ سب با مقصد ہیں تو یہ انسان بے مقصد کیوں کر ہوسکتا ہے لہٰذا ایک دن یہ محاسبہ بھی ہونا چاہیے کہ اس نے اس مقصد کو پورا کیا یا نہیں پہلا امر یعنی قدرت پر نظر سے امکان معاد ثابت ہوتا ہے اور دوسرے امر سے ضرورت معاد۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿۳۴﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿۳۶﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِىَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ

هِیَ الْمَاْوٰی ﴿۴۱﴾

''تو جب وہ عظیم آفت آئے گی جس دن آدمی یاد کرے گا کہ اس کی سرگرمی کیا رہی اور دوزخ سامنے آجائے گا دیکھنے والے کو تو جو شخص سرکشی کرتا رہا اور اس نے دنیوی زندگی کو ترجیح دی تو دوزخ اس کا مستقبل ٹھکانا ہے اور جس نے اپنے پروردگار کے یہاں کی حضوری کا ڈر رکھا تھا اور اپنے کو نفسانی خواہشوں سے روکے رکھا تو بہشت اس کا مستقبل ٹھکانا ہے''؟

اب آدمی اپنے سابق میں کیے ہوئے ہر طرز عمل کو یاد کرے گا اور دوزخ جسے کانوں سے سنتا رہا تھا، اب ایک مشاہدہ میں آنے والی حقیقت بن کر سامنے ہوگا تو جس نے اپنے پروردگار سے سرکشی کی اور آخرت کے مقابلہ میں ہمیشہ دنیا کے مفادات کے پیچھے لگا رہا اس کے مستقبل قیام کی جگہ اب دوزخ ہے اور جس نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں کھڑے ہونے کا اندیشہ سامنے رکھا تھا.....ایک معنی یہ کہے گئے ہیں کہ اپنے پروردگار کی شان عظمت وجلال اور اس کے حاضر وناظر ہونے کا خیال دل میں رکھا تھا اور اپنی خواہشوں کے مقابلہ میں اس کے احکام کی پابندی کو ہمیشہ مقدم سمجھا تھا، اس کے لیے بہشت مستقل محل اقامت ہوگا۔ یہی دو (۲) طرز حیات ہیں جن کا محاسبہ ہونا ہے اور انہیں کے مطابق جزا وسزا ملنا ہے۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿۴۲﴾ فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿۴۳﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰىهَا ﴿۴۵﴾ كَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَهَا لَمْ یَلْبَثُوْۤا اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿۴۶﴾

''آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ آخر وہ کب برپا ہوگی؟ آپ کے متعلقہ کاموں میں اس کا بتانا کہاں ہے، اس کی انتہا تو بس اللہ پر ہے، آپ تو بس جو اس کا تصور رکھے اسے اس سے ڈرانے والے ہیں، یہ لوگ جب اسے دیکھیں گے تو ایسا محسوس ہوگا جیسے نہیں رہے تھے مگر ایک شام یا اس کے بعد کی صبح کا ایک پہر''۔

یہ پوچھنا سنجیدگی کے ساتھ واقعی اپنے علم کے لیے تو کبھی بھی نہیں تھا۔ اکثر بطور طنز یا استہزا ہی تھا، بہرحال اگر سنجیدگی کے ساتھ بھی ہوتا تو قرآن کے رو سے اس کا جواب پیغمبرؐ کی طرف سے ہمیشہ یہی رہا ہے کہ اس کا علم بس اللہ کو ہے۔ یہاں اس کے ساتھ یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ آپ کے فرائض منصبی میں یہ ہے کہ آپ اس کے تاریخ اور وقت سے لوگوں کو آگاہ کرتے رہیں۔ یہ لوگ واقعی اس کا تصور ہی نہیں رکھتے، آپ کا کام ڈرانا ہے اس کے حالات وکیفیات کو بیان کرکے جس سے خبردار تو آپ سب کو کریں گے مگر اس سے متاثر وہی ہوں گے جو اس کا تصور رکھتے ہوں اس کا تصور وہی ''مقام رب'' کا خوف ہے جسے گزشتہ آیت میں معیار نجات بتایا تھا۔ ڈرانے کو اس جماعت سے مخصوص بتانا اسی لحاظ سے ہے کہ فائدہ اس سے یہی جماعت اٹھائے گی، دوسرے لوگ تو اس ڈرانے کو بھی ہنسی مذاق میں اڑائیں گے۔

سُوْرَۃُ عَبَسَ

مکیّہ.....۴۲.....آیات

اس سورے کا یہ نام تو سورے کی پہلی ہی لفظ کی بنا پر ہے اور بعض نے اس کا ایک دوسرا نام السفرۃ بتایا ہے۔[1] جو بعد کی ایک لفظ کی بناء پر ہے جو تھوڑی دور پر ان آیتوں میں ہے کہ بایدی سفرۃ کرام بررۃ سفیروں کے ہاتھ سے جو بزرگ مرتبہ ایک کردار ہے۔

سورے کی ابتدا ایک واقعہ سے ہے جس کا زیادہ تر مفسرین کے بیان کے مطابق جو ظاہری الفاظ قرآن کے موافق بھی معلوم ہوتا ہے خود رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے لیکن ایک روایت کے مطابق ایک دوسرے شخص سے ہے جو رسولؐ کی خدمت میں اس وقت تھا اور اس نے یہ رویہ اختیار کیا تھا۔ غرض پہلی چند آیتوں کے آغاز عمل کے نامناسب ہونے پر زور دیا گیا ہے پھر منکرین اور متکبرین کو ان کے آغاز خلقت کو یاد دلاتے ہوئے سرزنش ہے کہ اسے پیش نظر رکھیں، تو وہ تکبر سے کام نہ لیں، پھر وہی پہلے اللہ کی کچھ نعمتوں کا ذکر ہے جو انسانوں کے لیے پیدا کی گئی ہیں اور اس کے بعد آخرت کے ہولناک دن اور پھر دو جماعتوں کی تقسیم ہے ایک جو ہشاش وبشاش ہوں گے اور ایک جن کے چہروں پر دھویں اُڑ رہے ہوں گے۔ وہ مؤمن اور یہ کافر۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝١ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝٢ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝٣ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝٤ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝٥ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝٦ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝٧ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝٨ وَهُوَ يَخْشٰى ۝٩ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝١٠

''اس نے ترش روئی کی اور منہ پھیر لیا کہ اس کے پاس اندھا آ گیا اور آپ کو کیا خبر، شاید وہ پاک صاف ہو جائے یا نصیحت سے اثر لے اور یہ نصیحت اسے فائدہ پہنچائے جو بے نیاز ہیں، آپ ان کے درپے ہوتے ہیں حالانکہ آپ کا کیا نقصان اگر وہ اصلاح کا اثر نہیں لیتے اور جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ انجام سے ڈرتا ہے تو آپ اس سے بے توجہی اختیار کرتے ہیں''۔

یہ ہے وہ سلسلہ آیات کا جس کا ظاہری مفہوم بھی اسی کے مطابق ہے اور عام مفسرین بھی لکھتے ہیں کہ وہ ابن اُم مکتوم کے بارے میں

---

[1] ۔سورہ عبس تسمیٰ سورۃ السفرۃ (مجمع البیان)

نازل ہوئیں کہ وہ حضرتؐ کے پاس آئے ایسے وقت جب آپ کے پاس عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل ابن ہشام اور امیہ بن ابی خلف اور عباس ابن عبدالمطلب بیٹھے تھے اور آپ انہیں اسلام لانے کی ترغیب دے رہے تھے جسے آپ مفاد اسلامی کے لیے بہت اہم تصور فرما رہے تھے گفتگو جاری تھی۔ یہ ابن اُم مکتوم جو آئے تو بے چارے نابینا تھے، انہوں نے یہ محسوس نہ کیا کہ یہاں کوئی اہم گفتگو ہو رہی ہے یا سلسلہ کلام جاری ہے۔ انہوں نے چیخ چیخ کر حضرتؐ کو مخاطب کر کے کچھ پوچھنا شروع کر دیا۔ حضرتؐ کو بار بار اپنی بات قطع ہونے سے اذیت ہوئی اور آثار برہمی آپ کے چہرہ مبارک پر نمودار ہوئے۔ اس کی بنا پر یہ آیات نازل ہوئے۔

علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے امام جعفر الصادق علیہ السلام سے ایک روایت درج کی ہے کہ وہ آیتیں بنی امیہ کے ایک شخص کے بارے میں اتری ہیں جو اس وقت وہاں موجود تھا اور جب ابن مکتوم آئے تو ان کے میلے کپڑوں کی وجہ سے اس نے اپنے کپڑے سمیٹے اور اظہار ناگواری کیا، اس پر یہ آیتیں اتریں۔

میں نے ایک مرتبہ ایک صاحب کو جنھوں نے ان آیات کے متعلق دریافت کیا اس کے بعد فوراً جو ہے كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ہرگز نہیں ہے، یہ تو ایک نصیحت ہے، اس کلاّ کی لفظ سے مطمئن کیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حاشا، آپ بھلا ایسا تھوڑی کریں گے۔ یہ تو عام طور پر ایک نصیحت ہے کہ اسے یاد رکھنا چاہیے۔

دوسرے لوگ جو اسے حضرتؐ سے متعلق قرار دیتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ حضرتؐ کا عمل معاذ اللہ بر بنائے تکبر نہ تھا کہ آپ غریبوں کو ذلیل نظر سے دیکھتے ہوں اور مال دار کی عزت فرماتے ہوں بلکہ مفاد اسلامی کی خاطر تھا لہٰذا وہ کوئی گناہ تو نہیں تھا جو خلاف عصمت ہو لیکن خداوند عالم نے اسے ''ترک اولیٰ'' کی طرح قابل ترک قرار دیا اور اس سے بہتر طرز عمل کی ہدایت فرمائی۔

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾

''ہرگز نہیں، یہ ایک نصیحت ہے تو جو چاہے اسے یاد رکھے، وہ ایسے مصحفوں میں ہے جو بڑے عزت دار ہیں بلند درجے کے پاک و پاکیزہ ہیں، ان خداوندی لکھنے والوں کے ہاتھ سے جو عزت دار نیک کردار ہیں''۔

کلام کے ایک معنی وہی ہیں جو ابھی سابق میں درج ہوئے کہ ہرگز نہیں ہے، آپ کا یہ شیوہ نہیں ہے، یہ تو ایک عام نصیحت ہے ہر داعی حق کے لیے، جو چاہے اسے یاد رکھے، دوسرے معنی عام مفسرین کے خیال کے مطابق ہیں، یہ ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کو دعوت حق کے سلسلے میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کون طالب حق ہے اور حق کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ نہ یہ کہ کون بڑا آدمی ہے اور کس کے حق کو قبول کرنے سے حق کو فائدہ زیادہ پہونچے گا، جب کہ وہ خود اختیار حق ست بے نیاز ی کا ثبوت دے رہا ہے تو خود آپ کو بھی ان سے بے نیاز ہونا چاہیے۔ یہ قرآن کی تعلیم ہے، بعد میں جو اوصاف ہیں وہ تو فرشتوں کے ہیں۔ لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تو قرآن مکتوبی شکل میں نہیں پہنچا لہٰذا اس لکھنے کو لوح محفوظ سے متعلق قرار دیا گیا ہے یہ عالم بالا میں جہاں بھی وہ فرشتے اسے لکھنے پر مامور ہوں اور پھر اسی کے مطابق پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اسے نازل کیا جاتا ہو۔

یہ اس صورت میں ہے جب سفرۃ کے معنی لکھنے والوں کے لیے جائیں لیکن اگر وہ سفیروں کے معنی میں لیے جائیں [1] تو وہ بلا تکلف اسی تنزیل سے متعلق ہے جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہوئی بس اس صورت میں اتنا ہے کہ یہاں ایک مخصوص ملک کی جو جبرئیل امینؑ ہیں بطور ابہام جمع سے تعبیر کی گئی ہے جیسے بعض جگہ قرآن مجید میں ایک شخص کی بات کے بیان کرنے میں جمع کے صیغے صرف کیے گئے ہیں یا صحف سے مراد یہاں قرآن مجید کے ساتھ اور انبیا علیہم السلام کی کتابیں اور صحیفے بھی مراد لئے گئے ہیں۔ [2]

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾

''لعنت ہو اس انسان پر کتنا یہ ناشکرا ہے، کس چیز سے اُس (اللہ) نے اسے پیدا کیا ہے؟ نطفے سے، اس کو پیدا کیا اور اس کی تقدیر مقرر کی پھر ایک خاص راستے کی طرف اس کے چلنے میں آسانی پیدا کی پھر اسے موت دی پھر اسے قبر میں پہنچایا پھر جب چاہے اسے باہر لے آئے گا، اس سب کے بعد بھی اس نے پورا نہ کیا اسے جو اس نے حکم دیا تھا''۔

تقدیر کے دائرہ میں تو شکل وصورت، قد وقامت، صحت ومرض اور عمر وغیرہ کی طرح اس کا کردار بھی ہے مگر کردار سے تعلق تقدیر بحد جبر نہیں ہے ورنہ شروع اور آخر میں یہ سرزنش نہ ہوتی کہ لعنت ہو اس پر کتنا یہ ناشکرا ہے اور پھر یہ کہ اس نے اسے جو حکم دیا تھا وہ پورا نہیں کیا۔ اگر مجبور محض ہوتا تو یہ ملامت کیسی۔ ''ایک خاص راستے کی طرف چلنے میں سے آسانی پیدا کی جائیں'' یہ دین اور شریعت کا راستہ بھی ہے جس میں انبیا مرسلین کے بھیجنے کے ساتھ آسانی پیدا کی اور بسر زندگی کا سامان بھی داخل ہے جسے عموماً رزق کہتے ہیں۔ ملامت اسی پر ہے کہ جو ایسا صاحب اقتدار مالک، خالق اور مربّی ہے، اس کے مقابلے میں اسے سرکشی تو نہیں کرنا چاہیے اور اس کے احکام سے سرتابی کا راستہ اختیار نہ کرنا چاہیے

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾

''پھر انسان نگاہ کرے اپنی غذا کی طرف کہ ہم نے جیسا چاہیے پانی برسایا، پھر زمین میں شگاف پیدا کیا، پھر اس میں اگائے اناج کے دانوں اور انگور اور سبزیاں اور زیتون اور کھجور اور بڑے گھنے باغ اور پھل اور چارا سامان زندگی تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے''۔

---

[1] ۔قیل یعنی اسفرۃ لہ بالوحی بین اللہ تعالیٰ وہ بین رسلہ من السفارۃ (مجمع البیان)

[2] ۔قیل کتب الانبیا المنزلۃ علیہم کقولہ ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ (مجمع البیان)

انہی چیزوں کی طرف قبل کے سوروں میں توجہ دلائی گئی تھی اور انہی چیزوں کی طرف اب اس سورے میں توجہ دلائی گئی کہ جس ''خدا نے تمہارے لیے یہ سب زندگی کا سامان فراہم کیا ہے، تم اس کی نعمتوں کو کیوں یاد نہیں رکھتے اور کیوں اس سے سرکشی کرتے ہو''۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ مکّہ میں نازل شدہ سورتوں میں وہی انداز ہے جیسا ابتدائی طالب علموں کے شعبوں میں مختلف طرح بار بار کچھ باتوں کو دھرایا جاتا ہے تا کہ اُنہیں یاد ہوں اور اُن کے ذہن میں رہ سکیں، پھر جب وہ انہیں یاد ہو جائیں گی اور ذہن نشین ہو جائیں گی تو آئندہ آگے کے سبق دیے جائیں گے۔ اللہ کی نعمتوں کا ذکر اس کی اطاعت کی تحریک کے لیے بھی ہے اور اپنے محاسبۂ نفوس کے لیے بھی اور آخرت کا خوف پیدا کرنے کے لیے بھی اور اس کی قدرت کو دکھلا کر جو اس کے مخلوقات سے ظاہر ہے انسان کے دوبارہ زندہ کیے جانے پر استدلال کے لیے بھی جسے مشرکین ناممکن سمجھ رہے تھے یا اسے بعید خیال کرتے تھے۔

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾

''تو جب وہ کانوں کر پھاڑنے والی آواز بلند ہو گی تو وہ ایسا دن ہو گا کہ آدمی بھاگ رہا ہو گا اپنے بھائی، اپنی ماں، اپنے باپ، اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے، ہر ایک کا ان میں سے یہ عالم ہو گا کہ اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہو گا، کچھ چہرے اس دن خوش خوش ہوں گے اور کچھ چہروں پر گرد و غبار چھایا ہو گا جن پر سیاہی دوڑ رہی ہو گی''۔

بھاگنا اس معنی میں بھی کہ کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا اور اس معنی میں بھی کہ کہیں یہ سب میرے خلاف مستغیث نہ ہوں کہ میں نے ان پر مظالم کیے ہیں یا یہ کہیں میرے خلاف غلط اعمال کے گواہ نہ ہوں۔ علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے کئی وجوہ بیان کیے ہیں اس طرح کہ:۔

ای لایلتفت الیٰ واحدمن ھٰؤلاءلعظم ماھوفیه وشغل نفسه وان کان فی الدنیایعنی بشانهم وقیل یفرّمنهم حذرلمن مطالبتهم ایّاہ بمابینه وبینهم من التبعات والمظالم ولعلمه بانهم لاینفعونه ولایغنون عنه شیئاویجوزان یکون مؤمناواقرباؤہٗ من اهل النارفیعادیهم ولایلتفت الیهم اویفرّمنهم لئلایری مانزل بهم من الهون ..... (مجمع البیان) یعنی ان میں سے کسی ایک طرف بھی وہ متوجہ نہیں ہو گا، اس صورت حال کی شدت کی وجہ سے جس میں وہ خود گرفتار ہے اور خود اپنی فکر کی وجہ سے حالاں کہ دنیا میں اُسے اُن کی فکر ہوئی تھی اور کہا گیا ہے کہ اُن سے بھاگے گا اس خوف سے کہ یہ اس سے مطالبہ کریں گے ان کے حقوق کا جو ان کے آپس میں تھے اور مظالم کا اور پھر اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ اسے کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے اور ہو سکتا ہے کہ یہ مؤمن ہو اور اس کے وہ عزیز اہل دوزخ سے ہوں تو خود اسے ان سے نفرت ہو گی اور ان کی طرف توجہ نہ کرے گا یا ان سے نفرت ہو اور ان سے بھاگے تا کہ اسے آنکھوں سے دکھائی نہ دے وہ ذلت جو ان کی ہو رہی ہے۔

سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ

مکیّہ.....۲۹.....آیات

پہلی ہی آیت میں کورت کی لفظ ہے، اس کا مصدر تکویر ہے جس کے معنی لپٹنے کے ہیں۔ یہ اس سورے کا نام ہوا۔ اس میں بھی شروع میں وہی قیامت کے سخت ہولناک حالات کا ذکر ہے اور اس سب کے بعد انسان کو یہ سوچنے کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس دن کے لیے کیا ذخیرہ چھوڑ رہا ہے۔

پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت اور قرآن مجید کی سچائی اور از جانب الٰہی ہونے کا پرزور الفاظ میں اظہار ہے اور لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم اسے قبول نہ کر کے ادھر ادھر بھٹک رہے ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہونچنے والا بڑا مہربان ہے''

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝١ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝٢ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝٣
وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝٤ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝٥ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝٦
وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝٧

''جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور جب تارے تہہ و بالا ہو جائیں گے اور جب پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹا دیئے جائیں گے اور جب حاملہ اونٹنیوں کی فکر ختم ہو جائے گی اور جب صحرائی جانور اکٹھا ہو جائیں گے اور جب سمندر شعلہ آور ہو جائیں گے اور جب جانیں ملا دی جائیں گی''۔

سورج کے لپیٹے جانے سے مقصود یہ ہے کہ اس کی کرنیں جو ہر طرف پھیلی ہوئی روشنی پھیلاتی ہیں سب سمیٹ کر اس کے حرم میں محدود ہو جائیں گے تو چاروں طرف تاریکی چھا جائے گی۔ انْكَدَرَتْ کی لفظ جو ستاروں کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ اس کی ایک تشریح یہ ہوئی ہے۔ کہ جب پرندہ فضا سے ٹوٹ کر زمین کی طرف تیزی سے آئے تو کہتے ہیں تکدّر الطائر۔ اسی طرح ستارے اپنے اپنے محل سے ٹوٹ کر جدا ہو جائیں گے جب کہ قرآن مجید میں ابھی اس کے بعد کے سورے میں آئے گا وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ. ''جب ستارے بکھر جائیں گے'' یعنی ان کا نظم ضبط ختم ہو جائے گا جس کے لحاظ سے ہم نے ترجمہ کیا تہہ و بالا ہو جائیں گے۔

دوسری تشریح یہ ہے کہ پانی مٹیالا ہو تو اسے کہتے ہیں کہ پانی مکدّر ہے تو مطلب یہ ہے کہ ستاروں کی روشنی مدّھم ہو جائے گی اور وہ بے

نور ہو جائیں گے۔

''پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹا دیئے جائیں گے'' تو پھر کیا ہوں گے؟ دوسرے مقامات پر ہے کہ ''وہ دھنکے ہوئے اون کے گالوں کی طرح چاروں طرف فضا میں اڑ رہے ہوں گے اور کہیں یہ ہے کہ ''ریزوں کی طرح روشن دانوں میں بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن ہاتھ میں پکڑائی نہیں دیتے ایسے بے حقیقت ہو جائیں گے۔

عربوں کا سب سے قیمتی سرمایہ اونٹ تھے لہٰذا وہ اونٹنی جس کے پیٹ میں بچہ ہو، اس کا بہت خیال ہوتا تھا اس وقت عام اضطراب اور بدحواسی کا عالم یہ ہوگا کہ ان اونٹنیوں کو چھوڑ دیا جائے گا، ان کا پرسان حال کوئی نہ ہوگا۔

جنگلی جانور سب اکٹھا ہو جائیں گے۔ یہ عالم دہشت میں عام طور پر ان جانوروں کی فطرت ہے بلکہ یہ سب جو ایک دوسرے کے دشمن بھی ہیں سب اکٹھا ہو جاتے ہیں۔

''سمندر شعلہ آور ہو جائیں گے'' یعنی بجائے پانی کے ان میں آگ بھڑکنے لگے گی''۔

''جانیں ملا دی جائیں گی'' یہ شاید اس عام تباہی کے بعد اب دوبارہ زندہ کیے جانے کا ذکر ہے کہ وہ جدائی جو موت کے بعد روح اور جسد میں ہوئی تھی اب دور ہو جائے گی اور دوبارہ ان میں اتصال ہو جائے گا بعض نے کہا ہے کہ ہر ایک کے اپنے ہم جنس کے ساتھ محشور ہونے کا ذکر ہے۔ نیک نیکوں کے ساتھ اور بد بدوں کے ساتھ [1] اور بعض نے کہا ہے کہ اب یہ اس کے بعد کے مرحلے کا ذکر ہے کہ بہشت میں مؤمنین کو حوروں کے قبیل سے بیویاں ملیں گی اور اہل دوزخ کو ان کے لائق ساتھ والیاں جنات اور شیاطین میں سے۔

وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ﴿٨﴾ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ﴿٩﴾

''اور جب زندہ زمین میں دفن کی جانے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ کس گناہ میں اس کی جان لی گئی''۔

عرب میں جو غلط رسم رائج ہو گئی تھی کہ وہ لڑکیوں کو پیدائش کے فوراً بعد ہی یا کچھ دنوں بعد زمین میں گڑھا کھود کر اس میں گرا دیتے تھے اور اسے مٹی سے پاٹ دیتے تھے کہ وہ ہلاک ہو جاتی تھی تو اب قیامت میں الفاظ قرآنی کے معنی تو یہی ہیں کہ خود اس سے پوچھا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود اپنا استغاثہ پیش کرے تاکہ اس کے قاتل کا سزا دی جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قاتل سے سوال کر کے مقصود اس لڑکی کے بارے میں تو عربی کے لحاظ سے سُئِلَتْ کے معنی ہوں گے سئل عنها 'اس کے متعلق دریافت کیا جائے گا''۔ اس کی نظیر قرآن مجید میں یہ ہے کہ ارشاد ہوا ہے:۔ (بنی اسرائیل۔ ۳۴)

ان العهد كان مسئولا ۔ ''عہد سے سوال کیا جائے گا؟ یعنی عہد کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ اسے پورا کیا یا نہیں؟

اسلام نے اس عمل کو گناہ عظیم ہی نہیں قرار دیا بلکہ لڑکی کی پرورش و پرداخت کے ثواب بہت بیان کیے گئے جو احادیث میں درج ہیں، یہاں تک کہ اپنے حبیب خاص کے لیے حکمت الٰہی نے بیٹیوں کو زندہ رکھنا ضروری نہیں سمجھا مگر فاطمہ سلام اللہ علیہا ایسی بیٹی کرامت فرما کر آپ کی نسل مطہر کو اسی بیٹی سے دنیا میں قائم رکھا۔

---

[1] ۔ای قرن كل واحد منهما الى شكل فصتم اليه (مجمع البيان)

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿۱۰﴾ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴿۱۱﴾ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ﴿۱۲﴾
وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿۱۳﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾

''اور جب نامہ ہائے اعمال کھولے جائیں گے اور جب آسمان کا پردہ چاک کیا جائے گا اور اجب دوزخ بھڑکایا جائے گا اور جب بہشت نزدیک لے آیا جائے گا تو ہر متنفس کو پتہ چلے گا کیا اُس نے لاکر پیش کیا ہے''۔

اب وہ منزل آگئی جب صحیفہ اعمال ہر ایک کے ہاتھ میں دیدیا گیا اور اس نے دیکھ لیا کہ اس کی کارگزاری دنیا میں کیا رہی تھی اور ''جب آسمان کا پردہ چاک کیا جائے گا'' یا تو اس کے وہی معنی میں جن کے لحاظ سے کبھی کہا گیا ہے کہ آسمان شگافتہ ہوجائے گا اور کبھی یہ کہ اس میں دروازے ہوجائیں گے یعنی درمیان کی رکاوٹیں ختم ہوجائیں گی۔ اور ہر قسم کی بلائیں ٹوٹ پریں گی تو یہ پہلے ہی مرحلے کا ایک جز ہے جو تعبیر کے لحاظ سے ترتیب واقعہ اب بیان ہوگیا اور یا یہ مراد ہے کہ یہ نظام پورا بدل جائے گا جسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ شامیانہ فلک کا کھل جائے گا اور اب دوسرا آسمان ہوگا اور دوسری طرح کی زمین جب ایک جگہ قرآن مجید میں ہے: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (سورۃ ابراھیم-۴۸) جس دن یہ زمین بدل جائے گی دوسری زمین کے ساتھ اور تمام آسمان'' اور اس وقت دوزخ کے شعلے بھی سامنے نظر آرہے ہوں گے اور بہشت بھی سامنے دکھائی دے رہا ہوگا۔ دوسری جگہ ہے:۔ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ، ''بہشت پرہیزگاروں کے نزدیک کردیا جائے گا اور دوزخ بے نقاب ہوگا گمراہوں کے لیے'' (شعراء-۹۰،۹۱)

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾ وَالصُّبْحِ
اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾
مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿۲۳﴾

''تو نہیں میں قسم کھاتا ہوں ان تاروں کی جو چھپتے ہیں اور چلتے اور پھر چمک کر چھپتے ہیں اور رات کی جب کہ وہ تاریک ہوئی ہو، اور صبح کی جب کہ اس کا سفیدہ نمودار ہوا ہو کہ یہ ایک معزز پیغام پہنچانے والے کی بات ہے جو طاقت والا عرش کے مالک کی بارگاہ میں عزت رکھنے والا جس کے احکام کی تعمیل ہوتی ہے اور پھر وہ امانت دار ہے اور تمہارا سابقہ جس (پیغمبر) کے ساتھ ہے یہ دیوانہ نہیں ہے اور اس نے اسے کھلی ہوئی روشن فضا میں دیکھا ہے''۔

لاکو زائدہ نہ مانتے ہوئے ہر جگہ اس نفی کا تعلق مشرکین کے اُس مزعومہ کے ساتھ ہوتا ہے جس کے مقابلے میں اُن کی بات کو رد کرتے ہوئے اصل حقیقت پر قسم کھائی گئی ہے۔ یہاں چونکہ بعد کو یہ ہے کہ یہ قرآن ایک معزز فرشتے کے ذریعے سے جس کے اوصاف بعد میں بیان کیے گئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچتا ہے اور یہ پیغمبر معاذ اللہ دیوانہ نہیں ہے.....اور پھر بعد میں آئے گا کہ وہ کسی شیطان کے ذریعے سے نہیں پہنچتا ہے تو اس نفی کا تعلق انہی دو جملوں کے ساتھ ہوتا ہے، ایک حضرت کو معاذ اللہ مجنون سمجھنا اور اس قرآن کو شیطانی کارگزاری کا نتیجہ سمجھنا.....اس کے مقابلہ میں قسموں کے ساتھ جو بات کہی گئی وہ اصل حقیقت ہے کہ اسے یہ فرشتہ خدا کی طرف سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچاتا ہے۔ اسے اس پیغام

پہنچانے والے کا قول کہنا اس اعتبار سے ہے کہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اس کے ذریعے سے پہنچتا ہے اور اس لیے اس فرشتے کو یہاں رسول کی لفظ سے یاد کیا ہے کہ وہ جو پہنچاتا ہے وہ درحقیقت اللہ کا پیغام ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ اس کی نسبت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اس اعتبار سے دی گئی ہے کہ وہ عامۂ خلائق تک آپ کے ذریعہ سے پہنچتا ہے ورنہ حقیقت میں نہ وہ آپ کا کلام ہے، نہ جبرئیل امینؑ کا بلکہ وہ خالق متعال کا کلام ہے جو ان کے ذریعہ سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتا ہے اور آپ کے ذریعے سے دوسروں تک۔

جبرئیل امینؑ کے لیے جو مطاع کی لفظ استعمال کی گئی ہے کہ ان کا احکام کی تعمیل ہوتی ہے اس سے جیسا کہ بعض اہل نظر نے استفادہ کیا ہے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جیسے جناب عزرائیلؑ ملک الموت کا ایک عملہ ہے جو اکثر ان کے حکم سے قبض ارواح کے لیے چلا جاتا ہے، اسی طرح جناب جبرئیل امینؑ کے لیے ان کے دائرہ عمل میں ایک عملہ ہے جو اس کے حکم کی تعمیل کرتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے پاس بشارت فرزند کے لیے کئی فرشتے آئے تھے جو ان کے مہمان ہوئے تھے اور پھر وہ قوم لوط کی طرف عذاب نازل کرنے کے لیے گئے تھے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ﴿٢٤﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ﴿٢٥﴾ فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ ﴿٢٦﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿٢٧﴾ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ ﴿٢٨﴾ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٢٩﴾

''اور یہ غیبی باتوں (کے پہنچانے) میں کنجوس نہیں ہیں اور وہ کسی مردود شیطان کا قول نہیں ہے تو تم لوگ کدھر جارہے ہو یہ نہیں ہے مگر ایک نصیحت تمام دنیا جہاں کے لیے اس کے لیے جو تم میں سے سیدھی راہ پر چلنا چاہیے اور تم ایسا نہیں چاہو گے، جب تک اللہ نہ چاہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے''۔

یعنی صرف اس لیے کہ تم لوگ مذاق اڑاؤ گے یا ان باتوں کے پہنچانے سے ناگواری محسوس کر کے انہیں طرح طرح کی اذیتیں دو گے وہ ان غیبی حقیقتوں کے پہنچانے میں کمی نہیں کریں گے اور تمہارا یہ سمجھنا کہ معاذ اللہ کوئی شیطان انہیں یہ باتیں سکھاتا ہے جو یہ دنیا تک پہنچاتے ہیں بالکل غلط ہے۔ بھلا شیطان ایسے بلند اخلاقی تعلیمات پہنچانے کا درپے کیوں کر ہوسکتا ہے اس کا کام تو گمراہ کرنا ہے ہدایت کی باتیں اس کی وسوسہ انگیزی کا نتیجہ کہاں ہوسکتی ہے بہرحال ان کا کام نصیحت کرنا ہے۔ اور وہ نصیحت سب کو کریں گے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے فائدہ وہی اٹھائیں گے جنھیں فائدہ اٹھانے کی خواہش ہوگی اور یہ خواہش بھی ان کی اسی وقت ہوگی جب توفیق الٰہی شامل حال ہو جو صلاحیت دیکھ کر شامل حال ہوتی ہے۔

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ

مکیّہ.....۱۹.....آیات

پہلی ہی آیت میں انفطرت کی لفظ کا مصدر انفطار ہے وہی اس کا نام ہوا۔

اس سورے کا انداز بالکل سورہ تکویر کا سا ہے۔شروع میں کچھ احوال قیامت ،اعمال گزشتہ کا ہر ایک کے سامنے آجانا،نعمت وجود اور ابتدائی خلقت کو یاد دلانا کہ اس کے کرم واحسان کے مقابلہ میں تمہارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ اور جب کہ تمہارا رویہ اس کے خلاف ہے تو اس کے محاسبے اور مواخذہ کا کوئی وقت ہونا چاہیے۔اس دن نیکوکاروں کا عالم اور ہوگا اور بدکاروں کا انجام دوسرا ہوگا۔کوئی کسی کے کام نہ آسکے گا بس اللہ کا اختیار واقتدار کارفرما ہوگا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝۱ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝۲ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝۳ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝۴ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝۵

''جب آسمان شگافتہ ہوجائے گا اور جب ستارے منتشر ہوجائیں گے اور جب سمندروں کی تہیں پھاڑ دی جائیں گی اور جب قبریں کھول دی جائیں گی تو ہر شخص کو پتہ چل جائے گا کہ اس نے کس چیز کو آگے رکھا اور کسے پس پشت ڈال دیا''۔

آسمان کا پردہ ہٹادیا جائے گا جس کا اس کے قبل کے سورے میں ذکر ہے(وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ)اور یہاں شگافتہ ہے (اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ)اب اس سب کا مفہوم یہی سمجھ میں آتا ہے کہ درمیان کے اجسام اور اجرام ادھر ادھر بکھر جائیں گے اور نظام درہم برہم ہوجائے گا جو اس کے بعد ستاروں کے منتشر ہونے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

زمین کی اندرونی تہوں میں جو سمندروں کی نیچے کی تہہ کے بعد ہے بہت گرم لاوا ہے، قیامت کی تباہی میں سمندر کی اندرونی تہیں شق ہوجائیں گی اور سمندر سب اس لاوے تک پہنچ جائے گا اور جیسا کہ سورۃ التکویر میں تھا خود سمندروں میں آگ بھڑکنے لگے گی۔اس سب کے بعد قبریں کھلیں گی،اور مردے دوبارہ زندہ ہوکر حشر ونشر کے لیے اٹھیں گے ،تب اعمال کا حساب وکتاب ہوگا جو آگے کے فقرے میں بیان کیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۙ﴿۶﴾ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ﴿۷﴾ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ؕ﴿۸﴾ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۙ﴿۹﴾ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ﴿۱۰﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اے آدمی! کاہے نے تجھے دھوکے میں مبتلا کر دیا اپنے اس لطف وکرم والے پروردگار کے بارے میں جس نے تجھے خلق کیا تو تجھے سرتا پا درست بنایا، تیرے اعضا میں تناسب پیدا کیا اور جس طرح چاہا تیرے اجزا کو ملا کر تیری صورت بنائی۔ ہرگز نہیں بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) تم جزا وسزا کو جھوٹ سمجھتے ہو حالاں کہ تم پر محفوظ رکھنے والے مقرر ہیں عزت دار کاتب جو سب کچھ تم کرتے ہو، اسے جانتے ہیں''۔

یعنی بلا وجہ تو اس دھوکے میں پڑ گیا کہ جو کچھ اس کا فضل وانعام ہے، وہ سب تیرا حق ہے جو تجھے مل رہا ہے اور اس سے کوئی ذمہ داری تجھ پر عائد نہیں ہوتی، اس لیے تو نے اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے اس کی نافرمانی اور اس کے احکام سے سرتابی شروع کر دی اور اسی راستے پر آخر تک قائم رہا اس دھوکے کی کوئی وجہ نہ تھی مگر اصل یہ ہے کہ تم نے جزا وسزا والے دن کو مانا ہی نہیں۔ اسے غلط سمجھتے رہے، حالاں کہ اسی خالق نے جس نے سب نعمتیں عطا کیں، اپنی طرف سے معزز لکھنے والے تو تم پر مقرر کر دیے تھے جو تمہارے ہر کام کو لکھتے رہے تھے اور اسی کے مطابق اب جزا وسزا دی جائے گی۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۚ﴿۱۳﴾ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۖ﴿۱۴﴾ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ؕ﴿۱۶﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۙ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ؕ﴿۱۸﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ؕ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾

''یقیناً نیکوکار لوگ عیش وآرام میں ہوں گے اور یقیناً فاسق وفاجر دوزخ میں ہوں گے، وہ اس کی تپش کا سایہ کریں گے جزا وسزا والے دن میں اور تم کیا جانو جزا وسزا والا دن کیا چیز ہے۔ پھر (سنو کہ) جزا وسزا والا دن کیا چیز ہے؟ جس دن کوئی دوسرے کے کسی طرح کام نہ آسکے گا اور اختیار اس دن سب اللہ کے ہاتھ میں ہوگا''۔

شفاعت کرنے والے جو مؤمنین کی شفاعت کریں گے، وہ بھی اللہ کی اجازت سے اور اس کی مرضی کے ماتحت، خود اپنے اختیار سے وہاں کوئی فائدہ کسی کو نہیں پہنچا سکتا۔

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ

مکیّہ.....۳۶.....آیات

چونکہ پہلی ہی آیت ویل للمطففین ہے، اس لیے یہ نام ہوا۔

ناپ تول میں دھاندلی کر کے کمی زیادتی کرنے والوں کو سخت تنبیہ کی گئی ہے، اس ذیل میں پھر وہی روز جزا کا نقشہ ہے اور حساب آخرت پر توجہ دہانی ہے، پھر وہی اچھے اعمال اور برے اعمال کے صحیفوں کا ذکر ہے اور برے لوگوں کے انجام سے ان مؤمنین کا جنہیں آج مذاق میں اڑا کر توہین کی جارہی ہے اس دن خوش ہونا ہے کہ اب آج وہ قہقہے لگا رہے ہوں گے اور ان کی سزا سے خوش ہو رہے ہوں گے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝١ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝٢ وَاِذَا كَالُوْهُمْ
اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝٣ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝٤ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝٥
يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٦

''لعنت ہے دنڈی مارنے والوں پر جو لوگوں سے ناپ تولیں تو پورا پورا وصول کریں، اور جب خود ناپ یا تول کریں تو انہیں گھاٹا پہنچائیں، کیا انہیں یہ گمان نہیں کہ یہ زندہ کر کے لائے جائیں گے ایک بڑے دن میں جس دن سب کھڑے ہوں گے جہانوں کے پروردگار کے سامنے''۔

تطفیف یعنی ناپ تول میں دھوکا دے کر نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا کاروباری حلقے میں بہت رائج رہا ہے حالاں کہ وہ جرم عظیم ہے جس پر امم سابقہ میں بھی عذاب نازل ہوا ہے۔ یہ عرب میں بھی رائج تھا، اس جرم عظیم پر متنبہ کر کے لیے آخرت کو یاد دلایا جارہا ہے کہ وقتی نفع ہے جو اس ترکیب سے فروخت کرنے میں ہو جائے گا مگر اس کے نتیجے میں جو سزا ہے، اسے یاد رکھنا ضروری ہے۔ اگر اسے یاد رکھے تو اس جرم کا ارتکاب نہ کرے۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝٧ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝٨ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝٩
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝١٠ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝١١ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ

اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾

''ہرگز نہیں بداعمال لوگوں کے اعمال کی تحریر دائمی قید خانے کے رجسٹر میں ہے اور تم کیا جانو قید خانے کا رجسٹر کیا چیز ہے۔ وہ لکھی ہوئی کتاب ہے، لعنت ہے اس دن کو جھٹلانے والوں پر، جو جزا و سزا کے دن کو جھٹلاتے ہیں اور نہیں جھٹلاتا اسے مگر ہر ایک وہ ظلم وہ تعدی کرنے والا گناہگار ہے کہ جب ہماری آیتیں اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو پہلے زمانہ والوں کی کہانیاں ہیں''۔

سجین کی لفظ سے عام طور پر عرب ناواقف تھے۔ صرف ایک عربی شاعر نے اس لفظ کو شدید کے معنی میں استعمال کیا ہے علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قول لکھا ہے کہ وہ سجن سے مشتق ہے جس کے معنی قید خانہ کے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ چونکہ سجین تشدید کے ساتھ مبالغہ کا اظہار کرتا ہے جیسے تشریب ''بہت پینے والا'' اور ''سکیرّ یت نشہ میں رہنے والا'' اس لیے اس لفظ کے معنی میں یہاں دائمی قید کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ چونکہ عام طور پر لغوی معنی اس کے غیر واضح تھے، اس لیے اہل کتاب وغیرہ کے علماء نے اس کے معنی میں طرح طرح کی باتیں کیں۔ کعب الاخبار کی زبانی یہ ہے کہ کافر و فاجر کی روح کہ آسمان کی طرف لے جائیں گے تو آسمان اُس کے قبول کرنے انکار کر دے گا اور زمین کی طرف لے جائیں گے تو زمین بھی انکار کر دے گی۔ تب سات طبقے زمین کے طے کر کے اُس کے حصے میں جو ابلیس اور دوسرے شیطانوں کا مرکز ہے پہنچا کر رکھ دیا گیا ہے، بعض نے کہا ہے سجن دوزخ کا ایک کنواں ہے۔ جس کا منھ کھلا ہوا ہے، یہاں سب سے زیادہ واضح مفہوم وہی ہے جس کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ اُن کے لئے ہے جو جزاؤ سزا والے دن کو جھوٹ کہتے تھے۔ بعد میں بتایا گیا کہ اُسے جھوٹا وہی کہتے ہیں جو ظلم و ستم کے مرتکب ہیں تو وہ اپنی ظالمانہ روش پر برقرار رہنے کے لئے اُس کا انکار کرتے ہیں اور اس لئے ان آیات کو جن میں اُس کی اطلاع دی گئی ہے، پرانے لوگوں کی بیان کی ہوئی کہانی قرار دیتے ہیں۔

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۷﴾

''ہرگز نہیں، بلکہ زنگ آلود کر دیا ہے اُن کے دلوں کو اُن اعمال نے جو یہ کرتے رہے، ہرگز نہیں یہ لوگ اپنے پروردگار سے پردے میں رہیں گے، ہرگز نہیں یہ لوگ یقیناً دوزخ میں ڈالے جائیں گے پھر کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ جسے تم جھٹلاتے تھے۔

ہرگز نہیں یعنی روز قیامت کو افسانہ کہنا غلط ہے، پھر جیسے پہلے کہا گیا تھا کہ جھٹلاتے وہ ہیں جو ظلم و تعدّی اور گناہ کے مرتکب ہیں، اُسی کو اس انداز میں کہا جا رہا ہے کہ گناہوں نے جو وہ کر چکے ہیں، اُن کے دلوں پر زنگ کے غلاف چڑھا دیے ہیں یعنی اُن کے دل و دماغ اب شعور حق سے بالکل محروم ہو گئے ہیں جو گناہوں کے خوگر ہونے کا نتیجہ ہے، اس لئے حقیقتیں جو بیان ہوئی ہیں وہ اُنہیں اُلٹ کہتے ہی نہیں بلکہ بے شعوری سے سمجھتے بھی ایسا ہی ہیں۔

''یہ لوگ اپنے پروردگار سے پردے میں رہیں گے'' اس میں جو لوگ دیدار کے قائل ہیں، وہ تو بلا تکلّف یہ معنی کہہ دیتے ہیں کہ وہ دیدار الٰہی سے جو اہل ایمان کو ہوگا محروم رہیں گے مگر رویت الٰہی کے غیر ممکن ہونے کے پیش نظر اس کے معنی یہ ہیں کہ جن رحمتِ الٰہی کے جلووں سے اہل ایمان محفوظ و متمتّع ہو رہے ہوں گے، اُن سے یہ محروم رہیں گے جس کے لئے جناب امیر علیہ السلام کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ:- محرومون عن ثوابه و کرامته ''اُس کی طرف کے ثواب اور اعزاز سے محروم رہیں گے'' دوسرے لوگوں کے اقوال بھی اس کے موافق ہیں۔[1]

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾

''ہرگز نہیں یقیناً نیکوکاروں کے اعمال کی تحریر بلند افراد کے رجسٹر میں ہے اور تم کیا جانو کہ بلند افراد کا رجسٹر کیا چیز ہے؟ وہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے جس پر مقرّب فرشتوں کی گواہیاں ہیں''۔

قرآن کے انداز بیان سے ظاہر ہے کہ علیّین سجّین کے مقابل کی چیز ہے بلکہ وہ دائمی قیدیوں کا رجسٹر تھا تو یہ رجسٹر وہ ہے جو ہمیشہ کی نعمتوں سے سرفراز ہونے والے ہیں۔ اُن کے نیک اعمال وہ ہیں جن کے مقرّب فرشتے گواہ ہیں، یہ کاتبانِ اعمال بھی ہو سکتے ہیں جنہوں نے دنیا میں اُن کے اعمال حسنہ کو لکھا تھا اور دوسرے فرشتے بھی ہو سکتے ہیں جو اب اُس نامۂ عمل پر مطلع ہو رہے ہیں۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿۲۴﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾

''یقیناً نیکوکار لوگ نعمت و آرام میں ہیں، بلند مسندوں پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے اُن کے چہروں پر راحت و آرام کی شادابی ہوگی، اُنہیں مہر لگی ہوئی عمدہ شراب پلائی جا رہی ہوگی جس پر مشک کی مہر ہے اور یہ وہ ہے جس کی طرف ہماہمی کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کرنا چاہیے ہماہمی کرنے والوں کو اور اُس میں ملا ہوا ہوگا آب تسنیم یہ وہ ہمیشہ ہے جس سے مقرّب لوگ سیراب ہوں گے''۔

مشک کی مہر کے ظاہری معنی تو یہی ہیں کہ وہ شراب جن بوتلوں میں بند ہے، اُن پر مشک کی مہر لگی ہوئی ہے کہ ہاتھ میں لیتے ہی اُس کی خوشبو محسوس ہوتی ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ شراب جس پر مہر لگی ہوئی ہے وہ جب پی جائے گی تو بجائے بدبو کے جو دنیا کی شراب میں ہوتی ہے، مشک کی خوشبو محسوس ہوگی۔ اس کے پہلے سورۂ دہر میں ایک ایسے چشمے کا ذکر تھا جس میں کافور کی آمیزش ہوگی، وہاں اُس کا نام نہیں تھا اور پھر ایک چشمے کا ذکر تھا جس کا نام سلسبیل۔ اب اس چشمے کا ذکر جس کا نام تسنیم ہے جس کی آمیزش اس شراب میں ہوگی۔

---

[1] محجوبون یوم القیٰمة عن رحمة ربهم واحسانه و کرامتهعن الحسن وقتادة وقیل ممنوعون مرّة رحمته مدفون عن ثوابه غیر مقبولین ولا مرضیین عن ابی مسلم (مجمع البیان)

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

''بلاشبہہ جومجرم لوگ ہوں، وہ ان پر جوایمان لائے ہیں ہنستے تھے اور جب ان کی طرف سے گزرتے تھے توآنکھوں سے اُن کی طرف اشارہ کرتے تھے اور جب اپنے گھر والوں کی طرف واپس ہوتے تھے تو تفریح سے لطف اٹھاتے ہوئے واپس ہوتے تھے، اور جب اُنہیں دیکھتے تھے تو کہتے تھے یہ بھٹکے ہوئے لوگ ہیں، حالاں کہ وہ ان کے نگراں کے طور پر نہیں بھیجے گئے ہیں، لواب آج وہ مومن ہیں، جو کافروں پر ہنس رہے ہیں، اونچی مسندوں پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہیں کہ کیا کافروں کو کوئی ثواب ملا اُس کا جو وہ کرتے تھے''۔

''لطف اٹھاتے ہوئے واپس ہوتے تھے'' یعنی اس طعن وتشنیع اور آنکھوں کے اشاروں سے جواُن کا مذاق اُڑایا تھا اُس سے وہ ایسے لذّت اندوز ہوتے تھے کہ اپنے گھروں کو واپس ہونے تک اُنہیں اُس سے مزہ آتا رہتا تھا۔ آخر کے جملے کا مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ کرتے تھے، اُسے کارِ ثواب سمجھ کر کرتے تھے تو اب آج مومن دیکھ رہے ہیں کہ اُنہیں اُن کے طرزِ عمل پر بجائے ثواب کے کس طرح عذاب مل رہا ہے۔

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ

مکیّہ.....۲۵.....آیات

سورۂ انفطار کی طرح چونکہ پہلی آیت میں آسمان کے پھٹنے کا ذکر ہے، اس لئے یہ نام ہوا، چونکہ انشقاق اور انفطار دونوں تقریباً ہم معنی لفظیں ہیں جن کے معنی شگافتہ ہونے کے ہیں۔

ان سوروں کا عموماً جو انداز ہے، اس سورے کا بھی وہی ہے۔ قیامت کی کیفیت، خدا کی قدرت اور مالکیت سے اس کا ثبوت کہ یہ تمام چیزیں اس کے اقتدار کے احاطہ میں ہیں لہٰذا وہ جو چاہے کرے۔ آسمان اور زمین دونوں اُس کے تابع فرمان ہیں۔

پھر دو قسم کے لوگوں کا ذکر، ایک جن کے نامۂ عمل اُن کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، دوسرے وہ جو بداعمال ہیں، یہاں اُن کے لئے بائیں ہاتھ کے بجائے پس پشت کہا گیا ہے۔ اس کی تشریح اس آیت کے ذیل میں بعد کو ہوگی۔ یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے۔ اس لئے کہ وہ آج

کے دن کو بھولے رہے اور ممکن تصوّر نہ کیا کہ ہمیں خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ انقلابات زمانہ کی رفتار دکھلا کر دنیوی زندگی سے پلٹ کر آخرت کی منزل تک پہنچنے کو ذہن نشین کیا گیا ہے اور پھر آخر میں کفّار کے دردناک عذاب کی خبر کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کے حسن انجام کی خوش خبری دی گئی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ﴿۱﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ﴿۲﴾ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ﴿۳﴾ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۙ﴿۴﴾ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۙ﴿۵﴾

''وہ وقت جب آسمان شِگافتہ ہوجائے گا اور وہ اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اسے یہ کرنا ہی چاہیے اور جب زمین کو کھینچ کر بڑھا دیا جائے گا اور جو کچھ اُس کے اندر ہے وہ اُسے باہر ڈال دے گی اور خالی ہوجائے گی اور اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل کرے گی اور اُسے کرنا ہی چاہیے''۔

اذنت لربّها وحقّت کا فقرہ جو دو ۲ بار ہے، یہ از قبیل تکرار اس لئے نہیں ہے کہ وہ پہلا جملہ آسمان کے لئے تھا اور یہ جملہ زمین کے لئے ہے اور یہ ایک طرح ان چیزوں میں ان تبدیلیوں کے پیدا ہونے کو ضروری بتانا ہے کہ وہ تو جو اُن کا خالق ہے وہ جب اُن میں یہ تبدیلیاں پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ سرتابی کہاں کرسکتی ہیں۔ [1]

جو کچھ اندر ہے، اُسے زمین باہر لے آئے گی یعنی مردے جو اُس کے اندر دفن تھے وہ سب اب زندہ ہوکر اوپر آجائیں گے۔ ''زمین کو کھینچ کر بڑھا دیا جائے گا'' یعنی سمندر سب ختم ہوجائیں گے اور پہاڑ ہوا میں منتشر ہوجائیں گے زمین سپاٹ میدان کی شکل میں ہوجائے گی تو لازماً پہلے کی بہ نسبت اُس کی وسعت میں بہت اضافہ ہوجائے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۚ﴿۶﴾

''اے انسان! تو زبردستی کھنچا چلا جارہا ہے اپنے پروردگار کی طرف لازماً اس کے یہاں حاضر ہونے والا ہے''۔

جب یہ ہوگا اور جب یہ ہوگا، تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ علم نحو کی اصطلاح میں ان شرطوں کی جزا اور منطق کی زبان میں اس مقدّم کا تالی کیا ہے؟ وہ گزشتہ آیات کے بعد الفاظ قرآن میں موجود نہیں ہے اس کا اب اس کے بعد کے جملے سے پتہ چلتا ہے، یعنی اُس دن تو اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہوگا.....اس آیت میں کہا جارہا ہے کہ یکے بعد دیگرے جو حالات تیرے پیدا ہوتے ہیں پیدائش کے بعد بچپنے کا دور اور بچپن کے بعد جوانی اور جوانی کے بعد بڑھاپا..... یہ تمام تغیّرات درحقیقت ایک سرگرم رفتار ہے جس سے تو بجبوری اُس کی بارگاہ میں حاضر ہونے والا ہے جس کا تصوّر نہیں رکھتا اور سمجھتا ہے کہ یہی بس دنیا ہے اور اس کے آگے کچھ نہیں۔

---

[1] ۔ حق لها ان تاذن بالانقیاد لامر ربّها الذی خلقها و تطیع لهه (مجمع البیان)

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ﴿۷﴾ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا ۙ﴿۸﴾ وَّیَنْقَلِبُ اِلٰۤی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ﴿۹﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا ؕ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ﴿۱۳﴾ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ ۛؕ﴿۱۴﴾ بَلٰۤی ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِیْرًا ؕ﴿۱۵﴾

''تو جس کا نامۂ عمل اُس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو بہت جلد آسانی کے ساتھ اُس کا حساب ہو جائے گا اور وہ اپنے والوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا اور جس کا نامۂ عمل اُس کے پس پشت سے دیا جائے گا تو وہ پکارے گا ہائے تباہی اور وہ آتشِ جہنّم میں داخل کر دیا جائے گا یہ اپنے والوں میں پہلے بڑا خوش تھا سمجھتا تھا کہ وہ کبھی پلٹے گا نہیں، کیوں نہیں، یقیناً اُس کا رب اُسے خوب دیکھ رہا تھا''۔

آسانی سے حساب ہو جائے گا یعنی بس اُس نامۂ عمل کی سرسری جانچ کر لی جائے گی، اُس میں قابل گرفت چیزیں ہوں گی ہی نہیں تا کہ اُن کے متعلّق پوچھ گچھ کی ضرورت ہو، اور اُسے جواب دہی کرنا پڑے لیکن جس کا نامۂ عمل اُس کے پس پشت سے دیا جائے گا.....اب یا تو چونکہ اسے یقین ہے کہ اُسے نامۂ عمل بائیں ہاتھ میں ملے گا اس لئے کہ اُس کے اعمال اسی قابل ہیں تو وہ اپنا ہاتھ بڑھائے گا ہی نہیں بلکہ اپنا ہاتھ پیٹھ کے پیچھے کر لے گا لیکن اس کی وجہ سے بچ نہیں جائے گا بلکہ پس پشت ہی اس کے ہاتھ میں وہ نامۂ اعمال دیا جائے گا اور یا یہ کہ اُس کا حشر ہی اس طرح ہوگا کہ وہ پشت کی طرف مڑا ہوا ہوگا اور بعض کا خیال ہے کہ اُس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں گے اور اس طرح بایاں ہاتھ پشت کی طرف ہوگا مگر یہ ہاتھوں کا بندھنا یا طوق وسلاسل کا پہننا تو حساب کے بعد کی باتیں ہیں.....بظاہر پہلی ہی بات درست معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے اعمال سے مایوسی کی بنا پر اپنا ہاتھ بڑھائے گا ہی نہیں بلکہ پیچھے کی طرف چھپالے گا اب نامۂ اعمال کو دیکھتے ہی وہ چلّا اٹھے گا کہ ہائے تباہی و بربادی.....کہا جا رہا ہے کہ اب یہ ہائے واویلا کاہے کی ہے۔ وہ تو دنیا میں بڑا خوش تھا اور سمجھتا تھا کہ کبھی بارگاہ ربّ میں حاضری ہوگی ہی نہیں، اور پروردگار اُس کے ایک ایک لمحہ سے واقف تھا تو ناممکن تھا کہ اُسے اُن اعمال کی پاداش نہ ملے۔

اپنے والوں کے یہاں سے مراد وہ آخرت میں جو اُسے اللہ کی طرف سے شریک حیات بننے کے لئے اور خدمات کے واسطے حور وغلماں ملے ہیں وہ بھی ہو سکتے اور وہ عزیز واقارب بھی جو اُس کی طرح نجات کے مستحق ہوں.....باقی تمام اہل ایمان جو اہل جنّت ہیں وہ بھی ہو سکتے ہیں۔

فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ﴿۱۶﴾ وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ﴿۱۷﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ﴿۱۸﴾ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ؕ﴿۱۹﴾ فَمَا لَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۲۰﴾ وَاِذَا قُرِئَ عَلَیْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا یَسْجُدُوْنَ ۩ ؕ﴿۲۱﴾ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُكَذِّبُوْنَ ۪﴿۲۲﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُوْعُوْنَ ۖ﴿۲۳﴾

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۴﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾

''تو قسم ہے شفق کی اور رات کی جب وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ تھوڑا ہو جاتا ہے کہ تم یونہی ایک ایک منزل طے کرو گے تو اُنہیں کیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے اور جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ سربسجود نہیں ہوتے بلکہ جو کافر ہیں وہ جھٹلاتے ہیں حالاں کہ جو کچھ وہ بھر کے محفوظ کر رہے ہیں اللہ اُسے خوب جانتا ہے تو اُنہیں دردناک عذاب کی خوش خبری دیدیجئے مگر جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے، اُن کے واسطے اجر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا''۔

یعنی ان کا خیال کہ وہ کبھی ملیں گے نہیں بالکل غلط ہے، ایسا نہیں ہے؟ جن چیزوں کی قسم کھائی جارہی ہے ان تغیرات جس طرح مشاہدہ میں ہیں اور وہ یکے بعد دیگرے آرہے ہیں۔ اسی طرح یہ اپنی تمام منزلیں زندگی کی طے کر کے بہرحال اُس آخری نقطہ کی طرف رہ سپار ہیں جو آخرت کہلاتی ہے تو یہ اُسے مانتے کیوں نہیں اور قرآن جو ان حقیقتوں کو پیش کرتا ہے، اُس کے سامنے سر نہیں جھکاتے۔

یہاں چونکہ سجدہ نہ کرنے کی مذمت ہے اس لئے آیت میں لایسجدون کے لفظ سے سجدہ کا حکم ہے لیکن فقہ امامیہ کے رو سے وہ واجب نہیں ہے.....واجب سجدے چار ہیں جن میں یہ جگہ داخل نہیں ہے۔

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ

مکیّہ.....۲۲.....آیات

پہلی ہی آیت میں چونکہ ذات البروج کا لفظ ہے، اس لئے اس سورے کا یہ نام ہوا۔

اس سورے کے شروع میں اہل حق کی سابق زمانہ کی ایک جماعت کا ذکر ہے جنہیں حق پرستی کے جرم میں آگ سے بھرے ہوئے گڑھے میں زندہ ڈال کر جلا دیا گیا۔ اُن گرانے والوں کا جو انجام ہوا، وہی ان لوگوں کا ہوگا جو اسلام لانے کے جرم میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والوں کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچا رہے ہیں۔ اس ذیل میں اہل ایمان کو صبر و ثبات کی تلقین ہے کہ جیسے اس جماعت نے آگ کے گڑھے میں گر کر جان جانے کو گوارا کر لیا مگر حق کے راستے سے منحرف نہیں ہوئے، ویسے ہی تم سب سختیاں اٹھا لو مگر حق کے جادے سے منحرف نہ ہو۔ نتیجہ میں وہ تمہیں ہمیشہ والی زندگی میں اجر عطا کرے گا اور اُنہیں جو تمہاری جان لے رہے ہیں ابدی ہلاکت میں مبتلا کر کے عتاب ابدی کا مستوجب گردانے گا اور نہ ختم ہونے والی سزا دے گا.....اُنہیں عاد و ثمود وغیرہ کو یاد کرنا چاہیے جو کیسی طاقتور قومیں تھیں لیکن جب اُس کی طرف کا اشارہ ہو گیا تو وہ سب تباہ برباد ہو گئے۔ آخری جملوں میں قرآن کی حقّانیت پر زور دیا گیا ہے کہ اس کی ہر بات لوح محفوظ کے مطابق ہے جو کسی کے

جھٹلانے سے مٹ نہیں سکتی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝١ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝٢ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝٣

''قسم ہے قلعوں والے آسمان کی اور وعدہ کیے ہوئے دن کی اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی''۔

یہ قسمیں اُس واقعہ سے متعلق ہیں جو ابھی بیان ہوگا۔ اصل آیت میں جو بُروج کا لفظ ہے، اُسے قدیم زمانہ میں اُس وقت کی ہیئت کے لحاظ سے اُن بارہ ۱۲ برجوں کے معنی میں لیا جاتا تھا جس میں سیّاروں کی گردش ہوتی تھی اب اُن سے مراد عالم بالا کے بڑے بڑے اجسام واجرام ثوابت وسیّارات سمجھے جاتے ہیں جس کی تائید میں بھی قدیم مفسّرین کے اقوال موجود ہیں۔ یوم موعود سے بالکل ظاہر ہے کہ قیامت کا دن مراد ہے اور پھر سے ذہن کو اُس جزاؤ سزا کی طرف منتقل کیا گیا ہے جو مظلوم وظالم کو ملنے والی ہے اور شاہد سے مراد آخرت کی دیکھنے والی تمام نگاہیں بھی ہوسکتی ہیں، دنیا والے مظالم کو دیکھنے والے نوع انسانی کے افراد بھی اور پہلی صورت میں مشہود آخرت کے مناظر ہوتے ہیں اور دوسری صورت میں موجودہ مظالم کا مشاہدہ کرنے والے۔ اس کے علاوہ شاہد ومشہود کے لفظ میں اتنے قول ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ متشابہات میں داخل ہے جن کا متعیّن مفہوم سمجھنا مشکل ہے مگر اُن میں سے اکثر اس سلسلۂ بیان سے بالکل غیر مرتبط ہیں اس لئے ان الفاظ کا اُن پر محمول کرنا مشکل ہے۔ اگرچہ بعض ان میں سے معصومین علیہم السلام سے بھی مروی ہیں مگر یہ احادیث عموماً مرسلات کے قبیل سے ہوتے ہیں لہٰذا جب تک وہ بالکل الفاظ قرآنی پر منطبق نہ ہوں، اُن پر اعتماد کرنا مشکل ہے۔ بہرحال ایک اُن میں سے یہ ہے کہ شاہد روز جمعہ ہے اور مشہود روز عرفہ ہے یعنی ۹ ذی الحجہ ہے۔ یہ ابن عباسؓ اور قتادہ کا قول ہے اور اس کی روایت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی طرف نسبت دے کر بھی ہوئی ہے اور بعض نے اس خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی بھی نقل کیا ہے اور روز جمعہ کو شاہد اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ تمام لوگوں کے اعمال کی جو اُس میں عمل خیر کریں گواہی دے گا اور روز عرفہ کو مشہود کہا گیا ہے اس لئے کہ اس میں تمام اطراف کے لوگ حج کے سلسلہ میں حاضر ہوتے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ شاہد روز عید ہے، ۱۰ ذی الحج اور مشہود عرفہ کا دن ہے۔ تیسری روایت میں ایک شخص کا بیان ہے کہ میں مسجد میں آیا۔ دیکھا ایک صاحب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احادیث بیان کررہے ہیں۔ میں نے ان سے شاہد ومشہود کے معنی پوچھے، انہوں نے کہا شاہد روز جمعہ ہے اور مشہود روز عرفہ آگے بڑھا تو دیکھا دوسرے صاحب احادیث بیان کررہے ہیں۔ میں نے اُن سے یہ سوال کیا تو اُنہوں نے شاہد روز جمعہ ہے اور مشہود روز قربانی ہے۔ اور آگے بڑھا تو دیکھا ایک صاحبزادے احادیث بیان کررہے ہیں جن کا چہرہ کندن کا ایسا چمکدار ہے میں نے ان سے وہی سوال کیا تو اُنہوں نے کہا شاہد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور مشہود روز قیامت ہے حضرت کے لئے خود خالق کریم کا ارشاد ہے کہ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا۔ (احزاب۔ ۴۵) اور قیامت کے لئے قرآن میں ہے: ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ. (ہود۔ ۱۰۳) یہ وہ دن ہوگا جس کے لئے تمام انسان جمع ہوں گے اور یہ روز مشہود ہوگا سب اُس کا مشاہدہ کریں گے۔

راوی کا بیان ہے کہ میں ان شخصیتوں کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا پہلے حضرت عبداللہ بن عباسؓ تھے اور دوسرے عبداللہ بن عمر تھے اور تیسرے حضرت امام حسن بن علیؑ تھے۔ ایسے ہی اور روایات واقوال ہیں۔ ان میں سے یہ امام حسنؑ کی روایت سیاق آیت قرآن سے

اس لئے زیادہ مطابق ہے کہ یہاں بھی الیوم الموعود کے بعد جو مشہود آیا ہے اُس سے قیامت کا مراد ہونا بالکل درست معلوم ہوتا ہے اور اُس کا مشاہدہ کرنے والے جتنے ہوں گے ان کی فرد اکمل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات گرامی ہے لہٰذا امام حسنؑ نے دوسری قرآنی آیت کی شہادت پیش کرتے ہوئے جو آپ کو شاہد بتایا وہ بھی بالکل صحیح ہے۔ آسمان کی عظمت کی قسم کھا کر اُس کے خالق کے عظمت واقتدار مالکانہ کی طرف متوجہ کیا گیا کہ ظالم لوگ اُس کی گرفت سے کہاں نکل سکتے ہیں اور روز قیامت کی قسم کھا کر اُس کی طرف کی سزا کا ظالموں کو تصوّر پیدا کیا گیا ہے کہ تم اُس کی سزا سے نکل کر کہاں جا سکتے ہو۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۙ﴿۵﴾ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۙ﴿۶﴾ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ؕ﴿۷﴾ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۸﴾ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ؕ﴿۹﴾

''جان سے مارے جائیں وہ گڑھا کھودنے والے اُس بھڑکتی ہوئی آگ کا جس میں بہت ایندھن تھا، جب وہ اُس کے اردگرد بیٹھے تھے اور جو کچھ ایمان والوں کے ساتھ وہ کر رہے تھے، اُس کا تماشا دیکھ رہے تھے اور اُنہیں اُن سے عداوت کی کوئی وجہ نہیں تھی سوا اس کے کہ وہ ایمان لائے تھے اللہ پر جو عزّت وغلبہ والا اور ہر تعریف کا حق دار ہے جس کے لئے سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہر چیز پر حاضر وناظر ہے''۔

یہ ایک قدیم واقعہ کا حوالہ ہے جو اسلامی روایات میں بھی مختلف صورتوں سے آیا ہے اور مغربی محققین نے قدیم کتبوں اور تحریروں سے بھی اُس کے کچھ تفصیلات محفوظ کیے ہیں کہ سرزمین یمن کے عیسائیت اختیار کرنے کے جرم میں یہودیوں نے یہ ظلم کیا تھا، کہا جاتا ہے کہ نجران میں اب تک وہ جگہ لوگوں کو معلوم ہے جہاں یہ گڑھا تھا جسے قرآن میں الاخدود کہا گیا ہے۔

یہاں المؤمنین جنہیں کہا گیا ہے، وہ عیسائی ہی تھے جن کے لئے اُس وقت دینِ حق یہی تھا اور اس کے مقابلہ میں وہ تشدّد کرنے والے یہودی کافر کی حیثیت رکھتے تھے۔

اُس پر قرآن نے جیسے مرثیہ پڑھا ہے، اس طرح دین کے معاملے میں تشدّد کی مذمت کی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ؕ﴿۱۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ؕ﴿۱۱﴾

''یقیناً جنہوں نے باایمان مردوں اور باایمان عورتوں پر مظالم کیے، پھر توبہ نہیں کی، ان کے لیے دوزخ کی سزا ہے اور اُن کے لیے آگ میں جلنے کا عذاب ہے، یقیناً جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک اعمال کیے، اُن کے لئے

بہشت میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں''۔

وہ گزشتہ واقعات کا بیان تھا جو ہو چکا، لیکن چونکہ اس کا بیان کوئی تاریخی واقعہ کے بیان کے طور پر صرف وسعت معلومات کے لئے نہیں تھا بلکہ اُس سے موجودہ دَور کے ظالموں کو جو اہل ایمان پر مظالم ڈھا رہے ہیں تنبیہ مقصود ہے لہٰذا اب بطور کلیّہ بر بنائے ایمان مؤمنین اور مؤمنات پر مظالم کی سزا کا اعلان ہے اور چونکہ یہ ظلم ڈھانے والے کافر ہوں گے لہٰذا اب یہ کہا گیا کہ اس کے بعد اگر وہ توبہ نہ کریں، اب اس توبہ کا مطلب دین حق کا اختیار کر لینا ہے جس کے لئے اصول یہ ہے کہ الاسلام یجب ما قبلہ اسلام قبول کر لینا پہلے والی باتوں کا نظر انداز کر دیتا ہے، یہاں ان مظالم کا ذکر نہیں ہے جو اسلام کا ادّعا کرنے والے اہل حق کے ساتھ کریں، آخر میں اس پر اشارہ کیا گیا ہے کہ اس دنیا کی کامیابی اور یہ سمجھ لینا کہ ہم نے اپنی مخالف جماعت کے اپنے راستے سے ہٹا دیا کوئی کامیابی نہیں ہے، اصل کامیابی وہی آخرت کی ہے جو اہل بہشت سے مخصوص ہے۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ﴿۱۳﴾ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ﴿۱۴﴾ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ﴿۱۵﴾ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۶﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ﴿۱۸﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿۱۹﴾ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿۲۰﴾ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾

''یقیناً تمہارے پروردگار کی گرفت بہت سخت ہے، وہی پہلے بھی پیدا کرتا ہے اور دوبارہ بھی پیدا کرتا ہے اور وہ بڑا بخشنے والا ہے، بڑی محبّت والا، عرش کا مالک، بزرگ مرتبہ، جو کچھ چاہے، پورے طور پر کر ڈالنے والا، کیا تمہیں پہنچا ہے تذکرہ اُن فوجوں کا فرعون اور قبیلہ ثمود کے لشکر مگر وہ جو کافر ہیں جھٹلانے میں پڑے ہوئے ہیں حالاں کہ اُن کے پس پشت سے اُن کے گھیرا ڈالے ہوئے ہے بلکہ یہ بزرگ مرتبہ قرآن ہے جو لوح محفوظ میں ثبت ہے''۔

فرعون اور ثمود کے ساتھ فوجیں کہہ کر صرف اُن کی مادی طاقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اپنے زعم میں اُنہیں حاصل تھیں اور بس انہیں یاد دلا کر جنہیں خبریں اُن کے انجام کی پہنچ چکی ہوں، اُن کے لئے لمحۂ فکریہ پیدا کر دیا کہ جو اس وقت اپنی طاقت کا گھمنڈ رکھتے ہیں اُن کے غرور و طاقتوری کو شکست ہو اور جنہیں پورے واقعات اُن کے نہ معلوم ہوں اُنہیں ذوق جستجو پیدا ہو اور وہ معلوم کر کے اُس سے عبرت حاصل کریں۔

چونکہ جنود یعنی افواج کہہ کر اُن کے طاقت و اقتدار کے زعم کا اظہار کیا گیا تھا، اس لئے اس کے مقابلہ میں خالق کے احاطہ و اقتدار کی وسعت کو بیان کیا گیا ہے کہ جو کچھ وہ کرنا چاہے، اُسے وہ ناکام نہیں بنا سکتے، ذرہ بھر اُس کے احاطہ و اقتدار سے وہ نکل سکتے نہیں اور یہ قرآن اُس کی طرف کی لوح محفوظ میں ثبت ہے لہٰذا اس کی مندرجہ کسی بات اور اُس کی دی ہوئی کسی خبر کو وہ کتنا ہی جھٹلائیں مگر جو کچھ وہ اعلان کر رہا ہے، وہ سب ہو کر رہے گا، اس کا کوئی جزء ٹل نہیں سکتا۔

سُوْرَةُ الطَّارِقِ

مکیّہ.....۱۷.....آیات

چونکہ پہلی ہی آیت میں ''الطارق'' کی قسم ہے یعنی رات کو نمودار ہونے والے تارے، اس لئے یہ نام ہوا۔ مکّہ میں نازل ہونے والے دوسرے تمام سوروں کی طرح اس میں بھی نگاہ آسمان اور اس کے ستاروں کی طرف موڑی گئی ہے تا کہ پتہ چلے کہ جو اس تمام نظام کی نگہبانی کر رہا ہے وہ انسان کو نظر انداز نہیں کر سکتا، پھر انسان کو اُس کی ابتدائے خلقت کی یاد دلائی گئی ہے کہ اُسے غرور کبھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خود کچھ ہے اور پھر اُسی سے دوبارہ پیدا ہونے پر اُس کی قدرت کا اظہار کیا گیا ہے جو اس دَور کے سوروں کی امتیازی مہم ہے اور بتایا ہے کہ اُس قیامت میں اس کے چھپے ہوئے اعمال سب نمایاں ہوں گے اور وہاں کوئی اس کا مددگار نہیں ہوگا پھر قرآن کی سچائی پر زور دیا گیا ہے۔ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں مشرکین کہ سرگرمیوں کا اظہار کرتے ہوئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مومنین کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لاکھ تدبیریں کریں، خدا کی تدبیر کے مقابلہ میں ان کی کوئی تدبیر نہیں سکتی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝۲ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝۳ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝۴

''قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی اور تم کیا جانو کہ رات کو نمودار ہونیوالا کیا ہے؟ وہ چمکتا ہوا تارا ہوتا ہے، کوئی متنفّس نہیں مگر یہ کہ اُس پر کوئی نگہبان ہے''۔

اگر چہ الطارق کے لفظ اور انداز بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی خاص رات کو نمودار ہونے والی روشن چیز ہے جس کی قسم کھائی جا رہی ہے اس لیے بعض قدیم مفسّرین نے کہا ہے کہ وہ زحل ہے سبعہ سیّارہ میں سب سے اونچا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ثریا مراد ہے کہ عرب اُسے النّجم کہتے تھے اور بعض نے چاند کہا ہے مگر زیادہ قوت اسی کو ہے کہ اس سے یہاں بطور جنس آسمان کے تارے مراد ہیں جو رات کو نظر آتے ہیں اور اُن کی قسم کھائی گئی ہے کہ خالق اس پورے عالم بالا کے نظام کا نگہبان ہے تو کسی انسان کو اپنے کو مطلق العنان نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اُس کی طرف سے اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝۵ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝۶ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ

وَالتَّرَآئِبِ ۝ ۷ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝ ۸ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝ ۹ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝ ۱۰

''تو انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کاہے سے پیدا کیا گیا ہے؟ وہ پیدا کیا گیا ہے ایک اچھل کر نکلنے والے پانی سے جو ریڑھ اور سینے کی ہڈیوں کے بیچ میں سے نکلتا ہے، وہ اس کے پلٹا کے لانے پر بھی قادر ہے اُس دن جب تمام چھپی ہوئی باتوں کا بھی جائزہ لیا جائے گا تو اس آدمی کے پاس نہ خود کوئی طاقت ہوگی، یہ اس کا کوئی مددگار ہوگا''۔

جسم کے اسی حصّے سے جو پشت اور سینے کے درمیان ہے، مادۂ تولید برآمد ہوتا ہے، اس کا بنیادی ربط دماغ سے ضرور ہے لیکن براہ راست یہ دماغ سے خارج نہیں ہوتا اس لئے محاورے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ یہ اولاد اُس باپ کے صلب سے ہے اور صلب کے معنی پشت کے ہیں، جس خدا نے ایسے پیچیدہ جسم کے نظام کو پہلی دفعہ میں پیدا کیا، وہی دوبارہ بعد میں موت اُسے پلٹا بھی سکتا ہے، اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اُس دن تمام چھپی ہوئی باتیں سامنے آجائیں گی اور اُن کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہ پوشیدہ اعمال بھی ہیں اور دل کی نیتیں بھی ہیں جو دنیا میں لوگوں کو معلوم ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ آخرت میں وہ سب دیکھ لی جائیں گی اور اُن کے مطابق جزاؤ سزا دی جائے گی۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝ ۱۱ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝ ۱۲ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ ۱۳ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝ ۱۴ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝ ۱۵ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝ ۱۶ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ ۱۷

''قسم ہے آسمان کی جو بارش والا ہے اور زمین کی جو (نباتات کے ذریعہ سے) شگافتہ ہونے والی ہے کہ یہ فیصلہ کن بات ہے اور وہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ یہ (کافر لوگ) اپنی چالیں چل رہے ہیں اور میں اپنی چال چل رہا ہوں تو چھوڑ دو ان کافروں کو تھوڑا سا (پھر دیکھا جائے گا)''۔

چونکہ روزی کا انحصار آسمان کی بارش اور زمین کی پیداوار پر ہے جس کے لئے پہلے بھی آچکا ہے شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ ۲۶ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا. (عبس۔ ۲۶ تا ۲۸) ہم نے زمین کو شگافتہ کیا اور اس میں اناج اور انگور اگائیں گے اس لئے آسمان اور زمین کی قسم میں اُسے ذات الرجع کہا گیا اور رجع کے معنی محاورۂ عرب میں بارش کے ہوتے ہیں اور زمین کی صفت شگافتہ ہونے والی بتائی کہ اُس کی سطح کو پھاڑ کر نباتات برآمد ہوتے ہیں۔

یہ اپنی دوبارہ زندگی کا ملنا اور جزاؤ سزا کا ہونا فیصلہ کن بات ہے جو ٹل نہیں سکتی، پھر کافروں کی سرگرمیوں، ریشہ دوانیوں اور ترکیبوں کا حوالہ دیتے ہوئے جو وہ رسول خدا ﷺ کے خلاف کر رہے ہیں، رسول ﷺ کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ تھوڑے دن انہیں جو کر رہا ہیں کرنے دیجئے پھر ہم بھی انہیں موقع دے رہے ہیں جسے یہ اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں، وہ ہماری ان کے ساتھ چال ہے کہ پھر ان کو ایک دم تباہ و برباد کر دیا جائے اور پھر آخرت کے عذاب میں رکھا جائے جو ان کا آخری انجام ہے۔

سُوْرَةُ الْاَعْلٰی

مکیّہ.....۱۹.....آیات

پہلی آیت میں رب الاعلیٰ کی تسبیح کا حکم ہوا ہے اس لئے الاعلیٰ اس کا نام ہوا۔

شروع میں رب کے وصف کے ساتھ اُس کی تسبیح کا حکم دیتے ہوئے نظام تخلیق کو یاد دلا کر اس کی طرف کی ہدایت کا ذکر ہوا ہے جس کے ساتھ جزاؤ سزا کا ہونا ضروری ہے اور بہار و خزاں کے مشاہدات پر توجہ دلائی گئی ہے اس طرح ان چند جملوں میں مبدأ اور معاد دونوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ جو آپ پر وحی آ رہی ہے اُس کے لئے یہ اندیشہ نہ کیجئے کہ آپ اسے کہیں بھول نہ جائیں اس کے ہم ضامن ہیں کہ آپ کو ایسا پڑھائیں گے کہ آپ بھولیں نہیں۔ اس کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو مشرکین کے رویّہ اور آپ کی دعوت کے قبول نہ کرنے سے صدمہ ہوتا تھا، اس کے لئے کہا گیا ہے کہ آپ کا کام ہدایت کرنا ہے یعنی صحیح باتوں کو پہنچا دینا۔ اب لوگ مانتے ہیں یا نہیں اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے، جس میں صلاحیت ہوگی اور نفس میں اُس کے طہارت ہوگی وہ خود مان لے گا اور نتیجہ میں ہمیشہ کی کامیابی و کامرانی سے دوچار ہوگا یہ لوگ دنیاوی زندگی کو سب کچھ سمجھ رہے ہیں حالاں کہ آخرت مقدّم ہے اور وہی مستقل اور پائیدار ہے۔ یہ آج ہی نہیں بلکہ پہلے کتب سماوی میں بھی کہا جاتا رہا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ﴿۱﴾ الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۪ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۪ۙ﴿۳﴾ وَالَّذِیْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۪ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ؕ﴿۵﴾

''تسبیح کیجئے اپنے پروردگار کے بلند و برتر نام کی جس نے پیدا کیا تو بالکل ٹھیک توازن قائم کیا، اور جس نے تقدیر مقرر کی اور صحیح راستے کی طرف ہدایت کی اور جس نے نباتات برآمد کئے، پھر اُنہیں خشک کر کے سیاہ بنا دیا''۔

تسبیح کے معنی نقائص سے بری سمجھنے اور اس کا اظہار کرنے کے ہیں اور جتنے نقائص ہیں وہ سب اُس کی بلندی ذات کے خلاف ہیں اس لئے تسبیح کے حکم کے ساتھ رب کے اعلیٰ ہونے کی صفت کا ذکر کیا۔

اس کی ذات سے ہر قسم کے نقص کا دور سمجھنا توحید ہے اور اُس کے افعال سے ہر قسم کے ظلم و نقص کو دور سمجھنا عدل ہے جو ہماری جماعت امامیہ کا امتیازی نشان ہے۔ کائنات میں ہر صورت سے توازن کا ہونا اس پیدا کرنے والے کے علم و حکمت کی دلیل ہے۔ ہر شے کی اُس نے تقدیر مقرّر کی، کب پیدا ہوگی کتنے دن رہے گی، کیا خاصیتیں اُس سے ظہور میں آئیں گی اور کب وہ ختم ہو جائے گی اور اُس کی ہدایت کی یعنی اُسے

درجہ بدرجہ اُس آخری نقطہ تک پہنچایا جو اُس کا انجام ہے، یہ ہدایت ہر چیز میں بالکل جبری طور پر ہے لیکن انسان کو ایک منزل میں آکر اُسی نے ایک حد تک اختیار کا مالک بنایا تو اُس کے لئے صحیح اور غلط راستوں میں امتیاز کے لئے اندرونی طور پر عقل کو قرار دیا اور جن باتوں کے لئے عقل کام نہیں کرتی اُن میں ہدایت تشریعی کا نظام قائم کیا جو انبیاؤ مرسلین کے ذریعہ سے ہوتا ہے، نباتات کا لہلہانہ اور پھر خشک ہو کر سیاہ ہو جانا اُس کا ثبوت ہے کہ یہ نوع انسانی بھی اس طرح باقی نہیں رہے گی بلکہ اس کے لئے بھی ایک اختتام کی منزل ہے جو موت ہے انسان کو اُسے یاد رکھنا چاہیے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ﴿۶﴾ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ﴿۷﴾ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۚ﴿۸﴾

''ہم آپ کو پڑھا دیں گے آپ بھولیں گے نہیں سوا اُس کے جو اللہ کو منظور ہو۔ اللہ جانتا ہے ظاہر کی بات کو بھی اور اُسے بھی جو چھپا ہوا ہو اور ہم آپ کو آسان شریعت کے پہنچانے میں آسانی پیدا کریں گے''۔

یوں تو خالق کا اُنہیں کتاب کی تبلیغ پر مامور کرنا جو غیر مکتوبی شکل میں نازل ہوا جس کے اکثر طولانی سورے بھی ایک ساتھ اترے ہیں ان کے حافظہ پر اُس کے اعتماد کی دلیل تھا تاہم اس دنیا کے اطمینان لئے جو اسباب ظاہری پر اعتماد رکھتی ہے آپ اسے محفوظ کرنے کی کوشش بھی فرماتے تھے کہ آپ اُس کے نازل ہوتے وقت خود اُسے بار بار پڑھتے جاتے تھے اور کبھی بلند آواز سے پڑھتے تھے تو قرآن میں دو تین جگہ صراحۃً اس کی ضمانت دی ہے کہ آپ اُسے بھولیں گے نہیں لہٰذا جو خدا پر ایمان رکھتا ہے، اُسے آپ کے حافظہ پر ایمان لازم ہے اور جس بات کو آپ نہ پہنچائیں، اُسے آپ کے حافظہ کا نقص نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ خدا کو اُس کا پہنچانا منظور ہی نہیں تھا جس شریعت سہلہ کی تبلیغ پر آپ مامور ہوئے ہیں، اُس کے پہنچانے میں مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا مگر خدا ان دشواریوں کو دور کرے گا اور آپ کو اس کی تبلیغ کے لئے آسانیاں بہم پہنچائے گا۔

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ؕ﴿۹﴾ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۙ﴿۱۰﴾ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۙ﴿۱۱﴾ الَّذِىْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۚ﴿۱۲﴾ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۱۳﴾

''تو آپ یاددہانی کرتے رہیے اگر اس یاددہانی سے فائدہ پہنچے، فائدہ اٹھائے گا جو اندیشہ آخرت رکھے اور اُس سے بچنا چاہے گا وہ بدبخت جسے اس بڑی آگ میں جانا ہے، پھر نہ اُس میں وہ مرے گا اور نہ جئے ہی گا''۔

ظاہر ہے کہ عمومی تبلیغ تو سب کے لئے ہے، ورنہ یہ پتہ ہی کہاں چلے گا کون فائدہ اٹھاتا ہے اور کون نہیں لیکن خصوصی کوشش تبلیغ کی اُن لوگوں کے پیچھے پڑ کر بے کار ہے جنہیں مبداؤ معاد سے کوئی سروکار نہیں ہے اور فکر انجام سے بالکل بے نیاز ہیں۔ اس لئے وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ اس میں موت بھی ایسی نہ آئے گی کہ وہ اس عذاب سے چھٹکارا دیدے اور زندگی بھی ایسی نہ ہوگی جس میں کیفِ زندگی ہو۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ﴿۱۴﴾ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ؕ﴿۱۵﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۖ﴿۱۶﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ؕ﴿۱۷﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۙ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿۱۹﴾

''دین اور دینا کی بہتری حاصل کی اُس نے کہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے پروردگار کے نام کو یاد کیا اس طرح کہ نماز پڑھی مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو مقدّم سمجھتے ہو حالاں کہ آخرت بہتر اور پائدار ہے یقیناً یہ پہلے کی کتابوں میں بھی بیان آتا رہا ہے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں''۔

پاکیزگی اختیار کرنے کا مطلب ہے کفر و شرک کی آلائش سے دامن کو بچا کر ایمان کی طہارت کو اختیار کرنا اور بُرے کردار کو چھوڑ کر اچھے کردار سے آراستہ ہونا اور دنیا کی بہتری جو فلاح کے معنی میں مضمر ہے وہ مال و دولت یا عیش و آرام نہیں ہے کہ یہ کافروں کو بھی حاصل ہوتا ہے بلکہ اکثر مومن سے زیادہ ملتا ہے بلکہ وہ سکون ضمیر بھی ہے جو راہ راست پر ہونے سے وابستہ ہے۔

سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ

مکیّہ.....۲۶.....آیات

پہلی آیت میں جو الغاشیۃ کا لفظ ہے، اُس پر یہ نام ہوا۔

صحرائی عربوں کے لئے جو سب سے زیادہ قریبی مشاہدات تھے ریگستان کے سفر میں سواری کے لئے اونٹ۔ اوپر نظر اٹھائی تو آسمان، اِدھر اُدھر دیکھا تو پہاڑ، نیچے نگاہ کی تو زمین، انہی مشاہدات کے ذریعہ سے مبدأ و معاد دونوں پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہی چیزوں کی طرف نظر کو متوجّہ کر کے مبدأ و معاد خدا کی حکمت اور آخرت کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

شروع ہی میں سب پر چھا جانے والی آفت یعنی قیامت میں ماننے اور نہ ماننے والے دو ۲ گروہوں کے انجام میں فرق، اور سورہ کے بالکل آخر میں حساب کے لفظ سے سے اُنہیں ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک میں شامل ہونے کے لئے اپنے ضمیر سے فیصلہ کرنے کی دعوت ہے اور درمیان میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تخاطب کر کے یہ کہا گیا ہے کہ آپ کا کام بس سمجھنا ہے، زبردستی منوانا آپ کا کام نہیں ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝١ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝٢ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝٣
تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝٤ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝٥ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ
ضَرِيْعٍ ۝٦ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝٧ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۝٨ لِّسَعْيِهَا
رَاضِيَةٌ ۝٩ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝١٠ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ۝١١ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝١٢

فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ﴿۱۳﴾ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ﴿۱۴﴾ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ﴿۱۵﴾ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ﴿۱۶﴾

''کیا تمہیں پہنچی ہے خبر اُس چھا جانے والی آفت کی۔ اُس دن کچھ چہرے تذلّل کا منظر پیش کرنے والے ہوں گے ، بہت کام کیے ہوئے ، بڑی محنت ومشقّت اٹھائے ہوئے ، وہ گرمی اٹھا رہے ہوں گے آگ کی ، پینے کو پی رہے ہوں گے بہت شدید گرم چشمے سے، اُن کے لئے کوئی غذا نہ ہوگی سوا خاردار گھاس ''ضریع'' کے جو نہ موٹا پا پیدا کر دیتی ہے اور نہ بھوک کی تکلیف کو دور کرتی ہے، کچھ چہرے تر وتازہ ہوں گے، اپنی کدوکاوش سے مطمئن، بہشت برین میں، جہاں کوئی لایعنی بات سننے میں نہ آئے گی، اُس میں ایک چشمہ رواں ہوگا، اُس میں اونچے اونچے تخت ہوں گے اور جام وساغر رکھے ہوں گے اور گاؤ تکیے ترتیب کے ساتھ لگے ہوئے اور طرح طرح کے عمدہ بچھونے بچھے ہوئے''۔

پہلے پژمردہ چہروں کے ساتھ عاملۃ ناصبۃ بہت کام کئے ہوئے ، بڑی محنت ومشقت اٹھائے ہوئے ، یہ لفظیں چہرے کی اُس کیفیت کے اظہار کے لئے ہیں جسے ہم ''تھکے ہارے ہوئے'' کے لفظوں سے بھی ادا کر سکتے ہیں اور یا یہ طنز ہے اُن لوگوں کی اُن سرگرمیوں پر جو وہ دنیا میں بخیال خود اپنی کامیابیوں کے لئے کرتے رہے تھے کہ وہ سب اکارت گئیں اور اُنہیں کوئی ثمرہ حاصل نہ ہوا۔ خصوصاً منافقین جنہوں نے اپنی پوری پوری عمریں بخیال خود عبادت میں بھی گزار دیں اور بڑے بڑے کارہائے خیر بھی انجام دیئے مگر چونکہ وہ سب بغیر ایمان صحیح کے تھے اس لئے وہ سب بے کار ہو گئے۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾ فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ﴿۲۳﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾

''تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں سیکھتے کہ یہ کیوں کر پیدا کئے گئے ہیں اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیوں کر بلند ہوا اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیوں کر قائم کئے گئے اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیوں کر بچھائی گئی ، تو بس آپ یاددہانی کئے جائیے ، آپ کا کام تو بس یاددہانی کرتے رہنا ہے، آپ اُنہیں زبردستی منوانے کے ذمہ دار نہیں ہیں، بے شک جو شخص روگردانی کرے گا اور کفر اختیار کرے گا تو اللہ اُسے سب سے بڑی سزا دے گا یقیناً اُن کا پلٹنا ہماری ہی طرف ہے پھر ہمارے ہی ذمّے ان کا حساب کتاب ہے''۔

یعنی یہ اَن دیکھی حقیقتوں کا انکار کرتے ہیں تو جو باتیں ان کے ماحول کے لحاظ سے ہر وقت ان کے سامنے ہیں، اونٹوں کو دیکھ لیں جن

پر ریگستانی راستے طے کرتے ہیں کہ ان کی خلقت ان کے سفروں کے لیے کتنی موزوں ومناسب رکھی گئی ہے جن کی کلیں آدمیوں کو دیکھنے میں کیسی ہی ٹیڑھی معلوم ہوں گی مگر اپنے مصرف کے لحاظ سے وہ بالکل صحیح ودرست اور ضروری ہیں، آسمان کے پورے نظام کو کیوں نہیں دیکھتے جوان کے بالائے سر ہیں پہاڑ جو ہر طرف نظر آتے ہیں کس طرح اپنی جگہوں پر جمائے گئے ہیں اور زمین کس طرح بچھائی گئی ہے، جس خالق کی قدرت سے یہ سب باتیں ہوگئیں، اُسی کی قدرت سے جب قیامت کی بات بیان کی جائے، بہشت اور دوزخ کے تذکرے کئے جائیں تو وہ کیوں مذاق اڑاتے ہیں اور جھٹلاتے ہیں۔ جب اُن کے اس رویّہ کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے تو وہ سزا کے حقدار نہیں ہیں تو اور کیا ہیں تو اُس سے وہ بچ نہیں سکتے اس لئے کہ اُنہیں پلٹ کر ہماری ہی طرف آنا ہے اور ان سے حساب لینا ہمارے ذمّے ہے جس کے نتیجہ میں یہ سزائے سخت کے مستوجب ہیں۔

سُوْرَةُ الْفَجْرِ

مکیّہ.....۳۰.....آیات

چونکہ فجر یعنی صبح کی قسم سے سورے کو شروع کیا گیا ہے اس لئے یہ نام ہوا۔

اس میں قسموں کے ذریعے روز وشب کے انقلابات اور ان کی نوعیتوں پر توجہ دلاتے ہوئے خالق کی قدرت دکھلاتے ہوئے گزشتہ اعمال کے انجام پر توجہ دلائی گئی ہے اور انسانوں کو اُن کے غلط رویّہ پر متنبّہ کرتے ہوئے آخرت کی کامیابی اور ناکامیابی کے دونوں رُخ پیش کئے گئے ہیں اور آخر میں نہ ماننے والوں کے تاثرات کیا ہوں گے؟ اسی پر سورہ کو ختم کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

وَالْفَجْرِ ۙ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۙ﴿۲﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۙ﴿۳﴾ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۚ﴿۴﴾ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ؕ﴿۵﴾

''قسم ہے صبح کی اور دس ۱۰ راتوں کی اور جفت اور طاق کی اور رات کی جب کہ وہ رخصت ہو رہی ہو کیا اس میں کوئی قسم صاحب عقل کے لئے (توجہ کے قابل) ہے''۔

زیادہ تر مفسّرین کا رجحان اور قدیم روایات تو یہی ہیں کہ صبح جس کی قسم کھائی ہے، کوئی خاص صبح ہے اور دس ۱۰ راتیں بھی کوئی خاص ہیں جفت اور طاق میں بھی کوئی خصوصیت ہے اور وہ رات بھی کوئی خاص ہے لیکن یہ روایتیں اتنی مختلف ہیں کہ وثوق کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ فجر کے ذیل میں کہا جاتا ہے کہ وہ ذی الحج کی پہلی تاریخ کی صبح ہے اور اسی سے جو عشرہ شروع ہوتا ہے جس کی انتہا عید قربان پر ہوتی ہے یہ دس ۱۰ راتیں ہیں اور کسی نے کہا کہ دس راتیں تو یہی ہیں لیکن فجر ان دونوں کی آخری صبح یعنی عید قربان کی صبح ہے، کسی نے کہا دس راتیں ماہ رمضان

کی آخری راتیں ہیں، شفع اور وتر میں کہا جاتا ہے کہ نمازیں ہیں جن میں کوئی جفت ہے اور کوئی طاق، کسی نے کہا شفع آدمؑ اور حوّا ہیں اور وتر تنہا آدمؑ ہیں، کسی نے کہا جفت مخلوق کے صفات ہیں جن میں ہر ایک دوسرے مقابل ہے مثلاً علم و جہل، عزّت و ذلّت، وجود و عدم اور قدرت و عاجزی وغیرہ اور وتر اللہ کی صفت ہے کہ اس کے مثل و مانند کوئی نہیں کسی نے کہا کہ شفع صفا اور مروہ ہیں اور وتر خانۂ کعبہ ہے.....اور انہی کے ساتھ یہ روایت ہمارے یہاں آ گئی ہے کہ شفع علیؑ و فاطمہؑ اور وتر حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، دس راتوں میں یہ ہے کہ یہ عشرۂ محرّم کی دس راتیں ہیں.....لیل میں یہ بھی روایت ہے کہ وہ سبِ معراج ہے جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمان پر گئے، اور سب اختلافات سے بچنے کے لئے مفرّ کی صورت یہ اختیار کی گئی ہے کہ فجر بھی کوئی سی صبح ہے جب پَو پھوٹتی ہے اور دس راتیں بھی مہینے کی تیس راتوں میں سے ہر دس راتیں ہیں اور حقیقت انہی تاریخوں کی تبدیلی مراد ہے کہ ایک سے دو اور دو سے تین ہو جاتی ہیں۔ یہی سلسلہ آخر ماہ تک جاری رہتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے علم کو اللہ ہی کے حوالے رکھنا چاہیے کسی بات کو بھی حتم و جزم کے ساتھ کہنے کی جرأت نہیں کرنا چاہیے۔

قسمیں کھا کر کیا بات کہنا منظور ہے، وہ بھی ظاہر الفاظ کے اندر مذکور نہیں.....بہر حال بعد کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ گفتگو وہی جزاؤ سزا کی ہے اور اُسے جھٹلانے والوں کو جو سزائیں مل چکی ہیں ان کا ذکر ہے اور موجودہ منکرین کے طبقے کو براہ راست اور بعد والوں کو اُن کے ذیل میں تنبیہ ہے کہ ان کا انجام بھی یہی ہونے والا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝٦ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝٧ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝٨ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝٩ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۝١٠ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝١١ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝١٢ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝١٣ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝١٤

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے اُونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ کیا کیا جن کی ایسی کوئی قوم ان ملکوں میں پیدا نہیں ہوئی تھی اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراش کر عمارتیں بنائی تھیں اور میخوں والے فرعون کے ساتھ جنہوں نے ملکوں میں سرکشی کی تھی اور بہت بڑا فساد پھیلایا تھا تو اللہ نے اُن پر عذاب کے تازیانے برسائے یقیناً تمہارا پروردگار گھات میں لگا ہوا ہے''۔

ہمارے قدیم مفسّرین نے ارم کو جیسے اُس قبیلۂ عاد کے علاوہ قرار دے کر جس کا تذکرہ بہت جگہ قرآن مجید میں ہے اس ذیل میں جنّت شدّاد کا قصّہ لکھ دیا ہے لیکن تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عاد ارم سے مراد وہی قدیم قبیلۂ عاد ہے جس کی طرف جناب ہودؑ مبعوث ہوئے تھے اور جو عذابِ الٰہی سے تباہ و برباد کر دیا گیا ان کو ستونوں والے اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ بڑی بڑی بلند عمارتیں بناتے تھے اور بلند ستونوں پر عمارتیں قائم کرنے کا طریقہ اُنہوں نے شروع کیا تھا جس طرح قبیلۂ ثمود کی یہ خصوصیت ہے کہ اُنہوں نے پہاڑوں کے اندر پتھروں کو تراش کر عمارتیں بنانے کا طریقہ شروع کیا تھا۔

فرعون کو میخوں والا کیوں کہا گیا ہے؟ اس میں پھر کئی توجیہیں ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مجاز ہے کہ اُس کا لشکر اتنا مضبوط اور طاقتور تھا کہ ان

میخوں پر اُس کی سلطنت مستحکم و پائدار تھی دوسرے یہ کہ اُس کے لشکر کی کثرت اتنی تھی کہ ہر طرف اس فوج کے جانے پر میخیں ہی میخیں نظر آتی تھیں جہاں اُن کے شامیانے نصب ہوتے تھے۔ یہ بھی وہ دولت مندی کے سبب سے لشکر کے گھوڑے سونے کی میخوں سے باندھا کرتا تھا۔ یہ بھی اپنے مخالفوں کو میخیں ٹھونک کر سزا دیتا تھا، یہ بھی کہ اہرام مصر مراد ہیں جو اُن کی عظمت اور شان وشوکت کی نشانی کے طور پر بعد میں مدّتوں سے قائم ہیں، مگر یہ اہرام تو فراعنہ مصر کی یادیں ہیں جو تمام اُس سلسلہ کے سلاطین مصر سے متعلّق ہیں، یہاں یہ صفت جیسے خاص اُس فرعون کی معلوم ہوتی ہے جو حضرت موسیٰؑ کا ہم عصر تھا اور جس پر عذاب آیا تھا۔ ان سب کے عذاب کا یہاں اجمالی طور پر تذکرہ کر دیا گیا ہے جس کے تفصیلات قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر درج ہیں۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾

”مگر انسان، جب اُس کا پروردگار اُسے آزمائش میں ڈالتا ہے اور اُسے عزّت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے میری عزّت افزائی کی اور جب اُسے آزمائش میں ڈالتا ہے تو اُس پر اُس کی روزی میں تنگی کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلّت دیدی، ہرگز نہیں، بلکہ تم ہو کہ یتیم سے عزّت کا برتاؤ نہیں کرتے اور غریب کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو آمادہ ہیں کرتے اور میراث کا مال اکٹھا کر کے کھاتے ہو اور مال سے بہت زیادہ محبّت کرتے ہو“۔

یعنی یہ انسان عزت وذلت کا پیمانہ اس دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کو سمجھتا ہے، دنیوی عزت اور دولت عیش وآرام مل گیا تو سمجھا کہ بس خدا کی نظر میں میری عزت ہے اور تنگ دستی میں مبتلا ہو گیا تو سمجھا کہ خدا نے مجھے ذلیل کر دیا حالانکہ معیار عزت وذلت انسان کا کردار ہے۔ یہ اپنے کردار کو کبھی نہیں دیکھتا کہ وہ کیا ہے؟۔

اس کا کردار یہ ہے کہ یتیم کی دلجوئی کے بجائے اسے ذلیل نظر سے دیکھتا ہے اور غریب کو کھانا کھلانے کے بجائے دوسروں کو آمادہ بھی نہیں کرتے کہ اس کے پیٹ بھرنے کا سامان کریں اور دوسروں کے حقوق پر قبضہ کر کے اپنی دولت بڑھانے کی فکر رہتی ہے۔

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿۲۴﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾

”ہرگز نہیں، جب زمین پوری طرح کوٹ پیٹ کر سپاٹ بنا دی جائے گی اور تمہارا پروردگار آجائے گا اور فرشتے

صف در صف اور دوزخ کو اس دن لے آیا جائے گا اس وقت انسان کو سبق ملے گا مگر اب اس سبق لینے سے کیا فائدہ ہوگا۔ وہ کہے گا، کاش میں نے آج کے دن کے لیے کچھ کر رکھا ہوتا تو اس دن اللہ کا سا عذاب دینے والا، کوئی نہیں اور اس کا ایسا گرفت میں لینے والا کوئی نہیں''۔

اللہ کی طرف آنے کی نسبت اس معنی میں ہے کہ آج وہ برسر محاسبہ آئے گا۔ اب اس نے اس انسان کو موقع دیا، اب موقع دینے والی مہلت گزر گئی اور آخری فیصلے کا ہنگام آ گیا۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾

''اے پورا اطمینان رکھنے والے نفس! تو پلٹ آ اپنے پروردگار کی طرف اس طرح کہ تو اس سے خوش رہے اور وہ تجھ سے خوش ہو تو شامل ہو جا میرے (خاص) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں''۔

وہ نفس جو دنیا میں شکوک و شبہات کی آماجگاہ رہا اور کردار اس کا مایوس کن ثابت ہوا وہ تو اپنا انجام دیکھ رہا ہے اور اب وہ نفس ہے جو ایمان و عمل صالح کے لحاظ سے سکون و اطمینان کا مرکز ہے، اس سے ان محبت بھرے الفاظ میں تخاطب ہے اور گویا اس کے حسن انجام پر اسے مبارکباد دی جا رہی ہے جو اسے موت سے لے کر اب تک وقتاً فوقتاً ملتی رہی تھی اور اب آخری انجام کے ظہور کے موقع پر اسے پھر مل رہی ہے، خواہ فرشتوں کی زبانی ہو اور خواہ قدرت کی طرف کے القاء کی صورت سے ہو۔

سُوْرَةُ الْبَلَدِ

مکیّہ.....۲۰.....آیات

شروع میں بلد یعنی اس شہر کی قسم ہے، اس لیے یہ نام ہوا۔

اس میں قسم کے ذریعہ سے شہر مکّہ کی اہمیت اور اس میں حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود مقدس کی ضرورت کو پیش کیا گیا ہے جسے سننے والوں کی نگاہ کو اس شہر کے حالات اور ان میں حضرتؐ کے ذریعے سے کیا انقلاب لاتا ہے، اس کی طرف موڑا گیا ہے، پھر سننے والے کو پھر نوع انسانی کے آغاز، اس کی آفرینش کی ابتداء اور انتہا پر روشنی ڈالی گئی ہے جن سے وہی دونوں مہمیں جو مبدا و معاد کے ذہن نشین کرنے کی ہیں پایہ تکمیل تک پہونچتی ہیں: اس ذیل میں انسانی اعضا جوارح کی افادیت اور ان کے منافع اور مقاصد کو ذہن میں لایا گیا ہے تاکہ وہ نہ انہیں عبث سمجھے نہ غلط مقاصد میں صرف کرے اور پھر آخر میں عملی زندگی میں جس کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے یعنی حقوق الناس پر سورے کو ختم کیا گیا ہے جس میں سب سے آخری جہنم کا انجام ہے جس سے نکلنا ممکن نہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے۔''

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۱﴾ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۲﴾ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ؕ﴿۴﴾

''نہیں میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی درآنحالانکہ آپ اس شہر میں مقیم ہیں اور باپ کی اور جو اس کے اولاد ہو، کہ ہم نے انسان کو محنت و مشقت کے لیے پیدا کیا ہے''۔

شہر ایک وقت وہ بے آب و گیاہ تھا اور اب وہ مرکز خلائق بنا ہوا ہے، جس کی خصوصیت خاص یہ ہے کہ اس پورے بدامنی کے ماحول میں یہ ایک محل امن سمجھا جاتا ہے۔ آپ اسی میں مقیم ہیں، اب اس شہر والوں کو اس شہر کے شایان اپنے کردار پر بھی غور کرنا چاہیے کہ تمہیں کیسا آدمی ہونا چاہیے اور پھر یہ سلسلہ نسل انسانی جو آدم علیہ السلام سے لے کر چلا اور پھیل گیا، اس سلسلے کو جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے اپنے کردار پر غور کرنا چاہیے کہ وہ اپنی شرافت انسانی کے تقاضوں کو کس طرح محفوظ رکھ سکتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ تن آسانی اور بے کار وقت گزاری کے لیے پیدا ہوا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ سعی و عمل کے لیے پیدا ہوا ہے۔

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۘ﴿۵﴾ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ﴿۶﴾ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ؕ﴿۷﴾

''کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے کسی کا بس نہیں ہے، وہ کہتا ہے کہ میں نے بہت دولت خرچ کر دی ہے، کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اسے دیکھا ہی نہیں''۔

یعنی انہیں اپنی قدرت اور طاقت پر گھمنڈ بھی ہے اور اپنی فضول خرچیوں پر غرور بھی، چنانچہ عرب میں شراب خوری فیّاضی سمجھی جاتی، حالانکہ انہیں سمجھنا چاہیے تھا کہ ایک بالادست طاقت ان کے اوپر ہے جس کی قدرت کے دائرہ سے وہ باہر نہیں جا سکتے، وہ ان کے حالات کو بدلنے پر بھی قادر ہے کہ جب چاہے ان کی پوری دولت کو ختم کر دے اور اس کے احاطہ علم سے بھی وہ باہر نہیں نکل سکتے، وہ انکے پورے حالات کا نگراں ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ﴿۸﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۙ﴿۹﴾ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ﴿۱۰﴾ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۖ﴿۱۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ؕ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۙ﴿۱۴﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ؕ﴿۱۶﴾

''کیا ہم نے اسے دو (۲) آنکھیں نہیں دیں اور زبان اور ہونٹ اور ہم نے دونوں امتیازی راستے آپ

کو دکھا دیئے تو وہ کٹھن گھاٹی نہ اترا اور تم کیا جانو کٹھن گھاٹی کیا ہوتی ہے؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا یا بھوک والوں میں کسی قریب والے یتیم یا خاک پر بیٹھے ہوئے غریب کو کھانا کھلانا''۔

مطلب یہ ہے کہ یہ آنکھیں ملی ہیں حقیقتوں پر نظر ڈالنے کے لیے اور زبان اور دہن ملا تھا صحیح باتوں کو کہنے کے لیے مگر اس نے حقیقتوں کے دیکھنے سے نگاہیں چرائیں اور حق کے اقرار سے زبان کو خاموش رکھا اس طرح جو انسانی اعضا اسے عطا ہوئے تھے ،دونوں امتیازی راستے دکھا دئے یعنی ایک بلندی کی طرف لے جانے والا جو سخت اور کٹھن ہے اور دوسرا آسان یعنی مطلق العنانی کا جو پستی کی طرف لے جانے والا مگر یہ اس سخت قرض شناسی کے راستے پر نہ چلا جو بلندی کی طرف لے جاتا۔ وہ سخت کٹھن راستہ یہ تھا کہ اپنے اوپر جبر کرنا، اور دوسروں کے دکھ درد میں کام آنا، کسی غلام یا کنیز کی قید غلامی سے گلوخلاصی کرنا، کسی یتیم یا مسکین کو بھوک کی حالت میں کھانا کھلانا۔ اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے لگا رہا اس لیے پستی اس کی بڑھتی گئی۔ حالانکہ بلندی اسے اسی پہلے راستے میں ملتی جس راستے پر چلنے سے یہ اس گروہ میں شامل ہوتا ہے جس کا ذکر ابھی آتا ہے۔

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿۱۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿۱۹﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾

''پھر یہ ان لوگوں میں سے ہو جنہوں نے ایمان اختیار کیا اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی دعوت دی اور ایک دوسرے کو رحم وکرم کی ہدایت کی ، یہ لوگ داہنی طرف والے ہیں اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ بائیں طرف والے ہیں۔ ان پر آگ کا حلقہ جو چاروں طرف سے بند ہے''۔

''پھر'' کا یہ مطلب نہیں کہ وہ باتیں پہلے ہونا چاہیں جو قبل میں بیان ہوئیں ہیں اور یہ باتیں ثانوی حیثیت سے ہیں جن کا درجہ بعد کو ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ باتیں جو پہلے ہیں وہ قابل قبول نہ ہوں گی جب تک کہ ایمان نہ ہو اور ایمان کو ثبوت اس کے اس کردار سے ہوگا جو قبل میں بھی مذکور تھا اور بعد میں بھی ہوگا اور جو ایمان سے منحرف اور ان احکام الٰہی کے منکر ہیں وہ دوسرے گروہ میں شامل ہیں جو بائیں ہاتھ والوں کا ہے، انہیں نحوست والا گروہ بھی کہہ سکتے ہیں جو شوم کی لفظ سے ماخوذ مشئمہ کے معنی ہوتے ہیں، ان کے چاروں طرف آگ کا ایسا احاطہ ہے جس سے وہ باہر نہیں نکل سکتے۔

سُوْرَةُ الشَّمْسِ

مکیّہ.....۱۵.....آیات

پہلی قسم شمس یعنی سورج کی ہے، اس لئے یہ نام ہوا۔

اس میں بھی قسموں کے بعد تعبیر بدل کر خالق کی طرف سے دونوں راستوں کا بتا دینا کہ کون اچھا کردار ادا کر رہے اور کون برا اور پھر اسی کے لحاظ سے انجام کا فرق بیان کیا گیا ہے۔

اس میں اچھے اور برے راستوں کے امتیاز کے لئے بتایا ہے کہ یہ امتیاز اس کے ضمیر میں خالق کی طرف سے رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ علاوہ انبیاؑ کے ذریعے سے شرعی احکام کے ذریعہ سے تفصیلات بتانے کے اچھے اور برے، دو راستے الگ ہیں جن کا امتیاز خود انسان کا شعور کر سکتا ہے یہ حسن قبح عقلی کی دلیل ہے جس کا ایک طبقہ منکر ہے۔

پھر قبیلہ ثمود کی سرکشی اور اپنے رسول کو اذیت پہنچانے اور حکم الٰہی سے مخالفت کرنے کا انجام تھوڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس کی مزید تفصیل دوسرے سوروں میں ہے، اس سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا دینے والے اس دور کے مشرکین کو متنبہ کرنا ہے کہ ان کا انجام بھی یہی ہوگا جسے صراحت کے ساتھ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ خود اس نظریہ کے پیش کرنے سے اسے سمجھ سکتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۝١ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝٢ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝٣ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝٤ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝٥ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝٦ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝٧ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝٨ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝٩ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝١٠

''قسم سورج اور اس کی پھیلتی ہوئی شعاعوں کی اور چاند کی جب وہ اس کے پیچھے سامنے آتا ہے اور دن کی جب کہ وہ اس (سورج) کو نمایاں کرتا ہے اور رات کی جب کہ وہ اسے ڈھانپ لیتی ہے اور آسمان کی اور اس کی جس نے اس کی عمارت قائم کی اور زمین کی اور جس نے اس کا بچھونا بچھایا اور انسانی نفس کی اور جس نے اس میں توازن پیدا کیا تو اس نے اس میں اس کے بُرے کردار اور اچھے کردار کا القا کر دیا، ہر طرح کی بہتری حاصل کی اس نے

جس نے اسے پاک صاف بنایا اور ناکام ہوا وہ جس نے اسے پامال کر دیا''۔

جو شعاعیں چڑھتی ہیں تو یہی دھوپ کہلاتی ہیں جن میں روشنی بھی ہوتی ہے اور گرمی بھی اور ضحیٰ کا وقت یعنی چاشت وہی ہوتا ہے جب یہ دونوں صفتیں پیدا ہونے لگتی ہیں اور انہی دونوں صفتوں سے انسانوں کے کاروبار کا نظام بھی قائم ہے اور پھلوں اور زراعتوں کے پختہ اور رسیدہ ہونے میں اس کی روزی کا انحصار بھی، اس لیے آفتاب کے ساتھ ضحیٰ کی قسم قرار دیا ہے اس کے بعد کے قریبی ایک سورہ میں بغیر آفتاب کا ذکر کیے ہوئے مستقل طور پر بھی مورد قسم قرار دیا ہے، یہاں سورج ہی کو مرکز بنا کر نظام لیل ونہار میں جتنے تغیرات ہیں سب ہی کو قسموں کے ذریعے سے یکے بعد دیگرے پیش کیا گیا ہے جن تغیرات کے ضروری ہونے پر دوسرے سوروں میں بھی قرآن کے اندر جا بجا روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ان مخلوقات کو مرکز قسم بنانے کے بعد ذہن کو ان کے خالق کی طرف موڑا ہے کہ اس پورے نظام کو قائم کس نے کیا، تو کہا قسم آسمان کی اور جس نے اس کی عمارت قائم کی۔

ما بناھا اور پھر بعد کے جملوں میں بھی اگرچہ مَا کی لفظ جس کے معنی عموماً وہ چیز کے ہوتے ہیں مگر اس کی نظیریں خود قرآن میں متعدد ہیں کہ ما کو من کے معنی میں لایا گیا ہے جس کے معنی وہ شخص کے ہوتے ہیں اس لیے اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ ما کو مصدریہ لے کر یہ ترجمہ کیا جائے کہ قسم آسمان اور اس کے بنائے جانے کی کہ اس کے بچھائے جانے کی اور نفس انسانی اور اس کے درست کیے جانے کی کیوں کہ اس کے بعد والا جملہ پھر نہیں بنے گا کہ اس نفس انسانی میں اس کے اچھے اور برے راستوں کا امتیاز اس نے ڈالا اور مائے مصدریہ کے فعل پر عطف کے ساتھ فعل کا لانا بظاہر عربی میں درست نہیں ہے کہ اس جملے کے معنی بھی یوں کہے جائیں کہ نفس انسانی کے درست ہونے کی قسم اور اس میں اچھائی اور برائی کا احساس پیدا ہونے کی قسم اس لیے قبل کے جملوں میں قدیم مترجمین نے بھی اس تفسیر کو قبول نہیں کیا ہے جو ما کو مصدریہ قرار دینے کے ساتھ وابستہ ہے بلکہ ما کو وہ ''شخص'' کے ہم معنی لفظ کے ساتھ تعبیر کیا ہے [1] اور صدر اول کے قدیم مفسرین کے اقوال بھی اس کے موافق موجود ہیں۔ [2]

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ﴿۱۱﴾ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ﴿۱۲﴾ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ﴿۱۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۫ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿۱۴﴾ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿۱۵﴾

''قبیلہ ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے جھٹلایا، جب اس میں کا سب سے زیادہ بدبخت آدمی اٹھا، تو ان لوگوں سے اللہ کے پیغمبر نے تو یہ کہا تھا کہ اللہ کی اونٹنی کا خیال رکھنا اور اس کے پانی پینے کا مگر ان لوگوں نے انہیں جھٹلایا تو اسے پے کر ڈالا جس پر ان کے پروردگار نے ان پر آفت ڈال دی کہ اس بستی کو زمین کے برابر کر دیا اور خدا کو اس کے انجام کو کوئی اندیشہ نہیں ہے''۔

یعنی وہ کسی قوم پر عذاب نازل کرے تو اس پر کوئی بالادست طاقت نہیں ہے جس کا اسے اندیشہ ہو کہ وہ کہیں اس قوم کی حمایت میں مجھے کوئی نقصان پہنچائے یا اس کا مجھ سے محاسبہ کرے۔

---

[1] ۔بذاتی کہ ساخت اورا.....شاہ ولی اللہ (اس ذات کی کہ پیدا کیا اس کو (رفیع الدین)

[2] ۔ای ومن بناھا عن مجاھد والکلبی وقیل والذی بناھا عن عطاء (مجمع البیان)

سُوْرَةُ الَّيْلِ

مکیّہ.....۲۱.....آیات

پہلی ہی قسم لیل یعنی رات کی ہے، اس لیے یہ نام ہوا،

کائنات میں شب وروز کی دورنگی اور مخلوقات میں مرد اور عورت، نر اور مادہ کی دورنگی، اس کو قسم کے ذریعہ سے پیش کر کے انسانی کارگزاری کی دورنگی اور پھر اس کے نتیجے کی دورنگی، پورا سورہ انہی دو جزؤں پر مشتمل ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے"

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۙ﴿۱﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ﴿۲﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۙ﴿۳﴾ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ؕ﴿۴﴾ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۙ﴿۵﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۶﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ؕ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ﴿۸﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ؕ﴿۱۰﴾ وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى ؕ﴿۱۱﴾

"قسم رات کی جب وہ چھاجائے اور دن کی جب کہ وہ جلوہ گر ہو اور اس کی جس نے ذکور و اناث (دونوں صنفوں) کو پیدا کیا یقیناً تم لوگوں کی کوشش الگ الگ ہے تو جو شخص (خدا کی راہ میں) دے دلاؤ اور پرہیزگاری سے کام لے اور اچھی بات کا یقین مانے تو ہم اسے آسان منزل تک پہنچنے کی آسانی دیتے ہیں اور جو بخل سے کام لے اور بے نیازی اختیار کرے اور اچھی بات کو جھٹلائے تو ہم اس کے لیے مشکل منزل تک پہونچنے کا سامان کرتے ہیں اور اس کی دولت اسے کچھ فائدہ نہیں دیتی بس وہ منہ کے بھل گرا ہوا ہے"۔

جس طرح ہم نے فہرست مضامین میں بتایا مطلب یہ ہے کہ رات اور دن الگ الگ ہیں اور ان دونوں کے مقاصد الگ الگ ہیں اس طرح نر اور مادہ دو صنفیں الگ الگ ہیں اور ان کے مقاصد الگ الگ ہیں اس طرح تم لوگوں کی کوششیں بھی الگ ہیں۔ ان کی قسمیں جدا جدا ہیں اور ان کے نتائج بھی مختلف ہیں۔ ایک طرف یہ ہے کہ انسان اپنے مال کو راہ خدا میں صرف کرے اور اس سے حقوق اللہ اور حقوق الناس ادا کرے اور خدا کی ناراضگی کی باتوں سے پرہیز کرے جو جو اچھی باتوں کی انہیں تعلیم دی گئی ہے، انہیں سچ سمجھے اور ان پر عمل پیرا ہوں تو اس کے لیے خدا کی طرف سے نیک راہ پر چلنے میں آسانیاں فراہم ہوتی جائیں گی اس راستے پر قائم رہنے جسے پہلے ایک سورے میں کہا گیا تھا کہ وہ سخت گھاٹی ہے جس پر چڑھنے کی

وہ ہمت نہیں کرتا اور اب اسے کہا جا رہا ہے کہ وہ آسان منزل ہوگی، یعنی وہ سختی اس وقت تک محسوس ہو رہی تھی جب تک ہمت نہیں کی تھی اور جب ہمت باندھ لی تو اب توفیقات الٰہی شامل حال ہوں گے اور سب باتیں آسان محسوس ہوں گی جن کا نتیجہ بھی پھر حسن انجام کی صورت میں آنکھوں کے سامنے آئے گا، دوسری طرف وہ جو بخل سے کام لے کر حقوق اللہ اور حقوق الناس ادا نہیں کرے گا اور اچھائی کی تعلیمات سے منکر اور ان سے عملاً منحرف رہے گا تو اسے قدم قدم پر دشواریاں ہی محسوس ہوں گی راہ حق پر آنا اور اس پر قائم رہنا اسے دشوار سے دوتر ہی ہوتا جائے گا اور نتیجہ میں اس کے لیے تباہی و بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے جس سے اس کا مال دولت اسے کچھ فائدہ پہنچا نہیں سکتا۔

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ﴿١٢﴾ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴿١٣﴾ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴿١٤﴾ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿١٥﴾ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿١٦﴾ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿١٨﴾ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿١٩﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿٢٠﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿٢١﴾

''یقیناً ہمارے ذمے راستہ دکھانا ہے اور بلاشبہ ہماری ہیں آخرت اور دنیا تو میں نے تمہیں ڈرایا اس آگ سے جو بھڑکتی ہوگی، اس میں نہیں جلے گا مگر وہ بدترین بدبخت جو جھٹلائے اور روگرانی کرے اور اس سے بچا رہے گا وہ انتہائی پرہیزگار جو اپنا مال اپنی پاکیزگی کے لیے دیتا رہے اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلا دیا جا رہا ہو، سوا اپنے برتر پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے اور بلاشبہ وہ اس سے خوش ہوگا''۔

چونکہ وہ خالق ہی نہیں بلکہ رب ہے، تربیت کا لازمی جز بقا اور ارتقا کا اہتمام کرنا ہے اس بنا پر ہدایت کرنا اس کے ذمے ہے لہٰذا اس نے پہلے عقل و ضمیر انسان کی رہنمائی اور پھر انبیا و مرسلین کے ذریعے سے ہدایت کا سامان کیا۔ یہ حقیقت قرآن مجید میں بہت مقامات پر مذکور ہے اور اسی کو یہاں اس مختصر جملے میں ادا کیا گیا ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى 'ہمارے ذمے راستہ دکھانا ہے''

''ہمارے ہیں آخرت اور دنیا'' دونوں کے مالک ہم ہی ہیں۔ اور دونوں کے فائدے اور نقصانات ہمارے ہی ہاتھ میں ہیں لہٰذا تم ہر لمحہ ہمارے محتاج ہو اور پھر یہ کہیں تم ہمارے قابو سے باہر نہیں نکل سکتے کہیں بھاگ کر بچ نہیں سکتے۔

اشقیٰ اور اتقیٰ اگرچہ دونوں افعل التفضیل کے صیغے ہیں یعنی سب سے زیادہ شقی اور سب سے زیادہ متقی لیکن یہاں بظاہر اس کی یہ دوسروں پر زیادتی کا لحاظ نہیں ہے بلکہ یہاں اشقیٰ کے معنی بس شقی یعنی بدبخت کے ہیں جس کی تشریح بعد کو ہے کہ وہ جھٹلاتا ہے اور صحیح تعلیمات سے منہ پھیرتا ہے اور اتقیٰ کے معنی بس تقی یعنی پرہیزگار کے ہیں جسکے کردار کی تشریح بعد کو ہے کہ وہ رضائے الٰہی کی خاطر اپنا مال خرچ کرتا ہے۔

وہ اس کی سزا ہے اور یہ اس کی جزا ہے جس کی پوری تفصیل اس اجمال میں مضمر ہے کہ وہ خوش ہو جائے گا کہ اسے اس عمل کا اجر ملا۔

سُوْرَةُ الضُّحٰی

مکیّہ.....۱۱.....آیات

پہلی ہی قسم ضحیٰ کی ہے جو دھوپ چڑھنے کے وقت کو کہتے ہیں، اس لیے یہ نام ہوا۔

روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور سورے کا مضمون بھی بتاتا ہے کہ ابتدائے بعثت میں کچھ آیتوں اور سوروں کے نازل ہونے کے بعد تھوڑی مدت تک وحی کا سلسلہ موقوف رہا، اس سے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عظمت الٰہی کے احساس اور بتقاضائے عبودیت یہ تشویش اور تردد ہوا کہ خالق کی نظر میری طرف توجہ میری طرف سے ہٹ گئی ہے، اس لیے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطمینان دہانی کے لیے اب آغاز وحی اس سورے کے ساتھ ہوا اور آپ کو اطمینان دلایا گیا۔ اور پھر آپ کو خبر دی گئی کہ آپ کے سامنے بڑی مشکلیں اس دعوت اسلامی کے سلسلے میں پیش آئیں گی لیکن وہ عارضی ہوں گی اور نتیجہ بہرحال آپ کے موافق رہے گا جس کو دیکھ کر آپ کو خوشی ہوگی اور مزید اطمینان کے لیے اپنے سابق کے انعامات جو رسول پر رہے ہیں، انہیں یاد دلایا گیا ہے کہ اس کے بعد آپ کو یہ خیال پیدا ہی نہ ہونا چاہیے کہ آپ کا پروردگار آپ سے ناراض ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''۔

وَالضُّحٰى ۝١ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۝٢ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝٣ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝٤ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝٥

''قسم ہے دھوپ چڑھنے کے وقت کی اور رات کی جب کہ اس کا سناٹا چھا جائے، آپ کو آپ کے پروردگار نے نہ چھوڑا ہے اور نہ وہ ناراض ہوا ہے اور بلاشبہ انجام آپ کے آغاز سے بہتر ہے اور بہت جلد آپ کو پروردگار آپ کو عطا کرے گا ایسا کہ آپ خوش ہو جائیں''۔

اصل مقصود دن کی قسم کھانا ہے مگر جیسے رات کی قسم میں اس کے سناٹا چھانے کے وقت کا تذکرہ ہوا ہے، اسلیے کہ اسی وقت رات کی کیفیت پورے طور پر نمایاں ہوتی ہے، اسی طرح دن کی طرف اس کے آثار کے نمایاں ہونے کے موقع کا نام لیا ہے اور وہ اسی وقت ہوتے ہیں جب دھوپ چڑھتی ہے۔

رات کے ساتھ سناٹے کی کیفیت کا تصور اس پس منظر کے ساتھ بھی بہت تناسب رکھتا ہے جو وحی کے تسلسل میں درمیانی وقفہ کی وجہ سے پریشانی کا ہے کہ جیسے وہ سناٹا وقتی ہے جس کے بعد پھر دن آتا ہے اور اس کی چہل پہل ہو جاتی ہے، ویسے ہی یہ وقفہ وقتی ہے جس کے بعد لگاتار وحی کا سلسلہ قائم ہو جائے گا۔

''انجام آغاز سے بہتر ہے'' یہ فقرہ اس عالم کا مشاہدہ سے بھی متعلق ہوسکتا ہے جیسا کہ پہلے لکھا گیا کہ یہ مشکلات وقتی ہیں جو اس وقت آپ کے سامنے آرہی ہیں اور عنقریب اس دارِ دنیا میں آپ کی کوشش کے خوش گوار نتائج سامنے آتے جائیں گے اور پھر آخرت سے مراد اس دنیا کے بعد کی منزل بھی ہے کہ اس دنیا میں آپ کے سامنے جتنے بھی مصائب اور اذیت رساں حالات پیش آئیں، دنیا کے بعد جو آخرت کا دور ہے وہ آپ کے لیے بہتر سے بہتر ہے اور آپ کو اللہ اتنا عطا کرے گا کہ آپ خوش ہوجائیں گے۔

چنانچہ تفسیر اہل بیتؑ میں ہے کہ اس سے شفاعت کا درجہ اور بخشش امت مراد ہے [1] اس کے لیے جناب محمد حنفیہ کی زبانی بھی آیا ہے کہ انھوں نے کہا:۔

یااھل العراق تزعمون ان ارجی آیة فی کتاب اللہ عزوجل یاعبادی الذین اسرفوا علیٰ انفسھم لاتقنطوا من رحمة اللہ وانا اھل البیت علیہم السلام تقول ارجیٰ آیة فی کتاب اللہ ولسوف یعطیك ربك فترضیٰ وھی الشفاعة یعطیھا فی اھل لا الہ الاّ اللہ حتیٰ یقول رب رضیت۔

''اے عراق والو! تم لوگ خیال کرتے ہو کہ سب سے زیادہ امید افزا آیت قرآن میں یہ ہے کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنے اوپر ستم ڈھایا اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اور ہم خاندان رسالت والے کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ امید افزا آیت کتاب خدا میں یہ ہے کہ عنقریب اللہ آپ کو اتنا دے گا کہ آپ خوش ہوجائیں گے اور یہ بخدا شفاعت ہے جسے کلمہ گویوں میں اتنا قبول کیا جائے گا کہ آپ کہیں گے پروردگار! میں خوش ہوگیا''۔

اور امام جعفر الصادق علیہ السلام نے فرمایا:۔

ان رضا جدی ان لا یبقیٰ فی النار موحد''م

یرے جد بزرگوار کی خوشی اس میں ہے کہ دوزخ میں کوئی کلمہ توحید کا قائل باقی نہ رہے۔

بہرحال اس شفاعت میں حدود و قیود ہیں جنہیں خود شفاعت کرنے والے رسول اور ان کے جانشینوں نے بتایا ہے جس میں سب سے زیادہ قید یہ ہے کلمہ لا الہ الا اللہ صرف زبانی نہ ہو بلکہ صدق دل سے اس کا اقرار ہو جس کا اثر افعال اور اعمال پر پڑنا لازمی ہے اور پھر یہ کہ ان کی رضا رضایت الٰہی کے ساتھ مشروط ہے جو قرآن کے دوسرے آیات سے ثابت ہے اور وہ ان کا تقاضائے عبودیت ہے۔

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۝۷ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ۝۸
فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝۹ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱

''کیا ایسا نہیں کہ اس نے آپ کو یتیم پایا تو پناہ کی جگہ دی اور آپ کو کھویا ہوا پایا تو رہنمائی کی اور آپ کو تہی دست پایا تو مالدار بنایا تو کوئی یتیم ہو تو اس پر سختی نہ کیجیے اور جو سائل ہو اسے جھڑکیے نہیں اور اپنے پروردگار کی نعمت کو ظاہر کرتے رہیے''۔

---

[1] ۔سیؤتیك ربك فی الآخرة من الشفاعة والحوض وسائر انواع الکرامة فیك وفی امتك ماترضیٰ بہ (مجمع البیان)

ان فقرات میں خالق نے اپنے فضل وکرم کا جو ابتدائے عمر سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شامل حال رہا ہے تذکرہ فرمایا ہے ''یتیم پایا تو پناہ کی جگہ دی'' زیادہ تر معتبر روایت یہی ہے کہ حضرتؐ اس دارِ دنیا میں پیدا ہی ہوئے بحالت یتیمی یعنی آپ شکم مادر میں تھے، جب آپ کے والد بزرگوار جناب عبداللہؑ کی وفات ہوگئی جس کے بعد صرف ان کی والدہ تھیں جو پرورش کرتی رہیں مگر آپ چھ برس ہی کے تھے کہ والدہ کا انتقال ہوگیا تو آپ کے دادا جناب عبدالمطلبؑ پورے ذمہ دار آپ کی تربیت کے ہوئے اور انہوں نے اس طرح آپ کی پرورش کی جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ صرف ایک دادا کے طور پر پال نہیں رہے ہیں بلکہ وہ ان کی اس شان سے واقف ہیں جو مستقبل میں سامنے آنے والی ہے چنانچہ ان کا یہ قول تاریخ میں درج ہے کہ ان لہ شانا کبیرا۔ ''اس بچہ کی بڑی شان ہے''۔

ظاہر ہے کہ جو دادا اپنے پوتے کی مستقبل میں سامنے آنے والی شان سے واقف تھا، وہ غیر ممکن تھا کہ اپنے بیٹوں کی موجودہ شان وحالت سے واقف نہ ہو۔ چنانچہ انھوں نے خدا کے اس دیے ہوئے علم ہی کی بنا پر اپنی اولاد میں سے جناب ابوطالبؑ کو منتخب کیا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا کہ اب تم ان کی تربیت کے ذمہ دار ہو۔

اب یہی تربیت تھی جس میں آپ پورے طور پر پروان چڑھے یہاں تک کہ بعثت کے بعد بھی وہ دس برس تک آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے مشن یعنی اسلام کے بھی جائے پناہ رہے اس لیے وہ مفسرین جنہیں ابوطالب سے پرخاش ہے وہ آپ کو پسند نہیں کرتے۔ اس محل پر جناب ابوطالبؑ کے تذکرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے، چنانچہ بعض نے والدہ اور دادا کی تربیت کے بعد اور بعض نے بغیر اُن کے تذکرے کے صرف اسی آخری کفیل کا ذکر ہے۔[1]

اسی طرح تیسرے فقرے میں کہ ''آپ کو تہی دست پایا تو مالدار بنایا، قدیم تفسیر میں زیادہ تر جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا کا تذکرہ ضروری ہوا ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر نے لکھا ہے:

حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا اپنی قوم میں اشرف تھیں اور مالدار، ان سے نکاح ہوا'' (موضع القرآن)

بے شک ان دونوں کے درمیان کے فقرے کی تشریح ذرا نزاکت رکھتی ہے جس کا وہ مفسرین احساس نہیں کر سکتے جو قبل بعثت رسولؐ کے مرتبہ کی رفعت اور آپ کی شان عصمت کے قائل نہیں ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس محل پر ضال کے معنی کھوئے ہوئے کے ہیں اور جو شے کھوئی ہوئی ہے اس کا پتہ جب تک مل نہ جائے دوسرے کو نہیں ہوتا ہے، چنانچہ عرب کا محاورہ ہے: ضلت الناقہ ''اونٹنی کھوگئی'' اس کا مطلب یہ ہے کہ مالک کو پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ اس کے علاوہ کہتے ہیں ضل اللبن فی الماء ''دودھ پانی کے اندر کھو گیا یعنی دیکھنے والے کو پتہ نہیں چلتا۔ امرء القیس نے اپنے مشہور معلقہ میں کہا ہے۔:

تضل العقاص فی مثنی ومرسل یعنی بال حسینہ کے سر کے اتنے گھنے ہیں کہ دو (۲) لٹوں کی گندھی ہوئی زلفوں اور یونہی کھلے ہوئے بالوں کے اندر جوڑے گم ہوجاتے ہیں، بعض نسخ میں ہے۔ تضل المداری فی مثنی ومرسل ''یعنی گندھی زلفوں اور کھلے ہوئے بالوں میں کنگھیاں گم ہوجاتی ہیں''۔

---

[1] ۔ اوٰی بان ضمك الیٰ عمك ابی طالب (جلالین)

سُوْرَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ

مکیّہ.....۸.....آیات

اس سورے کا توعلیٰحدہ سے مفرد نام ہی کوئی نہ ہوا بلکہ پہلے ہی مرکب فقرے کو اس کا نام قرار دے دیا گیا۔

اس سورے کا مضمون گزشتہ سورے کے ساتھ اتنا قریبی تعلق رکھتا ہے کہ ہمارے اکثر علماء تو ان کو ایک سورہ سمجھتے ہیں اور ان کا فتویٰ یہ ہے کہ نماز میں سورہ حمد کے ساتھ جو پورا ایک سورہ پڑھنا لازم ہے تو ان میں سے ایک پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ دونوں سورہ میں درمیان میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہے ہوئے پڑھے جائیں۔[1] پھر بھی باوجود اتحاد مضمون کے چونکہ لفظی ساخت دونوں سوروں کی ذرا الگ الگ ہے اس طرح کہ ان میں اتصال واتحاد مشکل محسوس ہوتا ہے اس لیے احتیاط یہ ہے کہ نماز فریضہ میں ان کی تلاوت کو اختیار نہ کیا جائے کیوں کہ اگر ایک پڑھا جائے تو تبعیض یعنی سورے کے نامکمل ہونے کا احتمال ہے جسے اکثر علماء دوست نہیں سمجھتے اور دونوں پڑھے جائیں تو تھوڑا سا احتمال قرآن یعنی حمد کے بعد دو سوروں کے ایک ساتھ پڑھنے کا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝١ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝٢ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝٣ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝٤ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٥ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝٧ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝٨

''کیا ہم نے آپ کے سینے کو کشادہ نہیں کیا اور اتارا نہیں آپ پر سے اس بوجھ کو جو آپ کی پیٹھ کو توڑے دیتا تھا اور اونچا کیا آپ کے ذکر کو تو یقیناً دشواری کے ساتھ آسانی ہونا ہے، یقیناً دشواری کے ساتھ ساتھ آسانی ہوتی ہے لہٰذا جب ان کاموں سے فراغت کیجیے تو عبادت وریاضت میں لگ جایا کیجیے اور اپنے پروردگار ہی سے لو لگائے''۔

''سینہ کشادہ کرنے'' کا مطلب ہے اس پریشانی کو دور کرنا کہ مہم کس طرح آگے بڑھے اور وہ عزم ہمت اور حوصلہ عطا ہونا کہ اتنے عظیم کام کے لیے آپ بغیر کسی پس وپیش کے کھڑے ہو جائیں جس میں پورے ماحول اور معاشرت سے ٹکرانا تھا۔ اس شواہد خود قرآن مجید میں موجود

---

[1] ۔روی اصحابنا ان الضحیٰ الم نشرح سورۃ واحدلتعلق احدھما بالاخریٰ ولم یفضلوبینھا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وقرأ تھا فی الرکعۃ الواحدۃ فی لفریضہ (مجمع البیان)

ہیں۔اس لیے اسے اہل سنت کی اس روایت پر کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ کو بچپن میں چاک کیا گیا اور اس میں سے دل نکال کر دھویا گیا، اور اس کالے نقطہ کو (معاذ اللہ) جو اس میں تھا دور کیا گیا جو اصل روایت ہی ہمارے نزدیک غلط ہے منطبق کرنا بہر حال غلط ہے۔

دوسرا فقرہ ''اور آپ پر سے اس بوجھ کو اتار دیا جو آپ کی پیٹھ کو توڑے دیتا تھا'' اس میں بوجھ سے مراد معاذ للہ ان گناہوں کی فکر کو لینا جو ان لوگوں کے زعم کے مطابق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل بعثت ہو چکے تھے یہ بھی غلط ہے کہ بوجھ کے معنی گناہ کے نہیں ہیں بلکہ بوجھ سے مراد وہ فکر ہے جو آپ کو اپنی قوم کی جہالت اور غلط کاریوں کے مشاہدہ سے تھی۔اب جب کہ ان کی اصلاح کا کام آپ نے اس راہ میں قدم اٹھا دیا۔

اور'' آپ کے ذکر کو بلند کیا''۔یہ بلند کرنا قیامت تک کے لیے وعدہ ہے کہ آپ کا ذکر اونچا رہے گا اور روایتیں بتاتی ہیں اور مشاہد بھی ہے کہ اس کا سب سے بڑا مصداق ہے اذان میں شہادت توحید کے ساتھ شہادت رسالت کا اعلان جو دنیا کے ہر ملک میں جہاں مسلمان بستے ہیں میناروں پر بلند آواز سے ہوتا ہے۔

اتنی اطمینان دہانیوں کے ساتھ بطور تاکید دہراتے ہوئے یہ کہا جا رہا ہے کہ اب جو مشکلات اس وقت درپیش ہیں انہیں عارضی سمجھنا چاہیے۔ان کے سامنے آسانی پیدا ہونا یقینی ہے۔آپ ان کی فکر نہ کیجیے اور اپنے کاموں میں لگے رہیے اور تبلیغی مہموں، نیز اپنے ضروریات حیات کے پورے کرنے سے حیات کے پورے کرنے سے جتنا وقت بچے ان میں پوری تندہی کے ساتھ عبادت الٰہی میں مصروف ہو جائے اور ان لوگوں کے رویہ سے متاثر ہونے کے بجائے اپنے پروردگار سے لو لگائیے کہ یہی سب سے بڑا مشکلات کے آسان ہونے کا ذریعہ ہے۔

سُوْرَةُ التِّيْنِ

مکیّہ.....۷.....آیات

چونکہ پہلی ہی قسم تین یعنی انجیر کی کھائی گئی ہے، اس لیے یہ نام ہوا۔

اس میں قسموں کے بعد انسان کے اصل خلقت میں اچھی صلاحیتوں کے حامل ہونے اور پھر اپنے کردار کے لحاظ سے انتہائی پستی میں گرفتار ہونے اور بلندی کی منزل تک جا کے بہترین جزا کے حق دار ہونے کا تذکرہ کیا ہے جس سے وہی جزا و سزا کی ضرورت پر روشنی ڈالنا مقصود ہے جو ان ابتدائی دور کے سوروں کا خاص موضوع ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝۱ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝۲ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝۳ لَقَدْ

خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝۵ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۶ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝۷ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸

''قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طور سینا اور امن وامان والے شہر (مکّہ) کی کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا پھر پلٹا دیا اس کو پست سے پست ترین مخلوقات کے درجے پر سوا ان کے جو ایمان لائیں اور اچھے اعمال رکھیں کہ ان کے لیے نہ ختم ہونے والا معاوضہ ہے تو آپ کو اس کے بعد جزا و سزا کے بارے میں کون جھٹلا سکتا ہے۔ کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟''۔

انجیر اور زیتون یوں تو دو پھل ہیں مگر چونکہ بعد کو دو مقامات کی قسم ہے اس لیے بظاہر تین اور زیتوں سے مراد وہ علاقے ہیں جہاں یہ پھل کثرت سے پائے جاتے تھے اور وہ شام اور فلسطینوں کے علاقے ہیں کہ یہاں انبیا و مرسلین کثرت سے ہوئے۔

ان قسموں کے بعد جو بات کہی جا رہی ہے، وہ یہ ہے ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے جسمانی طور بھی اس میں وہ توازن اور تناسب ہے جو نوعی طور پر کسی دوسرے ذی روح میں نہیں ہے اور پھر ذہنی ترقی کے امکانات بھی ہیں، وہ کسی دوسرے کو عطا نہیں ہوئے اور اسی مناسبت سے اس کے قبل انبیا و مرسلین کے خاص مرکزوں کی قسمیں کھائی گئی ہیں کہ یہی طبقہ عملی طور پر اس کمال انسانی کا نمائندہ ہے مگر بعد میں اس نے اپنے سوٗ اختیار سے اپنے کو اس کردار کی منزل پر پہنچا دیا۔

جس کی وجہ سے ہم نے اسے مخلوقات کے سب سے نیچے درجے تک پہنچا دیا کیوں کہ اس نے کردار بھی وہ اختیار کیا جو حیوانات میں سے بھی کسی کا نہیں ہے، جس کا مشاہدہ ہر شخص کو ان جنگوں اور نیز فسادات میں بڑا جانور ثابت ہوتا ہے، اس سے مستثنیٰ بس وہ ہیں جو سچے طور پر ایمان کے جوہر سے آرستہ اور عمل صالح کے پابند ہوں، یہ اس شرف انسانی کے درجے پر باقی رہتے ہیں جو ان کی رفعت کا تقاضا تھا اور جس کا اعلیٰ نمونہ انبیاؑ مرسلین تھے اور اس طبقے کو اللہ کی طرف سے وہ جزا ملتی ہے جو ختم ہونے والی نہیں اور غیر ممنون کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ جزا انہیں بطور ایک ایسے احسان کے جو بلا استحقاق ہو عطا نہیں کی جائے گی۔

بلکہ اُن کے حق طور پر اُنہیں دی جائے گی اور جب کہ نوع انسانی میں یہ دو قسم کے نمونے عالم مشاہدہ میں موجود ہیں تو جزا و سزا کا انکار کس بنیاد پر ہو سکتا ہے اور اس خبر دینے والے کو جھوٹا کیوں کر کہا جا سکتا ہے، جب کہ ہر حاکم کے لیے انصاف ضروری سمجھا جاتا ہے جو تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم ہے وہ بھلا انصاف نہ کرے؟ یہ کیسے غضب کی بات ہے اور اس انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ جب دو (۲) قسم کے نمونے کردار کے پائے جاتے ہیں تو ان کے نتیجہ میں ایسا ہی فرق ہو جس میں ایک کا نام جزا ہو اور ایک کا نام سزا ہو۔

سُوْرَةُ الْعَلَقِ

مکیّہ.....۱۹.....آیات

سورے کی دوسری آیت خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ میں سے لفظ علق پر اس کا نام ہو۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے بعثت کے بعد سورۂ اقرأ نازل ہوا ہے مگر حقیقت امر یہ ہے کہ یہ پورا سورہ پہلے نازل نہیں ہوا ہے بلکہ اُس کی ابتدائی پانچ آیتیں ہیں جو اس وقت نازل ہوئیں باقی آیتیں بعد کو اتریں۔

روایت بتاتی ہے کہ حضرتؐ کے بعثت کے کچھ عرصہ پہلے کئی کئی دن جا کر غار حرا میں عبادت الٰہی میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اسی میں ایک دن فرشتہ اترا اور اس نے یہ پیغام پہنچایا اس طرح اسی سے آغاز بعثت ہوا اس میں شروع میں قرأت کا حکم اور پھر ایک طرح کتابت کی اہمیت پر روشنی ڈالنے کے بعد رسولؐ کی نماز میں مزاحمت کرنے والے کی مذمت اور اسے زجر و توبیخ اور تہدید ہے اور رسولؐ کو ہدایت ہے کہ ان لوگوں کی ممانعت میں نہ آیئے اور آپ اپنے طریق کار پر جو نماز کا ہے برقرار رہیے اور ان کی مزاحمت کی پرواہ نہ کیجیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ﴿۵﴾

''پڑھیے اپنے پروردگار کے نام کے سہارے سے جس نے پیدا کیا خون کے جمے ہوئے ایک ٹکڑے سے انسان کو پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا پروردگار وہ بہت بڑا فضل و کرم والا ہے جس نے تعلیم کا سامان کیا قلم کے ساتھ۔ انسان کو وہ تعلیم دی جسے وہ نہیں جانتا تھا'' چونکہ تنزیل اول کے روایات میں ایک روایت موجود ہے کہ:۔

اول سورة نزلت علیٰ رسول اللہ فاتحة الکتاب.....(مجمع البیان)

پہلا سورہ جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا وہ سورۂ حمد ہے۔

اور پڑھنے کے حکم سے ظاہر ہے کہ پیغمبر خدا کو کچھ پڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے، پھر اس کے ساتھ سورۂ حمد کا نماز میں لازمی طور پر پڑھا جانا اور اس سورے کے اسلوب کا اس طرح ہونا کہ جیسے بندہ اپنے خالق کی بارگاہ میں کچھ عرض معروض کر رہا ہے جسکی بنا پر میں نے اسی تفسیر کے پہلے

پارے میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ سورہ وہ ہے جس سے اقرأ کا حکم متعلق ہے تو جس طرح قل ھواللہ احد میں قل کی لفظ وہ ہے جو کلام خالق میں ھواللہ احد کے جملے کو جو بندے کی طرف سے خالق کے لیے غائبانہ لب ولہجہ کا حامل ہے کلام خالق میں منسلک بناتی ہے اسی طرح اقرأ ہے جو پورے الحمد کو جو بندے کی زبانی خالق کی بارگاہ میں عرض معروض کے لیے اترا ہے، کلام الٰہی کا جز بناتا ہے۔

علق وہ حالت ہے جو نطفہ ہونے بعد منزل میں پیدا ہوتی ہے اور اس کے بعد مضغہ ہونے کی کیفیت ہے۔قرآن مجید نے ابتدائی خلقت میں کہیں اس پہلی منزل سے ابتدا کی ہے کبھی ماء مہین ایک حقیر پانی کہہ کر اور کہیں نطفہ ہی کی لفظ کہہ کر اور مضغہ کا نام لیا ہے۔یہاں اس درمیانی حالت یعنی علقہ کا نام لیا ہے کہ یہ تینوں ہی حالتیں انسان پر روح کے داخل ہونے سے پہلے پیدا ہوتی ہیں۔

رب کے تعارف میں پہلے صرف خلقت کا ذکر کیا گیا اور متعلق کو اطلاق کے پردے میں چھپا دیا گیا کہ وہ سب ہی کا خالق ہے۔پھر خصوصیت کے ساتھ انسانی تخلیق کا تذکرہ کیا کہ اسی سے سورے کے مضمون کا تعلق ہے اور اسے متوجہ کیا گیا کہ اس ابتدا کیوں کر تھی اور اس سے ترقی کر کے وہ انسانیت کی منزل تک آیا لہٰذا اسے اب اپنے اس جوہر کے تحفظ کے لئے اس کے شایان شان کردار اختیار کرنا چاہیے۔

خلقت کے بعد سب سے بڑی اللہ کی نعمت علم کو قرار دیا گیا ہے اور اس کے تحفظ اور ارتقا کا جو سب سے بڑا ذریعہ یعنی قلم ہے، اس کی افادیت کو انسان کے ذہن نشین کیا۔

اگر خدا کا رسول عام انسانوں کی طرح ماحول کا ساختہ و پرداختہ ہوتا تو ہمارے رسولؐ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور اتنی عمر گزاری تھی، اس کے لحاظ سے وحی اول میں سیف کا ذکر ہوتا مگر تلوار کا ذکر نہ ہونا قلم کا ذکر ہونا اس کی دلیل ہے کہ یہ پیغمبر امن ہے اور دنیا میں امن وامان کا حامی ہے نہ کہ خونریزی کا.....اب اگر خونریزی کی صورتیں پیدا ہوں تو وہ دوسروں کے ہاتھوں ہوں گی۔اس پر جارحیت کا الزام عائد کرنا غلط ہوگا۔

آخر کا جملہ بتاتا ہے کہ علم بھی انسان کو جو حاصل ہوتا ہے، وہ اصل میں اللہ ہی کا عطیہ ہے لہٰذا جتنی اُس کی مرضی ہوتی ہے، اتنا ہی وہ علم سے نوازتا ہے اور جب تک وہ چاہے اُس وقت تک باقی رکھے اور جب وہ چاہے اُسے سلب کر لے۔لہٰذا کسی کو علمی پندار بھی پیدا ہونا غلطی ہے۔ وہ جو کچھ بھی ہے عطیہ غیر ہے۔اپنا کچھ نہیں ہے۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝

''ہرگز نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے کہ وہ اپنے کو بے نیاز سمجھتا ہے، حالاں کہ یقیناً تمہارے پروردگار ہی کی طرف پلٹنا ہے''۔

انسان کو اس مرکز فیض وکرم کو یاد رکھنا چاہیے مگر ہرگز نہیں، وہ اسے یاد نہیں رکھتا بلکہ بھول جاتا ہے اور اپنے کو جس جس چیز پر اسے ناز ہے ،خواہ علم پر ہو یا دولت پر اسے وہ اپنی ملکیت سمجھ کر اس سے اپنے کو بے نیاز سمجھتا ہے، اس لیے اس کے مقابلے میں سرکشی سے کام لیتا ہے جب کہ اب بھی پورا سلسلہ اسباب کا اسی کے ہاتھ میں ہے اور ہر پھر کر ہر نعمت اسی کی طرف راجع ہے اور خود اس آدمی کو بھی پلٹ کر اسی کے پاس جانا ہے۔یہ تمہید ہے اس سرکشانہ طرز عمل کے بیان کی جو ابھی سامنے آئے گا۔انسان بجائے اس کی کہ وہ اللہ کو یاد کرے اس کے یاد کرنے والے کی یاد سے روکتا بھی ہے۔

اَرَءَيْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی ۙ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ؕ﴿۱۰﴾ اَرَءَیْتَ اِنْ كَانَ عَلَی الْهُدٰۤی ۙ﴿۱۱﴾ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی ؕ﴿۱۲﴾ اَرَءَیْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ؕ﴿۱۳﴾ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ؕ﴿۱۴﴾

''کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو منع کرتا ہے ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے، کیا تم نے دیکھا اگر وہ صحیح راستے پر ہے یا پرہیزگاری کی دعوت دیتا ہے، کیا تم نے غور کیا اگر یہ شخص جھٹلاتا ہو اور روگردانی کرتا ہو، کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے''؟

قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی واحد مذکر حاضر کا صیغہ ہے، بعض مفسّرین اُس کا مخاطب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کو قرار دیتے ہیں مگر ہم اسے درست نہیں سمجھتے، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مخاطب غیر معیّن سے خطاب ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسے دیکھنا چاہیے چنانچہ یہاں شروع سے جو کئی دفعہ ''کیا تم نے دیکھا، کیا تم نے دیکھا'' ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ دیکھنے کی بات ہے۔ اب جو ذرا انصاف پسند اور صاحب شعور ہو وہ دیکھے۔

مذکورہ جملوں میں دو ۲ کردار پیش کیے جا رہے ہیں۔ ایک اُس بندے کا جو خاموشی کے ساتھ اپنے پروردگار کی نماز پڑھ رہا ہے، وہ کسی کا کیا بگاڑ رہا ہے جو اسے روکا جائے ''کیا تم نے دیکھا'' یعنی جو ٹھنڈے دل سے دیکھنے سے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ یہ اس کا مستحق نہیں ہے کہ اسے روکا جائے۔ دوسرا کردار اُس شخص کا جو بلاوجہ اُسے روک رہا ہے۔ اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگر یہ بلاوجہ اس سچے کے پیغام کو جھٹلاتا اور اس سے روگردانی کرتا ہے تو کیا اس کا یہ طرزِ عمل درست ہے۔

کیا یہ روکنے والا نہیں جانتا کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس میں جزاؤ سزا کا اعلان مقرّر ہے کہ وہ اس بندے کو جو مظلوم ہے نوازے گا اور اُسے جزا دے گا اور اس ظالم کو بلاوجہ اُسے کارِ نیک سے روک رہا ہے، سزا دے گا۔

روکنے والا شخص ابوجہل تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کعبہ کے پاس نماز پڑھنے سے مانع ہوتا تھا۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِیَةِ ۙ﴿۱۵﴾ نَاصِیَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ﴿۱۶﴾ فَلْیَدْعُ نَادِیَهٗ ۙ﴿۱۷﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ ۙ﴿۱۸﴾ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ة﴿۱۹﴾ السجدة

''ہرگز نہیں، اگر وہ باز نہ آیا تو ہم پیشانی کے بال پکڑ کر اُسے کھینچیں گے، ایسی پیشانی جو دروغ گو اور خطا کار کی پیشانی ہے تو وہ بلائے اپنے مجمع کو، ہم صدا دیں گے اپنے ہرکاروں کو، ہرگز نہیں، اُس کا کہنا نہ مانیے اور سربسجود ہو جائیے اور (اپنے پروردگار کا قرب) حاصل کیجئے''۔

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ جب ابوجہل نماز میں مانع ہوا تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے عذاب خدا سے ڈرایا مگر اُس نے اپنے حمائتیوں کی کثرت کا اعلان کیا کہ تم میرا کیا بنا سکتے ہو میرے اتنے مددگار ہیں، اتنی بڑی جماعت میرا ساتھ دینے والی ہے، اس پر جبّار و قہار پروردگار نے اُس کے چیلنج کا جواب دیا ہے کہ اچھا وہ اپنے حمائتیوں کو بلا لے، ہم اپنے عذاب والے عملے کو بلا لیں گے، پھر دیکھیں اُسے ہمارے عذاب سے کون بچاتا ہے۔ پھر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطمینان دلایا گیا کہ آپ اس کے کہنے میں نہ آئیے، اطمینان کے ساتھ اس طرح نماز پڑھتے رہئے اور اللہ سے تقرّب حاصل کرنے کا جو آپ کا طریقہ ہے اُسے جاری رکھیے۔

فقہ جعفری کے لحاظ سے موجودہ ترتیب قرآن کے لحاظ سے یہ چوتھی جگہ ہے جہاں سجدہ واجب ہے۔ پہلے اکیسویں پارے میں سورۂ الٓمٓ سجدہ میں، پھر چوبیسویں پارے میں سورۂ فصّلت میں جو حٰمٓ سجدہ ہے، پھر ستائیسویں پارے میں سورۂ نجم میں اور پھر آخر میں یہ سورۂ اقرأ کے لفظ اِقترب پر..... باقی سجدے جو معدّد مقامات پر ہیں وہ ہمارے نزدیک مستحب ہیں، واجب نہیں ہیں۔

سُوْرَۃُ الْقَدْرِ

مکیّہ.....۵.....آیات

پہلی ہی آیت میں لفظ القدر جس پر اس سورے کا نام ہوا۔ اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے لیکن زیادہ تر علماء اسے مکی ہی قرار دیتے ہیں، اس میں قرآن مجید کے شب قدر میں نازل ہونے اور اس رات کی قدر و قیمت کی اہمیت کہ اس میں سال کے اندر ہونے والے بہت سے واقعات کے تقدیر الٰہی سے فیصلے ہوتے ہیں اور وہ ایک ہزار مہینوں سے افضل و برتر رات ہے جس میں ملائکہ روح احکام الٰہی لے کر نازل ہوتے ہیں، اور وہ صبح صادق تک مرکز خیر و سلامتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳ تَنَزَّلُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴ سَلٰمٌ ۣ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵

''ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا چیز ہے، شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے فرمان کے موافق ہر حکم کو لے کر اترتے ہیں، وہ سلامتی ہی سلامتی ہے صبح صادق تک''۔

''اُسے'' یہ چیز بلاشبہہ قرآن مجید کی طرف راجع ہے جیسے دوسری جگہ لیلۃ مبارکہ کہا ہے۔ بابرکت رات اور دوسرے پارے میں جس کی تفسیر پہلے ہو چکی ہے زمانۂ تنزیل ماہِ رمضان کو بتایا ہے کہ اس مہینے میں قرآن نازل ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شب قدر ماہ رمضان میں کی کوئی رات ہے، بس اس حد تک تعلّق قرآن سے ہوتا ہے لیکن اس کے آگے کہ وہ رات کونسی ہے؟ یہ قرآن مجید سے پتہ نہیں چلتا، اس کی روایات و احادیث مختلف ہیں جو فریقین کے یہاں موجود ہیں۔ اہل سنّت کے روایات اس بارے میں اتنی کثرت کے ساتھ اختلاف کے حامل ہیں کہ اُن کی بنا پر چالیس ۴۰

قول ہو گئے ہیں، جن میں ترجیح اُن کے یہاں اکثر علماء کے نزدیک ۲۷ رمضان کو ہے۔ شیعہ روایات کی بنا پر زیادہ ترجیح تین راتوں کو ہے۔ اُنیس، اکیس، اور تیئیس لیکن ان روایات میں بھی زیادہ ترجیح اسی آخری قول کو ہے جو تیئیس ۲۳ ماہِ رمضان کے متعلّق ہے، قرآن کے نازل کرنے کا شب قدر میں کیا مطلب ہے؟ اس پر مقدمہ تفسیر میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ چونکہ مسائل آپس میں دست گریباں رہتے ہیں لہٰذا اس کا تعلّق کلام نفس اور خلق قرآن وغیرہ کی بحث سے بھی ہو جاتا ہے اور پھر تاریخی طور پر اس صورت میں جب اس کے معنی یہ لیے جائیں کہ ابتداء نزول قرآن کی اس رات میں ہوئی تو اُس کا اثر واقعہ بعثت پر پڑتا ہے کہ اس میں شیعہ وسنّی اختلاف ہے۔ اہل سنّت اسی شب قدر کو آغاز بعثت بتاتے ہیں اور شیعہ روایات میں ۲۷ رجب عید مبعث مانی جاتی ہے کہ بعثت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظاہری طور پر اس رات کو ہوئی ہے یعنی کہ پہلی مرتبہ فرشتہ وحی لے کر اسی رات کو آیا۔

قدر کے معنی یوں تو قدر و منزلت کے بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ بڑی عظیم القدر رات ہے مگر چونکہ پہلے اُس لیلۂ مبارکہ کے لئے آچکا ہے کہ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ. (الدخان: ۴) ''اس میں ہر بات کا جو حکیمانہ فیصلہ کیا جاتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ تقدیرات کے ایک وسیع احاطہ کے محفوظ رہتے ہوئے جو ازل سے طے ہے اس رات کو کچھ اہم فیصلے ہوتے ہیں۔ اس طرح اُس سے اُس بداء کے مسئلہ کا تعلّق ہو جاتا ہے جو بہت ہی اہم علم کلام کا مسئلہ بن گیا ہے مثلاً کچھ عمروں میں اضافہ اور کچھ عمروں میں کمی اس طرح اور تقدیر کے بہت سے اور فیصلے ہوتے ہیں۔ جو بغیر بداء کو مانے ہوئے سمجھ میں نہیں آسکتے یعنی اگر کسی نے یہ سمجھ لیا کہ ازل میں جو کچھ طے ہو گیا تھا اب خدا اس کا پابند ہے تو یہ غلط ہے تو پھر آخر یہ کون امور ہیں جنہیں کہا گیا ہے کہ شب قدر میں طے پاتی ہیں اور یہی احکام تشریعیہ نہیں، احکام تکوینیہ ہوتے ہیں جن کے احکام لے کر فرشتے اور روح اس شب میں اترتے ہیں اور یہ فجر یعنی صبح صادق تک ہر آفت و بلا سے سلامتی کا ذریعہ ہے بشرطیکہ خود انسان ان احکام پر عمل کرے جو تشریعی طور پر اس کی ذمہ داری سے وابستہ ہیں۔

سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ

مکیّہ.....۸.....آیات

اس سورے کے بھی مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔

نام اس کے ''کھلے ہوئے ثبوت'' کے معنی میں پہلی آیت کا جزء ہے۔ وہ اس کے بعد کے مضامین دونوں ایسے ہیں جو مکّہ اور مدینہ دونوں جگہ کے لئے مشترک حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے اُن سے بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور کھلے ہوئے دلائل کے ساتھ جو اکثر قرآن میں لفظ بیّنہ کے ساتھ معجزات کے معنی میں ہوتے ہیں، اُن کی حقانیت کا اعلان ہے اور آخر میں مومن اور غیر مومن دونوں کے آخری انجام پر سورے کو ختم کیا گیا ہے، یہی انسانوں میں بہتر سے بہتر اور بد سے بدترین حد کا حل ہے جس کے درمیانی درجے بھی اسی اعتبار سے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ﴿۲﴾ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ؕ﴿۳﴾

''اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے کفر اختیار کیا، وہ اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے تھے جب تک کہ ان کی طرف ایک روشن رہنمائی آ نہ جائے، وہ اللہ کا پیغمبر جو اللہ کی طرف کے پاک و پاکیزہ صحیفے پڑھ کر سنائے جس میں بالکل درست تحریریں موجود ہوں''۔

کفر میں تو وہ سب شریک ہیں مگر مشرک کا لقب جب اہل کتاب کے ساتھ الگ سے بولا جائے تو اس سے وہ بت پرست مراد ہوتے ہیں جن کے پاس نام کی بھی کوئی آسمانی کتاب موجود نہ تھی جسے وہ پڑھتے ہوں، یوں وصف کے لحاظ سے اہل کتاب بھی شرک میں مبتلا ہو گئے تھے مگر لفظ مشرکین بحیثیت لقب اُن کے لئے استعمال نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے احکام شرک جو کفر و شرک کی بنا پر ہیں وہ اُن کے لئے بھی ثابت ہیں۔ پھر بھی نام کے لحاظ سے دونوں میں فرق ہے۔ اس لئے احکام فقہیہ میں یہ اجتہادی چیز جزء بن گئی کہ کس حد تک احکام کا تعلّق شرک کے ساتھ بحیثیت لقب کا ہے اور کس حد بحیثیت وصف۔

یہاں اہل کتاب کے لئے جو کافر کے لفظ کا اطلاق ہے، وہ اس اعتبار سے ہے کہ وہ اُن سچائیوں میں سے اکثر سے بھی منحرف ہو گئے تھے جو خود اُن کتابوں میں بھی صحیح صورت پر موجود تھیں، نیز یہ کہ اُن کتابوں میں بھی تحریف کر کے کچھ کا کچھ بنا دیا تھا۔ اُن کا ان گمراہیوں سے چھڑانا ضروری تھا جو ممکن نہیں تھا اُس وقت تک جب تک اللہ کی طرف کی صحیح رہنمائی ایک سچے رسول کے ذریعہ سے پھر اُن کے سامنے نہ آئے، اُس کے لئے خالق نے اپنے اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا جو اُنہیں اُن کی غلطیوں پر متنبّہ کرے۔

کسی نہ کسی قسم کے کفر میں مبتلا وہ سب ہی تھے خواہ اہل کتاب ہوں، خواہ مشرکین اس لئے من اہل الکتاب والمشرکین میں جو من کا لفظ ہے، یہ تبعیض کے لئے نہیں ہے کہ بعض اُن میں سے کفر میں مبتلا ہے اور کچھ نہ تھے بلکہ یہ بیان کے لئے ہے کہ وہ جو کافر ہیں، دو قسم کے لوگ ہیں۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ؕ﴿۴﴾ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ؕ﴿۵﴾

''اور اُن میں کہ نہیں کتاب ملی تھی تفرقہ نہیں پڑا مگر اس کے بعد کہ اُن پاس کھلا ہوا بیان حقیقت کا آ چکا تھا اور انہیں پہلے بھی حکم یہی ہوا تھا کہ وہ بس اللہ کی عبادت کریں اور سب غلط راستوں سے ہٹ کر دین کو اُس کے لئے خالص رکھیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور یہی بالکل صحیح و درست دین ہے''۔

یعنی ہر نبی کا آنا اور ہر کتاب کا نازل کیا جانا اسی لئے رہا ہے کہ خالق کی طرف سے اتمام حجت ہو جائے تا کہ اس کے بعد جو تفرقہ اُن میں پیدا ہو اُس کی ذمہ داری خود اُن پر ہو، خالق کی طرف کی ہدایت میں کوئی کمی نہ رہنے پائے، اب اس کے بعد بھی جو نہ مانیں، اُن کے کفر کا خدا ذمہ

دار نہیں ہے کیوں کہ خدا کو جبری طور سے ہدایت کرنا نہیں ہے بلکہ ہدایت کر کے اُنہیں اختیار کے صرف کا موقع فراہم کرتا ہے اور اسی پر سزا و جزا کی بنیاد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ؕ ۶

''یقیناً اہل کتاب اور مشرکین جو کفر میں مبتلا ہیں دوزخ کی آگ میں ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، یہ لوگ بدترین مخلوق ہیں''۔

''دوزخ کی آگ میں ہیں'' اس کا مطلب عمومی طور پر دوسری آیات قرآن کی روشنی میں یہی ہے کہ یہ ان کا کفر انہیں عذاب دوزخ کا مستحق بنائے ہوئے ہیں جس میں داخل ہونے کے بعد پھر وہاں سے نہیں نکلیں گے ہمیشہ ہمیشہ جلتے رہیں گے اور جو لوگ تجسیم اعمال کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہی کفر اُن کا آگ کے شعلوں کی شکل اختیار کر لے گا جس میں وہ ہمیشہ جلتے رہیں گے اور اس آیت کی روشنی میں استثنائی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسی دنیا میں ایسا عذاب آ جائے جس کا سلسلہ قیامت تک جاری ہے کبھی ختم نہ ہو، یہ وہ ہیں جو اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے ایسے کردار کی منزل پر پہنچ گئے کہ وہ بدتر خلائق ہو گئے۔ اس لئے کہ دوسروں کے نقائص طبعی حیثیت رکھتے ہوئے اُنہیں اس سزا کا حق دار نہیں بناتے اور یہ عقل وشعور اور امتیاز حق و باطل کے لئے عقل رکھتے ہوئے پھر بھی اس پستی کردار میں مبتلا رہے کہ وہ جمادات، نباتات اور حیوانات سے بدتر ہو گئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ؕ ۷ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۸

''بے شک جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے، یہ بہترین مخلوقات ہیں، اُن کا صلہ اُن کے پروردگار کے یہاں وہ بہشت ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، وہ اُن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ سب اس کے لئے ہے جو اللہ سے ڈرتا رہے''۔

خدا سے ڈرتا ہے یعنی ہمیشہ اس کا لحاظ رکھے کہ کوئی بات اللہ کی مرضی کے خلاف نہ ہو، اُس کے اس کردار سے اللہ مطمئن رہے اور یہ اُس کی طرف کے اس صلے سے جو اُس نے اُنہیں دیا ہے، صدق دل سے مطمئن ہیں۔

سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ

مکیّہ.....۸.....آیات

اس میں پہلا ہی لفظ جو اذا زلزلت کی ہے اُس پر سورے کا نام ہو گیا اور مکّی اور مدنی ہونے کا اختلاف اس سورے میں بھی ہے، بر بنائے روایات قوت اسے سمجھی گئی کہ یہ مدنی سورہ ہے اس لئے پیشانی پر یہی لکھا جاتا ہے لیکن مضمون اس کا مکّی ہونے سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے قیامت کی ہولناک کیفیت، اور زمین کے اندر کی چیزوں کا اوپر آجانا یعنی مُردوں کا دوبارہ زندہ ہو کر باہر آجانا اور پھر ذرا بھی عمل خیر کیا ہو، تو اُس کے نتیجہ کا اور جو غلط عمل کیا ہو، اُن کے نتیجہ کا سامنے آجانا جس پر سورہ ختم کیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝۱ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝۲ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝۳ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝۴ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝۵

''جب زمین پورے طور پر ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے تمام بوجھوں کو نکال کر باہر کر دے گی اور آدمی کہے گا کہ یہ اسے کیا ہو گیا ہے، اس دن وہ اپنے اوپر کی تمام خبروں کو بیان کرے گی اس لئے کہ تمہارے پروردگار کا اُسے ایسا حکم ہو گا''۔

قیامت والے زلزلے کے بعض کیفیات قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہوئے ہیں جن سے مجموعۃً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک زلزلہ قیامت کے آنے سے پہلے بطور تمہید ہو گا اور ایک زلزلہ خود قیامت میں ہو گا۔ اس لئے یہاں جو زلزلہ ہے اُسے اکثر یہی سمجھا گیا ہے کہ یہ دوسرے زلزلے کا بیان ہے جس کے لئے پہلے سورۂ انشقاق میں آچکا ہے کہ القت ما فیھا و تخلّت جو کچھ اُس کے اندر تھا سب کو باہر کر دیا اور وہ خالی ہو گیا۔ یہاں کہا جا رہا ہے کہ اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر ڈال دیا۔ اس سے ایسا بھی سمجھا گیا ہے کہ مردے جو دفن ہو چکے تھے وہ سب باہر آگئے اور جو کچھ سونا، چاندی، جواہرات وغیرہ زمین کے اندر تھا وہ سب باہر آگیا جس سے ان انسانوں کو حیرت بھی ہوئی اور اپنی ناکامی کا مزید احساس جزء عذاب کے طور پر کہ یہی وہ دولت تھی جس پر میں جان دیتا تھا اج وہ سب میرے سامنے ہے اور نہ میں اُس سے کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہوں، نہ وہ میرے کسی کام آسکتی ہے۔ اور اس لئے اس حیرت و پریشانی کی صورت اُنہی کے لئے سمجھنا چاہیے جو اس کے منکر تھے۔ اب وہ سب جس کا وہ انکار کرتے تھے، اُن کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اہل ایمان جو سورۂ فجر میں نفس مطمئنہ کا حامل بتایا جا چکا ہے انہیں حیرت وغیرہ کی کیفیت یوں طاری نہ ہونا چاہیے کہ جسے وہ از اوّل صدق دل سے مانتے تھے، وہ سب اُن کی آنکھوں کے سامنے آرہا ہے، نہ اس دولت کو پہلے اُنہوں نے قابل لحاظ سمجھا

۔نہ اب اُن کے لئے کوئی قدر و قیمت رکھتی ہے اور اب اُنہیں اُس کی ضرورت بھی بالکل نہیں کیونکہ خدا کی مستقل نعمت اور کرامت بطور جزاء اُن کے سامنے ہے جس کا ابھی ابھی ذکر آئے گا س۔اسی طرح وہ زمین جو سب کے لئے گزارہ بسر اور فائدوں کا مرکز تھی، اب کافروں کے خلاف بطور گواہ اُن کے کردار کو بیان کر رہی ہے اور مومنین کے حسن عمل کے لئے بطور گواہ اُن کے عمل خیر کے اُن کے کارناموں کو پیش کر رہی ہوگی اور یہ اس لئے کہ وہ سب بے زبان چیزیں جو پہلے خاموش تھیں بحکم خدا آج بول رہی ہیں جیسے خود ان کی زبان جو پہلے کافروں کے ارادے کی پابند تھی، آج ان کی گرفت سے بالکل نکل چکی ہے۔ یہاں بیچ بیچ میں اب بھی کچھ ان کی حسرتوں اور تمناؤں وغیرہ کی شکل میں ان کی ترجمان بنادی جائے گی۔ یہ بھی حقیقت میں خدا ہی کی طرف سے اُن کے عذاب کا ایک جزء ہوگا جیسا کہ زمین کے لئے آخر میں کہا گیا ہے کہ بانّ ربک اوحیٰ لہا اس لئے کہ تمہارے پروردگار نے اُسے ایسا حکم دیا ہوگا۔ یہ حکم وہی کُن کی طرح کا حکم ہے کہ ''ہوجا'' اور وہی ہو رہا ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

''اس دن لوگ جدا جدا اپنی منزل تک پہنچیں گے تا کہ اعمال اپنی آنکھوں سے اُنہیں دکھائے جائیں تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی اُسے بھی دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ بھر بُرائی کی ہوگی اُسے بھی دیکھ لے گا''۔

بظاہر قبروں سے تو ایک ساتھ برآمد ہوں گے لیکن سوال و جواب اور حساب و کتاب وغیرہ سب کے بعد آخری منزل الگ الگ ہے۔اور اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کام کی خواہ اچھا ہو یا برا، ایک وزن ہے، کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو حقیر سمجھ کے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور کسی چھوٹی سے چھوٹی برائی کو عمل میں نہیں لانا چاہیے کیونکہ وہی چھوٹی نیکیاں بڑی نیکی کی شکل اختیار کرتی ہیں اور وہی چھوٹی برائیاں مل کر بہت بڑی برائی بنتی ہے۔تو وہ نیک کام چھوٹا حقیر ہے۔اور نہ یہ بُرا کام چھوٹا سے چھوٹا بے اثر ہے اُس کا نتیجہ بھی آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔

ہاں اہل ایمان کے لئے توبہ و مغفرت کا دروازہ اس سے بند نہیں ہوتا لیکن کفار و منافقین کو اُن کے اصولی اور فروعی دونوں ہی قسم کے افعال و اعمال کی سزا مل کر رہے گی جس سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔

سُوْرَۃُ العٰدِیٰتِ

مکیّہ.....۱۱.....آیات

ہمارے یہاں کی ایک روایت سے جس کی تفصیل قرأت ابراہیم کوفی میں ہے۔اس میں مدنی ہونے کا پتہ چلتا ہے لیکن عام طور پر مفسّرین اُسے مکیّہ قرار دیتے ہیں۔اور عادیات کے معنی دوڑنے والے گھوڑے کے ہیں۔تو یہ میدان جنگ میں جو عام طور سے عربوں کی زندگی کا جزء تھی قسم کے ذریعہ سے اُن کی ضروریاتِ حیات کے لحاظ سے جو اُن کے ماحول کا ضروری جزء تھا مثل آسمان اور زمین کے جن کی قسمیں کھائی گئیں

ہیں قسم کے ذریعہ سے ذہن کو متوجہ کیا گیا ہے اور اُس لحاظ سے اس کا یہ نام ہوا۔ جس کے ساتھ اُن کا اس طرزِ عمل کے نتیجہ کی بے وقعتی کا اظہار کرتے ہوئے اُنہیں آخرت کی فکر کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور منعم حقیقی کو شروع سے لے کر آخر تک اُسے یاد دلا گیا ہے وہ ان نعمتوں کی وقعت سمجھتا ہے اور پھر اس منعم کا تصوّر نہیں کرتا جس نے یہ نعمت عطا کی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ؕ﴿۸﴾

''قسم پھنکارے مارتے ہوئے دوڑنے والے گھوڑوں کی جو (اپنی ٹاپوں کی زد سے) پتھروں سے آگ کی چنگاریاں نکالتے ہیں تو اُس سے غبار اُڑاتے ہیں اور کسی جماعت کے درمیان پہنچ جاتے ہیں، یقیناً انسان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے اور وہ خود اس پر گواہ ہے اور وہ مال و دولت کی محبّت میں بری طرح گرفتار ہے''۔

اگر سورہ مدنی مانا جائے تو مجاہدین کے گھوڑے ہیں جن کی قسم کھائی جارہی ہے مگر جیسا کہ عام طور پر مفسّرین کا فیصلہ ہے جب کہ وہ مکیّہ سورہ ہے اور جہاد بالسّیف کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تو یہ وہی عام طور سے عرب کے گھوڑے مراد ہوں جو اُن کی زندگی کے ہر شعبے میں ان کے مددگار تھے اور اُن سے وہ آس پاس کے قبیلوں پر چھاپے مارتے تھے انہی گھوڑوں کی یہ قسم ہے کہ اُن کے گویا بسر معاش کا ایک لازمی جزء تھا۔ جس سے ان کا برابر ساتھ تھا جیسے عام زندگی کے سفروں میں اونٹ ہوتے تھے، ویسے جنگ کے میدان کا گھوڑے کے ساتھ تعلّق تھا۔ لہٰذا اُن کے ذہن کو اِس کی طرف موڑنے کے لئے اُن کے اس جزو زندگی کو سامنے لاکر اُنہیں بتایا ہے کہ یہ سب کچھ تم اُس مال و دولت کی طلب میں کرتے ہو جس کا ذریعہ تمہارے نزدیک یہی ہے لیکن اس کے ساتھ جو سب سے بڑی بات تمہارے سوچنے کی ہے اُس پر غور نہیں کرتے کہ آخر تمہیں وہ طاقت کہاں سے ملتی ہے جس سے تم اپنے فریق مقابل پر حملہ آور ہوتے ہو تو اُس کے نتیجہ میں جو دولت حاصل ہوتی ہے، اُس کے لئے یہ سوچنا چاہیے کہ اُس کا دینے والا کون ہے اور اُس پر مغرور و سرکش نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں ناشکرے ہونے کے اظہار سے اس حقیقت پر بھی انتباہ ہے کہ یہ طریقہ صرف طاقت کا اس منعم کی نعمت کی ناقدری ہے جس سے کمزوروں کو پامال کی جائے اور امن و امان کو غارت کیا جائے۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۙ﴿۹﴾ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ ۧ﴿۱۱﴾

''تو وہ کیوں نہیں جانتا کہ جب قبروں میں جو کچھ دفن ہے، وہ نکال لیا جائے گا اور سینہ میں جو کچھ چھپا ہوا ہے، یقیناً ان کا پروردگار اُن کے حالات سے باخبر ہے''۔

یعنی وہ مردے بھی جو دفن ہو چکے ہیں، سب باہر آجائیں گے اور دلوں کے اندر جو پوشیدہ ہیں وہ بھی سب ظاہر ہو جائیں گے، اس وقت اُن کے سب اعمال کا جائزہ لیا جائے گا، اور یوں تو خدا پہلے ہی سے اُن سے واقف ہے، وہ خود ان کی اپنے خلاف گواہیاں اور یہ سب آنکھوں کے سامنے لے آیا جائے گا۔ جزا و سزا کی حقّانیت کا ہر پہلو سے ثبوت ہے جو مکمل طور پر قیامت میں سب کے سامنے آجائے گا، ورنہ اللہ کا ذاتی علم اُن کے افعال و اعمال سے متعلّق بجائے خود اُس کی طرف کی سزا ہے۔

سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ

مکیّہ.....۱۱.....آیات

قارعہ قیامت کو کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں عظیم حادثہ، یہی اس سورہ کا نام ہے اور پورا سورہ اس کی کیفیت کا حامل ہے، اس کی ابتدا کا بھی ذکر ہے اور اُس کی انتہا کا بھی جو حسنِ انجام اور بدانجامی کی صورت میں اہل ایمان اور کافروں کے سامنے آنے والی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اَلْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝۴ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝۵ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱

''وہ بڑا حادثہ اور کیا ہے وہ بڑا حادثہ اور تم کیا جانو کہ وہ بڑا حادثہ کیا ہے؟ جس دن سب لوگ مثل منتشر پروانوں کے ہوں گے اور پہاڑ رنگ برنگ کے دھنکے ہوئے اون کے ایسے ہونگے تو جس کے (نیک اعمال کے) پلڑے بھاری ہوں گے وہ اپنے پسندیدہ عیش و آرام میں رہے گا اور جس کے (اعمال کے) پلڑے ہلکے ہوں گے تو گہرا گڑھا اُن کا مرکز رہے گا اور تم کیا جانو وہ کیا ہے۔ وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہوگی''۔

قارعۃ اصل میں دھماکے والی چیز کو کہتے ہیں جس سے دل ہل جائیں، کوئی بڑی آفت و بلا چونکہ ایسی ہی دھمک والی چیز ہوتی ہے، اس لئے اُسے قارعۃ کہتے ہیں اور سب سے بڑی دل ہلا دینے والی مصیبت قیامت کی ہے اس لئے قرآن میں قیامت کے لئے یہ لفظ آیا ہے۔ یوں اس سے کم درجہ کی کوئی آفت اس دنیا کی ہو تو اُسے بھی بعض جگہ قرآن میں قارعۃ کہا گیا ہے مگر قیامت عظیم ترین حادثہ ہے تو وہ سب سے بڑے ''قارعۃ''

کی حیثیت رکھتی ہے جس کا یہاں ذکر ہے۔

''انسان مثل منتشر پروانوں کے پھیلے ہوئے ہوں گے'' چونکہ اس کے ساتھ پہاڑوں کا اُون کی طرح اِدھر اُدھر پراگندہ ہونے کا ذکر ہے، تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ابھی قیامت کے قبل کا تذکرہ ہے جب کہ ابھی سب لوگوں کی موت نہیں آئی ہے تو جن کے سامنے یہ آفت برپا ہے وہ گھبرائے ہوئے اِدھر اُدھر پراگندہ پھر رہے ہیں۔ اب اُس کے برے اعمال خیر کے پلڑے کے بھاری ہونے سے حسن انجام اور پلڑوں کے ہلکے ہونے سے جو بدانجامی کا تذکرہ ہے وہ قیامت آنے کے نتیجہ کا اظہار ہے کہ اب جزاؤ سزا کی منزل سامنے آ گئی ہے۔

یہاں ایک فریق کا انجام جو ''ہمیشہ رَاضِيَةً'' کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے اس میں باعتبار مراتب بہت درجے ہیں اور مقابل فریق کے لئے جس بدانجامی کا ذکر ہے اُس میں بھی بہت طبقے ہیں جو الگ ہیں۔ ان کے درمیانی منزلوں کا اظہار یہاں نہیں کیا گیا ہے۔

سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ

مکیّہ.....۸.....آیات

پہلی ہی آیت میں ''التکاثر'' کا لفظ ہے جس پر اس سورے کا نام ہوا۔

اس میں انسان کی ہوس جو مال و اولاد وغیرہ کی کثرت میں اندھا دھند استعمال سے وابستہ ہے اُس کی مذمّت اور اُس کے نتیجہ میں جو تباہی اور بربادی انسان کے سامنے آنا ہے اُسی پر اُس کی بیداری کا سامان فراہم کرنا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ﴿۴﴾ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ؕ﴿۵﴾ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ﴿۶﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ﴿۷﴾ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۧ﴿۸﴾

''تم لوگوں کو مدہوش بنا رکھا ہے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی فکر نے یہاں تک کہ اسی فکر میں تم قبروں تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں جلد ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا پھر (سمجھ لو کہ) عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں، اگر تم یقینی طور پر انجام سے واقف ہوتے (تو ایسا نہ کرتے) ضرور ضرور تمہیں دوزخ کا

سامنا ہوگا، پھر تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلب ہوگا''۔

تکاثر میں کثرت حاصل کرنے کی فکر میں اندھا دھند سرگرمی بھی ہے اور پھر اُس پر سرمایۂ فخر بنا کر ایک دوسرے کے مقابلہ میں پیش کرنا بھی ہے۔ جس کے لئے ایک روایت ہے کہ عرب دو قبیلوں میں آپس میں جو بخشم بحثا ہوئی تو اپنے کارناموں کو اپنی کثرت مال و اولاد اور قبیلہ کو پیش کرتے کرتے وہ قبرستان بھی چلے گئے اور وہاں قبروں کا شمار کر کے بھی پیش کرنے لگے۔ مگر قرآن اس سب کے انجام پر توجہ دلاتے ہوئے لازمی فراض سے غفلت کی وجہ سے اُس دوزخ کو یاد دلا رہا ہے جس کا انہیں سامنا کرنا ہے اور وہاں ان نعمتوں کے شمار کے ساتھ اُن کے استعمال کے متعلّق جواب طلب ہوگا کہ تم بس زیادتی حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہے اور اُن کے استعمال میں جو فرائض عائد تھے اُس کا خیال نہ کیا، اُس کے نتیجہ میں اب یہ جہنّم کی سزا بھی بھگتنا ہے۔

سُوْرَةُ الْعَصْرِ

مکیّہ.....۳.....آیات

عصر کی قسم سے آغاز ہے، اس لئے یہی نام ہے۔

اس میں انسان کی فلاح و نجاح کا معیار اور اُس کے مقابل کے بڑے خسارے کا اظہار ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝٢ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣

''قسم زمانے کی یقیناً انسان خسارے میں ہے سوا اُن کے جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کرتے رہیں اور ایک دوسرے کو حق کی ہدایت اور صبر و تحمّل کی تلقین کرتے رہیں''۔

اگر قسم اظہار شرف کے لئے ہو تو یہ الف لام عہد کا ہوگا جس سے اشارہ خاص کی طرف ہوتا ہے یعنی اس دور زمانہ کی قسم اور یہ وہ زمانۂ خاص ہے جو اُس کے حیثیت سے تعلّق خاص رکھتا ہے تو اُس شہر کی قسم کھائی جو اُس کا ظرف مکان تھا، ویسے ہی اُس ظرف زمان کی جو اُس سے مفتخر و مشرّف ہے اور اگر قسم بعد والے مطلب کے لئے ثبوت کے طور پر ہے تو مطلب یہ ہے کہ خود زمانہ اُس نقص کے اظہار کے لئے کافی ہے جواب بیان ہو رہا ہے۔ یہ نقص ممکن الوجود یعنی مخلوق ہونے والی ذاتی کمی نہیں ہے جو واجب الوجود یعنی ذات الٰہی کے علاوہ ہر شے کو حاوی ہے مگر یہ تجارت کی اصطلاح ہے کہ جب کاروبار کے سلسلہ میں جتنا تھا، اُس سے اضافہ ہو جائے تو اُسے ربح کہتے ہیں جیسے قرآن میں ہے فما ربحت تجارتھم اور جب

کمی ہوجائے اور جو پونجی تھی وہ نابود یا کالعدم ہوجائے تو اُسے اُردو میں گھاٹا، فارسی میں زیاں اور عربی میں خسر کہتے ہیں جس سے اُردو میں لفظ خسارے کی ہوئی۔ اور عربی میں بھی خسر کے علاوہ خسار کا لفظ مستعمل ہے اور اسی لئے اس خسارے کے امتیازی طور پر انسان کے لئے بتایا گیا ہے کیوں کہ انسان کے علاوہ کوئی دوسری مخلوق اتنی لچکدار نہیں ہے جس میں ترقی اور تنزّل کے اتنے امکانات ہوں جتنے انسان میں ہیں کہ وہ بد سے بدتر بھی بن سکتا ہو اور بہتر سے بہتر بھی اپنے اس جوہر اختیار کے صحیح وغلط استعمال سے جس کا وہ حامل ہے اس لئے اُسے کہا گیا ہے کہ وہ خسارے میں ہے۔ اگر کلام الٰہی اتنے پر ختم ہوجاتا تو یہ مطلب نکلتا کہ سب ہی خسارے میں ہیں مگر جب کلام آگے بڑھایا اور الّا کے ذریعہ سے استثناء ہوگیا تو اب یہ تھا کہ اگر یہ اوصاف موجود ہوں، جن کا بعد میں ذکر ہے، تو وہ نفع میں ہے اور خسارے سے بری ہے لیکن اگر یہ اوصاف موجود نہ ہوں تو وہ اس خسارے میں ہے جس کا عام طور پر اُس کے لئے اظہار کیا گیا ہے۔ یہ چار ۴ وصف حسب ذیل ہیں۔

پہلے ایمان جس کے معنی اُن حقیقتوں کو تسلیم کرنا جنہیں دین پیش کرتا ہے اور جن سے انسان دنیا وآخرت کی کامیابی مضمر ہے اور دوسرے عمل صالح یعنی اُن حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے عملی تقاضوں کو پورا کرنا ہے اور چونکہ خدا کی ہر نعمت، اُسے ایک میں محدود ہو کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ اُس کا فیض دوسروں تک پہنچانا چاہیے، اس لئے ایمان جب متعدی غیر کی طرف ہوا تو اُس کا اظہار تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ. کی لفظوں سے ہوا اور عمل صالح دوسروں تک متعدی ہونے کے لئے تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. کی لفظیں ہیں کیونکہ صبر کے معنی خاموشی کے ساتھ حربوں کی برداشت کرنے کے نہیں ہیں بلکہ اس میں فرائض کی پوری دنیا سمٹی ہوئی ہے یعنی اُس جادے پر ثابت قدم رہنا جس پر اُسے چلنا چاہیے، چاہے کتنی ہی ناگواریاں سامنے آئیں۔ اس لئے علماء نے کہا ہے کہ صبر کی دو قسمیں ہیں۔

ایک صبر عن المحبوب یعنی گوارۂ طبع اور پسندیدہ چیز کے چھوٹنے پر صبر اور دوسرے صبر علی المکروہ یعنی ناپسند بات کے اختیار پر صبر۔ پہلے میں تمام حرام باتوں کا ترک داخل ہے اور دوسرے میں تمام واجبات کا مثبت طور پر عمل میں لانا یہی دونوں شعبے مل کر عمل صالح ہوتے ہیں اور انہی کی دوسروں کو دعوت دینے کا نام تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. کا مصداق ہے۔

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ

مکیّہ.....۹.....آیات

پہلی ہی آیت کی ایک لفظ پر اس کا نام ہوا۔ اور یہ دوسروں پر چشمک زنی اور اُن کے عیوب کو بیان کر کے اُن کی توہین وتذلیل اور پھر اپنے مال ودولت پر فخر وغرور وغیرہ ایسی برائیوں پر جو عرب میں بہت زیادہ رائج تھیں متنبہ کر کے اُس کے نتیجے کی یاددہانی کے لئے اُتری ہے اس لئے اُس کو نام میں بھی پیش نظر رکھا گیا ہے اور وہی اس سورے کا موضوع بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝١ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝٢ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝٣ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝٤ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝٥ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝٦ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝٧ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۝٨ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝٩

''وائے ہو ہر اُس شخص کے لئے جو طعن و تشنیع کرنے والا لوگوں کی برائیوں کو اچھالنے والا ہو جس نے مال جمع کیا اور اُسے گن گن کر رکھا، کیا وہ سمجھتا ہے کہ اُس کے مال نے اُسے ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی دے دی۔ ہرگز نہیں، وہ چورا چورا کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا اور تم کیا جانو کہ وہ چورا چورا کر دینے والی جگہ کیا ہے؟ اللہ کی خاص بھڑکتی ہوئی آگ جو دلوں تک پہنچے گی، وہ اُن پر چاروں طرف سے ڈھاک کر بند کر دی جائے گی، لمبے لمبے ستونوں کے احاطے میں''۔

دوسروں کی توہین و تذلیل کی بہت صورتیں ہوتی ہیں۔ منہ پر بھی طعن کرنا، اشاروں، کنایوں سے اور ہاتھوں اور بھوؤں اور آنکھوں کے اشاروں سے اُن کی توہین و تذلیل کرنا اور پیٹھ پیچھے بھی اُن کی برائیوں کو اچھالنا۔ یہ سب ہی ان دونوں لفظوں میں (**همزة لمزة**) مضمر ہیں، اسی کی ایک شکل پھبتیاں کسنا ہوتی ہیں جو اکثر شہرتِ عام حاصل کر کے اُس شخص کی مستقل توہین و تذلیل کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ یہ سب باتیں اُس وقت بھی رائج تھیں اور اب بھی کم و بیش ہر معاشرہ میں پائی جاتی ہیں اور مال دنیا کی ہوس اور اُس کی طرح طرح سے حفاظت کی فکر اور برابر اعداد شمار کا محفوظ رکھنا کہ اس میں اضافہ ہوتا رہے جیسے کہ وہ اس دنیا میں ہمیشہ رہے گا اور یہ مال بھی اُس کے پاس ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہے گا حالانکہ چونکہ یہ سب واجب الادا فرائض کی فکر سے غافل رہتے ہوئے اور اُن کو نظر انداز کرتے ہوئے ہے تو نتیجہ میں ایسی ایسی بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں میں اُسے جلنا ہے جسے اُس کی ہولناکی کو دکھلانے ہی کے لئے اُس کی خاص نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے جس آگ کا اور اُس کا تمہیں مشاہدہ ہوا کرتا ہے وہ تو آدمیوں کی بھڑکائی ہوئی آگ ہوتی ہے۔ اور وہ آگ خاص اللہ کی بھڑکائی ہوئی ہے جسے امیر المؤمنینؑ نے ایک محل پر ایسا فرمایا ہے کہ **ستر جر ها الجبار لغضبه** ''اُسے جبّار و قہّار خدا نے اپنے خاص غضب نازل کرنے ہی کے لئے بھڑکایا ہے تو اُس کی شدّت قوت کا اندازہ اس دنیا کی آگ سے کہاں کیا جا سکتا ہے۔ وہ چاروں طرف سے اُنہیں ایسا گھیرے میں لئے ہوگی کہ ہر طرف سے بند ہوگی، کہیں باہر کی طرف نکلنے کے لئے دروازہ کیسا روزن بھی نہ ہوگا۔

اب یہ لمبے ستون خواہ اُس احاطے کے سمجھے جائیں جو اُنہیں گھیرے ہوئے ہے اور خواہ جیسا کہ بعض نے سمجھا ہے اُس آگ کے لمبے لمبے شعلے ہوں جو انہیں چاروں طرف سے گیرے ہوئے ہیں؟

یہ آگ دلوں تک پہنچتی ہے۔ اپنی حرارت اور طپش کے ساتھ بھی اور اس ضمیر کی کرب و اذیت کے ساتھ بھی جو اپنے جرائم کے احساس کی وجہ سے انہیں مستقل طور پر ہے جسے ایک جگہ کہا گیا ہے: اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ. (الحاقة: ۵۰) ''وہ کافروں کے لئے مستقل حسرت و ناکامی کے احساس کا ہنگام ہوگا''۔

سُوْرَةُ الْفِيْلِ

مکیّہ.....۵.....آیات

چونکہ اس میں خانۂ کعبہ پر جو ہاتھیوں کے ساتھ حملہ ہوا تھا، اُس سے جو خانۂ کعبہ کی خدا نے حفاظت کی اُس کا اظہار ہے اور وہی اس سورے کا موضوع ہے اور اُس پر اس کا نام ہوا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝۲ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝۳ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝۴ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝۵

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اُس نے اُن کی ترکیب کو بے کار نہیں کر دیا اور اُن پر غول پر غول پرندوں کے بھیج دیئے جو اُن پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے، تو اُنہیں ایسا کر دیا جیسے مویشیوں کا کھایا ہوا بھوسا ہو''۔

باوجود یہ کہ کعبہ میں ۳۶۰ بُت تھے مگر اُس موقع پر کسی نے اُن بتوں سے فریاد نہیں کی، جناب عبدالمطلبؑ کی سرکردگی میں جتنی دعائیں مانگی گئیں، سب اللہ سے مانگی گئیں اور پھر انجام سامنے آیا اور وہ سخت حملہ جو ابرہہ کی سرکردگی میں کعبہ کے ڈھانے کے لئے ہوا تھا اس قدرتی انتظام سے ناکام ہوا اور وہ پوری جماعت تباہ و برباد ہوئی تو اس پر جو اشعار کہے گئے ان میں بھی اس کارنامہ کو اللہ ہی کی قدرت کا کرشمہ قرار دیا گیا تو اس لئے اس واقعہ کو یاد دلا کر اُنہیں یہ سمجھایا ہے کہ پھر ان بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو، اُس خدا کی عبادت کیوں نہیں کرتے جسے حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیش کر رہے ہیں جسے ابھی سورۂ قریش میں نمایاں کر دیا جائے گا جو اس سورۂ فیل کے مضمون سے اتنا قریبی تعلّق رکھتا ہے اس لئے بعض صحابہ کے مرتّب کردہ قرآن میں جس کے موافق ہمارے یہاں کے بعض روایات بھی ہیں کہ وہ دونوں ایک ہی سورہ کے جزء مانے گئے ہیں۔

چونکہ یہ ہاتھیوں والا واقعہ مکّہ کے لئے بہت قریبی تاریخ کا ایک بڑا جزء تھا، اس لئے کہ یہ وہی سال تھا جس میں حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور اُس سے عرب کی جنتری گویا مرتّب ہوئی کہ اس سال کا نام عام الفیل ہوا اور اسی سے واقعات کو نسبت دی جانے لگی لہٰذا ''کیا تم نے نہیں دیکھا'' کے الفاظ اس وقت کے بہت سے لوگوں کے لئے چشم دید واقعہ کی یاد دہانی کی حیثیت رکھتے تھے اور خواہ لفظی حیثیت سے

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب ہوں لیکن اُن میں سے ہر ایک ان کا اصلی مخاطب ہوسکتا تھا۔ اس لئے دوسری اُمتوں پر عذاب کے واقعات قرآن مجید میں متعدّد مقامات پر بیان ہوئے ہیں لیکن اس واقعہ کا یہ مختصر تذکرہ صرف یہاں ہے اور کسی مقام پر نہیں ہے اور یہاں بھی اُس کے تفصیلات بیان نہیں ہوئے ہیں کہ وہ اں کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھے۔

یمن پر پہلے یہودیوں کا اقتدار تھا تو اُنہوں نے وہاں کے عیسائیوں کے ساتھ تشدّد کیا اور بہت ظلم وستم کے ساتھ اُن کو ختم کیا۔ اُن سے انتقام لینے کے لئے حبش اور روم کے باہمی تعاون سے جہاں عیسائی برسر اقتدار تھے ملک حبش سے فوج گئی تھی۔ اُس نے اُن یہودیوں کی قوت کا خاتمہ کر کے اپنا تسلّط قائم کیا۔

اُس وقت سے یمن عیسائیوں کا مرکز اقتدار ہوگیا اور انہی میں ابرہہ جو اُس فوج کے ایک معمولی خدمت گار کے طور پر آیا تھا رفتہ رفتہ یمن میں ایک بڑی طاقت کی حیثیت اختیار کر گیا جیسے کہ وہ وہاں کا خودمختار بادشاہ ہے۔ حالانکہ برائے نام تو ویسے بادشاہ حبش کا نام کہتا تھا مگر عملاً اب وہی حکمران ہوگیا تھا۔ اُس نے یمن کے دارالسلطنت صنعا میں ایک عالی شان کلیسا بنوایا اور اُس کلیسا کو تمام عرب کا مرکز بنانے کے لئے اُس نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ مکّہ کے اس عظیم معبد کو جہاں عرب حج کو جاتے ہیں ڈھادے اور اُس کے لئے ۶۰ ہزار فوج کے ساتھ غملہ کر دیا اس میں بارہ ہاتھی اور ایک روایت کے مطابق ۹ ہاتھی تھے، اس لئے اُنہیں اصحاب الفیل کہا گیا ہے۔

راستے میں کچھ عرب قبیلوں نے مقابلہ کی کوشش کی اور وہ شکست کھا گئے اور بعض نے کسی حد تک تعاون کر کے اپنی جان بچائی۔ جناب عبدالمطلبؑ نے اپنے ایمان اور اللہ پر اعتماد کے زور پر اُس سے جا کر بتایا کہ یہ اللہ کا گھر ہے۔ وہ اس کی حفاظت کا ذمّہ دار ہے لہٰذا وہ اپنے اس اقدام سے باز رہے لیکن اُس نے نہ مانا، جناب عبدالمطلبؑ اتمام حجت کر کے واپس آ گئے۔

دوسرے دن ابرہہ مکّہ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا مگر پہلے تو اُس کا خاص ہاتھی جو محمود تھا اور سب سے آگے اُسے رکھا گیا تھا ایک دم بیٹھ گیا اور پیچھے مڑ کر تو وہ دوڑنے لگتا مگر جب آگے کی طرف منہ کر کے اُسے چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ بیٹھ جاتا تھا۔ اور پھر یکا یک کچھ عجیب پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ چونچوں اور پنجوں میں سخت قسم کے مٹی کے پتھر لئے ہوئے آ گئے۔

جنہوں نے ان سنگریزوں کی بارش کر دی جس سے جسم گلنے اور سڑنے لگتا۔ اس فوج کے بہت سے وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے میں جا بجا مر مر کر گرتے رہے اور خود ابرہہ بھی اسی طرح بھاگتے ہوئے ہلاک ہوا۔ یہ پتھر کچھ لوگوں نے اہل مکّہ میں سے پائے اور اُنہیں محفوظ کر لیا مسلمان راویوں میں سے بعض کا بیان تھا کہ اُنہوں نے وہ پتھر دیکھے تھے۔

سُوْرَۃُ قُرَیْشٍ

مکیّہ.....۴.....آیات

چونکہ پہلی آیت ہی میں قبیلۂ قریش کا نام ہے اور سورہ انہی سے متعلّق ہے لہٰذا سورے کا یہی نام ہوا اور یہی اُس کا موضوع ہے۔

چونکہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبیلۂ قریش میں پیدا ہوئے تھے اور اُسی کے بڑے بڑے لوگوں نے آپ کی سب سے زیادہ مخالفت کی اس لئے دعوت اسلامی میں اُنہیں خاص طور پر اُس حقیقت پر توجہ دلانا ضروری تھی جسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیش کر رہے تھے اور چونکہ عرب کی تجارت ان کے ہاتھ میں تھی اور انہوں نے اس سلسلہ میں دوسرے ممالک سے تعلّقات قائم کئے تھی اور ہاتھیوں والے حملے کا مقصد بہت بڑا اس تجارت کو ختم کرانا تھا اس لئے اس سورۂ فیل کے ساتھ جیسا کہ پہلے بیان ہوا اتنا گہرا ہے کہ اس لئے ایک تصور یہ بھی ہے اور بعض ہمارے روایات کے بھی موافق جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ اِن دو سوروں کو حقیقت میں ایک ہی سورے کے دو ۲ جزء مانتے ہوئے متحد قرار دیا گیا ہے لیکن خلیفۂ ثالث جناب عثمان نے جو قرآن لکھوا کر اطراف میں مشتہر کرائے، اُن میں اُن کے درمیان بسم اللہ درج تھی اور دو ۲ سوروں کی طرح لکھے ہوئے تھے اس لئے عموماً وہ دو ۲ ہی سوروں کے شمار میں آئے اور تمام دنیا میں اسی صورت سے مشہور معروف ہیں۔ اگر ہاتھیوں والا حملہ ناکام نہ ہوتا جو بالکل خدا کی قدرت قاہرہ کے ظہور سے ہوا تو یہ اُن کے سفر ختم ہو جاتے جو تجارتی ہوا کرتے تھے اور اس طرح وہ بھوکوں مر جاتے۔ اس قدرتی کاروائی سے اُن کی معاشی زندگی اور اس کا تحفظ ہوا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝١ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝٢ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝٣ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝٤

''چونکہ افراد قریش عادی ہیں، وہ عادی ہیں جاڑے اور گرمی والے سفروں کے تو اُنہیں لازم ہے کہ وہ عبادت کریں اس گھر کے پروردگار کی جس نے اُنہیں بھوک کے بجائے پیٹ بھرنے کا سامان دیا اور اُنہیں بھی خوف و دہشت کے بجائے امن و عافیت عطا کی''۔

یہ دونوں باتیں اس حملہ کے ناکام بنانے سے حاصل ہوئیں جس کی وجہ سے وہ ان سفروں کا جو جاڑوں میں تجارت کے لئے گرم مملک کی طرف اور گرمی میں سرد ملک یعنی شام وغیرہ کی طرف ہوتے تھے۔ نہ یہ راستے ان کے سفروں کے لئے بند ہوئے اور نہ اُن پر حملے کی کسی کو ہمّت ہوئی اور یہ سب اُن کے علم میں اللہ کی طرف سے ہوا جو اس گھر کا مالک ہے اس لئے اُنہیں اُن بتوں کی نہیں بلکہ اسی ذات واحد کی عبادت کرنا چاہیے۔

سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ

مکیّہ.....۷.....آیات

اس سورے میں ماعون کا لفظ بالکل آخر میں ہے جس پر اس کا نام ہوا تحریری طور پر رواج اس سورے میں بھی پیشانی پر مکّی لکھنے کا ہے لیکن اُس کا مضمون زیادہ قوت اسے پیدا کرتا ہے کہ وہ مدنی ہے کیوں کر دکھاوے کی نماز پڑھنے والوں کو جو اکساتے ہوئے آکر جماعت میں نمائشی طور پر شریک ہوئے ہیں سرزنش ہے اور ایسے نمازی مکّہ میں نہ تھے

وہاں کے حالات میں کسی کو نماز پڑھنا ہی مشکل تھا، چہ جائیکہ وہ نماز کا قائل نہ ہو اور پڑھنا نہ چاہتا ہو اور پھر بھی دکھاوے کے لئے آکر نماز پڑھے۔ یہ قسم منافقین کی مدینہ ہی میں پیدا ہوئی تھی جب کہ اسلام کو قوت حاصل ہو گئی تھی، اس لئے وہی اس سے مراد ہو سکتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝١ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝٢ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝٣ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝٤ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝٥ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝٦ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝٧

''کیا تم نے دیکھا اُس کو جو جزاؤ سزا کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہ ہے جو یتیم کو دھکا دیتا ہے اور کسی غریب کو کھانا دینے پر (لوگوں) کو آمادہ نہیں کرتا تو وائے ہے اُن نمازیوں کے لئے اپنی نماز سے بے اعتنائی برتتے ہیں، دکھاوے سے کام لیتے ہیں اور اپنے کو کسی بھی امداد سے روکتے ہیں''۔

''کیا تم نے دیکھا'' یعنی تم جو توجہ سے آنکھیں کھول کر دیکھو تو ایسے لوگ نظر آئیں گے اور اُن کا کردار خود بتائے گا کہ وہ آخرت کے قائل نہیں ہیں اور وہاں کی جزاؤ سزا کو نہیں مانتے۔ اُن کا ایک شعبۂ زندگی کے لحاظ سے یہ عمل ہے کہ یتیم مدد چاہتا ہے تو وہ دھکے دے کر نکالتے ہیں، اور خود کھلانا درکنار، دوسرے کو بھی آمادہ نہیں کرتے کہ وہ غریب کو کھانا کھلائے۔

اور دوسرے شعبۂ حیات یعنی حقوق اللہ کی ادائیگی میں بھی اُن کا یہ عالم ہے کہ نماز سے غفلت برتتے ہیں اور پڑھتے ہیں تو اس طرح کہ اُن کے طرزِ عمل سے یہ نمایاں ہے کہ وہ اُسے کوئی فریضہ نہیں سمجھتے۔

بلکہ ایک بار ہے جو سر سے اُتارنا چاہتے ہیں بلکہ یہ بھی لوگوں کی نظروں کے سامنے کہ وہ اُنہیں تارک الصلوٰۃ نہ سمجھیں، اپنے محل پر تو

اُسے ٹال ہی جاتے ہیں اور پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔

ماعون کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے ساتھ مدد ہے جسے عام طور پر پڑوسی لوگ ایک دوسرے سے مانگ لینا عیب نہیں سمجھتے، کسی وقت نمک نہ ہوا اور پاس والے مکان سے نمک مانگ لیا یا چولہا جلانے کے لئے اور آگ سلگانے کے لئے کسی وقت دیا سلائی نہ ہوئی جس کے لئے پہلے چقماق ہوا کرتا تھا اور اُسے پاس والے مکان سے وقتی طور پر مانگ لیا۔ ان کی تنگ دلی کا یہ عالم ہے کہ ایسی چیزوں کے ساتھ مدد کرنے میں بھی باوجود امکان وہ گریز کرتے ہیں۔

غور کیا جائے تو اس میں دو ۲ گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ ہیں جو کھلم کھلا دین یعنی جزاؤ سزا کے منکر ہیں، لہٰذا اُن کے کردار میں نماز کا ذکر نہیں ہے۔ اور یہ دوسرے وہ ہیں جو بظاہر مسلمان ہو چکے ہیں لیکن دل سے قائل نہیں۔ اُن کے یہاں نماز کی ادائیگی کے ساتھ یہ بے اعتنائی پائی جاتی ہے اور حقوق الناس کی ادائیگی میں بھی یہ عالم ہے۔

سُوْرَۃُ الْکَوْثَرِ

مکیّہ..... ۳.....آیات

کوثر کے جو بھی معنی ہوں جس میں اختلاف ہے جس پر ابھی روشنی ڈالی جائے گی، بہر حال پہلی آیت میں اس کے رسول ﷺ کو عطا ہونے کا اعلان ہے، اس لئے یہ نام ہوا اس کا۔

اور اس سورے میں جو مضمون درج ہے وہ یہی ہے کچھ لوگوں نے پیغمبر خدا ﷺ کی نسبت گستاخانہ طور پر ابتر کی لفظ کہہ دی، اُس کے مقابل میں خالق کی طرف سے رسول ﷺ کو تسلی دی گئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ آج جو آپ کے کام ہیں وہ کرتے رہیے۔ ابتر یہی ہوں گے۔ جو آپ کو کہہ رہے ہیں اور آپ کو تو اللہ نے کوثر عطا کیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝١ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝٢ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝٣

''ہم نے تو آپ کو کثرت نسل عطا کی ہے، تو آپ اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھتے رہیے اور قربانی کرتے رہیے، یقیناً آپ کا دشمن ہی بے اولاد ہوگا''۔

کوثر کے لئے چونکہ روایات میں ہے کہ یہ جنّت کی ایک بڑی نہر ہے جو معراج میں رسول ﷺ کو دکھائی بھی گئی تھی اور مسلمانوں میں بھی کوثر کا چرچا بہت ہے اور کوثر سے سیرابی کا شوق ہے اس لئے پہلی آیت میں جو کوثر کی عطا کا اعلان ہوا ہے، اُس کی تفسیر کے لئے اسی کے

مطابق یہ روایت آ گئی اور یہ آ گئی اور یہ شہرت ہوگئی کہ یہ اسی نہر کے عطا ہونے کا اعلان ہے۔

لیکن حقیقت میں یہ کوثر کی عطا کا اعلان مقابل میں دشمنوں کی زبان سے نکلی ہوئی لفظ ابتر سے ہے جس کو خداوند عالم نے خود اُن کے لئے دہرا دیا ہے اس لئے اس کوثر کے معنی اُسی ابتر کی مناسبت سے اور اُس کے تقابل کے ساتھ لینا چاہیے جس کا اس لفظ سے جوڑ ہو جو حضرتؐ کے لئے اُنہوں نے استعمال کی تھی۔ جہاں تک ہم غور کرتے ہیں کوثر جو نہر ہے، اُس کا کوئی جوڑ اُس ابتر سے نہیں ہوتا جو وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے کہتے تھے۔

ابتر کی لفظ بتر سے ہے جس کے معنی قطع ہونے یعنی کٹنے کے ہیں۔ وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو ابتر کہتے تھے اُس کے لئے کئی روایات میں ہے کہ جب آپ کے فرزند جو بطن جناب خدیجہؑ سے تھے، پے در پے وفات پاتے رہے تو اُن لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ ابتر ہیں ان کا مشن بہت جلد ختم ہو جائے گا یعنی اُن کے نزدیک بھی انسان کے کارنامہ کی بقاء اُس کی اولاد سے وابستہ تھی۔ اس سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیّت ہوئی۔ تو اُس کے مقابل میں اعلان ہوا کہ یہ آپ کو ابتر کہتے ہیں۔

ارے ہم بتاتے ہیں کہ ابتر یہی ہوں گے۔ اُن کی اولاد سب ختم ہو جائے گی اور آپ کو تو اللہ نے کثرت نسل و اولاد عطا کی ہے۔ یہ خالق کی بات نسل جانب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے پوری ہوئی۔ جو ایک طرف قرآن مجید کے اعلان کا زندہ معجزہ ہے جس کا مشاہدہ اقطاع و اطراف عالم میں کیا جا سکتا ہے۔

اور دوسری طرف اولاد جناب فاطمہؑ کے ابنائے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کا ثبوت ہے جو مسلمانوں میں بدنصیبی سے ایک بحث طلب مسئلہ بن گیا اس لئے اُس کے بالمقابل یہ تشریح آ گئی کہ ابتر کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ اپنی قوم سے کٹ کر الگ ہو گئے ہیں اور بے یار و مددگار رہیں، بہت جلدی ختم ہو جائیں گے۔

اُس کے جواب میں کہا گیا کہ نہیں آپ کو تو کثرت اصحاب و تابعین ہم نے عطا کی ہے اور آپ کی جماعت بہت زیادہ ہے۔ یہ خود بے یار و مددگار رہوں گے، اور ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔

بہرحال جیسا کہ پہلے بیان ہوا ابتر کے کسی مفہوم کا جوڑ اُس نہر کوثر سے نہیں ہے۔ جو خداوند عالم نے آپ کو عطا کی ہے۔ یہاں اُسے مراد لینا درست نہیں ہے۔

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ

مکیّہ.....٦.....آیات

اس سورے کی پہلی ہی آیت میں الکافرون لاکر مخالفین سے تخاطب ہے، اس لئے اس سورے کا نام یہ ہوا۔ اس سورے میں مخالفین سے اپنے کسی اصول سے دستبردار ہوکر کسی سمجھوتے سے انکار ہے، چونکہ آپ کے سامنے اُن کی طرف سے یہ تجویز پیش ہورہی تھیں کہ ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں اور ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی پرستش کیجئے، اسی کو دوسری لفظوں میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک سال آپ ہمارے دین کو اختیار کریں اور ایک سال ہم آپ کے دین کو قبول کرلیں اور اُسے برتتے رہیں تو اُن کے خیالات خام کی نفی اور ایسی غلط پیش کشوں کے مسترد کرنے کے لئے یہ سورہ اترا ہے کہ ایسی غلط قسم کی رواداری جو اپنے اصول کو ترک کرکے رواداری نہیں بلکہ دین سے انحراف ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ﴿١﴾ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ﴿٢﴾ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ﴿٣﴾ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ﴿٤﴾ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ؕ﴿٥﴾ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۧ﴿٦﴾

''کہیے اے کافرلوگو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی تم نے عبادت کی ہے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین''۔

چونکہ اس وقت ان لوگوں کے جنھوں نے یہ پیش کش کی تھی کہ کچھ زمانے تک آپ ہمارے معبودوں کی پرستش کیجیے اور کچھ زمانے تک ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں گے۔ مخاطب پیغمبر اکرم ﷺ تھے لہٰذا خالق نے جو کہنے کا حکم دیا ہے اس کے مخاطب بھی رسولؐ ہی ہیں لیکن اصول بہرحال اصول ہے اور اس لیے یہ کہنے پر مامور ہر مسلمان ہے جس کے سامنے ایسی پیش کش ہو۔

صیغہ مضارع عربی میں حال اور استقبال میں مشترک ہوتا ہے اور اسم فاعل اسی سے بنتا ہے اس لیے اس میں بھی دونوں زمانوں کا اشتراک ہے۔ یہاں ان میں سے ہر ایک کو دھرایا گیا ہے، پہلی جگہ اس سے حال مراد ہے۔ اور دوسری جگہ استقبال یعنی نہ اس وقت ایسا ممکن ہے کہ میں تمہارے معبودوں کی عبادت کروں اور نہ آئندہ کبھی ایسا ہونے کی امید رکھو۔ اس طرح ان کی توقع کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا گیا ہے کہ اب

ان کے لیے اپنی اس بات پر اصرار کا دروازہ بند ہو جائے۔ نہ وہ کسی بھی تبدیلی کے ساتھ آئندہ اس طرح کی کوئی متبادل تجویز پیش کریں۔

یہ غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ مشرکین بتوں کے ساتھ ساتھ اللہ کی بھی عبادت کر لیتے تھے اور یہ کیوں کہا گیا کہ تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں عبادت کو قبول کرتا ہوں، اس لیے کہ چاہے نام کو اللہ کی عبادت کو قبول کرتے ہوں مگر اسلام جس طرح خالص عبادت اللہ کی چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ مانا جائے۔ وہ اس کے قائل نہیں ہیں لہٰذا دوسروں میں شامل کر کے اللہ کی عبادت نام کو وہ کرتے بھی تو یہ عبادت نہیں جسے اسلام اللہ کی عبادت قرار دیتا ہے۔

اب یہ امکانی رواداری ہے جو صرف کی گئی کہ نقطہ دین کو دونوں طرف یکساں طور پر استعمال کر دیا گیا ہے کہ ''تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور ہمارے لیے ہمارا دین''۔

حالانکہ حقیقت کے لحاظ سے وہ مشرکین ہی کا عمل ہے جو بے دینی کا مصداق ہے۔ دین نہیں ہے۔

سُوْرَةُ النَّصْرِ

مدنیہ..... ۳.....آیات

اس میں اسلام کی مکمل فتح وظفر کا اعلان پیغمبرؐ اسلام کے مشن کی کامیابی کو بصورت مشاہدہ سامنے کے بیان کے ساتھ آپ کو حمد وشکر الٰہی ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لیے اس کا یہ نام ہے اور یہی مضمون اس سورے کا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳

''جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح وظفر ہو جائے اور آپ دیکھیے کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کے حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجیے اور اس سے بخشش کی دعا مانگیے، بے شک وہ بڑا نظر مرحمت متوجہ کرنے والا ہے''۔

یہ کسی خاص معرکے میں فتح نہیں ہے بلکہ عمر کے پورے کارنامہ کی مکمل فتح ہے جس سے رسولؐ کا مقابلہ میں کسی معرکہ آرائی کی کسی کو ہمت نہ رہے اس لیے مفسرین کا بیان ہے کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والا آخری سورہ ہے۔

فوج در فوج دین الٰہی میں داخل ہوتے تھے یعنی اس کے پہلے انفرادی طور پر دو، دو یا ایک، ایک آدمی آ کر مسلمان ہوتے تھے اور اب

دستے پر دستہ اجتماعی طور پر آتا ہے اور وہ اسلام قبول کرتا ہے اس طرح کہ بظاہر پورے ملک میں اب کوئی ایسا نہیں رہا جس نے دین اسلام قبول نہ کیا ہو اور اللہ کی توحید اور جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت کو نہ مان لیا ہو۔ یہ صورت واقعہ فتح مکّہ کے بعد کی مدت میں حجۃ الوداع تک رونما ہوئی اور اس اپنی کارگزاری کے نتیجہ کو رسول نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا مگر وہ دنیا فتح ہوتی جس کے بعد کسی جشن مسرت منانے کا حکم ہوتا اور اپنی فتح کے نقارے بجانے کی تقریب منعقد کرائی جاتی، یہ دین کی فتح ہے اسلیے تقاضائے عبودیت یہی ہے اور اسی کا حکم دیا جارہا ہے کہ اس پر اللہ کی حمد وثنا اور اس کی یاد میں مزید سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل ہوجانا چاہیے کہ خداوندا تیری ہی ذات ہے جس کی بدولت یہ فتح کا منظر سامنے آیا ہے۔ تو اس خدمت کو قبول فرما اور اس میں مجھ سے جو کوتاہی ہوئی ہو اس کو نظر انداز فرما یقیناً تیری بخشش اور عطا درکار ہے۔

سُوْرَةُ اللَّهَبِ

مکیّہ.....۵.....آیات

چونکہ پہلی ہی آیت میں ابولہب کا نام ہے لہٰذا اُس کے ایک جز ولہب پر اس سورے کا نام ہوگیا اور اُس میں ابولہب کی ایک گستاخی کا جو اُس نے شان رسالتؐ میں کی تھی، خالق کی طرف سے جواب ہے۔ یہی اس سورے کا مضمون ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب فیض پہنچانے والا، بڑا مہربان ہے''

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝١ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝٢ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝٣ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝٤ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝٥

''ٹوٹ گئے ہاتھ ابولہب کے اور وہ ہلاک ہوا، اس کا مال جو اس نے کمایا وہ اس کے بالکل کام نہ آیا، بہت جلد وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا جائے گا اور اس کی عورت بھی جو لکڑیاں لاد کے لانے والی تھی، اس کی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی''

ابولہب پیغمبر ﷺ کا قریب ترین ہمسایہ تھا یعنی صرف ایک دیوار بیچ میں تھی اور اُس کی رفیقۂ حیات ابوسفیان کی بہن اُم جمیل تھی، یہ دونوں حضرتؐ کے لئے بڑے ایذا رساں تھے ہر وقت بحیثیت پڑوسی کے جو انتہائی سخت ایذائیں پہنچاتے تھے، وہ تو پہنچاتے ہی تھی، باہر جب حضرتؐ نکلتے اور لوگوں کو دعوت اسلام دینے جاتے تھے تو یہ ابولہب پیچھے لگ جاتا تھا اور آپ پیغام حق پہنچاتے تو یہ چیختا جاتا کہ یہ شخص جھوٹا ہے، دین سے منحرف ہوگیا ہے اور تم لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اور اس کی بات کبھی نہ ماننا، اجنبی لوگ دریافت کرتے، یہ کون ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کا چچا ہے تو اُن پر اُس کی بات کا بہت اثر پڑتا اور پیغمبر خدا ﷺ کی تبلیغ کے مقصد کو سخت نقصان پہنچتا۔ وہ اُس کی شریک حیات اُم جمیل جو تھی

خاردار جھاڑیاں حضرتؐ کے دروازے پر پھیلا جاتی جس حضرت زخمی ہوں اور آپ کو اذیت پہنچے۔ یہ تھا کہ ابولہب کا اُس کی کنیت کے ساتھ جو نام سے زیادہ مشہور تھی، صراحۃً اس سورے میں نام لیا گیا اور پورا سورہ اسی پر معنون ہوا اور اُس نے دو ایک مرتبہ جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں تبّاً کی لفظ کہی تھی، ایک دفعہ جب کوہ صفا پر حضرتؐ اعلانیہ اپنے پیغام کو سب تک پہنچانے کے لئے تشریف لے گئے تو اور لوگ تو خاموش رہے یا ہنستے ہوئے چلے گئے مگر اُس نے کہا تبّا لک الھٰذا جمعتنا ''ہلاکت ہو تیرے لئے۔ کیا اس لئے تو نے ہم سب کو اکٹھا کیا''؟ اس لفظ کو دو ۲ طرح سے اس کی طرف واپس کر دیا گیا۔ تبت یدا اور پھر تبّ جو بددعا بھی ہو سکتی ہے مگر زیادہ قوّت اس کو ہے کہ وہ مستقبل کی اطلاع ہے جسے یقینی ہونے کی بنا پر ماضی کے صیغے سے ادا کیا گیا ہے کہ سمجھ لو کہ ایسا ہو ہی گیا کہ اُس کے ہاتھ ٹوٹ گئے یعنی وہ بالکل عاجز اور بے بس ہو گیا اور ہلاک ہوا چنانچہ چند ہی سال کے بعد جنگ بدر میں قریش کے بڑے بڑے سرداروں کے اسلام کے مقابلہ میں آ کر قتل ہو جانے سے اُسے ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ ایک ہفتہ سے زیادہ پھر زندہ نہیں رہ سکا اور وہ بھی ایسے سخت موذی اور متعدّی مرض میں مبتلا ہو کر کہ خود اُس کے گھر والوں نے اُس سے دوری اختیار کر لی اور مرنے کے بعد اُس کے دفن کرنے سے بھی پرہیز کیا۔ یہاں تک کہ کئی دن تک بے گور رہنے سے جب اُس کی لاش سڑنے لگی اور بدبو پھیلی تو کچھ مزدوروں کو جو حبشی تھے بلا کر ایک گڑھا بصورت قبر کھود کر بانسوں سے اُس کی لاش کو ڈھکیل کر وہاں تک پہنچایا اور اس طرح سپرد خاک ہوا۔

اُس کی بیوی کو جو اُم جمیل تھی لکڑیوں کو بوجھا لا دکر لانے والی اس کے اُس کردار کے لحاظ سے بھی کہا گیا جو وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا پہنچانے کے لئے اختیار کئے ہوئے تھی اور پھر اس لفظ کو عرب میں لگائی بجھائی کرنے والوں کے لئے بھی کہا جاتا ہے کہ وہ فتنہ کی آگ کو بھڑکا کر گویا اُس کے لئے ایندھن فراہم کرتا ہے۔ گردن کے لئے جید کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں لمبی گردن، یہ واقعہ تھا اور اُس کے گلے میں ایک قیمتی موتیوں کا ہار رہتا تھا تو اُس کے بالمقابل اُس کی سزا کے اعلان میں مونجھ کی رسّی کا نام لیا گیا ہے جو ظاہر میں مونجھ کی ہو گی مگر حقیقت میں وہ دوزخ کی آگ کا ایک جزء ہو گی جو اُس شکل سے اُس کے گلے کا ہار بنی رہے گی اور اُسے مستقل دائمی ایذا پہنچاتی رہے گی۔

سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ

مکیّہ ..... ۴ ..... آیات

لفظ اخلاص اس سورے کے اندر نہیں ہے جس پر اس سورے کا نام ہو بلکہ مضمون اس سورے کا جو ہے اُس کے خلاصہ کو اس سورے کا نام قرار دیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴

’’کہیے کہ وہ اللہ ہے یکتا، اللہ وہ مالک ہے جس سے سب لولگاتے ہیں نہ اُس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد اور کوئی اُس کا برابر دار نہیں ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آکر وقتاً فوقتاً اس طرح کا سوال پیش ہوتا تھا کہ اپنے اللہ کی اصل ونسل بتایئے، وہ کس چیز سے بنا ہے، سونے، چاندی، پیتل یا کاہے سے اور اُس کا خاندان کیا ہے؟ اس کے لئے یہ سورہ نازل کیا گیا ہے کہ جب اس قسم کا سوال پیش ہو تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سورہ پڑھ کر سنادیں۔

چونکہ مشرکین لفظ رحمٰن سے تو اجنبی تھے مگر اللہ کے لفظ سے ان اصنام کے علاوہ جو اُن کے معبود تھے ایک ذات کا تصوّر کرتے تھے۔ تو اس لفظ کے کہنے ہی میں یہ مضمر ہے کہ وہ تمہارے بتوں کی طرح کا کوئی بت ہوتا تو میں بتاتا کہ وہ کاہے سے بنا ہے، کس چیز سے تراشا گیا ہے۔ وہ تو اللہ ہے جسے تم خود ان بتوں کے علاوہ ایک الگ ذات مانتے ہو، تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو کہ وہ کاہے سے بنا ہے اور اُس کے وجود کا اصل مادّہ کیا ہے؟

احد وہ ہے جو ہر حیثیت سے ایک ہے یعنی اُن کاموں میں جو اُس کے ہیں کوئی اُس کا شریک نہیں ہے، وہ تنہا ہے اور ذات میں اُس کی کثرت کا شائبہ نہیں کہ وہ کچھ اجزاء سے مل کر بنا ہو۔ یا اُس کا تجزیہ ہو سکے اور نہ وہ کسی دوسرے کا ہم جنس ہے کہ ذہنی حیثیت سے وہ کسی بات میں دوسروں کے شریک ہو، اور پھر کسی جزء کے لحاظ سے اُسے دوسروں سے امتیاز حاصل ہو۔

وہ یکتا اور بے ہمتا ہے، سب اُسی سے لَو لگاتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سب اُس کے محتاج ہیں اور وہ سب سے بے نیاز ہے۔ سب سے بے نیاز ہونے میں پھر اجزا کی نفی اور مادّہ وجودات سے بری ہونے کا مفہوم نکل آتا ہے جو اُن کے سوالات کا جواب ہے۔

’’اُس کی کوئی اولاد نہیں، نہ وہ کسی کی اولاد ہے‘‘۔ اس سے خاندان کے تصوّر کی نفی ہوگئی اور اس سوال کا جواب کہ اُس کا نسب کیا ہے؟ اگرچہ کھل کر مشرکین نے بھی اللہ کے لئے کوئی باپ تجویز نہیں کیا مگر منطقی طور پر جب اولاد کا تصوّر اُس کی ذات سے وابستہ کرلیا جائے تو ذہن میں یہ تصوّر پیدا ہوتا ہے کہ وہ خود کس کی اولاد ہے۔ اس لئے یہ سوال ہوا، یہ بھی کہ آخر یہ کائنات کا اقتدار کس سے اُس کے ورثہ میں آیا ہے، وہ کس کا وارث ہے اور اُس کا کون وارث ہے۔

لہٰذا صاف الفاظ میں نفی میں دونوں جزء ایک ساتھ کہہ دیئے کہ نہ کوئی اُس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اُس کا کوئی ہمسر ہے یعنی تربیت کائنات اور اُس کے پہلے تخلیق کی منزل میں بھی کوئی دوسرا نہیں جو اُس کے ساتھ شریک ہو یا اُس کے ذات وصفات میں اُس کے مماثل ہو۔ اس طرح آغاز سورہ میں جو بات کہی گئی تھی، اُس کو دوسرے عنوان سے آخر سورہ میں بھی دہرادیا گیا لیکن اوروں کی طرح اُس کے لئے اصل نسل اور کسی مادّہ وصورت کا تلاش کرنا غلط ہے۔

سُوْرَةُ الْفَلَقِ

مکیّہ.....۵.....آیات

یہ اور اُس کے بعد والا سورہ موجودہ ترتیب میں قرآن کا آخری سورہ ہے دونوں معوّذتان بھی کہلاتے ہیں۔اس لئے کہ ان کے مضمون کے لحاظ سے بندہ ان کے ذریعہ سے اپنے کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہے۔اور پہلے سورہ میں چونکہ پہلی آیت میں بربّ الفلق ہے،اس لئے وہ اس نام سے موسوم ہے۔

اہل سنّت کے روایات میں ہے کہ جس طرح حضرتؐ پر طرح طرح کے حملے ہو رہے تھے،اُسی طرح ایک مرتبہ حضرتؐ پر جادو کیا گیا اور اُس کی وجہ سے آپ شدّت کے ساتھ علیل ہو گئے۔اُس کے دفعیہ کے لئے خالق نے یہ سورہ نازل فرما کر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تعلیم دی اور بارشاد ربّانی ان سوروں کے پڑھنے سے حضرتؐ کو مرض سے چھٹکارا حاصل ہوا۔ظاہر ہے اگر معصومینؑ کی طرف سے ان روایات کے خلاف ہمیں کوئی رہنمائی ملی ہوتی تو ہم قوّت کے ساتھ انہیں رد کر سکتے تھے لیکن موجودہ حالت میں ایسا ممکن نہیں ہے،بہرصورت یہ یقینی ہے کہ سحر کا اثر حضرتؐ پر ایسا کبھی نہیں ہوسکتا جس سے فرائض رسالت کو صدمہ پہنچے۔یوں سحر میں ایسی خاصیتوں کا ہونا جیسے دواؤں میں خاصیتیں ہیں نا قابل انکار ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۙ﴿۴﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۧ﴿۵﴾

''کہیے کہ میں پناہ لیتا ہوں صبح کے مالک کی طرف اُس چیز کے شر سے جس کو اُس نے پیدا کیا ہے اور رات کے اندھیرے کے شر سے جب وہ چھا جاتا ہے اور گرھوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے اور حسد رکھنے والے کے حسد سے جب وہ حسد کرے''۔

چونکہ اکثر آفتیں اور بلائیں تاریکی شب میں آتی تھیں اور اُن سے بعد میں پناہ مانگی گئی ہے،اس کی بنا پر جس کی پناہ طلب کی جارہی ہے،اُس کا پہلا وصف قرار دیا گیا ہے کہ وہ سفیدۂ سحری کا مالک ہے اس لئے ان بلاؤں اور مصیبتوں سے بچانے والا وہی ہے اور پھر چونکہ اُس واقعہ میں کہ جس سلسلہ میں یہ سورا اترا ہے،جادو جو برآمد ہوا تھا،وہ یہی تھا کہ گنڈے کی صورت میں گرھیں لگی ہوئی تھیں اور خالق کی طرف سے جبرئیلؑ نے بھی یہی پیغام پہنچایا تھا کہ اس سورے کے ذریعہ سے اس کا دفعیہ کیجئے جس کے لئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو ہدایت کی اور آپ نے ہر گرہ پر اس سورے یا اگر اسی کے ساتھ دوسرا سورہ بھی اترا ہوتا اُس کی بھی ایک ایک آیت دم کی اور ہر ترتیب کے ساتھ ایک گرہ کھلی،اس لئے

پناہ مانگی گئی اُن کے شر سے جو پھونک کر گرہیں لگاتی ہیں، چونکہ زیادہ تر اس قسم کے جادو کی ماہر عورتیں ہی ہوتی تھیں اس لئے جمع مؤنث کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں اور پھر اُس کے ساتھ حسد کرنے والوں کے حسد سے پناہ مانگی ہے، اس لئے کہ وہ ہر طرح سے نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔

سُوْرَةُ النَّاسِ

مکیّہ.....٦.....آیات

چونکہ پہلی ہی آیت میں، بلکہ آخر تک ہر آیت کا اختتام الناس کے لفظ پر ہوا ہے لہٰذا سورے کا یہ نام ہوا، یہ باعتبار مضمون تقریباً تتمّہ ہے پہلے سورے کا۔ اس لئے اکثر دونوں کو ملا کر ایک نام یعنی معوّذتان سے یاد کیا گیا ہے کہ دونوں میں یکساں طور پر ضرر رساں چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کی گئی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے والا بڑا مہربان ہے''

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۙ﴿۴﴾ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۧ﴿۶﴾

''کہیے میں پناہ لیتا ہوں تمام آدمیوں کے پروردگار سے جو تمام آدمیوں پر سلطنت کا مالک ہے جو سب آدمیوں کا خدا ہے، شر سے وسوسے پیدا کرنے والے سے جو بار بار پلٹ پلٹ کر آتا ہے جو لوگوں کے دل سے وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ جنوں میں سے ہو، یا آدمیوں میں سے''۔

ان تمام چیزوں کے شر سے پناہ مانگنے کے بعد جنوں کا ذکر پہلے ہوا اب اس قسم کے نقصان پہنچانے والوں کے شر سے پناہ مانگی جا رہی ہے کہ یہ ہدایت کے راستے میں بڑی رکاوٹ ڈالنے والے ایک مصیبت ہیں۔ ایسے آدمی بھی جو گمراہ ہیں اور گمراہ کرنے والے ہیں اور شیاطین بھی جن کا کام ہی گمراہ کرنا ہے۔ ان سب کی وسوسہ انگیزیوں سے بندہ اپنے کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہے۔

تمام شدہ

علی نقی النقوی ۱۵ ماہ صیام ۱۴۰۷ھ